حُجۃُ الاسلام امام ابُو حامد محمدؒ بن محمدؒ بن محمدؒ غزالیؒ

کی تصنیف

کیمیائے سعادتؒ (فارسی)

کا اُردو ترجمہ

مُترجم

پروفیسر عبدالعزیز جاویدؔ

حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد بن محمد غزالی کی تصنیف

کیمیائے سعادت (فارسی)

کا اردو ترجمہ

از

پروفیسر عبدالعزیز جاوید

نام کتاب	......	کیمیائے سعادت
مصنّف	......	حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد بن محمد بن محمد غزالی
مترجم	......	پروفیسر عبدالعزیز جاوید
کمپوزنگ	......	رئیس نذیر احمد
پروف ریڈر		حافظ محمد ابراہیم حنیف
		ڈاکٹر شفیق احمد۔ اسبق چیرمین شعبۂ اردو
		اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور
		پروفیسر زاہد اختر شاہین، حمیرہ انور
سال اشاعت	......	۲۰۱۳ء
تعداد	......	۱۰۰۰
قیمت	......	اخلاص فی العمل کے عہد کی تجدید و توثیق اور ایفاء

ملنے کا پتہ

۲/ ہسپتال روڈ، رحیم یار خان

انتساب

متداول اردو ترجموں میں موجود محیر العقول بوالعجبیوں

کے نام

جنھوں نے مجھے امام غزالی کی کیمیائے سعادت کے اصل فارسی متن کی راہ سجھائی

حرفِ اعتذار

امام غزالی کی فارسی تصنیف 'کیمیائے سعادت' خود ان کی معرکۃ الآراء عربی تصنیف 'احیاء علوم الدین' کا خلاصہ ہے۔ اس کتاب کے متعدد اردو تراجم ہو چکے ہیں۔ اس وقت جو تراجم متداول ہیں ان میں سے 'اکسیر ہدایت' کے نام سے جو ترجمہ دستیاب ہے وہ مفتی اعظم پاکستان حضرت محمد شفیع صاحب کے نامور صاحبان علم وفضل اخلاف کا پسندیدہ ہے اور انھی کے ادارے 'دارالاشاعت' سے شائع ہوا ہے۔ اس اردو ترجمے کے مترجم جناب فخر الدین صدیقی صاحب ہیں جو علمائے فرنگی محل ایسے نامور اساتذہ کی اولاد میں سے ہیں۔ انھی کے ترجمے کو متذکرۃ الصدر ادارے نے صحیح ترین اور مستند ترین قرار دیا ہے۔ اس لئے راقم الحروف نے جب اکسیرِ ہدایت نام کے اس ترجمے میں بوالعجبیاں دیکھیں تو امام کے اصل فارسی متن کی طرف رجوع کیا۔ کیمیائے سعادت کا یہ متن جناب حسین خدیوجم نام کے ایک ایرانی محقق کا مرتبہ ہے۔ جو تقاہرہ سے حاصل شدہ دو نسخوں پر مبنی ہے جسے چند اور نسخوں کی مدد سے مدوّن کیا گیا ہے، حسین خدیوجم نے امام کے احیاء علوم الدین (عربی) کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا ہے۔ اس لیے ان کے مرتبہ کیمیائے سعادت فارسی کا استناد قوی تر ہو جاتا ہے۔ اکسیرِ ہدایت کے بارے میں ناشران کہتے ہیں کہ یہ صدیقی صاحب کے ترجمے کی فوٹو کاپی ہے۔ پھر ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کی اغلاط بھی اہل علم سے دور کرادی ہیں۔ لہٰذا اب یہ نسخہ صحیح ترین اور مستند ترین ہے۔ لیکن یہ بات کلیۃً صحیح نہیں۔ کیونکہ اب بھی عجیب قسم کی اغلاط اکسیر ہدایت میں موجود ہیں جو امام غزالی کا ہرگز منشاء نہیں۔ خردہ گیری میرا شیوہ نہیں۔ یوں بھی کوئی فرزند آدم خطا سے مبرّا نہیں ہوتا۔ لیکن کیمیائے سعادت چونکہ دینی عقاید و اعمال کا دل انگیز دفتر ہے، لہٰذا اس کو اغلاط سے پاک ہونا چاہئے۔ اس لیے بقول سعدی کہ ؎

چو کاری بے فضولِ من برآید　　مرا رُوی سخن گفتن نشاید
دگر بینم کہ نا بینا و چاہ است　　اگر خاموش بنشینم گناہ است

مشتے نمونہ از خروارے: امام ایک جگہ لکھتے ہیں کہ انسان کی اصل ضرورت صرف تین چیزیں ہیں یعنی روٹی، کپڑا اور مسکن۔ پھر فرماتے ہیں کہ ان کی فراہمی کے لئے بھی تین ہی حرفتوں کی ضرورت ہے۔ وہ ہیں برزیگری، جولاہی و بنائی۔ لیکن اکسیرِ ہدایت میں صدیقی صاحب برزیگری کو زرگری پڑھتے ہیں اور لکھتے ہیں سنار (یعنی زیور سازی) بھلا سنار کو روٹی کی فراہمی سے کیا تعلق ہے۔ برزیگری تو زراعت کو کہتے ہیں۔ یہ کسان ہے جو گندم و جو کاشت و برداشت کرتا ہے۔

اسی طرح ایک اور موقعے پر صدیقی صاحب ترجمہ فرماتے ہیں کہ "تو اگر کسی عالم کو اس بات کی آگاہی حاصل ہو تو اس کو نہایت عزیز جاننا چاہئے۔ اس کی زیارت بھی عبادت ہے اس کے واسطے سب کو چھوڑ دینا چاہئے؟؟؟ (صفحہ نمبر ۴۰۵، سطر نمبر ۶) جب کہ اصل فارسی متن یہ ہے: "پس اگر با کسی آگاہیٔ این معنی بودٔ سخت عزیز تر بود و دیدار وی عبادت بود و ہمہ را بادی تبرک باید کرد" صحیح ترجمہ اس کا یہ ہوتا ہے: پس اگر کوئی اس حقیقت سے آگاہ ہو تو ایسا شخص بہت نادر ہوتا ہے۔ ایسے شخص کی زیارت عبادت ہوگی۔ اس سے سبھی کو برکت حاصل کرنی چاہئے"۔

مترجم نے یہاں بھی غلط خوانی سے 'تِرک' کو ترک پڑھا اور یہ نہیں سوچا کہ یوں لکھنے سے اجتماع نقیضین کا عیب پیدا ہوتا ہے۔ ع بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی ست! ابتدائی صفحات ہی میں ایک موقع پر کیمیائے سعادت فارسی کی اصل عبارت یہ ہے کہ: ''اگر مارا خواب نبودی وکسی مارا حکایت کردی کہ کسی بیوفتد وحرکت نکند و نہ بیند ونہ شنود' امّا بداند کہ فردا چہ خواہد بودن وچوں شنوا و بینا بود' این نمی توانست دانستن''۔

اکسیرِ ہدایت میں صفحہ نمبر ۱۵' سطر نمبر ۹ پر ترجمہ ملاحظہ ہو: ''لوگ اگر ہم سے ذکر کرتے کہ کوئی شخص گر پڑتا ہے اور بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے' نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے نہ جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا''۔

فارسی میں اَمّا کا کلمہ فقط قیدِ استثنا کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔لہٰذا امّا بداند کہ فردا چہ خواہد بودن'' کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ ''لیکن وہ جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا''۔صدیقی صاحب نے اس فقرے کا ترجمہ حقیقت کے برعکس یہ کر دیا ہے کہ ''نہ جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا' تو اَمّا کا یہ نقیب مترجم کا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

کیمیائے سعادت (فارسی) میں فصل کا عنوان ہے: ''تفاوتِ لذتِ دیدار بالذّتِ معرفت'' صفحہ ۵۸۸ سطر نمبر ۲۲: ہمانا کہ گوئی کہ اگر لذتِ دیدار از جنسِ لذتِ معرفت است' این بس لذتی نیست''۔صاحب اکسیرِ ہدایت صفحہ نمبر ۵۹۳ سطر نمبر ۸ پر اس کا ترجمہ یہ لکھتے ہیں: ''اے عزیز شاید تو یہ کہے کہ اگر دیدار کی لذت' لذتِ معرفت کی جنس سے نہ ہو تو وہ لذت ہی نہیں'' امام تو ''از جنس لذتِ معرفت است'' لکھ رہے ہیں اور مترجم لذتِ معرفت کی جنس سے نہ ہو' لکھ رہے ہیں۔

اصل فارسی متن کیمیائے سعادت جلد دوم صفحہ ۲۱ سطر ۵ پر مرقوم ہے کہ: ''سری سقطیؒ گوید' 'چہل سال است تا نفسِ من می خواہد کہ گردہ ای بہ انگبیں فرو برم وبخورم' ہنوز نہ خوردہ ام' صدیقی صاحب' گردہ (کہ اصل میں' گردہ' نان ہے) کو گردو یعنی اخروٹ پڑھتے ہیں اور ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ ''میرا جی چاہتا ہے کہ مغز اخروٹ شہد میں بھگو کر کھاؤں''۔مغز اخروٹ اور شہد کا مجموعہ گویا ویاگرا کا نعم البدل ہے۔ایک زاہد صوفی کے ہاں اس قسم کا خیال یعنی چہ؟

کیمیائے سعادت (فارسی) میں صفحہ نمبر ۹۱ سطر نمبر ۲۰ تا صفحہ نمبر ۹۲ تحریر ہے کہ: ''پس انچہ دیگران را بر مرگ مکشوف خواہد شد' ایشان را اینجا مکشوف شود آنگاہ چوں با خویشتن می آیند وبعالم محسوسات افتند' بیشتر آں باشد کہ ازاں چیزی بریادوی نماندہ بود ولیکن اثری ازاں بادی بماندہ باشد' اگر حقیقتِ بہشت بہ وی نمودہ باشند روح وراحت وشادی ونشاط آں بادی بود' اگر دوزخ بردی عرضہ کردہ باشند کوفتگی و خستگی آں بادی باشد'' اس آخری فقرے کا ترجمہ صدیقی صاحب یہ کرتے ہیں: ''اگر دوزخ کی حقیقت اس کے سامنے پیش کی ہے تو اس کی اداسی اور خستگی اس کے ساتھ باقی رہتی ہے''۔دوزخ کی کوفتگی کا ترجمہ اداسی! نعوذ باللہ من ذالك!

صدیقی صاحب ہی کے ترجمے کو سعید الرحمٰن صاحب علوی نے نئی زبان اردو سے آشنا کیا ہے۔جسے مکتبہ رحمانیہ لاہور والوں نے شائع کیا ہے۔وہ بھی آنکھیں بند کر کے صدیقی صاحب کے ترجمے کی پیروی کرتے ہیں جو غلطی موخر الذکر کے ہاں ہے اُسے بحال رکھتے ہیں جہاں کہیں اپج سے کام لیا ہے مسئلے کو مزید الجھا دیا ہے۔امام غزالی نے ایک جگہ ایک لفظ ''گوژدہ'' استعمال کیا ہے۔صدیقی صاحب اس لفظ سے آشنا نہ تھے انھوں نے اسے کوزہ لکھ دیا ہے لیکن باقی معانی فقرے کے صحیح لکھے ہیں۔علوی صاحب نے کوزہ کو خاک کر دیا ہے اور معنی فقرے کے کچھ کے کچھ کر دیئے ہیں۔

گوژدہ یا گونژدہ دراصل عربی لفظ جُعَل کا فارسی مترادف ہے۔ آج کل اسے متعدد ناموں سے ایرانی یاد کرتے ہیں۔ سرگین خور، سرگین غلطان، زیادہ معروف ہیں۔ انگریزی میں اسے Dung Beetle کہتے ہیں۔ یہ کیڑا عموماً رات کے وقت غلاظت کی گولیاں بناتا ہے، اسے سونگھتا اور کھاتا ہے۔ امام نے پستی کے گڑھے میں گرے ہوئے انسان کو اس سے تشبیہ دی ہے۔

معاملات کے باب میں امام نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "اس قسم کی شرایط بیع کو باطل نہ کریں گی"۔ صدیقی صاحب والے ترجمے میں حرف نفی یعنی نہ رہ گیا ہے جس سے معانی اصل کی بجائے اس کے برعکس ہوگئے ہیں۔

کیمیائے سعادت میں ایک دو اور جگہوں پر نفی و اثبات الٹ پلٹ ہوگئے ہیں

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

یوں صدیقی صاحب والا ترجمہ زبان و بیان کے اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور لایق ستایش ہے۔ کاش اس چاند میں متذکرہ داغ نہ ہوتے۔ سعید الرحمٰن علوی صاحب نے جہاں اپنے مریدانہ مسلک سے انحراف کیا ہے وہاں عجیب طرح کے گل کھلائے ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ غزالی غزالہ میں پیدا ہوئے۔ حالانکہ آج تک کسی نے بھی یہ بات نہیں کی۔ سب اس امر میں ہم نوا ہیں کہ امام طوس کے ایک گاؤں طابراں میں پیدا ہوئے جو بخش نیشاپور کا ایک قریہ ہے۔ غزالی طوسی کی ترکیب اسی طرح کی ہے جیسے کہ خیام نیشاپوری اور فردوسی طوسی کی ہے۔ کلمہ اوّل ان کے پشتینی پیشے کی خبر دیتا ہے تو کلمہ ثانی ان کے مسقط الراس کے معنی کا حامل ہے۔

علوی صاحب نے متن کے ترجمے میں جگہ جگہ توضیحِ مطلب کے لئے اشعار شامل کر دیئے ہیں حالانکہ ان کی جگہ حاشیے میں ہونی چاہئے۔

ترجمے میں اغلاط کے بارے میں ایک گمان یہ ہوسکتا ہے کہ صدیقی صاحب کے زیر ترجمہ نسخہ اس نسخے سے مختلف ہو لیکن اس کا امکان اس لئے نہیں کہ میں نے ترجمہ کرتے وقت محسوس کیا ہے کہ صاحب موصوف کے پیش نظر جو نسخہ رہا ہے وہ ہو بہو اسی استنبولی نسخے کی کاپی ہے جسے حسین خدیوجم نے مرتب کیا ہے۔

حسین خدیوجم نے اپنے مرتب کردہ نسخے کے شروع میں جو مقدمہ تحریر کیا ہے اس میں امام غزالی کی سوانح بہ تفصیل درج کی ہیں اور ان کی تصانیف کی تعداد کے بارے میں اب تک جو تحقیق مشرق و مغرب میں ہوئی ہے اس کا خلاصہ بھی قارئین کی نذر کیا ہے۔ امام کی سوانح حیات سے ثابت ہوتا ہے کہ مقاصد عالیہ کے حصول کے لئے فقط اخلاص اور عزم راسخ کی ضرورت ہے۔ مادی وسائل کا اس امر میں کوئی کردار نہیں۔ کیونکہ ایسے میں توفیقِ ایزدی خود دستگیری کرتی ہے اور سالک کو منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔ ہمارے اس ترجمے میں یہ تحقیق و تنقید پہلی بار اردو خوان حضرات کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ امام کی جدوجہد سے آشنا ہمارے قاری اپنے باطن میں بلند کردار کا انگیزہ پائیں گے اور اس راہِ عمل پر گامزن ہو جائیں گے جس کی نظیر قرون اولیٰ کے ہمارے بزرگوں نے پیش کی تھی۔

احقر العباد

پروفیسر عبدالعزیز جاوید

۱۷/ جون ۲۰۱۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدّمہ

حجت الاسلام' ابوحامد' امام محمد غزالی طوسی' بزرگ مرد جو ۴۵۰ ہجری قمری میں طوس کے ایک گاؤں طابران میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن اور جوانی حصولِ علم اور سیاحت میں صرف ہوئے' یہاں تک کہ آپ چالیس سال کی عمر کی سرحد کو پہنچے تو گونا گوں علوم اسلامی میں اپنے معاصر اہلِ علم و دانش کے سرآمد روزگار قرار پائے اور دنیائے اسلام میں اس امر میں سب کی زبان پر آپ ہی کا نام تھا۔

غزالی نے اپنی عمیق اور پُرمغز تصانیف کے ذریعے قسما قسم علوم اسلامی کے قالب میں تازہ روح پھونک دی۔ تصوف و عرفان' فلسفہ و کلام اور نفسیات و اخلاق میں جدّت پیدا کی۔ آپ ۳۹ سال کے تھے کہ آپ تصفیۂ روح کے لئے اور ارزندہ ترین تصانیف کے لئے خلوت گزین ہوگئے اور دم مرگ تک گمنامی اور گوشہ نشینی میں بسر کی' آخر کار ۵۰۵ ھ میں اپنی پچپن سالہ پُرثمر زندگی کے بعد دنیائے علم کا یہ روشن چراغ اپنے وطن میں گل ہوگیا۔ لیکن آپ کے افکار کی پُرفروغ مشعلیں اپنی گراں قدر کثیر تصانیف کی صورت میں اب بھی باقی ہیں اور اسی طرح فروزاں ہیں اور ان کی آب و تاب جب تک اسلام باقی ہے فارسی اور عربی زبان میں اہل دل کو دینی' اخلاقی' سماجی اور ادبی مسائل کے حل کی راہ دکھاتی رہیں گی۔

زندگی نامۂ غزالی

سال ولادت غزالی: ۴۵۰ ھ ق مطابق بہ ۱۰۵۸ عیسوی۔

آپ کا پورا نام حجۃ الاسلام ابوحامد' محمد بن محمد بن محمد غزالی طوسی ہے۔

غزالی کا اطلاق پیشہ وری پر تھا کہ جو اونی دھاگہ بیچتے تھے' پشم خام تیار کرتے جسے دھنکنے کے بعد پشم کاتنے والی عورتوں کے سپرد کیا جاتا تھا تاکہ کتنے کے بعد برائے فروخت آمادہ ہوجائے۔ یہ پیشہ آج بھی مشہد میں حلاج' ندّاف اور رنخ فروش کے نام سے رائج ہے۔ اس امر کا تذکرہ غزالی نے اپنی کتاب احیاء علوم الدین میں بدین الفاظ کیا ہے: ''واصل بن عطا کو اس لئے غزال کہتے تھے کہ وہ کاتنے والوں کے پاس بیٹھتے تھے اس لئے کہ جب کسی ضعیفہ کو دیکھیں صدقہ اس کو دیں''۔ (۱)

(۱) ترجمۂ احیاء علوم الدین' ربع مہلکات' صفحہ ۶۷۶۔ مرتضیٰ زبیدی: ''اتحاف السادۃ المتقین بہ شرح اسرار احیاء علوم الدین' جلد ۸ صفحہ ۱۸۰' در متن کہن ترجمہ کتاب احیاء نیز غزال بہ معنی ریسمان فروش ضبط شدہ است۔

غزالی کے والد محترم مرد پرہیزگار اور صوفی مسلک تھے۔ جو طوس کے شہر میں غزالی یا نخ پشم فروشی کا کاروبار کرتے تھے۔ جب ان صوفی مسلک کا وقتِ وفات قریب آ پہنچا تو آپ نے اپنے دو بیٹوں محمد اور احمد کو مختصر اندوختے کے ساتھ اپنے ہم مسلک دوستوں میں سے ایک کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ ''چونکہ میں نے لکھنے پڑھنے کے ہنر سے محرومی کے باعث بہت رنج اٹھایا ہے میری آرزو یہ ہے کہ میرے یہ فرزند اس ہنر سے بہرہ ور ہوں''۔

آغازِ یتیمی: (احتمالاً ۴۵۷ھ ق مطابق بہ ۱۰۶۵ عیسوی)

اب دو لڑکوں (محمد و احمد) کے یتیم ہونے کے بعد نیکو کار وصی ان کی تربیت میں لگ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے والد کی مختصر میراث تمام ہو جاتی ہے اور خود یہ صوفی وصی ان کی کفالت سے عاجز آ جاتا ہے تو اس وقت وہ نہایت اخلاص کے ساتھ ان دونوں کے سامنے تجویز کرتا ہے کہ زندگی کی گذران اور تحصیل علم کو جاری رکھنے کے لئے مدارسِ دینی میں سے کسی ایک مدرسہ میں وظیفہ خوار طالب علموں کے گروہ میں شامل ہو جائیں۔ تو ان دونوں نے ناچار اس کی تجویز کو قبول کر لیا۔ ابو حامد محمد غزالی کی یہ بات کہ: ''میں نے علم غیر خدا کے لئے پڑھا لیکن خود علم نے ماسوا اللہ کو قبول نہ کیا'' ہو سکتا ہے اسی حقیقت کی موید ہو۔

آپ کا مدرسہ میں داخل ہونا (۴۶۳ھ ق ۱۰۷۰ عیسوی):

یہ تاریخ بھی تقریبی ہے یعنی ممکن ہے کہ اس تاریخ سے ایک دو سال قبل آپ وظیفہ خوار طالب علموں میں شامل ہو گئے ہوں۔ کیونکہ خود آپ نے ایک خط میں جو آپ نے شاہِ سلجوقی کو لکھا ہے وہ اس راز سے یوں پردہ اٹھاتا ہے:

> ''آپ کو علم ہو گا کہ اس داعی نے زندگی کی ۵۳ سال بتا دئے ہیں۔ چالیس برس علوم دین کے سمندر میں غواصی کی ہے حتیٰ کہ اب یہ عالم ہے کہ اب اس کی بات اہل زمانہ میں سے بیشتر کے فہم سے بالاتر ہے۔ بیس سال سلطان شہید (ملک شاہ) کے زمانے میں گذارے اور ان سے اصفہان اور بغداد میں نہایت خوش اقبالیاں دیکھیں اور کئی دفعہ سلطان اور امیر المؤمنین کے درمیان عظیم امور میں سفارت انجام دی....''(۱)

غزالی کے اس قول کو کہ آپ نے ''چالیس برس سال علوم دین میں غوّاصی کی ہے'' قبول کر لیں تو آپ کا علمائے دین کے گروہ میں داخل ہو جانے کا زمانہ ۱۳ سال کی عمر میں مسلّم ہو جاتا ہے۔ یعنی اس عمر میں آپ گویا دانش اندوزی کے مقدمات کار کو حاصل کر چکے تھے۔

دینی مدرسہ میں جب آپ زندگانی کی معمولی حاجات کی فراہمی سے بہرہ ور ہو گئے تو آسودہ دلی اور امید فراوان کے ساتھ آپ نے دل کتاب کے سپرد کیا اور کان استاد کی بات کی نذر کر دیئے۔ یہاں تک کہ علم فقہ سیکھنے کے لئے استعداد پیدا کر لی جس کی بناء پر اپنے اوّلین استاد احمد بن محمد رادکانی کے اچھے شاگردوں کی صف میں جگہ پالی۔

طوسی میں غزالی کی طالب علمی کا زمانہ بعض قرائن کی بناء پر اندازاً پانچ سال کے قریب تھا۔ یعنی جس وقت وہ شہر

---

(۱) غزالی = مکاتیب فارسی تصحیح عباس اقبال آشتیانی صفحہ ۴

طوس سے جرجان[1] کی راہ لیتے ہیں تا کہ اپنے استاد دوم یعنی ابوالقاسم اسمٰعیلی جرجانی کے محضر سے بہرہ ور ہوں۔ احتمالاً اٹھارہ انیس برس کے نوجوان ہوں گے۔

حصولِ علم کے لئے طوس سے جرجان کی طرف غزالی کا یہ سفر بلاتردید اولین سفر تھا۔ لیکن موجودہ مآخذ سے یہ بات روشن نہیں ہوتی کہ اس سفر کے آغاز میں غزالی کی عمر کیا تھی۔ اگر فرض کریں کہ اٹھارہ انیس برس کی عمر میں وہ اس سفر پر نکلے تھے تو احتمالاً آپ کے جانے آنے اور وہاں قیام کی مدت دو برس کے قریب ٹھہرتی ہے۔ یہ تخمینہ اس حکایت کے ساتھ جو امام اسعد میہنہ ای نے غزالی سے روایت کی ہے ایک حد تک ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ امام اسعد کہتے ہیں:

> ''میں نے ابوحامد محمد غزالی سے سنا کہ آپ نے فرمایا: ''جرجان سے لوٹتے ہوئے میں عیاران راہزن سے دوچار رہا۔ عیاروں نے جو کچھ میرے پاس تھا لے لیا۔ میں اپنے تعلیقوں (جزوہ ہائے یادداشتِ درسی) کے واپس لینے کے لئے عیاروں کے پیچھے گیا اور اصرار کیا، عیاروں کے سردار نے جب مجھے مصر دیکھا تو کہا کہ ''لوٹ جاورنہ مارا جائے گا'' میں نے اسے کہا کہ میں تمھیں اس فرد کی قسم دیتا ہوں جس سے آپ امن کی توقع رکھتے ہیں کہ مجھے صرف تعلیقوں کا تھیلا لوٹا دو کیونکہ وہ آپ کے تو کسی کام کا ہے نہیں۔ عیار نے پوچھا کہ یہ تیرے تعلیقے کیا بلا ہیں؟ میں نے کہا اس تھیلے میں یادداشتیں نیز دست نوشتیں ہیں جن کے سننے، لکھنے اور ان کے جاننے سے میں نے رنجِ سفر اور مشکلات کو اپنے اوپر ہموار کیا ہے''۔ عیاروں کا سردار قہقہہ مار کر کہنے لگا ''تو کیسے ان کے علم کا دعویٰ کرتا ہے درآں حالیکہ وہ تجھ سے لے لی جائیں تو تیرا علم بھی جاتا رہے۔ اور تم بے علم ہو جاؤ''؟ پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ میرا تھیلا واپس دے دیں''۔

غزالی کہتے ہیں کہ ''یہ عیار گویا ملامت گر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی زبان کھولی جو میرے لئے حصول علم کے لئے نصیحت آموز قول کی صورت میں راہبر ثابت ہوئی۔ جب میں طوس پہنچا تین سال تامل میں لگ گیا اور میں نے اپنے ساتھ خلوت کی یہاں تک کہ تمام تعلیقوں کو اپنے دل کے حوالے کیا اور ایسے ہو گیا کہ اگر پھر کبھی راہزنوں سے دوچار ہونا بھی پڑے تو میں اپنے علمی اندوختے سے بے نصیب نہ ہوسکوں''۔

سفر نیشاپور کی طرف (۴۷۳ھ ق ۱۰۸۰عیسوی):

غزالی کی اس بات سے ''جب میں طوس پہنچا تو تین سال تامل میں لگ گیا'' یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ غزالی ۲۳ سال کی عمر کے بعد طوس سے نیشاپور کے سفر پر نکلے ہوں گے۔ تا کہ نامور عالم امام الحرمین ابوالمعالی جوینی کے محضر سے بہرہ اندوز ہوں۔ غزالی نے اس استاد نامدار کی صحبت سے اس قدر فیض پایا کہ فقط ایک دو سال کے بعد بہترین شاگردوں میں جگہ پائی اور خود امام الحرمین اس شاگرد درس خوان و ہوشیار کے اتنے شیفتہ و والہ تھے کہ وہ ہر محفل میں غزالی جیسے شاگرد کے ذکر پر فخر

(۱) جرجان: (گرگان) شہرستانی بودہ است واقع درحدود گنبد قابوس امروز

کرتے تھے۔

غزالی کے حصول علم کا یہ دورہ جو فقیہان نیشا بور میں شہرت اور انگشت نمائی کا موجب ٹھہرا۔ پانچ سال سے زیادہ کا نہ تھا کیونکہ امام الحرمین کی زندگی کا چراغ ۴۷۸ ہجری میں خاموش ہوگیا۔ غزالی اپنے زمانے میں علوم دینی میں اس انتہائی حد کو پہنچ چکے تھے کہ جہاں کسی استاد کی حاجت نہیں رہتی۔ یا یہ کہ ایسا استاد جو غزالی کے لئے استفادے کے قابل ہوتا مفقود تھا۔ اس بناء پر تحقیق وتصنیف میں لگ گئے۔

آشنائی باخواجہ نظام الملک طوسی: (۴۷۸ھ ق ۱۰۸۵ عیسوی)

اس سال غزالی نے ملک شاہ سلجوقی کی چھاؤنی کا رخ کیا جو نیشا بور کے قریب واقع ہوئی تھی۔ اور اپنے ہم ولایت خواجہ نظام الملک طوسی کی خدمت میں پہنچے جو اپنے زمانے کا سیاستمدار تھا۔ اس شافعی مذہب' ادب دوست اور گوہر شناس کے محضر میں غزالی کو بارہا فقیہوں اور اہل علم سے مناظرہ کرنا پڑا۔ اور ہر موقعے پر فتح مندی کا سہرا آپ ہی کے سر رہا۔ اسی طرح جلد ہی نظام الملک نہایت اشتیاق کے ساتھ غزالی کی حمایت میں لگ گیا اور اُن کی بزرگداشت اور تجلیل میں کوشاں ہوا۔ حتیٰ کہ انھیں زین الدین وشرف الائمہ' کے القابات سے نوازا۔ اور نظامیہ بغداد کی استادی کے لیے انتخاب کرلیا۔

آغاز استادی' نظامیہ بغداد میں (۴۸۴ھ ق ۱۰۹۱ عیسوی):

غزالی سال ۴۸۴ھ میں طوس سے براستہ اصفہان بغداد[۱] کے لئے روانہ ہوئے۔ اہل بغداد نے بڑی سرگرمی کے ساتھ آپ کا خیر مقدم کیا۔ جلد ہی آپ کا نام عام وخاص کی زبان پر جاری ہوگیا۔

علمی مجالس میں ان کے نبوغِ سرشار اور علمی بلند پائیگی کے بارے میں داستانیں بیان ہونے لگیں۔ اور جو قافلے بغداد سے مشرق یا مغرب کو جاتے وہ راستے میں آنے والے شہروں میں غزالی کی ہوش مندی اور نبوغ کے بارے میں حکایات بیان کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کی حشمت وشوکت اس مرتبے کو پہنچی کہ ان کے ہم عصر امراء وزراء اور بادشاہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

۴۸۷ ہجری میں غزالی ان بزرگوں میں سے ایک تھے جو حجت الاسلام اور استادِ برگزیدہ نظامیہ بغداد کے لقب کے ساتھ المستظہر باللہ اٹھائیسویں خلیفۂ عباسی کے مراسم جلوس سنہ خلافت میں شریک ہوئے اور اس کی بیعت سے مشرف ہوئے۔

خود غزالی نے اپنے ایک خط میں جو ۵۰۴ ہجری میں آپ نے نظام الدین احمد کے جواب میں لکھا ہے اس میں آپ اپنی گذشتہ زندگی کی جنجالی اور اشرافی زندگی پر ندامت کے ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:

''در بغداد از مناظرہ کردن چارہ نباشد واز سلام دار الخلافہ امتناع نتوان کرد''

(بغداد میں مناظرہ کرنا ناگزیر ہے اور دار الخلافہ کے سلام سے امتناع ممکن نہیں)[۲]

---

(۱) ابن الجوزی' ''المنتظم'' جلد ۹' صفحہ ۵۵۔

(۲) غزالی مکاتیب فارسی تصحیح عباس اقبال صفحہ ۴۵

مردم گریزی (۴۸۸ھ ق ۱۰۹۴ عیسوی):

غزالی بغداد میں شوکت وشہرت کی معراج کو پہنچنے کے بعد خاص وعام میں سب سے بلند مقام پر فائز ہو چکے تھے تو احساس ہوا کہ اس راہ سے روحانی سکون تک پہنچنا ممکن نہیں۔ بہت کچھ ردّ وکد کے بعد آخر کار صوفیانِ وارستۂ بی نام ونشان کی پیروی کی ٹھانی۔ زیارت کعبہ کے بہانے بغداد سے نکل گئے۔ کچھ عرصہ گمنامی کے ساتھ سیر آفاق میں لگ گئے اور سالوں حجاز شام اور فلسطین میں خلوت گزین رہے تا کہ اپنے باطنی درد کی دوا تلاش کر سکیں۔ اس گوشہ نشینی کے بارے میں بھی نظام الدین احمد کے نام غزالی نے یوں اشارہ کیا ہے:

''جب میں خلیل علیہ السلام کی قبر پر پہنچا ۴۸۹ ہجری میں تو آج اس کو تقریباً ۱۵ سال ہو چکے میں نے تین منتیں مانی تھیں: ایک یہ کہ کسی بادشاہ کی کوئی نذر قبول نہ کروں گا' دوسری یہ کہ کسی پادشاہ کے سلام کو نہ جاؤں گا' تیسری یہ کہ اب مناظرہ نہیں کروں گا۔ اگر ان نذور کے خلاف اقدام کروں تو دل ووقت دونوں شوریدہ ہو جائیں گے''۔(۱)

بازگشت بہ میان مردم (۴۹۹ھ ق ۱۱۰۵ عیسوی):

اس راز سے بھی غزالی نے خود پردہ ہٹایا ہے: ''اتفاق ایسا ہوا کہ ۴۹۹ ہجری میں ان باتوں کے لکھنے والے غزالی کے ذمے لگایا گیا کہ بعد اس کے کہ ۱۲ سال عزلت گزیں رہا اور ایک گوشے کو اپنے اوپر لازم کر لیا تھا کہ نیشا پور کی راہ لے تا کہ علم کے افاضے اور شریعت کے نشر میں مشغول ہو سکے۔ کیونکہ سستی اور ضعف نے علمی کام میں راہ پالی ہے۔ پس اہل دل اور اہل بصیرت عزیزوں کے قلوب اس حرکت کی مدد میں اٹھ کھڑے ہوئے اور خواب نیز بیداری میں تنبیہیں ہونے لگیں کہ یہ تحرک خیرات کا سرچشمہ اور احیائے علم وشریعت کا باعث ہوگا۔ پس جب اس پر لبیک کہہ دیا گیا اور تدریس کے کام میں رونق آ گئی اور طالب علم اطراف جہان سے آنے لگے تو حاسد حسد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے...... (۲)

یہ حاسد جن کی طرف غزالی نے اشارہ کیا ہے حنفی مذہب کے علماء تھے جو سلطان سنجر کی بارگاہ میں شرکت اور قدرت پا چکے تھے۔ جو اپنے مقام ومنصب کے تحفظ کے لیے مالکی مذہب کے کچھ پیشواؤں اور طرابلس غرب کے لوگوں کے ساتھ مل بیٹھے تا کہ غزالی جیسے بزرگ مرد کو تہمت اور فریب کے ذریعے میدان علم سے باہر کر دیں۔ یا اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے شافعی مذہبوں کی قدرت کو کم کر دیں۔ غزالی نے سلطان سنجر کو جو خط لکھا ہے اس میں اپنی بے گناہی کا دفاع ان الفاظ میں کیا ہے: (اردو ترجمہ)

> ''اور خاص ضرورت سے یہ کہ میں نے بارہ برس خلوت گزینی کی اور مخلوق سے اعراض برتا۔ اس کے بعد فخر الملک رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ہدایت کی کہ نیشا بور جانا چاہئے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ زمانہ

---

(۱) غزالی مکاتیب فارسی تصحیح عباس اقبال صفحہ ۴۵

(۲) غزالی' مکاتیب فارسی' تصحیح عباس اقبال' صفحہ ۱۱

میری بات کا متحمل نہیں ہوسکتا کیونکہ جوکوئی آج کل کلمۂ حق زبان پر لاتا ہے درودیوار اس کی دشمنی میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ فخر الملک نے کہا کہ سنجر عادل بادشاہ ہے اور خود میں تمھاری نصرت میں تمھارے ساتھ ہوں۔ آج نوبت یہ آ گئی ہے کہ میں ایسی باتیں سنتا ہوں کہ اگر خواب میں دیکھتا تو میں کہتا پریشان خوابی ہے جس کی تعبیر ممکن نہیں۔ جو بات علوم عقلی سے متعلق ہے اگر کسی کو اس پر اعتراض ہوتو کچھ عجب نہیں کیونکہ میری گفتگو میں نادر اور مشکل الفاظ وتراکیب ایسی بہت ہوتی ہیں جن تک ہر شخص کا فہم نہیں پہنچتا۔ لیکن میں تنہا ہوں جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی تشریح جو بھی ہو اس دنیا میں ہے اس کے لیے تیار ہوں کہ اصلاح سے عہدہ برا ہوسکوں۔ یہ آسان ہے۔ لیکن یہ جو کہا گیا ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر طعن کیا ہے اسے برداشت نہیں کرسکتا...... (۱)

اپنے اہل دیار کے ساتھ (۵۰۳ھ ق ۱۱۰۹ میلادی):

جب ان ناکسوں کا وسوسہ سلطان سنجر کے دل میں گھر کرگیا تو اس بادشاہ نے ایک آدمی بھیجا کہ حجت الاسلام کو جو اپنی زادگاہ طابران طوس میں تعلیم وعبادت میں مشغول تھے اپنی چھاؤنی تروغ میں جو آج کل کے مشہد کے قریب تھی بلا لائے۔ غزالی نے جب دیکھا کہ ایک خونخوار شیر نر کے ہتھے چڑھ گیا ہے اور جائے بغیر چارہ نہیں تو انھوں نے یہ تدبیر کی کہ استادانہ ایک خط کے ذریعے سلطان سنجر کے غضب کو ٹھنڈا کردیا۔ لیجئے اس خط کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''طوس والوں پر رحم کر کیونکہ انھوں نے بہت ظلم برداشت کئے ہیں۔ غلہ سردی اور قحطِ آب کی وجہ سے تباہ ہوگیا ہے۔ اور سو سالہ درخت بھی جڑ سے خشک ہوگئے ہیں اور دیہاتیوں کے پاس سوائے ایک پوستین کے یا بھوکے ننگے اہل خانہ کے، اگر رضا یہ ہوکہ پوستین اتار ننگے بدن اپنی اولاد کے ساتھ کسی تنور میں چلے جائیں۔ رضا نہ دیجئے کہ پوستین اتاردیں۔ اگر ان سے کوئی چیز طلب کریں تو وہ خالی ہاتھ ہونے کی بناء پر فرار کریں گے اور پہاڑوں میں جا کر ہلاک ہوجائیں گے اور پوست باز کرنا ہی ہوگا''۔

اس داعی نے زندگی کے ۵۳ برس بتادیئے ہیں۔ چالیس سال علوم دین میں غوطہ زنی کی ہے یہ اور اس مقام پر ہے کہ اس کی بات اہل زمانہ میں سے بیشتر کے فہم سے بالا ہے۔ بیس سال سلطان شہید ملک شاہ کے عہد میں گذارے اور ان سے اصفہان اور بغداد میں بلند اقبالیاں دیکھیں اور بندہ نے کئی دفعہ سلطان اور امیر المومنین کے مابین سفارت کا فریضہ سرانجام دیا۔ عظیم کاموں میں، اور علوم دینی میں تقریباً ستر کتب تصنیف کیں۔ پس دنیا کو جیسی کہ وہ تھی دیکھا۔ سب کو چھوڑ دیا۔ ایک مدت تک بیت المقدس اور مکہ مکرمہ میں قیام کیا۔ اور ابراہیم خلیل اللہ، صلوات اللہ علیہ، کی قبر پر عہد کیا کہ سلطان کے پاس نہیں جاؤں گا اور سلطان سے کوئی مال قبول نہ کروں گا اور مناظرہ اور تعصب سے بھی دست کش

---

(۱) غزالی، مکاتیب فارسی، تصحیح عباس اقبال، صفحہ ۱۱

رہوں گا۔ بارہ برس اسی عہد سے وفا کی ہے اور امیر المؤمنین اور سب سلاطین نے اسے معذور جانا ہے''۔

سفر آخرت کی تیاری (۵۰۲ھ ق ۱۱۱۰عیسوی):

شمس الاسلام کیا امام ہراسی (ہزاری) طبری فقیہہ شافعی استاد نظامیہ بغداد کی وفات پر کہ مرحوم بھی امام الحرمین کے برگزیدہ شاگردوں میں سے غزالی کے ہم درس رہے تھے۔ عباسی خلیفہ اور سلجوقی سلطان کے اشارے پر وزیر عراق ضیاء الملک احمد فرزند خواجہ نظام الملک نے وزیر خراسان صدر الدین محمد فرزند فخر الملک کو خط لکھا کہ آپ غزالی کو محبت اور دل جوئی کے ساتھ بغداد واپس بھیج دیں تاکہ مدرسۂ نظامیہ بغداد کے طلباء بے سامانی سے نجات پائیں۔ لیکن وارستہ غزالی جو ہر چیز سے دست کش ہو چکے تھے آمادہ نہ ہو سکے۔ انھوں نے جواب میں لکھا:

مدرسۂ بغداد کے معاملے میں صدر وزارت کے حکم کی تعمیل کی ذیل میں عذر یہ ہے کہ ترک وطن زیادت دین کی طلب یا زیادت دنیا کی آرزو کے بغیر میسر نہیں ہوتی۔ لیکن اقبال دنیا کی کثرت اور اس کی طلب بحمد اللہ تعالیٰ دل سے اٹھ گئی ہے۔ اگر بغداد کو طوس میں لے آئیں اور ملک و مملکت غزالی کو مہیا و صافی اور مسلم رکھیں اور دل اس کی طرف ملتفت ہو مصیبت ضعف ایمان ہوگا کہ التفات اس کا نتیجہ ہوگا۔ اور وقت کو برباد کر دے گا اور تمام کاموں سے بے پروا کر دے گا۔ اور زیادت دین، مجھے اپنی جان کی قسم، حرکت وطلب کی مستحق ہے اور بے شبہ علمی افاضت وہاں میسر تر ہے اور اس کے اسباب وہاں ساز گار تر اور طلبۂ علم وہاں کثیر تر ہیں لیکن اس کے مقابل اعتذار کثیر تر ہے۔ دینی بھی کہ اس میں خلل آئے گا اور یہ زیادت اس نقصان کو پورا نہیں کرتی۔ ایک یہ کہ یہاں تقریباً ڈیڑھ سو پارسا طالب علم استفادے میں مشغول ہیں۔ ان کو بغداد منتقل کرنا اور اس کا تدارک اسباب متعذر رہے۔ اس جماعت کی فروگذاشت اور ان کو ناراض کرنا، زیادت عدد کی امید میں، دوسری جگہ جانا ٹھیک نہیں۔ یہ تو ایسے ہے جیسے کوئی دس یتیم کو جو اس کی کفالت میں ہوں ان کو بے یار و مددگار چھوڑ کر دوسری جگہ بیس یتیموں کو تعہد میں لے جب کہ موت اور آفت آپ کا تعاقب کر رہی ہو۔

دوسرا عذر یہ ہے کہ جس وقت صدر شہید نظام الملک، قدس اللہ روحہٗ نے مجھے بغداد بلایا تھا میں مجرد تھا۔ بے علایق بے اہل وفرزند، اب علایق واولاد وجود میں آ گئے ہیں..... مختصر یہ کہ جب عمر بہت ہو چکی اور وداع وفراق کا وقت ہے نہ کہ عراق کے سفر کا موقع، امید ہے کہ مکارم اخلاق سے آپ اس عذر کو قبول فرمائیں گے کہ: جب غزالی بغداد پہنچا فرمان حق تعالیٰ برائے مرگ خود پالے نہ یہ کہ تدبیر مدرسہ کی جائے؟ آج وہی تقدیر کرے (= فرض کرے)[1]

وفات: (۵۵ھ ق=۱۱۱۱عیسوی)

مرتضیٰ زبیدی جو احیاء علوم الدین کے سب سے بڑے شارح صاحب تصنیف ہیں شرح احیاء کے مقدمے میں نیز دوسروں کے اقوال کی نقل کے ساتھ کیا خوب کہتے ہیں کہ پہلے حصے کا ترجمہ یہ ہے:

(۱) غزالی۔ مکاتیب فارسی، صفحہ ۴۴، ۴۵۔

''کہتے ہیں کہ غزالی اپنے اوقات کو ہمیشہ تلاوت قرآن اور صاحب دلوں کی صحبت اور ادائیگی نماز میں صرف کرتے تھے۔حتی کہ ۵۰۵ھ ق کا ماہ جمادی الآخر آن پہنچا' احمد غزالی برادر حجۃ الاسلام کہتے ہیں کہ پیر کے روز صبح کے وقت میرے بھائی نے وضو کیا اور نماز ادا کی اور کہا: میرا کفن لاؤ۔ کفن لایا گیا آپ نے کفن کو بوسہ دیا پھر آنکھوں پر رکھا اور کہا ''سمعاً و طاعته'' للدخول علی الملك ''پھر اپنے پاؤں قبلہ کی طرف پھیلا دیئے اور سورج نکلنے سے پہلے بہشت کی راہ لی''۔

غزالی کے عقاید و آراء:

جب امام محمد غزالی جیسے مرد کے عقاید و آراء کی تحقیق جو ان کی کثیر تصانیف میں سے ہر تصنیف میں گوناگوں اور رو بکمال کی صورت میں متجلی ہوتے ہیں تو یہ مہم نہایت وسیع اور دشوار لگتی ہے۔ ناچار ہم اس بحث کو غزالی کے روحانی انقلاب اور ان کی دو کتب احیاء اور کیمیا تک محدود کر لیتے ہیں تا کہ بات لمبی اور ملال انگیز نہ ہو۔ کیونکہ یہ دونوں کتابیں غزالی کے گراں قدر ترین آثار میں سے ہیں۔ جو مردم گریزی کے زمانے کا ثمر ہیں۔آپ مردم گریزی کے وقت نئے فکر وایماں کے ساتھ ساتھ ان دونوں کتابوں کی نگارش میں لگ گئے تھے۔ یہ ان کی پختگی کے زمانے کا حاصل ہیں۔غزالی بھی ناصر خسرو اور سنائی کی طرح چالیس سال کی عمر کو پہنچنے پر ہشیار ہوئے کہ بے مقصد زندگی صرف ہو رہی ہے۔اور جاہ و مال وجدل کے پردے دل کی چشم بصیرت کے آگے لٹکے ہوئے ہیں۔ان کے اپنے قول کے مطابق ''چھ ماہ باطنی کشمکش اور تردید میں لگ گئے تا کہ دنیا کی دلربا آرزوؤں اور آخرت کی امید بخش خوشخبری میں سے ایک کو انتخاب کیا جائے''۔(۱)

تولد نو:

غزالی نے آخر کار اپنی خرد کی راہنمای اور دروں بین بصیرت کی روشنی میں خوش فرجام راستے میں قدم رکھا اور اپنے ماضی کے پر جنجال بے حاصل عہد سے الگ ہو گئے۔ ہر چیز سے اپنے دل کو آزاد کر لیا۔اور جہانِ گمنامی' آزادگی و درویشی و خموشی میں پناہ لی۔یہیں وہ ہوس سے بے نیاز جان و دل سے آشنا ہوئے۔ وہ جان و دل کہ ایک حد تک کیمیائے سعادت اس کی مظہر ہے اور اسلام کی عقلی اور روحی زندگی میں غزالی کی تاثیر سے پردہ اٹھا سکتی ہے۔

ہاں اس روحانی انقلاب کے بعد جو ماہ رجب سال ۴۸۸ ہجری میں اس مفکر مصلح میں رونما ہوا۔تو وہ غزالی جو چالیس سال عمر کی حد تک جاہ و مال وجدل کا دلدادہ تھا نابود ہو گیا۔اور ندامت کی آگ میں جلنے والی جان سے ایک نئے غزالی نے جنم لیا۔ جو زندۂ جاوید ہے۔ کیونکہ باوجود اس امر کے کہ اب تک غزالی کے اس دوسرے جنم کو نو سو سال سے زیادہ زمانہ گذر چکا ہے آج بھی ان کا نام مشرق و مغرب عالم میں زبانوں پر ہے۔اور علوم انسانی کے ماہرین ان کے بیشتر آثار بالخصوص احیاء اور کیمیا کو حیرت اور تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

---

(۱) المنقذ من الضلال تصحیح دکتر عبدالحلیم محمود' صفحہ ۱۶۶

اس بناء پر بجا ہے اگر کہا جائے کہ : غزالی نئے جنم کے بعد کارساز زندگی میں لگ گئے اور خلوت اور گمنامی میں اپنی اہم ترین تصانیف میں سے چند کی تدوین ونگارش میں لگ گئے احیاء اور کیمیا جیسے آثار جنھوں نے مسلمانوں کی عقلی و روحانی زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا اور تاریخ میں بے مثال نتیجہ پیدا کیا۔ (۱)

متلاشی یقین :

یہ باطنی انقلاب غزالی کی معنوی زندگی میں ایک حد فاصل ہے اور آپ نے اسے دو متمایز حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں ''غزالی فقیہہ اصولی متکلم'' کے طور پر زندگی بسر کرتا ہے کہ کچھ عرصہ سرداری کی کرسی کا اسیر ہے' ندیم مقام وزارت' امین دستگاہ خلافت اور تر دامنوں کی حمایت کا مورد رہا۔

زندگی کے اس دوسرے حصے میں غزالی کی پیشانی ایک وارستہ صوفی' سازندہ ناقد' مجدد علوم دینی' اور اسلام کی عقلی 'عرفانی اور روحی زندگی کی بے سروسامانی کو متمول کرنے والا دکھائی دیتا ہے۔ اس شخص کا سیمائے نیکو جو باطنی انقلاب کے ساتھ دوسرے جنم سے بہرہ ور ہوا جستجوئے یقین میں نکلا یہاں تک کہ زندہ جاوید ہو گیا۔ کیونکہ وہ روحانی انقلاب جسے غزالی نے دقت اور امانت کے ساتھ اپنی کتاب' المنقذ من الضلال میں ثبت کر دیا ہے ایک فتنہ آشوب گر جان کے سوا اور کچھ نہیں۔ جان بے قرار جو ہمہ وقت نجات کی تلاش میں ہے اور یقین کی کھوج میں ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب غزالی سے پوچھا جاتا ہے کہ ''تم ابوحنیفہ کا مذہب رکھتے ہو یا شافعی کا''؟ آپ جواب میں کہتے ہیں:

> ''میں عقلیات میں مذہب برہان رکھتا ہوں' شرعیات میں قرآن کا مذہب' ابوحنیفہ نہ شافعی دونوں سے میں نے کچھ نہیں لیا''۔

یا پھر اپنی آزاد فکری کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''جو کچھ پیغمبر ﷺ سے ہم تک پہنچا ہے اسے ہم نے بسر چشم قبول کیا ہے اور جو کچھ صحابہ سے پہنچا تو اس میں سے کچھ اخذ کیا کچھ چھوڑ دیا' اور جو تابعین سے پہنچا تو وہ بھی مرد ہیں تو ہم بھی مرد ہیں''۔ (۲)

غزالی اس مرحلے میں تصفیہ و پاکیزگی قلب کے بعد ریاضت اور مجاہدے کے سائے میں انقلاب سے دوچار ہوتے ہیں۔ یعنی فکر سے ارادے کی طرف تبدیلی' کیونکہ ارادہ تجربے کا آشکار ترین عنصر ہے۔ کیونکہ حصول معرفت وذوق سے کہ ان کے ذریعے حقائق وجود' اسرار الوہیت اور ربوبیت کے اسرار منکشف ہوتے ہیں۔ جس کا امکان قوۃ خرد سے ممکن نہیں۔ بلکہ اس کا امکان ارادے سے وابستہ ہے۔ ارادہ جو تجربۂ صوفیانہ کا خاص ترین مظہر ہے کیونکہ صوفی اس تجربے میں مشغولی سے نہ صرف اپنے وجود سے آشنا ہوتا ہے بلکہ خدا شناس بھی ہوتا ہے۔

---

(۱) یہ بحث اس مقدمے میں سے گلچینی کے مصداق ہے جو میں ترجمۂ احیاء جلد اوّل میں ربع مہلکات کے ذیل میں لکھ چکا ہوں۔

(۲) ترجمہ احیاء جلد اوّل صفحہ ۲۴' مقدمہ

ہاں غزالی دکارت کی طرح یوں نہیں کہتا کہ ''میں سوچتا ہوں پس میں ہوں'' بلکہ وہ وہی کہتا ہے کہ جو اس سے پہلے اور بعد کے صوفیاء نے کہا:

''میں روحانی تجربے میں مصروف ہوتا ہوں' میں معرفت کو چکھتا ہوں' میں چاہتا ہوں پس میں ہوں اور وہ خدا جو وجد و اقبال اتصال کے عالم میں مجھ پر آشکار ہوتا موجود ہے''۔

یا ایک اور جگہ کہتا ہے:

''ہماری ہستی وہ ہے کہ جس سے ہمیں آگاہی ہے اور اس کی خبر ہے''۔(۱)

''اور اس دل کی ہستی ظاہر ہے کہ آدمی کو اپنی ہستی کے بارے میں کوئی شبہ نہیں''۔(۲)

اور یہ بات غزالی نے دکارت سے ساڑھے پانچ سو برس پہلے کہی ہے۔ یہاں ہم اس فیلسوف خدا پرست کی آراء و عقائد کے بارے میں جو اسی کیمیائے سعادت میں ربع منجیات' اصل ہشتم' توحید و توکل کے عنوان کی ذیل میں خوب صورت رواں نثر میں بیان ہوئے ہیں ان کے ذریعے اس بحث کو مکمل کرتے ہیں۔

ہمبستگی آلی جہان ہستی:

''جو کچھ عالم وجود میں ہے ایک دوسرے سے مربوط ہے اور سب ایک حیوان کی طرح ہے اور نسبتِ اجزائے عالم..... باہم دگر ایک حیوان کے اعضا کی طرح ہے اور عالم کی نسبت اس کے مدبر کے ساتھ ایک وجہ سے نہ کہ بہمہ وجوہ' مملکت تن حیوان کی نسبت اس کی روح کے ساتھ کی مانند ہے جو اس کی مدبّر ہے''۔

جبر یا اختیار:

''تو اگر سمجھتا ہے کہ انسان کے قبضۂ قدرت میں کچھ ہے تو یہ خطا ہے کیونکہ آدمی اپنے اختیار کے نقش میں مجبور و مضطر ہے..... کیونکہ اس کا کام قید قدرت میں ہے۔ اور قدرت مسخرِ ارادت ہے کہ جو چاہے کرے..... پس چونکہ قدرت مسخرِ ارادت ہے اور ارادت کی کلید اس کے ہاتھ میں نہیں پس کوئی چیز اس کے قبضے میں نہیں''۔

اکتساب: (کسبِ شعری)

''اور وہ قدرت جو آدمی میں پیدا کی گئی ہے وہ اس زنجیر کی ایک کڑی ہے (سلسلہ اسباب) اس بناء پر انسان کو یہ گمان ہوا کہ اس کے پاس بھی کچھ ہے اور یہ خطائے محض ہے۔ کیونکہ انسان کا تعلق اس سے کچھ زیادہ نہیں کہ وہ اس کا محل ہے یا اس کی راہ گذر۔ پس وہ اختیار کی راہ گذر ہے جو اس میں پیدا کرتے ہیں اور راہ گذر قدرت و ارادت پس درخت کی طرح جو ہوا سے ہلتا ہے اس میں قدرت و ارادت پیدا نہیں کی گئی اور اسے اس کا محل نہیں بنایا گیا بہ ضرورت اس کو اضطرار

---

(۱) احیاء صفحہ ۲۵۵

(۲) احیاء صفحہ ۱۵

محض کا نام دیا گیا' جب اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے اس کی قدرت اس سے باہر کسی چیز کی قید میں نہیں اسے اختراع کا نام دیا گیا اور جب انسان ایسا ہے نہ ویسا کیونکہ اس کی قدرت وارادت دوسرے اسباب سے تعلق رکھتی ہے جو اس کے قبضۂ قدرت میں نہیں تو اس کا فعل اللہ تعالیٰ کے فعل کی مانند نہیں ہوتا کہ اسے خلق یا اختراع کہہ سکیں۔ اور چونکہ انسان محل قدرت وارادت ہوتا ہے کہ بہ ضرورت اس میں پیدا کرتے ہیں درخت کی طرح نہیں ہوتا کہ اس کے فعل کو اضطرار محض کا نام دیں۔ بلکہ یہ ایک دوسری تقسیم ہے اس کے لئے ایک دوسرا نام تجویز ہوا اور اس کو کسب کہتے ہیں۔ اس جملہ بحث کا لب لباب یہ ہے کہ اگرچہ ظاہراً انسان کا فعل اس کے اختیار سے ہے لیکن وہ خود اپنے اختیار کے نفس میں مضطر ہے وہ چاہے یا اگر نہ چاہے' پس اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں''۔

غزالی نے اس روحانی انقلاب میں اپنی خاص مشکل کے سوا غور نہیں کیا۔ شاید یہ بات اس کے جی میں نہیں آئی کہ خود اس کی مشکل کے حل کے ساتھ دوسرے مسلمانوں کی مشکلات بھی حل ہو جائیں گی۔ مسلمان جواز لحاظ تقلید ایک طرف سے اور فلسفہ و کلام اور ہوا پرستوں کی باتوں سے دوسری طرف' صورت اس کے متماثل رکھتے تھے۔ اس بناء پر جس طرح غزالی نے روحانی انقلاب کے بعد ایک نئے راستے پر قدم رکھا' دین اسلام نے بھی غزالی کے بعد اس کی ''تصانیف اور تعلیمات کے فیض سے ایک نئے راستے کی سیر کی۔ چونکہ غزالی نے اسلامی تعلیمات اور اسلامی علوم پر تازہ مہر لگائی تھی اس کی اس مہر کا اثر بہت سے موارد پر اب بھی باقی ہے۔

فلسفے کی ناتوانی:

غزالی نے مسائل الٰہیات اور حقیقت الوہیت ونبوت کے علم یقینی تک رسائی میں فلسفے کی ناتوانی آشکار کر دی اور واضح کر دیا کہ متکلموں کا جدال ممکن ہے کبھی کبھی ان کے مطلوب سے ہم آہنگ ہو جائے لیکن کسی ایسے شخص کے لیے کہ جو ان کے مقدمات کے آگے سر نہ ڈال دے کافی نہیں۔ آپ نے تاکید کی کہ تصوف اس الہام وذوق اور تجلی سے جو اس میں پوشیدہ ہیں ہی وہ راستہ ہے کہ ممکن ہے جو یقینی معرفت اور جان ودل کے سکون میں انجام پذیر ہو۔ نیز فرمایا کہ فلسفہ وکلام اور تصوف کو مسائل الٰہی میں دین کی بنیاد پر استوار ہونا چاہئے۔ اور انھیں دین ہی کے اصول وتعالیم پر ہم قدم ہونا چاہئے۔

غروب فلسفہ:

غزالی ہی وہ عبقری ہے جس نے کندی' فارابی اور ابن سینا کے ساختہ پرداختہ مسائل الٰہیات کے باب میں فلسفہ مشائی اسلام پر ضرب کاری لگائی۔ بلاشبہ اس فلسفے نے غزالی کی کتاب تہافتہ الفلاسفہ کے شیوع کے بعد اپنے استقلال کو رفتہ رفتہ کھو دیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کی ابن رشد اور خواجہ نصیر طوسی جیسوں کا دفاع بھی کارگر نہ ہو سکا۔ (۱)

---

(۱) ابن رشد نے تہافتہ التہافت لکھ کر گویا غزالی کا جواب دیا' اور خواجہ نصیر طوسی نے ''شرح اشارات'' کے ساتھ کوشش کی کہ حملۂ غزالی کو بے اثر کر سکیں لیکن مرورِ ایام نے ثابت کر دیا کہ اس علمی مبارزے میں ان میں سے کوئی بھی کامیابی حاصل نہ کر سکا۔

اس سبب سے فکر اسلامی کی تاریخ میں' غزالی کے بعد کئی صدیوں تک ابونصر فارابی' زکریا رازی اور ابن سینا کے پائے کے کوئی اور فیلسوف افق اندیشہ پر طلوع نہ ہوئے۔اور فلسفہ شرق کے مقام بلند پر سوائے خلاصہ کرنے والے شارح یا حاشیہ نویس اصحاب کے جنھوں نے اگلوں کے فلسفے سے کم ہی آگے قدم بڑھایا ہے کوئی بھی منصۂ شہود پر نہیں آیا کہ جسے ان ناموروں کے برابر قرار دیا جا سکے۔حتیٰ کہ اندلس اور مغرب اقصیٰ کے بزرگ فیلسوفوں کو' بہ استثنای ابن رشد کے جس نے بہ اخلاص اپنی تمام شروح وتعلیقات کو فلسفہ ارسطو کے ساتھ اختصاص دیا باقی سب فلاسفہ شرق کے وسیع دسترخوان کے ریزہ خوار تھے۔جو گویا چھوٹے چھوٹے سیارے تھے جو بزرگ ستاروں کے گرد محوطواف ہوں' مثلاً ابن ماجہ جو فلک فارابی میں گردش پذیر ہوا اور ابن طفیل فلک ابن سینا کا ماہوارہ تھا۔

بزرگ نو آور:

غزالی وہی شخص ہے جس نے علم کلام کے پرانے طریق کو تبدیل کر دیا۔اور علم کلام جدید کے لئے نئے راستے کی نشان دہی کی کہ ماضی کی طرح اس کی برہان فقط حکم عقل پر استوار نہیں ہوتی بلکہ وہ عقل اور کشف دونوں پر تکیہ کرتا ہے۔غزالی نے فلسفہ وکلام کو جیسا کہ آپ نے خود سمجھا اس کو سادہ کر دیا تاکہ متوسط لوگوں کی عقل کے قریب ہو۔کیونکہ غزالی سے پہلے فلاسفہ اپنے آپ کو مبہم کلمات کے حصار میں محصور رکھتے تھے اور فلسفہ کے لئے ایسی زبان انتخاب کر رکھی تھی جو دشوار اور پیچیدہ الفاظ کا ڈھیر تھی یا ایسی اصطلاحات وضع کر رکھی تھیں جو عربی زبان جاننے والوں یا خود عربوں کے لئے بھی بیگانہ دکھائی دیتی تھی۔لفظ کے لحاظ سے یا مفاہیم تازہ کے لحاظ سے فلسفہ یونان' عربی زبان میں ترجمہ کے بعد اپنے ہمراہ نیا تحفہ لایا تھا۔

غزالی اپنی اکثر تصانیف میں فلاسفہ کے اسلوب اور ان کی اصطلاحات اور الفاظ سے کلیۃً پیچھا نہیں چھڑا سکا۔خصوصاً اپنی کتاب تہافۃ الفلاسفہ میں۔اور یہ اس لئے ہے کہ فلاسفہ کے ساتھ جدال میں خود ان کی اصطلاحوں اور ان کی زبان مخصوص میں بات کی جائے۔اور اس جنگ معنوی میں انھی جیسے اسلحہ کے ساتھ آغاز کیا جائے تاکہ کامیابی حتمی ہو۔

زندگی ساز حرکت:

جس طرح غزالی کے روحانی انقلاب کو ہم ایک نئے جنم کا نام دے سکتے ہیں اور اس کی بےقرار جان کے لئے ایک جدید رستا خیز قرار دے سکتے ہیں اس طرح اس انقلابی حرکت کو جو آپ نے اپنے زمانے میں علوم دینی اور اسلامی زندگی کو بخشی' زندگی ساز تحریک کا نام دے سکتے ہیں۔جس نے مباحث معنوی ومسائل دینی کے خزاں دیدہ چمن میں نو بہار کا سامان کیا اور ہر مورد کے لئے ایک نئے موقف کو جنم دیا۔

اس بناء پر حیرت نہ ہو گی اگر غزالی نے جب اپنی دو بڑی بے مثال تصانیف کے لئے احیاء اور کیمیا کا نام انتخاب کیا تو اپنے موقف کو تعالیم اسلامی اور علوم دینی کے لئے زندگی ساز کیمیا گری سمجھا ہو۔کیونکہ احیاء اور کیمیا دونوں کتابوں کے متداول ہو جانے کے اثر کے پیش نظر اس نتیجہ پر پہنچیں کہ غزالی کی تمنا ایک راست پرواز تیر کی مانند اس کے فکر کی کمان سے نکلی اور ٹھیک دل خواہ اساسی ہدف کے مرکز میں گر گئی۔

کوئی شبہ نہیں کہ اس انقلاب کے بعد سازندگی اور سازگاری کی فکر غزالی کی ہر کتاب میں غالب نظر آتی ہے۔ وہ ہر حالت میں کوشاں تھے کہ مسلمانوں کی روحانی زندگی اور اسلامی فکرنئی روش پر برقرار ہو تا کہ اپنی ماضی کی قدرت ورونق کی بازیاب ہو۔ اس امید میں کہ مسلمان ایک دفعہ پھر سے خواب سے بیدار ہو جائیں اور حقوق فردی اور پامال شدہ عدالت اجتماعی کو پھر سے پہچان سکیں۔ آپ کی تصانیف میں سے اس ہدف کو پانے کے لئے امام کی کوئی کتاب بھی احیاء اور کیمیا کے برابر جہان اسلام کے مشرق ومغرب میں موثر نہیں ہوئی۔

اس زندگی ساز حرکت میں جالب توجہ نکتہ یہ ہے کہ غزالی باوجود اس کے کہ اپنے عمیق علمی وعرفانی تجربات کے ساتھ تعالیٰ اسلام اور علوم اسلامی کے لئے اٹھا اور آپ نے دین اسلام کو خاص تصوفی اساس پر جو ان کی خود شناخت تھی نئے سرے سے متعارف کرایا لیکن بااین ہمہ کسی مورد میں بھی بدعت کا ارتکاب نہیں کیا۔ اور کسی علمی ابتکار کو جو بے سابقہ ہو روشناس نہیں کرایا بلکہ صرف ان علوم اسلامی کی اصلاح میں مشغول ہوئے جو مرور ایام کے ساتھ ضعف و بیماری کا شکار ہوئے تھے اور کسی شایستہ کارشناس کے ہاتھوں معالجے کے محتاج تھے۔

غزالی کو اس باب میں ایسے باغبان سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس نے اپنے باغ کے درختوں کو شادابی اور خرمی کے بعد خزاں رسیدہ اور پژمردہ پایا ہو۔ اس صورت حال کا مشاہدہ پہلے اسے آزردہ کرتا ہے پھر اسے اس کی چارہ جوئی پر انگیز کرتا ہے۔ آخر کار وہ جائے درد کو پہچان لیتا ہے تو مہارت اور تردستی کے ساتھ اس کے علاج میں لگ جاتا ہے۔ تو جلد ہی اس کی صحیح تیمارداری اور استادانہ درمان کی وجہ سے درخت پھر سے جی اٹھتے ہیں، شگوفہ برگ وباراور سرسبزگی سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں۔ اور بارآوری سے جو باغبان کی آگاہی اور استادی کی مظہر ہے سرشار ہو جاتے ہیں۔

اعتراف غزالی:

غزالی کے فلسفیانہ اسلوب فکر وروش کو صحت کے ساتھ جاننے کے لئے خود ان کی بہترین تصنیف یعنی المنقذ من الضلال کا خلاصہ اس باب میں جو ۵۱ سال کی عمر کے لگ بھگ زمانے میں یعنی وفات سے کوئی چار برس پہلے لکھی گئی تھی اس کتاب کو آپ کی دیگر تصانیف کے درمیان ''اعترافات ژان ژاک روسو کے مماثل قرار دیا گیا ہے جو فارسی میں منتقل ہوتا ہے۔[1]

غزالی اس کتاب میں اپنی زندگی کے حقایق اور اپنے عقاید کی روح کو جزبجز بے باکانہ بیان کرتے ہیں اور کہیں بھی ریا سے کام نہیں لیتے۔ اور نہ خلاف واقع دکھاتے ہیں۔ اس کتاب کا موضوع سوالات ہیں جو غزالی سے کئے گئے جن میں سے ہر ایک کا جواب مناسب آپ نے دیا ہے۔ خلاصہ بدیں ترتیب پیش خدمت ہے:

امام محمد غزالی سے کئے گئے سوالات کا خلاصہ:

''آپ نے اپنے آپ کو عالمی ادیان ومذاہب کے پیچ خم سے کیسے نجات دی اور کس وسیلے سے اپنے آپ کو تقلید کی پستی سے تحقیق کی بلندی تک پہنچایا؟ اور بالآخر اس تمام تحقیق کے بعد کس نتیجے کو پہنچے اور اپنے اس کام سے کیا حاصل کیا؟

(۱) یہ قطعہ استاد ہمائی گلچین کے 'غزالی نامہ' کے صفحات ۳۷۱ تا ۳۷۵ سے اخذ کیا گیا ہے۔

پہلی دفعہ فن کلام سے کیا فائدہ آپ کو ملا؟ اور دوسرے مرحلے میں طریق تعلیمیہ (= باطنیہ) جو حقایق کے ادراک میں امام ناطق کی تقلید میں رکھتے ہیں اس سے آپ نے کیا سمجھا؟ اور تیسری دفعہ فلسفہ اور تفلسف کے مقام کو جہاں آپ پہنچ گئے تھے کیوں نظر انداز کر دیا اور دور پھینک دیا۔ اور بالآخر کیوں رشتۂ تصوف کو پسند کیا اور اسی کو تمام اہواء وعقاید میں سے منتخب کیا؟

وہ مختلف آراء وعقاید کہ انسان ان کا پابند ہے ان کے حقایق سے آپ نے کیا پایا؟ مذاہب کے حقایق کی تحقیق پر کس قسم کے مطالب کا انکشاف آپ پر ہوا؟

کیا بات ہوئی تھی کہ آپ نے ان تمام طالبان علم کو اور مستفید ہونے والوں کو جو آپ کے ساتھ بغداد میں تھے ان کے تدریس اور نشر علوم ومعارف کے فریضے سے منہ پھیرلیا؟ و نیز تعلیم وتدریس کے کام سے مدتوں دست کش رہنے کے بعد کیا ہوا تھا کہ آپ دوبارہ نیشاپور میں لوٹ کر تدریس میں لگ گئے؟''(۱)

ان متذکرہ سوالات کا غزالی کے جواب کا خلاصہ:

''ادیان میں لوگوں کا اختلاف اور امم واقوام عالم کے مذاہب میں اختلاف کے اسباب باآں ہمہ تفاوت وتبائن کے جوان کے طریقوں اور مسالک میں موجود ہے ایک اتھاہ گہرا سمندر ہے بے پایاں' کہ بہت سے متلاشی حقیقت اس میں غرق ہوگئے اور شاید ہی کسی خوش بخت کی جان سلامت رہی ہو ؎

دریں ورطۂ کشتی فرو شد ہزار   نیامد ازاں تختۂ بر کنار

(اس بھنور میں ہزاروں کشتیاں غرق ہوگئیں یہاں تک کہ کسی ایک کا ایک تختہ بھی ساحل تک نہ پہنچا) کیونکہ ہر فرقہ تنہا اپنے آپ کو نجات یافتہ اور دوسروں کو گمراہ اور ہالک جانتا ہے: کل حزب بما لدیھم فرحون۔

غزالی فرماتے ہیں: میں آغاز جوانی سے' اس وقت سے کہ نشو ونما پا رہا تھا اور عمر شرعی بلوغ کی حد کو پہنچی اب تک کہ عمر پچاس سال سے اوپر ہوگئی ہے اسی گہرے سمندر میں غوطہ زن اور اسی بحر بیکراں میں شناور رہا ہوں اس غرض سے کہ حق کو باطل سے اور سنت کو بدعت سے متمایز کرسکوں۔ میں نے ہر فرقے کے عقاید میں کنجکاوی کی اور ہر طائفے کے اسرار ورموز فرقہ ظاہریہ کے دین سے لے کر جو شرع کے ظواہر کے متعبد اور جامد ہیں اور اس مرحلہ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاتے' کافر زندیق تک' جس نے تمام دنیا کے ادیان وشرایع کو پشت پا سے ٹھکرا دیا ہے سب کی تحقیق کی۔ اور ظاہریہ' باطنیہ' حکماء' متکلمین' صوفیہ' زہاد' عباد' کفار اور زنادقہ کے باب میں نظر عمیق سے کام لیا۔ ہر جگہ رموز ودقایق کے کشف میں لگا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ مختلف عقاید کے اصلی اسباب وعلل کو معلوم کروں تا کہ جان سکوں کہ جملہ طبقات' عابد سے لے کر ملحد تک کیا کہتے ہیں اور ان کی عقیدت کی روح کیا ہے؟

---

(۱) سوالوں کی ترتیب سیر وسلوک کے مراحل اور غزالی کی دگرگونی کے مظہر ہیں اور بتاتے ہیں کہ پہلے وہ متکلم تھے آخر کار صوفی ہوگئے اور ان کے درمیان آپ نے تعلیمیہ اور فیلسوفوں کے مراحل طے کئے تھے۔

تحقیق و کنجکاوی سے عشق میری فطرت کا خمیر تھا۔ ادراکِ حقایق کی پیاس نوجوانی ہی سے میری رفیق راہ تھی مجھ میں ایک مدت سے ہر چیز کی حقیقت دریافت کی تشنگی تھی۔ یہ تشنگی میرے اختیار میں نہ تھی بلکہ فطری اور جبلی تھی اور میں ذاتی طور پر فطرتاً تقلید اور تعبد سے بے بہرہ تھا۔ میری روح تقلید سے چین نہ پاتی تھی۔ کسی کے قول کو بغیر دلیل و برہان کے کافی نہ جانتا تھا۔ اس وجہ سے ہمیشہ اجتہاد کے ساتھ حقیقت کی تلاش میں لگا رہتا' ہمیشہ سوچتا رہتا میں چاہتا تھا کہ ہر چیز کو' جیسی کہ وہ درحقیقت ہے معلوم کر سکوں۔

ابھی عہد جوانی اور دوران شباب تمام نہ ہوا تھا کہ تقلید کا رشتہ ٹوٹ گیا اور میرے موروثی عقاید جو ادھر ادھر سے مجھ تک پہنچے تھے وہ بھی شکست آشنا ہو گئے۔ اب میں تقلید کے زیر بار نہیں ہو سکتا تھا۔ یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کے لڑکوں کو دیکھتا تھا کہ سب کے سب نے اپنے والدین کے مذہب کے گہوارے میں پرورش پائی ہے اور موروثی عقاید کے ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ اس حدیث کو کہ' ہر مولود ابتداء میں فطرت اصلی پر پیدا ہوتا ہے اور اس کے والدین اس کو یہودی' نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں'' سن رکھا تھا۔ ہیجان باطنی مجھے فطرتِ اصلی کی دریافت کی طرف بلاتا تھا۔ میں چاہتا تھا اسی فطرت اصلی کو معلوم کروں اور اس کو ان عقاید عارضی سے جو والدین مربی اور استاد کی تلقینات سے حاصل ہوتے ہیں جدا کروں''۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اختلاف عقاید جملہ عوارض ہیں جو تلقین و تقلید سے قوت حاصل کرتے ہیں اور میں فطرتِ اصلی اور جوہری کی کھوج میں تھا۔ میرا مقصود کیا تھا؟ میں چاہتا تھا کہ حقایق امور سے آ گاہی پیدا کروں' میں نے اپنے آپ سے کہا کہ: ''چاہئے کہ پہلے یہ جانوں کہ علم کی حقیقت کیا ہے؟ پھر میں علم کے پیچھے لگوں''۔ یہ نکتہ مجھ پر روشن ہو گیا کہ علم اُس وقت علم حقیقی اور اطمینان بخش ہو گا جب شک و شبہ' غلط اور گمان کسی طور بھی اس میں راہ نہ پا سکیں۔ اور کسی مشکک کی تشکیک اس کے ارکان میں خلل انداز نہ ہو سکے۔ ورنہ وہ علم جو شک و شبہ' تردید اور احتمال سے خلل پذیر ہو حقیقت میں علم نہیں بلکہ وہم و گمان ہے۔

لاریب یقینی علم کی بنیاد شک و تردید سے متزلزل نہ ہو گی' معجزہ اور کرامت بھی علم یقینی کی اساس کو کمزور نہیں کر سکیں گے۔ مثلاً یہ علم کہ دس کا عدد تین کے عدد سے بڑا ہے یقینی علم ہے جس میں شک و شبہ کا احتمال نہیں ہے۔ اب اگر کوئی منکر اس بات کا انکار کرے اور اپنے دعوے کی سچائی میں معجزہ اور کرامت کے سہارے ہماری آنکھوں کے سامنے ایک پتھر کو سونا یا عصا کو اژدہا بنا دے اور پھر کہے کہ تین کا عدد دس کے عدد سے بڑا ہے تو ہم اس کی بات کو ہرگز قبول نہیں کریں گے اور ہمارے علم میں کوئی شک و تردید پیدا نہ ہو گی اور وہ خرق عادت جو ہماری آنکھوں کے سامنے صورت پذیر ہوا ہے اس سے بجز حیرت کے کچھ اور حاصل نہ ہو گا۔ ہاں ہم اس کے عمل پر متعجب تو ہوں گے لیکن اس کے دعوے کو کہ تین کا عدد دس کے عدد سے بڑا ہے ہرگز قبول نہ کریں گے۔ الحاصل یہ کہ حقیقتِ علم کے بارے میں یہ اساس جو آپ نے سنی میں اس کو سمجھ گیا۔ تو اس کے بعد میں نے جان لیا کہ جو کچھ میری معلومات میں قطع و یقین کے اس درجے تک نہ پہنچا ہو۔ وہ وثوق و اطمینان کے لایق نہیں۔ اور وہ میرے تسکینِ قلب کا باعث نہ ہو گا۔ پس چاہئے کہ میں ایسے علم کی تلاش میں نکلوں جو میری روح کے اطمینان اور آسایش کا باعث ہو۔ نہ ایسا کہ ذرا سے شک و تردید کی نذر ہو جائے۔ یعنی میں پائیدار سرمایہ تلاش کروں نہ ایسا کہ جسے چور ڈاکو کا خطرہ ہو''

تاثیرِ تربیت:

غزالی بھی ژان ژاک روسو کی طرح فطرتِ انسانی کو پاک اور ہر قسم کی الائش سے عاری پاتا ہے۔ وہ کہتا ہے ''افراد میں باہمی اختلاف کے باوجود روح انسانی فطرتاً حقیقت اشیاء کی شناسائی کی استعداد رکھتی ہے۔ کیا روح ربانی امر نہیں ہے؟ اس صورت میں وہ شر جو انسان کے وجود میں ہے فطری نہیں ہے وہ کسبی ہے اور تاثیر تربیت سے ہے۔ اس لئے کہ تربیت لوگوں کے احوال پر قوی تاثیر کی مالک ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ہی بدن جس وقت دنیا میں آتا ہے کامل نہیں ہوتا' چاہئے کہ تغذیہ سے قوت پائے اور کمال کو پہنچے' اسی طرح روح بھی ہنگام ولادت کامل نہیں ہوتی تربیت اور اخلاق اسے کمال کو پہنچاتے ہیں۔ فطرتاً چھوٹا بچہ ایک ایسے قلب کا مالک ہوتا ہے جس پر کوئی نقش یا خال نہیں ہوتا اور وہ ہر رنگ و تعصب سے پاک ہوتا ہے۔ والدین ہیں کہ اپنی پیروی میں ممکن ہے اسے یہودی بنا دیں یا مسیحی یا مجوسی' اسی بناء پر تربیت انسان کی سعادت و شقاوت کی سب سے بڑی جواب دہ ہے۔ تربیت فطرتِ سلیم کو چاہے آلودہ کر دے یا درخشاں' فرشتوں کی قلمرو کی طرف لے جائے یا بارگاہِ شیطان کی جانب''۔ (۱)

آثارِ غزالی:

غزالی دور اندیشی اور جہان علم میں فکر انسانی سے بہرہ ور بزرگ ترین نام آوروں میں سے ہے۔ وہ ایک آزاد مفکر ہے جو اپنے ہم عصروں میں فکر کے بلند ترین مرتبے کا مالک ہے۔ پس مرد پُر کار اور فراواں اثر کی تصانیف کی تعداد میں اگر مبالغہ ہو اور حقیقت و افسانہ مخلوط ہو جائیں تو جائے حیرت نہیں۔

غزالی ارسطو ہی کی طرح بلند آوازہ اہل دانش میں سے ہے اپنی حقیقی تصانیف کے علاوہ مرورِ ایام کے ساتھ دوسری بہت سے کتابیں اسی سے منسوب ہوگئی ہیں جن کی تعداد اس اصل سے چھ گنا ہے جو خود اس نے اپنی وفات سے دو سال قبل سلطان سنجر کے خط میں مذکور کی ہے۔ (۲) ان آثار فراواں کو غزالی کی اصل تصانیف کے ساتھ خلط ملط کرنے والوں نے اہل تحقیق کی بررسی کے کام کو اس قدر دشوار کر دیا ہے کہ درست کو نادرست سے متمائز کرنے کے لیے محققوں کو ایک دقیق معیار یعنی ترتیب تاریخی ''آثارِ غزالی کی تحقیق کی حاجت بھی لازم ہوگئی ہے۔ یعنی وہ معیار جو غزالی کی حقیقی تصانیف کے معرض وجود میں آنے کی تاریخ کو روشن کرے اس بزرگ استاد کے تکاملِ فکر کے دوران کی پہچان تنہا اس قسم کے معیار سے امکان پذیر نہیں ہے۔ یوں اس وسیلے سے ممکن ہے کہ اس عظیم انقلاب سے جو اس کی نشیب و فراز سے پُر زندگی میں نمودار ہوا آگاہ ہو جائیں۔

ترتیبِ تاریخی آثارِ غزالی:

ہماری خوش نصیبی ہے کہ مستشرقین نے غزالی کے آثار کے تاریخی ترتب کے بارے میں بہت کام کیا ہے اور

---

(۱) ''فرار از مدرسہ'' نوشتہ دکتر زریں کوب' صفحہ ۱۸۵

(۲) آپ کو معلوم ہو کہ بندہ نے علوم دینی میں ستر کتب تیار کی ہیں۔

دکتر عبدالرحمٰن بدوی نے ان کے بیشتر علمی کاموں کے خلاصے کو اپنی گراں قدر تصنیف ''مؤلفات الغزالی'' کے آغاز میں جمع کر دیا ہے۔ میں اس کتاب کے ترجمہ سے گل چینی کو یہاں پیش کروں گا۔

گشہ،(۱) میکڈانلڈ(۲) اور گولڈ(۳) زیہر کو چھوڑ کر پہلا مستشرق جس نے اپنی کتاب میں ''ترتیب تاریخی مولفاتِ غزالی'' کے زیر عنوان بات کی ہے لوئی ماسینیون ہے جس نے غزالی کی تصانیف کے زمانے کو چار مراحل میں بدیں ترتیب تنظیم دی ہے:

مرحلۂ اوّل: (۴۷۸ تا ۴۸۴ھ ق) کتاب الوجیز اس مرحلے میں تالیف ہوئی ہے۔

مرحلۂ دوم: (۴۸۴ تا ۴۸۸ھ ق) غزالی نے اس زمانے میں مقاصد الفلاسفہ، تہافتہ الفلاسفہ، الاقتصاد فی الاعتقاد اور فضائح الباطنیہ لکھیں۔

مرحلۂ سوم: (۴۸۹ تا ۴۹۵ھ ق) غزالی نے ان سالوں میں احیاء علوم الدین کو جسے وہ پہلے شروع کر چکے تھے انجام کو پہنچایا اور المستصفی در اصول فقہ، کیمیائے سعادت اور ''منہاج العابدین الی جنۃ رب العالمین'' تحریر کیں۔

مرحلۂ چہارم: (جو سال ۴۹۵ ہجری سے شروع ہوتا ہے اور ۵۰۵ ہجری قمری میں شہر طوس میں ان کی وفات کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے) غزالی ان سالوں میں معیار العلم، محک النظر، المقصد الاسنی فی شرح اسماء الحسنیٰ والاجوبۃ المسکتۃ، میزان العمل، جواہر القرآن، المنقذ من الضلال اور الجام العوام کے علاوہ کچھ اور کتب اور رسائل کی نگارش میں مصروف رہے۔

لوئی ماسینیون کے بعد اسین پلاسیوس(۴) نے غزالی کی اصیل اور مشکوک مولفات کی تشخیص کے بارے میں بحث کا آغاز کیا اور ایک ضخیم کتاب چار جلدوں میں ''روحانیۃ الغزالی'' کے نام سے تالیف کی جو ۱۹۳۴ء اور ۱۹۴۱ عیسوی کے درمیان میڈرڈ سے شائع ہوئی۔ مولف موصوف نے اپنی اس تالیف کی چوتھی جلد میں غزالی کی تصنیفات کے بارے میں ہر لحاظ سے بحث کی ہے جو صفحہ ۳۸۵ سے ۳۹۰ تک پھیلی ہوئی ہے اور امام سے منسوب مشکوک آثار کے بارے میں اپنے دلائل دیئے ہیں۔

(۵) اس بحث کی تفصیل عبدالرحمٰن بدوی کی کتاب ''مولفات الغزالی'' کے مقدمے میں ملاحظہ ہو۔

اسیس پلاسیوس کی گرانقدر تحقیق کے بعد منٹگمری واٹ کے تحقیقی مقالے کا نام آتا ہے جو ۱۹۵۲ء میں بعنوان ''صحت مولفات منسوب بہ غزالی'' شائع ہوا۔(۶) بعد ازیں موریس بویژ(۷) آثار غزالی کی تاریخی ترتیب کے لئے جامع تر کام میں مصروف ہیں اور اگلے مستشرقین کے کام کی تکمیل کا بیڑہ اٹھاتے ہیں۔ اور قبل اس کے ان کا حاصل کار شائع ہو وہ خود بائیس جنوری ۱۹۵۱ء عیسوی کو موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ خوش بختی سے اس دانش مند کے ادھورے کام کو ایک لبنانی استاد

---

(۱) Gosche (۲) D. B. Macdonald (۳) Goldziher

(۴) Asin Palacios (۵) اس بحث کی تفصیل عبدالرحمٰن بدوی کی کتاب ''مولفات الغزالی'' کے مقدمے میں ملاحظہ ہو

(۶) W. M. Wat, Jras 1852 pp24-45 (۷) M. Bouyges

ڈاکٹر میشل آلارد[1] مکمل کر کے ۱۹۵۹ء میں شائع کر دیتے ہیں۔

آخر کار مصری دانش مند ڈاکٹر عبدالرحمٰن بدوی جملہ مستشرقین کی تحقیقات سے استفادہ کر کے اپنی نفیس کتاب ''مولفات الغزالی'' کی تالیف میں لگ جاتے ہیں جو امام ابوحامد محمد الغزالی کے ہزارویں سال میلاد کی تقریب میں ۱۹۶۰ء کے موسم گرما میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ۴۵۷ اصلی و منسوب و مشکوک کتابوں کا ذکر ہوا ہے جن میں سے مولف ۷۲ کو بے تردید غزالی کا مال قرار دیتا ہے اور بقیہ کے بارے میں شک و تردید کا اظہار کرتا ہے۔ تہتّر سے لے کر پچانوے ایسی کتب ہیں جو مشکوک ہیں کہ امام کی ہوں۔ اسی طرح ۹۶ سے لے کر ۱۲۷ تک وہ ہیں جن کے بارے میں قوی احتمال ہے کہ غزالی کی نہیں اور ۱۲۸ سے ۲۲۴ تک وہ ہیں جو غزالی کی کتب کے نام سے غلط مشہور ہو گئی ہیں جب کہ حقیقتاً وہ غزالی کی تالیفات کے بعض ابواب یا فصلیں ہیں۔ اسی طرح ۲۲۵ سے لے کر ۲۷۳ نام ان کتب کے ہیں جو دراصل غزالی کی تصانیف کی تلخیص میں تدوین ہوئی ہیں یا دوسروں کے ردّ و انتقاد پر ہیں جو انھوں نے غزالی کی تصانیف پر لکھے ہیں۔ وہ غلطی سے غزالی سے منسوب ہو گئی ہیں۔ مثلاً ابنِ جوزی کی تلخیص احیاء علوم الدین شمارہ ۲۷۴ سے ۳۷۹ تک ان کتابوں کے نام ہیں جو غزالی کی تصانیف کی شرح و ستایش میں تالیف و تدوین ہوئیں اور ان کے مؤلفین نامعلوم ہیں۔ مثلاً ''کتاب الانتصار لماوقع فی الاحیاء من الاسرار'' ۳۸۱ سے لے کر پایان کتاب تک خطی نسخوں کے نام غزالی کی اصلی اور منسوب کتابوں کے ہیں جو دنیا کے کتاب خانوں میں موجود ہیں۔

مسلمان تذکرہ نویس اور غزالی:

چونکہ اس دامن مختصر میں ان تمام اسلامی مورخوں کے نام گننا جنھوں نے غزالی اور ان کی تصانیف پر بحث کی ہے اور ذکر کرنا ممکن نہیں اس لئے ناچار چند دانشوروں کے نام کے ذکر پر کفایت کرتے ہیں

۱: **عبدالغافر بن اسمٰعیل فارسی نیشاپوری (۵۲۹-۴۵۱ ھ)**: مولف ''کتاب السیاق'' در تاریخ نیشاپور'' یہ صاحب غزالی کی معاصر ہیں۔

۲: **ابن عساکر، مولفِ تاریخ دمشق (۵۷۱-۴۹۹ ھ)**: جنھوں نے اپنی اَسّی (۸۰) جلدی تاریخ میں غزالی اور ان کی تصانیف کا ذکر بھی کیا ہے۔

۳: **ابن الجوزی (ابوالفرج) (۵۹۷-۵۰۸ ھ ق)**: جنھوں نے غزالی کے بارے میں نیز ان کے آثار و عقاید کے باب میں اپنی کتاب 'المنتظم' میں ذکر کیا ہے۔

۴: **سبط ابن الجوزی (۶۵۴-۵۸۱ ھ ق)**: جو اپنی کتاب بنام ''مرآۃ الزمان فی تاریخ الاعیان'' میں غزالی اور ان کی تصانیف میں بحث کرتے ہیں۔

۵: **ابن خلکان (شمس الدین ابوالعباس احمد) (۶۸۱-۶۰۸)**: جو کتاب ''وفیات الاعیان و اابناء ابناء الزمان'' میں غزالی کے بارے میں ایک شرح لائے ہیں۔

---

(۱) R.P.Michel Allard

۶: تاج الدین ابونصر عبدالوہاب سبکی (۷۷۱-۷۲۷ھ ق): جنھوں نے ''طبقات الشافیہ الکبریٰ'' میں غزالی اوران کے آثار کے بارے میں مفصل اور مشروح بحث کی ہے۔

۷: طاش کبری زادہ (فوت ۹۶۲ھ ق = ۱۵۵۲عیسوی): جو اپنی کتاب ''مفتاح السعادت'' میں غزالی اوران کی تصانیف کا ذکر کرتے ہیں۔

۸: مرتضٰی زبیدی (۱۲۰۵-۱۱۴۵ھ ق): جو دس جلدی ''احیاء علوم الدین'' کی شرح بنام ''اتحاف السادۃ المتقین بہ شرح اسرار احیاء علوم الدین'' کے مقدمے میں امام غزالی اوران کے آثار کے باب میں عالمانہ بحث کرتے ہیں۔ وہ بحث جو سراسر دقتِ نظر، صداقت اور عالمانہ معیار کی آئینہ دار ہے۔ اس پُر مایہ شارح نے ۸۷ آثار غزالی کو حروف تہجی کی ترتیب سے (بر بنائے حرف اوّل کتاب) منظم کیا ہے۔ اور غزالی کی دیگر تصانیف سے پہلے غزالی کی کتاب ''احیاء علوم الدین'' کا ذکر تین دلیلوں کی بناء پر کیا ہے۔ اول یہ کہ اس کتاب کا نام حرف الف سے شروع ہوتا ہے، دوم یہ کہ مولف کے اس عقیدے کی بناء پر کہ یہ علوم آخرت پر مشتمل ہونے کے باعث غزالی کی دیگر تصانیف پر برتری رکھتی ہے۔ سوم اس بناء پر کہ یہ کتاب سورج کی طرح عالمی شہرت سے بہرہ ور ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ بہتر یہی ہے کہ غزالی کی تصانیف کی الفبائی ترتیب کے مطابق مرتضٰی زبیدی کی دس جلدی شرح احیاء علوم الدین کے مقدمے کی طرف رخ کیا جائے اور آثار غزالی کی تاریخی ترتیب کے باب میں اوران کی حقیقی تصانیف اوران سے منسوب ومشکوک تصانیف کے امتیاز کے لئے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بدوی کی تالیف ''مولفات غزالی'' جو آج تک کے تمام مآخذ سے بہتر ہے اس کے مقدمے سے بدیں ترتیب استفادہ کیا جائے:

ترتیب تاریخی آثار امام محمد غزالی، پانچ مرحلوں میں

الف آثار سالہای دانش اندوزیٔ غزالی ۴۶۵ تا ۴۷۸ھ ق

۱-التعلیقہ فی فروع المذہب (۱)
۲-المنخول فی الاصول (۲)

ب آثار نخستین دوران درس و بحث

۳-البسیط فی الفروع
۴-الوسیط
۵-الوجیز
۶-خلاصۃ المختصر ونقاوۃ المعتصر
۷-المنتحل فی علم الجدل
۸- مآخذ الخلاف
۹-لباب النظر
۱۰- تحصیل المآخذ فی علم الخلاف

(۱) یہ کتاب انھی تعلیقات کا مجموعہ ہے جو جرجان (گورگان) کے سفر سے لوٹتے ہوقت راہزنوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور غزالی نے التماس اور زاری کے ساتھ ملامت سننے کے بعد واپس حاصل کی تھی۔

(۲) اس کتاب کے بارے میں غزالی نے خود اپنے مکاتیب فارسی میں یوں لکھا ہے: (اردو ترجمہ) پس وہ تعلیق جو میں نے لڑکپن میں کئے تھے انھی کی پشتیبانی پر میں نے ''المنخول من تعلیق الاصول'' لکھی تھی.... (مکاتیب فارسی۔ عباس اقبال، صفحہ ۱۲)۔

۱۱-المبادی والغایات
۱۲-شفاء العلیل فی القیاس والتعلیل
۱۳-فتاوی الغزالی
۱۴-فتویٰ (فی شان یزید)
۱۵-غایۃ الغور فی درایۃ الدور
۱۶-مقاصد الفلاسفہ
۱۷-تہافت الفلاسفہ
۱۸-معیار العلم فی فن المنطق
۱۹-معیار العقول
۲۰-محک النظر فی المنطق
۲۱-میزان العمل
۲۲-المستظہری فی الرد علی الباطنیہ
۲۳-حجۃ الحق
۲۴-قواصم الباطنیہ
۲۵-الاقتصاد فی الاعتقاد
۲۶-الرسالۃ القدسیہ فی قواعد العقلیہ
۲۷-المعارف العقلیہ ولباب الحکمۃ الالٰہیہ

ج آثار دوران خلوت نشینی و مردم گریزی از سال ۴۸۸ تا ۴۹۹ ہجری قمری:

۲۸-احیاء علوم الدین
۲۹- کتاب فی مسئلہ کل مجتہد مصیب
۳۰-جواب الغزالی عن دعوۃ الملک لہ
۳۱-جواب مفصّل الخلاف
۳۲-جواب المسائل الاربع التی سالہا الباطنیہ بہمدان من ابی حامد الغزلی
۳۳-المقصد الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ
۳۴-رسالہ فی رجوع اسماء اللہ الیٰ ذات واحدۃ علیٰ رائ المعتزلہ والفلاسفہ
۳۵-بدایۃ الہدایۃ
۳۶- کتاب الوجیز فی الفقہ
۳۷-جواہر القرآن
۳۸- کتاب الاربعین فی اصول الدین
۳۹- کتاب المضنون بہ علی غیر اہلہ
۴۰-المضنون بہ علی اہلہ
۴۱- کتاب الدرج المرقوم بالجداول
۴۲-القسطاس المستقیم
۴۳-فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ
۴۴-القانون الکلی والتاویل
۴۵- کیمیائے سعادت (فارسی)
۴۶-ایہا الولد
۴۷-اسرار معاملات الدین
۴۸-زاد آخرت (فارسی)
۴۹-رسالہ الیٰ ابی الفتح احمد بن سلامۃ
۵۰-الرسالۃ اللدنیہ
۵۱-رسالۃ الیٰ بعض اہل عصرہ
۵۲-مشکات الانوار
۵۳- تفسیر یاقوت التاویل
۵۴-الکشف والتبیین
۵۵- تلبیس ابلیس

د - بازگشت بہ سوئے مردم ودومین دوران درس و بحث از سال ۴۹۹ تا ۵۰۳ھ ق

۵۶-المنقذ من الضلال
۵۷- کتب فی السحر والخواص الکیمیا
۵۸-غور الدور فی المسئلۃ السریجیہ
۵۹-تہذیب الاصول
۶۰- کتاب حقیقۃ القولین
۶۱- کتاب اساس القیاس
۶۲- کتاب حقیقۃ القرآن
۶۳-المستصفی من العلم الاصول
۶۴-الاملاء علی مشکل (الاحیاء)

۵- آخریں سالہائی زندگی ۵۰۳ تا ۵۰۵ھ ق
۶۵-الاستدراج
۶۶-الدرۃ الفاخرہ فی کشف علوم الآخرۃ
۶۷-سر العالمین وکشف مافی الدارین
۶۸-نصیحۃ الملوک (فارسی) (۲)
۶۹-جواب مسائل سئل عنہا فی نصوص اشکلت علی المسائل
۷۰-رسالۃ الاقطاب
۷۱-منہاج العابدین
۷۲-الجام العوام (۱)

کیمیائے سعادت کی قدر و قیمت:

''قریب تھا کہ کیمیائے سعادت ایک قرآن بن جائے'' اگر اسلامی علوم مفقود ہو جائیں تو یہ سب علوم غزالی کی احیاء سے اخذ کئے جا سکتے ہیں''۔ یہ ستائش اقوال جو احیاء کے بارے میں کہے گئے ہیں یہ کیمیائے سعادت کے بارے میں بھی صادق ہیں۔ چونکہ کیمیائے سعادت ضخیم کتاب احیاء کا خلاصہ ہے ایسی کمی بیشی کے ساتھ کہ کہا جا سکتا ہے کہ: ''غزالی نے اسے نظم ترتیب کے ساتھ اپنی مادری زبان میں رواں اور حسین نثر کی صورت میں لکھا ہے کہ اہلِ علم نے اسے دائرہ معارف اسلامی قرار دیا ہے۔

غزالی نے کیمیائے سعادت پانچویں صدی ہجری کے آخر میں لکھی ہے اور اب تقریباً اس نفیس اثر کو لکھے ہوئی نو سو سال گذر چکے ہیں اور حیرت ہے کہ اس نو سو سال پرانی تصنیف کی فارسی زبان کا حسن و جمال کئی حیثیتوں سے اب بھی توانا' زندۂ لطیف اور زیبا ہے۔

مقدمۂ کتاب کے چار عنوان ہیں: خود شناسی' خدا شناسی' دنیا شناسی' اور آخرت شناسی۔ کیمیائے سعادت کا متن احیاء کے متن ہی کی طرح چار ارکان میں منقسم ہے۔

عبادات' معاملات' مہلکات' منجیات

ربع عبادات میں غزالی فقہی تالیفات کے علی رغم عبادات کے ظواہر میں مشغول نہیں ہوتے بلکہ ہر جگہ فلسفۂ عبادات

(۱) یہ کتاب دوبار ایران میں استاد رپیانی کی ہمت سے ایران میں چھپ چکی ہے۔

(۲) شہید علی کے نسخہ خطی شمارہ ۱/۱۲/۱۱۷ استانبول میں لکھا ہوا ہے کہ اس کتاب کی تالیف ۵۰۵ھ میں تمام ہوئی ہے چونکہ غزالی ۱۴ جمادی الآخر کو فوت ہوئے لہٰذا ممکن ہے کہ آپ کی آخری تصنیف ہو۔

اوران کے معانی کو بھی مورد بحث قرار دیتے ہیں۔

کیمیائے سعادت کی گراں قدری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ غزالی کا سا مصنف شاید ہی مل سکے جس کا اسلوب اس حد تک دقیق ہو اور ساتھ ہی اتنا غنی بھی ہو جو احیاء علوم الدین اور کیمیائے سعادت جیسی بلند پایہ کتابوں میں تشبیہ و تمثیل کو شاعرانہ بیان سے نکھارتا ہے اس حیثیت سے کیمیائے سعادت جو سادہ نثر لطیف کا دلپذیر نمونہ پیش کرتی ہے اس انداز بیان کی پیش رو ہے جو عطار اور رومی کے آثار میں اوج جلال تک جا پہنچتا ہے۔ غزالی کی تشبیہات و استعارات اکثر احوالِ انسانی کو گل و گیاہ و سنگ و کوہ اور جانور کے ہم سنگ قرار دیتی ہیں۔ دنیائے آثار غزالی کو بھی مثنوی ہی کی طرح متجلی کرتی ہیں کہ ان میں گویا روح موجود ہے اور ہر چیز انسان کے ساتھ باتیں کرتی ہے۔(۱)

روشِ تصحیح:

کیمیائے سعادت کی پہلی جلد (نصف اول) جو ۱۳۵۴ ہجری میں تہران میں شائع ہوئی تھی اس کے مقدمے میں یعنی آج سے دس برس قبل، ہم نے یوں لکھا تھا: ''پہلی بار ہم نے محترم ناشر سے یہ طے کیا تھا کہ کیمیائے سعادت غزالی کا ایک انتخاب ایک مجلد میں تیار ہوتا کہ مجموعہ سخن پارسی کے ادارے کی جیبی کتابوں کے طور پر شائع ہو لیکن انتخاب کیمیا کے ایک حصے کی تیاری کے بعد ناشر نے رائے بدل دی اور پوری کتاب کو دو جلدوں میں شائع کرنے پر موافقت کی۔ اس شرط کے ساتھ کہ ہر صفحے کے فٹ نوٹ میں نسخہ بدلوں کی جگہ دشوار الفاظ کے معنے لکھے جائیں۔ نیز قواعد (گرامر) کے نکات کی طرف اشارات مندرج ہوں تا کہ کتاب تمام طالب علموں کے لئے جو پرانی فارسی سے استفادہ کریں سہل ہو جائے۔ چونکہ خاطر خواہ فرصت میسر تھی اور ناشر کی شرایط معقول تھیں اور آلات کار ہر لحاظ سے تیار تھے، میں نے ناشر کی تجویز قبول کی اور پورے متن کی تصحیح کے کام میں از سر نو لگ گیا۔ تازہ دستیاب چار نسخوں کی بنیاد پر جو مؤرّخ بھی تھے ان کو بنیاد بنا کر تر کی کے نفیس اور کامل و مشکول نسخے کہ جس پر تاریخ ۶۲۴ ہجری لکھی ہوئی ہے پر بیشتر تکیہ کیا۔

لیکن کیمیائے سعادت کے قدیم ترین اور معتبر ترین خطی نسخے جو پوری کتاب کے متن (یعنی چاپ حاضر) کی تصحیح کی بناء قرار پائے درج ذیل ہیں:

۱۔ **نسخہ مورخ ۵۷۶ ھ ق)** متعلق بہ دار الکتب القومیۂ قاہرہ بروز ہفتہ پنجم محرم بسال ۵۷۶ ہجری عبداللہ بن ابوالقاسم کے توسط سے استنساخ ہوا اور کیمیائے سعادت کے نصف دوم یعنی دو ربع مہلکات و منجیات کو محیط ہے۔ اس میں ۲۱۴ ورق ہیں اور ہر ورق ۲۷ سطری ہے۔

۲۔ **نسخہ مورخ ۶۰۰ ھ ق**۔ موجود در دار الکتب الوقومیۂ قاہرہ جو ۱۹ سطری ہے ۲۱۹ ورق پر پھیلا ہوا ہے وہ کیمیائے سعادت کے نصف اول پر مشتمل ہے۔

میں محترم پڑھنے والوں کی توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ مذکورہ بالا دونوں نسخے مل کر کیمیائے

(۱) فرار از مدرسہ، صفحہ ۲۰۱، ۲۰۲

سعادت کے کامل متن پر مشتمل ہیں جو قدامت اور اعتبار کی بناء پر چاپ حاضر کے مصحح متن کی اساس ٹھہرے ہیں۔

۳۔ کتاب خانہء چلپی عبداللہ مورخ ۶۲۴ھ ق کا کامل ومشکول نسخہ جسے مجتبیٰ مینوی مرحوم نے مائیکروفلم پر دانش گاہ تہران کے مرکزی کتاب خانے کے لئے تیار کیا تھا۔ یہ نسخہ بروز ہفتہ یکم جمادی الآخر سال ۶۲۴ میں کتابت ہوا۔ کامل نسخہ ہے صرف صفحہ اول اور صفحہ آخر کو سید نسیب نام کے ایک کاتب نے دوبارہ لکھا ہے۔ یہ پورا نسخہ سوائے دو ترمیم شدہ صفحات کے مشکول ہے۔ یعنی اس بے مثال نسخے کے عربی و فارسی کلمات پر دقیقاً روشنی اعراب' کاتب کے زمانہ زندگی کے رسم الخط کے مطابق لگائے گئے ہیں۔

۴۔ یہ نسخہ جو سال ۵۸۴ھ ق سے پہلے کا مورخ ہے اور لینن گراڈ کے مرکز شرق شناسی میں موجود ہے۔ اس نسخے کا مالک اس کے آخر میں یوں رقم طراز ہے: ''ولادت فرزند قرتلعین (کذا) ابوبکر اسعدہ اللہ بروز چہارشنبہ ۲۵ ماہ ربیع اوّل ۵۸۴ وقت آفتاب فراخ شدن نزدیک جا..... '' یہ نسخہ صرف ربع معاملات پر مشتمل ہے۔

آج سے پندرہ سال پہلے کی بات ہے کہ میں کیمیائے کے قدیم نسخوں کی کچھ مائیکروفلمیں استاد آرام کی خدمت میں لے گیا تا کہ ان کے لئے کیمیا کی جدید چھپائی کے لئے بنیاد فراہم ہو۔ استاد محترم نے کشادہ روئی اور مشفقانہ لہجے میں فرمایا: ''میں اب اس کام میں مشغول ہونے کی ہمت وحوصلہ نہیں رکھتا تم خود ہی ہمت کرو اور تصحیح کے کام میں جُت جاؤ'' پھر اس کے ساتھ ہی مربوط ناشر کے ساتھ ٹیلی فون پر رابطہ کر کے اسے تاکید کی کہ تصحیح متن کے مقدمات فراہم ہو جائیں۔ استاد کی بات نے بہ سرعت جامۂ عمل پہن لیا اور جلد ہی میرے لئے مقدمات کار مہیا ہو گئے۔

تنظیم قرارداد پر میکروفلموں کے عکس کی تیاری ونسخوں کے دقیق مطالعے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ دونفیس نسخے جو ۵۷۶ اور سال ۶۰۰ھ کے مورخ ہیں جو تماماً کتاب کے متن میں شامل ہیں اور دوسرے نسخوں کی نسبت قدیم تر اور معتبر تر ہیں ان سے نسخہ تیار کروں اور انھیں تصحیح کے لئے اساس ٹھہراؤں پھر دیگر نسخوں کی مدد سے جو مورخ اور معتمد ہوں تصحیح متن کے کام میں لگ جاؤں۔ اسی بناء پر کیمیائے سعادت کے متن کی پہلی' دوسری اور تیسری چاپ جو آج تک اس حقیر کے ذریعے صورت پذیر ہوئی انھی نفیس مورخ نسخوں کی اساس پر انجام کو پہنچی ہے۔ بہ این معنی کہ نسخہ نمبر ۱ اور نمبر ۲ تصحیح کے اساسی نسخے تھے اور متن کی بعض مشکلات کو حل کرنے کے لئے' نہایت امانت کے ساتھ نسخہ نمبر ۳ و ۴ و چاپ استاد آرام اور ترجمہ کہن احیاء علوم الدین (از مویدالدین خوارزمی بہ تصحیح نگارندہ این سطور) سے مدد لی گئی ہے۔ اس غرض سے کہ کتاب نسخہائے بدل کی شرح سے گراں بار نہ ہونے پائے موارد اختلاف کا ذکر ضرورت کے پیش نظر کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں عبارت مبہم دکھائی دی تو کلمے یا جملے کی دوسری صورت مآخذ مربوط کے ذکر کے ساتھ فٹ نوٹ میں درج کر دی ہے تا کہ قاری کے لئے ابہام باقی نہ رہے۔

کیمیا کی پہلی مجلد اشاعت (در سال ۱۳۵۴ کے بعد سات سال لگ گئے جب جا کر کیمیائے سعادت کا کامل ایڈیشن دو جلدوں میں انتسارات شرکتِ علمی وفرہنگی کے توسط سے امکان پذیر ہوا۔ اور کتاب سال ۱۳۶۱ میں بازار میں آ گئی۔ اور خوش بختانہ علاقہ مندوں نے نہایت خوش دلی سے کتاب کا استقبال کیا۔

۱۳۶۱ کے ایڈیشن کی اشاعت پر استاد احمد آرام اور دکتر غلام حسین یوسفی نے ''مجلّہ نشر دانش'' میں اپنے شاگرد کی از راہ تشویق تحسین کی اور مہربان دوست صاحب علم دکتر محمد رضا شفیعی کدکنی نے اس پر عالمانہ انتقادی نوٹ لکھا۔ جس میں ایسے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جن کی رعایت لازم دکھائی دیتی تھی جو موجودہ اشاعت میں جہاں تک ہوسکا عمل میں لائی گئی ہے۔[۱]

موجودہ ایڈیشن کے بارے میں:

۱۔ موجودہ ایڈیشن میں فٹ نوٹوں میں متن کے الفاظ کے معنی کو مزید روشن کرنے کے لئے جہاں ضروری تھا اصلاح کردی گئی ہے۔ مثال کے لئے صفحہ ۱۴۳ جلد اوّل کے شمارہ ۲ کو ملاحظہ کیجئے۔

۲۔ پہلے ایڈیشن میں چھاپے کی بعض اغلاط جہاں کہیں دکھائی دیں یا اہل نظر نے نشان دہی کی ان کی اصلاح کردی گئی۔ جلد دوم کے دو صفحہ (۲۲۰ و ۲۲۱) کی طرح جہاں جفت و جور ادھر ادھر ہوگئے تھے اب اپنی حقیقی جگہ پر آ گئے ہیں۔ علاوہ ازیں سر صفحہ عنوان اور پاورقی کے کچھ شمارے جلد دوم کے فٹ نوٹوں میں ناہم آہنگ تھے اب یک رنگ اور ہم آہنگ ہوگئے ہیں۔

۳۔ سب سے اہم تر اس کتاب کی فہرست لغات و ترکیبات کی تیاری اور تدوین ہے جو نثر فارسی کے لحاظ سے توجہ کے لایق ہے۔ قدرت تعبیر' ایجاز' سادگی' انشائے جاندار پر تاثیر جو اس کتاب کا سرمایہ افتخار ہے پتہ دیتا ہے کہ غزالی معارف اسلامی کے تبحر کے علاوہ زبان فارسی میں نہایت بلند مرتبت صاحبِ قلم تھے۔ کیمیائے سعادت میں کی فصیح و بلیغ ترکیبات نے غزالی کی نثر کو ایک خاص قسم کی قدرت عطا کی ہے جو فارسی کے نثری متون میں کم نظیر ہے۔[۲]

اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے زندگی کی مہلت عطا کی کہ جس کے بل پر میں مشکل پسند دانا دوستوں کی آرزو و انتظار کو اس بارے میں علمی شکل دے سکا۔

واضح رہے کہ لغات و ترکیبات کی فہرست موجود ایڈیشن کی جلد دوم میں اضافہ کردی گئی ہے۔ اور ہر جلد کی اعلام و آیات و احادیث کی عمومی فہرست پہلے ایڈیشن کی طرح اپنی جگہ باقی رکھی گئی ہے۔

قرآن و برہان کا دل بستہ:

جاہ و مال کے دل بستہ تر دامنوں کی صحبت ترک کرنے کے بعد غزالی پُرشور و حال مردان آزاد کی سی خلوت گزینی میں سترہ سال نہایت اخلاص کے ساتھ ہمہ تن مصروف رہے اور دل اپنے خالق کے حوالے کردیا۔ اور امکانی حد تک گراں قدر آثار مثلاً احیاء علوم الدین' کیمیائے سعادت و جواہر القرآن وغیرہ کی تصنیف و تدوین کی۔ اور اسلام اور اہل اسلام کے لئے علمی اور فرہنگی میراث فراہم کردی۔ وہ میراث جو آگاہی و اتحاد کی اساس ہے۔ جو مسلمانوں کو متنبہ کرتی ہے کہ اگر اسلام کو پورے عالم میں فروغ کے خواہاں ہو تو ناگزیر ہے کہ ''شرعیات میں مذہبِ قرآن کے پیرو ہوں اور عقلیات میں مذہب

---

(۱) مجلّہ نشر دانش کے سال سوم کا چھٹا شمارہ ملاحظہ ہو۔

(۲) اس ضمن میں بیشتر آگاہی کے لئے دکتر حسین یوسفی کے '' کاغذ زرنوشتہ'' کو ملاحظہ کیجئے۔

برہان کے'' تاکہ آیہ ''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا'' کا سچا مفہوم نمودار ہو۔ یعنی وہی حقیقت جو آج عالمی محروم عوام خصوصاً اسلامی ممالک کے غلام تا حدے خواب گراں سے بیدار مسلمانوں کو انقلاب ایران کی طرح امیدوار کر سکے۔

لیکن کیمیائے سعادت اور امام کی دیگر تصانیف میں روایت شدہ اخبار و احادیث میں سے بعض کے صحت و سقم کے باب میں اہل دانش صدیوں سے اپنی سمجھ کے مطابق دادرسی میں لگے رہے ہیں ان میں سے اکثر علم و دانش و آزادگی و دین و مروت سے بہرہ ور تھے آخر کار ایسے رستے کے راہی ہوئے ہیں کہ جس کی قرآن کریم نے نصیحت کی ہے یعنی آیہ ''فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَه'' کے مطابق عمل کیا ہے تاکہ مسلمانوں کا اتحاد تفرقے کی منزل کو نہ جا پہنچے۔

ابو حامد محمد غزالی کا مرتبہ حکیم ملا صدرائے شیرازی کی نظر میں:

حکیم الٰہی، ملا صدرای شیرازی اپنی ارزشمند کتاب ''اسفار'' (جز و دوم سفر اول) کی ۲۷ ویں فصل میں اثبات التکثر فی الحقایق الامکانیة'' کی ذیل میں کتاب احیاء علوم الدین کے ایک حصے (رابع منجیات، کتاب توحید و توکل) کو اپنی بات کے گواہ کے طور پر انتخاب کرتے ہیں۔ اور انجام کار غزالی کی بات ستائش بدیں الفاظ کرتے ہیں'' وانما اوردنا کلام هذاالبحر القمقام الموسوم عندالانام بالامام وحجة الاسلام ليكون تلبيناً لقلوب السالكين مسلك اهل الايمان'' پھر ''مفاتیح الغیب'' میں ملا فرماتے ہیں: ''بے شبہ رموزِ قرآنی اور خزائن رحمانی'' کے باب میں انھی تحقیقات و تاویلات کی طرف مختصر اشارہ ہے۔ حجۃ الاسلام غزالی کثیر تمثیلوں کا مختصر خلاصہ ہے اس دانش ور پارسا و پیش رو کی مفصل دریافتوں کا، ایک انتخاب ہے جانوں کی نجات اور روحوں کی شفا کا۔ راہ ہدایت و نجات کے عرفان کی نہایت عمدہ گل چینی ہے۔

چونکہ غزالی ایداللہ تعالیٰ، موتی پیدا کرنے والا سمندر ہیں کہ جس کی سیپیوں سے ''جواہر القرآن'' شکار کئے جا سکتے ہیں اور آگ ہے روشن جس کے نور فروزاں سے بیان کے انوار حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

غزالی کا پُر روشن ذہن کبریتِ احمر ہے جس سے بزرگ کیمیائے سعادت نے فیض پایا ہے۔ اس کی فکر وہ غواص ہے جس نے اساسی سمندروں سے معانی کے موتی شکار کئے ہیں۔ اس کا فہم ایک بصیر صراف ہے جو اپنے نقد کو علمی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اس کی عقل وہ میزان ہے جو برہان قویم (= درست و راست) یعنی قرآن کو صراطِ مستقیم پر پرکھتا ہے۔ اس کا دم مردہ علوم دین کے لئے حیات بخش اور اہداف یقین کو از سر نو ظہور عطا کرنے کے لئے حضرت موسیٰ کے ید بیضا کی مانند معجز ہے۔

''پس وہ روح شادمان رہے جس کے آثار و خواص ایسے ہوں اور سیراب رہے وہ روان جو نجات پا گئی جس نے لوگوں کے درمیان بسر کی اور آخر اپنے خالق سے جا ملی''۔

سید حسین خدیوجم

تہران، شنبہ نہم شہریور ۱۳۶۴ھ ق

چہارہم ذیحجہ ۱۴۰۵ھ شمسی

دیباچہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
وبہ نستعین (۱)

خدائے تعالیٰ کا فراواں شکر آسمان کے ستاروں، بارش کے قطروں، درختوں کے پتوں، بیابان کی ریت زمین و آسمان کے ذروں کی تعداد میں، وحدت جس کی صفت ہے اور جلال و کبریا، عظمت و عُلا اور مجد و بہا خاصیت اسی کی ہے۔ مخلوق میں سے کوئی بھی اس کے جلال کے کمال سے آگاہ نہیں اور سوائے اس کے کسی کو اس کی معرفت کی حقیقت معلوم نہیں، بلکہ اس کی معرفت کی حقیقت سے اظہارِ عجز صدیقوں کا منتہائے معرفت ہے اور اس کی حمد و ثناء میں تقصیر کا اعتراف فرشتوں اور پیغمبروں کی ثنا کا منتہا ہے۔ اس کے جلال کے اشراق کی اصل میں عقل کا منتہا حیرت ہے اور سالکوں اور مریدوں کی اس کے جمال کے حضور میں قرب کی طلب کا منتہا ہے۔ اور اس کی معرفت کے اصل سے امید کا فقدان تعطیل ہے اور اس کی معرفت کے کمال کا دعویٰ خیال، تشبیہ و تمثیل سے ہے۔ جملہ آنکھوں کے نصیب میں اس کی ذات کے جمال کے ملاحظات میں سے خیرگی ہے۔ نظر بہ عجائب صنع وہی معرفت ضروری تمام عقول کا ثمرہ ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی شخص اس کی ذات کی عظمت کے بارے میں سوچے کہ وہ کیسی ہے اور کیا ہے؟ اور مبادا کہ کوئی دل ایک لحظے کے لیے بھی اس کی صنعت گری سے غافل ہو کہ اس کی ہستی کس چیز سے ہے اور کس کی قدرت سے ہے تا کہ لازماً پہچانے کہ سب اسی کی قدرت کے آثار ہیں۔ اور اس کی عظمت کے جملہ انوار اور تمام بدایع اور نوادر اس کی حکمت کے ہیں۔ اور سب اسی کے حضور کے جمال کا پرتو ہیں۔ اور سب کچھ اسی سے ہے سب اسی کا ہے بلکہ خود وہ ہے کیونکہ کسی چیز کی ہستی حقیقت (۲) میں ہے ہی نہیں بلکہ تمام چیزوں کی ہستی اسی کی ہستی کے نور کا پرتو ہے۔

(۱) بنام خداوند بخشندہ مہربان واز و یاری می جویم۔

(۲) بہ حقیقت، حقیقی

اور درود بر مصطفیٰ ﷺ کہ پیغمبروں کے سردار ہیں۔اور مومنوں کے رہبر و رہنما' اسرار ربوبیت کے امین اور بارگاہِ الٰہیت کے برگزیدہ و برداشتہ ہیں اور سلام ہو ان کے تمام یاروں اور ان کے اہل بیت پر کہ جن میں سے ہر ایک امت کا پیشوا اور شریعت کی راہ دکھانے والا ہے۔

امابعد' جان لیجئے کہ انسان کو بیکار پیدا نہیں کیا گیا کام اس کا بڑا عظیم ہے[1] اور اہمیت اس کی نہایت زیادہ ہے کیونکہ وہ اگرچہ ازلی نہیں لیکن ابدی ہے۔ اگر اس کا کالبد خاکی ہے اور سفلی ہے تو اس کی روح علوی اور ربانی ہے۔اور اس کا گوہر اگرچہ ابتداء میں بہیمی' سبعی اور شیطانی صفات سے آمیختہ و آویختہ ہے لیکن جب اسے مجاہدے کی کٹھالی میں ڈالیں تو وہ اس آمیزش و آلائش سے پاک ہو جاتا ہے۔اور حضرت ربوبیت کے قرب کے لائق ہو جاتا ہے۔اور اَسۡفَلُ السَّافِلِیۡن (۱) سے اَعۡلٰی عِلِّیِّین (۲) تک تمام نشیب و فراز اسی کا کام ہے۔اس کا اسفل السافلین یہ ہے کہ بہایم اور درندوں کے پایۂ پست میں گر جاتا ہے اور شہوت و غضب میں اسیر ہو جاتا ہے اور اس کا اعلیٰ علّیین یہ ہے کہ فرشتے کے درجے کو پہنچ جاتا ہے۔اس انداز سے کہ شہوت و غضب سے نجات پاتا ہے اور شہوت و غضب دونوں اس کے اسیر ہو جاتے ہیں اور وہ ان کا پادشاہ بن جاتا ہے۔اور جب اس پادشاہی کو پہنچتا ہے بارگاہِ اُلوہیت میں بندگی کے لائق ہو جاتا ہے اور جب اسے حضرت اُلوہیّت کے جمال سے انس کا مزہ ملتا ہے تو حضرت کے اس جمال کے مطالعے سے ایک لحظہ بھی صبر نہیں کر سکتا۔اور اس جمال کا نظارہ گویا اس کی بہشت بن جاتا ہے اور وہ بہشت جو چشم و فرج و شکم کو نصیب ہے اس کے نزدیک حقیر ہو جاتی ہے۔

اور چونکہ انسان کا گوہرِ اوّل آفرینش میں ناقص اور حسین ہے اس لیے اس نقص کو بدرجۂ کمال تک پہنچانا سوائے مجاہدت اور معالجت کے ممکن نہیں اور جس طرح کیمیا جو تانبے اور پیتل کو صفائے زر خالص تک پہنچائے اس کا عمل دشوار ہے اور ہر کوئی اس کا علم نہیں رکھتا۔اسی طرح یہ کیمیا کہ جو گوہر آدمی کو بہیمیت کی کثافت سے فرشتگی کی نفاست تک پہنچائے تا کہ اس کے بل پر ابدی سعادت سے بہرہ مند ہو تو یہ کام بھی دشوار ہے اور ہر کسی کے بس کا نہیں۔

اور مقصود اس کتاب کی نگارش اسی کیمیا کے اخلاط کی شرح ہے جو حقیقت میں ابدی کیمیائے سعادت ہے اور ہم نے اس کتاب کا نام اسی معنی میں کیمیائے سعادت رکھا ہے۔اور کیمیا کا نام اس کے لیے اولیٰ تر ہے۔ کیونکہ تانبے اور سونے کے درمیان تفاوت زردی اور گراں مایگی سے زیادہ نہیں اور اس مادی کیمیا کا ثمر دنیاوی

---

(۱) اہمیت (خطر)

(۲) (قرآن ۱۸/۸۳) برترہمۂ برقرآن۔سب برتروں سے برتر

تنعم سے کچھ بڑھ کر نہیں اور مدت دنیا کتنی ہے اور نعمتِ دنیا خود ہے کیا؟ اور صفات بہایم اور صفات ملائکہ میں تفاوت اس قدر ہے کہ جو اسفل السافلین سے اعلیٰ علیین تک ہے۔ اور ثمر اس کا ابدی خوش بختی ہے جو جاودان ہے اور اس کی گونا گوں نعمتوں کی حد نہیں اور کسی کدورت کا گزر اس کی نعمتوں کی پاکیزگی میں ممکن ہی نہیں۔ پس کیمیا کا یہ نام اسی کیمیا سے مستعار ہے۔

فصل: جان لیجئے کہ جس طرح کیمیا ہر بڑھیا کے خزانے میں نہیں ملتا بلکہ بادشاہوں کے خزانے میں ہوتا ہے اسی طرح کیمیائے سعادت ابدی بھی ہر جگہ نہیں ہوتا بلکہ خزانۂ ربوبیت میں ہوتا ہے۔ اور خزانہ خدا تعالیٰ کا آسمان میں جواہر ملائکہ ہے اور زمین میں پیغمبروں کا دل۔ پس جو کوئی اس کیمیا کو بارگاہ نبوت کے علاوہ کسی اور دروازے سے تلاش کرے گا تو گمراہ ہو جائے گا۔ اور آخر کار ان کا سفر کھوٹا ہو جائے گا۔ اور اس کے عمل کا حاصل پندار اور وہم وگمان کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اور قیامت کے دن اس کی بے مائیگی ظاہر ہو جائے گی اور اس کا کھوٹ آشکار ہو جائے گا اور اس کا پندار رسوا ہوگا اور اس سے کہا جائے گا: فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ۔[1] (قرآن: ۲۲/۵۰)

اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اس کام کے لیے مخلوق کی طرف بھیجے تاکہ پہلے یہ کیمیا مخلوق کو سکھائیں۔ اور ان سے کہیں کہ دل کے جوہر کو مجاہدے کی کٹھالی میں کیسے رکھنا چاہئے اور اخلاق ذمیمہ کو کہ دل کی کدورت اور خباثت کا باعث ہیں کیسے دور کرنا چاہئے۔ اور اوصافِ حمیدہ کو کیسے دل نشیں کرنا چاہئے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی اور پاکیزگی کی مدح انبیاء کو بھیج کر کی۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔[2] نیز تمدح کی اور احسان رکھا اور فرمایا: يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ○ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔[3] (قرآن: ۶۰/۱،۲) اور يُزَكِّيْهِمْ

---

(۱) (قرآن: ۲۲/۵۰) ہم نے تمہارے گمان پر سے پردہ اٹھا دیا اور آج تمہاری آنکھ بڑی تیز بین ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا درود ان سب پر ہو۔

(۳) (قرآن: ۶۲/۱ و ۲) جو کچھ بھی زمین وآسمان میں ہے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتا ہے۔ وہ بادشاہ پاک ستودہ بے عیب بے ہمتا دانائے راستکار راست دانش اللہ وہ ہے جس نے ناخواندہ وناد بیروں میں انہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو اللہ کا کلام ان کے سامنے پڑھتا ہے اور ان کو پاک اور صاحب ہنر بناتا ہے اور ان کو قرآن اور علم راست سکھاتا ہے جو اس سے پہلے مگر آشکار گمراہی میں تھے

یہ تھا کہ ناپسندیدہ اخلاق جو بہایم کی صفات ہیں ان سے انسانوں کو پاک کرے اور یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ یہ ہے کہ ملکوتی صفات کو انسانوں کی خلعت اور لباس بنادے اور اس کیمیا کا مقصود ہے کہ جو کچھ نا مطلوب ہے' اور وہ نقص کی صفات ہیں انسان ان سے پاک اور عاری ہوجائے اور صفاتِ کمال جو مطلوب و مقصود ہیں ان سے آراستہ ہوجائے۔

اس کیمیا کا لب لباب یہ ہے کہ انسان دنیا سے منہ پھیر کر اللہ تعالیٰ کی طرف کرلے۔ چنانچہ پہلے پیغمبر (ﷺ) کو یہ تعلیم دی اور کہا: وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا[1] (قرآن: ۷۳/۸) اور تبتیل کے معنی یہ ہیں کہ انسان تمام چیزوں سے کٹ جائے اور سراپا خود کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردے۔ الغرض فذالک[2] یہ کیمیا یہ ہے لیکن تفصیل اس کی بہت دراز ہے۔

◆◆◆

---

(۱) اپنے خدا کو یاد کر اور ہر چیز سے منہ موڑ لے اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کے لیے اس کی طرف رخ کر۔

(۲) فذالک' خلاصہ۔

فہرست کتاب

عنوان اس کا چار چیزوں کی معرفت ہے اور اس کے ارکان چار معاملات ہیں اور ہر رکن کی دس اصلیں ہیں۔

مسلمانی کے عنوان

اوّل یہ کہ: انسان اپنی حقیقت کو پہچانے
دوم یہ کہ: اپنے خدائے تعالیٰ کو پہچانے
سوم یہ کہ: دنیا کی حقیقت کو پہچانے
چہارم یہ کہ: آخرت کی حقیقت کو پہچانے

معاملت مسلمانی کے ارکان

معاملتِ مسلمانی کے ارکان چار ہیں، دو ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں تو دو باطن سے متعلق ہیں، وہ دو جو ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں یہ ہیں:
رکن اوّل: اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری جسے عبادات کہتے ہیں۔
رکن دوم: حرکات، سکنات اور معیشت میں آداب کو ملحوظ رکھنا جسے معاملات کہتے ہیں۔
اور وہ دو ارکان جو باطن سے تعلق رکھتے ہیں:
ایک تو ناپسندیدہ اخلاق مثلاً خشم، بخل، حسد، تکبر، عُجب وریا وغیرہ سے دل کو پاک رکھنا کہ ان اخلاق کو مہلکات اور رراہ دین کے عقبات (راہزنوں سے لٹنے کے مواقع) کہتے ہیں۔
دوسرا رکن: دل کو صبر، شکر، محبت، رضا، رجا اور توکل سے آراستہ کرنا ہے انہیں منجیات کہتے ہیں۔
رکنِ اوّل: جس میں عبادات کا بیان ہے اس کی دس۱۰ اصلیں ہیں:

اصلِ اوّل: اہل سنت و جماعت کے عقاید کی درستی۔ **اصلِ دوم**: طلب علم میں مشغول ہونا۔ **اصلِ سوم**: طہارت۔ **اصلِ چہارم**: ادائیگی نماز' **اصلِ پنجم**: زکوٰۃ کے بارے میں۔ **اصلِ ششم**: روزے کے بارے میں۔ **اصلِ ہفتم**: حج کے باب میں۔ **اصلِ ہشتم**: قرآن کے پڑھنے میں۔ **اصلِ نہم**: ذکر وتسبیح میں۔ **اصلِ دہم**: اوراد واوقات عبادات کی راستی کے بارے میں۔

رکنِ دوم: جو آداب معاملات کے باب میں ہے اس کی بھی دس۱۰ اصلیں ہیں:

اصلِ اوّل: کھانا کھانے کے آداب میں۔ **اصلِ دوم**: نکاح کے آداب میں۔ **اصلِ سوم**: آدابِ کسب وتجارت میں۔ **اصلِ چہارم**: طلبِ حلال میں۔ **اصلِ پنجم**: آدابِ صحبتِ خلق میں۔ **اصلِ ششم**: آدابِ خلوت میں۔ **اصلِ ہفتم**: آدابِ سفر میں۔ **اصلِ ہشتم**: آدابِ سماع ووجد میں۔ **اصلِ نہم**: آدابِ امر معروف اور نہی عن المنکر کے باب میں اور **اصلِ دہم**: ولایت داری کے آداب میں۔

رکنِ سوم: عقبات راہ دین جنہیں مہلکات کہتے ہیں ان کا استیصال' اس کی بھی دس۱۰ اصلیں ہیں:

اصلِ اوّل: ریاضت نفس اور خوئے بد کا علاج دریافت کرنا اور خوئے نیک کو حاصل کرنا۔ **اصلِ دوم**: شہوتِ شکم وفرج کے باب میں۔ **اصلِ سوم**: بات کی ہوس اور زبان کی آفتوں کے بیان میں۔ **اصلِ چہارم**: خشم' حِقد' حسد کی بیماریوں کے علاج میں۔ **اصلِ پنجم**: دنیا دوستی اور مرضِ طمع کے بارے میں۔ **اصلِ ششم**: مال جمع کرنے کی حرص اور بخل کے علاج میں۔ **اصلِ ہفتم**: جاہ وحشمت پسندی کے علاج اور اس کی آفت کے باب میں۔ **اصلِ ہشتم**: عبادات میں ریا اور نفاق کے علاج میں۔ **اصلِ نہم**: کبر وعجب کے علاج میں اور **اصلِ دہم**: غفلت' گمراہی اور غرور کے علاج کے بیان میں۔

رکنِ چہارم: منجیات کے بارے میں: اس کی بھی دس۱۰ اصلیں ہیں:

اصلِ اوّل: توبہ کے باب میں نیز مظالم سے نجات پانے میں۔ **اصلِ دوم**: صبر وشکر میں۔ **اصلِ سوم**: خوف ورجا میں۔ **اصلِ چہارم**: درویشی وزہد کے باب میں۔ **اصلِ پنجم**: صدق واخلاص کے بیان میں۔ **اصلِ ششم**: محاسبہ اور مراقبہ کے بیان میں۔ **اصلِ ہفتم**: تفکر کے بارے میں۔ **اصلِ ہشتم**: توحید وتوکل میں۔ **اصلِ نہم**: محبت وشوق کے باب میں اور **اصلِ دہم**: ذکرِ موت کے بارے میں۔

اور ہم نے اس کتاب میں ان تمام چہار عنوان اور چالیس اصلوں کا بیان فارسی زبان والوں کے لیے کیا ہے اور لمبی' مغلق عبارات اور معانیٔ باریک اور دشوار کن تحریر سے قلم کو روکا ہے تاکہ اِدراک آسان ہو۔ اور اگر کسی کو اس سے بڑھ کر تحقیق وتدقیق کا شوق ہو تو اسے چاہیے کہ یہ اُمور احیاء علوم الدین' جواہر القرآن اور

دوسری عربی تصانیف سے استفادہ کرے۔ کیونکہ یہ صورت عربی میں اختیار کی گئی ہے جب کہ اس کتاب (کیمیائے سعادت) کا مقصود عوامِ خلق ہیں جنہوں نے ان مطالب کو فارسی زبان میں طلب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بات قاری کی سمجھ سے زائد نہیں کی جا سکتی۔

اللہ تعالیٰ قاریوں کی آرزو کی نیت اور ان کی اجابت میں ہماری نیت کو اپنی رحمت سے اخلاص سے بہرہ مند کرے اور ریا کے شائبوں اور تکلف کے کدورات سے پاک رکھے اور ہمارے لیے صحت وصواب کا راستہ کھول دے اور آسانی اور توفیق ارزانی فرمائے تا کہ جو کچھ زبان سے کہا جائے عمل میں ایسے ہی ایفا ہو۔ کیونکہ بے کردار گفتار سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور قال بدون حال آخرت کے وبال کا سبب بنتا ہے۔ پناہ بخدا۔

◆◆◆

آغاز کتاب ــ مسلمانی کے عنوان کے بیان میں

عنوان اوّل: اپنے نفس کی پہچان میں
عنوان دوم: حق سبحانہ کی معرفت میں
عنوان سوم: دنیا کی شناخت میں
عنوان چہارم: آخرت کی معرفت کے بیان میں

عنوان اوّل: اپنے نفس کی پہچان میں

معلوم رہے کہ خدائے تعالیٰ کی معرفت کی کلید خود اپنے نفس کی معرفت ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ''[۱] اور اسی لیے باری سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا: ''سَنُرِیْهِمْ اٰیَاتِنَا فِی الْآفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقّ'' کہا کہ ہم اپنے نشانات دنیا میں نیز ان کے نفوس میں دکھاتے ہیں تاکہ حقیقت حق ان پر ظاہر ہو جائے۔ مختصر یہ کہ کوئی چیز بھی خود آپ کی ذات سے زیادہ آپ کے قریب نہیں۔ اگر آپ اپنی پہچان نہیں رکھتے دوسرے کو کیسے پہچانیں گے؟ اور تو بے شک کہتا ہے کہ: خود کو پہچانتا ہوں'' یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ ایسی شناخت معرفتِ حق کی کلید نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ ایسی خود شناسی میں تو ڈھور ڈنگر بھی آپ کے برابر ہیں۔ آپ اپنے سر و ہاتھ پاؤں اور ظاہر گوشت پوست سے زیادہ کچھ نہیں جانتے اور اپنے باطن کے بارے میں تم فقط یہ جانتے ہو کہ جب بھوک لگتی ہے تو روٹی کھاتے ہو اور جب غصہ آتا ہے تو کسی سے الجھتے ہو اور جب شہوت کا غلبہ ہوتا ہے تو نکاح کا ارادہ کرتے ہو اور ان امور میں تمام جانور آپ کے برابر ہیں۔ پس آپ کو اپنی حقیقت کی طلب کرنی چاہیے کہ آپ کیا چیز ہیں، کہاں سے آئے ہیں، کہاں جائیں گے اور اس منزل میں کس لیے آئے اور آپ کو کس لیے لایا گیا ہے آپ کی سعادت کیا ہے اور کس چیز میں ہے۔ اور شقاوت کیا ہے اور کس شے میں ہے؟

(۱) جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا بلاشبہ اُس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا۔

اور یہ صفات جو آپ کے باطن میں جمع کر دی گئی ہیں ان میں سے بعض جانوروں کی صفات ہیں تو بعض درندوں کی، بعض شیطانوں کی تو بعض ملائکہ کی۔ آپ ان سب میں سے کون ہیں اور آپ کے گوہر کی حقیقت کیا ہے اور دوسری تو نادر اور مستعار ہیں۔ کیونکہ اگر اس بات کو نہ جانے گا اپنی سعادت کی طلب کیونکر کرے گا؟ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی غذا جداگانہ ہے۔ اور سعادت بھی جداگانہ، ڈھور ڈنگر کی غذا اور سعادت کھانے پینے سونے اور جفتی کرنے میں ہے۔ اگر تم بھی ڈھور ڈنگر ہو تو کوشاں رہو کہ شب و روز شہوت شکم و فرج کے کام میں لگے رہو۔ اور درندوں کی غذا اور سعادت چیرنے پھاڑنے اور مار ڈالنے اور غصہ نکالنے میں ہے اور شیطانوں کی غذا شر انگیزی اور حیلہ و مکر ہے اگر تم ان میں سے ہو تو ان کے سے کاموں میں مشغول ہو جاؤ تاکہ اپنی نیک بختی اور راحت کو پہنچ جاؤ۔ اور فرشتوں کی غذا اور سعادت حضرت الوہیت کے جمال کا مشاہدہ ہے اور بہایم اور درندوں کی صفاتِ خشم و شہوت کا گزر وہاں نہیں۔ اگر آپ اپنی اصل میں فرشتہ گہر ہیں تو کوشش کریں کہ حضرت الوہیت کو پہچانیں اور خود کو اس جمال کے مشاہدے کی راہ پر ڈالیں اور اپنے آپ کو شہوت اور خشم وغیرہ جو بہایم اور سباع کی صفات ہیں ان کے ہاتھ سے خلاصی پائیں اور یہ جاننے کی سعی کریں کہ بہایم اور درندوں کی یہ صفات آپ میں آخر کیوں پیدا کی گئی ہیں کیا اسی لیے آپ کو اسیر کر کے اپنا خدمت گار بنالیں اور شب و روز آپ سے بیگار لیں؟ اس لیے چاہیئے کہ قبل اس کے کہ یہ تمہیں اپنا اسیر بنائیں آپ ان کو اپنا اسیر بنالیں اور جو سفر آپ کو درپیش ہے اس کے لیے ان میں سے ایک کو اپنی سواری بنائیں اور دوسرے کو اپنا اسلحہ، اور یہ چند روز کہ اس منزل میں رہیں ان سے کام لے لیں تاکہ اپنی سعادت کا بیج ان کی مدد سے شکار کر سکیں۔ جب اپنی سعادت کا بیج ہاتھ آ جائے تو ان کو اپنے پاؤں کے نیچے رکھیں اور اپنی سعادت کی اس قرارگاہ کا رخ کریں۔ وہ قرارگاہ کہ جس کے خواص کی عبارت بارگاہِ الوہیت ہے جسے عرفِ عام میں بہشت کہتے ہیں۔

آپ کے لیے یہ جملہ مطالب جاننے کے لائق ہیں تاکہ اپنی پہچان کے بارے میں آپ کچھ جان سکیں اور جو کوئی نہ پہچانے تو دین کی راہ میں اس کے نصیب میں صرف چھلکے ہی ہوں گے اور وہ دین کی حقیقت سے ناشناس رہے گا۔

فصلِ اوّل: جسم ظاہر ہے اور معنی باطن

اگر تم اپنے آپ کو پہچاننا چاہتے ہو تو جان لو کہ تمہیں پیدا کیا گیا ہے تو دو چیزوں سے: ایک کالبد (جسم) جو ظاہر ہے جسے تن یا بدن کہتے ہیں اور جسے ظاہری آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ تو دوسرے معنی باطن جسے نفس، دل اور جان کہتے ہیں اور اسے باطنی بصیرت سے پہچانا جا سکتا ہے ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اور

تمہاری حقیقت وہ معنئِ باطن ہے اور جو کچھ اس کے سوا ہے سب اس کی ماتحتی میں ہے اور اسی کی فوج اور خادم ہے اور ہم اس کا نام دل رکھیں گے۔ اور جب دل کا ذکر کریں گے تو جان لو کہ مراد رُوح ہوگی جس کو کبھی کبھی نفس بھی کہتے ہیں اور دل سے گوشت کا وہ ٹکڑا مراد نہیں ہے جو بائیں طرف ہمارے سینے میں رکھا گیا ہے کہ جس کی کوئی قدر نہیں۔ وہ حیوانوں اور مُردوں میں بھی ہوتا ہے اور اسے چشم ظاہر سے دیکھ سکتے ہیں۔ اور جو کچھ ظاہر آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے اسی عالم سے ہوتا ہے جسے عالم شہادت کہتے ہیں۔ جب کہ دل کی حقیقت اس عالم کی چیز نہیں وہ اس عالم میں مسافر ہے اور راستے میں ہے اور یہ ظاہر گوشت اس کی سواری اور اوزار ہے۔ اور بدن کے تمام اعضا اس کے لشکری ہیں اور تمام جسم کا بادشاہ وہی ہے اور معرفتِ خداوندی اور اس کی بارگاہ کا جمال اس کی صفت ہے۔ مکلّف دل ہی ہے اور خطاب بھی اسی سے ہے۔ اور عتاب و عقاب اسی پر ہے اور سعادت اور شقاوتِ اصلی اسی کی ہے اور بدن بہر حال اس کی ماتحتی میں ہے۔ اس کی حقیقت کی معرِفت اور اس کی صفات کی پہچان خدائے تعالیٰ کی معرفت کی کلید ہے۔

تُو نہایت درجہ کوشش کر تا کہ تُو اس کو پہچانے کہ عزیز وہ گوہر ہے اور فرشتوں کے گوہر کی جنس سے ہے اور اس کی اصلی کان بارگاہِ الوہیت ہے۔ دل وہیں سے آیا ہے اور لوٹ کر وہیں جائے گا۔ یہاں تو وہ مسافرت میں ہے تجارت اور زراعت کے لیے' اور اس کے بعد تم تجارت اور حراثت کے معنی کو ان شاء اللہ پہچان لو گے۔

فصل دوم: شناختِ حقیقتِ دل

یاد رہے کہ جب تک تم دل کی ہستی سے شناسائی حاصل نہیں کر لیتے دل کی حقیقت کی معرفت ممکن نہیں۔ پس تم دل کی حقیقت کو پہچانو کہ وہ کیا شے ہے۔ پھر اس کے لشکر کو پہچانو کہ کس قدر ہے۔ پھر اس لشکر کے ساتھ اس کے تعلق کو پہچانو۔ پس آپ اس کی صفت کو پہچان لیں گے کہ دل معرفت حق تعالیٰ کو کیونکر حاصل کرتا ہے اور اس کے ذریعے اپنی سعادت کو کیسے پہنچتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں اشارہ کیا جاتا ہے۔
دل کی ہستی کسی دلیل کی محتاج نہیں کیونکہ انسان کو اپنے وجود کے بارے میں کبھی شبہ نہیں ہوا۔ اور اس کی ہستی اس بدن کی بنا پر نہیں ہے کیونکہ بدن تو مردے کا بھی ہوتا ہے۔ اور اس میں جان نہیں ہوتی۔ اور ہم اس دل سے روح کی حقیقت کے طالب بھی ہیں۔ اگر یہ روح نہ ہو تو بدن مردہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی آنکھ بند کر لے اور اپنے بدن کو بھول جائے اور زمین و آسمان اور ہر وہ چیز جس کو بچشم دیکھا جا سکتا ہے فراموش کر دے خود اپنی ہستی کو کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ وہ خود سے باخبر ہوگا اگرچہ اپنے بدن اور زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے اُن کے

بارے میں بے خبر ہوگا۔ اور اگر کوئی خوبی کے ساتھ اس کے بارے میں تامل کرے گا وہ آخرت میں سے ایک چیز کو پہچان لے گا اور جان لے گا کہ جائز ہے کہ بدن اس سے واپس لے لیں تو تب بھی وہ اپنی جگہ موجود ہوگا اور معدوم نہ ہوگا۔

فصل سوم: حقیقتِ دل

اور یہ کہ حقیقت دل کیا شے ہے اور اس کی صفت خاص کیا ہے اس پر بحث کی اجازت شریعت نے نہیں دی اور اسی بناء پر پیغمبر (ﷺ) نے اس کی شرح نہیں کی۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے: ''یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ ط قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ'' (قرآن: ۸۵/۱۷) آپ سے جان کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجیے جان امرِ ربی ہے)۔ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ملی کہ کہے کہ روح از جملہ کارہائے الٰہی ہے اور امر عالمِ امر سے ہے۔ ''اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ'' (قرآن: ۵۴/۷) (آگاہ رہو کہ خلاّقی اور امر اللہ کا ہے)۔ عالم خلق اور ہے اور عالم امر اور جہاں مسافت، مقدار اور تعداد کو دخل ہوا سے عالم خلق کہتے ہیں۔ خلق اصل لغت میں تقدیر کے معنی رکھتا ہے اور انسان کا دل مقدار اور کمیت سے بے بہرہ ہے۔ اس لیے کہ تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔ اگر جز و جز و ہوسکتا ہوتو جائز ہوتا کہ کسی چیز کے بارے میں اس کے ایک طرف جہل ہوتا تو دوسری جانب اسی کے بارے میں علم ہوتا اور دل بیک وقت جاہل بھی ہوتا اور عالم بھی۔ لیکن یہ امر محال ہے۔

اور یہ روح باوجود اس کے تقسیم پذیر نہیں ہے اور مقدار کو اس میں راہ نہیں مخلوق ہے۔ اور خلق آفریدہ ہی کو کہتے ہیں۔ پس اس معنی میں روح بھی جملہ خلق میں سے ہے۔ معلوم رہے کہ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ روح عالم امر میں سے ہے نہ کہ عالم خلق سے۔ کیونکہ عالم امر ان چیزوں سے عبارت ہے جن میں مساحت و مقدار (ناپ تول) کو دخل نہیں۔

پس جن لوگوں کا گمان تھا کہ روح قدیم ہے وہ غلطی پر تھے اور جنہوں نے اسے عَرَض کہا وہ بھی غلطی ہی پر تھے۔ کیونکہ عَـــرَض بذات خود قائم نہیں ہوتا بلکہ تبع ہوتا ہے اور آدمی کی اصل تو جان ہے اور تمام قالب اس کا ماتحت، عَرَض کیسے ہوا؟

اور جنہوں نے روح کو جسم کہا وہ بھی غلط فاحش کے مرتکب ہوئے کیونکہ جسم تو جز و جز و ہوسکتا ہے جب کہ جان قابل تقسیم نہیں۔

لیکن ایک اور چیز ہے جسے روح کہتے ہیں اور وہ قسمت پذیر ہے لیکن وہ روح حیوانوں کی روح بھی ہے۔ لیکن وہ روح جسے ہم دل کہتے ہیں خدائے عزوجل کی معرفت کا محل ہے اور بہائم میں یہ نہیں ہوتی۔ اور یہ

جسم ہوتی ہے نہ عَرَض بلکہ ایک گوہر ہے ملائکہ کے گوہر کی جنس میں سے۔اوراس کی حقیقت کی معرفت دشوار ہے اوراس کی تشریح کی اجازت نہیں اور شروع میں راہ دین پر چلنے کے لیے اس کی معرفت کی حاجت نہیں۔ کیونکہ ابتدائے راہ دین میں مجاہدہ ہے اور جب کوئی از روئے شرط یہ مجاہدہ کرے خود یہ معرفت اسے حاصل ہو جاتی ہے۔ بغیر اس کے کہ کسی اور سے سنے۔اور یہ معرفت من جملہ اس ہدایت کے ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ''وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا '' (القرآن:۶۹/۲۹) (''جو ہمارے لیے کوشش کرتے ہیں حق یہ ہے کہ ہم انہیں اپنی راہوں میں سے راہ دکھاتے ہیں'')۔اور جس نے ابھی مجاہدہ نہیں کیا ہوتا اس سے حقیقتِ روح کا بیان جائز نہیں۔لیکن مجاہدے سے قبل سپاہ دل کو جاننا چاہیے۔ کیونکہ جو سپاہ کو نہیں جانتا جہاد نہیں کرسکتا۔

فصل چہارم: دل جسم کا پادشاہ

معلوم رہے کہ بدن دل کی مملکت ہے اور اس مملکت میں' دل کے مختلف لشکر ہیں۔ ''وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ'' (قرآن: ۳۱/۷۴) (کوئی بھی تمہارے خدا کے لشکروں کو سوائے خود اس کو نہیں جانتا) اور دل کو جو پیدا کیا گیا ہے آخرت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔اور شغلِ دل طلبِ سعادت ہے' اور اس کی سعادت معرفتِ خدائے تعالیٰ میں ہے اور معرفتِ خداوند' دل کو' خدا تعالیٰ کی صنعت گری کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے اور وہ ہے تمام عالم اور عجائب عالم کی معرفت جو دل کو حواس کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اور ان حواس کا قِوام بدن سے ہے۔ پس معرفت اس کا شکار اور حواس اس کا دام اور بدن اس کے لیے سواری ہے اور اس کے جال کے لیے حمّالی۔ پس دل کو اسی سبب سے جسم کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

اور بدن آب و خاک و حرارت و رطوبت کا مرکّب ہے اس وجہ سے کمزور ہے اور ہلاکت کے معرض خطر میں ہے۔ باطن میں بھوک پیاس کے باعث اور بیرون میں آگ پانی اور دشمنوں اور درندوں کے قصد کے سبب۔ پس اسے بھوک پیاس کی وجہ سے کھانے پینے کی حاجت ہوئی۔اس سبب سے دو لشکروں کی ضرورت تھی۔ایک ظاہر جیسے ہاتھ' پاؤں' منہ' دانت اور معدہ اور دوسری پوشیدہ جیسے کھانے پینے کی خواہش' اور اسے بیرونی دشمنوں کے دفاع کے لیے دو لشکروں کی حاجت ہوئی' ایک ظاہر جیسے ہاتھ پاؤں اور ہتھیار اور دوسری مخفی جیسے خشم و شہوت۔

اور چونکہ ممکن نہ تھا کہ جو غذا اسے نظر نہیں آتی اسے طلب کرے اور جس دشمن کو دیکھتا نہیں دفع کرسکے اسے ادراکات کی حاجت ہوئی جن میں بعض ظاہر جو پانچ حواس سے عبارت ہیں یعنی آنکھ' ناک' کان' ذائقہ

اور لمس اور بعض باطنی جو ظاہر ہی کی مانند پانچ ہی ہیں اور جن کا مسکن دماغ ہے مثلاً قوتِ خیال، قوتِ فکر، قوتِ حافظہ، قوتِ تذکر، اور قوتِ توہم۔ اور ان تمام قویٰ میں سے ہر ایک کا خصوصی فریضہ ہے اگر ان میں کوئی ایک مختل ہو جائے تو دین و دنیا میں اس کا کام بھی مختل ہو جاتا ہے۔ اور یہ تمام عساکر دل کے فرمان میں ہیں اور دل ان سب کا امیر اور بادشاہ ہے۔ وہ جب زبان کو حکم دیتا ہے تو وہ بولتی ہے۔ ہاتھ کو حکم دیتا ہے تو وہ پکڑ لیتا ہے اور جب پاؤں کو حکم دیتا ہے تو وہ چل نکلتا ہے۔ جب آنکھ کو حکم دیتا ہے تو وہ محو دید ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب قوتِ تفکر کو حکم دیتا ہے تو محوِ فکر ہو جاتی ہے۔ سب کو طبعاً اور طوعاً دل کا فرماں بردار بنایا گیا ہے تا کہ جسم کی حفاظت کریں تا کہ وہ اپنا زاد لے سکے اور اپنا شکار حاصل کر سکے اور آخرت کی تجارت کی تکمیل کر سکے اور اپنی سعادت کا بیج بکھیر سکے۔ اور دل سے اس لشکر کی اطاعت فرشتوں کے خدائے تعالیٰ کی فرماں برداری کی مثل ہے کہ کسی فرمان کے خلاف نہیں کر سکتے بلکہ طبعاً اور طوعاً حکم بجالاتے ہیں۔

فصل پنجم: دل کی سپاہ

دل کے لشکر کو پہچاننے کی تفصیل طویل ہے لیکن تمہیں اس کا مقصود ایک مثال سے معلوم ہو جائے گا۔

یاد رہے کہ جسم کی مثال ایک شہر کی سی ہے۔ اور ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء گویا شہر کے پیشہ ور ہیں اور شہوت ایک خراج کے عامل کی طرح ہے اور غضب شہر کے کوتوال کی مانند ہے۔ اور دل اس شہر کا بادشاہ۔ عقل اس کی وزیر، اور بادشاہ کو ان سب کی ضرورت ہے تا کہ مملکت کو راست رکھے۔ لیکن شہوت جو خراج کی عامل ہے دروغ زن اور بے ہودہ اور تخلیط کار ہے۔ اور عقل کہ وزیر ہے جو کچھ کہتی ہے شہوت اس کی مخالفت میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اس کی خواہش ہمیشہ سے یہ ہوتی ہے کہ جو مال خزانہ مملکت میں ہے خراج کے بہانے لے لے۔ اور یہ غضب جو کوتوال ہے، شریر اور سخت تند و تیز ہے، مار دھاڑ اور شکست و ریخت کو عزیز جانتا ہے اور اسی طرح بادشاہ شہر اگر تمام مشاورت وزیر کے ساتھ کرتا ہے اور دروغ زن عامل کی گوشمالی کرتا ہے اور وزیر کے برخلاف وہ جو کچھ بھی کہتا ہے پادشاہ اس پر کان نہیں دھرتا اور کوتوال کو اس پر مسلط کر دیتا ہے تا کہ اس کو بے ہودگی سے باز رکھے اور خود کوتوال کو بھی دبا کر رکھے تا کہ پاؤں اپنی حد سے باہر نہ نکالے تو اس طریق سے کارِ مملکت منظم رہتا ہے۔ اسی طرح دل کا پادشاہ جب کام عقل کے اشارے پر کرتا ہے اور شہوت و غضب کو عقل کے زیر فرمان رکھتا ہے اور عقل کو ان سے مسخر ہونے نہیں دیتا تو بدن کی مملکت کا نظام راست رہتا ہے اور راہ سعادت اور بارگاہ الوہیت میں رسائی میں خلل نہیں آتا۔ اگر اس کے برعکس عقل کو شہوت و غضب کا اسیر بنا دے تو مملکت ویران

ہو جائے گی اور بادشاہ بدبختی اور ہلاکت کی نذر ہو جائے گا۔

فصل ششم: فرماں روائی دل

یہ جو کچھ بیان ہو چکا اس سے تم نے جان لیا ہوگا کہ نفسانی خواہش اور غضب کو کھانے پینے اور بدن کی حفاظت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ پس یہ دونوں بدن کے خادم ہیں اور کھانا پینا گویا بدن کا چارہ ہے اور جسم کو حواس کے بار بردار کے طور پر پیدا کیا گیا ہے۔ پس تن حواس کا خادم ہے اور حواس کو عقل کی جاسوسی کے لیے تخلیق کیا گیا ہے تا کہ اس کا دام ہو کہ جس سے صنع اللہ تعالیٰ کے عجائب کو پہچانے۔ پس حواس عقل کے خادم ہیں اور عقل کو دل کے لیے پیدا کیا گیا ہے تا کہ اس کے لیے شمع و چراغ کا فریضہ انجام دے تا کہ اس نور میں دل حضرت الوہیت کا مشاہدہ کرے کہ اس کی بہشت یہی ہے۔ پس عقل دل کی خادم ہے اور دل کو حضرتِ الوہیت کے نظارۂ جمال کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ پس اگر اس میں مشغول ہوگا تو گویا درگاہِ حضرتِ الوہیت کا بندہ اور خادم ہے اور یہ جو اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: ''مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ'' (قرآن:۵۱/۵۲) (میں نے جن و انس کو فقط اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے)۔

پس دل کو پیدا کیا گیا اور یہ مملکت اور اس کی سپاہ دل کے حوالے کر دی گئی۔ اور بدن کی اس سواری کو اس کے سپرد کر دیا گیا تا کہ دل عالم خاکی سے اعلیٰ علیین کا سفر کرے۔ اگر چاہے کہ اس نعمت کا حق ادا کرے اور شرطِ بندگی بجا لائے تو چاہئے کہ بادشاہ کی طرح مملکت کے صدر میں بیٹھے اور حضرت الوہیت کو قبلہ اور مقصد ٹھہرائے اور آخرت کو اپنا وطن اور مسکن بنائے۔ دنیا کو منزل بنائے، تن کو سواری اور اپنے ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضا کو شاگرد بنائے، عقل کو وزیر اور شہوت کو مال کدخدا تو غضب کو کوتوال اور حواس کو جاسوس بنائے اور ان سب کو دوسرے عالم کا موکل بنائے تا کہ اس عالم کی خبریں جمع کریں اور قوتِ خیال کو جو دماغ کے اگلے حصے میں ہے۔ ڈاک خانہ کا انچارج بنائے تا کہ تمام جاسوس اخبار اس کے پاس جمع کرائیں اور قوتِ حفظ سے کہ آخر دماغ میں ہے خریطہ دار تیار کرے تا کہ رقعہ اخبار صاحب برید سے لے اور اس کی نگرانی کرے اور وقت آنے پر وزیر عقل کے حضور پیش کرے اور وزیر مملکت سے آنے والی خبروں کے مطابق مملکتِ دل کی تدبیر کرے۔ اور بادشاہ کے سفر کا اہتمام کرے اور جب دیکھے کہ لشکر میں سے یعنی شہوت و غضب وغیرہ میں سے کوئی بادشاہ سے باغی ہو گیا ہے اور پاؤں بادشاہ کے فرمان اور طاعت سے باہر نکال لیا ہے اور راہزنی پر آمادہ ہے تو ایسی تدبیر کرے کہ اس کے کام میں لگ جائے۔ اور اس کو مار ڈالنے یا برطرف کرنے کا ارادہ نہ کرے کہ مملکت ان کے

بغیر تنظیم نہیں پاتی بلکہ ایسی تدبیر کرے کہ ان باغیوں کو حدِ اطاعت میں لے آتے تا کہ درپیش سفر میں معاون ہوں نہ کہ اس کے دشمن اور رفیق ہوں نہ کہ چوڈاکو۔ جب وزیرِ عقل یوں کرے گا تو سعادت مند ٹھہرے گا اور حقِ نعمت ادا کرنے والا قرار پائے گا اور اس خدمت پر وقت آنے پر خِلعت سے سرفراز ہوگا۔ وزیرِ عقل اس کے برعکس رہزنوں اور دشمنوں کے ساتھ کہ جو باغی ہو گئے ہیں موافقت کرے گا تو نمک حرام اور شقی قرار پائے گا اور رسوائی اور عقوبت کا مستوجب ٹھہرے گا۔

فصل ہفتم: نیکی و بدی کی جڑیں انسان میں

معلوم رہے کہ اس سپاہ میں سے ہر ایک کے ساتھ جو انسان کے باطن میں ہے دل کو تعلق ہے۔ اور اس پر اس سپاہ میں سے ہر ایک کا خُلق اور اس کی صفت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان اخلاق میں سے بعض اچھے نہیں ہوتے جنہیں وہ ہلاک کر دیتا ہے اور ان میں سے بعض نیک ہوتے ہیں دل انہیں سعادت کو پہنچا دیتا ہے۔ اور وہ تمام اخلاق جو اگر چہ بہت سے ہیں چار نوع کے ہیں: اخلاقِ بہایم' اخلاقِ درندگان' اخلاقِ شیاطین' اخلاقِ فرشتگان کیونکہ اس بناء پر کہ انسان میں شہوت اور طمع بھی موجود ہے اس لیے بہایم کا کام یعنی کھانے پینے اور جماع میں حرص و آز کا اظہار ہے' اور اس بنا پر اس میں خشم بھی رکھا گیا ہے اس لیے ہاتھ اور زبان کے ذریعے مخلوق سے الجھتا ہے اور کتے' بھیڑیے' اور شیر کی طرح انہیں پیٹتا ہے اور جان سے مار ڈالتا ہے۔ اور اس سبب سے کہ اس میں حیلہ و مکر و تلبیس و تخلیط اور خلق کے درمیان فتنہ انگیزی کے عوامل بھی ہیں یہ شیطان کا کام کرتا ہے۔ اور اس بناء پر کہ انسان میں عقل بھی ہے فرشتوں کا سا کام کرتا ہے مثلاً علم دوستی' صلاح' برے کاموں سے پرہیز اور مخلوق کے درمیان صلح جوئی اور خسیس کاموں سے خود کو بچاتا اور کاموں کی معرفت پر خوش ہوتا ہے اور جہل و نادانی کو عیب سمجھتا ہے۔

اور حقیقت گوئی میں کہ ہر آدمی کی کھال میں چار چیزیں ہیں: سگی (کتاپن) خوکی (سؤرپن) شیطنت اور فرشتگی۔ معلوم رہے کہ کتا اپنی صورت ہاتھ پاؤں یا کھال کی وجہ سے مردود و مذموم نہیں ہوتا بلکہ اس صورت و وصف کی بناء پر مذموم ہے جو اس کے باطن میں ہے جس کے بل پر وہ انسانوں پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اور سؤر اپنی ہیئت کی بناء پر مذموم نہیں ہے بلکہ پلید اور بری چیزوں پر حرص و آز کی بناء پر مذموم ہے۔ فی الحقیقت سگی اور خوکی کی روح اس معنی میں ہے اور انسان میں بھی یہی مفہوم ہے' اسی طرح شیطنت اور فرشتگی انہی معانی کی حامل ہے جو مذکور ہوئے۔

انسان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ عقل کی روشنی میں جو انوارِ فرشتگان کے آثار میں سے ہے شیطان کے مکر و

فریب سے آگاہ ہو سکے۔ تاکہ شیطان رسوا ہو اور فتنہ انگیزی نہ کر سکے۔ چنانچہ رسول (ﷺ) نے فرمایا: ''ہر آدمی کے ساتھ شیطان لگا ہوا ہے اور میرے ساتھ بھی لیکن مجھے خدائے تعالیٰ نے اُس پر فتح و نصرت سے نوازا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ میرا مقہور ہے اور شر پر قادر نہیں۔

اور انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ حرص و آز کے اس خنزیر اور غضب کے کتے کی تادیب کرے اور عقل کے زیردست رکھے تاکہ اس کے حکم کے بغیر کوئی حرکت نہ کرے۔ اگر یوں کرے گا تو اسے اس سے پسندیدہ اخلاق وصفات حاصل ہوں گی جو اس کی سعادت کا بیج ثابت ہوں گی۔ اور اگر اس کے خلاف کرے گا اور ان کی خدمت میں کمربستہ ہو جائے گا تو انسان میں برے اخلاق جنم لیں گے جو اس کی بدبختی کا بیج ہوں گے۔ اگر اس کے اس حال کو خواب یا بیداری میں اس پر منکشف کریں گے تو وہ دیکھے گا کہ کتے، خنزیر یا شیطان کے آگے خدمت میں کمربستہ ہے اور وہ شخص جو ایک مسلمان کو کسی کافر کے ہاتھ میں قیدی بنائے ظاہر ہے کہ اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ وہ شخص جو فرشتے کو کتے، خنزیر اور شیطان کے ہاتھ میں قیدی بنائے تو اس کا حال اس سے بھی زیادہ بدتر ہوگا اور انسانوں میں اکثریت اگر انصاف سے کام لے اور اپنا محاسبہ کرے تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ شب و روز کمربستہ ہیں اور ان کا حال حقیقت میں یہ ہے کہ اگرچہ بصورت انسانوں کی طرح ہیں، لیکن کل قیامت میں یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی اور صورت معنی کا روپ اختیار کرے گی۔ تاکہ اس شخص کو جس پر شہوت و آز غالب ہوں گے کل (قیامت) اسے بھیڑیے کی صورت میں دیکھیں گے۔ اسی بناء پر کہ اگر کوئی خواب میں بھیڑیے کو دیکھے اس کی تعبیر ہوگی: ایک ظالم مرد اس وجہ سے کہ نیند موت ہی کی نمود گار ہے۔ اس قدر کہ خواب کی وجہ سے اس عالم سے دور تر ٹھہرا۔ صورت معنی ہی کی تابع ہوتی ہے۔ جیسے نتیجۂ جس کسی کو اس صورت میں دیکھیں تو معلوم ہو کہ اس کی حقیقت اور باطن بھی ایسے ہی ہیں اور یہ راز اتنا عظیم ہے کہ ہماری یہ کتاب اس کے شرحی بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

فصل ہشتم: اپنی حرکات وسکنات کا مراقبہ

پس جب تم نے جان لیا کہ تمہارے باطن میں یہ چار قہرمان اور کارفرما ہیں تو تمہیں اپنی حرکات و سکنات کی نگرانی کرنی چاہیے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان چار میں سے تم کس کی اطاعت کر رہے ہو۔ اور اس حقیقت کو حرزِ جاں بنالو کہ جو حرکت بھی تم کرتے ہو اس سے ایک صفت تمہارے دل میں ہوگی جو تم میں باقی رہے گی اور تمہارے ساتھ ہی اُس عالم میں آئے گی اور انہی صفات کو اخلاق کا نام دیا گیا ہے۔

تمام اخلاق انھی چار قہرمانوں سے اخذ و منشعب ہوتے ہیں: اگر تم شہوت کے خنزیر کے مطیع ہو گے تو تم میں پلیدی، بے شرمی، حرص، چاپلوسی، خِسّت، شماتت اور حسد وغیرہ کی صفات ظاہر ہوں گی۔ اور اگر تم اسے مقہور، مؤدب اور محکوم رکھو گے تو قناعت، خویشتن داری، شرم، آرام، ظریفی، پارسائی، بے طمعی اور بے ضرری کی صفات تم میں سے دکھائی دیں گی۔ اور اگر غضب کے کتے کی اطاعت کرو گے تو تم میں تہوّر، بے خوفی، لاف زنی، تفاخر، خود بینی، استہزاء، استخفاف اور تذلیل اور مخلوق پر ناحق چڑھ دوڑنے کی صفات کا ظہور ہوگا۔ اور اگر اس کتے کو مؤدب بنا کر رکھو گے تو تم میں صبر، بردباری، عفو، ثبات، شجاعت، ساکنی، شہامت اور کرم کی صفات وجود پذیر ہوں گی۔ اور اگر اس شیطان کو جس کا کام ہی یہ ہے کہ اس کتے اور خنزیر کو ایک جگہ سے برانگیختہ کرتا ہلاشیری کرتا اور حیلہ و مکر سکھاتا ہے اپنا حاکم بناتا ہے تو تم میں فریب کاری، خیانت، تخلیط، بد باطنی اور تزویر و تلبیس کا ظہور ہوگا۔ اور تو اگر شیطان کو محکوم بنا کر رکھے گا اور اس کی تلبیس کے فریب میں نہ آئے گا اور عقل کی سپاہ کی کمک کرے گا تو تجھ میں زیرکی و معرفت و علم و حکمت و صلاح و حسنِ خُلق و بزرگی اور سروری کی صفات کا ظہور ہوگا۔ اور یہ اچھے اخلاق اگر تمہارا حال بن جائیں تو یہ سب باقیاتِ صالحات ہیں جو تمہاری خوش نصیبی کا بیج ہیں۔ اور وہ افعال جو انسان کے ہاں اخلاقِ بد کے ظہور کا باعث ہیں اسے معصیت کہتے ہیں۔ اور وہ افعال جن سے نیک اخلاق کا ظہور ہوتا ہے اسے طاعت کہا جاتا ہے۔ انسان کی جملہ حرکات و سکنات ان دو سے خالی نہیں ہوتیں اور دل ایک شفاف آئینے کی طرح ہے۔ اور بُرے اخلاق دھویں کی مانند ہیں اور جو ظلمت اس دھویں سے دل کو پہنچتی ہے اسے تاریک بنا دیتی ہے تاکہ آئندہ حضرت الوہیت کو نہ دیکھ پائے اور محجوب ہو رہے۔ جب کہ اچھے اخلاق نور کی مانند ہیں جو دل میں پہنچ کر معصیت کی ظلمت سے اسے پاک کر دیتے ہیں۔ اس بناء پر رسول (ﷺ) نے فرمایا: ''اِتبعِ السَّیِّئَۃَ الْحَسَنَۃَ تَمحِھَا'' یعنی ہر برائی کے بعد نیکی کرتا کہ وہ برائی کو مٹا دے''۔

اور قیامت میں دل ہی ہوگا کہ باہر نکلے گا تو یا تو روشن ہوگا یا تاریک۔ ''وَلَا یَنجو اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ'' (قرآن: ۸۹/۲۶) (نجات نہیں پائے گا سوائے اس کے کہ اللہ کے حضور شرک سے پاک دل لے کر آئے''۔ ابتدائے آفرینش میں انسان کا دل اُس لوہے کی مانند ہوتا ہے جس سے روشن آئینہ تیار کیا جاتا ہے، کہ جس میں تمام عالم دکھائی دیتا ہے۔ بشرطیکہ جیسا چاہئے اسے ویسا ہی ملحوظ رکھیں۔ ورنہ وہ زنگار خوردہ ہو کر ایسا ہو جاتا ہے کہ اس سے آئینہ نہیں بنایا جا سکتا۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے: کَلَّا بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ'' (قرآن: ۱۴/۸۳) (ایسے نہیں ہے بلکہ زنگ اور بار اس کا جو وہ کرتے ہیں ان کے دلوں پر بیٹھ گیا)۔

فصل نہم: اصلِ آدمی گُہر ملائکہ ہے

بے شک آپ کہہ سکتے ہیں: جب انسان میں درندوں، بہایم، شیاطین اور فرشتے کی صفات اس کے باطن میں ہیں تو ہم کس طرح جانیں کہ اس کی اصل اور گہر فرشتگی ہے اور دوسری صفات نادر محض ہیں۔ اور کیسے جانیں کہ انسان فرشتگی اور فرشتوں کے سے اخلاق کے ۔لیے پیدا کیا گیا ہے تاکہ اسی کو حاصل کریں اور دیگر صفات اس کا مقصود نہیں؟ معلوم رہے کہ اس امر کا انحصار اس پر ہے کہ تمہیں معلوم ہو کہ آدمی بہایم اور درندوں سے بزرگ تر اور کامل تر ہے اور ہر وہ شے جسے کوئی کمال دیا گیا ہو جو اس کے درجے کی انتہا ہو اس کو اس کے لیے پیدا کیا گیا ہے بطور مثال کے گھوڑا گدھے سے شریف تر ہے، کیونکہ گدھے کو بار برداری کے لیے اور گھوڑے کو جنگ و جہاد میں دوڑنے کے لیے بنایا گیا ہے تاکہ سوار کی زیر ران جیسے کہ چاہیے دوڑے اور اسے بار برداری کی قوت بھی حاصل ہے، گدھے ہی کی طرح۔ لیکن ایک ایسا کمال نیز دیا گیا ہے جس سے گدھا محروم ہے۔ گھوڑا اگر اپنے کمال سے عاجز آ جائے تو اس پر پالان ڈال کر لدّو بنا دیتے ہیں اور گدھے کے پست تر مرتبے میں شمار ہونے لگتا ہے۔ یہ صورت اس کے نقصان اور ہلاکت کی ہے۔

اسی طرح ایک گروہ نے غلط گمان کیا کہ انسان کو کھانے پینے، سونے، جماع کرنے یا تمتّع کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اور وہ ساری عمر اسی میں کھو دیتے ہیں۔ ایک دوسرا گروہ سمجھتا ہے انہیں غلبہ قہر اور استیلا کے لیے پیدا کیا گیا ہے جیسے کُرد، ترک اور عرب ہیں۔ تو یہ دونوں خیال غلط ہیں کیونکہ کھانا اور جماع دونوں شہوت ہیں۔ اور یہ صفات جانوروں کو ملی ہیں۔ کھانے میں جانور انسان سے زیادہ کھاتے ہیں اور جماع میں چڑیا کی استعداد انسانوں کی قوت جماع سے کہیں زیادہ ہے۔ پس آدمی ان سے شریف تر کیسے؟ اور غلبہ و استیلا غضب سے ہوتا ہے اور یہ درندوں کا خاصہ ہے۔ پس جو کچھ درندوں اور بہایم کو دیا گیا ہے آدمی کو بھی حاصل ہے۔ لیکن انسان کو ان سے زائد بھی ایک کمال مرحمت ہوا ہے اور وہ ہے عقل جس کے ذریعے وہ اپنے خدا کو پہچانتا ہے اور اس کی حکمت اور صنعت گری کے عجائب کو جانتا ہے۔ اور عقل ہی کی وساطت سے اپنے آپ کو شہوت و غضب کے ہاتھ سے رہائی دلاتا ہے اور یہ صفت فرشتوں کی ہے اور انسان انہی صفات کی بناء پر بہایم اور درندوں پر غالب ہے اور یہ سب اس کے مسخر ہیں مع ہر چیز کے جو روئے زمین پر ہے۔ جیسے کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَسَخَّرَلَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ'' (قرآن: ۱۳/۴۵) (تمہارے لیے مسخر کر دیا جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے۔ سبھی اسی کا ہے)۔

پس انسان کی حقیقت وہ ہے جو اس کا کمال ہے اور اس کا شرف اسی کی بدولت ہے اور باقی صفات گویا مسافر و مستعار ہیں جنہیں اس کی مدد اور چاکری کے لیے ساتھ کر دیا گیا ہے اس لیے جب آدمی مرتا ہے تو نہ غضب رہتا ہے نہ شہوت' وہ رہتا ہے اور بس۔ یا تو روشن اور نورانی جوہر' معرفت حق تعالیٰ سے آراستہ بصورت مَلَک تاکہ لاجرم ان کا رفیق ہو۔ اور ملأ الاَعلیٰ کا رفیق یہی ہے اور وہ سب حضرتِ الٰہیت میں ہوں گے: ''فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ'' (قرآن: ۵۵/۵۴) (سچی مقام گاہ میں اور توانا بادشاہ کے قریب)۔ یا تاریک اور مظلم نگونسار' تاریکی اس لیے کہ دل معصیت کی ظلمت سے زنگ آلود ہو چکا ہوگا۔ اور نگونساری اس لیے کہ اس نے شہوت و غضب کے اخلاق ہی پر بس کیا ہوگا اور جو کچھ اس کی شہوت ہوگی اِس دنیا میں چھوڑ گیا ہوگا اور اس کے دل کا رُخ اسی جہان کی طرف ہوگا۔ کیونکہ اس کے شہوات و مراد یہیں ہوں گے۔ اور یہ جہان اُس جہان کے نیچے ہے پس اس کا سر نیچے کی طرف اور جھکا ہوا ہوگا۔ اور ''وَلَوْ تَرٰٓی اِذِالْمُجْرِمُوْنَ نَاکِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ'' (قرآن: ۱۲/۳۲) (اور اگر تو دیکھے اس وقت کہ کافر سرنگوں تھے اپنے خداوند کے نزدیک) کے معنی یہی ہوں گے۔ اور جو ایسا ہوگا وہ شیطان کے ہمراہ سجین میں ہوگا۔ اور سجین کے معنی کوئی نہیں جانتا اسی لیے کہا: ''وَمَآ اَدْرٰیکَ مَا سِجِّیْنٌ'' (قرآن: ۸/۸۳) (تجھے کیا معلوم کہ وہ زندان کیا چیز ہے)؟

فصل دہم: عجائب عالمہائے دل

جہان ہائے دل کے عجائب کی کوئی انتہا نہیں۔ اور دل کا شرف اسی بناء پر ہے کہ وہ سب سے عجب تر ہے۔ اور مخلوق کی اکثریت اس سے غافل ہے۔ دل کا یہ شرف دو وجوہ کی بناء پر ہے۔ ایک از روئے علم اور دوسرے از روئے قدرت۔ از روئے علم اس کے شرف کے دو طبقے ہیں۔ ایک درجہ وہ ہے کہ جملہ مخلوق اسے جان سکتی ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جو پوشیدہ ہے اور ہر کوئی اسے نہیں جانتا اور یہ کمیاب ہے۔ اور جو کہ ظاہر ہے وہ ہے کہ جس سے جملہ علموں اور صنائع کی قوتِ معرفت حاصل ہوتی ہے تاکہ انسان اس کی مدد سے تمام صنائع کا علم حاصل کر سکے۔ اور جو کچھ کتابوں میں ہے اس کا مطالعہ کرے اور جانے' مثلاً علم ہندسہ و حساب و طب و نجوم و علوم شریعت اور باوجود اس کے وہ ایک چیز ہے اور تجزیے کی متحمل نہیں اس لیے یہ تمام علوم اسی میں سما جاتے ہیں بلکہ تمام عالم اس میں صحرا کے ایک ذرے کے مصداق ہے۔ اور ایک ثانیے میں ایک فکرت و حرکت میں تحت الثریٰ سے عالم بالا میں جا پہنچتا ہے اور مشرق سے مغرب۔ باوجود اس کے کہ عالم خاک میں مقید ہے۔

تمام آسمانوں کو ناپتا ہے اور ہر ستارے کی مقدار کو جانتا ہے اور مساحت میں بتاتا ہے کہ کتنے گز ہے۔ اور مچھلی کو حیلے سے قعر دریا سے باہر
نکال لاتا ہے۔ اور اڑتے پرندے کو زمین پر لے آتا ہے اور ہاتھی، شیر اور گھوڑے جیسے قومی جانوروں کو اپنے لیے مسخر کرتا ہے اور جو کچھ دنیائے علوم وعجائب میں ہے سب اس کا پیشہ ہے اور یہ تمام انسانوں کو پانچ حواس کی راہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس بناء پر کہ ظاہر ہے اور سبھی اس کا طریق جانتے ہیں۔

اور عجیب تر یہ ہے کہ بطنِ دل سے ملکوتِ آسمان کی طرف ایک کشادہ روزن ہے۔ جیسے کہ عالم محسوسات کی طرف بیرون دل سے پانچ دروازے وا ہیں۔ عالم محسوسات کو اسی طرح جسمانی کہا جاتا ہے جس طرح عالم ملکوت کو عالمِ روحانی کہا جاتا ہے اور زیادہ تر مخلوق محسوس عالمِ جسمانی سے آگاہ ہے۔ حالانکہ یہ نہایت مختصر اور بے اصل ہے۔ اور لوگ حواس ہی کو علم کا ذریعہ جانتے ہیں اور یہ علم بھی مختصر ہے۔ اور اس امر کی دلیل کہ دل کے اندر سے علوم کے لیے ایک اور روزن ہے دو چیزیں ہیں: ایک تو خواب (نیند) ہے کہ جب حواس کی راہ بند ہو جاتی ہے تو وہ باطنی دروازہ کھل جاتا ہے اور عالمِ ملکوت اور لوحِ محفوظِ غیب نمودار ہونے لگتے ہیں۔ تاکہ جو کچھ مستقبل میں ہونے والا ہے انسان اس کو پہچانے اور دیکھے۔ خواہ شدنی روشن ہو خواہ مثالی جس کی تعبیر چاہیے اور اس بناء پر کہ ظاہر ہے لوگ گمان کرتے ہیں کہ جو بیدار ہوتا ہے معرفت میں وہ اولیٰ تر ہے۔ حالانکہ دیکھتے ہیں کہ بیداری میں غیب دکھائی نہیں دیتا بلکہ خواب میں دیکھا جاتا ہے اور حواس کی راہ سے بھی نہیں۔

اور خواب کی حقیقت کی تشریح اس کتاب میں ممکن نہیں۔ لیکن اس قدر جان لینا چاہیے کہ دل کی مثال ایک آئینے کی طرح ہے اور لوحِ محفوظ ایسے آئینے کی سی ہے جس میں جملہ موجودات کی صورتیں ہیں۔ چنانچہ ان صورتوں کو ایک آئینے سے جب دوسرے آئینے کے مقابل رکھیں گے تو وہ وہاں منعکس ہو جائیں گی۔ اسی طرح لوحِ محفوظ سے تصویرِ آئینہ دل میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ دل اگر پاک ہو اور محسوسات سے فارغ ہو تو وہ اس کے ساتھ مناسبت پاتا ہے۔ اور اگر محسوسات میں مشغول ہو تو عالم ملکوت کی مناسبت سے محجوب وقاصر ہوتا ہے جب کہ خواب میں محسوسات سے فارغ ہوتا ہے تو بے شبہ جو کچھ اس کے گوہر میں ہے وہ مطالعۂ ملکوت سے ظہور پذیر ہونے لگتا ہے۔ لیکن اگرچہ خواب کے باعث حواس معطل ہوتے ہیں۔ لیکن خیال اپنی جگہ قائم ہوتا ہے۔ اس بناء پر کہ جو کچھ دیکھتا ہے۔ خیال کی مثال کے لباس میں ہوتا ہے صریح اور واضح نہیں ہوتا۔ سرپوش اور پردے سے خالی نہیں ہوتا۔ اور جب انسان مرجاتا ہے تو حواس باقی رہتے ہیں نہ خیال انسان اس وقت کاموں کو بے پردہ اور بے خیال دیکھتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے: ''فَکَشَفْنَا عَنْکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الْیَوْمَ

حَـدِيۡـدٌ ''(قرآن: ۲۲/۵۰) (تیرے گمان سے ہم نے پردے اٹھا دیے ہیں اور تیری آنکھ آج بہت تیز بین ہے)۔نیز کہتے ہیں: ''اَبۡصَـرۡنَـا وَسَمِعۡنَا فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا ''(قرآن: ۳۲/۱۳) (خداوندا ہم نے قیامت دیکھ لی ہے اور صور کی آواز سن لی ہے ہمیں دنیا میں دوبارہ بھیج دے تا کہ ہم نیکی کریں)۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جس کو فراستیں اور سچے خیال بر سبیل الہام دل میں نہ آئے ہوں جو حواس کی راہ سے نہیں بلکہ براہ راست دل میں پیدا ہوتے ہیں۔اور انسان کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کہاں سے وارد ہوئے ہیں اور اتنا تو جانتا ہے کہ سب محسوسات کا حاصل نہیں اور یہ بھی جانتا ہے کہ دل اس دنیا کی چیز نہیں بلکہ عالمِ ملکوت سے ہے اور حواس انسان کے' اس عالم کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔لازماً عالم ملکوت کے مطالعے کی راہ میں حواس حجاب بن جاتے ہیں اس لیے انسان جب تک ان سے فارغ نہ ہوا سے ملکوت کی راہ کسی طرح بھی نہیں ملتی۔

فصل یازدہم: عالم ملکوت سے دل کا پیوند

یہ گمان نہ کرنا کہ عالم ملکوت کی جانب دل کی کھڑکی بے خواب و مرگ کشادہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ یوں نہیں ہے بلکہ اگر بیداری میں انسان ریاض کرے اور دل کو غضب و شہوت جیسے اخلاقِ بد اور دنیا کی نیازمندی سے دُور کر کے خلوت میں بیٹھے اور آنکھ کھولے اور حواس کو معطل کر دے اور دل کو عام ملکوت کے ساتھ مناسبت دے اور اللہ کا نام دوام کے ساتھ لے لیکن دل سے' فقط زبان سے نہیں حتٰی کہ انسان ہر چیز سے بے خبر ہو جائے اور دنیا و مافیہا سے کلیۃً بے خبر ہو جائے ماسوائے ذاتِ خداوندی کے' تو جب یہ صورت ہوگی تو روزنِ دل کھل جائے گا اگرچہ انسان بیدار ہو' اور جو کچھ دوسرے خواب میں دیکھتے ہیں وہ بیداری میں دیکھتا ہے۔اور ملائکہ کی روحیں حسین صورتوں میں اسے دکھائی دیں گی اور انسان پیغمبروں کا دیدار کرنے لگتا ہے اور ان سے فواید حاصل کرتا ہے۔اور مدد حاصل کرتا ہے اور زمین و آسمان کی بادشاہی اس کے لیے روشن کر دی جاتی ہے۔اور جس انسان پر دل کی یہ راہ کھل جاتی ہے وہ ایسے عظیم کام دیکھتا ہے جن کی توصیف ممکن نہیں۔اور یہ جو رسول (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ: ''زُوِيت لِيَ الۡاَرۡضَ فَاُرِيۡتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا ''(قرآن:) زمین میری نظروں کے سامنے آ گئی اور میں نے اس شرق و غرب کو دیکھا) اور فرمان خداوندی ہے کہ ''وَكَـذٰلِكَ نُـرِيۡٓ اِبۡـرٰهِيۡـمَ مَـلَـكُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلِيَكُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِيۡنَ ''(قرآن: ۶/۷۵) (اور جیسے کہ ہے ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی ملکوت دکھا دی تا کہ بے گمانوں میں سے ہو جائے)۔سب اسی حالتِ بیداری میں ہوا۔اور انبیاء کے جملہ علوم دل ہی کی راہ سے وارد ہوئے۔حواس و تعلیم کی راہ سے نہیں۔اور تمام مجاہدوں کی

تمہید یہی تھی۔ جیسے کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلاً'' (قرآن: ۸/۸۳)
(اپنے خدا کو یاد کر اور ہر چیز سے منہ موڑ لے اور خدا کی طرف رخ کر خلوص سے عبادت کے لیے) اور دنیا کی تدبیر میں مشغول نہ ہو کیونکہ اللہ خود تمہارے کام بنائے گا۔ ''رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلاً'' (قرآن: ۹/۷۳) (خدا ہی رب مشرق ومغرب کا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں اسی کو اپنا کارساز بنالے)۔ جب تو نے خدا کو اپنا وکیل بنالیا تو اب فارغ ہو جا مخلوق سے سروکار نہ رکھ اور وابستہ نہ رہ''۔ ''وَاصْبِرْ عَلٰی مَایَقُوْلُوْنَ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلاً'' (قرآن: ۱۰/۷۳) (لوگ جو کچھ بھی کہیں اس پر شکیبائی کر، تو ان سے خوبی کے ساتھ جدا ہو جا)۔ یہ سب ریاضت اور مجاہدے کی تعلیم ہے تاکہ دل لوگوں کی عداوت، شہوتِ دنیا اور مشغلہ محسوسات سے پاک ہو جائے نبوت اور صوفیا کا طریق یہی ہے۔

اور تعلم کی راہ سے حصولِ علم علماء کا طریقہ ہے اور یہ بھی عظیم ہے لیکن راہ نبوت اور علم انبیاءؑ واولیاء کی نسبت سے مختصر ہے کیونکہ انبیاء واولیاء تو انسانوں کی تعلیم اور کسی واسطے کے بغیر بارگاہ خداوندی سے بہرہ وَر ہوتے ہیں۔ اور اس راستے کی درستی بھی تجربے سے ثابت ہے، بہت سی مخلوق کو، نیز برہانِ عقلی سے بھی ثابت شدہ ہے اور اگر تمہیں ذوق سے یا تعلیم سے بھی حاصل نہیں ہوئی تو اس کی کمترین حد یہ ہے کہ انسان برہان عقلی سے اس پر ایمان لے آئے۔ اور تصدیق کرے تاکہ تیسرے درجے سے بھی محروم نہ رہے اور کافر نہ ہو جائے۔ اور یہ جہانہائے دل کے عجائب میں سے ہے اور اسی سے آدمی کے دل کی عظمت کا ہمیں علم ہوتا ہے۔

فصل دوازدہم: آدمی کی ولادت فطرت پر ہے

یہ گمان نہ کرنا کہ یہ پیغمبروں کے لیے مخصوص ہے۔ بلکہ تمام انسانوں کا گوہر اصل فطرت میں اس کا سزاوار ہے۔ کیونکہ کوئی لوہا ایسا نہیں ہے جس کی اصل فطرت میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ آئینہ بن سکے۔ جو عالم کی تصویر منعکس کرے۔ سوائے اس کے کہ اس کو زنگ لگ چکا ہو اور اسے برباد کر چکا ہو۔ اسی طرح ہر وہ دل کہ جس پر حرص دنیا اور معاصی کی شہوت غالب آ چکی ہو اور اس میں متمکن ہو جائے۔ یعنی انھی امور میں اسیر ہو جائے جو دل کی تاریکی کا باعث ہوں اور آئینۂ دل مکدّر ہو جائے۔ تو یہ شائستگی اس میں باطل ہو جاتی ہے۔ اور ''کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُّوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ وَیُنَصِّرَانِہٖ وَیُمَجِّسَانِہٖ'' (یعنی ہر آدمی زادہ فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی ونصرانی ومجوسی بنا دیتے ہیں)۔ خود خدائے تعالیٰ نے اس صلاحیت کے عموم کے بارے میں ان الفاظ میں خبر دی ہے کہ ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی'' (قرآن: ۷/

۱۷۲) (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو روحوں نے کہا کیوں نہیں؟ ہم گواہ ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں)۔ جس طرح اگر کوئی کہے کہ آپ جس عاقل سے بھی کہیں گے کہ کیا دو ایک سے زیادہ نہیں ہے؟ تو وہ جواب میں کہے گا ''کیوں نہیں۔ یہ بات بالکل ٹھیک ہے''۔ اگر چہ ہر عاقل نے یہ بات اپنے کانوں نہ سنی ہو اور زبان سے نہ کہی ہو لیکن اس کا باطن اس کی سچائی سے لبریز ہوتا ہے۔ جیسے یہ امر تمام انسانوں کی فطرت ہے معرفتِ ربوبیت بھی جملہ انسانوں کی فطرت ہے جس طرح فرمان باری تعالیٰ ہے: ''وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا) '' (قرآن: ۲۵/۳۱) (اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ جواب میں کہیں گے کہ خدا نے)''۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا '' (قرآن: ۳۰/۳۰) (اللہ کی فطرت کہ آدمیوں کو اس پر رکھا اور وہ تخلیق کہ انہیں اس پر پیدا کیا) اور تجربے نیز بدلائلِ عقلی معلوم ہوا ہے کہ یہ امر پیغمبروں ہی سے مخصوص نہیں ہے کہ پیغمبر بھی انسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ '' (قرآن: ۱۸/۱۱۰) (اے محمد ﷺ کہہ دو کہ میں تمہاری طرح انسان ہوں)۔

جس پر یہ راہ کشادہ ہوئی اگر تمام مخلوق کی صلاح (فلاح، خیر و نیکی) تمام تر اسے دکھا کر اس کی دعوت دی جائے تو جو کچھ اسے دکھایا گیا ہے اسے شریعت کہتے ہیں۔ اور ایسے انسان کو پیغمبر' اور اس کی حالت کو معجزہ اور اگر دعوتِ خلق میں کوئی مشغول نہ ہو اسے ولی کہتے ہیں۔ اور اس کے حالات کو کرامات کہا جاتا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ جس کا یہ حال ہو جائے وہ مخلوق میں یا دعوت میں مشغول ہو جائے۔ بلکہ یہ قدرتِ خداوندی ہے کہ اسے دعوی خلق میں مشغول نہ کرے۔ خواہ اس بناء پر کہ یہ وہ وقت ہو کہ شریعت ابھی تازہ ہو اور کسی دوسرے کی دعوت کی حاجت نہ ہو یا اس بناء پر کہ دعوت کے لیے اور شرایط ہوں جو اس ولی میں ناپید ہوں۔

پس چاہیئے کہ اولیاء کی ولایت و کرامت کے بارے میں تمہارا عقیدہ صحیح ہو اور تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کام کا آغاز مجاہدے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اختیار کو اس میں دخل ہے لیکن لازم نہیں کہ جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے اور نہ یہ کہ جو چل نکلتا ہے منزل کو بھی پالیتا ہے اور جو امر جتنا نادر ہوتا ہے اس کی شرط بھی بڑی ہوتی ہے اور اس کا پالینا بھی کمیاب ہوتا ہے۔ مقامِ معرفت میں یہ آدمی کے لیے شریف تر درجات ہیں۔ جن کو بغیر مجاہدے اور بغیر پختہ کار راہرو پیر کے طلب کرنا تمنائے خام ہے۔ اور اگر یہ دونوں حاصل بھی ہوں جب تک توفیقِ خداوندی مساعدت نہ کرے اور روز ازل کسی کو اس سعادت کا حکم نہ ملا ہو وہ مراد کو نہیں پہنچ سکتا۔ خود علمِ ظاہر میں امامت کے درجے سے بہرہ مندی بلکہ تمام اختیاری کاموں میں کامیابی کا راز یہی ہے۔

فصل سیزدہم: از روئے قدرت دل کا شرف

آدمی کے گوہر کے شرف کے مظہر کو جسے دل کہتے ہیں معرفت کی راہ میں جب تم نے پہچان لیا ہے تو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ دل کو از روئے قدرت بھی شرف حاصل ہے کہ وہ بھی فرشتوں کی خاصیت ہے جو دوسرے حیوانات میں نہیں ہوتی۔ اور وہ یہ ہے کہ ملائکہ کے لیے جس طرح عالمِ اجسام مسخر ہیں بہ طورے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جیسا مناسب سمجھتے ہیں اور مخلوق کو محتاج دیکھتے ہیں تو بارش لے آتے ہیں۔ اور زمانۂ بہار میں ہوا کو انگیز کرتے ہیں اور حیوانات کے رحم میں حیوانوں کو اور نباتات کو زمین میں صورت دیتے اور آراستہ کرتے ہیں۔ اور ان کاموں کی ہر نوع کے لیے فرشتوں کا ایک گروہ مؤکل ہے اور آدمی کے دل کے لیے بھی موکل ہے۔ جو گوہر ملک کی جنس سے ہے اور اسے بھی قدرت حاصل ہے جس کے بل پر اجسام عالم میں سے بعض اس کے مسخر ہیں۔

ہر کسی کا عالمِ خاص اس کا بدن ہے اور بدن دل کا محکوم و مسخر ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ دل کا ٹھکانہ انگلی نہیں نہ انگلی میں علم و ارادہ لیکن جب دل انگلی کو حکم دیتا ہے تو وہ دل ہی کے فرمان سے حرکت کرتی ہے اور جب دل میں خشم کی صورت پیدا ہوتی ہے تو پسینہ پورے جسم سے بہنے لگتا ہے اور یہ مثل بارش کے ہے اور جب شہوات کی صورت دل میں پیدا ہوتی ہے تو ایک ہوا جنم لیتی ہے جو آلہ تناسل کا رُخ کرتی ہے۔ اور دل جب کھانا کھانے کی فکر کرتا ہے تو وہ قوت جو زبان کے نیچے ہے اس کی خدمت کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور رال ٹپکنے لگتی ہے تاکہ طعام کو تر کرے اس انداز سے کہ کھایا جا سکے۔

اور یہ امر مخفی نہیں کہ دل کا حکم جسم پر چلتا ہے اور بدن دل کا محکوم ہے لیکن معلوم رہے کہ جائز ہوگا کہ دلوں میں بعض جو شریف تر اور قوی تر ہوتے ہیں اور جواہر ملائکہ کے مشابہ تر اور نزدیک تر ہوتے ہیں تو اور اجسام بھی؛ اس کے بدن سے باہر بھی ان کے مطیع ہو جاتے ہیں۔ نتیجۃً ایسے دل کی ہیبت جب درندہ شیر پر پڑتی ہے تو وہ اس کا مطیع و فرماں بردار بن جاتا ہے۔ جب کسی بیمار کے لیے ہمت (دعا) کرتا ہے تو وہ تندرست ہو جاتا ہے۔ اور اسی ہمت کی بدولت تندرست فرد بیمار ہو جاتا ہے۔ اور بعض میں ایسی فکر انگیزی کرتا ہے کہ وہ اس کے قریب آئے اور اس شخص کے باطن میں ایسی تحریک ہوتی ہے کہ اگر بارش کی دعا کرتا ہے تو بارش برسنے لگتی ہے۔ بُرہان عقلی بھی اس کے امکان پر شاہد ہے اور ہمیں تجربے سے بھی معلوم ہے اور جسے نظر لگنا لگانا یا سحر کہا جاتا ہے وہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔ یہ جملہ انسان کے نفس کی دوسرے ابدان پر تاثیر کی مثالیں ہیں۔ یہاں تک کہ خبیث اور حاسد نفس کسی اچھے گھوڑے (جانور) کو دیکھے تو بحکم حسد اس کے ہلاک کا خیال کرتا ہے تو وہ جانور فوراً ہلاک

ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر ﷺ کی حدیث ہے: ''اَلْعَیْنُ حَقٌّ؛ اَلْعَیْنُ تَدخِلُ الرَّجَلُ الْقَبر وَالْجَملُ الْقَدِر'' (بد نظری حق ہے' بدنظری مرد کو قبر میں اور اونٹ کو دیگ میں پہنچا دیتی ہے)۔

پس یہ امر بھی دل کی قدرتوں کے عجائب میں سے ہے۔ اس قسم کی خاصیت جب کسی کے ہاں ظاہر ہوتی ہے اگر وہ داعیِ خلق ہو تو اسے معجزہ کہتے ہیں اور اگر نہ ہو تو کرامات کہتے ہیں۔ اور اگر اعمال خیر میں ہو تو ایسے شخص کو نبی کہتے ہیں یا ولی اور اگر شر کے کاموں میں ہو تو ایسے شخص کو ساحر (جادوگر) کہتے ہیں۔ اور سحر ہو یا کرامات یا معجزہ جملہ انسانی دل کی قدرت کے خواص ہیں۔ اگرچہ[1] ان کے درمیان بے حد فرق ہے جس کی تفصیل اس کتاب کے ظرف سے باہر ہے۔

فصل چہاردہم: نبوت وولایت کی حقیقت

اگر کسی کو ان جملہ امور کا جو بیان ہو چکے پتہ نہ ہو تو اسے حقیقتِ نبوت کی بھی کوئی خبر نہ ہوگی۔ سوائے کچھ سنی سنائی کے۔ کیونکہ نبوت وولایت انسان کے دل کے شرف کے درجات ہیں اور حاصل اس کا تین خواص ہیں: ایک وہ جس کا انکشاف عامۃ الخلق کو خواب میں ہوتا ہے اسے بیداری میں کشف کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ عام مخلوق کا نفس خود اپنے بدن سے باہر کارفرما نہیں ہوتا۔ جب کہ نبی کا نفس ان اجسام پر بھی موثر ہوتا ہے جو اس کے اپنے بدن سے باہر ہیں۔ اس انداز سے کہ مخلوق کی فلاح اس میں ہو اس طریق سے کہ اس میں کوئی فساد نہ ہو۔ تیسرے وہ جو عموم خلق کو علوم سے جو تعلم سے حاصل ہوتا ہے اسے بے تعلم اپنے باطن سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اور جائز ہے کہ جو شخص زیرک اور پاک دل ہو بغیر کسی استاد کی تعلیم وتدریس کے بعض علوم اپنے دل میں وارد کرے اور یہ بھی جائز ہوگا کہ وہ شخص جو پاک دل تر اور قوی دل تر ہو پیشہ وروں کے جملہ علوم کو یا بیشتر کو کسی قدر اپنے ہاں پالے۔ اسے علم لدُنی کہتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا'' (قرآن: ۱۸/۶۵) (ہم نے اسے سکھا دیا تھا اپنے ہاں سے علم کو)۔ جس کے ہاں مذکورہ بالا تینوں صفات جمع ہو جائیں وہ عظیم پیغمبروں میں سے ہوتا ہے۔ یا اولیائے بزرگ میں سے اور اگر کوئی ان تینوں میں سے ایک ہو اسے بھی یہی درجہ حاصل ہوگا۔ لیکن ان میں سے ہر ایک میں تفاوت بہت ہے کہ کسی کو ان خواص میں سے تھوڑا تھوڑا حاصل ہوتا ہے اور کوئی ایسا ہو کہ جسے بہت زیادہ حاصل ہو۔ اور ہمارے پیغمبر (ﷺ) کا کمال اس میں تھا کہ انہیں یہ تینوں صفات بغایتِ کمال حاصل تھیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے جب چاہا کہ خلق کو نبوت سے روشناس

(۱) معجزہ اور سحر

کرائے تا کہ اس کی پیروی کریں اور سعادت کی راہ اس سے سیکھیں ان تینوں خاصیتوں میں سے ہر کسی کو ایک نمونہ اس کا دیا۔ خواب ایک خاصیت کا نمونہ ہے۔ اور فراستِ راست دوسرا نمونہ اور علوم میں خاطرِ راست گویا تیسرا نمونہ ہے۔ اور انسان کے لیے ممکن ہے کہ ایسی چیز پر ایمان لائے جس کا نمونہ اس کے ہاں نہ ہو۔ خواہ اس کو اس کی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی حقیقتِ الٰہیت کو بتمام وکمال نہیں جانتا۔ سوائے خود اللہ تعالیٰ کے۔ اور اس تحقیق کی تفصیل بہت دراز ہے۔ ہم نے اپنی تصنیف ''معانی اسماء اللہ'' میں اسے روشن دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور مقصود یہ ہے کہ اب ہم اس امر کو جائز قرار دیں کہ ان تین مذکورہ بالا خواص کے علاوہ انبیاء واولیاء کے اور بھی خواص ہیں جن کی خبر ہمیں نہیں کیونکہ ہماری ذات میں ان کا کوئی نمونہ نہیں۔ پس جب ہم کہتے ہیں کہ کوئی بھی خدا کو بتمام وکمال نہیں پہچانتا مگر خود خدائے تعالیٰ؛ تو ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول (ﷺ) کو کوئی بھی بکمال نہیں پہچانتا مگر خود رسول یا وہ جو اس کے درجے سے بلند تر درجے پر ہے۔ پس انسانوں میں پیغمبروں کے مرتبے سے پیغمبر ہی آشنا ہوتے ہیں اور ہمیں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کہ اگر ہم نیند سے آشنا نہ ہوتے اور کوئی ہم سے کہتا ہے کہ کوئی گر پڑتا ہے اور بے حرکت ہو جاتا ہے۔ نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے لیکن یہ جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا تو جب دیکھ سن رہا ہو یعنی عالم بیداری میں ہو تو اس کو سمجھ نہیں سکتا' تو ہم ہرگز اس کا یقین نہ کرتے۔ انسان نے جسے کبھی دیکھا نہ ہو اسے باور نہیں کرتا اسی لیے حق تعالیٰ کا فرمان ہے: ''بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهٗ'' (قرآن: ۳۹/۱۰) (بلکہ انہوں نے جس چیز کو نہیں سمجھا اسے جھوٹ جانا اور اس کے علم کو نہ پہنچے اور ان کو اس کی حقیقت نہ پہنچی)۔ نیز فرمایا: ''اِذْلَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ'' (قرآن: ۱۱/۴۶) (اور جب راہ نہیں پاتے تو کہہ دیتے ہیں کہ پرانا دروغ ہے)۔

تم اس بات پر حیرت زدہ نہ ہونا کہ انبیا اور اولیاء کے ہاں ایسی صفت ہوتی ہے کہ دوسروں کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی جب کہ انبیاء واولیاء کو اس صفت سے لذت اور حال میسر ہوتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جس شخص کو شعر کا ذوق نہ ہو تو وہ اس کے باعث لذتِ وزنِ سماع سے محروم رہتا ہے۔ اور اگر کوئی چاہے کہ اس ذوق کی تفہیم اُسے کرے' نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ اس کی نوعیت ہی سے بے خبر ہے۔ اسی طرح مادرزاد اندھا رنگوں کے ادراک سے قاصر اور ذوقِ دیدار کے فہم سے محروم ہوتا ہے۔ پس خدا کی اس قدرت پر تم متعجب نہ ہونا کہ درجۂ نبوت سے بالاتر مدارج کی تخلیق کرے جس کی خبر اس سے قبل کسی کو نہ ہو۔

فصل پانزدہم: حجابِ راہ

اب تک جو کچھ بیان ہوا اس سے گو ہر انسان کا شرف معلوم ہوا اور صوفیاء کا طریق بھی معلوم ہوا کہ کیا ہے۔ اور تم نے یقیناً صوفیوں سے سنا ہوگا کہ جو کہتے ہیں کہ ''علم اس راہ کا حجاب ہے'' اور تم نے اس قول سے انکار کیا ہوگا۔ لیکن تم اس بات کا انکار نہ کرو کیونکہ یہ بات حق ہے کیونکہ محسوسات اور ہر وہ علم جو محسوسات کی راہ سے حاصل ہوتا ہے جب تم اسی میں مشغول و مستغرق رہو گے تو یہ حجاب ہی رہے گا۔ دل کی مثال ایک حوض کی سی ہے اور حواس گویا پانچ آب جوئیں ہیں؛ جو اس حوض میں باہر سے پانی لاتی ہیں۔ تو اگر تم چاہو کہ شفاف پانی حوض کی گہرائی سے برآمد ہو تو تدبیر اس کی یہ ہے کہ پہلے آب جوؤں کی طرف سے آنے والے سارے پانی کو دل کے حوض سے خالی کریں اور حوض میں جو اس پانی کی مٹی تہ نشین ہوگئی تھی اسے بھی نکال باہر کریں اور آب جوؤں کے راستوں کو بند کریں تا کہ اب ان کا پانی حوض میں داخل نہ ہو سکے۔ اور حوض کی گہرائی کو کھودیں تا کہ شفاف پانی حوض کے اندرون سے نکلے۔ اور حوض جب تک اس سابقہ پانی سے جو باہر سے آتا تھا اس میں اگر مشغول رہے تو امکان اس کا نہیں کہ حوض کے اندرون سے پانی برآمد ہونے لگے۔ اسی طرح وہ علم جو درون دل سے نکلتا ہے اس کا حصول ممکن نہیں جب تک دل جو کچھ باہر سے آتا ہے اس سے خالی نہ ہو جائے۔

اور اگر کوئی عالمِ سابقہ آموختہ علم سے دست کش ہو جائے اور دل کو اس میں مصروف نہ رکھے تو وہ گذشتہ علم اس کے لیے حجاب نہ ہوگا۔ اور امکان اس کا ہے کہ یہ فتح اسے حاصل ہو جائے جیسے کہ اگر دل کو خیالات و محسوسات سے پاک کرے گا' گذشتہ خیالات اس کے لیے حجاب نہ رہیں گے۔ حجاب کا سبب یہ ہے کہ جب کوئی اہل سنت کے عقاید سیکھ لیتا ہے اور وہ دلائل جو بحث و مناظرہ میں بروئے کار لائے جاتے ہیں سیکھ لیتا ہے۔ اور سراپا ان کا دلدادہ ہو جاتا ہے اور معتقد اس امر کا ہو جاتا ہے کہ ان کے علاوہ اور کوئی چیز علم کا درجہ نہیں رکھتی اور اگر کوئی اور چیز اس کے دل میں آئے تو کہتا ہے کہ یہ تو جو کچھ میں نے سنا تھا اس کے خلاف ہے اور جو کچھ میرے مکسوبہ علم کے خلاف ہے سب باطل ہے۔ تو ممکن نہیں کہ ایسے شخص کو حقیقتِ کار معلوم ہو سکے کہ جو اعتقاد مخلوقِ عامہ کو سکھایا جاتا ہے وہ تو حقیقت کا قالب ہے نہ کہ عینِ حقیقت۔ اور کامل معرفت یہ ہوتی ہے کہ حقایق اس قالب سے کھلنے لگیں جیسے مغز چھلکے سے برآمد ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ جو کوئی جدل و بحث کی راہ سے اعتقاد کی نصرت سیکھتا ہے اس پر حقیقت کا انکشاف نہیں ہوا ہوتا۔ اور جب ایسا شخص یہ گمان کرتا ہے کہ سب کچھ یہی ہے جو اس کا مبلغ اعتقاد ہے تو یہ گمانِ باطل اس کے لیے

حجاب بن جاتا ہے۔اس صداقت کے پیش نظر کہ اس قسم کا پندار اکثر اسی شخص پر غالب آتا ہے جس نے کچھ سیکھا ہو۔اور بیشتر یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ محجوب رہتے ہیں۔اور یہ درجہ مناظروں کا ہے۔

پس اگر کوئی اس پندار سے خلاصی پالے علم اس کا حجاب نہیں رہتا۔ بلکہ یہ امر جب اس پر روشن ہو جاتا ہے تو اس کا درجہ بغایتِ کمال کو پہنچ جاتا ہے اور اس کی راہ مامون اور درست تر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ شخص جس کا قدم علم میں شروع سے راسخ نہ ہو، ہوسکتا ہے کہ بند خیالی میں رہے اور ذرا سا شبہ بھی اس کے لیے حجاب بن جائے۔اور عالم اس قسم کے خطرے سے محفوظ ہوتا ہے۔پس اس قول کی حقیقت ''کہ علم حجاب ہے'' تم پر روشن ہونی چاہیے اور جب کسی سے سنو کہ وہ درجہ مکاشفت کو پہنچ چکا ہے تو تمہیں اس کا انکار نہیں کرنا چاہیے۔

اور اباحیتوں[1] کا یہ گروہ اور یہ مطوق بے حاصل کہ جو اس زمانے میں نمودار ہوئے ہیں اور ہرگز صاحب حال نہیں ہیں۔لیکن چند مجعول عبارتیں صوفیاء کی طامات (لاف وگزاف) سے لے لی ہیں۔اور ان کا کام یہ ہے کہ دن بھر خود کو دھوتے رہتے ہیں اور عمامے، مرقع اور سجادے سے خود کو مزیّن کرتے ہیں۔ پھر علم وعلماء کی مذمت کرتے ہیں۔ وہ گردن زدنی ہیں۔ وہ مخلوق کے لیے بمنزلہ شیاطین ہیں اور خدا اور اس کے رسول (ﷺ) کے دشمن۔ کیونکہ خدا اور رسول تو علم اور علماء کے ثنا خواں ہیں۔اور انہوں نے تمام دنیا کو حصولِ علم کی دعوت دی ہے۔یہ کم بخت مطوق بہروپیا چونکہ صاحب حال نہیں ہوتا اور علم سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے۔تو اس کے منہ سے یہ بات کیونکر روا ہوسکتی ہے۔اس کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جس نے سن رکھا ہو کہ کیمیا سونے سے بہتر ہے کیونکہ کیمیا سے بے انتہا سونا حاصل ہوتا ہے اور اگر سونے کے خزانے اس کے حضور پیش کیے جائیں تو وہ اس کو ہاتھ نہیں لگاتا اور کہتا ہے ''سونا کس کام کا؛ اور اس کی کیا حیثیت؟ ہمیں کیمیا درکار ہے جو اس کی اصل ہے۔'' جو سونا لیتا نہیں اور کیمیا گری کا مالک نہیں۔تو وہ بدبخت مفلس اور بھوکا رہے گا۔اور اس بات کی خوشی میں کہ ''میں نے کہہ دیا ہے کہ کیمیا سونے سے بہتر ہوتی ہے'' مسرور ہوتا اور ڈینگ مارتا ہے۔

پس انبیاء اولیاء کی مثال کیمیا کی سی ہے اور علماء کے علم کی مثال زر کی سی۔اور صاحب کیمیا کو صاحب زر پر بطور کلی برتری حاصل ہے۔لیکن یہاں ایک اور دقیق نکتہ ہے یہ کہ اگر کوئی اتنی کیمیا ہی رکھتا ہو کہ اس سے ۱۰۰ دینار ہوتے ہوں تو اسے ہزار دینار کے مالک پر فضیلت نہ ہوگی۔

اور جس طرح کتب کیمیا اور اس کا بیان اور اس کے چاہنے والے بہ کثرت ہیں اور حقیقت اس کی قرنوں سے ہر کسی کے ہاتھ نہیں آتی۔ اکثر اشخاص جو کیمیا کی طلب میں نکلتے ہیں ان کے ہاتھ جعل سازی

(۱) وہ لوگ جو خود کو وظایف وقیود شریعت کا مقید نہیں سمجھتے اور شریعت کی پابندی اہل حقیقت کے لیے لازم نہیں گردانتے

(قلب زنی) کے سوا کچھ نہیں آ تا۔صوفیا کا کام بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔عزیز وکمیاب ؛اور جو کچھ ہوتا بھی ہے نہایت قلیل ہوتا ہے اور نادر بھی ہوتا ہے کہ کوئی خوش بخت کمال کو پہنچے۔

پس چاہئے کہ تم کو معلوم رہے کہ جس کسی کو حالتِ صوفیاء میں سے کچھ دکھائی دے تو یہ جانے کہ اسے تمام عالم پر فوقیت حاصل نہیں ہوئی۔صوفیاء میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک کو اوائل کار میں کچھ دکھائی دیتا ہے لیکن پھر جاتا رہتا ہے اور تمام نہیں ہو پاتا۔اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ کوئی خیال یا سودا ان پر غالب ہو جاتا ہے جس کی کچھ حقیقت نہیں ہوتی ہے اور صوفی گمان کرتا ہے کہ اس نے میدان مار لیا ہے اور دس میں سے نو کی کیفیت یہی ہوتی ہے۔جس طرح نیند میں حقیقت بھی ہوتی ہے اور اوٹ پٹانگ تعبیر ناپذیر خواب بھی۔اس میں حال ایسا ہی ہوتا ہے بلکہ علماء پر برتری اس کو ہے کہ اس حال میں ایسا کامل ہو کہ ہر وہ علم جو اس سے تعلق رکھتا ہے جو دوسروں نے کسی استاد سے حاصل کیا ہو اس کو اس وسیلے کے بغیر جانتا ہو اور ایسا شاذ ہی ہوتا ہے۔پس چاہیے کہ آپ اصل راہِ تصوف اور صوفیاء کے فضل پر یقین رکھیں اور زمانے کے بہروپیوں کے باعث اہل اللہ کے باب میں اپنی عقیدت کو برباد نہ کریں۔اور ان میں سے اگر کوئی علمِ وعلماء کے باب میں طعنہ زنی کرے تو آپ جان لیں کہ یہ بے ہودہ بات ہے۔

فصل شانزدہم: خدائے تعالیٰ کی معرفت میں انسان کی سعادت

تم یقیناً کہو گے کہ "یہ کیونکر معلوم ہو کہ انسان کی سعادت اللہ تعالیٰ کی پہچان میں ہے" تو جان لو کہ یہ بات اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ تمہیں اس بات کا علم ہو کہ ہر چیز کی سعادت اس میں ہوتی ہے کہ اس چیز کی لذت وراحت اس کے اندر ہوتی ہے اور ہر چیز کی لذت اس میں ہے کہ خود طبیعت اس کی مقتضی ہو۔اور ہر چیز کا اقتضائے طبع وہ ہوتا ہے کہ جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔چنانچہ شہوت کی لذت اس میں ہے کہ اپنی آرزو کی تکمیل کو پہنچے اور لذتِ غضب اس میں ہے کہ دشمن سے انتقام لے اور لذت چشم اس میں ہے کہ خوب صورت چہرے دیکھے۔اور کان کی لذت اس میں ہے کہ خوش الحان نوا کو سنے' اسی طرح دل کی لذت اس میں ہے کہ جو اس کی خاصیت ہے اور جس کے لیے اسے تخلیق کیا گیا ہے اور وہ ہے کاموں کی حقیقت کی معرفت کہ انسان کے دل کی خاصیت ہے۔لیکن شہوت وغضب اور حواس خمسہ کی دریافت تو خود ڈھور ڈنگروں کو بھی حاصل ہے

اسی لیے ہے کہ انسان جو چیز نہیں جانتا اس کے بارے میں اس کا طبعی تقاضا ہوتا ہے کہ اس چیز کو جانے وہ اس پر شاداں ہوتا ہے اور اس پر فخر وناز کرتا ہے۔اگر چہ وہ چیز نہایت معمولی ہو۔مثلاً شطرنج اگر کوئی جانتا ہو تو اسے کہتے ہیں کہ بازی میں مصروف کسی کی مدد نہ کرنا۔تو اس کے لیے یہ ممانعت گراں ہوتی ہے۔اس خوشی

سے کہ وہ جانتا ہے کہ استادانہ حرکت کس مہرے کی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس فخر کا اظہار کرے۔

جب تم نے جان لیا کہ دل کی لذت کاموں کی معرفت میں ہے۔ تو یہ بھی معلوم رہے کہ کسی چیز کی معرفت جتنی عظیم ہوگی یا شریف تر ہوگی اتنی ہی لذت اسی کی بیشتر ہوگی۔ وہ شخص جو وزیر کے اسرار سے باخبر ہے وہ اس پر شاداں ہوگا۔ اور اگر اسے خود بادشاہ کے رموز سے آگاہی ہو جائے اور تدبیر مملکت میں شہ کے فکر سے مطلّع ہو جائے تو وہ اس پر اور بھی خوش ہوگا۔ اور جو شخص علم ہندسہ اور آسمانوں کی ہیئت اور مقدار کو جانتا ہو تو وہ اس شخص سے بڑھ کر شاداں ہوگا جو شطرنج کا علم رکھتا ہے۔

اور وہ شخص جو جانتا ہے کہ چال کس طرح چلنی چاہئے اور وہ چال شاطرانہ چلے اور بازی جیت لے تو اس شخص کی نسبت بیشتر لذت سے بہرہ ور ہوگا جو بازئ شطرنج جانتا ہے۔ اس طرح جس قدر امر معلوم شریف تر ہوگا اس کا علم بھی اسی قدر شریف تر ہوگا۔ اور لذت بھی اس کی بیشتر ہوگی۔ اور موجودات میں سے کوئی موجود اس ہستی سے شریف تر نہیں ہو سکتا جس سے تمام موجودات کا شرف وابستہ ہے۔ اور جو دونوں جہانوں کا بادشاہ ہے اور عالَم کے جملہ عجائب و نوادر اسی کی صنعت گری کے آثار ہیں۔ پس کوئی معرفت اس کی معرفت سے شریف تر اور لذیذ تر نہیں ہو سکتی۔ اور طبع دل کا مقتضی وہی ہے۔ اس لیے کہ ہر چیز کی خاصیت ہی مقتض طبع ہوتی ہے جسے اس کے لیے پیدا کیا گیا ہوتا ہے۔ اگر کوئی دل بیمار ہوا اور اس میں معرفت کا تقاضا باطل ہو گیا ہو تو وہ ایک بیمار جسم ہی کی مانند ہوتا ہے جس میں غذا کا تقاضا نہیں ہوتا اور اسے روٹی سے زیادہ مٹی مرغوب ہوتی ہے۔ اگر اس کا علاج نہ کیا جائے کہ اس کی فطری اشتہا لوٹ آئے اور یہ فاسد شہوت اس سے دور ہو جائے تو ایسا شخص اس دنیا کا بدنصیب شخص ہوگا اور آخر ہلاک ہو جائے گا۔ اسی طرح وہ شخص جس کے دل میں حضرتِ الوہیت کی اشتہا کی بجائے دوسری چیزوں کی اشتہا غالب تر ہو جائے وہ بیمار ہے۔ اگر اس کا علاج نہیں کریں گے تو وہ عالَمِ آخرت کا بدنصیب ہوگا اور ہلاک ہو جائے گا۔

اور تمام شہوتیں اور محسوسات کی لذتیں جو انسانی بدن سے متعلق ہیں لازماً موت کے ساتھ ساقط ہو جاتی ہیں اور جو رنج زندگی میں اٹھائے ہوں گے باطل ہو جائیں گے۔ لیکن معرفت کی وہ لذت جو دل سے متعلق ہے مرنے پر دگنی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دل انسان کی موت پر ہلاک نہیں ہوتا بلکہ روشن تر ہو جاتا ہے۔ اور اس کی لذت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دیگر شہوتوں کی گرانی باقی نہیں رہتی۔ اس امر کی تفصیل ان شاء اللہ کتاب کے آخر میں آئے گی وہاں رجوع کریں۔

فصلِ ہفد ہم: بدنِ انسان میں صنعتی عجائب

آدمی کے گوہر کے احوال کے بارے میں جو کچھ کہا جا چکا ہے اس جیسی کتاب کے لیے کافی ہے اور اگر کسی کو زیادہ شرح کی تمنا ہو تو اس کا سامان ہم نے اپنی کتاب ''عجائب القلب'' میں کر دیا ہے اور ان دو کتابوں کے ذریعے بھی آدمی کاملاً خود شناس نہیں ہوتا کیونکہ یہ جملہ تفصیل دل کی بعض صفات کی ہے جو ایک رکن ہے اور انسان کا دوسرا رکن بدن ہے۔ اور بدن کی آفرینش میں بھی بہت سے عجائب ہیں اور ہر عضو کے اندر اس کے ظاہر و باطن میں عجیب معانی مضمر ہیں۔ پھر ہر ایک عضو میں نادر حکمتیں ہیں۔ تنِ آدمی میں کئی ہر رگ و پے اور ہڈیاں ہیں۔ ہر ایک جداگانہ شکل وصفت کی مالک اور ہر ایک جداگانہ غرض کے لیے ہے اور تم سب سے بے خبر ہو گے۔ اس قدر جانتے ہو کہ ہاتھ گرفت کے لیے ہیں تو پاؤں چلنے کے لیے اور زبان بولنے کے لیے ہے۔ لیکن آنکھ جسے دس مختلف طبقوں میں ترکیب دی گئی ہے اگر ان میں سے ایک طبقہ بھی کم ہو جائے تو دیدار میں خلل آ جاتا ہے۔ تم نہیں جانتے اور یہ بھی نہیں جانتے کہ ہر طبقہ کس غرض سے ہے۔ اور دیدار کے لیے کس وجہ سے اس طبقے کی ضرورت ہے اور آنکھ کی مقدار ظاہر ہے کہ کتنی ہے اور آنکھ کی شرح ضخیم مجلدات میں بہ تفصیل بیان ہوئی ہے۔ بلکہ اگر تمہیں اس کا علم نہیں تو کچھ عجب نہیں کہ احشائے باطن مثلاً جگر، تلی، پتہ اور گردے وغیرہ کس لیے ہیں۔ جگر اس لیے ہے کہ معدے سے جو خوردہ چیزیں اس تک پہنچتی ہیں وہ انہیں خون کی صورت میں ہم رنگ بناتا ہے تاکہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ پورے جسم کی غذا بن جائیں۔ خون جب جگر میں پختگی پاتا ہے تو اس میں سے کچھ تلچھٹ بچ جاتی ہے۔ جسے سودا کہتے ہیں۔ تلی کا کام یہی ہے کہ وہ تلچھٹ اس سے لے لیتی ہے۔ اور اس کے اوپر ایک جھاگ انڈے کی زردی کی سی آ جاتی ہے جو صفراء کہلاتی ہے۔ پتہ یہ صفرا اس سے لے لیتا ہے اور خون جب جگر سے باہر نکلتا ہے تو وہ لطیف اور رقیق اور بے قوام ہوتا ہے۔ گردہ اس لیے ہے کہ خون سے پانی لے تاکہ خون صفراء اور سودا سے پاک باقوام ہو کر عروق میں پہنچ جائے۔ اگر پتے میں کوئی نقص پیدا ہو جائے تو صفراء خون ہی میں رہ جاتا ہے جس سے یرقان کی بیماری جنم لیتی ہے۔ اور دوسرے صفراوی امراض وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اور اگر تلی علیل ہو جائے اور سودا خون میں رہ جائے تو سوداوی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر گردہ آفت زدہ ہو جائے تو پانی خون میں باقی رہ جاتا ہے جس سے مرضِ استسقا لاحق ہو جاتا ہے۔

اسی انداز سے بدن کے ظاہری اور اندرونی اعضا و اجزاء پیدا کیے گئے ہیں کہ بدن بغیر اس کے خلل آشنا ہو جاتا ہے۔ بلکہ انسانی بدن اپنے اختصار کے ساتھ تمام عالم کی مثال ہے کہ جو کچھ عالم میں پیدا کیا گیا ہے

انسانی بدن میں اس کا نمونہ موجود ہے۔ ہڈیاں پہاڑ کی مانند ہیں' پسینہ پانی کی طرح' بال سبزے کی مثل' دماغ آسمان کی مانند اور حواس ستاروں کی طرح ہیں۔ تفصیل اس کی بڑی لمبی ہے۔

بلکہ ہمہ نوع تخلیق کی مثال انسانی جسم میں موجود ہے۔ جیسے خنزیر' کتا' بھیڑیا' گھوڑا' گدھا' دیو' پری اور فرشتہ جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ بلکہ ہر پیشہ ور جو دنیا میں موجود ہے انسانی بدن میں اس کا نمونہ موجود ہے؛ معدے میں جو قوت ہے وہ طبّاخ کی سی ہے کہ کھانے کو ہضم کرتی ہے۔ اور وہ جو صافی طعام کو جگر میں بھیجتی ہے اور اس کی کثافت کو انتڑیوں کے حوالے کرتی ہے وہ گویا عصار کی سی ہے۔ اور وہ قوت جو صافی طعام کو جگر میں خون کا رنگ دیتی ہے مثل رنگرز کے ہے۔ اور وہ جو خون کو سینے میں سپید دودھ بناتی ہے اور دونوں خایوں میں نُطفہ بنا دیتی ہے وہ مانند دھولی کے ہے۔ اور وہ جو غذا کے ہر جزو کو اپنی طرف کھینچتی ہے وہ جلّاب کی طرح ہے اور وہ قوت جو جگر سے پانی گردے کی طرف کھینچتی ہے تاکہ مثانے میں چلا جائے وہ مانند سقّے کے ہے۔ اور وہ جو تلچھٹ کو باہر لے جاتی ہے مثل کنّاس (خاکروب) کے ہے اور وہ جو صفرا اور سودا کو باطن میں انگیخت دے کر جسم کو تباہ کرتی ہے مُفسد عیّار کی مثل ہے۔ اور وہ قوت جو صفراء اور کئی بیماریوں کا ازالہ کرتی ہے حاکم عادل کی طرح ہے۔ اور تفصیل اس کی بہت لمبی ہے۔ مقصود اس بیان سے یہ ہے کہ تم جان سکو کہ کس قدر مختلف قسم کے عوامل آپ کے بدن میں مصروف عمل ہیں۔ اور آپ خود ان سے بے خبر پڑے سوتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی آپ کی خدمت سے ہاتھ نہیں کھینچتا۔ اور آپ ہیں کہ ان میں سے کسی کے آشنا ہیں' نہ اس کے شکرگزار جس نے انہیں آپ کی خدمت پر مامور کیا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی اپنے ملازم کو ایک دن کے لیے آپ کی خدمت کے لیے بھیجتا ہے اس کا شکریہ تو تمام عمر کرتے رہتے ہو۔ افسوس صد افسوس کہ وہ جس نے اس قسم کے ہزاروں پیشہ ور تمہاری خدمت کے لیے بھیج رکھے ہیں جو زندگی بھر مسلسل تمہاری خدمت میں لگے رہتے ہیں تم اس کا شکر ادا نہیں کرتے اور نہ ہی اسے یاد کرتے ہو۔

اعضائے بدن کی ترکیب اور ان کی منفعت کے علم کو علمِ تشریح کہتے ہیں۔ اور طب کا یہ علم بڑا عظیم علم ہے۔ اور لوگ اس سے غافل ہیں۔ اور اس کا علم حاصل نہیں کرتے اور اگر پڑھتے بھی ہیں تو محض اس لیے کہ علم طب میں استاد ہو جائیں۔ اور طب اور علم طب خود کم ارزش ہے اگرچہ اس کی ضرورت ہے لیکن راہ دین سے متعلق نہیں۔ ہاں اگر کوئی اس پر اس پہلو سے نظر ڈالے کہ خدائے عزوجل کی صنعت گری کا مشاہدہ کر سکے تو بہ ضرورت اس میں صفاتِ الٰہیت میں سے تین صفات پیدا ہو جائیں گی۔ ایک یہ کہ جان لے کہ اس بدن کا مؤسس اور اس شخصیت کا خالق ایک قادر ہے باکمال؛ جس کی قدرت میں کوئی نقص یا عجز راہ نہیں پا سکتا۔

کیونکہ وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی کام اس سے بڑھ کر عجیب نہیں ہے کہ ایک حقیر قطرۂ آب سے ایک ایسے شخص کی تخلیق کرے اور وہ جو یہ کرسکتا ہے موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنا اس صاحب قدرت کے لیے آسان تر ہوگا۔ دوسرے یہ کہ وہ عالم ایسا ہے کہ اس کا علم تمام کاموں پر محیط ہے۔ اس قسم کے عجائب باایں ہمہ حکمت ہائے نادر ممکن نہیں مگر کمال علم سے۔ اور تیسری یہ کہ اپنے بندوں پر اللہ تعالیٰ کے الطاف ورحمت وعنایات کی کوئی انتہا نہیں کہ جو کچھ بھی درکار ہے خالق نے اس میں کوئی چیز روک نہیں رکھی بلکہ ضرورت کے لیے جو کچھ بھی لازم تھا جیسے دل، جگر، دماغ وغیرہ زندگی کے اصول عطا کیے اور جن کی حاجت تھی اگرچہ ضرورت نہ تھی جیسے ہاتھ، پاؤں آنکھ زبان بھی دیئے۔ اور وہ جن کی حاجت تھی نہ ضرورت مگر اس سے انسان کے حسن میں اضافہ ہوتا تھا اسے نہایت خوب صورت پیکر عطا کیا۔ مثلاً بالوں کی سیاہی، لبوں کی سرخی، ابروؤں کو کجی، قد کو راستی، آنکھ کی پلکوں کو ہمواری وغیرہ۔ اور یہ لطف وعنایت صرف آدمی کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ جملہ مخلوق کے لیے عام تھی۔ بلکہ مچھر، مکھی اور زنبور کو بھی جو کچھ چاہئے تھا عطا ہوا۔ اس کے علاوہ ان کی شکلوں کو اور ان کے ظاہر کو عمدہ رنگوں اور نقوش سے آراستہ بھی کیا۔

پس تنِ آدمی کی تخلیق وتشکیل پر نگاہ صفاتِ الٰہیت کی بدیں وجہ معرفت کی کلید ہے۔ اس سبب سے یہ علم شرف کا مالک ٹھہرتا ہے نہ اس بناء پر کہ طبیب کو اس کی ضرورت ہے۔ اور جس طرح سے نوادرات شعر وتصنیف وصنعت کا علم تمہیں جس قدر زیادہ ہوگا اسی قدر شاعر، مصنف اور صانع کی عظمت تمہارے دل میں زیادہ ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی صنعت گری کے عجائب اسی طرح اس جل جلالہ، کی عظمتِ صانع کے علم کی کلید ہیں۔ لیکن علم دل کے مقابلے میں مختصر ہیں۔ کیونکہ یہ علم الابدان ہے اور بدن انسان کی سواری ہے اور دل مانند اس کے سوار کے ہے۔ اور تخلیق کا مقصود سوار ہے نہ کہ سواری، کیونکہ سواری سوار کے لیے ہے نہ کہ سوار سواری کے لیے۔ لیکن اس قدر بیان کیا گیا ہے تا کہ تمہیں معلوم ہو کہ اس آسانی کے ساتھ اپنے آپ کو کلیۃً پہچانا نہیں جاسکتا باوجود اس کے کہ کوئی چیز تمہاری ذات سے بڑھ کر تمہارے قریب نہیں ہوسکتی۔ اور وہ جس نے خود کو نہ پہچانا ہو کسی دوسری چیز کی شناخت کا دعویٰ کرے اس کی مثال ایسے مفلس کی سی ہے جو خود کو تو کھانا دے نہیں سکتا لیکن مدعی اس کا ہے کہ اس نے شہر کے تمام درویشوں کو کھانا دیا اور سب اسی کی روٹی کھاتے ہیں۔ یہ سب برا ہے اور محال بھی۔

فصل ہیجدہم: اس دنیا میں انسان کے عجز ونقصان کی غایت

جب تم نے انسان کے گوہر دل کے عزّ وشرف اور عظمت کے باب میں یہ سب کچھ جان لیا تو یہ بھی

معلوم ہونا چاہیے کہ جہاں اس گوہرعزیز کو تم کو مرحمت کیا گیا ہے اسے آپ سے مخفی بھی رکھا گیا ہے اور اگر آپ اسے طلب نہیں کرتے اور کھود یتے ہیں تو آپ گویا اس سے غافل ہیں کہ یہ ایک عظیم خسران اور غبن ہے۔ تمہیں اس کے لیے جدو جہد کرنی چاہیے کہ دل کو باز یاب کرسکو۔ اور اسے دنیوی مصروفیات سے الگ کرسکو۔ اور اسے اس کے کمال کی منزل تک پہنچاؤ۔ کیونکہ دل کا عزّ وشرف اُس دنیا میں ظاہر ہوگا کہ وہاں غم سے پاک خوشی دیکھے گا اور بقائے فنا کا مشاہدہ کرے گا۔ اور بے عجز قدرت دیکھے گا۔ اور خالص معرفت جس میں شبہ کا شائبہ بھی نہ ہو اُس کا نظارہ کرے گا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جمالِ حضرت بے کدورت سے بہرہ ور ہوگا۔ لیکن اس جہان میں دل کا شرف یہ ہے کہ اسے اس کی استعداد اور شایستگی حاصل ہے جن کے بل پر وہ حقیقی عزوشرف کو پہنچتا ہے۔ ورنہ آج اس سے ناقص تر اور بے چارہ تر دوسرا کون ہے۔ کہ بھوک پیاس گرما' سرما' بیماری' درد واندوہ اور رنج وخشم وآز کا اسیر ہے۔ اور جس چیز میں اس کے لیے لذت وراحت ہے وہ اس کی زیاں کار ہے۔ اور جو اس کے لیے نافع ہے وہ تلخی اور رنج کے ساتھ ہے اور جو کوئی شریف وعزیز ہوتا ہے تو وہ بر بنائے علم یا قوت وقدرت یا بہ ہمت وارادت یا بہ جمال وصورت ہوتا ہے۔

اور اگر تو اس کے علم پر نظر ڈالے تو اس سے جاہل تر اور کون ہے کیونکہ اگر اس کے دماغ کی ایک رگ بھی مختل ہو جائے تو ہلاکت یا دیوانگی کا خطرہ ہوتا ہے۔ اور وہ نہیں جانتا کہ اس کا منبع کون سا ہے اور نجات کیونکر ہو۔ عین ممکن ہے کہ اس کا علاج اس کے پاس ہو وہ دیکھتا ہے لیکن نہیں جانتا۔ اور اگر تم اس کی قدرت وقوت پر نگاہ ڈالو تو انسان سے عاجز تر کون ہے؛ کہ وہ تو مکھی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اور اگر اس پر کسی مچھر کو مامور کر دیں تو اس کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی زنبور اسے ڈنگ مار دے تو وہ بے قرار ہو جاتا ہے۔ اور نیندیں اس کی اچاٹ ہو جاتی ہیں اور اگر اس کی ہمت وحوصلہ پر نگاہ ڈالئے تو اگر ایک چھدام کا نقصان ہو تو متغیر ورنجور ہو جاتا ہے۔ اور ایک لقمے سے درگذر کرے تو بھوک کے مارے مدہوش ہو جاتا ہے۔ پس اس سے خسیس تر اور کون ہوگا؟

اور اگر اس کے حسن صورت پر نظر ڈالیے تو وہ ایک کھال ہے جو گند کے ڈھیر پر کھینچی ہوئی ہے۔ اگر دو دن شست وشونہ کرے اس پر رسوائیاں نمودار ہوں گی ایسی کہ خود سے بیزار ہو جائے۔ اور اس سے بدبو ابھرنے لگے۔ اور جس چیز سے زیادہ گندہ اور رسواتر ہے وہ' وہ غلاظت ہے جو اپنے پیٹ میں اٹھائے پھرتا ہے گویا اس کا قلی ہے اور دن میں دو بار اپنے ہاتھ سے اس غلاظت کو دھوتا ہے۔

ایک روز شیخ ابوسعید (رحمۃ اللہ علیہ) صوفیوں کے ساتھ جا رہے تھے تو ایسی جگہ پہنچے کہ جہاں غلاظت کا

گڑھا تھا اور نجاست راہ میں تھی سب ایک طرف کو بھاگے اور ناک پکڑ لی لیکن شیخ ابوسعید رُک گئے اور کہنے لگے:
''جانتے ہو نجاست مجھے کیا کہہ رہی ہے؟ وہ کہہ رہی ہے کہ ''میں وہی ہوں کہ بازار میں تھی جس پر ہر کوئی اپنا کیسۂ زر نچھاور کرتا تھا تا کہ مجھے حاصل کر سکے۔ اور میں نے ایک رات سے زاید آپ کے ساتھ صحبت اختیار نہیں کی کہ اس صورت کو پہنچ گئی ہوں۔ کہیے ایسے میں مجھے آپ سے دوری اختیار کرنی چاہیے تھی یا آپ کو مجھ سے؟''۔

اور حقیقت یہی ہے کہ اس دنیا میں آدمی ناکسی اور انتہا درجے کے نقصان و عجز میں ہے اور اس کا روزِ بازار کل قیامت کو ہوگا۔ اگر کیمیائے سعادت کو دل کے گوہر پر ڈالے گا تو بہایم کے درجے سے نکل کر فرشتوں کے مرتبے کو پہنچ جائے گا۔ اور اگر دنیا یا اس دنیا کی شہوات کا رُخ کرے گا تو کل خنزیر یا کتے کو اس پر فضیلت حاصل ہوگی۔ کیونکہ وہ سب مر کر مٹی ہو جائیں گے اور رنج سے نجات پا جائیں گے لیکن انسان عذاب میں رہے گا۔ پس جب اس نے اپنے شرف کی شناخت کر لی ہے تو اسے اپنی ناکسی اور بے چارگی کا علم بھی ہونا چاہئے۔ کیونکہ معرفتِ نفس اسی بناء پر خدائے تعالیٰ کی معرفت کی کلیدوں میں سے ایک کلید ہے۔

خودشناسی کی شرح میں اسی قدر کافی ہوگا۔ کیونکہ یہ کتاب، جو کچھ مذکور ہوا اس سے زاید کی متحمل نہیں۔ اور توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ (باللہ التوفیق)۔

◆ ◆ ◆

عنوانِ دوم: حق سبحانہ کی معرفت

فصل اوّل: معرفتِ نفس، کلیدِ معرفتِ حق

معلوم رہے کہ اگلے پیغمبروں کی کتب میں یہ جملہ معروف ہے کہ "اِعْرِفْ نَفْسِكَ تَعرِفْ رَبَّكَ" (اپنے آپ کو پہچان تا کہ اپنے رب کو پہچان لے) اور اخبار و آثار میں معروف ہے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَد عَرَفَ رَبَّہٗ" (جس نے خود اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا)۔ اور یہ سب دلیل اس امر کی ہے کہ انسان کا نفس آئینے کی طرح ہے۔ تو جو کوئی اسے دیکھتا ہے خدا کو دیکھتا ہے۔ لیکن مخلوق اکثر خود کو دیکھتی ہے لیکن حق کو نہیں پہچانتی۔ بس نفس کی شناخت ضروری ہے۔ اس بناء پر کہ وہ آئینہ معرفت ہے۔ اور یہ دو وجوہ سے ہے۔ ایک وہ وجہ ہے کہ زیادہ دقیق ہے اور بیشتر فہم اس کے متحمل نہیں ہوتے۔ اس لیے اس کی شرح عامۃ الناس کے سامنے نہیں کی جاسکتی اور اس کا بیان مناسب نہیں۔

لیکن وہ وجہ جسے ہر کوئی سمجھ سکتا ہے یہ ہے کہ انسان اپنی ذات سے ہستیٔ ذاتِ حق سبحانہ تعالیٰ کو پہچان لے اور اپنی صفاتِ سے صفات حق تعالیٰ کو پہچانے اور اپنے بدن اور اعضا میں کہ اس کی مملکت ہے تصرف سے حق تعالیٰ کے تمام عالم میں تصرف کو پہچانے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان نے پہلے خود کو وجود سے پہچانا۔ اور جانتا ہے کہ اس سے چند سال قبل وہ نہیں تھا۔ اس کا نام ونشان نہ تھا جیسے حق تعالیٰ کا فرمان ہے: "هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا" (قرآن: ٧٦/١) (انسان پر دنیا میں وہ وقت آیا کہ اس نے کسی چیز کو یاد کیا اور وہ یاد کرنے کے لائق نہ تھا)۔ اور انسان جو کچھ اپنی اصل تخلیق کی راہ سے حاصل کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے علم ہے کہ اپنی موجودہ ہستی سے پہلے وہ نطفہ تھا۔ پلید پانی کا ایک قطرہ جس میں نہ عقل تھی نہ سمع و بصر نہ سر و دست نہ آنکھ نہ زبان نہ رگ و پے نہ استخوان نہ گوشت پوست بلکہ سفید پانی تھا ایک سا۔ پھر یہ تمام عجائب اس میں ظہور پذیر ہوئے۔ خواہ خود اس نے خود کو وجود بخشا یا کوئی اور اسے معرضِ ظہور میں لایا۔ وہ یقیناً جانتا ہے کہ اب جب درجہ کمال میں ہے ایک بال کی تخلیق سے بھی عاجز ہے، جانتا ہے کہ اس وقت ایک قطرہ تھا تو اس وقت عاجز تر اور ناقص تر تھا۔ پس لازماً اس کو اپنی ذات کے ہست ہونے سے ہستیٔ ذاتِ حق تعالیٰ معلوم ہو جائے گی اور جب اپنے بدن کے عجائب کا جائزہ اندر باہر سے لے گا جیسے کہ بعض اعضاء کا ذکر

پہلے سے ہو چکا ہے تو وہ اپنے خالق کی قدرت کو دیکھ لے گا۔ اور پہچان لے گا کہ یہ قدرت بدرجہ کمال ہے۔ خدا جو چاہتا ہے اور جیسا کہ چاہتا ہے پیدا کر سکتا ہے اس سے بڑھ کر قدرت کیا ہوگی کہ جس نے ایک حقیر قطرۂ آب سے ایسے باکمال و جمال اور عجائب و غرائب سے مالا مال پیکر پیدا کر دیا۔

انسان جب اپنی نادر بدیع صفات اور اپنے اعضا کے فوائد پر غور کرتا ہے کہ ہاتھ پاؤں آنکھ زبان دانت کہ اعضائے ظاہر ہیں اور جگر، تلی، پتہ وغیرہ کہ اعضائے باطن ہیں ان کو کس حکمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے خالق کا علم انتہائی کمال درجے کا ہے۔ اور ہر چیز کو محیط ہے۔ اور یہ بھی جان لیتا ہے کہ ایسے عالم سے کوئی چیز مخفی نہیں رہ سکتی۔ اگر تمام اہلِ عقل کی عقول کو جمع کر لیں اور انہیں لمبی عمر عطا کریں اور وہ مل کر غور کریں تا کہ تمام اعضائے انسانی میں سے کسی ایک عضو کو ایک ایسی نئی صورت دے سکیں جو موجودہ عضو سے بہتر ہونا ممکن ہے۔ یا اگر چاہیں کہ دانتوں کو ایک نئی صورت سے ترتیب دیں کہ سامنے کے دانتوں کے سر تیز ہیں تا کہ غذا کو کاٹ سکیں اور دوسرے دانتوں کے سر چوڑے ہیں تا کہ طعام کو پیس سکیں اور زبان ان کے درمیان آسیابان کے آب خورے کی مانند ہے جو غذا کو چکی میں ڈالتا ہے۔ اور وہ قوتی جو زبان کے نیچے ہے آب ریز چشمے کی طرح کہ چاہیے پانی ڈالے کہ طعام تر ہو جائے اور لقمہ گلے میں جائے تو وہاں پھنس نہ جائے۔ تو دنیا کے تمام اہل خرد ایسی کوئی صورت تجویز نہیں کر سکتے جو موجودہ صورت سے کمال تر یا خوب تر ہو۔ اسی طرح ہاتھ کو دیکھئے کہ اس میں پانچ انگلیاں ہیں۔ چار ان میں سے ایک صف میں ہیں اور انگوٹھا ان سے دور تر فربہ لیکن قامت میں چھوٹا ہوتا ہے اس طرح سب انگلیوں کے ساتھ کام کرتا ہے اور سب کے ساتھ گردش کرتا ہے۔ ہر انگلی میں تین جوڑ دکھائی دیتے ہیں جب کہ انگوٹھے میں دو جوڑ ہیں تا کہ اگر چاہے کہ تو پکڑ سکے اور چاہے اس سے مجرفہ آب خورہ بنا لے یا مغرفہ بنا لے اور چاہے تو گھونسہ بنا کر سلاح بنا لے خواہ پھیلا کر کف گیر وطبق بنا لے یعنی کئی طرح سے اس سے کام لے سکتا ہے۔ اگر دنیا بھر کے اہل خرد و دانش چاہیں کہ انگلیوں کی ترکیب و ترتیب ایسی ہو کہ سب ایک سی ہوں یا یہ کہ تین ایک طرف ہوں اور دو دوسری طرف یا یہ کہ پانچ کی بجائے چھ ہوں یا چار یا یہ کہ تین جوڑوں کی بجائے دو دو جوڑوں کی ہوں یا چار چار جوڑوں کی تو اس باب میں جو کچھ سوچیں گے یا کہیں گے وہ سب ناقص ہوگا۔ اور وہ کامل ترین موجودہ صورت ہی کو پائیں گے۔ جس کی صورت گری خدائے تعالیٰ نے کی۔ پس معلوم ہوا کہ خالق حقیقی کا علم انسان پر محیط ہے اور وہ ہر چیز کی خبر رکھتا ہے اور انسان کے جملہ اجزاء میں سے ہر جزو میں اسی قسم کی حکمتیں ہیں۔ اور جو کوئی ان حکمتوں کا شعور بیشتر رکھے گا تو خدائے تعالیٰ کی عظمت کے بارے میں اس کی حیرت اسی قدر زیادہ ہوگی۔ اور جب انسان اپنی حاجات پر نظر

ڈالے تو اُسے معلوم ہوگا کہ اسے اعضا کی حاجت ہے۔ اور اعضا کو غذا' لباس اور مسکن کی حاجت ہے۔ اور خود غذا کو بارش' ہوا' بادل اور سردی گرمی کی حاجت ہے اور ان صنائع کی حاجت بھی ہے جو کھانے پینے کی چیزوں میں صلاح لائیں اور ان صنعتوں کو لوہے' لکڑی' تانبے' پیتل وغیرہ کے آلات کی حاجت ہے۔ اور ان آلات کو اس علم و معرفت کی حاجت ہے کہ کس طرح بنائے جائیں۔ پھر انسان انہیں بہترین صورت میں خلق شدہ اور بنا ہوا دیکھے گا اور ہر ایک گوناگوں' کہ ممکن نہ تھا کہ اگر ان کو پیوانہ کرتا تو کسی دل میں اس کا خیال آتا یا ان کو بنا سکتا۔ بے طلب اور نادانستہ سراپا رحمت و لطف خداوندی سے بنا پاتا۔ یہاں سے اُسے ایک اور صنعت کا علم ہوتا ہے کہ تمام اولیاء کی حیات اس کی بناء پر ہے۔ اور وہ ہے لطف و رحمت و عنایت کی صفت جو تمام تخلیق کاروں کو عطا ہوئی۔ جیسا کہ فرمان خداوندی ہے: ''سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ غَضَبِیْ'' (حدیث قدسی: میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی) اور جیسا کہ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا: ''اپنے بندوں پر خدائے عزوجل کی شفقت شیر خوار بچے پر اس کی ماں سے بھی زیادہ ہے''۔ پس انسان اپنی ذات کے ظہور میں ہستیٔ ذات حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے اور حکمتوں کے عجائب اور اپنے گردو پیش منافعوں میں اللہ تعالیٰ کے کمال علم سے آشنا ہوتا ہے اور درکار چیزوں کی فراہمی کو جن کی اسے ضرورت ہے یا حاجت یا زیب و زینت کے لیے مطلوب ہوں ان سب کو اپنے ساتھ ہی پیدا شدہ پاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے بے پایاں لطف و رحمت کا مشاہدہ کرتا ہے۔

فصل دوم: تنزیہہ و تقدیسِ حق

جس طرح انسان نے اپنی صفات کی شناخت کے ذریعے حق تعالیٰ کی صفات کو جانا اور اس کی ذات کا شعور اپنی ذات کے شعور کی راہ سے حاصل کیا تو حق تعالیٰ کے تنزیہہ و تقدیس کو بھی اپنے تنزیہہ و تقدیس کے وسیلے سے جانتا ہے کہ وہ ذاتِ پاک اور مقدس ہے۔ ہر اس چیز سے جو وہم و خیال میں آسکتی ہے۔ اور وہ ذات اس سے پاک ہے کہ اسے کسی مکان سے نسبت دے سکیں اگرچہ کوئی جگہ اللہ کے تصرف سے خالی نہیں۔ اور انسان اس کا نمونہ اپنی ذات میں دیکھتا ہے کہ اس کی جان کی حقیقت جسے ہم دل کہتے ہیں وہ بھی ہمارے وہم و خیال میں آنے والی ہر شے سے منزّہ ہے۔ کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کی کوئی مقدار و کمیت نہیں اور اس کو جزو جزو نہیں کیا جاسکتا۔ اور جب ایسا ہے تو اس کا کوئی رنگ بھی نہیں ہے۔ اور ہر وہ چیز جس کی کوئی مقدار ہو نہ رنگ کسی طور پر بھی خیال میں نہیں سماسکتی کیونکہ خیال اس چیز میں کارفرما ہوسکتا ہے جسے آنکھ نے دیکھا ہو یا اس کی جنس کو دیکھا ہو اور شکل اور رنگ و روپ کے سوا وہم و خیال کی مملکت میں اور کچھ بھی نہیں اور طبع انسانی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کی کیفیت کا احاطہ کر سکے۔ یعنی یہ کہ اس کی شکل و صورت کیسی ہے؟ چھوٹی ہے یا بڑی؟ اور

وہ چیز جوان صفات کی متحمل نہیں ہوتی تو کیفیت اس میں باطل ہوتی ہے۔ اور اگر تم یہ جاننا چاہو کہ ''ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز ہو لیکن کیف وکم سے عاری'' تو تم اپنی حقیقت پر نگاہ ڈالو کہ تمہاری وہ حقیقت جو معرفت کا محل ہے وہ بھی مجرد ہے اور جزو جز و نہیں ہوسکتی اور کیف وکم کو بھی اس میں دخل نہیں۔ اگر کوئی پوچھے کہ روح کیسی شے ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ''کیفیت کو اس میں راہ نہیں''۔

جب تم نے اپنی صفات کا ادراک کرلیا۔ تو یہ بھی جان لو کہ تقدیس وتنزیہہ میں ذاتِ حق سبحانہ تعالیٰ اس امر میں اولیٰ تر ہے اور لوگ اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ کوئی ہستی ایسی بھی ہے جو بے چون و بے چگون ہے۔ حالانکہ خود بھی ایسے ہی ہیں۔ بلکہ آدمی اگر خود کو اپنے بدن ہی میں طلب کرے تو لاکھوں چیزیں پائے اور دیکھے جو بے چون وچگون ہیں کیونکہ انسان اپنے اندر غصے کو دیکھتا ہے' محبت کو دیکھتا ہے' درد کو دیکھتا ہے' لذت کو دیکھتا ہے جن سب کے صفات چون وچگون سے عاری ہیں۔ اگر چاہے کہ ان کی حقیقت وکیفیت کی طلب کرے تو نہیں جان سکتا۔ کیونکہ یہ چیزیں شکل یا رنگ سے بہرہ مند نہیں۔ لہٰذا اس سوال کو ان کے بارے میں کوئی دخل نہیں۔ بلکہ اگر کوئی آواز کی حقیقت یا بُو کی حقیقت یا طعم کی حقیقت جاننا چاہے کہ چون وچگون ہے تو ناکام رہے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ چون اور چگون خیال کا تقاضا ہے جو حاسۂ چشم سے حاصل ہوتا ہے۔ پھر انسان ہر چیز کو دیکھنا چاہتا ہے اور جو کچھ کان کی مملکت میں ہے مثلاً آواز تو آنکھ کو آواز کے بارے میں کوئی صلاحیت نہیں بلکہ آنکھ کے لیے آواز کے کیف وکم کے بارے میں جاننے کی خواہش احمقانہ ہے اور محال؛ کیونکہ آواز آنکھ کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ جیسے رنگ اور شکل کے باب میں کان ساکت ہے۔ اسی طرح انسان جو کچھ حاسۂ دل میں پاتا ہے یا عقل سے پہچانتا ہے تو وہ جملہ حواس کے ماورا ہوتا ہے۔ اور کیف وکم کا تعلق محسوسات سے ہے اور ان کے لیے جو حقایق اور دقائق ہیں ان کی تفصیل ہم نے کتب معقولات میں کردی ہے۔ اور یہاں اسی قدر بیان اُن کا کافی ہے۔ مقصود فقط یہ ہے کہ انسان اپنی بے چونی و بے چگونی کی وساطت سے حق سبحانہ تعالیٰ کی بے چونی وچگونی کو پہچان سکے۔ اور اسے معلوم ہو کہ جس طرح جان موجود ہے اور مملکت تن کی بادشاہ ہے اور تن میں جو کچھ چونی وچگونی رکھتا ہے سب جان ہی کی مِلک ہے۔ اور خود جان بے چون وچگونہ ہے۔ اسی طرح پادشاہِ علم بھی بے چون وچگونہ ہے اور جو کچھ چون وچگونگی رکھتی ہیں مثلاً محسوسات سب اسی کی مِلک ہیں۔

اور تنزیہ کی دوسری نوع یہ ہے کہ اُسے کسی ایک جگہ سے متعلق نہ کرے اور جان کو کسی ایک عضو کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ جان ہاتھ میں ہے یا پاؤں میں ہے یا سر میں ہے یا کسی

اور عضو میں۔ بلکہ جسم کے جملہ اجزا قسمت پذیر ہیں اور جان قسمت پذیر نہیں۔ اور یہ محال ہے کہ کوئی قسمت ناپذیر کسی قسمت پذیر میں اتر جائے۔ اور پھر وہ بھی قسمت پذیر ہو جائے۔ جان باوجود اس کے کہ کسی عضو سے نسبت قبول نہیں کرتی کوئی عضو جان کے تصرف سے خالی نہیں بلکہ تمام اعضائے بدن اس کے تصرف میں ہیں اور اس کے زیر فرمان۔ اور وہ سب کی پادشاہ ہے۔ جیسے کہ عالَم پادشاہ و عالَم (خدا تعالیٰ) کے تصرف میں ہے اور خود وہ اس امر سے پاک ہے کہ اسے کسی خاص جگہ سے نسبت دیں۔ اس قسم کی تقدیس کلیۃً اس طرح آشکار ہو سکتی ہے کہ کوئی روح کی خاصیت اور اس کے راز کو آشکارا بیان کرے۔ لیکن روح کی خاصیت اور سرّ کے بیان کی اجازت نہیں۔ اور ''اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ'' کے کلی معنی بھی اس وقت آشکار ہو سکتے ہیں جب ہم روح کی خاصیت اور اس کے سرّ کو آشکارا بیان کر سکیں۔ (جو ممکن نہیں)۔

فصل سوم: اللہ تعالیٰ کی فرماں روائی کی پہچان

جب ہستیِ ذاتِ حق تعالیٰ کا علم ہو چکا اور چونی و چگونگی سے اس کی پاکی اور تقدیس بھی معلوم ہو گئی اور کسی ایک مقام سے نسبت کے باب میں اس کی پاکیزگی کا علم بھی ہو چکا اور یہ بھی واضح ہو چکا کہ ان جملہ امور کی معرفت کی کلید خود نفس انسانی ہے۔ لیکن معرفت کا ایک باب ابھی باقی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرماں روائی اپنی مملکت میں کس قسم کی ہے؟ اور صورت اس کی کیا ہے؟ اس کا فرشتوں کو حکم دینا اور ملائکہ کی فرماں برداری اور کاموں کو بدست ملائکہ چلانا اور آسمان سے زمین کو حکم دینا اور آسمانوں اور ستاروں کو گردش میں لانا اور اہل زمین کے کاموں کو آسمانوں کے ساتھ وابستہ کرنا اور فراہمیٔ رزق کی کلید آسمان کے حوالہ کرنا وغیرہ امور کی حقیقت کیا ہے؟

معرفتِ باری تعالیٰ میں یہ ایک عظیم باب ہے اور اسے معرفتِ افعال کہا گیا ہے جیسے کہ اس سے پہلے کو معرفتِ ذات وصفات کا نام دیا گیا ہے۔ اور معرفتِ افعال کی کلید بھی معرفتِ نفس انسانی ہی ہے اور اگر تم خود اس بات سے ناآگاہ ہو کہ خود اپنی مملکت میں کیونکر حکمرانی کرتے ہو تو کیونکر جان سکتے ہو کہ پادشاہِ عالم کیسے حکمرانی کرتا ہے۔ سب سے پہلے خود کو پہچان پھر اپنے کسی ایک فعل کو مثلاً تحریر کو جب تو چاہتا ہے کہ کاغذ پر بسم اللہ کا کلمہ لکھے تو پہلے تیرے دل میں رغبت اور ارادت اس امر کی پیدا ہوتی ہے۔ پھر تیرے دل میں ایک حرکت وجنبش جنم لیتی ہے۔ (اس دل میں نہیں جو گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اور سینے میں بائیں جانب رکھا ہوا ہے) اور ایک لطیف جسم دل سے حرکت کر کے دماغ میں جا پہنچتا ہے۔ اسی جسم لطیف کو اطباء رُوح کہتے ہیں۔ جو حس

وحرکت کی حامل ہے اور یہ روح وہ نہیں ہے جو ڈھوڑ ڈنگروں میں جان کی صورت میں موجود ہوتی ہے۔ جو موت کی دسترس میں ہوتی ہے۔ اور یہ دوسری روح جسے ہم نے ''دل'' کا نام دیا ہے۔ چوپایوں میں نہیں ہوتی۔ یہ مرگ نا آشنا ہے' کبھی نہیں مرتی۔ کیونکہ وہ معرفتِ خداوندی کا محل ہے۔ پس یہ روح جب دماغ میں پہنچتی ہے اور بسم اللہ کی صورت دماغ کے خزینۂ اول میں کہ قوت خیال کا نشیمن ہے ظہور پذیر ہوتی ہے پھر دماغ سے ایک اثر اعصاب پر وارد ہوتا ہے جو دماغ سے ابھرا ہے اور ہر طرف پہنچ کر انگلیوں کو رسیوں کی طرح باندھ دیتا ہے اور اسے اس شخص کی کلائی مین جو کمزور ہو دیکھا جا سکتا ہے۔ پس اعصاب حرکت میں آتے ہیں اور سر انگشت کو حرکت دیتے ہیں۔ پھر انگلیاں قلم کو حرکت دیتی ہیں۔ پھر قلم روشنائی کو حرکت دیتا ہے۔ پھر بسم اللہ کی صورت جیسی خزینۂ خیال میں ہے کاغذ پر نمودار ہو جاتی ہے۔ حواس کی معاونت سے خصوصاً آنکھ کی مدد سے کہ لکھنے ہیں اِس کی حاجت ہوتی ہے۔

پس جس طرح کہ نفس انسانی میں کسی بھی کام کی ابتداء میں رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح تمام کاموں میں خدائے تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے جسے ارادہ کہتے ہیں۔ اور جس طرح سے ارادہ کا اثر خود تمہارے دل میں ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے واسطے سے دوسری جگہوں میں پہنچتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ کے ارادے کا اثر پہلے عرش پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ دوسروں تک پہنچتا ہے اور جس طرح سے بخار کا سا جسم لطیف دل کی رگوں کی راہ سے یہ اثر دماغ کو پہنچاتا ہے اس جسم کو روح کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ کے ہاں بھی ایک جوہرِ لطیف ہے جو اثر عرش سے کرسی تک پہنچاتا ہے اور اس جوہر کو فرشتہ کہتے ہیں اور روح کہتے ہیں۔ اور روح القدس کہتے ہیں۔ جیسے نفس انسانی میں دل سے اثر دماغ کو پہنچتا ہے اور دماغ دل کا محکوم ہے اور دل کی مملکت میں ہے اور اس کے زیر تصرف ہے اسی طرح ارادۂ خداوندی کا اثر عرشِ خداوندی سے کرسی کو پہنچتا ہے اور کرسی عرش کی زیر دست ہے اور جس طرح صورت ''بسم اللہ'' تمہارا فعل ہے اور تمہاری مراد ہے وہ دماغ کے خزینۂ اول میں جنم لیتی ہے تو فعل اس کے مطابق صورت پذیر ہوتا ہے۔ گویا جو چیز بھی عالم میں ظاہر ہونے والی ہو پہلے اس کا نقش لوح محفوظ میں نمودار ہوتا ہے۔

اور جس طرح کہ ایک قوت جو دماغ میں ہے اور لطیف ہے اعصاب کو حرکت میں لاتی ہے اور اعصاب ہاتھ اور انگلیوں کو حرکت میں لاتے ہیں تا کہ انگلیاں قلم کو حرکت دیں۔ اسی طرح جواہر لطیف جو عرش و کرسی پر موکل ہیں آسمان کو ستاروں کے ساتھ حرکت میں لاتے ہیں۔ اور جس طرح قوۃ دماغ رگ وریشہ کے ذریعے انگلیوں کو حرکت دیتی ہے۔ اسی طرح وہ جواہر لطیف جنہیں ملائکہ کہا جاتا ہے ستاروں کے ذریعے اور عالم

سفلی کے ساتھ ان کی ستاروں کے روابط کے بل پر امہات عالم کی طبائع کو حرکت میں لاتے ہیں۔ جنہیں چار طبع کہا جاتا ہے یعنی: حرارت، برودت، رطوبت و یبوست (گرمی، سردی، نمی اور خشکی)۔ اور جس طرح قلم روشنائی کو پھیلاتا سمیٹتا ہے تا کہ بسم اللہ کی صورت نمود میں آئے اسی طرح گرمی سردی آب و خاک اور ان مرکبات کی امہات کو حرکت میں لاتی ہیں۔

اور جس طرح کہ کاغذ روشنائی کو قبول کرتا ہے کہ اسے پھیلاتا یا سمیٹتا ہے۔ رطوبت ان مرکبات کو ایک صورت قبول کرنے کے لیے تیار کرتی ہے اور خشکی کو اس شکل کی محافظ بناتی ہے تا کہ اس کی نگہ داری کرے اور اسے ہاتھ سے نہ دے کیونکہ اگر رطوبت نہ ہوتو خود صورت پذیر نہ ہو اور اگر یبوست نہ ہوتو صورت محفوظ نہ رہے اور جب قلم نے اپنا پورا کام انجام دے دیا اور اپنی حرکت تمام کر دی تو بسم اللہ کی صورت اس نقش کے مطابق کہ خزینۂ خیال میں تھا آنکھ کی معاونت سے ظاہر ہوگئی۔ اسی طرح جب گرمی سردی ان امہات، مرکبات کو تحریک بہ معاونتِ ملائکہ کرتی ہیں تو نباتات وحیوانات وغیرہ اس عالم میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس صورت کے مطابق جو لوح محفوظ میں ہے اور جس طرح تمام جسم میں سے پہلے دل میں ابتداء کسی کام کی ہوتی ہے اور پھر تمام اعضا پر منتشر ہو جاتی ہے اسی طرح عالم اجسام میں کاموں کی تمہید عرش میں نمودار ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس خاصیت کو قبول کرنے والا پہلا فرد دل ہوتا ہے اور اس کے علاوہ دوسرے سب اعضا دل سے نسبت دیتے ہیں۔ نتیجۂ گمان کرتے ہیں کہ تو دل میں رہتا ہے۔ اسی طرح چونکہ حق تعالیٰ کا غلبہ جملہ مخلوق پر عرش کے واسطے سے ہے گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر متمکن ہے۔

اور جس طرح سے کہ تم دل پر غالب ہو جاتے ہو دل کا کام بدن کی تمام مملکت کی تدبیر کے لیے موزوں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب ایزد تعالیٰ عرش کی تخلیق پر غالب ہو جاتے ہیں اور عرش سر وقد ہموار ہو جاتا ہے تو گویا تدبیر مملکت کا سامان ہو گیا اور عبارت یوں آئی: ''اَسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ'' (قرآن: ۳/۱۰) ''وہ عرش پر بیٹھ گیا اور ہر کام کی تدبیر کی''۔

یاد رہے کہ یہ سب حقیقت ہے اور اہل بصیرت کو مکاشفتِ ظاہر سے معلوم ہو چکی ہے اور انہوں نے بہ حقیقت اس مفہوم کو پالیا ہے کہ 'اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَ جَلَّ' خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ (خداوند نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے اس کو جان لے اور خود کو پہچان' اے انسان! تا کہ اپنے خدا کو پہچان سکے۔) اور یہ حقیقت مخفی نہ رہے کہ پادشاہ کو اور پادشاہی کو پادشاہوں کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اگر یوں نہ ہوتا کہ تمہیں تمہاری مملکت پر بادشاہی دی ہوتی اور ایک مختصر سا نسخہ اللہ تعالیٰ کی مملکت و بادشاہی کا دیا ہوتا تو تم خداوند عالم کی شناخت نہ کر

سکتے۔ پس تم شکر کرو کہ اس شاہ کا جس نے تمہیں پیدا کیا ایک مملکت دی اور اس کی پادشاہی عطا کی خود اپنی مملکت کے نمونے پر؛ اور تمہارے دل کو تمہارا عرش بنایا اور روحِ حیات کہ جس کا سرچشمہ دل ہے اسے تمہارا اسرافیل بنایا اور دماغ کو تمہاری کرسی ٹھہرایا اور خیالات کے خزانے سے تمہاری لوح محفوظ بنائی اور آنکھ کان جیسے جملہ حواس کو تمہارے لیے بمنزلہ ملائک قرار دیا اور قبۂ دماغ جو اعصابِ دل کا منبع ہے تمہارا آسمان اور تمہارے انجم بنائے اور انگلیوں اور قلم اور روشنائی کے ذریعے طبائع کو تمہارے لیے مسخر کیا اور تمہیں یگانہ بے چون و چگون تخلیق کیا اور سب کا بادشاہ بنایا پھر تمہیں کہا خبردار کبھی خود سے اور اپنی بادشاہی سے غافل نہ ہونا کہ اس طرح تم اپنے خالق سے بھی غافل ہو جاؤ گے کہ ''فَاِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ فَاعرِف ذٰلِکَ وَاعرِفْ نَفْسَکَ یَا اِنْسَانُ تَعرِفْ رَبَّکَ'' (خداوند نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا اسے جان لے اور خود پہچان اے انسان تاکہ اپنے خدا کو پہچان سکے)۔

فصل چہارم: انسانی پادشاہی اور خدائے تعالیٰ کی پادشاہی کے موازنے کا مقصود

حضرتِ پادشائی آدمی اور حضرت پادشائی حق تعالیٰ کے موازنے میں جو یہ سب کچھ مذکور ہوا اس میں دو عظیم علموں کی طرف اشارہ ہوا ہے: ایک نفس انسان کا علم اور اس کے قویٰ اور صفات سے اس کے اعضا کی کیفیت اور اس کے قویٰ وصفات کی کیفیت اس کے دل کے ساتھ اور یہ طویل علم ہے جس کی حقیقت اس جیسی مختصر کتاب میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اور دوسرے پادشاہِ عالم کی مملکت کے فرشتوں کے ساتھ ارتباط کی تفصیل اور خود فرشتوں کا ایک دوسرے سے ارتباط اور سمٰوٰت وعرش وکرسی کا ارتباط فرشتوں کے ساتھ اور یہ علم اس سے بھی درازتر ہے۔

اور مقصود اس اشارت کا یہ ہے کہ جو کوئی زیرک ہو ان سب کا اعتقاد رکھے۔ اور ان سب کے ذریعے خدائے تعالیٰ کی عظمت کو پہچانے اور جو کند ذہن ہے اس قدر تو جان لے کہ کیسا غافل ہے اور کس قسم کا مغبون (مال لٹا) ہے کہ ایسی بارگاہ کے مطالعے سے باایں ہمہ جمال محروم ہے۔ اور بارگاہِ الوہیت کے جمال سے خود مخلوق کو کیا خبر ہے۔ اور یہ مقدار جو معرض بیان میں آئی ازاں جملہ ہے کہ خلق پہچان سکے کہ خود کیا ہے؟

فصل پنجم: نیچری اور منجم کی تشبیہ ایک چیونٹی کے ساتھ

وہم وگمان کا مارا نیچری اور محروم نجومی دونوں اعمال وافعال کو فطرت اور ستاروں کے حوالے کیے ہوتے

ہیں۔ ان کی مثال ایک ننھی چیونٹی کی سی ہے جو کاغذ پر رواں ہے اور دیکھتی ہے کہ کاغذ سیاہ ہو رہا ہے۔ اور اس پر نقش ظاہر ہو رہے ہیں نگاہ اٹھاتی ہے تو نوکِ قلم کو دیکھتی ہے تو پھولے نہیں سماتی۔ اور کہتی ہے کہ ''اس حقیقت کا علم مجھے ہوگیا! یہ نقش ونگار قلم بناتا ہے''۔ یہ گویا نیچری کی مثال ہے کہ اس نے محرکات کو مطلق نہیں جانا سوائے نہایت پست درجے کے۔

اس کے بعد ایک دوسری چیونٹی آئی کہ جس کی آنکھ کسی قدر بڑی تھی اور اس کی وسعت نگاہ میں چیونٹی سے کچھ زیادہ تھی وہ بولی ''تم نے غلط کہا میں اس قلم کو تو ایک مسخر کی صورت میں دیکھتی ہوں اور اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی دیکھتی ہوں جو دراصل یہ نقاشی کر رہی ہے''۔ اور اس پر شاداں اترائی اور بولی: ''حقیقت وہ ہے جس کا علم مجھے ہوا ہے کہ نقاش دراصل انگلی ہے قلم نہیں۔ اور قلم انگلیوں کے تصرف میں ہے''۔ تو یہ مثال نجومی کی ہے کہ جس کی نظر نسبتاً بالاتر تھی اس نے سمجھا کہ طبائع ستاروں کے زیر تصرف ہیں۔ لیکن نہ جان سکا کہ کواکب بھی فرشتوں کے زیر تصرف ہیں اور اس سے بھی آگے جو درجات ہیں ان تک راہ نہ پائی اور جس طرح یہ تفاوت عالم اجسام میں منجم اور نیچری کے درمیان پیدا ہوا اور اس سے اختلاف نے راہ پائی۔ اسی طرح ان لوگوں کے درمیان جنہوں نے عالم ارواح میں ترقی کی یہی اختلاف ہوا۔ کیونکہ جب بیشتر خلق نے عالمِ اجسام سے ترقی کی اور کوئی چیز اجسام سے باہر انہیں مل گئی وہ پہلے درجہ پر نیچے آرہے اور عالم ارواح پر راہ معراج ان کے لیے بند ہوگئی۔ اور عالم ارواح میں کہ عالم انوار ہے درجات کی راہ میں آڑیں اور پردے بہت ہیں۔ بعض وہ کہ جن کا درجہ ستاروں کی طرح ہے اور بعض وہ جن کا درجہ چاند کا سا اور بعض وہ جن کا مرتبہ سورج کی طرح ہے اور یہ سیڑھیاں ایسے لوگوں کی معراج ہیں جنہیں آسمانوں کی بادشاہی دکھائی جاتی ہے۔ جیسے اللہ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرمایا: ''وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' (قرآن: ۷۵/۶) (اور اسی طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کے فرشتے دکھائے) یہاں تک کہ فرمایا (ابراہیم علیہ السلام نے) کہ: ''اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ'' (قرآن: ۷۹/۶) (میں نے اپنا دین اور کردار پاک کرلیا اور دل کو اس خدا کے لیے مختص کردیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا) اور اسی بناء پر رسول (ﷺ) نے فرمایا: ''اِنَّ لِلّٰهِ سَبْعِيْنَ حِجَابًا مِّنْ نُوْرٍ لَوْ كَشَفَهَا لَا حَرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ كُلَّ مَنْ اَدْرَكَ بَصَرُهٗ'' (خدا کے ستر پردے ہیں اگر ان پردوں کو ہٹادے تو اس کے چہرے کے انوار ہر دیکھنے والے کو جلاڈالیں)۔ تفصیل اس امر کی ہم نے اپنی کتاب ''مشکوٰۃ الانوار ومصفاۃ الاسرار'' میں بیان کردی ہے۔ وہاں سے طلب کیجیے۔

مقصود یہ ہے کہ تمہیں معلوم رہے کہ نیچری بیچارہ جس نے ایک چیز کو حرارت و برودت کے حوالے کر دیا ٹھیک کیا کیونکہ اگر یہ گرمی سردی اسبابِ الٰہی میں نہ ہوتیں تو علم طب' باطل ہوتا لیکن اس نے غلطی اس بناء پر کی کہ اس کی آنکھ مختصر تھی اور دور تک نہ دیکھ سکی۔ پہلی ہی منزل میں ٹھہر گئی۔ اور حرارت و برودت ہی کو اصل قرار دے دیا نہ کہ اسباب کو کہ جو خود مسخّر ہیں اور حق تعالیٰ کے تصرف میں ہیں اور اسی کے چاکر ہیں۔ اور وہ خود بھی ان جملہ چاکروں میں سب سے پچھلی صف میں ہے جسے صفِ نعال کہا جاتا ہے۔

اور منجم جس نے ستارے کو من جملہ اسباب سمجھا' ٹھیک تھا۔ کیونکہ اگر یوں نہ ہوتا تو دن رات برابر ہوتے اور سورج بھی ایک ستارہ ہے کہ دنیا میں روشنی اور گرمی اسی سے ہے۔ پھر موسم سرما اور گرما یکساں ہوتے۔ کیونکہ تابستان کی گرمی اس بناء پر ہوتی ہے کہ آفتاب آسمان میں زمین کے نزدیک ہو جاتا ہے اور سردیوں کے موسم میں دور۔ اور وہ خدا کہ جس کی قدرت ہے کہ آفتاب کو گرم اور روشن پیدا کیا۔ کیا عجب اگر ستارہ زحل کو سرد و خشک پیدا کرے اور زہرہ کو گرم تر تخلیق کرے۔ اس بات سے معتقدات اسلامی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اور منجم نے اس لیے غلطی کی کہ ستاروں ہی کو اصل اور حوالہ گاہ بنا دیا اور ان کے مسخّر ہونے پر نگاہ نہ کی اور نہ جانا کہ: "وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ م بِاَمْرِہٖ (قرآن: ۷/۵۴) (پیدا کیا سورج چاند اور ستاروں کو رام کیا اور رواں کیا؛ بہ فرمان خدا؛) اور مسخر وہ ہوتا ہے جسے کام پر لگاتے ہیں۔ پس یہ سب مزدور ہیں۔ بہ سرخود یا بہ سبب خود نہیں۔ بلکہ عُمال ملائکہ کی طرف کارندے ہیں۔ جیسے کہ اعصاب' اطرافِ بدن (ہاتھ پاؤں وغیرہ) کو حرکت میں لانے میں اس قوت کی طرف سے جو دماغ میں ہے' استعمال ہوتے ہیں اور ستارے بھی انہیں ادنیٰ چاکروں میں سے ہیں۔ اگرچہ نقیبوں کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ چار طبع کی مانند صف نعال میں نہیں ہیں۔ کیونکہ چہار طبع سب سے ادنیٰ درجے کے چاکروں میں ایسے ہی ہیں جیسے لکھنے میں قلم۔

فصل ششم: مخلوق کے درمیان وجہ اختلاف

خلق کے درمیان بیشتر اختلاف اس قسم کا ہے کہ سب ایک رُو سے تو راست گو ہیں۔ لیکن بعض ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور گمان یہ کرتے ہیں کہ انہوں نے حقیقت کو کلیۃً دیکھ لیا ہے اور اُن کی مثال اُن اندھوں کے گروہ کی سی ہے جنہوں نے سنا تھا کہ ان کے شہر میں ہاتھی آیا ہے تو وہاں جائیں اور اس کی شناخت کریں۔ اور گمان کیا کہ اسے ہاتھ سے چھو کر پہچان لیں گے۔ تو وہ ہاتھی کو ہاتھ سے چھونے لگتے ہیں۔ ایک کا ہاتھ کان پر پڑا تو دوسرے کا پاؤں پر' تیسرے کا ران پر تو چوتھے کا دانتوں پر۔ تو جب یہ نابینا دوسرے اندھوں کے پاس پہنچے تو

انہوں نے ہاتھی کے وصف کے بارے میں ان سے پوچھا تو جس اندھے نے ہاتھ ہاتھی کے پاؤں پر رکھا تھا بولا ''ہاتھی ستون کی طرح ہے'' اور جس نے کان سے لمس کیا تھا کہنے لگا کہ ''کمبل کی طرح ہے'' اور وہ جس نے ہاتھی کے دانتوں کو چھوا تھا بولا: ''ایک پتھر کی طرح ہے'' سب نے سچ کہا لیکن غلطی کی کہ انہوں نے گمان کیا کہ انہوں نے پورے ہاتھی کو پالیا ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

اسی طرح منجم اور طبیب میں سے ہر ایک کی نگاہ حضرتِ الوہیت کے چاکروں میں سے کسی ایک پر پڑی تو وہ اللہ کی مملکت اور اس مملکت پر اللہ کے استیلا سے متحیر ہو کر کہنے لگا بادشاہ یہی ہے: ''ھٰذَا رَبِّیْ'' (قرآن: ۶/۷۶) (میرا خدا یہی ہے)۔ یہاں تک کہ وہ شخص کہ جس پر یہ راہ کشادہ کر دی گئی تو اس نے اس کمی کو دیکھا اور اس کے سوا کو دیکھا تو کہہ اٹھا کہ یہ تو ایک اور کے تابع ہے اور جو کہ محکوم ہو وہ خدا کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ خدائی کے قابل نہیں۔ ''لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ'' (۶/۷۶) (میں پستی گزینوں اور ادنوں کو عزیز نہیں جانتا)۔

فصل ہفتم: دست گاہ پادشاہی کے لیے کواکب و بروج کی تشبیہ

کواکب و طبائع اور فلک الکواکب کے بروج کہ بارہ[۱۲] قسم ہیں کی مثال اور عرش کہ ان سب سے ماورا ہے ایک رُو سے اس کی مثال ایسی بادشاہی کی سی ہے کہ جس کا ایک خاص حجرہ ہو کہ وزیر اس کا وہاں بیٹھتا ہو اور اس حجرے کے گرداگرد ایک رواق ہو بارہ[۱۲] دروازوں کا۔ اور ہر دروازے میں اس وزیر کا ایک نائب بیٹھا ہو اور سات سوار نقیب اس بارہ دری رواق کے گرد گردش میں ہوں اور وزیر کے نائبوں کے فرمان جو انہیں وزیر کی جانب سے موصول ہوئے ہوں نقیب انہیں سنتے ہیں۔ اور چار پیادے جو ان سات نقیبوں کے علاوہ سروقد کھڑے ہیں اور نظریں ان کی ان سات نقیبوں پر گڑی ہیں کہ حضرت سے ان کے لیے کیا حکم آتا ہے۔ اور چار کمندیں ان چاروں پیادوں کے ہاتھوں میں ہیں تا کہ ڈالیں اور ایک گروہ کو بحکمِ فرمان بہ حضرت بھیجتے ہیں اور وہ ایک گروہ کو بارگاہ سے دور بھی رکھتے ہیں۔ تو ایک گروہ کو شاہی لباس بھی عطا کرتے ہیں۔ نیز ایک گروہ کو عقوبت سے بھی نوازتے ہیں۔

اور عرش حجرۂ خاص ہے جو وزیر مملکت کا مستقر ہے۔ اور وہ مقرب ترین فرشتہ ہوتا ہے اور وہ رواق فلک الکواکب ہے اور بارہ برج بارہ دروازے ہیں اور نائبانِ وزیر دوسرے فرشتے ہیں کہ جن کا درجہ مقرب ترین فرشتے سے کمتر ہے اور ان میں سے ہر ایک کے لیے جداگانہ عمل تفویض ہوا ہے۔ اور ہفت سوار سات ستارے ہیں جو نقیبوں کی طرح ان دروازوں کے گرد نمودار ہوتے ہیں۔ اوز ہر دروازے سے ان کو ایک نئی قسم کا فرمان ملتا

ہے اور یہ کہ جسے چار عنصر یعنی جنہیں آب و آتش و خاک و باد کہتے ہیں چار پیادہ چاکروں کی طرح ہیں۔ جو اپنے وطن سے ہجرت کرتے ہیں اور چار طبائع جیسے گرمی، سردی، تری اور خشکی ان کے ہاتھوں میں کمندوں کی مانند ہیں۔

مثلاً جب کسی کی حالت اس طرح دگرگوں ہو جاتی ہے کہ دل دنیا سے سیر ہو جاتا ہے اور غم واندوہ اس پر غالب ہو جاتا ہے اور دنیا کی نعمتیں اس کے دل میں ناخوب ہو جاتی ہیں۔ اور وہ عاقبت کار کی فکر میں لگ جاتا ہے تو طبیب کہتا ہے کہ ''وہ بیمار ہے اور اس بیماری کو مالیخولیا کہتے ہیں۔ اور علاج اس مرض کا جوشاندہ افتیمون (دواالجنون) ہے''۔ اور طبیعی کہتا ہے اس بیماری کی ابتداء خشکی سے ہوتی ہے جو دماغ پر چھا جاتی ہے اور اس خشکی کا سبب موسم سرما ہے۔ اس لیے جب تک فصل بہار نہ آئے اور ہوا میں رطوبت کا غلبہ نہ ہو بیمار تندرست نہیں ہوتا''۔ اور منجم کہتا ہے کہ: ''یہ سودا ہے جو اس شخص میں ظاہر ہوا ہے اور سودا ستارۂ عطارد سے ہے جو وضع میں ستارہ مریخ کا ہم صورت ہے اور ان دونوں کا اتحاد مذموم ہے۔ اور جب تک عطارد قران[1] سعدین یا تثلیث کو نہ پہنچے یہ حالت صلاح پذیر نہ ہوگی''۔ یہ سب ٹھیک کہتے ہیں لیکن: ''ذٰلِکَ مَبۡلَغُهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ'' (ان کا مبلغ فہم و دانش اسی قدر ہے)۔

اور یہ کہ اس بیمار کے بارے میں جس نے منہ دنیا سے پھیر لیا ہے۔ حضرت ربوبیت سے حکم صادر ہوا ہے اور دو نقیب سریع اور کاردان جنہیں عطارد اور مریخ کہتے ہیں ان کو اس واسطے بھیجا کہ درگاہ الٰہی کے پیادوں میں سے ایک پیادہ یعنی ہوا خشکی کی کمند مارے اور اس شخص کے دماغ میں خشکی ڈال دے اور دنیا کی لذتوں سے اس کا منہ پھیر دے۔ خوف اور رنج کو کوڑے مار کر قصد اور طلب کی مہار کے ذریعے اسے درگاہِ الٰہی میں بلائے نہ علم طب میں ہے نہ علم طبیعت و نجوم میں۔ بلکہ یہ گوہرِ آب دار علم نبوت کے ناپیدا کنار سمندر سے حاصل ہوتا ہے یعنی یہ بات عالم علوم نبوت سے معلوم ہوتی ہے، جو مملکت کے سب کناروں اور جناب احدیت کے سب عالموں اور نقیبوں کو محیط ہے اور پہچانتا ہے کہ ہر عامل کس کام پر مامور ہے اور یہ عامل کس کے حکم سے حرکت میں آتے ہیں اور خلق کو کس بات کی دعوت دیتے ہیں اور کس بات سے روکتے ہیں۔ تو ان تینوں داناؤں

متن میں مشاکلت کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں وضع میں عمومی موافقت اور ظاہراً یہ نظر کے لیے استعمال ہوا ہے اور نظر نجوم کی اصطلاح میں مفہوم ہے: دو چیزوں کا ایک مخصوص وضع میں آسمان میں ہونا؛ اور قران کے معنی ہیں کہ شمس وقمر کے علاوہ کسی دو سیاروں کا منطقۃ البروج کے ایک درجہ میں جمع ہونا۔ اور قران سعدین سے مشتری اور سیارہ زہرہ کا قران مراد ہے۔ اور تثلیث سے مراد وہ وقت ہے کہ دو سیاروں کا باہمی فاصلہ تین برج۔ (°۹۰) کا ہو جائے۔

نے جو کچھ بھی کہا درست تھا لیکن بادشاہِ مملکت اور اس کے تمام سپہ سالاروں کے بھید سے بے خبر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اسی طرح ابتلا، بیماری، سودا اور رنج ومحن سے خلق کو اپنے حضور طلب کرتا ہے کہ یہ بیماری نہیں ہماری مہربانی کی کمند ہے کہ اپنے دوستوں کو اس کمند کے ذریعے اپنے حضور میں بلاتے ہیں"۔ اِنَّ الْبَلَاءَ مُوَکَّلٌ بِالْاَنْبِیَاءِ ثُمَّ بِالْاَوْلِیَاءِ ثُمَّ الْاَمْثَلِ فَالْاَمْثَل " (کیونکہ بلا انبیاء واولیاء اور ان جیسے لوگوں کو دامن گیر ہوتی ہے)۔ بیماروں کی آنکھ سے انہیں نہ دیکھو کیونکہ یہ لوگ ہمارا اثاثہ ہیں کہ: "مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِیْ" (میں بیمار ہوا تھا تم میری عیادت کو نہ آئے) انہی کے حق میں آیا ہے۔

پس پہلی مثالِ انسانی مملکت کی منہاج کے بارے میں تھی خود انسان کے باطن میں، اور یہ مثال بھی اسی مملکت کے منہاج کے بارے میں ہے لیکن اس کے بدن کے باہر؛ اس وجہ سے یہ معرفت بھی ذاتی معرفت ہی سے حاصل ہوتی ہے اسی بناء پر ہم نے اسے "معرفتِ نفس خود" کا عنوان دیا ہے۔

فصل ہشتم: چہارگانہ تسبیحات کی پہچان کے باب میں

اب وہ مرحلہ آن لگا ہے کہ تم سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَکْبَر کے معنی کو پہچانو کہ یہ چار مختصر کلمات ہیں جو معرفتِ الٰہیت کے جامع ہیں۔

جب تم نے اپنی پاکیزگی سے خدائے تعالیٰ کی پاکیزگی کو پہچانا تو کلمۂ سُبْحَانَ اللهِ کو پہچانا۔ اور جب اپنی مملکت سے خدا کی مملکت کی تفصیل سے آشنا ہوئے کہ تمام اسباب ووسائط اسی کے تصرف میں ہیں جیسے قلم کاتب کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ تو تم نے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے معنی بھی پہچان لیے کیونکہ مُنعم سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں اس لیے حمد وشکر بھی اسی کا ہونا چاہیے اور جب تمہیں معلوم ہو چکا کہ اُس کے سوا کسی اور کو یارائے فرماں روائی نہیں تو گویا تم نے لَا اِلٰـــهَ اِلَّا اللهُ کے کلمے کے معنی بھی پہچان لیے۔ اب وقت وہ ہے کہ کلمۂ اَللهُ اَکْبَـــــرُ کے معنی کو پہچانو اور یہ بھی جان لو کہ با ایں ہمہ کہ تم نے جان لیا لیکن ذات باری تعالیٰ کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ کہ اللہ اکبر کے معنی یہ ہیں کہ تو کہے کہ خدا سب سے بڑا ہے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بزرگ تر ہے کہ مخلوق اپنے قیاس سے اس کو پہچان سکے۔ یہ معنی نہیں کہ وہ دیگر اشیاء سے بزرگ تر ہے۔ کیونکہ خود اس کے ساتھ اور کوئی چیز ہے ہی نہیں جس سے وہ بڑا ہو۔ چونکہ تمام موجودات اس کے وجود کے نور سے ہے اور نورِ آفتاب سوائے آفتاب کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ کہا جا سکے کہ آفتاب اپنے نور سے زیادہ بزرگ تر ہے۔ بلکہ اللہ اکبر کے معنی یہ ہیں اللہ اس سے بزرگ تر ہے کہ آدمی بہ قیاس عقل اس کو پہچان سکے۔

معاذ اللہ کہ کیا اللہ تعالیٰ کی تقدیس اور تنزیہہ آدمی کی تنزیہہ اور تقدیس کی سی ہے؟ اللہ تو تمام مخلوق کی مشابہت سے پاک ہے۔ آدمی کیا ہے اور اس کی ذات کیا؟ اور معاذ اللہ کہ اللہ کی بادشاہی بندے کی بادشاہی کی سی ہے اپنے تن پر یا اللہ کی صفات مثلاً علم وقدرت آدمی کی ان صفات کی سی ہوں۔ بلکہ یہ سب نمونے ہیں تاکہ بے شک وریب جمالِ حضرتِ الٰہیت سے بقدر عجز بشریت انسان کو حاصل ہوسکیں۔ اس نمودگار کی مثال ایسی ہے کہ اگر کوئی نابالغ ہم سے پوچھے کہ سرداری' سلطنت اور مملکت داری کی لذت کیسی ہوتی ہے تو ہم اسے کہتے ہیں جیسے چوگان بازی وغیرہ کا مزہ ہے کیونکہ وہ سوائے اس لذت کے کسی اور لذت سے آشنا نہیں۔ کیونکہ جو کچھ اس کی نہیں ہوتی تو وہ اسے اس کے قیاس سے پہچانتا ہے جو اس کے ہاں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ سلطنت کی لذت کو چوگان زنی سے کوئی نسبت نہیں لیکن خوشی اور لذت کا نام دونوں میں مشترک ہے۔ پس نام میں وجہ جملی سے مساوی ہے۔ پس اسی قسم کا نمونہ نونہالوں کے لیے مناسب ہے۔ ان نمودگاروں اور مثالوں کو ایسے ہی سمجھو۔ پس اللہ تعالیٰ کو درحقیقت تمام وکمال سوائے خود اس کی ذات کے کوئی اور نہیں پہچانتا۔

فصل نہم: متابعتِ شریعت سعادت کی راہ ہے

حق تعالیٰ کی معرفت کی شرح دراز ہے۔ جو اس قسم کی کتاب میں بیان نہیں ہوسکتی۔ کہ مناسب نہ ہوگی۔ اس معرفت کی پوری طلب کے لیے آگاہی اور تشویق کی خاطر آدمی کے ظرف کے پیش نظر اسی قدر کافی ہے۔ کیونکہ انسان کی تمام سعادت اسی میں ہے۔ بلکہ انسان کی سعادت معرفت میں ہے اور اللہ کی بندگی اور عبادت میں ہے یہ بات کہ معرفت انسانی سعادت کا ذریعہ ہے؛ ہو چکی لیکن یہ وجہ کہ بندگی اور عبادت انسان کی سعادت کا سبب ہے یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا سروکار اللہ کے ساتھ ہوگا۔ ''وَاِلَیْـــہِ الْمَـرْجِعُ الْـمَـصِیْـر'' (بازگشت اسی اللہ کی طرف ہے) اور جس کسی کا ٹھکانہ کسی دوسرے کے ساتھ ہونے والا ہو اس کی سعادت یہ ہے کہ وہ اس کا دوست ہو۔ اور جس قدر اسے زیادہ دوست رکھے گا سعادت اس کی اس قدر زیادہ ہو گی۔ اس لیے کہ لذت وراحت محبوب کے مشاہدے سے فزونی پاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی دوستی بغیر اس کی معرفت اور کثرتِ ذکر کے دل میں فروغ نہیں پاتی۔ کیونکہ جو کسی کا دوست ہوتا ہے اپنے دوست کا ذکر بکثرت کرتا ہے۔ اور اگر اس کا ذکر زیادہ تر کرے گا تو دوست دارتر ہو جائے گا یہی وجہ تھی کہ داؤد (علیہ السلام) پر وحی آئی ''اَنَا بُدّکَ اللَّازِمُ فَالْزَمْ بُدَّکَ'' یعنی ''تمہارا چارہ میں ہوں اور سروکار تمہارا میرے ساتھ ہے۔ میرے ذکر سے غافل نہ ہونا''۔

اور ذکر دل پر غالب عبادات میں باقاعدگی ومواظبت سے ہوتا ہے۔ اور انسان عبادت کے لیے فراغت اس وقت پاتا ہے جب شہوات کے علایق سے دل کو علیحدہ کر لیتا ہے اور شہوات کے علایق سے دل اس طرح دور ہوسکتا ہے کہ انسان معاصی سے ہاتھ کھینچ لے۔ پس معصیت سے دست کشی فراغِ دل کا سبب ہے۔ اور ذکر کا غلبہ طاعت بجالانے کا سبب ہے۔ اور یہ دونوں محبت کا سبب ہیں جو سعادت کا تخم ہے۔ اور اس سعادت کو فلاح کہا جاتا ہے۔ جیسے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: ''قَدْ اَفلَحَ مَنْ تزَكّٰی وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی'' (قرآن: ۸۷/ ۱۴، ۱۵) (حق یہ ہے کہ خوش بخت ٹھہرا جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے اللہ کے نام کو یاد کیا اور نماز ادا کی)۔

اور چونکہ جملہ اعمال شائستہ عبادت نہیں ہوتے۔ بلکہ ممکن ہے کہ بعض اس کے سزاوار ہوں اور بعض نہ ہوں۔ اور تمام شہوات سے دست کشی ممکن نہیں۔ اور یہ مناسب بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر انسان کھانا نہ کھائے تو ہلاک ہو جائے گا یا اگر مباشرت نہ کرے تو نسلِ انسانی منقطع ہو جائے۔ پس بعض شہوات وہ ہیں جن سے دست کشی لازم ہے اور بعض وہ ہیں جو عمل میں لانے کی ہیں۔ پس ایک حد چاہیے جس سے اس کو انسان اُس سے الگ کرے۔

اور یہ حدود حال سے خالی نہیں ہوتی۔ کہ یا تو انسان اپنی عقل، ہویٰ اور اجتہاد سے کام لے اور اپنی نظر سے اختیار کرے یا کسی دوسرے سے مدد حاصل کرے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ اس امر کو خود اس کے اختیار و اجتہاد پر چھوڑ دیں۔ کیونکہ ہوٰی جو انسان پر غالب ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ حق کی راہ کو اس سے مخفی رکھتی ہے۔ اور جس صورت میں اس کی تمنا ہو اسی کو صواب کی صورت میں اسے دکھاتی ہے۔ پس چاہیے کہ زمامِ اختیار خود ہی اسی کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ کسی اور صاحب دل کے پاس ہو۔ ہر کوئی اس کا اہل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے بصیر ترینِ خلق درکار ہیں۔ اور وہ ہیں انبیاء کرام صَلَوٰاتُ اللّٰہِ عَلَیۡھِم اَجۡمَعِین۔

پس لازماً شریعت کی پیروی اور حدود احکام کا لزوم راہِ سعادت کی ضرورت ہیں اور بندگی کا مطلب یہی ہے۔ اور جو کوئی اپنے ہی تصرف کے باعث حدودِ شرع سے تجاوز کرے گا معرض ہلاکت میں گر جائے گا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدُاللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَه'' (قرآن: ۶۵/۱) (جس نے اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود سے تجاوز کیا اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا)۔

فصل دہم: اہلِ اباحت کی جہالت اور گمراہی

وہ جو اہل اباحت ہیں انہوں نے حدودِ حکمِ خداوندی میں دست اندازی کی اور یہ جہالت اُن کی سات وجوہ سے ہے۔

وجہ اوّل: یہ ان لوگوں کی جہالت ہے کہ خدا سبحانہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے کیونکہ انہوں نے خدا کو اپنے ہی وہم وخیال کے خزینے میں تلاش کیا۔ اوراس کے کیف وکم کی جستجو کی اور جب نہیں ملا تو منکر ہو گئے۔ اور کارِ جہاں کو نجوم اور طبیعت کے حوالے کر دیا۔ اور گمان یہ کیا کہ انسان اور دیگر حیوانات اور جملہ عجائبات عالم بااین ہمہ حکمت وترتیب از خود وجود میں آ گئے ہیں۔ یا خود ہمیشہ سے تھے۔ یا فعل طبیعی کا ثمر ہیں۔ وہ جو خود کو بھی نہیں جانتا وہ دوسری اشیاء کے بارے میں کیا جانے گا۔ مثال ان کی ایسے شخص کی سی ہے جس نے ایک خوب صورت نوشتہ دیکھا تو گمان کیا کہ یہ خود بخود تحریر میں آ گیا ہے۔ بغیر کسی صاحبِ قدرت کاتب وعالم اور ارادت مند کے یا خود اسی طرح ہمیشہ سے نوشتہ رہا ہے۔ اور جس شخص کی نابینائی کا یہ عالم ہو وہ سعادت کی راہ کو کیونکر پائے گا اور طبیعی اور منجم کی غلط نگری کی وجہ تو اس سے پہلے بیان ہو چکی ہے۔

وجہ دوم: اس گروہ کی جہالت ہے آخرت کے باب میں۔ جو یہ گمان کرتے ہیں کہ انسان بھی نباتات یا دوسرے حیوانات ہی کی طرح ہے کہ جب مر جاتا ہے تو قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ اوراس کے ساتھ عتاب ہوتا ہے نہ عتاب نہ ثواب اور سبب اس کا اپنے نفس کی شناخت کا فقدان ہے کہ خود کو بھی گدھے گائے، بیل اور گھاس پھوس کا ایک فرد سمجھتا ہے۔ اور وہ روح جو انسان کی اصل حقیقت ہے اس سے ناآشنا ہے۔ کیونکہ وہ تو ابدی ہے اور کبھی نہیں مرتی اس سے صرف قالب (جسم) واپس لے لیا جاتا ہے جسے موت کہتے ہیں۔ جس کی حقیقت عنوان چہارم میں بیان ہو گی۔ ان شاءاللہ۔

وجہ سوم: ان کی جہالت ہے کہ وہ خدا اور آخرت پر تو ایمان رکھتے ہیں لیکن ضعیف قسم کا ایمان۔ مگر شریعت کے معنی کو نہیں سمجھا اور کہتے ہیں کہ ''خدائے عزوجل کو ہماری بندگی کی کیا حاجت ہے۔ اور ہماری معصیّت سے اسے کیا رنج پہنچ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ تو بادشاہ ہے اور مخلوق کی عبادت سے مستغنی۔ اوران کے نزدیک عبادت ومعصیت یکساں ہے۔ حالانکہ وہ دیکھتے ہیں کہ قرآن میں فرمان خداوندی ہے کہ: ''وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ[1] وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ[2] وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا

---

(۱) (قرآن: ۱۸/۳۵) (جس نے پاکیزگی اختیار کی اس نے اپنے ہی نفس کے لیے اختیار کی۔)

(۲) (قرآن: ۶/۲۹) (جو کسی دشمن یا اپنی بدنی ہوا وہوس کے ساتھ جہاد کرتا ہے اپنے ہی نفس کے لیے ہے)

فَلِنَفْسِہٖ [۳] (یہ بد بخت شریعت نا آشنا ہے۔ گمان کرتا ہے کہ شریعت کے معنی ہیں خدا کے لیے کوئی کام سرانجام دینا نہ کہ خود اپنے لیے۔ اور یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی بیمار پرہیز نہ کرے اور کہے کہ "طبیب کا اسی میں کیا فائدہ ہے؟ کہ میں اس کی بات پر عمل کروں یا نہ کروں" یہ بات تو درست ہے لیکن خود وہ مریض بد پرہیزی سے مرجائے گا۔ طبیب کی حاجت کی بناء پر نہیں لیکن اس وجہ سے کہ اس نے پرہیز نہ کی۔ اور طبیب نے بدلائل روشن کر دیا تھا اور راہ دکھائی تھی۔ اور دلیل کا اس امر میں کیا زیان؛ کہ اگر وہ ہلاک ہوجائے اور جس طرح جسمانی مرض اس جہاں کی ہلاکت کا سبب ہے اسی طرح بیماریٔ دل اُس جہان کی شقاوت کا باعث ہے اور جس طرح دوا دارو اور پرہیز جسمانی سلامتی کا ذریعہ ہیں۔ اسی طرح طاعت و معرفت اور معصیت سے پرہیز دل کی سلامتی کا سبب ہیں۔ "وَلَا یَنْجُو اِلَّا مَنْ اَتَی اللهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ" [۴]۔

وجہ چہارم: شریعت سے لوگوں کی جہالت ایک اور وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ "شرع کا حکم ہے کہ دل کو خشم و شہوت اور ریا سے پاک کرو"۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ تو آدمی کی فطرت میں ہیں۔ اور یہ تو ایسے ہی ہے کہ کوئی سیاہ کمبل کو سپید کرے۔ پس اس میں مشغول ہونا ایک محال شے کی طلب کے مترادف ہے" اور ان احمقوں نے نہیں جانا کہ شرع کا حکم یہ نہیں ہے بلکہ حکم یہ ہے کہ خشم و شہوت کو محکوم رکھو اس انداز سے کہ یہ شریعت اور عقل پر غلبہ نہ پاسکیں اور سرکشی نہ کریں بلکہ حدودِ شریعت کو ملحوظ رکھیں اور کبائر سے دور رہیں۔ تا کہ آپ کے صغیرہ گناہوں کو بخش دیا جائے اور یہ ممکن ہے اور بہت سے اس کو پہنچ چکے ہیں۔ اور رسول (ﷺ) نے یہ نہیں کہا کہ "خشم و شہوت کی حاجت نہیں" اور آپ کی ازواج مطہرات کی تعداد نو [۹] ہے اور آپ فرماتے تھے: "اَنَا بَشَرٌ اَغْضَبُ کَمَا یَغْضَبُ الْبَشَرُ" یعنی میں بشر ہوں اور بشر ہی کی طرح خشمگیں ہوتا ہوں اور حق تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ" [۵] اور تعریف کی جس نے غصے کو پی لیا نہ کہ اس کی جس میں سرے سے غیظ و غضب ہی نہ ہو۔

وجہ پنجم: اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں بعض لوگوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ کہتے ہیں کہ: (خدائے تعالیٰ رحیم و کریم ہے تو اپنی جس صفت سے بھی کام لے گا ہم پر رحمت فرمائے گا" اور نہیں جانتے کہ جس طرح رحیم و کریم ہے، وہ اسی طرح شدید العقاب بھی ہے اور نہیں دیکھتے کہ وہ کتنی زیادہ مخلوق کو اس دنیا میں

---

(۳) (قرآن: ۴۶/۴۱) (جو کوئی نیکی کرتا ہے اپنے ساتھ ہی نیکی کرتا ہے)
(۴) (قرآن: ۸۹/۲۲) (نجات نہیں پائے گا" الا یہ کہ وہ اللہ کے پاس آئے شرک سے پاک دل کے ساتھ)
(۵) (قرآن: ۱۴۳/۳) (غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کے ساتھ درگزر کرنے والے)

بلا، بیماری اور افلاس میں رکھتا ہے باآنکہ کریم ہے اور رحیم ہے۔ اور نہیں دیکھتے کہ جب تک کھیتی باڑی نہ کریں یا تجارت نہ کریں زرو مال ہاتھ میں نہیں آتا اسی طرح جب تک شدید کوشش نہ کریں علم نہیں سیکھ سکتے۔ اور یہ لوگ طلب دنیا میں کوئی کمی فروگزار نہیں کرتے اور اس باب میں تو نہیں کہتے کہ "خدائے تعالیٰ رحیم و کریم ہے بے تجارت وحراثت خود روزی دے دے گا"۔ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے فراہمیٔ رزق اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ اور کہتا ہے: "وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا" (قرآن: ۱۱/۶) (زمین میں کوئی متحرّک ایسا نہیں جس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو) اور خدائے تعالیٰ نے آخرت کے کام کو عمل کی تحویل میں دیا ہے۔ اور کہتا ہے: "وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى" (قرآن: ۳۹:۵۳) (نہیں ہے انسان کے لیے جزا مگر جس کے لیے وہ سعی کرے) ایسے لوگ جب اللہ تعالیٰ کے کرم پر ایمان نہیں رکھتے اس لیے دنیا اور طلب دنیا سے تو دست کش نہیں ہوتے اور جو کچھ آخرت کے باب میں کہتے ہیں وہ ان کی زبان پر ہے وہ شیطان کی تلقین ہے اور اس کی کچھ اصل نہیں۔

وجہ ششم: یہ ایسے لوگوں کی جہالت ہے جو خود پر اتراتے ہیں۔ اور غرور ان کا یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ ہم ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اَب معصیت ہمیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی اور ہمارا دین دوقُلہ[ا] ہو گیا ہے۔ اس لیے نجاست کو قبول نہیں کرتا۔ اور ان احمقوں میں سے بیشتر اتنے حقیر ہوتے ہیں کہ اگر کوئی ان کی ایک بات کو ٹھکرائے یا ان کی رعونت شکنی کرے تو تمام عمر کے لیے اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اور اگر ایک لقمہ جس کی انہوں نے آرزو کی ہو کوئی اسے نظرانداز کر دے تو دنیا گویا ان پر تنگ و تاریک ہو جاتی ہے۔ اور یہ بیوقوف کہ ابھی مردمی میں بھی دوقلہ نہیں ہوئے جس کے نتیجے میں ان چیزوں کی پروا نہ کریں۔ تو ان کا یہ دعویٰ کیسے مان لیا جائے؟ اگر بفرضِ محال اگر کوئی ایسا ہو بھی گیا ہو کہ عداوت و شہوت و ریا و خشم اس میں درگذر نہ ہوتے ہوں تو بھی وہ اس دعوے میں مغرور ہی سمجھا جائے گا کیونکہ انبیاء سے تو اُس کا درجہ بلند تر نہیں ہو سکتا جو کسی خطا اور معصیت کی وجہ سے نوحہ کرتے اور بے حد غمگین ہو جاتے تھے اور اللہ سے عذر خواہی میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اور صدیقان صحابہ تو صغائر سے بھی پرہیز کرتے تھے بلکہ مشتبہ ہونے کی صورت میں رزقِ حلال سے بھی دوری اختیار کرتے تھے۔ پس اس احمق نے کیونکر جان لیا کہ شیطان کے فریب میں گرفتار نہیں؟ اور اس کا درجہ ان کے

(ا) بڑی دیگ جس میں میں تین سو من پانی کی گنجائش ہو۔ (غیاث) یعنی ہمارا عقیدہ ایسے پانی کی طرح ہے جو پاک کنندہ ہے اور کسی چیز کی آمیزش سے نجس نہیں ہوتا۔

غالب ہوتے ہیں۔ اور اجازت نہیں دیتے کہ فساد کریں اور کہتے ہیں ''ہمیں اس سے نقصان پہنچے گا''۔ کہ پھر فساد ان کے دل پر تلخ ہو جاتا ہے بلکہ کہتے ہیں کہ یہ خود فساد نہیں۔ بلکہ یہ تہمت اور افتراء ہے وہ تہمت کے معنی جانتے ہیں نہ افتراء کے اس قسم کا انسان غافل اور پُرشہوت ہوتا ہے۔ اور شیطان اس پر سوار ہو جاتا ہے۔ تو ایسا شخص پند و نصائح سے صلاح کی طرف نہیں آتا کیونکہ اسے غلطی یا شبہ کسی بات سے نہیں ہوا۔ اور اس گروہ کے افراد بیشتر ایسے ہی ہوتے ہیں کہ جن کے بارے میں حق تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اَکِنَّۃً اَنْ یَّفْقَھُوْہُ وَفِیْٓ اٰذَانِھِمْ وَقْرًا وَاِنْ تَدْعُھُمْ اِلَی الْھُدٰی فَلَنْ یَّھْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا وَاِذَا ذَکَرْتَ رَبَّکَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَہٗ وَلَّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِھِمْ نُفُوْرًا'' (قرآن: ۱۸/۵۷) (ہم نے ان کے دلوں پر غلاف اور پردے ڈال دیے ہیں تو وہ اس پیغام اور بات کو نہ پا سکیں گے اور ان کے کانوں میں بار اور بہرہ پن ڈال دیتے ہیں اس لیے اگر آپ انہیں راہ راست کی طرف بلائیں گے تو یہ ہرگز راہ نہ پائیں گے۔ (قرآن: ۱۷/۴۶)۔

اور جب آپ قرآن میں سے اپنے خدا کو واحد ذکر کرتے ہیں تو یہ لوگ الٹے پاؤں بھاگ جاتے ہیں۔ پس ان کے ساتھ معاملہ بحث و تمحیص کی بجائے شمشیر سے بہتر ہے اور اہلِ اباحت کی فضیحت کے لیے اسی قدر کافی ہوگا اور اس عنوان میں بیان ہو چکا ہے کہ اس کا سبب یا تو اپنے نفس سے ناشناسائی ہے یا حق تعالیٰ کے باب میں جہالت ہے یا حق کی طرف گامزن ہونے والی راہ جسے شریعت کہتے ہیں اس سے بے خبری اور جب جہالت ایسے کام میں ہوتی ہے جو طبیعت کے موافق ہو تو اس کا ازالہ دشوار ہوتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ ایک گروہ ہے جو آنکھیں بند کر کے اباحت کی راہ چلا جا رہا ہے۔ اور کہتے یہ ہیں کہ ہم متحیر ہیں اور اگر آپ ان سے کہیں کہ ''میاں کس چیز میں متحیر ہو؟ تو نہیں بتا سکتے۔ کیونکہ انہیں نہ اس میں شبہ ہوتا ہے نہ حقیقت جاننے کی آرزو ہوتی ہے۔ اور ایسے کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو طبیب سے کہتا ہے کہ میں بیمار ہوں۔ اور نہیں بتاتا کہ دکھ تکلیف ہے کیا؟ تو ایسے کا علاج نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اسے کیا بیماری ہے۔ اور بہتر یہی ہوگا کہ اسے کہیں: (میاں جس میں چاہو متحیر رہو اور متشکک لیکن اس حقیقت میں ہرگز شک نہ کرنا کہ تم مخلوق ہو اور خالق تمہارا قادر ہے اور عالم ہے جو کچھ چاہتا ہے کر سکتا ہے) اور یہ مطلب بدلائل جن کی تفصیل گذر چکی ہے' اس کے ذہن نشین کریں۔

◆◆◆

عنوانِ سوم: دنیا کی شناخت میں

فصل اوّل: دنیا میں انسان کے ہونے کا سبب

معلوم رہے کہ دنیا دین کی راہ کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے۔ اور حضرتِ الٰہیت کی جانب مسافروں کی راہ گذر ہے۔ اور ایک آراستہ بازار ہے صحرا میں تاکہ مسافر یہاں سے اپنے لیے زادِراہ لیں۔ اور دنیا اور آخرت دو حالتوں سے عبارت ہیں: وہ جو موت سے پہلے ہے اور تمھارے زیادہ نزدیک ہے اُسے دنیا کا نام دیا گیا ہے اور وہ جو موت کے بعد ہے اسے آخرت کہتے ہیں۔

اور دنیا سے مقصود زادِ آخرت لینا ہے۔ انسان کو ابتدائے آفرینش میں سادہ اور ناقص تخلیق کیا گیا ہے۔ لیکن وہ حصولِ کمال کی استعداد رکھتا ہے اور صورتِ ملکوت کو اپنے دل میں منقش کرسکتا ہے۔ اس انداز سے کہ بارگاہِ الٰہیت کے قابل ہوجائے۔ اس معنی میں کہ وہ راہ پالے حتیٰ کہ جمالِ حضرت کا مشاہدہ کرنے والوں میں سے ہوجائے۔ انسان کی منتہائے سعادت یہی ہے۔ اور اس کی بہشت بھی یہی۔ کیونکہ اسے پیدا ہی اسی لیے کیا گیا ہے۔ اور جمال حضرت کا مشاہدہ ممکن نہیں جب تک انسان کی آنکھ کھل نہ جائے اور اس جمال کا ادراک نہ کرے۔ اور یہ بات معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جمالِ الٰہیت کی معرفت کی کلید صنع الٰہی کے عجائب کی پہچان ہے۔ اور صنع الٰہی کی پہلی کلید یہی انسانی حواس ہیں اور یہ حواس آب وخاک کے مرکب بدن کے بغیر ممکن نہیں۔

پس اسی سبب سے انسان عالم آب وخاک میں پڑا تاکہ یہ زاد حاصل کرسکے۔ اور معرفتِ حق تعالیٰ خود اپنے نفس کی پہچان اور جملہ آفاق کی معرفت سے جو مدرک بہ حواس ہے اس کی کلید سے حاصل کرے۔ جب یہ حواس انسان کے ساتھ ہیں اور اس کی جاسوسی کرتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں ہے۔ اور جب وہ ان حواس کو الوادع کہتا ہے اور خود وہ رہ جاتا ہے یا اس کی ذات کی صفات تو پھر کہتے ہیں کہ وہ آخرت کو سدھار گیا۔ پس اس کے دنیا میں رہنے کا سبب یہی ہے۔

فصل دوم: حقیقت وآفت وغرض دنیا

انسان کو دنیا میں رہنے کے لیے دو چیزوں کی حاجت ہوتی ہے ایک یہ کہ دل کو ہلاکت کے اسباب

سے بچائے اوراس کے لیے غذا مہیا کرے دوسرے یہ کہ جسم کو مہلکات سے بچائے اوراس کے لیے غذا حاصل کرے۔اورغذادل کی حق تعالیٰ کی معرفت ومحبت ہے کیونکہ ہر چیز کی غذا اس کی طبیعت کے تقاضے کے مطابق ہوتی ہے کیونکہ یہ اس کی خاصیت ہوتی ہے۔ جو پہلے معلوم ہوچکی کہ انسان کی یہ خاصیت ہے۔اورانسان کے دل کی ہلاکت کا باعث ماسویٰ اللہ سے دوستی میں مستغرق ہوجانا ہے۔اورتعہدتن دل کے لیے ہونا چاہیے کیونکہ تن فانی ہے اوردل باقی۔اورتن دل کے لیے ایسے ہی ہے جیسے راہ حج میں حاجی کے لیے اونٹ اوراونٹ حاجی کے لیے ہوتا ہے اورحاجی اونٹ کے لیے نہیں ہوتا۔اگرچہ حاجی کو چارے پانی اورکپڑے سے اونٹ کی تواضع کرنی چاہیے یہاں تک کہ وہ کعبے میں پہنچ جائے تو اس تکلیف سے چھٹکارا پائے۔لیکن چاہیے کہ سواری کی دیکھ بھال صرف بقدر حاجت کرے کیونکہ اگر ہروقت اونٹ کو چارہ دینے اوراس کی زیب وزینت میں کوشاں رہے گا تو قافلے سے پیچھے رہ جائے گا اور ہلاک ہوجائے گا۔اس طرح اگرانسان اپنے بدن کی خدمت میں ہی لگا رہے کہ بدنی قوت بحال رہے اوراس ہلاکت کی اسباب اس سے دوررکھے تو اپنی حقیقی سعادت کو کھودے گا۔

دنیا میں انسان کے بدن کو صرف تین اشیاء کی حاجت ہوتی ہے اوربس روٹی' کپڑا اورگھر۔روٹی غذا کے لیے تو لباس ومسکن سرما گرما کے لیے تاکہ ہلاکت کے اسباب سے محفوظ رہے۔انسان کی ضرورت ان تین چیزوں کے سوا اورکچھ نہیں۔ بلکہ دنیا کا اصول خود یہی ہے۔ دل کی غذا معرفت ہے جس قدر زیادہ ہوا اتنا ہی اچھا۔اوربدن کی غذا طعام ہے لیکن اگر یہ حد سے زیادہ ہو تو انسان کی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ایک شہوت انسان پر موکل کی ہوئی ہے تاکہ وہ کھانے کپڑے اورمسکن کا تقاضا کرے تاکہ کالبدجو اس کی سواری ہے ہلاک نہ ہوجائے۔اورفطرت اس شہوت کی یہ ہے کہ اپنی حد میں نہیں رہتی زیادہ کا تقاضا کرتی ہے۔ اورعقل کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اس شہوت کو اس کی حدّ میں رکھے۔اوراس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی زبان کے ذریعے شریعت بھجوائی ہے تاکہ ان حدود کو روشن کرے۔اوریہ شہوت انسان کی پیدائش کے آغاز میں لڑکپن میں' رکھی گئی ہے کیونکہ اس وقت اس کی حاجت ہوتی ہے اورعقل اس کے بعد پیدا کی جاتی ہے۔پس شہوت نے پہلے ہی پاؤں گاڑ لیے ہیں اورغالب ہوگئی ہے۔اورعقل سے بغاوت کرتی ہے اورشرع کہ اس کے بعد آئی ہے تاکہ انسان کو یہ اجازت نہ دے کہ وہ ہمہ وقت کھانے کپڑے اورمسکن ہی میں لگا رہے۔اس بناء پر انسان خود کو بھول جاتا ہے اورنہیں دیکھتا کہ یہ کھانا' کپڑا اورمسکن وغیرہ کس لیے درکار ہے۔اورخود اس کا منصب اس دنیا میں کیا ہے۔اسی طرح دل کی غذا کہ زادِ آخرت ہے اسے فراموش کردیتا ہے۔

اس قدر بیان سے تُو نے دنیا کی حقیقت' اس کی آفت اوردنیا کی غرض کو پہچان لیا ہوگا۔اب چاہئے کہ

تُو اس کی شاخوں اوراس کی مصروفیت کوبھی پہچانے۔

فصل سوم: اصلِ دنیا کھانا کپڑا اور مسکن

معلوم رہے کہ جب تم دنیا کی تفاصیل پر نظر ڈالو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ دنیا عبارت ہے تین چیزوں سے: ایک اعیان چیزوں کا جو روئے زمین پر پیدا کی گئی ہیں۔ مثلاً سبزہ' معادِن اور حیوانات وغیرہ کہ اصلاً زمین رہنے کے لیے اور زراعت کے استفادے کے لیے ہے اور معدنی اشیاء تانبا' پیتل اور لوہا آلات سازی کے لیے ہیں اور حیوانات سواری کے لیے نیز خوراک کے لیے ہیں۔ اور انسان نے ان میں اپنے جسم و جان کو مصروف کر دیا ہے خواہ دل کو اس کی محبت میں مشغول رکھے خواہ جسم کو اس کی صلاح اور کارسازی میں لگا رکھے[1]۔ اور دل کو دنیا کی دوستی میں مشغول رکھنے سے دل میں ایسی صفات پیدا ہو جاتی ہیں جو دل کی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہیں۔ مثلاً حرص' بخل' حسد اور عداوت وغیرہ اور بدن کو دنیا کی دوستی میں مشغول رکھنے سے نتیجۃً دل کو فراموش کر دیتا ہے اور انسان ہمہ تن دنیا کے مشاغل میں کھویا رہتا ہے۔

اور جس طرح دنیا کی اصل تین چیزیں روٹی کپڑا اور مکان ہیں۔ اور صنائع کہ جو کہ آدمی کی ضرورت ہیں وہ بھی اصلاً تین ہی ہیں یعنی زراعت' بافندگی اور عمارت سازی لیکن آگے ان میں سے ہر ایک کی فروع ہیں کہ بعض ان کا ساز وسامان کرتی ہیں۔ جیسے دھنیا اور سوت کاتنے والا کہ جولاہے کے لیے سازندہ ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو اس عمل کو انجام تک پہنچاتے ہیں۔ جیسے درزی جو جولاہے کے کام کی تکمیل کرتا ہے۔ اور ان کو لکڑی' لوہے اور کھال کے آلات کی حاجت ہوتی ہے۔ پس لوہار' بڑھئی' اور چرمگر وجود میں آگئے۔ اور جب یہ سب آ نکلے تو ان کو ایک دوسرے کی معاونت کی حاجت ہوئی۔ کیونکہ کوئی بھی یہ سارے کام تنہا انجام نہیں دے سکتا۔ پس یہ اکٹھے ہو گئے۔ یہاں تک کہ درزی نے جولاہے اور لوہار کا کام پورا کر دیا اور لوہار ان دونوں کے کام میں معاونت کرتا ہے۔ اس طرح ہر ایک دوسرے کے کام میں معاون ہوتا ہے۔ پھر ان کے درمیان ایسے معاملات سر اٹھاتے ہیں کہ جن سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اور کوئی بھی اپنے حق پر قناعت نہیں کرتا اور ایک دوسرے کے قصد میں لگ جاتے ہیں۔ جس سے تین نئی قسم کی صنائع کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔ ایک صنعت سیاست کی اور سلطنت کی اور دوسری قضا اور حکومت کی اور تیسری فقہ کی جس سے عوام کے مابین

---

(۱) احیاء العلوم الدین کے ترجمے میں ربع مہلکات کتاب ذم دنیا (بیان حقیقت دنیا) میں یوں رقم طراز ہیں: ''پس اعیان دنیا یہ ہے۔ لیکن یہ ہے کہ اس کو انسان کے ساتھ دو علاقے ہیں' ایک تعلق بہ دل اور دوسرے تعلق بہ تن''۔

وساطت کے قانون کا علم ہوتا ہے۔اور یہ سب پیشے ہی ہیں۔اگرچہ ان میں سے بیشتر کا تعلق دستکاری سے نہیں۔پس اسی بناء پر دنیا میں کئی قسم کے مشاغل وجود میں آ گئے۔اور آپس میں مربوط ہو گئے۔اور مخلوق نے ان میں خود کو کھو دیا اور یہ بات نہ سمجھ سکے کہ ان سب کی اصل متذکرہ تین چیزوں سے زیادہ کچھ نہیں۔یہ سارے دھندے غذا' لباس اور مسکن ہی کے لیے ہیں۔اور یہ تینوں بدن کی حاجت ہیں۔اور تن کی ضرورت دل کے لیے ہے تا کہ اس کی سواری کا کام دے۔اور دل حق تعالیٰ کے لیے وقف ہونا چاہیے۔لیکن لوگوں نے خود کو اور حق تعالیٰ دونوں کو فراموش کر دیا۔اس حاجی کی مانند جس نے خود کو' کعبے کو اور سفر بہ کعبہ کو فراموش کر دیا۔اور ہمہ وقت اونٹ کی ٹہل سیوا میں لگا رہا۔

دنیا اور دنیا کی حقیقت یہی ہے۔جو بیان ہو چکی۔جو اس پر آمادہ اور تکمیل کار میں نہ لگا ہو اور چشم ہمت آخرت پر نہ لگائے اور کار دنیا میں اُس کی حاجت کی حد سے بڑھ کر لگ جائے تو جان لیجیے کہ اس نے دنیا کو نہیں پہچانا اور سبب اس امر کا جہالت ہے۔رسول (ﷺ) کا فرمان ہے کہ ''دنیا ہاروت و ماروت سے بھی بڑھ کر جادوگر ہے۔اس سے محترز رہیے'' اور جب دنیا اس نوع کی جادوگر ہے تو انسان کا فرض ہے کہ اس کے فریب کو پہچانے اور اس کے کام کی مثال کو ابنائے آدم پر روشن کرے پس اب یہ وقت ہے کہ تم اس کی مثالوں کو سنو:

فصل چہارم: دنیا کی سحر کاری کی مثالیں اور اہل دنیا کی غفلت

مثال اوّل: معلوم رہے کہ دنیا کا نمبر ایک جادو یہ ہے کہ تمہیں اپنے آپ کو یوں دکھاتی ہے جیسے وہ خود قائم ہے اور اس نے تمہارے ساتھ عہد باندھا ہے۔حالانکہ وہ برابر تم سے گریزاں ہے۔لیکن چونکہ بتدریج آہستہ آہستہ حرکت کرتی ہے اور اس کی مثال سائے کی سی ہے کہ دیکھنے میں ساکن لگتا ہے حالانکہ وہ مستقل حرکت میں ہے اور تمہاری زندگی ایسے گذر رہی ہے کہ متواتر حرکت میں ہے اور بتدریج ہر لحظہ کم تر ہوتی جاتی ہے۔اور دنیا ہے کہ تم سے گریزاں ہے اور تمہیں الوداع کہہ رہی ہے اور تم اس سے بے خبر ہو!

دوسری مثال: جادوگریٔ دنیا کی یہ بھی ہے کہ تمہیں خود کو تمہارا دوست بتاتی ہے تا کہ تمہیں اپنا عاشق بنائے۔اور یہ بھی کہتی دکھائی دیتی ہے کہ تمہارے ساتھ وفا کرے گی اور کسی اور کی نہ ہو گی۔اور پھر اچانک دشمنی پر اتر آتی ہے۔اس کی مثل ایک نابکار مفسد عورت کی سی ہے کہ لوگوں کو خود پر فریفتہ کرتی ہے تا کہ اپنا عاشق بنائے پھر ایسے عاشق کو گھر لے جا کر ہلاک کر دیتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دنیا کو اپنے مکاشفات میں ایک پیرزال کی صورت میں دیکھا تو پوچھا کہ تعداد

تمہارے شوہروں کی کیا ہے؟ تو اس کھوسٹ نے جواب دیا کہ ''اس قدر کثیر ہیں کہ گننا ممکن نہیں'' حضرت نے مزید سوال کیا کہ وہ شوہر مر گئے یا انہوں نے طلاق دی؟ دنیا بولی ''میں نے ان سب کو مار ڈالا''۔ حضرت نے فرمایا کہ ''یہ عجیب بات ہے کہ یہ دوسرے احمق دیکھتے ہیں کہ تم نے اگلوں کو مار ڈالا پھر بھی تمہاری طرف راغب ہیں اور عبرت نہیں پکڑتے''۔

تیسری مثال: دنیا کی ساحری کی تیسری مثال یہ ہے کہ اپنے ظاہر کو تو آراستہ رکھتی ہے اور جو کچھ ابتلاء اور رنج ہے اس کو مخفی رکھتی ہے تا کہ جاہل انسان اس کے ظاہر کو دیکھے اور فریفتہ ہو جائے۔ اس کی مثال اس کھوسٹ بڑھیا کی سی ہے جو بدرو چہرہ پر تو نقاب رکھتی ہے لیکن ریشمی لباس اور زیور سے خود کو آراستہ کرتی ہے تا کہ جو کوئی دور سے اسے دیکھے دل اس پر ہار دے اور اگر اس کے چہرے سے نقاب اٹھائے تو سخت پشیمان ہو کر فضیحتوں سے دوچار ہو۔

پیغمبر (ﷺ) کی حدیث ہے کہ قیامت کے روز دنیا کو ایک بدشکل کھوسٹ بڑھیا کی شکل میں لائیں گے۔ سبز چشم، دانت باہر کو نکلے ہوئے جب مخلوق اسے دیکھے گی تو کہہ اٹھے گی: ''پناہ بخدا! یہ کیا چیز ہے؟ اس فضیحت اور اس قدر بدرُوی کے ساتھ!'' تو کہیں گے کہ یہی دنیا ہے کہ جس کے سبب ابنائے آدم نے باہم حسد اور دشمنی کا ارتکاب کیا اور قتل و غارت کی، قریبی رشتوں کو فراموش کر دیا۔ اور دنیا پر فریفتہ ہو گئے اور اس پر مغرور ہو گئے۔ پھر دنیا کو دوزخ میں ڈالیں گے تو دنیا کا سوال کرے گی۔ ''بارِ خدایا میرے وہ دوست کہاں ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ حکم دیں گے جس پر دنیاداروں کو بھی دوزخ کی نذر کر دیا جائے گا۔

چوتھی مثال: اگر کوئی حساب کرے کہ اس کی اپنی پیدائش سے قبل ازل سے لے کر اب تک کتنا زمانہ گذرا کہ وہ دنیا میں نہ آیا ہوگا اور ابد میں کتنا عرصہ ہے۔ اور یہ چند دن، ازل اور ابد کے درمیان کتنے ہیں؛ تو جان لے گا کہ دنیا کی مثال ایک مسافر کے راہ کی طرح ہے کہ آغاز اس کا گہوارہ ہے اور انجام اس کا قبر اور درمیان ان کے معدودے چند منزلیں ہیں۔ ہر سال ایک منزل کی مانند ہے۔ ہر ماہ ایک فرسنگ اور ہر روز ایک نشانہ راہ اور ہر سانس ایک قدم کی طرح ہے۔ اور انسان متواتر سفر میں چلتا رہتا ہے۔ اس طرح کسی کا ایک فرسنگ راہ باقی ہے تو کسی کا فرسنگ سے بھی کم یعنی کسی کا کم ہے تو کسی کا بیش اور مسافر آرام سے یوں بیٹھا ہے جیسے ہمیشہ یہیں رہے گا۔ اور دس! سالوں کی ضروریات کے فراہم کرنے میں لگ جاتا ہے جب کہ اسے فقط دوروز کے بعد قبر میں پہنچ جانا ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس سے غافل ہوتا ہے۔

پانچویں مثال: یاد رہے کہ اہل دنیا جو دنیا کے لذائذ میں کھوئے ہوئے ہیں جب آخرت میں رسوائی

اور رنج سے دوچار ہوں گے تو ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو چربیلا شیریں خوش مزہ کھانا اس قدر کھالے کہ اس کا معدہ برباد ہو جائے تو پھر گند' اور معدے کی فضیحت اور سانس اور اپنے فضلے کو دیکھے گا تو نہایت درجہ نادم ہوگا اور پشیمان کہ لذت تو جاتی رہی اور فضیحت کا سامنا ہے۔ کیونکہ جو کھانا غذائیت سے پُر اور لذیذ ہوگا اس کا فضلہ اتنا ہی زیادہ گندہ ہوگا۔ اس لیے دنیا کی لذت جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی عاقبت رسوا تر ہوگی۔ اور یہ بات جان کنی کے وقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جس کے ہاں باغ و بوستان' کنیز' غلام اور مال و منال جس قدر زیادہ ہوگا جان کنی کے وقت رنج و تعب اور عذاب اُسی نسبت سے زیادہ ہوگا۔ بہ نسبت اُس مرنے والے کے جس کے ہاں دنیا کا مال محض برائے نام ہو۔ یاد رہے کہ یہ رنج و عذاب مرنے پر ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ فزوں تر ہو جائے کیونکہ یہ دوستی دل کی صفت ہے اور دل باقی رہتا ہے اور کبھی نہیں مرتا۔

چھٹی مثال: معلوم رہے کہ کارِ دُنیا جو درپیش ہو مختصر دکھائی دیتا ہے۔ اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ شغل طویل نہ ہوگا۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ ایک چھوٹے سے کام کی ذیل میں اور کتنے ہی کام ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ عمر اس میں تمام ہو جائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ''دنیا کے متلاشی کی مثال اس شخص کی سی ہے جو سمندر سے پانی پیتا ہے۔ جتنا زیادہ پیتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ پیاسا ہوتا جاتا ہے۔ تو پھر اور پیتا ہے نتیجۃً ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور یہ تشنگی ہرگز اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی''۔ اور ہمارے رسول (ﷺ) فرماتے ہیں کہ ''جس طرح یہ ممکن نہیں کہ کوئی پانی میں اترے اور تر نہ ہو اسی طرح یہ ممکن نہیں کہ کوئی دنیوی کار میں لگے اور آلودہ نہ ہو''۔

ساتویں مثال: جو شخص دنیا میں آتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ وہ کسی ایسے میزبان کا مہمان ہوتا ہے کہ جو مہمانوں کے لیے سرائے آراستہ رکھتا ہے اور انہیں دعوت دیتا ہے کہ ایک گروہ کے پیچھے دوسرا گروہ آ رہا ہے۔ پس وہ ان کے آگے زریں تشت رکھتا ہے جس پر نُقل ہوتا ہے اور چاندی کی انگیٹھی جس میں عود اور اگربتی ہوتے ہیں جو معطر اور خوشبودار ہوتے ہیں تو مہمان نُقل تو کھالیتا ہے اور انگیٹھی وغیرہ کو چھوڑ جاتا ہے۔ پھر ایک اور قوم آتی ہے اور جو بھی صاحب خرد ہو اور میزبان کے راہ و رسم سے آگاہ ہو وہ مجمر میں عود اور بخور ڈالتا اور خوشبو کا سامان کرتا' نُقل کھاتا اور طبق و مجمرہ وغیرہ کو علی حالہٖ چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اور شکر کرتا ہے۔ اور جو مہمان احمق ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس نُقل کے علاوہ یہ ساز و سامان بھی اسی کے لیے ہے تو جب وہ اُس سامان کو لے کر جانا چاہتا ہے تو یہ سامان اس سے لے لیا جاتا ہے تو وہ غمزدہ ہو کر دل تنگی میں فریاد کرنے لگتا ہے۔ دنیا بھی ایسی ہی مہمان سرائے ہے جو مسافروں کے لیے وقف ہے تاکہ مسافر زادِ راہ تو لیں لیکن جو کچھ سرائے میں ہے اس کی طمع نہ کریں۔

آٹھویں مثال: دنیاداروں کے دنیا میں مستغرق ہونے اور آخرت کو فراموش کر دینے والوں کی مثال اس قوم کی سی ہے جو ایک کشتی میں تھے۔ ایک جزیرہ کے پاس پہنچے تو قضائے حاجت اور طہارت کے لیے باہر نکلے۔ تو ملاح نے اعلان کیا کہ کوئی زیادہ دیر نہ لگائے' اور طہارت کے علاوہ کسی اور کام میں مشغول نہ ہو کیونکہ کشتی جلد چل نکلے گی۔ پس لوگ اس جزیرے میں بکھر گئے۔ وہ جو عاقل تر تھے جلدی سے طہارت کر کے لوٹ آئے اور کشتی چونکہ فارغ تھی اور اچھی موافق جگہ میں جاگزین ہو گئے۔ اور ایک گروہ ان میں کا اس جزیرہ کے عجائب کے مشاہدے میں لگ گیا اس کے درختوں کے شگوفوں خوش نوا پرندوں اور رنگ رنگ کے سنگریزوں کے دیکھنے میں لگ گیا۔ جب لوٹے تو کشتی میں فراخ جگہ نہ ملی۔ تنگ و تاریک جگہ میں بیٹھا اور زحمت اٹھائی۔ اور وہ تیسرا گروہ جس نے تاخیر کی اور نظارگی کے علاوہ خوب صورت نادر رنگوں کے سنگریزے چننے میں لگ گیا تھا جب اس بوجھ کے ساتھ لوٹے تو کشتی میں تنگ جگہ دیکھی تو بیٹھ کر ان سنگ ریزوں کو اپنی گردن پر رکھا۔ اور جب ایک دو روز گزر گئے تو ان سنگ ریزوں کی چمک دمک کافور ہو گئی اور ان میں سے بدبو آنے لگی۔ تو اب انہیں پھینکنے کی لیے انہیں جگہ نہ سوجھتی تھی۔ پشیمان ہو رہے تھے اور گردن سنگ ریزوں کے بوجھ سے گراں بار تھی۔ اور ایک چوتھا گروہ جو اب بھی جزیرے کے عجائبات کے مشاہدے میں غرق تھا۔ اور متحیر محوِ تماشا تھا۔ کشتی سے دور تھا اور کشتی چل دی تو یہ جزیرے ہی میں رہ گئے۔ تو ان میں سے بعض تو بھوک کی وجہ سے ہلاک ہوئے اور بعض کو درندوں نے مار ڈالا۔ تو گروہ اول گویا پرہیز گار مسلمانوں کا سا تھا۔ اور ان کے بعد کا گروہ مثل کافروں کے تھا۔ جنہوں نے خدا کو' خود کو اور آخرت کو فراموش کر دیا تھا۔ اور ہمہ تن دنیاداری میں زندگی بتا دی۔ ''اَسۡتَحَبُّوا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا عَلَی الۡاٰخِرَۃِ'' (قرآن: ۱۶/۱۰۷) (انہوں نے اُس جہان پر اس جہان کو ترجیح دے کر انتخاب کیا) اور ان دونوں کے درمیان کے دو گروہ ان عاصیوں کی مانند ہیں جنہوں نے ایمان کو تو بچا لیا لیکن دنیا سے دست کش نہ ہوئے۔ ایک نے درویشی سے تمتع کیا اور دوسرے نے نعیم دنیا میں سے بہت سا جمع کیا حتیٰ کہ اس سے گراں بار ہو گئے۔

فصل پنجم: دنیا کی ہر چیز مذموم نہیں

دنیا کی یہ جو مذمت کی گئی ہے اس سے یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ دنیا کی ہر چیز مذموم ہے۔ بلکہ دنیا میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو دنیا کی نہیں ہیں۔ مثلاً علم و عمل دنیا ہی میں حاصل کیا جاتا ہے لیکن یہ دنیا کی چیز نہیں کیونکہ یہ انسان کے ساتھ آخرت میں جاتے ہیں۔ علم تو بعینہٖ اس کے ساتھ رہتا ہے اور عمل اگرچہ بعینہٖ نہیں رہتا۔ اعمال کا اثر ساتھ رہتا ہے۔ اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جوہر دل کی پاکیزگی اور صفائی جو ترکِ معاصی سے ہاتھ

آتی ہے۔ اور دوسرے حق تعالیٰ کے ذکر سے انس جو عبادات کی باقاعدگی کا ثمر ہے۔ پس یہ دونوں جملہ باقیات صالحات میں سے ہیں جن کے بارے میں فرمانِ خداوندی ہے: ''وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ ثَوَابًا'' (قرآن: ۷۶/۱۹) (اچھی باتیں اور پسندیدہ اعمال اللہ کے نزدیک ان کی جزا بہترین ہے)۔

لذتِ علم، لذتِ مناجات اور ذکرِ حق تعالیٰ سے اُنس تمام لذتوں سے بڑھ کر ہیں اور یہ دنیا میں ممکن ہے اگرچہ یہ دنیا کی چیزیں نہیں۔ پس تمام لذائذ دنیا ناپسندیدہ نہیں۔ بلکہ وہ لذّتیں جو آنی و فانی ہیں اگرچہ یہ بھی سب کی سب مذموم نہیں۔ یہ بھی دو قسم کی ہیں، ایک وہ ہے جو دنیا میں کی ہے۔ لیکن انسان کے مرنے کے بعد باقی نہیں رہتی لیکن کارِ آخرت کے لیے معاون ہے یہ علم، عمل اور مؤمنوں کی تکثیر میں مدد دیتی ہے۔ جیسے بقدر ضرورت غذا، نکاح، لباس اور مسکن کہ یہ آخر کی راہ کی شرط ہیں کیونکہ جو کوئی دنیا میں قناعت سے کام لیتا ہے اور قصد اُس کا اِن اُمور سے دین کے لیے اعانت طلبی ہو تو ایسا شخص دنیادار شمار نہیں ہوگا۔ پس دنیا میں مذموم وہی چیزیں ہیں جن کا مقصود کوئی دین کا کام نہیں ہوتا بلکہ وہ ہیں جو دل کے لیے غفلت، غرور اور دنیا سے دل لگانے کا باعث ہی نہیں ہوتیں بلکہ عالمِ آخرت سے نفرت کا سبب بھی ٹھہرتی ہیں۔ اسی بناء پر حضرت رسول (ﷺ) نے فرمایا ہے: ''اَلدُّنیا مَلعونَۃٌ وَمَلعُونٌ مَافِیھا اِلَّا ذِکرُ اللّٰہِ وَمَا والاہُ'' یعنی دنیا اور جو کچھ اس میں ہے ملعون ہے سوائے ذکرِ خداوند تعالیٰ کے اور جو اس ذکر کے لیے معاون ہوں۔

دنیا کے مقصود اور اس کی حقیقت کے بارے میں اسی قدر تشریح کافی ہے اور باقی کا بیان تیسرے حصے میں، ارکان معاملات کی ذیل میں جنہیں دین کے راہ کی دشواریاں کہا جاتا ہے کیا جائے گا۔

O

عنوانِ چہارم: آخرت کی معرفت میں

فصل اوّل: جسمانی وروحانی بہشت ودوزخ

یادرہے کہ کوئی بھی آخرت کی حقیقت سے آشنانہیں ہوتا جب تک پہلے موت کو نہ پہچان لے۔اور موت کی حقیقت کونہیں جان سکتا جب تک زندگی کی حقیقت سے آشنانہ ہو۔اورزندگی کی حقیقت کونہیں جان سکتا جب تک کہ روح کی حقیقت کو نہ جانے اور روح کی حقیقت کی معرفت کا مدار خود اپنے نفس کی حقیقت شناسی پر ہے کہ اس میں سے بعض کا بیان ہو چکا۔

یادرہے کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ انسان دواصلوں کا مُرکّب ہے۔ایک روح تو دوسرا اس کا بدن۔روح مثل ایک سوار کے ہے اور بدن ایک سواری کی مانند۔اورروح کو آخرت میں بدن کے واسطے سے حالت ہوگی بہشتی اور دوزخی، اورروح کو خود اپنی ذات کے باعث بھی ایک حالت ہے جس میں جسم شریک نہیں ہوتا۔اوراس کوبھی قالب کے لیے ایک بہشت اور دوزخ ہے۔اور سعادت وشقاوت ہے اور ہم دل کی نعیم ولذایذ کو جو قالب کے واسطے کے بغیر ہوتی ہیں بہشت روحانی کا نام دیتے ہیں۔اور بے واسطۂ قالب، دل کے الم وشقاوت کو آتشِ رُوحانی سے موسوم کرتے ہیں۔اور بہشت ودوزخ کہ بدن جس میں ملوث ہو خود ظاہر ہیں۔جنت کا حاصل نہریں، اشجار، حور وقصور، مطعوم اور مشروب وغیرہ ہیں۔اور دوزخ کا حاصل آگ، سانپ، بچھّو اور زقّوم وغیرہ ہیں۔اور جنت ودوزخ دونوں کی صفات قرآن وحدیث میں مذکور ومشہور ہیں اور ہر شخص ان کا فہم پالیتا ہے۔اور تفصیل اس کی ''احیاءعلوم الدین'' میں ذکرالموت کے باب میں بیان ہوئی ہے، یہاں ہم فقط حقیقتِ مرگ کے بیان پر کفایت کرتے ہیں۔اور بہشت ودوزخِ روحانی کے معنی کی طرف کسی قدر اشارات سے کام لیں گے کیونکہ ہرکوئی اس کا شناسانہیں۔اور یہ جو کہا گیا ہے کہ: ''اَعَدَدتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِینَ مَالَا عَینٌ رَأَت وَلَا اُذُنٌ سَمِعَت وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلبِ بَشَر'' (حدیث: ہم نے اپنے نیکوکار بندوں کے لیے ایسی چیزیں تیار کی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ کسی بشر کے دل میں تصوران کا پیدا ہوا ہوگا)۔یہ بہشت روحانی کے باب میں ہے۔اور دل کے باطن سے عالمِ ملکوت کی طرف ایک روزن ہے جس سے یہ معانی آشکار ہوتے ہیں۔اوراس میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔اور جس کے لیے بھی یہ راہ کھول دی جائے اس کو

آخرت کی سعادت وشقاوت کا یقین محکم حاصل ہو جاتا ہے۔ سنی سنائی تقلید کی راہ سے نہیں بلکہ بہ طریق بصیرت ومشاہدت۔ جس طرح کوئی طبیب یہ پہچان لیتا ہے کہ اس دنیا میں قالب کے لیے بھی سعادت وشقاوت ہے۔ جنہیں صحت ومرض کا نام دیا گیا ہے۔ اوران کے بھی اسباب ہیں مثلاً دوادارو اور پرہیز اور حد سے زیادہ کھانا اور پرہیز نہ کرنا۔ اسی طرح مشاہدے کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے دل کو یعنی روح کو سعادت ہے یا شقاوت۔ اور عبادت ومعرفت اس سعادت کا دارو ہیں۔ تو جہل ومعصیت سعادت کے لیے زہر اور یہ علم نہایت کمیاب ہے۔

اکثر لوگ کہ جنہیں علماء کہا جاتا ہے اس امر سے غافل ہوتے ہیں بلکہ اس کے منکر ہوتے ہیں اور بدن کے بہشت ودوزخ سے آگے راہ نہیں پاتے اور آخرت کی حقیقت کے باب میں بھی سوائے سنی سنائی یا تقلید کے کسی راہ کے آشنا نہیں ہوتے۔ جب کہ ہمارے ہاں اس دلیل کی تحقیق میں عربی زبان میں ضخیم کتب موجود ہیں۔ اور زیرِ نظر کتاب میں اس قدر بیان ہوا ہے کہ جو کوئی زیرک ہو اور باطن اس کا تعصب وتقلید کی آلائش سے پاک ہو وہ اس کو پالے گا اور کارِ آخرت اس کے دل میں راسخ اور مستحکم ہو جائے گا۔ آخرت کے بارے میں لوگوں کی اکثریت کا ایمان کمزور اور متزلزل ہوتا ہے۔

فصل دوم: حقیقتِ مرگ

اگر تم چاہتے ہو کہ حقیقتِ مرگ کا اثر تمہیں معلوم ہو اور یہ کہ مرگ کے معنی کیا ہیں۔ تو جان لو کہ انسان کے ہاں دو روحیں ہیں۔ ایک وہ جو حیوانات کی روح کی قسم سے ہے جسے ہم روح حیوانی کا نام دیتے ہیں تو دوسری ملائکہ کی روح کی جنس سے ہے۔ جسے ہم رُوحِ انسانی کہتے ہیں اور روح حیوانی کا سرچشمہ دل ہے گوشت کا وہ ٹکڑا جو انسان کے بدن کے بائیں جانب واقع ہے اور حیوانی روح حیوان کے باطنی اخلاط میں سے ایک لطیف بخار کی طرح ہے۔ اور اسے معتدل مزاجی حاصل ہے اور وہ عروقِ ضوارب کے واسطے سے کہ انہیں نبض اور حرکت ہوتی ہے دل سے دماغ اور جسم کے تمام حصوں میں پہنچتی ہے۔ یہ رُوح حِس وحرکت کے قویٰ کی حامل ہے اور جب یہ دماغ میں پہنچتی ہے تو اس کی حرارت کم ہو کر معتدل ہو جاتی ہے۔ آنکھ اس سے دیکھنے کی قوت حاصل کرتی ہے اور کان سننے کی قوت پاتا ہے اور اسی طرح باقی تینوں حواس محظوظ ہوتے ہیں اور مثال اس کی ایک چراغ کی سی ہے جو ایک گھر میں سائر ہو جہاں بھی پہنچے گھر کے درودیوار اس سے منور ہو جاتے ہیں۔ پس جیسے چراغ کی روشنی دیوار پر پڑتی ہے۔ سبحانہ تعالیٰ کی قدرت سے دیکھنے، سننے والے قوا اور دیگر تمام حواس روح سے ظاہری اعضا میں نمودار ہوتے ہیں۔ اور اگر بعض عروق میں کوئی سدہ یا رکاوٹ پیدا ہو جائے تو وہ عضو

جو اِن رکاوٹوں کے بعد واقع ہو معطل و مفلوج ہو جاتا ہے' اور اس میں حس و حرکت کی قوت باقی نہیں رہتی۔ اور طبیب کوشش کرتا ہے کہ اس رکاوٹ کو کھول دے۔

اس روح کی مثال دیے کی آگ کی سی ہے اور قلب کی چراغ کی بتی کی طرح اور غذا کی مثال دیے کے تیل کی مانند ہے اس لیے اگر تیل روک لیا جائے گا تو چراغ بجھ جائے گا اور جب غذا واپس لے لے گا تو اس روح کا مزاج معتدل باطل ہو جائے گا جس سے حیوان کی موت واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح کہ اگرچہ تیل ہو فتیلہ چونکہ بہت زیادہ روغن کھینچے تو تباہ ہو جاتا ہے اور پھر وہ روغن کو قبول نہیں کرتا اسی طرح ایک طویل عرصے کے لیے اس عالم میں رہے تو غذا کو قبول نہ کرے گا۔ اور جس طرح کہ تم چراغ پر کوئی ایسی چیز مارو جس سے چراغ گل ہو جائے تو اگرچہ روغن بتی اپنی اپنی جگہ موجود ہوں گے چراغ بجھ جائے گا۔ اسی طرح جانور کو اگر کاری زخم لگ جائے تو مر جاتا ہے۔

اور یہ رُوح کہ جب تک اس کا مزاج معتدل رہتا ہے جیسے کہ شرط ہے۔ قوتِ حس و حرکت جیسے معانی کو قبول کرتی ہے۔ آسمانی ملائکہ کے انوار سے ایزد تعالیٰ کے دستور کے مطابق اس کا یہ مزاج فاقد ہو جاتا ہے تو حرارت یا برودت یا اور کسی سبب سے اس میں یہ استعداد پیدا نہیں ہوتی کہ ان آثار کو قبول کرے۔ ایک آئینے کی مانند کہ جب وہ صاف و شفاف ہو تو عکس کو قبول کرتا ہے۔ اور جب صاف نہ ہو اور زنگار خوردہ ہو تو وہ صورت کو قبول نہیں کرتا۔ اس بناء پر نہیں کہ صورتیں ہلاک ہو گئیں ہوں یا غائب ہو گئی ہوں۔ فقط اس بناء پر کہ اس میں قبولیت کی استعداد باقی نہیں رہی۔

اس طرح اس معتدل و لطیف بخار کی استعداد کہ جس کو ہم نے روحِ حیوانی کا نام دیا ہے اس کی صلاحیت کا مدار اس کے مزاج کے اعتدال پر ہے۔ تو جب اعتدال مزاج فاقد ہو جائے تو قبول نہ کرے گی۔ اور جب حس و حرکت کے قویٰ کو قبول نہ کرے گی تو اعضا اس کے اثر سے محروم ہو جائیں گے۔ اور بے حس و حرکت ہو جائیں گے تو کہا جائے گا کہ جاندار مر گیا ہے۔ روحِ حیوانی کی موت کے یہی معنی ہیں' اور موت کے ان اسباب کو فراہم کرنے والا کہ مزاج اعتدال سے جاتا رہے وہ مخلوق ہے مخلوق خداوندی سے کہ جسے ملک الموت کہتے ہیں۔ اور لوگ صرف اس کے نام سے آشنا ہیں۔ اور اس کی حقیقت کا علم ایک لمبی بات ہے۔

حیوانات کی موت کے یہی معنی ہیں لیکن انسانی موت کی صورت جداگانہ ہے۔ کیونکہ انسان کے پاس روح حیوانی کے علاوہ ایک دوسری روح بھی ہے جسے ہم نے گذشتہ اوراق میں روح انسانی یا دل کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور وہ دوسری روح کی نوع میں سے نہیں ہے۔ کیونکہ روح حیوانی ہوا کی مانند لطیف اور پختہ اور

صاف شدہ بخار کی طرح ہے۔

لیکن انسانی روح جسم نہیں ہے کیونکہ یہ جز و جزو نہیں ہو سکتی اور معرفت حق تعالیٰ اس میں نزول کرتی ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ قسمت پذیر نہیں ہے اور یکتا ہے۔ اس لیے یکتا کی معرفت کا محل بھی یکتا اور قسمت ناپذیر ہے۔ پس معرفتِ خداوندی کسی قسمت پذیر شے میں نزول نہیں پاتی۔ بلکہ یگانہ اور قسمت ناپذیر شے میں نازل ہوتی ہے۔

پس چراغ کی بتی اور آگ اور چراغ کی روشنی کو فرض کرو۔ بتی مثلاً دل کی سی ہے اور چراغ کی آگ رُوح حیوانی کی مثل ہے۔ اور نورِ چراغ مثلِ روحِ انسانی ہے۔ اور جس طرح نور چراغ لطیف ہے اور چراغ سے لطیف تر گویا اس کی طرف اشارہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور روحِ انسانی روحِ حیوانی کی نسبت لطیف ہے گویا اشارہ پذیر نہیں ہے اور یہ مثال درست ہوگی جب تم از روئے لطافت اس کا جائزہ لو گے۔ لیکن ایک اور وجہ سے درست نہیں۔ کیونکہ چراغ کا نور چراغ کے تابع ہے اور اس کی فرع ہے۔ اس لیے وہ چراغ کے باطل ہونے پر باطل ہو جاتا ہے۔ جب کہ روحِ انسانی روحِ حیوانی کی تابع و محکوم نہیں ہے۔ بلکہ اصل وہ ہے اور وہ روحِ حیوانی کے باطل ہونے پر باطل نہیں ہوتی بلکہ باقی رہتی ہے۔ اس لیے اگر تم اس کی مثال چاہتے ہو تو نور کو فرض کرو کہ چراغ سے کہیں زیادہ لطیف ہوتا ہے۔ اور چراغ کا قوام اس سے ہوتا ہے نہ کہ اس کا قوام چراغ سے۔ پھر یہ مثال ٹھیک بیٹھے گی۔

پس یہ روح حیوانی' ایک لحاظ سے روح انسانی کے لیے سواری کی مانند ہے۔ اور ایک دوسرے لحاظ سے ایک آلے کی طرح ہے۔ جب اس روحِ حیوانی کا مزاج باطل ہو جاتا ہے تو قالب مر جاتا ہے لیکن روح انسانی اپنی جگہ پر باقی رہتی ہے۔ لیکن سواری اور آلے سے محروم۔ لیکن سواری کی موت اور آلے کے چھن جانے پر سوار تو معدوم اور ضائع نہیں ہوتا۔ لیکن بے سلاح رہ جاتا ہے۔

اور یہ آلہ جو اسے دیا گیا تھا اس لیے مرحمت ہوا تھا کہ حق تعالیٰ کی معرفت و محبت کو شکار کرے۔ اگر انسان نے اس معرفت و محبت کو شکار کر لیا ہو تو اس آلے سے محرومی اس کے لیے باعثِ خیر ہے۔ تا کہ اس کے بوجھ سے نجات پائے۔ اور یہ جو رسول (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ ''موت مومن کے لیے بمنزلہ تحفہ وہدیہ کے ہے'' یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی کے پاس شکار کے لیے جال ہے تو وہ اس کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہے لیکن جب شکار ہاتھ آجاتا ہے تو پھر جال کو کھو دینا غنیمت ہوگا۔ اور اگر العیاذ باللہ قبل اس کے کہ شکار پر قابض ہو اور یہ آلہ کھو دے تو یہ امر اس کے لیے بے انتہا حسرت اور مصیبت کا باعث ہوگا۔ اور یہ الم اور حسرت عذاب قبر کی تمہید ہوگی۔ نعوذ

باللہ منہ (ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں)۔

فصل سوم: آپ کا آپا اس قالب کی بدولت ہی نہیں

معلوم رہے کہ اگر کسی کے ہاتھ پاؤں مفلوج ہو جائیں وہ اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔ کیونکہ اس کی حقیقت اس کے اعضاء کی بناء پر نہیں کیونکہ یہ ہاتھ پاؤں تو اس کے ہتھیار ہیں اور وہ انہیں استعمال میں لاتا ہے۔ جس طرح سے تمہارے آپے کی حقیقت ہاتھ پاؤں میں نہیں ہے اسی طرح پشت وشکم وسر میں بھی نہیں نہ اس تمھارے قالب میں۔ کیونکہ اگر پورا جسم بھی مفلوج ہو جائے تو بھی روا ہے کہ تُو باقی رہے۔ اور موت کے معنی یہ ہیں کہ تمام بدن مفلوج ہو جاتا ہے کیونکہ ہاتھ کے مفلوج ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہارا کہا نہیں مانتا۔ کیونکہ ہاتھ جو اطاعت رکھتا تھا وہ اس صفت کی بناء پر رکھتا تھا جسے قدرت کہتے ہیں۔ اور وہ نوری صفت ہوتی ہے جو روحِ حیوانی کے چراغ سے اسے پہنچتی تھی۔ جب عرُوق میں جو اس روح کے راستے ہیں کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے تو اس کی وہ قدرت جاتی رہتی ہے۔ اور وہ طاعت سے معذرت کر لیتی ہے۔ اسی طرح تمہارا پورا قالب جو تمہاری اطاعت کرتا ہے اس روح حیوانی کے واسطے ہی سے کرتا ہے۔ پس جب مزاج اس کا تباہ ہو جاتا ہے تو پھر اطاعت نہیں کرتا۔ اس کو موت کہا جاتا ہے۔ لیکن تُو اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ اگر چہ مُطیع تیرا اپنی جگہ پر باقی نہیں۔

اور تیرے آپے کی حقیقت یہ بدن کیونکر قرار پا سکتا ہے۔ کیونکہ تُو اگر غور وفکر سے کام لے تو تجھے معلوم ہو کہ تیرے اجزا اس وقت وہ نہیں جو بچپن میں تھے کیونکہ وہ سب تحلیل ہو گئے ہوں گے۔ اور غذا سے ان کا بدل لوٹ آیا ہوگا۔ پس تیرا قالب معرضِ تغیّر میں ہے لیکن تو وہی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ تیری حقیقت اس قالب سے نہیں۔ قالب اگر تباہ ہوتا ہے تو کہہ دے جا ہو جا، لیکن تو اُسی طرح زندہ رہتا ہے۔

لیکن تیرے اوصاف دو قسم کے ہوں گے۔ ایک وہ جو قالب کی مشارکت سے ہوں گے جیسے بھوک، پیاس اور نیند اور یہ بغیر معدے کے جسم کو راس نہیں آتے۔ یہ صفت موت سے باطل ہو جاتی ہے۔

اور دوسری صفت وہ ہے کہ قالب کا اس میں کوئی کردار نہیں ہوتا۔ جیسے معرفتِ خدائے تعالیٰ اور اس کی بارگاہ کا جمال اور اس پر شادمانی۔ یہ تیری ذات کی صفت ہے۔ اور یہ تیرے ساتھ باقی رہتی ہے۔ اور بدل اس کا اگر حق تعالیٰ کے باب میں جہالت ہو تو یہ صفت بھی تیری ہی ٹھہرے گی۔ اور تیرے ساتھ باقی رہے گی۔ اور یہ گویا روح کی نابینائی ہے جو تیری شقاوت کا تخم ہے۔ ''وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى

وَاَضَلُّ سَبِیْلاً ‘‘ (قرآن: ۱۷/۷۲) (جو اس دنیا میں دیدِ حق سے اندھا رہا تو اس جہان میں بھی اندھا رہے گا اور نابینا سے بھی گمراہ تر)۔ پس تو کسی حال میں بھی موت کی حقیقت نہ جانے گا جب تک ان دونوں رُوحوں کو نہ پہچانے گا جب تک ان کے درمیان جو فرق ہے اور جو اُن کا باہم دگر تعلق ہے اس کو نہ جان لے گا۔

فصل چہارم: روح کے اعتدال کی حفاظت

یاد رہے کہ یہ حیوانی روح عالمِ سفلی سے ہے۔ جو اخلاط کے بخار کی لطافت کا مرکّب ہے۔ اور اخلاط چار ہیں۔ یعنی خون، بلغم، صفرا اور سودا۔ ان چاروں اخلاط کی اصل پانی، آگ، خاک اور ہوا ہیں۔ اور مزاج کا اختلاف و اعتدال حرارت، برودت، رطوبت، اور یبوست کی مقداروں میں تفاوت کی بناء پر ہوتا ہے۔ اور صنعتِ طب کا مقصود یہ ہے کہ ان چاروں طبائع کو اس روحِ حیوانی میں محفوظ رکھے۔ تا کہ یہ اس دوسری روح کا مرکب اور آلہ بننے کے لائق ہو جائے۔ جسے ہم نے روحِ انسانی کا نام دیا ہے۔ جو اس دنیا سے نہیں بلکہ عالم علوی سے ہے اور فرشتوں کے جواہر میں سے ہے اور اس کی ذات کی طبیعت کی رُو سے اس کا اس عالم میں نزول ایک مسافر کا سا ہے۔ لیکن اس کا یہ سفر اس لیے ہے کہ تا کہ ہدایت سے اپنا زادِ راہ لے۔ جیسا کہ فرمان حق تعالیٰ ہے:

’’قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ‘‘ (قرآن: ۲/۳۸) (ہم نے کہا تم سب بہشت سے نیچے اترو۔ اگر میری طرف سے تمھیں کوئی پیغام یا نشان ملے تو جو کوئی میرے پیغام و نشان کی پیروی کرے گا تو جنھوں نے یہ کیا انھیں کوئی غم نہیں ہو گا اور نہ کوئی اندوہ)۔ اور یہ جو حق تعالیٰ نے کہا ہے کہ: ’’اِنِّیْ خَالِقٌ م بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ ‘‘ (قرآن: ۳۸/۷۲) (میں لوگ پیدا کروں گا مٹی سے اور جب میں اسے ٹھیک ٹھاک کر لوں گا تو اس میں اپنی روح پھونکوں گا) اس میں اشارہ ہے ان دو روحوں کے اختلاف کی طرف کہ ایک کو تو مٹی کے حوالے کیا۔ اور اس کے اعتدالِ مزاج کی طرف سوّیہ 'یعنی میں نے اسے راست اور آمادہ کیا' کے لفظ سے تعبیر کیا اور اعتدال یہ تھا۔ پھر فرمایا نفخت فیه من روحی اس سے اپنی ذات سے نسبت دی۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ کوئی کپاس سے کوئلہ تیار کرے تا کہ آتش پذیری کے لیے آمادہ ہو جائے۔ پھر اسے آگ کے نزدیک لے جائے۔ اور پھر اس میں پھونک مارے تا کہ اس میں آگ لگ جائے۔ اور جس طرح سے کہ روحِ سفلی کا اعتدال ہے اور طبیب اس کے اعتدال اسباب کو جانتا ہے تا کہ بیماری اس سے دور کرے۔ اور ہلاکت سے بچائے۔ اسی طرح روحِ انسانی علوی کہ جو دل کی حقیقت ہے اس کا بھی اعتدال ہے۔ کہ علم اخلاق، و ریاضت، کو

شریعت کو پہچانے ۔ اس کے اعتدال کو ملحوظ رکھے ۔ یہ امر اس کی صحت کا سبب ٹھہرے گا۔ جس طرح سے کہ از یں بعد ارکان اسلام میں مذکور ہوگا۔

پس معلوم ہوا کہ جب تک کوئی انسان کی ارواح کو نہیں پہچانے گا ممکن نہیں کہ آخرت کو بصیرت کے ساتھ پہچانے ۔ ایسے ہی جیسے کہ جب تک خود کو نہیں پہچانتا حق تعالیٰ عز وجل کو نہیں پہچان سکتا۔ پس خود اپنے نفس کی شناخت معرفتِ حق کی کلید ہے۔ اور دین کی اصل " اَلْاِیْمَان بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِر " (" اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہے") ۔ اس لیے ہم نے اس معرفت کا بیان پیشتر کر دیا۔

لیکن اس کے اصلی اوصاف کے اسرار میں سے ایک سرّ جس کا ذکر ہم نے نہیں کیا کہ اس میں بات کرنے کی اجازت نہیں کیونکہ مہم اس کے متحمل نہیں ہو سکتے ۔ لیکن معرفتِ حق اور معرفتِ آخرت کلیۃً اس پر موقوف ہیں ۔ تو تم سعی اس کی کرو کہ از راہِ مجاہدت وطلب اس کی پہچان کر سکو کیونکہ اگر کسی اور سے سنے گا تو اس کے سننے کی تاب نہ لائے گا۔ کیونکہ بہتوں نے حق تعالیٰ کی اس صفت کو سنا لیکن باور نہ کیا۔ چونکہ اس کے سماع کی طاقت نہ رکھتے تھے اس لیے انکار کر دیا۔ اور کہنے لگے کہ " یہ خود ممکن نہیں ۔ اور یہ تنزیہ نہیں بلکہ تعطیل ہے" پس تمہیں آدمی کے حق میں اس کے سننے کی تاب کیونکر ہو؟ بلکہ حق تعالیٰ کے حق میں اس صفت کا صریح بیان قرآن میں ہے نہ حدیث میں ۔ اسی سبب سے کہ جب خلق سنے گی انکار کر دے گی ۔ اور انبیاء سے کہا گیا کہ " كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِم " (لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق بات کرو) لوگوں سے وہ کہو جس کی تاب وہ رکھتے ہیں ۔ اور بعض انبیاء پر وحی آئی کہ ہماری صفات میں سے وہ جن کی سمجھ کی صلاحیت سے عوام بے بہرہ ہیں انہیں بیان نہ کرو کیونکہ وہ اسے باور نہ کریں گے اور ان کے انکار کے باعث انہیں نقصان پہنچے گا۔

فصل پنجم: حشر ونشر اور بعثت واعادہ کے معنی

اس تمام بیان سے تم نے جان لیا ہوگا کہ انسانی جان کی حقیقت قالب کے بغیر اپنی ذات میں قائم ہے اور اپنی ذات کے قوام میں نیز صفاتِ خاص میں قالب سے مستغنی ہے۔ اور موت کا مطلب روح انسانی کا فنا ہونا نہیں بلکہ موت کا مطلب فقط روح انسانی کا اپنے قالب سے تصرف کا انقطاع ہے اور بس اور حشر نشر کے اور بعث واعادہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ روحِ انسانی کو نیستی کے بعد دوبارہ وجود میں لاتے ہیں ۔ بلکہ یہ ہیں کہ اسے دوبارہ قالب عطا کرتے ہیں ۔ اس معنی میں کہ ایک قالب کو ایک بار پھر اس کے تصرف کو دوبارہ قبول کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں جیسے کہ پہلی بار کیا تھا۔ اور اس دفعہ بہ آسانی' کیونکہ پہلے تو قالب اور روح دونوں کو پیدا

کرنا تھا اور اس دوسری دفعہ روح تو پہلے ہی سے موجود تھی یعنی روح انسانی نیز اجزائے قالب اپنی جگہ موجود تھے۔ اور ان کا جمع کرنا ان کی تخلیق کی نسبت آسان تر تھا۔ یعنی یہ آسانی اور آسان تر ہونا انسانی نقطہ نظر سے ہے ورنہ جہاں تک حقیقت ہے صفتِ انسانی عقلِ الٰہی کے ادراک سے قاصر ہے۔ کیونکہ وہاں دشواری یا آسانی کا وجود کہاں؟

اور اعادہ اس سے مشروط نہیں کہ وہی سابقہ بدن انسان کو دیا جائے گا۔ کیونکہ قالب تو سواری ہے اگر چہ گھوڑا بدل جائے سوار تو وہی ہے اور قالب انسان بچپن سے پیری تک اختلافِ اجزائے غذا کے باعث معرض تغیر میں ہوتا ہے لیکن خود تو وہی موجود رہتا ہے۔

پس جن لوگوں نے اعادے کے لیے مذکورہ شرط لگائی کہ دوبارہ زندہ کر کے وہی سابقہ قالب ملے گا تو ان پر اعتراضات ہوئے اور انہوں نے ان اعتراضوں کے کمزور جواب دیے۔ حالانکہ اس تکلف سے وہ مستغنی تھے۔ ان سے لوگوں نے اعتراض کیے اور کہا کہ اگر ایک آدمی دوسرے آدمی کو کھا جائے اور دونوں کے اجزاء ایک ہو جائیں گے تو وہ اجزاء حشر میں کسے دیے جائیں گے اور اگر کسی کے بدن سے ایک عضو کاٹ ڈالیں اور کاٹ ڈالنے کے بعد وہ شخص عبادت کرے تو جب اس کا ثواب ملے گا تو وہ کٹا ہوا عضو اس کے بدن میں ہوگا یا نہیں اگر نہ ہوگا تو بے ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہ کے وہ شخص بہشت میں ہوگا۔ اور اگر وہ عضو جو زندگی میں کٹ گیا تھا اس کے بدن میں ہوگا تو ثواب میں اور اعضا کا کیونکر شریک ہوگا۔ کہ نیک کام کرنے میں تو شریک تھا ہی نہیں۔ لوگ ایسے واہیات اعتراضات بہت کرتے ہیں اور طرف ثانی تکلف کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب کچھ غیر ضروری ہے۔ جب تم نے اعادے کی حقیقت کو جان لیا کہ اسی قالب کی حاجت نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ اشکال تو اس لیے پیدا ہوا کہ لوگوں نے گمان یہ کیا کہ انسان کا آپا اور اس کی حقیقت فقط اس کا بدن ہے۔ اس لیے بدن جب بعینہٖ نہ رہے گا تو انسان کہاں؟ اس سبب سے اشکال میں پڑ گئے۔ حالانکہ یہ سوال ہی خلل کی بناء پر واہی ہے۔

فصل ششم: بہشت اور دوزخ کا مشاہدہ اس دنیا میں

اے عزیز شاید تو کہے کہ فقہاء اور متکلمان[1] کے مذہب کے مطابق مرنے پر انسانی جان معدوم ہو جاتی ہے اور اسے دوبارہ وجود میں لاتے ہیں۔ تو جو کچھ آپ نے کہا یہ اس کے برخلاف ہے۔ پس جان لے کہ جو شخص دوسروں کی بات پر بغیر سوچے سمجھے لگ جائے وہ تو گویا نابینا ہے۔ اس لیے یہ بات وہی کہے گا جو اہل تقلید

(۱) متکلم سے مراد معتزلہ ہیں

ہے نہ کہ اہل بصیرت۔ کیونکہ اگر صاحب بصیرت ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ بدن کی موت حقیقت انسانی کی نفی نہیں کرتی اور اگر اہل تقلید بھی ہوتا تب بھی قرآن وحدیث سے پہچان لیا ہوتا کہ روحِ انسانی موت کے بعد قائم رہتی ہے۔ کیونکہ یہ ارواح دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ارواح اشقیاء اور ارواحِ اہلِ سعادت۔ ارواحِ اہل سعادت کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ''وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَا آتٰهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهٖ'' (قرآن: ۱۶۹/۳) (جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انہیں مردہ نہ سمجھو کیونکہ وہ اپنے رب کے نزدیک زندہ ہیں۔ انہیں دواماً رزق دیا جاتا ہے اور وہ اللہ کے فضل سے ان خلعتوں کے ساتھ شادمان ہیں جو انہوں نے بارگاہ الوہیت سے پائی ہیں) اور اشقیا کے حق میں: معرکۂ بدر میں جو کافر رسول (ﷺ) اور اصحاب رسول کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ رسول (ﷺ) ایک ایک کو آواز دیتے حالانکہ وہ مر چکے تھے اور پکار کر کہتے تھے کہ اے فلاں اے فلاں وہ وعدے جو اللہ نے مجھ سے کیے تھے اللہ کے دشمنوں کے قہر کے بارے ان سب کو میں نے سچ پایا۔ اور اللہ تعالیٰ نے وہ وعدے جو تم سے موت کے بعد عقوبت کے باب میں کیے تھے تم نے انہیں سچ پایا یا نہیں؟'' تو صحابہ نے اس پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ کہ یہ تو مر چکے ان سے آپ بات کیوں کر رہے ہیں؟ تو آپ (ﷺ) نے فرمایا ''وہ خدا جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے اس کی قسم کہ یہ مردار تم سے یہ بات سننے میں بڑھ کر ہیں لیکن میری بات کا جواب نہیں دے سکتے''۔

اور جو کوئی کاوش کرتا ہے کہ معلوم کرے کہ مُردوں کے حق میں حدیث میں کیا آیا ہے اور مُردوں کا اہل ماتم وزیارت اور جو کچھ اس دنیا میں وقوع پذیر ہوتا ہے کے باب میں عالم ہونا حتماً جانا جاتا ہے کہ مردوں کی کلیۃً نفی شرع میں نہیں آئی ہے۔ بلکہ یہ آیا ہے کہ صفت بدل جاتی ہے۔ اور ان کی منزل تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور قبر ایک گڑھا ہے دوزخ کے گڑھوں میں سے یا ایک باغ ہے بہشت کے باغوں میں سے۔ پس تم اس کو حقیقت باور کرو کہ ہرگز کوئی چیز تمہاری ذات اور تمہارے خواص صفات میں سے باطل نہ ہوگی لیکن تمہارے حواس، حرکات اور تخیلات کہ جو دماغ واعضاء کے ذریعے تھے وہ باطل ہو جاتے ہیں لیکن تم قائم رہتے ہو۔ فرد اور تنہا جیسے کہ یہاں سے گئے ہو۔ اور جان لو کہ گھوڑا مر جاتا ہے تو سوار اگر جولاہہ ہو فقیہہ نہیں بن جاتا اور اگر نابینا ہو تو بینا نہیں ہو جاتا اور اگر بینا ہو تو نابینا نہیں ہو جاتا۔ بلکہ سوار صرف پیادہ ہو جاتا ہے اور بس۔ اور قالب سواری ہے گھوڑے کی سی اور تم سوار ہو۔

یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو خود اپنی ذات سے اور اپنے محسوسات سے غائب ہو جاتے ہیں اور مراقبہ کرتے ہیں اور ذکر خدائے تعالیٰ میں مشغول ومستغرق ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہ تصوف کی راہ کی ابتداء ہے۔ تو

آخرت کے احوال ان کے لیے مشاہدے کی طرح ہوتے ہیں کہ ان کی حیوانی روح اگرچہ اعتدالِ مزاج سے منحرف نہیں ہوتی لیکن بے حس ہو چکی ہوتی ہے اور جب ان میں سستی اور بے حسی پیدا ہو چکی ہوتی ہے تو روحِ حیوانی ان کو حقیقت ذات سے منصرف نہیں ہونے دیتی کہ وہ خود میں مشغول ہو جائیں۔ پس ان کا حال مردے کے حال کے قریب تر ہوتا ہے۔ اس طرح جو امر دوسروں پر مرنے کے بعد منکشف ہوگا۔ ان پر یہیں اس دنیا میں منکشف ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ ہوش میں آتے ہیں اور عالم محسوسات سے دوچار ہوتے ہیں تو بیشتر ایسے ہوتا ہے کہ انہیں اُس دنیا کی کوئی چیز یاد نہیں ہوتی لیکن اس کا ایک اثر ان پر باقی ہوتا ہے۔ اگر بہشت کی حقیقت انہیں دکھائی گئی ہو تو اس کی خوشبوءِ راحت وسرور اور شادمانی ہمراہ ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر اُنھیں دوزخ دکھائی گئی ہو تو ایک گونہ کوفتگی اور خستگی اس کے ساتھ باقی ہوتی ہے۔

اور اگر کوئی چیز اس کیفیت کے باب میں ابھی فراموش نہ ہوتی ہو وہ اس کی خبر دیتا ہے۔ اور خزانہ خیال نے اس چیز کو کسی صورت کے روپ میں دکھایا ہو تو یہ صورت ایسی ہوتی ہے کہ حافظے میں محفوظ ہو جاتی ہے جس سے وہ اس کی خبر دیتا ہے۔ جیسے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ایک دفعہ ہاتھ آگے بڑھایا تھا تو آپ نے فرمایا کہ: بہشت سے ایک خوشہ انگور کا مجھے دکھایا گیا تھا میں نے چاہا کہ اسے اس دنیا میں لاؤں'' تم یہ گمان نہ کرنا کہ وہ حقیقت جسے خوشہ انگور کا روپ دیا گیا تھا اس دنیا میں لائی جاسکتی تھی۔ بلکہ یہ خود محال تھا۔ کیونکہ اگر ممکن ہوتا تو ظاہر ہو جاتی۔ لیکن اس کا انکشاف مشاہدے میں ہوا تھا۔ اور اسی استحالت کی حقیقت کی شناخت طول طویل ہے اور تمہیں اسے طلب کرنے کی حاجت نہیں۔

اور علما کے مقامات میں اختلاف یوں ہوتا ہے کہ ایک کو سراسر اس کا سودا ہوتا ہے کہ وہ جان سکے کہ یہ خوشہ انگور بہشت سے کیا تھا؟ اور کیوں تھا کہ رسول (ﷺ) نے تو اسے دیکھا لیکن دوسروں کو دکھائی نہ دیا۔ اور دوسرے کو اس سے زیادہ کچھ نصیب نہیں ہوتا کہ رسول (ﷺ) نے ہاتھ ہلایا پس اَلْفِعْلُ الْقَلِیْلُ لَایُبْطِلُ الصَّلٰوۃ یعنی قلیل حرکت سے نماز باطل نہیں ہوتی اور اس کی تفصیل میں خوب غور کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اول و آخر علم یہی ہے جس نے یہ جانا لیکن اس پر قناعت نہ کی اور پھر اس میں لگ جاتا ہے تو یہ سمجھو کہ وہ معطل ہے اور علم شریعت سے روگردان۔

مقصود یہ ہے کہ تم یہ گمان نہ کرنا کہ رسول (ﷺ) نے بہشت کی خبر تقلیداً حضرت جبرئیل سے سن کر دی اور جس طرح تم جبریل سے سماع کے معنی جانتے ہو کہ وہ معنی بھی تم نے دوسرے کاموں ہی کی طرح سمجھے۔ لیکن رسول (ﷺ) نے واقعی بہشت کو دیکھا اور بہشت کو اس دنیا میں تو نہیں دیکھا جاسکتا۔ بلکہ رسول اُس عالم میں

گئے اور اِس دنیا سے غائب ہوگئے اور یہ ایک گونہ ان کا معراج تھا کہ غائب ہونے کی دوصورتیں ہیں۔ ایک روحِ حیوانی کا مرجانا یعنی جسے عرف عام میں موت کہتے ہیں تو دوسری روح حیوانی کی بے حسی۔ لیکن اس دنیا میں بہشت کونہیں دیکھا جاسکتا۔ کیونکہ جس طرح سات آسمان اور سات زمینیں ایک پستے کے چھلکے میں نہیں سما سکتے تو بہشت کا ایک ذرہ بھی اس دنیا میں نہیں سماتا۔ بلکہ جس طرح حاسۂ سمع زمین وآسمان کی صورت دیکھنے سے قاصر ہے کہ آنکھ تو دیکھ سکتی ہے۔ تو اس دنیا کے جملہ حواس بہشت کی لذتوں کے ادراک سے عاجز ہیں کیونکہ اُس عالم کے حواس بھی خود اور ہی ہیں۔

فصل ہفتم: عذاب قبر کے معنی

اب وہ مرحلہ آن لگا ہے کہ تم عذابِ قبر کے معنی جان سکو۔ معلوم رہے کہ عذاب قبر بھی روحانی اور جسمانی دو قسم کا ہے جسمانی عذاب کو تو ہر کوئی پہچانتا ہے لیکن روحانی عذاب سے آشنا نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ جس نے خود کو پہچان لیا ہو۔ اور اس نے حقیقتِ روح کو جانا ہے کہ وہ اپنی ذات میں قائم ہے اور اسے اپنے قوام میں قالب کی حاجت نہیں۔ اور وہ مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ کیونکہ موت اس کو فنا آشنا نہیں کرتی۔ موت ہاتھ پاؤں آنکھ کان یعنی جملہ حواس کو اس سے واپس لے لیتی ہے اور جب حواس اس سے جاتے رہے تو بیوی، بچے، گھربار، خادم اور مال ڈنگر اور خویش واقارب بلکہ زمین وآسمان وغیرہ جنہیں حواس سے پاتے ہیں اس سے واپس لے لیتے ہیں۔ اگر یہ تمام چیزیں اس کے محبوب کے درجے میں تھیں اور اس نے اپنے آپ کو ہمہ تن ان کے لیے وقف کر رکھا تھا تو وہ لازماً ان کے فراق میں گرفتار رہے گا اور اگر ان سب سے فارغ تھا اور اس دنیا میں اس کا ایسا کوئی محبوب نہ تھا۔ بلکہ وہ موت کا آرزومند تھا تو وہ موت سے راحت میں داخل ہوگیا۔ اور اگر اس نے اللہ تعالیٰ سے دوستی کی ہوگی اور ذکرِ حق تعالیٰ سے اُنس ہوگا تو اس نے اس کے لیے خود کو سراپا وقف کردیا ہوگا۔ اور اسبابِ دنیا اس کو منغص اور پریشان کرنے کا باعث رہے ہوں تو موت پر تو گویا وہ اپنے معشوق کو پہنچ گیا اور اسباب تشویش وتشویر درمیان سے رخصت ہوگئے اور وہ سعادت کو پہنچ گیا۔

اب تم سوچو کہ آیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اپنے آپ کو پہچانے کہ وہ باقی رہے گا۔ اور یہ جانے کہ اس کی جملہ مرادیں اور معشوق دنیا میں ہے۔ اور پھر اس شبہ میں ہو کہ جب دنیا سے گیا " اپنے محبوبوں کے فراق کی بناء پر رنج وعذاب میں مبتلا ہوجائے گا جیسا کہ رسول (ﷺ) نے فرمایا: "اَحبب مَا اَحْبَبْتَ فَاِنکَّ مَفَارِقُہ" (یعنی تو جسے چاہے عزیز رکھ لیکن جان لے کہ اس سے جدا ہوجائے گا) یا اگر وہ جان لے کہ اس کا محبوب حقیقتاً حق

سبحانہ وتعالیٰ ہے اور دنیا کو اور جو کچھ اس دنیا میں ہے دشمن سمجھے سوائے اس مقدار کے جس کی حاجت زادِ راہ کے لیے ہے تو کیا اسے اس بات میں شبہ ہوگا کہ جب اس دنیا سے جائے گا تو رنج سے رہا ہو جائے گا اور راحت میں ہوگا؟ پس جس نے اس بات کو پہچان لیا تو اسے عذابِ قبر کے بارے میں کوئی شک نہ رہے گا کہ واقعی ہے۔ اور یہ شبہ پرہیزگاروں کو نہیں ہوتا۔ جب کہ دنیاداروں کو ہوتا ہے۔ اور وہ جنہوں نے سراپا خود کو دنیا ہی کے لیے وقف کر رکھا ہے مبتلائے شبہ ہوتے ہیں اور "اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَ جَنَّةُ الْکَافِرِ" (دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے) کی حدیث سے یہ معنی متبادر ہوتے ہیں۔

فصل ہشتم: عذابِ قبر کے درجات اور ان کی حقیقت

جس طرح تم نے قبر کے عذاب کی حقیقت کو پہچانا کہ اس کا سبب دنیا سے محبت ہے تو یہ بھی جان لو کہ یہ عذاب متفاوت ہے۔ کہ بعضوں کو زیادہ ہوگا تو بعضوں کو کم۔ یعنی شہواتِ دنیا کے ساتھ تعلق کے متناسب ہوگا۔ پس اس شخص کا عذاب جو دنیا میں کسی ایک چیز کے سوا اور کسی شے سے وابستہ نہ تھا وہ اس قدر نہ ہوگا جس قدر عذاب ایسے شخص کو ہوگا کہ جو ضیاع (زرعی زمین) اسباب، نوکر چاکر، جاہ وحشم، جیسی تمام دنیوی نعمتوں سے بہرہ مند ہو اور اس نے دل کو انہی کے لیے وقف کر رکھا ہو۔ بلکہ اگر کسی کو یہ خبر دیں کہ اس کا ایک گھوڑا جاتا رہا ہے تو اس کے دل پر اس کا رنج اس شخص سے بہت کم ہوگا کہ جسے کہا جائے کہ تمہارے دس گھوڑے جاتے رہے۔ اور اگر اس کا تمام مال چھین لیا جائے تو رنج اس کا آدھے کے نقصان کے مقابلے میں زیادہ ہوگا اور اس شخص کے رنج سے کم ہوگا جس کے مال کے علاوہ زن وفرزند اور جو کچھ اس کے پاس دنیا میں تھا سب لٹ جائے۔ اور اسے ولایت سے برطرف کر دیں۔ اور وہ یکہ وتنہا رہ جائے۔ موت کے معنی یہی ہیں۔

پس ہر کسی کی عقوبت وراحت کی مقدار اس کی دنیا سے دل بستگی یا بے تعلقی کی مقدار کے متناسب ہو گی۔ وہ شخص جو دنیوی اسباب کو بہر طور جمع کرنے میں لگا رہا تھا اور اس نے خود کو ہمہ تن اسی کے لیے وقف کر رکھا تھا اس کو عذاب بھی سخت عظیم ہوگا۔ چنانچہ فرمان خداوندی ہے: "ذٰلِکَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَةِ" (قرآن: ۱۶/۱۰۷) (یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے اس دنیا کو آخرت پر ترجیح دی) اور عبارت اس کی یوں ہوئی کہ رسول (ﷺ) نے فرمایا: "جانتے ہو کہ یہ آیت کس معنی میں نازل ہوئی کہ: "فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی" (قرآن: ۲۰/۱۲۴) (اس کے لیے زندگی تنگی اور سختی کے ساتھ ہے۔ اور کل ہم اسے اٹھائیں گے ایسے کہ وہ اپنے پاس حجت دیکھے گا نہ عذر) تو صحابہ نے کہا کہ خدا اور

رسول ہی اس کے معنی بہتر جانتے ہیں۔ تو آپ (ﷺ) نے فرمایا: "کافر کا عذاب قبر میں یہ ہے کہ ننانوے[۹۹] اژدہا مسلط کر دیے جائیں گے جانتے ہو یہ اژدہا کیا شے ہے؟ کہ ننانوے سانپ ہوں گے جن میں ہر ایک کے نو سر ہوں گے جو اس کافر کو ڈسیں گے اور اس کو چاٹیں گے تو اس پر پھنکاریں گے روز قیامت تک"۔

اور اہل نظر نے ان اژدہاؤں کو بچشم بصیرت دیکھا ہے۔ اور بے بصر احمق یہ کہتے ہیں کہ "ہم نے ایک قبر میں نگاہ ڈالی ہمیں تو ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دی۔ اگر ہوتی تو ہماری نگاہ بالکل ٹھیک ہے ہمیں بھی نظر آ جاتی"۔ ان احمقوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ اژدہا مردے کی روح کی ذات میں ہوتے ہیں اور اس کی جان کے باطن سے باہر نہیں ہوتے کہ دوسرے انہیں دیکھ سکیں۔ بلکہ یہ اژدہا موت سے قبل بھی اس کے باطن میں موجود تھے لیکن وہ ان سے غافل تھا۔ اور نہیں جانتا تھا۔ لیکن چاہیے کہ وہ جان لے کہ یہ اژدہا اس کی اپنی نفسی صفات کا مرکب ہیں اور ان کے سروں کی تعداد اخلاقِ مذموم کی شاخوں کے مساوی ہوتی ہے۔ اور ان اژدہاؤں کی فطرت کی اصل حُبِّ دنیا سے ہے۔ اور سر ان کے ان اخلاقِ بد کے ہم عدد دوستی ٔ دنیا سے نمودار ہوتے ہیں۔ جیسے کہ حسد، ریا، کبر، شرہ، مکر، خداع، عداوت، جاہ و حشمت کی محبت اور مال و حشمت وغیرہ ہیں۔ اور ان اژدہاؤں کی اصل حقیقت اور ان کے سروں کی کثرت کو نورِ بصیرت سے پہچانا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے عدد کی مقدار کو نورِ نبوت سے دیکھ سکتے ہیں جو عددِ اخلاق مذموم کی مقدار کو محیط ہوتا ہے جب کہ ہمیں اخلاق کی تعداد ٹھیک سے معلوم نہیں۔

پس یہ اژدہا کافروں کی روح کے اندر متمکن ہوتے ہیں اور پوشیدہ؛ نہ اس بناء پر کہ کافر خدا اور رسول کے بارے میں غافل ہو جاتا ہے بلکہ اس لیے کہ اس نے خود کو ہمہ تن دنیا پر نچھاور کر دیا ہوتا ہے جیسے کہ فرمان خداوندی ہے: "ذٰلِکَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ" اور اسی طرح فرمایا: "اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِىْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا" (قرآن: ۲۰/۴۶:۲) (تم نے اپنی زندگی ہی میں اُس جہانِ آخرت کی خوشیاں پا لیں اور ان کا پھل کھا لیا)۔ اور اگر یوں ہوتا کہ یہ اژدہا ان کی روح سے باہر ہوتے جیسے کہ عوام گمان کرتے ہیں تو آسان تر ہوتا۔ کیوں کہ امکان اس کا تھا کہ تم فوراً دنیا سے ہاتھ کھینچ لیتے لیکن چونکہ یہ اژدہا اس کی روح کے اندر مقیم ہوتے ہیں جو خود عین اس کی صفات سے ہیں تو وہ اس سے نجات کیسے پائے؟

اور جس طرح سے کہ وہ شخص جو ایک کنیز کو بیچ ڈالتا ہے اور پھر وہ اس کا عاشق بھی ہو۔ تو وہ اژدہا جو اس کی جان کو ڈستا ہے اس کا عشق ہے کہ اس کے دل میں تھا۔ لیکن پوشیدہ تھا۔ لیکن وہ اس سے بے خبر تھا۔ حتیٰ کہ اب تک اس زخم کے ساتھ قائم رہا۔ اسی طرح یہ ننانوے اژدہے موت سے قبل بھی اس کے ساتھ تھے اور اسے

پتہ نہیں تھا حتی کہ اب ان کا زخم ظاہر ہوا۔ اور جس طرح کہ عین عشق اس کی راحت کا سبب تھا جب تک وہ اپنی معشوقہ کے ساتھ تھا لیکن وہی فراق میں اس کے رنج کا باعث ہوگیا۔ اگر اسے کنیز سے عشق نہ ہوتا تو دوران فراق میں رنج بھی نہ ہوتا۔ اسی طرح حب دنیا اور اس کا عشق کہ سبب راحت ہے وہی اس کے عذاب کا سبب بن جاتا ہے۔ کیونکہ اگر عشق نہ ہوتا تو فراق میں رنج کیوں ہوتا۔ ایسے ہی حُبِّ دنیا اور اس کا عشق کہ سبب راحت تھا وہی اس کے عذاب کا سبب بن جاتا ہے۔ جاہ و مرتبہ کا عشق ایک اژدہا کی مانند اسے ڈستا ہے اور مال کا عشق سانپ کی طرح اور گھر بار کا عشق بچھو کی طرح ڈنگ مارتا ہے اور باقی کو اسی پر قیاس کرلو۔

اور جس طرح کنیز کا عاشق فراق میں چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو پانی یا آگ میں ڈال مرے یا اسے کوئی بچھو ڈسے تاکہ اس دردِ عشق سے نجات پائے۔ اسی طرح وہ جسے قبر میں عذاب کا سامنا ہے چاہتا ہے کہ اُس عذاب کے بدلے سانپ بچھوؤں کے ڈسنے کا عذاب ہوتا۔ کیونکہ اس دنیا میں لوگ جانتے ہیں کہ سانپ بچھو زخم جسم پر لگاتے ہیں اور باہر سے لگاتے ہیں اور وہ زخم جان میں لگاتے ہیں اور اندرون سے' اس لیے ظاہر کی آنکھ اسے دیکھ نہیں سکتی۔

پس درحقیقت ہر کوئی اپنا عذاب قبر میں اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے اور وہ اُس کے باطن میں ہوتا ہے۔ اسی لیے رسول (ﷺ) نے فرمایا: ''اِنَّمَا هِیَ اَعْمَالُكُمْ تُرَدُّ اِلَيْكُم ''یعنی یہ تمام عقوبت اس سے کچھ زیادہ نہیں ہے کہ آپ ہی کا مال آپ کے سامنے لا رکھتے ہیں''۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے فرمایا: ''اگر تم کو علم الیقین ہوتا تو تم خود دوزخ کو دیکھ لیتے'' ''كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ؕ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ'' (قرآن: ۱۰۲/۵'۶'۷) اور اسی لیے فرمایا: ''وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكَافِرِيْنَ'' (قرآن: ۴۹/۹) یعنی دوزخ ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ ان کے ساتھ بہم ہے' اور یہ نہیں کہا کہ احاطہ کرے گی۔

فصل نہم: عالم آخرت میں جو کچھ ہوگا اسے موجودہ آنکھ سے نہیں دیکھا جاسکتا

لاریب ظاہر شرع سے یہ معلوم ہے کہ اس اژدہا کو تو موجود آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں اور وہ اژدہا جو جان میں ہے اس آنکھ سے اسے دیکھا نہیں جاسکتا۔ یاد رہے کہ یہ اژدہا دیدنی ہیں ہر مردہ ان کو دیکھتا ہے۔ لیکن وہ زندہ انسان جو اس دنیا میں ہوتے ہیں نہیں دیکھتے۔ کیونکہ وہ چیز جو عالم آخرت سے متعلق ہے اسے اس دنیا میں عطا کردہ آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔ اور یہ اژدہا مردہ کے لیے متمثل ہوتا ہے کہ وہ ایسے ہی دیکھتا ہے جیسے کہ مردہ اس جہان میں دیکھتا تھا۔ لیکن زندہ نہیں دیکھتا۔ جس طرح سویا ہوا اکثر دیکھتا ہے کہ اسے ایک سانپ ڈس

رہا ہے۔ اور جو شخص بیدار اس کے پاس بیٹھا ہے نہیں دیکھتا۔ اور وہ سانپ سوئے ہوئے کے لیے موجود ہوتا ہے۔ اور اس کا رنج اسے حاصل ہوتا ہے۔ اور بیدار کے حق میں معدوم ہوتا ہے اور بیدار شخص کے نہ دیکھنے سے خواب دیکھنے والے کے رنج میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

اور سویا ہوا جب خواب میں دیکھتا ہے کہ اسے ایک سانپ ڈس رہا ہے اور وہ زخم ایسا دشمن ہے جو اس پر فتح پالے گا۔ تو یہ رنج روحانی ہوگا۔ اور دل پر ہوگا۔ لیکن اس کی مثال اگر اس دنیا سے مستعار چاہیں گے تو یہ مثال مستعار روحانی سانپ کے رنج کا ایک نمونہ ہوگی۔ اور ممکن ہے کہ سونے والا دشمن کی طرح اس پر فتح پالے تو وہ کہے "میں نے اپنے خواب کی تعبیر دیکھ لی" اور کہے "کاش کہ سانپ مجھے ڈستا اور یہ دشمن اپنا مطلب مجھ سے حاصل نہ کرتا کیونکہ دل پر کا یہ عذاب اس رنج سے کہ سانپ کے ڈسنے سے جسم پر ہوتا کہیں بڑھ کر ہے۔

پس اگر تو یہ کہے کہ سانپ معدوم ہے اور یہ جو اس نے مجھے ڈسا ہے ہوسکتا ہے خیالِ محض ہو۔ تو جان لے کہ یہ عظیم غلطی ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ وہ سانپ موجود ہے۔ کیونکہ معنی موجود یافتہ ہوتے ہیں اور معنی معدوم نایافتہ' جو کچھ خواب میں تمہارا یافتہ' ہوتا ہے اور تو اس کو دیکھتا ہے۔ وہ تمہارے حق میں موجود ہے۔ اگر چہ دوسرا اس کو نہیں دیکھ سکتا۔ اور جس کو تم نہیں دیکھتے وہ تمہارے لیے نایافتہ اور ناموجود ہے۔ اگر چہ اسے ساری دنیا دیکھے۔ اور جب انسان نے عذاب اور مردہ وخفتہ کے عذاب کے سبب دونوں کو پالیا ہے۔ تو اس بناء پر کہ دوسرا اسے نہیں دیکھتا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ یہ خواب دیکھنے والا جلد بیدار ہو جائے اور اس رنج سے رہا ہو جائے۔ پس ایسی صورت میں اسے خیالی کا نام دیتے ہیں۔ لیکن مردہ اسی میں رہتا ہے بلکہ موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتا پس اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اور ثبات میں اس دنیا کے محسوسات کی طرح ہوتا ہے۔

اور شریعت میں نہیں ہے کہ وہ مار و کثر دم اور اژدہے کہ قبر میں ہوتے ہیں انہیں عامۃ الناس کی اس چشم ظاہر سے دیکھا جاسکتا ہے۔ جس وقت کہ وہ اس عالم شہادۃ میں ہوتے ہیں اور اگر کوئی اس عالم سے دور ہو جائے بوسیلہ خواب مردے کے اس حال کو اس پر منکشف کرتے ہیں تو وہ خود کو سانپ بچھوؤں کے درمیان پاتا ہے اور انبیاء واولیاء تو بیداری میں بھی دیکھتے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ دوسروں کے لیے خواب میں ہوتا ہے ان کے لیے بیداری میں ہوتا ہے۔ کیونکہ عالم محسوسات انہیں اُس دنیا کے کاموں کے مشاہدات سے محجوب نہیں کرسکتا۔

یہ امر کہ بات لمبی ہوگئی اس کی وجہ یہ تھی کہ احمقوں کا ایک گروہ اس بناء پر کہ وہ اس چشم ظاہر سے قبر میں ایسی کوئی شے نہیں دیکھتے اس لیے عذاب قبر کے منکر ہو جاتے ہیں اور سبب اس کا یہ ہے کہ وہ اُس دنیا کے دستور العمل کو نہیں جانتے۔

فصلِ دہم: عذاب قبر کن لوگوں کو ہوتا اور کن لوگوں کو نہیں ہوتا

بے شک تم کہو گے کہ ''اگر عذاب قبر اس دنیا کے ساتھ وابستگیِ دل کی بناء پر ہوتا ہے تو کوئی بھی اس تعلق سے خالی نہیں کیونکہ ہر کوئی بیوی بچوں مال و جاہ کو عزیز رکھتا ہے۔ پس سب کو عذاب قبر ہوگا اور کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہ ہوگا''۔ جواب اس کا یہ ہے کہ حقیقت یوں نہیں ہے کیونکہ ایسے بھی ہوں گے جو دنیا سے سیر ہو چکے ہوں گے۔ اور ان کے لیے آسائش کی کوئی جگہ باقی نہ رہی ہوگی اور وہ موت کے آرزومند ہوں گے اور مسلمان اکثر دنیوی اعتبار سے تہی دست ہوں گے اور ایسے ہی ہوں گے۔ لیکن وہ گروہ جو صاحب مال اور منال ہوگا وہ بھی دو قسم کا ہوگا۔ ایک وہ گروہ ہوگا جو باوجود اس کے کہ وہ اسباب کو عزیز جانتے ہیں لیکن خدائے تعالیٰ سے بھی محبت کرتے ہیں، پس اگر یوں ہو کہ خدائے تعالیٰ کو اسباب دنیا سے بڑھ کر چاہتے ہوں تو ان کو بھی عذاب نہ ہوگا۔ ان کی مثال ایسے شخص کی سی ہے کہ جو سرائے کا مالک ہے اور ایک شہر بھی رکھتا ہے کہ جسے عزیز جانتا ہے لیکن ریاست وسلطنت اور محل و باغ کو اُن سے بڑھ کر دوست رکھتا ہے۔ اور جب اسے بادشاہ کی طرف سے حکم ملتا ہے کہ ایک دوسرے شہر کی سرداری اسے تفویض ہوئی ہے تو اسے ترکِ وطن کا کوئی صدمہ نہیں ہوتا۔ اور سرائے خانہ اور شہر جو اس ریاست دوستی میں اجزائے غالب تر ہیں ناچیز ٹھہرتے ہیں۔ بلکہ ناپید ہو جاتے ہیں اور ان کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ پس انبیاء و اولیاء اور پرہیز گار مسلمان اگرچہ ان کے دل میں زن و فرزند اور شہر و وطن سے ایک گونہ التفات ہوتا ہے لیکن جب دوستیِ خدائے تعالیٰ نمودار ہوتی ہے اور اس سے اُنس کی لذت سے آگاہ ہوتے ہیں تو یہ چیزیں ان کی نگاہ میں بے وقعت ہو جاتی ہیں۔ اور یہ لذت موت پر ظاہر ہوتی ہے۔ پس وہ عذابِ قبر سے مامون ہوتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو شہواتِ دنیا کو زیادہ عزیز جانتے ہیں عذابِ قبر سے نہیں بچ سکتے۔ اور بیشتر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اسی بناء پر فرمان خداوندی ہے: ''وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا، ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا'' (قرآن: ۱۹/۷۱، ۷۲) (اور نہیں ہے تم میں سے کوئی مگر اس میں پہنچنے والا ہے یہ امر ہو چکا ہے تیرے رب پر ضرور مقرر، پھر نجات دیں گے ہم ان کو جو ڈرتے رہے)۔ یہ قوم ایک عرصے تک عذاب جھیلتی ہے۔ جب دنیا سے اس ربط کو ایک زمانہ گذر جاتا ہے تو وہ دنیا اور دنیا کی لذت کو بھول جاتے ہیں۔ اور خدائے تعالیٰ کی اصل دوستی جو دل میں موجود تھی دوبارہ نمودار ہوتی ہے۔ مثال اُن کی ایسے شخص کی سی ہے جو ایک گھر کو ایک دوسرے گھر سے اور ایک شہر کو دوسرے شہر سے اور ایک بیوی کو دوسری عورت سے زیادہ دوست رکھتا ہے لیکن اس دوسرے کو بھی دوست رکھتا ہے۔ تو جب اس کو عزیز ترین سے دور کرتے ہیں اور وہ دوسرے شہر میں پہنچتا ہے تو ایک مدت تک پہلے کے فراق میں رنجور

رہتا ہے پھر وہ اسے فراموش کر دیتا ہے اور اس دوسرے سے عادی ہو جاتا ہے۔ اور وہ اصل دوستی جو دل میں تھی وہ ایک دراز مدت کے بعد پھر دید میں آتی ہے۔ لیکن وہ جو دراصل خدائے تعالیٰ کو دوست نہیں رکھتا اسی عذاب میں رہتا ہے کیونکہ اس کی دوستی اس سے ہوتی ہے جو اس سے واپس لے لیا گیا ہے۔ پس وہ کیونکر اس عذاب سے نجات پائے گا۔ اور کافر کے لیے عذاب دائمی کا سبب منجملہ اسباب دیگر کے یہ بھی ہے۔

یاد رہے کہ جو کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ خدائے تعالیٰ کو دوست رکھتا ہے یا کہے کہ اس دنیا سے زیادہ اللہ کو دوست رکھتا ہے اور یہ جملہ مخلوق کا دعویٰ ہے مگر زبانی۔ اور اس کے لیے ایک کسوٹی اور معیار ہے کہ جس سے اسے پہچانتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ: وہ کہ جسے اس کا نفس اور شہوت ایک چیز کا حکم لگائیں اور شرع خداوندی اس کے برعکس حکم فرما ہو تو اگر وہ اپنے دل کو فرمانِ خداوند کی طرف مائل تر دیکھتا ہے تو گویا وہ خدا کو دوست تر رکھتا ہے۔ جیسے کوئی دو شخصوں کو دوست رکھتا ہے لیکن ایک کو زیادہ عزیز رکھتا ہے اور جب ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو تو وہ خود کو اس کی طرف مائل دیکھے جسے وہ زیادہ عزیز جانتا ہے تو وہ لازماً اس کو پہچان لے گا کہ وہ اسے عزیز تر جانتا ہے۔ اور اگر یوں نہ ہو تو محض زبانی ادعا سے کچھ حاصل نہیں کیونکہ وہ زبانی دعویٰ دروغ ہوگا۔

اور اسی بناء پر رسول (ﷺ) نے فرمایا: لاالٰہ الا اللہ کہنے والے خدائے عزوجل کے عذاب کی حمایت کرتے ہیں جب تک وہ معاملۂ دنیا کو دین پر ترجیحاً اختیار کرتے ہیں۔ جب وہ یوں کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں دروغ زن کہتا ہے۔ کیونکہ لا الٰہ الا اللہ کہنا اس معاملت کے باعث دروغ ہی ٹھہرے گا''۔

پس تم نے اس جملہ بیان سے پہچان لیا ہوگا کہ اہل بصیرت بہ نظر باطن دیکھتے ہیں کہ کون عذاب قبر سے نجات پائے گا اور جانتے ہیں کہ بیشتر خلق رہائی پا جائے گی لیکن عذاب کی مدت اور شدت میں تفاوت بہت ہوگا ایسے ہی جیسے کہ دنیا کے ساتھ ان کے تعلق میں تفاوت بہت ہوگا۔

فصلِ یازدہم: عذاب قبر سے مامونیت کے تجربے کی راہ

بے شک احمقوں اور متکبروں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ''اگر عذاب قبر یہی ہے تو ہم اس سے بری ہیں کیونکہ ہمیں دنیا سے کوئی تعلق نہیں اور اس کا ہونا یا نہ ہونا ہمارے لیے برابر ہے''۔ تو ان کا یہ دعویٰ محال ہوگا کیونکہ جب تک آزماتا نہیں بے خبر رہے گا۔ اگر ایسے ہی ہے تو جو کچھ اس کا ہے چور لے جائے اور جو کچھ اس کا پسندیدہ ہے وہ کسی دوسرے کا قرار پا جائے۔ اور اس کے اقارب میں سے جملہ اور ہر وہ جو اس کا ارادت مند ہے اس سے پھر جائیں اور اس کی مذمت کرنے لگیں تو اگر اس کا کوئی اثر اس کے دل پر نہ ہو اور اسے یوں پائیں جیسے کسی اور کا مال لٹ گیا ہو مقبولیت کسی اور کی جاتی رہی ہو یعنی وہ اپنے اس نقصان سے قطعاً غیر متاثر ہو تو اس کا

یہ دعویٰ کہ ''ہم لوگ دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے'' درست قرار پائے گا۔اور امکان اس کا بھی ہے کہ وہ کہے ''میں اسی صفت کا ہوں'' اور فریب زدہ ہو تو جب تک اس کا مال نہ لٹے اور لوگ اس سے پھر نہ جائیں وہ نہیں جانتا کہ حقیقت کیا ہے پس چاہیے کہ مال کو خود سے جدا کردے اور مقبولیت سے گریزاں ہو جائے اور اس طرح خود کو آزمائے پھر اعتماد کرے۔ کیونکہ اکثر یوں ہوتا ہے کہ ایک شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اسے زن و کنیز سے کوئی علاقہ نہیں ہے تو جب اس نے بیوی کو طلاق دے دی یا کنیز کو بیچ ڈالا' تو عشق و علاقہ کی وہ آگ جو اس کے نہاں خانہ دل میں تھی بھڑک اٹھتی ہے۔جس کے سوز سے وہ دیوانہ ہو جاتا ہے۔

پس جو کوئی چاہتا ہے کہ عذابِ قبر سے نجات پائے تو چاہیے کہ دنیا سے اسے غیر ضروری تعلق نہ ہو۔ مثلاً کسی کو طہارت کی حاجت ہو تو وہ اسے ذو لضرورت عزیز رکھتا ہے۔اور چاہتا ہے کہ قضائے حاجت کی گندگی سے نجات پائے۔ پس اس کی حرص پیٹ میں غذا پہنچانے کے لیے اسی نوع کی ہے جس نوع کی معدے کو خوردہ طعام سے فارغ کرنے کی ہوتی ہے۔ کیونکہ دونوں لازمی ہیں۔اور باقی سب کام بھی اسی طرح سمجھو۔

پس اگر انسان دل کو دنیوی تعلق سے خالی نہ کر سکے تو چاہیے کہ عبادت اور ذکر حق تعالیٰ کی مواظبت کرے اور اُنسِ ذکر کو اپنے دل پر غالب کرے اس طرح کہ وہ دوستیٔ دنیا پر غالب آجائے۔اور ''غلبۂ دوستیٔ خدا بر دوستیٔ دنیا'' کے لیے اپنے آپ سے دلیل اور نشان طلب کرے۔اور وہ دلیل اور نشان یہ ہے کہ وہ شریعت کی پیروی کرتا ہے اور فرمانِ خداوندی کو اپنے نفس کی خواہش پر مقدم رکھتا ہے۔اگر اس کا نفس اس معنی میں (یعنی پیرویٔ شریعت اور فرمانِ خدا کو مقدم جاننے میں) اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار ہو۔تو اسے بھروسہ کرنا چاہئے کہ عذابِ قبر سے رہائی پا گیا۔اور اگر ایسا نہ ہو تو عذابِ قبر کے لیے تیار رہے۔الا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا عفو اس کو پہنچ جائے اور وہ اسے پالے۔

فصلِ دوازدہم: روحانی دوزخ کی تین قسم کی آگ

اب ہمیں روحانی دوزخ کے معنی کی تشریح کرنی چاہیے۔اور روحانی سے ہماری مراد یہ ہے کہ روح کے لیے مختص ہو اور بدن درمیان میں نہ ہو۔ ''نَارُ اللہِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ'' (قرآن: ۱۰۴/۶'۷) (وہ آگ ہے جسے اللہ نے روشن کیا ہے وہ جلاتی ہے آدمی کو یہاں تک کہ اس کے دل تک پہنچ جاتی ہے اور دل کو جلاتی ہے) کے معنی یہی ہیں۔ یہ وہ آگ ہے کہ جس کا غلبہ دل پر ہوگا۔اور وہ آگ جو جسم سے متعلق ہے اسے جسمانی آگ کہا گیا ہے۔ پس اے عزیز جان لے کہ روحانی دوزخ میں تین قسم کی آگ ہوگی: ایک شہواتِ دنیا سے فراق کی آگ' دوسری شرمساری' پشیمانی' خجالتوں اور رسوائیوں کی آگ اور تیسری جمالِ حضرت الٰہیت

سے محرومی اور اس سے نا امیدی کی آگ اور ان تینوں قسم کی آگ کا سروکار جان و دل سے ہوگا نہ کہ بدن سے ' اور ان ہر سہ آتش کے سبب کی شرح لازم ہے جنہیں انسان اس دنیا سے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ اور معنی اس کے ایک مثال سے جو ہم اس جہان سے مستعار لیں گے معلوم ہو جائیں گے۔

پہلی آگ کی صفت: فراقِ شہواتِ دنیا ہے۔ اور اس کا سبب عذابُ القبر کی فصل میں بیان ہو چکا ہے کہ حاجات سے عشق دل کی بہشت بھی ہے اور دل کا دوزخ بھی۔ یہ بہشت ہے جب تک معشوق کے ہمراہ ہو اور دوزخ ہے اگر بغیر معشوق کے ہو۔ پس عاشقِ دنیا' دنیا میں بہشت میں ہوتا ہے'' 'اَلدُّنْيَا جَنَّةُ الْكَافِر' 'اور آخرت میں دوزخ میں ہوتا ہے کیونکہ اس کا معشوق اس سے واپس لے لیا جاتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ایک چیز جہاں باعثِ لذت ہے وہی سبب رنج بھی ہوتی ہے۔ لیکن دو مختلف احوال میں۔

اور دنیا میں اس آگ کی مثال یہ ہے کہ کوئی بادشاہ ہو کہ تمام رُوے زمین اس کی اطاعت و فرماں برداری میں ہو اور بادشاہ ہمیشہ خوبرو کنیزوں' غلاموں اور عورتوں سے تمتع میں مصروف رہتا ہو۔ اور باغوں اور خوب صورت محلات کا نظارہ ہمہ وقت کرتا ہو کہ اچانک ایک دشمن آئے اسے گرفتار کر لے اور غلام بنا لے اور اہل مملکت کے سامنے اسے کتوں کی دیکھ بھال پر مامور کر دے اور اس کے سامنے اس کے اہل و عیال اور اس کی کنیزوں کو کام میں لگائے۔ اور اپنے غلاموں کو ان سے کام لینے کے لیے مامور کر دے تاکہ ان سے کام لیں۔ اور اس کے خزانے میں جو چیز اسے زیادہ عزیز تھی اس کے دشمنوں کو دے دے۔ تو دیکھئے کہ اس مرد معزول کو اس سے کتنی تکلیف ہوگی۔ اور ریاست' زن و فرزند و کنیزک اور نعمت و خزانے کے فراق کی آگ اس کی جان میں لگی ہوئی ہوگی۔ اور اسے جلا رہی ہوگی۔ اور وہ چاہتا ہوگا کہ کاش اسے دفعۃً ہلاک کر دیتے تاکہ اس مسلسل عذاب سے چھوٹ جاتا۔ یہ مثال ایک آگ کی ہے۔ اور جس قدر کثیر نعمتوں اور وسیع تر ولایت کا مالک رہا ہو یہ آگ اسی قدر تیز تر ہوگی۔

پس جس نے دنیا سے جس قدر زیادہ استفادہ کیا ہوگا اور دنیا نے اس کے ساتھ زیادہ مساعدت کی ہوگی اس کا عشق دنیا کے ساتھ اسی قدر زیادہ سخت ہوگا۔ اور فراق کی آگ بھی اس کی جان کے لیے سوزاں تر ہوگی۔ اور ممکن نہیں ہوتا کہ اس آگ کی مثال اس دنیا میں دستیاب ہو۔ اور دل کا وہ رنج جو اس جہان میں ہوتا ہے وہ کلیۃً دل و جان میں متمکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ حواس اور اس دنیا کے مشاغل اس کے دل کو مصروف رکھتے ہیں۔ اور مشاغل دل کے لئے حجاب کی طرح ہوتے ہیں جن کے نتیجے میں عذاب اس کے دل میں جاگزیں نہیں ہوتا۔ اسی بناء پر کہ یہ شخص چونکہ اپنے آنکھ کان یعنی حواس کو کسی امر میں مشغول رکھتا ہے تو رنج اسے کم ہوتا ہے اور

جب فارغ ہوتا ہے تو رنج زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صاحب مصیبت جب سو جاتا ہے تو اس کے دل پر مصیبت کا زخم اس کے دل میں اور گہرا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نیند میں جان پاک ہو گئی ہوتی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ محسوسات کی طرف لوٹے جو کچھ اسے پہنچتا ہے وہ اثر زیادہ کرتا ہے۔ نتیجۃً اگر خواب میں اچھی آواز سنے تو اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے وجہ یہ کہ اس کا دل اس وقت محسوسات سے فارغ ہوتا ہے لیکن اس دنیا کی زندگی میں دل محسوسات سے کلیۃً خالی نہیں ہوتا۔ البتہ جب مر جاتا ہے تو دل اثر محسوسات سے صافی اور مجرد ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کا رنج یا راحت عظیم ہوتا ہے اور اس کے دل میں متمکن ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ گمان نہ کرنا کہ وہ آگ اس آگ کی سی ہوگی جو دنیا میں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس آگ کو تو ستر (۷۰) پانیوں میں دھونے کے بعد دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

دوسری آگ کی صفت: یہ آگ رسوائیوں سے شرم ساری اور پریشانی کی ہوتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک بادشاہ ایک حقیر اور خسیس کو انتخاب کر کے اپنی مملکت کا نائب بنا دیتا ہے۔ اور اسے اپنے حرم میں آنے جانے کی اجازت دیتا ہے۔ نتیجۃً کوئی اس سے پردہ نہیں کرتا۔ بادشاہ اپنا خزانہ بھی اس کی تحویل میں دے دیتا ہے۔ اور ہر کام میں اس پر بھروسہ کرتا ہے۔ یہ کمینہ مرد خسیس جب ان نعمتوں سے بہرہ مند ہوتا ہے تو باطن میں باغی ہو جاتا ہے۔ اور بادشاہ کے خزانے میں متصرف ہو جاتا ہے۔ اور بادشاہ کے اہل و حرم میں خیانت اور فساد برپا کرتا ہے اور بادشاہ کے حضور بظاہر امانت کی نمائش کرتا ہے۔ پس ایک دن وہ اس فساد کے درمیان جو اس کے حرم میں کرتا ہے دیکھتا ہے کہ بادشاہ ایک روزن میں سے اسے دیکھ رہا ہے اور خیال کرتا ہے کہ بادشاہ اسی طرح اسے دیکھتا رہا ہے۔ اور تاخیر اس نے اس لیے کی ہے کہ اس کی یہ خیانت عظیم تر ہو جائے تاکہ یک بارگی اس کی فضیحت کرے اور ہلاک کر دے۔ آپ اندازہ کریں کہ اس رسوائی سے اس مرد کے دل و جان میں پشیمانی کی کیسی آگ بھڑک اٹھے گی۔ حالانکہ اس کا جسم سالم ہوگا۔ اور وہ چاہے گا کہ کاش اس حال میں وہ زمین میں غرق ہو جاتا تاکہ خجالت و تشویر و فضیحت کی اس آگ سے بچ جاتا۔ پس اسی طرح تم بھی دنیا میں عادتاً ایسے کام کرتے ہو کہ جن کا ظاہر بھلا لگتا ہے۔ لیکن اُس چیز کی روح اور حقیقت بُری اور رسوا ہے۔ جب روز قیامت اس چیز کی روح اور حقیقت کھلے گی تو تمہاری رسوائی آشکار ہو جائے گی۔ اور تم پشیمانی کی آگ میں جلنے لگو گے۔ مثلاً آج تم غیبت کا ارتکاب کرتے ہو تو کل قیامت میں اپنے آپ کو ایسے پاؤ گے کہ جیسے اس دنیا میں کوئی اپنے بھائی کا گوشت کھاتا ہو اور گمان یہ کرتا ہو کہ بھنا ہوا مرغ کھا رہا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ جو گوشت وہ کھا رہا ہے اس کے مرحوم بھائی کا ہے تو تم اندازہ کرو کہ اس کی کیا حالت ہوگی اور کیسی آگ اس کے دل میں لگی ہوئی

ہو گی۔ اور غیبت کی روح اور حقیقت یہی ہے اور یہ روح آج تم سے پوشیدہ ہے تو کل (روز قیامت) ظاہر ہو جائے گی۔ اس بناء پر اگر کوئی خواب میں دیکھے کہ وہ مردار کا گوشت کھا رہا ہے تو تعبیر اس خواب کی یہ ہو گی کہ وہ غیبت کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اے عزیز اگر تو ایک پتھر کسی دیوار میں مارے اور کوئی تجھے یہ خبر دے کہ یہ پتھر دیوار چیر کر تمہارے گھر میں جا پڑا ہے اور تمہاری اولاد کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ اور تو جب اپنے گھر میں داخل ہو کر دیکھتا ہے کہ تیرے عزیز فرزندوں کی آنکھیں اس پتھر سے اندھی ہو گئی ہیں۔ جانتا ہے کہ کیسی آگ تیرے دل میں پڑے گی اور تو کیسے رسوا ہو گا۔ وہ شخص جس نے کسی مسلمان سے حسد کیا وہ قیامت میں خود کو اسی صورت میں پائے گا۔ کیونکہ حسد اور اس کی روح کی حقیقت یہی ہے۔ کیونکہ تو دشمنی کا ارادہ کرتا ہے لیکن تیری دشمنی سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن زیان تیری طرف لوٹتا ہے تو تجھے اور تیری عبادات کو تباہ کر دیتا ہے کہ اُس دنیا میں تم بینا ہو گے۔ دیکھو گے کہ تمہاری عبادات محسود کے دیوان میں منتقل کر دیں گے اور تو بے عبادات (خالی ہاتھ) رہ جائے گا۔ اور کل قیامت کو تمہاری عبادت آج تمہاری اولاد کی امید سے بڑھ کر کام آئے گی۔ کیونکہ عبادت ہی تمہاری سعادت کا باعث ہے۔ اور اولاد تمہاری سعادت کا سبب نہیں ہو سکتی۔ پس کل قیامت کو صورتیں ارواح اور حقائق کے تابع ہوں گی۔ اور انسان جس شے کو بھی دیکھے گا کسی پیکر کی صورت میں دیکھے گا اُس صورت میں جو اس معنی کے لائق ہو گی۔ فضیحت اور پشیمانی وہاں ہو گی۔ اس اور سبب سے کہ خواب اُس عالم کے قریب ہے۔ اس لئے خواب میں صورتیں معنی کے مطابق ہوتی ہیں۔ جیسے کہ ایک شخص ابنِ سیرین کے پاس آیا اور بولا: ''میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے ہاتھ میں انگوٹھی تھی اور میں عورتوں کی شرم گاہ اور مردوں میں منہ پر اس سے مہر لگا رہا تھا''۔ ابنِ سیرین نے پوچھا کیا تم موذن ہو اور ماہِ رمضان میں اذان سحر سے پہلے نماز ادا کرتے ہو؟ اس شخص نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا ''جی ایسا ہی ہے''۔ اب تو دیکھ کہ خواب میں کس طرح معاملے کی روح و حقیقت اسے دکھائی گئی کہ نماز کی بانگ کہ ایک آواز کی صورت ہے اور ذکر ہے۔ جب کہ صومِ رمضان میں اس کی روح اور حقیقت کھانے پینے اور مباشرت سے پرہیز ہے۔ اور عجب یہ ہے کہ خواب میں ایک نمونہ قیامت کے مناظر میں دکھایا گیا ہے۔ اور تمہیں ان معانی وحقائق کی کچھ خبر نہیں۔ حدیث میں ہے کہ روزِ قیامت ''دنیا'' کو ایک بدشکل بڑھیا کی صورت میں لایا جائے گا اس انداز سے کہ جو بھی دیکھے فوراً ''نعوذ باللہ منك'' کہہ اُٹھے۔ یہ وہی دنیا ہے جس کے حصول کے لیے تو نے خود کو ہلاکت میں ڈالا''۔ اور جو بھی اسے دیکھے گا اس قدر پشیمان ہو گا کہ چاہے گا کہ خود اسے دوزخ میں لے جائیں تاکہ اس خجالت سے تو چھوٹے۔

ان رسوائیوں کی مثال ایسی ہے کہ حکایت بیان کرتے ہیں کہ بادشاہوں میں سے ایک نے اپنے بیٹے کو بیوی فراہم کردی تھی۔ شاہزادے نے اس رات شراب اپنے ظرف سے بیشتر پی لی اور جب نشے میں مست تھا تو دلھن کی طلب میں نکلا اور جب اس نے دلھن کے حجرے کا قصد کیا رستہ بھول گیا اور محل سے باہر نکل گیا۔ اور چلتا گیا حتیٰ کہ ایک گھر اور اس میں چراغ دکھائی دیا تو گمان کیا کہ دلھن کا حجرہ مل گیا۔ جب اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ محوخواب ہیں۔ اس نے آواز دی لیکن جواب نہ پا کر سمجھا کہ یہ نیند میں ہیں۔ ایک کو دیکھا کہ نئی چادر سے منہ ڈھانپ رکھا ہے۔ بولا: ''یہ دلھن ہے' اس کے ساتھ لیٹ گیا چادر سرکائی تو خوشبو محسوس ہوئی تو کہنے لگا کہ بے شک یہی دلھن ہے جس نے خوشبو کا اہتمام کیا ہے۔ تو دن چڑھنے تک اس سے مباشرت میں لگا رہا زبان اس کے منہ میں ڈالتا جس سے اس کا لعاب اس کے منہ میں پہنچتا تھا۔ اور اس گمان میں تھا کہ وہ اظہار مردمی میں ہے اور دلھن پر گلاب افشانی کر رہا ہے۔ ادھر دن کی روشنی نمودار ہوئی اور اس کا نشۂ شراب بھی کافور ہو گیا تو اس نے دیکھا کہ یہ تو آتش پرستوں کا قبرستان ہے۔ اور جنہیں اس نے محوخواب سمجھا تھا وہ تو مردے تھے۔ اور جس نئی چادر والی کو اس نے دلھن سمجھا تھا وہ ایک بدصورت بڑھیا تھی جو حال ہی میں مری تھی۔ اور وہ خوشبو اس کے حنوط کی تھی اور وہ تمام رطوبتیں جو اسے پہنچتی رہی تھیں مرنے والی کی نجاستیں تھیں۔ جب غور کیا تو اپنے تمام بدن کو نجاست سے آلودہ پایا اور منہ اور گلے میں آب دہان میں تلخی اور ناگواری محسوس کی۔ شاہزادے نے چاہا کہ اس رسوائی اور پشیمانی سے اے کاش مر جائے اور ڈرا کہ اس کا باپ اور اس کا لشکر آ کر اسے اس عالم نجاست میں دیکھے گا۔ اس خیال میں تھا کہ بادشاہ اور سرداران لشکر جو اس کی تلاش میں تھے آ پہنچے۔ اور انہوں نے شاہزادے کو فضیحت کے عالم میں دیکھا۔ شاہزادہ کی کیفیت یہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ زمین میں غرق ہو جائے تا کہ اس رسوائی و فضیحت سے تو چھوٹے۔

پس کل قیامت کو لوگ اہل دنیا کو نیز دنیا کی جملہ شہوات کو ایسی ہی صفت میں دیکھیں گے۔ اور شہوات کی آلودگی سے ان کے دل میں باز ماندہ اثر انہی نجاستوں اور تلخیوں کی مانند ان کے جسم اور ان کے کام و دہن میں باقی رہا ہوگا بلکہ رسواتر اور عظیم تر صورت میں۔

عالم آخرت کے کام کی مثال اس دنیا میں لوگ نہیں پاتے لیکن یہ ایک ادنیٰ نمونہ اس آگ کی تشریح کا ہے جو دل و جان میں وارد ہوگی۔ بدن اس سے بے خبر۔ کہ اسے شرم ساری اور پشیمانی کی آگ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

صفتِ آتش سوم: یہ ہے حسرت کی آگ۔ جمال حضرت الٰہیت سے محرومی اور اس سعادت کے

پانے سے نومیدی کی حسرت۔ سبب اس کا نابینائی اور جہالت ہے جو اس دنیا کے بارے میں تھی کہ انسان نے تعلیم اور مجاہدے سے اس کی معرفت حاصل نہ کی ہوگی۔ اور دل کو بھی پاکیزگی سے بہرہ ور نہ کیا ہوگا۔ کہ جمال حضرتِ الوہیت پس از مرگ اس میں دکھائی دیتا۔ جیسے کہ روشن آئینے میں دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ معصیت اور شہواتِ دنیا کے زنگار نے اس کے دل کو تاریک کر دیا ہوگا تاکہ نابینا رہے۔

اور اس آتش کی مثال ایسے ہے کہ تو فرض کرے کہ ایک قوم کے ساتھ اندھیری رات میں ایک ایسی جگہ پہنچتا ہے جہاں سنگ ریزے بہت ہوتے ہیں لیکن ان کا رنگ نظر نہیں آتا۔ تو تیرے ساتھی کہتے ہیں کہ ''جس قدر سنگ ریزے تم چاہو اٹھالو۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ اس میں بڑی منفعت ہے''۔ اور ان میں سے ہر ایک جس قدر اٹھا سکتا ہے سنگ ریزے اٹھا لیتا ہے۔ اور تو ان میں سے کچھ نہیں اٹھاتا اور کہتا ہے کہ یہ نہایت حماقت کی بات ہے کہ میں نقد رنج اپنے اوپر رکھوں اور بارگراں اٹھاؤں جب کہ یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ کل کسی کام کے بھی ہوں گے یا نہیں۔ اور وہ بارِگراں برداشت کرتے ہوئے وہاں سے چل دیتے ہیں اور تو خالی ہاتھ ان کے ہمراہ ہو جاتا ہے۔ ان پر ہنستا ہے انہیں احمق گردانتا ہے اور ان کا مذاق اڑاتا ہے اور کہتا ہے کہ جسے عقل ہو اور شعور ہو وہ آساں اور آسودہ چلتا ہے جیسے کہ میں چل رہا ہوں اور جو احمق ہو وہ اپنے آپ کو گدھا بنا لیتا ہے اور بوجھ اٹھا لیتا ہے۔ ایک ناممکن طمع میں؛ اور جب دن نکلتا ہے اور روشنی نمودار ہوتی ہے تو دیکھتے ہیں کہ وہ سب موتی ہیں یا یاقوت یا لعل اور ان میں سے ہر ایک کی قیمت لاکھوں دینار ہوگی تو وہ لوگ پشیمان ہوں گے کہ ہم نے بیشتر کیوں نہ اٹھائے اور تو اس نقصان پر کہ تو نے کچھ بھی نہ اٹھایا ہلاک ہو جائے گا اور اس حسرت کی آگ تیری روح میں لگ جائے گی۔ پس دوسرے یہ جواہر بیچ کر روئے زمین کی ولایت خریدیں گے اور جن نعمتوں سے چاہیں گے بہرہ مند ہوں گے۔ اور حظ اٹھائیں گے اور جہاں چاہیں گے جائیں گے۔ اور تجھے بھوکا ننگا رکھیں گے اور تجھے خادم بنا کر سخت کاموں کی انجام دہی کے لیے حکم دیں گے اور ہر چند تو کہے کہ اپنی نعمتوں میں سے کچھ مجھے بھی عنایت کرو''۔ ''اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا ''۔ (قرآن: ۷/۵۰،۵۱) (ہم پر بھی نچھاور کرو اور ہمیں بھی دو کچھ اس آب بہشت میں سے اور اللہ نے جو روزی تمہیں دی ہے اس میں سے ہمیں بھی کچھ کھانے کو دو)'' تو بہشتی ان کے جواب میں کہیں گے کہ ''اللہ نے بہشت کا کھانا پانی کافروں کے لیے حرام کر دیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے کھیل کود کو اپنا دین بنا رکھا تھا'' تو وہ کہیں گے کہ کل رات تو ہمارا مذاق اڑاتا تھا تو آج ہم تمہارا مذاق اڑائیں گے۔ ''اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝'' (قرآن: ۱۱/۳۸)

پس نعمتِ بہشت کے فوت ہونے اور دیدارِ حق تعالیٰ سے محرومی پر حسرت کی مثال ایسی ہی ہے۔ اور یہ جواہر عبادتوں کی مثل ہیں۔ اور یہ تاریکی دنیا کی مثال ہے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے طاعت کے جواہر نہیں چنے اور کہا کہ ہم ادھار نعمت کے لیے نقد رنج کیوں برداشت کریں کہ نسیہ تو مشتبہ ہے۔ وہی کل قیامت کو فریاد کریں گے۔ ''اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ ...... اور کیوں حسرت نہ کھائیں گے کیونکہ کل قیامت کو اللہ تعالیٰ قسما قسم کی سعادتیں اور نعمتیں اہل معرفت و طاعت پر نچھاور کریں گے کہ جن کے مقابلے میں دنیا بھر کی نعمتیں آنی و فانی قرار پائیں گی۔ بلکہ آخر میں اس شخص کو کہ جسے دوزخ سے باہر لائیں گے تو اس قدر اسے عنایت کریں گے کہ وہ اس دنیا کی جملہ نعمتوں سے دس گنا ہوگا۔ اور یہ مماثلت مادی ناپ تول میں نہیں بلکہ یہ تکثیر روحِ نعمت میں ہوگی اور وہ ہے شادمانی اور لذت' جیسے کہ عرف عام میں کہا جاتا ہے کہ یہ گوہر قیمت اور اصلیت میں دس دینار کے برابر ہے تو اس سے مالیت اور ناپ تول مراد نہیں ہوتا۔

فصل سیزدہم: آتش روحانی آتش جسمانی سے کہیں عظیم تر ہے

تو نے تین قسم کی آتش روحانی کو پہچان لیا تو اب یہ بھی جان لے کہ یہ آگ اس آگ سے عظیم تر ہوگی جس سے بدن دوچار ہوگا۔ کیونکہ جسم کو درد سے آگاہی نہیں ہوتی تاوقتیکہ کوئی اثر جان تک نہ پہنچے۔ پس درد جسم سے جان تک پہنچتا ہے تو اس سے عظیم ہو جاتا ہے۔ پس آتش و درد جو جان سے باہر آتا ہے لازماً عظیم تر ہوگا۔ اور یہ آتش جان کے درمیان سے اٹھتی ہے اور باہر سے اندر نہیں آتی۔

اور تمام دردوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ چیز جو طبیعت کا مقتضا ہوتی ہے اس کی ضد اس پر مستولی ہو جاتی ہے اور بدن کی طبیعت کا مقتضا یہ ہے کہ اس کی یہ ترکیب اس کے ساتھ رہے۔ اور اجزاء اس کے مجتمع رہیں۔ اور جب جراحت کے ذریعے سے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں تو اس کی ضد ظہور میں آتی ہے' دردمند ہو جاتا ہے۔ اور جراحت ایک جگہ کو ایک اور جگہ سے الگ کر دیتی ہے۔ اور آگ تمام اجزاء میں سرایت کر جاتی ہے۔ اور انھیں ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔ کیونکہ وہ جسم کے ایک جزو کو دوسرے جزو سے الگ نہیں کرتی بلکہ اس کے تمام اجزاء کو ایک دوسرے سے الگ کر دیتی ہے۔ اس سبب سے آگ سے درد کی تکلیف زیادہ سخت ہوتی ہے۔

پس وہ چیز جو دل کا مقتضا ہوتی ہے جب اس کی ضد متمکن ہو جاتی ہے تو جان میں اس کا درد زیادہ عظیم ہوتا ہے اور طبع دل کا مقتضا خدا کی معرفت ہے اور اس کا دیدار ہے۔ اگر نابینائی کرے جو مقتضائے طبع دل کی ضد ہے اس پر متمکن ہو جائے تو اس کے درد کی انتہا نہ ہوگی۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا کہ دل اس دنیا میں موت سے قبل بیمار

ہو جائیں تو تُو نابینائی (عدم معرفتِ خدا) کو اسی طرح بے انتہا درد کے ساتھ پاتا۔ ولیکن جیسے کہ دست و پا بے حس ہو جاتے ہیں اور ان میں سستی پیدا ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اسی وقت آگ بدن میں سرایت کرے تو محسوس نہ کرے گا لیکن جب سستی کا فتور اس سے جاتا رہے اور وہ آگ میں ہو تو یک بارگی عظیم درد کو پاتا ہے۔ اسی طرح دل دنیا میں بے حس ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بے حسی مرنے پر جاتی رہتی ہے۔ اور پھر دفعتہً یہ آگ جان میں سے لگ جاتی ہے اور کسی اور جگہ سے نہیں آتی۔ کیونکہ وہ خود اسے اپنے ساتھ لائی ہوتی ہے۔ یہ آگ اس کے دل میں ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ انسان علم الیقین سے محروم ہوتا ہے اس لیے اس کو دیکھ نہیں پاتا۔ اب (مرنے پر) عین الیقین حاصل ہو گیا اس لیے اسے جان لیا۔ ''كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ''[1] یہی ہے۔ اور یہ جو شریعت نے بہشت و دوزخ کو جسمانی صفت سے متصف اور بیان کیا ہے وہ اس لیے کہ عامۃ الناس ان کو پہچانیں اور سمجھ سکیں۔ لیکن اگر یہ بات تم کسی سے کہو گے تو وہ اسے حقیر سمجھے گا اور ان کی صعوبت اور عظمت کا ادارک نہ کر سکے گا۔ جیسے کہ تم کسی چھوٹے لڑکے سے کہو کہ کچھ سیکھ لو اگر نہ سیکھو گے تو باپ کی ریاست اور ولایت کے وارث نہ ٹھہرو گے اور اس سعادت کو کھو دو گے۔ تو یہ بات بھی اس کی سمجھ سے بعید ہو گی۔ نہ اس کی عظمت اس کے دل میں جاگزیں ہو گی۔ لیکن اگر تم کہو گے کہ ''استاد تمہاری گوشمالی کرے گا'' تو وہ ڈر جائے گا کہ اسے سمجھ سکتا ہے' اور جیسے کہ استاد کی گوشمالی حق ہے اور باپ کی ریاست سے محرومی کی آگ اس بچے کے لیے جو ادب نہ سیکھے حق ہے۔ اسی طرح جسمانی دوزخ حق ہے۔ اور جمالِ حضرت الٰہیت سے محرومی بھی حق ہے۔ اور جیسے کہ گوشمالی ریاست اور دولت سے محروم رہنے کے مقابلے میں کچھ بھی سزا نہیں ہے۔ اسی طرح دوزخ جسمانی بھی دوزخِ حرمانی کے مقابلے میں خفیف سی تکلیف ہے۔

فصل چہاردہم: دنیا میں روح کے سیر و سفر کی منازل

بے شک تم کہو گے کہ یہ شرح و تفصیل تو جو کچھ جملہ علماء و بیان کرتے ہیں اور معرض تحریر میں لائے ہیں۔ اس کے خلاف ہے۔ علماء تو کہتے ہیں کہ یہ امور سوائے تقلید اور سماع کے جانے نہیں جا سکتے اور بصیرت کو ان میں راہ نہیں ہے۔ جان لو کہ ان کا عذر کیا ہے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے اور ہماری بات اس کے خلاف نہیں ہے۔ آخرت کی شرح میں علماء نے جو کچھ کہا ہے درست ہے لیکن وہ شرحِ محسوسات سے آگے قدم نہیں رکھ سکے اور روحانیت کو یا تو انہوں نے جانا ہی نہیں یا اگر جانا ہے تو اس کی تفصیل اس لیے نہیں کی کہ عامۃ الناس

(۱) (قرآن: ۱۰۲/۵'۶) (اگر تم علم الیقین کو جانتے یقیناً تم دوزخ کی آگ کو دیکھو گے)

کی اکثریت اسے سمجھ نہ سکے گی۔

اور جو کچھ جسمانی ہے وہ صاحبِ شرع کی تقلید اور ان سے سنے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی۔ یہ حقیقتِ روح کی معرفت کی شاخ کی ایک دوسری قسم ہے۔ اور اس کا علم از راہِ بصیرت و مشاہدہ باطن حاصل ہوتا ہے۔ اور اس علم کو وہی پہنچتا ہے جو اپنے وطن سے ہجرت کرتا ہے اور اپنی جائے ولادت میں نہیں رہتا۔ بلکہ دین کی راہ کا سفر اختیار کرتا ہے۔ اس وطن سے ہماری مراد کوئی شہر یا گھر نہیں ہے کہ وہ تو قالب کا وطن ہوتا ہے۔ اور جسمانی سفر کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ لیکن وہ روح کا جو انسان کی حقیقت اور راز ہے۔ مسکن ہے کہ وہاں وجود میں آئی تھی اور وطن اس کا وہاں ہے اور یہاں وہ مسافر ہے۔ اور اس راہ میں اس کی منزلیں ہیں اور ہر منزل ایک نیا عالم ہے۔

اس کی پہلی منزل محسوسات ہے۔ پھر متخیلات، پھر موہومات، پھر معقولات کہ منزل چہارم ہے۔ اپنی حقیقت سے اسی چوتھے عالم میں آگاہ ہوتی ہے۔ اس سے پہلے بے خبر ہوتی ہے۔

اس پہلی منزل کو اور ان عالموں کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آدمی جب تک عالم محسوسات میں ہوتا ہے اس کا درجہ پروانے کا سا ہوتا ہے کہ خود کو چراغ پر مارتا ہے۔ اسے دیکھنے کی حس تو ہوتی ہے لیکن خیال و حافظہ کی نہیں۔ وہ ظلمت سے بھاگتا ہے اور روزن کا طالب ہوتا ہے۔ وہ گمان کرتا ہے کہ چراغ روزن ہے۔ اور خود کو روزن پر دے مارتا ہے جب آگ کی تکلیف پہنچتی ہے تو یہ بات اس کے حافظے میں باقی نہیں رہتی اور نہ اس کے خیال میں ٹھہرتی ہے۔ کیونکہ اسے تو حفظ و خیال کے قوا ہی حاصل نہیں۔ اور وہ اس درجے کو نہیں پہنچا ہوتا۔ اس لیے پھر خود کو چراغ پر دے مارتا ہے۔ اور ہلاک ہوجاتا ہے۔ اگر اسے قوتِ خیال و حفظ کا ودیعہ ہوتا تو اگر اسے ایک راہ سے درد کا سامنا ہوتا تو وہ پھر اس کا اعادہ نہ کرتا، کیونکہ دوسرے حیوانات کو جب ایک دفعہ مارتے ہیں تو جب وہ ڈنڈے کو دیکھتے ہیں تو بھاگ نکلتے ہیں کیونکہ خیال ان کے حافظہ میں باقی ہوتا ہے۔ پس محسوسات پہلی منزل شناخت کی ہے۔

اور منزل دوم متخیلات کی ہے۔ اور جب تک انسان اس منزل میں ہوتا ہے وہ بہائم کے مساوی ہوتا ہے کیونکہ جب تک کسی شے سے ضرر نہیں دیکھتا نہیں جانتا کہ اس سے دور رہنا چاہیے۔ جب ایک دفعہ کسی شے سے رنج پاتا ہے پھر وہ اس سے گریزاں رہتا ہے۔

منزل سوم موہومات کی ہے۔ جب انسان اس درجے کو پہنچا ہوتا ہے تو وہ گھوڑے بکری کے برابر ہوتا ہے کہ نادیدہ رنج سے بھاگتا ہے۔ اور اسے دشمن جانتا ہے۔ جس سے ضرر پہنچے گا۔ کیونکہ بھیڑ بکری جس نے کبھی بھیڑیے کو دیکھا نہیں ہوتا اور گھوڑا جس نے کبھی شیر کو نہیں دیکھا ہوتا تو جب وہ بھیڑیے اور شیر کو دیکھتے ہیں تو

بھاگ نکلتے ہیں۔ کہ جانتے ہیں کہ یہ دشمن ہیں۔ اگر چہ بیل، ہاتھی اور اونٹ صورتاً عظیم الجثہ ہیں وہ ان سے خائف نہیں ہوتے۔ یہ وہ پہچان ہے کہ جوان کے باطن یعنی فطرت میں رکھی گئی ہے جس سے وہ اپنے دشمن کو پہچانتے ہیں۔ لیکن باایں ہمہ وہ چیز جو مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والی ہے اس سے حذر ان کے لیے ممکن نہیں کہ یہ تو چوتھی منزل میں ہوتا ہے۔

چوتھی منزل معقولات کی منزل ہے۔ جب انسان اس منزل میں پہنچتا ہے تو تمام بہایم کی حد سے آگے نکل جاتا ہے۔ یہاں تک بہایم اس کے ہم قدم تھے۔ یہیں وہ عالمِ انسانیت کی پہلی منزل میں پہنچتا ہے۔ تو وہ ایسی چیزیں دیکھتا ہے جن کا ادراک حِس، تخیّل یا وہم کے بس کا نہیں۔ انسان ان کاموں سے جو مستقبل میں ہونے والے ہیں حذر کرتا ہے۔ اور کاموں کی صورت سے ان کی حقیقت اور روح کو کشید کر لیتا ہے۔ اور پالیتا ہے۔ اور ہر چیز کی حقیقت کی حد جو اس چیز کی تمام صورتوں کو شامل ہوتی ہے اس کو پالیتا ہے۔ اور وہ چیزیں جن کا مشاہدہ اس عالم میں ممکن ہے بے انتہا نہیں کیونکہ جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ اجسام ہی میں ہوتا ہے اور اجسام متناہی ہی ہوتے ہیں۔

اور عالمِ محسوسات میں انسان کا تردّد اور اس کی روش زمین پر چلنے کی مانند ہیں۔ اور زمین پر ہر کوئی چل سکتا ہے۔ اور عالمِ چہارم میں اس کی روش محض ارواح اور کاموں کی حقائق ہی کے بارے میں ایسے ہے جیسے پانی پر چلنا۔ اور موہومات کے بارے میں انسانی تردد کشتی نشینی کی طرح ہے جس کا درجہ پانی اور خشکی کے درمیان ہے۔

اور ورائے درجۂ معقولات ایک مقام ہے جو انبیاء و اولیاء اور اہلِ بصیرت کا ہے جو ہوا میں پرواز کی مانند ہے۔ اسی لیے تھا کہ رسول (ﷺ) سے لوگوں نے پوچھا تھا کہ ''کیا عیسیٰؑ پانی پر چلتے تھے؟'' اور آپ (ﷺ) نے فرمایا تھا کہ ہاں صحیح ہے۔ ''وَلَو ازْدَادَ يَقِيناً لَمَشىٰ فِي الْهَوَاءِ'' یعنی اگر اُن کے یقین کا درجہ زیادہ ہو جاتا تو وہ ہوا میں پرواز کرتے۔ پس ان عالموں میں سفر کی انسانی منازل ادراکات ہیں۔ اور انسان آخری منازل میں ہوتا ہے کہ جب درجہ ملائکہ کو پہنچ جاتا ہے۔ پس آخر درجہ بہایم سے اعلیٰ درجاتِ ملائکہ تک منازل آدمی کی معراج (سیڑھی) ہیں۔ اور نشیب و فراز اس کا کام ہے۔ اور انسان معرضِ خطر میں ہوتا ہے کہ وہ اسفل السافلین کی پستی میں جا گرے یا اعلیٰ علیین کی بلندی کو پہنچے اور اس خطر کی عبارت یوں آئی ہے کہ ''اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا'' (قرآن: ۷۲/۳۳) (تو ہم نے دین کی امانت آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں کو پیش کی لیکن ان

سب نے معذرت کی اور اس سے ڈرے۔ لیکن انسان نے بڑھ کر اپنی گردن پر لیا کیونکہ یہ ستمگار اور نادان ہے)۔

اور جو شے جماد کہلاتی ہے، اس کا درجہ نہیں بدلتا اور وہ بے خبر ہوتی ہے۔ پس بے قدر و قیمت ہے اور ملائکہ درجہ علیین میں ہیں۔ اور ان کے لیے ان کے درجے سے باہر کوئی راہ نہیں۔ بلکہ ہر ایک کا درجہ اس پر وقف ہے۔ فرشتے کہتے ہیں ''وَمَا مِنَّا اِلَّا لَہٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ'' (قرآن: ۱۶۴/۲۷) (ہم میں سے کوئی نہیں مگر اس کا عبادت میں مستقر مقرر اور جانا پہچانا ہے)۔ اور بہایم (چوپائے) اسفل السافلین میں سے ہیں۔ اور ان کے لیے بھی ترقی کی کوئی راہ نہیں اور انسان ملائکہ اور بہایم دونوں کے درمیان ہے اور خطر گاہ میں ہے۔ اس کے لیے امکان اس کا بھی ہے کہ بدرجۂ ملائک ترقی کر جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تنزل کر کے بہایم کے درجے میں گر جائے۔ اور امانت کے تحمل کے معنی یہی ہیں کہ انسان نے خطرناک کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ پس سوائے انسان کے کسی کا یارا نہیں کہ بار امانت کو اٹھا سکے۔ اور مقصود یہ ہے کہ تو نے کہا: ''اکثر مخلوق نے یہ باتیں نہیں کہی ہیں'' تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کچھ عجب نہیں کیونکہ مسافر ہمیشہ مقیموں کے برعکس ہوتا ہے اور بیشتر مخلوق مقیم ہوتی ہے اور مسافر بہ ندرت اور جس شخص نے پہلی ہی منزل میں کہ جو محسوسات اور تخیلات کی ہے ڈیرے ڈال دیے تو اسے کبھی حقائق اور کاموں کی روح کا علم نہیں ہو سکتا۔ وہ روحانی نہ ہونے کے باعث روحانیوں کے احکام سے ناآگاہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر یہ تفصیلات کتابوں میں کمتر مذکور ہوئی ہیں۔

آخرت کی پہچان کے بارے میں اسی پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ لوگوں کی سمجھ اس سے زاید کی متحمل نہیں ہوتی بلکہ بیشتر فہم تو جو کچھ بیان ہوا اس کے ادراک سے بھی عاری ہیں۔

فصلِ پانزدہم: آخرت کا انکار تو ادنیٰ گمان کی رو سے بھی روا نہیں

احمقوں کا وہ گروہ جنہیں نہ تو یہ قوت ہوتی ہے کہ کاموں کو اپنی بصیرت سے پہچانیں نہ یہ توفیق ہوتی ہے کہ شریعت کو قبول کریں۔ آخرت کے باب میں حیرت کا شکار ہوتے ہیں اور شک ان پر غالب ہوتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ان پر شہوت غالب ہوتی ہے اور انہیں اپنی طبع کے مطابق یوں لگتا ہے کہ آخرت کا انکار کر دیں تو ان کے باطن میں انکار نمودار ہوتا ہے۔ اور شیطان ان کو آخرت کے تصور سے پاک کر دیتا ہے۔ تو وہ گمان کرتے ہیں کہ دوزخ کے صفات میں جو کچھ آیا ہے وہ ہراساں کرنے کے لیے آیا ہے اور بہشت کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ عشوہ اور فریب ہے اس سبب سے اپنی شہوات کی پیروی میں لگ جاتے ہیں اور شریعت کو اختیار کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو شریعت کے پیرو ہوتے ہیں یہ انھیں بچشم حقارت

دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ گدڑی میں مست ہیں اور فریب زدہ ہیں' ایسے احمق کی بساط کہاں کہ اس قسم کے اسرار کو بدلائل معلوم کر سکے۔ پس اسے یہ دعوت دینی چاہیے کہ شاید ایک ظاہر بات میں تامل کرے اور اس سے کہا جائے کہ: ''اگر تمہارا غالب گمان یہ ہے کہ یہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اور جملہ اولیاء وعلماء وحکماء غلطی پر تھے اور فریب خوردہ تھے اور تو نے اپنی اس انتہائی حماقت کے باوجود ان کی فریب زدگی کا راز پالیا تو کیا یہ ممکن نہیں کہ تم خود غلطی کا شکار ہو گئے ہو۔ اور فریب خوردہ تمہی ہو کہ حقیقتِ آخرت کے علم سے عاری ہو۔ اور عذابِ روحانی کے فہم سے خالی اور عالم محسوسات سے روحانیات کی مثال اور وجہ کو نہ جان سکے ہو۔ اگر ایسے ہو کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم نہ کرے اور کہے: ''جیسے کہ مجھے معلوم ہے کہ دو ایک سے زائد ہوتے ہیں اسی طرح میں جانتا ہوں کہ روح کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اس کو بقا بھی نہیں ہو سکتی اور مرنے کے بعد مجھے کوئی رنج یا راحت نہیں ہونے کی' نہ روحانی نہ جسمانی'' تو سمجھ لینا چاہیے کہ فطرت اس کی تباہ ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس سے کوئی اُمید خیر کی نہیں رکھنی چاہیے۔ گویا وہ اس قوم میں سے ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: ''وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا'' (قرآن: ۱۸/۵۷) (اور اگر تو انہیں راہ راست کی طرف بلائے گا یہ ہرگز اس کی طرف نہ آئیں گے)۔ اور اگر وہ احمق کہے کہ ''اس کا محال ہونا میرے لیے ضروری نہیں کہ یہ ممکن ہے۔ لیکن بعید ہے۔ کیونکہ مجھے یہ حال درحقیقت معلوم نہیں۔ تو ایک ضعیف گمان کے باعث کیونکر تمام زندگی کو پرہیز کی نذر کر دوں اور لذائذ سے دست کش رہوں''۔ تو ہم اس سے کہتے ہیں کہ ''جب تو نے اس قدر اقرار کر لیا ہے تو اب تم پر واجب ہے کہ بحکم عقل شریعت کا راستہ اختیار کرو۔ کیونکہ خطرہ جب عظیم ہو تو ادنیٰ گمان پر بھی اس سے دوری اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر تو چاہے کہ کھانا کھائے اور کوئی کہہ دے کہ اس کھانے کو سانپ نے منہ لگایا ہے تو فوراً کھانے سے ہاتھ کھینچ لے گا۔ اگرچہ گمان یہ بھی ہو کہ اس شخص نے جھوٹ کہا ہے۔ اور اس لیے کہ دروغ باف خود اسے کھانا چاہتا ہے۔ لیکن چونکہ احتمال اس کا بھی ہے کہ اس نے سچ کہا ہو۔ تو تُو خود سے کہے گا کہ اگر میں یہ کھانا نہ کھاؤں تو بھوک کی برداشت آسان ہے۔ اگر کھالوں تو مبادا کہ اس نے سچ کہا ہو اور میں ہلاک ہو جاؤں اسی طرح اگر تو بیمار ہو جائے اور خطرے میں ہو تو کوئی تعویذ شناس کہے کہ ایک درم چاندی دے تاکہ تمہیں تعویذ دوں ایک کاغذ پر اس کا نقش بناؤں کہ تو صحت یاب ہو جائے۔ تو ہر چند کہ تیرا گمان غالب یہ ہو کہ تعویذ کسی طور بھی تندرستی سے متعلق نہیں لیکن تو جی میں کہے گا کہ ممکن ہے یہ سچ کہتا ہو۔ لہٰذا ایک درم کو ہاتھ سے دینا سہل ہے۔ اسی طرح اگر کوئی منجم تجھے کہے کہ جب چاند فلاں منزل میں پہنچے تو فلاں تلخ دوا کھانا تاکہ صحت یاب ہو جاؤ تو تم اس کے کہنے پر یہ رنج برداشت کر لو گے۔ تو تم کہو گے کہ ممکن ہے منجم صحیح کہتا ہو۔ اور اگر

جھوٹ بھی کہہ رہا ہوتو بھی مجوزہ رنج آسان ہے۔ پس کس عاقل فرد کے نزدیک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کا قول اور اولیاء اور حکماء جیسے جملہ بزرگانِ عالم کے اس پر اتفاق کی سند ایک منجم یا تعویذ نویس یا عیسائی طبیب کے قول سے تو کم تر نہیں ہوسکتی جن کے کہنے پر وہ تھوڑی تکلیف برداشت کی لیتا ہے تا کہ اس مصیبت سے جو بڑی عظیم ہوتی رہائی پائے۔ اور ممکن ہے خلاصی پالے اور رنج وزیان جو تھوڑا ہوتا ہے۔ تھوڑا وہ نسبتاً ہوتا ہے۔ جب کوئی حساب کرتا ہے تو دنیا کی عمر کتنی ہے اور ابد سے کہ جس کا اوّل نہیں ہے۔ یہ نسبت ازل کے کہ اس کا آخر نہیں کتنے گنا ہے۔ تو وہ جان لے گا کہ دنیا میں کا یہ رنج اٹھانا آخرت کے اس خطرِ عظیم کے مقابلے میں بہت معمولی بات ہے۔ کیونکہ انسان خود سے کہتا ہے کہ ''اگر سچ کہتے ہیں اور میں اس طرح کے عذاب میں رہوں گا تو کیا کروں گا اور دنیا کی یہ راحت کہ چندروزہ ہے اور گذشتنی ہے اِس سے کیا حاصل؟ کیونکہ ممکن ہے سچ کہہ رہے ہوں''۔

ابد کے معنی یہ ہیں کہ اگر تمام دنیا کو چینہ (دانہ سبل) سے بھر دیں اور ایک مرغ سے کہیں کہ ہر ایک ہزار سال کے بعد چینہ کا ایک دانہ اٹھاتے رہو تو عالم بھر کے چینے کی یہ مقدار ختم ہو جائے گی لیکن ابد میں کوئی کمی واقع نہ ہو پائے گی۔ پس اتنی طویل مدت کوئی عذاب روحانی ہو یا جسمانی ہو یا محض خیالی ہو کیونکر برداشت کیا جاسکتا ہے؟ اور اس کے مقابلے میں اِس دنیا کی زندگی کی کیا حیثیت ہے اور کون عقل مند ہوگا جو نادانی میں عمر کھودے اور نہ جانے کہ احتیاط کی روش اور پرہیز اس قسم کے خطرِ عظیم سے واجب ہے۔ اگرچہ تکلیف کے ساتھ ہو۔ بلکہ اگرچہ ظنی ہو۔ کیونکہ خلق تجارت کے لیے سمندروں کا طویل سفر اختیار کرتی اور بہت رنج اٹھاتی ہے تو سبھی گمان ہی پر ایسا کرتے ہیں۔ اگر اس شخص کو یقین نہیں آخر کمزور گمان تو ہونا چاہیے کہ: اگر اسے اپنے آپ پر شفقت ہو تو احتمالاً بھی اسے اختیار کرے گا۔

اور اسی بناء پر حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے جب وہ ایک ملحد سے مناظرہ کر رہے تھے فرمایا تھا کہ ''اگر وہی درست ہے جو تم کہہ رہے ہو تو تم بھی خلاصی پاؤ گے اور ہم بھی لیکن اگر آخرت کے بارے میں جو میں کہہ رہا ہوں درست نکلا تو ہم تو نجات پا جائیں گے لیکن تم عذابِ ابدی میں گرفتار ہو جاؤ گے''۔ اور امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بات اُس ملحد کے ضعفِ عقل کے پیش نظر کہی ہے۔ اس لیے نہیں کہ انہیں آخرت پر یقین نہ تھا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ یقین کا جو حقیقی راستہ ہے اس کے فہم سے یہ ملحد نابلد ہے۔

پس تجھے یہ پہچان لینا چاہیے کہ جو کوئی بھی دنیا میں سوائے زادِ آخرت کے حصول کے کسی اور مقصد کے لیے مصروفِ عمل ہے پرلے درجے کا احمق ہے اور سبب اس کا اس کی غفلت اور بے فکری ہے کیونکہ شہواتِ دنیا

انہیں موقع ہی نہیں دیتیں کہ اس میں غور کریں۔ ورنہ وہ شخص جو بہ یقین جانتا ہے اور وہ شخص جو بہ گمان غالب جانتا ہے اور وہ شخص جو اس باب میں ادنیٰ گمان رکھتا ہے ان سب پر لازم ہے کہ بحکم عقل اس خطرِ عظیم سے دوری اختیار کریں اور احتیاط اور ایمنی کا رستہ لیں۔ والسلام۔ عنوان مسلمانی کے تحت معرفتِ نفس، معرفتِ حق تعالیٰ، معرفتِ دنیا، اور معرفتِ آخر کا بیان تمام ہوا۔
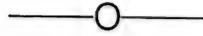
کتاب ارکانِ مسلمانی

بِسۡمِ اللہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ وبہ نستعین

اے عزیز جب تو عنوان مسلمانی کی معرفت سے فارغ ہوگیا' خودکو پہچانا' خدائے تعالیٰ کو پہچانا' دنیا وآخرت کو بھی جان لیا تو اب ہمیں ارکانِ معاملاتِ مسلمانی میں لگ جانا چاہیے۔ کیونکہ ازاں جملہ معلوم ہوگیا کہ انسان کی سعادت حق تعالیٰ کی شناخت اوراس کی بندگی میں ہے۔ اور اصل شناخت ان چار عنوانوں یعنی معرفتِ نفس وحق ودنیاوآخرت کی معرفت سے حاصل ہوئی۔ اور بندگی ان چار رکن سے حاصل ہوتی ہے۔

ایک تو یہ کہ تو اپنے آپ کو عبادات کے لیے آراستہ رکھے کہ یہ رکنِ عبادات ہے۔ دوسرے یہ کہ زندگانی اور حرکت وسکون میں آداب کو ملحوظ رکھے اور یہ رکن معاملات ہے۔ سوم یہ کہ اپنے دل کو ناپسندیدہ اخلاق سے پاک رکھے اور یہ رکنِ مہلکات ہے۔ چہارم یہ کہ اپنے دل کو پسندیدہ صفات سے آراستہ رکھے اور یہ رکن منجیات کا ہے۔

عبادات میں پہلا رکن

اس رکن کی دس اصلیں ہیں۔

اصل اوّل: اپنے اعتقادات اہل سنت درست کرنا

اصل دوم: طلبِ علم میں مشغول ہونا

اصل سوم: طہارت کرنا

اصل چہارم: نماز ادا کرنا

اصل پنجم: زکوٰۃ ادا کرنا

اصل ششم: روزہ رکھنا

اصل ہفتم: حج کرنا

اصل ہشتم: تلاوت قرآن

اصل نہم: ذکر و تسبیح کرنا

اصل دہم: اوراد اور عبادات کو صحیح وقت پر ادا کرنا

اصل اوّل: اہل سنت کے اعتقادات کا حصول

یاد رہے کہ جو کوئی مسلمان ہوتا ہے اسی پر واجب ہے کہ معنیٰ کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ جسے وہ زبان سے ادا کرتا ہے دل سے سچ جانے اور باور کرے۔ اس انداز سے کہ اس میں کسی قسم کا شبہ راہ نہ پا سکے۔ اور جب اس نے باور کرلیا اور دل اس پر ٹھہر گیا اور اس خوبی سے کہ اب اس میں شک کی گنجائش نہ رہے۔ اصل مسلمانی کے کے لیے کافی ہوگا۔ اور امر کو دلیل و برہان سے جاننا ہر مسلمان کے لیے فرض عین نہیں ہے کیونکہ رسول (ﷺ) نے عربوں کو دلیل طلب کرنے اور کلام پڑھنے اور شبہوں کی تلاش اور ان کے جواب کے لیے نہیں کہا۔ بلکہ تصدیق اور باور کرنے پر اکتفا کیا اور عمومِ خلق کا درجہ اسی سے زیادہ کا متقاضی نہیں۔

لیکن لازم ہے کہ ایک گروہ ان میں ایسا ہو جو بات کا طریقہ جانتا ہو اور اس اعتقاد کے لیے دلیل فراہم کرسکتا ہوتا کہ اگر کسی عامی کو شبہ ہو جائے اور وہ دین سے پھر جائے تو اس گروہ کو ایسی پُر اثر زبان کا مالک ہونا چاہیے کہ ایسے شبہ کا ازالہ کرسکیں۔ اور اس فن کو علم کلام کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور یہ فرضِ کفایہ ہے۔ اگر ہر شہر میں ایک یا دو اصحاب جو اس صفت کے مالک ہوں کافی ٹھہریں گے۔ گویا عامی اگر صاحبِ اعتقاد ہوگا تو علمِ کلام والا اس کے اعتقاد کا محافظ اور رہنما ہوگا۔

لیکن حقیقت معرفت کے لیے ایک دوسرا راستہ ہے۔ ورائے ایمان قلبی عامہ اور اعتقادِ استدلالی کے دو مقامات سے اور مقدمہ اس کا مجاہدہ ہے۔ اور جب تک کوئی مجاہدے اور ریاضت کی پوری راہ طے نہیں کرلیتا وہ اسی درجے کو نہیں پہنچتا۔ اور اس کے لیے مناسب نہیں کہ دعویٰ اس کا کرے۔ کیونکہ اس طرح اسے فائدے کی بجائے ضرر زیادہ پہنچے گا۔ اس کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو پرہیز کرنے سے پہلے دوا کھالے تو خطرہ اس بات کا ہوتا ہے کہ ہلاک ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ دارو اس کے معدے کی اخلاط کی صورت اختیار کرلے گا۔ اس بناء پر شفا حاصل نہ ہوگی بلکہ اس کے درد اور بیماری میں اضافہ ہو جائے گا۔

اور جو کچھ عنوانِ مسلمانی کی ذیل میں ہم نے کہا تھا وہ حقیقتِ معرفت کے نشان کا ایک نمونہ ہے۔ تا کہ جو کوئی اس کا اہل ہو اس کی طلب کرے اور اہل اس کا وہ ہے جسے دنیا سے ایسا کوئی تعلق نہ ہو کہ جس سے وہ دنیا میں مستغرق رہے اور تمام عمر سوائے طلب حق تعالیٰ کے کسی اور چیز میں مشغول نہ ہو۔ اس کے علاوہ کوئی اور

اس کا اہل نہیں ہوتا کہ اس معرفت کی حقیقت کو طلب کرے اور یہ کام مشکل بھی ہے اور لمبا بھی۔

پس جو کچھ تمام مخلوق کی غذا ہے ہم اس کی طرف اشارہ کریں گے اور وہ ہے اعتقادِ اہل سنت تا کہ ہر کوئی اس اعتقاد کو دل میں جاگزیں کر لے کیونکہ یہ اعتقاد ہی اس کی سعادت کا بیج قرار پائے گا۔

اعتقادات مسلمانی کا پیدا کرنا

اے عزیز جان لے کہ تو مخلوق ہے اور تیرا پیدا کرنے والا بھی وہ ایک ہے جو تمام عالم اور جو کچھ اس میں ہے اس کا بھی خالق ہے۔ اور وہ واحد لاشریک ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں۔ وہ یگانہ ہے بے ہمتا اور وہ ہمیشہ سے ہے کہ اس کی ہستی کی کوئی ابتداء نہیں اور وہ ابدی ہے اور اس کے وجود کی کوئی نہایت نہیں ہے اور ازل وابد میں اس کی ہستی ناگزیر ہے کہ جس میں فنا کو راہ نہیں اور اس کی ہستی خود اپنی ذات سے ہے اور اسے کسی شے کی حاجت نہیں وہ بے نیاز ہے۔ لیکن کوئی چیز اس سے بے نیاز نہیں۔ بلکہ اس کا قیام خود اس کی اپنی ذات سے ہے۔ جب کہ تمام اشیا کا قیام اسی کا مرہونِ منت ہے۔

تنزیہہ

خداوند تعالیٰ اپنی ذات میں جوہر ہے نہ عرض۔ وہ کسی کالبد میں حلول نہیں کرتا۔ وہ کسی شے کی مانند نہیں نہ کوئی اس کی مانند ہے۔ اس کی کوئی صورت نہیں اور کیف وکم کو اس کی ذات میں راہ نہیں۔ اور جو کچھ چندی و چگونی کے بارے میں خیال دل میں آئے وہ ذات اس سے پاک ہے۔ کیونکہ یہ تمام صفات اُس کی مخلوق کی ہیں اور وہ خود مخلوق کی کسی صفت سے متصف نہیں۔ بلکہ وہم وخیال کے تصورات کا خالق بھی وہی ہے۔ اور خُردی بزرگی یا مقدار کا اس کی ذات سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ یہ صفات تو دنیا کے اجسام کی ہیں اور اللہ تعالیٰ کوئی جسم تو ہے نہیں۔ اور اسے کسی جسم سے تعلق نہیں۔ اور نہیں کہہ سکتے کہ وہ فلاں جگہ ہے یا فلاں جگہ نہیں ہے بلکہ وہ ہرگز جائے گیر نہیں اور جائے پذیر نہیں۔ اور جو کچھ عالم میں ہے سب عرش کے نیچے ہے اور خود عرش اس کی قدرت سے اس کا مسخر ہے اور خود وہ بالائے عرش ہے' نہ اس طرح سے کہ جیسے کہ ایک جسم دوسرے جسم کے اوپر واقع ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ جسم نہیں اور عرش اس کا حامل یا اس کا بار اٹھانے والا نہیں ہے۔ بلکہ عرش اور عرش پر کا بوجھ سب اسی کا اٹھایا ہوا ہے جو اس کے لطف وقدرت کا محمول ہیں اور وہ آج بھی انہی صفات سے متصف ہے جن سے ازلی میں تھا۔ اور جیسے کہ عرش کی تخلیق سے قبل تھا اور ابد تک ایسے ہی رہے گا۔ کیونکہ تغیر وتبدل کو اس کی ذات میں راہ نہیں اور اس کی صفات میں بھی کوئی دخل نہیں۔ کیونکہ تبدیلی اگر کسی کمی کی صفت میں ہو تو خدا کو سزاوار نہیں۔

اور اگر تبدیلی کسی کمال کی صفت میں ہو اور وہ اس پہلو سے ناقص ہو اور اس کمال کا محتاج ہو تو محتاجی تو مخلوق کی صفت ہے جو صفت خالق کی نہیں ہو سکتی۔ اور باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کی صفات سے پاک ہے اس دنیا میں جاننے کے لائق ہے تو عالم آخرت میں دیکھنے کے لائق ہے جس طرح اس دنیا میں اسے بے چون وچگون جانتے ہیں۔ تو اُس جہاں میں اسے بے چون وچگون دیکھیں گے اور آخرت کا دیدار اس دنیا میں کے دیدار کا سا نہیں۔

قدرت

باوجود اس کے کہ خدائے تعالیٰ کسی شے کا سا نہیں ہے لیکن وہ تمام چیزوں پر قادر ہے اور توانائی اس کی بدرجۂ کمال ہے۔ اور کسی قسم کے عجز، کمی یا کمزوری کو اس میں دخل نہیں بلکہ اس نے جو چاہا کیا اور جو چاہے گا کرے گا۔ اور ساتوں آسمان وزمین وعرش وکرسی یعنی کائنات میں جو کچھ بھی ہے اسی کے قبضۂ قدرت میں مقہور ومسخر ہے۔ اور کسی اور کے ہاتھ میں کوئی چیز نہیں اور خلاّقی میں کوئی اس کا مددگار یا شریک نہیں۔

علم

وہ جاننے کے لائق ہر چیز کو جانتا ہے۔ اور علم اس کا ہر شے کو محیط ہے۔ اور عُلیٰ سے ثُریٰ تک کوئی چیز بھی اس کے علم کے بغیر سرمو حرکت نہیں کرتی کیونکہ سب کچھ اس کی قدرت سے ظہور میں آتا اور محوِ عمل ہوتا ہے۔ بلکہ صحرا کی ریت کے ذروں کی تعداد درختوں کے پتوں کا شمار اور دلوں کے افکار کی تعداد اور زمین اور فضا کے ذروں کا شمار اس کے علم میں ایسے ہی ہے جیسے آسمان کی تعداد (کہ سات ہے)۔

ارادت

اور عالم میں جو کچھ بھی ہے سبھی اس کی رضا اور ارادے سے ہے۔ اور کوئی چیز تھوڑی ہو یا کثیر، چھوٹی ہو یا بڑی خیر وشر، طاعت ومعصیت، کفر وایمان، سود وزیاں، کثرت یا کمی، رنج وراحت، بیماری وصحت وغیرہ میں سے کوئی شے بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر، مشیت اور اس کے قضا وحکم کے بغیر حرکت نہیں کرتی۔ اگر جن وانس شیاطین وملائکہ سب مل کر یہ چاہیں کہ عالم کا ایک ذرہ بھی حرکت میں لائیں یا کسی اور جگہ پر رکھیں یا کوئی کمی بیشی چاہیں تو بدون رضائے خداوندی کے سب ناکام رہیں گے اور نہ کر سکیں گے۔ بلکہ جس کو اللہ نہیں چاہتا وہ وجود میں نہیں آتا اور جسے وہ چاہتا ہو تو کوئی چیز یا کوئی شخص اس میں مانع نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ موجود ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے سب اسی کی تدبیر اور تقدیر کا محتاج ہے۔

سمع و بصر

اور جس طرح اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے اسی طرح ہر دیکھنے اور سننے کے لائق چیزوں کو دیکھتا سنتا ہے اور نزدودور اس کی سماعت کے لیے یکساں ہیں۔ اور صفتِ دید کے لیے روشنی اور تاریکی برابر ہیں اور ایک ننھی چیونٹی کے پاؤں کی آواز جب وہ شبِ تاریک میں حرکت میں کرتی ہے تو وہ اسے بھی سنتا ہے۔ اور اس کیڑے کے رنگ اور صورت کو جو زمین کے پاتال میں ہوتا ہے دیکھتا ہے اور اللہ کا یہ دیکھنا سننا اسی طرح بدونِ چشم و گوش ہوتا ہے جس طرح اس کا علم کسی تفکر یا تدبیر کا محتاج نہیں اس کی خلاّقی کسی آلے کی محتاج نہیں۔

کلام

اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری تمام مخلوق پر لازم ہے اور اس کی خبر جس چیز کی خبر بھی اس نے دی ہے سچ ہے۔ اور اس کا وعدہ و وعید حق ہے۔ اور فرمان و خبر وعدہ و وعید سب اسی کا کلام ہے۔ اور وہ زندہ و دانا، توانا بینا اور شنوا ہے۔ کلیم بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بے واسطہ براہ راست بات کی ہے اور گویائی اللہ کی ہماری طرح کام و زباں و لب و دنداں سے نہیں ہوتی جیسے کہ بات انسان کے دل میں بے حرف و صوت ہوتی ہے یعنی کہ کٹی کٹی آواز نہیں ہوتی تو کلام اللہ کا انسان کی مذکورہ صفت سے کہیں زیادہ پاک اور منزہ ہوتا ہے۔ قرآن توراۃ، انجیل اور زبور اور سب پیغمبروں کی کتب اسی کا کلام ہے۔ اور اس کی یہ سخن وری اس کی صفت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی تمام صفات قدیم ہیں اور ہمیشہ سے ہیں۔ اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے دلوں میں معلوم ہے اور زبانوں پر اس کا ذکر ہے ہمارا علم بھی مخلوق و معلوم و قدیم ہے۔ اور ہمارا ذکر بھی مخلوق و مذکور قدیم ہے تو اس کے کلام کی ذات بھی اس طرح قدیم ہے۔ ہمارے دلوں میں محفوظ ہماری زبانوں پر جاری اور مصحف میں مکتوب و محفوظ ہے نامخلوق ہے اور حفظ مخلوق اور مقرر نامخلوق اور قرأت اس کی مخلوق ہے۔ اور مکتوب نامخلوق اور کتابت اس کی مخلوق ہے۔

افعال

عالم اور جو کچھ عالم میں ہے سب خدا کا پیدا کردہ ہے اور جو کچھ اُس نے پیدا کیا اس سے بہتر اور خوب تر ممکن نہیں اور دنیا بھر کے اہلِ خرد کی عقل کو اکٹھا کر لیں اور غور و فکر کریں کہ اس مملکت عالم کی کوئی اور صورت جو موجودہ صورت سے بہتر ہو ممکن ہے یا نہیں۔ یا اس میں کوئی کمی بیشی کریں۔ تو حق یہ ہے کہ نہیں کر سکتے۔ اور اس کی فکر کریں جو موجود سے بہتر ہو تو خطاوار ہوں گے اور حکمت و مصلحت سے غفلت کے ارتکاب کے مستوجب قرار پائیں گے بلکہ ان کی مثال اس نابینا کی سی ہے جو ایک گھر میں داخل ہو جس میں ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ہو

لیکن وہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب ان سے ٹکراتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے ان چیزوں کو راہ میں کیوں رکھا گیا ہے۔ حالانکہ وہ خود کسی سڑک پر نہیں ہوتا۔ لیکن راستے کو دیکھنے پر وہ قادر ہی نہیں۔

پس اللہ نے جو کچھ پیدا کیا کامل عدل وحکمت کے ساتھ تخلیق کیا ہے اور جیسا ہونا چاہیے ویسا ہی پیدا کیا۔ اگر اس سے بڑھ کر ممکن ہوتا اور وہ اُس کے مطابق پیدا نہ کرتا تو یہ بمنزلہ اس کے عجز کے ہوتا یا باعث اس کے بخل کے، اور یہ دونوں صفات اللہ کے لیے محال ہیں۔ پس رنج، بیماری، فقر، جہل وعجز وغیرہ جو تخلیق کیے یہ سب عین عدل ہی ہیں اور اللہ کی طرف سے ظلم ممکن نہیں۔ کیونکہ ظلم وہ ہوتا ہے کہ دوسرے کی مملکت میں تصرف کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کسی دوسرے کی مملکت میں متصرف نہیں ہوتا۔ اور یہ ممکن ہی نہیں کہ ماسوائے اللہ کے کوئی اور بھی اس کے ساتھ مالک ہو۔ کیونکہ جو ہے یا تھا یا ہوگا یا ہوسکتا ہے سب اسی کے مملوک ہیں اور مالک ایک اللہ ہی ہے بس جو بے ہمتا ہے اور لاشریک۔

آخرت

اللہ تعالیٰ نے جو عالم تخلیق کیا ہے یہ دو قسم کا ہے یعنی عالم اجسام اور عالم ارواح اور عالمِ اجسام عالمِ ارواح انسانی کی منزل ہے۔ تاکہ انسان اس دنیا سے زاد آخرت حاصل کریں۔ اور ہر ایک کے لیے اس دنیا میں رہنے کی مدت معین کر دی۔ جس مدت کے تمام ہونے پر موت سے دوچار ہوگا۔ اور اس مدت میں کوئی کمی بیشی نہ ہوگی اس لیے جب موت آتی ہے جان جسم سے جدا ہو جاتی ہے۔

اور قیامت میں جو روز حساب ومکافات ہے اللہ جان کو جسم فراہم کرے گا اور سب کو اٹھائے گا اور ہر کوئی اپنے جملہ اعمال کو ایک نامے میں مرقوم دیکھے گا، کہ اس طرح جو کچھ دنیا میں اس نے کیا تھا یاد دلایا جائے گا۔ اور اسے اپنے کردہ خیر وشر کی مقدار معلوم ہو جائے گی اور یہ ایک ترازو کے ذریعے ہوگا جو اس کام کے لیے موزوں ہوگا۔ اور آخرت کا یہ ترازو اس دنیا کے ترازو کے مشابہ نہ ہوگا۔

صراط

اور پھر سب کو صراط پر سے گذرنے کا حکم ہوگا۔ جو بال سے باریک تر اور تلوار سے تیز تر ہوگا۔ جس نے اس دنیا میں سیدھی راہ لی ہوگی وہ اس صراط سے بآسانی گذر جائے گا اور جس نے دنیا میں کج روی کی ہوگی وہ صراط پر راہ نہ پائے گا اور دوزخ میں گر جائے گا۔ اور سب کو برسر صراط لایا جائے گا تو جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا ہوگا اس کے بارے میں پرسش ہوگی۔ صادقون سے صدق کی حقیقت کا مطالبہ ہوگا اور منافقوں اور ریاکاروں کو شرم سار کیا جائے گا اور وہ پشیمانی سے دوچار ہوں گے۔ ایک گروہ کو حساب کتاب کے بغیر بہشت

میں بھیجا جائے گا اور بعضوں کے ساتھ حساب میں آسانی برتی جائے گی تو بعضوں کے ساتھ سختی۔ اور آخر کار تمام کفار کو دوزخ میں بھیجا جائے گا جو کبھی نجات نہ پاسکیں گے۔ اور اطاعت گذار مسلمانوں کو بہشت میں بھیجا جائے گا۔ اور گناہ گار عاصیوں کو دوزخ میں اور اسی طرح ان کو بھی جنت میں بھیج دیا جائے گا جو انبیاء اور بزرگان ملت کی شفاعت پر معافی سے بہرہ مند ہو جائیں گے اور جس عاصی کی شفاعت نہ ہوگی اسے دوزخ میں لے جایا جائے گا اور گناہوں کے متناسب عقوبت کا سامنا ہوگا اور آخر شفاعتِ رسول (ﷺ) پر بہشت میں منتقل کر دیا جائے گا۔

پیغام بر

جب خدائے تعالیٰ نے یہ تقدیر کر دی تھی اور انسان کے اعمال واحوال کو مقدر کر دیا تھا کہ بعض انسان کی سعادت کا باعث ٹھہریں گے تو بعض اس کی شقاوت کا۔ اور انسان اس بات کو از خود پہچاننے سے قاصر رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے پیغمبروں کو پیدا کیا۔ تو حکم دیا کہ وہ لوگ جنہیں ازل سے اس نے کمال سعادت کا حکم کیا تھا۔ انہیں اس راز سے آگاہ کریں۔ انہیں پیغام دیا اور لوگوں میں بھیجا تاکہ سعادت نیز شقاوت ان پر آشکار کریں۔ تاکہ کسی شخص کو خدائے عزوجل پر حجت باقی نہ رہے۔

اور سب پیغمبروں کے آخر میں ہمارے رسول (ﷺ) کو لوگوں میں بھیجا اور آپ ﷺ کی نبوت کو درجہ کمال کو پہنچایا کہ اب کوئی فزونی اس میں ممکن نہ تھی۔ اسی بناء پر آپ ﷺ کو خاتم انبیاء قرار دیا کہ اب اُن کے بعد اور کوئی پیغمبر نہ ہوگا۔ اور انس وجن میں سے جملہ مخلوق کو آپ ﷺ کی پیروی کا حکم دیا۔ اور آپ ﷺ کو تمام پیغمبروں کا سردار قرار دیا۔ اور آپ کے اصحاب اور یاروں کو جملہ پیغمبروں کے صحابہ اور یاروں سے فضیلت عطا فرمائی۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

اصل دوم: طلب علم کے بارے میں

معلوم رہے کہ رسول (ﷺ) کا فرمان ہے: "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ" یعنی طلب علم تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے اور علماء نے اس باب میں اختلاف کیا ہے کہ یہ علم ہے کون سا؟ متکلم کہتے ہیں کہ یہ علم علمِ کلام ہے کہ اس سے خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور فقہا کہتے ہیں کہ یہ علم فقہ ہے کہ اس سے حلال وحرام متمائز ہوتے ہیں۔ اور محدث کہتے ہیں کہ یہ علم علمِ حدیث ہے۔ اور سنتِ پیغمبر کا علم ہے کیونکہ علوم شرع کی بنیاد یہی ہے۔ اور صوفیاء کہتے ہیں کہ یہ علم علم احوالِ دل ہے کیونکہ انسانی دل ہی اللہ تعالیٰ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ متذکرہ بالا گروہوں میں سے ہر کوئی اپنے علم کی تعظیم کرتا ہے اور ہمارا اختیار کسی ایک علم سے

مخصوص نہیں اور یہ سارے علم واجب بھی نہیں۔ لیکن ایک تفصیل ہے جس سے یہ اشکال دور ہو جائے گا۔

جان لیجیے کہ جو غیر مسلم چاشت کے وقت اسلام لاتا ہے یا مسلمان بالغ ہوتا ہے تو اس کے لیے یہ سارے علم سیکھنا واجب نہیں ہو جاتے۔ لیکن یہ امر فوراً واجب ہو جاتا ہے کہ معنیٰ کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو جانے اور اسے اعتقاد اہل سنت کے مطابق جس کا ذکر اصلِ اوّل میں ہو چکا ہے' جانے۔ اس معنی میں نہیں کہ بہ دلیل جانے کیونکہ یہ لازم نہیں لیکن قبول کرے اور باور رکھے۔ اور وہ پوری تفصیل بھی واجب نہیں۔ لیکن جملہ صفاتِ حق تعالیٰ اور صفاتِ پیغمبر (ﷺ) اور صفاتِ آخرت و بہشت و دوزخ اور حشر نشر پر اعتقاد رکھے کہ اس کا ایک خدا ہے ان صفات سے متصف اور اسی کی طرف سے اس کے رسول کی زبان پر مطالب ہیں کہ اگر ان کی اطاعت کرے گا تو سعادت کو پہنچے گا اور اگر معصیت کا مرتکب ہوگا تو اسے شقاوت پہنچے گی۔ جب اس نے یہ جان لیا تو اس کے بعد دو قسم کا علم اس پر واجب ہو جاتا ہے۔ ایک وہ جو اس کے دل سے تعلق رکھتا ہے تو دوسرا وہ جو اس کے اعضا و جوارح کے اعمال سے متعلق ہے۔ اور جو اعمال جوارح سے متعلق ہے وہ بھی دو نوع کا ہے۔ ایک کرنے کا ہے تو دوسرا نہ کرنے کا جو علم کرنے کا ہے وہ یوں ہے کہ جب کوئی چاشت کے وقت مسلمان ہوتا ہے جس وقت نماز ظہر کا وقت ہو جائے تو اس کے لیے واجب ہو جاتا ہے طہارت اور نماز کا سیکھنا' اس قدر کہ جتنا ان دونوں کا جاننا فرض ہے۔ اور وہ جو سنت ہے اس کا علم بھی سنت ہے فرض نہیں۔ اور اگر مثلاً نماز شام کے وقت کو پہنچے تو نماز شام (مغرب) کا علم اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ اسے علم ہو کہ وہ تین رکعت ہے۔ اور اس سے زاید فرض نہیں۔ اور جب ماہ رمضان آ پہنچے تو رمضان کے روزے کا علم واجب ہو جاتا ہے یعنی اس قدر جانے کہ روزے کی نیت واجب ہے اور آغاز سحر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانا پینا اور مباشرت حرام ہے اور اگر اس کے پاس بیس دینار نیشا پوری ہوں تو علم زکوٰۃ فوراً واجب نہیں ہو جاتا بلکہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب اس پر پورا سال گذر جائے۔ تاکہ جان سکے کہ اس مال کی زکوٰۃ کس قدر ہے اور زکوٰۃ کس کو دینی چاہیے اور شرط اس کی کیا ہے؟

اور علم حج واجب نہیں ہوتا تا آنکہ حج کرنا چاہے۔ کہ وقت اس کا زندگی بھر میں ہے۔ اس طرح انسان کو جس عمل کا بھی سامنا ہو تو اسے سرانجام دینے کے لیے علم ہونا چاہیے۔ مثلاً جب نکاح کرنا چاہے گا تو اس وقت اس کا علم اس پر واجب ہو جاتا ہے تاکہ جانتا ہو کہ بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے اور یہ کہ حیض کی حالت میں مباشرت جائز نہیں ہے۔ حیض کے بعد جب تک طہارت نہ کرے اور ایسے ہی جو کچھ اس سے متعلق ہے اس کا جاننا لازم ہے۔ اور جو پیشہ وہ اختیار کیے ہو اس پیشے کا علم بھی اس پر واجب ہے تاکہ اگر تاجر ہو تو علم

ربوا (سود) اس پر واجب ہے۔ بلکہ لازم ہے کہ بیع کی جملہ شرایط کو جانتا ہو۔ تا کہ باطل بیع سے بچ سکے اور اسی بناء پر تھا کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) اہل بازار کو تازیانہ مارتے اور علم تجارت سے آگاہی کے لیے روانہ کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ جسے بیع کی فقہ (قوانین) معلوم نہ ہوں اسے بازار نشین نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آدابِ تجارت سے ناآگاہ ہونے کے باعث حرام کھائے گا۔ اور ربوا خواری کرے گا اور اسے پتہ ہی نہیں ہوگا کہ روزی اس کی حرام ہے۔ اسی طرح ہر پیشے کا ایک علم ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی جراح ہو تو لازم ہے کہ اسے اس بات کا علم ہو کہ آدمی سے کیا قطع کرنا چاہیے اور کون سے دانت ایسے ہیں کہ انہیں نکال دینا چاہیے۔ اور کس حد تک غور کرنا چاہیے اور زخموں کے لیے مرہم بعمل لائے، وغیرہ وغیرہ۔

اور یہ علوم ہر کسی کے اختلافِ احوال کی مناسبت سے مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً بزاز کے لیے لازم نہیں کہ جراحت کا علم سیکھے۔ اسی طرح جراح کے لیے بزازی کے علم کی حاجت نہیں۔ تو یہ مثالیں کرنے والے کاموں کے لیے ہیں۔ اور جو ناکردنی کام ہیں ان کا علم بھی واجب ہے۔ لیکن وہ بھی ہر کسی کے احوال کی مناسبت سے متفاوت ہے۔ مثلاً اگر کوئی ریشمی لباس پہنے یا ایسی جگہ جہاں شراب پیتے ہوں یا خنزیر کا گوشت کھاتے ہوں یا وہ جگہ غاصبانہ چھینی گئی ہو یا کسی کے پاس حرام مال ہو تو اہل علم کے لیے واجب ہے اسے اس علم سے آگاہ کریں تا کہ وہ شخص ان سے بچے۔ اگر کوئی جگہ جس میں عورتیں بھی مخلوط ہوں کہ وہاں جانے والے کو لازم ہے کہ جانے کہ ان میں سے محرم کون سی ہے اور نامحرم کون سی؟ اور کس پر نگاہ ڈالنا جائز ہے اور کس پر نہیں۔ اور یہ بھی ہر کسی کے احوال کے پیش نظر متفاوت ہوتا ہے کیونکہ مختلف اشخاص مختلف کاموں میں ہوتے ہیں تو ایک پیشہ والے کے لیے لازم نہیں کہ وہ دوسرے پیشہ والے کے کام سے بھی آگاہ ہو۔ مثلاً عورتوں کے لیے واجب نہیں ہے کہ انہیں یہ معلوم ہو کہ مردوں کے لیے عورتوں کو ایام حیض میں طلاق دینا روا نہیں۔ اور مرد کے لیے واجب ہے کہ اس بات سے آگاہ ہو کیونکہ طلاق تو مرد ہی نے دینی ہوتی ہے۔

اور وہ علم جو دل سے متعلق ہے دو نوع کا ہے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ انسان کے لیے واجب ہے کہ جانے کہ کبر و حسد حرام ہے۔ اسی طرح ریا، حقد، عُجب اور بدگمانی وغیرہ سب حرام ہیں۔ اور یہ جملہ مخلوق کے لیے فرضِ عین ہے کہ وہ اس سے آگاہ ہو۔ کیونکہ کوئی شخص اس قسم کی معلومات سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ پس ان برائیوں اور ان کے علاج کا علم سب پر واجب ہے۔ کیونکہ اس نوع کی بیماریاں عام ہیں اور علاج ان کا بغیر علم کے ممکن نہیں۔ لیکن بیع و سلم اجارہ اور رہن اور وہ اجناس جن کا ذکر فقہ میں ہے فرض کفایہ ہے لیکن جو شخص از روئے پیشہ ان سے سروکار رکھتا ہے اس کے لیے ان کا علم بھی فرض عین ہے۔ اور اکثر لوگ اس سے آگاہ نہیں

ہوتے۔لیکن اس علم سے دل عاری نہیں ہوسکتا۔

اور دوسری قسم جو اعتقاد سے تعلق رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی کو اپنے اعتقاد کے بارے میں شک ہو تو لازم ہے کہ وہ اس شک کو دل سے دور کرے۔ جب کہ وہ اس اعتقاد میں کہ اپنی اصل میں واجب ہو یا اس اعتقاد میں کہ جس میں شبہ کی اجازت نہ ہو۔

پس اس تمام بحث سے معلوم ہوا کہ حصول علم تمام مسلمانوں پر فرض ہے اور کوئی مسلم بھی جنسِ علم سے مستغنی نہیں ہے اور وہ علم ایک ہی نوع کا نہیں ہے اور ہر ایک کے حق میں یکساں بھی نہیں۔ بلکہ احوال اور اوقات کے اختلاف کے پیش نظر متغیر ہوتا رہتا ہے۔لیکن کوئی بھی ایک نوع سے اس کی حاجت سے خالی نہیں ہوتا پس اسی بناء پر تھا کہ مصطفیٰ (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''کوئی مسلمان نہیں کہ جس پر طلب علم فرض نہ ہو''۔یعنی اس علم کی طلب جو اس کے عمل کے لیے لازم ہو۔

فصل: دین کے بارے میں بے علمی قابل قبول نہیں

جب یہ معلوم ہو چکا کہ ہر کسی پر اس علم کا سیکھنا جو اس کے معاملات سے متعلق ہے' واجب ہے۔تو اس سے ظاہر ہوا کہ عامی ہمیشہ معرض خطر میں ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے اور وہ نادانی کے باعث اپنے طور پر اسے حل کرے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس باب میں شرعی حکم کیا ہے۔اگر یہ مسئلہ اس شخص کے کاروبار میں اکثر پیش آتا ہو اور نادر نہ ہو تو ایسے شخص کو معذور نہیں سمجھا جائے گا۔مثلاً اگر کوئی بیوی سے حیض کی حالت میں مباشرت کرے یا حیض کے بعد بیوی کے غسل سے پہلے مباشرت کا مستوجب ہو تو اس کا یہ کہنا کہ مجھے اس امر کا علم نہ تھا تو اس کا یہ عذر مسموع نہ ہوگا۔اور اگر کوئی عورت صبح سے پہلے پاک ہو چکی ہو اور نماز شام اور نماز شب ادا نہ کرے اور اسے اس کا شرعی حکم معلوم نہ ہو یا کوئی اپنی بیوی کو ایام حیض میں طلاق دے اور اس نے معلوم نہ کیا ہو کہ یہ حرام ہے۔اسے معذور نہیں سمجھا جائے گا اور اس سے کہیں گے کہ ''تم سے کہا گیا تھا کہ طلب علم فریضہ ہے تو تم اس علم سے دست کش کیوں ہوئے کہ حرام کے مرتکب ہوئے؟'' ہاں اگر کوئی نادر واقع ہو کہ جس کے وقوع کی توقع نہ ہو۔اس وقت اس کے مرتکب کو معذور سمجھا جائے گا۔

فصل: کوئی کام بھی حصولِ علم سے افضل نہیں ہے

جب تجھے معلوم ہو چکا کہ جاہل عامی کسی وقت بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔یہیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی کام جس میں وہ مصروف ہونے والا ہے خود علم سے برتر یا گوارا تر ممکن نہیں۔اور انسان جو پیشہ بھی

اختیار کرے وہ طلب دنیا ہی کے لیے ہوگا۔اور علم دنیا میں بیشتر خلق کے لیے دوسرے پیشوں کی نسبت بہتر ہے کیونکہ علم سیکھنے والا چار حالتوں سے خالی نہیں ہوتا:

یا یہ کہ وہ دنیا سے اپنی میراث یا کسی دوسری جہت سے کفایت کا سامان کرتا ہے۔تو علم اس کے مال کی حفاظت کرے گا۔اور دنیا میں اس کے عزوجاہ کا باعث بنے گا۔اور آخرت میں اس کی سعادت کا باعث ہوگا۔ ایک تو اس قبیل سے ٹھہرا۔

دوم: یہ کہ کوئی شخص ایسا ہو کہ اپنی کفایت کا سامان نہ رکھتا ہو لیکن اس میں قناعت ہو کہ جو کچھ بھی میسر ہو اس پر کفایت کر سکتا ہو۔اور اسلام میں درویشی کی قدر جانتا ہو کہ مفلس صاحبِ مال لوگوں سے پانچ سو سال پہلے بہشت میں داخل ہو جائیں گے تو ایسے شخص کے لیے علم دنیوی آسائش اور آخرت کی سعادت کا سبب ٹھہرے گا

سوم: وہ شخص جو جانتا ہو کہ جب وہ علم سیکھ لے گا تو مالِ حلال بیت المال سے یا کسی مسلمان کے ہاتھ سے اس کو پہنچ جائے گا جو اس کے لیے کافی ہوگا۔بغیر اس کے کہ حرام مال کی طلب کرے یا کسی ظالم بادشاہ کا مرہون منت ٹھہرے۔پس ان تینوں متذکرہ بالا قسم کے لوگوں کے لیے اس دنیا میں طلب علم سے بڑھ کر اور کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

چہارم: ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے جو اپنی کفایت سے محروم ہو۔اور طلب علم سے مقصود اس کا حصول دنیا ہو اور زمانہ ایسا ہو کہ اپنی کفایت سوائے سلطان کے ایسے وظیفے کے جو خراج اور ظلم کی راہ سے آیا ہو یا یوں ہو کہ وہ لوگوں سے ریاکاری یا مذلت کے بغیر حاصل نہ کر سکتا ہو تو ایسے شخص کو اور ہر اس شخص کو کہ جس کا مقصود طلب علم کے ذریعے مال کا حصول ہو اس کے لیے اولیٰ تر یہ ہے کہ حصول علم کا خیال چھوڑ دے اور کسی کام میں لگ جائے۔کیونکہ اس قسم کا شخص انسانی شیاطین میں سے ایک شیطان بن جائے گا جس سے مخلوق میں سے اکثر تباہ ہو جائیں گے کیونکہ ہر عامی جو اسے دیکھے گا کہ وہ حرام لیتا ہے اور حصولِ مال دنیا کے لیے ہر قسم کے حیلے بہانے کرتا ہے تو وہ عامی بھی اس کی پیروی میں لگ جائے گا۔تو ایسے شخص کا فساد صلاح کی نسبت زیادہ فروغ پائے گا۔پس اس قسم کا صاحب علم جتنا کم ہوا تنا ہی بہتر ہے کیونکہ اولیٰ یہی ہے کہ دنیا کو انسان دنیا کے کاموں ہی کے ذریعے طلب کرے نہ کہ دینی کاموں کے وسیلے سے۔اگر کوئی کہے کہ علم انسان کو راہ راست پر لے آتا ہے جیسے کہ ایک گروہ کا قول ہے کہ: ''تَعَلَّمْنَا الْعِلْمَ لِغَیْرِ اللّٰہِ فَاَبَی الْعِلْمُ اَلَّا اَنْ یَکُوْنَ اِلَّا لِلّٰہِ''یعنی''علم ہم نے خدا کے لیے حاصل نہیں کیا لیکن خود علم ہمیں خدا کی راہ پر لے گیا'' تو جواب ان کے اس قول کا یہ ہے کہ وہ علم

کتاب وسنت اور راہِ آخرت کے رموز اور شریعت کے حقائق کا تھا جو انہیں خدا کی راہ پر لے گیا۔ تو اس وقت کی طلب ان کے باطن میں ہوگی کہ وہ دنیا کے شر سے کراہت رکھتے تھے۔ اور بزرگانِ دین کو دیکھتے تھے کہ وہ دنیا سے دامن کش تھے اور وہ آرزومند اس کے تھے کہ ان کی پیروی کریں۔ جب علم ایسا ہوا اور زمانہ ایسا تو وہ امید رکھتے تھے کہ وہ اس علم کی صفت سے متصف ہو جائیں اور علم ان کی پیروی نہ کرے۔

لیکن یہ علوم جو ہمارے زمانے میں حاصل کیے جا رہے ہیں جیسے کہ خلاف[1] و مذہب و کلام و قصص و طامات وغیرہ ہیں اور یہ جو ہمارے زمانے کے معلم ہیں کہ جنہوں نے اپنے جملہ علوم کو احوالِ دنیا کے لیے جال بنا رکھا ہے۔ تو ان سے میل جول یا ان سے تحصیل علم انسان کو دنیا سے دامن کش نہیں بناتی۔ ''وَلَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ'' شنیدہ کے بُوَد مانندِ دیدہ تو دیکھنا ہوگا کہ اس گروہ کے علماء کی اکثریت علمائے دنیا میں سے ہے یا علمائے آخرت میں سے؟ اور مخلوق کو ان کے احوال کے مشاہدے سے فائدہ ہوگا یا نقصان؟

اگر کسی جگہ ایسا شخص ہو جو زیور تقویٰ سے آراستہ ہو اور علمائے سلف کی راہ کا پیرو ہو اور ایسے علم کی تعلیم میں مصروف ہو جس کا ہدف غرورِ دنیا سے تحذیر اور تخویف ہو تو ایسے صاحب علم کی صحبت اور مشاہدہ سب کے لیے نافع ہوگا۔ اس قدر کہ خود تعلیم کی راہ سے اتنا نہ ہو سکے گا۔ اور جب وہ سودمند علم کی تدریس کرے گا تو یہ تمام کاموں سے افضل قرار پائے گا۔ اور سودمند علم وہ ہوتا ہے جس کے ذریعے دنیا کے حقیر ہونے کا پتہ چل جائے۔ نیز آخرت کے کاموں کی عظمت معلوم ہو جائے اور ان کی جہالت اور حماقت جنہوں نے دنیا ہی کو اپنی قبلہ گاہ بنالیا ہے اور آخرت سے منہ پھیرلیا ہے' ظاہر ہو جائے گی تا کہ لوگ کبر و حسد و ریا و عُجب و حرص و شرہ اور حُب دنیا کی حقیقت جانیں اور ان کے علاج کی فکر کریں۔

اور یہ علم اس شخص کے لیے جو حرص دنیا میں مبتلا ہو ایسے ہی ہے جیسے پیاسے کے لیے پانی یا بیمار کے لیے دوا۔ اور ایسے شخص کا فقہ' کلام' خلاف' اور ادب میں مشغول ہونا ایسے ہے جیسے بیمار اپنی تجویز ہی پر کوئی ایسی چیز کھالے جس سے اس کی بیماری مزید بڑھ جائے۔ کیونکہ اس قسم کے بیشتر علم انسان کے دل میں حسد' ریا' مباہات' معادات' رعونت' تشوق' (آزاردہی) تکبر اور طلب جاہ کا بیج دل میں بو دیتے ہیں اور کوئی جس قدر ان علوم کو زیادہ حاصل کرے گا تو متذکرہ عوارض اس کے دل میں محکم تر ہو جائیں گے۔ اور جب اس کی صحبت اور میل جول ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جو اسی نظریہ سے متفق ہوں گے اور اسی میں مشغول ہوں گے تو اس کا اثر یہ

---

(۱) علم خلاف وہ علم ہے جس میں حجت ہائے شرعی کے کوائف سے کارُبری اور ناہم ساز دلائل کی نارسائی کے باب میں بات ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ وہ جدل ہے جو دینی مقاصد سے سروکار رکھتا ہے۔

ربوا (سود) اس پر واجب ہے۔ بلکہ لازم ہے کہ بیع کی جملہ شرایط کو جانتا ہو۔ تا کہ باطل بیع سے بچ سکے اور اسی بناء پر تھا کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) اہل بازار کو تازیانہ مارتے اور علم تجارت سے آگاہی کے لیے روانہ کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ جسے بیع کی فقہ (قوانین) معلوم نہ ہوں اسے بازار نشین نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آدابِ تجارت سے ناآگاہ ہونے کے باعث حرام کھائے گا۔ اور ربوا خواری کرے گا اور اسے پتہ ہی نہیں ہوگا کہ روزی اس کی حرام ہے۔ اسی طرح ہر پیشے کا ایک علم ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی جراح ہو تو لازم ہے کہ اسے اس بات کا علم ہو کہ آدمی سے کیا قطع کرنا چاہیے اور کون سے دانت ایسے ہیں کہ انہیں نکال دینا چاہیے۔ اور کس حد تک غور کرنا چاہیے اور زخموں کے لیے مرہم بعمل لائے' وغیرہ وغیرہ۔

اور یہ علوم ہر کسی کے اختلافِ احوال کی مناسبت سے مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً بزاز کے لیے لازم نہیں کہ جراحت کا علم سیکھے۔ اسی طرح جراح کے لیے بزازی کے علم کی حاجت نہیں۔ تو یہ مثالیں کرنے والے کاموں کے لیے ہیں۔ اور جو ناکردنی کام ہیں ان کا علم بھی واجب ہے۔ لیکن وہ بھی ہر کسی کے احوال کی مناسبت سے متفاوت ہے۔ مثلاً اگر کوئی ریشمی لباس پہنے یا ایسی جگہ جہاں شراب پیتے ہوں یا خنزیر کا گوشت کھاتے ہوں یا وہ جگہ غاصبانہ چھینی گئی ہو یا کسی کے پاس حرام مال ہو تو اہل علم کے لیے واجب ہے اسے اس علم سے آگاہ کریں تا کہ وہ شخص ان سے بچے۔ اگر کوئی جگہ جس میں عورتیں بھی مخلوط ہوں کہ وہاں جانے والے کو لازم ہے کہ جانے کہ ان میں سے محرم کون سی ہے اور نامحرم کون سی؟ اور کس پر نگاہ ڈالنا جائز ہے اور کس پر نہیں۔ اور یہ بھی ہر کسی کے احوال کے پیش نظر متفاوت ہوتا ہے کیونکہ مختلف اشخاص مختلف کاموں میں ہوتے ہیں تو ایک پیشہ والے کے لیے لازم نہیں کہ وہ دوسرے پیشہ والے کے کام سے بھی آگاہ ہو۔ مثلاً عورتوں کے لیے واجب نہیں ہے کہ انہیں یہ معلوم ہو کہ مردوں کے لیے عورتوں کو ایام حیض میں طلاق دینا روا نہیں۔ اور مرد کے لیے واجب ہے کہ اس بات سے آگاہ ہو کیونکہ طلاق تو مرد ہی نے دینی ہوتی ہے۔

اور وہ علم جو دل سے متعلق ہے دو نوع کا ہے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ انسان کے لیے واجب ہے کہ جانے کہ کبر و حسد حرام ہے۔ اسی طرح ریا' حقد' عُجب اور بدگمانی وغیرہ سب حرام ہیں۔ اور یہ جملہ مخلوق کے لیے فرضِ عین ہے کہ وہ اس سے آگاہ ہو۔ کیونکہ کوئی شخص اس قسم کی معلومات سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ پس ان برائیوں اور ان کے علاج کا علم سب پر واجب ہے۔ کیونکہ اس نوع کی بیماریاں عام ہیں اور علاج ان کا بغیر علم کے ممکن نہیں۔ لیکن بیع وسلم اجارہ اور رہن اور وہ اجناس جن کا ذکر فقہ میں ہے فرض کفایہ ہے لیکن جو شخص از روئے پیشہ ان سے سروکار رکھتا ہے اس کے لیے ان کا علم بھی فرض عین ہے۔ اور اکثر لوگ اس سے آگاہ نہیں

ہوتے۔ لیکن اس علم سے دل عاری نہیں ہوسکتا۔

اور دوسری قسم جو اعتقاد سے تعلق رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی کو اپنے اعتقاد کے بارے میں شک ہو تو لازم ہے کہ وہ اس شک کو دل سے دور کرے۔ جب کہ وہ اس اعتقاد میں کہ اپنی اصل میں واجب ہو یا اس اعتقاد میں کہ جس میں شبہ کی اجازت نہ ہو۔

پس اس تمام بحث سے معلوم ہوا کہ حصول علم تمام مسلمانوں پر فرض ہے اور کوئی مسلم بھی جنسِ علم سے مستغنی نہیں ہے اور وہ علم ایک ہی نوع کا نہیں ہے اور ہر ایک کے حق میں یکساں بھی نہیں۔ بلکہ احوال اور اوقات کے اختلاف کے پیش نظر متغیر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن کوئی بھی ایک نوع سے اس کی حاجت سے خالی نہیں ہوتا پس اسی بناء پر تھا کہ مصطفیٰ (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''کوئی مسلمان نہیں کہ جس پر طلب علم فرض نہ ہو''۔ یعنی اس علم کی طلب جو اس کے عمل کے لیے لازم ہو۔

فصل: دین کے بارے میں بے علمی قابل قبول نہیں

جب یہ معلوم ہو چکا کہ ہر کسی پر اس علم کا سیکھنا جو اس کے معاملات سے متعلق ہے، واجب ہے۔ تو اس سے ظاہر ہوا کہ عامی ہمیشہ معرض خطر میں ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے اور وہ نادانی کے باعث اپنے طور پر اسے حل کرے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس باب میں شرعی حکم کیا ہے۔ اگر یہ مسئلہ اس شخص کے کاروبار میں اکثر پیش آتا ہو اور نادر نہ ہو تو ایسے شخص کو معذور نہیں سمجھا جائے گا۔ مثلاً اگر کوئی بیوی سے حیض کی حالت میں مباشرت کرے یا حیض کے بعد بیوی کے غسل سے پہلے مباشرت کا مستوجب ہو تو اس کا یہ کہنا کہ مجھے اس امر کا علم نہ تھا تو اس کا یہ عذر مسموع نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی عورت صبح سے پہلے پاک ہو چکی ہو اور نماز شام اور نماز شب ادا نہ کرے اور اسے اس کا شرعی حکم معلوم نہ ہو یا کوئی اپنی بیوی کو ایام حیض میں طلاق دے اور اس نے معلوم نہ کیا ہو کہ یہ حرام ہے۔ اسے معذور نہیں سمجھا جائے گا اور اس سے کہیں گے کہ ''تم سے کہا گیا تھا کہ طلب علم فریضہ ہے تو تم اس علم سے دست کش کیوں ہوئے کہ حرام کے مرتکب ہوئے؟'' ہاں اگر کوئی نادر واقع ہو کہ جس کے وقوع کی توقع نہ ہو۔ اس وقت اس کے مرتکب کو معذور سمجھا جائے گا۔

فصل: کوئی کام بھی حصولِ علم سے افضل نہیں ہے

جب تجھے معلوم ہو چکا کہ جاہل عامی کسی وقت بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ یہیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی کام جس میں وہ مصروف ہونے والا ہے خود علم سے برتر یا گوارا تر ممکن نہیں۔ اور انسان جو پیشہ بھی

اختیار کرے وہ طلب دنیا ہی کے لیے ہوگا۔ اور علم دنیا میں بیشتر خلق کے لیے دوسرے پیشوں کی نسبت بہتر ہے کیونکہ علم سیکھنے والا چار حالتوں سے خالی نہیں ہوتا:

یا یہ کہ وہ دنیا سے اپنی میراث یا کسی دوسری جہت سے کفایت کا سامان کرتا ہے۔ تو علم اس کے مال کی حفاظت کرے گا۔ اور دنیا میں اس کے عزو جاہ کا باعث بنے گا۔ اور آخرت میں اس کی سعادت کا باعث ہوگا۔ ایک تو اس قبیل سے ٹھہرا۔

دوم: یہ کہ کوئی شخص ایسا ہو کہ اپنی کفایت کا سامان نہ رکھتا ہو لیکن اس میں قناعت ہو کہ جو کچھ بھی میسر ہو اس پر کفایت کر سکتا ہو۔ اور اسلام میں درویشی کی قدر جانتا ہو کہ مفلس صاحبِ مال لوگوں سے پانچ سو سال پہلے بہشت میں داخل ہو جائیں گے تو ایسے شخص کے لیے علم دنیوی آسائش اور آخرت کی سعادت کا سبب ٹھہرے گا

سوم: وہ شخص جو جانتا ہو کہ جب وہ علم سیکھ لے گا تو مالِ حلال بیت المال سے یا کسی مسلمان کے ہاتھ سے اس کو پہنچ جائے گا جو اس کے لیے کافی ہوگا۔ بغیر اس کے کہ حرام مال کی طلب کرے یا کسی ظالم بادشاہ کا مرہون منت ٹھہرے۔ پس ان تینوں متذکرہ بالا قسم کے لوگوں کے لیے اس دنیا میں طلب علم سے بڑھ کر اور کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

چہارم: ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے جو اپنی کفایت سے محروم ہو۔ اور طلب علم سے مقصود اس کا حصول دنیا ہو اور زمانہ ایسا ہو کہ اپنی کفایت سوائے سلطان کے ایسے وظیفے کے جو خراج اور ظلم کی راہ سے آیا ہو یا یوں ہو کہ وہ لوگوں سے ریاکاری یا مذلت کے بغیر حاصل نہ کر سکتا ہو تو ایسے شخص کو اور ہر اس شخص کو کہ جس کا مقصود طلب علم کے ذریعے مال کا حصول ہو اس کے لیے اولیٰ تر یہ ہے کہ حصول علم کا خیال چھوڑ دے اور کسی کام میں لگ جائے۔ کیونکہ اس قسم کا شخص انسانی شیاطین میں سے ایک شیطان بن جائے گا جس سے مخلوق میں سے اکثر تباہ ہو جائیں گے کیونکہ ہر عامی جو اسے دیکھے گا کہ وہ حرام لیتا ہے اور حصولِ مال دنیا کے لیے ہر قسم کے حیلے بہانے کرتا ہے تو وہ عامی بھی اس کی پیروی میں لگ جائے گا۔ تو ایسے شخص کا فساد صلاح کی نسبت زیادہ فروغ پائے گا۔ پس اس قسم کا صاحب علم جتنا کم ہو اتنا ہی بہتر ہے کیونکہ اولیٰ یہی ہے کہ دنیا کو انسان دنیا کے کاموں ہی کے ذریعے طلب کرے نہ کہ دینی کاموں کے وسیلے سے۔ اگر کوئی کہے کہ علم انسان کو راہ راست پر لے آتا ہے جیسے کہ ایک گروہ کا قول ہے کہ: ”تَعَلَّمْنَا الْعِلْمَ لِغَیْرِ اللہِ فَاَبَی الْعِلْمُ اَلَا اَنْ یَکُوْنَ اِلَّا لِلہِ“ یعنی ”علم ہم نے خدا کے لیے حاصل نہیں کیا لیکن خود علم ہمیں خدا کی راہ پر لے گیا“ تو جواب ان کے اس قول کا یہ ہے کہ وہ علم

کتاب وسنت اور راہِ آخرت کے رموز اور شریعت کے حقائق کا تھا جو انہیں خدا کی راہ پر لے گیا۔ تو اس وقت کی طلب ان کے باطن میں ہوگی کہ وہ دنیا کے شر سے کراہت رکھتے تھے۔ اور بزرگانِ دین کو دیکھتے تھے کہ وہ دنیا سے دامن کش تھے اور وہ آرزومند اس کے تھے کہ ان کی پیروی کریں۔ جب علم ایسا ہوا اور زمانہ ایسا تو وہ امید رکھتے تھے کہ وہ اس علم کی صفت سے متصف ہو جائیں اور علم ان کی پیروی نہ کرے۔

لیکن یہ علوم جو ہمارے زمانے میں حاصل کیے جا رہے ہیں جیسے کہ خلاف[1] و مذہب وکلام وقصص و طامات وغیرہ ہیں اور یہ جو ہمارے زمانے کے معلم ہیں کہ جنہوں نے اپنے جملہ علوم کو احوالِ دنیا کے لیے جال بنا رکھا ہے۔ تو ان سے میل جول یا ان سے تحصیل علم انسان کو دنیا سے دامن کش نہیں بناتی۔ ''وَلَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ'' شنیدہ کے بُوَد مانندِ دیدہ تو دیکھنا ہوگا کہ اس گروہ کے علماء کی اکثریت علمائے دنیا میں سے ہے یا علمائے آخرت میں سے؟ اور مخلوق کو ان کے احوال کے مشاہدے سے فائدہ ہوگا یا نقصان؟

اگر کسی جگہ ایسا شخص ہو جو زیورِ تقویٰ سے آراستہ ہو اور علمائے سلف کی راہ کا پیرو ہو اور ایسے علم کی تعلیم میں مصروف ہو جس کا ہدف غرورِ دنیا سے تحذیر اور تخویف ہو تو ایسے صاحب علم کی صحبت اور مشاہدہ سب کے لیے نافع ہوگا۔ اس قدر کہ خود تعلیم کی راہ سے اتنا نہ ہو سکے گا۔ اور جب وہ سودمند علم کی تدریس کرے گا تو یہ تمام کاموں سے افضل قرار پائے گا۔ اور سودمند علم وہ ہوتا ہے جس کے ذریعے دنیا کے حقیر ہونے کا پتہ چل جائے۔ نیز آخرت کے کاموں کی عظمت معلوم ہو جائے اور ان کی جہالت اور حماقت جنہوں نے دنیا ہی کو اپنی قبلہ گاہ بنالیا ہے اور آخرت سے منہ پھیر لیا ہے' ظاہر ہو جائے گی تاکہ لوگ کبر وحسد وریا وعُجب وحرص وشرہ اور حُبِ دنیا کی حقیقت جانیں اور ان کے علاج کی فکر کریں۔

اور یہ علم اس شخص کے لیے جو حرصِ دنیا میں مبتلا ہو ایسے ہی ہے جیسے پیاسے کے لیے پانی یا بیمار کے لیے دوا۔ اور ایسے شخص کا فقہ' کلام' خلاف' اور ادب میں مشغول ہونا ایسے ہے جیسے بیمار اپنی تجویز ہی پر کوئی ایسی چیز کھالے جس سے اس کی بیماری مزید بڑھ جائے۔ کیونکہ اس قسم کے بیشتر علم انسان کے دل میں حسد' ریا' مباہات' معادات' رعونت' تشوق' (آزاردہی) تکبر اور طلب جاہ کا بیج دل میں بو دیتے ہیں اور کوئی جس قدر ان علوم کو زیادہ حاصل کرے گا تو متذکرہ عوارض اس کے دل میں محکم تر ہو جائیں گے۔ اور جب اس کی صحبت اور میل جول ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جو اسی نظریہ سے متفق ہوں گے اور اسی میں مشغول ہوں گے تو اس کا اثر یہ

---

(۱) علم خلاف وہ علم ہے جس میں حجت ہائے شرعی کے کوائف سے کاربری اور ناہم ساز دلائل کی نارسائی کے باب میں بات ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ وہ جدل ہے جو دینی مقاصد سے سروکار رکھتا ہے۔

ہوگا اور اگر وہ چاہے گا کہ اس راہ سے توبہ کرے تو یہ امر اس کے لیے دشوار ہوگا اور وہ توبہ نہ کر سکے گا۔

اصل سوم: طہارت (پاکیزگی) کے باب میں

یاد رہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیۡنَ وَیُحِبُّ الۡمُتَطَهِّرِیۡنَ ''(خدائے تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے محبت کرتا ہے) اور نیز فرماتا ہے کہ: ''اَلطُّھُوۡرُ شَطۡرُ الۡاِیۡمَان ''یعنی پاکیزگی نصف ایمان ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ: ''بُنِیَ الۡاِسۡلَامُ عَلَی النَّظَافَۃِ ''یعنی مسلمانی کی بنا پاکیزگی پر ہے'' پس یہ گمان نہ کرنا کہ یہ فضیلت وعظمت محض اس پاکی کی ہے جو پاکی انسان اپنے بدن اور لباس میں پانی کے وسیلے سے حاصل کرتا ہے بلکہ پاکیزگی کے چار درجے ہیں:

طبقہ اوّل: سرِّ دل کی پاکیزگی ماسوی اللہ سے۔ جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے: ''قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرۡھُمۡ ''(قرآن: ۹۱/۶) (کہہ دو کہ وہ ہے (توراۃ بھیجنے والا اور اسے سکھانے والا) اللہ پس ان کو چھوڑ دے) مقصود اس کا یہ ہے کہ جب کوئی شخص ماسوی اللہ کو ترک کر کے ہمہ تن مصروف بہ حق تعالیٰ ہو جاتا ہے تو یہ گویا کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی تحقیق ہے۔ اور یہ سب صدیقوں کا درجہ ہے۔ اور غیر حق سے پاکی نصف ایمان ہے۔ کیونکہ انسان جب تک غیر حق سے پاک نہ ہوگا اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے آراستہ نہ ہوگا۔

طبقۂ دوم: اخلاقِ پلید سے دل کے ظاہر کی پاکی ہے جیسے حسد وکبر وریا وحرص وعداوت ورعونت وغیرہ ان سے خلاصی۔ تاکہ پاک اور پسندیدہ اخلاق مثلاً تواضع، قناعت، توبہ، صبر، خوف ورجا، محبت وغیرہ سے بہرہ مند ہو سکے۔ اور یہ درجہ متقیوں کے ایمان کا ہے اور اخلاقِ مذموم سے پاکی نصف ایمان ہے۔

طبقۂ سوم: جسم کے اعضا وجوارح کا معصیتوں سے پاک ہونا ہے۔ مثلاً غیبت، دروغ، حرام خوری، خیانت اور نامحرم پر نظر ڈالنا وغیرہ سے پاک رہنا۔ تاکہ انسان تمام کاموں میں ادب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کی خوبی سے آراستہ ہو جائے اور یہ پرہیزگاروں کے ایمان کا درجہ ہے۔ اور اعضا وجوارح کو جملہ حرام شدہ چیزوں سے پاک رکھنا نصف ایمان ہے۔

طبقۂ چہارم: عبارت ہے جسم ولباس کو پلیدیوں سے پاک رکھنے سے۔ تاکہ پورا جسم ارکانِ نماز رکوع وسجود وغیرہ کے لیے آراستہ ہو جائے۔ پاکی کا یہ درجہ مسلمانی کا درجہ ہے کیونکہ مسلمان اور کافر کے معاملات میں ما بہ الامتیاز نماز ہی ہے اور یہ پاکی بھی نصف ایمان ہے۔ اس بناء پر معلوم ہوتا ہے کہ تمام طبقوں میں پاکیزگی اور صفائی نصف ایمان کے مترادف ہے۔ اور اس بناء پر کہ پاکی ہی بیشتر ایمان کا نصف ہے فرمایا: ''بُنِیَ الۡاِسۡلَامَ عَلَی النَّظَافَۃ ''بنائے دین نظافت (پاکیزگی) پر ہے۔ پس جسم ولباس کی طہارت کہ سب نے اس طرف رخ

کیا ہے اور اسی میں نہایت درجہ کوشش کرتے ہیں۔ پاکیزگیوں کا پست تریں درجہ ہے۔ لیکن چونکہ آسان تر ہے اور انسانی نفس اس سے بہرہ ور ہوتا ہے کیونکہ پاکیزگی اچھی شے ہے اور نفس کو اس میں راحت ہوتی ہے اور دوسرے اس کو دیکھتے ہیں اور اس کے پرہیز گار ہونے کی خبر اسی سے پاتے ہیں۔ اسی سبب سے لوگوں کے لیے جسم و لباس کی پاکیزگی زیادہ آسان ہو جاتی ہے۔ لیکن حسد، کبر، ریا اور دنیا و دوستی جیسی برائیوں سے دل کی پاکیزگی اور اعضائے جسم کی گناہ اور معصیت سے پاکیزگی سے نفس بے نصیب ہے۔ اور انسانی آنکھ دل کے احوال دیکھنے کی اہل نہیں۔ کیونکہ مشاہدۂ احوالِ دل اللہ تعالیٰ کے لیے مختص ہے۔ اس لیے صفائے دل کی سعی ہر کوئی نہیں کرتا۔

فصل: احتیاط کن شرائط کے ساتھ روا ہے

اس ظاہری طہارت کا درجہ اگرچہ پائین ترین ہے لیکن فضیلت اس کی بڑی عظیم ہے۔ بشرطیکہ اس کے آداب کو ملحوظ رکھا جائے اور وسوسے اور اسراف کو اس میں راہ نہ دے۔ اگر کوئی حد وسوسہ اور اسراف کو پہنچ جائے تو یہ امر مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ اور ممکن ہے ایسا انسان گناہ گار ٹھہرے اور صوفیوں کی یہ عادت کہ جوراب رکھتے ہیں۔ چادر سر پر اوڑھتے ہیں اور یقینی پاک پانی طلب کرتے ہیں اور لوٹے کو اس بات سے محفوظ رکھتے ہیں کہ کوئی دوسرا اس میں ہاتھ ڈالے یہ سب اچھی باتیں ہیں۔ اور فقہاء میں سے جو لوگ اس کو ملحوظ نہیں رکھتے انہیں نہیں چاہیے کہ ان پر معترض ہوں سوائے ایک شرط کے۔ اور صوفیوں کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ فقہا اور دوسروں پر جو احتیاط نہیں کرتے اعتراض کریں۔ کیونکہ وہ احتیاطیں اچھی ہیں لیکن اس کی چھ شرائط ہیں:

شرطِ اوّل: پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں وقت صرف کرنے کے سبب کسی اور بہتر کام سے محروم نہ رہے۔ اس واسطے کہ اگر کسی کو طلبِ علم میں مشغول ہونے کی استطاعت ہے یا ایسے تفکر میں مصروف ہونے کی قدرت ہے کہ جو کشف میں ازدیاد کا باعث ہو یا ایسے کسب میں متوجہ ہونے کی طاقت ہے کہ جس سے اپنی ذات یا اہل وعیال کی پرورش کی کفایت کرے جس کی بدولت لوگوں سے سوال کی حاجت نہ پڑے اور لوگوں کی دست نگری سے بچے تو اگر احتیاط میں وقت صرف کرنے سے کام میں حرج واقع ہوتا ہو تو اسے ایسی احتیاطوں میں مصروف نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ احتیاطِ طہارت سے اہم تر ہے۔ اور یہی سبب تھا کہ صحابہ ہرگز اس قسم کی احتیاطوں میں نہ پڑتے تھے۔ کیونکہ انہیں جہاد، کسب، طلب علم اور دیگر اہم تر کاموں میں لگنا ہوتا تھا۔ اسی بناء پر تھا کہ ننگے پاؤں ہوتے ننگی زمین پر نماز ادا کر لیتے، زمین پر بیٹھ جاتے کھانے کے بعد ہتھیلیاں پاؤں سے مل لیتے اور جانوروں کے پسینے سے نفرت نہ کرتے کیونکہ وہ جسمانی صفائی کی نسبت دل کی پاکیزگی کے لیے زیادہ کوشاں

رہتے تھے۔ پس اگر کوئی احتیاط نہ کرتا ہو تو صوفیوں کو اعتراض کا حق نہیں پہنچتا اور وہ جو سستی کے سبب احتیاط کو ملحوظ نہ رکھے اس کو حق نہیں کہ اہل احتیاط پر معترض ہو۔ کیونکہ احتیاط کرنا نہ کرنے کی نسبت فاضل تر ہے۔

شرط دوم: یہ ہے کہ انسان خود کو ریا اور اس کی رَعُونت سے بچائے کیونکہ جو کوئی یہ احتیاط کرتا ہے تو اس کا ہیولا سر سے پاؤں تک منادی کر رہا ہوتا ہے کہ: ''میں پارسا ہوں جو خود کو اس طرح پاک رکھے ہوئے ہوں'' اس کو اس میں ایک طمع پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر پاؤں زمین پر رکھتا ہے یا کسی دوسرے کے لوٹے سے طہارت کرتا ہے' ڈرتا ہے کہ اس طرح تو وہ لوگوں کی نگاہوں سے گر جائے گا۔ تو اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو اس امر میں آزمائے۔ اور لوگوں کے سامنے ننگے پاؤں چلے اور رخصت کی راہ لے اور پوشیدہ طور پر احتیاط کا تدارک کرے۔ اگر اس کا نفس اس باب میں اس سے الجھے تو جان لے کہ ریا کی آفت کا شکار ہو گیا ہے۔ تو اب اس پر لازم ہے کہ رخصت کا راستہ لے' ننگے پاؤں چلے۔ ننگی زمین پر بیٹھ جائے اور زمین ہی پر نماز ادا کرے اور احتیاط سے دست کش رہے کیونکہ ریا حرام ہے اور احتیاطِ سنت مستحب اور اگر حرام سے ترک احتیاط کے بغیر بچ نہیں سکتا تو اُس پر احتیاط کو ترک کر دینا واجب ہے۔

شرطِ سوم: یہ ہے کہ انسان کبھی کبھی رخصت سے بھی استفادہ کرے۔ اور احتیاط کو اپنے اوپر فریضہ نہ بنالے۔ جیسے کہ رسول (ﷺ) نے ایک دفعہ ایک مشرک کے کوزے سے بھی وضو کیا تھا۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عیسائی عورت کی صراحی سے طہارت کی تھی۔ اور وہ اکثر موقعوں پر ننگی زمین ہی پر نماز ادا کرتے تھے اور اگر کوئی سونے میں اپنے اور مٹی میں کوئی حجاب نہ کرتا تو اسے محترم تر گردانتے تھے۔ پس جو کوئی ان بزرگوں کی سیرت کا تارک ہوگا اور ناشائستہ کو باقی رکھے گا اور اس کا نفس اسلاف کی موافقت کے لیے مائل نہیں ہوتا تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ نفس نے احتیاط میں میلان پایا ہے۔ تو ایسے شخص کو لازماً احتیاط سے دست کش ہو جانا چاہئے۔

شرطِ چہارم: یہ ہے کہ ہر وہ احتیاط جس سے کسی مسلمان بھائی کے دل کو رنج پہنچنے کا اندیشہ ہو چھوڑ دے۔ کیونکہ کسی کا دل دُکھانا حرام ہے اور ترکِ احتیاط حرام نہیں۔ جیسے کہ کوئی سلام اور معانقے میں چاہے کہ دوسرے کے ہاتھ کو بھی پکڑے لیکن جب دیکھے کہ اس کا ہاتھ پسینہ آلود ہے تو ہاتھ روک لے تو یہ عمل حرام ہوگا۔ بلکہ مسلمان بھائی کی خوشی کے لیے خوش خلقی اور قرابت کا اظہار ایسے وقت میں ہزار احتیاط کی نسبت مبارک تر ہے۔ اسی طرح اگر کوئی اس کے سجادے پر پاؤں رکھ دے یا اس کے لوٹے سے طہارت کرے یا اس کے کوزے سے پانی پی لے تو نہیں چاہئے کہ اسے منع کرے یا کراہیت کا اظہار کرے۔ کیونکہ رسول (ﷺ) نے آبِ زم زم مانگا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ (جو اس وقت لوگوں کو پانی پلانے پر مامور تھے) نے کہا کہ بہت سے لوگوں نے

اس پانی میں ہاتھ ڈلا ہے اس لیے شوریدہ ہو گیا ہے۔ میں آپ کے لئے دوسرا ڈول کنویں میں ڈال کر پانی کھینچتا ہوں' اس پر آپ نے فرمایا نہیں میں یہی پانی پیوں گا کیونکہ مجھے مسلمانوں کے ہاتھوں کی برکت عزیز تر ہے۔

اور اکثر جاہل قاری ان دقائق کا عرفان نہیں رکھتے اور جو کوئی احتیاط نہ کرے خود کو اس سے دور رکھتے ہیں اور اس طرح اس کو رنجیدہ کرتے ہیں یہاں تک کہ ماں باپ بھائی یا رفیق کو ایسے موقع پر کہ ان کے لوٹے یا کپڑے کو ہاتھ لگائیں درشت الفاظ سے نوازتے ہیں۔ یہ سب کچھ حرام ہے کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ احتیاط کے باعث جو واجب نہیں خلق کے لیے آزار کا باعث بنیں اور اکثر قاری اس کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دماغ میں تکبر جاگزیں ہو گیا ہوتا ہے اور لوگوں پر احسان دھرتے ہیں کہ یونہی کرتے ہیں اور اسے غنیمت جانتے ہیں کہ خود کو دوسرے سے دور رکھتے ہیں اور اسے دکھ پہنچاتے ہیں اور اپنی پاکیزگی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور اپنے فخر کا مظاہرہ کرتے ہیں اور دوسروں کو نجس سے مطعون کرتے ہیں۔ معلوم رہے کہ جس طرح صحابہ نے سہولت کو اختیار کیا تھا ہمیں بھی ان کی پیروی میں یہی کرنا چاہیے اور کوئی استنجا میں سنگ ریزے پر اکتفا کرے تو یہ لوگ اسے کبائر میں سمجھتے ہیں اور اس قسم کا طرزِ عمل سراسر خبیث اخلاق میں سے ہے۔ اور نجاستِ باطن کی دلیل ہے۔ ان پلیدیوں سے دل کو پاک رکھنا فرض ہے کیونکہ یہ جملہ ہلاکت کا باعث ہیں اور ترک احتیاط باعثِ ہلاکت نہیں۔

شرطِ پنجم: یہ کہ یہی احتیاط کھانے پہننے اور گفتگو میں ملحوظ رکھے کہ یہ زیادہ اہم ہے اس کو ترک کر دے دلیل اس کی یہ ہے کہ احتیاط رعونت کی بناء پر یا بر بنائے عادت کرتا ہے۔ جیسے کہ کوئی نجس کھانا کھائے ایسے میں کہ اس کی بھوک کے لیے ضروری نہ ہو۔ پھر ہاتھ منہ نہیں دھوتا اور نماز بھی ادا نہیں کرتا۔ اور اتنا بھی نہیں جانتا کہ جو شے پلید ہو وہ حرام ہوتی ہے۔ اگر نجس ہے تو بے ضرورت کیوں کھاتا ہے۔ اور اگر نجس نہیں ہے تو ہاتھ کیوں دھوتا ہے۔ پس جس کپڑے پر عامۃ الناس بیٹھے ہوں نماز کیوں ادا نہیں کرتا۔ اور وہ کھانا جو عوام کے گھر میں پکایا گیا ہو اسے کیوں کھاتا ہے؟ اور احتیاط تو پاکی' لقمہ کے لیے مہم تر ہے۔ اور اس طرح کے اکثر لوگ بازاریوں اور ترکوں کا پکایا ہوا کھانا کھاتے ہیں اور ان کے کپڑے پر نماز ادا کرتے ہیں اور یہ اس کام میں صدق کی علامت نہیں۔

شرطِ ششم: کہ یہ احتیاط منہیات اور منکرات میں ادا نہیں کرتا۔ جیسے کہ طہارت میں تین بار سے زیادہ کرتا ہے اور چوتھی بار کی ممانعت ہے تاکہ طہارت طویل نہ ہو جائے۔ جب کہ کوئی دوسرا مسلمان باری کا منتظر ہو۔ اس لیے یہ مناسب نہیں۔ یا پانی زیادہ از ضرورت برتتا ہے یا نماز کے اول وقت سے تاخیر کرتا ہے یا امام ہو اور اہلِ جماعت کے انتظار میں ہو یا کسی مسلمان سے کسی کام کا وعدہ ہو اور اس کام میں دیر ہو جائے یا اس کے

باعث کسب کار کا وقت نکل جائے اور جس سے اس کے عیال کا ضیاع ہو۔ کیونکہ اس طرح کے کام احتیاط کے سبب کہ فرض نہیں مباح نہیں ہوجاتے ہیں یا فراخ سجادہ زمین پر مسجد میں بچھائے تا کہ کوئی دوسرا اپنا کپڑا نہ پھیلا سکے۔ اس میں تین منکرات ہیں: ایک یہ کہ اس نے مسجد کا ایک ٹکڑا مسلمانوں سے غصب کیا۔ حالانکہ حق اس کا اسی قدر ہے کہ وہ سجدہ کرے۔ دوسرا یہ کہ اس وجہ سے صف مسلسل نہ رہ سکے گی۔ جب کہ سنت یہ ہے کہ نمازی کندھے سے کندھا ملا کر قیام کریں۔ تیسرے یہ کہ وہ مسلمان بھائی سے ایسے حذر کرتا ہے جیسے کتے یا پلیدیوں سے کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے اور ایسے ہی بہت سے منکرات ہیں کہ جاہل قاری احتیاط کے نام پر ان کا ارتکاب کرتے ہیں اور نہیں جانتے۔

فصل: ظاہر طہارت کی اقسام

اے عزیز جب تو نے جان لیا کہ ظاہری طہارت باطنی طہارت سے جدا ہے اور باطن کی طہارت سہ گونہ ہے۔ ایک جوارح کی معاصی سے طہارت دوسرے برے اخلاق سے دل کی پاکیزگی اور تیسرے سرّ کی ماسوی اللہ سے پاکیزگی۔ معلوم رہے کہ طہارت ظاہری بھی تین ہی قسم کی ہے:

قسم اوّل: نجاست سے طہارت: اے عزیز جان لے کہ از قسم جمادات جو کچھ تخلیق کیا گیا ہے سب پاک ہے۔ مگر شراب جو نشہ آور ہے تھوڑی ہو یا بہت پلید ہے۔ مگر چار کس یعنی آدمی، مچھلی و مکڑی اور وہ کہ جس کے جسم میں خون رواں نہیں ہوتا جیسی مکھی، بھڑ، بچھو یا کرم جو کھانے میں پڑ جائے اور جو کچھ جانوروں کے پیٹ میں مستحیل اور متغیر ہو سب پلید ہے۔ مگر وہ جو جانوروں کی اصل ہو جیسے مادۂ منویہ، تخم مرغ، کرم ابریشم اور جو متغیر نہ ہو جیسے پسینہ اور آنسو وہ پاک ہیں۔

اور جو کچھ پلید ہے اس کے ساتھ ادائے نماز نہیں چاہیے سوائے پانچ قسم کے کہ جنھیں بہ سبب دشواری کے معاف کیا گیا ہے؛ ایک استنجا کہ تین ڈھیلے کے بعد بھی اگر اس کا اثر باقی رہے۔ بشرطیکہ اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھا ہو۔ دوسرے شاہراہ کی گیلی مٹی اگرچہ نجاست اس میں دکھائی دیتی ہو لیکن اس قدر کہ جس سے بچا نہ جاسکتا ہو معاف ٹھہرے گی۔ لیکن اگر کوئی اس کیچڑ میں گر جائے یا کوئی جانور اس کے لباس کو آلودہ کردے جو کہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، معاف نہیں۔ تیسری وہ نجاست ہے جو موزے کو لگ جائے لیکن اس مقدار میں کہ جس سے حذر ممکن نہیں وہ بھی معاف ہے۔ جب نماز ادا کرے موزے کو زمین سے مل لے۔ چوتھے جوؤں کا خون تھوڑا ہو یا بہت تمہارے لباس میں ہو یا کسی دوسرے کے لباس میں جسے تم نے پہن رکھا ہو معاف ہے۔ اگرچہ اس

کے ساتھ پسینہ بھی بہہ چکا ہو۔ پانچویں وہ خوناب جو ننھے مساموں میں سے جوش کی صورت میں نکلتا ہے کہ انسان کی کھال اس سے خالی نہیں ہوتی۔ اسی طرح وہ روشن رطوبت جو ان چھوٹے مساموں سے خارج ہوتی ہے سوائے اس کے کثیر ہو اور اس میں سے ریم خارج ہو رہا ہو۔ وہ دُمل کی طرح ہوتی ہے اور نادر بھی۔ اسے دھو کر دور کرنا واجب ہے۔ اور اگر دھونے کے باوجود کچھ نشان اس کا باقی رہ جائے امید ہے معاف ہوگا۔ لیکن اگر کسی کی رگ کٹی ہوئی ہو یا اس نے زخم کھایا ہو تو اس کے خون کو دھونا چاہیے لیکن اگر اس کے آثار باقی ہوں اور اس کا دھونا خطرے سے خالی نہ ہو تو نماز قضا کر دینی چاہیے کہ یہ عذر نادر ہوگا۔

فصل: پاک اور ناپاک پانی

ہر وہ جگہ جو ناپاک ہو، ماسوای کتے کی نجاست کے اگر اس نجاست پر سے پانی گذر جائے پاک ہو جاتی ہے۔ بجز اس کے کہ عین نجاست وہاں باقی ہو۔ پھر اسے دھو کر صاف کرنا چاہیے تا کہ عین نجاست باقی نہ رہے۔ اگر خوب مل کر دھو دی گئی ہو لیکن اس کا رنگ یا بو باقی ہوں، پاک متصور ہوگی۔

اور ہر وہ پانی جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے خود بھی پاک ہے اور پاکیزگی کا ذریعہ بھی۔ سوائے چار قسم کے پانی کے:

ایک وہ پانی جو طہارت میں ایک دفعہ مستعمل ہو چکا ہو۔ وہ پانی ناپاک ہے اور پاکیزگی دہندہ بھی نہیں۔ **دوسرے** وہ پانی جسے تم نے نجاست میں استعمال کیا ہو۔ وہ بھی پاک نہیں اور نہ پاک کنندہ۔ لیکن اگر اس پانی کا رنگ و بو اور مزا نجاست کے سبب تبدیل نہ ہوا ہو پاک ہے۔ **تیسرے** وہ پانی جس کی مقدار ڈھائی سو من سے کم ہو اور نجاست اس میں گر چکی ہو۔ شافعی مسلک کے نزدیک؛ اگرچہ متغیر نہ ہوا ہو پھر بھی پلید ہے، لیکن اگر ڈھائی سو من سے زیادہ ہو تو وہ باوجود اس کے کہ اس میں نجاست گر چکی ہو جب تک وہ پانی متغیر نہ ہو پلید متصور نہ ہوگا۔ **چہارم** وہ پانی جس کا رنگ و بو کسی ایسی پاک چیز سے کہ جس سے محفوظ رکھا جا سکتا تھا جیسے زعفران، صابون و اُشنان یا آٹا وغیرہ سے آلودہ ہو چکا ہو تو یہ ناپاک ہے اور پاکیزگی دہندہ بھی نہیں۔ لیکن آلودگی یا تغیر معمولی ہو تو اسے پاک کنندہ تصور کیا جائے گا۔

قسم دوم:

قضائے حاجت کی طہارت: اس میں پانچ چیزیں معلوم ہونی چاہییں یعنی قضائے حاجت کا طریقہ، استنجا، وضو، غسل و تیمّم۔

کیفیت قضائے حاجت: چاہیے کہ اگر انسان صحرا میں ہو تو لوگوں کی نگاہوں سے دور نکل جائے۔ یا ممکن ہو تو کسی دیوار کے عقب میں چلا جائے اور شرمگاہ کو بیٹھنے سے پہلے عریاں نہ کرے۔ اور منہ آفتاب یا چاند کی طرف نہ کرے۔ اور پشت یا منہ قبلہ کی طرف نہ کرے۔ سوائے اس کے کہ سامنے دیوار ہو، تب جائز ہوگا۔ لیکن زیادہ اچھا یہ ہے کہ قبلہ اس کے دائیں یا بائیں پڑتا ہو۔ اور جہاں لوگوں کی آمد و رفت ہو وہاں یہ حرکت نہیں کرنی چاہیے۔ اور کھڑے پانی میں پیشاب نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح میوہ دار درخت کے نیچے بھی بول و براز سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اور کسی بل میں بھی ٹٹی پیشاب نہیں کرنا چاہیے۔ اور ہوا کے بالمقابل سخت زمین پر پیشاب نہیں کرنا چاہیے تا کہ اس کا ترشح واپس خود اس پر نہ پڑے۔ اور کھڑے ہو کر بدون عذر پیشاب روا نہیں۔ اور وہ جگہ جہاں غسل یا وضو کرتے ہوں پیشاب نہیں کرنا چاہیے۔ بیٹھنے میں بائیں پاؤں پر بیٹھنا چاہیے اور جب انسان طہارت کی جگہ جائے تو بایاں پاؤں پہلے رکھے جب وہاں سے نکلے تو دایاں پاؤں پہلے نکالے۔ اور کوئی ایسی چیز جس پر اللہ کا نام مرقوم ہو ایسی جگہ ساتھ نہیں لے جانی چاہیے اور ننگے سر قضائے حاجت کے لیے نہ جائے۔ اور جب اندر داخل ہو جائے تو یہ دعا پڑھے: ''اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الرِّجسِ الخَبسِ الخبثِ المُخبِثِ الشَّیطانِ الرَّجِیم''۔ (یعنی میں ملعون شیطان کی پلیدی اور آلودگی سے پناہ چاہتا ہوں)۔ اور جب باہر آئے تو کہے ''اَلحمدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذھبَ عَنِّیْ مَا یُؤذِیْنِی و اَبقیٰ عَلَیَّ مَا یَنفَعُنِی'' (یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جو شے مجھے آزار دیتی تھی اسے مجھ سے دور کر دیا اور جو میرے لیے مفید تھی اسے باقی رکھا)۔

کیفیت استنجا: استنجے کے لیے چاہیے کہ انسان تین ڈھیلے قضائے حاجت سے قبل تیار رکھے۔ تو جب قضائے حاجت سے فارغ ہو تو بائیں ہاتھ سے ڈھیلا اس جگہ رکھے جو پلید نہ ہو اس سے اسے نجاست کی جگہ لے جائے اور وہاں پھرائے تا کہ نجاست کو اچک لے اس طرح کہ جائے نجاست سے آگے نہ لے جائے۔ اسی طرح تینوں ڈھیلوں کو استعمال میں لائے۔ اگر نجاست اب بھی باقی ہو تو دو ڈھیلے اور استعمال میں لائے تا کہ کلیۃً عدد طاق رہے۔ پھر ایک بڑا ڈھیلا پکڑے اور عضو تناسل کو بائیں ہاتھ میں لے کر ڈھیلے کو اس سے تین دفعہ چھوئے۔ یا یہی عمل کسی دیوار کے ساتھ کرے۔ تین دفعہ تین جگہوں پر؛ اور حرکت بائیں ہاتھ کو دے نہ کہ دائیں کو۔ اگر اسی پر بس کرے تو کافی ہے۔ لیکن اولیٰ تر ہے کہ ڈھیلوں کے علاوہ پانی سے بھی صاف کرے۔ اور پانی استعمال کرنے کے لیے دوسری جگہ جائے تا کہ پانی اس پر نہ ٹپکے پانی دائیں ہاتھ سے ڈالے اور بائیں سے ملے یہاں تک کہ کف دست سے معلوم ہو جائے کہ اب کچھ اثر باقی نہیں رہا۔ جب معلوم ہو کہ پاک ہو گیا ہے تو مزید پانی نہیں بہانا چاہیے۔ اور یہ کوشش نہ کرے کہ پانی باطن میں چلا جائے۔ استنجے کے وقت خود کو ڈھیلا

چھوڑ دے اس طرح آب دست لینے میں پانی جہاں نہ پہنچے وہ بدن کا باطن ہے وہ نجاست کے حکم سے باہر ہے اور وسوسے میں نہیں پڑنا چاہیے۔

اسی طرح قطرہ جھاڑنے میں تین بار ذکر کے نیچے ہاتھ لے جائے اور تین بار جھٹکے اور تین قدم چلے اور تین بار کھنکارے اور اس سے زیادہ خود کو تکلیف نہ دے کہ جس سے وسواس پیدا ہو۔ اگر اس سب کے بعد محسوس کیا کہ استنجا کرنے کے بعد تری ظاہر ہوئی ہے تو اپنے زیر جامہ پر پانی ڈال دے کہ وہ تری پانی کی معلوم ہو اور رسول (ﷺ) نے وسواس کو دور کرنے کے لیے ایسا ہی فرمایا ہے۔ جب استنجے سے فارغ ہو تو اپنے ہاتھ دیوار یا زمین پر ملے پھر دھوئے تا کہ کچھ بو باقی نہ رہے اور استنجے کے وقت یہ دعا پڑھے: ''اَللّٰھُمَّ طَھِّر قَلبِی مِنَ النِّفَاقِ وَحَصِّن فَرجِی مِنَ الفَوَاحِشِ'' (یعنی اے خدا میرے دل کو نفاق سے پاک کر دے او میری شرم گاہ کو زشتگاری سے امان میں رکھ)۔

کیفیتِ وضو: انسان جب استنجا سے فارغ ہو چکے تو مسواک کرے۔ تو پہلے اوپر کے دانتوں میں دائیں جانب سے آغاز کرے۔ پھر نیچے کے دانتوں میں بائیں جانب پھر دانتوں کی اندرونی جانب اسی ترتیب سے پھر زبان اور تالو میں مسواک کو لے جائے اور مسواک کو اہم جانے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ ''مسواک کے ساتھ ایک نماز سترّ بے مسواک نمازوں کے برابر ہوتی ہے اور مسواک کے وقت یہ نیت کرنی چاہیے کہ ''خدائے تعالیٰ کے ذکر کے راستے کو پاک کرتا ہوں'' قضائے حاجت کے بعد وضو کرے کیونکہ رسول (ﷺ) ایسے ہی کرتے تھے اور مسواک بھی۔

اور جب وضو کسی وجہ سے جاتا رہے تو دوبارہ وضو کر لینا چاہیے۔ اور اگر وضو نہ کرے لیکن محسوس ہو کہ اس کے منہ میں ذائقہ بدل گیا ہے اس بناء پر کہ پیاسا ہو گیا ہو یا زیادہ گفتگو کی ہو یا کوئی بودار چیز کھائی ہو تو ایسے میں مسواک کرنا سنت ہے۔

اور جب اس سے فارغ ہو جائے تو بلند جگہ پر روبقبلہ بیٹھے اور یہ دعا پڑھے: ''بِسمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ اَعُوذُ بِکَ مِن ھَمَزٰتِ الشَّیٰطِینِ وَاَعُوذُبِکَ رَبِّ اَن یَّحضُرُونِ'' (قرآن: ۹۷/۲۳، ۹۸) (اے اللہ مجھے شیطانوں کے وسوسے سے پناہ دے اور اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ شیطان آ موجود ہو)۔ اور تین دفعہ دونوں ہاتھ دھوئے اور کہے: ''اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسئَلُكَ الیُمنَ وَالبَرکَتَ وَاَعُوذُ بِكَ مِنَ الشُّومِ وَالتَّھلُکَۃِ'' (خدایا میں تجھ سے برکت اور افزونی کا خواہاں ہوں اور پریشانی اور ہلاکت کے باب میں تیری پناہ کا طالب ہوں)۔ اور ادائے نماز کی نیت کرے یا پلیدی کو دور کرنے کی نیت کرے اور اس نیت کو

منہ دھونے کے وقت تک قائم رکھے۔ پھر منہ میں تین بار پانی ڈالے اور اپنے تالو میں بھی ڈالے سوائے اس کے روزہ ہو۔ اور کہے: اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَ شُکْرِکَ وَتِلَاوَتِ کُتَابِکَ ' پھر تین بار پانی ناک میں ڈالے اور سانس لے اور کہے: ''اَللّٰھُمَّ اَرِحْنِیْ رَائِحۃِ الْجَنَّۃِ وَاَنْتَ عنی راضٍ '' (خدایا مجھے جنت کی خوشبو سے بہرہ ور کرنا اس حال میں کہ تو مجھ سے راضی ہو)۔ پھر تین دفعہ منہ دھوئے اور کہے: ''اَللّٰھُمَّ بَیِّضْ وَجھی بِنُوْرِکَ یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہُ اَوْلِیَائِکَ '' (خدایا روزِ قیامت جب تو اپنے دوستوں کو سرخرو کرے گا مجھے بھی سرخرو کرنا اپنے نور سے)۔ اور چہرے پر ہر بال کی جڑ تک پانی پہنچائے۔ اور اگر داڑھی کے بال بہت ہوں اور گھنے ہوں تو پانی داڑھی پر ڈالے اور انگلیاں بالوں کے اندر داخل کرے اسی کو خلال کرنا کہتے ہیں۔ اور جو کچھ چہرے کی طرف سے بُنِ گوش سے لے کر گوشۂ پیشانی تک چہرے ہی کے حدود میں داخل ہے۔ اور انگلی گوشۂ چشم میں داخل کرے تا کہ سرمہ وغیرہ کا کوئی ریزہ آنکھ میں ہو تو باہر نکل جائے۔ پھر تین بار دائیں ہاتھ کو میان بازو تک دھوئے اور جتنا بازو کے نزدیک تر دھوئے گا اتنا ہی اچھا ہوگا اور ساتھ ہی یہ دعا کرے: ''اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِیْ کِتَابِیْ بِیَمِیْنِ وَحَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَّسْرا '' (یارب میرا نامہ اعمال میرے دائیں ہاتھ میں دے اور حساب لینے میں نرمی فرما)۔ پھر اسی طرح بائیں ہاتھ کو دھوئے اور انگوٹھی (اگر ہو تو) کو حرکت دے تا کہ پانی اس کے نیچے بھی گذر جائے۔ اور پھر یہ دعا کرے: ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ اَنْ تُعْطِیَنِیْ کِتَابِیْ بِشِمَالِیِ اَوْمِنْ وَّرَاءِ ظَھْرِیْ '' (میں خدا کی پناہ طلب کرتا ہوں اس امر سے کہ میرا نامۂ اعمال میرے بائیں ہاتھ میں شمال سے دیا جائے یا پیٹھ پیچھے سے)۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ پانی سے تر کرے اور انگلیوں کے سروں کو باہم ملا کر سر کے اگلے حصے پر رکھ کر پیچھے کی طرف لے جائے اور پھر واپس نقطۂ آغاز کی طرف لے جائے۔ تا کہ بالوں کی دونوں جانبین تر ہو جائیں۔ یہ گویا ایک بار ہے۔ اس طرح تین بار کرے جس سے کہ تمام سر کا مسح ہو جائے اور یہ دعا کرے:
''اَللّٰھُمَّ غَشِّنِیْ بِرَحْمَتِکَ وَاَنْزِلْ عَلَیَّ مِنْ بَرَکَاتِکَ وَاَظِلَّنِیْ تَحْتَ عَرْشِکَ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلَّکَ '' (خدایا مجھے رحمت کا جامہ عطا کر اور اپنی برکات سے بہرہ مند کر اور اس دن کہ جس میں سوائے تیرے سائے کے اور کوئی سایہ نہ ہوگا مجھے اپنے عرش کے سائے میں پناہ دینا)۔ پھر دونوں کانوں کا مسح تین بار کرے اور انگلی کان کے سوراخ میں داخل کرے اور انگوٹھے سے پشت گوش کا مسح کرے۔ اور کہے: ''اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہ '' (خدایا مجھے ان لوگوں میں شمار ہونے کی جگہ دے جو بات کو غور سے سنیں اور بات کے بہترین کی پیروی کریں)۔ پھر پوری پشت گردن پر مسح کرے اور یہ دعا کرے: ''اَللّٰھُمَّ فکِّ رَقَبَتِیْ مِنَ النَّارِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ السَّلَاسِلَ وَالْاَغْلَال '' (اے خدا مجھے آگ سے دور رکھنا اور زنجیر و بند سے

پناہ دینا)۔اس کے بعد دایاں پاؤں تین بار میان ساق تک دھوئے اور انگلیوں کے درمیان بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے نیچے کی طرف سے خلال کرے اور ابتدا دائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی کی طرف سے کرے اور ختم بائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی پر کرے اور کہے: ''اَللّٰھُمَّ ثَبِّتْ قَدَمَیَّ عَلَی الصِّرَاطِ یَوْمَ تَزِلُّ مِنْہُ الْاَقْدَامُ'' (خدایا پل صراط پر میرے قدم استوار رکھنا اس دن کہ جب پاؤں پھسل رہے ہوں گے)۔اور اسی طرح بائیں پاؤں کو دھوئے اور کہے: ''اَعُوْذُبِکَ اَنْ تَزِلَّ قَدَمَیَّ عَلَی الصِّرَاطَ یَوْمَ تَزِلُّ اَقْدَامُ الْمُنَافِقِیْنَ'' (اے خدا میں تجھ سے اس کی پناہ مانگتا ہوں کہ میرے پاؤں صراط پر سے پھسلیں اس روز کہ جب منافقین کے پاؤں پھسلیں گے)۔اور جب وضو سے فارغ ہو جائے تو یہ کہے: ''اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ، وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ؛ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنْ عِبَادِکَ الصَّالِحِیْنَ'' (میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا یگانہ اور لاشریک ہے اور محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے۔اے خدا مجھے توبہ کرنے والوں، پاکیزہ لوگوں اور اپنے نیکوکار بندوں کی صف میں جگہ عطا فرما) ۔اور جو عربی نہیں جانتا تو اسے ان دعاؤں کے معنی معلوم ہونے چاہییں تاکہ خود بھی معلوم ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔اور حدیث میں ہے کہ جو شخص وضو کے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اس کے جسم کے جملہ اعضا و جوارح تمام گناہوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔اور وہ خطائیں بھی جو اس سے سرزد ہوتی ہوں۔اور اگر اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کرے گا تو اس کے جسم کے وہی حصے پاک متصور ہوں گے جنہیں اس نے پانی سے دھویا ہو۔

اور چاہیے کہ ہر نماز کے لیے از سر نو وضو کرے۔اگرچہ سابقہ وضو بحال ہو۔کیونکہ حدیث میں ہے کہ جو کوئی تازہ وضو کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا ایمان تازہ کر دیتے ہیں۔اور جب وضو تمام کر لے تو جان لے بیرون جسم تو لوگوں کی نظارہ گاہ ہے جسے اس نے پاک کیا ہے۔اللہ تعالیٰ کی نظارہ گاہ تو دل ہے تو اگر دل کو ناپسندیدہ اخلاق سے بذریعہ توبہ پاک نہ کرے گا تو اس کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو بادشاہ کی مہمانی کرنے والا ہو وہ اپنے گھر کے بیرونی حصے میں تو صفائی کر کرا دے اور وہ بلند صدر نشین جو بادشاہ کی نشست گاہ ہونے والی ہے اسے پلید ہی چھوڑ دے۔

فصل: معلوم رہے کہ وضو کے دوران یہ چھ چیزیں مکروہ ہیں

باتیں کرنا، ہاتھ منہ پر رکھنا، اور تر ہاتھوں کو جھٹکنا، اور دھوپ سے گرم شدہ پانی سے وضو کرنا، اور ضرورت سے زیادہ پانی بہانا، اور تین دفعہ پر زیادہ کرنا، اور چہرے کو اس بناء پر خشک کرنا کہ اس پر گرد و غبار نہ بیٹھے یا اس

غرض سے خشک نہ کرنا کہ عبادت کا اثر باقی رہے۔ یہ دونوں صورتیں منقول ہیں تو دونوں کی اجازت ہے۔ جب نیت یہی ہو جو مذکور ہوئی دونوں میں فضیلت ہے۔ اور مٹی کے بڑے ظرف کے ساتھ وضو کرنا آفتابے اور طاس کی نسبت بہتر ہے نیز کسر نفسی کے بھی قریب ہے۔

کیفیتِ غسل: جو کوئی اپنی بیوی سے صحبت کرے یا محتلم ہو' بیداری میں یا خواب میں' غسل اس پر واجب ہو جاتا ہے۔ اب اس کا فرض ہے کہ پورے بدن کو دھوئے اور پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچائے اور گناہ کو دور کرنے کی نیت کرے۔ لیکن سنت طریقہ یہ ہے: پہلے بسم اللہ پڑھے' پھر تین دفعہ ہاتھ دھوئے اور بدن جہاں جہاں سے پلید ہو چکا ہو ان جگہوں کو بھی دھوئے۔ پھر جیسے کہ ہم بیان کر چکے ہیں' ان تمام سنتوں کے ساتھ وضو کرے اور پاؤں دھونے میں تاخیر کرے تا کہ غسل سے فارغ ہو جائے۔ پھر تین بار پانی جسم کے دائیں جانب ڈالے اور پھر بائیں پہلو پر ڈالے پھر تین بار پانی سر پر ڈالے اور جہاں تک ہاتھ پہنچ سکتا ہے اس سے جسم کو ملے اور وہ جگہیں جہاں سلوٹیں پڑی ہوں کوشش کر کے ان میں پانی پہنچائے کیونکہ یہ فرض ہے۔ اور اپنی شرم گاہ کو چھونے سے پرہیز کرے۔

کیفیتِ تیمّم: معلوم رہے کہ جب پانی میسر نہ ہو یا اس قدر ہو کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ صرف اتنا ہو کہ بقدر پینے کے ہو اور بس۔ یا یہ کہ پانی کی راہ میں کسی درندے کا خطرہ ہو یا کوئی ایسا شخص ہو جس سے خطرہ ہو۔ یا یہ کہ پانی کسی دوسرے کی ملکیت ہو اور وہ اس کی اصل قیمت سے بہت زیادہ نرخ سے بیچتا ہو خود ایسا زخم رکھتا ہو کہ پانی کے استعمال سے ہلاکت کا خوف ہو یا بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو تو صبر کرے حتّٰی کہ نماز کا وقت آ جائے تو پاک جگہ کو دیکھے پھر دونوں ہاتھ اس پر اس طرح مارے کہ زمین پر سے گرد اٹھے اور ایسے میں انگلیاں کھلی رکھے۔ اور ادائے نماز کی نیت کرے۔ اور پورے چہرے کا دونوں ہاتھوں سے مسح کرے اور یہ تکلف نہ کرے کہ خاک بن مو تک پہنچے۔ پھر انگشتری اتار کر دوبارہ دونوں ہاتھ حسب سابق خاک پر مارے اور انگلیاں کھلی رکھے۔ پھر دائیں ہاتھ کی انگلیوں کی پشت بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان ڈالے۔ پھر بائیں ہاتھ کی انگلیاں دائیں ہاتھ کی پشت پر پھیرے۔ پھر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر پھیرے۔ پھر بایاں انگوٹھا دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کی پشت پر پھیرے پھر دست راست کو بائیں ہاتھ پر اسی طرح پھیرے۔ پھر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو باہم ملے۔ پھر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسری میں ڈال کر ملے۔ اور جب یوں کر لے تو ایسی ایک ضرب کافی ہوگی۔ اگر یہ نہ کر سکتا ہوں تو اس میں اضافہ کرے اس قدر کہ غبار پورے ہاتھ کو پہنچ جائے اور جب اس تیمّم سے فرض نماز ادا کرے تو سنن و نوافل جس قدر چاہے اس تیمّم سے ادا

کر سکتا ہے، لیکن جب دوسری فرض نماز ادا کرنا چاہے تو دوبارہ تیمّم کرے۔

قسم سوم:

فضلات جسم سے طہارت: یہ دو قسم کی ہے۔

اوّل: میل کچیل جو سر کے بالوں یا داڑھی میں ہوتی ہے اس کا ازالہ حمام کی کنگھی اور وہاں کی آب وگل سے کرنا چاہیے۔ یاد رہے کہ سفر ہو یا حضر کنگھی حضرت رسول (ﷺ) سے جدا نہ ہوتی تھی۔ اور اس قسم کی میل کچیل سے خود کو پاک رکھنا حضور کی سنت ہے۔

دوسری: وہ میل (گرد) جو آنکھ کے گوشے میں جمع ہو جاتی ہے اسے وضو کرتے ہوئے انگلی سے دور کر دینا چاہیے اور وہ میل جو کان میں ہو تو گرمابے سے نکلنے کے بعد دور کر دینی چاہیے۔ نیز وہ جو ناک میں ہو یہ بھی۔ اور جو دانتوں میں زردی کی صورت میں ہوتی ہے مسواک اور کلی اور ناک میں پانی داخل کرنے سے ان کا ازالہ ہو جاتا ہے اور وہ میل جو انگلیوں کے جوڑوں پر یا پشت پا پر یا ایڑیوں پر سر ناخن پر اور وہ جو جسم کے کسی بھی حصے پر ہو اس کا ازالہ بھی سنت ہے۔

یہ بھی معلوم رہے کہ جسم کے کسی جگہ پر میل باقی رہنے سے طہارت باطل نہیں ہوتی اور یہ میل پانی کو جسمانی کھال تک پہنچنے سے نہیں روکتی سوائے اس کے کہ حد سے زیادہ ناخن کے نیچے ہو۔ ایسی غیر معمولی صورت میں البتہ پانی پہنچنے میں مانع ہو سکتی ہے۔ اور اس قسم کی میل کچیل کو گرم پانی اور حمام کی مٹی سے دور کرنا سنت ہے۔

فصل: حمام کے آداب

جو شخص حمام میں جائے اس پر چار[۴] چیزیں واجب ہوتی ہیں تو دس[۱۰] سنت ہیں: دو واجب اس کی شرم گاہ کے بارے میں ہیں کہ ناف سے زانو تک کپڑے کی مدد سے پوشیدہ رکھے اور نہلانے والے حمامی کو بھی اس جگہ ہاتھ نہ لگانے دے کیونکہ ملنا تو دیکھنے سے بھی برا ہے۔ اور دو دوسروں کی شرم گاہ کے بارے میں ہیں۔ ایک یہ کہ اپنی نگاہ کو دوسروں کی شرم گاہ پر پڑنے سے روکے رکھے۔ اور اگر کوئی دوسرا اپنی شرم گاہ کو عریاں کرے تو اسے اس بات سے روکنا بھی واجب ہے۔ کیونکہ اگر اس برائی سے نہیں روکے گا گناہ گار ٹھہرے گا۔ ایسے میں جو کوئی روکنے کا یہ اقدام نہ کرے وہ گویا حمام سے عاصی برآمد ہوگا۔ حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک روز دن میں حمام میں رُو بہ دیوار کسی چیز سے آنکھوں کو ڈھانپے ہوئے تھے، عورتوں کے لیے بھی یہی واجباتِ حمام ہیں۔ اور عورتوں کے لیے حمام میں جانے کی نہی آئی ہے، الا بہ عذر ظاہر۔

اور حمام کی سنتیں یہ ہیں: اوّل یہ کہ نیت کرے کہ میں سنت بجالا رہا ہوں کہ میں وقتِ نماز کے لیے آراستہ ہو جاؤں نہ کہ مخلوق کو دکھانے کے لیے۔ اور حمامی کو غسل وغیرہ کی مزدوری پہلے ہی دے دے تاکہ وہ نہلانے میں خوشی محسوس کرے۔ اور اسے معلوم ہو کہ گاہک اسے کیا دے رہا ہے۔ تب بایاں پاؤں حمام میں رکھے۔ اور جب حمام میں داخل ہو جائے تو یہ دعا کرے ''بسم اللہ الرحمن الرحیم' اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الرِّجْسِ وَالنَّجَسِ الْخَبِیْثِ الْمُخْبِثَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' (میں شیطان مردود کی پلیدی اور آلودگی سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں)۔ اس بناء پر کہ حمام شیطان کی جگہ ہے اس لیے کوشش کرے کہ دوسرے اس کے لیے حمام خالی کر دیں۔ یا ایسے وقت میں جائے کہ حمام میں بھیڑ نہ ہو۔ اور جلدی کے ساتھ گرم خانے میں نہ جائے۔ جس سے خدشہ ہے کہ زیادہ پسینہ بہے گا۔ اور جب داخل ہو تو فوراً دونوں ہاتھ دھوئے۔ اور فضول پانی نہ گرائے۔ اتنا گرائے کہ اگر حمامی دیکھے تو اسے برا نہ لگے۔ داخلے کے وقت سلام نہ کہے۔ ہاں مصافحے میں مضائقہ نہیں۔ اور اگر دوسرا کوئی سلام کہے تو جواب یہ دے: عافاك الله (اللہ تمہیں معاف فرمائے)۔ اور زیادہ باتیں نہ کرے۔ قرآن بھی پڑھے تو آہستہ اور بلند آواز نہ نکالے۔ ہاں اگر شیطان کے بارے میں اللہ کی پناہ بہ آواز بلند طلب کرے تو روا ہے۔ نماز فجر عصر مغرب وعشاء کے وقت حمام میں نہیں جانا چاہیے کیونکہ یہ اوقات انتشار شیطان کے ہیں۔ اور جب خانۂ گرم میں جائے تو آتش دوزخ کو یاد کرے۔ تو ایک گھڑی (گھنٹہ) یا کچھ اس سے زائد وہاں ٹھہرے تاکہ جان سکے کہ زندانی دوزخ کے ساتھ کیا ہوگا۔ بلکہ عاقل وہ ہے جو جس چیز پر بھی نگاہ ڈالے آخرت کو یاد کرے۔ اگر تاریکی دیکھے تو قبر کی تاریکی کو یاد کرے۔ اور سانپ دیکھے تو دوزخ کے سانپوں کو یاد کرے۔ اور اگر کوئی خوفناک چہرہ دیکھے تو منکر نکیر اور التہاب دوزخ کو یاد کرے۔ اور اگر سخت آواز کو سنے تو نفخۂ صور کو ذہن میں لائے۔ اور اگر کسی کام میں ناکامی وکامیابی کو دیکھے تو آخرت کی ردّ وقبول کو یاد کرے۔ اور شرعی سنتیں یہی ہیں۔

اور طبی نقطہ نظر سے کہا گیا ہے کہ مہینے میں ایک بار زیر ناف کے بالوں کی صفائی مفید ہوتی ہے۔ حمام سے نکلتے وقت اگر پاؤں پر ٹھنڈا پانی ڈالے تو نقرس کی بیماری سے محفوظ رہے گا۔ اور درد سر نہیں ہوگا۔ اور ٹھنڈا پانی سر پر نہ ڈالے۔ جب حمام سے باہر آ کر گرمیوں کے موسم میں سو جائے تو خواب ایک شربت کا کام کرے گا

نوعِ دوم:

جسم کے میل کچیل کی ایک اور نوع بھی ہے جس کی تعداد سات ہے:

پہلی: سر کے بال ہیں جن کا مونڈنا اولیٰ تر ہے۔ اور پاکیزگی کے قریب بھی۔ سوائے سادات کے اور بغل

کا مونڈنا اور مونڈے بالوں کو لشکریوں کی طرح اِدھر اُدھر پھینک دینا مکروہ ہے اور اس کی ممانعت آئی ہے۔

دوسری: مونچھیں کہ جنہیں لبوں کے ساتھ رکھنا سنت ہے اور انہیں یونہی بدون تراش چھوڑ دینا منع ہے

تیسری: بغل کے بال جنہیں ہر چالیس روز کے بعد اکھاڑ کر دور کرنا سنت ہے۔ اگر شروع ہی سے انسان اس کام کا عادی ہو جائے تو آسانی رہتی ہے اور اگر عادی نہ ہو تو ان کا مونڈنا اولیٰ تر ہے تاکہ خود کو تکلیف نہ پہنچائے

چوتھی: شرم گاہ کے بال ہیں اور انہیں بال صفا آھک سے مونڈنا سنت ہے۔ اور چالیس دن سے زیادہ تاخیر اس کام میں نہ کرنا چاہیے۔

پانچویں: ناخن کاٹنا ہے۔ تاکہ ان میں میل کچیل جمع نہ ہونے پائے۔ لیکن اگر میل ان میں جمع ہو جائے وضو باطل نہیں ہوگا۔ جیسے کہ آنحضرت (ﷺ) نے ایک دفعہ ایک گروہ کے ناخنوں میں میل دیکھا تو کہا کہ ناخن کو تراش لیں لیکن نماز قضا کرنے کے لیے نہیں فرمایا تھا۔ حدیث میں ہے کہ ناخن جب لمبے ہو جائیں تو شیطان کا مستقر ہو جاتے ہیں۔ اور چاہیے کہ ناخن تراشتے وقت ابتداء انگلیوں سے کی جائے کہ اس کی فضیلت ہے۔ اور ہاتھوں سے ابتداء پاؤں کی نسبت بہتر ہے۔ اسی طرح دائیں کو بائیں سے پہلے مورد کار بنانا افضل ہے۔ اور ابتداء انگشت شہادت سے جسے سبابہ کہتے ہیں، افضل ہے پس ابتداء اُس سے کرے۔ اور اس کے داہنی طرف کاٹتا جائے۔ حتیٰ کہ پھر اسی انگلی تک پہنچے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے سرے ملا کر حلقے کی مانند فرض کرے تو داہنے ہاتھ کی کلمہ شہادت والی انگلی سے شروع کرے اور چھنگلی تک کاٹتا چلا جائے۔ پھر بائیں ہاتھ کی چھنگلی سے شروع اور پانچوں ناخن کاٹ کر داہنے ہاتھ کے انگوٹھے پر ختم کرے۔

چھٹی: ناف کاٹنا اور یہ وقت ولادت ہوتا ہے۔

ساتویں: زن و مرد کا ختنہ کرنا۔

فصل: داڑھی کے آداب میں

داڑھی اگرچہ بڑھ جائے تو جائز ہے کہ ایک قبضہ کی مقدار چھوڑ کر باقی کو کاٹ دے تاکہ حد سے نہ بڑھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ اور تابعین کی ایک جماعت اسی کے مطابق عمل کرتی تھی۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ داڑھی کو کھلا چھوڑ دینا چاہیے (یعنی اس کو کاٹنا نہ چاہیے)۔

معلوم رہے کہ محاسن (داڑھی) کے باب میں دس چیزیں مکروہ ہیں:

اوّل: سیاہ خضاب سے داڑھی کو رنگنا۔ کہ حدیث میں مذکور ہے کہ سیاہ خضاب اہل دوزخ کا ہے یا

کافروں کا خضاب ہے۔ اور پہلا شخص جس نے یہ خضاب استعمال کیا فرعونِ مصر تھا۔ اور ابن عباس راوی ہیں کہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا: ''آخری زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے جو سیاہ خضاب کریں گے اور وہ بہشت کی بُو نہ پائیں گے''۔ اور حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ بوڑھوں میں سب سے برے وہ ہیں جو خود کو جوانوں کی طرح بناتے ہیں۔ اور جوانوں میں بہترین وہ ہیں جو خود کو بوڑھوں کا سا ظاہر کرتے ہیں اور اس کی ممانعت کا سبب یہ ہے کہ یہ تلبیس فاسد اغراض کے لیے ہوتی ہے۔

دوم: خضاب سرخی اور زردی سے۔ اور اگر ایسا مجاہد کریں تا کہ کافر اُن پر دلیر نہ ہوں اور انہیں بوڑھا اور ضعیف نہ سمجھیں تو استعمال ایسے خضاب کا سنت ہوگا۔ اور متذکرہ مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے سیاہ رنگ خضاب بھی کیا ہے، لیکن اگر یہ مقصد پیش نظر نہ ہو تو خضاب جائز نہیں۔

سوم: داڑھی کو گندھک سے سفید کرنا تا کہ دیکھنے والے گمان کریں کہ یہ بوڑھا ہے، اس لیے اس کا احترام ملحوظ رکھیں تو یہ حماقت ہوگی کیونکہ احترام بر بنائے علم وخرد ہوتا ہے نہ کہ بر بنائے پیری و جوانی۔ اور اُنس بن مالک (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ رسول خدا جب اس دنیا سے عالم آخرت کو روانہ ہوئے تو ان کی داڑھی میں بیس سے زیادہ بال سفید نہ تھے۔

چہارم: یہ کہ کوئی اپنی داڑھی میں سے سفید بال چنے اور پیری سے ننگ محسوس کرے تو یہ ایسے ہی ہے کہ خدائے تعالیٰ نے جو نور اسے عطا فرمایا ہے یہ اس سے ننگ رکھتا ہے، تو یہ حماقت کے سوا کیا ہے؟

پنجم: ابتدائے جوانی میں بر بنائے ہوس وسودا داڑھی کے بال اس غرض سے نوچنا کہ بے ریش (جوان) نظر آئے تو یہ جہالت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ایسے فرشتے بھی ہیں جن کی تسبیح یہ ہے کہ جس کا ورد وہ کرتے ہیں: ''سُبْحٰنَ مَنْ زَيَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحیٰ وَ النِّسَاءَ بِالذَّوَائِب''، یعنی پاک ہے وہ خدا جس نے مردوں کو محاسن (رِیش) سے اور عورتوں کو گیسوؤں سے آراستہ کیا۔

ششم: داڑھی کو کبوتر کی دم کی طرح تراشنا کہ خواتین کی نگاہ میں خوب صورت لگے اور وہ اس کی طرف زیادہ راغب ہوں۔

ہفتم: سر کے بالوں سے داڑھی میں فزونی دینا اور زلف کو بنا گوش سے اس قدر فروگذاشت کرنا جو اہل صلاح کے ہاں معمول نہ ہو۔

ہشتم: کہ متکبروں کی نگاہ سے بالوں کی سیاہی یا سفیدی کو دیکھے۔ اور خدائے تعالیٰ کسی ایسے شخص کو دوست نہیں رکھتا جو خود کو تکبر کی آنکھ سے دیکھے۔

نہم: یہ کہ کنگھی بالوں میں لوگوں کو دکھانے کے لیے کرے نہ کہ سنت کی بجا آوری کے لیے۔
دہم: یہ کہ بالوں کو الجھا ہوا (بے آراستہ) اس لیے چھوڑ دے کہ لوگ اسے زاہد سمجھیں اور گمان کریں کہ وہ زہد و عبادت سے فرصت ہی نہیں پاتا کہ بالوں کو آراستہ کر سکے۔
احکامِ طہارتِ جسم کے باب میں اسی قدر کافی ہوگا۔ انشاء اللہ۔

———•••———

اصل چہارم: نماز

یادر ہے کہ نماز اسلام کا ستون ہے اور دین کی بنیاد ہے اور تمام عبادتوں کی پیش رو اور سردار ہے۔ اور جو شخص نماز کی شرائط کے ساتھ وقت مقررہ پر نماز ادا کرتا ہے تو گویا اللہ تعالیٰ اس سے وعدہ کرتا ہے وہ اس کی امان اور حمایت سے مستفیض ہوگا۔ اور اگر وہ کبائر سے دور رہے گا تو اس کے بقیہ سب گناہ جن کا ارتکاب ہو جائے یہ پانچوں نمازیں ان گناہوں کا کفارہ قرار پائیں گی۔ رسول (ﷺ) نے فرمایا: ''ان پانچ نمازوں کی مثال ایک روشن ندی کی سی ہے جو کسی شخص کے گھر کے دروازے کے ساتھ بہتی ہے اور وہ شخص خود کو اس پاک ندی کے پانی سے پاک کرتا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس پر کوئی میل باقی رہے؟'' تو صحابہ نے جواب میں کہا کہ: ''نہیں یا رسول اللہ'' تو آنحضرت نے فرمایا کہ ''یہ پانچ نمازیں گناہ کو اسی طرح بہا لے جاتی ہیں جیسے پانی میل کچیل کو''۔
اور آنحضرت نے فرمایا: ''نماز دین کا ستون ہے جو کوئی اس سے دست کش ہوا اس نے اپنا دین ویران کر دیا''۔ جب صحابہ نے آپ سے پوچھا کہ اعمال میں فاضل ترعمل کون سا ہے تو آپ نے فرمایا: ''نماز کو بروقت ادا کرنا'' نیز آپؐ نے فرمایا نماز بہشت کی کلید ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے عقیدۂ توحید کے بعد نماز کے علاوہ کسی چیز کو اپنے بندوں کا فرض قرار نہیں دیا کیونکہ نماز اس کے نزدیک محبوب تر ہے۔ اور اگر نماز سے کوئی اور عبادت اللہ کو عزیز تر ہوتی تو وہ ملائکہ کو اس میں مصروف کرتا کہ وہ سب کے سب نماز میں ہیں۔ ایک گروہ رکوع میں ہے تو ایک سجود میں تو ایک قیام میں ہے تو ایک قعود میں۔ آنحضرت نے فرمایا کہ جس نے ایک نماز سے عمداً اجتناب کیا وہ کافر ہو گیا'' یعنی وہ کفر کے قریب پہنچ گیا۔ اس لیے کہ ایمان کی بنیاد میں خلل واقع ہو گیا۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ جس کے پاس سے صحرا میں پانی ضائع ہو گیا وہ ہلاک ہو گیا۔ یعنی ہلاکت کے نزدیک پہنچ گیا اور خطرے میں پڑ گیا۔ آنحضرت نے یہ بھی فرمایا کہ روزِ قیامت جس چیز پر پہلے نگاہ ڈالی جائے گی وہ نماز ہے۔ اور یہ کامل ہوئی اور بہ شرط ادا ہوئی ہو تو قبولیت کا شرف پائے گی اور اس کے دیگر اعمال اسی کی تبعیت میں جیسے ہوں گے قبول کیے جائیں گے۔ اور اگر نماز ناقص ہوئی تو یہ اس کے منہ پر ماردی

جائے گی۔ اور ساتھ ہی اس کے دوسرے اعمال بھی مسترد ہو جائیں گے۔

اور رسول (ﷺ) نے فرمایا کہ جس نے اچھی طرح وضو کیا اور نماز اپنے وقت پر ادا کی اور رکوع و سجود خوبی سے بجالایا اور بہ دلِ خشوع و خضوع یہ عمل کیا تو اس کی نماز عرش کی بلندی کو چھوتی ہے سفید اور روشن اور نماز کہتی ہے کہ خدا تعالیٰ تیری حفاظت اسی طرح کرے جس طرح تو نے میری حفاظت کی ہے۔

اور جو کوئی بروقت ادا نہیں کرتا نہ وضو ٹھیک سے کرتا ہے نہ رکوع و سجود خوبی سے کرتا ہے اور نہ خشوع و خضوع کو بجالاتا ہے تو اس کی نماز سیاہ اور تاریک حالت میں آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے یہ کہتی جاتی ہے ''جس طرح تم نے مجھے ضائع کیا ہے خدا تمہیں بھی ایسے ہی ضائع کردے'' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کی نماز پھٹے پرانے کپڑے کی طرح لپیٹ کر اس کے منہ پر مارے۔ رسول (ﷺ) نے فرمایا کہ ''چوروں میں بدترین چور وہ ہے جو نماز کی چوری کا مرتکب ہوتا ہے''۔

کیفیتِ ظاہرِ نماز

یاد رہے کہ ظاہر نماز کا بدن کی مانند ہے لیکن اس کی ایک حقیقت اور راز بھی ہے جسے نماز کی روح کہا جاتا ہے اور ہم پہلے نماز کے ظاہر کا ذکر کرتے ہیں:

پہلی بات یہ کہ جب انسان جسم و لباس کو پاک کرلے اور اپنی شرم گاہ کو ڈھانپ لے تو پاک جگہ پر رو بہ قبلہ کھڑا ہو جائے اور دونوں پاؤں کے درمیان چار انگلی کا فاصلہ رکھ کر سیدھا کھڑا ہو جائے اور سر آگے جھکا لے اور نگاہ سجدے کی جگہ سے آگے نہ لے جائے۔ اور جب سیدھا کھڑا ہو گیا تو قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاس والی سورۃ پڑھے تاکہ شیطان کو خود سے دور کرلے۔ اور پھر اگر امکان اس کا ہے کہ کوئی دوسرا اس کا اقتداء کرے گا تو نماز کی اذان بہ آواز کہے ورنہ اقامت پر کفایت کرے۔ اور نیت نماز کی دل میں متحضر کرے اور دل میں کہے کہ میں فلاں نماز کا خدائے عزوجل کا فریضہ ادا کر رہا ہوں۔

تکبیر

جب ان الفاظ کے معنی اس کے دل میں اتر جائیں تو کانوں کے قریب تک ہاتھ اٹھائے اس طرح سے کہ سرانگشت سرگوش کے برابر ہوں اور انگوٹھے کا سرا بُنا گوش کے برابر ہو جائے اور ہتھیلیاں کندھے کے برابر ہو جائیں تو اللہ اکبـــــر کہے۔ پھر دونوں ہاتھ ناف کے اوپر اور سینے کے نیچے رکھے اور دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے اوپر جا گزیں کرے اور انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی بائیں ہاتھ کی کلائی کی پشت پر رکھے۔ اور باقی

انگلیوں سے بائیں کلائی کے گرد حلقہ بنائے اور ایسا نہ کرے کہ کانوں سے ہاتھ اتار کر سیدھے چھوڑ دے اور پھر سینے کی طرف لے جائے بلکہ اتارتے وقت ہی ہاتھ سینے کی طرف لے جائے کہ یہی زیادہ صحیح ہے۔ اس دوران ہاتھ نہ جھٹکے نہ ادھر اُدھر لے جائے اور تکبیر (اقامت) میں مبالغہ نہ کرے کہ 'واؤ' اللہ کے بعد ظاہر ہو یا 'الف' اکبر کے 'با' کے بعد ایسے ہو جائے جیسے اکبر نہیں 'اکبار' کہہ رہا ہو۔ کہ یہ موسوسوں اور جاہلوں کا کام ہے۔ بلکہ جس طرح بدونِ نماز دیگر مواقع پر ان کلمات کو ادا کرتا ہے بے تکلف اور بلا مبالغہ اسی طرح ادا کرے۔

قرأت

اور جب ہاتھ باندھ لے تو ''اللہ اکبر کبیراً والحمدللہ کثیراً وسبحان اللہ بکرۃ واصیلاً'' یعنی (خدا بزرگ ہے اور اچھی اور کثیر حمد اسی کے لیے ہے۔ اور میں صبح وشام اسی کی تسبیح بیان کرتا ہوں)۔ پھر ''وَجَّهتُ وَجهِی'' پڑھے (یعنی یہ پوری آیت پڑھے) اس کے بعد ''سُبحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَ بِحَمدِکَ وَتَبارَکَ اسمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰهَ غَیرُکَ'' (خدایا میں تجھے پاک شمار کرتا ہوں اور تیری حمد بیان کرتا ہوں۔ تیرا نام مبارک' برتر' پاک اور سب سے بزرگوار تر ہے اور تیرے سوا کوئی خدا نہیں) تا کہ تمام روایتوں اور مسلکوں کا جامع ہو جائے۔ پھر ''اَعُوذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ' اِنَّ اللہَ هُوَالسَّمِیعُ العَلِیمُ'' کہے اور ''بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ'' کہے۔

حمد وسورۃ

پھر سورۃ الحمد بہ اعراب صحیح ادا کرے لیکن حروف میں مبالغہ نہ کرے اس طور کہ آشفتہ ہو جائیں اور حرفِ ضاد اور ظا کا امتیاز ملحوظ رکھے۔ اگر ان میں امتیاز نہ کر سکے تو بھی حرج نہیں اور سورۂ الحمد کی قرأت کر چکے تو آمین کہے لیکن سورۃ سے ملا کر نہیں بلکہ ذرا رک کر۔ پھر کوئی اور سورۃ جو بھی قرآن میں سے پڑھنا چاہے پڑھے اور نماز سحر' مغرب اور عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں قرأت بہ جہر کرے لیکن اس صورت میں کہ تنہا نماز پڑھ رہا ہو خود مقتدی ہو تو خاموش رہے۔

رکوع

پھر تکبیر کہہ کر رکوع میں چلا جائے اس انداز سے کہ آخر سورۃ کے ساتھ متصل نہ ہو۔ اور رفع یدین کرے۔ ایسے ہی جیسے کہ ابتدائے نماز میں کیا تھا۔ اور تکبیر کو امتداد دے یہاں تک کہ حد رکوع کو پہنچ جائے اور ہتھیلیاں دونوں زانوؤں پر رکھے۔ اور انگلی سیدھی قبلہ رو رکھے اور انگلیاں آپس میں کشادہ ہوں اور گھٹنوں کو

سیدھا رکھے اور پشت و سر کو ایک تختے کی طرح ہموار رکھے۔ ایسے کہ سب اعضا مل کر حرف 'ک' کی صورت اختیار کر لیں۔ دونوں بازو پہلوؤں سے دور رکھے اور بازو پہلو سے ملائے نہیں۔ لیکن عورتوں کے لیے یہ حکم ہے کہ دونوں بازو پہلوؤں سے ملا کر رکھیں۔ پھر جب کھڑا ہو جائے تو تین دفعہ ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم وَبِحَمْدِہٖ'' کہے اور اگر امام کے اقتدا میں نہ ہو سات دفعہ یا دس دفعہ کہے تو اور بھی اچھا ہوگا۔ پھر رکوع سے نکل کر سیدھا کھڑا ہو جائے اور ہاتھ چھوڑے رکھے اور کہے ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' اور ذرا وقفے کے بعد کہے ''رَبَّنَا لكَ الْحَمد مِلاءُ السَّمٰوٰتِ وَمَلاءُ الْاَرْضِ وَمَلاءُ مَا شِئتَ مِن شَیءٍ بعد'' اور نماز سحر کی دوسری رکعت فرض میں قنوت پڑھے۔

سجود

پھر تکبیر کہہ کر سجدے میں چلا جائے۔ اس انداز سے کہ جو اعضا زمین کے نزدیک تر ہیں وہ پہلے زمین پر پہنچیں یعنی پہلے زانو پھر ہاتھ پھر پیشانی پھر ناک اور دونوں ہاتھ کانوں کے برابر زمین پر رکھے۔ انگلیاں آپس میں ملی ہوئی ہوں اور دونوں کلائیاں زمین پر پھیلا دے۔ اور بازوؤں اور پہلوؤں کے درمیان اور شکم اور ران کے درمیان خلا رکھے لیکن عورتیں یہ سارے اعضا باہم ملا کر رکھیں۔ پھر ''سُبْحٰنَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی وَبِحَمْدِہٖ'' تین دفعہ کہے اور اگر امام کے پیچھے نہ ہو مفرد ہو تو اس تکرار میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ پھر اللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر سجدے سے نکل آئے اور بائیں پاؤں پر بیٹھ جائے اور ہاتھ دونوں رانوں پر رکھے اور کہے: ''رَبِّ اغْفِرْلِی وَارْحَمنِی وَارْزُقنِیْ وَاھدِنی وَاَجرنِی وَعَافِنِی وَاعفُ عَنِّی'' پھر دوسرے سجدے میں یہی کرے۔ پھر سجدے کے بعد اسی طرح بیٹھ جائے۔ نشست کے ساتھ پھر تکبیر کہہ کر کھڑا ہو جائے اور تیسری رکعت اسی طرح تمام کرے اور الحمد شریف سے قبل اَعُوذُ بِاللّٰہ پڑھے۔

تشہد

جب دوسری رکعت کے سجدے سے فارغ ہو جائے تو تشہد کے لیے بائیں پاؤں پر بیٹھ جائے۔ جیسے کہ دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھا تھا' اور دونوں ہاتھ اسی طرح رانوں پر رکھے۔ لیکن یہاں ماسوائے انگشت شہادت کے باقی انگلیاں اکٹھی کرے اور انگشت شہادت سے وقت شہادت یعنی جب اِلَّا اللّٰہ کہے نہ کہ جب لَا اِلٰہَ کہے اشارہ کرے اور انگوٹھے کو بھی چھوڑ دے تو جائز ہوگا۔ پھر دوسری تشہد میں بھی اسی طرح کرے۔ لیکن اب دونوں پاؤں دائیں طرف باہر نکال لے اور بایاں چوتڑ زمین پر رکھ لے۔ اور جب پہلے تشہد میں ''اَللّٰھُمَّ صلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ'' تک پہنچے تو کھڑا ہو جائے لیکن دوسرے تشہد میں یہ درود دعائے

مغفرت کے آخر تک پورا پڑھے۔ پھر ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ'' کہہ کر چہرہ دائیں طرف پھیرے اس انداز سے کہ اگر کوئی شخص جو اُس کے پیچھے ہو تو اس کا نیم چہرہ دیکھ سکے۔ پھر بائیں طرف سلام کہے۔ اور ان دونوں سلاموں کے ساتھ نماز کے ختم کی نیت کرے۔ اور حاضرین اور ملائکہ پر سلام کی نیت کرے۔

فصل: نماز میں چند چیزیں مکروہ ہیں

مثلاً بھوک، پیاس اور خشم کی حالت میں اور تقاضائے بول وقضائے حاجت یعنی ہر وہ امر جو خشوع میں حارج ہو مکروہ ہے۔ اور قیام میں دونوں پاؤں کو ملا کر رکھنا اور سجدے میں دونوں کھڑے پاؤں پر بیٹھنا، یا دونوں چوتڑوں کے سہارے بیٹھنا یا دونوں گھٹنوں کو سینے تک لے آنا یا زیر جامہ میں ہاتھ ڈالنا اور وقت سجود لباس کو آگے پیچھے سے پکڑنا اور زیر جامہ کا ازار باندھنا یا ہاتھ لٹکانا یا اِدھر اُدھر دیکھنا اور انگلیاں چٹخانا اور اندام میں کھجانا یا جماہیاں لینا یا داڑھی کے بالوں سے کھیلنا یا سجدہ گاہ میں سنگ ریزوں کو سجدے کے لیے ہموار کرنا اور بوقت سجود زمین پر پھونک مارنا اور انگلیوں کو کھلا چھوڑنا اور کسی چیز سے پشت کا سہارا لینا۔ مختصر یہ کہ آنکھ ہاتھ وغیرہ تمام اعضا مؤدب ہوں اور نماز کی صفت سے متصف ہوں تا کہ نماز کامل ہو اور زادِ آخرت کے لائق ہو۔

اور جو کچھ ہم نے کہا اس میں سے بارہ چیزیں فرض ہیں۔ یعنی نماز کی نیت، قیام، سورہ فاتحہ کا پڑھنا، رکوع بہ سکون اور رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہونا اور آرام سے سجدہ کرنا، اور سجدے سے اٹھ کر سیدھا بیٹھنا اور آخری تشہد کے لیے بیٹھنا اور رسول (ﷺ) پر درود کہنا اور تحیۃ میں بیٹھنا اور سلام۔ (یہ سب فرض ہیں)۔

جب نمازی اس قدر کرے گا تو اس کی نماز درست متصور ہوگی۔ اس معنی میں کہ اب وہ مسلمان سمجھا جائے گا اور اس کا قتل ناروا ٹھہرے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی نماز کی قبولیت حتمی نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ ایک کنیز کسی بادشاہ کے حضور بہ طور تحفہ پیش کی جائے جس کے ناک، کان باقی ہوں نہ ہاتھ پاؤں، لیکن زندہ ہو تو یہ خطرہ باقی رہتا ہے کہ ممکن ہے مقبول ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ رد کر دی جائے۔

نماز کی حقیقت اور روح

یاد رہے کہ اب تک جو ہم نے کہا ہے کہ وہ اس کی جسمانی شکل وصورت سے متعلق ہے اور اس ظاہر صورت کی ایک حقیقت بھی ہے جسے نماز کی روح کہتے ہیں، یہ بھی جاننا چاہئے کہ نماز کے اعمال میں سے ہر عمل کی اور اذکار میں سے ہر ذکر کی ایک اور خصوصی روح ہے۔ کہ اگر اصل روح نہ ہو تو نماز مردہ انسان کی طرح ہوتی ہے ایک بے جان قالب۔ اور اگر اصل ہو لیکن اعمال وآداب کامل نہ ہوں تو اس آدمی کی مثل ہوتی ہے جس کے

ناک، کان، آنکھ کٹے ہوئے ہوں۔ اسی طرح اگر اعمال تو ہوں لیکن ان کی روح اور حقیقت ساتھ نہ ہو تو وہ ایسے ہوگا کہ آنکھ تو ہے لیکن بینا نہیں، کان ہے لیکن سماعت سے عاری۔

نماز کی روح کی اصل خشوع ہے۔ اور پوری نماز کے دوران دل کا حضور کیونکہ نماز کا مقصود دل کو حق تعالیٰ کے ساتھ راست اور درست رکھنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ہیبت و تعظیم کے ساتھ ذکر حق کو تازگی دینا ہے۔ جیسے کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِی" (میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو) اور رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ اکثر لوگ ایسے ہیں کہ نماز میں سے انہیں سوائے رنج و ماندگی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ یوں ہوتا ہے کہ نمازی کا جسم تو نماز ادا کرتا ہے لیکن غافل دل کے ساتھ" آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ "اکثر ایسے ہیں کہ نماز تو ادا کرتے ہیں لیکن کراماً کاتبین ان کی نماز کے چھٹے یا دسویں حصے سے زیادہ کا اندراج نہیں کرتے کیونکہ ملائکہ ہر شخص کی نماز کی وہی مقدار معرض تحریر میں لاتے ہیں جس میں حضورِ دل بھی تھا۔ آپ نے فرمایا کہ: "نماز کو ایسے ادا کر جیسے تو کسی کو وداع کہہ رہا ہو۔ یعنی اس نماز سے خود کو اپنی تمنا کو الوداع کہہ دے بلکہ بجز حق تعالیٰ کے اور جو کچھ ہے اس کو وداع کہہ دے۔ اور خود کو سراپا نماز میں کھو دے۔ اس بناء پر حضرت عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) فرماتی تھیں کہ "رسول (ﷺ) ہم سے باتیں کر رہے ہوتے اور ہم بھی ان سے گفتگو میں مشغول ہوتے تھے لیکن جونہی نماز کا وقت آتا تو یوں ہوتا جیسے وہ ہم میں سے کسی سے آشنا ہی نہیں۔ نہ ہم ان کے آشنا اس مصروفیت سے جو آپ (ﷺ) کو عظمت حق تعالیٰ سے ہوتی"۔ آنحضرت کا فرمان ہے کہ ہر وہ نماز جس میں حضورِ دل نہ ہو حق تعالیٰ اس نماز کو دیکھنے کے روادار بھی نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب نماز ادا کر رہے ہوتے تو لوگ ان کے دل کا جوش و خروش دو دو میل تک سنتے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جب اذانِ نماز سنتے تو ان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا اور چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ اور آپ فرماتے کہ اس امانت کا وقت آ پہنچا جو سات آسمان و زمین کے سامنے پیش کی گئی تھی اور انہیں اس کی تاب نہ تھی"۔ سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ: "ہر وہ نماز جس میں حضورِ دل نہ ہو وہ نماز درست نہیں" اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ "ہر وہ نماز جس میں حضورِ دل نہ ہو وہ عقوبت کے قریب تر ہوتی ہے"۔ اور معاذ ابن جبل فرماتے ہیں کہ: "جو کوئی دوران نماز عمداً یہ دیکھے کہ اس کے دائیں بائیں کون کھڑا ہے تو اس کی نماز نہیں ہوئی"۔ اور ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور شافعی رضی اللہ عنہ اور بیشتر علماء اگرچہ کہتے ہیں کہ بوقت تکبیر (اولیٰ) اگر دل فارغ تھا تو نماز درست ادا ہو گئی۔ تو ان حضرات کا یہ فتویٰ اس ضرورت کے تحت آیا ہے کہ آج کل لوگوں پر غفلت غالب ہے۔ اور درستی نماز کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے شخص کا قتل اب روا نہیں رہا لیکن زادِ آخرت کے لیے نماز اس درجے کی ہونی

چاہیے جس میں دل حاضر ہو۔ مختصر یہ کہ جس شخص کا دل تکبیر اقامت کے وقت کے علاوہ دورانِ نماز حاضر نہ رہا ہو تو امید یہ ہے کہ حال اس کا اس شخص سے جو اصلاً نماز ہی ادا نہیں کرتا بہتر متصور ہوگا۔ اور خطرہ اس کا بھی ہے کہ اس کا حال بدتر ہو کیونکہ جو شخص بے دلی کے ساتھ خدمت کو آتا ہے اس پر گرفت اس شخص سے زیادہ ہوگی جو اصلاً آیا ہی نہیں۔ اسی بناء پر حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: ''یہ نماز عقوبت کے زیادہ قریب ہے''۔ بلکہ حدیث ہے کہ: ''جس شخص کی نماز اس کو فواحش اور منکرات سے باز نہیں رکھتی تو اس کو ایسی نماز سے بجز دوری حق تعالیٰ کے کچھ حاصل نہیں ہوتا''۔

پس اس ساری بحث سے اے عزیز تو نے جان لیا ہوگا کہ کامل نماز کی روح یہ ہے کہ پوری نماز کے دوران دل اس میں حاضر رہے اور وہ نماز جس میں بوقتِ تکبیر کے سوا حضورِ دل نہ رہا ہو تو گویا اس نماز میں ایک رمق سے زیادہ کچھ موجود نہیں اس زندہ انسان کی طرح جس میں ایک آدھ سانس سے زیادہ کچھ باقی نہ رہا ہو۔

حقیقتِ روحِ اعمال نماز کا بیان

یاد رہے کہ پہلی چیز جو تجھ کو پہنچتی ہے وہ ہے نماز کی اذان۔ تو چاہیے کہ دل و جان سے اسے سنے اور جس کام میں بھی مصروف ہو اس سے ہاتھ کھینچ لے۔ کیونکہ اسلاف یونہی کرتے تھے۔ جب وہ نماز کی اذان سنتے تو جو لوہار ہوتا اور اگر اس نے ہتھوڑا ضرب لگانے کے لیے اٹھایا ہوتا' اس سے ہاتھ کھینچ لیتا۔ اور جوتا بنانے والے نے اگر سوئی سلائی کے لیے ڈالی ہوتی تو اسے وہیں چھوڑ دیتا باہر نہ نکالتا تھا فوراً اپنی جگہ سے جست لگاتا اس لیے کہ یہ منادی اسے روزِ قیامت کی منادی کی یاد دلاتی ہے۔ اور ہر پیشہ وَر یہ جانتا تھا کہ فرمانِ اذان پر شتابی کرے گا تو روزِ قیامت سوائے بشارت کے کسی اور شے سے دوچار نہ ہوگا۔ اور اگر ایسا ہی ہو کہ تو بھی اس منادی سے اگر دل کو رغبت اور خوشی سے معمور پائے گا تو جان لے کہ اس منادی سے ایسی ہی بشارت سے بہرہ ور ہوگا۔

طہارت

اور راز طہارت کا یہ ہے کہ تو جان لے کہ بدن ولباس کی پاکیزگی تو غلاف ہے اور اس طہارت کی روح دل کی پاکیزگی ہے اخلاق ناپسندیدہ سے توبہ اور پشیمانی کے ذریعے دوری' کیونکہ دل حق تعالیٰ کی نظارہ گاہ ہے۔ اور حقیقتِ نماز کی جگہ دل ہے اور تن صورتِ نماز کی جگہ ہے۔

شرم گاہ کو چھپانا

مطلب اس کا یہ ہے کہ جو تیرے ظاہر بدن میں سے بدنما ہے اسے لوگوں کی نگاہ سے چھپائے اور روح

وراز اس کا یہ ہے کہ جو کچھ تیرے باطن میں برا ہے اس کو نظر حق تعالیٰ سے مخفی رکھے۔ اور جانے کہ اللہ تعالیٰ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے چارہ کار سوا اس کے نہیں کہ ان بُرائیوں سے دل کو پاک کر لے۔ اور دل پاک ان سے اس طرح ہوگا کہ تو ماضی پر پشیمان ہو اور یہ عزم کرے کہ آئندہ ان کا ارتکاب نہ کرے گا۔ ''التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ'' ''توبہ گناہ کو زائل کر دیتی ہے''۔ اگر ایسا کر سکے کہ خجلت وبیم و شرمساری کا ایک پردہ اپنی شرم گاہوں پر ڈال دے اور شکستہ دلی کے ساتھ اور شرمساری کے ساتھ خدائے تعالیٰ کے حضور میں ایسے پیش ہو جیسے کوئی گناہ گار، مفرور غلام پشیمانی بھرا دل لے کر اپنے آقا کے سامنے آئے اور اپنی فضیحت کی بناء پر سر اوپر نہ اٹھائے۔

استقبالِ قبلہ

معنی اس کے یہ ہیں کہ انسان اپنا ظاہری منہ ہر طرف سے پھیر کر ایک جہت ہو جائے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ جو کچھ بھی دونوں جہانوں میں ہے اس سے دل کو پھیر کر حق تعالیٰ کے ساتھ مشغول کرے تا کہ یک صفت ہو جائے۔ اور جس طرح قبلۂ ظاہر ایک ہی ہے قبلۂ دل بھی اسی طرح ایک ہے اور وہ ہے حق سبحانہٗ کی ذات۔ اور جب دل افکار کی وادی میں رواں ہو تو ایسے ہی ہوتا ہے کہ روئے ظاہر اطراف میں پھر رہا ہوتا ہے اور جیسے یہ ظاہر نماز کی صورت نہیں ہوتی تو وہ نماز کی حقیقت بھی نہیں ہوتی۔ اسی بناء پر فرمان رسول (ﷺ) ہے کہ: ''جو کوئی نماز میں کھڑا ہوتا ہے اور اس کی خواہش اور اس کا چہرہ اور اس کا دل تینوں حق تعالیٰ کے ساتھ ہوں تو جب وہ ادائے نماز کے بعد لوٹتا ہے تو وہ ایسا ہوتا ہے جیسے اس کی ماں نے اسے آج ہی جنا ہو۔ یعنی تمام گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے''۔

اور یہ حقیقت جان کہ جس طرح جانبِ قبلہ سے روگردانی نماز کی ظاہری صورت کو باطل کر دیتی ہے اس طرح روئے دل کو حق تعالیٰ سے پھیر کر دیگر افکار میں لگا دینے سے حقیقتِ روحِ نماز باطل ہو جاتی ہے۔ بلکہ اولیٰ تر دل ہے۔ کیونکہ ظاہر تو باطن کا غلاف ہے اور اہم وہ ہے جو غلاف کے اندر ہے۔ اور غلاف کا مقدور اس سے کچھ زیادہ نہیں۔

قیام

ظاہر اس کا یہ ہے کہ جسم حق تعالیٰ کے حضور سر ڈالے خادم کی طرح کھڑا ہو دست بستہ۔ اور حقیقت قیام کی یہ ہے کہ دل دیگر تمام حرکات کو چھوڑ کر لازمی خدمت کے لیے بر سبیل تعظیم وانکسار اپنے آقا کے حضور کھڑا ہو۔ اور ایسے میں چاہیے کہ انسان قیامت میں خدا کے حضور پیشی کو یاد کرے۔ یہ وہ وقت ہوگا جب اس کے تمام

اسرار طشت از بام ہو جائیں گے اور اس کا نامۂ اعمال اسے دکھا دیا جائے گا اور یوں جانے کہ وہ تمام اسرار اس وقت اللہ تعالیٰ پر آشکار ہیں۔ اور جو کچھ اس کے دل میں ہے یا تھا اسے اللہ تعالیٰ دیکھتا جانتا ہے اور اس کے ظاہر و باطن سے مطلع ہے اور عجب یہ ہے کہ اہلِ صلاح میں سے کوئی اسے دیکھ رہا ہو کہ نماز کس طرح ادا کر رہا ہے تو نمازی دکھاوے کے لیے اپنے تمام اعضا کو بہ ادب رکھتا ہے اور اِدھر اُدھر نہیں دیکھتا اور اس وجہ سے نماز جلدی ختم کرنے یا التفات کرنے میں شرم کرتا ہے۔ جب کہ جانتا ہے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے پھر بھی اس سے شرم سار نہیں ہوتا۔ اس لیے بڑھ کر اور جہالت کیا ہوگی کہ ایک بندۂ بے چارہ سے کہ جس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے اس سے تو شرم رکھتا ہے اس سبب سے کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے ادب کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے اور بادشاہوں کے بادشاہ کی نظر سے خائف نہیں اور اس کو آسان سمجھتا ہے۔

اور اسی لیے تھا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یارسول اللہ! شرم اللہ تعالیٰ سے کیونکر رکھنی چاہیے''؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جیسے کہ تو اپنے گھر والوں میں جو صالح ہو اس سے شرماتا ہے''۔ اور اسی تعظیم کے سبب سے تھا کہ صحابہ نماز میں اس طرح ساکن ہوتے تھے کہ پرندے ان سے ڈرتے نہ تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ پتھر ہیں۔ اور جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت جاگزیں ہو جائے تو وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ تو اس کے تمام اعضا خاشع ہو جاتے ہیں۔ اسی سبب سے جب رسول (ﷺ) نے کسی کو دیکھا کہ دورانِ نماز داڑھی میں ہاتھ پھیر رہا ہے تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کا ہاتھ بھی اس کے دل کی طرح صاحبِ خشوع ہوتا''۔

رکوع و سجود

معلوم رہے کہ رکوع و سجود جسم کے ذریعے عاجزی کا اظہار ہے۔ اور فی الاصل مراد دلی انکسار ہے۔ اور جو شخص یہ جانتا ہے کہ زمین پر چہرہ رکھ دینا گویا عزیز ترین عضوِ جسم کو خاک پر رکھ دینا ہے وہ خاک جو تمام چیزوں سے ذلیل سمجھی جاتی ہے اس پر سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ تا کہ انسان جان لے کہ اس کی اصل تو خاک ہے جو خاک ہی میں ایک دن مل جائے گی۔ اس لیے اسے تکبر اپنی اصل بساط کے لائق موزوں ہے اس سے اسے اپنی ناکسی اور بے چارگی کا علم ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر کام میں ایک حقیقت اور راز ہوتا ہے اگر انسان اس امر سے غافل ہو تو معنی کہاں فقط صورت اس کا مقدر ہوتی ہے۔

نماز کے دوران قرأت اور اذکار کی حقیقت

معلوم رہے کہ ہر وہ کلمہ جو نماز میں ادا کرتا ہے اس کی ایک حقیقت ہوتی ہے جس کا علم نمازی کو ہونا

چاہیے۔ اور چاہیے کہ وہ کلمہ ادا کرنے والا اسی کی صفت سے متصف ہوتا کہ اس کا قول سچا ہو۔ مثلاً اللہ اکبر کے معنی ہیں ''خدا جو سب سے عظیم ہے'' تو اگر کوئی اس مفہوم سے نا آشنا ہے تو جاہل ہے اور اگر آشنائے معنی ہو لیکن اس کے دل میں حق تعالیٰ سے عظیم تر کوئی متمکن ہو تو اس کا یہ قول صادق نہ ہوگا اور اس سے کہا جائے گا کہ اللہ کی عظمت کی بات تو صحیح ہے لیکن تو جھوٹا ہے۔ کیونکہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی نسبت کسی اور شے کا زیادہ فرمانبردار ہو تو وہ چیز اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ سے بزرگ تر ہے اور وہی شے اصل میں اس کی معبود اور الٰہ ہے جس کی اطاعت وہ کرتا ہے جیسے کہ فرمان خداوند ہے: ''اَرَاءَ یْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَه' هَوٰاهُ'' (قرآن: ۴۳/۲۵) (کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی ہوا و ہوس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے''؟

اور جب نمازی کہتا ہے: ''وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ'' تو معنی اس کے یہ ہیں کہ میں نے اپنے روئے دل کو دنیا کی ہر چیز سے ہٹا کر حق تعالیٰ کی طرف متمکن کر دیا ہے اور اگر اس کا دل اس وقت کسی اور چیز میں محو ہو تو نمازی کا یہ دعویٰ دروغ ہے اور اگر پہلی ہی بات حق تعالیٰ سے مناجات کے باب میں دروغ قرار پائے تو اس کا خطر معلوم! اور جب اس نے کہا حنیفاً مسلماً (میں مسلمان ہوں پاک دین والا) تو گویا اس نے مسلمانی کا دعویٰ کیا۔ اور رسول (ﷺ) نے فرمایا ہے ''مسلمان وہ ہے کہ دیگر مسلمان اس کے ہاتھ اور زبان سے محفوظ ہوں''۔ تو نمازی کو چاہیے کہ اسی صفت کا مالک ہو یا کم از کم اس کا عزم کرے، اور جب الحمدللہ کہے تو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو دل میں تازہ کرے یہاں تک کہ اس کا دل سراپا صفتِ شکر ہو جائے۔ کیونکہ یہ کلمۂ شکر ہے اور شکر دل سے کیا جاتا ہے۔ اور جب ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' کہے تو چاہیے کہ اخلاص کی حقیقت اس کے دل میں تازہ ہو جائے۔ اور جب نمازی ''اِهْدِنَا'' کہے تو چاہیے کہ اس کا دل تضرع اور عاجزی کی صفت سے متصف ہو کیونکہ وہ ہدایت کا سوالی ہے اور تسبیح و تہلیل و قرأت میں کے ہر کلمے کے دوران یہی حالت ہونی چاہیے۔ جس طرح سے کہ جانتا ہے اور اس کا دل اسی معنی کی صفت میں تبدیل ہو جانا چاہیے۔ تفصیل اس راز کی دراز ہے۔

نمازی اگر چاہتا ہو کہ اسے حقیقتِ نماز نصیب ہو تو اسے ایسے ہی ہونا چاہیے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے معنی سے خالی صورت پر قناعت کر لی ہے۔

دل کو حضوری کے لیے تیار کرنا

یاد رہے کہ نماز میں دل کی غفلت دو سبب سے ہوتی ہے۔

ایک ظاہر سے اور ایک باطن سے۔ ظاہر سے غفلت یہ ہے کہ نماز ایسی جگہ ادا کرتا ہے کہ جہاں کوئی چیز مظاہرے میں ہو یا سنائی دیتی ہے جس سے دل اس میں مصروف ہو جائے۔ تو اس صورت کا علاج یہ ہے کہ نماز ایسی جگہ ادا کرے جہاں باہر کی کوئی آواز وغیرہ نہ سن سکے۔ اور یہ جگہ اگر تاریک ہو تو بہتر ہوگی یا آنکھ بند کر لے۔ اکثر عابدوں نے عبادت کے لیے ایک چھوٹا سا حجرہ جو تاریک ہوتا ہے تعمیر یا مختص کر لیا ہوتا ہے۔ کیونکہ کھلی جگہ پر دل پراگندہ تر ہوتا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ جب نماز ادا کرتے تو شمشیر اور کتاب یا وہ قماش جو وہاں ہوتا کہ جن پر نظر پڑنے کا احتمال ہوتا نماز شروع کرنے سے پہلے وہاں سے ہٹا دیتے تھے تاکہ نگاہ ان میں مشغول نہ ہو۔

دوسرا سبب: باطنی ہے اور وہ افکار اور پراگندہ خیالی ہے اور یہ دشوار اور سخت تر ہے۔ اور یہ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو ایسے کام کے بارے میں ہوتی ہے کہ جو دل کو مشغول رکھتا ہے تو اس کے ازالے کی تدبیر یہ ہے کہ ایسا کام پہلے تمام کرلے تاکہ دل اس سے فارغ ہو جائے پھر نماز ادا کرے۔ اسی بنا پر آنحضرت نے فرمایا: ''اِذَا حَضَرَ العِشاءُ و العَشاءُ فابدؤا بالعَشاءِ'' یعنی اگر کھانے اور نماز دونوں کا وقت آ پہنچے تو چاہیے کہ پہلے تم کھانا کھالو یا کسی سے کوئی بات کرنی ہو تو پہلے بات کرلو تاکہ دل اس کے اندیشہ وخیال سے خالی ہو۔ اور ایک قسم اندیشہ کار کی یہ ہوتی ہے کہ وہ کام ایک گھنٹے میں بھی مکمل ہونے والا نہیں ہوتا۔ یا کوئی پریشان کن خیال دِل پر غالب ہوتا ہے بہ طور عادی۔ تو علاج اس کا یہ ہے کہ اگر یہ اندیشہ غالب نہ ہو اور اس کام کی خواہش قوی نہ ہو تو ذکر اور قرآن جسے وہ ادا کر رہا ہے دل کو ان کے معانی کے غور پر مامور کر دے تاکہ دل کے غور وفکر میں مصروف کرنے سے اُن کی پراگندگی اور پریشانی کا ازالہ ہو جائے۔ اور یہ چیز تفکرات کے سکوت کا باعث بن جاتی ہے۔ اور بحالتِ دیگر شہوت قوی ہو تو اس کا تفکر اس تدبیر سے دفع نہ ہوتا ہو تو اسے مسہل (جلاب) لینا چاہیے تاکہ بیماری کی جڑ کو باطن سے اکھاڑ دے۔ اور مسہل سے یہاں مراد یہ ہے کہ وہ چیز جو باعث پریشانی ہے ترک کر دے تاکہ نجات پا جائے اور اگر ایسا نہیں کر سکتا اور اس پراگندہ خیالی سے نجات ممکن نہیں ہوتی تو اس کی نماز ہمیشہ نفس کی باتوں سے مملو رہتی ہو تو مثال اس کی ایسے شخص کی سی ہے کہ جو ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہو اور چڑیوں کے شور وغوغا کو سننا نہ چاہتا ہو۔ تو وہ ایک لکڑی پکڑ کر انھیں وہاں سے اڑائے لیکن چڑیاں جلد ہی لوٹ آتی ہوں۔ تو اگر وہ واقعی ان سے نجات کا خواہاں ہو تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ پورے درخت ہی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ (نہ ہوگا بانس نہ رہے گی بانسری) کیونکہ جب تک درخت بہ اصل موجود رہے گا چڑیوں کا نشیمن بھی رہے گا۔ اسی طرح جب تک کسی کام کی شہوت اس کے دل پر مستولی رہے گی تو پراگندگیٔ اندیشہ لازماً اسی کے ساتھ رہے گی۔ یہی وجہ تھی کہ جب رسول (ﷺ) کے لیے ایک خوب صورت جامہ ہدیۃً لایا گیا تھا جس پر

عمدہ نقش ونگار بنے ہوئے تھے تو آپ کی نگاہ دورانِ نماز ان نقوش پر پڑی تو ادائے نماز کے بعد آپ (ﷺ) نے وہ لباس تحفۃً لانے والے کو واپس دے دیا اور وہی اپنا پرانا لباس زیب تن فرما لیا۔ اور اسی طرح جب آپ کے نعلین مبارک پر نئے تسمے باندھے گئے تھے تو آپ کی نگاہ دورانِ نماز ان پر پڑی کہ خوب تھے تو آپ نے فرمایا کہ یہ نئے تسمے نکال دو اور وہی پرانے تسمے دوبارہ نعلین میں ڈال دو۔ تو وہ تسمے دوبارہ لوٹائے گئے تھے۔ ایک دفعہ آپ کے لیے نعلین بنائے گئے جو آنکھوں کو بھلے لگے تو آپ سجدے میں گر گئے۔ اور کہا کہ میں نے خدا کے سامنے سر جھکا دیا کہ وہ مجھے اس نگاہ پر جو میں نے نئے جوتوں پر ڈالی ہے معتوب قرار نہ دے۔ آپ نے وہ نیا جوتا اتار کر رکھ دیا اور جو پہلا سائل آیا اس کی نذر کر دیا۔

طلحہ رضی اللہ عنہ اپنے کھجوروں کے باغ میں نماز ادا کر رہے تھے تو آپ نے ایک نہایت خوب صورت پرندے کو دیکھا جو ان درختوں کے درمیان اڑتا پھر رہا تھا اور راہ نہیں پا رہا تھا۔ حضرت طلحہ کا دل اس میں مشغول ہو گیا اور بھول گئے کہ کتنی رکعتیں ہوئیں۔ پس آپ رسول (ﷺ) کے ہاں حاضر ہوئے اور اپنے دل کی شکایت کی اور بہ طور کفارہ وہ نخلستان صدقہ کر دیا۔

اسلاف اس طرح کا عمل اکثر کرتے تھے اور اسے حضورِ دل کا سامان سمجھتے تھے۔ مختصر یہ کہ انسان نماز سے پہلے اگر ذکرِ حق تعالیٰ کو تقاضائے دل نہ سمجھے تو اسے نماز کے لیے کھڑا نہ ہونا چاہیے اور دل میں جب کوئی اندیشہ راہ پا چکا ہو تو وہ اس کے ساتھ اگر نماز میں جائے گا تو نماز میں اس اندیشے سے دل خالی نہ ہوگا۔ اس لیے اگر حضورِ دل کے ساتھ نماز کا خواہاں ہے تو چاہیے کہ دل کے اس عارضے کا علاج کر چکا ہو اور دل اس اندیشے سے خالی ہو چکا ہو اور یہ ممکن اس طرح ہوتا ہے کہ انسان دنیوی مشاغل کو دل سے ہمیشہ کے لیے دور کر چکا ہو اور دنیا سے بقدر حاجت قانع ہو چکا ہو۔ اور اس قدر قناعت کا مقصد عبادت کے لیے فراغت کا حصول ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو بعض نمازوں کے سوا حاضر نہ ہوگا۔ تو چاہیے کہ نوافل میں اضافہ کرے اور دل کو مثلاً چار رکعت نماز کے لیے تیار کرے تو دل حاضر ہو جائے گا کیونکہ نوافل فرایض کا کفارہ ہیں۔

نماز کے لیے سنتِ جماعت کی حصولی

رسول (ﷺ) نے فرمایا: ''ایک باجماعت نماز تنہا ستائیس مفرد نمازوں کے برابر ہوتی ہے''۔ نیز فرمایا کہ جو شخص نماز عشاء جماعت کے ساتھ ادا کرتا ہے وہ ایسے ہی ہے کہ جیسے اس نے آدھی رات نماز میں گذاری ہو اور جس نے نماز فجر باجماعت ادا کی ہو ایسے ہے جیسے وہ پوری رات شب زندہ دار رہا ہو۔ اور یہ بھی فرمایا کہ

جس نے مسلسل چالیس روز جمعہ نمازیں اس طرح با جماعت ادا کی ہوں کہ اس کی تکبیر اولیٰ فوت نہ ہوئی ہو تو اس کے لیے دو برأتیں لکھی جاتی ہیں۔ ایک برأت نفاق سے تو دوسری دوزخ سے۔ یہی وجہ تھی کہ اسلاف میں سے جس کی تکبیرِ اُولیٰ فوت ہو جاتی وہ تین دن خود اس پر افسوس وتعزیت کرتا اور ایک نماز جماعت سے فوت ہو جاتی تو سات دن اس کا غم کھاتا۔

سعید میبّب کہتا ہے: ''بیس سال ہو گئے ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں اذان سے پہلے مسجد میں نہ پہنچا ہوں'' اور اکثر علماء یہ کہتے ہیں کہ جو بلا عذر تنہا نماز ادا کرے تو اس کی نماز درست نہ سمجھی جائے گی۔ پس جماعت کو پوری اہمیت دینی چاہیے اور امامت واقتدا کے آداب کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

پہلی بات: تو یہ ہے کہ لوگوں کی دلی خوشی کے بغیر جو اسے حاصل ہونی چاہیے' امامت کے لیے آمادہ نہ ہو اور اگر نمازی اس سے نفور ہوں تو امامت سے دامن بچائے۔ اور اگر وہ اس سے امامی کے متقاضی ہوں تو بے عذر حذر نہ کرے کیونکہ امامت کی فضیلت عظیم ہے۔ جو موذنی سے فاضل تر اور بیشتر ہے۔ اور چاہیے کہ اپنے لباس کی پاکیزگی میں پوری پوری احتیاط برتے۔ اور وقتِ نماز کو ملحوظ رکھے۔ اور اوّل وقت میں نماز ادا کرے۔ اور جماعت کے لیے منتظر نہ رہے کیونکہ اوّل وقت کی فضیلت زیادہ ہے۔ اور صحابہ اگر دو بھی ہوتے تو تیسرے کا انتظار نہ کرتے تھے۔ اسی طرح نمازِ جنازہ میں اگر چار شخص بھی ہوتے تو پانچویں کا انتظار نہ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک دن رسول (ﷺ) نماز کے لیے ذرا دیر سے پہنچے تو ان کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ اور عبدالرحمٰن ابن عوف نے امام کا فریضہ ادا کیا۔ اور جب آپ (ﷺ) تشریف لائے تو ایک رکعت ہو چکی تھی۔ صحابہ جب نماز ادا کر چکے تو ڈرے لیکن آپ (ﷺ) نے فرمایا: ''تم نے بالکل درست کیا آئندہ بھی ایسے ہی کیجیے گا''۔

اور امام کو چاہیے کہ بے مُزد محض اللہ اخلاص کے ساتھ نماز کا یہ فریضہ ادا کرے۔ اور جب تک صفیں سیدھی نہ ہو جائیں تکبیر نہ کہے۔ اور تکبیرات میں آواز بلند رکھے اور نیت امامی کی کرے تاکہ ثواب پائے۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو جماعت تو درست متصور ہو گی لیکن جماعت کرانے کا ثواب اسے نہ مل پائے گا۔

امام کو لازم ہے کہ جہری نمازوں میں قرأت بآواز کرے اور تین وقفوں کو بجالائے ایک جب تکبیر کہے خاموشی سے وَجَهّتُ وَجهِي پڑھے اور مقتدی فاتحہ میں مصروف ہوں۔

دوم: اس وقت جب امام فاتحہ پڑھ چکے تو سورہ کی قرأۃ کے لیے تاخیر کرے تاکہ مقتدیوں میں سے جس نے ابھی سورہ فاتحہ نہ پڑھی ہو وہ اسے مکمل کر لے۔

سوم: اس وقت جب سورہ پڑھ چکے امام چندان خاموش رہے تاکہ آخر سورہ پر تکبیر پیوستہ نہ ہو' اور

مقتدی کو سوائے فاتحہ کے امام کے پیچھے اور کچھ پڑھنا نہیں چاہیے۔ سوائے اس کے کہ امام سے بہت دور صف میں ہو اور امام کی قرأت کو صاف نہ سن سکے۔ اور امام کو رکوع و سجود ہلکے کرنے چاہییں اور تسبیح تین دفعہ سے زائد نہیں کہنی چاہیے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ کوئی شخص بھی آنحضرت سے بڑھ کر ہلکی اور کامل تر نماز والا نہ تھا۔ سنت یہی ہے کہ امام نماز کو طول نہ دے کیونکہ ہوسکتا ہے مقتدیوں میں کوئی ضعیف بھی ہو یا کوئی کام در پیش ہو اور مقتدی کو امام کی اتباع کرنی چاہیے اور امام کے برابر بھی رکوع سجود وغیرہ نہیں کرنا چاہیے اور جب تک امام سجدے میں پیشانی نہ رکھ دے مقتدی سجدے میں نہ جائے۔ اور جب تک امام حدِ رکوع کو نہ پہنچ جائے مقتدی رکوع کا قصد نہ کرے کیونکہ متابعت اسی کو کہتے ہیں۔ مقتدی اگر عمداً پہل کرے گا تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔ اور امام جب سلام پھیرے تو صرف اس قدر تاخیر کرے کہ جس میں ''اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَا ذَالْجَلَالِ وَالْاِکْرَام''[1] کہہ سکے اس کے بعد فوراً اپنا چہرہ مقتدیوں کی طرف پھیر کر دعا شروع کر دے۔ اور مقتدیوں کو چاہیے کہ امام سے پہلے نہ اٹھیں کیونکہ یہ مکروہ ہے۔

نماز جمعہ کی فضیلت کا بیان

یاد رہے کہ جمعے کا دن نہایت بزرگ تر دن ہے۔ اور فضیلت اس کی نہایت عظیم ہے۔ اور یہ مؤمنوں کی عید کا دن ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ''جس نے تین جمعوں کی نمازوں میں بے عذر شرکت نہ کی اس نے اسلام کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے دل کو زنگ لگ گیا''۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جمعے کو چھ لاکھ بندوں کو دوزخ کی قید سے آزاد فرماتے ہیں۔ نیز آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ''دوزخ کو ہر روز زوالِ آفتاب کے قریب تپایا جاتا ہے۔ لیکن جمعے کے دن دوزخ کو اس وقت میں گرم نہیں کیا جاتا۔ اور فرمایا کہ جو کوئی جمعے کے دن فوت ہوتا ہے اسے شہیدی کا درجہ عطا ہوتا ہے اور وہ عذاب قبر سے محفوظ رہتا ہے''۔

نماز جمعہ کی شرائط

معلوم رہے کہ جو شرایط دوسری نمازوں کی ہیں وہ نماز جمعہ کی بھی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ جمعہ نماز کے لیے چھ شرطیں مزید بھی ہیں:

پہلی شرط: وقت ہے۔ مثلاً اگر امام نماز عصر کے وقت کے آغاز ہو جانے کے بعد نمازِ جمعہ کا سلام پھیرتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ نماز جمعہ فوت ہوگئی۔ لہٰذا اب ظہر کی نماز ادا کر لینی چاہیے۔

---

(۱) اے خدا تو عیب سے پاک ہے اور سلامتی تجھی سے ہے۔ اور تو ہی برتر، پاک تر اور عظیم تر ہے اے خداوند بزرگواری و بندہ نوازی۔

دوسری شرط: جگہ سے متعلق ہے کہ یہ نماز صحرا میں یا خیموں میں جائز نہیں بلکہ شہر میں یا کسی گاؤں میں جہاں چالیس عاقل بالغ آزاد مرد رہتے ہوں جائز ہے۔ اگر چہ مسجد میں نہ ہو جائز ہو گی۔

شرط سوم: تعداد کے بارے میں کہ جب تک چالیس مکلّف آزاد مقیم مرد نماز میں شریک نہ ہوں نماز جمعہ درست نہ ٹھہرے گی۔ اور اسی تعداد سے اگر خطبے یا دورانِ نماز کم ہوں تو ظاہر ہے نماز درست نہ ہو گی۔

چوتھی شرط نماز: جماعت ہے کہ اگر مذکورہ تعداد میں سے ہر کوئی الگ الگ نماز پڑھے گا تو نماز جمعہ نہ ہو گی۔ ہاں جماعت میں اگر کوئی آخری رکعت میں بھی پہنچا تو اس کی نماز درست متصور ہو گی۔ اگر چہ دوسری رکعت میں مفرد ہو گا۔ اور اگر ایسا مقتدی دوسری رکعت کا رکوع نہ پا سکے تو چاہیے کہ نماز ظہر کی نیت کر کے اقتداء کرے۔

پانچویں شرط: یہ ہے کہ اس سے پہلے اس جمعے کی یہ نماز ادا نہ کر دی گئی ہو کیونکہ ایک شہر میں ایک سے زائد مقام پر جمعہ نماز کا انعقاد نہ ہونا چاہیے۔ ہاں اگر صورت یہ ہو کہ ایک مسجد میں سارے نمازی نہیں سما سکتے یا اس امر میں دشواری کا سامنا ہو تو دو جگہ بھی جمعہ نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اور درست یہ ہو گا کہ انہوں نے قبلاً تکبیر اولیٰ کہہ رکھی ہو۔

چھٹی شرط: یہ ہے کہ نماز جمعہ سے قبل دو خطبے ہوتے ہیں اور دونوں فرض ہیں۔ اور خطبہ اوّل میں چار چیزیں فرض ہیں: یعنی تحمید اور الحمدللہ اس کے لیے کافی ہے اور رسول (ﷺ) پر درود پڑھنا اور تقویٰ کی نصیحت کرنا جس کے لیے۔ ''اُوْصِیْکُمْ عِبَادَاللہِ بِتَقْوَی اللہِ'' کافی ہو گا۔ علاوہ ازیں یہ کہ قرآن میں سے ایک آیت پڑھے۔ دوسرے خطبے میں بھی یہی امور فریضہ ہیں لیکن قرآن کی آیت کی بجائے دعا فرض ہے۔ یاد رہے کہ یہ نماز عورتوں غلاموں، نابالغوں اور مسافروں پر واجب نہیں۔ اسی طرح بارش کیچڑ وغیرہ کی بناء پر نیز بیمار کی تیمارداری کے باعث جب کوئی دوسرا تیمارداری کے لیے موجود نہ ہو نمازِ جمعہ ایسوں کے لیے فرض نہیں۔ لیکن اولیٰ تر یہ ہو گا کہ ایسے معذورین نمازِ ظہر اس وقت ادا کریں جب لوگ نماز جمعہ سے فارغ ہوں۔

جمعہ کے آداب

یاد رہے کہ جمعہ میں دس چیزیں سنت ہیں جن کا ادب ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ادبِ اوّل: یہ ہے کہ جمعرات کے دن جمعے کا استقبال جان و دل سے کرے۔ اور سفید لباس کی تیاری اور کوئی ایسا کام جو جمعے سے پہلے کرنے والا ہو کرے تا کہ نماز فجر میں شریک جماعت ہو سکے۔ اور جمعرات کی عصر نماز میں فراغت کے ساتھ تسبیح و استغفار میں مشغول ہونا کہ اس گھڑی کا فضل بہت عظیم ہے جو جمعہ کے دن کی ایسی ساعت کے مقابلے میں عزیز و نادر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب اپنی

زوج سے مباشرت سنت ہے جو میاں بیوی دونوں کے لیے جمعے کے دن غسل کی متقاضی ہے۔

جمعے کا دوسرا ادب یہ ہے کہ علی الصبح غسل میں مشغول ہو جائے اگر جلد مسجد میں پہنچ جائے تو فبہا ورنہ تاخیر اولیٰ تر ہے کیونکہ آنحضرت نے غسل جمعہ کا موکد فرمان دیا ہے۔ یہاں تک کہ علما میں سے ایک گروہ نے اس غسل کو بمنزلہ فرض قرار دیا ہے۔ اور مدینۃ النبی کے باشندے جب کسی کو سخت الفاظ سے مخاطب کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ''تو اس شخص سے بھی برا ہے جو جمعے کو غسل نہیں کرتا'' اور اگر ایسے میں جُنب ہو تو جب وہ غسل جنابت کرے تو اولیٰ تر یہ ہے کہ غسل جمعہ کی نیت کے ساتھ دوبارہ اپنے جسم پر پانی ڈالے۔ پس اگر دونوں نیتوں کے ساتھ ایک غسل کرے گا تو یہ کافی ہے۔ اس سے جمعہ کے غسل کی فضیلت بھی اسے حاصل ہو جائے گی۔

تیسرا ادب یہ ہے کہ انسان پاک صاف اور آراستہ ہو کر پسندیدہ ہیت کے ساتھ مسجد میں آئے اور پاکیزگی یوں ہوتی ہے کہ بال تراشے' ناخن تراشے اور مونچھ کے بڑھے ہوئے بالوں کو کاٹ کر ہونٹ کی سیدھ تک باقی رکھے اور اگر حمام میں جا کر یہ سب کچھ کر چکا ہو تو کافی ہے۔ اور آراستگی یہ ہے کہ سفید لباس پہنے کیونکہ خدائے تعالیٰ کو سفید لباس زیادہ پسند ہے۔ اور عطر و خوشبو لگائے اور نیت نماز اور مسجد کی تعظیم کی ہو۔ تاکہ کوئی بری بُو نہ آئے جس سے کسی کو تکلیف کا خدشہ ہو۔ اور وہ غیبت کا مرتکب ہو جائے۔ اور چوتھا ادب علی الصبح جامع مسجد میں پہنچنے کا ہے کہ ثواب اس کا بہت ہے۔ اگلے زمانے میں صبح کے وقت چراغ لے کر لوگ مسجد میں پہنچتے تھے۔ اور راستے اس قسم کے دشوار گذار ہوتے تھے کہ ان کا طے کرنا کارے دارد تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ایک بار مسجد میں جو پہنچے تو دیکھا کہ ان سے پہلے تین افراد مسجد میں پہنچ چکے تھے تو آپ کو خود اپنے اوپر بہت غصہ آیا تو بولے: ''تیرا مقام چوتھے درجے میں ہے تیرا کام کیسے مقبول ہوگا''؟ اور یوں کہتے تھے کہ اسلام میں سب سے پہلے جو بدعت پیدا ہوئی وہ یہی تھی کہ لوگوں نے مسجد میں جلد حاضر ہونے سے پہلوتہی کا آغاز کر دیا۔ اور یہودی اور عیسائی جو ہفتے اور اتوار کے دن علی الصبح کلیسا اور کنشت میں جاتے ہیں اور مسلمان کہ جمعہ ان کا عظیم دن ہے۔ اس میں تقصیر کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کیسے متصور ہے؟

اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ''جو شخص جمعہ کے روز پہلی ہی ساعت میں جامع مسجد میں داخل ہو جاتا ہے وہ ایسے ہے جیسے اس نے ایک اونٹ راہ خدا میں قربان کر دیا ہو۔ اگر دوسری ساعت میں پہنچے تو گویا اس نے ایک گائے قربان کر دی۔ آنے والے تیسرے نے ایک بکری قربان کر دی تو چوتھا ایسا ہے جیسے اس نے ایک مرغی راہ خدا میں دے دی ہو اور پانچواں وہ ہے ایک انڈہ راہ خدا میں دے دیا ہو۔ اور جب خطیب منبر پر آجاتا ہے تو وہ فرشتے جو ان قربانیوں کو معرض تحریر میں لا رہے تھے وہ اپنے دفتر لپیٹ لیتے ہیں اور سماع خطبہ میں

مشغول ہو جاتے ہیں۔اور جو کوئی اس وقت مسجد میں پہنچے اس کو سوائے فضل نماز کے اور کچھ فضیلت عطا نہ ہوگی۔

پانچواں ادب یہ ہے کہ اگر کوئی دیر سے آیا ہو تو اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ دوسروں کی گردنوں پر پاؤں رکھتا ہوا آگے جانے کی کوشش کرے۔ کیونکہ حدیث میں مذکور ہے کہ جو شخص ایسا کرے گا تو قیامت میں اس سے ایک پل بنایا جائے گا تاکہ لوگ اس کے اوپر سے گذریں اور آنحضرت نے جب ایسے شخص کو دیکھا جو یوں کرتا تھا تو جب وہ نماز پڑھ چکا تو آپ (ﷺ) نے اس سے کہا: ''تم نے جمعہ کیوں ادا نہیں کیا''؟ تو وہ بولا: ''یارسول اللہ میں آپ کے ساتھ تھا'' تو آپ نے فرمایا: ''میں نے دیکھا تھا کہ تو لوگوں کی گردنوں پر پاؤں رکھ کر گذر رہا تھا''۔یعنی جو کوئی یہ عمل کرے گا تو متصور یہ ہوگا کہ اس نے نماز ادا نہیں کی۔اور اگر ایسے میں صفِ اوّل میں جگہ خالی ہو تو جائز ہوگا کہ کوئی صفِ اوّل کا قصد کرے کیونکہ قصور ان کا ہے جنہوں نے اپنے سے اگلی صف کو خالی چھوڑ رکھا تھا۔

چھٹا ادب یہ ہے کہ کسی نمازی کے آگے سے جب وہ نماز کی حالت میں ہو نہ گذرے۔اور جب بیٹھے تو دیوار یا ستون کے نزدیک بیٹھے تاکہ کسی کے لیے اس کے آگے راہ نہ ہو۔ کیونکہ نمازی کے آگے سے گذرنے سے منع کیا گیا ہے۔اور جب حدیث میں وارد ہے کہ اگر وہ راکھ بن جائے اور ہوا اسے بکھیر دے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ کسی نمازی کے آگے سے گذرے۔

ساتواں ادب یہ ہے کہ پہلی صف میں پہنچنے کی کوشش کرے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو جس قدر نزدیک تر ہو بہتر ہے۔ کیونکہ یہ فضیلت بہت عظیم ہے۔سوائے اس کے کہ صف اوّل میں فوجی ہوں جنہوں نے ریشمی لباس زیب تن کیا ہوا ہو۔ یا خطیب کا جامہ سیاہ ریشمی ہو۔ یا اس کی شمشیر میں طلائی کام ہوا ہو یا ایسا ہی کوئی اور منکر ہو تو ایسے میں نمازی جتنا اس سے دور رہے گا اُتنا ہی اچھا ہوگا۔ کیونکہ منکر جگہ پر عمداً بیٹھنا ناپسندیدہ ہے۔

آٹھواں ادب یہ ہے کہ جب خطیب باہر آئے تو کوئی بات نہ کرنی چاہیے۔اور مؤذن کی اذان کے جواب میں مشغول ہونا چاہیے۔ پھر خطبہ سننے میں مصروف ہونا چاہیے تو دورانِ خطبہ اگر کوئی بولے تو بہ اشارہ اسے خاموش کرے۔اور زبان سے ہرگز نہیں۔ کیونکہ آپ (ﷺ) نے فرمایا: ''دوران خطبہ جس نے دوسرے سے کہا کہ خاموش رہو یا یہ خطبہ سنو تو اس نے بے ہودہ بات کی اور جس نے ایسے میں بے ہودہ بات کا ارتکاب کیا اس کا جمعہ نہیں ہوا۔اور اگر دور ہو جہاں خطبے کی آواز سنائی نہ دیتی ہو تب بھی خاموش رہنا چاہیے اور جہاں نمازی محوِ گفتگو ہوں وہاں نہ بیٹھے۔اور خطبے کے دوران کسی قسم کی نماز جائز نہیں۔سوائے تحیۃ مسجد کے۔

نواں ادب یہ ہے کہ جب نماز فرض ادا کر چکے تو سات دفعہ الحمد شریف اور سات ہی دفعہ ''قل ھو اللہ

اَحَدٌ'' کی تلاوت کرے۔ اور معوذتین بھی پڑھے۔ کیونکہ آثار کتب میں ہے کہ ''یہ اس جمعہ سے اگلے جمعہ تک شیطان سے پناہ کے مصداق ہوگا'' اور کہے کہ: ''اَللّٰھُمَّ یَا غَنِیُّ وَیَا حَمِیْدُ یَا مُبْدِیُ یَا مُعِیْدُ یَا رَحِیْمُ یَا وُدُوْدُ اَغْنِنِیْ بِحَلالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَبِطَاعَتِكَ عن معصیتك وَبِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ'' (اے خدائے بے نیاز وستودہ اور اے ایجاد کنندہ اور لوٹانے والے اور اے مہربان اور دوست دار مجھے حرام سے اپنے حلال کی طرف اور نافرمانی سے اپنی فرماں برداری کی طرف اور اس فضل سے جو تیرے سوا ہر چیز سے بے نیاز کردے بہرہ مند فرما)۔ کہتے ہیں کہ جو اس دعا پر مداومت کرے گا تو اسے روزی ایسی جگہ سے پہنچے گی کہ جس کا گمان بھی اسے نہ ہوگا۔ اور وہ مخلوق سے بے نیاز ہوگا)۔ نماز جمعہ کے فرض کی ادائیگی کے بعد اسے چھ رکعت سنتیں ادا کرنی چاہییں کیونکہ اسی مقدار کی روایت رسول (ﷺ) سے ہوئی ہے۔

دسواں ادب نماز جمعہ کا یہ ہے کہ مسجد ہی میں ٹھہرا رہے حتیٰ کہ نمازِ عصر ادا کرلے۔ اور اگر نماز مغرب تک مسجد نشین رہے تو یہ اور بھی فضیلت کا عمل ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ عمل ایک حج اور ایک عمرے کے ثواب کا مستحق ہے۔ اور اگر اس قدر قیام مسجد میں نہ کرے اور گھر کو لوٹ جائے تو چاہیے کہ ذکرِ حق تعالیٰ سے غافل نہ رہے تاکہ وہ ساعت کم یاب جو جمعہ کے دن میں ہے اسے غفلت میں نہ پائے کہ اس کے فضل سے محروم رہ جائے۔

روزِ جمعہ کے آداب

چاہیے کہ انسان جمعہ کے اس پورے دن میں سات فضیلتوں کی طلب کرے۔

اوّل: یہ کہ علی الصبح مجلس علم میں حاضری دے اور قصہ گوئیوں اور حلقہ نشینوں سے محترز رہے۔ اور ایسے شخص کی مجلس میں حاضر ہو کہ جس کا قال وحال انسان کو رغبت دنیا کی تقلیل سے زادِ راہِ آخرت کی طرف بلائے۔ اور جو بات بھی یہ اہلیت نہ رکھتی ہو تو وہ مجلس علم نہیں متصور ہوگی۔ لیکن اگر صحیح مجلسِ علم موجود ہو تو اس میں شرکت کے بارے میں حدیث میں ہے کہ ''ایسی ایک مجلس میں حاضر ہونا ہزار رکعت نماز ادا کرنے سے فاضل تر ہے''۔

دوسرے یہ کہ جمعے کے دن ایک ایسی کم یاب اور صاحبِ شرف ساعت ہے کہ جو کوئی اسی ساعت عزیز میں حاجت چاہے گا روا ہوگی اور یہ ساعت کون سی ہے اس میں اختلاف ہے۔ طلوع آفتاب کے وقت ہے؟ یا زوال کے وقت ہے یا بوقت غروب ہے یا اذان نماز کے وقت ہے یا خطیب کے منبر پر پہنچنے کے وقت ہے یا قیام نماز کے وقت ہے یا نماز عصر کے وقت ہے؟ اور صحیح یہ ہے کہ یہ ساعت معلوم نہیں۔ اور شب قدر ہی کی طرح مبہم ہے۔ اس لیے چاہیے کہ انسان دن بھر جمعے کے روز مراقبے میں رہے اور کوئی وقت بھی ذکر وعبادت سے

خالی نہ گذرے۔

تیسرے یہ کہ جمعے کے دن حضور (ﷺ) پر درود بکثرت بھیجے کیونکہ حضور کا فرمان ہے جس نے اس دن مجھ پر اَسّی ۸۰ دفعہ درود بھیجا اس کے اَسّی سال کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ صحابہ کرام نے سوال کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ) درود آپ پر کس طرح بھیجنا چاہیے! تو آپ نے فرمایا یوں کہئے: ''اللھم صل علی محمد وعلی محمد صلواۃ تکن لك رضا ولحقہ اداءً و اعطہ الوسیلة والفضیلة وابعث المقام المحمود الذی وعدته واعجز عنا ما ھو اھله واجزہ افضل ما جزیت عن امتة وصل علی جمیع اخوانه من النبیین والصالحین یا ارحم الراحمین ''یعنی (خدایا محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر درود بھیج وہ درود جو تجھے راضی کرے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سزاوار ہو اور اسےؐ نزدیکی اور برتری عطا فرما اور اس گرانقدر مرتبے پر فائز فرما جس کا تو نے وعدہ کر رکھا ہے اور ہماری طرف سے اسےؐ وہ بدلہ دے جو اس کے شایانِ شان ہو۔ وہ بدلہ جو تو نے پیغمبروں کو ان کے پیرووں کی طرف سے عطا کیا ہے اور اے ارحم الراحمین پیغمبروں میں سے اسؐ کے سب بھائیوں اور صالحین پر درود بھیج)۔ کہا جاتا ہے کہ جو کوئی سات جمعوں میں اس درود کو سات دفعہ پڑھے گا۔ وہ لامحالہ رسول کی شفاعت پالے گا۔ اور اگر کوئی ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ'' سے زیادہ نہیں کہے گا تو یہ بھی کافی ہوگا۔

چوتھے یہ کہ اس دن قرآن کی تلاوت بکثرت کرے۔ اور سورہ الکھف پڑھے کہ فضیلت اس کی حدیث میں وارد ہوئی ہے۔ اور اسلاف میں کے عابدوں کا معمول یہ ہوتا تھا کہ جمعے کے دن ہزار بار قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَد پڑھتے اور ہزار بار درود بھیجتے اور ہزار بار ''سُبْحٰنَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ وَاللّٰہُ اَکْبَر '' کا ورد کرتے تھے۔

پنجم یہ کہ اس دن نماز زیادہ ادا کرے۔ اور حدیث میں ہے کہ ''جو شخص جامع مسجد میں داخل ہو تو اسی وقت چار رکعت نماز ادا کرے اور ہر رکعت میں پچاس ۵۰ دفعہ سورۃ اخلاص سورۃ فاتحہ کے ساتھ پڑھے تو موت سے قبل اس کو جنت میں اس کے مقام کا دیدار کرایا جائے گا۔ یا اس دوسرے کے ساتھ کہ جو اس کو خبر دے''۔ اور اس دن سورۃ الانعام، سورۃ الکھف، سورۃ یٰسں اور سورۃ طٰہٰ چاروں سورتوں کے ساتھ چار رکعت نماز ادا کرنا مستحب ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو سورۃ سجدہ ولقمان اور سورۃ الدخان اور سورۃ الملک پڑھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ جمعے کے دن نماز تسبیح سے کبھی دست کش نہیں ہوئے تھے اور یہ نماز معروف ہے اور اولیٰ تر یہ ہوگا کہ زوال کے وقت تک نماز پڑھتا رہے اور پھر زوال کے اختتام سے لے کر نماز عصر تک مجلسِ علم میں بیٹھے اور اس کے بعد نماز عشاء تک تسبیح

واستغفار میں مصروف رہے۔

ششم یہ کہ یہ دن صدقہ خیرات سے خالی نہ چھوڑے۔ اگر چہ روٹی کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس روز صدقہ کی فضیلت بہت ہے اور ہر وہ سائل جو امام کے خطبہ کے وقت کسی چیز کا سوال کرے اسے تنبیہً روک دینا چاہیے اور ایسے میں اسے کچھ دینا مکروہ ہے۔

ساتویں یہ کہ ہفتے کے سات دنوں میں سے اس دن کو آخرت کے لیے مسلّم سمجھے اور ہر روز حدیث میں مصروف رہے اور کارِ دنیا کو موقوف رکھے۔ اور یہ جو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ''فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ'' اس کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں فضل کے معنی خرید و فروخت یا کسب دنیا نہیں بلکہ طلب علم، زیارتِ برادران، عیادتِ بیماران اور تشییع جنازہ اور ایسے ہی کام مراد ہیں''۔

مسئلہ: یاد رہے کہ جو کچھ ضروری تھا نماز کے بارے میں بیان ہو چکا اور دیگر مسائل حاجت ہونے پر پوچھنے چاہییں کیونکہ اس جیسی کتاب میں ان کی تفصیل و تشریح ممکن نہیں۔ لیکن چونکہ نماز میں وساوس بہت ہوتے ہیں اس لیے ان کے بارے میں کچھ اشارۃً بیان کیا جا رہا ہے۔

معلوم رہے کہ وسوسۂ نیت اس کو لاحق ہوتا ہے جس کی عقل میں فتور ہو۔ یا وہ دیوانہ ہو یا شریعت کے باب میں جاہل ہو اور نیت کے معنی نہ جانتا ہو۔ کیونکہ نیت تمہاری وہ رغبت ہے جو تمہیں رو بہ قبلہ لائی ہے اور تمھیں اس پر انگیخت کیا ہے کہ تم فرمان اُس کا بجا لائے جیسے کہ کوئی تجھے کہے کہ ''فلاں عالم آ پہنچا ہے اس کے لئے اٹھ اور اس کا احترام کر'' تو تو خود سے نہ کہے کہ ''میں نے نیت کی کہ میں اٹھ جاؤں اور فلاں عالم کو اس کے علم کے لیے بہ فرمان فلاں کس'' لیکن تو اسی وقت اٹھے اور یہ نیت تیرے دل میں ہو اور بغیر اس کے کہ دل سے کہے یا زبان سے اور جو کچھ دل سے کہے گا وہ حدیثِ نفس ہو گی نیت نہ ہو گی کیونکہ نیت دراصل وہ رغبت ہو گی جو تمہارے دل میں نمودار ہو گی اور تجھے اٹھنے پر انگیخت کرے گی اور تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ نیت کے بارے میں فرمان کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ مثلاً تجھے معلوم ہو کہ وقت ادائے نماز ظہر ہے یا عصر کا تو جب دل اس امر سے غافل نہ ہو تو تُو اللہ اکبر کہے گا اور اگر دل غافل ہو گا تو یاد کرے اور یہ گمان نہ کرے کہ ادا اور ظہر اور فرض کے معنی یک بارگی دل میں مفصل جمع ہو جائیں۔ لیکن جو دل کے نزدیک ہوا سے باہم جمع کرے تو اس قدر ہی نیت میں کافی ہے۔ اس واسطے کہ اگر کوئی تجھ سے پوچھے تو نے ظہر کی نماز پڑھی ہے تو کہے گا 'ہاں' تو تُو جس وقت ہاں کہتا ہے تو سب معنی تیرے دل میں موجود تو ہوتے ہیں مفصل نہیں ہوتے۔ تو تجھے اپنے تئیں یاد دلانا اس کے پوچھنے کے

مثل ہے اور اللہ اکبر کہنا ایسا ہے جیسے ہاں کہنا اور اگر اس سے زیادہ کا متلاشی ہوگا تو تیرا دل اور نماز دونوں پریشان ہوں گے۔ انسان کو چاہیے کہ آسان امر اختیار کرے۔ جس قدر بیان ہوا ہے جب اپنی نیت کر لی تو پھر جس سنت پر بھی ہو جان لے کہ نماز درست ہوگئی۔ اس واسطے کہ نماز کی نیت بھی دوسرے کاموں کی نیت ہی کی طرح ہوتی ہے۔ اسی بناء پر رسول (ﷺ) اور صحابہ کرام کے زمانے میں کسی کو نیت کے باب میں وسوسہ نہ ہوتا تھا۔ اس بناء پر کہ جانتے تھے کہ یہ کام آسان ہے اور جو کوئی اسے آسان نہ جانے وہ جاہل ہے۔

اصل پنجم: زکوٰۃ کے بیان میں

معلوم رہے کہ زکوٰۃ ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اسلام کی بنیاد پانچ اصلوں پر ہے: کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ' نماز' روزہ زکوٰۃ و حج'' اور حدیث میں ہے کہ وہ لوگ جو سونا چاندی رکھتے ہوں اگر زکوٰۃ نہ دیں تو سونا چاندی دونوں کو داغ کر ان کے سینے پر لگایا جائے گا۔ اس انداز سے کہ یہ سونا چاندی ان کی پشت پر سے باہر نکل آئے گا۔ اسی طرح پشت پر گرم کر کے رکھا جائے گا جس سے یہ زر ان کے سینے میں سے نکل پڑے گا۔ اور جو کوئی چار پائے رکھتا ہے اور ان کی زکوٰۃ نہیں دیتا روزِ قیامت ان چار پایوں کو اس شخص پر مسلط کر دیا جائے گا تاکہ اس کو سینگ ماریں اور اسے پاؤں میں روندیں۔ اور جب سارے چار پائے اسے روندتے ہوئے گذر جائیں تو وہ پہلے کی طرح لوٹ کر دوبارہ اسی طرح روندنے لگیں گے۔ اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک جملہ مخلوقِ انسانی کا حساب نہ لے لیں اور یہ حدیث بخاری اور مُسلم دونوں میں موجود ہے۔ پس زکوٰۃ کا جاننا مال داروں پر واجب ہے اور فرض ہے۔

فصل: انواعِ زکوٰۃ اور ان کی شرائط

معلوم رہے کہ چھ قسم کی زکوٰۃ واجب ہے:

نوعِ اوّل:

چار پایوں کی زکوٰۃ: اور یہ اونٹ' گائے بیل' بھیڑ بکری پر واجب ہے اور گھوڑے گدھے اور دیگر حیوانات پر واجب نہیں۔ اور یہ زکوٰۃ چار شرائط کے ساتھ واجب ہوتی ہے۔

پہلی شرط: یہ ہے کہ چار پایوں کو خرید کردہ چارے سے پالا نہ گیا ہو بلکہ چراگاہ سے پالا پوسا گیا ہو اور ان پر کوئی زیادہ خرچہ نہ کیا گیا ہو۔ اگر سال بھر خرید کردہ چارے پر معتدبہ روپیہ صرف ہوا ہو تو ایسے میں زکوٰۃ

ساقط ہو جاتی ہے۔

دوسری شرط: یہ ہے کہ یہ چار پائے پورا سال اس کی ملک میں رہے ہوں اگر اس دوران میں اس کی ملکیت سے نکل گئے ہوں تو زکوٰۃ واجب نہ رہے گی۔ لیکن اونٹ، گائے بیل اور بھیڑ بکری کے بچے جو دوران سال پیدا ہوئے ہوں وہ بھی محسوب ہوں گے اور ان پر زکوٰۃ اصل مال ہی کی طرح واجب ہو گی۔

تیسری شرط: یہ ہے کہ صاحب مال اس مال کی بدولت دولت مند ہو اور یہ مال اس کے تصرف میں ہو۔ لیکن اگر یہ مال گم ہو جائے یا کسی ظالم نے اس سے چھین لیا ہو تو اس پر اس کی زکوٰۃ واجب نہ رہے گی کیونکہ حقیقت میں وہ مفلس ہے سوائے اس کے کہ یہ سب مال اور اس سے پہنچنے والے فوائد اس کو واپس مل جائیں۔ تب یہ زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ اگر کوئی جتنا مال رکھتا ہے اور وہ قرض پر ہو تو درست یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہو گی۔

چوتھی شرط: یہ ہے کہ یہ مال نصابی ہو کہ جس مقدار کے مطابق متمول شمار ہوتا ہو۔ کیونکہ تھوڑی سی مقدار سے دولت مندی حاصل نہیں ہوتی۔ مثلاً اونٹ جب تک پانچ نہ ہو جائیں تو مالک پر کچھ واجب نہیں اور پانچ اونٹوں کی زکوٰۃ ایک بھیڑ ہے اور دس اونٹ پر دو بھیڑیں زکوٰۃ ہے۔ پندرہ پر تین، بیس پر چار۔ اور زکوٰۃ میں دی جانے والی بھیڑیں عمر میں ایک سال سے کم کی نہ ہوں۔ اور اگر بکری ہو تو دو سال سے کم کی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر اونٹوں کی تعداد پچیس ہو جائے تو ایک یک سالہ اونٹنی ان کی زکوٰۃ ٹھہرے گی۔ اگر اونٹنی نہ ہو تو دو سالہ نر اونٹ اس کی جگہ واجب ہو گا۔ اور پھر جب تک اونٹوں کی تعداد چھتیس نہ ہو جائے کوئی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ لیکن جب یہ تعداد چھتیس ہو جائے تو ایک دو سالہ اونٹنی کی زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ اور یہ تعداد چھیالیس ہو جائے تو تین سالہ مادہ اونٹنی ایک عدد زکوٰۃ ٹھہرے گی۔ اور اگر تعداد اکسٹھ ہو جائے تو چار سالہ ایک اونٹنی زکوٰۃ میں دینی ہو گی۔ چھہتر [۷۶] اونٹوں پر دو دو [۲] سالہ اونٹنیاں واجب ہوں گی اور اگر تعداد اکانوے [۹۱] ہو تو دو [۲] تین سالہ اونٹنیاں زکوٰۃ قرار پائیں گی۔ اور ایک سو اکیس [۱۲۱] اونٹوں پر تین [۳] دو سالہ اونٹنیاں زکوٰۃ میں دینی ہوں گی۔ اور اس کے بعد حساب یوں ہو گا کہ ہر پچاس اونٹوں پر ایک اونٹنی سہ سالہ اور ہر چالیس اونٹوں پر ایک دو سالہ اونٹنی کی زکوٰۃ واجب ہو گی اور اگر گائے بیل ہوں تو جب تک ان کی تعداد [۳۰] نہ ہو جائے کچھ واجب نہیں ہوتا۔ لیکن تیس کی تعداد ہونے پر ایک سالہ گائے بطور زکوٰۃ واجب ہو جائے گی اور چالیس ہونے پر ایک دو سالہ اور ساٹھ ہونے پر دو یک سالہ واجب ہوں گی اور اس کے بعد ہر چالیس کے اضافے پر ایک گائے دو سالہ اور ہر تیس کے اضافے پر ایک سالہ گائے زکوٰۃ میں دی جائے گی اور اگر گوسفند ہوں تو ہر چالیس پر ایک زکوٰۃ میں دی جائے گی اور اگر یہ

تعداد میں ایک سو اکیس[۱۲۱] ہوں تو دو[۲] گوسفند زکوۃ میں دینی ہوں گی۔ اور یہ تعداد دو سو ایک[۲۰۱] ہو تو تین زکوۃ میں دی جائیں گی اور چار سو کی صورت میں چار عدد زکوۃ ٹھہرے گی۔ اور اس کے آگے حساب کی صورت یہ ہوگی: ہر سو گوسفند پر ایک جو عمر میں ایک سال سے کم نہ ہو اور اگر نہ ہو تو بکرا دو سال سے کم عمر کا نہ ہو۔ اور اگر دو شخص مشترکہ ان کے مالک ہوں تو دونوں پر زکوۃ واجب ہوگی۔ بشرطیکہ ان دونوں میں سے ایک کافر یا غلام نہ ہو تو دونوں کا حصہ ایک ہی مال کا حکم رکھتا ہے۔ اگر دونوں کا حصہ ملا کر چالیس بھیڑوں سے زیادہ نہ ہوں تو ہر ایک پر آدھی آدھی بھیڑ واجب ہوگی۔ اور اگر دونوں ملا کر ایک سو بیس بھیڑیں رکھتے ہوں تو دونوں شخص مل کر ایک بھیڑ زکوۃ میں دیں گے تو وہ بھی کافی ہے۔

نوع دوم:

غلہ وغیرہ کی زکوۃ ہے۔ جس کے پاس آٹھ سو من[(۱)] گندم یا جو یا کشمش یا خُرما وغیرہ جو انسانی غذا کے لیے درکار ہوتی ہے اور ایک قوم کی غذا شمار ہوتی ہے جو خود مکتفی ہو۔ جیسے چنے، چاول اور باقلی وغیرہ ہیں ان پر بھی عشر واجب ہے۔ جو شے کھانے کی نہ ہو جیسے روئی، اخروٹ اور السی اور اثمار ان پر عشر واجب نہیں۔ اگر کسی کے پاس چار سو من گندم ہو اور چار سو من جو ہوں تو عشر واجب نہ ہوگا۔ کیونکہ نصاب ایک ہی جنس کا ہونا چاہیے۔ اور اگر کھیتی نہری پانی یا کاریز سے سیراب نہ ہوتی ہو بلکہ ڈول کنویں سے سیراب کی جاتی ہو تو عشر آدھا واجب ہوگا۔ اور انگور اور رطب عشر میں نہیں لی جائے گی بلکہ صاحب مال کو کشمش اور خُرما بہ طور عشر دینی ہوں گی۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ اس کے ہاں کشمش نہ بناتے ہوں تو انگور بہ طور عشر جائز ہوگا اور چاہیے کہ انگور جب رنگ پکڑ لے اور گندم وجو کے دانے سخت ہو جائیں تو صاحبِ مال ان میں کوئی تصرف نہ کرے جب تک یہ تخمینہ نہ لگا لے کہ مفلسوں کا حصہ اس میں کس قدر ہوگا۔ اور جب معلوم ہو جائے کہ تخمیناً مقدار کیا ہوگی تو پھر اگر اس میں متصرف ہو تو کوئی حرج نہیں۔

نوع سوم: سونے چاندی کی زکوۃ:

سال تمام ہونے پر دو سو درم چاندی پر پانچ درم زکوۃ واجب ہے اور بیس دینار پر آدھا دینار اور یہ چالیسواں حصہ کل مال کا ہے۔ اور یہ جس قدر زیادہ ہوگا زکوۃ اسی حساب سے لاگو ہو جائے گی اور چاندی سونے کے برتنوں اور زریں ساز و یراق اسپ اور وہ سونا جو شمشیر اور دوات وغیرہ پر ناروا کام میں لایا گیا ہو اس سب پر بھی زکوۃ واجب ہے۔ لیکن وہ زیور جو مرد و زن کے لیے جائز ہو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی۔ اور اگر زر و مال

(۱) ایرانی من تقریباً ساڑھے تین کیلو کا ہوتا ہے۔

کسی اور کے پاس رکھا ہو لیکن اس پر قادر ہو کہ جب چاہے واپس لے لے تو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔

نوع چہارم: تجارت پر زکوٰۃ:

جب کوئی شخص بیس دینار کے بقدر کوئی چیز تجارت کی نیت سے خریدے اور اس پر پورا سال گذر جائے تو اس نقد کی زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اور جس قدر منافع اس پر حاصل ہوا ہو اس پر بھی واجب ہو جاتی ہے۔ چاہیے کہ آخر سال مال کی قیمت معلوم کرے اور سرمائے میں سونے چاندی کی صورت میں اضافہ ہوا ہو تو اس میں سے بھی زکوٰۃ دے اور اگر نقدی دے کر خریدا ہو تو اس نقد سے جو شہر میں بہ کثرت متداول ہو ادا کرے اور اگر متاع ہو اور نیت تجارت کی ہو تو جب تک اس سے کوئی چیز نہ خریدے تو محض نیت سے زکوٰۃ کے سال کا آغاز نہ ہوگا۔ اور جس وقت دورانِ سال تجارت کا ارادہ نہ رہے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ ہاں اگر نقدی کی صورت میں ہو اور بمقدارِ نصاب ہو اور نیت تجارت کی کرے تو زکوٰۃ کے سال کا آغاز خرید کے دن سے نہ ہوگا بلکہ اس دن سے ہوگا جب وہ حدِ نصاب میں پہنچ کر حد نصاب میں داخل ہو ہر چند خرید بدیر انجام پائے۔

نوع پنجم: فطرانے کی زکوٰۃ:

ہر وہ مسلمان جو شبِ عید رمضان اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے روزِ عید درکار کھانے، گھر، لباس اور دیگر لوازم ضروریہ سے زائد کا مالک ہو اس کے لیے ایک صاع[1] رزق اس جنس سے جسے وہ خود مصرف میں لاتا ہے، فطرانے میں دینا واجب ہے۔ ایک۔ صاع یعنی دو من و چار دانگ۔ اگر خود گندم کھاتا ہے گندم ہی میں سے دے، جَو میں سے نہ دے اور اگر غلے کی ہر قسم سے استفادہ کرتا ہو تو جو غلہ بہترین ہے اس میں سے دے۔ امام شافعی کے نزدیک گندم کے دانوں کے عوض آٹا وغیرہ دینا مناسب نہیں، اور ہر وہ فرد خانہ جس کا نان ونفقہ صاحب خانہ کے ذمے ہے تو ان افراد کا فطرانہ بھی اسی کے ذمے ہے۔ افرادِ خانہ جیسے بیوی، بچے، ماں باپ اور خادم لونڈی ہیں۔ اور خادم اگر دو افراد کا مشترکہ خادم ہے تو دونوں اصحاب اس کا فطرانہ ادا کریں گے۔ اور غلام لونڈی اگر کافر ہو تو ان کا فطرانہ واجب نہیں۔ اگر بیوی فطرانہ اپنے مال میں سے دینا چاہے تو بھی روا ہے۔ زکوٰۃ کے مسائل میں اس قدر بیان کافی ہے۔ اگر کوئی صورت مبینہ صورتوں کے علاوہ کسی کو درپیش ہو تو اسے علماء کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اور لازم ہے کہ معلوم کرے۔

زکوٰۃ دینے کی کیفیت

لازم ہے کہ انسان زکوٰۃ دیتے وقت پانچ چیزوں کو ملحوظ رکھے:

زکوٰۃ دینے کی کیفیت

لازم ہے کہ انسان زکوٰۃ دیتے وقت پانچ چیزوں کوملحوظ رکھے:

ایک یہ کہ انسان زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت کرے اور اگر اس کے لیے کسی اور مختار کار مقرر کرے تو یا تو بوقتِ توکیل خود نیت کرے یا مختار کار سے کہے کہ زکوٰۃ دیتے وقت اس کی نیت کرے۔ جیسے کسی بچے کے مال پر زکوٰۃ دیتے وقت ولی نیت کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ جب سال پورا ہو جائے تو ادائے زکوٰۃ میں دیر نہ کرے کیونکہ بلا عذر تاخیر پسندیدہ نہیں۔ اور فطرانے کی ادائیگی میں روزِ عید سے تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ ماہ رمضان میں فطرانے کی ادائیگی کی اجازت ہے۔ لیکن ماہ رمضان سے قبل نہیں۔ اور مال کی زکوٰۃ میں تعجیل پورے سال میں جائز ہے۔ اس شرط پر کہ زکوٰۃ پانے والا آخر سال تک مفلس رہا ہو۔ اگر وہ سال سے پہلے مر جائے یا خود دولت مند ہو جائے یا مرتد ہو جائے تو زکوٰۃ دوبارہ کسی مستحق کو دینی چاہیے۔

تیسرے یہ کہ ہر مال کی زکوٰۃ اسی کی جنس میں سے دے۔ اگر سونا چاندی کی جگہ دے یا گندم جَو کے بدلے میں یا کوئی اور مال اس کی قیمت کے برابر دینا چاہے تو مذہبِ شافعی کے نزدیک درست نہیں۔

چوتھے یہ کہ جہاں زکوٰۃ کا مال ہے وہیں پر زکوٰۃ کے مستحقین میں تقسیم کرے کیونکہ مفلس اس سے اس کی امید لگائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر وہ کسی دوسرے شہر میں جا کر دے تو حق یہ ہے کہ زکوٰۃ اس سے ساقط نہیں ہوئی۔

پانچویں یہ کہ زکوٰۃ آٹھ گروہوں میں تقسیم کرے اس طرح کہ ہر قسم کے گروہ میں تین افراد سے کم نہ ہوں۔ اس طرح افراد کی تعداد چوبیس ۲۴ ہو گئی۔ اگر زکوٰۃ ایک درم بھی ہو تو مسلک شافعی کے مطابق چاہیے کہ صاحب مال اس میں سے سب کو پہنچائے۔ آٹھ مساوی حصوں میں تقسیم کرے۔ پھر اسے ہر گروہ کے تین یا زائد افراد میں جیسے چاہے بانٹ دے۔ اگرچہ سب برابر نہ ہوں۔ اس زمانے میں تین افراد کمتر پائے جاتے ہیں۔ یعنی غازی، ومؤلفہ اور عاملِ زکوٰۃ لیکن فقیر، مسکین ومکاتب یعنی غلام وابنِ سبیل (مسافر) اور مقروض پاتے ہیں۔ پس ہر کسی کو امام شافعی کے نزدیک یہ زکوٰۃ پندرہ افراد سے کم کو نہیں دینی چاہیے۔ اور شافعی مذہب میں دو مسئلے دشوار ہیں۔ ایک یہ کہ بدل نہیں دینا چاہیے اور دوسرے یہ کہ مستحقین کی جملہ اقسام کو دینی چاہیے۔ بیشتر لوگ مذہبِ ابوحنیفہ کی پیروی کرتے ہیں۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ زکوٰۃ دہندگان اس اختلاف پر ماخوذ

نہ ہوں گے۔ان شاء اللہ۔

مستحقین زکوٰۃ کی تلاش اور یہ آٹھ قسم کے ہیں

پہلی صِنف فقیر ہے: اور فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہیں اور روزی کمانے کے لائق بھی نہیں۔ اگر ایک دن کی روزی رکھتا ہے اور جسم پر کپڑے بھی پورے ہیں تو وہ فقیر متصور نہ ہوگا۔ اور اگر صرف آدھے دن کی خوراک رکھتا ہے یا قمیض تو ہے لیکن پگڑی نہیں یا پگڑی تو ہے لیکن قمیض نہیں وہ درویش سمجھا جائے گا اور اگر کسی آلے کے ذریعے روزی کما سکتا ہو لیکن اس کے پاس وہ آلہ نہ ہو تو درویش متصور ہوگا۔ اگر طالب علم ہو لیکن کسب روزی کی بناء پر اگر تحصیل علم میں حرج واقع ہوتا ہو تو وہ بھی درویش ہے اور ایسے درویش کم تر دستیاب ہیں سوائے لڑکوں کے۔ اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ عیال دار درویش کی تلاش کرے اور فقیر کا حصہ اس کی اولاد کے تناسب سے درویش کو دے دے۔

صنفِ دوم مسکین ہے: جس کسی کا بنیادی اہم خرچ اس کی آمدنی سے زیادہ ہو وہ مسکین سمجھا جائے گا۔ اگر چہ مسکن اور لباس رکھتا ہو لیکن چونکہ ایک سالہ کفایت سے بہرہ ور نہیں اور کمائی اس کی وفا نہیں کرتی تو جائز ہوگا کہ ایسے کو اتنا دیں کہ جو پورے ایک سال کے لیے کافی ہو۔ اور اگر چٹائی، برتن اور گھر کے دیگر اثاثے کا محتاج ہو تو وہ مسکین متصور ہوگا۔ اور اگر حاجت سے زائد کوئی چیز رکھتا ہو تو مسکین شمار نہ ہوگا۔

صنفِ سوم: وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ جمع کرتے ہیں: اور درویش تک پہنچاتے ہیں۔ تو عاملین زکوٰۃ کو بھی زکوٰۃ میں سے ان کی مزدوری دی جا سکتی ہے۔

صِنفِ چہارم: مؤلفہ ہیں: یہ وہ صاحبِ حشمت ہے کہ اگر اسے مال دیا جائے تو تو وہ مسلمان ہو جائے دوسرے جو ہنوز غیر مسلم ہیں انہیں بھی اس سے رغبت ہوگی اور وہ بھی مسلمان ہو جائیں گے۔

صِنفِ پنجم: مکاتب کی ہے: اور یہ وہ غلام ہوتے ہیں جو اپنے آقا سے خود کو خرید لیتے ہیں تا کہ اپنی قیمت اپنے اس آقا کو لوٹا سکیں۔

صِنفِ ششم: وہ ہے جو مقروض ہو: لیکن اس نے قرض کسی ناروا کام یا غیر ضروری امر کے لیے نہ لیا ہو۔ لیکن مفلس ہو۔ یا تو انگر ہو لیکن اس نے قرض کسی ایسے کام کے لیے لیا ہو جو کسی فتنے کو بٹھانے کے لیے تھا وہ بھی مستحق ہے۔

صِنفِ ہفتم: وہ غازی ہیں: جنہیں حکومت کے خزانے سے تنخواہ نہیں ملتی اگر چہ وہ تو انگر ہوں تو انہیں

زادراہ زکوٰۃ میں سے دے سکتے ہیں۔

صنفِ ہشتم مسافر ہیں: جن کے پاس زادِراہ نہ ہو۔ راہگیر ہو یا اپنے شہر سے سفر میں نکلا ہو تو زادِراہ اور کرائے کے بقدر اسے دیا جاتا ہے۔ اور جو کوئی بھی خود کو درویش یا مسکین قرار دے تو جائز ہے کہ اس کے قول کو صحیح تسلیم کیا جائے۔ بشرطیکہ معلوم نہ ہو کہ وہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔ اور مسافر اور غازی اگر سفر اور غزا میں نہیں جاتے تو زکوٰۃ ان سے واپس لے لینی چاہیے اور اقسام کے زکوٰۃ خواہوں کے لیے بہتر ہے کہ معتمد لوگوں سے ان کے بارے میں تحقیق کرے۔

زکوٰۃ دینے کے اسرار

معلوم رہے کہ جس طرح نماز کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت جو اس صورت کی روح ہوتی ہے زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے۔ اور اگر کوئی زکوٰۃ کی حقیقت اور راز کو نہ پہنچانتا ہو تو اس کی صورت بغیر روح کے ہو گی۔ اور سرّ اس کا تین چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ خلق اللہ تعالیٰ کی محبت پر مامور ہے اور اگر کوئی مومن ایسا نہیں ہے جو اس کا مدعی نہ ہو بلکہ مخلوق اس پر مامور ہے کہ کسی اور کو اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر دوست نہ رکھیں جیسے کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ (الآیۃ) (قرآن: ۲۴/۹) (اگر ایسا ہے کہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہارے ہمسر اور اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارا جمع کردہ مال اور وہ اسباب جو تم تجارت کے لیے رکھتے ہو اور اس میں خسران سے ڈرتے ہو اور تم نے پسندیدہ مساکن بنا رکھے ہیں اگر ایسا ہے کہ یہ سب تمہیں خدا اور اس کے رسول سے بڑھ کر عزیز ہیں اور اس کے لیے دشمن کے ساتھ جہاد کی امید رکھتے ہو تو جب تک خدا اپنا کام لائے اور فرمان تمہارے سر ہو تو جان لو کہ خدا فاسقوں کے کام کو فروغ دینے والا نہیں ہے) اور کوئی مومن ایسا نہیں ہے کہ یہ دعویٰ نہ کرتا ہو کہ حق تعالیٰ کو ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ ایسے ہی ہے۔ پس اس کے لیے نشان اور دلیل کی ضرورت ہے تا کہ ہر کوئی بے حاصل دعویٰ پر مغرور نہ ہو۔ پس مال انسان کی محبوب اشیاء میں سے ایک ہے اس لیے اسے اسی سے آزمایا جاتا ہے اور کہا گیا کہ اگر تو اپنے دعویٰ دوستی میں سچا ہے تو اپنے اس ایک معشوق کو فدا کر دے تا کہ تجھے اللہ تعالیٰ سے تیری محبت کا درجہ معلوم ہو سکے۔ پس جن لوگوں نے یہ بھید پالیا ان کے تین طبقے ہو گئے۔

طبقہ اوّل: صدیقوں کا طبقہ ہے جنہوں نے جو کچھ ان کے پاس تھا راہِ حق میں قربان کر دیا، انہوں نے کہا کہ دو صد درم میں سے پانچ درم زکوٰۃ دینا بخیلوں کا کام ہے۔ ہم پر وجوب اس کا ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس

ہے سب کا سب اللہ تعالیٰ کی دوستی کی نذر کر دیں۔ایک گروہ نے کل مال کا نصف دے دیا۔جیسے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ جو سارا مال لے آئے تو آنخضرت نے فرمایا کہ گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا؟ حضرت ابو بکر نے کہا ''خدا اور رسولِ خدا'' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر کے کل مال کا آدھا لے آئے تھے۔آنخضرت نے ان سے بھی یہی سوال کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''اتنا ہی جتنا میں لایا ہوں''،تو رسول (ﷺ) نے فرمایا ''بَیۡنَکُمَا مَا بَیۡنَ (تمھارے درجوں میں بھی اتنا ہی تفاوت ہے جتنا تمہارے کلام میں)۔

طبقہ دوم: یہ طبقہ نیک مردوں کا ہے کہ انہوں نے مال یک بار خرچ نہیں کیا کہ انہیں اس کی تاب نہ تھی۔لیکن محفوظ رکھتے تھے۔وہ فقراء کی حاجتوں کے انتظار میں تھے۔اور وجوہ خیرات میں لگے رہتے تھے۔خود کو مفلسوں کے برابر سمجھتے تھے۔وہ بقدر زکوٰۃ پر اکتفا نہ کرتے تھے۔لیکن جب درویشوں کو پاتے تو ان کے ساتھ اپنے عیال کی طرح سلوک کرتے۔

طبقہ سوم: ایسے لوگوں پر مشتمل تھا کہ وہ دوصد درم پر پانچ درم سے زائد زکوٰۃ میں دینے کا حوصلہ نہ رکھتے تھے۔وہ فرض مقدار پر اکتفار کرتے تھے۔اور اللہ تعالیٰ کا فرمان بہ سرعت خوش دلی کے ساتھ بجالاتے تھے اور زکوٰۃ دینے میں درویشوں پر کوئی احسان نہ رکھتے تھے۔لیکن یہ سب سے پست درجہ ہے۔کیونکہ کوئی بھی جسے اللہ تعالیٰ نے دوسو درموں سے نوازا ہوا سے اس میں سے پانچ درم راہِ خدا میں دینے پر کسی دلی گرانی کا سامنا نہ ہوتا تھا۔لیکن ایسے شخص کو دوستی حق میں سے کچھ نصیب نہیں ہوتا اور جب وہ اس سے زاید نہیں دے سکتا تو اس کا حقِ دوستی نہایت کمزور سمجھا جائے گا۔اس کا شمار بخیل دوستوں میں ہوگا۔

زکوٰۃ کا سرّ دوم: زکوٰۃ بخل اور پلیدی سے دل کی تطہیر ہے۔کیونکہ بخل دل میں نجاست کے مصداق ہے جو قربِ حق تعالیٰ کے ساتھ ناشائستگی کا باعث ہے۔جیسے کہ پیش گاہ نماز میں نمازی کے بدن پر کی ظاہری ناپاکی اسے نماز کے لیے شائستہ نہیں رکھتی اور بخل کی یہ نجاست مال خرچ کیے بغیر دور نہیں ہوتی۔اس بناء پر زکوٰۃ بخل کی نجاست کو ایسے دور کر دیتی ہے جیسے پانی نجاست کو دھوڈالتا ہے۔یہی باعث ہے کہ زکوٰۃ اور صدقہ رسول (ﷺ) پر اور ان کے اہل بیت پر روا نہیں بلکہ حرام ہے کیونکہ آنخضرت کے منصبِ عالی کو لوگوں کے مال کی آلودگی سے محفوظ رکھنا مقصود ہے۔

سرِّ سوم: شکر نعمت ہے کہ مال مومن کے حق میں نعمت ہے جو دنیا اور آخرت میں راحت کا باعث ہے۔پس جس طرح نماز، حج اور روزہ بدن کی نعمت کے شکرانے کے مصداق ہے۔زکوٰۃ نعمتِ مال کے لیے شکر کی صورت ہے تا کہ جب خود کو اس نعمت کی بناء پر بے نیاز دیکھے اور پھر اپنے ہی جیسے مسلمان کو درماندہ پائے تو

اپنے آپ سے کہے کہ "وہ میری ہی مانند اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے۔تو مجھے اس بات کا شکر کہ مجھے اس سے اللہ نے بے نیاز کر دیا اور اُسے میرے ساتھ نیاز مند ٹھہرایا تو مجھے اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا چاہیے کیونکہ اگر میں بخل کروں تو ہوسکتا ہے یہ میری آزمائش کے لیے ہو کہ تقصیر پر اللہ مجھے اس کی مانند اور اسے میری مانند کر دے"۔

پس چاہیے کہ ہر کوئی زکوٰۃ کے ان اسرار سے آشنا ہوتا کہ زکوٰۃ کی یہ عبادت بدنِ بے روح نہ رہے۔

زکوٰۃ دینے کے آداب ودقائق

اگر کوئی یہ چاہے کہ اس کی عبادت زندہ رہے اور بے روح نہ ہو اور ثواب اس کا بڑھتا رہے تو اسے چاہیے کہ سات وظیفوں کو ملحوظ رکھے:

وظیفہ اوّل:

یہ کہ زکوٰۃ دینے میں دیر نہ کرے قبل اس کے کہ واجب ہو پورے سال میں دے سکتا ہے۔جس سے تین فائدے حاصل ہوں گے۔ایک یہ کہ اس میں عبادت کی رغبت پیدا ہوئی۔کیونکہ وجوب کے بعد تو ادائیگی سے مفر نہیں کیونکہ اگر نہ دے تو عقوبت کا نشانہ بنے گا۔تو اس وقت تو ادائیگی خوف سے ہوگی نہ کہ دوستی سے۔تو ایسا کرنا تو خطرے کے باعث ہوا دوستی اور شفقت سے تو نہ ہوا۔

دوسرے یہ کہ تعجیل سے حاجت مندوں کے دل کی شادمانی کا باعث بنے گا تو وہ جو دعا اسے دیں گے وہ مخلصانہ تر ہوگی۔کیونکہ یہ خوشی انہیں اچانک ملے گی اور درویشوں کی دعا اس کے لیے جملہ آفات سے بچاؤ کی فصیل ثابت ہوگی۔

تیسرے یہ کہ زمانے کے دیگر کاموں کی مشغولی سے مامون رہے گا اور تاخیر میں آفات متعدد ہوسکتی ہیں ہوسکتا ہے انسان ان میں مشغول ہو جائے اور اس خیر سے محروم ہو جائے اور جب دل میں کسی چیز کی رغبت پیدا ہو جائے تو اسے غنیمت جاننا چاہیے۔کیونکہ وہ گویا رحمت کی نگاہ ہوتی ہے۔اور خطرہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس دوران شیطان حملہ آور ہو جائے۔"فان قلب المومن بین اصبعین من اصابع الرحمن "یعنی" مومن کا دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے"ایک بزرگ جو طہارت کے لیے جارہے تھے ان کے دل میں آیا کہ اپنا کرتا کسی درویش کو دے دیں تو آپ نے ایک مرید کو بلایا اور کرتا اتار کر اسے دیا تو اس نے کہا "یا شیخ آپ نے طہارت سے لوٹ کر اتار دیا ہوتا جلدی کیوں کی"؟ تو ان بزرگ نے فرمایا "میں اس بات سے ڈرا کہ کہیں ایک دوسرا ایسا خیال نہ آجائے کہ جس کے باعث میں اس نیکی سے محروم رہ جاؤں"۔

وظیفہ دوم:

اگر زکوٰۃ سب کو دینا چاہے گا کہ محرم میں دے کہ شروع سال ہے اور محرم ماہ حرام بھی ہے یا ماہ رمضان میں کہ یہ مہینہ زیادہ شرف کا مالک ہے اور ثواب اس کا دگنا ہوگا اور رسول (ﷺ) سخی ترین خلق تھے جو کچھ پاس ہوتا سب عطا کر دیتے تھے۔ اور رمضان میں تو کچھ بھی روک نہ رکھتے تھے سب حاجت مندوں پر نثار کر دیتے۔

وظیفہ سوم:

یہ کہ زکوٰۃ چھپا کر دے۔ برملا نہ دے تا کہ ریا سے دور اور اخلاق سے قریب تر رہے اور حدیث میں ہے کہ ''مخفی صدقہ وخیرات اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو زائل کر دیتا ہے'' اور حدیث میں ہے کہ ''سات قسم کے لوگ روز قیامت سایہ عرش میں ہوں گے۔ ایک امام عادل تو دوسرا وہ شخص جو صدقہ دائیں ہاتھ سے اس طرح دیتا ہے کہ بائیں ہاتھ کو اس کی خبر نہیں ہوتی''۔ تو غور فرمائیے کہ وہ درجہ کس عظمت کا ہے جو امامِ عادل کے درجے کے برابر ٹھہرے۔

اور حدیث میں ہے کہ اگر کوئی صدقہ مخفیانہ دیتا ہے تو اس صدقے کو سرّی اعمال میں درج کیا جاتا ہے۔ اور اگر برملا دیتا ہے تو برملا اعمال میں درج ہوتا ہے۔ اور اگر وہ کسی دوسرے سے یہ کہے کہ میں نے یوں کیا ہے تو اس کے نامۂ اعمال کو سرّی اور علنی دونوں جگہوں سے قلم زد کر کے جریدہ ریا میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اسی بناء پر اسلاف صدقے کو مخفی رکھنے کے لیے اتنی احتیاط برتتے تھے کہ ایسے بھی تھے کہ کسی نابینا کو بلواتے اور صدقہ خاموشی سے اس کے ہاتھ میں دے دیتے اور خاموش اس لیے رہتے تا کہ اسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ دینے والا کون ہے۔ بعض یہ کرتے تھے کہ سوئے ہوئے درویش کو تلاش کرتے تا کہ اس کے کپڑے میں صدقہ باندھ دیں تا کہ جب بیدار ہو تو لے جائے لیکن اسے یہ خبر نہ ہونے پائے کہ کس نے دیا ہے۔ اور کوئی ایسے بھی تھے کہ درویشوں کی گذرگاہ میں پھینک دیتے تھے کہ درویش یہ جانے بغیر کہ کس نے دیا ہے اٹھالیں۔ اور بعض یہ کرتے کہ کسی کو مختار بنا دیتے کہ وہ حاجت مندوں تک بغیر بتائے پہنچا دے اور یہ سب کچھ اس غرض سے تھا کہ درویش کو معطی کا پتہ نہ چلے اور دوسروں سے چھپانے میں تو اور بھی احتیاط برتتے تھے اس لیے کہ جب برملا دیں تو باطن میں ریا جنم لیتی ہے۔ اگرچہ باطن میں بخل کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ لیکن ریا نمو پانے لگتی ہے۔ اور یہ جملہ صفات مہلک ہیں۔ لیکن بخل قبر میں بچھو کی مانند ہے اور ریا سانپ کی مثل اور وہ قوی تر ہوتی ہے۔ اور جب بچھو کو سانپ کا لقمہ بنا دیتے ہیں تا کہ سانپ کی قوت میں اضافہ ہو تو مردہ ایک مہلک سے اگرچہ نجات پاتا ہے کہ اس سے زیادہ صعب کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور ان صفات کا زخم دل پر جب قبر میں لگے گا تو یہ زخم سانپ بچھو کے زخم کی مانند ہوگا۔

جیسا کہ عنوان 'مسلمانی' میں بیان ہوا تھا۔ پس دکھا کر صدقہ دینے کا ضرر اس کے فائدے سے زیادہ ہے۔

وظیفہ چہارم:

یہ ہے کہ ریا سے ایمن رہے۔ اور اپنے دل کو اس سے پاک کر چکا ہو۔ لیکن اگر برملا دینے میں مصلحت سمجھے کہ اس طرح دینے میں دیکھنے والوں کو بھی ادائیگی کی تحریک و رغبت ہوگی اور وہ اس کی اقتداء کریں گے تو ایسے شخص کے لیے برملا دینا بہتر ہوگا اور فاضل تر۔ اور ایسے شخص کی صفت یہ ہونی چاہیے کہ مدح و ذم اس کے لیے دونوں یکساں ہوں اور کاموں میں اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے کو کافی سمجھتا ہو۔

وظیفہ پنجم:

یہ ہے کہ صدقے کو احسان جتا کر یا حاجت مند کو آزردہ کر کے ضائع نہ کر دے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى '' (قرآن: ۲/۲۶۴) (اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور رنجیدہ کر کے ضائع نہ کرو) اور کسی درویش کو آزردہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ رُوترش کرے یا پیشانی پر بل لائے۔ اور حاجت مند کے ساتھ بات تندی اور دُرشتی سے کرے اور اسے درویشی اور سوال کے سبب ذلیل کرے اور نظرِ حقارت سے اسے دیکھے۔ اس سے دو قسم کی جہالت اور حماقت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ اس کے لیے مال کو ہاتھ سے دینا دشوار ہو جاتا ہے اس بناء پر تنگ دل ہو جاتا ہے اور بات پرخاش کے ساتھ کرتا ہے۔ اور ہر وہ شخص کہ اس کے لیے ایک درم دینے پر ہزار درم حاصل کرنا مشکل ہو وہ جاہل ہی تو ہوگا۔ اسے تو اس ادائے زکوٰۃ سے فردوسِ اعلیٰ یعنی رضائے خداوندی ملے گی اور دوزخ سے بچاؤ ہوگا۔ تو یہ امر اس کے لیے کیونکر دشوار ہوگا اگر اس کا ایمان اس پر پختہ ہو؟ حماقت اس کی یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اسے مفلس پر دولت کی بناء پر فوقیت حاصل ہے۔ اور نہیں جانتا کہ جو اس سے جنت میں پانچ سو سال پہلے داخل ہوگا وہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک درجے میں اس کے درجے کی نسبت بزرگوار تر ہوگا کیونکہ افتخار درویشی کو حاصل ہے نہ کہ دولت مندی کو۔ اور اس دنیا میں بھی یہ شرف درویش کا ہے کہ دولت مند کو اس دنیا میں رنج اور اس کے وبال سے مصروف کر رکھا ہے۔ حالانکہ نصیب اس کا مقدارِ حاجت سے کچھ زیادہ نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ نے دولت مند پر واجب کر رکھا ہے کہ بقدر حاجت درویش کو بھی پہنچائے۔ پس درحقیقت اس دنیا میں خدا نے دولت مند کو درویش کے لیے بیگار میں لگا رکھا ہے اور آخرت میں اس کے لیے جنت میں داخلے کے لیے پانچ سو سال کا طویل انتظار مختص کر دیا ہے۔

وظیفہ ششم:

یہ ہے کہ درویش پر احسان نہ دھرے کیونکہ احسان دھرنے کی اصل جہالت ہے جو دل کی صفت ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ اس نے درویش کے ساتھ نیکی کی ہے کہ اس نے اپنی نعمت میں سے جو اس کی مملوکہ ہے کچھ درویش کو دیا ہے اس لیے درویش اس کا زیردست ہو گیا۔ جب وہ ایسا سوچتا ہے تو یہ علامت اس بات کی ہے کہ دولت مند امید یہ رکھتا ہے کہ درویش اس کی خدمت کرے اس کے کاموں کے لیے حاضر ہو اور اسلام میں ابتداء کرے۔ مختصر یہ کہ درویش سے احترام وتکریم کی امید رکھتا ہے اور درویش اس کے حق میں کمی کرے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ تعجب کرے گا اور ممکن ہے کہ احسان جتاتے ہوئے یہ بھی کہے کہ ''میں نے تیرے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے'' تو یہ سب جہالت ہے کیونکہ حقیقت تو یہ ہے کہ درویش نے اس کے ساتھ نیکی کی ہے کہ اس کا صدقہ قبول کیا ہے جو دولت مند کو دوزخ سے نجات دے گا۔ نیز اس نے دولت مند کا دل بخل کی پلیدی سے پاک کر دیا ہے اور اگر کوئی جراح مفت میں اس کی رگ زنی کرتا تو اس کا احسان مانتا کیونکہ وہ خون اس کی ہلاکت کا باعث تھا' جراح نے اس خون کو اس سے دور کر دیا۔ اسی طرح بخل اس کے باطن میں اور مال زکوٰۃ اس کے ہاتھ میں ہلاک و پلیدی کا سبب ہے۔ چونکہ درویش ہی کے باعث اسے طہارت حاصل ہوئی۔ نیز نجات حاصل ہوئی اس لیے دولت مند کو درویش کا احسان ماننا چاہیے۔

نیز رسول (ﷺ) کا فرمان ہے کہ صدقہ پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں آتا ہے پھر درویش کے ہاتھ میں پہنچتا ہے۔ تو معطی چونکہ خدائے تعالیٰ کو دیتا ہے اور اس کے حق میں درویش حق تعالیٰ کے نائب کے مصداق ہے اس لیے چاہیے کہ دولت مند درویش کا ممنون ہو نہ کہ اس پر احسان دھرنے والا۔ اور جب اسرار زکوٰۃ میں سے تین سرّ اس کو پہنچیں اور وہ ان پر غور کرے تو اسے معلوم ہو کہ احسان دھرنا جہالت ہے اور احسان جتانے کے عیب سے بچنے کے لیے اسلاف نہایت درجہ اہتمام کیا کرتے تھے۔ وہ درویش کے سامنے نہایت ادب سے کھڑے ہوتے اور نہایت انکساری کے ساتھ درویش سے استدعا کرتے کہ اسے میری طرف سے قبول فرمایئے۔ اور وہ تو زر صدقہ اپنے ہاتھ پر رکھ کر درویش کے حضور اس طرح پیش کرتے کہ اُس کا ہاتھ بالا ہوتا کہ: ''اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیرٌمِن الْیَدِ السِفلٰی'' اسی کو زیبا ہے جو احسان نہیں رکھتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا جب کسی محتاج کو کوئی چیز بھیجتیں تو لے جانے والے سے کہتیں کہ 'محتاج جو دعا دے اسے یاد رکھنا'' تا کہ اس کی ہر دعا کے بدلے میں وہ بھی دعا دیں تا کہ صدقہ خالص رہ سکے۔ دعائے درویش کا بدلہ دعا سے دیتیں کیونکہ اس کے بغیر درویش کی دعا کی طمع نہ رکھتی تھیں کہ کہیں یہ خیال دل میں خطور نہ کرے کہ انہوں نے کوئی احسان کیا ہے۔ کیونکہ محسن دراصل درویش ہے جس نے چیز قبول کر کے تمھیں کے بار سے سبک دوش کیا۔

وظیفہ ہفتم:

کہ چاہیے اپنے مال میں سے جو حلال تر اور خوب تر ہو زکوٰۃ میں وہ دے اور جس مال میں شبہ ہو تو وہ تقرب کے لائق نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اور وہ سوائے پاکیزہ مال کے قبول نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ''وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ'' (قرآن: ۲/ ۲۶۷) (زکوٰۃ وصدقہ دیتے وقت بدتر کا ارادہ نہ کرنا کیونکہ ایسے ادنیٰ کو لین دین میں تم خود قبول نہیں کرتے مگر تساہل اور محابات کے ساتھ جو تم اس کی قدر و قیمت کے باب میں دیکھتے ہو)۔ یعنی وہ چیز کہ اگر تمہیں دی جائے تو تم اسے بکراہت قبول کرو گے وہ چیز خدا تعالیٰ کی راہ میں کیوں صرف کرتے ہو۔ اگر کوئی شخص جو کچھ اس کے گھر میں ہو اس میں سے بدتر درویش کو پیش کرے تو وہ گویا ایک گونہ استخفاف ہے جس کا وہ مرتکب ہوگا۔ کیسے یہ روا ہو سکتا ہے کہ بدترین تو خدا کو دیں اور بہترین بندوں کے لیے رکھ لیں؟ اور بدترین اگر دیتا ہے تو ظاہر ہے بہ کراہیت دیتا ہے۔ اور ہر وہ صدقہ جو خوش دلی سے نہ دیا جائے خطرہ اس بات کا ہے کہ وہ مسترد کر دیا جائے۔ اور پیغمبر (ﷺ) کا یہ پیغام کہ صدقے کا ایک درم ہزار درموں پر سبقت رکھتا ہے تو یہ اس صورت میں ہوگا کہ بہترین میں سے دے اور خوشدلی سے دے۔

درویش طلب کرنے کے آداب

معلوم رہے کہ تو جس مسلمان کو بھی زکوٰۃ دے دے تیرا فرض پورا ہو جائے گا۔ لیکن وہ شخص جو آخرت کی تجارت کرتا ہے اسے نہیں چاہیے کہ واقعی مستحق درویش کی تلاش میں پیش آنے والی تکلیف سے پہلو تہی کرے۔ کیونکہ صدقہ جب اپنی صحیح جگہ پہنچے گا تو ثواب اس کا کئی گنا ہوگا۔ پس چاہیے کہ پانچ صفات میں سے کوئی ایک طلب کرے:

صفتِ اوّل: یہ ہے کہ درویش پارسا اور متقی ہو۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''أَطعِمُوا طعامَکُم الاتقیاء'' یعنی طعام متقیوں پرہیزگاروں کو دو۔ کیونکہ وہ جو کچھ لیتے ہیں اس سے اطاعت خداوندی میں مدد حاصل کرتے ہیں۔ تو صدقہ دینے والا اس طرح ثواب میں شریک ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے درویشوں کی اس امر اطاعت میں اعانت کی ہوتی ہے۔

بزرگوں اور توانگروں میں سے ایک ایسا تھا کہ صدقہ سوائے صوفیوں کے کسی اور کو نہ دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''ان لوگوں کو سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کوئی صورت ہمت نہیں ہے۔ اور جب ان کو کوئی حاجت در پیش ہوتی ہے تو تفکر ان کا پراگندہ ہو جاتا ہے۔ اور میں جب ایک دل کو حضور حق میں لے جاتا ہوں تو میں اس کو بہ

نسبت سوا ایسے دلوں کی مراعات کے جن کا قبلہ ہمتِ دنیا ہو زیادہ عزیز جانتا ہوں"۔ یہ بات جب حضرت جنیدؒ کو بتائی گئی تو آپ نے فرمایا کہ "یہ بات اولیائے خداوند میں سے ایک ولی کی ہے"۔ اور یہ مرد پیشہ کے اعتبار سے بقال تھا لیکن مفلس ہو گیا۔ کیونکہ جو کچھ اس کے پاس تھا اس نے سب دے دیا۔ صوفی جس شے کی آرزو کرتے یہ فراہم کر دیتا تھا اور معاوضہ نہیں طلب کرتا تھا۔ حضرت جنید نے اس کے پاس مال بھیجا تا کہ پھر سے پیشۂ تجارت میں لگ جائے۔ نیز کہا کہ "تم جیسے مرد کو تجارت ضرر نہیں پہنچا سکتی"۔

صفتِ دوم: یہ کہ درویش اہل علم ہو تو جب وہ صدقہ پا کر حصولِ علم کے لیے فراغت پائے گا تو اس سے معطّی ثوابِ علم میں شریک ہو جائے گا۔

صفتِ سوم: یہ کہ درویش اپنی حاجت کو ظاہر نہ کرتا ہو اور اپنے افلاس کو مخفی رکھتا ہو۔ اور بہ ظاہر صاحبِ تجمل ہو "یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ" (قرآن: ۲/۲۷۳) (ایسا شخص جو ان کو نہ پہچانتا ہو اور گمان کرتا ہو کہ وہ بے نیاز ہیں' اس لیے کہ حاجت کا اظہار نہیں کرتے اور لوگوں سے کسی شے کا سوال نہیں کرتے)۔ یہ وہ درویش ہیں جو اپنے چہرے پر تجمل کا نقاب ڈالے رکھتے ہیں۔ اس لیے ایسے نہیں ہونا چاہیے کہ تُو ایسے مفلس کو دے جو مانگنے سے باک نہیں رکھتا۔

صفتِ چہارم: وہ درویش جو بیوی بچوں والا ہو یا بیمار ہو اس کو دے کیونکہ درویش کو حاجت زیادہ ہو گی یا تکلیف زیادہ ہو گی تو ایسے کو دینے کا ثواب بھی اسی قدر زیادہ ہو گا۔

صفتِ پنجم: یہ کہ درویش اپنے اقارب میں سے ہوتا کہ صلۂ رحم بھی ہو اور صدقہ بھی اور وہ جو صدقہ کرنے والے کی برادری کی دوستی میں وہ بھی درجہ اقارب میں سے ہو گا۔ اور اگر صاحبِ صدقہ کسی ایسے درویش کو پالے کہ جو مندرجہ بالا جملہ صفات سے متصف ہو یا زیادہ تر صفات کا مالک ہو تو اولیٰ تر وہ ہے۔ تو جب اس قسم کے لوگوں کو صدقہ خیرات سے بہرہ مند کرے گا تو ان درویشوں کی ہمت' تفکر اور دعائیں اس کے لیے قلعہ بن جائیں گی اور یہ فائدہ اپنے آپ سے دوریٔ بخل کے علاوہ مزید ہو گا۔ اور اس طرح گویا شکر نعمت ادا کر دی اور چاہیے کہ زکوٰۃ علویوں (سادات) کو یا کافروں کو نہ دے کیونکہ یہ زکوٰۃ تو فی الاصل لوگوں کے مال کی مَیل کی مانند ہے اور علوی اس سے دریغ کرے گا اور یہ کافر سے گریز کرے گی۔

زکوٰۃ لینے والے کے آداب

زکوٰۃ لینے والے کو چاہیے کہ پانچ آداب کو ملحوظ رکھے:

وظیفہ اوّل: یہ ہے کہ درویش کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ حق تعالیٰ نے جب اپنے بندوں کو مال کا محتاج پیدا کیا اس سبب سے زیادہ مال اپنے بندوں کے ہاتھ میں نہیں رکھا۔ اور گروہ جن کے حق میں عنایت زیادہ کی ان کو دنیا کے وبال اور مشاغل سے تحفظ فراہم کیا اور اکتساب دنیا کا رنج و درد اور اس کی حفاظت کا بار دولت مندوں کے کندھوں پر رکھا۔ اور دولت مندوں کو حکم دیا کہ وہ بندے جو کم یاب ہیں ان کو بقدرِ حاجت مال پہنچائیں تا کہ وہ عزیز دنیا کے بار سے بچے رہیں تا کہ وہ یک سو اور یک ہمت ہو کر طاعتِ حق تعالیٰ میں لگے رہیں اور چونکہ یہ حاجت کے باعث پراگندہ ہمت ہو جاتے ہیں اسی لیے بقدر حاجت دولت مندوں کے ہاتھ انھیں پہنچا دیا جاتا ہے تا کہ ان کی دعا اور ہمت کی برکت دولت مندوں کے لیے کفارہ بن جائے۔ پس درویش کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ اس نیت کے ساتھ قبول کرے کہ جو کچھ لیتا ہے اس کو بہ کفایت صرف کرے گا تا کہ طاعتِ خداوندی کے لیے فراغت پائے اور اس نعمت کی قدر کو پہچانے کہ قسامِ ازل نے دولت مندوں کو ان کے لئے بیگار میں لگا رکھا ہے تا کہ درویش سکونِ قلب کے ساتھ عبادت میں لگے رہیں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ دنیا کے بادشاہ اپنے غلامانِ خاص کو نہیں چاہتے کہ خدمت سے دور رہیں تو وہ انہیں کسبِ دنیا کی اجازت نہیں دیتے۔ لیکن دیہاتیوں اور اہلِ بازار کو جو خدمتِ خاص کے لیے درکار نہیں ہوتے بندگانِ خاص کی بیگار پر لگا دیتے ہیں اور ان سے باج خراج وغیرہ حاصل کر کے غلامانِ خاص کی تنخواہوں کا سامان کر لیتے ہیں اور جس طرح سب ملک کا مقصود ان خواص کا اِستخدام ہے۔ اسی طرح مراد حق تعالیٰ کی جملہ خلق سے حضرت عبودیت کی بندگی ہے۔ اسی لیے فرمان خداوندی ہے کہ: ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ'' (قرآن: ۵۶/۵۱) (میں نے جن و انس کو فقط عبادت کے لیے پیدا کیا ہے)۔ پس درویش کو چاہیے کہ جو کچھ لے اسی نیت سے لے۔ اسی بناء پر حضرت رسول (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''دینے والے کی مزدوری لینے والے کی مزدوری سے زیادہ نہیں ہوتی''۔ ایسے لینے والے سے وہ درویش مراد ہے کہ جس کا مقصد دین کے لیے فراغت ہو۔

وظیفہ دوم: یہ ہے کہ لینے والا درویش دراصل حق تعالیٰ سے لیتا ہے اور اسی سے دیکھتا ہے اور دولت مندوں کو اسی کی وجہ سے مسخر سمجھتا ہے اور اسی کے لیے ایک مُوکل کو ذریعہ بنایا ہے تا کہ مال اسے دے۔ اور مؤکل اس کا ایمان ہے۔ جو اسے عطا ہوا ہے تا کہ جان لے کہ اس کی سعادت صدقے سے وابستہ ہے۔ اور اگر یہ مؤکل نہ ہوتا تو دولت مند ایک دانہ بھی کسی کو نہ دیتا۔ تو فقیر پر اس کا احسان ہے کہ جس نے امیر کے ساتھ ایک مؤکل لگا دیا ہے۔ تو جب لینے والا یہ سمجھا کہ امیر کا ہاتھ واسطہ اور مسخر ہے تو اس وساطت پر خیال کر کے دینے والے امیر کا شکر یہ ادا کرے۔ حدیث شریف میں آیا ہے: ''فَاِنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللہَ'' (یعنی''

جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کیا وہ خدا کا شکر گذار بھی نہ ہوگا'')۔اور باوصف اس امر کے کہ حق تعالیٰ بندوں کے کاموں کا خالق ہے مگر یہ بندہ نوازی ہے کہ ان کی تعریف فرماتا ہے اوران کا شکر بجالاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ''نِعْمَ الْعَبْدُ ط اِنَّہٗ اَوَّابٌ'' (قرآن:۴۴/۳۸) (بےشک اچھا بندہ ہےاور لاریب وہ تائب ہے)۔ نیز فرمایا: ''اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا'' (قرآن:۴۱/۱۹) (وہ ابراہیم علیہ السلام راست گو پیغمبر تھا)۔اسی طرح جس کسی کو بھی ذریعہ خیر بنایا اسے عزیز گردانا جیسے کہ فرمایا: ''طوبٰی لِمَنْ خَلَقْتُہٗ لِلْخَیر واَجریت عَلٰی یَدَیہِ'' یعنی ''خوش نصیب ہے وہ جسے میں نے نیکی کے لیے پیدا کیا اور نیکی کو اس کے ہاتھ سے جاری کیا''۔ پس اللہ کے ان کم یاب بندوں کو پہچاننا چاہیے۔اور شکر کے معنی یہی ہیں۔اور چاہیے کہ اس کے لیے دعا کرے اور کہے'' طَهَّرَ اللّٰہُ قَلبَكَ فِیْ قُلُوبِ الْاَسْرَارِ وَزَكّٰی عَمَلَكَ فِیْ عَمَلِ الْاَخْیَارِ وَصَلّٰی عَلٰی رُوْحِكَ فِیْ اَرْوَاحِ الشُّهَدَاءِ'' (اللہ تیرے دل کو نیکیوں کا دل اور تیرے عمل کو نیکوں کے عمل کے ساتھ پاکیزہ رکھے اور تیری روح پر شہیدوں کی روحوں کے درمیان درود بھیجے) اور حدیث میں ہے کہ: ''جو کوئی تمہارے ساتھ نیکی کرے تم اس کا بدلہ دو۔ اگر ایسا نہ کرسکو تو اتنی دعائیں دو کہ تم سمجھو کہ بدلہ ہوگیا'' اور کامل شکر اس کا ہے کہ صدقے کا عیب مخفی رکھے۔اور تھوڑا ہو تو بھی اس کو تھوڑا نہ سمجھے اور حقیر خیال نہ کرے جیسے کہ صدقہ دینے والے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ جو کچھ دے اگرچہ وہ بہت ہو لیکن وہ اسے حقیر اور تھوڑا ہی سمجھے اور بچشم تعظیم اسے نہ دیکھے۔

وظیفہ سوم: یہ ہے کہ جو حلال نہ ہو اسے قبول نہ کرے۔ظالموں کے مال سے کچھ نہ لینا چاہیے۔نیز اس کے مال سے بھی احتیاط کرے جو سود کا کاروبار کرتا ہو۔

وظیفہ چہارم: یہ کہ درویش اپنی حاجت سے زیادہ نہ لے۔ اگر بر سبیل سفر لے رہا ہے تو زاد اور کرایہ سے زیادہ نہ لے اگر لینے والا مقروض ہو تو وہ قرض رقم سے زیادہ نہ لے۔اور اگر اس کے اہل وعیال کے لیے دس درم کافی ہوں تو گیارہ درم نہ لے۔ کیونکہ یہ ایک درم اس کے لیے حرام ہوگا اور اگر اپنے گھر میں چیزیں از قسم قماش ولباس وغیرہ کے زیادہ ہیں تو اسے زکوٰۃ نہیں لینی چاہیے۔

وظیفہ پنجم: یہ کہ اگر زکوٰۃ دینے والا یہ نہ جانتا ہو کہ کس حصے میں سے دے رہا ہے تو زکوٰۃ لینے والے کو چاہیے کہ پوچھ لے کہ یہ مساکین کے حصے میں سے دے رہا ہے یا مثلاً قرض دار کے حصے سے؟ تاکہ لینے والا اگر اس صفت سے متصف نہ ہو۔ یا دینے والا زکوٰۃ کا پورا آٹھواں اسے دے رہا ہو تو نہ لے کیونکہ امام شافعی رضی اللہ عنہ کے نزدیک پورا ایک حصہ ایک ہی شخص کو دینا روا نہیں۔

صدقہ دینے کی فضیلت

آنحضرت نے فرمایا: ''صدقہ دو اگرچہ بقدر ایک خرما ہی کے ہو کیونکہ یہ درویش کو زندگی دیتا ہے اور گناہ کو مرگ آشنا کرتا ہے۔ ایسے ہی جیسے پانی آگ کو''۔ نیز فرمایا کہ ''دوزخ سے پرہیز کرو اگر آدھا خرما ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ایسا نہ کرسکو تو اپنے بھائی کو اچھی بات ہی سے خوش کردو''۔ نیز فرمایا کہ کوئی مسلمان جو مالِ حلال سے صدقہ دیتا ہے تو ایزد تعالیٰ اپنے دستِ لطف سے اسے قبول کرتا ہے اور اس کو پالتا اور فزونی دیتا ہے ایسے ہی جیسے تم اپنے جانوروں کو پالتے پوستے ہو۔ یہاں تک کہ ایک خرما کو وہ احد سے بھی کئی گنا بڑا ہو جاتا ہے''۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ''قیامت کے دن ہر کوئی اپنے صدقے کے سائے میں ہوگا۔ حتیٰ کہ خلائق کے درمیان فیصلہ کردیں'' فرمایا کہ صدقہ شر کے دروازوں میں سے ستر دروازوں کو بند کردیتا ہے''۔ صحابہ نے پوچھا کہ کون سا صدقہ فاضل تر ہے؟ آپ نے فرمایا ''وہ جسے تو تندرستی کی حالت میں دے کہ جب تو زندگی کی امید رکھتا ہو اور افلاس سے نہ ڈرے نہ یہ کہ ملتوی کرتا رہے یہاں تک جان لبوں پر آجائے تو کہے کہ یہ اس کا اور وہ اس کا کیونکہ اب تو وہ خود بخود فلاں کا ہو جائے گا خواہ تو کہے یا نہ کہے'' اور حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ جس نے سائل کو محروم کیا اور اپنے ہاں سے محروم لوٹا دیا۔ تو سات دن تک ملائکہ اس کے گھر کا رخ نہیں کرتے اور آنحضرت دو کام کسی دوسرے پر نہ چھوڑتے تھے بلکہ اپنے ہاتھ سے انجام دیتے تھے۔ ایک یہ کہ مسکین کو صدقہ اپنے ہاتھ مبارک سے دیتے تھے تو دوسرے یہ کہ رات کو وضو کے پانی کو اپنے ہاتھ سے رکھتے تھے اور ڈھانپتے تھے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ ''جس نے کسی مسلمان کو لباس فراہم کیا وہ اللہ تعالیٰ کی امان میں ہوگا۔ جب تک وہ لباس پیوند کے ساتھ بھی باقی رہے گا۔'' حضرت عائشہ نے پچاس ہزار درم صدقے میں دیئے اور اپنے لیے ایک کرتا بھی نہ بنایا۔ اور اپنے لیے پیوند زدہ کرتے ہی پر اکتفا کیا۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے ستر سال عبادت کی تو اس سے ایک بڑا گناہ سرزد ہو گیا جس سے اس کی عبادت باطل ہوگئی۔ لیکن جب اس کا گذر ایک حاجت مند پر ہوا اور اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا اس کو دیا تو اس کا وہ گناہ بخش دیا گیا اور اس کی ستر سال کی عبادت کا ثواب اس کو لوٹا دیا گیا۔ جناب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ: ''جب بھی تجھ سے کسی گناہ کا ارتکاب ہو جائے تو تُو صدقہ دے'' اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ صدقے میں شکر بہت عطا کرتے تھے اور کہتے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ'' (قرآن: ۹۲/۳) (تم ہرگز نیکی کو حاصل نہ کرو گے جب تک تم اس شے میں سے خیرات نہ دو گے جسے تم دوست رکھتے ہو)۔ اور مجھے شکر پسند ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ ''جو کوئی صدقہ دینے والا خود کو صدقہ لینے والے درویش سے محتاج تر نہ جانتا ہو اس کا صدقہ قبول

نہیں کیا جاتا''۔حسن بصریؒ نے ایک بردہ فروش کو دیکھا کہ اس کے پاس اچھی کنیز ہے تو اسے کہا کہ ''دو درم میں بیچو گے''؟ تو بردہ فروش نے کہا ''نہیں''۔ تو آپ نے فرمایا کہ ''نہ سہی۔ جاؤ نور العین دو دانوں کے عوض عطا کریں گے جو تمہاری اس کنیز سے کہیں زیادہ حسین ہو گی''۔ دو دانے یعنی معمولی صدقہ کے عوض۔
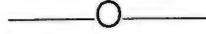
اصل ششم: روزہ اور اس کے شرائط

معلوم رہے کہ روزہ ارکان اسلام میں سے ایک ہے۔ آنحضرت نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''ہر نیکی کا بدلہ دس گنا سے لے کر ستر گنا تک دیتا ہوں لیکن روزہ کہ میری آن ہے خصوصی اور جزا اس کی میں ہی دیتا ہوں''۔ فرمان خداوندی ہے: ''اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ بِغَیْرِ حِسَاب'' وہ لوگ جو اپنی شہوات میں صبر کرتے ہیں ان کی مزدوری بے حد وحساب ہے بلکہ حد سے زیادہ ہے''۔ اور آنحضرت نے فرمایا: ''صبر نصف ایمان ہے اور روزہ ایمان کا نصف ہے''۔ نیز فرمایا کہ: ''روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک سے زیادہ اچھی ہے''۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''میرے بندے نے اپنے کھانے پینے اور شہوت کو میرے لیے ترک کیا تو اس خصوصی عمل کے لیے اس کی جزا میں ہی دے سکتا ہوں''۔ آپ (ﷺ) نے یہ بھی فرمایا کہ ''روزہ دار کی نیند بھی عبادت ہے''۔ اور یہ بھی فرمایا کہ: ''جب ماہ رمضان کی آمد آمد ہوتی ہے تو بہشت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اور شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے۔ تو ایک منادی یہ صدا لگاتا ہے: ''اے خیر کے طالب! کہ اب وقت تمہارا ہے اور اے طالبِ شر باز رہ کہ تمہارے لیے یہ پیش کش نہیں ہے''۔ اور روزے کے فضل کی عظمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کو خود سے نسبت دی ہے۔ فرمایا: ''اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ''[1] یعنی (روزہ میری ملک ہے اس لیے میں ہی اس کی جزا دوں گا) اگرچہ تمام عبادتیں اسی کی ہیں۔ ایسے ہی جیسے کہ کعبے کو اپنا گھر کہا حالانکہ پوری کائنات اسی کی ملکیت ہے۔ روزے کی دو خاصیتیں ایسی ہیں کہ جس کی بناء پر وہ اس نسبت کا سزاوار ٹھہرا ہے۔ ایک یہ کہ: اس کی حقیقت ترکِ شہوات ہے اور باطن سے متعلق ہے کہ نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور ریا کو اس میں راہ نہیں۔ کیونکہ روزہ کی نیت رات کو کی جاتی ہے۔ دوسری یہ کہ: جو دشمن خدا یعنی ابلیس کے لیے موجب قہر ہے کیونکہ اس کی فوج شہوات پر مبنی ہوتی ہے جس کو روزہ شکست دیتا ہے۔ کیونکہ روزہ کی حقیقت ترکِ شہوات ہے۔ اسی لیے آنحضرت نے فرمایا کہ: ''شیطان انسان کے رگ و پے میں رواں ہوتا ہے۔ عین اسی طرح جیسے بدن میں

---

(۱) قرآن: ۱/۳۹

خون رواں ہوتا ہے۔ تو چاہیے کہ بھوک پیاس سے ابلیس کی راہ تنگ کردی جائے''۔ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ: ''جنت کا دروازہ کھٹکھٹانے سے کبھی نہ رکنا''۔ تو ان سے سوال ہوا کہ ''کس شے سے''۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''روزے سے''یعنی روزے کی گرسنگی کے ذریعے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ روزہ ڈھال ہے''۔ اَلصَّوۡمُ جُنَّۃٌ'' اور یہ سب اس لیے ہے کہ جملہ عبادات سے روکنے والی شے شہواتِ نفسانی ہیں۔ اور سیری ان شہوات کی معاون ہے۔ جب کہ بھوک پیاس ان شہوات کا توڑ ہیں۔

روزے کے فرائض

یاد رہے کہ روزے کے فرائض چھ ہیں:

ایک یہ کہ: آغازِ ماہ معلوم کرے کہ انتیس ۲۹ کے بعد ہے یا تیسویں ۳۰ کے بعد۔ اس کے لیے ایک عادل کی گواہی بھی کافی ہے۔ اگرچہ عید کے لیے دو سے کم گواہ نہ ہونے چاہییں اور جس نے بھی کسی معتمد سے جو اس کے نزدیک راست باز ہو اس سے سنا تو روزہ اسی پر واجب ہوگیا۔ اگرچہ قاضی نے اس کے قول پر فتویٰ نہ دیا ہو۔ اگر چاند کسی ایسے شہر میں دیکھا گیا ہو جو اس کے شہر سے سولہ فرسنگ (۱) کی دوری پر ہو تو روزہ اس گروہ پر واجب نہ ہوگا۔ لیکن اگر یہ فاصلہ مذکورہ فاصلے سے کم ہو تو روزہ ان پر واجب ہو جائے گا۔

فریضہ دوم: نیت کرنے کا ہے اور چاہیے کہ ہر رات نیت کرے اور یاد میں لائے کہ یہ روزہ رمضان کا ہے جو فرض ہے اور اس کی ادائیگی لازم ہے۔ اور ہر وہ مسلمان جو نیت کا ارادہ کرے گا اس کا دل نیت سے خالی نہ رہے گا۔ اور شب شک (شب سی ام ماہ شعبان) اگر کوئی یوں کہے کہ ''میں نے روزے کی نیت کی اگر ماہ رمضان ہو''۔ تو یہ نیت درست متصور نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ کسی معتمد کے قول پر شبہ رفع ہو جائے۔ لیکن شب آخر رمضان ایسی نیت درست سمجھی جائے گی اگرچہ شک میں ہو۔ کیونکہ اصل یہ ہے کہ رمضان ہنوز گذرا نہیں ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص جائے تاریک میں مقید ہو وہ جو کچھ فکر واجتہاد سے معلوم کرے اس پر اعتماد کرنا صحیح ہوگا۔ اور اگر رات کو نیت کرے کہ کوئی شے کھائے گا اس پر بھی اس کی نیت باطل نہ ہوگی۔ بلکہ عورت اگر یہ جانے کہ حیض منقطع ہو جائے گا تو نیت کرے اور حیض منقطع ہو جائے تو اس کا روزہ درست قرار پائے گا۔

فریضہ سوم یہ ہے کہ: کوئی شے اپنے پیٹ میں دوران روزہ' قصداً یا عمداً نہ ڈالے۔ لیکن کسی قسم کی رگ زنی یا سرمہ آنکھ میں ڈالنے یا کان میں سلائی پھیرنے یا روٹی ڈالنے سے روزہ میں کوئی خلل نہیں آتا۔ کیونکہ باطن وہ ہے جو کسی شے کا مستقر ہو۔ جیسے کہ ناک' شکم' معدہ اور مثانہ وغیرہ ہیں۔ اور اگر بے ارادہ کوئی چیز اس

(۱) فرسنگ: چھ کیلومیٹر

کے پیٹ میں چلی جائے جیسے مکھی، غبار راہ، دھواں یا کلی کا پانی جو تالو سے پھسل جائے وہ بھی روزے کے لیے باعث زیاں نہیں۔ سوائے اس کے کہ کلی کرنے میں مبالغہ کرے جس کے باعث پانی گلے میں اتر جائے۔ ایسے ہی اگر بھول کر کچھ کھالے تو بھی روزہ باقی رہتا ہے۔ لیکن اگر صبح کو یا شام کو بہ گمان کچھ کھالے اور بعد میں معلوم ہو کہ سحور کا وقت ختم ہونے پر یا غروبِ آفتاب سے قبل کھایا تھا تو روزہ نہیں ہوا اس کی قضا کرنی ہو گی۔

فریضہ چہارم یہ ہے کہ: بیوی سے مباشرت روزے کے دوران نہ کرے۔ اگر اتنا قرب کرے کہ جس سے غسل واجب ہوتا ہے تو روزہ باطل ہو گیا۔ اگر بھول کر ایسا کیا تو روزہ باطل نہ ہو گا۔ رات کے دوران مباشرت کی ہو اور صبح غسل کر لیا ہو تو جائز ہے۔

فریضہ پنجم یہ ہے کہ: کسی طور پر بھی ایسا قصد نہ کرے کہ منی اس سے جدا ہو جائے۔ اگر اپنی بیوی سے نزدیکی کرے لیکن صحبت نہ کرے اور خود جواں ہو تو انزال کے باب میں معرضِ خطر میں ہوتا ہے۔ اس لیے اگر انزال ہو جائے تو روزہ باطل ہو جائے گا۔

فریضہ ششم کہ: بہ قصد نہ کرے۔ اگر قے بدون اختیار ہو جائے تو روزہ باطل نہ ہو گا۔ اگر زکام یا کسی اور سبب سے قے ہو جائے اور حلق سے باہر نکل جائے روزہ اس سے مختل نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس سے حذر دشوار ہو۔ لیکن اگر قے منہ میں آ جائے اور روزہ دار اسے پھر سے نگل لے تو روزہ باطل ہو جائے گا۔

روزے کی سنتیں

یہ بھی چھ ہیں: سحور میں تاخیر اور افطار میں تعجیل خرما کے ساتھ یا پانی کے ساتھ نماز سے قبل اور زوال کے بعد مسواک نہ کرنا۔ اور صدقے اور کھانے کے ذریعے سخاوت کرنا۔ اور تلاوتِ قرآن کثرت کے ساتھ اور مسجد میں اعتکاف خصوصاً آخری دہے میں کہ لیلۃ القدر اسی میں ہوتی ہے۔ آنحضرت تو ان آخری دس دنوں میں بستر کو لپیٹ رکھتے تھے اور کمرِ عبادت باندھ لیتے تھے۔ خود آپ اور آپ کے اہل خانہ عبادت میں جت جاتے تھے۔ اور لیلۃ القدر اکیسویں[۲۱] یا تئیسویں[۲۳] یا پچیسویں[۲۵] ستائیسویں[۲۷] یا انتیسویں[۲۹] تاریخ میں ہو سکتی ہے۔ اور ستائیسویں رات موکد تر اور ممکن تر ہے اور اولیٰ تر یہ ہے کہ اس آخری دہے میں مسلسل معتکف رہے اور اگر معتکف نے مسلسل اعتکاف کی نیت کی ہو تو لازم ہے کہ سوائے قضائے حاجت کے مسجد سے باہر نہ نکلے۔ اور وضو میں جس قدر وقت صرف ہوتا ہو اس سے زائد وقت کے لیے گھر میں نہ ٹھہرے۔ اگر نماز جنازہ کے لیے یا کسی بیمار کی عیادت کے لیے یا کسی کی گواہی کے لیے یا تجدید غسل کے لیے مسجد سے باہر نکلے گا تو اعتکاف ٹوٹ

جائے گا۔ مسجد کے اندر ہاتھ دھونا، کھانا کھانا یا سونا، بالکل جائز ہے۔ لیکن معتکف جب قضائے حاجت سے لوٹے تو چاہیے کہ اعتکاف کی نیت تازہ کرے۔

روزے کا بھید اور اس کی حقیقت

یاد رہے کہ روزے کے تین درجے ہیں۔ روزہ عوام، روزہ خواص، وروزۂ خاص الخاص۔

روزہ عوام وہ ہے جو بیان ہو چکا ہے۔ اور غایت اس کی پیٹ اور شرم گاہ کی حفاظت ہے اور یہ پست ترین درجہ ہے۔ اور خاص الخاص روزہ درجوں میں سب سے بالا درجے کا ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے دل کو سوائے حق تعالیٰ کے جملہ دیگر افکار سے روکے رکھے اور سراپا خود کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے اور جو کچھ اللہ کے سوا ہے بہ ظاہر یا بباطن اس سے روزہ رکھ لے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ کسی بھی چیز کا خیال کرے تو روزہ باقی نہ رہے گا، کھل جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی دنیوی غرض کے بارے میں فکر کرنے لگے اگرچہ مباح ہو اس سے بھی روزہ باطل ہو جاتا ہے۔ سوائے اس دنیوی امر کے جو دین کی راہ میں معاون ہو کیونکہ وہ حقیقت کی رُو سے دنیوی نہیں ہوتا۔ اور یہاں تک کہ روزہ دار اس امر کی تدبیر میں لگ جاتے ہیں کہ روزہ کسی چیز سے افطار کرے گا تو ملائکہ اس کو بھی اس کی خطا کے طور پر لکھ دیتے ہیں کیونکہ ایسا خیال اس امر کی دلیل ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی رزاقی جو موعود ہے اس پر وثوق نہیں۔ اور یہ درجہ انبیاء اور صدیقوں کا ہے اور ہر کوئی اس مرتبے کو نہیں پہنچتا۔

اور خواص کا روزہ یہ ہے کہ اپنے جملہ اعضا و جوارح کو ناشائستہ امور سے باز رکھے۔ صرف پیٹ اور شرم گاہ کی نگہبانی تک محدود نہ رہے اور روزہ کے کامل ہونے کا مدار چھ چیزوں پر ہے:

ایک یہ کہ آنکھ کو ہر اس امر سے جو تجھے حق تعالیٰ کے ساتھ مصروفیت سے ہٹانے کا سبب ہو سکتا ہو روکے۔ خصوصاً اس شے سے جو شہوت کی محرک ہو سکتی ہو۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ آنکھ کی نگاہ ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر ہے جو زہر میں بجھا ہوا ہوتا ہے۔ جو کوئی اللہ کے خوف کی بناء پر اس سے محترز رہے اسے ایمانی خلعت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ وہ خلعت کہ جس کی حلاوت دل میں باقی رہتی ہے اور روزہ دار اس کے ذوق سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ پانچ چیزوں سے روزہ باطل ہو جاتا ہے وہ ہیں: جھوٹ، غیبت، سخن چینی، جھوٹی قسم اور نظرِ شہوت۔

دوم یہ کہ زبان کو بے ہودہ گوئی اور نامطلوب سے بچائے رکھے۔ خاموش رہے، یا ذکر اور تلاوتِ قرآن میں مصروف ہو جائے۔ مناظرہ اور ستیزہ کاری مضر بے ہودگی میں سے ہیں اور غیبت اور دروغ علماء کے نزدیک روزہ عوام میں بھی بُطلان کا باعث ٹھہرتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ ''دوعورتیں روزے سے تھیں اور ایسے ہوگئیں کہ خوف تھا کہ بھوک سے ہلاک ہوجائیں گے تونہوں نے آنحضرت سے اجازت مانگی کہ روزہ افطار کرلیں۔تو آپ (ﷺ) نے ان کے پاس ایک پیالہ بھیجا تاکہ اس میں قے کریں۔تو دونوں کے گلوں میں جما ہوا خون برآمد ہوا اور لوگ حیرت میں رہ گئے تو آنخضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ان دونوں نے اس غذا سے جو اللہ تعالیٰ نے حلال کررکھی ہے روزہ رکھا لیکن جسے حرام کیا تھا اس سے روزہ توڑ دیا۔ یہ غیبت کی مرتکب ہوئیں اور یہ جوان کے گلے سے نکلا ہے یہ لوگوں کا گوشت ہے جو انہوں نے کھایا''۔

سوم یہ کہ کانوں کی حفاظت بھی کرے کہ جو کہنا نہیں چاہیے وہ سننا بھی جائز نہیں کیونکہ اس طرح سننے والا دروغ وغیبت وغیرہ میں کہنے والے کا شریک بن جاتا ہے۔

چہارم یہ کہ: ہاتھ پاؤں جملہ جوارح کو ناشائستہ سے بچائے اور ہر وہ روزہ دار جو ان برائیوں سے محترز نہیں رہتا اس کی مثال ایسے بیمار کی ہے جو میوہ سے احتراز کرے لیکن زہر کھائے۔ کیونکہ معصیت زہر ہے اور طعام غذا ہے لیکن اس کو ضرورت سے زیادہ کھانے سے ضرر پہنچتا ہے لیکن اصل اس کی زیاں کار نہیں۔اسی بناء پر آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''اکثر روزہ دار وہ ہیں جنہیں روزے سے بجز بھوک پیاس کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا''۔

پنجم یہ کہ افطار کے وقت حرام یا مشتبہ شے سے روزہ افطار نہ کرے اور خالص حلال میں سے بھی زیادہ نہ کھائے کیونکہ جو کچھ دن میں روزے سے حاصل کیا تھا بسیار خوری سے شب کو کھو دیا۔مقصود تو روزے کا نفسانی شہوات کو کم کرنا تھا۔لیکن اس نے زیادہ کھا کر شہوت میں پھر اضافہ کردیا۔خصوصاً اگر طرح طرح کے کھانے جمع کرے تاکہ معدہ خالی نہ رہے۔ نتیجۃً دل صاف نہیں رہتا۔اس لیے سنت یہ ہے کہ دن کے وقت زیادہ نہ سوئے تاکہ بھوک پیاس اور کمزوری کا اثر خود میں پائے۔اور اگر رات کو تھوڑا نہ کھائے تو جلدی نیند سے مغلوب ہو جائے گا اور نماز عشاء ادا نہ کر پائے گا۔اسی بناء پر آنخضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''جس ظرف کو بھی لبالب بھر دیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک معدے سے بڑھ کر دشمن نہیں''۔

ششم یہ کہ: افطار کے بعد روزہ دار کا دل بیم و امید کے درمیان معلق ہوتا ہے کیونکہ نہیں جانتا کہ اس کا روزہ مقبول ہوا ہے یا بارگاہ خداوندی سے مسترد ہوگیا ہے۔حسن بصریؒ عید کے دن ایک گروہ کے پاس سے گذرے جو ہنس کھیل رہے تھے۔تو آپ نے فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے ماہِ رمضان کو ایک میدان بنایا ہے تاکہ اس کے بندے طاعت خداوندی میں سبقت ڈھونڈیں۔اس لیے ایک گروہ نے سبقت پالی اور ایک گروہ پیچھے رہ گیا۔حیرت ہے ان پر جو ہنس رہے ہیں اور اپنے حال کی حقیقت نہ جان سکے۔قسم اس ذاتِ پاک کی کہ اگر

روئے کار سے پردہ اٹھادیا جائے تو مقبولیت پانے والے خوشی میں مشغول ہو جائیں اور مردود اپنے اندوہ میں ماتم میں لگ جائیں اور ان میں سے کوئی بھی ہنسی یا کھیل میں نہ لگے"۔

پس اے عزیز اس تفصیل سے تو نے جان لیا ہو گا کہ جو کوئی فقط کھانے پینے سے روزے میں احتراز کرتا ہے تو اس کا روزہ بے جان پیکر کی مانند ہو گا کیونکہ روزے کی روح حقیقت میں یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ملائکہ کی مانند بنائے جنہیں اصلاً شہوت نہیں ہوتی جب کہ جانوروں پر شہوت غالب ہوتی ہے۔ اس لیے فرشتے بہایم سے بہت دور ہیں اور ہر وہ شخص جو شہوت سے مغلوب ہو وہ گویا بہایم کے درجے میں ہے اور جب اس کی شہوت ضعیف ہو گئی تو وہ ایک گونہ ملائکہ کے مشابہ ہو گیا اس سبب سے وہ ملائکہ کے نزدیک ہوا۔ یہ نزدیک صفت میں ہے قربِ مکانی مراد نہیں اور ملائکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہیں۔ پس روزہ دار بھی اللہ تعالیٰ کے قریب ٹھہرا۔ اور اگر وہ افطار کے کھانے کے ذریعے شہوت کو اپنے مطلوب سے کمک پہنچاتا ہے تو اس سے شہوت پھر قوی تر ہو جاتی ہے نہ کہ ضعیف تر۔ اس طرح روزے کی روح سے بے بہرہ رہتا ہے۔

لوازمِ افطار

معلوم رہے کہ قضاء، کفارہ، فدیہ و امساک افطار رمضان میں واجب ہے۔ لیکن ہر ایک اپنے موقعے پر قضا ہر مسلمان پر واجب ہے اگر وہ روزہ نہیں رکھتا خواہ کسی عذر سے یا بے عذر۔ اس طرح حائض عورت مسافر، بیمار اور حاملہ عورت پر بھی واجب ہے۔ اور مرتد پر بھی اسی طرح۔ لیکن دیوانے اور نابالغ پر واجب نہیں۔ اور کفارہ بجز مباشرت یا بہ اختیار انزال منی کے واجب نہیں۔ اور کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو دو ماہ متواتر روزہ رکھے۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے بہ سبب بیماری یا ضعف کے تو ساٹھ مد (۲/۳ من) طعام درویشوں کو دے۔ ہر درویش کو ایک مُد دے اور مُد ایک تہائی کم ایک من ہوتا ہے۔

امساک باقی دن کے لیے اس پر واجب ہے جو بلا عذر روزہ افطار کرے لیکن حائضہ عورت پر واجب نہیں۔ اگرچہ وہ درمیان روزہ پاک ہو جائے۔ اور مسافر پر اگرچہ مقیم ہو جائے اور بیمار پر اگرچہ بہتر ہو جائے، روزہ واجب نہیں۔

اور شک کے دن اگر ایک شخص بھی گواہی دے کہ اس نے چاند دیکھا ہے تو جس نے لاعلمی میں کھانا کھایا ہو تو اس کے لیے لازم ہے کہ باقی دن روزہ دار کی مانند بے کھائے پیئے گذارے اور جو کوئی دن کے درمیان سفر کا آغاز کرے اسے روزہ چھوڑنا نہیں چاہیے اور اگر روزے کے ساتھ کسی شہر میں پہنچے تو اسے روزہ پورا کرنا چاہیے۔

مسافروں کے لیے روزہ افطار سے بہتر ہے سوائے اس کے کہ روزہ کی قوت نہ رکھتے ہوں۔ فدیہ ایک مُد کھانا ہے جو وہ کسی مسکین کو پہنچائے اور حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے لیے فدیہ اور قضا دونوں واجب ہیں۔ کیونکہ روزہ اس نے اس خیال سے نہیں رکھا کہ شیر خوار کو کوئی ضرر نہ پہنچے اور بیمار کی مانند نہیں جس نے اپنے موہوم ضرر سے روزہ نہ رکھا ہو۔ اور بوڑھا جو نہایت ضعیف ہو اور روزہ نہ رکھ سکتا ہو اس پر بھی فدیہ واجب ہے۔ قضا کے بدل کے طور پر، اور جو کوئی ماہ رمضان کے روزوں کی قضا میں اتنی تاخیر کرے کہ سال آئندہ کا رمضان بھی آ پہنچے اس کے لیے قضا کے علاوہ ہر روز کے لیے ایک مُد طعام دینا بھی واجب ہے۔

فصل: صاحبِ شرف و فضل دنوں میں روزہ رکھنا سنت ہے

سال بھر میں ایام عرفہ و عاشورا اور ذوالحجہ کے پہلے نو دن اور ماہ محرم، رجب اور شعبان کی پہلی تاریخ یہ جملہ ایام صاحب شرف و فضیلت ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ماہ رمضان کے بعد سب سے فاضل تر ماہ محرم کا ہے۔ اور تمام محرم میں روزہ رکھنا سنت ہے۔ اور محرم کا پہلا عشرہ موکد تر ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ ماہ حرام کا ایک روزہ دوسرے مہینوں کے تیس ۳۰ روزوں کے برابر ہے۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ جو کوئی کہ ماہ ہائے حرام کے ایام جمعرات، جمعہ اور ہفتہ کو روزہ رکھے اس کے نامہ اعمال میں سات سو ۷۰۰ سال کی عبادت لکھ دی جاتی ہے۔ اور ماہ ہائے حرام چار ہیں: ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم، رجب۔ اور فاضل ترین ان میں ذوالحجہ ہے کہ زمانہ حج ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذوالحجہ کے عشرہ اوّل کی عبادت سے بڑھ کر دوسری کوئی عبادت نہیں۔ ان دنوں میں ایک دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر ہے اور ایک رات کا قیام لیلۃ القدر کے قیام کے برابر ہے''۔ اس پر صحابہ نے استفسار کیا کہ ''یارسول اللہ یہ روزہ جہاد سے بھی بڑھ کر ہے تو آپ نے فرمایا: ''جہاد سے بھی الا یہ کہ کسی کا گھوڑا جہاد میں مارا جائے اور خود مجاہد نے اپنا خون اسی میں بہایا ہو''۔ صحابہ میں سے ایک گروہ پورے رجب میں متواتر روزہ رکھنے کو مکروہ سمجھتا تھا۔ اسی بناء پر کہ ماہ رمضان کے مشابہ نہ ہو جائے۔ اسی لیے ایک دن یا زیادہ چھوڑ کر روزہ رکھتے تھے۔ اور حدیث میں ہے کہ ''جب شعبان آدھا گذر جائے اس کے بعد روزہ نہیں ہے سوائے ماہ رمضان کے''۔ مختصر یہ کہ آخر شعبان روزہ نہ رکھنا نیکوتر ہے۔ تا کہ رمضان شعبان سے فاصلے پر رہے۔ لیکن شعبان کے روزِ آخر رمضان کے استقبال میں روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ سوائے اس کے کہ بجز استقبال رمضان کے ارادے کے ہو۔

مہینے کے فضیلت والے ایام: صاحب فضیلت ایام ایام البیض ہیں: یعنی تیرہویں، چودہویں اور

پندرہویں۔ اور ہفتے کے صاحب فضیلت ایام پیر، جمعرات، اور جمعہ ہیں۔ اور لگا تار سال بھر کا روزہ ان سب کا جامع ہے۔ لیکن پانچ روز وہ ہیں جن میں روزہ ممنوع ہے۔ یعنی دونوں عیدوں کے دو دن اور تین ایام تشریق کے عید الاضحیٰ کے بعد، اور چاہیے کہ افطار میں خود پر جبر نہ کرے۔ کیونکہ تاخیر مکروہ ہے اور جو کوئی سال بھر روزہ رکھ سکتا ہو تو وہ ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھ لے۔ یہی روزۂ داؤد کہلاتا ہے اور فضیلت اس کی بہت ہے۔

حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص نے آنحضرت (ﷺ) سے فاضل ترین روزے اور اس کے رکھنے کے طریق کے بارے میں پوچھا تو آپ (ﷺ) نے اسی روزہ داود کو بتایا تو عبداللہ بن عمرو نے کہا کہ میں اس سے فاضل تر کا خواہاں ہوں تو آپ (ﷺ) نے جواب دیا کہ اس سے فاضل تر نہیں اور اس سے کمتر درجے کا یہ ہے کہ جمعرات اور جمعے کا روزہ رکھے تاکہ ماہ رمضان کے روزوں کو ملا کر تہائی سال کے برابر ہو جائیں۔

اور اگر کوئی حقیقت روزہ کے عرفان سے بے بہرہ ہو۔ جس کا مقصود شہوت کو کم کرنا ہے اور صفائے دل مراد ہے، اسے چاہیے کہ اپنے دل کا ہمہ وقت مراقب ہو تو جب ایسے ہو تو کبھی افطار فاضل تر ہوتا ہے تو کبھی روزہ۔ اسی بناء پر آنحضرت (ﷺ) کبھی اس قدر روزہ رکھتے کہ صحابہ گمان کرتے کہ اب یہ کبھی بے روزہ نہ رہیں گے اور کبھی آپ اس قدر بے روزہ ہوتے کہ گمان ہوتا کہ اب یہ کبھی روزہ نہ رکھیں گے۔ اُن کے روزوں کی ترتیب معلوم نہ ہو پاتی۔

اور علماء اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ روز عید اور ایام تشریق کے سوا متواتر چار دن بے روزہ رہیں۔ اس لیے کہ متواتر بے روزہ رہنے سے خطرہ یہ ہوتا ہے کہ دل سیاہ ہو جائے۔ اور غفلت غالب ہو جائے اور دل کی آگاہی اور بیداری کمزور پڑ جائے۔

اصل ہفتم: حج

یاد رہے کہ حج ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے۔ اور عمر بھر کی عبادت ہے۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا: ''جس نے حج نہ کیا اور مر گیا تو اسے کہو خواہ یہودی کے طور پر مرے یا عیسائی کے طور پر''۔ نیز فرمایا کہ: ''جس نے اپنے تن کو فسق سے آلودہ نہ کیا اور زبان کو بے ہودہ گوئی اور ناسزا سے محفوظ رکھا تو وہ گویا تمام گناہوں سے بچ نکلا اور ایسا ہے کہ اس کی ماں نے اسے آج ہی جنا ہو''۔ آپ (ﷺ) نے فرمایا: ''بہت گناہ ایسے ہیں جن کا کوئی کفارہ نہیں سوائے میدان عرفات میں کھڑے ہونے کے''۔ نیز فرمایا کہ شیطان کو روزِ عرفہ سے زیادہ خوار تر اور حقیر تر اور زردرُو تر نہیں دیکھا گیا۔ کیونکہ اس دن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کی نہایت درجہ بارش اپنی مخلوق پر

برساتا ہے اور کتنے ہی عظیم کبائر کو معاف کر دیتا ہے''۔ نیز فرمایا جو کوئی حج کے ارادے سے گھر سے نکلا لیکن راہ میں مر گیا تو اس کے لیے ہر سال حج اور عمرے کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہتا ہے اور جو کوئی مکہ میں مرتا ہے یا مدینہ میں اس کا حساب ہوتا ہے نہ کتاب''۔ نیز فرمایا کہ ''ایک حج مبرور دنیا و مافیہا سے بہتر ہوتا ہے اور ایسے مومن کی جزا بہشت سے کم نہ ہوگی''۔ نیز فرمایا کہ ''کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کو جو شخص عرفات میں کھڑا ہو اور اسے یہ وہم ہو کہ شاید بخشا نہیں گیا''۔

علی بن موفق جن کا شمار بزرگانِ دین میں ہوتا ہے فرماتے ہیں: ایک سال میں نے حج کیا تو عرفہ کی رات میں نے دو فرشتوں کو خواب میں دیکھا کہ آسمان سے اترے ہیں اور سبز لباس میں ملبوس ہیں۔ تو ان میں سے ایک دوسرے سے کہتا ہے: ''کیا تم جانتے ہو اس برس حاجی کتنے تھے؟ تو اس نے نفی میں جواب دیا تو پہلے نے اسے بتایا کہ چھ لاکھ تھے۔ اس نے پھر سوال کیا کہ جانتے ہو کہ کس قدر لوگوں کا حج قبول ہوا تو اس نے پھر نفی میں جواب دیا تو سوال کرنے والے فرشتے نے خود ہی بتایا کہ ''صرف چھ اشخاص کا'' اور میں نیند سے بیدار ہو گیا اور خوف اور اس بات سے سخت غمگین ہو گیا۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ ''میں کسی طور بھی ان چھ اشخاص میں سے نہیں ہونے کا!'' اسی فکر و غم میں میں مشعر الحرام میں پہنچا اور سو گیا۔ تو میں نے پھر ان دونوں فرشتوں کو خواب میں بات باہم کرتے دیکھا۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ جانتے ہو کہ آج رات حق تعالیٰ نے مخلوق کے درمیان کیا فیصلہ کیا ہے؟ تو دوسرے فرشتے نے پھر لاعلمی کا اظہار کیا۔ تو پہلے فرشتے نے کہا کہ ان چھ حاجیوں کے طفیل ہر ایک کے پیچھے ایک لاکھ افراد کا حج قبول کر لیا گیا۔ اور جملہ حاجیوں کو ان چھ کے عمل میں شریک کر دیا تو جب نیند سے بیدار ہوا تو میں نے شادمانی کے ساتھ حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا''۔

آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ ہر سال چھ لاکھ افراد حج کے لیے اس گھر کی زیارت کریں گے اور لوگ اگر اس تعداد سے کم ہوئے تو پورا کرنے کے لیے فرشتوں کو بھیجا جائے گا اور کعبے کو ایک دلھن کی طرح جسے منصۂ شہود پر لایا گیا ہو آراستہ کریں گے۔ اور جس کسی نے حج کیا اور کعبے کا طواف کیا اور ہاتھ غلاف پردہ سے لگایا تو جب وہ بہشت میں داخل ہوگا دوسرے حاجی بھی اس کے ساتھ بہشت میں داخل ہو جائیں گے۔

شرائطِ حج

معلوم رہے کہ جو مسلمان بھی حج کرنا چاہے تو اسے ایام حج ہی میں ادا کرنا چاہیے۔ ایام حج شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے نو دن ہیں۔ یہاں تک کہ دسویں کی صبح کو عید کے لیے نکلے۔ احرام اس تمام مدت حج

میں درست ہے۔ اور اگر مذکورہ ایام سے پہلے حج کا احرام باندھے گا وہ عمرہ شمار ہوگا اور باتمیز چھوٹے لڑکے کا حج بھی درست ہوگا۔ اور شیر خوار بچہ جس کی طرف سے اس کا ولی احرام باندھ لے اور اسے عرفات میں لے جائے اور سعی اور طواف میں ساتھ رکھے تو اس کا حج بھی درست ہوگا۔ پس حجِ اسلام کی درستی کے لئے سوائے ایام حج کے صحیح ہونے کے اور کوئی شرط نہیں۔

اور یہ شرط کہ حجِ اسلام ہو اور فریضہ ادا ہو جائے اس کی پانچ شرطیں ہیں۔ یعنی مسلمان ہونا' آزاد ہونا بالغ ہونا اور عاقل ہونا پھر میقات کے اندر احرام باندھنا۔ اگر لڑکا احرام باندھے اور عرفات میں قیام سے پہلے بالغ ہو جائے یا غلام ہو لیکن اس سے پہلے آزاد ہو جائے تو حج اسلام کے لیے کافی ہے اور ادائیگی عمرہ کے لیے بھی یہی شرائط ہیں سوائے وقت کے کیونکہ عمرہ کے لیے پورے سال میں جائز ہے۔

اور کسی دوسرے کے لیے نیابت میں حج گذارنے کی شرط یہ ہے کہ نائب نے پہلے حج کیا ہوا ہو۔ لیکن اگر پہلے خود حج نہ کیا ہو اور دوسرے کے لیے نیت کرے تو اس کا حج تو ہو جائے گا لیکن اس دوسرے کا نہیں جس نے اسے نائب ٹھہرایا تھا۔ پہلے حج اسلام ہو پھر قضا پھر قدر پھر نیابت تو اس ترتیب سے حج ادا ہوگا اگرچہ نیت اس کے خلاف کرے۔

وجوب حج کی شرائط

یہ ہیں: مسلمان ہو' بالغ ہو' عاقل ہو' آزاد ہو اور حج کی استطاعت بھی رکھتا ہو۔ استطاعت کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ توانا ہو تا کہ خود بہ نفس نفیس حج کر سکے اور یہ تین چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ تندرست ہو' حج کی راہ پُر امن ہو اور راہِ حج میں کوئی خطرناک سمندر یا ایسا دشمن نہ ہو کہ جس سے مال و جان کا خطرہ ہو اور دیگر یہ کہ اتنا مال رکھتا ہو کہ آنے جانے کے اخراجات کے لیے کافی ہو اور اہل و عیال کے پاس واپسی تک کے اخراجات کے لیے مال ہو۔ نیز یہ کہ سب قرض ادا کر چکا ہو۔ اور اگر سواری کا مالک ہو تو پیادہ حج کرنا ضروری نہیں۔ اور ایک قسم اور بھی ہے کہ کوئی خود حج نہیں کر سکتا کیونکہ مفلوج ہے یا اس نوع کی ماندگی سے دوچار ہو کہ جس سے بہتری کی امید نہ ہو اِلّا یہ کہ نادر۔ لیکن اتنی استطاعت رکھتا ہو کہ اتنے کا مالک ہو کہ جس سے کسی کو بہ طور نائب بھیج سکے کہ اس کے لیے حج کرے اور نائب کو زحمت نہ دے سکے اور اگر اس کا بیٹا قبول کرے کہ وہ اس کے لیے مفت حج کرے تو باپ کے لیے لازم ہے کہ اجازت دے کیونکہ باپ کی خدمت شرف ہے اور اگر کہے کہ "میں مال دیتا ہوں کسی اور کو اجارہ پر لے لے" تو پھر اس بیٹے کا احسان اٹھانا لازم نہیں۔

کسی مسلمان کو جب استطاعت حج کی ہو تو وہ ادائے حج میں جلدی کرے۔ لیکن اگر کچھ تاخیر بھی

ہو جائے تو بھی جائز ہے۔ اگر توفیق ہو تو اگلے سال کرے لیکن اگر اتنی تاخیر کرے کہ ادائے حج سے پہلے مر جائے تو گناہ گار ہو گا تو اس صورت میں لازم ہے کہ اس کے ترکے میں حجِ نیابت کا بندوبست کیا جائے۔ اگر چہ اس نے اس کی وصیت نہ بھی کی ہو۔ کیونکہ حج اس پر فرض ہو گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ ''میرا ارادہ یہ ہے کہ عمال کو لکھوں کہ جو صاحبِ استطاعت شہروں میں موجود ہو اور اس کے باوصف حج نہ کرے تو اس سے جزیہ لیا جائے''۔

حج کے ارکان اور ادائے حج کی صورتیں اور محظوراتِ حج

معلوم رہے کہ وہ ارکان جن کی ادائیگی نہ ہو تو حج درست نہیں ہوتا۔ ان کی تعداد پانچ ہے: احرام، طوائفِ کعبہ اور سعی اور عرفات میں قیام اور ایک قول پر بال منڈوانا اور اگر واجبات حج ادا نہ کر سکے تو بھی حج باطل نہیں ہوتا لیکن بکری کا کفارہ دینا لازم ہوتا ہے۔ ایسے واجبات چھ ہیں: میقات میں احرام باندھنا، اگر احرام باندھے بغیر میقات سے آگے نکل جائے تو ایک بکری بہ طور کفارہ دے اور رجم کرنا اور غروب آفتاب تک عرفات میں ٹھہرنا اور رات کو مزدلفہ میں ٹھہرنا۔ اسی طرح منا میں اور طواف وداع اور ان آخری چاروں کے بارے میں ایک قول اور بھی ہے کہ اگر انہیں انجام نہ دے سکے تو اس کے لیے بکری بہ طور کفارہ دینا لازم نہیں کیونکہ یہ فرض نہیں البتہ ان کا بجالانا سنت ہے۔ ادائے حج کی تین صورتیں ہیں یعنی: افراد، قران و تمتع۔ افراد ان میں زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ کہ حج پہلے تنہا ادا کرے تو جب پورا ہو جائے تو احرام کھول دے اور پھر عمرے کا احرام باندھے اور عمرہ ادا کرے اور احرام عمرہ جعرانہ میں باندھنا تنعیم میں باندھنے سے افضل ہے اور تنعیم سے فاضل تر یہ ہے کہ حدیبیہ کے مقام پر باندھے۔ اور یہ تینوں سنت ہیں۔

قران: حج قران یہ ہے کہ یہ کہے: ''لبيك بحجة وعمرة'' تاکہ ایک ہی باری میں مُحرِم ہو جائے اور اعمالِ حج بجالائے اور بس عمرہ اس میں شامل سمجھا جائے گا۔ جیسے وضو غسل میں شامل متصور ہوتا ہے۔ اور جو ایسے کرتا ہے بکری اس پر واجب ہوتی ہے۔ سوائے اس کے جو اہل مکہ ہو کہ اس پر بکری واجب نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کا میقات خود مکہ ہے اور جو حج قران کرتا ہے اگر عرفات کے وقوف سے پہلے طواف کر لے اور سعی کر لے تو سعی حج و عمرہ دونوں کے لیے محسوب ہوتی ہے لیکن طوافِ وقوف عرفہ کے بعد دوہرانا چاہیے۔ کیونکہ شرطِ طواف فرض ہے جو وقوفِ عرفات کے بعد ادا ہو۔

حجِ تمتع: یوں ہے کہ جب میقات میں پہنچے تو عمرے کا احرام باندھے اور مکہ میں تحلل[1] کرے تاکہ

---

(۱) احرام سے باہر آنا۔

احرام کی قید میں نہ رہے۔ پھر حج کے موقعے پر مکہ میں جائے اور حج کے لیے احرام باندھے تو اس پر ایک بکری کا دم واجب ہوگا۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو تین دن روزے رکھے۔ عیدالاضحیٰ سے پہلے پہلے متواتر یا پراگندہ اور سات دن کے روزے وطن واپسی پر اور قران میں بھی اگر بکری کی استطاعت نہ ہو تو مذکورہ عمل کرے۔

اور حجِ تمتع کا دم اس شخص پر واجب ہوتا ہے جو عمرے کا احرام ماہ شوال میں یا ذوالقعدہ میں ذوالحجہ کے عشرہ اول میں باندھے تا کہ حج کے لئے زحمت کمتر کی ہو۔ اور احرام حج کو اپنے میقات پر نہ باندھا ہو۔ پس اگر وہ مکی ہے یا مسافر ہے اور بوقت حج میقات میں آئے اور سفر اس کا ایک میل کا ہو تو ایک بکری کا دم اس پر واجب ہوگا۔

ممنوعاتِ حج

چھ ہیں: ایک یہ کہ لباس نہ پہنے کیونکہ احرام میں کُرتا شلوار یا پگڑی موزہ وغیرہ پہننا نہیں چاہیے۔ بلکہ ازار اور ردا اور نعلین یعنی احرام پہنے اور ہفت اندام ازار سے پوشیدہ کرے تو جائز ہے لیکن سر کو ننگا رکھنا چاہیے۔ ہاں عورت کو لباس عادی پہننے کی اجازت ہے۔ لیکن اسے چہرہ ننگا رکھنا چاہیے لیکن اگر محمل یا کجاوے میں ہو تو جائز ہے۔

دوسرے یہ کہ خوشبو استعمال نہ کرے اگر کرے گا اور لباس پہنے گا تو ایک بکری بہ طور دم واجب ہوگی۔

تیسرے یہ کہ بال یا ناخن نہ کاٹے اگر ایسا کرے گا تو ایک بکری کا دم واجب ہو جائے گا۔ لیکن حمام اور بالوں میں کنگھی اس انداز سے کہ بال اکھڑنے نہ پائیں جائز ہے۔

چوتھے یہ کہ جماع نہ کرے۔ اگر اس کا مرتکب ہو تو ایک اونٹ یا ایک گائے یا سات بکریاں دم میں دے۔ اور حج اس کا فاسد ہو جائے گا اور قضا لازم۔ لیکن اگر پہلا احرام کھولنے کے بعد اس کا ارتکاب کرے تو اونٹ کا دم واجب ہوگا لیکن حج تباہ نہ ہوگا۔

پانچویں یہ کہ مباشرت کے مقدمات جیسے عورت کو لمس کرنا یا بوسہ دینا وغیرہ ممنوع ہے۔ اگر لمس سے طہارت باقی نہ رہے تو ایک بکری کا دم واجب ہوگا اور انزال منی کی صورت میں بھی بکری کا دم واجب ہو جائے گا۔ مُحرم کے لیے نکاح کا انعقاد بھی جائز نہیں۔ اگر کوئی نکاح کرے تو درست نہ ہوگا۔ لیکن کوئی شے واجب نہ ہوگی۔

چھٹے یہ کہ خشکی پر شکار کرنا ممنوع ہے لیکن پانی میں مچھلی وغیرہ کے شکار کی اجازت ہے اور جب شکار کرے گا تو شکار ہی کی مانند دم واجب ہوگا۔ اونٹ، گائے، یا بکری میں سے شکار جس سے زیادہ مشابہ ہو وہی دم ٹھہرے گا۔

کیفیتِ حج

یاد رہے کہ اعمال حج اول تا آخر بہ ترتیب معلوم ہونے چاہییں۔ فرائض، سنن اور آداب سب کے

سب۔ کیونکہ آپ ﷺ کی سنت یہی ہے جو کوئی عبادت بہ عادت نہیں کرتا سنت و آداب و فریضہ اس کے نزدیک سب برابر ہوتے ہیں اور جو بھی درجہ محبت کو پہنچتا ہے۔ نوافل اور سنن ہی کے ذریعے پہنچتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''میرے بندے ادائے فریضہ سے بہتر مجھ سے قربت نہیں پاتے اور جو بندہ ہو وہ کبھی نوافل اور سنن کے ذریعے تقرب سے باز نہیں رہتا تا کہ اس درجے کو پہنچے کہ میں اس کا سامعہ، باصرہ، دست و زبان بن جاؤں۔ وہ مجھی سے سنے، مجھی سے دیکھے اور مجھی کو پکڑے اور مجھی سے کہے'' پس عبادات آداب و سنن کے مطابق بجالانا اور ہر چیز میں آداب کو ملحوظ رکھنا لازم ٹھہرا۔

سفرِ حج کے آداب ولوازم

خواہانِ حج کو چاہیے کہ سب سے پہلے حج کی نیت کرے۔ توبہ کرے، مظالم واپس دے، قرض ادا کرے اور اہل و عیال کو نیز دیگر جس کسی کا نان و نفقہ اس کے ذمے ہے فراہم کرے اور وصیت نامہ لکھے اور زادِ راہ حلال ذرائع سے جمع کرے۔ اور مشتبہ سے احتراز کرے کیونکہ حج اگر مشتبہ مال سے کرے گا تو خطرہ یہ ہے کہ قبول نہ ہو۔ اور زادِ راہ اس قدر ہو تا کہ دورانِ سفر تہی دستوں سے سلوک کر سکے۔ اور حج پر نکلنے سے پہلے سلامتی راہ کے لیے کسی شے کا صدقہ کرے اور قوی خچر کرائے پر حاصل کرے اور جو کچھ دورانِ سفر ساتھ لے جائے گا صاحب خچر کو دکھا دے تا کہ رستے میں کسی قسم کی کراہیت کا سامنا نہ ہو۔ اور ایسے رفیق کو بہ صلاح دستیاب کرے جو سفر کردہ ہو اور جو دین اور مصالحِ راہ میں معاون ہو سکے۔ پھر دوستوں کو وداع کہے اور ان سے حلال اور دعا کا متمنی ہو اور ہر دوست سے کہے: ''اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَاَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ'' (تمہارے دین، امانت اور انجام کار کو میں اللہ کے حوالے کرتا ہوں) اور اس کے دوستوں کو جواب میں یہ کہنا چاہیے: ''فِيْ حِفْظِ اللّٰهِ وَكَنَفِهٖ زَوَّدَكَ اللّٰهُ التَّقْوٰى وَجَنَّبَكَ الرَّدٰى وَغَفَرَ ذَنْبَكَ وَجَّهَكَ لِلْخَيْرِ اَيْنَمَا تَوَجَّهْتَ'' (تو اللہ کی حفظ و پناہ میں رہے، اللہ تجھے پرہیزگاری کا توشہ دے، بدی سے دور رکھے، تیرے گناہ بخش دے اور تو جہاں بھی جائے اللہ تجھے کامیاب کرے)۔

اور جب گھر سے نکلے تو پہلے دو رکعت نماز ادا کرے اور پہلی رکعت میں الحمد شریف اور قل یا ایھا الکفرون پڑھے تو دوسری رکعت میں الحمد اور قل ھو اللہ احد پڑھے۔ اور جب نماز سے فارغ ہو تو کہے: ''اللھم انت الصاحب فی السفر و انت الخلیفة فی الاھل و المال و الولد احفظنا و ایاھم من کل آفة اللھم ان انسارك فی مسیرنا ھذا البر و التقوی و من العمل ما ترضی'' یعنی (اے اللہ تو سفر میں

میرا رفیق ہے اور خاندان و مال وفرزند ہمیں اور ان کو ہر آفت سے پناہ میں رکھے کہ تو ہی مسافروں کا جانشین ہے۔ خدایا اس سفر میں ہم آپ سے چاہتے ہیں کہ ہم نیکوکار اور پارسا ہوں۔ اور وہی کریں جس پر تو راضی ہو) اور جب گھر کے دروازے پر پہنچے تو کہے: "بِسْمِ اللهِ، تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ اَللّٰهُمَّ بِكَ اِنْتَشَرْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَبِكَ اِعْتَصَمْتُ وَاِلَيْكَ تَوَجَّهْتُ اَللّٰهُمَّ زَوِّدْنِيْ التَّقْوٰى وَاغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ وَوَجِّهْنِيْ لِلْخَيْرِ اَيْنَمَا تَوَجَّهْتُ" یعنی بنام خدا خود کو میں نے خدا کے سپرد کیا سوائے خدا کے توانائی اور قوت نہیں۔ خدایا میں تیری امید میں خاندان سے جدا ہو رہا ہوں اور دل میں نے تیرے حوالے کر دیا۔ اور تجھ سے مل گیا ہوں اور میں نے اپنے دل کا رخ تیری طرف پھیر دیا ہے۔ اے خدا مجھے پارسائی کا توشہ عطا فرما اور میرے گناہ بخش دے اور میں جدھر کا رخ کروں اس میں کامیاب کر دے۔ اور جب سواری پر بیٹھے تو یہ دعا پڑھے: "بِسْمِ اللهِ وَبِاللهِ وَاللهُ اَكْبَرُ سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَلَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۙ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ" (قرآن: ۱۳/۴۳، ۱۴) (پاک ہے اور بے عیب ہے وہ ذات کہ جس نے اس سواری کو ہمارے ماتحت اور نرم کر دیا ورنہ ہم اس پر نہ آ سکتے اور ہم اس نعمت میں اپنے خداوند کی طرف پھرنے والے ہیں)۔ اور پورے راستے میں ذکرِ حق اور قرآن کی تلاوت میں مشغول رہے اور جب کسی بلندی کو پہنچے تو کہے: "اَللّٰهُمَّ لَكَ الشَّرَفُ عَلٰى كُلِّ الشَّرَفِ وَلَكَ الْحَمْدُ عَلٰى كُلِّ حَالٍ" یعنی "اے اللہ تو بزرگ ہے تمام بزرگیوں کی سرآمد اور تمام احوال میں ستائش کا مستحق تو ہے"۔ اور جب دورانِ سفر کوئی خطرہ درپیش ہو تو آیۃ الکرسی وَشَهِدَ اللهُ[1] وَقُلْ هُوَ اللهُ اور مُعَوَّذَتَيْن کی تلاوت کرے۔

احرام اور مکہ شریف میں داخل ہونے کے آداب: چاہیے کہ میقات میں پہنچے جہاں قافلہ والے احرام باندھیں پہلے غسل کرے، پھر ناخن اور بال تراشے ایسے ہی جیسے نمازِ جمعہ کے باب میں بیان ہوا اور سلا ہوا لباس اتار دے اور سفید ازار اور ردا پہن لے اور احرام باندھنے سے قبل خوشبو لگائے اور جب جانے کے لیے اٹھے تو سواری کو راہ پر لگا دے اور نیت حج کی کرے۔ اور دل و زبان سے کہے: "لبیك اللهم لبیك لا شریك لك لبیك ان الحمد و النعمة لك و الملك لا شریك لك" (اے اللہ میں حاضر ہوں تیرا فرماں بردار، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، ستائش و نعمت اور بادشاہی تیری ہی ہے تیرا کوئی شریک نہیں) اور یہی کلمات دوہراتا رہے۔ بلندی پر ہو یا نشیب میں یا قافلہ ازدحام میں ہو ہر جگہ یہی ورد کرتا رہے۔ اور جب مکہ کے قریب پہنچے تو غسل کرے۔

---

(۱) قرآن: ۳/۸۔

حج کے دوران نو اسباب پر غسل سنت ہے: احرام باندھتے وقت‘ مکہ میں داخلے کے وقت‘ طواف زیارت کے وقت‘ عرفات میں وقوف کے وقت‘ مزدلفہ میں مقام کے وقت‘ اور تین غسل تینوں جمرہوں پر سنگ باری کے وقت اور طوافِ وداع کے وقت غسل واجب ہے لیکن جمرۃ العقبہ پر رمی کے وقت غسل واجب نہیں۔

پس جب بعد غسل مکہ میں داخل ہو اور نگاہ خانہ کعبہ پر پڑے اور ابھی شہر ہی میں ہو تو یہ دعا پڑھے: ”لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ و اللّٰہ اَکْبَر اللھم انت السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلام و دارك دارالسلام‘ تَبَارَكْتَ یَا ذالجلال والاکرام اَللّٰھُمَّ ھٰذا بَیْتُكَ عَظَّمْتَه‘ وَ کَرَّمته وَشَرَّفته‘ اللھم فزده تعظیما و تشریفا و تکریما‘ وزده مَھَابته وزد مَنْ حَجَّه برا و کرامةً‘ اللھم افتح لی ابواب رحمتك وادخلنی جَنَّتَكَ وَاِعِذْنی من الشیطن الرجیم“ (سوائے اللہ کے اور کوئی اللہ نہیں اور اللہ بزرگ ہے۔ اے اللہ تو سلام ہے اور سلام تجھی سے ہے اور تیرا گھر امن و آرائش کا گھر ہے۔ اے صاحبِ شان و شکوہ تو بزرگوار ہے اور مبارک۔ یا اللہ یہ تیرا گھر ہے جسے تو نے بزرگی اور شرف سے بہرہ ور کیا ہے۔ اے اللہ تو اس کی بزرگی اور شرف کو فزونی عطا کر‘ اس کی ہیبت کو فروغ دے اور اس کے زائروں کو مزید نیکی اور کرامت ارزانی فرما‘ اے اللہ تو اپنی رحمت کے دروازے مجھ پر کھول دے اور مجھے بہشت میں جگہ عنایت کر شیطان الرجیم سے اپنی پناہ میں رکھ)۔

پھر باب بنی شیبہ سے حرم کعبہ میں داخل ہو حجر الاسود کا قصد کرے اور اسے بوسہ دے لیکن اگر بھیڑ کی وجہ سے بوسہ نہ دے سکے تو ہاتھ اس کی جانب اٹھائے اور کہے: ”اَللّٰھُمَّ امانتی اَدَّیْتُھَا و مِیثَاقِی تَعاھدُته‘ اُشْھِدْ لِی بِالْمَوافَاة“ (اے اللہ میں نے اپنی امانت ادا کر دی اور جو عہد میرے ذمہ تھا میں نے پورا کر دیا آپ گواہ رہیں کہ وعدے کا پورا ہوں)۔ اس کے بعد طواف اور پھر سعی میں لگ جائے۔

طواف کے آداب: جان لے کہ طواف نماز کی مانند ہے۔ اور طواف میں لباس و جسم کی پاکیزگی نیز جگہ کی پاکیزگی اور شرم گاہ کو پوشیدہ رکھنا شرط ہے۔ اگرچہ اس میں بات کرنے کی اجازت ہے۔ پہلے چاہیے کہ اضطباع کی سنت بجالائے۔ اور اضطباع یہ ہے کہ تہبند کا پیچ داہنے ہاتھ کے نیچے کر کے اس کے دونوں کنارے بائیں کاندھے پر ڈالے اور بیت اللہ کو پہلو کی جانب کر کے اس طرح حجر اسود سے طواف شروع کرے کہ اس میں اور بیت اللہ میں تین قدم سے کم فاصلہ نہ رہے تاکہ پاؤں فرش اور پردے پر نہ پڑیں کیونکہ یہ خانہ کعبہ کی حد میں داخل ہے اور جب طواف شروع کرے تو یہ کہے: ”اَللّٰھُمَّ اِیْمَاناً‘ بِكَ وَتَصْدِیْقًا‘ بِکِتَابِكِ وَوَفَاءً‘ بِعَھْدِكَ وَاِتِّبَاعًا‘ لِسُنَّةِ نَبِیِّكَ مُحَمَّد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلم“ (اے اللہ میں تجھ پر ایمان لایا اور تیری کتاب پر یقین کیا اور تیرے پیمان پر گردن جھکا دی۔ اور میں نے تیرے پیغمبر محمد ﷺ کی اقتدا کی اور جب درِ خانہ کعبہ

میں پہنچے تو کہے: ''اَللّٰھُمَّ ھٰذَا البَیتُ بَیتُکَ الحَرام وھذالحَرمُ حَرمُکَ وھذالامن اَمنُکَ وھذا المَقامُ العَائِذ بِکَ من النار'' (اے اللہ یہ خانۂ گرامی تیرا گھر ہے اور یہ حرم تیرا حرم ہے اور یہ ایمنی تیری ایمنی ہے اور یہ جگہ اس کی ہے جو آتش دوزخ سے تیری پناہ کا طالب ہو)۔

اور جب رکن عراقی کو پہنچے تو یوں کہے: ''اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوذُبِکَ من الشرک وَالشَّکَ وَالکُفر وَالنِّفَاقِ وَالشِّقَاقِ وَسُوءِ الاَخلاقِ وَسُوءِ المَنظَرِ فِی الاَھلِ وَالمَالِ وَالوَلَدِ'' (اے اللہ میں تیری پناہ کا طالب ہوں شرک سے' شک سے' کفر سے' منافقت سے' جدائی سے' بدخوئی سے اور خاندان و مال و اولاد میں بدنمائی سے)۔ اور جب کعبے کے پرنالے کے سامنے پہنچے تو کہے: ''اَللّٰھُمَّ اَظِلَّنِی تَحتَ عَرشِکَ یَومَ لَاظِلَّ اِلَّا ظل عَرشِکَ' اَللّٰھُمَّ اَسقِنِی بِکَأسِ مُحمدٍ علیه السلام شربت لا اظما بعد هاابدا'' (اے اللہ مجھے اپنے عرش کے نیچے سایہ دے اس دن جب تیرے عرش کے سایہ کے علاوہ کہیں سایہ نہ ہوگا۔ اے اللہ محمد ﷺ کے جام سے مجھے شربت پلا کہ جس کے بعد اور کوئی پیاس نہیں اور جب رکن شامی کو پہنچے تو کہے: ''اَللّٰھُمَّ اجعَلہُ حَجًّا مَبرُورًا وَسَعیًا مَشکُوراً وَذَنباً مَّغفُورًا وتِجارةً لَّن تَبُورا یا عَزِیزُ یا غَفُورُ رَبِّ اغفِر وَارحَم وَتَجاوَز عَمَّا تَعلَمُ اِنَّکَ اَنتَ الاَ عَزُّالاَکرَم''۔ (اے اللہ اس حج کو مقبول بنادے اور کوشش کو مشکور اور گناہ کو معاف اور تجارۃ کو بے زیان بنادے اے توانائے آمرزگار) اور جب رکن یمانی کو پہنچے تو کہے: ''اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوذُبِکَ مِنَ الکُفرِ وَالفَقرِ وَمِن عَذَابِ القَبرِ وَالفِتنَةِ المَحیَا وَالمَمَاتِ وَاَعُوذُبِکَ مِن الخِزیِ فِی الدُّنیَا وَالآخِرَة'' (اے اللہ میں تیری پناہ کا طالب ہوں کفر' افلاس' عذاب قبر اور زندوں مردوں کے فتنہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں دنیا و آخرت کی رسوائی سے) اور اس رکن اور حجر الاسود کے درمیان یہ دعا پڑھے: ''رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنیَا وَفِی الآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا بِرَحمَتِکَ عَذَابَ النَّار وَعَذَابَ القَبر'' (اے اللہ دنیا و آخرت میں ہمیں نیکی ارزانی فرما اور اپنی رحمت سے آگ' عذاب قبر سے بچا) پھر اسی طرح سات بار طواف کرے اور ہر دفعہ یہی دعائیں پڑھے اور ایک طواف کو اشوط کہتے ہیں۔ تین اشواط میں تو جلدی جلدی چلے اور نشاط کے ساتھ اور اگر خانہ کعبہ کے نزدیک بھیڑ ہو تو دور تر ہو جائے تاکہ تیز پا چل سکے اور بعد کے چار اشواط میں آہستہ آہستہ چلے اور ہر دفعہ حجر الاسود کو بوسہ دے اور ہاتھ رکن یمانی کی طرف بلند کرے اور اگر بھیڑ کی وجہ سے بوسہ نہ دے سکے تو ہاتھ سے اشارہ کرے اور جب ساتوں اشواط پورے ہو جائیں تو کعبے کے دروازے اور حجر اسود کے درمیان کھڑا ہو جائے اور شکم سینہ کو اور چہرے کے دائیں حصے کو کعبہ کی دیوار کے ساتھ رکھے اور اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر کے نیچے دیوار کعبہ سے لگائے یا کعبہ کے غلاف پر رکھے اور اس جگہ کو ملتزم کہتے ہیں۔ اور جو

دعا یہاں کی جائے مستجاب ہوتی ہے اور وہ یہ ہے: ''اَللّٰھُمَّ یَارَبَّ البیتِ الْعَتِیقِ اعتق رَقَبَتِی مِنَ النَّار وَ اَعِذْنِی مِنْ کل سوءٍ وَقَنِّعنی بِمَا رَزَقْنِی وَبَارِكْ لِیْ فِیما آتَیْتَنِی'' (اے اللہ اے صاحب خانہ کعبہ کہن میری گردن آ گ سے بچا اور مجھے ہر بدی سے اپنی پناہ میں رکھ۔ اور جو رزق میرے لیے مقدر کر رکھا ہے مجھے اس پر قناعت عطا کر اور جو کچھ تو نے مجھے عطا کیا ہے اس میں برکت دے)۔ پھر مقام ابراہیم کے پیچھے کھڑا ہو کر دو رکعت نماز ادا کرے جنہیں طواف کی دو رکعتیں کہا جاتا ہے۔ اور طواف کی تکمیل انہی پر ہوتی ہے۔ پہلی رکعت میں الحمد شریف اور قل یا ایھا الکفرون پڑھے اور نماز کے بعد دعا مانگے اور جب تک خانہ کعبہ کے گرد سات چکر نہ لگا لے ایک طواف پورا نہیں ہوتا اور ہر ہفت بار کے طواف کے ساتھ یہ دو رکعت نماز پڑھے۔ پھر حجر الاسود کے قریب جائے' بوسہ دے اور طواف ختم کرے پھر سعی میں مشغول ہو جائے۔

سعی کے آداب: چاہیے کہ در صفا سے آغاز کرے اور چند قدم صفا پر چلے یہاں تک کہ کعبے کو دیکھ سکے تو روبہ کعبہ ہو کر کہے: ''لَا اِلٰـهَ الا الله وَحْدَه' لَاشَرِیْکَ لَه' لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ' یُحْیِ وَیُمِیْتُ' وَهُوَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ' بِیَدِهِ الْخَیْرِ وهو علٰی کل شیٌ قدر' لا اله الا الله وحده وَصَدقَ وَعْدَه' وَ نَصَرَ عَبْدُه' وَاَعَزَّ جُنْدَه' وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَه' لا اله الا اللهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَلَو کَرِهِ الْکٰفِرُوْن'' (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یگانہ اور لاشریک ہے' بادشاہی اور ستائش کا سزاوار وہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا ہے' اس کا وعدہ سچا ہے جو اس کے بندے کا معاون ہے اور لشکر اس کا جو سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ وہ اکیلا جرار لشکروں کو شکست دیتا ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں اور مومنوں نے اللہ کے دین کو بہ اخلاص قبول کیا ہے۔ اگرچہ کافروں کو اچھا نہ لگے)۔ اور دعا مانگے اور جو حاجت رکھتا ہے بیان کرے۔ پھر آگے چلے اور سعی کی ابتداء مروہ تک کرے۔ ابتداء میں آہستہ چلے اور کہے: ''رب اغفروارحم وتجاوز عما تعلم انك انت الاعز الاکرم' اللھم ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الأخرة حسنة وقنا عذاب النار'' اور سبز ستون تک آہستہ چلے' یہ سبز ستون مسجد حرام کے ایک گوشے میں ہے پھر بقدر چھ گز فاصلے کے جلد جلد چلے یہاں تک کہ دو سبز ستونوں تک پہنچ جائے۔ پھر آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دے یہاں تک کہ مروہ تک پہنچ جائے۔ پھر وہاں سے لوٹے اور صفا کی طرف منہ کرے اور پھر یہی دعا پڑھے۔ یہ گویا ایک سعی ہوگئی اور جب صفا تک لوٹ آئے تو یہ دوسری سعی ہوگئی۔ اسی طرح سات بار کرے۔ اور اسی طرح سے سرانجام دے۔ جب اس سے فارغ ہو جائے تو طواف قدوم [1] سعی بجالائے اور حج میں یہ عمل سنت ہے اور وہ طواف جو حج کا رکن ہے وہ وقوف کے بعد ہوتا ہے۔ سعی میں وضو سنت ہے اور طواف میں واجب۔ اور سعی اسی پر کافی

ہے کیونکہ سعی کی شرط یہ نہیں ہے کہ وقوف کے بعد ہو لیکن چاہئے کہ طواف کے بعد ہو اگر چہ وہ طواف سنت ہو۔

عرفات میں وقوف کے آداب: معلوم رہے کہ اگر کوئی قافلہ عرفہ کے دن عرفات میں پہنچے تو انہیں طواف قدوم میں نہیں لگنا چاہیے اور اگر یوم عرفہ سے پہلے پہنچیں تو طوافِ قدوم بجالائیں اور ہشتم ذوالحجہ مکہ سے نکلیں اور رات منا میں رہیں اور اگلے دن عرفات کی طرف روانہ ہو جائیں اور وقوف کا وقت عرفہ کے دن بعداز زوال شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ روز عید کی صبح ہو جائے۔ اگر صبح روز عید کے بعد پہنچیں تو حج فوت ہو گیا۔ اور عرفہ کے دن غسل کرنا چاہئے اور عرفات میں ظہر اور عصر کی نمازیں بیک وقت گذاریں۔ حتیٰ کہ دعا میں مشغول ہو جائیں۔ عرفہ کے دن حاجی روزہ نہ رکھیں تاکہ قوی رہیں اور دعا میں طوالت دے سکیں کیونکہ بھید حج کا دلوں کا اجتماع اور اُس وقت شریف میں نیرومند ہمتوں کا جمع ہونا ہے اور اس وقت میں فاضل ترین ذکر کلمہ لَا اِلٰــــہَ اِلَّا اللہ کا وِرد ہے۔ مختصر یہ کہ وقتِ زوال سے لے کر رات تک تضرّع اور زاری اور استغفار میں انسان مشغول رہے۔ اور قطعی توبہ کرے اور ماضی کے گناہوں کی معافی مانگے وقوف عرفات کے اس وقت کی دعائیں بہت ہیں جن کی نقل طول طلب ہے۔ ہم نے اپنی کتاب احیاء میں ان کا ذکر بہ تفصیل کر دیا ہے وہاں سے یاد کر لیں۔ یا جو دعا بھی یاد ہو وہ کرے کیونکہ تمام دعاہائے ماثورہ اس وقت درست ہیں اگر یاد نہ ہوں تو تحریر سے پڑھتا رہے یا کوئی دوسرا آواز پڑھے تو یہ آمین کہتا جائے اور قبل اس کے کہ سورج غروب ہو میدان عرفات سے نکل جائے۔

دیگر اعمال حج کے آداب: عرفات سے نکل کر مزدلفہ میں چلا جائے اور غسل کرے کہ مزدلفہ حرم میں داخل ہے اور نماز مغرب میں تاخیر کرے حتیٰ کہ نماز عشاء کے ساتھ دونوں اکٹھی ادا کرے۔ ایک ہی اذان کے ساتھ دو اقامتیں ہوں گی۔ اگر ممکن ہو تو شب مزدلفہ میں رات بھر عبادت کرے کیونکہ یہ رات صاحب فضیلت اور عزیز ہے اور اس شب میں قیام جملہ عبادات میں سے ہے اور جو کوئی قیام نہ کرے وہ بکری کا دم دے۔

یہاں سے ستر کنکریاں لے تاکہ منا میں ڈال سکے کیونکہ اِس جگہ اس طرح کی کنکریاں کثرت سے دستیاب ہیں اور رات کے دوسرے نصف میں منا کا قصد کرے اور نماز سحر وہاں ادا کرے اور جب مزدلفہ کے آخر میں پہنچے تو وہ جگہ جسے مشعر الحرام کہتے ہیں وہاں دن نکلتے تک بیٹھے اور دعائیں مانگتا رہے۔ پھر اس جگہ کے بعد اس جگہ پہنچے کہ جسے وادئ محسّر کہتے ہیں۔ یہاں سواری کو تیزی سے چلائے۔ پیادہ ہونے کی صورت میں بہ شتاب چلے۔ یہاں تک کہ اس کی حدود سے نکل جائے کیونکہ سنت یہی ہے۔

---

(۱) طواف قدوم یعنی طواف ورود

پس عید کی صبح کو کبھی تکبیر کہے تو کبھی تلبیہ اس وقت تک کہ اس اونچائی کو پہنچے جسے جمرات کہتے ہیں اور اس سے گذر کر جب راستے کی دائیں جانب سے بالائی کو پہنچے تو رُو بقبلہ رہے کہ اس کو جمرۃ العقبہ کہتے ہیں یہاں تک کہ آفتاب ایک نیزہ بلند ہو جائے۔ تو اس جمرہ میں سات کنکریاں مارے اور چہرہ قبلہ کی طرف رکھے اور یہاں تلبیہ کی جگہ تکبیر کہے اور جب بھی کنکری مارے تو یہ کہے: ''اَللّٰهُمَّ تصدِيقًا بِكِتَابِكَ واتباعاً لِسُنَّتِ نَبِيِّكَ مُحَمَّد'' (اے اللہ تیری کتاب پر ایمان اور تیرے پیغمبر محمد ﷺ کی سنت کی پیروی میں ہم یوں کرتے ہیں)۔ جب فارغ ہو جائے تو تلبیہ و تکبیر سے رک جائے۔ مگر ایام تشریق کے آخری روز کی صبح تک فرض نمازوں کے بعد کہا کرے اور وہ دن عید کے روز سے چوتھا دن ہے۔ پھر فرود گاہ جا کر دعا میں مشغول ہو جائے۔ پھر قربانی کرے اور ایسا کرتے وقت قربان گاہ کی شرائط کو ملحوظ رکھے۔ اور سر منڈائے۔ اور جب رمی اور سر منڈانے کا عمل کر چکا تو اس روز ایسا کرنے سے گویا ایک تحلل حاصل ہوا اور سوائے مباشرت اور شکار کے احرام کے باقی جملہ ممنوعات مباح ہو گئے۔ پھر مکہ جائے اور طواف رکن بجالائے۔ جب شب عید آدھی گذر جائے تو اس طواف کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ مگر عید کے دن یہ طواف کرنا اولیٰ ہے۔ اور اس طواف کے وقت کی انتہا مقرر نہیں۔ اس لیے جتنی تاخیر بھی کرے یہ طواف فوت نہ ہوگا۔ لیکن دوسرا تحلل حاصل نہ ہوگا۔ اور جماع حرام رہے گا۔ لیکن جب یہ طواف بھی اسی طرح جس طرح ہم نے طواف قدوم میں بیان کیا تمام ہوگا تو اس پر حج کا اتمام ہو جائے گا۔ اب مباشرت اور شکار کرنا بھی حلال ہو جائے گا۔

اگر سعی پہلے ہی کر چکا ہے تو اعادہ نہ کرے ورنہ سعی رکن اس طواف کے بعد کرے۔ جب رمی کر چکا' بال منڈا چکا' طواف کر چکا تو حج تمام ہو گیا اور احرام سے باہر ہو گیا۔ لیکن ایام تشریق میں رمی اور منا میں شب بسری احرام سے نکلنے کے بعد ہوتی ہے اور جب طواف و سعی سے فارغ ہو جائے تو عید کے دن منا میں آئے اور رات وہاں قیام کرے کیونکہ یہ قیام واجب ہے اور اگلے دن زوال کے بعد رمی کے لیے غسل کرے اور پہلے جمرے پر سات کنکریاں پھینکے یہ جمرہ عرفات کی طرف ہے۔ پھر رو بقبلہ کھڑا ہو کر دعا مانگے۔ سورۂ بقرہ کے بقدر اور پھر درمیانے جمرہ پر سات کنکریاں مارے اور دعا مانگے' پھر جمرۃ العقبہ پر سات کنکریاں پھینکے اور اس رات منا میں قیام کرے۔ اور عید کے تیسرے دن بھی یہ عمل اس ترتیب سے دہرائے اور ان تینوں جمرہوں پر کلاً اکیس کنکریاں اسی اندازے سے مارے۔ اگر اسی پر اکتفا چاہے تو مکہ چلا جائے اور اگر یہاں غروب آفتاب تک ٹھہرا رہے تو یہ رات بھی اسے واجب ہے کہ یہیں بسر کرے۔ اس طرح اگلے دن بھی تینوں جمروں پر کلاً اکیس کنکریاں مارنا واجب ہو جائے گا۔ حج کی تمام تفصیل یہی ہے جو یہاں بیان ہو چکی۔

کیفیتِ عمرہ

جب عمرہ کرنا چاہے تو غسل کرے اور جامۂ احرام پہنے جیسے حج کے لیے پہنا تھا اور مکہ سے نکل کر میقات عمرہ تک پہنچے اور میقات عمرے کے لیے جعرانہ، تنعیم اور حدیبیہ ہیں اور نیت عمرے کی کرے اور کہے ''لبیك بعمرۃ'' اور مسجد عائشہ رضی اللہ عنہا میں دو رکعت نماز ادا کرے۔ پھر مکے میں آئے اور راستے میں تلبیہ کہتا ہوا آئے۔ جب حرم میں داخل مسجد ہو تو تلبیہ بند کردے۔ طواف کرے اور سعی اس طرح جیسے حج میں بیان ہوا۔ پھر بال منڈائے عمرے میں تو اسی پر عمرہ ادا ہو گیا اور عمرہ پورے سال میں جب چاہے ادا کرسکتا ہے۔ اور جو کوئی وہاں ہو جتنے عمرے کرسکتا ہو کرے۔ اگر عمرے نہیں کرسکتا تو طواف کعبہ کرے اور اگر طواف بھی نہیں کرسکتا تو کعبے کو دیکھتا رہے۔ جب خانہ کعبہ میں داخل ہو تو دو عمودوں کے درمیان نماز ادا کرے پابرہنہ توقیر اور حرمت کے ساتھ داخل ہونا چاہیے۔ پھر جی بھر کر آب زم زم پیئے۔ یہاں تک کہ معدہ اس سے پُر ہو جائے۔ جس نیت سے نوش کرے شفا ہوگی۔ اور کہے: ''اَللّٰھُمَّ اجْعَلْه شِفَاءً مِّنْ كُلِّ سَقْمٍ وَّارْزُقْنَا الْاِخْلَاصِ وَالْيَقِيْنَ وَالْمُعَافَاةَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ برحمتك يا ارحم الراحمين'' (اے اللہ اسے ہر بیماری کے لیے شفایاب بنادے اور ہمیں اخلاص و یقین اور دنیا اور آخرت کی سلامتی عطا فرما اے مہربان ترین مہربانان اپنی رحمت سے)

طوافِ وداع

حاجی ارادۂ وطن واپسی کا کرے تو پہلے اپنا سامان باندھ لے اور سب کاموں کے بعد خانۂ خدا کو وداع کہے یعنی سات بار طواف وداع کرے اور دو رکعت نماز پڑھے جیسا کہ طواف کے باب میں پہلے بیان ہو چکا۔ اس طواف میں اصطباع اور جلدی چلنا لازم نہیں۔ پھر دو رکعت نماز ادا کرے پھر ملتزم پر جائے اور دعا مانگے۔ اور واپس آجائے اور کعبے کو دیکھتا ہوا مسجد سے باہر نکلے۔

زیارتِ مدینہ

اب مدینے کی زیارت کا قصد کرے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''جس نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی وہ ایسے ہی ہے جیسے کہ میری زندگی میں مجھے دیکھا ہو''۔ آپ (ﷺ) نے فرمایا جو کوئی مدینے کا قصد کرے گا اور قصد اس کا سوائے زیارت کے اور کچھ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا حق ہے کہ مجھے اپنا شفیع قرار دے''۔

حاجی جب مدینے کے سفر میں ہو تو درود بہت پڑھے اور جب نگاہ مدینے کی دیوار پر پڑے تو کہے:

''اَللّٰھُمَّ ھٰذَا حَرَمُ رَسُوْلِكَ ﷺ فَاجْعَلْهُ لِیْ وِقَایَةً مِّنَ النَّارِ وَاَمَانًا مِّنَ الْعَذَابِ وَسُوْءِ الْحِسَابِ ''(۱) تو پہلے غسل کرے اور پھر مدینہ میں داخل ہو۔ اور خوشبو لگائے اور پاک سفید لباس پہنے اور جب شہر میں داخل ہو تو تواضع اور توقیر کے ساتھ داخل ہو اور یہ دعا مانگے: ''رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا '' (قرآن: ۸۰/۱۷) (اے اللہ مجھے صادقانہ اندر لے جا اور صادقانہ باہر لانا اور میرے لیے اپنی قدرت سے ایک معاون مقرر فرما)۔ پھر مسجد نبویؐ میں داخل ہو جائے اور منبر کے بالمقابل دو رکعت نماز پڑھے۔ اس انداز سے کہ منبر کا عمود دائیں کندھے کے برابر ہو کیونکہ آنحضرت کا موقف اسی طرح تھا۔ پھر قصد زیارت کرے اور چہرہ مشہد کی دیوار کی طرف کرے اور پشت قبلے کی طرف ہو۔ دیوار پر ہاتھ لگانا اس کو بوسہ دینا سنت نہیں بلکہ مواجہ شریف سے دور مودب کھڑا ہونا حرمت کے لیے اولیٰ تر ہے۔ پھر کہے: ''السّلام عَلَیْکَ یا رسول اللّٰه' اَلسّلام علیك یا نبی اللّٰه 'اَلسّلام علیك یا حبیب اللّٰه' السلام علیك یا صفوة اللّٰه ' السلام علیك یا اکرم ولدآدم' السلام علیك یا سَیِّدِالمُرسلین' السلام علیك یا خاتم البنین ورسول رب العالمین' السلام علیك وعلی اصحابك الطاهرین وازواجك الطاهرات' امهات المومنین جزاك اللّٰه افضل ماجزیٰ نبیاً عَنْ اُمَّتِه وَصَلّٰی عَلَیْكَ کُلَّمَا ذَکَرَكَ الذّاکِرُوْن وَغَفَلَ عَنْكَ الغَافِلُوْن'' (اے پیغمبر خدا' اے فرستادۂ خدا تجھ پر درود ہو اور اے اللہ کے دوست تجھ پر درود ہو اور اللہ کے برگزیدہ تجھ پر درود ہو اور اے اولادِ آدم میں گرامی تر تجھ پر درود اے سرور پیغمبران تجھ پر درود ہو۔ اور اے خاتم پیغمبران تجھ پر درود ہو۔ اور اے پروردگار عالم کے فرستادہ تجھ پر درود ہو اور درود جو تجھ پر اور تیرے پاک یاروں پر اور آپ کی ازواج مطہرات پر جو امت کی مائیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ تجھے ہماری طرف سے وہ جزا عطا فرمائے جو دیگر جملہ پیغمبروں کی امت کی طرف سے مانگی گئی جزا سے بڑھ کر ہو اور تجھ پر درود ہر اس وقت جب تیرے یاد کرنے والے تجھے یاد کریں اور بے خبر تجھ سے غافل ہوں)۔ اور اگر کسی سے وعدہ کیا ہو کہ اس کی طرف سے درود بھیجے گا تو کہے: ''السَّلام عَلَیْكَ من فُلَان' السَّلام عَلَیْكَ مِنْ فلان'' پھر دو گز کے قریب آگے بڑھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کو سلام کرے اور کہے: ''اَلسَّلامُ عَلَیکُمَا یا وزیری رَسُولِ اللّٰه وَالْمُعَاوِنَینِ لہ عَلَی الْقِیَامِ بِالدِّیْن مَادَامَ حَیاً وَالْقَائِمَیْن فِی اُمَّته بَعْدَه' بِاُمُوْرِ الدِّین تَتَّبُعَانِ فِی ذٰلِكَ آثَارَه وَتَعْمَلَان بِسُنَّةٍ فَجَزَا کُمَا خَیرُ مَاجَزیٰ وَزَرَاءَ نَبِیٍ عَلٰی دِیْنِہ'' (اے پیغمبر خدا کے دو وزیرو تم پر درود ہو اور پرداخت دین میں پیغمبر کے زمان حیات میں معاونت کرنے والو تم پر درود ہو۔ اور آپ (ﷺ)

---

(۱) اے اللہ یہ تیرے پیغمبر کا حرم شریف ہے اس کو میرے آگ سے بچانے والا ٹھہرا دے اور عذاب و حساب سے ایمنی عطا کر۔

کے بعد اے کار دین کو ساز و سامان دینے والو! مسلمانوں کے درمیان، اور پیغمبر کے آثار دین کے پیرو و اور آپ کی رضی اللہ عنہ سنت پر عمل کرنے والو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی جزائے خیر سے نوازے جو تمام پیغمبروں کے وزیروں کی جزا سے بڑھ کر ہو) پھر وہاں کھڑا رہ کر جتنی دعائیں دینا چاہے دے۔ پھر یہاں سے نکل کر جنت البقیع کا رخ کرے۔ اور صحابہ اور بزرگان دین کی قبروں کی زیارت کرے۔ جب لوٹنے لگے تو ایک بار پھر رسولؐ کی زیارت کرے اور وداع کہے۔

اسرار و دقائقِ حج

معلوم رہے کہ ہم نے جو کچھ اب تک بیان کیا یہ اعمال حج کی صورت کے باب میں تھا۔ جب کہ ان جملہ اعمال میں سے ہر عمل میں ایک بھید ہے جس کا مقصود عبرت ہے اور امور آخرت کی یاد آوری ہے۔

اور اس حقیقت کی اصل یہ ہے کہ آدمی کو اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ جب تک اپنے اختیار کو ترک نہ کرے گا اپنی سعادت کو نہ پہنچے گا۔ جیسا کہ ہم عنوانِ مسلمانی کی ذیل میں لکھ چکے ہیں اور ہوا و ہوس اُسکی ہلاکت کا باعث ہے۔ جو کچھ انسان اپنے اختیار سے کرتا ہے اور وہ حکم شریعت کے مطابق نہیں ہوتا تو وہ ہوائے نفس کی پیروی میں ہوتا ہے اور اس کا عمل بندوں کا سا نہیں ہوتا۔ جب کہ سعادت اس کی بندگی میں ہے یہی سبب تھا کہ دوسرے ادیان میں ہر امتی کو حکم تھا کہ رہبانیت اور سفر و سیاحت پر عمل کریں۔ جس پر ان کے عبادت گذار بندے مخلوق سے گریزاں ہو کر کسی پہاڑ پر چلے جاتے اور ساری عمر مجاہدے اور ریاضت میں گذار دیتے تھے۔ آنحضرتؐ سے سوال ہوا کہ اس دین میں سیاحت اور رہبانیت نہیں ہے کیا؟ تو آپ (ﷺ) نے جواب دیا ہمیں اس کی بجائے جہاد اور حج دیے گئے ہیں۔ بس حق سبحانہ وتعالیٰ نے اس امت کو حج کا حکم دیا جس میں مجاہدے کا مقصود بھی حاصل ہو جاتا ہے اور دوسری عبرتیں بھی جو اس میں ظاہر ہیں کہ حق تعالیٰ نے کعبے کو عظمت عطا فرمائی اور اسے اپنی ذات سے منسوب کیا اور بادشاہوں کی بارگاہ کے مشابہ قرار دیا اور کعبے کے اطراف واکناف کو اس کا حرم قرار دیا اور اس میں کے درخت اور جانوروں کے شکار کو حرام قرار دیا۔ اس کی تعظیم وحرمت کے لئے اور عرفات کو درگاہِ ملوک میں حرم کے آگے میدان کی مثال ٹھہرایا تاکہ لوگ دنیا کی ہر سمت سے خانہ کعبہ کا قصد کریں باوجود اس کے کہ سب جانتے ہیں کہ اللہ کسی گھر یا مکان میں نزول سے پاک ہے۔ لیکن جب شوق عظیم ہو تو جو چیز بھی محبوب سے منسوب ہو وہ محبوب ومطلوب قرار پاتی ہے۔

پس اہل اسلام نے اسی شوق میں اپنے اہل وعیال اور اولاد کو فرو گذار کر دیا اور صحرا کا خطرہ برداشت کر لیا اور غلام کی طرح آقائے کل کی بارگاہ کا عزم کر لیا اور حج کی عبادت میں ایسے کاموں کا حکم دیا کہ کسی عقل

انسانی کو اس میں راہ نہیں۔ مثلاً کنکریاں مارنا' صفا و مروہ کے درمیان بھاگنا؛ اس لیے جس بات میں عقل راہ یاب ہو نفس انسانی کو بھی اس سے انس ہوتا ہے کہ جانے کہ کیا کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے۔ جب معلوم ہو جاتا ہے کہ زکوٰۃ سے محتاجوں کے ساتھ حسنِ سلوک مراد ہوتا ہے اور نماز سے غرض اللہ تعالیٰ کہ جان کا مالک ہے اس کے سامنے عاجزی کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح معلوم ہے کہ روزے سے غرض شیطان کے لشکر کو خاک میں ملانا اور شکست دینا ہے۔ اس لیے طبعِ انسان اس کی موافقت پر بآسانی عمل کرتی ہے۔ لیکن کمالِ بندگی اس میں ہے کہ بے چون و چرا آقا کے فرمان پر عمل کیا جائے۔ اگرچہ غلام کے باطن سے اس کے لیے کوئی تقاضا پیدا نہ ہوتا ہو اور رمی و سعی ایسے ہی اعمال سے ہیں جو محض بندگی کے سوا عمل میں نہیں لائے جا سکتے۔ اسی بناء پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ: ''لَبَّیكَ بِحَجَّةٍ حَقاً وَتَعَبُّداً وِرَقاً''(۱) تنہا حج میں تعبد اور رق کی قید لگائی اور دیگر عبادات میں نہیں اور اسے تعبّد و رِق کا نام دیا''۔

اور یہ جو ایک گروہ جو متحیر ہیں کہ ان اعمال سے مقصود و مراد کیا ہے تو ان کا یہ تحیّر کاموں کی حقیقت سے ناآگاہی کے باعث ہوتا ہے کیونکہ مقصود اس سے بے مقصودی ہے اور غرض اس کی بے غرضی۔ کیونکہ بندگی اسی سے ظہور میں آتی ہے کہ غلام کو سوائے فرماں برداری کے' حکم کی کنہ سے کوئی غرض نہ ہو۔ اور عقل اور طبیعت کو اس کے فہم میں کوئی راہ نہیں ہوتی۔ تاکہ جو کچھ خود اس سے متعلق ہو اس کو ترک کر دے اور دور پھینک دے۔ کیونکہ انسان کی سعادت اپنی نیستی میں ہے۔ تاکہ اس میں سوائے حق کے اور فرمان حق کی بے چون و چرا بجا آوری کے اور کچھ باقی نہ رہے۔

حج کی عبرتیں

سفرِ حج کو سفرِ آخرت ہی کی طرح ترتیب دیا گیا ہے۔ اس سفر کی منزل مقصود اللہ کا گھر ہے تو اُس سفر سے مقصود گھر والا ہوتا ہے اور اس سفر کے احوال سے چاہیے کہ مسافر اُس سفرِ آخرت کے احوال کو یاد میں لائے کہ جب وہ سفرِ حج کے لیے اپنے گھر والوں اور دوستوں کو وداع کرتا ہے تو جان لیتا ہے کہ یہ وداع اسی وداع کا سا ہے جو وہ سکراتِ موت کے وقت کرے گا اور لازم ہے کہ پہلے دل تمام علائق سے فارغ کرے پھر نکلے۔ ایسے ہی جیسے کہ آخر عمر میں انسان دل تمام دنیا سے فارغ کر لیتا ہے۔ ورنہ سفر اس کے لیے ناگوار ہوگا۔ اور جب ہر طرح کا زادِ راہ تیار کرتا ہے اور ہر قسم کی احتیاط بروئے کار لاتا ہے تاکہ صحرا میں کسی محتاجی کا سامنا نہ کرنا پڑے تو

(۱) ''بفرمانم بہ حجی کہ حق است وتعبد ورق''

اسے معلوم ہونا چاہئے کہ صحرائے قیامت اس سے کہیں زیادہ دراز اور ہولناک ہوگا اور وہاں زاد کی حاجت بڑھ کر ہوگی اور جو چیز جلد خراب ہو جانے والی ہو اسے حاجی اپنے ساتھ نہیں لیتا۔ کیونکہ جانتا ہے کہ ساتھ نہ دے گی اس لیے سفر صحرا کے لائق نہیں۔ اسی طرح ہر وہ عبادت جو ریا اور تقصیر سے آلودہ ہو زادِ آخرت کے لائق نہیں ہوتی اور جب شُتر پر سوار ہو تو چاہیے کہ جنازہ کو دھیان میں لائے اور یقین کرے کہ سفرِ آخرت میں یہی اس کی سواری ہوگی۔ اور ہو سکتا ہے قبل اس کے کہ اونٹ سے نیچے اترے جنازے کا وقت آ چکا ہو۔ اس لیے حج کا سفر اس انداز کا ہونا چاہیے جو سفرِ آخرت کے زاد میں درکار ہوگا۔

اور جب جامۂ احرام تیار کر لیتا ہے کہ جب میقات پر پہنچے گا تو عادی لباس اتار کر احرام پہن لے گا۔ جو دو سفید چادروں پر مبنی ہوتا ہے۔ چاہئے کہ کفن کو یاد میں لائے کیونکہ سفرِ آخرت کا پہناوا اس دنیا کے عادی لباس سے مختلف ہوتا ہے۔

اور جب صحرائے عبقات اور خطرات کو دیکھے تو چاہئے کہ انسان منکر نکیر اور قبر کے سانپ بچھوؤں کو یاد کرے کیونکہ قبر سے حشر تک ایک وسیع صحرا کا سامنا ہوگا جس میں بہت سے دشوار گذار راہوں سے دوچار ہوگا اور جس طرح صحرا کی آفتوں سے بغیر کسی رہنما کے سلامتی کے ساتھ بچ نکلنا ممکن نہیں ہوتا تو اسی طرح قبر کی ہولناکیوں سے بغیر بدرقۂ طاعت کے نجات نہ ہوگی۔ اور جس طرح سفر حج میں انسان اپنے اہل وعیال اور دوستوں کے ساتھ نہیں ہوتا اسی طرح قبر میں بھی تنہا ہوگا۔

اور جب لبیک کہنا شروع کرے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ حق تعالیٰ کے بلاوے کا جواب ہے۔ قیامت میں بھی اسی طرح اسے ندا پہنچے گی تو اُس ہول کو یاد میں لائے بلکہ چاہئے کہ اُس ندا کی اہمیت کے پیش نظر اس میں مستغرق رہے۔ علی بن الحسین رضی اللہ عنہ جب احرام باندھتے تو چہرہ زرد ہو جاتا اور جسم کانپنے لگتا یہاں تک کہ لبیک بھی کہہ نہ پاتے۔ کسی نے کہا آپ لبیک کیوں نہیں کہتے تو آپ نے فرمایا کہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے لبیک کہنے پر وہاں سے یہ جواب نہ مل جائے کہ: ''لَا لَبَّيْكَ و لاسَعدَيك '' (تو لبیکی ہے نہ سعدیکی) یہ کہا تو اونٹ سے گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔ اور احمد بن الحواری جو ابوسلیمان دارانی کے مرید تھے' بیان کرتے ہیں کہ ''میں ابوسلیمان دارانی کی خدمت میں تھا کہ انہوں نے لبیک نہیں کہا حتیٰ کہ ایک میل تک سفر کیا تو بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو کہا اے احمد! ''حق تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا'' اپنی امت کے ظالموں سے کہو کہ وہ میرا نام نہ لیں اور مجھے ہرگز یاد نہ کریں۔ کیونکہ جو کوئی مجھے یاد کرتا ہے میں اسے یاد کرتا ہوں۔ تو مجھے یاد کرنے والے اگر ظالم ہوں گے تو میں ان کو لعنت سے یاد کروں گا''۔ نیز فرمایا کہ جو کوئی نفقۂ حج مشتبہ مال سے تیار کرتا

ہے تو جب وہ کہتا ہے کہ "لبیک" تو اس کو جواب یہ ملتا ہے کہ: "لَا لَبَّيْكَ وَلَا سَعْدَيْكَ حَتّٰى تَرُدَّ مَا فِي يَدَيْكَ" (تیرا لبیك اور سعدیك درست نہیں ہوگا جب تک تو شبہ والے مال کو اس کے اصل مالک کو لوٹا نہ دے)۔

اور طواف و سعی مشابہ اس کے ہیں کہ بے بس لوگ بادشاہوں کی درگاہ میں جاتے ہیں اور بادشاہ کے محل کے گرد پھرتے ہیں کہ جب موقع ملے تو اپنی حاجت پیش کریں۔ تو وہ محل میں جاتے آتے ہیں تا کہ کسی ایسے شخص کو پائیں جو ان کی شفاعت کرے۔ اور امید رکھتے ہیں کہ شاید بادشاہ کی نگاہ اچانک ان پر پڑ جائے وہ ان پر شفقت کی نگاہ ڈالے تو صفا مروہ کے درمیان سعی اس کی مثل ہے۔

اور میدان عرفات میں وقوف اور اطرافِ عالم سے آئی ہوئی رنگارنگ مخلوق اور ان کا مختلف زبانوں میں دعا کرنا عرصات قیامت کے مشابہ ہے۔ جہاں جملہ مخلوق جمع ہوگی جہاں نفسانفسی کا عالم ہوگا اور لوگ بارگاہِ خداوندی میں ردوقبول کے باب میں متحیر ہوں گے۔

اور کنکریاں پھینکنے کا مقصود اظہار بندگی ہے۔ بر سبیل تعبّد محض۔ نیز حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے مشابہت کی غرض سے کہ اس جگہ شیطان اُن کے پاس آیا تھا کہ حضرت کو شبہ میں ڈال دے اور حضرت نے اُسے پتھر مارا تھا۔ پس اگر تیرے دل میں یہ آئے کہ حضرت ابراہیم کو تو شیطان دکھائی دیا تھا اور مجھے تو نظر نہیں آیا میں بے کار سنگ زنی کیوں کروں؟ تو جان لے کہ یہ خیال بھی تم میں شیطان ہی نے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا پتھر مارتا کہ شیطان کی کمر توڑ دے کیونکہ شیطان کی پشت شکنی اسی طرح ممکن ہے کہ تو فرماں بردار بندہ ہو اور تجھے حکم ملے کہ یوں کر تو اسے بجالانے میں بے چون و چرا عمل کرے اور واقعی سمجھے کہ پتھر پھینکنے سے تُو شیطان کی کمر توڑ رہا ہے اور اسے مغلوب و مقہور کر رہا ہے۔

حج کی عبرتوں کی ذیل میں اس قدر بیان اس لیے ہوا کہ اگر کوئی شخص اس راہ کو پہچانے گا تو جس قدر اس کا ذہن مستعد ہوگا اور شوق کامل ہوگا اور سعی و کوشش بلیغ ہوگی اُسی قدر معنی شناس ہوگا۔ اور ہر امر میں بہرہ اور نصیبہ پائے گا کہ روحِ عبادت یہی ہے۔ یہ باتیں معلوم ہونے سے صورت سے معنی کی طرف قدم بڑھائے گا۔ ان شاء اللہ۔

•••

اصل ہشتم: تلاوت قرآن

یاد رہے کہ تلاوتِ قرآن عبادات میں سب سے افضل عبادت ہے۔ خصوصاً جب تلاوت نماز میں ہو اور قیام کی حالت میں ہو۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "میرے نزدیک افضل ترین عبادت قرآن پڑھنا ہے۔ نیز

فرمایا کہ ''جس کسی کو قرآن خوانی کی نعمت عطا کی گئی ہو اور وہ گمان کرے کہ مجھے جو کچھ عطا ہوا ہے کسی اور کو اس سے بھی بڑھ کر کوئی اور چیز دی گئی ہے تو اس نے حماقت سے اس چیز کو ادنیٰ سمجھا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ قرار دیا اور آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''بمثل اگر قرآن کو ایک کھال میں لپیٹ دیں اور آگ میں ڈال دیں تو آگ اسے نہ چھوئے گی''۔ نیز فرمایا کہ روز قیامت اللہ تعالیٰ کے نزدیک قرآن سے بڑھ کر اور شفیع نہیں ہوگا نہ پیغمبر نہ فرشتہ اور نہ ان کے سوا کوئی اور'' اور فرمایا کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''جس کسی کو قرآن دعا مانگنے سے باز رکھے تو شکر گذاروں کے لیے جو فاضل ترین ثواب ہے میں اس کو عطا کروں گا''۔ اور آنحضرت کا فرمان ہے کہ ''دلوں کو زنگ لگ جاتا ہے جیسے لوہے کو لگتا ہے'' تو صحابہ نے استفسار کیا ''یارسول اللہ یہ زنگ کیسے دور ہوسکتا ہے''؟ تو آپ نے فرمایا: ''تلاوت قرآن سے اور موت کو یاد کرنے سے''۔ نیز فرمایا کہ ''میں اپنے پیچھے تمھارے لیے دو واعظ چھوڑ جاؤں گا جو تمہیں نصیحت کیا کریں گے۔ ایک گویا ہے تو دوسرا خاموش؛ واعظِ گویا تو قرآن ہے اور واعظِ خاموش موت ہے''۔

اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''قرآن پڑھو جس کے ہر حرف کے عوض دس نیکیاں ہیں اور میں نہیں کہتا کہ ''الم'' ایک حرف ہے لیکن الف حرف' لام حرف اور میم حرف ہے''۔ احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا تو میں نے کہا ''اے اللہ آپ کا تقرب کس چیز سے فاضل تر ہو؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میرے کلام قرآن سے''۔ تو میں نے عرض کیا کہ اس کے معنی سمجھتے ہوں یا سمجھے بغیر؟'' تو اللہ نے فرمایا ''معنی سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں دونوں حال میں''۔

غافلوں کی تلاوت: جان لے کہ جس نے قرآن سیکھا اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ چاہیے کہ وہ قرآن کی حرمت رکھے۔ اپنے آپ کو ناشائستہ کاموں سے بچائے اور مؤدب رہے ورنہ خطرہ اس بات کا ہے کہ قرآن اس کا دشمن ہو جائے گا''۔ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ: میری امت کے بیشتر منافق قرآن خوان ہوں گے''۔ ابوسلیمان دارانی کہتے ہیں کہ ''عذاب گر فرشتے بت پرستوں کی نسبت مفسِد قرآن خوانوں سے جلد الجھتے ہیں''۔ تورات میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''اے میرے بندے! تجھے شرم نہیں آتی کہ اگر کسی بھائی کا خط تجھے پہنچے اور تُو سفر میں ہو تو رک جائے اور یکسو ہو جائے یا بیٹھ جائے اور اس خط کا ایک ایک حرف پڑھے اور اس پر غور کرے اور یہ کتاب وہ خط ہے جو میں نے تمہیں بھیجا ہے تاکہ تو اس پر غور کرے اور اس کے مطابق عمل کرے اور تو اس سے پہلو تہی کرتا ہے۔ اور اس کے مطابق عمل پیرا نہیں ہوتا۔ اور اگر پڑھتا ہے تو اس پر غور نہیں کرتا کہ کیا ہے؟ اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ: ''جو لوگ تم سے پہلے گذرے ہیں وہ قرآن کو اللہ تعالیٰ کی

طرف سے نامہ سمجھتے تھے جو انہیں بھیجا گیا ہے۔ تو اسلاف رات کو اس پر غور وفکر کرتے تو دن کو اس کے مطابق عمل کرتے تھے اور تم ہو کہ اس کے پڑھنے ہی کو سب کچھ سمجھتے ہو۔ اس کے حرف اور زیر زبر وغیرہ کی روشنی میں لگتے ہو اور اس میں دیئے گئے احکام کی بجا آوری کو اہمیت ہی نہیں دیتے''۔

مختصراً یہ کہ قرآن کا مقصود خالی حرف پڑھنا ہی نہیں بلکہ مقصود اس کے فرمان کے مطابق عمل ہے۔ اور تلاوت یاد آوری کے لیے ہے اور یاد آوری فرماں برداری کے لیے ہے جو فرماں برداری تو کرتا نہیں اور تلاوت کرتا ہے اور حروف اس کے صحیح ادا کرتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے اللہ تعالیٰ کا خط ملتا ہے۔ جس میں کئی کاموں کا حکم دیا گیا ہے۔ تو مکتوب الیہ بیٹھ کر اس نامے کو خوش الحانی سے پڑھتا ہے اور حروف کی درستی کو ملحوظ رکھتا ہے لیکن اس میں کے فرمانوں میں سے کسی پر بھی عمل پیرا نہیں ہوتا بے شبہ وہ سختی اور عقوبت کا مستوجب ہے۔

آدابِ تلاوت

آدابِ ظاہر:

چاہیے کہ ظاہر آداب میں سے چھ چیزوں کو ملحوظ رکھے:

ادبِ اوّل: یہ کہ احترام کے ساتھ تلاوت کرے۔ پہلے وضو کرے اور روبقبلہ متواضع ہو کر بیٹھے جیسے نماز میں بیٹھتے ہیں۔ علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب فرماتے ہیں کہ: ''جو شخص قیام نماز میں قرآن پڑھتا ہے اس کے لیے ایک ایک حرف پر سو سو نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں اور اگر بیٹھ کر نماز میں قرآن پڑھتا ہے تو ایک حرف پر پچاس نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں، لیکن اگر وضو کے ساتھ تلاوت کرے اگرچہ یہ تلاوت نماز میں نہ ہو پچیس نیکیاں فی حرف لکھ دی جاتی ہیں اور اگر بے وضو زبان سے تلاوت کرے گا تو ایک حرف کے بدلے دس سے زائد نیکیاں نہیں لکھی جاتیں اور جو تلاوت وہ رات کو کرتا ہے بخصوص نماز میں وہ سب سے بڑھ کر فضیلت والی شمار ہوتی ہے کیونکہ دل فارغ تر ہوتا ہے تو ثواب بیشتر ہوتا ہے۔

ادبِ دوم: کہ تلاوت آہستہ آہستہ آواز کے ساتھ کرے اور اس کے معانی میں تدبّر کرے اور جلدی ختم کرنے کی فکر میں نہ ہو۔ جیسے کہ ایک گروہ اس میں جلدی کرتا ہے کہ ہر روز ایک منزل کو تمام کرے۔ رسول (ﷺ) فرماتے ہیں کہ جو کوئی تین دنوں سے کم میں قرآن ختم کرے تو فقہ قرآن اسے حاصل نہیں ہوتا۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''اذا زلزلت و القارعة'' آہستگی سے پڑھتا ہوں اور ان دونوں میں تامّل کرتا ہوں۔ تو میں اسے سورۂ البقرہ اور آل عمران کو بہ عجلت پڑھنے سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں حضرت عائشہ رضی

اللہ عنہا نے کسی کو قرآن بہ شتاب پڑھتے دیکھا تو فرمایا: ''نہ خاموش ہے نہ قرآں خوان'' اور اگر کوئی عجمی ہو اور قرآن کے معنی نہ جانتا ہو اسے بھی تلاوت بہ آہستگی کرنی چاہیے۔ کیونکہ قرآن کی حرمت کے پیش نظر یہی صورت فاضل تر ہے۔

ادبِ سوم: رونا ہے۔ رسول (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''قرآن پڑھو اور گریہ زاری کرو' اگر رونا نہ آئے تو بھی بہ تکلف رونی صورت بناؤ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تم سجدہ جو سورۃ سبحٰن الذی میں ہے ادا کرو تو سجود میں جلدی نہ کرو تا کہ گریہ کر سکو۔ اگر کسی کی آنکھ نہ روئے اس کا دل تو گریاں ہونا چاہیے۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''قرآن اندوہ کے لیے اترا ہے اس لیے جب بھی تلاوت کرو خود کو اندوہ گین کرو''۔ اور جو کوئی وعدہ وعید اور فرمانہائے قرآن میں تامل کرتا ہے اور اپنے عجز سے آشنا ہوتا ہے تو ناچار اندوہ گیں ہوتا ہے بشرطیکہ غفلت اس پر غالب نہ آ چکی ہو۔

ادبِ چہارم: یہ ہے کہ ہر آیت کا حق ادا کرے اور آنحضرت جب عذاب کی کسی آیت پر پہنچتے تھے تو اللہ سے اس کی پناہ چاہتے تھے اور جب کسی آیۂ رحمت پر پہنچتے تو تنزیہہ اور تسبیح کرتے۔ ابتدائے تلاوت میں اعوذ باللہ پڑھتے اور جب تلاوت سے فارغ ہوتے تو یہ دعا مانگتے تھے: ''اَللّٰھُمَّ ارحَمنِی بِالقُرآن وَاجعَلہ' اماماً وَنوراً وھُدًی ورَحمةً ' اللّٰھُمَّ ذَکِّرنِی مِنہُ مانَسیتُ وعَلِّمنِی مِنہُ ما جَھلِتُ وارزُقنِی تَلاوَتَہٗ اٰنا ءَ اللّیل والنَّھارِ واَجعَلہ' حُجَّةً لِّی یَارَبَّ العَالَمِین'' (اے اللہ براہ قرآن مجھے بخش دے اور اسے میرے لیے امام' روشنی' راہبر اور رحمت قرار دے۔ اے اللہ جو کچھ قرآن میں سے میں بھول گیا ہوں مجھے یاد دلا دے اور جو کچھ میں نہیں جانتا وہ مجھے سکھا دے اور مجھے روز و شب قرآن کی تلاوت کی توفیق عطا فرما اور اسے میرے لیے دلیل بنا دے۔ اے اہل دنیا کے پروردگار) اور جب سجدے کی آیات کو پہنچے تو سجدۂ تلاوت کرے پہلے تکبیر کہے اور پھر سجدہ کرے۔ سترِ شرم گاہ اور وضو کی شرائط نماز ہی کی طرح ملحوظ رکھے۔ سجدۂ تلاوت میں تکبیر و سجدہ کافی ہوں گے۔ بے تشہد و سلام۔

ادبِ پنجم: اگر ریا کے معنی میں کوئی چیز ہو یا کسی دوسرے کی نماز میں خلل کا امکان ہو تو تلاوت آہستہ آواز میں کرے کیونکہ حدیث میں ہے کہ ''خفی تلاوت' جہری تلاوت پر ایسے ہی برتری رکھتی ہے جیسے صدقۂ سرِّ صدقۂ علانیہ پر فضیلت رکھتا ہے''۔ لیکن اگر ریا اور مزاحمت کا اندیشہ نہ ہو تو با آواز تلاوت کرے تا کہ دوسروں کو سماع کا ثواب پہنچے نیز اس لیے کہ اسے آگاہی زیادہ ہو اور اس کی ہمت جمع تر ہو جائے اور اس کے نشاط میں اضافہ ہو اور نیند دور ہو اور سونے والے جاگ اٹھیں۔ اگر یہ تمام نیتیں جمع ہو جائیں تو قاری ان سب کا ثواب

پائے گا۔قرآن میں سے دیکھ کر پڑھنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔اس لیے کہ اس میں آنکھیں بھی شریک عمل ہو جاتی ہیں۔کہتے ہیں کہ ''قرآن سے دیکھ کر ایک ختم کرنا بے دیکھے زبانی سات ختموں کے برابر ہوتا ہے''۔ فقہائے مصر میں سے ایک فقیہہ امام شافعیؒ کے پاس آیا تو انہیں سجود میں دیکھا۔مصحف رکھے ہوئے شافعیؒ نے کہا ''فقہ نے تم کو قرآن شریف سے باز رکھا اور میں نماز عشاء کے بعد صبح تک قرآن ہاتھ میں لیتا ہوں اور بیدار رہتا ہوں''۔آنحضرت کا گذر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس سے ہوا تو وہ نمازِ عشاء میں قرآن آہستہ پڑھ رہے تھے۔تو آپ نے استفسار فرمایا کہ ''آہستہ کیوں پڑھ رہے ہو؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''جس سے ہم کلام ہوں وہ سن رہا ہے'' اور آپ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو وہ نماز بہ جہر پڑھ رہے تھے۔تو آنحضرت نے یہی سوال کیا کہ قرآن بآواز کیوں پڑھ رہے ہو؟'' تو انہوں جواب دیا ''اس لیے کہ سونے والے کو بیدار کر رہا ہوں اور شیطان کو بھگا رہا ہوں''۔تو آنحضرت نے فرمایا ''دونوں ٹھیک کر رہے ہو''۔پس اس قسم کے اعمال نیت کے تابع ہوتے ہیں۔چونکہ ان دونوں اصحاب کی نیتیں خوب تر تھیں اس لیے دونوں صورتوں میں قاری ثواب پاتا ہے۔

ادبِ ششم: یہ ہے کہ قاری کوشش کرے کہ خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کرے۔کیونکہ آنحضرت کا فرمان ہے کہ ''قرآن کو خوشنوائی کے ساتھ آراستہ کرو''۔آنحضرت نے بوحذیفہ کے غلام[(۱)] کو دیکھا کہ قرآن خوش الحانی کے ساتھ پڑھ رہا تھا تو آپ (ﷺ) نے فرمایا: ''اَلحمدُ للهِ الَّذِی جَعَلَ فِیْ اُمَّتِی مِثْلہ'' (سب تعریفیں اللہ کی جس نے اس جیسے شخص کو میری امت میں داخل فرمایا) سبب اس کا یہ ہے کہ قاری کی آواز جس قدر زیادہ خوش لحن ہوگی اس قدر دلوں پر قرآن کا اثر بیشتر ہوگا اور سنت یہ ہے کہ خوش الحانی سے پڑھے لیکن د وکلمات وحروف کے درمیان طویل الحان جو قوالوں کی عادت ہے۔مکروہ ہے۔

آدابِ باطن

تلاوت کے آدابِ باطن بھی چھ ہی ہیں:

ادبِ اوّل: یہ ہے کہ قاریٔ قرآن کو عظمتِ کلام کا علم ہونا چاہیے کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کا ہے اور قدیم ہے نیز اللہ کی صفت ہے۔ اور اسی کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور جو کچھ اس کی زبان پر جاری ہے وہ حروف ہیں۔اور جس طرح ''آتش'' زبان سے کہنا آسان ہے اور ہر کوئی اسے کہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔لیکن اصل آتش کی تاب نہیں رکھتا۔اسی طرح اگر قرآنی حروف کے معنی آشکار ہو جائیں تو ہفت آسمان اور ہفت زمینیں اس

---

(۱) اِحیاءعلوم الدین میں غزالی نے اس کا نام سالم لکھا ہے۔

کی تجلی کی تاب نہیں رکھتے۔ اسی بناء پر حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَه' خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللهِ'' (قرآن:۲۱/۵۹) (اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو جو سنگ خارہ سے ہوتا تو تُو اس پہاڑ کو دیکھتا کہ ڈرتا اور غم ناک ہو جاتا اور خوف خدا سے ذرہ ذرہ ہو جاتا)۔'' لیکن قرآن کے جمال و عظمت کو حروف میں ملفوف کر دیا گیا ہے تا کہ زبانیں اور دل اس کی تاب لا سکیں۔ اور حروف کو لباس سے ملبوس کیے بغیر انسان تک قرآن کو پہنچانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اور یہ بات اس امر کی دلیل نہیں کہ ورائے حروف کوئی عظیم کام نہیں اور جس طرح بہائم کو ہانکنے، پانی پلانے یا ان سے کام لینے میں انسان کا کلام کارآمد نہیں۔ کیونکہ چارپایوں کو اس کے فہم کی صلاحیت ودیعت نہیں ہوئی۔ لہٰذا چارپایوں کی آواز کے مشابہ آوازیں رکھی گئی ہیں تا کہ ان کے ذریعے سے بہائم کو آگاہ کریں تو وہ جب ایسی آواز سنتے ہیں تو کام انجام دینے میں لگ جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ کام کی حکمت سے نابلد ہوتے ہیں۔ بیلوں کو ایسی آواز سے خطاب کرتے ہیں۔ جس سے وہ زمین کو نرم کرتے ہیں لیکن زمین کو نرم کرنے میں کیا حکمت ہے وہ نہیں جانتے۔ یعنی یہ کہ اس سے ذرہ ہائے خاک کے درمیان ہوا ہوتا کہ پانی سے دونوں باہم مل جائیں اور تینوں کے اجتماع سے زمین میں ایک ایسا درجۂ حرارت پیدا ہو جائے جو بیج کی غذا ہو اور اس کی پرورش کا ذریعہ بنے تو ان امور سے بیل کو کیا خبر؟ اسی طرح بیشتر قاریوں کو آواز اور ظاہر معنی سے زیادہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی لیے ایک گروہ نے گمان کیا کہ قرآن خود حروف ہے یا اصوات۔ جو کم فہمی اور سادہ دلی کی دلیل ہے اور یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی یہ گمان کرے کہ 'آتش' کی حقیقت الف، تا اور شین ہے اور بس۔ اور نہیں جانتا کہ اگر آگ کاغذ کو دیکھے تو اسے جلا دے اور اس کی تاب لانا اس کے لیے ممکن نہیں۔ لیکن یہ حروف معمولاً کاغذ ہی پر ہوتے ہیں اور یہ حروف کاغذ پر ایسا کوئی اثر نہیں کرتے جیسے کہ ہر جسم میں ایک روح ہوتی ہے جو اس کے مشابہ نہیں ہوتی۔ حروف کے معنی روح کی مانند ہیں۔ اور حروف قالب کی مانند ہیں۔ اور جسم یا قالب کا شرف روح کے سبب سے ہے۔ اسی طرح شرفِ حروف روح معانی کے باعث ہے اور حقیقت معنی کا بیان بہ تمام و کمال اس کتاب کے حوصلے سے زاید ہے۔ اس لیے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ادبِ دوم: یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی عظمت کہ یہ کلام اسی کا ہے تلاوت سے پہلے اپنے دل میں جاگزین کرے تو اسے معلوم رہے کہ جو کلام وہ پڑھ رہا ہے اور جس بحرِ خطر میں کہ بیٹھا ہوا ہے وہ اسے کہہ رہا ہے کہ ''لَا یَمَسُّه' اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ'' (قرآن:۵۶/۷۹) (اسے کوئی شخص پاکیزہ ہوئے بغیر نہیں چھوتا)۔ اور جس طرح ظاہر مصحف کو پاکیزہ ہاتھوں کے بغیر چھونا نہیں چاہیے اسی طرح جاننا چاہیے کہ حق تعالیٰ کے کلام کی حقیقت کو نہیں پا سکتے الا یہ کہ دل اخلاقِ بد کی نجاست سے پاک ہو اور نورِ تعظیم و توقیر سے آراستہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ عکرمہ

ﷺ جب قرآن کھولتے تھے تو ان پر غشی طاری ہو جاتی اور وہ کہہ اٹھتے کہ ''ھُوَ کَلَامُ رَبِّیْ، ھُوَ کَلَامُ رَبِّیْ '' (یہ کلام میرے پروردگار کا ہے۔ یہ کلام میرے پروردگار کا ہے)۔ اور کوئی شخص قرآن کی عظمت سے آگاہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت سے آشنا نہ ہو۔ اور یہ عظمت دل میں پیدا نہیں ہوتی جب تک کہ انسان اللہ تعالیٰ کے افعال اور اس کی صفات پر غور و فکر نہ کرے۔ اور جب عرش، کرسی، سات آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے نیز ملائکہ، جنّ و انس، حشرات، جمادات نباتات و جملہ اصناف خلق کو دل میں حاضر کرے گا تو جانے گا کہ یہ کلام اسی ذات کا ہے اور یہ سب کچھ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ ذات اقدس اگر سب کو ہلاک کرے تو کسی خوف سے دوچار نہیں ہوتی اور اس ذات کے کمال میں کوئی کمی نہیں۔ اور وہ سب کا خالق، مالک اور پروردگار ہے۔ تبھی ممکن ہے کہ کسی قدر عظمت قاری کے دل میں جاگزین ہو۔

ادبِ سوم: یہ کہ دل کو حاضر رکھے اور پڑھنے میں غافل نہ ہو اور وسوسے قاری کو پراگندہ اطراف کی جانب مشغول نہ کریں۔ اور جو کچھ غفلت کے ساتھ پڑھے گا تو اس کو ناخواندہ سمجھے اسے اس کا اعادہ کرنا چاہیے یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی بوستان میں مشاہدہ کے لیے داخل ہو پھر وہاں غفلت کا شکار ہو جائے۔ اور عجائبِ بوستان سے محروم رہے اور جب باہر نکلے تو خالی ہاتھ ہو۔ یہ قرآن مومنوں کے لیے تماشا گاہ ہے اور اس میں عجائب اور حکمتیں ہیں کہ جو کوئی ان کے بارے میں تامّل کرتا ہے وہ باقی ہر شے سے دست کش ہو جاتا ہے۔ پس اگر کوئی معنئ قرآن سے ناآشنا ہے تو اس کے نصیب میں بہت کم پہنچتا ہے لیکن چاہیے کہ قرآن کی عظمت دل میں موجود ہو تاکہ پریشان خیالی سے دوچار نہ ہو۔

ادبِ چہارم: یہ ہے کہ ہر کلمے کے معنی میں غور کرے تاکہ اُس کا مفہوم معلوم ہو جائے۔ اگر ایک دفعہ فہم میں نہ آئے دوبارہ غور کرے اور اگر اس میں لذّت پائے تو دہرائے کیونکہ اعادہ زیادہ کی تلاوت سے اولیٰ تر ہے۔ حضرت ابوذر غفاری کہتے ہیں کہ آنحضرت ایک تہائی رات سے لے کر صبح تک اسی آیہ شریف کو دہراتے رہتے تھے کہ: ''اِنْ تُعَذِّبْھُمْ فَاِنَّھُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْلَھُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْم '' اور بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا اعادہ بیس بار فرماتے۔ (قرآن: ۱۱۸/۵) (اگر تو عذاب دے تو وہ تیرے ہی غلام ہیں اور اگر ان کو بخش دے تو تُو ہی توانا اور دانا ہے)۔ اور سعید بن جبیر نے اسی ایک آیت میں رات تمام کر دی: ''وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّھَا الْمُجْرِمُوْنَ '' (قرآن: ۵۹/۳۶) (اور کافروں سے کہا جائے گا کہ 'اے کافرو آج الگ ہو جاؤ) قاری اگر ایک آیت پڑھے لیکن غور کسی اور آیت کے معنی پر کر رہا ہو تو گویا اس نے اس آیت کا حق ادا نہ کیا۔ عامر بن عبد قیس وسوسوں کا گلہ کر رہا تھا تو ان سے کہا گیا کہ وہ ''حدیث دنیا ہوگی'' تو اس نے کہا: ''اگر

میرے سینے میں خنجر بھی مار دیں تو وہ میرے لیے اس کی برداشت اس سے آسان تر ہوگی کہ نماز میں کسی دنیاوی امر میں مشغول ہوں۔ سوائے اس دل مشغولی کے کہ روزِ قیامت حق تعالیٰ کے سامنے کیسے کھڑا ہوں گا اور کس عالم میں لوٹوں گا''۔ اس کو وہ منجملہ وسواس سمجھتے تھے۔ بحکم آنکہ جو کلمہ بھی انسان نماز میں پڑھتا ہے تو چاہیے کہ اس وقت بجز اس کے معنی کے کسی بھی اور شے کو نہ سوچے۔ اگر کوئی اور شے کا خیال کرتا ہے اگرچہ وہ دینی امر ہی کیوں نہ ہو وسواس متصور ہوگا۔ بلکہ چاہیے کہ ہر آیت میں سوائے اس کے معنی کے اور کچھ نہ سوچے اور جب صفاتِ حق تعالیٰ پر مبنی آیات کو پڑھے تو اسرارِ صفات میں غور کرے کہ مثلاً قدوس، عزیز، جبار، متکبر اور حکیم جیسی صفات کے معنی کیا ہیں؟ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کے افعال کی تلاوت کرے تو مثلاً ''خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْض'' تو عجائبِ خلق کے باب میں خالق کی عظمت کو فہم کرے۔ اور اس کے کمال علم اور اس کی قدرت کو پہچانے تاکہ ایسے ہو جائے کہ جس شے کو بھی دیکھے تو حق کا مشاہدہ کرے کہ سب اسی سے دیکھے اور سب اسی کا دیکھے۔ اور جب یہ آیت پڑھے کہ: اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ'' (قرآن:۲/۷۶) (پیدا کیا ہم نے لوگوں کو آمیختہ نطفہ سے اور ہم اسے آزمائیں گے) تو عجائبِ نطفہ میں غور کرے کہ یک صفت قطرۂ آب کے ہاں سے کس طرح مختلف چیزیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ گوشت پوست رگ و پے اور استخوان وغیرہ اور پھر اس سے ہاتھ پاؤں، سر و چشم و زبان جیسے اعضا کیونکر وجود میں آتے ہیں۔ پھر سمع و بصر و حیات وغیرہ کے عجائب و جواہر معنی پر غور کرے کہ یہ کیسے ظہور میں آئے۔ قرآن کے جملہ معانی کی تشریح دشوار ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ قرآن میں کس قسم کا تفکر ہونا چاہئے اس سے متنبہ کرنا منظور تھا۔

اور معانی قرآن تین قسم کے افراد پر روشن نہیں ہو سکتے:

اوّل: وہ جس نے تفسیر ظاہر (ترجمہ) نہ پڑھا ہو۔ اور عربیت نہ جانتا ہو۔ اور

دوسرا: جو گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر مصر ہو۔ یا کسی بدعت کا مقید ہو جس سے اس کا دل تاریک ہو گیا ہو۔ اور

تیسرا: وہ جو علم کلام سے سرشار ہو اور اس کے ظاہر ہی پر اٹک گیا ہو اور جو کچھ اس کے خلاف اس کے دل میں خطور کرے اس سے دوری اختیار کرتا ہو۔ پھر ممکن نہیں ہوتا کہ ایسا شخص اس ظاہر سے آگے قدم بڑھا سکے۔

ادبِ پنجم: یہ کہ اس کا دل آیاتِ قرآن کے اختلافِ صفات کے ساتھ متغیر ہوتا رہے۔ جب آیات خوف پر پہنچے تو اس کا دل سراپا ہراس اور زاری بن جائے اور جب آیت رحمت کو پہنچے تو دل میں کشادگی اور استبشار کا ظہور ہو اور جب صفاتِ حق تعالیٰ سنے تو سراپا انکساری اور شکستگی کی تصویر ہو جائے۔ اور جب محالات

کفار (امور محال) سنے جو حق تعالیٰ کے بارے میں کہے گئے ہوں جیسے فرزند یا شریک تو آواز کو آہستہ کرے اور نہایت شرم وحیا اور خجلت کے انداز میں ادا کرے۔اسی طرح ہر آیت کے معنی ہوتے ہیں اوران معانی کا تقاضا ہوتا ہے کہ قاری اسی صفت کا سا ہو جائے تا کہ اس آیت کا حق ادا کر دیا ہو۔

ادبِ ششم: یہ ہے کہ قرآن کو اس انداز سے سنے جیسے خود حق تعالیٰ سے سنتے ہیں۔اور فرض کرے کہ حق تعالیٰ ہی سے سن رہا ہے۔ بزرگوں میں سے ایک فرماتے ہیں کہ: میں قرآن پڑھتا تھا لیکن اس کی حلاوت نہ پاتا تھا۔حتی کہ میں نے یوں فرض کیا جیسے آنحضرت سے سن رہا ہوں تو اس سے آگے بڑھا تو منزلتِ مہین (بزرگ ترین منزل) کو پہنچ گیا اور اب میں اس طرح پڑھتا ہوں جیسے کہ حق تعالیٰ سے براہِ راست سنتا ہوں تو مجھے وہ لذت نصیب ہوتی ہے جو میں نے پہلے کبھی نہ پائی تھی''۔

◆◆◆

اصلِ نہم: ذکرِ حق تعالیٰ

اے عزیز جان لے کہ تمام عبادتوں کا مقصود اور لب لباب حق سبحانہ وتعالیٰ کا ذکر ہے۔اسلام کا ستون نماز ہے۔تو مقصود اس کا ذکرِ حق تعالیٰ ہے۔جیسے کہ فرمایا گیا کہ : ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللہِ اَکْبَرُ'' (نماز برائی اور ناپسندیدہ سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد عظیم ہے)۔

اور قرآن پڑھنا فاضل ترین عبادات سے ہے۔اس بناء پر کہ یہ اللہ ہی کا کلام ہے اور اسی کا ذکر ہے اور جو کچھ بھی قرآن میں ہے وہ سب ذکرِ حق سبحانہ کو تازہ کرنے کے لئے ہے۔اسی طرح روزہ کا مقصد شہوات کی تقصیر ہے تا کہ جب دل شہوات کے ازدحام سے خلاصی پائے صاف ہو جائے تا کہ ذکرِ حق کا مستقر بن جائے۔ کیونکہ جب دل شہوات سے پُر ہو تو اس سے ذکر کا امکان نہیں ہوتا اور نہ ذکر اس پر اثر کرتا ہے اور حج جس کا مقصود خانۂ خدا کی زیارت ہے فی الاصل اس سے اللہ تعالیٰ کا ذکر مقصود ہوتا ہے اور دیدار اللہ کے شوق کی مہمیز۔پس تمام عبادات کا لب لباب اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی ہے۔ بلکہ اصل مسلمانی کلمۂ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللہُ ہے اور یہ عین ذکر حق ہے اور جملہ عبادات اسی ذکر کی موکد ہیں اور حق تعالیٰ کا تجھے یاد کرنا تیرے اللہ کے ذکر ہی کا ثمر ہے اور اس سے بڑھ کر اور ثمر کیا ہوگا۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ'' (قرآن: ۱۵۲/۲) (تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا) تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔یاد کرنے کا یہ عمل دوامی ہونا چاہئے۔ دوامی نہ ہو تو کم از کم بیشتر احوال میں ہونا چاہیے۔ کیونکہ فلاح اسی سے وابستہ ہے اسی لیے فرمایا کہ :

''وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ'' (قرآن: ۱۰/۶۲) (اگر فلاح کی امید رکھتے ہو تو کلید اس کی بکثرت ذکر ہے' تھوڑا نہیں' اور اکثر احوال میں''۔ اور اسی لیے فرمایا: ''اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِم'' (قرآن: ۱۹۱/۳)۔ ان لوگوں کی تعریف کی جو اٹھتے' بیٹھتے' سوتے کسی حال میں بھی غافل نہیں ہوتے ذکر کرتے ہیں۔ نیز فرمایا کہ ''وَاذْکُر رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَةً وَّدُوْنَ الْجَھْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ'' (قرآن: ۲۰۵/۷) (''اسے یاد کرو زاری کے ساتھ' ہراس میں اور پوشیدہ' صبح وشام اور کبھی غافل نہ رہنا'')۔

آنحضرتؐ سے پوچھا گیا کہ ''کاموں میں سب سے فضیلت والا کام کون سا ہے؟'' تو آپ نے فرمایا یہ کہ: ''جب تو مرے تو تیری زبان ذکرِ حق سے شاداب ہو''۔ نیز فرمایا کہ میں تمھیں نہ بتادوں کہ تمہارے اعمال میں سے بہترین کون سے ہیں جو اس بادشاہ جل جلالہ کے نزدیک مقبول ترین ہوں اور تمہارے درجات کے لیے عظیم ترین ہوں۔ اور جو سونے چاندی کا صدقہ دینے سے بھی بہتر ہوں اور جہاد میں دشمنانِ خدا کا خون بہانے سے بھی بڑھ کر ہوں اگرچہ تم ان کی گردنیں مارو اور دشمن تمہاری گردنیں ماریں؟'' تو صحابہ نے کہا کہ ''وہ کون سا ایسا عمل ہے''؟ آنحضرتؐ نے فرمایا ''ذِکْرُ اللّٰہ''، ''اللہ تعالیٰ کی یاد''۔ اور نیز فرمایا کہ ''جس کو میرا ذکر دعا سے باز رکھے اور وہ میرے بارے میں غور کرے تو اس کا بدلہ میرے نزدیک عطائے سائلان سے بھی فاضل تر اور بزرگ تر ہوگا''۔ نیز فرمایا کہ ''غافلون کے درمیان ذاکر ایسا ہی ہے جیسے مُردوں کے درمیان زندہ یا خشک درختوں کے درمیان سرسبز درخت ہو اور اس نمازی کی مانند ہے جو میدان جنگ میں ڈٹا رہے جب کہ دوسرے پشت دکھا رہے ہوں''۔ اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ابن جبل فرماتے ہیں کہ ''اہلِ بہشت کسی چیز کی حسرت نہ کریں گے بجز اس ایک ساعت کی جو دنیا میں ذکرِ حق تعالیٰ سے خالی رہ گیا ہو''۔

حقیقتِ ذکر

معلوم رہے کہ ذکر کے چار درجے ہیں:

اوّل: یہ کہ زبان سے تو ذکر ہو لیکن دل غافل ہو تو اثر اس کا نہایت کمزور ہوتا ہے لیکن بے اثر بھی نہیں ہوتا کیونکہ جس زبان کو بہ خدمت مصروف رکھا گیا ہو وہ اس زبان پر جو ناروا کاموں میں مشغول ہو یا معطل چھوڑ دیا گیا ہو فضیلت رکھتی ہے۔

دوسرا: درجہ یہ کہ ذکر دل میں ہو لیکن متمکن نہ ہو اور جاگزین نہ ہو گیا ہو اور ایسا ہو کہ دل کو ذکر پر بہ تکلف لگانا پڑتا ہو۔ بطوریکہ اگر کوشش اور تکلف نہ کریں تو دل اپنی فطرت کی طرف لوٹ جائے گا یعنی غافل ہو جائے گا

اور حدیث نفس میں لگ جائے گا۔

تیسرا: درجہ یہ کہ ذکر دل میں قرار پا گیا ہو اور دل میں متمکن اور غالب ہو گیا ہو ایسے کہ کسی اور کام پر بہ تکلف اسے لے جایا جا سکے اور یہ عظیم صورت ہے۔

پایۂ چہارم: یہ ہے کہ مذکور یعنی حق تعالیٰ دل پر غالب ہو۔ نہ کہ ذکر؛ اور جس کا دل سراپا مذکور کو دوست رکھتا ہو اور وہ جس کا دل ذکر کو محبوب رکھتا ہو دونوں میں فرق ہے بلکہ کمال یہ ہے کہ ذکر اور آگاہیٔ ذکر دونوں دل سے رخصت ہو جائیں اور مذکور (یعنی حق تعالیٰ) فقط باقی رہ جائے اور بس۔ ذکر بہ زبانِ عربی ہو یا بہ زبان فارسی دل ان دونوں کے ذریعے ذکر سے خالی نہ ہو۔ بلکہ دل سراپا ذکر بن جائے اور اصل یہ ہے کہ بیان عربی فارسی یا جو کچھ بھی ہے دل اس سے خالی ہو اور سراپا وہی بن جائے کہ کوئی اور شے اس میں سما نہ سکے اور یہ فقط ایک کی محبت کا نتیجہ ہوتا ہے جسے عشق کہتے ہیں اور اگر مرد عاشق دل کو ہمہ تن معشوق سے وابستہ رکھتا ہے اور ایسا ممکن ہے دل سے جو مشغولی وہ رکھتا ہے نتیجۃً اس کا نام بھی بھول جاتا ہے اور جب استغراق کا یہ عالم ہو کہ خود کو اور دیگر جو کچھ بھی ماسوائے حق تعالیٰ کے ہے سب کو فراموش کر دیتا ہے تو گویا راہِ تصوف کے نقطہ آغاز پر پہنچ گیا۔ صوفیاء اس حالت کو ''فنا'' کہتے ہیں۔ اور نیستی کا نام دیتے ہیں۔ یعنی جو کچھ بھی ہے ذکرِ حق تعالیٰ سے معدوم ہو گیا۔ اور خود ذاکر بھی معدوم ہو گیا چونکہ حق تعالیٰ کے عالم اس قدر ہیں کہ ہمیں ان کی کچھ خبر نہیں۔ تو وہ عالم ہمارے حق میں بمنزلہ نیست کے ہیں اور ہمارے لیے بمنزلہ ہست وہ ہیں جن کا ہمیں علم ہے یا ان کے بارے میں خبر ہے۔ اور جو عالم ہستِ خلق ہیں کسی کو فراموش ہو گئے تو ان کی نفی ہو گئی اور جب اس نے اپنی ذات کو بھی فراموش کر دیا تو وہ خود بھی معدوم ٹھہرا اور جب اس کے ساتھ کچھ باقی نہ رہا سوائے حق تعالیٰ کے تو وجود باری تعالیٰ حق ٹھہرا اور بس۔ اے عزیز جب تو دیکھے گا تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس سے زیادہ کچھ دیکھ نہ پائے گا۔ تو کہے گا کہ ''عالم خود اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے بس یہی کچھ ہے''۔ تو ذاکر بھی کسی چیز کو نہیں دیکھتا سوائے حق تعالیٰ کے تو کہہ اٹھتا ہے کہ ''ہمہ اوست'' اور سوائے اس کے کچھ نہیں''۔ تو یہاں پہنچ کر ذاکر و مذکور میں جدائی نہیں رہتی بلکہ یگانگی حاصل ہوتی ہے۔ تو یہ عالمِ توحید و وحدانیت کا آغاز ہے۔ یعنی جب جدائی اٹھ جاتی ہے تو ذاکر کو جدائی اور دوری کی خبر نہیں ہوتی۔ کیونکہ جدائی کا علم اُسے ہو سکتا ہے جو دو چیزوں کو جانتا ہو یعنی خود کو اور حق تعالیٰ کو۔ جب کہ یہ اس حال میں خود سے بے خبر ہوتا ہے اور سوائے ایک کے اور کچھ نہیں دیکھتا تو جدائی سے کیونکر آگاہ ہو گا؟

اور جب سالک اس درجے کو پہنچ گیا تو صورتِ ملکوت رفتہ رفتہ منکشف ہونے لگتی ہے اور ملائکہ اور

انبیاء کی روحیں حسین روپ میں اسے دکھائی دینے لگتی ہیں اور حضرتِ الٰہیت کے جو خواص ہیں ظاہر ہونے لگتے ہیں اور ایسے عظیم احوال منصۂ شہود میں آنے لگتے ہیں جن کا بیان تحریر ممکن نہیں۔

اور سالک جب خود میں لوٹتا ہے اور کاموں کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کا اثر اس پر باقی رہتا ہے اور اس حالت کا شوق اس پر غالب ہوتا ہے تو دنیا و مافیہا اور جو مخلوق اس میں ہوتی ہے وہ اس کے دل میں ناپسند قرار پاتی ہے۔ تو وہ لوگوں کے درمیان جسماً تو موجود ہوتا ہے لیکن بہ دل غائب ہوتا ہے اور حیران ہوتا ہے کہ لوگ کارِ دنیا میں محو ہیں اور اسے ان پر رحم آتا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ کن کاموں سے یہ لوگ بے بہرہ اور محروم ہیں۔ جب کہ لوگ اس پر ہنستے ہیں کہ سالک کیوں ان کی مانند کارِ دنیا میں مصروف نہیں ہوتا وہ گمان کرتے ہیں کہ شاید جنون یا سودا کا شکار ہونے والا ہے۔ پس اگر کوئی فنا اور نیستی کے درجے کو نہ پہنچے اور یہ احوال اور مکاشفات اس پر ظاہر نہ ہوں لیکن ذکر اس پر غالب ہو تو یہ بھی کیمیائے سعادت ہی سمجھی جانی چاہیے۔ کیونکہ جب ذکر غالب ہوگا تو انس و محبت بھی غالب ہوں گے۔ جب ایسے ہو جاتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو تمام دنیا سے اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے دوست تر رکھتا ہے تو اصل سعادت یہی ہے کیونکہ جب مرجع اور مصیر حق کے ساتھ ہوگا تو وہ موت سے بڑی لذت محسوس کرے گا اور مشاہدہ اس کا اس کی محبت ہی کے بقدر ہوگا اور وہ شخص جسے دنیا محبوب ہو تو اس کا رنج اور دردِ فراق دنیا کے باعث ہو تو وہ دنیا کے عشق کے متناسب ہوگا۔ جیسا کہ ہم عنوانِ مسلمانی میں بیان کر چکے ہیں۔ پس اگر کوئی ذکر بکثرت کرے لیکن جو احوال صوفیا کا سرمایہ ہیں اُن کا ظہور اُس پر نہ ہو تو بھی اسے ہمت نہ ہارنی چاہیے۔ کیونکہ یہ سعادت اسی پر موقوف نہیں ہے۔ کیونکہ جب دل نورِ ذکر سے مزین ہو جائے تو کمالِ سعادت مہیا ہوگئی۔ جو کچھ اس دنیا میں ظاہر نہیں ہوا مرنے پر روشن ہو جائے گا۔ لازم ہے کہ دل کے مراقبے میں مشغول رہے تا کہ جب حق تعالیٰ اسے کسی راز سے آگاہ کرنا چاہیں وہ اس سے بے خبر نہ ہو۔ ذکر میں مداومت حضرتِ ملکوت کے عجائب کی کنجی ہے۔ اور یہ جو آنحضرت نے فرمایا کہ: ''جو کوئی چاہتا ہے کہ بہشت کے باغوں کا مشاہدہ کرے اسے چاہیے کہ ذکرِ حق تعالیٰ بکثرت کرے'' اس کے معنی یہی ہیں۔

اور یہ جو ہم نے بہ اختصار بیان کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جملہ عبادتوں کا لب لباب ذکرِ حق تعالیٰ ہے اور ذکرِ حقیقی یہ ہے کہ امر و نہی کے وقت قدم بڑھائے اور اللہ کو یاد کرے اور معصیت کے وقت ہاتھ کو روکے اور جب حکمِ حق ہو تو بجالائے۔ اگر ایسے ہو کہ ذکر اس کو اس پر گامزن نہ کر سکے تو یہ صورت غماز اس کی ہے کہ یہ محض فریب نفس تھا اور بے حقیقت۔

تہلیل و تسبیح وتحمید وصلوات اور استغفار کی فضیلت

تہلیل: آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: بندہ جو نیکی بھی کرتا ہے اسے روزِ قیامت تولا جائے گا۔ البتہ کلمہ لاالٰہ الا اللہ کو ترازو میں رکھیں گے تو وہ ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب سے گراں تر نکلے گا''۔ نیز فرمایا: ''لا الٰــہ الا اللہ کہنے والا اگر اپنے قول میں صادق ہو لیکن زمین کی خاک کثرت کے برابر بھی گناہ کا مرتکب ہوا ہو اس سے درگذر کیا جائے گا۔'' نیز فرمایا کہ: ''جس نے اخلاص کے ساتھ لاالٰــہ الا اللہ کہا بہشت میں داخل ہوگا'' نیز فرمایا کہ جس نے ہر روز سو بار کہا کہ لَا اِلٰــهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِیْکَ لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ یُحْیِ وَیُمِیْتُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر ''تو وہ ایسے متصور ہوگا جیسے اس نے دس۱۰ غلام آزاد کر دیے ہوں اور سو۱۰۰ نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں، سو بدیاں مٹا دی جاتی ہیں اور رات تک یہ کلمہ اسے شیطان سے محفوظ رکھے گا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جو کوئی اس کلمے کا وِرد کرے گا وہ ایسے ہوگا جیسے اس نے فرزندان حضرت اسمٰعیل میں سے چالیس بندوں کو آزاد کیا ہو۔

تسبیح وتحمید: آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ جس نے دن میں سو بار ''سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ'' کہا اس کے جملہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں اگر چہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر کیوں نہ ہوں''۔ نیز فرمایا کہ جو کوئی ہر نماز کے بعد تینتیس۳۳ بار ''سُبْحٰنَ اللّٰهِ'' کہے اور تینتیس۳۳ بار ''الحمد للہ'' کہے اور تینتیس۳۳ بار ''اللہ اکبر'' کہے اور سو بار پورا کرنے کے لیے یہ کہے ''لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ الملك ولہ الحمد یحی ویمیت وھو علی کل شیءٍ قدیر'' تو اس کے سب گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اگر چہ کثرت میں سمندر کی جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں''۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ ''دنیا نے مجھے بھلا دیا، میں تنگ دست اور مفلس ہو گیا اور درماندہ ہوں میرے لیے تدبیر کیا ہوگی؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم کہاں ہو کہ صلواتِ ملائکہ اور خلائق کی تسبیح سے بے خبر ہو جس سے وہ روزی پاتے ہیں'' تو اس شخص نے کہا: ''وہ کیا ہے یارسول اللہ؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''سبحٰن اللہ العظیم، سبحٰن اللہ وبحمدہٖ استغفر اللہ'' سو بار کہہ ہر روز نماز سحر سے پہلے پھر صبح کے بعد تاکہ دنیا تیری طرف ملتفت ہو۔ ناچار اور حق تعالیٰ ہر کلمہ سے ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے جو قیامت تک تسبیح کہتا رہے گا اور ثواب اس کا تمھیں پہنچے گا''۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: باقیاتِ صالحات یہ کلمات ہیں: ''سبحٰن اللہ والحمدللہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر'' نیز فرمایا کہ ''میں یہی کلمات ادا کرتا ہوں اور گردشِ آفتاب کے نیچے جو کچھ ہے اسے اس سے بڑھ کر عزیز رکھتا ہوں'' اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزیز ترین یہی چار کلمات ہیں۔ ''آپ ﷺ نے فرمایا دو کلمات ایسے ہیں جن کی زبان سے

ادائیگی بہت سُبک ہے لیکن میزان میں بہت گراں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں: ''سبحن اللہ وبحمدہٖ سبحٰن اللہ العظیم''۔ درویشوں نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ: ''دولت مند آخرت کا سارا ثواب لے گئے کیونکہ ہر وہ عبادت جو ہم کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں لیکن وہ صدقہ بھی دیتے ہیں جب کہ ہم اس کی استطاعت نہیں رکھتے''۔ تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ تمھارے لیے فقر کی بناء پر ہر تسبیح وتہلیل وتکبیر بمنزلہ صدقہ کے ہے اور اسی طرح ہر امر معروف اور نہی عن المنکر بھی اور تم میں سے جو کوئی اپنی بیوی بچوں کے منہ میں لقمہ ڈالتا ہے وہ بھی صدقہ ہی تو ہے۔ یاد رہے کہ تسبیح وتحمید وتہلیل کی فضیلت درویشوں کے حق میں اس لیے زیادہ ہے کہ درویشوں کا دل ظلمت دنیا سے تاریک نہیں ہوتا اور پاکیزہ تر ہوتا ہے تو جب مفلس ایک کلمہ ادا کرتا ہے تو وہ ایسے ہے جیسے کسی نے زرخیز زمین میں بیج ڈال دیا ہو تو وہ بہت صاحبِ اثر ہوتا اور پھل زیادہ دیتا ہے اور ذکر ایسے دل کے لیے جو شہواتِ دنیا سے آلودہ ہو ایسے بیج کی مانند ہوتا ہے جسے شورہ زمین میں ڈال دیا گیا ہو۔ اس لیے اس کا اثر زیادہ نہیں ہوتا۔

صلوات: آنحضرت (ﷺ) ایک روز باہر نکلے تو خوشی کے آثار ان پر نمایاں تھے۔ تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ: جبریل علیہ السلام آئے تھے اور کہا کہ ''آپ (ﷺ) کے لیے خوشخبری ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ''کیا تم اس پر قانع نہیں ہو کہ تمھاری امت میں سے ایک شخص ایک دفعہ آپ ﷺ پر درود بھیجے تو میں دس دفعہ اسے صلوات دوں۔ جب تم پر ایک سلام کہے تو میں دس مرتبہ اسے سلام دوں اور ملائکہ اور میرے مقرب بھی اسی طرح کریں؟'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی مجھ پر درود بھیجتا ہے تو تمام ملائکہ اس پر درود بھیجتے ہیں۔ بہت ہو یا کم''۔ نیز فرمایا کہ میرے لئے اولیٰ تر وہ شخص ہے جو مجھ پر زیادہ درود بھیجتا ہے۔ نیز فرمایا کہ جو مجھ پر درود بھیجتا ہے اس کے نامۂ اعمال میں دس نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں اور دس برائیاں مٹا دی جاتی ہیں''۔ نیز فرمایا کہ ''اگر کوئی اپنی تحریر لکھتے وقت مجھ پر درود بھیجنے کے لئے اسے معرضِ تحریر میں لے آئے تو ملائکہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہیں۔ جب تک میرا نام اس کتاب میں موجود رہتا ہے فرشتے استغفار کرتے رہتے ہیں''۔

استغفار: ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''قرآن میں دو آیات ایسی ہیں کہ اگر کوئی ایک گناہ کا مرتکب ہو جائے تو ان دونوں کو پڑھے اور استغفار کرے تو اس کا وہ گناہ بخش دیا جاتا ہے: ''وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ (الآیہ) وَمَنْ يَّعْمَلْ سوءً اور يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غفوراً رحیماً'' (قرآن: ۳/۱۳۵) ''اور وہ جب برائی کریں یا خود پر ظلم کریں تو اللہ کو یاد کریں اور بخشش کے طالب ہوں......'' (قرآن ۴/۱۰۰) ''جو کوئی برائی کا ارتکاب کرے اور

خود اپنے او پر بیداد کرے اور پھر اللہ سے بخشش کا طالب ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کو بخش دینے والا مہربان پائے گا''۔

اللہ تعالیٰ رسولؐ سے فرماتے ہیں: ''فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ کَانَ تَوَّابًا'' (قرآن: ۳/۱۱۰) (اپنے رب کی تسبیح بیان کر اور اس سے بخشش مانگ کہ وہ خداوند توبہ قبول کرنے والا ہے) اسی بناء پر رسول (ﷺ) اکثر ''سُبحٰنکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِی اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّاب الرَّحِیم (اے اللہ تو پاک اور بے عیب ہے اور میں تیری ستائش کرتا ہوں' اے اللہ تو مجھے بخش دے کہ تُو توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے)۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا: ''جو کوئی استغفار بہ کثرت کرتا ہے وہ کسی اندوہ سے بھی دوچار ہو کشایش پالیتا ہے اور جس تنگی میں ہو اس سے خلاصی پالیتا ہے اور اسے روزی اس طرف سے پہنچتی ہے جو اس کے گمان میں بھی نہیں ہوتی''۔ نیز فرمایا: ''میں ہر روز ستر بار استغفار کرتا ہوں''۔ جب آنحضرت (ﷺ) کا معمول یہ ہو تو دوسروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی وقت بھی استغفار سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ نیز آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ جو کوئی سونے سے قبل تین مرتبہ کہے: ''اَسْتَغْفِرُ اللہَ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوم'' (میں اللہ سے معافی چاہتا ہوں جس کے سوا اور کوئی اللہ نہیں اور وہ زندہ و پائندہ ہے) تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ کثرت میں سمندر کی جھاگ' صحرا کی ریت' درختوں کے پتوں اور دنیا کے دنوں سے بھی زیادہ ہوں''۔ نیز فرمایا کہ: ''اگر کوئی بندہ گناہ کا مرتکب ہو جائے پھر اچھی طرح سے وضو کرے اور دو رکعت نماز ادا کرے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی بخشش چاہے تو ممکن ہی نہیں کہ اس کو بخش نہ دیا جائے''۔

دعا کے آداب

اے عزیز جان لے کہ تضرّع اور زاری کے ساتھ دعا مانگنا منجملہ قربات کے ہے۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا: ''دعا عبادت کا مغز ہے'' اس لیے کہ عبادت کا مقصود عبودیت ہے اور عبودیت خود شکستگی اور عظمتِ خداوندی کو یکجا دیکھے اور جانے اور دعا میں یہ دونوں چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انسان جس قدر زیادہ انکساری کرے گا اتنا ہی اچھا۔

دعا کے لیے آٹھ آداب کو ملحوظ رکھنا چاہیے:

اوّل: یہ کہ نہایت درجہ کوشش کرے کہ اوقاتِ شریف میں دعا مانگے جیسے عرفہ' رمضان' جمعہ' سحر گاہ اور درمیانِ شب کہ صاحب شرف اوقات ہیں۔

دوم: یہ کہ شریف احوال کو ملحوظ رکھے جیسے غازیوں کو کفار کے مقابلے میں جنگ کا وقت ہے یا بارش آنے کا وقت ہے یا فرض نماز کا وقت ہے۔ حدیث میں ہے کہ ان اوقات میں آسمان کے دروازے کھول دیئے

جاتے ہیں۔اسی طرح اذان اور اقامت کے درمیان کا وقت اور وہ وقت جب انسان روزہ سے ہو اور وہ وقت جب دل زیادہ رقیق ہو کہ دل کی رقّت کشادِ درِ رحمت کی دلیل ہوتی ہے۔

سوم: یہ کہ دونوں ہاتھ اٹھائے اور آخر میں چہرے پر لے آئے کیونکہ حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ اس سے کریم تر ہے کہ جو ہاتھ اس کے سامنے پھیلائے جائیں انھیں خالی لوٹا دے''۔رسول اللہ (ﷺ) فرماتے ہیں کہ: ''جو کوئی دعا کرتا ہے تو تین صورتوں سے خالی نہیں ہوسکتی؛ یا تو اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں یا اس وقت اس کو خیر سے بہرہ مند کر دیا جاتا ہے یا ترسیلِ خیر التوا میں ڈال دی جاتی ہے''۔

چہارم: یہ کہ دعا شک وتردید کے عالم میں نہ کرے بلکہ تہِ دل سے یقین رکھے کہ دعا قبول ہوگی۔ کیونکہ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے ''اُدعُوا اللہَ وَانتُم مُوقِنُونَ بِالاِجَابۃ'' (اللہ کو ایسے عالم میں پکارو کہ تمھیں یقین ہو کہ دعا مستجاب ہوگی)۔

پنجم: یہ کہ دعا زاری، تضرع، خشوع اور حضورِ قلب کے ساتھ کرے کیونکہ حدیث میں ہے کہ غافل دل سے کوئی دعا مسموع نہیں ہوتی۔

ششم: یہ کہ نماز ہو یا دعا انتہائے زاری والتماس وانکسار کے ساتھ کرنی چاہیے۔تکرار کرے اور خیال لائے اور کبھی یہ نہ کہے کہ میں نے اکثر دعا کی لیکن قبول نہ ہوئی کیونکہ دعا کے وقتِ اجابت اور اس کی مصلحت کو حق تعالیٰ بہتر جانتے ہیں اور جب دعا قبول ہو جائے تو سنت یہ ہے کہ کہے: ''اَلحَمدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ بِنِعمَۃِ تَتِمُّ الصَّالِحَات'' (سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں کہ جس کی صواب دید سے نیک کام انجام پاتے ہیں۔اگر اجابت میں دیر ہو تو کہے: ''الحمدللہ علیٰ کل حالٍ'' (ہر حال میں تعریف اللہ ہی کے لیے ہے)

ہفتم: یہ کہ پہلے تسبیح کرے اور رسول (ﷺ) پر درود بھیجے۔آنحضرت (ﷺ) دعا سے پہلے پڑھتے تھے''سُبحٰنَ رَبِّیَ الاعلی الوَھَّاب'' (پاک ہے میرا رب بڑے مرتبے والا بخشش دینے والا) نیز آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''جو کوئی دعا مانگنا چاہے تو چاہیے کہ پہلے مجھ پر درود بھیجے کہ اس طرح دعا لازماً قبول ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے بعید ہے کہ دعا کے ایک حصے کو قبول کرے اور دوسرے کو منع کر دے''۔

ہشتم: یہ کہ توبہ کرے اور مظالم کو کلیۃً ترک کر دے اور دل سراپا حق سے وابستہ کرے کیونکہ بیشتر وہ دعائیں مسترد ہوتی ہیں جو غافل دل کے ساتھ کی جائیں یا گناہوں کی ظلمت ہو۔کعب احبار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''بنی اسرائیل کو قحط کا سامنا تھا تو موسیٰ (علیہ السلام) اپنی تمام امت کے ساتھ نماز استسقا کے لیے تین بار نکلے لیکن دعا قبول نہ ہوئی۔حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر وحی آئی کہ تمھارے درمیان ایک غیبت کا مجرم ہے اور جب تک وہ

درمیان میں ہے دعا قبول نہ ہوگی۔ تو حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے استفسار کیا کہ نمّام کون ہے تاکہ میں اسے باہر نکال دوں'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تو تمھیں غیبت سے منع کرتا ہوں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں خود اس کا ارتکاب کروں؟'' تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی امت سے کہا: ''ہم سب غیبت اور نمّامی سے توبہ کرتے ہیں۔سب نے توبہ کی۔تو بارش شروع ہوگئی''۔ مالک دینار کہتے ہیں کہ: ''بنی اسرائیل کو قحط کا سامنا تھا تو وہ بارہا نماز استسقا کے لیے باہر نکلے لیکن دعا قبول نہ ہوئی تو ان کے پیغمبر پر وحی آئی کہ اپنی ملت سے کہو کہ تم نماز استسقا کے لیے باہر نکلے ہو اور دعا اس بدن کے ساتھ کر رہے ہو جو پلید ہے اور پیٹ تمھارے غذائے حرام سے پُر ہیں اور ہاتھ خون ناحق سے آلودہ تو ان احوال کے ساتھ باہر آنا میرے خشم میں افزونی کا باعث بنتا ہے۔ میرے سامنے سے دفع ہو جاؤ''۔

دعوات پراگندہ (مختلف دعائیں)

اے عزیز جان لے کہ دعاہائے ماثورہ بہت ہیں جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیں اور جن کا حکم دیا۔ان کے صبح وشام، نماز کے بعد اور دیگر مختلف اوقات میں کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ان میں سے بہت سی ہم نے اپنی کتاب احیاء علوم الدّین میں جمع کر دی ہیں جو ان کا طالب ہو وہاں سے لے لے۔بعض جو خوب تر ہیں وہ بدایت الہدایہ میں شامل ہیں، وہاں سے لی جا سکتی ہیں۔یہاں اس کتاب میں ان کو معرض تحریر میں لانا دراز ہے، ان میں سے بعض تو معروف ہیں جو اکثر کو پہلے ہی سے یاد ہوں گی۔

چند دعائیں وہ ہیں جو اسی قبیل کی ہیں اور ایسے مواقع پر جو حادث ہوں، کی جاتی ہیں۔سنت ہیں وہ کم لوگوں کو یاد ہوتی ہیں۔ان کا بیان کریں گے تاکہ یاد کر لیں اور معنی ان کے پہچانیں اور موقع کی مناسبت سے کی جائیں کیونکہ انسان کو کسی وقت بھی اپنے آقا یعنی حق تعالیٰ سے غافل نہیں رہنا چاہیے اور کسی وقت بھی تضرّع اور دعا سے خالی نہیں رہنا چاہیے۔

انسان جب گھر سے باہر نکلے تو چاہیے کہ یہ دعا مانگے: ''بِسۡمِ اللّٰہِ رَبِّ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَضِلَّ اَوۡ اُضَلَّ اَوۡ اَظۡلِمَ اَوۡ اُظۡلَمَ اَوۡ اَجۡهَلَ اَوۡ یُجۡهَلَ عَلَیَّ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لَا حَوۡلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَالتُّکۡلَانُ عَلَی اللّٰہِ ''(شروع اللہ کے نام سے، پروردگار! میں تیری پناہ کا طالب ہوں، اس سے کہ گمراہ ہوں یا گمراہ کروں، ستم کروں یا ستم سہوں، نادانی کروں یا نادانی کا سامنا کروں۔بنام اللہ جو وسعت عطا کرنے والا مہربان ہے، سوائے اللہ کے کسی کو توانائی اور قدرت حاصل نہیں اور توکل اللہ پر ہے''۔

اور جب مسجد میں داخل ہو تو یہ دعا پڑھے: ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ، اَللّٰهُمَّ

اغْـفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ ‘‘ (اے اللہ درود وسلام بھیج محمد ﷺ پر اور خاندان محمد پر‘ اے اللہ میرے گناہ بخش دے‘ اور اپنی عطا کے دروازے مجھ پر کھول دے)۔

جب کسی ایسی مجلس میں بیٹھے جہاں پراگندہ باتیں ہوں تو کفارہ اس کا یہ ہے کہ یہ دعا مانگے: ’’سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ عَمِلْتُ سوءً وظَلَمْتُ نَفْسِی فَاغْفِرْلِی ذُنُوبِی فَاِنَّ الذُّنُوبَ لَا يَغْفِرُهَا اِلَّا اَنْتَ ‘‘ (اے اللہ پاک اور بے عیب تو ہی ہے‘ میں تیری حمد کہتا ہوں‘ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا اور کوئی خدا نہیں‘ تجھ سے بخشش کا طالب ہوں‘ تیری ہی طرف لوٹتا ہوں‘ میں نے برا کیا اور خود پر ستم روا رکھا۔ تو میرے گناہ بخش دے کیونکہ سوائے تیرے اور کوئی گناہ بخشنے والا نہیں ہے)۔

اور جب بازار جائے تو کہے: ’’لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوتُ بِيَدِهِ الْخَيرِ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِير ‘‘ (اللہ کے سوا اور کوئی خدا نہیں‘ وہ یکتا اور لاشریک ہے‘ بادشاہ ہے اور سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں‘ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے‘ لیکن خود زندہ اور لایموت ہے‘ نیکی اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔ اور جب نیا لباس زیب تن کرے تو کہے: ’’اَللّٰهُمَّ كَسَوْتَنِی هذا الثَّوبَ فَلَكَ الحَمْدُ وَاَسالُكَ مِن خَيرِهٖ وَخَير مَاصُنِع لَه‘ وَاَعُوذُبِكَ من شَرِّه وشَرِّما صُنِعَ لَه‘‘ (اے اللہ تعریف تیری ہی ہے کہ تو نے یہ کپڑا مجھے پہنایا‘ اس کی خوبی اور خوبی کے ساتھ اسے استعمال کرنے کی توفیق تجھ سے چاہتا ہوں‘ اس کی برائی اور برے استعمال سے تیری پناہ کا طالب ہوں‘‘۔

اور جب ماہِ نو دیکھے تو کہے: ’’اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهٗ عَلَينا بِالاَمنِ والايمان والسَّلامَتِ وَالْاِسلامِ رَبِّی وَ رَبُّكَ الله‘‘ (اے اللہ اس چاند کو آسودہ دلی‘ ایمان‘ تندرستی اور اسلام عطا کر۔ اے چاند تیرا اور میرا رب اللہ ہے‘‘۔

اور جب آندھی چلے تو کہے: ’’اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسئَلُكَ خَيرَهٰذِهِ الرِّيحَ وَخَيرَمافِيهَا و خيرما اَرسِلتَ بِهٖ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِن شَرِّمَا فِيها وَشَرِّمَا اَرسِلَت به ‘‘ (اے اللہ اس ہوا کی نیکی اور جو کچھ اس میں ہے اور جو کچھ یہ ہمراہ رکھتی ہے اس کی اچھائی کا تجھ سے طالب ہوں‘ اور اس کی برائی سے جو اس میں ہے یا اس کے ہمراہ ہے اس سے بھی اللہ کی پناہ چاہتا ہوں)۔

اور جب کسی کی موت کی خبر سنے تو کہے: ’’سبحٰنَ الَّذِی لَایَمُوْتُ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن ‘‘ (پاک اور منزہ ہے میرا اللہ جو ہرگز نہیں مرے گا بے شک ہم اسی اللہ سے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے)۔

جب صدقہ دے تو کہے: ’’رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم ‘‘ (پروردگار! مجھ سے یہ قبول فرمالے کیونکہ تو ہی سمیع وعلیم ہے‘‘۔

جب کوئی نقصان ہو جائے تو کہے: ''عَسٰی رَبُّنَآ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رَاغِبُوْنَ'' (قرآن: ۳۲/۶۸) (ہم امید رکھتے ہیں کہ اللہ اس کا بدل ہمیں عطا فرمائے گا کہ ہم اپنے پروردگار کی طرف راغب ہونے والے ہیں)۔

اور جب کسی کام کا آغاز کرے تو کہے: ''رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا'' (قرآن: ۱۰/۱۸) (اے ہمارے رب اپنے پاس سے ہمیں بخشائش عطا کر اور ہمارا کام راستی، خوبی اور درستی کے ساتھ بنا دے)۔

جب آسمان پر نگاہ ڈالے تو کہے: ''رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا'' (قرآن: ۱۹۱/۳ و ۲۵/ ۶۱) (اے ہمارے رب تو نے اسے یہ گزاف اور باطل پیدا نہیں کیا۔ تو پاک اور بے عیب ہے۔ پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔ پاک اور بابرکت ہے وہ اللہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں دن کے لیے چراغ رکھا اور رات کے لیے روشن چاند)۔

اور جب کڑکنے والی بجلی کی آواز سنے تو کہے: ''وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِکَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ'' (قرآن: ۱۳/۱۳) (پاک ہے وہ ذات جس کی پاکی بیان کرتی ہے رعد اس کی تعریف کے ساتھ اور ملائکہ اس کے ڈر سے)۔

اور جب کہیں بجلی گرے تو یہ کہے: ''اَللّٰهُمَّ لَا تَقْتُلنا بِغَضَبِكَ وَلا تُهلِكنا بِعَذابِكَ وعَافِنَا قبلَ ذَلِكَ'' (اے اللہ ہمیں اپنے غضب سے نہ مار اور اپنے عذاب سے ہلاک نہ کر اور اس کے پہنچنے سے پہلے ہمیں معاف فرما دے)۔

اور بارش کے وقت کہے: ''اَللّٰهُمَّ جعَلهُ سُقِيًا هنيًا و صبا نافعًا واَجعَله سَبَّبِ رَحمَةٍ وَلَا تَجعَلهُ سَبَّبِ عذابٍ'' (اے اللہ اس کو ہماری گوارا سیرابی بنا اور نفع بخش اترنے والی بنا اور اسے بخشائش کا سبب بنا دے اور عذاب کا سبب نہ بنا)۔

غضب کے موقع پر کہے: ''اَللّٰهُمَّ اغفِرلِی ذَنبِی واذهَب غَیظَ قَلبِی وَاجِرنِی مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم'' (اے اللہ میرے گناہ بخش دے اور میرے دل کے خشم کو بٹھا دے اور مجھے راندۂ درگاہ شیطان سے اپنی پناہ میں لے لے)۔

اور خوف و ہراس کے موقع پر کہے: ''اَللّٰهُمَّ اِنّا ندرأُ بِكَ فِی نُحورِهم ونَعُوذ بِكَ مِن

شُـرُورِهِم ''(اے اللہ ہم تیری ہی مدد سے دشمنوں کے سینے پر ضرب لگاتے ہیں اور ان کے آزار سے تیری پناہ مانگتے ہیں)۔

اور جب کوئی جگہ مبتلائے درد ہو تو کہے: ''بِسْمِ اللہ (تین دفعہ) اور ''اعوذ باللہ وقدرته من شرّ ما اجدُ و اُحاذِر '' سات دفعہ کہے (میں اللہ اور اس کی قدرت میں پناہ لیتا ہوں۔ اس زیان سے جو میں دیکھتا ہوں اور اس سے پرہیز کرتا ہوں)۔

اور جب کوئی **اندوہ** پہنچے تو کہے: ''لَا اِلٰـه اِلَّا اللہ الـعَـلـيُّ الـحَكِيم' لا اِلٰـه الّا اللّٰهُ رَبّ الـعَرشِ العَظِيم '' (بلند پایہ خدائے دانا کے سوا کوئی خدا نہیں اور بزرگ عرش والے اللہ کے بغیر اور کوئی اللہ نہیں)۔

اور جب کسی کام میں **درماندگی** دیکھے تو کہے: ''اَللّٰهُـمَّ اِنِی عَبدُكَ وابنُ عَبدِكَ ابنُ اَمتِكَ نَاصِيتي بِيَدِكَ مَاضٍ فِيَّ حُكمكَ نَافِذٌ فِيَّ قضائُكَ اَسْاَلكَ بِكُلِّ اِسمِ سَمَّيتَ بِه نَفسَكَ وانزلته فِي كِتَابِكَ وَاعـطَيتَـه' اَحَدًا مِـن خَلقِكَ واستاثرت به فِي عِلمِ الغَيبِ عِندكَ ان تَجعَل القُرآن رَبِيعَ قلبی ونور صَدرِي وَجِلاَ غُمی ذِهَاب حُزني وهمّي '' (اے اللہ میں تیرا بندہ ہوں اور تیرے بندے کی اولاد اور اور تیری کنیز کی اولاد ہوں۔ میں تیرا فرماں بردار ہوں۔ میں تیرا فرمانبردار ہوں۔ تیرا حکم مجھ پر جاری ہے تو فیصلہ تیرا مجھ پر نافذ ہے۔ میں تجھے چاہتا ہوں ہر اس نام سے جو تو نے اپنے لیے رکھا ہے یا اپنی کتاب میں بھیجا ہے یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو ارزانی فرمایا ہے یا اسے اپنے علم غیب میں مخصوص کیا ہوا ہے۔ قرآن کو میرے دل کی بہار اور میرے سینے کا نور بنادے اور اسے میرے اندوہ افسردگی اور پریشانی کے ازالے کا سبب بنادے)۔

جب **آئینہ** دیکھے تو کہے: ''اَلـحَمدُ للهِ الَّـذِی خَـلَـقـنِـی فَـاحسَـنَ خَـلقِي وصَوَّرنِي فَاَحسَنَ صُـورَتِي '' (سب تعریفیں اللہ کی ہیں جس نے مجھے پیدا کیا اور خوب رُو پیدا کیا اور میرے چہرے کے عمدہ نقش و نگار بنائے)۔

جب کوئی **غلام خریدے** تو اس کی پیشانی کو پکڑ کر کہے: ''اَللّٰهُـمَّ اِنّي اَسئالُكَ خيرَه وخَيرَ مَا جُبِلَ عَـلَيـهِ وَاعُـوذُ بِكَ مِـن شرّه وشرمَا جُبِلَ عَلَيهِ '' (اے اللہ میں اس کی خوبی اور اس کی فطرت کی خوبی کا تجھ سے طالب ہوں اور اس کی بدی اور اس کی سرشت کی برائی سے تیری پناہ چاہتا ہوں)۔

سوتے وقت یہ دعا مانگے: ''رَبِّ بِـاسِـمِكَ وَضَعَتُ جَنبِی وبِاسمِكَ ارفعَه' هٰذِه نَفسِی اَنتَ تَتَـوفَّـا هـالَكَ مَـمَـاتُها وَمَحيَاهَا اِن اَمسَكتَهَا فَاغفِرلَهاواِن اَرسَلتَها فَاحفِظهَا بِمَا تَحفَّظ به عِبَادِكَ الـصَّـالِـحِين '' (اے پروردگار میں نے تیرے نام پر پہلو بستر پر رکھا اور تیرے ہی نام پر پہلو بدلوں گا۔ یہ میرا

نفس ہے کہ سراسر تیرے قبضے میں ہے۔ اس کی زندگی اور موت تجھی سے ہے۔ اگر تو اسے پکڑے تو معاف کر دینا اور اگر اس کو رہا کر دے گا تو اپنے نیکوکار بندوں کو جس طرح اپنی حفاظت میں رکھتا ہے اسے بھی پناہ دے)۔

اور جب بیدار ہو تو دعا پڑھے: اَلحمدُللهِ الَّذِی اَحیَانا بَعدَمَا اَمَاتَنا وَاِلیه النَّشُور' اَصْبَحنا وَ اَصبَحَ المُلکُ لِلّٰہ وَعَظَمَتُه' وَالسلطان للّٰہ والعِزّۃ وَالْقُدرۃُ للّٰہِ اَصْبَحنا عَلٰی فِطرۃِ الاِسْلَامِ و کلمۃ الاِخلاص وعلی دینِ نَبِیّنا مُحمَّد صَلّی اللّٰہِ عَلَیہِ وَسَلَّم وَعَلٰی مِلّتِ اَنبیا اِبراھِیمَ حَنِیفًا وَمَا کان مِنَ المُشرِکین '' (سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں کہ جو ہمیں موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔ اور ہمارا نشور قیامت اسی کی طرف ہے اور پادشاہ عالم وہی اللہ ہے بزرگی اور عزت اللہ ہی کو ہے' توانائی اور قدرت بھی اس ہی کو ہے۔ ہم فطرتِ اسلام اور کلمۂ اخلاص پر پیدا ہوئے ہیں اور آپ کے پیغمبر محمد (ﷺ) کے دین اور ملت ابراہیم جو یکتا گو' یکتا شناس اور یکتا پرست تھے اور اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والوں میں سے نہیں تھے' کے صدقے)۔

◆◆◆

اصل دہم: اوراد و وظائف کی ترتیب کے بارے میں

جو کچھ ہم نے مسلمانی کے عنوان کے تحت بیان کیا تھا اسی سے معلوم ہو گیا تھا کہ انسان کو اس عالمِ غریب میں کہ عالمِ آب وگل ہے۔ تجارت کے لیے بھیجا گیا ہے ورنہ اس کی روح کی حقیقت علوی ہے اور وہ وہاں سے آئی ہے اور عالمِ علوی ہی کو لوٹ جائے گی اور سرمایہ اس کا اس تجارت میں انسان کی عمر ہے اور یہ سرمایہ وہ ہے جو مسلسل خسارے میں جا رہا ہے۔ اگر اس کے ایک ایک سانس سے استفادہ نہ کیا جائے تو اسے نقصان پہنچے گا اور ہلاک ہو جائے گا۔ اسی بناء پر حق تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ...... '' (قرآن: ۲/۱۰۳ و ۳) (دنیا' شب و روز اور وقت کی قسم کہ انسان خسارے میں ہے مگر وہ جو ایمان لائے اور اعمال صالح کیے.....)۔ اس کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جس کا سرمایہ برف ہو موسم گرما میں رکھے کہ بیچے گا اور صدا یہ دے اے مسلمانو! اس شخص پر رحم کرو کہ جس کا سرمایہ پگھل رہا ہو'۔ اور عمر کا سرمایہ مسلسل پگھل رہا ہے کیونکہ ہماری زندگی کے لمحات معدودے چند ہیں جن کا علم حق تعالیٰ کو ہے۔ پس جنھوں نے اس کام کی اہمیت کو سمجھا انھوں نے اپنے انفاس کی مراقبت کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ زندگی کا ایک ایک لمحہ ایک گرانقدر گہر کی مانند ہے جو انھیں سعادتِ ابد فراہم کر سکتا ہے۔ اور وہ اس

پر کسی سونے چاندی کے سرمایہ دار سے بڑھ کر مشفق تھے اور شفقت یوں تھی کہ انھوں نے اوقاتِ شب وروز کو اعمالِ خیر کے لیے تقسیم کر رکھا تھا اور انھوں نے ہر چیز کے لیے وقت معیّن کیا اور مختلف وِردوں کے لیے وقف کر دیا۔ اور ہر وِرد کی بنیاد اس انداز سے رکھی کہ ان کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ سعادتِ اُخروی کو وہی پہنچتا ہے جو عالم کے مشاغل سے ہاتھ کھینچ لے اور حق تعالیٰ کا اُنس اور محبت اسی پر غالب ہو اور اُنس مسلسل ذکر کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح محبت معرفت کے بغیر حاصل ہونے کی نہیں اور معرفت کا حصول بدونِ تفکر کے ممکن نہیں۔ پس ذکر کی مداومت اور فکر سعادت کا بیج ٹھہرے اور ترکِ دنیا اور شہوات ومعاصی کا ترک اس لیے لازم ٹھہرا تا کہ ذکر وفکر کے لیے فراغت پائیں۔

دوامِ ذکر کے دو طریقے ہیں: ایک یہ کہ اللہ اللہ بہ دوام کہتا رہے۔ دل سے' نہ کہ زبان سے۔ بلکہ دل سے بھی نہ کہے کیونکہ 'کہنا' حدیثِ نفس کا سا ہے بلکہ مشاہدے میں رہے اس طور کہ کبھی غافل نہ ہو۔ لیکن یہ بڑا متعذر اور دشوار ہے اور ہر کوئی اس کی طاقت نہیں رکھتا کہ اپنے دل کو ہمیشہ ایک صفت اور ایک حالت پر قائم رکھ سکے۔ اس یکسانی سے انسان ملال کا شکار ہو جاتا ہے۔ پس اسی بناء پر اوراد کی مختلف صورتیں وجود میں آتی ہیں۔ بعض جسم سے متعلق ہیں جیسے نماز بعض زبان سے متعلق ہو گئیں جیسے تلاوتِ قرآن وتسبیح اور بعض دل سے مربوط ہیں جیسے تفکر وتامل تا کہ ملال کا سامنا نہ ہو کیونکہ ہر وقت ایک نیا مشغلہ چاہیے اور ایک حال سے دوسرے حال میں تبدیلی سکون کا باعث ہوتی ہے۔

اور ذکر کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اوقاتِ اوراد' ان اوقات سے جو حاجات دنیا میں لازماً صرف کرنے پڑتے ہیں' سے متمیز ہو جائیں اور اصل یہ ہے کہ انسان اگر جملہ اوقات کارِ آخرت میں صرف نہ کر سکے تو کم از کم بیشتر اوقات اس کے لیے وقف کرے تا کہ نیکیوں کا پلڑا بھاری رہے کیونکہ اگر نصف اوقات دنیا سے تمتع اور مباحات میں صرف کرے اور اسی قدر دین کے کام میں صرف کرے تو خطرہ اس بات کا ہے کہ کارِ دنیا کا پلڑا بھاری ہو جائے کیونکہ انسان مقتضائے طبع کی تکمیل کی طرف کہ انسان فطرت سے جلد مائل ہو جاتا ہے اور دل کو کارِ دین میں مشغول کرنا اس کی فطرت کے برعکس ہے اور اس میں اخلاص پیدا کرنا مشکل ہے اور بے اخلاص جو کام بھی کیا جائے بے فائدہ ہے۔ اس لیے اعمال کی کثرت ہونی چاہیے تا کہ ایک آدھ تو بہ اخلاص سرزد ہو۔ اس بناء پر چاہیے کہ بیشتر اوقات اعمالِ دین میں صرف کیے جائیں اور کارِ دنیا کارِ دین کے مقابلے میں کم اوقات میں سرانجام ہو۔ اسی لیے آنحضرت (ﷺ) نے اللہ تعالیٰ کے اس قول: ''وَمِنْ اٰنَآیِٔ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّھَارِ لَعَلَّکَ تَرْضٰی '' (قرآن: ۱۳۰/۲۰) (رات کی گھڑیوں میں بھی اللہ کی حمد بیان کر' نماز ادا کر

اور دن کے گوشوں میں بھی تا کہ شاید تجھے مسرور کرتا کہ تُو مسرور رہو)۔اور نیز فرمایا: ''وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا؛ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَه وَسَبِّحه لَيلًا طَوِيْلًا ؛اور نیز فرمایا: ''كانوا قليلاً من الليل ما يهجعون'' (قرآن:۷۶/۲۵)(اور اپنے رب کو یاد کر اس کے نام سے صبح شام)(قرآن:۷۶/۲۶)اور رات کو اس کو سجدہ کر اور طویل راتوں میں اس کی عبادت کر اور حمد بیان کر)۔ان تمام آیات میں اشارہ اس بات کا ہے کہ بیشتر اوقات حق تعالیٰ کے ساتھ مشغولی میں صرف ہونے چاہییں جو اوقاتِ شب و روز کو اس کے منقسم کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔پس اس امر کا بیان لازم و لابد ہے۔

دن کے اوراد معلوم کرنا

معلوم رہے کہ دن میں پانچ اوراد ادا ہونے چاہییں:

وِرد اوّل: یہ سحر سے طلوع آفتاب تک ہے اور یہ وقت بڑی بزرگی کا مالک ہے۔اللہ تعالیٰ نے یہ سوگند اس کا ذکر ''وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ''[1] کہہ کر کیا ہے۔نیز ''قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ''[2] نیز فرمایا: ''فَالِقُ الْاِصْبَاحِ''[3] یہ جملہ اسی امر میں ہے۔تو چاہیے کہ ان اوقات میں انسان اپنے تمام انفاس کا مراقبہ کرے۔

اور جب نیند سے بیدار ہو تو کہے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ''[4] اور دعا جس کا ذکر ہو چکا کرے اور لباس پہنے اور دعا میں مشغول ہو جائے۔لباس پہنتے وقت نیت شرم گاہ چھپانے اور اللہ کی فرماں برداری کی کرے اور ریا اور رعونت کے خیال سے دور رہے۔جب عبادت کے لیے جائے تو پہلے بایاں پاؤں رکھے اور وضو و مسواک کے بعد جیسا کہ بیان ہوا ذکر اذکار اور دعوات انجام دے۔صبح کی نماز کی سنتیں گھر میں ادا کرے پھر مسجد میں چلا جائے کیونکہ آنحضرت ﷺ ایسے ہی کرتے تھے۔ادائے سنت کے بعد جو دعا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے وہ ہماری کتاب بدایۃ الہدایہ میں موجود ہے، وہاں سے یاد کر لے اور ادا کرے۔پھر مسجد کو چلا جائے آہستہ پا کے ساتھ اور مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دایاں پاؤں رکھے اور مسجد میں داخلے کے وقت کی دعا پڑھے اور قصد صف اول کا کرے۔اور اگر گھر میں سنتیں ادا نہ کی ہوں تو سنتیں

---

(۱) (قرآن:۸۱/۱۸)(قسم ہے صبح کی جب نمودار ہو)

(۲) (قرآن:۱۱۳/۱)(کہہ دو میں پناہ مانگتا ہوں نمودار کرنے والے خدا کی)

(۳) (قرآن:۶/۹۶)(رات میں سے دن کو پھاڑنے والا)

(۴) سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں موت کے بعد زندہ کیا اور نشور روزِ قیامت اسی کی طرف ہے۔

ادا کرے۔ اگر گھر میں پڑھ کے آیا ہے تو تحیتِ مسجد کے دو نفل ادا کرے اور نماز جماعت کے انتظار میں بیٹھ جائے اور اس دوران تسبیح واستغفار میں لگا رہے۔ جب فرض نماز ادا کر چکے تو مسجد ہی میں طلوع سورج تک بیٹھا رہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ میں چار غلام آزاد کرنے کی نسبت مسجد میں بیٹھنے کو زیادہ عزیز رکھتا ہوں اور طلوع آفتاب تک ان چار قسم کے ذکر میں لگا رہے: دعا، تسبیح، تلاوتِ قرآن اور تفکر۔

جب نماز سے سلام پھیرے تو ابتداء دعا سے یہ کہتے ہوئے کرے: ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّد؛ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلاَم ومنکَ السَّلام وَاِلیکَ یعودُالسَّلام حَیِّنا رَبَّنا بِالسَّلام وَادخِلنا دَارَالسَّلام تبارَکتَ یَاذَالجلالِ وَالْاِکرام ''یعنی (اے اللہ محمد (ﷺ) اور آلِ محمد (علیہم السلام) پر درود بھیج، اے اللہ تو سلام ہے اور تجھی سے سلام ہے اور سلام تیری ہی طرف لوٹتا ہے۔ اے اللہ ہمیں سلام سے خوش نصیبی عطا فرما اور بہشت میں جگہ عطا فرما، اے صاحبِ عظمت وشرف تو ہی مبارک اور بزرگوار ہے۔ پھر اسی وقت کی دعائے ماثورہ پڑھنے میں لگ جائے۔ یہ دعا احیاء علوم الدین یا دعوات سے یاد کی جاسکتی ہے۔

جب دعا سے فارغ ہو جائے تسبیح وتہلیل میں لگ جائے۔ ہر ایک ۱۰۰ بار یا ۷۰ بار یا ۱۰ بار کہے۔ جب ۱۰ اذکار کو دس دس بار ادا کرے گا تو مجموعاً سو ہو جائے گا۔ اور تعداد اس سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ اور ان دس اذکار کی فضیلتوں کے باب میں بہت کچھ کہا گیا ہے جن کی یہاں نقل اس لیے نہیں کی کہ بات لمبی ہو جائے گی۔

دس اذکار یہ ہیں:

اوّل: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ یُحیِ وَیُمِیْتُ وَھُوَ حَیٌّ لَا یَمُوتُ بِیَدِہِ الْخَیْرُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر۔

دوم: یہ کہ: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ الْمُبِیْن (سوائے اللہ کے کوئی اللہ نہیں جو برحق آشکارا بادشاہ ہے)۔

سوم: سُبْحٰنَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَر وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم۔

چہارم: ''سُبْحٰنَ اللّٰہِ الْعَظِیْم وَبِحَمْدِہٖ' (پاک ہے وہ ذات جو عظمت والی ہے اور جملہ تعریفوں کی مالک)۔

پنجم: ''سبوحٌ قدوسٌ رَبُّ الْمَلٰئِکَۃِ وَالرُّوح '' (پاک ہے بے عیب ہے اور ستائش کیا جاتا ہے اور فرشتوں اور روح کا رب ہے)۔

ششم: اَستَغفِرُاللہ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّاھُوَالحَیُّ القَیُّوم وَاَسالُہُ التَّوبَہ ''(میں بخشش مانگتا ہوں اس اللہ سے جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ زندہ و پائندہ ہے اور اسی سے توبہ کا طالب ہوں؛۔

ہفتم: یَا حَیُّ یَا قَیُّوم بِرَحْمَتِكَ اَستَغِیْثُ لَا تکلنی اِلٰی نَفسِی طَرفَۃَ عَیْنٍ وَاصلِح لِی شَأنی کُلَّہ''(اے زندہ و پائندہ میں تیری مہربانی کے لیے دستِ نیاز پھیلا رہا ہوں کہ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی نہ چھوڑنا اور میرے تمام کام درست فرمانا''۔

ہشتم: اَللّٰھُمَّ لامانِعَ لِمَا اَعطَیتُ ولا مُعطِی لِمَا مَنَعتَ ولا ینفعُ ذا الجَدِّ مِنكَ الجد'' (اے اللہ تجھے بخشش سے روکنے والا کوئی نہیں اور جس کو تو مانع ہے اسے عطا کرنے والا کون ہے اور تجھ سے فیض پانے والے کو کسی کوشش کی حاجت نہیں۔

نہم: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ(ﷺ)

دہم: ''بِسْمِ اللہِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِہٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَھُوَالسَّمِیْعُ الْعَلِیْم''(بنام اللہ کہ جس کے نام کے ساتھ زمین و آسمان میں کوئی چیز نقصان نہیں پہنچاتی)۔

یہ دس کلمات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو دس دفعہ یا جتنی بار بھی کہہ سکتا ہے کہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی جداگانہ فضیلت ہے اور ہر ایک مختلف لذت اور جداگانہ انس ہے۔ یہ کر چکے تو تلاوت قرآن میں مشغول ہو جائے۔ اور اگر حفظ نہ ہو تو تفاریقات قوارع[1] قرآن سے یاد کرے اور انہیں پڑھے۔ جیسے کہ آیۃ الکرسی[2] وامن الرسول[3] وشھداللہ[4] وقل اللھم ملك الملك[5] واول سبح[6] الحدید وآخر سبح الحشر'' ہیں۔

اور اگر کوئی جامع چیز کا خواہاں ہو تو قرآن سے اور ذکر اللہ سے تو جو کچھ خضر (علیہ السلام) نے ابراہیم تیمی کو

---

۱ قوارع (جمع قارعہ، حوادث زمانہ، سختیاں وہ چیزیں جن سے دل خوف کے مارے لرزنے لگتا ہے۔ تفاریقات قوارع: وہ مختلف آیات جو دفع شیطان اور دفع بلا کے لیے ہیں۔

۲ (قرآن: ۲۵۵/۲)

۳ (قرآن: ۲۸۵/۲)

۴ (قرآن: ۱۸/۳)

۵ (قرآن: ۲۶/۳)

۶ (قرآن: سورہ الحدید ۵۷: وسورہ الحشر ۵۹ دونوں کلمہ سبح سے شروع ہوتی ہیں۔ احیاء میں الحدید کی پہلی پانچ آیات اور تین سورہ الحشر کی آخری لکھا ہے۔

سکھایا تھا' ان کے مکاشفات میں کہ جو انھیں ہوئے اسے پڑھے کیونکہ اس میں فضیلت بہت ہے۔ اسے مسبعات عشر کہتے ہیں۔ وہ دس ہیں۔ ہر ایک سات بار۔ الحمد شریف' والموذتین' سورۂ اخلاص' قل یا ایھا الکافرون' آیۃ الکرسی یہ چھ تو قرآن میں سے ہیں اور باقی چار اذکار حسب ذیل ہیں:

۱۔ ''سُبحٰن اللهِ وَالحَمدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَکبر''

۲۔ ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ''

۳۔ ''اَللّٰھُمَّ اغفِر لِلمُؤمِنِینَ وَالمُومِنَاتِ''

۴۔ ''اَللّٰھُمَّ اغفِرلِی وَلِوَالِدَیَّ وَارحَمھُمَا وَافعل بی وبھم عاجلاً وآجلاً فِی الدِّین وَالدُّنیَا وَالآخِرۃ مَا اَنتَ لَه' اهل وَلَا تفعَل بنا یا مولانا مانَحنُ اهلُه اِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِیم'' (اے اللہ مجھے اور میرے والدین کو بخش دے اور ان دونوں کے ساتھ مہربانی فرما۔ میرے ساتھ اور میرے والدین کے ساتھ حال وآئندہ میں' دین ودنیا میں اور آخرت میں وہ سلوک کر جس کا تو سزاوار ہے اور ہمارے ساتھ وہ نہ کرنا جس کے مستحق ہیں' کیونکہ تو بخشنے والا اور مہربان ہے)۔ اور اس کی فضیلت میں بھی حکایت ہے جسے ہم نے احیاء علوم الدین میں بیان کیا ہے۔ جب ان اوراد سے فارغ ہو جائے تو تفکر میں لگ جائے۔ اور تفکر کا میدان بہت وسیع ہے۔ جو اس کتاب کے آخر میں بیان ہوگا لیکن جو ہر روز مہم ہے وہ یہ ہی کہ انسان موت زندگی اور اجل کے بارے میں تفکر کرے اور اپنے آپ سے کہے: ''موت آنے میں ایک دن باقی ہے''۔ اور فائدہ اس کا بہت عظیم ہے۔ کیونکہ لوگوں نے دنیا ہی کو اپنا قبلہ بنالیا ہے جس کا سبب طولِ امل ہے۔ کیونکہ اگر بہ یقین جانتے کہ ایک ماہ یا ایک سال کے بعد مر جائیں گے تو جس کام میں بھی لگے ہوتے اسے چھوڑ بیٹھتے۔ امکان یہ بھی ہے کہ اگلے روز ہی مر جائیں۔ درآنحالیکہ وہ ایسے کام میں لگے ہوتے ہیں کہ جس کی ضرورت شاید دس برس میں بھی نہ ہو۔ اسی لیے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اَوَلَم یَنظُرُوا فِی مَلَکُوتِ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ مَا خَلَقَ اللهُ مِن شَیءٍ وَاَن عَسٰی اَن یَکُونَ قَد اِقتَرَبَ اَجلُھُم' (الآیہ)۔ (قرآن ۷/۱۸۵)

اور انسان جب دل کو پاک کر لے اور سوچ بچار کرے تو زادِ آخرت تیار کرنے کی رغبت دل میں تحریک پاتی ہے۔ پس انسان کو تفکر کرنا چاہئے تاکہ اس چند روزہ زندگی میں اسے خیر میسر ہو سکے۔ پھر جو کچھ معصیت میں سے ہے اس سے حذر کرنا چاہئے اور ماضی میں جو تقصیر کی ہو اس کا تدارک کرنا چاہئے جس کے لئے تدبیر و تفکر لازم ہے۔

پس اگر کسی کو وسیع النظری میسر ہو کہ زمین وآسمان کی سلطنت پر نگاہ ڈالے اور عجائب صنع میں غور

کرے بلکہ حضرت الٰہیت کے جلال و جمال کو دیکھے تو یہ فکر تمام عبادات اور تفکر سے بڑھ کر ہے۔ بجز اس کے کہ تعظیم حق تعالیٰ اس کے دل پر غالب ہو جائے۔ اور جب تک تعظیم غالب نہ ہو محبت غالب نہیں ہوتی اور کمالِ سعادت حاصل نہیں ہوتا۔ اور کمالِ سعادت کمالِ محبت میں ہے اور یہ ہر کسی کو میسر نہیں ہوتا۔ لیکن بدلے اس کے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں پر غور کرے جن سے خود بہرہ ور ہے۔ اور وہ رنج و محن جو دنیا میں مثلاً بیماری' افلاس وغیرہ یعنی وہ عقوبات جن سے اسے نجات ملی ہوئی ہے۔ ان پر غور کرے تاکہ اسے معلوم ہو کہ اس پر تو اللہ کا شکر واجب ہے اور شکر اس طرح ادا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان بجالاتا ہے اور گناہوں سے دور رہے۔ مختصر یہ کہ انسان ایک گھڑی اس باب میں تفکر کرے کہ طلوعِ سحر کے بعد سنّت اور فرض نماز کے علاوہ طلوع آفتاب تک اور کوئی نماز نہیں بلکہ بدل اس کا ذکر و فکر ہے۔

اور **وِردِ دوم**: یہ ہے کہ طلوعِ آفتاب کے بعد چاشت گاہ تک چاہیے کہ اگر ممکن ہو تو سورج نکلنے تک مسجد ہی میں ٹھہرے۔ حتیٰ کہ سورج ایک نیزہ بھر اونچا ہو جائے۔ تسبیح میں مشغول رہے تاکہ نماز کے لیے جو مکروہ وقت ہے وہ گذر جائے۔ پھر دو رکعت نماز پڑھے اور جب چاشت گاہ فراخ ہو جائے یہاں تک کہ ان کا ایک چوتھائی تمام ہو جائے تو ایسے میں چاشت کی نماز فاضل تر ہے۔ لہٰذا تو چار' چھ یا آٹھ رکعت نماز ادا کرے کہ یہ سب تعداد نفل ہوئی ہیں۔ اور جب سورج بلند ہو جائے اور یہ رکعتیں ادا کر چکا ہو تو ان چیزوں میں جو مخلوق سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً بیمار کی عیادت' جنازے کے ساتھ یا مسلمانوں کی ضروریات پوری کرنا یا کسی علمی مجلس میں شرکت وغیرہ میں مشغول ہو جائے۔

اور **وِردِ سوم**: چاشت گاہ سے لے کر نمازِ ظہر تک یہ حکم مردوں کے لیے مختلف قسم کا ہے جو چار حال سے خالی نہیں ہوگا:

حالتِ اوّل: یہ ہے کہ تحصیلِ علم پر قادر ہو اور کوئی عبادت تحصیل علم سے بڑھ کر نہیں بلکہ جو اس پر قادر ہو تو اسے چاہیے کہ جب نماز فجر ادا کر چکے اولیٰ تر ہوگا کہ حصول علم میں لگ جائے لیکن وہ علم پڑھے جو آخرت کے لیے مفید ہو۔ وہ علم وہ ہے جو دنیا کی طرف رغبت کو ضعیف اور آخرت کی طرف رغبت کو توانائی بخشے اور اعمال کے عیوب و آفات اس پر روشن کرے اور اخلاص کی طرف بلائے۔ لیکن جدل و مناظرہ اور علم قصص اور منبر گوئی جس کے ڈانڈے صنائع شعری سے ملے ہوئے ہیں' یہ سب حرص و دنیا کی فزونی کا باعث ہیں اور دل میں حسد و مباہات کی تخم ریزی کا باعث ہیں۔ علم نافع کیا ہے۔ ہم نے کتاب 'احیاء' اور 'جواہر القرآن' میں نیز اس کتاب میں مجموعاً بیان کر دیا ہے اسے دیگر علوم سے قبل حاصل کر لینا چاہیے۔

حالتِ دوم: یہ ہے کہ اس کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ لیکن ذکر و عبادت میں مشغول رہ سکتا ہو تو یہ درجہ عابدوں کا ہے اور ایک عظیم مقام' خصوصاً اگر ایسے ذکر میں مشغول ہو سکے جو دل پر غالب ہو اور دل میں متمکن اور ملازم ہو جائے۔

حالتِ سوم: یہ ہے کہ کسی ایسی چیز میں مشغول ہو جو خلق کی راحت کا باعث ہو۔ جیسے کہ صوفیاء' فقہا اور درویشوں کی خدمت ہے تو یہ نفلی عبادات سے بہتر ہے۔ کیونکہ یہ بیک وقت عبادت بھی ہے اور مسلمانوں کی راحت بھی۔ اور اُن عبادات کے لیے معاونت بھی اور متذکرہ مخدوموں کی دعاؤں کی برکات عظیم اثر رکھتی ہیں۔

حالتِ چہارم: یہ ہے کہ کوئی اس پر قادر نہ ہو لیکن اپنے لیے اہل و عیال کے لیے کسب روزی کے لیے مصروف ہو تو جب کسب روزی میں امانت کو ملحوظ رکھے اور مخلوق اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ ہوں اور حرصِ دنیا اسے زیادہ کی طلب میں ملوث نہ کر سکے اور وہ بقدرِ کفایت قناعت کرے تو وہ بھی جملہ عابدوں میں سے ہے اور اصحاب الیمین کے درجہ میں شمار ہو گا اگرچہ سابقان و مقربان میں سے نہ بھی ہو اور درجہ سلامت کو لازم رکھنا پست ترین درجہ ہے۔ اور وہ جو چاروں قسم کے احوال و اوراد والے اصحاب میں سے نہ ہو تو وہ ہالکوں میں سے ہے اور شیطان کے ساتھیوں اور پیرؤوں میں شمار ہو گا۔

اور وِردِ چہارم: اس کا وقت زوال کے وقت سے لے کر نمازِ عصر تک ہے۔ تو چاہیے کہ زوال سے پہلے قیلولہ کرے اور قیلولہ نماز عشاء کے لیے ایسے ہی ہے جیسے روزہ کے لیے سحور۔ لیکن جو شب کا قیام نہ کرے تو قیلولہ اس کے لیے مکروہ ہے۔ کیونکہ زیادہ سونا بھی پسندیدہ نہیں۔ اور جب بیدار ہو جائے تو چاہیے کہ نمازِ ظہر سے پہلے طہارت کرے اور کوشش یہ کرے کہ نماز کی اذان سے پہلے مسجد میں پہنچ جائے اور نماز تحیۃ مسجد ادا کرے اور جب موذن اذان دے تو چار رکعت نماز فرض سے پہلے ادا کرے۔ کیونکہ آنحضرت (ﷺ) ان چار رکعتوں کو بہت طول دیتے تھے اور فرماتے کہ "اس وقت میں آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں"۔ اور حدیث میں ہے کہ "جو شخص یہ چار رکعت نماز ادا کرتا ہے ستر ہزار فرشتے اس کے ساتھ یہ نماز ادا کرتے ہیں اور رات آنے تک اس شخص کے لیے بخشش طلب کرتے ہیں"۔ پھر امام کے اقتداء میں نماز فرض ادا کرے۔ پھر دو رکعت نماز سنت پڑھے۔ اور نماز عصر تک سوائے حصولِ علم کے یا کسی مسلمان کے امداد یا ذکر یا تلاوت قرآن یا بہ کسب حلال بقدرِ حاجت کسی کام میں مشغول نہ رہے۔

اور وِردِ پنجم: نماز عصر سے غروبِ آفتاب تک کے لیے ہے۔ چاہیے کہ نمازِ عصر سے پہلے مسجد میں آ جائے اور چار رکعت نماز ادا کرے۔ "اللہ تعالیٰ اس پر رحمت کرے جو فرض نماز دیگر سے پہلے چار رکعت نماز

ادا کرتا ہے''۔ اور جب فرض نماز سے فارغ ہو جائے تو جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں اس کے سوا کسی اور کام میں نہ لگے۔ پھر نمازِ مغرب سے پہلے مسجد میں پہنچ جائے اور تسبیح استغفار میں لگ جائے کیونکہ اس وقت کی فضیلت سحر گاہ کی فضیلت جیسی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس و قبل الغروب '' (قرآن: ۵۰/۳۶) (اپنے اللہ کی حمد میں نماز ادا کر سورج طلوع ہونے سے پہلے اور غروب آفتاب سے قبل)۔ اور اس وقت چاہیے کہ ''والشمس وضحٰها'' (۱) واللیل اذا یغشٰی' (۲) والمعوذتین (۳) پڑھے۔ اور چاہیے کہ جب سورج غروب ہو تو بندہ استغفار میں ہو۔ مختصر یہ کہ اوقات منقسم ہیں اور ہر وقت کے لیے ایک مختلف کام مقرر ہے جو اس وقت کا مقتضی ہوتا ہے کہ عمر کی برکت اسی سے ظہور میں آتی ہے اور وہ جس نے ان اوقات کا شعور حاصل نہ کیا ہو کہ کون سا وقت کس کام کے لیے ہے تو اس نے گویا اپنی عمر ناحق کھو دی۔

اور وقتِ شب کے اوراد تین ہیں

وِردِ اوّل: جو نماز مغرب سے نماز عشاء تک ہوتا ہے اور ان دو نمازوں کے درمیان بیدار رہنا عظیم فضیلت کا مالک ہے۔

اور حدیث میں ہے کہ ''تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (قرآن: ۳۲/۱۶) (ان کے پہلو ان کی خواب گاہوں سے بیدار ہو جاتے ہیں' تو وہ اپنے اللہ کو پکارتے ہیں بیم و امید کے عالم میں)۔ اسی کے لیے قرآن میں آیا ہے چاہیے کہ نماز میں مشغول رہے حتٰی کہ نماز عشاء ادا کرے۔ اور اسلاف دن بھر روزہ رکھنے اور اس وقت افطاری میں مصروف رہنے کی بجائے اس کو ترجیح دیتے تھے۔ جب ادائے نماز وتر سے فارغ ہو جائے تو چاہیے کہ بے ہودہ باتوں یا لہولعب میں مشغول نہ ہو کہ انجام شغل اس پر ہو بلکہ حق یہ ہے کہ اعمال کا انجام سوائے خیر کے نہیں ہونا چاہیے۔

اور وِردِ دوم خواب ہے: نیند ہر چند بذات خود عبادت نہیں لیکن اگر آداب و سنن سے مزین ہو تو مثل عبادت کے ہے۔ سنت یہ ہے کہ رُو بقبلہ سوئے اور شروع میں دائیں کروٹ پر سوئے۔ جیسے کہ مردے کو لحد میں لٹاتے ہیں اور جان لے کہ نیند موت کی بہن ہے اور بیداری حشر کی مانند ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو روح نیند میں الگ کر لی جاتی ہے بیدار ہونے پر لوٹائی نہ جائے' اس لیے چاہیے کہ کارِ آخرت کو آمادہ رکھے اور یہ بھی چاہیے کہ باوضو ہو کر سوئے اور توبہ بھی کرے اور یہ عزم بھی کہ دوبارہ معصیت کا ارتکاب نہیں کرے گا اور اگر بیدار ہو

(۱) سورہ ۹۱ (۲) سورہ ۹۲ (۳) سورہ ۱۱۳ و ۱۱۴

جائے تو وصیت لکھ کر سرہانے کے نیچے رکھے اور بہ تکلف اپنے اوپر نیند طاری نہ کرے۔ اور نرم بستر پر نہ سوئے تاکہ خواب غالب نہ ہونے پائے کیونکہ سونا عمر کا کھونا ہے۔ چاہیے کہ شبانہ روز میں کہ چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں ان میں آٹھ گھنٹوں سے زیادہ نہ سوئے کیونکہ اس انداز سے بھی ساٹھ سالہ عمر سے بیس سال نیند ہی کی نذر ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا اسے زیادہ ضیاع اوقات نہ ہونا چاہیے۔ اور چاہیے کہ پانی اور مسواک سونے سے قبل اپنے ہاتھ سے موقع پر رکھے تاکہ اگر رات کو یا سحر گاہ نماز کے لیے اٹھے' چاہئے کہ رات کے قیام کی نیت کرے یا سحر گاہ اٹھنے کی نیت کر کے سوئے کیونکہ جب یہ نیت کرے گا تو مستحق ثواب ہوگا۔ اگرچہ خواب سے مغلوب رہ جائے۔

اور جب پہلو زمین پر رکھے تو کہے: ''رَبِّ بِاسمِكَ وَضعتُ جَنبِي وبِاسمِكَ اَرفَعُهٗ'' (اے پروردگار میں نے تیرے نام سے پہلو بستر پر رکھا اور تیرے ہی نام سے پہلو اٹھاتا ہوں) اور جو دعائیں ہم نے بیان کی ہیں انھیں یاد کرے اور آیة الکرسی و آمن الرسول ومعوّذتین وسورہ تبارك پڑھے۔ جیسے سونے سے پہلے' اسی طرح ذکر کے درمیان اور وضو کے موقع پر کرے۔ اور جو ایسا کرے گا تو اس کی روح کو عرش پر لے جایا جائے گا اور نامۂ اعمال میں ثواب لکھا جائے گا یہاں تک کہ بیدار ہو جائے۔

اور وِردِ سوم تہجد ہے۔ اور نمازِ شب یعنی آدھی رات گذرنے پر بیداری کی نماز۔ کیونکہ رات کے پچھلے حصۂ نصف میں دو رکعت نماز دوسری تمام نمازوں کے اوقات میں نماز ادا کرنے کی نسبت فاضل تر ہے۔ کیونکہ اس وقت میں دل پاک تر ہوتا ہے۔ اور دنیا کا کوئی مشغلہ نہیں ہوتا۔ اور آسمان کے رحمت کے دروازے کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور احادیث قیام شب کے باب میں بہت سی ہیں۔ ان کا ذکر ہم نے احیاء العلوم الدین میں کیا ہے۔ مختصر یہ کہ چاہیے دن رات کے جملہ اوقات میں انسان کسی نہ کسی عمل خیر میں لگا رہے اور اس میں کسی قسم کی فروگذاشت نہ کرے۔ اور جب اس نے ایک شبانہ روز اس طرح کیا تو آخر عمر تک اسے معمول بنالے۔ اگر کسی پر یہ دشوار ہو تو اسے چاہئے کہ طول امل میں نہ بڑھے اور خود سے کہے کہ ''آج تہجد پڑھتا ہوں کیونکہ ہوسکتا ہے آج ہی رات میں مرجاؤں۔ آج رات یہ کرلوں کیونکہ ہوسکتا ہے کل مرجاؤں''۔ روزانہ اسی طرح کرے۔ ان شاء اللہ معمول بن جائے گا۔

اور معمولِ مواظبت میں رنج دیکھے تو جان لے کہ وہ سفر میں ہے اور وطن اس کا آخرت کا گھر ہے۔ اور سفر میں حضر کی نسبت تکلیف تو ہوتی ہی ہے۔ لیکن اطمینان یہ ہوتا ہے کہ زود گذر ہے۔ وطن میں جا کر آرام کرلیں گے۔ اور مقدار عمر ظاہر ہے کہ مختصر ہے۔ بہ مقابل اس عمر جاوداں کے جو آخرت میں عطا ہوگی۔ اگر کوئی دس سالہ راحت کے بدلے ایک سال رنج اٹھائے تو اس پر کوئی حیرت کا اظہار نہیں کرتا چہ جائیکہ کوئی سو سال بھی لاکھوں کی راحت کے عوض رنج اٹھائے تو حیرانی کیونکر ہو؟

رکن دوم: معاملات میں

اس باب میں بھی دس اصلیں ہیں:

اصل اوّل: کھانا کھانے کے آداب

اصل دوم: نکاح کے آداب

اصل سوم: تجارت اور کسب وکار کے آداب

اصل چہارم: طلبِ حلال

اصل پنجم: آدابِ صحبت باخلق

اصل ششم: آدابِ عزلت

اصل ہفتم: سفر کے آداب

اصل ہشتم: آدابِ سماع

اصل نہم: امر بہ معروف

اصل دہم: ولایت داری

اصل اوّل: کھانا کھانے کے آداب

اے عزیز جان لے کہ عبادت کی راہ بھی جملہ عبادات میں سے ہے اور زادِراہ راستے ہی کا جزو ہے۔ پس راہ دین میں جس شے کی ضرورت ہے تو وہ بھی دین ہی میں شمار ہوتی ہے اور راہ دین میں کھانا کھانے کی حاجت ہے۔ سالکوں کا مقصود دیدارِ حق تعالیٰ ہے اور تخم اس کا علم وعمل ہے۔ اور علم وعمل کا تسلسل سلامتی تن کے بغیر ممکن نہیں اور تن کی سلامتی بے کھائے پیے ممکن نہیں بلکہ کھانا کھانا راہ دین کی ضرورت ہے۔ پس یہ سب کچھ دین ہی سمجھا جائے گا۔ اسی لیے فرمانِ خداوندی ہے: ''كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا'' (قرآن: ۲۳/۵۱) (پاک حلال میں سے کھاؤ اور عمل صالح کرو)۔ اللہ نے کھانے اور عمل صالح کو یک جا کر دیا۔ پس جو کوئی کھانا اس لیے کھاتا ہے کہ اسے علم وعمل کے لیے قوت حاصل ہو اور راہِ آخرت پر چلنے کی توانائی میسر ہو تو اس کا

کھانا کھانا عبادت ہی ہوگا۔ جیسے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مومن کے لیے ہر چیز میں ثواب ہے حتٰی کہ جو لقمہ اپنے منہ میں ڈالتا ہے یا اپنے اہل کے منہ میں ڈالتا ہے وہ بھی ثواب ہے''۔ آپ ﷺ نے یہ اس لیے فرمایا کیونکہ اس تمام سے مومن کا مقصود راہ آخرت ہوتا ہے اور دلیل اس کی کہ اس کا کھانا راہِ دین کے لیے ہوتا ہے یہ ہے کہ حریصانہ طعام نہیں کھاتا بلکہ حلال کھاتا ہے اور بقدرِ حاجت کھاتا ہے اور کھانے کے آداب بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ یاد رہے کہ کھانے پینے کے لیے سنتیں ہیں۔ بعض قبلِ طعام کی تو بعض بعد طعام کی، تو بعض دورانِ طعام کی

کھانا کھانے سے پہلے کے آداب

اوّل: یہ کہ منہ ہاتھ دھوئے کیونکہ کھانا چونکہ زادِ آخرت کی نیت سے کھایا جائے گا تو یہ عبادت ہے اور عبادت میں جیسے اذان سے پہلے وضو کرتے ہیں اس سے ہاتھ منہ پاک ہو جاتے ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ جو کوئی کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھولے افلاس سے بچا رہے گا۔

دوم: یہ کہ طعام سفرہ پر رکھنے نہ کہ طبق پر کیونکہ سنت یہی ہے۔ اس لیے کہ سفرہ سفر کی یاد دلاتا ہے اور سفرِ دنیا سفرِ آخرت کی یاد دلاتا ہے اور زمین پر بیٹھ کر کھانا انکساری کے قریب بھی ہے۔ یوں طبق پر کھانا بھی جائز ہے کیونکہ اس کے بارے میں نہی نہیں آتی لیکن اسلاف کی عادت سفرہ ہی کی تھی اور خود آنحضرت ﷺ کا طریقہ بھی یہی تھا۔

سوم: یہ کہ ٹھیک سے بیٹھے۔ دایاں گھٹنا کھڑا رکھے اور بائیں زانو پر بیٹھے اور تکیہ نہ لگائے کیونکہ حضور (ﷺ) کا فرمان ہے کہ ''میں تکیہ لگا کر کھانا نہیں کھاتا کیونکہ میں بندہ ہوں۔ اس لیے بندوں کی طرح بیٹھتا ہوں اور بندہ وار کھانا کھاتا ہوں''۔

چہارم: یہ کہ نیت کرے کہ طعام قوتِ عبادت کے لیے کھاؤں گا نہ کہ از برائے شہوات۔ ابراہیم شیبانی فرماتے ہیں: ''اسّی ۸۰ سال ہو چکے کہ جن میں میں نے کبھی کوئی شے شہوت کی غرض سے نہیں کھائی''۔ اور اس درستی کی دلیل یہ ہے کہ عزم کرے تھوڑا کھانے کا کیونکہ بسیار خوری عبادت سے روک دیتی ہے۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے: ''چند لقمے جس سے آدمی کی پشت سیدھی رہے کافی ہیں''۔ اگر کوئی اس پر قناعت نہ کرے تو کم از کم معدے کا ایک تہائی کھانے کے لیے ایک تہائی پانی کے لیے اور ایک تہائی سانس کے لیے رکھنے پر قانع ہو۔

پنجم: یہ کہ جب تک بھوک نہ لگے ہاتھ کھانے کی طرف نہ لے جائے اور خوب تر طریقہ کھانے کے آغاز کا یہ ہے کہ بھوک ہو کیونکہ بھوک کے بغیر کھانا مذموم اور مکروہ ہے اور جب کھانے لگے تو چاہیے کہ جب ابھی کچھ بھوک باقی ہو کھانے سے ہاتھ کھینچ لے تو کبھی طبیب کی حاجت نہ ہوگی۔

ششم: یہ کہ جو کچھ موجود ہو اس پر قناعت کرے اور پر تکلف کھانوں کو پسند نہ کرے کیونکہ مومن کی غرض قوتِ عبادت کو بحال رکھنا ہے اور تنعم سے غرض نہیں ہوتی اور روٹی کا احترام سنت ہے کیونکہ انسان کا قوام اس سے ہے اور روٹی کا بہترین اکرام یہ ہے کہ اسے پانے کے بعد سالن کا انتظار نہ کیا جائے۔ بلکہ نماز کے انتظار میں بھی کھانا معرض التواء میں نہ ڈالا جائے۔ جب روٹی آ جائے تو پہلے اسے کھائیں اور پھر نماز ادا کریں

ساتویں: یہ کہ ہاتھ کھانے کی طرف نہ بڑھائے جب تک کہ کوئی اور شریک ہونے کے لیے نہ آ جائے۔ کیونکہ تنہا کھانا اچھا نہیں کیونکہ کھانے کی طرف جتنے زیادہ ہاتھ بڑھیں گے برکت اسی قدر زیادہ ہوگی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی تنہا کھانا نہ کھاتے تھے۔

کھانا کھانے کے وقت کے آداب

کھانا کھانے کے وقت کے آداب یہ ہیں کہ اوّل: بِسْمِ اللهِ کہے اور کھانے کے آخر میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہے۔ بلکہ زیادہ اچھا یہ ہے کہ پہلے لقمے سے قبل بِسْمِ اللهِ کہے تو دوسرے لقمے سے قبل بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ کہے تو تیسرے لقمے سے قبل بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہے اور بآواز کہے تا کہ دوسروں کو یاد دلا دے۔ اور دائیں ہاتھ سے کھائے۔ ابتداء نمک سے کرے اور ختم بھی نمک ہی سے کرے۔ حدیث میں وارد ہے تا کہ حرص کو شروع ہی میں شکست دے دے۔ بہ ایں وسیلہ خلافِ شہوت ایک لقمہ لے اور اسے خوب چبا کر مہین کرے اور جب تک اسے نگل نہ لے دوسرے لقمے کی طرف ہاتھ نہ اٹھائے۔ اور کسی کھانے کو برا نہ کہے کیونکہ آنحضرت (ﷺ) کسی بھی کھانے کو برا نہ کہتے تھے۔ اگر پسندیدہ ہوتا تو کھا لیتے ورنہ ہاتھ روک لیتے تھے اور اپنے سامنے سے کھائے۔ لیکن پھل کی صورت میں طبق میں سے جہاں سے چاہے کھائے۔ کیونکہ پھل مختلف ہوتے ہیں، برتن کے درمیان سے ثرید نہ کھائے۔ اپنی طرف سے کھائے اور روٹی کو درمیان سے نہ کھائے بلکہ کنارے سے شروع کرے اور اردگرد سے کھاتا رہے اور روٹی کو چھری سے نہ کاٹے۔ اسی طرح گوشت کو بھی اسی طرح سے کھائے اور کاسہ اور ہر ایسی شے جو خود روٹی نہ ہو روٹی کے اوپر نہ رکھے۔ اور روٹی سے ہاتھ صاف نہ کرے اور اگر روٹی کا لقمہ یا دوسرا کوئی کھانا ہاتھ سے گر جائے تو اسے اٹھا کر صاف کر کے کھا لے کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ اگر اٹھائے گا نہیں تو مصداق اس کے ہو جائے گا جیسے اسی نے شیطان کے لیے چھوڑ دیا ہو۔ کھا چکے تو انگلیاں چاٹ لے پھر کپڑے سے صاف کرے تا کہ وہ طعام جو اس نے کھایا ہو اس کا نشان جاتا رہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ برکت خود اس میں باقی ہو اور گرم طعام میں پھونکیں نہ مارے بلکہ انتظار کرے تا کہ

ٹھنڈا ہو جائے۔ اور جب خرما یا خوبانی یا ایسی کوئی شے جسے گنا جا سکے کھائے تو طاق عدد میں کھائے۔ یعنی سات، گیارہ، یا اکیس کی تعداد میں کھائے تا کہ تمام کاموں میں حق تعالیٰ سے مناسبت ہو کیونکہ وہ طاق ہے اور اس کا کوئی جفت نہیں۔ اور ہر وہ کام جو کسی طور پر بھی حق تعالیٰ سے نسبت نہ رکھتا ہو بے فائدہ اور باطل ہے۔ پس طاق جفت سے اسی بناء پر اولیٰ تر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایک گونہ مناسبت رکھتا ہے اور خرما کی گٹھلی کھجوروں کے طبق میں جمع نہ کرے نہ ہاتھ میں رکھے۔ اسی طرح ہر وہ چیز جس میں گٹھلی ہو یا اس میں کا کچھ حصہ گرانے والا ہو اس کے لیے بھی یہی ادب ہے۔ نیز کھانے کے دوران زیادہ پانی نہ پیئے۔

پانی پینے کے آداب

پانی پینے کا ادب یہ ہے کہ کوزہ کو دائیں ہاتھ میں پکڑ کے کہے: ''بِسْمِ اللہ'' اور آہستہ آہستہ پیئے۔ اور کھڑے ہو کر یا لیٹ کر نہ پیئے۔ پہلے کوزہ کو دیکھ لے کہ اس میں کوئی تنکا یا کیڑا وغیرہ نہ ہو۔ اگر ڈکار آ جائے تو منہ کوزے سے پھیر لے اگر ایک دفعہ سے زیادہ بار پینا ہو تو تین گھونٹ میں پیئے۔ اور ہر دفعہ بِسْمِ اللہ کہے اور آخر میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہ اور کوزے کے نیچے دیکھے تا کہ پانی نہ ٹپکائے۔ اور جب پی چکے تو کہے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی جَعَلَہٗ عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِہٖ وَلَمْ یَجْعَلْہُ مِلْحًا اُجَاجًا بِذُنُوْبِنَا'' (سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں کہ جس نے اپنی رحمت سے اسے شیریں اور گوارا بنایا اور ہمارے گناہوں کے سبب اسے تلخ نہیں بنایا)۔

کھانا کھانے کے بعد کے آداب

کھانے کے بعد کے آداب یہ ہیں کہ سیر ہونے سے پہلے ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لے' انگلیاں چاٹ لے اور پھر دستر خوان سے صاف کر لے۔ اور روٹی کے ٹکڑوں کو چن لے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ ''جو کوئی ایسا کرے گا تو رزق اس پر فراخ کر دیا جائے گا اور اس کے بچے صحیح سلامت رہتے ہیں اور بے عیب ہوتے ہیں''۔ نان ریزے چن لینے کا یہ عمل جنت کی حور العین کا مہر قرار پاتا ہے۔

پھر خلال کرے جو زبان یا دانتوں سے جدا ہو اس کو نگل لے۔ اور جو کچھ خلال پر باہر آ جائے اسے پھینک دے۔ کھانے کے برتن کو انگلیوں سے صاف کرے۔ حدیث میں ہے کہ جو کوئی کاسے کو چاٹ کر صاف کر دے تو کاسہ کہتا ہے کہ ''اے اللہ تو اسے آگ سے ایسے ہی آزاد کر دے جس طرح اس نے مجھے شیطان سے بچایا ہے''۔ اور اگر کاسے میں پانی ڈال کر پی لے جس سے وہ صاف تر ہو جائے تو ایسے ہی جیسے اس نے ایک غلام آزاد کر دیا ہو اور کھانا کھانے کے بعد یہ دعا مانگے: ''الحمدللہ الذی اطعمنا وسقانا و کفانا

وآوانا وھو سیدنا ومولانا اور قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحد [(۱)] نیز'' لِاِیْلاٰفِ قُریش [(۲)] '' پڑھے۔اور جب حلال کھانا میسر آتا ہے تو اللہ کا شکرادا کرے۔اور اگر کھانا مشتبہ ہوتو روئے اور اظہارغم کرے۔اور جو مشتبہ کھانا کھا کراندوہ گیں ہو وہ اس شخص کا سا کیونکر ہوسکتا ہے جوایسا کھانا کھائے اور غفلت میں خوش ہو۔تو جب ہاتھ دھوئے تو صابن بائیں ہاتھ میں لے اور صابن کے استعمال سے پہلے دائیں ہاتھ کی انگلی دھوئے پھر اسے صابن پر لگا کر لب ودندان اور منہ میں ڈال کر خوب ملے پھر انگلیاں دھوئے پھر منہ صابن سے پاک کرے۔

کسی دوسرے شخص کے ساتھ کھانا کھانے کے آداب

متذکرہ بالا آداب وہ ہیں جنھیں تنہا کھانے والے کوملحوظ رکھنا چاہئے تو کسی دوسرے کے ساتھ کھانے کو بھی اسی طرح کرنا چاہئے لیکن جب کسی اور کے ساتھ مل کر کھائے تو چھ مزید ادب کا اضافہ کرے:

اوّل: یہ کہ جب تک دوسرا شخص کھانے کا آغاز نہ کرے جونسب میں، علم میں یا پارسائی میں یا ایسے ہی کسی امر میں اس پر فضیلت رکھتا ہو یہ ہاتھ نہ بڑھائے۔اگر مقدم خود ہی ہوتو دوسروں کو منتظر نہ رکھے' آغاز کردے۔

دوسرے: یہ کہ کھاتے وقت خاموش نہ رہے کہ یہ عجمیوں کی عادت ہے۔لیکن بات اچھی کرے۔جیسے پرہیزگاروں کی حکایات ہیں یا حکمت کی بات ہو اور یاوہ سرائی نہ کرے۔

تیسرے: یہ کہ اپنے ہم کاسہ کے حق کو ملحوظ رکھے اس کے حصے سے زیادہ نہ کھائے کیونکہ مشترکہ طعام ہونے کے باعث ایسا کرنا حرام ہے بلکہ پسندیدہ یہ ہے کہ ایثار کرے اور بہترین اسے پیش کرے۔اگر رفیق بہت آہستہ کھا رہا ہوتو اس سے تقاضا نہ کرے کہ بھائی بہ نشاط کھاؤ۔لیکن تین بار سے زیادہ کھانے کو نہ کہے۔کیونکہ اس سے زاید الحاح اور افراط متصور ہوگا اور قسم نہ دے کہ کھانا وہ مرتبہ نہیں رکھتا کہ اس کے لیے قسم دی جائے۔

چوتھے: یہ ساتھی کو بہ تکلف یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اور کھاؤ' لیکن جیسے کہ وہ کھا رہا ہے اس کا ساتھ دینا چاہیے۔اور اپنے معمول سے کم نہ کھائے کیونکہ یہ ریا ہے۔تنہا کھاتے وقت بھی ان آداب کوملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ ساتھیوں کے ہمراہ کھانا آسانی سے ممکن ہو۔لیکن اگر بقصد ایثار کم کھائے تو مناسب ہے۔لیکن اگر اس لیے زیادہ کھانا پڑے کہ دوسرے بہ نشاط کھائیں تو بھی ٹھیک ہے۔ابن المبارکؒ جب درویشوں کی دعوت فرمایا

---

(۱) سورہ ۱۱۲ قرآن

(۲) سورہ ۱۰۶ قرآن

کرتے تو کہتے تھے کہ جو کوئی زیادہ کھجوریں کھائے گا تو ہر کھجور پر جو وہ زائد کھائے گا ایک درم انعام دوں گا۔ پھر وہ گھٹلیوں کو گنتے تھے تا کہ معلوم کریں کہ کس نے زیادہ کھائیں تو اسے اسی حساب سے درم عطا کرتے تھے۔

پنجم: یہ کہ اپنی نگاہ اپنے سامنے رکھے اور دوسروں کے لقموں پر نہ ڈالے اور ساتھیوں سے پہلے کھانے سے ہاتھ نہ کھینچے کیونکہ دوسرے اس کا لحاظ کریں گے۔ اگر معمولاً کم خور ہو تو شروع میں آہستگی سے کام لے تا کہ آخر تک بہ نشاط کھا سکے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو ساتھیوں سے معذرت کرے تا کہ وہ کھانا جاری رکھ سکیں۔

ششم: یہ کہ ایسی کوئی حرکت جو ساتھیوں کو بری لگتی ہو نہ کرے۔ مثلاً کاسے میں نہ جھٹکے اور منہ کاسے پر نہ رکھے تا کہ اگر اس کے منہ سے کچھ گرے تو کاسے میں نہ پڑے۔ اور جب منہ سے کوئی چیز نکالنا چاہے تو منہ دوسری جانب پھیر لے اور روغن آلودہ لقمہ سرکے میں نہ ڈالے۔ اور وہ لقمہ جسے اس نے دانتوں سے کاٹا ہوا سے کاسے میں نہ ڈالے کیونکہ طبیعتیں اس سے مکدر ہوتی ہیں۔ نیز گھناؤنی چیزوں کا تذکرہ نہ کرے۔

ہفتم: یہ کہ جب ہاتھ دھوئے تو دوسرے کے ساتھ کلی کا پانی طشت میں نہ پھینکے۔ اور صاحبِ عظمت کو پہل کرنے دے۔ لیکن اگر دوسرے اسی کا اکرام کرتے ہوں تو خود قبول کر کے پہل کرے۔ اور طشت کو دائیں طرف سے گردش دینی چاہیے۔ اور سب کا پانی جمع ہونے پر باہر گرائیں اور ہر ایک کا پانی جدا گانہ نہ گرائیں کیونکہ یہ عادت عجم کی ہے اور اگر سب ساتھی بیک وقت ہاتھ دھویں تو یہ اولیٰ تر ہے اور تواضع کے قریب تر بھی۔ اور کلی کا پانی جب گرائے تو آہستگی سے گرائے تا کہ چھینٹے کسی اور پر نہ پڑیں۔ اور فرش پر بھی نہ گریں۔ اور جو بھی پانی ہاتھ پر ڈالنا چاہے تو اسے چاہیے کہ کھڑا ہو جائے کیونکہ یہ بیٹھے رہنے کی نسبت اولیٰ تر ہے۔

اور یہ جملہ آداب اخبار و آثار میں موجود ہیں اور انسان اور چار پائے میں فرق انھی آداب سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ جانور تو اپنی فطرت پر عمل کرتے ہیں اور اچھے برے کے فرق کو نہیں جانتے کیونکہ انھیں انسان کی طرح نیک و بد میں امتیاز کی صلاحیت نہیں دی گئی۔ لیکن اگر انسان اپنی اس صلاحیت سے کام نہ لے تو گویا اس نے عقل و تمیز کی اس نعمت کا حق ادا نہیں کیا تو کفرانِ نعمت کا مرتکب ٹھہرا۔

دوستوں اور برادرانِ دین کے ساتھ کھانے کھانے کی فضیلت کا بیان

معلوم رہے کہ کسی دوست کی مہمانی پر میزبانی کرنا بہت سے صدقات سے فاضل تر ہے اور حدیث میں ہے کہ تین چیزوں میں بندے سے حساب نہ لیا جائے گا۔ ایک وہ جو وہ سحور میں کھائے اور جس سے روزے افطار کرے اور جو کچھ وہ دوستوں کے ساتھ کھائے۔

جعفر ؓ بن محمد فرماتے ہیں: ''جب تو اپنے بھائیوں کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھے تو عجلت نہ کرتا کہ مدت دراز ہو جائے کیونکہ اس طرح گزارے ہوئے وقت کا حساب نہیں لیا جائے گا۔ حسن ؓ بصری فرماتے ہیں کہ: ''بندہ جو کچھ اپنی ذات پر یا اپنے والدین پر خرچ کرتا ہے اس کا حساب ہوگا لیکن جو کچھ وہ بہ صورت طعام دوستوں کو پیش کرے گا اس کا حساب نہیں ہوگا''۔ اور بزرگوں میں سے بعض کا معمول یہ تھا کہ جب اپنے بھائیوں کے لیے دستر خوان بچھاتے تو اس پر کھانا کثیر مقدار میں رکھتے تو کہتے ''حدیث میں وارد ہے کہ جو کوئی وہ کھانا کھائے جو دوستوں کو کھلانے کے بعد بچ جائے اس کا حساب نہیں لیا جائے گا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اسے کھاؤں جو آپ کے کھا چکنے کے بعد باقی ہو''۔ اور امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ: ''میں ایک غلام آزاد کرنے کی نسبت اسی بات کو عزیز رکھتا ہوں کہ اپنے بھائیوں کی خدمت میں ایک صاع کھانا رکھوں''۔ اور حدیث میں ہے کہ: ''حق تعالیٰ روزِ قیامت کہیں گے: ''اے ابن آدم میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہ دیا''۔ تو لوگ کہیں گے یا رب العزت تو کیسے بھوکا ہوسکتا ہے کہ تُو تو پورے عالم کا خداوند ہے؟'' تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تیرا بھائی بھوکا تھا۔ اس لیے اگر تو نے اسے کھانا دیا ہوتا تو ایسے ہی جیسے مجھے دیا ہوتا''۔

اور آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ جس نے اپنے مسلمان بھائی کو کھانے پینے سے نوازا کہ وہ سیر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے نارِ جہنم سے محفوظ رکھے گا۔ سات خندقوں کی دوری تک کہ ہر دو خندقوں کے درمیان پانچ سو سال کی رہ گذر ہوگی۔ نیز فرمایا: ''خیرکم من اطعم الطعام'' تم میں سب اسے چھا وہ ہے جو کھانا کھلائے''۔

وہ دوست جو ایک دوسرے کی زیارت کو جائیں ان کے کھانے کے آداب

اوّل: یہ کہ کھانے کے وقت کسی دوست سے ملنے کو نہ جانے کی نیت کرے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ ''جو کوئی بن بلائے کسی کے ہاں کھانے کا قصد کرے وہ فاسق ہے اور حرام خور'' لیکن اگر اتفاقاً کھانے کے وقت پہنچے تو بے اجازت نہ کھائے اور اگر کہیں کہ کھاؤ لیکن اگر وہ دل سے نہ کہہ رہے ہوں تو نہ کھائے کیونکہ مناسب نہیں۔ بہ لطائف الحیل انکار کر دے۔ لیکن اگر کسی بے تکلف دوست کے ہاں گیا ہو جس کے بارے میں اطمینان ہو کہ بخلوصِ دل دعوت دے رہا ہے تو کھانے میں شرکت جائز قرار پائے گی بلکہ مخلص دوستوں کے درمیان سنت یہی ہے۔

رسول (ﷺ) وابوبکر (ؓ) اور عمر (ؓ) بھوک کے وقت ابوایوب انصاری (ؓ) اور ابوالہیثم بن

النہیان (رضی اللہ عنہ) کے گھر میں گئے اور کھانا طلب کیا تو یہ میزبان کے لیے نیکی میں معاونت ہوگی۔ جب جانتے ہوں کہ میزبان خود اس کی رغبت رکھتا ہے۔ اسلاف میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس کے تین سو ساٹھ ۳۶۰ دوست تھے۔ تو ہر رات کو ایک دوست کے ہاں چلا جاتا تو بعض وہ تھے جن کے تیس ۳۰ دوست تھے۔ تو ہر ماہ ایک شب ایک دوست کے ہاں جاتا اور ایک وہ تھا کہ جس کے سات ۷ دوست تھے۔ تو وہ ہفتے میں ایک رات ایک دوست کے ہاں چلا جاتا۔ تو یہ اصحاب ان کے لیے بمنزلہ مال و منال تھے بجائے کسب و ضیاع کے۔ اور یہ میزبان اپنے ان دینی بھائیوں کے لیے بہ فراغتِ عبادت کے لیے معاونت کا باعث تھے۔ بلکہ جب دینی دوستی ہوگئی تو اگر صاحب خانہ گھر پر موجود نہ بھی ہو تو وہاں اس کا کھانا اس کی غیر حاضری میں کھالینا جائز ہے۔ آنحضرت ﷺ جب کبھی بریرہ (رضی اللہ عنہ) کے گھر جاتے تو ان کے وہاں موجود نہ ہونے کے باوصف کھانا کھاتے کیونکہ آپ (ﷺ) کو معلوم تھا کہ بریرہ (رضی اللہ عنہ) اس سے خوش ہوں گے۔ اور محمد (رضی اللہ عنہ) بن واسع پارسا بزرگوں میں سے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حسن بصریؒ کے ہاں چلے جاتے تو جو کچھ پاتے کھالیتے تھے۔ تو جب حسن بصری گھر لوٹتے تو اس خبر پر شادمان ہوتے۔ ایک گروہ یہی عمل حضرت عثمان ثوریؒ کے ساتھ کرتے تھے۔ تو جب عثمان گھر لوٹتے تو فرماتے: ''آپ لوگوں نے اسلاف کے اخلاق مجھے یاد دلا دیئے کیونکہ وہ ایسے ہی کرتے تھے''۔

ادبِ دوم: یہ ہے کہ صاحبِ خانہ ماحضر پیش کر دے جب کوئی دوست زیارت کو آئے۔ اور کسی قسم کا تکلف نہ کرے اگر خالی ہاتھ ہے تو قرض نہ اٹھائے بلکہ اگر اس کے اپنے اہل و عیال کی ضرورت سے زائد نہ ہو تو انھی کے لئے رکھ دے۔ مہمان کو نہ دے۔ کسی نے حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم کو دعوت طعام دی تو آپ نے کہا کہ تین شرائط ہیں یہ پوری ہوں تو میں آؤں گا؛ ایک یہ کہ تم بازار سے کچھ نہیں لاؤ گے' دوسرے یہ کہ جو کچھ تمہارے گھر میں ہے وہ سب دستر خوان پر لے آؤ گے اور تیسرے یہ کہ اپنے اہل و عیال کا حصہ ان کے لیے باقی رکھو گے۔

فضیلؒ عیاض کہتے ہیں ''لوگ جو ایک دوسرے سے کٹ گئے ہیں وہ بر بنائے تکلف کٹ گئے ہیں۔ اگر تکلف کو چھوڑ دیں تو بے تکلف ایک دوسرے کو مل سکیں گے''۔ ایک دوست نے بزرگوں میں سے ایک کے لیے تکلف کیا تو ان بزرگ نے کہا کہ ''جب تم اکیلے ہوتے ہو تو پر تکلف کھانے نہیں کھاتے اور میں بھی جب تنہا ہوتا ہوں تو ایسے کھانے نہیں کھاتا تو جب ہم اکٹھے ہوں تو یہ تکلف کیوں؟ لہٰذا یا تو تکلف کو درمیان سے نکال باہر کرو یا میں آنا چھوڑ دیتا ہوں''۔

سلمان فارسیؒ کہتے ہیں کہ ہمیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''تکلف نہ کریں اور جو کچھ گھر میں موجود ہو

اس کو معمول رکھیں''۔ اور صحابہؓ روٹی کا ٹکڑا اور خشک کھجوریں ایک دوسرے کے پاس لے جاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ''ہم نہیں جانتے کہ کون زیادہ گناہ گار ہے: وہ جو ماحضر کو حقیر جانے اور پیش نہ کرے یا وہ کہ جب اس کو پیش کریں تو وہ اسے حقیر جانے؟'' حضرت یونس علیہ السلام پیغمبر روٹی کا ٹکڑا اور سبزی جوان کی کھیتی میں تھی دوستوں کے سامنے رکھتے تو فرماتے: ''اگر اللہ تعالیٰ نے تکلف کرنے والوں کو ملعون نہ کہا ہوتا تو میں ضرور تکلف کرتا''۔

ایک قوم کا باہم جھگڑا تھا تو انھوں نے حضرت زکریا علیہ السلام کو مصالحت کے لیے طلب کیا تو وہ حضرت زکریا علیہ السلام کے گھر میں داخل ہوئے تو حضرت زکریا کو نہ پایا لیکن وہاں ایک خوب رو عورت کو دیکھا تو متعجب ہوئے کہ آپ (علیہ السلام) پیغمبر ہیں لیکن ایسی عورت کے ساتھ عیش کررہے ہیں۔ تو جب انھوں نے حضرت علیہ السلام کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ کہیں مزدوری کررہے ہیں۔ جب ان کو پایا تو دیکھا کہ حضرت کھانا کھارہے ہیں۔ اور یہ لوگ باتیں کرتے تھے۔ لیکن حضرت علیہ السلام نے انھیں نہیں کہا کہ آؤ میرے ساتھ شریک طعام ہوجاؤ۔ اور حضرت علیہ السلام جب اٹھے تو پابرہنہ اس زمین سے باہر نکلے تو ان لوگوں کو آپ (علیہ السلام) کے یہ تینوں کام عجیب لگے۔ تو جب انھوں نے استفسار کیا یہ کیا ہے؟ تو آپ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ: ''میں نے وہ خوب رُو عورت اس لیے رکھی ہے کہ میرے دین کی حفاظت کرے' اور میری نگاہ اور دل کو کہیں اور نہ بھٹکنے نہ دے اور تمھیں میں نے کھانے میں شرکت کی دعوت اس لیے نہیں دی کہ میری مزد تھی تا کہ میں کام کرسکوں اگر میں کم کھاتا تو ان کے کام کا صحیح حق ادا نہ کرپاتا۔ جب کہ وہ میرا فرض تھا۔ اور پابرہنہ اس لیے نکلا ہوں کہ اس زمین کے مالکوں میں باہم عداوت تھی اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک زمین کی مٹی میرے جوتے میں پڑ کر دوسرے کی زمین میں جائے''۔ اس واقعے سے معلوم ہوا کہ جملہ کاموں میں صدق وراستی تکلف کی نسبت اولیٰ تر ہے۔

ادبِ سوم: یہ کہ میزبان پر ایسی فرمائش نہ کرے جب معلوم ہو کہ اس پر گراں گذرے گی۔ اور اگر میزبان دو چیزوں میں سے کسی ایک کے طلب کرنے کا اختیار دے تو مہمان کو آسان ترین تجویز کرنی چاہیے کیونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جملہ امور میں یونہی کرتے تھے۔

کوئی شخص سلمان (رضی اللہ عنہ) کے پاس آیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے جو کی روٹی اور نمک پیش کیا۔ تو اس شخص نے کہا کہ اگر سبز سقر بھی نمک کے ساتھ ہوتا تو بہت موزوں تھا۔ سلمان کے پاس کچھ نہ تھا۔ اس لیے سقر کے لیے لوٹا گروی رکھ دیا۔ تو جب یہ صاحب کھانا کھا چکے تو دعا میں فرمایا: ''الحمدللہ الذی قنعنا بمارزقنا'' (سب تعریفیں اللہ کے لیے کہ جس نے اپنے رزق پر قانع ٹھہرایا)۔ تو سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: ''صاحب! اگر آپ نے قناعت کی ہوتی تو مجھے اپنا لوٹا گروی نہ رکھنا پڑتا''۔ تاہم اگر میزبان کے بارے میں جانتا ہو کہ فرمائش اس پر گراں

نہ ہوگی بلکہ وہ اس پر خوش ہوگا تو بے شک اپنی خواہش کا اظہار کردے۔ امام شافعیؒ ایک مرتبہ بغداد میں ایک زعفرانی کے ہاں مہمان تھے۔ زعفرانی ہر روز متنوع کھانے کا نسخہ تحریر کر کے باورچن کو دیتا تھا۔ ایک دن حضرت شافعیؒ نے اپنے قلم سے ایک لون کا اضافہ اس نسخے میں تحریر کردیا۔ جب زعفرانی نے کنیز کے ہاتھ میں اسے دیکھا تو بہت خوش ہوا اور کنیز کو آزاد کردیا۔

ادبِ چہارم: یہ ہے کہ اگر اہل خانہ مہمانوں سے کہے کہ: ''آپ کیا چاہتے ہیں کس شے کی آرزو ہے''؟ اگر وہ معلوم ہو کہ تہ دل سے کہہ رہا ہے تو مہمان اگر اپنی آرزو کے مطابق فرمائش کریں تو ثواب اس میں بیشتر ہوگا۔

آنحضرت (ﷺ) فرماتے ہیں کہ: ''جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی آرزو پوری کرتا ہے تو دس لاکھ نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں' اور اسی قدر برائیاں اس کے دیوان سے ہٹا دی جاتی ہیں اور اسی قدر درجات اس کے بڑھا دیئے جاتے ہیں اور اسے تین قسم کی بہشت عطا کر دیتے ہیں: فردوس' عدن اور خلد''۔ اور مہمان سے یہ پوچھنا کہ فلاں چیز لاؤں یا نہ؟ مکروہ اور مذموم ہے بلکہ جو کچھ موجود ہے پیش کر دیا جانا چاہیے اگر وہ کسی چیز کو نہ کھائیں تو واپس لے جائی جا سکتی ہے۔

میزبانی کی فضیلت

اب تک جو بیان ہوا ہے وہ اس سلسلے میں تھا کہ اگر کوئی بن بلائے زیارت کو جائے تو آداب اس امر میں کیا ہیں؟ لیکن دعوتِ طعام کا حکم اس سے مختلف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''اگر کوئی مہمان ناگاہ آجائے تو کوئی تکلف نہ کر لیکن اگر خود دعوت دے تو کچھ پیچھے نہ چھوڑ'' یعنی جس قدر استطاعت ہے کر۔

اور میزبانی کی فضیلت میں بہت سی احادیث ہیں اور عربوں کا معمول ہے کہ سفر میں قبائل ایک دوسرے کی قرارگاہ میں پہنچ کر سواری سے اترتے ہیں اور اس قسم کے مہمان کا حق ادا کرنا لازم ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو مہماندار نہیں اس میں نیکی ناپید ہے''۔ نیز فرمایا کہ: ''مہمان کے لیے تکلف نہ کرو کیونکہ اس طرح تم مہمان کو دوست نہیں دشمن سمجھتے ہو اور جو مہمان کو دشمن سمجھتا ہے تو گویا اللہ کو دشمن سمجھتا ہے۔ اور جو اللہ کو دشمن سمجھتا ہے اللہ اسے اپنا دشمن گردانتا ہے''۔ اور مسافر اگر مہمان ہو تو اس کی میزبانی کے لیے قرض لینا اور تکلف بھی روا ہے۔ لیکن دوستوں کے لیے ایک دوسرے سے ملنے آئیں ان کے لیے جائز نہیں۔ کیونکہ یہ قطع تعلق پر منتج ہوتا ہے۔

ابورافع (رضی اللہ عنہ) مولائے رسول کا بیان ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے فرمایا کہ ''فلاں یہودی سے کہو کہ مجھے ماہ رجب تک آٹا ادھار دے۔ کیونکہ ایک مہمان آ گیا ہے'' تو اس یہودی نے کہا کہ جب تک کوئی شے گروی نہ رکھو گے قرض نہیں دوں گا'' تو میں لوٹ آیا اور اس امر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کیا تو آنحضرت (علیہ السلام) نے فرمایا ''بخدا میں آسمان میں نیز زمین پر امین ہوں اگر ادھار دے دیتا تو میں اسے لازماً لوٹا دیتا۔ اب یوں کرو کہ میری زرہ لے جاؤ اور اس کے پاس گرو رکھ دو'' تو میں نے زرہ لے لی اور یہودی کے پاس گروی رکھ دی''۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) مہمان کی تلاش ایک دو میل تک نکل جاتے اور جب تک کوئی مہمان نہ ملتا کھانا نہ کھاتے تھے۔ آپ (علیہ السلام) کے صدق کی بناء پر اب بھی آپ کے مزار مبارک پر مہمان نوازی کا لنگر جاری ہے[1]۔ اور اب تک ایک رات بھی ایسی نہیں گذری جو ضیافت سے خالی ہو۔ اور کبھی تو یہ صورت ہوتی ہے کہ سو ۱۰۰ دو سو ۲۰۰ مہمان موجود ہوتے ہیں۔ کئی گاؤں اسی کام کے لیے وقف ہیں۔

دعوت دینے اور دعوت قبول کرنے کے آداب

جو شخص دعوت دے اس کے لیے سنت طریقہ یہ ہے کہ سوائے نیکوکاروں کے کسی اور کو نہ بلائے۔ کیونکہ کھانا دینا قوت دینے کے مترادف ہے۔ اور فاسق کو قوت دینا گویا فسق کی اعانت ہے۔ اس طرح درویشوں کو دعوت دے دولت مندوں کو نہیں۔ کیونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فرمان ہے: ''سب سے برا کھانا ولیمے کا کھانا ہے کہ امراء کو تو شریک طعام کرتے ہیں اور درویشوں کو محروم رکھتے ہیں''۔ چاہیے کہ اپنے عزیز و اقارب اور نزدیکی دوستوں کو فراموش نہ کریں کیونکہ اگر فراموش کریں گے تو یہ دوری کا باعث بنے گا۔ اور دعوت میں تفاخر اور لاف زنی کی نیت نہ کرے لیکن سنت کی بجا آوری اور درویشوں کو راحت رسانی کی فکر کرے۔ اور جس کے بارے میں علم ہو کہ قبولیت اسے دشوار ہو گی تو اسے نہ بلائے۔ کیونکہ اگر وہ قبول بھی کرے گا تو اس کا کھانا طوعاً و کرہاً ہی کھائے گا۔ اور یہ باعث خطا ہے۔

ادبِ اجابتِ دعوت: یہ ہے کہ داعی غریب ہو یا دولت مندان میں امتیاز نہ کرے اور درویش کی دعوت پر ترجیح نہ دے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکینوں کی دعوت بھی قبول فرماتے تھے۔ حسن (رضی اللہ عنہ) بن علی (رضی اللہ عنہ) کا گذر ایک

---

[1] حسین خدیو جم مصحح کتاب کا بیان ہے کہ بیس سال قبل فلسطین کے شہر ابراہیم خلیل سے گذرا تھا' اس وقت بھی یہ میزبانی جاری و ساری تھی۔

مرتبہ درویشوں کی ایک جماعت پر ہوا' جن کے سامنے روٹی کے چند ٹکڑے تھے جنھیں وہ کھا رہے تھے۔ تو انھوں نے کہا ''اے اللہ کے رسول کے بیٹے ہمارے ساتھ موافقت کرو'' تو حضرت حسن سواری سے اترے اور ان کے ساتھ کھانے میں موافقت کی۔ اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ متکبروں کو عزیز نہیں رکھتا'' کھا چکے تو اُن سے فرمایا کہ کل تم میرے مہمان ہو۔ تو آپ نے اگلے دن ان کے لیے کھانا تیار کیا اور ان کے ساتھ بیٹھ کر تناول فرمایا۔

ادبِ دوم: اگر معلوم ہو کہ میز بان اس پر احسان رکھے گا اور امتیازی کھانا دے گا تو عذر کرے اور قبول نہ کرے کیونکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ مہمان کے قبول کر لینے کو فضل اور احسان سمجھے۔ اس طرح اگر معلوم ہو کہ میز بان کا مال مشتبہ ہے یا اس موقع پر کوئی امر منکرات میں سے ہوگا جیسے ریشمین فرش یا چاندی کی انگیٹھی یا دیواروں پر جانوروں کی تصویریں یا چھت پر ایسے نقش ونگار یا ساز و مزامیر کے ساتھ سماع ہو یا کوئی مسخر گی کرتا ہو یا فحش بکتا ہو یا جوان عورتیں مردوں کے سامنے آتی ہوں تو دعوت کو قبول نہ کرے۔ کیونکہ یہ سب مذموم ہے اور ایسی جگہ حاضر ہونا مناسب نہیں۔

اسی طرح اگر میز بان بدعتی ہو یا فاسق ہو یا ظالم ہو یا دعوت سے اس کی غرض لاف وتکبّر ہو تو اس کی دعوت کو قبول نہیں کرنا چاہیے۔ اور اگر قبول کر لیا ہو اور اگر ان منکرات کو وہاں دیکھے لیکن منع نہ کر پائے تو وہاں سے نکل جائے۔

ادبِ سوم: یہ کہ دوری کے باعث انکار نہ کرے بلکہ جس چیز کو معمولاً برداشت نہیں کر سکتا' برداشت کرے۔ توارت میں ہے کہ ''ایک میل چل کر بیماروں کی عیادت کر' دو میل جنازے کے ساتھ چل اور دعوت کی اجابت کے لیے تین میل کا سفر طے کر۔ اور برادر دین کی زیارت کی خاطر چار میل کا فاصلہ طے کر''۔

ادبِ چہارم: یہ کہ روزہ سے ہونے کے سبب انکار نہ کرے۔ حاضر ہو جائے۔ اور اگر میز بان کی دوری کا باعث نہ ہو تو خوشبوئے طعام اور اچھی گفتگو پر قناعت کرے۔ کیونکہ روزہ دار کی میز بانی کی صورت یہی ہے۔ لیکن اگر میز بان کے ناراض ہو جانے کا خطرہ ہو تو نفلی روزہ افطار کر لے۔ کیونکہ کسی مسلم بھائی کی خوشنودی کا سامان کرنا روزہ سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ آنحضرت (ﷺ) نے ایسے شخص کو جو بر بنائے روزہ دعوت قبول نہ کرے پسند نہیں فرمایا کیونکہ آپ (ﷺ) فرماتے تھے کہ ''تمھارے بھائی نے تمھارے لیے تکلف کیا ہے اور تم کہتے ہو کہ میں روزہ سے ہوں''۔

ادبِ پنجم: یہ کہ اجابت شکم کی شہوت رانی کی نیت سے نہ کرے کہ یہ ڈھور ڈنگروں کا کام ہے۔ بلکہ سنت رسول (ﷺ) کی پیروی کی نیت کرے۔ اور حذر کی نیت نہ کرے کیونکہ آنحضرت کا فرمان ہے کہ ''وہ جو دعوت کو

قبول نہیں کرتا وہ اللہ اور رسول دونوں کا عاصی ہے"۔ اسی بناء پر ایک گروہ کا کہنا ہے کہ "دعوت کی اجابت واجب ہے"۔ اور نیت یہ کرے کہ مسلمان بھائی کا اکرام کرے گا۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ "جس نے کسی مومن کا اکرام کیا اس نے اللہ کا اکرام کیا"۔ اور نیت کرے کہ اپنے مسلمان بھائی کے دل کو خوشی فراہم کرے گا۔ کیونکہ حدیث میں ہے "جس نے کسی مومن کو خوش کیا تو اس نے خدائے عزوجل کو خوش کیا" اور میزبان زیارت کی نیت کرے۔ کیونکہ مومنین کی زیارت عظیم قرابتوں میں سے ہے اور اپنے آپ کو غیبت سے محفوظ رکھنے کی نیت کرے تاکہ یہ نہ کہیں کہ بدخوئی یا تکبر کی بنا پر نہیں آیا"۔

یہ چھ عدد نیتیں ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کے باعث اجابت کرنے والوں کو ثواب ہوگا اور ان نیّات کی بدولت مباحات بھی منجملہ قربات قرار پاتے ہیں اور بزرگان اس کی بہت کوشش کرتے تھے کہ ان کی حرکت و سکون کی ہر صورت میں نیت ہوتی تھی جو دین سے مناسب رکھتی تھی۔ غرض یہ ہوتی تھی کہ زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہونے پائے۔

دعوت میں حاضر ہونے کے آداب

دعوت میں حاضر ہونے کے آداب یہ ہیں کہ دیر کرے نہ جلدی بلکہ عین وقت پر پہنچے۔ اور برتر جگہ پر نہ بیٹھے بلکہ میزبان جدھر اشارہ کرے وہاں بیٹھے۔ اگر دوسرے مہمان اس کو صدر پیش کریں تو انکساری کی راہ اختیار کرے اور عورتوں کے حجرے کے مقابل نہ بیٹھے اور جس طرف سے کھانا لایا جارہا ہو ادھر بھی زیادہ نگاہ نہ کرے۔ اور جب کوئی اس کے قریب آکر بیٹھے تو اسے سلام کہے اور اس کی خیریت پوچھے۔

اور اگر وہاں منکرات میں سے کچھ دیکھے تو منع کرے اور اگر اسے تبدیل نہیں کرسکتا تو وہاں سے نکل جائے۔ حضرت احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ "اگر چاندی کی سرمہ دانی بھی وہاں پائے اسے وہاں ٹھہرنا نہیں چاہیے۔ اور اگر رات وہیں ٹھہرنا ہو تو میزبان کو چاہیے کہ جائے طہارت اور قبلے کا رخ اسے بتادے۔

دسترخوان پر کھانا رکھنے کے آداب

ادبِ اوّل: یہ ہے کہ تاخیر کرے اور یہ سب اکرام مہمانوں کے لیے ہے کہ وہ انتظار میں نہ رہے۔ اور جب سب آچکیں اور کوئی ایک رہ گیا ہو تو حاضرین کا حق اولیٰ تر ہے' سوائے اس کے کہ ہنوز نہ پہنچنے والا درویش ہو جو اس بناء پر شکستہ دلی کا شکار ہوسکتا ہے تو پھر اس غرض سے تاخیر اچھی ہے۔

حاتم اصمؒ کہتے ہیں کہ "عجلت شیطان کا کام ہے سوائے پانچ چیزوں کے: طعامِ مہمان' مرنے والوں کی

تجہیز، بیٹوں کا نکاح، قرضے کی واپسی اور گناہوں سے توبہ کے''اور ولیمہ میں تعجیل سنت ہے۔

ادبِ دوم : یہ ہے کہ پہلے میوہ پیش کرے۔ اور سفرہ سبزی سے خالی نہ ہو۔ کیونکہ جب دسترخوان پر سبزی ہوگی تو اس بارے میں آثار میں ہے کہ'' ملائکہ تشریف لاتے ہیں'' اور چاہیے کہ اچھے کھانے پیش کرے تاکہ مہمان ان سے سیر ہوں۔ اور بسیار خوروں کی عادت ہے کہ ٹھوس غذاؤں کو سامنے رکھتے ہیں تاکہ زیادہ تر کھائیں اور یہ مکروہ ہے۔ اور بعضوں کی عادت یہ ہے کہ ہمہ قسم طعام ایک ہی مرتبہ سفرہ پر رکھ دیتے ہیں تاکہ ہر کوئی اپنی پسند کا کھانا لے لے اور جب کھانا لگادیں تو جلدی نہ سمیٹیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ مہمانوں میں سے بعض نے سیر ہوکر ابھی نہ کھایا ہو۔

ادبِ سوم : یہ ہے کہ کھانا کم مقدار میں نہ رکھے کہ یہ بے مروتی ہوگی اور بہت زیادہ بھی نہ رکھے کہ یہ تکبر کا مظہر ہوگا لیکن اگر نیت یہ ہو کہ اس کا حساب نہیں ہوگا تو حرج نہیں۔

حضرت ابراہیمؒ بن ادھم نے کھانا بکثرت رکھا تو حضرت سفیانؒ نے فرمایا کہ''نہیں ڈرتے کہ یہ اسراف ہے؟''تو حضرت ابراہیم نے کہا''کھانے میں اسراف نہیں ہوتا''۔

اور چاہیے کہ اہل وعیال کو مہمانوں سے پہلے کھلا دے تاکہ ان کی نگاہ سفرہ پر لگی نہ رہے۔ کیونکہ اگر کچھ باقی نہ بچے تو مہمانوں کو کوسنے لگیں۔ اور یہ مہمان کے ساتھ بدی کے مترادف ہے۔ اور مہمانوں کے لیے روا نہیں کہ بچا ہوا کھانا ساتھ لے جائیں جیسا کہ بعض صوفیوں کی عادت ہے۔ لیکن اگر میزبان خود ایسا کرنے کو بہ صراحت کہے تو روا ہے۔ اس بناء پر نہیں کہ ان سے شرم کے باعث کہے بلکہ وہ جانتے ہوں کہ میزبان دل سے راضی ہے تو پھر کھانا ساتھ لے جانا روا ہے۔ بشرطیکہ ہم کاسہ پر ظلم نہ کرے۔ اگر زیادہ اٹھائے تو حرام ہوگا۔ اور اگر میزبان کے لیے باعث کراہیت ہو تو بھی حرام ہوگا۔ اور اس میں اور چوری میں فرق نہ ہوگا۔ اور جس سے ہم کاسہ شرم کی بنا پر دست کش ہو جائے اور دل خوشی سے نہ ہو تو بھی حرام ہوگا۔

باہر آنے کے آداب

دعوت سے واپس آنے کا ادب یہ ہے کہ میزبان کی اجازت سے نکلے اور میزبان کو چاہیے کہ دروازے تک مشایعت کرے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کا فرمان یہی ہے اور چاہیے کہ مہمان اچھی بات کرے اور کشادہ رُو ہو۔ اور مہمان اگر کوئی نقص دیکھے تو خوش دلی کے ساتھ اس سے صرف نظر کرے کیونکہ حسنِ اخلاق بہت سی قربات[1] سے فاضل تر ہے۔

---

[1] قربات: (جمع قربت) وہ کام جو بندہ کے لیے اس سے قرب کا باعث ہوں۔

کہتے ہیں کہ استاد جنید کو ایک چھوٹے لڑکے نے ایک دعوت پر جو اس کے باپ نے ترتیب دی تھی' بلایا اور جب حضرت جنید اس کے گھر پہنچے تو اس لڑکے کے باپ نے اندر جانے نہیں دیا۔ تو آپ لوٹ گئے۔ تو لڑکے نے دوسری مرتبہ پھر بلایا تو آپ پھر گئے لیکن باپ نے پھر اندر جانے سے روکا۔ اس طرح چار بار آئے اور گئے۔ کیونکہ آنے سے لڑکے کا دل خوش ہوتا تھا اور لوٹنے پر والد خوش ہوتا تھا اور خود وہ اس میں فارغ تھے۔ اور ان کے ہر ردو قبول میں ان کے لیے عبرت تھی جسے وہ اللہ کی طرف سے سمجھتے تھے۔

❖

اصل دوم: آدابِ نکاح

اے عزیز جان لے کہ نکاح کرنا کھانا کھانے ہی کی طرح منجملہ آداب راہ دین ہی ہے کیونکہ راہ دین کے لیے انسان کی زندگی اور بقا ضروری ہے اور زندگی بے کھائے پیئے ممکن نہیں اور اسی طرح نوعِ انسانی اور اس کی نسل کی بقا بھی لازم ہے اور یہ بغیر نکاح کے ممکن نہیں۔ پس نکاح وجود کی اصل کا سبب ہے اور کھانا بقائے وجود کا سبب ہے اور نکاح کا مباح کرنا اسی وجہ سے ہے نہ کہ شہوت رانی کے لیے۔ بلکہ شہوت جو تخلیق ہوئی ہے تا کہ وہ مختار ہو اور متقاضی ہو کہ خلق کو نکاح کے لیے آمادہ کرے تا کہ راہِ حق کے سالک وجود میں آئیں اور دین کی راہ چلیں۔ جملہ مخلوق کو دین ہی کی راہ کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ''[1] اور جس قدر نوع انسانی کثیر ہوگی اسی قدر حضرتِ ربوبیت کے بندوں میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''نکاح کرو تا کہ تم بکثرت ہو جاؤ اور میں روز قیامت دوسری امم کے مقابلے میں فخر کر سکوں''۔ پس اس شخص کے لیے ثواب کا باعث ہے جو کوشش کرتا ہے کہ ایک بندے کا اضافہ کرے تا کہ راہ دین میں اس سے بندگی کا ظہور ہو تو یہ بہت عظیم بات ہے۔ اسی بناء پر بچے پر باپ کا حق عظیم ہے اور استاد کا حق بھی بزرگ ہے۔ کہ باپ اس کو وجود میں لانے کا سبب ہے اور استاد اسے راہ دین سے شناسائی کا ذریعہ ہے۔ اس سبب سے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ نکاح کرنا نوافل میں عبادت میں مشغول ہونے سے بہتر ہے۔ اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ نکاح جملہ راہِ دین میں سے تو اس کے آداب کی شرح بھی اہم ہے۔ اور شرح اس کی تین ابواب کی شناخت سے ممکن ہے۔ باب اوّل درفوایدو آفاتِ نکاح؛ باب دوم عقد نکاح کے آداب میں اور باب سوم نکاح کے بعد معیشت اور زندگانی کے آداب میں۔

[1] (قرآن: ۵۶/۵۱) (ہم نے جن وانس کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے)۔

باب اوّل: نکاح کے فوایدو آفات کے بارے میں

معلوم رہے کہ فضیلت نکاح اس کے فوایدکی بناء پر ہے۔اور نکاح کے فواید پانچ ہیں:

فایدہ اوّل:

اولاد میں ہےاوراولاد کے سبب چارقسم کاثواب ہے:

ثواب اوّل: کہ اس نے جوامرِ محبوب حق تعالیٰ کو وجودِ آدمی اوراس کی بقائے نسل سے حاصل ہوتا ہےاس کے لیےکوشش کی ہےاور جوآفرینش کی حکمت کوسمجھتا ہےاسےاس بات میں کوئی شبہ لاحق نہیں ہوتا کہ نکاح محبوب حق تعالیٰ ہے کیونکہ جب مالک اس زمین کو جوزراعت کے لائق ہوتو اپنے بندے کو دیتا ہےاور تخم فراہم کرتا ہے نیز بیلوں کی جوڑی اور زرعی آلات اس کے حوالے کرتا ہےاوراس پر ایک مختار کا بھیجتا ہے کہ وہ غلام کوکھیتی باڑی میں مصروف رکھےتو غلام اگر معمولی سمجھ کا مالک ہی ہوتو اسےمعلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقصد اس سے کیاہے اگرچہ مالک اس بارے میں زبان سے کچھ نہ کہےاوراللہ تعالیٰ جس نے عورت کے شکم میں رحم کو پیدا کیااورعضوہائے مباشرت پیدا کیےاورشہوت کومردوزن پر موکل ٹھہرایااوراولاد کا بیج مردوزن کے پشت اور سینے میں ودیعت کیاتو کسی بھی صاحب خرد سے مخفی نہیں رہتا کہ غرض اس سے کیاہےاور اگر کوئی بیج کو ضائع کرےاور موکل کو حیلے بہانے دور رکھےتو ظاہر ہے کہ وہ فطرت کے مقصود کی راہ سے بھٹک گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلاف اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس امر کومکروہ جانتے تھے کہ بے نکاح مرجائیں۔یہاں تک کہ معاذ رضی اللہ عنہ کی دوبیویاں وبائے طاعون میں مر گئیں اورخوداس میں بھی اس مرض کے آثار نمودار ہوئے توانھوں نے فرمایا''مجھےمرنے سےقبل بیوی فراہم کروکیونکہ میں نہیں چاہتا کہ بےاولادمروں''۔

ثوابِ دوم: یہ کہ بربنائے نکاح اس نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس بات کی موافقت کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کثرتِ امت کی بناء پرفخر کریں گےاسےثواب حاصل ہوگا۔اس لیے بانجھ عورت سے بیاہ کرنے سے منع فرمایا گیاہے کہ اس بچہ سے وجود میں نہ آئے گا۔اورآنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا''عقیم عورت سےتو کھجور کے پتوں کی چٹائی گھرمیں بہتر ہے''۔اور بدرُوعورت جو بچے دیتی ہواس حسینہ سےاچھی ہے جوعقیم ہو''۔یہاں سے یہ امر بھی معلوم ہوا کہ نکاح شہوت رانی کے لیےنہیں ہے کیونکہ شہوت رانی کے لیےتو خوب رُوبدرُوسےبہتر ہے۔

ثواب سوم: یہ ہے کہ اولاد سےدعاحاصل ہوتی ہے کیونکہ تمام خیریہ اعمال کہ جن سےثواب منقطع نہیں

ہوتا ایک اولاد صالح بھی ہے کہ اس کی دعا ماں باپ کے رخصت ہو جانے پر متواتر جاری رہتی ہے جو والدین کو ملتی رہتی ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ دعا کو نور کے طبقوں میں سجا کر مُردوں کو پیش کیا جاتا ہے جن کے سبب انھیں آسایشیں حاصل ہوتی ہیں۔

ثواب چہارم: یہ ہے کہ ایسے بھی ہوتا ہے کہ فرزند باپ سے پہلے فوت ہو جاتا ہے جس سے والدین کو مصیبت کا رنج اٹھانا پڑتا ہے۔ اس لیے فرزند باپ کا شفیع بن جاتا ہے۔ فرمان رسول (ﷺ) ہے ''طفل سے کہا جائے گا کہ چلو بہشت میں داخل ہو جاؤ تو اس پر رنج واندوہ طاری ہوگا تو وہ کہے گا کہ میں اپنے ماں باپ کے بغیر بہشت میں داخل نہ ہوں گا۔ آنحضرت (ﷺ) نے کسی کا جامہ پکڑ کر کھینچا تو فرمایا کہ ''جس طرح میں نے تمھیں کھینچا ہے لڑکا اسی طرح اپنے والدین کو بہشت میں کھینچ لے جائے گا''۔ حدیث میں ہے کہ: ''بچے بہشت کے دروازے پر جمع ہو جائیں گے تو دفعۃً فریادوزاری کریں گے اور ماں باپ کو طلب کریں گے یہاں تک کہ والدین کو ان کے درمیان جمع کر دیا جائے گا اور ہر بچہ اپنے ماں باپ کو جنت میں کھینچ کر لے جائے گا''۔

کہتے ہیں کہ بزرگوں میں سے ایک نکاح سے محترز تھے۔ حتیٰ کہ ایک شب خواب میں دیکھا کہ قیامت برپا ہے اور مخلوق پیاس کی وجہ سے سخت تکلیف میں ہے۔ اس نے دیکھا کہ لڑکوں کی ایک جماعت سونے چاندی کے پیالوں میں ایک گروہ کو پانی دے رہے ہیں تو اس نے بھی پانی ان سے مانگا لیکن انھوں نے اسے پانی نہ دیا اور کہا کہ تمھارا کوئی فرزند ہمارے درمیان نہیں ہے''۔ تو جب وہ بیدار ہوا تو فوراً نکاح کر لیا۔

فایدہ دوم: نکاح کا دوسرا فایدہ یہ ہے کہ وہ اپنے دین کو حصار میں لے لیتا ہے اور شہوت کو جو شیطان کا آلہ ہے۔ اس طرح اسے خود سے باز رکھتا ہے۔ اسی لیے آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''جس نے نکاح کر لیا اس نے اپنے آدھے دین کو محفوظ کر لیا''۔ اور وہ جو نکاح نہ کرے تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ آنکھ کو نگاہ سے اور دل کو وسوسے سے محفوظ نہیں رکھ سکتا اگرچہ شرم گاہ کو بچا سکے۔ لیکن نکاح اولاد کی غرض سے کرنا چاہیے نہ کہ شہوت رانی کے لیے۔ وہ عمل جو دفع موکل کی خاطر کیا جائے اس کی نسبت نکاح جو اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری یعنی اولاد پیدا کرنے کی نیت سے کیا جائے اس کا بجالانا اللہ کو زیادہ محبوب ہے اور وہ فاضل تر بھی ہے اور شہوت کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ محرک اور متقاضی ہو۔ ہر چند کہ شہوت میں اور بھی حکمت ہے کہ اس میں بڑی لذت رکھی گئی ہے تاکہ آخرت کی لذتوں کی مظہر ہو۔ جیسے کہ آگ پیدا کی گئی ہے تاکہ اس کی تکلیف آخرت کی تکلیف کی نمودگار ہو۔ ہر چند کہ مباشرت کی لذت اور دنیا کی آگ کی تکلیف مختصر ہیں بمقابلہ اس لذت ورنج کے جس سے آخرت میں دوچار ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے اس میں کئی حکمتیں ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شے

میں بہت سی حکمتیں ہوں لیکن ہم پر پوشیدہ ہوں۔ لیکن بزرگ اور علما سے مخفی نہ ہوں۔ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہر وہ عورت جو باہر نکلتی ہے شیطان اس کے ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے انسان جب کسی خوب رُو عورت کو دیکھے تو چاہیے کہ اپنے گھر جائے اور اسی وقت اپنی بیوی سے مباشرت کرے کیونکہ اس معنی میں سب عورتیں یکساں ہیں۔

فایدہ سوم: اپنی بیویوں سے مل بیٹھنے پر دل کو انس اور راحت ہوتی ہے۔ یہ سبب ان سے مجالست اور مزاح کے۔ یہ آسایش عبادت میں رغبت پیدا کرتی ہے کیونکہ عبادت پر مواظبت ملال آور ہوتی ہے اور دل اس میں گرفتہ ہو جاتا ہے تو یہ آسایش اس قوت کو بحال کر دیتی ہے۔ اور علی (رضی اللہ عنہ) کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ: ''دفعتہً اپنے دلوں سے راحت اور آسایش نہیں روکنا چاہیے کہ اس طرح دل نابینا ہو جاتے ہیں''۔

کبھی ایسا وقت بھی ہوتا کہ مکاشفات میں آنحضرت ﷺ کو عظیم کام کا سامنا ہوتا کہ آپ کا نازک بدن اس کی تاب نہ رکھتا تو آپ حضرت عایشہ رضی اللہ عنہا سے فرماتے: ''عایشہ مجھ سے باتیں کرو''۔ غرض یہ ہوتی کہ خود میں بارِ وحی کو برداشت کرنے کی قوت پیدا کریں اور جب آپ ﷺ اس عالم کی طرف لوٹتے تو وہ قوت تمام ہو جاتی تو اس کام کا شوق آپ (ﷺ) پر غالب ہو جاتا تو فرماتے: ''ارحنا یا بلالؓ'' (اے بلال مجھے راحت پہنچا)۔ تب آپ نماز کا رُخ کرتے اور کبھی یوں ہوتا کہ مشامِ جان کو خوشبو سے قوت فراہم کرتے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ''حُبّب اِلَیّ مِن دُنیا کُم ثِلاث :الطِّیبُ والنِّساءُ وقُرَّۃَ عَینِی فِی الصَّلوٰۃ '' یعنی آپ نے فرمایا کہ مجھے اس دنیا میں تین دوست عطا ہوئے ہیں: خوشبو، عورتیں اور نماز'' لیکن خصوصیت آپ ﷺ نے نماز کو دی۔ کیونکہ مقصود یہی نماز ہی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ میری آنکھوں کا نور نماز میں ہے اور خوشبو اور عورتیں جسم کی آسایش کے لیے ہیں تاکہ ان سے قوت پا کر نماز ادا کریں اور نورِ عین جو نماز میں ہے، اسے حاصل کر سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ دنیا کا مال جمع کرنے سے منع فرماتے تھے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے آپ ﷺ سے استفسار کیا: ''پس دنیا سے ہم کیا چیز لیں؟ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''لِیَتَّخِذ اَحَدَکُم لِسانًا ذاکراً وَ قَلبًا شَاکراً وَزَوجۃ مؤمِنۃ'' فرمایا ذاکر زبان، شاکر دل اور زنِ پارسا۔ پرہیزگار بیوی کا نام ذکر و شُکر کے ساتھ لیا۔

فایدہ چہارم: یہ ہے کہ عورت امور خانہ داری سر انجام دیتی ہے۔ کھانا پکانے، گھر کی صفائی اور کپڑے دھونے وغیرہ سے عہدہ برآء ہوتی ہے کیونکہ مردان کاموں میں مشغول ہوتا تو علم و عمل اور عبادت نہ کر پاتا۔ اس

بنا پر عورت راہ دین میں مرد کی معاون ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے سلمان دارانی ؒ کہتے ہیں کہ: ''نیک بیوی دنیا سے نہیں آخرت کا عطیہ ہے''یعنی کہ تجھے دنیا سے فارغ رکھے تاکہ تُو کارِ آخرت میں مصروف رہے۔ عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ''ایمان کے بعد شایستہ بیوی سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں''۔

فایدہ پنجم: عورتوں کے اخلاق پر صبر کرنا اور ان کی ضروریات پوری کرنا اور انھیں راہِ شریعت پر چلانا ایک مجاہدے کے بغیر ممکن نہیں۔ اور یہ مجاہدہ فاضل ترین عبادات میں سے ہے۔ حدیث میں ہے کہ نفقۂ عیال صدقہ دینے سے فاضل تر ہے۔ اسلاف کا قول ہے کہ ''بیوی بچوں کے لیے حلال روزی فراہم کرنا ابدال کا کام ہے''۔

ابن المبارک ؒ بزرگوں کے ایک گروہ کے ہمراہ غزو میں تھے تو کسی نے سوال کیا ''ہم لوگ جس کام میں اس وقت مشغول ہیں کوئی اور کام اس عمل سے زیادہ فضیلت والا ہے؟'' تو انھوں نے کہا ''جہاد و قتال سے فاضل تر کوئی چیز ہم نہیں جانتے'' تو ابن المبارک ؒ نے کہا: ''میں جانتا ہوں کہ جس کے بیوی بچے ہوں اور وہ انھیں بہ صلاح تربیت کرے رات کو بیدار ہو کر چھوٹے بچوں کو اگر برہنہ دیکھے تو ان پر کپڑا اوڑھے' تو اس کا یہ عمل ہمارے اس غزو سے بڑھ کر ہے''۔ اور بشر حافی ؒ فرماتے ہیں کہ ''احمدِ حنبل ؒ کو مجھ پر تین فضائل ہیں جو مجھے حاصل نہیں: ایک یہ کہ وہ اپنے لیے نیز اپنے اہل وعیال کے لیے روزی فراہم کرتا ہے جب کہ میں صرف اپنے لیے روزی طلب کرتا ہوں''۔ اور حدیث میں ہے کہ گناہوں میں ایک گناہ ایسا بھی ہے جس کا کفارہ سوائے بیوی بچوں کے لیے زحمت برداشت کرنے کے اور کوئی نہیں۔

بزرگوں میں سے ایک کی بیوی فوت ہوگئی۔ اسے نکاحِ دیگر کے لیے آمادہ کرنے کی سعی کی گئی وہ رغبت نہ کرتے تھے اور کہتے ''اکیلے میں میں دل کو حاضر تر اور ہمت کو جمع تر پاتا ہوں''۔ یہاں تک کہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھلے ہیں اور مردوں کا ایک گروہ ایک دوسرے کے پیچھے چلے آتے ہیں اور فضا میں چلے جا رہے ہیں جب اس کے پاس پہنچے تو پہلے شخص نے کہا کہ ''یہ مردِ میشوم ہے؟'' تو دوسرے نے کہا ''ہاں'' تیسرے نے کہا: ''یہ مرد میشوم ہے؟'' تو چوتھے نے کہا ''ہاں'' تو یہ ان کی ہیبت سے ڈرا کہ پوچھے کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے؟ یہاں تک کہ ان میں کا آخری اس کے پاس آ گیا تو اس نے کہا کہ ''یہ لوگ شُوم کسے کہتے ہیں؟'' تو اس شخص نے کہا کہ ''تجھے۔ کیونکہ اس سے قبل تیری عبادت کو مجاہدوں کے اعمال کے ساتھ آسمان پر لے جاتے تھے اور اب ایک ہفتہ ہو چلا کہ تمھارا نام مجاہدوں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ پتہ نہیں تم نے کیا کیا ہے''۔ تو جونہی یہ بیدار ہوا تو فوراً دوبارہ نکاح کیا تاکہ جملہ مجاہدوں میں سے ہو۔ یہ ہیں وہ جملہ فوایدِ نکاح جن کے باعث نکاح کی طرف راغب ہونا چاہیے۔

آفاتِ نکاح: یہ تین ہیں:

آفتِ اوّل: ہوسکتا ہے کہ انسان حلال روزی کی طلب سے عاجز ہو۔ خصوصاً اس جیسے زمانے میں، اور بیوی بچوں کے باعث حرام اور مشتبہ روزی حاصل کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اور یہ امر اس کے دین کی ہلاکت کا باعث بن جائے۔ اور کوئی فضیلت اس کا تدارک نہیں کرتی۔ حدیث میں ہے کہ ''انسان کو ترازو کے پاس رکھتے ہیں اور اس کے اچھے اعمال ہوں جن میں سے ہر ایک پہاڑ کا سا ضخیم ہو۔ پھر اس سے پوچھیں گے کہ بیوی بچوں کو نفقہ کہاں سے فراہم کیا تھا؟ تو اس بناء پر پکڑ ہوگی یہاں تک اس کی تمام نیکیاں ضایع ہو جائیں گے۔ ساتھ ہی اعلان کیا جائے گا کہ یہ وہ شخص ہے جس کی بیوی اس کی تمام نیکیاں ہڑپ کر گئی۔ اور وہ پکڑا گیا''۔ اور آثار میں ہے کہ پہلا فرد جو بندے کے ساتھ قیامت میں الجھے گا اس کی بیوی ہوگی جو کہے گی: ''بارِ خدایا ہمارا انصاف اس سے لے جس نے ہمیں حرام کھلایا، جب کہ ہمیں اس کا علم نہ تھا۔ اور جو کچھ ہمیں تعلیم کیا جانا چاہیے تھا اس نے تعلیم نہ کیا حتٰی کہ ہم اس سے جاہل رہے''۔

پس جس کے پاس مال و میراث نہ ہو یا کسب حلال کا ذریعہ نہ ہو اسے نکاح نہیں کرنا چاہیے۔ اِلّا یہ کہ اسے بہ یقین یہ احساس ہو کہ اگر نکاح نہ کرے گا تو زنا کا مرتکب ہوگا۔

آفتِ دوم: کہ حق عیال میں ایستادگی سوائے ان کا رنج برداشت کرنے اور ان کے محالات پر صبر کرنے اور خوش اخلاقی کے اور ان کے کاموں میں مسلسل تدبیر کرنے کے ممکن نہیں۔ اور یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ اہل و عیال کو رنج پہنچائے یا انھیں بے تحفظ چھوڑ دے۔

اور حدیث میں ہے کہ ''جو شخص اپنے اہل و عیال سے گریزاں ہو وہ ایسے غلام کا سا ہے جو مفرور ہو اس کا نماز و روزہ اس وقت تک قبول نہ ہوگا جب تک وہ ان کے قریب نہ ہو''۔

مختصر یہ کہ ہر آدمی پر اپنے نفس کی اصلاح واجب ہے جو اپنے نفس کی اصلاح نہیں کرسکتا تو بہتر یہ ہے کہ دوسرے کے نفس کی اصلاح کی ذمہ داری نہ لے۔ بشر حافیؒ سے لوگوں نے کہا: ''تم نکاح کیوں نہیں کرتے؟'' تو انھوں نے کہا کہ میں اس آیہ شریف سے ڈرتا ہوں کہ: ''**وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِی عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ**'' (قرآن: ۲۲۸/۲) (عورتوں کے لیے مردوں پر مقدور بھر پاک صاف رکھنا اور خوش رکھنا اتنا ہی واجب ہے جس قدر مردوں کے لیے عورتوں کو اسی طرح رکھنا واجب ہے''۔

اور جب ابراہیم بن ادھمؒ سے کہا گیا کہ ''تم نکاح کیوں نہیں کرتے؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''میں نکاح کیسے کروں کہ مجھے عورت کی حاجت نہیں تو میں کسی عورت کو اپنے لیے فریب کیونکر دوں؟''

آفتِ سوم: یہ ہے کہ انسان کا دل اور افکار اہل وعیال کے کام سنوارنے میں صرف ہو جاتے ہیں جس سے وہ ذکرِ اللہ ذکرِ آخرت اور زادِ آخرت کی فراہمی نہیں کر پاتا اور جو شے ذکرِ اللہ سے مانع ہو وہ سبب ہلاکت ہے۔اسی لیے حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ'' (قرآن: ۹/۶۳) (اے ایمان والو تمھیں تمھارا مال اور تمھاری اولاد ذکر اللہ سے غافل نہ کردے!) پس جس شخص کو یہ قوت نہ ہو کہ اہل وعیال میں مشغولی اس کو ذکر اللہ سے مشغول نہ کرے گی جیسے کہ رسول (ﷺ) کو تھی اور جانتا ہو کہ اگر نکاح نہ کرے گا تو ذکر وعبادت میں مصروف رہے گا اور حرام سے مامون رہے گا تو اس کے لیے نکاح نہ کرنا ہی فاضل تر ہے۔مگر وہ جو رزق حلال پر قادر ہو اور اپنے اخلاق اور شفقت پر مطمئن ہو گا۔ اور اسے یہ علم ہو کہ نکاح اسے ذکرِ حق تعالیٰ سے غافل نہ کر سکے گا۔تو وہ اگر نکاح کرے اور ذکر حق میں مداومت کا امیدوار ہو تو نکاح اس کے لیے آفت نہ سمجھا جائے گا۔

•••

باب دوم: عقدِ نکاح کی کیفیت اس کے آداب اور صفات جو عورت کے بارے میں ملحوظ رہنی چاہییں

شرایط نکاح پانچ ہیں:

شرط اوّل: ولی ہے۔ کیونکہ ولی کے بغیر نکاح درست نہیں ہوتا۔ اور جس کا ولی نہ ہو بادشاہ اس کا ولی ہوتا ہے۔

شرط دوم: یہ کہ عورت رضا مند ہو۔ سوائے اس کے کہ دوشیزہ ہو۔ جب باپ یا دادا رضا دے رہا ہو تو عورت کی رضامندی کی ضرورت نہیں۔ اولیٰ تر یہ ہے کہ اسے بھی بتائیں۔ اگر خاموش رہے تو بھی کافی ہے

شرط سوم: یہ کہ دو عادل گواہ موجود ہونے چاہییں اور اولیٰ تر یہ ہے کہ اہل صلاح میں سے ایک جماعت موجود ہو اور دو ہی شخصوں پر اکتفا نہ کریں۔ یوں اگر دو غیر معروف اصحاب کا ہونا جن کا فسق لوگوں کو معلوم نہ ہو نکاح کے لیے درست ہے۔

شرط چہارم: یہ کہ ولی اور شوہر یا ان کا وکیل ایجاب وقبول کے الفاظ زبان پر لائیں صراحت کے ساتھ۔ اور لفظ نکاح یا تزویج یا فارسی متبادل بھی کہا جائے اور سنت یہ ہے کہ ولی یہ الفاظ کہے۔ بعد اس کے کہ خطبہ پڑھا جائے۔ ''بِسۡمِ اللهِ وَالۡحَمۡدُ لِلهِ میں فلاں کو اس قدر مہر کے ساتھ تمھارے نکاح میں دیتا ہوں'' اور شوہر کہے کہ ''بِسۡمِ اللهِ وَالۡحَمۡدُ لِله اس نکاح کو اس قدر مہر کے ساتھ قبول کرتا ہوں''۔ اور اولیٰ تر یہ ہے کہ دولہا دلھن کو عقد سے پہلے دیکھ لے تاکہ پسند کرے تو نکاح کرے کیونکہ اس صورت میں محبت کی زیادہ امید ہے۔ اور چاہیے کہ نکاح کا مقصد اور نیت اولاد اور خود کو اپنے دل ونگاہ کو ناجائز سے بچانے کی غرض ہو اور مقصود فقط ہوا وہوس اور تمتع نہ ہونا چاہیے۔

شرط پنجم: یہ کہ عورت اس صفت سے متصف ہو کہ نکاح اس کا حلال ہو اور بیس کے قریب وہ صفات ہیں جن سے نکاح حرام ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ عورت جو کسی دوسرے کی منکوحہ ہو یا ابھی عدت میں ہو یا مرتد ہو۔ یا بت پرست ہو یا زندیق ہو اور قیامت اور اللہ ورسول پر ایمان نہ رکھتی ہو۔ یا اباحتی ہو کہ عورتوں مردوں کے اختلاط کو جائز سمجھتی ہو اور نماز نہ پڑھتی ہو اور کہتی ہو کہ ''ہمارے نزدیک مسلم ہے کہ بے نماز ہونے پر عقوبت نہ

ہوگی''۔عیسائی ہو یا یہودی ہو یا ایسے لوگوں کی نسل سے ہو جو ہمارے رسول (ﷺ) کے آنے کے بعد یہودی یا عیسائی ہو گئے ہوں۔ یا لونڈی اور مرد آزاد عورت کا مہر دینے پر قادر ہو یا زنا سے دور رہنے پر قادر ہوں یا وہ اس مرد کی ملکیت میں کلیۃً یا جزواً یا مرد کی رشتہ دار اور محرم ہو یا رضاعی ہونے کی وجہ سے حرام ہوگئی ہو یا قرابت کے سبب اس پر حرام ہوگئی ہو مثلاً وہ اس سے پہلے اس کی اولاد میں سے کسی سے نکاح کر چکا ہو یا اس کی بیٹی یا نواسی یا ماں یا دادی نانی سے نکاح کر چکا ہو۔اور ان سے مباشرت بھی کر چکا ہو یا موجودہ عورت اس کے باپ یا اس کے بیٹے کے نکاح میں رہ چکی ہو۔ یا مرد کی پہلے ہی چار بیویاں ہوں۔اور وہ پانچویں ہو۔ یا اس کی بہن یا چچی یا خالہ اس کے نکاح میں پہلے سے موجود ہو۔ کیونکہ ان کو جمع کرنا جائز نہیں اور ہر دو عورتوں میں ایسی قرابت داری ہو کہ اگر ان میں سے ایک عورت ہو اور دوسرا مرد اور ان کا نکاح ناجائز ہو تو جائز نہیں کہ کوئی مرد ان کو بیویوں کے طور پر جمع کرے۔ یا وہ عورت پہلے اس کے نکاح میں رہ چکی ہو اور خود اس سے طلاق یافتہ ہو یا اسے تین بار خریدا یا بیچا ہو تو ایسی عورت جب تک کسی اور کے نکاح میں نہ رہ چکی ہو دوبارہ اس کی بیوی نہیں بن سکتی۔ یا ان کے درمیان لعان ہو چکا ہو۔ یا مرد عورت کا محرم ہو یا حج یا عمرہ کا احرام باندھے ہو یا یہ عورت یتیم ہو یا نابالغ ہو تو جب تک بالغ نہ ہو جائے نکاح جائز نہیں۔ مذکورہ بالا تمام قسم کی عورتوں سے نکاح حرام ہے۔ یہ ہیں شرائط نکاح کے درست ہونے یا حلال ہونے کی۔

صفات نکاح عورتوں میں

عورتوں میں وہ صفات جن کو ملحوظ رکھنا سنت ہے' آٹھ ہیں:

صفت اوّل: پارسا ہونا ہے۔اور یہ بنیادی صفت ہے کہ ناپارسا عورت اگر شوہر کے مال میں خیانت کرے تو شوہر کی گھر میں برتری مختل ہو جاتی ہے۔اور اگر عورت اپنے بدن میں خیانت کرے تو اگر مرد چشم پوشی کرے تو یہ حمیت اور دین میں نقصان کا باعث ہے۔اور خلق کے درمیان سیاہ روی اور نکوہش کا سبب ہوتی ہے۔ شوہر اگر خاموش نہ رہے تو باہم زندگی بسر کرنا دوبھر ہو جائے گا۔اور اگر طلاق دے تو ممکن ہے کہ دل علاقہ مند رہے۔اور اگر ناپارسائی کے ساتھ خوب صورت ہو تو یہ مصیبت زیادہ گھمبیر ہوگی۔ ہر چند ایسا ہی ہو لیکن بہتر یہ ہے کہ طلاق دے دے۔ الا یہ کہ دل میں گھر کر گئی ہو۔ایک شخص نے رسول (ﷺ) کے پاس شکایت اپنی بیوی کی ناپارسائی کی کی تو آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ''اسے طلاق دے دو'' تو اس پر اس شخص نے کہا کہ ''مجھے اس سے محبت ہے'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''پھر اسے طلاق نہ دے کیونکہ اگر طلاق دے گا تو تو بھی فساد میں مبتلا ہو جائے گا''۔

حدیث میں ہے کہ جو عورت کو اس کے مال و جمال کے لیے چاہتا ہو وہ دونوں سے محروم رہتا ہے۔ اور اگر عورت کو بر بنائے دین چاہے تو مقصود مال و جمال خود حاصل ہو جائے گا۔

صفت دوم: اچھا اخلاق ہے کیونکہ بدخُو عورت ناشکری ہوتی ہے۔ زبان دراز ہوتی ہے اور بے جا حکم چلاتی ہے جس سے جینا دوبھر ہو جاتا ہے اور دین میں فساد کا سبب ٹھہرتی ہے۔

صفت سوم: جمال ہے کہ الفت کا سبب ہے۔ اسی لیے نکاح سے قبل دیدار سنت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''انصاری عورتوں کی آنکھوں میں کوئی ایسی چیز ہے کہ انسان دل سے نفرت کرتا ہے۔ اس لیے جو ان سے نکاح کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ پہلے ان کی آنکھوں میں جھانکے''۔ کہتے ہیں کہ ''جو نکاح دیدار سے قبل منعقد ہو جائے اس کا انجام اندوہ و پشیمانی پر ہوتا ہے''۔ اور یہ جو آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ ''عورت کو جمال کے لیے نہیں بلکہ دین کے لیے چاہنا چاہیے'' اس کے معنی یہ ہیں کہ بے دیانت محض جمال کی بناء پر انتخاب نہیں کرنا چاہیے۔ مفہوم یہ ہے کہ جمال کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اور اگر کسی کا مقصود نکاح سے فقط اولاد ہو اور مجرد سنت ہو اور وہ جمالِ زن کو ملحوظ نہ رکھے تو یہ زہد کے ابواب میں سے ایک باب ہے۔ جیسے کہ جناب احمد ابن حنبل نے ایک یک چشم عورت کو نکاح کے لیے اس کی بہن جو صاحبِ جمال تھی اس پر ترجیح دی کیونکہ زنِ یک چشم کے لیے انھیں بتایا گیا تھا کہ وہ عاقل تر ہے۔

صفت چہارم: یہ کہ مہر اس کا زیادہ نہ ہو۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ عورتوں میں بہترین وہ عورتیں ہیں جن کا مہر سبک تر ہو اور چہرہ خوب صورت''۔ گراں مہر مکروہ ہے۔ آنحضرت (ﷺ) نے بعض نکاح دس درم مہر پر کیے ہیں اور اپنی اولاد کو کبھی چار سو درم سے زاید مہر پر نہیں دیا۔

صفت پنجم: یہ کہ بانجھ نہ ہو کیونکہ آنحضرت (ﷺ) فرماتے ہیں کہ ''گھر کے گوشے میں کھجور کی چٹائی زن نازا سے اچھی ہے''۔

صفت ششم: یہ کہ باکرہ ہو کہ الفت کے قریب تر ہوتی ہے اور وہ جو شوہر دیدہ ہو بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ اس کا دل سابق شوہر سے وابستہ ہوتا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک بیوہ سے شادی کی تھی۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا تم نے کسی باکرہ سے شادی کیوں نہ کی تاکہ تو اس سے ہنستا کھیلتا اور وہ تجھ سے ہنستی کھیلتی؟''

صفت ہفتم: یہ کہ عورت نسباً محترم ہو۔ دین داری اور اصلاح کے پیش نظر کیونکہ کم اصل ادب سے بے بہرہ ہوتی ہے۔ اور اخلاق اس کے ناپسندیدہ ہوتے ہیں اور اس امر کا خدشہ ہوتا ہے کہ ایسے اخلاق اولاد میں بھی منتقل ہو جائیں۔

صفتِ ہشتم : یہ کہ قریبی عزیزوں میں سے نہ ہو کیونکہ حدیث میں ہے کہ اس طرح اولاد کمزور پیدا ہوتی ہے۔شاید سبب اس کا یہ ہو کہ اقارب کے لیے شہوت کمزور ہوتی ہے۔تو یہ ہیں عورتوں کی صفات۔

لیکن دلھن کا ولی جو اسے زوجیت میں دینے کا خواہاں ہو اس پر واجب ہے کہ اس مصلحت کو ملحوظ خاطر رکھے۔اور وہ ایسے شخص کو اس کے لیے اختیار کرے جو شایستہ ہو بدشکل بداخلاق اور نان ونفقہ سے عاجز شخص سے احتراز کرے۔ جب کفو نہ ہو تو نکاح روا نہ ہوگا۔ اس طرح کسی فاسق کو بیٹی دینا بھی ناجائز ہے۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ: جو اپنی بیٹی کو کسی فاسق کے نکاح میں دے گا تو وہ قاطع رحم ہوگا''۔ نیز یہ فرمایا کہ: ''نکاح ایک گونہ غلامی ہے۔اس لیے نہایت غور کرنا چاہیے کہ کس شخص کی غلامی میں دے رہا ہے''۔

•••

باب سوم: عورتوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے آداب

ابتدائے نکاح سے لے کر آخر تک

اے عزیز جان لے کہ جب یہ معلوم ہو چکا کہ نکاح اصول دین میں سے ایک اصل ہے تو چاہیے کہ اس امر میں آداب دین کو ملحوظ رکھے ورنہ انسانوں کے نکاح اور جانوروں کی جفتی کرنے میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ پس نکاح میں بارہ[۱۲] آداب ملحوظ رکھنے چاہییں:

ادب اوّل: ولیمہ ہے اور یہ سنتِ مؤکدہ ہے۔ آنحضرت (ﷺ) نے عبدالرحمٰن بن عوف سے کہ جب وہ نکاح کر چکے فرمایا: ''اولم ولو بشاۃ'' ''ولیمہ کرو اگرچہ ایک بکری ہی کیوں نہ ہو'' اور اگر کسی کے پاس بکری نہ ہو تو وہ جس قدر طعام بھی دوستوں کے آگے رکھ دے گا ولیمہ ہوگا۔ آنحضرت (ﷺ) نے جب حضرت صفیہ سے نکاح کیا تو آپ ﷺ نے جو کے آٹے اور خرما سے ولیمہ انجام دیا تھا پس جس قدر استطاعت ہو ولیمے کی تعظیم کے لیے پیش کر دے۔ اور چاہیے کہ تین دنوں سے زیادہ تاخیر نہ کرے۔ اگر بہ امر مجبوری تاخیر کرنا پڑے تو بھی ہفتے سے زیادہ نہ ہونی چاہیے۔

اور دف بجانا اور نکاح کا اظہار کرنا اور اس سے خوشی کا سامان کرنا سنت ہے۔ کیونکہ روئے زمین پر اشرف الخلوق انسان ہیں۔ اور ان کی تخلیق کا فتح باب نکاح ہے۔ پس یہ شادی عین برمحل ہے اور سماع اور دف ایسے موقع پر سنت ہے۔ ربیع بنتِ معوذ سے روایت ہے کہ ''جس رات کو مجھے دلھن بنایا گیا تو اگلے دن آنحضرت (ﷺ) تشریف لائے تو کنیزیں دف بجا رہی تھیں اور گیت گا رہی تھیں۔ تو جب انھوں نے آنحضرت (ﷺ) کو دیکھا تو شعر میں آپ ﷺ کی ثناء میں لگ گئیں تو آنحضرت (ﷺ) نے انھیں کہا کہ: ''اسی پر آ ؤ جو پہلے گا رہی تھیں''۔ اور اجازت نہ دی کہ آپ (ﷺ) کی تعریف گائیں۔ کیونکہ سنجیدہ کو کھیل میں آمیزش دینا مناسب نہیں، جب کہ آپ (ﷺ) کی ثنا عین امر جِدّ ہے۔

ادب دوم: یہ ہے کہ عورتوں کے ساتھ خوش خوئی سے پیش آیا جائے اور خوش خوئی کے معنی یہی نہیں کہ انھیں تکلیف نہ پہنچائی جائے بلکہ یہ ہیں کہ ان کا رنج برداشت کرے اور ان کے محال مطالبات اور ناشکر گزاری پر صبر کرے۔ حدیث میں ہے کہ: عورتوں کو ضعیف اور مستور پیدا کیا گیا ہے۔ تو ان کے ضعف کا علاج خاموشی

ہے اوران کی مستوریت کا داروان کو گھر کی چار دیواری میں مقید کرنا ہے''۔

آنحضرت (ﷺ) فرماتے ہیں کہ ''جوکوئی اپنی اہل کی بدخوئی پر صبر کرے گا تو اسے اتنا ثواب دیا جاتا ہے جتنا حضرت ایوب علیہ السلام کوان کی ابتلا پر دیا گیا تھا اور اسی طرح جوعورت اپنے شوہر کی عادت بد پر صبر کرے گی تو اس کا ثواب آسیہؓ کے ثواب جیسا ہوگا جو فرعون کی بیوی تھیں''۔ اور آنحضرت (ﷺ) کے زمان آخر میں بوقت وفات صحابہؓ نے آنحضرت (ﷺ) سے جو چیز سنی جسے وہ زیر زبان فرمار ہے تھے وہ یہ تین باتیں تھیں: ''نماز کو قائم رکھنا؛ غلاموں کے ساتھ حسن سلوک رکھنا اور اللہ اللہ عورتوں کے بارے میں فرمایا کہ وہ تمھارے ہاتھوں میں قید ہیں۔ ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ زندگی گزارنا'' اور رسول (ﷺ) اپنی بیگمات کا غم وغصہ برداشت کرتے تھے۔ ایک دن حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی بیوی نے انھیں غصے میں جواب دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''بدزبان تو جواب دیتی ہے؟'' تو اس نے کہا: ''ہاں رسول تجھ سے بہتر جانتے ہیں اوران کی زوجات انھیں جواب دیتی ہیں'' تو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو افسوس ہے حفصہ (رضی اللہ عنہ) پر کہ اس کے سر پر خاک'' پھر حفصہ رضی اللہ عنہا سے جوان کی بیٹی اور آنحضرت (ﷺ) کی بیوی تھیں تو حفصہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ خبردار جو تو نے کبھی آنحضرت (ﷺ) کو جواب دیا۔ ابوبکر کی بیٹی کی طرح خود کو نہ سمجھنا وہ تو ان کی محبوب ہیں۔ اس لیے وہ ان کی ہر بات برداشت کر لیتے ہیں''۔

ایک دن ایک عورت نے غصے میں ہاتھ آنحضرت ﷺ کے سینے پر مارا تو اس کی ماں نے اسے سختی سے ٹوکا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جانے دو یہ تو اس سے بھی زیادہ میرے ساتھ کرتی ہیں اور میں درگذر کرتا ہوں''۔ نیز فرمایا کہ: ''خیر کم خیر کم لاھله وانا خیر کم لاھلی ''یعنی تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا ہے۔ اور میں اپنی زوجات کے ساتھ سلوک میں سب سے بڑھ کر ہوں''۔

ادب سوم: یہ ہے کہ ان کے ساتھ ہنسی مذاق کرے اور خاموش نہ بیٹھا رہے۔ اوران کی سمجھ کے مطابق سلوک کرے اور کوئی شخص بھی اہل کے ساتھ خوش مزاجی نہ کرتا ہوگا جتنا کہ آنحضرت (ﷺ) فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ (ﷺ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوڑ لگاتے تا کہ معلوم ہو سکے کہ کون آگے نکل جاتا ہے۔ اور رسول ﷺ آگے نکل گئے۔ ایک اور موقع پر دوڑے تو عائشہ آگے نکل گئیں تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''ایک کے مساوی ایک ہوا'' یعنی اب ہم برابر ہو گئے۔ ایک دن آپ (ﷺ) نے حبشیوں کی آواز سنی جو بازی گر تھے اور رقص کر رہے تھے۔ تو آپ (ﷺ) نے حضرت عائشہ سے کہا کہ دیکھنا چاہتی ہو؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ''ہاں'' تو آپ (ﷺ) دروازے کے قریب آئے اور ہاتھ آگے بڑھایا حتی کہ عائشہ رضی اللہ عنہا

نے ٹھوڑی آنحضرت (ﷺ) کی کلائی پر رکھی اور تماشا دیکھنے لگیں۔ کافی وقت گذر گیا تو آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا: ''عایشہ کافی نہیں ہو چکا؟'' تو حضرت عایشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ''ابھی چپ رہیں'' حتٰی کہ آپ (ﷺ) نے تین دفعہ یہی کہا تو عایشہ نے بس کہا۔

حضرت عمرؓ بیوی کے ساتھ سنجیدگی اور درشتی کار کے باب میں کہتے ہیں کہ مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ ایک لڑکے کی طرح گزارنا چاہیے لیکن جب بیوی سرداری کی خواہاں ہو تو مردانہ اقدام کرے''۔ کہتے ہیں مرد جب گھر میں داخل ہو تو مسکراتا ہوا داخل ہو لیکن جب گھر سے نکلے تو خاموشی کے ساتھ نکلے۔ اور جو مل جائے کھا لے اور جو نہ ملے اس کے بارے میں نہ پوچھے۔

ادب چہارم: یہ کہ ہنسی مذاق کو اس حد کو نہ پہنچائے کہ اس کا رعب داب ہی جاتا رہے اور عورتوں کے ساتھ امرِ باطل میں معاونت نہ کرے بلکہ چاہیے یہ کہ جب کوئی کام خلافِ مروت یا خلافِ شریعت دیکھے تو ان کی سرزنش کرے۔ کیونکہ اگر اس کو نظر انداز کرے گا تو ان کے لیے ہنسی کا باعث ٹھہرے گا۔ کیونکہ ''**الرجال قوامون علی النساء**'' کا مفہوم ہی یہ ہے کہ مرد غالب رہے۔ آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ ''**تعس عبدالزوجہ**'' یعنی بیوی کا غلام ہونا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ عورتوں کے ساتھ مشورہ کرنا چاہیے لیکن عمل ان کے مشورہ کے برعکس کرنا چاہیے''۔ اور حقیقت یہ ہے کہ عورت کا نفس مرد کے نفس ہی کے مانند ہے۔ اس لیے اگر ذرہ بھی فروگذاشت کرے گا تو ہاتھ سے نکل جائے گی اور حد سے باہر ہو جائے گی تو پھر تدارک دشوار ہوگا۔ مختصر یہ کہ عورتوں میں ایک کمزوری ہے علاج اس کا یہ ہے کہ آدمی متحمل ہو۔ اور یہ ایسی کجی ہے جس کا علاج ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ مرد کو چاہیے کہ طبیب استاد کی طرح ہو جو ہر علاج کو موقع کی مناسبت سے بروئے کار لائے۔

اجمالاً یہ ہے کہ مرد زیادہ تر صبر برداشت سے کام لے کیونکہ حدیث میں ہے کہ ''عورت پسلی کی ہڈی کی طرح ٹیڑھی ہے اگر اسے بالکل سیدھا کرنا چاہو گے تو ٹوٹ جائے گی''۔

ادب پنجم: یہ ہے کہ میاں غیرت میں اعتدال کو ملحوظ رکھے اور جس بات سے احتمال یہ ہو کہ آفت اٹھ کھڑی ہوگی اس سے بحدِ امکان باز رہے۔ بیوی کو گھر سے نہ نکالے چھت کے اوپر یا دروازے پر نہ چھوڑے کہ کوئی نامحرم اسے دیکھ سکے۔ اور نہ اس کی اجازت دے کہ عورت کسی نامحرم کو دیکھے اور اجازت نہ دے کہ روزن یا کھڑکی میں سے لوگوں کو دیکھے کیونکہ تمام آفات نگاہ ہی سے جنم لیتی ہیں اور وہ گھر کے اندرون سے پیدا نہیں ہوں گی بلکہ کھڑکی، روزن اور درو بام سے سر اٹھاتی ہیں۔ اس لیے ان معانی کو یونہی نہیں گردانا چاہیے۔ لیکن یہ بھی مناسب نہیں کہ بے سبب بدگمانی کرے اور اس کی برائی کرے اور غیرت کو حد سے باہر لے جائے

اوراحوال کے باطن کی ٹوہ میں مبالغے کاارتکاب کرے۔

ایک دفعہ جب حضرت ﷺ سفر سے لوٹے تو رات کا آغاز تھا تو آپ ﷺ نے منع فرماتے ہوئے کہا کہ ''آج کوئی شخص بھی اپنے گھر میں ناگاہ داخل نہ ہو اس لیے کل صبح تک صبر کرو''۔ لیکن دو شخصوں نے اس کے خلاف کیا تو جب گھر میں داخل ہوئے تو منکر سے دوچار ہوئے۔

امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان ہے کہ ''عورتوں کے لیے غیرت کو اس حد تک نہ بڑھاؤ کہ لوگ آگاہ ہو جائیں اور ان پر زبان درازی کرنے لگیں''۔ اصل غیرت یہ ہے کہ نامحرموں پر ان کی آنکھوں کی راہ بند رکھی جائے۔ آنحضرت (ﷺ) نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''عورتوں کے لیے بہتر کیا ہے؟'' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ: ''مرد انھیں نہ دیکھیں اور وہ مردوں کو نہ دیکھیں''۔ تو آنحضرت (ﷺ) کو یہ بات بہت اچھی لگی۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنی آغوش میں لے کر فرمایا: ''ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ'' (قرآن: ۳۴/۳) (ان کو اولاد اور نسل بنایا ایک دوسرے سے اور نیکوں میں سے نیکوں کو)

معاذ نے اپنی بیوی کو اس لیے مارا کہ روزن سے باہر جھانک رہی تھی۔ اور اس بناء پر بھی مارا کہ سیب میں سے ایک مرتبہ اس نے کچھ کھایا تو کچھ غلام کو دیا تھا۔

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ عورتوں کو خوب صورت لباس نہ پہناؤ تاکہ گھر میں بیٹھیں کیونکہ جب عمدہ لباس پہنیں گی تو نمائش کے لیے باہر نکلنے کی تمنا پیدا ہوگی۔ آنحضرت (ﷺ) کے زمانے میں عورتوں کے لیے حکم تھا کہ جس سے وہ پردہ میں مستور ہو کر باجماعت مسجد میں داخل ہوتی تھیں اور آخری صف میں کھڑی ہوتی تھیں لیکن آپ (ﷺ) کے بعد صحابہ کے زمانے میں مسجد میں آنے سے روک دیا گیا۔ کیونکہ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ: ''اگر آنحضرت (ﷺ) دیکھتے کہ عورتیں کس صفت کی ہوگئی ہیں تو مسجد میں نہ آنے دیتے''۔ تو آج تو مسجد میں عورتوں کے آنے کی ممنوعیت یا مجلس میں شرکت اور نظارہ پر پابندی اولیٰ تر ہے۔ مگر وہ بڑھیا جو پیوند زدہ پرانا لباس پہنے ہو اس سے کسی فتنے کا اندیشہ نہیں وہ منع نہیں اور اگر فتنہ کا ڈر ہو تو وہاں عورت کا جانا درست نہیں اور عورت کو چاہیے کہ اپنی آنکھ پر نگاہ رکھے کیونکہ ایک دفعہ ایک نابینا شخص آنحضرت (ﷺ) کے گھر میں داخل ہوا تو اس وقت حضرت عائشہ اور ایک اور عورت بیٹھی تھیں۔ وہ وہاں سے اٹھی نہیں کہ نابینا ہے تو اس پر آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''وہ نابینا ہے تم نابینا نہیں ہو''۔

ادب ششم: یہ ہے کہ مرد اپنی بیوی کو اچھا نان ونفقہ دے۔ تنگی نہ دے۔ اسراف بھی نہ کرے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ بیوی پر نفقے کا ثواب صدقے کے ثواب سے بھی بڑھ کر ہے۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان

ہے کہ اگر کوئی دو دینار جہاد میں صرف کرے یا وہ دینار جس سے غلام آزاد کرے یا کسی مسکین کو ایک دینار دے لیکن جو ایک دینار اپنی بیوی پر صرف کرے تو فاضل ترین اور نیکوترین وہ ایک دینار ہے جو وہ اپنی عیال پر صرف کرتا ہے۔

چاہیے کہ اچھا کھانا کبھی تنہا نہ کھائے۔ اگر تنہا ہی کھانا چاہتا ہو تو چھپ کر کھائے اور جس طعام کو فراہم نہیں کر سکتا اس کی تعریف عورتوں کے سامنے نہ کرے۔

ابن سیرین کہتے ہیں کہ "ہفتے میں ایک بار حلوہ یا شیرینی تیار کرائے۔ یک بارگی شیرینی ترک کرنا بے مروتی ہے"۔ اور کھانا مہمان نہ ہونے کی صورت میں بہ جمع خوان اپنی بیوی کے ساتھ کھائے۔ کیونکہ حدیث میں ایسے ہی بیان ہوا ہے کہ: "حق تعالیٰ اور ملائکہ اُن صاحبان خانہ پر درود بھیجتے ہیں جو اکٹھے کھانا کھاتے ہیں"۔

اور اصل یہ ہے کہ مرد جو کچھ بھی نفقہ کرے کسبِ حلال میں سے ہونا چاہیے کیونکہ اہل وعیال کے ساتھ اس سے بڑھ کر اور کوئی ظلم یا خیانت نہیں ہو سکتی کہ وہ بیوی بچوں کو حرام کھلائے۔

ادبِ ہفتم: یہ ہے کہ عورتوں کو نماز، طہارت وحیض وغیرہ جو امور درپیش آتے ہیں ان کے بارے دین کے احکام سکھائے اگر مرد عورت کو نہ سکھائے تو عورت پر لازم ہے کہ ان مسائل کے بارے میں حصولِ علم کے لیے باہر نکلے۔ لیکن اگر خود اس کے میاں نے ان مسائل کی تعلیم دے دی ہو تو پھر اس کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم رکھنا جائز نہیں۔ مرد اگر اس امر میں فروگذاشت کرے تو گناہ گار ہوگا۔ کیونکہ فرمانِ خداوندی ہے کہ: "قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" (قرآن: ۶/۶۶) (یعنی خود کو اپنی اہل کو آتشِ دوزخ سے بچاؤ)۔

اور اس قدر سکھانا کہ اگر غروب آفتاب سے پہلے حیض منقطع ہو جائے تو عورت کو نماز ظہر اور عصر قضا کرنی چاہیے اور اگر طلوعِ آفتاب سے قبل منقطع ہو جائیں تو اسے نماز مغرب اور عشاء قضا کرنی ہوگی اور بیشتر عورتوں کو اس کا علم نہیں ہوتا۔

ادبِ ہشتم: یہ ہے کہ اگر دو بیویاں ہوں تو ان کے ساتھ مساوی سلوک کرے کیونکہ حدیث میں ہے کہ: "جو ایک بیوی سے زاید میلان رکھتا ہو جب قیامت کے روز نمودار ہوگا تو اس کا نصف بکڑا ہو چکا ہوگا"۔

عطا کرنے اور شب بسری میں برابری کو ملحوظ رکھنا چاہیے لیکن محبت اور جماع میں یکسانی واجب نہیں کیونکہ یہ امور انسان کے دائرہ اختیار سے باہر ہوتے ہیں۔ آنحضرت (ﷺ) ہر رات باری باری زوجات کے ساتھ بسر کرتے تھے لیکن عائشہ کو زیادہ محبوب رکھتے تھے۔ اور فرماتے تھے: "بارخدایا جو کچھ میرے بس میں ہے اس میں نہایت سعی کرتا ہوں لیکن دل میرے قابو میں نہیں"۔

اگر کوئی اپنی بیوی سے سیر ہو گیا ہو اور نہیں چاہتا کہ اس کے پاس جائے تو چاہیے کہ اسے طلاق دے دے۔ ناروا قید میں نہ رکھے۔ آنحضرت (ﷺ) نے اپنی بیوی سودہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دینی چاہی کہ معمر ہو گئی تھیں تو حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "اے اللہ کے رسول (ﷺ) میں اپنی باری عایشہ کو دیتی ہوں۔ مجھے طلاق نہ دیجیے تاکہ روزِ قیامت آپ ﷺ کی زوجیت کے شرف کے ساتھ نکلوں"۔ تو یہ سن کر آپ ﷺ نے اسے طلاق نہ دی اور دو شب حضرت عایشہ (رضی اللہ عنہا) کے ساتھ بسر کرنے لگے اور ایک ایک رات باقی ازواج کے ساتھ۔

ادب نہم: یہ کہ جب بیوی نافرمانی کرے اور شوہر کی اطاعت نہ کرے تو شوہر کو چاہیے کہ اسے مہربانی اور نرمی کے ساتھ اطاعت کی طرف بلائے۔ اگر اطاعت نہ کرے تو اس کا بستر الگ کر دے۔ اگر یہ بھی بے اثر رہے تو اسے مارے لیکن چہرے پر ضرب نہ لگائے اور ضربِ شدید بھی نہیں ہونی چاہیے کہ کوئی جگہ ٹوٹ جائے۔ بیوی اگر نماز یا دین کے کسی کام میں تقصیر کی مرتکب ہو تو اس سے ناراض ہو جائے اور ایک ماہ تک اس سے جدائی اختیار کرے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے تمام زوجات کے ساتھ ایک مرتبہ ایک ماہ یونہی کیا تھا۔

ادب دہم: بیوی سے جماع کے بارے میں ہے۔ چاہیے کہ منہ قبلہ سے پھیر لے اور ابتداء میں بات یا ہنسی مذاق اور بوس و کنار سے اس کا دل بہلائے۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے مرد کو جانوروں کی طرح بیوی پر دفعۃً سوار نہیں ہو جانا چاہیے بلکہ چاہیے کہ مباشرت سے پہلے رسولی ہو" تو آپ (ﷺ) سے سوال ہوا کہ "رسولی یعنی چہ؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا بوسہ"۔ پس جب ابتداء کرنے لگے تو کہے: "بسم اللہ العلی العظیم اللہ اکبر اللہ اکبر"؛ اور اگر ابتداء میں قل ھو اللہ احد پڑھے تو زیادہ اچھا ہے۔ اور کہے: "اللھم جنبنا الشیطان و جنب الشیطان و ما رزقتنا[1]" کیونکہ حدیث میں ہے کہ اگر اس جماع سے بچہ پیدا ہو گا تو وہ شیطان سے محفوظ رہے گا۔

اور انزال کے وقت دل میں لائے کہ: "الحمدللہ الذی خلق من الماء بشراً و جعلہ نسبا وصہرا[2]" اور جب انزال کا وقت ہو تو صبر کرے تاکہ عورت بھی انزال کر لے۔ کیونکہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ تین چیزیں مرد کے عجز میں سے ہیں: ایک یہ کہ کسی کو دیکھے اور اسے دوست رکھتا ہو اور اس کا نام معلوم نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ اسے ایک بھائی کرامت کرے تو اس کی کرامت کو رد کر دے۔ تیسرے یہ کہ قبل اس کے

۱۔ اللہ تعالیٰ ہمیں شیطان سے دور رکھ اور شیطان کو اس روزی سے جو ہمیں ملی دور رکھ۔

۲۔ (قرآن: ۲۵/۵۴) سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے پانی سے آدمی تخلیق کیا اور نسب و خویش و پیوند دیا۔

بوس و کنار میں لگے صحبت میں لگ جائے اور جب اس کی حاجت پوری ہو جائے تو صبر نہ کرے کہ بیوی کی حاجت بھی پوری ہو جائے''۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ' امیر معاویہؓ اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ چاند رات اور مہینے کی آخری رات اور پندرھویں رات مکروہ ہے کیونکہ ان راتوں میں شیطان بوقت صحبت آتے ہیں۔ مرد کو چاہیے کہ ایام حیض میں خود کو جماع سے بچائے لیکن بیوی کے ساتھ برہنہ سونا روا ہے اور جماع غسل حیض سے پہلے بھی ناجائز ہے۔ اسی طرح اگر ایک بار جماع کرنے کے بعد دوسری مرتبہ جماع کو جی چاہے تو چاہیے کہ مرد خود کو دھو لے اور اگر کچھ کھانا چاہیے تو پہلے وضو کرے اور اگر سونا چاہے تو بھی وضو کرے اگرچہ پاک نہ ہوگا کیونکہ سنت یہی ہے اور غسل سے پہلے بال یا ناخن نہ تراشے تاکہ جنابت کی حالت میں اس سے جدا نہ ہوں اور اولیٰ تر یہ ہے کہ مادہ منویہ کو عورت کے رحم میں پہنچائے اور واپس نہ لے آئے لیکن اگر عزل کرے تو حرام نہیں' روا ہے۔

ایک شخص نے آنحضرت (ﷺ) سے سوال کیا کہ میری ایک کنیز خادمہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ حاملہ ہو جائے کیونکہ اس طرح وہ کام سے رہ جائے گی تو آپ ﷺ نے فرمایا: عزل کرلو کیونکہ اگر تقدیر ہوگی تو فرزند خود وجود میں آجائے گا۔ پھر وہ شخص حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ ''بچہ پیدا ہوا ہے''۔ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''کنا لعزل والقرآن ینزل'' ہم عزل کرتے تھے اور وحی آتی تھی اور منع نہیں کرتے تھے۔

ادب یازدہم: فرزند کے پیدا ہونے کے بارے میں ہے۔ چاہیے کہ جب پیدا ہو اس کے دائیں کان میں اذان کہی جائے اور بائیں کان میں اقامت۔ حدیث میں ہے کہ ''جو کوئی یہ عمل کرے گا اس کا فرزند بچوں کے امراض سے مامون رہے گا''۔ فرزند کا حق ہے کہ اس کا اچھا سا نام رکھے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ کے نزدیک محبوب ترین نام عبداللہ' عبدالرحمٰن اور اسی قسم کے نام ہیں۔ اور بچہ اگرچہ ساقط بھی ہو جائے تو بھی اس کا نام رکھنا چاہیے اور عقیقہ سنت موکدہ ہے۔ لڑکی ہو تو ایک بکری اور لڑکا ہو تو دو بکریوں کا عقیقہ کرے لیکن اگر استطاعت ایک کی ہو تو بھی اجازت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عقیقہ کی بکری کی ہڈیاں توڑنی نہیں چاہییں۔

جب بچہ پیدا ہو تو سنت یہ ہے کہ اس کا منہ کھول کر شیرینی دی جائے اور ساتویں دن اس کے سر کے بال مونڈنا اور بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقے میں دینا سنت ہے۔

اگر لڑکی پیدا ہو تو کراہیت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے اسی طرح اگر لڑکا پیدا ہو تو حد سے زیادہ اظہار خوشی بھی مناسب نہیں کیونکہ انسان کو کیا معلوم کہ خیر کس میں ہے اور بیٹی تو مبارک تر ہوتی ہے کیونکہ ثواب اس میں

بیشتر ہوتا ہے۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے: ''جس کی تین بیٹیاں ہوں یا اس کی تین بہنیں ہوں تو رنج ان کا اٹھائے اور ان کا کام بنائے تو اللہ تعالیٰ اس کے ان لڑکیوں پر رحم کرنے کے باعث خود اس پر رحمتیں نازل فرمائے گا۔ ایک شخص نے کہا کہ ''یا رسول اللہ اگر کسی کی دو بیٹیاں ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''تو بھی''۔ ایک اور شخص نے کہا کہ اگر ایک بیٹی ہو تو آپ (ﷺ) نے فرمایا ''تو بھی''۔ آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ جس کی ایک بیٹی ہے وہ رنجور ہے، جس کی دو بیٹیاں ہیں وہ گرانبار ہے اور جس کی تین بیٹیاں ہیں تو اے مسلمانو! اس کی مدد کرو کہ وہ میرے ساتھ دو انگلیوں کی مثل جنت میں ہوگا'' یعنی نزدیک ہوگا۔

آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ''جو شخص بازار سے نیا پھل خرید کر لائے وہ مثل صدقے کے ہے۔ تو چاہیے کہ ابتداء بیٹی سے کرے اور لڑکوں کو اس کے بعد دے۔ جس نے بیٹی کو خوش کیا وہ ایسے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے خوف سے مبتلائے گریہ ہوا ہو اور جو شخص خوف خدا سے رویا ہو اس کا جسم آگ پر حرام ہوتا ہے''۔

ادب دوازدہم: یہ ہے کہ حتی الوسع بیوی کو طلاق نہ دے کیونکہ تمام مباحات میں سے اللہ تعالیٰ طلاق کو دشمن جانتا ہے۔ مختصر یہ کہ کسی کو بھی رنج پہنچانا جائز نہیں الا یہ کہ ناگزیر ہو اور اگر طلاق لازم ہو جائے تو چاہیے کہ ایک وقت میں ایک طلاق سے زیادہ نہ دے کیونکہ ایک ہی وقت میں تین طلاق دینا ناپسندیدہ ہے۔ اور عورت اگر ایام میں ہو تو طلاق دینا حرام ہے اور حالت طہر میں بھی اگر صحبت کر چکا ہو تو بھی طلاق حرام ہے۔

اور چاہیے طلاق میں عذر لائے بر سبیل تلطف اور خشم اور استخفا کے ساتھ طلاق نہ دے بلکہ اسے کوئی تحفہ دے کر اس کی دل جوئی کرے اور اپنی بیوی کا راز کسی اور پر نہ کھولے اور آشکارا نہ کرے کہ کیوں طلاق دیتا ہے۔ ایک شخص سے لوگوں نے پوچھا کہ اپنی بیوی کو طلاق کیوں دیتے ہو تو اس نے کہا میں اپنی بیوی کا راز کیوں افشا کروں۔ جب طلاق دے دی تو لوگوں نے پوچھا کہ ''طلاق کیوں دی''؟ تو کہا: ''مجھے دوسروں کی عورت سے کیا غرض کہ اس کا تذکرہ کروں''۔

فصل: شوہر کا حق بیوی پر

اب تک جو کچھ کہا گیا وہ شوہر پر بیوی کے حق کے بارے میں تھا لیکن بیوی پر مرد کا حق عظیم تر ہے کہ بیوی مرد کے لیے بمنزلہ غلام کے ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر اللہ کے سوا کسی کو سجدہ روا ہوتا تو عورتوں کو مردوں کے سجدے کا حکم ہوتا اور مرد کا حق عورت پر یہ ہے کہ گھر میں بیٹھے اور بغیر مرد کی اجازت کے باہر نہ نکلے۔ اور در و بام کے آگے نہ جائے۔ اور ہمسایوں کے ساتھ بھی زیادہ گفت و شنید اور میل جول نہ رکھے۔ اور بے ضرورت ان کے ہاں نہ جائے۔ اور اپنے شوہر سے سوائے اچھی بات کے نہ کہے۔ اور معاشرت اور صحبت میں اگر کوئی

گستاخی ہوتو اس کا ذکر نہ کرے اور جملہ کاموں میں شوہر کی خوشنودی کی خواہاں ہو اور اس کے مال میں خیانت نہ کرے اور تمام کاموں میں اس کی مراد چاہے اور شفقت کو ملحوظ رکھے اور اگر اس کے شوہر کا کوئی دوست دروازہ کھٹکھٹائے تو جواب اس طرح دے کہ وہ اسے پہچان نہ سکے اور شوہر کے تمام آشناؤں سے پردہ کرے۔ تاکہ وہ اسے نہ پہچانیں اور شوہر سے جو کچھ ملے اس پر قناعت کرے۔ اس سے زیادہ کی طلب نہ کرے۔ اور شوہر کے حق کو اپنے عزیز واقارب پر ترجیح دے۔ اور ہمیشہ اپنے آپ کو پاکیزہ رکھے جیسا کہ صحبت ومباشرت اور معاشرت کا تقاضا ہے اور جو خدمت بھی اپنے ہاتھ سے سرانجام دے سکتی ہو انجام دے اور شوہر کے رُوبرو اپنے جمال پر فخر نہ کرے اور جو نیکی اس نے شوہر کے ہاتھوں اپنے لیے دیکھی ہو تو اس کی ناشکری نہ کرے اور کبھی یہ نہ کہے کہ ''میں نے تجھ سے کیا پایا ہے''؟ اور ہر وقت اس کے عیب نہ ڈھونڈتی رہے۔ اور خشم سے بھی پرہیز کرے۔ اور خرید وفروخت اور طلاق نہ مانگے۔ کہ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے: ''میں نے دوزخ میں جھانکا تو وہاں اکثریت عورتوں کی دیکھی تو میں نے کہا ایسا کیوں ہے؟'' تو جواب ملا: کہ شوہروں کی تذلیل اور ناشکری بہت کرتی ہیں''۔

◆◆◆

اصل سوم: کسب وتجارت کے باب میں

چونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور انسان کو قوت اور لباس کی حاجت ہے جو بے کسب ممکن نہیں۔ اس لیے چاہیے کہ انسان کو کسب کے آداب کا علم ہو۔ اور جو ہمہ تن کسب دنیا ہی کے لیے وقف ہو جائے بدنصیب ہے اور جو خود کو سراپا آخرت کے حوالے کر دے اور توکل کرے نیک بخت ہے۔ لیکن معتدل ترین وہ ہے جو معاش میں بھی مشغول ہو اور فکرِ معاد میں بھی مصروف ہو لیکن اصلی مقصد معاد ہی ہونا چاہیے اور معاش اسباب معاد کے لیے فراغت کا باعث ہو۔ اور جو کچھ کسب کے احکام وآداب میں جاننے کے لائق ہے اسے ہم پانچ ابواب میں بیان کریں گے۔

باب اوّل: کسب کی فضیلت
باب دوم: معاملات کی شرایط میں
باب سوم: معاملات میں انصاف کو ملحوظ رکھنا
باب چہارم: نیکوکاری جو ورائے انصاف ہے
باب پنجم: آپس کے معاملات میں شفقتِ دین کو ملحوظ رکھنا

باب اوّل: کسب حلال کی فضیلت اور اس کے ثواب کے بارے میں

اے عزیز جان لے کہ خود کو اور اپنے اہل وعیال کو خلق سے بے نیاز رکھنا اور رزق حلال کے ذریعے ان کی کفایت کرنا یہ راہ دین میں منجملہ جہاد ہی کے ہے اور جو بہت سی عبادات سے فاضل تر ہے۔ ایک دن آنحضرت (ﷺ) اپنے صحابہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے تو ایک قوی جوان صبح کے وقت ان کے پاس سے گذرا اور وہ بازار کی طرف دکان پر جا رہا تھا تو صحابہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے کاش اس کا اس وقت اٹھنا راہِ اللہ کے لیے ہوتا''۔ تو آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''یوں نہ کہو کیونکہ اگر وہ بازار میں اس لیے جا رہا ہے کہ خود کو خلق سے بے نیاز کرے یا اپنے والدین کو اپنے بیوی بچوں کو دوسروں سے بے نیاز کرتا ہے تو یہ عمل اللہ تعالیٰ ہی کی راہ میں ہے اور اگر تفاخر دنیا یا لاف یا دولت جمع کرنے کے لیے ہو تو یہ راہِ شیطان میں ہوگا''۔

آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا: ''جو کوئی دنیا سے حلال روزی کا طالب ہے تا کہ خلق سے بے نیاز ہو جائے یا ہمسائے اور اپنے اعزہ واقارب کے ساتھ حسن سلوک کرے تو جب قیامت کو نکلے گا تو چہرہ اس کا چودھویں کے چاند کی طرح روشن ہوگا''۔ نیز فرمایا: ''راست باز تاجر روزِ قیامت صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ اٹھے گا''۔ نیز یہ کہ کاسب مومن کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے''۔ نیز فرمایا کہ: ''حلال ترین چیز پیشہ ور کی کمائی ہے بشرطیکہ پاک ہو درست کار ہو اور غلّ وغش سے دور ہو''۔ نیز فرمایا کہ: ''تجارت کرو کیونکہ دس میں سے نو حصے روزی تجارت میں ہے۔ نیز فرمایا: جو کوئی اپنے لیے سوال کا ایک دروزاہ کھولتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایسے ستر دروازے کھول دیتے ہیں''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک شخص کو دیکھا تو پوچھا: ''تو کیا کام کرتا ہے؟'' تو اس نے کہا: ''عبادت کرتا ہوں''۔ تو آپ ﷺ نے دوبارہ سوال کیا کہ: ''روزی کہاں سے کھاتے ہو؟'' تو اس نے کہا: ''میرا ایک بھائی ہے وہ میری کفالت کرتا ہے''۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرا بھائی تجھ سے بڑھ کر عبادت گزار ہے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہ کہہ کر کہ اللہ روزی دیتا ہے۔ ہاتھ کسب حلال سے نہ روکو کیونکہ اللہ تعالیٰ آسمان سے زر وسیم نہیں بھیجتا''۔ لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ ''کسب حلال سے ہاتھ نہ کھینچنا کیونکہ جو کوئی مفلس ہو جائے اور دوسروں کا حاجت مند ہو تو اس کا دین بہت کمزور ہو جاتا ہے اور عقل اس کی ضعیف اور مروّت باطل ہو جاتی ہے اور لوگ اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں''۔ بزرگوں میں سے ایک سے سوال کیا گیا کہ ''عابد فاضل تر ہے یا با امانت تاجر؟'' تو انھوں نے جواب دیا کہ: ''با امانت تاجر' کیونکہ وہ جہاد میں ہے کہ شیطان ترازو کے ذریعے لین دین میں اس کا قصد کرتا ہے تو تاجر شیطان کے خلاف کرتا ہے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''مجھے موت کے وقت کے لیے اس سے بہتر کوئی وقت دکھائی نہیں دیتا کہ میں اس وقت بازار میں کسبِ حلال میں مصروف ہوں''۔

امام احمد بن حنبلؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو مسجد میں عبادت کے لیے بیٹھ جائے کہ اللہ تعالیٰ خود روزی عطا فرمائیں گے''۔ تو آپ نے فرمایا کہ: ''یہ شخص جاہل ہوگا کہ حکم شرع نہیں جانتا' کہ آنحضرت (ﷺ) کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری روزی میرے نیزے کے سائے میں منسلک کر دی ہے یعنی جہاد کرنے میں''۔

اوزاعیؒ نے حضرت ابراہیمؒ بن ادھم کو دیکھا کہ ایندھن کا گٹھا گردن پر اٹھائے ہوئے ہیں تو کہا کہ ''کب تک یہ تیرا کسب جاری رہے گا؟ آپ کے بھائی آپ کے لیے رنج اٹھا سکتے ہیں''۔ تو آپ نے فرمایا کہ

: ''خاموش! کہ حدیث میں ہے کہ جو کوئی طلب حلال کے لیے مذلت کے موقف میں قیام کرے گا اللہ تعالیٰ بہشت اس کے لیے لازم کر دیں گے''۔

سوال: اگر کوئی پوچھے کہ آنحضرت (ﷺ) فرماتے ہیں کہ: ''مَا اُوحِیَ اِلَیَّ اَن اجمَعِ المَالَ وَ کُن مِنَ التَّاجِرِینَ ولٰکِن اوحِیَ اِلَیَّ اَن سَبِّح بِحَمدِ رَبِّکَ وَ کُن مِنَ السَّاجِدِینَ وَاعبُد رَبَّکَ حَتّٰی یَاتِیَکَ الیَقِین ''یعنی مجھے نہیں کہا گیا کہ مال جمع کر اور تاجروں میں سے ہو جا بلکہ کہا کہ تسبیح کر اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جا اور عبادت کر اپنے اللہ کی آخر عمر تک''۔ تو یہ دلیل اس کی ہے کہ عبادت کسب سے فاضل تر ہے۔

جواب: اس کا یہ ہے کہ جان لے کہ جو کوئی اپنے نیز اپنے اہل وعیال کے لیے با کفایت مال رکھتا ہے بے شبہ اس کی عبادت کسب سے فاضل تر ہے کیونکہ جس کے ہاں کسب کفایت سے زیادہ ہو تو اس میں کوئی فضیلت کیا ہوگی' الٹا نقصان ہوتا ہے کہ یہ تو دل کو دنیا میں وابستہ کرنا ہوا جو تمام گناہوں کا سرچشمہ ہے اور جس شخص کو مالِ مصالح یا اوقاف سے روزی فراہم ہوتی ہے اس کو کسب نہ کرنا ہی اولیٰ تر ہے اور یہ چار قسم کے لوگوں کے لیے ہے:

ایک وہ شخص جو علمی کام میں مصروف ہو اور خلق کو اس سے دینی مفاد ہوتا ہے جیسے کہ علم شریعت ہے یا دنیاوی علم جیسے کہ علمِ طب ہے یا وہ شخص جو قضا و اوقاف یا مصالح خلق کی ولایت کی بناء پر مشغول ہو۔

یا وہ شخص جو راہِ سلوک کا مسافر ہو یعنی صوفیاء کے احوال ومکاشفات میں ہو۔

یا وہ شخص ظاہر عبادات اور اوراد میں کسی خانقاہ میں مشغول ہو جو ایسے ہی لوگوں کے لیے وقف ہو۔

پس اس طرح کے لوگوں کے لیے کسب نہ کرنا اولیٰ تر ہے۔ پس اگر روزی ان کی لوگوں کے ہاتھ سے ہو اور زمانہ ایسا ہو کہ لوگ اس قسم کی خیر کے لیے دل سے راغب ہوں اور مانگنے کی نوبت ہی نہ آتی ہو اور دینے والے احسان نہ دھرتے ہوں تو بھی کسب نہ کرنا ہی اولیٰ تر ہے۔ اسلاف میں سے ایک شخص کے تین سو ساٹھ دوست تھے۔ تو وہ ہمیشہ عبادات میں لگا رہتا تھا اور ہر رات ان دوستوں میں سے ایک کے ہاں مہمان ہو جاتا ہے اور اس عبادت کا ذریعہ اس کے دوست ہوتے کہ اسے فارغ دل رکھتے تھے اور یہ سبب ہوتا ہے کہ جس سے خیر کا دروازہ خلق پر کھول دیا جاتا ہے اور ایک وہ شخص تھا کہ جس کے تیس۳۰ دوست تھے۔ تو وہ ہر ماہ ایک رات ایک دوست کے مہمان ہو جاتا تھا۔

لیکن اگر زمانہ ایسا ہو کہ لوگ بے سوال اور بے مذلت اس کی کفایت کی جانب راغب نہ ہوتے ہوں تو کسب فاضل تر ہوگا۔ سوائے اس کے کہ جس کا درجہ عظیم ہو اور علم اس کا بہت فائدہ رساں ہو طلبِ قوت میں

مذلت کم ہو تو پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا کسب نہ کرنا اولیٰ تر ہے۔

لیکن اگر کوئی بہ ظاہر تو کسب میں مشغول ہو لیکن دلی طور پر کسب میں مشغول نہ ہو اس کے لیے کسب اولیٰ تر ہے۔[1] کیونکہ تمام عبادات کی حقیقت ذکرِ حق تعالیٰ ہے اور انسان کسبِ حلال کے دوران دل کو اللہ کے ساتھ مشغول رکھ سکتا ہے۔

باب دوم: کسب کا علم حاصل کرنا تاکہ شرع کے مطابق ہو

معلوم رہے کہ یہ موضوع بڑا وسیع ہے اور جسے ہم نے بتمام وکمال فقہ کی کتب میں بیان کر دیا ہے لیکن یہاں اس قدر کہ جس کی ضرورت زیادہ تر ہوتی ہے، بیان کرتے ہیں تاکہ ہر کوئی اسے جانے۔ پھر بھی اگر کوئی مشکل پیدا ہو تو پوچھ سکتا ہے اور جب علم کسب سے بے بہرہ ہو وہ حرام یا ربا کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ کسی سے پوچھ لینا چاہیے۔ اور اکثر کسب چھ معاملات کی صورت میں ہوتا ہے یعنی: بیع، ربا، سَلَم، اجارہ، قرض اور شرکت میں۔ پس ان جملہ عقود کے بارے میں ضروری شرایط کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

عقد اوّل: بیع ہے۔ اور علم بیع حاصل کرنا فرض ہے اور کسی کو بھی اس کے بغیر چارہ نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بازار میں جاتے تھے تو درہ مارتے اور کہتے تھے "کوئی شخص فقہ بیع سیکھنے سے پہلے بازار میں معاملت نہ کرے ورنہ خواہ مخواہ ربا کا مرتکب ہو جائے گا"۔ معلوم رہے کہ بیع کے تین رکن ہیں۔ ایک خریدار تو دوسرا بیچنے والا کہ ان دونوں کو عاقد کہتے ہیں اور متاع وکالا جسے معقود علیہ کہتے ہیں اور تیسرا رکن لفظ بیع ہے۔

رکن اوّل: عاقد ہے، چاہیے کہ بازار والا پانچ شخصوں کے ساتھ معاملہ نہ کرے، بچہ، دیوانہ، غلام، نابینا اور حرام خور۔ جو لڑکا بالغ نہ ہو، امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی کی ہوئی بیع باطل ہے۔ اگرچہ ولی کے حکم سے ہو اور دیوانے کا بھی یہی حکم ہے۔ آدمی جو کچھ ان سے مول لے گا وہ اگر ضائع ہو جائے تو مول لینے والے پر تاوان ہو گا۔ اگر کچھ دے گا تو اس کا تاوان ان سے نہیں لے سکتا۔ اس واسطے کہ اس نے خود مال دے کر ضائع کیا اور لونڈی غلام کی بیع ان کے مالک کی اجازت کے بغیر باطل ہے۔ قصائی، نانبائی، بنیے وغیرہ جب تک مالک سے اجازت نہ لے لیں تب تک انھیں لونڈی غلام سے معاملہ کرنا درست نہیں یا کوئی عادل خبر دے یا شہر میں مشہور ہو کہ اس کے مالک نے معاملہ کی اجازت دے دی ہے۔ تو اگر اس کے مالک کی اجازت کے بغیر اس سے کچھ لیں گے تو تاوان ان پر ہوگا۔ اور اگر اس کو کچھ دیں گے تو جب تک وہ آزاد نہ ہو جائے تب تک اس سے تاوان نہیں مانگ سکتے۔ اندھے کا کیا ہوا معاملہ باطل ہے۔ مگر یہ کہ ایک بینا وکیل مقرر کرے وہ جو کچھ لے گا اس پر

---

[1] دل در دوست و دست در کار، مشہور لائحہ عمل ہے۔

تاوان ہوگا۔ اس لیے کہ مکلّف آزاد ہے۔ حرام کھانے والے مثلاً ترک' ظالم' چور' سود دینے والے شراب بیچنے والے' ڈاکو' گویّے نوحہ خواں' جھوٹی گواہی دینے والے' رشوت کھانے والے ان میں سے کسی کے ساتھ معاملہ درست نہیں۔ اگر معاملہ کرے اور یہ تحقیق جانے کہ جو کچھ مول لیا ہے انھی کی ملکیت ہے تو حرام نہیں درست ہے۔ اور اگر یہ تحقیق جانتا ہو کہ یہ مال ان کا نہیں ہے تو معاملہ باطل ہے۔ اگر مال مشتبہ ہو تو دیکھے اگر زیادہ تر حلال ہے تو حرام کا مال قلیل ہے تو معاملہ درست ہے۔ لیکن شبہ سے خالی نہیں۔ اور اگر بہت سا مال حرام کا ہے اور تھوڑا سا حلال ہے تو ظاہر معاملہ کو ہم حرام قرار نہیں دے سکتے لیکن یہ شبہ حرام کے قریب ہے اور اس کا خطرہ بہت بڑا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے ساتھ معاملہ کرنا اگرچہ درست ہے لیکن قرآن شریف ان کے ہاتھ ہدیہ نہیں کرنا چاہیے۔ نہ لونڈی غلام ان کے ہاتھ بیچے۔ اگر چہ حربی ہوں تو ہتھیار بھی ان کے ہاتھ نہ بیچے کیونکہ یہ معاملہ ظاہر مذہب کی رو سے باطل ہے اور بیچنے والا گناہ گار ہوگا۔ اہل اباحت بے دین ہیں ان کے ساتھ معاملہ باطل ہے۔ ایسے لوگوں کا خون بہانا اور مال لے لینا جائز ہے کیونکہ یہ لوگ فی الحقیقت کسی شے کے مالک نہیں ہیں۔ ان کا نکاح بھی باطل ہے اور ان کا حکم مرتدوں کی مانند ہے اور جو شخص شراب خور ہو اور نامحرم عورتوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہو اور نماز نہ پڑھتا ہو تو اس کو سات ان شبہوں میں سے جو عنوانِ مسلمانی میں مذکور ہو چکے ہیں ایک بھی شبہ کا حامل پائے تو وہ زندیق ہے' اس کے ساتھ معاملہ اور نکاح درست نہیں۔

رکن دوم:

مال ہے کہ اس پر معاملہ کیا جاتا ہے۔ اس میں چھ شرطوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

شرطِ اوّل: یہ ہے کہ وہ مال نجس نہ ہو۔ کتے' خنزیر' گوہ' ہاتھی کی ہڈی' شراب' مُردار کا گوشت اور مردار کی چربی کی بیع باطل ہے۔ لیکن پاک روغن میں اگر نجاست پڑ جائے تو اس کی بیع حرام نہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس جو کپڑا ناپاک ہو جائے اس کا حکم بھی یہی ہے لیکن مُشک نافہ اور تخمِ کرم ابریشم کی بیع درست ہے۔ اس واسطے کہ صحیح یہی ہے کہ یہ دونوں پاک ہیں۔

شرطِ دوم: یہ ہے کہ بیچی جانے والی چیز میں کوئی منفعت ہو کیونکہ وہ مقصود ہوتی ہے۔ اور چوہے' سانپ' بچھو اور حشرات الارض کی بیع باطل ہوگی۔ اور شعبدہ باز کو سانپ سے جو منفعت ہوتی ہے وہ بے اصل ہے۔ اسی طرح گندم کے ایک دانے یا کوئی شے جو ذرہ ہونے میں ایسی ہو کہ جس سے کوئی غرض پوری نہیں ہوتی وہ بھی باطل ہے۔ لیکن شہد کی مکھی' بلی' شیر' پلنگ' بھیڑیا وغیرہ ہر وہ جانور جس کی کھال میں اسے مارنے پر منفعت ہو جائز ہوگی۔ اسی طرح طوطی' طاؤس' اور خوب رُو پرندوں کی بیع روا ہے۔ منفعت ان کی دید سے راحت اور خوش نوائی

ہے اور بربط و چنگ و رباب کی بیع باطل ہے کیونکہ منفعت ان کی حرام ہے اور نفع کالعدم ہے۔

مٹی کے کھلونے تا کہ بچے ان سے کھیلیں تو جو کسی جانور کی صورت ہوں وہ باطل ہیں، تو قیمت ان کی حرام ہے اور ان کو توڑ دینا واجب ہے۔ لیکن نباتات کی صورت میں ہوں تو جائز ہے۔ لیکن طبق یا کپڑا جس پر کوئی صورت نقش ہو اس کی بیع درست ہے۔ اسے فرشی چادر بنانا یا سرہانہ بنالینا جائز ہے لیکن پہننا جائز نہیں۔

شرطِ سوم: یہ ہے کہ مال بیچنے والے کی ملکیت ہو اور جو کوئی کسی اور کا مال فروخت کرے باطل ہو گا۔ اگرچہ بیچنے والا شوہر ہو یا باپ ہو یا بیٹا پس اگر کسی نے بیچ دیا تو اس کے بعد مالک اگر اجازت دے بھی دے تو معاملہ درست نہ ہو گا۔ اس لیے کہ اجازت فروخت سے پہلے ہونی چاہیے۔

شرطِ چہارم: یہ ہے کہ بیچی جانے والی شے گاہک کے حوالے کر سکتا ہو۔ لہٰذا مفرور غلام، آب گیر کی مچھلی، اڑتے پرندے اور گھوڑی کے پیٹ میں بچے یا نطفہ جو ہنوز گھوڑے کی پشت میں ہے ان کی بیع حرام ہے۔ کیونکہ ان کا گاہک کے ہاتھ میں دینا وقتِ بیع بائع کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح جانور پر لگی پشم اور اور اس کے پستان میں موجود دودھ کی بیع بھی باطل ہے کیونکہ جب حوالے کرے گا تو اس وقت اس دودھ میں اور دودھ شامل ہو جائے گا۔ اور گروی کردہ شے کی بیع بھی گروی رکھنے والے کی مرضی کے بغیر باطل ہے اور ایسی کنیز جو کسی بچے کی ماں بن چکی ہو اس کی بیع باطل ہے۔ کیونکہ اس کا گاہک کے حوالے کرنا روا نہیں۔ اسی طرح وہ کنیز جس کا چھوٹا بچہ ہو تو اسے بیع کرنا اور بچے کو روک رکھنا یا بچے کو بیچنا اور کنیز کو روک رکھنا باطل ہو گا۔ کیونکہ ایسے میں ماں بچے میں جدائی ڈالنا ناجائز ہے۔

شرطِ پنجم: یہ ہے کہ عین سامان اور اس کی مقدار و کیفیت معلوم ہونا چاہیے اور اس کا عین نہ جاننا یہ ہے کہ کہے: ''اس گلے میں کوئی ایک بکری یا اس گٹھڑی میں سے کپڑے کا کوئی ایک تھان جو چاہے لے لے فروخت کرتا ہوں'' تو یہ بیع باطل ہے۔ بلکہ چاہیے کہ پہلے اشارے سے اسے الگ کرے پھر بیچے اور اگر کہے کہ میں نے اس زمین میں سے جہاں سے تو چاہے دس گز زمین میں نے تمھیں بیچ دی تو یہ بیع بھی باطل ہے اور مقدار کا جاننا وہاں ہے کہ عین اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر سکے۔ اگر کہے کہ میں تمھیں اتنے کو اسی قدر جامہ فروخت کرتا ہوں جتنا کہ فلاں شخص نے فروخت کیا ہے یا فلانی چیز کے ہم وزن سونے یا چاندی کے عوض اور عین و ثمن دونوں کی مقدار معلوم نہیں تو یہ بیع باطل ہے۔ لیکن اگر یہ کہے کہ سونے یا چاندی کے عوض اس آب خورے بھر گیہوں میں نے تیرے ہاتھ بیچے اور مول لینے والا دیکھتا ہے تو یہ بیع درست ہے اور صفت کا جاننا بہ ایں طور ہوتا ہے کہ جو چیز دیکھی ہی نہیں اسے دیکھے یا وہ چیز بہت دنوں پہلے دیکھی تھی اور وہ چیز اتنے دنوں میں متغیر

ہونے والی ہو تو بیع اس کی باطل ہے اور جو مہین کپڑا ٹاٹ اور موٹے کپڑے میں ملفوف ہو اور جو گیہوں ابھی بالی میں ہو اس کی بیع باطل ہے۔ جب آدمی لونڈی خریدے تو اس کے سر کے بال اور ہاتھ پاؤں جو کچھ کہ بردہ فروش معمولاً دکھاتا ہے دیکھ لے تو اگر اس میں سے کچھ بھی دیکھنے سے رہ جائے گا تو بیع باطل ہوگی اور اگر مکان مول لے گا اور اس کا ایک درجہ بھی دیکھنے سے رہ گیا تو بیع باطل ہوگی۔ مگر اخروٹ یا بادام' باقلا' مرغی کا انڈہ' اگرچہ چھلکے سمیت پوشیدہ ہوں ان کی بیع درست ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کو اس طرح بیچنے میں مصلحت ہے۔ کچے اخروٹ اور باقلا جو دُہرے چھلکے میں ہوں بمقتضائے حاجت ان کی بیع درست ہے اور فقاع (سماروغ) کی بیع باطل ہے کیونکہ وہ پوشیدہ ہے۔ مگر اجازت سے اس کا کھانا پینا مباح ہے۔

چھٹی شرط: یہ ہے کہ جو کچھ مول لیا ہے جب تک اس پر قبضہ نہ کرے تب تک اس کی بیع درست نہیں۔ اس لیے چاہیے کہ پہلے بائع کے ہاتھ آئے تو وہ بیچے تا کہ گاہک کے حوالے اسی وقت کر سکے۔

تیسرا رکن:

عقد ہے۔ اسے لفظاً کہے بغیر چارہ نہیں لہٰذا کہے کہ: ''یہ چیز میں نے تمھارے پاس بیچ دی'' اور گاہک کہے کہ: ''میں نے خرید لی'' یا بائع کہے کہ: ''میں نے تمھیں فلاں شے کے عوض دے دی'' اور گاہک کہے: ''میں نے لے لی'' یا ''قبول کر لی'' یا کوئی اور لفظ جس کے معنی بیع کے ہوں اگر صریح نہ ہو۔ پس اگر داد و ستد لفظاً نہ ہو تو جائز نہیں۔ جیسا کہ آج کل معمول ہو گیا ہے۔ پس اولیٰ تر یہ ہے کہ حقیر چیزوں میں رخصت کے سبب اسے جائز رکھیں کیونکہ یہ غالب ہو گیا ہے۔ اور ابوحنیفہ ؒ کا مذہب یہی ہے۔ اور علمائے شافعی مذہب کے ایک گروہ نے اس قول کا اعتبار کیا ہے اور تین وجوہ سے اس قول پر فتویٰ دینا کچھ بعید نہیں۔ ایک یہ کہ عادت اس کی عام ہو گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ شاید صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں یہی صورت تھی۔ اس لیے کہ اگر لفظ بیع کی بہ تکلف عادت ہوتی تو اُن پر دِقّت ہوتی۔ اور اس تکلف کو صحابہ کو نقل کرتے اور پوشیدہ نہ رہتا۔ تیسرے یہ کہ اگر عادت ہو جائے تو فعل کو قول کا قائم مقام کرنا ناممکن نہیں۔ جیسا کہ ہدیہ میں ظاہر ہے کہ جو کچھ لوگ آنحضرت (ﷺ) کی خدمت میں لے جاتے تھے تو اس میں ایجاب و قبول کا تکلف نہ ہوتا تھا اور ہر زمانے میں ایسا ہی رہا اور جب ایسے معاملے میں کہ جس میں عوض نہ ہو بمقتضائے عادت مجرد فعل سے ملکیت حاصل ہو جاتی ہے تو اس معاملہ بیع میں کہ عوض یعنی قیمت موجود ہے فقط فعل سے ملکیت حاصل ہو جانا' مستبعد نہیں۔ لیکن ہدیہ میں بہ تقاضائے عادت تھوڑے بہت میں فرق نہیں ہوتا۔ اور قیمتی چیز کی بیع میں لفظ بیع کہنے کی عادت تھی۔ جیسے مسکن' زمین' غلام' جانور' اور قیمتی کپڑا ہے تو ایسی چیزوں میں اگر لفظ بیع نہ کہے گا تو اگلے بزرگوں کی عادت کے

خلاف مرتکب ہوگا اور ملک حاصل نہ ہوگی۔ لیکن روٹی، گوشت، میوہ جیسی متفرق چیزیں جو خریدی جائیں ان میں عادت اور حاجت کے تحت رخصت بے وجہ نہیں اور کم قیمت اور گراں قیمت میں درجات ہیں جن سے معلوم کیا جاتا ہے کہ یہ کم قیمت اشیاء ہیں یا نہیں۔ ان میں یہ طے کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے احتیاط کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

معلوم رہے کہ اگر کوئی خروار گندم خریدے اور بیع وشرا کے الفاظ بولے نہ جائیں تو بغیر بیع کے کیسے یہ معاملہ درست ہوگا کیونکہ یہ مقدار حقیر نہیں۔ لیکن اس گندم میں سے کھانا اور تصرف کرنا حرام نہیں کیونکہ حوالے کر دینے کے سبب اجابت حاصل ہو جاتی ہے اگرچہ مِلک حاصل نہیں ہوتی۔ اور اگر کسی مہمان کو اس گندم میں سے دے دے تو وہ بھی حلال ہے۔ اس لیے کہ مالک کا حوالہ کر دینا قرینہ حال سے اس بات کی دلیل ہے کہ اس پر حلال کر دیا ہے۔ مگر بہ شرط عوض۔ اور اگر صریح کہہ دیتا کہ میرا اناج مہمان کو کھلا دینا پھر تاوان دے دینا تو درست ہوتا۔ اور تاوان واجب آتا، جب اپنے فعل کو اس دلیل پر کیا تو بھی یہ امر حاصل ہو گیا۔ تو لفظ بیع نہ کہنے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ گیہوں خریدار کی ملک نہیں ہو جاتا یہاں تک کہ اگر وہ کسی کے ہاتھ بیچنا چاہے تو بیچ نہیں سکتا اور گیہوں بیچنے والا گیہوں واپس لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔ قبل اس کے کہ خریدار اس میں سے کھائے۔ ایسے کھانے کی طرح جسے مہمانی میں دستر خوان پر رکھیں۔

معلوم رہے کہ بیع اس بناء پر درست قرار پاتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اور شرط عاید نہ کرے مثلاً اگر کہے کہ اس شرط پر یہ ایندھن کی لکڑی خریدتا ہوں کہ تو اسے میرے گھر تک پہنچا دے یا یہ کہے کہ میں نے یہ گندم اس شرط پر خریدی ہے کہ تو اسے پسوا دے یا یہ کہے کہ مجھے کوئی چیز ادھار دے یا ایسی ہی کوئی اور شرط لگائے تو یہ بیع باطل ٹھہرے گی۔ سوائے ان چھ شرطوں کے کہ: ایک یہ کہ بیچے گا بہ شرطیکہ فلاں چیز اس کے پاس گرو رکھی جائے یا گواہ طلب کرے یا فلاں کسی کو ضامن دے یا قیمت مہلت دار ہو اور وقت معین ہوئے بغیر نہ دینا چاہے یا مالک اور گاہک دونوں کو بیع فسخ کرنے کا تین دن یا اس سے کم مدت میں اختیار ہو تو اس سے زیادہ روا نہ ہوگا۔ یا ایک غلام اس شرط پر بیچے کہ لکھنا جانتا ہو یا کوئی اور پیشہ جانتا ہو تو اس قسم کی شرایط بیع کو باطل نہ کریں گے، جائز ہیں۔

عقد دوم: ربا ہے۔ اور ربا نقد میں ہوتا ہے یا طعام میں۔ لیکن بیع نقد میں دو چیزیں حرام ہیں۔ ایک یہ کہ چاندی کو چاندی اور سونے کو سونے کے عوض ادھار بیچنا جائز نہیں۔ جب تک دونوں اشیاء موجود نہ ہوں اور دونوں شخص جدا ہونے سے پہلے اسے اپنے اپنے قبضے میں نہ لے لیں۔ اگر اسی نشست میں قبضے میں نہ لے لیں

بیع باطل ہو جائے گی۔

دوسرے یہ کہ ایک ہی جنس کے بدلے دوسرے سے اسی جنس کی چیز میں زائد طلب کرنا ناجائز ہے۔ اسی طرح ایک دینار کے عوض ایک دینار اور ذرا زاید طلب کرنا روا نہیں۔ اور یہ بھی روا نہیں کہ اچھے دینار کو کسی برے دینار مع کچھ زیادتی کے بیچے یہ بھی جائز نہیں۔ بلکہ اچھا برا سالم شکستہ برابر ہیں اور درست ہیں لیکن اگر کوئی ایک کپڑا ایک دینار کے عوض خریدے اور پھر اسے ایک دینار اور کچھ اوپر پر فروخت کرے اسی شخص کو تو روا ہو گا۔ مقصود حاصل ہو گا۔ اور وہ سونا جس میں چاندی کی آمیزش ہو اسے زر خالص کے عوض نہیں بیچنا چاہیے۔ یا سیم خالص کو زر مسکوک خالص کے عوض بیچنا صحیح نہیں بلکہ چاہیے کہ درمیان میں کوئی چیز رکھ لے۔ اور یہی حکم زرینہ کے بارے میں ہے کہ اس میں زر خالص نہیں ہوتا۔ اور مروارید کا ہار کہ جس میں سونا ہو اسے سونے کے بدلے فروخت نہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح زریں کپڑا بھی زر کے بدلے فروخت نہ کرنا چاہیے الا یہ کہ سونے کی مقدار زرتار کپڑے میں اسی قدر ہو جتنا کہ سونا ہے۔ اور کپڑا جلانے پر زاید سونا نہ نکلے تو بیع درست ہو گی۔

لیکن کھانا بہ نسیہ نہیں چاہیے۔ اگرچہ دو جنس ہو بلکہ اسی ایک نشست میں دونوں کے قبضے میں چلا جانا چاہیے۔ اگر ایک ہی جنس کا ہو جیسے گندم کے بدلے گندم ہے۔ تو یہ ادھار ہونا چاہیے نہ زاید۔ بلکہ ناپ میں برابر سرابر ہو۔ اور اگر ترازو میں برابر ہو تو جائز نہ گا۔ بلکہ برابری کے لیے اس چیز کو ملحوظ رکھنا چاہیے جو بکثرت معمول میں ہو۔ قصاب کو بکری گوشت کے عوض بیچنا' نانبائی کو گندم نان کے عوض دینا اور تیلی کو تیل' مغز اخروٹ وغیرہ روغن کے عوض دینا وغیرہ مناسب نہیں۔ کیونکہ بیع قرار نہیں پاتی۔ لیکن اگر بیع نہ کرے بلکہ ویسے ہی دے دے اور ویسے ہی لے لے تو اس کے لیے اس کا کھانا مباح ہو گا لیکن اس کی ملک نہ ہو گا۔ اس لیے بیچ نہیں سکتا۔ اسی طرح گندم نانبائی کے تصرف کے لیے مباح ہو گی لیکن وہ گندم بیچنے کا مجاز نہ ہو گا۔ خریدار کی گندم نانبائی پر اور نانبائی کی روٹی خریدار پر باقی رہتی ہے۔ جب چاہے اس کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ دونوں باہم بحل کریں تو کافی نہ ہو گا۔ کیونکہ اگر ایک کہے کہ ''میں نے تجھے بحل کیا بشرطیکہ تم بھی مجھے بحل کرو'' تو یہ قول اس کو باطل کر دے گا۔ لیکن اگر یہ شرط صراحتاً نہ کہے اور یوں کہے: ''میں نے بحل کیا'' جب فریق ثانی جانتا ہو کہ یہ شرط دل میں ہے اور بغیر اس کے ایک من گندم وہ اسے نہ دے گا تو یہ بحل اُس جہان میں اس کے اور اس کے اللہ کے درمیان حاصل نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ رضا زبان سے تو ہو گی اور دل سے نہیں اور جو رضا دل سے نہ ہو وہ عالم آخرت کے سزاوار نہیں ہوتی لیکن اگر کہے کہ ''میں نے تمھیں بحل کیا تو مجھے بحل کرے یا نہ کرے'' اور دل میں بھی یہی رکھتا ہو کہ یہی کہے گا تو یہ درست ہو گا۔ اور اگر دوسرا بھی بحل کرے تو ایسے ہی ہو گا۔ لیکن اگر ایک دوسرے کو بحل

نہ کریں لیکن قیمت دونوں کی برابر ہو اور مقدار بھی برابر ہو تو اس دنیا میں اس سے کوئی جھگڑا کھڑا نہیں ہوتا۔ نہ اس جہان میں کوئی قصاص وارد ہو گا۔ لیکن اگر قیمت یا مقدار میں فرق ہو تو اس دنیا میں خصومت اور اُس جہان میں مظلمت کا خدشہ ہے۔

یاد رہے کہ جس چیز کو کھانا بنانے میں استعمال کریں اسے طعام کے عوض فروخت کرنا نہیں چاہیے اگرچہ برابر ہو۔ مثلاً جو کچھ گندم سے حاصل ہوتا ہے جیسے آٹا تو اسے گندم کے عوض فروخت نہ کرنا چاہیے۔ اس طرح انگور کو سرکہ یا انگبینہ کے عوض بیچنا۔ نہ دودھ کو پنیر کے عوض اور شیراز کو روغن کے عوض بیچنا بلکہ انگور کو انگور کے عوض بیچنا اور رُطب کو رطب کے برابر بیچنا نہ چاہیے تاکہ کشمش اور خرما بن سکیں۔ اس امر میں تفصیل دراز ہے لیکن جس قدر ہم نے بیان کر دیا اس قدر جاننا لازم ہے۔ اگر کوئی چیز ایسی پیش آئے جس کا اسے علم نہ ہو تو اہل علم سے پوچھ لینا چاہیے۔ کیونکہ اگر کوئی اس قدر بھی نہ جانتا جس قدر ہم نے بیان کیا ہے تو اسے اہل علم سے دریافت کرنا چاہیے اور احتیاط کرے ورنہ حرام کا مرتکب ہو گا اور معذور نہ سمجھا جائے گا کیونکہ طلبِ علم جہاں فرض ہے عمل بھی علم کے مطابق فرض ہے۔

عقد سوم: عقد سلم ہے۔ اور اس میں دس شرائط ہیں جو ملحوظ رہنی چاہییں۔

شرطِ اوّل: یہ ہے کہ وقت عقد بیع کہے کہ "میں نے یہ چاندی یا سونا یا کپڑا یا جو کچھ بھی بیع کر رہا ہو ایک خروار گندم میں سلم دیا مثلاً اس قسم کی صفات والی گندم" اور ہر وہ صفت جس کی بناء پر قیمت متغیر ہو جاتی ہو اور مقصود ہو اور معمولاً اس میں نرمی نہ برتی جاتی ہو تمام بیان کرے تاکہ معلوم ہو جائے اور فریق ثانی کہے کہ "میں نے قبول کیا" اور لفظِ سلم کا بدل کہے کہ "میں نے اس صفت والی چیز تم سے خرید لی" تو بھی جائز ہے۔

شرطِ دوم: کہ جو کچھ دے بہ گزاف نہ دے بلکہ وزن و مقدار معلوم کرے تاکہ اگر واپس لینے کی حاجت ہو تو اسے معلوم ہو کہ اس نے کیا اور کس قدر دیا تھا۔

شرطِ سوم: یہ ہے کہ اسی نشست میں راس المال حوالے کر دے۔

شرطِ چہارم: یہ ہے کہ سلم میں ایسی چیز دے کہ وصف سے جس کا حال معلوم ہو جائے۔ جیسے دانے' روٹی' اون' ابریشم اور حیوان کا گوشت وغیرہ۔ لیکن اگر معجون کی صورت میں ہو تو ہر جزو کی مقدار نہ جانے جیسے کہ غالیہ ہے۔ یہ مرکب ہو ہر چیز سے جیسے ترکی کمان یا مصنوع ہو جیسے جوتا' موزہ' نعلین اور تراشیدہ تیر تو اس میں سلم باطل ہو گا کیونکہ یہ چیزیں صفت پذیر ہیں اور درست یہ ہے کہ نان میں سلم روا ہے۔ اگرچہ نان نمک اور آب سے آمیختہ ہوتا ہے۔ لیکن آب و نمک کی یہ مقدار مقصود نہیں ہوتی اور جہل نہیں رکھتی۔

شرطِ پنجم: یہ کہ اگر مہلت پر خریدر ہا ہو تو وہ مہلت مشخص ہونی چاہیے۔ یوں نہیں کہ کہے: ''غلہ پہنچنے تک'' کیونکہ غلہ کی آمد بہ تفاوت ہوتی ہے۔ اور اگر کہے کہ ''نوروز تک'' و ''دونوروز'' تو یہ معروف ہوں گے۔ یا اگر کہے'' تا جمادی'' تو درست ہوگا۔ اور جمادی سے جمادی الاول مراد لی جائے گی۔

شرطِ ششم: یہ کہ اس چیز میں سلم دے کہ اسے وقت موعود پر پائے۔ اگر میوہ میں سلم دے تو جب تک اس کا وقت نہ آپہنچے درست نہ ہوگا اور باطل ٹھہرے گا۔ لیکن اگر عموماً وقت پہنچ چکا ہو تو جائز ہوگا۔ اگر کسی آفت کی بناء پر معرض التوا میں پڑ جائے تو صاحبِ مال یا تو مہلت دے اگر مہلت نہ دینا چاہے تو مال واپس لے لے۔

شرطِ ہفتم: یہ ہے کہ بیچنے والا گاہک سے پوچھ لے کہ مال کہاں فراہم کرنا ہوگا۔ شہر میں یا گاؤں میں؟ یہ اس لیے کہ مبہم ہونے کی صورت میں یا خلاف ہونے کی صورت میں جھگڑے کا امکان ہے۔

شرطِ ہشتم: یہ کہ کسی عین سے اشارہ نہ کرے کہ اس باغ کے انگور یا اس زمین کی گندم اس طرح کا معاملہ باطل ہے۔

شرطِ نہم: یہ ہے کہ سلم میں کم یاب یا نایاب چیز جیسے بڑا مروارید کہ جو یکدانہ ہو یا خوب رُو کنیز فرزند کے ہمراہ ہو نہ دے۔

شرطِ دہم: یہ ہے کہ طعام میں سلم نہ دے۔ کیونکہ راس المال طعام ہوگا۔ خواہ جنس سے خواہ غیر جنس سے۔ نیز جو، گندم، چنے وغیرہ کے عوض سلم میں نہ دے۔

عقد چہارم: اجازت ہے جس کے دو رکن ہیں: اجرت اور منفعت۔ لیکن عاقد ارا اور لفظ عقد اسی طرح ہے جیسے ہم نے بیع کے زیرِ عنوان بیان کیا ہے اور مزدوری معلوم ہونی چاہیے ایسے ہی جیسے بیع میں لازم ہے۔ اگر گھر مرمت کے عوض کرایہ پر دے تو باطل ہوگا کیونکہ مرمت واضح نہیں ہوتی بلکہ مجہول ہوتی ہے۔ اگر یہ کہے کہ دس درم میں مرمت کرے تو یہ بھی باطل ہوگا کیونکہ مرمت کے کہنے میں عمل مجہول ہوگا۔ قصاب کی اجرت بکری کی کھال کی صورت میں باطل ہوگی۔ اسی طرح چکی والے کی اجرت سبوس یا آٹے کی ایک مقدار کی صورت میں باطل ہوگی۔ یعنی مزدور کے عمل کے نتیجے میں حاصل ہونے والی شے میں سے مزدوری دینا نامناسب ہے۔ اور اگر یہ کہے کہ میں تمھیں یہ ''دکان ماہانہ ایک دینار کرائے پر دیتا ہوں تو یہ باطل ہوگا کیونکہ اتنا کہنے سے اجازت کی مدت معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے چاہیے کہ کہ مثلاً ''سال یا دو سال کے لیے'' تا کہ سب معلوم ہو۔

منفعت: معلوم رہے کہ ہر وہ عمل جو مباح ہو اور معلوم ہو اس میں مشقت کرنی پڑتی ہو یا اس میں سختیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہو اس مین اجارہ درست ہے لیکن اس میں پانچ شرطوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

شرطِ اوّل: یہ کہ اس عمل کی قدر و قیمت ہو اور اس میں زحمت اٹھانی پڑتی ہو۔ اگر کوئی طعامی اجارہ کرے کہ دکان کو آراستہ کرے یا درخت اجارہ پر دے کہ اس پر کپڑے خشک کرلیں یا ایک سیب اجارۃ پر دے کہ اس کو سونگھ لیں یہ سب باطل ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی ایک دانہ گندم کا فروخت کرے۔

اور اگر بیّاعی (دلّال) ہو جو صاحبِ جاہ و حشم ہو اور اس کی ایک ہی بات پر بیع ہو جاتی ہو تو اس کے ساتھ شرط کرے کہ ایک بات کہے اور بیع کردے تو یہ بیع باطل ہوگی اور اجرت اس کی حرام ہوگی کیونکہ اس میں کوئی رنج اٹھانا نہیں پڑتا بلکہ بیّاع اور دلال کی مزدوری اس وقت حلال ہوتی ہے کہ جب اسے گفت وشنود میں بہت جھک جھک اور چانہ زنی کرنی پڑتی ہو یعنی خاصی دشواری کا سامنا ہو پھر بھی اس کام کے اندازے سے زیادہ اجر واجب نہیں ہوتا۔ اور یہ جو انہوں نے معمول بنالیا ہے کہ پانچ فی صد لیں گے اور مال کی مقدار کے مطابق محسوب کرلیں گے نہ کہ اس رنج کے بدلے جو انھوں نے دلالی میں انجام دیا ہے تو یہ حرام ہے۔ پس بیاعوں اور دلالوں کا مال جو وہ اس طرح سے لیتے ہیں حتماً حرام ہے۔ پس دلال اس غضب ونہب سے دو طرح سے نجات پا سکتا ہے: ایک یہ کہ جو کچھ اسے دیا جائے تو وہی قبول کرے اور اصرار نہ کرے مگر اپنے رنج کی مقدار کے برابر۔ اور مال کی قیمت کے متناسب اصرار نہ کرے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہی طے کرلے اور کہے کہ اگر میں مال بکوادوں تو ''اتنے درہم لوں گا یا دینار'' اور مالک مان لے۔ اور دلال نہ کہے کہ میں مال کا اتنا فی صد لوں گا۔ کیونکہ یہ مجہول ہوتا ہے، معلوم نہیں ہوتا کہ گاہک کتنے کا خریدے گا۔ اگر مال کا متناسب کہے گا تو یہ باطل ہوگا اور مالک مال کے ذمے اجرِ مثل سے زاید لازم نہیں ہے۔

شرطِ دوم: کہ اجارت منفعت پر ہونی چاہیے اور عین اس میں نہیں آتا۔ اگر بستان یا انگور کا باغ اجارے پر لے تاکہ پھل لے سکے یا گائے اجارے پر لے کہ دودھ اس سے حاصل کرسکے یا ادھیارے پر دے کہ نصف دودھ لے گا تو یہ سب معاملات باطل ہیں کیونکہ چارہ اور دودھ دونوں مجہول ہیں۔ لیکن اگر کسی عورت کو اجارت پر لیں کہ بچے کو دودھ پلائے تو جائز ہوگا۔ کیونکہ مقصود بچے کی داشت ہے اور دودھ اسی کی تبع میں ہے۔ جیسے کاتب کے لیے روشنائی اور درزی کے لیے سلائی کا دھاگا۔ کیونکہ تبعیت میں اس قدر جائز ہے۔

شرطِ سوم: یہ ہے کہ ایسے کام پر اجارہ کرے جو اس کے سپرد کیا جاسکے اور وہ کام مباح بھی ہو۔ اگر کسی ضعیف کو ایسے کام پر لگانے کو اجارہ کرے جو وہ نہ کرسکتا ہو تو یہ اجارہ باطل ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی حایضہ عورت کو مسجد کی صفائی کے لیے اجارہ کرے تو یہ بھی باطل ہے کیونکہ یہ حرام ہے۔ یا کسی شخص کو اس لیے اجارہ کرے کہ صحیح سالم دانت نکال دے یا صحیح سالم ہاتھ کو کاٹ دے یا کسی بچے کے کان بندھے کہ اس میں بالی ڈالی جاسکے یہ

سب باطل ہوگا اور ایسے کاموں کی مزدوری حرام ہوگی۔ اسی طرح جسم پر سیاہی سے نقش ونگار کھودنے والوں کا اجارہ بھی حرام ہے۔ اور وہ کلاہ درز جو مردوں کے لیے ریشمی ٹوپی سیتے ہیں اور ان درزیوں کی مزدوری جو عنابی[1] قبا اور ریشمی جبہ اور ریشمی لباس مردوں کے لیے تیار کرتے ہیں‘ حرام اور اجارہ اس کے لیے حرام ہے۔

اسی طرح اگر کسی کو اس لیے اجارہ پر لے کہ کوئی اسے رسن بازی سکھائے تو یہ حرام ہے۔ تو جو کوئی رسن باز کو دیکھے تو وہ بھی اس کے خون میں شریک ہے۔ (خون بند باز میں کہ اس کے گر کر مرنے کا خطرہ ہوتا ہے) کیونکہ اگر لوگ رسن بازی کا تماشا نہ دیکھیں تو کوئی بھی رسن بازی نہ کرے گا۔ اور جو کوئی کسی رسن باز یا دوال باز یا خنجر باز کو جن کے یہ کام خطرناک ہونے کے علاوہ بے فائدہ بھی ہیں‘ کچھ دے گا‘ گناہ گار ہوگا۔ ایسے ہی مسخرے‘ مطرب‘ نوحہ گر اور ہجو گو شاعری کی مزدوری بھی حرام ہے۔

قاضی کی مزدوری فیصلے پر اور گواہ کی مزدوری گواہی پر حرام ہے۔ لیکن اگر قاضی دعوے کے احکام اسناد معرض تحریر میں لاتا ہے تو اگر وہ اپنے کام کا معاوضہ لے تو جائز ہے کیونکہ تحریر اس کے ذمے نہیں ہوتی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دوسروں کو سجل نویسی سے منع نہ کرے۔ لیکن اگر منع کر دے اور خود ہی لکھے اور وہ سجل جو ایک گھنٹہ بھر میں لکھا جا سکتا ہے تو اس کے دس دینار یا ایک دینار مانگے تو یہ حرام ہوگا۔ لیکن اگر دوسروں کو اس سے منع نہ کرے اور یہ شرط لگا دے کہ ”میں اپنے ہاتھ سے دس دینار سے کم میں نہ لکھوں گا“ تو جائز ہوگا۔ اور اگر سجل کوئی دوسرا لکھے اور قاضی مہر لگا کر توقیع کر دے اور پھر کچھ معاوضہ اس کا یہ کہہ کر طلب کرے کہ میرے لیے تصدیقی تحریر فرض نہیں تو یہ حرام ہے۔ کیونکہ درست یہ ہے کہ جس قدر مشقت ہو معاوضہ اسی کے متناسب ہوتا ہے۔ پس اگر مشقت اسی قدر ہو جس قدر ایک استیر[2] گندم کی ہوتی ہے کہ یہ بہت کم قدر ہے۔ اور یہ قیمت اس بناء پر مانگی گئی ہے کہ ”حاکم کی تحریر ہے“، لیکن جاہ وحکم کی بناء پر ہو اس کا معاوضہ نہیں لینا چاہیے۔ لیکن قاضی کے وکیل کی اجرت حلال ہے لیکن کسی ایسے کو وکیل نہ کرنا چاہیے کہ جس کے بارے میں معلوم ہو کہ ناحق کام کرتا ہے کیونکہ چاہیے تو یہ کہ وکیل قاضی حق شناس ہو کہ جانتا ہو کہ حق ہے یا نہ جانتا ہو کہ مبطل ہے۔ شرط یہ ہے کہ جھوٹ نہ کہے جائے لیکن کسی ایسی چیز کا اقرار جس سے حق باطل ہوتا ہوا گر اس کا انکار کر دے تو یہ جائز ہوگا۔ اور متوسط جو دو شخصوں کے درمیان رابطہ ہو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ دونوں جانب سے مزدوری لے کیونکہ ایک جھگڑے میں دونوں فریقوں کا کام انجام نہیں دے سکتا۔ لیکن اگر وہ ایک فریق کی طرف تگ ودو کرے اور اس میں زحمت

۱۔ لکیر دار لہروں والا رنگا رنگ بالاپوش۔

۲۔ ایک دانہ گندم مراد ہے۔

اٹھائے جس کی قدر ہو تو اس کے لیے مزدوری حلال ٹھہرے گی۔ بشرطیکہ جھوٹ کہ حرام ہے نہ بولے اور فریب نہ دے۔ اور جو حق ہو اسے دونوں میں سے کسی سے نہ چھپائے اور کسی کو بھی باطل کے ذریعے ہراساں نہ کرے کہ اس کی بناء پر صلح کرے کہ اگر حقیقت حال جانتا تو صلح نہ کرتا۔ تو اس طریق سے اکثر صلح وجود میں نہیں آتی۔ پس توسط غالب تر وہ ہوتا ہے جس میں ظلم و دروغ اور فریب سے خالی نہ ہو اس لیے اجرت اس کی حرام ہے۔

جب متوسط جانتا ہو کہ ایک جانب حق ہے تو روا نہ ہوگا کہ حیلے بہانے سے صاحب حق کو اس پر آمادہ کرے کہ اپنے حق سے کم پر فریق ثانی سے صلح کر لے۔ لیکن اگر جانتا ہو کہ ظلم کرے گا تو یہ تدبیر ڈرائے تا کہ ارادۂ ظلم سے ہاتھ کھینچ لے' اس میں رخصت ہے۔

اور وہ ثالث جس پر دیانت غالب ہو اور جانتا ہو کہ جو کچھ میرے منہ سے نکلے گا اس پر آخرت میں گرفت ہوگی کہ "کیوں یوں کہا؟ کس لیے کہا؟ سچ کہا کہ جھوٹ؟ اور نیت نیک تھی یا باطل؟ تو وہ ثالثی کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا۔ اور وکالت و فیصلہ اس سے ممکن ہو۔

لیکن مہتروں کے ہاں شفاعت کرنے والا کہ جس سے کسی کو ملازمت دلا سکے۔ اگر دوڑ دھوپ کرے اور اس کی اجرت لے تو ناروا نہ ہوگی بشرطیکہ اس کام میں دشواری پیش آئی ہو اور اپنے اثر و رسوخ کی بناء پر نہ لے اور ایسے کام میں جو جائز ہو تو اگر ظالم کی مدد میں زبان کھولے گا یا حرام مالی امداد کے لیے سفارش کرے گا یا حق کی گواہی کو چھپانے کے لیے بولے گا یا ایسے کام کے لیے کہ حرام کلمہ تائید زبان پر لائے گا تو گناہ گار ہوگا اور ایسی مزدوری اس پر حرام ہوگی۔

یہ جملہ احکام اجارہ کے سلسلے میں جاننا ضروری ہیں تا کہ اجارہ دینے والا اور لینے والا دونوں اس کے عدم علم کی بناء پر گنہ کے مرتکب ہو سکتے ہیں اور یوں اجارہ کی تفصیل بہت دراز ہے۔ لیکن مبیّنہ مقدار سے عام آدمی محل اشکال کو پہچان لیتا ہے اور ضرورت ہو تو اہل علم سے دریافت کر سکتا ہے۔

شرط چہارم: یہ ہے کہ وہ کام اس کا فریضہ نہ ہو اور نہ ہی اس میں نیابت جائز ہو۔ کیونکہ اگر غازی کو اجرت پر لیں کہ غزا (جنگ دینی) میں جائے تو روا نہیں ہوگا۔ کیونکہ جب وہ میدان جنگ میں صف بستہ ہو گیا تو اب یہ کام اس کا فریضہ ٹھہرا پس اجرت کیسی؟ اور قاضی اور گواہ کی اجرت بھی اسی سبب سے روا نہیں۔ اسی طرح کسی کو اجرت دینا کہ وہ کسی دوسرے کے لیے نماز ادا کرے یا روزہ رکھے جائز نہ ہوگا کیوں کہ اس میں نیابت نہیں چلتی۔ تاہم حج میں ایسے شخص کی نیابت جو درماندہ اور زمین گیر ہو اور اچھا ہو جانے کی امید نہ ہو جائز ہے۔ اور تعلیم قرآن اور کسی علم معین کی تعلیم میں بھی اجارت روا ہے لیکن گورکنی' مردہ شوئی اور جنازہ کے لیے روا نہیں۔

اگرچہ فروض کفایہ ہیں۔ لیکن نماز تراویح کی امامی اور موذنی کی اجرت کے بارے میں اختلاف رائے ہے اور درست یہ ہے کہ حرام ہے۔ کیونکہ ان کی زحمت کے پیش نظر متصور ہوتی ہے کہ وہ وقت دیتا ہے اور معینہ وقت پر مسجد میں حاضر ہوتا ہے اور یہ اجرت نماز واذان کے لیے نہیں ہوتی۔ پھر یہ اجرت کراہیت اور شبہ سے خالی نہیں۔

شرطِ پنجم: یہ ہے کہ اجارے میں انجام دیا جانے والا عمل معلوم ہونا چاہیے۔ جب کوئی سواری کا جانور کرایے پر لے تو کرایہ پر لینے والے پر لازم ہے کہ جانور کو دیکھ لے اور کرایہ دہندہ (مالک سواری) کو معلوم ہونا چاہیے کہ سواری پر بوجھ کس قدر ہوگا؟ کون سوار ہوگا؟ اور روزانہ کس قدر اسے چلائے گا لیکن اگر عادتاً معروف ہو تو وہ کافی ہے۔ اور اگر کوئی زمین اجارہ پر لے تو اسے بتا دینا چاہیے کہ اس میں کیا کاشت کرے گا۔ کیونکہ گندم کی نسبت چینہ کی کاشت و برداشت سے زمین زیادہ کمزور ہو جاتی ہے۔ سوائے اس کے کہ معمولاً معلوم ہو۔ اسی طرح تمام قسم کی اجارت میں جانبین کو سب کچھ معلوم کر لینا چاہیے کہ بعد میں جھگڑا نہ اُٹھے۔ اور ہر وہ شے کہ جس کے جہل کے باعث خصومت پیدا ہوتی ہو باطل ہے۔

عقد پنجم: مضاربہ ہے جس کے تین رکن ہیں:

رکنِ اوّل: سرمایہ ہے جو سونے چاندی کی صورت میں نقد ہونا چاہیے اور چاندی و کپڑا یا ایسا ہی کوئی اور متبادل نہیں چاہیے اور زر و سیم کا وزن معلوم ہونا چاہیے اور عامل کے حوالے ہو جانا چاہیے اور اگر مالک یہ شرط عاید کرے کہ اپنے پاس رکھے گا تو یہ ناروا ہے۔

رکنِ دوم: یعنی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ عامل کا حصہ اس میں کس قدر ہوگا مثلاً آدھا یا ایک تہائی؟ اگر کہے کہ "دس درم تیرے یا میرے اور باقی کو بانٹ لیں گے"۔ تو یہ باطل ہے۔

رکن سوم: عمل ہے اور شرط یہ ہے کہ وہ عمل تجارت ہو۔ جسے خرید و فروش کہتے ہیں پیشہ وری نہیں۔ اگر گندم نانبائی کو دے تاکہ نانوائی کرے اور منافع نصف کرے تو روا نہ ہوگا۔ اور ایسے اگر تیلی کو السی اسی شرط پر دے تو یہ بھی روا نہیں۔ اور گر اگر تجارت میں یہ شرط عاید کرے کہ فقط فلاں کو نہ بیچے یا فقط فلاں سے نہ خریدے تو یہ باطل ہوگا اور جو امر بھی معاملت کو محدود کرے اس کو شرط ٹھہرانا روا نہیں۔

اور عقد مضاربہ یہ ہے کہ کہے: "مجھے قبول ہے" اور جب معاہدہ ہو گیا تو اب عامل اس کا خرید و فروخت میں نمایندہ ہوگا اور جب معاہدہ منسخ کرنا چاہے کہ کرسکتا ہے اور جب مالک فسخ کرے۔ اگر مال جملہ نقد ہو اور منافع ہو تو باہم بانٹ لیں۔ اگر مال ماورائے نقد ہو اور منافع نہ ہو تو وہ مالک کے حوالے کر دے عامل کے لیے لازم نہیں کہ اسے بیچے۔ اور اگر عامل کہے کہ "میں بیچتا ہوں" تو مالک کے لیے روا ہے کہ منع کر دے۔

الاّ یہ کہ پرچون فروش منافع پر خریدنے کو آ گیا ہو تو پھر مالک منع نہیں کر سکتا۔ اور جب مال عروض ہو اور اس میں فائدہ ہو تو عامل پر واجب ہے کہ اسے نقد پر بیچ دے جو سرمایہ تھا نہ کہ کسی اور نقد پر اور جب مقدار سرمایہ کو نقد کر لیا تو باقی کو ہم بانٹ لیں۔ اور عامل کے ذمہ بیچنا اب فرض نہ ہو گا۔ اور کاروبار میں جب ایک سال گزر جائے تو مال کی قیمت کا تخمینہ زکات کے لیے لازم ہے۔ عامل کے حصے کی زکات عامل کے ذمے ہے۔ عامل کو مالک کی رضامندی کے بغیر سفر نہیں کرنا چاہیے۔ اگر بے اجازت سفر کرے گا تو عامل پر تاوان ہو گا۔ اور سفر اگر مالک کے حکم پر کرے گا تو سفر خرچ مال مضاربہ سے وضع ہو گا۔ ایسے ہی جیسے ناپ تول بار برداری اور کرایہ دکان وغیرہ مال پر ہوتا ہے۔ عامل جب سفر سے لوٹے تو سُفرہ، لوٹا اور جو کچھ بھی اس نے مال مضاربہ سے خریدا تھا وہ مضاربہ کا مال ہے۔

عقد ششم: شرکت ہے۔ جب مال مشترک ہو تو شرکت یہ ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کو تصرف میں عمل کی اجازت دے دیں تو ایسے میں منافع مال مساوی ہونے کی صورت میں مساوی ہو گا۔ اگر مال متفاوت ہو گا تو منافع اسی کی نسبت سے منقسم ہو گا۔ اور اس اصول میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں۔ مگر اس وقت کہ جب کام صرف ایک کرے تو پھر روا ہو گا کہ اس کام کرنے کے باعث منافع میں زیادتی کی شرط لاگو کر دی جائے۔ اور یہ بہ اشتراک بہم مضاربہ ہی کی طرح ہے۔ شرکت کی تین اور قسمیں بھی معمول ہیں جو باطل ہیں:

ایک قسم: یہ ہے کہ بار بردار یا پیشہ ور یہ شرط باندھ لیتے ہیں کہ جو کچھ وہ کمائیں گے مشترک ہو گا تو یہ باطل ہے۔ اس لیے کہ جو کسی نے کمایا وہ اسی کی ملک ہوتا ہے۔

دوسری قسم: یہ ہے کہ جسے شرکت مفاوضہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ان کے پاس تھا اس کو جمع کر کے کہتے ہیں کہ ''اس سے جو سود و زیاں ہو گا اس میں سب یکساں شریک ہوں گے'' وہ بھی باطل ہے۔

تیسری قسم: یہ ہے کہ ایک کا مال ہو گا تو دوسرے کا جاہ اور مال صاحب جاہ کے قول پر فروخت ہو گا تا کہ منافع مشترک ہو تو یہ صورت بھی باطل ہے۔

علم معاملت سیکھنے کے لیے یہ مقدار واجب ہے کیونکہ اکثر اسی کی حاجت ہوتی ہے اور اس سے زاید شاذ ہی ہوتا ہے۔ یہ جاننے کے بعد بھی کوئی اشکال ہو تو اہل علم سے پوچھ سکتا ہے۔ لیکن اگر اس قدر بھی نہ جانتا ہو تو حرام کا مرتکب ہو گا اور معذور نہ سمجھا جائے گا۔

باب سوم: معاملات میں انصاف کو ملحوظ رکھنا

معلوم رہے کہ ہم نے اب تک جو بیان کیا وہ ظواہر شرع میں درستی معاملت کے بارے میں تھا۔ اور بہت سے معاملے ایسے ہوتے ہیں کہ ہم ان کی درستی کا فتویٰ دیتے ہیں۔ لیکن ایسے معاملے کا مرتکب شخص فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک ملعون ہوتا ہے۔ اور یہ معاملت کی وہ صورت مسلمانوں کے رنج وزیاں کا باعث ہوتی ہے۔ اور یہ دو قسم کی ہے: ایک عام اور ایک خاص اور یہ جو رنج عام ہے دو قسم کی ہے:

قسم اوّل: احتکار (ذخیرہ اندوزی) ہے۔ ذخیرہ اندوز ملعون ہے۔ محتکر طعام (گیہوں) خرید کر جمع کرتا ہے تا کہ جب مہنگا ہو جائے تو فروخت کرے۔ جب کہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے: ''جس نے چالیس دن گندم کو روکے رکھا تا کہ گراں ہو جائے تو پھر اگر وہ تمام ذخیرہ بھی صدقہ کر دے تو یہ اس بدنیتی کا کفارہ نہ ہوگا''۔ نیز فرمایا کہ: ''جو کوئی گندم کو چالیس دن اس نیت پر روکے رکھے گا کہ مہنگا ہونے پر بیچے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے بیزار ہے اور وہ اللہ سے''۔ نیز فرمایا کہ جو کوئی غلہ خریدتا ہے اور شہر میں لے جا کر جاری نرخ پر بیچ دیتا ہے تو وہ ایسے ہی ہے جیسے اس نے صدقہ کر دیا ہو اور ایک دوسری روایت کے مطابق ''ایسے ہے جیسے اس نے ایک غلام آزاد کر دیا ہو''۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''جو کوئی چالیس روز غلہ کو روکے رکھے اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے''۔ آپ رضی اللہ عنہ کو ذخیرہ شدہ غلے کے بارے میں خبر ملی تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے نذرِ آتش کرنے کا حکم دیا۔

بزرگوں میں سے کسی نے اپنے مختار کے ہاتھ غلہ بصرہ سے واسط بھیجا تا کہ بیچ دیا جائے۔ تو جب غلہ پہنچا تو بہت سستا تھا۔ اس نے ایک ہفتہ صبر کیا تا کہ زیادہ نفع پر بیچے اور اس نے مالک کو لکھا کہ ''میں نے یوں کیا ہے'' تو مالک نے جواب یہ لکھا کہ ''ہم نے تھوڑے منافع پر قناعت کی تھی سلامتی دین کے ساتھ۔ نہیں چاہیے تھا کہ تو ہمارے دین کو زیادہ منافع کے عوض دے دیتا اور یہ جو تو نے کیا ہے کبیرہ گناہ ہے۔ اب چاہیے کہ اس مال کو صدقہ کر دے کہ اس کا کفارہ ہو اور یقین نہیں کہ اس کے باوجود ہم اس نحوست سے بچ سکیں۔

یاد رہے کہ اس کی تحریم کا سبب یہ ہے کہ اس میں مخلوق کا ضرر ہے کیونکہ گندم انسان کی خوراک اور قوام ہے۔ جب بیچتا ہے تو سب کے لیے اس کا خریدنا مباح ہے لیکن جب ایک شخص خرید کر بند کر لیتا ہے تو گویا اس نے رزق کو دوسروں کی دسترس سے باہر کر دیا ہے۔ یہ ایسے ہے کہ کوئی مباح پانی کو مقید کرے تا کہ لوگ شدت پیاس میں مبتلا ہو کر مہنگا خریدنے پر مجبور ہو جائیں۔

اور غلہ کو اس نیت سے خریدنا گناہ ہے۔ لیکن دیہاتی جس نے غلہ کاشت و برداشت کیا ہو تو وہ خود اسی کا ہے وہ جب چاہے بیچے اور اس پر واجب نہیں کہ جلدی بیچ دے لیکن اگر تاخیر نہ کرے تو یہ اولیٰ تر ہے اور اگر اس کے جی میں یہ خواہش ہو کہ گراں ہونے پر بیچے گا تو یہ خواہش مذموم ہے۔

یاد رہے کہ ادویہ کا احتکار یا ایسی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی جو نہ خوراک ہوں نہ ان کی عمومی حاجت ہو حرام نہیں لیکن کھائی جانے والی اشیا میں احتکار جائز نہیں۔ لیکن جو چیزیں طعام ہی کی ذیل میں شمار ہوتی ہیں جیسے گوشت یا روغن وغیرہ تو اُن کے بارے میں اختلاف ہے۔ درست یہ ہے کہ کراہیت سے خالی نہیں۔ اگر چہ طعام کے درجے کو نہیں پہنچیں لیکن ان کا روکنا بھی اس وقت حرام ہوگا جب ان کی دستیابی بمشکل ہو۔ لیکن ان اشیا کی دستیابی بہ آسانی ممکن ہو تو دکان دار کا ان اشیاء کو نہ بیچنا حرام نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ لیکن اہل علم کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اس صورت میں بھی احتکار حرام ہے اور صحیح یہ ہے کہ مکروہ ہے کیونکہ گرانی کا انتظار کرتا ہے اور لوگوں کے لیے رنج کی خواہش رکھنا مذموم ہے۔ اسلاف دو قسم کی تجارت کو مکروہ جانتے تھے: ایک گندم کی فروخت کو اور دوسرے کفن کی تجارت کو۔ کیونکہ لوگوں کی موت کا منتظر رہنا اور ان کے رنج کا انتظار کرنا مذموم ہے۔ اور دو قسم کے پیشوں کو بھی مذموم گردانا گیا ہے۔ قصابی کہ جس سے دل سخت ہو جاتا ہے اور زرگری کہ آرائش دنیا کی مستوجب ہے۔

اور رنج عام کی دوسری قسم معاملت میں کھوٹا سکہ دینا ہے' کیونکہ اگر لینے والا نہ جانتا ہو تو دینے والے نے اس پر ظلم کیا اگر وہ جانتا ہو تو امکان اس کا ہے کہ وہ آگے کسی اور کو اس کا نشانہ بنائے گا اور نشانہ بننے والا آگے کسی اور کو سونپ دے گا اور یہ عمل مسلسل ہوگا۔ یہاں تک کہ ایک لمبے عرصے تک یہ دست بدست چلتا رہے گا تو اس سب کا ظلم اسی کے کندھے پر ہوگا جس نے آغاز کیا۔ اسی بناء پر بزرگوں میں سے ایک کا قول ہے کہ: ''ایک کھوٹا سکہ درم چلانا سو درم چوری کرنے سے بھی بُرا ہے''۔ یہ اس لیے کہا کہ چوری کی معصیت اور وقت ختم ہو جاتا ہے لیکن کھوٹے سکے کو چلانا تو ایسا کرنے والے کی موت کے بعد بھی تسلسل میں رہے گا اور وہ بدنصیب ہوگا کہ وہ تو مر جائے لیکن اس کی معصیت اسی طرح زندہ رہے اور ہو سکتا ہے سو سال یا دو سو سال باقی رہے اور اس کے باقی کو قبر میں متواتر تعذیب کا سامنا ہو۔ اس بناء پر کہ آغاز اس کا اس کے ہاتھوں ہوا تھا۔

اب کھوٹے سونے چاندی کے مسکوک کے بارے میں پانچ چیزیں معلوم ہونی چاہییں۔

اوّل: یہ کہ جب کسی کے ہاتھ کھوٹا سکہ آئے اسے چاہیے کہ کسی کنویں میں پھینک دے اور نہیں چاہیے کہ آگے کسی اور کو دے اگر چہ کہے کہ کھوٹا ہے کیونکہ خدشہ یہ ہے کہ وہ آگے کسی کو تھما دے گا۔

دوسرے یہ کہ بازار میں کام کرنے والے کو کھوٹے کھرے کے امتیاز کا علم ہونا چاہیے تاکہ جان سکے کہ بُرا یعنی کھوٹا کونسا ہے۔ محض اس لیے نہیں کہ آیندہ کھوٹا لینے سے بچے بلکہ اس لیے بھی آگے کسی اور کو غلطی سے بھی نہ دے اور مسلمانوں کے حق کو ضرر نہ پہنچائے۔ اور جو کھوٹے کھرے کی پہچان نہیں سیکھتا تو اگر غلطی سے اس کے ہاتھ میں چلا جائے تو گناہ گار ہو گا اس لیے کہ معاملات کے جس شعبے میں کاروبار کرنا چاہے تو واجب ہے اس کا علم حاصل کرے۔

تیسرے یہ کہ اگرچہ کھوٹا سکہ اس نیت پر قبول کرے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''رَحِمَ اللّٰہُ اِمرأً سَہلَ القَضَاءِ سَہلَ الِاقتِضَاءِ'' (یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کو بخش دے جو لین دین کے کام کو سہل بنادے) تو اچھی بات ہے۔ لیکن اس عزم پر قبول کرے کہ اسے کنویں میں پھینک دے گا۔ لیکن اگر اس خیال سے قبول کرے کہ آگے چلادے گا' تو ایسا نہیں چاہیے۔ اگرچہ دیتا ہوا بتادے کہ کھوٹا ہے۔

چہارم و پنجم یہ کہ زیّف (کھوٹا) اسے کہتے ہیں کہ اسی میں کوئی سونا یا چاندی نہ ہو لیکن جو کچھ اس میں سونا چاندی ہے ناقص ہے۔ اسے کنویں میں پھینکنا واجب نہیں ہوتا بلکہ اگر خرچ کرے اور چیز واجب کرے ایک یہ کہ برملا کہے اور مخفی نہ رکھے۔ دوسرے یہ کہ ایسے شخص کو دے کہ جس کی امانت پر اعتماد ہو کہ وہ آگے کسی کے ساتھ فریب نہ کرے گا۔ پس اگر جانتا ہے کہ اس کا خرچ کرنا حلال شمار کرتا ہے۔ لیکن کہتا نہیں تو یہ مثل اس کے ہے کہ انگور کسی کے ہاتھ بیچے جسے جانتا ہے کہ وہ سکی[1] خوار ہے اور سکی کرے گا یا سلاح ایسے کے ہاتھ بیچے جس کے بارے میں علم ہو کہ رہزنی کرے گا تو یہ حرام ہو گا۔ معاملت میں دشواری ہی کے باعث داناؤں نے کہا ہے ''باامانت تاجر عابد سے برتر ہے''۔

قسم دوم: ظلم خاص ہے کہ سوائے خود اس کے کسی اور کو نہیں پہنچتا کہ معاملت اس کے ساتھ ہے اور ہر وہ معاملہ جس میں ضرر ہوتا ہو ظلم سمجھا جائے گا اور وہ حرام ٹھہرے گا۔

ماحصل یہ ہے کہ جس چیز کو انسان نہیں چاہتا کہ دوسرے اس کے ساتھ کریں تو وہ چیز کسی مسلمان کے ساتھ نہ کرے کیونکہ جو کوئی دوسرے مسلمان کے لیے ایسی چیز پسند کرے جس کو خود اپنے لیے پسند نہیں کرتا تو ایمان اس کا کامل نہیں ہوتا اور تفصیل اس کی چار چیزیں ہیں:

اوّل یہ کہ اپنے مال کی تعریف حقیقت سے زیادہ نہ کرے کیونکہ وہ دروغ بھی ہے اور ظلم و تلبیس بھی بلکہ بہتر ہے کہ سچی تعریف بھی نہ کرے کیونکہ گاہک اس کے بیان کرنے کے بغیر بھی حق کو جانتا ہے تو

۱۔ سکی: شیرہ انگور کو اتنا جوش دینا کہ جوش کے بعد ایک تہائی رہ جائے۔

ایسے میں ثنا کوئی بے ہودہ بات ہے ''وَمَا یَلفظُ مِن قولٍ اِلاَّ لَدَیہِ رقیب عَتیدا'' کیونکہ جو بات بھی کہے گا اس کی پرسش ہوگی کہ کیوں کہی اور اگر بے ہودہ کہی تو بھی عذر مسموع نہ ہوگا۔

اور مال کے لیے قسم کھانا اگر دروغ ہوتو یہ کبائر میں سے ہے۔ اگر سچی ہوتو ایک ادنیٰ کام کے لیے اللہ کا نام لیا تو یہ بے حرمتی کے مترادف ہے اور حدیث میں ہے ''وائے برما زرگانان از لا واللہ وبلیٰ واللہ ووای پر پیشہ وران از فرداو پس فردا'' حدیث میں ہے کہ جو کوئی اپنے مال کو قسم کے ذریعے فروغ دیتا ہے تو روز قیامت اللہ تعالیٰ اس کو دیکھنا بھی نہ چاہے گا''۔ کہتے ہیں کہ یونس بن عبید رضی اللہ عنہ جو ریشمیں جامہ بیچتے تھے ایک روز انھوں نے خریدار کے آگے ٹوکری کھول دی تو یونس رضی اللہ عنہ کا شاگرد اس پر گویا ہوا کہ ''اے اللہ مجھے بہشت کے لباس عطا فرما''۔ تو آپؒ نے یہ سنتے ہی مال سمیٹ لیا اور ریشمیں جامہ فروخت نہ کیا کیوں کہ ڈرے کہ شاگرد کا یہ قول کہیں مال کی ثنا کے لیے نہ ہو''۔

واجب دوم فروخت میں یہ ہے کہ خریدار سے مال کا عیب مخفی نہ رکھے اور سب سچائی کے ساتھ اسے بتادے کیونکہ اگر پوشیدہ رکھے گا تو یہ فریب ومکر متصور ہوگا اور اس طرح گویا اس نے خیر خواہی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ لہٰذا ظالم وعاصی ٹھہرا۔ اور جب بہترین کپڑا دکھانا چاہے یا تاریک جگہ میں دکھائے تاکہ عمدہ لگے یا جوتے یا موزے کا بہترین پاؤں دکھائے تو ظالم وفاسق قرار پائے گا۔ ایک دن رسول (ﷺ) کا گزر ایک ایسے شخص پر ہوا جو گندم بیچا کرتا تھا۔ تو آپ ﷺ نے گندم کے ڈھیر میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر سے گندم تر ہے۔ تو فرمایا: ''یہ کیا ہے؟'' تو بولا پانی کی تری ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس تری کو تو نے ننگا کیوں نہیں رہنے دیا؟ ''مَن غَشَّ فَلیسَ مِنّا'' جو فریب دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

ایک شخص نے ایک اونٹ تین سو درم میں بیچا جب کہ اونٹ کے ایک پاؤں میں عیب تھا۔ واصلہ بن اسقعؓ کہ صحابہ میں سے تھے وہاں کھڑے تھے انھیں جب اس بات کی خبر ہوئی تو فوراً خریدار کی تلاش میں نکلے اور کہا کہ اونٹ کا ایک پاؤں ناقص ہے تو وہ شخص لوٹ کر آیا اور بیچنے والے سے سو درم واپس لے گیا۔ تو فروشندہ بولا کہ تم نے میری فروخت کو تباہ کر دیا''۔ تو اس پر ان صحابیؓ نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت (ﷺ) سے سنا ہے کہ: ''حلال نہیں ہے کہ کوئی چیز بیچے اور عیب اس کا خریدار پر ظاہر نہ کرے''۔ اور یہ بھی جائز نہیں کہ اگر کوئی دوسرا دیکھے اور بیان نہ کرے، نیز فرمایا کہ میں نے رسول (ﷺ) کے ہاتھ بیعت کی ہے کہ مسلمانوں کی خیر چاہوں گا اور ان پر شفقت کی نگاہ ڈالوں گا اور عیب چھپانا خیر خواہی نہیں''۔

یاد رہے کہ معاملات میں بخوبی عہدہ برآ ہونا بہت مشکل ہے اور یہ عظیم ہدایت میں سے ہے لیکن

دو چیزوں سے آسانی ہو جاتی ہے۔

ایک یہ کہ عیب دار مال نہ خریدے اگر خرید چکا تو جی سے کہے: ''اگر مجھ سے فریب کیا گیا ہے تو جان لے کہ اس کا ضرر مجھ کو پہنچا ہے تو مجھے یہ ضرر دوسرے کو نہیں پہنچانا چاہیے کیونکہ فریب دینے والے کو ملعون کہا گیا ہے اس لیے خود کو لعنت کا ہدف نہ بنانا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ یقین جان لے کہ روزی میں مکر وفریب سے اضافہ نہیں ہوتا بلکہ مال سے برکت جاتی رہتی ہے۔ اور استفادہ نہیں ہوتا۔ اور طراری وعیاری سے تھوڑا تھوڑا کر کے جو جمع ہوتا ہے تو یک بارگی ایسا ہوتا ہے کہ وہ خسارے سے دوچار ہو جاتا ہے اور ظلم اس کی گردن پر باقی رہ جاتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دودھ میں پانی ملاتا تھا۔ ایک لڑکا گلہ چرانے کے لیے پہاڑ کی طرف لے گیا اچانک سیلاب آیا اور اس کی بکریوں کو بہا لے گیا۔ تو گلہ بان لڑکے نے مالک سے آ کر کہا کہ ''وہ پانی جو ہم تھوڑا تھوڑا کر کے دودھ میں ملاتے رہے تھے اس نے جمع ہو کر سیلاب کی صورت اختیار کر لی اور بکریوں کو بہا لے گیا''۔

آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ ''جب معاملت میں خیانت نے راہ پائی برکت اٹھ گئی'' برکت کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص مال تھوڑا رکھتا ہے لیکن نہ صرف وہ اس سے مفاد حاصل کرتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اس سے فیض یاب کرتا ہے۔ اس طرح اس سے خیر کثیر وجود میں آتی ہے اور ایک وہ شخص ہے کہ کثیر مال کا مالک ہوتا ہے لیکن وہ مال کثیر اس کی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے۔ جس سے وہ نہ دنیا نہ آخرت میں اس سے کچھ حاصل کر پاتا ہے۔ پس چاہیے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے برکت کا طالب ہو نہ کہ کثرت کا۔ اور برکت امانت میں ہوتی ہے کیونکہ جو شخص امانت میں مشہور ہو جائے سب اسی کی طرف راغب ہو جاتے ہیں جس سے اس کا نفع بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی خیانت میں معروف ہو جائے تو سب لوگ اس سے کنارہ کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ انسان جان لے کہ زندگی سو سال سے تو زیادہ نہ ہوگی۔ جب کہ آخرت کی زندگی کی کوئی انتہا نہیں کہ ابدی ہے۔ تو یہ کیسے درست ہے کہ چندروزہ مختصر زندگی کے لیے مال ومنال کی آرزو زندگی ابد کے مقابلے میں کرے۔ چاہیے کہ انسان یہ بات حرزِ جان بنا لے تا کہ طراری اور خیانت اس کے دل کو اچھی نہ لگے۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ: ''مخلوق کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کی برکت سے اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچی ہوئی ہے لیکن جب دنیا کو دین پر ترجیح دیتے ہیں اور یہ کلمہ زبان پر لاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اس بات میں تو جھوٹا ہے اور راست گو نہیں''۔

اور جس طرح خرید وفروش میں فریب سے باز رہنا فرض ہے اسی طرح پیشے میں بھی فرض ہے کیونکہ کھوٹا

کام کرنا حرام ہے۔ الا یہ کہ اس کو چھپائے نہیں۔ کسی نے حضرت احمد بن حنبلؒ سے رفو گری کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ: ''اس کے لیے مناسب ہے کہ جو پہننے کے لیے کرے لیکن جو کوئی رفو فریب دینے کے لیے کرے وہ عاصی ہوگا اور اجرت اس کی حرام ہوگی''۔

واجب سوم یہ ہے کہ ناپ تول میں ہرگز فریب نہ کرے۔ ٹھیک تولے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَیلٌ لِّلْمطفِّفِین''[۱] ''افسوس ہے ان لوگوں پر کہ جب لیتے ہیں تول میں زیادہ لیتے ہیں اور جب دیتے ہیں تول میں کمی کرتے ہیں'' ہمارے اسلاف کا معمول تو یہ تھا کہ جب لیتے تھے تو بمقدار نیم حبہ کم لیتے تھے اور جب دیتے تھے تو بمقدار نیم حبہ زیادہ دیتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ ''یہ نیم حبہ ہمارے اور دوزخ کے درمیان حجاب ہے''۔ اور ڈرتے تھے کہ پورا پورا تولنا ممکن نہیں۔ اور کہتے کہ: ''بے وقوف ہے وہ شخص جو بہشت کو کہ جس کی وسعت ساتوں آسمان و زمین سے کئی گنا ہے اسے نیم حبہ میں بیچ دے؛ اور وہ شخص احمق ہی ہوگا جو نیم حبہ طوبیٰ کو ویل سے یعنی بھلائی کے بدلے برائی خریدے۔

آنحضرت (ﷺ) جب کوئی شے خریدتے تو دکاندار سے کہتے کہ ''قیمت کے مطابق تول اور جھکتا تول''؛ فضیل بن عیاض نے اپنے بیٹے کو دیکھا کہ ایک دینار کو تول رہا تھا جو اسے کسی کو دینا تھا تو وہ میل جو دینار پر جم گئی تھی اسے صاف کر رہا تھا۔ اس پر فضیل نے کہا: ''یہ فعل تمھارے لیے دو حج اور عمرہ سے فاضل تر ہے''۔

اسلاف فرماتے ہیں کہ وہ شخص جو دو ترازو رکھتا ہے کہ ایک سے دیتا ہے تو دوسرے سے لیتا ہے وہ تمام فاسقوں سے بدتر ہے۔ اور ہر وہ بزاز جو لیتے وقت تو ڈھیلا ناپتا ہے اور دیتے وقت کس کر ناپتا ہے وہ بھی بدترین میں سے ہے اور جو قصاب گوشت کے ساتھ وہ ہڈیاں بھی تولتا ہے جو عرف کے خلاف ہیں وہ بھی انھی میں کا ایک فرد ہے۔ اور جو کوئی ایسا غلہ بیچتا ہے جس میں معمول سے زیادہ مٹی ملی ہوئی ہو وہ بھی اس جماعت کا فرد ہے۔ اور یہ سب حرام ہے بلکہ یہ عدل و انصاف جملہ کاموں اور معاملات میں مخلوق کے ساتھ روا رکھنا چاہیے۔ اسی طرح اگر کسی نے دوسرے کو ایسی بات کہی کہ وہی بات اگر خود اسے کہی جاتی تو اسے برا لگتا تو گویا اس نے بھی داد و ستد میں امتیاز کا ارتکاب کیا۔ اور انسان اس برائی سے اس طرح بچ سکتا ہے کہ کسی معاملے میں بھی خود کو دوسرے پر ترجیح نہ دے۔ اگرچہ مشکل کام ہے۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''وَاِنْ مِّنکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا''[۲] کوئی شخص ایسا نہیں کہ جس کا گذر دوزخ میں نہ ہو الا یہ کہ وہ تقویٰ کے قریب ہو وہ جلدی خلاصی پا جائے گا۔

---

۱ قرآن کریم: ۱/۸۳

۲ قرآن کریم: ۷۱/۱۹

چوتھا واجب یہ ہے کہ نرخ میں بھی فریب نہ دے اور اسے پوشیدہ نہ رکھے کہ آنحضرت (ﷺ) نے منع فرمایا ہے۔ اس سے کہ کوئی کاروان کے پاس جائے اور شہر میں نرخ پوشیدہ رکھے اور اس طرح سامان ارزاں خرید لائے تو جو کوئی اس کا مرتکب ہو تو فروشندہ کو حق پہنچتا ہے کہ معاملہ فسخ کر دے۔ آنحضرت (ﷺ) نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ اگر کوئی مسافر شہر میں سامان لائے اور وہ ارزاں ہو تو کوئی اس سے کہے کہ "میرے پاس رکھ دو تاکہ میں اس کے بعد گراں تر بیچوں" تو آپ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ کسی شخص سے بظاہر کوئی چیز اس واسطے گراں خریدی کہ دوسرا شخص اسے سچا جان کر زیادہ قیمت دے کر مول لے جائے تو اگر کوئی اس کا مرتکب ہوا جس سے دوسرا ابتلائے فریب ہو جائے تو جب یہ بھید کھل جائے تو فسخ بیع کرنا درست ہے اور یہ بھی متداول ہے کہ سامان بازار نیلام میں دے دیتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو خریدنا تو نہیں چاہتے لیکن بولی میں شامل ہو کر نرخ بڑھا دیتے ہیں۔ یہ امر بھی حرام ہے۔ اسی طرح سامان ایسے بھولے شخص سے خریدا جائے جو بھاؤ نہیں جانتا اور ارزاں بیچ دیتا ہے یا بھولا شخص اس لیے گراں خریدتا ہے کہ بازار کے بھاؤ سے بے خبر ہوتا ہے تو ہر چند بہ ظاہر درست ہونے کی بناء پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ حقیقت حال دوسرے سے مخفی رکھی گئی ہے اس لیے گناہ گار ہوگا۔

تابعین میں سے ایک صاحب بصرہ میں تھے تو اس کے غلاموں میں سے ایک نے شہر سوسن سے خط لکھا کہ "اس سال شکر میں قحط ہو گیا۔ اس لیے قبل اس کے کہ لوگ اس سے آگاہ ہوں کثیر مقدار میں شکر خرید لیں" تو اس نے شکر بہت سی خرید لی اور اپنے وقت پر بیچ دی۔ اس طرح تیس[۳۰] ہزار درم منافع ہوا۔ پھر اپنے آپ سے کہا کہ تم نے مسلمانوں کے ساتھ غداری کی ہے اور قحط شکر کو پوشیدہ رکھا ہے یہ کیونکہ جائز ہو سکتا ہے؟ تو وہ یہ تیس ہزار درم شکر فروش کے پاس لے گیا اور کہا کہ لے لو یہ تمھارا مال ہے۔ بائع نے کہا کہ کس طرح؟ تو اس نے سب کچھ بیان کر دیا تو بائع نے کہا: "اب میں نے تمھیں بحل کیا"۔ جب وہ شخص گھر میں لوٹ آیا اور رات کو جب اس نے پھر اس پر غور کیا تو وہ کہنے لگا کہ: "ہو سکتا ہے کہ بائع نے شرم کے مارے بحل کیا ہو جب کہ میں نے اس سے بے وفائی کی ہے"۔ وہ اگلے دن پھر وہ رقم ساتھ لے آیا اور بہ اصرار تیس ہزار درم منافع بائع کے حوالے کر دیا۔

یاد رہے کہ جو کوئی اپنی خرید کا نرخ بتائے تو واجب یہ ہے کہ سچ بتائے اور کسی قسم کا فریب نہ دے اور اگر کوئی عیب نکل آیا ہو تو مالک مال سے کہے اور اگر مسامحت بائع سے دوستی کے سبب کی ہو یا رشتہ داری کی بنا پر گراں خریدا ہو تو بھی بتا دے اور اگر اس کے عوض کوئی سامان دیا ہے دس دینار میں کہ اصل نو دینار کا ہو تو پھر یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میری خرید دس دینار کی ہے۔ لیکن اگر اس وقت ارزاں خریدی ہو لیکن اس کے بعد بھاؤ متغیر

ہو گیا ہو اور اب نو دینار قیمت ہو تو بیان کر دینی چاہیے۔ تفصیل اس کی دراز ہے اور یہاں اس کا بیان ممکن نہیں۔ اور بازاریوں کی یہ حالت ہے کہ خیانت بہت کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ خیانت ہے۔ حق یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کے ساتھ فریب کرے تو فریب خوردہ کو چاہیے کہ وہ کسی اور سے یہ عمل نہ کرے۔ اور اس کو اپنا معیار ٹھہرائے کیونکہ جو کوئی قیمت خرید پر اعتماد کر کے خریدتا ہے اور اس لیے خریدتا ہے کہ اسے یہ گمان ہوتا ہے کہ میں نے اس کو خوب جانچ لیا ہے اور اس طرح سستا خریدا ہے لیکن اس میں مخفی طراری کارفرما ہو اور گاہک اس پر راضی نہ ہو تو یہ طراری ہے۔

٭٭٭

باب چہارم: معاملت میں احسان اور نیکوکاری

اے عزیز جان لے کہ خدائے تعالیٰ نے جس طرح عدل کا حکم دیا ہے اسی طرح احسان کا حکم بھی دیا ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ یَامُرُ بِالْعَدلِ وَالْاِحسَانِ'' گذشتہ باب میں بیان عدل کے بارے میں تھا تاکہ لوگ ظلم سے بچیں اور یہ باب احسان کے بیان میں ہے۔ فرمان خداوندی ہے: ''اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْن'' (قرآن: ۷/۵۶) (بے شک اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے نزدیک تر ہے) اور جو عدل پر بھروسہ کرتا ہے گویا دین میں اس نے سرمایہ بچا رکھا ہے اور منافع احسان میں ہے۔ عاقل وہی ہے جو کسی معاملے میں بھی آخرت کے منافع سے صرف نظر نہ کرے۔ احسان وہ نیک عمل ہے جس کے عامل کو اس میں منفعت ہو اور تجھ پر واجب ہے۔

احسان کا درجہ چھ وجوہ سے حاصل ہوتا ہے

وجہ اوّل: یہ کہ نفع زیادہ روا نہ رکھے۔ اگرچہ خریدار زیادہ پر بھی راضی ہو بر بنائے حاجت کے۔ سری سقطیؒ دکان کرتے تھے اور روا نہ رکھتے تھے کہ پانچ فی صد سے زیادہ نفع لیں۔ ایک دفعہ انھوں نے ساٹھ دینار کے بادام خریدے۔ تو بھاؤ بادام کا چڑھ گیا۔ ایک دلال نے بادام ان سے لے کر فروخت کرنے چاہے تو سری سقطیؒ نے کہا کہ تریسٹھ ۶۳ دینار پر فروخت کر دینا''۔ دلال نے کہا کہ ''آج اس کی قیمت نوے ۹۰ دینار ہے''۔ سری سقطیؒ نے فرمایا کہ میں نے دل سے عہد کیا ہے کہ پانچ فی صد سے زائد منافع نہ لوں گا تو میں اس عزم کو توڑنا نہیں چاہتا''۔ دلال نے کہا: ''میں بھی تمھارے مال کو کم پر بیچنا روا نہیں رکھتا''۔ تو نہ اس نے بیچا نہ سریؒ نے زیادہ پر بیچنے کی اجازت دی۔ درجہ احسان یہ ہے۔ اور محمد بن المنکدر بزرگوں میں سے ہوئے ہیں۔ دکان دار تھے اور بزازی کا کام کرتے تھے۔ بعض کپڑے پانچ دینار کے تھے تو بعض دس دینار کے۔ اُن کے شاگرد نے ان کی غیر حاضری میں پانچ دیناری کپڑوں میں سے ایک کپڑا ایک اعرابی کے ہاتھ بیچ دیا۔ جب آپ واپس دکان پر آئے تو اس بات کا علم ہوا تو دن بھر اس دیہاتی عرب کی تلاش میں لگے رہے جب وہ ملا تو اس سے کہا کہ تم جو کپڑا لے گئے ہو وہ پانچ دینار کا ہے۔ اعرابی نے کہا کہ میں تو رضا دے چکا ہوں تو۔ آپ نے کہا جو بات میں اپنے لیے پسند نہیں کرتا کسی دوسرے مسلمان کے لیے بھی مجھے پسند نہیں۔ لہٰذا یا تو بیع کو فسخ کر دو یا پانچ دینار مجھ سے واپس لے لو۔ تو اعرابی نے پانچ دینار واپس لے لیے۔ پھر اس نے کسی سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟

تو لوگوں نے بتایا کہ کہ "محمد بن المنکدر رہیں" تو وہ اعرابی بولا: "سُبحٰنَ اللہِ یہ وہ شخص ہے کہ صحرا میں بارش نہ ہوئی ہو اور ہم نماز استسقا کے لیے جائیں اس کا نام بارگاہ خداوندی میں لیں تو اسی وقت بارش ہونے لگتی ہے"۔

اسلاف کی عادت یہ تھی کہ معاملت کثیر کرتے اور منافع کم لیتے اور اس اسلوب کو زیادہ منافع کے انتظار میں رہنے کے بجائے مبارک تر جانتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفے کے بازاروں میں گھومتے تو یہ کہتے: اے لوگو! تھوڑے منافعے کو رد نہ کرو کہ زیادہ کو کھو دو"۔ لوگوں نے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف سے پوچھا "تمھاری دولت مندی کا سبب کیا ہے؟" تو انھوں نے کہا کہ میں نے تھوڑے منافعے کو رد نہیں کیا اور میرے پاس جو جانور ہوتے بیچ دیتا تھا۔ ایک دن میں نے ہزار اونٹ فروخت کیے اسی قیمت میں جس میں میں نے خریدے تھے اور میں نے ایک ہزار زانو بند سے زیادہ نفع حاصل نہیں کیا۔ اور ایک زانو بند (عقالہ) کی قیمت ایک درم تھی۔ اور ہر اونٹ کے لیے روزانہ جو ایک درم چارہ پر صرف کرتا تھا وہ بچت ہوئی۔ اس طرح ان دونوں مدوں سے مجھے دو ہزار درم کا منافع ہوا۔

وجہ دوم: یہ ہے کہ غریبوں کا مال زیادہ نفع دے کر خریدے تا کہ وہ خوش ہوں۔ جیسے بوڑھی عورتوں کے ہاتھ کاتی ہوئی روئی اور چھوٹے بچوں سے میوہ یا وہ درویش جو درماندہ ہو۔ کیونکہ یہ مسامحہ صدقے سے بہتر ہے اور برتر بھی جو اس طرح کرتا ہے آنحضرت (ﷺ) کی یہ دعا اس کو حاصل ہو جاتی ہے: "رَحِمَ اللّٰہُ اِمرأً سَہِلُ البَیعِ وَ سَہَلَ الشّریٰ" (اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے جو خرید و فروش کو آسان کرے"۔

اور دولت مند سے مال مہنگا خریدنا نہ ثواب ہے نہ شکر۔ اور یہ تو مال کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ بلکہ امیروں سے تخفیف کرا کے ارزاں خریدنا اولیٰ تر ہے۔ حضرات حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ کوشش کرتے کہ ارزاں تر خریدیں اس لیے بہت چانہ زنی کرتے تھے۔ تو لوگ ان سے کہتے کہ "تم لوگ ہر روز ہزاروں درم حاجت مندوں کو دیتے ہو اس تھوڑی سے مقدار میں کمی کیوں چاہتے ہو؟ تو وہ فرماتے کہ "جو کچھ ہم دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لیے دیتے ہیں اور اس راہ میں جتنا دو اتنا تھوڑا ہے۔ لیکن مہنگا قبول کرنا عقل اور مال دونوں کا نقصان ہے"۔

وجہ سوم: گاہک سے قیمت لینے میں تین قسم کا احسان ہے۔ ایک بعض کی قیمت کم کرنا اور شکستہ سکے یا نقدی کہ ناقص ہو اسے قبول کرنا اور تیسرے قیمت کی ادائیگی میں مہلت دینا۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے: "اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو اس شخص پر جو لین دین میں آسانی فراہم کرے"۔ نیز فرمایا کہ "جو کوئی آسانی کو اپنائے اللہ تعالیٰ اس کے کام آسان کر دیتا ہے"۔

اور مفلس کو مہلت دینے سے بڑھ کر اور کوئی احسان نہیں۔ اگر درویش خالی ہاتھ ہو تو مہلت دینا خود

واجب ہے اور یہ امر عدل میں سے ہے۔ لیکن اگر کچھ رکھتا بھی ہو لیکن وہ چیز اصل قیمت سے کم بیچنی ہوگی یا ایسی چیز کا مالک ہے جو اس کی روزمرہ کی ضرورت ہے تو ایسے شخص کو ادائے قیمت میں مہلت دینا احسان ہوگا جو صدقات میں بڑی فضیلت رکھتا ہے۔

آنحضرت (ﷺ) فرماتے ہیں کہ روزِ قیامت ایک شخص کو لایا جائے گا جس نے اپنے اوپر بہت ظلم کیا ہوگا۔ اور اس کے نامۂ اعمال میں کوئی نیکی نہ ہوگی۔ تو اس سے کہا جائے گا کہ ''کیا تم نے کبھی کوئی کارِ خیر انجام نہیں دیا؟'' تو وہ کہے گا کہ ''نہیں مگر یہ کہ میں نے اپنے شاگردوں کو کہہ رکھا تھا کہ جو کوئی میرا مقروض ہو لیکن تنگ دست ہو یا درماندہ ہو اسے مہلت دے دینا۔ اور نرمی سے کام لینا''۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ: ''پس آج تم تنگ دست ہو یا درماندہ ہو اس لیے ہمارے لئے اولیٰ تر یہ ہے کہ تمھارے ساتھ نرمی برتیں'' اور اللہ اسے بخش دے گا۔

حدیث میں ہے کہ جو کوئی کسی کو ایک معینہ مدت تک کے لیے قرض دیتا ہے تو ہر روز اس قرض خواہ کے دیوان میں صدقہ لکھا جاتا ہے اور معینہ مدت کے گذرنے کے بعد جو مہلت دے گا وہ ایسے ہوگا جیسے اس نے مال صدقے میں دے دیا ہو اور اسلاف میں ایسے بزرگ بھی گذرے ہیں جو نہیں چاہتے کہ دادہ قرض واپس ملے کیونکہ روزانہ ان کے نامۂ اعمال میں عدم ادائیگی کی بناء پر پورا مال صدقہ کے طور پر درج ہوتا ہے۔

آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''میں نے بہشت کے دروازے پر یہ تحریر دیکھی کہ صدقے کا ایک درم دس درم کے برابر ہے اور قرض کا ایک درم اٹھارہ درم کے مصداق ہے''۔ اور یہ اس لیے ہے کہ قرض ماسوائے حاجت مند کے نہیں لیتا جب کہ صدقہ ہوسکتا ہے کہ مستحق کی بجائے کسی غیر مستحق کو مل جائے۔

وجہ چہارم: قرضہ ادا کرنا۔ احسان اس میں یہ ہے کہ ادائیگی میں جلدی کرے اور قرض خواہ کی طرف سے تقاضے کا انتظار نہ کرے۔ اور کھری نقدی کی صورت میں بدست خود ادا کرے۔ اور مالک کے گھر پہنچا دے اس طرح کہ اسے آدمی اس امر کے لیے بھیجنا نہ پڑے۔ حدیث میں ہے کہ ''تم میں اچھا وہ ہے جو قرض کو بہ طریق احسن ادا کرے''۔ حدیث میں ہے کہ ''ادھار لینے والا اگر دل میں یہ نیت کرے کہ بہتر نقدی ادا کرے گا۔ تو حق تعالیٰ اس پر کچھ فرشتے مامور کردیتے ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ نیز دعا کرتے ہیں اس کے لیے تاکہ وہ قرض ادا ہو جائے''۔

مقروض اگر ادا کرسکتا ہو تو اسے ایک گھنٹہ بھی تاخیر نہ کرنی چاہیے۔ قرض خواہ کی رضامندی کے بغیر ورنہ ظالم اور گناہ گار ہوگا۔ خواہ نماز میں مشغول ہو یا روزہ میں ہو یا نیند میں تو ان سب حالتوں میں وہ اللہ تعالیٰ کی

لعنت کا نشانہ بنے گا اور یہ وہ معصیت ہے کہ وہ سو رہا ہے لیکن بدعملی کا مرتکب سمجھا جائے گا۔

اور معذرت کی شرط یہ نہیں کہ نقدی رکھتا ہو بلکہ اگر کوئی چیز فروخت کر سکتا ہو لیکن فروخت نہ کرے تو عاصی ہوگا۔ اگر ناقص نقدی دے یا اس کا عوض اور قرض خواہ اسے بہ کراہیت قبول کرے تو بھی گناہ گار ہوگا۔ مختصر یہ کہ جب تک اس کی خوش دلی حاصل نہ کرے مظلمہ سے نجات نہ ہوگی۔ اور یہ کبائر میں سے ہے جسے لوگوں نے معمولی سمجھ رکھا ہے۔

وجہ پنجم: یہ ہے کہ اگر کسی ایسے شخص سے معاملت کرے کہ جو بعد میں پشیمان ہو تو چاہیے کہ معاملہ فسخ کر دے۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''جو شخص بیع کو فسخ کر دے اور یہ جانے جیسے اس نے معاملہ کیا ہی نہیں تھا تو خدا تعالیٰ اس کے گناہوں کو نا کردہ شمار کر لیں گے''۔ اور یہ فسخ واجب نہیں اس لیے اس کا ثواب عظیم ہے اور من جملہ احسان کے ہے۔

وجہ ششم: یہ ہے کہ مفلسوں کے ہاتھ چیزیں ادھار بیچ دے اگر چہ معمولی ہوں۔ اور ارادہ یہ کرے کہ اگر قیمت نہ دیں تو وہ چیزیں واپس نہ چاہے گا۔ اور اگر وہ تنگ دستی ہی کی حالت میں مر جائیں تو انھیں بخش دے۔ اور اسلاف میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے پاس یادداشت کے دو رجسٹر ہوتے تھے۔ ایک وہ تھا جس میں ایسے مفلسوں کے مجہول نام ہوتے جو بالکل تہی دست ہوتے ان میں نام درج ہوتے لیکن اگر ان میں سے کوئی مر جاتا تو کوئی مطالبہ نہ کیا جاتا تھا۔ ایسے اہل مال کو بہترین شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ بہترین وہ متصور ہوتے تھے جو درویشوں کا نام یادداشت میں درج ہی نہ کرتے تھے تاکہ اگر دے دیں تو لے لیتے ورنہ واپسی کی طمع نہ رکھتے تھے۔

اہل دین معاملت میں ایسے ہی تھے۔ اور مردان دین کا درجہ دنیوی معاملات میں ظاہر ہوتا ہے اور جو کوئی ایک درم مشتبہ چاندی سے قدم باہر رکھتا ہے وہ من جملہ اہل دین ہے۔

◆◆◆

باب پنجم: معاملاتِ دنیا میں دینی شفقت سے کام لینا

یاد رہے کہ جسے دنیا کی تجارت کی مشغولی کسب دین سے باز رکھے وہ بد بخت ہے۔ وہ کیسا بدحال ہوگا جو زرین کوزہ مٹی کے کوزے کے عوض دے دے۔ مٹی کا کوزہ دنیا کی مثل ہے اور آخرت کی مثل کوزہ زرین ہے جو خوب صورت بھی ہے۔ پائیدار بھی ہے کبھی ضائع ہونے والا بھی نہیں۔ دنیا کی تجارت زاد آخرت ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ بلکہ نہایت زیادہ کوشش کی ضرورت ہے تا کہ دوزخ کا راستہ بند ہو جائے۔ اور انسان کا اصل سرمایہ اس کا دین اور آخرت ہے۔ مبادا اس امر سے کوئی غافل ہو اور اپنے اوپر رحم نہ کرے اور سارا زور کاروبار تجارت یا کشاورزی میں صرف کر دے۔ دین پر اس کی شفقت تبھی ممکن ہے اگر وہ حسب ذیل سات احتیاطیں بروئے کار لائے:

احتیاط اوّل: یہ ہے کہ ہر روز دل میں نیک نیتوں کو تازہ کرے تا کہ ''بازار اس غرض سے جائے کہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے رزق حاصل کرے تا کہ خلق سے بے نیاز ہو اور مخلوق سے طمع منقطع کر سکے تا کہ اس قدر قوت اور فراغت حاصل کر سکے کہ جس سے حق تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہ سکے اور راہ آخرت پر گامزن ہونا ممکن ہو؛ اور نیت کرے کہ آج خلق خدا کے ساتھ شفقت' خیر خواہی اور امانت داری کو ملحوظ رکھے گا۔'' اور یہ نیت بھی کرے کہ معروف کا حکم دے گا اور نہی سے منع کرے گا۔ اور اگر کوئی خیانت کا مرتکب ہو تو اس کا محاسبہ کرے گا' چشم پوشی نہیں کرے گا؛ جب یہ نیتیں کرے گا تو یہ جملۂ اعمالِ آخرت ہیں اور دین کے لیے مفید ہوں گے اور اگر دنیا کا بھی کچھ فائدہ ہو تو یہ مستزاد ہوگا۔

احتیاطِ دوم: یہ ہے کہ یہ جان لے کہ میں ایک دن بھی زندگی گزار نہیں سکتا جب تک کم از کم ایک ہزار آدمی کسی نہ کسی کام میں مصروف نہ ہوں۔ جیسے نانبائی' کسان' جولاہہ' لوہار' دھنیا اور ایسے ہی دوسرے پیشہ ور جو اس کا کام انجام دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان سب کا محتاج ہے اور یہ مناسب نہیں کہ دوسرے تو سب اس کے کام میں لگے ہوں اور جس سے اسے فائدہ ہوتا ہو اور خود اس سے ان میں سے کسی کو فائدہ حاصل نہ ہوتا ہو۔ اس دنیا میں ہر کوئی سفر میں ہے اور مسافروں کو چاہیے کہ متحد ہوں تا کہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں اور خود انسان یہ نیت کرے کہ: ''میں بازار جاتا ہوں تا کہ وہ کام کروں جو دوسروں کے لیے راحت کا باعث ہو۔ جیسے دوسرے مسلمان کام میرے لیے کرتے ہیں'' کیونکہ تمام کام فرض کفایہ ہیں۔ تو انسان کو بھی نیت کرنی چاہیے کہ میں بھی

ان فریضہ ادا کرنے والوں میں سے ہو جاؤں۔ اور اس نیت کی درستی کی علامت یہ ہے کہ اس کام میں لگے کہ خلق جس کی محتاج ہو کہ اگر وہ کام نہ ہو تو لوگوں کو خلل کا سامنا ہوگا۔ زرگری، نقاشی، گچ کاری، کندہ گری وغیرہ جیسے کام نہیں کہ یہ تو سب آرایش دنیا کے لیے ہیں اور بے ضرورت ان کاموں سے بچنا ہی بہتر ہے۔ اگرچہ یہ کام مباح ہیں۔ لیکن ریشمی لباس سینا، مردوں کے لیے زرکاری کرنا تو یہ بجائے خود حرام ہیں اور وہ پیشے جن کو اسلاف مکروہ سمجھتے تھے جیسے طعام بیچنا، کفن فروشی، قصابی، اور صرافی کہ جس میں انسان کو ربوا کی باریکیوں سے بچنا دشوار ہوا اور جراحی کہ جس میں انسان کی جراحت کی جاتی ہے اس گمان پر کہ یہ مفید ہے لیکن امکان اس کا بھی تو ہے کہ مضر ہو اور کناسی دباغی کہ جن میں مشغولی کے باعث لباس پاک رکھنا دشوار ہوتا ہے اور کم ہمتی کی دلیل بھی ہیں اور ستوربانی اور دلالی جس میں جھک جھک کرنے سے بچنا مشکل ہے۔ ان جیسے کاموں سے احتراز واجب ہے۔

حدیث میں ہے کہ کاروبار میں سب سے اچھا بزازی ہے۔ اور پیشوں میں بہترین خرازی ہے۔ یعنی وہ جو مشک، ڈول اور مطہرہ وغیرہ سیتا ہو۔ اور حدیث میں ہے کہ ''اگر بہشت میں کاروبار تجارت ہوتا تو بزازی ہوتی اور اگر دوزخ میں کوئی کام ہوتا تو وہ صرافی ہوتا۔ اور چار پیشوں کو رکیک سمجھا گیا ہے: جولاہگی، پنبہ فروشی، دوک تراشی اور معلّمی اور سبب اس کا یہ ہے کہ اس قوم کو کام عورتوں یا لڑکوں سے ہوتا ہے۔ اور جسے کم عقلوں سے سابقہ پڑتا ہو وہ خود بھی آخر کم عقل ہو جاتا ہے۔

احتیاط سوم: یہ ہے کہ دنیا کا بازار انسان کو بازار آخرت سے مانع نہ ہو پائے۔ اور آخرت کا بازار مسجدیں ہیں۔ حق تعالیٰ کا فرمان ہے: ''لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ'' (قرآن: ۹/۶۳) (اپنے اموال اور اولاد کو اللہ کے ذکر سے باز رکھ کر ہلاک نہ کرو)۔ فرمایا کہ تمھاری تجارت کا مشغلہ تمھیں ذکر حق تعالیٰ سے روکنے کا باعث نہ بنے کہ اس طرح گھاٹے میں رہو۔ اور حضرت عمرؓ نے ایک بازرگان سے کہا کہ ''پہلے روز آخرت کا فرض ادا کرو اور دنیا کا اس کے بعد''۔ اور اسلاف کا معمول یہ تھا کہ سحر گاہ اور شبان گاہ آخرت کے لیے وقف تھی۔ تو مسجد میں ذکر حق میں مشغول ہوتے یا مجلس علم میں۔ اور ہریسہ مع بھنی ہوئی سری سب لڑکے اور ذمی بیچتے کیونکہ اس وقت سب مرد مسجدوں میں ہوتے تھے۔ اور حدیث میں ہے کہ: ''فرشتے جب کسی بندے کا دفتر جس نے دن کے آغاز اور انجام کے وقت کوئی نیکی کی ہو تو ان اوقات کے درمیان میں اس نے جو کچھ کیا ہو وہ بخش دیا جاتا ہے''۔ اور یہ بھی حدیث میں ہے کہ: ''رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے جب اکٹھے حضور حق میں حاضر ہوتے ہیں تو حق تعالیٰ ان سے کہتا ہے: ''تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟'' تو وہ کہیں گے کہ: ''جب ہم نے انھیں چھوڑا تو نماز میں مشغول تھے اور جب پہنچے تو بھی وہ نماز میں

مشغول تھے، تو حق تعالیٰ کہیں گے کہ "میں تمھیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان کو بخش دیا"۔

اور چاہیے کہ دن کے درمیان جب اذان نماز کی آواز سنے تو بے فکر جس کام میں ہے اسے چھوڑ دے اور مسجد کی راہ لے اور اس آیت کی تفسیر میں کہ: "لا تلهيهم تجارةً و لا بيع عن ذكر الله" آیا ہے کہ لوہار نے اگر ہتھوڑا اٹھایا ہوتا تو اسے مزید بکار نہ لاتا اور خراز جس نے سوئی چمڑے میں داخل کی ہوتی اسے نہ نکالتا اذان سنتے ہی مسجد کا رُخ کرتا تھا۔

احتیاط چہارم: یہ ہے کہ بازار میں انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر اور تسبیح سے غافل نہ رہے۔ جہاں تک ممکن ہے زبان و دل کو بیکار نہ رکھے۔ اور جان لے کہ یہ فائدہ اگر جاتا رہے تو تمام جہان بھی اس کی کفایت نہ کرے گا۔ اور غافلوں کے درمیان ذکر کرنا زیادہ ثواب رکھتا ہے۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا: "غافلوں کے درمیان اللہ کا ذکر کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے خشک درختوں کے درمیان سرسبز درخت ہو اور جیسے مُردوں کے درمیان زندہ یا جیسے مفروروں کے درمیان استادہ مجاہد"۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ: "جو کوئی بازار جائے اور کہے کہ: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِ وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَايَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" تو اس کے نام بیس لاکھ نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں۔

حضرت جنیدؒ ایک دن کہتے تھے کہ "بازار میں ایسے کئی بندگان خدا ہیں کہ اگر وہ صوفیوں کا کان پکڑیں اور ان کی جگہ لیں تو وہ اس کے اہل ہیں"۔ نیز فرمایا کہ ہم ایسے شخص کو بھی جانتے ہیں جس کا بازار میں روزانہ کا ورد سات سو رکعت نماز ہے اور تیس ہزار تسبیح" اور کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد خود ان کی اپنی ذات تھی۔ مختصر یہ کہ بازار میں انسان رزق کے لیے جائے تاکہ دین کے لیے فراغت ہو اور اصل مقصود کو فروگذار نہ کرے۔ لیکن جو دنیاوی اغراض کے لیے بازار میں کاروبار کرے تو جب مسجد میں جاتا ہے تو پریشان خاطر ہونے کے باعث نماز کے دوران بھی دکان کے حساب میں لگا ہوتا ہے۔

احتیاط پنجم: یہ ہے کہ بازار پر زیادہ حریص نہ ہو کہ بازار میں آنے والوں میں اولین وہ ہو اسی طرح جانے والوں میں آخرین ہو۔ اور کاروبار کے لیے پُرخطر دراز سفر کرنا اور سمندری سفر کرنا وغیرہ وغیرہ غایت حرص کی دلیل ہے۔ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "ابلیس کا ایک بیٹا ہے جس کا نام زلنبور ہے اور ابلیس کا نائب بازار میں اس کا یہ بیٹا ہوتا ہے۔ تو ابلیس اسے کہتا ہے: "بازار میں جا اور جھوٹی قسم، مکر و خیانت اور طراری ان کے دلوں میں آراستہ کر اور جو شخص سب سے پہلے بازار میں جاتا ہے اور سب سے آخر میں بازار سے واپس گھر آتا ہے اس کے ساتھ لگے رہنا"۔ اور حدیث میں ہے "بازار سب سے بری جگہ ہے اور ان میں

بدترین وہ بازاری ہے جو سب سے پہلے بازار میں پہنچتا ہے اور سب سے آخر میں بازار سے نکلتا ہے''۔ پس انسان کو چاہیے کہ اپنے اوپر یہ لازم کرے کہ جب تک مجلس علم اور نماز سحر اور نماز چاشت اور ان کے اوراد و وظائف سے عہدہ برا نہ ہوگا بازار نہ جائے گا۔ اور جب اس قدر کما لے جو ایک دن کے لیے کافی ہو تو لوٹ آئے اور مسجد کا رُخ کرے اور آخرت کی زندگی کے لیے اثاثہ حاصل کرے کہ وہ عمر نہایت طویل ہے۔ اس لیے حاجت اس کے لیے زیادہ ہے۔ اور انسان کا ہاتھ زادِ آخرت کے لیے خالی ہے۔

حضرت حمادؒ بن سلمہ ابوحنیفہؒ کے استاد تھے۔ مقنعہ فروش تھے۔ جب دو حبہ بھر کما لیتے تو گٹھڑی سمیٹتے' گھر کو لوٹ جاتے۔

ابراہیم بن یسارؒ نے ابراہیم بن ادھمؒ سے کہا: ''آج میں گارے مٹی کے کام کے لیے جاتا ہوں'' تو ابراہیم نے اسے کہا کہ: ''اے ابن یسار تو تلاش میں ہے اور لوگ تیری تلاش میں ہیں۔ اور وہ جو تیرا متلاشی ہے تو اس سے بچ نہیں پائے گا'' اور جس کو تو ڈھونڈ رہا ہے وہ تجھ سے بچ نکلے گا۔ کیا تو نے کبھی محروم حریص کو اور کاہل مرزوق کو نہیں دیکھا؟'' تو بن یسار نے کہا میرے پاس ایک دانگ چاندی ہے جو ایک بقال پر قرض ہے۔ تو ابراہیم بن ادھم نے کہا: ''افسوس ہے تیری مسلمانی پر کہ تیرے پاس ایک دانگ چاندی ہے پھر بھی مٹی کے کام کا ارادہ رکھتا ہے۔

اسلاف میں ایسے افراد بھی تھے جو بازار میں ہفتے میں دو دن سے زیادہ نہ جاتے تھے اور ایک گروہ وہ تھا کہ روزانہ بازار جاتا تھا لیکن ظہر کے وقت لوٹ آتا اور کوئی عصر کے وقت واپس آ جاتا۔ یعنی جب ایک دن کی روزی کا سامان ہو جاتا تو مسجد کا رُخ کرتا تھا۔

احتیاط ششم: یہ ہے کہ مشتبہ سے دور رہے۔ اگر حرام کے پیچھے لگے گا فاسق و عاصی ہوگا۔ اور جس چیز میں شبہ ہو اس کے بارے میں اپنے ضمیر سے فتویٰ پوچھے اور مفتیوں سے نہیں اگر خود اہل دل میں سے ہے اور یہ نادر ہوتا ہے۔ جس چیز کے بارے میں اپنے دل میں کراہیت پائے اسے نہ خریدے۔ اور ظالموں اور ان کے گماشتوں کے ساتھ معاملہ نہ کرے اور کسی ظالم کے ہاتھ ادھار دینے کی غلطی نہ کرے۔ کیونکہ اگر بہ نسیہ دینے کے بعد ظالم مر جائے تو اسے غم ہوگا۔ اور اس کی دولت مندی پر خوش ہوگا۔ جب کہ نہیں چاہیے کہ ظالم کے مرنے پر غمگین ہو اور اس کی خوش حالی پر خوش ہو اور جو کچھ ان کے ہاتھ فروخت کرے گا اگر جانتا ہو کہ یہ ظلم کرے گا تو بیچنے والا بھی اس ظلم میں شریک متصور ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی مستوفیوں[1] اور ظالموں کے ہاتھ کاغذ فروخت کرے

---

[1] مستوفی: خزانے کا دفتر دار

اس کا مواخذہ ہوگا۔

مختصر یہ کہ ہر کسی کے ساتھ معاملت نہ کرے بلکہ انسان کو چاہیے کہ اہل معاملہ کا متلاشی ہو اور یوں کہا گیا ہے کہ: ''ایک زمانہ تھا کہ جو کوئی بازار جاتا تو پوچھتا تھا کہ کس سے معاملہ کرے تو اس سے کہا جاتا تھا کہ ''جس سے جی چاہے کرو کیونکہ سبھی اہل معاملہ ہیں اور محتاط'' لیکن اس کے بعد وہ زمانہ آیا کہ جواب یہ ملتا تھا کہ ''کسی سے بجز فلاں ایک شخص کے معاملہ نہ کرنا'' اور خطرہ یہ ہے کہ وہ دن دور نہیں کہ جب کوئی محتاط اہل معاملہ نہ مل سکے۔ اور یہ بات ہمارے زمانے سے قبل کہی گئی تھی اور بے شک ہمارا زمانہ ویسا ہی ہو گیا ہے کہ معاملت میں کوئی فرق ہی باقی نہیں رہا اور دکان دار دلیر ہو گئے ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے ناقص علم اور ناقص دین نام نہاد علماؒ سے سنا ہے کہ ''مال دنیا سب یک رنگ ہو گیا ہے اور سب حرام ہے'' اور یہ بڑی غلطی ہے کیونکہ ایسے نہیں ہے۔ شرط اس کی حلال وحرام کے باب میں بیان ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

احتیاط ہفتم: یہ ہے کہ جو کوئی معاملت کرے تو دوسرے کے ساتھ حساب قول وفعل میں اور لین دین میں صاف رکھے۔ کیونکہ روزِ قیامت ہر ایسے شخص کو جس سے اس نے معاملہ کیا ہو سامنے لایا جائے گا اور انصاف طلب کیا جائے گا۔ بزرگوں میں ایک نے ایک دکان دار کو خواب میں دیکھا تو سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تو وہ بولا کہ پچاس ہزار دفتر میرے سامنے رکھے گئے تو میں نے پوچھا بارِ الٰہا کیا یہ سب گناہوں کے دفتر ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: ''تو نے پچاس ہزار لوگوں کے ساتھ معاملت کی تھی تو ان سب کے یہ صحیفے ہیں''۔ اس نے کہا کہ میں نے اپنے ہر صحیفے کو اول سے آخر تک دیکھا تو صاحب معاملہ کو اپنے ساتھ پایا''۔ مختصر یہ کہ اگر ایک پیسہ بھی اس کے ذمے ہو اس شخص کا جسے فریب دے کر اس نے نقصان پہنچایا تو اس زیان کے باعث پکڑا جائے گا۔ تو اسے کوئی شے فائدہ مند نہ ہوگی کہ جس سے وہ عہدہ برآ ہو سکے۔

یہ ہے اسلاف کی سیرت راہ شریعت میں جس کا بیان معاملت کے باب میں ہو چکا۔ اور اب یہ طریقہ اٹھ چکا ہے اور لوگوں نے علم معاملت کو اس زمانے میں فراموش کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی ان سنتوں میں سے ایک کو بھی بجا لائے گا تو اسے ثواب اس کا بہت ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا: ''ایک زمانہ وہ آنے والا ہے کہ جو کوئی ان احتیاطوں میں سے کوئی ایک دہائی (1/10) احتیاط بھی جو تم کرتے ہو کرے گا تو اس کے لیے کافی ہوگا''۔ تو صحابہ نے پوچھا ''کس لیے؟'' تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ تم تو خیرات پر یقین رکھتے ہو اس سبب سے یہ تمھارے لیے آسان ہے۔ اور وہ باور نہ رکھیں گے اور وہ غافلوں کے اندر شاذ و نادر ہوں گے جو باور رکھیں گے''۔ اور یہ اس لیے کہا جاتا ہے تا کہ جو کوئی اسے سنے مایوس نہ ہو جائے اور یہ کہے کہ یہ

سب احتیاطیں اور شرایط کیونکر بجالائی جاسکتی ہیں اس لیے جس قدر بھی بجالائے کافی ہوگا۔ بلکہ جو ایمان رکھتا ہے کہ آخرت دنیا سے بہتر ہے تو وہ تو یہ سب بجالائے گا۔ کیونکہ ان احتیاطوں سے سوائے درویشی کے اور کوئی چیز جنم نہیں لیتی اور ہر تنگی جو ابدی بادشاہی کا موجب ہو برداشت کی جاسکتی ہے۔لوگ تو کسی ملک میں پہنچنے کے لیے یا حصول مال کے لیے تہی دستی، رنج سفر بے حد وشمار خواری پر صبر کرتے ہیں اور اگر موت آجائے تو تمام مال سے محروم ہوجاتے ہیں۔تو کچھ دشوار نہ ہوگا اگر کوئی آخوت کی بادشاہی کے لیے کسی ایسے معاملے کو پسند نہ کرے کہ اگر اس سے کیا جائے تو ناگوار ہو تو وہ دوسروں کے ساتھ بھی ایسا نہ کرے۔

◆◆◆

اصل چہارم: حلال وحرام اور مشتبہ کی پہچان کے بارے میں

آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ: ''طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ'' (طلب رزق حلال تمام مسلمانوں پر فرض ہے) اور طلب حلال ممکن نہیں جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ حلال کسے کہتے ہیں۔ نیز آپ (ﷺ) فرماتے ہیں کہ حلال واضح ہے اور حرام بھی ظاہر ہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان مُشتبہ صورتیں ہیں جو مشکل بھی ہیں اور مخفی بھی ہیں۔ اور ان کے پیچھے چلنے والا ہو سکتا ہے حرام میں پڑ جائے''۔ معلوم رہے کہ یہ علم بڑا وسیع ہے اور تفصیل اس کی ہم نے اپنی کتاب احیاء میں بیان کی ہے۔ اس صراحت کے ساتھ کہ کسی اور کتاب میں دستیاب نہ ہوگی۔ اور یہاں ہم اسی قدر بیان کریں گے جس کو سمجھنا عوام کے بس میں ہو اور اسے ہم نے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے:

باب اوّل: طلبِ حلال کے ثواب اور برتری کے بارے میں
باب دوم: پرہیزگاری کے درجات حلال وحرام میں
باب سوم: حلال وحرام کے امتیاز میں اور سوال نہ کرنے کے بارے میں
باب چہارم: بادشاہوں کی عطا اور ان سے میل جول کے بارے میں

باب اوّل: طلب حلال کے ثواب اور برتری کے بارے میں

یاد رہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا'' (قرآن: ۵۱/۲۳) (اے رسولو! جو کچھ کھاتے ہو پاک کھاؤ اور حلال اور طاعت میں جو کچھ کرتے ہو شایستہ کرو) آنحضرت ﷺ نے اسی بناء پر فرمایا ہے کہ: ''طلب حلال تمام مسلمانوں پر فرض ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''جو کوئی چالیس دن حلال کھائے گا اور کسی قسم کے حرام کو مخلوط نہ کرے گا تو حق تعالیٰ اس کے دل کو پُر نور کر دیں گے۔ اور حکمت کے چشمے اس کے دل میں سے ابل پڑیں گے'' اور ایک روایت میں ہے کہ ''ایسے شخص کے دل سے دنیا کی محبت رخصت ہو جائے گی''۔

سعد رضی اللہ عنہ بزرگ صحابہ میں سے ہیں انھوں نے آنحضرت (ﷺ) سے عرض کیا کہ: ''یارسول اللہ دعا فرمائیں تاکہ میں جو دعا کروں وہ مستجاب ہو'' تو آپ (ﷺ) نے کہا کہ مال حلال کھاؤ تاکہ جو دعا بھی کرو

قبول ہو جائے''۔ آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''بہت سے لوگ وہ ہیں کہ جن کا طعام' غذا اور لباس سب حرام ہیں تو وہ جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں تو ایسی دعا کیونکر قبول ہو؟'' نیز فرمایا کہ حق تعالیٰ کا ایک فرشتہ بیت المقدس میں ہے وہ ہر رات منادی کرتا ہے کہ: ''جو کوئی حرام کھاتا ہے خدائے تعالیٰ اس سے فرض قبول کرتا ہے نہ سنت''۔ نیز فرمایا کہ جو کوئی کپڑا دس درم میں خریدے اور اس میں ایک درم حرام ہو تو جب تک وہ لباس اس کے جسم پر رہے گا اس کی ایک نماز بھی مقبول نہ ہوگی''۔ نیز ارشاد فرمایا کہ'' وہ گوشت جو حرام مال سے انسان کے جسم پر وجود میں آیا ہو اس کے لیے آگ بہتر ہے۔ اور جو کوئی خوف نہیں رکھتا کہ مال کہاں سے لانا چاہیے تو اللہ تعالیٰ بھی باک نہیں رکھتا کہ اسے کہاں سے دوزخ میں پھینک دیا جائے۔ نیز فرمایا کہ'' عبادت کے دس اجزاء ہیں جن میں سے نو جز و طلب حلال کے ہیں'' اور فرمایا کہ: ''جو کوئی طلب حلال میں تھکا ماندہ شب کو گھر لوٹے تو وہ سونے سے پہلے بخش دیا جائے گا اور جب صبح بستر سے اٹھے گا حق تعالیٰ اس سے راضی ہوں گے''۔

نیز کہا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''جو لوگ حرام سے پرہیز کرتے ہیں تو مجھے شرم آتی ہے کہ ان سے حساب لوں''۔ اور فرمایا کہ ربوا کا ایک درم تیس دفعہ زنا کرنے سے بھی زیادہ بُرا ہے''۔ نیز فرمایا کہ جو حرام ذریعے سے مال کماتا ہے وہ اگر صدقہ دے تو قبول نہیں کیا جاتا۔ اور اگر وہ ربوا کی رقم رکھ لے تو یہ اس کے لیے دوزخ کا زادراہ ہوگا''۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک غلام کے ہاتھ سے ایک گھونٹ دودھ پی لیا تو معلوم ہوا کہ نیک ذریعہ سے نہ لیا تھا۔ منہ میں انگلی ڈال کر قے کر دی اور یہ خوف تھا کہ اس رنج اور سختی کی بناء پر جان نہ دے دیں۔ پھر کہا کہ ''اے اللہ میں تجھ سے اس دودھ کی پناہ چاہتا ہوں جو میری رگوں میں رہ گئی ہو''۔ عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح کیا جب صدقے کا دودھ انھیں دیا گیا اور غلطی سے آگاہ ہونے پر فوراً اگل دیا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اگر اس قدر ادائیگی نماز کی جائے کہ جس سے پشت ٹیڑھی ہو جائے اور اتنے روزے رکھو کہ جس سے بال کی طرح لاغر ہو جاؤ تو اس سے کچھ حاصل نہیں اور وہ مقبول نہ ہوں گے جب تک حرام سے پرہیز نہ کیا جائے۔ سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ جو کوئی حرام صدقہ دے اور خیرات کرے وہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی نجس کپڑے کو پیشاب سے دھوئے جس سے وہ اور بھی پلید ہو جائے۔ یحییٰ معاذ کہتے ہیں کہ: ''طاعت اللہ تعالیٰ کا خزانہ ہے اور اس خزانے کی کلید دعا ہے اور کلید کے دندانے لقمہ حلال'' سہل تستری کہتے ہیں'' کوئی شخص حقیقت ایمان کو بغیر چار چیزوں کے نہیں پہنچا: کہ تمام فرائض بہ شرط وسنت ادا کرے' حلال کھائے مطابق شرع کے اور پرہیزگاری کے ساتھ اور تمام ناشایستہ کاموں سے پرہیز کرے ظاہر میں بھی اور

باطن میں تادم مرگ اسی پر صبر بھی کرے"۔

کہتے ہیں کہ اگر کوئی چالیس دن مشتبہ کھانا کھائے تو دل اس کا تاریک ہو جاتا ہے اور زنگ آلود ہو جاتا ہے۔

عبداللہ ابن مبارک کہتے ہیں کہ: "میں ایک درہم جو مشتبہ ہوا سے اس کے اصل مالک کو لوٹانا ایک لاکھ درہم صدقہ دینے سے بڑھ کر جانتا ہوں۔ سہل تستری کہتا ہے جو کوئی حرام کھاتا ہے تو اس کا پورا جسم ناچار معصیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ چاہے یا نہ چاہے اور جو کوئی حلال کھاتا ہے تو اس کا پورا جسم طاعت میں شمار ہوتا ہے وہ چاہے یا نہ چاہے۔ اور خیر کی توفیق اس سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں اخبار و آثار بہت ہیں یہی وجہ ہے کہ پارسا بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب وھیب بن الورد ہوئے ہیں جو کوئی چیز نہیں کھاتے تھے کہ جس کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ کہاں سے آئی ہے۔ ایک دن ان کی ماں نے انھیں دودھ کا ایک پیالہ دیا تو آپ نے پوچھا کہ کہاں سے لایا گیا ہے اور پیسے کہاں سے آئے جس سے یہ دودھ خریدا گیا۔ جب سب کچھ معلوم ہو گیا تو بولے کہ یہ پوچھنا رہ گیا کہ جس جانور کا یہ دودھ ہے وہ چرا کہاں کرتا تھا؟ اور وہ جانور جہاں سے چرا کرتا تھا اس میں مسلمانوں کا حصہ بھی تھا۔ اس لیے آپ نے نہ پیا تو ماں نے کہا پی لو اللہ تم پر رحم فرمائے گا۔ تو بولے کہ اگرچہ اللہ رحمت کرے میں پھر بھی نہیں پیوں گا۔ کیونکہ پیوں گا تو میں اس کی رحمت سے معصیت میں پہنچ جاؤں گا جو مجھے گوارا نہیں"۔ لوگوں نے بشر حافی سے پوچھا کہ "کھاتے کہاں سے ہو" اور وہ نہایت درجہ احتیاط کیا کرتے تھے جواب میں کہا: "جہاں سے دوسرے کھاتے ہیں لیکن فرق ہے جو کھاتا اور گریہ وزاری کرتا ہے اور اس میں جو کھاتا ہے اور ہنستا ہے"۔ نیز کہا کہ اس سے تو کم نہیں ہونا چاہیے کہ دراز دستی نہ کرے اور تھوڑا کھائے"۔

◆◆◆

باب دوم: درجات حلال وحرام

معلوم رہے کہ حلال اور حرام کے درجات ہیں اور سب ایک ہی طرح کے نہیں ہیں۔ مثلاً بعض حلال ہے تو بعض حلالِ پاک ہے اور بعض پاک تر اسی طرح حرام میں بعض حرام ہے اور جو صعب تر ہے اور پلید تر ہے۔ جیسے کہ بیماری کہ حرارت اس کے لیے مضر ہے اور جو شے گرم تر ہو تو ضرر اس کا بیشتر ہوگا۔ پھر گرمی کے بھی درجات ہیں کہ شہد اور شکر ایک سے نہیں ہوتے' یہی حال حرام کا ہے۔

اور مسلمانی کے طبقات حرام اور مشتبہ سے پرہیز میں پانچ درجوں میں ہیں:

درجہ اوّل: ورع وعدل ہے اور یہ ورع عام مسلمانوں کا ہے کہ جس چیز کے ظاہر کے بارے میں فتویٰ حرام کا ہے اس سے دور رہتے ہیں اور یہ درجات میں سے پست ترین درجہ ہے۔ اگر کوئی کسی دوسرے کا مال فاسد عقد کے ذریعے اس کی رضامندی سے لیتا ہے' حرام ہے۔ لیکن جو غصب سے لیتا ہے تو یہ حرام تر ہے اور اگر کسی یتیم یا مفلس سے اس طرح لیتا ہے تو حرام تر ہو تو یہ اور بھی بُرا ہوگا۔ اور عقد فاسد اگر ربوا کے سبب ہو تو اس سے اس کا حرام ہونا نہایت زیادہ برا ہوگا۔ اگرچہ حرام کا نام سب پر ہوگا لیکن جس قدر حرام تر ہوگا عاقبت میں اس کا خطر بھی بیشتر ہوگا۔ اور بخشش کی امید کمتر ہوگی۔ جیسے کوئی بیمار شہد کھالے تو اس کا ضرر دیسی شکر کھانے کی نسبت زیادہ ہوگا۔ اور اگر زیادہ کھائے گا تو خطرہ زیادہ ہوگا اس سے جو کم کھائے گا۔

اور تفصیل اس کی کہ حرام کون سا ہے اور حلال کون سا ہے وہی جان سکتا ہے جو پورا فقہ پڑھے اور پورا فقہ پڑھنا ہر کسی کے لیے واجب بھی نہیں کہ وہ شخص جس کی روزی نہ مال غنیمت سے ہو اور نہ ذمیّوں کے جزیہ سے ہو اسے مال غنایم وجزیہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن جس پر جو واجب ہے وہ اسے پڑھے کیونکہ وہ اس کا محتاج ہے۔ مثلاً اگر اس کی آمدنی بیع سے ہوتی ہو تو علم بیع اس پر فرض ہے۔ اور اگر ذریعہ مزدوری ہے تو اجارت کا علم اس کے لیے واجب ہے کہ سیکھے۔ اسی طرح ہر پیشے کا ایک علم ہے تو پیشہ ور پر لازم ہے کہ اپنے پیشے کا علم رکھتا ہو۔

درجہ دوم: نیک انسانوں کا ورع ہے جنھیں صالحین کہا جاتا ہے۔ اور یہ وہ ہے کہ ہر چند مفتی کہے کہ حرام نہیں لیکن چونکہ شبہت سے خالی نہیں تو صالح اس سے محترز رہتا ہے اور شبہت بھی تین قسم کی ہے:

بعض وہ شبہت ہے کہ جس سے محترز رہنا واجب ہے اور بعضی وہ ہے جس سے احتراز واجب تو نہیں

ہوتا ہے لیکن مستحب ہوتا ہے اور واجب میں احتراز اوّل درجہ ہے اور مستحب سے دوسرا اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ وسوسے کی بناء پر اس سے احتراز کیا جائے اور جس کا معمول نہیں۔ جیسے کوئی شکار کا گوشت نہ کھائے اور کہے کہ یہ جانور شاید کسی کی ملک ہو اور یہ جانور اپنے مالک کے ہاں سے بھاگا ہوا ہو۔ یا مسکن مستعار ہو تو باہر نکل آئے اور کہے کہ ہوسکتا ہے کہ مالک مسکن مر گیا ہو اور گھر وارثوں کی ملکیت میں چلا گیا ہو۔ ایسی صورتوں میں اگر کوئی دلیل موجود نہ ہو یہ وسواس ہے اور بے کار ہے۔

درجہ سوم: پرہیز گاروں کا ورع ہے۔ جنھیں متقی کہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ جو حرام ہو نہ مشتبہ بلکہ حلالِ مطلق ہو لیکن خطرہ یہ ہو کہ اس میں کوئی اور شبہ یا حرامی پڑنے کا احتمال ہو۔ متقی اس سے بھی محترز رہتا ہے۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''کوئی متقیوں کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس چیز سے جو پاک نہ ہو ہاتھ نہ روکے اس خوف کی بناء پر کہ کسی ایسی چیز میں جا پڑے کہ جس سے خطرہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے حلال میں سے دس میں سے نو حصے چھوڑے ہیں اس خوف سے کہ کہیں حرام کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ جس کے سو درم کسی دوسرے پر واجب ہوتے وہ ننھانوے ۹۹ درم سے زیادہ واپس نہ لیتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پورے لینے سے زیادتی کا مستوجب ٹھہرے

علی بن معید کہتے ہیں کہ میرے پاس کرایے کا گھر تھا۔ میں نے ایک خط لکھا تو میں نے چاہا کہ اس کی تحریر کو دیوار کی مٹی سے خشک کروں مجھے خیال آیا کہ دیوار میری ملکیت تو نہیں اس لیے یہ نہ کروں لیکن پھر خیال آیا کہ اتنی سی مٹی کی کیا قدر و قیمت ہے۔ تو میں نے ذرا سی مٹی اپنی تحریر پر ڈال دی۔ لیکن سونے پر خواب میں دیکھا کہ ایک شخص مجھ سے کہہ رہا ہے: ''وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ کسی دیوار کی ذرا سی مٹی کی کیا حیثیت ہے تو وہ قیامت میں اس سے آگاہ ہوں گے''۔ وہ لوگ جو اس درجے میں ہوں کہ جو تھوڑی سی بھی ہو اور مسامحت کے محل میں ہو اس سے محترز رہتے ہیں اس لیے کہ اگر یہ دروازہ کھل جائے تو وہ اس سے بھی بڑھ کر کریں تو اور لوگ بھی آخرت میں متقیوں کے درجے سے گر جائیں۔

اسی بناء پر تھا کہ حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے مال صدقہ میں سے ایک کھجور منہ میں ڈال لی تھی، اور ابھی لڑکے ہی تھے، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''کخ کخ القہا'' یعنی نکال پھینک'' مال غنیمت میں مشک لایا گیا تھا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی ناک پکڑ لی اور فرمایا کہ مشک کی منفعت اس کی خوشبو ہے اور یہ حق جملہ مسلمانوں کا ہے''۔

اسلاف میں سے ایک بزرگ ایک بیمار کی تیمارداری میں تھے جب وہ بیمار فوت ہو گیا تو چراغ گل کر

دیا اور فرمایا کہ ''اب وارثوں کا حق تیل میں داخل ہو گیا''۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مالِ غنیمت میں آمدہ مُشک کو اپنی بیوی کے سپرد کر رکھا تھا کہ مسلمانوں کے لیے بیچے۔ ایک دفعہ جب گھر میں داخل ہوئے تو بیوی کے دوپٹے سے مشک کی بو پائی تو فرمایا ''یہ کیا ہے؟ تو بیوی نے جواب دیا کہ میں مشک بیچ رہی تھی کہ تو میرے ہاتھ میں جو آلودگی تھی وہ میں نے دُوسری سے صاف کی تھی۔ تو حضرت عمر نے وہ دُوسری بیوی سے لے کر دھوئی اور مٹی میں ملی اور ساتھ ہی اسے سونگھتے جاتے تھے تاکہ بو کا ذرا اثر بھی باقی نہ رہے۔ پھر بیوی کو دے دی۔ تو یہ ذرا سی مقدار محل مسامحت میں ہے۔ لیکن عمر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ یہ دروازہ بند رہے اور یہ کام کسی دوسری چیز کی طرف نہ لے جائے۔ یا حرام کے خوف سے حلال بھی اس غرض سے چھوڑ دیا ہو کہ متقیوں کا ثواب حاصل ہو۔ احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے پوچھا کہ ''اگر کوئی مال سلطان میں سے خریدی ہوئی اگربتی مسجد میں جلائے تو اس کا کیا حکم ہے؟'' آپ نے فرمایا مسجد سے باہر نکل آنا چاہیے تاکہ اگربتی کی خوشبو ناک میں داخل نہ ہونے پائے اور یہ حرام کے قریب ہوتی ہے۔ کیونکہ جس قدر کسی کے قریب پہنچتی ہے وہ لباس میں بھی رچ جاتی ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ مسامحت کے درجے میں نہ ہو''۔ آپ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی حدیث میں سے کوئی ورق پائے اور بے اجازت اسے لکھنا چاہے تو کیا یہ روا ہے؟'' تو امام نے فرمایا: ''نہیں''۔

عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب ایک بیوی کو عزیز جانتے تھے۔ جب خلافت کو پہنچے تو اسے طلاق دے دی اس بناء پر کہ ممکن ہے کہ وہ کسی چیز میں شفاعت کرے اور آپ رضی اللہ عنہ اس کو نظر انداز نہ کر پائیں''۔ اے عزیز جان لے کہ ہر مباح جو نیت دنیا کی طرف پھرے من جملہ اس کے ہے: کہ جب اسی میں مشغول ہوگا تو وہ آگے کسی اور کام میں ڈال دے گی بلکہ جو حلال میں سے بھی پیٹ بھر کر کھائے گا وہ متقیوں کے درجے سے محروم رہے گا۔ اس لیے کہ حلال میں سے پیٹ بھر کر کھانا شہوت کو تحریک دیتا ہے۔ پھر اس کو اس کے حصول کے لیے سرگرم کر دیتا ہے اور خطرہ یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں ناروا کا مرتکب نہ ہو جائے اور نظر بد کی خواہش پیدا ہو جائے اور اہل دنیا کے مال و منال، باغ، کاخ و محل وغیرہ کی دید بھی اسی قبیل کی ہے کہ دنیا کی حرص کی محرک ہوتی ہے۔ پھر انسان اس کے حصول کے لیے حرام کا مرتکب بھی ہوسکتا ہے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''حُبُّ الدُّنیا رَاسُ کُلِّ خَطِیئَۃ ''یعنی دنیا دوستی تمام گناہوں کا سر ہے''۔ یاد رہے کہ مباح دنیا کی آرزو کہ دنیائے مباح کی محبت پورے دل کو زیادہ دنیا خواہی میں لگا دیتی ہے اور جو گناہ کے ارتکاب کے بغیر ممکن نہیں حتیٰ کہ ذکر حق تعالیٰ اس کے دل سے رخصت ہو جاتا ہے۔ تمام شقاوتوں کا سر ایسی ہی شقاوتیں ہیں جس سے غفلت حق تعالیٰ دل پر غلبہ پا لیتی ہے۔ اسی بناء پر تھا کہ ایک دفعہ سفیان ثوری ایک بلند عمارت کے سامنے سے جو کسی محتشم کی ملکیت

تھی، گذر رہے تھے تو ایک اور شخص بھی ان کے ہمراہ تھا۔ تو وہ اس عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔ تو آپ نے اسے اس سے منع کیا اور فرمایا کہ اگر تم لوگ ایسی چیزوں کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھتے تو وہ لوگ اسراف کا ارتکاب نہ کرتے۔ دیکھو گے تو ان کے اسراف کی عظمت میں شریک ٹھہرو گے۔

لوگوں نے احمد بن حنبلؒ سے مسجد یا گھر کی دیواروں کو گچ کرنے کے بارے میں استفسار کیا تو آپ نے فرمایا کہ فرش کو گچ کرنا تو روا ہے تا کہ مٹی نہ اڑے لیکن دیواروں کو گچ کرنے کے بارے میں مجھے اچھا نہیں لگتا کیونکہ یہ آرایش میں شمار ہوتا ہے۔ اور اسلاف کا قول ہے کہ جس شخص کا لباس تنک اور باریک ہو اس کا دین بھی تنک یعنی ضعیف ہی ہوتا ہے۔

درجہ چہارم: صدیقوں کی پارسائی ہے کہ اس حلال سے جس میں حرام کی طرف لے جانے کا خدشہ بظاہر نہ بھی ہو لیکن اس کے حصول میں کارفرما اسباب میں کسی ایک سبب میں معصیت ہوگئی ہو اس سے محترز رہتے تھے۔ مثال اس کی یہ ہے، بشر حافیؒ اس نہر سے پانی نہ پیتے تھے جسے کسی بادشاہ نے کھودا ہو۔ اسی طرح راہ حج میں بعض عازمین ان حوضوں سے پانی نہ لیتے تھے جو کسی سلطان نے تعمیر کیے ہوں اور بعض اصحاب اس باغ کا انگور نہ کھاتے تھے جو اسی نہر سے سیراب ہوتا تھا جسے کسی سلطان نے احداث کیا ہو۔ اسی طرح احمد بن حنبلؒ اس بات کو مکروہ سمجھتے تھے کہ کوئی مسجد میں کپڑے سینے کا کام کرے۔ لوگوں نے ان سے قبرستان کے گنبد میں بیٹھنے اور سوت کاتنے والوں کے جواز و عدم جواز کے بارے میں پوچھا تو آپ نے بکراہیت فرمایا کہ گور خانہ آخرت کے لیے ہے''۔ ایک غلام نے سلطانی توشہ خانے سے ایک چراغ لیا تو اس غلام کے آقا نے چراغ کو بجھا دیا۔ اسی طرح ایک شخص کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ گیا۔ شاہی مشعل گذر رہی تھی۔ تو اس نے اس کی روشنی میں تسمہ درست کرنے کو پسند نہیں کیا۔ اسی لیے محترز رہا۔ ایک عورت چرخہ کات رہی تھی شاہی مشعل گذری تو رُک گئی۔ تا کہ سلطانی روشنی میں دھاگہ بٹنے سے باز رہے۔

ذوالنون مصری کو قید خانے میں بند کر دیا گیا۔ چند دن بھوکے رہے۔ ایک پارسا عورت جوان کی مرید تھی تو اس نے اپنے ریسمان حلال سے اسے کھانا بھیجا آپؒ نے نہ کھایا تو وہ عورت ناراض ہوئی اور کہنے لگی کہ ''آپ کو معلوم تھا کہ جو کچھ میں بھیجتی ہوں حلال ہوتا ہے۔ تم بھوکے تھے تو کیوں نہیں کھایا؟'' ذوالنون نے فرمایا کہ ''اس لیے کہ ایک ظالم کے طبق پر رکھا مجھ تک پہنچا تھا۔ اور سلطانی غلام کے ہاتھ سے موصول ہوا تھا''۔ تو آپؒ نے اس سے احتراز اس بناء پر کیا کہ اس کا پہنچنا ایک ظالم کی قوت بازو کے سہارے سے ممکن ہوا تھا۔ اور ظالم نے وہ قوت حرام سے حاصل کی تھی۔ اور یہ ورع اور تقویٰ کے عظیم ترین درجات میں سے ہے۔

اور جو کوئی اس تحقیق کی معرفت نہ رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ اس کو وسوسہ کی ذیل میں شمار کرے تا کہ کسی فاسق یا ظالم کے ہاتھ سے کھانے سے بچ جائے۔ اور یہ بات صرف ظالم سے مخصوص نہیں جس سے وہ حرام ہو۔ اور ظالم کی قوت اس حرام مال سے حاصل شدہ ہو۔ اور جو زنا کرتا ہے مثلاً تو اس کی قوت حرام سے حاصل شدہ نہیں ہوتی۔ پس حرام ہونے کا باعث فقط یہی نہیں ہوتا کہ بھیجنے والے کی طاقت مال حرام سے حاصل شدہ ہو۔

سری سقطیؒ کہتے ہیں کہ ''ایک دن میں صحرا میں ایک پانی پر پہنچا تو میں نے ایک گیاہ (سبزی کا پودا) دیکھا تو میں نے کہا کہ ''یہ کھاؤں کیونکہ اگر قطعاً حلال کھانا ہو تو یہی وہ حلال شے ہے' لیکن ہاتف غیبی نے آواز دی کہ وہ قوت جس نے تجھے یہاں تک پہنچایا وہ کہاں سے آئی' تو کہا' میں پشیمان ہوا اور اللہ سے بخشش طلب کی''۔ یہ ہے مرتبہ صدیقوں کا جو اس قدر تحقیق احتیاطوں پر کرتے تھے۔ اب یہ مقلّب ہوگئی ہے کیونکہ اب تو کپڑے دھونے کے لیے پاکیزہ پانی طلب کیا جاتا ہے جب کہ اسلاف اس کو اہمیت نہ دیتے تھے۔ ننگے پاؤں چلے جاتے اور جو پانی بھی میسر ہوتا اس سے وضو کر لیتے تھے۔ ظاہر ہے یہ طہارت بیرونی آرائش کی ہے۔ اور لوگوں کی نظارہ گاہ ہے اور اس میں ایک بڑا لالچ نفس کا ہے کہ مسلمانوں کو فریب میں مصروف کر لیتے ہیں۔ جب کہ نظارہ گاہ حق باطن کی آرائش ہے جو ایک دشوار کام ہے۔

درجہ پنجم: اللہ تعالیٰ کے مقربوں اور موحدوں کا درجہ ہے کہ جو شے بھی اللہ کے سوا ہو کھانا پینا ہو یا سونا سب کو اپنے لیے حرام تصور کرتے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو یک ہمت اور یک صفت ہوگئے ہوں اور عظیم درجے کے موحد ہوتے ہیں۔

یحییٰ بن یحییٰ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے دواپی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی نے کہا ''چند قدم آگے چلیے''۔ یحییٰ نے کہا ''اس چلنے کی وجہ میں نہیں جانتا۔ تیس ۳۰ سال سے میں اپنا حساب محفوظ رکھتا ہوں تا کہ ماسوائے کار دین کے میں قدم نہیں اٹھاتا۔ پس اس قدم کو جب تک کوئی نیت دینی نہ ہو کوئی حرکت نہیں دیتے۔ اور اگر کچھ کھاتے ہیں تو اس قدر جس سے ان کی زندگی اور عقل باقی رہے۔ عبادت کی قوت کے لیے بات کریں تو وہ ان کے دین کی راہ ہو اور اس کے سوا جو کچھ ہو اسے اپنے لیے حرام سمجھتے تھے۔

یہ ہیں پرہیز گاری کے مدارج اور اس سے کمتر درجہ نہیں۔ چاہیے کہ خود کو جان سکے۔ اور اپنی ناکسی کا اندازہ کر سکے۔ اگر چاہے کہ پہلے درجے کو کہ جو انصاف پسند مسلمانوں کی پرہیز گاری کا ہے اسے پالے تا کہ تیرے نام سے فسق دور ہو جائے اور جب نوبت بات کی ہو تو منہ کھول دے اور ملکوتِ آسمانی کی بات کرے۔ اور ظاہر بات سے جو علم شریعت میں ہے اس کے بیان سے شرماتا ہے اور خواہش تیری یہ ہوتی ہے کہ صوفیاء کی

نقل میں طامات اور اونچی باتیں کرے۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''بدترین لوگ وہ ہیں کہ بدن ان کا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے استوار ہو اور طرح طرح کے کھانے کھاتے ہوں اور رنگارنگ لباس زیب تن کرتے ہوں۔ جب منہ کھولتے ہیں تو اچھی گفتگو کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان آفات سے اپنے فضل کے ذریعے مامون رکھے۔ آمین۔

◆◆◆

باب سوم: حلال وحرام کی تمیز و تحقیق میں

معلوم رہے کہ ایک گروہ نے گمان یہ کیا ہے مال دنیا سراسر حرام ہے یا بیشتر حرام ہے۔ اور وہ تین گروہوں میں بٹ گئے ہیں: وہ قوم کہ جس پر احتیاط اور پرہیزگاری کا غلبہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''ہم کچھ نہیں کھائیں گے سوائے صحرا کی بوٹیوں کے اور مچھلی کے گوشت کے اور شکار کے یا اس کے مثل کے'' دوسرا وہ گروہ جس پر باطل اور شہوت غالب ہو چلی ہے وہ کہتے ہیں کہ کسی امتیاز کی ضرورت نہیں سب کچھ کھا لینا چاہیے''۔ اور تیسرا گروہ جو اعتدال کے قریب ہے اس کا کہنا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ سب کھا لینا چاہیے لیکن ضرورت کے مطابق'' لیکن یہ تینوں حتماً غلطی پر ہیں۔ کیونکہ درست یہ ہے ایک وہ حلال ہے جو واضح ہے اور ایک حرام ہے جو واضح ہے۔ اور مشتبہ ان دونوں کے درمیان ہے تا بہ قیامت جیسے کہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے۔

اور وہ شخص جو یہ گمان کرتا ہے کہ دنیا کے مال میں سے بیشتر حرام ہے۔ وہ غلطی پر ہے۔ کیونکہ حرام بہت ہے لیکن بیشتر نہیں۔ اور بسیار اور بیشتر میں فرق ہے۔ جیسے بیمار، مسافر یا فوجی بسیار ہیں لیکن وہ بیشتر نہیں۔ اسی طرح ظالم بسیار ہیں کہ بیشتر مظلوم ہیں اور اس غلطی کی وجہ ہم نے احیاء علوم الدین میں بہ تفصیل و دلیل بیان کر دی ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ تجھے معلوم ہو کہ یہ نہیں کہا گیا کہ ''وہ چیز کھاؤ جو اللہ کے علم میں حلال ہو'' کیونکہ اس کی قدرت کس کو ہے؟ بلکہ حکم یہ دیا گیا ہے کہ ''وہ کھاؤ جو تمھارے خیال میں حلال ہے اور جس کا حرام ہونا ظاہر نہ ہو''۔ اور ایسا کھانا ہمیشہ بآسانی دستیاب ہو سکتا ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آنحضرت (ﷺ) نے ایک مشرک کے لوٹے سے وضو کیا اور عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عیسائی عورت کے کوزے سے وضو کیا۔ اور اگر پیاسے ہوتے تو پانی پی لیتے اور نجس کھانا حلال نہیں ہوتا۔ اور غالب یہ ہوگا کہ ان کا ہاتھ پلید ہو کہ شراب پی ہو یا مردار کھایا ہو لیکن چونکہ پلیدی کا علم نہ تھا اس لیے پاک سمجھ کر استعمال کر لیا۔

اسی طرح صحابہ جس شہر میں جاتے تھے وہاں سے کھانا کھاتے اور معاملت کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ ان کے زمانے میں چور، سود پر روپیہ دینے والے اور شراب فروش سبھی موجود تھے۔ اور انھوں نے پوری دنیا سے ہاتھ نہیں روکا تھا لیکن سب کو ایک سا بھی نہیں سمجھا تھا اور بہ قدر ضرورت قناعت بھی نہ کی تھی۔ پس یہ جان لو کہ لوگ تمھارے حق میں چھ قسم کے ہیں:

قسمِ اوّل: وہ شخص کہ جس کی صلاح اور فساد کے بارے میں تمھیں علم نہ ہو مثلاً تم کسی دوسرے شہر میں مسافر کی حیثیت میں وارد ہوئے ہو تو جائز ہوگا کہ جس سے چاہو روٹی خریدو اور معاملہ کرو۔ کیونکہ جو اس کے ہاتھ ہے میں ظاہر ہے کہ اس کی ملکیت ہے۔ تو یہ دلیل اس کے صالح ہونے کے لیے کافی ہے۔ سوائے ایسے معاملے کے کہ جو اس کی حرمت پر دلیل ہو باطل نہ ہوگی۔ لیکن اگر کوئی اس میں توقف کرے اور کسی ایسے شخص کی تلاش کرے کہ جس کے صالح ہونے کا اسے علم ہو تو یہ امر من جملہ پارسائی کے ہے لیکن واجب نہیں۔

قسم دوم: وہ شخص جس کے صالح ہونے کا علم تمھیں ہو۔ تو اس کے مال میں سے کھانا جائز ہوگا۔ تو اس میں توقف کرنا ورع نہ کہلائے گا۔ بلکہ وسوسہ کہلائے گا۔ اگر وہ شخص تمھارے توقف کی وجہ سے رنجیدہ خاطر ہو جائے تو یہ رنج رسانی معصیت قرار پائے گی اور اہل صلاح کے باب میں بدگمانی خود معصیت ہے۔

قسم سوم: وہ شخص ہے جسے تو ظالم سمجھتا ہے جیسے ترک یا بادشاہ کے کارندے یا تمھیں علم ہو کہ اس کا تمام یا بیشتر مال حرام ہے تو اس کے مال سے حذر واجب ہے۔ سوائے اس کے جس کے بارے میں تمھیں علم ہو کہ حلال جگہ سے ہے۔ اور یہاں اس کے حال سے کوئی علامت پائی جاتی ہو کہ اس نے کسی کا مال غصب کیا ہے۔

قسم چہارم: وہ شخص ہے جس کے بارے میں تمھیں یہ علم ہو کہ اکثر مال حلال کا ہے لیکن حرام سے کلیۃً خالی نہیں مثلاً کوئی شخص کسان ہو لیکن بادشاہ کی طرف سے عمل داری بھی کرتا ہو یا کوئی سوداگر ہو جو بادشاہ کے متعلقین سے بھی معاملہ کرتا ہو تو ایسے شخص کا مال حلال ہے اس میں سے اکثر لینا حلال ہے کیونکہ اکثر حلال کا ہے۔ لیکن اہل ورع کو اس سے محترز رہنا چاہیے۔ عبداللہ ابن مبارکؒ کے نمایندے نے بصرہ سے اسے لکھا کہ "آیا وہ لوگ جو متعلقین بادشاہ سے معاملہ کرتے ہیں کیا ان سے معاملہ کرنا روا ہے؟" تو آپ نے جواب میں لکھا کہ "اگر وہ صرف متعلقین شاہ سے معاملہ کرتے ہوں تو ان سے معاملہ نہ کرنا' لیکن اگر وہ دوسروں سے بھی معاملہ کرتے ہوں تو ان سے معاملہ کرنا جائز ہے"۔

قسم پنجم: وہ شخص ہے کہ تو اس کا ظلم نہ جانتا ہو اور اس کے مال سے بھی بے خبر ہو لیکن اس کے پاس ظلم کی علامت دیکھے جیسے لشکریوں کی کلاہ وقبا وغیرہ دیکھے تو یہ ظلم کی ظاہر علامت ہے۔ ایسوں سے معاملہ کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ جب تک تو نہ جانے کہ وہ کس کا مال تجھے دے رہے ہیں یا وہ کہاں سے حاصل کرتے ہیں۔

قسم ششم: وہ شخص ہے کہ جس کے پاس تو ظلم کی علامت نہ دیکھے لیکن فسق کی علامت دیکھے مثلاً وہ ریشمی لباس میں ملبوس ہو یا ساز و برگ زرین رکھتا ہو اور تجھے معلوم ہو کہ شراب خوار ہے اور نامحرم عورتوں کو گھورتا ہے تو درست یہ ہے کہ اس کے مال سے حذر نہ کیا جائے کیونکہ یہ مال کو حرام نہیں ٹھہراتے اور اس سے زیادہ نہ ہوگا کہ

لوگ کہیں کہ: ''جب یہ حلال رکھتا ہے ممکن ہے حرام سے حذر نہ کرتا ہو''۔ اوراس پر اس کے مال کے حرامی ہونے کے باوجود حکم نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ کوئی شخص بھی معصیت سے معصوم نہیں ہوتا اور اکثر ایسا شخص بھی ہوتا ہے کہ مظالم سے حذر کرتا ہے اور معصیت سے حذر نہیں کرتا۔

اور یہ قاعدہ حلال وحرام میں ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اگر کسی نے انجانے میں حرام کھالیا ہوتو وہ اس سے ماخوذ نہ ہوگا۔ ایسے ہی جیسے نماز ناپاکی کے ساتھ جائز نہیں۔ لیکن اگر کسی کو اس نجاست کا علم ہی نہ ہوتو وہ ماخوذ نہ ہوگا اور اگر نماز ادا کرنے کے بعد معلوم ہوتو ایک قول کے مطابق قضا واجب نہ ہوگی کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ایک بار دوران نماز میں نعلین اتارے تھے اور نماز دہرائی نہیں تھی اور آپ (ﷺ) نے فرمایا تھا کہ مجھے جبریل نے اطلاع دی تھی کہ نعلین آلودہ ہے''۔

معلوم رہے کہ جہاں ہم نے کہا ہے کہ ورع مہم ہے اگرچہ واجب نہیں'' شاید روا ہو کہ صاحب مال سے سوال کرے کہ کہاں سے حاصل کیا ہے؟ بشرطیکہ باعث رنج نہ ہو۔ اگر احتمال یہ ہو کہ صاحب مال اس سے رنجیدہ ہوگا تو سوال حرام ہوگا۔ کیونکہ ورع احتیاط ہے لیکن رنج رسانی حرام ہے۔ بلکہ چاہیے کہ لطف کا اظہار کرے اور کوئی بہانہ لے آئے اور نہ کھائے۔ لیکن اگر یہ نہیں کرسکتا تو چاہیے کہ کھالے تاکہ وہ شخص رنجیدہ خاطر نہ ہونے پائے۔ اور اگر کسی ایسے دوسرے شخص سے پوچھے کہ ممکن ہو کہ صاحبِ مال بھی سن لے تو یہ حرام ہے کیونکہ یہ تجسس ہے اور غیبت ہے اور بدگمانی اور یہ جملہ حرام ہیں اور احتیاط کی خاطر مباح نہیں ہوجاتیں

آنحضرت (ﷺ) مہمان ہوتے تھے تو پوچھتے نہ تھے۔ ہدیہ لیتے تو بھی استفسار نہ فرماتے کہ یہ ہدیہ ہے یا صدقہ الا یہ کہ شبہ کا سبب ظاہر ہو۔ لیکن شروع میں جب مدینہ کو مستقر بنایا تھا تو پوچھ لیتے تھے کہ ہدیہ ہے یا صدقہ؟ اس لیے کہ شک کا موقع تھا۔ اور استفسار سے کوئی برا بھی نہ مانتا تھا کہ جس سے رنجیدہ خاطر ہوتا۔

یاد رہے کہ اگر کسی بازار میں سلطانی مال بزور دکھاتے اور بیچتے ہوں یا لوٹ مار کی بکری ہو۔ اگر معلوم ہوجائے کہ اس بازار میں کا بیشتر مال حرام ہے تو چاہیے کہ نہ خریدے جب تک یہ معلوم نہ کرلے کہ کہاں سے لیا ہے۔ اگر بیشتر مال حرام نہ ہوتو بے تحقیق خریدنا روا ہے لیکن از روئے ورع پوچھنا لازم ہے۔

◆◆◆

باب چہارم: بادشاہوں کی مقرری اوران کے حضور سلام کرنا اور جو کچھ ان کے حلال مال سے ہو اس کے لینے کے بارے میں

معلوم رہے کہ اس زمانے کے بادشاہوں کے پاس جو کچھ ہے مسلمانوں کے خراج سے ہے' یا جرمانہ کی مد سے ہے' یا رشوت ہے یہ سب حرام ہے۔ اور ان کے پاس مال حلال تین قسم کا ہے۔ ایک یہ جو کفار سے غنیمت میں ملتا ہے یا جزیہ جو ذمیوں سے لیا جاتا ہے بشرطیکہ بحکم شرع لیا گیا ہو یا وہ میراث کہ جس کے مالک کے مرنے پر اس کا کوئی وارث نہ ہو ایسا مال مصالح کے لیے ہوتا ہے۔

چونکہ زمانہ ایسا ہے کہ یہ مال حلال نادر ہے۔ اور بیشتر حرام اور مصادرہ سے ہوتا ہے اس لیے بادشاہوں سے جب تک اس کی حِلّت یقینی نہ ہو نہ لینا چاہیے خواہ غنیمت میں سے ہو جا جزیے سے یا ترکے میں سے ہو جس کے حق دار صرف اس کے وارث ہوں۔

اور روا ہے کہ سلطان بھی کسی مِلک کا احیا کرے اور وہ اس کے لیے حلال ہو لیکن اگر مزدور بیگار میں پکڑے گئے ہوں تو مشتبہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ حرام نہ ہو اور اگر زمین غلہ خیز ملک ذِمّہ سے خریدے تو وہ اس کی ملک ہوگی۔ لیکن چونکہ قیمت اس کی حرام مال سے ادا کی ہو تو وہ بھی مشتبہ ٹھہرے گی۔

پس جو کوئی سلطان سے روزینہ پاتا ہے اگر بادشاہ کی ملک خاص میں سے پاتا ہے جس قدر بھی ہو جائز ہے۔ اور اگر ترکات یا مال مصالح سے ہو تو حلال نہ ہوگی جب تک یہ شخص ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کی ملکیت سے کوئی مصلحت اس سے وابستہ ہو جیسے کہ مفتی' قاضی' فقیہہ' موقوفہ کا متولی اور طبیب ہے۔

مختصر یہ کہ جو شخص ایسے کام میں مشغول ہو جس میں خیر عامہ ہو۔ طلبہ علم اس میں شریک ہوں گے۔ اور وہ شخص بھی جو مفلس ہو اور کمائی نہ کر سکتا ہو۔ وہ بھی اس کے مستحقین میں شامل ہے۔ لیکن اہل علم اور دوسروں کو اس شرط پر روا ہے کہ سلطانی عامل کے ساتھ اس میں کسی قسم کی مداہنت نہ کریں اور باطل کاموں میں ان سے موافقت نہ کریں اور ان کو ظلم کی چھٹی نہ دیں بلکہ ان کے قریب بھی نہ جائیں لیکن اگر نزدیک ہونا پڑے تو بشرط شرع نزدیک ہوں جس کی شرح بیان ہو چکی ہے۔

فصل: (سلاطین اور عمال سلاطین کے ساتھ لوگوں کے احوال میں)

معلوم رہے کہ علما اور غیر علما کی سلاطین کے ساتھ تین حالتیں ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ بادشاہ کے قریب نہ جائیں اور نہ بادشاہ ان کے قریب جائیں تو دین کی سلامتی اسی میں ہے

حالتِ دوم یہ ہے کہ بادشاہوں کے پاس جائیں اور انھیں سلام کریں اور یہ شرعی اعتبار سے مذموم ہے نہایت زیادہ الاّ یہ کہ کوئی ضرورت ہو۔ آنحضرت (ﷺ) نے امرائے ظالم کی صفات کی ذیل میں کہا تھا کہ: ''جو کوئی ان سے دوری ڈھونڈتا ہے وہ نجات پا گیا اور جو کوئی ان کے ساتھ دنیا میں جا پڑا وہ انھی میں سے ہے''۔ نیز فرمایا کہ: ''پس ظالم سلطانوں میں سے ہوگا جو کوئی ان کے دروغ اور ظلم پر چشم پوشی کرے گا اور مطمئن ہوگا کہ میں نے تو نہیں کیا اس کے لیے روزِ قیامت میرے حوض کوثر تک آنے کی راہ نہ ہوگی''۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دشمن علماء وہ علما ہوں گے کہ جو امرا کے قریب ہوں گے''۔ نیز فرمایا کہ ''امراء میں سے بہتر وہ ہیں جو علما کے نزدیک حاضر ہوں''۔ نیز فرمایا کہ: ''علماء تو پیغمبروں کے امانت دار ہوتے ہیں جب تک سلطانوں سے میل جول نہ رکھیں لیکن جب ان سے ملنے لگیں تو گویا امانت میں خیانت کے مرتکب ہو گئے۔ لہٰذا بادشاہوں سے حذر کرو اور دور رہو۔

اور ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے سَلَمہ سے کہا کہ: ''بارگاہ سلطان سے دور رہ کیونکہ اس کی دنیا سے تمھیں کوئی ایسی چیز حاصل نہ ہوگی جس سے تمھارے دین میں اضافہ ہو''۔ اور فرمایا کہ ''دوزخ میں وادی ہے جس میں ان عالموں کے سوا جو بادشاہ کی زیارت کو جاتے ہیں اور کوئی نہ ہوگا''۔ اور عبادۃ بن الصامت فرماتے ہیں کہ: ''علماء اور پارساؤں کی امراء سے دوستی دلیل نفاق ہے اور دولت مندوں کے ساتھ دوستی ریاکاری کی دلیل ہے''۔ ابن مسعود کا فرمان ہے کہ: ''ایک شخص جو درست دین سے بہرہ مند ہوگا وہ دولت مندوں کے پاس جائے گا تو جب لوٹے گا دین سے خالی ہاتھ ہوگا۔ لوگوں نے پوچھا کس طرح؟ فرمایا کہ ''وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے وہ دولت مندوں کی رضا کے لیے تلاش کرے گا''۔ اور فضیل رحمہ اللہ کہتا ہے کہ ''جس قدر کوئی عالم سلطان کے نزدیک ہوتا ہے حق تعالیٰ اسی قدر اس سے دور ہو جاتے ہیں''۔ اور وھیب رحمہ اللہ کہتا ہے کہ ''یہ علماء جو بادشاہ کے پاس جاتے ہیں ان کا ضرر جوابازوں کے ضرر سے مسلمانوں پر زیادہ تر ہوتا ہے''۔ محمد بن سلمہ رحمہ اللہ کہتا ہے کہ ''ان علماء سے جو بارگاہ سلطان میں جاتے ہیں ان سے وہ مکھی اچھی جو غلاظت پر بیٹھتی ہے''۔

فصل: یاد رہے کہ اس قسم کی تشدید کا سبب یہ ہے کہ جو بھی سلطان کے پاس گیا وہ خطر معصیت میں گرفتار ہو گیا خواہ کردار میں خواہ گفتار میں، خواہ خاموشی میں خواہ اعتقاد میں۔ اور معصیت کردار یہ ہے کہ اکثر ایسا

ہوتا ہے کہ گھر ان کا غصب شدہ ہوتا ہے جس میں داخل نہ ہونا چاہیے۔ نہ اس میں قدم رکھنا چاہیے اور اگر مباح زمین میں بے فرش و خیمہ ہو اگر خدمت کرے گا اور سر جھکائے گا تو اس نے ظالم کے آگے انکساری کی اگرچہ ظالم نہ ہو دولت مند کے لیے ہو تو اس کے دین میں کے دو حصے تباہ ہو جاتے ہیں۔ پس سوائے سلام کے اور کچھ روا نہیں لیکن دست بوسی کرنا یا پشت خم کرنا یا سر جھکانا وغیرہ مذموم ہے۔ سوائے سلطان عادل کے یا عالم کے یا کسی ایسے شخص کے جو بہ سبب دین تواضع کا مستحق ہو اور اسلاف میں سے بعض نے مبالغہ کرتے ہوئے ظالموں کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تا کہ ان کے ظلم کے باعث ان کی تحقیر کا اظہار کر سکیں۔

اور گفتار کا گناہ جو اس طرح ہوتا ہے کہ ظالم کے لیے دعا کرے مثلاً: حق تعالیٰ تجھے لمبی عمر ارزانی فرمائیں" یہ یا اس جیسی کوئی اور دعا نہیں چاہیے کہ آنحضرت (ﷺ) فرماتے ہیں: "جو کوئی کسی ظالم کے طول بقا کے لیے دعا کرے تو گویا اس نے اس بات کو عزیز رکھا کہ روئے زمین پر ہمیشہ ایسا شخص فرماں روا رہے جو اللہ تعالیٰ کا عاصی ہو"۔ پس کوئی دعا روا نہیں الّا یہ کہ کہے: "اَصلَحَكَ اللّٰهُ" یا "وَفَّقَكَ اللّٰهُ لِلخَيرَاتِ طَوَّلَ اللّٰهُ عُمرَكَ فِي طَاعَةِ" (اللہ تجھے بہ صلاح رکھے' یا' اللہ تجھے نیکیوں پر کامیاب رکھے' اللہ تیری زندگانی کو اپنی فرماں برداری میں درازی عطا فرمائے"۔ اور جب دعا سے فارغ ہو تو اکثر یوں ہوتا ہے کہ خدمت کے لیے اپنے اشتیاق کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "میں چاہتا ہوں کہ ہمیشہ آپ کی خدمت میں پہنچوں" اگر یہ اشتیاق دل میں نہ ہو تو جھوٹ بولنے اور نفاق برتنے کا موجب ٹھہرا۔ محض مفت میں؛ اور اگر یہ تہ دل سے کہا ہو تو جو کوئی ظالموں کے دیدار کا مشتاق ہو تو وہ نور اسلام سے خالی ہو گیا بلکہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے تو چاہیے تو یہ کہ اس کی دیدار سے اسی طرح نفور ہو جیسے اس شخص سے نفور ہوتا جو خود اس کے خلاف کہتا ہے۔ دعا سے فارغ ہوتا ہے تو عموماً اس کے عدل و انصاف و کرم جیسی صفات کی ثنا گوئی کرنے لگتا ہے جب کہ یہ دروغ اور نفاق سے خالی نہیں ہوتا۔ اور کمترین یہ ہوتا ہے کہ ظالم کی دلداری اور خوشی کا باعث بنتا ہے جو پسندیدہ نہیں اور جب اس سے فارغ ہوتا ہے تو اکثر یوں ہوتا ہے کہ وہ ظالم بے ہودہ بے اصل دروغ گوئی میں لگ جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ تصدیق میں سر ہلایا جائے جب کہ یہ سب معصیت ہے۔

اور **معصیت خاموشی**: یہ ہے کہ اس کے گھر میں ریشمیں فرش دیکھے دیواروں پر تصویریں پائے اور خود اس کو ابریشمن لباس اور زرین انگوٹھی اور چاندی کے کوزہ کا مالک پائے تو امکان اس کا ہے کہ اس سے فحش زبان سنے یا دروغ سنے جب کہ اس سب میں باز پرس واجب ہے اور خاموش نہیں رہنا چاہیے اور اگر ڈرے گا تو باز پُرس نہ کر پائے گا لیکن بے ضرورت اندر جانے کے لیے معذور نہیں کیونکہ جہاں معصیت پر باز پُرسی ممکن نہ ہو

وہاں جانا خود معصیت ہے۔

دل و اعتقاد کی معصیت: وہ اس طرح ہوتی ہے کہ انسان کا اس طرف میلان ہو اور وہ اسے عزیز رکھتا ہو اور اس کے آگے انکساری اعتقاد کرتا ہو اور اس کی نعمت کو دیکھتا ہو اور اسی طرح اس میں نعیم دنیا کے حصول کی رغبت پیدا ہوتی ہو۔ اس کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''اے جماعت مہاجران! اہل دنیا کے نزدیک نہ جاؤ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو رزق تمھیں فراہم کیا ہے اس پر خشمگین ہوتا ہے''۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: ''اہل دنیا کے مال پر نگاہ نہ ڈالو کیونکہ دنیا کی یہ چمک دمک تمھارے دل سے ایمان کی حلاوت لے اڑے گی''۔

پس اس جملہ بیان سے تجھے، اے عزیز، معلوم ہونا چاہیے کہ ظالم کے نزدیک جانے کی اجازت نہیں سوائے دو عذر کے ایک یہ کہ حکم بادشاہ کا ہو اور تاکید ہو کہ اگر نہ مانے گا تو تجھے آزار کا سامنا ہوگا۔ یا نہ ماننے کی صورت میں سلطان کی حشمت باطل ہوتی ہو جس سے رعایا دلیر ہو۔ دوسرے یہ کہ اپنے حق کے لیے فریاد کرنی ہو یا کسی مسلمان کے حق میں شفاعت کرنی ہو تو اس میں اجازت ہے۔ بشرطیکہ جھوٹ نہ کہے، سلطان کی ثنا نہ کرے، اور سخت نصیحت کرنے سے باز نہ رہے اور اگر خوف ہو تو نرمی سے نصیحت کرے۔ اگرچہ جانتا ہو کہ نصیحت قبول نہ کرے گا تو جھوٹی تعریف سے گریز کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ یہ حیلہ کرے کہ میں تو سفارش کے واسطے جاتا ہوں۔ اور پھر وہ کام کسی اور کی سعی سے نکل آئے یا کسی اور کو بادشاہ کا تقرب حاصل ہو تو اگر اس پر افسردہ ہو تو یہ دلیل اس بات کی ہے کہ وہ دینی ضرورت سے نہیں جاتا بلکہ طلب جاہ کے لیے حضور شاہ میں جاتا ہے۔

تیسری حالت یہ ہے کہ وہ تو سلاطین کے ہاں نہ جائے لیکن سلاطین اس کے پاس آئیں۔ تو شرط یہ ہے کہ جب وہ سلام کہیں تو سلام کا جواب دے اور اگر اُن کے اکرام میں کھڑا ہو جائے تو روا ہے کیونکہ سلطان کا آنا علم ہی کا اکرام ہے۔ اس لیے اس کی نیکی کی بناء پر بادشاہ اکرام کا مستحق ہے۔ ایسے ہی جیسے ظلم کی بناء پر اہانت کا مستوجب ہے لیکن اگر عالم کھڑا نہ ہو اور غرض حقارت دنیا کا اظہار ہو تو اولیٰ تر ہے۔ اِلّا یہ کہ ڈرتا ہو کہ غضب شاہی کا نشانہ بنے گا۔ یہ خیال ہو کہ اس صورت میں استقبال نہ کرنے سے رعیت میں بادشاہ کا رعب داب جاتا رہے گا۔

جب بادشاہ بیٹھ جائے تو عالم کے لیے تین قسم کی نصائح واجب ہیں: ایک یہ کہ بادشاہ کوئی ایسا کام کرتا ہے جس کے حرام ہونے کا اسے علم نہ ہو تو اس کے حرام ہونے کے بارے میں شناسائی سلطان کو فراہم کرے۔

دوسرے یہ کہ اگر شاہ ایسا کوئی کام کرتا ہے جس کے بارے میں جانتا ہے کہ حرام ہے جیسے کہ ظلم وفسق ہے تو اسے ڈرائے اور نصیحت کرے اور کہے کہ ''لذایذ دنیا اس قابل نہیں کہ جن کے لیے انسان آخرت کو ضرر پہنچائے اور جو کچھ اس کے مشابہ ہو''۔ تیسرے یہ کہ اگر دیکھے کہ بادشاہ خلق خدا کے حقوق ومراعات کے بارے میں غافل ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ بادشاہ قبول کرے گا تو انتباہ کرے اور یہ تینوں باتیں ہر اس شخص پر واجب ہیں جسے قربِ سلطان حاصل ہو۔ اور قبولیت کی توقع ہو۔ اور جب عالم درحقیقت عالم کی صفات سے متصف ہوگا تو اس کی بات قبولیت سے خالی نہیں رہ سکتی۔ لیکن اگر عالم ان کی دنیا کا حریص ہو اس کے لیے خاموشی اچھی کیونکہ اس صورت میں سوائے اس کے کہ اس کا مذاق اڑائیں اور کوئی فایدہ حاصل نہ ہوگا۔

مقابل بن صالح کہتا ہے کہ میں حماد بن سلمہ کے پاس تھا اور اس کے پورے گھر میں مصحف تھا' یا چٹائی یا ایک تھیلا یا ایک لوٹا۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا گیا کہ ''محمد بن سلیمان خلیفۂ وقت ہے'' وہ داخل ہوا اور بیٹھ گیا اور بولا کہ ''کیا سبب ہے کہ جس وقت میں تمھیں دیکھتا ہوں میرا باطن ہیبت سے لبریز ہو جاتا ہے؟'' حمادؒ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''وہ عالم جس کا مقصود عرفان خدا ہو اس سے ہر کوئی ڈرتا ہے اور اگر اس کا مقصود دنیا ہو تو وہ خود ہر کسی سے ڈرتا ہے'' پس خلیفہ نے چالیس[۴۰] ہزار درم اس کے حضور میں پیش کیے اور کہا کہ اسے کسی کام میں صرف کر لیں'' تو حمادؒ نے کہا کہ جاؤ اور اس کے مالک کو واپس دے دو''۔ خلیفہ نے قسم کھائی کہ میں نے اسے میراث حلال میں سے پایا ہے''۔ حماد نے کہا مجھے اس کی حاجت نہیں''۔ خلیفہ نے کہا کہ اسے آپ مسلمانوں اور مستحقوں میں تقسیم فرما دیجیے''۔ تو حماد نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ میں بہ انصاف تقسیم کروں اس پر بھی کوئی کہہ دے کہ انصاف کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور وہ گناہ گار ہو جائے تو میں یہ بھی نہیں چاہتا''۔ حماد نے یہ ہدیہ قبول نہیں کیا۔ بادشاہوں کے ساتھ علماء کا حال اور گفتگو ایسی ہی ہوتی تھی جب وہ علماء کی بارگاہ میں حاضر ہوتے تھے۔

طاووس بن کیسانی ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک کہ خلیفہ تھا کے پاس گیا اور جب ہشام مدینہ پہنچا تو اس نے کہا کہ صحابہ میں سے کسی کو میرے پاس لاؤ۔ تو لوگوں نے کہا کہ سب فوت ہو چکے تو کہا کہ تابعین میں سے کسی کو لاؤ تو طاووس کو اس کے پاس لایا گیا۔ جب طاووس داخل ہوئے تو نعلین اتار دیے اور بولے: ''السلام علیک اے ہشام'' ہشام تو کیسا ہے؟'' اس پر ہشام نہایت زیادہ غصے میں بھر گیا۔ اور قصد یہ کیا کہ اسے ہلاک کر دے تو لوگوں نے کہا کہ مدینہ آنحضرت ﷺ کا حرم ہے۔ اور یہ شخص بزرگ علماء میں سے ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر خلیفہ نے کہا کہ ''تم نے یہ دلیری کس لیے کی؟'' تو طاووسؒ نے کہا کہ کیا کیا ہے

میں نے؟'' تو ہشام کا غصہ اور بھی بڑھ گیا اور بولا کہ تم نے چار آداب کو ترک کیا ایک یہ کہ نعلین میری بساط کے کنارے پر اتارے۔ اور یہ ان کے نزدیک بُرا تھا کیونکہ ان کے حضور موزہ اور نعلین کے ساتھ کھڑے ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ خلفا کے محل میں اب بھی یہی رسم ہے۔ دوسرے یہ کہ تم نے امیر المؤمنین نہیں کہا اور تیسرے یہ کہ تم نے مجھے میرے نام سے خطاب کیا اور بہ کنیت نہ کیا۔ اور یہ عربوں کے نزدیک ناپسندیدہ ہوتا ہے اور چوتھے یہ کہ تم میری اجازت کے بغیر میرے حضور میں بیٹھ گئے اور میرے ہاتھ پر بوسہ نہیں دیا''۔ طاوسؒ نے جواباً فرمایا کہ یہ جو میں نے تمھارے سامنے نعلین پاؤں سے الگ کیے ہیں تو میں یہ عمل روزانہ پانچ مرتبہ اپنے اللہ کے حضور جو جملہ مخلوق کا مالک ہے' کرتا ہوں۔ اور اللہ اس سے مجھ سے خفا نہیں ہوتا اور یہ کہ میں نے آپ کو امیر المؤمنین نہیں کہا وہ اس لیے کہ سارے مسلمان تمھیں خلیفہ نہیں مانتے اس لیے میں اگر اس طرح کہتا تو جھوٹ کا مرتکب ہوتا اور یہ جو تمھیں تمھارے نام سے خطاب کیا ہے اور کنیت سے نہیں تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جملہ دوستوں کو نام ہی سے پکارا ہے اور کنیت سے نہیں اور کہا اے آدم! اے داؤدؑ اے یحییٰ' اے موسیٰ' اے عیسیٰ اور دشمن کو کنیت سے یاد کیا ہے اور فرمایا ''تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ'' اور یہ جو میں نے دست بوسی نہیں کی تو میں نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا تھا کہ ''کسی کی دست بوسی جائز نہیں سوائے اپنی بیوی کے بہ شہوت یا بیٹے کی برحمت؛ اور یہ جو تمھارے سامنے کھڑا رہنے کی بجائے بیٹھ گیا ہوں تو میں نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سن رکھا ہے کہ ''جو کوئی اہل دوزخ میں سے کسی کو دیکھنا چاہے تو وہ اس شخص کو دیکھے جو خود تو بیٹھا ہو اور ایک جماعت اس کے حضور استادہ''۔ ہشام کو یہ توضیحات پسند آئیں تو بولا ''مجھے پند دیجیے'' تو طاوس نے فرمایا کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا تھا کہ آپ نے فرمایا: ''دوزخ میں اژدہا ہیں اور ہر ایک جسامت میں کئی پہاڑوں کے برابر ہے اور بچھو ہیں جن میں سے ہر ایک اونٹ کے قد وقامت کا ہے' اور وہ ان امراء کے منتظر ہیں جو اپنی رعایا کے ساتھ انصاف نہیں کرتے''۔ یہ کہا اور وہاں سے نکل گئے۔ اور سلیمان بن عبدالملک خلیفہ تھا جب مدینہ پہنچا تو ابوحازم کو جو بزرگ علماء میں تھے بلوایا اور اُن سے کہا کہ ''کیا وجہ ہے کہ ہم موت سے خائف ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا: ''اس لیے کہ تو نے دنیا کو تو آباد کیا اور آخرت کو ویران کر دیا۔ اور جسے پُر رونق سرائے سے ویران گھر میں جانا پڑے اندوہ گیں تو ہوگا''۔ بولا: ''اللہ تعالیٰ کے حضور خلق کا کیا حال ہوگا؟'' فرمایا کہ نیکوکاروں کا حال ایسے ہوگا جیسے سفر سے لوٹ کر کوئی اپنے عزیز واقارب میں پہنچ جائے۔ اور بدکرداروں کا احوال یوں ہوگا کہ جیسے کوئی غلام فرار کے بعد پکڑا گیا ہو اور اپنے آقا کے معرض خطاب میں ہو''۔ کہنے لگا: ''کاش کہ میں جانتا کہ میرا حال کیسا ہوگا؟ فرمایا: ''خود کو قرآن کے حضور پیش کر کہ فرماتا ہے کہ: ''اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۚ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ''

(قرآن: ۸۲/ ۱۳، ۱۴) (بے شک نیک لوگ ناز و نعمت میں ہوں گے اور بدکار جہنم میں ہوں گے)۔ پھر پوچھا کہ ''رحمت خداوندی کہاں ہوگی؟'' تو فرمایا کہ: ''اِنَّ رَحْمَتَ اللهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ'' (قرآن: ۷/ ۵۶) ''نیکو کاروں کے قریب ہوگی''۔

علماء دین کا اسلوب سلاطین کے ساتھ اسی قسم کا تھا۔ اور علمائے دنیا کا بادشاہوں کے ساتھ انداز دعا اور ثناء اور فصّالی[1] ہوتا ہے اور مقصد ان کا یہ ہوتا ہے کہ ان سے کوئی ایسی چیز کہیں جو ان کو اچھی لگے اور حیلے بہانے ڈھونڈتے ہیں تاکہ اپنی مراد کو پاسکیں اور اگر نصیحت کرتے ہیں تو غرض اس سے یہ ہوتی ہے کہ اپنے تئیں عزت حاصل ہو دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا یہ نصیحت کرے تو اس سے حسد کرتے ہیں۔

پس کسی حال میں بھی ظالموں سے نہ ملنا ہی بہتر ہے۔ ان سے کبھی میل جول نہیں رکھنا چاہیے اور ان لوگوں سے بھی مراسم نہیں رکھنے چاہئیں جو ان ظالموں سے میل جول رکھتے ہوں۔ اور اگر کوئی اس پر قادر نہ ہو کہ ان سے مخالطت سے بچ سکے تا آنکہ کسی گوشے میں چھپ نہ جائے اور دوسروں سے بے قطع محبت کئے کوئی شخص ظالموں سے روابط کو نہ چھوڑ سکے تو اس صورت میں گوشہ گیری موزوں ہے اور سب سے مخالطت ترک کر دینی چاہیے۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''میری امت اس وقت تک سایۂ حمایتِ اللہ تعالیٰ میں رہے گی جب تک اس کے علماء امراء کے ساتھ روابط نہ رکھیں گے''۔ مختصر یہ کہ رعایا میں فساد کا باعث ملوک و سلاطین کے فساد کی بنا پر ہوتا ہے اور فساد سلاطین فساد علماء سے جنم لیتا ہے کہ وہ سلاطین کی اصلاح نہیں کرتے اور ان سے گریز نہیں کرتے۔

فصل (سلاطین کا مال قبول کرنے کی شرایط کے بارے میں)

اگر کوئی بادشاہ کسی عالم کے پاس مال اس غرض سے بھیجتا ہے کہ خیرات میں تقسیم کرے تو عالم اگر جانتا ہو کہ اس مال کا ایک معین مالک ہے تو نہیں چاہیے کہ یہ مال تقسیم کرے۔ بلکہ چاہیے کہ کہے کہ اسے اس کے مالک کو دیں۔ اور اگر مالک ظاہر نہ ہو تو علماء کے ایک گروہ نے ایسے مال کو لینا اور تقسیم کرنا ناجائز قرار دیا ہے۔ اور ہمارے نزدیک اولیٰ تر یہ ہوگا یہ مال ان سے لے کر خیرات میں تقسیم کر دینا چاہیے تاکہ سلاطین کے ہاتھ سے نکل جائے اور اس طرح ذریعۂ ظلم نہ بن سکے۔ اس سے مفلسوں کو سامان راحت بھی میسر آئے گا۔ ایسے مال کو مستحق افراد تک پہنچانے کے لیے تین شرایط ہیں:

شرط اوّل: یہ ہے کہ ایسا مال لینے کی بناء پر سلطان اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ مال اس کا حلال

۱۔ **فصّال:** وہ شخص جو مال کی امید میں کسی کی ثناء کرتا ہے۔ (جیسے قصیدہ گو شاعر)۔

ہے کیونکہ اگر حلال نہ ہوتا تو قبولیت کیونکر پاتا تو اس طرح بے خوف کسب حرام کا مرتکب ہوگا اور خیر تقسیم کی نسبت شر بیشتر ہوگا۔

شرطِ دوم: یہ ہے کہ عالم ایسے محل میں نہ ہو کہ دوسرے اس کی پیروی میں مال لینے لگیں لیکن تقسیم کے بارے میں غفلت سے کام لیں۔ جیسے کہ ایک گروہ نے جواز کی دلیل میں امام شافعی کی مثال دی ہے کہ خلفا سے مال لے لیتے تھے اور اس امر سے غافل ہیں کہ وہ یہ مال آگے مستحقوں کی نذر کر دیتے تھے۔

وہب منبہ اور طاؤس بن کیسان دونوں حجاج کے بھائی کے پاس گئے صبح کا وقت تھا اور فضا سرد تھی اور طاؤس اس کو نصیحت کر رہے تھے۔ حجاج کے بھائی نے کہا کہ طاوس کے کندھے پر طیلسان ڈال دیں۔ طاوس بات بھی کرتا جا رہا تھا اور ہل بھی رہا تھا۔ نتیجۃً وہ طیلسان اس کے کندھے سے نیچے گر گئی۔ برادر حجاج سمجھ گیا اور ناراض ہوگیا۔ جب دونوں باہر نکلے تو وہب نے کہا ''اگر تم طیلسان لے لیتے اور آگے کسی درویش کو دے دیتے تو برادر حجاج کو خشمگین کرنے سے بہتر تھا''۔ طاوس نے کہا کہ میں اس امر سے مطمئن نہ تھا کہ کوئی میری اقتدا میں ایسوں کا مال لے لے اور یہ نہ جانتا ہو کہ میں نے درویش کو دے دیا ہے۔

شرطِ سوم: یہ ہے کہ قبول کرنے سے ظالم کی دوستی دل میں پیدا نہ ہو۔ اس مال کے بانٹنے کے لیے لئے جو لیا ہو۔ کیونکہ ظالموں کی دوستی بہت سے معصیتوں کا سبب بن جاتی ہے جو مداہنت کا باعث ہوتی ہے۔ اور سبب اس کا بھی بن جاتی ہے کہ ایسے ظالم کے معزول ہو جانے یا مرجانے پر وصول کرنے والا غمگین ہوتا ہے اور اس کی حشمت وولایت میں ترقی پر شاد ہوتا ہے۔ اسی لیے آنحضرت (ﷺ) نے اللہ سے یہ دعا کی ہے کہ ''بار خدایا کسی فاجر کو یہ قوت نہ دے کہ وہ میرے ساتھ کوئی نیکی کرے کہ جس کی بناء پر میرا دل اس کی طرف مائل ہو جائے''۔ یہ اس لیے فرمایا کہ تیرا دل لازماً اس شخص کی طرف مائل ہوتا ہے جو تیرے ساتھ نیکی کرے''۔ فرمان باری تعالیٰ ہے: ''لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ'' (قرآن: ۱۱/۱۱۳) (ظالموں کے ساتھ چسپاں نہ ہوں اور مائل نہ ہوں کہ تمھیں ان کے ساتھ آگ کا سامنا کرنا پڑے)۔

خلفاء میں سے ایک نے دس ہزار درم مالک دینار کی خدمت میں بھیجے تو انھوں نے سب درویشوں میں تقسیم کر دیئے اور ایک درم بھی نہ روکا۔ محمد واسع دیکھ رہے تھے کہنے لگے کہ ''سچ بتاؤ کہ تمھارے دل میں اس سبب سے اس سے دوستی کا میلان بڑھا؟'' کہا ہاں' تو وہ بولے مجھے اسی کا خوف تھا آخر اس مال کی نحوست نے تم پر اپنا اثر دکھا کے چھوڑا''۔ بصرہ کے بزرگوں میں سے ایک سلطان کا مال لے کر تقسیم کر دیتے تھے تو لوگوں نے ان سے کہا کہ ''تم نہیں ڈرتے کہ اس سے تمھارے دل میں ان سے دوستی کی تحریک ہوگی؟'' تو کہا کہ: ''اگر کوئی

میرا ہاتھ پکڑ کر جنت میں لے جائے اور پھر معصیت کا مرتکب ہو تو اس کو بھی میں دشمن جانوں؟ اور اس کو اللہ کی خاطر دشمن رکھوں جس نے اس کو میرے لیے مسخر کر دیا یہاں تک کہ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر جنت میں لے گیا؟'' جب کسی میں ایسی قدرت ہو تو کوئی باک نہیں اگر وہ ظالموں سے مال کو مستحقوں میں تقسیم کر دے۔

•••

اصل پنجم: خلق کے ساتھ حق صحبت کی ادائیگی اور خویش و اقارب، ہمسایہ اور غلام کے حقوق کی نگہ داشت کے بارے میں نیز دوستوں، درویشوں اور برادران دین کے حقوق کی حفاظت کے بیان میں

اے عزیز جان لے کہ دنیا اللہ تعالیٰ کے راستے کی منازل میں سے ایک منزل ہے اور دنیا کی اس منزل میں سب لوگ مسافر ہیں؛ اور مسافروں کا قافلہ چونکہ ان کا مقصد سفر ایک ہی ہے تو وہ بمنزلہ ایک کے ہیں تو چاہیے کہ ان کے درمیان الفت، اتحاد، معاونت ہو اور وہ ایک دوسرے کے حقوق کی پاس داری کریں اور خلق کے ساتھ صحبت کے حقوق کی شرح تین ابواب ذیل میں کریں گے:

باب اوّل: اللہ کے لیے دوستی اور برادری کے لیے

باب دوم: دوستوں کے حقوق کے بارے میں

باب سوم: مسلمانوں کے حقوق اور رشتہ داروں اور اقارب اور غلام وغیرہ کے بارے میں

باب اوّل: اس دوستی اور برادری کے بارے میں جو حق تعالیٰ کے لیے ہو

لازم ہے کہ تمھیں معلوم ہو کہ خدائے تعالیٰ کے لیے دوستی اور برادری اختیار کرنا فاضل ترین عبادتوں میں سے ہے یہ دین کے بلند درجات میں سے ہے۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ جس کے لیے خیر کے خواہاں ہوں اسے ایک شایستہ دوست مہیا کر دیتے ہیں تاکہ اگر خدا کو فراموش کرے تو دوست اسے یاد دلا دے اور اگر اللہ کو یاد کرے تو دوست اس کا مددگار ہوگا''۔ نیز فرمایا کہ: ''کبھی دو مومن اکٹھے نہیں ہوتے کہ ایک دوسرے سے فایدہ دین نہ ہو''۔

نیز فرمایا کہ جو کوئی کسی کو راہ حق میں اپنا بھائی قرار دیتا ہے تو بہشت میں اسے ایسا رفیع الشان درجہ عطا کرتے ہیں جس کو کوئی دوسرا عمل نہیں پہنچ سکتا۔ ابوادریس نے معاذ سے کہا: ''میں تمھیں اللہ تعالیٰ کے لیے

دوست رکھتا ہوں'' تو معاذ نے کہا کہ تمھیں خوش خبری ہو کہ میں نے آنحضرت (ﷺ) سے سنا ہے کہ روزِ قیامت عرش کے گرداگرد کرسیاں رکھی جائیں گی تو ایک گروہ جن کے چہرے چودھویں کے چاند کی مانند روشن ہوں گے اور جب تمام خلق ہراس میں ہوگی اور وہ ایمن ہوں گے اور سب خوف میں ہوں گے لیکن وہ پرسکون ہوں گے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء (دوست) ہوں گے کہ انھیں خوف ہوگا نہ غم''۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ''یا رسول اللہ یہ گروہ کن لوگوں کا ہوگا؟'' تو فرمایا: ''اَلْمُتَحَابُّوْنَ فِی اللّٰہ'' یعنی یہ وہ گروہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں''۔

آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا: ''کہ ''مومن دوستوں میں سے جو دوسرے کو اپنی ذات سے زیادہ عزیز رکھتا ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ زیادہ مرتبے کا مالک ہے''۔ اور فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے ساتھ دوستی کے مستحق وہ ہیں جو ایک دوسرے کی زیارت میرے لیے کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے مال میں میرے لیے مساحت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد میرے لیے کرتے ہیں۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ حق تعالیٰ روزِ قیامت کہیں گے کہ ''کہاں ہیں وہ لوگ جو میرے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے تاکہ آج جب پناہ حق کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لوں''۔ آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ جب روز قیامت کسی کو سایہ نہ ملے تو سات قسم کے لوگ حق تعالیٰ کے سائے میں ہوں گے: ''ایک امام عادل، دوسرے وہ جوان جو جوانی ہی میں عبادت حق تعالیٰ میں نمایاں ہوا اور وہ مرد کہ جو مسجد سے نکلے لیکن اس کا دل مسجد میں اٹکا رہے اور وہ دو شخص جو ایک دوسرے کے دوست ہوں اور دوستی ہی کے لیے جمع ہوئے ہوں اور دوستی ہی کے لیے جدا ہوئے ہوں، نیز وہ شخص جو خلوت میں اللہ کو یاد کرے اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگیں، نیز وہ شخص بھی سایۂ خداوندی میں ہوگا جسے کسی صاحب جمال وحشمت عورت نے اپنی طرف بلایا ہو تو وہ انکار کرتے ہوئے کہے کہ میں اپنے اللہ سے ڈرتا ہوں، اور وہ شخص بھی جو صدقہ اس طرح پوشیدہ دے کہ اگر دائیں ہاتھ سے دے تو بائیں کو اس کی خبر نہ ہو'' سایۂ عرش خداوندی میں ہوگا۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے بھائی کی زیارت نہیں کرتا اِلّا یہ کہ ایک فرشتہ منادی کرتا ہے اور کہتا ہے ''تجھے بہشتِ حق تعالیٰ فرخ ومبارک ہو''۔

آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا: ''ایک شخص اپنے دوست کی زیارت کو جارہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ راستے میں بھیج دیا جس نے اس سے کہا ''کہاں جارہے ہو؟'' تو اس شخص نے کہا ''فلاں بھائی کی زیارت کو جارہا ہوں۔ تو فرشتے نے کہا ''اس سے کوئی کام آن پڑا ہے؟'' تو اس نے کہا نہیں''۔ فرشتے نے پوچھا کہ

''اس سے کوئی رشتہ داری ہے؟'' اس شخص نے کہا ''نہیں'' تو فرشتے نے کہا ''تو پھر کس لیے جا رہے ہو؟'' تو اس شخص نے کہا میں اللہ تعالیٰ کے لیے اس سے محبت کرتا ہوں''۔ اس پر فرشتے نے کہا ''حق تعالیٰ نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے کہ تمھیں خوش خبری دوں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں دوست رکھتا ہے تمھاری اس دوستی کی بناء پر جو تمھیں اس بھائی سے ہے اور تم پر بہشت واجب کر دی ہے''۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''ایمان کے لیے استوار ترین دستاویز اللہ تعالیٰ سے دوستی یا دشمنی کی ہے''۔

حق تعالیٰ نے بعض انبیاء پر یہ وحی بھیجی کہ ''یہ زہد جو تم نے اختیار کیا ہے اس کے ذریعے اپنی راحت کا سامان کرنے میں تم نے جلدی کی جس سے تم دنیا اور دنیا کے رنج سے بچ گئے اور یہ جو میری بندگی میں مصروف رہے ہو اس سے اپنی رفعت مرتبت حاصل کر لی۔ لیکن دیکھو تم نے کبھی میرے لیے میرے دوستوں سے دوستی کی؟ اور میرے دشمنوں کے ساتھ میرے لیے دشمنی کی؟

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر وحی بھیجی کہ ''اگر تم تمام زمین وآسمان والوں کے برابر عبادت بجالائے اور اس میں میری دوستی یا دشمنی کا عنصر نہ ہو تو اس کا کوئی فایدہ نہیں''۔ حضرت عیسیٰ نے کہا: ''لوگو اپنے آپ کو اللہ کے نزدیک دوست بناؤ۔ اللہ کے دشمنوں اور عاصیوں سے دشمنی کے ذریعے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے قریب لے جاؤ اس کے دشمنوں سے دور رہ کر اور اس کے دشمنوں پر اظہار ناراضگی سے اللہ کی رضا طلب کرو''۔ لوگوں نے حضرت عیسیٰ سے دریافت کیا کہ ہم کس کے پاس بیٹھیں؟ تو حضرت نے فرمایا اس کے پاس جن کو دیکھ کر اللہ یاد آئے۔ اور بات ان کی تمھارے علم میں اضافہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر حضرت داؤد پر وحی کی کہ: اے داؤد کیوں لوگوں سے منہ موڑ کر تنہا بیٹھ گئے ہو؟'' حضرت داؤد نے جواب دیا کہ ''بارِخدایا تیری دوستی نے میرے دل سے خلق کی یاد محو کر دی ہے جس سے میں سب سے نفور ہو گیا''۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''داؤد جاگو اور اپنے بھائیوں کو حاصل کرو۔ اور جو راہ دین میں تمھارا معاون نہ ہو دوری اس سے اختیار کرو کیونکہ وہ تمھارے دل کو سیاہ کرتا ہے اور مجھ سے تمھیں دور کرتا ہے''۔

ہمارے پیغمبر کا فرمان ہے کہ ''حق تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جس کا آدھا دھڑ آگ کا ہے اور آدھا برف کا ہے۔ تو وہ فرشتہ کہتا ہے: ''بارِخدایا جس طرح تو نے آگ اور برف میں الفت پیدا کر دی ہے اسی طرح اپنے شایستہ بندوں کے دلوں میں بھی الفت ڈال دے''۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا: ''وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے لیے باہم دوست ہیں ان کے لیے یاقوت سرخ سے ایک عمارت بنائی جاتی ہے جس پر ستر ہزار محل ہوں گے وہاں سے اہل بہشت کو دیکھیں گے اور ان کے چہرے کا نور اہل بہشت پر پڑے گا۔ جیسے آفتاب کا نور اہل دنیا

پر پڑ رہا ہے۔ اور اہل بہشت کہیں گے آیئے ہم ان کے نظارے کے لیے چلیں تو وہ انھیں سبز سندس کے لباس میں ملبوس دیکھیں گے اور ان لوگوں کی پیشانیوں پہ لکھا ہوگا: "المتاحبون فی اللہ" یہ اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں"۔ ابن سماک وقت مرگ کہتے تھے: "بارِ خدایا تو جانتا ہے کہ جب میں معصیت کا مرتکب ہوتا تھا تو میں تیرے مطیع بندوں کو دوست رکھتا تھا۔ تو اس دوستی کو میری معصیتوں کا کفارہ بنا دے" اور مجاہد کہتا ہے: "اللہ تعالیٰ کے دوست جب بہم خندہ زنی کرتے ہیں تو ان کے گناہ اس طرح ان سے جھڑتے ہیں جس طرح خزاں میں درختوں سے پتے گرتے ہیں"۔

یہ معلوم کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی دوستی سے کیا مراد ہے

یاد رہے کہ وہ دوستی جو کسی سے مکتب میں یا سفر کے دوران' یا مدرسے میں یا محلے میں بہم قریب رہنے سے پیدا ہوتی ہے' اللہ کی دوستی نہیں کہلاتی۔ اور اگر کسی کو تم اس لیے دوست رکھتے ہو کہ حسین ہے یا خوش گو ہے وہ بھی اللہ کی دوستی نہیں کہلاتی اور جسے تم اس لیے دوست رکھو کہ تمھیں اس سے جاہ حاصل ہو یا مالی یا اور کوئی دنیوی غرض ہو وہ دوستی بھی اللہ تعالیٰ کی دوستی نہیں۔ اور متذکرہ صورتیں اس شخص سے ظہور میں آتی ہیں جسے اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں ہوتا نہ آخرت کا یقین ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دوستی ایمان کے بغیر متصور ہی نہیں اور اس کے دو درجے ہیں:

درجہ اوّل: وہ ہے کہ تم کسی کو کسی غرض کی بنا پر دوست رکھتے ہو کہ وہ غرض اس سے وابستہ ہے لیکن غرض وہ دینی ہو اور برائے اللہ ہو۔ جیسے تم استاد کو دوست رکھتے ہو کہ تمھیں علم عطا کرتا ہے۔ تو یہ دوستی دوستیٔ اللہ کی ہو گی۔ اگر تمھارا مقصود علم سے آخرت ہو اور مقصود جاہ و مال نہ ہو لیکن اگر مقصود دنیوی ہو تو یہ دوستی بھی اللہ تعالیٰ کے لیے دوستی نہ ہو گی۔ اور اگر تم کسی شاگرد کو دوست رکھتے ہو تا کہ تم سے علم حاصل کرے اور اسے حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو تعلیم کی بناء پر اور تعلیم کا ثواب تمھیں حاصل ہو تو یہ دوستی حق تعالیٰ کی دوستی سمجھی جائے گی۔ اگر تم جاہ و حشمت کی غرض سے یہ کام انجام دو گے تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے متصور نہ ہو گی۔ اور اگر کوئی کسی کو صدقہ دے اس شرط پر کہ وہ حاجت مندوں تک پہنچا دے گا یا درویشوں کی مہمانی کرے اور وہ اس بناء پر کسی کو دوست رکھتا ہو کہ کھانا اچھا بناتا ہے تو یہ دوستی اللہ کی خاطر دوستی ہو گی بلکہ اگر کوئی کسی کو اس لیے دوست رکھتا ہے وہ اسے روٹی کپڑا دیتا ہو جس سے وہ بہ سکون عبادت میں لگ جاتا ہو تو یہ دوستی بھی اللہ تعالیٰ کی دوستی ہو گی۔ کیونکہ مقصود اس کا فراغتِ عبادت ہے اور علماء و عباد میں سے بہت سوں نے اس غرض سے دولت مندوں کی دوستی رکھی تھی۔ اس طرح دولت مندوں کو بھی علماء و زہاد کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دوستی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے بلکہ اگر کوئی اپنی

بیوی سے اس بناء پر محبت کرتا ہے کہ وہ اسے فساد سے بچاتی ہے اور اولاد کو وجود میں لانے کا سبب ہے تو اس کے لیے نیک دعائیں کرتا ہے تو یہ دوستی حق تعالیٰ کے لیے متصور ہوگی۔ اور جو نفقہ بھی بیوی پر کرے گا صدقہ متصور ہوگا۔ بلکہ اگر کوئی اپنے شاگرد کو دو وجوہ سے عزیز رکھتا ہو ایک یہ کہ وہ استاد کی خدمت کرتا ہے تو دوسرے یہ کہ عبادت کے لیے اسے فارغ دل رکھنے کا موجب ہوتا ہے تو جس قدر یہ عبادت ہے جملہ اللہ تعالیٰ کی دوستی میں شمار ہوگی اور اس پر ثواب ملے گا۔

درجہ دوم: یہ بزرگ تر درجہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی سے اللہ کے لئے دوستی رکھے۔ بغیر کسی غرض کے حصول کے لیے، لیکن اس بناء پر کہ اللہ تعالیٰ کا مطیع وفرماں بردار اور اس کا محبّ ہے اسے دوست رکھے۔ بلکہ اس بناء پر کہ بندہ خدا ہے اور اس کی مخلوق ہے تو یہ دوستی بھی خدائی دوستی ہے۔ اور یہ عظیم تر ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے وجود میں آتی ہے۔ جو بافراط ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ عشق کی حدوں کو چھونے لگتی ہے۔ اور جو کسی پر عاشق ہوجائے فطرتاً محبوب کے کوچے محلے کو بھی عزیز رکھتا ہے۔ محبوب کے گھر کے در و دیوار بھی اسے عزیز ہوتے ہیں بلکہ اس کی گلی کے کتے کو بھی دوسرے کتوں کی نسبت عزیز جانتا ہے۔ ناچار اپنے محبوب کے محبّ کو اور محبوب کے محبوب کو اور اس شخص کو جو بھی محبوب کا فرماں بردار ہو یا نوکر ہو یا اس کا غلام یا اس کا کوئی رشتہ دار تو وہ ان سب کو لازماً محبوب رکھے گا کیونکہ جس چیز نے اس کے محبوب سے نسبت پالی تو دوستی اس میں سرایت کر جاتی ہے اور عشق جس قدر عظیم ہوگا اس کی سرایت دوسروں پر جو تبع معشوق ہیں یا اس کے متعلقین میں سے ہیں بیشتر ہوگی۔

پس جس کی دوستی حق تعالیٰ کے ساتھ عشق کی حدوں کو چھو رہی ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں سے بھی محبت کرے گا۔ خصوصاً اللہ کے دوستوں کے ساتھ۔ اور تمام مخلوقات کو جو معرض وجود میں آئی ہیں وہ تمام اس اللہ تعالیٰ کی صنعت گری اور قدرت کا ثمر ہیں۔ جو اس کا محبوب ہے اور عاشق محبوب کے خدوخال اور حسن سیرت کو عزیز جانتا ہے اور جب بھی آنحضرت (ﷺ) کی خدمت میں نورس پھل پیش کیا جاتا تو آپ (ﷺ) اس کو گرامی رکھتے اور آنکھوں سے لگاتے اور فرماتے کہ اس کا زمانہ حق تعالیٰ سے قریب ہے''۔

اور دوستی اللہ تعالیٰ بھی دو قسم کی ہے بعض دنیا و آخرت کی نعمت کے لئے ہوتی ہے اور بعض دوستی خالصۃً اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے اور اگر خود کوئی اور شے درمیان میں نہ ہو تو یہ کامل تر ہوگی تو ہم اس کی تفصیل 'اصل محبت' کی ذیل میں کتاب کے رکن چہارم میں بیان کریں گے۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کی قوت' قوت ایمانی کے متناسب ہوتی ہے اور ایمان جس قدر قوی

ہو گا محبت اسی قدر غالب ہو گی۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں اور اس کے پسندیدہ بندوں میں سرایت کرے گی اور اگر دوستی سوائے فایدے کے خالی نہ ہوتی، مرنے والوں کی دوستی یعنی جو انبیاءؑ اولیاء اور علماء گذر گئے ان سے دوستی صورت پذیر نہ ہوتی جب کہ ان سب کے ساتھ محبت ہمارے دل میں زندہ ہے۔ پس جو کوئی اہل علم، علویوں، صوفیوں پارساؤں اور ان کے خدمت گاروں اور دوستوں کو محبوب رکھتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے رکھتا ہے لیکن مقدار دوستی کی دوستوں پر مال وجاہ نچھاور کرنے ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک ایسا شخص ہوتا ہے کہ اس کا ایمان اور دوستی اتنی قوی ہوتی ہے کہ جملہ مال یک بارگی راہِ اللہ میں دیتا ہے جیسے کہ ابوبکر صدیق اور کوئی ایسا ہوتا ہے کہ راہِ اللہ میں آدھا مال حضرت عمر کی طرح پیش کر دیتا ہے۔ اور کوئی ایسا ہوتا ہے کہ تھوڑے سے زاید کی استطاعت نہیں رکھتا اور کسی مومن کا دل اس دوستی کی اصل سے خالی نہیں ہوتا، اگرچہ کمزور ہو۔

حق تعالیٰ کے ساتھ دشمنی کی شناخت

یاد رہے کہ جو کوئی اللہ کے فرماں برداروں کو اللہ کے لیے عزیز رکھتا ہے لازماً کافروں، فاسقوں اور ظالموں کو اللہ ہی کے لیے دشمن جانے گا کیونکہ جو کوئی کسی کو دوست رکھتا ہے تو دوست کے دوست کو بھی عزیز رکھتا ہے اور اس کے دشمن کو دشمن سمجھتا ہے اور حق تعالیٰ بھی ایسوں کو دشمن سمجھتا ہے۔ پس اگر کوئی فاسق ہو تو اس سے دوستی مسلمان ہونے کے ناطے ہونی چاہیے اور اس کے فسق کی بناء پر اسے دشمن سمجھے۔ اس طرح دوستی اور دشمنی یک جا ہو جائے گی۔ ایسے ہی جیسے کوئی ایک بیٹے کو انعام میں خلعت دے تو دوسرے فرزند کو سزا دے اور اس پر سختی کرے۔ ایک وجہ سے دوست رکھے اور ایک دوسری وجہ سے دشمن۔ تو یہ محال نہیں۔ کیونکہ اگر کسی کے تین فرزند ہوں کہ ایک تو زیرک اور فرماں بردار ہو۔ ایک احمق اور نافرمان اور ایک احمق لیکن فرماں بردار ہو۔ تو باپ اوّل الذکر کو دوست رکھے گا، ثانی الذکر کو دشمن اور ثالث الذکر کو ایک وجہ سے دوست اور ایک وجہ سے دشمن قرار دے گا اور اثر اس کا معاملت پر پڑتا ہے۔ نتیجۃً ایک کا اکرام کرے گا۔ ایک کی اہانت اور ایک اکرام واہانت کے بین بین۔

مختصر یہ کہ جو کوئی معصیت کی بناء پر اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے اسی طرح وہ تمھارا بھی دشمن متصور ہو گا اور تو اس کی مخالفت کے بقدر اس کو دشمن رکھتا ہے اور موافقت کے بقدر اسے دوست رکھتا ہے۔ اور اثر اس کا تمھارے کلام، میل جول اور لین دین میں ظاہر ہو گا۔ جس سے تم عاصی کے ساتھ گرفتہ رو رہو گے اور درشت سخن اور جس کا فسق زیادہ ہو گا اس سے تم گرفتہ روتر ہو گے اور اگر وہ حد سے گذر جائے تو اس سے بول چال بند کر دو گے

اور اس سے منہ موڑ لو گے اور ظالم کے حق میں تو فاسق کی نسبت اور بھی سخت رویہ اختیار کر لو گے لیکن وہ فقط تجھ پر ظلم کا مرتکب ہو تو اسے برداشت کرنا اور اسے معاف کر دینا زیادہ اچھا ہے۔ اسلاف کا طرزِ عمل ایسی حالت میں مختلف رہا ہے' ایک گروہ نے سختی میں اضافہ کر دیا۔ دین کی خاطر' اور شرعی سیاست کی رُو سے۔ احمد بن حنبل انھیں میں سے تھے۔ وہ حارث محاسبی سے ناراض ہو گئے اس بناء پر کہ حارث نے ایک کتاب معتزلہ کے رد میں کلام میں تصنیف کی تھی فرمایا کہ ''تو اپنی تصنیف کردہ کتاب میں ان کی شبہت کو بیان کرتا ہے اور پھر اس کا جواب دیتا ہے۔ تو احتمال اس کا ہے کہ کوئی اس شبہت کو پڑھے اور وہ شبہ اس کے دل میں جاگزیں ہو جائے''۔ یحیٰ معین نے کہا کہ ''میں اب کسی سے کچھ قبول نہ کروں گا لیکن اگر بادشاہ دے گا تو لے لوں گا''۔ تو احمد بن حنبل اس سے ناراض ہو گئے اور اس سے بول چال بند کر دی تو یحیٰ معین نے معافی چاہتے ہوئے کہا کہ میں نے تو یہ ازراہِ ہنسی مذاق کہہ دیا تھا'' تو احمد بن حنبل نے کہا کھانا کھانا بھی شعارِ دین سے ہے اور دین کے ساتھ مذاق کرنا جائز نہیں''۔

اور ایک وہ جماعت تھی کہ سب کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے تو عمل کی بنیاد گویا نیت اور فکر کے مطابق متنوع پیدا ہوتی ہے۔ جس کی نظر توحید پر ہوتی ہے وہ سب کو قبضہ قہر ربوبیت میں مجبور سمجھتا ہے تو رحمت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ تو یہ بھی بزرگ متصور ہوگا۔ لیکن حماقت پر فخر کرنا احمقوں کا شیوہ ہے۔ کوئی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے باطن میں مداہنت کارفرما ہو اور گمان یہ کرے کہ یہ توحید ہے اور دلیل توحید کی یہ ہے کہ اگر کوئی اسے مارے یا اس کا مال لوٹ لے جائے یا اس کی تذلیل کرے اور اسے برا بھلا کہے تو ناراض نہ ہو بلکہ اسے بہ نظر شفقت دیکھے۔ کیونکہ وہ توحید اور خلق کی ضرورت کو ملحوظ رکھتا ہے۔ جیسے کہ آنحضرت ﷺ کے دانت توڑ دیئے گئے تھے اور منہ سے خون بہہ رہا تھا لیکن آپ (ﷺ) کی زبان پر یہ کلمات تھے: ''اَللّٰھُمَّ اَھْدِ قَومِی فَاِنَّھُم لَایَعلَمُونَ'' (اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے کہ وہ نادان ہیں)۔

اور اگر کوئی اپنے حق کو تو ملحوظ رکھتا ہو لیکن اللہ کے حق کے بارے میں خاموش رہتا ہو تو یہ مداہنت نفاق اور حماقت ہے اور علامت اس کی ہے کہ توحید اس پر غالب نہیں۔ فاسق کا فسق اسے اللہ کا دلی دشمن نہیں بناتا فقط اس کے ایمان دوستی حق کی کمزوری کی دلیل ہے۔ جیسے کوئی تمھارے دوست کو برا کہے اور تم اس پر غضب کا اظہار نہ کرو تو یہ صورت اس کی غماز ہے کہ تمھاری دوستی بے اصل ہے۔

فصل: جان لے کہ مخالفان حق تعالیٰ کے درجے متفاوت ہیں۔ اس لیے ان سے سختی اور خشم بھی متفاوت ہوگا۔

پہلے درجے میں کافر ہیں۔ اگر کافر اہل حرب میں سے ہوں تو دشمنی ان کی فرض ہے اور معاملت ان کے ساتھ یہ ہے کہ انھیں قتل کیا جائے اور غلام بنایا جائے۔

دوسرے درجے میں ذمّی ہیں۔ اُن سے دشمنی کرنا فرض ہے اور معاملت ان کے ساتھ یوں ہے کہ انھیں حقیر رکھے اور ان کا اکرام نہ کرے اور ان کے لیے راہ تنگ رکھی جائے اور انھیں دوست رکھنا نہایت مکروہ ہے اور ہوسکتا ہے کہ حرام کے درجے کو پہنچ جائے کیونکہ فرمان خداوندی ہے: ''لَاتَجِدُ قَوْماً یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِیُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ'' (قرآن: ۵۸/۲۲) (تو ہرگز نہیں پائے گا ایک گروہ جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوں وہ کسی ایسے کے ساتھ دوستی رکھتے ہوں جو اللہ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ دشمنی رکھتا ہو)۔ اور آنحضرت ﷺ کا پیغام ہے ''جو کوئی اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اللہ کے دشمنوں کا دوست نہیں ہوسکتا''۔ اس لیے انھیں ولایت دنیا اور حاکم بنانا اور ان پر اعتماد کرنا اور مسلمانوں پر مسلط کرنا اسلام کے استخفاف کی دلیل ہے۔ نیز گناہانِ کبیرہ میں سے ہے۔

تیسرے درجے میں بدعتی ہے جو لوگوں کو بدعت کی طرف بلاتا ہو۔ تو ایسوں سے دشمنی لازماً برملا ہونی چاہیے تا کہ خلق کو اس سے نفرت ہو جائے اور اولیٰ تر ہے کہ نہ صرف اسے سلام دعا نہ دیں نہ لیں بلکہ اس سے بول چال بھی بند رکھیں کیونکہ جب وہ بدعت کی دعوت دے گا تو شر اس کا متعدی ہوگا۔ لیکن بدعتی اگر عاصی ہو تو اس سے نمٹنا آسان ہے۔

چوتھے درجے میں عاصی ہے۔ جو خلق کے لیے باعث آزار ہے۔ جیسے ظلم، جھوٹی گواہی، اور شرع میں اپنی مرضی کا حکم لگانا اور شعر میں ہجو گوئی اور غیبت کرنا اور لوگوں میں فساد انگیزی کرنا وغیرہ ہیں۔ ایسوں سے علیحدگی اختیار کرنا اور ان کے ساتھ سختی روا رکھنا نہایت اچھی بات ہے اور ان سے دوستی رکھنا نہایت مکروہ ہے۔ بلکہ بظاہر تحریم کو پہنچتی ہے۔ اگرچہ ضبطِ تحریر میں نہ آئے۔

درجہ پنجم میں وہ شخص ہے شراب خوار ہو اور فسق میں مبتلا ہو لیکن کسی دوسرے کے لیے باعث آزار نہ ہو تو اس کی اصلاح کا کام آسان ہے۔ اس کے ساتھ شفقت اور نصیحت کرنا اولیٰ تر ہے۔ خواہ قبول کرے خواہ نہ کرے۔ اس سے اعراض تو کرنا چاہیے لیکن اس کے سلام کا جواب دینا چاہیے اور اس پر لعنت بھی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ پیغمبر ﷺ کے زمانے میں ایک شخص نے کئی بار شراب پی اور اس پر حد جاری ہوئی تو صحابہ میں سے ایک نے اس پر لعنت کی اور کہا: ''تیرا یہ فساد کب تک جاری رہے گا؟'' تو آنحضرت ﷺ نے اسے روکا اور کہا کہ: ''اس کے لیے خود شیطان دشمنی کو کافی ہے۔ تو بھی اس کے لیے شیطان کا معاون نہ بن''۔

باب دوم: حقوقِ صحبت اور اس کی شرایط میں

معلوم رہے کہ ہر شخص دوستی کے قابل نہیں ہوتا بلکہ چاہیے کہ تو صحبت اس کے ساتھ رکھے جس میں یہ تین خصائل ہوں:

خصلتِ اوّل عقل ہے کیونکہ احمق کی صحبت سے کچھ فایدہ حاصل نہیں ہوتا اور انجام علیحدگی پر ہوتا ہے۔ کیونکہ احمق جب یہ چاہتا ہے کہ تمھارے ساتھ نیکی کرے تو ہوسکتا ہے کہ حماقت کی وجہ سے وہ کرے کہ جس میں تمھارا ضرر ہو اور اسے معلوم ہی نہ ہو۔ اور داناؤں نے کہا ہے کہ ''احمق سے دور رہنا قربت ہے اور احمق کا چہرہ دیکھنا خطا ہے'' اور احمق وہ ہوتا ہے کہ حقیقت کار نہیں جانتا اور اگر تو اسے بتائے تو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔

خصلت دوم اچھی عادت ہے۔ کیونکہ بدخوئی کی وجہ سے صحت مند متصور نہیں ہوتا اور جب اس کی بدخوئی حرکت میں آئے گی تو وہ تیرا حق نظر انداز کردے گا اور اس سے خائف بھی نہ ہوگا۔

خصلت سوم یہ کہ نیکوکار ہو۔ کیونکہ جو کوئی معصیت پر مصر ہو وہ خدا ترس نہیں ہوتا اور جو اللہ سے نہ ڈرے اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ فرمان خداوندی ہے کہ: ''وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ'' (قرآن: ۲۸/۱۸) (اس کی اطاعت نہ کر جسے ہم نے اپنے ذکر سے غافل کردیا ہے وہ اپنی خواہشوں کے پیچھے لگا ہوا ہے)۔ اور اگر بدعتی ہو تو اس سے دور رہنا چاہیے۔ کیونکہ بدعت اس کی آگے سرایت کرتی ہے۔ یا اس کی نحوست تجھ تک پہنچ جائے اور یہ بدعت جو اب ظہور میں آئی ہے اس سے بڑی بدعت اور کیا ہوسکتی ہے کہ کہا جارہا ہے کہ ''خلق اللہ کے ساتھ دوری نہیں چاہیے اور کسی کو فسق و فجور اور معصیت سے روکنا نہیں چاہیے کیونکہ ہمیں خلق اللہ سے خصومت کا حق نہیں اور ان سے تصرف کا حق نہیں''۔ اور یہ بات اباحت کا تخم ہے اور یہ زندقہ کی اصل ہے۔ تو یہ بدعت کبائر میں سے ہے اور ایسے لوگوں سے میل جول نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ یہ بات طبایع کے موافق ہے اور شیطان اس کی مدد سے دلنشین کرتا ہے اور جلد ہی صریح اباحت کی طرف انسان کو لے جاتا ہے۔

حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ: پانچ قسم کے آدمیوں سے دور رہنا چاہیے۔ ایک دروغ زن کہ ہمیشہ اس کے ساتھ فریب میں رہے گا۔ دوسرے احمق کہ جب تیرا فایدہ چاہے گا تو تجھے نقصان پہنچادے گا

اور اسے خبر بھی نہ ہوگی۔ اور بخیل کہ عین وقت پر دوستی چھوڑ دے گا اور بزدل بوقت ضرورت تجھے بے زیاں چھوڑ دے گا اور فاسق جو ایک لقمے میں تجھے بیچ دے گا بلکہ ایک لقمے سے کم تر میں بھی فروخت کر دے گا''۔ لوگوں نے پوچھا کہ لقمے سے کمتر کیا ہے تو آپ نے فرمایا'' لقمے کی طمع''۔ حضرت جنید فرماتے ہیں کہ ''میں خوش اخلاق فاسقوں کو بدخوقاریوں کی نسبت زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ یاد رہے کہ یہ جملہ خصائل خوب کسی ایک ہی شخص میں کمتر وقوع میں آتی ہیں۔ اس لیے چاہیے کہ تو اپنی غرض معلوم کرے اگر مقصود اُنس ہے تو خوش اخلاق کو طلب کر' اور اگر مقصود دنیوی ہو تو کسی صاحب سخاوت و کرم کی تلاش کر۔ اور اگر مقصود دین ہے تو کسی عالم و پرہیز گار کو ڈھونڈ اور شرایط ہر ایک کے لیے متفاوت ہیں۔

یاد رہے کہ مخلوق تین قسم کی ہے۔ بعض غذا کی مانند ہیں کہ جس کے بغیر چارہ نہیں اور بعض دوا دارو کی طرح ہیں کہ بعض احوال میں ان کی ضرورت پڑتی ہے اور بعض بیماری کی طرح ہیں جس کی کبھی حاجت نہیں ہوتی لیکن لوگ اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو ایسوں سے مدارا کرنا چاہیے تاکہ ان سے نجات ہو۔ مختصر یہ کہ ہم نشینی اس کے ساتھ اختیار کرنی چاہیے کہ اسے تم سے دینی فایدہ حاصل ہو یا تمھیں اس سے دینی فایدہ حاصل ہو۔

ہم نشینی اور دوستی کے حقوق معلوم کرنا

معلوم رہے کہ جب کسی سے برادری اور ہم نشینی کا عہد و پیمان ہو گیا۔ وہ عقد نکاح کا سا ہے کہ جس کے حقوق ہیں۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''دو بھائیوں کی مثال دو ہاتھوں کی سی ہے جو ایک دوسرے کو دھو کر پاک کرتے ہیں اور یہ حقوق دس قسم کے ہیں:

حق اوّل: مال ہے کہ جس کا عظیم ترین درجہ یہ ہے کہ دوسرے کے حق کو اوّلیت دے اور ایثار کرے جیسے کہ انصاریوں کی شان میں آیا ہے کہ ''وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَّاصَةٌ'' (قرآن: ۹/۵۹) (مہمان کو خود پر ترجیح دیتے ہیں ہر چند کہ خود بھوکے ہوں)۔ اور درجہ دوم یہ ہے کہ ہم نشین کو اپنے برابر قرار دے اور مال و منال کو اپنے اور اس دوست کے درمیان مشترک سمجھے اور پست ترین درجہ یہ ہے کہ دوست کو اپنا غلام یا خادم سمجھے اور جو کچھ اپنے مصرف کے بعد بچے اس سے اس کی ضرورت پوری کرے لیکن اس کے بے مانگے۔ اور اگر اس کے مانگنے اور کہنے پر دے تو یہ درجہ دوستی سے خارج ہے۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نشین کا خیال اور تیمار اس کے دل سے اٹھ گیا ہے۔ تو ایسی صحبت معمولی ہے جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

عتبہ الغلام رضی اللہ عنہ کا ایک دوست تھا جس نے اس سے کہا کہ ''مجھے چار ہزار درہم کی ضرورت ہے''۔ عتبہ

نے کہا ''آؤ اور مجھ سے دو ہزار درم لے لو''۔ اس نے اعراض کیا اور کہا: ''تمھیں شرم نہیں آتی کہ دعویٰ تو یہ کرتے ہو کہ اللہ کے لیے دوستی کرتے ہو اور دنیا کو اللہ کے لیے ایثار کرنے پر آمادہ نہیں''۔

ایک خلیفہ کے پاس لوگوں نے صوفیاء کے ایک گروہ کے بارے میں بدگوئی کی جس پر تلوار لائی گئی تا کہ سب کو تہ تیغ کر دیں۔ ان صوفیا میں ابوالحسن نوری بھی تھے۔ وہ آگے بڑھے کہ پہلے انھیں قتل کیا جائے۔ اس پر خلیفہ نے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں یا ہے''؟ تو ابوالحسن نے فرمایا کہ یہ میرے دینی بھائی ہیں اس لیے میں نے چاہا کہ اپنی جان ایک ساعت پہلے ایثار کروں''۔ اس پر خلیفہ نے کہا کہ جو لوگ اس مرتبے کو ہوں انھیں قتل کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ سب سے ہاتھ کھینچ لیا۔

فتح موصلی ایک دوست کے گھر میں حاضر ہوئے اور اس دوست کی لونڈی سے کہا کہ اس کا مخزن لاؤ۔ لایا گیا تو اس سے جتنا چاہیے تھا لے کر چلے گئے۔ تو وہ دوست جب گھر کو لوٹے اور قصہ سنا تو اتنے خوش ہوئے کہ اس خوشی میں کنیز کو آزاد کر دیا۔ ایک شخص ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور بولا کہ ''میں تمھارے ساتھ برادری کا خواہاں ہوں''۔ تو انھوں نے فرمایا ''جانتے ہو کہ حق برادری کیا ہے؟'' اس نے کہا ''نہیں'' تو آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تو مال وزر میں مجھ سے اولیٰ تر نہ ہوگا'' تو اس شخص نے کہا کہ ''میں اس درجے کو نہیں پہنچا'' تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''تو پھر جاؤ یہ کام آپ کے بس کا نہیں''۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ میں سے ایک نے گوسفند کی ایک بھنی ہوئی سری کسی کے ہاں یہ کہہ کر بھجوائی کہ ''یہ میرے فلاں دینی بھائی کے لیے اولیٰ تر اور لازم تر ہے'' اور اس شخص نے کسی اور بھائی کو بھجوا دی اور اسی طرح یہ سری دست بدست گردش کے بعد عاقبت کار اسی پہلے شخص کے پاس پہنچ گئی جس نے بھجوائی تھی۔

مسروق اور خیثمہ کے درمیان برادری تھی اور دونوں مقروض تھے۔ تو ایک نے دوسرے کا قرض ادا کر دیا تو دوسرے نے اس کا قرض ادا کر دیا' جب کہ دونوں ایک دوسرے کے ایثار سے بے خبر تھے۔

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کسی دینی برادر کو بیس درم دینے کو سو درم مفلسوں کو دینے کی نسبت ترجیح دیتا ہوں''۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک جنگل کی طرف نکلے تو آپ نے دو مسواکیں تیار کیں۔ ان میں سے ایک سیدھی تھی تو دوسری کج تھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہ میں سے ایک شخص جو اس وقت ان کے ہمراہ تھے تو سیدھی مسواک ان کو دی اور ٹیڑھی اپنے لیے رکھ لی۔ تو اس صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ سیدھی آپ کے لیے مناسب تر ہے''۔ تو اس پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: کہ نہیں۔ کیونکہ جو شخص کسی دوسرے کے ساتھ ایک گھڑی بھر صحبت میں رہا ہو تو روزِ قیامت اس سے سوال ہوگا کہ تم نے اس ہم صحبت کا حق ادا کیا یا ضائع کر دیا؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا

اشارہ اس طرف تھا کہ حق صحبت ایثار ہے۔ آپ (ﷺ) نے فرمایا ''کوئی دو شخص ہم نشین نہیں ہوتے جن میں سے دوست ترین وہ نہ ہو جو رفیق ترین ہے''۔

حق دوم: یہ ہے کہ دوست کی ہر حال میں مدد کرنا قبل اس کے وہ مانگے یا خود کہے اور مہمات میں اس کے دوش بدوش کشادہ پیشانی کے ساتھ کھڑے ہونا۔ اور ہمارے اسلاف اسی قسم کے تھے وہ اپنے دوست کے گھر کے دروازے پر جاتے تو پوچھتے تھے کہ کوئی کام ہو تو بتایئے۔ روٹی' ایندھن' نمک' گھی وغیرہ میں سے کیا درکار ہے؟ اور ان کا کام اپنا کام سمجھ کر انجام دیتے تھے اور جب کام کا کہا جاتا تو اس کہنے کو احسان مانتے تھے۔

حسن بصری فرماتے ہیں کہ ہمارے بھائی ہمیں اپنے زن و فرزند سے زیادہ عزیز تر ہیں کہ وہ ہمیں دین کی یاد دلاتے ہیں۔ اور علماء کا فرمان ہے کہ ''تین دن کی غیبت کے بعد اپنے دوستوں کی طلب میں نکلو۔ اگر بیمار ہوں تو عیادت کرو اور اگر کسی کام میں مشغول ہوں تو ان کی معاونت کرو۔ اور اگر بھول گئے ہوں تو انھیں یاد دلاؤ۔

جعفر بن محمد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''میں جلدی کرتا ہوں کہ دشمن کی حاجت روا کروں تا کہ مجھ سے بے نیاز ہو جائے' میں دوست کے حق میں کیا کروں؟ اور اسلاف میں ایک شخص ایسا بھی ہوا ہے جس نے اپنے بھائی کی وفات کے بعد چالیس برس اس کے اہل و عیال کی ضروریات پوری کیں۔ حفظہ حق صحبت کی خاطر۔

حق سوم: زبان پر ہے کہ اپنے بھائیوں کے بارے میں اچھی بات کہے اور ان کے معائب سے آلودہ نہ ہو۔ اگر کوئی ان کے غیاب میں ان کے بارے میں کچھ کہے تو اس کا جواب دے اور گمان یہ کرے کہ وہ ایک دیوار کے پیچھے موجود ہے اور سن رہا ہے۔ اور جس طرح وہ اپنے غیاب میں اپنے بھائیوں سے خوبی کی توقع رکھتا ہے تو اسے بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اور مداہنت نہ کرے جب بھائی بات کرے غور سے سنے اس کے ساتھ بحث و مباحثہ میں نہ پڑے۔ اپنے دوست بھائی کے راز کی حفاظت کرے۔ اگر چہ اب اس سے قطع تعلق کر چکا ہو۔ کیونکہ یہ بدسرشتی ہے۔ اور دوست کے اہل و عیال کے بارے میں اور خود اس کے اسباب کے بارے میں زبان کو روکے رکھے۔ اگر کوئی اس کی برائی میں کچھ کہے تو دوست سے اس کا ذکر نہ کرے کیونکہ ذکر کرنے سے اسے رنج پہنچانے کا مستوجب ہوگا اور اگر کوئی اس کے بارے میں کلمۂ تحسین کہے تو اسے پنہاں نہ رکھے بلکہ اسے بتائے کہ فلاں تمھارے بارے میں حسن ظن رکھتا ہے۔ کیونکہ اگر مخفی رکھے گا تو یہ حسد کے مترادف ہے۔ اور اگر دوست خود اس کے حق میں تقصیر بھی کرے تو گلہ نہ کرے بلکہ اسے معذور سمجھے۔ اور اپنی اس تقصیر کو یاد کرے جو انسان اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کی ذیل میں کر جاتا ہے تا کہ اس پر متحیر نہ ہو کہ کوئی اس کے حق میں تقصیر کرے۔ کیونکہ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اگر وہ چاہے کہ کوئی ایسا فرد مل سکے جس میں کوئی کمی نہ ہو تو یہ محال ہے تو اس طرح

خلق کی صحبت سے محروم رہے گا۔

حدیث میں ہے کہ ''مومن ہمیشہ دوسروں کے لیے عفوودرگذر سے کام لیتا ہے اور منافق عیب ہی کا ذکر کرتا ہے''۔ انسان کو چاہیے کہ ایک نیکی پر دس معائب کو مخفی رکھے کہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ ''برے یار کی پناہ اللہ سے مانگو جو جب برائی دیکھتا ہے تو اس کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے اور جب تمھاری نیکی دیکھتا ہے تو اسے چھپاتا ہے''۔ اس لیے دوست کی جس تقصیر کو اس کی معذوری سمجھا جاسکتا ہو تو اسے بہترین انداز میں برداشت کرے اور بدگمانی نہ کرے کیونکہ بدگمانی حرام ہے۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے: ''حق تعالیٰ نے مومن پر چار چیزیں حرام کردی ہیں: ''مال' جان' نیکی (ناموس) اور بدگمانی''۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ''میں اس شخص کے بارے میں کیا کہوں جو اپنے سوتے ہوئے بھائی کی شرم گاہ سے کپڑا ہٹاتا ہے تاکہ وہ ننگا ہوجائے؟'' لوگوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول کون اس کو روا رکھے گا کہ یہ کرے؟'' تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''تم' کہ اپنے بھائی کی کسی برائی کی خبر پاتے ہو تو اسے آشکار کرتے ہو اور بیان کرتے ہو تاکہ دوسرے جانیں''۔

کہتے ہیں کہ جب تو کسی کو دوست بنانا چاہے تو پہلے اسے کسی طریقے سے غصے میں لا۔ اور کسی شخص کو مخفیانہ اس شخص کے پاس بھیج تاکہ تیراذکر وہاں کرے تو اگر وہ مطلوبہ شخص تیرا کوئی راز اس کے سامنے آشکار کرے تو وہ دوستی کے لائق نہیں۔ اور داناؤں نے کہا ہے کہ ''ہم نشین اس کو بنا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ تیرے بارے میں جانتا ہے اسی قدر وہ بھی جانتا ہو اور جس طرح اللہ تعالیٰ پردہ داری کرتا ہے وہ بھی پردہ داری کرے''۔ ایک شخص نے اپنے ایک دوست سے راز کی بات کہی اور پھر کہا یاد ہوگیا؟ تو اس نے کہا ''نہیں میں نے فراموش کردیا''۔ داناؤں نے کہا ہے کہ جو کوئی ان موقعوں پر پھر جائے دوستی کے قابل نہیں ہوتا: رضا کے وقت' حشم کے وقت' طمع کے وقت اور ہواوہوس کے وقت' کیونکہ ایسے مواقع پر تو یہ چاہیے کہ تیرے حق کو نظرانداز نہ کرے۔

عباس نے اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کہا: ''عمر رضی اللہ عنہ تجھے اپنا قریبی شمار کرتا ہے اور بزرگوں پر تجھے برتری دیتا ہے۔ اس لیے پانچ چیزوں کو کبھی نہ بھولنا۔ اس کے کسی راز سے پردہ نہ اٹھانا' اس کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرنا' اس کے ساتھ کبھی جھوٹ نہ بولنا' اور وہ جو کچھ حکم دے اس کے خلاف نہ کرنا اور کبھی ایسا نہ ہو کہ تجھ سے خیانت یا خلاف دیکھے''۔ یاد رہے کہ کوئی چیز مناظرہ اور مخالفت سے بڑھ کر دوستی کی دشمن نہیں۔ اور دوست کی بات کو رد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے احمق اور جاہل سمجھا گیا ہے اور خود کو عاقل اور فاضل اور اس پر تکبر

کرنے کے مترادف ہے اور اسے چشمِ حقارت سے دیکھنے کے برابر۔ اور یہ اسلوب دوستی کی بجائے دشمنی کے زیادہ قریب ہے۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں ''اپنے بھائی کے فرمان کے برعکس نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا تمسخر بھی زیبا نہیں اور وعدے کی خلاف ورزی بھی نہیں ہونی چاہیے''۔

بزرگوں نے کہا ہے کہ: ''جب تو اپنے برادر دوست سے کہے کہ اٹھو' تو وہ کہے کہ ''کہاں جانا ہوگا'' تو وہ ہم نشینی کے لائق نہیں۔ بلکہ ایسے میں اُٹھ جانا چاہیے اور نہیں پوچھنا چاہیے کہ ''کیوں کہاں؟' ابو سلیم دارائیؒ فرماتے ہیں کہ ''میرا ایک دوست تھا میں جو مانگتا دے دیتا تھا' ایک مرتبہ میں نے کہا ''ایک چیز کی حاجت ہے'' تو بولا ''کس قدر چاہیے؟'' اس کی دوستی کی حلاوت میرے دل سے جاتی رہی۔ مختصر یہ کہ محبت کی استواری ہر حال میں موافقت کی بناء پر ہے۔

حق چہارم: یہ ہے کہ زبان سے شفقت و دوستی کا اظہار کرے۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ: ''اِذَا اَحَبَّ اَحَدُکُم اَخَاہُ فَلیُخبِرہ ''یعنی جس کو دوست رکھتے ہو اسے اس امر سے باخبر کرو''۔ اور یہ اس لیے کہا گیا کہ اس کے دل میں بھی اُس سے محبت پیدا ہو۔ اس طرح دوسری جانب سے دوستی میں فزونی آتی ہے۔ پس چاہیے کہ ہمہ احوال میں اپنے دوست سے زبان سے بھی پوچھے اور غم وشادی میں اس امر کا اظہار کرے کہ وہ اس کا شریک ہے اور وہ اس کے غم وشادی کو اپنی غم وشادی سمجھتا ہے۔ اور جب اس کو بلائے تو بہترین نام سے پکارے اور اگر اس کا کوئی خطاب ہو جسے وہ زیادہ عزیز رکھتا ہو اس سے بلائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تیری اپنے بھائی سے دوستی تین چیزوں سے پاکیزگی پاتی ہے: ''ایک یہ کہ اسے اس کے پسندیدہ ترین نام سے پکارے اور ابتدا سلام سے کرے' تیسرے یہ کہ نشست کے لیے اولیت اسے دے''۔ یہ خوش اسلوبی اُنھی میں سے ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کی تعریف کرے اور جو جگہ اُس کو پسند ہو وہاں خود نہ بیٹھے۔ اسی طرح اس کے بیوی بچوں اور اس کے متعلقین کی تعریف کرے۔ کیونکہ یہ دوستی پر بہت اچھا اثر ڈالتی ہے۔ اور جو نیکی بھی کرے تو اس کا شکر ادا کرے۔ علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''جو کوئی اپنے بھائی کی نیک نیتی پر شکر ادا نہیں کرتا وہ نیک عمل پر بھی شکر نہیں کرتا''۔ اور چاہیے کہ دوست کی عدم موجودگی میں اس کی نصرت کرے اور اس پر متعنت کی بات کو رد کرے اور اسے اپنے جیسا جانے۔ اور یہ اپنے دوست پر عظیم ظلم ہوگا اگر اس کے سامنے اس کے دوست کو برائی کے ساتھ یاد کیا جا رہا ہو اور وہ خاموش رہے تو یہ ایسا ہی ہے کہ اس کے سامنے اس کے دوستوں کو مارا پیٹا جا رہا ہو اور وہ خاموشی سے دیکھتا رہے اور اس کی مدد نہ کرے۔ اور زبان کا زخم سب سے کاری زخم ہوتا ہے۔

ایک صاحب کہتے ہیں کہ "میں نے کبھی غیر موجود دوست کے بارے میں بات نہیں کی جب تک میں نے فرض نہیں کرلیا کہ وہ موجود ہے اور سن رہا ہے۔ نتیجۃً میں نے اس طرح بات کی گویا وہ سن رہا ہے"۔

ابو دردا رضی اللہ عنہ نے دو بیلوں کو دیکھا جو ایک جگہ بندھے ہوئے تھے۔ اور بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن جب ایک اٹھتا تو دوسرا بھی اُٹھ کھڑا ہوتا۔ تو حضرت پر گریہ طاری ہوگیا' فرمانے لگے "اللہ کے لیے دوست داروں کو چاہیے کہ وہ بھی ایسے ہی ہوں کہ اٹھنے بیٹھنے میں اور چلنے میں ان بیلوں کی طرح باہم موافقت کریں"۔

حق پنجم: "یہ ہے کہ علم دین میں دوست کی رہنمائی کی بقدر حاجت کرے کیونکہ بھائی کو دوزخ کی آگ سے بچانا رنج دنیا سے بچانے کی نسبت اولیٰ تر ہے۔ اگر دوست نے علم دین سیکھ تو لیا لیکن اس پر عمل نہیں کرتا تو چاہیے کہ اس کی خیر خواہی میں پند دے اور اسے اللہ تعالیٰ سے ڈرائے۔ لیکن نصیحت خلوت میں کرے تاکہ شفقت قرار پائے۔ کیونکہ دوسروں کی موجودگی میں نصیحت فضیحت کا حکم رکھتی ہے اور جو کچھ اس باب میں دوست سے کہے نرمی سے کہے نہ کہ درشتی وقساوت کے ساتھ کہ آنحضرت (ﷺ) کا قول ہے کہ "مومن مومن کا آئینہ ہے" یعنی اپنا عیب وثواب اس میں دیکھے اور آگاہی حاصل کرے اور جب تیرے بھائی نے تنہائی میں تیرے عیب سے تجھے آگاہ کیا ہے تو تجھے اس کا ممنون ہونا چاہیے اور خفا نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ کوئی تمھیں بتائے کہ تمھارے لباس میں سانپ ہے یا بچھو ہے اس سے بچو' تو تم اس پر اس سے ناراض نہیں ہوتے بلکہ احسان مند ہوتے ہو۔ اور تمھاری بری صفات بمنزلہ سانپ اور بچھو ہی کی طرح ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان سے لگے زخم قبر میں نمایاں ہوتے ہیں۔ برائیوں کے یہ زخم روح پر لگے ہوتے ہیں جو اس دنیا میں سانپ بچھو کے ڈسنے سے لگنے والے زخموں سے شدید تر ہوتے ہیں جو جسم پر لگتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ "اللہ تعالیٰ اس شخص کو اپنے سایہ رحمت میں لے جو میرے عیب کا تحفہ مجھے پیش کرے"۔ جب حضرت سلمان پارسی رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے تو فرمایا کہ "سلمان سچ سچ بتانا کہ تم نے میرے احوال میں جو شے مذموم تھی یا سنی وہ کیا ہے؟ تو سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "مجھے اس کے بیان سے معاف رکھو"۔ تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "ناگزیر"۔ اور جب آپ رضی اللہ عنہ نے اصرار کیا تو حضرت سلمان نے کہا کہ "میں نے سنا ہے کہ آپ کے خوان پر دو قسم کے سالن بیک وقت ہوتے ہیں۔ اور تمھارے پاس لباس کے دو جوڑے ہیں کہ ایک رات کے وقت پہنتے ہو تو دوسرا دن کے وقت" تو حضرت عمر نے فرمایا "یہ دونوں ہی صحیح نہیں۔ کہیے ان کے علاوہ بھی آپ نے کچھ سنا؟" تو حضرت سلمان نے فرمایا "نہیں"۔

حذیفۃ المرعشی نے یوسف اسنباط کو خط لکھا کہ "میں نے سنا ہے تم نے بازار سے کچھ خریدتے وقت اپنا

دین دوحبہ[۱] دودمڑی میں بیچ دیا ہے کہ اس شخص نے کہا کہ ایک ''دانگ'' اور تم نے کہا تین تسو[۲] میں دے اور اس شخص نے دے دیا کیونکہ تمھیں پہچانتا تھا اور اس نے یہ نرمی تمھارے دین اور صلاح کے باعث کی۔ غفلت کا نقاب چہرے سے ہٹا لے اور خواب سے بیدار ہوجا اور جان لے کہ جس نے علم قرآن حاصل کیا پھر دنیا کی طرف راغب ہوگیا تو میں اس کے بارے میں ایمن نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی آیات کا مذاق اڑانے والوں میں سے شمار ہوگا۔'' پس رغبت دین کی علامت یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں میں ناصح کا احسان مند ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جھوٹ بولنے والوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ: ''وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ'' (قرآن: ۷/۹۷) (اے دروغ زنو! تم اپنے خیر خواہوں کو عزیز نہیں رکھتے) اور جو نصیحت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا بناء اس کی یہ ہے کہ رعونت اور تکبر اس کے دین پر غالب ہوگئے ہوتے ہیں اور یہ سب وہاں ہوتا ہے جہاں انسان اپنے عیب سے بے علم ہوتا ہے اور جب اس امر سے آگاہ ہو تو دوست کو نصیحت کنایۃً کرنی چاہیے آشکارا نہیں کرنی چاہیے۔ اگر اس عیب کے باعث تمھارے حق میں کچھ تقصیر ہوئی ہو تو اس سے صرفِ نظر کرنا چاہیے اور نادانستہ سمجھنا چاہیے بشرطیکہ دوستی میں دل ملول نہ ہو۔ اور دل کے پھر جانے کا خوف ہو تو خلوت میں عتاب کرنا قطعیت کی نسبت اولیٰ تر ہے اور قطعیت (قطع تعلق) زبان درازی اور وقیعت سے بہتر ہے۔

دوستی سے تمھارا مقصد ذاتی تہذیب اخلاق ہوتا کہ اپنے بھائیوں کی درشتی کو تحمل کر سکے اور اُن سے حسنِ سلوک کی امید میں یہ رشتہ استوار نہیں کرنا چاہیے۔ ابوبکر کتانیؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص میرے ساتھ ہم صحبت تھا اور اس کی موجودگی میرے دل پر گراں گذری۔ میں نے اسے کچھ عطا کیا تاکہ یہ گرانی میرے دل سے دور ہو جائے۔ لیکن یہ گرانی دور نہ ہوئی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور میں اسے اپنے گھر میں لے گیا اور میں نے اسے کہا کہ تم اپنا پاؤں میرے چہرے پر رکھو'' تو اس نے کہا ''ایسا ہرگز نہ ہوگا''۔ میں نے کہا ''یوں کرنا ناگزیر ہے''۔ تو جب اس نے ایسا ہی کیا تو میرے دل سے گرانی دور ہوگئی۔

بوعلی رباطی کہتے ہیں ''میں ابوعبداللہ رازی کے ہمراہ صحرا میں تھا تو اس نے کہا ''اس سفر میں میں تمھارا امیر ہوں گا یا تم؟'' میں نے کہا: ''تم'' تو وہ بولا جو کچھ میں کہوں گا تمھیں اس کی اطاعت کرنا ہوگی'' میں نے کہا: ''سمعنًا و طاعۃً'' تو اس نے کہا: ''وہ توبرہ لاؤ'' میں وہ توبرہ اُس کے پاس لے آیا تو اس میں ہم نے دونوں کا

---

۱ حبہ دمڑی کہ لیجیے۔
۲ تسو یعنی ایک چوتھائی دانگ جو دو حبہ کا ہم وزن ہوتا ہے۔

زادِراہ کپڑا وغیرہ تھا اسے نکال کر رکھ دیا اور توبرے کو پشت پر رکھ کر چل دیا۔ ہر چند میں نے اصرار کیا کہ مجھے دے دو کہ تھک جاؤ گے'' تو اس نے کہا ''کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ امیر میں ہوں۔ لہٰذا تو میرا فرماں بردار ہوگا''۔ اگلی رات بارش آ گئی تو دن نکلنے تک کھڑا رہا اور کمبل مجھ پر ڈالے رکھا تاکہ مجھ پر بارش کا پانی نہ گرے۔ اور جب میں کچھ کہتا تو حکم ملتا کہ ''امیر میں ہوں تم اطاعت کرو''۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے آپ سے کہا کاش کہ میں اسے امیر قرار نہ دیتا''۔

حق ششم: دوست کی لغزش یا تقصیر سے عفو و درگذر کرنا۔ داناؤں نے کہا ہے کہ اگر تیرا بھائی تیرے لیے کوئی تقصیر کرے تو ستر گنا اس سے عذر خواہی کر اگر تیرا نفس اس پر آمادہ نہ ہو تو اپنے آپ سے کہہ: ''یہ تو ہی بداخلاق اور بدگہر ہے کہ تیرے بھائی نے تجھ سے ستر بار عذر خواہی کی ہے اور تم نے قبول نہ کی!'' اور تقصیر ایسی ہو جیسے اس نے اللہ کی نافرمانی کی ہو تو اسے شفقت کے ساتھ نصیحت کرتا کہ عصیان سے ہاتھ روک لے اور اگر ہاتھ نہ روکے اسی پر مصر رہے تو اسے نادیدہ سمجھ۔ اور اگر اصرار کو دواماً جاری رکھے تو بھی نصیحت کر۔ اگر موثر نہ ہو تو صحابہ میں اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔ ابوذر کا مذہب یہ ہے کہ اس سے قطع تعلق کر لینا چاہیے کہ اس کو میں اللہ تعالیٰ کے لیے دوست رکھتا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے دشمن جانتا ہوں۔ اور ابوداؤد اور صحابہ کی جماعت کا کہنا ہے کہ ''قطع تعلق نہیں کرنا چاہیے کہ امید یہ ہوتی ہے کہ وہ پھر آئے' لیکن ایسے شخص کے ساتھ ہم نشینی کا آغاز ہی نہیں کرنا چاہیے اور اگر دوستی کا پیمان ہو چکا تو بعجلت قطع نہیں کر دینا چاہیے''۔ ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک گناہ پر کہ جس سے تیرا بھائی عاصی ہوا ہے اس سے دوری اختیار نہ کر کیونکہ ہوسکتا ہے کہ آج کرتا ہے لیکن کل اس کا ارتکاب نہ کرے۔'' اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عالم کی لغزش پر محترز رہو لیکن اس سے تعلق منقطع نہ کرو بلکہ امید رکھو کہ وہ جلدی نیکی کی طرف لوٹ آئے گا''۔

بزرگانِ دین میں سے دو بھائی تھے۔ ایک اپنے نفس کی غلامی میں مخلوق کے لیے باعث آزار ہو گیا۔ تو اس نے دوسرے سے کہا کہ میرا دل بیماری کا شکار ہو گیا ہے اس لیے چاہو تو برادری کے اس رشتے کو منقطع کر دو''۔ تو اس نے کہا: ''اللہ کی پناہ کہ میں ایک گناہ پر اپنے بھائی سے تعلق ختم کر دوں''۔ اور اس نے عہد کیا کہ جب تک اللہ تعالیٰ اس کو خرابی سے عافیت نہ دے گا میں اپنے شکم میں کھانا پانی نہ پہنچاؤں گا۔ چالیس دنوں تک یہی کیا اور اس کے لیے بارگاہ خداوندی میں دعائیں کرتا رہا جب احوال پوچھا تو اس بھائی نے کہا کہ ''وہی عالم ہے''۔ تو وہ اسی طرح صبر کرتا اور بھوک کا عذاب سہتا رہا۔ اور جسم اس کا پگھلتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کا وہ بیمار بھائی آیا اور کہنے لگا ''اللہ تعالیٰ نے مہربانی کی ہے اور مجھے اس کے عشق سے سرد کر دیا ہے''۔ جب یہ سنا تو اس

نے کھانا کھایا اور پانی پیا۔ ایک شخص کو لوگوں نے کہا کہ ''تیرا بھائی دین سے پھر گیا ہے اور گناہ میں پڑ گیا ہے تو اسے قطع تعلق کیوں نہیں کر لیتا؟'' وہ بولا ''آج اسے اپنے بھائی کی ضرورت لاحق ہوگئی ہے۔ میں ایسے میں اس سے دوری کیونکر اختیار کروں بلکہ مجھے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہیے تاکہ بہ الطاف اسے دوزخ سے بچانے کا سامان کروں''۔

بنی اسرائیل میں کے دو دوست ایک پہاڑ پر عبادت کیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک شہر سے کچھ خریدنے کے لیے آیا۔ اس کی نظر ایک بازاری عورت پر پڑی اس پر فریفتہ ہو گیا اور عبادت حق سے محروم ہو گیا۔ اور اسی کی صحبت اختیار کر لی۔ جب چند روز اس طرح گذر گئے تو دوسرا کوہ نشین اس کی تلاش میں نکلا تو حال اس کا معلوم ہوا۔ اس کے پاس پہنچا تو اس نے شرمندگی کے مارے کہا کہ ''میں تو تمھیں جانتا ہی نہیں'' تو اس نے کہا کہ بھائی فکرمند نہ ہو کیونکہ مجھے تم سے اس وقت جو محبت اور شفقت ہے وہ پہلے کبھی نہیں تھی۔ یہ کہہ کر وہ اس سے لپٹ گیا اور اس کے چہرے پر بوسہ بار بار دیا۔ تو جب اس نے اس قدر شفقت اس کی طرف سے دیکھی تو معلوم ہوا کہ اس دوست کی نگاہوں سے گرا نہیں تو اٹھا اور توبہ کی اور اپنے دوست کے ہمراہ چل نکلا۔

پس بوذر کا طریقِ سلامتی کے نزدک تر ہے۔ لیکن یہ طریقہ لطیف تر اور فقیہہ تر ہے کیونکہ یہ لطف ہی ہے جس نے اسے توبہ کی راہ دکھائی۔ اور درماندگی کے وقت کہ جب برادران کی ضرورت ہوتی ہے تو اس وقت حاجت مند کو کیسے بے سہارا چھوڑا جا سکتا ہے؟ وجہ اس فقہ کی یہ ہے کہ جب پیمان دوستی بندھ گیا تو یہ مثل قرابت کے ہے۔ اور معصیت کے باعث قطع رحم نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے فرمان خداوندی ہے: ''فَاِنْ عَصَوْکَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ'' (قرآن: ۲۶/۲۱۶) یعنی ''اگر تیرا خاندان اور تیرے خویش عاصی ہو جائیں تو تو کہہ کہ ''میں تمھارے عمل سے بیزار ہوں'' اور یہ نہیں کہا کہ ''میں تم سے بیزار ہوں''۔

ابودرداؓ سے لوگوں نے کہا ''تیرے بھائی نے معصیت کی ہے تم اسے دشمن کیوں نہیں ٹھہراتے؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''میں اس کی معصیت کا دشمن ہوں۔ لیکن وہ میرا بھائی ہے لہٰذا اس کا دشمن تو نہیں ہو سکتا''۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ ایسے شخص سے برادری کا رشتہ ہی استوار نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ برادری نہ کرنا خیانت نہیں ہے۔ لیکن دوستی منقطع کرنا خیانت ہے۔ اور ثابت شدہ حق کو فروگزار کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر تیرے حق میں تقصیر کرے تو معاف کر دینا اولیٰ تر ہے۔ جب وہ معذرت کرے اگرچہ تجھے معلوم ہو کہ جھوٹ کہہ رہا ہے لیکن عذر اس کا قبول کر لینا چاہیے۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ: ''مومن جلد خشم گین ہوتا ہے اور جلد ہی راضی بھی ہو جاتا ہے''۔ ابوسلیمان دارانی نے اپنے مرید سے

کہا: ''جب تو اپنے دوست سے جفا دیکھے تو اس پر عتاب نہ کر کیونکہ عتاب کرنے میں خطرہ یہ ہے کہ تو اس سے ایسی بات سنے جو جفا سے بدتر ہو۔ تو اس نے کہا کہ جب میں نے اسے آزمایا تو ایسے ہی دیکھا''۔

حق ہفتم: ہے کہ اپنے دوست کو دعاؤں میں یاد رکھے۔ زندگی میں بھی اور اس کی وفات کے بعد بھی۔ اسی طرح اس کے اہل وعیال کے لیے دعا گو رہے جس طرح اپنے لیے دعا کرتا ہے کیونکہ درحقیقت یہ دعا تو نے اپنے لیے ہی کی ہوتی۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''جو اپنے بھائی کے لیے اس کی غیر حاضری میں دعا کرتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے ''تجھے بھی'' ایک دوسری روایت میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ میں ابتداء تجھ سے کرتا ہوں''۔ نیز فرمایا ''غیاب میں دوستوں کے لیے کی گئی دعا رد نہیں ہوتی''۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے ستر دوست ہیں جن کا نام میں سجدے میں لیتا ہوں اور ایک ایک کے لیے دعا کرتا ہوں۔

داناؤں نے کہا ہے کہ برادر وہ ہے جو تمھاری موت کے بعد جب سب تیری میراث کی تقسیم وغیرہ میں مشغول ہوں گے تو وہ تیرے لیے دعا میں مشغول ہو اور اس فکر میں اس کا دل مشغول ہو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے''۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ ''مردے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ڈوب رہا ہو اور بچنے کے لیے ہر جانب ہاتھ مار رہا ہو اور مردہ بھی اسی طرح اپنے اہل وعیال، دوستوں کی دعاؤں کا منتظر ہوتا ہے۔ اور زندوں کی دعائیں نور کے پہاڑوں کی مانند مرنے والوں کی قبروں میں پہنچتی ہیں''۔ حدیث میں ہے کہ ''دعائیں مردوں کے پاس نوری طبقوں میں رکھ کر پیش کی جاتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ یہ فلاں کی طرف سے تحفہ ہے۔ اور مردے ان تحفوں کو پا کر اسی طرح خوش ہوتے ہیں جیسے زندہ انسان تحفے پا کر خوش ہوتے ہیں۔

حق ہشتم: دوستوں کے ساتھ وفا ملحوظ رکھنا ہے اور وفاداری کے ایک معنی یہ ہیں کہ دوست کے مرنے کے بعد اس کے بیوی بچوں اور دوستوں سے غافل نہ رہے۔ ایک بڑھیا آنحضرت (ﷺ) کے پاس آئی تو آپ ﷺ نے اس کا اکرام کیا تو دیکھنے والے حیران ہوئے تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ وہ خدیجہؓ کے زمانے میں ہمارے پاس آیا کرتی تھی۔ اور عہد کی تکریم جزو ایمان ہے۔ دوسرے معنی وفا کے یہ ہیں کہ جو کوئی اس کے دوست کے ساتھ تعلق رکھتا ہے مثلاً اولاد، شاگرد یا غلام، ان سب پر دست شفقت رکھے اور اس کے دل پر زیادہ اثر ہونا چاہیے بہ نسبت اُس شفقت کے جو وہ اپنے دوست کے ساتھ کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ جاہ وحشمت یا کسی بلند مرتبے کو پہنچے تو دوست احباب کے ساتھ وہی تواضع کہ جو اس سے قبل کرتا تھا، روا رکھے اور دوستوں پر تکبر نہ کرے۔ نیز وفا یہ بھی ہے کہ دوستی کو بہ دوام جاری رکھے۔ اور کسی بناء پر دوستی قطع نہ کرے۔ کیونکہ شیطان کے لیے اس سے اہم تر کام اور کوئی نہیں کہ دوستوں کے درمیان دوری پیدا کرے۔ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: ''اِنَّ

الشَّیطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَھُمْ'' (قرآن: ۵۳/۱۷) (شیطان دشمنی اور تباہی کے در پے ہے)۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ: ''مِنْ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ'' (قرآن: ۱۰۰/۱۲) (پس وہ تباہی اور دشمنی جو شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان پیدا کی)۔ نیز وفا یہ بھی ہے کہ دوست کے باب میں کسی شخص کی غیبت پر کان نہ دھرے اور چغل خور کو دروغ زن سمجھے۔ اور وفا یہ بھی ہے کہ دوست کے دشمن کے ساتھ دوستی نہ کرے بلکہ دوست کے دشمن کو اپنا دشمن سمجھے۔ اور جو کوئی کسی کا دوست ہو تو چاہیے کہ اس کے دشمن کے ساتھ دشمنی کرے۔ اگر دوست کے دشمن کے ساتھ دوستی کرے گا تو ایسی دوستی ضعیف متصور ہوگی۔

حق نہم: یہ ہے کہ تکلف درمیان سے اٹھا دے اور دوست کے ساتھ ایسا ہی ہو جیسے تنہا ہو۔ ایک دوسرے سے اگر تکلف روا رکھیں گے تو ایسی دوستی ناقص سمجھی جائے گی۔ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''دوستوں میں بدترین وہ ہے جس کے لیے تمھیں عذر خواہی یا اس کے ساتھ تکلف برتنے کی حاجت ہو''۔ جنیدؒ کہتے ہیں کہ: ''میں نے بہت سے بھائیوں کو دیکھا ہے کسی ایسے دو بھائیوں کو نہیں دیکھا کہ جن کے درمیان تکلف ہو کہ دونوں میں سے ایک حشمت کے سبب دوسرے کی وحشت کا باعث ہو۔ مگر یہ کہ ان میں سے ایک ناقص ہو''۔ کہا جاتا ہے کہ ''اہلِ دنیا کے ساتھ زندگی بہ ادب گزار اور اہلِ آخرت کے ساتھ بہ علم اور اہلِ معرفت کے ساتھ جس طرح تیرا دل چاہے''۔

صوفیاء میں سے ایک گروہ باہم اس شرط پر دوست تھے کہ اگر ایک صائم الدہر ہو یا بے روزہ ہو یا تمام رات سوتا رہے یا نماز میں گزارے تو دوسرا اس پر معترض نہ ہوگا۔

حق تعالیٰ کے ساتھ دوستی کے معنی یگانگت ہیں اور ظاہر ہے یگانگت میں تکلف نہیں ہوتا۔

حق دہم یہ ہے کہ خود کو جملہ دوستوں سے کمتر سمجھے اور ان سے کسی شے کی امید نہ رکھے۔ نہ کسی قسم کی مراعات کا امیدوار ہو اور تمام حقوق پورے کرے۔ ایک شخص جنیدؒ کے سامنے کہہ رہا تھا کہ اس زمانے میں برادر کمیاب ہو گئے ہیں بلکہ نایاب اور یہ جملہ اس نے چند بار دہرایا تو اس پر جنیدؒ نے کہا کہ اگر تو چاہتا ہے کہ تیری خدمت میں تیرے رنج کو برداشت کرے واقعی وہ نایاب ہے۔ اور اگر کسی ایسے کو چاہے جس کے رنج کا بار تو اٹھائے تو میرے نزدیک ایسے بہت دوست موجود ہیں''۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ جو کوئی دوستوں پر خود کو فوقیت دیتا ہے تو وہ گناہ گار ہوتا ہے اور دوسرے بھی اس کے حق میں گنہگار ہوں گے۔ اگر خود کو اپنے دوستوں کا ساجانے گا تو وہ بھی رنجور ہوں گے اور یہ خود بھی رنجور ہوگا۔ اگر دوستوں کی نسبت خود کو ادنیٰ سمجھے گا تو بہ راحت وسلامت رہے گا خود بھی اور اس کے دوست

بھی''۔ابومعاویۃ الاسود نے کہا کہ: ''میرے تمام دوست مجھ سے بہتر ہیں کیونکہ وہ مجھے خود اپنے آپ سے اولیت دیتے ہیں اور برتر جانتے ہیں''۔

———•••———

باب سوم

مسلمانوں، ہمسایوں عزیز و اقارب اور غلاموں کے حقوق کے بارے میں

اے عزیز جان لے کہ ہر کسی کا حق بقدر اس کی نزدیکی کے ہوتا ہے۔ اور نزدیکی کے درجے ہیں اور حقوق اسی کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور قوی ترین رابطہ اللہ تعالیٰ کے لیے برادری ہے۔ اور حقوق ان کے بیان ہو چکے ہیں۔ اور ان کے بھی جن سے دوستی ہو۔ لیکن قرابت اسلام کے حقوق بھی ہیں:

حقوق مسلماناں

حق اوّل: یہ ہے کہ انسان جو اپنے لیے پسند نہیں کرتا کسی بھی مسلمان کے لیے پسند نہ کرے۔ کیونکہ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ: ''تمام مسلمانوں کی مثال ایک جسم کی طرح ہے۔ جب کسی ایک عضو کو ضرر پہنچے تو باقی تمام اعضا بھی آگاہ ہوتے ہیں اور رنج میں مبتلا ہو جاتے ہیں''۔ نیز فرمایا کہ ''جو کوئی چاہتا ہے کہ دوزخ سے نجات پائے تو چاہیے کہ جب مرے تو کلمۂ شہادت پر مرے۔ اور خود جسے نہیں چاہتا کہ اس سے کیا جائے وہ کسی دوسرے مسلمان کے ساتھ بھی نہ کرے''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ''اے اللہ تیرے بندوں میں عادل تر کون ہے؟'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جو انصاف کرے''۔

حق دوم: یہ ہے کہ کوئی مسلمان اس کی زبان یا ہاتھ سے رنجیدہ نہ ہو۔ آنحضرت (ﷺ) فرمایا کہ: ''جانتے ہو کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟'' تو صحابہ نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں''۔ تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''وہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان آسودہ ہوں'' تو صحابہ نے استفسار فرمایا کہ ''پھر مومن کون ہوگا؟'' تو آپ (ﷺ) نے جواب دیا کہ ''وہ جس کے ہاتھ سے مسلمان اپنی جان و مال کے بارے میں مامون ہوں''۔ پھر پوچھا گیا کہ ''مہاجر کسے کہا جائے گا؟'' آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''وہ جس نے اپنے آپ کو برے اعمال سے منقطع کر لیا ہو''۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''کسی کے لیے بھی یہ حلال نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو ایسی نگاہ سے دیکھے کہ اس کے لیے باعث رنج ہو اور حلال نہیں کہ کوئی ایسی چیز کرے کہ کوئی مسلمان اس سے ڈرے یا خوف میں مبتلا ہو جائے''۔

مجاہد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دوزخیوں کو ایسی خارش اور گرمی میں مبتلا کرے گا جس سے وہ اپنے جسموں کو اس قدر خراشیں گے کہ ان کی ہڈیاں ننگی ہو جائیں گی۔ پس ندا آئے گی کہ ''یہ رنج کیسا ہے؟'' تو دوزخی جواب میں کہیں گے ''نہایت شدید ہے''۔ جواب میں کہا جائے گا کہ ''یہ اس بلیے ہے کہ ''تم مسلمانوں کو دنیا میں دکھ دیتے تھے''۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ میں نے ایک شخص کو بہشت میں دیکھا کہ جیسے چاہتا گھوم رہا تھا اس بناء پر کہ اس نے اپنی حیات میں ایک درخت کو راہ سے ہٹا دیا تھا تاکہ کسی کو تکلیف نہ پہنچے''۔

حق سوم: یہ ہے کہ کوئی شخص بھی تکبر نہ کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ متکبروں کو دشمن رکھتا ہے۔ اور آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''اللہ نے مجھے وحی کی کہ انکساری اختیار کر تاکہ کوئی کسی دوسرے کے مقابل فخر نہ کرے''۔ یہی وجہ تھی کہ آپ (ﷺ) کسی بیوہ عورت یا مسکین کے ساتھ ان کی ضرورت پوری کرنے کے لیے چلے جاتے تھے۔ اور مسلمان کو زیبا نہیں کہ کسی کو بچشم حقارت دیکھے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ولی ہو اور وہ اسے نہ جانتا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو پوشیدہ رکھا ہوا ہے تاکہ کوئی ان تک راہ نہ پاسکے۔

حق چہارم: یہ کہ کسی چغل خور کی بات کسی مسلمان کے بارے میں نہ سنے۔ کیونکہ بات عدل کی سننی چاہیے اور نمّام فاسق ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''کوئی چغل خور بہشت میں داخل نہ ہوگا''۔ یاد رکھئے کہ جو کوئی کسی کے بارے میں تمھارے سامنے برائی بیان کرتا ہے وہ تمھارے بارے میں بھی برائی کے ساتھ دوسروں سے ذکر کرے گا۔ اس سے دور رہنا چاہیے اور نمّام کو جھوٹا سمجھنا چاہیے۔

حق پنجم: یہ ہے کہ کسی آشنا سے تین دن سے زیادہ بول چال بند نہ کرے۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ ''کسی مسلمان بھائی سے تین دن سے زاید بول چال بند رکھنا حلال نہیں''۔ اور ان میں بہترین وہ ہے جو سلام میں ابتداء کرے۔

عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''حق تعالیٰ نے حضرت یوسف سے فرمایا: ''ہم نے تیرا درجہ اور نام اس لیے بزرگ قرار دیا کہ تو نے اپنے بھائیوں کا گناہ بخش دیا''۔ حدیث میں ہے کہ ''تو نے اپنے بھائی کی جس برائی کو بھی معاف کر دیا تو اس سے تیری بزرگی میں اضافے کے سوا اور کچھ ہوتا؟''

حق ششم: یہ کہ ہر کسی کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو نیکی کرے اور اچھے برے کا فرق نہ کرے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ ''ہر ایک کے ساتھ نیکی کر جہاں تک ممکن ہو کیونکہ اگر وہ نیکی کرنے کا اہل نہیں تو تو نیکی کرنے کا اہل ہے''۔ اور حدیث میں ہے کہ ایمان کے بعد اصلِ عمل یہ ہے کہ مخلوق کے ساتھ دوستی کی جائے اور پارسا ہو یا ناپارسا سب کے ساتھ بلاامتیاز نیکی کی جائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اگر کوئی شخص

آنحضرت (ﷺ) کا ہاتھ پکڑتا کہ ان سے کوئی بات کرے تو آپ (ﷺ) اس شخص سے اپنا ہاتھ چھڑاتے نہ تھے۔ جب تک وہ شخص خود ہی آپ ﷺ کا ہاتھ نہ چھوڑ دیتا اور دوسرا جو بات کرتا اس کی طرف متوجہ رہتے اور جب تک اپنی بات وہ تمام نہ کرتا صبر فرماتے تھے"۔

حق ہفتم: یہ ہے کہ بوڑھوں کا احترام کرے اور بچوں پر رحمت کہ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ: "جو بوڑھے کا احترام اور بچوں پر رحمت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔ اور فرمایا کہ "سفید بالوں کی تجلیل اللہ تعالیٰ کی تجلیل ہے"۔ نیز آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ جو جوان بوڑھوں کی تکریم کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بڑھاپے کے وقت جوانوں کو اس کی تکریم پر مامور فرمائیں گے تا کہ اس کے احترام کو ملحوظ رکھیں"۔ اور یہ لمبی عمر کی بشارت ہے کیونکہ جو بزرگوں کی توقیر کی توفیق پاتا ہے تو یہ دلیل اس امر کی ہے کہ وہ بڑھاپے کو پہنچے گا تا کہ اس کا بدلہ پائے۔

آپ (ﷺ) جب سفر سے لوٹتے تو لوگ لڑکوں کو آپ ﷺ کے استقبال کے لیے بھیجتے تو آپ ان کو سواری پر اپنے آگے اور پیچھے بٹھا لیتے تھے۔ تو بچے یہ کہہ کر ایک دوسرے پر فخر کرتے کہ آپ (ﷺ) نے آگے بٹھایا ہے اور تمھیں پیچھے" اور جب نوزاد کو آپ کے پاس نام رکھنے اور دعا کے لیے لایا جاتا تو آپ بچے کو آغوش میں لے لیتے تو کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ بچہ پیشاب کر دیتا تو لواحقین چلانے لگتے اور چاہتے کہ بچے کو آپ ﷺ سے لے لیں تو آپ (ﷺ) اس پر فرماتے کہ "رہنے دو تا کہ پیشاب کرے اسے اس سے نہ روکو" اور پھر اس شخص کے رخصت ہونے تک وہیں بیٹھے رہتے تا کہ رنجیدہ نہ ہو جب وہ چلا جاتا تو دھوتے اور اگر بچہ کم سن ہوتا تو اپنے کپڑوں پر پانی کا چھینٹا مار لیتے اور دھوتے نہیں تھے۔

حق ہشتم یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کے ساتھ خوش روئی اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے۔ اور سب کے ساتھ خنداں وفرحاں رہے۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ "اللہ تعالیٰ کشادہ رُو اور آسان گیر کو دوست رکھتا ہے"۔ نیز فرمایا کہ نیکوکاری جو مغفرت خداوندی کا موجب ہے بہت آسان ہے وہ ہے خندہ پیشانی اور خوش زبانی"۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "ایک بے کس عورت رسول ﷺ کے راستے میں آئی اور کہنے لگی کہ مجھے آپ سے کچھ کام ہے" تو آپ (ﷺ) نے فرمایا اس سے کہ اس گلی میں جہاں جی چاہے بیٹھ جاؤ میں بھی وہیں بیٹھ جاؤں گا"۔ پھر آپ (ﷺ) اس عورت کے ساتھ گلی میں بیٹھ گئے یہاں تک کہ اس عورت نے جو کچھ بھی کہنا تھا کہا"۔

حق نہم: یہ ہے کہ کسی مسلمان بھائی سے وعدہ خلافی نہ کرے۔ حدیث میں ہے کہ "جس میں یہ تین

چیزیں ہوں وہ منافق ہے اگرچہ نمازی ہو اور روزہ دار بھی' کہ بات کرے تو جھوٹ بولے۔ وعدہ کرے تو ایفا نہ کرے' اور امانت میں خیانت کرے''۔

حق دہم: یہ ہے کہ انسان ہر کسی کا احترام اس کے مرتبے کے مطابق کرے۔ جو عزیز تر ہو اسے عزیز تر لوگوں میں رکھے۔ ممکن ہے کہ وہ اچھے لباس میں ہو گھوڑے کا مالک ہو اور تجمل کا سامان رکھتا ہو تو اس سے اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ گرامی تر ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سفر میں تھیں۔ دستر خوان بچھایا گیا تو وہاں سے ایک درویش گذرا تو آپ نے فرمایا ''ایک روٹی اسے دیں''۔ اور جب ایک سوار گذرا تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اسے بلایئے'' لوگوں نے کہا کہ آپ نے درویش کو چھوڑ دیا اور دولت مند کو بلایا'' تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہر کسی کو ایک درجہ عطا کیا ہے تو ہمیں بھی اس درجے کا حق ملحوظ رکھنا چاہیے۔ درویش ایک روٹی پا کر خوش ہو جاتا ہے۔ لیکن دولت مند کے ساتھ اگر یہی کیا جائے تو یہ برا ہے۔ اس طرح کا اقدام کرنا چاہیے کہ وہ بھی خوش ہو جائے''۔

حدیث میں ہے کہ ''جب کسی قوم کا سردار آپ کے پاس آئے تو آپ اسے عزیز رکھیں''۔ ایک شخص تھا جس کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی ردا عطا کر دی تا کہ اس پر بیٹھ جائے اور ایک بڑھیا جب آپ کے پاس آئی تو اسے اپنی ردا پر بٹھایا اور کہا ''مرحبا اے ماں حکم دیجئے اور فرمایئے کہ آپ کی خدمت میں کیا پیش کیا جائے پھر آپ نے وہ حصہ جو مال غنیمت سے ملا تھا اسے عطا کیا جسے اس نے حضرت عثمان کے ہاتھ ہزار درم میں فروخت کر دیا۔

حق یازدہم: یہ ہے کہ جہاں دو مسلمانوں میں کشیدگی دیکھے تو نہایت درجہ کوشش کرے کہ ان میں صلح و آشتی ہو جائے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فرمان ہے کہ آپ لوگوں کو بتاؤں کہ نماز' روزے اور صدقے سے برتر عبادت کون سی ہے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا ضرور بتایئے تو اس پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ''مسلمانوں کے درمیان صلح قائم کرنا''۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''ایک دن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بیٹھے ہوئے تھے کہ ہنسے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ کس وجہ سے مسکرائے ہیں؟'' تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ ''میری امت کے دو فرد روزِ قیامت بارگاہ خداوندی میں انصاف طلبی میں دو زانو ہوں گے۔ ایک کہے گا کہ ''اس نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ اس سے میرا انصاف لے'' تو حق تعالیٰ فرمائے گا کہ ''تو اس کا حق دے'' تو وہ کہے گا کہ ''بارِ خدایا میری تمام نیکیاں تو میرے دشمن لے گئے اب میرے پاس کچھ باقی نہیں رہا'' تو اللہ تعالیٰ فریادی سے کہے گا ''اب کیا کیا جائے کہ اب اس کے پاس کچھ بچا ہی نہیں''۔ تو وہ کہے گا کہ ''میرے گناہ اس

کے حوالے کر دیں''۔ پس اس کے گناہ اس پر منتقل کر دیے جائیں گے۔ لیکن مظلمت اب بھی باقی رہے گی''۔
اس پر آنحضرت (ﷺ) پر گریہ طاری ہو گیا اور فرمایا کہ ''یہ ہے وہ عظیم دن کہ جب ہر کوئی اس بات کا حاجت مند ہو گا کہ اس کا بوجھ اس کے سر سے اتر جائے''۔ اس پر اللہ تعالیٰ فریادی سے کہیں گے ''نگاہ اٹھاؤ اور دیکھو'' تو وہ دیکھتا ہے اور کہتا ہے: ''میں شہر دیکھ رہا ہوں چاندی کے محل دیکھ رہا ہوں سونے کے' جو جواہر اور مروارید سے مرصع ہیں''۔ فریادی کہے گا کہ ''یہ کس پیغمبر کے ہو سکتے ہیں یا کس صدیق کے لیے ہیں یا کس شہید کا نصیبہ ہیں؟'' تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ ''اس کے ہیں جو ان کی قیمت ادا کرے'' تو فریادی کہے گا کہ کون ان کی قیمت دے سکتا ہے؟'' تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تُو''۔ تو فریادی کہے گا کہ کیا؟'' تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ''عفو سے کہ اپنے بھائی کو معاف کرنے سے'' تو فریادی کہے گا کہ ''بارِ خدایا میں نے معاف کیا''۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ''اٹھ اور اپنے بھائی کا ہاتھ تھام اور دونوں بہشت میں داخل ہو جاؤ''۔ پھر آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور مخلوق کے درمیان صلح کا سامان کرو کیونکہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ بھی مسلمانوں کے درمیان صلح کراتا ہے۔

حق دوازدہم: یہ ہے کہ انسان مسلمانوں کے عیب و ننگ کو چھپائے رکھے۔ حدیث میں ہے کہ ''جو کوئی اس دنیا میں مسلمانوں کی پردہ داری کرے گا اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گا''۔
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''میں جس چور یا شراب خور کو پکڑتا ہوں تو میری آرزو یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس جرم فاحش کی پردہ پوشی کرے''۔

آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے ''اے وہ لوگو کہ ایمان لائے ہو بہ زباں! اور ایمان ابھی تمھارے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوا۔ لوگوں کی غیبت نہ کیا کرو۔ کیونکہ جو کوئی کسی مسلمان کی پردہ دری کرتا ہے تاکہ اس کا ڈھنڈورا پیٹے تو حق تعالیٰ اس کے عیب سے پردہ اٹھا دیتا ہے کہ اس کی فضیحت ہو۔ اگرچہ وہ اندرون خانہ اس کا ارتکاب کرتا ہو۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''مجھے یاد ہے کہ لوگوں نے اوّل اوّل جس شخص کو چوری کے جرم میں پکڑا تھا اور آنحضرت (ﷺ) کے پاس لائے تھے تاکہ اس کا ہاتھ کاٹا جائے تو آنحضرت (ﷺ) کا رنگ اڑ گیا تو لوگوں نے کہا: یارسول اللہ کیا آپ ﷺ کو اس کام سے کراہیت آئی؟'' تو آپ (ﷺ) فرمایا: ''کیوں نہ آئے اور میں کیوں اپنے بھائیوں کی دشمنی میں شیطان کا مددگار بنوں؟ اگر تم چاہتے ہو کہ حق تعالیٰ عفو و درگذر سے کام لے اور تمھارے گناہ معاف کرے اور پردہ پوشی کرے تو تمھیں بھی چاہیے کہ تم بھی اپنے مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کرو۔ کیونکہ اگر تم حاکم کے پاس پہنچو گے تو حد کا اجراء ناگزیر ہو جائے گا''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطاب رات کو لوگوں کے احوال سے آگہی کے لیے گردش کرتے تھے کہ انھوں نے ایک گھر سے سرود کی آواز سنی تو آپ اس گھر کی چھت پر سے اس میں داخل ہوئے جب نیچے اترے تو دیکھا کہ ایک مرد ایک عورت کے پاس بیٹھا ہے اور شراب بھی وہاں ہے۔ تو بولے ''اے دشمن خدا! تمھارا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے اس گناہ کی پردہ پوشی کرے گا؟'' تو وہ شخص بولا: ''اے امیر المؤمنین جلدی نہ کریں کیونکہ اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے تین گناہ کئے ہیں؟ ایک یہ کہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ تجسس نہ کیا کرو اور آپ نے تجسس کا ارتکاب کیا۔ نیز یہ حکم دیا تھا کہ ''وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا'' (قرآن: ۱۸۹/۲) (جب گھروں میں داخل ہو تو دروازوں سے داخل ہوا کرو) اور آپ چھت پر سے داخل ہوئے اور تیسرے یہ کہ حکم تو یہ تھا کہ ''وَلَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا'' (قرآن: ۲۷/۲۴) (اپنے گھر کے علاوہ کسی اور کے گھر میں داخل نہ ہونا جب تک معلوم نہ کرلو کہ گھر میں کوئی مرد ہے اور جب تک اہل خانہ سے سلام نہ کہہ لو تو گھر میں داخل نہ ہونا) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ بغیر اجازت کسی کے گھر میں داخل نہ ہونا اور سلام کیا کرو۔ اور آپ بلا اجازت آ گئے اور سلام بھی نہیں کیا''۔ تو اس پر امیر المؤمنین نے کہا کہ ''اگر میں معاف کردوں تو توبہ کرو گے؟'' تو اس شخص نے کہا کہ اگر مجھے معاف کردو گے تو میں آئندہ اس کا ارتکاب نہیں کروں گا''۔ پس آپ نے معاف فرما دیا اور اس نے توبہ کرلی۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ ''جو کوئی لوگوں کی اُس بات کے سننے کے درپے ہو جو اس سے نہ کہی جارہی ہو تو روزِ قیامت پگھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈیلا جائے گا''۔

حقِ سیزدہم: یہ ہے کہ انسان تہمت سے دور رہے تا کہ مسلمانوں کے دل کو بدگمانی سے اور ان کی زبان کو غیبت سے بچانے کا باعث ٹھہرے کیونکہ جو کوئی کسی دوسرے کی معصیت کا باعث ہو وہ شریک معصیت متصور ہوتا ہے۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ ''کیسا ہے وہ شخص جو اپنے ماں باپ کو گالی دے؟'' تو صحابہ رضی اللہ عنہ نے کہا ''ایسا کون ہوسکتا ہے؟'' اے اللہ کے رسول!'' تو آپ (ﷺ) فرمایا کہ وہ شخص جو کسی کے ماں باپ کو گالی دے جس کے نتیجے میں اُس کے ماں باپ کو گالی دی جائے تو وہ گالی اس نے اپنے ماں باپ ہی کو دی ہوگی!'' عمر خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو کوئی ایسی جگہ بیٹھے جہاں وہ تہمت کا نشانہ بن سکتا ہو تو اسے پھر یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس شخص کی ملامت کرے جو اس بناء پر بدگمانی کا مرتکب ہوا ہو''۔

آنحضرت (ﷺ) آخر رمضان مسجد میں اپنی بیوی صفیہ سے محو گفتگو تھے کہ دو مردوں کا وہاں سے گذر ہوا تو آپ ﷺ نے ان کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا: ''یہ میری بیوی صفیہ ہے'' تو وہ کہنے لگے کہ ''اے اللہ کے

رسول کسی اور کے باب میں تو بدگمانی کا شائبہ ہوسکتا ہے آپ کے بارے میں تو ہرگز ممکن نہیں'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح اس کی رگوں میں دواں ہے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو سرراہ ایک عورت سے محو گفتگو دیکھا تو اسے درہ مارا تو وہ شخص بولا کہ: ''حضرت یہ میری بیوی ہے'' تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیوں اس سے بات چیت ایسی جگہ نہیں کرتا جو دوسروں کی نظروں سے مخفی ہو؟''

حق چہاردہم: یہ ہے کہ اگر انسان کو جاہ حاصل ہو تو کسی دوسرے شخص کے حق میں سفارش سے دریغ نہ کرنا چاہئے۔ آنحضرت (ﷺ) نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا ''اگر تم مجھ سے کچھ مانگو اور میرے دل میں ہو کہ دوں گا۔ لیکن تاخیر اس لئے کرتا ہوں کہ تم میں سے کوئی حاجت خواہ کی سفارش کرے تا کہ وہ بھی ثواب کا مستحق ہو جائے۔ سفارش کرے تا کہ ثواب حاصل کرے''۔ نیز فرمایا کہ کوئی صدقہ زبان کے صدقہ سے برتر نہیں''۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ کیسے؟'' فرمایا ''وہ سفارش کہ جس سے خون محفوظ رہے یا کسی کا فائدہ ہو یا جو کسی کو مصیبت سے بچالے''۔

حق پانزدہم: یہ ہے کہ انسان جب سنے کہ کوئی غیر موجود مسلمان کے بارے میں زبان درازی کر رہا ہے اور اس کے جان مال کے غصب کا ارادہ رکھتا ہے تو اس غیر موجود کے لئے جواب دے کر اس کی نصرت کرے اور اس پر ظلم نہ ہونے دے۔ کیونکہ آنحضرت کا فرمان ہے کہ ''کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جو دوسرے مسلمان بھائی کی ایسے موقع پر جب اسے بُرے الفاظ میں یاد کیا جا رہا ہو اور اس کی حرمت کو گرایا جا رہا ہو دفاع نہ کرے تو خدائے تعالیٰ اس شخص کی ضرورت کے وقت نصرت نہ فرمائیں اور کوئی مسلمان جو اپنے بھائی کی مدد نہ کرے اور اس کے لئے نہ جھگڑے تو حق تعالیٰ بھی اس کے حق کو جسے وہ عزیز تر جانتا ہے ایسے موقع پر فروگذاشت کر دیں گے''۔

حق شانزدہم: یہ ہے کہ انسان جب کسی بُرے کی صحبت میں مبتلا ہو جائے تو خوش اسلوبی اور مدارا سے کام لینا چاہئے تا کہ اس سے نجات مل سکے۔ اور نہیں چاہیے کہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کے معنی میں فرماتے ہیں: ''وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ'' (قرآن: ۲۲/۱۳) یعنی ''بدکاری کا بدلہ نیکی سے دیتے ہیں'' کہ فحش کا مقابلہ سلام و مدارا سے کرنا چاہیے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت (ﷺ) سے ملنے کی اجازت مانگی تو آپ (ﷺ) نے فرمایا اسے اجازت دے دیں کہ وہ اپنی قوم میں بُرا شخص ہے''۔ اور جب وہ شخص داخل ہوا تو اس قدر اس کی مراعات اور مردمی کی کہ میں سمجھی کہ اس کا آپ (ﷺ) کے نزدیک کوئی مرتبہ ہے۔ تو جب وہ شخص چلا گیا تو میں نے آپ

(ﷺ) سے کہا کہ آپ تو کہتے تھے کہ بُرا شخص ہے لیکن آپ نے اس سے مراعات کیں تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ "اے عائشہ اللہ کے نزدیک روزِ قیامت بدترین شخص وہ ہے کہ جس کی تکریم اس کے شر کے خوف سے کی گئی ہو"۔ حدیث میں ہے کہ جس شے کے ذریعے تو اپنی ناموس کو بدگوئیوں سے بچالے وہ صدقہ ہے"۔ ابودرداؓ فرماتے ہیں کہ "ایسے بہت سے افراد ہیں کہ ہم ان کے روبرو ہنستے ہیں لیکن ہمارا دل ان پر لعنت بھیجتا ہے"۔

حق ہفدہم: یہ ہے کہ اٹھنا بیٹھنا اور دوستی مفلسوں کے ساتھ رکھے اور دولت مندوں کی ہم نشینی سے پرہیز کرے۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ "مُردوں کے ساتھ ہم نشینی نہ کرو"۔ تو صحابہؓ نے پوچھا کہ "یہ مردے کون ہیں؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "دولت مند" حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی مملکت میں جہاں کہیں کسی مسکین کو پاتے اس کے پاس بیٹھ جاتے اور فرماتے کہ مسکین مسکین کا ہم جلیس ہے"۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام خطاب کے لئے اس سے بہتر کوئی لفظ پسند نہ فرماتے کہ "اے مسکین!" اور ہمارے رسول (ﷺ) فرماتے ہیں کہ "اے اللہ جب تک تو مجھے زندہ رکھے مسکین زندہ رکھ اور جب مجھے موت دے تو مسکین کی موت دے اور روزِ قیامت مجھے مسکینوں میں اٹھانا"۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا "اے اللہ میں تجھے کہاں تلاش کروں؟" تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا "شکستہ دلوں کے ہاں"۔

حق ہیجدہم: یہ ہے کہ کوشاں رہے کہ مسلمان کے دل کو خوش کر سکے یا اس کی کوئی ضرورت پوری کر سکے۔ آنحضرت (ﷺ) فرماتے ہیں: جو کوئی کسی مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کرتا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے اس نے تمام عمر حق تعالیٰ کی خدمت کی ہو"۔ نیز فرمایا کہ: "جو کوئی کسی مومن کی آنکھ روشن کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کی آنکھ کو منور فرمائیں گے"۔ نیز فرمایا کہ: "جو کوئی کسی مسلمان بھائی کی حاجت روائی کے لئے دن یا رات میں ایک گھنٹہ صرف کرے وہ حاجت پوری ہو یا نہ ہو اس کے لئے دوبارہ مسجد میں معتکف رہنے سے بہتر ہے"۔ نیز فرمایا کہ: "جو کوئی کسی غم زدہ کو کشاد سے بہرہ مند کرے یا کسی مظلوم کو ظلم سے نجات دلائے تو اللہ تعالیٰ اسے تہتر کرامتوں سے نوازتے ہیں"۔ نیز فرمایا "اپنے بھائی کی مدد کر دو وہ ظالم ہو یا مظلوم"۔ تو صحابہؓ نے پوچھا کہ: "جب ظالم ہو تو اس کی مدد کیوں کر کریں؟" تو آپ نے (ﷺ) فرمایا "اسے ظلم سے باز رکھنا اس کی نصرت ہوگی"۔ نیز فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی اطاعت کو اس کام سے جس سے کسی مسلمان کی خوشی کا سامان ہوتا ہو بڑھ کر عزیز نہیں رکھتا"۔ نیز فرمایا کہ: "دو خصائل وہ ہیں کہ جن سے ماورا کوئی عبادت نہیں ہے"۔ ایک ایمان لانا اور دوسرے خلق کی خوشی (رضا) ڈھونڈنا"۔ نیز فرمایا کہ: "جس کو مسلمانوں کی فکر نہیں ہے وہ ان میں سے نہیں ہے"۔

فضیلؒ کولوگوں نے دیکھا کہ رو رہے ہیں تو لوگوں نے پوچھا ''آپ کیوں رو رہے ہیں؟'' تو جواب میں فرمایا کہ: ''میں بے چارے مسلمان کے غم میں رو رہا ہوں جس نے مجھ پر ظلم کیا ہے کیونکہ جب روزِ قیامت کل اس سے تعرض ہوگا تو وہ بے چارہ رسوا ہوگا اور اس کے پاس کوئی عذر یا دلیل نہ ہوگی''۔ معروف کرخیؒ فرماتے ہیں کہ: ''جو کوئی دن میں تین مرتبہ یہ دعا کرے گا کہ: ''اَللّٰھُمَّ اَصلِح اُمَّۃَ مُحَمَّد، اَللّٰھُمَّ اَرحَم اُمَّۃَ مُحَمَّد، اَللّٰھُمَّ فَرِّج عَنْ اُمَّۃَ مُحَمَّد'' (اے اللہ اُمتِ محمد کو صلاح کی طرف لا، اُمتِ محمد کو بخش دے، اے اللہ امتِ محمد کو وسعت دے) تو اس کا نام من جملہ ابدال لکھا جائے گا''۔

حق نوزدہم: یہ ہے کہ جس کے ہاں بھی جائے ابتداء سلام سے کرے پھر کوئی اور بات کرے۔ اور اپنے بھائی کا ہاتھ تھام لے۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ: ''جو شخص سلام کہنے سے پہلے کوئی اور بات کہے تو جواب نہ دو تا کہ سب سے پہلے سلام کہے''۔ ایک شخص آنحضرت (ﷺ) کے پاس گیا اور اس نے سلام نہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ باہر جاؤ پھر آؤ اور ابتداء سلام سے کرو''۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب مجھے حضور کی خدمت میں آٹھ سال ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''اے انس طہارت پوری طرح کرتا کہ تیری عمر دراز ہو اور جس کسی سے ملے اسے سلام کہہ تا کہ تیری نیکیوں میں اضافہ ہو۔ اور جب گھر میں داخل ہو تو اہل خانہ کو سلام کہہ تا کہ گھر میں خیر کا بکثرت اضافہ ہو۔ ایک شخص آنحضرت (ﷺ) کے پاس آیا تو کہا کہ: ''السلامُ علیکم'' تو اس پر آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ اس کے لئے دس نیکیاں لکھ دی گئی ہیں''۔ جب دوسرا آیا تو اس نے کہا: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے حق میں بیس نیکیاں لکھ دی گئی ہیں۔ جب تیسرے نے آ کر کہا کہ: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' تو آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ اس کے نامۂ اعمال میں تیس نیکیاں لکھ دی گئیں''۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ جب تم کہیں جاؤ تو سلام کہو اور جب وہاں سے نکلو تو پھر سلام کہو کیونکہ پہلا سلام دوسرے سلام سے برتر نہیں''۔ نیز فرمایا کہ جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ستر ۷۰ رحمتیں ان میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ ان میں سے انہتر ۶۹ اس کے لئے ہوتی ہیں جو خنداں تر ہو۔ اور کشادہ رُو ہو۔ اور جب دو مسلمان کہیں اکٹھے ہوں تو ان پر سو ۱۰۰ رحمتیں تقسیم کی جاتی ہیں۔ نوّے ۹۰ اس کے لئے مختص ہوتی ہیں جو سلام میں ابتدا کرے اور دس ۱۰ دوسرے کے ہوتی ہیں جو سلام کا جواب دے''۔ اور بزرگانِ دین کے ہاتھ پر بوسہ سنت ہے۔ ابوعبیدہ جراح نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت (ﷺ) سے ہم نے پوچھا کہ جب ہم ایک دوسرے سے ملیں تو کیا جھک کر ملیں؟ تو آپ نے فرمایا ''نہیں''۔ میں نے پوچھا ''مصافحہ کریں؟'' فرمایا ''ہاں''۔ اور سفر سے

لوٹ کر آنے پر چہرے پر بوسہ دینا اور گلے لگانا سنت ہے۔ لیکن کسی کے آنے پر کھڑا ہو کر استقبال کرنے سے آپ (ﷺ) نے منع فرمایا ہے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر کوئی اور ہمیں عزیز نہ تھا لیکن ہم ان کی آمد پر کھڑے نہ ہوتے تھے کیونکہ ہم جانتے تھے کہ انھیں یہ بات پسند نہ تھی"۔ لیکن اگر کوئی کسی کی تکریم میں ایسے مقام پر کھڑا ہو جائے جہاں یہ امر عادی ہو تو ناروا نہ ہوگا۔ لیکن کسی کے آگے کھڑے ہونے کی ممانعت ہے۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ "جو کوئی اس بات کو دوست رکھے کہ دوسرے اس کے حضور کھڑے ہوں اور وہ بیٹھا رہتا ہو تو اسے کہہ دو کہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالے"۔

حقِ بستم: یہ ہے کہ اگر کسی کو چھینک آ جائے تو اس پر "الحمد للہ کہے"۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "آنحضرت ﷺ نے ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ جب کسی کو چھینک آئے تو چاہیے کہ 'اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' کہے اور جو کوئی اسے یہ کہتا ہوا سنے وہ 'یَرْحَمُكَ اللّٰہ' کہے یا 'یَرْحَمُكَ رَبُّكَ' کہے۔ تو جب یہ سنے تو چھینک مارنے والا کہے کہ 'یَغْفِرُاللّٰہِ لِیْ وَلَکُم' اور اگر چھینک مارنے والا 'اَلْحَمْدُلِلّٰہِ' نہ کہے وہ 'یَرْحَمُكَ اللّٰہ' کا مستحق نہیں ہوتا" اور آنحضرت کو ﷺ چھینک لاحق ہوتی تو آواز پست کر لیتے اور ہاتھ منہ پر رکھ لیتے تھے"۔

اور اگر کسی کو قضائے حاجت کے دوران چھینک آ جائے تو اسے دل میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہہ لینا چاہیے۔ ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ اگر زبان سے بھی کہہ دے تو حرج نہیں۔ کعب احبان کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ "اے خدا تو نزدیک ہے کہ بات مخفیانہ کہوں یا تو دور ہے تا کہ با آواز بلند کہوں؟" تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: "جو کوئی مجھے یاد کرتا ہے میں اس کا ہم نشین ہوتا ہوں"۔ حضرت موسیٰ نے کہا: خدایا ہماری حالتیں متنوع ہیں جیسے مباشرت یا قضائے حاجت تو ایسے میں ہم تجھے اس سے برتر جانتے ہیں کہ ایسی حالت میں تجھے یاد کریں"۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: "بے خوف جس حال میں بھی ہو مجھے یاد کر"۔

حق بیست و یکم: یہ ہے کہ جس کو جانتا ہو اس کی عیادت کر اگر چہ دوست نہ بھی ہو۔ آنحضرت (ﷺ) کا فرمان ہے کہ انسان جب عیادت کے بعد لوٹتا ہے ستر (۷۰) ہزار فرشتے اس پر مامور کئے جاتے ہیں کہ اس پر رات تک سلام بھیجیں"۔ عیادت کی سنت یہ ہے کہ عیادت کرنے والا ہاتھ مریض کے ہاتھ پر رکھے یا اس کی پیشانی پر اور پوچھے کہ بھائی کیسے ہو؟ اور یہ دعا پڑھے: "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم' اُعِیْذُكَ بِاللّٰہِ الْاَحَدِ الصَّمَدِ الَّذِیْ لَمْ یَلِد وَلَمْ یُوْلَد وَلَم یَکُنْ لَّہ' کُفُواً اَحَد مِنْ شَرِّ مَا تجد"[۱] عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ

---

[۱] "تجھے اس بری شے جو کچھ بھی ہے خدائے یگانہ کے حوالے کرتا ہوں جو نہ پیدا ہوا نہ اس سے کوئی ولادت پذیر ہوا اور نہ کوئی اس کا ہمتا ہے"

''میں بیمار تھا تو آنحضرت (ﷺ) تشریف لائے تو کئی مرتبہ یہی دعا فرمائی ''اور بیمار کے لئے سنت یہ ہے کہ کہے: ''اَعُوذُ بِعِزَّۃِ اللّٰہِ وَقُدرَتِہٖ مِنْ شَرِّمَا اَجِدُ وَاُحاذِرُ''[۱] اور جب کوئی احوال پرسی کرے تو بیمار کو حرف شکایت زبان پر نہ لانا چاہئے۔

حدیث میں ہے کہ جب کوئی بندہ خدا بیمار ہوتا ہے تو حق تعالیٰ دو فرشتے اس پر مامور کر دیتے ہیں تا کہ جب کوئی عیادت کو آئے تو بیمار شکر کا اظہار کرے اور اگر شکوہ کرے تو کہے ''خیر ہے الحمد للہ رب العلمین'' تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرا بندہ مجھ پر توکل کئے ہوئے ہے اس لئے اگر میں اسے لے جاؤں تو اپنی رحمت سے بہشت میں لے جاؤں گا۔ اور اگر اسے صحت عطا کروں گا تو اس بیماری کو اس کے گناہوں کا کفارہ کروں گا۔ اور وہ خون اور گوشت جو بیماری سے پہلے تھا اس سے بہتر لوٹاؤں گا۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں جسے پیٹ کا درد لاحق ہو جائے اسے چاہئے کہ اپنی بیوی کے مہر سے کچھ لے کر شہد خرید لے اور اسے بارش کے پانی میں ملا دے اور پئے تو شفا پائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بارش کو مبارک کہا ہے۔ اور شہد کو شفا کہا ہے اور وہ مہر جو عورتیں بخش دیں اس کو نوش اور گوارا کہا گیا ہے۔ جب یہ تینوں جمع ہو جائیں تو ناچار شفا پائے گا۔

مختصر یہ کہ بیمار کا ادب و طریق یہ ہے کہ گلہ نہ کرے' اور جزع نہ کرے۔ اور امید یہ رکھے کہ بیماری اس کے گناہوں کا کفارہ ہوگی۔ اور جب دوا کھائے تو توکل اللہ تعالیٰ پر کرے نہ کہ دوا پر۔ اور جو کوئی بیمار پرسی کو آئے اس کے لئے طریق یہ ہے۔ زیادہ دیر تک نہ بیٹھے۔ اور زیادہ پرسش نہ کرے اور صحت و عافیت کے لئے دعا کرے تو ظاہر کرے کہ میں بھی تمھاری بیماری کی وجہ سے غم زدہ ہوں اور گھر کے در و دیوار کی طرف نہ دیکھے اور جب کسی کے دروازے پر جائے تو اجازت طلب کرے اور دروازے کے عین سامنے کھڑا نہ ہو بلکہ ایک طرف کھڑا ہو اور دستک دے تو آہستہ اور یا غلام کہہ کر نہ پکارے اور جب اہل خانہ پوچھیں کہ کون ہے؟ تو یہ نہ کہے کہ ''میں ہوں'' لیکن اس کی بجائے ''سبحان اللہ والحمد للہ'' کہے۔ بیمار کا دروازہ جو بھی کھٹکھٹائے اسے یہی کرنا چاہئے۔

حق بیست و دوم: یہ کہ اپنے بھائی کے جنازے کے ہمراہ جائے۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ جو کوئی اپنے بھائی کے جنازے کے ساتھ جائے تو اسے ایک قیراط ثواب ملتا ہے اور اگر دفن تک وہاں ٹھہرے تو ثواب اس کا دو قیراط ہے۔ اور ہر قیراط کوہ احد سے کئی گنا بڑا ہے''۔ اور جنازے کے ساتھ جانے کا ادب یہ ہے کہ خاموش رہے۔ ہنسنے سے پرہیز کرے اور عبرت حاصل کرنے میں مشغول رہے اور اپنی موت کے بارے

۱؎ میں پناہ لیتا ہوں خداوند عزیز کی اور اس کی قدرت میں کی اس بُرائی سے جو ہے۔

میں سوچے۔ اعمشؒ فرماتے ہیں کہ ''میں ایک جنازے کے پیچھے جارہا تھا اور نہ جانتا تھا کہ کس سے تعزیت کروں کیونکہ سب ایک دوسرے سے بڑھ کر غمگین تھے''۔

ایک جماعت مردے پر غم کھاتی تھی تو بزرگوں میں سے ایک بزرگ نے کہا: ''اپنی فکر کرو کہ اس نے تو تین دشواریوں کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اس نے ملک الموت کا چہرہ دیکھ لیا' جان کنی کی تلخی چکھ چکا اور خاتمے کے خوف سے آزاد ہوگیا''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''مرنے کے بعد تین چیزیں پیچھے رہ جاتی ہیں: اہل' مال اور عمل۔ تو اہل و مال تو لوٹ جاتے ہیں اور عمل مردے کے ساتھ رہتا ہے''۔

حق بیست و سوم: یہ ہے کہ قبروں کی زیارت کے لئے جائے تو مرنے والوں کے لئے دعا کرے اور اپنے لئے عبرت اندوزی کرے اور جانے کہ وہ تو اس سے پہلے چلے گئے خود اسے بھی جلد وہیں جانا ہے اور جگہ اس کی بھی انھیں کی طرح قبر ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ: ''جو کوئی اپنی قبر کو بہت یاد رکھتا ہے تو وہ اپنی قبر کو ایک باغ کی صورت میں پاتا ہے جو بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔ اور جو اپنی قبر کو بھلائے رکھتا ہے تو وہ دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھے کی صورت میں پاتا ہے''۔ اور ربیع خثیم جس کی تربت طوس میں ہے' بزرگان تابعین میں سے ہے' اس نے اپنے گھر میں قبر کھود رکھی تھی جب اپنے دل میں قساوت پاتا تو ایک گھڑی اس قبر میں سوتا تو کہتا کہ یارب مجھے دنیا میں بھیج تا کہ میں اپنے قصوروں کا ازالہ کروں''۔ پھر اٹھتا اور کہتا ''اے ربیع اب خبردار ہو جا کہ تجھے دنیا میں دوبارہ بھیج دیا گیا ہے۔ اب انتہائی کوشش کر کیونکہ دوبارہ دنیا میں بھیجنے کا مزید موقع نہ ملے گا''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ قبرستان میں گئے اور ایک قبر کے سرہانے بیٹھ گئے اور بہت روئے میں ان کے نزدیک تھا میں نے پوچھا ''اے اللہ کے رسول (ﷺ) آپ کیوں روئے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''یہ میری ماں کی قبر ہے' میں نے اللہ تعالیٰ سے اجازت مانگی تا کہ میں اس کی زیارت کروں اور ماں کے لئے بخشش کی دعا کروں۔ تو اللہ تعالیٰ نے زیارت کی اجازت تو مرحمت فرمادی لیکن دعائے بخشش کی اجازت نہ دی اس پر میرے دل میں شفقت فرزندی جوش میں آئی تو مجھ پر گریہ طاری ہوگیا''۔

یہ ہے مسلمانوں کے حقوق کی جملہ تفصیل جسے محض مسلمان ہونے کی بناء پر ملحوظ رکھنا لازم ہے۔

اور حقوق ہمسایگی جو مستزاد ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''ایک ہمسایہ وہ ہے جو کافر ہے اس کا ایک حق ہے اور ایک ہمسایہ وہ ہے جس کے دو حق ہیں اور وہ ہے مسلمان ہمسایہ۔ اور ایک ہمسایہ وہ ہے جس کے تین حق ہیں اور وہ ہے رشتہ دار مسلمان''۔ نیز فرمایا کہ جبریل علیہ السلام مجھے ہمیشہ حق ہمسایہ کی نصیحت کرتے

تھے۔ یہاں تک کہ مجھے گمان ہوا کہ شاید اُسے میری میراث میں بھی شریک ٹھہرا دیا جائے''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جو کوئی اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے تو اسے کہو کہ اپنے ہمسائے کا احترام کرے''۔ نیز فرمایا کہ ''وہ شخص مومن نہیں جس کا ہمسایہ اس سے تکلیف میں ہو اور مامون نہ ہو''۔ نیز فرمایا کہ: ''روز قیامت جو دو شخص باہم خصومت میں ہوں گے اور داد خواہ ہوں گے وہ ''ہمسائے ہوں گے''۔ نیز فرمایا کہ جس نے پڑوسی کے لئے پتھر پھینکا اس نے ہمسائے کو ناراض کیا''۔ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ ''فلاں عورت دن میں روزے سے ہوتی ہے اور رات نماز میں ہوتی ہے لیکن ہمسائے کو آزار دیتی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ چالیسویں گھر تک ہمسائے ہی ہیں''۔ زہری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ چہل گھر دائیں، چالیس گھر بائیں طرف، چالیس گھر سامنے والے اور چالیس پچھلی جانب، یہ سب ہمسائے ہیں''۔ یاد رہے کہ ہمسائے کا حق یہی نہیں کہ تو اسے دکھ نہ دے بلکہ اس کا حق ہے کہ اس کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ ''روزِ قیامت مفلس ہمسایہ دولت مند ہمسائے سے الجھے گا اور کہے گا ''اے اللہ اس سے پوچھئے کہ اس نے میرے ساتھ نیک سلوک کیوں نہ کیا اور اپنا دروازہ مجھ پر بند کیوں رکھا تھا؟''

ایک بزرگ کو چوہوں کی کثرت نے تنگ کر رکھا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ بلی کیوں نہیں رکھ لیتے؟'' تو آپ نے فرمایا کہ مجھے خوف یہ ہے کہ چوہے جب بلی کی آواز سنیں گے تو ہمسائے کے گھر میں چلے جائیں گے تو گویا میں جو چیز اپنے لئے پسند نہیں رکھتا اسے ہمسائے کے لئے پسند کرنے والا گردانا جاؤں گا''۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جانتے ہو کہ حق ہمسایہ کیا ہے؟'' یہ ہے کہ اگر تجھ سے امداد کا خواہاں ہو تو تُو اس کی مدد کرے۔ اگر قرض مانگے تو اسے قرض دے اور اگر مفلس ہو تو اس کو مالی مدد دے، بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے اور اگر فوت ہو جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جائے۔ اور اگر ہمسائے کو خوشی نصیب ہو تو اسے مبارک باد کہے اور اسے غم کا سامنا ہو تو اسے صبر کی تلقین کرے۔ اور اپنے گھر کی دیوار اتنی اونچی نہ اٹھائے کہ پڑوسی کے لئے ہوا یا دھوپ کا راستہ بند ہو جائے۔ اور جب پھل کھائے تو اسے بھی بھیجے اگر ایسا نہیں کر سکتا تو چھپ کر کھائے اور تجھے یہ بھی پسند نہ کرنا چاہئے کہ تیرا بیٹا میوہ بدست اس طرح باہر نکلے کہ ہمسائے کے بچوں کی نگاہ اس پر پڑے۔ اور اپنے ہمسائے کو اپنے باورچی خانے کے دھوئیں سے آزار نہ دے اِلا یہ کہ اپنے پکوان میں سے اسے بھی بھیجے''۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا جانتے ہو حق ہمسایہ کیا ہے؟'' جان لے کہ اللہ جس کے قبضہ قدرت میں اور فرمان میں محمد کی جان ہے کہ حقوق ہمسایہ کو وہی پورا کرتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمائی ہو''۔ اور یاد رہے کہ ہمسائے کے جملہ حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ چھت پر سے اس کے گھر پر نگاہ نہ کرے اور

اگر وہ شہتیر تیری دیوار پر رکھے تو منع نہ کرے اور اس کے پرنالے کی راہ کو بند نہ کرے۔ اور اگر کوڑا کرکٹ تیرے دروازے کے سامنے پھینکے تو اس سے لڑائی نہ کرے۔ اور اس کے جن پوشیدہ امور سے مطلع ہوا سے مخفی رکھے اور اس کی بات کو دزدیدہ نہ سنے۔ اور اس کے اہل حرم سے نگاہ کو روکے رکھے اور اس کی کنیز کو بھی زیادہ نہ دیکھے۔ تو یہ وہ مستزاد حقوق ہیں جن کا بیان ہم نے مسلمانوں کے باہمی حقوق کے بارے میں کیا ہے۔ انھیں بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے دوست' آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جب ہنڈیا میں سالن تیار کرے تو اس میں شوربا زیادہ بنا لے اور اس میں سے کچھ پڑوسی کو بھیج دے''۔ ایک شخص نے عبداللہؒ بن مبارک سے پوچھا کہ ''میرے ہمسائے نے میرے غلام کے بارے میں شکوہ کیا ہے۔ تو اگر میں بے دلیل غلام کی سرزنش کروں تو گناہ گار ہوں گا اور سرزنش نہیں کرتا تو ہمسایہ ناراض ہوگا۔ ایسے میں کیا کروں؟'' تو آپ نے کہا کہ ٹھہر جاؤ یہاں تک کہ تیرا غلام ایسی بے ہودگی کرے جو مستوجب تادیب ہو تو اس تادیب کو موخر کردے یہاں تک کہ ہمسایہ گلہ کرے پھر غلام کی سرزنش کرنا تاکہ دونوں کا حق ادا ہو جائے''۔

رشتہ داروں کے حقوق:

یاد رہے کہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''میں رحمان ہوں اور خویشاوندی رحم ہے تو یہ نام میں نے اپنے نام سے مشتق کیا ہے (یعنی میں نے رحم کو رحمان سے مشتق کیا ہے) جو کوئی صلہ رحم کرتا ہے میں اس کے ساتھ رہتا ہوں اور جو کوئی اسے چھوڑ دیتا ہے میں اس کو چھوڑ دیتا ہوں''۔ نیز آپ نے فرمایا کہ جو کوئی چاہتا ہے کہ لمبی عمر پاوے اور روزی اس کی فراخ ہو تو اسے کہو کہ اپنے رشتہ داروں سے حسن سلوک کرے''۔ نیز فرمایا کسی عبادت کا ثواب صلہ رحم کے عمل سے بڑھ کر نہیں ہوتا کہ ہوسکتا ہے کہ گھر والے فسق و فجور میں مبتلا ہوں تو جب صلہ رحم کریں گے تو اس کی برکت سے ان کے رزق میں اضافہ ہوگا''۔ نیز فرمایا کہ ''کوئی صدقہ اس سے فاضل تر نہیں جو تو اپنے ایسے رشتہ دار پر کرے' جو تجھ سے خصومت میں ہو''۔ یاد رہے کہ رحم کا پیوند کرنا یہ ہے کہ رشتہ دار تو تجھ سے تعلق منقطع کریں لیکن تو یہ تعلق استوار کرے۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ تمام فضائل سے بڑھ کر فضیلت یہ ہے کہ جو کوئی تجھ سے یہ تعلق منقطع کرے تو اس سے جوڑے اور جو کوئی تجھے محروم رکھے تو اس کو عطا کرے اور جو کوئی تجھ پر ظلم کرے تو اسے معاف کردے۔

والدین کے حقوق:

جان لے کہ والدین کے حقوق نہایت عظیم ہیں کہ قرب ان کا زیادہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے

کہ کوئی شخص اپنے باپ کا حق ادا نہیں کر پاتا جب تک کہ اسے غلام پائے اور خرید کر آزاد نہ کردے''۔ نیز فرمایا کہ ''ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک نماز، روزہ، حج، عمرہ اور جہاد سے بھی بڑھ کر ہے''۔ اور فرمایا کہ وہ شخص جو کہ ''عاق اور قطع رحم کا ارتکاب نہ کرے وہ پانچ سو سال کی مسافت راہ سے بہشت کی خوشبو سے بہرہ مند ہو جاتا ہے''۔ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی کی کہ: ''جو کوئی اپنے والدین کا فرماں بردار ہو ہم اسے اپنا فرماں بردار لکھ لیتے ہیں اور جو کوئی اپنے والدین کا نافرمان ہوتا ہے ہم اسے اپنا نافرمان لکھ لیتے ہیں''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''کیا زیان اس میں ہے کہ اگر کوئی صدقہ دے اور مرحوم والدین کے ثواب کے لئے دے تو خود اس کے ثواب میں کچھ کمی نہ کی جائے گی''۔ ایک شخص آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ''میرے والدین مر چکے ہیں۔ تو اب ان کا کون سا حق باقی ہے جسے میں ادا کروں؟'' تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان کے لئے نماز پڑھ اور دعا مانگ اور بخشش مانگ اور ان کی وصیت کو بجالا اور ان کے دوستوں کا احترام کر اور ان کے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کر''۔ اور فرمایا کہ ''ماں کا حق باپ کے حق سے دوگنا ہے''۔

اولاد کے حقوق:

معلوم رہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ میں نیکی کس کے ساتھ کروں؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اپنے ماں باپ سے'' اس شخص نے کہا کہ وہ فوت ہو چکے ہیں'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اپنی اولاد کے ساتھ نیکی کر کیونکہ جس طرح باپ کا حق ہے اسی طرح بیٹے کا حق باپ پر ہے''۔

اولاد کے حقوق میں سے ایک حق یہ ہے کہ باپ اپنی بدخوئی کے باعث اپنی اولاد کو عاق یا نافرمان نہ کردے۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''اللہ تعالیٰ اس باپ پر رحم فرمائے جو اپنے بیٹے کو نافرمان نہ ہونے دے''۔

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''بیٹا جب سات دن کا ہو جائے تو اس کا عقیقہ کرو اور اس کا اچھا سا نام رکھو اور اسے پاکیزگی عطا کرو اور چھ سال کا ہو جائے تو اسے آداب سکھاؤ اور سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز کا حکم دو اور جب نو سال کا ہو جائے تو اس کا بستر الگ کردو۔ اور دس سال کا ہو جائے تو نماز کے سبب اس سے سختی سے نمٹو اور سولہ سال کا ہو جائے تو باپ کا فرض ہے کہ اس کا بیاہ کردے اور فرزند کا ہاتھ پکڑ کر کہے کہ: میں نے تمھیں ادب سکھایا، قرآن سکھایا اور تمھیں بیوی مہیا کی اب میں دنیا میں تیرے فتنے سے اور آخرت میں عذاب سے اللہ تعالیٰ کی پناہ کا طالب ہوں''۔

اور یہ امر بھی اولاد کے حق میں سے ہے کہ عطا و نوازش میں ان کے ساتھ سلوک یکساں ہو اور چھوٹے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرنا اور اسے بوسہ دینا سنت ہے۔ آنحضرت ﷺ حسن رضی اللہ عنہ کو بوسہ دیا کرتے تھے۔ اقرع

بن حابس نے کہا ''میرے دس بیٹے ہیں میں نے ان میں سے بھی کسی کو بوسہ نہیں دیا'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحمت نہیں کی جاتی''۔ آنحضرت ﷺ منبر پر تھے کہ حسن منہ کے بل گر گیا تو آپ فوراً منبر سے بسرعت اترے اور اسے آغوش میں لے لیا اور یہ آیت پڑھی: ''اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ'' (قرآن: ۶۴/۱۵) (تمھارے اموال اور اولاد فتنہ وآزمائش ہیں)۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نماز ادا کر رہے تھے جب سجدہ میں گئے تو حسین رضی اللہ عنہ نے اپنا پاؤں آپ کی گردن مبارک پر رکھ دیا تو آپ ﷺ نے سجدے کی حالت میں اس قدر توقف کیا کہ صحابہ نے گمان کیا شاید وحی آ گئی ہے کہ سجدہ کو طویل کیا جائے''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ حسین نے مجھے اپنا اونٹ بنا لیا تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کو ہٹاؤں''۔

ماں باپ کا حق اولاد پر' اولاد کے ماں باپ پر حق سے موکد تر ہے کیونکہ والدین کی تعظیم اولاد پر واجب ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی عبادت کے مساوی قرار دیا ہے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ: ''وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا'' (قرآن: ۱۷/۲۳) (تیرے خداوند نے حکم دیا ہے اور نصیحت کی ہے کہ سوائے خدا کے کسی اور کی عبادت نہ کرنا اور (نصیحت کی اور فرمایا کہ) اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو''۔ اور والدین کی تعظیم کی ذیل میں ان کا حق ان پر واجب ہے ایک وہ کہ جس پر بیشتر علماء متفق ہیں وہ یہ ہے کہ اگر طعام مشتبہ ہو اور حرام محض نہ ہو اولاد سے کھانے کو کہیں تو اولاد کو اطاعت کرتے ہوئے کھا لینا چاہئے کیونکہ والدین کی خوش نودی طعام مشتبہ سے احتراز کی نسبت اہم تر ہے۔ دوسرے یہ کہ والدین کی اجازت کے بغیر اولاد سفر پر نہ نکلے سوائے اس کے کہ فرض عین ہو۔ جیسے نماز کا علم اور روزہ کا علم جب ان کے مسکن کے مقام پر ان کے سکھانے والا موجود نہ ہو اور حج کے لئے درست یہ ہے کہ والدین کی اجازت کے بغیر نہ نکلیں کہ تاخیر اس کے لئے مباح ہے اگرچہ حج فریضہ ہے۔

ایک شخص نے غزو پر جانے کی آنحضرت ﷺ سے اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ ''تمھاری ماں ہے؟'' تو اس نے اثبات میں جواب دیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''ماں کی خدمت میں رہو کہ جنت اس کے پاؤں تلے ہے''۔

ایک شخص یمن سے آیا اور آنحضرت ﷺ سے غزو میں شرکت کے لئے اجازت طلب کی تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ ''تیرے ماں باپ زندہ ہیں؟'' تو اس نے کہا 'ہاں' تو آپ ﷺ نے اس سے کہا جا پہلے ان سے اجازت لے۔ اگر اجازت نہ دیں تو ان کا کہا ماننا کیونکہ توحید کے بعد اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی قربت والدین کی فرماں برداری سے بڑھ کر نہیں''۔

یاد رہے کہ بڑے بیٹے کا حق باپ کے قریب ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''بڑے بھائی کا حق چھوٹے بھائی پر اولاد پر باپ کے حق کا سا ہے۔

غلاموں کے حقوق:

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''لونڈی غلاموں کے حقوق کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ انھیں وہی کھانا دو جو تم خود کھاؤ اور انھیں وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ اور انھیں ایسا کام نہ کہو جس کی تاب وہ نہ رکھتے ہوں۔ شایستہ ہوں تو رکھیں ورنہ بیچ دیں اور خلق اللہ کو عذاب میں نہ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تمھارا لونڈی غلام بنایا ہے۔ اگر چاہتا تو تمھیں ان کا غلام بنا دیتا۔ ایک شخص نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ ''اے اللہ کے رسول میں اپنے غلاموں کو کتنی دفعہ معاف کروں؟'' تو آپ نے جواب میں فرمایا ''ستر بار''۔

احنف قیس سے لوگوں نے پوچھا ''تم نے بردباری کس سے سیکھی؟'' تو انھوں نے جواب دیا قیس عاصم سے، کہ ان کی کنیز ایک لوہے کی سیخ میں لٹکا ہوا بکری کا کباب شدہ بچہ لا رہی تھی کہ وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر اس کے بچے پر گر گیا اور قیس عاصم کا فرزند ہلاک ہو گیا۔ کنیز خوف کے مارے ہوش کھو بیٹھی۔ اس پر عاصم نے کہا کہ ڈرو نہیں تم نے کوئی جرم نہیں کیا جاؤ میں نے اللہ تعالیٰ کے لئے تمھیں آزاد کیا۔

عون بن عبداللہ کا غلام جب بھی اس کی نافرمانی کرتا تو کہتے کہ ''تم نے ٹھیک اپنے آقا کی سیرت اپنائی ہے، جس طرح تمھارا آقا اپنے آقا (اللہ) کی نافرمانی کرتا ہے تو بھی اسی کی تقلید کرتا ہے''

ابومسعود انصاری کا ایک غلام تھا۔ وہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ اس نے سنا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ ''اے ابا مسعود اس سے اپنا ہاتھ روک لے''۔ پھر دیکھا تو آنحضرت ﷺ کو پایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اس سے کہیں زیادہ قادر تر ہے جتنی قدرت تم اس غلام پر رکھتے ہو''۔

پس مملوک کا حق یہ ہے کہ اسے روٹی سالن اور لباس سے محروم نہ رکھا جائے اور تکبر کی نگاہ سے اسے نہ دیکھا جائے۔ اور اسے معلوم ہونا چاہئے کہ غلام بھی اسی کی مانند انسان ہے۔ اور جب غلام خطا کا ارتکاب کرے تو آقا کو اپنی ان خطاؤں کو یاد کرنا چاہئے جو وہ اپنے اللہ کے بارے میں کرتا ہے۔ جب خشمگیں ہو تو اپنی قدرت کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کو خیال میں لائے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جس کے غلام نے اس کے لئے کھانا تیار کیا ہے اور زحمت کی ہے اور دھواں کھایا ہے اور اپنے آقا کو ان سے بچایا ہے تو ایسے آقا سے کہو کہ اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلائے اگر یہ نہ کرے تو کم از کم ایک لقمہ گھی میں تر کر کے اپنے ہاتھ سے غلام کے منہ میں ڈالے اور زبان سے کہے کہ

لو بھئی کھاؤ''۔

اصل ششم: گوشہ گیری اور خلق سے علیحدگی اختیار کرنے کے آداب میں

یاد رہے کہ عزلت گزینی اور خلوت نشینی کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے کہ یہ میل جول سے فاضل تر ہے؟ سفیان ثوری، ابراہیم بن ادہم، داود طائی، فضیل بن عیاض، سلیمان خواص، یوسف اسباط، حذیفہ مرعشی، بشر حافی اور بہت سے متقیوں اور بزرگوں کا مذہب یہ ہے کہ خلق کے ساتھ میل جول رکھنے کی نسبت خلوت گزینی اور گوشہ نشینی فاضل تر ہے۔ اور علمائے ظاہر میں سے ایک بڑی جماعت کے نزدیک خلق سے میل ملاپ اولیٰ تر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''عزلت میں سے اپنے حصے کو ملحوظ رکھو'' ابن سیرینؒ کہتے ہیں کہ ''عزلت عبادت ہے''۔ ایک شخص نے داوَد طائیؒ سے کہا کہ ''مجھے کوئی نصیحت فرمایئے'' تو انھوں نے کہا ''دنیا سے روزہ رکھ اور دم مرگ تک یہ روزہ افطار نہ کرنا اور لوگوں سے اس طرح گریزاں رہ جیسے شیر سے بھاگتے ہیں''۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ تورات میں ہے کہ ''جب انسان نے قناعت کی آزاد ہو گیا' حسد کرنے سے باز رہا تو اس کی مروت نمایاں ہوئی اور اگر چند روزہ زندگی میں صبر کیا تو جاودانی برخورداری پائی''۔

اور وہیب بن الورد کہتے ہیں کہ ''حکمت کی دس۱۰ صورتیں ہیں جن میں سے نو۹ خاموشی میں ہیں اور دسویں خلوت میں'' ربیع خثیم رضی اللہ عنہ وابراہیم نخعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''علم حاصل کرو اور لوگوں سے گوشہ گیری اختیار کرو''۔

مالک بن انس مسلمان بھائیوں کی زیارت وعیادت کو جاتے تھے۔ جنازہ کی مشایعت میں جاتے تھے۔ پھر ایک ایک سے دست کش ہو گئے اور خلوت اختیار کرلی۔

فضیلؒ کہتے ہیں کہ: ''اس شخص کا نہایت درجہ احسان مند ہوں کہ جو میرے پاس سے گذرے اور سلام نہ کہے اور جب میں بیمار پڑوں تو کوئی میری عیادت کو نہ آئے''۔ سعد وقاص اور سعید بن زید بزرگ صحابہ میں سے تھے۔ مدینہ کے قریب جہاں رہتے تھے اس جگہ کو عقیق کہا جاتا تھا۔ وہ نماز جمعہ کے لئے یا کسی دوسرے کام کے لئے مدینہ نہ آتے تھے۔ حتیٰ کہ وہیں فوت ہو گئے۔

امراء میں سے ایک نے حاتم اصم سے کہا کہ: ''کوئی حاجت ہے؟'' تو حاتم نے کہا ''ہاں'' امیر نے کہا ''مانگ'' تو حاتم نے کہا حاجت یہ ہے کہ نہ تو مجھے دیکھے نہ میں تجھے دیکھوں''۔ ایک شخص نے سہل تستریؒ سے کہا کہ ''میں چاہتا ہوں کہ ہم باہم جلیس ہو جائیں'' تو سہل نے کہا کہ ''جب ہم میں سے ایک مر جائے گا تو دوسرا کس

کے ساتھ ہم نشین ہوگا۔اب اسی کے ساتھ ہم صحبت ہونا چاہئے''۔
یادرہے کہ عزلت گزینی کے باب میں اسی طرح کا اختلاف ہے جس طرح کا نکاح کے بارے میں ہے کہ نکاح فاضل تر ہے یا نکاح نہ کرنا فاضل تر ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ احوال کے ساتھ متغیر ہوجاتا ہے۔کسی کے لئے عزلت گزینی فاضل تر ہوتی ہے اور ایسا شخص بھی ہوتا ہے جس کے لئے لوگوں سے میل جول مفید ہوتا ہے۔اور یہ امر خلوت گزینی کے فوایدوآفات کو بہ تفصیل بیان کئے بغیر واضح نہ ہوگا۔

فوایدِ عزلت

معلوم رہے کہ خلوت گزینی کے چھ فائدے ہیں:

فائدہ اوّل:

ذکروفکر کے لئے فراغت: کیونکہ ذکر وفکر ہی بزرگ ترین عبادت ہے۔صنع خداوندی کے عجائب میں اور آسمان اور زمین کے ملکوت میں اور ایزد تعالیٰ کے دنیا وآخرت کے اسرار کو سمجھنے میں خلوت معاون ہوتی ہے۔ان میں سب سے عظیم یہ ہے کہ خود کو سراپا ذکر حق تعالیٰ میں مصروف کرے اور اس کے سوا ہر چیز سے بے خبر ہو جائے حتیٰ کہ خود کو بھی بھول جائے اور سوائے حق تعالیٰ کے کوئی چیز نہ رہے۔اور یہ صورت بجز خلوت گزینی اور گوشہ گیری کے ہاتھ نہیں آسکتی۔اور جو کچھ ماسوائے اللہ ہے وہ اللہ سے انحراف کا باعث ہوتی ہے۔خصوصاً اس شخص کے لئے جس کو یہ قدرت نہ ہو کہ درمیانِ خلق حق تعالیٰ کے ساتھ لگا رہے۔اور خلق سے صرف نظر انبیا کی طرح نہ کرسکے۔یہی وجہ تھی کہ آنخضرت ﷺ نے ابتدائے کار میں خلوت اختیار کی تھی اور آپ ﷺ غار حرا میں خلق سے کٹے رہے تا آنکہ نور نبوت قوی ہوگیا اور اس درجے کو پہنچ گیا کہ آپ ﷺ کا جسم تو خلق کے ساتھ ہوتا تھا لیکن دل حضرت حق کے ساتھ ہوتا تھا۔آنخضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر میں کسی کو دوست بناتا تو ابوبکر کو بناتا۔لیکن اللہ تعالیٰ کی دوستی نے کسی اور دوستی کے لئے جگہ ہی نہیں چھوڑی''۔اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ آپ ﷺ سب کے دوست ہیں۔اور کچھ عجیب نہیں اگر اولیا اللہ بھی اس درجے کو پہنچ جائیں کہ سہل تستریؒ کہتے ہیں کہ ''تیس سال ہوگئے ہیں کہ میں حق تعالیٰ سے ہم کلام ہوں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ میں خلق سے ہم کلام ہوں'' اور یہ محال نہیں۔کیونکہ ایک شخص ایسا ہو کہ کسی مخلوق کا عشق ایسا گرفتار کرے کہ لوگوں کے درمیان ہو لیکن مشغولی کے باعث وہ کسی کی سنتا ہو نہ کسی کو دیکھتا ہو۔لیکن ہر کسی کو اس پر اترانا نہ چاہئے۔کیونکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جو خلق سے میل جول رکھتا ہے مقصد سے محروم ہوجاتا ہے۔کسی نے ایک دفعہ رہبانی سے کہا کہ ''الحق صبوری تنہائی

میں''۔تو رہبانی نے کہا: ''میں تنہا نہیں ہوں کیونکہ میں حق تعالیٰ کا ہم نشین ہوں۔ جب چاہتا ہوں کہ اس سے راز و نیاز کروں تو میں نماز ادا کرتا ہوں۔ اور جب میں چاہتا ہوں کہ حق میرے ساتھ راز بیان فرمائے تو میں تلاوت قرآن کرتا ہوں''۔ ایک شخص سے لوگوں نے پوچھا کہ ''اس قوم نے خلوتوں سے کیا فائدہ حاصل کیا ہے؟'' تو اس نے کہا ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت''۔

حسن بصریؒ سے لوگوں نے کہا کہ: ''یہاں ایک شخص تنہا ایک ستون کے پیچھے بیٹھتا ہے'' تو حسن بصریؒ نے کہا کہ جب وہ موجود ہو تو مجھے اطلاع دینا۔ اس کے آنے پر حسن بصریؒ کو اطلاع ملی تو اس کے قریب آ کر آپ نے پوچھا کہ ''آپ ہمیشہ تنہا بیٹھتے ہیں لوگوں سے میل ملاپ کیوں نہیں رکھتے؟''۔ بولا کہ مجھے ایک ایسا کام درپیش ہے جس نے مجھے خلق سے حق تعالیٰ کے ساتھ مشغول کر رکھا ہے''۔ تو آپ نے کہا کہ ''کیوں حسن بصریؒ کے پاس نہیں جاتے اور اس کی بات نہیں سنتے؟'' تو وہ بولا ''یہ کام وہ ہے جس نے مجھے حسن اور لوگوں سے ہٹا کر خود میں مشغول کر رکھا ہے''۔ تو حسن نے کہا ''کیوں اور یہ کیا کام ہے؟'' بولا ''کوئی ایسی ساعت نہیں جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے نعمت نہ پہنچتی ہو اور نہ یہ کہ مجھ سے گناہ سرزد نہ ہوتا ہو میں اس نعمت کا شکر ادا کرتا ہوں اور گناہ کے لئے استغفار کرتا ہوں''۔ اس لئے میں حسن سے مشغول ہوتا ہوں نہ اور لوگوں سے''۔ اس پر حسن بصری نے فرمایا کہ ''آپ اس مقام کی حفاظت کریں کیونکہ آپ حسن سے فاضل تر اور فقیہہ تر ہیں''۔ ہرم بن حبان اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ اویس نے پوچھا ''آپ کس لئے آئے ہیں؟'' تو وہ شخص بولا اس لئے کہ آپ سے آسودگی حاصل کروں''۔ تو حضرت اویس نے فرمایا کہ ''مجھے ہرگز کسی ایسے شخص کا علم نہ تھا جو اللہ تعالیٰ کو جانتا پہچانتا ہو اور پھر کسی غیر سے آسودگی کا خواہاں ہو''۔

فضیلؒ نے کہا ''جب رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے تو میرا دل مسرت آشنا ہو جاتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ ''دن نکلنے تک اپنے اللہ کے ساتھ خلوت میں بیٹھوں گا''۔ اور جب دن کی روشنائی نمودار ہوتی ہے تو میرے دل میں اندوہ پیدا ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اب لوگ مجھے اللہ سے ہٹا کر خود میں مصروف کر لیں گے''۔ اور مالک دینارؒ کہتے ہیں کہ ''جو کوئی لوگوں کے ساتھ مصروف ہونے کو نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی اور مناجات کو فاضل تر نہ جانتا ہو تو وہ بہت کم علم ہے اور دل اس کا نابینا ہے اور عمر اس نے ضائع کر دی''۔ حکماء میں سے ایک کا کہنا ہے کہ ''جس کسی کا تقاضا یہ ہو کہ وہ کسی کو ملے تا کہ اس کے ساتھ ہم جلیس ہو تو یہ بات اس کے ناقص ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ اس کا دل اس چیز سے جو دراصل درکار ہے خالی ہے اور وہ خارج سے امداد کا طالب ہے''۔ داناؤں نے کہا ہے کہ جسے خلق سے انس ہو وہ مفلسوں میں سے ہے''۔

پس اس جملہ بیان سے تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ جوکوئی اس پر قادر ہو کہ حق تعالیٰ کا انس دوام ذکر سے حاصل کرے یا بہ دوام فکر علم و معرفت حاصل کرے اور اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال سے آشنا ہو تو یہ ہر اس عبادت سے جو خلق سے تعلق رکھتی ہے فاضل تر ہے۔ اور تمام سعادتوں کی غایت یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت اور انس اس پر غالب ہو جائے اور انس ذکر حق سے مکمل ہوتا ہے اور محبت معرفت کا ثمر ہے۔ اور معرفت فکر کا ثمر ہے۔ اور یہ سب خلوت ہی سے میسر آتا ہے۔

فائدہ دوم: یہ ہے کہ خلوت نشینی کے باعث انسان بہت سی معصیتوں سے نجات پاتا ہے اور میل جول سے چار معصیتیں ایسی ہیں کہ جن سے نجات پانا ہر کسی کے بس کا نہیں۔

معصیت اوّل: غیبت کرنا یا غیبت سننا۔ یہ دین کی ہلاکت کا باعث ہے۔

معصیت دوم: امر معروف و نہی منکر اگر خاموش رہے گا تو یا تو فاسق ہوگا یا عاصی ہوگا۔ اور اگر ناراضگی کا اظہار کرے گا تو بہت سی خصومت اور وحشت کا سامنا کرنا ہوگا۔

معصیت سوم: ریا و نفاق: کہ میل جول میں لازم ہے کہ اگر خلق کے ساتھ مدارانہ کرے گا تو وہ اسے رنج پہنچائیں گے۔ اور اگر مدارا کرے گا تو جلد ریا میں پڑ جائے گا۔ کیونکہ مداہنت اور ریا کو مدارا سے الگ کرنا بہت دشوار ہے۔ اور اگر دو دشمنوں سے بات کرے گا اور ہر ایک کے ساتھ موافقت کرے گا تو یہ دوروئی ہوگی۔ اور اگر نہیں کرے گا تو ان کی دشمنی سے نجات نہ پائے گا۔ اور پست ترین صورت اس کی یہ ہے کہ جس سے ملے تو وہ شخص کہتا ہے کہ ''میں ہمیشہ آرزومند ہوں'' اور اکثر یہ جھوٹ ہوتا ہے۔ اور اگر اس قسم کے کلمات نہ کہے تو وہ متوحش ہوتے ہیں۔ اور اگر تم بھی ''میں ہمیشہ آرزومند ہوں'' کہو گے تو یہ نفاق اور دروغ ہوگا۔ اور کم ترین یہ ہو گا کہ ہر کسی سے پوچھے کہ ''کیسے ہو آپ کی قوم کا کیا حال ہے؟'' جب کہ باطن ان کے اندوہ سے کہ کیسے ہیں فارغ ہوگا تو یہ نفاق ہوگا۔

ابن مسعود کہتے ہیں کہ ''کوئی شخص ایسا ہوگا کہ باہر نکلے اور اسے کسی سے کام ہو تو اس کی اتنی تعریف اور خوشامد کرے کہ دین اس میں کھودے اور حاجت اس کی پوری ہوگئی ہو تو جب گھر لوٹا تو اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے''۔ سری سقطی ؒ کہتے ہیں کہ ''اگر کوئی بھائی میرے پاس آئے اور میں ہاتھ اپنی داڑھی میں پھیرنے لگوں کہ اسے درست کرلوں تو مجھے ڈر ہے کہ میرا نام منافقوں میں لکھ لیا جائے گا''۔

فضیل مسجد حرام میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بھائی ان کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا کہ ''کہئے کس لئے آئے'' تو وہ بولا ''اے بوعلی موانست کے لئے'' تو آپ نے فرمایا کہ ''یہ تو موانست کی نسبت وحشت سے

زیادہ مماثل ہے۔ آیا تو سوائے اس کے چاہتا ہے کہ تو میرے لئے اور میں تیرے لئے جھوٹی تعریف کروں۔ ایک جھوٹ تو میرے لئے بولے اور ایک جھوٹ میں تیرے لئے بولوں۔ لہٰذا یا تو تم یہاں سے چلے جاؤ یا میں اٹھ جاتا ہوں''۔ اور اگر کوئی اس قسم کی باتوں سے محترز رہ سکتا ہے اسے مجالست سے ضرر نہ ہوگا۔

اسلاف جب ایک دوسرے سے ملتے تو دنیا کے بارے میں نہ پوچھتے تھے صرف دین کے بارے میں احوال پرسی کرتے تھے۔ حاتم اصم نے حامد لفاف سے کہا ''آپ کیسے ہیں؟'' تو جواب دیا کہ ''بہ سلامت وعافیت'' تو حاتم نے کہا ''سلامتی اس وقت ہوگی کہ جب پل صراط سے گذر گئے اور عافیت اس وقت ہوگی جب بہشت میں داخل ہو گئے''۔ اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہتے کہ ''کیسے احوال ہیں؟'' تو فرماتے کہ جو کچھ میرے فایدہ کی ہے وہ میرے بس میں نہیں اور جو کچھ میرے لئے مضر ہے اسے دور کرنے پر میں قادر نہیں۔ میں اپنے کام میں گرو ہوں جب کہ کام میرا دوسرے کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ لہٰذا مجھ سے بڑھ کر مفلس اور بے چارہ کون ہوگا؟'' جب ربیع خثیم رضی اللہ عنہ سے لوگ کہتے کہ ''احوال کیسے ہیں؟'' تو آپ فرماتے کہ ''کمزور' گنہگار موت جس کے پیچھے لگی ہوئی۔ اپنی روزی کھاتا ہوں اور امید رحمت کی رکھتا ہوں''۔ اور جب ابو دردا سے پوچھا جاتا کہ: ''احوال کیسے ہیں؟'' تو وہ جواب دیتے کہ ''اچھے ہیں بشرطیکہ دوزخ سے بچ جاؤں'' اور جب اویس قرنی سے پوچھا جاتا کہ ''کہئے احوال کیسے ہیں؟'' تو آپ فرماتے کہ ''کیسا ہوگا احوال اس شخص کا کہ جب صبح بیدار ہوتا ہے تو نہیں جانتا کہ شام تک زندہ رہے گا کہ نہیں اور رات کو نہیں جانتا کہ صبح تک جئے گا کہ نہیں''۔ اور جب مالک دینار سے پوچھا جاتا کہ ''احوال کیسے ہیں؟'' تو فرماتے کہ ''کیسا ہوگا احوال اس کا جس کی عمر کم ہوتی جاتی ہو اور گناہ بڑھتے جاتے ہوں''۔ ایک دانا سے یہی سوال ہوا تو اس نے کہا کہ ''روزی اللہ تعالیٰ کی کھاتا ہوں اور فرماں برداری اس کے دشمن ابلیس کی کرتا ہوں!'' اور محمد بن واسع سے لوگ کہتے کہ ''احوال کیسے ہیں؟'' تو آپ فرماتے کہ ''کیسے ہو سکتے ہیں احوال اس کے جو ہر روز ایک منزل آخرت کے قریب ہو جاتا ہو؟'' حامد لفافؒ سے لوگ پوچھتے کہ ''احوال کیسے ہیں؟'' تو آپ فرماتے کہ ''میں یہ خواہش رکھتا ہوں کہ ایک دن عافیت میں ہوں'' تو لوگ کہتے کہ ''کیا اب عافیت میں نہیں ہو؟'' تو وہ فرماتے کہ ''عافیت اس دن ہوگی جب میں کسی معصیت کا مرتکب نہ ہوں گا''۔ اور ایک شخص سے بوقت مرگ یہی سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ ''کیسے احوال ہوگا اس کا جو لمبے سفر پر ہو اور زاد راہ سے خالی ہو اور ایک تاریک قبر میں ہو جہاں اس کا کوئی مونس نہ ہو اور ایک عادل بادشاہ کے حضور میں بے دلیل پیش ہو؟'' حسان بن ابی سنان رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ احوال کیسے ہیں؟'' تو فرمایا کہ کیسا ہوگا احوال اس کا جس کی موت یقینی ہے اور اسے زندہ کر کے اس سے حساب لیا جائے گا''۔

ابن سیرینؒ نے ایک شخص سے پوچھا کہ "احوال کیسے ہیں؟" تو آپ نے فرمایا کہ کیسے ہوں گے احوال اس کے جو پانچ سو درم کا مقروض ہو اور عیال دار ہو اور پاس اس کے کچھ نہ ہو"۔ ابن سیرینؒ اپنے گھر گئے ہزار درم لا کر اسے دیئے اور کہا کہ پانچ سو درم قرض خواہ کو دے اور باقی پانچ سو اپنے عیال پر صرف کر۔ اور میں نے عہد کیا کہ آئندہ کسی کی احوال پرسی نہ کروں گا"۔ اور آپ نے یہ اس لئے کیا کہ اگر اس کی ضرورت جاننے پر بھی پوری نہ کرے گا تو منافق ٹھہرے گا۔

بزرگ کہتے ہیں کہ ہم نے وہ لوگ بھی دیکھے ہیں کہ کبھی ایک دوسرے کو سلام نہ کہتے تھے لیکن اگر ایک دوسرے پر حکم دیتا تو جو کچھ اس کے پاس ہوتا اس سے دریغ نہ کرتا۔ اب ایسے لوگ ہیں کہ ایک دوسرے کی زیارت اتنی طویل کرتے ہیں کہ گھر کی مرغی کے بارے میں استفسار ہوتا ہے۔ لیکن ایک درم بھی مانگنے کی جسارت کی جائے تو انکار کر دیتے ہیں۔ تو یہ نفاق نہیں تو اور کیا ہے؟" پس جب خلق اس قسم کے اخلاق کی مالک ہو تو جو کوئی ان سے میل ملاپ رکھے تو اگر موافقت کرے تو اس نفاق اور دروغ میں شریک ہوگا۔ اور اگر مخالفت کرے گا تو اسے دشمن قرار دیں گے اور اسے اگر اَن جان کہیں گے اور سب اس کی غیبت میں لگ جائیں گے تو اس کا دین اُس کے باعث اُس دن کا اس کے باعث برباد ہو جائے گا۔

معصیت چہارم: جو خلق سے میل ملاپ کا لازمہ ہے یہ ہے کہ تم جس کی صحبت میں ہو گے اس کی سیرت کا اثر تم پر سرایت کرے گا۔ اس طرح کہ تمھیں پتا بھی نہ چلے گا۔ اور طبع تمھاری اس کی طبع سے ایسے متاثر ہوگی کہ تم اس سے بے خبر ہو گے۔ اور یہ ممکن ہے بہت سے گناہوں کا تخم ہو۔ جب نشست اہل غفلت کے ساتھ ہو۔ کیونکہ جو کوئی دنیاداروں سے ملتا ہے دنیا کے بارے میں ان کی حرص کو دیکھتا ہے تو اسی قسم کا اثر اس میں بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔ اور جو کوئی اہل فسق سے میل ملاپ رکھتا ہے اگرچہ فسق کو مانع ہو لیکن جب فسق کو بہ کثرت دیکھتا ہے تو فسق اس کی نگاہ میں معمولی ہو جاتا ہے اور جو معصیت بھی عام ہو جائے تو اس کی ممانعت دل سے رخصت ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی عالم کو ریشمی لباس میں ملبوس دیکھتے ہیں تو عیب سمجھتے ہیں اور دن بھر غیبت میں لگے رہتے ہیں اور اس کو برا نہیں جانتے۔ حالانکہ غیبت ریشم پہننے کی نسبت کہیں زیادہ بری ہے بلکہ غیبت تو زنا سے بھی صعب تر کہی گئی ہے۔ لیکن چونکہ غیبت عام ہوگئی ہے اس لئے اس کی برائی کا خیال ذہنوں سے اتر گیا ہے بلکہ اہل غفلت کا احوال سننا ایسے ہی مضر ہے جیسے احوال صحابہ اور بزرگوں کے احوال سننا فایدہ مند ہے اور ان کے ذکر کے وقت رحمت کی بارش ہوتی ہے۔ جیسے کہ حدیث میں ہے کہ "عند ذکر الصالحین تنزل الرحمة" اور رحمت کا سبب یہ ہے کہ اس سے خیر کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اور رغبت دنیا کم ہوتی ہے۔

جب کوئی ان کا احوال سنے تو۔ اسی طرح اہل غفلت کے ذکر کے وقت لعنت کی بارش ہوتی ہے لعنت کا سبب غفلت اور دنیا کی رغبت ہے اور ایسوں کا ذکر دین کے نقصان کا باعث ہے۔ پس ان سے میل جول نہایت برا ٹھہرا۔ اس بناء پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "بُرے شخص کی صحبت آہن گر کی سی ہے کہ اگر لباس نہ جلے گا تو دھواں تو اثر کرے گا۔ اور نیک کی صحبت عطّار کی سی ہے کہ اگر مشک نہ بھی دے عطر کی خوش بو تو مشام جان کو معطر کرے گی"۔ پس جان لیجئے کہ بُرے ہم نشین سے تنہائی بہتر ہے اور نیک نفس کی صحبت تنہائی سے افضل ہے جیسے کہ حدیث میں وارد ہے۔

پس جس کی صحبت تجھ سے دنیا کی رغبت دور کرے اور تجھے حق تعالیٰ کی جانب دعوت دے تو اس کی ہم نشینی بہت بڑی غنیمت ہے۔ اسے اپنے لئے لازم بنالے۔ اور جو کوئی اس کے برعکس ہو اس سے دوری اختیار کر خصوصاً اس عالم سے جو دنیا کا حریص ہو۔ اور اس کی گفتار اور کردار یکساں ہوں۔ تو ایسا شخص زہر قاتل کے مصداق ہے اور وہ حرمت اسلام کو دل سے صاف نکال باہر کرتا ہے۔ کیونکہ انسان کے جی میں آتا ہے کہ "اگر اس کے نزدیک ایمان داری کی کچھ اصل ہوتی ہے تو یہ عالم ایمان داری کے واسطے اولیٰ ہوتا"۔ اگر کوئی شخص روز ینے کا طبق سامنے رکھے مزے سے کھا رہا ہو اور ساتھ ہی اونچی آواز میں کہہ رہا ہو کہ اے مسلمانو اس روز ینے سے دور رہو کہ یہ تمام تر زہر ہے تو کون اسے باور کرے گا۔ اور کھانے میں اس کی دلیری دلیل اس امر کی ہے کہ روز ینے میں کوئی زہر نہیں۔ اور ایسے بھی ہیں جو حرام کھانے اور معصیت کرنے میں دلیر نہیں ہوتے لیکن جب سنتے یا دیکھتے ہیں کہ فلاں عالم یہی کرتا ہے تو بے باک ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ کسی عالم کی لغزش کا ذکر نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے دو سبب: ایک یہ غیبت ہوگی اور دوسرے یہ کہ لوگوں کو دلیر کرے گی کہ وہ اسے جواز کی دلیل قرار دے کر اس کا اقتدا کریں گے اور شیطان ایسوں کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ "تم فلاں عالم سے بڑھ کر صاحبِ حشمت اور پرہیز گار تو نہیں ہو سکتے"۔

اور عامی کے لئے مناسب یہ ہے کہ جس کسی عالم سے تقصیر دیکھے تو دو چیزوں کے بارے میں سوچے: ایک یہ کہ جانتا ہو کہ جب کوئی عالم تقصیر کرتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس کا علم اس کے لئے کفارہ بن جائے۔ کیونکہ علم ایک بزرگ شفیع ہے اور عامی کو اس کا علم نہیں۔ جب عمل نہ کرے تو بھروسہ کس پر کرے۔ تو دوسرے یہ کہ یہ جانے کہ عالم کا یہ جاننا کہ "حرام مال نہیں کھانا چاہئے"۔ وہ عامی کے اس علم کی طرح ہے کہ "شراب خواری اور زنا نہیں کرنا چاہئے"۔ اور ہر کوئی اس قدر تو عالم ہوتا ہے کہ "شراب اور زنا ممنوع ہیں" اور اگر عام آدمی شراب پئے گا تو وہ دوسروں کے لئے حجت نہ ہوگا۔ اور عالم کے حرام کھانے کا عمل بھی اسی نوعیت کا ہے۔

بیشتر لوگ حرام خواری پر وہ دلیر ہوتے ہیں کہ جو نام کے عالم ہوتے ہیں اور حقیقت علم سے عاری ہوتے ہیں۔ یا اپنے ایسے عمل کے لئے کوئی عذر اور تاویل کرتے ہیں جس کا فہم عوام نہیں رکھتے۔ اس لئے چاہئے کہ عامی ایسی نگاہ سے دیکھے جو اس کی ہلاکت کا باعث نہ ہو۔

غرض یہ ہے کہ زمانہ ایسا آن لگا ہے کہ بیشتر خلق سے حذر کرنا چاہئے۔ موسیٰ علیہ السلام اور خضر کی مثال کہ خضر نے کشتی میں شگاف ڈال دیا اور موسیٰ نے اس پر ٹوکا تو یہ واقعہ قرآن میں اس لئے مذکور ہوا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ زمانہ ایسا ہے کہ خلق سے زیادہ صحبت زیان کا باعث ہے۔ پس زیادہ لوگوں سے صحبت کی نسبت عزلت اور گوشہ گیری بہتر ہے۔

فائدہ سوم: یہ ہے کہ کوئی شہر فتنہ وخصومت سے خالی نہیں ہے الا ماشاء اللہ۔ لہٰذا جس نے عزلت اختیار کی وہ فتنے سے نجات پا گیا۔ اور اگر میل ملاپ رکھے گا تو فتنہ میں پڑ جائے گا اور دین اس کا مختل ہو جائے گا اور خود خطر میں جا پڑے گا۔

عبداللہ عمرو عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جب تو لوگوں کو غصے میں اس طرح دست وگریباں دیکھے۔ (آپ نے اپنی انگلیوں کو آپس میں گلو گیر کیا)[1]۔ تو اپنے گھر کے اندرون کو اپنے لئے لازم بنا لینا اور زبان کو حفاظت میں رکھنا اور جس قدر جانتا ہے اس پر عمل پیرا رہنا اور جس کا علم نہیں اسے چھوڑ دینا اور اپنے خصوصی عمل (کار دین) میں مصروف رہنا اور عوام کے کام کو چھوڑ دینا''۔ عبداللہ بن مسعود راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ مرد کا دین سلامتی نہ پائے گا سوائے اس کے کہ مرد ایک جگہ سے بھاگ کر دوسری جگہ جائے یا ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ کی طرف جائے اور ایک غار سے دوسری غار کی طرف لومڑی کی طرح جو اپنے آپ کو خود اپنی ذات سے چھپاتی پھرتی ہو''۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ وہ زمانہ کب آئے گا؟'' آپؐ نے فرمایا کہ ''روزی بے معصیت ہاتھ نہ آ سکے گی۔ تو ایسے میں مجرد رہنا حلال ہوگا۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ ''یہ کیونکر اللہ کے رسول؟ کیونکہ آپؐ نے تو ہمیں نکاح کا حکم دیا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس وقت مرد کی ہلاکت ماں باپ کے ہاتھ سے ہوگی اور وہ مر چکے ہوں تو ہلاکت بیوی بچوں کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوگی اگر اہل وعیال نہ ہوں تو اہل قرابت کے ہاتھوں ہوگی''۔ صحابہؓ نے

---

[1] احیاء علوم الدین (ترجمہ فارسی) میں ہے کہ ''عبداللہ عمرو عاص نے کہا کہ آنحضرت نے جب فتنوں کا ذکر کیا اور ان کی صفات بیان کیں تو فرمایا کہ ''جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وقت وہ ہوگا کہ لوگوں کے عہد و پیمان آشفتہ ہوں گے اور ان کی امانت داریاں ضعیف ہوں گی۔ اور ایسے ہوں گے: آپ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسری کے ساتھ گلوگیر کر دیا''۔

استفسار فرمایا: ''کس لئے؟'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ وہ تنگ دستی اور مفلسی کے باعث اسے ملامت کریں گے اور وہ چیز جس کی استطاعت وہ نہیں رکھتا طلب کریں گے جس سے اسے ہلاکت کا سامنا ہوگا''۔ اگرچہ یہ حدیث تجرد کے بارے میں ہے عزلت بھی اس سے معلوم ہوتی ہے۔ اور جس زمانے کا آنحضرت ﷺ نے ذکر کیا تھا وہ زمانہ تو عرصے سے ہمارے اس عہد سے بھی پہلے آ چکا ہے۔

سفیان ثوری اپنے زمانے کے بارے میں کہتے ہیں کہ '' وَاللہِ لقد حَلَّتِ العُزوبہ '' (اللہ کی قسم اب مجرد رہنا حلال ہے)۔

فائدہ چہارم: یہ ہے کہ خلوت میں انسان لوگوں کے شر سے محفوظ اور آسودہ رہتا ہے۔ کیونکہ جب تک لوگوں کا ہم صحبت رہے گا تو ان کے رنج، غیبت اور بدگمانی سے مامون نہ رہے گا۔ اور محال تمناؤں سے خلاصی نہ پائے گا اور اس بات سے خالی نہ رہے گا کہ جب لوگ اس سے کوئی ایسی چیز دیکھیں گے کہ جس کے سمجھنے سے ان کی عقل عاری ہو تو وہ اس پر زبان درازی شروع کردیں گے تو سالک اگر چاہے کہ سب کے حقوق کی ادائیگی تہنیت، تعزیت اور مہمانی وغیرہ کے باب میں مستعد ہو تو وہ اپنا تمام وقت انھی امور کی نذر کردے گا اور اپنے حقیقی کام میں مشغول نہ ہو پائے گا۔ اور اگر ملنے والوں میں امتیاز کرے گا تو دوسرے متوحش ہوں گے اور اس کی تکلیف کا باعث بنیں گے۔

بزرگوں میں ایک ایسے بھی تھے کہ ہمیشہ قبرستان میں رہتے اور ایک کتاب ان کے ہاتھ میں ہوتی۔ اور تنہا بیٹھے رہتے۔ تو لوگوں نے پوچھا کہ ''ایسے کیوں کرتے ہو؟'' تو انھوں نے کہا کہ مجھے تنہائی سے بڑھ کر کوئی جگہ نہیں ملی۔ اور قبرستان سے بہتر واعظ میں نے نہیں دیکھا۔ اور کتاب سے بہتر کسی کو مونس نہیں پایا''۔

ثابت بنانیؒ جملہ اولیاء میں سے تھے۔ انھوں نے حسن بصری کو لکھا کہ ''میں نے سنا ہے کہ آپ حج کے لئے جائیں گے تو میں چاہتا ہوں کہ آپ کی صحبت میں میں بھی یہ فریضہ انجام دوں''۔ تو حسن نے جواب میں لکھا کہ ''چھوڑیئے تا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے پردے کے سائے میں زندگی بسر کریں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جب ہم اکٹھے ہوں تو ایک دوسرے سے کوئی ایسی چیز دیکھیں جس سے باہم دشمن ہو جائیں۔'' عزلت کے فوائد میں ایک یہ بھی ہے کہ پردہ مروت قائم رہتا ہے اور باطن ننگے نہیں ہوتے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ غیر متوقع شئے ظہور پذیر ہو۔

فائدہ پنجم: یہ ہے کہ لوگوں کی طمع اس سے اور اس کی طمع لوگوں سے منقطع ہو جاتی ہے کہ ان دونوں طمعوں سے بہت سی معصیتیں اور مصائب پیدا ہوتے ہیں کیونکہ جو کوئی دنیاداروں سے میل ملاپ رکھتا ہے اسے بھی دنیا کی طمع پیدا ہو جاتی ہے اور طمع حرص کی متبع ہے۔ اور خواری طمع کی متبع ہے۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ کا فرمان

ہے کہ: ''وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا''[۱]۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''چشم رغبت سے ان لوگوں کی آراستہ دنیا کو نہ دیکھو کیونکہ وہ ان کے حق میں فتنہ ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''جو کوئی دنیوی اعتبار سے تم سے بالاتر ہے تو اس پر نگاہ نہ ڈالو کیونکہ اس سے حق تعالیٰ کی نعمت تمھاری نگاہ میں حقیر ہو جائے گی'' اور جو کوئی دولت مندوں کی نعمتوں کی طرف دیکھ کر ان کی طلب میں پڑتا ہے تو وہ ہاتھ نہیں آتیں اور آخرت کو ضرر پہنچ جاتا ہے۔ اگر طلب نہ کرے لیکن مجاہدے اور صبر کا سامنا ہوگا جو دشوار ہے۔

فائدہ ششم: خلوت کا یہ ہے کہ انسان غافلوں اور احمقوں اور ان لوگوں کے دیدار سے بچا رہتا ہے جو طبعاً ناپسند ہیں۔ اعمشؒ سے لوگوں نے پوچھا ''تمھاری آنکھ کس وجہ سے مختل ہوگئی ہے؟'' تو فرمایا اس لئے کہ میں نے غافلوں پر بہت نگاہ ڈالی تھی'' جالینوس کہتا ہے کہ جیسے جسم کے لئے بخار کی بیماری ہے۔ روح کے لئے بھی تپ کی بیماری ہے اور وہ ہے احمقوں کا دیدار''۔ حضرت شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں کبھی غافلوں کے ساتھ نہیں بیٹھا کہ میرا وہ پہلو جو ان کی جانب ہوتا تھا بوجھل نہ ہوگیا ہو''۔ خلوت سے دنیوی فوائد کے علاوہ دینی فوائد بھی ہیں۔ کیونکہ جب انسان کسی ایسے کو دیکھتا ہے کہ جس کا دیدار ناگوار ہو تو انسان بہ زبان یا بہ دل اس کی غیبت کرنے لگتا ہے۔ ~~دیکھو اور یہ متاع اس دنیا کا شگوفہ ہے جو چمکدار ہے لیکن پائیدار نہیں~~۔ اور جب تنہا ہوگا تو اس قسم کے گناہوں سے بچا رہے گا۔ یہ ہیں گوشہ گیری کے فواید۔

تنہائی کی آفات

یاد رہے کہ دینی اور دنیوی مقاصد میں سے بعض ایسے ہیں جو دوسروں کے بغیر حاصل نہیں ہوتے اور ان سے ملے بغیر دل خواہ نہیں ہوتے اور عزلت میں یہ ممکن نہیں اور وہ مقاصد فوت ہو جاتے ہیں اور ان کا فوت[۲] ہونا عزلت کی آفات کی وجہ سے ہے اور وہ آفات تعداد میں چھ ہیں:

آفت اوّل: یہ ہے کہ انسان تعلیم و تعلم سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس لئے جس نے وہ علم جس کا جاننا فرض ہو اور اس نے وہ ابھی حاصل نہ کیا ہو تو اس کے لئے عزلت حرام ہے۔ لیکن اگر کسی نے فرض شدہ علم تو

۱۔ قرآن: ۲۰/۱۳۱: وہ متاع جو ہم نے دولت مندوں اور نافرمانوں کو عطا کیا ہے اس کی طرف رغبت کی نگاہ سے نہ دیکھو اور یہ متاع اس دنیا کا شگوفہ ہے جو چمکدار ہے لیکن پائیدار نہیں۔

۲۔ احیاء علوم الدین میں ہے: پس وہ سب جو لوگوں سے ہم صحبت ہونے سے حاصل ہوتا ہے وہ عزلت میں فوت ہو جاتا ہے اور ان کی فوات عزلت کی آفات میں سے ہے۔

حاصل کرلیا ہواور دیگر علوم کونہیں سیکھ سکتا نہ انھیں سمجھ سکتا ہے وہ اگر عبادت کے لئے گوشہ گیر ہونا چاہے تو اس کے لئے جائز ہے۔ اور اگر علوم شرع بہ تمام وکمال سیکھنا چاہے تو اس کے لئے گوشہ گیری میں خسرانِ عظیم ہے۔ کیونکہ جو کوئی علم سیکھنے سے پہلے گوشہ گیر ہوتا ہے۔ تو اپنے بیشتر اوقات سونے میں یا بیکاری میں یا پراگندہ خیالی میں ضایع کرتا ہے۔ اور اگر دن بھر عبادت میں مصروف رہتا ہے تو چونکہ علم میں ہنوز مستحکم نہیں ہوتا تو عبادت میں غرور اور مکر سے خالی نہیں ہوتا۔ اور اعتقاد میں غلط فکری اور محال سے خالی نہیں ہوتا۔ اور حق تعالیٰ کے باب میں جو خیال آتے ہیں ہوسکتا ہے کہ وہ کفریہ ہوں۔ یا بدعت ہوں جس کا علم اسے نہیں ہوتا اور گوشہ گیری علماء کو چاہئے نہ کہ عوام کو۔ کیونکہ عامی جب بیمار ہوتا ہے تو اسے طبیب سے گریز نہیں کرنی چاہئے اور اگر اپنا علاج خود کرے گا تو جلد ہلاک ہو جائے گا۔

اور تعلیم دینے کا درجہ بہت بلند ہے۔ حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں کہ: ''جو کوئی علم سے بہرہ ور ہے اور وہ علم سے کام لیتا ہے اور دوسروں کو علم سکھاتا ہے اسے ملکوتِ آسمان سے عظیم کہا جاتا ہے''۔ اور تعلیم عزلت میں ممکن نہیں۔ پس تعلیم عزلت سے اولیٰ تر ہے اور یہ الویت اس امر سے مشروط ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں کی نیت دین کی ہو نہ کہ طلبِ جاہ ومال کی۔ اور چاہئے کہ معلّم وہ تعلیم دے جو دین میں فایدہ مند ہو۔ اور جو زیادہ اہم ہو اسے پہلے تعلیم کرے مثلاً جب طہارت کی تعلیم شروع کرے تو کہے کہ کپڑے اور جسم کی پاکی کم اہم ہے اور مقصود اس سے ایک اور پاکیزگی ہے جو اس کے سوا ہے۔ اور وہ ہے آنکھ کی پاکیزگی اور زبان ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضا کی پاکیزگی معاصی سے۔ اور اس کی تفصیل بیان کرے تاکہ شاگرد اس کو عمل میں لائے۔ اور وہ اگر اسے عمل میں نہیں لاتا اور مزید علم کا طالب ہو تو مقصود اس کا جاہ ہے اور جب اس طہارت سے فارغ ہو جائے تو کہے اس طہارت سے ماورا ایک اور طہارت مقصود ہے اور وہ ہے دنیا کی دوستی سے دل کی پاکیزگی اور جو کچھ ماسوائے اللہ کے ہے اس سے پاکیزگی مقصود ہے۔ اور لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا کوئی معبود نہیں مگر اللہ تعالیٰ اور جو کوئی اپنی خواہشوں کا غلام ہے۔ ''فقد اتحذ اللہ ھواہ'' اس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے اور وہ ایمان کی حیثیت سے محروم ہے۔ اور خواہشوں سے نجات پانے کی راہ سے ناواقف رہے گا جب تک وہ جو کچھ ہم نے رکن منجیات اور مہلکات میں تحریر کیا ہے اسے نہ پڑھے۔ اور یہ تمام افراد کے لئے فرض عین ہے۔ اور جو طالب علم اس فرض عین علم کے حصول سے پہلے علم حیض، طلاق، خراج وفتاویٰ وخصومات طلب کرے یا مذہب مناظرہ، جدل، علم کلام وغیرہ طلب کرے یا معتزلہ یا کرامیوں یا ایسے ہی اور علم کا متقاضی ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ ان سے جاہ ومال طلب کرنا چاہتا ہے نہ کہ دین۔ تو ایسے طالب کو خود سے دور کر دینا چاہئے۔ کیونکہ اس کا شر بہت

بڑا ہوگا۔ اور جب شیطان کے ساتھ جو اس کی ہلاکت کا خواہاں ہے مناظرہ نہ کرے اور اپنے نفس کے ساتھ کہ اس کا دشمن ہے خصومت نہ کرے اور چاہتا ہو کہ خصومت و مناظرہ ابوحنیفہ، شافعی اور معتزلہ کے ساتھ کرے تو یہ امر دلیل اس کی ہے کہ وہ شیطان کے پنجے میں گرفتار ہے۔ شیطان اس سے خنداں ہے۔ اور اس کے باطن میں حسد و کبر وریا و عُجب و دنیا دوستی و شر جاہ و مال کی سی صفات ہیں کہ سب کی سب اس کی ہلاکت کا باعث ہیں تو جب تک اپنے دل کو ان رذائل سے پاک نہ کرے گا اور مصروف اس میں ہو جائے کہ فتاوائے نکاح وطلاق وسَلَم واجارہ کون سا زیادہ صحیح ہے؟ اور اگر کسی نے اس میں خطا کی ہے تو اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ثواب اس کا دو سے ایک ہو۔ کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''جس نے اجتہاد کیا اور صحیح ٹھہرا ہو تو اس کو دوگنا ثواب ہے۔ اور اگر اجتہاد میں خطا کی تو ثواب ایک گنا ہوگا''۔ پس اگر شافعیؒ کا مذہب اختیار کرے یا ابوحنیفہ کا تو ان علوم کا مصرف اس سے کچھ زیادہ نہ ہوگا۔ اور جب تک مذکورہ بالا رذایل کو اپنے دل سے مٹائے گا نہیں تو مصرف ان کا اس کے دین کی ہلاکت ہے۔

اور زمانہ وہ آن لگا ہے۔ ایک بڑے شہر میں ایک یا دو اصحاب علم و دانش نہ پائے گا کہ وہ تعلّم میں اس انداز سے ان کی طرف راغب ہو۔ پس مدرس کے لئے بھی گوشہ گیری اولیٰ تر ہے۔ کیونکہ جسے وہ تعلیم دے رہا ہے اس کا ارادہ مقصد دنیا ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی ایسے کے ہاتھ تلوار فروخت کرے جس کا مقصد راہ زنی ہو۔ اگر مُعلّم یہ کہے کہ ہوسکتا ہے وہ دین کی راہ اختیار کرے''۔ وہ ایسے ہی ہے جیسے کہ کہے کہ ''ہوسکتا ہے یہ راہزن ایک دن توبہ کرلے اور مذہبی جنگ یعنی غزوات میں شریک ہو جائے''۔ اور اگر کہے کہ ''تلوار راہزن کو توبہ کی طرف نہیں بلاتی لیکن علم انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہے''۔ تو یہ بات بھی غلط ہے کیونکہ خصومات ومعاملات کے فتاویٰ، علم کلام، علم نحو ولغت وغیرہ کسی شخص کو اللہ کی طرف نہیں بلاتے کیونکہ ان میں دین کے لئے تحذیر و ترغیب کا سامان نہیں ہے۔ بلکہ ان علوم میں سے ہر ایک انسان کے دل میں حسد و مباہات و کبر و تعصب کا بیج بو دیتا ہے۔ ''ولَیسَ الخَیر کَالمُعَانیه'' (شنیدہ کے بود مانند دیدہ؛ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ جو لوگ ان علوم میں مصروف رہے ہیں وہ کیسے لوگ تھے اور کیسے مرد ہیں۔ وہ علم جو انسان کو آخرت کی دعوت دیتا ہے اور دنیا داری سے مانع ہے وہ علم حدیث اور علم تفسیر ہے اور وہ علوم ہیں جن کا ذکر ہم نے مہلکات اور منجیات میں کیا ہے۔ بے شک ان علوم کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہئے۔ کہ یہ علوم ہر انسان پر اثر کرتے ہیں۔ سوائے نادر کے کیونکہ شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جو قسی القلب ہو۔ پس اگر کوئی اس شرط کے ساتھ جو بیان ہوئی علم کا طالب ہو تو ایسے مستعد افراد کو علم سے محروم رکھنا گناہِ عظیم ہے۔ لیکن کوئی علم حدیث و تفسیر اور جو کچھ اس سلسلے میں اہم ہے

پڑھے لیکن اگر اپنے اوپر طلب جاہ کو غالب دیکھے تو اسے چاہئے کہ تحصیل علم کو چھوڑ دے۔ اگر چہ اس کی تعلیم سے دوسروں کی بھلائی بہت ہو لیکن خود اس کے لئے اس میں ہلاکت ہے؛ وہ دوسروں پر قربان ہو جائے گا اور ان میں ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے دین کی نصرت حاصل کرتا ہے کہ خود جن کو دین سے کچھ نصیب نہیں ہوتا''۔ مثال ان کی شمع کی سی ہے کہ گھر اس سے روشن ہو جاتا ہے جب کہ شمع خود جلنے اور کم ہونے میں لگی رہتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بشر حافی نے کہ جس کے پاس سات[1] توبرے کتب حدیث کے تھے جو اس نے سن رکھی تھیں زیر زمین دفن کر دیئے تھے اور پھر بیان حدیث بند کر دیا تھا اور کہتے تھے: ''میں اس لئے اب حدیث کی روایت نہیں کرتا کہ خود میں روایت کی خواہش پاتا ہوں اگر آرزو خاموشی کی ہوتی تو میں ضرور روایت حدیث کرتا'' اور ایسے ہی بزرگوں نے کہا ہے کہ 'حدثنا'[2] کا کلمہ دنیا کی طرف ایک دروازہ ہے۔ اس لئے جو کوئی کہتا ہے کہ ''حدثنا'' تو مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ مجھے صدر میں جگہ دو''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک شخص کے پاس سے گذرے جو منبر پر بیٹھا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ''اَعرِفُونِی'' (مجھے پہچانو) اسی طرح ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اجازت مانگی کہ نماز سحر کے بعد لوگوں کو وعظ کہے۔ تو حضرت رضی اللہ عنہ نے اجازت نہ دی تو وہ شخص بولا کہ ''نصیحت کرنے سے روکتے ہو؟'' تو فرمایا ''ہاں'' کیونکہ مجھے خوف ہے کہ تم خود میں بادِ غرور اتنی بھر لو گے کہ ثریا تک جا پہنچو گے۔ اور رابعہ عدویہؒ نے سفیان ثوری رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ''تو نیک انسان ہوتا اگر تجھے دنیا عزیز نہ ہوتی'' سفیان ثوری نے پوچھا: ''وہ دنیا کون سی ہے؟'' فرمایا تم روایت حدیث کو بہ آرزو چاہتے ہو''۔ ابوسلمان خطائی کہتا ہے کہ ''اس زمانے میں جو کوئی یہ چاہتا ہے کہ تمھارا ہم صحبت ہو اور علم کی تدریس کی خواہش رکھتا ہو تو ایسوں سے محترز رہو۔ کیونکہ ان کے پاس مال ہے نہ جمال بہ ظاہر دوست ہیں لیکن بباطن دشمن ہیں۔ منہ پر تعریف کرتے ہیں اور عدم موجودگی میں برائی بیان کرتے ہیں۔ سبھی اہل نفاق اور غیبت گو اور فریبی ہیں۔ اور مقصد ان کا یہ ہوتا ہے کہ تجھے اپنے لئے سیڑھی بنائیں اور اپنی فاسد اغراض کے لئے تجھے سواری بنائیں اور تو انھیں شہر میں خود پر سوار کر کے شہرت دے اور تیرے پاس آنے کو احسان دھریں اور چاہتے ہیں کہ تو اپنی نیکی اور جاہ و مال ان پر نچھاور کرے۔ اس بات کی وجہ سے کہ وہ چل کر

---

[1] احیاء علوم الدین میں لکھا ہے کہ: اسی لئے کہتے ہیں کہ بشر نے سترہ[۱۷] توبروں سے جو کتب حدیث سے پُر تھے جو انھوں نے سنی تھیں دفن کر دیا اور روایت حدیث نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ''مجھے روایت کی خواہش ہے''

[2] 'حدثنا' (ہمیں بیان کیا) وہ کلمہ ہے جسے حدیث نقل کرتے ہوئے راویانِ حدیث زبان پر لاتے تھے۔

تمھارے پاس آئے ہیں۔اوران کے حقوق کے علاوہ ان کے عزیز واقارب کے حقوق پورے کرنے کے لئے کمربستہ رہے۔اورتو ان کی قوم کا ادنیٰ خادم بنا رہے۔ان کے دشمنوں کا دشمن ہو۔اوراگران میں سے کسی ایک امر میں تقصیر کرے تو پھر دیکھے کہ تیری آبرو تیرے علم اور تیری ذات کے بارے میں کیسے دشمن ظاہر ہوتے ہیں۔اور یہ درحقیقت ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے کہ خطائی نے بیان کیا ہے۔کیونکہ آج کل کوئی شاگرد استاد کو مفت میں قبول نہیں کرتا۔اول یہ کہ وظیفہ چاہتے ہیں جو مستقل ہو اور مدرس بیچارہ نہ تو یہ تاب رکھتا ہے کہ شاگرد کو چھوڑ دے کیونکہ اس طرح لوگوں کی نظروں میں محتشم نہ رہے گا۔اور نہ شاگردوں کو روزینہ فراہم کرنے کا متحمل ہوسکتا ہے۔اِلّا یہ کہ ظالموں کی خدمت میں جائے اوران کے ساتھ مداہنت کا مرتکب ہو۔اوراپنی مسلمانی کو ان کے سرکا تاج بنائے لیکن ان سے کچھ بھی حاصل نہ کرپائے۔لیکن جو تدریس کا اہل ہو اور مذکورہ آفات سے دور رہ سکتا ہو اس کے لئے تعلیم دینا گوشہ گیری سے برتر ہے۔

اب عامی کے لئے لازم ہے کہ جس عالم کو بھی عامۃ الناس سے مخاطب یا تدریس میں دیکھے تو اس پر بدگمانی نہ کرے کہ یہ مال و جاہ کے لئے کرتا ہے۔ بلکہ گمان یہ کرنا چاہئے کہ وہ یہ کام اللہ تعالیٰ کے لئے کررہا ہے۔کیوں کہ عامی کا فرض یہی ہے کہ خوش گمانی سے کام لے۔جب باطن پلید ہو تو خوش گمانی کے لئے جگہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہرکوئی دوسروں کو اپنے نفس پر قیاس کرتا ہے۔اور یہ اس لئے کہا گیا ہے کہ عالم اپنا فرض ادا کرے اور عامی اپنی حماقت کی بناء پر حیلہ جوئی نہ کرے نیز علماء کی مذمت نہ کرے کیونکہ اس بدگمانی کے ہاتھوں مارا جائے گا۔

آفت دوم: گوشہ گیری کی یہ ہے کہ انسان منفعت گیری اور منفعت رسانی سے رہ جاتا ہے۔اور حصولِ منفعت روزی کمانے سے ممکن ہے اور یہ دوسروں کے ساتھ روابط کے بغیر درست نہیں اور جو کوئی عیال دار ہو اور کوئی کام روزی کے لئے نہ کرتا ہو اسے گوشہ گیر نہ ہونا چاہئے۔کیونکہ اہل وعیال کو کھونا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔اگر روزی بقدر کفاف رکھتا ہو اور بیوی بچوں کا بکھیڑا نہ ہو تو اس کے لئے خلوت گزینی زیادہ اچھی ہے۔

اور دوسروں کو منفعت پہنچانا صدقہ دینے اور مسلمانوں کے حقوق کے لئے کمربستہ ہونے کے مترادف ہے۔اس لئے اگر کوئی تنہائی میں بجز ظاہر عبادات کے مصروف نہ رہے گا تو اس کی نسبت اس کا کسب حلال کرنا اور صدقہ دینا گوشہ گیری سے اولیٰ تر ہے۔اور اگر اس کے باطن میں حق تعالیٰ کے جلال کی معرفت اور مناجات سے انس کی راہ کھل گئی ہے تو یہ تمام صدقات سے فاضل تر ہے کیونکہ تمام عبادتوں کی غرض وغایت یہی ہے۔

آفتِ سوم: یہ ہے کہ انسان اس مجاہدے اور ریاضت سے جو لوگوں کی عادات پر صبر کرنے سے

حاصل ہوتے ہیں محروم رہتا ہے۔ اور یہ اس شخص کے لئے نہایت عظیم فایدہ ہے جس نے ابھی ریاضت نہ پائی ہو۔ کیونکہ اچھی عادت تمام ریاضتوں اور عبادتوں کی اصل ہے۔ جو انسانوں سے میل جول کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور خوش اخلاقی یہ ہے کہ انسان دوسروں کی بیہودگیوں پر صبر کرے۔ اور صوفیوں کے خادم لوگوں سے اسی لئے ملتے ہیں تا کہ لوگوں سے مانگنے کی وجہ سے رعونت اور کبر کا ازالہ ہوتا ہے۔ اور صوفیوں کے لئے نفقے سے دولت مندوں کے بخل کو دور کرتے ہیں اور امرا سے سست وسخت سن کر خود کو بااخلاق بناتے ہیں۔ اور ان کی خدمت کر کے ان کی دعا اور ہمت سے برکت حاصل کرتے ہیں۔ پہلے آغاز کار یہیں سے ہوتا تھا اگرچہ اب نیتیں اور سوچ بدل گئے ہیں اور بعضوں کا مقصد مال وجاہ ٹھہر گیا ہے۔ پس اگر کسی نے ریاضت کر لی ہو اس کے لئے خلوت گزینی اولیٰ تر ہے کیونکہ غرض ریاضت کی یہ نہیں ہے کہ ساری عمر تکلیف اٹھاتا رہے۔ جیسے دوا کا مقصود تلخی نہیں ہوتا بلکہ غرض یہ ہوتی ہے کہ بیماری جاتی رہے۔ جب بیماری جاتی رہی تو پھر بہ دوام دوا کی تلخی برداشت کرنا لازم نہیں ہوتا۔ بلکہ مقصود ورائے ریاضت ہے۔ اور وہ ہے حق تعالیٰ کے ذکر سے انس کا حصول۔ اور مقصود ریاضت کا یہ ہے کہ جو چیز اسے اللہ تعالیٰ کے انس سے روکتی ہے اسے خود سے دور کرے تا کہ حق تعالیٰ کے انس میں لگ جائے۔ یاد رہے کہ جس طرح خود ریاضت کرنا ناگزیر ہے اسی طرح دوسروں کو ریاضت سے بہرہ مند کرنا اور دوسروں کی تربیت کرنا بھی دین ہی کا کام ہے۔ ظاہر ہے یہ خلوت گیری میں ممکن نہیں۔ بلکہ پیر معرفت کو مریدوں کے ساتھ ہم نشینی ناگزیر ہے۔ اور مریدوں سے تنہائی شرط نہیں۔ لیکن جس طرح علماء کے لئے لازم ہے کہ طلب جاہ اور آفت ریا سے محترز رہیں۔ مشائخ کو بھی محترز رہنا چاہئے کیونکہ مریدوں سے ہم نشینی لازم ہے اس لئے گوشہ گیری کی نسبت بہتر ہے۔

آفتِ چہارم: یہ ہے کہ خلوت میں احتمال اس کا ہے کہ وسواس غلبہ کرے اور ہوسکتا ہے دل ذکر حق سے نفور ہو جائے اور ملول ہو جائے۔ ان خرابیوں سے نجات لوگوں کے ساتھ ہم جلیسی کے بغیر ممکن نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "اگر مجھے وسواس کا خوف نہ ہوتا تو میں لوگوں کی ہم نشینی کبھی اختیار نہ کرتا۔" حضرت علی ابن طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "دل کی راحت دل سے واپس نہ لو کیونکہ دل کو اگر ایک دفعہ کراہت سے آشنا کرو گے نابینا ہو جائے گا"۔

پس چاہئے کہ ہر روز ایک ایسا شخص ہونا چاہئے کہ جس کی موانست سے استراحت ہو جس سے نشاط میں فروغ ہو لیکن ضروری ہے کہ وہ شخص ایسا ہو دینی مسائل کی گفتگو ہو اور دین میں اپنی تقصیر کے احوال کے بارے میں بات چیت ہو یا اسباب دین کی فراہمی کی تدبیر زیر بحث آئے۔ لیکن اہل غفلت کے ساتھ ایک گھڑی

ہی کی نشست کیوں نہ ہو مضر ہوتی ہے اور وہ صفائی دل جو پورے دن کا ثمر ہو تیرہ وتار ہو جاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''جو کوئی بہ صفت دوست کسی کا ہم نشین ہو اس کے لئے یہ لازم ہے کہ بہ غور دیکھے کہ دوست کس کا ہے''۔

آفتِ پنجم: یہ ہے کہ خلوت گزینی کے باعث انسان سے عیادت، تشیع جنازہ اور دعوت، تہنیت و تعزیت وغیرہ کے سے لوگوں کے حقوق فوت ہو جاتے ہیں اور ان کاموں میں بھی آفت ہے کہ رسم نفاق اور تکلف نے راہ پالیا ہے۔اور ہو سکتا ہے کہ کوئی ان آفات سے خود کو بچا نہیں سکتا۔اور اس کی شرط نبھا نہیں سکتا تو ایسے شخص کے لئے عزلت گزینی ہی اولیٰ تر ہے۔اور اسلاف میں بہت ایسے تھے ایسا ہی کیا اور اس سب کو ترک کر دیا کیونکہ انھوں نے سلامتی عزلت میں دیکھی تھی۔

آفتِ ششم: یہ ہے کہ لوگوں سے میل جول اور لوگوں کے حقوق کی ادائیگی پر کمر بستہ ہونا ایک قسم کی انکساری ہے۔ جب کہ عزلت گزینی ایک قسم کا تکبر ہے اور ممکن ہے کہ عزلت کا سبب خواجگی اور تکبر ہو۔اور یہ کہ خلوت نشین چاہتا ہے کہ لوگ تو اس کی زیارت کو آئیں اور وہ خود کسی کو ملنے نہ جائے۔ کہتے ہیں بنی اسرائیل میں ایک حکیم تھا بزرگ، اس نے تین سو ساٹھ کتب تصنیف کی تھیں حکمت کے موضوع پر، یہاں تک کہ اس میں گمان یہ پیدا ہوا کہ جیسے اللہ کے نزدیک اسے مرتبہ مل گیا ہے۔اس زمانے کے پیغمبر پر وحی نازل ہوئی کہ ''اسے کہو کہ روئے زمین پر اپنے جنجال اور آوازے کا سامان کیا ہے تو میں تمھاری یہ شہرت پسندی کو قبول نہیں کرتا''۔پس وہ ڈر گیا اور ہاتھ اس سے کھینچ لیا اور خالی ایک گوشے میں بیٹھ گیا اور کہا: ''کیا اب اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہیں؟'' تو وحی آئی کہ ''میں اس سے خوشنود نہیں ہوں''۔پس خلوت سے باہر نکل آیا اور بازاروں میں جانے لگا۔لوگوں سے ملتا جلتا اور ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔تو وحی آئی کہ ''اب اس نے میری رضا پائی''۔

یاد رہے کہ ممکن ہے کوئی خلوت نشین تکبر کے باعث اختیار کرے کہ اس کو ڈر ہو کہ مجامع اور محافل میں میرا احترام ملحوظ نہ رکھیں گے۔یا اس لئے ڈرے کہ لوگ اس کے علم یا عمل کے نقص سے آگاہ ہو جائیں گے۔اور گوشہ نشینی کو اپنے نقائص کا پردہ بنالے اور ہمیشہ اس کا آرزومند ہو کہ لوگ اس کی زیارت کو آئیں اور اسے تبرک کا اظہار کریں اور تعریف کریں اور اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیں۔تو یہ گوشہ گیری عین نفاق ہے۔

اور وہ عزلت گزینی جو اللہ کے لئے ہوتی ہے اس کی علامت دو چیزیں ہیں: یہ کہ خلوت میں کبھی بیکار نہ بیٹھے بلکہ ذکر و فکر میں مشغول رہے۔اور علم و عبادت میں لگا رہے۔دوسری یہ کہ ناپسند ہو کر لوگ اس کی زیارت کو آئیں سوائے اس کے کہ جسے اس سے کوئی دینی فایدہ ہو۔

ابوالحسن حاتمی طوس کے خواجگان میں سے تھے وہ خواجہ ابوالقاسم گرگانیؒ کے سلام کے لئے گئے۔ جو بزرگ اولیاء میں سے تھے۔ ملنے پر حاتمی معذرت کرنے لگے کہ میں کمتر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں"۔ تو ابوالقاسم نے فرمایا کہ لوگ آنے پر ممنون ہوتے ہیں جب کہ ہم ان کے نہ آنے پر ممنون ہوتے ہیں کیونکہ خود اس مہتر یعنی ملک الموت کے آنے سے زیادہ کسی اور کے آنے کی پرواہمارے دل میں نہیں ہوتی"۔

ایک امیر حاتم اصم کے پاس گیا اور بولا: "کہئے آپ کو کس شئے کی ضرورت ہے؟" تو حاتم نے کہا کہ "یہ کہ نہ تو مجھے ملے اور نہ میں تجھ سے ملوں"۔ یاد رہے کہ خلوت میں اس غرض سے بیٹھنا کہ لوگ میری تعظیم کریں عظیم جہالت ہے۔ کیونکہ پست ترین شعور یہ ہے کہ انسان سمجھے کہ میرے کام میں سے کوئی چیز خلق کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اور جان لے کہ اگر پہاڑ کی چوٹی پر بھی چلا جائے تو بھی عیب جو یہی کہے گا کہ "نفاق کا مرتکب ہے" اور اگر خرابات میں جائے گا تو وہ جو اس کا دوست یا مرید ہوگا کہے گا کہ اس نے ملامت کی راہ لی ہے تا کہ خود کو لوگوں کی نظروں سے گرا دے"۔ وہ جس صورت کو بھی اختیار کرے گا تو اس کے حق میں دو گروہ ہوں گے۔ چاہئے کہ یہ انسان اپنا دل اپنے دین میں لگا لے نہ کہ لوگوں میں۔

سہل تستریؒ نے اپنے ایک مرید کو ایک کام کا حکم دیا تو وہ بولا "لوگوں کی زبان کے خوف سے میں یہ کام نہیں کر سکتا"۔ سہل نے اپنے اصحاب کی طرف منہ کر کے کہا: "کوئی شخص اس کام کی حقیقت کو نہیں پہنچ سکتا جب تک دو صفات میں سے ایک صفت حاصل نہ کر لے: یا تو مخلوق اس کی آنکھوں سے غائب ہو جائے اور وہ محض حق کو دیکھے یا اس کا نفس معزول ہو جائے تا کہ وہ کسی صفت سے ترساں نہ ہو کہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں"۔

حسن بصریؒ سے لوگوں نے کہا کہ کچھ لوگ آپ کی مجلس میں آتے ہیں تو ایسی باتیں یاد میں لاتے ہیں تا کہ ان پر اعتراض کریں اور ان کے عیب ڈھونڈیں"۔ تو حسنؒ نے فرمایا کہ: "میں نے خود کو دیکھا ہے کہ فردوس اعلیٰ اور قرب خداوندی کی آرزو کرتا ہے اور ہرگز لوگوں سے سلامتی کی طمع نہیں کرتا۔ کیونکہ ان کا خالق بھی ان کی زبان سے سلامت نہیں"۔

پس اس تمام بحث سے خلوت گزینی کے فوائد اور نقصانات روشن ہو گئے ہوں گے۔ ہر شخص کو خود اپنا حساب کر لینا چاہئے اور اپنے آپ کو متذکرہ بالا حقائق کے سامنے لانا چاہئے تا کہ معلوم ہو سکے اس کے لئے خلوت بہتر ہے یا مجلس نشینی؟

آدابِ عزلت

جب کسی نے خلوت اختیار کی تو چاہئے کہ نیت کرے کہ اس عزلت سے اپنے شر کو لوگوں سے باز رکھے

اورلوگوں کے شر سے سلامتی کا طالب ہواور فراغت طلب کرے تا کہ اطمینان سے عبادتِ حق تعالیٰ میں مصروف ہو سکے۔اور چاہئے کہ ایک لمحہ بھی بے کار یا غافل نہ رہے۔ کیونکہ ذکر وفکر، علم وعمل میں محور ہے۔اورلوگوں کے لئے اپنا دروازہ بند رکھے۔اور شہر کی خبروں اور بے کار افواہوں کو نہ پوچھے نہ لوگوں کے احوال کے بارے میں استفسار کرے۔ کیونکہ انسان جو کچھ سنتا ہے وہ ایسے بیج کی مانند ہے جو سینے میں گر کر سینے سے سر اٹھاتا ہے۔ جب کہ خلوت میں اہم ترین کام حدیث نفس کو منقطع کرنا ہوتا ہے تا کہ ذکر بہ اخلاص ہو۔اورلوگوں کے بارے میں خبریں حدیث نفس ہیں۔ نیز چاہئے کہ خلوت نشین تھوڑی خوراک اور مختصر لباس پر قناعت کرے ورنہ لوگوں کے میل ملاپ سے مستغنی نہ ہو پائے گا۔ نیز چاہئے کہ صابر ہو۔ ہمسایوں کی طرف سے پہنچنے والے رنج سے اور ان باتوں سے جو لوگ اس کے بارے میں کہیں تعریف میں ہوں یا برائی میں ان پر کان نہ دھرے۔اور دل میں نہ لائے۔اگر لوگ عزلت میں ہونے کی وجہ سے منافق کہیں یا مخلص، یا متواضع یا متکبر تو اسے بھی خاطر میں نہ لائے تا کہ اپنا وقت تشویش کی نذر نہ ہو کیونکہ مقصود عزلت کا فقط یہ ہے کہ انسان آخرت ہی کے کام میں مشغول رہے۔

———•••———

اصل ہفتم: آدابِ سفر

اے عزیز جان لے کہ سفر دو ہیں ایک ظاہر ہے تو ایک باطن۔

سفر باطن ایزد تعالیٰ کی صنعت گری کے عجائب اور زمین و آسمان کی بادشاہی میں دل کا سفر ہے۔اور دین کی راہ کی منزلوں کا سفر ہے۔اور مردوں کا سفر یہ ہے کہ جسماً تو گھر میں بیٹھے ہوں لیکن جولان بہشت میں کر رہے ہوں جس کی وسعت سات آسمان و زمین کے کئی گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ عالمہائے ملکوت عارفوں کی بہشت ہے۔ وہ بہشت کہ جس میں داخلے سے کوئی چیز مانع یا مزاحم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سفر کی دعوت دیتے ہیں۔فرماتے ہیں: ''اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ'' (۷/ ۱۹۵) (آیا نہیں دیکھتے اس میں جو اللہ کی بادشاہی کے نشانات ہیں زمینوں آسمانوں میں اور اللہ کی تخلیق میں جو اس نے تخلیق کیا؟'') اور جو کوئی اس سفر سے عاجز ہو تو اسے چاہئے کہ یہ ظاہر سفر کرے اور اپنے جسم کو آگے لے جائے تا کہ ہر جگہ سے فایدہ حاصل کرے اور مثال اس شخص کی ایسے شخص کی سی ہے جو چل کر کعبے کو جائے تا کہ کعبے کے ظاہر کو دیکھے۔اور دوسرے کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو اپنے گھر میں بیٹھا ہو اور کعبہ خود اس کے پاس چلا آئے اور اس شخص کے گرد طواف کرنے لگے۔اور اپنے دل کی باتیں اس سے کرنے لگے۔ان دونوں اشخاص کے

درمیان تفاوت بہت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ فرماتے تھے کہ ''جب اہل ظاہر راستے کی تکالیف برداشت کرتے ہیں صاحب دل آسودگی کے ساتھ مقصد کو پہنچ جاتے ہیں''۔ اور ہم اس کتاب میں سفر ظاہر کا تذکرہ دو[۲] ابواب میں کریں گے اور سفر باطن کی شرح چونکہ دقیق ہے اس کتاب میں تشریح اس کی نہ ہو سکے گی۔

باب اوّل: نیت سفر اور اس کے آداب وانواع

باب دوم: علم میں سفر کی رخصتیں

باب اوّل: سفر کی نیت اور اس کے آداب وانواع

معلوم رہے کہ سفر پانچ قسم کا ہے:

سفر اوّل: طلب علم کے لئے ہے اور یہ سفر فرض ہے۔ چونکہ علم سیکھنا فریضہ ہے۔ اور سنت بھی ہے کیونکہ تحصیل علم سنت ہے۔ اور حصول علم کے لئے سفر تین وجوہ سے ہے:

ایک: یہ کہ علم شرع سیکھے۔ اور حدیث میں ہے کہ جو کوئی اپنے گھر سے طلب علم کے لئے نکلے وہ اللہ کی راہ میں ہے جب تک لوٹ نہ آئے''۔ حدیث میں یہ بھی ہے کہ ''فرشتے طالب علم کے لئے اپنے پر پھیلائے رکھتے ہیں'' اور اسلاف میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس نے ایک حدیث کے لئے طویل سفر کیا تھا اور شعبی کہتے ہیں کہ ''اگر کوئی شام سے یمن تک کا سفر اس لئے کرے کہ وہاں سے ایک کلمہ ایسا سنے جو اس کے لئے راہ دین میں مفید ہو تو اس کا یہ سفر ضایع نہ جائے گا''۔ لیکن سفر ایسے علم کے لئے کرے جو زادِ آخرت کے لئے درکار ہے۔ اور ہر وہ علم جو اسے دنیا سے آخرت کی طرف دعوت نہ دے اور حرص سے قناعت کی طرف نہ بلائے اور ریا سے اخلاص کی طرف نہ بلائے اور مخلوق کی یہ کوشش اسے خالق کی پرستش کی طرف نہ بلائے وہ علم اس کے ضرر کا باعث ہے۔

وجہ دوم: یہ ہے کہ سفر کرے تا کہ خود کو اور اپنے اخلاق کو پہچان سکے۔ تا کہ ان صفات کے علاج کے لئے جو مذموم ہیں مشغول ہو سکے۔ اور یہ بھی اہم ہے کہ انسان جب تک اپنے گھر میں ہوتا ہے تو کام اس کے منشا کے مطابق چلتا ہے تو اپنے بارے میں خوش گمان ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ خوش اخلاق ہے اور سفر میں اخلاق باطن سے پردہ اٹھ جاتا ہے۔ اور ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ جس سے انسان اپنی کمزوری بدخوئی اور عاجزی سے آشنا ہوتا ہے۔ اور جب اپنی بیماری کا علم ہوتا ہے تو اس کے علاج میں مشغول ہوا جا سکتا ہے۔ اور جس نے کبھی سفر نہ کیا ہو تو وہ کاموں میں مردانہ وار نہیں ہوتا۔ بشر حافیؒ فرمایا کرتے تھے کہ: ''اے قاریو سفر کرو تا کہ

پاک ہو جاؤ کیونکہ جو پانی کھڑا رہتا ہے گندہ ہو جاتا ہے''۔

وجہ سوم: یہ ہے کہ انسان سفر کرے تا کہ برو بحر اور کوہ و بیاباں میں اور مختلف اقالیم میں اللہ تعالیٰ کی صنعت گری کے عجائب کو دیکھ سکے۔ اور حیوانوں اور نباتات کی رنگارنگ مخلوق کو نواح عالم میں دیکھے اور دیکھے کہ وہ سب اپنے خالق کی تسبیح میں مشغول ہیں اور اس کی توحید پر گواہی دیتی ہیں۔ اور جس شخص کی یہ آنکھ روشن ہو جائے کہ جمادات کا کلام جو بے حرف وصوت ہے اسے سن سکے اور اللہ تعالیٰ کی وہ تحریر جو جملہ موجودات کے چہرے پر موجود ہے کہ نہ حرف کی صورت میں۔ ہے نہ مرقومے کی صورت میں ہے اسے پڑھ سکے اور مملکت خداوندی کو اس سے پہچان سکتا ہے۔ خود اس کو ضرورت نہ ہوگی کہ گرد زمین کے طواف کرے بلکہ ملکوت آسمان پر نظر کرے کہ دن رات خود اس کے گرد محو طواف ہیں اور اپنے اسرار کے عجائب اس پر بہ زبان حال منکشف کر رہے ہیں اور منادی کر رہے ہیں کہ: ''وَكَاَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ'' (قرآن: ۱۲/۱۰۵) (اور چند نشان زمین و آسمان میں ظاہر ہیں جس پر وہ (مشرکان مکہ) گذرتے ہیں لیکن ان کو دیکھنے سے روگردانی کرتے ہیں اور غافل ہیں)۔ بلکہ اگر کوئی اپنی آفرینش پر نگاہ ڈالے اور اپنے اعضا و جوارح اور ان کی صفات پر نظر کرے اور اپنی تمام عمر کا مشاہدہ کرے۔ بلکہ اپنے عجائب اس وقت دیکھے گا جب چشم ظاہر سے صرف نظر کرے گا اور دل کی آنکھ کو کھولے گا۔ بزرگوں میں سے ایک کا قول ہے کہ ''لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ آنکھیں کھولو تا کہ عجائب کو دیکھ سکو اور میں کہتا ہوں کہ آنکھیں بند کر لو تا کہ عجائب کو دیکھ سکو'' لیکن دونوں حق ہیں۔ کیونکہ منزل (پہلی) یہی ہے کہ چشم ظاہر کھولے اور عجائب کو دیکھے۔ پھر دوسری منزل کی طرف رخ کرے۔ عجائب ظاہر کی ایک انتہا ہے جس کا تعلق عالم اجسام سے ہے۔ اور وہ محدود ہے اور عجائب باطن کو انتہا نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق ارواح اور حقایق سے ہے۔ اور حقایق کی کوئی حد نہیں اور ہر ظاہر صورت کے ساتھ ایک روح اور حقیقت ہے۔ صورت ظاہر آنکھ کا نصیبہ ہے اور حقیقت چشم باطن کا نصیب ہے۔ اور صورت نہایت مختصر ہے۔ اور بے قدر اور مثال اس کی ایسے ہے جیسے کوئی زبان کو دیکھے اور گمان کرے کہ گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اور دل کو دیکھے تو گمان کرے کہ پارۂ خون ہے۔ تو سوچنا چاہئے کہ یہ ذراسی مقدار جو چشم ظاہر کا نصیبہ ہے۔ تو اس کے مقابلے میں زبان و دل کی جو حقیقت ہے اس کا کیا عالم ہے اور تمام اجزائے عالم اور ذرات کی کیفیت یہی ہے کہ جسے چشم ظاہر سے زیادہ کچھ نہ دیا گیا ہو تو مرتبہ اس کا چوپایوں کے برابر ہے۔ لیکن بعض حدیثوں میں ہے کہ: ''چشم ظاہر چشم باطن کا قالب ہے''۔ اس وجہ سے عجائب آفرینش کے مشاہدے کے لئے سفر بھی خالی از فائدہ نہیں۔

سفر دوم: عبادت کے لئے ہے جیسے کہ حج، جہاد اور انبیاءؑ، صحابہؓ اور تابعین کی قبروں کی زیارت ہے۔

بلکہ علماء اور بزرگان دین کی زیارت کہ جن کے چہرے پر نظر ڈالنا بھی عبادت ہے اور دعا ان کی نہایت عظیم المرتبت ہوتی ہے۔ان کی زیارت کی برکات میں سے ایک یہ کہ ان کو دیکھ کر ان کی پیروی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔پس ان کا دیدار بھی عبادت ٹھہرا۔اور یہ بہت سی دیگر عبادتوں کا تخم بھی ہوتا ہے۔جب ان بزرگوں کے انفاس اور کلام انسان کے یار ہو جائیں تو یہ فوایدکئی گنا ہو جاتے ہیں اور ارادۂ بزرگوں کی قبروں کی زیارت جائز ہے۔اور یہ جو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''لَاتَشَدُّ الرِّحالُ اِلَّا اِلٰی ثَلاثَۃِ مَسَاجِد '' (بار سفر سوائے تین مساجد کے نہیں باندھتے ہیں''یعنی کہ مکہ' مدینہ اور بیت المقدس'' دلیل اس امر کی ہے کہ عام مساجد اور بقاع سے برکت حاصل نہیں کرتے کیونکہ یہ سب برابر ہیں سوائے ان تین کے۔اور جس طرح زندہ علماء کی زیارت اس میں مشمول نہیں تو وہ جو مردہ ہیں وہ بھی اس میں شمار نہ ہوں گے؛ پس انبیاء اولیاء اور علماء کی قبروں کی زیارت کے لئے سفر کرنا اس سبب سے جائز ہوگا۔[1]

سفر سوم: اس چیز سے گریز ہے کہ جو دین کے لئے باعث تشویش ہو۔جیسے کہ جاہ' مال' ولایت اور مشاغل دنیا ہیں۔اور یہ سفر اس شخص کے لئے فرض ہے جس کے لئے مشاغل دنیا کے ساتھ راہ دین پر چلنا ممکن نہ ہو۔ کیونکہ دین کی راہ فراغت ہی سے ملتی ہے۔ ہر چند کہ انسان اپنی ضروری حاجات کی بناء پر کلیۃً تو فارغ نہیں ہو سکتا لیکن سبکبار تو ہو سکتا ہے۔وَقَد نَجا المُخَفَّفُونَ'' (یعنی سبکبار نجات پا گئے ہیں اگرچہ بے بار نہ تھے۔اور جس پر حشمت اور معرفت نمودار ہوں تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ حق کی نسبت دنیا داری میں زیادہ مشغول ہو جاتا ہے۔

سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ یہ زمانہ ایسا برا ہے کہ گمنام اور مجہول بھی اس سے خائف ہے اور معروف کے لئے تو اور بھی خطرناک ہے۔''زمانہ یہ ہے کہ جہاں تجھے لوگ پہچان لیں وہاں سے گریز کر کے ایسی جگہ چلا جانا چاہئے کہ جہاں تمھارا جاننے والا کوئی نہ ہو''۔لوگوں نے سفیان کو دیکھا کہ ایک تھیلا پشت پر رکھا ہے اور چلے جا رہے ہیں۔لوگوں نے پوچھا کہ ''کہاں کا ارادہ ہے؟'' فرمایا کہ ''فلاں گاؤں کا کہ وہاں کھانا سستا دستیاب ہے۔وہاں جا رہا ہوں''۔تو لوگوں نے کہا کہ ''کیا ایسے سفر کو جائز رکھتے ہو؟'' تو فرمایا کہ ''جہاں روزی فراغ تر ہو وہاں جاؤ تا کہ دین سلامت تر رہے اور دل فارغ تر''۔ابراہیم خواصؒ کسی شہر میں چالیس روز سے زیادہ نہ ٹھہرتے تھے۔

---

[1] احیاء علوم الدین میں ہے کہ: کیونکہ یہ حدیثیں مسجدوں کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور مسجدیں ان تین مسجدوں کے بعد باہم برابر ہیں۔لیکن انبیاء اولیاء اور علماء کی زیارت میں اہل فضیلت میں فرق نہیں۔اگرچہ ان کے درجات میں عظیم تفاوت ہے۔اس اعتبار سے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے درجات مختلف ہیں۔مختصر یہ کہ زندوں کی زیارت مردوں کی زیارت سے اولیٰ تر ہے۔

سفر چہارم: دنیا کی طلب میں تجارت کا سفر ہے اور یہ سفر جائز ہے۔ اور اگر اس سفر سے نیت یہ ہو کہ خود کو نیز اپنے اہل وعیال کو خلق سے بے نیاز رکھے تو یہ سفر عبادت ہوگا اور اگر تفاخر و تجمل کے لئے زیادہ مال دنیا کی طلب کے لئے کرے تو یہ سفر شیطان کی راہ میں متصور ہوگا۔ اور اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسا شخص تمام عمر سفر کا رنج برداشت کرتا ہے۔ کیونکہ افراط کفایت کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ آخر کار راہزن مال لوٹ لے جاتے ہیں یا کسی غیر معروف مقام پر مر جاتا ہے اور مال بادشاہ لے جاتا ہے اور بہترین صورت یہ ہوتی ہے کہ وارث مفت میں پاتا ہے اور اپنی خواہشات اور شہوات کی نذر کر دیتا ہے۔ اور تاجر کو فراموش کر دیتا ہے کہ اس کی وصیت پر عمل کرنے سے قاصر رہتا ہے اور اس کا قرض وراثت سے ادا نہیں کرتا۔ جس سے آخرت کی وبال تاجر پر ہوتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر اور خسران کیا ہوگا کہ ساری زندگی رنج وہ خود اٹھائے اور وبال کا سامنا بھی اسی کو ہو اور مزے اس کے مال سے دوسرے کریں۔

سفر پنجم: سیر وتماشا کا سفر ہے۔ اور اگر مختصر ہو اور کبھی کبھار ہو تو جائز ہے۔ اور اگر کوئی شہر بہ شہر پھرنے کو معمول بنا لے اور غرض اس کے سوا اور کوئی نہ ہو کہ نئے شہر اور نئے لوگوں کو دیکھے۔ تو علماء میں اس قسم کے سفر کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ "یہ اپنے آپ کو بے فایدہ مبتلائے رنج کرنا ہے لہٰذا نہیں چاہئے کہ ایسا سفر کیا جائے"۔ اور ہمارے نزدیک درست یہ ہے کہ یہ حرام نہیں کیونکہ مشاہدہ بھی ایک غرض ہے اگر چہ فرومایہ ہے اور مباح ہر کسی کے لئے اسی کے بقدر ہوتا ہے۔ اور اس طرح کے لوگ خسیس طبع ہوتے ہیں اور ان کی یہ غرض بھی انھی کے لائق ہوتی ہے اور گدڑی پوشوں میں سے ایک گروہ ہے جن کی عادت یہ بن گئی ہے کہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہوتے رہتے ہیں بغیر اس کے کہ مقصود کسی بزرگ کی زیارت ہو کہ خدمت اس کی لازم سمجھیں۔ ان کا مقصود صرف سیر وتماشا ہوتا ہے۔ اور عبادت پر دوام کی طاقت سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اور ان پر باطن کی راہ مقامات تصوف میں ہنوز کھلی نہیں ہوتی اور غفلت اور بطالت کے باعث یہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ کسی پیر کی ہدایت پر کسی ایک شہر میں ساکن ہو جائیں۔ شہر بہ شہر پھرتے ہیں جہاں کھانے پینے کو فراواں ملے وہیں ڈیرے ڈال لیتے ہیں اور جب ان کے حسب دل خواہ نہ ہو خادم پر زبان درازی کرتے ہیں۔ اور اس کو دکھ دیتے ہیں اور جہاں بہتر حلوے مانڈے کی خبر ملے ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی قبر کی زیارت کو بہانہ بنائیں کہ "ہمارا مقصود یہ ہے"۔ جب کہ وہ مقصود نہ ہو۔ تو یہ سفر اگر چہ حرام نہ ہوگا لیکن مکروہ ہے۔ اور ایسے لوگ مذموم ہیں اگر چہ عاصی اور فاسق نہیں۔ اور اگر نان تو صوفیوں کی کھاتے ہوں اور سوال کریں اور خود کو صوفیوں کی صورت میں جلوہ گر کریں تو فاسق و عاصی ہوں گے۔ اور جو کچھ اس طرح حاصل

کرتے ہیں حرام ہے۔ کیونکہ جو کوئی گدڑی پہنے اور پنج وقتہ نماز ادا کرے لازماً صوفی نہیں ہوتا بلکہ صوفی وہ ہوتا ہے کہ اسے کوئی شے مطلوب ہو اور اس نے رخ اس طرف کرلیا ہو جس سے اس تک پہنچ گیا ہو یا ہنوز اس کی تلاش میں ہو تو ضرورت سے زاید اس شے سے تصرف نہ کرے یا صوفی وہ ہوتا ہے جو صوفیا کی خدمت میں مشغول ہو۔ تو صوفیوں کی روٹی ان تین قسم کے لوگوں کے سوا کسی اور کے لئے حلال نہیں۔

اور وہ شخص جو مغرور ہو اور باطن اس کا طلب و مجاہدت میں اس طلب سے عاری ہوتا ہے اور وہ خدمت میں مشغول نہیں ہوتا۔ وہ اگرچہ گدڑی پوش ہو صوفی نہ ہوگا۔ بلکہ اگر لوگوں نے کوئی چیز گرہ کٹوں یا اچکوں کے لئے وقف کر رکھی ہو وہ ایسے شخص کے لئے مباح ہے۔ کیونکہ خود کو بے ضرورت کے روپ میں پیش کرنا بغیر اس کے کہ ان کی ایک صفت بھی اس میں، ہو تو یہ محض نفاق اور طراری ہے۔ اور اس گروہ میں بدترین وہ ہے جس نے چند جملے صوفیوں کی عبارت سے یاد کر لئے ہوتے ہیں اور جا و بے جا اسے استعمال کرتا ہے اور گمان یہ کرتا ہے کہ لوگوں پر اولین و آخرین علم واضح ہو چکا ہے جو یہ بات کہہ سکتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ان کی بات کی نحوست یہاں تک پھیل جائے کہ علم اور علماء کو بہ چشم حقارت دیکھنے لگیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ شرع بھی ان کے نزدیک بے حیثیت ہو جائے۔ اور کہنے لگیں ''یہ ضعیفوں کے لئے ہے اور وہ لوگ جو صوفیوں کی راہ میں قوی ہو گئے ہیں ان کے لئے کوئی چیز مضر نہیں ہوسکتی اور دین ان کا دو کوزہ ہو گیا ہے جس سے کسی چیز سے نجاست کو قبول نہیں کرتا''۔ جب نوبت یہاں تک پہنچے تو ان میں ایک کا قتل ہند و روم میں ہزار کافروں کو قتل کرنے سے افضل ہے۔ کیونکہ لوگ کفار سے تو خود کو بچا لیتے ہیں اور یہ ملعون اسلام کو اصل اسلام کی زبان سے باطل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور شیطان نے اس عہد میں اس جیسا اور کوئی جال نہیں پھیلایا۔ اور کتنے ہی اس جال میں پھنس کر ہلاک ہو چکے۔

آداب مسافر

آداب مسافر ظاہر میں اوّل سفر سے آخر سفر تک:

وہ آداب تعداد میں آٹھ ہیں:

ادب اوّل: یہ ہے کہ سفر پر نکلنے سے پہلے اپنے مظالم کا ازالہ کرے۔ امانتیں ان کے مالکوں کے حوالے کرے۔ اور جس کسی کا نان نفقہ اس کے ذمے ہے فراہم کرے۔ اور زادراہ حلال کرے۔ اور اتنا ساتھ لے جس سے ہم سفروں کے ساتھ سلوک کرسکے۔ کیونکہ کھانا دینا اور خوش گوئی اور مکاری[1] کے ساتھ خوش اخلاقی

[1] **مکاری:** کرائے کے جانور کا مالک

دورانِ سفر جملہ مکارم اخلاق میں سے ہے۔

ادب دوم: یہ ہے کہ ایک شایستہ رفیق سفر تلاش کرے جو دین میں اس کا معاون ہو۔ اور آنحضرت ﷺ نے تنہا سفر کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور فرمایا کہ تین ہوں تو یہ جماعت ہے اور ضروری ہے کہ ان میں سے ایک کو امیر مقرر کرلیں ۔ کیونکہ سفر میں مختلف افکار جنم لیتے ہیں ۔ اور اگر سر رشتہ کار ایک کے ہاتھ میں نہ ہو تو کام تباہ ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا کا سروکار دو خداؤں کے ہاتھ میں ہوتا تو بہت بربادی ہوتی ۔ اور امیر ایسے شخص کو کرنا چاہئے کہ جو خوش اخلاق ہو اور پہلے بھی بہت سفر کر چکا ہو۔

ادب سوم: یہ ہے کہ اپنے حاضر ساتھیوں کو الوادع کہے اور آنحضرت ﷺ کی مسنون دعا ہر ایک سے کہے کہ: ''اَستَودِعُ اللہَ دِینَکَ وَاَمَانَتَکَ وَخَوَاتِیمَ عَمَلِکَ''۔

اور آنحضرت ﷺ جب ان کے پاس سے کوئی شخص سفر پر روانہ ہوتا تو اسے کہتے: ''زَوَّدَکَ اللہُ التَّقویٰ وَغَفَرَ ذَنبَکَ وَوَجھَکَ لِلخَیرِ حَیثُ تَوَجَّھتَ'' یہ دعا اس شخص کے لئے مستحب ہے جو مسافر کو وداع کہہ رہا ہو۔ اور مسافر کو چاہئے کہ جب وداع ہو سب کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔

ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ عطا تقسیم کر رہے تھے کہ ایک شخص چھوٹے بچے کے ساتھ آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''سبحان اللہ! میں نے کبھی ایسا شخص نہیں دیکھا جو مشابہت میں ایسا ہو جیسے یہ بچہ تم سے مشابہ ہے''۔ تو اس شخص نے کہا کہ ''اے امیر المؤمنین! میں آپ کو اس کے عجب کام سے خبر دوں: میں سفر پر جانے والا تھا تو اس بچے کی ماں حاملہ تھی تو وہ بولی مجھے اس حالت میں چھوڑے جا رہے ہو!؟ تو میں نے کہا کہ ''اَستَودِعُ اللہَ مَا فِی بَطنِکَ'' (اللہ کے سپرد کرتا ہوں اسے جو تمھارے شکم میں ہے)۔ لیکن جب سفر سے واپس آیا تو اس کی ماں مر چکی تھی۔ ایک رات ہم محو گفتگو تھے کہ مجھے دور سے آگ دکھائی دی تو میں نے کہا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ تمھاری بیوی کی قبر سے نکلتی ہے۔ اور میں ہر رات اسی طرح مشاہدہ کرتا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ عورت نماز' روزے کی پابند تھی تو یہ کیا حالت ہے؟ میں نے جا کر قبر کھولی کہ معلوم کروں کہ قصہ کیا ہے۔ تو میں نے دیکھا کہ چراغ رکھا ہوا ہے اور یہ بچہ کھیل رہا ہے۔ اتنے میں میں نے یہ آواز سنی کہ جیسے کہ مجھ سے کہا جا رہا ہو کہ: ''اس بچے کو تم نے ہمارے سپرد کر دیا تھا اگر اس کی ماں کو بھی ہمارے حوالے کیا ہوتا تو اسے ''زندہ واپس پاتے''۔

ادب چہارم: مسافر کے لئے یہ ہے کہ دو نمازیں ادا کرے ایک نماز استخارہ قبل اس کے کہ سفر کے لئے گھر سے نکلے اور یہ نماز اور دعا معروف ہیں۔ اور دوسری باہر نکلتے وقت چار رکعت نماز ادا کرے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے

ہیں ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا: مجھے سفر کا خیال ہے اور میں نے وصیت تحریر کر لی ہے تو یہ وصیت نامہ میں اپنے باپ کو دوں یا بیٹے کو دوں یا بھائی کو دوں؟ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص بھی سفر پر نکلا اس نے اپنی جگہ کوئی نائب اللہ کے نزدیک چار رکعت نماز سے بڑھ کر درست نہیں چھوڑا جو وہ اس وقت ادا کرتا ہے جب اس نے سامان سفر باندھ لیا ہو۔ اور ہر رکعت میں الحمد شریف اور قل ہو اللہ احد ایک بار پڑھے اور جب نماز سے فارغ ہو تو یہ دعا مانگے کہ: "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَتَقَرَّبُ بِهِنَّ اِلَیْكَ فَاخْلُفْنِی بِهِنَّ فِی اَهْلِی وَمَالِی وَوَلَدِی فَهِیَ خَلِیْفَةٌ فِی اَهْلِهٖ وَمَالِهٖ وَحِرْزٌ حَوْلَ دَارِهٖ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلٰی اَهْلِهٖ" (اے اللہ ان نمازوں کے ذریعے میں تیرا قرب چاہتا ہوں اور برکت ان کی میرے اہل و عیال اور مال اور میرے جانشین میں ہو۔ پس وہ نمازیں اس کی جانشین ہو جائیں گی اس کے اہل اور مال میں اور اس کے گھر کے اردگرد نگہبانی کریں گی حتیٰ کہ مسافر لوٹ آئے)۔

ادب پنجم: یہ ہے کہ جب اپنے گھر کے دروازے پر پہنچے تو کہے: بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَی اللّٰهِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ وَاَزِلَّ اَوْ اُزَلَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَجْهَلَ اَوْ یُجْهَلَ عَلَیَّ (بسم اللہ اے میرے رب میں تیری پناہ لیتا ہوں اس امر سے کہ گمراہ ہوں یا گمراہ کروں، ستم کروں یا ستم سہوں نادانی کروں یا نادانی سہوں)۔

اور جب سواری پر بیٹھے تو کہے: "سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ" (قرآن: ۴۳/۱۳، ۱۴) (پاکی اور بے عیبی اس کے لئے جس نے اس سواری کو ہمارے لئے زیردست کیا ورنہ ہم اس پر سوار نہ ہو سکے تھے اور ہم اس نعمت پر اپنے اللہ کی طرف پھرتے ہیں)۔ اور دوسرا ادب یہ ہے کہ کوشش کرے کہ ابتدائے سفر جمعرات کے دن سے صبح کے وقت ہو۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ ابتدا سفر کی جمعرات ہی کو کرتے تھے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ: "جو کوئی سفر کرنا چاہے یا کسی سے کوئی ضرورت پوری کرنی چاہے صبح کے وقت کرے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے دعا کی ہے کہ: "اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لِاُمَّتِیْ فِیْ بُكُوْرِهَا یَوْمَ خَمِیْسِهَا" (اے اللہ میری امت پر جمعرات کے دن برکت بھیج)۔

اور نیز فرمایا "اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لِاُمَّتِیْ بُكُوْرِهَا یَوْمَ خَمِیْسِهَا" (اے اللہ صبح اٹھنے کے سبب میری امت پر ہفتے اور جمعرات کے دن برکت بھیج) پس ہفتے اور جمعرات کی صبح مبارک ہے۔

ادب ششم: یہ ہے کہ سواری پر بوجھ زیادہ نہ ڈالے اور اس کی پشت پر کھڑا نہ ہو۔ جب سواری کھڑی ہو اور سواری پر سوئے نہیں۔ اور سواری پر سانٹا نہ مارے۔ اور صبح کے وقت نیز شام کے وقت ایک گھنٹہ پیادہ چلے

تا کہ پاؤں کھل جائیں اور سواری کو سبکباری حاصل ہو جائے۔اس طرح مکاری کا دل خوش کرے۔اسلاف میں سے بعض سواری کرایہ پر لیتے تو کہتے کہ ہم کبھی اس سے اتریں گے نہیں لیکن پھر سواری سے اتر آتے تا کہ یہ سواری پر صدقہ ہو جائے اور جس سواری کو بے وجہ ماریں یا بارگراں اس پر لاد دیں تو یہ سواری روزِ قیامت اللہ سے دادخواہی کرے گی۔

ابو درداء ﷛ کا ایک اونٹ مر گیا تو کہنے لگے کہ: ''اے اونٹ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں میرے بارے میں گلا نہ کرنا کیونکہ تجھے معلوم ہے کہ میں نے بوجھ ہمیشہ تمھاری طاقت کے مطابق تجھ پر رکھا تھا''۔

چاہئے کہ جو کچھ سواری پر لادے گا وہ سواری کے مالک کو دکھادے تا کہ اس کی رضا حاصل ہو جائے۔ پھر اس طے شدہ وزن میں اضافہ نہیں کرنا چاہئے۔ابن المبارک سواری پر بیٹھے تھے کہ کسی نے انھیں ایک خط دیا کہ پہنچا دینا۔تو آپ نے انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ مالک سواری سے اس کی منظور نہیں لی تھی۔اور فقیہوں کی اس بحث میں نہیں پڑے کہ نامے کا ''وزن ہے ہی کیا۔یہ مسامحت کی ذیل میں آتا ہے'' بلکہ یہ احتیاط ان کے کمال ورع کی دلیل ہے۔

ادب ہفتم: یہ ہے کہ حضرت عائشہ ؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ جب سفر پر نکلتے تھے تو کنگھی، آئینہ، مسواک، سرمہ دانی اور ناخن گیر ساتھ لیتے تھے اور صوفیاء نے اس پر ڈول رسی کا اضافہ کر دیا۔اسلاف کے ہاں اس اضافے کا معمول نہ تھا کیونکہ جہاں جاتے پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمّم کر لیتے تھے اور استنجا میں ڈھیلوں پر کفایت کر لیتے تھے۔اور ہر اس پانی سے جس میں نجاست ظاہر نہ ہوتی وضو کر لیتے تھے۔اگر چہ یہ پہلے معمول نہ تھا لیکن اس قوم کے لئے رسی ڈول اچھے ہیں۔کیونکہ ان کا سفر اس طرح کا نہیں ہے کہ جس میں اس نوع کی احتیاط نہ ہو۔احتیاط اچھی چیز ہے۔اسلاف کا سفر تو بیشتر غزو و جہاد جیسے عظیم کاموں کے لئے ہوتا تھا اس لئے وہ ان تفصیلی چیزوں کے بکھیڑے میں نہ پڑتے تھے۔

ادب ہشتم: یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ سفر سے واپس تشریف لاتے اور نگاہ آپ کی شہر مدینہ پر پڑتی تو فرماتے: ''اَللّٰھُمَّ اجعَل لَنا بھا قراراً و رزقًا حَسَنًا'' (اے اللہ اس شہر کو ہمارے لئے سکون کی جگہ بنا اور خاطر خواہ روزی عطا فرما)۔اور پھر کسی شخص کو بھیج کر منادی کرادیتے کہ کوئی شخص اپنے گھر میں بے اطلاع ناگاہ نہ پہنچے۔ایک دفعہ دو اشخاص نے اس کے خلاف کیا تو اپنے گھروں میں ایسے منکر کو پایا کہ جس سے انھیں دکھ پہنچا۔آنحضرت ﷺ جب واپس مدینے میں پہنچتے تو پہلے مسجد میں جاتے اور دو رکعت نماز ادا فرماتے اور کہتے: ''توباً توباً لِرَبِّنَا اَوبًا لَا یُغادِرُ عَلَینَا حوباً'' (اے اللہ ہم تیری بخشش کے خواہاں ہیں اور یوں لوٹے

ہیں کہ ہم پر کوئی گناہ نہ ہو) اور سفر سے واپسی پر اہل خانہ کے لئے تحائف کی تاکید فرماتے اور حدیث میں ہے کہ اگر اور کچھ ممکن نہ ہو تو اپنے تھیلے میں سنگریزے ہی ڈال لے تو اصل میں یہ مثل ہے تو اس سنت کی تاکید میں وجود میں آئی ہے۔ تو یہ جملہ آدابِ سفرِ ظاہر کے ہیں۔

اور سفرِ باطن کے مخصوص آداب ہیں کہ انسان اس وقت تک سفر پر نہ نکلے جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ دین میں فروغ سفر میں ہے۔ اور جب سفر میں اپنے دل میں کوئی ضرر دیکھے تو چاہیئے کہ لوٹ آئے۔ نیت کرنی چاہیئے کہ جس شہر میں بھی جائے گا بزرگوں کی قبور کی زیارت کرے گا۔ اور مشائخ کی تلاش کر کے ہر ایک سے فیض حاصل کرے گا۔ محض اس لئے نہیں کہ لوگوں سے کہہ سکے کہ "میں بزرگوں سے ملا ہوں" بلکہ اس لئے کہ ان کے اقوال مفیدہ پر عمل کرے گا۔ نیز یہ کہ کسی شہر میں دس دن سے زیادہ مقیم نہ رہے الا یہ کہ کسی بزرگ نے مزید ٹھہرنے کا اشارہ کیا ہو۔ کہ وہ مقصود ہے۔ اور اگر اپنے مسلمان بھائی کی زیارت کو جائے تو تین دن سے زیادہ نہ ٹھہرے کیونکہ مہمانی کی حد یہی ہے۔ لیکن اگر یہ خیال ہو کہ اس سے اس کا بھائی ناراض ہوگا تو مزید ٹھہر جائے۔ اور جب کسی پیر کی خدمت میں جائے تو ایک شبانہ روز سے زیادہ نہ ٹھہرے کیونکہ مقصود زیارت سے کچھ مزید نہ تھا۔ اور جب سلام کے لئے جائے تو دروازے پر دستک دے اور صبر کرے تاکہ صاحب خانہ باہر آ جائے اور اس کی زیارت سے پہلے اور کچھ نہ کرے تاکہ زیارت کا عمل مکمل ہو جائے۔ اور جب تک وہ خود نہ پوچھے کوئی بات از خود شروع نہ کرے۔ جب اس نے پوچھا تو اس قدر کہے جو اس کے استفسار کا جواب ہو۔ اگر یہ خود کسی سوال کا ارادہ رکھتا ہے تو پہلے صاحب خانہ سے اجازت لے۔ نیز یہ کہ اس شہر میں عشرت میں مشغول نہ ہو کیونکہ اس سے اخلاص زیارت ضائع ہو جاتا ہے۔ دوران سفر تسبیح اور ذکر اذکار میں لگا رہے اور تلاوت قرآن آہستگی کے ساتھ کرے تاکہ کوئی اور نہ سنے۔ اور جب کوئی اور اس سے بات کرے تو اس کے جواب کو تسبیح پر ترجیح دے اور اگر حضر میں کسی دینی کام میں مصروف ہو اور آسان بھی ہو تو سفر نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ پھر یہ کفران نعمت ہوگا۔

باب دوم: کہ وہ علم جو مسافروں کو سفر سے پہلے سیکھ لینا چاہیئے

انسان پر لازم ہے کہ علم رخصت[1] سفر سیکھے اگرچہ رخصت[2] نہ کرنے کا عزم رکھتا ہو۔ ممکن ہے کہ ضرورت

۱ ان تسہیلات کا علم جو تکالیف شرعی میں بہ رعایت حال مسافر متوقع ہیں۔

۲ اگرچہ اس نے پختہ ارادہ کر لیا ہو کہ وہ مواقع کہ جن میں تکلیف شرعی نہیں ہے ان تسہیلات سے استفادہ نہ کرے گا۔

لاحق ہونے پر ان کی حاجت ہو جائے۔علم قبلہ اور ساعت کا علم بھی سیکھنا چاہئے۔

سفر میں طہارت کے باب میں دو چیزوں کی رخصت ہے ایک موزہ کا مسح اور دوسرے تیمّم اور نماز میں دو رخصتیں ہیں: ''ایک یہ کہ فرضوں میں قصر کی اجازت ہے اور دو وقتوں کی نماز جمع کرنے کی اجازت بھی ہے۔ اسی طرح سنت میں دو رخصتیں ہیں۔یعنی سواری پر نماز ادا کرنا یا چلتے میں نماز ادا کرنا۔اور روزہ کی رخصت یعنی سفر میں روزہ نہ رکھنا۔اور مجموعاً یہ سات رخصتیں ہیں:

رخصت اوّل: موزے پر مسح: جس نے پوری طہارت کے بعد موزہ پہنا ہو اور پھر وہ موزہ آلودہ ہو گیا ہو تو وہ تین دنوں تک اس پر مسح کر سکتا ہے اور اگر مسافر نہ ہو بلکہ مقیم ہو تو ایک شبانہ روز مسح کی اجازت ہے لیکن اس کی پانچ شرطیں ہیں:

ایک: یہ کہ پوری طرح طہارت کرے' پھر موزہ پہنے۔ اگر ایک پاؤں دھو کر موزہ پہن لے یعنی دوسرے پاؤں کو ہنوز نہیں دھویا تو امام شافعی کے نزدیک روا نہیں۔پس جب دوسرا پاؤں دھو لے اور موزہ پہنے تو چاہئے کہ پہلے پاؤں کو موزہ سے نکال کر دوبارہ پہنے (تاکہ پوری طہارت کے عنوان کا اطلاق ہو جائے جس سے موزہ پر مسح روا ہے)۔

دوم: یہ کہ موزہ مضبوط ہونا چاہئے کہ جسے پہن کر چلا جا سکے اور موزہ اگر چمڑے کا نہ ہو تو جائز نہیں[1]۔

سوم: یہ کہ: ایڑی تک درست ہو اگر اس جگہ تک کہ مسح اس کا واجب ہو کچھ چیز پیدا ہو گئی ہو یا سوراخ ہو گیا ہو امام شافعی کے نزدیک صحیح نہیں۔لیکن امام مالک کے نزدیک یہ ہے کہ اگرچہ موزہ پھٹ گیا ہو لیکن اگر اس حالت میں اس کے ساتھ چلا جا سکتا ہو تو مسح جائز ہے۔ پہلے شافعی کا قول بھی یہی تھا۔اور ہمارے نزدیک اولیٰ تر یہی ہے کیونکہ سفر میں اکثر موزہ پھٹ جاتا ہے لیکن اس کا سینا ہر وقت ممکن نہیں ہوتا۔

چہارم: یہ کہ موزہ پاؤں سے نہ اتارے اگر مسح کر لیا ہو تو' اور اگر اتار لیا تو وضو از سر نو کرے اور اگر پاؤں دھونے پر اقتصار کرے تو ظاہر یہ ہے کہ روا ہو گا۔

پنجم: یہ کہ مسح کو پنڈلی تک نہ کھینچ لے جائے بلکہ پاؤں ہی تک محدود رکھے اور پشت پا پر اولیٰ تر ہے۔ اور اگر مسح ایک انگلی سے کرنے تو جائز ہے۔لیکن تین انگلیوں سے کرے تو اولیٰ تر ہے۔اور مسح ایک ہی دفعہ کرنا چاہئے اور سفر پر جانے سے پہلے حضر کی صورت میں مسح ایک شبانہ روز کے لئے صحیح ہو گا۔اور سنت یہ ہے کہ جب

---

[1] جیسے جوراب یا جرموق وغیرہ ہیں جو موزے کے اوپر پہنے جاتے ہیں

موزہ پہننے لگے تو پہلے اسے نگونسار کر کے جھٹکے کیونکہ جب آنخضرت ﷺ موزہ پہن رہے تھے ایک موزہ پہنا تھا کہ دوسرے موزے کو ایک کوا لے اڑا تو جب کوے کی چونچ سے گر گیا تو اس موزے میں ایک سانپ نکلا۔ اس پر آنخضرت ﷺ نے فرمایا: (''جو اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا اسے کہو کہ جب تک موزے کو جھٹک نہ لے نہ پہنے'')۔

رخصت دوم: تیمّم ہے اور تیمّم کی تفصیل ہم اصلِ طہارت میں کہہ چکے ہیں تو طوالت کے خوف سے اس کا اعادہ نہیں کرتے۔

رخصت سوم: مسافر کے لئے یہ ہے کہ جو فرض نماز چار رکعت کی ہے اس کی دو رکعت پڑھے۔ لیکن اس کی چار شرطیں ہیں:

شرطِ اوّل: یہ ہے کہ نماز کو اس کے وقت پر ادا کرے۔ لیکن اگر قضاء کرے تو قصر روا نہیں۔

شرطِ دوم: یہ ہے کہ قصر کی نیت کرے۔ اگر تمام کی نیت کرے گا یہ شبہ میں مبتلا ہو جائے کہ پوری کی نیت کی تھی یا قصر کی تو پوری رکعتیں ادا کرے۔

شرطِ سوم: یہ ہے کہ پوری نماز پڑھنے والے امام کی اقتداء نہ کرے۔ اگر اس کی اقتداء کرے تو پوری نماز ادا کرے بلکہ اگر امام کے بارے میں شک ہو کہ مقیم ہے یا مسافر تو مقتدی کے لئے لازم ہے کہ پوری نماز ادا کرے۔ کیونکہ مسافر اور مقیم کا امتیاز آسان نہیں ہوتا۔ لیکن اگر معلوم ہو کہ امام مسافر ہے یا شک ہو کہ امام قصر کرے گا تو اس کے لئے روا ہے کہ نماز میں قصر کرے۔ کیونکہ نیت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس لئے نیت کے جاننے کو شرط قرار نہیں دیا جا سکتا۔

شرطِ چہارم: یہ ہے کہ سفر طویل ہو اور مباح ہو۔ اور مفرور غلام کا سفر یا وہ جو راہزنی کے لئے سفر کرے یا حرام روزینے کے لئے نکلے یا ماں باپ کے اذن کے بغیر سفر پر ہو حرام ہے۔ اور ان کے لئے رخصت نہیں۔ اسی طرح جو کوئی قرض خواہ سے ڈر کر سفر پر نکلے اور وہ مدیون ہو اس کے لئے بھی رخصت نہیں۔ مختصر یہ کہ سفر کس غرض سے ہوتا ہے اگر وہ غرض حرام ہے تو اس کے لئے سفر بھی حرام ہو گا۔

اور سفر طویل وہ ہے جو سولہ[۱۶] فرسنگ تک کا ہو۔ اس سے کم ہو تو قصر جائز نہیں۔ اور ہر فرسنگ بارہ ہزار قدم کا ہوتا ہے اور سفر کا نقطہ آغاز وہ ہے جہاں شہر کی عمارتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر چہ خراب شدہ عمارتوں اور جنگلوں سے باہر نہ نکلا ہو۔ اور انتہائے سفر وہ ہو گا جب وطن کی آبادی کے پاس پہنچ جائے گا یا اس شہر کے قریب پہنچے جہاں ورود و خروج کے دو دن چھوڑ کر تین یا اس سے زاید دنوں کا قیام مطلوب ہو لیکن اگر کوئی ایسی کوئی نیت نہ

کرے لیکن اپنے کام کے پورا کرنے میں لگا ہوا ور نہ جانتا ہو کہ کب مکمل ہوگا اور امید ہر روزہ یہ رکھتا ہو کہ آج پورا ہو جائے گا۔ جس سے تین دن سے زیادہ تاخیر ہو جائے تو ایک قول کے مطابق کہ قیاس کے زیادہ قریب ہے جائز ہوگا کہ نمازوں میں قصر کرے۔ وہ ایسے مسافر کی مانند ہے جس نے بہ دل قرار نہیں کیا اور جسے عزم قرار نہ تھا۔

رخصت چہارم: نمازوں کو جمع کرنے کی رخصت ہے۔ روا ہے کہ طویل سفر میں جو مباح ہو نماز ظہر کو معرض تاخیر میں ڈال دے اور نماز عصر کے ساتھ اکٹھا ادا کرے۔ اور نماز دیگر میں پہل کرے اور نماز ظہر کے ساتھ ادا کرے اسی طرح نماز مغرب اور نماز عشاء کو بہم جمع کرے۔ اور جب نماز عصر کا وقت نماز ظہر کے ساتھ جمع کرے تو نماز عصر سے شروع نہ کرے بلکہ پہلے نماز ظہر ادا کرے اور پھر نماز عصر۔ اور اولیٰ تر یہ ہے کہ سنتوں سے ہاتھ نہ کھینچے بلکہ ادا کرے تا کہ ان کی فضیلت نہ جاتی رہے۔ کیونکہ سفر کا فایدہ جو ترک سنت کے ساتھ ہو ادائے سنت والے سفر کے فایدے کے برابر نہیں ہوسکتا۔ مسافر اگر چاہے کہ سنتیں سواری پر ادا کرے یا پیادہ چلنے کے دوران تو ترتیب اس کی یہ ہے کہ پہلے چار رکعت نماز سنت جو ظہر کی ہیں ادا کرے۔ اور پھر چار رکعت نماز سنت عصر کی ادا کرے پھر نماز کی اذان دے اور اقامت کے اور نماز ظہر کے فرض ادا کرے پھر فرض نماز دیگر کی اقامت کہے اگر تیمّم کرتا ہے تو تیمّم کا اعادہ کرے اور نماز عصر کا فریضہ ادا کرے۔ اور دونوں نمازوں کے درمیان سوائے تیمّم اور قامت کے وقت کسی اور چیز میں صرف نہ کرے۔ پھر سنت کی دو رکعت جو نماز ظہر کی ہیں وہ نماز دیگر کے بعد ادا کرے۔ اور جب ظہر کو عصر تک تاخیر کرے تو ایسے ہی کرے اور اگر نماز عصر ادا کر لی اور غروب آفتاب سے قبل شہر میں واپس آ گیا ہے تو عصر دوبارہ نہ پڑھے۔ اور یہی حکم نماز مغرب اور عشاء جمع میں ہے جو ظہر اور عصر کے جمع کی صورت میں اوپر بیان ہوا۔ ایک قول کے مطابق مختصر سفر میں بھی جمع صلوٰۃ جائز ہے۔

رخصت پنجم: یہ کہ سنت کی ادائیگی سواری کی پشت پر جائز ہے۔ اور روبقبلہ رکھنا واجب نہیں۔ بلکہ راہ قبلہ کا بدل ہے۔ اور اگر خود قبلے کے ارادے سے راہ تبدیل کرے اور وہ رخ قبلے کا نہ ہو تو نماز باطل ہو جائے گی۔ لیکن اگر یہ سہو ہو یا سواری سرکشی کرے تو رخ کسی اور جانب کر لے تو کوئی حرج نہیں ہوتا۔ رکوع وسجود بہ اشارہ کرنا چاہیئے۔ پشت خم کرے اور سجود میں رکوع کی نسبت زیادہ خم کرے لیکن نہ اتنا کہ گر جانے کا خطرہ ہو لیکن سوار اگر کجاوے یا تخت رواں میں ہو تو رکوع وسجود کاملاً کرے۔

رخصت ششم: یہ ہے کہ اگر وہ جو پیدل چلتا ہوا نماز ادا کرتا ہے ابتداء میں تکبیر رُو بہ قبلہ کہتا ہے تو اس کے لئے تو آسان ہے اور جو سوار ہو اس کے لئے یہ دشوار ہوگا۔ اور رکوع وسجود بہ اشارت کرتا ہے۔ اور تشہد کے وقت چلا جا رہا ہے اور تحیات پڑھتا ہے اور مواظب ہوتا ہے کہ پاؤں نجاست پر نہ پڑے۔ لیکن اس کے لئے

واجب نہیں ہے کہ نجاست کے سبب جو اس کے راہ میں آئیں راستہ تبدیل کرے۔ اور چلنا اپنے لئے دشوار بنائے۔ اور جو کوئی دشمن سے فرار کرتا ہے یا صف قتال میں ہو یا کتے یا بھیڑیئے سے گریزاں ہو اس کے لئے جائز ہوگا کہ فریضہ چلتے ہوئے ادا کرے یا سواری کی پشت پر۔ اسی طرح سنت کے بارے میں ہم نے کہا ہے کہ قضا سنتوں کی لازم نہیں۔

رخصت ہفتم: سفر میں روزہ نہ رکھنا ہے اور مسافر جس نے روزہ کی نیت کی ہو جائز ہے کہ روزہ افطار کرلے۔ اگر صبح کے بعد شہر سے نکلے تو افطار نا روا ہے۔ اگر بے روزہ ہو تو جب کسی شہر میں پہنچے تو روانہ ہوگا کہ دن کے وقت کھانا کھائے۔ اور اگر روزے سے ہو تو کسی شہر میں پہنچ کر افطار جائز نہیں اور نماز میں قصر پوری نماز ادا کرنے سے فاضل تر ہے۔ تاکہ شبہ اور خلاف سے باہر رہے۔ کیونکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک پوری فرض نماز روا نہیں لیکن سفر میں روزہ رکھنا نہ رکھنے سے افضل ہے تاکہ قضا کے اندیشے میں نہ پڑے۔ الا یہ کہ خود سے خائف ہو اور روزہ کی تاب نہ رکھتا ہو تو اس کے لئے افطار فاضل تر ہے۔

ان سات متذکرہ رخصتوں میں سے تین طویل سفر میں جائز ہوں گی یعنی قصر و افطار اور موزہ پر تین شبانہ روز کا مسح۔ اور تین وہ ہیں جو مختصر سفر میں بھی جائز ہیں اور وہ ہیں۔ سواری کی حالت میں یا پیدل چلتے ہوئے سنت کی ادائیگی۔ اور جمعہ کو ترک کرنا اور بے قضائے نماز تیمّم کرنا۔ لیکن کوتاہ سفر میں دو نماز کو جمع کرنے کے بارے میں فقہا میں اختلاف ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہوتا ہے کہ مختصر سفر میں نمازوں کو جمع نہیں کرنا چاہئے۔

یہ علوم مسافروں کو قبل کو از سفر سیکھ لینے چاہئیں کیونکہ دوران سفر ضرورت لاحق ہونے پر کس سے سیکھے گا؟ اور دلائل قبلہ اور نمازوں کے اوقات کا علم بھی سیکھنا چاہیے۔ کیونکہ اگر راستے میں آبادیاں نہ پڑتی ہوں تو محراب پوشیدہ رہے گا اور قبلہ معلوم نہ ہو سکے گا۔ اس قدر تو معلوم ہونا چاہئے کہ ظہر کے وقت جب رو بقبلہ ہو تو آفتاب کس طرف ہوگا۔ اور بوقت غروب و طلوع قبلہ کہاں ہوگا۔ اور اس کی کیفیت کیا ہوگی۔ اور شمال کسی طرف کو ہے۔ اگر راستے میں پہاڑ واقع ہو تو معلوم ہونا چاہئے کہ قبلہ دائیں طرف ہے یا بائیں طرف؟ اس قدر علم کے بغیر تو چارہ نہیں۔

——— ♦♦♦ ———

اصل ہشتم: آداب سماع و وجد

حکم سماع کو ہم دو ابواب میں بیان کریں گے

باب اوّل

سماع کے مباح ہونے کے بارے میں اور اس کی حلت وحرمت کے بارے میں

معلوم رہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک بھید انسان کے دل میں اس طرح پوشیدہ ہے جیسے آگ لوہے میں پوشیدہ ہے۔ اور جس طرح پتھر کو لوہے پر مارنے سے آگ نمودار ہوتی ہے اور آشکارا ہو جاتی ہے جس میں انسان کے اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور سبب اس کا وہ مناسبت ہے جو گوہر انسان کو عالم علوی کے ساتھ ہے کہ جسے عالم ارواح کہتے ہیں۔ اور عالمِ علوی عالمِ حسن و جمال ہے اور حسن و جمال کی اصل تناسب ہے اور جو چیز بھی تناسب سے بہرہ ور ہے وہ اس عالم علوی کے جمال کا ایک مظہر ہے۔ اس محسوس دنیا میں جو جمال وحسن وتناسب پایا جاتا ہے سب اسی عالم ارواح کے حسن و جمال وتناسب کا ثمرہ ہے۔ اور متناسب موزوں اور خوش لحن آواز اُس عالم کے عجائب سے ایک گونہ مشابہت رکھتی ہے اور وہ سبب جو دل میں آگاہی پیدا کرتا ہے اور ایک حرکت اور شوق کو وجود میں لاتا ہے انسان خود نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے۔ اور یہ اس دل میں ہوتا ہے جو سادہ ہوتا ہو اور عشق وشوق جو اس میں راہ پاتا ہے دل اس سے خالی ہوتا ہے۔ اور اگر خالی نہ ہو تو کسی چیز میں مشغول ہوتا ہے اور دل جس چیز میں مشغول ہوتا ہے وہ حرکت میں آجاتی ہے۔ ایسے ہی جیسے آگ پھونک مارنے سے فروزاں تر ہو جاتی ہے۔

اور جس انسان کے دل پر دوستیِ حق تعالیٰ غالب ہوتی ہے سماع اس کے لئے مہم ہوتا ہے کیونکہ اس سے یہ دوستی حق تیز تر ہو جاتی ہے۔ اور جس کے دل میں باطل کی دوستی ہو سماع اس کے لئے زہرِ قاتل ہے اور اس پر حرام ہے۔ سماع کی حلت وحرمت کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے اور جس نے حرام قرار دیا ہے وہ اہل ظاہر میں سے تھا۔ کیونکہ اسے یہ تصور حاصل نہیں ہوا تھا کہ حق تعالیٰ کی دوستی درحقیقت آدمی کے دل میں جاگزین ہوتی ہے۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ آدمی اپنی جنس ہی کا دوست ہو سکتا ہے تو وہ جو اس کی جنس میں سے نہیں ہے اور نہ وہ اس کے مشابہ ہے اس کو دوست کیسے رکھ سکتا ہے؟ پس اس کے نزدیک دل میں سوائے عشق مخلوق کے اور کوئی صورت متصور نہیں ہوتی۔ اور اگر عشق خالق صورت پذیر ہو تو تشبیہ کے خیال سے باطل ہوگا۔

اس لئے کہتا ہے کہ سماع یا تو لہو ولعب ہے یا مخلوق کا عشق ہوسکتا ہے اور یہ دونوں دین میں مذموم ہیں!

اور جب اس سے سوال کیا جائے کہ ''حق تعالیٰ کی دوستی جو خلق پر واجب ہے پھر وہ کیا ہے؟'' تو جواب یہ دیتا ہے ''کہ وہ ہے اس کی فرماں برداری اور اطاعت''۔ یہ ایک عظیم مغالطہ ہے جس سے لوگ دوچار ہیں۔ اور ہم کتاب محبت میں، رکن منجیات میں اس پر روشنی ڈالیں گے۔ یہاں اس قدر کہہ دنیا کافی ہے کہ سماع کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں فیصلہ خود دل پر چھوڑ دینا چاہئے۔ کیونکہ سماع دل میں کوئی ایسی شے داخل نہیں کرتا جو دل میں نہ ہو بلکہ وہ جو دل میں ہے اسے تحریک دیتا ہے۔ اور جس کسی کے دل میں حق ہے اور وہ شرع میں محبوب اور اس کی تقویت مطلوب ہے اور وہ اس کا طالب ہے۔ جب سماع اس کو فروغ دیتا ہے تو اس کے لئے باعث ثواب ہوگا۔ اور جس کے دل میں باطل ہے اور وہ از روئے شریعت مذموم ہے تو ایسے کو سماع پر عقوبت کا سامنا ہوگا۔ اور جس کا دل حق و باطل دونوں سے خالی ہوگا۔ لیکن وہ بر سبیل بازی سماع کرے اور بحکم طبیعت اس سے لذت گیر ہو سماع اس کے لئے مباح ہے۔ موجب گناہ نہ موجب ثواب۔ پس سماع تین قسم کا ہوگا۔

قسم اوّل: یہ ہے کہ بہ غفلت بر طریق بازی سنے اور یہ کام اہل غفلت کا ہے۔ اور دنیا سراسر لہو ولعب ہے۔ اور یہ بھی اسی میں کا ہے۔ اور اچھا لگنے کے سبب سماع حرام نہ ہوگا۔ کیونکہ خوشیاں حرام نہیں۔ اور شادمانیوں میں سے جو حرام ہیں وہ اس دنیا پر حرام نہیں کہ خوشنما ہیں بلکہ حرام اس بناء پر ہیں کہ ان میں ضرر اور فساد ہے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اچھی لگتی ہے۔ اور حرام نہیں ہے۔ پھولوں غنچوں اور سبزہ و آب رواں کا نظارہ خوش کن ہے اور ظاہر ہے حرام نہیں۔ پس اچھی آواز کان کے حق میں ایسے ہی ہے جیسے آنکھوں کے حق میں سبزہ و آب رواں اور غنچہ و گل کا مشاہدہ ہے۔ اسی طرح ناک کے لیے مشک نافے کی خوشبو حلال ہے۔ اور ذوق کے حق میں خوش مزہ کھانا اسی طرح کا حکم رکھتا ہے۔ اور عقل کے حق میں اچھی حکمتیں پسندیدہ غذا ہیں۔ جملہ حواس اس کے لئے ایک گونہ فرحت کا سامان ہے تو یہ حرام کیونکر ہوسکتا ہے۔

اور طبیعت اور کھیل اور کھیل کود یکھنا حرام نہیں۔ کیونکہ حضرت عایشہؓ راوی ہیں کہ ''عید کے دن حبشی مسجد میں بازی گری میں مشغول تھے۔ تو آپ آنحضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ ''دیکھنا چاہتی ہو؟'' میں نے کہا ''ہاں میں چاہتی ہوں''۔ تو آپؐ دروازے میں کھڑے ہو گئے اور اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے ٹھوڑی ان کے ہاتھ پر رکھی۔ اور اتنی دیر تک دیکھنے میں محو رہی کہ آپ ﷺ نے کئی دفعہ کہا کہ ''کافی نہیں؟'' تو میں کہہ دیتی تھی کہ ''نہیں'' اور یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے اور اسی حدیث سے پانچ رخصتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ بازی

اور لہو لعب جو کبھی کبھار ہو تو اس کا نظارہ حرام نہیں۔ دوم یہ کہ بازی مسجد میں ہو رہی تھی۔ سوم یہ کہ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ حضرت عائشہ ؓ کو خود وہاں لے گئے تھے اور فرمایا کہ ''دُونکم یا بنی افعۃ ''یعنی بازی دیکھنے میں مصروف رہو اور یہ فرمان ہے۔ پس جو حرام ہو اس کے ارتکاب کا حکم پیغمبر کیونکہ دے سکتا ہے۔ چوتھے یہ کہ ابتدا آپ ﷺ نے کی کہ کہا ''دیکھنا چاہو گی'' اور یہ تقاضا کے حکم میں ہے۔ اور یہ اس کا سا نہیں ہے کہ حضرت عائشہ ؓ از خود نظارہ کرتیں اور آپ ؐ خاموش رہتے تو کوئی کہہ سکتا تھا کہ آنحضرت ﷺ اس لئے خاموش رہے کہ نہیں چاہتے تھے کہ عائشہ ؓ کے دل کو رنجیدہ کریں کیونکہ وہ بدخوئی کے مترادف ہوتا۔ پنجم یہ کہ آپ خود عائشہ ؓ کے ساتھ کھڑے رہے ایک طویل وقت کے لئے۔ باوجود اس کے بازی اور اس کا مشاہدہ پیغمبر کا کام نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بچوں اور عورتوں کا دل خوش کرنے کے لئے ایسے کاموں میں موافقت کرنا خوش اخلاقی ہے۔ اور یہ رُوترشی اور بیزاری اور اپنے آپ کو جدا تصور کرنے سے افضل تر ہے۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث بھی موجود ہے کہ حضرت عائشہ ؓ راوی ہیں کہ: ''میں ہنوز لڑکی تھی گڑیوں سے کھیلتی تھی جیسے کہ چھوٹی لڑکیوں میں معمول ہے۔ اور میری اور ہم نشین لڑکیاں بھی میرے ساتھ ہوتی تھیں اور جب آنحضرت ﷺ تشریف لاتے تو وہ لڑکیاں ادھر ادھر بھاگنے لگتیں تو آنحضرت ﷺ انھیں میرے پاس لاتے۔ ایک دن ایک لڑکی سے فرمانے لگے: ''یہ عروسکیں کیا شئے ہیں؟'' تو وہ بولی یہ ''میری بیٹیاں ہیں'' پھر فرمایا اور یہ کیا ہے جو ان کی کمر سے باندھ رکھا ہے؟'' تو لڑکی نے جواب دیا ''یہ ان کا گھوڑا ہے''۔ پھر فرمایا کہ ''اس گھوڑے پر یہ کیا ہے؟'' تو لڑکی بولی ''یہ گھوڑے کے بال و پر ہیں'' تو آپ ﷺ نے اس سے کہا کہ ''گھوڑے کے بال و پر کہاں ہوتے ہیں'' تو بولی ''آپ نے نہیں سنا حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک گھوڑا تھا جس کے بال و پر تھے''۔ تو آنحضرت ﷺ اس قدر ہنسے کہ آپ کے تمام دانت نمایاں ہو گئے''۔

یہ واقعہ میں نے اس لئے عرض کیا ہے کہ معلوم ہو جائے کہ لئے دیئے رہنا اور رُوترش رکھنا اور خود کو ایسے کاموں سے دور رکھنا دین نہیں ہے۔ خصوصاً بچوں کے ساتھ اور اس کے ساتھ جو اس کا اہل ہو اور اس کے لئے برا نہیں اور یہ حدیث دلیل اس امر کی ہے کہ شبیہ انسان یا جاندار بنانا جائز ہے۔ اور بچوں کی گڑیائیں لکڑی' چیتھڑوں وغیرہ کی ہوتی ہیں اور وہ کسی حیوان کی مکمل نقل بھی نہیں ہوتیں اور حدیث میں ہے کہ گھوڑے کے بال و پر خرقہ (کپڑے) کے تھے۔

حضرت عائشہ ؓ ہی روایت فرماتی ہیں کہ دو کنیزیں عید کے دن میرے پاس دف بجا رہی تھیں اور گیت گا رہی تھیں کہ آنحضرت ﷺ گھر میں داخل ہوئے اور بستر پر لیٹ گئے اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ اتنے

میں حضرت ابوبکرآ گئے۔ تو انھوں نے کنیزوں کو ڈانٹا اور کہا کہ ''پیغمبر کا گھر اور شیطان کے مزمار!'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ابوبکر ان سے ہاتھ روک لے کہ آج تو عید کا دن ہے'' پس اس سے دف بجانے اور گیت گانے کا جواز ثابت ہوگیا۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ گیت اور دف کی آواز حضورؐ کے کانوں میں پہنچی ہوگی اور آپ ﷺ کا حضرت ابوبکر کو روکنا دلیل صریح اس کی ہے کہ سماع مباح ہے۔

قسم دوم: یہ ہے کہ سامع کے دل میں ایک مذموم صفت ہو جیسے کسی کے دل میں کسی عورت یا لڑکے کی محبت ہو اور وہ اپنے اس محبوب کی موجودگی میں سماع کرے تاکہ لذت زیادہ ہو یا اس کی غیر موجودگی میں سماع کرے امید وصال میں تاکہ شوق میں فزونی ہو یا ایسا گیت سنے جس میں زلف وخط وخال وجمال کا بیان ہو اور ان کو اپنے محبوب لڑکے یا لڑکی پر تطبیق دے تو یہ حرام ہے۔ اور بیشتر جوان اس طرح کے ہوتے ہیں' اور چونکہ یہ آتش عشق باطل کو گرم تر کرتے ہیں تو اس آگ کو بجھانا واجب ہے' فروغ دینا کیسے جائز ہوگا۔ لیکن اگر ان کا عشق اپنی بیوی یا کنیز کے ساتھ ہے جو متاع دنیا میں سے ہے تو مباح ہوگا۔ لیکن جب بیوی کو طلاق دے دے اور کنیز کو بیچ چکے تو اب ان سے عشق یا عشق کو فروغ دینے والا سماع ناجائز ہوں گے۔

قسم سوم: یہ ہے کہ سامع کے دل میں محمود صفت ہو جسے سماع قوت دیتا ہے یہ چار قسم کی ہے۔

نوعِ اوّل: یہ گیت اور اشعار حاجیوں کے ہیں جو صحرا' کعبہ اور خانہ خدا کے شوق کو دل میں مہمیز کرنے والے ہوں تو ایسا سماع اس شخص کے لئے ہے جس کے لئے حج روا ہے۔ لیکن اس شخص کے لئے جس کے والدین حج کی اجازت نہ دیں یا کسی اور وجہ سے اس کا حج پر جانا روانہ ہو تو اس کے لئے جائز نہیں کہ اس قسم کا سماع کرے۔ اور یہ آرزو اپنے دل میں قوی کرے الا یہ کہ جانتا ہو کہ اگرچہ اس کا شوق قوت پکڑے گا وہ اس پر قادر ہو کہ قوت گیر نہ ہو اور رُک جائے۔ اسی نوع کا سرود و سماع غازیوں کا ہے جو خلق کو دشمنانِ خدا کے خلاف جنگ وغزا پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کا بھی ثواب ہے۔ اسی طرح وہ اشعار رجز جو میدان جنگ میں انسان کو دلیری کے ساتھ جنگ پر انگیخت کریں اور دلاوری میں فزونی دیں جب جنگ کافروں کے ساتھ ہو تو اس کا سماع بھی ثواب رکھتا ہے۔ لیکن یہی جنگ اگر اہل حق کے ساتھ تو حرام ہوگا۔

نوعِ دوم: نوحہ ہے۔ جو گریہ آور ہے اور غم کو دل میں بڑھاتا ہے تو اس میں بھی ثواب ہوگا۔ جب انسان اپنی تقصیروں اور معصیتوں پر نوحہ گری کرے گا۔ جو اس سے سرزد ہوئی ہوں۔ اور ان درجات بزرگ سے محروم رہا ہو جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہوں ان کے غم میں نوحہ کرے گا۔ جیسے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا نوحہ تھا کہ ان کی مجالس سے لوگوں کے جنازے اٹھتے جو شدت غم سے مرجاتے تھے۔ آپ (داؤد علیہ السلام) خوش

الحانی کے ساتھ نوحہ سرائی کرتے تھے۔ لیکن اگر کسی حرام کا غم دل میں ہے تو نوحہ حرام ہوگا۔ جیسے کہ کسی کا کوئی مر گیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَافَاتَکُمْ '' (قرآن: ۲۳/۵۷) یعنی گذشتہ کا غم نہ کھاؤ۔ جو اللہ تعالیٰ کی قضا کو بکراہت دیکھے اور اس پر اندوہ گیں ہو اور نوحہ کرنے لگے تا کہ غم اس کا زیادہ ہو تو یہ نوحہ گری حرام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوحہ گر کی مزدوری حرام ہے۔ کیونکہ نوحہ گر حرام کا مرتکب ہوگا اور جو اس کا سماع کرے گا وہ بھی عاصی ہوگا۔

نوع سوم: یہ ہے کہ دل میں کوئی خوشی ہو اور چاہے کہ اس میں سماع سے فزونی ہو تو یہ سماع مباح ہوگا۔ جب خوشی ایسی چیز پر ہو جو روا ہو کہ اس پر اظہار خوشی کریں۔ جیسے کہ شادی بیاہ، ولیمہ، عقیقہ یا بچہ پیدا ہونے کی خوشی کے موقع پر یا ختنہ کرتے وقت یا سفر سے واپسی پر خوشی ہوتی ہے، تو سماع ان مواقع پر روا ہے۔ آنحضرت ﷺ جب مدینہ پہنچے تھے تو لوگ ان کے استقبال کو نکلتے تھے تو وہ دف بجاتے اور اظہار خوشی میں شعر پڑھتے تھے: ''طلع البدر علینا' من ثنیات الوداع ' وجب الشکر علینا مادعا للہ داع [1]

اسی طرح ایام عید میں خوشیاں منانا جائز ہے اور اسی طرح اسی سبب سے سماع بھی روا ہوگا۔ اسی طرح جب دوست بہم مل بیٹھیں اور موافقت کریں۔ کھانا کھائیں اور اگر چاہیں کہ وقت خوبی سے گذاریں تو سماع اور خوشی میں ایک دوسرے کی موافقت جائز ہوگی۔

نوع چہارم: اصل یہ ہے کہ جس کے دل پر حق تعالیٰ کی دوستی غالب ہو اور عشق کی حد کو پہنچ گئی ہو اس کے لئے سماع مہم ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ بہت سی رسمی خیرات سے اثر اس کا زیادہ ہو۔ اور جس شے سے حق تعالیٰ سے دوستی زیادہ ہو تو اس کا ثواب بھی زیادہ ہوگا۔ اور صوفیا کے ہاں سماع جو متداول ہے وہ اسی سبب سے ہے۔ اگر چہ اب وہ خالص نہیں رہا کیونکہ ان میں ایسا گروہ داخل ہو گیا ہے جس نے صورت صوفیاء کی سی بنا رکھی ہے۔ لیکن معنیٔ تصوف سے دل ان کے عاری ہیں۔ اور سماع آتش محبت کو فروغ دینے میں عظیم اثر رکھتا ہے۔ اور صوفیا میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ درمیان سماع کسی مکاشفے سے بہرہ مند ہو۔ اور اس کے ساتھ ایسی کریمانہ الطاف ہوں کہ خارج از سماع وارد نہ ہوتی ہوں۔ اور وہ احوال لطیف جو عالم غیب سے ان سے بہ سبب سماع ملحق ہونے لگتے ہیں اسے وجد کہتے ہیں۔ اور ہوسکتا ہے کہ ان کے دل سماع میں ایسے پاک صاف ہو جائیں جیسے چاندی آگ میں رکھنے سے خالص ہو جاتی ہے۔ سماع دل میں ایسی آگ لگاتا ہے جس سے تمام کدورتیں وہاں سے

---

[1] چودھویں کا چاند (پیغمبر) وداع یعنی سلامتی کی راہ سے ہم پر طلوع ہوا، تو اس کا شکر ہم پر واجب ہوا، جب دعا مانگی اللہ سے دعا مانگنے والے نے''۔

رخصت ہوجاتی ہیں۔اور عین ممکن ہے کہ بہت سی ریاضتیں معمولاً حاصل نہ ہوسکیں جو سماع کے ذریعے حاصل ہوجاتی ہوں۔اور سماع اس سرِّ مناسبت کی بناء پر جو عالم ارواح سے انسان کو ودیعت شدہ ہے حرکت دے یہاں تک کہ انسان کو کلیۃً اِس عالم سے اچک لے یہاں تک کہ جو کچھ اس دنیا میں ہے یا ہورہا ہے اس سے بے خبر کردے۔اور ہوسکتا ہے کہ اس کے اعضا مفلوج ہوجائیں اور وہ گر کر بے ہوش ہوجائے اور ان احوال میں سے جس قدر درست ہوگا اور اصل پر مبنی ہوگا تو اس کا درجہ بھی بڑا ہوگا۔اور وہ جس کا اس پر ایمان ہوگا۔اور سماع میں موجود نہ ہوگا وہ بھی ان برکات سے محروم نہ رہے گا لیکن غلطی کا احتمال اس میں بہت ہے اور غلطی کے گمان بہت ہیں۔حق و باطل کے نشان کو پیران پختہ کار اور سالکان راہ پیمودہ ہی جانتے ہیں۔اور مرید کے لئے جائز نہیں کہ اپنی مرضی سے سماع میں لگ جائے محض اس بناء پر کہ اس کے جی میں تقاضا پیدا ہوگیا ہو۔خواجہ علی حلاج خواجہ ابوالقاسم گرگانی کے مریدوں میں سے تھے۔اپنے پیر سے سماع کی اجازت مانگی تو خواجہ ابوالقاسم گرگانی نے فرمایا کہ: ''تین دن تک فاقہ کرو اور کچھ نہ کھاؤ اس کے بعد کھانا تیار کرنے کو کہو اگر پھر بھی میل تمھارا سماع کی طرف ہو تو سماع کو کھانے پر ترجیح دینا۔تب تمھارا یہ تقاضا بحق ہوگا اور تمھارے لئے مسلّم ہوگا''۔لیکن وہ مرید جس کے ہاں ابھی احوال دل پیدا نہ ہوئے ہوں اور راہ بجز معاملت کے نہ جانتا ہو یا احوال تو دل میں پیدا ہونے لگے ہوں لیکن شہوات نفسانی سے ابھی نجات نہ پائی ہو تو ایسے میں پیر پر لازم ہے کہ اسے سماع سے منع کرے۔کیونکہ اسے سود کی نسبت زیان زیادہ ہوگا۔

یاد رہے کہ جو کوئی سماع و وجد اور صوفیاء کے احوال کا منکر ہو اور کم قدری کے باعث انکار کرتا ہو تو وہ اس انکار میں معذور سمجھا جائے گا۔کیونکہ جس چیز سے خود عاری ہو تو اس پر ایمان لانا دشوار ہوتا ہے۔اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ مخنث کہ جس کو باور نہیں ہوتا کہ جماع میں لذت ہے کیونکہ وہ لذت تو قوت شہوت سے حاصل کی جاسکتی ہے جب وہ شہوت ہی سے عاری ہوتا ہے تو وہ اس لذّت سے کیسے آشنا ہوسکتا ہے؟ اگر نابینا شخص سبزہ و آب رواں کے نظارے سے انکار کرے تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کیونکہ وہ تو آنکھوں ہی سے محروم ہے اور نظارے سے بہرہ مند ہونے کے لئے آنکھ ضروری ہے۔اس طرح اگر چھوٹا لڑکا ریاست اور سلطنت اور فرماں روائی اور ملک داری سے انکار کرے تو کچھ عجب نہیں کیونکہ وہ تو کھیل تماشے کا راہی ہے۔ملک داری سے اسے کیا سروکار ہوسکتا ہے؟

یاد رہے کہ احوال صوفیاء سے لوگوں کا انکار عامی ہو یا خاص چھوٹے بچوں ہی کی طرح کا ہوتا ہے۔کیونکہ جس منزل کو ہنوز نہیں پہنچے اس کے منکر ہیں۔اور وہ شخص جو ذرا سی سمجھ رکھتا ہو وہ اقرار کرے گا۔اور کہے گا

کہ ''میرا حال تو یہ نہیں ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ صوفیا کا حال ہے تو وہ اس پر ایمان لاتا ہے اور بجا ہی لاتا ہے۔ اور وہ شخص جو سمجھتا ہے کہ جو کچھ مجھے حاصل نہیں وہ محال ہے اس لئے دوسرے کے ہاں بھی نہیں ہوسکتا تو وہ پرلے درجے کا احمق ہے۔ اور وہ ان لوگوں میں سے متصور ہوگا جن کے بارے میں فرمان خداوندی ہے کہ:
''وَاِذْلَمْ یَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَیَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْکٌ قَدِیْمٌ'' (قرآن: ۱۱/۴۶) (جب وہ اسے سمجھ نہیں پاتے تو کہنے لگتے ہیں کہ یہ پرانا دروغ ہے)۔

فصل: یاد رہے کہ جہاں ہم نے سماع کو مباح قرار دیا ہے۔ پانچ اسباب کی بناء پر سماع حرام ہے لہٰذا ان سے حذر کرنا چاہیے۔

سبب اوّل: یہ ہے کہ کسی عورت سے سنے یا کسی امرد سے کہ محل شہوت میں ہو۔ کیونکہ یہ حرام ہے۔ کیونکہ اگر کسی کا دل اللہ کے کام میں مستغرق ہو تو شہوت چونکہ انسانی سرشت میں ہے تو جب خوب صورت چہرہ دکھائی دے تو شیطان معاونت کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس لئے سماع بحکمِ شہوت شمار ہوگا۔ لیکن ایسے چھوٹے لڑکے سے سماع جو ہنوز محل فتنہ سے دور ہو' مباح ہے لیکن عورت اگرچہ بدرُو ہو' اس سے سماع مباح نہیں۔ کیونکہ سننے والا اس عورت کو دیکھتا ہے اور غیر محرم کو دیکھنا بہرصفت کہ ہو حرام ہے۔ اور اگر پس پردہ سے آواز سنے فتنہ کا خوف ہو تو حرام ہے۔ اگر یہ خطرہ نہ ہو تو مباح ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ حضرت عایشہ کے گھر میں دو کنیزیں گیت گا رہی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کے کانوں تک ان کی آواز پہنچ رہی تھی۔ پس آواز عورتوں کی چھوٹے بچوں کے چہروں سے پردے کی متقاضی نہیں۔ لیکن چھوٹے بچوں کو شہوانی نظر سے دیکھنا جہاں خوف فتنے کا ہو حرام ہے۔ اسی طرح عورتوں کی آواز بھی۔ یہ ہر کسی کے مقتضائے حال کے مطابق دگرگوں ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کوئی شخص ایسا ہوتا ہے کہ وہ کلیۃً مامون ہوتا ہے تو کوئی خام ہونے کے باعث خطرے میں ہوتا ہے۔ اور یہ ایسے ہی ہے کہ جو شخص شہوت پر کنٹرول رکھتا ہے۔ تو وہ ماہ رمضان میں روزہ کی حالت میں اگر وہ اپنی بیوی کو بوسہ دے تو جائز ہے۔ لیکن ایسے شخص کے لئے اپنی بیوی کو روزے کی حالت میں بوسہ دینا حرام ہوگا جسے یہ خوف ہو کہ شہوت اُسے مباشرت کی طرف لے جائے گی۔ یا محض بیوی کے بوسے سے انزال کا خوف ہو۔

سبب دوم: چونکہ رباب و چنگ و بربط کے تار انتڑیوں کے ہوتے ہیں یا نائے عراقی ہو اس لئے ان کے ساتھ گانا گانے کی نہی آئی ہے۔ اور یہ نہی اس بناء پر نہیں کہ ان سازوں میں سے عمدہ لے نکلتی ہے بلکہ اس لئے کہ ان کے تار انتڑیوں سے بنے ہوتے ہیں۔ اس لئے نوائے خوش و ناخوش دونوں صورتوں میں ان کے ساتھ سماع حرام ہے۔ لیکن اس بناء پر کہ یہ ساز شرابیوں کا معمول ہیں اور جو کچھ ان سے مخصوص ہو حرام کیا گیا ہے۔

شراب کی تبعیت میں۔ اس لئے کہ ان سے شراب یاد آجاتی ہے اور اس کی آرزو کو حرکت دیتی ہے۔

لیکن طبل وشاہین اور دف اگرچہ اس میں جلاجل بھی ہوں حرام نہیں۔ کیونکہ ان کی ممانعت یا عدم ممانعت کا بیان حدیث میں وارد نہیں۔ اور یہ رودوں کی مانند بھی نہیں اور نہ شرانجوار انھیں استعمال کرتے ہیں۔

پس انھیں چنگ و بربط وغیرہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ آنحضرت ﷺ کے سامنے دف بجائی گئی ہے۔ اور آنحضرت ﷺ نے خود شادی بیاہ کے موقع پر دف بجانے کا حکم دیا ہے۔ یاد رہے کہ دف پر جلاجل کا اضافہ ہونے پر دف زنی حرام نہیں ہوجاتی۔ اور طبل زنی حاجیوں اور غازیوں میں خود مروج ہے۔ لیکن مخنثوں کا طبل حرام ہے۔ کہ یہ ان کا شعار و پہچان ہے۔ ان کا طبل طویل ہوتا ہے۔ درمیان میں سے باریک اور ہر دو سروں پر چوڑا ہوتا ہے۔ لیکن شاہین خواہ اس کا سر آگے نکلا ہوا ہو یا سینہ نکلا ہوا ہو حرام نہیں۔ کیونکہ اسے چرواہے بجاتے تھے۔ شاہین کی آواز ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے کانوں میں آئی تو آپ ﷺ نے انگلی کان میں دے لی اور ابن عمر رضی اللہ عنہ جو اس وقت ہمراہ تھے سے فرمایا کہ شاہین کی آواز سنتے رہنا اور جب ختم ہوجائے تو مجھے بتانا۔ پس ابن عمر کو سماع کی اجازت دینا دلیل اس بات کی ہے کہ اس کا سننا مباح ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کا کانوں میں انگلیاں دے لینا دلیل اس امر کی ہے کہ اس وقت آپ ﷺ کو ایسی شریف اور بزرگوار حالت کا سامنا ہو کہ خوف یہ ہو کہ شاہین کی آواز اپنی طرف راغب نہ کرلے۔ کیونکہ سماع شوق حق تعالیٰ کو مہمیز دینے میں اثر رکھتا ہے۔ اسے جو عین اس کام میں نہ ہو۔ اور یہ ضعیفوں کے لئے خود ان کا یہ حال نہیں ہوتا الطاف کریمانہ ہے۔ لیکن وہ جو پہلے ہی کار حق میں مستغرق ہو تو خوف یہ ہوتا ہے کہ سماع اس کو خود میں مشغول کرلے تو یہ اس کے حق میں باعث ضرر ہوگا۔ پس آنحضرت ﷺ کا اس سماع سے پرہیز دلیل اس بات کی نہیں کہ سماع حرام ہے۔ کیونکہ کئی مباح امر ایسے ہیں کہ جن سے محترز رہا جاتا ہے۔ لیکن اجازت دینا اس کے مباح ہونے کی دلیل قاطع ہے۔ کیونکہ وجہ اس کی اور کوئی نہ ہوگی۔

سبب سوم: یہ کہ اگر گیت میں فحش ہو یا ہجو ہو یا طعن ہو اہل دین کے بارے میں جیسے کہ روافض کے اشعار صحابہؓ کے بارے میں ہیں۔ یا اس میں معروف عورتوں کے بارے میں ایسی ہی صفات کا تذکرہ ہو تو مردوں کے سامنے عورتوں کی صفات وغیرہ کا ذکر کرنا جائز نہیں۔ اس لئے اس طرح کے تمام اشعار کہنا اور سننا دونوں حرام ہیں۔ لیکن وہ اشعار جن میں زلف و خد و خال و جمال ہو یا بیان وصال و فراق جو عشاق کے ہاں معمول ہے ان کا سننا یا گانا حرام نہیں۔ حرام اس وقت ہوتا ہے کہ جب کوئی اپنے خیال کو کسی عورت یا امرد پر تطبیق دیتا ہے تو اس وقت اس کا یہ اندیشہ حرام ہوتا ہے اور اگر اپنی بیوی یا کنیز پر منطبق کرے تو حرام نہ ہوگا۔ لیکن

صوفیاء اور وہ لوگ جو دوستی حق تعالیٰ میں مستغرق ہوتے ہیں سماع ان کا کریں تو ان کے لئے ضرر رساں نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اپنے اپنے احوال روحانی کے مطابق ان اصطلاحوں کے معنی مراد لیتے ہیں۔ جیسے زلف سے ظلمت کفر اور نور رو سے نور ایمان مراد لیں۔ اور اسی طرح زلف سے سلسلۂ اشکال حضرت الٰہیت مراد لیں جیسے کہ شاعر کہتا ہے کہ ؎

گفتم بشمارم سرِ یک حلقۂ زلفت　　تا بو کہ بہ تفصیل سرِ جملہ برآرم

خندید بمن بر٘ سر زلفین مشکین　　یک پیچ بہ پیچید و غلط کردشمارم

کہ اس زلف سے سلسلہ اشکال مراد رکھتے ہیں کہ اگر کوئی چاہے کہ عقل کو بروئے کار لا کر عجائب حضرت الٰہیت کے ایک بال کو بھی سمجھ سکے تو اس میں اگر ایک پیچ بھی پڑ جائے تو گننے والے کا شمار غلط ہو جائے۔ اور جملہ عقول بے ہوش ہو جائیں۔ ایسے ہی جب شراب و مستی کا ذکر ہو تو شعر سے اس کے ظاہری معنی مراد نہیں رکھتے۔ مثلاً جب کہتے ہیں کہ: ؎

گرمے دو ہزار رطل بر پیمائی　　تا خود نخوری بناشدت شیدائی

تو اس شعر سے وہ یہ مطلب لیتے ہیں کہ دین کا کام محض علم بیان سے پورا نہیں ہوتا بلکہ ذوق کے سہارے تکمیل پاتا ہے۔ یعنی اگر بہ کثرت محبت و عشق و زہد و توکل کے معانی بیان کرے اور ان معانی میں کتابیں بھی تصنیف کرے اور ورق کے ورق بھی سیاہ کر دے اس کا کوئی فائدہ نہیں جب تک خود کو اس صفت سے عملاً متصف نہ کرے اور جو خرابات کے بارے میں شعر کہے جاتے ہیں ان کا مفہوم دوسروں سے مختلف مراد رکھتے ہیں۔ مثلاً جب کہتے ہیں کہ: ؎

ہر کو بہ خرابات نشد بے دین ست　　زیرا کہ خرابات اصول دین ست

تو وہ خرابات کے لفظ سے خرابی صفات بشریت مراد رکھتے ہیں کیونکہ اصول دین یہ ہے کہ یہ بری صفات جو دل میں جاگزیں ہوگئی ہیں ویران ہو جائیں تاکہ جو انسان کے گھر میں ہنوز ناپیدا ہے یعنی فضائل وہ اس میں جاگزیں ہو کر فروغ پا سکیں، وغیرہ مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ اور صوفیاء کے فہم کی شرح بہت طویل ہے۔ کیونکہ ہر کوئی اپنے فکر و نظر کے مطابق الفاظ و تراکیب کا مفہوم اخذ کرتا ہے لیکن اس کا کسی قدر بیان اس لئے ناگزیر تھا کہ احمقوں اور بدعتیوں کا ایک گروہ ایسا ہے کو وہ صوفیاء کو طعن و تشنیع کا نشانہ اس لئے بناتے ہیں کہ ''صوفیاء بھی صنم و زلف و حال و مستی و خرابات کا بیان سنتے اور کرتے ہیں، جو حرام ہے''۔ اور گمان یہ کرتے ہیں کہ بجائے خود یہ بڑی دلیل ہے جو انھوں نے خود دی ہے۔ اور طعن منکرات میں سے ہے کہ عوام صوفیاء کے احوال کو نہیں جانتے۔

بلکہ صوفیاء کا سماع نوا پر ہوتا ہے۔ الفاظ کے معنی پر نہیں ہوتا۔ مجرد آواز کو سنتے ہیں۔ کیونکہ ساز شاہین کی آواز ہی پر وہ سماع سے لطف اندوز ہوتے ہیں اگرچہ اس کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ عربی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں لیکن عربی شعر سن کر سماع سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں اور احمق ہنستے ہیں کہ یہ عربی تو جانتے نہیں عربی شعر سے سماع سے کیونکر مستفید ہو سکتے ہیں۔ اور یہ احمق اس قدر علم بھی نہیں رکھتے کہ اونٹ بھی عربی نہیں جانتا لیکن تھکن پر عرب ساربان کی خوش الحانی سے متاثر ہو کر باوجود بار گران کے قوت سماع ونشاط کے ساتھ تیز دوڑنے لگتا ہے۔ اور جب منزل پر پہنچ کر حدی خوان سماع کو چھوڑ دیتا ہے تو اونٹ پر وہ حال وارد ہوتا ہے کہ جس سے اکثر وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ تو ان احمقوں کو چاہئے کہ اونٹ سے مناظرہ کرتے کہ تو تو عربی سے آشنا ہی نہیں تو یہ کیسا نشاط وسرور ہے کہ تجھ میں پیدا ہوتا ہے؟'' اور ایسے بھی ہوتا ہے کہ سماع سننے والا تازی کے اس شعر کو اس معنی پر محمول کرے جو اس کے معنی نہیں۔ لیکن ایسوں کو بعض اوقات وہ خیال ذہن میں ابھرتا ہے کیونکہ ان کا مقصد شعر کی تشریح نہیں ہوتا۔ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ ''مَازَارَنِی فِی النَّوم اِلَّا خَیَالُکُم'' (خواب میں تمھارے خیال کے سوا میرا اور کوئی ہمدم نہیں ہوتا)۔ ایک صوفی پر اس سے حال وارد ہوگا۔ تو لوگوں نے کہا عرب زبان سے نابلد ہونے کی بناء پر جب تمھیں معلوم ہی نہیں کہ اس نے کیا کہا ہے۔ تو تمھارا یہ حال یعنی چہ؟ تو وہ بولا: ''میں کیوں نہیں جانتا؟ وہ کہتا ہے کہ ''ما زاریم'' تو ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے کہ ہم سب حال زار میں ہیں۔ اور پیچھے رہ گئے ہیں اور معرض خطر میں ہیں''۔ پس صوفیاء کا سماع اسی انداز کا ہوتا ہے۔ اور جس کے دل میں کوئی کام جاگزین ہو جاتا ہے اور غالب ہو جاتا ہے تو وہ جو کچھ سنتا ہے تو وہ وہی سنتا ہے اور وہی دیکھتا ہے جس سے اس کا دل سرشار ہے۔ اور وہ جس کے دل میں آتشِ عشق، باطل کے لئے یا حق کے لئے پیدا نہ ہوئی ہو وہ اس راز کو سمجھ نہیں سکتا۔

سبب چہارم: یہ ہے کہ سننے والا جوان ہو اور شہوت اس پر غالب ہو۔ اور اپنے خدا کی محبت کو نہ جانتا ہو کہ کیا شے ہے۔ تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ جب وہ زلف وخدوخال وخوب رُو کے الفاظ سنتا ہے تو شیطان اس کی گردن پر سوار ہو جاتا ہے اور اس کی شہوت کو انگیخت کرتا ہے اور حسینوں کے عشق کو اس کے دل میں آراستہ کرتا ہے اور جب عشاق کے احوال سنتا ہے تو اس کو وہ احوال بھلے لگتے ہیں تو پھر وہ اس کی آرزو اور طلب میں بہ طریقِ عشق چل نکلتا ہے۔ اور مردوں عورتوں میں بہت ایسے ہیں جو صوفیاء کے لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ اور اس کام میں لگ گئے ہیں۔ پھر عبادت اور شیوہ طامات کے ساتھ اسے عذر قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''فلاں کے ہاں جنوں اور شوریدہ سری پیدا ہوگئی ہے۔ اور خاشاک اس کی راہ کا روزہ بن گئے ہیں''۔ نیز یہ

کہتے ہیں کہ ''عشق دامِ حق ہے اور اسے حال میں پھانس لیا گیا ہے''۔ نیز کہتے ہیں کہ : ''اس کے دل کی حفاظت اور کوشش کرنا کہ وہ اپنے معشوق سے مل سکے عظیم نیکی ہے''۔ اور عفت کی دلالی کی خوبی اور خوش اخلاقی کا نام دیتے ہیں اور فسق ولواطت کو عشق وجنون کا نام دیتے ہیں۔ اور خود کو معذور رکھنے کے لئے ممکن ہے کہیں: ''ہمارے فلاں پیر کو ایک لڑکے کے ساتھ محبت تھی۔ اور ایسا ہمیشہ بزرگوں کی راہ میں ہوا ہے۔ اور یہ لواطت نہیں کہ شاہد بازی ہے''۔ ممکن ہے کہ یہ کہیں کہ : ''یہ عین روح بازی ہے''۔ اور اس قسم کی ترہات (گزاف گوئی) بیان کرتے ہیں تا کہ اپنی فضیحت کو اس قسم کی یاوہ گوئی سے چھپائیں۔ اور حق یہ ہے کہ جو کوئی یہ اعتقاد نہ رکھتا ہو کہ یہ حرام ہے۔ اور فسق ہے وہ اباحتی قرار دیا جائے گا قتل ایسے کا مباح ہے۔ اور یہ جو پیروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لڑکے پر نظر رکھتے تھے۔ تو یا تو یہ بات محض اپنے عذر کے لئے بہ دروغ گھڑ لی ہوگی یا اگر کسی پیر نے دیکھا ہو تو ظاہر ہے کہ بہ نظر بد نہ دیکھا ہوگا۔ بلکہ یوں ہوگا کہ جیسے کوئی سرخ سیب کو دیکھے یا غنچہ وگل پر نظر ڈالے یا ممکن ہے وہ پیر خطا کے مرتکب ہو گئے ہیں۔ کیونکہ غلطی سے کوئی بھی معصوم نہیں ہوتا۔ اور جس بات سے پیر غلط کار ہو یا معصیت کا مجرم ٹھہرے تو وہ معصیت جائز نہیں ٹھہرائی جاسکتی۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کی حکایت اس لئے بیان ہوئی ہے تا کہ کبھی کوئی یہ گمان نہ کرے کہ اس قسم کے صغائر سے مامون ہوتا ہے۔ اگر چہ بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کے نوحے اور گریہ زاری اور توبہ کا ذکر اسی لئے ہوا ہے کہ کوئی اس کو حجت قرار نہ دے اور پھر خود کو معذور سمجھے اور باعث اس کا ایک اور بھی ہے۔ لیکن بہت نادر ہے کہ کوئی ایسا ہوتا ہے کہ اسے اسی حالت میں جو صوفیاء کا خاصہ ہے کوئی چیز دکھائی جاتی ہے۔ جو ممکن ہے جواہر ملائکہ اور ارواحِ انبیاء اس پر مثالی صورت میں کشف ہوں۔ اور وہ انتہائی خوب صورت انسان کے روپ میں ہو اور مثال لازماً حقیقت معنی کے مطابق ہوتی ہے۔ اور جب وہ معنی معانی ارواح کے درمیان انتہا درجے کے کمال میں ہو تو مثال اس کی عالم صورت میں انتہائی جمال کی صورت میں ہوگی۔ مثلاً عرب میں دحیۂ کلبی سے خوب صورت تر اور کوئی شخص نہ تھا۔ آنحضرت ﷺ حضرت جبریل کو اس کے روپ میں دیکھتے تھے۔ اس لئے ممکن ہے کہ پیر پر کوئی شے ایک خوب رو امرد کی صورت میں کشف ہوئی ہو جس سے اس نے عظیم لذت پائی ہو۔ اور جب اس حال سے لوٹتا ہے تو وہ معنی پھر اس سے محجوب ہو چکے ہوتے ہیں۔ تو وہ اس معنی کے شوق وطلب میں کہ صورت جس کی مثالی تھی تو امکان اس کا ہوتا ہے کہ دوبارہ اس معنی سے بہرہ مند نہ ہو۔ جس سے وہ وجد وحال میسر ہو تو جائز ہوگا کہ کوئی یہ رغبت رکھے کہ پھر سے وہ صورت نیکو دیکھے تا کہ اس حالت کو پھر سے پا سکے اور جو کوئی ان رموز عرفان سے نابلد ہوتا ہے تو جب وہ ان بزرگ کی رغبت دیکھتا ہے تو اسے اپنے نفس کی رغبت

کا سا سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ صوفی کے اسرار سے بے خبر ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ صوفیا کا مسلک عظیم بھی ہے لیکن پر خطر بھی ہے اور مخفی بھی ہے۔ اور کوئی اس باب میں غلط فہمی میں پڑنے سے بڑھ کر کسی اور امر میں خطا کا مرتکب نہیں ہوتا۔

اس قدر بیان کیا گیا تا کہ معلوم ہو سکے کہ صوفیاء مظلوم ہیں کہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ اس نوع کے تھے۔ جیسے کہ اِس زمانے میں وجود میں آ گئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مظلوم وہ شخص ہوگا جو اس طرح گمان کرتا ہے۔ کیونکہ اس نے خود پر ظلم کیا کہ صوفیاء کے باب میں تحریف کی اور عامۃ الناس پر انھیں قیاس کیا۔

سبب پنجم: یہ ہے کہ عوام سماع عادتاً کرتے ہیں اور اسے کھیل تماشا سمجھتے ہیں۔ تو یہ اس صورت میں مباح ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اسے پیشہ نہ بنالیں اور اس پر مواظبت نہ کریں۔ کیونکہ جس طرح بعض گناہ صغیرہ ہیں لیکن اگر معمول بن جائیں تو کبائر کو پہنچ جاتے ہیں بعض چیزیں مباح کی ذیل میں شمار ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ کبھی کبھار ہوں اور مختصر ہوں۔ تو جب وہ بکثرت ہونے لگیں تو حرام قرار پاتی ہیں۔ جیسے کہ حبشی مسجد میں تماشا دکھا رہے تھے تو آپ ﷺ نے منع نہیں کیا لیکن اگر مسجد کو بازی گاہ بنا لیتے تو حضور منع فرما دیتے اسی طرح تماشا دیکھنے سے حضرت عائشہ ؓ کو آپ نے منع نہیں کیا۔ لیکن اگر کوئی ان کے ساتھ مل کر پیشہ بنالے تو جائز نہ ہوگا۔ اسی طرح خوش طبع جو کبھی کبھار ہو مباح ہے۔ لیکن اگر کوئی اس کا عادی ہو جائے اور مسخرہ بن جائے تو پسندیدہ نہیں۔

———◆◆◆———

باب دوم: آ ثار سماع میں اوراس کے آداب میں

معلوم رہے کہ سماع میں مقام تین ہیں: اوّل فہم' دوم وجداور سوم حرکت اوران تینوں میں کلام ہے۔

مقام اوّل: فہم میں ہے۔لیکن اگر کوئی سماع طبعاً اور غفلت سے کرے یا مخلوق سمجھ کر کرے تو وہ اس قابل نہیں کہ اس کے بارے میں بات کی جائے۔لیکن وہ جس پر دین کی فکر غالب ہواوراللہ تعالیٰ کی محبت سے بہرہ مند ہواس کے مدارج دو ہیں۔

درجہ اوّل: مرید کا درجہ ہے کہ جس کے احوال قبض وبسط وآسانی ودشواری اورآ ثار قبول اورآ ثار رد کے بارے میں اپنی طلب میں اوراپنے راہ کے سلوک میں متفاوت ہوتے ہیں۔اور کلیۃً دل اس کا اس میں محو ہو۔جب کوئی اور بات سنے جس میں عتاب وقبول' وصل وہجر وقرب وبعد ورضا وسخط وامید ونومیدی' وامن و خوف' ووفا بہ عہد وبدعہدی' وشادی وصال واندوہ فراق اور جو کچھ ان کا سا ہواس کا بیان ہوتو وہ اسے اپنے احوال سے تطبیق دیتا ہے۔اور جو کچھ اس کے باطن میں ہوتا ہے وہ فروزاں ہونے لگتا ہے۔اوراس میں کئی مختلف احوال ظاہر ہونے لگتے ہیں۔تو اس سے اس کے دل میں مختلف اندیشے جنم لیتے ہیں اوراگر اس کے علم کی بنیاد اور عقاید محکم نہ ہوں تو عین ممکن ہے کہ سماع میں اس کے دل میں ایسے خیال خطور کرنے لگیں جو کفر ہوں۔ کیونکہ حق سبحانہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی چیز سنے کہ محال ہو جیسے کہ مثلاً یہ شعر سنے

زاوّل بہ منت میل بُد آں میل کجاست؟ وامروز ملول گشتن از بہرِ چراست؟

تو ہر وہ مرید جو اول کار تیز اور رواں رہا ہو اور پھر وہ ضعیف تر ہو گیا ہو۔تو وہ گمان کرے گا کہ حق تعالیٰ کو اس کے ساتھ معاملہ عنایت اور توجہ کا رہا ہے۔لیکن اب تبدیل ہو گیا ہے تو اس سے حق تعالیٰ کے باب میں تغیر سمجھتا ہے جو کہ کفر ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے باب میں تغیر کو راہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ تو مغیّر ہے اور متغیّر نہیں ہے۔اور جاننا اسے یہ چاہئے کہ خوداسی کی حالت متغیر ہوگئی ہے جس کے نتیجے میں وہ معنی جو کشادہ تھے وہ محجوب ہو گئے ہیں۔اوراللہ تعالیٰ کی طرف سے ہرگز منع وحجاب وملال نہیں ہوتا بلکہ اس کی بارگاہ تو کھلی ہے' آفتاب کی طرح کہ تو اس کا مبذول ہے۔سوائے اس کے جو خود کسی دیوار کے پیچھے چھپ جائے اوراس روشنی سے حجاب میں جا پڑے۔اس طرح تغیر خود اس کی ذات میں واقع ہوتا ہے نہ کہ آفتاب میں۔تو اس لئے مرید کو

اقبالاً یہ شعر پڑھنا چاہیئے ؎

خورشید بر آمدائے نگارین دیر ست گر بر سر من نتابد از ادبیر ست[1]

چاہیئے کہ حوالت حجاب اپنے ادبار کے باعث قرار دے۔ اس تقصیر کے سبب جو اس سے سرزد ہوئی ہو نہ کہ حق تعالیٰ سے۔ اور مقصود اس مثال سے یہ ہے کہ جو نقص اور تغیّر کی صفات سے ہو اسے اپنے حق میں اور اپنے نفس کا نتیجہ قرار دے اور جو کچھ وجود کے جلال و جمال کے بارے میں ہو اسے حق تعالیٰ کے حق میں قرار دے۔ اگر علم میں سے اس قدر سرمایہ بھی نہیں رکھتا تو جلد کفر میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور جانتا بھی نہیں کہ اس بناء پر حق تعالیٰ کی دوستی کے باب میں سماع سے عظیم خطرات ہیں۔

درجہ دوم: وہ ہے کہ جب درجۂ مریداں سے آگے نکل گیا ہو اور احوال اور مقدمات کو پیچھے چھوڑ گیا ہو اور اس حال کی انتہا کو پہنچ گیا ہو جسے فنا کہتے ہیں یا نیستی جسے ماسوی اللہ سے نسبت دیتے ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ سے نسبت دیتے ہیں تو اسے توحید یا یگانگی کہتے ہیں۔ اور ایسے شخص کا سماع بر سبیل معنی نہیں ہوتا۔ بلکہ جب سماع اس تک پہنچتا ہے تو فنا اور یگانگی اس کے لئے تازہ ہو جاتی ہے اور وہ خود سے کلیۃً غائب ہو جاتا ہے۔ اور اس عالم سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ اگر آگ میں بھی پڑ جائے تو خبر نہ لگے۔ جیسے شیخ ابوالحسن نوریؒ سماع میں ایسے کھیت پر سے بھاگے کہ جس میں سے نے کاٹی گئی تھی۔ جس سے اُن کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے اور وہ خود اس سے بے خبر تھے۔ اس قسم کے اصحاب کا سماع کامل ہوتا ہے۔

لیکن مریدوں کا سماع صفاتِ بشریت سے خالی نہیں ہوتا۔ اور یہ وہ ہے کہ سماع میں مشغول کو کاملاً اسے خود سے اچک لیتا ہے، جیسے کہ عورتوں نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تھا اور سب نے خود فراموشی کے عالم میں اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔ تو اس قسم کی نیستی کا انکار کرتے ہوئے یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ ''میں اسے دیکھتا ہوں وہ 'نیست' کس طرح ہوا؟'' کیونکہ وہ وہ نہیں ہے جسے تم دیکھ رہے ہو۔ وہ کالبد ہے نہ کہ اس کی انسانی حقیقت۔ اور جب وہ مر جائے گا تو بھی اسے دیکھے گا۔ جب کہ وہ نیست ہو چکا ہے۔ حقیقت اس کی وہ معنی لطیف ہے جو محلِ معرفت ہے۔ جب ہر چیز کی معرفت اس سے غائب ہو گئی تو اس کے حق میں نفی ہو گئی۔ اور جب اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو گیا تو اپنے حق میں بھی معدوم ہو گیا اور اب سوائے ذکر حق تعالیٰ کے کچھ باقی نہ رہا۔ جو کچھ فانی تھا ختم ہو گیا اور جو کچھ باقی تھا وہ باقی رہا۔ پس یگانگی یا توحید کے معنی یہ ہیں کہ جب سالک سوائے اللہ کے اور کچھ نہ دیکھے اور کہے: ''خود ہمہ اوست اور میں نہیں ہوں'' یا کہے کہ ''میں خود وہ ہوں'' اور ایک

---

[1] ممالۂ ادبار

گروہ نے یہاں غلطی کا ارتکاب کیا ہے کہ اسے 'حلول' کہا ہے تو بعض نے اسے اتحاد کا نام دیا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ کسی نے اگر کبھی آئینہ نہ دیکھا ہو۔ اور آئینے میں دیکھے تو اپنی صورت کو دیکھے گا اور گمان یہ کرے گا کہ اس کی صورت خود آئینے کی صورت ہے اور صفت آئینے کی خود یہ ہے کہ وہ سرخ و سفید دکھاتا ہے۔ تو اگر وہ شخص سمجھے کہ وہ خود آئینے میں اتر آیا ہے تو یہ حلول ہوگا اور اگر گمان یہ کرے کہ آئینے نے خود اس کی صورت اختیار کر لی ہے تو یہ اتحاد ہوگا۔ تو یہ دونوں گمان غلط ہیں۔ کیونکہ آئینہ کبھی صورت نہیں ہو سکتا اور نہ صورت آئینہ ہو سکتی ہے۔ لیکن دکھائی یوں دیتی ہے۔ اور یہ گمان اس کا ہے جو ابھی اس راہ میں پختہ کار نہ۔ اور کیمیائے سعادت جیسی کتاب میں اس کی تفصیل طویل ہونے کے باعث بیان نہیں ہو سکتی۔

مقام دوم: جب فہم سے فارغ ہو گیا تو ایک حال ہے جو وارد ہوتا ہے جسے وجد کہتے ہیں۔ اور وجد پانے کو کہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حالت جو اس سے قبل نہ تھی اس سے دوچار ہے۔ اور اس حالت کی حقیقت کے باب میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ کہ وہ کیا ہے؟ درست یہ ہے کہ یہ ایک نوع ہے بلکہ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ لیکن بہ اعتبار جنس دو ہیں۔ ایک جنسِ احوال اور دوسرے جنسِ مکاشفات۔

اور احوال یوں ہوتا ہے کہ سالک پر ایک صفت غالب ہو جاتی ہے جو اسے ایک مست کا سا بنا دیتی ہے اور وہ صفت کبھی شوق ہوتی ہے کبھی خوف ہوتی ہے یا آتش عشق ہوتی ہے۔ کبھی طلب ہوتی ہے' کبھی اندوہ تو کبھی حسرت ہوتی ہے۔ اس کی قسمیں بہت ہیں۔ جب وہ آگ دل پر غالب ہو تو اس کا دھواں دماغ کا رخ کرتا ہے اور اس کے حواس کو مغلوب کر لیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ سوئے ہوئے شخص کی مانند نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے یا اگر دیکھتا یا سنتا ہے تو بھی اسی دید شنید سے چونکہ مست ہوتا ہے غافل ہوتا ہے۔

دوسری نوع مکاشفات ہے کہ ایسی چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں جیسے کہ صوفیاء کے ہاں نمودار ہوتی ہیں تو ان میں سے بعض تو مثال کے لباس میں ہوتی ہیں تو بعض صریح۔ اور سماع کا اثر ان میں اس بناء پر ہوتا ہے کہ جو دل کو صفائی سے بہرہ مند کرتا ہے۔ اور اگر دل آئینے کی طرح ہو جس پر گرد و غبار آ گیا ہو تو اسے اس گرد سے پاک کر دیتا ہے تا کہ صاف ہو جائے اور صورت اس میں نمایاں ہو جائے۔

اور جو کچھ تم اس معنیٰ میں معرض تحریر میں لا سکتے ہو وہ ایک قیاسی اور مثالی علم ہوگا۔ اور حقیقت اس کی سوائے اُس شخص کے جو اس مقام کو کو پہنچ گیا ہو اور کسی کو معلوم نہ ہوگی۔ پھر ہر ایک کو اپنے مرتبے کا علم ہو جائے گا۔ اگر دوسرا تصرّف کرے گا تو وہ اپنے مرتبے ہی کے قیاس کے مطابق کرے گا اور جو کچھ از روئے قیاس ہوگا وہ ورق علم سے ہوگا نہ کہ ذوق کے ورق سے۔ جس قدر جو بیان ہوا ہے غرض اس سے یہ ہے کہ جب تک لوگوں

کو ذوقاً یہ حالت نصیب نہ ہو صوفیاء کے احوال کو باور کریں اور ان کی تکذیب نہ کریں کہ یہ تکذیب خود ان کے حق میں مضر ہے۔ اور انتہائی احمق وہ شخص ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اُس کے خزانے میں نہیں وہ بادشاہ کے خزانے میں بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اس سے احمق تر وہ ہوگا جو اپنی بے مقداری پر خود کو بادشاہ تصور کرتے ہوئے لاف زنی کرے کہ ''میں تمام منازل طے کر چکا ہوں۔ اور سب کچھ حاصل ہو چکا اور جو کچھ میرے پاس نہیں اس کا وجود ہی نہیں'' اور تمام ان کا مبلغ علم اسی قسم کی دو نوع کی حماقتوں کا ثمر ہے۔

معلوم رہے کہ وجد بہ تکلف بھی ہو سکتا ہے اور وہ عین نفاق ہے۔ الا یہ کہ اس کے اسباب دل میں بہ تکلف لائے۔ تا کہ وجد کی حقیقت ظاہر ہو سکے۔ حدیث میں ہے کہ ''جب تم قرآن کی تلاوت کو سنو تو گریہ کرو۔ اگر رونا نہ آئے بہ تکلف رونی صورت بنالو۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ حُزن کے اسباب بہ تکلف دل میں لاؤ اور یہ تکلف بے اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ حقیقت تک پہنچا دے۔

سوال: اگر کوئی کہے کہ ''جب سماع ان کا حق ہے اور حق ہی کے لئے ہے تو چاہئے کہ دعوتوں میں قاریوں کو بٹھاتے اور قرآن پڑھواتے۔ بجائے اس کے کہ قوال راگ سنائیں۔ کیونکہ قرآن کلام حق ہے اس لئے قرآن کا سماع اشعار سے اولیٰ تر ہے''۔ تو جواب اس سوال کا یہ ہے کہ آیاتِ قرآن کا سماع عظیم ہے۔ اور وجد بھی اس سے بہت پیدا ہوتا ہے اور اکثر یہ ہوتا ہے۔ سماعِ قرآن سے سامعین ہوش کھو دیتے ہیں اور ایسا بھی ہوا ہے کہ بہت سے لوگوں نے تلاوتِ قرآن کے سماع پر جان کھو دی ہے۔ اور اس کے بیان میں طوالت کا خوف ہے۔ ہم نے اپنی کتاب احیاء میں بہ تفصیل اسے بیان کیا ہے۔ لیکن قاریوں کی جگہ قوالوں کو بٹھاتے ہیں اور قرآن کی جگہ سرور کو دیتے ہیں اس کا سبب پانچ چیزیں ہیں:

اوّل یہ کہ قرآن کی تمام آیات عشاق کے احوال سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ قرآن میں کافروں کے قصے اور اہل دنیا کے معاملات اور دوسری چیزوں کا بیان بہ کثرت ہے۔ کیونکہ قرآن تمام قسم کی مخلوق کے لئے شفا کا حکم رکھتا ہے۔ تو جب قاری اس آیت کو پڑھتا ہے کہ ''ماں کے لئے میراث میں چھٹا حصہ ہے اور بہن کا آدھا یا ''اگر کسی عورت کا شوہر مر جائے تو اسے چار ماہ دس دن کی عدت گذارنا چاہئے''۔ اور اس جیسی آیات بکثرت ہیں۔ تو یہ آیات آتش عشق کو فروغ نہیں دیتیں سوائے اس کے جو انتہا درجے کا عاشق ہو اور اس کے لئے ہر چیز سماع کا حکم رکھتی ہو اگر چہ مقصود سے دور ہو۔ لیکن یہ صورت نہایت شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔

سبب دوم یہ کہ قرآن اکثر یاد کیا جاتا ہے اور تلاوت بھی بہت کی جاتی ہے اور جو چیز کثرت سے سنی جائے اکثر احوال میں وہ دل کو حقائق سے آگاہ نہیں کرتی۔ ایسے ہی ایک شعر جو پہلی مرتبہ سنا جائے اس سے

جو سرور حاصل ہوتا ہے اس شعر کو جب دوبارہ سنتے ہیں تو وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ شعر وسرور تو نیا بیان کیا جاسکتا ہے لیکن قرآن میں تو تجدید کی گنجائش نہیں۔ عرب جب آنحضرت ﷺ کے زمانے میں آتے تھے تو جب وہ تازہ قرآن کو سنتے تھے تو ان پر گریہ طاری ہوجاتا تھا۔ اور ان پر احوال ظاہر ہوتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان سے فرماتے کہ "كُنَّا كَمَا كُنتُم ثُمَّ قَسَت قُلُوبُنَا" ہم بھی تمھاری ہی طرح تھے لیکن اب ہمارے دل سخت ہوگئے ہیں۔ یعنی قرآن کے ساتھ سکون پاگئے ہیں اور اس کے عادی ہوگئے ہیں۔ پس جو چیز نئی ہو اثر اس کا زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاجیوں سے فرماتے کہ حج کے اتمام پر اپنے اپنے شہروں کو واپس ہوجاؤ۔ اور فرماتے تھے کہ مجھے ڈر ہے کہ کعبے کے خوگر ہوجانے پر کہیں ان کے دل سے کعبے کا احترام جاتا نہ رہے۔

سبب سوم یہ ہے کہ بیشتر دل حرکت میں نہیں آتے جب تک کوئی انھیں خوش الحانی اور موزونی شعر سے تحریک نہ دے۔ یہی وجہ ہے کہ محض بیان سے اثر کم ہوتا ہے۔ لیکن خوش نوائی' موزونی' اور خوش الحانی سے اثر بیشتر ہوتا ہے۔ تو ایسے میں سرور ونغمہ اور آہنگ سے مزید اثر انگیزی ہوتی ہے۔ اور قرآن کو الحان میں ڈالنے اور نغمہ وسرود کے ذریعے تصرف کرنا ممنوع ہے۔ اور جب کوئی بات بے الحان ہو تو مجرد بات ہی رہ جائے گی لیکن نغمہ وسرود سے سوز کی کیفیت فروغ پاتی ہے۔

سبب چہارم یہ ہے کہ خوش الحانی کو مدد بھی ملنی چاہئے دیگر آوازوں سے تاکہ اثر زیادہ ہو تو بنسری' دف' شاہین اور طبل وغیرہ سے یہ مدد سماع میں معمولاً فراہم کی جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ہزل کی ایک صورت ہے جب کہ قرآن عین جد ہے۔ تو قرآن کی اس حیثیت کی حفاظت فرض ہے۔ ان چیزوں سے جو عوام کی نگاہ میں ہزل کے حکم میں ہیں۔ آنحضرت رُبَیع بنتِ مُعوّذ کے گھر گئے وہاں کنیزیں دف بجا رہی تھیں اور گیت گا رہی تھیں تو جب ان کنیزوں نے آپ ﷺ کو دیکھا تو حضور کی ثنا میں شعر گانے لگیں۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا "خاموش وہی جاری رکھو جو پہلے گا رہی تھیں"۔ یہ اس لئے فرمایا کہ ثنا آنحضرت ﷺ کی عین جدّ ہے اور اس سے کہیں بالاتر ہے کہ اسے دف کے ساتھ گایا جائے۔ کیونکہ یہ صورت ہزل کی ہے اس لئے منع ہے۔

سبب پنجم یہ ہے کہ ہر کسی کا احوال مختلف ہوتا ہے اور تمنا اس کی یہ ہوتی ہے کہ ایسا شعر سنے جو اس کے حسب حال ہو۔ اور اگر شعر موافق نہ ہو تو اسے ناگوار ہوگا اور ممکن ہے کہ وہ کہہ اٹھے کہ "یہ نہ کہو دوسرا کہو" ظاہر ہے قرآن کو ایسے معرض میں نہیں لایا جاسکتا کہ جس سے کراہت کا احتمال ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ تمام آیات ہر کسی کے احوال سے موافق ہوں۔ پس اگر کوئی شعر اس کے موافق نہ ہو اور وہ اپنے حال کے موافق تنزیل کرے تو

لازم نہیں کہ شعر کا وہی مفہوم سمجھیں جو شاعر کی مراد ہے۔ لیکن قرآن کو اپنے خیال پر محمول کرنے کی یا معانی قرآن میں تغیر کی اجازت نہیں۔ پس مشائخ صوفیاء کا سماع کے لئے قوال کو اختیار کرنے کا سبب بیان ہو چکا۔ اور اس معنی کا حاصل دو اسباب کی بناء پر ہے۔ ایک سننے والے کا ضعف تو دوسرا حرمت قرآن کی تجلیل تا کہ تصرف اور اندیشہ سے محفوظ رہے۔

مقام سوم: سماع میں حرکت، رقص اور لباس پھاڑنا ہے۔ اور جس امر میں بھی سامع مغلوب ہو اور بے اختیار ہو تو اس پر ماخوذ نہ ہوگا۔ اور اس ضمن میں جو کچھ بہ اختیار کرے گا کہ لوگوں پر بہ دروغ نمایش کرے کہ وہ سمجھیں کہ صاحب حال ہے اور درحقیقت ایسا نہ ہو تو یہ حرام ہے۔ کیونکہ عین نفاق ہے۔

ابوالقاسم نصر آبادی کہتے ہیں "ان لوگوں کا سماع میں مشغول ہونا غیبت کے ارتکاب سے تو بہتر ہے"۔ بوعمرو بن نجید کہتے ہیں کہ: "اگر کوئی تیس سال غیبت کرتا رہے تو وہ اس سے بہتر ہے کہ سماع میں جھوٹ موٹ کسی حالت کا اظہار کرے"۔

معلوم رہے کہ کامل ترین وہ ہوتا ہے جو سماع میں مصروف ہوتا ہے لیکن پرسکون ہوتا ہے۔ اور اس کے ظاہر سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ اور اس کی نہایت قوت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کسی قسم کے ردعمل کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ کیونکہ حرکت یا آوازیں نکالنا اور گریہ سبب ضعف کی علامت ہیں۔ لیکن اس قسم کی قوت کمیاب ہے۔ بے شبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس قول کے کہ "کُنَّا کَمَا ثُمَّ قَسَت قُلُوبُنَا" کے معنی یہ ہیں کہ "قویت قُلُوبُنا"، یعنی قوت میں سخت ہو گیا۔ یعنی ہم یہ تاب و تواں رکھتے ہیں کہ خود کی حفاظت کر سکیں۔ تو جو شخص خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا اس کے لئے لازم ہے کہ جب تک ضرورت نہ ہو ظاہر نہ کرے اور خود کو ظاہر سے بچائے۔

ایک نوجوان حضرت جنیدؒ کی صحبت میں تھا تو جب سماع سنتا تو ہاہو کرنے لگتا اس پر حضرت جنیدؒ نے کہا کہ "اگر تم نے دوبارہ یہ حرکت کی تو تم میری صحبت میں نہ رہو گے"۔ تو وہ لڑکا بڑی جدوجہد سے صبر کرتا رہا۔ آخر بے تاب ہو گیا آواز نکالی تو پیٹ اس کا پھٹ گیا اور وہ مر گیا۔

لیکن اگر کوئی اپنی کسی حالت کا اظہار نہیں کرتا رقص کرتا ہے تا کہ بہ تکلف خود پر گریہ طاری کر سکے تو جائز ہوگا۔ کیونکہ رقص مباح ہے اور حبشی مسجد میں رقص کرتے تھے اور حضرت عائشہ نے ان کا رقص دیکھا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا "تو مجھ سے ہے تو میں تجھ سے ہوں"۔ تو علی رضی اللہ عنہ یہ سن کر رقص کرنے لگے اور کئی بار پاؤں زمین پر مارا۔ جیسے کہ عربوں کے ہاں معمول ہے کہ نشاط اور خوشی کے عالم میں کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جعفر علیہ السلام سے کہا "تم صورت و سیرت میں مجھ سے مشابہ ہو" تو وہ بھی خوشی میں رقص کرنے لگے

تھے۔ زید بن حارثہ سے جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''تم ہمارے بھائی اور آقا ہو'' تو وہ فرطِ خوشی میں رقص کرنے لگا۔

اور اگر کوئی رقص کو حرام کہے تو غلطی پر ہے۔ کیونکہ زیادہ سے زیادہ وہ آپ اس کو بازی قرار دے سکتے ہیں اور بازی حرام نہیں۔ اور اگر کوئی رقص اس لئے کرتا ہے کہ جو حالت اس کے دل میں پیدا ہورہی ہے قوی تر ہوجائے تو یہ خود محمود ہے۔

لیکن لباس بہ اختیار پھاڑنا مناسب نہیں۔ کیونکہ یہ مال ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن اگر مغلوب ہو تو روا ہے۔ ہر چند جامہ بہ اختیار پھاڑے لیکن ہوسکتا ہے کہ اس اختیار میں مجبور ہو۔ کیونکہ ہوتا یوں ہے کہ اگر چاہے کہ یہ نہ کرے لیکن باز نہیں رہ پاتا۔ جیسے بیمار کی ہائے وائے بہ اختیار ہوتی ہے۔ لیکن بیمار اگر چاہے کہ نہ کہے تو اس کے لئے یہ جبر ممکن نہیں ہوتا۔ جو کچھ بہ ارادت وقصد ہوتا ہے۔ آدمی اس سے بہمہ حال ہاتھ روک سکتا ہے لیکن جب اس قدر مغلوب ہو تو پھر وہ ماخوذ نہیں ہوتا۔ اور یہ جو صوفیاء کپڑے کو بہ اختیار پارہ پارہ کرتے ہیں بعضوں نے اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ ٹھیک نہیں تو غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کیونکہ کپڑے کو سینے کے لئے ٹکڑے کرنا ہی پڑتا ہے تاکہ پیراہن تیار کیا جاسکے۔ تو یہ ضائع کرنا کیونکر ہوا کیونکہ ایک مقصد کے لئے قطع کیا جاتا ہے۔ تو یہ کام جائز ٹھہرا۔ اس لئے صوفیاء کو کپڑے کا پارہ پارہ کرنا کہ دوسروں کو بھی اس میں سے حصہ مل سکے تاکہ مصلے اور گدڑی میں سی سکیں روا ہوگا کہ اگر کوئی ایک کپڑے کو سوٹکڑوں میں کاٹ کر درویشوں کو دے تو مباح ہوگا کیونکہ اس کا ہر ٹکڑا استعمال میں آجائے گا۔

آدابِ سماع

معلوم رہے کہ سماع میں تین چیزیں ملحوظ رکھنی چاہییں: وقت' جگہ اور اِخوان۔

کیونکہ جس وقت دل پہلے ہی کسی اور فکر میں ہے یا نماز کا وقت ہے یا کھانے کا وقت ہے یا دل کسی سبب سے پراگندہ ہے تو ایسے وقت میں سماع بے سود ہے۔

اور مکان یعنی سماع کی جگہ اگر مثلاً راہ گذر ہو یا نامرغوب یا تاریک ہو یا کسی ظالم کا گھر ہو تو سارا وقت پریشانی کی نذر ہوگا۔

اور اخوان یہ ہے کہ لازم ہے کہ حاضرین سب اہل سماع ہوں۔ کیونکہ اگر اہل دنیا میں سے کوئی متکبر شخص حاضر ہو یا کوئی قاری جو سماع کا منکر ہو سماع میں حاضر ہو یا کوئی متکلف موجود ہو جو ہر وقت بہ تکلف رقص و حال کا ارتکاب کرتا ہو یا ایسے اہل غفلت حاضر ہوں کہ جو سماع سے باطل کے لئے استفادہ کرتے ہوں یا سماع

کی بجائے بے ہودہ باتوں میں مصروف ہوتے ہوں اور ادھر ادھر نگاہیں ڈالتے ہوں اور آداب مجلس کو ملحوظ نہ رکھتے ہوں یا عورتوں میں سے کچھ وہاں سے دکھائی دیتی ہوں۔ اور جوانوں کے گروہ میں ایسے بھی ہوں تو ایک دوسرے کے خیال میں لگے ہوئے ہوں تو اس قسم کا سماع بے کار ہوگا۔ اور حضرت جنیدؒ کے اس قول کے کہ ''سماع میں زمان، مکان اور اخوان شرط ہیں'' یہی معنی ہیں۔

اس لئے سماع کے لئے ایسی جگہ بیٹھنا کہ جہاں سے جوان عورتوں پر نگاہ پڑتی ہو اور حاضرین میں جوان موجود ہوں اور اہل غفلت کہ شہوت ان پر غالب ہو حرام ہوگا۔ کیونکہ ایسے موقع پر دونوں طرف سے سماع آتش شہوت کو بھڑکاتا ہے۔ اور ہر کوئی بہ شہوت دوسری طرف نگاہ ڈالتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ دلی طور پر بھی مصروف ہو جائے۔ اور وہ بہت سے فسق وفساد کا موجب ہوتا ہے۔ تو کبھی اس قسم کا سماع منعقد نہیں کرنا چاہئے

پس جب حاضرین اہل سماع میں سے مجلس آرائی کریں تو اولین ادب یہ ہے کہ سر جھکا کر بیٹھیں اور ادھر ادھر نہ دیکھیں اور ہر کوئی سراپا آداب سماع کو ملحوظ رکھے۔ درمیانِ سماع خاموش رہے۔ نہ پانی پئے نہ اطراف میں دیکھے۔ ہاتھ ہلائے نہ سر کو جنبش دے اور بہ تکلف کوئی حرکت نہ کرے بلکہ نماز میں جس طرح تشہد کے موقع پر بہ ادب بیٹھتے ہیں بیٹھے اور دل سراپا حق تعالیٰ سے لگائے اور منتظر اس کا ہو کہ غیب سے سماع کے باعث کیا مکاشفات ظہور میں آتے ہیں۔ اور خود کو بچائے تاکہ بہ اختیار نہ اٹھے اور کوئی حرکت نہ کرے۔

اور جب سامعین میں سے کوئی وجد سے مغلوب ہو کر اٹھ کھڑا ہو تو اس سے موافقت کرنی چاہئے اور اگر صاحب وجد کی پگڑی گر جائے تو حاضرین کو بھی سر سے پگڑیاں اتار دینی چاہییں۔ یہ اگرچہ بدعت ہے اور صحابہ اور تابعین سے منقول نہیں لیکن مطلق بدعت کے باعث تو منع نہیں ہوتا کیونکہ بعض بدعات اچھی بھی ہوتی ہیں۔ حضرت شافعیؒ کا فرمان ہے کہ ''تراویح کی جماعت کی صورت عمر بن الخطاب ؓ کی وضع کردہ ہے۔ لیکن یہ بدعتِ حسنہ ہے''۔ پس بدعت وہ مذموم ہوتی ہے جو خلافِ سنت ہو۔ لیکن حسن اخلاق اور دوسروں کی خوشی کا سامان کرنا شرعاً پسندیدہ ہے۔ اور ہر قوم کا ایک رسمی معمول ہوتا ہے تو اس کی مخالفت ان کے اخلاق کی رُو سے بدخوئی قرار پائے گی۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''خَالِقُوا النَّاسَ بِاَخْلَاقِهِم'' ہر ایک کے ساتھ زندگانی اس کے اخلاق کے مطابق بسر کرو کیونکہ یہ قوم ان کی موافقت کے باعث خوش ہوگی اور مخالفت سے متوحش ہوگی تو موافقت ان کی سنت ہوگی۔ صحابہؓ آنحضرت ﷺ کے استقبال میں کھڑے نہ ہوتے تھے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کو یہ بات پسند نہ تھی۔ لیکن جہاں یہ امر عادی ہو تو وہاں اٹھ کر کھڑا نہ ہونے سے وحشت پیدا ہوتی ہے۔ تو دوسروں کی خوشی کے لئے کھڑا ہو جانا اولیٰ تر ہے۔ کیونکہ عربوں کا معمول اور ہے اور عجمیوں کا اور۔

اصل نہم: امرِ معروف ونہیٔ منکر

یہ ایک معیار ہے دین کے ملاک ووار ومدار میں سے کہ تمام انبیاء کو اسی لئے دنیا میں بھیجا گیا ہے اور اگر یہ فرسودہ سمجھ کر انسانوں کے درمیان سے رخصت کر دیئے جائیں تو شرع کے جملہ شعائر باطل ہو جاتے ہیں اور ہم اس علم کو تین ابواب میں بیان کریں گے۔

باب اوّل: امرِ معروف ونہی منکر کے وجوب میں

باب دوم: باز پرس کے شرط ہونے میں

باب سوم: ان منکرات کے بارے میں جو زیادہ تر معمول وعادی ہیں

باب اوّل: امرِ معروف اور نہی عن المنکر کے وجوب میں

معلوم رہے کہ امرِ معروف اور نہی منکر مسلمانوں کے لئے واجب ہیں۔ اور جو کوئی ایسے موقع پر اس سے پہلو تہی کرے وہ گناہگار رہے۔ فرمان خداوندی ہے کہ: ''وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ '' (قرآن: ۱۰۴/۳) (چاہئے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جن کا کام یہ ہو کہ لوگوں کو خیر کی طرف بلائیں' معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں)۔ اور یہ دلیل اس امر کی ہے کہ یہ فریضہ ہے۔ لیکن فرض کفایہ ہے۔ کیونکہ جب ایک جماعت اس کے لئے کمر بستہ ہو جائے گی تو کافی ہو گی۔ لیکن اگر کوئی بھی یہ کام نہ کرے تو سب گناہ گار قرار پائیں گے۔ نیز فرمان خداوندی ہے کہ: ''اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ '' (قرآن: ۴۱/۲۲) (وہ لوگ کہ اگر ہم انھیں دسترس دیں اور متمکن کریں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیکوکاری کا حکم دیں گے اور مذموم سے روکیں گے) امرِ معروف کو نماز اور زکوٰۃ کہ فرض ہیں ان کے ساتھ قرار دیا اور اہل دین کو اس صفت کے ساتھ یاد فرمایا۔

اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''معروف کا حکم دو ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر تم میں سے جو بدترین ہیں مسلط کر دیں گے تو پھر اگرچہ تم میں سے بہترین دعا کرے گا اللہ کے نزدیک اس کی شنوائی نہ ہو گی''۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس کے درمیان معصیت کا چلن ہو اور

لوگ اس کو نہ روکیں تو وہ کبھی اللہ تعالیٰ کے عذاب عام سے بچ نہیں سکتے''۔ فرمان رسول ﷺ یہ بھی ہے کہ ''تمام نیک اعمال غزا کے مقابلے میں ایسے ہی ہیں جیسے سمندر کے مقابل قطرہ اور عملِ غزا امر معروف کے مقابلے ایسے ہی کم قدر ہے۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان جو بات بھی کرے اس کا اثر اسی تک ہے۔ سوائے امر معروف، نہی منکر اور ذکر خدائے تعالیٰ کے''۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بے گناہ خواص کو عوام کے سبب کبھی عذاب نہیں دیتے سوائے اس وقت کے کہ خواص منکر کو دیکھیں اور منع کر سکنے کے باوجود منع نہ کریں اور خاموش رہیں''۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ایسی جگہ نہ ٹھہرو جہاں کسی کو بہ ظلم ہلاک کیا جا رہا ہو یا پیٹا جا رہا ہو کیونکہ جو اس کا شاہد ہو تو اس ظلم کو روک سکتا ہو اور نہ روکے تو اس پر لعنت برستی ہے''۔ نیز فرمایا کہ: ''نہیں چاہئے کہ کوئی شخص ایسی جگہ کھڑا ہو جہاں ناشایستہ کا ارتکاب ہو رہا ہو اور وہ باز پرس نہ کرے۔ کیونکہ ایسی باز پرس نہ اس کی موت کو جلد لانے کا سبب ہو سکتی ہے اور نہ اس روزی میں کمی پیدا کر سکتی ہے''۔ اور یہ دلیل اس امر کی ہے کہ ظالموں کے گھر یا وہ جگہ جہاں منکر کا ارتکاب ہوتا ہو اور انسان باز پرس نہ کر سکتا ہو تو ایسی جگہوں کا رخ بے ضرورت نہ کرنا چاہئے۔ یہ وجہ تھی کہ اسلاف میں سے بہت سوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی کیونکہ انھوں نے بازاروں اور گلی کوچوں کو منکرات سے خالی نہ پایا تھا۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جس کے سامنے گناہ کا ارتکاب ہو رہا ہو تو وہ اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے تو وہ ایسے ہی ہے جیسے یہ معصیت اس کے غیاب میں ہوئی ہو۔ اور اگر معصیت اس کے غیاب میں ہوئی ہو لیکن وہ اس پر راضی ہو تو ایسے ہی ہے جیسے اس کی موجودگی میں یہ کام ہوتا ہو''۔ اور کوئی رسول ایسا نہیں ہے کہ جس کے حواری یعنی صحابہ نہ ہوں۔ جو اس کے بعد اللہ کی کتاب اور اس کی سنت پر عمل کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان صحابہ کے بعد ایسے لوگ بھی آئے جو برسر منبر تو اچھی بات کہتے تھے لیکن معاملات میں بدعمل تھے۔ تو ہر مومن پر یہ فرض ہے کہ ایسوں کے ساتھ جہاد کرے عملاً اپنے زور بازو سے اور اگر یہ نہ کر سکے تو زبان سے جہاد کرے اور اگر یہ بھی نہ کر سکتا تو اُن کے عمل بد کو دل سے برا جانے۔ اور اس سے پست تر درجہ جہاد اسلام میں موجود نہیں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کو حکم دیا کہ فلاں شہر کو زیروزبر کر دو، تو فرشتے نے عرض کیا کہ ''بارخدایا فلاں شخص بھی وہاں ہے جس نے اشارہ چشم کا گناہ بھی نہیں۔ فرمایئے ایسے میں کیا کروں؟'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''بے خطر زیروزبر کر گذرو کہ دوسروں کی معصیت دیکھ کر بھی اس کے ماتھے پر بل تک نہ آیا''۔

حضرت عایشہ رضی اللہ عنہا راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک شہر کے تمام اہالیان پر عذاب بھیجا جس میں اٹھارہ ہزار مرد ایسے تھے جن کا عمل پیغمبروں کے عمل کا سا تھا۔ اس پر صحابہ نے سوال کیا کہ ''کیوں

یارسول اللہ؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس لئے کہ وہ نیک افراد دوسروں پر خوشنودی خدا کے لئے خشم گین نہ ہوتے تھے اور عاصیوں سے باز پرس نہ کرتے تھے۔

ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے استفسار کیا کہ ''شہداء میں سے فاضل تر کون ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا وہ شخص جو جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہتا ہے جس پر سلطان اسے مار ڈالے یا نہ مارے اس کے بعد اس حق گو کے نامۂ اعمال میں کوئی گناہ درج نہ کیا جائے گا۔ اگرچہ کتنی ہی لمبی عمر پائے''۔

حدیث میں ہے کہ ''حق تعالیٰ نے یوشع بن نون علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ تمھاری قوم میں سے ایک لاکھ مرد افراد کو ہلاک کرنے والا ہوں جس میں سے چالیس ہزار تو نیک مرد ہیں اور ساٹھ ہزار بدعمل ہیں''۔ تو یوشع بن نون علیہ السلام نے عرض کیا کہ ''بارِ خدایا! نیک مردوں کو کیوں ہلاک کرتا ہے؟'' تو حضرت حق سے جواب ملا ''اس لئے کہ وہ بدعملوں کے ساتھ دشمنی نہ کرتے تھے۔ اور ان سے ملنے ملانے کھانے پینے اور ان سے معاملہ کرنے سے احتراز نہ کرتے تھے''۔

———•••———

باب دوم: حسبت (احتساب) کی شرط کے بیان میں

معلوم رہے کہ حسبت تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔ اس لئے اس کی شرط کا علم ہونا بھی لازم اور ناگزیر ہے۔ کیونکہ جس فریضے کی شرایط سے انسان بے خبر ہو اس کی ادائیگی ممکن نہیں ہوتی۔ اور حسبت کے چار رکن ہیں: ایک محتسب، تو دوسرے وہ جس کی حسبت ہونی چاہئے۔ تو تیسرے وہ امر جس کے باب میں حسبت مطلوب ہے اور چوتھے احتساب کی کیفیت۔

رکنِ اوّل:

محتسب: اس کی شرط اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ محتسب مسلمان ہو اور مکلّف ہو کیونکہ حسبت گویا دین کا حق ادا کرنا ہے۔ اس لئے جو بھی اہل دین ہے اہل حسبت ہے اور اس بات میں اختلاف رائے ہے کہ عدالت اور حکم سلطان اس کے لئے شرط ہے کہ نہیں۔ اور ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ ایسی کوئی شرط نہیں اور عدالت و پارسائی محتسب کے لئے شرط کیسے ہو سکتے ہیں کہ اگر شرط یہ ہو کہ محتسب وہ ہو سکتا ہے کہ جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو تو احتساب ممکن ہی نہیں ہوگا۔ کیونکہ کوئی بھی معصوم نہیں ہونے کا۔ سعدی بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ ''اگر احتساب اس وقت کریں جب ہم نے کوئی گناہ نہ کیا ہو تو حسبت کبھی ہو ہی نہیں سکتی''۔ لوگوں نے حسن بصریؒ سے کہا کہ کوئی کہتا ہے کہ ''لوگوں کو پاکیزگی نفس کی دعوت اس وقت تک نہ دو جب تک خود کو پوری طرح پاک نہ کرلو''۔ تو اس پر حسن نے فرمایا کہ: ''شیطان کی آرزو اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ بات ہمارے دل میں مزین کرے تا کہ احتساب کا دروازہ بند ہو جائے''۔ اور انصاف اس مسئلے میں یہ ہے کہ حسبت دو قسم کی ہوتی ہے:

ایک وہ جو نصیحت و وعظ کے ذریعے کی جاتی ہے۔ لیکن وہ شخص جو خود بد عمل ہو لیکن دوسرے کو کہے کہ 'بد عمل نہ کر' تو سوائے اس کے کہ لوگ اس پر ہنسیں گے۔ کچھ فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ ایسے کا وعظ کچھ اثر نہیں رکھتا۔ اس قسم کا احتساب فاسق کو نہیں کرنا چاہئے۔ جب اسے معلوم ہو کہ نہیں سنتے اور اس پر ہنستے ہیں۔ اس قسم کے شخص کو حسبت گناہ بھی ہے۔ کیونکہ رونق وعظ اور حشمت شرع لوگوں کی نگاہوں سے گر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے عالم جن کا فسق و فجور ظاہر ہو وعظ ان کا لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے اور وہ گناہ گار ہو جاتے ہیں۔ اس بناء پر حضرت رسول ﷺ نے فرمایا کہ ''جس رات مجھے معراج پر لے گئے تھے تو میں نے ایک جماعت کو دیکھا کہ ان

کے ہونٹ آتشی ناخن گیر سے کاٹے جا رہے تھے۔تو میں نے ان سے پوچھا کہ تم کون ہو؟'' تو وہ بولے کہ ''ہم وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو نیکی کی طرف بلاتے تھے لیکن خود نیکی نہ کرتے تھے اور برائی کی نہی کی تعلیم دیتے تھے لیکن خود اس سے دامن نہ بچاتے تھے''۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ ''اے ابن مریم پہلے خود کو نصیحت کر جب تیرا نفس لبیک کہے تو پھر دوسروں کو بھی پند دے ورنہ مجھ سے شرم کر''۔

احتساب کی دوسری قسم یہ ہے کہ ہاتھ سے کی جائے اور سختی کے ساتھ نمٹا جائے۔ایسے کہ شراب کو زمین پر بہا دیا جائے۔ چنگ ورباب کو توڑ دیا جائے اور جو کوئی قصد فساد کا کرے اس کو سختی کے ساتھ اس سے باز رکھا جائے اور یہ فاسق کے لئے بھی جائز ہوگا۔ کیونکہ ہر کسی پر دو چیزیں واجب ہیں: ایک یہ کہ خود ممنوع کا ارتکاب نہ کرے اور دوسرے کو بھی ارتکاب نہ کرنے دے۔ اگر ایک واجب کا تارک ہے تو دوسرا واجب کہ احتساب ہے۔اس کو کیوں ترک کرے؛ اگر کوئی کہے کہ ''برا ہے کہ خود تو ریشمی لباس میں ملبوس ہو تو احتساب کرتے ہوئے دوسرے کے سر سے ریشمی لباس کھینچ لے یا خود تو شراب پیئے لیکن دوسروں کی شراب چھین کر گرا دے'' تو جواب اس کا یہ ہے کہ زشت اور چیز ہے اور باطل اور شے ہے۔ یہ اس رُو سے زشت ہوگا کہ اُس نے اہم تر کو ترک کر دیا۔ نہ اس لئے کہ یہ پسندیدہ نہیں۔ مثلاً اگر کوئی روزہ تو رکھے لیکن نماز ادا نہ کرے تو اسے زشت (بُرا) کہا جائے گا کیونکہ اس نے زیادہ اہم سے ہاتھ کھینچا نہ اس لئے کہ اسے روزہ نہیں رکھنا چاہئے کہ باطل ہوگا۔ لیکن نماز زیادہ ضروری ہے''۔ اسی طرح عمل کرنا عمل کا حکم دینے سے اہم تر ہے لیکن دونوں واجب ہیں۔ اور ایک دوسرے سے مشروط نہیں ہے کہ اس کو دوسرے کے ساتھ ادا کرے کہ کہتے ہیں کہ ''شراب پینے سے منع کرنا اس پر واجب ہے جب تک خود شراب نہ پیئے اور جب خود شراب پیئے تو یہ واجب اس سے ساقط ہو جاتا ہے'' اور یہ بے اصل ہے اور باطل۔

شرطِ دوم کہ وہ ہے بادشاہ سے اجازت مانگنا اور منشور احتساب تحریری ہوتا ہے۔ لیکن یہ شرط نہیں ہے کیونکہ بزرگانِ سلف نے خود خلفا اور بادشاہوں کا احتساب کیا ہے۔ بیان اس کا طویل ہے۔ اور اس مسئلے کی حقیقت کے علم کا انحصار درجات احتساب کے علم سے بہرہ ور ہونے پر ہے۔ اور احتساب کے چار مدارج ہیں:

درجہ اوّل: نصیحت کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرانا ہے۔ اور یہ تمام مسلمانوں پر فرض ہے تو اس میں منشور کی حاجت کہاں ہے؟ کیونکہ فاضل ترین عبادت یہ ہے کہ خود مسلمان کو نصیحت کرے اور اللہ کا خوف دلائے۔

درجہ دوم: یہ ہے کہ سختی سے تنبیہ کرے اور یوں گویا ہو کہ: ''اے فاسق' اے ظالم' اے احمق یا اے جاہل! اللہ سے نہیں ڈرتا جو یوں کرتا ہے۔ اور یہ تمام کلمات فاسق کے حق میں درست ہیں اور حق گوئی کے لئے

کسی منشور کی حاجت نہیں ہوتی

درجہ سوم: یہ ہے کہ ہاتھ سے منع کرے۔ اور عیش وعشرت کے لوازم کو ضایع کردے رباب کو توڑ دے اور ریشمی پگڑی کو اس کے سر سے اتار لے اور یہ سب امور بمنزلہ عبادت کے ہیں۔ اور واجب ہیں۔ اور ہر وہ چیز جس کا ذکر ہم باب اوّل میں بہ روایت ذکر کر چکے ہیں وہ اس امر پر دلیل ہیں کہ جو کوئی بھی مومن ہے اس کو شرع نے یہ اختیار دیا ہے، جس کے لئے بادشاہ کی اجازت لازم نہیں۔

درجہ چہارم: یہ ہے کہ مارے اور مارنے میں تنبیہ کرے۔ تو ہو سکتا ہے کہ ایسے شخص کے خویش واقارب مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اور خود محتسب کو کمک کی حاجت لاحق ہو جائے۔ اور فتنہ وفساد کے پیدا ہونے کا خطرہ لاحق ہو جائے۔ کیونکہ سلطان کی اجازت کے بغیر اقدام ہوا ہے۔ اس لئے اولیٰ تر ہے کہ اس مرحلے میں بادشاہ کی اجازت کے بغیر اقدام نہ کیا جائے۔

اور کچھ عجب نہیں کہ احتساب کے درجے متغیر ہو جائیں۔ کیونکہ اگر بیٹا باپ کا احتساب کرنا چاہے گا تو اس کے لئے نصیحت اور نرمی کے ساتھ بات کرنے سے زیادہ مناسب نہ ہوگا۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''بیٹا نصیحت کرے جب باپ کے خشمگین ہونے کا خطرہ ہو تو خاموش رہے''۔ لیکن سخت الفاظ جیسے احمق، جاہل وغیرہ ہیں ان کا استعمال باپ کے لئے یا مار پیٹ جائز نہیں۔ اور اس کا قتل بھی روا نہیں اگرچہ کافر بھی ہو۔ اور باپ کو تازیانہ مارنا اگرچہ بیٹا تازیانہ زن ہو، روا نہیں۔ پس باپ کے لئے نصیحت اور تلطف اولیٰ تر ہے۔ لیکن اس کی شراب گرا دے یا اس کے ریشمی لباس میں شگاف ڈال دے اور جو چیز باپ نے حرام ذریعہ سے حاصل کی ہو اس کے مالک کو لوٹا دے اور چاندی کا کوزہ توڑ دے یا اگر کوئی ممنوع تصویر دیوار پر بنا رکھی ہو خراب کر دے یا ایسے ہی کوئی اور منکرات ہوں ان کا ضیاع، اگرچہ باپ خشمگین ہو، جائز ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا حق ہے اور خشم پدر باطل ہے۔ اور یہ نفس باپ کے بارے میں گالی یا مار پیٹ جیسا تصرف نہیں۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ ''جب باپ سخت ناراض ہوگا تو بیٹا یوں نہ کرے''۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''اگر باپ خشمگین ہوگا تو بیٹے کو چاہئے کہ خاموش رہے، ہاتھ وعظ ونصیحت سے روک لے''۔

یاد رہے کہ غلام کا احتساب اپنے آقا پر اور بیوی کا شوہر پر اور رعایا کا سلطان پر ایسے ہی ہے جیسے بیٹے کا باپ پر۔ کیونکہ یہ حقوق تمام تر موکد ہیں اور عظیم ہیں۔ لیکن شاگرد کا احتساب استاد پر آسان تر ہے۔ کیونکہ وہ حرمت مجرد دین کی ہے جب اس علم سے جو اس نے استاد سے سیکھا ہے کام لے گا اور اس کا احتساب بے کار نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ عالم جو اپنے علم پر خود عامل نہیں تو اس نے اپنا احترام اور علم کی حرمت خود اپنے ہاتھ سے کھودی

ہے۔

رکن دوم:

وہ امر جس کا احتساب ہے: معلوم رہے کہ جو کام بھی منکرات میں سے ہو اور اس وقت موجود ہو اور محتسب بے تجسس اسے پہچانتا ہو اور ناشایستگی اس کی بہ یقین معلوم ہو تو احتساب اس کا روا ہوگا۔ اور اس میں چار شرطیں ہیں:

شرطِ اوّل: یہ کہ امر منکر ہو۔ اگرچہ معصیت نہ ہو۔ اگرچہ گناہ صغیرہ ہو۔ مثلاً اگر دیوانے کو یا نابالغ لڑکے کو دیکھے کہ کسی جانور کے ساتھ جماع کر رہا ہے تو اسے منع کرنا چاہئے۔ اگرچہ اسے معصیت نہیں کہیں گے۔ کیونکہ وہ مکلّف نہیں۔ لیکن یہ فعل خود شرع میں ممنوع ہے اور فاحش۔ اگر کسی دیوانے کو دیکھے کہ شراب پی رہا ہے یا کوئی نادان لڑکا کسی کا مال ضایع کر رہا ہے اسے بھی منع کرنا چاہئے۔ اور جو معصیت ہو اگرچہ صغیرہ ہو اس کا احتساب بھی کرنا چاہئے۔ جیسے حمام میں اپنی شرم گاہ کو ننگا کرنا۔ یا عورتوں کی طرف دیکھنا یا ان کے ساتھ خلوت میں کھڑے ہونا یا سونے کی انگوٹھی پہننا یا ریشمی لباس زیب تن کرنا یا چاندی کے برتن میں پانی پینا یا ایسے ہی دیگر صغائر میں احتساب کرنا چاہئے۔

شرطِ دوم: یہ ہے کہ معصیت کا ارتکاب ہو رہا ہو۔ لیکن اگر کوئی عملِ معصیت سے فارغ ہو چکا ہو جیسے شراب پی چکا ہو تو اس کے بعد اسے رنج نہیں پہنچانا چاہئے سوائے نصیحت کرنے کے۔ اور حد لگانا حاکم کے سوا کسی کو نہ چاہئے۔ اسی طرح اگر کوئی یہ نیت کرے کہ آج رات شراب پئے گا تو اسے بھی رنج پہنچانا مناسب نہیں کیونکہ ممکن ہے وہ شراب نہ پئے۔ اور جب کوئی کہے کہ "میں شراب نہ پیوں گا" تو اس پر بدگمانی مناسب نہیں۔ لیکن اگر کوئی کسی عورت کے ساتھ خلوت نشین ہو تو اس کا احتساب قبل اس کے کہ زنا کی طرف بڑھے روا ہے۔ کیونکہ خلوت تخم معصیت ہے۔ بلکہ اگر کوئی عورتوں کے حمام کے دروازے پر کھڑا ہو تا کہ جب وہ حمام سے نکلیں تو ان کو دیکھے تو ایسے کا احتساب بھی لازم ہے۔ کیونکہ یوں کھڑا ہونا معصیت ہے۔

شرطِ سوم: یہ ہے کہ معصیت محتسب کے تجسس کے بغیر ظاہر و باہر ہو۔ لیکن تجسس نہیں کرنا چاہئے اور جو کوئی اپنے گھر میں ہو اور دروازہ بند کر لے تو بے اجازت اندر داخل ہونا یا پوچھنا کہ کیا کر رہا ہے ناروا ہے۔ اور در و بام سے کان نہیں لگانا چاہئے کہ گانے بجانے کی آواز سنے کہ احتساب کر سکے بلکہ جسے اللہ تعالیٰ پوشیدہ رکھ رہے ہیں بندہ بھی اسے پوشیدہ رکھے۔ الا یہ کہ شراب کے مستوں کا غل غپاڑہ اور گانے بجانے کی آوازیں گھر سے باہر سنائی دیں۔ تو ایسے میں بلا اجازت گھر میں داخل ہونا روا ہے۔ اور اگر کوئی فاسق زیر دامن رکھتا ہو اور

گمان ہو کہ شراب ہو گی تو نہیں چاہئے کہ محتسب کہے کہ "مجھے نکال کر دکھاؤ کہ کیا ہے؟" کیونکہ یہ تجسس ہے یہ۔ امکان یہ بھی ہے کہ زیر دامن شراب نہ ہو تو اسے نادیدہ سمجھنا چاہئے۔ لیکن اگر شراب کی بو آ رہی ہو تو جائز ہے کہ اسے چھین کر گرا دے۔ اگر کوئی بڑا بربط لئے ہو اور غلاف اس کا باریک ہو جس سے ملفوف کی صورت دیکھی جا سکتی ہو تو توڑنا اس کا جائز ہے۔ اگر کسی اور چیز کا امکان بھی ہو تو اسے نادیدہ سمجھے اور تعرض نہ کرے۔ اور حضرت عمر کا قصہ کہ چھت پر چڑھ کر اترے تو دیکھا کہ ایک شخص ایک عورت اور شراب کے ساتھ بیٹھا ہے جس کا ذکر ہم حقوق صحبت کے بارے میں کر چکے ہیں۔ مشہور ہے کہ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر تھے تو آپؓ نے صحابہ سے از راہ مشاورت پوچھا کہ "آپ اس باب میں کیا فرماتے ہیں کہ امام اگر اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ ایک منکر کا ارتکاب ہو رہا ہے تو اس کا حد جاری کرنا جائز ہو گا؟" لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "یہ کام وہ ہے جسے حق تعالیٰ نے دو شاہدانِ عادل کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ ایک ہی شخص اس کے لئے کافی نہیں ہے" تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جائز نہیں رکھا کہ امام فقط اپنے علم پر یہ کام کرے اور اسے پوشیدہ رکھنے کو واجب قرار دیا۔

شرط چہارم: یہ ہے کہ بہ تحقیق معلوم ہو کہ یہ چیز ناشایستہ ہے۔ فقط گمان واجتہاد سے نہیں۔ پس کسی شافعی مسلک کے لئے روا نہیں کہ حنفی مسلک پر اعتراض کرے کہ جب وہ بغیر ولی کے عندیے کے نکاح کرے یا کھجوروں کا مشروب جسے نبیذ کہتے ہیں پئے یا شفع جوار کو جائز قرار دے وغیرہ۔ لیکن اگر کوئی شافعی مسلک بے ولی کے نکاح کرے یا نبیذ پئے تو اس پر اعتراض جائز ہو گا۔ کیونکہ اپنے مسلک کے امام کی مخالفت کسی وقت بھی اور کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔ اور ایک جماعت کا کہنا ہے کہ شراب' زنا اور خنزیر سے بہرہ ور کا احتساب جائز ہے کیونکہ ان کی حرمت بہ اتفاق اور بہ یقین معلوم ہے۔ اور یہ اجتہاد کا نتیجہ نہیں۔ اور یہ درست نہیں کیونکہ اہل تحقیق اس پر متفق ہیں کہ جو کوئی اپنے اجتہاد یا اپنے مسلک کے امام کے اجتہاد کے خلاف عمل کرتا ہے وہ عاصی ہے۔ پس یہ در حقیقت حرام ہے۔ اور ہر وہ شخص اس جہت کی طرف پشت کرتا ہے جو بہ اجتہاد قبلہ طے ہو چکی ہو اور نماز ادا کرتا ہے۔ وہ عاصی ہو گا۔ اگر چہ کوئی یہ گمان کرے کہ وہ شخص صحیح ہے اور جو کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ یہ روا ہے کوئی جس جس امام کے مسلک پر جس مسئلے میں چاہے اقتداء کرے تو یہ بیہودہ بات سمجھی جائے گی اور اعتماد کے لائق نہیں۔ بلکہ ہر کوئی اس کا مکلف ہے کہ اپنے گمان کے مطابق عمل کرے اور جب گمان اس کا یہ ہو کہ شافعی عالم تر ہے تو پھر اسے شافعی کی مخالفت کے لئے کوئی دلیل نہ ہو گی سوائے شہوت کے۔

وہ بدعتی جو اللہ کو جسم کہتا ہے کہ اور قرآن کو مخلوق' نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا جا سکتا وغیرہ۔ تو اس کا احتساب کرنا چاہئے اگر چہ حنفی اور مالکی احتساب نہ کریں۔ کیونکہ بدعتیوں کی خطائے قطعی ہے۔ احکام فقہ ظنی

ہیں نہ کہ قطعی لیکن اس قوم کی خطا قطعی ہے اور اعتقادی۔ لیکن مبتدع کا احتساب اس شہر میں کرنا چاہئے جہاں یہ بہت کم ہوں۔ شاذ و نادر ہی ہوں۔ اور بیشتر جہاں اہل سنت ہوں۔ لیکن جہاں دو گروہ برابر کے ہوں تو اگر تو مبتدع کا احتساب کرے گا تو وہ جواب میں تیرا احتساب کرے گا جس سے فتنہ پیدا ہوگا۔ تو ایسے میں بغیر اجازت وقوت سلطان کے احتساب نہیں کرنا چاہئے۔

رکن سوم:

وہ ہے جس کا احتساب ہو: شرط اس کی یہ ہے کہ وہ مکلّف ہو تا کہ اس کا فعل معصیت ہو اور اس کی کوئی حرمت احتساب کی مانع نہ ہو۔ جیسے باپ کہ اس کی حرمت احتساب میں ہاتھ یا زبان کے ذریعے استخفاف کو مانع ہو۔ لیکن دیوانے اور نابالغ کو فواحش سے ہم منع کرتے ہیں جیسا کہ بیان ہو چکا لیکن اسے محاسبت نہیں کہتے۔ بلکہ اگر ہم کسی چوپائے کو دیکھیں جو کسی مسلمان کا غلہ کھا رہا ہو تو مسلمان کے مال کی حفاظت کے لئے اس جانور کو روکیں تو یہ فرض نہیں ہے۔ واجب ہے اس وقت جب منع کرنا آسان ہو۔ اور اس سے کوئی ضرر حاصل نہ ہو۔ اور جب روکنے والے کو کسی زیان کا سامنا نہ ہو اور کوئی رنج پہنچنے کا احتمال نہ ہو تو حق اسلام کے لئے واجب ہوگا۔ اگر کوئی کسی کا مال ضایع کرنے والا ہو اور شہادت اس کی بہت ہو اور راہ طویل نہ ہو تو مسلمانوں کے حق کے لئے وہاں ہو جانا لازم ہے۔

لیکن جب کوئی عاقل بالغ کسی کا مال تلف کرے تو یہ ظلم و معصیت ہے۔ اگرچہ اس میں احتساب کرنے والے کو رنج بھی اٹھانا پڑے اسے احتساب اس کا کرنا چاہئے۔ کیونکہ معصیت کی ممانعت کے لئے رنج تو اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ بے رنج اٹھائے یہ کام ممکن نہیں۔ سوائے اس رنج کے کہ جس کی تاب نہ رکھتا ہو اور اس سے عاجز ہو۔ اور احتساب کا مقصد شعائر اسلام کا ظاہر کرنا ہے۔ تو اس راہ میں رنج برداشت کرنا بھی واجب ہے۔ مثلاً اگر کسی جگہ شراب کثیر مقدار میں ہو اور اس کو گرانے والا گراتے گراتے تھک جائے تو یہ واجب ہے۔ لیکن اگر بکریاں کثیر تعداد میں کسی مسلمان کا غلہ کھا رہی ہوں تو اگر ان کے باہر نکالنے میں ماندگی کا اندیشہ ہو تو بکریوں کو دور کرنا اس کے لئے واجب نہیں۔ صاحب غلہ کے حق کی نگہداشت دوسروں کے حق کے مساوی ہونی چاہئے۔ تو وقت اس شخص کا جو بکریوں کو غلہ خوری کی حالت میں دیکھتا ہے حق ہے۔ تو اس کے لئے لازم نہیں کہ اپنا قیمتی وقت کسی دوسرے کے مال کی حفاظت میں دے بلکہ واجب یہ ہے کہ اپنا وقت دین کے لئے دے اور معصیت سے منع کرنے میں صرف کرے۔

احتساب کے تحمل کرنے کی شرائط کی تفصیل:

احتساب میں جملہ رنج برداشت کرنا واجب نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں بھی تفصیل ہے۔ وہ تفصیل یہ ہے کہ اگر عاجز ہو تو خود معذور ہے۔ تو ایسے میں سوائے دلی انکار کے اور کچھ واجب نہیں۔ لیکن اگر عاجز نہ ہو لیکن ڈرتا ہو کہ اسے ماریں پیٹیں گے یا یہ جانتا ہو کہ میری بات کا کوئی فایدہ نہ ہوگا تو اس کی چار صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ جانتا ہو کہ اسے ماریں گے اور معصیت سے باز نہ آئیں گے، تو احتساب اسکے لئے واجب نہ ہوگا بلکہ مباح ہوگا۔ کہ زبان یا ہاتھ سے محاسبہ کرے اور زخم کھانے پر صبر کرے بلکہ وہ اس پر ثواب پائے گا۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ "کوئی شہید بھی اس شہید سے بڑھ کر نہ ہوگا جو ظالم سلطان کا محاسبہ کرے اور اسے ہلاک کر دیا جائے"۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معصیت سے منع کر سکتا ہے اور کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوتا۔ اسے پوری قدرت حاصل ہو تو بھی محاسبہ نہ کرے تو گناہ گار ہوگا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ گناہ کے مرتکب معصیت سے دست کش نہیں ہوتے اور محتسب کو مار پیٹ بھی نہیں سکتے۔ تو تجلیل شرع کے لئے ان کا محاسبہ زبان سے کرنا واجب ہے۔ جیسے کہ دل سے برا جاننے سے معذور نہیں تو زبان سے احتساب سے بھی عاجز نہ ہوگا۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ معصیت کا بطلان کر سکتا ہے۔ لیکن اسے عاصی مارتے ہیں جیسے کہ وہ شراب کے شیشے پر پتھر مار کر ناگاہ اسے توڑ ڈالے۔ یا چنگ ورباب پر ضرب لگائے اور توڑ ڈالے تو واجب نہیں۔ لیکن انکار اور صبر کرنا اولیٰ تر اور فاضل تر ہے۔ اور کوئی کہے کہ فرمان خداوندی ہے کہ "وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" یعنی "خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو" تو جواب اس اشکال کا یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس فرمان خداوندی کے معنی یہ ہیں کہ "مال کو اللہ کی راہ میں صرف کرو تا کہ ہلاکت سے بچ جاؤ"۔ اور براء عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ معنی اس کے یہ ہیں کہ "مال کو صرف کرو اور توبہ کرو" کیونکہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ 'میں توبہ کرتا ہوں' اور میں اس کی توبہ قبول نہیں کرتا" اور عبیدہ کہتے ہیں کہ "معنی اس کے یہ ہیں کہ گناہ کرتا ہے لیکن گناہ کے بعد کوئی نیکی کا کام نہیں کرتا"۔

مختصر یہ کہ روا ہے کہ ایک مسلمان کفار کی ایک صف پر ٹوٹ پڑے اور جنگ کرے حتیٰ کہ مارا جائے۔ تو یہ گویا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ لیکن اگر اس میں فایدہ ہو کہ وہ بھی کسی کافر کو تہ تیغ کر دے تا کہ کفار کے حوصلے

پست ہو جائیں اور کہنے لگیں کہ شاید تمام مسلمان ایسے ہی دلیر ہیں تو ایسا کرنے میں ثواب ہوگا۔لیکن اگر کوئی نابینا یا عاجز صف کفار پر حملہ آور ہو تو روا نہیں کیونکہ یہ تو بے فایدہ خود کو ہلاکت کی نذر کرنا ہے۔اسی طرح محاسبت ایسی جگہ ہو کہ محتسب کو مار ڈالیں یا ضرر پہنچائیں اور معصیت سے دست کش نہ ہوں۔تو جس دینی استواری کا مظاہرہ وہ کرتا ہے اس سے فاسقوں کے دل میں بے حوصلگی پیدا نہیں ہوتی اور کسی میں بھی خیر کی رغبت فزونی نہ پائے گی تو اسے بھی نہیں چاہئے کہ بے فایدہ ضرر برداشت کرے۔اس قاعدے میں دو اشکال ہیں:

ایک یہ کہ اس کا خوف بزدلی اور وہم کے باعث ہو۔اور دوسرے یہ کہ خود تو ضرر سے نہ ڈرتا ہو لیکن اپنے عزیز و اقارب کے جاہ و مال اور ان کے رنج سے ڈرتا ہو تو پہلے اشکال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر بہ ظن غالب جانتا ہو کہ اسے مارے پیٹیں گے تو معذور ہوگا۔لیکن اگر ظن غالب یہ ہو کہ ماریں پیٹیں گے اور احتمال یہ بھی ہو کہ نہ پیٹیں گے تو پھر وہ معذور نہیں ہے۔کیونکہ یہ احتمال و گمانِ بد ہوں گے۔تو اس بناء پر محاسبے سے ہاتھ نہیں کھینچنا چاہئے۔اگر مارنے کا شک ہو تو ہم کہتے ہیں کہ یقیناً احتساب واجب ہے کیونکہ شک سے وجوب نہ جاتا رہے گا۔اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ احتساب ایسے مقام پر واجب ہوتا ہے جہاں سلامتی کا ظن غالب ہو۔دوسرے اشکال کی تفصیل یہ ہے کہ اس پر زبان درازی کریں گے یا خوف یہ ہو کہ اس پر دینی اور دنیوی فایدے کا دروازہ بند ہو جائے گا تو اس کی اقسام بہت ساری ہیں۔اور ہر ایک کے لئے جداگانہ حکم ہے۔

اپنے حق میں محاسبے کے عواقب کا خوف:

وہ جو اپنے حق میں خائف ہے اس کی دو قسمیں:

ایک یہ کہ ڈرتا ہے کہ مستقبل میں کوئی شے حاصل نہ ہو سکے گی۔جیسے کہ اگر استاد کا محاسبہ کرے تو خوف یہ ہے کہ استاد اس کی تعلیم میں تقصیر کرے گا۔یا اگر معالج کا محاسبہ کرے تو شاید وہ اس کے معالجے میں تقصیر کرے۔اور اگر اپنے آقا کا احتساب کرے تو خوف یہ ہے کہ اس کا روزینہ بند ہو جائے گا۔یا اگر اسے کوئی کام درپیش ہو تو معاونت نہ کرے گا۔یہ وہ تمام اوہام ہیں جن کے باوجود معذور نہ سمجھا جائے گا کیونکہ یہ ضرر نہیں ہے۔بلکہ ہراس ہے اس اضافے کے بارے میں جو مستقبل سے تعلق رکھتا ہے۔لیکن اگر اسی وقت محتاج ہو جیسے کہ بیمار ہو اور اس کے طبیب نے ممنوع ریشمی جامہ زیب تن کیا ہو تو اگر ایسے میں محاسبہ کرے گا تو طبیب کے دور ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے یا مفلس ہو اور توکل کی تاب نہ رکھتا ہو اور اس کو نفقہ دینے والا بھی ایک ہی شخص ہو اور اگر محاسبہ کرے گا تو وہ اس کا نفقہ روک لے گا۔یا کسی شریر شخص کے ہاتھ میں درماندگی کی حالت میں ہے۔اور ایک وہی ہے جو اس کی حمایت کرتا ہو تو یہ حاجتیں زمانہ حال میں ہیں۔تو اگر ہم ان عذروں کی بناء پر اسے معذور

قرار دیں تو کچھ بعید نہیں کہ اس کو خاموشی اختیار کرنے کی اجازت دیں۔ کیونکہ یہ ضرر فی الفور وجود میں آئے گا۔ لیکن اس ضرر کی مقدار مختلف احوال میں مختلف ہوگی جو اس کے فکر و اجتہاد سے تعلق رکھتی ہے۔ چاہئے کہ وہ اپنے دین پر نظر ڈالے اور احتیاط کرے تاکہ بلاوجہ احتساب سے ہاتھ نہ کھینچے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ ڈرتا ہے کہ جو چیز حاصل ہے وہ جاتی رہے گی۔ جیسے مال ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ جانتا ہے کہ اس سے لے لیں گے اور گھر اس کا اجڑ جائے گا۔ یا پیٹے جانے کے باعث اعضائے جسم سلامت نہ رہیں گے۔ یا اس کی شان و شوکت جاتی رہے گی اس لئے کہ سر برہنہ بازاروں میں لئے پھریں گے۔ اگرچہ ماریں نہیں۔ تو ان سب کی بناء پر معذور ہوگا۔ لیکن اگر کسی ایسی چیز سے ڈرتا ہے جو مروت میں تو بد گوئی نہ کرے گی لیکن اس کے تجمل اور رعب داب کے لئے مضر ہوگی جیسے بازار میں ننگے پاؤں لے جائیں اور اجازت نہ دیں کہ عمدہ لباس زیب تن کرے۔ یا اس پر بدگوئی کریں۔ تو یہ سب جاہ کے شاخسانے ہیں۔ لہٰذا ان کی بناء پر معذور نہیں ہوگا۔ کیونکہ شرعاً اس قسم کی چیزوں کی نگہ داری پسندیدہ نہیں۔ لیکن شرع میں حفظ مروت مقصود ہے۔ لیکن اگر اس کا خوف ہے کہ اس کی غیبت کریں گے یا اس پر زبان درازی کریں گے اور اسے دشمن شمار کریں گے اور کاموں میں اس کا اتباع نہ کریں گے تو بے شبہ یہ عذر نہیں کیونکہ کوئی محاسبہ ان سے خالی نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے وہ معصیت غیبت ہو اور جانتا ہو کہ اگر محاسبہ کرے گا تو وہ غیبت کو ترک نہیں کریں گے۔ اور معصیت میں اضافہ کریں گے تو اس عذر کی بناء پر معذور ہوگا۔ لیکن اگر اس معنی میں اپنے عزیز و اقارب کے حق میں ڈرتا ہے جیسے ایک زاہد جانتا ہو کہ اسے ماریں پیٹیں گے نہیں اور مال ہے نہیں جسے وہ چھین سکیں۔ لیکن اس کے انتقام میں اس کے عزیز و اقارب کو ستائیں گے تو اس کو محاسبہ نہیں کرنا چاہئے اور اپنے حق کے لئے صبر کرنا اس کے لئے روا ہوگا۔ لیکن دوسروں کے حق کے لئے صبر روا نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کی نگہ داری حقِ دین ہے اور اس لئے یہ اہم ہے۔

رکن چہارم:

احتساب کی کیفیت ہے: معلوم رہے کہ احتساب کے آٹھ درجے ہیں:

اوّل: حال کا علم ہونا ہے:

پھر اس شخص کو یہ بتانا کہ یہ منکر ہے پھر اسے نصیحت کرنا' پھر سخت زبان استعمال کرنا۔ پھر زبان اور ہاتھ سے بدلنا پھر ضرب کے ذریعے خوف دلانا اور تہدید کرنا پھر تلوار وغیرہ کھینچنا پھر اس کے معاونوں کو بلانا۔ تو یہ ترتیب ملحوظ رکھنا واجب ہے۔

درجہ اوّل: حال کا جاننا ہے: چاہئے کہ پہلے بہ یقین جانتا ہو اور حقیقت شناس ہو۔ تجسس نہ کرے۔

اور درو بام سے ٹوہ نہ لگائے اور ہمسایوں سے نہ پوچھے۔ اگر زیر محاسبہ شخص زیر دامن کچھ پوشیدہ رکھتا ہے تو اسے جاننے کے لئے ہاتھ نہ بڑھائے لیکن اگر بے تجسس گانے بجانے کی آواز سنے یا شراب کی بو ناک میں چلی آئے یا بہ نظر خود دیکھے تو پھر محاسبہ کرے۔ اور اگر شاہد عادل اسے خبر دیں تو ان کی خبر قبول کرے۔ تو تب روا ہوگا کہ گھر کے اندر بلا اجازت داخل ہو جائے۔ لیکن ایک شاہد عادل کے قول پر بہتر یہ ہے کہ گھر میں داخل نہ ہو کیونکہ گھر کا مالک وہی ہے۔ تو ایک گواہ کے قول پر اس کا حق ملکیت باطل نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ حضرت لقمان کی انگوٹھی کا نقش یہ تھا کہ ''عیاں کو دیکھ کر پوشیدہ رکھنا محض گمان پر کسی کو رسوا کرنے کی نسبت اولیٰ تر ہے''۔

درجہ دوم: تعلیم و شناسائی ہے: تو چاہئے کہ اگر کوئی ایسا کرتا ہے جو ممنوع ہے جیسے کوئی دیہاتی مسجد میں نماز پڑھ رہا ہو۔ اور رکوع و سجود وغیرہ کا ملاً ادا نہ کر رہا ہو یا اس کے جوتے میں نجاست لگی ہو اگر اسے یہ معلوم ہو کہ نجس لباس کے ساتھ نماز نہیں ہوتی۔ تو اسے یہ بات بتانی چاہئے۔ اور طریقہ اس کا یہ ہے کہ نرمی کے ساتھ سکھائے تا کہ رنجیدہ خاطر نہ ہو۔ کیونکہ مسلمان کو بے سبب ستانا جائز نہیں اور اگر تو کسی کو اس انداز سے سکھائے کہ اسے جاہل و احمق وغیرہ کے کلمات سے خطاب کرے اور اس کے عیب کو اس کے سامنے واشگاف کرے تو اس قسم کی بے مرہم جراحی برداشت نہیں ہوتی۔ تو اس کی مرہم یہ ہے کہ اس کا عذر ملحوظ رکھے یوں کہے: ''ہر کوئی ماں کے پیٹ سے تو علم لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ علم تو سیکھنے سے آتا ہے اس لئے نادانی کا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ والدین یا استاد تربیت سے قاصر رہے ہوں۔ شاید آپ کے نواح میں کوئی صاحب علم نہ تھا جو تمھیں سکھاتا' تو اس قسم کے کلمات سے نادان کے دل کو خوش کرنا چاہئے۔ اور جو کوئی اس قسم کا اسلوب تفہیم و تعلیم اختیار نہیں کرتا اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو خون آلودہ کپڑے کو پیشاب سے دھوئے یا نیت تو نیکی کی ہو لیکن بدی کر گذرے۔

درجہ سوم: وعظ و نصیحت نرمی سے کرنی چاہئے: درشتی کے ساتھ نہیں۔ کیونکہ جس کا محاسبہ کیا جا رہا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ حرام ہے کہ کسی پر سختی کی جائے۔ تو اس لئے عیب گنوانے کا کوئی فایدہ نہیں۔ اس لئے اسے ڈرانا چاہئے۔ اور لطف اسی میں ہے۔ کہ جب کوئی غیبت کا ارتکاب کرے تو اس سے یہ کہا جانا چاہئے کہ ''ہم میں سے کوئی بھی عیب سے پاک نہیں اس لئے اپنے عیبوں کو دور کرنے میں مشغول رہنا چاہئے'' یا غیبت کے بارے میں قرآن یا حدیث میں سے حوالہ دے۔ اور اس میں عظیم خطرہ ہے اور سلامتی وہی پائے گا جو نرمی سے کام لے گا کہ نصیحت کرنے میں نفس کے لئے دو شرف ہیں: ایک علم کی تجلیل اور اپنی پارسائی کا اظہار دوسرے عزِ تحکم اور زیر محاسبہ شخص پر اپنی بڑائی کا اظہار اور یہ دونوں جاہ پسندی سے جنم لیتے ہیں۔ اور یہ انسان کی فطرت ہے اور ایسا کرنے والا سمجھتا ہے کہ وہ نصیحت کر رہا ہے اور شریعت کی پابندی میں مصروف ہے جب کہ حقیقت میں وہ اپنی

شہوت جاہ میں لگا ہوا ہے اور یہ معصیت جس کا وہ مرتکب ہوا ہے وہ اس معصیت سے جس کا ارتکاب زیر احتساب شخص کرتا ہے بدتر ہے۔ چاہئے کہ انسان پہلے اپنے اوپر نظر ڈالے اگر خود بخود یا دوسرے کی نصیحت کے سبب سے اس شخص کے توبہ کرنے کو اپنی نصیحت کی بہ نسبت توبہ کرنے سے زیادہ دوست رکھتا ہے اور نصیحت کرنے سے نفور ہو۔ تو ایسے شخص کو زیبا ہے کہ نصیحت کیا کرے اور اگر وہ اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ کوئی میری ہی نصیحت پر توبہ کرے تو اللہ سے ڈرنا چاہئے کیونکہ اس صورت میں تو وہ اس شخص کو اپنی طرف بلاتا ہے نہ کہ اللہ کی طرف جو فی الاصل مطلوب ہے۔

حضرت داؤد سے لوگوں نے پوچھا کہ: ''آپ کی اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے جو بادشاہ کے پاس جا کر اس کا محاسبہ کرے؟'' تو آپ نے فرمایا کہ: ''مجھے خوف ہے کہ اسے دُرّے مارے جائیں گے'' لوگوں نے کہا کہ ''وہ اس کی تاب رکھتا ہے'' تو آپ نے فرمایا ''مجھے ڈر ہے کہ وہ اسے مار ڈالیں گے'' تو لوگوں نے کہا کہ ''وہ اس کی تاب بھی رکھتا ہے'' تو آپ نے فرمایا کہ ''میں اس علت سے جو بہت عظیم ہے لیکن پوشیدہ ہے یعنی عُجب' میں اس سے خائف ہوں''۔

ابوسلیمان دارانی نے کہا کہ ''میں نے فلاں خلیفہ کا انکار کرنا چاہا اور میں جانتا تھا کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ لیکن میں اس سے نہیں ڈرا۔ لیکن لوگ بکثرت تھے۔ تو میں ڈرا کہ لوگ جب میرے صدق وصلابت کو دیکھیں گے تو ان کا یہ مشاہدہ میرے دل کو شیریں لگے گا۔ تو اس طرح تو میں عاری از اخلاص مارا جاؤں گا''۔

درجہ چہارم: بات سختی سے کرنے میں ہے: اور اس کے دو طریقے ہیں: ایک یہ کہ نرمی سے بات کرے اگر کافی ہو تو سختی سے کام نہ لے۔ دوسرے یہ کہ جب بات کرے تو فحش نہ کہے۔ اور سوائے سچ کے نہ کہے۔ اور ظالم' فاسق' احمق اور جاہل سے بڑھ کر اور کسی لفظ سے خطاب نہ کرے۔ کیونکہ جو کوئی معصیت کا ارتکاب کرتا ہے احمق ہی ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''سمجھ دار وہ ہے جو اپنا محاسبہ کرتا ہے اور بعد مرگ پر نگاہ ڈالتا ہے۔ اور احمق وہ ہے جو اپنی خواہشوں کے پیچھے لگا رہتا ہے اور خود کو فریب دیتا ہے۔ اور امید یہ رکھتا ہے کہ اس کی حماقتوں سے درگذر کیا جائے گا''۔ اور سخت گفتاری اس وقت روا ہے کہ یقین ہو کہ اس کا فائدہ ہوگا۔ لیکن جب یہ جانتا ہو کہ بے فایدہ ہے تو اس سے روترشی کرے اسے بہ نگاہِ حقارت دیکھے اور اس سے اعراض کرے۔

درجہ پنجم: ہاتھ سے تبدیل کرنا ہے اور اس کے دو طریقے ہیں: ایک یہ کہ جہاں تک ہو سکے دوسرے سے کہے کہ اپنی حالت کو بدلو۔ تا کہ ریشمی لباس کو اتار پھینکے۔ غصب کردہ زمین کو چھوڑ دے۔ شراب کو گرا دے اور فرش دیبا پر نہ بیٹھے اور اگر جنبی ہو تو مسجد سے نکل جائے۔

دوسرا طریقہ: یہ ہے کہ اگر وہ خود یہ سب نہ کرے تو طریقہ یہ ہے کہ کمترین پر اقتصار کرے۔ جب اسے باہر نکالنے کے لئے اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے تو اس کی ڈاڑھی نہ پکڑے اور نہ پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹے۔ جب چنگ کا ساز توڑے تو ریزہ ریزہ نہ کرے۔ ریشمی لباس کی درز آہستہ آہستہ کھولے تا کہ پھٹے نہیں۔ تو شراب کا برتن نہ توڑے صرف شراب گرادے۔ اگر شراب کا کوزہ شراب خوار کے ہاتھ میں ہو تو جائز ہوگا کہ اس پر پتھر مار کر توڑ دے تا کہ شراب کا ظرف ہونے کے باعث کوزہ اپنی ارزش کھودے۔ ظرف شراب اگر تنگ منہ کی صراحی ہو تو آہستگی میں خطرہ یہ ہے کہ اسے پکڑ کر ماریں گے تو جائز ہوگا کہ صراحی شراب کو توڑ دے اور وہاں سے بھاگ جائے۔ اگر چہ ابتداءً تحریم شراب کا حکم تھا بجائے ظرف شراب کے توڑنے کے لیکن اب منسوخ ہو چکا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ برتن شراب ہی کے لئے مخصوص تھا۔ لیکن اب بے عذر ظرف نہیں توڑنا چاہئے۔ کیونکہ اس پر تاوان ہے۔

درجہ ششم: تہدید ہے: جیسے کہ 'شراب کو گرادو ورنہ میں تمھارا سر توڑ دوں گا'۔ اور میں تمھارے ساتھ اس طرح پیش آؤں گا یا اُس طرح پیش آؤں گا''۔ اس وقت جائز ہوگا کہ ضرورت ہو اور بہ تلطف شراب نہ گرائے اور اس ادب کی دو چیزیں ہیں: ایک یہ کہ ایسی چیز سے تہدید نہ کرے کہ جو جائز نہ ہو۔ جیسے کہے کہ ''میں تیرا لباس پھاڑ دوں گا۔ اور تیرا گھر اجاڑ دوں گا اور تیرے بیوی بچوں کو ستاؤں گا اور نیز وہ کہے کہ جو وہ کر سکتا ہے تا کہ جھوٹ نہ ہو۔ اور نہ کہے کہ ''میں تمھاری گردن توڑوں گا یا میں تمھیں پھانسی پر لٹکا دوں گا وغیرہ''۔ تو یہ دروغ ہوگا۔ لیکن اگر اپنے عزم سے کہنے میں مبالغہ کرے یہ جان کر کہ اس کا فایدہ ہوگا تو اس مصلحت سے مبالغہ روا ہوگا۔ جیسے کہ دو بھائیوں میں سے مصالحت کی خاطر ایک کی باتوں میں کمی بیشی کرنی پڑے تو ناروا نہیں۔

درجہ ہفتم: ہاتھ پاؤں یا لکڑی سے پیٹنے کا ہے: بوقت ضرورت یہ جائز ہے لیکن بقدر ضرورت۔ اور ضرورت کا وقت وہ ہے جب ضرب کھائے بغیر معصیت سے باز نہ آتا ہو۔ لیکن اگر معصیت سے باز آ گیا ہو تو مار پیٹ مناسب نہیں۔ کیونکہ گناہ کے بعد عقوبت تعزیر یا حد ہوتی ہے جو سلطان کے سوا کسی کے لئے روا نہیں۔ اور طریقہ یہ ہے کہ اگر ہاتھ سے ضرب کافی ہو تو ڈنڈا استعمال نہ کیا جائے۔ نیز منہ پر ضرب نہ لگانی چاہئے۔ اگر مار پیٹ کفایت نہ کرے تو روا ہے کہ شمشیر کھینچے۔ اور اگر کسی نے عورت پر دست درازی کی ہو اور وہ اسے چھوڑنے پر سوائے تلوار کے خوف کے آمادہ نہ ہو تو بھی شمشیر کشی روا ہے۔ اگر محتسب اور وہ جس کا احتساب ہو رہا ہو دونوں کے درمیان نہر ہو تو محتسب کو چاہئے کہ تیر کمان میں چلہ چڑھائے تو کہے کہ ''رک جاؤ ورنہ تمھیں نشانہ

بناتا ہوں''۔ اگر اس پر بھی نہ رکے تو جائز ہے کہ تیر مارے لیکن ہدف ران یا پنڈلی کو بنائے۔ اور جہاں جان جانے کا خطرہ ہو وہاں تیر نہ مارے۔

درجہ ہشتم: یہ ہے کہ اگر محتسب تنہا کافی نہ ہو تو پکار کر لوگوں کو جمع کر لے اور فاسق کے ساتھ جنگ کرے۔ ایسے میں ممکن ہے کہ فاسق بھی اپنوں کو پکارے اور معاملہ قتال تک بڑھ جائے۔ اس لئے علماؒ میں سے ایک کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں بلا اجازت سلطان کے مواخذہ نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس سے فتنہ اٹھتا ہے اور فساد پر منتج ہوتا ہے۔ اور ایک گروہ کی رائے اس کے برعکس یہ ہے کہ جب کوئی قوم امام کی اجازت حاصل کئے بغیر کافروں کے ساتھ جنگ کے لئے نکل سکتی ہے تو جائز ہوگا کہ فاسقوں کے خلاف بھی بے اجازت جنگ کی جائے۔ اور اگر اس جنگ میں محتسب مارا بھی جائے گا تو شہید کے درجے پر متمکن ہوگا۔

محتسب کے آداب:

معلوم رہے کہ محتسب کے لئے تین خصائل ناگزیر ہیں: علم و ورع وحسنِ اخلاق کیونکہ اگر عالم نہ ہوگا تو منکر اور معروف کو ممتاز کیونکر کر سکے گا۔ لیکن اگر پارسا نہ ہوگا تو کام بغرض کرے گا۔ جب حسن خلق سے عاری ہو گا تو زیر احتساب لوگ اسے ستائیں گے تو وہ خشمگین ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ کو بھول جائے گا۔ اور حد پر کفایت نہ کرے گا۔ تو ایسے میں جو کچھ کرے گا وہ نفس کے لئے کرے گا نہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے تو اس کا احتساب بجائے ثواب کے معصیت ٹھہرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک کافر کو گراتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسے قتل کر دیں لیکن کافر نے حضرت کے منہ پر تھوک دیا تو آپ نے چھوڑ دیا۔ اور قتل نہ کیا اور فرمایا کہ ''میں غیظ میں آ گیا تھا ڈر گیا کہ اس طرح تو میں نے اللہ تعالیٰ کے لئے قتل نہ کیا ہوگا''۔ اسی طرح ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو تادیباً درہ مارا اور چاہتے تھے کہ ایک اور درہ ماریں کہ اس شخص نے آپ کو گالی دی۔ تو پھر آپ نے ہاتھ روک لیا۔ تو آپ نے فرمایا اب تک میں نے حق تعالیٰ کے لئے مارا تھا اب جب اس نے مجھے دشنام دی ہے تو اب اگر ماروں تو غصے کی بنا پر ماروں گا''۔ اسی لئے آنحضرت نے فرمایا کہ ''محاسبہ وہی کرتا ہے جو فقیہہ ہو اور جو کرے گا اس کے مطابق کرے گا۔ اور حکیم ہوگا جو کچھ بھی کہے گا اور نہی کا حکم دے گا اور رفیق ہوگا اس میں کہ جس کے کرنے کا حکم دے دیا جس سے منع کرے گا''۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ: ''جو کچھ تو کرنے کے لئے دوسرے سے کہے پہلے خود اس پر عمل پیرا ہوتا کہ خود فرماں بردار رہو''۔ یہ آداب میں سے ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ لوگوں نے آنحضرتؐ سے استفسار کیا کہ پہلے ہم خود حکم امر بمعروف کریں اور نہی منکر کریں؟'' تو آپؐ نے فرمایا کہ ''نہیں اگر پوری طرح خود عمل نہ بھی کیا ہو تو بھی باز پرسی سے باز نہ رہو''۔

محاسبے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ انسان صبور ہو اور جسمانی تکلیف اٹھائے کیونکہ حکم خداوندی ہے کہ: ''وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ '' (قرآن: ۱۷/۳۱) (نیکی کا حکم دے اور ناپسندیدہ سے روک اور برے کام سے منع کر اور اس راہ میں جو رنج پہنچے اسے صبر کے ساتھ برداشت کر''۔ اس راہ سے امر معروف اور نہی منکر مراد ہے۔ اور جو کوئی رنج پر صبر نہیں کر سکتا محاسبے کا اہل نہیں۔

آداب محاسبت میں ایک اہم یہ ہے کہ محاسب بے نیاز اور کوتاہ طمع ہو۔ کیونکہ جہاں کہیں طمع درمیان میں آئی محاسبہ باطل ہوا۔ مشائخ میں سے ایک کی عادت یہ تھی کہ قصاب سے بلّی کے لئے چھچھڑے مانگ لیتے تھے۔ تو ایک دن انھوں نے قصاب کو ایک منکر کا مرتکب پایا تو قصاب کے ہاں سے پلٹے اور بلّی کو گھر سے نکال دیا اور پھر لوٹ کر قصاب سے منکر کے بارے میں باز پرس کی تو قصاب نے کہا کہ جب تک بلی کے لئے غدودیں طلب کرو گے تم محاسبہ نہیں کر سکتے۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں پہلے ہی بلی کو رخصت کر چکا ہوں تب تمھارے محاسبے کے لئے آیا ہوں''۔ تو جو کوئی چاہتا ہے کہ لوگ اسے عزیز رکھیں اور اس کی تعریف کریں اور اس سے راضی ہوں وہ محاسبہ نہیں کر سکتا۔

کعب الاحبار نے ابو مسلم خولانی سے کہا ''تمھارا حال تمھاری قوم کے درمیان کیسا ہے؟'' کہا ''خوب ہے'' تو کعب الاحبار نے کہا کہ تورات میں ہے کہ ''جو کوئی محاسبت کرتا ہے اس کا حال اپنی قوم میں برا ہوتا ہے''۔ تو ابو مسلم نے کہا: ''تورات سچ کہتی ہے اور ابو مسلم جھوٹ کہتا ہے''۔

یاد رہے کہ حسبت کی حقیقت یہ ہے کہ محتسب دراصل اس عاصی کے لئے جس نے معصیت کی ہو مغموم ہوتا ہے اور وہ عاصی کو بہ نگاہ شفقت دیکھتا ہے۔ اور ہر منکر کے لئے ایسے ہی منع کرتا ہے جیسے وہ اپنی اولاد کو منع کرتا ہے اور نرمی ملحوظ ہوتی ہے۔ ایک شخص نے خلیفہ مامون الرشید کا احتساب کیا اور سخت کلامی سے کام لیا۔ تو مامون نے کہا: ''اے جواں مرد اللہ تعالیٰ نے تجھ سے بہتر کو مجھ سے بدتر کے پاس بھیجا تو فرمایا ''بات نرمی سے کرنا''۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہ السلام کو فرعون کے پاس روانہ کیا تو فرمایا: ''فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا '' سخن نرم کہنا تاکہ ہو سکتا ہے فرعون قبول کر لے''۔ بلکہ چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدا کرے۔ ایک جوان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور بولا: ''یارسول اللہ مجھے اجازت دیجئے تاکہ میں زنا کر سکوں'' صحابہ نے یہ سنا تو برہمی میں اس پر آوازے کسے اور اسے مار ڈالنا چاہا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو روکا۔ اور اس نوجوان کو اپنے قریب بلایا حتیٰ کہ وہ آپ کے سامنے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''اے جوان کیا تو اس بات کو روا رکھے گا کہ کوئی تیری ماں کے ساتھ یہ کرے؟'' تو اس نے کہا کہ ''نہیں''۔ تو آپؐ نے فرمایا دوسرے بھی اسے

روانہیں رکھتے''۔ پھر کہا کہ: ''کیا تو روا رکھتا ہے کہ دوسرے تیری بہن یا بیٹی کے ساتھ یہ عمل کریں؟'' تو وہ بولا: ''نہیں'' تو آپؐ نے فرمایا کہ لوگ بھی اسے روانہیں رکھتے''۔ پھر فرمایا کہ ''تو روا رکھتا ہے کہ لوگ تیری خالہ یا پھوپھی کے ساتھ یہ عمل کریں؟'' تو بولا کہ ''نہیں''۔ حضرت ایک ایک کے لئے کہتے اور وہ نفی میں جواب دیتا رہا تو پھر آنحضرتؐ نے ہاتھ اس کے دل کی طرف بڑھایا اور بولے ''بارِ خدایا اس کے دل کو پاکیز گی عطا فرما اور اس کی شرم گاہ کی حفاظت فرما اور اس کے گناہ بخش دے''۔ تو جب وہ جوان لوٹا تو اس کے لئے زنا سے بڑھ کر اور کوئی اس کا دشمن نہ تھا۔ فضیل عیاض سے لوگوں نے کہا کہ: ''سفیان عینہ سلطان سے خلعت حاصل کرتا ہے''۔ تو بولے کہ ''اس کا حق تو بیت المال سے اس سے بھی زیادہ ہے''۔ لیکن جب سفیان کو خلوت میں پایا تو اس پر عتاب کیا اور ملامت کی۔ تو سفیان بولا ''یا ابا علی اگر چہ ہم صالحان میں سے نہیں لیکن ہم صالحوں سے محبت کرتے ہیں''۔ وصلت بن اُشیم اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ ایک شخص وہاں سے گذرا جس کی چادر زمین سے گھسٹتی جا رہی تھی جیسے کہ عرب کے متکبروں کا شیوہ ہے۔ جب کہ اس کے لئے نہی آئی ہے۔ تو اس کے مریدوں نے چاہا کہ اس کے ساتھ درشتی سے پیش آئیں۔ تو آپ نے انھیں خاموش رہنے کو کہا کہ میں اکیلا ہی اس کے لئے کافی ہوں۔ آپ نے آواز دی کہ ''اے بھائی مجھے تم سے ایک کام ہے'' تو وہ بولا: ''فرمایئے''۔ تو آپ نے کہا کہ آپ اپنی چادر ذرا اوپر اٹھالیں'' تو وہ شخص بولا کہ ''نعم وکرامتہ'' یعنی بہت خوب میں آپ کا احسان مند ہوں۔ تو پھر آپ نے شاگردوں سے فرمایا کہ اگر میں سختی سے کچھ کہتا تو وہ انکار کر دیتا اور کہتا کہ ''نہیں کرتا'' اور ممکن ہے کہ وہ مجھے گالی بھی دیتا۔

ایک شخص نے ایک عورت میں ہاتھ ڈال رکھا تھا اور ایک ہاتھ میں خنجر تھا۔ اور کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ اس کے نزدیک جاتا۔ اور عورت نالہ وفریاد کر رہی تھی۔ وہاں سے بشر حافیؒ کا گذر ہوا ایسے کہ اُن کا کندھا اس شخص کے کندھے سے مل گیا۔ تو وہ مرد گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اور پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اور عورت کی نجات ہوگئی جب وہ شخص ہوش میں آیا تو لوگوں نے اس سے پوچھا کہ ''تجھے کیا ہوا؟'' کہنے لگا ''میں نہیں جانتا فقط یہ یاد ہے کہ ایک شخص میرے پاس سے گذرا اس کا جسم میرے جسم سے چھوا اس نے آہستہ سے مجھے کہا کہ: ''اللہ دیکھ رہا ہے کہ تو کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے اس بات کی ہیبت سے میں گر گیا''۔ تو لوگوں نے اسے بتایا کہ ''وہ بشر حافی تھے'' تو بولا اب میں شرم کے مارے اسے کیسے ملوں؟'' اسی وقت اسے شدید بخار ہوا اور ایک ہفتے بعد چل بسا۔

———◆◆◆———

باب سوم: منکرات جو اکثر معمول ہیں

معلوم رہے کہ اس زمانے میں عالم منکرات سے پر ہے۔ اور لوگ ناامید ہو گئے ہیں کہ اصلاح ہو پائے گی۔ کیونکہ ان سب منکرات کی اصلاح پر قادر نہیں اور جس پر قادر بھی ہیں اس سے بھی ہاتھ کھینچ لیا ہے جو اہل دین ہیں ان کی یہی حالت ہے۔ اور اہل غفلت تو اس حالت پر راضی ہیں۔ حالانکہ روا نہیں کہ جس برائی کے ازالہ کی قدرت نہ ہو تو اس برائی پر انسان راضی بھی ہو جائے۔ تو ہم ان میں سے ہر ایک کے بارے میں اشارے سے کام لیں گے کیونکہ مفصل ذکر ان کا ممکن نہیں اور یہ منکرات وہ ہیں جو کچھ تو مساجد میں ہیں کچھ بازار میں اور گلی کوچوں میں ہیں۔ اور بعض حماموں میں اور بعضے گھروں میں موجود ہیں۔

مسجدوں میں منکرات: اکثر دیکھا گیا ہے کہ نمازی نماز ادا کر رہا ہے لیکن رکوع و سجود کا ملاً ادا نہیں کر رہا یا قرآن پڑھ رہا ہے تو غلط اور نادرست۔ یا موذن ایسے جمع ہو جاتے ہیں کہ جب اذان دیتے ہیں تو الحان طویل کر دیتے ہیں۔ یہ سب ممنوع ہے۔ حی علی الصلوٰۃ کہتے وقت پورا جسم قبلے سے پھیر لیتے ہیں اور خطیب سیاہ ریشمی لباس میں ملبوس ہوتا ہے۔ تلوار پر طلاکاری ہوتی ہے جو حرام ہے۔ اور لوگ مسجد میں ہنگامہ آرائی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ قصہ گوئی یا شعر گوئی کرتے ہیں یا تعویذ بیچتے ہیں یا ایسے ہی دیگر ممنوعات کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور دیوانے یا چھوٹے بچے یا مست جب مسجد میں آ کر شور مچاتے ہیں تو اس سے مسجد نشینوں کو رنج پہنچتا ہے۔ لیکن وہ نادان بچہ جو خاموش رہتا ہو یا دیوانہ جو بے ضرر ہو اور مسجد کو آلودہ نہ کرے تو ایسوں کا مسجد میں آنا ناروا نہیں۔ اور اگر نادان کبھی کبھار مسجد میں کھیلے تو اس کو منع کرنا واجب نہیں۔ کیونکہ حبشی مدینہ کی مسجد میں شمشیر و سپر کا کھیل دکھاتے تھے تو حضرت عائشہ نے یہ کھیل دیکھا تھا۔ لیکن اگر مسجد کو اکثر کھیل کا میدان بنا لیں تو یہ منع کر دینا چاہئے۔ لیکن اگر کوئی سلائی کرے یا کتابت جس سے نمازیوں کو تکلیف نہ ہو تو روا ہے۔ لیکن دکان لگا لینا ناجائز ہے۔ لیکن ایسا کام جس سے مسجد میں لوگوں کا ہجوم ہونے لگے۔ جیسے بر دوام حکم کرنا یا قبالہ لکھنا ممنوع ہے۔ اِلّا یہ کہ کبھی کبھار ہو۔ آنحضرت ﷺ نے کبھی کبھی احکام سنائے ہیں۔ لیکن اس کام کے لئے جم کر نہیں بیٹھے تھے۔ لیکن دھوبیوں کا مسجد میں کپڑے سکھانا یا رنگریزوں کا کپڑوں کو رنگنا یہ سب مسجد میں ممنوع ہے۔ بلکہ وہ لوگ جو منبر پر بیٹھ کر قصہ گوئی کرتے ہیں جن میں مبالغہ ہوتا ہے یا تقصیر اور جو معتبر کتب احادیث سے باہر کی

چیز ہوں تو ایسوں کو بھی مسجد سے نکال دینا چاہئے۔ کیونکہ اسلاف ایسے ہی کرتے تھے اور ایسے واعظ اور مجلس گو جو بن سنور کر آتے ہیں اور شہوت ان پر غالب ہوتی ہے باتیں مسجع کرتے ہیں اور شعر پڑھتے ہیں اور جوان عورتیں مسجد میں موجود ہوتی ہیں۔ تو یہ کام کبائر میں شمار ہوتا ہے اس لئے مسجد سے باہر بھی نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ واعظ دراصل وہ ہوتا ہے جس کا ظاہر صلاح یافتہ ہو اور اہل دین کی ہئیت اور وقار کا مالک ہو۔ اور کسی حالت میں بھی جوان عورتوں اور جوان مردوں کو مسجد میں اس طرح نہ بیٹھنا چاہئے کہ ان کے درمیان کوئی شے حائل نہ ہو۔ بلکہ حضرت عائشہؓ اپنے زمانے میں عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع فرماتی تھیں۔ جب کہ آنحضرتؐ کے دور میں ممنوع نہ تھیں۔ عائشہؓ فرماتی تھیں کہ اگر رسولؐ موجودہ صورت حال کو دیکھتے تو یقیناً عورتوں کو مسجد میں آنے سے روک دیتے۔

مسجد کے منکرات میں سے یہ بھی ہے کہ دیوان لگائیں اور اموال تقسیم کریں اور دیہاتیوں کے معاملات اور حسابات کا تصفیہ کریں یا معرض تحریر میں لائیں یا بیٹھیں تماشا گاہ بنالیں اور یاوہ گوئی کریں یہ سب منکر ہے اور مسجد کی حرمت کے منافی۔

بازار اوران کے منکرات: وہ ہیں کہ قیمت خرید کے بارے میں دروغ گوئی کریں۔ سامان تجارت کا عیب پوشیدہ رکھیں اور تراز و بٹے اور گز معیاری نہ رکھیں اور سامان تجارت میں فریب دیں۔ اور چنگ و چغانہ جیسے ساز فروخت کریں۔ یا عید کے مواقع پر بچوں کے ہاتھ حیوانات کے بت فروخت کریں اور نوروز کے موقع پر لکڑی کے شمشیر و سپر بیچیں اور سدہ کے جشن کے موقع پر مٹی کے بگل فروخت کریں یا ریشمی قبا و کلاہ بیچیں مردوں کے لئے، اور رفو شدہ جامہ یا دھوبی کا لباس نیا کہہ کر فروخت کریں۔ اسی طرح وہ جس میں فریب ہو اسے فروخت کریں۔ اور سونے چاندی سے بنے ہوئے کوزے، آتشدان، دوات اور برتن وغیرہ بیچیں۔ ان اشیاء میں بعض حرام ہیں تو بعض مکروہ ہیں۔ حیوان کی صورت بنانا حرام ہے اور جشن سدہ اور نوروز کے موقع پر لکڑی کی شمشیر و سپر یا مٹی کے بگل فروخت کرتے ہیں یہ اپنی ذات میں حرام نہیں لیکن آتش پرستوں کے شعار کے اظہار کے باعث حرام قرار پاتے ہیں اور یہ شرع کے خلاف ہے۔ اور جو کچھ بھی اس نیت سے کیا جائے نہ کرنا چاہئے۔ اور نوروز کے سبب بازاروں کو آراستہ کرنا اور قطایف[1] بکثرت کرنا اور نوروز کے لئے روز افزوں تکلفات کرنا ناپسندیدہ ہے۔ بلکہ چاہئے تو یہ کہ نوروز اور سدہ کا کوئی نام نہ لے تا کہ یہ فراموش ہو جائیں۔ حتیٰ کہ اسلاف کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ ''نوروز کے دن روزہ رکھنا چاہئے تا کہ وہ کھانے جو معمول میں نہ کھائے جائیں اور

۱۔ قطایف: جمع قطیفہ: نان ہے۔ اس لفظ کی اصل ایک قسم کا کپڑا ہے اور وہ مخملین معروف بالا پوش ہے

سدہ کی رات چراغ بھی نہ جلانا چاہئے تا کہ کہیں آگ دکھائی نہ دے اور محققوں کا کہنا ہے کہ "اس دن روزہ رکھنا بھی چونکہ اس دن کی یاد میں معاون ہے جب کہ اس دن کا نام کسی طور بھی مسلمانوں کو نہیں لینا چاہئے۔ بلکہ اسے دوسرے ایام کا سا سمجھا جانا چاہئے۔ اور شب سدہ کو بھی اسی طرح تا کہ اس کا نام ونشان باقی نہ رہے"۔

شاہراہوں کے منکرات: یہ ہے کہ شاہراہ میں ستون کھڑا کر کے نیچے دکان سجا لیتے ہیں جس سے راستہ تنگ ہو جاتا ہے۔ یا راہ میں درخت لگا دیتے ہیں یا سائبان آگے بڑھا دیتے ہیں کہ اگر کوئی سواری پر وہاں سے گذرے تو سر سائبان سے ٹکرائے۔ بازار میں خروار رکھ دیتے ہیں اور وہیں جانور بھی باندھ دیتے ہیں جس سے راہ تنگ ہو جاتی ہے۔ تو یہ ناپسندیدہ ہے۔ الا بہ قدر ضرورت' جیسے کہ اٹھا رہے ہوں اور گھر کے اندر لے جا رہے ہوں۔ تو وہ خروار جو خار دار ہوں اور لوگوں کے لباس کو پھاڑنے کا باعث ہوتے ہوں انھیں ایسی راہ سے گذارنا جو تنگ ہو مناسب نہیں۔ لیکن اگر اور کوئی راستہ ہی نہ ہو تو از روئے حاجت جائز ہے۔

اور جانور پر بوجھ اس کی طاقت سے زیادہ لادنا نہیں چاہئے اور راہ میں قصاب کا بکری ذبح کرنا جس سے راہیوں کے لباس کے خون آلود ہونے کا خطرہ ہے مناسب نہیں۔ بلکہ اپنی دکان میں اس کام کے لئے قصاب کو جگہ بنانی چاہئے۔ اسی طرح بازار میں پھلوں کے چھلکے پھینکنا یا اتنا پانی چھڑکانا کہ پھسلنے کا خطرہ ہو۔ اسی طرح راہ گذر میں برف پھینکنا یا چھت پر سے آنے والا پانی راستے میں آلودگی کا باعث ہو تو صاحب خانہ کو راہ لازماً صاف کرنا چاہئے اور یہ صورت عام ہو تو سب پر فرض ہے کہ راہ گذر کو صاف رکھیں۔ اور والی شہر کو حق پہنچتا ہے کہ لوگوں کو اس پر لگائے تا کہ گند کو اٹھائیں اور اگر کوئی اپنے دروازے پر کتا رکھے جس سے لوگوں کو خطرہ ہو تو یہ ناجائز ہے۔ لیکن اگر راستے کے نجس ہونے یا پلید ہونے کے علاوہ اور کوئی خطرہ نہ ہو تو اس کو منع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ احتراز ممکن ہے۔ لیکن اگر کتا راستے میں سوئے جس سے راستہ تنگ ہو جائے تو پسندیدہ نہیں۔ اسی طرح اگر اس کتے کا مالک راہ میں نشست جما لے یا سو جائے تو یہ بھی ناروا ہے۔

منکراتِ گرمابہ (حمام کے منکرات) ایک منکر یہ ہے کہ غسل خانے والا ناف سے زانو تک اپنی شرم گاہ پوشیدہ نہ رکھے۔ یا ران حمامی کے آگے ننگی کر دے کہ وہ اسے ملے اور اس کی میل اتارے۔ بلکہ اگر وہ ران کے نیچے کپڑے کے اندر سے ملنے کے لئے ہاتھ بڑھائے تو ناروا ہے کیونکہ ملنا دیکھنے کے مترادف ہے۔ اور حمام میں جاندار کی صورت نقش کرنا بھی منکرات میں سے ہے۔ تو اسے خراب کرنا واجب ہے یا وہاں سے باہر نکل آیا جائے۔ اور بالٹی جس میں تھوڑا پانی اور طاس جو پلید ہو اس میں ہاتھ ڈالنا بھی امام شافعی کے نزدیک منکرات میں سے ہے۔ اگرچہ مسلکِ مالک کے پیرو کو منع نہیں کر سکتے کہ ان کے مذہب میں یہ جائز ہے۔ اور بے

ضرورت پانی بہانا کہ اسراف میں شمار ہوتا ہے منکر ہے۔اور مزید منکرات بھی ہیں جن کا ذکر ہم نے باب طہارت میں کر دیا ہے۔

منکراتِ مہمانی: ریشمی فرش، اور سیمیں وزریں آتش دان، گلاب زن اور غالیہ دان، اور لٹکتے پردے جن پر ذی حیات کی تصویریں ہوں، منکرات میں سے ہیں۔لیکن فرش اور سرہانے پر صورت گری روا ہے۔اور آتش دان کو حیوان کی صورت دینا منکر ہے۔لیکن سماع رود اور جوان عورتوں کا جوان مردوں کو دیکھنا خود فساد کی اصل ہے اور احتساب ان سب کا واجب ہے۔اگر نہیں کر سکتا تو وہاں سے نکل جائے۔احمد بن حنبلؒ نے جب چاندی کی سرمہ دانی دیکھی تو اٹھے اور وہاں سے نکل گئے تھے۔اسی طرح اگر مہمانی میں دیکھے کہ کوئی شخص ریشمی لباس میں ملبوس ہے یا انگوٹھی اس نے سونے کی پہن رکھی ہے تو وہاں بیٹھ رہنا مناسب نہیں۔اگر کوئی صاحب تمیز نوجوان ریشمی لباس میں ہو تو وہاں بھی بیٹھنا نہ چاہئے۔کیونکہ ملت کے مردوں کے لئے یہ ایسے ہی حرام ہے جیسے کہ شراب حرام ہے۔اور اگر کوئی اس کا خوگر ہو جائے تو بعد از بلوغ بھی یہ منکرات اس پر باقی رہتے ہیں۔اور جب ہنوز صاحب تمیز نہ ہو اور ان مکروہات سے لذت گیر نہیں ہوتا تو یہ مکروہ کے حکم میں ہے۔بے شک درجہ تحریم کو نہیں پہنچتا۔اگر مہمانی کی مجلس میں کوئی مسخرہ ہو جو لوگوں کو ناسزا اور دروغ کے ذریعے ہنسائے تو اس کے پاس بیٹھنا بھی مناسب نہیں۔

منکرات کی تفصیل طویل ہے۔جب تو نے ان کی پہچان کر لی تو مدارس، خانقاہوں، مجالس حکم اور دیوانِ سلطان کے منکرات کو انھی کے قیاس پر جان لے گا۔ان شاءاللہ۔

———•••———

اصل دہم: رعایا پروری اور حکمرانی کے باب میں

معلوم رہے کہ حاکم ہونا عظیم کام ہے اور یہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت ہے۔ بشرطیکہ عدل وانصاف کے راستے پر چلے۔ اور اگر شفقت اور عدل سے عاری ہو تو یہ شیطان کی نیابت ہوگی کیونکہ کوئی سبب فساد کا حاکم کے ظلم سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا۔ تو اصل حکمرانی علم وعمل سے بہرہ ور ہونا ہے۔

اور حکمرانی کا علم بہت وسیع ہے۔ لیکن عنوان ان علوم کا یہ ہے کہ حاکم کو معلوم ہو کہ اسے کس لئے اس دنیا میں لایا گیا ہے اور اس کی قرارگاہ کیا ہے۔ اور یہ کہ یہ دنیا ایک منزل ہے۔ اور قرارگاہ نہیں۔ اور وہ خود ایک مسافر کی صورت میں ہے۔ اور ماں کا رحم اس کی پہلی منزل ہے اور قبر آخری منزل ہے۔ اور وطن اس کا اس کے سوا ہے۔ اور ہر سال، ہر ماہ اور ہر روز اس کی زندگی سے جو گذرتا ہے وہ ایک مرحلے کی طرح ہے کہ جس کے ذریعے وہ اپنی قرارگاہ کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے اور جسے پل پر سے گذرنا ہو وہ پل کی تعمیر ہی میں ساری عمر صرف کر دیتا ہے اور منزل کو بھول جاتا ہے تو وہ بے عقل ہی ہوگا۔ بلکہ عاقل وہ ہوگا جو دنیا کی منزل میں سوائے طلب زادِراہ کے مشغول نہ ہو اور دنیا سے بقدر حاجت وضرورت قناعت کرے۔ اور اس سے زیادہ جو کچھ بھی ہو گا زہر قاتل ہے۔ اور بوقت مرگ چاہے گا کہ میری تمام ریاست خاک ہوتی ہے اور اس میں کوئی سیم وزر نہ ہوتا۔ پس وہ جو کچھ بھی زیادہ جمع کرے گا اس کے نصیب میں تو وہ قدر کفایت ہوگی باقی سب حسرت وندامت کا باعث ہوگی اور بوقت مرگ جان کنی دشوارتر ہوگی اور یہ اس وقت ہوگا اگر اس نے حلال کیا ہو۔ اور اگر حرام ہوگا تو عذاب آخرت کا رنج اس حسرت کے رنج کے باعث بڑھ جائے گا۔

شہوائے دنیا سے پرہیز رنج اٹھائے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن اگر ایمان پختہ ہو تو کچھ مشکل نہ ہوگی۔ معلوم رہے کہ اس چندروزہ لذت کے سبب کہ جو منغص اور مکدر ہے آخرت کی لذت فوت ہو جائے گی۔ حالانکہ وہ پادشاہی وہ ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ جاودانی ہے اور اس میں کسی کدورت کو راہ بھی نہیں بشرطیکہ ایمان صحیح ہو۔ تو چند دنوں کے لئے صبر کرنا آسان ہوگا۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ جس کا کوئی معشوق ہو تو اس سے کہا جائے کہ "اگر آج رات اس کے پاس جاؤ گے تو اسے مل نہ پاؤ لیکن اگر آج کی رات صبر کرو گے تو ہم ہزار راتوں کے لئے اسے تمھارے حوالے کر دیں گے۔ جس میں کوئی رقیب ہوگا نہ نگہبان"۔ اگرچہ اس کا عشق حد

سے بڑھا ہوا ہو تو ایک رات کا صبر اس امید میں کہ ہزار شب کا وصل میسر ہوگا اس کے لئے مشکل نہ ہوگا۔ اور مدت دنیا کی آخرت کے مقابلے میں اس کا ہزارواں حصہ بھی نہیں۔ بلکہ اسے تو آخرت کی جاودانی سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ کیونکہ اس کی تو کوئی انتہا ہی نہیں اور ابد کی درازی کسی انسان کے وہم وفہم میں نہیں سماتی۔ کیونکہ اگر فرض کرے کہ ساتوں آسمان اور زمین چینے کے دانوں سے پُر ہوں اور ہر ہزار سال کے بعد ایک پرندہ اس ڈھیر میں سے ایک دانہ لے جائے تو ایک نہ ایک دن چینہ کا وہ ڈھیر آخر تمام ہو جائے گا لیکن ابد میں کچھ کمی واقع نہ ہوگی۔ پس اگر انسان سو سال بھی جئے اور روئے زمین کی مشرق سے لے کر مغرب تک سب بغیر کسی تنازع کے بادشاہی اس کو عطا کر دی جائے تو وہ بے نہایت آخرت کے مقابلے میں بے مقدار ٹھہرے گی۔ پس ہر کسی کو دنیا میں سے تھوڑا سا ہی حصہ ملتا ہے اور وہ بھی منغص و مکدّر رہتا ہے۔ اور جو کچھ بھی ہو اس میں بہت سے اور کمینے بھی اس معنی میں اس سے آگے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ تو کیا عذر ہے کہ کوئی ہمیشہ کی بادشاہی تو اس حقیر اور مکدّر اور مختصر حکومت کے عوض دے دے؟ اور یہ معنی والی اور غیر والی اپنے لئے فرض کرے اور اپنے دل میں تازہ رکھے تاکہ اس کے لئے چند دن شہوات سے صبر کرنا اور رعایا پر شفقت کرنا اور بندگان خدا کے ساتھ حسن سلوک اور حق نیابت خداوندی ادا کرنا آسان ہو جائے۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو اب حاکم کو اس طرح اپنا فریضہ ادا کرنے میں لگ جانا چاہئے کہ جس طرح اللہ کا حکم ہے نہ کہ اس طرح کہ جیسے اس کی دنیوی صلاح ہو۔ کیونکہ کوئی عبادت اور اللہ تعالیٰ سے قرب، عدل کے ساتھ حکمرانی سے بڑھ کر نہیں۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ ''سلطان عادل کا ایک روز کا عدل ساٹھ سال کی مسلسل عبادت سے بڑھ کر ہے۔ اور وہ سات شخص جو روز قیامت، بروئے حدیث نبوی، حق تعالیٰ کے سائے میں ہوں گے ان میں سب سے پہلا نام سلطان عادل کا ہے''۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ سلطان عادل کو ہر روز عبادت میں ساٹھ مجتہد صدیقوں کے عمل کے برابر ترقی دیتے ہیں اور آسمان پر لے جاتے ہیں''۔ نیز فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ترین اور درست ترین شخص امام عادل ہے اور دشمن ترین اور بدترین امامِ ظالم ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے ہر روز والیٔ عادل کو اتنے عمل کا ثواب دیتے ہیں جو اس کی تمام رعایا کے اعمال کے برابر ہوتی ہے۔ اور حاکم عادل کی ہر نماز ستر (۷۰) ہزار نمازوں کے برابر درج ہوتی ہے۔ پس جب حقیقت حال یہ ہو تو اس سے بڑھ کر مال غنیمت اور کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو والی کا منصب عطا فرمائے اور پھر اس والیٔ عادل کا ایک گھنٹہ دوسرے کی پوری عمر کے ثواب کے برابر ٹھہرے۔ اور اگر کوئی اس نعمت کے حق کو نہ پہچانے اور ظلم کرے اور اپنی خواہشوں کا غلام بن جائے تو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اللہ کا دشمن ہے۔ اور اس عدل

کے قیام کے لئے دس قواعد کو ملحوظ رکھنا ہوگا:

قاعدہ اوّل: جو واقعہ بھی پیش آئے تو والی کا یہ فرض ہے کہ وہ فرض کرے کہ رعیت ہے اور والی دوسرا ہے۔ اور اپنے لئے جو کوئی ایسی چیز پسند نہیں کرتا دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی پسند نہ کرے۔ اگر یہ پسند کرے گا تو گویا اس نے فریب دیا اور خیانت خود اپنی ولایت میں کی۔ غزوہ بدر کے دن حضور ایک سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور کہنے لگا: ''تم سائے میں ہو اور ساتھی تمھارے دھوپ میں!'' اس ذرا سے فرق پر جبریل نے آپ ﷺ پر عتاب کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''جو کوئی دوزخ سے نجات کا خواہاں ہے اور بہشت میں جانا چاہتا ہے تو چاہئے کہ جب موت آئے تو کلمۂ لا الٰہ الا اللہ پر آئے اور جو اپنے لئے پسند نہیں کرتا کسی مسلمان کے لئے پسند نہ کرے''۔ نیز فرمایا کہ جو کوئی صبح کو بیدار ہو تو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی خیال ہو تو وہ مرد خدا نہیں ہوگا۔ اور اگر مسلمانوں کے کاموں اور ان کی خبر گیری سے عاری ہو تو وہ مسلمانوں میں شمار نہ ہوگا''۔

قاعدہ دوم: یہ کہ اپنی بارگاہ میں محو انتظار ارباب حاجات کو حقیر نہ سمجھے۔ اور ان کے خیال کو فراموش نہ کرے اور جب تک ایک مسلمان بھی جو حاجت مند ہو باقی ہو تو کسی نفلی عبادت میں مشغول نہ ہو۔ کیونکہ مسلمانوں کی حاجت روائی جملہ نوافل کی ادائیگی سے فاضل تر ہے۔ ایک دن حضرت عمر بن عبدالعزیز لوگوں کے کاموں میں نماز ظہر تک لگے رہے تو تھک گئے۔ تو گھر میں چلے گئے تا کہ ایک گھڑی آرام کرلیں۔ تو ایک شخص نے کہا ''تو کس لئے ایمن ہے اس بات سے کہ ایک گھڑی میں موت آ پہنچے اور کوئی تمھارے دروازے پر حاجت روائی کا منتظر ہو اور تو اس کے حق میں تقصیر کا مرتکب ہو؟'' تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں یہ کہہ کر فوراً گھر سے باہر نکل آئے اور مصروف عمل ہو گئے۔

قاعدہ سوم: یہ ہے کہ شہوات میں مشغولی کو معمول نہ بنائے کہ اچھا لباس زیب تن کرے یا عمدہ کھانا کھائے بلکہ ہر چیز میں قناعت سے کام لے کیونکہ قناعت کے بغیر عدل ممکن نہیں۔

حضرت عمر بن رضی اللہ عنہ خطاب نے سلمان پارسی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ''آپ نے میرے احوال کے بارے میں کیا سنا جو آپ کو پسند نہیں آیا؟'' تو سلمان نے کہا کہ میں سنا ہے کہ بیک بار دو قسم کے سالن تمھارے دستر خوان پر ہوتے ہیں اور دو لباس ہیں کہ ایک دن میں پہنتے ہو تو دوسرا رات کو''۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ ''اس کے علاوہ اور کچھ نہیں'' تو سلمان نے کہا نہیں تو آپ نے فرمایا کہ ''اب یہ بھی نہ ہوگا''۔

قاعدہ چہارم: یہ کہ بنائے کار۔ جہاں تک ممکن ہو نرمی رکھے نہ کہ سختی پر۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان

ہے کہ جو رعایا کے ساتھ نرمی برتتا ہے تو روزِ قیامت اس کے ساتھ بھی نرمی برتی جائے گی"۔ اور آپ ﷺ نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: "بارِ خدایا جو حاکم اپنی رعایا پر نرمی برتتا ہے تو بھی اس کے ساتھ نرمی برت اور جو رعایا کے ساتھ سختی کرتا ہے تو بھی اس کے ساتھ سختی کر"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: "ولایت اور فرماں روائی اچھی چیز ہے لیکن اُس شخص کے لئے جو اس کے حق کی ادائیگی پر قادر ہو اور ولایت بری شے ہے اس شخص کے لئے جو اس کے حق میں قاصر ہو"۔

خلفاء میں سے ایک ہشام بن عبدالمطلب تھا اس نے ابوحازم سے جو بزرگ علماء میں سے تھے پوچھا کہ "اس کام میں نجات کی تدبیر کیا ہے؟" تو آپ نے فرمایا یہ کہ ہر درم جو تو لیتا ہے تو ایسی جگہ سے لے جو حلال ہو اور اس درم کو وہاں رکھ جہاں اس کا حق ہے"۔ ہشام نے کہا کہ: "یہ کون کرسکتا ہے"۔ تو ابوحازم نے کہا: "وہ جو دوزخ کی تاب نہیں رکھتا اور بہشت کو دوست رکھتا ہے"۔

قاعدہ پنجم: یہ ہے کہ نہایت درجہ کوشش کرے کہ تمام رعایا شرع کی موافقت کی بناء پر اس سے راضی ہو۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ "ائمہ میں سے بہترین وہ ہیں جو تمھیں دوست رکھتے ہیں اور تم انھیں دوست رکھتے ہو اور ان میں بدترین وہ ہیں جو تمھارے ساتھ دشمنی کرتے ہیں اور تم ان کے ساتھ دشمنی کرتے ہو اور وہ تم پر لعنت کرتے ہوں اور تم ان پر لعنت کرتے ہو"۔ اور چاہئے کہ اس بات سے مغرور نہ ہو جائے کہ جو کوئی اس کے پاس آتا ہے اس کی تعریف کرتا ہے اور گمان کرے کہ سب اسے پسند کرتے ہیں کیونکہ بیم کی بناء پر عوام ایسا کرتے ہیں۔ بلکہ حاکم کو چاہئے کہ قابل بھروسہ افراد کو اس کام پر مامور کرے کہ بذریعہ جاسوسی لوگوں سے اپنے احوال کے بارے میں حقائق معلوم کرے۔ کیوں کہ اپنے معائب عوام ہی سے معلوم کئے جاسکتے ہیں۔

قاعدہ ششم: یہ ہے کہ خلاف شرع کسی کی رضا طلب نہ کرے کیوں کہ مخالف شرع کی ناراضگی اسے کوئی ضرر نہیں پہنچاسکتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "ہر روز جب میں بیدار ہوتا ہوں تو آدھی مخلوق مجھ سے ناخوش نود ہوتی ہے"۔ ظاہر ہے جس سے انصاف لیا جائے گا ناخوش ہی ہوگا۔ پس دونوں متخاصموں کو راضی نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کا فرمان ہے کہ "انتہائی جاہل وہ شخص ہے جو مخلوق کی رضا حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو چھوڑ دے"۔ امیر معاویہ نے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں لکھا کہ "مجھے مختصر نصیحت فرمائیے"۔ حضرت عائشہؓ نے جواب میں لکھا کہ "میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ جو کوئی خلق کی ناخوشنودی سے حق تعالیٰ کی خوشنودی ڈھونڈتا ہے تو اللہ اس سے خوشنود ہوتا ہے اور خلق کو بھی اس سے خوشنود کردیتا ہے اور جو کوئی مخلوق کی خوشنودی اللہ تعالیٰ کی ناخوشنودی سے چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے ناخوشنود ہوجاتے ہیں

اور مخلوق کو بھی اس سے ناخوشنود کر دیتے ہیں''۔

قاعدہ ہفتم: یہ ہے کہ ولایت کا ارادہ بہت گراں ہے اور لوگوں کے کاموں کی ذمہ داری لینا بڑا عظیم کام ہے اور جسے اس سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق مل گئی تو اس نے وہ سعادت پائی کہ جس کے سوا اور کوئی سعادت ہے ہی نہیں۔ اور اگر وہ اس سے قاصر رہتا ہے تو یہ وہ بدبختی ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی بدبختی نہیں۔ ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن آنحضرت ﷺ کو دیکھا کہ آپؐ نے آ کر کعبے کے دروازے کی زنجیر کو تھاما۔ اور اس وقت قریش کا ایک گروہ کعبہ کے اندر تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ''ائمہ اور سلطان قریش میں سے ہوں گے بشرطیکہ تین کام بجالائیں: ایک یہ کہ جب ان سے رحمت کی استدعا کی جائے رحمت کریں اور جب لوگ ان سے دادطلب ہوں تو انصاف کریں اور حال ان کا قال کے مطابق ہو۔ اور جو کوئی یہ نہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ فرشتوں اور عوام کی لعنت ان پر ہو۔ اللہ تعالیٰ نہ ان کا کوئی فریضہ قبول کرے گا اور نہ سنت''۔ پس غور کرو کہ وہ کتنا عظیم کام ہوگا کہ جس کے نہ ہونے پر کوئی عبادت مقبول نہ ہوگی۔ فرض نہ سنت۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''جو کوئی دو اشخاص کے تنازعہ پر انصاف کی بجائے ظلم کرتا ہے تو ایسے ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو''۔ نیز فرمایا کہ ''تین شخص ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت ان کو دیکھنا بھی پسند نہ کرے گا: ایک جھوٹ بولنے والا سلطان، تو دوسرا زناکار بوڑھا اور تیسرا گدائے گندآور یعنی متکبر ولاف زن مفلس''۔ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ''جلد ہی مشرق اور مغرب میں فتوحات ہوں گی جو تمھاری ملک قرار پائیں گی۔ اور ان علاقوں کے حکام سب آگ کی نذر ہوں گے۔ اِلّا یہ کہ کوئی اللہ سے ڈرا اور اس نے ورع وتقویٰ اختیار کیا اور امانت کا حق ادا کیا''۔ نیز فرمایا کہ ''کوئی ایسا بندہ نہیں ہے کہ اللہ نے رعایا اس کے حوالے کی اور اس نے ان سے فریب کیا ہو اور شفقت اور نصیحت بجا نہ لایا ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے بہشت اس پر حرام نہ کر دی ہو''۔ نیز فرمایا کہ ''ہر وہ شخص جسے مسلمانوں پر حاکمیت دی گئی ہو اور وہ رعایا کو اپنے بیوی بچوں کی مانند نہ رکھے تو اس سے کہہ دو کہ جہنم میں اپنا مستقر بنالے''۔ نیز فرمایا کہ ''میری امت میں سے میری شفاعت سے دو شخص محروم رہیں گے: ایک ظالم بادشاہ اور دوسرا بدعتی جو دین میں اس درجہ غلو کرے کہ حد سے نکل جائے''۔ نیز فرمایا کہ ''روزِ قیامت سخت ترین عذاب ظالم بادشاہوں کو ہوگا''۔ نیز فرمایا کہ ''پانچ شخص وہ ہیں کہ اللہ جن سے ناراض ہے تو چاہے تو اس دنیا میں ان پر اپنا غصہ نکالے ورنہ مستقر ان کا دوزخ ہے: ایک وہ امیر قوم جو قوم سے اپنا حق تو لیتا ہے لیکن ان سے انصاف نہیں کرتا۔ اور ان پر سے ظلم دور نہیں کرتا۔ دوسرا وہ رئیس قوم کہ لوگ تو اس کی اطاعت کریں اور وہ قوی اور ضعیف کو ایک ہی نظر سے نہ دیکھے۔ اور بات اپنے نفس کی خواہش کے مطابق کرے۔ اور

تیسرے وہ مرد جو اپنے اہل وعیال کو اللہ کی بندگی کا حکم نہ دے اور دینی امور کا علم اُنھیں نہ سکھائے۔ اور فکر نہ کرے کہ انھیں نان ونفقہ کہاں سے فراہم کرے گا۔ چوتھے وہ جو مزدور سے کام تو پورا لے لیکن اسے حق مزدوری پورا نہ دے اور پانچویں وہ جو بیوی سے مہر میں ظلم کا ارتکاب کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن چاہا کہ ایک نماز جنازہ میں شریک ہوں تو ایک شخص آگے بڑھا اور نماز ادا کی۔ جب مردے کو دفن کر دیا گیا تو اس نے قبر پر ہاتھ رکھ کر کہا ''بارِ خدایا اگر تو اس پر عذاب کرے کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ گناہ کا مرتکب ہوا ہو اور اگر تو رحمت فرمائے تو یہ تیری رحمت کا محتاج ہے۔ خوش نصیب ہے اے مرد کہ تو کبھی حاکم تھا نہ کوئی مہتر قوم نہ کاتب نہ عوان[1] نہ جابی[2]''۔ تو پھر وہ شخص وہاں سے غائب ہو گیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تلاش کا حکم دیا تو وہ شخص نہ ملا تو حضرت عمر نے فرمایا کہ ''یہ خضر علیہ السلام ہوگا''۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''افسوس ہے امیروں پر اور افسوس ہے عریفوں پر اور افسوس ہے خیانت کار امینوں پر جو قیامت کے دن آرزو کریں گے کہ انھیں ان کے سر کے بالوں کو پکڑ کر آسمان سے لٹکا دیا گیا ہوتا اور انھیں حاکم مقرر نہ کیا ہوتا''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی آدمی کو دس آدمیوں پر سرداری نہ دی ہو اور روزِ قیامت اس کو طوق بہ کف نہ لائیں اگر نیکوکار ہوگا تو اسے رہا کر دیں گے ورنہ ایک اور طوق اس پر بڑھا دیں گے''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ: ''افسوس ہے دنیا میں انصاف کرنے والے پر' آسمان کے عادل کی طرف سے کہ جس دن وہ اسے دیکھے گا اِلَّا یہ کہ اس نے عدل کیا ہو۔ اور حق حق دار کو دلایا ہو اور اپنی مرضی کا حکم نہ دیا ہو اور عزیز واقارب کا لحاظ نہ کیا ہو یا خود یا امید کی بناء پر فیصلہ نہ بدلا ہو اور کتاب اللہ کو آئینہ بنایا ہو اور ہمیشہ اپنے سامنے رکھا ہو اور اس کے مطابق فیصلہ کیا ہو''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ: ''روزِ قیامت والیان ولایت کو لا کر کہا جائے گا کہ ''تم ہماری بکریوں کے پاسبان تھے اور زمین پر ہمارے خزانچی تھے تو تم نے کیوں کسی پر عقوبت کرتے ہوئے ہماری بتائی ہوئی حد سے زیادہ سزا دی؟'' تو وہ جواب دیں گے کہ ''بارِ خدایا اس خشم میں کہ انھوں نے آپ کی خلاف ورزی کی تھی'' تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ''تمھارا غصہ میرے غضب سے زیادہ کیسے ہوا؟'' پھر دوسرے سے کہے گا کہ ''تو نے ہماری فرمودہ حد سے مجرم پر کمتر حد کیوں لگائی؟'' تو وہ جواب دے گا کہ: ''میں نے اس پر رحمت کی'' تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ''تو مجھ سے بڑھ کر رحیم کیوں کر ہوا؟'' تو فرشتے اس حاکم کو جس نے حد زنی میں زیادتی کی تھی اور اس کو جس نے حد زنی میں کمی کی تھی دونوں کو دوزخ

---

۱ عوان: مامور اجرائے دیوان واحتساب

۲ جابی: خراج خواہ

میں ڈال دیں گے۔

حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "حاکم کی ثنا نہیں کرتا نیک ہو یا بد"۔ تو لوگوں نے پوچھا کہ "کیوں؟" تو فرمایا کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا کہ "روزِ قیامت تمام حکام کو لیا جائے گا۔ ظالم کو بھی عادل کو بھی۔ اور سب کو صراط پر لیا جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ پل صراط کو حکم دیں گے کہ ان کو ایک جھٹک میں گرادے۔ تو جس حاکم نے فیصلہ میں ظلم کیا ہوگا یا فیصلہ کے لئے رشوت لی ہوگی یا دونوں میں سے ایک فریق کی بات زیادہ سنی ہوگی تو ایسے جملہ حکام نیچے گر جائیں گے اور ستر سال تک دوزخ میں رہیں گے پھر اپنی اپنی قرار گاہ کا رُخ کریں گے"۔ حدیث میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام بھیس بدل کر رات کو باہر نکلتے تھے جس سے لوگ انھیں پہچان نہ سکتے تھے۔ تو انھیں جو کوئی بھی ملتا اس سے داؤد کی سیرت کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ ایک دن حضرت جبریل علیہ السلام آدمی کی صورت میں آکر حضرت سے ملا تو اس سے بھی آپ نے اپنے بارے میں سوال کیا تو جبریل نے جواب میں کہا کہ "داؤد نیک انسان ہے، لیکن کاش بیت المال سے نفقہ حاصل نہ کرتا بلکہ اپنی محنت سے روزی کماتا"۔ یہ سن کر حضرت داؤد محراب مسجد میں گریہ وزاری میں کہنے لگے کہ "بارِ خدایا مجھے کوئی ہنر سکھا تاکہ میں اپنی محنت سے روزی کماؤں، پس خدائے تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو زرہ گری سکھائی"۔

حضرت عمر خطاب رضی اللہ عنہ ہر شب چوکیدار کی بجائے خود مدینے کی گلیوں میں گردش کرتے تاکہ اگر کہیں خلل دیکھیں تو اس کا تدارک کریں۔ آپ فرماتے کہ "اگر خارش زدہ بکری کو لوگ دریا فرات کے ساحل پر چھوڑ دیں اور اس پر تیل نہ ملیں تو مجھے خوف ہے کہ قیامت کے روز مجھ سے اس کا حساب لیا جائے گا"۔ باوجود اس کے کہ آپ کا عدل اس معیار کا تھا کہ کوئی اس کو نہیں پہنچا۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دعا کی تھی کہ اے اللہ عمر رضی اللہ عنہ کو مجھے خواب میں دکھائیو۔ تو میں نے ان کی وفات کو بارہ سال ہو گئے تھے کہ خواب میں دیکھا۔ یوں لگا جیسے نہا کر نکلے ہوں اور اپنی چادر پکڑے ہوئے تھے۔ تو میں نے سوال کیا کہ "اے امیر المؤمنین آپ نے اللہ تعالیٰ کو کیسے پایا؟" تو حضرت عمر نے کہا "اے عبداللہ مجھے تم سے جدا ہوئے کتنی مدت ہو چکی ہے؟" میں نے کہا "بارہ سال" تو آپ نے فرمایا کہ "میں اس وقت سے اب تک حساب دیتا رہا ہوں۔ اگر خدائے تعالیٰ رحیم نہ ہوتے تو مجھے خوف تھا کہ میرا کام تباہ ہو جائے گا"۔ حضرت عمر کا حال یہ ہوا حالانکہ آپ کی ملکیت میں ایک تازیانے کے سوا اور کوئی شے نہ تھی۔ بزرجمہر نے ایران سے ایک سفیر کو بھیجا تاکہ دیکھ کر آئے کہ عمر رضی اللہ عنہ کیسا شخص ہے اور اس کی سیرت کیسی ہے تو وہ سفیر مدینہ پہنچا تو اس نے پوچھا کہ تمھارا بادشاہ کہاں ہے؟" تو لوگوں نے کہا ہمارے ہاں بادشاہ نہیں ہمارے ہاں امیر ہوتا ہے۔ اور اس وقت گھر سے

باہر جا چکا ہے۔ تو وہ سفیر بھی باہر نکلا تو اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دھوپ میں زمین پر سویا ہوا پایا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے درہ اپنے سر کے نیچے رکھا ہوا تھا اور پسینہ آپ کی پیشانی سے بہہ رہا تھا۔ جس سے زمین تر ہو گئی تھی۔ سفیر نے جب یہ منظر دیکھا تو بغایت درجہ متاثر ہوا کہ وہ شخص جس کی ہیئت سے دنیا بھر کے بادشاہ لرزہ براندام تھے وہ ایسا ہوگا! پھر وہ بولا تو عدل کے سبب میٹھی نیند سوتا ہے۔ اور ہمارا بادشاہ ظلم کرتا ہے اس لئے ہراساں رہتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ دین حق آپ ہی کا دین ہے۔ اگر میں بہ طور سفیر نہ آیا ہوتا تو اسی وقت مسلمان ہو گیا ہوتا۔ لیکن اب اپنا فرض ادا کر کے لوٹوں گا۔ پس ولایت کا خطر یہی ہے۔ اور علم اس کا بہت دراز ہے۔ اور والی سلامتی اس طرح پا سکتا ہے کہ ہمیشہ دین دار علما سے قریب رہے تا کہ وہ اسے عدل کی راہ دکھاتے رہیں اور اس کام کے خطر کو والی کے ذہن میں تازہ رکھیں۔

قاعدہ ہشتم: یہ ہے کہ والی ہمیشہ علمائے دیندار کے دیدار کا پیاسا ہو۔ اور ان کے پند و نصائح کا حریص۔ اور دنیا کے حریص علماء سے احتراز کرے جو اسے مبتلائے فریب کریں گے اور اس کی تعریف کریں گے اور اس کی خوشنودی کے طالب ہوں گے۔ تا کہ اس مردار اور حرام دنیا سے جو اس کے ہاتھ میں ہے حیلہ و مکر سے اس سے حاصل کر سکیں۔

عالم دیندار وہ ہے جسے کوئی لالچ نہ ہو اور بات فقط انصاف کی کرے۔ جیسے کہ شقیق بلخی ہارون الرشید کے پاس گیا تو ہارون نے پوچھا کہ ''تو زاہد شقیق ہے؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''میں شقیق ہی ہوں لیکن زاہد نہیں''۔ تو ہارون نے کہا: ''مجھے نصیحت کیجئے''۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تجھے ابوبکر صدیق کی جگہ بٹھایا ہے۔ تو وہ تجھ سے اسی طرح صدق کا خواہاں ہے جس طرح صدیق تھے۔ اور عمر فاروق کی جگہ بٹھایا ہے۔ اس لئے تجھ سے حق و باطل کے فرق کا خواہاں ہے۔ جیسے کہ عمر رضی اللہ عنہ سے چاہتا تھا اور تجھے عثمان ذی النورین کی جگہ بٹھایا ہے تو تجھ سے حیا کا طالب ہے جیسے کہ عثمان سے طالب تھا۔ اور علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کی جگہ بٹھایا ہے کہ تجھ سے علم و عدل کا خواہاں ہے جیسے کہ علی رضی اللہ عنہ سے خواہاں تھا۔ تو ہارون نے کہا ''مزید نصیحت فرمایئے''۔ تو فرمایا کہ ''ہاں اللہ کے ہاں ایک سرائے ہے جسے دوزخ کہتے ہیں اور تجھے اس کا دربان مقرر کیا ہے اور تجھے تین چیزیں عطا فرمائی ہیں:

بیت المال کا مال، شمشیر اور تازیانہ۔ اور حکم دیا ہے کہ ان کے ذریعے لوگوں کو دوزخ سے باز رکھ۔ اس لئے کوئی حاجت مند تیرے پاس آئے تو اس مال کو اس سے دریغ نہ رکھ۔ اور جو کوئی فرمان خداوندی کے خلاف کرے تو اس تازیانے سے اس کی تادیب کر۔ اور جو کوئی کسی کو ناحق جان سے مارے تو اسے اس تلوار سے اس

کے ولی کی اجازت سے موت کے گھاٹ اتار دے۔ اور اگر یہ نہ کرے گا تو پہلے دوزخ میں داخل ہوگا اور دوسرے تیرے پیچھے دوزخ میں داخل ہوں گے"۔ ہارون نے کہا نصیحت میں اضافہ فرمائیے"۔ تو آپ نے فرمایا "چشمہ تُو ہے اور دوسرے نہریں جو تیرے عمّال ہیں۔ اگر چشمہ شفاف ہوگا تو نہروں کی تیرگی زیان کا باعث نہ ہوگی۔ اور اگر چشمہ تاریک ہو تو نہروں سے روشنی کی کوئی امید نہیں"۔

ہارون الرشید عباسی کی ہمراہی میں کہ ایک اس کے خواص میں سے تھا۔ فضیل عیاض کے پاس جا رہے تھے جب اس کے دروازے پر پہنچے تو اس وقت فضیل تلاوت قرآن میں مشغول تھے اور اس آیت پر پہنچے تھے کہ: "اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ" تو ہارون نے کہا کہ "اگر میں نصیحت کا طالب ہوں تو میرے لئے یہی ایک آیت کافی ہے۔ (قرآن: ۲۱/۴۵) (وہ لوگ جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ان کا گمان یہ ہے کہ ہم انھیں ان لوگوں کے برابر قرار دیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کیئے۔ یہ بے انصافی ہے جو انھوں نے کی)۔ پھر ہارون نے دروازہ کھٹکھٹانے کو کہا۔ عباس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا کہ "امیر المؤمنین کے لئے دروازہ کھولو"۔ فضیل نے پوچھا کہ "امیر المؤمنین کو مجھ سے کیا غرض ہے؟" عباس نے کہا کہ "امیر المؤمنین کی فرماں برداری کر اور دروازہ کھول"۔ فضیل نے دروازہ کھول دیا۔ رات کا وقت تھا اس نے چراغ بجھا دیا۔ ہارون نے تاریکی میں ہاتھ بڑھایا تو فضیل کے ہاتھ سے جا لگا۔ تو فضیل نے کہا: "آہ یہ ہاتھ اور اتنا نرم اگر اللہ کے عذاب سے نجات پا جائے"۔ پھر کہا: "اے امیر المؤمنین! اپنا جواب تیار رکھ کہ روزِ قیامت تجھے ایک ایک مسلمان کے ساتھ بٹھایا جائے گا اور تجھ سے انصاف طلب کیا جائے گا"۔ اس پر ہارون پر گریہ طاری ہوگیا تو عباس بولا: "چپ رہ تو نے تو امیر المؤمنین کو مار ڈالا"۔ تو فضیل نے فرمایا: "اے ہامان[1]! تو نے اور تیری قوم نے ہارون کو ہلاک کر ڈالا اور الزام مجھ پر دیتے ہو کہ تو نے اسے مار ڈالا! اس پر ہارون نے عباس سے کہا کہ "تجھے ہامان اس لئے کہا کہ مجھے فرعون کے برابر قرار دیا ہے"۔ پھر فضیل کی خدمت میں ہزار دینار پیش کیئے اور کہا: "یہ حلال ہے کہ میری ماں کے مہر میں سے ہے"۔ تو فضیل نے فرمایا کہ "میں تجھ سے کہتا ہوں کہ جو کچھ تیرے پاس ہے اس سے دست کش ہو جا اور جس کا ہے اس کو لوٹا دے اور تو الٹا مجھے دے رہا ہے"۔ تو ہارون وہاں سے رخصت ہوا اور فضیل نے یہ مال اس سے قبول نہ کیا۔ عمر بن عبد العزیز نے محمد بن کعب قرطبی سے کہا

[1] ہامان فرعون کا وزیر تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاصر۔ نام اس کا قرآن میں مذکور ہوا ہے۔ یہاں بہ طور طعنہ استعمال ہوا ہے۔

''مجھے عدل کی صفت سے آگاہ فرمایئے!'' تو آپ نے فرمایا جو کوئی مسلمانوں میں سے تجھ سے چھوٹا ہے اس کا باپ بن جا اور تجھ سے بڑا ہے اس کا بیٹا بن جا۔ اور جو تیرا ہم نشین ہو اس کا بھائی بن جا۔ اور ہر ایک کو اس کے گناہ کے مطابق سزا دے۔ اور کبھی غیظ وغضب میں آ کر کسی کو تازیانہ نہ مار دینا ورنہ ٹھکانہ دوزخ میں ہوگا''۔
زاہدوں میں ایک اپنے زمانے کے خلیفہ کے پاس گیا تو خلیفہ نے کہا کہ مجھے نصیحت کیجئے؛ تو اس زاہد نے کہا کہ میں چین کے سفر پر تھا کہ وہاں کا بادشاہ بہرہ ہو گیا تھا۔ اور بہت گریہ وزاری کرتا اور کہتا کہ میں اس لئے نہیں روتا کہ میری شنوائی میں خلل آ گیا ہے۔ روتا اس لئے ہوں کہ مظلوم میرے دروازے پر آ کر فریاد کرے اور میں یہ سن نہ پاؤں گا۔ لیکن بینائی بحال ہے۔ منادی کر دی جائے کہ فریادی سرخ لباس پہن لے''۔ پس وہ ہر روز ہاتھی پر سوار ہو کر نکلتا تو جس کو سرخ لباس میں دیکھتا اس کی دادرسی کرتا۔ اے امیر المؤمنین وہ کافر تھا اور خلق خدا پر اس درجہ پر مشفق تھا۔ اور تو تو ایک مومن ہے اور اہل بیت رسول ﷺ میں سے ہے۔ تو تو دیکھ لے تیری شفقت خدائے تعالیٰ کے لئے کیسی ہے؟'' بوقلابہ عمر بن عبدالعزیز کے پاس گیا تو عمر نے اس سے کہا ''مجھے نصیحت فرمایئے'' تو وہ بولے ''حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر آج تک کوئی خلیفہ نہیں ہوا سوائے تیرے''۔ عمر نے کہا ''مزید فرمایئے''۔ تو بولے کہ ''سب سے پہلے جو خلیفہ مرے گا وہ تو ہوگا''۔ عمر نے فرمایا ''مزید فرمایئے'' تو آپ بولے: ''اگر اللہ تعالیٰ تیرے ساتھ ہے تو خوف کس بات کا؟'' اور اگر اللہ تعالیٰ تیرے ساتھ نہ ہوا تو پھر کون تجھے پناہ دے گا؟'' اس پر عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا ''آپ نے جو کچھ فرمایا ہے کافی ہے''۔
سلیمان بن عبدالملک خلیفہ تھا۔ ایک روز اسے خیال آیا کہ ''میں نے اس دنیا میں اس قدر خوش گذرانی کی ہے قیامت میں میرا حال کیسا ہوگا؟'' ابوحازم کو بلا بھیجا جو اپنے زمانے کے عالم اور زاہد تھے۔ تو سلیمان نے کہا ''جس شے سے آپ روزہ افطار کرتے ہیں اس میں سے کچھ مجھے بھیجئے''۔ تو آپ نے بریان شدہ سبوس کسی قدر بھیج دیا اور کہا کہ میں رات کو اسی میں سے کچھ کھا لیتا ہوں''۔ سلیمان نے جب سبوس کو دیکھا تو اس پر گریہ طاری ہو گیا اور دل اس کا بے حد متاثر ہوا۔ سلیمان نے تین دن روزہ رکھا اور کوئی چیز نہ کھائی اور تیسری رات کو روزہ اسی سبوس سے افطار کیا۔ کہتے ہیں کہ اس رات اس نے اپنی بیوی سے جماع کیا جس سے اس کے بیٹے عبدالعزیز نے جنم لیا جو عدل وانصاف میں یگانہ روزگار عمر خطاب کی نظیر تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ سب اس کی خوش نیتی اور وہ طعام سبوس تھا جو اس نے اس رات نوش جان کیا تھا۔
عمر بن عبدالعزیز سے لوگوں نے پوچھا کہ: ''آپ کی توبہ کا سبب کیا تھا؟'' فرمایا کہ ''میں ایک دن ایک غلام کو زدوکوب کر رہا تھا کہ غلام نے کہا کہ ''اس رات کو مت بھول جب اگلی صبح روز قیامت ہوگا۔ اس کی یہ

بات میرے دل میں اتر گئی''۔

ہارون الرشید کو کسی بزرگ نے دیکھا کہ میدان عرفات میں گرم سنگریزوں پر برہنہ پا اور برہنہ سر کھڑا ہے اور دست بدعا کہہ رہا ہے کہ ''بارِ خدایا تُو تو ہے اور مَیں مَیں۔ میرا کام یہ ہے کہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہوں اور تیرا کام یہ ہے کہ ہر زمان مجھے معاف فرما دیتا ہے۔ مجھ پر رحم فرما''۔ تو اس بزرگ نے کہا ''لوگو دیکھو کہ زمین کا جبار آسمان کے جبار کی بارگاہ میں کیسے زاری کا اظہار کر رہا ہے!''

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت ابو حازم سے کہا: ''مجھے نصیحت فرمایئے''۔ تو ابو حازم نے فرمایا کہ ''زمین پر سو اور موت کو سرہانہ بنا۔ اور جس حال میں خواہاں ہے کہ تجھے موت پائے اسے ملحوظ رکھ۔ اور جسے نہیں چاہتا اس سے دور رہ (یعنی اس طرح بسر کر جیسے تو موت کے وقت چاہتا ہے)۔ کیوں کہ موت دور نہیں ہے''۔ پس لازم ہے کہ والیان سلطنت ان احکامات کو پیش نظر رکھیں اور ان نصائح کو جو دوسروں کو دی گئی ہوں قبول کریں۔ اور جس عالم کو دیکھیں اُس سے نصیحت کی استدعا کریں اور جو عالم بھی ان سے ملیں اسی نوع کی نصائح کریں اور کلمۂ حق سے باز نہ رہیں۔ اور عالم کو والیٔ سلطنت کو فخر و غرور سے بہرہ مند نہ کرنا چاہئے کیوں کہ اگر ایسا کرے گا تو ظلم میں شریک ہوگا۔

قاعدہ نہم: یہ ہے کہ والیٔ ریاست نہ صرف یہ کہ خود ظلم نہ کرے بلکہ اپنے غلاموں، چاکروں اور نائبوں کو بھی مہذب بنائے اور ان کے ظلم کرنے پر خاموش نہ رہے۔ کیوں کہ اس سے اس کے ماتحتوں کے بارے میں بھی باز پرس ہوگی۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ اشعری کو کہ جو ان کے مامور کردہ گورنر تھے لکھا کہ ''اما بعد رعیت داروں میں سے خوش نصیب ترین وہ ہے کہ جس کی وجہ سے اس کی رعیت خوش نصیب ہو۔ اور بد بخت ترین وہ عامل ہے کہ جس کی رعیت اس کی وجہ سے بد بخت ہو تو کبھی اپنے اختیارات سے تجاوز نہ کرنا ورنہ تمھارے اہل کار اسی طرح کریں گے۔ پھر تمھاری مثال اس چوپائے کی سی ہوگی جو سبزہ پا کر بسیار خوری کرے اور موٹا تازہ ہو جائے اور یہ فربہی اس کی موت کا باعث بن جائے۔ کیوں کہ جب جانور موٹا تازہ ہو جائے تو اسے ذبح کر کے کھا لیا جاتا ہے''۔

تورات میں ہے کہ ''جو ظلم بادشاہ کے کسی والی سے سرزد ہو اور بادشاہ اس پر خاموش رہا ہو تو سمجھا یہ جائے گا کہ یہ ظلم خود بادشاہ نے کیا ہے۔ اور وہ اس کے لئے جواب دہ ہوگا''۔ اور چاہئے کہ والی جانتا ہو کہ کوئی شخص جو اپنی آخرت کو دوسرے کی دنیا کے لئے فروخت کرے اس سے بڑھ کر بے عقل اور اموال کھونے والا اور کون ہوگا۔ اور تمام عمّال اور ملازمین اپنی دنیاوی اغراض کے لئے نوکری کرتے ہیں۔ وہ والیٔ مملکت کی آنکھ

میں ظلم کوسنوار کر پیش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ والی دوزخ میں پہنچ جاتا ہے۔ اور ماتحت اپنی اغراض پالیتے ہیں۔ تو اس سے بڑھ کر اور کوئی تمھارا دشمن کیا ہوگا جو تمھاری ہلاکت کا سامان کرے اور وہ بھی چند حرام کے درم کے حصول کے لئے!؟

مختصر یہ کہ وہ والی رعایا کے ساتھ عدل نہیں کرتا جو اپنے عمّال اور چاکروں کو عدل پر قائم نہ رکھے۔ اور وہ جو اپنے اہل وعیال اور غلاموں کو عدل پر قائم نہیں رکھتا۔ یہ نہیں کرسکتا مگر جو پہلے اپنے باطن میں عدل کو ملحوظ رکھےاور عدل یہ ہے کہ عقل کی قوت سے ظلم، شہوت اور غضب سے باز رہے تاکہ ان کو عقل ودین کا قیدی بنائے نہ کہ عقل ودین کو ان کا قیدی بنائے۔ اور اکثر مخلوق کا یہ حال ہے کہ عقل کو اپنی شہوات اور غضب کی خدمت پر لگا رکھا ہے تاکہ عقل انھیں ایسا حیلہ سجھائے جس سے وہ اپنے غضب اور شہوات کی تکمیل کرسکیں۔ حالانکہ عقل فرشتوں کا جوہر ہے اور اللہ تعالیٰ کا لشکر۔ اور شہوات وغضب شیطان کا لشکر ہے۔ تو جو کوئی اللہ تعالیٰ کے لشکر کو ابلیس کی تحویل میں دیتا ہے وہ دوسروں سے انصاف کیسے کرسکے گا۔ پس آفتابِ عدل کا نور پہلے دل میں نمودار ہوتا ہے پھر اس کا نور اہل خانہ پر پڑتا ہے پھر خواص میں سرایت کرتا ہے پھر اس کی کرنیں رعایا پر پڑنے لگتی ہیں۔ اس لئے جو کوئی آفتاب کے بغیر کرنوں کی امید رکھتا ہے تو وہ ایسا ہے جو کسی محال شے کا طالب ہو۔

یادرہے کہ عدل کمالِ عقل سے جنم لیتا ہے اور تمام عقل یہ ہے کہ انسان چیزیں جیسی کہ فی الاصل ہیں مشاہدہ کرے اور ان کی حقیقت کو پالے اور ان کے ظاہر ہی پر مغرور نہ ہوجائے۔ مثلاً جب کوئی دنیا کے لئے عدل سے ہاتھ روک لے تو اسے دیکھنا چاہئے کہ دنیا سے اس کا مقصود کیا ہے۔ اگر مقصود یہ ہو کہ اچھا کھانا کھائے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک چوپایہ ہے بہ صورت آدمی۔ کیونکہ خوش خوراکی جانوروں کا شیوہ ہے۔ اور اگر دنیوی غرض یہ ہو کہ عمدہ لباس پہن سکے تو ایسا شخص گویا مرد نہیں عورت ہے کہ بناؤ سنگھار عورتوں کا شیوہ ہے اور اگر اس لئے کرتا ہے کہ اپنے دشمنوں کو غیظ وغضب کا نشانہ بنائے تو گویا وہ آدمی کی صورت میں درندہ ہے۔ کیوں کہ خلق کے ساتھ غیظ وغضب اور مار دھاڑ درندوں کا کام ہے۔ اور اگر غرض یہ ہو کہ لوگ اس کی خدمت کریں تو وہ ایک عاقل کے روپ میں جاہل ہوگا کیوں کہ اگر صاحب خرد ہو تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سب اپنے پیٹ کے چاکر ہیں اور اپنی شہوت اور اپنی شرم گاہ کے خادم ہیں۔ اور اس کو اپنی شہوات کے لئے جال بنا رکھا ہے۔ اور اس کو جو سجود بہ ظاہر کرتے ہیں وہ دراصل خود کو کرتے ہیں اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر دروغ گووں سے سنتے ہیں کہ ولایت اور عمل کسی اور کو تفویض کیا جارہا ہے تو وہ اس سے اعراض کریں گے اور دوسرے مجوزہ والی کی قربت کے حصول میں کوشاں ہوجائیں گے۔ اور جہاں سے بھی زر و مال ملنے کی توقع ہوگی تو اس کی

خدمت اور سجود میں لگ جائیں گے۔ پس وہ خدمت کرنا نہ ہوا بلکہ اس پر ہنسی مذاق ہوا۔ عقل مند وہ ہے جو کاموں کی حقیقت اور روح کا ادراک کرے نہ کہ ظاہر بینی۔ اور حقیقت ان کاموں کی ایسی ہی ہے جیسی کہ بیان ہوئی اور جو کوئی اس طریقے سے فہم نہیں کرتا وہ عاقل نہیں وہ عادل نہیں اور مستقر اس کا دوزخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل کو تمام سعادات کا سردار کہا گیا ہے۔

قاعدہ دہم: یہ ہے کہ والی پر تکبر غالب ہوتا ہے اور تکبر سے غضب غالب ہو جاتا ہے۔ جو اسے انتقام کی دعوت دیتا ہے اور غضب عقل کا دشمن ہے اور اس کی آفت ہوتا ہے۔ اور علاج اس کا ہم باب غضب میں رکن مہلکات کی ذیل میں بیان کریں گے۔ جب خشم و غضب غالب ہو جائے تو والی کو چاہئے کہ جہد کرے اور تمام کاموں میں عفو کا پہلو اختیار کرے اور کرم اور بردباری کو اپنا پیشہ بنائے۔ اور چاہئے کہ جانے کہ جب وہ اسے پیشہ بنائے گا تو انبیاء صحابہ اور اولیاء کی مثل ہوگا۔ اور اگر خشم گیر ہوگا تو وہ ترکوں اور کُردوں کا سا ہوگا۔ اور احمقوں کا سا ہوگا یا درندوں اور چوپایوں کا سا سمجھا جائے گا۔

کہتے ہیں کہ ابو جعفر خلیفہ تھا تو اس نے ایک ایسے شخص کو جو خیانت کا مرتکب ہوا تھا مار ڈالنے کا حکم دیا۔ مبارک بن فضالہ حاضر تھے' کہنے لگے: ''اے امیر المؤمنین پہلے مجھ سے آنحضرت ﷺ کی ایک حدیث سن لے'' تو اس نے کہا ''کہئے'' تو مبارک نے کہا کہ حسن بصریؒ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ روزِ قیامت جب تمام خلق ایک میدان میں جمع ہوں گے تو منادی آواز دے گا کہ جس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوستی ہے اٹھے' تو کوئی بھی نہیں اٹھے گا۔ بجز اس کے کہ جس نے معاف کر دیا ہو''۔ تو ابو جعفر نے کہا کہ اس کے قتل سے ہاتھ روک لو میں نے اسے معاف کر دیا''۔

والیوں کے اکثر خشم کا سبب یہ ہوتا ہے کہ کسی نے ان پر بدزبانی کی ہو۔ تو والی چاہتے ہیں کہ اس کے قتل کی سعی کریں۔ تو ایسے میں انھیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت عیسٰی نے حضرت یحییٰ سے کہا تھا کہ ''جو کوئی تجھے ایسی بات کہے جو بات درست ہو تو تجھے اس کا شکر بجالانا چاہئے۔ اور اگر وہ بات جھوٹ ہو تو شکر کو عظیم تر کرنا۔ کیوں کہ اس طرح تیرے نامۂ اعمال میں بن کچھ کئے اور رنج اٹھائے ایک عمل کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یعنی اس شخص کی عبادت تیرے نامۂ اعمال میں منتقل کر دی جاتی ہے''۔

ایک شخص کے بارے میں لوگوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے کہا کہ وہ شخص بڑی عظیم قوت مردانہ کا مالک ہے۔ آپ نے فرمایا ''کیوں کر؟'' تو لوگوں نے کہا کہ جس سے بھی کشتی لڑتا ہے اس کو پچھاڑ دیتا ہے اور ہر شخص پر قابو پالیتا ہے''۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''قوی اور مردانہ وہ شخص ہے جو اپنے غصے پر قابو پالینے کی

قدرت رکھتا ہے نہ کہ وہ جو ہر ایک کو کشتی میں پچھاڑ دیتا ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''تین چیزیں ہیں جس نے انھیں پالیا اس کا ایمان مکمل ہو گیا''۔ جب غصے میں آئے تو باطل کا ارادہ نہ کرے' اور جب خوشنود ہو تو حق کو نہ چھوڑے اور جب قادر ہو تو اپنے حق سے زیادہ نہ لے''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''کسی شخص پر اعتماد نہ کر جب تک تو اس کے غصے کو نہ دیکھ لے اور کسی شخص کے دین کا اعتماد نہ کر جب تک بوقت طمع تو اسے آزمانہ لے''۔

علی بن الحسین ایک دن مسجد کو جا رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کو گالی دی۔ تو علی کے غلاموں نے اس شخص کا قصد کیا تو آپ نے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ اپنے ہاتھ روک لو۔ اور اس سے یوں گویا ہوئے کہ: ''جو کچھ ہمارے بارے میں تجھ سے مخفی ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ کہو اگر کوئی حاجت ہے جو ہم پوری کر سکیں؟'' تو وہ شخص شرم سار ہوا۔ پس علی نے اپنے کندھے سے کپڑا پکڑا اور اس کو دے دیا اور اسے ہزار درم بھی مرحمت فرمائے۔ تو وہ شخص جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ''یہ فرزند رسول کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا''۔ علی بن الحسین ہی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ نے غلام کو دو بار آواز دی لیکن اس نے جواب نہ دیا تو فرمایا ''تم نے سنا نہیں؟'' تو غلام نے کہا کہ میں نے سنا تھا' تو آپ نے پوچھا کہ ''جواب کیوں نہیں دیا؟'' تو وہ بولا کہ مجھے آپ کی خوش خوئی اور خوش خلقی کے باعث یقین تھا کہ مجھ سے ناراض نہ ہوں گے''۔ تو آپ نے فرمایا کہ ''اللہ کا شکر ہے کہ میرا غلام مجھ سے امن میں ہے''۔ آپ ہی کا ایک غلام تھا جس نے ایک دن ایک بکری کی ٹانگ توڑ دی تھی تو آپ نے باز پرس کرتے ہوئے فرمایا ''تم نے ایسا کیوں کیا؟'' تو وہ بولا ''میں نے عمداً ایسا کیا تھا تا کہ آپ کے غصے کو انگیخت کروں'' تو آپ نے فرمایا کہ ''میں اب اس کو خشمگیں کرتا ہوں جس نے تجھے یہ بات سکھائی ہے۔ یعنی ابلیس کو''۔ اور اس غلام کو آزاد کر دیا۔ ایک شخص نے آپ کو دشنام دی تو آپ نے فرمایا کہ ''اے جوانمرد میرے اور دوزخ کے درمیان یہی گھاٹی ہے اگر میں اس گھاٹی کو طے کر گیا تو جو کچھ تو کہتا ہے تو اس سے میں کچھ باک نہیں رکھتا اور اگر طے نہ کر سکا تو تو جو کچھ کہتا ہے تو میں اس سے بھی بدتر ہوں''۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کوئی شخص ایسا ہو گا کہ حلم و عفو میں جو صائم الدہر اور قائم اللیل کے درجے کو پہنچے گا اور کوئی شخص ایسا ہو گا جس کا نام جریدہ جباران میں درج ہو گا۔ حالانکہ سوائے اس کے اپنے اہل و عیال کے کوئی اس کا ماتحت نہ ہو گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فرمان ہے کہ دوزخ کا ایک دروازہ ایسا ہے کہ جس سے کوئی داخل نہ ہو گا۔ سوائے اس شخص کے جس نے خلاف شرع اپنا غصہ نکالا ہو گا۔

روایت کی گئی ہے کہ ابلیس ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا' بولا کہ: ''میں تجھے تین چیزیں سکھاتا ہوں تاکہ تو اللہ سے میرے لئے معافی کی حاجت چاہے''۔ تو حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ ''وہ تین چیزیں کیا ہیں؟'' تو ابلیس نے کہا کہ عجلت سے دور رہ کیوں کہ جو تیز اور سبک سر ہوا سے میں ایسے سامان بازی بناتا ہوں جیسے نوجوان گیند سے کھیلتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ عورتوں سے دور رہ کیوں کہ جتنا بھروسہ میں نے عورتوں پر لوگوں کو بہکانے میں کیا ہے کسی اور حال پر نہیں کیا۔ تیسرے یہ کہ بخل سے دور رہ کیوں کہ جو کوئی بخیل ہوتا ہے میں اس کے دین اور دنیا دونوں میں ضرر پہنچاتا ہوں''۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''جو کوئی غصے کو پی جائے جب کہ غصہ نکالنے پر بھی قادر ہو' تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو امن اور ایمان سے پُر کردیتے ہیں۔ اور جو پرشکوہ لباس اس لئے نہ پہنے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور انکساری کا ارادہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے بزرگی کی خلعت عطا فرماتے ہیں''۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''افسوس ہے اس شخص پر جو غصے کا اظہار کرے اور اپنے اوپر اللہ کے غصے کو فراموش کردے''۔

ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ: ''مجھے وہ کام سکھایئے کہ جس سے میں بہشت میں جاسکوں''۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''غضب میں نہ آنا بہشت تمھاری ہے'' تو وہ بولا اور کیا؟'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''نماز عصر کے بعد ستر بار استغفار کرنا تاکہ تیرے ستّر سالہ گناہ معاف کردیئے جائیں۔ تو وہ بولا میرے گناہ ستر سالہ نہیں۔ فرمایا: ''تمھاری ماں کے'' وہ بولا میری ماں کے بھی گناہ نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''تمھارے باپ کے؟'' تو وہ بولا: ''میرے باپ کے گناہ بھی اس قدر نہیں'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''تمھارے بھائیوں کے''۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ مال تقسیم فرما رہے تھے تو ایک شخص بولا کہ: ''یہ تقسیم اللہ تعالیٰ کے لئے تو نہ ہوئی'' یعنی انصاف کے ساتھ مال تقسیم نہیں ہو رہا۔ ابن مسعود نے یہ بات آپ ﷺ تک پہنچائی تو آپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ میرے بھائی موسیٰ پر رحم فرمائیں جنھیں لوگوں نے اس سے بھی زیادہ دکھ پہنچایا لیکن انھوں نے صبر کا دامن ہاتھ نہ دیا''۔

والیان ریاست کی نصیحت کے لئے یہ احادیث وحکایات کافی ہوں گی کیوں کہ اگر اصل ایمان سے بہرہ ور ہوں گے تو یہ بے اثر نہ رہیں گی۔ اور اگر یہ بے اثر رہیں تو دلیل اس بات کی ہے کہ ان کے دل ایمان سے خالی ہوں گے۔ اور سوائے زبان کے ایمان اور کہیں نہ ہوگا۔ کیوں کہ ایمان کا ذکر جو دل میں ہوتا ہے وہ اور شے ہے اور ایمان اور شے۔ میں نہیں جانتا کہ ایمان کی حقیقت کسی عامل کے دل میں کیوں کر جاگزین ہوسکتی

ہے جو سالانہ چند ہزار درم و دینار لے کے دوسرے کو عطا کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ سرتا سر مامون ہو جائے۔ روزِ قیامت اس سے واپس طلب کئے جائیں گے۔ حالانکہ فائدہ اس کا دوسروں کو پہنچا ہوگا۔ یہ نہایت درجے کی غفلت اور نامسلمانی ہے۔ والسلام۔

———•••———

رکن سوم: مہلکات کے بارے میں

اس رکن میں بھی دس اصلیں ہیں:

اصل اوّل:	ریاضتِ نفس کے بارے میں
اصل دوم:	شکم وفرج کی شہوت کے علاج کے بارے میں
اصل سوم:	بات کرنے کی حرص اور زبان کی آفتوں کے بارے میں
اصل چہارم:	خشم، حقد اور حسد کی بیماریوں علاج کے بارے میں
اصل پنجم:	دوستیِ دنیا کے علاج کے بارے میں
اصل ششم:	مال کی محبت کے علاج اور بخل کی آفت کے بیان میں
اصل ہفتم:	جاہ وحشمت کی محبت کے علاج کے بیان میں
اصل ہشتم:	عبادت کی ریا اور نفاق کے علاج کے بارے میں
اصل نہم:	کبروعُجب کے علاج کے بارے میں
اصل دہم:	غروراور فریفتگی کے علاج کے بارے میں

اصل اوّل: نفس کی ریاضت اور خوئے بد سے اس کی پاکیزگی کے بیان میں

ہم اس اصل میں نیک خوئی کی فضیلت بیان کریں گے۔ پھر خوئے نیک کی حقیقت معلوم کریں گے کہ کیا ہے۔ پھر معلوم کریں گے کہ خوش خوئی ریاضت کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ پھر اس کا طریقہ بتائیں گے کہ کیا ہے۔ پھر بدخوئی کی علامت بیان کریں گے۔ پھر اس کی تدبیر کا بیان کریں گے جس سے انسان اپنے عیوب کو پہچان سکتا ہے۔ پھر خوش خلقی کی علامت معلوم کریں گے۔ اس کے بعد بچوں کی پرورش اور تربیت کا بیان ہوگا۔ اس کے بعد ابتدائے کار میں مرید کے مجاہدے کا سراغ لگائیں گے۔

خوش خوئی کی فضیلت معلوم کرنا اور اس کے ثواب کا بیان

معلوم رہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی خوش خلقی کی تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ'' (قرآن:۶۸/۴) (تم عظیم خلق پر ہو) اور آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''مجھے بھیجا گیا ہے کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں''۔ نیز آپ نے فرمایا کہ ''عظیم تر چیز جو ترازو میں رکھی جائے گی وہ نیک خوئی ہے''۔

ایک شخص آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور بولا: ''دین کیا چیز ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''حسنِ اخلاق'' اسی طرح کوئی دائیں طرف سے وارد ہوا تو کوئی بائیں طرف سے تو آپ ﷺ نے سب کو یہی جواب دیا۔ اور آخری دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تو نہیں جانتا کہ خشمگین نہیں ہونا چاہئے؟''

آپ سے لوگوں نے پوچھا کہ اعمال میں سے فاضل ترین عمل کون سا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''خوش خوئی''۔ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ ''مجھے نصیحت کیجئے'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''تو کوئی بھی ہو اللہ سے ڈر''۔ اس نے کہا اور فرمائیے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہر برائی کے بعد کوئی نیک کام کرتا کہ اس سے اُس برائی کو مٹا دیا جائے''۔ اُس نے کہا مزید فرمائیے تو آپ نے ﷺ نے فرمایا کہ ''لوگوں سے ملنے ملانے میں خوش خلقی سے کام لے''۔ حضور ﷺ ہی کا فرمان ہے کہ ''جسے اللہ تعالیٰ نے خوب رو اور نیک خو بنایا اسے آگ نگل نہیں سکتی''۔ حضور سے لوگوں نے کہا کہ فلاں عورت دن کو روزہ سے ہوتی ہے شب کو نماز پڑھتی ہے لیکن بداخلاق ہے اور اپنے پڑوسیوں کو ستاتی ہے''۔ تو آپ نے فرمایا ''ٹھکانہ اس کا جہنم ہے''۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''بداخلاقی طاعت کو یوں برباد کر دیتی ہے جیسے کہ سرکہ شہد کو''۔

آنحضرت ﷺ دعا میں کہتے کہ ''بارِ خدایا تو نے مجھے خوش اخلاقی عطا فرمائی مجھے خوش خلق بھی بنا دے''۔ نیز فرماتے ''خدایا! مجھے تندرستی، عافیت اور خوش خوئی عطا فرما''۔

آنحضرت ﷺ سے لوگوں نے پوچھا کہ ''کون سی شے بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو دے؟'' تو آپ نے فرمایا ''خوش خلقی''۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ خوش خوئی گناہ کو اس طرح نابود کر دیتی ہے جیسے دھوپ برف کو''۔

عبدالرحمٰن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت کے پاس تھے کہ آپ نے فرمایا ''کل رات میں نے عجیب شے دیکھی میں نے اپنے ایک امتی کو دیکھا کہ وہ دوزانو بیٹھا ہے اور اس کے اور اللہ کے درمیان حجاب ہے۔ اتنے میں اس کی خوش خوئی آئی اور اس نے اُس پردے کو ہٹا دیا اور اُسے حق تعالیٰ تک پہنچا دیا''۔ آپ نے فرمایا کہ بندہ خوش اخلاقی کے ذریعے اس شخص کے مرتبے کو پہنچ جاتا ہے جو دن کو روزہ سے ہو۔ رات نماز میں گذارے اور آخرت میں عظیم درجہ پائے۔ اگرچہ خوش خلق انسان عبادات میں کمزور ہو''۔

اور خوش اخلاق ترین فرد ہمارے رسول ﷺ تھے۔ ایک دن عورتیں آپ کے حضور ﷺ میں چلّا رہی

تھیں اور غالب تھیں اور جونہی حضرت عمر ؓ آئے تو بھاگ گئیں۔ تو حضرت عمر نے فرمایا ''اے خود اپنی دشمنو! مجھ سے تو خائف ہو اور رسول اللہ سے باک نہیں رکھتیں؟'' تو عورتوں نے جواب دیا ''تو آنحضرت ﷺ کی نسبت تند تر ہے اور سخت تر''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''اے ابنِ خطّاب! اس اللہ کی قسم کی جس کے حکم میں میری جان ہے کہ شیطان بھی کبھی اُس راہ میں ٹھہر نہیں سکتا جہاں تمھارا گذر ہو۔ وہ تو تمھاری ہیبت کی بناء پر راستہ ہی بدل لیتا ہے''۔

فضیل عیاضؒ فرماتے ہیں کہ ''میں خوش اخلاق فاسق کی صحبت کو بداخلاق قاریوں کی صحبت پر ترجیح دیتا ہوں''۔ ابن المبارکؒ ایک بداخلاق شخص سے راستے میں دوچار ہوئے جب وہ شخص جدا ہوا تو آپ رونے لگے۔ تو لوگوں نے رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ ''یہ بیچارہ میرے قُرب سے دور ہو گیا اور اپنی بدخوئی سے دور نہ ہوا اور اُسے اسی طرح اپنے ساتھ لے گیا''۔

ابوبکر کتانیؒ فرماتے ہیں کہ ''تصوف خوش اخلاقی کا نام ہے' اس لئے جو تجھ سے خوش اخلاق تر ہے وہ تجھ سے زیادہ صوفی ہے''۔

یحیٰ بن معاذ ؓ فرماتے ہیں کہ بداخلاقی وہ گناہ ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے کوئی عبادت سودمند نہیں اور خوش اخلاقی وہ عبادت ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے کوئی معصیت ضرر کا باعث نہیں ہوتی''

خوش خلقی کی حقیقت

خوش خلقی کی حقیقت کیا ہے اور یہ کس شے کا نام ہے اسے جاننا چاہئے۔ اس باب میں بہت کچھ کہا گیا ہے ہر وہ شخص جس نے جس قسم کا تجربہ کیا ہے اسی کو بیان کیا ہے اور اس کی کامل تعریف نہیں کی۔ چنانچہ ایک کہتا ہے کہ ''خوش خُلقی کشادہ رُوی کا نام ہے'' تو دوسرا کہتا ہے کہ ''لوگوں کی طرف سے رنج رسانی کو برداشت کرنا خوش خلقی ہے''۔ تو تیسرا کہتا ہے کہ ''برائی کا بدلہ نہ لینا خوش خلقی ہے'' وغیرہ۔ اور یہ سب خوش اخلاقی کی شاخیں ہیں نہ کہ حقیقت نہ اس کا کامل احاطہ۔ آیئے اس کی حقیقت اور کامل تعریف کا سراغ لگائیں۔

یاد رہے کہ انسان کے لئے دو چیزیں تخلیق ہوئی ہیں۔ ایک قالب کہ جسے چشم ظاہر سے دیکھ سکتے ہیں تو دوسری 'روح' جسے دل کی آنکھ کے بغیر مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ اور ان دونوں کے لئے ایک نیکی ہے تو ایک برائی۔ ایک کو حسنِ خَلق کہتے ہیں تو دوسری کو حسنِ خُلق کہتے ہیں۔ اور حسنِ خُلق صورت باطن سے عبارت ہے۔ جیسے حُسنِ خَلق عبارت ہے صورتِ ظاہر سے۔ اور صورتِ ظاہر فقط اس بناء پر خوب نہیں ہوتی کہ آنکھیں خوب

صورت ہیں اور بس یا دہانہ حسین ہے اور بس، یا ناک حسین ہے اور بس۔ تو جب تک ناک، آنکھ، دہان سب خوب صورت نہ ہوں، باہم متناسب نہ ہوں، ظاہر صورت حسین نہیں کہلا سکتی۔ اس طرح باطن کی صورت حسین نہ کہلائے گی۔ جب تک کہ باطن میں چار قویٰ حسین نہ ہوں: قوتِ علم، قوتِ خشم، قوتِ شہوت اور ان تینوں میں اعتدال۔

قوتِ علم: سے ہماری مراد ذہانت ہے اور حسن اس کا اس درجے کا ہو کہ سچ کو جھوٹ سے جو باتوں میں زیرِ عمل آتا ہے بہ آسانی پہچان سکے اور کردار میں خوبی کو برائی سے امتیاز دے سکے۔ اور اعتقادات میں حق و باطل کو از ہم متمایز کر سکے۔ جب انسان کا دل اس کمال کو پہنچے تو اس سے حکمت وجود میں آتی ہے جو تمام سعادتوں کا سر ہے۔ جیسے کہ حق عز و جل کا فرمان ہے کہ ''وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا'' (قرآن: ۲۶۹/۲) (جس کو حکمت دی گئی اسے خیر کثیر عطا ہوا)۔

اور قوتِ غضب: جس کا حسن اس میں ہے کہ حکمت اور شرع کی حدود کے اندر رہے۔ اور انھی کے حکم سے پیدا ہو اور انھی کے حکم سے فرو ہو۔

اور قوتِ شہوت: کا حسن بھی اس میں ہے کہ سرکش نہ ہو اور شرع و عقل کے دستور کے تابع ہو تا کہ طاعت اس کی اس کے لئے آسان ہو۔

اور قوتِ عقل: کا حسن اس میں ہے کہ دین و عقل کے تقاضوں کے مطابق غضب و شہوت کو کنٹرول میں رکھے۔ غضب کی مثال شکاری کتے کی سی ہے۔ اور شہوت کی مثال گھوڑے کی سی ہے اور عقل کی مثال سوار کی سی ہے۔ تو گھوڑا کبھی سرکش ہوتا ہے تو کبھی فرماں بردار اور دست آموز۔ اور کتا کبھی مؤدب ہوتا ہے تو کبھی اپنی فطرت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ تو جب تک کتا سدھایا نہ گیا ہو اور تربیت یافتہ نہ ہو تو سوار کو امید نہیں ہوتی کہ شکار کو پکڑ سکے گا۔ بلکہ خوف ہوتا ہے کہ خود ہلاک ہو جائے کہ خود کتا اسے کاٹ کھائے یا گھوڑا اسے زمین پر پٹخ دے۔

اور عدل کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں کو عقل و دین کے ماتحت رکھے۔ کبھی شہوت کو غضب پر مسلط کرے تا کہ اس کی سرکشی کو توڑے تو کبھی غضب کو شہوت پر مسلط کرے تا کہ اس کی حرص کا قلع قمع کرے۔ جب یہ چاروں باطنی قویٰ اس صفت سے متصف ہوں گے تو ان سے خوش خلقیٔ مطلق وجود میں آئے گی۔ لیکن اگر ان میں کچھ حسین ہوں ساری نہ ہوں تو اسے مطلق خوش خلقی نہیں کہا جائے گا۔ جیسے کہ دہانہ تو حسین ہو لیکن آنکھیں بری یا آنکھیں تو حسین ہوں لیکن ناک بدنما ہو تو ایسے کو حسن مطلق نہیں کہنے کے۔[1]

---

[1] کیونکہ حسن تو اعضا کے کامل تناسب کا نام ہے۔ اور حسن میں مدارج نہیں ہوتے۔ اس لئے یا تو کوئی شے یا چہرہ حسین ہے یا ہرگز حسین نہیں۔

یاد رہے کہ اگر ان چار قوائے باطن میں سے جو قوت بدرُو ہوگی تو اس سے بد اخلاق ہی ظہور میں آئیں گے۔ اور اعمالِ بد وجود پذیر ہوں گے۔ اور ان قویٰ میں سے ہر ایک کی برائی دو صورتوں میں ہوگی۔ ایک حد سے تجاوز کی بناء پر ہوگی تو دوسری حد میں کمی کر دینے کے باعث ناقص ٹھہرے گی۔

قوتِ علم جب حد سے بڑھ جائے اور علم کو برے کاموں کے لئے صرف کریں تو اس سے مکّاری جنم لیتی ہے۔ اور بسیار دانی کا زعم ہوتا ہے۔ اور قوتِ علم اگر ناقص ہوگی تو اس سے بے وقوفی اور حماقت وجود میں آئے گی۔ اور قوتِ علم اگر اعتدال پر ہوگی تو اس سے نیک تدبیر اور درست رائے اور صحیح فکر و فراستِ حقّہ ظہور میں آئیں گی۔

اور قوتِ خشم: جب حد سے بڑھ جائے تو اس کو تہوّر کہتے ہیں اور جب کم ہو جائے تو اسے بزدلی کہتے ہیں یا بے حمیتی۔ جب یہ قوت معتدل ہو اور حد سے متجاوز نہ ہو اور حد سے کم نہ ہو تو اسے شجاعت کہتے ہیں اور شجاعت ہی سے کرم، بزرگ ہمتی، دلیری، حلم، بردباری، آہستگی اور غصے کو پی جانے کی خوبی جیسے اخلاق وجود میں آتے ہیں۔ اور تہور سے لاف، عُجب، کبر، جسارت، فخر فروشی اور پرخطر کاموں میں شرکت کی حماقت وغیرہ وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اور جب قوتِ غضب ناقص ہو تو خود تذلیلی، بے چارگی اور تملق، اور ذاتی ناقدری جنم لیتی ہے۔

اور قوتِ شہوت: جب بہ افراط ہو تو اسے شرہ کہتے ہیں۔ جس سے شوخی، پلیدی، بے مرّوتی، ناپاکی اور حسد اور دولت مندوں کے ہاتھوں ذلت برداری اور مفلسوں کو حقیر جاننے جیسی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ اور قوتِ شہوت اگر ناقص ہو تو اس سے سستی، نامردی اور بے شخصیتی وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ لیکن یہ قوت اگر بہ اعتدال ہو تو اسے عِفّت کہا جاتا ہے۔ جس سے شرم وقناعت وصبر، مسامحت، ظرافت اور موافقت وجود میں آتے ہیں۔

ان باطنی قویٰ میں سے ہر ایک کی دو انتہائیں ہیں جو مذموم اور بری ہیں۔ لیکن میانہ ان کا حسین اور پسندیدہ ہے۔ اور وہ میانہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان بال سے بھی زیادہ باریک ہے۔ اور صراطِ مستقیم یہی میانہ ہے۔ اور باریکی میں آخرت کے صراط کی طرح ہے۔ جو کوئی دنیا میں اس راستے پر مستقیم چلتا ہے تو کل روز قیامت وہ صراط پر ایمن رہے گا۔ یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے جملہ اخلاق میں میانہ روی کا حکم دیا ہے۔ اور دونوں انتہاؤں سے منع اور انتباہ کیا ہے۔ فرمایا کہ ''وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا'' (قرآن: ۶۷/۲۵) (اور وہ جب خرچ کرتے ہیں اور کھاتے ہیں تو نہ گزاف کرتے ہیں نہ تنگی بلکہ ان دونوں کے درمیان رہتے ہیں)۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو خرچ میں بخل کرتے ہیں نہ اسراف بلکہ میانہ رو ہیں۔ اور آنحضرت ﷺ سے فرمایا ہے کہ ''وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ

وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ ''(قرآن:۲۹/۱۷)(یعنی مٹھی بند نہ رکھ کہ کسی کو کچھ نہ دے اور اتنا بھی نہ کھول کہ سب کچھ نثار کر دے اور خود بے سروسامان رہ جائے)۔

پس مطلق خوش خلقی وہ ہوگی جس میں تمام متذکرہ معانی' اعتدال اور براستی موجود ہوں۔ جیسے کہ ظاہری حسن وہی ہوگا جس کے تمام اعضا اپنی جگہ خوب صورت ہوں اور باہم متناسب بھی ہوں۔ اور لوگ اس بارے میں چار گروہوں میں منقسم ہیں:

ایک وہ کہ جسے وہ تمام صفات بتمام وکمال حاصل ہوں۔ اور خوش اخلاق کا ملأ رکھتے ہوں۔ تو تمام لوگوں کو ان کی اقتداء کرنی چاہئے۔ اور یہ کمال آنحضرت ﷺ کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ جیسے کہ خوب صورتی حضرت یوسف علیہ السلام پر تمام ہوئی تھی۔

دوم یہ کہ اسی طرح اگر صفاتِ بد کسی میں بہ غایت زشتی موجود ہوں تو ایسا شخص مطلق بدخو ہوگا اور اسے لوگوں سے نکال باہر کرنا واجب ہوگا۔ کیونکہ وہ شیطان کے مشابہ زیادہ ہوگا۔ کیونکہ شیطان انتہائی درجے کا بد شکل ہے اور شیطان کی بدروی باطن وصفات واخلاق کی بدصورتی ہے۔

سوم یہ ہے کہ ان متذکرہ دو درجوں کے درمیان ہو لیکن نیکی سے زیادہ قریب ہو۔

چہارم یہ کہ ان متذکرہ دو درجوں کے درمیان ہو لیکن بدروئی کے زیادہ قریب ہو۔

اور جس طرح جسمانی حسن میں انتہائی خوب صورتی اور انتہائی بدروی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے اور عموماً صورت اس کے بین بین ہوتی ہے۔ خوش خلقی میں بھی ایسی ہی صورت حال ہے۔

پس اگر کوئی کمال کو نہیں پہنچتا تو کم از کم کوشش کرے کہ کمال کے قریب تو پہنچے۔ اگر سارے اخلاق خوب نہ ہوں زیادہ تر تو خوب صورت ہونے چاہئیں۔

اور جس طرح خوب صورتی اور جسمانی بدصورتی میں تفاوت بہت ہے اسی طرح قوائے اخلاق میں بہت تفاوت ہے۔ یہ ہیں خوش خلقی کے معنی بہ تمام وکمال۔ اور یہ ایک شے ہے نہ دس نہ سو بلکہ بہت زیادہ ہے۔ لیکن اصل اس کی قوتِ علم وغضب وشہوت وعدل ہی ہے اور باقی سب اس کی فروع ہیں۔

یہ معلوم کرنا کہ خوش خلقی کا حصول ممکن ہے

معلوم رہے کہ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ جس طرح خلق ظاہر اپنی آفرینش کے علیٰ رغم تبدیل نہیں ہوتا۔ کوتاہ قد کسی حیلے سے دراز نہیں ہوتا اور دراز کسی تدبیر سے کوتاہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح اخلاق کہ باطن کی ایک

صورت ہے۔ تبدیل نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ کیونکہ اگر یہ حقیقت ہوتی تو تادیب، ریاضت، پند و نصائح برائے اصلاحِ نفس عبث ہوتے۔ تو آنحضرت نہ فرماتے کہ ''حَسِّنُوا اَخلَاقَکُم ''یعنی اپنے اخلاق کو خوب صورت بناؤ۔ تو یہ محال کیونکر ہوسکتا ہے۔ جب کہ چار پایوں کو تادیب کے ذریعے سرکشی سے اطاعت پر لایا جاسکتا ہے اور صید وحشی کو انس سے بہرہ مند کیا جاسکتا ہے۔ آفرینش پر قیاس اس کا باطل ہے۔ کیونکہ کام دو قسم کے ہیں۔ بعضے وہ ہیں کہ انسان ان میں دخل دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ جیسے کھجور کی گٹھلی سے سیب نہیں اگایا جاسکتا۔ لیکن اس سے درخت خرما اگایا جاسکتا ہے۔ اور تربیت اور نگہداشت البتہ شرط ہے۔ اسی طرح غضب و شہوت کو انسان کی فطرت سے جدا کرنا ممکن نہیں لیکن غضب و شہوت کو ریاض کے ذریعے حدِ اعتدال میں لایا جاسکتا ہے۔ اور یہ بات تجربے سے ثابت شدہ ہے۔ اگرچہ خلق میں سے بعض کے لیے اعتدال تک رسائی دشوارتر ہوتی ہے۔ اور یہ دشواری دو وجوہ سے ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ کوئی فطرت میں شدتِ سے گرفتار ہوتا ہے۔ اور دوسری یہ کہ اس نے ایک طویل عرصے کے لیے اس کی اطاعت کی ہو جس۔ سے وہ خُلق اس پر غالب ہو چکا ہو۔ لوگ اس امر میں چار درجوں میں ہیں:

درجہ اوّل: یہ ہے کہ سادہ دل ہو کہ ابھی نیک و بد میں امتیاز نہ کرسکا ہو۔ اور ابھی نیک و بد میں سے کسی ایک کا خوگر نہ ہو۔ لیکن فطرتِ اول پر ہو تو وہ نقش پذیر ہوگی اور جلدی اصلاح پا جائے گی۔ اسے صرف ایسے شخص کی حاجت ہے جو اس کو تعلیم دے اور بداخلاقی کی آفت کو اس کے سامنے واضح کردے اور صحیح راہ خوش خلقی کی دکھائے۔ چھوٹے بچے ابتدائے فطرت میں ایسے ہی ہوتے ہیں اور ان کے والدین راہزنی کا ارتکاب کرتے ہیں اور انھیں دنیا پر حریص بناتے ہیں۔ اور اولاد کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں کہ جہاں چاہیں جائیں اور جو چاہیں کریں۔ اور ان کے دین کی ہلاکت کا بار والدین کی گردن پر ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمان خداوندی ہے کہ: ''قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا'' (قرآن: ۶/۶۶) (اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو آتش دوزخ سے بچاؤ)۔

درجۂ دوم: یہ ہے کہ کسی نے ابھی بداعتقادی کی کوئی چیز نہ کی ہو۔ لیکن شہوت و غضب کی پیروی کا ایک مدت سے عادی ہو لیکن یہ جانتا ہو کہ یہ منکرات میں سے ہے۔ تو اس کی اصلاح زیادہ مشکل ہے کیونکہ اسے دو چیزوں کی حاجت ہے: ایک یہ کہ خوی فساد اس کے معمولات سے دور کی جائے۔ دوسرے یہ کہ اس میں نیکی کا بیج بویا جائے۔ لیکن اگر اس میں سنجیدگی اور ضرورت نمودار ہو تو وہ جلد اصلاح یافتہ ہو جائے گا۔ اور فساد سے اپنی عادت کو روک لے گا۔

درجۂ سوم: یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ فساد کو اس نے معمول بنالیا ہو اور نہیں جانتا کہ یہ ممنوع ہے۔

کیونکہ وہ اس کی نگاہوں میں بھلا لگنے لگا ہو۔تو ایسا شخص صلاح کی طرف نہ آئے گا۔الا ماشاءاللہ۔

درجۂ چہارم: یہ ہے کہ بااین ہمہ فساد پر فخر کرتا ہو اور گمان کرتا ہو کہ یہ ہنر ہے۔جیسے کچھ لوگ لاف زنی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم نے اتنے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور اتنی شراب پی ہے۔ایسے لوگوں کی اصلاح ممکن نہیں۔سوائے اس کے کہ آسمان سے کوئی سعادت نازل ہو جائے کہ آدمی کے بس میں نہیں۔

بدخلق کے معالجے کا طریقہ معلوم کرنا

معلوم رہے کہ جو کوئی اپنی بدخلقی سے جان چھڑانا چاہتا ہو اس کے لیے ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جو اس بدخلقی کا تقاضا ہے۔اس کے علیٰ رغم اقدام کرے۔شہوت کو مخالفت کے بغیر شکست نہیں دی جاسکتی۔ ہر چیز کو اس کی ضد ہی شکست آشنا کر سکتی ہے۔کیونکہ جو بیماری گرمی سے پیدا ہوتی ہے تو اس کا علاج سردی ہے۔ اور ہر بیماری جو غضب سے پیدا ہوتی ہے اس کا علاج بردباری ہے اور تکبر سے پیدا ہوتی ہو اس کا علاج کسرنفسی میں ہے۔اور جو بیماری بخل سے جنم لیتی ہے اس کا ازالہ مال عطا کرنے سے ہے۔اور جملہ ناپسندیدہ اخلاق کا علاج اس کی ضد سے ممکن ہے۔

پس جو کوئی نیک کاموں کی عادت ڈال لے تو نیک اخلاق اس سے ظہور میں آئیں گے اور راز اس بات کا کہ شریعت نے نیک کام کا حکم دیا ہے یہ ہے کہ مقصود اس کا دل کو بدروئی سے خوش روئی کی طرف پھیرنا ہے۔اور جسے انسان بہ تکلف معمول بنا لے وہ اس کی فطرت بن جاتا ہے۔جیسے بچہ ابتدا میں مدرسے اور تعلیم سے گریزاں ہوتا ہے۔لیکن جب اس کو بہ دوام تعلیم پر لگائے رکھتے ہیں تو پھر وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے۔اور جب بڑا ہو جاتا ہے تو اس کی تمام خوشیوں کا سامان تحصیل علم میں ہوتا ہے۔اور وہ اس کے بغیر رہ نہیں پاتا بلکہ جو شخص کبوتر بازی یا شطرنج بازی یا قمار بازی کا عادی ہو جاتا ہے تو یہ چیز اس کی فطرت بن جاتی ہے۔دنیا کی تمام راحتیں اور جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے انھی کی نذر کر دیتا ہے اور ان سے دست کش نہیں ہوتا۔بلکہ وہ چیزیں بھی جو خلاف طبع ہوتی ہیں عادت ہو جانے کی بناء پر طبعی بن جاتی ہیں۔

حتیٰ کہ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو عیّاری پر فخر کرتے ہیں۔تازیانے کی ضربیں برداشت کرتے ہیں صبر کرتے ہیں۔ہاتھ کٹنے پر بھی باز نہیں آتے اور مخنث باوجود اپنے کام کی رسوائی کے ایک دوسرے پر مخنثی میں فخر کرتے ہیں۔بلکہ اگر کوئی جرّاحوں' خاکروبوں کو دیکھے تو وہ بھی اپنے ان ذلیل کاموں میں باہم فخر ایسے کرتے ہیں جیسے علماء وملوک باہم فخر کرتے ہیں اور یہ سب عادی ہو جانے کا ثمر ہے۔بلکہ جو مٹی کھانے کو معمول بنا لیتا

ہےتو وہ اس میں اتنا پختہ ہو جاتا ہے کہ اس سے باز نہیں رہ سکتا۔ بلکہ بیماری اور ہلاکت تک کو برداشت کر لیتا ہے پس جو شے بھی خلافِ طبع ہوتی ہے عادی ہو جانے کے باعث طبع بن جاتی ہے۔ جو کچھ موافق طبع ہے وہ دل کے لیے ایسے ہی ہے جیسے کہ کھانا پینا بدن کے لیے ہے۔ اس کا حاصل کرنا حق تعالیٰ کی عبادت و معرفت و طاعت کے لیے اولیٰ تر ہے۔ اور غضب و شہوت کہ انسان کے مقتضائے طبع ہیں ان پر کنٹرول رکھنا واجب ہے۔ کیونکہ انسان فرشتوں کے گُہر سے ہے اور غذا اس کی یہی ہے۔ اور وہ شخص جس کی میل اس کے برعکس ہے وہ بیمار ہے جس کے نتیجے میں اس کی اصل غذا نا مطبوع ہوگئی ہے۔ اور بیمار کو یوں بھی دیکھا گیا ہے کہ مفید کھانے کو دشمن سمجھتا ہے اور جو شے اس کے لیے مضر ہو اس پر حریص ہوتا ہے۔ پس جو کوئی حق تعالیٰ کی معرفت اور طاعت کے علاوہ کسی اور شے کو دوست رکھتا ہے وہ گویا بیمار ہے۔ جیسے کہ فرمان خداوندی ہے کہ ''فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَرَضٌ'' ''ان کے دلوں میں بیماری ہے (قرآن: ۱۰/۲) نیز فرمایا کہ: ''اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰهَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ'' (قرآن: ۸۹/۲۲) ''(مگر وہ جو (شرک سے آزاد) قلب سلیم لے کر آیا)'' اور جس طرح بیمار تن اِس دنیا کی ہلاکت کے خطرے میں ہوتا ہے اسی طرح بیمار دل اُس جہان کی ہلاکت کے خطرے میں ہوتا ہے۔ اور جس طرح بیمار کی تندرستی کی امید نہیں ہوتی اِلّا یہ کہ اپنے نفس کے خلاف طبیب کے کہنے کے مطابق دوائے تلخ کھائے اس طرح دل کی بیماری کا چارہ اور کوئی نہیں اِلّا یہ کہ خواہشِ نفس کے برعکس صاحب شریعت کے قول پر عمل کرے جو لوگوں کے دلوں کا طبیب ہے۔

خلاصہ یہ کہ جسم کے علاج اور دل کے علاج کا طریقہ ایک ہی طرح کا ہے۔ گرمی کو سردی اور سردی کو گرمی سے اصلاح ہوتی ہے۔ اسی طرح جس پر تکبر غالب ہو تو اسے بہ تکلف انکساری اختیار کرنی چاہئے تا کہ شفا پائے اور اگر تواضع اس قدر غالب ہو چکی ہو کہ رذالت کی حد کو چھو رہی ہو تو چاہئے کہ وہ بہ تکلف تکبر کرے تا کہ شفا پائے۔ پس معلوم رہے کہ خوش اخلاقی کا سبب تین چیزیں ہیں:

ایک وہ جو اصل فطرت ہے۔ اور وہ حق تعالیٰ کی عطا ہے کہ وہ کسی کو خوش خلقی کی اصل فطرت پر پیدا کرے اور یہ عطا اس کی بہ کثرت ہے۔

دوسرے یہ کہ انسان بہ تکلف نیک اعمال کرنے لگے۔ حتیٰ کہ وہ اس کی عادت بن جائیں۔

تیسرے یہ کہ انسان ایسے لوگوں کو دیکھے کہ جن کے اخلاق و افعال نیک ہوں تو ان کی صحبت اختیار کرے تو لازماً ان کی یہ عمدہ صفات اس کی طبع میں موثر ہوں گی۔ اگر چہ خود اس کو خبر بھی نہ چلے۔

جسے یہ تینوں سعادتیں نصیب ہو جائیں کہ فطرتاً نیک خو ہو۔ اہل خیر کے ساتھ ہم صحبت ہو اور افعال خیر

کا عادی ہوتو وہ درجۂ کمال کو پہنچ گیا۔اور وہ جوان تینوں سے محروم رہا ہو کہ فطرتاً ناقص ہو اور صحبت برائی کی رکھتا ہو۔اور افعال بد کا عادی ہوتو وہ شقاوت میں کمال درجے پر پہنچ گیا۔اوران دونوں کے درمیان اور بھی بہت سے مدارج ہیں کہ بعض ہوں اور بعض نہ ہوں۔لیکن سعادت وشقاوت (نکبت) ہر ایک کی اس کی مقدار کے مطابق ہوگی۔فرمانِ خداوندی ہے: ''فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ'' (قرآن:۹۹/۷،۸) (جوکوئی ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ اسے (اوراس کے ثواب کو) دیکھ لے گا)۔اور جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی ہوگی تو وہ اسے (اوراس کی پاداش کو دیکھ لے گا'')

فصل اوّل: تمام سعادتیں اعمال خیر بہ تکلف کرنے میں ہیں

یاد رہے کہ اعمال اعضاء وجوارح سے وجود میں آتے ہیں لیکن مقصود اس کا گردشِ دل ہے کیونکہ دل ہی ہے جو اس عالم بالا کی طرف سفر کرے گا۔اور چاہیے کہ دل اس جمال وکمال سے بہرہ ور ہوجائے کہ بارگاہِ خداوندی میں پیش کرنے کے لائق ہو۔اور ایک آئینے کی طرح صاف وشفاف ہو اور بے زنگ کہ جس میں ملکوت کی صورت دکھائی دینے لگے۔شاہد اس میں وہ انتہائے جمال مشاہدہ کرے گا کہ بہشت ان تمام صفات کے باوصف جو اس نے اس کے بارے میں سن رکھی ہیں اس کی نگاہوں میں حقیر دکھائی دے گی۔اوراگرچہ اُس عالم میں بھی جسم کا ایک نصیبہ ہے۔لیکن اصل دل ہے اور جسم اس کی تبع۔

یاد رہے کہ دل اور ہے اور جسم اور۔دل عالم ملکوت سے ہے اور جسم عالم شہادت سے ہے اور اسے عنوان کتاب ہی میں آپ نے پہچان لیا ہے۔لیکن اگرچہ جسم دل سے جدا ہے' لیکن اسے دل سے ایک تعلق ہے کہ ہر اچھا معاملہ دل پر وارد ہوتا ہے تو جسم سے ایک نور دل کے ساتھ جاملتا ہے۔اسی طرح جسم جو برا معاملہ کرتا ہے تو ایک ظلمت دل پر جاوارد ہوتی ہے۔جس طرح نیکی کا نور سعادت کا تخم ہے ایسے ہی یہ ظلمت دل کے لیے تخمِ شقاوت ہے۔اسی تعلق کے سبب سے انسان کو اس دنیا میں لایا گیا ہے تاکہ جسم سے ایک جال اور آلہ کا کام لے کر اپنے لئے صفاتِ کمال حاصل کرے۔

معلوم رہے کہ کتابت ایک صنعت ہے جو دل کی صفت ہے۔لیکن صدور اس کا انگلیوں کے ذریعے سے ہوتا ہے اور اگر کوئی چاہے کہ خوش نویس ہوجائے تو تدبیر اس کی یہ ہے کہ بہ تکلف خوب صورت خط لکھتا رہے تاکہ اس کے باطن میں عمدہ خط کا نقش جاگزیں ہوجائے۔جب جاگزیں ہوگیا تو کاتب کی انگلی وہ نقش باطن سے حاصل کرنے لگتی ہے۔اور لکھنے لگ پڑتی ہے۔پس اسی طرح ظاہر میں کردہ نیک عمل سے انسان کا

باطن خوش خلقی حاصل کرتا ہے اور جب خوش خلقی اس کے باطن کی صفت بن جاتی ہے تو اس کے افعال اس کے خُلق کے ہم رنگ ہو جاتے ہیں۔ پس تمام سعادتوں کی تمہید اعمال خیر ہیں بہ تکلف اور ثمرہ اس کا یہ ہے کہ دل کا باطن خیر سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ پھر اس کا نور دوبارہ باہر کی جانب لپکتا ہے جس سے انسان طبعاً اور طوعاً اعمالِ خیر قبول کرنے لگتا ہے۔ اور بھید اس کا وہ تعلق ہے جو دل اور جسم کے درمیان ہے کہ جس کی بناء پر دل جسم پر اثر انداز ہوتا ہے اور جسم دل پر۔ یہی وجہ ہے کہ جو فعل غفلتاً وجود میں آئے وہ حبطہ یعنی بے ہودہ و بے کار متصور ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا فعل دل پر کسی قسم کا اثر نہیں چھوڑتا کیونکہ دل اس سے غافل ہوتا ہے۔

فصل: جملہ اخلاق اچھے یا برے جب انسان کی فطرت بن جائیں تو تکلف باقی نہیں رہتا

معلوم رہے کہ وہ بیماری جو سردی کے باعث ہو اس کے لئے مریض کو گرم چیزیں زیادہ نہیں کھانی چاہیں کہ جس سے گرمی بھی ایک علت بن جائے۔ بلکہ اسے ایک اعتدال اور معیار کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ کیونکہ مقصود یہ ہے کہ مزاج معتدل رہے۔ نہ گرمی کی جانب میلان رکھتا ہو نہ سردی کی جانب اور جب مزاج حدِّ اعتدال میں آ جاتا' ہے۔ تو علاج ترک کر دیتے ہیں۔ اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس اعتدال کو برقرار رکھا جائے۔ اور معتدل اشیاء کھائی جائیں۔ اسی طرح جملہ اخلاق بھی دو اطراف رکھتے ہیں۔ ایک طرف محمود ہے تو دوسری انتہا مذموم۔ جب کہ مقصود اعتدال ہوتا ہے۔ مثلاً بخیل سے ہم کہتے ہیں کہ مال دے تا کہ اس کے لئے داد و دہش آسان ہو جائے اور اس طرح نہیں کہ فضول خرچی کرنے لگے کیونکہ وہ بھی ناپسندیدہ ہے۔ لیکن ترازو اس کا شریعت ہے۔ ایسے ہی جیسے جسم کے علاج کا ترازو علم طب ہے۔ تو چاہئے کہ ایسے ہو جائے کہ جس چیز کے بارے میں شریعت حکم دے کہ 'دے' تو دے دے تو دینا اس کے لئے آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ اس طرح اس کو بچانے یا روکنے کا خیال پیدا نہ ہوگا۔ کیونکہ معتدل ہوگا۔ لیکن اگر اس میں طبعاً تقاضا روکنے کا ہو اور وہ بہ تکلف عطا کرے تو مطلب اس کا یہ ہوگا کہ ہنوز بیمار ہے۔ لیکن پھر بھی قابل تعریف ہے کہ اگرچہ بہ تکلف دوا کھاتا ہے لیکن یہ تکلف ہی ایک دن اس کی فطرت بن جائے گا۔ اسی بناء پر آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت طوعاً کرنی چاہیئے ایسا ممکن نہ ہو تو کرہاً کرو کیونکہ اس صورت میں صبر کرنا بھی خیرِ کثیر ہے''۔

معلوم رہے کہ جو کوئی مال بہ تکلف دیتا ہو تو وہ سخی نہ ہوگا کہ سخی وہ ہے جس کے لئے مال عطا کرنا آسان ہو اسی طرح جو مال کو بہ تکلف روکتا ہے اسے بخیل نہیں کہنے کے۔ کیونکہ بخیل فی الاصل وہ ہے جو طبعاً مال کو روکتا ہے۔ پس تمام اخلاق کو طبعی ہو جانا چاہئے تا کہ تکلف جاتا رہے۔ بلکہ کمال خلق یہ ہے کہ انسان اپنی باگ ڈور

شرع کے ہاتھ میں دے دے۔اس طرح فرماں برداری اس کے لئے آسان ہوجائے گی۔اوراس کے باطن میں کوئی خرخشہ باقی نہ رہے گا۔فرمان خداوندی ہے کہ ''فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا'' (قرآن:۴/۶۵) فرمایا: ان کا ایمان مکمل جب ہوگا جب تجھے اپنا حاکم ومصنف قرار دے لیں گے۔اوران کے دل میں کسی قسم کی گرانی اور تنگی نہ ہوگی''۔اس میں جو راز ہے ہر چند کہ اس کتاب کے حوصلے سے زائد ہے تاہم اشارۃً کچھ بیان کیا جاتا ہے:

جاننا چاہئے کہ سعادت انسان کی یہ ہے کہ فرشتوں کی صفات کا حامل بن جائے۔کیونکہ انسان کا گھر انھی میں سے ہے اوراس دنیا میں انسان محض مسافر ہے۔لیکن اصل اس کی عالمِ فرشتگان ہے۔اور ہر صفتِ غریب جو انسان یہاں سے لے جائے گا فرشتوں کی موافقت سے دور کرے گا۔چاہئے یہ کہ جب انسان عالم بالا میں جائے فرشتوں کا ہم صفت ہو اور یہاں سے جب دوسرے جہان کو سدھارے تو یہاں سے کوئی صفت سفر کی ساتھ نہ لے جائے۔

اور جو کوئی امساکِ مال کا حریص ہو وہ مال میں مشغول ہے اور جو مال صرف کرنے کا حریص ہو وہ بھی مال ہی میں مشغول ہے۔اسی طرح جو تکبر کرنے میں حریص ہے وہ بھی خَلق ہی میں مشغول ہے اور جو انکساری کا حریص ہے وہ بھی مخلوق ہی میں مشغول ہے۔جب کہ ملائکہ نہ مال میں مشغول ہیں نہ خلق میں۔بلکہ عشقِ حضرت الاہیت کے علاوہ کسی شے کی طرف ملتفت نہیں ہوتے۔پس مقصود یہ ہے کہ انسان کے دل کا تعلق مال سے منطقع ہوجائے اور خلق سے بھی کٹ جائے۔یہاں تک کہ انسان کلیۃً اس سے پاک ہوجائے اور ہر وہ صفت جس سے انسان خالی نہیں ہوسکتا تو چاہئے کہ اس میں میانہ روی اختیار کرے تاکہ ایک رُو سے ایسے دکھائی دے جیسے اس سے خالی ہے۔جیسے کہ پانی گرمی یا سردی کی صفت سے عاری نہیں ہوسکتا۔لیکن اگر نیم گرم ہو تو معتدل قرار پائے گا تو یہ مشابہ اس کے ہے کہ گرمی اور سردی دونوں سے پاک ہے۔

پس ان تمام مذکورہ صفات میں اعتدال اور میانہ روی بہتر ہے۔پس نگاہ دل پر ہونی چاہئے تاکہ ماسوا سے بالکل کٹ جائے۔اور حق تعالیٰ میں مستغرق ہو۔جیسے کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے: ''قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ فِیْ خَوْضِھِمْ یَلْعَبُوْنَ'' (قرآن:۶/۹۱) (کہو (تورات بھیجنے والا اور تعلیم دینے والا) اللہ ہے۔پس ان کو چھوڑ دے تاکہ اپنے کھیل میں پورے طور پر لگے رہیں'') بلکہ لا الہ الا اللہ کی حقیقت خود یہی ہے۔اوراس سبب سے ممکن نہیں کہ انسان تمام آلائشوں سے پاک ہو۔کہ فرمان الٰہی ہے کہ: ''وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا کَانَ عَلٰی رَبِّکَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا'' (قرآن:۱۹/۷۱) (نہیں ہے تم میں سے کوئی مگر دوزخ میں پہنچنے والا اور رب پر وعدہ

مضبوط اور حتمی ہے)۔

پس یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تمام ریاضتوں اور مجاہدوں کا مقصود یہ ہے کہ توحید پر انسان پہنچ جائے کہ اُسی کو دیکھے اور بس' اُسی کی اطاعت کرے اور بس' اور اُس کے علاوہ کوئی اور تقاضا اس کے باطن میں باقی نہ رہے۔ جب یہ ہو جائے تو خوش اخلاقی حاصل ہوگئی ہوگی۔ بلکہ انسان عالمِ بشریت سے نکل کر حقیقت کو پہنچ گیا ہوگا۔

فصل: خوش خلقی تک پہنچنے کی راہ

معلوم رہے کہ ریاضت کارِ مشکل ہے اور گویا جان کنی ہے۔ لیکن اگر طبیب ماہر ہو اور وہ لطیف دوا کی راہ جانتا ہو تو یہ منزل بہت آسان ہو جاتی ہے۔ طبیب کا لطف یہ ہے کہ مرید کو شروع ہی میں حقیقت حق کے درجے کی طرف نہ بلائے کیونکہ وہ اسی کی تاب نہیں رکھتا۔ جیسے اگر چھوٹے بچے سے کہا جائے کہ ''مدرسے جاؤ تاکہ ملکی ریاست پر فائز ہو سکو'' تو اسے سرداری کی لذت کی کیا خبر؟ کہ کیا شے ہے؟ تو ایسے میں کہنا یہ چاہئے کہ: ''مدرسے جاؤ میں شام کو تمھیں چوگان اور گیند دوں گا اسی سے کھیلنا''۔ یہ کہا جائے تاکہ بچہ اس کے لالچ میں مدرسے جائے۔ اور جب وہ بڑا ہو جائے تو اسے عمدہ لباس اور زیب و زینت کی ترغیب دی جائے تاکہ کھیل کود سے ہاتھ روک لے۔ جب وہ اور بڑا ہو جائے تو اسے آقائی اور ریاست کا وعدہ دیا جائے اور کہا جائے کہ ریشمی لباس میں آراستگی عورتوں کا کام ہے''۔ اور جب اس سے بھی بڑا ہو جائے تو کہا جائے: ''دنیا کی آقائی اور سرداری بے اصل چیزیں ہیں کیونکہ یہ موت کے ساتھ ختم ہو جائیں گی۔ تب جا کر اسے پادشاہیٔ جاوید کا وعدہ دینا چاہئے۔

پس ہو سکتا ہے کہ مرید ابتدائے کار میں پورے اخلاص پر قادر نہ ہو تو اسے اس کی رخصت دے دینی چاہئے تاکہ وہ اس لالچ میں مجاہدہ کرتا رہے کہ لوگ اسے اچھی نظر سے دیکھیں۔ تاکہ ریا کی یہ آرزو شکم اور مال کے حرص کو ختم کر دے۔ تو جب اس سے فارغ ہوگا تو مرید میں رعونت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر طبیبِ روحانی کو چاہئے کہ حرصِ رعونت کا انسداد کرے۔ اس طریقہ سے کہ کہے کہ بازار میں جا کر گدائی کرو۔ اور جب اس میں قبولیت نمودار ہو تو اسے اس سے منع کر دے اور ادنیٰ قسم کی خدمت میں جیسے طہارت خانہ وغیرہ کی خدمت ہے اس پر مامور کر دے۔ اور اس طرح جو صفت بھی اس میں پیدا ہوگی اس کا علاج بہ تدریج کرتا جائے اور یک بارگی نہ کہہ دے۔ کیونکہ وہ اس کی تاب سے خالی ہوتا ہے اور آرزوئے ریا اور نیک نامی کی خواہش میں ہر رنج وہ برداشت کر سکتا ہے کیونکہ ان جملہ صفات کی مثال سانپ اور بچھو کی سی ہے۔ ریا کی مثال اژدہا کی سی ہے۔ جو

سب کونگل جاتا ہے اور آخری صفت جو صدیقوں کے ہاں سے زائل ہو جاتی ہے یہی ہے۔

بیماریٔ دل اور عیوبِ نفس کی پہچان اور تدبیر معلوم کرنا

معلوم رہے کہ جس طرح جسم' ہاتھ' پاؤں اور آنکھ وغیرہ کی تندرستی کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ان اعضاء و جوارح کو جس غرض کے لئے تخلیق کیا گیا ہے وہ بہ کمال اسے پورا کرنے پر قادر ہوں۔ تا کہ آنکھ صحیح دیکھ سکے۔ پاؤں ٹھیک سے چلیں اسی طرح دل کی درستی یہ ہے کہ جو اس کی خاصیت ہے جس کی خاطر اسے خلق کیا گیا ہے اس پر اس کی ادائیگی آسان ہو۔ اور اصلِ فطرت میں جو اس کی طبع ہے اس کا دوست دار ہو۔

دل کی تندرستی کے آثار: یہ علامت دو چیزوں میں نمودار ہوتی ہے۔ ایک نیت میں تو دوسری قدرتِ کار میں۔

ارادت یا نیت میں نمود کی دلیل یہ ہے کہ انسان کسی شے کو خدائے تعالیٰ سے بڑھ کر عزیز نہ رکھے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ کی معرفت دل کی غذا ہے۔ ایسے ہی جیسے کھانا جسم کی غذا ہے۔ اور اگر جسم میں کھانے کی خواہش نہ رہے تو جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ یا بیمار پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ دل جو اللہ تعالیٰ کی محبت سے خالی ہو جائے یا ضعیف ہے یا بیمار ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: ''قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَاؤُ کُمْ وَ اَبْنَآؤُ کُمْ'' (قرآن: ۹/۲۴) فرمایا: ''اگر والدین' اولاد' تجارت' خاندان اور قرابت وغیرہ جو کچھ رکھتے ہو انھیں حق تعالیٰ سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہو تو انتظار کرو تا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان آ پہنچے اور تم اسے دیکھو''۔ قدرت دل کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی فرماں برداری اس کے لئے نہایت آسان ہو گئی ہو۔ اور اس کی ضرورت نہیں پڑتی کہ انسان خود کو بہ جبر اس اطاعت پر رکھے۔ بلکہ حال یہ ہونا چاہئے کہ ادائے فرض میں انسان کو مزہ آتا ہو۔ جیسے کہ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ''وَجعلت قُرَّۃ عینی فی الصَّلٰوۃ'' (نماز میری آنکھ کا نور بن گئی ہے)۔

پس جو کوئی ان دو معنی یعنی ارادت و قدرتِ دل کو اپنے ہاں نہ پائے تو یہ امر ٹھیک اس کے دل کی بیماری کی علامت ہے۔ اس لئے اس کے علاج میں لگ جانا چاہئے۔ اور ممکن ہے کہ انسان غلطی سے یہ گمان کرے کہ وہ ان صفات کا مالک ہے۔ درآں حالیکہ وہ ان کا مالک نہ ہو۔ کیونکہ انسان معمولاً اپنے عیوب کے بارے میں نابینا ہوتا ہے۔

اپنے عیوب چار طریقوں سے معلوم کئے جاسکتے ہیں:

ایک: یہ کہ کسی پختہ کار پیر کے پاس جائے جو اس راہ کا تجربہ رکھتا ہو تا کہ وہ پیر اس کے باطن میں

جھانکے اور تشخیص پر اس کے عیب اسے بیان کرے۔ لیکن اس زمانے میں ایسا پیر کمیاب اور نادر ہے۔

دوسرے: یہ کہ کسی مشفق دوست کو اپنے اوپر نگہبان مقرر کرے تاکہ مداہنت کی بناء پر اس کی عیب پوشی نہ کرے اور حسد کی بناء پر مبالغہ بھی نہ کرے۔ اور ایسا دوست ملنا بھی آج کل مشکل ہے۔

لوگوں نے داؤ طائیؒ سے کہا کہ: ''آپ خلق کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھتے اور میل جول نہیں رکھتے؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''کیا کروں کیونکہ جو لوگ میرے ہم صحبت ہوتے ہیں میرے عیب کو دیکھتے ہیں لیکن مجھے آگاہ کرنے کی بجائے چھپاتے ہیں''۔

تیسرے یہ کہ اپنے دشمنوں کی باتیں اپنے بارے میں سنے۔ کیونکہ دشمن کی نظر ہمیشہ تیرے عیوب پر ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ دشمنی کی بناء پر مبالغہ ہی کیوں نہ کرتا ہو لیکن اس کی بات سچائی سے کلیۃً تو خالی نہ ہوگی۔

چوتھے: یہ کہ انسان دوسروں پر نگاہ ڈالے ان میں جو عیب دیکھے خود کو ان عیوب سے دور رکھے۔ اور اپنے بارے میں گمان یہ کرے کہ دوسرا بھی میرے ہی جیسا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لوگوں نے پوچھا ''آپ کو ادب کس نے سکھایا؟'' تو فرمایا ''کسی نے بھی نہیں۔ جو مجھے دوسروں کے ہاں برا لگا میں نے اس سے پرہیز کی''۔ معلوم رہے کہ جو زیادہ احمق ہوتا ہے وہ اپنے بارے میں خوش گمان تر ہوتا ہے اور جو شخص زیادہ عقل مند ہو وہ اپنے بارے میں بدگمان تر ہوتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھتے تھے کہ ''آنحضرت نے منافقوں کا راز تجھ پر کھولا ہے تو تم مجھ میں نفاق کی علامتوں میں سے کیا مشاہدہ کرتے ہو؟'' پس چاہئے کہ جو کوئی اپنے عیب معلوم کرنا چاہے جب تک سبب اس کا نہ جانے گا علاج نہیں کر سکتا۔

اور تمام علاج خواہشات کی مخالفت میں مضمر ہیں جیسے کہ فرمان خداوندی ہے کہ: ''وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْس عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاوٰی''۔ (قرآن: ۴۱/۴۰/۸۹) (اور وہ جو اپنے خداوند کے سامنے پیش ہونے سے ڈرا اور اپنے جسم کو خواہشوں سے روک رکھتا ہے، بے شک، بہشت اس کا ٹھکانہ ہے)،

آنحضرت ﷺ جب صحابہ غزا سے واپس آتے تو ان سے فرماتے: ''جہاد اصغر سے اب جہادِ اکبر کی طرف آپ نے مراجعت کی ہے''۔ تو صحابہ پوچھتے تھے کہ وہ کیسا جہاد ہے؟'' تو آپ جواب میں فرماتے: ''اپنے نفس کے ساتھ جہاد''۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''اپنے نفس سے پہنچنے والی تکلیف سے خود کو بچاؤ اور نفس کی آرزوں

کو حق تعالیٰ کی معصیت میں پورا نہ کرو کہ کل روزِ قیامت آپ کا نفس آپ سے جھگڑے اور تم پر لعنت بھیجے یہاں تک کہ تمھارے تمام اعضا تم پر لعنت بھیجیں''۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''کوئی سرکش سواری جس کو سخت لگام دینے کی ضرورت ہے وہ خود اپنے نفس سے اولیٰ تر نہیں''۔ سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ: ''چالیس سال سے میرا نفس چاہتا ہے کہ[1] روٹی شہد میں بھگو کر کھاؤں لیکن میں نے نہیں کھایا''۔ ابراہیم خواصؒ فرماتے ہیں کہ ''میں لبنان کے علاقے کوہ لگام میں جا رہا تھا کہ میں نے انار بکثرت دیکھے۔ مجھے خواہش پیدا ہوئی تو ایک انار کو میں نے چیرا تو ترش نکلا تو میں نے اس سے ہاتھ روک لیا اور چل پڑا۔ تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی گرا پڑا ہے اور بھڑیں جمع ہوگئی ہیں اور اسے ڈس رہی ہیں۔ تو وہ بولا: ''السلام علیک یا ابراہیم''۔ تو میں نے اس سے پوچھا کہ تو نے مجھے کیونکر پہچانا؟'' تو وہ بولا: ''جو کوئی حق تعالیٰ کو پہچانتا ہے اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی''۔ تو میں نے کہا ''میں دیکھتا ہوں کہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ صاحب حال ہے تو اللہ سے استدعا کیوں نہیں کرتا کہ ان بھڑوں کو تجھ سے دور رکھے''۔ تو وہ بولا ''تم بھی تو صاحبِ حال ہو کر کیوں نہیں چاہتے کہ انار کی یہ خواہش تم سے لے لے؟ کہ شہوات کا زخم تو آخرت میں برداشت کرنا ہوگا اور بھڑوں کا زخم اسی دنیا میں اٹھانا پڑے گا''۔

معلوم رہے کہ انار اگرچہ حلال ہے لیکن محتاط لوگ جانتے ہیں کہ شہوت حلال کی ہو یا حرام کی بات ایک ہی ہے۔ اگر تو حلال کا دروزاہ خواہشات پر بند نہ کرے گا اور نفس کو حدِ ضروری تک محفوظ نہ رکھے گا تو نفس حرام طلب کرنے لگے گا۔ اس بناء پر پرہیزگاروں نے مباحات کی صورت میں بھی شہوات کو خود سے دور رکھا ہے تاکہ شہوات کے ہاتھ سے نجات پا جائیں جیسے کہ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ ''ہم نے ستر حلال دروازوں سے ہاتھ اس خوف سے روکے رکھا ہے کہ کہیں حرام میں داخل نہ ہو جائیں''۔

اور ایک اور سبب ہے کہ نفس جب ناز و نعمت کا خوگر ہو جائے تو دنیا کی مباحات کو دوست بنا لیتا ہے۔ اور سرمستی لگا لیتا ہے۔ اور یہ دنیا اس کے لئے بہشت بن جاتی ہے۔ تو مرگ اس کے لئے دشوار ہو جاتی ہے۔ اور سرمستی اور غفلت اس کے جی میں نمودار ہوتی ہے۔ تو جب ذکر و مناجات کرتا ہے تو اس میں لذت نہیں پاتا۔ اور اگر تو اپنے نفس کو شہواتِ مباح سے باز رکھے گا تو وہ شکستہ اور رنجور ہوگا لیکن دنیا سے نفرت کرنے لگے گا۔ اور نعیمِ آخرت کا شوق اس میں پیدا ہوگا۔ اور حُزن اور شکستگی کی حالت میں ایک تسبیح اس قدر اثر انگیز ہوگی کہ خوشی اور ناز و نعم کی حالت میں اس سے سو گنا زیادہ تسبیح کی جائے اسی کے برابر نہ ہو سکے گی۔

---

۱ صدیقی صاحب گردہ کو گردو پڑھ کر اخروٹ لکھتے ہیں

انسانی نفس کی مثال باز کی سی ہے کہ جب اس کی تربیت کرتے ہیں تو خاص طور پر اندر گھر میں رکھتے ہیں اوراس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں تا کہ جو کچھ باز کے اندر ہواُس عادت کو ترک کردے۔ پھر تھوڑا تھوڑا گوشت باز کو کھلایا جاتا ہے تا کہ باز اپنے مالک سے الفت کرنے لگے اوراس کا مطیع ہو جائے۔اسی طرح نفسِ انسانی میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدانہیں ہوتی جب تک تو اسے تمام عادتوں سے عاری نہ کردے اور آنکھ‘ زبان اورکان وغیرہ کی راہ بند نہ کردے اوراسے تنہائی‘ خاموشی‘ بے خوابی کی ریاضتوں سے دوچار نہ کرے۔ شروع میں یہ صورت نفس پر گراں گذرتی ہے ایسے ہی جیسے وہ بچہ جس کا دودھ چھڑاتے ہیں اس پر گراں گذرتا ہے۔لیکن ریاضت کے بعد یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اگر بہ جبر اسے دودھ دینے کی کوشش کریں تو بھی وہ دودھ نہیں پی سکتا۔

یادرہے کہ ہرکسی کے لئے ریاضت اس چیز کے لئے درکار ہے جواُس کے لئے زیادہ خوشی کا باعث ہو وہ اسے ترک کرے اور جواس پر غالب تر ہواس کے خلاف کرے۔ مثلاً جس شخص کی خوشی کا باعث جاہ وحشمت ہو وہ جاہ وحشمت کو ترک کردے اور جس کی خوشی کا باعث اس کا مال ہو وہ مال خرچ کرڈالے اس طرح جس شخص کے ہاں خدائے تعالیٰ کے سوا کوئی سرمایہ شادی وتسلیٔ دل کا ہو تو وہ سختی سے اسے خود سے جدا کردے اور خود ملازم اس کا ہو جائے جو ہمیشہ اس کے ساتھ دینے والا ہے (یعنی خدائے تعالیٰ) اور جسے موت پر وداع کرے گا خود آج ہی اپنے اختیار سے وداع کردے اور ہمیشہ کا ساتھی خدا تعالیٰ ہے۔ جیسے کہ حق تعالیٰ نے حضرت دواد علیہ السلام کی طرف وحی کی ’’اے داؤد! تجھے میرے بغیر چارہ نہیں لہٰذا میرا ملازم ہو جا‘‘۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے میرے باطن میں پھونکا: ’’احبب من احببت فانك مفارقه ‘‘یعنی جس کو چاہے دنیا میں سے دوست رکھ لیکن وہ تجھ سے واپس لے لی جائے گی‘‘۔ والسلام۔

خوش خلقی کی علامات معلوم کرنا

معلوم رہے کہ خوش خُوئی کی علامات وہ ہیں جو حق تعالیٰ نے سورۃ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ میں تا بہ آخر آیہ دہم بیان فرمائی ہیں۔اور اس آیت میں کہ فرمایا کہ ’’اَلتَّـائِبُـوْنَ الْعَابِدُوْنَ ..... ‘‘ اور یہ آیات کہ فرماتا ہے کہ ’’وَعِبَادُالرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا‘‘ تا آخر۔

اور جو کچھ منافقوں کی علامت میں کہا ہے علامت ’بری عادت‘ ہے۔ جیسے کہ آنحضرت کا فرمان ہے کہ: ’’مومن کی ہمت نماز روزہ اور عبادت ہے۔اور منافق کی ہمت چوپایوں کی طرح کھانا پینا ہے‘‘۔

حاتم اصمؒ فرماتے ہیں کہ : ''مومن فکرت اور عبرت میں مشغول ہوتا ہے اور منافق حرص و خواہش میں۔ اور مومن ہر شخص سے ناامید ہوتا ہے سوائے حق تعالیٰ کے اور منافق ہر شخص سے امید رکھتا ہے سوائے حق تعالیٰ کے۔ اور مومن مال دین پر قربان کرتا ہے اور منافق دین کو مال پر قربان کرتا ہے اور مومن اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا اور گریہ کرتا ہے۔ اور منافق معصیت کرتا ہے اور ہنستا ہے اور مومن خلوت پسند ہوتا ہے۔ لیکن منافق میل جول اور بھیڑ کو پسند کرتا ہے، مومن فصل کاشت کرتا ہے اور ڈرتا ہے کہ شاید اس کا حاصل نہ کر پائے اور منافق بوئے بغیر طمع رکھتا ہے کہ فصل کاٹے''۔

کہا گیا ہے کہ خوش خو وہ ہوتا ہے جو شرمیلا ہو، کم گو ہو، کم رنج ہو، راست گو ہو اور صلاح جُو ہو اور بہت طاعت گذار ہو اور کم خطا اور کم فضول ہو اور سب کا بھی خواہ ہو۔ اور سب لوگوں کے حق میں نیک کردار، مشفق و باوقار اور آہستہ و صبور و قانع اور شکور، نرم دل، رفیق، بے ضرر اور بے طمع ہو۔ نہ کسی کو گالی دے نہ لعنت کرے اور نہ غیبت کرے اور نہ سخن چینی کرے، نہ فحش گوئی کرے نہ جلد بازی کرے، نہ دل میں کینہ رکھے، نہ حاسد ہو، کشادہ رُو ہو اور خوش گو ہو اور اس کی دوستی، دشمنی، غضب اور خوشنودی سب حق تعالیٰ کے لئے ہوں اور بس''۔

یاد رہے کہ بیشتر خوش خلقی بردباری اور متحمل مزاجی سے جنم لیتی ہے جیسے کہ آنحضرت کو لوگوں نے بہت اذیت دی تھی حتیٰ کہ آپ کے دندان مبارک بھی شہید کر دئے تھے لیکن اس سب کے باوجود آپ نے فرمایا تھا کہ : ''اے خدا ان کو راہِ راست دکھا کہ یہ نہیں جانتے''۔

ابراہیم بن ادہمؒ صحرا میں جا رہے تھے کہ ایک فوجی آپ تک آ پہنچا تو کہنے لگا : ''تو غلام ہے؟'' آپ نے فرمایا ''ہاں'' تو بولا: ''آبادی کس طرف ہے؟'' تو آپ نے قبرستان کی طرف اشارہ کیا۔ تو وہ بولا ''میں آبادی کو پوچھ رہا ہوں'' تو آپ نے فرمایا کہ ''وہیں ہے آبادی'' تو فوجی نے آپ کے سر پر ایک ڈنڈا مارا جس سے آپ کے سر سے خون بہنے لگا۔ آپ کو پکڑ کر شہر لے آیا جب جاننے والوں نے دیکھا تو فوجی سے کہا کہ ''اے احمق یہ تو ابراہیم ادھم ہیں یگانۂ روزگار'' تو فوجی گھوڑے سے اترا اور آپ کے پاؤں پر بوسہ دیا اور بولا کہ آپ نے خود کو غلام کیوں کہا؟'' تو آپ نے جواب دیا: ''اس لئے کہ میں اللہ کا غلام ہوں''۔ پھر بولا ''آبادی کی جگہ آپ نے مجھے قبرستان بتائی'' تو فرمایا: ''سب کے لئے اس کا وعدہ ہے کہ وہاں آباد ہوگا''۔ فوجی بولا چونکہ میں نے آپ کی بے ادبی کی ہے مجھے حلال کر دیجئے''۔ اس پر آپ نے کہا کہ ''جب اس نے میرے سر پر ضرب لگائی تو میں نے اس کے لئے دعا کی'' لوگوں نے کہا ''کیوں؟'' فرمایا کہ : ''اس لئے کہ مجھے معلوم تھا کہ مجھے اس کے سبب ثواب ملے گا تو میں نے نہیں چاہا کہ مجھے تو ثواب ملے لیکن مجھ سے اسے برائی ملے اس لئے

میں نے اس کے لئے دعائے خیر کی''۔

ابوعثمان حیریؒ کو ایک شخص نے دعوت پر بلایا تا کہ ان کی آزمائش کرے۔ جب اس کے گھر کے دروازے پر پہنچے تو اس نے اندر نہ آنے دیا اور باہر ہی سے کہہ دیا کہ اب کچھ باقی نہیں رہا''۔ آپ لوٹ گئے۔ جب کسی قدر دور ہوئے تو وہ شخص ان کے پیچھے گیا اور واپس بلالیا۔ آپ واپس ہو گئے۔ جب گھر کے دروازے پر پہنچے تو اندر نہ جانے دیا اور وہی معذرت کے الفاظ کہے۔ آپ پھر لوٹ گئے۔ اس شخص نے کئی بار یہی عمل کیا۔ جب انھیں بلاتے تو آ جاتے اور جب نکال دیا جاتا تو لوٹ جاتے۔ آخر میں وہ شخص بولا کہ ''حضور تو بہت خوش اخلاق نکلے''۔ تو آپ نے فرمایا کہ ''یہ جو آپ نے مجھ سے دیکھا ہے تو یہ تو کتے کی عادت ہے کہ جب اسے بلاؤ تو چلا آتا ہے اور دھتکار دو تو دور ہو جاتا ہے اس عادت کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے''۔ ایک دن کسی نے بالا خانے سے آپ کے سر پر راکھ انڈیل دی تو آپ نے کپڑے کو جھٹک کر صاف کیا اور شکر ادا کیا۔ لوگوں نے بحیرت پوچھا کہ ''شکر کس بات پر آپ نے کیا؟'' تو فرمایا کہ: ''وہ شخص جو مستحق آگ کا ہو اگر خاکستر پر اسے راضی کر لیں تو یہ مقام شکر نہ ہوگا؟''

اور علی بن موسیٰ الرضاؒ سیاہ فام تھے اور آپ کے گھر کے قریب نیشاپور میں ایک حمام تھا اور جب آپ حمام کو جاتے تو ان کے لئے حمام خالی کر دیا جاتا تھا۔ ایک روز حمام خالی کیا گیا اور آپ حمام میں چلے گئے اور حمّامی اتفاقاً غافل ہو گیا۔ ایک دیہاتی جو حمام میں داخل ہوا تو جب آپ کو دیکھا تو گمان اس نے یہ کیا کہ یہ ہندو[1] ہے اور حمام کے چاکروں میں سے ہوگا۔ تو وہ دیہاتی بولا ''اٹھو اور پانی لاؤ'' آپ پانی لے آئے۔ پھر بولا اٹھو اور مٹی لاؤ۔ آپ مٹی لے آئے۔ غرض وہ دیہاتی حکم چلاتا رہا اور آپ اطاعت کرتے رہے۔ جب حمامی واپس آیا اور اس نے دیہاتی کی آواز سنی کہ ان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ تو حمامی ڈرا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ اور جب علی بن موسیٰؒ باہر نکلے تو لوگوں نے کہا کہ اس واقعہ کی وجہ سے حمامی ڈر کر بھاگ گیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس سے کہو کہ وہ گریزاں نہ ہو۔ کیونکہ جرم تو اس کا ہے جس نے تخم ایک سیاہ فام کنیز کے رِحم میں داخل کیا''۔

عبداللہ درزی اپنے زمانے کے بزرگان میں سے۔ ایک آتش پرست اُن سے کپڑے سلواتا اور ہر

---

[1] ہندو فارسی میں کالے کو کہتے ہیں۔

خط بڑھا زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

دفعہ جعلی سکہ چاندی کا مزدوری میں دیتا اور آپ اسے قبول کر لیتے۔اور کچھ نہ کہتے' ایک دفعہ آپ موجود نہ تھے تو آپ کے شاگرد نے اس سے کھوٹی چاندی قبول نہ کی۔ جب آپ واپس آئے تو شاگرد سے کہا'' تو نے ایسے کیوں کیا؟ کہ کئی سال سے وہ میرے ساتھ یہی کرتا آ رہا ہے۔اور میں نے اس پر آشکار نہیں کیا اور اس سے کھوٹی چاندی لیتا رہا اس خیال سے کہ کسی اور مسلمان کو کھوٹی چاندی سے فریب نہ دے سکے۔اور میں کھوٹے سکوں کو زمین میں دفن کرتا رہا ہوں''۔

اویس قرنی رضی اللہ عنہ جب کہیں سے گذرتے تو لڑکے ان پر پتھر مارتے تو آپ ان سے کہتے کہ ذرا چھوٹے پتھر مارو تاکہ میری پنڈلیاں ٹوٹ نہ جائیں کیونکہ پھر تو میں نماز کے لئے قیام نہ کر پاؤں گا''۔

ایک شخص نے احنف قیس رضی اللہ عنہ کو گالی دی اور ساتھ چلا جا رہا تھا۔آپ خاموش رہے۔ جب اپنے قبیلہ کے قریب پہنچے تو رک گئے اور اس شخص سے کہا کہ'' اگر اور کچھ رہ گیا ہے یہیں کہہ لو کیونکہ اگر میری قوم سن لے گی تو وہ تمھیں آزار دیں گے''۔

ایک عورت نے مالک دینارؒ سے کہا'' اے ریاکار!'' تو آپ نے فرمایا کہ اہلِ بصرہ میرا نام بھول گئے تھے تم نے پالیا'' یہ ہے کمال خوش اخلاقی کا نشان جس سے یہ لوگ بہرہ ور تھے۔اور یہ صفت ان لوگوں کی ہوتی ہے جنہوں نے ریاضت کے ذریعے خود کو بشری صفات سے کلیۃً پاک کر لیا ہے اور سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو نہیں دیکھتے اور جو کچھ دیکھتے ہیں اللہ ہی کی جانب سے دیکھتے ہیں اور جو شخص خود میں یہ نہ دیکھے یا ان خواص میں سے کسی قدر بھی خود میں نہ پائے تو اسے فریب نہ کھانا چاہئے کہ خود کو خوش خلق سمجھنے لگے۔ والسلام۔

چھوٹے لڑکوں کی تربیت و تادیب

یاد رہے کہ بچے ماں باپ کے ہاتھوں میں امانت ہوتے ہیں اور بچوں کا دل ایک نفیس گوہر کی مانند ہوتا ہے اور موم کی طرح نقش قبول کرتا ہے اور خود تمام قسم کے نقوش سے خالی ہوتا ہے۔ایک ایسی ارض پاک کی طرح کہ جو بیج بھی آپ اس میں بوئیں وہ اگے گا۔اگر تخم خیر بوؤ گے تو وہ دین و دنیا کی سعادت کو پہنچے گا۔اور والدین اور استاد اس ثواب میں حصہ دار ہوں گے اور اگر اس کے برعکس ہوا اور وہ بدبخت ہو جائے تو بھی والدین اس میں شریک متصور ہوں گے۔

فرمانِ خداوندی ہے کہ'' قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا '' خود کو اور اپنے بیوی بچے کو آتش دوزخ سے بچاؤ اور بچے کو آتشِ دوزخ سے بچانا دنیا کی آگ سے بچانے سے اولیٰ تر ہے۔

دوزخ سے بچانے کا مطلب اس کی تادیب اور اسے اچھے اخلاق سے بہرہ ور کرنا ہے۔ اور برے کی قربت سے بچانا ہے کیونکہ تمام فسادوں کی جڑ برے کی صحبت ہے اور اسے ناز و نعم اور خوش پوشی کا عادی نہ بنائے کیونکہ پھر وہ بچہ اس کے بغیر صبر نہ کرے گا۔ اور ساری عمر اسی کی طلب میں ضائع کر دے گا بلکہ شروع ہی میں کوشش یہ کرنی چاہئے کہ وہ عورت جو بچے کو دودھ پلاتی ہے بہ صلاح، خوش خو اور حلال خوار ہو کیونکہ دایہ ہی سے بری عادت سرایت کرتی ہے۔ اور دودھ اگر حرام سے حاصل ہو تو پلید ہوگا۔ چونکہ بچے کا گوشت پوست اس دودھ سے تیار ہوتا ہے اس لئے بلوغت پر اسی کے متناسب صفات کا اظہار اس کی طبع سے ہوگا۔ جب بچہ بولنے لگے تو چاہئے کہ پہلا لفظ اس کی زبان پر ''اللہ'' کا ہو۔ جو اس کو تلقین کا باعث ہوتا ہے اور جب ایسے ہو کہ اس میں بعض چیزوں کی حرص ہو تو یہ بشارت ہوگی اور دلیل اس کی ہوگی کہ نور عقل کا پرتو اس پر پڑا ہوگا اور شرم کو پاسبان بنائے گا جو اسے ہر اس شے سے جو بری ہو اس سے شرم دلائے گی۔

پہلی چیز جو بچے میں پیدا ہوگی وہ کھانے کی حرص ہوگی۔ تو ایسے میں کھانا کھانے کے آداب اسے سکھانا شروع کر دینا چاہئے تاکہ دائیں ہاتھ سے کھائے اور بسم اللہ کہے، جلدی جلدی نہ کھائے، اور خوب چبا کر کھائے۔ دوسروں کے لقمے کی طرف نہ دیکھے اور جب تک پہلا لقمہ نگل نہ لے، ہاتھ دوسرے لقمے کی طرف نہ بڑھائے اور ہاتھ اور لباس کھانے سے آلودہ نہ کرے۔ اور کبھی کبھی اسے فقط روٹی کھانے کو دی جائے تاکہ ہمیشہ سالن کے ساتھ کھانے کو عادت نہ بنالے اور بسیار خوری کو اس کی نگاہوں میں برا ٹھیرا دینا چاہئے۔ اس کے لئے کہا جائے کہ ''یہ بے عقل چوپایوں کا شیوہ ہے'' اور بسیار خوار بچے کے اس عیب کا ذکر اپنے بچے کے سامنے کرے اور کم خوار باادب بچے کی تعریف کرے تاکہ فخر کی رگ اس میں تحریک پائے اور وہ بھی اسی طرح کرنے لگے۔

سفید لباس کو بچے کی نگاہ میں آراستہ کرے اور ریشمی اور رنگین لباس کو اس کی نگاہوں میں ناپسندیدہ ٹھہرائے اور ساتھ ہی یہ کہے کہ عورتوں کا شیوہ ہے یا بننے سنوارنے والوں کا۔ اور خود آرائی مخنثوں کا وطیرہ ہے نہ کہ مردوں کا'' اور مواظب رہے تاکہ وہ بچے جو ریشمی لباس پہنتے ہوں اور اس پر نازاں ہوں بچہ ان سے میل جول نہ رکھے کیونکہ یہ اس کے لئے زیان کا باعث ہوگا کیونکہ وہ بھی اس کی آرزو کرنے لگے گا۔

بچے کو برے شخص کے قریب ہونے سے بھی بچانا چاہئے کیونکہ جس بچے کو ایسے شخص سے بچایا نہیں جاتا وہ شوخ دروغ زن، ضدی اور بے باک ہو جاتا ہے اور پھر یہ برائیاں اس کی طبع سے طویل زمانے میں بھی دور نہیں ہو پاتیں۔ اور جب بچے کو مکتب میں بھیجے اسے قرآن سکھائے۔ اس کے بعد حدیث اور پرہیزگاروں

کی حکایات اور صحابہ اور اسلاف کی سیرت میں مصروف کرے۔ البتہ اس کی اجازت نہ دے کہ وہ اشعار جن میں عورتوں کے حسن و عشق وغیرہ کا بیان ہو اس میں مشغول ہو۔ اور اسے ایسے استاد سے بچائے جو یہ کہتا ہے کہ ''شعر خوانی سے طبیعت میں لطافت پیدا ہوتی ہے'' کیونکہ وہ استاد نہیں بلکہ شیطان ہے کیونکہ وہ تخمِ فساد بچے کے دل میں بوتا ہے۔

اور جب بچہ کوئی اچھا کام کرے اور اس سے نیک خوئی کا اظہار ہو تو اس کی تعریف کرنی چاہئے اور انعام میں ایسی شے دینی چاہئے جس سے وہ خوش ہو جائے اور لوگوں کے سامنے بچے کی اچھی صفات کی تعریف کرنی چاہئے اور اگر بچہ غلطی کرے تو ایک آدھ بار نظر انداز کر دے تا کہ نصیحت کی بے قدری نہ کرے۔ خصوصاً کہ وہ اسے چھپائے رکھے۔ کیونکہ زیادہ روک ٹوک کی جائے گی تو نڈر ہو جائے گا اور آشکارا کرنے لگے گا اور اگر خطا کا اعادہ کرے تو ایک دفعہ خلوت میں تعرض کرے اور کہے کہ ''خبردار کسی کو تمھاری اس حرکت کا علم نہیں ہونا چاہئے کہ اس سے تم لوگوں میں رسوا ہو جاؤ گے اور لوگ تمھاری ذرہ بھر وقعت نہ کریں گے''۔ باپ کو اپنے مرتبے کے مطابق بچے پر نظر رکھنی چاہئے اور ماں کو چاہئے کہ اسے باپ سے ڈرائے۔ بچے کو دن کے وقت سونے سے روکنا چاہئے کیونکہ اس طرح وہ کاہل ہو جائے گا۔ اسی طرح رات کو نرم بستر پر سلانا نہیں چاہئے تا کہ اس کا جسم قوی ہو۔ اور روزانہ اسے ایک گھنٹہ کھیل کود کی اجازت ہونی چاہئے تا کہ تربیت پائے اور تنگ دل نہ ہو کیونکہ تفریح کے بغیر بدخو اور کوردل ہو جائے گا۔ بچے کو اس بات کا عادی بنا دینا چاہئے کہ سب کے ساتھ عاجزی سے پیش آئے اور دوسرے بچوں میں فخر کا اظہار نہ کرے اور لاف زنی نہ کرے۔ اور مواظبت کریں کہ آپ کا بچہ دوسروں سے نہ مانگے بلکہ عطا کرے اور اسے کہا جائے کہ 'مفت میں لینا بھیک منگوں اور بے ہمتوں کا شیوہ ہے''۔ اور زر و مال اور ساز و سامان کے لالچ کی عادت کسی سے سیکھے تو والدین کو چاہئے کہ اسے اس پر عمل پیرا نہ ہونے دیں کیونکہ یہ اس کے لئے زہرِ قاتل ہے جس سے وہ برے کاموں میں لگ جائے گا۔

بچے کو یہ بھی سکھایا جائے کہ تھوک یا ناک لوگوں کے سامنے صاف نہ کرے۔ اور جب بیٹھے تو دوسروں کی طرف پیٹھ کر کے نہ بیٹھے۔ بلکہ مؤدب ہو کر بیٹھے اور ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر نہ بیٹھے کیونکہ یہ کاہلی کی علامت ہے اور بسیار گوئی نہ کرے۔ اور قسمیں نہ کھائے اور جب تک اس سے پوچھا نہ جائے بات نہ کرے اور اپنے سے بڑے کا احترام کرے اور چلتے ہوئے بزرگوں سے آگے نہ نکلے۔ اپنی زبان کو لعنت اور فحش سے بچائے جب استاد اس کی سرزنش کرے تو بچے سے کہے کہ زیادہ فریاد و فغان نہ کرے شفیع کو نہ پکارے اور صبر کرے ایسے میں بچے سے کہنا چاہئے کہ ''مردوں کا کام یہی ہے اور رونا دھونا اور چیخ و پکار عورتوں اور کنیزوں کا

کام ہے''۔ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے وضو اور نماز کا حکم دے لیکن نرمی کے ساتھ اور جب دس سال کا ہو جائے تو اگر نماز میں تقصیر کرے تو سختی سے تادیب کرے۔ چوری، حرام خوری اور دروغ گوئی کو اس کی نظروں میں زشت ٹھہرائے اور ہمیشہ ان کی مذمت کرے جب بچے کی پرورش اس نوع کی ہوگی تو جب وہ بالغ ہو جائے تو ان آداب کی حقیقت اس پر منکشف کرنی چاہیے۔ بتایا جائے کہ ''کھانے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو خدائے تعالیٰ کی فرماں برداری کے لئے قوت حاصل ہو اور دنیا سے مقصود زادِ آخرت حاصل کرنا ہے کیونکہ دنیا ہمیشہ کسی کے ساتھ نہیں رہتی۔ اور مرگ ناگاہ آتی ہے۔ عقل مند وہ ہوگا جو دنیا سے زادِ آخرت حاصل کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو اور بہشت میں جائے اور بہشت و دوزخ کے خصائص اس کے سامنے بیان کرنے چاہئیں۔ اسی طرح اعمال کے ثواب و عذاب کا بیان اس سے کیا جائے اگر بچے کو شروع ہی سے ادب کے ساتھ پرورش کیا گیا ہو تو یہ باتیں اس کے دل میں ایسے نقش ہوں گی جیسے پتھر پر لکیر۔ اور اگر والدین نے فروگذاشت کی ہو تو یہ نصائح بچے کی نظروں سے یوں گر جائیں گی جیسے کچی دیوار سے مٹی گرتی ہے۔

سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ میں تین سال کا تھا، تو میں رات کے وقت اپنے ماموں محمد سوار کو نماز عشاء ادا کرتے دیکھتا تھا۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا کہ ''وہ اللہ جس نے تجھے پیدا کیا ہے تو اپنے بیٹے کو اسے ایک دفعہ یاد نہ کرائے گا؟'' تو میں نے کہا کہ اسے کیونکر یاد کروں؟ تو کہنے لگے کہ ''رات کو جب تو سونے لگے تو تین دفعہ دل سے کہے زبان سے نہیں کہ ''اللہ تعالیٰ میرے ساتھ ہے، وہ مجھے دیکھ رہا ہے وہ میری طرف متوجہ ہے'' تو میں نے پوچھا کہ کتنی دفعہ مجھے یوں کہنا ہوگا؟'' تو کہا کہ ''ہر رات سات دفعہ کہہ'' تو میں اسی طرح کہتا رہا پھر کہا کہ ''پندرہ بار کہہ'' تو میں پندرہ بار کہنے لگا۔ تو میرے دل میں اس کی لذت و حلاوت جاگزین ہوگئی۔ اور جب اس طرح ایک سال گذر گیا تو فرمایا کہ ''جو کچھ میں نے تمھیں بتایا ہے ساری عمر اسے یاد رکھنا۔ یہاں تک کہ تجھے قبر میں اتار دیں۔ تو یہ ورد تمھاری دستگیری اس دنیا میں بھی کرے گا اور اُس جہان میں بھی۔ چند سال کا ورد ایسا تھا کہ اس کی حلاوت میں نے اپنے باطن میں نمودار پائی۔ پھر میرے ماموں نے مجھے کہا کہ ''وہ شخص کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہو اور اسے دیکھ رہا ہو اور اس پر متوجہ ہو تو اس قسم کا شخص گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اس لئے کبھی معصیت کا ارتکاب نہ کرنا۔ کیونکہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے''۔ اس کے بعد مجھے مکتب میں بھیج دیا گیا۔ میرا دل پریشان رہنے لگا تو میں نے استدعا کی کہ مجھے ایک گھڑی سے زیادہ کے لئے مکتب نہ بھیجا جائے۔ حتی کہ میں نے قرآن کی تحصیل کی۔ اس وقت میں سات سال کا تھا۔ جب دس سال کا ہوا تو لگاتار روزہ رکھتا تھا۔ جو کی روٹی کھاتا تھا۔ یہاں تک کہ بارہ سال کا ہو گیا۔ تیرہویں سال میرے دل میں ایک سوال پیدا ہوا تو میں نے کہا کہ

''مجھے بصرہ بھیجئے تا کہ یہ مسئلہ علمائے بصرہ سے پوچھوں'' انھوں نے مجھے بصرہ بھجوادیا۔ میں نے تمام علمائے بصرہ سے اس مسئلے کے بارے استفسار کیا لیکن وہ حل نہ کر سکے۔ مجھے آبادان کے ایک شخص کے بارے میں بتایا گیا تو میں وہاں پہنچا۔ اس نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔ ایک عرصہ تک میں اس شخص کی خدمت میں رہا پھر تستر (شوستر) میں لوٹ آیا۔ میں نے ایک درم چاندی کے جَو خریدے اور روزہ نانِ جویں سے افطار کرتا تھا۔ بغیر کسی سالن وغیرہ کے۔ ایک سال ایک درم چاندی پر کفایت کرتا تھا۔ پھر میں نے عزم کیا کہ تین دن رات کچھ نہیں کھاؤں گا۔ جب اس پر قادر ہو گیا تو اس کے بعد پانچ شبانہ روز کا روزہ رکھا۔ پھر سات شبانہ روز کا حتیٰ کہ میں نے اسے پچیس شبانہ روز تک بڑھا دیا اور میں کوئی چیز نہ کھاتا تھا اور بیس برس میں نے اسی طرح صبر کیا اور رات بھر عبادت میں رہتا تھا''۔

یہ حکایت جو ہم نے بیان کی تو مقصد یہ تھا کہ معلوم ہو جائے کہ ہر بڑے کام کا بیج بچپن ہی میں بچے کے دل میں بویا جاتا ہے جس کا ظہور بعد میں ہوتا ہے۔

ابتدائے مجاہدہ میں جو شرائط مرید ہیں ان کا اور ریاضت سے راہِ دین پر چلنے کی کیفیت کا بیان

معلوم رہے کہ جو شخص حق کو نہ پہنچا تو سبب اس کا یہ ہے کہ راہ ہی پر نہیں چلا۔ اور جس نے حق کی جانب راہ نہ لی وہ اس لئے کہ اس نے طلب ہی نہیں کی۔ اور جس نے طلب نہ کی وہ اس لئے کہ اسے علم ہی نہ تھا اور ایمان اس کامل نہ تھا کیونکہ جو کوئی جانتا ہو کہ دنیا منغص ہے اور چند روزہ ہے۔ جب کہ آخرت صاف ستھری ہے اور مدامی ہے۔ تو اس کے دل میں زادِ آخرت کی طلب پیدا ہو جاتی ہے اور اس پر کچھ مشکل نہیں ہوتا کہ وہ حقیر چیز کو نفیس شے کے عوض دے دے۔ جیسے کہ آج مٹی کا پیالہ ترک کر کے کل کوزۂ زرین ملنے والا ہو تو کچھ مشکل نہ ہوگا۔

پس اس جملہ صورتِ حال کا سبب ضعفِ ایمان ہوگا اور ضعفِ ایمان کا سبب رہبروں کا فقدان ہوگا۔ کیونکہ راہِ دین کے رہبر اور رہ نما پرہیز گار ہوتے ہیں اور علمائے پرہیز گار باقی نہیں رہے اور چونکہ رہبر و رہنما نہیں ہیں۔ لہٰذا راہِ دین خالی ہے اور اس طرح لوگ اپنی سعادت سے محروم رہ گئے ہیں۔ اور علماء میں سے جو باقی ہیں بدقسمتی سے دنیا ان کے دلوں پر غالب ہے۔ جب وہ خود طلب دنیا میں مگن ہوں تو وہ لوگوں کو دین و آخرت کی طرف کیسے بلائیں۔ اور دنیا کی راہ آخرت کی راہ کے برعکس ہے کہ دنیا و آخرت میں بعد المشرقین ہے۔ ایک مشرق میں ہے تو دوسری مغرب میں ہے۔ تو جس قدر ایک کے قریب ہوگا تو دوسری سے اس قدر بعید ہوگا۔

پس اگر کسی کے ہاں حق تعالیٰ عزوجل کی محبت پیدا ہوگی تو وہ من جملہ ان کے ہوگا کہ حق تعالیٰ جن کے

بارے میں فرماتے ہیں کہ: ''وَمَن ارادَ الآخرۃ'' تو چاہئے کہ جانے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ ''وسعٰی لھا سعیھا'' تو یہ سعی کیا ہے؟ یاد رہے کہ یہ سعی راستہ طے کرنا ہے اور اس کے راہی کی اوّلین شرط یہ ہے کہ پہلے بجالائے اور پھر ایک دستاویز ہے کہ جس سے گناہوں سے بچا جائے۔ پھر ایک پناہ گاہ ہے اور قلعہ کہ جس کے ذریعے پناہ دی جانی چاہئے۔

حق تعالیٰ اور خلق کے درمیان حجابات

شرط یہ ہے کہ پہلے اپنے اور حق تعالیٰ کے درمیان حجاب کو اٹھادے تاکہ اس قوم میں سے شمار نہ ہو جس کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے کہ: وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا (قرآن: ۳۶/ ۹) ''ہم نے ان کے آگے دیوار کھڑی کردی (تاکہ حق کو نہ دیکھیں) اور ان کے پیچھے بھی دیوار کھڑی کردی (تاکہ حق کو نہ سن پائیں)'' اور یہ حجاب چار ہیں: ''مال، جاہ، تقلید اور معصیت''۔

مال اس بنا پر حجاب ہے کہ دل کو مشغول رکھتا ہے۔ اور انسان راہِ حق فارغ دل کے بغیر طے نہیں کرسکتا۔ تو چاہئے کہ مال کو راہ سے ہٹادے اور صرف اس قدر کہ جس سے مشغولی اس میں نہ ہو وہ بقدر ضرورت پاس رکھے۔ اور اگر کوئی ایسا ہو کہ جو خالی ہاتھ ہو اور کفالت اس کی کسی اور کے ہاتھ میں ہو تو وہ یہ راہ جلد طے کرلے گا

حجابِ جاہ وحشمت اس طرح اٹھ سکتا ہے کہ سالک فرار کرکے ایسی جگہ چلا جائے جہاں لوگ اسے پہچانتے نہ ہوں۔ کیونکہ جب تک نامدار ہوگا۔ تو ہمیشہ خلق اور اقبالِ خلق میں مشغول رہے گا۔ اور جو کوئی خلق سے لذت حاصل کرے وہ حق کو نہیں پہنچ سکتا۔

اور تقلید حجاب اس بناء پر ہے کہ جب کسی کا مذہب اختیار کیا اور بر سبیل جدل اس کی بات سنی تو کسی اور شے کے لئے جگہ اس کے دل میں نہ رہی۔ تو چاہئے کہ اس کو فراموش کردے اور لا الٰہ الا اللہ کے معنی پر ایمان لائے۔ اور اس کی تحقیق خود اپنے آپ سے طلب کرے۔ اور تحقیق اس کی یہ ہوگی کہ سوائے حق تعالیٰ کے اس کا کوئی اور معبود باقی نہ رہے گا۔ کیونکہ جس پر ہوا و ہوس غالب ہو تو ہوا و ہوس ہی اس کا معبود ہوں گے۔ اور جب مرید پر یہ حال محقق ہو جائے گا۔ تو چاہئے کہ تحقیق کے لئے مجاہدے سے کام لے نہ کہ مجادلے سے۔

اور معصیت سب سے بڑا حجاب ہے کیونکہ جو کوئی معصیت پر مصر ہوگا۔ اس کا دل تاریک ہوگا تو حق کس طرح اس پر منکشف ہو؟ خصوصاً جب اس کا کھانا پینا حرام ہو۔ کیونکہ حلال روزی نورِ دل کے لئے جس قدر موثر ہوتی ہے اور کوئی شے نہیں ہو پاتی۔ اور بنیادی بات یہ ہے کہ لقمۂ حرام سے پرہیز کرے۔ اور روزی صرف حلال کھائے اور جو کوئی یہ چاہتا ہے کہ دین اور شریعت کے اسرار اس پر منکشف ہوں قبل اس کے کہ ظاہر شرع معاملت

میں بجالائے تو اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو عربی زبان سیکھنے سے پہلے تفسیر قرآن جاننا چاہتا ہو۔

دلیلِ راہ: مرید جب یہ حجابات اٹھادے تو مثال اس کی ایسے ہے جیسے کہ کوئی وضو کرلے اور نماز کے لائق ہو جائے۔ اب اسے امام کی حاجت ہو گی جس کا اقتدا کرے اور وہ پیرِ معرفت ہے۔ کیونکہ بغیر پیر کے راہِ دین طے کرنا ممکن نہیں کیونکہ یہ راہ پوشیدہ ہے اور ابلیس کی راہیں راہِ حق سے آمیختہ ہیں۔ راہِ حق فقط ایک ہے اور راہِ باطل ہزاروں ہیں۔ تو بغیر راہنما کے راہِ حق پر چلنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے اور جب پیر مل جائے تو اپنا سارا کام اس پر چھوڑ دے اور اپنے تصرّف سے دست کش ہو جائے اور جان لے کہ پیر کی خطا میں بھی اس کا فائدہ خود اپنے صواب سے بھی بڑھ کر ہو گا۔ اور جو کچھ اپنے پیر سے سنے اور وجہ اس کی نہ جانتا ہو تو چاہئے کہ موسیٰ اور حضر علیہم السلام کے قصے کو یاد کرے۔ کیونکہ وہ پیر و مرید کی حکایت ہی میں ہے کیونکہ مشائخ ایسی چیزوں کے عالم ہوتے ہیں کہ جو عقل کے بس کی بات نہیں ہوتیں۔

جالینوس کے زمانے میں ایک شخص کے دائیں ہاتھ کی انگلی میں درد اٹھا تو ناقص طبیبوں نے اس کی انگلی پر دوا لگائی لیکن فایدہ نہ ہوا۔ جالینوس نے اس شخص کے بائیں کندھے پر دوا لگائی تو لوگ کہنے لگے کہ یہ کیسی حماقت ہے کہ درد تو اِس طرف ہے اور دوا اس طرف! اس سے کیا فایدہ ہو گا۔ لیکن انگلی بہتر ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ جالینوس جانتا تھا کہ خلل پٹھے کی جڑ میں پیدا ہوا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اعصاب دماغ اور پشت کی جانب سے آتے ہیں۔ مقصود اس مثال سے یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ مرید کے باطن میں مرید کو خود کوئی تصرف نہ کرنا چاہئے۔

میں نے خواجہ بوعلی فارمذیؒ سے سنا کہ آپ نے فرمایا کہ ''ایک دفعہ اپنے شیخ ابوالقاسم گورگانی کے حضور کہ میرے پیر تھے میں اپنا ایک خواب بیان کر رہا تھا۔ تو وہ مجھ سے ناراض ہو گئے اور پورا ایک مہینہ مجھ سے بات نہ کی۔ جب کہ مجھے اس کی کوئی وجہ معلوم نہ تھی۔ یہاں تک کہ آپ نے فرمایا کہ ''خواب کی حکایت میں تو نے اُس خواب میں اس طرح کہا کہ تو کہ ایک شیخ ہے۔ تو نے خواب میں مجھ سے بات یوں کہی؟ میں نے کہا کیوں؟'' آپ نے فرمایا کہ ''اگر تیرے باطن میں چرا (کیوں؟) کی جگہ نہ ہوتی تو خواب میں یہ لفظ تمھاری زبان پر نہ آتا''۔

پس جب مرید نے اپنا کام پیر کو تفویض کر دیا تو پیر کا سب سے پہلا کام یہ ہو گا کہ مرید کو ایک حصار میں لے لے تاکہ آفات اس کے اردگرد نہ رہیں۔ اور اس حصار کی چار دیواریں ہیں: ایک خلوت، ایک خاموشی، ایک بھوک تو ایک بے خوابی؛ بھوک شیطان کی راہ بند رکھے گی، اور کم خوابی دل کو منور کرتی ہے اور خاموشی بیان کی

پریشانی کو دل سے دور رکھتی ہے۔ اور خلوت خلق کی ظلمت کو اس سے دور رکھتی ہے اور اس کے کان اور آنکھ کے راستوں کو بند رکھتی ہے۔

سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ ''صوفیاء میں جو لوگ ابدالوں میں ابدال کے مرتبے کو پہنچے ہیں وہ خلوت' بھوک' خاموشی' اور بے خوابی ہی سے اس مرتبے کو پہنچے ہیں''۔

مرید جب راہِ مشغلہ سے باہر نکل آیا تو اب راہِ سلوک پر گامزن ہوگا۔ اور راہ کا آغاز یوں ہوگا کہ راہ کے عقبات (راہِ دشوارِ کوہستان) کو پہلے قطع کرے گا اور عقبات راہِ دل میں مذموم صفات ہیں۔ اور وہ ایسے کاموں کی جڑ ہیں جن سے دور رہنا چاہئے جیسے کہ مال وجاہ وتنعم کی حرص ہے یا تکبر وریا وغیرہ۔ تاکہ مشغلے کا مادہ باطن سے کٹ جائے۔ اور دل ان سے خالی ہو جائے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ اس کا باطن بیشتر سے خالی ہو اور ایک چیز سے زیادہ آلودہ نہ ہو۔ پس اسے قطع کرنے کی سعی کرے اس طریق سے جسے شیخ صواب سمجھتا ہو جو مرید کے لئے مناسب تر ہو۔ اور یہ اختلافِ احوال کے پیش نظر مختلف ہوتا ہے۔ اب جب ارضِ دل خس وخاشاک سے پاک ہوگئی تو اب اس میں بیج بونا شروع کرے اور بیج حق تعالیٰ کا ذکر ہے۔ چونکہ غیرِ خدا سے باطن خالی ہو گیا۔ پس اب مرید گوشہ گیر ہو کر اللہ اللہ کہنا شروع کرے' دوام کے ساتھ' دل اور زبان دونوں کے ذریعے۔ یہاں تک کہ زبان خاموش ہو جائے لیکن دل ذکر کرنے لگے۔ پھر ایک وقت وہ آتا ہے کہ دل بھی ذکر سے رک جاتا ہے اور اس کلمے کے معنی دل پر غالب ہو جاتے ہیں۔ وہ معنی جو حروف سے بے نیاز ہوتے ہیں اور وہ عربی ہوتے ہیں نہ فارسی کہ دل سے کہنا بھی بیان ہے اور بیان اس بیج کا قشر ہے نہ کہ عین بیج۔ پس چاہئے کہ یہ معنی دل میں متمکن ہو جائیں۔ اور مستولی اور غالب ہو جائیں۔ اس طرح کہ دل کو اس پر مامور کرنے کے لئے تکلف کی ضرورت نہ پڑے۔ بلکہ ایک عاشق کی طرح دل کو اس معنی کے ورد سے باز نہ رکھ سکے۔

شبلیؒ نے اپنے مرید کو حصر کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تو ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ میرے پاس آئے اور اگر سوائے خدائے تعالیٰ کے کوئی چیز تیرے دل میں گذرے تو تیرا میرے پاس آنا حرام ہے''۔

پس جب مرید نے وساوسِ دنیا سے دل کو پاک کر لیا۔ اور یہ بیج ڈال دیا تو اب کوئی شے باقی نہ رہی جو اختیار سے تعلق رکھتی ہو۔ کیونکہ اختیار جہاں تک ممکن تھا ہو چکا۔ پس اس کے بعد انتظار کرے کہ یہ کیا اگتا ہے اور نمو پاتا ہے۔ اور اکثر یہ تخم ضائع نہیں جاتا۔ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: ''مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَۃِ نَزِدْ لَہٗ فِیْ حَرْثِہٖ'' (قرآن: ۴۲/۲۰) فرمایا'' (جو کوئی آخرت کا کام کرتا ہے اور تخم افشانی کرتا ہے تو ہم اسے فروغ دیتے ہیں)''۔

اس مرحلے میں مریدوں کے احوال مختلف ہوتے ہیں کوئی ایسا ہوتا ہے کہ اس کلمے کے معنی اس پر

آشکار ہونے لگتے ہیں اور باطل خیال بھی پیش آتے ہیں اور کوئی ایسا ہوتا ہے جو ان باطل خیالوں سے بھی پاک ہوتا ہے اور جواہرِ ملائکہ اور انبیاء کی ارواح اسے خوبرو پیکروں میں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ جیسے کہ خواب میں ہوتی ہیں۔ اسی طرح بیداری میں بھی دکھائی دیتی ہیں جنھیں وہ دیکھتا ہے۔ اور اس کے بعد اور احوال ہیں کہ تفصیل جن کی دراز ہے اور ان کے بیان سے کوئی فایدہ بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ عمل کی راہ ہے۔ قول کی نہیں اور ہر کسی کے ہاں مختلف صورتیں پیش آتی ہیں اور جو سلوک کی راہ چلنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اولیٰ تر یہ ہے کہ اس نے اس میں سے کچھ نہ سنا ہو کہ اس کے انتظار میں دل مشغول ہو جائے اور یہ حجاب بن جائے۔ جس قدر علم کو اس راہ میں تصرف ہے یہیں تک ہے اور کہنے کا مقصود یہ ہے کہ تا کہ اس سے ایمان ظہور پذیر ہو۔ اور علماء میں سے اکثر اس کے منکر ہیں اور جو کچھ رسمی تعلیم و تعلم میں ہے وہ اس کے سوا کسی اور طریق پر یقین نہیں رکھتے۔

•••

اصلِ دوم: دین کی راہ کے عقبات شکم و شرمگاہ کی شہوات ہیں

معلوم رہے کہ انسان کا معدہ جسم کا حوض ہے اور وہ رگیں جو اس سے ہفت اندام کو پہنچتی ہیں وہ نہروں کی طرح ہیں۔ اور تمام شہوات کا منبع معدہ ہے اور آدمی پر غالب ترین شہوت ہے اور آدم اس شہوت کے باعث بہشت سے باہر ہوا۔ اور پھر یہ شہوت دوسری جملہ شہوات کی اصل ہے۔ جب شکم سیر ہو جاتا ہے تو نکاح کی شہوت حرکت میں آتی ہے اور شکم اور شرمگاہ کی شہوت کا قیام مال کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے مال کی حرص پیدا ہو جاتی ہے۔ اور مال جاہ وحشمت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا اس لئے جاہ کی آرزو جنم لیتی ہے اور مال و جاہ کی حفاظت خلق کے ساتھ خصومت کے بغیر ممکن نہیں۔ تو اس سے حسد، تعصب، عداوت، کبر، ریا، کینہ اور جدل وغیرہ سب وجود میں آتے ہیں۔

علاج شہوتِ شکم: پس معدے کو کھلی چھٹی دے دینا تمام گناہوں کی جڑ ہے اور شکم اور بھوک کو کنٹرول میں رکھنا تمام نیکیوں کی اصل ہے ہم اس اصل میں بھوک کی فضیلت بیان کریں گے۔ پھر بھوک کے فوائد بیان کریں گے۔ پھر کم خوری کی ریاضت کا طریق بیان کریں گے۔ پھر لوگوں میں اس کے اختلاف کا بیان کریں گے۔ پھر کم خوری کے ذریعے ریا کی آفت کا ذکر کریں گے۔ پھر شہوتِ فرج کی آفت کا بیان ہوگا۔ اور جو کوئی اس شہوت کو کنٹرول میں رکھے گا اس کے ثواب کا بیان ہوگا۔

بھوک کی فضیلت معلوم کرنا اور اس کا ثواب: آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''بھوک پیاس میں اپنے

ساتھ جہاد کرو کیونکہ ثواب اس کا کُفّار کے ساتھ جہاد کا سا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی عمل بھوک پیاس سے عزیز تر نہیں''۔ نیز فرمایا کہ ''جس نے پیٹ کو پُر کرلیا اسے ملکوتِ آسمان کی راہ نہیں دی جاتی''۔ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ فاضل ترین کون سا ہے؟ تو آپ نے فرمایا ''وہ جو کم کھاتا ہے کم ہنستا ہے اور جو کچھ اس کی شرمگاہ کو چھپائے اس پر قانع ہو''۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تمام اعمال کی سردار بھوک ہے'' نیز فرمایا کہ ''لباس پہنو اور کھاؤ پیو لیکن نیم شکم کہ یہ نبوت کا ایک جزو ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''فکر آدھی عبادت ہے اور کم خوری کامل عبادت ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سے فاضل ترین وہ ہے جس کا تفکر اور بھوک طویل تر ہوں اور تم میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک دشمن ترین وہ ہے جو کھانا بہت کھائے اور پانی بہت پیئے اور بہت سوئے'' نیز فرمایا کہ ''حق تعالیٰ اپنے فرشتوں کے سامنے اس شخص پر جو کم خور ہے فخر و مباہات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''دیکھو میں نے اسے طعام کی آرزو میں مبتلا کردیا لیکن اس نے میرے لئے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ تو اے فرشتو گواہ رہنا کہ اس نے جو لقمہ ترک کیا میں اس کے عوض بہشت میں اسے درجہ عطا کروں گا''۔ نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اپنے دلوں کو خورد و نوش کی کثرت سے مردہ نہ بناؤ کیونکہ دل ایک کھیتی کی طرح ہے۔ اس لئے اگر پانی اس میں بکثرت داخل ہوجائے تو وہ مرجاتی ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''انسان کسی ظرف کو شکم سے زیادہ بری طرح پُر نہیں کرتا انسان کو صرف چند لقموں کی ضرورت ہے جن سے اس کی کمر سیدھی رہے۔ اگر ناگزیر ہو تو ایک تہائی شکم کھانے کے لئے ہے اور ایک تہائی پانی کے لئے ہے اور ایک تہائی سانس لینے کے لئے ہے''۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ''ایک تہائی ذکر کے لئے''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ''اپنے آپ کو بھوکے ننگے رکھو تاکہ تمھارا دل حضرتِ حق کا مشاہدہ کرسکے''۔ اور ہمارے پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح رگوں میں جاری ہے۔ اس لئے اس کا راستہ بھوک کے ذریعے تنگ کرو''۔ نیز فرمایا کہ مومن ایک رُودہ بھر کھاتا ہے لیکن منافق اس کا سات گنا''۔ مطلب یہ کہ منافق کی خوراک اور شہوت مومن کے مقابلے میں سات گنا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''بہشت کا دروازہ مسلسل کھٹکھٹاتے رہو تاکہ تمھارے لئے دروازہ کھول دیں''۔ تو میں نے پوچھا کہ ''اے اللہ کے رسول کس شے سے دروازہ کھٹکھٹائیں؟'' فرمایا ''بھوک پیاس سے''۔ بو جحیفہؓ کو آنحضرت کے سامنے ڈکار آ گیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس ڈکار کو خود سے دور رکھو کیونکہ جو اس دنیا میں شکم سیر ہے وہ اُس جہان میں گُرسنہ تر ہوگا''۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ آنحضرت کبھی سیر ہو کر نہ کھاتے تھے اور ایسے بھی ہوتا کہ مجھے ان کی بھوک کی بناء پر ان پر رحم آتا تو میں ہاتھ ان

کے شکم مبارک پر رکھ کر کہتی کہ : ''میرا تن آپ پر قربان ہو! کیا ہو جائے گا اگر آپ دنیا سے اتنا تو کھائیں کہ گرسنہ نہ رہیں؟'' تو آپ فرماتے ''میرے بھائی اولوالعزم پیغمبر جو پہلے گذرے ہیں انھوں نے حق تعالیٰ سے کرامتیں پائی ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں تنعم کروں تو میرا درجہ ان سے کمتر ٹھہرے گا اس لئے چند روز تھوڑے پر قناعت کو دوست تر رکھتا ہوں۔ اس سے کہ وہاں میرا حصہ کم تر ہو جائے۔ اور مجھے کوئی شے اس سے عزیز تر نہیں ہے کہ میں اپنے بھائیوں (پیغمبروں) کے برابر قرار پاؤں۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ اللہ کی قسم اس کے بعد آپ سات دن سے زیادہ زندہ نہ رہے''۔

حضرت فاطمہ ؓ کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ آنحضرت ﷺ کے پاس آئیں تو آپ ﷺ نے کہا: ''یہ کیا ہے؟'' تو کہا میں نے ایک روٹی پکائی تھی لیکن میں آپ کے بغیر کھا نہ سکی'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''تین دن کے بعد یہ پہلا کھانا ہے جو تیرے باپ کے منہ جائے گا''۔ حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ آنحضرت کے گھر میں تین دن بہ تواتر گندمی روٹی کھائی نہیں جاتی تھی''۔ ابوسلیمان دارانی ؒ فرماتے ہیں کہ : ''رات کو کھانے میں ایک لقمہ کمتر کھانے کو رات بھر نماز میں گذارنے پر ترجیح دیتا ہوں''۔ حضرت فضیل ؒ اپنے آپ سے کہتے: ''کس بات سے ڈرتے ہو؟ کیا یہ خوف ہے کہ بھوکے رہو گے؟ افسوس! کہ حق تعالیٰ محمد ﷺ کو اور ان کے اصحاب کو بھوک عطا فرمائے اور ہم جیسوں کو اس تحفے سے محروم رکھے''۔

کہمس ؒ فرماتے ہیں کہ : ''اے اللہ تو نے مجھے بھوکا ننگا رکھا اور لمبی راتوں میں خلوت عطا کی۔ مجھے یہ مرتبۂ قرب کس بناء پر عطا ہوا؟ کیونکہ یہ تو اپنے دوستوں کے ساتھ کرتا ہے''۔ مالک دینار ؒ فرماتے ہیں کہ : ''خوش قسمت ہے وہ کہ جس کے پاس اتنا غلہ ہو کہ اس کے لئے کافی ہو جس سے وہ خلق سے بے نیاز ہو'' محمد واسع ؒ فرماتے ہیں: ''نہیں خوش نصیب وہ جو صبح کے وقت بھوکا ہو شام کو بھی بھوکا ہو اور اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو'' اور سہل تستری ؒ فرماتے ہیں کہ : ''بزرگوں اور داناؤں نے غور کیا تو انہیں کوئی چیز دین و دنیا میں فاقے سے بڑھ کر مفید دکھائی نہ دی اور کوئی چیز آخرت کے لئے پُرخوری سے زیادہ مضر نہ دیکھی''۔ عبدالواحد زید ؒ کا بیان ہے کہ : ''اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنا دوست نہیں ٹھہرایا بجز اہل گرسنگی کے اور کوئی شخص پانی پر چل نہیں سکا بجز گرسنگی کے' اور کسی شخص کو زمین پیمائی کی توانائی نہیں دی گئی کہ جس کے نتیجے میں وہ ہر رات سو فرسنگ کرے سوائے فاقہ زدگی کے''۔ حدیث میں ہے کہ حضرتِ موسیٰ نے ان چالیس دن میں کہ حق تعالیٰ ان سے ہم کلام ہونے والا تھا کوئی چیز نہیں کھائی۔

فاقے کے فوایداور شکم سیری کے نقصانات

یادر ہے کہ بھوک کی فضیلت اس بناء پرنہیں کہ اس میں رنج اٹھانا پڑتا ہے جیسے کہ دوا کی فضیلت اس لئےنہیں ہوتی کہ کڑوی ہوتی ہے۔ بھوک میں دو فایدے ہیں:

فایدۂ اوّل: یہ ہے کہ بھوک دل کو صاف اور روشن کر دیتی ہے۔ جب کہ شکم سیری انسان کو کوردل اور کُند فکر بنادیتی ہے۔ معدہ سے ایسا بخار اٹھتا ہے کہ جو انسان کو احمق بنادیتا ہے۔ تا کہ فکر اس کی پراگندہ ہو جائے۔ اسی بناء پر آنحضرت نے فرمایا ہے کہ: ''اپنے دلوں کو تھوڑا ہنسنے سے زندہ کرو۔ اور پاک کرو فاقے کی مدد سے تاکہ رقیق اور نرم ہو جائے''۔ نیز فرمایا کہ ''جو خود کو بھوکا رکھے تو اس کا دل دانا ہو جاتا ہے اور قوتِ فکر عظیم ہو جاتی ہے''۔ شبلیؒ فرماتے ہیں کہ ''میں کسی دن بھی اللہ کے لئے بھوکا نہیں رہا کہ اس سے میں نے اپنے دل میں کوئی حکمت اور عبرت تازہ نہ پائی ہو''۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''سیر ہو کر مت کھاؤ کیونکہ اس سے تمھارے دل میں سے نورِ معرفت بجھ جاتا ہے''۔ پس جب نورِ معرفت راہِ بہشت ہے اور بھوک پیاس معرفت کی بارگاہ ہے۔ اس لئے بھوکا رہنا بہشت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے مصداق ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ: ''ادیموا اقترع باب الجنة بالجوع ''بہشت کا دروازہ بھوک کی مدد سے کھٹکھٹاؤ''۔

فایدۂ دوم: بھوک پیاس کا فایدہ یہ ہے کہ دل نرم ہو جاتا ہے جس سے ذکر اور مناجات میں مزہ آتا ہے۔ جب کہ سیری سے دل میں قسوت اور سختی پیدا ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذکر زبان تک محدود رہتا ہے اور دل میں نہیں اترتا۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ ''تم میں سے ہر ایک نے اپنے اور اپنے اللہ کے درمیان پُر طعام توبرہ رکھا ہوا ہے اور ہر ایک چاہتا ہے کہ مناجات میں لذت پائے تو ایسا ہرگز ممکن نہیں''۔

فایدۂ سوم: یہ ہے کہ سرمستی اور غفلت دوزخ کا دروازہ ہے۔ شکستگی' بیچارگی اور عاجزی بہشت کی درگاہ ہے۔ شکم سیری' سرمستی اور غفلت پیدا کرتی ہے اور فاقہ عاجری اور شکستگی لاتا ہے اور جب تک انسان خود کو عجز کی نگاہ سے نہ دیکھے کہ اگر ایک لقمہ نہ پائے تو دنیا اس پر تنگ و تاریک ہو جاتی ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی عزت و قدرت کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس بناء پر تھا کہ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں روئے زمین کے خزانوں کی کنجیاں پیش کی گئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا ''نہیں میں نہیں چاہتا سوائے اس کے ایک دن سیری ہو تو دوسرے دن فاقہ ہوتا کہ جب بھوکا ہوں تو صبر کروں اور سیر ہوں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں''۔

فایدۂ چہارم: یہ ہے کہ جب انسان سیر ہو جاتا ہے تو وہ بھوکوں کو بھول جاتا ہے اور خلقِ خدا پر شفقت نہیں برتتا اور عذابِ آخرت کو بھول جاتا ہے۔ اور جب بھوکا ہوتا ہے تو اہلِ دوزخ کی بھوک کو یاد کرتا ہے اور

جب پیاسا ہوتا ہے روزِ قیامت کی تشنگی کو یاد کرتا ہے اور آخرت کا خوف اور خلق پر شفقت بہشت کی درگاہ میں سے ہے۔ اور اسی بناء پر تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے لوگوں نے کہا "روئے زمین کے خزانے تیرے پاس ہیں تو تو گرسنہ کیوں ہے؟" تو آپ نے فرمایا کہ "میں ڈرتا ہوں کہ اگر سیر ہو جاؤں گا تو حاجت مندوں کو بھول جاؤں گا"۔

فائدۂ پنجم: یہ ہے کہ تمام فواید اور سعادتوں کا سردار یہ عمل ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو حاصل کر لے اور شقاوت یہ ہے کہ خود اپنے نفس کا غلام بن جائے اور جس طرح سرکش جانور' سواری کا' سوائے اسے بھوکا رکھنے کے رام اور نرم نہیں ہوتا۔ انسانی نفس کا بھی یہی حال ہے اور اس کا فایدہ ایک یہی نہیں بلکہ بھوک کیمیائے فواید ہے۔ کیونکہ تمام معصیتیں شہوت سے پیدا ہوتی ہیں اور تمام شہوات سیری سے جنم لیتی ہیں۔

ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں "میں نے کبھی سیر ہو کر نہیں کھایا کہ معصیت نہ کی ہو یا معصیت کا ارادہ نہ کیا ہو" اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "آنحضرت ﷺ کے بعد پہلی بدعت جو شروع ہوئی وہ شکم سیری تھی۔ اور جب قوم نے سیر ہو کر کھایا تو ان کے نفس نے سرکشی اختیار کی"۔ اگر بھوک کے باعث اور کچھ فایدہ نہ ہو لیکن شہوتِ فرج ضعیف ہو جائے اور شہوتِ سخن جاتی رہے تو یہ بھی بہت ہے۔ کیونکہ جو سیر ہو کر کھاتا ہے تو یاوہ گوئی اور غیبت میں لگ جاتا ہے اور شرم گاہ کی شہوت غالب ہو جاتی ہے۔ اگر فرج ملحوظ ہو تو آنکھ پر قابو رکھے گا اور اگر آنکھ پر قابو رکھے گا تو دل کی فکر پر قابو رکھے گا تو بھوک ان سب امور کے لئے کافی ہے۔ بزرگوں نے اس لئے فرمایا ہے کہ: "بھوک اللہ تعالیٰ کے خزانے کا ایک گوہر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ عطا اسے کرتے ہیں جو اُسے دوست رکھے۔ اور ہر ایک کو یہ گہر دیا نہیں جاتا"۔ حکماء میں سے ایک کا کہنا ہے کہ "ہر مرید جو ایک سال بھر خالی روٹی کھائے اور وہ بھی اس کے معمول سے آدھی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے دل سے عورتوں کا خیال دور کر دیتے ہیں"۔

فائدۂ ششم: تھوڑا سونے میں ہے۔ جو خصوصاً رات کی عبادات' مناجات اور ذکر و فکر کی اصل ہے۔ جو کوئی سیر ہو کر کھاتا ہے اس پر نیند غالب ہو جاتی ہے اور وہ مردار کی طرح گر پڑتا ہے اور زندگی اس میں کھو دیتا ہے۔ پیروں میں سے ایک دسترخوان پر ہر رات منادی کرتے تھے کہ "اے مریدو! روٹی زیادہ نہ کھاؤ کہ پھر تم پانی زیادہ پیو گے جس کی وجہ سے زیادہ سوؤ گے اور نتیجۃً قیامت کے دن حسرت بھی زیادہ کھاؤ گے"۔ اور ستر صدیقوں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ زیادہ سونا زیادہ پانی پینے کے باعث ہے اور چونکہ انسان کا سرمایہ اس کی عمر ہے اور ہر سانس وہ گوہر ہے کہ جس سے آخرت کی سعادت شکار کی جا سکتی ہے۔ اور نیند زندگی کے لئے مضر ہے اور اسے تباہ کرنے والی ہے۔ تو ایسے میں کون سی چیز نیند کو دور کرنے سے زیادہ عزیز ہو سکتی ہے؟ اور جو

شخص سیری کے ساتھ شب بیداری کرتا ہے وہ مناجات کی لذت سے محروم رہتا ہے۔ سیری سے خواب غلبہ کرتا ہے اور خدشہ ہے کہ انسان مُحتلم ہو جائے اور رات کو غسل نہ کر سکے اور جُنب کی حالت میں رہے تو عبادت سے محروم ہو جائے گا اور غسل سے خطرہ ہے کہ تکلیف پہنچے اور حمام میں جانے کے لئے پیسے پاس نہ ہوں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حمام میں کسی اور کی شرم گاہ پر نظر پڑ جائے جس سے کئی آفتیں وجود پذیر ہوتی ہیں۔ ابوسلیمان دارائیؒ فرماتے ہیں کہ: ''احتلام عقوبت (سزا) ہے اور اسے سیری ہی کا نتیجہ بتاتے ہیں''۔

فایدۂ ہفتم: بھوک کا یہ ہے کہ علم وعمل کے لئے زیادہ وقت میسر ہوتا ہے کیونکہ بسیار خوری کے لئے کھانا پکانا' سونا' خریدنا' بنانا اور اس کے اسباب کا انتظار کرنا بہت سے وقت کو سلب کر لیتا ہے۔ اور پھر قضائے حاجت کے لئے جانے اور طہارت میں ضیاعِ وقت مُستزاد ہے۔ جب کہ وقت کا ایک ایک لمحہ موتی کی طرح گراں قدر ہے اور وقت ہی فی الاصل انسان کا سرمایہ ہے۔ تو اسے بے ضرورت کھونا حماقت ہی قرار پائے گا۔

سرّی سقطیؒ فرماتے ہیں کہ: ''میں نے علی گرگانی کو دیکھا کہ جَو کا آٹا پھانک رہا ہے تو میں نے کہا کہ روٹی بنالی ہوتی تو فرمایا کہ میرے اس تصرف میں اور روٹی بنا کر کھانے میں ستر بار تسبیح کا تفاوت ہے اور میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اس بناء پر چالیس سال ہوگئے ہیں کہ میں نے روٹی نہیں کھائی کہ چبانے میں وقت کھو کر اس منفعت سے رہ جاؤں گا۔ اور بے شبہ جو فاقے کی عادت ڈالے گا تو روزہ رکھنا اس کے لئے آسان ہو جائے گا اور مسجد میں اعتکاف بھی ممکن ہوگا۔ اور ہمیشہ باوضو رہ سکے گا۔ اور اس قسم کے منافع ان لوگوں کے نزدیک جو آخرت کے تاجر ہیں حقیر نہیں ہوتے۔

بوسلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص سیر ہو کر کھاتا ہے اس کا ثمرہ چھ چیزیں ہیں: عبادت میں حلاوت نہیں پاتا اور حکمت کو از بر کرنے کی صلاحیت جاتی رہتی ہے۔ خلق پر شفقت کرنے سے محروم رہتا ہے کیونکہ گمان اس کا یہ ہوتا ہے کہ تمام لوگ اسی طرح سیر ہیں۔ اور عبادت اس پر گراں ہو جاتی ہے اور اس کی شہوتیں فزونی پاتی ہیں اور مومن جب مسجد کا رخ کر رہے ہوتے ہیں وہ شکم سیر مستراح اور طہارت کی راہ لیتا ہے۔

فایدۂ ہشتم: یہ ہے کہ جو کم کھاتا ہے ہمیشہ تندرست رہتا ہے اور بیماری کے رنج' دوا کے خرچ اور طبیب کی ناز برداری اور فصد کھلوانے کی تکلیف اور کڑوی دوا کھانے سے بچا رہتا ہے اور حکماء اور اطباء اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی شے ایسی نہیں جس میں فایدے ہی فایدے ہوں سوائے کم خوری کے جس میں فایدہ ہی فایدہ ہے اور ذرہ بھر زیان نہیں۔ حکماء میں سے ایک کا کہنا ہے کہ بہترین چیز جو انسان کھاتا ہے انار ہے اور بدترین خشک گوشت ہے۔ اور اگر خشک گوشت کم کھائے تو وہ زیادہ انار کھانے کی نسبت بہتر ہے اور حدیث میں ہے کہ

''روزہ رکھو تاکہ تندرست رہو''۔

فائدۂ نہم: یہ ہے کہ جو کوئی کم خور ہو اس کا خرچ کم ہو گا اور اسے زیادہ مال کی حاجت نہ ہو گی۔ اور تمام بلائیں اور معصیتیں اور دلی مصروفیتیں زیادہ مال کی ضرورت پر وقوع میں آتی ہیں۔ جب کوئی یہ چاہے کہ ہر روز اچھی چیز کھائے اور بکثرت کھائے تو وہ تمام دن اس کے لئے تکلیف اٹھائے گا اور جب ہاتھ میں لانا چاہے گا تو مشتبہ اور حرام کی طمع میں لگ جائے گا۔ ایک حکیم کہتا ہے کہ ''میں اپنی بیشتر حاجات کو اس طرح روا رکھتا ہوں کہ میں ان کو ترک کر دیتا ہوں اور یہ میرے لئے آسان ہے''۔ ایک اور دانا کا قول ہے کہ ''جب مجھے قرض کی حاجت ہو تو میں قرض اپنے شکم سے لیتا ہوں یعنی وہ آرزو ہی ترک کر دیتا ہوں''۔ ابراہیم بن ادھمؒ نے کسی شے کا نرخ پوچھا تو لوگوں نے کہا کہ ''گراں ہے'' تو آپ نے فرمایا کہ ''ارخصوہ بالترک'' اسے ترک کر دو آسان اور سستی ہو جائے گی''۔

فائدۂ دہم: یہ ہے کہ جب انسان اپنے شکم پر کنٹرول پالیتا ہے تو صدقہ دینے' ایثار کرنے اور بخشش کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ پیٹ میں جاتا ہے جگہ اس کی کثیف ہوتی ہے اور جو کچھ صدقہ میں دیا جاتا ہے تو اس کا مقام حق تعالیٰ کا خزانہ لطیف ہوتا ہے۔ آنحضرت نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا پیٹ فربہ ہے۔ فرمایا کہ ''اگر یہ جو تم نے اس میں داخل کیا ہے اگر کسی اور جگہ کرتے تو تمھارے لئے بہتر ہوتا''۔ یعنی خدا تعالیٰ کے لئے صدقہ کرتے تو بہتر ہوتا''۔

مرید کے لیے کم خوری اور بروقت خوری کے آداب کا علم

معلوم رہے کہ کھانا حلال ہونا چاہئے اس کے بعد مرید پر لازم ہے کہ تین احتیاطیں ملحوظ رکھے:

پہلی احتیاط: کم کھانے میں۔ مناسب نہیں کہ بسیار خوری سے یک بارگی کم خوری اختیار کرے' کیونکہ مرید اس کی تاب نہیں رکھتا۔ اس سے ضرر کا اندیشہ ہے۔ بلکہ یہ کام بہ تدریج کرنا چاہئے۔ مثلاً اگر ایک روٹی کم کرنا چاہے تو ہر روز ایک لقمہ کم کرتا جائے۔ پہلے روز ایک لقمہ تو دوسرے روز دو لقمے اور تیسرے روز تین لقمے علیٰ ہٰذا القیاس تقریباً ایک ماہ میں ایک روٹی کم کر سکے گا۔ تو جب ایسے کرے گا تو یہ آسان ہو گا تو اس کمی کا پتہ بھی نہ چلے گا۔ اور طبیعت بھی بحال رہے گی۔ پھر وہ مقدار جس پر ٹھہرے گا اس کے چار درجے ہیں:

درجۂ اوّل: عظیم ترین ہے۔ اور وہ درجہ صدیقوں کا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ضرورت کے بقدر قناعت کرے۔ سہل تستریؒ نے اس کو اختیار کیا تھا ان کا فرمان ہے کہ: ''عبادت کے لئے زندگی' عقل اور قوت چاہئے۔ نقصان قوت کا خوف نہ ہو تو کھانا نہیں کھانا چاہئے کیونکہ جو کوئی بھوک کی وجہ سے کمزور ہو گیا ہو اس کے

لئے بیٹھ کر نماز ادا کرنے میں سیر خوری کے ساتھ قیام کے ساتھ ادا کرنے سے زیادہ ثواب ہے۔ لیکن جب یہ خوف ہو کہ نہ کھانے سے زندگی یا عقل میں خلل کا خوف ہو تو کھانا کھانا چاہیئے۔ کیونکہ عقل کے بغیر عبادت ممکن نہیں اور جان خود اصل ہے"۔ لوگوں نے سہل تستریؒ سے پوچھا کہ "آپ نے کیا کھایا ہے"؟ تو آپ نے فرمایا کہ "سال بھر میں میرا کل خرچ تین درم کا تھا: ایک درم کا چاول کا آٹا ایک درم کا شہد اور ایک درم کا روغن جمع کر لیتا تھا۔ ان تینوں چیزوں کو بہم ملا لیتا تھا اور اس کی تین سو ساٹھ قُرصیں بنا لیتا تھا۔ تو میں ہر رات کو اس ایک قرص سے روزہ افطار کر لیتا تھا"۔ تو لوگوں نے سوال کیا کہ آج کل آپ کیسے کھاتے ہیں"؟ تو آپ نے فرمایا "جیسے بھی ہو"۔ اور رہبروں میں ایسے بھی ہیں جو ایک درم کے برابر وزن سے زیادہ کھانا نہیں کھاتے۔ اور ظاہر ہے اس مقدار پر خود کو بتدریج لائے ہوں گے۔

درجۂ دوم: یہ ہے کہ آدھے مُد پر کفایت کرے۔ اور یہ ایک نان اور ایک تہائی نان کے برابر ہوگا۔ اور وہ نان ایک من کا چوتھائی ہوگی۔ بے شبہ یہ تہائی حصہ شکم کا ہوگی جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ "ایک تہائی طعام کے لئے ایک تہائی پانی کے لئے اور ایک تہائی ذکر کے لئے ہے۔ اور ایک روایت کے مطابق ایک تہائی سانس لینے کے لئے۔ اور یہ وہی ہے جو آپ نے فرمایا کہ "انسان کے لئے چند لقمے کافی ہیں" اور چند دس سے کم کی حد ہے۔ خود حضرت عمرؓ سات یا نو لقموں سے زیادہ نہ کھاتے تھے۔

درجۂ سوم: یہ ہے کہ مرید ایک مُد پر کفایت کرے اور وہ تین روٹیوں کے برابر ہوگا۔ اور بے شک یہ بیشتر کے حق میں تہائی سے بڑھ کر نصف تک بڑھ گیا ہوگا۔

درجۂ چہارم: وہ ہے کہ مُرید ایک وقت میں پورا من رزق کھا جائے۔ یا من سے زیادہ تو یہ اِسراف ہوگا اور قرآن کی اس آیت کی خلاف ورزی ہوگا کہ ولاتسرفوا یعنی اندازے سے نہ بڑھو۔ لیکن یہ مقدار وقت زمانہ جثہ اور میزانِ کار کے مطابق متفاوت ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ ہاتھ کھانے سے اس وقت روک لے جب بھوک بھی کسی قدر باقی ہو۔ اور بعضوں نے کوئی اندازہ مقرر نہیں کیا البتہ بے بھوک نہ کھاتے تھے۔ اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتے تھے۔ جب بھوک بھی کسی قدر باقی ہوتی تھی۔ بھوک کی علامت یہ ہے کہ بغیر سالن کے انسان خالی روٹی پر اکتفا کا حریص ہو۔ اور خواہش پر انسان جَو کی روٹی ہو یا چنے کی شوق سے کھا لیتا ہے۔ اور سالن کا آرزو مند بھی ہو تو یہ علامت اس امر کی ہے کہ بھوک سچ مچ نہیں۔ اور بیشتر صحابہ نیم مد سے آگے نہیں بڑھے۔ ایسے بھی تھے کہ ان میں سے ہر ایک ہفتہ بھر میں ایک صاع بھر کھاتا تھا۔ اور ایک صاع چار مُد کے برابر ہوتا ہے اور جب خرما کھاتا تو ڈیڑھ صاع کیونکہ ان میں گٹھلیاں بھی ہوتی ہیں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''حضور کے زمانے میں میرا طعام ایک جمعے سے دوسرے جمعے تک ایک صاع جَو تھے اور اللہ کی قسم میں اس میں کوئی تبدیلی نہ کروں گا حتیٰ کہ اللہ کی بارگاہ میں پہنچ جاؤں''۔ اور آپ ایک گروہ پر طعن و تشنیع کرتے تھے کہ ''تم اب بدل گئے ہو''۔ آنحضرت ﷺ فرماتے تھے کہ ''میرا دوست ترین اور نزدیک ترین شخص وہ ہوگا جو مرتے وقت بھی ویسا ہی ہوگا جیسا کہ آج ہے''۔ ابوذر رضی اللہ عنہ جو فرماتے تھے یہ تھا کہ ''تم پھر گئے ہو کہ تم جو کا آٹا چھان کر استعمال کرنے لگے ہو اور چپاتیاں پکانے لگے ہو اور سالن کے ساتھ کھانے لگے ہو اور لباس تمھارا دن کا اور ہے اور رات کا اور' جب کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں تم ایسے نہ تھے۔ اور اہل صُفّہ کی خوراک دو افراد کے لئے ایک مُد خرما ہوتی تھی۔ اور گٹھلیاں اس سے باہر''۔

سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ: ''اگر سارا عالم خون ہو جائے (جو حرام ہے) تو مومن کے لئے بقدرِ کفایت وہ حلال ہوگا''۔ معنی اس کے یہ ہیں کہ بجز کفایت کی مقدار کے زیادہ نہ کھائے۔ اور اباحتی جو یہ کہتے ہیں کہ ایسے میں جو مومن کے پاس پہنچے حلال ہے تو یہ غلطِ محض ہے کیونکہ ایک خُرما بھی جب صدقے کی مَد میں حضور کو پہنچتا تھا حلال نہ ہو جاتا تھا۔

احتیاطِ دوم:

وقت پر کھانا کھانے کے بارے میں: اس کے بھی تین درجے ہیں: سب سے بڑا درجہ یہ ہے کہ تین روز سے زیادہ تک کچھ نہ کھائے۔ اور ایک شخص تھا جو سات روز سے زیادہ تک پہنچا ہے۔ اور تابعین میں سے بارہ ۱۲ اصحاب گذرے ہیں کہ جنھوں نے چالیس دن تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ ابراہیم ادہمؒ اور سفیان ثوریؒ ہر تیسرے دن کھاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جو کوئی چالیس روز تک کچھ نہ کھائے تو لازماً ملکوت کے عجائب میں سے کچھ اس پر آشکار ہوتا ہے۔ ایک صوفی نے ایک عیسائی راہب سے مناظرہ کے دوران کہا کہ ''تم محمد پر ایمان کیوں نہیں لائے؟'' تو راہب نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن تک کچھ نہ کھایا تھا اور یہ کام سوائے کسی سچے پیغمبر کے ممکن نہیں۔ اور تمھارے پیغمبر نے یہ نہیں کیا''۔ صوفی نے کہا کہ میں اپنے پیغمبر کا ایک امتی ہوں۔ تو اگر میں چالیس روز تک کچھ نہ کھاؤں تو کیا تم ہمارے پیغمبر پر ایمان لاؤ گے؟'' تو راہب نے کہا ''ہاں'' صوفی پچاس روز کے لئے بیٹھ گیا۔ راہب نے کہا ''اس میں اضافہ کرو گے؟'' تو صوفی نے کہا ''ہاں'' تو اس نے ساٹھ دن پورے کر دیئے اور کچھ نہ کھایا۔ تو وہ راہب ایمان لے آیا اور یہ بہت عظیم درجہ ہے اور بہ تکلف کوئی اس درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ اِلّا یہ کسی کو اس دُنیا کے باہر سے کوئی اور عالم دکھائی دیا ہو جو اس کی قوت کو محفوظ رکھتا ہو اور وہ قوت صوفی کو مشغول رکھتی ہو جس کی اسے خبر نہیں ہوتی۔

درجۂ دوم: یہ ہے کہ کوئی دو تین روز کچھ نہ کھائے۔ تو یہ ممکن ہے اور اکثر ایسے ہوتا ہے۔

درجۂ سوم: یہ ہے کہ مرید دن میں ایک بار کھانا کھائے۔ اور یہ پست ترین درجہ ہے۔ جب دن میں دو بار کھایا تو گویا اِسراف کیا۔ تو کبھی بھوک نہ لگے گی۔ آنحضرت ﷺ اگر رات کو کچھ کھاتے تو صبح کو کچھ نہیں کھاتے تھے۔ اور جب صبح کچھ کھاتے تو رات کو کچھ نہ کھاتے تھے۔ آنحضرت نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ ''کبھی اِسراف نہ کرنا'' دن میں دوبارہ کھانا اِسراف ہے''۔ اور اگر دن میں ایک بار کھانا چاہے تو اولیٰ تر یہ ہے کہ صبح کے وقت کھائے تاکہ نماز عشاء میں سبک ہو اور دل صاف ہو۔ اگر ایسا ہو کہ خیال کھانے کی طرف جائے گا تو بہتر ہے کہ ایک دفعہ افطار کے وقت کھائے تو دوسرے وقت سحور کے وقت کھائے۔

احتیاطِ سوم: جنسِ طعام میں ہے۔ سب سے اعلیٰ چھنی ہوئی گندم ہے۔ اور سب سے ادنیٰ ان چھنا جَو اور میانہ چھنا ہوا جَو ہے۔ اور سالن میں سب سے اعلیٰ گوشت اور حلوہ ہے اور کمترین سرکہ و نمک' اور میانہ گوشت کے بغیر روغنی روٹی۔ اور وہ لوگ جنھوں نے آخرت کی راہ اختیار کی تھی وہ سالن سے پرہیز کرتے تھے اور جس شے میں شہواتِ نفس پاتے اس میں نفس کی مخالفت کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ نفس جب اپنی خواہش کی تکمیل پاتا ہے تو اس میں سرمستی اور غفلت اور ظلمت پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر انسان دنیا میں رہنے کو زیادہ دوست رکھتا ہے اور موت کو دشمن سمجھتا ہے۔ اس لئے چاہیئے کہ دنیا کو اپنے اوپر تنگ کرلے تاکہ اس کے لئے قید خانہ بن جائے۔ اور موت اس کے لئے نجات کا باعث ہوگی حدیث میں ہے کہ ''شَرارُ اُمَّتِی الَّذِینَ یَاکُلُونَ مُخَّ الحِنطَةَ'' یعنی میری امت کے بدترین افراد وہ ہیں جو گندم کا مغز کھاتے ہیں اور یہ حرام نہیں لیکن کبھی کبھار اسے کھانا روا ہے۔ اگر بہ دوام اس کا عادی ہوجائے تو تنعم طبیعت پر غلبہ کرتا ہے جس کا خطرہ یہ ہے کہ سرمستی اور غفلت کا شکار ہوجائے۔ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ: ''میری امت میں بدترین وہ گروہ ہے کہ جن کا جسم نعمتِ دنیا کے لئے وقف ہو'' تو ایسوں کی تمام تر ہمت قسماقسم کے لباس اور رنگارنگ کھانوں میں صرف ہوتی ہے اور بے ہودہ لمبی چوڑی باتیں کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ ''اے موسیٰ جان لے کہ مستقر تیرا تیری قبر ہے۔ تو چاہیئے کہ اس جسم کو کثرتِ شہوات سے بچائے'' اور جسے تنعم کے اسباب نصیب ہوئے ہیں اور جس کی ہر آرزو پوری ہوئی ہوا ایسے کو اہلِ نظر اچھا نہ سمجھتے تھے۔

وہب منبہؒ فرماتے ہیں کہ ''چوتھے آسمان میں دو فرشتے ایک ساتھ پہنچے۔ ایک بولا کہ میں جاتا ہوں تاکہ مچھلی کو جال میں پھانسوں کیونکہ فلاں یہودی نے مچھلی کی خواہش کی ہے''۔ دوسرا فرشتہ بولا کہ ''میں بھی جاتا

ہوں کہ ایک پیالہ روغن مہیا کروں کیونکہ فلاں عابد نے روغن کی خواہش کی ہے اور وہ اس کے پاس لائی گئی''۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ شہد ملا ٹھنڈا پانی پیش کیا گیا تو آپ نے نہ پیا اور فرمایا کہ: ''اس کا حساب مجھ سے دور رکھئے کہ مجھے یہی زیادہ عزیز ہے''۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ بیمار تھے۔ انھوں نے مچھلی کے کباب کی خواہش کی تو نافع رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: ''مدینہ میں مچھلی سوائے بڑی جدوجہد کے دستیاب نہیں۔ میں نے ایک مچھلی ڈیڑھ درم چاندی میں خریدی اور کباب بنا کر اُن حضرت کے پاس لے گیا۔ ایک سوالی اتفاق سے ان کے گھر کے دروازے پر آ گیا۔ تو ابن عمر نے فرمایا کہ اسے اٹھاؤ اور اس گدا کو دے دو''۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو آپ کی خواہش پر میں بڑی جدوجہد کے بعد لایا ہوں مجھے اجازت دیجئے میں اس کے بقدر پیسے سوالی کو دے دیتا ہوں۔ تو ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں اِسے اُسی طرح دے دو'' میں نے اُسے دی دی۔ پھر اس درویش کے پیچھے گیا اور اس سے مچھلی میں نے خرید لی اور پیسے اسے دے دیئے۔ اور واپس لا کر میں نے کہا کہ میں نے اس مچھلی کی قیمت درویش کو دے دی اور خرید لایا ہوں۔ تو آپ نے پھر کہا کہ جاؤ یہ مچھلی اسے دو قیمت بھی اس کے پاس رہنے دو کیونکہ میں نے آنحضرت سے سنا ہے کہ: جسے کسی شے کی آرزو ہو اور وہ اس شے کو خرید لائے اور پھر اُس سے اللہ تعالیٰ کے لئے ہاتھ روک لے تو اللہ تعالے اسے بخش دیں گے''۔

عتبۃ الغلام رضی اللہ عنہ خمیر کو دھوپ میں رکھ دیتے تھے جب خشک ہو جاتا تو بغیر پکائے کھا لیتے تھے تا کہ لذت نہ پائیں اور پانی دھوپ سے لے لیتے اور اسی طرح گرم پی لیتے تھے۔

مالک دینارؒ کو چالیس سال دودھ کی آرزو ستاتی رہی لیکن آپ نے نفس کی مخالفت میں ہرگز نہ پیا۔ کوئی شخص ان کے پاس تر خرما لے گیا تو انھوں نے ہاتھ میں لے کر اسے گردش دی پھر دوستوں سے فرمایا کہ تم لوگ کھاؤ میں نے تو اسے چالیس سال ہو گئے نہیں کھایا''۔

احمد بن ابی الحواریؒ ابوسلیمان دارانیؒ کے مرید تھے بیان کرتے ہیں کہ ''ابوسلیمان دارانی نے گرم روٹی کی خواہش کی تھی تا کہ نمک کے ساتھ کھائیں تو میں لے آیا تو انھوں نے اس میں سے ایک لقمہ لیا اور چھوڑ کر رونے لگے اور فرمایا کہ: بارِ خدایا تو نے میری خواہش پوری کر کے میرے سامنے رکھ دی تو کیا مجھے سزا دے گا؟ توبہ کرتا ہوں مجھے بخش دے''۔

مالک بن ضیغمؒ نے فرمایا ہے کہ: ''میں بصرہ کے بازار میں جا رہا تھا۔ تو میں نے ترہ نہایت عمدہ دیکھی اس کی آرزو میرے اندر حرکت میں آئی تو میں نے قسم کھائی کہ نہیں کھاؤں گا۔ اور چالیس سال ہو گئے ہیں کہ میں نے اس پر صبر کیا ہے''۔

مالک دینارؒ فرماتے ہیں کہ پچاس سال ہو گئے میں نے دنیا کو طلاق دے رکھی ہے۔ فقط دودھ کے ایک شربت کی آرزو میں۔ جسے میں نے نہیں پیا اور نہ پیوں گا حتی کہ اپنے اللہ کی بارگاہ میں پہنچ جاؤں''۔

حمادؒ فرماتے ہیں کہ میں داود طائیؒ کے درِ دولت پر پہنچا تو میں نے ان کی آواز سنی کہ فرما رہے تھے کہ : ''ایک دفعہ تو نے گاجر کی تمنا کی تھی تو میں نے تجھے دی اب خُرما کی خواہش کرتے ہو؟ ہرگز نہ ملے گی اور کبھی کھا نہ سکو گے''۔ جب میں اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ وہاں تنہا تھے۔ اب معلوم ہوا کہ خود اپنے جسم سے مخاطب تھے''۔

عتبۃ الغلامؒ نے عبدالواحد بن زید سے کہا کہ ''فلاں اپنے باطن کی ایسی صفت بیان کرتا ہے جو مجھے حاصل نہیں''۔ تو عبدالواحدؒ نے کہا کہ ''وہ ہمیشہ خالی روٹی کھاتا ہے جب کہ تو خرما کے ساتھ روٹی کھاتا ہے''۔ تو عتبہ بولا ''اگر میں بھی ہاتھ روک لوں تو کیا اس درجے کو پہنچ جاؤں گا؟'' تو انھوں نے کہا ''ہاں پہنچ جائے گا''۔ عتبہ کہتا ہے کہ میں نے خُرما سے ہاتھ روک لیا اور رویا تو لوگوں نے کہا ''خرما کے لئے رو رہا ہے؟'' عبدالواحد نے کہا کہ ''اس کا نفس خرما کو دوست رکھتا ہے جب کہ اس کے عزم کا صدق جانتا ہے کہ اب کبھی خرما نہ کھائے گا اس لئے رو رہا ہے''۔

ابوبکر جلاءؒ کہتے ہیں کہ میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں کہ اس کے نفس کو ایک چیز کی خواہش ہے۔ اس کا نفس کہتا ہے کہ ''میں دس روز صبر کرتا ہوں پھر اس کے بعد مجھے دے دینا''۔ تو وہ شخص اپنے نفس سے کہتا ہے ''میں یہ نہیں چاہتا کہ تو دس دن ایک چیز نہ کھائے بلکہ چاہتا ہوں کہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ کھینچ لے''۔

یہ ہے سالکوں اور بزرگوں کی راہ۔ جب کوئی اس درجے کو نہیں پہنچتا تو اسے چاہئے کہ اپنے نفس سے غافل نہ ہو اور شہوات میں حرص کا مرتکب نہ ہو۔ ایثار سے کام لے اور گوشت خوری میں دوام نہ کرے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص چالیس روز متواتر گوشت کھاتا ہے اس کا دل سخت ہو جاتا ہے اور جو چالیس روز تک متواتر نہ کھائے وہ نرم دل ہو جاتا ہے''۔ اور معتدل وہ ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ ''ایک دفعہ گوشت، ایک دفعہ روغن، ایک دفعہ دودھ، ایک دفعہ سرکہ اور ایک دفعہ خالی روٹی''۔

اور مستحب یہ ہے کہ سیری کے ساتھ نہ سوئے کیونکہ اس طرح اس نے دو غفلتوں کو جمع کر لیا ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ نماز اور ذکر میں لگ جاؤ اور کھانے کو چھوڑ دو۔ اور زیادہ نہ سوؤ کیونکہ اس سے دل سیاہ ہو جاتا ہے''۔ کہتے ہیں کہ کھانا کھانے کے بعد چار رکعت نماز ادا کرو اور سو بار تسبیح یا کسی قدر تلاوت قرآن کرو تا کہ طعام کی ابتلاؤں سے نجات ہو''۔

سُفیان ثوریؒ جب کبھی سیر ہو کر کھاتے تو رات بھر عبادت میں لگے رہتے اور فرماتے ''سواری کے

جانور کو جب آپ پیٹ بھر کر کھلائیں تو اسے سخت کام پر مامور کرنا چاہئے''۔ بزرگوں میں سے ایک اپنے مریدوں سے کہتے تھے ''اپنی آرزوؤں کے مطابق نہ کھاؤ اور طلب نہ کرو اور اگر کھاؤ تو طلب نہ کرو اگر طلب کیا تو انھیں دوست نہ رکھو''

اس مجاہدے اور پیر اور مرید کے حکم کے اختلاف کا راز

یادر ہے کہ فاقے کا مقصود یہ ہے کہ نفس شکستہ ہو جائے اور فرماں بردار ہو جائے اور مؤدب ہو جائے اور جب سیدھا ہو جائے تو ان سختیوں سے مستغنی ہو جائے گا۔ اسی لئے ہے کہ پیر مرید کو تو اس قسم کے جملہ احکام دیتا ہے اور خود ان کا عامل نہیں ہوتا۔ کیونکہ مقصود اذیت و فاقہ نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ اتنا ہی کھائے جس سے معدے میں گرانی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ بھوک کا احساس جاتا رہے کیونکہ یہ دونوں جب خود میں مصروف ہو جاتے ہیں تو انسان کو عبادت سے باز رکھتے ہیں اور کمال اس میں ہے کہ انسان فرشتوں کی صفت کا حامل بن جائے۔ کیونکہ فرشتوں کو نہ بھوک کا رنج ہوتا ہے نہ کھانے کی گرانی کی تکلیف لیکن نفس انسانی اس اعتدال سے بہرہ ور نہیں ہوتا اِلّا یہ کہ ابتداء ہی سے اس پر سختی کریں۔ اور بزرگوں میں سے جو خود اپنے بارے میں بدگمان تھے انھوں نے احتیاط کی راہ لی ہے۔ اور ہمیشہ اس کو ملحوظ رکھا ہے اور جو کامل ہوئے وہ حدِ اعتدال پر قائم رہے ہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ آنحضرت کبھی ایسا ہوتا کہ روزہ سے ہوتے اور لوگ کہتے اب افطار نہ کریں گے اور کبھی آپ روزہ سے نہ ہوتے تو لوگ کہتے اب شاید روزہ نہ رکھیں گے۔ اور جب گھر میں کسی شے کو طلب فرماتے اگر ہوتی تو کھا لیتے اور اگر نہ ہوتی تو فرماتے ''میں روزہ رکھتا ہوں''۔ آپ کو شہد پسند تھا اور گوشت کو بھی دوست رکھتے تھے۔

لوگ معروف کرخیؒ کے لئے عمدہ کھانا لاتے تو وہ کھا لیتے جب کہ بشر حافی نہ کھاتے تھے۔ لوگوں نے معروفؒ سے اس بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا ''میرے بھائی بشر حافی کو پرہیز گاری نے پکڑ رکھا ہے۔ اور مجھے معرفت نے کشادہ عطا کی ہے۔ میں اپنے آقا کے ہاں مہمان ہوں جب دیتا ہے میں کھا لیتا ہوں اور جب نہیں دیتا تو میں صبر کرتا ہوں۔ میرے بس میں تصرف نہیں اور نہ کوئی اعتراض یہ احمق لوگوں کی خود فریبی ہے کہ جو کوئی اپنے نفس کی مخالفت کی تاب نہیں رکھتا کہتا ہے کہ ''میں معروف کرخی کی طرح عارف ہوں'' پس اس مجاہدے میں سوائے دو اشخاص کے کوئی دوسرا ہاتھ نہیں روکتا۔ ایک وہ صدیق جو کارِ حق پر قائم ہو دوسرے وہ احمق جو اپنے گمان میں غلطی سے خود کو راہِ راست پر سمجھتا ہے۔ معروف کرخیؒ کے لئے تصرف نہ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اگر لوگ اس کے بارے میں ہاتھ یا زبان سے خیانت کرتے تو اس کے باطن میں کسی

قسم کا غیظ تحریک نہ پاتا اور معروف اسے حق کی طرف سے دیکھتے تو یہ بات اس جیسے کے لئے ہی درست متصور ہوگی۔ اور بشر حافیؒ، سری سقطیؒ اور مالک دینارؒ اور ایسے ہی دوسرے اصحاب جو اپنے نفس سے مطمئن نہ تھے۔ ان سے مجاہدہ روکنے کو نہ کہا گیا ہوگا۔ ناممکن ہے کہ کوئی اس زمانے میں اپنے بارے میں اس قسم کا گمان کرے۔ والسلام۔

شہوت سے ہاتھ روکنے کی ابتلا کا علم

معلوم رہے کہ اس سے دو آفتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ بعض شہوات سے دستکش ہونے پر قادر نہ ہو اور نہیں چاہتا کہ کوئی انھیں جانے اور چھپ کر کھاتا ہے۔ اور برملا نہیں کھاتا۔ تو یہ عین نفاق ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شیطان اُسے فریب دے کہ ''یہ لوگوں کی مصلحت ہے کہ لوگ تیری پیروی کریں''۔ تو یہ فریب محض ہے۔ کوئی شخص ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ جو اپنی خواش کی شے خرید لے اور گھر لے جائے اور لوگ دیکھتے ہوں اور وہ اس پر قادر ہو کہ اسے نہ کھائے اور وہ نہ کھائے بلکہ مخفیانہ صدقہ کردے تو یہ انتہائی صدق ہے۔ اور صدیقوں کا کام ہے۔ اور یہ نفس کے لئے بڑا دشوار کام ہے اور اخلاص کی شرط یہ ہے کہ ایسا کرنا آسان ہو۔ اگر دشوار ہو تو معنی اس کے یہ ہیں کہ دل میں ریائے خفی ابھی باقی ہے۔ تو گویا ریا کی اطاعت کررہا ہے نہ کہ حق کی۔ اور جو کوئی کھانے کی شہوت سے بھاگتا ہے لیکن شہوتِ ریا میں گرفتار ہوجاتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو بارش سے تو گریزاں ہو لیکن بہتے پرنالے کے نیچے بیٹھ جائے۔ اس لئے چاہئے کہ جب انسان کے نفس میں یہ تقاضا نمودار ہو تو لوگوں کے سامنے اپنی اس خواہش سے تھوڑا کھائے۔ اور پورا نہ کھائے تا کہ ریا بھی نہ رہے نہ شہوت ہی رہے۔

شہوتِ فرج، شہوتِ فرج معلوم کرنا

یاد رہے کہ ہم خوابگی کی تمنا انسان پر اس لئے مسلط کی گئی ہے تا کہ تخم ڈالنے کی متقاضی ہو تا کہ نسل انسانی منقطع نہ ہونے پائے۔ اور بہشت کی لذت کا نمونہ بن سکے اور اس شہوت کی آفت بھی بہت عظیم ہے۔ ابلیس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ''کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ بیٹھنا کیونکہ کوئی مرد کسی عورت سے خلوت میں نہیں ہوتا کہ میں وہاں نہ ہوں۔ تا کہ اسے فتنے میں گرفتار کروں''۔

سعید مسیّب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ ابلیس عورتوں کے سبب اس سے ابھی ناامید نہ ہوا ہو۔ اور میں اپنے بارے میں اس سے بڑھ کر کسی اور شے سے نہیں ڈرتا۔ اس لئے گھر یا اپنی بیٹی کے گھر کے علاوہ کسی اور گھر میں داخل ہی نہیں ہوتا''۔

معلوم رہے کہ اس شہوت میں بھی افراط وتفریط اور اعتدال ہے۔ افراط یہ ہے کہ انسان فواحش کے ارتکاب سے شرم نہیں رکھتا اور خود کو سراپا اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور جب یہ حال ہو تو اس کی شکست روزہ کے ذریعے واجب ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر روزے کے باوجود شکست نہ ہو سکے تو ایسے انسان کو نکاح کر لینا چاہئے۔ اور تفریط یہ ہے کہ شہوت کلیۃً مفقود ہو۔ تو یہ نقصان اور کمی ہے۔ اور اعتدال یہ ہے کہ شہوت ہو لیکن قابو میں ہو۔ اور بعض لوگ شہوت کی فزونی کے لئے چیزیں کھاتے ہیں۔ تو یہ جہالت ہے۔ ایسے شخص کی مثال اس کی سی ہے جو بھڑوں کے چھتے کو چھیڑتا ہو کہ اس پر حملہ آور ہوں اور اسے ڈنگ ماریں۔ ماسوا اس شخص کے جس نے نکاح کیا ہو اور مقصود یہ ہو کہ خود کو عورتوں پر نگاہ ڈالنے سے روکے کہ عورتوں کی حفاظت مردوں ہی سے ممکن ہے۔ اور نادر احادیث میں ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ ''میں نے خود میں ضعفِ شہوت کا احساس کیا تو جبریل علیہ السلام نے ہریسہ (حلیم) تجویز کیا۔ اور سبب اس کا یہ تھا کہ آپ ﷺ کی نو بیویاں تھیں جو تمام اہل دنیا پر حرام تھیں اور امید ان کی تمام عالم سے منقطع تھی۔

ان آفاتِ جماع میں سے ایک عشق کی شہوت ہے جو بہت سی معصیتوں کا باعث ہے اور اگر اس کے شروع ہی میں احتیاط نہ کی جائے تو معاملہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور احتیاط آنکھ کو بچانا ہے۔ اگر اتفاقاً کسی پر نگاہ پڑ جائے تو دوسری دفعہ ایسے نہ دیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور اگر انسان تعرض نہ کرے تو پھر نگاہ کو روکنا دشوار ہو جائے گا۔ نفسِ انسانی کی مثال ایسے جانورِ سواری کی سی ہے کہ اگر جانور کسی جگہ کا ارادہ کرے تو اس کو ادھر سے روکنا آسان ہوتا ہے لیکن اگر اس جگہ کے اندر داخل ہو جائے تو اسے دُم سے پکڑ کا باہر کھینچنا دشوار ہوتا ہے۔ پس اصل آنکھ کو باز رکھنا ہے۔

سعید جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''فتنہ داؤد آنکھ ہی کا کیا دھرا تھا'' حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے فرزند سے کہا تھا کہ: ''تو اگر کسی شیر یا اژدہا کا تعاقب کرے تو روا ہے لیکن کسی عورت کے پیچھے مت لگنا''۔

آنحضرت کا فرمان ہے کہ: ''عورتوں کی طرف دیکھنا شیطان کے زہر آلود تیروں میں سے ایک ہے۔ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے خوف سے نگاہ کو روکے لے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسا ایمان عطا فرماتے ہیں کہ حلاوت اس کی خود بخود دل میں آجاتی ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''میری وفات کے بعد عورتوں کے فتنہ سے بڑھ کر اور کوئی فتنہ باقی نہ رہے گا''۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آنکھ اس طرح گناہ کرتی ہے جس طرح عضو تناسل' آنکھ کا زنا غیر محرم کو دیکھنا ہے''۔

پس جو اپنی آنکھ کو باز نہیں رکھ سکتا تو اس کے لئے لازم ہے کہ شہوت کے لئے ریاض کرے۔ شہوت

کے لئے علاج روزہ رکھنے میں ہے۔ اگر موثر نہ ہو تو ایسے شخص کو نکاح کر لینا چاہئے۔

اور اگر کوئی خوب صورت لڑکوں سے آنکھ کو روک نہیں سکتا تو یہ آفت بہت عظیم ہے کیونکہ اس کو حلال نہیں کیا جا سکتا۔ جس کے ہاں شہوت تحریک پائے کہ کسی امرد کو دیکھے اور اس سے راحت پائے تو اس کے لئے اسے دیکھنا حرام ہے۔ سوائے اس کے کہ یہ راحت اس قسم کی ہو جو انسان سبزی اور گل وغنچہ کے مشاہدہ سے پاتا ہے۔ تو اس کا کوئی حرج نہیں کہ بے ضرر ہے۔ علامت اس کی یہ ہے کہ دیکھنے والے کے دل میں قرب کا تقاضا نہ ہو۔ کیونکہ شگوفہ وگل کتنے ہی خوب صورت کیوں نہ ہوں انھیں بوسہ دینے یا ان سے کسی عضو کے ملنے کی خواہش نہیں ہوتی لیکن اگر قربت کا تقاضا ظاہر ہو تو یہ شہوت کی علامت ہے اور لواطت کی طرف قدم اوّل۔

مشائخ میں سے ایک کا فرمان ہے کہ ''میں ایک جوان مرید کے لئے امرد کو خشمگیں شیر سے بھی زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں''۔ مریدوں میں سے ایک کا کہنا ہے ''مجھ پر شہوت اس قدر غالب ہوئی کہ میں اس کی تاب نہ لا سکا۔ میں نے زاری اور دعائیں بہت کیں۔ رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص نے مجھ سے کہا ''تجھے کیا ہو گیا ہے؟'' تو میں نے اپنا حال اسے بیان کیا تو اس نے ہاتھ میرے سینے پر رکھا۔ جب بیدار ہو تو میں نے اسے کافی پایا۔ جب ایک سال گذر گیا تو دکھائی دیا۔ میں بہت رویا اور اس شخص کو خواب میں دیکھا تو اس نے پوچھا کہ ''کیا تم چاہتے ہو کہ کیفیت تم سے جاتی رہے؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا تو بولا ''گردن آگے بڑھاؤ''۔ میں نے گردن آگے بڑھا دی تو وہ ایک تلوار لایا اور میری گردن پر دے ماری۔ تو جب میں بیدار ہوا تو افاقہ ہو چکا تھا۔ ایک سال اور گذر گیا تو میں نے اسے خواب میں دیکھا تو میں نے گریہ زاری اور دعا کی تو وہ بولا'' کہ کب تک اس چیز کو خود سے دور کرنے کی آرزو میں لگے رہو گے جسے دور کرنے کی بجائے حضرت حق دوست رکھتے ہوں''۔ میں جب بیدار ہوا تو میں نے نکاح کیا اور اس بلا سے نجات پائی۔

اس شخص کا ثواب معلوم کرنا جو شہوتِ جماع کے خلاف کرتا ہو

یاد رہے کہ شہوت کتنی ہی غالب ہو ثواب اس کی مخالفت میں اتنا ہی زیادہ ہے۔ اور اس شہوت سے بڑھ کر غلبہ کرنے والی اور کوئی شہوت نہیں۔ لیکن اس شہوت سے شہوتِ بد مراد ہے۔ اور اکثر لوگ جو اس شہوت کے مرتکب نہیں ہوتے اس کی وجہ یا عجز ہے یا شرم ہے یا یہ خوف کہ آشکار ہو جائے گی اور بدنامی کا باعث ہو گی اور جو کوئی اس بناء پر محترز رہے اسے ثواب نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ ایک دنیوی غرض کی طاعت ہے شرع کی طاعت نہیں۔ لیکن اسبابِ معصیت سے عجز خوش بختی ہے کہ عقوبت اور سزا کا مستوجب نہ ہو گا جس سبب سے بھی

رک جائے۔ لیکن اگر کوئی اس کارحرام میں متمکن ہو جائے اور کوئی امر اس میں مانع نہ ہو۔ بہ خوفِ خدا رک جائے اس کا ثواب عظیم ہے۔ وہ ان سات افراد میں سے ہے جو روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں ہوں گے۔ اور بدین معنی درجہ اس کا حضرت یوسف علیہ السلام کے درجے جیسا ہے۔ اور اس دشوار گذار راہ کو طے کرنے والے امام اور مقتدا حضرت یوسف علیہ السلام ہی تھے۔

سلیمان نہایت خوب رُو جوان تھا۔ ایک عورت نے خود کو اسے پیش کیا۔ تو وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ اور کہا کہ "میں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب میں دیکھا تو میں نے کہا کہ "تم یوسف علیہ السلام ہو" تو آپ نے فرمایا: ہاں میں وہ یوسف ہوں کہ جس نے قصد کیا تھا اور تو وہ سلیمان ہے جس نے قصد نہیں کیا"۔ اشارہ اللہ کے اس فرمان کی طرف ہے کہ: "وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا" (قرآن: ۲۴/۱۲) "اس عورت نے اس کا ارادہ کیا اور یوسف علیہ السلام نے اس عورت کا ارادہ کیا" اسی سلیمان کا بیان ہے کہ "میں حج کے لئے جا رہا تھا جب مدینہ سے نکلا تو راستے میں ہم لوگ اس مقام پر اترے جسے ابواء[1] کہتے ہیں تو میرا رفیق طعام خریدنے کے لئے گیا زنانِ عرب میں سے ایک عورت جو چاند کا سا چہرہ رکھتی تھی آئی اور چہرے سے نقاب اٹھا کر مجھ سے کہا "اھنیتی" "میں نے سمجھا کہ روٹی طلب کر رہی ہے تو میں نے دستر خوان طلب کیا تو بولی کہ "میں تم سے وہ مانگ رہی ہوں جو عورتیں مردوں سے طلب کرتی ہیں"۔ سلیمان یسار کہتے ہیں کہ "میں نے سر گریبان میں چھپا لیا اور زاری کرنے لگا۔ اور اتنی دیر رویا کہ وہ عورت چلی گئی۔ جب میرا رفیق لوٹا تو میرے چہرے سے رونے کے آثار دیکھ کر بولا "تجھے کیا ہوا" تو میں نے کہا کہ "مجھے اپنی اولاد کا خیال آیا تھا تو میں ان کے اندوہ میں رویا تھا"۔ رفیق بولا کہ "نہیں ابھی تو تم ان کے خیال سے فارغ تھے تجھ پر کوئی افتاد واقع ہوئی ہے۔ مجھے ضرور بتاؤ" جب اس نے اصرار کیا تو میں نے حقیقت بیان کر دی تو وہ بھی رونے لگا۔ تو میں نے کہا کہ "تو کیوں رو رہا ہے؟" تو بولا "اس لئے کہ مجھے خوف ہے کہ اگر میں ہوتا تو یہ نہ کر سکتا تھا جو تم نے کیا"۔ جب میں مکہ پہنچا تو میں نے طواف اور سعی کی اور ایک حجرے میں بیٹھ گیا اور مجھے نیند نے آ لیا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص ہے نہایت حسین و جمیل کشادہ رو خوشبو اور بلند قامت تو میں نے کہا کہ آپ کون ہیں؟" تو فرمایا کہ "یوسف ہوں" میں نے کہا "یوسفِ صدیق؟" فرمایا "ہاں" تو میں نے کہا کہ "آپ کا زنِ مصر کے ساتھ حیران کن واقعہ ہے" تو حضرت نے فرمایا کہ "تمھاری اس زنِ اعرابی سے کہانی اس سے بھی زیادہ حیران کن ہے"۔

ابنِ عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا کہ اگلے زمانے میں تین شخص سفر پر نکلے رات آ گئی تو

---

[1] ابواء مکہ اور مدینہ کے درمیان یہ جگہ مدینے سے چھ منزل کے فاصلے پر تھی اور ہر منزل تقریباً چھ فرسنگ کی تھی۔

ایک غار میں داخل ہو گئے تا کہ ایمن ہوں۔ اتنے میں ایک بڑی چٹان پہاڑ سے گری اور اُس نے غار کا دروازہ بند کر دیا۔ اسی چٹان کو حرکت دینے کی کوئی تدبیر دکھائی نہ دی۔ تو کہنے لگے کہ اس چٹان کو دروازے سے ہٹانے کے لئے کوئی تدبیر دعا سے بہتر نہیں ہو گی۔ لہٰذا ہم میں سے ہر کوئی اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے کسی اچھے عمل کو بیان کرے تو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ ہمیں اس کی جزا میں راستہ کھول دے۔ تو ان تینوں میں ایک یوں گویا ہوا کہ ''اے اللہ میرے والدین تھے کہ میں کبھی ان سے پہلے کھانا نہ کھاتا تھا اور اپنے اہل و عیال کو نہ دیتا تھا۔ ایک دن میں ایسے کام میں لگا رہا کہ رات کو دیر سے گھر میں لوٹا تو میرے والدین سو گئے تھے اور دودھ کا وہ پیالہ جو میں ان کے لئے لایا تھا میں اسے پکڑے ان کے بیدار ہونے کے انتظار میں کھڑا رہا۔ میرے بچے رو رہے اور زاری کر رہے تھے تو میں نے ان سے کہا تھا کہ جب تک میرے ماں باپ پہلے نہ کھا لیں تمھیں کھانا نہ دوں گا۔ والدین میرے صبح تک بیدار نہ ہوئے اور میں دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لئے کھڑا رہا اور بچے اسی طرح بھوکے رہے۔ بارِ خدایا اگر تو جانتا ہے کہ یہ سوائے تیری رضا جوئی کے اور کچھ نہ تھا' ہمارے لئے راستہ کھول دے''۔ جب اس نے یہ کہا تو چٹان حرکت میں آئی اور ایک سوراخ ظاہر ہوا لیکن اتنا بڑا نہ تھا کہ اس میں سے باہر نکلا جا سکے۔ پھر دوسرے نے عرض کا آغاز کرتے ہوئے کہا: ''بارِ خدایا تجھے معلوم ہے کہ میری ایک پھوپھی زاد تھی جس پر میں عاشق تھا اور وہ میری بات نہیں مانتی تھی۔ یہاں تک کہ قحط پڑ گیا تو درماندہ ہوئی اور اس نے مجھ سے گستاخی کی۔ تو میں نے اسے ایک سو بیس دینار دیئے تا کہ میری اطاعت کرے۔ جب میں اس کام کے قریب ہوا تو وہ بولی کہ ''اللہ سے نہیں ڈرتے کہ اس کی اجازت کے بغیر مہر توڑ رہے ہو''۔ تو میں ڈر گیا۔ روپیہ چھوڑا اور ارادۂ بد سے ہاتھ روک لیا۔ جب کہ پوری دنیا میں اس سے زیادہ حرص مجھے کسی اور شے کی نہ تھی۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے صرف آپ کی اطاعت میں یہ کیا ہے تو ہمارے لئے راہ کھول دے''۔ تو اس پر وہ چٹان پھر حرکت میں آئی اور راستہ مزید کھل گیا۔ لیکن باہر نکلنا اب بھی ممکن نہ تھا۔ پھر تیسرے شخص نے کہنا شروع کیا کہ: ''بارِ خدایا تو جانتا ہے کہ ایک دفعہ میں نے مزدوروں سے کام لیا تھا میں نے اور تو سب مزدوروں کی مزدوری دے دی لیکن ایک شخص جو چلا گیا تھا اور مزدوری میرے پاس چھوڑ گیا تھا۔ میں نے اس کی مزدوری سے ایک بکری خریدی اور میں اس سے تجارت کرتا تھا جس سے میرے پاس بہت سا مال جمع ہو گیا۔ تو ایک دن وہ مزدور اپنی مزدوری لینے کے لئے میرے پاس آیا تو اس وقت صحرا گاؤ' بکری اور اونٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ سب تمھاری مزدوری ہے۔ تو وہ بولا: ''آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟'' میں نے کہا ''نہیں یہ سب تمھارے مال ہی سے حاصل ہوا ہے'' تو میں نے وہ سب جانور اس کے حوالے کر دیئے۔ اور کوئی چیز ان میں سے نہ روکی۔ بارِ خدایا اگر

تو جانتا ہے کہ میں نے تیرے لئے یوں کیا تھا تو ہمیں کشاد عطا فرما''۔ پس وہ چٹان حرکت میں آئی اور اپنی جگہ سے ہٹ گئی اور راہ کشادہ ہو گیا اور وہ تینوں افراد غار سے باہر نکل آئے۔

اور بکر بن عبداللہ المزنی ؒ کہتے ہیں کہ ایک قصاب تھا ہمسائے کی کنیز پر عاشق ہو گیا۔ ایک روز ہمسائے نے اس کنیز کو ایک گاؤں کی طرف بھیجا تو قصاب اس کے پیچھے لگ گیا اور صحرا میں اس سے لپٹ گیا۔ تو وہ کنیز بولی جس قدر تم مجھ پر مفتون ہو میں تم پر اس سے کہیں زیادہ مفتون ہوں۔ لیکن میں حق تعالیٰ سے ڈرتی ہوں''۔ تو قصاب نے کہا کہ جب تو اللہ سے ڈرتی تو میں اللہ تعالیٰ سے کیوں نہ ڈروں''۔ قصاب نے توبہ کی اور لوٹ گیا۔ راستے میں پیاس سے مغلوب ہو گیا اور خطرہ تھا کہ ہلاک ہو جائے۔ ایک شخص اس کے پاس آ پہنچا جسے اس زمانے کے پیغمبروں میں سے ایک نے کسی جگہ قاصد کے طور پر روانہ کیا تھا۔ تو اس نے قصاب سے پوچھا کہ ''تمھیں کیا ہو گیا ہے؟'' تو بولا ''پیاس'' تو قاصد نے کہا آؤ دعا کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ گھٹا بھیج دے جو ہمارے سر پر سایہ کرے اور ہم شہر میں پہنچ جائیں''۔ تو قصاب نے کہا ''میرے پاس کوئی طاعت نہیں تم دعا کرو میں آمین کہوں گا''۔ تو انھوں نے ایسے ہی کیا تو گھٹا آ کر ان پر سائبان بن گئی جس کے سایے میں وہ چلتے رہے۔ جب آپس میں جدا ہوئے تو گھٹا قصاب کے ساتھ چلی اور پیغمبر کا قاصد دھوپ میں رہ گیا تو بولا کہ اے جوانمرد تم تو کہتے تھے کہ میں طاعت سے خالی ہوں لیکن اب معلوم ہوا کہ گھٹا تیری وجہ سے تھی۔ مجھے اپنا احوال بیان کر'' تو قصاب بولا کہ ''میں کچھ نہیں جانتا اور اِلّا یہ کہ میں نے ایک کنیز کے کہنے پر توبہ کر لی'' تو قاصد بولا کہ ''ایسے ہی ہے۔ وہ قبولیت جو تائب کو حاصل ہوتی ہے حق تعالیٰ کے نزدیک کسی اور کو حاصل نہیں ہوتی''۔

عورتوں کی طرف دیکھنا اور جو کچھ اس میں حرام ہے اس کا بیان

معلوم رہے کہ یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ انسان اس قسم کے کام میں قدرت پائے اور اپنے آپ کو روک سکے اس لئے اولیٰ تر یہ ہے کہ آغاز کار پر نظر رکھے اور ابتدا آنکھ سے ہوتی ہے۔ علاء بن زیاد کہتے ہیں کہ ''آنکھ کسی عورت کی چادر پر نہ ڈالو کیونکہ اس سے دل میں شہوت پیدا ہوتی ہے''۔ اور حقیقت میں عورتوں کے لباس پر نگاہ ڈالنے، ان کے لباس کی خوشبو سونگھنے اور ان کی آواز سننے اور پیغام سننے اور بھیجنے اور ایسی جگہ سے گذرنے کو جہاں سے وہ تمھیں دیکھ سکتی ہوں اگرچہ تم انھیں نہ بھی دیکھو تو ان سب سے پرہیز کرنی چاہئے۔ کیونکہ جہاں کہیں بھی حسن و جمال ہو یہ دل میں تخمِ شہوت اور اندیشۂ بد پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ خود عورتوں کو بھی باجمال مردوں سے پرہیز کرنی چاہئے۔ اور جو نظر قصداً صاحب جمال پر ڈالی جائے گی

حرام ہوگی۔ اور جو نظر شہوت والی ہوگی اگر فقط لباس تک ہی ہو وہ بھی حرام ہے۔ اگر بے اختیار بدونِ قصد نظر جا پڑے تو گناہ نہیں لیکن دوسری نظر حرام ہوگی۔ آنحضرت فرماتے ہیں کہ ''پہلی نظر تمھاری ہے لیکن دوسری نظر تمھاری گردن پر ہے۔ یعنی اس پر مواخذہ ہوگا۔ نیز فرمایا کہ: ''جو عاشق ہو اور اپنے آپ کو بچائے رکھے اور یہ امر مخفی رکھے اور اسی رنج میں مر جائے تو شہید قرار پائے گا۔ اور اپنے آپ کو بچانے کا مطلب یہ ہے کہ پہلی نظر محض اتفاق سے پڑی ہو۔ تو دوسری نگاہ ڈالنے سے باز رہے اور نہ دیکھے اور نہ آرزو کرے اور اپنے عشق کو دل میں مخفی رکھے''۔

معلوم رہے کہ کوئی بیج فساد کا مجالس میں مردوں عورتوں کے اختلاط اور مہمانیوں میں ایک دوسرے کے دیکھنے کے برابر نہیں جب ان کے درمیان حجاب نہ ہو تو عورتوں کا چادر پوش ہونا یا نقاب دار ہونا کافی نہیں ہوتا۔ کیونکہ جب چادر سفید ہو اور نقاب پوشی میں تجمل اور خودنمائی کریں گی تو شہوت کو تحریک ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ نقاب بے نقاب چہرے کی نسبت خوب تر ہو۔ پس عورتوں کے لئے سفید چادر اور پاکیزہ پر تکلف روبند کے ساتھ گھروں سے باہر نکلنا حرام ہے۔ اور جو عورت اس کی مرتکب ہو وہ گناہ گار ہے۔ اور شوہران کے اور دیگر متعلقین سب اس گناہ میں شریک متصور ہوں گے۔ اور جو شہوت اور خیال مردوں کے دل میں حرکت پذیر ہوتا ہے اور ہر وہ فساد جو اس سے جنم لیتا ہے اس کی ذمہ داری اس شخص کی گردن پر ہے جس نے اس پر رضا کا اظہار کیا ہو۔

اور مرد کے لئے جائز نہیں کہ وہ لباس جو کسی عورت کا ہو شہوت کے ارادے سے پہنے یا شہوت کے ساتھ اس لباس کو ہاتھ لگائے یا اسے سونگھے۔ یا ریحان سبز یا سیب کہ کسی عورت کو دے یا اس سے لے۔ اور اچھی نرم بات عورت سے کہے اور عورت کو جائز نہیں کہ غیر مرد سے بات کرے۔ سوائے سختی اور زجر کے جیسے کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: ''اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِىْ فِىْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا'' (قرآن: ۳۲/۳۳) (اگر ایسا ہے کہ تم خدا سے ڈرتی ہو تو بیگانے مردوں سے بات ناز سے نہ کرو ورنہ وہ مرد تم سے طمع کرے گا جس کے دل میں عورتوں سے دوستی کی بیماری ہو ایسے میں معروف طریقے سے بات کرنا) اللہ تعالیٰ پیغمبر کی ازواج مطہرات سے کہتا ہے کہ غیر مردوں کے ساتھ نرم اور خوش آوازی کے ساتھ بات نہ کرنا۔ اور جس پیالے سے کسی عورت نے پانی پیا ہو اس میں سے قصداً اس جگہ منہ لگا کر پینا جہاں سے اس نے پیا ہو ناروا ہے۔ ایک حکیم کہتا ہے کہ حضرت ایوب انصاری کے اہل و عیال ہر وہ کاسہ جو انھوں نے آنحضرت سے لیا کہ جس میں سے آپ ﷺ نے کچھ پیا ہو یا ہاتھ لگایا ہو تو وہ اس میں تبرّک کی خاطر انگلی ڈالتے تھے۔ تو اس

میں ثواب ہے۔ لیکن اگر کوئی سوئے بد سے ایسا کرے تو گناہ ہوگا جو چیز بھی عورتوں سے متعلق ہو اور اس سے حذر کرنے کی نسبت اور کسی شے سے حذر اہم تر نہیں۔ والسلام۔

یاد رہے کہ ہر عورت اور لڑکا جو گلی کوچے میں ہو تو شیطان تقاضا کرتا ہے کہ "دیکھو یہ کیسا ہے" تو چاہیئے کہ انسان شیطان سے بحث کرے اور کہے "کیا دیکھوں؟ اگر بدشکل ہو تو میں رنجیدہ ہوں گا نیز گناہ گار اور اگر خوب رُو ہو تو جب مجھ پر حلال نہیں تو میں گناہ گار ہوں گا اور حسرت و رنج مجھ پر باقی رہیں گے اور اگر میں اس کے تعاقب میں لگ جاؤں تو دین اور عمر کو کھو دوں اور ممکن ہے کہ مقصود کو پھر بھی نہ پہنچوں"۔

آنحضرت کی نگاہ ایک دن سرِ راہ ایک عورت پر پڑ گئی تو لوٹ کر اپنے گھر گئے اور اس وقت اپنی زوجہ کے ساتھ صحبت کی اور غسل کیا اور باہر نکلے اور فرمایا کہ "جب شیطان کی طرح کوئی عورت دکھائی دے تو شہوت کو تحریک ہوتی ہے تو ایسے میں اپنے گھر جانا چاہیئے اور اپنی بیوی سے جماع کرنا چاہیئے کیونکہ جو تمھاری بیوی کے پاس ہے تو وہی شے تو غیر عورت کے پاس ہے"۔

اصل سوم: بات کرنے کی آرزو اور زبان کی آفت

معلوم رہے کہ زبان اللہ تعالیٰ کی صنعت گری کے عجائب میں سے ہے جو ایک گوشت کے ٹکڑے کی صورت میں ہے اور حقیقت میں جو کچھ وجود میں ہے اس کے تصرف میں ہے بلکہ جو عدم میں ہے وہ بھی' کیونکہ زبان عدم کا بیان بھی کرتی ہے اور وجود کا بھی۔ بلکہ زبان عقل کی نائب ہے۔ اور کوئی چیز احاطۂ عقل سے باہر نہیں ہے۔ اور جو کچھ عقل یا وہم اور خیال میں آتا ہے زبان اس کو بیان کرتی ہے جب کہ دوسرے اعضا اس طرح کے نہیں۔ کیونکہ آنکھ کی ولایت میں سوائے رنگ اور اشکال کے کچھ نہیں۔ اور کان کی ولایت میں آواز کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور یہی حال دوسرے اعضا کا ہے کہ ہر ایک کی ولایت مملکت بدن کے ایک محدود گوشے سے زاید نہیں۔ جب کہ زبان کی سلطنت دل کی ولایت کی مانند تمام مملکت میں جاری ہے۔ چونکہ زبان دل کے مقابل ہے۔ دل سے صورتیں اخذ کرتی ہے اور معرضِ بیان میں لے آتی ہے۔ اسی طرح زبان صورتیں دل کو پہنچاتی ہے۔ اور زبان جو کچھ کہتی ہے دل اس سے ایک صورت پاتا ہے۔ مثلاً جب زبان پر تضرّع اور زاری وارد ہوتی ہے تو زبان اس کے کلمات کہنے لگتی ہے اور نوحہ گری کے الفاظ نوک پر لاتی ہے اور دل اس سے رقت' اندوہ اور سوز کی صفات اخذ کرنے لگ جاتا ہے اور دل کی آگ کے بخارات دفاع کا قصد کرتے ہیں اور آنکھ سے بہنے لگتے ہیں۔ اسی طرح جب زبان طرب کے الفاظ اور اچھوں کی صفت بیان کرتی ہے تو جو کلمہ بھی زبان سے

سرزد ہوتا ہے اس کے مطابق ایک صفت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ نتیجۃً جب زبان سخت الفاظ ادا کرتی ہے تو دل تاریک ہوجاتا ہے۔ اور جب زبان سچی بات کرتی ہے تو دل منور ہوجاتا ہے اور جب جھوٹ بولتی ہے تو دل بھی کج ہوجاتا ہے۔ حتی کہ دل چیزوں کو راست نہیں دیکھ پاتا۔ ایسے ہی جیسے آئینہ ٹیڑھا ہوجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ شاعر اور جھوٹے کا خواب سچ نہیں نکلتا کیونکہ باطن اس کا کجی کی وجہ سے اندھا ہوجاتا ہے۔ اور جو راستی کو پنا معمول بنالیتا ہے تو اس کا خواب سچ اور درست ہوتا ہے۔

اور جس طرح اس عالم میں کوئی سچا خواب نہیں دیکھتا تو جب وہ اُس دنیا میں بارگاہِ الٰہیت میں کہ جس کا مشاہدہ تمام لذتوں کی غایت ہے اس کے دل میں ٹیڑھا دکھائی دیتا ہے اور وہ سیدھا نہیں دیکھتا۔ اس لئے اس لذت کی سعادت سے محروم رہتا ہے بلکہ جس طرح خوب صورت چہرہ ٹیڑھے آئینے میں بدصورت دکھائی دیتا ہے جیسے کہ شمشیر کی چوڑائی میں دیکھے یا لمبائی میں، صورت کے جمال کی لذت باطل ہوجاتی ہے۔ اُس دنیا کے کام اور الٰہی کاموں کے حقایق اسی طرح کے ہیں۔ پس دل کی راستی اور کجی زبان کی راستی اور کجی کے تابع ہے۔ اسی بناء پر آنحضرت نے فرمایا ہے کہ: ''ایمان راست اور مستقیم نہیں ہوتا جب تک دل راست نہ ہو۔ اور دل راست نہیں ہوتا جب تک زبان راست نہ ہو''۔

پس زبان کے شر و آفات سے احتراز مہمات دین میں سے ہے جیسے ہم فصلِ خاموشی کے باب میں بیان کریں گے۔ اور پھر بسیار گوئی اور بیہودہ گوئی اور جدل کی لذت اور مناظرے اور فحش گوئی اور دشنام طرازی اور زبان درازی اور لعنت کرنے کی اِبتلا اور مزاح و تمسخر اور آفتِ دروغ و غیبت اور چغل خوری، منافقت، مدح و ہجو گوئی اور ان کے متعلقات سب کے سب بہ تفصیل بیان کریں گے اور ان کا علاج بھی مذکور ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

ثوابِ خاموشی معلوم کرنا

معلوم رہے کہ جس طرح زبان کی آفتیں بہت زیادہ ہیں اور ان سے بچنا بہت مشکل ہے تو اس کی تدبیر خاموشی سے بڑھ کر اور کوئی نہیں۔ جہاں تک ممکن ہے کہ کر سکے کرے۔ بس چاہئے کہ انسان بجز ضرورت کے زبان نہ کھولے۔ کہتے ہیں ابدال وہ ہوتا ہے جو بولنے اور کھانے اور سونے کا ارتکاب محض بقدر ضرورت کرتا ہے اور حق تعالیٰ نے بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''لَا خَیْرَ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ م بَیْنَ النَّاسِ ''(قرآن: ۱۱۴/۴)(بات کرنے میں خیر نہیں ہے الا یہ کہ صدقہ دینے کا حکم ہو یا لوگوں کے درمیان خیر و صلح کا فرمان مطلوب ہو)۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''من صمت نجا'' جو خاموش رہا نجات پا گیا''۔ نیز فرمایا کہ ''جس کسی کو شرم گاہ، شکم اور زبان کا تحفظ دیا گیا وہ گویا ہمہ قسم تحفظ سے بہرہ مند ہوا''۔ اور معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ نے آنحضرت سے پوچھا کہ ''اے اللہ کے رسول کون سا عمل زیادہ فضیلت والا ہے؟'' تو آپ ﷺ نے زبان باہر نکال کر اس پر انگلی رکھی یعنی کہ خاموشی''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ اپنی زبان کو انگلی میں پکڑا ہوا ہے اور کھینچ کر مل رہے تھے تو میں نے کہا کہ ''اے خلیفۂ رسول! ایسے کیوں کر رہے ہو''؟ تو فرمایا کہ ''اس نے مجھے کتنے ہی کاموں میں ڈال رکھا ہے''۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''انسان کی بیشتر خطائیں اس کی زبان سے سرزد ہوتی ہیں''۔ نیز فرمایا کہ ''میں تمھیں آسان ترین عبادتوں کی خبر دوں؟ زبانِ خاموش اور اخلاقِ عمدہ'' نیز فرمایا ''جو کوئی حق تعالیٰ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے کہو کہ سوائے اچھی بات کے کچھ نہ کہے یا خاموش رہے''۔

لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ ''ہمیں اس چیز کی تعلیم دیں جو ہمیں بہشت میں لے جائے''۔ تو آپ نے فرمایا کہ ''ہرگز کوئی بات نہ کرنا'' لوگوں نے کہا کہ ''یہ ہمارے لئے ممکن نہیں'' تو آپ نے فرمایا کہ ''سوائے اچھی بات کے زبان نہ کھولنا''۔ اور ہمارے پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جب تو کسی مومن کو خاموش اور باوقار دیکھے اس کے قریب ہو جا کیونکہ وہ حکمت سے خالی نہ ہوگا''۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ''عبادتیں شمار میں دس ہیں: نو عبادتیں تو خاموشی میں ہیں اور ایک لوگوں سے احتراز میں'' اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''جو کوئی بسیار گو ہو بسیار خطا کار ہوتا ہے اور جو کوئی زیادہ خطار کار ہو وہ زیادہ گناہ گار ہوتا ہے۔ اس کے لئے آگ اولیٰ تر ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے منہ میں سنگریزہ رکھتے تھے کہ بات نہ کہہ سکیں۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''کوئی چیز زبان سے بڑھ کر اس امر کی مستحق نہیں کہ اسے کاٹ دیا جائے''۔ اور یونس عبیدؒ فرماتے ہیں کہ: ''میں نے کسی شخص کو نہیں پایا کہ اپنی زبان کا نگہبان ہو کہ اس کے جملہ اعمال میں ظاہر نہ ہوتی ہو''۔ لوگ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حضور باتیں کر رہے تھے لیکن احنف رضی اللہ عنہ خاموش تھے۔ تو لوگوں نے کہا کہ ''تم کیوں بات نہیں کر رہے ہو؟ تو احنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''اگر دروغ کہتا ہوں تو مجھے اللہ کا خوف ہے اور اگر سچ کہتا ہوں تو تم سے خائف ہوں'' ربیع بن خثیم رضی اللہ عنہ نے بیس سال دنیا کی کوئی بات نہ کی۔ جب صبح بیدار ہوتے تو کاغذ قلم لے کر اپنے ہی بارے میں کہتے اور تحریر میں لاتے اور پھر رات کے وقت ان کی

رُو سے خود احتسابی فرماتے تھے۔

یاد رہے کہ خاموشی کی یہ ساری فضیلت اس بنا پر ہے کہ زبان کی آفتیں بہت ہیں۔ کیونکہ وہ بیہودہ گوئی کے لئے اکثر تیار ہوتی ہے' اور اسے بولنا اچھا لگتا ہے اور کہنا یوں بھی آسان ہے اور نیک و بد میں تمیز کرنا مشکل امر ہے۔ اور خاموشی میں زبان کے وبال سے سلامتی ہے۔ اور تفکر اور ذکر کی قوت محفوظ ہوتی ہے جس سے انسان بخوبی تفکر و ذکر میں لگ جاتا ہے۔

معلوم رہے کہ سخن کی چار قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو سراپا ضرر ہوتی ہے۔ دوسرے وہ ہے جس میں نفع وضرر دونوں ہوتے ہیں۔

تیسری قسم: وہ ہے کہ جس میں فائدہ ہوتا ہے نہ نقصان اور وہ بات فضول ہوتی ہے اس کے ضرر میں یہی بہت ہے کہ وقت ضائع کرتی ہے۔ اور

چوتھی قسم: یہ ہے کہ جو سراسر فایدے کی ہوتی ہے۔ پس باتوں میں سے تین چوتھائی تو کہنے کے لائق نہیں اور کہنے کے لائق صرف ایک چوتھائی ہیں اور وہ وہ ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے'' اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ '' (قرآن: ۱۱۴/۴) (سوائے صدقہ کا حکم دینے اور لوگوں کے درمیان خیر وصلاح کا فرمان دینے میں) اسی کی حقیقت کے بیان میں آنحضرت نے فرمایا کہ: ''جو خاموش رہا نجات پا گیا سلامتی سے بہرہ مند ہوا''۔ تم اس حقیقت سے تبھی آگاہ ہو سکتے ہو اگر زبان کی آفات سے آگاہ ہو۔ یہ آفات پندرہ قسم کی ہیں اور ہم یہاں ان میں سے ہر ایک کی تفصیل بیان کریں گے:

زبان کی آفات

آفتِ اول: یہ ہے کہ تو ایسی بات کہے جس کی کوئی ضرورت نہ ہو کہ اگر نہ کہے تو اس سے کوئی نقصان تجھے دنیا میں ہو نہ دین میں۔ لیکن اس کے کہنے کی بناء پر حسن اسلام سے دور ہو جائے گا۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''من حسن اسلام المرءِ ترکه مالا یعنی'' یعنی جس چیز سے رکا جا سکتا ہے اس سے باز رہنا حسن اسلام ہے''۔ اس قسم کی مثل ایسی ہے کہ تو کسی گروہ کے ساتھ بیٹھے اور اپنے سفر کی کہانی بیان کرے اور شہروں' ہوٹلوں کو وہ باغ و بستان اور ایسے ہی احوال جن سے دوچار رہا ہو کہ ان کے بیان سے کوئی فائدہ یا نقصان نہ ہو تو سب فضول ہوگا اور اس سے احتراز کرنا چاہئے۔ کیونکہ اگر تو نہ کہے تو کوئی نقصان نہیں ہونے کا۔ ایسے ہی اگر تو کسی سے ملے اور اس سے ایسی چیز پوچھے جس سے تجھے کوئی سروکار نہ ہو یہ اس وقت ہے کہ پوچھنے

میں کوئی برائی نہ ہولیکن اگر پوچھے کہ کیا ''روزے سے ہو؟'' مثلاً اگر وہ سچ کہے تو اس نے اپنی عبادت کا اظہار کیا جونا شائستہ ہے اور اگر پوچھے کہ ''تو کہاں سے آیا ہے؟'' اور کیا کرتا ہے؟'' تو ہوسکتا ہے کہ وہ آشکارا نہ کہ سکتا ہو تو جھوٹ میں جا پڑے گا۔ یہ خود باطل ہوگا اور فضول وہ ہے کہ جس میں کوئی شے باطل نہ ہو۔

کہتے ہیں کہ ''لقمان ایک سال حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ اور حضرتِ داؤد زرہ بناتے تھے اور لقمان چاہتے تھے کہ معلوم کریں کہ یہ کیا ہے۔ لیکن پوچھتے نہ تھے۔ حتیٰ کہ حضرت داؤد نے زرہ مکمل کرلی اور پہن لی اور فرمایا کہ جنگ کے لئے یہ اچھا لباس ہے؛ اس پر آگاہ ہونے پر لقمان بولا کہ: ''خاموشی حکمت ہے لیکن کسی کو اس کی رغبت نہیں''۔ اس طرح کے سوال کا سبب یہ ہوتا ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ لوگوں کے احوال جانے اور بات کی راہ کھل جائے تا کہ کسی سے دوستی کا اظہار کر سکے۔ تو علاج اس کا یہ ہے کہ انسان جانے کہ موت سامنے اور نزدیک ہے تو ایسے میں جو تسبیح اور ذکر اذکار کرے گا وہ خزانہ ہوگا جو اس نے جمع کیا ہوگا۔ اگر اسے ضائع کردے گا تو اپنا نقصان کیا۔ تو یہ تو ہے اس کا علمی علاج۔ اور عملی علاج یہ ہے کہ عزلت گزینی کرے یا منہ میں سنگریزے رکھ لے۔

حدیث میں ہے کہ غزوہ احد کے دن ایک جوان شہید ہوگیا۔ تو لوگوں نے دیکھا کہ اس نے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا ہے۔ اس کی ماں نے اس کے چہرے سے گرد و غبار صاف کرتے ہوئے کہا ''ھنیــــاً لك الجنة ''یعنی تجھے بہشت مبارک ہو۔ آنحضرت نے فرمایا ''تمھیں کیا معلوم؟ ہوسکتا ہے اس نے بخل کیا ہو ایسی چیز کے بارے میں جو اس کے کسی کام کی نہ ہو یا اس نے کسی چیز میں کوئی ایسی بات کہی ہو جو اس کے لئے بے سود ہو''۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اس سے حساب لیا جائے گا اور 'ھنی' وہ ہے کہ جس میں رنج حساب نہیں ہوتا۔

ایک دن آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت یہاں ایک اہل بہشت داخل ہوگا'' اتنے میں عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ دروازے سے داخل ہوئے لوگوں نے انھیں خبر دی کہ حضور نے یوں فرمایا ہے تو ''بتایئے کہ آپ نے ایسا کون سا عمل کیا ہے؟'' تو انھوں نے جواب میں کہا کہ ''عمل میرا تھوڑا ہی ہے لیکن جس سے میرا سروکار نہ ہو میں اس میں دخل نہیں دیتا۔ دوسرے یہ کہ میں کسی کا برا نہیں چاہتا''۔

یاد رہے کہ جو بات ایک لفظ میں کہی جاسکتی ہو اسے اگر دو لفظوں میں بیان کرے گا تو وہ دوسرا کلمہ فضول ہوگا۔ اور تیرے لئے وبال ہوگا۔ صحابہ کرام میں سے ایک کہتے ہیں کہ ''اگر کوئی مجھ سے ایسی بات کہے کہ جس کا جواب میرے لئے ایسا ہی ہو جیسا کہ پیاسے کے لئے آبِ سرد نوش جان کرنا۔ لیکن میں اس کا جواب اس خوف سے نہ دوں گا کہ فضول ہوگا''۔ مطرّف ابن عبداللہؒ فرماتے ہیں کہ: جلالِ خداوندی آپ کے دل میں

اس سے کہیں عظیم ہے کہ تم بات بات پر اس کا نام لو جیسے کہ تم گھوڑے بلی وغیرہ کو کہتے ہو کہ خدا تیرے ساتھ یہ کرے یا وہ کرے!'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''خوش بخت ہے وہ شخص جس نے زائد بات روک لی اور زاید مال اللہ کی راہ میں دے دیا۔ یعنی کیسۂ مال سے بند کھول کر زبان پر لگا دیا''۔ نیز آپ نے فرمایا کہ ''انسان کو زبانِ دراز سے بری شے اور کوئی نہیں دی گئی''۔

یاد رہے کہ تو جو کچھ بھی تو کہتا ہے تیرے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہے: ''مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ'' (قرآن: ۱۸/۵۰) (منہ سے کوئی بات باہر نہیں نکلتا سوائے اس کے کہ انسان کے قریب ایک نگہبان فرشتہ آمادۂ تحریر ہوتا ہے) اور اگر یہ فرشتے مفت تحریر نہ کر رہے ہوتے بلکہ تحریر کا معاوضہ طلب کرتے تو انسان دس کی بجائے ایک کہتا جب کہ بسیار گوئی میں ضیاعِ وقت کا ضرر تو ہے ہی تحریر کی اجرت اگر طلب کی جاتی تو بھی اس سے کہیں زیادہ ہے۔

دوسری آفت: باطل اور معصیت کی بات کرنا ہے۔ باطل یہ ہے کہ انسان بدعت کی باتیں کرے یا قتالِ صحابہ اور ان کے واقعات کے باب میں کلام کرے۔ اور معصیت یہ ہے کہ فسق کا بیان کرے یا وہ مجلس کہ جس میں دو افراد کے درمیان مناظرہ ہوا ہو اور انھوں نے ایک دوسرے کو گالی دی ہو یا رنج پہنچایا ہو یا ایسے فحش احوال کا بیان کرے کہ جس سے ہنسی آئے یہ سب معصیت کی صورتیں ہیں نہ کہ اس اگلی آفت کی طرح کہ جس سے درجے کا نقصان ہوتا ہے۔

آنحضرت کا فرمان ہے کہ ''ایسا شخص بھی ہوتا ہے کہ ایسی بات کہتا ہے کہ خود اس سے باک نہیں رکھتا اور اس کے وزن اور مقدار سے بے خبر ہوتا ہے جب کہ وہی بات اسے جہنم کے گڑھے میں لے جاتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسی بات کہے کہ جس سے وہ خائف ہو لیکن وہ بات اسے جنت میں لے جاتی ہے''۔

آفتِ سوم: مناظرے اور جدل کی بات کہنا ہے۔ ایسے کو مرائی (ریاکار) کہتے ہیں اور ایسا شخص بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص بات کرتا ہے تو وہ اس کو مسترد کر دے اور کہے کہ ''ایسے نہیں ہے'' مطلب اس کا یہ ہے کہ تو تو احمق ہے یا نادان ہے یا جھوٹا ہے لیکن میں سمجھ دار عاقل اور راست باز ہوں''۔ تو اس نے گویا ایک بات سے دو مہلک صفات کو تقویت دی۔ ایک تکبر کو اور دوسرے کسی پر طعن و تشنیع کو۔

اسی بناء پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو شخص جدال اور بیان میں خصومت سے ہاتھ روکے رکھتا ہے اور جو باطل ہے اسے زبان پر نہیں لاتا اس کے لئے گھر بہشت میں تعمیر کیا جاتا ہے اور اگر حق کے بیان سے بھی ایسے میں باز رہتا ہے اس کے لئے بہشت اعلیٰ میں گھر تعمیر کیا جاتا ہے۔ ثواب میں اس اضافے کا راز یہ

ہے کہ بے ہودہ اور دروغ پر صبر کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ "لوگوں کا ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک جدال سے دست کش نہ ہو جائیں اگرچہ حق ہی پر ہوں"۔

یاد رہے کہ جدال صرف مذہبی فرقوں کے درمیان ہی نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی کہے کہ "یہ انار شیریں ہے" اور تو کہے کہ "نہیں یہ ترش ہے" یا کوئی کہے کہ "فلاں جگہ یہاں سے ایک فرسنگ کے فاصلے پر ہے" اور تو کہے کہ "نہیں" تو یہ سب مذموم ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: "ہر لجاج جو تُو کسی کے ساتھ کرے اس کا کفارہ دو رکعت نماز ہے" اور مختصراً لجاج یہ ہے کہ کوئی ایک بات کہے تو تُو اس کی غلطی پکڑے اور خلل اس کا اسے دکھائے تو یہ سب حرام ہے۔ کیونکہ اس سے رنجش وجود میں آتی ہے اور کسی مسلمان کو بے ضرورت رنجیدہ کرنا مناسب نہیں۔ اور ایسی چیزوں میں خطا سے صرفِ نظر کرنا فرض ہے۔ بلکہ خاموش رہنا کمالِ ایمان میں سے ہے۔ اور جب یہ لجاج مذہبی فرقوں میں ہوتا ہے اسے جدل کہا جاتا ہے۔ اور یہ بھی ناپسندیدہ ہے۔ سوائے اس کے کہ خلوت میں ازراہِ خیر خواہی حقیقت بیان کی جاتی ہو۔ بشرطیکہ قبول کی امید ہو لیکن اگر قبول حق کی امید نہ ہو تو خاموش رہنا چاہئے

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ کوئی قوم گمراہ نہیں ہوتی کہ جس پر جدل غالب نہ ہوا ہو۔

لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا کہ: "علما کے ساتھ جدل نہ کہنا ورنہ تجھے اپنا دشمن قرار دیں گے"۔

یاد رہے کہ کوئی چیز اس قدر قوت کی طالب نہیں جس قدر محال اور باطل پر خاموشی کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ مجاہدات کے فضایل میں سے ہے۔ داؤد طائی نے گوشہ نشینی اختیار کی تو ابوحنیفہؒ نے اُن سے کہا کہ: "باہر کیوں نہیں آتے؟" تو داؤد طائی نے جواب میں کہا کہ "میں مجاہدے سے خود کو جدل کہنے سے روک رہا ہوں"۔ تو ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ: "مناظرے کی مجالس میں آ اور سن اور پھر خاموش رہ" تو داؤد کہتے ہیں کہ میں نے ایسے ہی کیا لیکن حق یہ ہے کہ اس سے زیادہ سخت مجاہدہ میں نے نہیں کیا۔ اور کوئی آفت اس سے بڑھ کر نہیں ہوگی کہ کسی شہر میں مذہب کا تعصب ہو اور وہ گروہ جو جاہ اور مریدوں کا طالب ہوتا ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ جدل کہنا امورِ دینی میں سے ہے۔ اور درندوں کی سی طبع اور تکبر اس کا متقاضی ہوتا ہے اور وہ گمان کرتا ہے کہ یہ دین ہی ہے۔ چنانچہ حرص باطن میں محکم ہو جاتی ہے اور اس سے باز رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ نفسِ انسانی کو اس میں کئی قسم کی حرص اور لذت ہوتی ہے۔ مالک بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "جدل دین میں سے نہیں ہے"۔ اور اسلاف نے جدل سے منع کیا ہے۔ لیکن اگر کوئی مبتدع ہو تو آیاتِ قرآن یا احادیث رسول کے حوالے سے بات بغیر لجاج یا تطویل کے کی گئی ہے۔ لیکن جب دیکھا کہ بے سود ہے تو پھر اس سے اعراض

کیا گیا ہے۔

آفتِ چہارم: مال میں خصومت کرنا جب قاضی کے پاس جائے یا کسی اور جگہ تو یہ عظیم آفت ہے۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جو کوئی بے علم کسی کے ساتھ جھگڑتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے غضب میں ہوتا ہے تا آنکہ خاموش ہو جائے''۔ داناؤں نے کہا ہے کہ ''مال میں جھگڑا کرنے سے دل میں جو پراگندگی پیدا ہوتی ہے اور جو زندگی کی لذت کی دشمن اور مروتِ دین کی رہزن ہو تو اور کوئی خصومت اس سے بڑھ کر نہیں۔ اور کہتے ہیں کہ کوئی پرہیز گار شخص مال میں خصومت نہیں کرتا اس بناء پر کہ زیادہ بولے بغیر خصومت میں کامیابی نہیں ہوتی اور مردِ پارسا زیادہ بات نہیں کرتا۔ اگر اور کچھ نہ ہو تو کوئی شخص خصم کے ساتھ اچھی بات نہیں کر سکتا کہ جب کہ اچھی بات کہنے میں فضیلت بہت ہے۔ پس جسے خصومت کا سامنا ہو تو جہاں تک ممکن ہو اس سے احتراز کرنا چاہئے اگر ممکن نہ ہو تو سوائے سچ کے اور کچھ نہ کہے اور حریف کو رنجیدہ کرنے کا قصد نہ کرے اور سخت بات نہ کہے اور حق سے زیادہ طلب نہ کرے کیونکہ یہ سب دین کے لئے مادۂ ہلاکت ہیں۔

آفتِ پنجم: فحش گوئی ہے۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''فحش گو پر بہشت حرام ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''ایسے لوگ ہوں گے کہ جن کے منہ سے غلاظت جاری ہوگی جس کی بدبو سے خود اہل دوزخ فریاد کناں کہیں گے کہ 'یہ کیا ہے؟' تو جواب ملے گا کہ یہ وہ ہے کہ جو جہاں کہیں سخنِ فاحش یا پلید ہوتی یہ اسے عزیز رکھتا تھا اور سخن فاحش کہتا بھی تھا''۔

ابراہیم بن میسرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''جو کوئی فحش گوئی کرتا ہے روز قیامت کتے کی صورت میں نمودار ہوگا''۔ یاد رہے کہ بیشترین فحش اس میں ہوتی ہیں کہ ہم خوابگی کی بدترین تعبیر ہو۔ جیسے کہ اہل فساد کی عادت ہے جب کہ دشنام یہ ہے کہ کسی کو اس سے منسوب کرے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''لعنت ہو اس پر جس کے ماں باپ اس سے راضی نہ ہوں اور وہ اپنے ماں باپ کو گالی دیتا ہو''۔ صحابہ نے پوچھا کہ ''اے اللہ کے رسول ایسا کون کرتا ہے؟'' فرمایا کہ ''جو کسی دوسرے کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے۔ نتیجۃً اس کے ماں باپ کو گالی دی جاتی ہے تو وہ گالی خود اس نے دی ہے!''

معلوم رہے کہ جیسے کہ مباشرت کا بیان کنایۃً کرنا چاہئے تاکہ فحش نہ ہو اسی طرح جو بُری بات ہے اسے اشارۃً بیان کرنا چاہئے اور بہ صراحت بیان نہ کرنا چاہئے۔ اور عورتوں کا نام بھی بہ تصریح نہ لینا چاہئے بلکہ مستورات کہنا چاہئے اور اگر کسی کو بواسیر یا برص وغیرہ کا عارضہ ہو فقط لفظ 'بیماری' پر کفایت کرنی چاہئے اور ان کا کلمات میں ادب کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ کیونکہ یہ بھی ایک طرح کی فحش بیانی ہے۔

آفتِ ششم: آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''مومن لعنت کا ارتکاب نہیں کرتا'' ایک عورت آنحضرت ﷺ کے ہمراہ سفر میں تھی اس نے اونٹ پر لعنت کی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس اونٹ پر سے کجاوہ وغیرہ الگ کردو اور قافلے سے دور کردو کہ ملعون ہے''۔ تو وہ اونٹ ایک مدت تک ایسے ہی آوارہ پھرتا رہا اور کسی نے اس کا پیچھا نہ کیا۔

بودرداؓ فرماتے ہیں کہ ''جب انسان زمین یا کسی چیز پر لعنت کہتا ہے تو وہ چیز کہتی ہے کہ ''لعنت اس پر ہو جو ہم دونوں میں زیادہ گناہ گار ہے''۔ ایک دن حضرت ابوبکر کسی چیز پر لعنت کر رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ وہاں بیٹھے تھے فرمایا کہ ''ابوبکر لعنت اور صدیق؟ لعنت اور صدیق؟'' ! تو ابوبکر نے کہا ''لا ورب الکعبہ'' ''نہیں رب کعبہ کی قسم!'' آپ نے توبہ کی اور کفارہ میں ایک غلام آزاد کیا۔

یاد رہے کہ لعنت افراد پر نہیں کرنی چاہئے۔ سوائے لوگوں کی جماعت کے جو مذموم ہوں۔ مثلاً کہے کہ ''ظالموں پر لعنت ہو۔ یا فاسقوں اور بدعتیوں پر پر لعنت ہو یا کافروں پر لعنت ہو'' لیکن یہ کہنا کہ معتزلی اور کرامی پر لعنت ہو تو یہ خطرناک ہوگا کیونکہ اس سے فساد پیدا ہوتا ہے۔ تو اس سے احتراز کرنا چاہئے۔ اِلّا یہ کہ شرع میں ان پر لعنت کا لفظ وارد ہوا ہو اور حدیث صحیح ہو۔ لیکن کسی شخص کو کہنا کہ ''تجھ پر لعنت ہو یا فلاں پر لعنت ہو'' تو یہ اسی کے لئے جائز ہے کہ شرعاً جانتا ہو کہ کفر پر مرا ہو جیسے فرعون وابوجہل''۔

آنحضرت ﷺ نے ایک قوم کو کفار کے لفظ سے یاد فرمایا اور لعنت کی کیونکہ جانتے تھے کہ یہ لوگ اسلام نہ لائیں گے۔ لیکن کسی یہودی کو یہ کہنا کہ ''تجھ پر لعنت ہو'' اس میں خطرہ ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ قبل از مرگ مسلمان ہو جائے اور اہل بہشت میں سے ہو جائے۔ اور ہوسکتا ہے کہ وہ لعنت کرنے والے سے بہتر ہو جائے۔ اور اگر کوئی کہے کہ ''ہم مسلمان کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس پر اللہ کی رحمت ہو'' اگرچہ ممکن ہے کہ وہ بعد میں مرتد ہو جائے اور موت اس کی کفر پر ہو لیکن اندر حال اس پر لعنت نہیں کہتے اور کافر پر لعنت کہتے ہیں جو اس وقت کافر ہے'' تو یہ کہنا درست نہیں کیونکہ رحمت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے اسلام پر قائم رکھے کہ سبب رحمت کا ہے۔ اور نہیں چاہئے کہ تو کہے کہ ''اللہ تعالیٰ اسے کفر پر رکھے''۔ پس تعیین کے ساتھ لعنت نہ کرنی چاہئے اور اگر کوئی کہے کہ ''کیا یزید پر لعنت روا ہے؟'' تو ہمارا جواب یہ ہے کہ تو کہے کہ: ''حضرت حسینؓ کے قاتل پر لعنت اگر وہ توبہ سے پہلے مر جائے''۔ کیونکہ قتل کفر سے بڑھ کر نہیں ہے اس لئے اگر قاتل توبہ کرے تو لعنت اس پر نہ کرنی چاہئے۔ وحشی نے حضرت حمزہ کو مار ڈالا تھا جو مسلمان ہو گیا تھا تو لعنت اس سے ساقط ہو گئی۔ اور یزید کا حال خود مبہم ہے کہ اس نے مارا؟ ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نے قتل کا حکم دیا تھا ایک گروہ کہتا ہے کہ حکم تو نہیں دیا لیکن راضی تھا۔ اور کسی

پر معصیت کی تہمت لگانا نہیں چاہئے کیونکہ یہ خود گناہ ہے اور اس زمانے میں کتنے ہی بزرگوں کو مار ڈالا گیا کہ کچھ پتہ نہیں چلا کہ کس نے اس کا حکم دیا تھا۔ پس اب تک چار سو سال سے کچھ اوپر گذر چکے تو اس واقعہ کی حقیقت کیونکر معلوم ہو۔ ور اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس فضول اور خطر سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اگر کوئی ساری عمر میں ابلیس پر لعنت نہ کرے تو روزِ قیامت نہ پوچھیں گے کہ ''تو نے لعنت کیوں نہ کی؟'' لیکن جب کوئی کسی پر لعنت کرے گا تو خطرہ یہ ہے کہ قیامت میں اس سے پوچھا جائے گا کہ تو نے لعنت کیوں کی اور ایسا کیوں کیا؟''

اسلاف میں سے ایک کا کہنا ہے کہ ''اگر میرے صحیفے میں کلمہ لا الٰہ الا اللہ نکل آئے یا کسی پر لعنت تو میں ترجیح اس کو دوں گا کہ کلمہ لا الٰـــــہ الا اللہ نکل آئے جسے میں زیادہ دوست رکھتا ہوں''۔ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے کہا: ''مجھے نصیحت کیجئے'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''لعنت نہ کرنا''۔ اور کہا گیا ہے کہ ''مومن پر لعنت کہنا اس کے قتل کے برابر ہے''۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ''یہ آنحضرت ﷺ کی حدیث ہے''۔

پس اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مشغولی ابلیس پر لعنت کہنے سے اولیٰ تر ہے۔ تو کسی اور پر لعنت کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو کوئی کسی پر لعنت کرتا ہے اور اپنے آپ سے کہتا ہے کہ یہ دین کی استواری ہے تو وہ شیطان کا فریب خوردہ سمجھا جائے گا اور یہ کام اکثر تعصب اور ذاتی خواہش کی بنا پر ہوتا ہے۔

آفتِ ہفتم : شعر و سرود ہے۔ ہم نے بابِ سماع میں اس کی تفصیل بیان کر دی ہے کہ سماع حرام نہیں ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کے حضور لوگوں نے شعر پڑھے اور آپ نے حسان رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ کفار کو ان کی ہجو گوئی کا جواب دو۔ لیکن جس شعر میں دروغ ہو یا کسی مسلمان کی ہجو ہو یا مدح میں دروغ ہو یہ جائز نہیں۔ لیکن جو کچھ بر سبیل تشبیہ کہ صنائع شعری میں سے ہے کہا جائے اگرچہ دروغ کی صورت میں ہو حرام نہیں۔ کیونکہ مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اس دروغ پر اعتقاد کریں۔ اس قسم کے شعر عربی زبان میں آنحضرت ﷺ کے حضور پڑھے جاتے رہے ہیں۔

آفتِ ہشتم: مزاح ہے اور آنحضرت نے سراپا مزاح کرنے سے منع فرمایا ہے۔ لیکن کسی قدر کبھی کبھار مباح ہے کہ خوش خلقی کی دلیل ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ معمول نہ بن جائے۔ اور پیشہ نہ بنا لے اور مباح میں سچ کے سوا کچھ نہ کہے۔ کیونکہ کثرتِ مزاح ضیاعِ وقت ہے اور خندہ آور بھی۔ اور خندۂ کثیر دل کو سیاہ کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں انسان کے وقار اور اس کے رعب داب کو ضرر پہنچاتا ہے اور ممکن ہے کہ ایسے شخص سے لوگ دوری اختیار کریں۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ ''میں مزاح کرتا ہوں لیکن حق کے سوا نہیں کہتا''۔ نیز فرمایا کہ ''کوئی ایسا

بھی ہوتا ہے کہ ایسی بات کہتا ہے کہ لوگ ہنسیں لیکن وہ اپنے مرتبے سے اتنا گر جاتا ہے جتنا کوئی ثریا سے زمین پر آ گرے"۔ اور جو چیز خندہ بہ کثرت لائے وہ مذموم ہے۔ اور خندہ میں تبسم سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ "جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تمھیں اس کا علم ہوتا تو تم ہنستے کم اور روتے زیادہ"۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ "تمھیں معلوم نہیں کہ لازماً دوزخ میں گذر ہوگا کیونکہ فرمان خداوندی ہے کہ: "اِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا کَانَ عَلٰی رَبِّکَ حَتْماً مَّقْضِیًا" (قرآن:۱۹/۷۱) (تم میں سے کوئی نہیں کہ سوائے اس کے کہ دوزخ میں پہنچے اور یہ قطعی ہے اور وعدہ یقینی ہے) تو اس دوسرے شخص نے کہا "میں جانتا ہوں"۔ تو وہ بولا "یہ جانتے ہو کہ دوزخ میں سے نکلا کیسے جائے گا؟"

تو اس نے کہا کہ "نہیں جانتا" تو پہلے نے کہا "پھر یہ ہنسی کیسی؟ اور ہنسنے کا موقع کیسے؟"

عطا سُلمی رضی اللہ عنہ چالیس سال نہ ہنسے۔ وہیب بن الورد نے ایک گروہ کو دیکھا کہ عید رمضان کے موقع پر ہنس رہے تھے۔ تو فرمایا کہ "اگر اس گروہ کو بخش دیا گیا ہے اور ان کے روزے قبول کر لئے گئے ہیں تو بھی یہ ہنسنا شکر گذاروں کا کام نہیں۔ اور اگر ان کے روزے قبول نہیں ہوئے تو یہ ہنسنا اللہ سے ڈرنے والوں کا فعل نہیں"۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "جو کوئی گناہ کر کے ہنستا ہے وہ دوزخ میں جاتا ہے اور وہاں روتا ہے"۔ محمد بن واسع نے فرمایا ہے کہ "اگر کوئی بہشت میں روئے تو باعثِ حیرت ہے"۔ تو لوگوں نے کہا "ایسا ممکن ہے"۔ پھر ابن واسع نے فرمایا کہ "وہ جو اس دنیا میں خندہ زنی کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ مستقر اس کا دوزخ ہے یا بہشت تو یہ اس سے زیادہ عجیب ہوگا"۔ حدیث میں ہے کہ ایک بدو نے جو اونٹ پر سوار تھا چاہا کہ آنحضرت ﷺ کے قریب جائے اور کچھ پوچھے۔ جس قدر کوشش کرتا اونٹ پیچھے کی جانب جست لگاتا۔ تو اس پر اصحاب رسول ہنستے۔ آخر اونٹ نے اُسے گرا دیا اور وہ وہیں مر گیا۔ تو اصحاب رسول نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ "وہ شخص اونٹ سے گر کر مر گیا ہے"۔ تو آنحضرت ﷺ نے "فرمایا کہ تمھارے منہ اس کے خون سے پُر ہیں" یعنی کہ تم اس پر ہنستے تھے۔

عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ "اللہ سے ڈرو اور مزاح نہ کرو کیونکہ اس کا اثر دل پر ظاہر ہوتا ہے تو اس سے برے کام جنم لیتے ہیں۔ اس لئے جہاں بیٹھو قرآن کی بات کرو اگر نہ کر سکو تو نیک لوگوں کے احوال بیان کرو"۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "جو کوئی کسی کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا ہے وہ اس کی نظروں میں خوار اور بے وقعت ہو جاتا ہے"۔ آنحضرت ﷺ سے پوری زندگی میں بجز دو تین کلماتِ مزاح کا بیان نقل نہیں ہوا۔ مثلاً آپ نے ایک بڑھیا سے کہا کہ "بڑھیا بہشت میں نہ جائے گی" تو وہ بڑھیا رونے لگی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اے بڑھیا پریشان نہ ہو کیونکہ پہلے آپ کو جوان کیا جائے گا اور پھر بہشت میں داخل کیا جائے گا"۔ آپ

ﷺ سے ایک عورت نے کہا کہ ''میرا شوہر آپ ﷺ کو بلاتا ہے''۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تیرا شوہر وہ ہے جس کی آنکھ میں سفیدی ہے؟'' تو وہ بولی میرا شوہر چشم سفید نہیں ہے'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کوئی ایسا ہے جس کی آنکھ میں سفیدی نہ ہو؟''

ایک عورت نے آپ ﷺ سے درخوات کی کہ مجھے اونٹ کی سواری دیجئے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں تمھیں اونٹ کے بچے پر سوار کراتا ہوں'' تو وہ بولی میں نہیں چاہتی کیونکہ شتر بچہ مجھے گرادے گا''۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی اونٹ ایسا نہیں جو اونٹ کا بچہ نہ ہو''۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ ایک چھوٹا لڑکا تھا جس کا نام ابوعمیر تھا اس کے پاس ایک چڑیا تھی وہ مرگئی تو رونے لگا۔ آنحضرت ﷺ نے اسے دیکھا تو آپ نے فرمایا ''یاباعمیر فعل النفیر لنغیر'' نغیر چڑیا کے بچے کو کہتے ہیں۔ فرمایا ''یاباعمیر چون شد کار نغیر یا نفیر؟ چڑیا کے بچے سے تو نے کیا کیا؟ کہاں چلا گیا؟''

اور آپ کے ایسے مزاح زیادہ تر عورتوں یا بچوں سے تھے تا کہ ان کا دل خوش ہو نیز آپ کی ہیبت سے نفور نہ ہوں۔ آپ اپنی ازواج مطہرات سے بھی اسی قسم کی خوش طبعی فرماتے تھے محض ان کی خوشی کی خاطر اور بس

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا راوی ہیں کہ سودہ رضی اللہ عنہا میرے ہاں آئی میں نے دودھ سے ایک چیز تیار کی تھی تو میں نے اسے کھانے کی دعوت دی تو سودہ نے انکار کردیا اور بولی میں نہیں چاہتی'' اس پر میں نے کہا کہ ''اگر تو نہیں کھائے گی تو میں تجھ پر مل دوں گی۔ سودہ نے پھر کہا کہ میں نہیں کھاؤں گی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کھیر کا کچھ حصہ اس کے منہ پر مل دیا اور آنحضرت ہمارے درمیان فروکش تھے۔ تو آپ نے گھٹنے کو ایک طرف کرلیا تا کہ سودہ کو بھی راہ مل جائے کہ مجھ سے بدلہ لے تو سودہ نے بھی کھیر میرے منہ پر مل دی۔ تو آنحضرت اس پر مسکرائے۔

ضحاک بن سفیان ایک شخص نہایت بدصورت تھا۔ آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھا تھا۔ کہنے لگا کہ ''اے اللہ کے رسول ﷺ میری دو بیویاں ہیں جو عایشہ سے زیادہ خوب صورت ہیں اگر آپ پسند فرمائیں تو میں ایک کو طلاق دے دوں تا کہ آپ اس سے محبت فرمائیں''۔ اور یہ بات اس نے مزاحاً کہی تھی۔ اور حضرت عائشہ سن رہی تھیں بولیں ''وہ تجھ سے زیادہ خوب رُو ہیں یا تم ان سے زیادہ خوب صورت ہو؟'' تو وہ بولا ''میں زیادہ خوب صورت ہوں''۔ اس پر آنحضرت ﷺ ہنسے کیونکہ وہ شخص انتہائی بدشکل تھا۔ اور یہ واقعہ عورتوں کے لئے پردے کا حکم آنے سے پہلے کا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے صہیب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ''خرما کھا رہے ہو اور آشوب چشم کے ساتھ؟'' تو صہیب نے کہا ''میں دوسری طرف سے کھا رہا ہوں''۔ آنحضرت ﷺ نے اس پر تبسم فرمایا۔

خوات بن جبیر عورتوں کی طرف مائل تھا۔ ایک دن مکے کے راستے میں عورتوں کے ایک گروہ کے ساتھ کھڑا تھا۔ اتنے میں آنحضرت ﷺ پہنچے تو وہ شرمندہ ہوا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''کیا کر رہے ہو؟'' بولا ''میرا ایک سرکش اونٹ ہے میں چاہتا ہوں کہ یہ عورتیں میرے اس اونٹ کے لئے ایک رسی بٹ دیں''۔ پس حضور چلے گئے''۔ خوات نے بیان کیا کہ آپ جب اس واقعے کے بعد مجھے ملے تو فرمایا کہ ''اے خوات! اس اونٹ نے سرکشی سے ہاتھ نہیں کھینچا؟'' خوات نے کہا کہ میں نے شرم کے مارے کوئی جواب نہ دیا۔ اور آنحضرت ﷺ جب مجھے دیکھتے یہی کہتے۔ یہاں تک کہ ایک دن میں گدھے پر سوار دونوں ٹانگیں ایک طرف کئے آ رہا تھا کہ کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''اے خوات اس سرکش اونٹ کا حال کیسا ہے؟'' تو میں نے کہا ''اس اللہ کی قسم جس نے آپ کو سچائی کے لئے خلق میں بھیجا ہے کہ جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے اس اونٹ نے بھی سرکشی نہیں کی''۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''اَللّٰہُ اَکْبَر اَللّٰھُمَّ اَھْدِ اَبَا عَبْدُ اللہ'' (اللہ اکبر! اے اللہ ابا عبداللہ کو ہدایت دے)

نعیمان انصاری مزاح بہت کرتا تھا اور شراب بہت پیتا تھا اور لوگ ہر دفعہ اسے جوتے مارتے اور حضور ﷺ کے پاس لاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ صحابہ میں سے ایک نے کہا ''لعنت اللہ کب تک شراب پئے گا؟'' تو آنحضرت نے فرمایا کہ ''اس پر لعنت نہ کہو کہ یہ اللہ عزوجل اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے''۔ اور نعیمان کی عادت تھی کہ جب مدینہ میں نیا پھل لایا جاتا وہ اسے لیتا اور حضور ﷺ کی خدمت میں ہدیۃً پیش کرتا اور پھل والا جب قیمت کا تقاضا کرتا تو وہ اسے آنحضرت ﷺ کے پاس لا کر کہتا کہ ''پھل انھوں نے کھایا ہے قیمت ان سے طلب کر'' تو آنحضرت ﷺ متبسم ہوتے اور اس کو قیمت دے دیتے۔ پھر آنحضرت ﷺ پوچھتے کہ ''تم لائے کیوں تھے؟'' تو کہتا کہ ''میرے پاس پیسے نہیں تھے لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ نیا پھل آپ کے سوا کوئی اور کھائے میں کیا کروں؟'' یہی کچھ ہے جو مطائبات میں سے آنحضرت ﷺ کے بارے میں پوری زندگی میں بیان ہوا ہے۔ اور ان مطائبات میں کوئی چیز باطل نہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ کسی کو رنج پہنچا ہو۔ اور نہ آپ کی شان میں کچھ فرق آیا۔ خوش طبعی کبھی کبھار تو سنت ہے لیکن معمول بنا لینا ناجائز ہے۔

آفتِ نہم : استہزا اور کسی کا مذاق اڑانا ہے۔ اس کے بولنے کے انداز کی نقل اتارنا کہ جس سے ہنسی آئے۔ لیکن اس سے چونکہ وہ شخص رنجیدہ ہوگا اس لئے حرام ہے۔ کیونکہ فرمانِ خداوندی ہے کہ: ''لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ'' (قرآن: ۱۱/۴۹) (کسی کا مذاق نہ اڑاؤ اور کسی کو نظر حقارت سے نہ دیکھو کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ تم سے بہتر ہو)۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جو کسی کی غیبت کرے گا ایسے گناہ کے بارے میں جو وہ ترک کر چکا ہو تو غیبت کرنے والا مرنے سے پہلے خود اس گناہ کا ارتکاب کرے گا''۔ نیز فرمایا کہ ''کسی کے ہاں سے اگر رنج خارج ہو تو ہنسنا نہیں چاہئے اس لئے کہ کوئی ایسی چیز پر کیسے ہنس سکتا ہے جس کا ارتکاب خود بھی کرتا ہو''۔ نیز فرمایا کہ جو استہزا کرتا ہو اور دوسروں کا مذاق اڑاتا ہو قیامت کے دن بہشت کا دروازہ کھولیں گے اور اس سے کہیں گے آؤ جب وہ آگے آئے گا تو اسے اندر نہ جانے دیں گے۔ تو جب وہ لوٹے گا تو اسے پھر بلائیں گے اور دوسرا دروازہ کھولیں گے اور وہ غم واندوہ میں اس کی طمع کرے گا۔ اور جب نزدیک پہنچے گا تو پھر دروازہ بند کر دیں گے۔ یہاں تک کہ جتنا بھی بلائیں گے وہ نہ آئے۔ کیونکہ جان چکا ہے کہ اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ لیکن اگر ایسا مذاق ہو جس کے بارے میں اطمینان ہو کہ وہ برا نہ مانے گا تو وہ حرام نہ ہوگا۔ منجملہ مزاح کے ہوگا۔ حرام اس وقت ہوگا جب وہ کسی کے لئے باعث رنج ہو۔

آفتِ دہم: جھوٹا وعدہ ہے۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی کسی میں ہو تو وہ منافق ہوگا۔ اگرچہ نماز روزے کا پابند ہو۔ کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے''۔ نیز فرمایا کہ ''وعدہ کرنا ایک گونہ قرض ہے'' یعنی اس کے خلاف نہ کرنا چاہئے۔ حق تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی تعریف کی ہے کہ صادق الوعد تھے۔ کہتے ہیں کہ کسی نے اُن سے ایک جگہ وعدہ کیا کہ میں ابھی آتا ہوں لیکن وہ شخص لوٹا نہیں۔ آپ نے بائیس دن تک وہیں اس کا انتظار کیا تا کہ ایفائے وعدہ ہو۔

ایک شخص کا بیان ہے کہ ''میں نے آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اور وعدہ کیا کہ میں فلاں جگہ آؤں گا۔ لیکن میں بھول گیا۔ تیسرے دن جب وہاں گیا تو آنحضرت وہیں محوِ انتظار تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اے جواں مرد میں تین دن سے یہیں تمہارا انتظار کر رہا ہوں''۔ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص سے وعدہ کر رکھا تھا کہ ''جب تم آؤ گے جس حاجت کا اظہار کرو گے میں روا کروں گا''۔ اور جب خیبر کی جنگ سے آمدہ مالِ غنیمت تقسیم کیا جا رہا تھا تو وہ شخص آیا اور بولا: ''اے اللہ کے رسول میرا وعدہ؟'' تو آپ نے ﷺ فرمایا کہ: ''جو چاہتے ہو حکم کرو''۔ تو اس شخص نے اسّی ۸۰ بکریوں کی درخواست کی تو آپ نے عطا کر دیں اور فرمایا کہ تم نے تو بہت تھوڑے کی آرزو کی' وہ عورت جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی ہڈی کا پتا بتایا تھا جس کی بناء پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بازیاب کی اور آپ ﷺ نے وعدہ کیا کہ تمہاری ضرورت پوری کروں گا' تو تجھ سے تو اس عورت نے بہتر حکم دیا تھا اور اس سے زیادہ کی آرزو کی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس عورت سے پوچھا کہ

''کھو کیا چاہتی ہو تو بولی کہ ''میری جوانی مجھے لوٹائی جائے اور توبہ پر مجھے بہشت میں داخلہ ملے'' تب سے اس شخص کی آرزو بہ مثل مشہور ہوگئی عرب کہتے ہیں کہ ''فلاں اَسّی بکریوں کے مالک کی نسبت آسان گیر تر ہے''۔

اور جو چیز تم نہیں کر سکتے اس کا پختہ وعدہ نہیں کرنا چاہئے۔ آنحضرت ﷺ وعدہ کے بارے میں فرماتے: ''عسیٰ'' یعنی امید ہے کہ میں یہ کر سکوں گا' اور جب تم وعدہ کرو تو حتی الامکان اس کے خلاف نہ کرو سوائے امر مجبوری کے۔ اور جب تم نے کسی سے کس جگہ پر کا وعدہ دیا ہے نماز کے وقت آ جانے تک وہیں کھڑے رہنا چاہئے۔

یاد رہے کہ کوئی چیز کسی کو عطا کرنے کے بعد واپس لینا وعدہ خلافی سے بھی بدتر ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایسے شخص کو ایک کتے سے تشبیہ دی ہے جو قے کر کے پھر اسی کو کھا لے۔

آفتِ یازدہم: جھوٹی بات اور جھوٹی قسم ہے۔ اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''جھوٹ نفاق کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے'' نیز فرمایا کہ: ''بندہ ایک ایک کر کے دروغ گوئی کرتا ہے حتیٰ کہ اسے اللہ تعالیٰ کے نزدیک دروغ زن لکھا جاتا ہے''۔ نیز فرمایا کہ جھوٹ روزی کو کم کر دیتا ہے نیز فرمایا کہ تاجر فاجر ہیں تو لوگوں نے کہا کہ کس لیے؟ کیونکہ بیع حلال ہے۔ تو آپ نے فرمایا اس لیے کہ قسم کھاتے ہیں اور گناہگار ہو جاتے ہیں۔ بات کرتے ہیں تو جھوٹی ''افسوس ہے اس شخص پر جو جھوٹ اس لئے بولتا ہے کہ لوگ ہنسیں۔ افسوس اس پر صد افسوس''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''میں نے دیکھا کہ ایک نے مجھے کہا کہ ''اٹھو'' تو میں اٹھ کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک مرد کھڑا ہے تو دوسرا بیٹھا ہے۔ وہ جو کھڑا تھا اس نے ایک لوہے کی سیخ جس کا سر کج تھا اس شخص کے منہ میں ڈالی ہوئی تھی۔ اور اس کے منہ کا ایک گوشہ اس قدر کھینچ رکھا تھا کہ وہ اس کے کندھے کے سرے تک پہنچا ہوا تھا۔ پھر اسے دوسری طرف اسی طرح کھینچتا تھا پھر سامنے کی طرف کھینچتا تھا۔ تو میں نے اس سے کہا کہ: ''یہ کیا ہے'' تو وہ بولا یہ دروغ زن ہے کہ اس کی قبر میں اسی طرح اسے عذاب دیا جاتا ہے اور روزِ قیامت تک''۔

عبداللہ بن جراد رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ ''کیا مومن زنا کرتا ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہو سکتا ہے کہ کرے'' تو پھر پوچھا کہ ''مومن جھوٹ بولتا ہے'' فرمایا کہ ''نہیں'' ساتھ ہی یہ آیت آپ ﷺ نے پڑھی: ''اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ'' (قرآن: ۱۶/۱۰۵) (وہ جھوٹ وضع کرتے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی طرف مائل نہیں ہیں اور جھوٹے وہی ہیں)۔ جھوٹ وہ لوگ بولتے ہیں جو ایمان نہیں رکھتے۔

عبداللہ بن عامر ؓ فرماتے ہیں کہ ایک چھوٹا لڑکا کھیل میں مشغول تھا میں نے اس سے کہا ''آؤ میں تمھیں ایک چیز دیتا ہوں''۔ آنحضرت ﷺ ہمارے ہاں موجود تھے فرمایا کہ: ''اسے کیا دینا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا کہ ''خرما'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر تم نے خرما نہ دی تو تمھیں دروغ زن لکھا جائے گا''۔ نیز فرمایا کہ ''میں تمھیں بتاؤں کہ بزرگ تر کبائر کون سے ہیں؟'' شرک ہے اور ماں باپ کی نافرمانی؛ آپ تکیہ لگائے تھے۔ اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ: ''آلا وقول الزُّور' سخن دروغ نیز'' فرمایا کہ بندہ جب جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کی بدبو کی وجہ سے اس سے ایک میل دور ہو جاتا ہے''۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ بات کے دوران چھینک بات کی سچائی کی دلیل ہوتی ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ ''چھینک فرشتے کی طرف سے ہے اور جماہی شیطان کی طرف سے''۔ کیونکہ اگر بات جھوٹی ہوتی ہو تو فرشتہ موجود نہ ہوتا اور چھینک نہ آتی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو کوئی جھوٹی حکایت بیان کرتا ہے ایک دروغ زن وہ ہے'' آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی جھوٹی قسم کے ذریعے کسی کا مال لیتا ہے تو وہ روزِ قیامت اللہ کو خود پر غیظ کی حالت میں پائے گا''۔ نیز فرمایا کہ مومن میں ہر خصلت کا امکان ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے''۔

میمون بن ابی شبیب کہتے ہیں کہ میں ایک خط لکھ رہا تھا تو مجھے ایک ایسا کلمہ سوجھا کہ جس سے میرا نامہ آراستگی پاتا لیکن تھا دروغ اس لئے میں نے عزم کیا کہ نہیں لکھوں گا۔ تو مجھے ایک آواز سنائی دی کہ: ''یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ'' (قرآن: ۱۴/۲۷) (اللہ اپنے چاہنے والوں کو درست اور سچی بات پر استوار رکھتا ہے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)

ابن سماکؒ فرماتے ہیں کہ مجھے جھوٹ نہ بولنے پر کوئی مزدوری نہیں ملتی کہ میں اس کی بناء پر جھوٹ سے دامن کش رہوں بلکہ اس لئے جھوٹ سے پرہیز کرتا ہوں کہ جھوٹ بولنے سے مجھے شرم آتی ہے''۔

فصل: معلوم رہے کہ جھوٹ اس لئے حرام ہے کہ یہ دل پر اثر کرتا ہے جس سے دل کی صورت ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور یہ دل کو تاریک کرتا ہے۔ لیکن اگر ناگزیر ہو اور مصلحت کے لئے ہو تو وہ مکروہ تو ہے لیکن حرام نہیں۔ اس لئے کہ جب دل اس کے لئے بہ کراہت ہو تو دل اس سے اثر پذیر نہیں ہوتا نہ اس میں کجی آتی ہے اور جب انسان خیر کے ارادے سے جھوٹ کہتا ہے تو دل تاریک نہیں ہوتا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایک مسلمان کسی ظالم سے فرار کر کے آیا ہو تو نہیں چاہیئے کہ تم سچ سچ بتاؤ کہ وہ بیچارہ کہاں ہے۔ بلکہ ایسے میں جھوٹ واجب ہو جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے تین مواقع پر جھوٹ کی اجازت دی ہے:

ایک جنگ میں کہ اپنا عزم دشمن کو صحیح نہیں بتایا جا سکتا ہے۔ دوسرے جب تو دو شخصوں میں صلح کرانے

کی سعی میں ایک دوسرے سے اچھی بات کی روایت کرے اگرچہ اس نے نہ کہی ہو۔ اور تیسرے یہ کہ جس کی دو بیویاں ہوں تو وہ ان میں سے ہر ایک سے کہے کہ میں تمھیں دوسری سے زیادہ دوست رکھتا ہوں''۔

پس معلوم رہے کہ اگر کوئی ظالم شخص کسی کے مال کے بارے میں پوچھے تو اس امر کو مخفی رکھنا جائز ہوگا۔ اور اگر کسی دوسرے کے راز کو پوچھیں تو انکار روا ہوگا۔ کیونکہ حکم شرع یہ ہے کہ بُرے کاموں کی پردہ داری کرو۔ اور اگر بیوی بغیر وعدے کے خاوند کی اطاعت نہ کرے تو خاوند کے لئے جائز ہے کہ وعدہ کرے اگرچہ جانتا ہو کہ پورا نہ کر سکے گا۔ یہ اور ایسے ہی مواقع پر جھوٹ جائز ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دروغ نہیں کہنا چاہئے۔ لیکن اگر سچ کہنے سے ایسی چیز پیدا ہوتی ہو کہ جس سے حذر کرنا چاہئے۔ تو ایسے میں عدل وانصاف میں معاملے کو تولنا چاہئے۔ اگر عدم دروغ کی نسبت اس چیز کا نہ ہونا شرعاً مقصود تر ہو جیسے لوگوں کے درمیان لڑائی' اور میاں بیوی میں بے اُنسی یا مال کا ضیاع یا کسی بھید کا کھل جانا یا معصیت پر فضیحت کا ہونا وغیرہ ایسے میں دروغ مباح ہے کیونکہ اس کام کی بُرائی دروغ کی بُرائی سے زیادہ ہے۔ اور یہ ایسے ہی ہے کہ جب جان کے جانے کا خطرہ ہو تو مردار بھی حلال ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جان کا بچانا مردار نہ کھانے سے مقصود تر ہے۔ لیکن جب یہ صورت نہ ہو تو دروغ مباح نہ ہوگا۔ پس اگر کوئی اپنے جاہ ومال کی فزونی کے لئے جھوٹ بولے یا لاف زنی کرے یا خودستائی کرے یا اپنی شان وشوکت کے بارے میں غلط گوئی کرے تو یہ سب حرام ہیں۔

محترمہ اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ: اگر میں اپنے بارے میں اپنی سوت سے خاوند کی طرف ایسی مراعات کا ذکر کروں جو فی الاصل نہ ہوں۔ اور مقصود سوت کو غصہ دلانا ہو تو کیا یہ روا ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو کوئی اپنے بارے میں ایسی چیز کا ذکر کرے جو اسے حاصل نہیں وہ ایسے شخص کی مانند ہے جو بیک وقت دو جھوٹے لباس پہنے ہوئے ہو''۔ یعنی خود جھوٹ کہا ہو اور دوسرے کو بھی غلطی اور جہالت میں ڈال دیا ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ آگے بیان کرے جو اصلاً جھوٹ ہے۔ لیکن چھوٹے بچے سے ایسا وعدہ کرنا کہ جس سے وہ مکتب کی راہ لے جائز ہوگا اگرچہ جھوٹا ہو۔ اور حدیث میں ہے کہ وہ جھوٹ اس کے نامۂ اعمال میں لکھا نہیں جاتا۔ لیکن جو مباح ہو وہ بھی لکھا جاتا ہے تاکہ اس سے کہیں کہ ''تو نے کیوں کہا؟'' تاکہ درست غرض کا اظہار کرے کہ اس میں دروغ مباح ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ جو شخص کسی حدیث کا بیان کرے یا اس سے لوگ کوئی مسئلہ پوچھیں اور وہ جواب دے حالانکہ وہ حقیقتاً اس کا علم نہیں رکھتا تو یہ حرام ہوگا۔ کیونکہ یہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ ایسوں کی شان میں فرق نہ آئے۔

ایک گروہ خیرات اور ثواب کے کاموں کی تبلیغ کے لئے آنحضرت ﷺ کا نام استعمال کرنے کو روا جانتا

ہے لیکن یہ حرام ہے کیونکہ آنخضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''جو کوئی میرے بارے میں جھوٹ بولتا ہے اسے کہہ دو کہ اپنا مستقر دوزخ میں بنالے'' جب دروغ ماسوائے صحیح مقصد کے کہ شرعاً مقصود نہ ہو تو مناسب نہیں اور یہ بات گمان سے معلوم ہوسکتی ہے نہ کہ یقین سے اس لئے اولیٰ تر یہ ہے کہ جب تک یقین ظاہر نہ ہو تو لزوم کامل ثابت نہیں ہوتا اس لئے دروغ نہ کہنا چاہیے۔

فصل: اسلاف کو جب دروغ کہنے کی ضرورت پڑی ہے تو انھوں نے ایسی تدبیر کی ہے کہ ایسا لفظ استعمال کیا ہے کہ جس کو سننے والا مقصود کے سوا کچھ اور سمجھے۔ ایسے الفاظ کو معاریض کہا جاتا ہے۔ جیسے کہ مطرف رضی اللہ عنہ ایک امیر کے پاس گئے تو وہ امیر بولا کہ ''آپ اتنا کم کیوں آتے ہیں؟'' تو فرمایا کہ: ''جب سے آپ سے رخصت ہوا ہوں میں زمین پر پشت نہیں لگا سکا الّا جس کی حق تعالیٰ نے طاقت دی ہو''۔ تا کہ امیر سمجھے کہ بیمار رہا ہے۔ اور یہ بات سچ تھی۔ اور شعبی رضی اللہ عنہ کے دروازے پر جب کوئی ان کو طلب کرتا تو انھوں نے کنیز سے کہہ رکھا تھا کہ ایک دائرہ کھینچ کر اس کے اندر انگلی رکھ کر کہہ کہ ''شعبی یہاں نہیں ہیں'' یا کہہ دیتی کہ ''آپ ان سے مسجد میں ملئے''۔ اور معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ جب ولایت سے لوٹے تو ان کی بیوی نے کہا کہ ''عمر خطاب رضی اللہ عنہ کے اتنے کام آپ نے انجام دیئے ہمارے لئے آپ کیا لائے؟'' فرمایا کہ ایک نگہبان میرے ساتھ تھا اس لئے کوئی چیز نہ لا سکا'' یعنی حق تعالیٰ۔ جب کہ آپ کی بیوی یہ سمجھی کہ حضرت عمر نے کوئی جاسوس آپ کے ساتھ بھیج رکھا تھا۔ تو یہ عورت حضرت عمر کے گھر گئی اور عتاب کرتے ہوئے بولی کہ: ''معاذ رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول ﷺ کے نزدیک نیز ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نزدیک امین تھے تو تو نے معاذ کے ساتھ جاسوس کیوں بھیجا؟'' تو حضرت عمر نے معاذ کو بلوایا اور استفسار کیا تو جب معاذ نے حقیقت حال بیان کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہنسی آ گئی پھر آپ نے معاذ کو کچھ دیا تا کہ جا کر اپنی بیوی کو دے دیں۔

یاد رہے کہ یہ حیلہ بھی اس وقت روا ہے جب اس کی ضرورت لاحق ہو۔ لیکن جب ضرورت نہ ہو لوگوں کو غلطی میں ڈالنا مناسب نہیں، اگرچہ لفظ راست ہو۔

عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور میرا باپ ہم عمر بن عبد العزیز کے پاس گئے۔ جب میں باہر نکلا میں عمدہ لباس میں ملبوس تھا۔ تو لوگوں نے کہا کہ یہ امیر المؤمنین کی خلعت ہے''۔ تو میں نے کہا کہ: ''حق تعالیٰ امیر المؤمنین کو جزائے خیر دے''۔ تو میرے باپ نے کہا کہ کبھی جھوٹ نہیں کہنا چاہئے بلکہ جھوٹ کے مماثل بھی نہیں کہنا چاہئے''۔ یعنی کہ یہ جھوٹ کی مانند ہے لیکن معمولی غرض کے لئے بھی یہ مباح ہو گا۔ جیسے خوش طبعی کرنا یا کسی کا دل خوش کرنا جیسے کہ رسول نے فرمایا تھا کہ ''بڑھیا بہشت میں نہ جائے گی''۔

تمھیں اونٹ کے بچے پر بٹھائیں گے''۔ تیرے شوہر کی آنکھ میں سفیدی ہے؟'' لیکن اگر اس میں ضرر کا کوئی پہلو ہو تو روا نہیں۔ جیسے کسی کو فریب میں کہیں کہ ''ایک عورت تیری طرف مائل ہے'' تو سننے والا فریب میں مبتلا ہو جائے وغیرہ۔ لیکن اگر کوئی ضرر نہ ہو اور بہ طور مزاح دروغ گوئی کرے تو اگرچہ معصیت کے درجے کو تو نہ پہنچا لیکن کمالِ ایمان کے درجے سے گر گیا۔ آنحضرت کا فرمان ہے کہ: ''لوگوں کا ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ خلق کے لئے وہی پسند نہ کریں جو اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ اور جھوٹے مزاح سے ہاتھ نہ روک لیں اور یہ جو دل خوشی کے لئے کہا جاتا ہے کہ میں ''سو دفعہ آپ سے ملنے کی آرزو میں آپ کے گھر آیا ہوں''۔ تو یہ حرام کے درجے میں نہیں کیونکہ اس تقدیر سے مقصود حقیقتاً سو دفعہ نہیں بلکہ کثرت کے لئے کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اُسی قدر نہ ہو۔ لیکن اگر اکثر نہ آیا ہو تو دروغ ہوگا۔

اور یہ کہ معمول ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ''کچھ کھایئے'' اور جواب میں کہا جاتا ہے کہ ''مجھے نہیں چاہئے'' تو اگر کھانے کی خواہش ہو تو یہ جواب دینا چاہئے کہ مجھے ضرورت نہیں۔ آنحضرت نے دودھ کا ایک پیالہ عورتوں کو حضرت عائشہ ﷺ کی شادی کی رات پیش کیا تو وہ بولیں کہ ''ہمیں اس کی حاجت نہیں''۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''جھوٹ اور بھوک دونوں کو جمع نہ کرو''۔ تو عورتوں نے کہا کہ: ''اے اللہ کے رسول اتنی سی مقدار بھی دروغ ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''یہ چھوٹا سا جھوٹ ہے لیکن چھوٹا جھوٹ بھی لکھا جاتا ہے''۔

سعید مسیّب کو آنکھ کا درد تھا اور آنکھ کے گوشے میں ایک چیز جمع ہو گئی تھی۔ لوگوں نے کہا اگر اسے صاف کرے تو کیا حرج ہے؟ سعید بولا کہ: ''میں نے اپنے طبیب سے کہا ہے کہ میں آنکھ کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ اس لئے اگر صاف کروں تو خلاف وعدہ ہوگا اور دروغ متصور ہوگا''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ کبائر میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''خدا شاہد ہے کہ ایسے ہی ہے حالانکہ یہ دروغ ہوتا ہے''۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جو خواب کا بیان کرتے ہوئے جھوٹ بولتا ہے روزِ قیامت اس سے کہا جائے گا کہ جو کے دانے پر گرہ لگاؤ''۔

آفتِ دوازدہم: غیبت ہے۔ اور یہ اکثر زبانوں پر غالب ہوتی ہے۔ اور کوئی بھی اِلّا ماشاء اللہ اس سے بچا ہوا نہیں اور وبال اس کا بہت زیادہ ہے۔ حق تعالیٰ نے قرآن میں اس کے مشابہ قرار دیا ہے جیسے کہ کوئی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ اور آنحضرت کا فرمان ہے کہ ''غیبت سے بچو کیونکہ غیبت زنا سے بھی بدتر ہے۔ زنا سے توبہ قبول کی جاتی ہے لیکن غیبت کے لئے قبول نہیں ہوتی۔ کہ جب تک وہ جس کی غیبت کی گئی ہو خود معاف نہ کردے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ معراج کی رات میرا گذر ایک قوم پر ہوا جو اپنے چہرے کا گوشت

اپنے ناخنوں سے نوچ رہے تھے تو میں نے پوچھا کہ ''یہ کون سے لوگ ہیں؟'' تو مجھے بتایا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی غیبت کیا کرتے تھے''۔

سلیمان بن جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے استدعا کی کہ مجھے وہ چیز بتایئے جو میری دستگیری کرے' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''نیکی کے کاموں کو حقیر نہ سمجھو اگرچہ اتنا ہی کیوں نہ ہو کہ تم اپنے ڈول میں سے کچھ پانی کسی دوسرے کے کوزہ میں ڈال دو یا اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے پیش آؤ اور آپ سے جو رخصت ہو جائے تو اس کی غیبت نہ کرو''۔

حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ ''جو کوئی غیبت سے توبہ کر کے مرا وہ بہشت میں جانے والوں میں آخری شخص ہوگا اور اگر بغیر توبہ کئے مر گیا تو دوزخ میں جانے والوں میں اوّلین ہوگا''۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اللہ کے رسول کے ہمراہ سفر میں تھے۔ آپ ﷺ کا گذر دو قبروں پر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'یہ دونوں عذاب میں ہیں ایک غیبت کی بناء پر تو دوسرا اس بناء پر کہ کپڑوں کو پیشاب سے بچاتا نہ تھا۔ پھر آپ ﷺ نے ایک تازہ لکڑی کے دو ٹکڑے کئے اور ان دونوں کو قبر پر گاڑ دیا اور فرمایا کہ جب تک یہ لکڑیاں خشک نہ ہو جائیں گی ان پر عذاب ہلکا رہے گا۔

جب ایک شخص نے آنحضرت کے پاس آ کر زنا کا اقرار کیا تو آپ نے سنگسار کرنے کا حکم فرمایا۔ تو ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ ''اسے ایسے بٹھایا گیا ہے جیسے کسی کتے کو بٹھایا جاتا ہے''۔ پھر جب آپ ﷺ کا گذر ایک مردار جانور کے پاس سے ہوا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ''اس مردار کا گوشت کھاؤ'' تو وہ بولے کہ ''ہم مردار کیونکر کھائیں؟'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''وہ گوشت جو تم نے اپنے بھائی کا کھایا تھا وہ اس مردار سے بدتر اور غلیظ تر تھا''

اور آپ نے غیبت گو اور غیبت شنو دونوں کو معصیت کا مرتکب قرار دیا ہے۔

صحابہ ایک دوسرے سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرتے تھے۔ اور اسے فاضل ترین عبادت جانتے تھے۔ اور اس کے خلاف کو نفاق سمجھتے تھے۔

قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''عذابِ قبر تین قسم کو ہوتا ہے۔ اس کا ایک تہائی غیبت کے باعث ہوتا ہے اور ایک تہائی چغل خوری کے باعث اور ایک تہائی لباس کو پیشاب سے پاک نہ رکھنے کے باعث ہوتا ہے''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے حواریوں کے ساتھ ایک مردہ کتے کے پاس سے گذرے تو حواریوں نے کہا کہ ''یہ گندی شے ہے''۔ تو حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ ''اس کے سفید دانت کتنی عمدہ شے ہیں اور غیبت اس کتے کی

نسبت گندہ تر شے ہے''۔ آپ نے اس طرح انھیں یہ تعلیم دی ہے کہ جس چیز کو دیکھو اس کی خوبی کا ذکر کرو۔ ایک خنزیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذرا تو آپ نے فرمایا کہ: ''جاؤ سلامتی کے ساتھ'' تو حواری بولے: ''اے روح اللہ خنزیر سے آپ اس طرح فرماتے ہیں؟'' تو آپ نے فرمایا کہ میں اپنی زبان کو سوائے خیر کے کسی دیگر امر کے ساتھ آلودہ نہیں کرنا چاہتا''۔

حضرت علی بن الحسین نے ایک شخص کو دیکھا کہ غیبت کر رہا ہے تو آپ نے فرمایا ''خاموش! یہ دوزخ کے کتوں کا کھاجا ہے''۔

فصل: یاد رہے کہ غیبت یہ ہے کہ تو کسی شخص کے بارے میں اس کی غیر حاضری میں ایسی بات اس کے بارے میں کہے کہ اگر وہ خود سنے تو اس برا لگے اگرچہ تو نے سچ کہا ہو اور اگر تو نے جھوٹ کہا تو یہ باطل اور بہتان ہوگا۔ اور تو جو کسی کے حق میں کہے کہ جو غائب شخص کے لئے باعث نقصان ہو وہ غیبت ہے۔ اگر سراپا اس کے نسب وجاہ اور اس کے جانور' گھر یا کردار کے بارے میں کہے یا اس کے بدن کے بارے میں کہے کہ لمبا ہے یا سیاہ ہے یا زرد ہے یا کہے کہ گربہ چشم ہے' شوخ ہے یا بھینگا ہے۔ یا نسب کے باب میں کہے کہ ہندو بچہ یعنی غلام ہے یا حجام زادہ ہے یا جولاہے کا فرزند ہے۔ اور اس کے اخلاق کے بارے میں کہے کہ بدخو ہے' زبان دراز ہے' بزدل ہے اور عاجز ہے وغیرہ اور اس کے اعمال کے بارے میں کہے کہ چور ہے' خائن ہے' بے نماز ہے اور رکوع وسجود کا ملاً ادا نہیں کرتا اور قرآن غلط پڑھتا ہے' لباس پاک نہیں رکھتا' زکوٰۃ ادا نہیں کرتا۔ زبان کو قابو میں نہیں رکھتا' بسیار خور ہے' بہت زیادہ سوتا ہے' اور اپنی مقررہ جگہ پر نہیں بیٹھتا اور اس کے لباس کے بارے میں کہے کہ فراخ آستین اور دراز دامن ہے۔ لباس اس کا میلا ہے۔ مختصر یہ کہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''تو جو بھی کہے اگر وہ سنے تو اسے اس سے نفرت ہو۔ اور وہ برا مانے تو یہ غیبت ہے اگرچہ نفس لاامر میں سچ ہی کیوں نہ ہو''۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے ایک عورت کے بارے میں کہا کہ ''پست قامت ہے'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تم نے غیبت کا ارتکاب کیا۔ تھوک دو تو جب میں نے تھوکا تو اس میں سیاہ خون کا ایک ٹکڑا تھا جو میرے گلے سے باہر آیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا سو دفعہ استغفار کرو اور اُس عورت سے معافی چاہو''۔

ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ''جب کوئی معصیت کا ارتکاب کرے تو اس کا بیان غیبت نہ ہوگا کیونکہ یہ مذمت بھی دین ہی کے لئے ہے''۔ لیکن یہ خطا ہے۔ بلکہ کسی کو فاسق یا شراب خوار یا بے نماز نہیں کہنا چاہئے سوائے ایک عذر کے کہ جس کا بیان اس کے بعد ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے حد غیبت کے بارے میں فرمایا ہے کہ: ''اگر وہ شخص جس کی غیبت کی گئی ہے سنے تو اسے برا لگے تو ان جملہ بیان کردہ کلمات سے اسے کراہیت

ہوگی۔ یوں بھی بے فائدہ کلام سے پرہیز واجب ہے۔
فصل: یادرہے کہ غیبت فقط یہی نہیں کہ زبان سے کہے بلکہ آنکھ کے ذریعے یا اشارۃً یا ہاتھ سے یا لکھنے سے بھی غیبت کا ارتکاب ہوسکتا ہے۔ جو حرام ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا کہ فلاں عورت کوتاہ قد ہے تو آنحضرت نے فرمایا تھا کہ ''تو نے غیبت کی'' اسی طرح کسی کی نقل میں لنگڑا کر چلنا یا آنکھ کو ٹیڑھا کرنا کہ جس سے اس غائب کا حال معلوم ہو یہ بھی غیبت ہے۔ لیکن اگر نام نہ لے اور کہے کہ کسی نے ایسا کیا ہے'' تو یہ غیبت نہ ہوگی۔ لیکن اگر اس کے باوجود خدشہ ہو کہ حاضرین جان لیں گے کہ کس کے بارے میں ہے کہا گیا ہے تو پھر یہ بھی حرام ہوگا۔ کیونکہ مقصود تفہیم ہے جس ذریعے سے بھی ہو۔ قاریوں اور پارساؤں کا ایک جاہل گروہ غیبت کرتا ہے اور گمان یہ کرتا ہے کہ یہ غیبت نہیں ہے۔ مثلاً کسی شخص کے بارے میں ان کے سامنے کوئی بات کہی جاتی ہے تو فرماتے ہیں کہ: ''الحمدللہ حق تعالیٰ نے ہمیں اس سے بچایا ہوا ہے'' اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ تاکہ لوگ جان لیں کہ فلاں شخص یہ کرتا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ''فلاں بڑا خوش حال مرد ہے لیکن وہ بھی خلق میں ہماری ہی طرح مبتلا ہوگیا ہے اسے عشرت و آفت سے نجات کیسے ہو؟'' وغیرہ اور ایسے بھی ہوتا ہے کہ کوئی بہ ظاہر مذمت اپنی کرتا ہے لیکن اس سے دوسرے کی مذمت حاصل ہوتی ہے۔

ایسے بھی ہوتا ہے کہ کسی کے سامنے غیبت کی جاتی ہے تو وہ اس پر کہتا ہے کہ ''سبحان اللہ یہ بڑی عجیب بات ہے'' تاکہ غیبت کرنے والا مزید بانشاط ہو جائے یا وہ جو اہل مجلس میں ابھی غافل تھے وہ بھی متوجہ ہو جائیں یا کہے کہ ''مجھے یہ سن کر فلاں شخص اس طرح کے کام میں مبتلا ہوگیا ہے بہت غم ہوا ہے حق تعالیٰ اس پر رحم فرمائے''۔ اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس واقعے کو دوسرے بھی جان لیں۔ اور یوں ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کے بارے میں بات سن کر کہے۔ ''اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے توبہ کی توفیق دے'' تاکہ دوسروں کو معلوم ہو سکے کہ اُس نے معصیت کی ہے۔ یہ جملہ صورتیں غیبت ہی کی ہیں۔ لیکن جب یہ صورت ہوتی ہے تو ایسے شخص میں نفاق بھی ہوگا کیونکہ خود کو پارسا ظاہر کیا غیبت نہ کرنے سے جس کے نتیجے میں معصیت دگنی ہوگئی۔ حالانکہ وہ محض اپنی جہالت کی بناء پر سمجھتا ہے کہ اس نے خود غیبت نہیں کی۔ اور یوں بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی غیبت کرتا ہے تو جو اس سے کہتا ہے کہ ''خاموش رہ غیبت نہ کر'' لیکن دل سے غیبت کو برا نہ جانتا ہوں تو وہ بھی منافق ہے اور غیبت گو بھی کیونکہ غیبت پر کان دھرنے والا بھی غیبت میں شریک متصور ہوتا ہے۔ ایک دن ابوبکر صدیق اور عمر رضی اللہ عنہم دونوں اکٹھے تھے تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ ''فلاں شخص بہت سوتا ہے'' پھر انھوں نے آنحضرت ﷺ سے کھانے کے لئے سالن طلب کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم سالن تو کھا چکے'' تو وہ بولے کہ ''ہمیں تو معلوم

نہیں کہ ہم نے کیا کھایا ہے'' فرمایا ''تم نے اپنے ایک بھائی کا گوشت کھایا ہے'' تو آپ ﷺ نے دونوں کو یکساں قصور والا قرار دیا کہ ایک نے کہا تھا اور دوسرے نے سنا تھا۔ اور اگر کسی کی غیبت کو دل سے برا جانا ہو اور ہاتھ یا آنکھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا ہو تو بھی قصوروار ہوگا کیونکہ اس برائی کو سنجیدگی اور صراحت کے ساتھ منع کرنا چاہیئے تا کہ غائب شخص کے حق میں تقصیر کا مرتکب نہ ہوا ہو۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ وہ شخص جس کے بھائی کی غیبت کی جارہی ہو وہ اپنے غائب بھائی کی نصرت نہ کرے اور اسے تنہا چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ اسے اس وقت تنہا چھوڑ دیں گے جب اس کو مدد کی ضرورت اس سے زیادہ ہوگی۔

فصل: یاد رہے کہ دل سے غیبت کرنا اسی طرح حرام ہے جیسے زبان سے غیبت کرنا حرام ہے۔ چنانچہ جس طرح پسندیدہ نہیں کہ کسی کا عیب دوسرے سے بیان کرے تو اسی طرح کسی کے عیب کو اپنے دل سے بھی نہیں کہنا چاہیئے۔ دل سے غیبت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان بے دیکھے سنے یا بہ یقین جانے بغیر کسی کے بارے میں بدگمانی کرے۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''حق تعالیٰ نے مسلمان پر مسلمان کا خون، مال اور بدگمانی حرام کر دی ہے اور جو کچھ دل میں آئے اور اس کے بارے میں دو شاہدان عادل نے گواہی نہ دی ہو اور یقینی نہ ہو تو وہ خیال شیطان نے اس کے دل میں ڈالا ہوگا۔ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: ''ان جاء کم فاسق بنبا فبینوا'''' یعنی فاسق کی بات پر یقین نہ کرو اور شیطان کا سا فاسق اور کوئی نہیں اور حرام وہ ہوتا ہے جس پر تم دل کو لگا دو۔ لیکن اگر کوئی خیال ناگاہ بے اختیار دل میں وارد ہو اور تُو اسے برا جانے تو تُو اس کے لئے ماخوذ نہ ہوگا۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''مومن گمانِ بد سے خالی نہیں ہوتا لیکن سلامتی اس کی اس میں ہے کہ وہ گمانِ بد کو دل میں حقیقت کا درجہ نہ دے۔ اور جب تک اس میں احتمال کو موقع و مجال ہو تو خوب تر کا احتمال کرے اور تحقیق کی علامت یہ ہے کہ دل اس کے بارے میں گرانی محسوس کرے اور اس کی مراعات میں کمی کرنے لگے۔ لیکن اگر دل اور زبان اور اس شخص کے ساتھ معاملہ وہی رہے جو پہلے تھا تو یہ علامت اس بات کی ہے کہ تحقیق نہیں ہوئی۔ لیکن اگر ایک گواہ سے سنے تو توقف کرے اسے دروغ زن قرار نہ دے کیونکہ ایک گواہ کے بارے میں بدگمانی بھی روا نہیں۔ نہ فاسق کے بارے میں۔ بلکہ یہ کہے کہ اس شخص کا حال مجھ سے مخفی تھا اس شخص کے حال کی طرح اور اب بھی مخفی ہی ہے''۔ پس اگر معلوم ہو کہ دونوں کے درمیان عداوت اور حسد ہے تو ایسے میں توقف اولیٰ تر ہے۔ اور اگر اس مرد کو منصف تر جانے تو میلان اس کی طرف پہلے سے زیادہ ہوگا۔ اور جب کسی کے بارے میں بدگمانی ہوئی ہو تو اولیٰ تر یہ ہے کہ اس شخص کے تقرب میں کوشش زیادہ کرے۔ کیونکہ اس سے شیطان کے غم و غصہ میں اضافہ ہوتا

ہے۔اور بدگمانی کم ہونے لگتی ہے۔اور جب بہ یقین جان لے تو غیبت نہ کرے لیکن خلوت میں نصیحت کرے اور نصیحت میں فخر فروشی نہ کرے بلکہ چاہئے کہ نصیحت کے وقت اندوہ گیں ہو تا کہ مسلمان ہونے کے باعث غمگین ہوا ہو۔اور نصیحت بھی کی ہو تو اس طرح دونوں کے ثواب کا مستحق ٹھہرا۔

فصل: یاد رہے کہ دل میں غیبت کی آرزو بیماری ہے۔اور علاج اس کا فرض ہے اور علاج اس کا دو قسم کا ہے: اوّل علاجِ علمی' اور یہ بھی دو نوع کا ہے: ایک؛ یہ کہ وہ احادیث جو غیبت کے باب میں ہیں ان پر غور کرے اور جان لے جس کی غیبت وہ کرے گا اس کے بدلے میں اس کی نیکیاں اس شخص کے نامۂ اعمال میں منتقل کر دی جائیں گی۔نتیجۂ غیبت کرنے والا قلاش ہو جائے گا"۔آنخضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ غیبت نیکیوں کو اسی طرح نابود کر دیتی ہے جیسے آگ خشک لکڑی کو نابود کر دیتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کے باعث غیبت کرنے والے کے پاس برائیوں سے ایک نیکی بھی زائد نہ بچے اور غیبت کے باعث اس کی برائیوں کا پلڑا بھاری ہو جائے اور وہ اسی باعث دوزخ میں جائے۔دوسرے؛ یہ کہ انسان اپنے عیوب پر نگاہ ڈالے۔اگر اپنی ذات میں عیب دیکھے تو سمجھ لے کہ دوسرا بھی اسی کی طرح اس خرابی میں معذور ہے۔اور اگر اپنی ذات میں کوئی عیب نہ دیکھ پائے تو جان لے کہ اپنے عیبوں کے بارے میں لاعلمی سب عیبوں سے بڑا عیب ہے۔لیکن اگر سچ بھی کہتا ہو کہ خود میں کسی عیب سے شناسا نہیں تو بھی کسی مردار کے گوشت کھانے سے زیادہ برا اور کوئی عیب نہیں۔پس خود کو کہ بے عیب ہے غیبت کے ذریعے عیب دار کیوں بنائے؟ بلکہ چاہئے کہ اپنی بے عیبی پر اللہ کا شکر بجالائے۔ اور جان لے کہ اگر وہ کسی اور کو کسی تقصیر فعل سے منسوب کرے گا تو عیب سے تو کوئی انسان بھی خالی نہیں ہوتا اور جب انسان خود حدِ شرع کے کلیۂ مطابق نہیں ہوتا اگر چہ فقط صغائر میں مبتلا ہو تو جب خود پر پورا نہیں اتر پاتا تو دوسروں کے بارے میں استعجاب کیوں؟ اور اگر کسی شخص میں پیدائشی نقص ہے تو وہ تو خالق کی طرف سے ہے اور وہ شخص اس کا مرتکب نہیں ہے کہ اس کی ملامت کی جائے۔

اور علاج اس کا تفصیلاً یہ ہے کہ انسان غور کرے کہ وہ کیا شے ہے جو اسے غیبت پر انگیخت کرتی ہے۔وہ چیزیں آٹھ عدد سے زیادہ نہیں:

پہلی: یہ کہ غیبت کرنے والا اس شخص سے کسی وجہ سے ناراض ہو تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ کسی کی دشمنی میں خود کو دوزخ میں ڈالنا حماقت ہے۔تو گویا یہ دشمنی تو اس نے خود اپنی ذات سے کی۔آنخضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: "جو غصے کو پی لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اسے سب کے سامنے بلا کر فرمائیں گے کہ "حورانِ بہشتی میں سے جنھیں چاہے اختیار کر لے"۔

دوسری: وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انسان دوسروں کی موافقت کا طالب ہوتا ہے تا کہ ان کی رضا حاصل ہو تو علاج اس کا یہ ہے کہ اسے معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی حاصل کرنا بہ توسط لوگوں کی رضا کے حماقت اور جہالت ہے۔ بلکہ چاہئے تو یہ کہ لوگوں کو ناراض کر کے اور ان کا انکار کر کے، حق تعالیٰ کی خوش نودی کا طالب ہو۔

تیسری: وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اسے کسی جرم کی بناء پر پکڑا گیا ہو اور وہ کسی اور پر تھوپ دے تا کہ خود نجات پا جائے۔تو چاہئے کہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ کے خشم کی بلا بہ یقین اسے حاصل ہوگی۔اور وہ بلا اس مصیبت سے جس سے وہ اس دنیا میں خائف ہے عظیم تر ہوگی۔ پھر نجات کی یہ تدبیر محض وہمی ہے۔جب کہ اللہ تعالیٰ کا خشم بہ یقین اپنے وقت پر ظہور پذیر ہوگا۔تو ایسے میں چاہئے کہ اپنا دفاع تو کرے لیکن کسی دوسرے گناہ پر تو نہ تھوپے۔ ہوسکتا ہے کہ کہے ''اگر میں سلطان کے مال سے لے کر حرام کھاتا ہوں تو دوسرا بھی تو یہی کرتا ہے''۔تو یہ حماقت ہے۔کیونکہ گناہ میں کسی کی پیروی نہیں کرنی چاہئے۔تو یہ حوالہ دینے سے کون سی معذوری ثابت ہوتی ہے۔اگر تو کسی کو دیکھے کہ وہ آگ میں جارہا ہے تو اس کی پیروی نہ کرے گا۔تو معصیت میں موافقت بھی اسی قسم کی ہے۔ پس عذرِ باطل کے سبب ایک اور گناہ کا ارتکاب کیوں کرتے ہو اور غیبت بھی!

چوتھا سبب: یہ ہوتا ہے کہ کوئی چاہتا ہے کہ اپنی تعریف کرے لیکن اس کا امکان نہیں پاتا تو دوسروں کی برائی بیان کرتا ہے تا کہ اس کے ذریعے اپنی برتری اور پاکی کا اظہار کر سکے۔جیسے یہ کہے کہ: ''فلان بالکل احمق ہے یا فلاں عورتوں سے پرہیز نہیں کرتا'' مطلب یہ کہ میں کرتا ہوں۔تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ جو عاقل ہوگا وہ اس کی اس بات سے اُسی کے فسق اور جہل کا اعتقاد کرے گا اور اس کی فضیلت اور پارسائی کا قائل نہ ہو سکے گا۔ اور جاہل کے قائل ہونے سے کیا حاصل؟ بلکہ ایسا کرنے والا خود کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناقص کر لیتا ہے۔اور ناچیز انسان کے ہاتھ میں ہے کیا؟ کہ کسی شے کا اضافہ کر سکے۔

سببِ پنجم: حسد ہے کہ کسی کو جاہ، علم یا مال حاصل ہوتا ہے اور لوگ اس کے بارے میں خوش عقیدہ ہوتے ہیں، جسے حاسد نہیں دیکھنا چاہتا۔تو وہ اس کے عیب تلاش کرنے لگتا ہے تا کہ اس کے ساتھ نبرد آزما ہو۔ اور نہیں جانتا کہ یہ لڑائی تو وہ خود اپنے آپ سے کر رہا ہے کہ وہ اس جہان میں حسد کے عذاب میں ہے اور چاہتا ہے کہ اُس جہان آخرت میں بھی غیبت کے عذاب میں مبتلا ہو۔تا کہ دونوں جہانوں کی نعمتوں سے محروم ہو جائے۔اور نہیں جانتا کہ جس کے لئے جاہ وحشمت مقدر ہو چکا ہو تو حاسدوں کا حسد اس کے جاہ ٹیں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

سببِ ششم: استہزاء ہے تا کہ تمسخر سے کسی کا مذاق اڑائے۔نہیں جانتا کہ پہلے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنا

فضیحتہ کرتا ہے پھر دوسرے کا فضیحتہ لوگوں کے نزدیک کرتا ہے اور اگر غور کرے کہ وہ جس کا تمسخر اڑا رہا ہے روزِ قیامت وہ اپنے گناہ اِس کی گردن پر رکھے گا اور جس طرح گدھے کو ہانکتے ہیں وہ اسے ہانک کر دوزخ میں لے جائے گا۔ تو ایسے میں لوگ تجھی پر ہنسیں گے۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ جس کا حشر یہ ہونے والا ہے اگر صاحب خرد ہوگا تو کبھی تمسخر اور بازی کی طرف مشغول نہ ہوگا۔

سببِ ہفتم: یہ ہے کہ جس کی غیبت مقصود ہے اس سے کوئی گناہ سرزد ہوگیا ہو تو غیبت کرنے والا جیسا کہ اہل دین کی عادت ہے فی سبیل اللہ غمگین ہو جاتا ہے اور اس غم میں راست ہی کہتا ہے لیکن بیان غم میں اس گناہ گار کا نام اس کی زبان پر آ جاتا ہے اور وہ غافل ہوتا ہے کہ یہ تو غیبت ہے۔ اور نہیں جانتا کہ ابلیس نے اس کے ساتھ حسد کیا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ اس کے تاسف کی بناء پر اسے ثواب ملے تو ابلیس اس گناہ گار کا نام اس کی زبان سے ادا کرا دیتا ہے تا کہ اس غیبت کے باعث اس کے ثواب کو باطل کر دے۔

سببِ ہشتم: یہ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کے لئے اس شخص پر جس کی غیبت ہونے والی ہے گناہ گاری کے باعث رنج وغصہ ہو یا اس کے گناہ کے ارتکاب کے باعث اسے حیرت ہوتی ہو تو اس غم وغصے یا تعجب کے اظہار کے دوران اس گناہ گار کا نام اس کی زبان پر آ گیا ہو جس سے دوسرے باخبر ہو جائیں۔ تو یہ بات اس خشم کے ثواب کو زائل کر دے گی۔ بلکہ ایسے خشم وتعجب کا بیان تو ہو لیکن اس کا نام نہیں لینا چاہئے۔

عذروں کے سبب سے غیبت کی اجازت کا بیان

یاد رہے کہ غیبت جھوٹ ہی کی مانند حرام ہے اور سوائے کسی ضرورت کے مباح نہیں ہوتی۔ اور وہ چھ عذر ہیں:

عذرِ اوّل: بادشاہ یا قاضی کے حضور ظلم کی فریاد جو روا ہے۔ یا وہ جس سے فریادی امداد کا خواہاں ہو اس کے پاس بھی بیان کرنا روا ہے۔ لیکن جس شخص سے فریادی کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکتا ہو اس سے فریادی کو ظالم کے ظلم کی کہانی بیان نہ کرنی چاہئے۔ ایک شخص حضرت ابن سیرینؒ کے پاس حجاج کا ظلم بیان کر رہا تھا تو ابن سیرینؒ نے فرمایا کہ: ''حق تعالیٰ حجاج کا انصاف اس شخص سے جس نے غیبت کی اسی طرح لے گا جس طرح لوگوں کا انصاف حجاج سے طلب کرے گا''۔

عذرِ دوم: یہ ہے کہ اگر کہیں جائے فساد دیکھے تو ایسے شخص کو بتائے جو اس فساد کو روکنے پر قادر ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ طلحہ یا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس سے گذرے تو سلام کیا لیکن کسی نے سلام کا جواب نہ دیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی[1]۔ یہاں تک کہ ابوبکر نے بھی اس امر میں بات کی۔ لیکن اسے انھوں نے غیبت

(۱) احیاء العلوم الدین: ''عمر رضی اللہ عنہ عثمان رضی اللہ عنہ و مرتضیٰ علی رضی اللہ عنہ وطلحہ پر گذرے.....''

میں شمار نہیں کیا۔

عذرِ سوم: فتوٰی پوچھنا کہ ''بیوی یا باپ یا کوئی اور شخص میرے ساتھ یوں سلوک کرتا ہے'' تو اولیٰتر یہ ہے کہ یوں کہے کہ: ''اگر کوئی اس طرح کرے تو اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟'' اگر نام لے لے تو اجازت ہے تا کہ فتوٰی دینے والے کو اس واقعے میں بعینہٖ معلوم ہونا چاہیئے تا کہ راہِ چارہ پیدا ہو۔ ہندہؓ نے آنحضرت سے کہا کہ ''ابوسفیان بخیل ہے۔ جو دیتا ہے وہ میرے اور بچوں کی کفایت نہیں کرتا۔ اگر میں ابوسفیان کے علم کے بغیر اس کے مال میں سے کوئی چیز لے لوں تو کیا روا ہے؟'' تو آپ نے فرمایا ''اسی قدر جو کافی ہو انصاف کے ساتھ لے سکتی ہو''۔ ظلم اولاد پر یا بخیل کہنا غیبت ہے لیکن یہ عذرِ فتوٰی آنحضرت ﷺ نے جائز رکھا۔

عذرِ چہارم: یہ ہے کہ چاہتا ہو کہ ہدف غیبت کے شر سے لوگ بچیں۔ جیسے کوئی مبتدع ہو یا چور ہو اور کوئی سادگی میں اس پر اعتماد کرنے والا ہو یا ایسا شخص بیوی کا طالب ہو یا غلام خریدنا چاہتا ہوں اور جانتا ہو کہ اگر اس کا عیب بیان نہ کرے گا تو دوسرے کو نقصان پہنچے گا۔ تو ایسے میں عیب کا بیان کرنا اولیٰ تر ہے۔ اور چھپانا مسلمانوں پر شفقت برتنے کی بجائے خیانت ہوگی۔ اور قانوناً جرح کرنے والے کے لئے روا ہے کہ گواہ پر طعن کرے اور ایسے ہی وہ شخص کہ جس سے مشورہ کیا جائے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ ''فاسق میں جو برائی ہے وہ بیان کرو۔ تا کہ لوگ اس کی برائی سے بچ سکیں''۔ اور جہاں آفت کا خوف ہو وہاں اس کا ذکر سنت ہے۔ لیکن بغیر اس عذر کے بیان نہ کرنا چاہیئے۔ داناؤں نے کہا ہے کہ تین افراد کے حق میں جو کہا جائے وہ غیبت میں شمار نہیں ہوتا: ظالم بادشاہ، بدعتی، اور وہ جس کا فسق ظاہر ہو اور اس لئے ہے کہ یہ لوگ اسے مخفی نہیں رکھتے اور اگر کوئی بیان کرے تو ناراض نہیں ہوتے۔

عذرِ پنجم: یہ ہے کہ کوئی کسی ایسے نام سے معروف ہو کہ وہ نام معیوب ہو جیسے اعمش یا اعرج وغیرہ کہ جیسے نابینا کو بصیر یا چشم پوشیدہ یا ایسے ہی نام سے پکارے۔

عذرِ ششم: یہ ہے کہ کوئی برملا فسق کا ارتکاب کرے جیسے کہ مخنث یا شراب خور یا وہ لوگ جو فسق و فجور سے شرم سار نہ ہوں تو ایسوں کا ذکر روا ہوگا۔

غیبت کا کفارہ: معلوم رہے کہ غیبت کا کفارہ اس طرح ہے کہ انسان غیبت کرنے سے توبہ کرے اور اس پر پشیمان ہو۔ تا کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے نجات پائے۔ نیز جس کی غیبت کی ہو اس سے معافی طلب کرے تا کہ اس پر کئے گئے ظلم سے نجات پائے۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ جو کوئی کسی کی آبرو یا مال میں ظلم کرنے کا مجرم ہو اسے معافی طلب کر لینی چاہیئے قبل اس کے کہ ایسا وقت آ جائے کہ نہ درم رہے نہ دینار۔

پھر تو سوائے اس کے کہ غیبت کے مرتکب کی نیکیاں ہدفِ غیبت کو معاوضے میں دی جائیں۔ یا اس کی برائیاں غیبت کرنے والے کے نامۂ اعمال میں منتقل کردی جائیں اور کوئی چارہ نہ ہوگا۔

حضرت عایشہؓ نے ایک عورت کے بارے میں کہا کہ : ''وہ زبان دراز ہے'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم نے غیبت کی ہے جاؤ اس عورت سے معافی مانگو''۔ حدیث میں ہے کہ اگر انسان کسی کی غیبت کا مرتکب ہوا سے چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے اس شخص کی بخشش کی دعا کرے۔ تو بعضوں نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ سے غیبت زدہ شخص کے لئے بخشش ہی کافی ہے اور اس سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ دوسری ایسی ہی حدیثوں کی روشنی میں غلط فہمی ہے اور یہ استغفار اس وقت ہے کہ ہدف غیبت مر چکا ہو پھر استغفار اس کے لئے کرنی ہوگی اور بحلی سے مراد یہ ہے کہ عاجزی اور پشیمانی کے ساتھ غیبت زدہ کے پاس غیبت کرنے والا جائے اور کہے کہ ''میں نے غلطی کی۔ میں نے جھوٹ کہا مجھے معاف فرمائیے''۔ تو اگر غیبت شدہ شخص معاف نہ کرے تو اس کی ستایش کرنی چاہئے اور اسے مراعات دینی چاہئیں تا کہ دل اس کا راضی ہو جائے اور وہ معاف کردے۔ اس پر بھی معاف نہ کرے تو یہ اس کا حق ہے۔ لیکن جو مراعات غیبت کنندہ کرے گا سب اس کے اعمال میں بہ طور نیکی لکھی جائیں گی۔ اور ہو سکتا ہے کہ روزِ قیامت اس کا بدلہ دیں۔ لیکن اولیٰ تر یہ ہے کہ معاف کردیا جائے۔

اسلاف میں بعض معاف نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارے اعمال نامے میں اس سے عظیم تر نیکی اور کوئی نہیں''۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ معاف کردینا اس سے بھی فاضل تر نیکی ہے۔ ایک شخص نے حسن بصریؒ کی غیبت کی۔ تو حسن نے اس شخص کی خدمت میں تازہ رُطب کا ایک طباق بھیجا اور فرمایا کہ ''تم نے اپنی عبادت کا تحفہ میرے لئے بھیجا ہے تو نے چاہا کہ میں بھی اس کا بدلہ دوں۔ معذرت چاہتا ہوں کہ میں پورا پورا نہ دے سکا''

یاد رہے کہ معافی طلبی اس وقت درست ہوگی کہ معافی مانگنے والا ان الفاظ کو دہرائے جو بہ طور غیبت اس نے کہے ہوں کیونکہ مبہم اور مجہول سے اظہار بیزاری درست نہ ہوگا۔

آفتِ سیزدہم: غیبت اور نمامی ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے کہ ''هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ'' (قرآن: ۶۸/ ۱۱) (برائی تھوپنے والے اور سخن چین)۔ نیز فرمایا کہ ''وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ'' (قرآن: ۱/۱۰۴) غمازی' سخن چینی اور بدگوئی پر افسوس''۔ نیز فرمایا ''حَمَّالَةَ الْحَطَبِ'' (قرآن: ۴/۱۱۱) (وہ ایندھن اکٹھا کرنے والی) ان جملہ کلمات سے نمامی ہی مراد ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''نمام بہشت میں نہ جائے گا'' نیز فرمایا کہ ''میں تمھیں بتاؤں کہ تم

میں بدترین کون ہے: وہ لوگ جو چغل خوری کرتے ہیں اور حقائق میں آمیزش کر کے لوگوں کو باہم لڑاتے ہیں''۔ نیز فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے جب بہشت کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا کہ ''بات کرو'' تو بہشت بولی کہ ''خوش نصیب ہے وہ جو مجھ تک پہنچا'' اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''مجھے اپنے عزّ وجلال کی قسم کہ آٹھ قسم کے لوگ تجھ میں داخل نہ ہوسکیں گے: شراب خور' زانی جو اس پر قائم رہے' نمام' دیوث' بے غیرت' عوان (پاسبان) مخنث اور قاطع رحم اور وہ جو عہد کرے لیکن اسے ایفا نہ کرے۔

حدیث میں ہے کہ: ''بنی اسرائیل میں قحط پڑ گیا۔ بارہا دعائے باران کے لئے باہر نکلے لیکن بارش نہ ہوئی۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ تمھاری دعا اس لئے قبول نہیں کرتا کہ تمھارے درمیان ایک نمّام ہے''۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ فرمایئے وہ کون ہے تاکہ میں اسے باہر نکال دوں''۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''میں نمّام کو دشمن جانتا ہوں خود نمّامی کیسے کروں؟'' تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا اور سب نے توبہ نمامی سے کی تب اللہ تعالیٰ نے بارش بھیج دی۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص ایک حکیم کی تلاش میں تھا۔ اس نے اس کے لئے سات سو فرسنگ راہ طے کی۔ تب جا کر اس سے پوچھا ''وہ کیا شے ہے جو آسمان سے بھی وسیع تر ہو؟ اور وہ کیا ہے جو زمین سے گراں تر ہو؟ اور وہ کیا ہے جو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اور وہ کیا ہے جو آگ سے بھی زیادہ تیز ہے اور وہ کیا ہے جو زمہریر سے زیادہ سرد ہو اور وہ کیا ہے جو سمندر سے زیادہ دولت مند ہو۔ اور وہ کیا ہے جو یتیم سے خوار تر ہے؟'' تو اس حکیم نے کہا کہ: ''بے گناہ شخص پر بہتان زمین سے زیادہ بھاری ہے' اور حق آسمان سے فراخ تر ہے' اور قانع دل سمندر سے زیادہ دولت مند ہے' اور حسد آگ سے زیادہ تیز ہے' اپنے اقارب کی حاجت جو روا نہ کی جائے زمہریر سے سرد تر ہے اور کافر کا دل پتھر سے زیادہ سخت ہے اور وہ نمام (سخن چین) جس کی بات نہ سنی جائے وہ یتیم سے ذلیل تر ہے۔

فصل: معلوم رہے کہ نمامی فقط وہی نہیں ہے کہ جو ایک کی بات دوسرے کے پاس جا کر کہتا ہے بلکہ ہر وہ شخص جو کسی کے کام کو اس طرح آشکار کرے کہ جس سے دوسرے کو تکلیف پہنچے تو ایسا شخص نمام ہی کہلائے گا۔ خواہ وہ سخن چینی ہو یا فعل یا کوئی اور چیز خواہ اسے بات کے ذریعے آشکار کرے خواہ اشارۃً خواہ بذریعہ تحریر بلکہ کسی بھی شے سے پردہ اٹھانا کہ جس سے دوسرا رنجیدہ ہو شایستہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کسی نے مخفیانہ کسی کے مال میں خیانت کی ہو۔ تو اسے ظاہر کرنا جائز ہوگا۔ اور ایسے ہی وہ امر جس کے پوشیدہ رہنے سے مسلمان کا زیان ہو۔ اور ہر وہ شخص کہ جس کے پاس نقل کیا جائے کہ فلاں شخص نے تمھارے بارے میں یہ کہا ہے یا تیرے حق میں یوں کرنے والا ہے تو ایسے شخص کو چھ چیزیں بجالانی چاہئیں۔

پہلی بات: تو یہ ہے کہ نمّام پر یقین نہ کرے۔ کیونکہ نمّام فاسق ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''فاسق کی بات نہ سنو''۔

دوسرے: یہ کہ اسے نصیحت کرے اور اس گناہ سے روکے کیونکہ منکر کی نہی کرنا واجب ہے۔

تیسرے: یہ کہ نمام کو اللہ کا دشمن سمجھے کیونکہ نمّام کی دشمنی واجب ہے۔

چوتھے: یہ کہ دوسرے شخص کے بارے میں بدگمانی نہ کرے کیونکہ گمانِ بد حرام ہے۔

پانچویں: یہ کہ درستی کو جاننے کے لئے ٹوہ نہ لگائے کیونکہ تجسس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

چھٹے: یہ کہ جو کچھ نمّام کے لئے پسندیدہ نہیں سمجھتا، یعنی نمامی، تو وہ اپنے لئے بھی پسند نہ کرے۔ اور اس کی نمّامی کسی اور کو بیان نہ کرے بلکہ اس کی پردہ پوشی کرے۔ یہ چھئیوں باتیں واجب العمل ہیں۔

ایک شخص نے عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے پاس نمامی کی تو آپ نے فرمایا کہ: ''دیکھ اگر تو نے جھوٹ کہا ہے تو تو اس آیت کا مصداق ہے کہ ''اِنْ جَآءَ کُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ'' (اگر فاسق تمھارے پاس کوئی خبر لائے اس کی خوب تحقیق کرو) (قرآن: ۶/۴۹) اور اگر تو نے سچ کہا تو اس آیت کا مصداق ہے کہ ''ھَمَّازٍ مَّشَّآءٍ م بِنَمِیْمٍ'' (قرآن: ۱۱/۶۸) (نکوہش گر، سخن چین دونوں) اگر چاہو تو توبہ کرو تا کہ میں تمھیں معاف کر دوں''۔ وہ بولا: ''اے امیر المؤمنین معاف فرمایئے''۔ ایک شخص نے ایک حکیم سے کہا فلاں شخص نے تمھارے بارے میں یوں کہا ہے'' تو اس حکیم نے فرمایا کہ: ''تو زیارت کے لئے آیا تو تو نے تین خیانتیں کیں: اپنے بھائی کو میرے دل میں ناپسندیدہ ٹھہرایا۔ اور میرے خالی دل کو فضول میں مشغول کر دیا۔ اور خود کو میرے نزدیک فاسق اور متہم کر دیا''۔

سلیمان بن عبدالملک نے ایک شخص سے کہا ''تو نے مجھے کچھ کہا ہے؟'' تو وہ بولا کہ ''نہیں میں نے کچھ نہیں کہا'' تو سلیمان نے کہا کہ ''معتمد گواہ نے ذکر کیا ہے''۔ زُہری[1] وہاں بیٹھا ہوا تھا بولا کہ ''نمام کبھی گواہ عادل نہیں ہوتا'' تو سلیمان نے کہا ''تم نے صحیح فرمایا''۔

حسن بصری کا قول ہے کہ ''جو کوئی کسی دوسرے کی بات تمھارے پاس لاتا ہے وہ تمھاری بات بھی یقیناً دوسرے کے پاس لے جاتا ہے۔ ایسے شخص سے پرہیز کرو بلکہ درحقیقت اسے دشمن جاننا چاہئے۔ کیونکہ اس کا یہ فعل غیبت بھی ہے تو غدر وخیانت بھی اور کینہ اور حسد بھی، نفاق بھی اور تخلیط اور فریب بھی اور یہ سب خیانت ہی ہے۔ کہتے ہیں ''نمّام اور غمّاز وہ شخص ہے جو کبھی سچ نہیں کہتا خواہ دوسرے سب سچ کہیں''۔

---

۱ زُہری سے مراد ابو بکر محمد بن مسلم (۵۸-۱۲۴ھ-ق)

مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ہمارے نزدیک چغلی کو قبول کرنا چغلی کے ارتکاب سے بھی برا ہے کیونکہ سعایت دلالت ہے اور پذیرائی اجازت ہے''۔ آنحضرت کا فرمان ہے کہ ''چغل خور حلال زادہ نہیں ہوتا''۔

یاد رہے کہ نمّام اور مخلّط کا شر بہت بری چیز ہے۔ اور ممکن ہے کہ اس کے باعث خون ریزی ہونے لگے۔ ایک شخص غلام فروخت کرر ہا تھا تو ساتھ ہی بتا بھی رہا تھا کہ ''اس میں نمامی اور تخلیط کے سوا اور کوئی عیب نہیں'' تو ایک شخص نے کہا کہ کوئی حرج نہیں اور خرید لیا۔ تو اس غلام نے جب چند دن گذر گئے مالک کی بیوی سے کہا ''خواجہ تمھیں عزیز نہیں رکھتا وہ ایک کنیز کے خریدنے کے چکر میں ہے اس لئے اب تم یوں کرو کہ جب مالک سو جائے تو اس کے حلق کے نیچے سے چند بال استرے سے کاٹ لانا پھر میں اس پر جادو دم کردوں گا جس سے خواجہ تمھارا عاشق ہو جائے گا''۔ ادھر مالک سے کہا کہ تمھاری بیوی کسی اور پر عاشق ہے اس لئے تمھیں مار ڈالے گی۔ تو تم خود کو سویا ہوا بنا لینا پھر دیکھنا'' خواجہ رات کو لیٹ گیا اور ظاہر یوں کیا جیسے کہ سو گیا ہے۔ تو بیوی ہاتھ میں استرہ لئے مالک کے سرہانے آ بیٹھی اور اس کی ڈاڑھی کو پکڑا کہ بال کاٹ لے تو مالک کو شک نہ رہا کہ وہ مجھے قتل کرنے پر تلی ہوئی ہے' اچھلا اور بیوی کا کام تمام کر دیا۔ جب بیوی کے قبیلے والے مطلع ہوئے تو انھوں نے آ کر بیوی کے قتل کے عوض میاں کو مار ڈالا۔ اور دونوں قبیلوں کے عزیز و اقارب بکثرت تھے اور ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے تو اس جنگ میں بہت سے لوگ مارے گئے بہ سبب ایک نمّام کی نحوست کے۔

آفتِ چہاردہم: دو دشمنوں کے درمیان منافقت کرنا ہے۔ دونوں میں ہر ایک سے بات اس طریق سے کرنا کہ وہ خوش ہو جائے اور اِس کی بات اُس کے پاس نقل کرنا اور اُس کی بات اِس کے پاس نقل کرنا اور ہر ایک پر ظاہر یہ کرنا کہ میں تمھارا ہی دوست ہوں۔ تو یہ کام نمامی سے بھی بدتر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''جو کوئی اس دنیا میں دو زبان ہوگا تو اس دنیائے آخرت میں اس کی دو آتشیں زبانیں ہوں گی''۔ نیز فرمایا کہ انسانوں میں بدترین دورُوہے''۔

پس وہ شخص جو دو باہم دشمن افراد کے ساتھ میل جول رکھتا ہے۔ اسے چاہئے کہ جو کچھ بھی سنے تو اس کے بارے میں یا تو خاموش رہے یا جو حقیقت ہے وہ بیان کرے اس شخص کی موجودگی میں بھی اسی طرح اور غیر حاضری میں بھی اسی طرح تا کہ منافق نہ گردانا جائے۔ اور ایک کی بات دوسرے دشمن کے پاس نہ لے جائے۔ اور نہ ہر ایک سے کہے کہ میں تمھارا معاون ہوں۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے کہا کہ ''ہم جب امیروں کے پاس جاتے ہیں تو باتیں اور طرح کرتے ہیں باہر آتے ہیں تو دوسری طرح کرتے ہیں''۔ تو ابن عمر نے فرمایا کہ ''ہم عہد رسول اللہ میں اسے نفاق کہتے تھے۔

اور جو شخص بے ضرورت بادشاہوں کے حضور جاتا ہے وہاں ایسی بات کرتا ہے کہ واپسی پر نہیں کرتا منافق ہوگا اور دوزُو۔ لیکن اگر واقعی ضروری ہو تو اجازت دی گئی ہے۔

آفتِ پانزدہم: لوگوں کی تعریف وستایش کرنا اور صلے کی امید پر مدّاحی کرنا۔ اس میں چھ ابتلائیں ہیں۔ چار کہنے والے میں اور دو سننے والے میں جو ممدوح ہوتا ہے:

مدح کرنے والے کی ایک آفت یہ ہے کہ مبالغہ کرتا ہے اور دروغ بیان کرتا ہے۔ لہٰذا دروغ زن ہو جاتا ہے۔ کتب آثار میں ہے کہ ''جو کوئی لوگوں کی مدح میں مبالغہ کرتا ہے روزِ قیامت اس کی زبان لمبی ہوگی اتنی لمبی کہ زمین کو چھو رہی ہوگی اور چلنے پر پاؤں اس پر پڑتا ہوگا۔ اور وہ خود اس پر سے پھسلے گا''۔

دوسری آفت مدح کرنے والے کی یہ ہے کہ اس میں نفاق ہوگا۔ جس کا اظہار وہ مدح میں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمھیں دوست رکھتا ہوں اور ممکن ہے کہ دوست نہ رکھتا ہو۔

تیسری آفت مدح نگار کی یہ ہے کہ ایسی چیز کا بیان کرتا جسے وہ بہ تحقیق نہیں جانتا۔ مثلاً ممدوح کو پارساؤ پرہیز گار اور عالم فاضل وغیرہ۔ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کے سامنے ایک شخص کی مدح کی تو آپ ﷺ نے فرمایا ''تجھ پر افسوس! کہ تو نے تو اس کی گردن ماردی'' پھر آپ نے فرمایا کہ ''اگر کسی کی مدح گوئی لازم ہو جائے تو یوں کہنا چاہئے کہ ''میرا گمان ہے کہ وہ ایسا ہے اور اللہ تعالیٰ پر میں کسی کو پاکیزہ نہیں گردانتا'' تو اس طرح اس کا حساب اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ گمان کرتا ہے کہ سچ کہتا ہے''۔[1]

چوتھے یہ کہ ممکن ہے کہ ممدوح ظالم ہو اور مدح کہنے والے کی بات پر خوش ہو جائے جب کہ ظالم کو خوش کرنا پسندیدہ نہیں۔ آنحضرت کا فرمان ہے کہ ''جب کسی فاسق کی مدح کی جائے تو اللہ تعالیٰ مدح سرا کو غیظ کی نگاہ سے دیکھتا ہے''۔ اور ممدوح کو دو وجوہ زیان کی ہیں: ایک یہ کہ کبر وغرور اس کے باطن میں پیدا ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دن اپنا درّہ لئے بیٹھے تھے کہ اتنے میں جارود[2] وہاں آ گئے تو ایک شخص بولا کہ یہ قبیلہ ربیعہ کا سردار ہے''۔ تو جونہی جارود بیٹھے حضرت عمر نے انھیں ایک درہ مارا تو وہ بولے ''اے امیر المؤمنین! یہ کیا؟'' تو

۱؎ احیاء میں ہے کہ: اگر تم میں سے کوئی مدح کہنے پر مجبور ہو تو چاہئے کہ کہے ''فلاں کے بارے میں یہ میرا گمان ہے کہ میں اللہ کے حضور اس کے پاک باز ہونے کا اثبات نہیں کرتا کیونکہ اس کا حساب اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے''۔

۲؎ مراد بشر بن المنذر بن الجارود ہے اور وہ ابن الجارود کے طور پر معروف ہے (وفات: ۸۳ھ-ق) لیکن جارود اس شخص یعنی بشر بن عمرو کا جدامجد ہونا چاہئے۔

حضرت عمر نے فرمایا ''تم نے سنا نہیں کہ اس شخص نے کیا کہا؟'' تو وہ بولے ''میں نے سنا ہے لیکن اب کیا ہوا؟'' تو حضرت عمر نے فرمایا کہ ''مجھے خوف تھا کہ ''تمھارے دل میں کوئی آفت پیدا ہوگی اس لئے میں نے چاہا کہ تمھارے کبر کو توڑ دوں''۔

ممدوح کے لئے دوسری آفت یہ ہے کہ مدح کرنے والا جب اس کی صلاح اور اس کے علم کے بارے میں ثنا گوئی کرتا ہے تو ممدوح مستقبل میں سست پڑ جاتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ میں کمال کو پہنچ چکا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے کس شخص کی تعریف کی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم نے تو اُسے ہلاک کر ڈالا۔ کیونکہ جب اس نے سن لیا تو مزید فلاح سے دست کش ہو جائے گا''۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''اگر کوئی کسی کے نزدیک تیز چھری لے کر آئے تو یہ بہتر ہے اس سے وہ اس کے کہ سامنے اس کی تعریف کرے''۔

زیادہ بن اسلم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''جو کوئی اپنی تعریف سنتا ہے تو شیطان اس کے سامنے آتا ہے تو ممدوح کو اس جگہ سے اٹھالیتا ہے اور اگر ممدوح خود شناس مومن ہو تو شیطان اس کے حضور انکساری کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن جہاں ان چھ آفات کا خدشہ نہ ہو مدح سرائی پسندیدہ ہے۔ آنحضرت نے صحابہ کی تعریف فرمائی ہے۔ آپ نے فرمایا ''اے عمر رضی اللہ عنہ! اگر مجھے خلق پر مبعوث نہ کیا جاتا تو تمھیں مبعوث کیا جاتا''۔ اسی طرح فرمایا کہ ''اگر تمام عالم کا ایمان ابو بکر کے ایمان کے مقابلے میں لایا جائے تو ابو بکر کا ایمان زیادہ وزنی نکلے گا''۔ وغیرہ اس لئے کہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ انھیں اس ستایش سے کوئی ضرر نہیں پہنچنے کا۔

لیکن خود ستائی مذموم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے اور کہا ہے ''فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ'' (قرآن: ۳۲/۵۳) (خود کو بے گناہ نہ سمجھو اور پاک نہ کہو)۔ لیکن اگر کوئی لوگوں کا پیشوا ہو اور اپنا حال اس لئے بیان کرے تا کہ وہ اس کی پیشوائی کی توفیق پائیں تو روا ہوگا۔ جیسے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ'' یعنی میں اس سیادت پر فخر نہیں کرتا بلکہ فخر اس میں ہے کہ یہ مجھے عطا ہوئی'' اور یہ اس لئے فرمایا کہ سب آپ کی متابعت کریں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ''اِجْعَلْنِىْ عَلٰى خَزَائِنِ الْاَرْضِ اِنِّىْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ'' (قرآن: ۱۲/۵۵) (اے رب مجھے اس زمین کے خزانوں پر مقرر فرما کیونکہ میں ان کا محافظ ہوں اور جاننے والا ہوں)۔

فصل: جب کسی کی مدح کی جارہی ہو تو ممدوح کو چاہیئے کہ تکبر اور عُجب سے دور رہے۔ اور خاتمے کے خطر کے بارے میں سوچے کہ جس کی خبر کسی شخص کو بھی نہیں۔ اور جو کوئی دوزخ سے نجات نہ پا جائے تو اس سے تو کتے اور خنزیر برتر ٹھہرے۔ اور کسی کو خبر نہیں کہ وہ ناجی ہے یا نہیں۔

اور چاہئے کہ انسان سوچے کہ اگر مدح کرنے والا ممدوح کے تمام اسرار سے واقف ہوتو کبھی اس کی مدح نہ کرے۔ اس لئے ممدوح کو اللہ کا شکر کرنا چاہئے جو اس کے باطن کا پردہ پوش ہے۔ ممدوح کو چاہئے کہ اپنی مدح پر کراہیت کا اظہار کرے اور دل میں بھی برا سمجھے۔

اسلاف میں سے ایک کی مدح کی گئی تو فرمایا ''بارِ خدایا یہ لوگ مجھے نہیں جانتے اے اللہ تُو جانتا ہے'' اسی طرح ایک بزرگ کی مدح کی گئی تو فرمایا کہ: ''بارِ خدایا یہ مرد میرا التقرب اس شے سے کرتا ہے کہ جسے تو دشمن رکھتا ہے اور میں تجھے اپنا گواہ بناتا ہوں کہ میں تو آپ کے تقرب کا خواہاں اس کی دشمنی کے بل پر ہوں''۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابن ابی طالب کی ثنا لوگوں نے کہی تو آپ نے فرمایا کہ ''یارب! مجھے ان باتوں پر نہ پکڑنا جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں اور انھیں معاف کردے اس کے بارے میں جس کا علم نہیں اور مجھے اس سے بہتر بنادے جیسا کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں''۔ ایک شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت نہیں کرتا تھا لیکن از روئے نفاق اس نے حضرت علی کی ثنا کی تو حضرت نے فرمایا کہ: ''میں اس سے ادنیٰ ہوں جو تمھاری زبان پر ہے اور اس سے بڑھ کر ہوں جو میرے بارے میں تمھارے دل میں ہے''۔

اصل چہارم: خشم، حقد و حسد اور آفات کے بیان میں
(اوران کا علاج)

خشم کے بارے میں

معلوم رہے کہ جب خشم غلبہ پالے تو یہ مذموم صفت ہے۔ اور اصل اس کی آگ سے ہے وہ آگ کہ جس کا زخم دل پر لگتا ہے اور نسبت اس کی شیطان کے ساتھ ہے۔ جیسے کہ اس نے کہا کہ: ''خَلَقْتَنِي مِنْ نَار وَ خَلَقْتَهُ مِنْ طِيْن'' (قرآن: ۸۶/۳۸) (تو نے مجھے آتش سے تخلیق کیا اور اسے مٹی سے) اور آگ کا کام حرکت اور بے سکونی ہے، اور مٹی کا کام وقار اور آرام ہے اور جس پر غصہ غالب ہوتا ہے اس کی نسبت آدم کی بجائے شیاطن سے ظاہر تر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ ''وہ کیا چیز ہے جو مجھے اللہ تعالیٰ کے غصے سے دور رکھے؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''خشمگیں نہ ہونا'' نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ''مجھے ایسا عمل بتایئے جو مختصر ہو لیکن اس کے باعث نجات پاسکوں؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''لَا تَغْضَبْ''، یعنی غضب (خشم) میں نہ آنا''۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بار بار اپنا سوال دہرایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

ہر بار یہی جواب دیا کہ "لَا تَغْضَبْ"۔ آنحضرت کا فرمان ہے کہ غیظ وغضب ایمان کو اسی طرح تباہ وبرباد کر دیتا ہے جس طرح حنظل شہد کو برباد کر دیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک راہب سے کہا "خشمگیں نہ ہونا" تو راہب نے جواب دیا کہ "یہ نہیں کرسکتا کہ میں بشر ہوں"۔ تو حضرت عیسیٰ نے فرمایا: "مال جمع نہ کر" تو راہب نے کہا "ہاں یہ میں کرسکتا ہوں" یاد رہے کہ مطلق خشم سے دست کش ہونا فطرتاً ممکن نہیں لیکن غصے کو پی جانا تو تیری عظمت کی بات ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ" (قرآن: ۳/۱۳۴) (اور وہ غیظ وغضب کو پی جانے والے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دینے والے ہیں) اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو غصے کو پی جانے والے ہوں۔ آنحضرت فرماتے ہیں کہ "جو کوئی اپنے غصے کو روک لیتا ہے حق تعالیٰ اس پر سے اپنے عذاب کو روک لیتے ہیں اور جب ایسا شخص اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عذر کو قبول فرماتے ہیں۔ اور جو کوئی اپنی زبان قابو میں رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ننگ کی پردہ پوشی فرماتے ہیں"۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جو کوئی غصہ نکال سکتا ہو لیکن اگر غصہ پی جائے تو روزِ قیامت حق تعالیٰ اس کے دل کو اپنی رضا سے معمور کر دیں گے"۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ "دوزخ کا ایک دروازہ ہے جس میں سے کوئی نہیں گذر سکتا سوائے اس شخص کے جو خلاف شرع اپنا غصہ نکالتا ہو"۔ نیز فرمایا کہ "جو گھونٹ بھی انسان اپنے گلے سے اتارتا ہے اللہ تعالیٰ کو غصے کے ایسے گھونٹ کے اتارنے سے زیادہ عزیز نہیں اور کوئی بندہ بھی غصے کو نگل نہیں سکتا جب تک اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ایمان سے معمور نہ کر دیں"۔

فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ، سفیان ثوریؒ اور بزرگوں کی ایک جماعت اس بات پر متفق ہیں کہ غصے کے وقت بُردباری سے برتر اور کوئی عمل نہیں۔ نہ طمع کے وقت صبر سے برتر کوئی عمل ہے۔

ایک شخص نے عمر بن عبدالعزیزؒ سے سخت الفاظ میں بات کی تو آپ نے سر جھکایا اور کہا "تم نے چاہا کہ مجھے خشم آمادہ کرو اور شیطان مجھے کبر وسلطنت کی وجہ سے انگیز کرے اور میں تم پر اپنا غصہ نکالوں تو تم کل قیامت کو اس کا بدلہ مجھ سے چاہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہونے کا"۔ یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے۔ انبیاء کرام میں سے ایک نے فرمایا کہ کون ہے جو مجھ سے قبول کرے کہ خشمگیں نہ ہو اور میرے مرنے کے بعد میرا خلیفہ ہو اور بہشت میں برابر میرے ساتھ ہو؟" تو ایک نے کہا کہ "میں کفالت کرتا ہوں اور قبول کرتا ہوں"۔ نبی نے پھر اپنی بات دہرائی تو اس شخص نے وہی جواب دیا کہ "میں قبول کرتا ہوں"۔ پھر اس شخص نے اپنے اس عہد کو ایفا کیا۔ اور خلافتِ نبی کے درجے کو پہنچا۔ اسے ذوالکفل کا نام دیا گیا ہے اس بناء پر کہ اس نے یہ کفالت کی یعنی پیش کش کو قبول کیا۔

یادرہے کہ غیظ وغضب کوانسان کی فطرت میں اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ اس کا ہتھیار ہوتا کہ جوامر انسان کے لئے باعث زیان ہواسے خود سے روک سکے۔ جس طرح شہوت انسان کی خلقت میں ہے یہ بھی اس کا ایک ہتھیار ہے جس کی مدد سے سودمند اشیاء کو اپنے قریب جمع کرسکتا ہے۔ اورانسان کے لئے یہ دونوں ناگزیر ہیں۔ لیکن اگر یہ افراط کو چھوئیں تو زیان کار ہوں گی۔ اس کی مثال آگ کی سی ہے جو دل میں لگتی ہے۔ اور دھواں اس کا دماغ کی جانب اٹھتا ہے اور یہ دھواں عقل وفکر کی جگہ کو تاریک کردیتا ہے۔ جس سے صورتِ صواب دکھائی نہیں دیتی۔ اس دھوئیں کی طرح جو ایک غار میں داخل ہوجائے اوراسے اتنا تاریک کردے کہ آگے کچھ نظر نہ آئے۔ اور یہ سخت مذموم ہے۔ اسی بناء پر کہا گیا ہے کہ غصہ عقل کا آسیب ہے۔ ممکن ہے کہ یہ غصہ ہلکا ہو لیکن پھر بھی مذموم ہوگا۔ کیونکہ حرم کی حمیت اور دین کی حمیت کافروں کے ساتھ خشم سے پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ سے فرمایا کہ: ''جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ'' (قرآن: ۷۳/۹) (اے پیغمبر کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کراوران پر سختی کر) اور اللہ تعالیٰ نے صحابہ کی تعریف کی ہے فرمایا کہ: ''اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ'' (قرآن: ۲۹/۴۸) (سخت ہیں کافروں پر) اور یہ سب بھی خشم کا ہی نتیجہ ہے۔ پس چاہئے کہ قوتِ خشم نہ بہ افراط ہو نہ ضعیف ہو۔ بلکہ معتدل ہو۔ اور عقل ودین کے تقاضے کے مطابق ہو ایک گروہ نے گمان کیا ہے کہ ریاضت کا مقصود خشم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا نام ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ کیونکہ خشم ہتھیار ہے۔ جس کے بغیر گذارہ نہیں۔ اور خشم کا ابطال جب تک انسان زندہ ہے ممکن نہیں ہے۔ ایسے ہی جیسے اصل شہوت کا باطل ہونا ممکن نہیں۔ لیکن یہ جائز ہے کہ بعض کاموں میں اور بعض مواقع پر غصہ مخفی رہے۔ ایسے کہ گمان کرے کہ خشم اصلاً باقی نہیں رہا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ غصہ اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ جس شے کی ضرورت ہوتی ہے کوئی اسے اچک لے جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اور اگر اسکی ضرورت نہ ہو جیسے کہ کسی کے پاس کتا ہو جس کی اسے ضرورت نہ ہو اگر کوئی اس کتے کو مارے یا ہلاک کردے تو روا ہے کہ مالک خشمگیں نہ ہو۔ لیکن روٹی' کپڑا' مکان' تندرستی اور ایسی ہی دوسری اشیاء کہ جن سے بے نیازی ممکن نہیں۔ پس وہ جس کی سلامتی کسی جراحت کے نتیجے میں باقی نہ رہے یا اس سے روٹی' کپڑا چھن جائے تو اس کے ہاں لازماً غیظ وغضب وجود میں آئے گا۔ پس جیسے حاجات زیادہ ہوں گی اس سے غصے کا ظہور بھی زیادہ ہوگا۔ اور وہ بیچارہ تر اور درماندہ تر ہوگا۔ اور آزادی بے حاجتی میں ہے۔ حاجت جتنی زیادہ ہوگی غلامی کے زیادہ نزدیک ہوگی[1]۔ اور ممکن ہے کوئی ریاضت سے خود کو ایسے بنالے کہ اسے حاجت فقط بہ قدرِ ضرورت ہو جس کے نتیجے میں مال وجاہ اور دنیا کی فراوانی اس کے لئے

ا؎ آن چہ شیراں را کند روبہ مزاج   احتیاج است احتیاج است احتیاج (رومیؒ)

بے وقعت ہو جائے تو بے شک غصہ جو اس کا ثمر ہے اس کے ہاں سے رخصت ہو جائے۔ کیونکہ وہ جاہ کی طلب میں نہیں ہوتا۔ بہ ایں سبب کہ کوئی اس کے آگے بڑھ جائے۔ یا اس سے بالا دست مقام پر بیٹھ جائے، تو وہ برہم نہ ہوگا۔ اور خلق میں اس باب میں تفاوت بہت ہے۔ بیشتر خشم فزونیٔ مال و جاہ سے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی بڑی گھٹیا چیز پر فخر کرنے لگے۔ جیسے شطرنج و نرد بازی و کبوتر بازی یا شراب بکثرت خوری پر اور کوئی کہے کہ وہ شطرنج خوب نہیں کھیلتا یا شراب تھوڑی سی پیتا ہے تو غضب میں آ جائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کو جو کوئی اس نوع کا ہو تو وہ ریاضت کے ذریعے ان سے نجات پا سکتا ہے۔ لیکن وہ جو کچھ انسان کے لوازم میں سے ہے ان میں سے خشم کی جڑ باطل نہیں ہو سکتی۔ اور باطل ہونی بھی نہیں چاہئے۔ اور ابطال اس کا پسندیدہ بھی نہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہونا چاہئے کہ انسان اختیار سے عاری ہو جائے اور یہ خلافِ عقل و شرع اس پر غلبہ کر لے اور خشم کو ریاضت کے ذریعے اس درجے پر واپس لایا جا سکتا ہے۔ اور دلیل اس بات کی کہ خشم کا کامل استیصال ممکن نہیں اور ممکن ہونا بھی نہیں چاہئے۔ یہ ہے کہ آنحضرت بھی خشم سے خالی نہ تھے۔ آپ نے فرمایا کہ: ''میں بشر ہوں اَغضَبُ کَمَا یَغضَبُ البَشَر'' میں اسی طرح خشمگیں ہوتا ہوں جیسے کہ کوئی انسان بھی خشمگیں ہوتا ہے'' تو جس آدمی پر لعنت کروں یا غصے میں سخت بات کہوں یا اسے پیٹوں تو اے خدا! تو اسے میری جانب سے رحمت کا سبب بنا دے''۔

عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ جو کچھ فرماتے ہیں میں اسے لکھ لیا کروں''؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''لکھ لیا کرو اگرچہ میں بحالت غصب بھی ہوں کہ قسم اس اللہ کی جس نے مجھے خلق کی طرف بحق بھیجا ہے میں اگرچہ غضب کی حالت میں بھی ہوں تو میری زبان سے بجز حق اور کچھ صادر نہیں ہوتا''۔ اور آپ ﷺ نے یہ نہیں کہا کہ ''میں خشم سے پاک ہوں''۔ لیکن یہ فرمایا کہ ''میرا خشم حق سے ماورا نہیں ہوتا''۔

حضرت عائشہؓ ایک دن خشمگیں ہوئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تیرا شیطان آ گیا''۔ تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ ''کیا آپ کا شیطان نہیں ہے؟'' فرمایا کہ ''ہے لیکن حق تعالیٰ نے مجھے نصرت کی ہے جس کی بناء پر شیطان میرا محکوم ہے لہٰذا وہ بجز خیر کے اور کچھ نہیں کہتا''۔ اور آنحضرت ﷺ نے یہ نہیں کہا کہ ''میرے ہاں شیطان غضب نہیں''۔

فصل: یاد رہے کہ غصے کی جڑ باطن سے ہرگز اکھاڑی نہیں جا سکتی۔ لیکن روا ہوگا کہ بعض احوال میں یا بیشتر احوال میں کسی پر توحید غالب ہو جس کی بناء پر وہ جو کچھ دیکھے اللہ ہی کی طرف سے دیکھے تو خشم اس توحید

میں چھپ جاتا ہے۔ اوراس سے کوئی شے آشکارنہیں ہوتی۔ جیسے کہ اگر کسی پر پتھر پھینکا جائے تو وہ کسی حال میں بھی پتھر پر غضبناک نہیں ہوتا اگر چہ غضب کی جڑ باطن میں اپنی جگہ موجود ہوتی ہے۔ وہ یہ ظلم پتھر سے منسوب نہیں کرتا بلکہ اس شخص کواس کا مستوجب قرار دیتا ہے جس نے یہ پتھر پھینکا ہو۔ اور اگر بادشاہ تحریراً حکم دے کہ فلاں کوقتل کر دیا جائے تو مقتول ہونے والا شخص اس قلم پر خشمگیں نہیں ہوتا جس سے بادشاہ نے حکمِ قتل تحریر کیا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ قلم بادشاہ کے لئے مسخر ہے اور یہ حرکت قلم کی نہیں اگر چہ اس کے بل پر ہے۔

فصل: اسی طرح وہ شخص جس پر توحید غالب ہو تو وہ لازماً جانتا ہے کہ تمام مخلوق جس حال میں ہیں اس کے لئے مجبور محض ہیں۔ کیونکہ حرکت اگر چہ قدرت کی قید میں ہے لیکن قدرت خود ارادے کی قیدی ہے اور داعیے کی قید میں ہے۔ اور ارادت آدمی کے اختیار میں نہیں ہے لیکن داعیہ اس پر مسلط کیا گیا ہے انسان چاہے یا نہ چاہے۔ جب داعیہ بھیجا اور قدرت دی تو فعل لازماً وجود میں آئے گا۔ پس مثال اس کی پتھر کی سی ہے جو اسپر پھینکا گیا ہے اور پتھر لگنے سے رنج اور درد تو پیدا ہوتا ہے لیکن پتھر پہ غصہ نہیں آتا۔ پس اگر انسان کی روزی کسی بکری سے وابستہ ہو اور وہ بکری مر جائے تو انسان کو غم تو ہوتا ہے لیکن غصہ نہیں آتا۔ اور اگر کسی پر توحید غالب ہو تو اسے اس شخص پر بھی غصہ نہیں آتا جس نے اس کی بکری کو عمداً مار دیا ہو۔ یاد رہے کہ غلبۂ توحید اس شدت کے ساتھ دواماً باقی نہیں رہتا۔ بلکہ چشمک برق کی طرح ہوتا ہے اس لئے طبع بشریت ان اسباب کی طرف جو درمیان میں بروئے کار ہیں متوجہ ہوتی ہے۔ اور بہت سے لوگ احوال میں ایسے ہی تھے۔ لیکن یہ اس بناء پر نہ تھا کہ خشم کا کامل استیصال ہو چکا ہو۔ لیکن صوفی کی نظر چونکہ مسبب الاسباب ہی پر ہوتی ہے اس لئے وہ کسی انسان کی طرف سے حدوث کا قائل نہیں ہوتا۔ اس لئے خشم کا ظہور اس کی طرف سے نہیں ہوتا۔ اس پتھر کی طرح کہ جو اس پر آ لگتا ہے۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ غلبہ توحید نہ ہو لیکن اس کا دل زیادہ اہم کام میں محو ہو جس کی وجہ سے خشم پوشیدہ رہے اور ظہور میں نہ آئے۔

ایک شخص نے سلمان رضی اللہ عنہ کو گالی دی تو آپ نے فرمایا کہ ''اگر روزِ قیامت میرے گناہوں کا پلڑا بھاری ہوا تو میں اس سے بھی زیادہ برا ہوں کہ جو تو نے کہا اور اگر سیّئات کا پلڑا ہلکا نکلا تو مجھے تمھاری اس بات کا کیا خوف؟'' ایک شخص نے ربیع خثیمؒ کو گالی دی تو آپ نے فرمایا کہ ''میرے اور بہشت کے درمیان ایک حجاب ہے اور میں اسے دور کرنے میں مشغول ہوں۔ اگر میں اسے دور کر سکا تو مجھے تمھاری بات سے کیا خوف؟ اور اگر نہ کر سکا تو تم نے جو کچھ کہا ہے میں اس سے بھی زیادہ برا ہوں''۔ سلمان اور ربیع خثیم دونوں غمِ آخرت میں ایسے مستغرق تھے کہ غصہ ان کا ظہور میں نہ آسکا۔ ایک شخص نے مالک دینار رضی اللہ عنہ کو ریاکار کہا تو آپ نے فرمایا کہ

''تمھارے علاوہ کسی اور شخص نے مجھے نہیں پہنچانا''۔ ایک شخص نے شعبیؒ کو ایک بات کہی تو شعبی نے کہا کہ ''اگر تم نے سچ کہا ہے تو اللہ مجھے معاف فرمائے اور اگر تم نے دروغ کہا ہے تو اللہ تعالیٰ تجھے معاف فرمائے''۔

پس یہ احوال اس امر کی دلیل ہیں کہ ایسے احوال میں خشم کو مقہور رہنا چاہئے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو عزیز رکھتا ہے جو غصے میں نہ آتا ہو لیکن جب اظہار خشم کا سبب جاتا رہے تو اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے غصے کو مخفی رکھے۔ جیسے کسی کا کوئی معشوق ہو لیکن معشوق کا بیٹا عاشق پر جفا کرتا ہو تو عاشق جانتا ہے کہ وہ خود چاہتا ہے کہ اس جفا کا شکار معشوق کا بیٹا نہ ہو تو وہ چشم پوشی کرتا ہے اور نظر انداز کر دیتا ہے۔ تو عشق کا غلبہ اسے ایسا کر دیتا ہے کہ وہ فرزند کی جفا خاطر میں نہیں لاتا اس لئے خشمگیں نہیں ہوتا۔ پس چاہئے کہ انسان ان اسباب میں سے کسی ایک کے ذریعے اپنے غصے کو مار ڈالے۔ یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم اس کی قوت کو شکست آشنا کر دے تا کہ سرکشی نہ کر پائے اور شرع اور عقل کی مخالفت کا ارتکاب نہ کر سکے۔

فصل: یاد رہے کہ غصے کا علاج اور اس کے لئے ریاضت فرض ہے کیونکہ غصہ بیشتر خلق کو دوزخ میں لے جانے والا ہے اور غصے سے فساد بہت پیدا ہوتا ہے۔ اور علاج اس کا دو قسم کا ہے: ایک مسہل کی مانند ہے کہ جو اس کی جڑ اور مادے کو باطن سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ تو دوسرا سکنجبین کی طرح کا ہے کہ غصے کو تسکین تو دیتا ہے لیکن اس کا مادہ ختم نہیں ہوتا۔ لیکن مسہل آسان ہے کہ باطن میں غصے کا سبب کیا ہے تو ان اسباب کو جڑ سے اکھاڑ دے جو تعداد میں پانچ ہیں:

اسباب خشم

سببِ اوّل: کبر ہے۔ کیونکہ متکبر ذرا سی بات پر یا معاملے پر جو اس کی بزرگداشت کے خلاف ہو خشمگیں ہو جاتا ہے۔ تو چاہئے کہ غصے کو انکساری کے ذریعے توڑے اور یہ جانے کہ وہ دیگر قسم کے غلاموں میں سے ہے۔ اور فضیلت خوش خلقی کے باعث ہوتی ہے۔ اور کبر برے اخلاق میں سے ہے۔ اور سوائے انکساری کے کبر کی شکست ممکن نہیں۔

سببِ دوم: عُجب ہے کہ انسان خود کو بزرگ شمار کرتا ہے۔ اور کبر و عُجب کا کامل علاج اپنی جگہ پر بیان ہو چکا ہے۔

سببِ سوم: مزاح ہے۔ جو بیشتر صورتوں میں خشم پر منتج ہوتا ہے۔ تو ایسے میں چاہئے کہ انسان آخرت کے کام کے عرفان اور خوش خلقی کے حصول میں سنجیدگی کے ساتھ مصروف ہو جائے۔ اور مزاح سے ہاتھ کھینچ لے۔ اسی طرح ہنسی مذاق اور تمسخر اکثر خشم پر منتج ہوتا ہے۔ اس لئے چاہئے کہ انسان خود کو اس سے بچائے۔

کیونکہ جو کوئی استہزاء کرتا ہے تو اس کے ساتھ بھی استہزاء کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے جو دوسروں پر استہزاء کرے گا اپنے ہاتھوں خود کو ذلیل کرے گا۔

سببِ چہارم: ملامت کرنا ہے یا عیب گوئی ہے کہ یہ بھی خشم انگیز ہے۔ دونوں جانب سے علاج اس کا یہ ہے کہ انسان کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو خود بے عیب نہ ہو اسے دوسروں کی ملامت کا حق نہیں۔ اور کون ہے جو بے عیب ہو؟

سببِ پنجم: مال و جاہ میں اضافے کی حرص و آز کے سبب اس کی احتیاج بہت ہوتی ہے۔ اور جو شخص بخیل ہوتا ہے اس کا ایک دانہ بھی کوئی اٹھالے تو وہ خشمناک ہو جاتا ہے۔ اور جو لالچی ہوتا ہے اگر اس کا ایک لقمہ بھی جاتا رہے تو خشمناک ہو جاتا ہے۔ یہ سب برے اخلاق ہیں جو خشم کی جڑ ہیں۔

فصل: غصے کا علمی اور عملی علاج: غصے کا علمی علاج یہ ہے کہ انسان غصے کی آفت اور شر سے آگاہ ہو۔ تاکہ اسے معلوم ہو کہ اس کا ضرر امور دین و دنیا میں کس حد تک ہے حتیٰ کہ دل اس سے نفور ہو جائے۔ پھر غصے کے عملی علاج میں لگ جائے۔ اور عملی علاج اس طرح ہے کہ غصے کی صفات کی مخالفت پر انسان کمربستہ ہو جائے۔ کیونکہ تمام برے اخلاق کا علاج ان کی مخالفت میں ہے۔ جیسا کہ ہم نے تہذیبِ اخلاق کے باب میں بیان کیا ہے۔

غصے اور اخلاق بد کو انگیز کرنے کا بہت بڑا سبب یہ ہے کہ کوئی ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرے جن پر غضب ہو اور ہو سکتا ہے کہ انھوں نے غصے کو شجاعت اور صلابت کا نام دے رکھا ہو۔ اور اس پر نازاں ہوں اور کہیں کہ فلاں شخص کی ایک بات کی پاداش میں ہمارے فلاں بزرگ نے اسے مار ڈالا تھا۔ اور اس کے خان و مان کو تباہ کر دیا تھا۔ اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے خلاف زبان کھولتا۔ کیونکہ وہ مردان مردی تھی اور مرد یونہی کیا کرتے ہیں'' اور غصے کو فروگذار کرنے کو خود مذلتی اور بے حمیتی اور ناکسی قرار دیتے ہیں۔ خشم جو کتوں کی فطرت ہے اسے مردانگی اور شجاعت سے موسوم کرتے ہیں۔ اور حلم کو جو پیغمبروں کا اخلاق ہے اسے نامردی اور بے حمیتی کا نام دیتے ہیں۔ اور شیطان کا کام یہی ہے کہ یہ فریب کار بہ الفاظِ زشت فریب دے کر خوش خلقی سے باز رکھتا ہے اور خوب صورت الفاظ کے ذریعے بدخلقی کی طرف بلاتا ہے۔ اور عقل مند جانتا ہے کہ اگر غصے کی برانگیخت مردی اور بہادری ہوتی ہے تو لازم تھا کہ عورتیں، بچے، بوڑھے، ضعیف اور بیمار خشم کے زیادہ قریب نہ ہوتے اور مُسلّم ہے کہ یہ لوگ جلد غصے میں آجاتے ہیں۔ اور کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ اپنے غصے کا حریف خود کو ٹھہرائے۔ جو انبیاء و اولیاء کی صفت ہے۔ اور اس کے برعکس صفت کُردوں، ترکوں اور عربوں کی ہے۔ اور ان لوگوں کی جو

فطرتاً 'ڈھور' ڈنگروں اور درندوں کے قریب ہیں[1]۔خود غور فرمائیے کہ عظمت انبیاء کی مثل ہونے میں ہے یا احمقوں اور غافلوں کا سا ہونے میں ہے؟''

فصل: یہ علاج جو بیان ہوئے ہیں' ایک گونہ مُسہل ہیں۔ کیونکہ انسان کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ مادہ خشم کا استیصال کرے لیکن جو شخص اس مادہ خشم کا استیصال نہیں کرسکتا تو اسے چاہئے کہ جب غصے کا ہیجان ہواُسے سکون کی حالت پر لائے۔اور تسکین اس کی سکنکبین سے ہوگی۔ جسے حلم کی حلاوت اور صبر کی تلخی سے ترکیب کیا گیا ہو۔ اور جملہ اخلاق کا علاج علم وعمل کی معجون ہے۔اور یہ علم وہ ہے جو آیات واحادیث کا ثمرہ ہو جو خشم کی برائی میں اور غصہ پی جانے کی ستائش میں وارد ہوئی ہیں۔ ان پر غور کرے۔جیسے کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔اور انسان اپنے آپ سے کہے کہ: ''تو دوسرے کی مخالفت میں جو قوت رکھتا ہے حق تعالیٰ تیری مخالفت میں اس سے کہیں زیادہ پر قادر تر ہیں۔اور تجھے جو حریف پر مخالفت ہے اس سے کہیں زیادہ قوی مخالفت اللہ تعالیٰ کو تجھ سے ہے تو تو اپنا غضب ڈھانے کو کیونکر باعثِ اطمینان سمجھتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت تجھ پر اپنا غصہ نکالے گا؟'' جیسے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک خادم کو کسی کام پر بھیجا تو وہ بہت تاخیر کے بعد لوٹا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''اگر قیامت میں قصاص کا خوف نہ ہوتا تو میں تمھیں پیٹتا''۔ نیز خشمناک انسان خود کو خطاب کر کے کہے کہ: تیرا غصہ اسی لئے ہے نا کہ کام اُسی طرح انجام پذیر ہوا جیسے اللہ کی مرضی تھی۔اور تمھاری مرضی کے مطابق نہیں ہوا تو یہ ربوبیت کے ساتھ منازعت ہوئی؟'' اگر ان اسباب سے جو آخرت سے تعلق رکھتے ہیں غصہ فرو نہ ہو تو انسان دنیوی اغراض ہی کو اپنے سامنے لائے اور کہے کہ ''اگر تو غصہ نکالے گا تو ممکن ہے کہ وہ بھی مقابلے میں اٹھ کھڑا ہو اور مکافات کرے اور اپنے دشمن کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔اگر وہ ایک خادم کی طرح ہو جو اپنی خدمت کی ادائیگی میں کمی کرے اور گریزاں ہو تو ممکن ہے وہ کوئی عذر یا بہانہ سوچے''۔علاوہ ازیں انسان غصے کی حالت میں اپنی بدصورتی کو تصور میں لائے کہ کیسی بری اور متغیر ہو جاتی ہے۔اور جس سے انسان اس بھیڑیئے کا سا ہو جاتا ہے جو کسی پر حملہ آور ہو۔اور اس کا باطن تمام تر مشتعل ہو جاتا ہے اور صورت اس کی بھوکے کتے کی سی ہو جاتی ہے۔اور اکثر یوں ہوتا ہے کہ جب چشم پوشی کا ارادہ کرتا ہے۔تو شیطان اس سے کہتا ہے کہ ''یہ تمھاری ناکامی اور خواری پر محمول کیا جائے گا۔جس سے تمھاری شان وشوکت کو بٹہ لگے گا اور تم لوگوں کی نظروں میں حقیر ٹھہرو گے''۔ جاننا چاہئے کہ ''کوئی عزّ شان اس کو نہیں پہنچتی کہ انسان انبیاء کی سیرت کو اپنائے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا خواہاں ہو۔اور اگر آج دنیا میں لوگ مجھے ذلیل یا خوار سمجھیں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ کل روزِ قیامت میں

[1] غزالی کا یہ فرمان آج سے ہزار سال قبل جو لوگ تھے ان کے بارے میں ہے جو تعلیم وتربیت سے بے بہرہ تھے۔

خوار قرار دیا جاؤں''۔تو یہ یا ایسے ہی دوسرے افکار خشم کا علمی علاج ہیں۔

عملی علاج: یہ ہے کہ انسان بہ زبان کہے کہ: ''اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم'' اور سنت یہ ہے کہ اگر بحالت خشم کھڑا ہے تو بیٹھ جائے اور اگر بیٹھا ہے تو زمین پر لیٹ جائے۔ اگر اس پر بھی غصہ فرو نہ ہو تو ٹھنڈے پانی سے وضو کرے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''غصہ آگ کا شاخسانہ ہے اس لئے پانی سے فرو ہوگا''۔اور ایک روایت میں ہے کہ ایسے میں انسان کو سجدہ ریز ہو جانا چاہئے اور چہرہ خاک پر رکھ دینا چاہئے تا کہ اسے معلوم ہو جائے کہ وہ خاکی ہے اور اللہ کا غلام ہے۔اس لئے اسے غصہ کا حق نہیں۔ایک دن حضرت عمر خشمناک ہوئے تو آپ نے پانی طلب کیا اور ناک میں ڈالا اور فرمایا کہ: غصہ شیطان کی طرف سے ہے جو اس طرح فرو ہوسکتا ہے''

ایک دن ابوذر رضی اللہ عنہ ایک شخص سے لڑ پڑے اور کہا کہ ''یا بن الحمرا'' حریف کی ماں کا عیب بیان کیا کہ ''وہ سرخ رنگ کی ہے یعنی غلام ہے''۔اس پر آنحضرت ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ''میں نے سنا ہے کہ تو نے آج کسی کی ماں کا عیب بیان کیا ہے تو تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ تو کسی سیاہ یا سرخ سے برتر نہیں ہے سوائے اس کے کہ تو اس سے تقویٰ میں اس سے بڑھ کر ہو''۔تو ابوذر رضی اللہ عنہ اس شخص سے معافی خواہی کے لئے بڑھے۔تو وہ شخص پہلے بڑھا اور ابوذر کو سلام کیا۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب غصے میں آتیں تو آنحضرت ﷺ ان کی ناک پکڑ کر فرماتے کہ: ''ای عایشک'' کہو: ''اَللّٰھُمَّ رَب النَّبِیَّ مُحَمَّدٍ اِغفِرلِی ذَنبِیْ وَاَذھِبْ غَیظَ قَلْبِیْ وَاَخبِرنِی مِن مُضَلَّاتِ الْغِتَن'' (بارِ خدایا! اے پروردگارِ محمد پیغمبر میرے گناہ بخش دے۔میرے دل کو غصے سے پاک کر دے اور صیقل کر دے اور مجھے گمراہی کے آشوب سے بچا) تو یہ کہنا بھی سنت ہے۔

فصل: یاد رہے کہ اگر کوئی ظلم کرے یا بری بات کہے یا ڈرائے دھمکائے تو ایسے میں اولیٰ تر یہ ہے کہ مظلوم خاموش رہے اور ظالم کا جواب نہ دے۔اگر چہ خاموش رہنا فرض نہیں اور ہر بات کا جواب دینے کی اجازت نہیں ہے بلکہ دشنام سے دشنام کا مقابلہ اور غیبت سے غیبت وغیرہ کا مقابلہ روا نہیں۔کیونکہ ان اسباب سے حد شرعی واجب ہو جاتی ہے۔لیکن اگر جواب میں ایسی سخت بات کہے کہ جس میں دروغ نہ ہو اس کی اجازت ہے وہ گویا قصاص کی مانند ہے۔اگرچہ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی تیرا وہ عیب بیان کرے جو تجھ میں ہے تو تُو حریف کا وہ عیب جو اس میں ہے بیان نہ کرنا''۔تو یہ مستحب ہے جب گالی فحش نہ ہو تو جواب نہ دینا فرض نہیں۔دلیل اس کی یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''اَلمستبان مَاقالا فَھُوَعَلَی البَادِی حَتّٰی یَعتَدی المَظلُوم'' یعنی دو شخص جو ایک دوسرے کو سب وشتم کر رہے ہوں تو جو کچھ بھی کہیں وبال اس کا اس پر

ہوگا جس نے پہل کی ہو۔ یہاں تک کہ مظلوم حد سے گذر جائے۔ پس مظلوم کو نصرت نہ دے کہ وہ حد سے گذر جائے۔ حضرت عایشہؓ فرماتی ہیں کہ ازواج رسول ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو پیغام بھیجا کہ آنحضرت ﷺ سے کہیں کہ ہمارے اور عایشہؓ کے درمیان عدل وانصاف کو ملحوظ رکھا کریں۔ کیونکہ آپ ﷺ اس (عایشہ) کو دوست تر رکھتے ہیں اور ان کی طرف مائل ہیں۔ آنحضرتؐ لیٹے ہوئے تھے' فرمایا: اے فاطمہ جسے میں زیادہ دوست رکھتا ہوں تو اسے زیادہ عزیز نہیں رکھتی؟ تو حضرت فاطمہ نے کہا کہ ''میں اسے دست رکھتی ہوں'' تو آپ نے فرمایا: ''پس عایشہ کو دوست رکھ کیونکہ میں اسے دوست رکھتا ہوں''۔ پھر انھوں نے حضرت زینبؓ کو جو ازواج مطہرات میں سے تھیں اور حضور سے دوستی میں میرے ساتھ برابر کی مدعی تھیں انھیں حضور کی خدمت میں اسی غرض سے بھیجا۔ حضرت زینبؓ آئیں اور بولیں کہ ''ابوبکر کی بیٹی ایسی ہے اور ویسی ہے یعنی میرے بارے میں برا بھلا کہا۔ اور میں خاموش تھی اور جواب دینے کی اجازت کی منتظر تھی۔ جب آنحضرت ﷺ نے اجازت دی تو میں جواب دینے لگ گئی۔ اور میں نے برا بھلا کہا یہاں تک کہ میرا اگلا خشک ہوگیا۔ اور حضرت زینبؓ بھی عاجز آ گئیں۔ پھر آنحضرت نے فرمایا کہ: ''یہ ابوبکر کی بیٹی ہے''، یعنی تم اس کے ساتھ بات کرنے میں کافی نہیں ہو''۔ پس یہ دلیل اس امر کی ہے کہ دشنام کا جواب دینا جائز ہے بشرطیکہ یہ حق ہو اور دروغ نہ ہو جیسے انسان کہے کہ ''اے احمق' اے جاہل شرم کر اور خاموش رہ'' کیونکہ کوئی بھی جہل اور حماقت سے خالی نہیں ہوتا اس لیے چاہیے کہ زبان کو ایسے الفاظ کا عادی بنالے جو زیادہ برے نہ ہوں جنھیں بات کہتے وقت استعمال میں لائے تاکہ فحش کلامی کا مرتکب نہ ہو مثلاً کوئی کہے: اے متخلف و مدبر و ناکس و ناہموار اور بے نوا'' وغیرہ۔ مختصر یہ کہ جب انسان جواب دینے لگے تو حد پر رہنا دشوار ہو جاتا ہے اس لئے اولیٰ تر یہ ہے کہ بدگوئی کا جواب نہ دیا جائے۔ آنحضرت کے سامنے ایک شخص حضرت ابوبکر کو برا بھلا کہہ رہا تھا اور حضرت ابوبکر خاموش تھے۔ جب ابوبکرؓ اس شخص کو جواب دینے لگے تو آنحضرت ﷺ اٹھے اس پر ابوبکر نے عرض کیا کہ: ''اب تک آپ بیٹھے رہے۔ اور جب میں جواب کے لئے آمادہ ہوا تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے؟'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب تک تو خاموش تھا فرشتہ تیری جگہ جواب دے رہا تھا۔ اور جب تو نے خود جواب دینا شروع کر دیا تو شیطان آ گیا تو میں نے شیطان کے ساتھ ایک جگہ پر بیٹھنا پسند نہیں کیا''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''انسانوں کو مختلف طبقوں کی صورت میں پیدا کیا گیا ہے۔ کوئی ایسا ہوتا ہے کہ بدیر خشمناک ہوتا ہے اور بدیر ہی راضی ہوتا ہے۔ اور کوئی ہوتا ہے کہ جلد خشمناک ہوتا ہے اور جلد ہی خشنود بھی ہو جاتا ہے۔ اور تم میں بہترین وہ ہے جو بدیر خشمگیں ہوا اور جلد راضی ہو جائے۔ اور بدترین تم میں وہ ہے جو زود رنج ہو اور بدیر راضی ہوتا ہو''۔

حِقد (کینہ) کے بارے میں

فصل: یادر ہے کہ جو شخص اپنے اختیار اور دیانت کے بل پر اپنے غصے کو پی لیتا ہے۔ لایق تبریک ہے۔ لیکن اگر ناکسی اور ضرورت کے تحت پی جائے جو باطن میں جاگزین ہو جائے۔ اور فزونی پا کر کینے کی صورت اختیار کرے تو یہ حقد ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''اَلْمُؤْمِنُ لَیْسَ بِحَقُوْدٍ ''یعنی مومن کینہ ور نہیں ہوتا''۔ پس کینہ غیظ وغصب کا فرزند ہے۔ جس سے آٹھ پوتے پیدا ہوتے ہیں:

اول حسد: کہ جس سے انسان دوسرے کی خوشی کے موقع پر غمناک ہوتا ہے اور اس کے اندوہ پر خوش ہوتا ہے۔

دوم شماتت: کہ انسان کسی اور کو کسی ابتلا میں دیکھ کر شادکام ہوتا ہے اور اپنی اس خوشی کا اظہار بھی کرتا ہے

سوم: یہ کہ دوسرے سے بول چال بند کر لیتا ہے اور سلام کا جواب نہیں دیتا۔

چہارم: یہ کہ دوسرے کو حقارت ودنائت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

پنجم: یہ کہ حریف پر زبان درازی کرتا ہے۔ اور اسکے اسرار اور ننگ کو آشکار کرتا ہے غیبت' دروغ اور فحش کا مرتکب ہوتا ہے۔

ششم: یہ کہ حریف کی نقلیں اتارتا ہے اور تمسخر اڑاتا ہے۔

ہفتم: یہ کہ جب بھی موقع ملے حریف کو پیٹتا اور ستاتا ہے۔ یا کسی اور کو انگیخت کرتا ہے کہ اسے پیٹے۔

ہشتم: یہ کہ حریف کا حق ادا کرنے میں تقصیر کرتا ہے اور صلہ رحم سے دست کش ہو جاتا ہے اور اس سے لیا ہوا قرض واپس نہیں کرتا۔ اور اس کی تالیفِ قلب نہیں کرتا۔ اور غیبت کی معافی کا خواست گار نہیں ہوتا۔

پس اگر کوئی ایسا ہو کہ دیانت اس پر غالب ہو اور وہ ایسا کوئی اقدام نہ کرے کہ جس میں معصیت ہو تو کم از کم یہ تو ہوگا کہ دستِ احسان اس سے روک لے۔ اور اس کے ساتھ نرمی نہ کرے اور اس کے کام میں معاونت نہ کرے۔ اور اس کے ساتھ ذکرِ حق تعالیٰ میں نہ بیٹھے۔ اس کی ثناء ودعا نہ کہے۔ تو یہ سب امور اس کے درجات میں نقصان کا باعث ہیں اور ضرر ان کا بہت ہوتا ہے۔ مِسطح جو حضرت ابوبکر کا رشتہ دار تھا' واقعۂ اِفک عایشہ میں اُس نے بھی کوئی بات کہہ دی تو حضرت ابوبکر نے وہ نفقہ جو اسے دیا کرتے تھے روک لیا۔ اور قسم کھائی کہ آیندہ اسے نفقہ نہیں دوں گا۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: ''وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ۔ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ'' (قرآن: ۲۲/۲۴) (قسم مت کھاؤ کہ جس نے جفا کی اس کے ساتھ نیکی نہ کرو گے کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ حق تعالیٰ تمھیں بخش دے؟'' تو اس پر حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ: ''اللہ کی قسم میں اسے پسند کرتا

ہوں''۔ یہ کہا اور نفقہ پھر جاری کر دیا۔

پس جس کسی کے دل میں کینہ داخل ہو گیا وہ تین حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو اپنی ذات سے مجاہدہ کرے تا کہ حریف کے ساتھ نیکی کرے۔ اور اس کی مراعات میں اضافہ کرے۔ اور یہ درجہ صدیقوں کا ہے۔ یا نیکی نہ کرے۔ لیکن اس کے ساتھ برائی بھی نہ کرے، تو یہ درجہ پارساؤں کا ہے۔ اور برائی کرے اور نیکی نہ کرے تو یہ درجہ ظالموں فاسقوں کا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے قربت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی شے نہیں کہ تُو اس کے ساتھ نیکی کرے جو تیرے ساتھ برائی کرے۔ اگر یہ نہیں کر سکتا تو کم از کم اسے معاف کر دے کیونکہ عفو کی فضیلت بھی بہت عظیم ہے

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ تین چیزیں ہیں کہ جن پر میں قسم کھا سکتا ہوں: ایک یہ کہ کوئی مال صدقہ دینے سے کم نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ جس نے کسی دوسرے کو معاف کیا اور درگذر سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کی عزت میں اضافہ ارزانی فرمائیں گے۔ اور تیسرے یہ کہ کوئی ایسا شخص نہیں کہ جس نے خود پر گدائی اور سوال کا دروازہ کھولا ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس پر قلاشی اور افلاس کا دروازہ نہ کھول دیا ہو''۔ حضرت عایشہؓ فرماتی ہیں کہ: ''میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نے کسی سے اپنے حق میں بدلہ لیا ہو لیکن جب کوئی اللہ تعالیٰ کے حق کو فروگذار کرتا ہے تو آپ کے غیظ وغضب کی انتہا نہ ہوتی تھی۔ اور دو کاموں میں آپ کو اختیار نہ دیا گیا ہو کہ آپ نے ان میں سے آسان تر کو اختیار نہ کیا ہو اِلّا یہ کہ وہ معصیت ہوتا''۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''آنحضرت ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ ''میں تمھیں آگاہ نہ کروں کہ فاضل ترین اخلاق دنیا اور آخرت میں کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ جو کوئی تجھ سے کٹے تو اس سے جُڑ اور جو کوئی تجھے محروم کرے تو اسے عطا کر اور جو کوئی تجھ پر ظلم کرے تو اسے معاف کر دے''۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے عرض کیا کہ ''بارِ خدایا تیرے نزدیک بندوں میں سے کون عزیز تر ہے؟'' تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ ''وہ جو قدرت کے باوجود بدلہ نہ لے بلکہ معاف کر دے''۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ''جس نے ظالم کے لئے بددعا کی اس نے اپنا بدلہ لے لیا''۔

آنحضرت ﷺ نے جب مکہ فتح کیا اور قریش پر قابو پا لیا اور مکہ والوں نے آپ ﷺ پر بہت ظلم ڈھائے تھے تو اس بناء پر جملہ مکے والے سہمے ہوئے تھے اور امید جان کی کھو چکے تھے۔ تو آپ ﷺ نے ہاتھ کعبے کے دروازے پر رکھا، اور فرمایا کہ: ''اللہ ایک ہے۔ اور کوئی اس کا شریک نہیں اراس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور اپنے

بندے کی مدد کی۔ اور اپنے دشمنوں کو شکست دی' بتاؤ تم کیا امید رکھتے ہو اور کیا کہتے ہو؟'' تو مکہ والوں نے کہا ''کیا کہیں سوائے خیر کے! ہم آپ کے کرم کے امیدوار ہیں۔ آج قدرت آپ کے ہاتھ میں ہے'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''میں آج وہی کہوں گا جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے اس وقت کہا جب ان وہ اپنے بھائیوں پر قدرت پا چکے تھے اور فرمایا تھا کہ: ''لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ'' (قرآن: ۹۲/۱۲) (آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے آج اللہ تعالیٰ تمھیں معاف فرمائے)۔ سب کو امان دی اور فرمایا تم سے کسی کو کچھ کام نہیں تم آزاد ہو)۔

آنحضرت نے فرمایا'' کہ جب لوگ قیامت کے میدان میں ہوں گے تو منادی اعلان کرے گا کہ ''اٹھو جس نے عفو کی ہو اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے''۔ تو کئی ہزار مخلوق میں سے اٹھیں گے جو مرحلۂ حساب سے گذرے بغیر بہشت میں داخل ہو جائیں گے کیونکہ انھوں نے لوگوں کو دنیا میں معاف کر دیا ہوگا''۔

اور معاویہؓ فرماتے ہیں کہ: ''غیظ کی حالت میں صبر کرو تا کہ تمھیں زیادہ فرصت حاصل ہو اور جب فرصت مل جائے گی تو تمھیں وہ قوت حاصل ہوگی جس کے بل پر عفو اور درگذر کرو گے''۔ ایک شخص کو جس نے خیانت کا ارتکاب کیا تھا ہشام کے حضور لایا گیا تو اس نے اپنی صفائی میں دلائل دینے شروع کئے۔ ہشام کو غصہ آ گیا تو بولا: ''تو میرے حضور جدل کہہ رہا ہے؟'' تو وہ شخص بولا کہ ''قال اللّٰہ تعالٰی :يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا'' (قرآن: ۱۱۱/۱۶) (کل کافروں میں سے ہر کوئی اپنے لئے انصاف پائے گا (اور محبت وعذر جوئی کرے گا کہ ہم نے پیغام نہیں سنا تھا) تو جب اللہ تعالیٰ کے حضور عذر جوئی کی جا سکتی ہے۔ تمھارے سامنے کیوں نہیں کی جا سکتی؟'' اس پر ہشام نے کہا کہ: ''کہو کیا کہتے ہو؟''

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی کوئی چیز چوری ہوگئی۔ تو لوگ چور پر لعنت کرنے لگے۔ تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ''بارِ خدایا اگر چور نے بہ ضرورت اٹھائی ہے تو اسے مبارک ہو اور اگر بے خوف معصیت کی ہے تو اس کے گناہ اسی پر ہوں گے''۔

فضیل عیاض رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ جس کے روپے پیسے دورانِ طواف چوری ہو گئے تے تو وہ رو رہا تھا تو میں نے اسے کہا کہ ''تم زر کے لئے رو رہے ہو؟'' تو وہ بولا نہیں بلکہ مجھے خیال آیا کہ بیچارہ روزِ قیامت میرے ساتھ داوری میں کھڑا ہوگا اور اس کے پاس اس جرم کے لئے کوئی عذر نہ ہوگا تو اس لئے مجھے اس پر رحم آ گیا''۔

قیدیوں کا ایک گروہ عبدالمالک بن مروان کے پاس لایا گیا۔ تو بزرگوں میں سے ایک نے کہا ''حق

تعالیٰ نے جو تجھے پسند تھا تو وہ کامیابی اور فتح مندی تھی تجھے عطا فرمایا۔ اب تو بھی جو اللہ تعالیٰ کو دوست تر ہے بدلے میں دے اور وہ ہے عفو" اس پر عبدالمالک نے ان سب قیدیوں کو معاف کر دیا۔

انجیل مقدس میں ہے کہ "جو کوئی اپنے ظالم کے لئے اللہ سے بخشش کی دعا مانگتا ہے تو شیطان اس سے شکست کھاتا ہے۔ پس چاہئے کہ جب غصہ پیدا ہو تو انسان عفو سے کام لے۔ بلکہ چاہئے کہ ہر کام میں نرمی سے کام لے تاکہ غصہ پیدا ہی نہ ہو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اے عائشہؓ کہ جس کسی کو نرمی سے بہرہ مند کیا گیا تو اس نے دین و دنیا دونوں کی دولت پائی اور جسے نرمی سے محروم رکھا گیا وہ دین و دنیا دونوں کی بھلائی سے محروم رہا"۔ نیز فرمایا کہ "حق تعالیٰ رفیق ہے، رفق یعنی نرمی کو دوست رکھتا ہے۔ اور جو کچھ نرمی میں عطا کرتا ہے قساوت میں عطا نہیں کرتا"۔

حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ: "ہر کام میں نرمی ملحوظ رکھو کیونکہ جس کام میں بھی نرمی ہوگی وہ کام نہایت خوبی سے انجام پذیر ہوگا۔ اور جس کام میں نرمی بروئے کار نہ لائی جائے بدزیب ہوگا"۔

حسد اور اس کی آفات: یاد رہے کہ غیظ سے کینہ پیدا ہوتا ہے تو کینے سے حسد جنم لیتا ہے۔ اور حسد جملہ مہلکات میں سے ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "حسد اچھے اعمال کو یوں کھا لیتا ہے جیسے آگ خشک ایندھن کو کھا لیتی ہے"۔ نیز فرمایا کہ: "تین چیزیں ایسی ہیں کہ کوئی بھی ان سے خالی نہیں ہوتا: بدگمانی، بدفالی اور حسد۔ اور میں تمھیں ان بیماریوں کا علاج بتاتا ہوں۔ جب برا خیال آئے تو اس کو متحقق نہ سمجھنا اور اسی پر قائم نہ ہو جانا چاہئے۔ اور جب فال بد کا سامنا ہو تو محسود کے بارے میں فال پر اعتماد نہ کر، اور جب حسد سر اٹھائے تو زبان اور ہاتھ کو اسے عمل میں لانے سے روکو"۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "تم لوگوں میں بھی وہ چیز پیدا ہونے لگی ہے جس نے تم سے پہلے بہت سی امتوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ اور وہ ہے حسد، دشمنی اور عداوت۔ جان لو کہ اللہ تعالیٰ جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے اس کا فرمان ہے کہ تم بہشت میں نہیں جا سکتے۔ جب تک صاحب ایمان نہ ہو گے۔ اور صاحب ایمان نہیں ہو سکتے جب ایک دوسرے کے دوست نہ ہو گے۔ اور میں تمھیں بتاؤں کہ یہ کیونکر حاصل ہوگا: وہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کو سلام بہ جہر کیا کرو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک شخص کو عرش کے سایے میں دیکھا۔ تو آنحضرت کو اس شخص کے درجے کی آرزو پیدا ہوئی۔ تو کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی عزیز شخص ہے تو اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ "یہ کون ہے اور اس کا نام کیا ہے؟" تو اللہ تعالیٰ نے اس کا نام تو نہ بتایا البتہ فرمایا کہ "میں تمھیں اس کے کردار کی خبر دیتا ہوں: اس نے کبھی حسد نہیں کیا اور کبھی والدین کی نافرمانی نہیں کی اور چغل خوری کا ارتکاب نہیں کیا۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "حاسد میری نعمت کا دشمن ہے اور میرے فیصلے پر ناراض ہے اور جو تقسیم عطا میں نے لوگوں کے درمیان کی ہے اسے پسند نہیں"۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ چھ گروہ چھ گناہوں کے باعث دوزخ میں جائیں گے اور حساب سے پہلے: امراء جَور وظلم کے باعث' عرب تعصب کے باعث' مال دار تکبر کے باعث' تاجر خیانت کے باعث' دیہاتی نادانی کے باعث اور علماء حسد کے باعث"۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "ایک دن میں آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھا تھا۔ تو آپ نے فرمایا کہ "اس وقت ایک اہل بہشت اندر آئے گا" تو انصار میں سے ایک صاحب داخل ہوئے نعلین ان کے بائیں ہاتھ میں تھے۔ اور ان کی ریش مبارک سے پانی ٹپک رہا تھا کیونکہ وضو کیا تھا۔ اگلے دن بھی آپ ﷺ نے یہی فرمایا تو یہی صاحب تشریف لائے حتی کہ تین دفعہ ایسے ہی ہوا۔ تو اس پر عبداللہ بن عمرو بن العاص نے جاننا چاہا کہ اس شخص کا عمل کیا ہے تو اس شخص کے قریب جا کر بولے "میں اپنے والدین کے ساتھ لڑ کے آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میں تین راتیں آپ کے ہاں گذاروں' تو اس انصاری نے کہا ٹھیک ہے' تو عبداللہ نے اس کے ساتھ بسر ہوئی تین راتوں میں بجز اس کے اور کچھ نہ دیکھا کہ جب وہ خواب سے بیدار ہوتا تو اللہ کو یاد کرتا تھا۔ تو اس سے کہنے لگے کہ: میں اپنے والدین سے لڑ کر نہیں آیا لیکن آنحضرت ﷺ نے تمھارے بارے میں چنین چناں کہا ہے تو میں نے چاہا کہ میں تمھارے اس عمل کو جانوں"۔ تو اس انصاری نے کہا "یہی ہے جو کچھ تو نے دیکھا" جب میں چلا تو مجھے آواز دی اور فرمایا کہ ایک چیز البتہ ہے کہ میں نے کبھی حسد نہیں کیا کہ اسے کوئی چیز ملی ہے"۔ تو میں سمجھ گیا کہ یہ درجہ تمھیں اسی سبب عطا ہوا ہے"۔

عون بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ملوک میں سے ایک کو نصیحت کر رہے تھے کہ "تکبر سے دور رہ کیونکہ سب سے پہلی معصیت جو اللہ کی کی گئی وہ تکبر تھا۔ کیونکہ یہ کبر ہی تھا کہ ابلیس نے آدم کو سجدہ نہ کیا۔ اور حرص سے دور رہ کیونکہ آدم کو حرص ہی نے جنت سے نکالا تھا۔ اور حسد سے دور رہ کیونکہ اولین قتل حسد ہی کی بنا پر ہوا تھا۔ جس سے آدم کے بیٹے نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا۔ اور جب تمھارے سامنے صحابہ کا بیان کیا جائے یا حق تعالیٰ کی صفات کا یا ستاروں کا بیان ہو تو ایسے میں خاموش رہنا اور زبان کو روکے رکھنا"۔ بکر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "ایک شخص تھا ہر روز ایک بادشاہ کے پاس جاتا اور ہر روز کھڑا ہو کر کہتا "نیکوکار کے ساتھ نیکی کر اور بدکردار کے لئے اس کا کردارِ بد خود کافی ہے اسے اس کے کردارِ بد کے ساتھ چھوڑ دے" تو وہ بادشاہ اس شخص کی اس بات کے باعث اسے عزیز رکھتا تھا۔ ایک شخص نے اس کے ساتھ حسد کیا اور بادشاہ سے کہا کہ "وہ کہتا ہے کہ" بادشاہ کے منہ سے بدبو آتی ہے"۔ تو بادشاہ نے کہا اس کا ثبوت کیا ہے؟" تو حاسد بولا یہ ہے کہ آپ اسے اپنے قریب

بلائیں تو دیکھیں گے کہ وہ ہاتھ اپنی ناک پر رکھ لے گا تا کہ آپ کے منہ سے آنے والی بد بو نہ سونگھ سکے''۔ حاسد آیا اور اس مرد کو اپنے گھر لے گیا اور اسے کھانا دیا جسے اس نے سیر ہو کر کھایا تو جب بادشاہ نے اسے اپنے قریب بلایا تو اس نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا تو بادشاہ کو گمان ہوا کہ اس شخص نے سچ کہا ہے اور اس بادشاہ کی عادت یہ تھی کہ اپنے ہاتھ سے سوائے انعام کے خلعت کے اور کوئی تحریر نہ دیتا تھا۔ تو اس نے اپنے غلاموں میں سے ایک کو اپنے ہاتھ سے لکھا کہ ''اس خط کے پہنچانے والے کا سر قلم کر دیا جائے۔ اور اس کی کھال میں بھُس بھر کر میرے پاس روانہ کر دو۔ اور اپنی تحریر کو سربمہر کر کے اُس کے حوالے کیا۔ جب وہ باہر نکلا تو حاسد نے خوشی میں اسے دیکھا تو پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو اس نے کہا ''شاہی خلعت'' تو وہ بولا مجھے دے دے یہ کام میں کرتا ہوں۔ تو اِس نے اس شخص سے فرمان شاہی لے لیا اور اس گورنر کے پاس پہنچا تو عامل نے اسے بتایا کہ بادشاہ کے اس نامے میں فرمان ہے کہ تجھے ہلاک کر کے تیری کھال میں بھُس بھر کر بادشاہ کے حضور روانہ کروں۔ تو حاسد بولا کہ ''اللہ کی قسم یہ حکم ایک اور شخص کے بارے میں تھا بادشاہ کی طرف رجوع فرمایئے''۔ تو گورنر نے کہا کہ فرمان کے بارے میں رجوع نہیں کیا جاتا' یہ کہا اور اسے قتل کر دیا۔ ادھر بادشاہ کے دربار میں محسود اسی طرح اگلے دن کھڑا تھا اور نصیحت کے وہی کلمات دہرا رہا تھا۔ بادشاہ حیران ہو کر بولا کہ تو نے ہمارے اس نامے کو کیا کیا تو وہ بولا فلاں نے وہ نامہ مجھ سے مانگ لیا تھا تو میں نے اسے دے دیا۔ تو اس پر بادشاہ نے کہا کہ اُس نے مجھے بتایا کہ تو نے میرے بارے میں ایسا ایسا کہا تھا''۔ تو اس نے کہا کہ میں نے کبھی یوں نہیں کہا تو بادشاہ نے پوچھا کہ تم نے میرے پاس آ کر منہ پر ہاتھ کیوں رکھا تھا؟ تو اس نے کہا کہ اس (حاسد) نے مجھے جو کھانا اس روز کھلایا تھا اس میں لہسن بہت تھا'' تو بادشاہ نے کہا۔ جاؤ اور ہر روز یہی قول دہرایا کرو کہ ''نیکو کردار کو اس کی نیکی کا بدلہ دو اور بدکردار کے لئے اس کا کردار خود اس کی کفایت کرے گا''۔

ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میں نے دنیا کی بنا پر کسی سے حسد نہیں کیا' کیونکہ اگر کوئی اہل بہشت میں سے ہے تو جو نعمت اس کو بہشت کی صورت میں ملنے والی ہے اس کے مقابلے میں دنیا کی کیا حیثیت ہے؟ اور اگر وہ اہل دوزخ میں سے ہے تو اسے نعمت دنیا سے کیا حاصل جب ٹھکانا اس کا دوزخ ہو''۔

ایک شخص نے حسن بصریؒ سے کہا کہ ''کیا مومن حسد کرتا ہے؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''کیا فرزندان یعقوب علیہ السلام کو بھول گئے ہو؟ مومن حسد کرتا ہے لیکن اگر رنج سینے میں مخفی رہے تو اسے معاملات میں دخیل نہ ہونے دے تو کوئی ضرر نہیں''۔ اور حضرت بو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''جو کوئی موت کو بہت یاد کرتا ہے اسے خوشی ہوتی ہے نہ حسد''

حسد کی حقیقت

معلوم رہے کہ حسد اسے کہتے ہیں کہ کسی کو اللہ کی طرف سے کوئی نعمت پہنچے تو تجھے بری لگے اور تو زوال نعمت کی آرزو کرے تو یہ حرام ہے۔ احادیث کی رو سے نیز بہ ایں دلیل کہ یہ گویا حق تعالیٰ کے فیصلے پر کراہیت ہے اور باطن کا خبث کیونکہ جو نعمت تجھے ملنے کی نہ ہو تو دوسرے کے ہاں اس کا زوال چاہنا خبث نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن اگر تو بھی اس نعمت کا خواہاں ہو لیکن دوسرے کے ہاں سے زوالِ نعمت کا متمنی نہ ہو اور نفور نہ ہو تو اسے غبطت اور منافسہ کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ اگر دینی کام میں ہو تو پسندیدہ ہے اور واجب ہے۔

حق تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافِسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ'' (قرآن: ۲۶/۸۳) (اور ایسے ہو جا جیسے کوشش کرنے والے کوشش کرتے ہیں) نیز فرمایا کہ ''سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ'' (قرآن: ۲۱/۵۷) (جلدی کرو اور اپنے خدا کی بخشش ڈھونڈنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرو) یعنی ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو

اور آنحضرت کا فرمان ہے کہ: حسد دو چیزوں کے علاوہ کسی اور شے میں نہیں ہوتا: ایک وہ مرد جس کو اللہ تعالیٰ علم اور مال عطا فرماتے ہیں۔ تو وہ اپنے مال میں اپنے علم کے مطابق تصرف کرتا ہے۔ اور ایک دوسرے شخص کو علم عطا فرماتا ہے بغیر مال کے۔ تو وہ کہے کہ: اگر اللہ مجھے بھی مال دیتا تو میں بھی وہی کرتا' تو یہ دونوں ثواب میں برابر ہوں گے۔ وہ جسے اللہ تعالیٰ نے علم و مال دیا ہو اگر وہ مال معصیت میں صرف کرے تو کوئی دوسرا کہے کہ اگر میرے پاس بھی علم و مال ہوتے تو میں بھی یہی کرتا تو گناہ گاری میں دونوں برابر ہوں گے۔ پس اس منافست کو حسد بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس میں دوسرے کی نعمت پر کراہیت کا عنصر نہیں ہوتا۔ اور نعمت پر کراہیت کی اجازت ہرگز نہیں۔ ماسوائے اس نعمت کو جو ظالم اور فاسق کو پہنچے کیونکہ وہ اس کے فساد اور ظلم کا ہتھیار ہوتی ہے۔ تو ایسے شخص کی نعمت کے زوال کے لئے اگر کوئی دعا کرے تو جائز ہوگا۔ کیونکہ یہ ظالم اور فسق کے اعدام کی درخواست ہوگی نہ کہ زوالِ نعمت کی۔ اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر ظالم تائب ہو جائے تو اس کو عطا شدہ نعمت بری نہ لگے گی۔

یہاں ایک باریک نکتہ ہے کہ ایک کو دینی نعمت عطا ہوئی تو دوسرا بھی چاہے کہ اسے بھی وہ دینی نعمت عطا ہو اور جب نہ ملے تو ہو سکتا ہے کہ اسے بر بنائے تفاوت کراہیت ہو تو اس نعمت کی بقا کی نسبت' تفاوت کے اٹھنے کی وجہ سے نعمت کا زوال دوسرے کے لئے آسان ہوگا۔ اور خوف یہ ہے کہ طبع اس خواہش سے خالی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ جو اس کی طبع میں ہے تو اس قلبی خواہش کو پسند نہیں کرے گا۔ تو اگر اس کو اختیار ہوتا تو وہ دوسرے

صاحبِ نسبت سے نعمت کا زوال نہ چاہتا۔ اس لئے اس مقدار پر جو فطری امر ہے اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔ (اگرچہ وہ اسے بروئے کار لائے بھی)۔

حسد کا علاج: معلوم رہے کہ حسد دل کی بہت بڑی بیماری ہے اور علاج اس کا بھی وہی علم اور عمل کی معجون ہے۔ اور علمی علاج یہ ہے کہ جان لے کہ حسد اس کے لئے باعث آزار ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ جب کہ محسود کے لئے دنیا و آخرت دونوں میں فائدے کا سبب ہے۔

اور حاسد کا نقصان دنیا میں یہ ہے کہ وہ ہمیشہ غم واندوہ اور عذاب میں مبتلا ہوگا۔ کیونکہ محسود کو جو نعمت عطا ہوتی ہے اس کے غم واندوہ سے حاسد کا دل کبھی خالی نہ ہوگا۔ حاسد تو چاہتا ہے کہ محسود مبتلائے رنج ہو لیکن جس کیفیت کے لئے چاہتا ہے کہ دشمن اس سے دوچار ہو اس میں خود مبتلا ہوتا ہے۔ اور حسد کے غم سے بڑا غم اور کوئی نہیں ہوتا۔ تو اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہوگی کہ کوئی دشمن کے باعث خود کو مبتلائے رنج وغم رکھے جب کہ حسد کے باعث محسود کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی ہو۔ کیونکہ اس نعمت (=رزق) کے لئے حق تعالیٰ کی تقدیر میں تقدیم ہو سکتی ہے نہ تاخیر، نہ اس میں کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔ کیونکہ یہ ازل سے مقدر ہو چکی ہے۔ ایک گروہ اس مُقدّر کو خوش بختی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جیسے بھی کہیں لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ مقدر میں تبدیلی ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء میں سے ایک نبی ایک عورت سے عاجز آ گیا تھا کہ اس کے پاس بادشاہی تھی۔ تو وہ نبی اللہ تعالیٰ سے اس کے ظلم و جفا کی شکایت کرتا تھا۔ تو اسے وحی آئی کہ: ''فَرَّ قُدامِها حتّٰی تنقضِی اَیّامُها'' یعنی اس عورت کے ہاں سے دوری اختیار کرتا آنکہ اس کی بادشاہی کی مدت تمام ہو جائے۔ اور وہ مدت ازل سے مقرر ہو چکی ہے۔ اس لئے اس میں ترمیم ممکن نہیں''۔ انبیاء میں ایک نبی بلا میں گرفتار تھے۔ تو بہت گریہ وزاری اور دعا فرماتے تھے۔ تو انھیں وحی آئی کہ: ''جس دن میں نے زمین وزمان کی تقدیر کی تھی تمھارے حصے میں یہی ابتلا آئی تھی تو کیا میں تمھارے لئے اس ساری تقدیر و تقسیم کو نئے سرے سے ترتیب دوں؟''

اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کی حسد کی بناء پر دوسرے کی نعمت باطل ہو جائے اور ساتھ ہی وہ خود بھی زیاں کا شکار ہو جائے گا کیونکہ دوسرے کے حسد کی وجہ سے اس کی اپنی نعمت بھی باطل ہو جائے گی اور کفار کے ساتھ حسد کرنے پر اس کے اپنے ایمان کی نعمت بھی باطل ہو جائے گی جیسے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ''وَدَّتْ طَّآءِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ'' (قرآن: ۶۹/۳) (اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے چاہا کہ تمھیں گمراہ کریں) پس حسد حاسد کے لئے نقد پاداش ٹھہرا۔

حاسد کے لئے آخرت کا ضرر اس سے کہیں زیادہ ہے کہ حاسد کا غصہ حقیقت میں فیصلۂ حق تعالیٰ کے

باب میں ہوتا ہے انکار حاسد کا قسمت پر ہوتا ہے جو حق تعالیٰ نے اپنی کمال حکمت سے مقرر فرمائی ہے اور کسی کو بھی اس راز سے آگاہ نہیں فرمایا۔ تو حسد سے بڑ کر توحید میں اور خیانت کیا ہوگی؟ حسد کی وجہ سے انسان مسلمانوں کی خیر خواہی اور شفقت سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ کیونکہ اس طرح وہ ان کے لئے بدخواہی کا مرتکب ہوجاتا ہے اور اس خواہش میں وہ ابلیس کا شریک ساتھی قرار پائے گا۔ تو اس سے بڑھ کر شر اور کیا ہوگا؟!

اور محسود کو دنیا میں جو نفع ہوگا وہ یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں سوائے اس کے اور کیا چاہے گا کہ اس کا حاسد ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہے اور خود حسد سے بڑھ کر اور عذاب کیا ہوگا۔ کیونکہ کوئی اور ظالم ایسا نہیں ہے کہ مظلوم کی طرح ہو جیسے کہ حاسد محسود کی مانند ہوتا ہے۔ اور محسود کو اگر حاسد کی موت کی خبر ملے یا اسے معلوم ہو کہ وہ اس عذاب سے چھوٹ گیا ہے تو محسود کو رنج پہنچے گا۔ کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ نعمت کی بناء پر محسود رہوں اور حاسد حسد کے باعث رنج میں مبتلا رہے۔

اور محسود کی دینی منفعت یہ ہے کہ وہ حاسد کے حسد کی وجہ سے مظلوم قرار پاتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ حاسد زبان اور معاملت میں ظلم کرے تو اس بناء پر حاسد کی نیکیاں محسود کے نامۂ اعمال میں منتقل کردی جائیں اور محسود کے گناہ حاسد کی گردن پر لاد دیئے جائیں۔ حاسد نے تو چاہا تھا کہ محسود سے نعمتِ دنیا چھن جائے لیکن وہ نعمت نہ صرف یہ کہ چھنی نہیں گئی بلکہ اس پر آخرت کی نعمت میں اضافہ بھی ہوا۔ اور حاسد کے لئے دنیا کا عذاب تو نقد ہوا۔ اور آخرت کے عذاب کی بنیادیں بھی استوار کی گئیں۔

حاسد گمان کرتا ہے کہ وہ خود کا دوست ہے اور محسود کا دشمن ہے لیکن جب حاسد بہ نظر غائر دیکھے تو معلوم ہوگا کہ وہ محسود کا تو دوست ہے لیکن خود اپنا دشمن ہے۔ حاسد خود کو تو رنج میں مبتلا رکھتا ہے اور ابلیس کو جو اس کا سب سے بڑا دشمن ہے خوش رکھتا ہے۔ ابلیس نے جب دیکھا کہ حاسد کو علم و ورع اور جاہ و مال حاصل نہیں تو وہ ڈرا کہ اگر حاسد قانع ہوگیا تو اسے آخرت کا ثواب ملے گا تو ابلیس کی تمنا تو یہ تھی کہ آخرت کے ثواب سے بھی حاسد محروم رہے اور حاسد محروم رہا۔ کیونکہ جو کوئی اہلِ علم و دین کو عزیز رکھتا ہے اور ان کے جاہ و حشمت پر راضی ہوتا ہے تو کل قیامت کو وہ انھی اہل علم و دین کے ساتھ ہوگا۔ کیونکہ آنحضرت کا فرمان ہے کہ "جو کوئی کسی کو دوست رکھتا ہے قیامت کے دن اس کے ساتھ ہوگا"۔ داناؤں کا کہنا ہے کہ مرد وہ ہے جو عالم ہو یا علم کا طالب یا ان کو دوست رکھنے والا اور حاسد ان تینوں کے ثواب سے محروم ہوتا ہے۔ اور حاسد کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو پتھر پھینکتا ہے کہ اس کے دشمن کو لگے لیکن وہ پتھر دشمن کو لگنے کی بجائے لوٹ کر خود پتھر پھینکنے والے کی دائیں آنکھ میں آ لگتا ہے جس سے آنکھ ضائع ہوجاتی ہے۔ لیکن وہ پھر دشمن پر پتھر مارتا ہے لیکن پتھر لوٹ کر آتا

اوراس کے سر پر ضرب لگا تا ہے۔ وہ ایسے ہی کرتا ہے اور دشمن اس کا سلامت رہتا ہے۔تو دشمن اس کو دیکھ کر اس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ یہی حال حاسد کا ہے اور شیطان کا تمسخر اس پر مستزاد۔ اور یہ سب آفت حسد کی ہے، پس اگر نوبت یہاں تک آ جائے کہ حاسد زبان یا ہاتھ سے ظلم کرے یا غیبت کرے یا دروغ بافی کرے اور انکارِ حق کا مرتکب ہو تو یہ خود بہت بڑی مظلمت ہے۔ پس جسے معلوم ہو جائے کہ حسد اس کے لئے زہر قاتل ہے تو اگر عقل مند ہوگا تو حسد اس سے دور ہو جائے گا۔

حسد کا عملی علاج: یہ ہے کہ مجاہدات کے ذریعے حسد کے اسباب اپنے باطن سے اکھاڑ پھینکے۔ حسد کا سبب کبر، عُجب، عداوت، دوستی جاہ وغیرہ ہیں جنھیں ہم خشم کے باب میں بیان کر چکے ہیں۔ تو چاہئے کہ حاسد ان جڑوں کو مجاہدات کے ذریعے اپنے دل سے اکھاڑ پھینکے۔ اس بناء پر مُسہل ہی امتلائے شکم کی بیماری کا استیصال کرتا ہے تا کہ خود حسد ہی باقی نہ رہے۔ لیکن اگر حسد پیدا ہو جائے تو اس کو پنپنے نہ دے اس طرح کہ جو تقاضا حسد کا ہو اس کے برعکس عمل کرے۔ مثلاً حسد کہے کہ محسود پر طعن کرو تو انسان اس کی تعریف کرے اور جب کہے کہ محسود پر تکبر کر تو انسان انکساری کرے۔ اور جب حسد کہے کہ محسود کی نعمت کے ازالے کی سعی کر اور اس کے ساتھ خصومت کر، تو اس کے برعکس محسود کی معاونت کرے۔ اور کوئی علاج اتنا مجرب نہیں کہ محسود کی غیر حاضری میں اس کی تعریف کرے اور اس کے کام میں فروغ دے تا کہ وہ سنے تو اس کا دل خوش ہو جائے۔ اور جب محسود خوش ہو گیا تو اس خوشی کا پرتو از طریق انعکاس حاسد کے دل پر بھی پڑتا ہے، جو حاسد کے دل کو خوش کرتا ہے جس سے ان دونوں کی باہمی عداوت جاتی رہتی ہے۔ جیسے کہ فرمانِ خداوندی ہے کہ ''اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ'' (قرآن: ۴۱/۳۴) (اس کا دفاع احسن طریق سے کر پس وہ شخص کہ تمھارا دشمن ہے وہ ایسے ہو جائے گا کہ نزدیکی مہربان ہو) اور شیطان ایسے موقع پر کہتا ہے کہ ''اگر تم جھک گئے اور اس کی تحسین کی تو محسود اسے تمھاری شکست پر محمول کرے گا''۔ تو ایسے میں تو مختار ہے خواہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کر خواہ شیطان کی۔ تُو جان لے کہ یہ دوا نہایت درجہ مفید ہے اور نافع لیکن تلخ ہے، اور اس پر صبر کرنا دشوار ہوتا ہے۔ سوائے بذریعہ قوتِ علم کے کہ انسان سمجھتا ہو کہ نجات اس کی دین و دنیا میں اسی میں ہے اور ہلاکت اس کی دنیا و دین میں حسد کی وجہ سے ہے اور کوئی دوا صبر اور تلخی اور رنج برداشت کئے بغیر موثر نہیں ہوتی۔ اس لئے ایسی دوا کی طمع جو صبر، تلخی اور رنج سے خالی ہو نہ کرنی چاہئے۔ جب بیماری آ جائے تو جسم کو امیدِ شفا میں تکلیف اٹھانے کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ ورنہ بیماری ہلاکت پر منتج ہوگی تو رنج ناچار بیشتر ہوگا۔

فصل: یادرہے کہ اگر تو ریاضت زیادہ کرے گا تو غالب یہ ہوگا کہ تو اس شخص کے درمیان کہ جس نے تجھے رنج پہنچایا ہے اور وہ شخص جو تیرا دوست ہو تو تیرے دل میں ان کا فرق معلوم ہو جائے گا اور دونوں کی نعمت اور محنت تیرے نزدیک یکساں نہ ہوگی۔ بلکہ تو دشمن کی نعمت کو طبعاً برا جانے گا اور تو اس کا مکلّف نہیں ہے کہ فطرت کو متغیر کرے کیونکہ یہ تیرے بس کی نہیں۔ لیکن تو دو چیزوں کا مکلّف ہے کہ تو اسے اپنے قول یا فعل کے ذریعے ظاہر نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ تو از رُوئے عقل اپنے اندر اس صفت کو برا جانے اور منکر ہو اور طالب اس بات کا ہو کہ یہ صفت تجھ میں نہ رہے۔ تو جب تُو نے ایسا کیا تو تُو حسد کے وبال سے نجات پا گیا۔ لیکن اگر اظہار نہ کرے لیکن تیرے باطن میں اس صفت کے لئے نفرت ہو جو اپنے اندر پائے۔ تو ایک گروہ کا قول ہے کہ تُو اس کے لئے ماخوذ نہ ہوگا۔ لیکن درست یہ ہے کہ اس کے لئے ماخوذ ہوگا۔ کیونکہ حسد حرام ہے اور یہ عمل دل کا ہے نہ کہ جسم کا۔ اور جو کوئی بھی مسلمان بھائی کی تکلیف پر خوش ہو اور اس کی خوشی پر اندوہ گیں ہوگا لازماً ماخوذ ہوگا بجز اس کے کہ اس صفت کو برا جانتا ہو تب وہ اس کے وبال سے خلاصی پا سکے گا۔ تاہم اگر کسی پر توحید کا غلبہ ہو اور حسد سے کلیۃً نجات پا گیا ہو تو اس کا کوئی دوست یا دشمن نہ ہوگا بلکہ سب کو حق تعالیٰ کی بندگی کی نظر سے دیکھے گا اور تمام کاموں کا سرچشمہ اسی ایک ذات کو سمجھے گا، لیکن یہ حالت نادر ہوتی ہے اور برق کی مانند آتی اور غائب ہو جاتی ہے اور اکثر بے ثبات ہوتی ہے۔

اصل پنجم: کہ حُبِ دنیا تمام گناہوں کا منبع ہے اور حُبِ دنیا کا علاج

یادرہے کہ دنیا تمام برائیوں کی جڑ ہے اور دوستی اس کی تمام معصیتوں کی اصل ہے اور اس سے بڑھ کر منحوس کون ہوگا جو اللہ کا دشمن ہو اور اللہ کے دوستوں کا دشمن ہو۔ اور اللہ کے دشمنوں کا دوست ہو؟ اللہ کے ساتھ دشمنی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے بندوں کی راہزنی کرے تا کہ وہ اللہ تعالیٰ تک رسائی نہ پائیں اور اللہ تعالیٰ کے دوستوں کے ساتھ دشمنی اس طرح کرتی ہے کہ خود کو ان کے سامنے لاتی ہے اور خود کو ان کی نگاہوں میں آراستہ کرتی ہے تا کہ اس سے بچ نکلنے کے لئے تلخ مشروب پینے پڑیں اور اس کا رنج اٹھائیں اور دشمنانِ حقِ تعالیٰ کے ساتھ دشمنی یوں کرتی ہے کہ دنیا حیلے بہانے سے انھیں اپنی دوستی میں مبتلا کرتی ہے۔ جب وہ دنیا کے عاشق ہو جاتے ہیں تو ان سے دوری اختیار کر لیتی ہے۔ اور اللہ کے ان دشمنوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ زن فاحشہ کی طرح ایک مرد سے دوسرے مرد سے اظہارِ دوستی میں گردان رہتی ہے۔ حتیٰ کہ انسان اس دنیا میں

کبھی اس سے بہرہ وری کا رنج اٹھاتا ہے تو کبھی اس کے فراق کی حسرت کا شکار ہوتا ہے۔ اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے خشم وعذاب کا نشانہ بنتا ہے۔ اور کوئی بھی دامِ دنیا سے چھٹکارا نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی حقیقت سے آشنا ہو اور اس کی آفت کو پہچانتا ہو۔ اور اس سے پرہیز کرے جیسے کہ لوگ جادو ٹونے سے پرہیز کرتے ہیں۔ آنحضرت کا فرمان ہے کہ دنیا سے پرہیز کرو کہ یہ ہاروت و ماروت سے بڑی جادوگر ہے۔ دنیا کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی آفات کیا ہیں اور اس کے مکر و فریب آغاز کتاب میں تیسرے عنوان کے تحت ہم بیان کر چکے ہیں۔ یہاں ہم وہ اخبار و احادیث جو دنیا کی مذمّت میں وارد ہوئی ہیں ان کا بیان کریں گے۔ کیونکہ قرآن میں اس کے بارے میں بہت سی آیات موجود ہیں۔ اور خود قرآن کا مقصود اور انبیاء کی کتب اور انبیاء کی بعثت سب سے غرض یہ ہے کہ لوگوں کو دنیا سے آخرت کی طرف بلایا جائے اور دنیا کی آفت اور اس کے رنج و محن ان کے سامنے بیان کئے جایں تا کہ لوگ دنیا سے محترز رہیں۔

اخبار و احادیث سے دنیا کی آفات اور مذمّت معلوم کرنا

یاد رہے کہ ایک دن آنحضرت ﷺ کا گذر ایک مُردہ بکری کے پاس سے ہوا تو آپ ﷺ نے اپنے ہمراہ صحابہ سے فرمایا کہ ''یہ مردار کتنا خوار ہے کہ کوئی اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ اس اللہ کی قسم کہ جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے کہ دنیا اللہ کے نزدیک اس مردہ بکری سے بھی خوار تر ہے۔ اگر اللہ کے نزدیک مچھر کے پَر کی بھی کوئی قدر ہوتی تو وہ کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی نہ دیتا''۔ نیز فرمایا کہ ''دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے۔ ماسوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہو''۔ نیز فرمایا کہ ''دنیا کی دوستی تمام معصیتوں کا سر آغاز ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''جو کوئی دنیا کو دوست رکھتا ہے وہ آخرت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اور جو کوئی آخرت کو دوست رکھتا ہے وہ دنیا کو زیان سے آشنا کرتا ہے۔ پس جو باقی رہنے والی یعنی ابدی ہو اسے اختیار کرنا چاہئے بہ نسبت اس کے جو آنی و فانی ہو''۔

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھا تو ان کے لئے شہد آمیز پانی کا شربت لایا گیا۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے منہ کے قریب لائے تو روک لیا۔ اور شدید گریہ میں مبتلا ہو گئے۔ یہاں تک کہ ہم بھی رونے لگے۔ پھر ابوبکر خاموش ہو گئے۔ لیکن پھر رونا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ کسی کو یارا نہ تھا کہ سبب پوچھتا۔ جب انھوں نے آنکھیں پونچھیں تو پوچھا گیا کہ ''اے اللہ کے رسول کے خلیفہ کیا بات تھی؟'' تو فرمایا کہ ''ایک دن ہم رسول اللہ کے ساتھ بیٹھے تھے تو دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے ہاتھ سے کسی شے کو خود سے دور کر رہے ہیں۔ لیکن ہمیں کوئی شے نظر نہ آئی تو میں نے کہا ''اے اللہ کے رسول یہ کیا ہے؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''یہ دنیا

ہے جوخود کو میرے سامنے لا رہی ہے میں نے اسے دور کیا ہے۔لیکن دنیا لوٹ کر پھر آئی اور بولی کہ اگر تو میرے ہاتھ سے بچ نکلا تو وہ لوگ جو تیرے بعد آئیں گے وہ مجھ سے نہ بچ پائیں گے' اس لئے میں ڈرا کہ دنیا نے مجھی کو پالیا ہے''۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جو دنیا سے زیادہ خدا دشمن ہو اور جسے تخلیق کے بعد دوبارہ اللہ نے نہ دیکھا ہو'۔ نیز فرمایا کہ ''دنیا نگھروں کا گھر ہے اور بے مالوں کا مال ہے اور جمع اسے وہی کرتا ہے جو احمق ہو اور اس کی طلب میں وہ شخص عداوت کا مرتکب ہوتا ہے جو بے علم ہے۔ اور اس پر حسد وہ کرتا ہے جو بے فقہ ہو۔ اور طالب دنیا کا وہ ہوتا ہے جو بے یقین ہو''۔ نیز فرمایا کہ: ''جو کوئی صبح کو اٹھے اور نصب العین اس کا زیادہ تر دنیا ہو وہ اللہ کا مرد نہیں ہوتا۔ اور چار خصائل اس میں لازماً ہوتے ہیں۔ اندوہ جو ختم نہیں ہونے کا' اور شغل جس سے انسان کبھی فارغ نہیں ہوتا' اور افلاس جو کبھی دولت مندی کو نہیں پہنچتا اور اُمید جو کبھی کامیابی کی صورت نہیں پاتی''۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ایک دن آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم نہیں چاہتے کہ دنیا کو تمام تر دکھاؤں؟ میرا ہاتھ پکڑ آ اور ایک گھورے پر لے گئے کہ جس میں انسان کی ہڈیاں نیز بکریوں اور چارپایوں کی ہڈیاں تھیں اور آلودہ چیتھڑے اور لوگوں کا بول و براز تھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے ابو ہریرہ یہ سر تمھارے سروں ہی کی طرح حرص آز سے پُر تھے۔ جو اب ہڈیاں ہو گئے ہیں جن پر گوشت پوست باقی نہیں رہا۔ اور جو جلد ہی راکھ ہو جانے والی ہیں۔ اور یہ پلیدیاں دستر خواں کے کھانوں کی ہیں جنھیں بڑی کدو کاوش سے حاصل کیا گیا تھا۔ اور اب انھیں اس حالت میں گرا دیا گیا ہے کہ سب ان سے نفرت کرتے ہیں۔ اور یہ چیتھڑے کبھی لوگوں کے تجمل کا سامان تھے جنھیں اب ہوا اڑائے پھرتی ہے اور یہ ہڈیاں ان چوپایوں کی ہیں کہ جن پر سوار ہو کر لوگ دنیا کی سیر کرتے تھے۔ تو یہ ہے دنیا اور اس کی حقیقت۔ جو چاہتا ہے کہ دنیا پر ماتم کرے اسے کہہ دو کہ کرے کیونکہ موقع اسی کا ہے؛ تو جو لوگ بھی اس وقت موجود تھے سب رونے لگے''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جب سے دنیا وجود میں لائی گئی اور زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ نے کبھی اسے آنکھ بھر کر نہیں دیکھا اور روزِ قیامت دنیا کہے گی کہ ''خدایا مجھے اپنے ادنیٰ ترین بندوں کے حوالے کر دے تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ: ''خاموش اے ناچیز! میں نے تو دنیا میں بھی اسے پسند نہیں کیا کہ تو کسی کی ملکیت میں جائے تو کیا آج میں اسے پسند کروں؟'' نیز فرمایا کہ ''قیامت میں ایسے گروہ بھی آئیں گے کہ جن کے اعمال کوہِ تہامہ سے بھی کئی گنا بڑے ہوں گے لیکن وہ دوزخ میں بھیجے جائیں گے''۔ تو لوگوں نے استفسار کیا کہ ''اے اللہ کے رسول! وہ نمازی ہوں

گے؟'' تو فرمایا کہ ''نمازی ہوں گے، روزہ دار ہوں گے، شب زندہ دار ہوں گے، لیکن جب دنیا کی کوئی شے دکھائی دے تو اس پر جھپٹ پڑتے ہیں''۔

ایک دن آنحضرت ﷺ باہر نکلے تو اصحاب سے فرمایا کہ ''تم میں سے کون سا ہے جو چاہتا ہے کہ نابینا نہ ہو اور حق تعالیٰ اسے نابینا نہ کردیں؟ جان لو کہ جو کوئی دنیا کی طرف راغب ہوتا ہے اور طول امل کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے بقدر اس کے دل کو نابینا کردیتے ہیں اور جو کوئی دنیا کے بارے میں زاہد ہو امید کو مختصر کرے تو اللہ تعالیٰ اسے براہ راست علم عطا فرماتے ہیں جس کے لئے اسے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کرنا پڑتا اور اس کی رہبری اس طرح فرماتے ہیں کہ اسے کسی رہنما کی حاجت نہیں ہوتی''۔

ایک دن آنحضرت ﷺ باہر نکلے۔ ابوعبیدہ جراح نے بحرین سے مال بھیجا تھا اور انصار نے سن لیا تھا۔ نماز فجر میں ایک ہجوم جمع ہوگیا۔ جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو سب آپ کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ تو آپ مسکرائے اور فرمایا کہ: ''شاید آپ لوگوں نے سن لیا ہے کہ مال پہنچ گیا ہے''۔ تو وہ بولے ''جی ہاں''۔ تو آپ نے فرمایا کہ ''خوشخبری ہو تمھارے لئے کہ ایسے کام ہوں گے کہ تم لوگ خوش ہوجاؤ گے۔ اور مجھے یہ خوف نہیں کہ تم مفلسی کا شکار ہوگے بلکہ خائف اس لئے ہوں کہ دنیا تم پر نچھاور ہوگی جیسے ان لوگوں پر نچھاور ہوئی جو تم سے پہلے تھے۔ پھر تم منافسہ کرو گے جیسے کہ انھوں نے کیا تھا اور ہلاک ہوجاؤ گے جیسے کہ وہ ہلاک ہوگئے تھے''۔ نیز فرمایا کہ ''دل کو کبھی دنیا کی یاد میں مصروف نہ کرنا''۔ آپ نے دنیا کے ذکر ہی سے منع فرمایا دنیا کی دوستی اور اس کی طلب تو دور کی بات ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''آنحضرت کی ایک اونٹنی جسے وہ غضباء[1] کہتے تھے اور وہ تمام اشتروں سے زیادہ تیز رفتار تھی۔ ایک دن ایک بدوی ایک اشتر لایا اور اسے غضباء کے ساتھ دوڑایا تو بدوی کا اونٹ جیت گیا اس پر مسلمان غمگین ہوگئے۔ آنحضرت ﷺ نے اس پر فرمایا کہ ''یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ جسے دنیا میں اوپر اٹھاتا ہے اور اسے آخر خوار کردیتا ہے''۔ پھر فرمایا کہ ''اس کے بعد دنیا تمھارا رخ کرے گی اور تمھارے دین کو کھا جائے گی۔ ایسے ہی جیسے آگ ایندھن کو کھا جاتی ہے''۔ حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ ''دنیا کو آقائی کے لئے حاصل نہ کرنا کہ دنیا آخر تمھیں غلام بنالے گی۔ اور خزانہ ایسے محفوظ کرو کہ پھر اس کے بارے میں خوف نہ ہو۔ اور اس کے پاس رکھو جو ضائع نہ کرے۔ کیونکہ دنیا کا مال آفت سے مامون نہیں ہوتا۔ اور جو خزانہ تم اللہ کے لئے رکھو گے وہ محفوظ رہے گا''۔ نیز فرمایا کہ ''دنیا اور آخرت ایک دوسرے کی ہوو (سوکنیں) ہیں۔ اس لئے

---

[1] کان چھدی

جب ایک کو خوش کرے گا تو دوسری ناراض ہو جائے گی"۔ حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ: "اے میرے حواریو! میں نے دنیا تمھارے سامنے زمین پر پھینک دی ہے۔ تم اب اسے دوبارہ نہ اٹھالینا۔ کیونکہ دنیا کی ناپاکیز گی میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے سوائے اللہ تعالیٰ کی معصیت کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور ناپاکی اس کی یہ ہے کہ کوئی آخرت کو نہیں پا سکتا جب تک اسے ترک نہ کر دے۔ دنیا سے پرے پرے ہی گذر جاؤ اور اسے ترک کر دو۔ اور اس کی تعمیر میں نہ لگ جاؤ اور جان لو کہ تمام گناہوں کا سرچشمہ دنیا کی دوستی ہے۔ اور بہت سی شہوات وہ ہیں کہ جن کا ثمرہ نہایت اندوہ گیں ہے اور مزمن۔ نیز فرمایا کہ: "جیسے آب و آتش ایک جگہ قرار نہیں پاتے اسی طرح دنیا کی دوستی اور آخرت کی دوستی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں"۔ لوگوں نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ: "کیا ہو جائے گا کہ اگر آپ اپنے لئے نیا لباس تیار کرا لیں؟" تو آپ نے فرمایا کہ ہمارے لئے دوسروں کا اترن ہی کافی ہے"۔ ایک دن حضرت کو بارش اور گرج چمک نے آلیا۔ تو آپ پناہ کے لئے دوڑے ایک خیمہ دیکھا تو اس طرف گئے جب وہاں ایک عورت کو پایا تو وہاں سے بھاگے تو ایک غار دیکھا اس میں داخل ہوئے تو وہاں ایک شیر کو پایا تو وہاں سے بھاگے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا "بارِ خدایا تو نے جسے بھی پیدا کیا اسے مسکن بھی دیا لیکن مجھے؟" تو آپ علیہ السلام پر وحی آئی کہ "تمھاری آرام گاہ میری رحمت کا مستقر ہے یعنی بہشت اور بہشت میں ایک سو حوروں کو تمھاری زوج میں دوں گا جنھیں میں نے اپنے دستِ لطف سے تخلیق کیا ہے۔ اور چار ہزار سال تمھاری عروسی کی تقریب ہوتی رہے گی۔ جس کا ہر دن دنیا کی پوری عمر سے کئی گنا زیادہ ہوگا۔ تو میں ایک منادی کو حکم دوں گا کہ ندا کرے کہ 'کہاں ہیں دنیا کے زاہد؟ سب حضرت عیسیٰ زاہد کے عرس میں آ جائیں'۔ یہاں تک کہ زاہد آ جائیں گے"۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ کا گذر اپنے حواریوں کے ہمراہ ایک شہر پر ہوا دیکھا کہ لوگ سب راستے میں مرے پڑے ہیں۔ تو فرمایا کہ "اے قوم یہ سب اللہ تعالیٰ کے غیظ کے باعث مرے ہیں ورنہ یہ زیر زمین دفن ہوتے"۔ تو حواریوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ جانیں کہ یہ لوگ کس وجہ سے مرے ہیں؟" تو اس رات حضرت عیسیٰ ایک بلندی پر چڑھ گئے اور آواز دی کہ: "اے شہر والو!" تو اس پر ایک شخص کی آواز آئی کہ کہ جس نے کہا "لبیک یا روح اللہ" حضرت نے فرمایا کہ "تمھارا قصہ کیا ہے؟" تو وہ شخص بولا کہ "رات کو ہم بہ عافیت تھے اور صبح کے وقت دوزخ میں تھے"۔ حضرت نے پوچھا "کیوں؟" تو جواب ملا کہ: "ہم دنیا دوست تھے اور گناہ گاروں کی فرماں برداری کرتے تھے"۔ فرمایا "دنیا کو کس طرح دوست رکھتے تھے؟" تو جواب ملا "جس طرح ماں کو چھوٹا بچہ دوست رکھتا ہے جب دنیا آتی ہم خوش ہو جاتے تھے اور جب دنیا جاتی تو ہم غمگین ہو جاتے

تھے''۔ حضرت نے پوچھا ''دوسرے کیوں جواب نہیں دے رہے؟'' تو وہ بولا ''باقی سب کے دہانوں پر آگ کی لگامیں کسی ہوئی ہیں''۔ فرمایا ''پھر تم نے جواب کیونکر دیا''۔ تو وہ بولا میں اتفاق سے ان کے درمیان تھا اور نہ میں ان میں سے نہ تھا۔ جب عذاب آیا تو میں بھی ان کے درمیان پکڑا گیا۔ اور اس وقت دوزخ کے کنارے پر ہوں۔ نہیں معلوم نجات پاؤں گا کہ میں بھی دوزخ میں گر جاؤں گا''۔ حضرت عیسٰی نے اپنے حواریوں سے کہا: ''اے حواریو! جو کی روٹی اور موٹا نمک کھانا اور ٹاٹ کا لباس پہننا اور گھورے پر سو رہنا' تو یہ عافیت دنیا و آخرت کے لئے کافی ہوگا''۔ نیز فرمایا ''تھوڑی سی دنیا کو کافی سمجھنا دین کی سلامتی کے ساتھ جیسے کہ دوسروں نے دنیا کی سلامتی کے ساتھ تھوڑے دین کو کافی سمجھا''۔ نیز فرمایا کہ ''اے وہ کہ تم دنیا کے طالب ہو کہ وہ تمھاری مزدوری ٹھہرے اگر تم دنیا سے ہاتھ کھینچ لیتے تو اس سے کہیں زیادہ تمھیں مزدوری ملتی''۔

ایک دن حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام ایک عظیم موکب کے ساتھ نکلے۔ ہوا کے پرندے اور دیو و پری سب آپ کے ہمراہ تھے۔ تو بنی اسرائیل میں سے ایک عابد گذرا تو اس عابد نے پوچھا ''اے فرزند داؤد اللہ تعالیٰ نے تجھے عظیم ملک عطا فرمایا ہے''۔ تو آپ نے فرمایا کہ ''صحیفۂ مومن میں ایک تسبیح اس سے کہیں بہتر ہے جو فرزند داؤد کو عطا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ تسبیح اس کے نامۂ اعمال میں باقی رہے گی لیکن ملک و سلطنت باقی رہنے والے نہیں''۔

حدیث میں ہے کہ ''جب حضرت آدم نے گندم کھائی تو قضائے حاجت کی خواہش ہوئی' چاہتے تھے کہ خود کو بہشت میں اس سے فراغت دے لیں۔ تو حق تعالیٰ نے آدم کے پاس فرشتے کو بھیجا جس نے حضرت آدم سے پوچھا کیا ڈھونڈ رہے ہو' تو بولے کہ ''یہ جو میرے پیٹ میں ہے چاہتا ہوں کہ اسے کہیں رکھ دوں اور بہشت کے کھانوں میں یہ تفالہ نہیں تھا سوائے گندم کے۔ فرشتے نے کہا کہ ''اسے کہاں رکھو گے؟'' عرش پر رکھو گے؟ یا کرسی پر یا بہشت کی نہروں میں یا درختوں کے نیچے؟ جاؤ دنیا میں جاؤ جو اس قسم کی پلیدیوں کی جگہ ہے''۔

لوگوں نے حضرت عیسٰی سے عرض کیا کہ ''ہمیں وہ چیز سکھایئے جس سے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا دوست بنا لے''۔ تو آپ نے فرمایا کہ ''دنیا کو دشمن رکھو تا کہ اللہ تعالیٰ تمھیں دوست بنائے''۔ اس قدر احادیث کافی ہوں گی۔

اب آثار میں سے: علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ''جو کوئی چھ چیزیں بجا لایا تو اس نے بہشت کی طلب میں دوزخ سے دوری کے لئے کوئی کسر نہ چھوڑی: جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا اور اس کی اطاعت کی؛ شیطان کو پہچانا اور اس کی مخالفت کی؛ اور حق کو پہچانا کہ وہ کیا ہے پھر اس میں ہاتھ ڈالا اور باطل کو پہچانا اور ہاتھ اس سے روک لیا۔ اور دنیا کو پہچانا اور اسے پھینک دیا؛ اور آخرت کو پہچانا اور اس کی طلب میں کمر

بستہ ہو گیا''۔

داناؤں میں سے ایک کا کہنا ہے کہ ''دنیا میں سے جو کچھ تجھے دیا جائے وہ تجھ سے پہلے کسی کے پاس رہا ہو گا اور تیرے بعد کسی اور کو منتقل ہو جائے گا۔ تو تُو اس سے دل کیوں لگاتا ہے۔ کیونکہ دنیا میں سے تیرے حصے میں سوائے چاشت اور شام کے کھانے کے اور کچھ نہیں تو اس ذرہ سی مقدار کے لئے خود کو ہلاکت میں نہ ڈال۔ اور دنیا سے کاملاً روزہ رکھ لے۔ تاکہ آخرت میں افطار کرے کیونکہ سرمایہ دنیا کا محض ہوا و ہوس ہے اور نفع اس کا جہنم''۔

ایک شخص نے ابوحازمؒ سے کہا کہ ''میں دنیا کو دوست رکھتا ہوں کیا کروں کہ اس کی محبت میرے دل سے جاتی رہے؟'' ابوحازمؒ نے فرمایا کہ ''جو کچھ دنیا میں سے حلال ہے لے اور اسے اس کی جگہ پر رکھ تاکہ اس کی دوستی تیرے لئے زیان کا باعث نہ بنے''۔ اور یہ انھوں نے درحقیقت اس لئے کہا ہے کہ انھیں معلوم ہے کہ جب ایسا کرے گا تو دنیا اس کے لئے منغص ہو جائے گی اور اس کے دل میں ناپسندیدہ ہو جائے گی۔

یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دنیا شیطان کی دکان ہے۔ لہٰذا اس کی دکان سے کوئی چیز نہ چرانا نہ لینا کہ پھر وہ لازماً تجھ سے الجھے گا'' اور فضیل فرماتے ہیں کہ ''اگر دنیا سراسر سونا ہوتی لیکن فانی ہوتی اور آخرت سفال (مٹی) ہوتی لیکن ابدی ہوتی تو صاحب خرد پر لازم تھا کہ زرِ فانی کی بجائے سفالِ باقی کو دوست تر رکھتا۔ پس کیسے وہ سفال فانی (دنیا) کو زرِ باقی (آخرت) پر ترجیح دے سکتا ہے؟'' ابوحازم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''دنیا سے حذر کرو کیونکہ میں نے سنا ہے کہ جو کوئی دنیا کو عظمت دیتا ہے تو روزِ قیامت اسے سامنے لایا جائے گا اور منادی کی جائے گی یہ وہ شخص ہے جو اس چیز کو جسے اللہ تعالیٰ نے حقیر قرار دیا تھا اس کی بزرگداشت کا مرتکب ہوا ہے'' ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''جو کوئی بھی دنیا میں ہے مہمان ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے مستعار ہے تو مہمان کو سوائے جانے اور مستعار شے کو لوٹانے کے اور کوئی چارہ نہیں''۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا کہ ''اے بیٹے دنیا کو آخرت کے عوض بیچ دے تاکہ دونوں منفعتیں پائے اور آخرت کو دنیا کے عوض نہ بیچ کہ دونوں ضرر اٹھائے''۔

ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''جب آنحضرت کو پیغمبری پر مبعوث کیا گیا تو ابلیس کے فوجی ابلیس کے پاس آئے اور بولے کہ ''ایسے پیغمبر کو بھیجا گیا ہے اب ہم کیا کریں؟'' تو ابلیس بولا کہ ''کیا لوگ دنیا کو دوست رکھتے ہیں؟'' تو بولے کہ ہاں رکھتے ہیں۔ تو ابلیس نے کہا کہ وہ دنیا کو دوستی رکھتے ہیں غم نہ کرو اگرچہ بُت نہیں پوجتے۔ میں دنیا سے دوستی میں انھیں یہاں تک لے آؤں گا کہ جو کچھ ناحق ہوا سے وہ لیں اور جو کچھ

بھی دیں وہ بھی ناحق ہو۔اور جس شے کو روکیں حق پر نہ روکیں اور شر سراسر ان تین کاموں کا ثمر ہے"۔ فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے ساری دنیا بھی دے دیں جو حلال ہو اور روزِ قیامت اس کا حساب بھی نہ لیا جانے والا ہو تو بھی مجھے اس سے ایسی ہی نفرت ہوگی جیسی آپ لوگوں کو مردار سے ہوتی ہے"۔ابوعبیدہ جراح رضی اللہ عنہ شام کے امیر تھے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو ان کے گھر میں ایک شمشیر' ڈھال' قرآن مجید اور اونٹ کے کجاوے کے سوا کچھ نہ پایا۔تو فرمایا کہ "تم نے کھانے پینے کے برتن جیسے لوازم نہیں فراہم کیے؟" تو فرمایا کہ جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں کے لئے یہی کافی ہے۔یعنی قبر" حسن بصری رضی اللہ عنہ نے عمر بن عبدالعزیز کو خط لکھا اور اس سے زیادہ اور کچھ نہ لکھا کہ "وہ دن آیا سمجھو کہ جس کے بعد اس پر موت لکھی گئی ہو مر جائے"۔حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کے جواب میں لکھا: "وہ دن آیا سمجھ کہ گویا خود دنیا تھی ہی نہیں البتہ آخرت ہمیشہ سے ہے"۔ آثار میں ہے کہ "حیرت ہے اس شخص پر جو جانتا ہے کہ موت حق ہے وہ خوش کیسے ہو سکتا ہے؟ اور حیرت ہے اس شخص پر جو جانتا ہے کہ دوزخ ہے پھر بھی ہنستا ہے؟ اور حیرت ہے کہ اس پر جو دیکھتا ہے کہ دنیا کسی سے وفا نہیں کرتی پھر اس سے دل لگاتا ہے۔اور حیرت ہے اس پر جو جانتا ہے کہ رزق مقدر ہو چکا ہے پھر بھی دل کو روزی کی فکر میں مشغول رکھتا ہے۔داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "انسان ہر روز توبہ اور طاعت کو ملتوی کرتا رہتا ہے۔ ٹھیک ایسے ہی ہے جیسے کوئی بیگار کرے یا یہ کہ فائدہ اس کا دوسرے کو ہوگا۔

ابوحازم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: "دنیا میں کوئی شے ایسی نہین جس پر خوش ہوا جائے نہ اس میں کوئی ایسی شے ہے کہ جس کا غم کھایا جائے۔اور شادیٔ محض تو پیدا ہی نہیں کی گئی"۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص دنیا سے نہیں جاتا کہ موت کے وقت تین چیزوں کی حسرت اس کے گلو گیر نہ ہوئی ہو کہ: "جو کچھ اس نے جمع کیا تھا اسے سیر ہو کر نہ کھایا' اور جس کی امید تھی وہ پوری نہ ہوئی اور زادِ آخرت جیسا کہ چاہئے تھا تیار نہ کر سکا"۔

محمد بن المنکدر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "اگر کوئی عمر بھر دن کو روزہ رکھے اور رات کو نماز میں رہے۔حج اور جہاد کا فریضہ ادا کرے۔اور روزِ قیامت اس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا کی تجلیل کی حالانکہ حق تعالیٰ دنیا کو حقیر قرار دیا تھا تو اس شخص کا حال کیسا ہوگا؟ اور ہم میں سے کون ہے جو ایسا نہیں ہے باوجود اس کے کہ ہم بکثرت گناہوں کے مرتکب ہیں اور فرائض میں مقصر ہیں؟ داناؤں نے کہا ہے کہ "دنیا ایک ویران سرائے ہے اور اس سے زیادہ ویران اس شخص کا دل ہے جو طلب دنیا میں مصروف رہتا ہے۔اور بہشت پُر رونق سرائے ہے اور اس شخص کے دل سے کہیں زیادہ پُر رونق جو اس کا طالب ہے"۔

حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ بن ادھم نے ایک شخص سے فرمایا کہ "تمہیں خواب کا ایک دِرم عزیز ہے یا بیداری کا

ایک دینار؟'' تو اس نے جواب دیا کہ ''بیداری میں کا ایک دینار'' تو انھوں نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو کیونکہ دنیا تو ایک خواب ہے اور آخرت بیداری اور تو جو کچھ دنیا میں ہے اس کا طالب ہے''۔

یحییٰ معاذؒ فرماتے ہیں کہ ''عاقل وہ ہے جو تین کام کرتا ہے: دنیا سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے قبل اس کے کہ دنیا اسے ترک کر دے؛ اور قبل اس کے کہ قبر میں جائے قبر تیار کر لیتا ہے؛ اور حق تعالیٰ کو راضی کر لیتا ہے قبل اس کے کہ اس کے حضور پہنچے''۔ اور فرمایا کہ نحوست دنیا کی اس درجے کی ہے کہ اس کی خواہش انسان کو حق تعالیٰ سے ہٹا کر خود میں مشغول کر لیتی ہے۔ اور جب دنیا مل جائے تو پھر اس میں جو مصروفیت ہوگی تو اس کا تو مذکور ہی کیا''۔ بکر بن عبداللہؒ فرماتے ہیں کہ ''جو کوئی وسائل دنیا کے بل پر دنیا کو ترک کرنے کا خواہاں ہو اس کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو آگ کو بجھانا چاہتا ہے لیکن اس پر خشک ایندھن ڈالتا جائے''۔ اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ''دنیا چھ چیزوں کا مجموعہ ہے: کھانا' پینا' پہننا' سونگھنا' سوار ہونا اور نکاح چاہنا۔ اور کھانے کی چیزوں میں سب سے اشرف شہد ہے۔ جو مکھی کا تھوک ہے اور پینے کی چیزوں میں شریف ترین پانی ہے۔ جس میں تمام دنیا اور دنیا والے برابر کے شریک ہیں اور شریف ترین لباس ریشم کا ہے جو ایک کیڑے کی بافت ہے اور خوشبوؤں میں سب کی سردار مشک ہے جو دراصل ہرن کا خون ہے اور سب سے عمدہ سواری گھوڑا ہے اور سب اس کی پشت پر سوار ہو کر لوگوں کو قتل کرتے ہیں اور سب سے بڑی شہوت عورتوں کی شہوت ہے اور حاصل اس کا یہ ہے کہ شاش دانی شاشدانی میں داخل ہو جائے اور عورت خود کو اصل سے بڑھ کر آراستہ کرتی ہے اور انسان اس سے زیادہ بری شے کا طالب ہوتا ہے''۔ عمر بن عبدالعزیزؓ فرماتے ہیں کہ: ''اے لوگو تمھیں ایک کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اگر تم اس پر ایمان نہیں رکھتے تو تم کافر ہو اور اگر اس پر ایمان تو رکھتے ہو لیکن تم نے اسے آسان سمجھ رکھا ہے اس لئے کہ تم احمق ہو۔ تمھیں برائے دوام پیدا کیا گیا ہے لیکن ایک دوسری سرائے میں لے جایا جائے گا''۔

دنیائے مذموم کی حقیقت معلوم کرنا

معلوم رہے کہ اس بارے میں ہم معرفتِ دنیا کے عنوان کے تحت ایک فصل میں بیان کر چکے ہیں اور یہاں اس قدر جان لینا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''دنیا مع اس کے جو دنیا کے اندر سے ملعون ہے۔ سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہے''۔ پس جان لینا چاہئے کہ وہ کون سی شے ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور مذموم نہیں اور جو اس کے باہر ہے وہ ملعون ہے اور اس ملعون کی دوستی ہے جو تمام گناہوں کی اصل ہے۔

معلوم رہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے تین قسم کا ہے۔ **ایک**: وہ ہے جس کا ظاہر و باطن دونوں دنیا ہی سے

ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں ہوسکتا۔ اور وہ ہیں معصیتیں جو اللہ تعالیٰ کے قصد اور نیت سے نہیں ہوتیں۔ اور مباحات میں تنعم من جملہ ان کے ہے کہ یہ محض دنیا ہے' اور غرور و غفلت کا بیج ہے اور تمام معصیتوں کا سرمایہ ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ صورتاً تو اللہ کے لئے ہے لیکن ممکن ہے کہ نیت کے اعتبار سے سراسر دنیا ہی ہو۔ وہ عدداً تین ہیں یعنی فکر' ذکر اور شہوات کی مخالفت۔ اگر یہ تینوں بہ سبب آخرت اور اللہ تعالیٰ کی دوستی کے لئے ہوں تو اگرچہ دنیا میں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ اور اگر فکر سے غرض طلبِ علم ہوتا کہ اس سے مقبولیت اور جاہ حاصل ہو اور ذکر کی غرض یہ ہو کہ لوگ اسے پارسا سمجھیں تو یہ دنیا سے ہیں اور مذموم ہیں اور ملعون' اگرچہ بظاہر یوں دکھائی دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔

قسم سوم: یہ ہے کہ جو صورتاً حظِّ نفس کے لئے ہو لیکن ممکن ہے کہ بہ قصد و نیت اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔ جیسے کھانا کہ قصد یہ ہو کہ اس سے عبادت کے لئے قوت حاصل ہوگی اور نکاح کرنا قصد اس کا اولاد ہو اور تھوڑا مال چاہنا اور نیت یہ ہو کہ طاعت کے لئے فراغت میسر آسکے اور خلق سے بے نیازی ہو۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو کوئی دنیا اس لئے طلب کرے کہ مقصود لاف و تفاخر ہو تو وہ اللہ کو اپنے بارے میں ناراض دیکھے گا۔ لیکن اگر اس لئے طلب کرے کہ خلق کا محتاج نہ ہو تو روزِ قیامت ایسے نمودار ہوگا کہ چہرہ اس کا چودھویں کے چاند کی طرح منور ہوگا''۔ پس دنیا وہ ہے جو اس وقت حظِّ نفس کے لیے اور آخرت کو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور جس کی حاجتِ آخرت کو ہے چونکہ آخرت کے لئے ہوگی۔ لہٰذا وہ دنیا نہ سمجھی جائے گی۔ جس طرح حج کے سفر میں سواریوں کا چارہ بھی زادِ راہ حج میں سے ہے۔ اور جو کچھ دنیا میں شمار ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ہوا و ہوس کا نام دیا ہے۔ فرمایا ''وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى'' (قرآن: ۷۹/۴۰'۴۱) (جو اپنے تن کو خواہشات سے روکتا ہے اس کا ٹھکانہ جنت ہے)۔ ایک دوسرے مقام پر سب کو پانچ چیزوں میں جمع کر دیا ہے: ''اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ تَفَاخُرٌ م بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ'' (قرآن: ۵۷/۲۰) (اس دنیا کی زندگی کھیل کود ہے' نازش ہے' آرایش ہے' باہم فخر کرنا ہے' اولاد میں اور سود و زیاں میں)۔ فرمایا کہ جملہ دنیا پانچ چیزوں میں ہے: کھیل ہے' نشاط ہے' اور شہوات ہیں' خود آرائی ہے اور مال و اولاد میں سبقت جوئی اور وہ چیزیں جو ان پانچوں کے ساتھ وابستہ ہیں ان سب کو ایک آیت میں جمع کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ'' (قرآن: ۳/۱۴) (لوگوں کے لئے آراستہ کر دی گئیں دوستی خواہشات کی اور لوازم کی عورتوں' اولاد اور گائے کی کھال جس

طرح جس میں سونا بھر رکھا ہو جمع کردہ زر و سیم اور داغ کردہ گھوڑے اور چار پائے اور کھیتیاں) فرمایا کہ خلق کے دل میں ان سات چیزوں کی دوستی مزیّن کر دی گئی ہے: ''بیوی' بچے' سونا' چاندی' گھوڑے' زرخیز زمین اور چوپائے۔ ''ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنیَا'' (قرآن: ۱۴/۳) (یہ ہے دنیا کی زندگی کا متاع)۔

پس جان لے کہ جو کچھ من جملہ ان کے کارِ آخرت کے لئے ہو وہ آخرت ہی ہے اور تنعم اور ضرورت سے زیادہ کوئی شے بھی آخرت کے لئے نہیں ہوگی' بلکہ دنیا تین درجوں میں منقسم ہے: روٹی' کپڑا' مکان بہ قدر ضرورت اور اس کے ماورا مقدار حاجت ہے۔ اور اس کے ماورا زینت اور تجمل ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ اس لئے جس نے ضرورت پر کفایت کی وہ نجات پا گیا اور جو درجۂ تجمل میں گیا دوزخ میں گر گیا کہ اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اور جس نے بقدرِ حاجت پر اقتصار کیا خطرے سے خالی نہیں۔ کیونکہ حاجت کی دو اطراف ہیں ایک وہ جو ضرورت کے قریب ہے جب کہ دوسری تجمل کے قریب ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان وہ درجہ ہے جسے فکر و اجتہاد سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انسان اُس زائد کو جس کی حاجت نہیں اُسے حاجت میں محسوب کرے اور قیامت کے دن حساب کے خطرے میں جا پڑے۔ اسلاف اور اہل احتیاط اسی بناء پر بہ قدر ضرورت پر قناعت کرتے تھے۔ اور اس امر میں ان کے امام اور امقتداء اویس قرنی رضی اللہ عنہ تھے کہ انھوں نے دنیا سے اس قدر کم لیا تھا کہ اُن کی قوم اسے دیوانہ سمجھتی تھی۔ اور ایک دو سال ایسے بھی گذرے تھے کہ لوگوں نے اویس کا منہ نہ دیکھا تھا۔ بانگ سحر نماز کے شروع میں باہر نکل جاتے اور عشاء کے بعد لوٹتے تھے اور کھانا ان کا کھجور کی گٹھلیاں جو وہ راہ سے چن لیتے تھے' ہوتا تھا۔ اور ان کے کھانے سے گٹھلیاں کچھ زیادہ ہوتیں تو صدقہ کر دیتے تھے۔ یا کچھ بیچ کر کھجور خریدتے جس سے روزہ کھولتے تھے۔ اور لباس ان کا خرقہ (گدڑی) تھا جو وہ گھورے سے چن کر دھو لیتے اور ان سے خرقہ تیار کر لیتے تھے۔ نادان لڑکے ان پر سنگ باری کرتے کیونکہ وہ انھیں دیوانہ سمجھتے تھے۔ تو حضرت ان سے کہتے کہ چھوٹے پتھر مارنا تا کہ میری ٹانگ نہ ٹوٹ جائے جس سے میں وضو اور نماز سے رہ جاؤں''۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود اس کے کہ آنحضرت ﷺ نے انھیں کبھی نہ دیکھا تھا لیکن اُن کی ثناء و تعریف فرماتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر کو اُویس رضی اللہ عنہ کے حق میں وصیت فرمائی تھی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہلِ عراق کو اکٹھے پایا تو آپ اس وقت منبر پر تھے۔ فرمایا کہ ''اے لوگو تم میں جو عراقی ہیں کھڑے ہو جائیں'' تو سب کھڑے ہو گئے تو دوبارہ فرمایا کہ جو قَرَن سے نہیں ہیں بیٹھ جائیں۔ تو سوائے ایک مرد کے سبھی بیٹھ گئے۔ تو آپ نے اس سے پوچھا ''کیا تم قرن سے ہو؟'' تو وہ بولا ''ہاں'' تو آپ نے اس سے کہا کہ ''اُویس قرنی کو جانتے ہو؟'' تو وہ بولا ''جانتا ہوں وہ تو اس قابل نہیں کہ آپ اس کی بات کریں۔ ہمارے ہاں اس سے زیادہ

احمق اور دیوانہ اور قلاش اور ناکس کوئی نہیں''۔ جب حضرت نے یہ سنا تو ان پر گریہ طاری ہوگیا۔ پھر فرمایا کہ میں اس کا طالب اس لئے ہوں کہ میں نے آنحضرت سے سنا ہے کہ قبایل ربیعہ اور مُضر کے افراد کی تعداد کے برابر لوگ اُویس رضی اللہ عنہ کی شفاعت پر بہشت میں داخل ہوں گے'' اور یہ دو قبیلے وہ تھے کہ جن کے افراد اس قدر کثیر تھے کہ گنتی مشکل تھی۔

ہرم حیّان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ''جب میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بات سنی تو میں اُویس کی تلاش میں کوفہ گیا۔ میں نے انھیں ڈھونڈا حتی کہ وہ مل گئے۔ وہ دریائے فرات کے کنارے وضو کررہے تھے اور لباس دھو رہے تھے۔ میں نے ان صفات کی بناء پر جو مذکور ہوئیں انھیں پہچان لیا۔ میں نے سلام کیا تو آپ نے میری طرف دیکھا۔ میں نے چاہا کہ ان کا ہاتھ تھام لوں لیکن انھوں نے ہاتھ نہ بڑھایا۔ تو میں نے کہا: ''رحمك الله یا اُویس وغفرلك''[(۱)] آپ کیسے ہیں؟'' ساتھ ہی مجھ پر گریہ اس کی دوستی کے سبب طاری ہوگیا۔ اس بناء پر بھی کہ مجھے اس کے ضعیف حال پر رحم آیا۔ اویس بھی رونے لگے اور فرمایا کہ: ''حیاك الله یا ھرم بن حیّان''[(۲)]۔ کہو میرے بھائی آپ کیسے ہیں؟'' تمھیں میری طرف راہ کس نے دکھائی؟'' تو میں نے کہا آپ کو میرے نام اور میرے باپ کے نام کا پتہ کیسے چلا اور مجھے کیسے پہچانا کیونکہ آپ کبھی مجھے ملے نہ تھے؟'' تو فرمایا کہ: ''نَبَّانِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْر'' وہ جس کے علم وخبر سے کوئی شے پوشیدہ نہیں ہے اس نے مجھے بتایا ہے اور میری روح نے تمھاری روح کو پہچان لیا ہے۔ مومنوں کی روحوں کو ایک دوسرے کا علم ہوتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے ایک دوسرے کو نہ دیکھا ہو''۔ تو میں نے کہا کہ مجھے آنحضرت ﷺ کی کوئی حدیث سناؤ جو میرے لئے یادگار ہو۔ تو بولے کہ ''میرے جان وتن آنحضرت ﷺ پر قربان میں نے انھیں دیکھا نہیں اور ان کی احادیث اوروں سے سنی ہیں۔ اس لئے نہیں چاہتا کہ روایت حدیث کی راہ خود پر کشادہ کروں اور نہیں چاہتا کہ میں محدث، مفتی یا مذکر قرار پاؤں۔ اور میرے معمولات اجازت نہیں دیتے کہ میں اس کام میں لگوں؛ میں نے کہا کہ قرآن میں سے کوئی آیت تلاوت فرمایئے کہ میں سنوں اور میرے لئے دعا فرمایئے اور نصیحت فرمایئے تاکہ میں اس پر عمل کروں کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے تمھیں بے حد دوست رکھتا ہوں۔ پھر انھوں نے ساحلِ فرات پر میرا ہاتھ تھاما اور فرمایا ''اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم'' اور ساتھ ہی گریہ طاری ہوگیا۔ پھر فرمایا کہ یوں فرماتے ہیں میرے اللہ تعالیٰ کہ حق ترین اور راست ترین بات اللہ ہی کی ہے جو فرماتے ہیں: ''مَا خَلَقْتُ الْجِن و لانس

---

(۱) اللہ تجھ پر رحم فرمائے اور تجھے بخشے۔

(۲) اے ہرم بن حیان اللہ تجھے سلامت رکھے۔

الا لیعبدون ''اور فرمایا کہ: ''وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ مَا خَلَقْنَا هُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ''اور ''اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْم '' تک پڑھا۔ پھر ایسی چیخ ماری کہ بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آئے تو فرمایا کہ ''اے حیّان کے بیٹے! تیرا باپ حیّان مر گیا اور تو بھی مر جائے گا۔ تو یا بہشت میں جائے گا یا دوزخ میں۔ تیرا باپ آدم مر گیا تیری ماں حوا بھی مر گئی۔ نوح علیہ السلام مر گیا' ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام بھی مر گیا' موسیٰ کلیم اللہ بھی مر گیا اور داؤد خلیفۂ خدا بھی مر گیا۔ اور محمد ﷺ حبیب اللہ بھی مر گئے صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ اور ان کا خلیفہ ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی مر گیا اور عمر رضی اللہ عنہ میرا بھائی بھی مر گیا' واعمراہ واعمراہ' تو میں نے کہا احمك الله کہ عمر تو نہیں مرا تو اویس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مرگِ عمر رضی اللہ عنہ کی خبر دی ہے''۔ جب یہ کہا تو بولے کہ میں اور تم بھی مرنے والوں میں سے ہیں۔ پھر رسول ﷺ پر درود پڑھا اور مختصر سی دعا فرمائی اور کہا کہ نصیحت یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اہلِ صلاح کا طریق پیش نظر رکھو اور ایک لحہ بھی اپنی موت کی یاد سے غافل نہ ہونا۔ جب تم اپنی قوم میں پہنچو تو انھیں پند دنیا اور خلقِ خدا سے نصیحت کرتے رہنا۔ اور ایک قدم بھی سنت و جماعت کی موافقت سے پیچھے نہ ہٹانا۔ ورنہ بے دین ہو جاؤ گے اور دوزخ میں جا پڑو گے۔ چند دعائیں کیں اور فرمایا اے ہرم بن حیان اب تو مجھے دیکھے گا نہ میں تمھیں دیکھوں گا۔ مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا میں بھی تمھیں دعاؤں میں یاد رکھوں گا۔ تم اِس طرف کو جاؤ میں اُس طرف کو جاتا ہوں۔ میں نے چاہا کہ کسی قدر اُن کے ہمراہ جاؤں لیکن اجازت نہ دی' رونے لگے اور مجھے بھی رونا آ گیا۔ یہاں تک کہ اُویس کوفے کے ایک کوچے میں داخل ہو گئے اور از اں بعد مجھے ان کی کوئی خبر نہیں ملی''۔ پس وہ جنھوں نے آفاتِ دنیا کو پہچانا تھا ان کی سیرت ایسی ہی تھی۔ انبیاء و اولیاء کی راہ یہی ہے اور ہرم کے آقا وہی ہیں۔ اگر تو اس درجے کو نہیں پہنچتا تو اس سے کم تر نہیں کہ بقدر ضرورت پر ہو کفایت کرے اور کبھی طریق تنعم کی راہ نہ لینا کہ عظیم خطر میں پڑ جاؤ۔

حکمِ دنیا کے بارے میں اسی قدر کافی ہے۔ باقی ہم عنوانِ مسلمانی کے تحت بیان کر چکے ہیں''۔

اصلِ ششم: مال جمع کرنے کی حرص اور بخل کا علاج

معلوم رہے کہ دنیا کی شاخیں بہت سی ہیں۔ اس کی شاخوں میں سے ایک مال و نعمت ہے۔ ایک جاہ و حشمت ہے اور ایسی ہی اور شاخیں بھی ہیں۔ لیکن فتنہ مال عظیم ہے۔ اور عظیم تر فتنہ وہ ہے جسے خدائے تعالیٰ نے عقبہ (گھائی) نام دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ: ''فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ (قرآن: ۹۰، ۱۱تا۱۴) (نیز اپنے آپ کو عقبہ میں نہیں گرایا ہے اور تجھے کیا خبر کہ عقبہ کیا

ہے؟ اس عقبہ سے نجات کا ذریعہ غلام آزاد کرنا ہے یا اس دن کھانا دینا ہے جب تو خود بھوکا ہو) اور کوئی گھاٹی اس لیے بڑی نہیں۔ کیونکہ کھانے کپڑے اور مکان سے چارہ نہیں۔ اور یہ عین مال ہے۔ جو مال ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے پس اس کے نہ ملنے پر صبر نہیں ہوتا اور مل جائے تو سلامتی معرض خطر میں ہوتی ہے۔ اگر مال نہ ہو تو افلاس ہوگا جس سے کفر کا خوف ہے اور اگر مال ہو تو دولتمندی ہوگی جس سے غرور اور تکبر کا خطرہ ہے اور افلاس کی دو حالتیں ہوتی ہیں: ایک حرص تو دوسری قناعت۔ اور قناعت پسندیدہ ہے۔ اسی طرح حریص کی بھی دو حالتیں ہیں: ایک لوگوں سے طمع تو دوسرے اپنے ہاتھ کی کمائی، اور ہاتھ کی کمائی پسندیدہ ہے اور دولت مند کی بھی دو حالتیں ہوتی ہیں ایک بخل وامساک تو دوسری سخاوت اور دوسروں کو عطا۔ اور دینے والے کی بھی دو حالتیں ہیں ایک فضول خرچی تو دوسری میانہ روی۔ اور ان دونوں حالتوں میں ایک (یعنی اسراف) مذموم ہے اور دوسری یعنی میانہ روی متشابہ ہے۔ او پہچان اس کی مشکل کام ہے۔ مختصر یہ کہ مال فوائد نیز آفات سے خالی نہیں اور دونوں کی شناخت کرنا فرض ہے۔ تا کہ مال کی آفات سے دور رہا جا سکے اور طلب اس کی بقدر کفایت کی جائے۔

مال دوستی کی کراہت معلوم کرنا:

فرمانِ حق تعالیٰ ہے کہ "یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ" (قرآن: ۹/۶۳) (اے ایمان والو! اپنے مال اور اولاد کو ذکر سے غافل سے نہ کرنا اور جس نے یہ کیا وہ خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگا) "جو کوئی اپنے مال او فرزند کو ذکرِ حق تعالیٰ سے غافل کرے دے گا وہ خسارہ اٹھانے والوں اور نقصان پانے والوں میں سے ہے"۔ آنحضرت فرماتے ہیں کہ: "مال و جاہ کی محبت نفاق کو دل میں یوں جنم دیتی ہے جیسے پانی سبزی کی نمو میں عمل کرتا ہے" نیز فرمایا کہ "دو بھوکے بھیڑیے بھیڑ بکری کے گلے میں وہ تباہی نہیں مچاتے جو حُبِ مال و جاہ مردِ مسلمان کے دین میں تباہی کرتا ہے" تو لوگوں نے آنحضرت سے پوچھا کہ "اے اللہ کے رسول ﷺ! امت میں بدترین کون ہے؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "دولت مند" اور فرمایا کہ میرے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو طرح طرح کے اچھے کھانے کھائیں گے اور رنگا رنگ لباس پہنیں گے۔ بیویاں ان کی خوب صورت ہوں گی۔ گرانمایہ گھوڑوں کے مالک ہوں گے۔ پیٹ ان کا تھوڑے کھانے سے سیر نہ ہوگا اور کثیر پر بھی صبر نہ کریں گے اور ان کا تمام وقت دنیا کے لیے وقف ہوگا۔ انہوں نے دنیا یہ کو اپنا خدا بنا لیا ہوگا۔ جو کچھ بھی کریں گے دنیا ہی کے لیے کریں گے۔ مجھ محمد کا حکم واجب یہ ہے کہ تمھاری اولاد کی اولاد جو انہیں پائے ان دولت مندوں کو سلام نہ کہے۔ اُن کے بیمار پُرسی نہ کرے اور ان کے جنازے کے ساتھ بھی نہ جائے۔ اور دولت مندوں کے بزرگوں کا

احترام بھی نہ کرے اور جو کرے گا وہ گویا ان کا معاون متصور ہوگا دینِ اسلام کی ویرانی میں۔ نیز آپ نے فرمایا کہ ''دنیا کو اہل دنیا کے لیے چھوڑ دو۔ جو کوئی دنیا سے بقدر کفایت سے بڑھ کر کوئی چیز لے گا وہ اپنی ہلاکت کا مرتکب ہوگا'' نیز فرمایا کہ: ''سب لوگ میرا مال' میرا مال کہتے ہیں لیکن تمہارا مال وہی ہے جو تم نے کھا کر تمام کر دیا یا پہن کر پرانا کر دیا یا صدقہ دے کر اس کو دوام دے دیا'' ایک شخص نے آنحضرت سے سوال کیا کہ ''کیا وجہ ہے کہ میرے پاس موت کا کوئی سامان نہیں'' آپ ﷺ نے فرمایا ''کیا تمھارے پاس مال ہے؟'' تو اس شخص نے جواب دیا ''ہاں ہے'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اسے پیشگی ارسال کر دو'' یعنی صدقہ میں دے دو۔ کیونکہ لوگوں کا دل مال کے ساتھ رہتا ہے اگر اسے چھوڑ دے تو جی چاہتا ہے اس کے ساتھ دنیا ہی میں رہے اور اگر آگے بھیج دے تو وہ مرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''انسان کے دوست تین ہیں۔ ایک وہ جو اس کے ساتھ تا دم مرگ وفا کرتا ہے اور ایک قبر کے کنارے تک اور ایک تا بہ قیامت اسی کا مونس ہوتا ہے۔ وہ جو موت سے آگے وفا نہیں کرتا وہ مال ہے اور وہ جو اس کے ساتھ جاتے ہیں اہل قرابت ہوتے ہیں اور وہ جو قیامت میں اس کے ساتھ ہو وہ اس کا عمل ہے'' نیز فرمایا کہ ''جب آدمی مر جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس نے پیچھے کیا چھوڑا؟ اور فرشتے کہتے ہیں کہ اس نے آگے کیا بھیجا؟'' نیز فرمایا کہ ''غلہ خیز زمین فراہم نہ کرنا کیونکہ پھر تم دنیا کو اپنا دوست بناؤ گے''

حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ سے عرض کیا: ''سبب کیا ہے کہ آپ تو پانی کے اوپر چل سکتے ہیں اور ہم لوگ نہیں چل سکتے؟'' تو آپ نے فرمایا ''زر و سیم کی قدر تمھارے دل میں کیسی ہے؟'' تو وہ بولے ''خوب ہے'' تو آپ نے فرمایا ''میرے نزدیک مٹی کے برابر ہے''

آثار میں ہے کہ ایک شخص نے ابو دردا رضی اللہ عنہ کو رنج پہنچایا تو ابو دردا نے یہ دعا فرمایا کہ: ''بار خدایا تو اس شخص کو تندرستی اور عمر دراز اور مال کپڑے سے بہرہ ور فرما'' اور آپ نے یہ بدترین دعا سمجھی کیونکہ جس کسی کو یہ نعمتیں ملیں لازماً غفلت اور تکبر نے اسے آخرت سے غافل کر دیا۔ اور وہ مارا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک درم کو ہتھیلی پر رکھا اور کہا: ''تو وہ ہے کہ جب تک میرے ہاتھ سے نکل نہ جائے مجھے فائدہ نہ دے گا'' حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ: ''خدا کی قسم کہ جس شخص نے زر و سیم کو عزیز نہیں رکھا اللہ تعالیٰ نے اس کو کبھی ذلیل نہیں کیا'' آثار میں ہے کہ جب سونے چاندی کے سکے وجود میں آئے تو لوگ ابلیس کے حضور لے گئے تو ابلیس نے سکے لے کر آنکھوں پر رکھے اور انہیں بوسہ دیا اور بولا ''خدا کی قسم جو تجھے عزیز رکھتا ہے وہ میرا دوست ہے''

یحییٰ معاذؒ فرماتے ہیں کہ ''درم و دینار بچھو ہیں تو انہیں اس وقت تک ہاتھ نہ لگانا جب تک ان کا افسون

نہ سیکھ لے ورنہ ان کا زہر تمھیں ہلاک کر دے گا''۔ لوگوں نے سوال کیا ''ان کا افسوں کیا ہے؟'' تو آپ نے فرمایا کہ: ''ان کی آمد حلال ہو اور خرچ بحق ہو'' مسلمہ بن عبدالملک' عمر بن عبدالعزیز کے پاس ان کی وفات کے وقت گئے تو فرمایا کہ: ''اے امیر المومنین! تم نے وہ کام کیا جو کسی اور نے نہیں کیا۔ تیرے تیرہ ۱۳ فرزند ہیں لیکن تو نے ان کے لیے کوئی درم و دینار ورثے میں نہیں چھوڑے'' تو آپ نے فرمایا کہ ''مجھے سہارا دے کر بٹھاؤ'' تو لوگوں نے انہیں سہارا دے کر بٹھا دیا تو فرمایا کہ: ''میں نے اپنی اولاد کا کوئی ملک دوسروں کو دیا نہ دوسروں کا کوئی ملک اولاد کو دیا اور اولاد میری شائستہ ہوگی یا ناشائستہ۔ جو شائستہ ہوگی اور اللہ کی فرمانبردار ہوگی خدا اس کے لیے کافی ہے۔ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (قرآن: ۱۹۶/۷) (وہی ہے نیکوں کا کارپذیر اور کارساز) اور جو ناشائستہ ہوگی وہ جس حالت سے بھی دوچار ہوگی مجھے اس کا غم نہیں''

محمد بن کعب القرظیؒ کو کثیر مال ملا تو لوگوں نے کہا کہ اپنی اولاد کے لیے رکھ لو تو فرمایا کہ ''نہیں میں اسے اپنے لیے خدا تعالیٰ کے پاس رکھ دیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کو اولاد کے لیے رکھ دیتا ہوں تا کہ اُن سے حسن سلوک فرمائے'' یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں کہ: مال دار کے لیے بوقتِ مرگ دو مصیبتیں ایسی ہیں کہ کسی اور کو ان کا سامنا نہیں ہوتا وہ یہ کہ مال تماماً اس سے لے لیا جاتا ہے۔ اور وہ خود اس مال کے لیے پکڑا جاتا ہے اور اس سے اس کا حساب لیا جاتا ہے'' فصل (مال کی ستائش کی راہ) معلوم رہے کہ ہر چند مال بوجوہ ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے لیکن ایک وجہ سے قابل ستائش بھی ہے۔ کیونکہ اس میں شر بھی ہوتا ہے اور خیر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے خیر کہا ہے اور قرآن میں فرمایا ہے کہ: ''اِنْ تَرَكَ خَيْرًا نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ'' (قرآن ۱۸۰/۲) (تم پر لکھ لیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی پر موت آئے) اگر کچھ ترکہ ہو تو ماں باپ اور خویش و اقارب کے لیے وصیت نیکی کے طور پر لکھ لینا پرہیزگاروں کے لیے شائستہ ہے) آنحضرت نے فرمایا ہے کہ ''کادا الفقران یکون کفراً'' یعنی خطرہ یہ ہے کہ افلاس انسان کو کفر تک کھینچ لے جائے''۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جب کوئی درماندہ ہو جائے اور ایک روٹی کا محتاج ہو اور اس میں جان کھوئے اور اپنے اہل و عیال کو اندوہ میں دیکھے۔ اور دنیا میں بے شمار نعمتیں بھی نظر آئیں تو شیطان اسے کہتا ہے کہ: ''یہ کیسا عدل ہے؟ یہ کیسا انصاف ہے؟ جو تُو خدائے تعالیٰ کی طرف سے دیکھ رہا ہے اور یہ کیسی نامساوی قسمت ہے جو اللہ نے لوگوں میں بانٹی ہے؟ کہ فاسق اور ظالم کو تو اس قدر نوازا ہے کہ اسے خود اپنے بے حساب مال کا اندازہ نہیں اور خدا نہیں دیکھتا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ دوسری طرف ایک بے نوا کو بھوک سے ہلاک کر رہا ہے اور اسے ایک درم تک نہیں دیتا۔ اگر وہ تیری ضرورت سے بے خبر ہے تو گویا اس کے علم میں خلل ہے۔ لیکن اگر

جانتا ہے اور نہیں دیتا یا دے سکتا ہے تو اس کی قدرت میں خلل ہے۔ لیکن اگر جانتا ہے اور دے بھی سکتا ہے لیکن نہیں دیتا تو اس کی سخاوت و رحمت میں خلل ہے اور اگر اس لئے نہیں دیتا کہ آخرت میں ثواب دے۔ وہ ثواب بے رنج و بھوک کے بھی دے دسکتا ہے تو دیتا کیوں نہیں۔ اور اگر نہیں دے سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کاملاً قادر نہیں'' بااینہمہ یہ اعتقاد رکھنا کہ خدا رحیم ہے۔ سخی ہے۔ کریم ہے اور تمام دنیا کو تکلیف میں رکھتا ہے اور خزانہ اس کا نعمتوں سے پُر ہے اور نہیں دیتا تو یہ دشوار ہوگا''۔ شیطان کو وسوسہ ڈالنے کا موقع مل جائے گا اور تقدیر کا مسئلہ جسے اللہ تعالیٰ نے سب سے پوشیدہ رکھا ہے اس نادار کے سامنے رکھے گا۔ تا کہ نادار پر خشم غالب آجائے اور وہ فلک کو اور زمانے کو گالی دینے لگے گا اور کہے گا کہ: ''فلک بے عقل ہوگیا ہے اور زمانہ الٹ گیا ہے اور نعمت تمام غیر مستحقوں کو اور ناکسوں کو دیتا ہے'' تو ایسے میں اگر اسے کہیں کہ ''بھائی فلک اور زمانہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں مسخر ہیں'' تو اگر کہے کہ ''نہیں'' تو کافر ٹھہرا اور اگر کہے کہ ''ہاں'' ''مسخر ہیں'' تو اس طرح اس نے اللہ تعالیٰ پر جفا کا الزام لگایا اور یہ بھی کفر ہے۔ اسی بناء پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''لا تسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر'' دہر کو سب و شتم نہ کرو کہ دھر خدا تعالیٰ ہیں۔ یعنی جس کو تم کار مختار سمجھتے ہو اور اُسے دھر کے نام سے موسوم کرتے ہو وہ خود اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

پس افلاس سے کفر کی بُو آتی ہے۔ ماسوائے اس کے جس کا ایمان اس بارے میں قوی ہو کہ اللہ تعالیٰ افلاس میں راضی ہیں اور وہ جانتا ہے کہ خیر اس کی اسی میں ہے کہ مفلس رہے۔ لیکن چونکہ اکثر لوگ اسی خوبی فکر کے مالک نہیں ہوتے تو ان کے لیے اولیٰ تر یہ ہے کہ بہ قدرِ کفایتِ اسبابِ زیست رکھتے ہوں پس مال اسی بناء پر لائق ستائش بھی ہے۔

اور ایک دوسری وجہ یہ کہ سب سمجھدار اصحاب کا مقصود آخرت ہے جس تک رسائی بدون تین قسم کی نعمت کے ممکن نہیں۔ ایک انسان کے نفس سے متعلق ہے جیسے علم اور خوشخوئی۔ دوسری بدن سے متعلق ہے اور وہ ہے تندرستی اور سلامتی اور ایک جسم سے باہر ہے اور وہ ہے دنیا بہ قدرِ کفایت اور بیرون جسم جو ادنیٰ ترین ہے وہ ہے مال اور مال کی ادنیٰ صورت سونا چاندی ہے کہ ان کی ذات میں کوئی کوئی منفعت نہیں لیکن زر و سیم روٹی کپڑے کے حصوں کا ذریعہ ہیں اور روٹی کپڑا بدن کے لیے ہوتا ہے اور بدن حواس کا باربردار ہے اور حواس عقل کا دام ہیں۔ اور عقل نورِ دل کا چراغ ہے تا کہ انسان حضرتِ الٰہیت کو دیکھے اور اس کی معرفت حاصل کرے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت سعادت کی جڑ ہے۔ پس ان سب کی غرض و غایت خدائے تعالیٰ ہے۔ وہی اول اور وہی آخر۔ اور یہ مذکورہ ذرائع اس کی جانب راستے ہیں۔ جس نے اس راز کو پالیا اور دنیا سے فقط اس قدر مال لیا جو آخرت کے

لیے زادِ راہ ہو اور اس سے زیادہ کو زہر قاتل جانتا ہو تو مال اس کا شائستہ ہو گا اور شائستہ مرد کے لیے شائستہ قرار پائے گا۔ اسی بناء پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ "اے اللہ آلِ محمد ﷺ کو روزی بقدر کفایت عطا فرما" کیونکہ آپ جانتے تھے کہ جو کچھ بھی بہ قدر کفایت سے زیادہ ہو گا باعث ہلاکت ہے اور جو کفایت سے تھوڑا ہو اس سے کفر کی بُو آتی ہے تو یہ صورت بھی ہلاکت کا باعث ہو گی۔ پس جس نے یہ جان لیا وہ کبھی مال کو عزیز نہ رکھے گا۔ اور جو کوئی ایک چیز کسی اور غرض کے لیے طلب کرے گا اور اس غرض کو دوست رکھتا ہے نہ کہ اس چیز کو۔ پس جو کوئی مال کو خود مال ہی کے لیے دوست رکھتا ہے۔ تو وہ منکوس (واژگونہ) و معکوس ہے اور وہ مال کی حقیقت سے نا آشنا ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: لعن عبدالدنیاء و لعن عبدالدرھم "یعنی نگونسار (سر افگندہ) ہے بندہ دنیا و نگونسار ہے بندۂ درہم۔ کیونکہ جو کوئی کسی چیز کی فکر میں رہتا ہے وہی چیز اس شخص کی خداوند ہوتی ہے۔ اور جو کوئی کسی شے کی طاعت میں ہوتا ہے وہی شے اس کی خداوند ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی لیے فرمایا ہے کہ: "و اجبنی و بنی ان نعبد الاصنام" (قرآن ۳۵/۱۴) (مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائیو) بزرگ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم نے ان بتوں سے زر و سیم مراد رکھی تھی۔ کیونکہ زیادہ تر مخلوق کا بت زر و سیم ہی ہے۔ کہ انہی کی طرف مائل ہیں۔ کیونکہ پیغمبروں کا منصب اس سے کہیں بلند تر ہے کہ وہ بت پرستی کا خوف رکھتے ہوں۔ والسلام۔

مال کے فوائد اور نقصانات کی تفصیل

یاد رہے کہ مال سانپ کی مانند ہے جس میں زہر بھی ہوتا ہے اور تریاق بھی۔ اگر ہم زہر کو تریاق سے الگ نہیں کر سکتے تو اس کی حقیقت اور علم آشکار نہ ہو سکے گا۔ پس ہم اس کے فوائد اور اس کی آفات کو ایک ایک کر کے بہ تفصیل بیان کرتے ہیں: مال کے فوائد دو قسم کے ہیں۔ ایک دنیوی تو دوسرے دینی فوائد:

قسم اول: یعنی دنیوی فوائد جن کی تفصیل کی حاجت نہیں کہ ان سے ہر کوئی آگاہ ہے۔

قسم دوم: دینی فوائد جو تین نوع کے ہیں:

نوع اول: یہ ہے کہ انسان عبادت میں خود پر صرف کرے یا عبادت کے تدارک پر صرف کرے۔ عبادت مثلاً حج اور جہاد کہ مال انسان اپنے لیے صرف کرے تو یہ عین عبادت ہے۔ اور جو کچھ عبادت کے تدارک کے لیے درکار ہے جیسے روٹی کپڑا بہ قدر کفایت کیونکہ اس سے جملہ عبادتوں کے لیے قوت اور فراغت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ جس شے کے بغیر عبادت ممکن نہیں وہ شے عین عبادت ہے۔ کیونکہ جس کو یہ بقدر کفایت میسر نہ ہو وہ سارا دن دل و جان کے ساتھ اسے بقدر کفایت حاصل کرنے کے لیے لگا رہتا ہے۔ اور عبادت کہ

جس کا لب لباب ذکر وفکر ہے اس سے انسان محروم رہتا ہے۔ پس جب بقدرِ کفایت عبادت کے لیے ہو تو مال عین عبادت ہوگا۔ اور دینی فوائد میں سے ہوگا۔ اور سراسر دنیا کے لیے نہ ہوگا۔ اور یہ نیت اور اندیشہ دل کی رو سے متفاوت ہوتا ہے۔ قبلہ دل کیا ہے یہ معلوم ہو تو حقیقت معلوم ہو۔ اگر قبلہ دل فراغت اور راہ آخرت کو اختیار کرتا ہو تو بقدر کفایت زادِ راہ ہوگا۔ اور راہِ اور وسیلہ کا ایک جزو ہوگا۔

شیخ ابوالقاسم گورگانیؒ کی ایک حلال زرعی زمین تھی جس سے بقدر کفایت آمد ہوتی تھی۔ ایک دن اس زمین کا غلہ آیا ہوا تھا۔ میں نے خواجہ ابوعلی فارندی سے سنا کہ: شیخ نے اس میں سے اک لپ غلہ لیا اور فرمایا کہ: ''میں اسے تمام متوکلوں کے توکل کے بدلے نہ دوں گا۔'' یہ حقیقت وہی جان سکتا ہے جو دل کی نگہبانی میں مشغول ہو کہ جان سکے کہ کفایت سے حاصل شدہ فراغت راہِ آخرت میں چلنے میں کتنی معاون ہوتی ہے۔''

نوعِ دوم: وہ ہے کہ جو انسان اور وں کو دیتا ہے۔ اس کی آگے چار قسمیں ہیں:

قسم اول: صدقہ ہے۔ ثواب اس کا اور دریشوں کی دعا کی برکات اور ان کی صحت اور ان کی خوشنودی کا اثر دین و دنیا میں عظیم ہوتا ہے۔ اور جس کے پاس مال نہ ہو ظاہر ہے وہ ان برکات سے بہرہ ور نہیں ہو پاتا۔

قسم دوم: مروت ہے کہ صاحب مال اپنے بھائیوں کی میزبانی کے اگر چہ وہ بھائی دولت مند ہوں۔ نیکی کرے، تحفہ دے مواسات کرے اور لوگوں کا حق ادا کرنے پر کمر بستہ رہے اور معاشرے میں معروف رسمیں ادا کرے۔ یہ اگر چہ دولت مندوں کے ساتھ ہوں قابل ستائش ہیں۔ سخاوت کی صفت اس طرح حاصل ہوتی ہے۔ اور سخاوت بزرگ ترینِ اخلاق ہے چنانچہ اس کی مدح بیان ہوگی۔

قسم سوم: یہ ہے کہ صاحب مال، مال کے ذریعے اپنی آبرو قائم رکھتا ہے۔ جیسے کہ کسی شاعر کو دے، اور خادموں کو دے اور وہ لوگ جو اس کی طمع رکھتے ہوں تو اگر نہ دے تو زبان درازی کریں گے۔ اور غیبت کریں گے اور فحش گوئی کریں گے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''انسان جس شے سے اپنی آبرو بدگویوں کی زبان سے بچالے گا وہ صدقہ متصوّر ہوگی۔ کیونکہ عطا کرنے کی وجہ سے فحش گوئی اور غیبت کی راہ ان پر بند رہے گی اور خود صاحب مال دل مشغولی کی آفت سے خود کو بچالے گا۔ کیونکہ اگر عطا نہ کرے گا تو ممکن ہے کہ وہ خود بھی بدلہ لینے پر اتر آئے اس طرح عداوت بڑھ جائے گی اور ظاہر ہے کہ عطا بغیر مال کے ممکن نہیں۔

قسم چہارم: یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو مال دے جو صاحب مال کی خدمت کرتے ہوں۔ کیونکہ اگر کوئی اپنے سب کام اپنے ہی ہاتھ سے سرانجام دے گا تو جیسے کہ گھر کی صفائی، کھانا پکانا، خریدنا وغیرہ ہیں یہ سب کام اس کا سارا وقت تمام کردیں گے اور فرضِ عین وہ عبادت ہے کہ جو ہر کوئی خود ادا کرے اور جسے دوسرا ادا نہیں

کرسکتا، جیسے کہ ذکر وفکر ہیں۔اور جن امور میں نیابت کی اجازت ہے تو ان میں وقت صرف کرنا افسوس ناک ہوگا۔ کیونکہ زندگی مختصر ہے اور موت قریب ہے اور آخرت کے سفر کی راہ طویل اور زادِ راہ آخرت کثیر ہے اور ہر سانس عظیم غنیمت ہے۔تو انسان کو ایسے ہر کام سے بچنا چاہیے جن سے گریز ممکن ہو اور یہ صورت مال کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی کہ جسے وہ خادموں کو فراہم کرے تا کہ مصروفیتوں کے اس رنج سے اسے محفوظ رکھیں۔کام بہ نفس خود انجام دینا باعث ثواب ہے۔لیکن یہ کام اس کا ہے کہ جس کا درجہ یہ ہے کہ جس کی طاعت بدنی ہو نہ کہ دلی۔لیکن وہ شخص جو بہ طریق علم وفکر اہل معاملتِ دل ہو تو اس کا کام دوسروں کو انجام دینا چاہیے۔تا کہ وہ خدمت خادم کی عبادت ہو۔اور وہ صاحبِ علم وفکر کے لیے فراغت کا ذریعہ ہو ایسے کام کے لیے جو جسمانی اعمال سے زیادہ عزیز ہو۔

نوعِ سوم: یہ ہے کہ کسی کو معین نہ دے لیکن خیرات عام کے لیے دے جیسے کہ پُل، سرائے، مسجد، ہسپتال یا درویشوں کے لیے وقف وغیرہ کے لیے دے۔یہ رفاہِ عام ہوگی اور طویل مدت تک باقی رہے گی۔جس کی دعا اور برکات معطی کے مرنے کے بعد اسے پہنچتی رہیں گی اور ایسے کام روپے پیسے کے بغیر ممکن نہیں۔تو یہ ہیں دین میں مال کے فوائد۔دنیا میں مال کے فوائد کسی سے مخفی نہیں۔کہ انسان مال کے ذریعے عزیز اور مکرم ہوتا ہے۔خلق سے بے نیاز ہوتا ہے جب کہ خلق اس کی حاجت مند ہوتی ہے اور مال کے ذریعے دوست اور بھائی حاصل کیے جاسکتے ہیں اور صاحب مال عوام کے دلوں میں محبوب ہوتا ہے اور لوگ اسے حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے وغیرہ۔

آفاتِ مال کہ بعضی دنیوی ہیں تو بعضی دینی

دینی آفات تین قسم کی ہیں:

نوعِ اول: یہ کہ مال فسق وفجور کی راہ کو آسان بنا دیا ہے اور شہوات انسان کے باطن میں خود معاصی کی مقتضی ہوتی ہیں لیکن عجز (مال سے) عصمت کے اسباب میں سے ایک ہے جب قدرت حاصل ہوجاتی ہے تو اگر انسان معصیت میں گرفتار ہوجائے تو ہلاک ہوجائے گا۔اور اگر صبر کرے گا تو مصیبت میں پڑ جائے گا۔اور قدرت کے ہوتے ساتے صبر اور بھی مشکل ہوجاتا ہے۔

نوعِ دوم: یہ ہے کہ انسان دین میں قوی ہو اور خود کو معصیت سے بچائے رکھے۔تنعم کی صورت میں خود کو مباحات سے بچا نہ پائے گا اور کس کی یہ مجال کہ باہمہ دولت مندی جَو کی روٹی کھائے اور موٹا جھوٹا پہنے جیسے کہ حضرت سلیمانؑ اپنی بادشاہی میں عمل فرماتے تھے۔جب کوئی تنعم میں لگ جاتا ہے تو جسم اس کا اس کے

سامنے سروقد کھڑا ہو جاتا ہے تو باوجود اس عادت کے انسان صبر نہیں کر سکتا اور دنیا اُس کے لیے بہشت بن جاتی ہے اور وہ موت سے نفور ہوتا ہے۔ اور انسان اسباب تنعم ہر وقت حلال ذرائع سے حاصل نہیں کر سکتا تو مشتبہ کی طرف بھی ہاتھ بڑھانے لگتا ہے جیسے سلاطین کی قوت کے بغیر حاصل نہیں کر سکتا۔ تو سلاطین کی خدمت میں مداہنت' ریا اور دروغ وغیرہ کا ارتکاب کرنے لگتا ہے۔ اور جب ان کے نزدیک ہوتا ہے تو سلاطین کے خطرِ نیت اور کراہیّت کا ہدف ہوتا ہے اور جب وہ شاہ کا مقرب ہو جاتا ہے تو دوسرے اس سے حسد کرنے لگتے ہیں اور دشمن اس کے وجود میں آتے ہیں۔ جو اس کو ہدف بنا دیتے ہیں اور اسے ستاتے ہیں تو محسود بھی بدلہ لینے کے لیے عداوت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ نتیجے میں منافسہ اور محاسدہ وجود میں آتا ہے او یہ اخلاق جملہ معصیتوں کا باعث بن جاتے ہیں۔ انہی سے دروغ' غیبت اور خلق کی بدخواہی اور جملہ معاصی دل و زبان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور دوستی دنیا کہ جملہ معاصی کا منبع ہے کے یہی معنی ہیں۔ کیونکہ یہ سب اسی کے برگ و بار ہیں اور یہ ایک آفت نہیں نہ دس نہ سو ۱۰۰ بلکہ ان آفات کو گننا دشوار ہے' بلکہ ہاویہ ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ چنانچہ ہاویہ دوزخ انہی کے لیے آمادہ ہے۔

نوعِ سوم: اور کوئی اس سے بچ نہیں سکتا الا من عصمة الله۔ وہ جو اگرچہ معصیت نہ کرے اور عیش وعشرت نہ کرے اور شبہات سے دور رہے اور پارسائی راہ کو درحقیقت ملحوظ رکھے۔ تاکہ حلال ذرائع سے لے اور بجق دے لیکن مال کی نگہداشت میں دل تو مصروف رہے گا۔ تو یہ دل مشغولی اسے خدا تعالیٰ کے ذکر سے اور اس کے جلال و عظمت کے فکر سے باز رکھے گی اور جملہ عبادات کا لب لباب یہ ہے کہ ذکر حق تعالیٰ انسان پر غالب رہے۔ تاکہ انس ذاتِ حق سے کامل ہو جائے۔ جس کے ذریعے سے انسان ہر شے سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ اور یہ حالت فارغ دل کی مقتضی ہے کہ کسی بھی اور شے میں مشغول نہ ہو۔ اور مال دار شخص غلہ خیز زمین کا مالک ہے تو اس کے بیشتر اوقات اسی کی تعمیر' شرکاء کی خصوت حکومت کے خراج اور کسانوں کے حساب اور انہی کے احاطہ کی نذر ہو جائیں گے۔ اور اگر صاحب مال تاجر ہو تو شریک کار کے ساتھ حضومت' اس کی تقصیر و تدبیر اور سفر کرنے اور ایسے معاملات کی طلب جس سے نفع زیادہ ہو وغیرہ میں مشغول رہنا پڑتا ہے۔ اور اگر بھیڑ بکری کی پرورش جسے دامداری کہتے ہیں' میں لگے گا تو اس میں بھی مشغولیت کی یہی صورت ہو گی۔ اور کوئی مال اس سے زیادہ مشغلہ تر نہیں ہونے کا کہ جیسے کوئی زیرزمین خزانہ رکھتا ہو اور بقدر حاجت اس میں سے خرچ کرتا ہو تو ہمیشہ اس کی حفاظت اور اس خطرے میں کہ کہیں اس سے لے نہ جائیں یا طمع کریں جیسے اندیشوں میں مصروف رہے گا۔ اہل دنیا کے اندیشوں کی وادیوں کی کوئی حد نہیں۔ اس لیے جو کوئی چاہے کہ دنیا دار ہو اور فارغ ہو اس کی مثال

اس شخص کی سی ہے کہ جو چاہے کہ پانی میں اترے لیکن تر نہ ہو۔

یہ ہیں مال کے فوائد اور نقصانات۔ جب اصحاب بصیرت نے اس باب میں غور کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ مال میں سے قدرِ کفایت تو تریاق ہے اور کثرت اس کی زہر۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے اہل بیت کے لیے قدرِ کفایت ہی کی آرزو کی تھی اور مختصراً فرمایا کہ ''جس نے اپنی کفایت سے زیادہ لیا وہ ہلاک ہو گیا اور وہ نادان ہے''

لیکن یکبارگی سب سے ہاتھ کھینچ لینا کہ کچھ بھی باقی نہ رہے اور پھر نتیجتہً خود ضروری کے لیے دل مشغول ہو جائے تو یہ صورت شرعاً مکروہ ہے۔ جیسے کہ حضور ﷺ نے اس آیت قرآن کے بارے میں فرمایا ہے کہ: ''وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (قرآن: ۲۹/۱۷) اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے نہ باندھ اور اسراف و گزاف کے لیے بھر اوی نہ کھول کہ پھر قسمت کو کوستا ہوا بیٹھ جائے نفقہ سے درماندہ)۔

طمع اور حرص کا معلوم کرنا اور قناعت کا فائدہ

معلوم رہے کہ طمع جملہ اخلاق میں سے مذموم ہے۔ سوائے مذلت کے جو فوری نتیجہ ہے اور خجلت کے جو انجام کار حاصل ہوتی ہے۔ جب طمع پوری نہیں ہوتی تو بہت سے بد اخلاق اس سے جنم لیتے ہیں۔ کیونکہ جو کوئی کسی سے طمع کرتا ہے تو وہ اس کے ساتھ مداہنت کرتا ہے۔ نفاق برتتا ہے اور عبادات بہ طور ریا کرتا ہے اور اپنی تحقیر پر صبر کرتا ہے اور باطل میں اس کی معاونت کرتا ہے۔ انسان کو حریص پیدا کیا گیا ہے جس سے موجود پر وہ قناعت نہیں کرتا۔ اور سوائے قناعت کے حرص و طمع سے چھٹکارہ ممکن نہیں۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ: ''اگر انسان کے پاس دو وادیاں سونے سے پُر ہوں تو وہ تیسری کا خواہاں ہوتا ہے اور سوائے تربت یعنی قبر کے انسان کے جی نہیں بھرتا۔ اور جو کوئی توبہ کرنا چاہے تو اسے اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق دیتے ہیں۔'' نیز فرمایا کہ: ''انسان کی اکثر خواہشوں کی تکمیل ہو جاتی ہے سوائے دو چیزوں کے یعنی زندگی کی امید اور مال کی محبت کے'' نیز فرمایا کہ ''خوش بخت ہے وہ شخص جسے اسلام کی راہ دکھائی گئی اور روزی اسے بقدرِ کفایت دی گئی ہو اور اس نے اسی پر قناعت کی ہو'' نیز فرمایا کہ: ''روح القدس نے میرے دل میں پھونکا کہ کوئی انسان اس وقت تک نہیں مرتا جب تک اس کی روزی تماماً اس تک نہ پہنچ چکی ہو۔ حق تعالیٰ سے ڈرو اور تم روزی کی طلب خوبی کے ساتھ بہ آہستگی اللہ تعالیٰ سے کیا کرو'' یعنی اس میں مبالغہ نہ کرو اور حرص حد سے زیادہ نہ کرو۔'' نیز فرمایا کہ: ''شبہتوں سے پرہیز کیا کرو۔ تا کہ خلق میں عابد ترین قرار پاؤ اور جو کچھ حاصل ہو اس پر قانع رہو تا کہ شاکر ترین خلق بن سکو۔ اور دوسروں کے لیے وہی پسند کرو جو خود کے لیے پسند کرتے ہو تا کہ مومن

قرار پاؤ''۔

عوف بن مالک الاشجعی ؓ فرماتے ہیں کہ ہم سات آٹھ افراد آنحضرت ﷺ کے پاس تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''کیا رسول خدا کے ہاتھ پر بیعت نہ کرو گے؟ تو ہم نے عرض کیا کہ 'کیا ہم ایک دفعہ بیعت نہیں کر چکے؟' تو آپ ﷺ نے باردگر فرمایا کہ: ''کیا تم رسول خدا کے ہاتھ پر بیعت نہ کرو گے؟'' ہو ہم نے ہاتھ بڑھائے اور پوچھا ''کس بات پر بیعت کریں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس بات پر کہ: ''خدا تعالیٰ کی عبادت کرو گے اور پنج وقتہ نماز قائم رکھو گے ار جو کچھ حکم اللہ فرمائے گا اسے سنو گے اور طاعت کرو گے اور ایک بات بہ آہستگی کہی کہ 'کسی سے سوال نہ کرو گے'' عوف بن مالک نے کہا کہ: ''اب اس قوم کا یہ حال تھا کہ اگر کسی کے ہاتھ سے تازیانہ گر جاتا تو دوسرے سے نہ کہتا کہ یہ اٹھا کر مجھے دو''۔

حضرت موسیٰ ؑ نے فرمایا کہ: ''اللہ تیرے بندوں میں زیادہ دولت مند کون ہے؟'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: 'وہ جو کہ اسی پر قانع ہو جو میں نے اسے دیا ہو' تو مزید پوچھا کہ ''زیادہ عادل کون ہے؟'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''جو اپنے آپ سے انصاف کرے''۔

محمد واسع ؒ خشک روٹی میں نمک ڈال کر کھا رہے تھے اور فرماتے تھے کہ ''جو کوئی اس پر قناعت کرتا ہے وہ تمام مخلوق سے مستغنی ہوتا ہے'' ابن مسعود ؓ فرماتے ہیں کہ: ''ہر روز فرشتہ منادی کرتا ہے کہ 'اے ابن آدم وہ تھوڑا جو تیرے لیے کافی ہو وہ اس بہت سے جس سے تکبر اور غفلت پیدا ہو' بہتر ہے'' اور سمیط بن عجلان ؒ فرماتے ہیں کہ: ''تیرا پورا شکم بالشت بھر سے زیادہ نہیں ہے تو وہ تجھے دوزخ میں کیوں لے جائے؟''

حدیث میں ہے کہ ''حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''اے ابن آدم اگر میں پوری دنیا تجھے دے دوں تو تیرے حصے میں تو بجز روزی کے اور کچھ نہ آئے گا۔ اور اگر کھانے سے زیادہ نہ دوں اور حساب کا مشغلہ دوسروں پر رکھ دوں تو اس سے بڑھ کر تمہارے ساتھ کیا حسن سلوک ہو سکتا ہے؟''

داناؤں میں سے ایک فرماتے ہیں کہ لالچی طامع سے رنج برداری میں صابر تر اور کوئی نہیں ہوتا۔ اور قانع سے بڑھ کر اور کوئی خوش عیش نہیں ہوتا۔ اور کسی کو بھی حاسد سے زیادہ طویل اندوہ کا سامنا نہیں ہوتا۔ اور کوئی شخص تارک دنیا سے سبکسار تر نہیں ہوتا۔ اور کسی شخص کو بدکردار عالم سے بڑھ کر پشیمانی نہیں ہوتی''۔

شعبی ؒ فرماتے ہیں کہ ''ایک شخص نے ایک چڑیا کو پکڑ لیا تو چڑیا نے پوچھا 'تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟' تو وہ شخص بولا کہ ''میں تمہیں ذبح کر کے کھاؤں گا' تو چڑیا بولی کہ 'مجھے کھانے سے تجھے کیا ملے گا؟ میں تمہیں تین ایسی باتیں بتاتی ہوں کہ جو مجھے کھانے کی نسبت کہیں بہتر ہیں۔ ان میں سے ایک بات تو ابھی تمہارے ہاتھوں

میں ہوتے ہوئے بتاؤں گی اور دوسری اس وقت بتاؤں گی جب تو مجھے رہا کر دے گا اور میں درخت پر بیٹھ جاؤں گی اور تیسری اس وقت بتاؤں گی جب درخت پر سے پہاڑ کی طرف پرواز کروں گی' تو اس شخص نے کہا کہ ہاں کہو' تو چڑیا بولی ''پہلی بات یہ ہے کہ جو کچھ ہاتھ سے جاتا رہے اس کی حسرت نہ کرنا' تو اس مرد نے چڑیا کو چھوڑ دیا تو اڑ کر درخت پر جا بیٹھی تو اُس شخص نے کہا دوسری بات بتاؤ' چڑیا بولی کہ: ''محال بات کا کبھی یقین نہ کرنا' پھر اڑ کر پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ گئی اور بولی ''اے بدنصیب اگر تو مجھے ذبح کر لیتا تو میرے پیٹ میں دو دانے مروارید کے تھے جن سے ہر ایک کا وزن بیس مثقال ہے تو ان سے دولت مند ہو جاتا' تو اس شخص نے انگلی دانتوں میں داب لی اور کہا' دریغا' اے وائے' افسوس؟ اب تیسری بات بتا' تو چڑیا بولی تو نے پہلی دونوں فراموش کر دیں تیسری کو کیا کرو گے؟ میں نے تمہیں کہا تھا کہ 'گذشتہ پر افسوس نہ کرنا' یہ بھی کہا تھا کہ محال پر یقین نہ کرنا اور میرے بال و پر سمیت میرا کل گوشت دو مثقال سے زائد نہ ہوگا تو میرے باطن سے بیس ۲۰ مثقال مروارید کہاں سے آ گئے' یہ کہا اور چڑیا اڑ گئی' اور یہ مثل اس لئے بیان کی گئی ہے کہ جب طمع وجود میں آتی ہے تو انسان محالات کو باور کرنے لگتا ہے ابنِ سماکؒ فرماتے ہیں کہ ''طمع تیری گردن پر رسی ہے اور بند ہے تیرے پاؤں پر۔ اپنی گردن سے طمع کا طوق اتار دے تا کہ تیرے پاؤں کی زنجیر دور ہو جائے اور تو آزاد ہو جائے۔''

حرص و طمع کا علاج معلوم کرنا:

یاد رہے کہ حرص و طمع کا دارو ایک معجون ہے جو صبر کی تلخی' علم کی شرینی اور عمل کی دشواری کے مرکب سے عبارت ہے۔ اور بیماریٔ دل کی تمام دوائیں انہی اجزاء سے سے تیار ہوتی ہے اور حاصل ان کا پانچ چیزوں کا علاج ہے:

اوّل: عمل ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنا خرچہ کم سے کم کر دے۔ موٹے کپڑے اور سوکھی روٹی پر قناعت کرے اور سالن کبھی کبھار کھائے۔ کیونکہ اس قدر بے طمع اور بے حرص ہوگا تو بآسانی میسر آئے گا۔ لیکن اگر کوئی تجمل کرے یا خرچ کثیر کرے گا وہ قناعت نہ کر سکے گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''ما عال من اقتصدا'' جو کوئی خرچ از رو سے قاعدہ کرے گا وہ کبھی قلاش نہ ہوگا''۔ نیز فرمایا کہ ''تین چیزیں ہیں کہ خلق کی نجات ان میں ہے: خلوت و جلوت میں اللہ کا خوف' اور افلاس اور دولت مند دونوں حالتوں میں میانہ روی کے مطابق خرچ کرنا اور ناراضی اور خوشنودی ہر دو حال میں انصاف کرنا''۔ ایک شخص نے ابو درداؓ کو کھجور کی گٹھلیاں چنتے ہوئے دیکھا اور ساتھ ہی یہ کہتے ہوئے سنا کہ روزی میں نرمی ملحوظ رکھنا مرد کی عقل و علم کی دلیل ہے''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو کوئی خرچ ضابطے کے مطابق کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بے نیاز رکھتا ہے۔ او جو کوئی بے قاعدہ خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے مفلس رکھتے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ کو یاد کرتا ہے خدا اسے دوست رکھتا ہے'' نیز فرمایا کہ ''خرچ بہ تدبیر او بہ آہستگی آدھی معیشت ہے''

علاج دوم: یہ ہے کہ ''جب انسان ایک دن کی روزی بقدرِ کفایت پالے تو مستقبل کے لیے دل کو ایسے مصروف نہ رکھے کہ شیطان اس سے کہے کہ ''عمر لمبی ہو جاتی ہے اور کل کوئی چیز ہاتھ نہ آئے۔ اس لئے آج ہی اس کی طلب میں کوشاں ہو جا اور ہرگز آرام سے نہ بیٹھ جانا جہاں سے بھی مل سکے حاصل کرلے'' اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ '' (قرآن ۲۶۸/۲) (شیطان ہے جو تمہیں افلاس کی یاد دلاتا ہے اور تمہیں بخل کا حکم دیتا ہے) شیطان چاہتا ہے کہ تمہیں مستقبل کے افلاس کا رنج آج ہی مبتلائے رنج کردے اور تمہیں قلاشوں کی صورت میں رکھے اور تم پر ہنستا ہے کہ ممکن ہے کہ کل تم پر آئے ہی نہیں اگر آ بھی گیا تو اس کا رنج اس سے زیادہ نہ ہوگا کہ جس میں تم نے آج خود کو ڈال دیا ہے اور حذر اس سے اس طرح ممکن ہے کہ انسان کو علم ہو کہ رزق حرص کے سبب فراہم نہیں ہوتا کیونکہ روزی تو مقدر ہے اور وہ ناچار پہنچے گی۔

آنحضرت ﷺ ابن مسعودؓ کے پاس سے گزرے تو انہیں سخت اندوہ گین پایا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''دل پر اندوہ کا بوجھ نہ ڈالو کیونکہ قسامِ ازل نے جو کچھ مقدر کر دیا ہے ہو کر رہے گا اور مقدر رزق لازماً تجھے پہنچ جائے گا۔ اور تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کی روزی ایسی جگہ سے فراہم ہوتی ہے کہ جہاں سے اس کو امید بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ فرمان خداوندی ہے کہ: ''وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّ یَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لاَ یَحْتَسِبُ '' (القرآن: ۲/۶۵، ۳) (جو کوئی پرہیز گار رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو تنگی سے نکال دیتا ہے اور روزی دیتا ہے ایسی جگہ سے جس کا اسے گمان بھی نہیں ہوتا)۔ جو کوئی پرہیز گار رہتا ہے اس کی روزی اس جگہ سے پہنچتی ہے کہ جس کا اسے گمان ہی نہیں ہوتا۔

ابو حازم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''جو کچھ ہے دو قسم کا ہے۔ جو کچھ رزق میرا ہے وہ مجھ تک پہنچ کر رہے گا اور جو رزق دوسرے کا ہے اگر تمام زمین و آسمان والے بھی پوری کوشش کریں مجھ تک ہرگز نہیں پہنچے گا۔ پس روزی کے لئے میری بے قراری کس کام کی ہے؟''

علاج سوم: یہ ہے کہ انسان گمان کرے کہ اگر طمع نہ کرے اور صبر کرے تو رنجور ہوگا۔ لیکن اگر طمع کرے اور صبر نہ کرے تو ذلیل ہوگا اور رنجور بھی تو اس کی وجہ سے ملامت کا نشانہ بنے گا نیز عاقبت میں عقاب کا خطرہ بھی ہوگا۔ تو طمع نہ کرے اور صبر کرنے کی بناء پر ثواب کا مستحق ہوگا۔ اور لایق ستایش قرار پائے گا۔ آخر وہ

رنج جس میں ثواب ہواور ستایش ہواور عزِّ نفس ہواولیٰ تر ہے اس رنج سے جس میں مذلت ہونکوہش ہو نیز عقوبت کا خوف بھی ہو۔ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ: ''مومن کا اعزاز اس میں ہے کہ وہ خلق سے بے نیاز ہو''۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ ''تو جس کسی کا محتاج ہوگا اس کا قیدی ہوگا اور جس کسی کو تم سے حاجت ہو تو اس کا امیر ہوگا۔ اور جس سے تو بے نیاز ہے تو اسی کا سا اور اس کا ہمسایہ ہوگا''۔

علاج چہارم: یہ ہے کہ غور کرے کہ آخر یہ حرص و طمع کس لیے کرتا ہے؟ اگر پیٹ کے تنعم کے لیے کرتا ہے تو گائے گدھا وغیرہ اس سے زیادہ خوش خوراک ہیں۔ اور اگر نفسانی شہوت کے لئے کرتا ہے تو ریچھ اور خنزیر اس امر میں اس سے کہیں آگے ہیں اور اگر تجمل اور خوش پوشی کے لئے کرتا ہے یہود نصاریٰ پر نگاہ ڈال لے وہ اس امر میں کتنے آگے ہیں۔ اور اگر انسان طمع کو چھوڑ دے اور تھوڑے پر قناعت کر لے تو اس کا کوئی ثانی دکھائی نہ دے گا۔ سوائے انبیاء و اولیاء اور صدیقوں کے۔ تو اس قوم کی مانند ہونا بہتر ہے یا ان چار پایوں اور احمقوں کی نظیر ہونا؟''

علاج پنجم: یہ ہے کہ مال کی آفت پر کہ جب بکثرت ہو جائے غور کرے کہ دنیا میں بھی آفات کا خطرہ ہے اور آخرت میں بھی مفلسوں کی نسبت پانچ سو سال بعد جنت میں داخل ہوگا۔ اور چاہئے کہ اس کو دیکھے جو دنیوی اعتبار سے خود اس سے ادنیٰ ہو تا کہ اللہ کا شکر گذار بنے اور دولت مندوں کے احوال پر نظر نہ ڈالے تا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اس کی نگاہوں میں حقیر نہ ٹھہرے۔ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ: ''اس کو دیکھو جو دنیوی اعتبار سے تم سے پست ہو'' اور ابلیس ہمیشہ تمھیں کہتا ہے: ''کیوں قناعت کرتے ہو کہ فلاں فلاں تو اتنا مال رکھتے ہیں'' اور جب تم دنیا سے پرہیز کرتے ہو تو کہتا ہے کہ ''پرہیز کیوں کرتے ہو؟ فلاں فلاں عالم تو حذر نہیں کرتے اور حرام کھاتے جاتے ہیں''۔ ابلیس ہمیشہ دنیوی اعتبار سے اس کو سامنے لاتا ہے جو تم سے اس امر میں آگے ہو۔ اور دین میں اس کا ذکر کرتا ہے جو تم سے پیچھے ہو۔ حالانکہ سعادت اس کے برعکس ہے۔ چاہئے کہ دین میں بزرگوں کو پیش نظر رکھے تا کہ خود کو مقصر دیکھے اور دنیوی وجاہت کے اعتبار سے مفلسوں پر نگاہ ڈالے تا کہ خود کو نسبتاً دولت مند پائے۔

سخاوت کی فضیلت اور ثواب کا بیان

یاد رہے کہ جو شخص مالدار نہیں ہے تو اسے قانع ہونا چاہئے نہ کہ حریص۔ اور اگر مالدار ہو تو اسے چاہئے کہ وہ سخی ہو نہ کہ بخیل۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''سخاوت ایک درخت ہے بہشت میں اور جو اس دنیا میں سخی ہوگا اس درخت کی شاخ میں اس نے ہاتھ ڈال رکھا ہوگا۔ حتیٰ کہ وہ اسے بہشت میں لے جائیگی۔ اسی طرح بخل نام

کا ایک درخت دوزخ میں ہے تو جو کوئی بخیل ہوگا اس نے اس درخت کی شاخ کو تھام رکھا ہوگا۔حتٰی کہ وہ اسے دوزخ میں لے جائے گی''۔ نیز فرمایا کہ ''دو خلق ایسے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ دوست رکھتے ہیں اور وہ ہیں سخاوت اور خوش خوئی۔اور دو خلق ایسے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ دشمن رکھتا ہے اور وہ ہیں: بخل اور بدخوئی۔ نیز فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے کوئی ولی ایسا پیدا نہیں کیا جو سخی اور خوش خُو نہ ہو''۔ نیز فرمایا کہ: ''سخی کے گناہ فروگذار کر دیئے جاتے ہیں۔ کیونکہ جب کبھی سخی کسی لغزش کا شکار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دست گیری فرماتے ہیں''۔ آنحضرت ﷺ نے ایک جنگ کے دوران ایک گروہ کو قیدی بنالیا۔ سب کو مار ڈالا سوائے ایک شخص کے تو اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''ان سب کا دین ایک' گناہ ایک اور خدا ایک تھا تو اس لئے آپ نے اس ایک کو بھی کیوں ہلاک نہیں کیا؟'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''حضرت جبریل آئے اور مجھے خبر دی کہ اسے نہ ماریئے کہ یہ سخی ہے''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''فراخ دل (سخی) کا کھانا دوا ہے جب کہ بخیل کا کھانا بیماری ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''سخی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہے اور نزدیک ہے بہشت کے اور نزدیک ہے مردوں کے اور دور ہے دوزخ سے جب کہ بخیل اللہ تعالیٰ سے دور ہے اور دور ہے بہشت سے اور دور ہے لوگوں سے اور قریب ہے دوزخ کے اور اللہ تعالیٰ بے علم سخی کو بخیل عابد سے زیادہ دوست رکھتا ہے۔ اور بیماریوں میں سب سے بری بیماری بخل ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''میری امت کے ابدال بہشت میں نماز روزے کی بناء پر نہیں گئے۔ ولیکن سخاوت اور اخلاص کی بناء نیز لوگوں کی خیر خواہی اور شفقت کی بناء پر بہشت میں داخل ہوئے''۔ حدیث میں ہے کہ: ''حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی طرف وحی کی کہ سامری کو قتل نہ کرنا کہ وہ سخی ہے''۔ اقوال علی رضی اللہ عنہ میں ہے کہ ''جب دنیا نے تیری طرف رخ کیا ہے تو تو ایسے خرچ کرتا کہ کم نہ ہو۔ اور اگر دنیا تجھ سے منہ پھیر لے تو بھی خرچ کر کہ باقی نہ رہے گی''۔ ایک شخص نے حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو اپنا احوال لکھ بھیجا تو آپ نے خط لے لیا اور فرمایا کہ تمھاری حاجت روا ہو جائے گی'' تو لوگوں نے کہا کہ ''آپ نے اس کے نامے کو پڑھا کیوں نہیں؟'' تو آپ نے فرمایا کہ اتنی سی تاخیر پر اس کے میرے سامنے انکساری کے ساتھ کھڑے ہونے پر اللہ تعالیٰ میرا مواخذہ فرمائے گا''۔

محمد بن المنکدر رامِّ دَرّہ سے جو حضرت عائشہ کی کنیز تھیں روایت کرتے ہیں کہ: ''ایک دفعہ ابن الزبیر نے دو تھیلیاں چاندی کی ایک سو اسی ہزار درم پر مشتمل حضرت عائشہ کے پاس بھیجیں' تو انھوں نے طبق منگوائے اور سب کے سب درم مفلسوں اور مستحقوں میں تقسیم فرما دیئے۔ رات ہوئی تو فرمایا کھانے کو کچھ لاؤ کہ میں روزہ افطار کروں تو میں آپ کے لئے روٹی اور روغن زیتون لے گئی کیونکہ گوشت نہ تھا۔ اور میں نے اُن سے کہا کہ

''آپ نے یہ سارے درم چاندی کے آج ہی خرچ کر دیئے اگر ایک درم ہمارے گوشت کے لئے رکھ لیتیں تو کیا ہو جاتا؟'' تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ: ''تم اگر مجھے یاد دلا دیتیں تو میں خرید لیتی''۔

جب امیر معاویہؓ مدینہ میں سے گذرے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: ''جلدی سلام نہ کرنا'' جب معاویہؓ مدینہ سے باہر نکل گئے تو حسن نے فرمایا کہ ''ہم پر قرض ہے'' تو اُن کے پیچھے نکلے اور قرض کا قصہ امیر معاویہ سے بیان کیا تو امیر معاویہ کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ پیچھے رہ گیا پوچھا کہ ''یہ کیا ہے؟'' تو لوگوں نے بتایا کہ ''یہ مال ہے'' اسی ہزار دینار تھے تو امیر نے کہا یہ حسنؓ کے حوالے کر دیں تا کہ قرض میں لوٹا سکے''۔ ابوالحسن مدائنیؒ فرماتے ہیں کہ ''حسن و حسین و عبداللہ جعفر رضی اللہ عنہم اجمعین تینوں حج کے لئے جا رہے تھے۔ راستے میں بھوک لگی لیکن زادِ راہ والا اونٹ آگے نکل گیا تھا۔ تو یہ ایک جگہ بھوکے پیاسے رہ گئے تھے۔ پھر ایک عرب بڑھیا کے پاس گئے اور فرمایا کہ ''پینے کی کوئی چیز ہے؟'' تو اس نے کہا 'ہاں' تو اس نے اپنی بکری کا دودھ دوہا اور انھیں دیا۔ انھوں نے پیا تو پوچھا ''کھانے کی کوئی چیز ہے؟'' تو بڑھیا نے کہا کہ نہیں۔ سوائے اس بکری کے تم اسے ذبح کر لو اور کھا لو۔ تو انھوں نے اسے ذبح کر کے بکری کھالی اور فرمایا کہ ''ہم قریش میں سے ہیں تو جب ہم اس سفر سے لوٹیں گے تو ہمارے پاس آنا تا کہ ہم تمھارے ساتھ حسن سلوک کر سکیں۔ اور چلے گئے۔ تو جب اس بڑھیا کا خاوند واپس آیا تو اپنی بیوی سے ناراض ہوا اور کہنے لگا کہ ''تم نے ایسے لوگوں کو بکری دے دی جن کو تم جانتی ہی نہیں تھیں کہ کون ہیں؟'' کچھ زمانہ گذر گیا یہ میاں بیوی افلاس کے باعث مدینہ میں آ گئے۔ اور اونٹوں کی لید چن کر بیچنے لگے۔ ایک روز وہ بڑھیا ایک کوچے میں سے گذر رہی تھی کہ ایک گھر کے دروازے پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے تو آپ نے اس بڑھیا کو پہچان لیا اور فرمایا کہ ''اے بزرگوار مجھے پہچانتی ہو؟'' تو اس عورت نے کہا نہیں'' تو آپ نے فرمایا کہ میں تمھارا وہ مہمان ہوں کہ جو فلاں دن تمھارے پاس آیا تھا'' تو بڑھیا نے کہا ''تو وہی ہے؟'' فرمایا ''ہاں''۔ اس کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس پر ہزار بکریاں اور ہزار دینار اس بڑھیا کو عطا کئے گئے۔ پھر اس عورت کو اپنے غلام کے ساتھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجا تو حسین رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ میرے بھائی نے تمھیں کیا دیا؟'' تو وہ بولی ''ہزار دینار اور ہزار بکریاں'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی اسی قدر اسے عطا فرمایا اور غلام کے ساتھ عبداللہ بن جعفر کے پاس بھیجا تو عبداللہ نے بڑھیا سے پوچھا کہ ان دونوں نے تجھے کیا دیا؟'' تو بڑھیا نے کہا دو ہزار دینار اور دو ہزار بکریاں دیں''۔ تو عبداللہ نے اتنی ہی بکریاں اور دینار دیے جتنے ان دونوں بھائیوں نے دیئے تھے اور فرمایا کہ اگر تو پہلے میرے پاس آتی تو میں انھیں مصیبت میں ڈال دیتا یعنی تمھیں اس قدر زیادہ دیتا کہ وہ اتنا نہ دے سکتے' تو

وہ عورت چار ہزار دینار اور چار ہزار بکریاں لے کر اپنے خاوند کے پاس چلی گئی۔ ایک شخص عرب میں سخاوت کے لئے مشہور تھا۔ وہ مر گیا۔ تو ایک جماعت سفر میں آ رہی تھی اور بھوکی تھی۔ تو وہ اس شخص کی گلی کے سرے پر فروکش ہو گئے اور بھوکے سو گئے۔ ان میں سے ایک کے پاس اونٹ تھا اس نے اس مردہ سخی کو خواب میں دیکھا کہ اس نے کہا کیا تم اپنا اونٹ میرے اونٹ کے عوض دیتے ہو؟'' کہتے ہیں کہ اس سخی کا ایک برگزیدہ اونٹ اس کے پاس بچ گیا تھا۔ تو اونٹ والے نے جواب میں کہا ''ہاں دیتا ہوں''۔ اور وہ اسے دے دیا۔ تو اس مردے نے یہ اونٹ لے لیا اور اور ذبح کر دیا۔ جب وہ شخص خواب سے بیدار ہوا تو اس نے اپنے اونٹ کو ذبح شدہ پایا۔ تو اس کو دیگ میں ڈال کر پکایا گیا اور کھایا تو جب وہ وہاں سے چلے گئے تو ایک کاروان آ گیا تو اس میں سے ایک شخص اونٹ کے مالک کو اس کا نام لے کر پکار رہا تھا کہ تو جب اونٹ کا مالک اس کے پاس گیا تو اس نے پوچھا کہ ''تم نے فلاں مردے سے کوئی برگزیدہ اونٹ خریدا ہے'' تو اس شخص نے کہا کہ خریدا تو ہے لیکن خواب میں خریدا ہے۔ اور ساری بات بیان کر دی۔ تو اس شخص نے کہا برگزیدہ اونٹ یہ ہے۔ اس کو پکڑ و کیونکہ میں نے کل رات اپنے باپ کو خواب میں دیکھا تھا کہ جس نے کہا تھا ''اگر تو میرا بیٹا ہے تو یہ برگزیدہ اونٹ فلاں شخص کو دے دے''۔

ابوسعید خرگوشی راوی ہیں کہ: ''مصر میں ایک شخص تھا کہ درویشوں کی خدمت کرتا تھا اور انھیں ساز و سامان فراہم کرتا تھا۔ تو ایک شخص کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ خالی ہاتھ تھا۔ تو وہ بیان کرتا ہے کہ میں اس شخص کے پاس گیا۔ تو اس نے میرے لئے جس شخص سے بھی سوال کیا کچھ نہ ملا تو مجھے وہ ایک قبر کے سرہانے لے گیا اور بیٹھ گیا۔ اور صاحب قبر سے کہنے لگا ''خدائے تعالیٰ تجھ پر رحمت فرمائیں کہ تو مفلسوں کا غم کھاتا تھا اور جو کچھ چاہیئے ہوتا تو عطا کرتا تھا۔ آج میں نے اس مفلس شخص کے بچے کے لئے بہت کوشش کی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ پھر وہ شخص اٹھا اور اس کے پاس ایک دینار تھا اس نے اس کے دو ٹکڑے کئے اور آدھا مجھے دے دیا۔ اور کہا یہ میں نے اس وقت تک کے لئے ادھار دیا جب کچھ وجود میں آئے۔ اور اس شخص کو لوگ محتسب کہتے تھے۔ اس نے کہا کہ میں نے وہ نصف دینار لے لیا اور اس بچے کو لوازم مہیا کر دیئے۔ محتسب نے اس رات مردے کو خواب میں دیکھا کہ کہہ رہا تھا کہ: ''تو نے میری قبر پر جو کچھ کہا تھا وہ میں نے سن لیا تھا لیکن مجھے آج جواب کی اجازت نہیں۔ اب تو میرے گھر جا اور میرے بچوں سے کہہ کہ جہاں آتش دان ہے اس کو کھودیں وہاں پانچ صد دینار سونا دفن ہے وہ نکال کر اس مرد کو جس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے دے دیں''۔ تو محتسب اگلے دن گیا اور انھوں نے اس کے مطابق عمل کیا تو پانچ صد دینار مل گئے۔ تو محتسب نے مرحوم کے لڑکوں سے کہا کہ ''میرا خواب حکمی نہیں

ہے یہ سونا تمھاری ملک ہے لے لو"۔ تو وہ لڑکے بولے: "ہمارا مرحوم باپ سخاوت کرتا ہے اور ہم زندہ بخل کریں؟" تو تم یہ سب اس شخص کے پاس لے جاؤ جیسا کہ ہمارے باپ نے تمھیں کہا ہے" تو محتسب نے وہ مال اٹھالیا اور اس شخص کے پاس لے آیا۔ تو اس شخص نے ایک دینار پکڑا اور اس کے دو ٹکڑے کر دیئے تو ایک ٹکڑا قرض کی ادائیگی میں محتسب کو دے دیا اور کہا کہ باقی جو کچھ ہے مفلسوں کو دے دے کیونکہ میری حاجت اس کچھ اس سے کچھ زیادہ نہیں"۔ ابوسعید خرگوشی کہتا ہے کہ "میں نہیں جانتا کہ ان میں سے بڑا سخی کون تھا"۔ اور فرمایا کہ "جب میں مصر پہنچا تو میں نے اس شخص کے گھر کی تلاشی کی۔ اس شخص کے پوتے موجود تھے۔ میں نے انھیں دیکھا تو اُن کے چہرے خیر کے نور سے اسے روشن تھے۔ تو مجھے یہ آیت یاد آ گئی: "وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا" (قرآن:) (ان کا باپ نیک مرد تھا)۔ سخاوت کی وہ برکات جو مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے ان پر حیرت نہ ہونی چاہیئے۔ اور یہ طریق خواب ظہور پذیر ہوں۔ کیونکہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی عادت مبارک تھی کہ مہمان دار تھے اور مہمانوں کی ضیافت کرتے تھے۔ اور ان کی وفات سے لے کر اس وقت تک بھی ان کے مشہد پر وہ برکات باقی ہیں۔ ربیع بن سلیمان بیان کرتے ہیں کہ حضرت شافعیؒ مکے پہنچے تو ان کے پاس ہزار دینار تھے۔ مکے شہر کے باہر خیمہ زن ہو گئے۔ تو انھوں نے وہ سارا سونا ایک چادر پر ڈال رکھا تھا۔ تو کوئی آپ کے پاس سلام کو حاضر ہوتا مٹھی بھر دینار اسے دے دیتے تھے۔ حتٰی کہ نمازِ ظہر کے ادا کرنے کو اٹھے تو وہ چادر جھاڑ دی اور اس میں کچھ باقی نہ رہا تھا"۔ ایک دفعہ ایک شخص نے امام شافعی کی رکاب تھامی تا کہ آپ سوار ہو جائیں تو آپ نے ربیع سے کہا کہ چار ہزار دینار اسے دے دو اور میری طرف سے عذر خواہی کرو"۔ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ روئے تو لوگوں نے پوچھا کہ "آپ کیوں روئے؟" تو آپ نے فرمایا کہ سات دن ہو گئے کوئی مہمان ہمارے گھر میں نہیں آیا"۔

ایک شخص اپنے ایک دوست کے پاس گیا اور کہا کہ "میں چار سو دینار کا مقروض ہوں" تو اس دوست نے اسے وہ مطلوبہ رقم دے دی اور ساتھ ہی رویا تو اس کی بیوی نے کہا کہ "اگر تم دوست کی طلب پر روئے ہو تو دینار نہ دیتے"۔ تو اس شخص نے کہا کہ "مجھے رونا تو اس بات پر آیا کہ میں اپنے دوست کے بارے میں غافل رہا حتٰی کہ خود اسے سوال کی حاجت ہوئی"۔

بخل کی برائی کا بیان

فرمان خداوندی ہے کہ: "وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (قرآن:۹/۵۹) (وہ جو اپنے نفس سے بچ گئے وہی ہیں کامیاب)۔ نیز اللہ تعالیٰ وتقدس کا فرمان ہے کہ: "وَلَا يَحْسَبَنَّ

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ آتٰهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ط بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ''(قرآن: ۳/۱۸۰) (یہ گمان نہ کرنا تا کہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس میں کہ جو اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کیا ہے کہ یہ ان کے لئے خیر ہے بلکہ وہ ان کے لئے بمنزلہ شر ہے اور جلد ہوگا کہ جس میں وہ بخل کرتے ہیں اسے روزِ قیامت طوق بنا کر ان کی گردن میں ڈال دیا جائے گا)۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''بخل سے دور رہو۔ کیونکہ وہ قوم جو تم سے پہلے تھی بخل ہی کی بناء پر ہلاک ہوگئی۔ اور ان کے بخل نے ان کو اس نوبت تک پہنچایا تھا کہ ناحق قتل کرتے تھے اور حرام کو حلال سمجھتے تھے''۔ نیز فرمایا کہ تین چیزیں مہلک ہیں: بخل جب مطاع ہو یعنی تو اس کے حکم کے مطابق عمل کرے۔ اور اس کی نافرمانی نہ کرے اور وہ ہوائے باطل کہ جس کے پیچھے لگ جائے۔ اور تیسری خود پسندی''۔

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دو مرد آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے ایک اونٹ کی قیمت طلب کی۔ تو آپ ﷺ نے عطا فرمائی۔ جب وہ چلے گئے تو وہ حضرت عمر کے پاس پہنچے تو شکر ادا کیا۔ حضرت عمر نے یہ بات آنحضرت ﷺ کے پاس بیان کی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ فلاں شخص تو اس سے زیادہ لے گیا تھا لیکن اس نے شکر ادا نہیں کیا۔ جب تم میں سے کوئی بہ الحاح مجھ سے کچھ لے جاتا ہے گویا وہ آگ ہے جو اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے''۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ 'اگر وہ آگ ہے تو آپ اسے کیوں دیتے ہیں؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اس لئے کہ وہ اس کے لئے اصرار کرتا ہے اور حق تعالیٰ پسند نہیں کرتا کہ میں بخل کروں اور نہ دوں' اور فرمایا کہ آپ فرماتے ہیں کہ بخیل ظالم سے مغرور تر ہوتا ہے تو حق تعالیٰ کے نزدیک بخل سے بڑھ کر اور کون سا ظلم ہے؟ اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے اپنی عزت و عظمت کی کہ کسی بخیل کو جنت میں داخلے کی اجازت نہ دے گا''۔

ایک دن حضور طوافِ کعبہ میں مصروف تھے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک شخص نے کعبے کے دروازے کی زنجیر کو تھام رکھا تھا اور کہہ رہا تھا: ''بارِ خدایا اس گھر کی حرمت کا واسطہ میرے گناہ معاف فرمادے'' تو آپ ﷺ نے پوچھا تمھارا گناہ کیا ہے؟'' تو وہ بولا کہ میرا گناہ اس سے کہیں زیادہ عظیم ہے کہ بیان ہو سکے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تمھارا گناہ بڑا ہے یا زمین؟'' تو وہ بولا ''میرا گناہ'' تو آپ نے پوچھا تمھارا گناہ عظیم ہے یا آسمان؟'' تو وہ بولا ''میرا گناہ'' تو آپ ﷺ نے فرمایا تمھارا گناہ بڑا ہے یا عرش؟'' تو بولا میرا گناہ'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''تمھارا گناہ بڑا ہے یا حق تعالیٰ؟'' تو وہ بولا ''حق تعالیٰ عظیم ہیں'' تو آپ ﷺ نے فرمایا پس بیان کرو کہ وہ گناہ کیا ہے؟'' تو وہ بولا ''اے اللہ کے رسول میرے پاس مال بہت ہے لیکن جب سائل دور سے

دکھائی دیتا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آگ مجھ پر حملہ آور ہوگئی ہو"۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مجھ سے دور ہو جاؤ تا کہ مجھے اپنی آگ سے نہ جلا دو۔ اس خدا کی قسم کہ جس نے مجھے راستی پر بھیجا ہے کہ اگر رکن اور مقام کے درمیان ہزار سال بھی تو نماز پڑھے اور اتنا روئے کہ تیرے آنسوؤں سے پانی کی لہر جاری ہو جائے جس سے درخت اگ کھڑے ہوں۔ اور پھر تو بخل ہی پر مر جائے تو مقام تیرا بجز دوزخ کے اور نہ ہوگا۔ اور بخیل کا بخل کفر ہی کی ایک صورت ہے اور کفر آگ میں جائے گا۔ ویحک (وائے برتو) تو نے نہیں سنا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: "وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (قرآن: ۹/۵۹) (جس نے بخل کیا تو اس نے اپنے ہی نفس پر کیا اور جو اپنے نفس سے بچ گیا وہی کامیاب ہوا)۔ اور کعب فرماتے ہیں کہ "روزانہ ہر شخص پر دو فرشتے مقرر ہیں۔ جو منادی کرتے ہیں کہ "اے اللہ تعالیٰ کہ اگر یہ مال کو روکے تو اسے تلف کر دے اور اگر راہِ حق میں صرف کرے تو اسے اس کا عوض عطا فرما"۔

امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ "میں بخیل کی تعدیل نہیں کرتا اور اس کی گواہی پر کان نہیں دھرتا کیونکہ اس کا بخل اسے موشگافی کرنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ اپنے حق سے زیادہ طلب کرتا ہے اور لے لیتا ہے"۔

یحییٰ بن زکریا علیہ السلام نے ابلیس کو دیکھا تو کہا: "کون ہے کہ جسے تو زیادہ دوست کھتا ہے اور کون ہے جسے تو زیادہ دشمن رکھتا ہے؟" تو ابلیس نے جواب دیا کہ "بخیل پارسا کو زیادہ دوست رکھتا ہوں کہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے اور طاعت کرتا ہے اور بخل اس کا اس کی طاعت کو باطل کر دیتا ہے۔ اور فاسق سخی کو زیادہ دشمن سمجھتا ہوں کہ خوش گذران ہے اور مجھے خوف ہے کہ خدائے تعالیٰ اس کی سخاوت کے باعث اس پر رحم فرمائے گا اور اسے توبہ کی توفیق دے دے گا"!

ایثار کے ثواب کے بیان میں

یاد رہے کہ ایثار سخاوت سے بلند مرتبہ کا مالک ہے کیونکہ سخی وہ ہوتا ہے کہ جس شے کی ضرورت اسے نہ ہو عطا کرتا ہے اور ایثار یہ ہے کہ باوجود انسان کو خود اس کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ اسے دوسرے کی ضرورت کی نذر کر دیتا ہے۔ اور جیسے کمال سخاوت یہ ہے کہ اپنی ضرورت کی شے بھی دے دے۔ اور بخل کا کمال یہ ہے کہ اپنی انتہائی ضرورت کے لئے بخیل مال صرف نہیں کرتا حتیٰ کہ اگر بیمار ہو جائے تو بھی اپنے علاج کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ جب کہ اس کے دل میں آرزوئیں ہوتی ہیں لیکن وہ اس انتظار میں رہتا ہے کہ کسی اور سے طلب کرے اور اپنے مال سے خرید نہیں سکتا۔

اور ایثار کی فضیلت بہت عظیم ہے۔ حق تعالیٰ نے ایثار کی بدیں الفاظ تعریف فرمائی ہے: "وَيُؤْثِرُوْنَ

عَلٰی اَنۡفُسِهِمۡ وَلَوۡ کَانَ بِهِمۡ خَصَاصَةٌ'' (قرآن:۹/۵۹) (وہ دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہیں ہر چند کہ خود پریشان حال ہوں یا تنگ دست ہوں)۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو کوئی ایسی چیز پائے جس کی اسے تمنا ہو لیکن اپنی آرزو کو ترک کردے اور وہ شے عطا کردے تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ''ہم نے آنحضرت ﷺ کے گھر میں کبھی متواتر تین دن سیر ہو کر نہیں کھایا حالانکہ ہم متواتر سیر ہو کر کھا سکتے تھے لیکن ایثار کر دیتے تھے''۔

آنحضرت ﷺ کے ہاں ایک صاحب مہمان ہوئے اور گھر میں کچھ نہ تھا۔ تو انصار میں سے ایک صاحب آئے اور مہمان کو اپنے گھر لے گئے۔ اور کھانا ان کے ہاں تھوڑا سا تھا۔ تو انھوں نے چراغ گل کر دیا اور کھانا مہمان کے آگے رکھ دیا۔ اس کے اہل وعیال کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے لیکن کھاتے نہ تھے۔ حتیٰ کہ مہمان نے سیر ہو کر کھا لیا۔ تو اگلے دن آنحضرت ﷺ نے اس انصاری سے کہا کہ ''خدائے عزوجل تمھارے اس خلق اور اس مہمان کے ساتھ سخاوت پر متحیر تھے اور یہ آیت نازل ہوئی: ''وَيُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰی اَنۡفُسِهِمۡ وَلَوۡ کَانَ بِهِمۡ خَصَاصَةٌ'' (قرآن:۹/۵۹) (وہ دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہیں ہر چند کہ خود پریشان حال ہوں یا تنگ دست ہوں)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ ''یارب مجھے محمد (ﷺ) کا درجہ تو دکھایئے'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اس کی تاب نہیں لا سکتے لیکن میں اُن ﷺ کے درجات میں سے ایک تمھیں دکھاتا ہوں''۔ تو جب اللہ تعالیٰ نے اس کو متجلی کیا تو خطرہ اس بات کا تھا کہ اس کے نور وعظمت سے موسیٰ علیہ السلام مدہوش ہو جائیں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: ''یہ مرتبہ آپ ﷺ نے کس چیز سے پایا؟'' تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا ''اے موسیٰ ایثار سے؛ کوئی بندہ جس نے زندگی بھر میں ایک بار ہی ایثار کیا ہو تو مجھے حیا آتی ہے کہ اس سے حساب لوں۔ ثواب اس کا بہشت ہوگا۔ تو ایثار کرنے والا بہشت کے جس طبقے میں چاہے جائے''۔

عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ دوران سفر ایک کھجوروں کے باغ میں فروکش ہوئے۔ ایک سیاہ فام غلام اس باغ کا رکھوالا تھا۔ غلام کے لئے تین روٹیاں لائی گئیں۔ اتنے میں وہاں ایک کتا آ گیا تو اس غلام نے ایک روٹی کتے آگے ڈال دی جسے اس نے کھا لیا۔ تو دوسری بھی اسے ڈال دی تو کتا وہ بھی کھا گیا تو اس نے تیسری روٹی بھی اسی کے آگے ڈال دی۔ تو کتا وہ بھی کھا گیا۔ تو عبداللہ نے اس غلام سے پوچھا تمھاری روز کی مزدوری کس قدر ہے؟'' تو غلام بولا: ''یہ جو ابھی آپ نے ملاحظہ فرمایا یہی تین روٹیاں میرا روزینہ ہے''۔ تو فرمایا کہ ''تم نے سب کی سب آخر کتے کی نذر کیوں کر دیں؟'' تو وہ بولا ''یہاں کتے نہیں ہوتے تو یہ کتا

کہیں دور سے آیا تھا۔ تو میں نے پسند نہیں کیا کہ وہ بھوکا رہے''۔ تو آپ نے پوچھا کہ اب تم آج کیا کرو گے؟'' تو وہ غلام بولا ''میں صبر کروں گا''۔ تو آپ نے فرمایا کہ ''سبحان اللہ کہ لوگ مجھے سخاوت پر ملامت کرتے ہیں یہ غلام تو مجھ سے بھی بڑھ کر سخی ہے''۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس پر وہ نخلستان خرید لیا گیا اور غلام کو خرید لیا اور اسے آزاد کر دیا نیز نخلستان اسے عطا کر دیا''۔

آنحضرت ﷺ کفار کے ارادۂ قتل سے محترز تھے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے بستر پر سو گئے تا کہ کفار کے قصد کی صورت میں علی رضی اللہ عنہ اپنی جان آپ ﷺ پر قربان کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل و میکائیل علیہم السلام سے فرمایا کہ: ''میں نے تم میں بھائی چارہ قائم کر دیا اور تم دونوں میں سے ایک کی عمر درازتر کر دی۔ تم میں سے کون ایثار کرے گا؟'' لیکن دونوں میں سے ہر ایک اپنی درازتر عمر کا خواہاں تھا۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ''تم نے ایسا کیوں کیا کہ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا تھا کہ میں نے اسے محمدؐ کے ساتھ بھائی بنایا تھا تو اس نے اپنی جان فدا کر دی اور آپ ﷺ کے لئے ایثار کیا اور پیغمبر کے بستر پر ان کی جگہ سو گئے۔ تو جاؤ اور زمین پر اور اس کی حفاظت اس کے دشمن سے کرو''۔ جبریل اُن کے سرہانے کھڑے ہو گئے تو میکائیل پائنتی کی طرف کھڑے ہو گئے۔ اور بولے: ''خوشا بحال تو اے پسرِ ابوطالب! کہ حق تعالیٰ اپنے فرشتوں کے سامنے تجھ پر فخر و مباہات فرماتے ہیں''۔ اور یہ آیت نازل ہوئی: ''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ'' (قرآن: ۲/۲۰۷) (لوگوں میں وہ بھی ہیں جو خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے جانفروشی کرتے ہیں)۔

حسین انطا کیؒ بزرگ مشائخ میں سے تھے۔ ایک ات تیس سے کچھ زائد اصحاب آپ کے پاس جمع ہو گئے تو روٹی پوری نہ تھی۔ جو کچھ تھی اس کے ٹکڑے کر لئے اور سب کے سامنے رکھ دیئے۔ اور چراغ وہاں سے لے گئے اور بیٹھ گئے۔ جب چراغ واپس لائے تو دیکھا کہ روٹی کے وہ ٹکڑے اسی طرح موجود تھے۔ کسی نے بھی اس لئے نہ کھایا کہ میرا ساتھی کھا سکے۔

حذیفہ عدوی کہتے ہیں کہ ''جنگ تبوک کے دن مسلمانوں میں سے بہت سے شہید ہو گئے۔ تو میں پانی لے کر اپنے چچازاد کی تلاش میں نکلا تو دیکھا کہ وہ کوئی دم کا مہمان ہے پوچھا پانی چاہتے ہو تو بولے ہاں' اتنے میں ایک دوسرے نے کہا اے وائے پیاس! تو میرے چچازاد نے کہا کہ ان کو پلاؤ تو میں ان کے پاس لے گیا تو ہشام بن العاص جان دینے کے قریب تھا۔ تو میں نے اس سے کہا پانی لو تو اتنے میں ایک اور نے کہا آہ! تو ہشام نے بہ اشارہ کہا کہ اسے دو۔ جب اس کے پاس پہنچا تو وہ مر چکا تھا۔ جب ہشام کی طرف لوٹا تو وہ بھی جان ہار چکا تھا اپنے چچازاد کے پاس آیا تو وہ بھی جان ہار چکا تھا''۔

اور کہا جاتا ہے کہ کوئی جس طرح دنیا میں آتا ہے اس طرح واپس نہیں جاتا سوائے بشر حافیؒ کے۔ جانکنی کے وقت ایک سائل نے آکر کچھ مانگا تو آپ کے پاس کچھ نہ تھا۔ سوائے اپنے کرتے کے۔ اتار ااور اسے دے دیا۔ اور مستعار لباس طلب کیا اور فوت ہو گئے۔

سخاوت و بخل کے بیان میں

نیز یہ جاننے میں کہ سخی کون ہے اور بخیل کون

یاد رہے کہ جو کوئی خود کو سخی سمجھتا ہے ہو سکتا ہے دوسرے اسے بخیل جانتے ہوں۔ پس حقیقت اس کی جاننا ضروری ٹھہرا۔ کیونکہ بڑی سخت بیماری ہے تو جب اس کی تشخیص نہ ہو علاج نہیں کرتے۔ اور کوئی ایسا نہیں ہوتا کہ جو کچھ اس سے لوگ طلب کریں سب کا سب دے دے۔ پس اگر اس بناء پر حکم لگایا جائے کہ وہ بخیل ہے تو اس طرح ہر کوئی بخیل قرار پائے گا۔ اس لئے اس باب میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن بیشتر کی رائے یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ جو امر شرع نے فرض قرار دیا ہے جو اس کا انکاری ہو وہ بخیل ہے۔ اور اگر یہ آسانی عطا کر دے تو وہ بخیل نہ کہلائے گا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ حکم پسندیدہ نہیں جو کوئی نانبائی کو نان دے اور قصاب کو گوشت دے کہ اس میں کوئی کمی ہو تو وہ بخیل ٹھہرے گا۔ اسی طرح جو اپنے اہل وعیال کو قاضی کے مقرر کردہ انداز سے کم نفقہ فراہم کرے اور اس میں ایک لقمہ بھی کم ہو تو وہ بخیل ہوگا۔ اور ہر وہ شخص جو اپنے سامنے روٹی رکھے بیٹھا ہو اور کسی مفلس کو دور سے دیکھ کر روٹی چھپالے بخیل کہلائے گا۔ پس درست یہ ہے کہ بخیل وہ ہے جو دینے والی شے کو نہ دے۔ مال کو ایک حکمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تو جب حکمت دینے کا اقتضا کرے تو اس وقت اس کا روکنا بخل ہوگا۔ اور دینے والی شے وہ ہوتی ہے کہ جسے دینے کا حکم شرع یا مروت دے کہ دنیا چاہئے اور شرعاً واجبات معلوم ہیں۔ اور شرع نے اسی قدر پر اکتفا کیا ہو کہ بخیل اس کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ جیسا کہ فرمان خداوندی ہے کہ: ''اِنۡ یَّسۡـَٔلۡكُمُوۡهَا فَيُحۡفِكُمۡ تَبۡخَلُوۡا وَيُخۡرِجۡ اَضۡغَانَكُمۡ '' (قرآن: ۴۷/۳۷) (جب اس مالِ دنیا میں سے طلب کرتا ہے اور اصرار برتتا ہے تو تم بخل اختیار کرتے ہو تو تمھارے کینوں کو باہر لایا جاتا ہے)''۔

اور واجب مروت لوگوں کے احوال اور مقدارِ مال اور وہ جس کے ساتھ بخل کیا ہوگا اُن کے پیش نظر متغیّر ہوگا پس ایسی بہت سی چیزیں ہیں کہ جو دولت مندوں کی طرف سے معمول ہوں تو بری لگتی ہیں لیکن مفلسوں کی طرف سے ہوں تو بری نہیں لگتیں اور اہل وعیال کے ساتھ ہوں تو بری ہوں لیکن بیگانوں کے ساتھ بری نہ ہوں ۔ دوستوں کے ساتھ ہوں تو بری ہوں لیکن بیگانوں کے ساتھ بری نہ ہوں ۔ مہمانی میں بری ہوں ۔ لیکن

اس کی سی بیع و معاملت میں بری نہ ہوں۔ بوڑھوں سے ہوں تو بری ہوں لیکن جوانوں سے وجود میں آئیں تو بری نہ ہوں۔ مردوں کی طرف سے ظہور پذیر ہوں تو بری ہوں لیکن وہ عورتوں کی طرف سے ہو تو بری نہ ہوں۔

پس حداس کی یہ ہے کہ گو مال کی حفاظت مطلوب ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ 'غرض' مال کی حفاظت کی نسبت مقصود تر ہو۔ تو ایسے میں امساک بخل ہوگا۔ اور جب مال کی حفاظت زیادہ اہم ہو تو ایسے میں اس کا صرف اسراف ہوگا۔ اور یہ دونوں ناپسندیدہ ہیں۔ پس جب کوئی مہمان آ جائے تو مروت کو ملحوظ رکھنا حفظِ مال کی نسبت اہم تر ہوگا۔ اور مال کو اس بناء پر روکنا کہ میں نے زکوٰۃ دے دی ہے بری بات ہے اور یہ بخل ہوگا۔ اور جب ہمسایہ بھوکا ہو جب کہ آپ کے پاس کھانا بہت ہو تو ایسے میں کھانا نہ دینا بخل ہوگا۔ اگر آپ نے شرع کے واجبات ادا کر دیئے ہوں اور مروت کے تقاضے بھی پورے کر دیئے ہوں تو پھر بھی بہت سا مال بچ رہا ہو تو آخرت کے ثواب کی آرزو میں صدقات بہت اہم ہیں۔ اور مال کو زمانے کے حوادث کے خدشات کے پیش نظر محفوظ رکھنا بھی اہم ہے لیکن اغراض ثواب کے مقابلے میں خدشات کی بناء پر مال روکنا اہل نظر کے نزدیک بخل ہے اور عوام کی نگاہ میں بخل نہیں ہے۔ کیونکہ عوام کی نظر محض دنیا ہی تک محدود ہوتی ہے اور یہ امر اختلافِ نظر کے تحت متفاوت و متغیر ہوتا ہے۔

پس اگر کوئی شرع کے واجبات پورے کرنے اور مروت کے تقاضوں پر عمل کرنے میں کمی نہ کرے تو وہ بخل سے نجات پا گیا لیکن درجہ سخا تب پائے گا کہ جب اس میں اضافہ کرے گا تو جس قدر اضافہ کرے گا اسی کے مطابق سخاوت میں درجہ حاصل ہوگا۔ اور وہ اس کا ثواب پائے گا۔ یہ تھوڑا ہو یا بہت ہر کوئی اپنی مقدار کے مطابق ثواب پائے گا۔ اور سخی اس وقت ہوگا کہ عطا اس کے لئے نہایت آسان ہو۔ اور بہ رنج و زحمت دے تو سخی نہیں سمجھا جائے گا اور جواد اور سخی درحقیقت وہ ہوتا ہے جو بے غرض عطا کرے۔ اور یہ آدمی کے لئے محال ہے۔ بلکہ یہ صفت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ لیکن اگر کوئی ثوابِ آخر یا نیک نامی پر کفایت کرے تو اسے مجازاً سخی کہا جائے گا کیونکہ وہ اس دنیا میں کسی عوض کا طالب نہیں ہوتا۔ دنیا میں سخا اس کو کہتے ہیں۔

لیکن دین میں سخاوت یہ ہے کہ انسان دوستیٔ حق تعالیٰ کے لئے جان بازی سے دریغ نہ کرے۔ اور آخرت میں کسی معاوضے کا طالب نہ ہو۔ اور فقط دوستیٔ حق تعالیٰ اس کا منتہائے مطلوب ہو اور بس۔ تو ایسے میں جان فدا کرنا خود مقصود ہو اور اس کے لئے روحانی سرور کا باعث ہو۔ اگر کسی معاوضے کی امید رکھتا ہو تو یہ تجارت ہے سخاوت نہیں۔

بخل کا علاج معلوم کرنا

یادر ہے کہ بخل کا علاج بھی علم وعمل کا مرکب ہے۔اور علم یہ ہے کہ پہلے بخل کے اسباب کی تشخیص ہو کیونکہ جب تک بیماری کا سبب معلوم نہ ہو علاج ممکن نہیں اور سبب بخل کا شہوات سے محبت ہے۔کیونکہ مال کے بغیر حصول شہوات کی تکمیل ممکن نہیں اور ایسے مریض کو لمبی عمر کی امید بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر بخیل کو معلوم ہو کہ اس کی زندگی ایک دن یا ایک سال سے زاید نہیں تو راہِ حق میں مال صرف کرنا اس پر دشوار نہیں ہوگا۔سوائے اس کے کہ اس کا کوئی بیٹا بھی ہو۔تو اس وقت تو اپنے بیٹے کی بقا اپنی بقا کی مانند تصور کرتا ہے تو بخل اس کا اور پختہ ہو جاتا ہے۔اسی بناء پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''اولاد بخیلی، بزدلی اور جہالت کی کان ہے''۔

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ مال کی محبت سے بری شہوت جنم لیتی ہے۔یا اگر شہوت کے لئے نہ ہو عین مال اس کا محبوب ہوتا ہے اور وہ بہت بوڑھا ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے پاس اس قدر زیادہ مال ہے کہ آمد بھی ہے اور اس کی غلہ خیز زمین بھی ہے جو قیامت تک اس کے زن وفرزند کے۔لئے کافی ہے علاوہ کثیر نقد کے کہ جس کا وہ مالک ہے۔اور اگر بیمار پڑ جائے تو علاج نہیں کرتا، زکوۃ نہیں دیتا، اور مال کو محفوظ کرنے کے لئے زمین میں گاڑنے کا اسے لپکا ہو باوجود اس کے کہ جانتا ہے کہ مجھے مرنا ہے۔اور مال اس کا دشمن لے جائے گا۔لیکن بخل اسے خرچ کرنے اور دینے سے روکتا ہے۔اور یہ ایسی ظالم بیماری ہے کہ اس کا علاج کم ہی ممکن ہے۔

اب جب تمھیں سبب معلوم ہوگیا تو شہوات کی دوستی کا علاج تھوڑے پر قناعت اور صبر اور ترکِ شہوات کے ذریعے ممکن ہے تا کہ انسان مال سے بے نیاز ہو جائے اور طویل زندگی کی امید کا علاج یوں کرسکتا ہے کہ اپنی موت کو بہت سوچے اور اپنے حبیبوں کو دیکھے کہ اسی کی طرح غافل تھے اور ناگاہ مر گئے۔اور حسرت ساتھ لے گئے۔اور مال دشمنوں نے ظلم وستم پر تقسیم کردیا۔اور اولاد کی مفلسی کے خوف کا علاج یوں کرے کہ جان لے کہ جس نے انھیں پیدا کیا ہے اس نے ان کے ساتھ ہی ان کا رزق بھی مقدر کردیا ہے۔اگر اللہ تعالیٰ نے ان کا مقدر افلاس کردیا ہے تو وہ آپ کے بخل کے بل پر دولت مند نہیں ہونے کے۔بلکہ اس مال کو اڑائیں گے۔اور اگر اللہ تعالیٰ نے دولت مندی ان کا مقدر ٹھہرادی ہو تو کسی اور جگہ سے اس کا سامان کردے گا۔نہیں دیکھتا کہ کتنے ہی دولت مند ایسے ہیں جنھوں نے اپنے باپ سے ورثہ میں کچھ نہیں پایا تھا اور کتنے ہی ایسے ہیں جنھوں نے ورثہ میں کثیر مال پایا تھا۔لیکن وہ سب جاتا رہا۔جاننا چاہئے کہ اگر اولاد اللہ کی فرماں بردار ہوگی تو یہ بہت کافی ہے۔ورنہ درویشی ہی میں اس کے دین ودنیا کی مصلحت ہوگی تا کہ فرزند مال کو فساد میں صرف نہ کرے۔

اور بخل کی مذمت میں اور سخاوت کی مدح میں جو کچھ احادیث میں وارد ہے اس پر انسان کو غور کرنا

چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ مستقر بخیل کا سوائے دوزخ کے اور کوئی نہیں۔ اگرچہ اس نے طاعت بہت کی ہو۔ لیکن اس کا کیا حاصل ہے اور کیا فایدہ ہوگا اس مال سے قبل اس کے خود کو دوزخ سے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے نہ خریدے۔ نیز بخیلوں کے احوال پر غور کرے کہ کس قدر دلوں پر گرانی کا باعث ہیں اور لوگوں کی نگاہوں میں کتنے پست دکھائی دیتے ہیں سب انھیں دشمن جانتے ہیں اور ان کی مذمت کرتے ہیں۔ اس لئے اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ بھی اسی طرح لوگوں کے دل ونگاہ میں ناگوار اور حقیر وخسیس ہوگا۔

بخل کا عملی علاج: یہ ہے کہ اس امر میں پورے غور وفکر سے کام لے۔ اگر بیماری مزمن نہیں ہے۔ ایسی کہ علاج قبول نہ کرے تو خرچ کی رغبت اس میں پیدا ہو تو چاہئے کہ عمل میں مشغول ہو جائے۔ اور اولیں خیال ہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے خرچ کرنا شروع کردے۔ ابوالحسن بوشنجہؒ طہارت کی جگہ میں تھے کہ آپ نے وہیں سے ایک مرید کو آواز کی کہ ''میری قمیص لو اور محتاج کو دے دو'' تو مرید نے پوچھا کہ آپ نے انتظار کیوں نہ کیا کہ جائے ضرور سے باہر آکر کرتا درویش کو دے دیتے'' تو آپ نے فرمایا کہ مجھے خوف تھا کہ کہیں ایک دوسرا خیال آکر اس سے مانع ہو جائے''۔

مال عطا کئے بغیر بخل کا ازالہ ممکن ہی نہیں جیسے عاشق عشق سے نجات نہیں پا سکتا جب تک سفر کر کے معشوق سے دور نہ ہو جائے اور مال کے عشق کا علاج بھی مال سے جدائی اختیار کرنے میں ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اگر مال کو سمندر کی نذر بھی کردے تاکہ اس کی محبت سے نجات پا جائے تو اولیٰ تر ہے اس سے کہ بخل کے لئے مال کو روکے رکھے۔ بخل کے علاج معالجے کے لطیف طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ خود کو نیک نامی پر فریفتہ کرے اور کہے کہ: ''خرچ کرتا کہ لوگ تجھے سخی کہیں اور تجھے اچھا سمجھیں'' اور ریا اور جاہ کو مفسدۂ مال پر مسلط کردے۔ موجب مال سے نجات پا جائے تو ریا کا علاج کرے۔ جیسے کہ بچے کا دودھ چھڑاتے ہیں تو اسے کسی شے سے خوش کرتے ہیں۔ جو اسے پسند ہوتی ہے تاکہ وہ اس میں لگ کر دودھ کو بھول جائے۔

اخلاقی برائیوں کے استیصال کے لئے یہ اچھا طریقہ ہے کہ ایک صفت کو دوسری صفت پر مسلط کیا جائے تاکہ اس کی قوت سے انسان اخلاقی برائی سے نجات پا جائے۔ اور یہ ایسے ہی ہے کہ خون اگر پانی سے کپڑے پر سے دور نہ ہوتا سے پیشاب سے دھوتے ہیں تاکہ خون کو چھڑا دے اور پھر اس پیشاب کو پاک پانی سے دھو کر دور کر دیتے ہیں۔ جو کوئی بخل کو ریا کے ذریعے خود سے دور کرے تو اس نے گویا پلیدی کو پلیدی ہی سے دھویا لیکن اگر ریا پر ٹھہر نہ جائے تو اس نے خوب کیا ہوگا۔ بلکہ اگر ریا پر بھی ٹھہر گیا تو بھی فایدے میں رہا کیونکہ بخل اور اپنی تعریف سننے کا شرف دونوں کوئے بشریت سے ہیں۔ لیکن بشریت کے کوچے میں گلخن بھی ہے اور

گلشن بھی بھی اور بخل بشریت کی راہ کا گلخن ہے اور سخاوت برائے نیک نامی کوئے بشریت کا گلشن ہے۔اور سخاوت نیک نامی کے لئے حرام نہیں کیونکہ ریا عبادت میں حرام ہوتی ہے اور بس۔اور خدا کے لئے دینا اور خدا کے لئے رکھنا کوئے بشریت سے باہر ہے۔اور نہایت پسندیدہ ہے۔پس بخیل کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ازراہِ اعتراض کہے کہ ''فلاں تو خرچ بہ ریا کرتا ہے'' کیونکہ ریا کے لئے عطا بے ریا امساک وبخل سے زیادہ اچھی ہے۔جیسے کہ گلشن میں قیام کاٹھ کباڑ کے ڈھیر پر قیام سے بہتر ہے۔بخل کا علاج یہی ہے جو بیان ہو چکا۔یعنی تکلیف اور رنج کے باوجود عطا کرتے رہنا یہاں تک یہ فطرت ثانی بن جائے۔مشائخ میں سے بعض اپنے مریدوں کا علاج اس طرح کرتے تھے کہ کسی مرید کو اجازت نہ دیتے کہ جداگانہ خلوت گاہ میں رہے اور دل اس سے لگائے۔جب دیکھتے کہ اس نے اس گوشے میں دل لگا لیا ہے تو اسے دوسرے زاویے میں منتقل کر دیتے اور اس کا پہلا زاویہ کسی اور مصرف میں لے آتے یا دوسرے مرید کو دے دیتے۔اگر دیکھتے کہ کسی نے نئے جوتے پہنے ہیں اور دل کو اس میں مصروف دیکھتے تو جوتا اس سے لے کر دوسرے کو دے دیتے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ اپنے نعلین میں اچھا سا تسمہ ڈالا۔نماز میں آپ ﷺ کی نظر اس نئے تسمہ پر پڑی تو آپ نے وہی پرانا تسمہ طلب کیا اور نئے تسمے کو نکال کر وہی پرانا تسمہ نعلین میں ڈال لیا۔جب آپ نے یوں کیا تو معلوم ہوا کہ مال سے دل کو خالی کرنے کی اور کوئی ترکیب بجز اس کے نہیں کہ مال کو خود سے دور کر دیا جائے۔کیونکہ جب تک ہاتھ مال سے فارغ نہ ہو دل بھی اس سے فارغ نہ ہوگا۔اسی سے درویش فراخ دل ہوتا ہے لیکن جب اس کے پاس مال جمع ہونے لگتا ہے تو اسے جمع آوری میں مزا آنے لگتا ہے۔نتیجۃً بخیل ہو جاتا ہے اور جو چیز موجود ہی نہ ہو دل اس سے فارغ ہوتا ہے۔

ایک بادشاہ کو کسی نے فیروزہ کا مرصع پیالہ تحفے میں دیا۔ایسا کہ دنیا میں اس کی نظیر نہ تھی۔ایک دانا بھی وہاں موجود تھا تو بادشاہ نے اس سے کہا کہ ''یہ پیالہ آپ کی نگاہ میں کیسا ہے؟'' تو اس دانا نے کہا کہ ''یہ مصیبت ہے یا افلاس۔جب تک یہ نہ تھا تو تُو ان دونوں سے امن میں تھا''۔بادشاہ نے کہا ''کس لئے؟'' تو دانا نے کہا کہ اگر ٹوٹ گیا تو مصیبت ہے کہ اس کا سا اور کوئی ہے نہیں اور چوری ہو جائے تو فقر اور محتاجی ہوگی جب تک کہ دوبارہ دستیاب ہو''۔پھر اتفاق ایسا ہوا کہ وہ بے نظیر پیالہ ٹوٹ گیا۔تو اس پر بادشاہ کو بہت رنج ہوا تو بولا کہ ''اس مرد دانا نے صحیح کہا تھا''۔(۱)

---

(۱) اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا جامِ جم سے میرا جام سفال اچھا ہے (غالب)

مال کا منتر معلوم کرنا

یاد رہے کہ مال مانند مار کے ہے کہ سانپ میں بیک وقت زہر بھی ہوتا ہے اور تریاق بھی۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ تو جو کوئی سانپ کا منتر نہیں جانتا ہو تو اگر وہ سانپ کو ہاتھ میں لے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔

اس بناء پر روا نہیں ہی کہ کوئی یہ کہے کہ ''صحابہ میں بھی تو عبدالرحمٰن بن عوف جیسے دولت مند تھے۔ اس لئے دولت مندی میں کوئی عیب نہیں''۔

یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی لڑکا کسی افسونگر کو دیکھے کہ سانپ کو پکڑ کر ٹوکری میں ڈال لیتا ہے اور خود گمان یہ کرے کہ سانپ نرم ہوتا ہے اور مار گیر اسے پکڑ لیتا ہے اور سانپ ہاتھ میں خوش ہوتا ہے۔ تو نادان لڑکا بھی اسے پکڑنے لگے تو ناگاہ ہلاک ہو جائے گا۔

مال کے منتر پانچ ہیں:

پہلا منتر: یہ ہے کہ انسان کو معلوم ہو کہ مال کو کیوں وجود میں لایا گیا ہے جیسے ہم بیان کر چکے ہیں کہ مال کو کھانے کپڑے مکان کہ انسان کی جسمانی ضروریات ہیں کی فراہمی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور جسم حواس کے لئے ہے۔ اور حواس عقل کے لئے ہیں اور عقل دل کے لئے تا کہ معرفتِ حق تعالیٰ کے لئے آراستہ ہو جائے۔ تو جب انسان نے یہ جان لیا تو دل کو اپنے مقصود کے بہ قدر اس سے وابستہ کرے گا اور مقصود میں اس کی حکمت کو بروئے کار لائے گا۔

دوسرا منتر: یہ ہے کہ مال کے ذریعۂ آمد کو ملحوظ رکھے تا کہ حرام ذریعے سے نہ ہو۔ اور مشتبہ بھی نہ ہو اور ایسے ذرائع سے بھی نہ ہو جو مذموم ہیں: مثلاً رشوت، گدائی، جراحت کی مزدوری وغیرہ۔

تیسرا منتر: یہ ہے کہ مال کی مطلوب مقدار کو ملحوظ رکھے تا کہ ضرورت سے زایدہ جمع نہ کرے۔ اور جو ضرورت سے زاید ہے کہ نہ زادِراہ دین میں اس کی حاجت ہو تو اہل حاجت کے حق کو پہچانے اور جب محتاج دکھائی دے تو جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہے اسے محتاج سے نہ روکے۔ اگر ایثار کی طاقت نہیں رکھتا تو کم از کم حاجت روائی کے موقع پر تقصیر نہ کرے۔

چوتھا منتر: یہ ہے کہ اپنے خرچ پر نگاہ رکھے تا کہ بجز کفایت کے صرف نہ کرے اور تھوڑے پر قناعت کرے۔ اور بحق خرچ کرے۔ کیونکہ ناحق خرچ ناپسندیدہ ذرایع آمد ہی کی طرح ناپسندیدہ ہے۔

پانچواں منتر: یہ ہے کہ آمد و خرچ میں صحیح اور نیک نیت کو ملحوظ رکھے جو کچھ بھی حاصل کرے اہل وعیال کی فراغت کے لئے کرے اور جس کو ترک کرے اسے زہد اور دنیا کی تحقیر کی بناء پر ترک کرے۔ اس لئے کہ

اپنے دل کو مال کی حفاظت کی فکر سے بچا سکے تا کہ سکون کے ساتھ ذکرِ تعالیٰ میں مشغول ہو سکے۔ اور مال میں سے جو بچا رکھے وہ ایسی حاجت کے لئے ہونا چاہئے جو نہایت اہم ہو۔ راہِ دین کی فراغت کے لئے ہو اور ضرورت کا منتظر ہو تا کہ مال صرف کر سکے۔ جب ایسا کرے گا تو مال اس کے لئے باعثِ ضرر نہیں ہو گا اور اسے مال سے تریاق حاصل ہو گا نہ کہ زہر۔

اسی لئے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ اگر کوئی اللہ کے لئے پوری روئے زمین پر موجود مال پر قابض ہو جائے اور اسے اللہ ہی کی راہ میں دے دے تو وہ زاہد ہے۔ اگرچہ وہ دولت مند ترین خلق ہے۔ لیکن اگر وہ سب کچھ ترک کر دے لیکن ترک اللہ کے لئے نہ ہو تو وہ زاہد نہیں۔

پس دل کا قبلہ عبادت اور زادِ آخرت ہونا چاہئے تا کہ انسان جو حرکت بھی کرے اگر سراسر قضائے حاجت ہو یا طعام ہو سب عبادت ہو گی۔ اور ان سب پر ثواب ملے گا۔ کیونکہ راہِ دین میں ان سب کی حاجت ہوتی ہے اور اہم نیت ہی ہے چونکہ اکثر لوگ اس سے عاری ہوتے ہیں اور ان منتروں اور عزائم سے ناآگاہ ہوتے ہیں۔ یا جانتے تو ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کرتے تو اولیٰ تر یہ ہے کہ مال سے حتی الوسع بہت دور رہیں کہ اگر کثرتِ مال انسان کو تکبّر اور غفلت میں مبتلا نہ بھی کرے تو درجات آخرت میں کمی کا باعث تو ہو گا۔ اور اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہو گا؟ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو مال بہت سا پیچھے چھوڑ گئے۔ تو بعض صحابہ نے کہا کہ ہم ان کے بارے میں بہت خایف ہیں کہ انھوں نے ترکے میں بہت مال چھوڑا ہے۔ تو اس پر کعب احبار رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''سبحان اللہ آپ لوگ خایف کیوں ہیں کیونکہ انھوں نے مال حلال ذرایع سے حاصل کیا اور بحق صرف کیا اور جو کچھ پیچھے چھوڑا ہے حلال چھوڑا ہے اس لئے خوف کیوں؟'' یہ بات حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی تو آپ گھر سے نکلے خشمگیں۔ ہاتھ میں اونٹ کی ایک ہڈی تھی۔ اور کعب کی تلاش میں تھے کہ اسے ماریں۔ کعب ان سے بھاگ کر حضرت عثمانِ عفان کے گھر میں داخل ہو گئے۔ تو ابوذر بھی ان کے تعاقب میں ان کے پاس پہنچ گئے تو بولے ''ہاں اے یہودی کے بچے تو کہتا ہے کہ کیا خوف اس کا کہ عبدالرحمٰن بن عوف نے ترکے میں چھوڑا ہے؟ رسول ﷺ ایک دفعہ کوہِ اُحد کی طرف جا رہے تھے اور میں ان کے ہمراہ تھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اے ابوذر!'' تو میں نے کہا ''لبیک یا رسول اللہ!'' تو آنحضرت نے فرمایا کہ ''مالدار قیامت کے دن کم ترین اور پست ترین خلق ہوں گے۔ سوائے اس کے جو دائیں بائیں آگے پیچھے مال نفقہ کرے اور عطا کرے تو اے ابوذر میں نہیں چاہتا کہ میرے پاس احد سے کئی گنا سونا ہو اور میں اسے راہِ حق میں صرف نہ کروں اور جب میں مروں تو اس دن دو قیراط بچا ہوا ہو' رسول ﷺ نے تو یہ بتایا ہے اور تو یہودی

بچہ وہ کہہ رہا ہے تُو دروغ گو ہے اور دروغ زن'' ابوذر رضی اللہ عنہ نے جب یہ کہا تو کسی نے اس کا جواب نہ دیا۔ ایک دفعہ عبدالرحمٰن بن عوف کے اونٹوں کا کاروان یمن سے تجارت کے بعد مدینہ واپس آیا تو مدینہ میں اس کا غلغلہ بلند ہوا۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ ''یہ کیا ہے؟'' تو لوگوں نے کہا کہ ''عبدالرحمٰن بن عوف کے اونٹ ہیں'' تو آپ نے فرمایا کہ ''آنحضرت نے درست فرمایا ہے'' عبدالرحمٰن بن عوف کو خبر ملی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یوں کہا ہے۔ تو اس بات سے بہت پریشان ہوئے۔ اور اسی وقت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: ''اے عائشہ! آنحضرت نے کیا فرمایا تھا؟'' تو آپ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ: ''مجھے بہشت دکھائی گئی تو مفلس اصحاب کو میں نے دیکھا کہ وہ جلدی جلدی بہشت میں داخل ہو رہے تھے۔ لیکن کوئی دولت مند ان میں نظر نہیں آیا سوائے عبدالرحمٰن عوف کے جو چل نہیں سکتا تھا لیکن ہاتھ پاؤں کے سہارے رینگ کر بہشت میں داخل ہوا''۔ تو عبدالرحمٰن نے کہا ''اے عائشہؓ یہ تمام اونٹ اور وہ جو کچھ لائے ہیں یا ان کی پیٹھ پر ہے میں نے سب کا سب صدقہ کر دیا اور وہ تمام غلام جوان اونٹوں کے ہمراہ ہیں سب کو آزاد کر دیا۔ تاکہ ممکن ہے کہ میں بھی دیگر اصحاب کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤں''۔ آنحضرت ﷺ نے عبدالرحمٰن عوف سے کہا کہ: ''میری امت کے وہ دولت مند جو جنت میں داخل ہوں گے تُو ان میں سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگا لیکن کوشش وکاوش اور رینگنے کے بغیر داخلِ بہشت نہ ہو سکے گا''۔ بزرگ صحابہ میں سے ایک فرماتے ہیں کہ ''میں نہیں چاہتا کہ روزانہ ہزار دینار ذرائع حلال سے حاصل کروں اور حق تعالیٰ کی راہ میں صرف کر دوں اگرچہ نماز باجماعت اور روزہ سے باز نہ رہوں''۔ تو پوچھا گیا کہ ''کیوں؟'' تو جواب دیا کہ ''تاکہ مجھے موقف سوال وجواب میں نہ کہا جائے کہ ''میرے بندے کہاں سے حاصل کیا اور کہاں صرف کیا؟'' کیوں کہ میں سوال کے جواب کی تاب اور حساب دینے کی قوت نہیں رکھتا''۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''روزِ قیامت ایک ایسے شخص کو لایا جائے گا جس نے مالِ حرام کسب کیا ہوگا۔ اور حرام ہی میں صرف کیا ہوگا تو اسے دوزخ میں لے جائیں گے۔ ایک اور کو لائیں گے جس نے حرام ذرائع سے مال حاصل کیا ہوگا لیکن حلال مواقع پر خرچ کیا ہوگا۔ اسے بھی دوزخ میں بھیج دیں گے۔ پھر ایک اور کو لایا جائے گا کہ جس نے مال حلال ذرائع سے حاصل کیا ہوگا لیکن حرام میں صرف کیا ہوگا۔ اسے بھی دوزخ میں لے جائیں گے۔ اس کے بعد چوتھے کو لائیں گے جس نے بذریعہ حلال کسب کیا ہوگا اور حلال اور بحق صرف کیا ہوگا تو کہا جائے گا کہ اس کو روکئے کہ اس نے اس مال کے طلب میں وضو میں یا نماز میں یا نماز کے دوران رکوع وسجود میں تقصیر کی ہوگی اور نہ وقت پر اور نہ تمام شرائط کے مطابق نماز ادا کی ہوگی؛ تو وہ کہے گا: ''اے

اللہ میں نے حلال ذرائع سے مال حاصل کیا اور بحق صرف کیا اور کسی فریضے کی ادائیگی میں بھی تقصیر نہیں کی، تو اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ 'شاید کہ ریشمی لباس پہنا ہو اور اسپ وتجمل کا سامان فخر ولاف کے لئے کیا ہو' تو کہے گا کہ بارِ خدایا میں نے کسی فریضے میں تقصیر نہیں کی اور میں نے اس مال سے تفاخر نہیں کیا؛ تو اس سے کہا جائے گا کہ ''ہوسکتا ہے کہ کسی یتیم یا مسکین یا ہمسائے کے حق میں یا خویش واقارب کے حق میں تم نے تقصیر کی ہوگی' تو کہے گا: ''بارِ خدایا میں نے حلال ذرائع سے حاصل کیا اور بحق خرچ کیا اور فرایض میں تقصیر نہیں کی اور اس مال پر ناز نہیں کیا اور کسی کے حق میں تقصیر نہیں کی اس پر وہ سب جن کے بارے میں تقصیر کی ہوگی آ جائیں گے اور اس سے الجھیں گے اور کہیں گے کہ: ''بارِ خدایا تو نے اسے ہم میں سے مال ونعمت سے سرفراز کیا اس سے ہمارے حق کے بارے میں پوچھئے تو ایک ایک کے بارے میں سوال ہوگا اگر اس نے کوئی تقصیر نہ کی ہوگی تو کہا جائے گا کہ ٹھہر جا اور اس نعمت کا شکر لا اور جو لقمہ تو نے اپنے منہ میں ڈالا اور جو لذت تو نے پائی اس کا شکر لا' اور اس طرح اس سے گوناں سوال کیئے جائیں گے۔ اور کئے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلاف میں سے کسی کو دولت مندی کی طرف رغبت نہ تھی کہ اگر عذاب نہ ہوا تو حساب تو ہوگا اور اس طرح؛ اور آنحضرت ﷺ جو امت کے پیشوا ہیں۔ انھوں نے فقر اسی لئے اختیار کیا تا کہ امت کو معلوم ہو کہ درویشی بہتر ہے۔

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''میں آنحضرت کے ساتھ بے تکلف تھا تو ایک روز آپ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ ''آؤ فاطمہؓ کی بیمار پرسی کو چلیں''۔ تو ہم چلے تو جب ان کے گھر کے دروازے پر پہنچے تو دستک دی اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''السلام علیک ہم اندر آجائیں؟'' تو جواب ملا ''آجایئے'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں اور ایک اور شخص کہ میرے ساتھ ہے؟'' تو حضرت فاطمہ نے فرمایا کہ میرے جسم پر سوائے ایک پرانے کمبل کے اوڑھنے کے لئے اور کوئی شئے نہیں''۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''سر کمبل میں کرلو اور سمٹ جاؤ''۔ تو حضرت فاطمہ نے فرمایا کہ ''تن ڈھانپتی ہوں تو سر ننگا رہ جاتا ہے'' تو آپ ﷺ نے ایک پرانی چادر ان کی طرف پھینکی کہ اس سے سر کو ڈھانپ لیں۔ اس کے بعد آپ اندر داخل ہوئے اور پوچھا کہ ''اے فرزند عزیز کیسی ہو؟'' تو حضرت فاطمہ نے جواب دیا کہ بیمار ہوں اور مبتلائے درد ہوں اور رنج اس بناء پر بڑھ جاتا ہے کہ بھوکی بھی ہوں۔ اس بیماری کے ساتھ کوئی شے موجود نہیں جسے منہ میں ڈال سکوں۔ اور میں بھوک کی تاب نہیں لاسکتی''۔ اس پر آنحضرت ﷺ رونے لگے اور فرمایا کہ ''اے فاطمہ جزع (بےصبری) نہ کر کہ اللہ کی قسم تین دن ہو گئے میں نے بھی کچھ نہیں کھایا۔ اور میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم سے گرامی تر ہوں اگر میں مانگتا تو اللہ مجھے عطا فرماتا لیکن میں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی''۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ حضرت فاطمہ کے کندھے پر رکھا اور فرمایا کہ ''تجھے

خوشخبری ہو کہ تجھے اللہ تعالیٰ نے بہشت کی عورتوں کا سردار بنایا ہے' تو حضرت فاطمہ نے استفسار فرمایا کہ ''فرعون کی بیوی حضرت آسیہؓ اور حضرت عیسیٰ کی ماں مریمؑ کیا ہوئیں؟'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''وہ اپنے اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار ہیں تم اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار ہو اور تم سب ایسے گھروں میں ہوگی جو موتیوں سے آراستہ ہو۔ اور ان میں نہ کوئی سروصدا نہ رنج نہ کوئی اور دل مشغولی ہوگی''۔ پھر فرمایا کہ ''اپنے چچازاد اور اپنے شوہر کو کافی سمجھ کہ میں نے تمھیں جوڑا اس کا بنایا ہے جو دنیا میں بھی سردار ہے اور آخرت میں بھی سردار ہے''۔

کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ''میں چاہتا ہوں کہ آپ کی صحبت میں رہوں''۔ تو وہ اکٹھے چلے حتی کہ ایک نہر کے پاس پہنچے۔ ان کے پاس تین روٹیاں تھیں۔ دو انھوں نے کھالیں۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہر کے کنارے وضو کے لئے چلے گئے۔ تو جب آپ لوٹے تو تیسری روٹی کو نہ پایا تو اس شخص سے پوچھا کہ ''روٹی کون لے گیا؟'' تو اس نے کہا ''مجھے نہیں معلوم'' پھر وہاں سے چلے تو ایک ہرنی دو بچوں کے ساتھ آ رہی تھی۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہرنی کے ایک بچے کو آواز دی تو وہ بچہ آپ کے قریب آ گیا۔ تو آپ نے اسے ذبح کیا تو وہ اسی وقت کباب بن گیا جسے ان دونوں نے سیر ہو کر کھایا۔ تو پھر آپ نے فرمایا کہ ''اے آہو بچہ اللہ کے حکم سے زندہ ہو جا''۔ تو وہ زندہ ہو گیا اور چلا گیا۔ تو آپ نے اس شخص سے کہا کہ ''اس اللہ کی قسم جس نے تجھے یہ معجزہ دکھایا۔ بتا وہ تیسری روٹی کہاں ہے؟'' تو وہ بولا ''میں نہیں جانتا'' تو وہ وہاں سے چل نکلے۔ تو ایسی جگہ پہنچے جہاں ریت بہت تھی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس ریت کو جمع کر کے کہا کہ ''اللہ کے حکم سے سونا بن جا''۔ تو ریت کا ڈھیر سونا بن گیا۔ تو آپ نے اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اور کہا ''ایک حصہ میرا ہے تو دوسرا تمھارا ہے اور تیسرا اس کا ہے جس کے پاس وہ تیسری روٹی ہے'' تو وہ شخص حرص زر میں بولا کہ ''وہ روٹی میرے پاس ہے''۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ''سونے کے تینوں ڈھیر تمھارے'' اور اس کے لئے چھوڑ دیئے اور چل دیئے۔ دو شخص وہاں آ گئے تو انھوں نے چاہا کہ اسے مار دیں اور سونا لے اڑیں۔ تو اس شخص نے کہا کہ مجھے قتل نہ کرو ہم اس کے تین حصے کر لیتے ہیں اور ہر ایک ایک حصہ لے لے۔ پھر انھوں نے کہا کہ کسی کو بھیجیں کہ ہمارے لئے کھانا خرید لائے۔ تو ان میں سے ایک چلا گیا۔ اور اس نے کھانا خریدا اور اپنے آپ سے کہنے لگا کہ ''افسوس وہ اس سونے کو حاصل کریں۔ میں کھانے میں زہر ملا دیتا ہوں تا کہ وہ دونوں کھائیں اور مر جائیں اور سارا سونا میں لے سکوں''۔ ادھر ان دو شخصوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ ''ہم اس تیسرے کو سونا کیوں دیں۔ جب لوٹے تو اسے مار ڈالیں گے تو اس طرح اس کا حصہ بھی ہمارے ہاتھ آ جائے گا''۔ تو جب وہ لوٹا تو انھوں نے اسے مار ڈالا۔ اور وہ زہر آلود کھانا جو وہ لایا تھا اسے کھا گئے

اور مر گئے۔ اور سونا پورے کا پورے اسی طرح باقی رہ گیا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام حواریوں کے ساتھ وہاں سے گذرے تو سونا سب وہیں پڑا تھا اور وہ تینوں وہاں مر پڑے تھے۔

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "اے میرے ساتھیو دنیا ایسی ہے اس سے بچو"۔

پس اس حکایت سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگرچہ انسان استاد اور افسوں گر ہو بہتر یہ ہے کہ مال پر نگاہ نہ ڈالے اور مال کے پیچھے۔ مقدارِ حاجت سے زیادہ کے لئے نہ لگے۔ کیونکہ مار افسا آخر سانپ ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوتا ہے۔ والسلام۔

اصلِ ہفتم: علاجِ دوستیٔ جاہ وحشمت

یاد رہے کہ بیشتر خلق اس میں ہلاک ہوئی ہے کہ جاہ وحشمت اور ناموری اور اپنی تعریف کے حصول میں مشغول تھی۔ اور اس کے باعث رشک، عداوت اور بہت سی معصیتوں میں گرفتار ہوئے ہیں۔ جب یہ شہوت غالب ہوئی راہ دین سے بھٹک گئے۔ اور دل نفاق اور خیانت جیسے اخلاق سے آلودہ ہو گئے۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: "مال و جاہ کی محبت دل میں نفاق کو ایسے ہی پیدا کرتی ہے جیسے پانی سبزے کو نشو ونما دیتا ہے۔ نیز فرمایا کہ "بھیڑوں کے گلے میں دو بھوکے بھیڑیئے وہ تباہی نہیں مچاتے جو تباہی مال و جاہ کی محبت مرد مسلمان کے دل میں مچاتی ہے"۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: "خلق کو دو چیزوں نے ہلاک کیا۔ ایک ہوا و ہوس کے تعاقب نے تو دوسرے اپنی تعریف کی خواہش نے۔ اور اس آفت سے وہی جان بر ہوسکتا ہے جو ناموری کا متلاشی نہ ہو اور گم نامی پر قانع ہو۔ کیونکہ فرمانِ خداوندی ہے کہ: "تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ"۔ (قرآن: ۲۸/۸۳) فرمایا (آخرت کی خوش نصیبی ہم نے اس کے لئے رکھی ہے جو دنیا میں بزرگی اور جاہ و فساد کا متلاشی نہ ہو"۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ "اہل بہشت خاک آلودہ پریشان مُو اور چرک اور میلے لباس والے ہیں جنھیں لوگ کوئی وقعت نہیں دیتے۔ اگر وہ گھروں میں داخل ہونا چاہیں تو اجازت نہیں ملتی۔ اگر وہ نکاح کے طالب ہوں تو کوئی ان کو اپنی بیٹی دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اور اگر وہ بات کریں تو کوئی ان کی نہیں سنتا۔ لیکن اگر ان کے چہرے کا نور تمام لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے تو وہ سب روزِ قیامت رہائی پا جائیں"۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اکثر خاک آلودہ پھٹے پرانے لباس میں ملبوس شخص اگر اللہ تعالیٰ کی قسم کھائے اور بہشت چاہے تو وہ اسے بہشت عطا فرمائے۔ اور اگر دنیا کی کوئی شے چاہے تو اسے نہ دے"۔ نیز آپ نے فرمایا کہ:

''میری امت میں بہت سے ایسے ہیں کہ اگر وہ ایک درم یا ایک دانہ مانگے تو تم اسے نہ دو لیکن اگر وہ اللہ تعالیٰ سے بہشت کی آرزو کرے تو اسے بہشت عطا ہو جائے۔ اور وہ دنیا کی کوئی شے چاہے تو اللہ اسے نہیں دیتا اس لئے نہیں کہ وہ پست ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو معاذ رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ رو رہا ہے۔ تو آپ نے پوچھا ''اے معاذ! کیوں رو رہے ہو؟'' تو معاذ بولے ''میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''ذرا سی ریا بھی شرک ہے۔ اور حق تعالیٰ گم نام پرہیزگاروں کو محبوب رکھتا ہے کہ اگر وہ غائب ہو جائیں تو کوئی ان کی تلاش میں نہیں نکلتا۔ اور اگر آموجود ہوں تو کوئی انھیں نہیں پہچانتا۔ دل ان کے ہدایت کے راستے کے چراغ ہوتے ہیں اور وہ تمام ظلمتوں اور شبہتوں سے نجات پا گئے ہوتے ہیں''۔

ابراہیم بن ادھم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''جو کوئی ہوا و ہوس اور نیک نامی کو عزیز رکھتا ہے تو وہ اللہ کے دین میں سچا نہیں''۔ ایوب سجستانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''صدق کی علامت یہ ہے کہ انسان نہیں چاہتا ہو کہ کوئی اس کو پہچانے'' ابی بن کعب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کی ایک جماعت چلی جارہی تھی تو حضرت عمر نے اسے تازیانہ مارا۔ تو بولے کہ: ''دیکھئے یا امیر المؤمنین آپ کیا کر رہے ہیں؟'' تو حضرت عمر نے فرمایا کہ: ''یہ پیچھے چلنے والے کے لئے مذلت ہے تو پیشرو کے لئے فتنہ ہے''۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ہر وہ احمق جو دیکھے کہ لوگ اس کی پیروی کر رہے ہیں تو کسی صورت اس کا دل ٹھکانے پر نہیں رہتا''۔ ایوب سختیانی رحمۃ اللہ علیہ ایک سفر میں تھے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ان کے پیچھے چل رہے ہیں۔ تو بولے کہ ''اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ میں اسے برا جانتا ہوں۔ تو میں اللہ کے غضب سے ڈرتا''۔ اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسلاف اس کو پسند نہ فرماتے تھے کہ لباس ان کا انگشت نما ہو۔ پرانا ہونے میں یا نیا ہونے میں۔ بلکہ ایسا ہی ہونا چاہئے کہ کسی کے بیان کا موضوع نہ بنے۔ بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا کہ جو اس بات کو عزیز رکھے کہ لوگ اسے پہچانیں اور اس کا دین تباہ نہ ہوا اور وہ رسوا نہ ہوا ہو''۔

حقیقتِ جاہ کا بیان

یاد رہے کہ دولت مند کے معنی یہ ہیں کہ زر و مال اس کی ملکیت ہوں اور ان کے تصرف پر وہ قادر ہو۔ اور محتشم اور مالک جاہ کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کے دل اس کی ملکیت میں ہوں۔ یعنی اس کے مسخر ہوں۔ اور اس میں اس کا تصرف جائز ہو۔ اور جب دل کسی کا مسخر ہو گیا تو مال بھی اس کا تابع ہے۔ اور دل اسی کا مسخر ہو گا جس کے بارے میں انسان نیک اعتقاد رکھتا ہو۔ یاد رہے کہ اس کی عظمت انسان کے دل میں کسی کمال کے باعث

ہوتی ہے جو معتقد علیہ میں ہو۔ خواہ علم کی بناء پر ہو یا عبادت حسنِ اخلاق یا قوت یا ایسی ہی کسی شے کی بناء پر ہو کہ جسے لوگ کمال و بزرگی سمجھتے ہوں۔ تو جب اس کا معتقد ہوا تو دل اس کا مسخر ہو گیا۔ اور پھر انسان طبعاً اس کی فرماں برداری پر راغب ہوگا۔ اور اس کی مدح وثناء میں زبان وقف کرے گا۔ اور تن بدن کو اس کی خدمت پر مامور کرے گا۔ اور خود کو مال فدا کرنے پر تیار رکھے گا۔ ایسے ہی جیسے کہ غلام آقا کے لئے مسخر تر ہوتا ہے۔ اسی طرح صاحبِ جاہ کا مرید اور دوست دار ہوتا ہے بلکہ غلام تو بہ جبر اپنے آقا کا مسخر ہوتا ہے۔ لیکن صاحب جاہ کے لئے انسان کی مسخری طوعاً اور طبعاً ہوتی ہے۔ پس معنی مال اسباب زر و مال کا مالک ہونا ہے۔ اور معنی جاہ لوگوں کے دلوں کا مالک ہونا ہے۔ بیشتر خلق کے نزدیک جاہ مال سے زیادہ محبوب ہوگا ہے۔ تین اسبا کی بناء پر:

ایک: یہ کہ مال اسی لئے محبوب ہوتا ہے کہ تمام ضرورتیں اس سے پوری ہو جاتی ہیں۔ اور جاہ بھی ایسے ہی ہے بلکہ جسے جاہ حاصل ہو تو اس کے لئے مال حاصل کرنا بھی آسان ہوتا ہے۔ اگر چہ خسیس (بخیل) اگر چاہے کہ مال کے ذریعے جاہ حاصل کرے تو یہ اس کے لئے دشوار تر ہوگا۔

دوسرے: یہ کہ مال خطرے میں ہوتا ہے کہ ضایع ہو جائے یا چوری ہو جائے یا صرف ہو جائے اور اس طرح تمام ہو جائے۔ لیکن جاہ اس خطرے سے مامون ہوتا ہے۔

تیسرے: یہ کہ مال میں بے رنج تجارت وزراعت وغیرہ فزونی نہیں ہوتی۔ لیکن جاہ سرایت کے باعث فروغ پاتا ہے۔ کیونکہ جس کا دل تمھارا شکار ہو گیا تو وہ جہاں بھی جاتا ہے تمھارے گن گاتا ہے حتٰی کہ دوسرے بھی نادیدہ تمھارا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور جس قدر نام شہرت پاتا ہے جاہ اسی قدر بڑھتا جاتا ہے اور تابعین میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پس جاہ و مال دونوں مطلوب ٹھہرے۔ اس لئے کہ تمام حاجات کی تکمیل کا وسیلہ ہیں۔ لیکن انسانی فطرت میں ہے کہ جاہ و ناموری کا طالب دور دراز شہروں میں بھی ہوتا ہے حالانکہ جانتا ہے کہ کبھی وہاں نہیں جائے گا اور اس میں ایک عظیم نکتہ ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ انسان فرشتوں کے گُہر سے ہے۔ اور الٰہی کاموں میں سے ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" (قرآن: ۸۵/۱۷) (کہئے کہ روح میرے رب کا امر ہے) پس انسان اس مناسبت کی شدت کی بناء پر حضرت ربوبیت سے ایک گونہ مناسبت رکھتا ہے۔ اور ربوبیت جوئی انسان کی طبیعت میں ہے۔ اور لزوم اس خیال کا ہر کسی میں ہے۔ جیسے کہ فرعون نے کہا تھا کہ: "اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی" (قرآن: ۷۹/۲۴) (میں ہوں تم سے برترین تمھارا رب) پس ربوبیت ہر کسی کو طبعاً محبوب ہوتی ہے اور معنی ربوبیت کے یہ ہیں کہ فقط وہی ہو اور کوئی اس کا شریک نہ ہو۔ کیونکہ اگر کوئی دوسرا بھی وجود رکھتا ہو تو یہ اس کے ناقص ہونے کی دلیل ہے۔ جیسے سورج کا کمال

اس میں ہے کہ وہ یکتا ہے اور نور سب کا سب اسی سے ہے۔ اگر اس کا کوئی اور بھی شریک ہوتا تو یہ آفتاب کے ناقص ہونے کی دلیل ہوتی۔ اور یہ کمال کہ سراسر اسی سے مختص ہو خاصیت الٰہی ہے۔ کیونکہ وجود حقیقی اس کا ہے اور بس۔ اور وجود میں سوائے اس کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اور جو کچھ بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس کی قدرت کا نور ہے۔ پس وہ اس کا تبع ہوگا نہ کہ شریک۔ جیسے نور آفتاب تبع آفتاب ہے اور نور کوئی دوسرا وجود نہیں ہوتا۔ آفتاب کے مقابلے میں یا اس کے ساتھ۔ کہ جب ظہور میں آئے تو اس کے نقصان کی دلیل ہو۔

اور انسان کی فطرت ہے کہ چاہتا ہے کہ وہی وہ ہو۔ لیکن چونکہ ایسی یکتائی سے عاجز ہے۔ تو چاہتا ہے کہ سب اسی کا ہو۔ یعنی سب اسی کا مسخر ہو۔ اور تصرف اس کا اسی کے ارادے سے ہو۔ لیکن انسان اس بات سے بھی عاجز ہے کیونکہ موجوداتِ عالم دو قسم کی ہیں: ایک قسم یہ کہ انسان اس میں متصرف نہیں ہوسکتا۔ جیسے کہ آسمان ہیں۔ ستارے ہیں۔ فرشتوں اور شیاطین کی جواہر ہیں۔ اور جو کچھ تحت الثریٰ میں ہے یا سمندروں کی گہرائی میں ہے یا پہاڑوں کی تہ میں ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ اپنے علم کی وساطت سے ان سب پر غالب ہو جائے تاکہ سب کچھ اس کے علم کے تصرف میں آجائے اگرچہ اس کی قدرت کے تصرف میں نہ آئے۔

اسی بناء پر انسان چاہتا ہے کہ ملکوتِ آسمان وزمین اور بحر و برّ کے عجائب سب اس کے علم میں ہوں۔ ایسے ہی جیسے کوئی شطرنج کی بناء سے تو عاجز ہو لیکن چاہتا ہے کہ جان سکے کہ اس کی تشکیل کا راز کیا ہے۔ تو یہ بھی ایک قسم کا استیلا ہے۔ اور دوسری قسم یہ ہے کہ انسان اس میں متصرف ہوسکتا ہے۔ وہ یہ ہے زمین پر کے موجودات نباتات' حیوانات اور جمادات اور انسان چاہتا ہے کہ یہ سب اسی کی ملکیت ہوں۔ یعنی اس کے تصرّف میں ہوں۔ تاکہ اسے سب پر کمالِ قدرت واستیلاء ہو۔ اور جو کچھ زمین پر ہے اس میں نفیس ترین شے انسانوں کے دل ہیں۔ تو انسان چاہتا ہے کہ دل بھی اسی کے مسخر ہوں۔ اور اس کے لئے تصرف کی جولا نگاہ ہوں' تاکہ ہمیشہ اسی کے ذکر میں مشغول رہیں۔ اور معنی جاہ کے یہی ہیں۔ پس انسان طبعًا ربوبیت کو محبوب رکھتا ہے، جو اسے اس ذات پاک سے منسوب کرتی ہے اور وہ پیش گاہ الٰہی ہے۔ اور ربوبیت کے معنی یہ ہیں کہ کمال سب اسی کا ہو۔ اور کمال غلبے میں ہوتا ہے اور غلبہ سرتاپا علم اور قدرت سے حاصل ہوتا ہے۔ پس انسان کی مال وجاہ سے محبت کا راز یہی ہے۔

فصل (لوگ جاہ طلبی میں نقصان کی راہ لیتے ہیں):

اگر کوئی کہے کہ جب کمال ربوبیت کی طلب انسان کی فطرت ہے اور وہ علم وقدرت کے بغیر ممکن نہیں

اورعلم کی طلب قابل ستائش ہے کہ وہ کمال کی طلب ہے اور قدرت بھی من جملہ کمالات کے ہے اور وہ بھی صفاتِ حق تعالیٰ میں علم ہی کی طرح ایک صفت ہے۔اور انسان جس قدر صفات حق تعالیٰ میں کامل ہوگا اسی قدر وہ حق تعالیٰ کے نزدیک ہوگا۔تو جواب اس کا یہ ہے کہ علم وقدرت دونوں کمالات میں سے ہیں اور صفاتِ ربوبیت میں سے ہیں۔لیکن علم حقیقی تک رسائی تو ممکن ہے کہ انسان کو حاصل ہوجائے اور اس کے ساتھ جاوداں رہے۔لیکن قدرت حاصل نہیں ہوسکتی۔لیکن انسان گمان کرتا ہے کہ حاصل ہوگئی۔لیکن وہ اس کے ساتھ باقی رہنے والی نہیں۔کیونکہ مال اور خلق پر جو قدرت ہوتی ہے وہ انسان کے مرنے کے ساتھ ہی اس سے منقطع ہوجاتی ہے۔اور جو موت پر باطل ہوجائے وہ باقیات صالحات[1] میں سے نہیں۔اور ایسی شے کے لئے قیمتی وقت صرف کرنا حماقت ہوگی۔

پس قدرت میں سے اسی قدر کام آتا ہے جو حصولِ علم کا وسیلہ ہو۔اور علم کی جائے قرار انسان کا دل ہے جسم نہیں۔اور دل باقی رہنے والا اور ابدی ہے۔جب عالم اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے علم باقی ہوتا ہے اور وہ علم اس کا نور ہوتا ہے کہ جس کے ذریعے وہ جمالِ حضرت الٰہی سے بہرہ ور ہوتا ہے۔اور یہ ایسی لذت ہے کہ اس کے مقابلے میں بہشت کی تمام لذتیں ہیچ ہیں۔اور علم کو کسی ایسی شے سے تعلق نہیں کہ جو موت کے ساتھ باطل ہوجائے۔کیونکہ علم کا علاقہ نہ مال سے ہے نہ لوگوں کے دل سے بلکہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کی حکمت کہ جو ملکوت وملک وعجائب معقولات بہ جائزات وواجبات ومحالات سے ہے کہ یہ اصلی اور ابدی ہیں۔اور تغیر پذیر نہیں ہوتیں۔کیونکہ واجب کبھی محال نہیں ہوتا۔اور محال جائز نہیں ہوتا۔لیکن وہ علم جو مخلوقات اور اشیائے فانی سے متعلق ہے وہ بے قدر ہوتا ہے۔جیسے کہ علم لُغت کہ حادث ہے اور فانی ہے اور اس کی اہمیت اسی قدر ہوتی ہے کہ کتاب وسنت کے عرفان کا وسیلہ ہو۔اور معرفتِ کتاب وسنت حق تعالیٰ کی معرفت اور راہِ آخرت کی اوگھٹ گھاٹیوں کو طے کرنے کا وسیلہ ہے۔

پس وہ امور جو ہمہ وقت معرضِ تغیر میں ہوں یا فنا پذیر ہوں ان کا علم مقصود نہیں۔بلکہ مقصود علم علمِ ازلی والٰہی ہے۔جو من جملہ باقیات صالحات ہے اور بارگاہِ الٰہیت کہ ازلی وابدی ہے تغیر کو اس میں راہ نہیں۔پس انسان علم الٰہی میں جس قدر عالم تر ہوگا اسی قدر حق تعالیٰ کے نزدیک تر ہوگا۔اسے حقیقت کا علم ہوتا ہے لیکن حقیقت پر قدرت نہیں ہوتی۔لیکن قدرت کی ایک قسم کہ وہ بھی باقیات صالحات میں سے ہے اس کے بس میں ہے۔اور وہ ہے حُریّت یعنی شہوات کے ہاتھ سے آزادی۔کیونکہ جو کوئی شہوات کا اسیر ہے وہ اسی کا غلام ہے۔

---

(۱) وہ نیک اعمال جو اخروی اجر کا باعث ہیں۔

اور انسان جس کا بھی محتاج ہوگا وہ اس کی تقصیر کی علامت ہے۔ پس اپنی ایسی حاجت سے نجات اور اپنی نفسی شہوات پر قادر ہونا ایسا کمال ہے جو صفاتِ حق تعالیٰ اور صفاتِ ملائکہ کے قریب ہے۔ اس بناء پر کہ اسی کے باعث انسان تغیر و گردش و حاجت سے دور تر رہتا ہے۔ اور اس طرح صفتِ ملائکہ کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ پس وہ علم و معرفت کی حقیقت کا کمال ہے۔ نیز شہوات کے ہاتھوں آزادی۔ لیکن مال و جاہ بھی دکھائی تو کمال ہی کی طرح دیتے ہیں لیکن فی الاصل کمال نہیں اور یہ موت کے بعد باقی نہیں رہتے۔ پس خلق طلب کمال میں معذور بلکہ مامور ہے۔ لیکن لوگ کمالِ حقیقی سے بے خبر ہوتے ہیں جو کمال نہیں اسے کمال سمجھتے ہیں۔ اور سب نے اسی کو نصب العین بنا رکھا ہے۔ اور جو حقیقتاً کمال ہے اس سے روگردان ہیں۔ اس طرح گویا اپنے زیان کی طرف گامزن ہیں۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ'' (قرآن: ۱۰۳/۱،۲) (زمانے کی قسم کہ انسان بے شک خسارے میں ہے)۔

فصل (جاہ اگر بہ قدرِ کفایت ہو تو مذموم نہیں):

یاد رہے کہ جاہ مال ہی کی طرح ہے۔ جس طرح مال مطلقاً مذموم نہیں بلکہ بہ قدرِ کفایت مال زادِ آخرت ہے جب کہ کثرتِ مال چونکہ مشغولیٔ دل کا باعث بنتی ہے راہ زن آخرت ہے۔ جاہ بھی ایسا ہی ہے کہ انسان کو ناچار خادم لازم ہے۔ اور رفیق کہ اس کی مدد کرے اور غلبہ جو ظالموں کے شر کو اس سے دور رکھے۔ تو ایسوں کے لئے اس قدر جاہ کی طلب جس سے ان کا مقصود حاصل ہو روا ہے۔ جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ'' (قرآن: ۱۲/۵۵) (میں اس کا محافظ ہوں اور دانا)۔

اسی طرح اگر استاد کے دل میں طالب علم کی قدر نہ ہو تو وہ تعلیم نہ دے گا اور جب تک شاگرد کے دل میں استاد کی منزلت نہ ہوگی استاد سے استفادہ نہ کر پائے گا۔ پس جاہ سے بہ قدرِ کفایت طلب کرنا مال سے بہ قدرِ کفایت طلب کرنے جیسا ہی ہے۔ لیکن جاہ چار طریقوں سے طلب کیا جا سکتا ہے: اور ان طریقوں میں سے دو تو حرام ہیں اور دو مباح:

وہ دو طریق جو حرام ہیں ان میں سے ایک یہ کہ اپنی عبادت کے اظہار کے ذریعے کرے تو یہ ریا ہے۔ جب کہ عبادتِ خداوند بہ اخلاص ہونی چاہئے۔ اس لئے اگر عبادت کے وسیلے سے طلب کرے تو یہ حرام ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ فریب دے اور خود کو ایسی صفت کا مالک ظاہر کرے جس سے اصلاً وہ متصف نہیں ہوتا۔ مثلاً کہے کہ: ''میں سید ہوں یا فلاں نسب سے ہوں۔ یا فلاں پیشہ جانتا ہوں۔ اور حقیقت میں جانتا نہ ہو۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی فریب دے کر طلبِ جاہ کرے۔

اور وہ دو طریق جو حلال ہیں ایک یہ ہے کہ اس بناء پر طلبِ جاہ کرے جس میں فریب اور ریا نہ ہو اور دوسرے یہ کہ اپنے عیب کو پوشیدہ رکھے۔ اگر فاسق ہو تو اپنے گناہ کو مخفی رکھے تا کہ اسے بادشاہ کے نزدیک جاہ حاصل ہو۔ اور غرض یہ نہ ہو کہ لوگ اسے پارسا سمجھیں تو پھر اس میں رخصت ہے۔

دوستیٔ جاہ کا علاج

یاد رہے کہ جاہ کی دوستی دل پر غالب ہو جائے تو یہ دل کی بیماری بن جائے گی۔ اور اس کے علاج کی ضرورت لاحق ہو گی۔ کیونکہ یہ لازماً نفاق' ریا' دروغ' تلبیس' عداوت' حسد و رشک اور بہت سی معصیتوں پر منتج ہو گی۔ مال کی دوستی ہی کی طرح بلکہ اس سے بدتر ہو گی کیونکہ یہ انسانی فطرت پر غالب تر ہے۔

اور جو کوئی مال و جاہ کا صرف اسی قدر طالب ہو کہ جس سے اس کا دین سلامت رہے۔ اور اس سے زیادہ کا خواہاں نہ ہو تو اسے بیمار نہ کہیں گے۔ کیونکہ حقیقتاً وہ مال و جاہ کا دوست نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اسے دینی کاموں کی فراغت کے لئے طلب کرتا ہے۔

لیکن وہ شخص جو طبعاً جاہ دوست ہوتا ہے۔ تو اس کی فکر تمام تر خلق میں مستغرق ہوتی ہے۔ کہ لوگ مجھے کیسے دیکھتے ہیں؟ یا میرے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اور میرے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ وغیرہ جو کچھ بھی دل اس میں مشغول رکھتا ہے کہ لوگ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو اسے اپنی اس بیماری کا علاج بمنزلہ فریضہ کے ہے اور علاج اس کا علم و عمل سے مرکب ہے۔

علمی علاج: یہ ہے کہ جاہ کی ابتلا پر غور کرے، بحوالۂ دین و دنیا۔ دنیوی اعتبار سے یہ ہے کہ جاہ کا طالب رنج و مذلت اور لوگوں کی دلداری میں لگا رہتا ہے۔ اگر جاہ حاصل نہ ہوا تو خود ذلیل ہو گا۔ اور اگر جاہ حاصل ہو گیا تو مقصود و محسود ہو گا۔ ہمیشہ عداوت کے رنج اور دشمنوں کے ارادۂ بد کے قصد کے دفاع میں لگا رہے گا لیکن حاسدوں کے مکروہ عذر سے مامون نہ ہو گا۔ اور جو کوئی قصد سے خالی نہ ہو گا۔ اگر خصومت میں مغلوب ہو تو خود مذلت میں ہو گا۔ لیکن اگر غالب بھی آ جائے تو اس غلبے کو دوام نہ ہو گا۔ کیونکہ جاہ سرتاسر لوگوں کے دل سے تعلق رکھتا ہے اور لوگوں کے دلوں کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ سمندر کی لہر کی طرح وہ عزت نہایت ہی ضعیف ہوتی ہے کہ جس کی بناء پر چند بدبختوں کے دلوں پر ہو کہ جن میں کوئی خیال ایسا آئے کہ عزت منقلب ہو جائے خصوصاً اس کے لئے جاہ جس کا کسی ایسی ولایت کی بنا پر ہو جو عزل پذیر ہو۔ اور والئے ملک کے دل میں ایک خیال کی آمد ہی پر وہ معزول اور رسوا ہو جائے۔

پس طالبِ جاہ دنیا میں بھی مبتلائے رنج رہتا ہے اور آخرت میں بھی۔ اور یہ احمق یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لیکن جو کوئی بصیرت تامہ کا مالک ہو تو وہ جانتا ہے کہ مشرق سے مغرب تک تمام روئے زمین بھی اس پر مسلم ہو جائے اور بے خطر ہو تمام دنیا والے اس کے سامنے سر جھکائیں۔ تو یہ بھی کوئی خوشی کی بات نہیں کیونکہ جب مرے گا تو یہ سب کچھ باطل ہو جائے گا۔ اور تھوڑی ہی مدت میں نہ وہ رہے گا اور نہ وہ جو اس کو سجدہ کرتے تھے۔ ایسے ہی جیسے کوئی بادشاہ جو مر جاتا ہے تو کوئی اسے یاد نہیں کرتا۔ تو ایسے میں چند روزہ لذتِ دنیا کے لئے اس نے پادشاہیٔ ابدی کو ضرر پہنچایا۔ جس کسی نے بھی دل جاہ سے لگایا تو دوستی حق تعالیٰ اس کے ہاں سے رخصت ہو گئی۔ اور جو کوئی عالمِ آخرت کو گیا اور اس کے پاس سوائے دوستی حق تعالیٰ کے کوئی بھی اور شے ہوئی تو عذاب اس کا بہت طویل ہوگا۔ علمی علاج یہی ہے جس کا بیان ہو چکا۔ اور

عملی علاج: دو قسم کے ہیں: ایک یہ کہ وہ جگہ جہاں اسے جاہ حاصل ہے وہاں سے بھاگ جائے اور کسی دوسری جگہ جہاں کوئی بھی سے جانتا نہ ہو چلا جائے۔ تو یہ مکمل علاج ہے۔ کیونکہ اگر اپنے ہی شہر میں خلوت گزین ہو تو چونکہ لوگ جانتے ہیں کہ اس نے جاہ کو ترک کیا ہے۔ اس لئے تنہائی اختیار کی ہے تو اس بات سے اسے شر پہنچے گا۔ علامت اس کی یہ ہے کہ جب لوگ اس کی برائی بیان کرتے ہیں یا کہتے ہیں کہ یہ نفاق کرتا ہے تو جزع اور رنج اس کے لئے دل میں پیدا ہوگا۔ اور اگر اسے کسی جرم سے منسوب کریں تو اس کا عذر بیان کرنے لگے۔ اگرچہ دروغ ہی کیوں نہ ہو۔ تاکہ لوگ اس کے بارے میں بداعتقاد نہ ہوں۔ تو یہ جملہ امور دلیل اس بات کی ہیں کہ حبِ جاہ اب بھی اس کے دل میں قائم و دائم ہے۔

دوسرا **عملی علاج**: یہ ہے کہ ملامت کی راہ لے اور کوئی ایسا کام کرے کہ جس سے لوگوں کی نگاہوں سے گر جائے یہ نہیں کہ حرام کھائے جیسے کہ احمقوں کا ایک گروہ جو فی الاصل مبتلائے فساد ہوتے ہیں لیکن خود کو ملامتی جانتے ہیں۔ بلکہ اس طرح کہ مثلاً گذشتہ زمانے میں ایک زاہد تھا تو امیر شہر اس کے سلام کے لئے گیا تاکہ زاہد سے برکت حاصل کرے۔ جب امیر دور سے زاہد کو دکھائی دیا تو اس نے روٹی اور سبزی مانگی اور کھانے لگا۔ اور لقمے بڑے بڑے لینے لگا۔ تو امیر شہر نے اسے اس حالت میں دیکھا تو اس کا اعتقاد اس کے باب میں جاتا رہا اور وہ زاہد سے ملے بغیر لوٹ گیا۔

اسی طرح ایک اور عابد ایک شہر میں مقبول ہو گیا اور لوگ اس کی طرف راجع ہوئے۔ وہ ایک حمام سے نکلا تو ایک اور شخص کا اچھا لباس پہن کر نکلا جو وہاں نہا رہا تھا۔ اور شاہراہ پر کھڑا ہو گیا۔ حتیٰ کہ پکڑا گیا۔ لوگوں نے اس کی پٹائی کی اور لباس اس سے واپس لیا اور کہا کہ یہ چور ہے۔

اسی طرح ایک زاہد نے پینے والی حلال شے کو شراب کا روپ دیا اور پیالے میں ڈال کر پیا تو لوگوں نے گمان کیا کہ شراب ہے۔ تو جاہ کی مصیبت سے نجات کا طریقہ اسی قسم کا ہے۔

لوگوں کی ثناوستایش کی خواہش اور خلق کی مذمت پر ناگواری کا علاج

(تعریف سے محبت اور شکایت سے کراہت کا بیان)

یاد رہے کہ کوئی شخص ایسا بھی ہوتا ہے جو حریص ہوتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ اور نیک نامی کا آرزومند ہوتا ہے۔ اگرچہ کام وہ کرتا ہو جو خلاف شرع ہو اور لوگوں کی طرف سے ہونے والی شکایت اسے بری لگتی ہو۔ اگرچہ اس کام کے لیے ہو کہ وہ حق ہو۔ اور یہ بھی دل ہی کی ایک بیماری ہے اور علاج اس کا معلوم نہیں ہو سکتا جب تک دل کے لذت والم کا سبب مدح و مذمت میں معلوم نہ ہو۔

یاد رہے کہ مدح کی لذت کے اسباب چار ہیں

سبب اوّل: وہ ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں یعنی انسان اپنے کمال کو عزیز رکھتا ہے اور نقصان کو دشمن جانتا ہے۔ اور اپنی تعریف کو کمال کی دلیل قرار دیتا ہے۔ ممکن ہے خود اس امر میں جسے لوگ اس کا کمال کہتے ہیں اسے شک ہو۔ اور اس کی لذت کلیۃً نہ ہو۔ لیکن جب دوسروں سے سنتا ہے تو یقین کر لیتا ہے تاکہ اس کی خواہش میں آرام پائے تو وہ لذت تمام ہو جاتی ہے کہ جب اپنی جانب سے کمال کی بُو پاتا ہے۔ اس سے ربوبیت کا اثر اپنے اندر ظاہر ہوتا ہے اور ربوبیت طبعاً محبوب ہوتی ہے۔ اور جب اپنی مذمت سنتا ہے تو اپنی کوتاہیوں سے آشنا ہوتا ہے تو اس سبب سے رنجیدہ ہوتا ہے۔

پس اگر انسان اپنی تعریف یا اپنا عیب ایسے شخص سے سنے کہ جو دانا ہو اور گزاف گو نہ ہو جیسے کہ عالم منصف استاد ہوتا ہے تو بے شک انسان رنج و راحت کے بارے میں زیادہ آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور جب کوئی بے بصیرت شخص اس باب میں اظہار رائے کرے تو اس سے لذت حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اس کی بات سے یقین حاصل نہیں ہوتا۔

سبب دوم: یہ ہے کہ تعریف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تعریف کرنے والے شخص کا دل اس کی مِلک ہے اور اس کا مسخر ہے۔ اور اس کے دل میں اس کا مقام و مرتبہ ہے اور جاہ محبوب شے ہے۔ پس اگر یہ تعریف کسی محتشم شخص کی طرف سے ہو تو لذت زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ مدّاح کا دل ممدوح کی مِلک ہو جانے سے بڑی قوت حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر یہی تعریف کسی خسیس کی طرف سے ہو تو اس میں وہ لذت نہیں ہوتی۔

سببِ سوم: یہ کہ تعریف اس کی اس بات کی نوید ہوتی ہے کہ دوسروں کے دل بھی اس کا شکار ہوں گے۔ کیونکہ جب ایک تعریف کرتا ہے تو دوسرے بھی خوش عقیدگی کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ سرایت کرتی ہے۔ پس اگر تعریف برملا ہو اور ایسے شخص کی طرف سے ہو کہ جس کی بات مقبول ہو تو لذت اس کی بیشتر ہوتی ہے۔ اور مذمت اس کے برعکس۔

سببِ چہارم: یہ ہے کہ ثنا اس امر کی دلیل ہوتی ہے کہ مداح ممدوح کا اس کی عظمت وشوکت کے بارے میں نہایت درجہ معتقد ہے اور عظمت وشوکت بھی محبوب اخلاق ہیں۔ اگرچہ بہ جبر ہی ہوں۔ اگرچہ جانتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کا معتقد نہیں لیکن مدّاح کی حاجت مندی اسے ثناء گوئی پر قائم رکھتی ہے۔ اور وہ اسے اپنی کمالِ قدر سمجھتا ہے۔ پس اگر مدّاح ایسی چیز کی تعریف کرتا ہے کہ جانتا ہے کہ دروغ ہے اور کوئی اسے قبول نہ کرے گا۔ اور نہ ہی دل سے نہیں کہتا اور بخوف بھی نہیں کہتا لیکن مسخر ہونے کی وجہ سے کہتا ہے تو اس میں کوئی لذت نہیں ہوتی کیونکہ لذت کے تمام اسباب تو مفقود تھے۔ اب جب سبب اس کا جان لیا تو علاج بھی اس کا بہ آسانی جان لے گا اور اگر کوشش کرے گا تو علاج کر سکے گا۔

اور سبب اول یہ ہے کہ تو مداح کے قول پر اپنے کمال پر معتقد ہوتا ہے تو چاہئے کہ غور کرے کہ اگر یہ صفت جو مداح بیان کرتا ہے مثلاً علم اور پرہیز گاری اگر سچ ہے تو تمھاری خوشی اس صفت کی بناء پر ہوگی جو واقعی ہے اور اس خدا کی طرف سے ہوگی کہ جس نے یہ تمھیں عطا کی اور مدّاح کے قول سے نہیں جو کسی کے قول سے کم وبیش ہوتی ہو۔

اگر مداح تیری دولت، خواجگی، اور اسبابِ دنیا کی تعریف کرے تو یہ خوشی کے لائق نہیں۔ اگر اس کی کوئی قدر ہے بھی تو اس کے لئے خوش ہونا چاہئے جس نے یہ تمھیں عطا فرمائے نہ کہ مدح پر۔ بلکہ عالم بھی اگرچہ اپنے علم وورع سے آشنا ہوتا ہے لیکن اسے اس خوف سے کہ اس کا انجام معلوم نہیں کہ کیا ہوگا۔ اسے خوشی میں مصروف نہیں ہونا چاہئے اور جب تک وہ انجام معلوم نہیں تو یہ سب کچھ بیکار ہے۔

اور جس کا مستقر دوزخ ہونے والا ہو اس کے لئے شادی کا یہ کون سا موقع ہے؟ اور اگر وہ صفت جیسے علم وورع وغیرہ ہیں ان کے بارے میں جانتا ہو کہ وہ اس سے بے بہرہ ہے۔ تو اس پر خوش ہونا حماقت ہے۔ مثال اس کی اُس شخص کی سی ہے کہ کوئی اسے کہے یہ خواجہ مردِ گرانمایہ ہیں اور اس کا باطن عطر وخوشبو سے پُر ہے۔ جب کہ وہ خود جانتا ہو کہ نجاست سے پُر ہے۔ اس کے باوجود اس دروغ پر خوش ہو تو یہ دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے؟

اور اسباب کا حاصل جاہ وحشمت کی محبت ہے اور اس کا علاج بیان ہو چکا ہے اور اگر کوئی تمھاری

مذمت کرے تو اس پر غمگین ہونا یا اس شخص پر خشمگیں ہونا بھی بے وقوفی ہے۔ کیونکہ اگر وہ سچ کہتا ہے تو وہ فرشتہ صفت ہے۔ اگر دروغ گوئی کرتا ہے اور جان بوجھ کر کرتا ہے تو وہ شیطان صفت ہے۔ اور اگر وہ نہیں جانتا کہ جھوٹ کہہ رہا ہے تو گدھا اور احمق صفت ہے۔ اور معلوم ہونا چاہئے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی تقدیر ہے کہ کسی کو مسخ کر دیا کہ گدھا صفت بن جائے یا شیطان صفت ہو یا فرشتہ صفت تو تمھیں اس امر میں غمگین ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ پس اگر وہ سچ کہتا ہے تو تمھیں اس عیب کی بناء پر کہ واقعی تم میں ہو مغموم ہونا چاہئے کہ اگر اس عیب کی وجہ سے دین کا نقصان ہو تو یہ اس کے بیان کی بناء پر نہیں اور اگر وہ عیب دنیوی ہو تو وہ اہل دین کے نزدیک خوبی ہوگی نہ کہ عیب۔

مزید علاج اس کا یہ ہے کہ تم غور کرو کہ اس نے ذم کی صورت میں جو کچھ کہا ہے تین حال سے خالی نہیں ہونے کا: اگر اس نے سچ کہا تو ازراہِ شفقت کہا تو اس کا احسان ماننا چاہئے۔ کیونکہ اگر کوئی تجھے خبر دے کہ تیرے لباس میں سانپ ہے تاکہ تو اس سے بچے تو تجھے اس کا ممنون ہونا چاہئے۔ اسی طرح اگر عیب دین میں ہو تو وہ تو سانپ سے بھی بدتر ٹھہرا۔ کیونکہ اس کے باعث آخرت ہلاک ہو جاتی ہے۔ اگر تو کسی بادشاہ کے پاس جائے تو کوئی تجھ سے کہے کہ "ارے تمھارا لباس پلید ہے جاؤ اسے صاف کرو"۔ اور تُو دیکھے کہ واقعی نجاست آلود ہے اور اسی حال میں بادشاہ کے سامنے چلا جاتا تو خطرہ عقوبت کا تھا۔ اس لئے نشاندہی کرنے والے کا احسان ماننا چاہئے کہ اس نے تجھے خطرہ سے بچا لیا۔

اور اگر کوئی خُردہ گیری کے ارادے سے عیب نمائی کرے تو بھی اس میں تمھارا فائدہ ہے کیونکہ اس نے سچ کہا ہے اور عیب جوئی سے خود اس نے اپنے دین میں خیانت کی جس سے تمھارا فائدہ ہوا اور اس کا نقصان۔ تو ایسے میں تمھارا خشمگیں ہونا قطعاً بے جا ہے۔ اور اگر اس نے دروغ کہا ہو تو تجھے سوچنا چاہئے کہ اگر اس مذکورہ ایک عیب سے تم پاک ہو تو کتنے ہی اور عیب ہیں جو ہجا کرنے والے کو معلوم نہیں۔ اس لئے ایسے میں تو تمھیں اللہ کا شکر بجا لانے میں لگ جانا چاہئے کہ اس نے تمھارے دوسرے عیوب پر پردہ ڈال دیا ہے اور ہجو کرنے والے نے اپنی نیکیاں تمھیں تحفے میں دے دیں۔ اور اگر وہ تمھاری تعریف کرتا تو یہ تمھاری ہلاکت کے مترادف ہوتا۔ تو تم اپنی ہلاکت پر خوش کیوں ہوتے ہو اور تحفہ ملنے پر غمگین؟ اور یہ وہ احمق کرتا ہے جو کاموں کے ظاہر پر سطحی نظر ڈالتا ہے اور ان کی معنویت اور روح و حقیقت کے اسرار کو جاننے کی کوشش نہیں کرتا۔ اور جو کوئی عقل مند ہوتا ہے احمق سے اسی وسیلے سے جدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی نظر ظاہر پر نہیں بلکہ کاموں کی حقیقت اور روح پر ہوتی ہے۔

مدح وذم کے بارے میں لوگوں کے متفاوت درجات

یاد رہے کہ اپنی تعریف اور برائی سننے کے بارے میں لوگوں کے چار درجے ہیں:

درجہ اوّل: عمومِ خلق کا ہے جو اپنی تعریف سن کر خوش ہوتے ہیں اور شکریہ ادا کرتے ہیں اور مذمت پر خشمگیں ہوتے ہیں اور بدلہ لینے کی تیاری میں لگ جاتے ہیں اور یہ بدترین درجہ ہے۔

درجۂ دوم: پارساؤں کا درجہ ہے۔ جو مدح سن کر نیم شاد ہوتے ہیں اور ذم پر خشمگین ہوتے ہیں لیکن معاملت میں اس کا اظہار نہیں کرتے اور مدح و ذم کو بہ ظاہر برابر رکھتے ہیں۔ لیکن دل میں ایک کو دوست تو دوسرے کو دشمن رکھتے ہیں۔

درجۂ سوم: متقیوں کا ہے جو مدح وذم دونوں کو دل وزبان میں یکسان سمجھتے ہیں۔ اور کسی کی مذمت پر دل میں خشم کو جگہ نہیں دیتے اور مداح کو زیادہ پذیرائی نہیں دیتے کیونکہ دل ان کا نہ مدح کی طرف التفات کرتا ہے نہ مذمت پر برہم ہوتا ہے۔ اور یہ عظیم درجہ ہے۔

عابدوں کا ایک گروہ گمان کرتا ہے کہ وہ بھی اسی درجے کو پہنچ گئے ہیں مگر ان کا یہ خیال غلط ہے۔ کیونکہ علامت اس کی یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی بدگو اس کے پاس زیادہ بیٹھے تو اس کے دل پر مداح کی نسبت گراں تر نہ ہو۔ اور اگر وہ زیارت کے لئے کمتر آتا ہو تو دل میں اس کی طلب اور تقاضا مداح کے تقاضے سے کم تر نہ ہو اور اگر کسی کام میں بلائے تو اس کی معاونت مداح کی معاونت سے دشوار تر نہ ہو۔ اور اگر وہ مرجائے تو اس کی موت کا غم دوسرے کی موت سے کم نہ ہو۔ اور اگر کوئی ہجا گو کو تکلیف پہنچائے تو اسی طرح غمگین ہو جیسے کہ مداح کو تکلیف پہنچنے پر غمگین ہوتا۔ اور مداح اگر کسی لغزش کا مرتکب ہو تو ممدوح کو اسے معمولی نہیں جاننا چاہئے۔ اور یہ امر بہت مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ عابد مبتلائے فریب ہو اور کہے ''میں اس لئے اس سے ناراض ہوں کہ اس نے دین کی مذمت کی ہے۔ اس لئے گناہ گار ہے''۔ جب کہ یہ شیطان کا فریب ہے کہ اب ایسے بہت سے ہیں کہ خود کبائر کے مرتکب ہوتے ہیں اور مذمت دوسروں کی کرتے ہیں۔ اور جب وہ کراہیت اپنے اندر محسوس نہیں کرتے تو یہ دلیل اس امر کی ہے کہ وہ غصہ ان کے نفس کا ہے اور دین کا نہیں۔ اور وہ عابد جو عالِم نہیں ہوتا ان دقایق سے محرومی کی بناء پر اس کی بیشتر محنت ضایع جاتی ہے۔

درجۂ چہارم: صدیقوں کا درجہ ہے۔ جو مداح کو دشمن سمجھتے ہیں اور عیب بیان کرنے والے کو دوست سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس سے تین فوایداخذ کرتے ہیں: ایک یہ کہ اس سے اپنے عیب سے آگاہ ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس نے اپنی نیکیاں انھیں تحفے میں دے دیں۔ اور انھیں حریص بنادیا کہ عیب اور اس جیسے دیگر

نقائص سے خود کو پاک کریں۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ ''وائے اس روزہ دار پر اور شب زندہ دار پر اور اس پر جو گڈری پوش ہے اِلا یہ کہ اس کا باطن دنیا سے نفور ہو چکا ہو۔ اور اپنی تعریف کا دشمن ہو اور اپنی برائی سننے کو پسند کرتا ہو''۔ اور یہ حدیث اگر درست ہے تو یہ ایک عظیم مشکل کام ہے۔ کیونکہ اس درجے تک رسائی بڑا مشکل کام ہے۔ اور سخت متعذر ہے۔ بلکہ درجہ دوم میں پہنچنا کہ انسان بہ ظاہر مدح وذم میں فرق نہ کرے اگرچہ دل میں فرق کرے۔ یہ بھی دشوار ہے کیونکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جب کسی کام کا سامنا ہو انسان اپنے مرید یا مدح کرنے والے کی طرف مایل ہوتا ہے۔ اور معاملت میں بھی یہی کرتا ہے۔ اور اس آخری انتہائی درجے کو کوئی نہیں پہنچتا اِلا یہ کہ کسی نے اپنے نفس سے اتنی عداوت برتی ہو کہ اپنے نفس کا دشمن ہو گیا ہو کہ جب اپنے نفس کا عیب کسی سے سنے تو شاد ہو جائے۔ اور عیب بتانے والے کی فراست اور عقل کا معتقد ہو جائے۔ جیسے کہ کوئی اپنے دشمن کا عیب سنے تو دل خوش ہوتا ہے۔ اور یہ صورت بہت ہی شاذ و نادر ہوتی ہے۔ بلکہ اگر کوئی تمام عمر یہ مجاہدہ کرے کہ اس کا مداح اور اس کا ہجا گو اس کے نزدیک یکساں قرار پائیں تو اس مقام تک رسائی نہایت مشکل ہے۔

یاد رہے کہ اس میں وجہ خطر یہ ہے کہ جب ستایش و نکوہش میں فرق ظاہر ہوا تو مدح کی طلب دل پر غلبہ کرتی ہے اور اس کے لیے بہانے تراشتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہوسکتا ہے انسان عبادت میں ریاکاری کرنے لگے۔ اور اگر اس کے ذریعے معصیت تک رسائی ممکن ہو تو معصیت کر گذرے۔ یہ جو آنحضرت نے فرمایا ہے کہ: ''وائے روزہ دار پر اور وائے نمازی پر تو اس لیے کہا ہو کہ جب دل سے اس کا استیصال نہ ہوا ہو تو انسان جلد ہی مبتلائے معصیت ہوسکتا ہے''۔

یوں مذمت کو برا جاننا اور ستایش کو عزیز رکھنا۔ اگر کسی فساد پر منتج نہ ہو تو۔ نفس الامر میں حرام نہیں۔ لیکن بہت بعید ہے کہ فساد پر منتج نہ ہو۔ اور لوگوں کی معصیت بیشتر اسی بناء پر ہوتی ہے کہ ستایش اچھی لگتی ہے اور ہجا بری۔ اور جملہ خلق کا انداز فکر و عمل یہ ہو گیا ہے کہ لوگوں کے دکھاوے کے لیے کرتے ہیں جو کرتے ہیں۔ اور جب یہ صورت غالب ہوگئی تو انسان وہ کام کرنے لگتا ہے جو ناشایستہ ہوتے ہیں۔ ورنہ لوگوں کی دلداری اور اس امر کا لحاظ اگر بر سبیل ریا نہ ہو' حرام نہیں۔

•••

اصل ہشتم: طاعت و عبادات کے ذریعے ریا کا علاج

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادات میں ریا کبائر میں سے ہے اور شرک کے نزدیک ہے۔ اور پارساؤں

کے ہاں اس سے غالب تر بیماری نہیں ہے۔ کہ جب عبادت کرتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ لوگ اس سے مطلع ہوں اوران کی پارسائی کے معتقد ہوں۔ اور جب عبادت کا مقصد اوروں کا حسنِ اعتقاد ہو تو وہ عبادت ہی نہیں ہوگی۔ وہ تو مخلوق کی پوجا ہوگی۔ جو شرک ہے۔ کیونکہ اس طرح اپنی عبادتِ حق تعالیٰ میں ایک اور کو بھی شریک کرلیا ہو گا۔ اور فرمان خداوندی یہ ہے کہ: ''فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا '' (قرآن: ۱۸/۱۱۰) (پس جو کوئی اپنے خدا کے دیدار کا امیدوار ہے وہ نیک عمل کرتا ہے اور اپنی عبادت میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں ٹھہراتا) جو کوئی حق تعالیٰ کے دیدار کا امیدوار ہے اسے کہو کہ حق تعالیٰ کی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک نہ ٹھہرائے۔ خدائے تعالیٰ نیز فرماتے ہیں کہ: ''فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآؤُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ '' (قرآن: ۱۰۷/۴-۷) (افسوس ہے ان نمازیوں پر کہ نماز سے رہ گئے ہیں۔ جب نماز ادا کرتے ہیں تو لوگوں کے دکھانے کے لیے کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو ادائے زکوٰۃ سے روکتے ہیں) افسوس ہے ان لوگوں پر جو نماز سہو اور ریا پر ادا کرتے ہیں۔

ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ''نجات کس عمل میں ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کرے مگر لوگوں کے دکھاوے کے لیے نہیں''۔ نیز فرمایا کہ: ''قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائے گا اور یہ کہا جائے گا۔ ''اطاعت میں تمھارے پاس کیا ہے؟'' تو وہ کہے گا کہ ''میں نے اپنی جان راہِ حق تعالیٰ میں فدا کی یہاں تک کہ مجھے غزا کے دوران مار ڈالا گیا''۔ تو اس پر حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ: ''تو جھوٹ کہتا ہے تو نے یہ عمل اس لیے کیا تھا کہ لوگ کہیں کہ فلاں مرد مردانہ ہے' اور اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اسے دوزخ میں لے جاؤ''۔ ایک اور کو لایا جائے گا اور یہی سوال اس سے کہا جائے گا تو وہ کہے گا کہ: ''جو کچھ میرے پاس تھا میں نے وہ صدقہ میں دے دیا تھا''۔ تو حق تعالیٰ فرمائیں گے'' تو دروغ گوئی کرتا ہے۔ تو نے یہ عمل اس لیے کیا تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں۔ اسے پکڑو اور دوزخ میں لے جاؤ'' ایک اور کو لایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ تمھارے پاس طاعت کا کون سا اثاثہ ہے؟'' تو وہ کہے گا کہ ''میں نے علم و قرآن بہت محنت سے سیکھا اور لوگوں کو سکھایا'' تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ''تو جھوٹ کہہ رہا ہے۔ تو نے اس لیے سیکھا تھا کہ لوگ کہیں کہ فلاں عالم مرد ہے۔ اسے پکڑو اور دوزخ میں لے جاؤ''۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''میں اپنی امت کے بارے میں شرکِ خفی سے زیادہ اور کسی امر سے نہیں ڈرا۔ تو صحابہ نے دریافت فرمایا کہ ''اے اللہ کے رسول وہ کیا ہے؟'' تو آنحضرت ﷺ فرمایا کہ ''وہ ریا ہے'' روز قیامت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ: ''اے ریا کارو! اُن لوگوں کے قریب ہو جاؤ جن کے لیے تم

عبادت کیا کرتے تھے اور انھی سے اپنی جزا طلب کرو' آنحضرت ﷺ نے نیز فرمایا کہ ''حق تعالیٰ کی پناہ جُب الحزن' یعنی غارِ اندوہ سے طلب کرو' تو صحابہ نے استفسار کیا کہ: 'جُب الحزن' کیا ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''دوزخ میں ایک وادی ہے قاریوں اور ریاکاروں کے لیے' نیز فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''جس نے عبادت کی اور کسی اور کو میرا شریک ٹھہرایا تو میں شریک سے بے نیاز ہوں۔ اس لیے میں نے ایسی عبادت اس کے موہوم شریک کو دے دی'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ اس عمل کو جس میں ذرہ بھر ریا ہو قبول نہیں کرتا'' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ رو رہے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''تم روتے کیوں ہو؟'' تو معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''میں نے آنحضرت سے سنا ہے کہ ''ذرہ سی ریا بھی شرک ہے''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''ریاکار کو روزِ قیامت پکاریں گے اور کہیں گے کہ 'اے ریاکار' اے نابکار' اے غدّار! تیرے اعمال ضایع ہو گئے اور ثواب باطل ہو گیا۔ جاؤ ثواب اس شخص سے طلب کرو جس کے لیے عمل کیا تھا''۔ شدّاد بن اویس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ''میں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ رو رہے تھے تو میں نے پوچھا کہ آپ رو کیوں رہے ہیں؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میری امت شرک کی مرتکب ہوگی۔ اس لیے نہیں کہ بُت پوجیں گے یا سورج چاند کی پرستش کریں گے لیکن عبادت رُوی و ریا کے لیے کریں گے''۔ نیز فرمایا کہ ''عرش کے سایے میں اس دن کہ سوائے سایۂ عرش کے اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ سوائے اس مرد کے کوئی اور نہ ہوگا کہ جس کے دائیں ہاتھ نے صدقہ کیا ہوگا اس عالم میں کہ بائیں ہاتھ کو اس کی خبر نہ ہوگی'' نیز فرمایا کہ ''حق تعالیٰ نے جب زمین کو پیدا کیا تو زمین کانپنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کو تخلیق کیا تاکہ زمین کو قرار دے۔ فرشتوں نے کہا کہ 'اللہ تعالیٰ نے کوئی شے پہاڑ سے قوی تر پیدا نہیں کی'' پھر اللہ تعالیٰ نے لوہا پیدا کیا تاکہ پہاڑ کو کاٹ سکے؛ تو فرشتوں نے کہا کہ 'لوہا زیادہ قوی ہے' اللہ تعالیٰ نے آگ پیدا کی جس نے لوہے کو پگھلا دیا تو فرشتے بولے: ''آگ قوی تر ہے' پھر اللہ نے پانی تخلیق کیا جس نے آگ کو بجھا دیا' پھر ہوا کو حکم دیا تو اس نے پانی کو منجمد کر دیا۔ پس فرشتوں میں اختلاف ہوا تو کہنے لگے کہ حق تعالیٰ سے پوچھتے ہیں کہ: ''آپ کی تخلیقات میں وہ کون سی شے ہے کہ جس سے زیادہ اور کوئی چیز قوی نہیں'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدمی جو صدقہ دے دائیں ہاتھ سے اس طرح کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ میں نے اس سے زیادہ قوی اور کوئی شے خلق نہیں کی''۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی تخلیق سے پہلے سات فرشتے پیدا کئے۔ پھر آسمانوں کو پیدا کیا۔ تو ہر فرشتے کو ایک آسمان پر موکل ٹھہرایا اور اس آسمان کی دربانی اسے سونپی جب زمین پر کے فرشتے جو لوگوں کے نامۂ اعمال کے منشی ہیں انھیں حفظہ کہا جاتا ہے۔ تو وہ بندے کا

عمل جو اس نے صبح سے لے کر رات تک کیا ہو اسے اوپر لے جاتے ہیں۔ پہلے آسمان تک اس کی اطاعت کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اور اس شخص نے اتنی عبادت کی ہو گی کہ اسی کا نور سورج کے نور کا سا ہو گا۔ تو وہ فرشتہ جو آسمان دنیا پر مؤکل ہو گا کہے گا کہ ''یہ طاعت اس کے منہ پر مار دو کیونکہ میں اہل غیبت کا نگہبان ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جو شخص بھی غیبت کرتا ہے اس کے عمل کو اپنے پاس سے آگے نہ جانے دینا؛ پھر ایک دوسرے شخص نے غیبت نہ کی ہو گی اس کے عمل کو اوپر جانے دیں گے حتیٰ کہ آسمانِ دوم تک پہنچ جائے گا۔ تو وہاں کا موکل فرشتہ کہے گا کہ اس کے عمل کو اس کے منہ پر دے مارو کیونکہ اس نے عمل دنیا کے لیے کیا تھا۔ اور مجالس میں لوگ اس پر فخر کیا کرتے تھے۔ اور مجھے حکمِ خداوندی یہ ہے کہ ہر وہ عمل جو کسی نے دنیا کے لیے کیا ہو اور لوگ اس پر نازاں ہوں اس کو روک دوں' پھر ایک اور شخص کا عمل نامہ بلند کریں گے جس میں صدقہ ہو' روزہ ہو' نماز ہو اور نگہبان اس کے نور سے متحیّر ہوں گے جب وہ تیسرے آسمان پر پہنچے گا تو وہ فرشتہ کہے گا کہ 'میں کبر پر موکل ہوں اور میں متکبرانہ اعمال کو روکتا ہوں اور اس نے لوگوں پر تکبر کیا تھا' پھر ایک اور شخص کے عمل کو بلند کریں گے حتیٰ کہ چوتھے آسمان پر پہنچے گا تو وہ فرشتہ کہے گا کہ میں عُجب کا مؤکل ہوں۔ اور اس شخص کا عمل عُجب سے خالی نہیں اس لیے میں اجازت نہیں دیتا کہ اس کا عمل آگے جائے' پھر ایک اور کا عمل بلند کیا جائے گا اور وہ عمل اس دُلہن کی طرح حسین ہو گا جسے اس کے شوہر کے حوالے کیا جانے والا ہو۔ پانچویں آسمان تک لے جائیں گے تو وہاں کا فرشتہ کہے گا کہ اس عمل کو لے جایئے اور اس کے منہ پر دے ماریئے۔ اور اس کی گردن پر رکھ دیجئے' کیونکہ میں حسد کا مؤکل ہوں۔ اور یہ شخص اس شخص سے حسد کرتا تھا جس کا علم و عمل اس کے علم و عمل کے برابر ہو جاتا تھا؛ پھر ایک اور شخص کا عمل اوپر لایا جائے گا حتیٰ کہ کسی ممانعت کے بغیر چھٹے آسمان تک پہنچ جائے گا۔ تو اس آسمان کا فرشتہ کہے گا کہ یہ عمل اس کے منہ پر مار دو کیونکہ یہ شخص جب کوئی دوسرا مصیبت یا رنج میں مبتلا ہوتا تھا تو یہ نہ صرف اس پر رحم نہ کرتا الٹا خوش ہوتا تھا۔ میں فرشتۂ رحمت ہوں۔ مجھے حکم ہے کہ بے رحموں کو منع کروں' پھر ایک اور کا عمل اوپر لایا جائے گا کہ نور اس کا آفتاب کے نور کا سا ہو گا۔ اور شہرت اس کی آسمانوں میں بجلی کی کڑک کی سی ہو گی۔ اور کوئی فرشتہ اس کو روک نہ سکا ہو گا جب آسمانِ ہفتم تک پہنچا تو وہ فرشتہ جو آسمان ہفتم کا مؤکل ہے کہے گا کہ 'یہ عمل اس کے منہ پر دے مارو اور اس کے دل پر قفل ڈال دو کیونکہ اس نے اس عمل سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی نہ کی تھی بلکہ مقصود اس کا علماء کے نزدیک حشمت اور شہروں میں ناموری اور شہرت تھا اور جو کچھ ایسا ہے وہ ریا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ریا کار کا عمل قبول نہیں کرتا۔ پھر ایک اور کا عمل بلند کیا جاتا ہے اور اسے ساتویں آسمان سے آگے لے جاتے ہیں اور اس میں خوش خلقی' ذکر اور تسبیح اور قسما قسم کی عبادات ہوں گی تو ساتوں آسمانوں

کے فرشتے اس عبارت کے ہمراہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچیں گے اور سب گواہی دیں گے کہ یہ عمل بہ اخلاص ہے اور پاک ہے تو حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم اس کے عمل وعلم کے شاہد ہو اس میں اس کے دل کا نگہبان ہوں اس نے یہ اعمال میرے لیے نہیں کیئے اس کے دل میں نیت کچھ اور تھی۔ میں کہ اس کا خدا ہوں میری لعنت اس پر' تو فرشتے کہیں گے کہ آپ کی لعنت کے ساتھ ہماری لعنت بھی' اور آسمان اور جو کچھ آسمانوں میں ہے سب کہتے ہیں کہ ہماری لعنت ہو اس پر''۔

اس طرح کی حدیثیں ریا کے بارے میں بہت سی ہیں

اور آثار سے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ سر جھکائے ہوئے ہے یعنی کہ میں پارسا ہوں' تو آپ نے اسے کہا کہ ''اے ٹیڑھی گردن والے! گردن سیدھی کر کیونکہ خشوع دل میں ہوتا ہے گردن میں نہیں''۔ ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ سجدے میں رو رہا ہے۔ تو انھوں نے کہا کہ ''جو تُو مسجد میں کر رہا ہے اگر اپنے گھر میں کرتا تو تو بے نظیر ہوتا''۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ریاکار کی تین علامتیں ہیں: جب تنہا ہوتا ہے سستی کرتا ہے اور جب لوگوں کو دیکھتا ہے تو ہشاش بشاش ہوتا ہے اور جب اس کی تعریف کی جاتی ہو تو اپنے عمل میں اضافہ کرتا ہے۔ جب اس کی مذمت کرتے ہیں تو عمل میں کمی کر دیتا ہے''۔

ایک شخص نے سعید مسیّب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ''اگر کوئی مال ثواب کے لیے اور لوگوں کی تعریف کے حصول کے لیے دے تو اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟'' تو انھوں نے کہا کہ ''وہ خدا کو اپنا دشمن بنانا چاہتا ہے؟'' تو اس شخص نے کہا ''نہیں'' تو اس پر آپ نے کہا کہ ''وہ ایسا کام کیوں کرتا ہے جو سوائے خدا کے لیے نہیں کرنا چاہئے''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو تازیانے سے مارا تو فرمایا کہ ''مجھ سے قصاص کے لیے مجھے تازیانے سے مارو'' تو اس شخص نے کہا ''میں نے تمھارے لیے اور خدا کے لیے بخش دیا'' تو حضرت نے فرمایا ''اس کا کوئی فایدہ نہیں یا تو مجھے بخش تا کہ میں اس کا حق پہچانوں یا خدا کے لیے بدون شرکتِ غیرے بخش'' تو اس شخص نے کہا کہ ''میں نے فقط خدا کے لیے بے شرکت غیرے بخش دیا''۔

فضیل عیاض فرماتے ہیں کہ ''ایک وقت تھا کہ لوگ جو کچھ کرتے تھے بہ ریا کرتے تھے اب جو کچھ نہیں کرتے اس کی ریا کرتے ہیں''۔ قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''جب انسان ریا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ ''دیکھو انسان میرے ساتھ کیسے استہزا کرتا ہے:

وہ کام جن میں ریاکاری ہوتی ہے

یاد رہے کہ ریا کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پارسا دکھائے ان کے سامنے خود کو آراستہ کرتا ہے تاکہ لوگوں کے دلوں میں قبولیت پائے۔ تاکہ لوگ اس کا احترام کریں اور اسے مقبول ٹھہرائیں اور اس کی تعظیم کریں اور اچھی نگاہوں سے اسے دیکھیں اور وہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ چیز جو پارسائی اور دین میں عظمت کی دلیل ہو اسے لوگوں کو دکھاتا اور پیش کرتا ہے اور یہ پانچ قسم کی ہے:

جنس اوّل: بدن کی ظاہری صورت ہے۔ مثلاً چہرے کو زرد بنانا ہے تاکہ لوگ گمان کریں کہ شب زندہ دار ہے اور اپنے آپ کو نزار کرتا ہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ تہذیب نفس کے لیے بہت ریاضت کرتا ہے اور رُو گرفتہ ہوتا ہے تاکہ سمجھیں کہ دین کے غم میں اس حال کو پہنچا ہے۔ اور بالوں میں کنگھی نہیں کرتا تاکہ گمان کریں کہ اسے اس کی فراغت ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے خود کو بھول گیا ہے۔ اور بات آہستگی سے کرتا ہے اور آواز بلند نہیں کرتا تاکہ لوگ سمجھیں کہ اس کے دل میں دین کی توقیر ہے اور لب خشک رکھتا ہے تاکہ سمجھیں کہ روزہ سے ہے۔ چونکہ یہ صورتیں لوگوں کے گمان کا باعث ہوتی ہیں اس لیے نفس کو ان کے اظہار سے لذت اور حلاوت حاصل ہوتی ہے۔ اسی بناء پر حضرت عیسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ: ''جب کوئی روزہ رکھے اسے چاہئے کہ اپنے بالوں کو کنگھی سے مرتب کرے اور ان میں تیل لگائے اور لب روغن سے تر رکھے اور آنکھوں میں سرمہ ڈالے تاکہ کسی کو گمان نہ ہو کہ یہ شخص روزے کی حالت میں ہے''۔

دوسری قسم: ریا بذریعہ لباس ہے۔ جیسے کوئی صوف پہنے اور کپڑا موٹا جھوٹا اور مختصر، میلا اور پھٹا ہوا پہنے تاکہ لوگ اسے زاہد سمجھیں یا نیلا لباس اور سجادہ اور صوفیوں کی گدڑی پہنے تاکہ لوگ اسے صوفی سمجھیں باوجود اس کے صوفی گری کی کسی چیز سے بھی آشنا نہ ہو۔ یا خرقہ پگڑی کے اوپر ڈال لے یا چرمی موزہ پہنے تاکہ لوگ سمجھیں کہ طہارت میں محتاط ہے۔ حالانکہ محتاط ہوتا نہیں۔ یا جامہ دراز کہ زاہد اور شیوخ پہنتے ہیں اور طیلسان جو کندھے پر ڈالتے ہیں، پہنے کہ لوگ سمجھیں کہ عالم ہے درآں حالیکہ عالم نہ ہو۔ لباس کی ریاکاری میں یہ لوگ دو قسم کے ہیں۔ ایک گروہ عوام میں مقبولیت کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ پھٹا پرانا لباس ڈھونڈ کر پہنتے ہیں اور اگر کوئی ان کو بہ اصرار کہے کہ جامۂ توزی یا جامۂ خز (پوست جانور) یا ایسی چیز جو حلال ہو پہن لو تو اُمران کے لیے موت سے بھی مشکل ہوتا ہے کیونکہ انھیں یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ پھر تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ انھوں نے زاہدی چھوڑ دی ہے۔ اور ایک گروہ وہ ہے جو عوام خَلق کا قرب بھی چاہتا ہے اور بادشاہوں کی نزدیکی بھی اور عورتوں کے ہاں بھی مقبول ہونا چاہتا ہے۔ تو اگر پرانا لباس پہنیں تو سلطان کے نزدیک حقیر لگیں گے اور اگر تجمل

کا سامان کریں تو عوام کی نگاہوں میں حقیر ٹھہریں گے۔ اس لئے کوشش کرتے ہیں کہ باریک صوف اور گل بوٹہ دار لنگیاں ہاتھ لگیں جیسا کہ صالحوں اور زاہدوں کے کپڑوں کا رنگ ہوتا ہے تا کہ عوام اسے دیکھیں جب کہ قیمت کپڑے کی دولت مندوں کے کپڑوں کے برابر ہوتی ہے۔ تا کہ سلطان بہ حقارت نہ دیکھیں۔ ایسے لوگوں میں سے اگر آپ کسی سے کہیں کہ بھائی جامۂ خز چرمی یا توزی پہن لو جو اگرچہ اس کے فوطے سے سستا ہو تو یہ امر اس کے لئے جان کنی سے زیادہ مشکل تر ہوگا۔ مختصر یہ کہ جو لباس بھی وہ پہنتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ زہد سے پشیمان ہے اور اس کی تاب نہیں رکھتا۔ اور وہ احمق جب اپنے دل میں جھانکتا ہے کہ وہ لباس جو حلال ہو اور جسے اہل دین پہنتے ہوں وہ اسے نہیں پہن سکتا۔ تو یہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ وہ اس وسیلے سے لوگوں کی پرستش کر رہا ہے۔ ممکن ہے جانتا ہو لیکن بد بخت بے باک ہو۔

تیسری قسم: یعنی گفتار میں ریاکاری جیسے کہ لب ہلاتا رہے کہ لوگ سمجھیں کہ ہمیشہ ذکر میں لگا رہتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ واقعی ذکر کر رہا ہو۔ لیکن اگر چاہے کہ دل میں ذکر کرے اور لب نہ ہلائے تو یہ نہ کر سکے گا۔ کیونکہ پھر لوگوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ ذکر کر رہا ہے! یا لوگوں کے سامنے نواہی و منکرات کا ذکر کرے اور خود خلوت میں ایسا نہ کرے یا صوفیوں کی طامات اور اقوال یاد کر لے کہ لوگ سمجھیں کہ علم تصوّف سے خوب آگاہ ہے۔ یا سر وقت سر جھکائے اور سر ہلاتا رہے کہ لوگ سمجھیں کہ وجد کی حالت میں ہے۔ یا ٹھنڈی آہیں بھرے تا کہ مسلمانوں کی اپنے دین کی غفلت پر اندوہ گیں ہونے کا مظاہر کرے۔ یا کچھ حکایات یا احادیث یاد کر لے اور بیان کرے تا کہ لوگ کہیں کہ اس کا علم تو بہت زیادہ ہے اور اس نے بہت سے پیروں سے کسب فیض کیا ہے اور اس راہ میں سفر کی صعوبتیں اٹھائی ہیں۔

چوتھی قسم: طاعت کی ریا ہے۔ جیسے کہ کوئی دور سے آئے اور نماز خوبی سے ادا کرے اور سر آگے ڈال دے۔ اور رکوع اور سجود میں زیادہ وقت لگائے اور ادھر ادھر نہ دیکھے اور لوگوں کے سامنے صدقہ بہت دے وغیرہ اور جب چلے تو آہستہ چلے اور سر جھکائے رکھے۔ اور جب تنہا ہو تو جلدی چلے اور کسی کو دور سے آتا دیکھے تو پھر آہستہ چلنے لگے۔

پانچویں قسم: ریا کی یہ ہے کہ کہے میرے مرید ہیں اور بہت شاگرد ہیں۔ اور خواجگان اور امراء میرے سلام کے لئے آتے ہیں اور مجھ سے برکت حاصل کرتے ہیں۔ اور مشائخ میرا احترام کرتے ہیں اور مجھ پر تحسین کی نگاہ ڈالتے ہیں ممکن ہے۔ یہ مطالب اس کی زبان سے ادا ہوں یا کسی سے دشمنی اور جدال میں کہے کہ ''تو کون ہے؟ اور تو مرید کس کا ہے؟ اور تیرا پیر کون ہے؟ میں نے بے شمار پیر دیکھے ہیں اور کتنے ہی سال

فلاں بزرگ کی صحبت اٹھائی ہے تو تُو پیروں میں سے کن کی خدمت میں حاضر رہا ہے وغیرہ'' اور اس طرح اپنے بارے میں رنج اٹھانے کا ذکر کرے اور لذت میں ان تمام تکالیف کا دکھاوا آسان ہوتا ہے کیونکہ راہب ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ اپنی خوراک چنے کے ایک دانے کے برابر لے آیا ہو۔ اس تمنا میں کہ لوگوں کو علم ہو تو وہ میری تعریف کریں اور تمام جو مذکور ہوا مطلب یہ ہے کہ جب عبادت کی غرض نمود پارسائی ہو تو حرام ہے کیونکہ پارسائی تو اللہ کے لئے ہونی چاہئے۔ لیکن اگر کوئی ایسی چیز کے ذریعے جو عبادت نہ ہو جاہ اور قبولت کا متلاشی ہو تو جائز ہوگا۔ کیونکہ جو کوئی گھر سے باہر نکلتا ہے لباس بہتر پہنتا ہے۔ اور زیب و زینت کرتا ہے تو یہ مباح ہے بلکہ سنت ہے کیونکہ اس وسیلے سے وہ اپنے جمال اور مروت کا اظہار کرتا ہے نہ کہ اپنی پارسائی کا۔ بلکہ اگر کوئی علم لغت، نحو و حساب و طب وغیرہ کے بارے میں کہ علم دین سے متعلق نہیں اپنی برتری کا اظہار کرے کہ دوسرے ان میں اس کی پیروی کریں تو ان کا اظہار مباح ہوگا۔ کیونکہ ریا کا مطلوب جاہ ہوتا ہے اور ہم کہہ چکے ہیں کہ اگر طلبِ جاہ حد سے نہ گذرے مباح ہے۔ لیکن طاعت و عبادت میں ریا ناروا ہے۔

ایک دن آنحضرت ﷺ گھر باہر آنا چاہتے تھے کہ اصحاب جمع ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ نے پانی کے تالاب میں دیکھا اور اپنی پگڑی اور بالوں کو مرتب کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ''اے اللہ کے رسول آپ ایسے کرتے ہیں؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''ہاں'' اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا بندہ جب اپنے بھائیوں سے ملے تو خود کو مرتب اور آراستہ کر لے''۔ اور جس قدر کوئی خود کو آراستہ کرے کہ یہ فعل رسول ﷺ سے بھی اصلِ دین ہی سے ہوگا کیونکہ آپ ﷺ اس پر مامور تھے کہ خود کو صحابہ کے دل و نگاہ میں آراستہ رکھیں تاکہ ان میں میلان زیادہ ہو اور رسول ﷺ کی پیروی میں بہ شوق بڑھیں۔ لیکن اگر کوئی تجمل ہی کے لئے کرے تو بھی روا ہے کہ سنت ہے۔

اس کے فواید میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کوئی خود کو پریشان رکھتا ہو اور مروت کو ملحوظ نہ رکھے تو لوگ اس کی غیبت کرنے لگتے ہیں۔ اور اس سے نفور ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایسا انسان ان برائیوں کا باعث قرار پاتا ہے۔ لیکن ریا اگر عبادت میں ہو تو حرام ہے۔ دو اسباب کی بناء پر: ایک یہ کہ فریب کا مرتکب ہوا کیونکہ لوگوں کو دکھاتا ہے کہ وہ اس عبادت میں مخلص ہے۔ لیکن چونکہ دل کا مطمح خلق ہوتی ہے اس لئے مخلص نہ ہوا۔ اور اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ سب ان کے لئے کرتا ہے تو لوگ اس کے دشمن ہو جائیں گے اور وہ مقبولیت کھو دے گا۔ دوسرے یہ کہ نماز اور دیگر عبادات چونکہ فقط خدا تعالیٰ کے لئے مختص ہیں جب دوسروں کے لئے کرے گا تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمسخر کیا ہوگا اور عاجز اور ضعیف انسان کو اپنا مقصود ٹھہرایا ایسے کام میں جس کا

مقصود صرف ذاتِ حق تعالیٰ ہونی چاہئے تھی۔ مثال اس کی ایسے شخص کی سی ہے جو بادشاہ کے حضور خادم کی صورت میں مؤدّب کھڑا ہو غرض اس کی یہ ہو کہ کسی غلام یا کنیز کو دیکھے اور بادشاہ کے سامنے یوں دکھائے کہ میں اس کی خدمت کے لیے اِستادہ ہوں۔ جب مقصود اور کچھ ہو تو یہ تذلیل ہوگی جو اس نے بادشاہ کی کی۔ کیونکہ فی الاصل بادشاہ کی خدمت کی بجائے ایک اور مقصد اس کے لئے اہم تر تھا۔ اسی طرح جو کوئی نماز ریا کے لئے ادا کرے تو درحقیقت رکوع و سجود اس کا اوروں کے لئے ہوگا۔ (خدا کے لئے نہیں) کیونکہ سجود سے مقصود انسان کی تعظیم ہوتی تو یہ شرک جلی ہوتا۔ لیکن آدمی کی تعظیم اس وجہ سے ہے کہ لوگوں میں مقبولیت اس کا ہدف تھا۔ چونکہ سجود حق تعالیٰ کو اس لئے کرتا ہے کہ اپنی مقبولیت حاصل کرے۔ تو یہ شرک خفی (پنہاں) ہے نہ کہ جلی (آشکارا)۔

ریا کے درجات

یاد رہے کہ ریا کے مختلف درجے ہیں اور بعض بہت بڑے درجے ہیں۔ اور تفاوت ان کا تین اصلوں سے جنم لیتا ہے:

اصل اول: یہ ہے کہ ریا کا ارادہ بے مقصد ثواب ہو۔ جیسے کہ نماز پڑھے، روزہ رکھے اور اگر تنہا ہوتا تو نماز روزہ نہ کرتا۔ تو یہ بہت ہی بری بات ہے۔ اور اس کی سزا بھی بہت سخت ہے۔ لیکن اگر مقصد ثواب بھی رکھتا ہو لیکن اگر تنہا ہوتا تو ادا نہ کرتا تو یہ بھی اوّلین درجے کے قریب ہی ہے۔ کیونکہ اس کی یہ کمزور نیت اسے اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچا نہیں سکتی۔ لیکن اگر قصدِ ثواب غالب ہو اور تنہا ہونے کی صورت میں بھی نماز روزہ کرتا۔ لیکن جب کوئی اس عالم میں اسے دیکھ رہا ہو تو اس کے نشاط میں اضافہ ہوتا ہو تو ادائیگی اس کے لئے آسان تر ہوتی ہے۔ تو مجھے امید ہے کہ اس بناء پر اس کی عبادت باطل نہ ہوگی اور ثواب بھی باطل نہ ہوگا۔ لیکن جس قدر اس میں لذتِ ریا کا دخل ہوگا اس قدر اس کی عقوبت کی جائے گی۔ یا ثواب میں اسی نسبت سے کمی کر دی جائے گی۔ لیکن اگر دونوں قصد برابر سرابر ہوں اور کوئی ایک غالب تر نہ ہو۔ تو یہ شرکت ہوگی۔ اور احادیث سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ اس سے بہ طور مساوی نہیں بچے گا بلکہ اس کی عقوبت ہوگی۔

اصل دوم: تفاوت کہ جس میں ریا کرتے ہیں وہ طاعت ہے اور وہ بھی تین درجوں کی ہے:

درجۂ اوّل: ریا ہوگی اصل ایمان میں۔ اور یہ ایمان منافق کا ہوگا۔ تو اس کا معاملہ کافر سے زیادہ سخت ہوگا۔ کیونکہ وہ باطن میں بھی کافر ہوتا ہے اور بہ ظاہر فریب دیتا ہے۔ اور ایسے ابتدائے اسلام میں بہت سے تھے۔ اور آج کل نہایت کم ہوں گے۔ لیکن اباحتی اور وہ جو ملحد ہو گئے ہیں اور شریعت اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور بہ ظاہر اُس کے خلاف دکھائی دیتے ہیں وہ ان جملہ منافقوں میں سے ہیں جو ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے۔

درجۂ دوم: اصل عبادت میں ریا ہے۔ جیسے کوئی خدا نکردہ لوگوں کے سامنے نماز بے وضو ادا کرے۔ یا روزہ رکھے اور اگر تنہا ہوتا تو روزہ نہ رکھتا۔ یہ بھی بہت برا ہے لیکن اصل ایمان کے ساتھ ریا کا سا نہیں۔ لیکن چونکہ حق تعالیٰ کی بجائے لوگوں کے ہاں منزلت مقصود ہوتی ہے تو اس لئے قربِ حق تعالیٰ کی بجائے قربِ خلق کو دوست رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا ایمان کمزور ٹھہرا اگرچہ کافر نہ ہوگا۔ لیکن اگر توبہ نہ کرے تو وقتِ مرگ معرضِ خطر میں ہوگا۔

درجۂ سوم: یہ ہے کہ ریا اصل ایمان میں اور فرایض میں نہ کرے لیکن سنت میں ریا کرے۔ جیسے کہ نماز عشاء ادا کرے۔ اور صدقہ دے اور جماعت میں شریک ہو جائے۔ اور عرفہ کے دن اور عاشورہ کے روز اور پیر اور جمعرات کو نیز فضیلت والے ایام میں روزہ رکھے اور غرض یہ ہو کہ لوگ اس کی مذمت نہ کریں۔ یا اپنی تعریف مقصود ہو اور ہو سکتا ہے کہ کہے میں خیال کرتا ہوں کہ اگر میں یہ سب نہ کرتا کہ یہ مجھ پر فرض نہ تھا اور میں اب کسی ثواب کی امید نہیں رکھتا۔ تو چاہئے کہ اس کی عقوبت نہ ہو لیکن ایسے نہیں ہے کیونکہ عبادات حق تعالیٰ کے لئے ہیں کیونکہ خلق کو ان میں سے حاصل نہیں۔ لیکن جب کوئی یہ عبادات لوگوں کے لئے کرے گا تو گویا اس نے خلق کو حق تعالیٰ پر ترجیح دی۔ ایسی چیز میں جو سوائے حق تعالیٰ کے کسی اور کے لئے جائز ہی نہیں۔ تو یہ استہزاء ٹھہرا جو عقوبت کا باعث ہے۔ اگرچہ تعرض اس سختی کا نہ ہو جو ترکِ فرائض کی صورت میں ہوتا۔ اور وہ اس ریا کے قریب ہوگا جو لوگ سنتوں میں کرتے ہیں جو عبادات کی صفات ہیں جیسے کہ جب کسی کو دیکھے کہ رکوع و سجود اچھی طرح کرتا ہے اور کسی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اور قرأت بہت کرتا ہے۔ اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے تنہا نہیں کرتا۔ اور پہلی صف میں بیٹھتا ہے اور زکوٰۃ میں وہ شے دیتا ہے جو زیادہ عمدہ ہو اور روزہ کے دوران زبان پر قابو رکھتا ہے اور تنہائی میں بیٹھتا ہے۔

اصل سوم: ریا کار کا مقصود تفاوت ہوتا ہے کہ ریا کار کو لازماً ریا سے کچھ مقصود ہوتا ہے اس کے تین درجے ہیں:

درجۂ اوّل: یہ کہ مقصود اس کا جاہ ہوتا کہ اس کے ذریعے کسی فسق اور معصیت کو پہنچے جیسے کوئی امانت، تقوٰی اور شبہات سے مال میں پرہیز وغیرہ کا اظہار اس لئے کرے کہ اسے اوقاف وقضا و وصایا و ودیعت و امانت و مالِ یتیم کی ولایت مل جائے تا کہ پھر اس میں خیانت کرے یا مال اس کے حوالے کریں تا کہ زکوٰۃ، صدقہ دے اور مستحق تک پہنچائے یا حج کے راستے میں محتاجوں پر صرف کرے یا صوفیوں کی خانقاہ میں صرف کرے یا مسجدوں کی تعمیر اور سرایوں کی تعمیر میں صرف کرے۔ یا مجلس آراء ہو اور خود کو پارسا ظاہر کرے لیکن

آنکھ کسی عورت پر گاڑ رکھی ہو اور چاہتا ہو کہ وہ عورت اس کی طرف مایل ہو۔ تا کہ فساد کے لئے اس کے ساتھ بیٹھے۔ یا خود کسی مجلس میں جائے اور مقصود یہ ہو کہ وہاں کسی امرد یا عورت کو گھورے۔ یہ اور اس جیسے دوسرے اغراض سخت ترین مقصود میں سے ہیں۔ کہ انسان عبادت حق تعالیٰ کو وسیلہ معاصی کا بناتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی کسی کو مال یا عورت کی تہمت لگائے تو وہ مال صدقے میں دے اور پرہیز گاری کی نمود کرے تا کہ اس تہمت کو اپنے اوپر سے دور کر سکے۔ بہ طوریکہ لوگ کہیں کہ جو اپنا مال دے رہا ہے وہ دوسرے کے مال کو حلال کیسے سمجھ سکتا ہے۔

درجۂ دوم: یہ ہے کہ اسے امر مباح مقصود ہو۔ جیسے واعظ کہ خود کو پارسا ظاہر کرتا ہے تا کہ لوگ اسے کچھ دیں۔ یا یہ غرض ہو کہ کوئی عورت اس کے ساتھ نکاح کی رغبت کرے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے غضب کا باعث بن سکتا ہے اگرچہ حال اس کا اس کی ماضی کا سا برا نہ ہو۔ کیونکہ یہ بھی طاعتِ حق تعالیٰ کو متاعِ دنیا کے حصول کا وسیلہ بنانے کے مترادف ہے۔ حالانکہ طاعت قربت حق تعالیٰ اور سعادتِ اُخروی کا وسیلہ ہے۔ تو جب اس نے اسے حصول دنیا کا وسیلہ بنایا تو یہ بہت بڑی خیانت ہے۔

درجۂ سوم: یہ ہے کہ کوئی چیز تو مطلوب نہ ہو لیکن حذر اس لئے کرے کہ لوگ اسے احترام کی نگاہ سے دیکھیں۔ جیسے کہ لوگ زاہدوں اور صالحوں کو دیکھتے ہیں۔ جیسے کہ چلتا ہے لیکن جب کسی کو دور سے اپنی طرف آتا دیکھتا ہے تو آہستہ چلنے لگتا ہے۔ اور سر جھکا لیتا ہے اور مشائخ کی طرح چلنے لگتا ہے تا کہ اسے اہلِ غفلت میں شمار نہ کریں۔ اور سمجھیں کہ وہ چلنے میں بھی گویا کارِ دین میں مشغول ہے۔ اور جب ہنسنا چاہے تو ہنسی کو روک لے تا کہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ اس پر ہنسی مذاق غالب ہے۔ یا مزاح کی کوئی بات اس لئے نہ کرے کہ لوگ کہیں گے کہ ہزل گو ہے۔ یا آہِ سرد کھینچے اور استغفار کرے اور کہے "سبحان اللہ" ایسی غفلت انسان سے! ہمارے لئے اس آخرت سے غفلت کی کون سی راہ۔ ہے جو ہمارے سامنے ہے؛ اور حق تعالیٰ اس کے دل سے واقف ہیں کہ اگر وہ تنہا ہوتا تو استغفار کرتا نہ اظہار افسوس کرتا۔ یا کوئی اس کے سامنے غیبت کرے تو کہے کہ لوگوں کو اس سے زیادہ اہم کام درپیش ہے۔ اس لئے اپنے عیوب اور اپنی غیبت میں مصروف رہنا چاہئے تو اولیٰ ہے' تا کہ لوگ نہ کہیں کہ وہ غیبت کر رہا ہے۔ یا کسی گروہ کو دیکھتا ہے کہ نماز تراویح یا نماز عشاء ادا کر رہے ہوں یا جمعرات اور پیر کے دن روزہ رکھتے ہوں۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو لوگ اسے کاہل شمار کریں گے تو اس خوف سے وہ بھی ان کی موافقت کرنے لگے یا روز عرفہ و عاشورا روزہ نہ رکھے لیکن پیاس پر بھی پانی نہ پئے تا کہ لوگ سمجھیں کہ روزہ سے ہے۔ یا کوئی اسے کھانے کے لیے کہے تو جواب میں کہے کہ میں معذور ہوں (یعنی کہ روزہ سے ہوں)۔ اور حقیقتاً

روزہ سے نہ ہو۔اسی طرح اس نے دونا پاکیاں جمع کرلیں۔ایک نفاق کہ روزہ سے نہ تھا اور دوسرے یہ کہ ظاہر کیا میں نے روزہ کی عبادت کو مخفی رکھنے کے لئے کنایۃً کہا کہ ''مرا عذری ہست اور نہیں کہا کہ میں روزہ سے ہوں۔تو چاہتا ہے کہ خود کو عبادت میں مخلص ظاہر کرے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ صبر نہ کرسکے اور پانی پینے لگے تو پھر کہے کہ کل رات میں بیمار تھا۔اس لئے آج روزہ نہیں رکھ سکا۔یا فلاں شخص نے مجھے افطار کرایا۔اور ہوسکتا ہے کہ فوراً نہ کہے کیونکہ پھر تو لوگ جان لیں گے کہ ریا ہے کچھ دیر صبر کرتا ہے اور کوئی اور بات درمیان میں لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ ماؤں کا دل بہت کمزور ہوتا ہے اس لئے وہ سمجھتی ہیں کہ اگر میرا بیٹا روزہ رکھے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔مقصود یہ کہ میں نے اپنی ماں کا دل رکھنے کے لئے روزہ نہیں رکھا یا کہے کہ انسان جب روزہ رکھتا ہے رات کو نینداس پر جلد غالب ہوجاتی ہے۔اور رات کی طویل عبادت سے رہ جاتا ہے۔یہ اسی طرح کے اور بہانے شیطان اس کی زبان پر لاتا ہے۔اور ریا کی پلیدی جب باطن میں ہو اور مسکین قاری اس سے غافل ہوتا ہے کیونکہ نہیں جانتا کہ وہ خود اپنی جڑ کاٹ رہا ہے اور اپنی عبادت کو ضرر پہنچاتا ہے۔یہ پھر بھی آسان ہے۔کیونکہ ریا میں بعض وہ ہیں جو ایک چیونٹی کے چلنے کی آواز سے بھی پوشیدہ تر ہوتی ہیں کہ زیرک اور علماء بھی اس کی شناخت سے عاجز ہیں۔احمق عابدوں کا تو ذکر ہی کیا۔

اس ریا کو جاننا کہ جو ایک چیونٹی کی رفتار سے بھی پوشیدہ تر ہے

یاد رہے کہ ریا میں بعض ظاہر ہیں جیسے کوئی لوگوں کے درمیان نماز عشاء ادا کرے۔اگر تنہا ہوتو نہ کرے اور یہ ریا ظاہر ہے۔اس سے پوشیدہ تر وہ ریا ہوتی کہ کوئی ہر شب نماز ادا کرنے کا عادی ہو لیکن جب کوئی اور بھی موجود ہوتو شاداب تر ہو اور ادائیگی زیادہ آسان ہوجائے۔یہ بھی ظاہر ریا کی طرح ہے۔چیونٹی کے چلنے کی طرح خفی نہیں۔کیونکہ اسے بھی پہچانا جاسکتا ہے۔بلکہ ریا اس سے بھی پوشیدہ تر ہوتی ہے۔جیسے کہ دوسرے کی موجودگی نشاط اور آسانی کا باعث نہ بنے۔وہ اس طرح ہے کہ ہر رات نماز عشاء ادا کرتا ہے۔لیکن حال میں اس کی کوئی علامت ظاہر نہ ہو اور وہ اسے اپنے دل میں ایسے ہی پوشیدہ رکھے جیسے کہ آگ لوہے میں پوشیدہ ہوتی ہے۔لیکن اثر اس کا اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ اس صفت سے متصف ہے تو خوش ہوگا اور اپنے اندر کشادگی دیکھے گا۔اور یہ خوشی اور کشادگی دلیل اس بات کی ہے کہ ریا اس کے باطن میں پوشیدہ تھی۔اگر اس فرحت کو کراہت سے دور نہ کرے گا تو خطرہ اس بات کا ہے کہ یہ پوشیدہ رگ میں آجائے گی اور در پردہ چاہے کہ کوئی ایسا سبب بنائے کہ جس سے لوگ آگاہ ہوجائیں اور اگر صریحاً نہ کہے۔کنایۃً کہے اور اگر

کنایۃً نہ کہے تو شکل وصورت ایسی بنالے کہ جس سے اپنے آپ کو ضعیف اور شکستہ دکھا سکے تاکہ لوگ سمجھیں کہ شب بیدار رہا ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ ریا اس سے بھی زیادہ پوشیدہ ہو۔ مثلاً لوگوں کے آنے کی اطلاع پر شادنہ ہو اور فرحت زیادہ نہ بڑھے کہ لوگ موجود ہوں گے۔ لیکن باطن ریا سے پھر بھی خالی نہ ہوگا۔ علامت اس کی یہ ہے کہ جب کوئی اس کے پاس پہنچے سلام کے ساتھ ابتدا نہ کرے تو یہ اپنے باطن میں متعجب ہوگا۔ اور اگر کوئی اس کے احترام کو نظر انداز کردے یا اس کی ضرورت کو پورا کرنے میں نہ لگ جائے یا خرید وفروخت میں اس کے ساتھ مدارانہ کرے یا مجمعوں میں اس کے لئے زیادہ اچھی نشست مختص نہ کرے جس سے وہ اپنے باطن میں حیرت کا احساس کرے اور انکار کرے۔ تو ظاہر ہے کہ اگر اس نے اپنی اس عبادت کو چھپایا نہ ہوتا تو متعجب نہ ہوتا۔ تو گویا اس کا نفس اس عبادت کی بناء پر حرمت کا تقاضا کرتا ہے۔ القصہ اس کے نزدیک عبارت کا ہونا یا نہ ہونا برابر نہ ہوتا۔ ابھی تک اس کا باطن ریائے خفی سے پاک نہیں۔ اگر کسی کو ہزار دینار دے تاکہ اس سے وہ چیز حاصل کرے کہ جس کی قیمت ایک لاکھ دینار ہو۔ اسی طرح کسی پر احسان نہ رکھے اور کسی حرمت کی امید نہ رکھے اور لوگوں کے حق میں کاروبیکاری اس کے دل میں برابر ہوں۔ تو جب خدائے تعالیٰ کی عبادت کرے تاکہ ابدی سعادت کو پہنچے تو اس کے مقابلے میں چونکہ کسی شخص کی حرمت کا امیدوار ہے۔ پس خفی ترین ریا یہی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ روزِ قیامت علماء سے کہا جائے گا کہ ''لوگوں نے تمھارے ہاتھ اوروں کی نسبت ارزاں تر مال نہیں بیچا؟ تمھاری حاجت روائی میں لوگ کمر بستہ نہیں رہے؟ اور سلام کرنے میں انھوں نے ابتداء نہیں کی؟'' یعنی یہ جملہ تمھارے اعمال کی جزا ہے جو تم لے چکے اور تم نے اعمال خالصۃً اللہ کے لئے نہ کئے ان لوگوں میں سے ایک جنھوں نے خلق سے دوری اختیار کی تھی اور اللہ کی عبادت میں لگ گئے تھے۔ کہتا ہے کہ ''ہم نے فتنہ سے فرار کیا لیکن خوف یہ ہے کہ فتنہ ہمارے دین کے کام میں راہ پالے۔ کیونکہ جب ہم کسی کو دیکھتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ وہ ہمارا احترام کرے اور ہمارے حق کو ملحوظ رکھے''۔

یہی وجہ ہے کہ اہل اخلاص نے جہد کی ہے کہ اپنی عبادات کو اسی طرح پوشیدہ رکھیں جس طرح اپنے فواحش اور معاصی کو پنہاں رکھتے ہیں کیونکہ انھیں معلوم ہوچکا ہے قیامت میں سوائے خالص کے اور کچھ قبول نہ کیا جائے گا۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو حج پر جانے والا ہے اور جانتا ہے کہ صحرا میں سوائے زر خالص کے نہیں لیتے اور وہاں جان کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ اس لئے زر مغربی خالص حاصل کرتا ہے۔ اور جو کچھ کھوٹا ہو پھینک دیتا ہے اور ضروریات کے لئے زر خالص ہی کو محفوظ رکھتا ہے اور کوئی دن ایسا نہ ہوگا کہ خلق روزِ قیامت سے زیادہ دور ماندہ ہوں۔ اس لئے آج اگر کوئی عمل خالص حاصل نہیں کرتا تو اس روز (قیامت) خالی ہاتھ

ہوگا۔ اور کوئی اس کی دستگیری نہ کرے گا۔ جب تک وہ اپنے عمل کے شاہد چوپایہ جانوروں اور انسانوں میں امتیاز کرتا رہے گا۔ ریا سے خالی نہ ہوگا۔ اور جب تک فرق کرے گا کہ کوئی اسے عبادت کے دوران دیکھے یا سونے اور کھانے میں تو یہ ریا سے خالی ہونے کی دلیل نہیں۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ ''کمترین ریا اور خفی ترین ریا شرک ہے''۔ یعنی عبادتِ حق تعالیٰ میں اور کو شریک کرتا ہے۔ جب اس نے اللہ تعالیٰ کے علم کو کافی نہ سمجھا تو غیر اللہ کا علم اس کی عبادت پر اثر انداز ہوا۔

فصل: (عبادت پر لوگوں کے مطلع ہونے سے شادمانی کس وقت روا ہے)

یاد رہے کہ جو کوئی اس بات پر شاداں ہو کہ لوگوں کو اس کی عبادت کی خبر ہو تو یہ امر ریا سے خالی نہیں لیکن وہ شادمانی جو بحق ہو اس کی چار وجوہ ہیں:

اوّل: یہ کہ خوش اس پر ہو کہ خود پوشیدہ رکھنے کا قصد رکھتا ہو۔ لیکن حق تعالیٰ نے اس کی عبادت کا اظہار کر دیا اور گناہ بہت کئے تھے حق تعالیٰ نے ان کو پردہ پوشی کی تو جانے کہ اس پر فضل ولطف کیا جا رہا ہے کیونکہ جو اس کی برائیاں ہیں انھیں پوشیدہ رکھا جا رہا ہے اور اچھائیاں ظاہر کی جا رہی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے اس لطف وکریمی پر انسان خوش ہو نہ کہ لوگوں کی تعریف پر یا ان کی قبولیت پر، جیسے کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: ''قُلْ بِفَضْلِ اللهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا'' (قرآن: ۱۰/۵۸) (کہئے اے محمد ﷺ کہ لوگو! اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت پر خرم وشاداں رہو)

دوسرے: یہ کہ شاد ہو اس بات پر کہ جب اللہ تعالیٰ نے میری برائیوں کو دنیا میں پوشدہ رکھا تو یہ دلیل اس کی ہے کہ آخرت میں بھی پوشیدہ رکھے گا۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ ''خدا تعالیٰ اس سے کریم تر ہے کہ بندہ کا گناہ اس دنیا میں پوشیدہ رکھتا ہے وہ اس جہان میں اسے رسوا کرے!

سوم: انسان اس بات پر شاداں ہو کہ جانے کہ جب لوگ اس کو عبادت کرتے دیکھیں گے تو وہ بھی اس کی متابعت میں لگ جائیں گے۔ اس طرح وہ بھی سعادت ابدی کو پہنچیں گے۔ نتیجۃً اس کے اخفا کا ثواب بھی اس کے نامہ میں درج ہوگا۔ کیونکہ وہ اسی کا ارادہ رکھتا تھا اور ثواب آشکارا بھی درج نامہ ہوگا کہ بغیر اس کے چاہے، ظاہر ہوا۔

چہارم: یہ کہ وہ شخص اس بات پر شاداں ہو کہ جس نے اسے عبادت میں دیکھا وہ اس کا معترف ہو اور اس کے بارے میں خوش اعتقاد ہوا تو وہ خود اس ثنا اور اعتقاد کے باعث اللہ تعالیٰ کا مطیع قرار پایا۔ تو وہ اس کی طاعت حق پر خوش ہوگا۔ اپنے جاہ کی بناء پر نہیں۔ اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر کسی اور کے بارے میں طاعت

حق کی اطلاع ملے تو بھی اسی طرح خوش ہوگا۔

وہ ریا جو عمل کو باطل کر دیتی ہے اس کا بیان

یاد رہے کہ خیال آغازِ عبادت میں ہوتا ہے یا عبادت سے شروع ہونے پر یا درمیان عبادت میں۔ وہ جو آغاز عبادت میں ہوتا ہے وہ عبادت کو باطل کر دیتا ہے۔ کیونکہ نیت میں اخلاص شرط ہے۔ جو اس وجہ سے باطل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ریا اصل عبادت میں نہ ہو جیسے کہ نماز کی ابتداء اول وقت میں بہ سبب ریا کرے اور اگر تنہا ہوتا تو نماز میں تقصیر نہ کرتا۔ تو اوّل وقت کا ثواب باطل ہو جائے گا۔ لیکن اصل نماز درست ہونی چاہئے۔ کیونکہ اصل نماز میں اس کی نیت دیانت محض کے سبب سے ہے۔ ایسی ہی جیسے کوئی غصب شدہ گھر میں نماز ادا کرے۔ تو فریضہ ادا ہو گیا۔ اگر چہ خود گنہ گار ہے۔ لیکن نفس نماز میں گنہگار نہیں۔ تو یہاں بھی نفسِ نماز میں ریا کار نہیں۔ البتہ وقت میں ریا کار ہے۔ لیکن اگر نماز بہ اخلاص تمام کرے اور اس کے بعد ریا کا خیال کرے اور وہ اس کا اظہار کرے تو نماز گذشتہ باطل نہ ہوگی۔ لیکن اس نیت کی وجہ سے اسے عقوبت ہوگی۔

کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا کہ: ''کل رات میں نے سورۃ بقرہ پڑھی تھی''۔ اس پر ابن مسعود ؓ نے فرمایا کہ: ''اس کے نصیب میں اس عبادت سے یہی ہے'' یعنی یہ اظہار جو اسی نے کیا ہے اور ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کے حضور کہا کہ ''میں پیوستہ روزہ رکھتا ہوں'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تو روزہ دار ہے نہ بے روزہ'' کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ 'جب تو نے یہ کہہ دیا تو عبادت باطل ہوگئی' اور بہ ظاہر ہمارے نزدیک یہ ہے کہ آنحضرت اور ابن مسعود نے اس لئے یہ کہا کہ اس وسیلے سے معلوم ہوا کہ وقت عبادت میں ریا سے خالی نہ تھا۔ لیکن اگر ریا سے خالی ہو تو بعید ہوگا کہ وہ عبادت جو درست تھی اور مکمل ہوئی ہو وہ باطل ہو جائے اور اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یوں اس لئے کہا کہ پیوستہ روزہ رکھنے کے بارے میں نہی آئی ہے۔

لیکن وہ خیال جو دوران نماز آئے ہو لیکن اصل عبادت کو مغلوب نہ کرے نماز باطل نہ ہوگی۔ جیسے کہ کسی شے پر نظر پڑے یا گم کردہ چیز یاد آ جائے تو اگر لوگ نہ ہوتے تو نماز چھوڑ دیتا اور شرم کے مارے پوری کر دی تو یہ نماز باطل قرار پائے گی کیونکہ عبادت کی نیت جاتی رہی۔ اور یہ قیام لوگوں کے دکھاوے کے لئے تھا۔ لیکن اگر اصل نیت قائم ہو لیکن لوگوں کے دیکھنے کی وجہ سے ایک گونہ فرحت ہو اور نماز کو مزید اچھا کرنا شروع کر دے تو ہمارے نزدیک درست یہ ہے کہ نماز باطل نہ ہوگی۔ اگر چہ اس ریا کی وجہ سے گناہ گار ہوگا۔ لیکن اگر

کوئی اس کی عبادت کو دیکھے اور وہ اس عبادت کے باعث خوش ہو تو اس بارے میں حارث محاسبی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس کی نماز باطل ہوئی یا نہیں'' نیز فرمایا کہ ''میں اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور اب میرا گمان غالب یہ ہے کہ نماز اس کی باطل ہو گئی''۔ پھر فرمایا کہ ''اگر کوئی کہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں عمل پوشیدہ رکھتا ہوں لیکن جب لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ میں خوش ہوتا ہوں؛ تو آنحضرت نے فرمایا کہ تمھیں دوگونہ ثواب حاصل ہوئے۔ ایک ثواب خفی رکھنے کا تو دوسرے اظہار کا' تو جواب اس کا یہ ہے کہ ''یہ حدیث مرسل[1] ہے اور اسناد اس کے متصل نہیں ہیں''۔ پھر فرمایا کہ ''اس نے اس سے یہ چاہا کہ فراغت عبادت کے بعد اظہار ہو اور خوش ہو یا یہ چاہا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر خوش ہو گا اظہار طاعت میں' جیسے کہ ہم اس سے قبل کہہ چکے ہیں کہ۔ اور اس بناء پر کہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ لوگوں کے مطلع ہونے پر خوش ہونا اس لئے ہو کہ ثواب اس کا زیادہ ہو گا۔ اگرچہ باعث معصیت نہ ہوا ہو'' تو یہ ہے قول محاسبی؛ اور ہمارے نزدیک ظاہر ترین یہ ہے کہ اگر اسی قدر خوش ہو جس سے عمل میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور اصل نیت اپنی جگہ قائم ہو اور عمل بہ طریق آن نیت کرے تو اس سے نماز باطل نہ ہو گی۔ واللہ اعلم بالصواب

دل میں کی ریا کا علاج

یاد رہے کہ یہ بیماری بہت بڑی ہے اور خطرہ اس کا بہت ہے۔ اور علاج اس کا واجب ہے۔ اور انتہائی کوشش کے سوا اس کا علاج ممکن نہیں۔ کیونکہ یہ بیماری طبیعت دل سے ممزوج ہوتی ہے اور انسان کے باطن میں راسخ ہو چکی ہوتی ہے۔ اور علاج پذیر مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ اور اس بیماری کی صعوبت کا سبب یہ ہے کہ انسان بچپن ہی سے دیکھتا ہے کہ لوگ باہم روی و ریا کو ملحوظ رکھتے ہیں اور خود کو ایک دوسرے کی نظر میں آراستہ رکھتے ہیں۔ اور تمام تر یا بیشتر ان کا وتیرہ یہی ہوتا ہے۔ تو یہ بچے کے دل میں جنم لینے لگتی ہے۔ اور دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ عاقل کامل ہو جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ زیان کار ہے۔ اور یہ عادت غالب ہو چکی ہوتی ہے اور معالجہ اس کا دشوار ہو چکا ہوتا ہے۔ اس لئے بہت طویل عرصہ اس کے لئے درکار ہوتا ہے اور کوئی بھی اس بیماری سے خالی نہیں ہوتا۔ اور یہ مجاہدہ پوری خلق کے لئے فرض عین ہے۔ اور اس معالجے میں دو مقام ہیں۔

ایک ہے مسہل کی طلب' جو اس کے مادے کو باطن سے قلع قمع کر دے۔ اور یہ مسہل علم و عمل کا مرکب ہے۔ اور علمی یہ ہے کہ اس کو واجب سمجھے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اس لئے کرتا ہے کہ اسے اسی وقت اس سے

(۱) مرسل حدیث وہ ہے جس کا سلسلہ رواۃ ایک تابعی تک پہنچتا ہے اور صحابی تک نہیں۔

لذت حاصل ہوتی ہے جب یہ جان لے کہ آخرت میں اس کا ضرر اس قدر ہوگا کہ اس کی تاب نہ لا سکے گا۔ تو اس کام سے دستبردار ہونا آسان ہو جائے گا۔ جیسے کوئی جان لے کہ شہد میں زہر قاتل ملی ہوئی ہے تو اگرچہ حریص ہو ایسے شہد کے پینے سے دور رہے گا۔

ریا کی اصل اگرچہ کلیۃً دوستی' جاہ و منزلت سے پیدا ہوتی ہے لیکن اس کی تین جڑیں ہیں: ایک یہ اپنی تعریف و مدح کی محبت' دوسرے برائی اور مذمت کا خوف' تو تیسرے لوگوں سے توقعات۔ اسی بناء پر ایک بدوی نے آنحضرت سے پوچھا تھا کہ ''کیا فرماتے ہیں آپ اس شخص کے بارے میں جس نے حمیت کے لئے جہاد کیا یا اس لئے کہ کوئی شخص اسے دیکھے۔ یا اس لئے کہ لوگ اس کا چرچا کریں؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو کوئی جہاد اس لئے کرتا ہے کہ کلمۂ توحید کا غلبہ ہو تو اس کا یہ عمل راہِ حق میں ہے'' تو اس میں کنایۃً طلب ذکر و ثنا خود نیز مذمت کے خوف کا بیان ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی غزا اِس لئے کرتا ہے کہ اونٹ کے لئے عقالہ (زانو بند) حاصل کرے تو اس کی جزا سوائے اس کے نہیں کہ جس کی نیت اس نے کی ہو۔ پس ریا انھی تین اصلوں کا حاصل ہے۔ لیکن لوگوں کی مدح کی آرزو چاہئے کہ توڑ دے۔ اس لئے کہ روزِ قیامت اس سے اس کی فضیحت کو سوچے کہ سب کے سامنے منادی ندا کرتا ہوا کہے گا کہ ''اے ریا کار' اے فاجر' اے گمراہ شدہ تجھے شرم نہ آتی تھی کہ تو اللہ کی عبادت لوگوں کی تعریف کے بدلے میں بیچ ڈالتا تھا۔ اور خلق کی دلداری کو ملحوظ رکھتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی طرف التفات نہ کرتا تھا۔ اور حق تعالیٰ سے دوری اختیار کرتا تھا تاکہ خلق کے قریب ہو سکے۔ اور قبول خلق کو قبول حق پر ترجیح دیتا تھا اور اپنے خالق کی مذمت پر راضی رہتا تھا تاکہ لوگوں کی طرف سے ستایش پائے۔ اور تیرے نزدیک حق تعالیٰ سے بڑھ کر خوار تر نہ تھا کہ تُو لوگوں کا رضا جو ہوتا اور رضائے حق کی تجھے پروا نہ تھی۔ اور تُو نے اللہ تعالیٰ کے غضب کو انتخاب کیا''۔ صاحب خرد جب اس فضیحت سے خائف ہوتا ہے تو لوگوں کی مدح پر قانع نہیں ہوتا۔ خصوصاً جب معلوم ہو کہ جو طاعت وہ کرتا ہے اس کی نیکیوں کے پلڑے کے جھکاؤ کا باعث ہوں گی جب ریا کاری سے برباد ہو جائے گی تو وہ اس کی برائیوں کے پلڑے کے جھکاؤ کا سبب ہو جائے گی۔ اگر یہ ریا نہ کرتا تو انبیاء و اولیاء کا ساتھی ہوتا۔ اور اب اس ریا کے باعث دوزخ کے نگہبانوں کے ہاتھوں میں دوزخ میں جا رہا ہے۔ اور مہجوروں کا ساتھی ٹھہرا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس نے رضائے خلق کے لئے کیا۔ حالانکہ خود ان کی رضا بھی حاصل نہ ہوئی۔ کیونکہ خلق میں سے اگر ایک راضی ہو تو دوسرا ناراض ہوتا ہے۔ ایک مدح گو ہے تو دوسرا ہجا گو۔ لیکن اگر سب کے سب ثنا گو ہوں تو بھی لا حاصل ہے کہ مخلوق کے قبضۂ قدرت

میں تو کچھ بھی نہیں۔ نہ اس کی روزی نہ زندگی نہ سعادتِ دنیا نہ سعادتِ آخرت کچھ بھی تو نہیں۔ اس لئے یہ پرلے درجے کی جہالت ہے کہ کوئی اپنے دل کو وقتِ موجود پر اس قسم کی غرض کے لئے پریشانی کے حوالے کرے اور خود کو خدا کے عقاب اور دشمنی میں ڈال دے۔ اس جیسی امثال کو اپنے دل میں تازہ رکھنا چاہئے۔

اور طمع کا علاج جو ہم دوستیٔ مال کی اصل میں بیان کر چکے ہیں اس پر نظر ڈالے اور علاج کرے۔ اور تصوّر کرے کہ طمع وفا نہیں کرتی ہے اگر کرتی ہے تو مذمّت اور احسان کے ساتھ کرتی ہے۔ جس سے خدا کی رضا تو اس وقت جاتی رہتی ہے اور خلق کے دل بھی بدونِ مشیتِ الٰہی مسخر نہیں ہوتے۔ اس لئے انسان حق تعالیٰ کی رضا حاصل کرے تو اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں کو خود اس کا مسخر بنا دیتا ہے اور اگر رضا کے حق حاصل نہ کرے تو فضیحت سے دوچار ہوتا ہے اور لوگوں کے دل بھی اس سے نفور ہو جاتے ہیں۔

لوگوں کی مذمّت کے خوف کا علاج اس طرح کرے کہ خود سے کہے کہ ''اگر میں اللہ کے نزدیک قابل تعریف ہوں تو لوگوں کی مذمّت میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی اور اگر میں اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں تو لوگوں کی تعریف کا فایدہ؟ اگر انسان اخلاص کی راہ لے اور دل کو خلق کی تشویش سے پاک رکھے۔ تو اللہ تعالیٰ خود تمام لوگوں کے دلوں کو اس کی دوستی کے لئے آمادہ وآراستہ کر دیں گے۔ اگر اخلاص سے عبادت نہ کرے گا تو جلد ہی یہ ہوگا کہ لوگ اس کی ریا اور نفاق سے باخبر ہو جائیں گے۔ اور جس مذمت سے خائف تھا وہ آن حاضر ہوگی۔ اور رضائے حق تعالیٰ کھو دے گا۔ لیکن اگر دل کو متوجہ کرے اور اخلاص میں یک سو اور یک فکر ہو جائے اور لوگوں کے دلوں کی مراعات سے خلاصی پا جائے تو انوارِ الٰہی بتواتر اس کے دل میں متجلّی ہونے لگیں گے اور لطائفِ غیبی اور عنایات کی مدد بہ تسلسل آنے لگے گی اور اس طرح اخلاص کی راہ اور اس کی لذت کشادہ ہو جائے گی۔ اور عملی علاج یہ ہے کہ انسان اپنی خیرات وطاعت کو اس طرح پوشیدہ رکھے کہ جیسے کوئی اپنے فواحش اور گناہوں کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ اور طاعت میں صرف اللہ تعالیٰ پر قناعت کرے۔ شروع میں دشواری ہوگی لیکن جب مجاہدہ کرے گا تو آسان ہو جائے گی اور اس طرح اخلاص اور مناجات کی لذّت پائے گا۔ تو ایسے ہو جائے گا کہ اگر خلق بھی اسے نیکی کرتا دیکھے گی وہ خود اُن سے غافل ہوگا۔

مقام دوم: ریا کے اندیشے کی تسکین ہے۔ جب ریاکار اندیشہ ظاہر ہوتا ہے اگرچہ انسان خود کو مجاہدے کے ذریعے ایسے کر لیا ہے کہ لوگوں کے مال اور ان کی ستایش سے طمع منقطع کر لی ہے اور سب اس کی نگاہوں میں حقیر ٹھہرا ہے لیکن شیطان عبادت کے درمیان خطرہائے ریا سامنے لانا شروع کر دیتا ہے۔

خاطرہائے ریا: پہلا اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو معلوم ہو کہ کسی کو خبر مل گئی ہے یا امید ہے کہ اطلاع مل

جائے۔ دوم: رغبت ہے جو انسان کے نفس میں ظاہر ہوتی ہے کہ لوگ جانیں کہ اُن کے نزدیک اس کا ایک مقام ہے۔ سوم: اس رغبت کا قبول ہونا ہے اس طرح سے کہ انسان عزم کرے کہ اسے تحقیق عطا کرے۔

اور نہایت درجہ کوشش کرنی چاہئے کہ پہلے ہی اندیشے کو دور کرے اور اپنے آپ سے کہے مجھے لوگوں کے باخبر ہونے سے کیا حاصل؟ کیونکہ میرا خالق مطلع ہے اور میرے لئے اسی کا مطلع ہونا کافی ہے اور میرا معاملہ خلق سے وابستہ نہیں۔ اگر خاطر دوم قبول خلق کی رغبت میں حرکت پذیر ہو تو جو کچھ اس نے اپنے لئے ٹھہرایا ہے اسے یاد کرے کہ لوگوں کی مقبولیت اللہ تعالیٰ کے ردّ اور غضب کے مقابلے میں کیا فایدہ رکھتی ہے تا کہ اس خیال سے رغبت کے مقابلے میں کراہیت پیدا ہو جائے۔ پس یہ خواہش اسے خلق کی مقبولیت کی طرف بلاتی ہے اور کراہیت اسے روکتی ہے۔ تو ان دونوں میں سے جو غالب تر اور قوی تر ہوگی نفس اسی کی اطاعت کرے گا۔ پس ان تین خاطرات کے مقابلے میں تین اور کام ہیں:

ایک: یہ معلوم ہونا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی لعنت اور غضب کا نشانہ بنے گا۔ دوم: یہ کراہیت کہ جو اس معرفت سے پیدا ہوتی ہے۔ سوم: سختی کے ساتھ اندیشہ ریا کے دور کرنے کے لئے بافشاری کرنا۔ اور ممکن ہے کہ ریا کی خواہش اسی قدر ہجوم کرے کہ دل میں معرفت اور کراہیت کے لئے جگہ ہی نہ رہے۔ اور دکھائی نہ دے۔ اگر چہ اس سے پہلے اپنے لئے بہت عزم کر چکا ہو تو جب ایسے ہوگا تو یہ شیطان کی قوت کی دلیل ہے۔ اور یہ ایسے ہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو حلم پر قائم رکھتا ہے۔ خشم کی آفت اپنے اوپر تقدیر کر لیتا ہے۔ تو جب اس ہجوم کا سامنا ہوتا ہے تو خشم غلبہ پالیتا ہے جس سے انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ معرفت آموجود ہو جس سے معلوم ہو جائے کہ ریا ہے لیکن جب خواہش قوی ہوگی کراہیت ظاہر نہ ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کراہیت بھی ہو لیکن اس شہوت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور اسے دور نہ کر پائے اور قبولیتِ خلق کی طرف مایل ہو جائے۔

اور اکثر عالم ایسا ہوتا ہے کہ بات کرتا ہے۔ اور جانتا بھی ہے کہ ریا کہہ رہا ہے۔ اور یہ اس کے خسران کا باعث ہے لیکن کہتا رہتا ہے اور توبہ کو معرض تاخیر میں ڈالتا رہتا ہے۔

پس دفعِ ریا قوتِ کراہیت کی مقدار کے برابر ہوتی ہے۔ اور قوتِ کراہیت معرفت کی مقدار کے برابر ہوتی ہے۔ اور قوتِ معرفت ایمان کی قوت کے برابر ہوتی ہے اور اس کی مدد ملائکہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور ریا شہوتِ دنیا کی قوت کے برابر ہوتی ہے اور مدد اس کی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے اور دل ان دو متنازع لشکروں کے درمیان غلام ہوتا ہے اسے دونوں کے بارے میں شبہ ہوتا ہے۔ جب ایک شبہ جو اسی پر غالب ہوتا ہے تو اس کا اثر قابل تر ہوتا ہے اور دل اس کی طرف رغبت زیادہ کرتا ہے اور یہ شبہ پہلے ہی سے مقدر ہوا ہوگا کہ

بندہ نے نماز سے قبل اپنے ساتھ ایسے کیا ہو کہ ملائکہ کے اخلاق اسی پر غالب تر ہوں۔ ایسے ہی جیسے شیاطین کے اخلاق اس پر غالب تر ہوں۔ پس جب عبادت کے دوران ریا کا خیال در آتا ہے تو وہ خُلق ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اور تقدیر ازلی اسے ایسی جگہ کھینچ لے جاتی ہے جو قسمتِ ازلی سے اس کے حصہ میں ہے۔ وہ ملائکہ کی مشابہت کا غلبہ ہو یا شیطان کی مناسبت کا۔

فصل: ریا کے وسوسے سے نجات کی راہ: جب تو نے ریا کے تقاضے کے برعکس کیا اور تو دل سے ریا کو ناپسند کرتا تھا۔ اگر پھر بھی دل میں اس کی خواہش اور وسوسہ باقی رہے تو اس کے لئے تیرا مواخذہ نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے۔ اور تجھے فطرت کُشی کے لئے کہا نہیں گیا۔ بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ تو اپنے نفس کو مغلوب، مقہور اور زیردست رکھ تا کہ تجھے دوزخ میں نہ ڈال دے تو جب تُو نے یہ قدرت حاصل کر لی کہ جو کچھ نفس کہتا ہو اس پر عمل نہ کرتا ہو تو یہ دلیل اس کی ہے کہ تیرا نفس تیرا مقہور اور مغلوب ہے۔ اپنا فرض ادا کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اور تیری کراہیت اور مخالفت شہوت کے ساتھ، شہوت کا کفارہ ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ صحابہؓ نے آنحضرت سے کہا کہ "ہمیں دورانِ عبادت ایسے وَساوِس آتے ہیں کہ اگر ہمیں آسمان سے زمین پر دے مارا جائے تو وہ ہمارے لئے آسان تر ہوگا اور ہم ان وسوسوں سے متنفّر ہیں" تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا "یہ صریح اور ایمانِ محض ہے اور وہ وساوس حق تعالیٰ کے حق میں ہوتے ہیں" اور صریح ایمان وساوس کے لئے کراہیت ہے نہ کہ خود وساوس۔ پس جب ان کی کراہیت وساوس کا کفارہ ہوگی۔ اس لئے جو کچھ خلق کے وساوس سے متعلق ہے اسے تو کراہیت کی بناء پر محو ہونا اولیٰ تر ہے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ کوئی عین وسوسہ کے دوران اپنے نفس اور شیطان کے خلاف قوت پالے۔ شیطان وسوسہ ڈالے اور یہ ظاہر کرے کہ اس کی بہتری اسی میں ہے کہ شیطان کے ساتھ مجادلے میں مشغول ہو جائے تو اس وسوسے اور اس میں دل مشغولی مناجات کی لذت کو ضایع کر دیتی ہے۔ اس لئے یہ غلطی ہے اور اس کے چار درجے ہیں:

ایک: یہ کہ شیطان کے ساتھ مجادلے میں لگ کر اپنا وقت ضائع کرے۔

دوسرے: یہ کہ اس پر کفایت کرے کہ شیاطن کو جھٹلا دے اور فوراً عبادت ومناجات میں مصروف ہو جائے۔

تیسرے: یہ کہ شیطان کی تکذیب ودفع میں بھی نہ لگے کیونکہ جانتا ہے کہ یہ بھی وقت ضایع کرنا ہی ہو گا۔ اس کی طرف ملتفت ہی نہ ہو اور مناجات میں لگا رہے۔

چوتھے: یہ کہ اخلاص کی حرص اور کوشش زیادہ کرے کیونکہ جانتا ہے کہ اس سے شیطان زیادہ خشمگیں

ہوتا ہے اس لئے اس کی طرف التفات ہی نہ کرے۔ تو شیطان جب یہ صورت حال دیکھتا ہے تو اس سے مایوس ہو جاتا ہے۔ مثل اس کی چار ایسے شخصوں کی سی ہے جو طلب علم میں اکٹھے ہوں۔ تو ایک حاسد ان کی راہ میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور ایک کو روکتا ہے تو وہ اس کی بات نہیں مانتا اور اس سے لڑنے لگتا ہے اور اپنا وقت ضایع کر دیتا ہے۔ اور دوسرا طالب وہ ہے کہ جسے وہ روکتا ہے لیکن وہ اسے نظر انداز کر دیتا ہے اور اس سے جدل نہیں کرتا۔ تیسرا ایسا ہے کہ وہ اسے دفع کرنے کی بھی نہیں سوچتا بلکہ اس کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتا اور اپنی راہ چلتا رہتا ہے تاکہ اس کا ذرا سا وقت بھی ضائع نہ ہو۔ اور چوتھا ایسا ہے کہ روکنے والے پر نگاہ ہی نہیں ڈالتا اور تیزی سے چلنے لگتا ہے۔ تو اس حاسد نے پہلے دو طالبوں سے اپنی مراد حاصل کر لی۔ اور تیسرے سے محروم رہا اور چوتھے طالب سے باوجود اس کے کہ کچھ حاصل نہ کر سکا الٹا اس کی بھلائی کا باعث ٹھہرا۔ تو اگر سب سے پشیمان نہ ہوا ہو اُس آخری (چوتھے) سے پشیمان ہوگا کہ کاش کے میں نہ کرتا۔ پس اولیٰ تر ہے کہ وساوس اور مناظرے میں حتی الامکان نہ الجھے اور فوراً مناجات میں محو ہو جائے۔

اظہار اطاعت کی رخصت کے باب میں

یاد رہے کہ عبادت کے پوشیدہ رکھنے کا فائدہ یہ ہے کہ انسان ریا سے خلاصی پاتا ہے لیکن اظہار میں بھی ایک بڑا فایدہ ہے۔ اور وہ ہے لوگوں کا اس کی پیروی کرنا۔ اور لوگوں میں خیر کی تحریک رغبت کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ مقتدا اور مقتدیوں دونوں کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ: ''اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ'' (قرآن: ۲/۲۷۱) فرمایا کہ: اگر صدقہ آشکار دے گا تو بہت اچھی بات ہے اور اگر پوشیدہ دے گا اور بھی اچھی بات ہے''۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے چندے کی اپیل کی تو ایک انصاری ایک تھیلی سیم وزر کی لایا تو جب لوگوں نے اسے دیکھا تو وہ بھی مال لانے لگے۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جو کوئی اچھے طریق کی بنیاد رکھتا ہے کہ جس سے دوسرے اس کی تقلید کرنے لگتے ہیں تو اسے اپنے ثواب کے علاوہ متابعت کرنے والوں کے ثواب میں سے بھی حصہ ملتا ہے''۔ اسی طرح وہ شخص جو حج پر جائے گا یا غزا پر تو ان کے لئے جو کوئی تدارک کرنے کے لئے آگے بڑھے گا تاکہ لوگ بھی اس پر حریص ہوں یا نماز عشاء بلند آواز سے ادا کرے کہ اس کے قرآن پڑھنے سے دوسرے بیدار ہو جائیں۔ پس حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی کے پیش نظر دکھاوا نہ ہو بلکہ اظہار سے غرض لوگوں کے لئے اقتدا اور رغبت ہو تو یہ بات فاضل تر ہے۔ اور اگر ریا کی خواہش حرکت میں آئے تو اسے دوسروں کی رغبت سے کچھ حاصل نہ ہوگا تو ایسے میں پوشیدہ رکھنا اولیٰ تر ہے۔ پس جو کوئی عبادت کا اظہار کرنا چاہے تو اسے ایسے موقع پر اظہار کرنا چاہئے کہ جب معلوم ہو کہ دوسرے اس

کی اقتدا کریں گے۔ کیونکہ کوئی شخص ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے اہل وعیال اس کی پیروی کرتے ہوں لیکن اہل بازار نہ کرتے ہوں۔ اور کوئی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اہل بازار اس کی اقتدا کریں اور دوسرے نہ کریں۔

دوسرے: یہ کہ انسان اپنے دل کا مراقبہ کرے' کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ریا کی خواہش اس کے باطن میں پوشیدہ ہوتی ہے اور اسے دوسرے کے اِقتدا کے عذر میں اظہار پر آمادہ کرتی ہے۔ تاکہ برباد ہوجائے اور اس کمزور کی مثال ایسی ہے کہ کوئی تیرنا نہ جانتا ہو تو غرق ہوجائے گا۔ لیکن دوسرے کا ہاتھ بھی تھامتا ہے تاکہ دونوں ہلاک ہوجائیں۔ اور قوی شخص کی مثال ایسے شخص کی ہے جو شناگری میں ماہر ہو جو خود بھی ڈوبنے سے بچ نکلے اور دوسروں کو بھی غرق ہونے سے بچالے۔ اور یہ درجہ انبیاء واولیاء اور صدیقوں کا ہے۔ اور کسی کو مناسب نہیں کہ مبتلائے فریب ہو کر جس عبادت کو پوشیدہ رکھا جاسکتا ہے اس کو پنہاں نہ رکھے۔ صدق کی علامت اس میں یہ ہے کہ فرض کرے کہ اگر اس سے کہا جائے کہ تو اپنی عبادت کو پوشیدہ رکھ۔ تاکہ لوگ اس کے لئے کسی اور عابد کی پیروی کریں۔ تو تمھارا ثواب بھی اظہار کے ثواب کی مانند ہوگا۔ تو اس پر اگر اپنے باطن میں اظہار کی رغبت پائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تو اپنے درجے کی تلاش میں ہے نہ کہ ثواب آخرت کی تلاش میں۔

اظہار عبادت کا ایک اور طریق بھی ہے کہ ادائے عبادت کے بعد کہے میں نے کیا کیا ہے اور اس سے نفس کو ایک گونہ لذت اور فرحت ہو اور ہوسکتا ہے بہت زیادہ بیان کرے۔ اس لئے واجب ہوگا کہ زبان کو بند رکھے اور اظہار نہ کرے جب تک لوگوں کی مدح وذم اس کے لئے برابر نہ ہوجائیں۔ اور ان کا ردّ وقبول اس کی نگاہ میں یکساں نہ ہوجائے۔ تو پھر جب معلوم ہو کہ اظہار میں خیر کی رغبت کی تحریک دوسروں میں ہوگی تو پھر بیان کرے۔ اور یہ ان اسلاف کا کہنا ہے کہ جو بڑے قوی تھے' سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''جب سے میں مسلمان ہوا ہوں میں نے کوئی نماز ایسی ادا نہیں کی جس میں میرے نفس نے کوئی بات سوائے اس بات کے کی ہو کہ آخرت میں اللہ مجھ سے فرمائے گا تو میں یہ جواب دوں گا۔ اور میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی چیز نہیں سنی کہ مجھے یقین تھا کہ حق ہے'' عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ''مجھے خوف نہیں ہوتا کہ میں علی الصبح اٹھوں اور کام مجھ پر دشوار ہوں گے یا آسان کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میری بھلائی کس میں ہے''۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''میں جس حال میں بھی صبح بیدار ہوتا ہوں تو میں کبھی اُس کے برخلاف خواہش نہیں رکھتا''۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''جب سے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہے میں نے دائیں ہاتھ سے اپنی شرم گاہ کو نہیں چھوا نہ میں نے گانا گایا اور نہ کبھی جھوٹ کہا''۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے بوقتِ مرگ کہا تھا کہ ''مجھ پر گریہ نہ کرو کیونکہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں میں نے کوئی گناہ نہیں کیا''۔ اور حضرت عمر بن

عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ: ''قضائے الٰہی سے مجھ پر کوئی حادثہ نہیں گذرا کہ جس کے بارے میں میں نے یہ چاہا ہو کہ یہ نہ ہوتا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے میری تقدیر میں لکھ دیا تھا میں اسی پر خوش رہا''۔ تو یہ سب باتیں ان لوگوں کی ہیں جن کے ایمان نہایت قوی تھے۔ اور کمزور ایمان والوں کو اپنے بارے میں فریب میں مبتلا نہ ہو جانا چاہئے۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کاموں میں ایک ترتیب ہوتی ہے کہ کوئی اسے معلوم نہیں کر سکتا ہے۔ اور ہر شر کے نیچے ایک خیر ہوتی ہے۔ جسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ ریا میں بھی بہت سی مخلوق کے لئے خیر ہے۔ اگرچہ ریا کار کے لئے بربادی کا باعث ہے۔ کیونکہ انسان بہت سے کام محض ریا کارانہ کرتا ہے لیکن دوسرے سمجھتے ہیں کہ بہ اخلاص انجام دے رہا ہے اور وہ اس کی پیروی میں نیک کام کرنے لگتے ہیں۔

حکایت: کہتے ہیں کہ بصرہ میں سحر کے وقت میں یہ کیفیت تھی کہ جس کوچے میں سے گذرو قرآن خوانی اور ذکر کی آواز سنائی دیتی تھی۔ جس سے دوسروں کو رغبت زیادہ ہوتی تھی۔ پھر ایک شخص نے ایک کتاب ریا کے دقایق میں لکھ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے تلاوت و ذکر سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اس باب میں لوگوں کی رغبت کم ہو گئی۔ تو لوگ کہنے لگے کہ کاشکے وہ شخص یہ کتاب نہ لکھتا۔ پس ریا کار دوسروں پر قربان ہو جاتا ہے۔ خود تو ہلاکت سے دوچار ہوتا ہے لیکن دوسروں کو اخلاص کی دعوت دے دیتا ہے۔

(پنڈت بھئے مشعلچی باتیں کرے بنائے
اوروں کو بھیجے چاندنی آپ اندھیرے جائے)

معصیت چھپانے کی اجازت کا بیان

یاد رہے کہ عبادت کا اظہار بعض اوقات ریا کی ذیل میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن معصیت کو ہر وقت پنہاں رکھنا بہ سبب سات عدد عذر کے روا ہے:

عذرِ اوّل: یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ فسق و فجور کو پوشیدہ رکھو۔ اور آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: جس کسی سے فواحش میں سے کوئی چیز سرزد ہو جائے تو چاہئے کہ حق تعالیٰ اس کی پردہ پوشی کرے''۔

عذرِ دوم: یہ ہے کہ جب معصیت اِس جہان میں پوشیدہ رہی تو اس میں بشارت یہ ہے کہ امید یہ ہے کہ اُس جہان میں بھی پوشیدہ رہے گی۔

عذرِ سوم: یہ ہے کہ خائف ہے کہ لوگوں کی ملامت کے باعث دل کی پراگندگی کا شکار ہو گا اور عبادت میں بھی یکسوئی نہ رہے گی اور دل بھی پراگندہ ہو گا۔

عذرِ چہارم: یہ ہے کہ دل ملامت اور مذمت سے رنجیدہ ہوتا ہے اور یہ فطری امر ہے اور ملامت و مذمت سے رنجور ہونا اور اس سے حذر حرام نہیں۔ اور مدح و مذمت کو برابر رکھنا انتہائی توحید کی علامت ہے۔ اور ہر کوئی اس مقام کو پہنچ نہیں پاتا۔ لیکن عبادت مذمت کے خوف سے جائز نہ ہوگی کیونکہ طاعت بہ اخلاص ہونی چاہئے اور اس بات پر صبر کرنا کہ جو ستایش یا مدح نہ ہو آسان ہوتا ہے۔ لیکن مذمت پر صبر کرنا دشوار ہوتا ہے۔

عذرِ پنجم: یہ ہے کہ انسان ڈرتا ہے کہ لوگ اسے نشانہ بنائیں گے اور دکھ دیں گے اور شرعاً اس کی اجازت ہے کہ اگر عاصی پر حد بھی واجب ہو تو وہ اسے پوشیدہ رکھے اور توبہ کرے، پس دوسروں کے شر سے بچنا روا ہے۔

عذرِ ششم: یہ ہے کہ لوگوں سے شرم سار ہوگا اور شرم پسندیدہ ہے اور جزو ایمان ہے۔ شرم اور شے ہے اور ریا اور شے۔

عذرِ ہفتم: یہ ہے کہ انسان ڈرتا ہے کہ اگر گناہ کا اظہار کرے گا تو فاسق اس کی پیروی کریں گے اور معصیت میں بے باک ہو جائیں گے۔

تو اگر کوئی عاصی متذکرہ بالا نیتوں کے باعث اپنی خبائث کو مخفی رکھے تو وہ معذور ٹھہرے گا۔ لیکن اگر نیت یہ ہو کہ لوگ اسے متقی سمجھیں تو یہ ریا ہوگی اور حرام ہوگی۔ لیکن اگر کوئی ایسا ہو کہ جس کا ظاہر و باطن یکساں ہوں۔ تو یہ درجہ صدیقوں کا ہے اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ باطن میں کوئی معصیت نہیں کرتا۔ لیکن اگر کوئی ہو تو اگر کہے کہ: ''جو کچھ اللہ تعالیٰ جانتا ہے اسے بیان کردے کہ خلق بھی اسے جان لے''۔ تو یہ جہالت ہوگی اور مطلوب نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بھید کو محفوظ رکھنا واجب ہے۔

ریا کے خوف سے خیرات سے ہاتھ کھینچ لینے کی رخصت کا بیان

یاد رہے کہ طاعت کے تین درجے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ جو خلق سے تعلق نہیں رکھتی جیسے نماز روزہ۔ ایک وہ ہے کہ خلق سے تعلق رکھتی ہے جیسے کہ خلافت و قضا و ولایت اور ایک وہ ہے کہ جو خلق پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور عامل پر بھی جیسے کہ وعظ اور تذکیر۔

قسم اوّل: جیسے کہ نماز روزہ حج ہیں تو ان سے قطعاً ریا کے خوف سے ہاتھ نہیں کھینچ لینا چاہئے۔ نہ فریضے میں نہ سنت میں۔ لیکن ریا کا خیال اگر ابتدائے عبادت میں آئے یا درمیانِ عبادت میں آئے تو چاہئے کہ

انسان اسے دفع کرنے کی کوشش کرے۔ اور عبادت نیت کی از سر نو کرے۔ اور لوگوں کے دکھاوے کے لئے عبادت کو طول دے نہ کم کرے۔ سوائے اس جگہ کے جہاں خود نیت عبادت کی نہ رہے اور سراسر ریا ہو۔ ایسے میں تو عبادت ہی نہیں ہوگی۔ لیکن جب تک اصل نیت باقی ہو عبادت سے ہاتھ کھینچنا نہیں چاہئے۔ فضیلؒ فرماتے ہیں کہ: ''ریا یہ ہے کہ لوگوں کے دیکھنے کے خوف سے کوئی عبادت ہی سے ہاتھ کھینچ لے۔ لیکن وہ جو لوگوں کے لئے عبادت کرے وہ شرک ہوگا''۔ یاد رہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ تُو طاعت نہ کرے۔ تو جب عاجز آ جائے تو تجھے کہتا ہے کہ ''لوگ دیکھ رہے ہیں اس لئے یہ ریا ہے اور طاعت نہیں'' تاکہ اس فریب کاری سے تجھے عبادت سے روک رکھے۔ تو اگر تُو شیطان کی اس بات پر کان دھرے گا اور مثلاً فرار کرے گا یا زمین کے اندر گھس جائے گا ابلیس پھر بھی یہی کہے گا کہ ''لوگ جانتے ہیں کہ تو فرار کر کے زاہد بنا ہے۔ اس لئے یہ زہد نہیں بلکہ یہ ریا ہے''۔ پس ایسے میں طریقہ یہ ہے کہ تو شیطان سے کہے کہ ''دل خلق سے لگانا اور ان کے باعث عبادت کو ترک کرنا بھی ریا ہے۔ بلکہ خلق کا دیکھنا یا نہ دیکھنا دونوں برابر ہیں۔ میری جو عادت ہے میں اس کے مطابق عمل کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ خلق نہیں دیکھ رہی''۔ کیونکہ خلق کے خوف سے عبادت سے رک جانا ایسے ہی ہے جیسے کوئی گندم اپنے خادم کو دے اور کہے کہ اسے صاف کر تو وہ پاک کرنے کی بجائے کہے کہ: ''مجھے ڈر ہے کہ اگر میں اسے پاک کرتا تو پاک نہ کر سکتا''۔ تو آقا کہے کہ: ''اے بیوقوف اب تو نے اصل کام ہی کو ترک کر دیا۔ تو اس سے بھی گندم صاف نہ ہوگی''۔ پس انسان کو اخلاص کا حکم دیا گیا ہے۔ تو جب عمل ہی سے رک جائے گا تو اخلاص سے بھی رک گیا۔ کیونکہ اخلاص تو عمل ہی میں ہوتا ہے۔ اور یہ جو ابراہیم نخعیؒ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ قرآن پڑھتے تھے تو جب کوئی وہاں آ جاتا تو قرآن بند کر دیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ''نہیں چاہئے کہ کوئی دیکھے کہ ہم ہمیشہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں''۔ تو یہ اس لئے ہوا ہوگا کہ آپ نے سمجھا ہوگا کہ کوئی جب اندر آ جائے گا تو اس سے بات کرنی پڑے گی اور اس طرح قرآن خوانی سے ہاتھ روکنا ہوگا۔ پس اسے پوشیدہ رکھنا بہتر جانا ہوگا۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''ایک شخص تھا کہ رونے لگتا تھا۔ تو اسے پوشیدہ رکھتا تھا تاکہ لوگ نہ دیکھیں''۔ اور یہ روا ہے کیونکہ باطن کے گریہ کی نگہداشت کے لئے ظاہر گریہ کرنا کوئی فضیلت نہیں رکھتا۔ تو یہ کوئی عبادت نہیں جس سے اس نے ہاتھ کھینچا۔ حسن بصریؒ نیز فرماتے ہیں کہ ''ایک شخص تھا جو چاہتا تھا کہ راستے سے کوئی رکاوٹ ہٹائے لیکن بتاتا اس لئے نہ تھا کہ لوگ اسے پارسا نہ سمجھیں'' اور یہ حکایت ضعیف ایمان والے کی ہے کہ جو خود سے خائف تھا کہ لوگ اسے پہچان لیں گے۔ تو دوسری عبادات اس کے لئے پریشان کن ہو جائیں گی۔ لیکن شہرت کے خوف کی بناء پر اچھے عمل سے گریز اچھی بات نہیں۔ بلکہ عملِ

خیر انجام دینا چاہئے۔ اور ریا کے خیال کو دور کردینا چاہئے۔ سوائے اس کے کہ کوئی کمزور ایمان کا مالک ہو اور اپنی بہتری اس میں جانتا ہو۔ اور اس میں خسارے میں ہو۔

قسم دوم: وہ ہے کہ جو خلق سے تعلق رکھتی ہے۔ جیسے کہ قضا (عدالت) وولایت وخلافت ہیں' یہ اگر عدل سے مزیّن ہوں تو عظیم عبادات میں سے ہیں۔ اور اگر بے انصافی پر مبنی ہوں تو بہت عظیم معصیت ہیں۔ اس لئے جو اپنے بارے میں مطمئن نہ ہو کہ انصاف کر پائے گا اس کے لئے انھیں قبول کرنا حرام ہوگا۔ کیونکہ ان میں آفت بہت بڑی ہے۔ یہ نماز روزے کی مانند نہیں کہ جن میں کوئی لذت نہیں ہوتی۔ لذت ان میں یہ ہوتی ہے کہ لوگ دیکھیں۔ لیکن ولایت کو چلانے میں بہت لذت ہوتی ہے اور نفس اس میں بہت قوت پاتا ہے۔ اس لئے یہ اس کے لئے مناسب ہے جو اپنے بارے میں ایمن ہو۔ لیکن اگر کسی نے ولایت سے قبل خود کو آزمایا ہو اور کاموں میں امانت سے کام لیا ہو لیکن ڈر ہو کہ جب ولایت کو پہنچے گا تو بدل جائے گا اور ہر طرفی کے خوف سے مداہنت کرے گا۔ تو اس میں علماء میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اسے ولایت کا منصب قبول کر لینا چاہئے۔ کیونکہ یہ ایک وہم کے سوا اور کچھ نہیں۔ چونکہ اپنے آپ کو آزما چکا ہے۔ تو اعتماد اس پر کرنا چاہئے۔ لیکن ہمارے نزدیک درست یہ ہے کہ اسے یہ منصب قبول نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ نفس جب وعدہ کرتا ہے کہ انصاف پر عامل رہے گا۔ ممکن ہے کہ یہ فریب ہو اور جب ولایت کے منصب کو پہنچے تو بدل جائے۔ چونکہ پہلے ہی متردد ہے تو غالب یہ ہے کہ متغیر ہو جائے گا اس لئے حذر اولیٰ تر ہے۔

ولایت قوی ایمان والوں ہی کا کام ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رافع رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: ''ہرگز ولایت کو قبول نہ کرنا اگرچہ فقط دو افراد پر کی ہو'' پس جب ابو بکر نے خلافت قبول کر لی تو رافع رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''آپ نے مجھے منع نہیں کیا تھا کہ خود آپ نے خلافت قبول کر لی''؟ تو آپ نے فرمایا کہ ''میں اب بھی تجھے نہی کرتا ہوں اور جو عدل نہ کرے اللہ تعالیٰ کی لعنت اس پر ہو''۔ اور کمزور ایمان والے کے اعتراض کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی اپنے بیٹے کو پانی کے کنارے پر جانے سے منع کرے لیکن خود پانی میں اتر جائے کیونکہ خود تیرنا جانتا ہے۔ تو اگر ناداں بچہ یہی کرے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔ اور جس وقت بادشاہ ظالم ہوگا۔ تو قضا میں انصاف نہ کر سکے گا تو مداہنت لازم آئے گی۔ تو قضا قبول نہیں کرنی چاہئے۔ نہ ایسی ہی کوئی اور ولایت وامارت۔ لیکن اگر قبول کر لی تو معزولی کا خوف مداہنت کا جواز نہ ٹھہرے گا۔ بلکہ انصاف کرنا چاہئے تاوقتیکہ اسے معزول نہ کردیں۔ اور عدل پر شاداں رہنا چاہئے بشرطیکہ ولایت حق تعالیٰ کے لئے انجام دے۔

قسم سوم: وعظ وفتویٰ وتدریس اور روات حدیث وغیرہ سے عبارت ہے۔ اور اس میں بھی بڑی لذت

ہے۔اور ریا اس میں انسان پر زیادہ تر اس لئے راہ پاتی ہے کہ نماز روزہ کی طاعت بھی ولایت کے قریب قریب ہے۔فرق صرف اس قدر رہے کہ تذکر' وعظ اور احادیث جس طرح سننے والے کو فایدہ دیتی ہیں۔سنانے والے کو بھی فایدہ دیتی ہیں اور انسان دین کی دعوت دیتا ہے اور ریا سے روکتا ہے لیکن ولایت میں ایسا نہیں ہوتا۔پس اگر کسی کو ریا کا سامنا ہو تو ترک تذکیر و وعظ و اخبار محل نظر ہے۔ایک گروہ نے اس سے بھی گریز کیا ہے۔بیشتر صحابہ کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی ان سے فتویٰ چاہتا ہے تو وہ خود کچھ رائے دینے کی بجائے دوسرے کے حوالے کر دیتے تھے۔بشر حافیؒ نے حدیث کے کئی مجموعے زمین میں دفن کر دیئے تھے اور کہتے تھے کہ ''میں اپنے اندر محدّث کی خواہش دیکھتا تھا۔اگر نہ دیکھتا تو میں بھی راویٔ حدیث ہوتا''۔

اسلاف فرماتے تھے کہ حدثنا (حدیث گفت مارا' کلمۂ محدث در آغاز نقل حدیث) ایک باب ہے ابواب دنیا میں سے اور جو کوئی کہتا ہے کہ: 'حدثنا' تو اصل میں یہ کہتا ہے کہ مجھے صدر میں بٹھایئے'' ایک شخص نے حضرت عمر سے اجازت مانگی کہ ہر روز صبح کو لوگوں کو پند و نصیحت دے تو حضرت عمر نے اسے منع کر دیا۔اور فرمایا کہ: ''مجھے ڈر ہے کہ تو اپنے اندر اسی قدر ہوا بھرے گا کہ ثریا کو پہنچ جائے''۔ابراہیم تیمیؒ فرماتے ہیں کہ: ''جب تو اپنے اندر بیان کی خواہش دیکھے تو خاموش ہو جا۔اور جب خواہش خاموشی کی دیکھے تو بیان میں لگ جا''۔پس ان معنی میں اختیار ہمارے نزدیک یہ ہے کہ محدث یا مذکّر اپنے باطن میں جھانکے تو اگر طاعت حق تعالیٰ کی نیت کے ساتھ ریا کا بھی کوئی خیال ممزوج پائے تو بھی بیان سے ہاتھ نہ کھینچے بلکہ بیان کرے اور درست نیت دل میں پالے تاکہ قوی تر ہو جائے۔اور یہ حکم نماز کے سنت و نوافل کے حکم کی طرح ہے کہ ریا کے خیال سے ان کی ادائیگی سے ہاتھ نہ کھینچے تاکہ اصل نیت کو پا سکے۔برعکس ولایت کے کہ جب اس میں اندیشہ دخیل ہونے لگے تو اس سے گریز اولیٰ تر ہے۔کیونکہ جلد ہی نیتِ باطل غالب ہو جائے گی۔یہی وجہ ہے کہ ابو حنیفہؒ نے ولایت سے گریز کیا تھا۔اور اسے قضا کو قبول کرنے کو کہا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ''میں اس کے لایق نہیں ہوں'' تو کہا گیا کہ 'کیوں'؟ تو فرمایا کہ 'اگر یہ سچ ہے کہ میں اس کے لایق نہیں تو مجھے اس پر مامور نہیں کیا جانا چاہیئے اور اگر میرا یہ کہنا کہ دروغ ہے تو دروغ زن کو قضا کے عہدے پر ہرگز مامور نہیں کرنا چاہیئے''۔ لیکن آپ نے تعلیم دینے سے گریز نہیں کیا اور ہاتھ نہیں کھینچا۔لیکن اگر کوئی دل میں عبادت کی نیت نہ پائے اور باعث اس کا سراسر ریا اور طلب جاہ ہو تو ایسے شخص کا فرض ہے کہ اس سے خود کو باز رکھے۔اور اگر لوگ ہم سے پوچھیں کہ ''ہم کیا کریں گے''؟ تو ہم غور کرتے ہیں کہ ''اگر اس کی بات سے لوگوں کو کوئی فائدہ نہ ہوتا ہو جیسے کہ وہ شخص کہ جس کا بیان طامات سجع و نکتہ و سخن ایسے ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے وعدۂ رحمت کی بناء پر لوگوں کو

معصیت پر دلیر کریں یا اس کی تعلیم جدل وخلاف ومناظرہ وغیرہ سے عبارت ہو تو حسد اور مباہات کا بیج اس کے دل میں اگنے لگتا ہے۔ تو ہم اسے وعظ وتذکر سے منع کریں گے۔ کیونکہ ممانعت اس کے نیز لوگوں کے حق میں خیر عظیم ہے۔ لیکن اگر اس کا بیان لوگوں کے لئے نافع ہو اور قاعدۂ شرع کے مطابق اور لوگ اُسے مخلص جانتے ہوں۔ اور تعلیم اس کی علوم دینی میں مفید ہو تو ہم اسے اجازت نہ دیں گے کہ تعلیم سے ہاتھ کھینچے۔ کیونکہ اس کے اعراض میں اوروں کا خسران ہے اور وہ تعداد میں کثیر ہیں۔ اور خود اس کے بیان سے اس کا نقصان زیادہ نہیں اور ہمارے لئے اتنے سارے لوگوں کی نجات ایک شخص کی نجات کے مقابلے اہم تر ہے۔ ہم اسے لوگوں پر قربان کر دیں گے۔ آنحضرت کا فرمان ہے کہ ''خدا تعالیٰ اس دین کی نصرت ایسی جماعت کے ذریعے فراہم کریں گے جو اس امر میں کسی استفادے کی خواہاں نہ ہوگی''۔ اس سے مراد وہی قوم ہے۔ پس ہم اس سے زیادہ کچھ اضافہ نہ کریں گے کہ کہیں کہ ''ہاتھ مت کھینچو اور کوشش کرو کہ ریا سے دور رہو اور نیت بہ اخلاص رکھو اور اپنے وعظ سے پہلے خود نصیحت پر عمل کرو اور حق تعالیٰ سے خود ڈرو پھر دوسروں کو ڈراؤ۔

سوال: اگر کوئی کہے کہ ''ہمیں کیسے معلوم ہو کہ نیت واعظ کی درست ہے۔ علامت اس کی کیا ہوگی''؟

جواب: معلوم رہے کہ نیت درست وہ ہوگی کہ مقصود اس کا یہ ہو کہ لوگ اللہ کی راہ اختیار کریں اور دنیا سے منہ پھیر لیں اور غرض خلق پر شفقت ہو۔ اور اگر کوئی دوسرا آ نکلے جس کا وعظ زیادہ نافع اور سامعین میں خود اس کی نسبت زیادہ مقبول ہو تو چاہئے کہ وہ اس پر خوش ہو۔ اگر کوئی کسی کنویں میں گر گیا ہو تو کنویں کے اوپر ایک پتھر بہ طور ڈھکنے کے پڑا ہو اور وہ چاہتا ہو کہ از راہِ شفقت اسے نجات دے اور دوسرا نہایت درجہ سعی کے ساتھ اس پتھر کو ایک طرف کر دے تو جب کوئی وہاں آ جائے اور وہ پتھر ہٹا دے تو یہ رنج اس کے لئے کافی ہوگا تو وہ خوش ہوگا۔ لیکن اگر یہ واعظ خوش نہ ہو اور اپنے باطن میں حسد پائے تو جان لیجئے کہ اس واعظ کا مقصود لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا نہیں بلکہ اپنی طرف بلانا ہے۔ اور دوسری علامت یہ ہے کہ اہل دنیا اور اہل ولایت اس کی مجلس میں آئیں تو اس کے بیان میں کوئی تغیر نہ ہو۔ ان امراء کے آنے کے باوجود معمول کے انداز پر رہے۔ اور تیسرے یہ کہ جب ایسی بات آئے کہ لوگ اس پر نعرہ زن ہوں گے یا مبتلائے گریہ ہوں گے اور اس بات کی بنا بے اصل ہو تو وہ اسے ترک کر دے۔ یہ اور ایسی چیزوں کو اپنے باطن میں ڈھونڈے تو اگر پانے پر متنفر نہ ہو تو یہ پوری ریا کاری ہوگی۔ لیکن اگر اپنے جی میں کراہت دیکھے تو یہ دلیل اس بات کی ہے کہ نیت اور ہے۔ تو چاہئے کہ کوشاں رہے تا کہ یہ دوسری نیت غالب ہو جائے۔

فصل: عبادت میں سرور (نشاط) ہمیشہ ریا نہیں ہوتا:

اکثر ایسے ہوتا ہے کہ لوگوں کی موجودگی کے باعث عبادت میں ایک گونہ نشاط وجود میں آتا ہے اور وہ نشاط درست ہوگا۔ اور ریا میں کا نہ ہوگا۔ کیونکہ مردمومن ہمیشہ عبادت کی طرف راغب ہوتا ہے۔ لیکن ایسے ہوتا ہے کہ کوئی امر مانع اسے روک دے اور ممکن ہے کہ لوگوں کے موجود ہونے کے باعث وہ مانع مرتفع ہو جائے جس سے وہ فرحت تحریک پائے۔ جس طرح کوئی نماز عشاء کے وقت اپنے گھر میں ہو اور اس کے لئے اپنی بیوی کے ساتھ سونا اور باتوں میں مشغول ہونا دشوار ہو یا اس نے لباس خواب تیار کرلیا ہو۔ تو جب یہ دوسروں کے گھر میں ہوگا تو یہ موانع وہاں نہ ہوں گے۔ تو نشاطِ نمودار ہوگا۔ یا کسی ایسے نادر گھر میں ہو کہ نیند نہ آئے تو نماز میں مشغول ہو جائے۔ یا ایک جماعت کو دیکھے کہ سب نمازِ عشاء میں مشغول ہیں تو اس میں نشاط بھی حرکت میں آ جائے جس سے وہ بھی نماز میں مصروف ہو جائے یا ایسی جگہ میں ہو جہاں لوگ روزہ رکھتے ہوں اور کھانا تیار نہ ہو تو روزہ کا نشاط وجود میں آجائے یا ایک جماعت کو دیکھے کہ مسجد میں نمازِ تراویح میں مشغول ہیں اگر اپنے گھر میں کاہلی کا شکار ہو لیکن جب انھیں دیکھے تو قوتِ موافقت کی بناء پر کاہلی جاتی رہے۔ یا جمعے کے روز دیکھے کہ لوگ خدمتِ خداوندی میں مصروف ہیں تو وہ بھی نماز اور تسبیح میں لگ جائے جو اس کے روزانہ کے معمول سے زیادہ ہو۔ اور یہ سب ممکن ہے اور اس میں کوئی ریا بھی نہیں ہوگی۔ شیطان اس سے کہے گا کہ ''نہ کر کہ یہ لوگوں کے سبب ظاہر ہوئی ہے لہٰذا یہ ریا ہوگی''۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ نشاط لوگوں کی وجہ سے ہو اور رغبتِ خیر اور زوال موانع کی وجہ سے نہ ہو تو شیطان کہے گا کہ ''مت کر'' اور ملائکہ کہیں گے کہ ''عبادت کر کیونکہ یہ رغبت خود تیرے دل میں ہوگی لیکن موانع درپیش ہوں گے جو اب اٹھ گئے ہیں''۔ پس چاہئے کہ ان دونوں کو متمائز کرے۔ اور علامت اس کی یہ ہے کہ وہ فرض کرے کہ اگر وہ قوم اسے نہ دیکھے اور وہ ان کو دیکھے تو کیا عبادت کا یہ نشاط ایسا ہی ہوگا؟ اگر اپنی جگہ قائم ہو تو یہ خود رغبتِ خیر ہے۔ ورنہ ریا ہوگی لہٰذا ہاتھ کھینچ لے۔ اور اگر رغبتِ خیر اور ثنائے خلق کی محبت دونوں ہوں تو غور کرے کہ غالب تر ان میں سے کون سی ہے۔ تو اس پر اعتماد کرے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ ایک آیت سنے اور ایک جماعت کو دیکھے کہ رو رہے ہیں تو وہ خود بھی رونے لگے۔ لیکن اگر تنہا ہوتا تو اس آیت کے سننے پر نہ روتا۔ تو یہ ریا نہ ہوگی۔ کیونکہ اوروں کو محو ریاد دیکھ کر اس کے دل میں رقت پیدا ہوئی ہے۔ جب خلق کو اندوہ گیں دیکھتا ہے تو اسے بھی یاد آتا ہے رونے لگتا ہے۔ اور ہائے وائے کرنے لگتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ گریہ کی اصل دل کی رقت ہو لیکن نالہ وفریاد بہ ریا ہوں گے۔ تاکہ دوسرے سنیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اندوہ کے باعث گر

پڑے لیکن فوراً اٹھنے کی قوت پالے لیکن ڈرتا ہو کہ لوگ کہیں کہ اس کا یہ وجد بے اصل تھا۔ تو اس موقع پر ریا کاری کرے اور فی الاصل ریا کاری نہ ہو اور ہو سکتا ہے کہ رقص کرنے لگے۔ اور طاقت اس میں پیدا ہو جائے لیکن کسی دوسرے کا سہارا لے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھائے تا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ وجد اس کا بہ سرعت رخصت ہو گیا۔ ایسے ہی ہے کہ استغفار کرے اور 'اعوذ باللہ' کہے اور یہ بہ سبب گناہ کے کہے جو اسے یاد آیا ہو۔ یا اپنی تقصیر دیکھے کہ اور عبادت میں ہوں تو یہ درست ہوگا اور امکان یہ بھی ہے کہ بہ ریا ہو۔ تو ان خیالات اور خاطرات پر خود غور کرے۔ کہ آنحضرت کا فرمان ہے۔ ریا کے ستر ابواب ہیں'' اور جب خیال ریا کا پائے تو فرض کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کے باطن کی پلیدی سے باخبر ہے۔ اور وہ اس وقت اللہ کی پکڑ اور عقوبت میں ہے تا کہ ریا کو خود سے دور کر سکے۔ اور آنحضرت کے اس فرمان کو یاد کرے کہ ''نعوذ باللہ من خشوع النفاق' (میں منافقانہ طاعتِ خداوندی سے پناہ کا طالب ہوں) یہ وہ حالت ہے کہ بدن تو بہ ظاہر خشوع میں ہوتا ہے لیکن دل پراگندگی کا شکار ہوتا ہے۔

فصل: جو کام بھی ثواب کے لئے ہے اسے خالصۃً اللہ کے لئے ہونا چاہئے

یاد رہے کہ جو کچھ بھی نماز روزے کی طرح طاعت میں سے ہے اخلاص اس میں واجب ہے۔ اور ریا اس میں حرام ہوتی ہے۔ لیکن جو مباح ہے اگر ثواب مطلوب ہو تو اس میں بھی اخلاص واجب ہے۔ مثلاً جب اسلام کی حاجات میں ثواب کے لئے سعی کرے تو چاہئے کہ اپنی غرض کو معلوم کرے۔ تو اس کے لئے کسی شکر یا مکافات وغیرہ کی امید نہ ہونی چاہئے۔ ایسے ہی جو شخص کسی کو تعلیم و تدریس کرے اگر شاگرد سے ایسی ہی توقع کرے کہ اس کے پیچھے پیچھے چلے یا اس کی خدمت کرے تو گویا اس نے عوض طلب کیا لہٰذا ثواب نہ پائے گا۔ لیکن اگر کوئی معاوضہ طلب نہ کیا لیکن شاگرد خدمت کرے تو اولیٰ تر یہ ہے کہ استاد خدمت نہ لے۔ اگر لے تو جب مقصود نہ ہو تو ظاہر یہ دکھائی دیتا ہے کہ ثواب ضائع نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر شاگرد خدمت نہ کرے تو استاد اس کے اعراض سے متعجب نہ ہوگا۔ لیکن اہل احتیاط نے اس سے حذر کیا ہے۔ جیسے کہ ایک مُعلّم ایک کنویں میں گر گیا۔ لوگ رسّا لائے تو گرنے والے نے قسم دی کہ کوئی شخص جس نے مجھ سے حدیث سنی ہو یا قرآن پڑھا ہو وہ رسے کو ہاتھ نہ لگائے کیونکہ مجھے خوف ہے کہ یہ معاوضہ میرے ثواب کو باطل کر دے گا۔ ایک شخص سفیان ثوری کے پاس تحفہ لے گیا لیکن آپ نے قبول نہ کیا۔ تو اس شخص نے کہا کہ ''میں نے کبھی آپ سے حدیث نہیں سنی'' سفیان نے کہا کہ: ''تیرے بھائی نے مجھ سے حدیث سنی ہے اس لئے ڈرتا ہوں کہ میرا دل دوسرے شاگردوں

کی نسبت اس کے لئے زیادہ مشفق ہو جائے گا''۔ ایک شخص دو تھیلیاں سونے کی سفیانؒ کے حضور لے آیا۔ اور بولا: ''آپ جانتے ہیں کہ میرا باپ آپ کا دوست تھا اور حلال روزی کھاتا تھا۔ تو یہ میراث حلال ہے مجھ سے قبول فرمائیے'' جب آپ نے قبول کر لی اور وہ شخص چلا گیا تو سفیان نے وہ تھیلیاں اسی طرح اپنے بیٹے کے ہاتھ اس کو واپس بھیج دیں۔ شاید انھیں یاد آیا کہ ان کی دوستی اس شخص کے باپ کے ساتھ حق تعالیٰ کے لئے تھی۔ سفیان کے اس بیٹے کا بیان ہے کہ ''جب میں وہ سونا واپس دے کر لوٹا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ تو میں نے ابا جان سے کہا'' آپ کا دل شاید پتھر کا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں عیال دار ہوں۔ اور میرے پاس کچھ بھی نہیں آپ کو مجھ پر رحم نہیں آتا'' تو سفیان نے فرمایا کہ: ''میرے بیٹے تو چاہتا ہے کہ اچھا کھائے اور قیامت میں میری جواب طلبی ہو۔ مجھ میں اس کی تاب نہیں''۔ اسی طرح شاگرد کو بھی چاہئے کہ سوائے رضائے خداوندی کے کوئی اور غرض نہ رکھتا ہو۔ اور استاد سے بھی کوئی توقع نہ رکھے۔ ہوسکتا ہے کہ گمان کرے کہ اگر اپنی طاعت معلم کے حضور پیش کرے روا ہوگا کہ اس کی تعلیم میں استاد زیادہ توجہ دے گا۔ لیکن یہ غلطی ہے اور عین ریا ہے۔ بلکہ چاہئے یہ کہ انسان استاد کی خدمت کے ذریعے منزلت اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلب کرے نہ کہ معلم کے حضور۔ اسی طرح ماں باپ کی خوشنودی کی طلب بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہو۔ اور اپنی پارسائی کا اظہار ماں باپ کے رُوبرُو نہ کرے کہ اس سے راضی ہوں۔ کیونکہ یہ تو صاف معصیت ہے۔ مختصر یہ کہ انسان جس کام میں ثواب کا طالب ہو چاہئے وہ کام خالصۃً اللہ ہی کے لئے ہو۔

اصل نہم: کبر و عُجب کے علاج کے بارے میں

یاد رہے کہ کبر اور خود کو بزرگ جاننا مذموم خصلت ہے۔ اور حقیقتاً حق سبحانہ تعالیٰ کے ساتھ ایک گونہ دشمنی ہے۔ کیونکہ کبریائی اور عظمت اللہ ہی کو سزاوار ہیں۔ اسی سبب سے جبّار اور متکبر کے لئے بہت سی مذمتیں قرآن میں وارد ہیں۔ جیسے کہ فرمایا کہ: ''کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ'' (قرآن: ۴۰/۳۵) (اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر اور سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے)۔ نیز فرمایا کہ: ''وَخَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ'' (قرآن: ۱۴/۱۵) (اور ہر جبار اور سرکش نے اپنا نقصان کیا) نیز زبانِ موسیٰ سے فرمایا: ''اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ'' (قرآن: ۴۰/۲۷) (میں فریاد کرتا ہوں اور اپنے تمھارے رب کی پناہ چاہتا ہوں ہر اس جبار سے اور جو ایمان نہیں لایا روزِ قیامت پر)

اور آنحضرت نے فرمایا کہ: ''جو شخص رائی کے ایک دانے کے برابر دل میں تکبر رکھتا ہو بہشت میں نہ

جائے گا۔ نیز فرمایا کہ: ''کوئی ایسا بھی ہوگا جو اپنے آپ کو بزرگ جاننے کو پیشہ بنالے گا یہاں تک کہ اس کا نام جباروں کے جریدے میں لکھ لیا جائے گا اور اسے وہی عذاب دیا جائے گا جو جباروں کو دیا جائے گا''۔

حدیث میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے تمام جن و پری' پرندوں اور لوگوں کو حکم دیا کہ باہر نکلو۔ تو دو لاکھ انسان اور دو لاکھ جن آپ کے حضور جمع ہو گئے تو آپ نے ہوا کو حکم دیا تا کہ انھیں آسمان کے نزدیک لے جائے۔ تا کہ آپ فرشتوں کی آواز اور تسبیح سنیں۔ پھر ہوا انھیں زمین پر لے آئی حتیٰ کہ قعر دریا میں پہنچ گئی۔ تو وہاں آپ نے یہ آواز سنی کہ ''اگر سلیمان علیہ السلام کے دل میں ذرہ بھر کبر ہوتا تو قبل اس کے کہ اسے ہوا اوپر لاتی میں اسے زمین کے اندر گاڑ دیتا''۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''متکبروں کو روزِ قیامت چیونٹیوں کے روپ میں جو لوگوں کے پاؤں کے نیچے ذلت سے پڑی ہوں گی کہ حضورِ حق میں پیش ہوں گی''۔ نیز فرمایا کہ ''دوزخ میں ایک وادی ہے کہ جسے ھبھب کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لئے سزاوار ہے کہ جباروں اور متکبروں کو اس میں ڈال دے'' سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں کہ ''وہ گناہ جس کے ہوتے ساتے کوئی طاعت فائدہ نہیں دیتی کبر ہے''۔ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''حق تعالیٰ اس شخص کو ایک نظر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا جس کا لباس بر سبیل تکبر و فخر زمین پر گھسٹتا جا رہا ہو''۔ نیز فرمایا کہ ''ایک دفعہ ایک شخص ناز سے چلا جا رہا تھا اس نے فاخر لباس پہن رکھا تھا اور خود نگر تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں غرق کر دیا اور وہ اب تک اسی حالت میں قیامت تک جاتا رہے گا''۔ نیز فرمایا کہ جو خود کو بزرگ سمجھتا ہے اور فخر سے زمین پر چلتا ہے اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اسے بچشمِ غیظ دیکھیں گے''۔

محمد بن واسعؒ نے ایک دفعہ اپنے بیٹے کو دیکھا کہ ناز سے چل رہا ہے۔ تو اسے پکارا اور کہا کہ: ''جانتے ہو تم کون ہو؟ میں نے تمھاری ماں کو دو صد درم میں خریدا تھا اور باپ تمھارا مسلمانوں کے درمیان ایسا ہے کہ اس کا ساجتنا بھی کمتر ہو بہتر ہے''۔ مطرف بن عبد اللہؒ نے مہلّب کو دیکھا کہ ناز سے چلا جا رہا ہے۔ تو فرمایا: اے بندے! اس طرح چلنے کو اللہ تعالیٰ دشمن رکھتا ہے''۔ تو مہلّب نے کہا خبر دار! تم مجھے نہیں جانتے؟'' تو آپ نے فرمایا: ''جانتا ہوں تم پہلے ناپاک پانی تھے اور آخر میں ذلیل مردار ہو گے اور درمیان میں پلیدیوں کا بوجھ اٹھانے والے!''

انکساری کی فضیلت: آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کسی شخص نے انکساری اختیار نہیں کی جسے اللہ تعالیٰ نے زیادہ عزت سے بہرہ ور نہ کیا ہو''۔ نیز فرمایا کہ ''کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ جس کے سر پر لگام دو فرشتوں کے ہاتھ میں نہ ہو۔ جو کوئی تواضع اور انکساری کا اظہار کرتا ہے تو وہ فرشتے لگام اوپر اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''بارِ

خدایا اسے سرفراز فرما'' اور اگر وہ تکبر کرے تو اسے نیچے کی طرف کھینچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: ''بارِ خدایا اسے سر فگندہ رکھ''۔ نیز فرمایا کہ ''خوش بخت ہے وہ شخص جو بے چارگی کے باعث منکسر نہ ہو اور مال نفقہ کرے اس خزینہ سے جو اس نے بذریعہ معصیت جمع نہ کیا ہو۔ اور بے کسوں پر رحم کرتا ہو تو صحبت اس کی حکماء اور علماء کے ساتھ ہو''

بوسلمہ مدنیؒ اپنے دادا کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ ان کے دادا نے کہا کہ رسول ﷺ ایک دن ہمارے مہمان تھے۔ اور آپ روزہ سے تھے۔ ہم ان کے روزہ کے افطار کے لئے شہد ملا دودھ لائے۔ تو جب آپ نے اسے چکھا تو فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ تو ہم نے کہا کہ ''ہم نے اس میں شہد ڈال دیا ہے' تو آپنے ہاتھ سے رکھ دیا اور نہ پیا اور فرمایا کہ ''میں اسے حرام نہیں کہتا لیکن جو کوئی اللہ کے سامنے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اوپر اٹھاتا ہے اور سرفرازی عطا فرماتا ہے۔ اور جو کوئی تکبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے گرا دیتا ہے اور ذلیل کر دیتا ہے اور جو کوئی اخراجات میں میانہ روی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے لوگوں سے مستغنی کر دیتے ہیں۔ اور جو کوئی اخراجات میں میانہ روی اختیار نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اسے قلاش بنا دیتے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنا دوست بنا لیتے ہیں''۔

ایک دفعہ ایک مجروح فقیر نے آنخضرت کے دروازے پر صدا دی۔ اس وقت آنخضرت کھانا کھا رہے تھے۔ تو آپ نے اسے اندر بلایا تو باقی افراد ایک طرف کو چلے گئے۔ تو آپ ﷺ نے اسے اپنے پہلو میں بٹھایا اور فرمایا کہ 'کھاؤ' تو قریش میں سے ایک نے اسے پلید سمجھ کر بہ کراہیت دیکھا تو وہ قریشی اسی مرض میں مبتلا ہو کر مرا۔

آنخضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بات میں اختیار دیا ہے کہ میں ''رسول ہوں اور بندہ یا نبی ہوں اور بادشاہ'' تو میں نے توقف کیا۔ ملائکہ میں سے جبریل میرے دوست تھے میں نے ان کی طرف دیکھا تو حضرت جبریل نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تواضع اختیار کر تو میں نے کہا کہ ''میں چاہتا ہوں کہ میں بندہ بنوں اور رسول'' اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر وحی کی کہ ''میں نماز اس شخص کی قبول کرتا ہوں جو منکسر ہو اور میری مخلوق کے سامنے خود کو بڑا نہ ٹھہرائے اور دل کو میرے خوف سے معمور رکھے اور تمام دن میری یاد میں گذارے اور اپنے آپ کو میری خاطر شہوتوں سے روک رکھے''۔ آنخضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''بزرگی تقویٰ میں ہے اور شرف انکساری میں اور دولت مندی یقین میں ہے''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ''دنیا میں متواضع انسان خوش نصیب ہیں کہ قیامت کے دن اصحابِ

خیر وہی ہوں گے اور خوش بخت ہیں وہ لوگ جو دنیا میں افراد میں صلح کا اہتمام کرتے ہیں کیونکہ بہشت ان کی جائے قرار ہے۔ اور خوش بخت ہیں وہ لوگ جن کا دل دنیا کی محبت سے خالی ہے کیونکہ جزا اس کی دیدارِ خداوندی ہے''۔ آنحضرت نے فرمایا کہ'' جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کی راہ دکھائی انسے اچھی صورت سے نوازا اور حال اس کا اس طرح رکھا کہ جس سے شرمساری ہو اور اس سب کے ساتھ اسے فروتنی عطا کی وہ اللہ کے نزدیک برگزیدوں میں سے ہوگا''۔

ایک شخص کے جسم پر چیچک کے آبلے نکل آئے تھے۔ لوگ کھانے میں لگے ہوئے تھے وہ جس کے پاس بیٹھتا وہ شخص اس جگہ سے اٹھ جاتا۔ تو آنخضرت نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور فرمایا کہ'' میں اس شخص کو بے حد پسند کرتا ہوں جو اپنی ضرورت کی چیزیں ہاتھ میں لئے اپنے گھر جائے جو اس کے اہل وعیال کے لئے توشہ ہو تو کبر اس کے باعث اس شخص سے دور ہو جاتا ہے''۔ آنخضرت نے صحابہ سے فرمایا کہ'' کیا وجہ ہے کہ میں تم میں عبادت کی شیرینی نہیں دیکھتا''؟ تو صحابہ نے پوچھا کہ'' عبادت کی شیرینی کیا شے ہے''؟ تو آپ نے فرمایا'' تواضع'' تو آپ نے فرمایا کہ جب تم کسی متواضع شخص سے ملو تو اس کے ساتھ انکساری سے پیش آؤ اور جب متکبروں کو دیکھو تو تم بھی اظہار کبر کرو تا کہ ان کی تحقیر اور مذلت کا اظہار ہو۔

آثار۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ'' تم لوگ فاضل ترین عبادات سے غافل ہو اور وہ ہے انکساری''۔

فضیلؒ فرماتے ہیں کہ'' تواضع یہ ہے کہ جو کوئی بھی ہو اس سے حق قبول کرو اگرچہ لڑکا بالا ہی ہو یا جاہل ترین خلق ہی کیوں نہ ہو''۔ ابن المبارکؒ فرماتے ہیں کہ: تواضع یہ ہے کہ وہ شخص جو دنیوی اعتبار سے تم سے کم مال دار ہو تو تم خود کو اس لئے بھی فروتن رکھو تا کہ اس پر ظاہر کر سکو کہ دنیا داری کی وجہ سے تم اپنے آپ کو کوئی مرتبہ نہیں دیتے۔ اور جو کوئی تم سے زیادہ مال دنیا رکھتا ہو تو اس کے سامنے خود کو فراتر ظاہر کرو۔ تا کہ اس پر واضح کر سکو کہ دنیاداری کے سبب سے تمھارے نزدیک اس کی کوئی منزلت نہیں''۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ'' جب میں تجھے کوئی نعمت عطا کروں اگر تواضع کے ساتھ اس کا سامنا کرے گا تو میں تم کو وہ نعمت کامل کردوں گا''۔ ابن سماکؒ جس روز ہارون الرشید سے فرماتے: '' اے امیر المؤمنین! تیری تواضع تیرے شرف میں تیرے نسبی شرف سے شریف تر ہے'' تو اس پر ہارون الرشید کہتے کہ'' تم نے نہایت خوب کہا'' تو ابن سماک نے کہا: '' اے امیر المؤمنین! اللہ نے جس کو مال، جمال اور حشمت عطا فرمائی تو وہ مال میں مواسات کرتا ہے حشمت میں تواضع کرتا ہے، اور جمال میں پارسا ہوتا ہے۔ تو اس کا نام اللہ تعالیٰ کے دیوان میں جملہ اہل اخلاص کے ساتھ لکھا جاتا ہے'' تو ہارون نے کاغذ قلم طلب کیا اور ابن سماک کے اس قول کو لکھا۔ حضرت

سلیمان علیہ السلام اپنی مملکت کے دولت مندوں سے صبح کے وقت پوچھتے تو اس وقت مفلسوں کے ساتھ بیٹھتے تو فرماتے ''میں ایک مسکین ہوں اور تم سے بھی زیادہ مسکین ہوں''۔

بزرگوں میں سے کچھ تواضع کے بارے میں گفتگو فرما رہے تھے تو حسن بصریؒ نے فرمایا کہ ''تواضع یہ ہے کہ جب تُو گھر سے باہر نکلے تو جس کو بھی دیکھے خود سے برتر جانے''۔ مالک بن دینارؒ نے فرمایا کہ ''اگر مسجد کے دروازے پہ منادی کی جائے کہ 'تم میں جو بدترین ہے باہر آئے تو کوئی شخص مجھ پر سبقت نہ لے پائے گا اِلاّ بہ قہر''۔ ابن المبارک نے یہ سنا تو فرمایا کہ ''مالک کی بزرگی اسی بناء پر تھی'' ایک شخص شبلیؒ کے پاس آیا تو شبلی نے کہا کہ ''ما انت؟ تو کیا چیز ہے''؟ تو اس شخص نے کہا کہ میں وہ نقطہ ہوں جو حرفِ با (ب) کے نیچے دیا جاتا ہے۔ یعنی اس سے فرومایہ تر کوئی اور شے نہیں ہوتی'' تو شبلی نے فرمایا ''آباد اللہ شاہدک' تیرا اللہ تجھے اس سے بلند فرمائے کیونکہ تو نے اپنے آپ کو پائین ترین جگہ پر رکھا ہے''۔ بزرگوں میں سے ایک نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا تو کہا کہ ''مجھے نصیحت فرمایئے'' تو آپ نے فرمایا کہ ''درویشوں کے حضور دولت مندوں کا تواضع کرنا ثوابِ آخرت کے لئے کتنی اچھی بات ہے اور درویشوں کا دولت مندوں کے ساتھ تکبر کرنا بہ اعتماد فضل خدا تعالیٰ نیکوتر ہے۔

یحییٰ بن خالد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''کریم جب پارسائی اختیار کرتا ہے تو متواضع ہو جاتا ہے۔ اور کمینہ اور ناقص جب پارسائی اختیار کرتا ہے تو اس کے باطن میں تکبر پیدا ہو جاتا ہے''۔ بایزیدؒ فرماتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص خلق میں سے کسی کو بھی اپنے سے بدتر سمجھتا ہے متکبر ہے''۔ حضرت جنید نے ایک دن جمعے کے جلسے میں فرمایا کہ: ''اگر حدیث میں یہ نہ آیا ہوا ہوتا کہ آخر زمان قوم کا ناکس ترین فرد ان کا سردار ہو گا تو میں خود کو وعظ کہنے کے لئے جائز نہیں رکھتا'' جنیدؒ ہی فرماتے ہیں کہ ''تواضع اہل توحید کے نزدیک تکبر ہے یعنی تواضع یہ ہے کہ انسان خود کو پائین درجے میں لے جائے۔ تو جب تک پائین درجے میں آتا رہے گا تو اس وقت تک تو نے آپ کو مرتبہ عالی پر رکھا ہو گا''؟ عطائی سلمیؒ جب آندھی آتی یا گرج چمک ہوتی تو اٹھتے اور حاملہ عورت کی طرح ہاتھ اپنے پیٹ پر مارتے اور فرماتے ''یہ سب میری نحوست کی وجہ سے ہے کہ جو خلق کو برداشت کرنا پڑتا ہے'' کچھ لوگ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے سامنے اظہار فخر کر رہے تھے کہ آپ نے فرمایا کہ ''آغاز میرا نطفے سے ہوا اور انجام ایک مردار پر۔ اور پھر بدتر یا بہتر کا فیصلہ وزِ قیامت ترازو کرے گا۔ اگر میں بھاری نکلا تو کریم ہوں گا اور اگر سبک نکلا تو لئیم ٹھہروں گا''(۱)

(۱) احیاء میں ہے کہ: قریش سلمان کے سامنے مفاخرت کر رہے تھے' تو سلمان نے فرمایا کہ: ''لیکن میں ایک نطفہ ناپلید سے پیدا ہوا ہوں' آخر گلا سڑا مردار بن جاؤں گا۔ پھر رجوع ترازو کی طرف ہو گا۔ اگر بھاری نکلا تو میں کریم ٹھہرا اور اگر ہلکا نکلا تو لئیم۔

کبر کی حقیقت اور اس کی آفات

یاد رہے کہ کبر یک خُلق ہے۔ اور اخلاق دل کی صفات میں سے ہے۔ لیکن اثر اس کا ظاہر پر نمودار ہوتا ہے اور خُلق ِکبر یہ ہے کہ انسان خود کو دوسروں سے آگے رکھتا ہے اور بہتر جانتا ہے۔ اور اس سے اس کے اندر ایک بادِ نشاط پیدا ہوتی ہے۔ تو اسی باد کو جو اس کے باطن میں پیدا ہوتی ہے ِکبر کہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: "اعوذبك من نفخة الکبر" (اے اللہ میں کبر کی ہوا سے تیری پناہ چاہتا ہوں) یہ ہوا جب انسان کے اندر نمودار ہوتی ہے تو وہ دوسروں کو خود سے ادنیٰ جاننے لگتا ہے اور انھیں خادموں کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے بلکہ ممکن ہے کہ دوسروں کو اپنی خدمت کے لائق بھی نہ جانے۔ اور کہنے لگے کہ "تو کون ہے کہ اپنے آپ کو میری خدمت کے لائق تصور کرتا ہے"؟ جیسے کہ خلفا مسلّم نہیں رکھتے کہ ہر کوئی ان کے آستانے پر بوسہ دے اور اپنے تیئں ان کی طرف اضافت کر کے بندہ لکھے۔ مگر بادشاہوں کو اس کی اجازت ہے' اور یہ تکبر کی انتہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی سے بھی بڑھ گیا ہے۔ جو ہر کسی کی بندگی اور سجود کو قبول فرماتا ہے۔ متکبر شخص اس درجے کو نہ پہنچے تو چلنے میں یا نشست میں پہل کا طالب ہوتا ہے۔ اور منتظر اس کا ہوتا ہے کہ دوسرے اس کا احترام کریں۔ اور نوبت یہاں تک آتی ہے کہ اگر ایسے کو نصیحت کی جائے تو قبول نہ کرے۔ اور وہ خود اگر نصیحت کرے تو سختی سے کرے۔ اور اگر اس کو تعلیم دیں تو غضب میں آجائے۔ اور وہ انسانوں کو ایسے دیکھنے لگتا ہے جیسے وہ ڈھور ڈنگر ہوں۔

اصحاب رسول نے آپؐ سے پوچھا کہ "کبر کیا ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا کہ "یہ کہ حق کے آگے انسان سر نہ جھکائے اور لوگوں کو بہ چشم حقارت دیکھے" اور یہ دونوں خصلتیں اس کے اور حق تعالیٰ کے درمیان آڑ ہیں۔ اور اسی سے تمام بداخلاق جنم لیتے ہیں۔ اور انسان خوش خُلقی سے محروم رہتا ہے۔ کیونکہ جو کوئی آقائی اور خود پسندی اور اپنی بزرگ داری سے مغلوب ہو جاتا ہے تو وہ جو اپنے لئے پسند کرتا ہے دوسرے مسلمانوں کے لئے پسند نہیں کرسکتا۔ اور یہ مومنوں کا شیوہ نہیں۔ اور کسی کے ساتھ فروتنی نہیں کرسکتا۔ اور یہ صفت تو سے ڈرنے والوں کی نہیں۔ اور وہ کینہ وحسد سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔ اور نہ غصے کو پی سکتا ہے۔ نہ زبان کو غیبت سے بچاسکتا ہے۔ اور دل کو برائیوں سے پاک نہیں کرسکتا۔ اور جو کوئی اس کی تعظیم نہ کرے تو اس کے لئے دل میں کینہ رکھتا ہے۔ اور کم ترین یہ تو ہوگا کہ سارا دن خود پرستی اور خود کاری میں لگا رہے گا۔ اور فریب' دروغ اور نفاق سے عاری نہ ہوگا۔ تاکہ اپنے کام کو لوگوں کی نگاہ میں وقعت دے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص بھی مسلمانی کی خوشبو سے بہرہ مند ہوسکتا جب تک کہ خود کو نہ بھول جائے۔ بلکہ وہ دنیا کی راحت کو بھی نہیں پاسکتا۔ بزرگوں میں ایک

کا فرمان ہے کہ ''اگر تم چاہتے ہو کہ بہشت کی خوشبو سونگھ سکو تو خود کو جملہ خلق سے ادنیٰ قرار دو تا کہ بوئے بہشت سونگھ سکو اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو یہ بصیرت عطا کرے کہ وہ دو متکبروں کے باہم ملاقات کے وقت اُن کے دلوں میں جھانک سکے تو دیکھے گا کہ کسی گھورے پر وہ غلاظت اور فضیحت نہ ہوگی جو اُن کے دلوں میں موجود ہے۔ان کا باطن کتوں کی صورت میں منقلب ہو چکا ہوگا۔اور یہ لوگ اپنے ظاہر کو عورتوں کی مانند آراستہ کرتے ہیں۔اور وہ انس جو مسلمانوں کی مجالست کی علامت ہے وہ ان میں نہ ہوگا۔ بلکہ جس سے بھی تو ملے راحت سے اس وقت بہرہ ور ہوگا کہ جب تو سراپا اس میں گم ہو جائے اور جملہ تعظیم اسی کی کرے تا کہ دوئی باقی نہ رہے۔اور وہ باقی رہ جائے اور تو باقی نہ رہے۔یا وہ تجھ میں گم ہو جائے اور تو باقی رہ جائے اور وہ نہ رہے۔یا تم دونوں حق تعالیٰ میں کھو جاؤ اور اپنی طرف توجہ نہ کرو تو کمال یہی ہوگا۔[1] اور اس یگانگی سے کمال واجب ہوگا۔مختصر یہ کہ جب تک دوئی رہے گی راحت ممکن ہی نہیں۔راحت وحدانیت اور یگانگی ہی میں ہے۔تو یہ ہے کبر کی حقیقت اور کبر کی آفات۔

کبر کے درجوں کا بیان

یاد رہے کہ بعضا کبر زیادہ فاحش اور زیادہ بڑا ہے۔اور تفاوت اس میں اس بناء پر ہوتی ہے کہ تکبر تین قسم کا ہوگا۔یا تو یہ تکبر اللہ تعالیٰ پر ہوگا یا رسول ﷺ پر ہوگا یا لوگوں پر ہوگا۔

درجۂ اوّل: حق تعالیٰ پر تکبر: جیسے نمرود فرعون اور ابلیس کا تکبر ہے وہ لوگ جنھوں نے خدائی کا دعویٰ کیا اور حق تعالیٰ کی بندگی سے عاری تھے تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ'' (قرآن: ۴/۱۷۲) (نہ عیسیٰ علیہ السلام بندگی سے عاری ہے نہ مقرب فرشتے)۔

درجۂ دوم: اللہ کے رسول پر تکبر ہے۔جیسے کہ کفار قریش نے کہا کہ: ''ہم اپنے جیسے آدمی کے آگے سر نہ جھکائیں گے ہمارے پاس اللہ تعالیٰ نے کوئی فرشتہ کیوں نہ بھیجا؟ ایک یتیم کو بھیجا۔'' وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ '' (قرآن: ۴۳/۳۱) (اور انھوں نے) کہا کہ کیوں قرآن ان دو قریوں (مکہ وطایف) کے کسی مرد پا اتارا نہ گیا؟) ان کے دو گروہ تھے۔ایک گروہ وہ کہ کبر ان کی آڑ بن گیا۔نتیجۂ انھوں نے خود عذر ہی نہیں کیا اور اللہ کے پیغمبر کو نہ پہنچانا۔جیسے کہ فرمایا کہ: ''سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ '' (قرآن: ۷/۱۴۶) (میں متکبروں کو راہ نہیں دیتا تا کہ وہ حق کی نشانیاں نہ دیکھیں) لیکن ایک گروہ تھا کہ جانتا تھا لیکن انکار کرتا تھا اور کبر کے باعث تاب نہ رکھتا تھا کہ حق کا

---

(۱) من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جان شدی، تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری (امیر خسروؒ)

اقرار کرتا جیسے کہ فرمان خداوندی ہے کہ: ''وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا'' (قرآن: ۲۷/۱۴) (اوران سب نے اللہ کی آیات کا انکار کیا ظلم اور بڑائی کی وجہ سے حالانکہ ان کے نفسوں کو اس کا یقین تھا)۔

درجۂ سوم: وہ ہے کہ متکبر انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ تکبر کرتے ہیں اور انھیں بچشم حقارت دیکھتے ہیں۔ اوران سے حق بات کو قبول نہیں کرتے اور خود کو بہتر سمجھتے ہیں۔ اور خود کو بزرگ رکھتے ہیں۔ یہ اگرچہ متذکرہ بالا دو درجوں سے پست درجہ ہے لیکن دو اسباب کی بنا پر بہت عظیم ہے: ایک یہ کہ بزرگی صفت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ تو بندہ ضعیف اور عاجز کہ جس کے ہاتھ میں کوئی قدرت نہیں ہے۔ کبر اسے کہاں سے روا ٹھہرا کہ خود کو کچھ سمجھ سکے۔ اور جب وہ خود کو بڑا گمان کرتا ہے تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی صفت میں منازعت کی۔ مثال اس کی ایسے غلام کی سی ہے جو بادشاہ کا تاج سر پر رکھ لے اور تخت نشین ہو جائے۔ دیکھ لیجئے کہ وہ پھر کس درجہ عقوبت اور غداری کا مستوجب ٹھہرے گا۔ اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ''العظمة اِزاری والكبرياء رِدائي فمن نازعني فيهما فعصمة'' فرمایا کہ ''عظمت و کبریائی میری مخصوص صفت ہے جو کوئی اس میں مجھ سے نزاع کا مرتکب ہوگا میں اسے ہلاک کر دوں گا'' پس جب سوائے رب تعالیٰ کے کسی بندے کو تکبر کی اجازت نہیں تو اگر اللہ کا غلام اللہ کے بندوں پر تکبر کرے گا تو گویا اس نے اللہ کے ساتھ منازعت کی۔ جیسے کوئی شخص بادشاہ کے خادموں کو ایسے کام کا حکم دے جو بادشاہ کے سوا کسی اور کو زیبا نہ ہو۔

دوسرا سبب: یہ ہے کہ کبر دوسروں سے حق قبول کرنے میں آڑے آتا ہے۔ بہ طوریکہ وہ لوگ جو اس صفت کے مالک ہوں وہ دینی مسائل میں مناظرہ کرتے ہیں۔ جب ایک کی زبان پر حق ظاہر ہوتا ہے تو دوسرے کو کبر مجبور کرتا ہے کہ اس سے انکار کر دے اور قبول نہ کرے۔ اور یہ اخلاق منافقوں اور کافروں کا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے بارے میں فرمایا کہ: ''وقال الذين كفروا لاتسمعوا لهذا القرآن والغو فيه لعلكم تغلبون'' (قرآن: ۲۶/۴۹) (وہ لوگ جو کافر ہو گئے کہنے لگے یہ قرآن مت سنو اور اس میں شور مچاؤ تاکہ شاید تم غلبہ پا جاؤ) اور جیسے کہ فرمایا کہ: ''وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ'' (قرآن: ۲۰۶/۲) یعنی (جب اس سے کہتے ہیں کہ اللہ سے ڈرو تو اس کی بزرگی اور عزت اس پر قائم رکھتی ہے کہ وہ معصیت پر اصرار کرتا ہے)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''جب کسی سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر تو وہ کہتا ہے 'میاں اپنے کام سے کام رکھو' تو یہ بہت بڑا گناہ ہے'' ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے کہا کہ: ''میاں اپنے دائیں ہاتھ سے کھانا کھاؤ'' تو وہ بولا ''میں ایسا نہیں کر سکتا'' تو آنحضرت نے فرمایا کہ ''اللہ کرے کہ تو نہ کر سکے'' کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ اس نے کبر کی وجہ سے یہ کہا تھا۔ اور

شومئ کار سے اس کا ہاتھ شل ہو گیا اور حرکت سے عاری ہو گیا۔

یاد رہے کہ قصہ ابلیس تمھیں بطور افسانہ نہیں سنایا گیا۔ بلکہ اس لئے کہ تمھیں معلوم ہو سکے کہ کبر کی آفت انسان کو کہاں تک لے جاتی ہے۔ ابلیس نے کہا تھا کہ "اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ط خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَه‘ مِنْ طِيْنٍ" (قرآن: ۷۶/۳۸) (ابلیس نے کہا کہ میں اس (آدم) سے بہتر ہوں۔ کیونکہ مجھے آپ نے آگ سے تخلیق کیا ہے جب کہ اسے مٹی سے بنایا ہے" اور اس کا کبر اسے یہاں تک لے گیا کہ فرمان خداوند تعالیٰ سے انکار کر دیا اور آدم کو سجدہ نہ کیا جس کے لئے ابدی ملعون ٹھہرا۔

کبر کے اسباب اور ان کا علاج

یاد رہے کہ جو کوئی تکبر کرتا ہے وہ اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی صفت سے متصف سمجھتا ہے جس سے دوسرے عاری ہیں۔ اور وہ صفت کمال ہے۔ اور سبب اس کے سات ہیں:

اسبابِ کبر:

کبر کا پہلا سبب علم ہے کہ عالم خود کو کمالِ علم سے آراستہ دیکھتا ہے اور دوسروں کو اپنے مقابلے ڈھور ڈنگر کی طرح دیکھتا ہے اور کبر اسی پر غالب ہوتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ متکبر لوگوں سے مراعات اور خدمت اور اپنی تعظیم کی توقع رکھتا ہے اور اوّلیت کا خواہاں ہوتا ہے۔ اور اگر لوگ یہ نہ کریں تو متعجب ہوتا ہے۔ اگر لوگوں کو دیکھتا ہے یا کسی کی دعوت پر طلب ہو تو احسان دھرتا ہے اور اپنے نزدیک اسے بڑی قدرت سمجھتا ہے۔ اور اپنے علم سے خلق پر احسان دھرتا ہے۔ اور حدیث آخرت میں خود کو اوروں میں کا نہیں سمجھتا۔ اور اپنے کام میں امیدوار تر ہوتا ہے اور اپنی نسبت دوسروں کے بارے میں زیادہ ڈرتا ہے اور کہتا ہے کہ سب کو میری دعا اور پارسائی کی حاجت ہے اور لوگ دوزخ سے میرے وسیلے سے نجات پائیں گے۔ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: "آفة العلم الخیلاءُ" یعنی "علم کی آفت سے کہ خود کو بزرگ جاننا ہے"۔ اور حق یہ ہے کہ اس قسم کے عالم کو عالم کی بجائے جاہل کہنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ علم حقیقی یہ ہے کہ انسان کارِ آخرت کے خطر کو جانے اور صراطِ مستقیم کی باریکی کو پہچانے۔ اور جس نے اسے پہچان لیا تو وہ ہمیشہ خود کو اس سے ابھی دُور پاتا ہے اور خود کو مقصر جانتا ہے اور اپنی عاقبت کے خیال سے اور اس خوف سے کہ مجھ پر دلیل بنے گا انسان تکبر سے دور رہتا ہے۔ جیسے کہ ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ: "جو علم بھی زیادہ ہو جاتا ہے درد زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو علم سیکھتے ہیں اور کبر ان کا زیادہ ہو جاتا ہے۔ وہ دو وجہ سے ہوتا ہے:

ایک یہ کہ علمِ حقیقی کہ علم دین ہے اسے نہیں سیکھتا اور علم دین ہی ہے جس سے انسان خود کو پہچانتا ہے۔

اور راہِ دین کی اوگھٹ گھاٹیوں سے آشنا ہوتا ہے اور عاقبت کے خطر اور حق تعالیٰ کے راستے میں حجاب سے آشنا ہوتا ہے۔ یہی علم انسان کو اپنے گناہوں کے عواقب سے درد وغم اور دل شکستگی بڑھاتا ہے نہ کہ تکبر۔ لیکن جب کوئی علم طب وحساب ونجوم ولغت اور علم جدل وخلاف سیکھتا ہے تو ان علوم سے سوائے تکبر کے کوئی اور اضافہ نہیں ہوتا۔ اسی علم کے قریب ہی فتاویٰ کا علم ہے۔ اور یہ دنیا کی مخلوق کی اصلاح کا علم ہے۔ لہٰذا یہ علمِ دنیا ہے۔ اگر چہ دین کو اس کی حاجت ہے۔ لیکن اس سے خوف پیدا نہیں ہوتا بلکہ جب کوئی اسی پر اکتفا کرے اور دیگر علوم نہ پڑھے تو دل اس کا تاریک ہو جاتا ہے اور کبر غالب ہو جاتا ہے۔ 'ولیس الخبر کالمعانیة' 'شنیدن کے بود مانند دیدن؟ ایسے لوگوں کو بہ نظر غائر دیکھ تا کہ تجھے معلوم ہو کہ یہ کیسے لوگ ہیں۔ اسی طرح ذاکروں کے علم طیارات اور سجع' ان کی طامات اور ایسی باتوں کا لانا جس سے سامعین نعرہ لگائیں اور ایسے نکات جس سے مسالک ومذاہب میں تعصب کا سامان کرتے ہیں تا کہ عوام سمجھیں کہ یہی دین کی راہ ہے تو یہ سب کے سب کبر' حسد اور عداوت کے تخم ہیں جو دوسروں کے دلوں میں بوئے جاتے ہیں۔ اور ان سے کوئی درمندی اور دل شکستگی اضافہ پذیر نہیں ہوتی۔ بلکہ غرور اور فخر کو فروغ ملتا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ کوئی علم نافع حاصل کرے۔ جیسے کہ تفسیرِ قرآنی' حدیث اور سیرتِ اسلاف اور اسی نوع کے علوم جن کا ذکر ہم اس کتاب میں کر چکے ہیں یا احیاء وغیرہ میں مذکور ہیں تو وہ بھی متکبر ہو سکتا ہے۔ اور سبب اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ فطرۃً خبیث ہوتا ہے۔ اور اخلاق اس کے برے ہوتے ہیں۔ اور ان علوم کے پڑھنے اور بیان کرنے سے غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کا حامل ہو اور بس۔ اور تقویٰ برتنے کے لئے نہیں ہوتی۔ تو جب علم اس کے باطن میں داخل ہوتا ہے تو اس کے باطن ہی کا ہم رنگ ہو جاتا ہے۔ جیسے دوا جب معدے میں پہنچتی ہے تو قبل اس کے کہ مریض کی ناراحتی میں کمی کرے خِلطِ معدہ کی ہم صفت ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی کہ بارش کا پانی جو آسمان سے صاف اور شفاف برستا ہے اور ایک ہی صفت سے متصف ہوتا ہے لیکن جس پودے میں بھی پہنچتا ہے اس کی صفات کو فروغ دیتا ہے۔ اگر وہ بنات تلخ ہو تو تلخ تر ہو جاتی ہے اور اگر شیریں ہو تو شیریں تر ہو جاتی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا کہ: ''کچھ لوگ ہوں گے جو قرآن پڑھتے ہیں لیکن قرآن ان کے گلے سے نیچے نہیں اترتا۔ اور فخر سے کہتے ہیں کہ ''کون ہے جو ہماری طرح تلاوت کر سکے؟ کون وہ جانتا ہے جو ہم جانتے ہیں'' پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ ''وہ تمھیں میں سے ہوں گے اور میری امت اور وہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ''جبّار علماء میں

سے نہ ہو جانا کیونکہ پھر تمھارا علم تمھارے جہل سے وفا نہ کرے گا''۔اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو انکساری اور تواضع کا حکم دیا ہے۔اور فرمایا کہ: ''وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ'' (قرآن:۲۶/ ۲۱۵) (اپنے پروں کو نیچے رکھئے فروتنی اور مہربانی کے لئے تاکہ مومن آپ کی پیروی کریں) یہی وجہ تھی کہ صحابہؓ تکبر اور غرور سے ہراساں رہتے تھے۔حضرت حذیفہؓ نے ایک دفعہ امامتِ نماز کی۔تو اس کے بعد فرمایا: ''اپنے لئے کوئی اور امام تلاش کرلو کیونکہ میں نے جو امامت کی تو میرے دل میں یہ خیال گذرا کہ میں تم سے بہتر ہوں'' اور جب صحابہ کرام کا یہ حال تھا کہ کبر کے خیال سے بھی ڈر جاتے تھے تو دوسرے خیالِ کبر سے کیسے پاک ہو سکتے ہیں۔اور عصرِ حاضر میں ایسا عالم کہاں ملے گا؟ بلکہ شاذ ہی کوئی کوئی عالم ایسا ہوگا جو جانتا ہو کہ یہ مذموم صفت ہے اور اس سے دور رہنا چاہئے۔کیونکہ بیشتر وہ عالم ہیں جو اس سے بے خبر ہوتے ہیں اور اپنے تکبر پر نازاں ہوتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ: ''ہم فلاں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔اور اسے کسی لائق نہیں سمجھتے اور اس پر نگاہ ڈالنا بھی ہمیں پسند نہیں'' وغیرہ۔پس اس حقیقت کا محرم اگر کوئی ہے تو بہت نادر ہوگا۔اور اس کی زیارت عبادت ہوگی۔ اور سب کو اس سے برکت حاصل کرنی چاہئے۔[1]

اور اگر حدیث میں یہ نہ ہوتا کہ: ''ایک زمانہ آئے گا کہ جو کوئی آپ لوگوں کے دسویں حصے کے برابر بھی عمل کرے گا نجات پا جائے گا۔کیونکہ نا امید ہو جانے کا خطرہ تھا۔اس میں تھوڑا بھی بہت ہے۔کیونکہ دین کا مددگار باقی نہیں رہا اور دینی حقائق کہنہ و فرسودہ ہو گئے ہیں۔اس لئے جو کوئی دین کی راہ چلتا ہے بیشتر تنہا ہوتا ہے۔اس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔اور رنج اس کا دگنا ہو جاتا ہے۔پس اگر وہ اس پر کفایت کرے تو مناسب ہے ان شاء اللہ۔

سببِ دوم: کبر کا زہد و عبادت ہے کہ عابد و زاہد و صوفی و پارسا تکبر سے پاک نہیں ہوتے۔بہ طوریکہ دوسروں کو اپنی خدمت اور زیارت پا مامور دیکھنا چاہتے ہیں۔گویا اپنی عبادات کے ذریعے لوگوں پر احسان رکھتے ہیں۔ممکن ہے کہ وہ یہ گمان کرتے ہوں کہ دوسرے ہلاک ہو گئے ہیں لیک وہ خود ایمن اور زندہ ہیں۔یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی انھیں رنج پہنچائے اور پھر رنج پہنچانے والا کسی آفت میں گرفتار ہو جائے تو وہ اسے اپنی کرامت قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ انھی کے لئے ہے۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ جو کوئی دوسروں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ ''لوگ ہلاک ہو گئے'' تو ہلاک شدہ تو وہ خود ہے کہ لوگوں کو بہ نظر حقارت دیکھتا ہے'' نیز فرمایا کہ: ''وہ پورا گناہگار ہے جو اپنے مسلمان

---

(۱) اکثیر ہدایت میں لکھا ہے کہ سب کو اس کے واسطے چھوڑ دینا چاہئے۔

بھائی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو اس میں اور اس شخص میں جو ایسے عابد زاہد کی زیارت کو بابرکت جانتا ہے اور اپنے سے اسے بہتر جانتا ہے۔ اور حق تعالیٰ کے لئے اسے دوست رکھتا ہے تفاوت بہت ہے۔ اور خطرہ اس بات کا ہے کہ حق تعالیٰ اس کا درجہ اس کے معتقدوں کو دے دے اور اسے اپنی عبادت کی برکت سے محروم کر دے۔ جیسے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص ایسا تھا کہ کوئی دوسرا اس سے بڑھ کر عابد نہ تھا اور ایک شخص وہ تھا کہ جس سے گناہ گارتر کوئی اور نہ تھا۔ تو یہ عابد جہاں بیٹھا ہوا تھا وہاں بادل کے ایک ٹکڑے نے اس کے سر پر سایہ کر رکھا تھا۔ تو اس فاسق شخص کے جی میں آیا کہ میں اس عابد کے پاس بیٹھوں تا کہ حق تعالیٰ اس کی برکت سے مجھ پر رحم فرمائے۔ تو جب وہ اس عابد کے قریب بیٹھا تو عابد نے اپنے جی میں کہا کہ اس کا کیا مرتبہ ہے کہ میرے پاس بیٹھے حالانکہ اس شخص سے نابکارتر اور کوئی نہیں اور مجھ سے عابدتر کوئی نہیں تو وہ عابد بولا: ''اے فاسق اٹھ اور مجھ سے دور ہو جا'' تو وہ فاسق اٹھ کر چل دیا اور بادل کا ٹکڑا بھی اس کے سر پر سایہ کرتے ہوئے چل دیا۔ تو اس زمانے کے پیغمبر پر اللہ تعالیٰ نے وحی کی کہ ''آپ ان دونوں سے فرمائیں کہ اپنا کام از سر نو شروع کریں۔ کیونکہ جو کچھ فاسق نے کہا تھا اس کے نیک ایمان کی بناء پر ہم نے اسے معاف کر دیا۔ اور جو کچھ عابد نے بہ طور عبادت کیا تھا اس کے تکبر کی وجہ سے ہم نے اسے باطل کر دیا''۔

ایک شخص نے پاؤں عابد کی گردن پر رکھ دیا تو عابد نے کہا کہ ''پاؤں اٹھا لے اللہ کی قسم اللہ تجھ پر رحم نہ کرے گا''۔ تو وحی آئی کہ ''اسے کہو کہ اے وہ کہ جو قسم کھا کر فیصلہ صادر کرتا ہے کہ میں اسے نہ بخشوں گا معلوم رہے کہ میں تمھیں نہیں بخشوں گا'' اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہر عابد کہ جب کوئی اسے رنج پہنچاتا ہے گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وجہ سے کہ اس نے مجھے رنج پہنچایا ہے اس پر رحمت نہ فرمائے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کہے کہ وہ اپنے اس عمل کی سزا جلد پالے گا۔ اور اگر اتفاقاً اس شخص پر کوئی آفت آ جائے تو عابد کہتا ہے کہ تم نے دیکھ لیا نہ کہ اس پر کیا بیتی! مطلب یہ کہ من جملہ کرامات میری کرامت ہے۔ اور اس احمق (عابد) نے نہ دیکھا کہ کفار نے آنحضرت ﷺ کو کتنی اذیتیں دیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن سے انتقام نہ لیا تھا۔ اور بعضوں کو دولت اسلام سے بہرہ مند فرمایا تھا۔ تو ایسا عابد خود کو معاذ اللہ پیغمبروں سے بھی گرامی تر سمجھتا ہے کہ اس کے لئے اللہ انتقام لے گا۔ جاہل عابد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور صاحب بصیرت ایسے ہوتے ہیں کہ مخلوق کی طرف سے جو اذیت انھیں پہنچتی ہے تو وہ جانتے ہیں کہ ہمارے نفاق کی نحوست اور ہماری ہی تقصیر کی بناء پر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ باوصف صدق اخلاص کے حضرت حذیفہؓ سے پوچھتے تھے کہ ''مجھ میں نفاق کی علامت تم کیا پاتے ہو؟'' پس مومن تقویٰ اختیار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہے اور احمق عابد بہ ظاہر عمل کرتا ہے اور دل اس کا کبر

اور غرور کی پلیدی سے آلودہ ہوتا ہے اور اس سے ڈرتا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس نے یہ یقین کرلیا کہ وہ دوسروں سے بہتر ہے تو اس نے اپنی عبادات اِس جہالت کے باعث ضایع کردیں۔ کیونکہ جہالت سے بڑھ کر اور کوئی معصیت نہیں۔ ایک دن صحابہ رضی اللہ عنہم ایک شخص کی تعریف بہت کررہے تھے کہ اتفاقاً وہ شخص وہاں آ گیا۔ تو صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ جس شخص کی ستایش ہم کررہے تھے یہی ہے"۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "میں اس شخص میں نفاق دیکھتا ہوں" تو یہ سن کر سب حیران رہ گئے"۔ تو وہ شخص جب آنحضرت ﷺ کے قریب پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ "تمھیں اللہ کی قسم سچ کہو کہ کیا کبھی تمھارے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ اس قوم میں تم سے بہتر اور کوئی نہیں؟" تو اس شخص نے جواب دیا کہ "آتا ہے" پس آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "یہ پلیدی اس کے باطن میں تھی اور اس کے چہرے پر نور نبوت تھا اس کو نفاق کہتے ہیں" اور یہ علماء اور عابدوں کے لئے بڑی مصیبت ہے اور اس امر میں ان کے تین طبقے ہیں:

طبقۂ اوّل: وہ ہے کہ دل اس فخر سے خالی نہیں کرسکتا لیکن بہ مجاہدہ تواضع کرتا ہے۔ یعنی کسی کا کام بجالاتا ہے۔ گویا دوسروں کو خود سے بہتر جانتا ہے اور اس کے کسی عمل یا قول سے برتری کا اظہار نہیں ہوتا تو یہ وہ مرد ہے جو اپنے باطن سے کبر کا استیصال نہیں کرسکا لیکن اس کی شاخ تراشی کرتا رہتا ہے۔

طبقۂ دوم: وہ ہے کہ زبان پر قابو رکھتا ہے تاکہ تفوق کا اظہار نہ کرے اس لئے کہتا ہے کہ "میں خود کو ہر شخص سے پست تر سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کے معاملات و افعال اس قول پر گواہی نہیں دیتے بلکہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باطن میں کبر کا پتہ دیتا ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں جاتا ہے صدر کی جگہ کا خواہاں ہوتا ہے۔ اور پیش روی کرتا ہے۔ اور جو عالم ہوگا وہ ایک طرف کا رُخ کرے گا گویا لوگوں سے عار رکھتا ہے۔ اور جو عابد ہوگا وہ رُو ترش ہوگا گویا لوگوں سے ناراض ہے۔ اور یہ دونوں احمق نہیں جانتے کہ علم و عمل نہ سرکشی میں ہے نہ ترش رُوئی میں بلکہ دل میں ہوتا ہے۔ اور نور اس کا ظاہر میں انکساری، شفقت اور وسعت قلبی کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے کہ رسول ﷺ جو عالم ترین و متقی ترین خلق تھے تو ان سے بڑھ کر منکسر تر اور کشادہ روی تر نہ تھا تو آپ ﷺ کسی فرد انسان کو سوائے خندہ پیشانی اور کشادگی کے نہ ملتے تھے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ یوں خطاب فرماتے تھے کہ: "وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" (قرآن: ۲۱۵/۲۶) (فروتنی اور مہربانی فرماتے ہوئے اپنے پر سمیٹ لیجئے۔ ان مومنوں کے لئے جو آپ کی پیروی کریں)۔ نیز فرمایا کہ: "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ ج وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ" (قرآن: ۱۵۹/۳) یعنی (اللہ تعالیٰ کی رحمت آپ ﷺ پر اس بناء پر ہوتی ہے کہ آپ سب کے ساتھ خندہ پیشانی اور لطف و

کرم کے ساتھ پیش آئیں تاکہ آپ سے وہ متنفر نہ ہوں)۔

طبقۂ سوم: وہ ہے جو اپنی بڑائی کا اظہار زبان سے کرتے ہیں۔ اور فخر ومباہات کرتے ہیں اور خودستا ہیں اور اپنے احوال اور کرامات کا دعوٰی کرتے ہیں۔ عابد کہتا ہے کہ فلاں کون ہے اور اس کی عبادت کیا ہے؟ میں تو ہمیشہ روزے سے ہوتا ہوں۔ اور تمام رات عبادت میں گذارتا ہوں اور دن میں ہمیشہ قرآن ختم کرتا ہوں اور کوئی ایسا شخص نہیں کہ جس نے مجھے اذیّت دینے کا قصد کیا ہو اور ہلاک نہ ہو گیا ہو۔ فلاں شخص نے مجھے رنج پہنچایا تو اپنے کئے کا بدلہ پایا۔ اس کا بیٹا اور مال سب ہلاک ہو گئے۔ ممکن ہے نیکی کرنے میں مقابلے پر اتر آئے بہ طور یکہ اگر کسی جماعت کو دیکھے کہ نماز عشاء ادا کر رہے ہیں تو وہ طویل تر نماز پڑھے تاکہ انھیں عاجز کر دے۔ اور اگر وہ روزہ رکھیں تو وہ ایک مدت بھوکا رہے۔ اور متکبّر عالم کہتا ہے کہ ''میں کئی قسم کے علوم جانتا ہوں۔ تو میرے مقابلے میں فلاں کا مبلغ علم کیا ہے؟ اور استاد اس کا کون ہے؟ اور اگر مناظرہ کرے تو کوشش کرے گا کہ طرفِ مقابل کو شکست دے اگرچہ باطل ہی کے ذریعے کیوں نہ ہو۔ اور دن رات اسی میں لگا رہتا ہے۔ نادر عبارت اور سجع وغیرہ یاد کر لیتا ہے۔ تاکہ محافل میں اسے دہرائے اور اس کے ذریعے دوسروں سے سبقت لے جائے۔ اور ممکن ہے کہ نادر الفاظ اور احادیث یاد کر لے تاکہ دوسروں پر غلبہ پا سکے۔ اور دوسروں کے معایب بیان کرے۔ اور اس برائی سے کون عالم یا عابد بچا ہوا ہے؟ تھوڑا ہو یا بہت۔ پس جب وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جس شخص کے اندر ذرہ برابر بھی کبر ہے بہشت اس پر حرام ہے''۔ تو اس کے ہاں سوائے دردو غم اور بیم کے سوا کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔ تو وہ تکبر میں نہیں لگتا۔ اور اس نے جان لیا ہوگا کہ فرمانِ خداوندی ہے کہ: ''اگر تو خود کو ہیچ سمجھتا ہے تو ہم تمھارے قدردان ہیں اور اگر خود کو صاحب منزلت سمجھتا ہے تو ہمارے نزدیک بے قدر ہے'' اور جو کوئی دین کے حقایق میں سے یہ بات نہ سمجھ سکا ہو تو ایسے شخص کو عالم کہنے کی بجائے جاہل کہنا اولیٰ تر ہے۔

تیسری قسم: کا کبر نسبی ہوتا ہے، جیسے وہ لوگ جو علوی ہوں یا بزرگ زادے ہوں تو وہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے سب ہمارے خادم یا غلام ہیں۔ اگرچہ وہ پارسا ہوں یا خردمند ہوں۔ یہ کبرائی ان کے باطن میں ہوتی ہے اگرچہ اس کا اظہار نہ بھی کریں۔ لیکن جب وہ غضب میں ہوں تو یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے۔ اور ان کی زبان پر آ جاتی ہے۔ اور معاملات میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''تمھارا کیا منہ ہے کہ تم مجھ سے بات کرو تم اپنی اوقات کو نہیں جانتے؟'' وغیرہ

ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ایک شخص سے میرا جھگڑا ہو گیا تو میں نے اسے 'اے ابن السوداء!' یعنی اے

سیاہ بچے! کہہ دیا تو اس پر آنحضرت نے فرمایا کہ ''اے ابوذر سمجھ سے کام لو کیونکہ بہ تحقیق کسی سفید فام لڑکے کو سیاہ فام لڑکے پر فضیلت نہیں ہوتی۔ سوائے اس کے کہ تقویٰ کے باعث برتر ہو' ابوذر فرماتے ہیں کہ میں لیٹ گیا اور اس شخص سے کہا کہ 'اپنا پاؤں میرے منہ پر رکھو' غور فرمایئے کہ جب بوذر کو معلوم ہوا کہ یہ کبر ہے تو کیسا خود کو ہیچ سمجھا تا کہ اس کبر کو دور کرسکیں۔

دو شخص آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں باہم تفاخر کررہے تھے۔ ایک نے کہا کہ ''میں فلاں فلاں کا بیٹا ہوں تُو کیا ہے'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''دو شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے تفاخر کررہے تھے۔ تو ایک نے کہا کہ ''میں فلاں فلاں کا بیٹا ہوں اور اپنے اجداد کو نو پشتوں تک شمار کیا۔ تو حضرت موسیٰ پر وحی آئی کہ اسے کہو کہ: تمھارے وہ نو پشتوں تک کے اجداد دوزخ میں ہیں۔ اور تو ان میں دسواں ہے''۔ نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''وہ لوگ جو دوزخ میں کوئلہ ہوگئے ہیں ان پر فخر کرنے سے بچو تا کہ جُعَل کیڑے سے بھی زیادہ خوار قرار نہ پاؤ جو انسان کے براز کو سونگھتا اور چکھتا ہے''۔

کبر کا چوتھا سبب: جمال کی بناء پر ہوتا ہے اور یہ زیادہ تر عورتوں میں ہوتا ہے۔ جیسے کہ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا کہ ''فلانی کوتاہ قد ہے'' تو اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''تم نے غیبت کی ہے اور یہ اپنی بلند قامتی پر تکبر کے باعث تھا۔ کیونکہ اگر تُو بھی کوتاہ قد ہوتی تو یہ بات نہ کہتی''۔

کبر کا پانچواں سبب: دولت مندی کے باعث ہوتا ہے۔ تو مال دار کہتا ہے کہ ''میرا مال و نعمت تو اس قدر ہے جب کہ تو قلاش و مفلس ہے۔ میں اگر چاہوں تو تم جیسے بیسیوں غلام خرید سکتا ہوں'' وغیرہ۔ سورۃ الکہف میں جو دو بھائیوں کا قصہ بیان ہوا ہے اسی قسم کا ہے کہ ایک نے کہا کہ ''اَنَا اَکْثَرُ مِنْکَ مَالاً وَّاَعَزُّ نَفَرًا'' (قرآن: ۱۸/۳۴) ''میں تجھ سے خوش حال تر ہوں اور میرے کتنے ہی غلام ہیں''۔

تکبر کا چھٹا سبب: کمزوروں پر قوت کے باعث ہے۔

تکبر کا ساتواں سبب: مریدوں، پیروں، نوکر چاکروں کی کثرت کے باعث ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر وہ شے جسے انسان نعمت سمجھتا ہے اس پر فخر کرتا ہے اگر چہ وہ نعمت نہ ہو۔ جیسے کہ ایک مخنث بھی دوسرے مخنثوں پر مخنثی کے اسباب کی بناء پر فخر کرتا ہے۔

تو یہ ہیں تکبر کے اسباب۔ لیکن جو سبب کہ ظاہر ہے وہ ہے عداوت اور حسد۔ کہ ہر کوئی اسے دشمن جانتا ہے لیکن فخر بھی اسی پر کرتا ہے، ممکن ہے ریا کے باعث ہو کہ لوگوں کے سامنے تکبر کرنے لگے تا کہ لوگ اسے اچھی نظر سے دیکھنے لگیں یا اس لئے کہ اگر مناظرہ کسی کے ساتھ کرے کہ جانتا ہو کہ وہ اس سے فاضل تر ہے تو

باطن میں تو منکسر ہو لیکن بہ ظاہر تکبر کرے تا کہ لوگوں کو معلوم نہ ہو سکے۔ اب جب تم نے اسباب کبر کو جان لیا ہے تو اب کبر کا علاج بھی معلوم کرنا چاہئے۔ کیونکہ علاج ہر بیماری کا اس کے سبب کے ازالے سے ممکن ہوتا ہے:

کبر کا علاج

یاد رہے کہ وہ بیماری کہ جس کا ذرہ بھر راہِ سعادت کو مسدود کرے اور بہشت سے محجوب کرے علاج اس کا فرضِ عین ہے اور کوئی بھی اس بیماری سے پاک نہیں ہوتا۔ علاج اس کا دو نوع کا ہے ایک اجمال کے ساتھ تو دوسرا تفصیل کے ساتھ۔

علاج بہ اجمال: علم و عمل کے معجون سے مرکّب ہے۔ اور علمی علاج یہ ہے کہ انسان حق تعالیٰ کو پہچانے تا کہ جان سکے کہ کبریائی اور عظمت سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو سزاوار نہیں نہ کوئی دوسرا سے حاصل کر سکتا ہے۔ نیز انسان خود کو بھی پہچانے کہ اُس سے زیادہ خوار، زیادہ ذلیل، زیادہ حقیر اور ناکس تر اور کوئی نہیں نہ کوئی اور شے۔ تو یہ گویا مسہل ہو گا جو بیماری کے تخم اور جڑ کو اکھاڑ پھینکے گا۔ اگر کوئی اسے کاملاً جاننا چاہے تو اس کے لئے قرآن کی یہ آیت کافی ہوگی کہ: ''قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَہ، مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَہ، مِنْ نُّطْفَةٍ ط خَلَقَہ، فَقَدَّرَہ، ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَہ، ثُمَّ اَمَاتَہ، فَاَقْبَرَہ، ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَہ'' (قرآن: ۸۰/۱۷-۲۲) یعنی ''مارا جائے انسان جب کافر ہے۔ اس کے خالق نے اسے کس چیز سے تخلیق کیا ہے؟ پشت کے گندے پانی سے اسے پیدا کیا اور اس کا اندازہ کیا۔ پھر اس کے لئے راہ آسان کر دی۔ پھر اسے موت دی اور قبر میں ڈال دیا۔ پس جب چاہے گا اسے اٹھائے گا''۔ اور پہلے یہ جو کہا کہ ''مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَہ'' تو معلوم ہونا چاہئے کہ انسان جان لے کہ پشت کے پانی سے ناچیز تر اور کوئی شے ہے نہ ہو گی۔ اور نیست تھا اس کا نام تھا نہ نشان وہ کتمِ عدم میں تھا۔ اور تخلیق کے لمحے تک ازل اَزال میں تھا۔ جیسے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْءً مَّذْکُوْرًا۔'' بے شبہ انسان پر ایک مدت گذری ہے کہ جب وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا''۔ پس حق تعالیٰ نے خاک کو پیدا کیا اور خود خاک سے پست تر اور کچھ نہیں اور نطفے اور علقے کو جو خون پانی کا ٹکڑا ہے جس سے زیادہ پلید اور کوئی شے نہیں۔ اور اسے عدم سے وجود بخشا۔ جب کہ اصل انسان کی ذلیل مٹی، گندے پانی اور پلید خون سے ترکیب کی۔ جو گوشت کا ایک لوتھڑا تھا کہ جو سنتا، دیکھتا اور بولتا نہ تھا نہ اس میں قوت تھی نہ حرکت بلکہ ایک جماد تھا خود سے بے خبر تھا کسی اور شے نابلد۔ پھر اس کے لئے سمع و بصرہ، ذوق نطق و قدرت ہاتھ پاؤں آنکھیں اور جملہ اعضا پیدا کئے۔ جیسا کہ اب دیکھتا ہے کہ اب خاک، نطفہ اور خون میں ایسی کوئی شے نہ تھی۔ اور انسان کی ذات میں عجائب و بدایع پیدا کر دیئے کہ وہ اپنے خالق کے جلال و جمال

اور عظمت کو پہچان سکے۔ نہ یہ کہ ان قویٰ کے باعث تکبر کرنے لگے۔ کیونکہ یہ اس نے خود تو تخلیق نہیں کئے کہ جس پر نازاں ہو۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ'' (قرآن: ۲۰/۳۰) اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدت کے نشانات وہ ہیں کہ تمھیں مٹی سے پیدا کیا اور اب تم آشکار مرد ہو زمین میں بکھرے ہو اور بکھرے ہوئے اندگی بسر کر رہے ہو) تو آغازِ کار انسان کا یہ ہے تو غور کیجئے کہ یہ جائے کبر ہے یا تقاضا اس کا ہے کہ انسان خود سے شرمندہ ہو؟

اور آغاز وانجام کے درمیانی زمانے میں اللہ تعالیٰ انسان کو اس دنیا میں لے آیا اور ایک مدت یہاں رکھا۔ اور یہ اعضا و جوارح اور قویٰ اسے دیئے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کا کام انسان ہی کے ہاتھ میں دے دیتا اور اسے بے نیاز کر دیتا تو بھی روا ہوتا کہ غلطی کرتا تو گمان کرتا کہ وہ کچھ ہے۔ اللہ نے یہ بھی نہ کیا۔ بلکہ بھوک' پیاس' بیماری' گرمی' سردی' درد و رنج اور مختلف قسم کی ہزاروں بلائیں اس کے سر پر معلّق کر دیں۔ تاکہ کسی وقت بھی ایمن نہ ہو۔ شاید کہ مر جائے یا اندھا ہو جائے یا بہرہ ہو جائے۔ یا دیوانہ ہو جائے یا بیمار ہو جائے یا مجروح ہو جائے۔ یا بھوک پیاس سے مر جائے۔ اور فایدہ اس کا تلخ دواؤں میں رکھا تاکہ اگر فایدہ دے تو اسی وقت جب بیمار ہو جائے۔ اور ضرر انسان کا اچھی چیزوں میں رکھا تاکہ اگر وہ لذت پائے تو اس کا رنج اٹھائے۔ اور اس کے کام میں کوئی چیز اس کے ہاتھ میں نہ دی تاکہ جو کچھ جاننا چاہئے نہ جانے اور جسے بھول جانا چاہے بھول نہ سکے۔ اور جس کو سوچنا نہ چاہے وہی اس کے دل پر غلبہ پالے۔ اور جسے سوچنا چاہے تو دل اس سے گریزاں ہو۔ اور با ایں ہمہ عجایبِ صنع و کمال کے کہ انسان کو پیدا کیا اسے ایسا عاجز بنایا کہ اس سے بدبخت تر اور ناکس تر اور درماندہ تر کوئی شے نہیں۔ اور انجام انسان کا یہ ہے کہ مرجاتا ہے تو سمع باقی رہتا ہے نہ بصر نہ قوت نہ جمال و نہ تن و نہ اعضا بلکہ ایک گندہ مردار ہوتا ہے کہ ہر کوئی اس کی بدبو کی وجہ ناک پکڑتا ہے اور یہ نجاست قبر میں جا کر کیڑوں مکوڑوں اور حشرات الارض کے پیٹ میں چلی جاتی ہے۔ پھر انسان وہی ذلیل و خوار خاک بن جاتا ہے۔ اگر بات یہیں ختم ہو جاتی تو بھی فایدہ ہی تھا کہ چار پایوں کے مساوی قرار پاتا۔ اور اسے یہ دولت بھی نہ ملی۔ بلکہ اسے روزِ قیامت جمع کیا جائے گا۔ اور ہیبت ناک جگہ میں رکھا جائے گا۔ انسان آسمانوں کو شکافتہ اور ستاروں کو گرا ہوا' آفتاب و ماہ کو گرفتہ اور پہاڑوں کو پشم کی طرح دھنکا ہوا اور زمین کو منقلب دیکھے گا۔ اور فرشتگان شکنجہ شکار کے لئے کمند انداز ہوں گے۔ دوزخ غُرّا رہی ہوگی۔ اور ملائکہ ہر ایک کے ہاتھ میں ان کے نامۂ اعمال تھما رہے ہوں گے۔ اور انسانوں نے جو کچھ زندگی بھر کیا ہوگا۔ من جملہ فضائح و رسوائیوں کے انھیں سامنے پائیں گے۔ اور ایک ایک کو پڑھ کر افسوس کریں گے۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ آ اور جواب دے۔ کہ کیوں کہا اور

کیوں کیا اور کیوں کھایا' کیوں بیٹھا اور کیوں اٹھا کیوں دیکھا اور کیوں سوچا؟ پس اگر' پناہ بہ خدا' عہدہ برا نہ ہوسکا تو اسے دوزخ میں ڈال دیں گے۔ تو پھر وہ کہے گا کہ کاشکے میں خنزیر یا کتا یا مٹی ہوتا کہ یہ سب اس عذاب سے بچ گئے ہیں۔ وہ کہ جس کا حال ممکن ہے کہ کتے اور خنزیر سے بدتر ہو اس کے لئے تکبر اور فخر کا کون سا جواز ہے کہ اگر زمین و آسمان کے تمام ذرّے اس کی بدبختی اور معصیت پر نوحہ کریں اور اسکی فضیحتوں اور رسوائیوں کے فرمان کو پڑھیں پھر بھی مقصر ٹھہریں گے۔ کبھی آپ نے دیکھا کہ کوئی بادشاہ ایک کو کسی جرم میں پکڑے اور قید میں ڈال دے اور خطرہ یہ ہو کہ اسے پھانسی کے تختے پر چڑھائیں گے۔

اور وہ قید خانے میں فخر و تکبر میں مشغول ہو؟ دنیا میں جملہ خلق پادشاہِ عالم کے قید خانے میں ہے۔ اور جرموں کے بوجھ سے لدے ہوئے ہیں۔ اور عاقبت کو نہیں پہچانتے۔ تو ایسے میں کبر و فخر کا کون سا موقع ہے؟ جس نے اپنے آپ کو یوں پہچان لیا تو یہ پہچان اس کے لئے بمنزلہ مُسہل کے ہوگی کہ کبر کی جڑ کلیۃً اس کے باطن سے اکھاڑ پھینکے گی۔ بہ طوریکہ کسی چیز کو اپنی ذات سے بڑھ کر ناکس نہ دیکھے۔ بلکہ چاہے کہ کاش میں خاک ہوتا یا پرندہ ہوتا یا جماد ہوتا تا کہ اس خطرے میں نہ پڑتا۔

اور علاج عملی کبر کا یہ ہے انسان متواضع لوگوں کی راہ اختیار کرے ہر حال میں اور ہر کام میں۔ جیسے کہ آنحضرت ﷺ کھانا زمین پر بیٹھ کر کھاتے تھے اور اس دوران تکیہ نہ لیتے تھے۔ اور فرماتے کہ: ''میں تو بندہ (غلام) ہوں۔ لہٰذا مجھے غلاموں ہی کی طرح کھانا کھانا چاہئے''۔

(حضرت) سلمان رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے کہا ''زیبا لباس کیوں نہیں پہنتے؟'' تو آپ نے جواب دیا کہ ''میں بندہ ہوں اگر روزِ آخرت نجات پا گیا تو جامہ زیبا سے محروم نہ رہوں گا۔'' یاد رہے کہ اسرار نماز میں سے ایک تواضع ہے' جو رکوع اور سجود سے حاصل ہوتی ہے کہ انسان چہرے کو کہ انسانی بدن میں سب سے بلند مرتبت ہے خاک پر رکھ دیتا ہے جو سب سے خوار تر ہے۔ عربوں کے کبر کا یہ حال تھا کہ کسی کے سامنے پشت خم نہ کرتے تھے۔ تو یہ سجدہ ان پر بہت گراں تھا۔ پس چاہئے کہ کبر جس بات کا حکم دے انسان اس کے برعکس کرے۔ کیونکہ کبر کا اظہار صورت سے' زبان سے' آنکھ سے' نشست و برخاست سے' لباس سے' اور جملہ حرکات و سکنات سے ہوتا ہے۔ اس لئے چاہئے کہ انسان خود ان سے بہ تکلف دور رہے تا کہ آخر کار طبع بن جائے۔ اور آثار کبر کے بہت زیادہ ہیں:

ایک یہ ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ جب تک دوسرا اس کی رفاقت میں نہ ہو تنہا باہر نہ جائے۔ تو چاہئے کہ انسان اس سے دور رہے۔ حسن بصریؒ کے ہمراہ اگر کوئی جانا چاہتا تو اسے اجازت نہ دیتے تھے۔ اور فرماتے

کہ: ''اس طرح دل اپنی جگہ پر نہیں رہتا'' بودرداؓ فرماتے ہیں کہ ''لوگ جس قدر زیادہ تمھاری ہمراہی میں چلتے ہیں اس قدر تم اللہ تعالیٰ سے دور ہوجاتے ہو''۔ آنخضرت جب کسی گروہ میں جاتے تو کبھی ایسا بھی ہوتا کہ انھیں خود پر سبقت دیتے۔

دوسرے یہ ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے سیدھے اِستادہ ہوں یا آنے پر کھڑے ہوجائیں۔ اور آنخضرت اس بات کو برا جانتے تھے کہ کوئی ان کے سامنے کھڑا ہوجائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی کسی دوزخی کو دیکھنا چاہتا ہے تو اسے کہو کہ اس شخص کو دیکھے جو بیٹھا ہو اور دوسرا اس کے سامنے کھڑا ہو''۔

دیگر یہ کہ تکبر کی بناء پر انسان کسی کی زیارت کو نہ جائے۔ سفیان ثوریؒ مکہ شریف پہنچے تو حضرت ابراہیم بن ادھم رضی اللہ عنہ نے انھیں دعوت دی کہ ''آیئے اور ہمارے لئے بیانِ حدیث کیجئے''۔ حضرت سفیان آگئے۔ تو حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ ''میں چاہتا تھا کہ آپ کی انکساری لوگوں کو دکھاؤں''۔

دیگر یہ کہ متکبر انسان نہیں چاہتا کہ مفلس اس کے قریب بیٹھے۔ حالانکہ آنخضرت کا حال یہ تھا کہ جب کسی درویش سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دیتا آپ اپنا ہاتھ اس سے نہ کھینچتے تھے۔ اسی طرح رکھتے تھے۔ اور جو کوئی بیمار یا زخمی ہوتا تو دوسرے اس سے دوری ڈھونڈتے لیکن آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ شریک ہوکر کھانا کھاتے تھے۔

دیگر یہ کہ متکبر اپنے گھر میں کوئی کام نہیں کرتا۔ جب کہ آنخضرت اپنے گھر میں ہر قسم کا کام سرانجام دیتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاں ایک شخص مہمان تھا کہ چراغ بجھ گیا۔ تو مہمان نے کہا ''میں تیل لاؤں؟'' فرمایا کہ ''نہیں'' کیونکہ مہمان سے خدمت لینا مروت سے دور ہے''۔ تو مہمان نے کہا کہ میں ''غلام کو بیدار کروں؟'' فرمایا کہ ''نہیں'' کہ پہلی ہی نیند ہے کہ سویا ہے''۔ پس آپ خود اٹھے اور ڈبہ لائے اور تیل چراغ میں ڈالا۔ اس پر مہمان بولا: ''یا امیر المومنین آپ خود اٹھے اور یہ کیا؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''ہاں میں ہی اٹھا لیکن جب گیا تھا تو عمر تھا اور آیا ہوں تو بھی عمر ہی ہوں''

دیگر یہ کہ متکبر اشیائے ضرورت خود نہیں اٹھاتا کہ اپنے گھر لے جائے۔ جب کہ آنخضرت نے کوئی چیز پکڑی ہوئی تھی کہ اپنے گھر لے جائیں۔ تو ایک شخص نے چاہا کہ ان سے لے لے تاکہ خود رسول کو زحمت نہ ہو لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہ دی اور فرمایا کہ ''سامان کا مالک ہی اس کے لئے اولیٰ تر ہے'' ابوہریرہ نے اپنی پیٹھ پر ایندھن رکھا ہوا تھا اور بازار میں سے گذر رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ ''گورنر کے لئے راستہ دیجئے''

اس وقت آپ عامل (گورنر) تھے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بازار میں جاتے تو گوشت ان کے بائیں ہاتھ میں ہوتا تھا اور تازیانہ دائیں ہاتھ میں ہوتا تھا۔

دیگر یہ کہ متکبر اس لئے گھر سے باہر نہیں نکلتا کہ عمدہ لباس زیب تن نہیں۔ حالانکہ لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بازار اس حال میں دیکھا کہ تازیانے کے ساتھ اور لباس میں چودہ پیوند لگے ہوئے اور ان پیوندوں میں سے بعض پرانے کپڑے یا چمڑے کے تھے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین مختصر پرانا لباس زیب تن رکھتے تھے۔اس پر لوگوں نے اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا کہ: ''دل اس سے خاشع ہوتا ہے اور دوسرے پیروی کرتے ہیں۔اور مفلسوں کو دلی خوشی ہوتی ہے''۔حضرت طاوسؒ نے فرمایا کہ ''جب میں لباس دھوتا ہوں تو میں چند دن دل کو باز نہیں پاتا جب تک لباس میلا نہیں ہو جاتا۔یعنی ایک قسم کی رعونت اور کبر دل میں محسوس کرتا ہوں''۔عمر بن عبدالعزیز نے خلافت سے پہلے کے زمانے میں ایک لباس ہزار دینار میں خریدا۔اور کہتے 'بہت خوب ہے لیکن اس سے بھی نرم تر چاہئے''۔اور جب خلافت کو پہنچے تو ان کا لباس پانچ درم کا خریدا جاتا تو فرماتے کہ ''اچھا ہے لیکن اس سے سخت تر ہونا چاہئے'' پس لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ ''یہ کیا ہے؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھے نفس عطا فرمایا ہے چکھنے والا اور متمایل۔جب ایک کو چکھ لیتا ہے تو دوسرے کی طرف بڑھتا ہے۔اب تک کہ میں خلافت کو پہنچ گیا ہوں کہ جس سے آگے کوئی مرتبہ نہیں تو نفس نے یہ چکھ لیا ہے۔اب نفس ابدی بادشاہی کی طرف بڑھتا ہے اور اس کا خواہاں ہے''۔

یہ گمان نہ کرنا چاہئے کہ خوش لباسی ہمیشہ تکبر کی ہی بناء پر ہوتی ہے۔کیونکہ کوئی شخص ایسا بھی ہوسکتا ہے جو ہر چیز میں خوبی کو پسند کرتا ہو۔اور دلیل اس کی یہ ہے کہ خلوت میں بھی زیبائی پسند ہوتا ہے۔اور کوئی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ پرانے لباس کے ذریعہ تکبر کرتا ہو کہ خود کو زاہد ظاہر کرنا چاہتا ہو۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''یہ کیا ہے کہ تم نے لباس تو راہبوں کا پہن رکھا ہے اور باطن بھیڑیوں کے سے بنا رکھے ہیں؟ شاہی لباس پہنو لیکن دل حق تعالیٰ کے خوف سے نرم رکھو''۔حضرت عمر ملک شام میں گئے تو اس وقت بھی پھٹے پرانے لباس میں ملبوس تھے۔لوگوں نے کہا کہ ''یہاں دشمنانِ اسلام بہت ہیں۔اس لئے اگر آپ اچھا لباس پہن لیں تو کیا حرج ہے؟'' تو امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دولت سے ہمیں عزت بخشی ہے۔اس لئے ہم کسی بھی اور شے سے عزت کے طالب نہیں''۔

القصہ جو کوئی تواضع وانکساری کو سیکھنا چاہتا ہے تو اسے سیرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ہونا چاہئے۔اور اسی کی اقتداء کرنی چاہئے۔ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانوروں کو چارہ ڈالتے تھے۔اونٹ کا

زانو باندھتے تھے۔ گھر میں جھاڑو دیتے تھے۔ بکریوں کا دودھ دوہتے تھے۔ اپنا جوتا گانٹھتے تھے۔ لباس پر پیوند لگا لیتے تھے۔ اور اپنے غلام کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے۔ جب غلام چکی پیستا تھک جاتا تو اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ بازار سے چیز خرید کر اپنی چادر کے ایک گوشے میں باندھ لیتے اور گھر لے جاتے۔ اور غریب' امیر' چھوٹے بڑے جس سے بھی ملتے سلام میں پہل فرماتے اور ہاتھ ان سے ملاتے اور غلام' آزاد' سیاہ' سفید' درویش اور دولت مند میں امتیاز نہ فرماتے اور دن رات کا لباس وہی ہوتا۔ اور جو پریشان حال خاک آلود آپ کو کھانے پر بلاتا آپ چلے جاتے اور جو کچھ بھی آپ کے سامنے کھانے کو رکھ دیتے اگرچہ تھوڑا ہی ہو آپ اسے حقیر نہ جانتے تھے۔ اور رات کا کھانا صبح کے لئے یا صبح کا رات کے لئے اٹھا نہ رکھتے تھے۔ خوش اخلاق تھے۔ اور کریم الطبع اور خوش معاشرت اور کشادہ لب تھے لیکن خندہ زن ہوتے تھے۔ اور اندوہ گیں ہوتے لیکن ترش رُو نہ تھے۔ بے مذلت متواضع' بے درشتی باہیبت تھے۔ سخی تھے لیکن مسرف نہ تھے۔ سب پر رحیم تھے۔ رقیق القلب تھے۔ ہمیشہ سر جھکائے رکھتے تھے اور کسی سے طمع نہ رکھتے تھے''۔ پس جو کوئی خوش نصیبی چاہتا ہے آپ ﷺ کی اقتداء کرے۔ حق تعالیٰ نے اسی بناء پر آپ ﷺ کی ثنا فرماتے ہوئے فرمایا ہے کہ ''وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم'' (بے شک آپ عظیم اخلاق کے مالک ہیں)۔ کبر کا تفصیلی علاج یہ ہے کہ انسان غور کرے کہ کبر کرتا وہ کس بات پر ہے؟

اگر کوئی نسب کی بنا پر تکبر کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ حق تعالیٰ انسان کے نسب کے بارے میں کیا فرماتے ہیں: ''وَبَدَاَخَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ج ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَہٗ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ'' (قرآن: ٣٢/٧، ٨) یعنی ''آغاز کیا لوگوں (آدم) کی آفرینش کا مٹی سے پھر اس کی اولاد کا منی سے جو سست پانی ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''تیری اصل مٹی سے ہے اور فضل نطفے سے۔ پس نطفہ باپ ہے اور مٹی جد۔ تو ان دونوں سے ذلیل تر اور کون سی شے ہے؟ اگر تو کہے کہ آخر باپ درمیان میں ہے لیکن تیرے باپ کے درمیان نطفہ' علقہ' مضغہ جیسی کتنی ہی رسوائیاں ہیں۔ وہ تمہیں دکھائی نہیں دیتیں؟ اور حیرت اس بات پر ہے کہ تیرا باپ خاکسار ہوتا یا جراحی کرتا تو تُو اس سے شرم سار ہوتا کہ اس نے ہاتھ خاک یا خون سے آلودہ کر رکھے ہیں۔ حالانکہ تو خود خاک و خون ہی سے ہے تو فخر کس بات پر؟ جب تو نے یہ جان لیا تو تیری مثال اس شخص کی ہے جو گمان کرتا ہے کہ وہ علوی ہے جب کہ دو گواہ عال گواہی دیں کہ وہ تو غلام ہے اور فلاں جراح کا بیٹا ہے۔ اور اس پر یہ بات واضح کر دیں کہ ایسے ہی ہے۔ جب اس نے یہ جان لیا تو تکبر نہ کرے اور نہ کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں جو کوئی اپنے نسب پر نازاں ہو تو اس نے دوسرے پر ناز کیا حالانکہ فضل خود اس کی اپنی ذات

میں ہونا چاہیئے نہ کہ دوسرے میں۔ کیونکہ اگر انسان کے پیشاب سے ایک کیڑا جنم لے تو اسے اُس کیڑے پر فضیلت نہیں ہوتی جو گھوڑے کے پیشاب میں سے جنم لے۔

کبر کا سبب جمال کے باعث ہوسکتا ہے۔ تو جب اپنے حسن پر فخر کرتا ہے اسے اپنے باطن میں بھی جھانکنا چاہیئے تا کہ دل کی فضیحتوں کا نظارہ بھی کر سکے۔ اور یہ بھی دیکھے کہ اس کے معدے' مثانے' رگوں اور ناک کان وغیرہ جملہ اعضا میں کیسی رسوائیاں موجود ہیں۔ اور روزانہ اپنے ہاتھ سے نجاست کو دھوتا ہے۔ جس کو دیکھنے یا سونگھنے کی تاب بھی نہیں رکھتا۔ اور ہمیشہ اس غلاظت کو اٹھائے پھرتا ہے۔ پھر دیکھے کہ اس کی پیدائش خونِ حیض اور مادۂ منویہ سے ہے۔ اور پیشاب کی راہ سے گزر کر وجود پذیر ہوتا ہے۔

حضرت طاوس ؒ نے ایک شخص کو دیکھا کہ ناز سے چل رہا ہے۔ تو فرمایا کہ یہ رفتار اس شخص کی نہیں ہوسکتی جو جانتا ہو کہ اس کے پیٹ میں کیا ہے۔ اور اگر انسان ایک دن طہارت نہ کرے تو گھوروں سے زیادہ پلید ہو جاتا ہے۔ کیونکہ گھوروں پر کوئی شے انسانی براز سے پلید تر نہیں ہوتی۔ جس کا ظہور حضرتِ انسان سے ہوتا ہے۔ پھر اس کے چہرے کا جمال اس کی وجہ سے نہیں ہوتا کہ کس پر نازاں ہو۔ اور دوسروں کے بدچہرہ ہونے میں ان کا کوئی قصور نہیں ہوتا کہ انسان انھیں معیوب سمجھے۔ پھر صاحب جمال کو بھی اپنے حسن پر اعتماد نہ کرنا چاہیئے کہ جیسے ایک بیماری تباہ کر دیتی ہے۔ چیچک اسی کو سب سے زیادہ بدشکل بنا دیتی ہے تو ظاہر ہے یہ سب کبر کے لائق نہیں۔

لیکن وہ جو اپنی طاقت پر غرور کرتا ہے تو اسے سوچنا چاہیئے کہ ایک رگ بھی اس کے بدن میں مبتلائے درد ہو جائے تو کوئی اور اس سے بڑھ کر عاجز اور درماندہ نہ ہوگا۔ اگر ایک مکھی اس کے بدن سے کوئی شے لے اڑے تو عاجز آ جائے یا اگر ایک مچھر اس کی ناک میں چلا جائے۔ یا چیونٹی اس کے کان میں چلی جائے تو عاجز ہو جائے گا۔ اور خوف موت تک کا ہو جاتا ہے۔ پاؤں میں اگر کانٹا چبھ جائے تو انسان کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہے۔ اگرچہ کوئی بہت قوی بھی ہو لیکن گدھے' گائے' شیر یا ہاتھی سے تو قوی تر نہیں ہوسکتا' تو اس امر میں کیا فخر کرتا کہ جس میں گاؤ خر سبقت رکھتے ہوں۔

اور اگر کوئی دولت مندی' یا نوکر چاکر یا حکومت اور فرماں روائی پر نازاں ہو۔ تو یہ وہ چیزیں ہیں جو اس کی ذات میں نہیں بلکہ باہر ہیں۔ اس لئے مال اگر چور لے جائے۔ اور ولایت سے برطرف کر دیا جائے تو اب اس کے ہاتھ میں کیا بچا؟ پھر کتنے ہی یہودی اور غیر مسلم ہیں جو مال میں اس سے کہیں زیادہ بہرہ مند ہیں۔ اور اکثر بے عقل اور ناکس ہوتے ہیں جو اس سے عالی تر ولایت کے مالک ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جو کچھ

تیری ذات میں نہیں ہے وہ تیرا نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب مانگے تانگے کے ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی شے تمھاری ملک نہیں ہوتی۔

ان تمام اسباب میں سے کہ جن پر تکبر کیا جاسکتا ہے علم وعبادت کے اظہار میں ہے اور علاج اس کا زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ یہ کمالات میں سے ہے۔ اور علم حق تعالیٰ کے نزدیک عزیز ہے اور عظیم ہے اور علم صفاتِ حق تعالیٰ میں سے ہے۔ پس عالم کے لئے دشوار ہوتا ہے کہ اپنے اوپر نگاہ نہ ڈالے اور یہ دو وجہ سے آسان ہے۔

وجہِ اوّل : یہ کہ انسان جان لے کہ حجت خداوند عالم پر عظیم تر ہے اور خطر اس کا زیادہ تر ہے کیونکہ جاہل کے کام کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن عالم سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ اور عالم کا جرم فاحش تر ہوتا ہے اور وہ حدیثیں جو عالم کے کام کے خطر کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان پر غور زیادہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ قرآن میں حق تعالیٰ نے مقصر عالم کو کہ علم میں مقصر ہوا سے گدھے سے تشبیہ دی ہے۔ کہ ایک خروار کتابوں کا اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے ہے ''كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا '' (قرآن: ۵/۶۲) دُستانِ خر کی مانند ہے جو کتابوں سے لدا ہوا ہو۔ اور کتے سے مماثل کہا ہے: ''كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ '' (قرآن: ۱۷۶/۷) یعنی مثال اس کی ٹھیک کتے کی سی ہے کہ اگر تو اس پر حملہ کرے اور اس پر تاخت کرے تو زبان باہر نکال لیتا ہے۔ یا سے چھوڑ دے تو بھی زبان منہ سے باہر نکال لیتا ہے۔ یعنی جانتا ہو یا نہ جانتا اپنی فطرت کو ترک نہیں کرتا''۔ اور کتے یا گدھے سے خسیس تر اور کیا چیز ہوگی۔ اور اگر آخر میں نجات پا جائے تو بھی تمام جمادات اس سے برتر ہوں گے۔ حیوانات کا تو ذکر ہی کیا۔ یہی وجہ تھی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک فرما رہے تھے کہ ''کاشکے میں پرندہ ہوتا'' تو دوسرے کہہ رہے تھے'' کاشکے میں بکری ہوتا تا کہ لوگ مجھے ذبح کر کے کھالیتے''۔ تو تیسرے صاحب کہہ رہے تھے کہ'' کاشکے میں گھاس کا ایک تنکا ہوتا''۔ پس جو کوئی خاتمے کے خطرات سے آگاہ ہو جائے تو تکبر کا خیال بھی نہ کرے گا۔ حتیٰ کہ جب کسی کو اپنے آپ سے جاہل تر دیکھے گا تو کہے گا کہ ''اسے معلوم نہ تھا اس لئے معصیت میں معذور سمجھا جانا چاہے اور وہ مجھ سے بہتر ہے۔ اور جب کسی ایسے کو دیکھے جو اس سے زیادہ عالم ہو تو کہے کہ وہ وہ بات جانتا ہے جسے میں نہیں جانتا۔ وہ مجھ سے بہتر ہے اگر کسی بوڑھے کو دیکھے تو کہے کہ ''اس نے عبادت مجھ سے زیادہ کی ہے۔ یہ مجھ سے بہتر ہے''۔ یا اگر کسی جوان یا لڑکے بالے کو دیکھے تو کہے اس نے مجھ سے کم گناہ کئے ہیں۔ یہ مجھ سے بہتر ہے۔ بلکہ اگر کسی کافر کو دیکھے تو تکبر نہ کرے اور کہے کہ ممکن ہے کہ یہ مسلمان ہو جائے اور عاقبت اس کی بخیر ہو''۔ کیونکہ بہت سے لوگ جنھوں نے حضرت عمر کو مسلمان ہونے سے پہلے دیکھا تھا اُن پر تکبر کرتے تھے۔ جب کہ علمِ اللہ تعالیٰ میں یہ غلطی تھی۔ پس

جب عظمت نجاتِ آخرت میں ہے۔ اور آخرت کا علم کسی کو نہیں اس لئے چاہئے کہ ہر کوئی اس کے خوف میں مبتلا ہوتا کہ تکبر نہ کرے۔

دوسری حدیث یہ ہے کہ انسان جان لے کہ کبریائی فقط اللہ کو زیبا ہے۔ اور بس۔ اس لئے جو کوئی اللہ کے ساتھ اس امر میں تنازع کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنا دشمن جانتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر ایک سے کہہ رکھا ہے کہ تیری منزلت میرے نزدیک اس وقت ہوگی جب تو اپنے مرتبے کو پہچانے گا۔ پس اگرچہ انسان اپنی عاقبت کو پہچان بھی لے کہ بہ خیر ہوگی۔ پھر بھی باوجود اس معرفت کے تکبر نہ کرے۔ تاکہ کبر اس کے دل سے جاتا رہے۔ انبیائے کرام اسی لئے متواضع تھے کہ جانتے تھے کہ حق تعالیٰ کبر کو دشمن جانتا ہے۔

عابد کو چاہئے کہ عالم پر اگرچہ عالم عابد نہ بھی ہو تکبر نہ کرے۔ اور کہے کہ ہوسکتا ہے اس کا علم اس کا شفیع بن جائے اور اس کے گناہوں کو مٹا ڈالے۔ آنحضرت کا فرمان ہے کہ ''عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہی ہے جیسے میری فضیلت میرے یاروں اور میرے اصحاب میں سے کسی ایک پر ہے''۔ انسان اگر کسی جاہل کو دیکھے جس کا حال ظاہر نہ ہو تو یوں کہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ مجھ سے عابد تر ہو اور خود کو مشہور نہ کیا ہو۔ اگر مفسد (فاسق) کو دیکھے تو یوں کہے کہ: کتنے ہی گناہ ہیں جو میرے دل میں برے خیالات اور وسواس کی صورت میں گذرتے ہیں جو فسقِ ظاہر سے بدتر ہیں۔ کیونکہ میرے باطن میں ایک گناہ ہے کہ جس سے میں غافل ہوں تو ہوسکتا ہے میرے جملہ اعمالِ ظاہر اس کی وجہ سے برباد ہو جائیں۔ اور فاسق میں ایسا نیک خلق ہو جو اس کے تمام گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ توبہ کرے اور انجام اس کا بخیر ہو اور مجھ سے کوئی لغزش سرزد ہو کہ وقتِ مرگ میرا ایمان معرض خطر میں پڑ جائے۔

مختصر یہ کہ جب امکان اس کا ہے کہ خود اس کا نام اللہ تعالیٰ کے نزدیک اشقیاء میں سے ہو تو ایسے میں تکبر کرنا حماقت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلاف' علماء اور مشائخ ہمیشہ متواضع ہوتے تھے۔

عُجب اور اس کی آفات

یاد رہے کہ عُجب مذموم اخلاق میں سے ہے۔ آنحضرت نے تین چیزوں کو مہلک قرار دیا تھا: یعنی بخل و ہوا و عُجب۔ فرمایا تھا کہ ''اگر تم معصیت کا ارتکاب نہ کرو تو میں اس چیز سے جو معصیت سے بھی بری ہے ڈرتا ہوں اور وہ ہے عُجب۔ لوگوں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ 'مرد کب بدکردار ہوتا ہے؟'' تو آپؓ نے فرمایا کہ جب وہ گمان کرتا ہے کہ نیک کردار ہے۔ تو یہ پندار عُجب ہے''۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ہلاکت دو چیزوں میں سے ہے: ایک عُجب تو دوسری نومیدی''۔ یہ اس سبب سے کہا گیا ہے کہ نومید انسان طلب

میں سست ہوتا ہے اور مُعجب بھی ایسا ہی ہے کیونکہ گمان کرتا ہے کہ طلب سے مستغنی ہے۔ مطرف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "میں تمام رات سوتا ہوں، اور صبح کو شکستہ اور خائف ہوتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ بہ نسبت اس کے کہ میں شب بھر نماز ادا کروں اور صبح معجب ہوں۔ پسندیدہ تر ہے۔ بشر بن منصورؒ ایک دن نماز ادا کر رہے تھے تو ایک شخص آپ کی عبادت کو بہ نظر تعجب دیکھ رہا تھا۔ تو جب آپ نے سلام پھیرا تو فرمایا کہ "اے جوانمرد تعجب نہ کرنا کہ ابلیس نے دراز مدت تک عبادت کی تھی اور انجام کار کیا ہوا تم بھی جانتے ہو" یاد رہے کہ عُجب سے کتنی ہی آفات جنم لیتی ہیں۔ ان میں سے ایک کبر ہے کہ انسان اپنے تئیں دوسروں سے بہتر جانتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے گناہوں کو یاد نہیں کرتا۔ اور جو یاد بھی آ جائے تو اس کے تدارک میں مشغول نہیں ہوتا۔ اور گمان کرتا ہے کہ میں تو بخشا بخشایا ہوں۔ اور عبادت میں شکر گذار نہیں ہوتا اور گمان کرتا ہے کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں اور آفت عبادت کو نہیں جانتا اور طلب نہیں کرتا کیونکہ گمان یہ کرتا ہے کہ وہ خود بے آفت ہے اور خوفِ خدا اس کے دل سے جاتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے غافل ہوتا ہے۔ اور وہ عبادت جو حق تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت کی صورت میں اسے عطا ہوتی ہے اس کی بناء پر خود کو اللہ کے قرب کا مستحق جانتا ہے۔ تو خود ستائی اور خود نمائی کرتا ہے۔ اور چوں کہ اپنے علم پر نازاں ہوتا ہے تو کسی سے نہ جاننے پر بھی پوچھنا نہیں چاہتا۔ اور اگر اس کی رائے یا مراد کے خلاف کچھ کہا جائے تو نہیں سنتا۔ اس طرح ناقص ہی رہتا ہے اور کسی کی نصیحت پر کان نہیں دھرتا۔

عُجب اور اِدلال کی حقیقت: معلوم رہے کہ جسے حق تعالیٰ علم اور توفیق عبادت وغیرہ کی نعمتوں سے نوازے۔ اور وہ زوالِ نعمت سے ڈرتا ہو کہ اس سے واپس نہ لے لی جائیں۔ تو ایسا شخص مُعجب نہ ہوگا۔ اور اگر ڈرتا نہ ہو اور اس حالت پر شاداں ہو اس بناء پر کہ نعمت اور عطا حق تعالیٰ کی طرف سے نہ اس بناء پر کہ یہ خود اس کی صفت ہے۔ تو وہ بھی معجب نہ سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر خوش اس بناء پر ہو کہ یہ اس کی ذاتی صفت ہے اور اس حقیقت سے غافل ہو کہ یہ نعمتِ حق تعالیٰ ہے اور ہر اس سے خالی ہو تو اس کی اس صفت پر خوشی عُجب قرار پائے گا۔ اور اس کے باوجود خود کو اللہ پر حق دار سمجھتا ہو اور اپنی اس عبادت کو پسندیدہ سمجھتا ہو تو اسے اِدلال[1] کہتے ہیں۔ کہ خود کو ایک وسیلہ گردانتا ہے۔ اور کسی کو کوئی چیز دیتا ہے تو اس پر اگر اس کی تعظیم کی جائے تو دل میں مُعجب ہوگا۔ اور اگر اپنی عطا سے کسی خدمت یا بدلے کی توقع رکھے تو یہ دالہ (وسیلۂ ناز) ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: "جو شخص اپنی نماز پر نازاں ہو اس کی نماز اس کے سر سے آگے نہیں جاتی"۔ نیز فرمایا کہ "اگر تو ہنسے اور اپنی اس تقصیر کا اقرار کرلے تو اس سے بہتر یہ ہے کہ تو روئے اور اس عمل کا علم حاصل کرے۔

---

(۱) اِدلال: اپنے عمل پر فخر ناز کرنا

عجب کا علاج: یادرہے کہ ایک بیماری ہے سبب جس کا جہل محض ہے۔ پس علاج اس کا معرفتِ محض ہے۔ پس وہ شخص جس کے شب وروز علم اور عبادت میں گذرتے ہیں تو ہم اسے کہتے ہیں کہ تمھارا عُجب اسی بناء پر ہے کہ علم وعبادت کا گذر تجھ پر ہوتا ہے اور تو ان کی راہ گذر ہے۔ یا اس لئے کہ یہ تجھ سے وجود پذیر ہوتے ہیں اور تمھاری قوت سے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر اس لئے ہے کہ یہ تجھ میں گذرتے ہیں تو تُو ان کی راہ گذر ہے تو راہ گذر کو تو فخر کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ کیونکہ راہ گذر تو راہیوں پر مسخر ہوتی ہے۔ اور کوئی کام اس کے ہاتھ سے انجام نہیں پاتا۔

اور اگر تم کہو کہ میں کرتا ہوں اور یہ عمل میری قوت وقدرت کا نتیجہ ہے تو کیا نہیں جانتے کہ یہ قدرت وقوت وارادت اور اعضا کہ جن سے یہ عمل صادر ہوتے ہیں کہاں سے لائے ہو۔ تو اگر جواب میں کہو کہ یہ عمل میری خواہش پر ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ اس خواہش اور داعیے کو کس نے پیدا کیا اور تم پر مسلّط کر دیا کہ قہر کی ایک زنجیر تمھاری گردن میں ڈال دی اور تمھیں کام پر لگا دیا کیونکہ جس کسی پر داعیہ مسلط کیا جاتا ہے تو اس پر اس کا موکل بھیجا جاتا ہے جس سے اس کے برخلاف نہیں کرسکتا۔ اور داعیہ اُس کا نہیں ہوتا کہ بہ قہر اسے کام میں لگائے رکھے۔ پس یہ سب نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس لئے تمھارا عُجب حماقت ہے۔ کیونکہ تیری تو کوئی چیز نہیں بلکہ چاہئے کہ تو اس بات پر متحیر ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل کی وجہ سے ہے کہ بہت سی خلق کو غافل کر دیا اور ان کا داعیہ برے کاموں میں صرف ہوا۔ اور تجھے اپنی عنایت سے نجات کی چاہت عطا فرمائی۔ اور تجھ پر داعیے اپنے حضور لے گئے۔ اگر کوئی بادشاہ اپنے غلاموں پر نظر دوڑائے اور ان تمام میں سے ایک کو خِلعت عطا کرے بغیر کسی سابقہ خدمت کے کہ اس نے انجام دی ہو تو چاہئے کہ اس غلام کی حیرت بادشاہ کے فضل کی بناء پر ہو کہ بے استحقاق اس کے لئے مخصوص قرار پائی۔ پس اگر وہ کہے کہ بادشاہ صاحب نظر ہے اور جب تک اس نے مجھ میں استحقاق کی صفت مشاہدہ نہیں کی تو مجھے وہ خلعت خاص عطا نہیں کی۔ تو ہم پوچھیں گے کہ وہ صفت استحقاق تو کہاں سے لایا؟ اگر وہ صفت بھی بادشاہ ہی کی عطا ہے تو تمھارے لئے تو فخر کا کوئی موقع نہیں۔ اسی طرح ہے کہ بادشاہ تجھے گھوڑا عطا کرے تو نازاں نہ ہو اور اگر تجھے غلام عطا کرے تو ناز کرنے لگے اور کہنے لگے کہ مجھے بادشاہ نے غلام اس لئے عطا فرمایا کہ میرے پاس گھوڑا تھا جو دوسروں کے پاس نہ تھا۔ جب گھوڑا بھی بادشاہ ہی کی عطا ہو تو ناز یعنی چہ؟ بلکہ اسی طرح ہو گا کہ اگر بادشاہ غلام کو دونوں اکٹھے عطا کر دے۔ ایسے ہی اگر تو کہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے توفیق عبادت اس لئے مرحمت فرمائی کہ میں اللہ سے محبت کرتا ہوں۔ تو اس سے کہا جائے گا کہ یہ محبت تمھارے دل میں کس نے ڈالی؟ اور اگر کہے کہ میں اللہ سے محبت اس لئے کرتا ہوں کہ میں نے اس کی

معرفت حاصل کی۔ اور اس کے جمال کو دیافت کیا۔ تو اس سے کہا جائے گا کہ یہ معرفت اور یہ دیدار تجھے کس نے دیا؟ پس چونکہ سب عطائے خداوندی ہے پس جو دو فضل عطا کرنے والے کو ناز کا حق ہے کہ جس نے تجھے پیدا کیا۔ اور یہ صفات تجھے عطا کیں اور قدرت وارادت وداعیہ پیدا کئے۔ اور تو ان سب میں ہیچ ہے۔ اور ان میں سے کوئی شے تیری نہیں۔ سوائے اس کے کہ تُو حق تعالیٰ کی قدرت کی ایک راہ گذر ہے اور بس۔

فصل: سوال وجواب:

اگر کوئی کہے کہ جب سب کچھ وہی کرتا ہے اور میں نہیں کرتا تو میں ثواب کی امید کہاں سے رکھوں۔ اس لئے بے شبہ ثواب ہمارے عمل پر ہے کہ ہمارے اختیار میں ہے۔

جواب: حقیقی یہ ہے کہ تو قدرت کی راہ گذر ہے۔ اور بس۔ اور تو کوئی شے نہیں''۔ ''وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَ اللّٰہَ رَمٰی'' (قرآن: ۱۷/۸:۱۷) (جب پھینکا تو تُو نے نہیں پھینکا لیکن اللہ نے پھینکا) جو کچھ تو نے کیا تو نے نہیں کیا بلکہ اُس نے کیا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے علم وقدرت وارادت کے بعد حرکت تخلیق کی تو تجھے گمان یہ ہوا کہ تم نے کیا۔ اور یہ رمز بہت دقیق ہے۔ تو اسے سمجھنے سے قاصر ہے۔ ممکن ہے اس کتاب میں اصل توحید اور توکل کے باب میں اس کی طرف اشارہ کیا جائے۔ لیکن سر دست اپنے فہم کے مطابق مسامحت سے کام لے اور یوں فرض کر کہ تیرا عمل تیری قدرت کی بناء پر ہے لیکن تیرا عمل قدرت وارادت وعلم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ پس تیرے عمل کی کلید یہی تین امر ہیں۔ اور یہ تینوں عطائے خداوندی ہیں۔ پس اگر ایک خزانہ ہو مضبوط اور دروازہ اس کا مقفل ہو اور اس میں نعمتیں بہت ہوں اور تو اس لئے عاجز ہو کہ تیری پاس کلید نہ ہو۔ تو خزانہ دار کلید تجھے دے اور تو دروازہ کھول لے اور ہاتھ بڑھا کر وہ نعمت اٹھالے تو اس نعمت کا حوالہ اس شخص کو دے گا کہ جس نے کلید تجھے دی یا اپنے ہاتھ کو یہ اعزاز دے گا کہ اس نے کلید تھامی؟ جان لے کہ جب خازن نے کلید دے دی تو اسے لینے میں ہاتھ کا اعزاز نہ ہوگا۔ اعزاز اس کا ہوگا جس نے کلید تمھیں دی۔ اور نعمت اس کی طرف سے شمار ہوگی۔ پس تمھاری قدرت کے جملہ اسباب کہ کلیدِ اعمال ہیں سب کے سب عطائے خداوندی ہیں۔ پس تعجب اس کے فضل پر کہ جس نے طاعت کے خزانے کی کلید تجھے دی اور تمام فاسقوں پر روانہ رکھی اور معصیت کی کلید اوروں کو دی اور طاعت کے خزانے کا دروازہ ان پر بند کر دیا۔ بغیر اس کے کہ ان کی طرف سے کوئی خیانت ہوئی ہو۔ بلکہ اپنے عدل کی بناء پر بغیر اس کے کہ تجھ سے کوئی خدمت انجام پذیر ہوئی ہو' بلکہ محض اپنے فضل کی بناء پر تجھے عطایا سے بہرہ مند کیا۔

پس جس نے حقیقتاً توحید کا عرفان کیا اسے کبھی تکبر وعُجب نہ ہوگا۔ اور عُجب یہ ہے کہ عاقل درویش اس

بات پر متعجب ہو کہ اللہ تعالیٰ مال جاہلوں کو دیتا ہے۔ اور یوں کہنے لگے گا کہ: ''عاقل ہوں اور اللہ تعالیٰ نے محروم کر دیا اور یہ ذرہ سی بات نہ سمجھ سکا کہ عقل نعمتوں میں سب سے بہتر نعمت ہے جو اسے عطا ہوئی ہے اور عقل و مال دونوں ایک کو دے دیتا اور دوسرے کو ان دونوں سے محروم رکھتا تو یہ عدل سے بعید تھا۔ اور ممکن ہے کہ وہ عاقل شکایت کرے۔ اگر اس سے کہا جائے کہ اپنی عقل کو اس کے مال سے بدل لو تو کبھی نہ بدلے گا۔ اور خوب رُو مفلس عورت کو زیور اور تجمل سے آراستہ دیکھے اور کہے کہ یہ کیسی حکمت ہے کہ یہ نعمت ایک بدرُو کو دی جائے کہ اس پر سجتی ہی نہیں۔ اور اس قدر نہیں جانتی کہ جو کچھ اسے دیا گیا ہے دوسری سے کہیں بہتر ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ دونوں اسی کو دے دیتا تو یہ عدل سے بعید ہوتا۔ اور یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی بادشاہ کسی کو گھوڑا عطا فرمائے تو کسی کو خادم، تو گھوڑے والا حیرت کا اظہار کرے کہ گھوڑا تو میرے پاس ہے بادشاہ غلام دوسرے کو کیوں دیتا ہے۔ اور یہ سوال جہالت پر مبنی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت داؤد نے ایک دفعہ کہا کہ ''بارِ خدایا کوئی ایسی رات نہیں آتی کہ آلِ داؤد میں سے کوئی ایک طلوع روز تک عبادت میں نہ رہتا ہو۔ اور کوئی ایسا دن نہیں آتا کہ کوئی ایک روزہ نہ رکھے''۔ اس پر ان پر وحی آئی کہ ''ان کو یہ توفیق کس نے دی اگر توفیق میری نہ تھی؟ اب میں تجھے ایک لحظے کے لئے بہ سلب توفیق تجھی پر چھوڑ دیتا ہوں''۔ تو جب اللہ تعالیٰ نے انھیں ان پر چھوڑ دیا تو ان سے وہ خطا سرزد ہوئی کہ ایک عمر اس کی حسرت اور ندامت سے دوچار رہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے عرض کیا: ''بارِ خدایا تو نے یہ سب بلا مجھ پر ڈال دی جب کہ میں نے ذرہ بھر اپنی خواہش کو آپ کی مراد پر ترجیح نہیں دی''۔ تو اتنے دن میں ایک گھٹا ناگاہ آئی اور اس میں سے یہ منادی یہ صدائے بلند منادی سنائی دی کہ: ''تمھارا وہ صبر کہاں سے آیا تھا؟'' حضرت ایوب علیہ السلام سمجھ گئے اور راکھ کی ایک مٹھی سر پر ڈال لی اور کہا کہ: ''بارِ خدایا صبر آپ ہی کے فضل سے ہے۔ لہٰذا میں توبہ کرتا ہوں''۔: ''فرمان حق تعالیٰ ہے کہ: ''وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُه مَازَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّىْ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ'' (قرآن: ۲۱/۲۴) ''اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور بخشایش نہ ہوتی تم میں سے کوئی بھی پاک نہ ہوتا۔ لیکن خداوند پاک کرتا ہے اسی کو جو اس کا خواہاں ہو اور خداوند سننے والا اور جاننے والا ہے''۔ اگر ہمارا فضل نہ ہوتا تو کسی کو بھی اپنی پاکیزگی کی راہ نہ ملتی کہ کسی اور کام میں لگ سکتا''۔ اسی بناء پر آنحضرت نے فرمایا: ''کوئی شخص اپنے عمل کے بل پر آخرت میں نجات نہ پائے گا'' تو صحابہ نے عرض کیا کہ ''کیا آپ بھی نہیں؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''ہاں میں بھی نہیں۔ اِلّا برحمتِ حق تعالیٰ'' یہی وجہ تھی کہ

بزرگ صحابہ کہا کرتے تھے کہ ''کاشکے ہم مٹی ہوتے یا سرے سے وجود ہی میں نہ آتے''۔ پس جو کوئی اس حقیقت کو جان لے۔ عُجب میں مشغول نہ ہوگا۔

فصل: قدرت جمال یا نسب پر غرور حماقتِ محض ہے:

یاد رہے کہ بعضوں کی جہالت اس حد تک ہوتی ہے کہ ایسی چیز پر متکبر ہوتے ہیں کہ وہ چیز ان کی نہیں ہوتی اور ان کی قدرت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا جیسے کہ قوت، جمال اور نسب ہیں اور یہ جہل انتہائی درجے کا ہے۔ اگر عالم دعابد یہ کہے کہ: ''علم میں نے حاصل کیا اور عبادت میں نے کی تو بھی اس کے خیال کا ایک جواز ہے۔ لیکن یہ خود حماقتِ محض ہے۔

اور ایسا شخص بھی ہوتا ہے جو سلاطین اور ظالموں کے نسب پر فخر کرتا ہے۔ اگر وہ ان کو دوزخ میں دیکھ سکتا کہ کس صفت سے متصف ہیں اور یہ کہ قیامت میں وہ کس قسم کی ذلت کا سامنا کریں گے تو ان سے ننگ رکھتا کوئی نسب حضرت رسول ﷺ کے نسب سے زیادہ باشرف تر نہیں لیکن عُجب اس بناء پر باطل ہے۔ اور بعضوں کا عُجب اس نوبت کو پہنچتا ہے کہ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ کوئی گناہ ہمیں زیان نہ پہنچائے گا۔ اس لئے جو جی میں آتا ہے کرتے پھرتے ہیں۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ جب عمل اپنے باپ دادا کے برعکس کرتے ہیں تو انھوں نے اپنے آپ کو آباؤ اجداد سے منقطع کرلیا ہوتا ہے۔ جب کہ ان کے آباؤ اجداد تو اضع اور تقوٰی کو بنائے شرف جانتے تھے نہ کہ نسب کو۔ اور ان کے نسب میں ایسے بھی لوگ تھے جو دوزخ کے کتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے نسب پر فخر کرنے کو منع فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ: ''سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے تھے''۔ اور جب بلال نماز کی اذان دیتے تو بزرگانِ قریش بہ اعتراض کہتے کہ: ''اس حبشی غلام کا کیا حق ہے کہ یہ کام اس پر مسلّم ہو؟'' تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی ''اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ'' (قرآن: ۱۳/۴۹) (تم میں سے اللہ کے نزدیک گرامی ترین وہ ہے تو تم میں سے پرہیزگار ترین ہے) اور جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ''وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ'' (قرآن: ۲۱۴/۲۶) (اپنے خاندان کے نزدیک تروں کو خوف خدا سے ڈرایئے) تو آپ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا کہ: ''اے محمد ﷺ کی بیٹی اپنی فکر آپ کر کیونکہ کل روزِ قیامت میرا باپ ہونا تمھارے کسی کام نہ آئے گا'' نیز اپنی عمّہ صفیہؓ سے کہا کہ: ''اے محمد کی عمّہ اپنے اعمال میں لگ جایئے کیونکہ میں تمھارا دستگیر نہ ہوسکوں گا''۔ اگر اللہ کے رسول کے عزیز واقارب کے لئے آپ ﷺ کی قرابت کافی ہوتی تو چاہیئے تھا کہ آپ کی بیٹی فاطمہ رنج تقوٰی سے چھوٹ جاتی تو اچھی زندگی گذارتی اور دونوں دنیائیں اسی کی ملکیت ہوتیں۔ مختصر یہ کہ قرابت داری کی بناء پر آنحضرت کی شفاعت کی اُمید زیادہ ہے۔ لیکن بعض اوقات گناہ

ایسا ہوتا ہے کہ شفاعت کو قبول نہیں کرتا۔ اور نہ گناہ شفاعت پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: ''وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی'' (شفاعت نہیں کرتے اور بخشش نہیں چاہتے سوائے اُس شخص کے لئے جسے اللہ تعالیٰ پسند فرمائیں) شفاعت کی امید پر اپنی حدود سے تجاوز کرنا ایسے ہی ہے جیسے کہ بیمار پرہیز نہ کرے اور ہر شے اناپ شناپ اس لئے کھاتا جائے کہ میرا باپ ماہر طبیب ہے۔ تو کہا جائے گا کہ بیماری ایسی بھی ہوتی ہے کہ اس درجے کو پہنچ جاتی ہے کہ علاج پذیر نہیں ہوتی۔ اور طبیب کی مہارت کوئی فایدہ نہیں دیتی۔ اس لئے مزاج ایسا ہونا چاہئے کہ اس کی مدد طبیب کر سکے۔ اور ہر وہ شخص جو بادشاہوں کے نزدیک ایک مرتبے کا مالک ہوتا ہے ہر جرم میں کسی کی سفارش نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ جسے بادشاہ اپنا دشمن گردانتا ہے اس کے لئے سفارش کہاں مانتا ہے اور کوئی گناہ ایسا نہیں کہ بیزاری کا باعث نہ بنتا ہو۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے ناراضگی معصیتوں میں مخفی کر رکھی ہے۔ اس لئے جسے تم معمولی سمجھتے ہو وہی اللہ تعالیٰ کے غضب کا باعث بن جاتا ہے۔ جیسے کہ فرمان خداوندی ہے کہ ''وَتَحْسَبُوْنَہٗ هَیِّنًا وَّهُوَ عِنْدَاللّٰهِ عَظِیْمٌ'' (قرآن: ۱۵/۲۴) (تم اسے آسان قرار دیتے ہو جب کہ وہ اللہ کے نزدیک عظیم ہے) اور سب مسلمان شفاعت کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ اور امید شفاعت ہی سے خطرہ دور نہیں ہوتا اور ہراس کے ساتھ عُجب کا کوئی میل نہیں۔

•••

اصل دہم: غفلت، ضلالت اور غرور کے بیان میں

یاد رہے کہ جو کوئی سعادتِ آخرت سے محروم رہا وہ اس لئے محروم رہا کہ راہِ حق پر نہ چلا۔ اور جو کوئی یہ راہ نہیں چلا یا تو اسے اس کا علم نہ تھا یا چل نہ سکا۔ اور جو کوئی چل نہیں سکا تو اس لئے کہ شہوت کا اسیر تھا۔ اور اپنی شہوت پر قابو نہ پا سکا۔ اور جسے اس کا علم نہ تھا۔ اس لئے تھا کہ غافل تھا اور بے خبر تھا یا گمراہ ہو گیا تھا یا ایک قسم کے غرور کی وجہ سے راہ سے رہ گیا۔

لیکن وہ شقاوت جو ناتوانی سے پیدا ہوتی ہے ہم بیان کر چکے ہیں۔ تو مثال اس قوم کی ایسی ہی ہے کہ کوئی راہ چلنا چاہتا ہے لیکن راہ میں گھاٹیاں بہت ہیں اور دشوار گذار بھی اور وہ کمزور ہے۔ گھاٹی کو عبور نہیں کر سکتا۔ راستے کی گھاٹیاں شہوتِ جاہ، شہوتِ مال، شہوتِ شکم و فرج جیسی ہیں۔ اور یہ شہوات جن کا ذکر ہم نے کیا ہے تو کوئی ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک گھاٹی کو عبور کرے لیکن دوسری سے عاجز رہ جائے۔ اور کوئی ایسا ہوتا ہے کہ دو گھاٹیاں عبور کرے تیسری میں رہ جائے۔ اسی طرح جب تک یہ تمام گھاٹیاں پس پشت نہ ڈال دے انسان

مقصد کو نہیں پہنچتا۔

وہ شقاوت جو نادانی کی بناء پر ہوتی ہے تین قسم کی ہے

ایک **غفلت**: ہے اور بے خبری جسے نادانی کہا جاتا ہے تو ایسے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو سرِ راہ سو جائے اور قافلہ جاتا رہے۔ تو جب کوئی اسے بیدار نہ کرے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔

دوسری قسم **ضلالت** ہے: جسے گمراہی کہتے ہیں۔ مثال اس کی ایسے شخص کی سی ہے کہ منزلِ مقصود تو مشرق کی جانب ہے لیکن اس نے رُخ مغرب کی جانب کر رکھا ہے۔ اور چلتا جا رہا ہو۔ ظاہر ہے جتنا زیادہ چلے گا مقصد سے اتنا ہی دور تر ہوتا جائے گا۔ اسے ضلالتِ بعید کہتے ہیں۔ لیکن وہ جو دائیں بائیں ہو جائے وہ بھی ضلالت ہے لیکن بعید نہیں۔

اور تیسری قسم **غرور** ہے: کہ جسے فریفتگی اور پندار کہا جاتا ہے تو مثال اس کی اس شخص کی سی ہے جو حج پر جانا چاہتا ہے اور اسے صحرا میں کھرے سونے کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے اپنا اثاثہ بیچ کر سونا حاصل کرتا ہے۔ لیکن سونا جو حاصل کرتا ہے وہ کھوٹا ہوتا ہے یا مغشوش لیکن وہ نہیں جانتا۔ اور گمان یہ کرتا ہے کہ اس نے زادِ راہ حاصل کر لیا ہے۔ اس لئے اپنی مراد کو پہنچے گا اور جب وہ صحرا میں پہنچ کر سونا پیش کرتا ہے تو کوئی بھی اسے قبولیت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ تو سوائے حسرت و تشویر کے اس کے ہاتھ میں کچھ باقی نہیں ہوتا۔ ایسوں کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ''قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ؕ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا'' (قرآن: ۱۸/ ۱۰۳، ۱۰۴) (اے پیغمبر کہئے میں تمھیں خبر دیتا ہوں کہ تم میں اعمال میں زیاں کارترین کون سے نیک عمل کر رہے ہیں) فرمایا آخرت میں سب سے زیادہ خسارے میں وہ ہوں گے کہ انھوں نے دنیا میں رنج اٹھائے ہوں گے اور گمان یہ کرتے تھے کہ انھوں نے کوئی بڑا کام کیا ہے لیکن جب دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ سب غلط کیا تھا۔ تو تقصیر ایسے شخص کی یہ ہے کہ اسے چاہئے تھا کہ پہلے صرافی سیکھتا پھر سونا لیتا۔ تا کہ کھوٹے کھرے میں امتیاز کر سکتا۔ اگر خود صرافی نہ سیکھتا تو کم از کم وہ سونا کسی صرّاف کو دکھا لیتا اور پھر لیتا۔ چونکہ اس نے یہ بھی نہ کیا کسوٹی ہی کہیں سے حاصل کر لیتا۔ اور صیرفی مانند پیر استاد کے ہے۔ لہٰذا چاہئے کہ پیروں کے درجے پر ہو۔ یا کسی پیر کی صحبت میں کامل ہوا ہو کہ اپنا معاملہ پیر کے حضور پیش کرتا رہے۔ تو جب ان دونوں سے عاجز ٹھہرے تو چاہئے کہ کسوٹی حاصل کرے۔ کسوٹی اس کی خواہش ہے جس کام کی طرف اس کی خواہش اور طبیعت میل کرے تو جان لے کہ وہ کام باطل اور بے جا ہے۔ اس میں غلطی کا امکان بھی ہے۔ لیکن غالب یہ ہوتا ہے کہ درست ہو۔ پس چونکہ جہالت شقاوت میں پہلی اصل ہے تو یہ

تفصیلاً تین قسم کی ہے۔اوران تینوں کی پہچان اوران کا علاج فرض ہے کہ پہلی اصل راہ کی پہچان ہے۔ پھرراہ چلنے کا اسلوب تو جب یہ دونوں حاصل ہو گئے تو کچھ باقی نہ رہے گا۔یہی وجہ تھی کہ صدیق رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں اسی پر اکتفا کرتے تھے۔اورفرماتے کہ: ''اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وارزُقْنا اِتِّبَاعَہ' وَاَرِنَا الْبَاطِلَ' بَاطلاً وَارزُقْنا اِجْتِنَابَہ''،یعنی ''اے اللہ ہمیں حق دکھا جیسا کہ وہ فی الاصل ہے اور قدرت دے کہ ہم اس کی پیروی کریں اور باطل ہمیں دکھا کہ جیسے کہ وہ فی الاصل ہے تا کہ ہم اسے پرہیز کریں''۔پس ہم نے اس اصول میں کہ گذرا ناتوانی کا علاج بیان کر دیا۔اب نادانی کا علاج بیان کرتے ہیں۔

غفلت ونادانی کا علاج: یادرہے کہ اکثر لوگ غفلت کے سبب محجوب ہوتے ہیں۔بلاشبہ ننھانوے فی صد اس قسم کے ہوتے ہیں۔اس غفلت کے معنی یہ ہیں کہ وہ آخرت کے کام کے خطرات سے آگاہ نہیں ہوتے۔کیونکہ اگرآگاہ ہوتے تو تقصیر نہ کرتے۔انسان کو اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ جب خطرے کو دیکھتا ہے تو دور بھاگتا ہے۔اگرچہ کتنی ہی تکلیف اٹھانی پڑے۔لیکن یہ خطر نورنبوت سے دیکھا جاسکتا ہے یانبوت کی منادی سے جو دوسروں تک پہنچ جائے یا علماء کی منادی سے کہ انبیاء کے وارث ہیں کیونکہ جو کوئی راستے میں تھک کر سو گیا ہو تو اس کا کوئی علاج اس کے سوا نہیں کہ اسے بیدار کر دیا جائے۔یعنی کوئی مشفق وہاں پہنچ جائے اور اسے بیدار کر دے۔اور یہ مشفق بیدار کرنے والا پیغمبر ہے۔یا اس کے نائب جو علمائے دین ہیں۔اور تمام انبیاء اس لئے بھیجے گئے تھے جیسے کہ فرمان خداوندی ہے کہ''لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اُنْذِرَ اٰبَآؤُھُمْ فَھُمْ غٰفِلُوْنَ''(قرآن: ۶/۳۶)(تاکہ تو اس گروہ کو آگاہ کرے کہ جن کے والدین نے انھیں آگاہ نہیں کیا۔اور وہ بےخبر ہیں) نیز فرمایا کہ:''لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰھُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِکَ لَعَلَّھُمْ یَھْتَدُوْنَ''(قرآن: ۳/۳۲)(تاکہ تو ایک گروہ کو آگاہ کرے جن کے پاس تم سے پہلے کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا۔تاکہ شاید راہ راست پالیں)۔کہتا ہے کہ تجھے کہ تو محمد ہے ہم نے اس لئے بھیجا ہے کہ تو خلق کو خواب غفلت سے بیدار کرے اور سب سے کہے کہ: ''اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ''(قرآن: ۲/۱۰۳)(بےشک انسان خسارے میں ہے)۔سب کو دوزخ کے کنارے پر پیدا کیا گیا ہے۔''فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ۙ وَآثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ۙ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی ؕ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی ۙ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی''(قرآن: ۷۹/۳۷-۴۱)(وہ جو نافرمان ہو گیا اس نے اس دنیا کی زندگی انتخاب کر لی۔اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔لیکن وہ جو اپنے خدا کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اپنے تن کو ہوا وہوس سے بچالیا بہشت اس کا ٹھکانہ ہے) ہر وہ شخص جسے دنیا میں لایا گیا اور اپنی ہوا وہوس کی پیروی میں لگ گیا اور رخ دنیا کی طرف کر لیا وہ دوزخ میں گر گیا۔اور اس کے ہوا وہوس کی مثال اس باڑ

کی طرح ہے جو دوزخ کے گڑھے کے گرداگرد کھڑی ہے۔تو جو کوئی اس باڑ پر سے گذرے گا گڑھے میں گرے گا۔اور جس نے اپنی شہوت کے خلاف عمل کیا وہ بہشت میں چلا گیا۔اور شہوت کی مثال بہشت کی راہ میں ایک گھاٹی کی طرح ہے۔تو جو کوئی اس اوگھٹ گھاٹی کو عبور کر گیا جنت میں پہنچ گیا۔اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''حُفَّتِ الجنّه بالمَکاره حُفَّتِ النّار بالشَّهَواتِ''، ''بہشت کے گرداگرد سختیوں کی باڑ ہے اور دوزخ کے گرداگرد شہوتوں اور شادمانیوں کا احاطہ ہے'' پس وہ لوگ جو صحرانشین ہیں جیسے عرب' کُرد اور ترک وغیرہ ہیں کہ ان میں علماء کا فقدان ہے وہ خواب غفلت میں رہ گئے کہ اور کسی نے ان کو بیدار نہیں کیا۔اور وہ خود خطرِ آخرت سے بے خبر ہیں۔اس وجہ سے رہ راست پر نہیں چلتے اور جو لوگ دیہاتی ہیں ان کا بھی یہی حال ہے۔کیونکہ ان کے درمیان عالم کمتر ہی ہوتا ہے۔گاؤں تو قبر کی مانند ہوتا ہے۔چنانچہ حدیث میں ہے کہ: ''اهل الکفور هم اهل القبور'' (دہ نشین ساکنان قبرستان ہیں)۔اور جو کوئی کسی ایسے شہر میں ہوتا ہے کہ جس میں کوئی عالم اور واعظ جو منبر پر بات کرے نہ ہو یا اس شہر کا عالم دنیا میں مشغول ہو اور اسے دین کے کاموں سے سروکار نہ ہو تو ایسے شہر کے شہری بھی غفلت میں رہ جاتے ہیں کیونکہ یہ عالم بھی غافل اور سویا ہوا ہے تو دوسرے کو کیونکہ بیدار کرے گا۔اور عالمِ شہر منبر پر جا کر وعظ کہنے لگے جیسے کہ بے سود ذاکروں کی عادت ہے سجع و گزاف گوئی' نکتہ ای' عشوتی (فریب) دیتا ہے جس سے سامعین کو گمان یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ جیسے بھی ہوں رحمتِ خداوندی خود ان کو ڈھونڈھ لے گی۔تو حال ایسوں کا غافلوں سے بھی بدتر ہے مثال اس کی اس شخص کی سی ہے جو راہ میں سو گیا ہے۔اور اسے کوئی بیدار کر کے ایسا مشروب پلائے کہ جسے پی کر وہ مست ہو کر گر جائے۔اور یہ سونے والا اس سے قبل ایسا تھا کہ آسانی سے بیدار ہو جاتا کوئی آواز بھی اسے سننے پر بیدار کر دیتی ہے لیکن اب اس مشروبِ نشہ آور کے بعد ایسا بے حس ہو گیا ہے کہ اگر اس کے جسم پر پچاس ٹھوکریں ماریں تو اسے پتہ بھی نہ چلے۔اور تو جو کچھ بھی انتباہ میں اسے کہے تو وہ اس کے جواب میں کہے گا کہ ''اے مرد! اللہ تعالیٰ کریم ہے اور رحیم ہے۔میری معصیت سے اسے کیا حذر؟ اور بہشت اس کی اس سے کہیں زیادہ فراخ ہے کہ میرے لئے وہاں جگہ نہ ہو۔اسی طرح کی یاوہ گویاں ایسے لوگوں کے دماغوں میں پیدا ہو جاتی ہیں اور جو ذاکر بھی اسی طرح کا ہوگا وہ خُلق اور دین دونوں کاموں کا قاتل ہو گا۔مثال اس کی ایسے طبیب کی سی ہے کہ بیمار جو تپ میں مراجارہا ہو اسے شہد کھلا دے اور کہے کہ شہد میں شفا ہے۔حالانکہ شہد اُس کے لئے باعثِ شفا ہوتا ہے کہ علّت جس کی سردی ہو۔آیات واحادیث جو رجا' امید اور رحمت خداوندی پر مبنی ہیں وہ واقعی شفا ہیں لیکن دو قسم کے بیماروں کے لئے اور بس: ایک وہ کہ جس نے اس قدر گناہ کئے ہوں کہ جن کی وجہ سے ناامید ہو گیا ہو۔اور

ناامیدی کی وجہ سے توبہ نہ کرے اور کہے کہ میری توبہ کہاں قبول ہوگی تو یہ آیت اس کے لئے شفا ہے: ''قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ'' (قرآن: ۳۹/۵۳) (اے محمد میرے ان بندوں سے کہ جنھوں نے اپنے اوپر ظلم میں گزاف کیا ان سے کہو کہ اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ آمرزگاہ اور بخشنے والا ہے اور مہربان اور سب کے گناہوں کو بخش دیتا ہے) بہ شرطیکہ اس آیت کو بھی جو اس سے متصل ہے پڑھے کہ: ''وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ'' (قرآن: ۳۹/۵۴) (اپنے رب کی طرف لوٹ آؤ اور اس کے سامنے جھک جاؤ قبل اس کے تم پر عذاب آجائے۔ پھر تمھارا کوئی مددگار نہ ہوگا) اس سے کہتا ہے کہ ناامید نہ ہو کہ حق تعالیٰ اگر تو لوٹ آئے اور توبہ کرے تو تیرے تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ ''اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ'' (۳۹/۵۵) (نیکوترین جو اتارا گیا) کا اتباع کرے۔ اور دوسرا بیمار وہ ہے کہ خوفِ خداوندی جس پر غالب ہو چنانچہ عبادات سے آسودگی نہیں پاتا۔ اور خوف اس کا ہوتا ہے کہ کثرتِ جہد سے خود کو مار ڈالے گا۔ کیونکہ رات بھر سوتا نہیں۔ کھانا بھی بہت کم مقدار میں کھاتا ہے۔ اس قسم کے خوف کی جراحت کا مرہم یہ آیاتِ رحمت ہیں۔ لیکن جب یہ آیات تُو غافلوں اور بے باک لوگوں کے سامنے بیان کرے گا تو وہ ایسے ہی ہے جیسے جلے ہوئے شخص کے بدن پر نمک پاشی کرے جس سے بیماری اور بھی بڑھ گئی ہو۔ ایسے ہی ہے جیسے کہ کوئی طبیب حرارت کا علاج شہد سے کرے۔ تو وہ بیمار کے قتل میں ماخوذ ہوگا۔ اسی طرح ایسا عالم لوگوں کے دین کی ہلاکت میں ماخوذ ہوگا۔ وہ دجّال کا ساتھی اور ابلیس کا معاون ہوگا۔ اور جس شہر میں اس جیسا ایک عالم بھی ہوگا تو وہاں ابلیس کا کیا کام کیونکہ وہ عالم اس کی نیابت میں جو مصروفِ تخریب ہے۔

اور اگر واعظ کا کلام شرع کے مطابق ہو اور تخویف اور انداز سے بہرہ مند ہو لیکن خود اس کی سیرت اور معاملات اس کی گفتار کے برعکس ہوں اور وہ دنیا پر حریص ہو۔ تو اس کے وعظ سے لوگوں کے دلوں سے غفلت دور نہ ہو سکے گی۔ مثال اس واعظ کی ایسے شخص کی سی ہے جو اپنے سامنے لوزینے (حلوا) کا ایک طبق رکھے اپنی پوری خواہش کے مطابق الّم غلّم سب کا سب کھا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا جائے کہ اے لوگو کوئی شخص بھی اس کے پیچھے نہ لگو کیونکہ یہ لوزینہ زہر سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن اس کا یہ جھوٹا انتباہ لوگوں کو حریص تر بنا دے گا۔ کیونکہ وہ کہیں گے کہ وہ زہر اسے اس لئے کہہ رہا ہے کہ سارا خود ہی کھا جائے۔ اور کوئی کھانے میں اس کے ساتھ شریک نہ ہو سکے۔ لیکن اگر اس کے کردار و گفتار بہ شرط لازم ہوں اور وہ اَسلاف کی سیرت کا مالک ہو تو غافل اس کے گفتار سے خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائیں گے۔ بشرطیکہ وہ لوگوں میں مقبول ہو۔ لیکن اگر وہ عوام میں مقبول

نہ ہو یا کچھ لوگ اس کی بات پر کان نہ دھریں اور آمادۂ اصلاح نہ ہوں اور غفلت میں پڑے رہیں تو اس واعظ پر فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ان کا پیچھا کرے۔ ان کے گھر میں جائے اور دین کی دعوت دے۔

پس اس تمام بیان سے معلوم ہو گیا کہ خلق ننھانوے فی صد حجابِ غفلت میں ہیں اور کارِ آخرت کے خطرات سے بے خبر ہیں۔ اور غفلت وہ بیماری ہے کہ جس کا علاج بیمار خود نہ کر سکے۔ کیونکہ غافل کو اپنی غفلت کی خبر نہیں ہوتی۔ تو وہ علاج اس کا کیونکر کرے گا؟ علاج اس کا علماء کے ہاتھ میں ہے۔ پس بچے جو خوابِ غفلت سے بیدار ہوتے ہیں وہ ماں باپ یا معلّم کے قول پر بیدار ہوتے ہیں اور دوسرے بہ قولِ واعظ بیدار ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس معیار کا عالم و واعظ کمیاب ہے۔ بےشبہ غفلت کی یہ بیماری مزمن ہو گئی ہے۔ اور خلق بیماریٔ غفلت کا شکار ہے۔ اگر آخرت کی بات کرتے بھی ہیں تو محض زبانی اور رسماً لیکن باطن ان کا اس دکھ، مصیبت وہراس سے بے خبر ہوتا ہے اس لئے انھیں اس سے کوئی فایدہ حاصل نہیں ہو پاتا۔

ضلالت و گمراہی اور اس کا علاج

معلوم رہے کہ ایک اور گروہ ہے جو آخرت سے غافل ہے لیکن اعتقاد ایسا رکھتے ہیں جو خلافِ حق ہے۔ اس لئے راہِ حق سے بھٹک گئے ہیں اور وہ گمراہی ان کا حجاب بن گئی ہے۔ ہم اس کی پانچ مثالیں بیان کرتے ہیں تا کہ اس کی حقیقت معلوم ہو سکے۔

مثال اوّل: یہ ہے کہ ایک گروہ آخرت کا منکر ہے اور عقیدہ ان کا یہ ہے کہ انسان جب مر جاتا ہے تو نابود ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی پودا سوکھ جائے۔ یا چراغ بجھ جائے۔ اس لئے انھوں نے شرم کی لگام سر سے اتار دی ہے اور جیسے جی چاہتا ہے بسر کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ یہ جو انبیاء نے کہا ہے دنیا میں خلق کی اصلاح کے لئے کہا ہے۔ یا اپنی جاہ طلبی میں کہا ہے اور اپنے فایدے یا تابعین پیدا کرنے کے لئے کیا ہے اور بعض اوقات صریحاً بھی کہتے ہیں کہ بیان دوزخ ایسے ہی ہے جیسے کہ کسی لڑکے بالے سے کہا جائے کہ اگر مدرسے نہ جاؤ گے تو تمھیں چوہوں کے بل میں ڈال دیں گے۔ اور یہ احمق اگر اس قسم کی مثالوں پر غور کرے تو جان لے کہ یہ بدبختی کہ جس میں لڑکا مدرسے نہ جانے کے باعث پڑے گا وہ چوہوں کے بل سے بدتر ہے۔ جیسے کہ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے حجاب دوزخ سے زیادہ برا ہے۔ اور سبب اس کا اپنی ہوا و ہوس کی پیروی ہے۔ لیکن انکار ان کی طبیعت کے موافق ہے اس لئے اس زمانے میں اگر لوگوں کے باطن میں راسخ ہو گیا ہے۔ اگر چہ وہ زبان سے نہ کہیں اور ہو سکتا ہے کہ اسے اپنی ذات سے بھی پوشیدہ رکھتے ہوں لیکن معاملہ ان کا اس بات کی دلیل

ہے کہ عقل ان کی ایسی ہے کہ دنیا میں پیش آ سکنے والے رنج کے خوف سے نقد رنج اٹھاتے ہیں۔ لیکن اگر عاقبت کے خطرات کے معتقد ہوتے تو اسے آسان نہ سمجھتے۔ علاج اس مرض کا یہ ہے کہ ایسے شخص کو آخرت کی حقیقت کا ادراک ہو جائے جس کے تین طریقے ہیں:

طریقہ اوّل یہ ہے کہ بہشت و دوزخ کا مشاہدہ ہو اور مطیع و عاصی کا انجام جو مر چکے ہیں دیکھے اور یہ پیغمبروں اور اولیاء اللہ سے مخصوص ہے۔ کیونکہ وہ اگرچہ اس دنیا میں ہوتے ہیں لیکن ان احوال سے جو اُن پر وارد ہوتے ہیں کہ جنھیں اصطلاحاً فنا اور بے خبری کہتے ہیں وہ عالمِ آخرت کے احوال کو بہ رائے العین دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ایسے مشاہدے کا حجاب یا تو حواس کے عمل یا شہوات کے مشغلے کے باعث ہوتا ہے اور اس معنی میں عنوان کتاب کی ذیل میں ایک حد تک اشارہ ہو چکا ہے لیکن یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا وہ اس پر ایمان کیسے لائے گا اور کہاں اس کی طلب کرے گا؟ اور اگر طلب بھی کرے گا تو دین تک کیونکر پہنچے گا؟

طریقہ دوم یہ ہے کہ انسان بہ دلیل پہنچانے کہ آدمی کی حقیقت کیا ہے اور روح کیا شے ہے؟ تا کہ اسے معلوم ہو سکے کہ روح ایک جوہر ہے اپنے نفس پر قائم ہے اور اس قالب (بدن) سے مستغنی ہے اور یہ قالب اس کی سواری اور اس کا ہتھیار ہے نہ کہ روح کا قوام۔ اور روح انسان کے مرنے پر فنا نہیں ہوتی۔ اور اس کا ایک طریقہ ہے لیکن سخت نادر اور دشوار۔ یہ طریقہ ان علماء کا ہے جو علم میں بکمال راسخ ہوں۔ عنوان کتاب میں اس امر پر بھی اشارۃً مذکور ہو چکا ہے۔

طریقِ سوم طریقِ عموم خلق ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس معرفت کا نور ان لوگوں میں جو انبیاء و اولیاء و علمائے علم راسخ کی صحبت اختیار کرتے ہیں سرایت کر جاتا ہے اور اسے ایمان کہا جاتا ہے۔ اور جس پر پیر پختہ کار اور عالمِ پرہیز گار کی صحبت مساعدت نہیں کرتی وہ شقاوت میں رہ جاتا ہے۔ اور جس قدر کوئی پیر یا عالم عظیم ہو گا اس کے نور کی سرایت اہل محفل پر اتنی ہی عظیم تر ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں خوش نصیب ترین صحابہ تھے۔ سبب جس کا احوالِ مصطفیٰ کے مشاہدے کی سعادت تھی۔ پھر تابعین کا درجہ ہے راز جس کا مشاہدۂ صحابہ کی سعادت ہے۔ اسی بناء پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''خیر الناس قرنی ثم الذین یلونھم'' (لوگوں میں بہترین وہ ہیں جو میرے زمانے میں ہیں اور پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے)۔ اور مثال اس قوم کی ایسی ہے کہ ایک چھوٹا بچہ جو اپنے باپ کو دیکھتا ہے کہ باپ جہاں کہیں سانپ کو دیکھتا ہے تو اس سے دور بھاگتا ہے اور گھر اس پر چھوڑ دیتا ہے اور بچے نے یہ اکثر دیکھا ہو گا تو لازماً یہ یقین اسے حاصل ہو جاتا ہے کہ سانپ بری

شے ہے اس سے گریز کرنا چاہئے۔ تو پھر یہ امر اس کی فطرت بن جاتا ہے کہ جہاں اسے دیکھے گریزاں ہو جائے۔ بغیر اس کے کہ وہ سانپ کے ضرر کی حقیقت سے آشنا ہو۔ ممکن ہے کہ وہ سنے کہ اندر اس کے زہر ہوتا ہے۔ لیکن بچہ اس زہر کا نام تو جانتا ہے لیکن زہر کی حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے۔ لیکن خوف اسے کاملاً حاصل ہو جاتا ہے اور مشاہدۂ انبیاء کی مثال ایسی ہے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ جس کو سانپ نے ڈسا وہ مر گیا۔ دوسرے کو ڈسا تو وہ بھی مر گیا۔ اور ضرر اس کا مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے جو منتہائے یقین ہے۔ اور علمائے راسخ کی دلیل کی مثال ایسی ہے کہ اس نے یہ تو نہ دیکھا ہو لیکن ایک نوع سے مزاج آدمی کو قیاس سے جان لیا ہو اور سانپ کے مزاج کو بھی جان لیا ہو۔ اور ضد ان کے درمیان اسے معلوم ہو چکی ہو۔ تو اس سے بھی یقین حاصل ہوتا ہے لیکن مشاہدے کا سا نہیں۔ جملہ عوام کا ایمان، ماسوائے علمائے بزرگ کے سب بزرگوں کی نیز بزرگان دین کی صحبت کا فیض ہوتا ہے اور قریب ترین علاج یہی ہے۔

ضلال کی دوسری مثال: یہ ہے کہ ایک گروہ آخرت کا منکر نہیں ہوتا اور آخرت کے نہ ہونے کا بہ قطع یقین معتقد نہیں ہوتا۔ لیکن وہ اس کے بارے میں متحیر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت کو جانا یا پہچانا نہیں جا سکتا۔ شیطان انھیں یہ دلیل فراہم کرتا ہے جس پر وہ کہتے ہیں کہ ''دنیا تو یقینی ہے لیکن آخرت مشکوک ہے اور یقین کو شک کی نذر نہیں کیا جا سکتا'' لیکن یہ امر باطل ہے کیونکہ اہل یقین کے نزدیک آخرت یقینی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے تحیر کا علاج یہ ہے کہ ان سے کہا جائے کہ دوا کی تلخی تو یقینی ہوتی ہے اور شفا مشتبہ، اور سمندر کے سفر پر روانہ ہونا یقینی خطرناک ہے اور مالِ تجارت کا نفع مشتبہ ہوتا ہے۔ اور اگر تمھیں پیاس کی حالت میں کوئی کہے کہ اس پانی سے نہ پیو کہ اس میں سانپ نے منہ ڈالا ہے تو پینے کی لذت تو یقینی ہے اور سانپ کا زہر مشکوک ہے۔ تو پھر تم ایسے پانی کے پینے سے اجتناب کیوں کرتے ہو؟ لیکن تو کہے گا کہ لذت کا یقین اگر جاتا رہے تو رنج اس کا قابل برداشت ہے۔ اور اگر زہر کی بات سچ ہے تو ہلاک ہو جائے گا اور ہلاکت پر صبر ممکن نہیں۔ اسی طرح دنیا کی لذت سو سال سے زائد نہیں۔ جب گذر گئی خواب ہو گئی اور آخرت دوامی ہے۔ اور رنج جاودان تحمل کرنا ممکن نہیں۔ اور اگر یہ دروغ ہے تو دنیا میں یہ سمجھ کر چند روز نہ رہا جیسے کہ ازل میں نہیں تھا اور ابد میں نہیں رہے گا۔ اور اگر سچ ہے تو عذاب جاودانی سے چھوٹ گیا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک ملحد سے کہا تھا کہ اگر ایسے ہی ہے جیسے تو کہتا ہے تو ہم سب نجات پا گئے اور اگر ہم سچے نکلے تو ہم تو آخرت میں نجات پا جائیں گے ان شاء اللہ اور تم مارے جاؤ گے۔

مثال سوم: ایسے لوگوں کی ہے جو آخرت پر ایمان تو رکھتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ وہ ادھار ہے اور یہ دنیا

نقد ہے۔ اور نقد ادھار سے بہتر ہوتا ہے۔ وہ اس قدر نہیں جانتے کہ نقد ادھار سے اس وقت بہتر ہوتا ہے کہ جب دونوں برابر ہوں۔ لیکن اگر ادھار تو ہزار ہو اور نقد ایک تو ظاہر ہے ادھار بہتر ہے۔ جیسے کہ تمام خلق کے معاملات اسی بنا پر ہیں۔ تو یہ خیال بھی منجملہ گمراہیوں کے ہوگا کہ کوئی اس قدر بھی فہم نہ رکھتا ہو۔

مثال چہارم: اس کی ہے جو آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ اس دنیا میں کام اس کے حسب دلخواہ ہیں اور دنیوی نعمت کو مہیا پاتا ہے۔ تو کہتا ہے کہ جس طرح میں یہاں نعمتوں میں ہوں۔ تو وہاں بھی نعمتوں ہی میں ہوں گا۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ نے یہ نعمت مجھے اس وجہ سے دی ہے کہ وہ مجھے دوست رکھتا ہے۔ تو کل فردائے قیامت بھی ایسے ہی کرے گا جیسے کہ ان دو بھائیوں کا قصہ ہے جسے سورۃ الکہف میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک نے کہا کہ: ''وَلَـئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰی رَبِّیْ لَاَجِدَنَّ خَیْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا'' (قرآن: ۳۶/۱۸) (اگر مجھے میرے اللہ کے پاس دوبارہ لے جائیں تو میں اس سے بہتر جگہ پاؤں) اور اس دوسرے نے کہا: ''اِنَّ لِـیْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰی'' (قرآن: ۵۰/۴۱) (بے شک میرے واسطے اللہ کے نزدیک ایک بہتری ہے) اور علاج اس کا یہ ہے کہ کسی کا عزیز بیٹا ہو اور ذلیل غلام ہو۔ تو وہ اپنے فرزند کو تو دن بھر مدرسے میں رکھے اور سر پر استاد کا ڈنڈا ہو اور غلام کو کھلی چھٹی ہوتا کہ جیسے چاہئے عیش کرے۔ کیونکہ اسے اپنے غلام کی بدبختی کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ اگر یہ غلام گمان یہ کرے کہ آقا بر بنائے دوستی ایسا سلوک اس سے کرتا ہے اور اسے اپنے بیٹے کی نسبت زیادہ دوست رکھتا ہے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ اسی طرح اللہ کی سنت یہ ہے کہ اپنے دوستوں کو دنیا عطا کرنے سے دریغ رکھتا ہے۔ اور اپنے دشمنوں پر عطا کرتا ہے۔ اور اس شخص کی آسائش اور راحت اس کی راحت کی مانند ہوگی جو سستی کرتا ہے اور بیج نہیں بوتا تو لازماً فصل نہیں کاٹے گا۔

مثال پنجم: اس کی ہے جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحیم ہے اور کریم ہے اور بہشت عطا کرنے میں کسی سے بھی دریغ نہ کرے گا۔ یہ احمق نہیں جانتا کہ اس سے بڑھ کر اور کرم اور رحم کیا ہوگا کہ اس سے زیادہ اور کیا اسباب تجھے فراہم کرے کہ تو ایک دانہ بوتا ہے اور سات سو دانے اس سے حاصل کرتا ہے کہ جس کے وسیلے سے آخرت کی بادشاہی جاودانی کو پہنچ جاتا ہے۔ اگر کرم ورحمت کے معنی یہ ہیں کہ تو بن بوئے پیداوار حاصل کرے تو تو طلب رزق میں حراثت وتجارت وغیرہ کیوں کرتا ہے؟ صبر کر اور کوئی کام نہ کر کیونکہ بقولِ تو اللہ رحیم ہے کہ بے بیج اور کشاورزی فصل اگاتا ہے۔ جب تو اس کرم پر ایمان نہیں رکھتا باوجود اس کے کہ فرماتا ہے کہ: ''وَمَـا مِنْ دَآبَّةٍ فِـی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا'' (قرآن: ۶/۱۱) (کوئی حرکت کرنے والا زمین میں ایسا نہیں کہ جس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو) اور پھر آخرت پر یہ اعتقاد رکھتا ہے باوجود اس کے کہ وہ کہتا ہے کہ: ''وَاَنْ لَّیْـسَ

لِلاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی '' (قرآن: ۳۹/۵۳) اور نہیں ہے انسان کے لئے مگر جس کے لئے وہ کوشش کرے) تو یہ انتہائی گمراہی ہے۔ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ: ''الا حمق من اتبع نفسه هو ھا وتمنی علی اللہ '' (وہ احمق ہے کہ پیروی تو اپنے نفس کی خواہشات کی کرتا ہے اور توقع اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے)'' اسی طرح ہے وہ جو بغیر نکاح کئے اولاد کی امید رکھتا ہے۔ یا نکاح کرتا ہے لیکن جماع کے بغیر اولاد کی اُمید میں ہے۔ یا جماع تو کرتا ہے لیکن رحم میں بیج نہیں ڈالتا۔ وہ احمق ہی ہوگا باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کریم ہے اور تخلیق میں بے تخم اولاد دینے پر قادر ہے۔ ایک دوسرا جو جماع کرتا ہے اور تخم ریزی کرتا ہے اور پھر اس کی امید رکھتا ہے کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ آفات سے بچائے رکھے تاکہ باہوش اولاد پیدا ہو۔ ایسے ہی وہ جو ایمان نہیں لاتا یا ایمان تو لاتا ہے لیکن عملِ صالح نہیں کرتا اور نجات کا امیدوار ہے احمق ہے۔ اور وہ جو یہ دونوں رکھتا ہے یعنی ایمان لایا اور اعمال صالح کئے وہ امید رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے وقتِ مرگ ان کے برباد ہونے سے بچائے تاکہ ایمان سلامتی کے ساتھ ہمراہ لے جائے۔ تو یہ عاقل متصور ہوگا اور دوسرے مغرور سمجھے جائیں گے اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں اچھا رکھا ہے اُس عالم میں ہمیں اچھا ہی رکھے گا۔ کیونکہ وہ رحیم وکریم ہے۔ وہ حق تعالیٰ کے بارے میں مبتلائے فریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں سے حذر فرماتے ہوئے کہا ہے کہ: ''اِنَّ وَعْدَاللهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللهِ الْغَرُوْرُ '' (قرآن: ۳۱/۳۳) 'اللہ کا وعدہ سچا ہے' خبردار اس دنیا کی زندگی تمھیں فریب میں مبتلا نہ کردے۔ اور تمھیں فریبی شیطان فریب نہ دے) فرمانِ خداوندی ہے کہ اے لوگوں جو وعدہ میں نے دیا ہے وہ سچا ہے۔ کہ جو کوئی نیکی کرے گا نیکی پائے گا اور جو کوئی برائی کرے گا وہ بدلے میں برائی ہی دیکھے گا۔ یہ وعدہ سچا ہے۔ کان کھول کر سن لو کہ دنیا پر مغرور نہ ہوجانا اور نہ حق تعالیٰ پر غرہ کرنا۔

پندار کا بیان اور اس کا علاج

یاد رہے کہ اہل دنیا مذموم ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اور اپنے عمل کے بارے میں خوش گمان ہیں لیکن اس کی آفت سے غافل ہیں وہ کھوٹے کھرے کا امتیاز نہیں رکھتے اس لئے کہ انھوں نے صرافی خوبی کے ساتھ نہیں سیکھی۔ اور ظاہری رنگ وصورت پر مغرور ہوگئے ہیں۔ یا وہ لوگ جو علم وعبادت میں مصروف ہیں اور غفلت کے حجاب اور گمراہی سے باہر نکل گئے ہیں۔ ان میں سے ننانوے فی صد مغرور ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''روز قیامت آدم علیہ السلام سے کہا جائے گا کہ: ''اپنی اولاد میں سے دوزخیوں کو الگ کرلے'' تو حضرت آدم پوچھیں گے کہ: ''کن میں سے کتنے؟'' ہر ایک ہزار میں سے نوسو ننانوے'' اور یہ

وہ نہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ لیکن انھیں دوزخ میں سے گذرے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ کیونکہ ان میں ایک گروہ اہل غفلت کا ہوگا تو دوسرا اہل ضلال میں سے ہوگا۔ تو تیسرا اہل غرور میں سے ہوگا۔ اور چوتھا اہل عُجب کا ہوگا جو اپنی شہوت کے اسیر ہیں۔ اگرچہ انھیں معلوم ہوگا کہ قصوروار ہیں۔ اور اہل پندار تو بہت ہیں اور اقسام ان کی بے شمار ہیں۔ جو چار طبقات سے باہر نہیں۔ اور وہ ہیں علماء، عابد، صوفی اور مال ومنال والے۔

اصناف اہلِ پندار

طبقۂ اوّل: اہل پندار کا اہل علم ہیں کہ ان میں سے ایک گروہ اپنی عمر علم میں صرف کرتے ہیں تاکہ علوم حاصل کریں۔ لیکن وہ عمل میں تقصیر کرتے ہیں۔ ہاتھ، زبان، آنکھ اور شرم گاہ کو معاصی سے نہیں بچاتے اور اس پندار میں ہوتے ہیں کہ وہ خود علم میں اس درجے کو پہنچ گئے ہیں کہ ان جیسوں کو عذاب نہ ہوگا۔ اور معاملات میں ماخوذ نہ ہوں گے۔ بلکہ اُن کی شفاعت پر لوگ نجات پائیں گے۔ مثال ان کی اس بیمار کی سی ہے جو اپنی بیماری کا علم پڑھتا ہے اور اسے روزانہ ہر رات دہراتا ہے۔ اور نسخہ اچھا لکھتا ہے۔ اور بیماری کی دوا کی شرایط خوب جانتا ہے۔ لیکن کبھی بھی دوا نہیں پیتا اور دوائی کی تلخی برداشت نہیں کرتا۔ تو اس کا محض دوا کا تذکرہ اسے کیا فایدہ دے گا؟ اور فرمانِ خداوندی یہ ہے کہ: ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى'' (قرآن: ۱۴/۸۷)[1] اور فرماتا ہے کہ: ''وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى'' (قرآن: ۷۹/۴۰/۱۴) (جس نے اپنے نفس کو شہوات سے بچایا ٹھکانہ اس کا جنت ہے)۔ فرماتا ہے کہ فلاح اسی کی ہے جو پاک ہوگیا نہ کہ وہ جو پاکیزگی کی تعلیم دیتا ہے اور بہشت میں وہ جائے گا جو اپنی نفسانی خواہشات کے برعکس عمل کرے گا۔ یہ نہیں کہتا کہ جو کوئی اس بات کا عالم ہو کہ خواہشات نفس کے برعکس کرنا چاہئے اور یہ مردِ سادہ کہ اگر اس کا پندار ان احادیث سے پیدا ہوا ہو کہ جو علم کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں تو وہ کیوں ان احادیث کو نہیں پڑھتا جو علمائے سوء کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ قرآن میں ایسے عالم کو گدھے سے تشبیہ دی گئی ہے جس کی پشت پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ یا کتے سے تشبیہ دی گئی اور فرمایا گیا ہے کہ عالمِ بد کو دوزخ میں اس انداز سے پھینکا جائے گا کہ اس کی کمر اور گردن دونوں ٹوٹ جائیں گی۔ اور آگ اسے یوں پھرائے گی جیسے کہ گدھا چکی کو گھماتا ہے۔ سب دوزخی اس کے پاس جمع ہو کر پوچھیں گے کہ تو کون ہے؟ اور یہ کیسی عقوبت ہے کہ جس میں تو گرفتار ہے''۔ تو وہ کہے گا کہ ''میں وہ ہوں کہ جس نے دوسروں کو عمل کے لئے کہا لیکن خود عمل نہ کیا''۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''قیامت کے دن اس عالم کے عذاب سے بڑھ کر اور کوئی عذاب نہ ہوگا جس نے اپنے علم پر عمل نہ کیا''۔ بودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اس شخص پر ایک بار افسوس ہے جو جاہل ہے لیکن وہ جو عالم ہے اور اس پر عامل نہیں اس پر ستر بار افسوس ہے۔

یعنی علم اس پر حجت ہو جائے گا''۔

ایک وہ جماعت ہے کہ جس نے علم وعمل میں تقصیر نہ کی لیکن اعمالِ ظاہر بجالائے مگر دل کی پاکیزگی سے غافل رہے اور برے اخلاق باطن سے دور نہ کئے۔ جیسے کہ کبر' حسد' ریا وسرداری کی طلب' اور اپنے اقارب کی بدخواہی' اور اُن کی مصیبت پر خوشی منانا اور ان کی راحت پر رنجیدہ ہو جانا وغیرہ برائیاں ہیں۔ اور ان احادیث سے غافل رہے جن میں یہ بیان ہے کہ ذرا سی ریا بھی شرک ہے اور بہشت میں وہ داخل نہ ہو گا جس کے دل میں ذرہ بھر کبر ہو گا اور یہ کہ حسد ایمان کو یوں برباد کر دیتا ہے جیسے آگ ایندھن کو تباہ کر دیتی ہے۔ اور یہ کہ فرمانِ خداوندی ہے کہ ''حق تعالیٰ تمھاری صورت نہیں دیکھتا بلکہ تمھارے دل کے احوال کو دیکھتا ہے''۔

پس ایسے لوگوں کی مثال اس قوم کی سی ہے کہ جنھوں نے کوئی فصل بوئی ہو اور نلائی اس کی لازم ہوتا کہ فصل کو قوت ملے لیکن وہ خس وخاشاک کی شاخ تراشی تو کرتے ہیں اور نامطلوب بوٹیوں کی جڑیں باقی رہنے دیتے ہیں۔ جتنا ان کی شاخ تراشی کرتے ہیں وہ بوٹیاں اتنی ہی زیادہ فروغ پاتی ہے۔ اعمالِ بد کی جڑ اخلاقِ بد ہیں اور اصل ان کی وہ ہے جو جڑ سے اکھاڑ پھینکنی چاہئے اور مثال اس کی جو باطن تو پلید رکھتا ہے لیکن بہ ظاہر آراستہ ہے۔ ایسی ہیکہ 'جائے طہارت' باہر سے تو گچ کاری سے آراستہ ہو یا ایسی قبر کی سی ہے جس پر نقش ونگار بنے ہوں لیکن اندر اس کے مردار ہو یا ایسے تاریک گھر کی سی ہے کہ شمع جس کے باہر روشن ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عالمِ بد کو یوں تشبیہہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ''چھلنی کے سے نہ ہو جاؤ کہ جس میں سے آٹا تو نکل جاتا ہے لیکن سبوس اس میں باقی رہ جاتا ہے۔ تم بھی حکمت کی بات کرتے ہو اور جو برائی ہے وہ تم میں باقی رہ جاتی ہے''۔ ایک اور گروہ ہے کہ جنھیں علم ہو گا کہ یہ اخلاقِ بد ہے اور اس سے حذر کرنا چاہئے اور دل کو اس سے پاک رکھنا چاہئے۔ لیکن وہ گمان کرتے ہیں کہ ان کا دل خود اس سے پاک ہے اور وہ اس سے بالاتر ہیں کہ اس فکر میں مبتلا ہوں کیونکہ وہ اس سب کا علم بہتر رکھتے ہیں اور جب ان میں کبر کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو شیطان ان سے کہتا ہے کہ ''یہ کبر نہیں بلکہ یہ دین کی عزت کی طلب ہے۔ اور اگر تو صاحبِ عزت نہ ہوا تو اسلام بھی صاحبِ عزت نہ ہو گا''۔ اور اگر یہ لوگ اچھا لباس زیب تن کرتے ہوں اور اسب اور تجمل کا ساز وسامان رکھتے ہوں۔ تو کہتے ہیں کہ: ''یہ رعونت نہیں ہے کہ یہ دشمنان دین کی نابینائی ہے کہ بدعت کرنے والے اس سے اندھے ہو جائیں کہ علماء شان وشوکت کے ساتھ ہوں''۔ اور یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور ابوبکر رضی اللہ عنہ' عمر رضی اللہ عنہ' عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کے پھٹے پرانے لباسوں کو بھول جاتے ہیں۔ اور گمان یہ کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ کرتے تھے

---

(۱) کامیاب ہوا وہ جس نے اللہ کے لئے کوئی شے اپنے مال میں سے دی۔

اس سے اسلام کی ذلت ہوتی تھی۔ اور اب اسلام تجمل کے ساتھ معزز ہو جائے گا۔ اور اگر ان میں حسد پیدا ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ: ''یہ حق کی استواری ہے'' اور ان میں ریا پیدا ہو تو کہتے ہیں کہ ''یہ خلق کی مصلحت میں ہے کہ ہماری اطاعت کو پہچانیں اور ہماری پیروی کریں۔ اور جب ایسے لوگ بادشاہوں کی خدمت میں پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ: ''یہ ظالم کے آگے انکساری نہیں ہے جو حرام ہے۔ بلکہ یہ مسلمانوں کی سفارش اور ان کی مصلحت کار ہے'' اور جب حرام مال لیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ: ''یہ حرام نہیں کیونکہ اس کا مالک معلوم نہیں۔ اس لئے اسے مصالحت میں صرف کر دینا چاہئے۔ اور مصلحت اسلام مجھی سے وابستہ ہے''۔ حالانکہ اگر انصاف سے کام لے اور عدل کی میزان میں تولے تو اسے معلوم ہو کہ دین اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ انسان دنیا سے اِعراض کرے۔ اور حقیقت یہ ہوتی ہے کہ اُس کی وجہ سے جن لوگوں میں دنیا کی رغبت پیدا ہوئی وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں کہ جنھوں نے دنیا سے منہ موڑا ہو پس اسلام اس شخص کے عدم سے وابستہ ہے اور مصلحت اسلام یہ ہے کہ وہ اور اس جیسے لوگ نہ ہوں۔ یہ اور اس جیسے پندار اور غرور سب باطل ہیں۔ اور ان کی حقیقت اور ان کے علاج کے بارے میں ہم اصول بیان کر چکے ہیں اور تکرار ان کی یہاں طوالت کا باعث ہو گی۔ والسلام۔

ایک اور گروہ جو خود نفسِ علم کے فہم میں غلطی کا شکار ہوا ہے اور جو علم سے مہم تر ہے جیسے تفسیر' حدیث اور معاملتِ دل کا علم و علم اخلاق و طریق ریاضت اور جو کچھ ہم اس کتاب میں لا چکے ہیں۔ نیز علم راہِ آخرت اور ان کے متعلقات اور راہِ دین کے معاملات کی آفات' اور دل کے مراقبے کا طریق کہ جو فرضِ عین ہے وہ انھوں نے حاصل نہیں کیا ہوتا اور نہیں جانتے کہ یہ سب من جملہ علوم کے ہیں۔ اور اپنا وقت سراسر جدل و مناظرہ یا تعصبِ کلام میں یا دنیا کے جھگڑوں کے فتووں کی نذر کر دیا ہو۔ اور وہ تمام علم جو اسے دنیا سے ہٹا کر آخرت کی طرف بلائے نہ پڑھے اور اُسے حرص سے ہٹا کر قناعت کی طرف متوجہ نہ کیا۔ اور ریاکاری سے اخلاص کی جانب نہ بلایا۔ اور غفلت اور سہل انگاری سے خوف اور تقوٰی کی طرف دعوت نہ دی۔ اپنا تمام وقت ایسے ہی امور میں برباد کر دیتے ہیں اور گمان یہ کرتے ہیں کہ علم خود اسی قدر ہے۔ اور جس نے رخ دوسرے علوم کی طرف کیا تو گویا اس نے علم ہی سے منہ موڑ لیا اور اس نے علم کو ترک کر دیا۔ ان پنداروں کی تفصیل بہت دراز ہے۔ اسے ہم اپنی کتاب اِحیا میں بیان کر چکے ہیں۔ لیکن یہ کتاب اس کی تفصیل سے عاجز ہے۔

ایک گروہ علمِ وعظ میں لگا ہوا ہے۔ اور بات ان کی سراپا سجع' شعر' نکات' طامات پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ لوگ صوفیاء کی نامفہوم عبارات رٹ لیتے ہیں اور مقصود ان کا فقط یہ ہوتا ہے کہ لوگ سن کر نعرہ زنی کریں اور ان کی تعریف کریں۔ اور اتنا بھی نہیں جانتے کہ ذکر اصل میں یہ ہوتا ہے کہ دل میں آتشِ غم پیدا ہو جائے جس

سے لوگ خطرِ آخرت سے آگاہ ہوں۔ یہ لوگ اس مصیبت کی نوحہ گری میں لگ جاتے ہیں۔ ان کا وعظ وتذکیر اسی مصیبت کا نوحہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ نوحہ گری جو ماتم سے آلودہ نہ ہو۔ مانگے تانگے کی باتیں بیان کرتے ہیں جو کسی دل پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اور اس قوم کے مغرور بہت ہیں اور تفصیل ان کی طویل۔

ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے فقہ ظاہر کے جاننے میں ایک زمانہ صرف کر دیا ہو اور پھر بھی نہ جان سکے ہوں کہ حدِّ فقہ کچھ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ قانون جس کی مدد سے بادشاہ رعایا کی تہذیب کرتا ہے اس پر کڑی نظر رکھے۔ لیکن جو چیز راہِ آخرت سے تعلق رکھتی ہے وہ ایک دوسرا علم ہے۔ اور یہ لوگ گمان یہ کرتے ہیں کہ جو کچھ فقۂ ظاہر میں درست ہو وہی آخرت میں نفع آور ہے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ کوئی زکوٰۃ والا مال آخر سال میں اپنی بیوی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ اور اس کا مال خود خرید لیتا ہے تو فتوئ ظاہر شرع یہ ہوگا کہ زکوٰۃ دونوں سے ساقط ہوگئی۔ یعنی بادشاہ کا عاملِ زکوٰۃ اب ان سے زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ کیونکہ نظر ظاہر ملک پر ہوگی۔ اور ملک سال تمام ہونے سے پہلے منقطع ہوگئی۔ اور امکان یہی ہے کہ ایسا ہی فتوٰی دے اور نادان اتنا بھی نہیں جانتا کو جو شخص زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لئے یہ حیلہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا۔ اسی شخص کی طرح جو زکوٰۃ نہ دے۔ کیوں کہ بخل مہلک ہے اور زکوٰۃ بخل کی پلیدی سے نجات ہے۔ اور وہ بخل باعث ہلاکت ہوتا ہے جس کی اطاعت کریں۔ اور یہ حیلہ کرنا گویا بخل کی فرماں برداری ہے۔ پس جب بخل فرماں روا ٹھہرا تو سب کچھ برباد ہو گیا۔ نجات کیوں کر پائے گا۔

اسی طرح جو شوہر اپنی بیوی سے بد اخلاقی سے پیش آ کر اسے رنج پہنچائے تا کہ وہ حق مہر اسے لوٹا دے تو فتوئ ظاہر میں جو مجلس حکم سے متعلق ہے۔ یہ ابرا[1] درست ہوگا کیونکہ اس دنیا کا قاضی زبان کو جانتا ہے اور دل کی حقیقت نہیں جانتا۔ لیکن اُس عالم میں ماخوذ ہوگا کیونکہ یہ ابراء بہ جبر ہوا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی کسی سے کوئی چیز اوروں کے سامنے مانگے اور وہ شخص شرم کے مارے دے دے تو فتوئ ظاہر میں یہ مباح ہے لیکن حقیقت میں یہ غصب ہے۔ کیونکہ جیسے شرم کے تازیانے ماریں تا کہ اس کے رنج سے مال دے دے اور اس شخص میں کہ جیسے لاٹھی سے ماریں اور اس کا مال غصب کر لیں کچھ فرق نہیں۔ یہ اور اس جیسی اور کئی مثالیں ہین کہ جو شخص سوائے فقہ ظاہر کے اور کچھ نہ جانتا ہون۔ وہ اس غلط فہمی میں رہتا ہے کہ وہ اسرارِ دین کے وقایق سے بھی آشنا ہے۔

طبقۂ دوم: عابدوں اور زاہدوں کا ہے۔ اور ان میں بھی اہل پندار بہت کثرت سے ہیں۔ ایک گروہ

(۱) ابراء: قرض دار کا ادائے قرض سے جان بوجھ کر پہلو تہی کرنا

ان مغروروں کا ہے جو فضائل کے سبب فرایض سے رہ جاتے ہیں۔ جیسے کہ کسی کو طہارت میں ایسا وسوسہ ہوتا ہے کہ نماز بروقت ادا کرنے سے محروم رہتا ہے۔ اپنے والدین اور ساتھیوں کے ساتھ سخت کلامی سے پیش آتا ہے پانی کی نجاست کے باب میں گمانِ بعید اس کے لئے گمانِ قریب ہوتا ہے۔ لیکن جب کھانے کے پاس پہنچتا ہے تو پھر سمجھتا ہے کہ سب کچھ حلال ہے۔ بلکہ ایسے بھی ہوتا ہے کہ حرامِ محض سے بھی پرہیز نہیں کرتا۔ اور پاؤں بغیر جوتے کے زمین پر نہیں دھرتا۔ اور حرام محض کھاتا ہے۔ اور سیرت صحابہ کو بھلا دیتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ''میں نے ستر بار حلال سے بھی ہاتھ روک لیا اس خوف سے کہ کہیں حرام کا مرتکب نہ ہو جاؤں''۔ اور بایں ہمہ آپ نے عیسائی عورت کے کوزے سے وضو کیا۔ پس اس قوم نے احتیاطِ لقمہ کو احتیاطِ طہارت کے برابر کر دیا ہے۔ آنحضرت کو کفار جو لباس تحفۃً بھیجتے تھے آپ اسے زیب تن فرماتے تھے اور ہر وہ لباس جو کفار کے مال غنیمت میں سے ملتا صحابہ اسے پہن لیتے تھے۔ اور کبھی کسی نے نہیں کہا کہ پہلے وہ لباس دھویا جاتا تھا۔ بلکہ کفار سے حاصل کیا ہوا اسلحہ کمر پر باندھتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے۔ اور یہ نہ کہتے تھے کہ ہوسکتا ہے کہ کفار نے لوہے کو آب دی ہو۔ یا لاکھ اس (کے دستے) میں بھری ہو یا کھال جسے غلاف کے طور پر استعمال کیا ہوا سے پاک نہ کیا ہو۔ پس ہر وہ شخص جس نے معدے' زبان یا دیگر اعضا میں تو احتیاط نہ کی ہو اس جیسے امور میں حد درجہ مبالغہ کرتا ہے۔ تو یہ شیطان کے تمسخر کے مترادف ہوگا۔ بلکہ اگر سب کچھ بجالائے جیسے کہ پانی کے استعمال میں اِسراف کرے یا نماز اوّل وقت سے نکل جائے تب بھی مغرور ہوگا۔ اور اس احتیاط کی شرط ہم کتاب طہارت میں بیان کر چکے ہیں۔

اور ایک اور گروہ کہ جن پر وسوسہ غالب ہوتا ہے' نماز کی نیت بآواز ادا کرتے ہیں اور ہاتھ جھٹکتے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ پہلی رکعت کو کھودیں۔ اور اتنا بھی نہیں جانتے کہ نماز کی نیت قرض ادا کرنے اور زکوٰۃ دینے کی نیت کی سی ہوتی ہے۔ اور ان میں سے کوئی بھی دوبارہ زکوٰۃ یا قرض وسوسۂ نیت کی بناء پر نہیں دیتا۔ ایک گروہ وہ ہے جسے سورۂ الحمد کے حروف میں مبالغہ ہوتا ہے تاکہ صحیح مخارج سے ادا کریں اور نماز میں دل اسی میں مصروف رکھتے ہیں کہ حروف مخارج سے ہوں۔ حالانکہ ایسے کو چاہئے کہ دل معنی کی طرف متوجہ رکھے۔ تاکہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہتے وقت دل سراپا شکر بن جائے اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہتے وقت سراپا توحید اور عجز میں محو ہو جائے۔ اور ''اِھْدِنَا'' کے وقت ہمہ تن تضرع اور زاری بن جائے۔ حالانکہ وہ دل سراپا اس میں لگائے رکھتا ہے کہ 'ایاک' مخرج سے باہر لائے یا نہ؟ یہ ایسے ہی ہے کہ جب کوئی شخص بادشاہ سے کچھ مانگنا چاہتا ہو تو کہے: یا ایھا الامیر اور اسے پھر دہرائے تاکہ 'ایھا' درستی کے ساتھ کہے تو بے شبہ بادشاہ کے غیظ و غضب اور سزا کا

مستوجب ٹھہرے گا۔

ایک گروہ ہے جو ہر روز ایک قرآن ختم کرتے ہیں اور قرآن بہ عجلت پڑھتے ہیں اور بر سر زبان دوڑ لگاتے ہیں اور دل اس سے غافل ہوتا ہے۔ اور ان کی ساری کوشش اس میں ہوتی ہے کہ ایک ختم اپنے لئے شمار میں لائیں تاکہ کہہ سکیں کہ ہم نے اتنے قرآن ختم کئے ہیں۔ اور آج ہم نے کتنی منزلیں قرآن کی تلاوت کی ہیں اور نہیں جانتے کہ قرآن تو ایک نامہ ہے جو خلق کی طرف لکھا گیا ہے جس میں امر و نہی، وعد و وعید و مثل و وعظ و تذکیر و تخویف اور اِنذار ہے۔ اس لئے چاہئے کہ وعید کے وقت انسان سراپا خوف بن جائے۔ اور وعدے کے وقت سراپا شادمان ہو جائے۔ اور مثل کے وقت سراپا اعتبار ہو جائے اور بوقتِ وعظ سراپا کان بن جائے۔ اور تخویف کے وقت سراپا ہراس بن جائے۔ اور یہ سب کے سب احوالِ دل ہیں۔ اس لئے جان لے کہ اگر اسے فقط زبان پر لاتا ہو تو اس سے کیا حاصل؟ مثال اس کی اس شخص کی سی ہے کہ جسے بادشاہ خط لکھے جس میں کئی احکام ہوں۔ تو مکتوب الیہ کو از بر کرلے اور پڑھے لیکن اس میں درج فرامین سے غافل رہے تو اس کا کیا فایدہ؟

اسی طرح ایک گروہ حج پر جاتا ہے اور وہاں مجاور نشینی کرتا ہے اور روزہ رکھتا ہے اور دل کی نیز زبان کی نگاہ داشت نہیں کرتا کہ روزے کا حق ہے۔ اسی طرح مکے کا حق حرمت کو ملحوظ رکھنے میں ادا نہیں کرتا اور حلال زادِ راہ کے ذریعے راستے کا حق ادا نہیں کرتا۔ اور دل ان کا ہمیشہ خلق سے لگا رہتا ہے کہ لوگ انھیں مجاور سمجھیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے عرفات میں اتنی دفعہ قیام کیا اور اتنے سال مجاور رہے۔ اور اتنا بھی نہیں جانتے کہ اپنے ہی گھر میں کعبے کے شوق میں ہونا اس سے کہیں بہتر ہے کہ کوئی کعبے میں مشتاق اس کا ہو کہ لوگ اسے مجاور دیکھیں اور آرزو یہ ہو کہ کوئی انھیں کوئی چیز دے اور جو لقمہ وہ لیتا ہے بخل اس میں ظاہر ہوتا ہے کیونکہ ڈرتا ہے کہ کوئی دوسرا اس سے یہ نہ لے لے یا مانگ نہ لے۔ اور ایک گروہ وہ ہے جو زُہد کا راستہ لیتے ہیں اور ناجور موٹا لباس پہنتے ہیں۔ اور کھانا کم کھاتے ہیں اور مال میں زاہد ہوتے ہیں۔ لیکن جاہ و قبول میں زاہد نہیں ہوتے۔ لوگ ان سے تبرک حاصل کرتے ہیں اور یہ اس پر خوش ہوتے ہیں اور اپنا احوال لوگوں کی نگاہوں میں بنا سنوار کر رکھتے ہیں۔ لیکن اتنا بھی نہیں جانتے کہ جاہ مال سے زیادہ زیان کار ہے۔ جسے ترک کرنا دشوار تر ہے۔ کیونکہ امیدِ جاہ میں تمام تکلیفیں برداشت کرنا آسان ہے۔ اور زاہد تو وہ ہوتا ہے جو جاہ کو ترک کرے اور ایسے بھی ہوتا ہے کہ یہ کسی دوسرے سے کوئی چیز اس لئے نہیں لیتا کہ لوگ کہیں گے کہ یہ زاہد نہیں ہے۔ اور اگر اس سے کہا جائے کہ "لے لو اور حاجت مندوں کو دے دینا" تو یہ اس کے لئے موت سے بھی زیادہ گراں گذرتا ہے۔ اگرچہ حلال مال ہی سے ہو۔ محض اس خوف سے نہیں لیتا کہ لوگ گمان کریں گے کہ یہ زاہد نہیں۔ اور عجب یہ کہ اس کے ساتھ دولت

مندوں کا احترام بہت کرتا ہے۔ بہ نسبت مفلسوں کے۔ اور دولت مندوں کی مراعات میں اضافسہ کرتا ہے تو یہ سب غرور ہی تو ہے۔

ایک اور گروہ وہ ہے کہ جو تمام اعمال ظاہر بجالاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن میں ہزار رکعت نماز ادا کرتے ہیں۔ اور کئی ہزار تسبیحات کرتے ہیں۔ شب بیداری کرتے ہیں۔ دن کو روزہ سے ہوتے ہیں۔ لیکن ضروریات دل کو ملحوظ نہیں رکھتے کہ دل بداخلاق سے پاک ہو جائے۔ باطن ان کا کبر، حسد، ریا اور عُجب سے پُر ہوتا ہے۔ اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ بدخُو اور تُرش رُو ہوتے ہیں اور خلقِ خدا کے ساتھ بات چیں بجبیں ہو کر کرتے ہین۔ گویا سب کے ساتھ ناراضگی اور دشمنی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اتنا بھی نہیں جانتے کہ خوئے بد تمام عبادات کو تباہ کر دیتی ہے۔ اور خوش خلقی تمام عبادتوں کی سردار ہے۔ اور یہ کمینہ گویا اپنی عبادات کا احسان لوگوں پر رکھتا ہے اور انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور خود کو دوسروں سے ممتاز گردانتا ہے۔ اور اتنا بھی نہیں جانتا کہ تمام عابدوں اور زاہدوں کے سردار آنحضرت ﷺ تھے۔ جو سب سے زیادہ کُشادہ رُو تھے۔ اور سب سے زیادہ خوش اخلاق تھے۔ اور آپ ﷺ اس شخص کو جس کا لباس زیادہ میلا ہوتا ہے اور دوسرے اس سے دامن بچاتے، آپ اسے اپنے پاس بٹھاتے تھے۔ اور ہاتھ مصافحے کے لئے اس کی طرف بڑھاتے اور کون اس سے زیادہ احمق ہوگا جو خود کو آنحضرت سے بالاتر جانتا ہو۔ اور یہ ناسمجھ شرعِ مصطفیٰ پر تو عامل ہیں لیکن آپ ﷺ کی سیرت کے برعکس عمل کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہوگی؟

تیسرا طبقہ صوفیوں کا ہے کہ کسی قوم میں اس قدر غرور نہ ہوگا جو ان میں ہے۔ راہ جتنا دقیق تر ہوتا ہے مقصود اتنا ہی کمیاب تر ہوتا ہے۔ غلط پندار اور غرور اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ حالانکہ تصوف کی تمہید یہ ہے کہ انسان نے تین درجے حاصل کر لئے ہوں:

ایک یہ کہ اس کا نفس اس کا تابع ہو چکا ہو۔ اور اس کے باطن میں شہوت باقی رہی ہو نہ خشم۔ یہ نہیں کہ اصلاً باقی نہ رہے بلکہ مراد یہ ہے کہ مغلوب ہو جائیں تاکہ یہ صوفی پر حکم نہ چلا سکیں بجز اشارات شرع کے جیسے کہ ایک قلعہ فتح ہو جائے اور قلعہ والوں کو قتل نہ کریں۔ لیکن قلعے والے مطیع ہو جائیں۔ تو صوفی کے سینے کا قلعہ سلطانِ شرع کے ہاتھوں کشادہ ہوتا ہے۔

دوسرے: یہ کہ یہ دنیا اور آخرت دونوں اس کے ہاں سے رخصت ہو چکے ہوں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ عالمِ حِس وخیال سے آگے نکل گیا ہو اور حِس اور خیال میں جو کچھ آتا ہے دوسرے جانور اس امر میں اس کے شریک ہیں۔ اور یہ شہوتِ شکم وفرج وجسم کا نصیبہ ہے۔ اور بہشت بھی عالمِ حِس وخیال سے باہر نہیں ہے۔

نیز ہر وہ شے جو جہت پذیر ہو اور خیال کو اس سے سروکار ہو۔ وہ اس کے نزدیک ایسے ہو گئے ہوں جیسے اس شخص کے نزدیک گھاس پھوس جسے روزینہ اور کباب مرغ میسر ہوں۔ کیونکہ اس نے جان لیا ہوتا ہے کہ جو کچھ خیال میں آسکتا ہے حقیر اور پست ہے۔ اور وہ احمقوں کا نصیب ہے۔ ''واکثر اھل الجنۃ البلہ'' (بیشتر مردمِ بہشت سادہ دل ہیں)۔

تیسرے: یہ کہ اس کا سراپا حق تعالیٰ اور حضرتِ الٰہیت کے جلال و جمال کا اسیر ہو۔ اور یہ وہ ہے کہ جہت و مکان و حِس و خیال کو اس میں راہ نہیں۔ بلکہ خیال و حِس و علم جو اس سے پیدا ہوتا ہے وہ اس کے لئے ایسا ہی ہے کہ جیسے آنکھ کو آواز سے اور کانوں کو رنگ سے ہوتا ہے کہ لازماً وہ ان سے بے خبر ہوتا ہے۔ جب صوفی اس مقام پر پہنچ گیا تو گویا کوئے تصوف کے سرآغاز پر پہنچ گیا۔ اور اس کے ماوراء اس کے لئے احوال و مقامات حق تعالیٰ کے ساتھ ہوتے ہیں کہ جنھیں معرض بیان میں لانا مشکل ہے۔ بہ طوریکہ ایک گروہ اسے از راہِ تصوف یگانگی اور اتحاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ تو ایک گروہ حلول سے اور جس کا قدم علم میں راسخ نہ ہو اور وہ اس حال سے دوچار ہو تو وہ اس کے معنی کلیۃً بیان نہیں کر سکتا۔ اور جو کچھ کہتا ہے ضربِ کفر لگتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے نفس الامر میں درست ہوتا ہے۔ لیکن اسے اس کے بیان کی قدرت نہیں ہوتی۔ یہ ہے تصوف کے راہِ سلوک کا ایک نمونہ۔

اور اب غور فرمائیے تاکہ دوسروں کے غرور و پندار کو ملاحظہ کر سکیں۔ بہ طوریکہ ان میں سے ایک گروہ گدڑی، سجادہ اور سخنانِ گزاف جو انھوں نے اختیار کئے ہیں اور لباس اور ظاہر صورت و سیرت صوفیان خود پر طاری کر رکھی ہوں۔ اور انھی کی مانند سجادے پر بیٹھتے ہیں اور سر جھکائے رکھتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی خیال یا وسوسہ درپیش ہو۔ سر کو جنبش دیتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ کام ان کا اسی قدر ہے۔ ان لوگوں کی مثال اس عاجز بڑھیا کی سی ہے جو سر پر کلاہ رکھ لے قبا باندھ لے اور اسلحہ زیب تن کر لے جس نے یہ سن رکھا ہو کہ مجاہد میدان جنگ میں اسی طرح کبر و ناز سے چلتے ہیں اور رجز خوانی کیسے کرتے ہیں اور مجاہدوں کی جملہ حرکات سن رکھی ہوں۔ تو جب وہ بڑھیا سلطان کے پاس جاتی ہے کہ اپنا نام مجاہدوں میں لکھوائے اور سلطان ایسا ہے کہ ظاہر کو نہیں دیکھتا۔ برہان چاہتا ہے لہٰذا اسے برہنہ کر دیتا ہے تاکہ ایک جنگجو کے ساتھ مقابلے کے لئے میدان میں نکلے تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک خستہ حال کمزور بڑھیا ہے جس نے یہ روپ دھار رکھا ہے۔ تو وہ حکم دیتا ہے کہ اسے ہاتھی کے پاؤں میں ڈال دیا جائے تاکہ کسی کو یہ جرات نہ ہو کہ بادشاہ کی بارگاہ میں اس قسم کا استخفاف کر سکے۔

اور ایک گروہ ہو گا اس سے بھی بدتر کہ یہ بھی عاجز ہوں گے۔ جو انھی کی وضع و ہیبت کو ملحوظ رکھتے ہیں اور لباس پھٹا پرانا پہنتے ہیں۔ باریک دستار اور سرمئی رنگ کی گدڑی حاصل کر کے پہنتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ

جب لباس کو رنگ دے لیا جائے تو یہ بہت ہے اور یہ نہیں جانتے کہ انھوں نے کپڑوں کو سرمئی اس لئے کیا ہے کہ بار بار دھونے کی ضرورت نہ پڑے۔ اور نیلا اس لئے کیا کیونکہ دین میں مصیبت میں تھے نیل اس کے مناسب ہے۔ تو یہ بد بخت چونکہ دقیق النظر نہیں ہے کہ جامہ شوئی میں نہ گئے۔ اور ایسا مصیبت زدہ نہیں ہے کہ غم کا لباس پہنے اور اتنا عاجز بھی نہیں کہ اپنی گدڑی میں پیوند نہ لگا سکے۔ بلکہ عمداً نئی دستار کو پھاڑتا ہے تا کہ گدڑی ہو جائے۔ اس نے تو ظاہر صورت میں بھی صوفیاء کی موافقت نہ کی۔ کیونکہ پہلا گدڑی پوش عمر رضی اللہ عنہ تھا کہ جس نے اپنے کرتے پر چودہ پیوند لگا رکھے تھے جن میں سے بعض چمڑے کے تھے۔

اور ایک گروہ ان سے بھی بدتر ہوگا جو پھٹے محقر لباس کی تاب بھی نہیں رکھتا۔ نہ فرایض ادا کرتا ہے اور نہ معاصی کا تارک ہے۔ اور اس پر آمادہ نہیں کہ اپنے عجز کا اقرار کرے۔ کیونکہ یہ لوگ شیطان اور اپنی شہوات کے اسیر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دل اہم ہے اور ظاہری صورت غیر اہم ہے۔ اور ہمارا دل ہمیشہ نماز میں ہے۔ اور حق تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اس لئے ہمیں ان شرعی اعمال کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ تو اپنے نفس کے ساتھ مجاہدے کے لئے ہیں جو ان لوگوں کے لئے ہیں جو اپنے نفس کے اسیر ہیں۔ اور ہمارا نفس تو مر چکا ہے اور ہمارا دین 'دُو قلہ'[1] ہے۔ جو ان چیزوں سے آلودہ نہیں ہوتا۔ نہ متغیر ہوتا ہے۔ اور یہ جب عابدوں کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ وہ مزدور ہیں جو جزا سے محروم رہتے ہیں۔ جب علماء کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ: ''یہ قوم بیان کی زنجیر کے قیدی ہیں۔ یہ حقیقت کی راہ نہیں جانتے''۔ اس قسم کے لوگ گردن زدنی ہیں۔ اور کافر ہیں جن کا خون بہ اجماعِ اُمت حلال ہے۔

اور ایک گروہ وہ ہے جو صوفیوں کی خدمت کے لئے کمر بستہ ہو جاتے ہیں اور خدمت کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ کوئی اس قوم پر فدا ہو جائے اور اپنا مال قربان کرے اور خود کو ان کے عشق میں کلیۃً فراموش کر دے۔ اور جب کوئی ذریعہ آمدنی بنالیتا ہے تا کہ ان کے سبب سے مال حاصل کر سکے اور انھیں اپنا پیرو بنالے تا کہ اس کا نام خدمت میں مشہور ہو اور لوگ اس کی حرمت کریں۔ اور وہ جہاں سے بھی ملے لے لے حلال بھی حرام بھی، اور وہ صوفیوں کو دے تا کہ اس کی گرم بازاری قائم رہے۔ تو ایسا شخص محجوب رہتا ہے اور بے خبر کہ وہ مغرور ہے اور فریب خوردہ ہے۔

اور ایک گروہ ایسا ہے کہ جو کاملاً ریاضت کی راہ چلتے ہیں۔ اور اپنی شہوات کو مغلوب کر لیتے ہیں۔ اور سراپا خود کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اور ذکر میں خلوت نشین ہو جاتے ہیں۔ اور احوال[2] اُن کا ظاہر ہونے لگتا ہے

---

(۱) دو قلہ: چھ سو صاع پانی۔ کیونکہ ایک قلہ تین سو صاع پانی کے برابر ہوتا ہے۔ (یعنی ہم سمندر ہیں!)

(۲) احوال: صوفیا کی اصطلاح میں جو کچھ حق تعالیٰ کی جانب سے سالک کے دل پر وارد ہوتا ہے جس میں سالک کا اختیار نہیں ہوتا۔ اور جو نفسی اوصاف کے ظہور پر زائل ہو جاتا ہے۔

اس انداز سے کہ جس چیز کو چاہتے ہیں اس کی خبر پالیتے ہیں۔ اور اگر کوئی تقصیر کریں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انتباہ کا سامنا کرتے ہیں۔ اَے بسا کہ پیغمبروں اور فرشتوں کی تصویریں بخوبی دیکھنے لگیں۔ اور امکان اس کا بھی ہے کہ خود کو بہ مثل آسمان پر دیکھیں اور ملائکہ کو دیکھیں اور اس کی حقیقت اگر چہ درست ہو وہ ایک خواب کی مانند ہے جو راست اور درست ہو۔ لیکن وہ سونے والے کے خیال میں آتا ہے مگر یہ بیدار کے خیال میں آتا ہے اور وہ اس خیال سے مبتلائے فریب ہو جاتا ہے کہتا ہے کہ ''جو کچھ ساتوں زمینوں اور ساتوں آسمانوں میں ہے مجھے اس کا مشاہدہ کرادیا گیا ہے۔ اور گمان کرتا ہے کہ اولیاء کی انتہائی منزل یہی ہے۔ حالانکہ اس نے آفرینش کے بارے میں ابھی صُنعِ حق تعالیٰ کے عجائب کا نہیں جانا سرِ مُو آفرینش کے بارے میں جانا۔ اور گمان یہ کرتا ہے کہ موجودات میں جو کچھ ہے سب کا سب اسے دکھادیا گیا ہے۔ تو جب یہ حالت نمودار ہوتی ہے۔ تو سمجھتا ہے کہ اب کمال کو پہنچ گیا ہے۔ تو اس کی خوشی میں لگ جاتا ہے اور طلب میں قدم آگے نہیں بڑھاتا۔ اور امکان اس کا ہے کہ وہ نفس جو مغلوب ہو گیا تھا آہستہ آہستہ سر اٹھانے لگے۔ لیکن وہ گمان کرتا ہے کہ جب ایسی چیزیں اسے مشاہدہ کرادی گئی ہیں تو اپنے نفس کے بارے میں مطمئن ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ اور یہ بڑا گھناؤنا غرور ہے۔ بلکہ اس پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ اعتماد اس پر ہونا چاہیئے کہ انسان کی فطرت بدل کر شریعت کی مطیع ہو جائے تاکہ اس کی صفت کو اس کی ذات میں تصرف کا یارا نہ ہو۔

شیخ ابوالقاسم گورگانی ؒ کہتے ہیں کہ پانی پر چلنا' یا ہوا میں اڑنا یا غیب کی خبریں دینا کوئی کرامت نہیں کرامات یہ ہیں کہ کوئی سراپا امر بن جائے۔ یعنی وہ سراپا مطیعِ فرمان بن جائے اور حرام کا اس سے صدور ہی ممکن نہ ہو۔ تو اس حالت پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ اور باقی جملہ ہو سکتا ہے کہ شیطان کی طرف سے ہوں کیونکہ شیطان کو بھی غیب کی خبر ہوتی ہے۔ اور وہ لوگ جنھیں کاہن کہا جاتا ہے کئی کاموں کی خبر دیتے ہیں اور وہ حیرت انگیز چیزوں کے محل ہوتے ہیں۔ لیکن اعتماد اس پر کرنا چاہیئے کہ خود انسان اور اس کی آرزوئیں درمیان سے اٹھ جائیں اور ان کی جگہ تمام تر شریعت جاگزین ہو جائے۔ تو اگر شیر پر سوار نہیں ہو سکتا تو باک نہ رکھ۔ غضب وہ کتا ہے جو تیرے سینے میں ہے جب تو اسے کچل دے گا اور اسے مغلوب کرلے گا تو شیر پر سوار ہو جائے گا۔ اور اگر تو غیب کی خبر نہیں دے سکتا تو غم نہ کر کیونکہ جب اپنے عیب اور غرور سے کہ نفس کا خاصہ ہے آگاہ ہو جائے گا اور ان کی آفت اور فریب سے باخبر ہو جائے گا۔ تیرا عیب تیرا غیب ہے تو تُو نے غیب کی خبر بھی پالی۔ اور پانی پر نہیں چل سکتا یا فضا میں پرواز نہیں کر سکتا تو متفکر نہ ہو کیونکہ جب تجھے ماورائے حِسن خیال مقام دکھائی دے اور تو اس پر گامزن ہو تو گویا تو پانی پر چلا۔ اور ہوا میں پرواز کرنے لگا۔ اور اگر وسیع وطویل صحرا ایک ہی رات میں

طے نہیں کر سکا تو کیا ڈر۔ کیونکہ جب تو دنیا کی وادیوں سے درگذرا اور دنیوی مشاغل کو تو نے پس پشت ڈال دیا تو تو نے صحرا کو عبور کر لیا۔ اور اگر ایک ہی جست میں پہاڑ کی چوٹی پر قدم نہیں رکھ سکا تو بھی متفکر نہ ہو۔ کیونکہ اگر تو نے ایک مشتبہ درم کو پاؤں کے نیچے روند ڈالا تو گویا تو نے ایک اوگھٹ گھاٹی عبور کر لی۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے گھاٹی اسی کو کہا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ: ''فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَآ اَدْرٰیکَ مَاالْعَقَبَةُ'' (قرآن: ۱۲/۹۰، ۱۱) (اپنے آپ کو عقبہ میں نہیں ڈالا ہے اور تو کیا جانے کہ عقبہ کیا ہے)۔ یہ اس قوم کے غرور ہیں۔ لیکن سب کا بیان طوالت کا باعث ہوگا۔

طبقہ چہارم: دولت مندوں اور ارباب اموال کا ہے اور ان میں پندار اور غرور کے مارے بے شمار ہیں۔ ایک گروہ اپنا مال مسجد یا رباط یا پُل کی تعمیر پر صرف کرتے ہیں۔ لیکن اکثر ایسے ہوتا ہے کہ مال حرام کمایا ہو اور فرض تو یہ تھا کہ جس کا ہے اس کو لوٹا دیں۔ لیکن عمارت میں صرف کر دیتے ہیں جس سے معصیت مضاعف ہو جاتی ہے۔ اور یہ غلط فہمی سے سمجھتے ہیں کہ بڑا عظیم کام کیا ہے۔

اور ایک گروہ وہ ہے جو عمارتوں پر مالِ حلال سے خرچ کرتے ہیں۔ لیکن مقصود ان کا ریا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک درم یا ایک دینار بھی صرف کرتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ ان کا نام بہ طور معطّی کسی پختہ اینٹ پر ثبت کیا جائے۔ تو اگر ان سے کہا جائے کہ لکھنا کیا ضرور ہے یا کسی دوسرے کا نام لکھوا دو کیونکہ اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے کہ کس نے دیا ہے تو اس پر کان دھرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس ریا کی دلیل یہ ہے کہ ایسے شخص کے اقارب اور ہمسایوں میں حاجت مند ہوتے ہیں۔ اور عمارت کی بجائے انھیں دنیا زیادہ فضیلت رکھتا ہے لیکن انھیں نہیں دے سکتے۔ کیونکہ ان لوگوں کی پیشانی پر یہ تحریر کہ ''بناہ فلاں اطال اللہ بقائہٗ''، ''یعنی اس عمارت کو فلاں نے بنایا اللہ اس کی عمر دراز کرے''، ممکن نہیں ہوتی۔

اور ایک گروہ وہ ہے جو حلال مال بہ اخلاص صرف کرتا ہے لیکن مسجد ہی کے نقش و نگار پر۔ اور گمان یہ کرتا ہے کہ یہ عمل خیر ہے۔ جب کہ ان نقش و نگار سے دو مفسدے جنم لیتے ہیں۔ ایک یہ کہ دورانِ نماز نمازیوں کے دل ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس سے خشوع و خضوع جاتا رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نمازیوں کو اپنے گھر کو آراستہ کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح دنیا ان کی نگاہوں میں بھلی لگنے لگتی ہے اور وہ گمان یہ کرتا ہے کہ خیر کا کام انجام دے رہا ہے۔ حالانکہ آنحضرت کا فرمان ہے کہ: ''جو مسجد میں نقش و نگار بناتے ہیں یا قرآن مجید کی تحریر میں زر و سیم صرف کرتے ہیں ان پر ہلاکت ہو!'' مسجدوں کی آبادانی تو حاضر، خاضع اور خاشع دلوں کی بناء پر ہوتی ہے کہ دل دنیا سے منفور رہو۔ اور جو خشوع کو اچک لے اور دل میں دنیا کو آراستہ کرے تو وہ

مسجد کی ویرانی کا باعث ہوگا۔اس کم بخت نے حقیقتاً مسجد کو ویران کردیا اور گمان یہ کرتا ہے کہ اس نے کارِعظیم کیا ہے۔ایک گروہ وہ ہے جو ایسی بات کو عزیز رکھتا ہے کہ محتاج ان کے گھر کے دروازے پر جمع ہوں تاکہ شہر میں شہرہ ہو۔یا صدقہ اس کو دیتے ہیں جو زبان آور اور معروف ہو۔یا خرچ ایک جماعت پر کرتے ہیں کہ حج کی راہ میں صرف کریں۔یا کسی خانقاہ میں صرف کرتے ہیں تاکہ سب کو معلوم ہو اور وہ شکر گذار ہوں۔اور اگر تُو اس سے کہے کہ یہ مخفیانہ کسی مستحق کو دے دے کیونکہ یہ راہ حج میں صرف کرنے سے اسے افضل تر ہے تو نہ مانے گا۔کیونکہ اسے لذت اپنی تعریف اور لوگوں کے اظہار تشکر سے حاصل ہوتی ہے۔اور وہ گمان یہ کرتا ہے کہ عمل خیر کررہا ہے۔

ایک شخص نے بشر حافیؒ سے مشورہ کیا کہ میرے پاس حلال کمائی کے ہزار درم ہیں، میں حج پر جاؤں گا تو حافی نے اس سے کہا کہ "تماشے کے لئے جاؤ گے یا حق تعالیٰ کی رضا کے لئے؟" تو اس نے کہا کہ "حق تعالیٰ کی رضا کے لئے تو بشر حافیؒ نے کہا کہ "جاؤ قرض داروں، یتیموں اور عیال داروں کو دے دو۔کیونکہ یہ راحت جو تم مسلمانوں کو فراہم کرو گے۔حج اسلام کے بعد سو حجوں سے فاضل تر ہے"۔اس شخص نے کہا کہ "میں اپنے باطن میں حج کی رغبت بیشتر پاتا ہوں"۔تو حافی نے فرمایا کہ "اس وجہ سے کہ تم نے یہ مال درست ذرائع سے حاصل نہیں کیا اس لئے جب تک ناروا جگہوں پر صرف نہ کرو گے تمھارے جی کو چین نہ آئے گا"۔

اور ایک گروہ ایسا بخیل ہوتا ہے کہ زکوٰۃ بھی نہیں دیتا۔اور مال کو بچا کر رکھتا ہے۔اس پر ستم یہ کہ دعویٰ پارسائی کا کرتا ہے۔شب کو نماز ادا کرتا ہے دن کو روزہ رکھتا ہے۔مثال ان کی ایسے شخص کی سی ہے کہ جسے دردِ سر ہو لیکن وہ دوا پاؤں کی ایڑی پر لگاتا ہو۔یہ دشمنِ دین نہیں جانتا کہ اس کی بیماری دراصل بخل ہے بسیار خوری نہیں اور علاج اس کا خرچ کرنے میں ہے نہ کہ بھوک کی سختی برداشت کرنے میں۔یہ اور اس کی مثل اربابِ اموال کا غرور ہے اور اس سے ان میں سے کوئی بھی خالی نہیں ہوتا الّا یہ کہ علم حاصل کرے جیسا کہ اس کتاب میں بیان ہوا ہے تاکہ طاعت کی آفات اور غرورِ نفس اور مکرِ شیطان سے آگاہ ہوسکے۔پھر ان پر حق تعالیٰ کی دوستی غلبہ کرے گی۔اور دنیا ان کی نظروں سے دور ہو جائے گی۔سوائے بقدرِ ضرورت کے۔اور موت کو یاد رکھیں گے اور سوائے اس کے لئے تیاری کے کسی اور کام میں نہ لگیں گے۔اور یہ امر آسان ہے ہر اس خوش قسمت انسان کے لئے جسے اللہ تعالیٰ آسانی فراہم فرمائیں۔والسلام۔

•••

رکن چہارم: منجیات کے بیان میں

اس رکن میں بھی دس اصلیں ہیں:

اصل اوّل: توبہ کے بیان میں

اصل دوم: صبر وشکر کے بیان میں

اصل سوم: خوف ورجا کے بیان میں

اصل چہارم: فقروزہد کے بیان میں

اصل پنجم: صدق واخلاص کے بیان میں

اصل ششم: محاسبہ اور مراقبہ کے بیان میں

اصل ہفتم: تفکر اور ندامت کے بیان میں

اصل ہشتم: توکل اور توحید کے بیان میں

اصل نہم: محبت وشوق کے بیان میں

اصل دہم: موت اور احوال آخرت کے بیان میں

اصل اوّل: توبہ کے بیان میں

یادرہے کہ توبہ حق تعالیٰ کی طرف لوٹنے کا نام ہے یہ مریدوں کا اوّلین قدم اور سالکوں کی راہ کی ابتداء ہے۔ اور کسی انسان کو اس کے بغیر چارہ نہیں کیونکہ گناہوں سے پاک ہونا اوّل وآخر فرشتوں کا کام ہے۔ اور معصیت میں مستغرق رہنا اور ہمہ عمر دشمنی' شیطان کا شیوہ ہے۔ اور راہِ معصیت سے واپس طاعت بذریعہ توبہ آنا آدم اور آدمیوں کا کام ہے۔ جس نے توبہ کر کے اپنے گذشتہ گناہوں کا تدارک کیا تو اس نے اپنے بابا آدم کے ساتھ اپنی نسبت کی تصحیح کر لی۔ لیکن جس نے آخر عمر تک معصیت پر اصرار کیا تو اس نے شیطان کے ساتھ اپنا نسبی تعلق استوار کیا۔ تمام زندگی طاعت کو برقرار رکھنا انسان کے لئے ممکن نہیں۔ کیونکہ اسے ابتدائے آفرینش ہی سے ناقص بے عقل پیدا کیا ہے۔ اور ابتدء ہی میں اس پر شہوت مسلّط کر دی گئی ہے جو شیطان کا آلہ ہے۔

اور عقل جو شہوت کی دشمن ہے اور نور ہے وہ فرشتوں کا جوہر ہے۔ پس اس لئے پیدا کیا کہ شہوت غالب ہوگئی تھی اور سینے کا قلعہ غصب ہو چکا تھا اور نفس اس کا عادی بلکہ عاشق ہو چکا تھا۔ پس بہ ضرورت جب عقل پیدا ہوئی تو توبہ اور مجاہدہ کی حاجت ہوئی تاکہ یہ قلعہ فتح ہو اور شیطان کے قبضے سے آزاد ہو جائے۔ تو توبہ انسانوں کی ضرورت ٹھہری۔ جو سالکانِ راہِ حق کا اوّلین قدم ہے۔ پس وہ بیداری جو نور عقل و شرع سے حاصل ہوتی ہے اس سے غرض یہ ہے کہ انسان راہ اور بے راہے میں تمیز کر سکے۔ اور کوئی فرض سوائے توبہ کے نہیں ہے جس کے معنی بے راہی سے راہ کی طرف لوٹنے کے ہیں۔

فضیلت و ثواب توبہ: یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں کو نیز خلق کو توبہ کا حکم دیا ہے۔ فرمایا کہ: ''وَتُوبُوا اِلَی اللّٰہِ جَمِیعًا اَیُّہَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ'' (قرآن: ۳۱/۲۴) (اللہ کی طرف لوٹ آؤ اے مومنو! سب کے سب تاکہ کامیاب ہو جاؤ) فرمایا ہے کہ جو کوئی کامیابی کا امیدوار ہے اسے چاہئے کہ توبہ کرے۔ اور آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جو کوئی سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے توبہ کر لے اس کی توبہ قبول ہو جائے گی''۔ نیز فرمایا کہ ''پشیمانی توبہ ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''لوگوں کی راہ گذر میں ایک جگہ جسے لاف گاہ کہتے ہیں وہاں مت ٹھہریں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی وہاں ٹھہرے تو جو کوئی اس کے پاس سے گذرے گا اس پر ہنسے گا۔ اور ہر عورت جو وہاں پہنچتی ہے اس کے لئے بری باتیں کہتی ہے۔ وہ وہاں سے نہیں اٹھتا حتیٰ کہ دوزخ اس پر واجب ہو جاتی ہے۔ الا یہ کہ وہ توبہ کرے'' نیز فرمایا کہ: ''میں ہر روز ستر بار توبہ کرتا ہوں۔ اور استغفار کرتا ہوں''۔ نیز فرمایا کہ: ''جس نے گناہوں سے توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بھلا دیتا ہے۔ فرشتوں کے ہاں سے جو کہ انھوں نے لکھ رکھے تھے۔ اور فراموش کر دیتا ہے ہاتھ پاؤں اور اُس جگہ کو جہاں اس نے گناہ کیا ہوتا کہ بندہ جب اپنے اللہ کے حضور پیش ہو گناہوں سے پاک ہو''۔ نیز فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت سے پہلے تک قبول کرتا ہے کہ جان اس کے گلے تک پہنچ چکی ہو۔ اور وہ غرغرہ کے عالم میں ہو''۔ نیز فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا دست کرم کشادہ ہے اس شخص کے لئے جس نے دن میں گناہ کیا ہو لیکن رات کو توبہ کر لی ہو۔ یا جس نے رات کو گناہ کیا ہو اور دن میں توبہ کر لی ہو اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ اور جب تک آفتاب مغرب سے طلوع نہیں ہوتا یعنی قیامت تک قبول کرتا رہتا ہے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''توبہ کرو کہ میں دن میں سو ۱۰۰ بار توبہ کرتا ہوں''۔ نیز فرمایا کہ ''کوئی فرد بشر ایسا نہیں کہ جو گناہگار نہ ہو لیکن گناہگاروں میں بہترین وہ ہیں جو تائب ہیں''۔ نیز فرمایا کہ جس نے گناہ سے توبہ کی وہ ایسا ہی ہے کہ جس نے گناہ کیا ہی نہ ہو''۔ نیز فرمایا کہ ''گناہ سے توبہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ دوبارہ

کبھی نہ کرے"۔اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے عائشہ رضی اللہ عنہا "اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ" (قرآن:۱۵۹/۶) (وہ لوگ جو اپنے دین سے الگ ہو گئے اور بے دین ہو گئے اور فرقہ فرقہ ہو گئے تم ان میں سے کوئی شے نہیں ہو"۔ "وہ اہل بدعت ہیں اور گناہ گار کے لئے توبہ ہے لیکن مبتدع کے لئے توبہ نہیں۔ میں ان سے بیزار ہوں اور وہ مجھ سے بیزار ہیں"۔ نیز فرمایا کہ جب حضرت ابراہیم کو آسمان پر لے جایا گیا تو آپ نے دیکھا کہ ایک شخص ایک عورت سے زنا کر رہا ہے۔تو آپ نے ان کے لئے دعا فرمائی حتیٰ کہ دونوں ہلاک ہو گئے۔ایک اور کو دیکھا کہ گناہ کر رہا تھا اس پر بھی دعا کی تو آپ پر وحی آئی کہ "اے ابراہیم! میرے بندوں کو چھوڑ دے کیونکہ تین کاموں میں سے ایک ضرور ہوتا ہے: اگر وہ توبہ کرے تو میں قبول کر لیتا ہوں اور اگر بخشش مانگے تو میں اسے بخش دیتا ہوں یا اس سے اولاد پیدا ہوتی ہے جو میری عبادت کرتی ہے تو میں اسے اس کے کام میں لگا دیتا ہوں۔ تمھیں معلوم نہیں کہ میرے ناموں میں سے ایک نام "صبور" بھی ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راوی ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا کہ "خدائے تعالیٰ جس بندے کو گناہ پر پشیمان دیکھتا ہے قبل اس کے کہ وہ بندہ اس گناہ سے بخشش چاہے خود بخش دیتا ہے"۔نیز فرمایا کہ مغرب کی طرف ایک دروازہ ہے کہ جس کی چوڑائی ستر سالہ راہ ہے۔توبہ کے لئے کھولا ہوا ہے۔اور یہ اس روز سے کھلا ہوا ہے جب آسمان و زمین کی تخلیق ہوئی تھی۔اور کبھی بند نہیں ہوا تا آنکہ آفتاب مغرب سے طلوع ہو"۔نیز فرمایا کہ: "پیر اور جمعرات کے دن اعمال پیش کئے جاتے ہیں جس نے توبہ کی ہو قبول ہوتی ہے۔جس نے بخشش چاہی ہو اسے بخش دیا جاتا ہے۔لیکن وہ لوگ جن کے دل کبر سے پُر ہوں ان کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا ہے"۔نیز فرمایا کہ: "اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ پر اس سے بڑھ کر خوش ہوتا ہے کہ ایک اعرابی صحرا میں لیٹ کر سو جائے اور اس کا ایک اونٹ ہو جس پر اس نے زادِ راہ اور کھانے کا سامان لاد رکھا ہو۔جب نیند سے بیدار ہو تو اونٹ کو موجود نہ پائے۔اٹھے اور اس کی تلاش میں نکلے۔حتیٰ کہ اس حال کو پہنچے کہ بھوک پیاس سے ہلاکت کا خوف ہو اور اسے زندگی کی کوئی امید نہ ہو اور کہے کہ میں اپنی جگہ جا کر لیٹ جاؤں اور مر جاؤں' اپنی جگہ پر آ جائے اور نومیدی میں سر کلائی پر رکھ لے تا کہ مر جائے تو اس غم میں نیند اس پر طاری ہو جاتی ہے۔تو جونہی بیدار ہوتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ونٹ سلامتی کے ساتھ لوٹ آیا ہے۔اور زادِ راہ اور راحلہ اسی طرح موجود ہے۔تو اعرابی چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے تو کہے کہ: "اے میرے اللہ کہ میں تیرا بندہ ہوں' لیکن فرطِ خوشی میں غلطی سے کہتا ہے کہ 'اے کہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا اللہ ہوں' تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ پر اس اعرابی سے کہیں زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنے اونٹ اور زادِ راہ کو دوبارہ پانے پر خوش ہوا ہے"۔

حقیقتِ توبہ

جان لے کہ تمہید توبہ کی معرفت کا نور اور ایمان ہے جو نمودار ہوتا ہے کہ انسان اس نور میں دیکھتا ہے کہ گناہ زہرِ قاتل ہے۔ جب دیکھتا ہے کہ اس نے اس زہر سے بہت زیادہ کھالیا ہے اور ہلاکت کے قریب ہے۔ تو لازماً اس میں پشیمانی اور خوف پیدا ہوتا ہے۔ ایسے ہی جیسے کسی نے زہر کھالی ہو اور پشیمان ہو اور ڈرتا ہو۔ تو پشیمانی میں اپنے گلے میں انگلی ڈالتا ہے تاکہ قے کرلیں اور اس خوف کے سبب دوا کی تدبیر کرے تاکہ زہر سے پیدا شدہ اثر کو زائل کرسکے۔ عاصی اسی طرح دیکھتا ہے کہ ہر شہوت جس کا ارتکاب اس نے کیا شہد کی مانند تھی۔ جس میں زہر ملا ہوا ہو تو ابتداء میں تو شہد کی طرح شیریں ہو اور آخر میں ڈسنے والی ہو تو اس میں ماضی پر ندامت پیدا ہوتی ہے۔ اور آتشِ خوف سے اس کی جان میں آگ لگ جاتی ہے۔ کیونکہ اپنی ہلاکت کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اور اس آتشِ خوف میں شرہ اور شہوتِ گناہ جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ اور یہ شہوت حسرت میں منقلب ہو جاتی ہے۔ تو انسان عزم کرتا ہے کہ گذشتہ کا تدارک کرے اور مستقبل میں اس کا اعادہ نہ کرے اور ظلم و جفا کا لباس اتار پھینکتا ہے اور جامۂ وفا زیب تن کرتا ہے۔ اور اپنی جملہ حرکات و سکنات کو تبدیل کر لیتا ہے۔ اس سے پہلے غرور، غفلت اور خوش گذرانی میں تھا لیکن اب سراپا گریہ زاری، اندوہ اور حسرت کی تصویر ہے۔ اور اس سے قبل اس کی ہم نشینی اہل غفلت کے ساتھ تھی۔ اب اس کی صحبت اہل معرفت کے ساتھ ہوگی۔ پس نفسِ توبہ ندامت ہے اور اصل اس کی نورِ معرفت و ایماں اور فرع اس کی احوال کا انقلاب ہے۔ اور تمام اجزئے بدن کو معصیت و مخالفت سے ہٹا کر طاعت و مواعظت پر کاربند کرنا ہے۔

یہ امر کہ توبہ ہر شخص پر ہمہ وقت واجب ہے اس کا بیان

یہ امر کہ توبہ ہر شخص پر واجب ہے تُو اس سے پہچانے گا کہ جو کوئی بالغ ہو گیا اور کافر ہو تو اس پر توبہ واجب ہے کہ کفر سے توبہ کرے۔ اور اگر مسلمان ہے اور مسلمانی اس نے ماں باپ کی تقلید میں پائی ہے تو زبان سے کہتا ہو لیکن دل سے غافل ہو تو اسے بھی واجب ہے کہ غفلت سے توبہ کرے۔ اور ایسی توبہ کرے کہ دل اس کا حقیقتِ ایمان سے آگاہ ہو جائے اور وہ باخبر ہو جائے۔ اور اس آگاہی سے ہمارا مطلب وہ دلیل نہیں ہے جو اہلِ کلام کے ہاں مراد ہے سیکھے۔ کیونکہ وہ سب واجب نہیں۔ بلکہ اس سے ایمان کا وہ غلبہ مراد ہے جو انسان کے دل پر قاہر اور حاکم ہو۔ تاکہ حکم اسی کا ہو اور بس۔ اور حکم اس کا اس وقت ہوگا کہ مملکت تن میں جو کچھ ہو وہ سراسر حکمِ ایمان کے تحت ہو۔ نہ کہ حکم شیطان کے تحت۔ اور کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو ایمان زائل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ

فرمانِ رسول ہے کہ : ''کوئی شخص زنا کا ارتکاب نہیں کرتا حالانکہ وہ وقت زنا مومن ہو اور چوری نہیں کرتا دراں حالیکہ دُزدی کے وقت مومن ہو''۔ مقصد اس کا یہ نہیں کہ وہ اس حال میں کافر ہوتا ہے لیکن ایمان کے شعبے اور شاخیں بکثرت ہیں۔ اور ان شاخوں میں سے وہ ہے کہ انسان جانتا ہے کہ زہر قاتل ہے اور جو کوئی جانتا ہے کہ زہر ہے تو وہ زہر نہیں کھاتا۔ پس اس حالت میں شہوت کے غلبے نے اس کے ایمان کو اس امر میں کہ زنا مہلک ہے شکست دے دی ہوتا کہ غفلت کی بناء پر ایمان ناپیدا ہو گیا ہو۔ جس سے اس کا نور دودِ شبہت کی تاریکی میں گم ہو گیا ہو۔ تم نے جان لیا کہ پہلے توبہ کفر سے واجب ہے۔ اور اگر کافر نہ ہو لیکن حقیقت اسلام سے غافل ہو تو توبہ اس پر بھی واجب ہے کیونکہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے کے باعث اس کا ایمان تو تقلیدی تھا۔ پس اگر کسی نے یہ بھی کر لیا تو اکثر ایسے ہوتا ہے کہ معصیت سے خالی نہ ہو۔ لہٰذا معصیت سے توبہ بھی لازم ہے۔ اور اگر کسی نے اپنے ظاہر کو معصیت سے خالی کر لیا تو بھی اس کا باطن معاصی کے تخم سے خالی نہیں ہوتا۔ جیسے کھانے پینے کی خواہش یا بات کرنے کی طمع یا مال و جاہ کی تمنا اور حسد اور کبر اور ریا جیسے مہلکات کہ یہ سب دل کی خیانتیں ہیں اور معاصی کی جڑیں اس لئے ان سب سے توبہ واجب ہے تا کہ ان میں سے ہر ایک کو حدِّ اعتدال میں رکھے اور ان شہوات کو عقل و شرع کا فرماں بردار بنائے۔ اور یہ طویل مجاہدے سے ممکن ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی ان برائیوں سے بھی پاک ہو تو وہ وسوسوں اور بیانِ نفس اور نا کردنی خیالات سے خالی نہیں ہوتا۔ تو ان سب سے بھی توبہ واجب ہے اور اگر ان سے بھی پاک ہو گیا تو بھی حق تعالیٰ کے ذکر سے غفلت اور ایسے ہی دیگر احوال سے خالی نہیں ہوتا۔ اور خُسران کی اصل اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دینا ہے۔ اگر چہ ایک لمحے ہی کے لئے کیوں نہ ہو۔ اس لئے اس سے بھی توبہ واجب ہے۔ اور اگر کوئی اس جیسا ہو گیا کہ ہمیشہ برسرِ فکر و ذکر رہا اور ذکر و فکر سے عاری نہ ہو پھر بھی اور مختلف اور متفاوت مقامات ہیں اور ان درجات میں سے ہر ایک کا متناسب نقصان ہے۔ باوصف اس کہ اس سے بالاتر ہو اور ناقص درجے پر قناعت کرنا۔ جب کہ اس کی تکمیل ممکن ہو تو اس کے غبن و خُسران پر توبہ واجب ہے۔ اور یہ جو آنحضرت نے فرمایا ہے کہ ''میں ایک دن میں ستر بار توبہ و استغفار کرتا ہوں''۔ تو یہ اس لئے ہو کہ ان کا کام متواتر ترقی اور فزونی میں ہو۔ اور جس مرتبے پر پہنچے ہوں کمال سے آگاہ ہوئے ہوں کہ ان کا پہلا قدم مختصر تھا اس لئے گذشتہ قدم پر استغفار کرتے ہوں۔ اور توبہ کرتے ہوں۔ کیونکہ اگر کوئی ایسا کام کرتا ہو جس سے ایک درم حاصل کیا جا سکتا ہو تو جب ایک درم پا لیتا ہے تو خوش ہو جاتا ہے اور اگر اسے معلوم ہو کہ ایک دینار حاصل کر سکتا ہے اور وہ ایک درم پر قانع رہا تو غمگین ہو گا۔ اور اپنی اس تقصیر کے باعث پریشان ہو گا۔ یہاں تک کہ ایک دینار حاصل کر لے اور خوش ہو جائے۔ اور گمان کرتا ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہو گا۔ لیکن جب

اسے معلوم ہوتا ہے کہ ہزار دینار کا گراں قدر گوہر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے تو بھی پشیمان ہوگا کہ میں نے تقصیر کی اور توبہ کرے گا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ "حسنات الابرار سیئات الاقربین" یعنی پارساؤں کا کمال بزرگوں کے حق میں نقص کے مترادف ہوتا ہے اسی لئے وہ اس سے استغفار کرتے ہیں۔

سوال: اگر کوئی کہے کہ جب کسی نے کفر اور معصیت سے توبہ کرلی۔ تو بزرگ درجات کے پانے میں تقصیر پر توبہ کرنا تو فضایل میں سے ہوگا نہ کہ فرائض میں سے تو آپ نے کیوں یہ کہا کہ اس پر بھی توبہ واجب ہے؟

جواب: یہ ہے کہ وجوب دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ جو ہم عوام خلق کے درجے پر ظاہر فتوٰی میں کہتے ہیں وہ مقدار کہ جس میں لوگ مشغول ہوں عالم ویران نہ ہوگا اور لوگ معیشت دنیا میں لگ جائیں گے۔ اور یہ انھیں عذاب دوزخ سے بچالے گا۔

واجبِ دوم: یہ ہے کہ عمومِ خلق اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ اور جو اس پر قیام نہ کرے عذاب دوزخ سے تو نجات پا جائے گا۔ لیکن بالاتر درجے کی حسرت سے تو نجات نہ پائے گا۔ کیونکہ جب آخرت میں ایک گروہ کو خود سے بالاتر درجے میں دیکھے گا تو جیسے کہ ستارے کو آسمان پر دیکھے تو وہ غبن و حسرت جو اس پر طاری ہوں گے وہ بھی تو ایک عذاب ہی ہے۔ تو یہ توبہ جو ہم نے واجب قرار دی ہے وہ اسی عذاب سے نجات کا باعث ہوگی۔

جس طرح ہم اس دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ہمارے اقارب میں سے ایک درجے میں بڑھ جاتا ہے تو دوسرے پر یہ جہان غبن و حسرت میں تنگ و تاریک ہوتا ہے۔ اگرچہ تازیانے اور ہاتھ کٹنے اور مصادرے سے بچا ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ روزِ قیامت کو روزِ تغابن کہا جاتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی غبن سے خالی نہ ہوگا۔ جس نے طاعت نہ کی تو کیوں نہ کی اور جس نے کی زیادہ کیوں نہ کی۔ یہی وجہ تھی کہ انبیاء و اولیاء کا طریق یہ تھا کہ جہاں تک کر سکے طاعت سے ہاتھ نہ کھینچا اور فرماتے تھے کہ کل حسرتِ تقصیر نہ ہو۔ اور اس بارے میں کیا کہتے ہو کہ آنحضرت خود کو بھوکا رکھتے تھے۔ کیا انھیں معلوم نہ تھا کہ روٹی کھانا حرام نہیں؟ یہاں تک کہ حضرت عایشہ کا بیان ہے کہ میں آپ ﷺ کے شکم پر ہاتھ پھیرتی تو مجھے آپ ﷺ پر رحم آتا تھا۔ میں رونے لگتی تھی۔ میں کہتی "میری جان آپ ﷺ پر فدا ہو کیا ہو جائے گا اگر آپ اس روٹی سے سیر ہو کر کھالیں؟ تو آپ ﷺ فرماتے "اے عایشہ میرے اولوالعزم بھائی مجھ سے پہلے چلے گئے اور انھوں نے یہ کرامتیں دیکھیں اور خلعتیں پائیں۔ مجھے خوف ہے کہ اگر میں دنیا سے بہرہ یاب ہوں میرا درجہ ان سے کمتر ہو جائے گا۔ اس لئے چند روز صبر کرتا ہوں۔ اور یہ مجھے اپنے بھائیوں سے پیچھے رہ جانے کی نسبت زیادہ پسند ہے"۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام لیٹے تو ایک پتھر سرہانے

کے طور پر سر کے نیچے رکھ لیا۔ تو شیطان نے ان سے کہا کہ ''آپ نے ترکِ دنیا کے لئے نہیں فرمایا تھا کہ اب اس سے پشیمان ہو گئے ہو؟'' تو حضرت نے کہا کہ کیا کیا میں نے؟'' تو ابلیس نے کہا کہ ''تم نے پتھر اپنے سر کے نیچے رکھ کر آسایش کا سامان کیا ہے''۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وہ پتھر پھینک دیا اور فرمایا کہ: ''لو یہ بھی میں نے دنیا میں تیرے لئے چھوڑ دیا''۔ آنحضرت نے نعلین میں نئے تسمے ڈال رکھتے تھے جب بھلے لگے تو آپ نے فرمایا تو وہی پرانے تسمے واپس لائے گئے۔ اور نعلین میں ڈال دیئے گئے۔ اور نئے تسمے نعلین سے نکال دیئے گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دودھ کا ایک گھونٹ پیا تو جب معلوم ہوا کہ مشتبہ ہے تو انگلی گلے میں ڈالی اور خوف یہ تھا کہ جان ہی نکل جائے گی۔ تو تمھارا کیا خیال ہے کہ فتویٰ عامہ کی رُو سے یہ واجب نہ تھا؟ لیکن فتویٰ عامہ اور ہے اور صدیق جس خطرے کے شاہد ہوتے ہیں وہ اور ہے۔ اور مخلوق میں اللہ تعالیٰ کے سب سے بڑے عارف اور راہِ خداوندی کے خطرے کے عارف یہی لوگ ہیں۔ یہ گمان نہ کیجئے گا کہ انھوں نے یہ رنج عبث اٹھائے ہیں۔ لہٰذا اقتدا ان کی کرو اور فتویٰ عامہ پر ٹھہرے نہ رہو کہ وہ اور ہی قصہ ہے۔

پس تم نے اس تمام بیان سے جان لیا ہوگا کہ انسان کسی حال میں بھی توبہ سے مستغنی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بوسلیمان دارانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اگر انسان کسی چیز پر نہ روے سوائے اس بات کے اس نے اس حد تک اپنا وقت ضایع کر دیا ہے۔ تو یہ غم وقتِ مرگ تمام ہو جاتا ہے۔ پس اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو مستقبل کو بھی اسی طرح ضایع کر دیتا ہے؟'' جان لیجئے کہ جو کوئی نفیس گوہر کا مالک ہو اور وہ اسے کھودے تو یہ اس کے لئے گریہ وزاری کا باعث ہوگا۔ اور اگر ضائع ہونے کے علاوہ اس کے لئے بلا اور عقوبت کا سبب بن جائے۔ تو رونا اور بھی بڑھ جائے گا۔ زندگی کا ہر سانس ایک گوہر ہے کہ جس کے ذریعے ابدی سعادت کو شکار کیا جا سکتا ہے۔ تو جب کوئی اس سانس کو معصیت کی نذر کر دیتا ہے تاکہ اس کی ہلاکت کا سبب بن جائے۔ تو ایسے کا حال کیسا ہوگا۔ اگر اسے اس معصیت کی خبر ہو جائے؟ لیکن مصیبت یہ ہے کہ انسان کو یہ خبر اس وقت ہوتی ہے جب کہ حسرت کا کوئی فایدہ نہیں ہوتا۔ اور یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ''وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰکُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ'' (قرآن: ۱۰/۶۳) (اور جو روزی تمھیں دی گئی ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے ایک کو موت آ جائے اور وہ کہے اے اللہ تو مجھے زمان قریب کے لئے مہلت کیوں نہیں دیتا) کہتے ہیں کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ بندہ وقتِ مرگ ملک الموت کو دیکھتا ہے تو جانتا ہے کہ اب چل چلاؤ ہے تو اس کے دل پر وہ حسرت گذرتی ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ تو بندہ کہتا ہے کہ اسے ملک الموت! مجھے ایک روز کی مہلت دے تاکہ میں توبہ کروں اور معافی مانگوں تو

ملک الموت کہے گا کہ پہلے کتنے ہی دن تھے۔ اب تمھاری عمر تمام ہو چکی اور کچھ باقی نہیں۔ تو بندہ کہے گا کہ ایک ساعت کی مہلت دے تو ملک الموت کہے گا کہ ساعت بھی تمام ہو چکی کوئی ساعت باقی نہیں۔ تو جب انسان مایوسی کا یہ شربت چکھتا ہے تو اصل ایمان اس کا مضطرب ہو جاتا ہے۔ اگر' پناہ بہ خدا ازل میں اس کا خاتمہ شقاوت پر کیا گیا ہو تو دنیا سے شک واضطراب میں جاتا ہے اور بدبخت ہو جاتا ہے۔ اور اگر خاتمہ اس کا سعادت پر کیا گیا ہو تو وہ اصل ایمان سلامت لے گیا۔ اور فرمان خداوندی ہے: ''وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْئٰنَ'' (قرآن: ۱۸/۴) (اور ان کی توبہ قبول نہیں کی جاتی کہ جو جو شرک کرتے ہیں اور برائیاں کرتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے ایک پر موت آ جاتی ہے تو کہتا ہے اب میں لوٹ جاؤں) یوں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بندے کے ساتھ دو بھید ہوتے ہیں ایک اس وقت جب وہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''میں نے تجھے پاک اور آراستہ پیدا کیا اور زندگی تمھیں امانت کے طور پر دی تو کان کھول کر سن لے کہ موت پر تو اسے مجھے کس حالت میں لوٹاتا ہے۔ اور دوسرا بھید اللہ تعالیٰ کا وقت مرگ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ: ''اے میرے بندے میری امانت کا تم نے کیا کیا؟ اگر تو نے اس امانت کو کما حقہ محفوظ رکھا۔ تو خبر اس کی پالے گا اور اگر تو نے امانت ضایع کر دی ہے تو دوزخ تمھاری منتظر ہے' تیار ہو جاؤ۔

توبہ کی قبولیت کے بیان میں

یاد رہے کہ توبہ جب اپنی شرایط کے ساتھ کی جائے تو لازماً قبول ہوتی ہے۔ اس لئے جب تم نے توبہ کر لی تو اس کی قبولیت کے بارے میں شک نہ کرنا۔ بلکہ شک اس میں کرنی چاہئے کہ توبہ بہ شرط ہوئی ہے یا نہیں؟

اور جس نے انسانی دل کی کلی حقیقت کو پہچان لیا کہ کیا ہے اور دل کا تعلق بدن کے ساتھ کس طرح کا ہے اور دل کی مناسبت حضرتِ الٰہی کے ساتھ کس طرح کی ہے۔ اور دل کا حجاب کس شے سے ہوتا ہے۔ تو اسے شبہ میں نہ رہنا چاہئے کہ حجاب کا سبب گناہ ہوتے ہیں اور توبہ قبولیت کا سبب۔ کیونکہ انسان کا دل اپنی اصل کے اعتبار سے فرشتوں کے گوہر میں سے ایک پاک گوہر ہے اور ایک آئینے کی مانند ہے جس میں حضرتِ الٰہیت کا ظہور ہوتا ہے۔ اگر انسان اس دنیا سے پاک دل کے ساتھ جس میں زنگار نہ ہو رخصت ہو۔

انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے آئینہ دل پر ایک سیاہ دھبہ لگ جاتا ہے اور ہر طاعت کے ارتکاب پر دل پر ایک نور پیوند پاتا ہے جو معصیت کے دھبے کو دل سے دور کر دیتا ہے۔ طاعت کے یہ انوار اور معاصی کی ظلمت آئینہ دل پر مسلسل اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ جب ظلمت بڑھ جائے اور انسان توبہ کر لے تو

طاعات کے انوار اس ظلمت کو دور کر دیتے ہیں۔ اور دل باصفا اور اپنی پاکی کو پالیتا ہے۔ اِلا یہ کہ کوئی ارتکاب گناہ میں اتنا مصر ہو کہ زنگ دل کے جوہر تک پہنچ کر اس میں نفوذ کر گیا ہو۔ ایسا دل خود توبہ نہیں کر سکتا۔ سوائے اس کے کہ زبان سے کہے کہ میں نے توبہ کی جس طرح میلا لباس صابون سے دھونے پر پاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دل بھی ظلمتِ معاصی سے طاعت کے انوار کے ذریعے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی بناء پر آنحضرت نے فرمایا ہے کہ ''ہر برائی کے بعد نیکی کرتا کہ برائی کو مٹا دے''۔ نیز فرمایا کہ ''اگر تُو اتنے گناہ کرے کہ آسمان تک پہنچ جائیں تو اگر توبہ کرے تو توبہ قبول ہو جائے گی''۔ نیز فرمایا کہ: ''بندہ ہو سکتا ہے کہ گناہ کے بعد بہشت میں داخل ہو جائے''۔ صحابہ نے پوچھا ''یہ کیسے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''انسان گناہ کرے اور پھر پشیمان ہو جائے اور پشیمانی اس کی آنکھوں کے سامنے رہے حتی کہ بہشت میں پہنچ جائے'' کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ ابلیس ایسے شخص کے بارے میں یہ کہنے لگے کہ کاشکے میں اسے گناہ میں نہ ڈالتا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''نیکیاں گناہوں کو یوں محو کر دیتی ہیں جیسے صابون کپڑے سے میل کو مٹا دیتا ہے''۔ نیز فرمایا کہ: ''جب ابلیس ملعون ہوا تو کہنے لگا ''تیری عزت کی قسم میں آدمی کے دل سے جب تک اس کے بدن میں جان ہے باہر نہ آؤں گا''۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''مجھے اپنی عزت کی قسم کہ میں انسان پر توبہ کا دروازہ بند نہ کروں گا۔ جب تک اس کے بدن میں جان ہے''۔ ایک حبشی آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو کہنے لگا کہ: ''مجھ سے بہت سے فواحش کا ارتکاب ہوا ہے۔ کیا میری توبہ قبول ہوگی؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''قبول ہوگی''۔ جب وہ جانے لگا تو لوٹ کر بولا کہ ''جب میں گناہ کیا کرتا تھا تو کیا اللہ مجھے دیکھتا تھا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''ہاں دیکھتا تھا''۔ حبشی نے نعرہ مارا اور گر کر جان دے دی''۔

فضیلؒ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''اللہ عزوجل نے پیغمبروں میں سے ایک سے کہا کہ میرے بندوں کو بشارت دے اگر وہ توبہ کر کریں گے تو میں قبول کروں گا۔ اور صدیقوں کو ڈراؤ کہ اگر میں عدل ان کے ساتھ کروں گا تو سب کو سزا دوں گا''۔ طلق بن حبیبؒ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ کے حقوق اس سے کہیں عظیم تر ہیں کہ ادا کئے جا سکیں اس لئے انتہائی کوشش کرو کہ صبح توبہ کرتے ہوئے بیدار ہو تو رات توبہ کرتے ہوئے سوؤ''۔ اور حبیب بن ثابتؒ کہتے ہیں کہ: ''گناہ بندے کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں تو انسان دیکھ کر کر کہتا ہے ''افسوس کہ میں تو ہمیشہ تجھ سے ڈرتا تھا''۔ تو اس کے حق میں کوئی ایسی چیز صرف کی جاتی ہے کہ وہ اس سے ڈرا ہو''۔

بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا کہ جس نے گناہ بہت کئے تھے۔ تو اس نے چاہا کہ توبہ کرے اور اسے یہ

معلوم نہ تھا کہ توبہ قبول کی جائے گی یا نہیں۔ تو لوگوں نے اسے ایسے شخص کے بارے میں اطلاع دی جو اس زمانے کا عابد ترین شخص تھا تو اس نے اس عابد سے پوچھا کہ "میں بہت زیادہ گناہ گار ہوں اب تک میں نے ننانوے آدمیوں کو قتل کیا ہے، تو کیا میری توبہ قبول ہوگی؟" تو عابد نے کہا: "نہیں"، تو اس شخص نے اس عابد کو بھی قتل کر دیا۔ جس سے مقتولوں کی تعداد سو ہوگئی۔ اس کے بعد اسے ایک عالم ترین شخص کے بارے میں خبر دی گئی۔ تو اس نے اس کے پاس جا کر یہی سوال کیا کہ میرے لئے توبہ ہے؟ تو اس عالم نے کہا "ہاں ہے لیکن اپنی زمین سے چلا جا کہ یہ فساد کی جگہ ہے۔ اور فلاں جگہ چلا جا کہ جہاں اہل صلاح رہتے ہیں"۔ وہ گیا لیکن راہ ہی میں فوت ہوگیا۔ تو رحمت کے فرشتوں اور عذاب کے فرشتوں میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ ان میں سے ہر ایک یہ کہتا تھا کہ وہ میرے علاقے میں ہے تو اللہ نے حکم دیا کہ زمین کی پیمائش کرلیں۔ تو وہ اہل صلاح کے نزدیک ایک ہاتھ بھر زیادہ نکلا۔ پس رحمت کے فرشتے اس کی روح کو لے گئے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ برائیوں کا پلڑا خالی ہو لیکن چاہئے کہ نیکیوں کا پلڑا نسبتاً بھاری ہو اگرچہ ذرا ہی سا زائد ہو۔ لیکن اس سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

گناہِ صغیرہ و کبیرہ کا بیان

معلوم رہے کہ توبہ گناہ سے کی جاتی ہے۔ اور گناہ جس قدر صغیرہ ہوگا تو اس کا کام آسان ہے۔ بشرطیکہ انسان اصرار نہ کرے۔ حدیث میں ہے کہ فرض نماز کی ادائیگی تمام گناہوں کا کفارہ ہے سوائے کبائر کے۔ اور نمازِ جمعہ، ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے تمام گناہوں کا کفارہ ہے۔ سوائے کبائر کے۔ اور فرمانِ خداوندی ہے کہ: "اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ" (قرآن: ۳۱/۴) اگر لوگ کبائر سے باز رہیں تو ہم ان کے صغیرہ گناہ بخش دیں گے۔ پس یہ فرض ہے کہ جانا جائے کہ کبائر کون سے ہیں۔ صحابہ میں ان کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ تعداد میں سات ہیں بعض کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ ہیں تو بعض کے نزدیک کم ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے سنا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کبائر سات ہیں تو ابن عباس نے کہا کہ سات کی نسبت ستر کے قریب ہیں"۔ اور ابو طالب مکی جنھوں نے "قوت القلوب" نام کی کتاب تالیف کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے تمام احادیث اور اقوال صحابہ کو جمع کیا ہے۔ کبائر کی تعداد سترہ ہے:

چار دل میں سے ہوتے ہیں۔ ایک کفر دوسرا معصیت پر اصرار اگرچہ صغیرہ ہو۔ جیسے کوئی برا کام کرے لیکن اس کے دل میں توبہ کا کبھی خیال نہ آتا ہو۔ تیسرے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامیدی جسے قنوط کہا جاتا ہے۔ اور چوتھے اللہ تعالیٰ کی تدبیر و گرفت سے بے فکری۔ چنانچہ دل میں ہو کہ میں تو بخشا بخشایا ہوا ہوں۔

چار زبان سے ہوتے ہیں: ایک جھوٹی گواہی جس سے حق باطل ہو جائے۔ دوسرے شوہر دار عورتوں پر تہمت لگانا جن سے حد لازم ہوتی ہے۔ تیسرے جھوٹی قسم کھانا کہ جس کے ذریعے کسی کا مال ناحق غصب کرے۔ چوتھے جادو کہ وہ بھی کلمات ہیں جو زبان سے ادا ہوتے ہیں۔

تین پیٹ سے متعلق ہیں: ایک شراب پینا اور ہر وہ شے جو مستی لاتی ہو اسے استعمال میں لانا' دوسرے یتیم کا مال کھانا اور تیسرے سود کھانا اور سود دینا۔

اور دو شرم گاہ سے متعلق ہیں: زنا ولواطت

اور دو ہاتھ سے متعلق ہیں: قتل اور چوری کرنا اس قدر کہ حد واجب ہو۔

اور ایک پاؤں سے متعلق ہے: اور وہ ہے کافروں سے جنگ میں فرار کرنا۔ جیسے ایک دو سے یا دس بیس سے جنگ میں فرار کریں۔ لیکن اگر اس سے زیادہ ہوں تو فرار جائز ہوگا۔

اور ایک تمام بدن سے متعلق ہے اور وہ ہے والدین کی نافرمانی۔

معلوم رہے کہ یہ سترہ اس بناء پر کبائر سمجھے گئے ہیں کہ ان میں سے بعضے پر حد واجب ہے اور بعضے اس لئے کہ قرآن میں ان کے بارے میں عظیم تہدید وارد ہوئی ہے۔ ان کی تفصیل ہم اپنی کتاب احیاء میں بیان کر چکے ہیں اور اس کتاب (کیمیائے سعادت) میں اس کی گنجائش نہیں۔ جاننا ان کا اس لئے ضروری ہے تاکہ کبائر سے احتیاط زیادہ کی جائے۔

معلوم رہے کہ اگر صغیرہ پر اصرار کیا جائے تو یہ کبیرہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ہم کہیں کہ فرائض صغائر کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو اپنی گردن پر ایک پیسے کا غصب بھی رکھتا ہے جب تک اس کا کفارہ بصورت ادائیگی نہ کرے اپنے قرض سے عہدہ برآ نہیں ہوتا۔ مختصر یہ کہ ہر وہ معصیت جو اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہے اس کا معاف ہو جانا ان مظالم کی نسبت جو خلق سے تعلق رکھتے ہیں نزدیک تر ہے۔ حدیث میں ہے کہ: گناہ کے دفتر تین ہیں۔ ایک وہ دیوان ہے جس کی بخشش نہیں اور وہ ہے شرک وکفر۔ اور وہ دیوان کہ جس میں مندرجہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں وہ ایسے گناہ ہیں جو بندے اور اللہ کے درمیان ہیں۔ اور وہ دیوان جس کے گناہ فروگذار نہیں ہوتے وہ ہیں جو لوگوں پر مظالم کی صورت میں ہیں۔ یاد رہے کہ جس عمل سے بھی اسلام کا ضرر ہو وہ منجملہ اسی کے ہے۔ نفس میں ہو' مال میں ہو یا حشمت ومروّت میں ہو یا دین میں ہو۔ جیسے کہ کوئی لوگوں کو بدعت کی طرف بلائے کہ ان کے دین کو اچک لے یا وہ جو وعظ میں ایسی باتیں کہے کہ جس سے عوام معصیت پر دلیر ہو جائیں۔

صغائر کبائر میں کیسے تبدیل ہو جاتے ہیں اس کا بیان

معلوم رہے کہ صغیرہ کے مرتکب کے بارے میں امید ہے کہ اسے اس میں معافی مل جائے گی لیکن بعض اسباب کی بنا پر گناہِ صغیرہ بھی بہت بڑے ہو جاتے ہیں۔ اور خطرہ ان کا بڑا سخت ہے اور وہ اسباب چھ ہیں :

اوّل: یہ کہ کوئی صغیرہ پر اصرار کرے۔ جیسے کوئی مسلسل غیبت کرتا رہے یا ریشمی لباس زیب تن رکھے یا لہو ولعب پر مشتمل موسیقی سنے یا ایسی معصیت کہ دائمی ہو اس کا ارتکاب کرے۔ تو ایسے امور دل کے نور پر بڑا گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''بہترین اعمال وہ ہیں جو ہمیشہ کئے جائیں اگرچہ مختصر ہی کیوں نہ ہوں۔ مثال اس کی بارش کے پانی کے وہ قطرے ہیں جو لگا تار کسی پتھر پر گرتے ہیں لازماً پتھر پر سوراخ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر پتھر پر ایک ہی دفعہ بہت سا پانی گرا دیا جائے اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ پس جو صغیرہ گناہ میں مبتلا ہے چاہئے کہ وہ استغفار کرے اور پشیمان ہو اور عزم کرے کہ مزید نہ کرے گا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ کبیرہ استغفار سے صغیرہ ہو جاتے ہیں اور صغیرہ استمرار سے کبیرہ ہو جاتے ہیں۔

دوسرے: یہ کہ کوئی گناہ کو معمولی سمجھے اور اسے حقیر سمجھے تو اس سے گناہ بڑا ہو جاتا ہے۔ اور اگر کوئی گناہ بڑا عظیم سمجھے تو وہ صغیرہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ گناہ کو عظیم جاننا ایمان اور خوف کی برکت سے جنم لیتا ہے اور یہ بات دل کو گناہ کی ظلمت سے بچاتی ہے تاکہ زیادہ اثر نہ کرے۔ اور کسی گناہ کو معمولی سمجھنا گناہ سے محبت اور غفلت کا ثمر ہے۔ اور یہ دلیل اس امر کی ہے کہ اس نے دل کے ساتھ مناسبت پیدا کر لی ہے اور مقصود سب کا دل ہے۔ جو بھی دل پر زیادہ اثر انداز ہو وہ عظیم تر ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ ''مومن اپنے گناہ کو پہاڑ سے بھی اونچا سمجھتا ہے اور ہر وقت ڈرتا ہے کہ یہ پہاڑ اس پر آ گرے گا۔ جب کہ منافق اپنے گناہ کو ایک مکھی کی طرح سمجھتا ہے جو اس کی ناک پر بیٹھے اور اڑ جائے۔ کہتے ہیں کہ وہ گناہ جو بخشے نہ جائیں گے وہ ہیں کہ بندہ کہتا ہے کہ ''یہ سہل ہیں کاشکے میرے تمام گناہ اسی کے سے ہوتے ہیں''۔ بعض انبیاء پر وحی آئی کہ ''گناہ کے چھوٹے ہونے کو نہ دیکھ بلکہ اس کے بڑے ہونے کو دیکھ کہ تو اللہ کے فرمان کے برعکس کر رہا ہے'' اور جس قدر کوئی اللہ تعالیٰ کے جلال کا شناسا تر ہوگا اسی قدر اس کے نزدیک معمولی گناہ نہایت گھمبیر ہوگا۔ صحابہ میں سے ایک فرماتے ہیں کہ ''تم ایسے گناہ کرتے ہو جنھیں تم بال برابر سمجھتے ہو جب کہ ہم ان میں سے ہر گناہ کو کوئی پہاڑوں کے برابر جانتے ہیں''۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کا غضب معاصی میں مخفی ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ اس معصیت میں ہو جسے تو معمولی سمجھتا ہے۔ جیسے کہ فرمانِ خداوندی ہے کہ: ''تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ'' (قرآن: ۱۵/۲۴)
(تم گمان کرتے ہو کہ یہ معمولی ہے لیکن وہ اللہ کے نزدیک عظیم ہوتا ہے)۔

سوم: یہ کہ انسان گناہ کے ارتکاب پر خوش ہو اور اسے مالِ غنیمت اور فتوح سمجھے۔ اور اس پر فخر کرے اور ممکن ہے کہ مباہات اور نازش کے طور پر کہے کہ میں نے فلاں کو فریب دیا اور اس کا مال لے لیا۔ یا کہے کہ میں نے فلان کی خوب گوشمالی کی اُسے گالی دی اور ذلیل کیا اور مناظرے میں اسے شکست دی وغیرہ۔ اور جو کوئی اپنی ہلاکت پر شاداں ہو اور فخر کرتا ہو تو یہ دلیل اس بات کی ہے کہ اس کا دل سیاہ ہو چکا ہے' جو اس کی ہلاکت کا باعث ہے۔ پناہ بخدا!

چہارم: یہ کہ چونکہ گناہ گار کے گناہ کی پردہ پوشی کی جاتی ہے تو انسان سمجھتا ہے کہ خود یہ اس کے حق میں اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے اور نہیں ڈرتا کہ یہ تو اِتمام حجت ہے تا کہ کاملاً ہلاک ہو جائے۔

پنجم: یہ کہ کوئی اپنی معصیت کا اظہار کرے اور جو پردہ خدائے تعالیٰ نے اس پر ڈالا تھا وہ خود اسے اٹھا دے۔ اور ہوسکتا ہے کہ کوئی اور بھی اسی سبب سے اس کی رغبت کرے تو اسے اس کی رغبت و معصیت کے وبال کا سامنا کرنا پڑے جب کوئی صریحاً برائی کی ترغیب دے اور اس کے اسباب مہیا کرے کہ دوسروں کو بھی اس کی تدریس ہو تو یہ وبال دگنا ہو جائے گا۔ اسلاف کا فرمان ہے کہ: ''کسی مسلمان کے لئے اس سے بڑا گناہ کوئی نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کی نگاہوں میں معصیت کو معمولی اور آسان دکھائے''۔

ششم: یہ ہے کہ کوئی عالم یا پیشوا گناہ کرے اور دوسرے بھی اس کے کردار کی وجہ سے بے باک ہو جائیں اور کہیں کہ: ''اگر یہ ممنوع ہوتا تو ہمارا امام اس کا ارتکاب نہ کرتا''۔ جیسے کوئی عالم ریشمی لباس زیب تن کرے۔ بادشاہ کے ہاں جائے اور ان سے مال حاصل کرے اور مناظرے میں سفیہوں کی زبان استعمال کرے اور اپنوں پر زبان طعن دراز کرے۔ اور جاہ و مال کی کثرت پر فخر کرے۔ تو اس کے سب شاگرد اس کی پیروی کریں گے۔ اور جب یہ شاگرد استادی کو پہنچیں گے تو ان کے شاگرد انھیں کی اقتداء کریں گے اور ہر ایک کا قرب و جوار برباد ہو جائے گا۔ کیونکہ جس شہر کے شہری ان میں سے کسی کو دیکھیں گے تو وبال سب کا مقتدا پر ہو گا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ''خوش نصیب ہے وہ کہ جب مرے تو اس کے گناہ بھی مر کر نابود ہو جائیں گے''۔ علمائے بنی اسرائیل میں سے ایک نے توبہ کی تو اس زمانے کے نبی پر وحی آئی کہ اسے کہو کہ ''اگر گناہ میرے اور تیرے درمیان ہوتا تو ممکن ہے میں اسے معاف کر دیتا۔ لیکن اب سوچ کہ تو نے خود تو توبہ کر لی لیکن جس قوم کو گمراہ کیا اور وہ گمراہی میں رہے ان کا کیا کرے گا''۔ اسی لئے ہے کہ علماء معرضِ خطر میں ہوتے ہیں کیونکہ ان کا ایک گناہ ایک نہیں بلکہ ہزار شمار ہوتا ہے اور ان کی اطاعت بھی ایک ہو تو ہزار سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ ثواب ان لوگوں کی بناء پر حاصل ہوتا ہے کہ جنھوں نے اس کی اطاعت کی ہو۔ اس وجہ سے علماء کے لئے تو اور بھی لازم تر

ہے کہ معصیت نہ کریں۔ اگر مرتکب ہو جائیں تو اسے مخفی رکھیں بلکہ اگر کوئی امر مباح بھی ہو کہ جس کے باعث خلق کے غافل ہو جانے کا خوف ہو اس سے علماء حذر کریں۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ: ''پہلے ہم ہنسا کرتے تھے۔ اور کھیل کود لیتے تھے لیکن اب جب کہ مقتدا ہو گئے تبسم بھی جائز نہیں رہا۔ اور یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ کوئی کسی عالم کے گناہ کا ذکر کرے کیونکہ اس سے کثیر لوگ راہ سے بھٹک جائیں گے اور بے خوف ہو جائیں گے۔ پس تمام لوگوں کی لغزش کی پردہ پوشی لازم ہے۔ اور علماء کی لغزش تو کہیں زیادہ یہ استحقاق رکھتی ہے کہ ان کی خطا کی پردہ پوشی کی جائے۔

توبہ کی شرط اور اس کی علامت کا بیان

یاد رہے کہ اصل توبہ ندامت ہے۔ اور اس ندامت کا نتیجہ عزم ہے جو نمودار ہوتا ہے اور ندامت کی علامت یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اس کے بارے میں اندوہ اور حسرت میں مبتلا رہے کہ صورت اس کی یہ ہے کہ انسان ہمیشہ رونے' زاری اور تضرّع میں رہے کیونکہ جو کوئی خود کو معرضِ ہلاکت میں دیکھے وہ حسرت واندوہ سے خالی کیونکر رہ سکتا ہے؟ اور اگر اس کا فرزند بیمار ہو اور عیسائی یا آتش پرست طبیب بھی کہہ دے کہ بیمار خطرے میں ہے اور خوف یہ ہے کہ ہلاک ہو جائے۔ تو ظاہر ہے کہ اندوہ وبیم کی کیسی آگ باپ کی جان میں لگے گی۔ مسلّم ہے کہ اس کی جان اس کے بیٹے سے بھی عزیز تر ہے اور خدا اور اس کا رسول عیسائی طبیب سے کہیں زیادہ راست گو ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی گرفت معصیت پر بیماری کی مرگ پر دلالت سے روشن تر ہے۔ پس اگر کسی میں اس بناء پر خوف وحسرت پیدا نہ ہوں تو اس لئے کہ ایمان اس کا ابھی تک آفتِ معصیت میں پیدا نہیں ہوا۔ اور یہ آگ جس قدر سوز انتر ہوگی تو اثر اس کا گناہوں کی تکفیر میں اسی قدر زیادہ ہوگا۔ کیونکہ وہ زنگ وظلمت جو دل پر گناہ کے باعث بیٹھ گئی تھی اس کا ازالہ سوائے حسرت وندامت کے ممکن نہیں۔ اور اس سوز میں دل صاف اور نرم ہونے لگتا ہے۔

حدیث میں وارد ہے کہ 'تائبوں کی صحبت اختیار کرو کیونکہ ان کا دل رقیق تر ہوتا ہے'' اور دل جس قدر پاک تر ہوتا ہے اسی قدر گناہوں سے نفور تر ہوتا ہے۔ اور گناہ کی لذت دل میں جا کر تلخی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انبیاء میں سے ایک نے بنی اسرائیل میں سے اک شخص کی توبہ کی مقبولیت کے لئے شفاعت کی۔ تو وحی آئی کہ:
''مجھے اپنی عزت کی قسم کہ اگر تمام آسمان بھی شفاعت کریں گے تو میں قبول نہ کروں گا جب تک اس کے دل میں گناہ کی حلاوت باقی ہے''۔ یاد رہے کہ معصیت اگرچہ طبعاً مطلوب ہوتی ہے لیکن تائب کے حق میں ایسے شہد کی مانند ہوتی ہے جس میں زہر ملا ہوا ہو۔ جو کوئی اسے ایک دفعہ چکھے تو تکلیف بہت دیکھے تو جب وہ اس کا خیال دل

میں لائے تو اس کے جسم پر بال کراہیت کی بناء پر کھڑے ہو جائیں۔ تو اس کی لذت اور شہوت زیان کے خوف سے ڈھنپ جائیں اور چاہئے کہ انسان یہی تلخی تمام معاصی میں پائے۔ کیونکہ جو معصیت اس نے کی ہے زہر اس بناء پر ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی گرفت ہوتی ہے اور تمام معاصی اسی نوع کے ہیں۔

اور وہ عزم کہ جس میں یہ ندامت پیدا ہوتی ہے تین چیزوں سے تعلق رکھتا ہے اور وہ ہیں: حال، ماضی اور مستقبل۔

حال: یہ ہے کہ تمام معصیتوں کو ترک کر دے اور جو کچھ انسان کا فریضہ ہے اس میں مصروف ہو جائے۔

مستقبل: یہ ہے کہ عزم کرے کہ زندگانی کے آخر تک اسی پر صبر کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ظاہر و باطن میں پختہ عہد کرے کہ کبھی اس معصیت کے درپے نہ ہوگا۔ اور فرایض میں تقصیر نہ کرے۔ جیسے کہ بیمار کو علم ہو کہ فلاں پھل اس کے لئے مضر ہے تو وہ عزم کر لیتا ہے کہ اسے نہ کھائے گا۔ اور حال میں سستی اور تردّد کا عزم نہیں ہوتا۔ اگرچہ ممکن ہے کہ شہوت غلبہ کرے۔ اور ممکن نہیں ہوتا کہ توبہ کو سلامت رکھ سکے۔ اِلّا بہ تنہائی و خاموشی ولقمۂ حلال کہ حاصل کر چکا ہو۔ یا کسبِ حلال پر قادر ہو اور جب تک مشتبہ کسب سے ہاتھ نہ روکے گا توبہ کامل نہ ہوگی۔ اور جب تک شہوات کو شکست آشنا نہیں کر پاتا تو مشتبہ سے بھی ہاتھ نہیں روک سکتا۔ اور کہتے ہیں کہ جس کسی پر کوئی شہوت غلبہ پا چکی ہو تو اسے چاہئے کہ سات بار اس خواہش سے خود کو جہد کے ذریعے بچائے رکھے تو پھر یہ کام اس کے لئے آسان ہو جائے گا۔

اور ارادت بہ ماضی: اس سے تعلق رکھتی ہے کہ گذشتہ کی تلافی کرے اس طرح کہ غور کرے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے اور حقوق العباد میں سے کہاں کہاں تقصیر کا مرتکب ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حقوق دو قسم کے ہیں۔ ایک ادائے فرایض دوم ترکِ معاصی۔

اور **ادائے فرایض** کے بارے میں کہ جب سے وہ بالغ ہوا ہے۔ ایک دن کو یاد میں لائے۔ اگر ایک نماز کی ادائیگی نہ کی ہو یا لباس پاک پہنے نہ تھا۔ یا اس کی نیت نماز، روزے یا کسی اور عبادت میں جو نیت سے تعلق رکھتی ہے درست نہ رہی ہے کیونکہ جانتا نہ تھا۔ یا اس کے اصل اعتقاد میں خلل یا شک تھا۔ ان سب کی قضا کرے۔ اسی طرح زکوٰۃ کہ باوصف صاحب مال و نصاب ہونے کے مستحقوں تک نہ پہنچائی ہو یا زریں یا سیمیں ظروف کا مالک ہوا اور ان کی زکوٰۃ نہ دی ہو تو سب کا حساب لگا کر زکوٰۃ ادا کر دے۔ یا رمضان شریف کے فرض روزوں میں تقصیر کی ہو یا روزے کی نیت بھول گیا ہو یا نیت مشروط نہ ہو اس کا ازالہ بھی اسی طرح کرے۔ اور ان سب امور میں جن کے بارے میں قطعی یقین ہو ان کی قضا کرے۔ جن کے بارے میں شبہ میں ہو تو ظن غالب

کو اختیار کرنے میں اجتہاد کرے۔ یا جن کے بارے میں یقینی علم ہو خود کو محسوب سمجھے اور باقی کو قضا کرے اس سے گزشتہ کی تکمیل ہو جائے گی۔ یا جو کچھ غالب ظن کے مطابق ادا ہو چکا ہوا اسے محسوب سمجھے تو بھی جائز ہوگا۔ اور معصیتوں کے لئے مناسب یہ ہے کہ دیکھے کہ آغازِ بلوغ سے لے کر اب تک آنکھ' کان' ہاتھ' زبان' معدہ اور جملہ اعضا سے کن معاصی کا ارتکاب کیا ہے۔ اگر کبیرہ کا ارتکاب جیسے کہ زنا' لواطت' چوری یا شراب خواری اور جس پر بھی اللہ تعالیٰ کی حد واجب ہے سب سے توبہ کرے اور اس کے لئے واجب نہیں ہے کہ سلطان کے سامنے اقرار کرے تا کہ وہ حدّ جاری کرے۔ بلکہ اپنے ان گناہون کو مخفی رکھے۔ تدارک ان کا حددرجے کی طاعت کے ذریعے کرے۔ اور جو صغائر ہیں ان کے تدارک کے لئے بھی یہی کرے۔ مثلاً اگر کسی نامحرم پر نگاہ ڈالی ہو یا قرآن مجید کو بے وضو چھوا ہو یا بحالتِ جنبی مسجد میں بیٹھا ہو یا رُود کے ساز کا سماع کیا ہو تو ہر ایک کا کفارہ اس کی ضد کے ذریعے کرے تا کہ ان کو مٹا دے۔ کیونکہ فرمانِ خداوندی ہے کہ: ''اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ِ'' (قرآن: ۱۱/۱۱۴) (اچھے اعمال برے اعمال کا ازالہ کر دیتے ہیں)۔ اور جو ضد ہوگی اس کا اثر بیشتر ہوگا۔ سماعِ رُود کا کفارہ سماعِ قرآن اور مجلسِ علم کے ذریعے کرے اور بے غسل جماع مسجد میں بیٹھنے کا کفارہ اعتکاف اور عبادت کے ذریعے کرے۔ اور بے وضو قرآن کو چھونے کا کفارہ قرآن کے اکرام اور بکثرت تلاوت سے کرے۔ اور شراب خوری کی کفارت اس حلال مشروب کے ترک کرنے سے کرے جو اسے بہت مرغوب ہو۔ اور صدقہ دے۔ کیوں کہ ہر ظلمت جو ان سے حاصل ہوئی ہو ان کی بجائے نور اسی طرح حاصل ہوتا اور گناہوں کو مٹاتا ہے۔ اور ہر عیش اور غرور جو دنیا میں کیا ہو اس کا کفارہ د دنیا ہی میں رنج واندوہ سے ممکن ہے۔ کیونکہ دنیا کے عیش وراحت کی وجہ سے دل دنیا سے آویزاں ہو کر اسی سے بندھ جاتا ہے اور ہر رنج کہ دنیا سے اٹھائے دل اس سے ٹوٹ کر نفور ہو جاتا ہے۔

اسی بناء پر حدیث میں وارد ہے کہ: ''ہر وہ رنج جو مردِ مومن کو پہنچتا ہے اگر چہ ایک کانٹا ہی ہو جو پاؤں میں چبھ جاتا ہے اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''بعض گناہ ایسے ہیں کہ جن کا کفارہ بجز اندوہ کے نہیں ہوتا''۔ حضرت عایشہ ؓ فرماتی ہیں کہ: ''اگر بندے کے گناہ بہت ہوں اور طاعت نہ ہو کہ ان کا کفارہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر غم ڈال دیتا ہے تا کہ ان گناہوں کا کفارہ ہو جائے''۔ اور یہ گمان نہ کرنا کہ کہو کہ ''اندوہ بندے کے اختیار میں نہیں' کفارت کیسے ہوگی؟'' کیونکہ یہ ایسے نہیں ہے۔ بلکہ جو شے تیرے دل کو دنیا سے نفور کرتی ہے وہ تیرے لئے خیر ہے۔ اگر چہ یہ تمھارے اختیار میں نہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ ''آپ نے میرے بوڑھے اندوہ گین باپ یعقوب علیہ السلام کو کس

حال میں چھوڑا؟'' تو جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ ''ایسی ماں کے اندوہ میں جس کے سو فرزند مارے گئے ہوں''۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا کہ ''میرے باپ کو اس کا کیا اجر ملے گا؟'' تو حضرت جبریل نے فرمایا ''سو شہیدوں کا ثواب''۔ اور اب مظالم بندگان؛ چاہئے کہ انسان نے جن جن لوگوں کے ساتھ معاملت میں فریب کیا تھا اس کا حساب مرتب کرے۔ بلکہ معاملت کے علاوہ مجالست اور سخن گوئی میں بھی دیکھے کہ کہاں کہاں زیادتی کا مرتکب ہوا ہے تا کہ ہر وہ شخص جس کا اس پر حق ہے مال میں ہو یا اس امر میں کہ اسے رنج پہنچایا ہو یا غیبت کی ہو ادائے حق کے ذریعے اس سے عہدہ برآ ہو۔ اور جو کچھ واپس کرنے کا ہو اسے واپس لوٹائے۔ اور جس سے معافی چاہئے اس سے معافی مانگے یا اگر کسی کو قتل کیا ہو تو خود کو اس کے وارث کے حوالے کرے تا کہ وہ قصاص لے یا معاف کر دے۔ اور جو کچھ کہ اس کے ذمے ہو درم ہو یا دانگ اس کے مالک کو دنیا میں تلاش کرے اور روپیہ پیسہ واپس دے۔ اگر خود مالک نہ مل سکے تو اس کے وارث کو دے۔ اور یہ کام سخت مشکل ہے۔ خصوصاً حاکموں اور بازار والوں کے لئے کہ ان کے معاملات نہایت کثرت سے ہوتے ہیں۔ اور غیبت کے سلسلے میں تو عذر خواہی سب کے لئے دشوار ہے۔ کیونکہ انسان سب کو طلب نہیں کر سکتا۔ پس جب عاجز ہو گیا اور کوئی طریق سوا اس کے نہ رہا کہ اللہ کی فرماں برداری میں اضافہ کرے تا کہ طاعتِ خداوندی کا اتنا بڑا ذخیرہ ہو جائے کہ روزِ قیامت جب اس کی طاعت سے لوگوں کے حقوق ادا کریں تو ادائیگی کے بعد بھی نجات کے لئے بہ قدرِ کفایت طاعات باقی ہوں۔

فصل: یاد رہے کہ جس سے دوام توبہ میں کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اسے چاہئے کہ جلدی اس کا کفارہ اور تدارک کرے۔ اور وہ آثار جو اس کی دلیل ہیں وہ آٹھ کام ہیں جو گناہ کے ارتکاب پر کفارہ ہو جاتے ہیں: چار دل میں ہوتے ہیں: ایک توبہ یا توبہ پر عزم، تو دوسرا دوستی جسے دوبارہ نہ کرے گا، تیسرا یہ کہ معاقب[1] ہو اور چوتھے عفو کی امید۔ اور چار کام جسم سے متعلق ہیں: ایک یہ کہ دو رکعت نماز ادا کرے۔ اس کے بعد ستر بار استغفار کرے اور سو دفعہ کہے: ''سبحن ربی العظیم وبحمدہٖ'' اور دوسرا یہ کہ دَین کے بقدر صدقہ دے۔ تیسرا یہ کہ ایک دن کا روزہ رکھے اور چوتھا یہ کہ بعض کتابوں میں تحریر ہے کہ اچھی طرح وضو کر کے مسجد میں جا کر دو رکعت نماز ادا کرے۔ اور حدیث میں ہے کہ: ''جب تو نے گناہ چھپا کر کیا ہے اس لئے طاعت بھی چھپا کر کر۔ اور اگر آشکارا کیا تھا تو طاعت بھی آشکارا کر''۔ اور یاد رکھ کہ وہ کلمہ استغفار کہ زبان پر تو ہو لیکن دل اس میں شریک نہ ہو وہ کوئی کامل فایدہ نہیں دینے کا۔ اور دل کی شرکت اس طرح ہوتی ہے کہ طلبِ مغفرت کے وقت

(۱) **معاقب**: وہ شخص جس کے عمل بد کی سزا اسے دی جا چکی ہو۔

دل میں ہراس اور تضرّع ہو اور دل پشیمانی اور خجالت سے خالی نہ ہو۔ جب اسی طرح ہو تو اگر چہ عزم توبہ مصمم نہ کیا ہو بخشش کا امیدوار ہوگا۔ مختصر یہ کہ زبان سے استغفار کہ جس سے دل غافل ہو وہ بھی فایدے سے خالی نہیں کہ زبان کو بے ہودہ گوئی سے روکے تو خاموشی سے بھی بہتر ہوگی کہ جب زبان کو خیر کا عادی بنالے گا۔ تو کلمۂ استغفار کی خواہش بھی زیادہ ہوگی بہ نسبت یاوہ گوئی یا لعنت وغیرہ کے۔ ایک مرید نے عثمان مغربیؒ سے کہا کہ "بعض اوقات میری زبان تو ذکر میں لگ جاتی ہے لیکن دل ساتھ نہیں ہوتا"۔ تو آپؒ نے فرمایا کہ شکر کر کہ تیرے ایک عضو کو تو کام پر لگا دیا گیا ہے۔ اس باب میں شیطان تجھے فریب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "زبان کو ذکر سے خاموش کر دے۔ کیونکہ جب دل حاضر نہیں تو یہ حق تعالیٰ کی بے حرمتی ہے" اور لوگ شیطان کے اس جواب سے تین قسم کے ہو گئے ہیں:

ایک وہ سبقت کرنے والا جو کہے کہ "تم نے ٹھیک کہا۔ بے شک تمھیں اندھا کرنے کے لئے دل کو بھی حاضر کرتا ہوں تو یہ گویا شیطان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔

اور دوسرا ظالم کہ جس نے کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو واقعی زبان کی حرکت حضور دل کے بغیر بے سود ہے۔ یہ کہا اور استغفار کے ورد کو چھوڑ دیا اور گمان یہ کرتا ہے کہ میں نے بڑی سمجھ داری کی بات کی ہے۔ حالانکہ اس نے شیطان کی دوستی کی موافقت کی۔

توسوم مقتصد ہے کہ جس نے کہا کہ "اگر میں دل کو حاضر نہیں کر سکتا۔ آخر زبان سے ذکر خاموشی سے اچھا ہے۔ اگر چہ دل کے ساتھ ذکر اس سے بہتر ہے۔ جیسے بادشاہی صرافی سے بہتر ہے لیکن صرافی کناسی سے بہتر ہے۔ اور یہ لازم نہیں ہوتا کہ جو بادشاہی کے حصول سے عاجز ہو وہ صرّافی کو بھی ہاتھ سے دے دے اور کُناسی کو اختیار کر لے۔

توبہ کی تدبیر کا بیان

یادر ہے کہ جو لوگ توبہ نہیں کرتے ان کا علاج یہ ہے کہ تُو یہ معلوم کرے کہ کس سبب سے معصیت پر اصرار کرتے ہیں اور توبہ نہیں کرتے۔ وہ اسباب تعداد میں پانچ ہیں اور ہر سبب کا علاج جداگانہ ہے۔

سبب اوّل: یہ ہے کہ بیمار یا تو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا یا اس کے بارے میں شک میں ہے اور اس غرور کی اصل کا علاج ہم اسی کتاب میں ربع مہلکات کے آخر میں لکھ آئے ہیں۔

سبب دوم: وہ ہے کہ شہوت اس طرح غالب ہوتی ہے کہ وہ اسے ترک کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور لذت و شہوات اس پر اس طرح مستولی ہو چکے ہوتے ہیں کہ اسے کارِ آخرت کے خطر نیز عاقبت کے خطر سے

غافل رکھتے ہیں۔ اور زیادہ تر لوگوں کا حجاب شہوات ہیں۔ اس لئے آنحضرت نے فرمایا ہے کہ ''خدائے تعالیٰ نے دوزخ پیدا کی تو جبریل سے کہا اسے دیکھو' جب جبریل نے اس پر نظر دوڑائی اور اس کی ہیبت کو دیکھا تو کہا: ''اے اللہ تیری عزت کی قسم کہ جس نے دوزخ کی صفات کو سنا وہ اس میں نہ آئے گا' پھر اللہ تعالیٰ نے شہوات کو دوزخ کے اردگرد پیدا کیا تو فرمایا 'دیکھو' تو جبریل نے دیکھا اور بولا' مجھے خوف یہ ہے کہ کوئی بھی دوزخ میں داخل ہونے سے نہ رہے گا' پھر اللہ نے بہشت کو پیدا کیا تو جبریل سے کہا کہ 'دیکھو' تو جب جبریل نے بہشت کو دیکھا تو کہا کہ 'کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو اس کی صفات کو سنے اور اس میں داخلے کے لئے جلدی نہ کرے' اس پر اللہ تعالیٰ نے کراہتیں اور تلخ کام بہشت کی راہ اور اس کے اردگرد کھڑے کر دیئے اور فرمایا کہ 'جبریل دیکھ' تو جبریل نے کہا 'میں نے دیکھ لیا تیری عزت کی قسم مجھے خوف ہے کہ کوئی جنت میں نہ جائے گا کیونکہ اس کی راہ میں بڑی اوگھٹ گھاٹیاں ہیں۔

سبب سوم: یہ ہے کہ آخرت تو وعدہ ہے اور دنیا نقد ہے اور انسان کی طبیعت نقد کی طرف مایل ہوتی ہے۔ اور جو شے ادھار ہو یا جو اس کی نگاہوں سے دور ہے دل سے بھی دور ہو جاتی ہے۔ (از دیدہ دور از دل دور)۔

سبب چہارم: یہ ہے کہ جو مومن ہے وہ تو ہمہ روز توبہ کا عزم لئے ہوئے ہوتا ہے لیکن کل پر ڈالتا ہے۔ اور جو شہوت بھی پیش آتی ہے اسے یہ کہہ کر اس سے استفادہ کرتا ہے کہ بس اب کروں گا لیکن آئندہ نہیں۔

سبب پنجم: یہ ہے کہ گناہ ضروری نہیں ہے کہ دوزخ میں لے جائے۔ کیونکہ عفو بھی تو ممکن ہے اور انسان اپنے نصیب کے حق میں خوش گمان ہوتا ہے۔ جب شہوت سے مغلوب ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دینے والا ہے اور اللہ تعالیٰ سے رحمت کا امیدوار ہوتا ہے۔

علاجِ سبب اوّل: وہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس شخص کے علاج کے بارے میں بیان کر چکے ہیں۔ لیکن وہ جو آخرت کو ادھار سمجھتا ہے اور نقد (دنیا) کو ترک نہیں کرتا اور آخرت جو اس کی نگاہوں سے دور ہے اسے دل سے دور سمجھتا ہے اور ایسا ہے جو سمجھتا ہے کہ جیسے آنا ہی ہے اسے آیا سمجھ۔ وہ ایسا ہے کہ جس کی آنکھیں بند ہوئیں اور مر گیا تو اس کا نقد بھی جاتا رہا۔ ہوسکتا ہے کہ آج مر جائے یا کل مر جائے یا اسی گھڑی مر جائے تو ادھار آخرت تو نقد ہو جائے اور دنیا کا یہ نقد ادھار ہو جائے اور خواب کی طرح فراموش ہو جائے۔

اور وہ جو لذات کو ترک نہیں کرسکتا اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جب ایک ساعت شہوت سے صبر نہیں کرسکتا وہ دوزخ کی آگ کی تاب کیونکر لائے گا۔ اور بہشت کی لذتوں سے صبر کی طاقت کہاں سے لائے گا؟ اگر بیمار ہو جائے۔ اور اسے ٹھنڈے پانی سے بڑھ کر اور کوئی شے مرغوب نہ ہو اور بیگانہ طبیب جو بے دین بھی ہو

اگر کہے کہ یہ آبِ سرد تیرے لئے مضر ہے تو کیسے شوق کے ساتھ امید شفا میں آب سرد سے ہاتھ روک لے گا؟ جب کہ اللہ اور رسول ﷺ کے وعدے کے مطابق آخرت کی ابدی بادشاہی بہ سبب ترک شہوات کے تو اولیٰ تر ہونی چاہیئے۔

اور وہ جو توبہ کو ملتوی کرتا رہتا ہے۔ تو اسے کہا جائے گا کہ تم کل تک کے لئے توبہ کو معرض تعویق میں ڈال رہے ہو۔ اور کل کا لانا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کل نہ ائے اور مرجاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں بیان ہوا ہے کہ ''زیادہ تر دوزخی وہی ہوں گے جو توبہ کو کل پر ٹالتے رہتے تھے''۔ تو ایسے شخص سے کہا جائے گا کہ آج توبہ کو تاخیر میں کیوں ڈال رہے ہو؟ اگر اس لئے کہ تم کہتے ہو کہ آج تو ترک کرنا دشوار ہے۔ تو کل بھی تو ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا خصوصی دن پیدا نہیں کیا جس میں شہوات کا ترک کرنا آسان ہو۔ اور مثال تمھاری اس شخص کی سی ہے' جسے کہا جائے کہ اس درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینک تو وہ کہے کہ میں تو کمزور ہوں اور یہ درخت قوی ہے۔ اس لئے ایک سال صبر کرتا ہوں تو لوگ کہیں گے اس احمق کو دیکھو کہ درخت تو ایک اور سال میں قوی تر ہو جائے گا اور یہ احمق ضعیف تر ہو جائے گا۔ اس وتیرے سے جو تیرے زیر عمل ہے اور تو خود اس کی مخالفت میں عاجز تر ہو جائے گا۔ اور جتنی جلدی اس کے استیصال میں لگے گا آسان تر ہوگا۔

اور وہ جو اس امر کا مقتصد ہے کہ میں تو مومن ہوں اور اللہ تعالیٰ مومنوں کو معاف کر دے گا۔ تو ہم اسے کہیں گے کہ ہوسکتا ہے کہ معاف نہ کرے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری نہ کرے گا تو ایمان کا درخت کمزور ہو جائے گا۔ اور بوقتِ مرگ سکرات موت کی آندھی اس درختِ ایمان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ کیونکہ ایمان وہ درخت ہے جو طاعات کے پانی سے فیض پاتا ہے تو جب اس سے تغذیہ نہ پائے تو معرضِ خطر میں ہوتا ہے۔ بلکہ طاعتِ خداوندی سے عاری اور گناہوں سے گراں بار ایمان ایسے شخص کی طرح ہوتا ہے جو بہت سی بیماریوں کا شکار ہو۔ اور ہر وقت خطرہ اس بات کا ہوتا ہے کہ چل بسے گا۔ اگر ایمان بہ سلامت لے گیا تو ممکن ہے کہ بخش دیا جائے اور ممکن ہے کہ عقوبت میں گرفتار ہو جائے۔ اور غالب یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو اسی لئے بھیجا ہے کہ بتائیں کہ معصیت عقوبت کا باعث ہے۔ تو اس موہوم امید پر بیٹھ رہنا حماقتِ محض ہے۔ تو ایسے انسان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے جو کچھ اثاثہ تھا کھو دیا اور بیوی بچوں کو بھوکا چھوڑ دیا اور کہے کہ یہ ویرانے میں جائیں وہاں خزانہ پالیں گے۔ یا کسی شہر کو لوٹ لیں۔ اور وہ خود اپنے اثاثے کی کماحقہ حفاظت نہیں کرتا بلکہ ایک کھلے گھر میں چھوڑ رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ جو ظالم میرے گھر میں دراّنہ آئے گا مرجائے گا یا غافل

رہے گا اور میرے گھر میں داخل نہ ہوگا۔ یہ سب ممکن ہے اور عفو کا امکان بھی اسی جیسا ہے۔ لیکن اس پر اعتماد کرنا اور احتیاط سے صرفِ نظر کرنا حماقت ہوگا۔

فصل: کہ کوئی شخص جو تمام گناہوں سے توبہ نہیں کرتا لیکن بعض سے تائب ہو جاتا ہے اس کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے کہ اس کی توبہ درست ہوگی یا نہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ناممکن ہے کہ کوئی زنا سے توبہ کرے لیکن شراب خوری سے توبہ نہ کرے۔ کیونکہ اگر توبہ اس لئے کہ کرتا ہے کہ یہ گناہ ہے تو وہ بھی تو گناہ ہے۔ تو یہ بھی ایسے ہی محال ہے کہ ایک قسم کی شراب سے توبہ کرے لیکن دوسری قسم کی شراب سے توبہ نہ کرے کیونکہ دونوں برابر ہیں۔ معصیت بھی اسی طرح ہے لیکن درست یہ ہے کہ ایسی توبہ ممکن ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ تائب سمجھتا ہو کہ زنا شراب خوری سے صعب تر ہے۔ اس لئے صعب ترین سے توبہ کر لے یا سمجھتا ہو کہ شراب زنا سے منحوس تر ہے کہ خمر بھی زنا کاری میں ڈال دیتی ہے اور ایسے ہی اور کاموں میں مشغول کر دیتی ہے۔ ممکن ہے کہ غیبت سے توبہ کر لے اور شراب خوری سے توبہ نہ کرے اور کہے کہ شراب خوری عوام سے متعلق نہیں تو اس قسم کا خیال خطرناک تر ہے۔ بلکہ روا ہوگا کہ اصل شراب سے توبہ کی بجائے کم خوری کا عہد کرے اور کہے کہ جتنا زیادہ شراب پیوگے عقوبت اسی قدر زیادہ ہوگی۔ اور اپنی اصل شہوت سے تو عہدہ برا نہیں ہوسکتا کم مقداری سے ہوسکتا ہے۔ اور یہ لازم نہیں کہ جب شیطان مجھے کسی کام سے عاجز کر دے کہ جس میں میں فی الاصل عاجز نہ ہوں۔ اس میں بھی اس کی موافقت کروں، یہ سب ممکن ہے۔

اور یہ جو آیا ہے کہ التائب حبیب اللہ (تائب اللہ کا حبیب ہے) اور قرآن میں فرمایا ہے کہ "اَللّٰهُ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ" (قرآن: ۲۲۲/۲) (اللہ تعالیٰ اپنی طرف لوٹنے والوں کو پسند کرتا ہے اور نیز انھیں بھی جو پاک باز ہیں اور سعی و کوشش میں ہیں)۔ ظاہر ہے کہ یہ مذکورہ درجۂ محبت اس کا ہے جو تمام گناہوں سے توبہ کرے۔ اور وہ جو یہ کہتا ہے کہ بعضوں سے درست توبہ کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ شاید اس کا مقصد یہی ہو۔ ورنہ جس صغیرہ گناہ سے توبہ کریں تو توبہ اس صغیرہ گناہ کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ اور گناہ ایسے ہو جاتا ہے جیسے کیا ہی نہ گیا ہو۔ اور تمام معاصی سے توبہ ایک ہی قدم میں دشوار ہوتی ہے۔ بیشتر بہ تدریج ہوتی ہے۔ اور جس قدر توبہ میسر ہو جائے باعثِ ثواب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اصل: صبر شکر کے بیان میں

جان لیجئے کہ توبہ بغیر صبر کے ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ بلکہ کسی طاعت کی ادائیگی اور کسی معصیت کا ترک

بدون صبر خوبی کے ساتھ ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ آنحضرت ﷺ سے صحابہ نے پوچھا کہ ''ایمان کیا ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''صبر'' ایک اور حدیث میں فرمایا کہ ''صبر نصف ایمان ہے''۔ اور صبر ہی کی عظمت کے باعث اللہ تعالیٰ نے صبر کا ذکر ستر دفعہ سے زیادہ قرآن میں فرمایا ہے۔ اور جو بھی عظیم درجہ ہے اسے صبر پر موقوف رکھا ہے۔ حتیٰ کہ راہ دین میں امامت کو بھی صبر ہی پر موقوف رکھا ہے۔ فرمایا ہے کہ: ''وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيَاتِنَا يُوْقِنُوْنَ'' (قرآن: ۲۴/۳۲) (اوران میں سے ہم نے امام بنائے جو خلق کو خیر کی راہ دکھاتے تھے۔ ہمارے فرمانپر' جب انھوں نے صبر کیا۔ (عذاب فرعون پر) اور انھوں نے ہماری آیات پر یقین کیا) اور بے انتہا ثواب اور بے حساب عنایات صبر پر موقوف رکھیں۔ اور فرمایا کہ: ''اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ'' (قرآن: ۱۰/۳۹) (اور پورا پائیں گے صابرین اجر اپنا بغیر حساب کے) اور صابروں کو خوشخبری دی کہ وہ (اللہ) ان کے ساتھ ہے)۔ فرمایا کہ: ''اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ'' (قرآن: ۱۵۳/۲) (اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے) اور درود' رحمت اور ہدایت تینوں کو بجز صابروں کے لئے جمع نہیں کیا۔ فرمایا کہ: ''اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ'' (قرآن: ۱۵۷/۲) (وہ لوگ ہیں کہ جن پر اللہ تعالیٰ کے درود ہیں اور اس کی بخشایش ہے ان پر اور یہی ہیں جو راہِ راست پر ہیں)۔ اور صبر کی ایک بزرگی اور فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کمیاب کر دیا اور ہر کسی کو عطا نہیں فرمایا سوائے اپنے دوستوں کے اور وہ بھی تھوڑا سا۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ ''ان اقل ما او تیتم الیقین و عزیمة الصبر'' یعنی نہایت قلیل مقدار میں جو تمھیں عطا ہوا ہے وہ ہے یقین اور صبر۔ اور جس کسی کو یہ دونوں مل گئے اس سے کہو کہ اب بے خوف ہو جائے اگر چہ وہ نماز روزہ زیادہ نہ رکھتا ہو۔ اور اگر اسی پر صبر کرو کہ جو آج اپنے ساتھیوں کے ساتھ عملیات کا اثاثہ رکھتے ہو اور اس سے نہ پھرو گے تو میں اسے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ اس سے کہ تم میں سے ہر ایک اس قدر طاعت کرے جو تم سب نے کر رکھی ہو۔ لیکن ڈرتا اس سے ہوں کہ میرے بعد دنیا کی راہ تم پر کشادہ ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے کو خاطر میں نہ لاؤ گے اور اہل آسمان تمھیں خاطر میں نہ لائیں گے جو کوئی صبر کرے گا اور ثواب کی امید رکھے گا۔ اس کو اس کا پورا اجر ملے گا۔ صبر کرو کیونکہ دنیا باقی رہ جانے والی شے نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ثواب باقی رہے گا۔ ''مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ'' (قرآن: ۹۶/۱۶) (جو کچھ تمھارے پاس اس دنیا کا ہے وہ تمام ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اُس جہان میں باقی رہنے والا ہے اور یقیناً صبر کرنے والوں کو جزاء دی جائے گی ثواب کی احسن صورت میں کہ انھوں نے نیک اعمال

کیئے)۔آپ نے یہ آیت کاملاً تلاوت کی۔'' آنحضرت نے فرمایا کہ : صبر بہشت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے''۔ نیز فرمایا کہ : ''اگر صبر مرد ہوتا تو کریم مرد ہوتا اور اللہ تعالیٰ صابرون کو محبوب رکھتا ہے''۔ حضرت داوٗد علیہ السلام پر وحی آئی کہ : ''اخلاق میں میری پیروی کرو اور میرے اخلاق میں سے ایک یہ ہے کہ میں صبور ہوں''۔ حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں کہ : ''تم وہ کچھ نہیں پاسکتے جب تک کہ وہ جو تمھیں نامطلوب ہے اس پر صبر نہ کروگے''۔ آنحضرت نے انصار کے ایک گروہ کو دیکھا تو پوچھا: ''تم مومن ہو؟'' تو انھوں نے جواب دیا ''ہاں'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''تمھارے ایمان کی علامت کیا ہے؟'' تو انصار نے کہا کہ : ''ہم اللہ تعالیٰ کی نعمت پر شکر بجالاتے ہیں۔ اور رنج و محن میں صبر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہتے ہیں''۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''رب کعبہ کی قسم تم مومن ہو''۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ صبر کا مقام ایمان میں ایسا ہی ہے جیسا کہ سر کا جسم پر ہے۔ تو جس کا سر نہیں تن بھی نہیں اس لئے جس کے پاس صبر نہیں ایمان بھی نہیں''۔

حقیقتِ صبر : یاد رہے کہ صبر انسان کا خاصہ ہے۔ بہائم کو صبر نہیں ہوتا۔ کیونکہ حیوان بے حد ناقص ہوتے ہیں۔ اور ملائکہ کو صبر کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ انتہائی کامل ہیں۔ اور شہوت سے پاک ہوتے ہیں۔ پس بہائم شہوت سے مغلوب ہوتے ہیں اور بس۔ اور حیوان میں سوائے شہوات کے اور کوئی تقاضا نہیں ہوتا۔ اور ملائکہ حضرتِ الٰہیت کے عشق میں مستغرق ہوتے ہیں۔ اور ان کے لئے اس عشق میں کوئی شے مانع نہیں کہ جس کو دور کرنے کے لئے انھیں صبر سے کام لینا پڑے۔

انسان کو ابتداءً بہائم کی صفت پر تخلیق کیا گیا ہے۔ اور غذا، لباس و زینت ولہو لعب اس پر مسلط کر دیئے گئے ہیں۔ پھر بالغ ہونے پر ملائکہ کے انوار میں سے ایک نور انسان میں جنم لیتا ہے جس کے ذریعے وہ کاموں کے انجام کو دیکھتا ہے بلکہ دو فرشتے انسان پر موکل کر دیئے گئے ہیں جن سے بہایم محروم ہیں۔ ایک فرشتہ انسان کو راہ راست دکھاتا ہے اس طرح سے کہ اس کے انوار میں سے ایک نور انسان میں سرایت کر جاتا ہے کہ جس نور میں وہ عواقب کار کو دیکھتا ہے اور کاموں کی مصلحت سے آشنا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اسی نور میں خود کو اور اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے۔ اور اسے یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ جملہ شہوات کا انجام بربادی ہوتا ہے۔ اگرچہ وقتی طور پر خوش نما ہیں اور اسے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی خوشی اور راحت تو زود گذر ہیں لیکن ان کا ضرر طویل زمانے کے لئے باقی رہ جاتا ہے اور یہ رہنمائی بہائم کو حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ہدایت کافی نہیں ہے کہ کہ کیسے جانے کہ مضر ہے اور ضرر کو دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس سے کیا فایدہ ہوگا۔ جیسے بیمار جانتا ہے کہ بیماری اس کے لئے ضرر رساں ہے لیکن بیماری کو دور کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ایک اور فرشتہ اس پر موکل کر رکھا ہے

تا کہ وہ انسان کو قوت وقدرت دے اور تائید وتسدید کرے تا کہ اس کو جو اس کے لئے زیان کا باعث ہو سکتا ہے اس کو پہچانے اور اس سے ہاتھ روک لے۔ چنانچہ جب انسان میں شہوت رانی کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو انسان میں ایک اور خواہش بھی پیدا ہوتی ہے جو شہوت کی مخالفت کرتی ہے۔ تا کہ مستقبل میں ہونے والے ضرر سے انسان بچ جائے اور مخالفت کی متقاضی خواہش ملائکہ کے لشکر کی ایک فرد ہے۔ جب کہ شہوت رانی کی خواہش شیاطین کی فوج کا ایک فرد ہے۔ اور شہوات کی مخالفت کی اس آرزو کو ہم دینی باعث کا نام دیتے ہیں اور شہوت رانی کی خواہش کو باعثِ ہوائی کا نام دیتے ہیں۔ ان دو لشکروں میں دوامی جنگ جاری رہتی ہے کہ ایک کہتی ہے کہ 'کر' تو دوسری کہتی ہے کہ 'نہ کر' اور انسان دونوں تقاضوں کے درمیان معلق رہتا ہے۔

اگر دینی انگیزہ ہوا اور ہوس کے انگیزے کے ساتھ جنگ میں اپنی جگہ ایستادگی کرے اور ثبات کرے تو اس کے اس ثبات کو صبر کہتے ہیں۔ پس صبر کے معنی یہی ہیں۔ اور اگر یہ ہوا و ہوس کے انگیزے کو دور کر دے تو اس کے اس غلبہ کرنے کو فتح کا نام دیا جاتا ہے اور جب تک وہ انگیزہ ہوا کے ساتھ نبرد آزما رہتا ہے اسے جہادِ نفس کہا جاتا ہے۔ بس صبر کے معنی دینی انگیزے کی ہوا کے انگیزے کے مقابلے میں پافشاری ہیں۔ اور جہاں دونوں متخالف لشکر نہ ہوں وہاں صبر بھی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ملائکہ کو صبر کی حاجت نہیں ہوتی اور بہائم اور بچوں کو قدرتِ صبر نہیں ہوتی۔ یاد رہے کہ یہ دو فرشتے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے کرام الکاتبین یہی ہیں۔ اور جس کسی کے ہاں بصیرت اور استدلال کی راہ کشادہ ہو جاتی ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ جو چیز بھی حادث ہوتی ہے اس کا ایک سبب ہوتا ہے۔ اور جب دو چیزیں مختلف ہوں تو وہ دو مختلف اسباب کی متقاضی ہوتی ہیں۔ اور انسان دیکھتا ہے کہ بہائم کو نیز لڑکے بالے کو ابتدا میں ہدایت ہوتی ہے اور نہ معرفت کہ جس سے وہ عاقبتِ کار کو جان سکے۔ اور نہ خواہش اور قوت ہوتی ہے کہ صبر کرے۔ لیکن بلوغ کے قریب پہنچ کر یہ دونوں قوتیں ظہور میں آ جاتی ہیں۔ اور انسان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی دو وجوہ سے ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ دو فرشتے انھی دو اسباب سے عبارت ہیں۔ اور جان لیتا ہے کہ ہدایت اصل ہے۔ اور اس کی پیشوا اور پھر اس پر قدرت وارادتِ عمل۔

پس وہ فرشتہ جو ہدایت کا ذمہ دار ہے وہ شریف تر اور فاضل تر ہے۔ اس لئے صدر سے دائیں جانب نشست اس کی مسلّم ہے۔ اور صدر خود انسان ہے۔ کیونکہ یہ دونوں فرشتے اس کے مؤکل ہیں۔ پس وہ دائیں ہاتھ کا فرشتہ ہے۔ اور چونکہ وہ تیری رشد وہدایت کے لئے ہے تو تُو اس کی طرف کان لگا تا کہ اس سے ہدایت و معرفت حاصل کرے۔ تیرا یہ گوش برآواز رہنا احسان ہوگا جو تو نے کیا ہوگا کہ تو نے اسے معطل نہ چھوڑ دیا ہوگا۔ تو تیرے اس عمل کو ایک حسنہ کے طور پر تیرے نامۂ اعمال میں درج کر لیا جاتا ہے اور اگر تو اس سے اِعراض کرے اور اس

فرشتے کو معطل چھوڑ دے جس سے تو بچوں اور بہائم کی طرح ہدایتِ عواقب سے محروم رہ جائے۔ تو یہ ایک برائی ہوگی جو تو نے اس کے نیز اپنے حق میں کی اور یہ تیرے نامۂ اعمال میں درج کی جائے گی۔ اسی طرح وہ قوت جو تو نے دوسرے فرشتے سے پائی ہوگی کہ جسے شہوات کی مخالفت میں بروئے کار لائے گا اور جہد کرے گا تو یہ ایک عمل حسنہ ہوگا۔ اور اگر عمل میں نہ لائے گا تو یہ ایک سیۂ ہوگا۔ اور یہ دونوں قسم کے تیرے احوال تیرے نامۂ اعمال میں درج ہوتے رہیں گے۔ تیرے دل میں بھی لیکن تیرے دل سے پوشیدہ رقم ہوتے رہیں گے۔

اور یہ دو فرشتے اور ان کے صحائف اس عالم شہادت سے نہیں ہیں۔ اور انھیں حالیہ آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ جب موت آئے گی تو حالیہ آنکھ بند ہو جائے گی۔ اور وہ دوسری آنکھ کہ جس سے عالمِ ملکوت کو دیکھا جا سکے گا۔ وہ کھل جائے گی۔ تو تو یہ متذکرہ صحیفے اپنے سامنے موجود پائے گا اور پڑھ سکے گا اور چھوٹی قیامت میں اس کی خبر پائے گا۔ لیکن اس کی تفصیل بڑی قیامت میں دیکھے گا اور چھوٹی قیامت موت کے وقت ہوگی۔ جیسے کہ آنحضرت نے ﷺ فرمایا ہے کہ: ''من مات فقد قامت قیامة '' یعنی جو کوئی مر گیا اس کی قیامت قائم ہو گئی۔ اور جو کچھ بڑی قیامت میں ہوگا اس چھوٹی قیامت میں اس کا ایک نمونہ ہوتا ہے جس کی تفصیل ہم اپنی کتاب احیاء میں بیان کر چکے ہیں۔ یہ کتاب اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

مقصد یہ ہے کہ تو جان لے کہ صبر وہاں ہوتا ہے جہاں جنگ ہو۔ اور دو متخالف لشکر ہوں۔ اور یہ دو لشکر وہ ہیں کہ ایک تو ملائکہ پر مشتمل ہوتا ہے تو دوسرا شیاطین کے گروہ پر مشتمل ہوتا ہے جو انسان کے سینے میں جمع ہیں۔ پس اس جنگ میں مصروف ہونے کے لئے پہلا قدم راہِ دین میں مشغول ہونا ہے۔ کیونکہ سینے کے صحرا کو لڑکپن ہی سے شیطان کے لشکر نے غصب کر رکھا ہے جب کہ ملائکہ کا لشکر بلوغ کے قریب زمانے میں نمودار ہوتا ہے۔ پس جب تک انسان شہوت کے لشکر کی سرکوبی نہ کرے گا اپنی خوش بختی کو نہ پہنچے گا۔ اور جب تک جنگ نہ کرے گا اور جنگ میں صبر نہ کرے گا لشکرِ شہوات کی سرکوبی نہ کر سکے گا۔ اور جو اس جنگ میں مصروف نہیں ہے وہ ایسا ہے کہ جس نے شیطان کی سرداری کو تسلیم کر لیا ہو اور ہر وہ شخص جس نے شہوت کو کنٹرول کیا اور شرع کا مطیع ہو گیا وہ گویا اس جنگ میں فاتح قرار پایا۔ جیسے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''لکن الله اعاننی علی شیطانی واسلم '' یعنی اللہ تعالیٰ نے شیطان کے ساتھ جنگ میں میری مدد کی حتیٰ کہ شیطان میرا مطیع ہو گیا اور اکثر یہی ہوتا ہے کہ انسان جہاد میں لگا رہتا ہے۔ کبھی فتح پاتا ہے تو کبھی شکست سے دوچار ہوتا ہے۔ کبھی قوت شہوت کو ہوتی ہے تو کبھی دینی انگیزے کو۔ اور صبر و ثبات کے سوا اس قلعے کی فتح ممکن نہیں۔

صبر نصف ایمان کیوں ہے اور روزہ صبر کا نصف کیونکر ہے اس کا بیان

یاد رہے کہ ایمان ایک ہی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ اور قسمیں ہیں۔ جیسے کہ حدیث میں ہے کہ ایمان کے ستر سے کچھ اوپر ابواب ہیں۔ جن میں سب سے بڑا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے تو کم ترین راستے سے خار و خس دور کرنا ہے۔ ہر چند کہ اقسام اس کی بہت سی ہیں لیکن اصولاً تین اجناس کا ہے یعنی معارف' احوال اور اعمال۔ ایمان کے مقامات میں سے کوئی مقام ان تینوں سے خالی نہیں ہوتا۔ مثلاً توبہ کی حقیقت ندامت ہے اور یہ حال دل کا ہے۔ اور اصل اس کی معرفت ہے کہ گناہ زہر قاتل ہے۔ اور فرع اس کی یہ ہے کہ انسان گناہ سے ہاتھ روک لے اور طاعت میں مشغول ہو جائے۔ پس یہ حالت' اور وہ معرفت اور وہ عمل تینوں منجملہ ایمان کے ہیں۔ اور ایمان ان تینوں سے عبارت ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ محض معرفت سے مختص کر دیں کیونکہ ایمان کی اصل وہی ہے۔ معرفت ہی سے حالت پیدا ہوتی ہے۔ اور حالت سے عمل پیدا ہوتا ہے۔ پس معارف ایک درخت کی طرح ہیں۔ اور معرفت کے باعث دل کی حالت کی تبدیلی درخت کی شاخ کی طرح ہے اور وہ کردار جو ان متغیر احوال سے ظاہر ہوتے ہیں وہ گویا درخت کا ثمر ہیں۔

پس جملہ ایمان دو چیزیں ہیں: دیدار اور کردار' اور کردار بدون صبر کے ممکن نہیں۔ پس صبر آدھا ایمان ٹھہرا۔ اور صبر کی دو قسمیں ہیں: ایک صبر جنس شہوت سے تو دوسرا جنسِ غضب سے۔ اور روزہ صبر ہے جنس شہوت میں سے پس وہی آدھا صبر ٹھہرا۔ اور ایک دوسرے رخ سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب کردار کی بدولت ہے اور ایمان اسی سے عبارت ہوگا۔ مومن کا کردار محن میں صبر ہوتا ہے اور نعمت میں شکر اس وجہ سے صبر نصف ایمان ہے تو شکر باقی نصف ایمان ہے۔ جیسے کہ حدیث میں بیان ہوا۔ اور جب تو دیکھے کہ مشکل تر اور دشوار تر ہے اور اس کو اصل ٹھہرائے تو کوئی چیز صبر سے زیادہ دشوار نہیں۔ اس وجہ سے صبر سراپا ایمان ہے۔ جیسے کہ صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا تھا کہ: ''ایمان کیا ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''صبر'' یعنی کہ دشوار ترین صبر ہے۔ ایسے فرمایا کہ: ''حج عرفہ ہے'' یعنی کہ حج کے ثواب کی عظمت وقوف عرفات کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ اگر وقوفِ عرفات فوت ہو جائے تو دیگر تمام ارکانِ حج بھی فوت ہو جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ انسان کسی وقت بھی ایک چیز سے خالی نہیں ہوتا کہ اپنی خواہش کے موافق ہوگا یا اس کے مخالف اور ان دونوں حالتوں میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور وہ جو اس کی خواہش کے موافق ہوتے ہیں: جیسے مال و نعمت' جاہ و تندرستی' اور مرضی کے مطابق

زن وفرزند اور جوان کے مشابہ ہوں۔ تو صبر کسی حال میں بھی اس سے زیادہ اہم نہیں کہ اگر اپنے آپ کو نہ روکے اور تنعم میں اسراف کرے اور دل اس میں لگائے اور اس پر قرار پائے تو انسان میں غرور اور سرکشی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ داناؤں نے کہا ہے کہ ہر کوئی رنج ومحن میں تو صبر کرتا ہے لیکن عافیت میں صبر نہیں کرتا۔ سوائے صدیقی کے۔ صحابہ کے زمانے میں جب اموال ونعمت میں کثرت ہوئی تو کہنے لگے کہ ''ایک مدت ہم محن میں تھے تو صبر بہتر کر سکتے تھے۔ اب کی نسبت کہ جب ہم نعمت وتوانائی میں ہیں'' اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''اَنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ'' (قرآن: ۲۸/۸) یعنی تمھارے اموال اور اولاد تمھارے لئے آزمائش ہیں)۔ مختصر یہ کہ توانائی کے زمانے میں صبر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑی عصمت یہ ہے کہ توانائی نہ ہو۔ اور نعمت میں صبر یہ ہے کہ انسانی دل نعمت سے نہ لگائے اور اس پر زیادہ شاداں نہ ہو۔ اور سمجھ لے کہ یہ مستعار ہے اور جلد ہی یہ اس سے واپس لے لیں گے۔ بلکہ خود اسے نعمت ہی نہ سمجھے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ یہ نعمت روزِ قیامت اس کے درجات میں کمی کا باعث قرار پائے۔ پس شکرِ نعمت میں لگ جائے کیونکہ مال اور تندرستی وغیرہ جس نعمت سے بھی بہرہ مند ہے عطائے خداوندی ہے اور ان جملہ امور میں صبر کرنے کی ضرورت ہے۔

اور وہ احوال کہ جو انسان کی خواہش کے مطابق نہ ہوں تین قسم کے ہیں:

ایک وہ جو انسان کے اختیار میں ہیں جیسے کہ اطاعت اور ترکِ معصیت ہے۔ اور دوسرے وہ جو انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے جیسے کہ بلا اور مصیبت ہے۔ اور تیسرے وہ جو فی الاصل اس کے اختیار میں نہیں ہوتے لیکن انسان کو ان کے دفاع اور مکافات کا اختیار ہوتا ہے جیسے کہ دوسروں کے ہاتھوں اذیت پانا۔ وہ جو اس کے اختیار میں ہیں جیسے کہ طاعت ہے تو اس میں صبر کی حاجت ہوتی ہے کیونکہ بعض عبادات جو دشوار ہوتی ہیں محض کاہلی کی وجہ سے دشوار ہوتی ہیں جیسے کہ نماز ہے۔ اور بعض بخل کی وجہ سے دشوار ہوتی ہیں جیسے کہ زکوٰۃ ہے۔ اور بعض عبادات متذکرہ دونوں وجوہ سے نہیں ہو پاتیں جیسے کہ حج ہے۔ اور یہ بدون صبر ممکن نہیں ہوتیں۔ اور ہر طاعت میں صبر کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ شروع میں، درمیان میں اور آخر میں۔ شروع کی یہ ہے کہ نیت میں اخلاص حاصل کرے۔ اور درست رکھے۔ اور ریا کو دل سے دور کرے اور یہ صبر دشوار ہوتا ہے۔ اور دوسری جو درمیان کے صبر کی ہے وہ ہے اس طاعت کے آداب وشرایط کا لحاظ کہ اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ کرے۔ اگر نماز میں ہے تو ادھر ادھر نہ دیکھے اور دنیا کے بارے میں کچھ خیال دل میں نہ لائے اور آخر طاعت میں صبر سے یہ مراد ہے کہ ادائے عبادات کے بعد ان کے اظہار اور بیان سے کہ میں نے یہ کیا ہے، صبر کرے۔ اور ان پر فخر کرنے سے صبر کرے۔

اوراب معاصی: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گناہوں سے احتراز سوائے صبر کے ممکن نہیں۔ اور جس قدر شہوت قوی ہوگی معصیت اتنی ہی آسان ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کے ذریعے ہونے والے گناہوں پر صبر دشوارتر ہوتا ہے کیونکہ زبان ہلانا آسان ہے اور بہت زبان چلائی جائے تو عادت ہوجاتی ہے پھر عادت فطرت بن جاتی ہے اور شیطان کے لشکروں میں سے ایک عادت بھی ہے۔ اس سبب سے زبان غیبت گوئی اور دروغ گوئی، خودستائی اور دوسروں پر کیچڑ اچھالنے جیسے کاموں میں رواں رہتی ہے۔ اورا یک ایسا کلمہ کہ جو زبان پر آ کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دے اور جسے وہ پسند کریں گے تو اس پر صبر بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اور بیشتر لوگوں کے ساتھ ہم نشینی کی صورت میں اس سے صبر ممکن نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ انسان تنہائی اختیار کرے۔

دوسری قسم: وہ ہے کہ انسان اس میں مختار نہیں ہوتا۔ جیسے لوگوں کا اس کو ہاتھ یا زبان سے اذیت دینا یا رنج پہنچانا ہے لیکن اسے مکافات میں اختیار ہوتا ہے کہ بدلہ نہ لینے کے لئے پورے صبر کی ضرورت ہے۔ بلکہ مکافات میں حد میں رہنا صبر آزما ہوتا ہے۔ صحابہ میں سے ایک کا فرمان ہے کہ: ''ہم ایمان کو ایمان شمار نہیں کرتے کہ جب تک کہ اس کے ساتھ لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی اذیت پر صبر شامل نہ ہو''۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا: ''انھیں چھوڑ دو تا کہ تجھے رنج پہنچائیں اور تُو ہم پر توکل کر: ''وَدَعْ اَذٰیهُمْ وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ'' (قرآن: ۴۸/۳۳) فرمایا کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں اُس پر صبر کر اور ان کے ساتھ نیکی کر''۔ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا'' نیز فرمایا کہ: ''میں جانتا ہوں کہ کہ تو دشمنوں کی باتوں سے دل تنگ ہوتا ہے لیکن تو تسبیح میں معروف ہوجا''۔ '' وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ''۔ (قرآن: ۹۸،۹۷/۱۵) ایک دفعہ آنحضرت مال تقسیم فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے کہا کہ ''یہ اللہ کے لئے نہیں''، یعنی منصفانہ نہیں۔ یہ خبر لوگوں نے حضرت رسول کو دی تو آپ کا روئے مبارک سرخ ہوگیا اور سخت رنجور ہوئے تو فرمایا کہ: ''خدائے تعالیٰ میرے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے کہ جن کو مجھ سے بھی زیادہ ستایا گیا لیکن انھوں نے اللہ کے لئے صبر کیا''۔ نیز فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''اگر تمھیں کوئی اذیت دے تو تم اسی کے بقدر بدلہ لے سکتے ہو۔ لیکن اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے۔'' وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ''۔ (قرآن: ۱۲۶/۱۶) فرمایا کہ ''میں نے انجیل میں لکھا ہوا دیکھا کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ: ''مجھ سے پہلے ایک قوم آئی جنھوں نے کہا کہ ہاتھ کے بدلے ہاتھ، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت قصاص ہے۔ میں اس کو باطل نہیں کرتا لیکن تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ شر کا مقابلہ شر سے نہ کرو بلکہ اگر کوئی تمھارے

چہرے کے دائیں رخ پر مارے تو تم اسے بایاں رخ پیش کردو۔ اگر کوئی تمھاری پگڑی اچک لے اسے کرتا پیش کردو۔ اور اگر کوئی ظالمانہ تمھیں اپنے ہمراہ ایک میل لے جائے تو تم اس کے ساتھ دو میل چلو"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جو تمھیں کسی شے سے محروم کردے تم اسے کوئی چیز عطا کرو اور جو کوئی تمھارے ساتھ برائی کرے تو اس کے ساتھ نیکی کرو"۔ اس قسم کا صبر صدیقوں کے صاحبِ مرتبہ لوگوں کا ہے۔

اور تیسری قسم: کہ اول و آخر تمھارے اختیار میں نہیں وہ ہے 'مصیبت' جیسے اولاد کی موت یا مال کی تباہی یا اعضائے جسم میں سے اعضا کا مفلوج ہو جانا ہے۔ جیسے کہ کان' آنکھ' یا ہاتھ وغیرہ ہیں۔ اور تمام آسمانی بلائیں تو ان کے مقابلے میں صبر سے بہتر اور کوئی سپر نہیں۔

ابن عباس فرماتے ہیں کہ "قرآن میں صبر تین درجوں کا ہے: طاعت میں صبر ثواب کو تین سو درجے فزونی دیتا ہے۔ اور حرام سے صبر کرنا وہ سو درجے فزونی کا ہے۔ اور تیسرے یعنی معصیت پر اولِ معصیت ہی صبر کرنا نو سو درجے فزونی دیتا ہے"۔ یاد رہے کہ بلاؤں پر صبر صدیقوں کا درجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت نے دعا میں عرض کیا تھا کہ: "بارِ خدایا ہمیں اتنا یقین عطا فرما کہ دنیا کے مصائب ہمارے لئے آسان ہو جائیں"۔ نیز فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: "جس بندے کی طرف ہم نے بلا بھیجی اور اس نے صبر کیا اور گلہ شکوہ نہ کیا تو اسے اگر عافیت دوں گا تو اسے بہتر گوشت پوست عطا کروں گا۔ اور اگر اسے اپنے پاس لے جاؤں گا تو اپنی رحمت میں آسودہ رکھوں گا"۔ حضرت داؤد نے فرمایا ہے کہ: "بارِ خدایا اس شخص کی جزا کیا ہے جو معصیت میں تیرے لئے صبر کرتا ہے؟" تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "یہ کہ میں اسے ایمان کی خلعت پہناؤں گا جو کبھی واپس نہ لوں گا"۔ نیز فرمایا کہ حکم خداوندی یہ ہے کہ "جسے میں نے اس کے بدن یا مال یا اولاد میں مصیبت بھیجی اور اس نے صبر کے ساتھ اس کا سامنا کیا۔ مجھے شرم آتی ہے کہ روزِ قیامت اس کا حساب لوں اور اسے میزان یا اس کے نامۂ اعمال کے بکھیڑے میں ڈالوں"۔ آنحضرت نے فرمایا کہ "کشاد کا انتظار صبر کے ساتھ کرنا عبادت ہے"۔ نیز فرمایا کہ جو مصیبت آنے پر کہے کہ انا للہ وانا الیہ راجعون' اللھم اجنری واعقبنی خیرا منھا "(ہم خدا ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) "اے اللہ اس مصیبت میں ہمیں ثواب عطا فرما اور خوب تر بدل عطا فرما"۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی یہ دعا قبول فرماتے ہیں"۔ نیز فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "جانتے ہو کہ میں جس شخص کی بینائی واپس لیتا ہوں اس کی جزا کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ میں اسے اپنا دیدار کرامت کرتا ہوں"۔ بزرگوں میں سے ایک نے یہ کلمہ ایک کاغذ پر لکھ رکھا تھا کہ: "وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا "(اپنے پروردگار کے حکم پر صابر رہ تو ہماری نگاہوں کے سامنے ہے)۔ تو جب انھیں کوئی رنج

پہنچتا ہے تو جیب سے نکال کر اسے پڑھتے۔ فتح موصلیؒ کی بیوی گر پڑی اور اس کا ناخن ٹوٹ گیا۔ تو ہنسنے لگی۔ لوگوں نے کہا کیا تمھیں درد نہیں ہوتا؟'' تو فرمایا کہ ''ثواب کی خوشی نے مجھے درد سے بے خبر کر دیا ہے''۔ آنحضرت نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ کی تکریم کی ایک صورت یہ ہے کہ تو بیماری میں شکوہ نہ کرے اور اپنی مصیبت کو پنہاں رکھے''۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مولائے بوحذیفہ کو زخم لگا ہے اور وہ میدانِ جنگ میں گر پڑے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا پانی کی طلب ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ میرا پاؤں پکڑ کر دشمن کے قریب تر لے جاؤ اور پانی صراحی میں ڈال دو کیونکہ میں روزے سے ہوں اگر افطار کو پہنچ گیا تو پی لوں گا''۔

یاد رہے کہ جو روتا ہے یا دل سے اندوہ گیں ہو صبر کی فضیلت اس سے باطل نہیں ہوتی۔ صبر کی فضیلت فوت اس سے ہوتی ہے کہ انسان بین کرے لباس پھاڑے اور اللہ تعالیٰ کا شاکی ہو۔ کیونکہ آنحضرت بھی روئے تھے جب ان کا بیٹا ابراہیم فوت ہو گیا تھا۔ تو لوگوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ ''آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔ کیونکہ یہ رحمت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس پر رحمت فرماتا ہے جو رحیم ہو''۔ اور کہتے ہیں کہ صبر جمیل وہ ہوتا ہے کہ صاحب مصیبت کو باقی لوگوں سے لباس پھاڑنے یا منہ پر دوہتڑ مارنے یا بین کرنے میں ممتاز نہ دیکھیں کہ یہ سب حرام ہیں۔ بلکہ بے حال ہو جانا اور سر پر چادر ڈال لینا یا سر پر چھوٹی سی پگڑی باندھ لینا وغیرہ سب ناروا ہیں۔ بلکہ انسان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بندہ تمھارے بغیر پیدا کیا اور تمھارے بغیر اسے واپس بھی لے لیا۔ جیسے بوطلحہ کی بیوی رمیّصا اُم سلیم فرماتی ہیں کہ: ''میرا شوہر گھر پر نہ تھا میرا بیٹا فوت ہو گیا۔ تو میں نے اسے کپڑے سے ڈھانپ دیا جب میرا شوہر لوٹا تو کہنے لگا ''بیمار کا حال کیسا ہے؟'' تو میں نے کہا کہ آج کی رات سے پہلے کسی رات کو بھی بہتر نہ تھا''۔ پھر میں کھانا لے آئی جسے اس نے سیر ہو کر کھایا۔ اور میں نے خود کو سابقہ راتوں کی نسبت زیادہ بنایا سنوارا' یہاں تک کہ اس نے مجھ سے اپنی حاجت پوری کر لی۔ ہم نے غسل کیا پھر میں نے کہا کہ: ''میں نے فلاں ہمسائی کو فلاں چیز عاریۃً دی تھی جب واپس مانگی تو بانگ و فریاد کرنے لگی اور تنگ دلی کا اظہار کیا''۔ تو میرا شوہر بولا عجب بات ہے سخت احمق ہمسائی ہے' پھر میں نے کہا کہ ''یہ بچہ اللہ عزوجل کی طرف سے ہمارے ہاں مستعار تھا۔ تو اس نے واپس مانگا اور لے گیا''۔ تو شوہر نے بے اختیار کہا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ صبح کو میرے شوہر نے آنحضرت ﷺ سے مل کر گذشتہ رات جو ہوا تھا بیان کیا تو آنحضرت نے فرمایا کہ ''خدائے تعالیٰ گذشتہ شب کو تمھارے لئے مبارک فرمادے کہ یہ ایک عظیم رات تھی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ شب معراج مَیں بہشت میں گیا تو رمیصا زنِ بوطلحہ کو وہاں موجود پایا''۔

پس تم نے اس ساری بحث سے جان لیا ہوگا کہ انسان کسی حال میں بھی صبر سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر انسان تمام شہوات سے نجات پا جائے اور عزلت گزیں ہو جائے تو عزلت میں مختلف قسم کے لاکھوں وسوسے اور اندیشے اس کے باطن میں سر اٹھاتے ہیں کہ جو انسان کو ذکرِ حق کی بجائے خود میں مشغول کر لیتے ہیں اور وہ اندیشے اگر مباح بھی ہوں چونکہ ضیاع وقت کا باعث بنتے ہیں تو عمر جو انسان کا سرمایہ ہے تو اس کے ضیاع سے سراسر خسارے میں رہا۔ تدبیر اس کی یہ ہوگی کہ انسان خود کو اوراد میں مصروف رکھے۔ اگر نماز میں بھی وساوس کا یہی حال ہو تو چاہئے کہ انسان سخت کوشش کرے اور انسان خلاصی نہیں پاتا اِلَّا یہ ایسے کام میں مشغول ہو جو اس کے دل کو بھائے۔ اور حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ فارغ جوان کو دشمن سمجھتا ہے''۔ یہ اس لئے کہا کہ وہ جوان جو فارغ بیٹھتا ہے تو شیطان کا وسوسہ اس کے قریب ہوتا ہے۔ اور دل اس کا وسواس کا آشیانہ۔ اور وساوس کو سوائے ذکر حق تعالیٰ کے دور کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے چاہئے کہ جوان کسی پیشے میں لگ جائے یا کسی خدمت یا کام میں مصروف ہو جائے جس میں جذب ہو جائے۔ اور ایسے شخص کو خلوت نشین نہیں ہونا چاہئے بلکہ جو کوئی دل کے کام سے عاجز ہو اسے چاہئے کہ اپنے جسم کو مصروف کار رکھے۔

علاج صبر کا بیان

یاد رہے کہ ابوابِ صبر ایک ہی نہیں کثیر ہیں اور ہر ایک سے صبر کرنا جداگانہ دشواری رکھتا ہے اور علاج اس کا جداگانہ ہے۔ ہر چند کہ علاج سب کا علم و عمل کی معجون ہی کے ذریعے سے ہے۔ اور جو کچھ ہم نے مہلکات میں بیان کیا ہے وہ سب صبر ہی کا دارو ہے۔ یہاں صرف مثال کے طور پر ایک کا بیان کیا جاتا ہے تا کہ وہ نمونہ ہو اور دوسرے اسی پر قیاس کر کے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔

معلوم رہے کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ صبر کے معنی انگیزۂ شہوت کے مقابلے میں انگیزۂ دین کا ثبات ہے اور یہ دو انگیزوں کے درمیان ایک قسم کی جنگ ہے اور جو کوئی دو شخصوں کو میدان جنگ میں مشغول کرتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ ایک غالب ہو تو وہ ایسی تدبیر کرتا ہے کہ جسے وہ چاہتا ہے کہ غالب آئے اسے قوت اور مدد فراہم کرتا ہے اور دوسرے کو کمزور کرتا ہے اور اپنی مدد اس سے روک لیتا ہے اور اب اگر کسی پر مباشرت کی شہوت غالب آ چکی ہو اور وہ شرم گاہ کو روک نہ سکتا ہو اور صبر نہ کر سکتا ہو اور اگر چہ چاہتا ہو کہ آنکھ کو دیکھنے سے اور دل کو اندیشہ سے روکے روک نہیں سکتا اور صبر نہیں کر سکتا تو تدبیر اس کی یہ ہے کہ ہم پہلے شہوت کے انگیزے کو کمزور کر دیں اور وہ تین چیزوں سے ہوگا۔ ایک یہ کہ ہم جانیں کہ شہوت کی مدد اچھی غذا اور اچھے کھانے سے ہوتی ہے۔ تو ہم یہ مدد واپس لے لیں اور روزہ کا حکم دیں۔ چنانچہ رات کو سوکھی روٹی کھائے اور تھوڑی کھائے اور گوشت جیسے اچھے

کھانے سے باز رہے۔اور وہ دوسرے راہ جو شہوت انگیز ہوتے ہیں وہ بند کردئے جائیں۔شہوت کا ہیجان خوب صورت چہروں کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے تو چاہئے کہ عزلت گزین ہو جائے اور آنکھ کو قابو میں رکھے۔اور عورتوں اور لڑکوں بالوں کی راہ سے اٹھ جائے۔اور تیسرے یہ کہ اسے مباح ذریعہ سے تسکین دی جائے تا کہ اس سے شہوت حرام سے بچ جائے۔نکاح کرے تا کہ شہوت کو اس ذریعے سے سکون ملے' اور بیشتر بدون نکاح کے انسان اس شہوت سے نجات نہیں پاتا۔نفس کی مثال سرکش سواری کی سی ہے۔کہ ہم اس جانورِ سواری کو ریاضت اس طرح دیتے ہیں کہ پہلے اس کا چارہ روک دیتے ہیں تا کہ رام ہو جائے۔پھر یہ کہ چارہ اس کی نظروں سے دور رکھتے ہیں تا کہ نہ دیکھے اور جس قدر چارہ اس کے سکون کا باعث ہو اسی قدر اس کو دیں۔یہ تینوں اقدام شہوت کے لئے اس طرح کے ہیں جو انگیزۂ شہوت کو کمزور کر دیتے ہیں۔

اور انگیزۂ دین کی تقویت کا باعث دو چیزیں ہیں: ایک یہ کہ اسے شہوت کے ساتھ کشتی کے فایدے کا لالچ دے اس طور پر کہ حدیث میں اس پر صبر کرنے والوں کے حق میں جس ثواب کا ذکر آیا ہے اس پر غور کرے کہ جب ایمان قوی ہو جاتا ہے تو جانتا ہے کہ شہوت کا فایدہ تو ایک ساعت کا ہے لیکن اس پر صبر کرنے کا فایدہ ابدی بادشاہی ہے۔انگیزۂ دین قوتِ ایمان کے بقدر قوت پاتا ہے۔دوسرے یہ کہ اسے آہستہ آہستہ شہوات کی مخالفت کا عادی بناتے ہیں تا کہ دلیر ہو جائے۔جب کوئی چاہتا ہے کہ وہ قوی ہو جائے تو اسے قوت کو آزمانا چاہئے۔اور قوت طلب کام کرنے چاہئیں۔آہستہ آہستہ تھوڑا تھوڑا کر کے آگے بڑھتا ہے اور جو کوئی قوی انسان کے ساتھ کشتی کرانا چاہے تو اسے چاہئے کہ پہلے خود سے کمزوروں کے ساتھ کشتی لڑے اور اپنی قوت کو آزمائے کیونکہ اس سے قوت زیادہ ہوتی ہے اسی لئے ان لوگوں کی قوت زیادہ ہوتی ہے جو سخت کام انجام دیتے ہیں اور صبر کے علاج پر دسترس تمام کاموں میں اس طرح ممکن ہے۔

فضیلتِ شکر اور اس کی حقیقت کا بیان

معلوم رہے کہ شکر ایک مقام بزرگ اور درجۂ بلند ہے اور ہر کوئی اس کی حقیقت کو نہیں جانتا۔اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ''وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ'' (قرآن: ۱۳/۳۴) (میرے بندوں میں تھوڑے ہی شکر گذار ہیں) ابلیس نے آدمی پر طعن کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''لا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ'' (قرآن: ۱۷/۷) (ان میں سے بیشتر کو تو شکر گذار اور منعم شناس نہ پائے گا) ان میں سے بیشتر شاکر نہ ہوں گے۔

یاد رہے کہ جن صفات کو ہم نے منجیات کا نام دیا ہے دو قسم کی ہیں: ایک وہ ہیں جو راہِ دین کے مقدمات

کے بارے میں ہیں اور وہ اپنی ذات میں مقصود نہیں۔جیسے کہ توبہ' صبر' خوف' زہداور محاسبت ہیں کہ یہ سب ایک اور کام کا وسیلہ ہیں جوراہِ دین کا ہے۔اور دوسری قسم مقاصد اور نہایات ہیں کہ جواپنی ذات میں مقصود ہیں نہ کہ اس لئے کہ کسی اور کام کا وسیلہ ہوں۔جیسے کہ محبت' شوق' رضا' توحیداور توکل اور شکر ہیں۔اور جو کچھ آخرت میں مقصود ہے باقی رہے گا۔جیسے کہ فرمایا کہ: ''وَآخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ''(قرآن:۱۰/۱۰) (اوران کا پڑھنا آخر میں یہ ہوتا ہے کہ تعریف کے سزاوار اللہ ہے جو دنیا والوں کا خداوند ہے)۔پس اللہ تعالیٰ نے واجب کردیا کہ ذکراس کا پایان کتاب میں کیا جاتا لیکن چونکہ شکر صبر سے تعلق رکھتا ہے اس لئے یہاں بھی مذکور ہوا۔اور شکر کے درجے کی عظمت کی علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ذکر کا رفیق ٹھہرایا ہے۔فرمایا ہے کہ: ''فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ '(قرآن:۱۵۲/۲)(مجھے یاد کروتا کہ میں تمھیں یاد کروں اور میرا شکرادا کرو اور میرے ناسپاس گذار نہ بنو)اورآنحضرت نے فرمایا کہ: ''وہ شخص جو کھانا کھاتا ہے اور شکرادا کرتا ہے اس کا درجہ اس شخص کے درجے کا سا ہے جوروزہ رکھے اور صابر ہو''۔نیز فرمایا کہ: ''روزِ قیامت منادی کی جائے گی کہ ''این الحمادون؟''یعنی کہاں ہیں شکر گذار بندے؟' توکوئی شخص جواب میں نہ اٹھے گا سوائے اس کے کہ جس نے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکرادا کیا ہو''۔اور جب خزانۂ زرروک رکھنے کے بارے میں اوراس کی نفی میں آیت نازل ہوئی۔حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: ''اے اللہ کے رسول پھر ہم مال میں سے کیا جمع کریں؟''توآپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''ذاکرزبان' شاکردل' صابر بدن اور مومن بیوی''یعنی دنیا میں صرف اسی پر قناعت کروکہ کیونکہ مومن بیوی اس فراغت میں معاون ہوتی ہے جس میں ذکروشکر وصبر حاصل ہوتے ہیں۔ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ 'شکرآدھا ایمان ہے''۔عطاؒ فرماتے ہیں کہ ''میں حضرت عایشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا تو میں نے ان سے درخواست کی کہ آنحضرت کے عجائب اوراحوال میں سے کچھ بیان فرمایئے تو حضرت عایشہؓ نے فرمایا کہ: ''آپ ﷺ کے احوال میں سے کون سا حال ایسا ہے جو عجیب نہ ہو۔ایک روزآپ ﷺ میرے پاس شب خوابی کے لباس میں تشریف لائے تو میرا جسم ان کے برہنہ جسم سے ملا فرمایا کہ عایشہ چھوڑ دے تا کہ میں جاؤں اوراللہ کی عبادت کروں' تو میں نے کہا کہ میری آرزو تو یہ تھی کہ میں آپ کے قریب رہوں لیکن جایئے' توآپ اٹھ گئے۔مشک سے پانی لیا اور وضو کیا اور تھوڑا ہی سا پانی استعمال کیا اوراٹھ کھڑے ہوئے اور نماز میں لگ گئے اور روتے جارہے تھے۔یہاں تک کہ حضرت بلال آگئے تا کہ آپ سحر کی نماز کے لئے جائیں۔تو میں نے کہا اللہ تعالیٰ نے آپ کے سب گناہ بخش دیئے ہیں تو آپ روتے کیوں ہیں؟ فرمایا: تو کیا میں اللہ کا ایک شاکر بندہ نہ بنوں؟ کیوں گریہ نہ کروں؟ حالانکہ مجھ پر یہ آیت نازل ہو چکی

ہے کہ: ''اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۚ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ ''(قرآن: ۱۹۰،۱۹۱/۳)(زمین وآسمانوں کی تخلیق میں نیز شب وروز کی آمد وشد میں علامات ہیں عقل مندوں اور ہوشیاروں کے لئے' وہ جو کہ اللہ کو یاد کرتے ہیں قیام میں نشست میں اور پہلوؤں پر سوتے ہوئے) یعنی کہ اولوالالباب سوتے' بیٹھتے اور کھڑے حق تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہوتے ہیں اور ملکوتِ آسمان وزمین کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس مرتبے پر پہنچنے پر شکرادا کرتے ہیں اور روتے ہیں خوشی میں خوف ہی میں نہیں جیسے کہ روایت کی جاتی ہے کہ ''پیغمبروں میں سے ایک چھوٹے سے پتھر پر سے گذرے جس میں سے بہت پانی آرہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس پتھر کو گویائی عطا کی تو پتھر بولا'' جب سے یہ آیت وارد ہوئی ہے کہ ''وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ'' کہ لوگ اور پتھر دوزخ کا چارہ بنیں گے میں رورہا ہوں' تو اس پیغمبر نے اللہ سے درخواست کی کہ اس پتھر کو اس خوف سے ایمن کردے' تو یہ دعا قبول ہوئی۔ تو ایک اور دفعہ جب ان کا گذر وہاں سے ہوا تو دیکھا کہ پتھر اسی طرح پانی بہارہا ہے تو پوچھا کہ اب کیوں رورہا ہے؟ تو پتھر بولا کہ ''میرا رونا بر بنائے خوف تھا لیکن یہ رونا شکر کے طور پر ہے'' اور یہ مثال ہے آدمی کے دل کے لئے جو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے۔ انسان کو چاہئے کہ گریہ کرے۔ اندوہ میں بھی اور خوشی میں بھی تاکہ نرم دل ہوجائے۔

حقیقتِ شکر: یادر ہے کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ دین کے جملہ مقامات کی تین ہی اصلیں ہیں: یعنی علم وحال وعمل۔ علم اصل ہے۔ اس سے حال پیدا ہوتا ہے اور حال سے عمل۔ اسی طرح علم شکر نعمت کی پہچان ہے اپنے اللہ سے' اور حال دل کی خوشی ہے اس نعمت پر' اور عمل اس نعمت کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بروئے کار لاتا ہے۔ اور یہ عمل دل سے بھی تعلق رکھتا ہے اور زبان سے بھی نیز جسم سے بھی۔ جب تک یہ سب معلوم نہ ہو شکر کی حقیقت معلوم نہیں ہوگی۔

علم: یہ ہے کہ تجھے پتہ ہو کہ جو نعمت بھی تجھے پہنچتی ہے وہ حق سبحان تعالیٰ کی طرف سے ہے اور کوئی اس میں اس کا شریک نہیں۔ اور جب تک تو کسی شخص کو اسباب میں دیکھے اور اس کی طرف سے کوئی چیز گمان کرے تو یہ شکر کی کامل معرفت نہ ہوگی۔ کیونکہ جب ایک بادشاہ تجھے خلعت عطا کرے اور تو گمان کرے کہ یہ وزیر کی عنایت سے ملی ہے تو تیرا شکر بادشاہ کے لئے خالصۃً نہ ہوگا۔ بلکہ کچھ وزیر کے لئے ہوگا۔ اور تیری تمام تر خوشی بادشاہ سے نہ ہوگی بلکہ بعضی وزیر کے لئے ہوگی۔ اگرچہ تو جانتا ہے کہ خلعت تجھے بادشاہ کے دستخطوں پر ملی ہے اور اور یہ توقیع کاغذ قلم سے ہوتی ہے تو اس سے کوئی نقص معرفت میں پیدا نہیں ہوتا کیونکہ تجھے معلوم ہے کہ کاغذ

قلم تو بادشاہ کے مسخر ہوتے ہیں اور خود ان سے کوئی چیز متعلق نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر تو جانے کہ خزانہ دار نے تجھ تک پہنچائی ہے۔ تو اس سے بھی کوئی ضرر فہم میں نہیں ہونے کا۔ کیونکہ تمھیں معلوم ہے کہ خزانہ دار کے ہاتھ میں تو کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اور وہ بھی بادشاہ کا مسخر ہوتا ہے۔ جب اسے حکم ملا تو وہ اس حکم کے خلاف نہیں کر سکتا۔ اور اگر اسے حکم نہ ملے تو از خود وہ دے نہیں سکتا۔ تو وہ بھی کاغذ قلم ہی کی طرح مسخر ہے۔ اسی طرح اگر تو روئے زمین کی نعمت بارش کی بناء پر دیکھے اور بارش کو گھٹا کی وجہ سے گردانے اور کشتی کی نجات باد موافق کی وجہ سے جانے تو تیرا شکر درست نہ ہوگا۔ لیکن جب یہ جانتا ہے کہ گھٹا' بارش' ہوا' آفتاب' اور چاند تارے اور جو کچھ بھی کائنات میں ہے سب کا سب اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں مسخر ہے جیسے قلم منشی کے ہاتھ میں مسخر ہوتا ہے۔ اور قلم کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ تو اس سے ادائے شکر میں کوئی نقص وارد نہیں ہوتا۔ اس طرح اگر کوئی نعمت کسی آدمی کے ذریعے پہنچے اور تُو اسے اس کی طرف سے سمجھے تو یہ جہالت ہوگی اور مقام شکر سے حجاب' بلکہ جاننا تجھے یہ چاہیئے کہ اس شخص نے وہ نعمت تجھے اس لئے دی کہ حق تعالیٰ نے اس پر ایک موکل بھیج دیا تھا کہ جس نے لازماً اسے اس پر رکھا کہ وہ شخص چاہنے پر بھی اللہ تعالیٰ کے خلاف نہ کر سکتا تھا اور اگر اس کے بس میں ہوتا تو اس نعمت کا ایک ذرہ بھی تجھے نہ دیتا۔ اور وہ موکل وہ داعیہ ہے جو اس کے دل میں جاگزین ہوا کہ جس نے اسے بتایا کہ تیری خیر اس دنیا میں اور اُس دنیا میں اسی میں ہے کہ یہ نعمت تو اسے دے تاکہ وہ اس طمع میں کہ اپنی غرض کو پہنچے جو اس دنیا کی ہے یا اُس دنیا کی ہے اس نے وہ نعمت تجھے دے دی۔ اور درحقیقت اس نے وہ نعمت خود ہی کو دی کیونکہ اس نے اسے اپنے مقصد کے لئے وسیلہ بنایا۔ لیکن حق تعالیٰ نے تجھے دی اور درحقیقت اس نے خود ہی کو دی کہ اس کو اپنی غرض کیلئے وسیلہ بنایا۔ لیکن حق تعالیٰ نے تجھے دی کہ اس پر اس قسم کا موکل ٹھہرایا۔ اور حق کو اس نعمت کے معاوضے کی کوئی آرزو نہیں۔ پس جب تو یہ حقیقت جان لے کہ درمیان کے تمام انسان بادشاہ کے خازن کی طرح ہیں اور خازن قلم کی طرح ہے اور کسی کے ہاتھ میں بھی کچھ نہیں۔ سوائے اس کے کہ جس پر لازم کریں۔ پھر تُو نعمت حق تعالیٰ کا شکر کما حقہ ادا کر سکے گا۔

بلکہ یہ معرفت خود عین شکر ہے۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مناجات میں کہا کہ 'بارِ خدایا تو نے آدم کو اپنے دستِ قدرت سے پیدا کیا اور اس کے ساتھ ایسے ایسے کیا تو آدم نے اس پر بھی تیرا شکر کس طرح ادا کیا؟'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''آدم جانتا تھا کہ یہ تعرّض میری طرف سے ہے اور اس کا اس حقیقت سے آشنا ہونا ہی میرا شکر ہے''۔

یاد رہے کہ ایمان کے معارف کے باب بہت ہیں اور پہلا باب تقدیس ہے کہ تجھے معلوم ہو کہ خدائے

عزّ وجل مخلوق کی صفات اور جو کچھ بھی انسان کے وہم وگمان میں آ سکتا ہے اس سے پاک ہے۔ جس کی تعبیر 'سبحان اللہ' میں ہے۔ اور دوسرے یہ کہ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس پاکی کے ساتھ یگانہ ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ لا الٰہ الا اللہ سے عبارت ہے۔ اور تیسرے یہ کہ تو جان لے کہ جو کچھ ہے اسی سے ہے۔ اور یہ اس کی نعمت ہے۔ اور اس حالت کی عبارت 'الحمد للہ' سے ہے۔ اور یہ ان دو سے ماورا ہے کیونکہ وہ دونوں معرفتیں اسی کی ذیل میں ہیں۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''سبحان اللہ دس نیکیاں ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ بیس اور الحمد للہ تیس حسنات ہیں۔ اور یہ حسنات ان کلمات کے زبان پر لانے سے نہیں بلکہ یہ حسنات وہ معارف ہیں جو دل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور یہ کلمات ان معارف کی تعبیر ہیں۔ یہ ہیں شکر کے علم کے معنی۔ اور

حال شکر: وہ خوشی ہے جو اس معرفت سے دل میں پیدا ہوتی ہے کہ جو وہ کسی سے نعمت پاتا ہے اس مُنعم سے خوش ہوتا ہے لیکن یہ خوشی تین وجوہ سے ہو سکتی ہے۔

ایک: یہ کہ اگر بادشاہ سفر کا ارادہ کرے تو اپنے خادموں میں سے ایک کو گھوڑا عطا کرے۔ تو اگر یہ خادم اس سبب سے خوش ہو کہ اسے گھوڑے کی ضرورت تھی اور اس نے پالیا تو یہ خوشی بادشاہ کے شکر میں نہ ہوگی۔ کیونکہ اگر وہ یہی گھوڑا صحرا میں آوارہ پالیتا تو بھی اسی طرح خوش ہوتا۔

اور دوسری صورت: یہ ہے کہ خادم اس لئے خوش ہو کہ وہ اسے اپنے حق میں بادشاہ کی عنایت تصور کرے۔ تو اسے مزید نعمتوں کی امید پیدا ہو جائے۔ تو یہ شادی منعم سے ہوگی لیکن منعم کے لئے نہیں بلکہ امید انعام کے لئے ہوگی۔ اور یہ من جملہ شکر کے ہے لیکن ناقص ہے۔

تیسرا درجہ: وہ ہے کہ خادم خوش اس بناء پر ہو کہ وہ اس گھوڑے پر سوار ہو سکتا ہے اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ سکتا ہے تا کہ اس سے ملاقات کرے۔ اور وہ بادشاہ سے سوائے اس کے اور کسی شے کا خواہاں نہ ہو۔ تو یہ خوشی بادشاہ سے متعلق ہوگی اور یہ کامل شکر کی مثال ہے۔ اسی طرح وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے نعمت عطا کی اور وہ اس نعمت سے خوش ہوا نہ کہ منعم سے تو یہ شکر نہیں اور اگر منعم سے خوش تو ہوا لیکن اس لئے کہ اس کو رضا اور عنایت کی دلیل ٹھہرایا تو یہ شکر تو ہوگا لیکن ناقص۔ اور اگر خوش وہ اس بناء پر ہو کہ یہ نعمت اس کے لئے فراغتِ دین کا باعث ہوگی تا کہ عبادت اور حصولِ علم دین میں لگ جائے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کا طالب ہو جائے۔ تو یہ کمال شکر ہوگا۔ علامت اس کی یہ ہے کہ دنیا کی جو شے دین کی خدمت یا اللہ سے تعلق سے باز رکھے اس سے وہ غمگین ہو اور اسے وہ نعمت نہ سمجھے بلکہ اس کے ہاتھ سے جاتے رہنے کو نعمت قرار دے اور اس پر شکر گذار ہو پس ہر وہ چیز جو راہ دین میں اس کی معاون نہ ہو اس پر خوش نہ ہو۔ اسی بناء پر شبلیؒ نے فرمایا کہ: ''شکر یہ ہے کہ تو نعمت کو نہ

دیکھے مُنعم کو دیکھے'' اور جسے ماسوائے محسوسات کے لذت نہ ملتی ہو جیسے کہ شہوتِ چشم و شکم و فرج تو ایسے سے اس شکر کی توقع عبث ہے۔ پس انسان کو درجۂ دوم سے کم نہ ہونا چاہئے کیونکہ اس کا پہلا درجہ بھی شکر میں شمار نہیں ہوتا

شکر کا عمل دل پر بھی ہوتا ہے زبان پر بھی اور جسم پر بھی

شکر کا عمل دل پر اس طرح ہوتا ہے کہ شاکر تمام خلق کا خیر خواہ ہوتا ہے اور نعمت میں کسی سے حسد نہیں کرتا اور زبان اس طرح متاثر ہوتی ہے کہ انسان شکر کرتا ہے اور الحمدللہ بہ کثرت کہتا ہے اور ہر حال میں مُنعم سے خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ آنحضرت نے ایک شخص سے فرمایا کہ: ''کیسے ہو؟'' تو اس نے کہا ''بخیر'' آپ ﷺ نے پھر یہی سوال کیا تو وہ بولا ''بخیر والحمدللہ'' تو آپ نے فرمایا کہ: ''میں اسی کو ڈھونڈ رہا تھا'' اسلاف جب ایک دوسرے سے کہتے کہ: ''کیسے ہو؟'' تو اس لئے تھا کہ اس کا جواب 'شکر' ہو۔ تاکہ احوال پرسی کرنے والا اور جواب دینے والا دونوں ثواب میں شریک ہو جاتے ہوں۔ اور جو کوئی حرف شکایت لب پر لاتا ہے گناہ گار قرار پاتا ہے اگرچہ وہ مُصیبت ہی میں کیوں نہ ہو۔ اور ایسے بدبخت کی طرف سے گلہ تو اور بھی برا ہے جس کے ہاتھ میں ذرہ بھر قدرت نہیں وہ ساتوں آسمانوں اور زمینوں کے مالک کا گلہ کرے۔ بلکہ بلا پر شکر کرنا چاہئے کیونکہ ممکن ہے وہ بلا اس کے لئے سعادت ہو۔ اگر اور کچھ نہ کرے صبر تو کرے۔

شکر کا عمل جسم پر: یہ ہے کہ انسان کے جملہ اعضا اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں۔ اس لئے یہ اعضا جس مقصد کے لئے تخلیق ہوئے اسی کے لئے انہیں بروئے کار لائے اور ظاہر ہے سب کو آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی تمنا تجھ سے یہ ہے کہ تو اسی میں مصروف ہو۔ جب تو نے نعمت کو اللہ کی خواہش کے مطابق صرف کیا تو گویا تو نے اس کا شکر ادا کر دیا۔ اگرچہ خود اللہ تعالیٰ کو اس میں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کی ذات اس سے پاک ہے۔ مثال اس کی اس طرح ہے کہ کسی بادشاہ کو اپنے کسی غلام کے حق میں عنایت ہو اور وہ غلام اس سے دور ہو تو اسے سواری اور زادِ راہ بھجوائے تاکہ وہ بادشاہ کے پاس آ جائے تو شاہ کے قُرب کے باعث حضور شاہ میں محتشم قرار پائے گا۔ اور بلند مرتبہ پائے گا۔ حالانکہ پادشاہ کے لئے اس غلام کی دوری یا نزدیکی یکساں ہوتی ہے کہ اس سے اس کی مملکت میں نہ اضافہ ہوتا ہے نہ کسی شے کی کمی آتی ہے۔ لیکن غلام کے لئے اس لئے چاہتا ہے کہ اس کے لئے مفید ہو۔ کیونکہ بادشاہ اگر کریم ہو تو تمام خلق کا بھلا چاہتا ہے محض ان کے لئے نہ کہ اپنے لئے۔ پس اگر وہ غلام بادشاہ کے عنایت کردہ گھوڑے پر سوار ہو کر بارگاہِ بادشاہ کا رُخ کرے اور عطا کردہ زادِ راہ مصرف میں لائے تو اس نے گویا گھوڑے اور زادِ راہ کی نعمت کا شکر ادا کر دیا۔ لیکن اگر وہ سوار ہو کر

بادشاہ کی بارگاہ کی طرف پشت کرے تاکہ حضورِ شاہ سے اور بھی دور ہوجائے تو وہ کفرانِ نعمت کا مرتکب قرار پائے گا۔ اور اگر معطل رکھے کہ نہ تو بادشاہ کی طرف رُخ کرے اور نہ شاہ سے دور تر ہو تو یہ بھی کفران ہی ٹھہرے گا۔ اگر چہ اس شدت کا نہ ہوگا۔ اسی طرح جب بندہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو اس کی طاعت میں صرف کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعے قربِ خداوندی کا درجہ پائے تو اسے شاکر کہا جائے گا اور اگر تنعم مباح میں صرف کرے تو یہ بھی کفران ہی ہوگا۔ اگر چہ اس درجے کا نہ ہو۔ جب معلوم ہو چکا کہ شکرِ نعمت اس طرح ہوتا ہے کہ انسان نعمت کو اللہ کی پسندیدہ راہ میں صرف کرے اور یہ وہی کر سکتا ہے جو اللہ کو محبوب ہو اور حق تعالیٰ کی رضا اور ناراضگی میں امتیاز کر سکتا ہو۔ اور یہ ایک دقیق اور باریک علم ہے اور جب تک کوئی ہر چیز کی تخلیق کی حکمت کا شناسا نہ ہوا سے نہیں جان سکتا۔ اور ہم نے چند مختصر مثالوں کے ذریعے اس کتاب میں اشارہ کیا ہے۔ اگر کسی کو مزید کی ضرورت ہو تو وہ ہماری کتاب اِحیا سے حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ کتاب اس سے زیادہ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

اس بات کا بیان کہ کفران نعمت کا یہ ہے کہ اس کو اس کی حکمت کی راہ سے منحرف کر دیا جائے اور اسے اس طرح صرف نہ کیا جائے جس طرح صرف کرنے کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ راہ میں صرف کرنا تو شکر ہے اور ناپسندیدہ میں صرف کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ اور محبوب و مکروہ میں امتیاز بہ تفصیل بدونِ علمِ شرع ممکن نہیں۔ پس شرط یہ ہے کہ نعمت کو انسان اللہ تعالیٰ کی طاعت میں صرف کرے۔ جیسا کہ اس کا حکم ہے۔ اہل بصیرت کے لئے ایک راہ ہے کہ جس کے ذریعے وہ کاموں کی حکمت کو بنظرِ استدلال اور بر سبیلِ الہام پہچان سکیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی پہچان لے کہ گھٹا کی تخلیق میں حکمتِ بارش ہے اور بارش کی تخلیق میں حکمتِ نباتات ہے اور نباتات کی تخلیق میں حکمت جانوروں کی غذا ہے اور آفتاب کی تخلیق میں حکمتِ شب و روز کا وقوع ہے تاکہ رات آرام کے لئے ہو اور دن معیشت کے کام کے لئے۔ اس سے نیز اس جیسی مثالوں سے یہ بات روشن ہے کہ ہر کوئی یہ پہچان سکتا ہے لیکن آفتاب میں بہت سے حکمتیں ہیں۔ علاوہ ان حکمتوں کے کہ جنھیں سب جانتے ہیں۔ اور آسمان پر بے شمار ستارے ہیں کہ جن کی حکمتِ آفرینش ہر کوئی نہیں جانتا۔ جیسے کہ اپنے اعضا کے بارے میں جانتا ہے کہ مثلاً ہاتھ پکڑنے کے لئے ہیں اور پاؤں چلنے کے لئے، آنکھ دیکھنے کے لئے ہے لیکن نہیں جانتے کہ جگر اور تلی وغیرہ کس لئے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ آنکھ کے ڈھیلے کے دس طبقے ہیں اور کس لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ پس ان حکمتوں میں بعض دقیق ہوتی ہیں تو بعض دقیق تر کہ جنھیں سوائے خواص کے عوام نہیں جانتے اور تفصیل ان کی

طویل ہے۔

لیکن اسی قدر جاننا ضروری ہے کہ انسان کو آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ دنیا کے لئے۔ اور دنیا سے انسان کے حصے میں جو کچھ ہے وہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ آخرت کے لئے اس کا زادِ راہ ہو۔ اور یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ سب چیزیں اسی کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ جب کوئی ایسی چیز دیکھے جس میں اسے اپنے لئے کوئی فایدہ نظر نہ آئے تو کہنے لگے کہ انھیں کیوں پیدا کیا گیا ہے ان کی تخلیق میں کیا حکمت ہے؟ یا مثلاً کہے کہ چیونٹی اور مکھی کو یا سانپ کو کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ تو انسان کو معلوم ہونا چاہئے کہ چیونٹی بھی تمھاری آفرینش پر متحیر ہے کہ تمھیں کیوں پیدا کیا گیا ہے کہ ناحق انھیں روندتے اور ہلاک کرتے ہو۔ تو تعجب چیونٹی کا تمھارے تعجب ہی کا سا ہے۔ بلکہ کمالِ جودِ الٰہیت کے لئے لازم ہے کہ جو شے بھی حیوانات، نباتات اور معادِن وغیرہ کی جملہ اجناس وانواع میں ممکن الوجود ہے اسے اُس کی بہترین صورت میں وجود میں لایا جائے۔ اور جس شے کو جو درکار ہو وہ اس کی ضرورت اور حاجت کے مطابق اور بہترین روپ میں وجود میں لائی جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بخل اور منع کو دخل نہیں ہے۔ اور جو شے کمال و زینت کے ساتھ وجود میں نہیں آتی وہ اس لئے کہ محل اس کے قابل نہیں ہوتا کہ وہ اس کے برعکس صفت میں مشغول ہو اور ہوسکتا ہے کہ وہ ضد بھی ایک اور کام کے لئے مقصود ہو۔ جیسے آگ کے لئے ممکن نہیں ہے کہ سردی اور لطافت کو قبول کرے کیونکہ گرم شے سردی کو قبول نہیں کرتی کیونکہ یہ اس کی ضد ہے۔ اور گرمی اس کا مقصود ہے اور اس سے ازالہ کرنا بھی باعثِ نقصان ہے اور حقیقت میں وہ رطوبت جس سے مکھی کو پیدا کیا گیا ہے اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ مکھی اس رطوبت سے کامل تر ہے اور وہ رطوبت اس کمال کے قابل تھی اس لئے اس سے باز نہ رکھا کہ یہ روکنا بخل ہوتا۔ اور اس سے کامل تر ہے۔ کیونکہ اس میں زندگی، قدرت، حس وحرکت اور اشکال نادر ہیں کہ جو اس رطوبت میں نہیں ہیں۔ اس سبب سے انسان کو اس رطوبت سے پیدا نہیں کیا گیا کہ انسان کی تخلیق کا مرتبہ نہ رکھتی تھی اور اس کے قابل نہ تھی۔ کیونکہ رطوبت میں وہ صفات تھیں جو ان صفات کی متضاد تھیں جو انؔ کی آفرینش کی شرط تھیں۔ لیکن جس شے کی حاجت مکھی کو تھی اس کی فراہمی میں کمی نہیں کی گئی۔ یعنی پر و بال، ہاتھ پاؤں، آنکھ، دہان، سر و شکم اور وہ جگہ جہاں شے غذا داخل ہو اور وہ جگہ جہاں غذا ہضم ہونے کے لئے قرار پایا ہے اور اس کے اخراج کی جگہ، غرض جو کچھ بھی اس کے جسم کو لازم تھا از قسم تنگی و لطیفی و سبکی کسی میں بھی بخل نہیں کیا گیا۔ اور چونکہ مکھی کو دیکھنے کی حاجت تھی اور سر اس کا چھوٹا تھا اور وہ اس آنکھ کو کہ جس پر معمولاً پلک ہوتی برداشت نہ کرسکتا تھا۔ اس لئے اس کے لئے بے پلک دو نگینے دو آئینوں کے سے پیدا کئے۔ تاکہ اشکال ان میں منعکس ہوں اور انھیں دیکھ سکے اور پلکیں چونکہ اس

لئے ہوتی ہیں کہ آنکھوں میں جو گرد وغیرہ بیٹھ جائے اس کو صاف کریں وہ آئینے کے لئے صیقل کی مانند ہوتی ہیں۔ مکھی کی آنکھوں پر پلک نہیں ہوتی اس کا بدل دو ہاتھ زیادہ پیدا کئے تا کہ ان دونوں ہاتھوں سے ان آنکھوں کے نگینوں کو صاف کر سکے مکھی اس کے بعد اپنے ان دونوں ہاتھوں کو باہم ملتی ہے تا کہ گرد ہاتھوں سے دور ہو جائے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ تو جان لے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ لطف اور عنایت عام ہے اور فقط انسان سے مخصوص نہیں۔ کیونکہ ہر کیڑے مکوڑے اور مچھر کو جو کچھ درکار تھا سب بہ کمال عطا کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مچھر کو بھی اسی صورت پر تخلیق کیا گیا ہے۔ جس صورت پر ایک ہاتھی کو تخلیق کیا گیا ہے۔ اور یہ تخلیق انسان کے لئے نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ خود اسی کے لئے کی گئی ہے جیسے کہ تجھے خود تجھی کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔ کیونکہ تخلیق سے پہلے تیرے پاس کوئی ایسا وسیلہ یا قرابت نہ تھی کہ جس کی بناء پر پیدا ہونے کا تو مستحق ہوتا جو دوسروں کے پاس نہ تھی لیکن سخائے الٰہیت کا سمندر اس وقت تمام چیزون کو محیط تھا۔ اوران چیزوں میں سے ایک تو (انسان) ہے' ایک چیونٹی ہے' ایک مکھی ہے' ایک ہاتھی ہے اور ایک پرندہ ہے۔ اور اسی طرح مخلوق میں جو ناقص ہے اسے کامل پر قربان کر دیا گیا ہے۔ اور انسان رُوئے زمین پر جملہ مخلوق سے کامل تر ہے۔ تو لازماً بیشتر چیزیں اسی پر فدا ہیں۔ لیکن زمین کے پاتال میں سمندر کی گہرائی میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ جو انسان کو نصیب نہیں ۔ اور ان چیزوں کے ساتھ ان کے ظاہر و باطن میں اِنھی لطف وعنایات سے کام لیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ ان کے ظاہر پر ایسے نقش ونگار سے کام لیا گیا ہو کہ انسان اُن سے عاجز ہوں۔ آج کل یہ بات ان سمندری علوم سے متعلق ہے کہ بیشتر علما اس سے عاجز ہیں اور تفصیل ان کی دراز ہے۔

مقصد یہ ہے کہ تو اپنے آپ کو حضرت الٰہیت کے برگزیدوں میں شمار نہ کرے کہ ہر شے کو اپنے لئے گمان کرے اور جس شے میں اپنے لئے فایدہ نہ دیکھے تو کہنے لگے کہ اُسے کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں تو کوئی حکمت نہیں' اور جب تو نے جان لیا کہ چیونٹی کو تیرے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ تو یہ بھی جان لے کہ چاند' ستارے' سورج' آسمان اور جملہ ملائکہ اور یہ سب کچھ نیز تیرے لئے نہیں ہے۔ اگرچہ ان سے بعض سے تجھے بھی کچھ نصیب ہے' جیسے کہ مکھی کو تیرے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ اگرچہ تجھے اس سے کچھ نصیب ہے کہ مکھی کو اس پر انگیخت کیا گیا ہے کہ جو کچھ تجھے ناپسند ہے اور گل سڑ جانے والا ہو وہ اسے کھاتی ہے۔ تا کہ بدبوئیں کمتر ہو جائیں۔ اور قصاب کو مکھیوں کے لئے پیدا نہیں کیا گیا اگرچہ مکھی کو اس میں نصیب حاصل ہے۔ اور تیرا گمان کہ سورج ہر روز تیرے لئے نکلتا ہے تو مکھی کے اس گمان کا سا ہے جو سمجھتی ہے کہ قصاب ہر روز اس کے لئے دکان لگاتا ہے تا کہ وہ خون اور ان ناپسندیدہ اجزاء کو جی بھر کر کھا سکے۔ اور جس طرح قصاب ایک ایسے کام میں لگا ہوتا ہے کہ اسے

مکھی کا خیال بھی نہیں آتا اگرچہ اس کے کام کے فضلات مکھی کی غذا اور زندگی کا باعث ہیں۔ اسی طرح سورج بھی اپنے طواف وگردش میں بخدمتِ الٰہیت ہوتا ہے۔ اور تُو اس کے وہم وخیال میں بھی نہ ہوگا۔ اگرچہ اس کے فضلاتِ نور سے تیری آنکھ روشن ہوتی ہے اور سورج ہی کے فضلات سے زمین کا مزاج معتدل ہوتا ہے تا کہ نباتات جو تیری غذا ہیں وجود میں آئیں۔ پس ہمارے لئے ان چیزوں کی حکمتِ تخلیق جو انسان سے متعلق نہیں ہیں معنی شُکر میں بہ کار نہیں آتی۔ اور وہ چیزیں جو تجھ سے متعلق ہیں وہ بھی بہت سی ہیں کہ ان سب کا بیان ممکن نہیں۔ البتہ چند مثالیں بیان کی جاتی ہیں: ایک یہ کہ تجھے آنکھ دو کاموں کے لئے عطا ہوئی ہے۔ ایک اس لئے کہ اس دنیا میں اپنی حاجات کی راہ کو دیکھ سکے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صنعت گری کے عجائبات کا نظارہ کر سکے۔ اور ان کے ذریعے اللہ کی عظمت سے آشنا ہو۔ اور جب تو نامحرم کو دیکھے تو تُو نے کفرانِ نعمت کیا۔ بلکہ نعمت چشم بغیر نور آفتاب کے کامل نہیں کیونکہ بغیر اس کے دیکھ نہیں سکتی۔ اور آفتاب بے آسمان وزمین ممکن نہیں کہ شب وروز زمین وآسمان میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور تو نے نامحرم پر ایک نظر ڈالنے سے آنکھ' آفتاب بلکہ زمین وآسمان کی نعمتوں سے کفران کیا۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں وارد ہے کہ ''جو کوئی گناہ کرتا ہے زمین وآسمان اس پر لعنت کرتے ہیں''۔

اور ہاتھ تجھے اس لئے دیئے گئے ہیں کہ تو ان سے اپنے کام انجام دے سکے کہ کھانا کھا سکے' خود کو نہلا سکے وغیرہ۔ لیکن جب تو ہاتھ سے گناہ کرتا ہے تو کفران نعمت کا مرتکب ہوتا ہے۔ بلکہ مثلاً اگر دائیں ہاتھ سے استنجا کرے اور بائیں ہاتھ سے قرآن مجید کو لے تو کفران کا مرتکب ہوا۔ اور محبوبان خدائے تعالیٰ کی فہرست سے خارج ہو گیا۔ کیونکہ محبوب اس کا عدل ہے۔ اور عدل یہ ہے کہ شریف کا اور حقیر حقیر کا۔ اور تیرے دو ہاتھوں میں سے ایک غلبے میں قوی تر پیدا کیا گیا ہے تو وہ شریف تر ہے اور کام تیرے دو قسم کے ہیں کہ بعض حقیر ہوتے ہیں تو بعض شریف۔ تو چاہئے کہ جو کچھ شریف ہے اسے دائیں ہاتھ سے انجام دے اور جو کہ حقیر ہے اسے بائیں ہاتھ سے انجام دے۔ تا کہ عدل بجالایا ہو۔ ورنہ بہائم کی طرح حکمت کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ اور اگر تھوک کر قبلے کی جانب ڈالے تو تو نے نعمت جہات اور نعمت قبلہ کا کفران کیا۔ کیونکہ جہات سب برابر ہوتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے تیری بہتری کے لئے ایک جہت کو تیرا قبلہ بنا دیا تا کہ وقتِ عبادت رخ اس طرف کر سکے۔ جو تیرے ثبات اور سکون کا ذریعہ ہو۔ اور وہ گھر جو اس جہت پر رکھا اسے خود سے متعلق کیا۔ تجھے حقیر کام بھی انجام دینے ہوتے ہیں۔ جیسے قضائے حاجت اور تھوکنا اور شریف کام بھی کرنے ہوتے جیسے وضو اور نماز۔ اگر سب شریف وحقیر کو برابر ٹھہرائے گا تو گویا تو نے ڈھور ڈنگروں کی سی زندگی اختیار کی۔ اور نعمتِ عقل کا حق کہ

عدل وحکمت اس سے پیدا ہوتے ہیں اور حق نعمت قبلہ کو باطل کر دیا ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی درخت سے کوئی شاخ بے ضرورت توڑ کر پھینک دے یا کوئی شگوفہ توڑ کر پھینک دے تو اس طرح تو نے نعمتِ درخت اور ہاتھ کی نعمت کا کفران کیا۔ کیونکہ وہ شاخ پیدا کی گئی ہے اور اس میں ریشے ہیں تا کہ ان کے ذریعے خوراک کی کشید کرے اور اس میں غذا کے انہضام اور دوسری قوتیں پیدا کی گئی ہیں۔ اور ایسے کام کے لئے تخلیق ہوئی ہیں کہ جو اس کے مقصد کی تکمیل میں معاون ہوتا ہے۔ تو تو نے توڑنے کی بناء پر اس کا راستہ روک دیا اس لئے کفران ٹھہرا۔ اِلا یہ کہ تجھے اس شاخ کی ضرورت اپنے کسی کام کی تکمیل میں ہو۔ پھر درخت کا وہ کمال تیرے کمال پر فدا ہو جائے گا۔ کیونکہ عدل یہ ہے کہ ناقص کامل پر قربان ہو جائے اور اگر تو کسی دوسرے کی ملک میں کے درخت سے شاخ توڑے گا تو یہ کفران ہوگا۔ اگرچہ تجھے اس شاخ کی حاجت ہو۔ کیونکہ درخت کے مالک کی حاجت تیری حاجت سے بڑھ کر اور اولیٰ تر ہے۔ اگرچہ حقیقتاً کوئی شے انسان کی ملکیت نہیں ہوتی۔ لیکن دنیا ایک ایسے دسترخوان کی طرح ہے جس پر کھانے رکھے ہوئے ہیں اور اللہ کے بندے اس خوان پہ مہمانوں کی مانند ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی صاحبِ ملک نہیں ہوتا لیکن چونکہ ہر لقمہ سب کے لئے وفا نہیں کرتا اس لئے ایک مہمان نے جو لقمہ ہاتھ میں لیا ہے کہ اسے منہ میں لے جائے دوسرے مہمان کے لئے جائز نہیں کہ اس سے چھین لے۔ انسانوں کی مِلک اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور جس طرح مہمان کا یہ حق نہیں کہ طعام پکڑے اور کسی ایسی جگہ میں رکھ دے کہ دوسروں کی دسترس میں نہ رہے۔ اس طرح کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی حاجت سے بڑھ کر دنیا کا مال صرف کرے۔ اور اپنے خزانے میں رکھ لے اور محتاجوں کو نہ دے۔ لیکن اس پر فتویٰ ممکن نہیں کیونکہ حاجت ہر کسی کی معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگر ہم یہ راہ کھول دیں تو ہر کوئی دوسرے کے مال کو ہتھیا لے گا اور کہے گا کہ تجھے اس کی حاجت نہیں۔ پس اسے ہم نے ضرورت پر چھوڑ دیا ہے۔ لیکن حکمت کے خلاف ہے اور مال جمع کرنے کی ممانعت اس بنا پر آئی ہے۔ خاص طور پر گندم وجَو کی ذخیرہ اندوزی کی کہ یہ لوگوں کی زیست کی بنیادی ضرورت ہے اور جب اسے مالِ تجارت بنایا جاتا ہے تو یہ روک لی جاتی ہے اور محتاجوں تک پہنچ نہیں پاتی۔ اور احتکار زر وسیم میں بھی حرام ہے۔ س لئے کہ خدائے تعالیٰ نے زر وسیم کو دو حکمتوں کے لئے پیدا کیا ہے:

ایک: یہ کہ چیزوں کی قیمت زر وسیم میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ گھوڑا کتنے غلاموں کے عوض میں بکتا ہے۔ یا ایک غلام کتنے کپڑوں میں آتا ہے۔ اور یہ سب ایک دوسرے کے عوض بیچے جا سکتے ہیں۔ پس کسی ایسی چیز کی حاجت ہو سکتی ہے کہ سب کو اسی پر قیاس کر کے جان سکیں۔ زر وسیم اس کے لئے پیدا کئے گئے تا کہ ایسا حاکم ہو جو ہر چیز کی مقدار کو معلوم کرے۔ اور جو کوئی اسے خزانے میں ڈال رکھے وہ ایسا ہے جیسے کہ حاکم

مسلمانوں کو قید میں ڈال رکھے۔اور جو کوئی زر وسیم سے کوزہ یا لوٹا وغیرہ بنائے وہ ایسے ہوگا جیسے کوئی حاکم مسلمانوں کو بار برداری یا بافندگی کے حقیر کام پر لگائے۔ کیونکہ لوٹے جیسا برتن پانی کو محفوظ رکھنے کے لئے درکار ہوتا ہے جو مٹی یا تانبے سے بھی بن سکتا ہے۔

اور دوسری: حکمت یہ ہے کہ دو عزیز گوہر ایسے ہیں کہ ان کے ذریعے سے ہر چیز حاصل ہوتی ہے اور ہر کوئی ان کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جس کے پاس سونا ہے اس کے پاس گویا سب کچھ ہے اور ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی کے پاس کپڑا ہو اور سے کھانے کی شے کی حاجت ہو۔ وہ شخص جس کے پاس اشیائے طعام ہیں اسے کپڑے کی ضرورت نہ ہو کہ کپڑے کے عوض طعام بیچے۔اس لئے خدائے تعالیٰ نے سونے چاندی کو پیدا فرمایا اور اسے عزیز کر دیا تا کہ معاملات اس کے ذریعے رواں دواں رہیں تا کہ انھیں کہ جنھیں کوئی حاجت نہیں۔ جو چاہیں اس کے ذریعے حاصل کریں۔اور جب سونے کو سونے کے عوض اور چاندی کو چاندی کے عوض بیچنے لگیں اس طرح کہ اس پر سود ہو تو یہ دونوں ایک دوسرے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی قید میں آ جاتے ہیں اور دوسرے کاموں کا وسیلہ بننے سے باز رہتے ہیں۔

پس یہ گمان نہ کرنا کہ شرع میں کوئی چیز حکمت وعدل سے عاری ہو بلکہ ہر چیز اس انداز سے ہے کہ جس انداز سے اسے ہونا چاہئے۔لیکن ان حکمتوں میں سے بعض ایسی دقیق ہوتی ہیں کہ جنھیں پیغمبروں کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔اور بعض وہ ہوتی ہیں کہ جنھیں سوائے علما کے اور کوئی نہیں جانتا۔اور ہر وہ عالم جو محض مقلد ہو اور محقق نہ ہو وہ عوام کا سا ہے' جب اس نے ان حکمتوں کو پہچانا یہ کہ فقہا انھیں مکروہ جانتے ہیں وہ انھیں حرام سمجھتا ہے حتیٰ کہ بزرگوں میں سے ایک نے سہواً بایاں پاؤں پہلے جوتے میں ڈال دیا تھا اس نے اس کے کفارے میں کئی خروار گندم دی تھی۔لیکن عامی اگر درخت سے بے ضرورت شاخ توڑے یا تھوک قبلہ رخ پھینکے یا بائیں ہاتھ سے قرآن مجید کو لے تو ہم اس نقصان پر چنداں اعتراض نہ کریں گے۔ کیونکہ وہ عامی ہے اور عامی ڈھور ڈنگروں کے قریب ہی ہوتا ہے۔اور وہ ان کاموں کی استعداد نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کے احوال حکمت سے ایسے دور ہوتے ہیں کہ ان باریکیوں میں سے کچھ بھی وہاں دکھائی نہیں دیتا۔اگر کوئی کسی آزاد مرد کو جمعہ کے دن نماز کی اذان کے وقت بیچے تو اس پر اس لئے عتاب نہ کیا جائے گا کہ ایسے وقت میں بیع ممنوع ہوتی ہے کیونکہ آزاد فرد کو بیچنے کا بڑا گناہ اس کراہیت کو ڈھانپ لیتا ہے۔اسی طرح اگر کوئی محراب مسجد میں قضائے حاجت پشت بہ قبلہ کرے تو اس عتاب کو کہ پشت بہ قبلہ یہ کام کیا ہے جگہ نہیں رہتی کیونکہ گناہ اس کا بجائے خود اتنا برا ہے کہ یہ دقیق امر وہاں پیدا نہیں ہوتا۔اس لئے عوام کے ساتھ فقہ میں مسامحت کی جاتی ہے۔فتویٰ ظاہر عوام کے لئے ہے۔لیکن

راہِ آخرت کے سالک کو چاہئے کہ فتویٰ ظاہر کو نہ دیکھے بلکہ یہ تمام دقائق ملحوظ خاطر رکھے تا کہ عدل وحکمت میں فرشتوں کے قریب ہو جائے۔ ورنہ ترکِ دقائق کی وجہ سے بہائیم کے قریب جا پڑے گا۔

حقیقتِ نعمت کا بیان

یاد رہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے انسان کے حق میں چار قسم کا ہے:

ایک: وہ ہے جو انسان کے لئے اس دنیا میں بھی فایدہ مند ہے اور اس جہان میں بھی مفید ہے جیسے کہ علم خوش خلقی اور اس دنیا میں نعمت در حقیقت یہی ہے۔

دوسرے: وہ جو دونوں جہانوں میں اس کے لئے مضر ہیں جیسے کہ جہالت یا بدخوئی ہے اور بلا درحقیقت یہی ہے۔

تیسرے: وہ جو اس دنیا میں باعث راحت ہوتی ہے لیکن اُس دنیا میں باعثِ رنج۔ جیسے کہ نعمتِ دنیا کی کثرت اور اس سے استفادہ ہے اور یہ احمقوں کے نزدیک تو نعمت ہوگی لیکن عقل مندوں کے نزدیک بلا ہوگی۔ مثال اس کی ایسے بھوکے کی ہے جو شہد پالے لیکن اس میں زہر ملا ہوا ہو۔ تو جو احمق ہوتا ہے وہ نہیں جانتا کہ اس میں زہر ہے وہ اسے نعمت شمار کرتا ہے۔ اور اس کی حرص اس کے ضرر کو چھپا لیتی ہے لیکن جو عاقل ہو وہ ایسے شہد کی بلا اور مضرت سے باخبر ہوتا ہے۔

چہارم: وہ ہے کہ اس جہان میں باعثِ رنج ہوتی ہے لیکن اُس جہان میں باعث راحت ہوتی ہے۔ جیسے کہ ریاضت اور شہوات کی مخالفت ہے اور یہ نعمت عارفوں کے نزدیک ایسی ہے جیسے کہ غافل بیماروں کے نزدیک کڑوی دوا۔ اور احمقوں کے نزدیک یہ بلا ہے۔

فصل: یاد رہے کہ دنیا کے اسباب باہم مخلوط ہوتے ہیں کہ ان میں بیک وقت شر بھی ہوتا ہے اور خیر بھی۔ لیکن جس میں نفع ضرر کی نسبت زیادہ ہو وہ نعمت ہے اور یہ افراد کے ساتھ متغیر ہوتی ہے۔ کہ مال اگر بہ قدرِ کفایت ہو تو منفعت اس کی ضرر سے زیادہ ہوگی۔ اور اگر کفایت سے زیادہ ہو تو اس کا ضرر منفعت سے زیادہ ہوگا۔ اور بیشتر انسانوں میں اسی طرح ہوگا۔ اور ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے کہ تھوڑا بھی اس کے لئے باعث ضرر ہو اور سبب یہ ہوتا ہے کہ حرص زیادہ کی اس پر غالب ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اگر خالی ہاتھ ہوتا تو کسی شے کا متمنی نہ ہوتا۔ لیکن جو شخص کہ کامل ہو تو کثیر بھی اس کے لئے باعث ضرر نہیں ہونے کا کہ ضرورت کے وقت وہ از راہِ احسان محتاجوں کی مدد کر سکتا ہے۔ پس اس سے جان لے کہ یہ جائز ہوگا کہ ایک چیز جو کہ ایک کے حق میں نعمت

ہواس میں دوسرے کے لئے بلا ہو۔

فصل: یادرہے کہ لوگ جسے خیر سمجھتے ہیں وہ تین حال سے باہر نہیں ہوتی: حالت موجودہ میں اچھی ہے یا مستقبل میں سودمند ہے یا اپنی ذات میں اچھی ہے اور جسے شر سمجھا جاتا ہے تو یا تو وہ اسی وقت اچھی ہے یا مستقبل میں مضر ہے یا خود اپنی ذات میں بری ہے۔ پس کامل خیر وہ ہے کہ جس میں تینوں اچھائیاں جمع ہوں کہ اچھی ہو خوب ہو اور مفید بھی۔ اور وہ سوائے علم وحکمت کے اور کوئی نہیں۔ اور شر سراسر جہل ہے کہ ناخوش ہے اور بدرُو بھی اور مضر بھی ہے۔ جان لے کہ کوئی چیز بھی علم سے زیادہ اچھی نہیں ہے۔ لیکن اس کے نزدیک جس کا دل بیمار نہ ہو۔ یادرہے کہ جہالت درحال دردناک اور ناپسندیدہ ہے۔ کیونکہ جو کچھ بھی نہیں جانتا لیکن چاہتا ہو کہ جانے وہ اپنی جہالت کے درد سے آشنا ہوجائے گا۔ جہل برا ہے۔ اس کی برائی نمایاں نہیں ہوتی لیکن اس کا اثر دل پر ظاہر ہوتا ہے کہ دل کی صورت کو کج کردیتا ہے۔ اور جہالت کی یہ برائی اس کے ظاہر سے زیادہ بری ہے۔ ایک چیز ایسی ہوسکتی ہے کہ مستقبل میں نفع مند ہو لیکن ناخوش ہو۔ جیسے انگلی کا قطع اس لئے ہو کہ ورنہ پورے ہاتھ کے تباہ ہوجانے کا خوف ہو اور ایسی چیز بھی ہوسکتی ہے کہ جو ایک وجہ سے تو مفید ہو لیکن دوسری وجہ سے مضر ہو۔ جیسے کہ کوئی مال سمندر میں ڈال دے اس وقت جب کشتی غرق ہونے لگے تاکہ خود اس کی جان سلامت رہے۔

فصل: لوگ کہتے ہیں کہ جو شے اچھی ہو وہ نعمت ہوتی ہے۔ لیکن خوبیاں اور لذائذ تین قسم کے ہیں:

درجۂ اوّل: وہ ہے جو سب سے پست ہے اور وہ ہے لذتِ شکم وفرج کہ عوام اسی کو نعمت جانتے ہیں اور اس میں مصروف رہتے ہیں۔ اور جو کچھ چاہتے ہیں اس کے لئے چاہتے ہیں۔ اور اس کی پستی کی دلیل یہ ہے کہ تمام بہایم بھی اس میں انسان کے شریک ہیں اور اس میں وہ انسانوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ حیوانات کی خوراک اور جفتی انسانوں سے زیادہ ہے بلکہ مکھی، چیونٹی اور کیڑے مکوڑے اس بات میں انسان کے مساوی ہیں اور شریک۔ تو جب کسی نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کردیا گویا اس نے حشرات الارض کے درجے پر قناعت کرلی۔

دوسرا درجہ: غلبے کی لذت اور سرداری اور دوسروں سے برتر ہونا ہے جو قوت خشم ہے۔ جو اگرچہ لذتِ شکم وفرج سے شریف تر ہے لیکن وہ بھی پست ہی درجے کی ہے، کہ بعض حیوانات اس امر میں بھی انسانوں کے شریک ہیں۔ اگرچہ سب حیوان ایسے نہیں کیونکہ شیر چیتے کو بھی کبروغلبہ اور سروری کا شرہ فطرۃً ہوتا ہے۔

درجۂ سوم: علم وحکمت اور حق تعالیٰ اور اس کی حیرت انگیز صنعت گری کی معرفت کی لذت ہے اور یہ شریف ہے۔ اور یہ شرف حیوانات میں سے کسی کو حاصل نہیں۔ یہ ملائکہ کی صفات ہیں بلکہ صفاتِ حق تعالیٰ میں

سے ہیں اور ہر وہ شخص جس کی لذت کا سامان فقط اس میں ہے اور کسی چیز میں نہیں وہی کامل انسان ہے۔ اور جسے اس میں ذرہ برابر مزہ نہیں وہ اصلاً ناقص ہے بلکہ بیمار ہے اور نابود ہو جانے والا ہے۔ بیشتر مومن انھی دو قسموں کے ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کی لذت بھی پاتے ہیں۔ اور دیگر چیزوں کی لذت بھی۔ جیسے کہ سرداری کی لذت ہے اور شہوت ہے۔ لیکن جس پر معرفت کی لذت غالب ہو تو باقی دوسری لذائذ اس سے مستور و مقہور رہتی ہیں اور جس پر وہ دوسری غالب ہوں اور یہ بہ تکلف ہو تو وہ شخص نقصان کے درجے کے قریب ہوتا ہے۔ اگر اس کے غلبے کے لئے جدوجہد کرے تو حسنات کے پلڑے کے جھکاؤ کے معنی یہی ہیں۔

اقسام نعمت اور ان کے درجات کا بیان

جان لے کہ حقیقی نعمت آخرت کی سعادت ہے جو بنفس نفیس مطلوب ہے اور اس کے سوا کسی اور نعمت کے لئے مطلوب نہیں ہوتی۔ اور وہ چار چیزیں ہیں: ایک بقا کہ جس میں فنا کو دخل نہیں۔ دوم وہ خوشی جس میں اندوہ کو دخل نہیں۔ سوم وہ علم اور کشف کہ جو جہالت کی تاریکی و کدورت سے پاک ہو۔ چہارم بے نیازی کہ جس میں فقر و حاجت کو دخل نہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ یہ نعمت مشاہدۂ حضرتِ ربوبیت کی دوامی لذت کے ساتھ وجود میں آتی ہے کہ جس میں عدل اور زوال کو دخل نہیں ہوتا۔ اور حقیقی نعمت یہی ہے اور جسے دنیا میں نعمت شمار کیا جاتا ہے وہ اس لئے کہ وہ اس کا ذریعہ اور وسیلہ ہوتی ہے اور وہ خود مطلوب نہیں ہوتی ہے کہ خود جسے چاہا جاتا ہے اور جو کسی اور شے کے لئے درکار نہ ہوتی ہو۔ اسی بناء پر آنحضرت نے فرمایا ہے کہ "العیش عیش الآخرة" یعنی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ ایک بار انتہائے اندوہ میں آپ نے فرمایا کہ: "رنج دنیا سے اپنے تیئں تسکین دیں" اور ایک دفعہ آپ ﷺ نے انتہائے خوشی میں حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا کہ جب آپ کا کام کمال کو پہنچ گیا تھا اور تمام مخلوق نے آپ ہی کی طرف رخ کر رکھا تھا اور آپ ﷺ اونٹ پر سوار تھے اور لوگ آپ ﷺ سے اعمال حج کے بارے میں پوچھ رہے تھے تو جب آپ نے وہ کمال دیکھا تو فرمایا کہ آپ کا دل لذتِ دنیا کی طرف متوجہ نہ ہو تو ایک نے کہا کہ "بارِ خدایا انی اسئالك تمام النعمة" (یعنی میں تجھ سے کامل نعمت کا خواہاں ہوں) تو آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ "جانتے ہو کہ کامل نعمت کون سی ہے؟" تو اس شخص نے کہا "نہیں" تو آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کہ بہشت میں جائے گا"۔ لیکن دنیا کی وہ نعمتیں جو آخرت کا وسیلہ نہیں فی الحقیقت وہ نعمت ہی نہیں ہیں۔

وہ نعمتیں جو آخرت کا وسیلہ ہیں: دوہ گنتی میں باہم فرق کی بناء پر سولہ ہیں: چار دل میں ہیں؛ چار جسم کے اندر؛ چار جسم کے باہر اور چار ان بارہ کے مجموعے میں۔

وہ چار جو دل میں ہیں وہ یہ: ہیں علم مکاشفہ، علم معاملت، وعفت وعدل۔

علم مکاشفہ: یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو، اس کی صفات کو، ملائکہ کو اور اللہ کے رسولوں کو پہچانے۔

اور **علم معاملت:** یہ ہے کہ جن کا ذکر ہم اپنی اس کتاب میں عقبات راہ کے نام سے رکن مہلکات میں کر چکے ہیں اور زادِ راہ اس کا وہ ہے جو رکن عبادات اور معاملات میں مذکور ہوا اور منازلِ راہ جیسے کہ رکنِ منجیات میں بیان ہوئیں اور یہ سب کی سب اس کتاب سے کاملاً پہچانی جا سکتی ہیں۔

اور **عفت:** یہ ہے کہ انسان حسن اخلاق کاملاً حاصل کرے تا کہ قوتِ شہوت اور قوتِ غضب کی تہذیب کر سکے۔

اور **عدل:** یہ ہے کہ شہوت اور خشم کو کلیۃً تباہ نہ کرے کیونکہ یہ تو خسران ہوگا۔ اور ان کو غالب بھی نہ رہنے دے کہ سر پر سوار ہو جائے کہ طغیان کی صورت اختیار کر لیں۔ بلکہ کانٹے دار ترازو میں تولے جیسے کہ فرمانِ خداوندی ہے کہ: ''اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ ٥ وَاَقِیْمُو الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ'' (قرآن: ۹،۸/۵۵) (اس لئے کہ تم گزافکار نہ ہو ترازو میں کمی بیشی نہ کرو ترازو سیدھا رکھو دینے میں تولتے ہوئے اور خلق کو نقصان نہ پہنچاؤ)۔ اور یہ چاروں قسمیں کامل نہیں ہوسکتیں سوائے ان چار نعمتوں کے کہ جو تن میں ہوتی ہیں جو یہ ہیں: تندرستی، قوت و جمال اور عمر دراز۔ اور آخرت کی سعادت کے لئے تندرستی، قوت اور عمرِ دراز کی حاجت مخفی نہیں۔ اور علم و عمل اور خوش خلقی اور وہ فضایل جو انسان کے دِل میں مذکور ہوئے ہیں وہ ان بدنی قویٰ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔

جمال کی ضرورت اتنی زیادہ نہیں لیکن خوش روئی کی حاجت جائز تر ہوگی۔ اور جمال بھی اس معنی میں جاہ و مال کا سا ہوتا ہے۔ اور جو کچھ دنیا کی اہم حاجات میں بروئے کار آتا ہے آخرت میں بھی کار آمد ہوگا کیونکہ مہماتِ دنیا آخرت کے فراغ کا سبب ہیں اور دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ظاہر کی خوبی باطن کی خوبی کی غماز ہوتی ہے اور وہ بھی وہ عنایت ہے جو انسان پیدائش کے وقت ہی پالیتا ہے۔ اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی اپنے ظاہر کو آراستہ کرتا ہے تو باطن کو بھی خلق نیکو سے آراستہ کرتا ہے۔ اور اس لئے کہا گیا ہے کہ برا آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اپنی سیرت کی نسبت خوب صورت ہو۔ اور آنحضرت نے فرمایا ہے کہ ''اپنی ضرورت خوب رووٴں سے چاہو'' حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: ''جب تم اپنا کوئی قاصد بھیجو تو خوش رُو اور نیک نام بھیجو'' اور فقہا کا کہنا ہے کہ ''جب نماز کے لئے مختلف ائمہ علم فقہ، قرأت اور ورع میں برابر ہوں تو ان میں سے زیادہ خوب رُو کو پیشوا بناؤ۔ یاد رہے کہ اس خوب رُوئی سے ہماری مراد اس حسن سے نہیں جو شہوت انگیز ہو کیونکہ یہ صفت

عورتوں کی ہے بلکہ کشیدہ قامتی اور متناسب چہرہ مراد ہے کہ دل اور آنکھیں متنفر نہ ہوں۔

اور وہ نعمتیں جو جسم سے تو جدا ہیں لیکن جسم کو ان کی حاجت ہوتی ہے وہ ہیں مال وجاہ واہل وحرم وگروہ و خاندان اور بزرگی نسب۔ آخرت کو مال کی حاجت اس بنا پر ہے کہ اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو اور وہ تمام دن روزی کی طلب میں صرف کردے تو وہ علم وعمل میں کیونکر مشغول ہو سکے گا۔ پس مال بقدر کفایت بھی نعمتِ دینی ہوا۔

اور جاہ کی ضرورت اس لئے ہے کہ جو کوئی جاہ نہیں رکھتا ہمیشہ ذلت اور استخفاف کا نشانہ بنا رہتا ہے اور دشمنوں کے ارادۂ بد سے مامون نہیں ہوتا۔ لیکن آفت کثرتِ مال وجاہ میں ہوتی ہے۔ اس لئے آنحضرت نے فرمایا ہے کہ ''جو کوئی صبح نیند سے بیدار ہو اور تندرست ہو اور ایمن اور ایک دن کی روزی سے بہرہ مند ہو وہ ایسا ہے کہ جیسے ساری دنیا حاصل ہو''۔ اور یہ بے جاہ ومال ممکن نہیں۔ نیز آپ نے فرمایا کہ: نعم العون علی تقوی اللہ المال''، ''مال پرہیزگاری کا اچھا معاون ہے''۔

اور بیوی بچے بھی دین میں نعمت ہیں۔ کیونکہ بیوی بہت سے مشاغل سے فراغت کا سبب ہوتی ہے۔ اور شرِ شہوت سے حفاظت کا سبب بھی ہوتی ہے۔ اسی لئے آنحضرت نے فرمایا ہے کہ: ''شایستہ عورت دین کے لئے مرد کی اچھی معاون ہے'۔ حضرت عمرؓ نے آنحضرت سے استفسار کیا کہ ''ہم دنیا سے کیا جمع کریں؟'' تو آنحضرت نے جواب میں فرمایا کہ: ''ذاکر زبان، شاکر دل اور مومن بیوی'' اور اولاد مرنے کے بعد اچھی دعاؤں کا سبب ہوتی ہے۔ اور دورانِ حیات معاون ہوتی ہے اور نیک اولاد تو مرد کے لئے بمنزلہ دست وبازو و پروبال ہوتی ہے جو بہت سے کاموں کے لئے کافی ہوتی ہے اور یہ نعمت ہے بشرطیکہ انسان ان کی آفت سے بچتا رہے اور ان کی وجہ سے اپنی تمام تر ہمت امور دینوی ہی کی نذر نہ کردے۔

اور محترم نسب بھی نعمت ہے۔ کیونکہ امامت نسبِ قریش سے مخصوص ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''تخیروّ النطفکم الا کفاء وایاکم و خضراء الدمن ''یعنی'' اپنا تخم شایستہ جگہ میں ڈالو اور وہ سبزی جو گھورے پر اگ کھڑی ہوتی ہے (اور ناپائیدار ہوتی ہے) اس سے پرہیز کرو''۔ صحابہ نے سوال کیا کہ مزبلہ (گھورا) کی سبزی کیا شے ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''بے اصل نسب والی خوب رُو عورت'' یاد رہے کہ اس سے نسبِ دینا کی سرداری مطلوب نہیں بلکہ نسبِ دین اس سے مراد ہے جو اہل صلاح اور اہل علم سے عبارت ہے کہ یہ بھی ایک نعمت ہے۔ اور اصل پاکیزہ سے اخلاق زیادہ سرایت کرتے ہیں۔ اور اصل کی صلاح فرع کی صلاح کی دلیل ہوتی ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''وکان ابوھما صالحاً'''' اور ان دونوں کا باپ مردِ صالح تھا''۔

اور وہ چار نعمتیں جو ان متذکرہ بارہ نعمتوں کی جامع ہیں وہ ہیں: ہدایت ورشد و تائید وتسدید کہ ان سب کو توفیق کہتے ہیں۔ اور کوئی نعمت بغیر توفیق نہیں ہوتی۔ اور توفیق کے معنی اللہ تعالیٰ کی قضا اور بندے کے ارادے کے درمیان موافقت پیدا کرنا ہے اور یہ شر میں بھی ہوتی ہے اور خیر میں بھی ہوتی ہے لیکن معمول میں ہونے کی وجہ سے اس کے معنی صرف خیر میں اللہ اور بندے کے ارادے میں توافق ہے جو چار چیزوں سے مکمل ہوتا ہے:

اوّل ہدایت ہے کہ کوئی بھی ہدایت سے مستغنی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی آخرت کی سعادت کا طالب ہو جب اس کی راہ سے ناآشنا ہوگا اور بے راہی کو جانتا ہو تو اس کا کیا حاصل؟ پس اسباب کی آفرینش بے ہدایت راست نہ ہوگی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں پر احسان رکھا اور فرمایا کہ: ''اَلَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَه‘ ثُمَّ هَدٰی '' (قرآن: ۵۰/۲۰) (اللہ وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدائش عطا کی اور اس چیز کے دل میں ڈالا کہ کھانا کہاں سے ڈھونڈے اور دشمن سے کیسے پرہیز کرے اور اپنی ماں کے پاس کیسے پہنچے)۔ نیز فرمایا کہ: ''وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی '' (قرآن: ۳/۸۷) (اللہ وہ ہے کہ اندازہ کیا اس نے اور ہدایت کی) معلوم رہے کہ اس ہدایت کے تین مدارج ہیں:

پہلا درجہ: یہ ہے کہ انسان خیر وشر میں امتیاز کرے اور یہ شعور تمام عقلا کو ودیعت ہوا ہے۔ بعض کو بہ عقل تو بعض کو پیغمبروں کی زبان سے اور یہ جو فرمایا کہ: ''وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ '' (قرآن: ۱۰/۹۰) (اور ہم نے اسے راہ دکھائی دو راہ میں) یہ خواست کہ راہِ خیر وشر اسے دکھائی۔ اور یہ جو کہا کہ: ''وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْهُدٰی '' (قرآن: ۱۷/۴۱) (اور ثمود، ہم نے ان کو نشان راہ دیا لیکن انھوں نے نادانی اور راہ نادیدنی کو اختیار کیا بہ نسبت راست روی اور راہ یابی کے) مطلب یہ ہے کہ جو کوئی اس ہدایت سے محروم ہے یا تو حسد و کبر کے سبب سے ہے یا دنیا میں مشغولی کے باعث کہ کان انبیاء اور علماء کی بات پر نہیں دھرتے۔ ورنہ کوئی عاقل اس امتیاز سے عاجز نہیں ہوسکتا۔

درجۂ دوم: ہدایت خاص کا ہے جو معاملے اور مجاہدۂ دین میں آہستہ آہستہ ظاہر ہوتی ہے اور حکمت کی راہ کشادہ ہوتی جاتی ہے۔ اور یہ مجاہدت کا ثمر ہے جیسے کہ فرمایا کہ: ''وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا '' (قرآن: ۶۹/۲۹) (اور وہ جو ہمارے لئے کوشش کرتے ہیں اور ہماری پسندیدہ تلاش میں ہیں حق یہ ہے کہ ہم انھیں راہ دکھاتے ہیں اور اپنی راہ)۔ فرمایا کہ جب کوئی کوشش کرتا ہے اس کو ہم اپنی راہ دکھاتے ہیں یہ نہیں کہا کہ بخود ہدایت کرتے ہیں اور یہ جو کہا ہے کہ: ''وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی '' (قرآن: ۱۷/۴۷) (اور وہ جو راہ راست پر کھڑے ہیں اللہ نے ان کے لئے راست رہی کا اضافہ کیا) اس کے معنی بھی یہی ہیں۔

درجۂ سوم: خاص الخاص کی ہدایت ہے اور یہ نورِ دنیائے نبوت و ولایت میں پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ راہ خود اللہ کی طرف ہوتی ہے نہ کہ راہِ حق کی طرف۔ اور یہ اس انداز سے ہوتی ہے کہ عقل کا یہ یارا نہیں کہ خود اس تک پہنچ جائے۔ اور یہ جو فرمایا ہے کہ: "قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى" (قرآن: ۲/۱۲۰)(کہہ دو کہ اللہ کا راہ دکھانا بڑی اور اس کی راست راہی ہے) یعنی ہدایت مطلق یہی ہے اور اسے احیاء کا نام دیا۔ فرمایا کہ: "اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ" (قرآن: ۶/۱۲۲) (آیا تو کوئی تھا مردہ پھر زندہ کیا ہم نے اسے یعنی گمراہ تھا پس راہ بتائی ہم نے اسے اور پیدا کیا ہم نے اس کے لئے نور کہ وہ چلتا ہے اس کے سبب لوگوں میں)۔ اور

رُشد: یہ ہے کہ ہدایت پر انسان کے اندر راہِ حق پہ چلنے کا تقاضا پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ فرمایا: "ولقد اتینا ابراہیم رشدہٗ" (قرآن: ۲۱/۵۱) (اور ہم نے ابراہیم کو راہ شناسی عطا کی اور خیر کی پہچان) اور وہ لڑکا جو بالغ ہو جائے اگر جانتا ہو کہ مال کی حفاظت کیونکر کی جاتی ہے لیکن عملاً مال کی حفاظت نہ کرے تو اسے رشید نہیں کہا جائے گا اگرچہ ہدایت یافتہ ہو۔ اور

تسدید: یہ ہے کہ انسان کے اعضا کو صواب کی طرف بآسانی تحریک دے تاکہ جلدی اپنے مقصود کو پہنچے۔ پس ہدایت کا ثمرہ معرفت میں ہے اور ثمرۂ رشد داعیے اور ارادت میں ہے اور تسدید کا ثمرہ قدرت اور آلاتِ حرکت میں ہے۔ اور

تائید: عبارت ہے باطن میں غیب سے مدد بھیجنے سے، بصیرت کی تیزی سے اور ظاہر میں حرکت اور گرفت کی قوت سے عبارت ہے۔ جیسے کہ فرمایا کہ: "اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ" (قرآن: ۵/۱۱۰) (اور ہم نے تجھے قوت دی جان پاک کی یعنی جبریل سے)۔ اور عصمت بھی اسی کے قریب ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان کے باطن میں معصیت کی راہ میں ایک مانع وجود پذیر ہوتا ہے۔ اور اس مانع کی بدولت جان لیتا ہے کہ تیرگی کی راہ کہاں سے آئی۔ جیسے کہ فرمایا کہ: "وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ" (قرآن: ۱۲/۲۴) (اور اس عورت نے اس کا ارادہ کیا تھا اور یوسف علیہ السلام نے اس عورت کا ارادہ کیا تھا اگر اپنے خدا کی برہان اور حجت کو اپنے اوپر نہ دیکھتا)۔ یہ ہیں دنیا کی وہ نعمتیں جو آخرت کے لئے زادِ راہ ہیں۔ ان کو اور اسباب کی حاجت ہے اور ان اسباب کو اور اسباب کی یہاں تک کہ بلا آخر دلیل المستحیرین اور رب الارباب تک پہنچ جائے جو مسبب الاسباب ہے اور اسباب کی ان تمام کڑیوں کی شرح بہت طویل ہے اور جس قدر بیان ہوا کافی ہے۔

شکر کے بارے میں لوگوں کی تقصیر کا بیان

یاد رہے کہ ادائے شکر میں لوگوں کی تقصیر کے دو سبب ہیں:

ایک ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی کثرت سے ناآگاہی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے حدو اندازہ و شمار کو کوئی نہیں جانتا۔ جیسے کہ فرمایا ہے کہ: ''وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَاتُحْصُوْهَا'' (قرآن: ۱۴/۳۴) (اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو ان کو شمار نہ کرسکو گے) اور ہم نے اپنی کتاب احیاء میں حق تعالیٰ کی بعض نعمتوں کا ذکر کیا ہے تاکہ ان کے قیاس کے مطابق لوگ جان لیں کہ جملہ نعمتوں کی شناخت ہی انسان کے بس میں نہیں اور یہ کتاب ان کی تفصیل کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

اور ایک اور سبب یہ ہے کہ انسان ہر اس نعمت کو جو عام ہے نعمت شمار ہی نہیں کرتا اور کبھی اس کا شکر نہیں کرتا مثلاً اس ہوائے لطیف کو جس سے سانس لیتا ہے اور روح کو کہ دل میں ہے مدد دیتی ہے اور دل کی حرارت کو معتدل بناتی ہے اگر ایک لمحے کے لئے منقطع ہوجائے تو انساں ہلاک ہوجائے۔ بلکہ انسان اسے نعمت ہی نہیں سمجھتا۔ اور ایسی لاکھوں نعمتیں ہیں کہ جنھیں انسان نہیں جانتا۔ اِلّا یہ کہ ایک گھڑی ایسی جگہ میں جائے جہاں کی ہوا غلیظ ہو جس سے دم گھٹتا ہو اسے کسی گرم حمام میں قید کردیں کہ ہوا جہاں کی گرم ہو اور جب وہاں سے آزاد ہو تو اسے اس وقت اس نعم کی قدر معلوم ہوگی۔ بلکہ انسان بینائی کا شکر بھی ادا نہیں کرتا جب تک دردِ چشم میں مبتلا نہ ہو۔ یا اندھا نہ ہوجائے۔ اور یہ برے غلام کی طرح ہے کہ جب تک اسے پیٹیں نہیں نعمت کی قدر نہیں جانتا اور جب اس کی ٹھکائی نہ ہو اس میں غرور اور غفلت پیدا ہوتی ہے۔ پس تدبیر اس کی یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو اپنے دل میں تازہ رکھے۔ جیسے کہ ہم نے بعض کی تفصیل کتاب احیاء میں بیان کی ہے اور یہ کام مردِ کامل کا ہے۔ اور ناقص مرد کی اصلاح کی تدبیر یہ ہے کہ ہر روز ہسپتال میں جائے' قید خانے میں جائے' قبرستان میں جائے تاکہ گوناں گوں مصائب وہاں دیکھے اور اس طرح اپنی سلامتی کو پہچانے اس طرح ممکن ہے کہ شکر میں مصروف ہوجائے اور جب قبرستان میں جائے تو جان لے کہ تمام مردے ایک روزہ زندگی کی آرزو میں ہیں تاکہ اپنی تقصیروں کا تدارک کرسکیں لیکن وہ یہ یک روزہ مہلت نہیں پاتے۔ جب کہ خود اس زندہ کے لئے کتنے ہی لمبے دن تقصیروں کی تدارک کے لئے موجود ہیں لیکن وہ ان کی قدر سے ناآگاہ ہے۔

اور وہ جو نعمت عامہ میں شکر بجا نہیں لاتا جیسے کہ ہوا اور دھوپ اور روشن آنکھ' اور سب نعمتوں کو مال سمجھتا ہے اور جو کچھ اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسے جاننا چاہئے کہ یہ جہالت ہے۔ کیونکہ نعمت عام ہونے کی بناء پر نعمت ہونے سے ساقط نہیں ہوجاتی۔ پس اگر انسان غور کرے تو خاص نعمتیں بھی اس پر بہت سی ہیں۔ کوئی شخص

ایسا نہیں ہے جو یہ گمان نہ کرتا ہو کہ اس جیسی عقل کسی اور کی عقل نہیں ہے۔ اور اس جیسے اخلاق کا مالک کوئی اور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کو احمق اور بداخلاق گردانتا ہے اور خود کو ایسا نہیں سمجھتا۔ پس اسے چاہئے کہ دوسروں کے عیب کی نسبت اس کے شکر میں مشغول ہو جائے۔ بلکہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ جس میں فضائح اور عیب نہ ہوں جنھیں وہ خود جانتا ہے اور دوسرا کوئی نہیں جانتا اور اللہ تعالیٰ نے اسے بھید کی صورت دے دی ہے بلکہ اگر وہ جو کچھ انسان کے دل میں یا اندیشے میں خطور کرتا ہے اگر لوگ اس سے آگاہ ہوسکتے تو خجالت اور پشیمانی کا باعث بنے اور یہ ہر ایک کے حق میں خصوصی نعمت ہے تو چاہئے کہ انسان اس کا شکر ادا کرے اور ہمت و فکر اس پر نہ لگائے کہ وہ اس سے محروم ہے تاکہ شکر سے محروم نہ رہے۔ بلکہ اس طرح دیکھے کہ اسے نعمت بے استحقاق عطا ہوئی ہے۔

ایک درویش ایک بزرگ کے حضور مفلسی کا گلہ کر رہا تھا تو اس بزرگ نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ تمھاری آنکھ نہ ہو لیکن دس ہزار درم تمھارے پاس ہوں؟ تو وہ بولا ''نہیں''۔ تو بزرگ نے کہا کہ عقل؟ تو وہ بولا ''نہیں''، تو اس پر اُس بزرگ نے کہا کہ ''کان ہاتھ پاؤں؟'' تو وہ بولا ''نہیں'' تو اس بزرگ نے فرمایا کہ ''پس اللہ تعالیٰ نے تیرے پاس متاع واسباب کی صورت میں پچاس ہزار درم عطا کر رکھے ہیں تُو گلہ کس لئے کر رہا ہے؟'' بلکہ بیشتر خلق کو تو کہے کہ اپنے حال کو فلاں شخص کے حال سے تبدیل کر لے تو ہرگز نہ کرے گا۔ بلکہ بیشتر خلق کے حال سے بتادلے پر راضی نہ ہوگا۔ پس جو کچھ اسے دیا گیا ہے اکثر خلق کو نہیں دیا گیا۔ اس لئے یہ صورت شکر کی مقتضی ہے۔

فصل: یادر ہے کہ ابتلا پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا چاہئے کیونکہ صرف کفر اور معصیت ہی وہ بلائیں نہیں ہیں کہ جن میں کوئی خیر نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کے سوا جو بلائیں بھی ہیں ان میں مضمر خیر کو تو نہیں جانتا اللہ تعالیٰ بہر حال جانتا ہے کہ تیری خیر کس میں ہے۔ پس ہر بلا پر پانچ قسم کے شکر واجب ہیں:

ایک: یہ کہ وہ مصیبت جو جسم میں ہو اور دنیا کے کام میں ہو اور دین کے کام میں نہ ہو۔ ایک شخص نے سہل تستریؒ سے کہا کہ ''چور میرے گھر میں داخل ہوا اور میرا سامان سب لے گیا''۔ تو آپ نے اسے جواب میں پوچھا کہ ''اگر شیطان دل میں داخل ہو کر ایمان کو لے جاتا تو تُو کیا کرتا؟''۔

دوسرے: یہ کہ کوئی بیماری اور بلا ایسی نہیں کہ اس سے بدتر بھی ہوسکتی تھی۔ اس لئے شکر کرنا چاہئے کہ بدتر نہ تھی اور جو کوئی ہزار تازیانوں کا مستوجب ہوتا ہے اگر اسے سو تازیانوں سے زیادہ نہ مارے جائیں تو یہ مقام شکر ہوگا۔ مشائخ میں سے ایک گذر رہے تھے کہ کسی نے اوپر کی منزل سے راکھ کا طشت ان کے سر پر خالی

کردیا۔تو انہوں نے شکر کیا توان سے پوچھا گیا کہ ''آپ نے شکر کیوں کیا؟'' فرمایا کہ ''وہ جو آگ کا مستوجب ہورا کھ ہی سے نجات پا گیا تو یہ تو شکر کا موقع ہے اور یہ تو کامل نعمت ہی ہے''۔

تیسرے: یہ کہ کوئی عقوبت ایسی نہیں ہے کہ اگر آخرت پر موخر ہو جاتی تو سخت تر ہوتی اس لئے شکر کرنا چاہئے کہ دنیا ہی میں تھی۔اور یہ باعث اس امر کا بنتی ہے کہ اس سے آخرت کی عقوبت ساقط ہو جاتی ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جسے دنیا میں سزا دے دی گئی اسے آخرت میں سزا نہیں دی جائے گی''۔ کیونکہ بلا گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔پس جب گناہ کا کفارہ ہو گیا تو عقوبت کیوں ہو گی؟'' پس وہ طبیب جو تجھے کڑوی دوا پلاتا ہے اور فصد کھولتا ہے اگرچہ یہ کام تکلیف دہ ہے لیکن شکر کی جائے ہے کہ اس رنج کے ذریعے سخت تر بیماری سے چھوٹ گیا۔

چوتھے: یہ کہ یہ مصیبت تجھ پر لوح محفوظ میں لکھی ہوئی تھی اور راہ میں تھی۔ جب راہ سے اٹھ گئی تو پس پشت ڈال دی گئی۔لہٰذا شکر کی جائے ہے۔شیخ ابوسعیدؒ گدھے سے گر پڑے تو فرمایا ''الحمدللہ'' تو لوگوں نے کہا کہ ''آپ نے یہ کیوں کہا؟'' فرمایا کہ: گدھے سے گرنا میرا مقدر تھا جسے میں نے گر کر پس پشت ڈال دیا۔ یعنی کہ گرنا واجب ہی تھا۔کیونکہ تقدیر قضائے ازلی ہی میں طے شدہ ہوتی ہے''۔

پنجم: یہ کہ دنیا میں مصیبت میں آخرت کا ثواب دو وجہ سے ہوتا ہے: ایک یہ کہ بلا و مصیبت کا ثواب عظیم ہوتا ہے جیسا کہ حدیثوں میں وارد ہے۔اور دوسرے یہ کہ دنیا کی محبت گناہوں کا سرآغاز ہے۔یہاں تک کہ دنیا تیرے لئے بہشت بن جاتی ہے۔اور بارگاہِ خداوندی کا سفر تیرے لئے قید خانہ بن جاتا ہے۔اور جس کسی کو دنیا میں بلاؤں میں مبتلا کر دیا گیا اس کا دل دنیا سے نفور ہو جاتا ہے۔اور دنیا اس کے لئے قید خانہ بن جاتی ہے۔تو موت اس کی باعث نجات بن جاتی ہے۔اور کوئی بلا ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تادیب نہ ہو۔اگر لڑکے کو سمجھ ہو تو جب اس کا باپ اس کی تادیب کرے تو وہ شکر کرے گا۔کیونکہ فایدہ اس کا بہت ہوتا ہے۔اور حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ بلا کے ذریعے اپنے دوستوں کی نوازش کرتا ہے ایسے ہی جیسے تم اپنے بیماروں کو دوا دارو اور شربت کے ذریعے نوازتے ہو''۔

ایک شخص نے آنحضرت سے کہا کہ چور میرا مال لے گئے تو آپ نے فرمایا کہ ''جس شخص کا مال ضائع نہ ہویا اس کا جسم بیماری سے دوچار نہ ہو اس کے لئے خیر نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو دوست بناتا ہے تو اس پر بلا نازل کرتا ہے۔نیز فرمایا کہ ''بہشت میں بہت سے درجات ایسے ہیں کہ انسان اپنی کوشش سے ان تک نہیں پہنچ سکتا تو اللہ تعالیٰ بلا کے ذریعے انسان کو ان تک پہنچا دیتا ہے''۔

ایک دن آنحضرت آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے تو ہنسے اور کہنے لگے: ''میں مومن کے حق میں اللہ تعالیٰ کی قضا پر متحیر ہوں کہ اگر نعمت کا فیصلہ کرے تو راضی ہوتا ہے اس میں بندے کی خیر ہوتی ہے اور اگر بلا کا فیصلہ کرے تو بھی راضی ہوتا ہے کہ اس میں بھی بندے کے لئے خیر ہوتی ہے''۔ یعنی کہ ایک پر صبر کرتا ہے تو دوسری پر شکر اور دونوں میں مومن کے لئے خیر ہی ہوتی ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ ''اہل عافیت قیامت میں چاہیں گے کہ دنیا میں ان کے بدن کا گوشت ناخن تک کاٹ لیا جاتا' جب وہ اہل بلا کے درجات کو بہشت میں دیکھیں گے''۔

پیغمبروں میں سے ایک نے کہا کہ: ''تو نعمت تو کافروں کو عطا فرماتا ہے اور بلا مومنوں پر نازل کرتا ہے اس کا سبب کیا ہے؟'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''بندوں پر بلا اور نعمت سب میری طرف سے آتے ہیں۔ مومنوں کے بارے میں میں چاہتا ہوں کہ وہ وقتِ مرگ مجھ سے پاک اور بے گناہ ملیں اس لئے میں ان کے گناہوں کو کفارہ اس دنیا کی بلاؤں کے ذریعے کرتا ہوں۔ اور کافر کی جو نیکیاں ہوتی ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان کا اجر دنیا ہی میں ان کو دے دوں۔ تاکہ جب وہ مجھ سے ملیں تو ان کا کوئی حق مجھ پر باقی نہ ہو' تاکہ انھیں پوری پوری سزا دوں جب یہ آیت اتری کہ ''جو کوئی برائی کرے گا بدلہ پائے گا''۔ ''مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا یُّجۡزَ بِهٖ'' (قرآن: ۱۲۳/۴) تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا ''اے اللہ کے رسول ہم اس سے کیسے نجات پا سکتے ہیں؟'' تو آنحضرت نے فرمایا کہ: ''تو بیمار نہیں ہوتا؟'' ''تو غمگین نہیں ہوتا؟'' مومن کے گناہ کی سزا یہی ہے''۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک بیٹا مر گیا تو آپ بے حد غمگین ہوئے۔ تو دو فرشتے دو باہم دشمنوں کے رُوپ میں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ تو ایک نے کہا کہ ''اے اللہ کے پیغمبر میں نے زمین میں بیج بویا تو اس شخص نے پامال کر کے تباہ کر دیا''۔ تو دوسرے نے کہا کہ اس نے بیج شاہراہ میں بویا تھا چونکہ دائیں بائیں راہ نہ تھی اس لئے میری پامالی میں آ گیا''۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے پہلے شخص سے کہا کہ کیا تم نہ جانتے تھے کہ بیج اگر شاہراہوں میں کاشت کرو گے تو وہ راہیوں سے خالی نہ ہو گی؟'' تو وہ بولا:

''اے سلیمان تو نہ جانتا تھا کہ انسان موت کی شاہراہ پر ہوتا ہے کہ تو نے اپنے بیٹے کی موت پر ماتمی لباس پہن لیا ہے''۔ پس حضرت سلیمان علیہ السلام نے توبہ کی اور استغفار کی''۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے بیٹے کو خطر مرگ کی بیماری میں دیکھا تو فرمایا کہ ''تو مجھ سے پہلے جا رہا ہے اور میرے ترازو میں پڑے گا۔ تو اس کو میں اس میں سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں کہ میں تیرے ترازو میں پڑوں''۔ تو ان کے بیٹے نے کہا کہ: ''میں وہی چاہتا ہوں جو تُو چاہتا ہے اور جسے تو زیادہ عزیز رکھتا ہے''۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے خبر دی کہ تیری بیٹی مرگئی تو فرمایا: ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ'' (ہم اللہ کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں)۔ ستر ڈھپ گیا' خرچ کم ہوگیا اور ثواب نقد ہوگیا پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور دو رکعت نماز ادا کی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے کہ ''اِسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ'' (قرآن: ۲/۱۵۳) (یعنی نماز اور صبر سے مدد حاصل کرو) ہم دونوں بجالائے''۔

حاتم اصمؒ نے فرمایا کہ ''روز قیامت اللہ تعالیٰ چار افراد کو چار گروہوں پر گواہ قرار دیں گے:

حضرت سلیمان علیہ السلام کے وسیلے سے دولت مندوں پر اور حضرت یوسف علیہ السلام کے وسیلے سے غلاموں پر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وسیلے سے مفلسوں پر اور حضرت ایوب علیہ السلام کے وسیلے سے اہل بلا پر۔

اس کتاب میں علم شکر کے بارے اسی قدر کافی ہوگا۔

◆◆◆

اصل سوم: خوف ورجا کے بیان میں

معلوم رہے کہ خوف ورجا دو پروں کی مانند ہیں کہ جن کے بل پر سالکِ راہ پسندیدہ مقامات تک پہنچتا ہے۔ کیونکہ گھاٹیاں جو بارگاہِ الٰہی کا حجاب ہیں بہت اوگھٹ ہیں تو جب تک امید صادق نہ ہو اور نگاہ میں حضرتِ الٰہی نہ ہوں انسان ان گھاٹیوں کو طے نہیں کرسکتا۔ اور وہ شہوات جو دوزخ کی راہ میں ہیں بہت دل فریب ہیں اور جال ان کا گیرندہ ہے۔ جس سے بچنا مشکل ہوتا ہے۔ جب تک کہ دل میں اللہ کا خوف غالب نہ ہو اس سے بچنا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوف ورجا کا فضل عظیم شے ہے۔ کیونکہ امید ایک لگام کی طرح ہے جو بندے کو کھینچتی ہے۔ اور خوف تازیانے کی مانند ہے کہ جو اسے چلاتا ہے۔ ہم پہلے حکم رجا کا بیان کریں گے اس کے بعد خوف کا بیان ہوگا۔

رجا کی فضیلت: یاد رہے کہ خوفِ عقوبت سے کی جانے والی عبادت کی نسبت فضل وکرم کی امید پر کی جانے والی عبادت خوب تر ہے۔ کیونکہ امید سے محبت جنم لیتی ہے۔ اور کوئی مرتبہ محبت کے مرتبے سے بلند تر نہیں ہوتا۔ اور ہراس سے نفرت کا خوف ہوتا ہے۔ اسی لئے آنحضرت نے فرمایا کہ: ''لا یموتون احد کم الا وھو یحسن الظن با للہ عزوجل'' ''کوئی ایسا شخص' اللہ کرے' نہ ہو کہ جب مرے تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں خوش گمان نہ ہو''، نیز فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''میں وہیں ہوتا ہوں جہاں میرا بندہ گمان کرتا ہے گویا میرے بارے میں جو گمان تو چاہتا ہے کر''۔

آنحضرت ﷺ نے ایک شخص سے جانکنی کے وقت فرمایا کہ ''تم اپنے بارے میں کیسا محسوس کرتے ہو؟'' تو وہ بولا کہ: جس طرح میں اپنے گناہوں کی وجہ سے خائف ہوں اسی طرح اس کی رحمت کا امیدوار بھی ہوں''۔ تو آنحضرت نے فرمایا کہ ''کسی شخص کے دل میں ایسے وقت میں یہ دونوں جمع نہیں ہوسکتے الّا یہ کہ حق تعالیٰ اسے خوف سے ایمن نہ کردے۔ اور وہ جس کی امید رکھتا ہے عطا نہ کردے''۔

حق تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ ''جانتے ہو کہ میں نے یوسف علیہ السلام کو تجھ سے اتنے سال جدا کیوں رکھا؟ اس لئے کہ تو نے کہا تھا کہ ''اَخَافُ اَنْ یَّاْکُلَهُ الذِّئْبُ''' (قرآن: ۱۲/۱۳) ''میں ڈرتا ہوں کہ اسے بھیڑیا کھا جائے گا'' تو بھیڑیئے سے کیوں ڈرا اور مجھ سے امید کیوں نہ رکھی۔ یوسف کے بھائیوں کی غفلت کے اندیشے میں رہا اور میری حفاظت کا خیال نہ کیا؟''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کی کثرت کی وجہ سے ناامید ہے تو فرمایا کہ: ''ناامید نہ ہو کیونکہ اللہ کی رحمت تیرے گناہوں سے کہیں عظیم تر ہے''۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے روزِ قیامت کہے گا کہ ''تو نے منکر کو دیکھنے پر بھی روکنے کی کوشش کیوں نہ کی؟'' تو اگر اللہ تعالیٰ اسے دلیل کی زبان عطا کرے گا تو وہ کہے گا کہ ''میں خلقت سے ڈرتا تھا لیکن تجھ سے رحمت کا امیدوار تھا'' تو اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائیں گے''۔ ایک دن آنحضرت رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''تم اگر وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم زیادہ روتے اور کم ہنستے اور صحرا میں چلے جاتے اور سینے پر دوہتڑ مارتے اور گریہ وزاری کرتے''۔ اس پر حضرت جبریل آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''تم میرے بندوں کو میری رحمت سے ناامید کیوں کرتے ہو؟'' پس آپ باہر نکلے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے نیک امیدیں دیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ ''مجھے بندوں کے دلوں میں دوست بنادے'' تو آپ ﷺ نے استفسار فرماتے ہوئے کہا کہ ''کس طرح دوست بناؤں؟'' تو فرمایا کہ انھیں میری نعمت و فضل یاد دلا کیونکہ انھوں نے میری طرف سے بجز نیکی کے کسی اور شے کا مشاہدہ نہیں کیا''۔

یحییٰ بن اکثمؒ کو لوگوں نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے محل سوال میں کھڑا کر کے کہا: ''اے شیخ تو نے ایسا ایسا کیا؟'' تو اس پر مجھ پر عظیم ہراس طاری ہوگیا تو میں نے کہا کہ ''ہمیں تو تمھارے بارے میں اس طرح بتایا نہیں گیا تھا''۔ تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ''کس طرح بتایا گیا تھا؟'' تو میں نے کہا کہ عبدالرزق نے مجھے ایسی خبر زہریؒ سے دی' انس سے' تیرے

رسول محمد ﷺ سے جبریل سے کہ تجھ سے کہ تو اللہ ہے کہ تو نے کہا کہ میں اپنے بندے کے ساتھ وہ کرتا ہوں جیسا کہ اس نے میرے بارے میں گمان کیا ہوتا ہے۔ اور مجھ سے جو امید رکھتا ہے۔ اور میں امید رکھتا ہوں کہ تو مجھ پر رحمت کرے گا' تو اس پر اللہ تعالیٰ وتقدس نے فرمایا کہ: ''صحیح کہا زہری نے اور سچ کہا میرے رسول ﷺ نے اور سچ کہا جبریل نے۔ لہٰذا میں نے تم پر رحمت کی' بس مجھے خلعت پہنائی گئی۔ اس کے بعد بہشت کے خادم میرے جلو میں چلے اور میں نے ایسی خوشی پائی کہ جس کی مثال نہیں''۔

حدیث میں ہے کہ بنی سرائیل میں سے ایک لوگوں کو رحمت خداوندی سے مایوس کیا کرتا تھا اور کام ان کا سخت دشوار کرتا تھا۔ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ ''میں آج اپنی رحمت سے اسی طرح تمھیں مایوس کرتا ہوں جس طرح تو لوگوں کو میری رحمت سے مایوس کیا کرتا تھا''۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص ہزار سال سے دوزخ میں ہوگا تو کہے گا ''یا حنّان یا منّان'' تو اللہ تعالیٰ جبریل سے فرمائیں گے کہ ''جاؤ میرے بندے کو لاؤ''۔ تو جب وہ اسے لے آئے گا تو اللہ اس سے کہے گا کہ ''اپنی جگہ دوزخ میں تم نے کیسی پائی؟'' تو وہ کہے گا ''بدترین جگہوں میں سے'' تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ''اسے دوزخ میں لے جاؤ''۔ جب اسے دوزخ کی طرف لے جائیں گے تو پیچھے مڑ کر دیکھے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آئے گی کہ 'کیوں دیکھتے ہو' تو وہ بندہ کہے گا کہ ''بارِ خدایا میں گمان کرتا تھا کہ بعد اس کے کہ تو نے مجھے دوزخ سے باہر نکال لیا ہے دوبارہ دوزخ میں نہ بھیجے گا''۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ''اسے بہشت میں لے جاؤ'' تو وہ اس گمان اور امید کی وجہ سے نجات پا جائے گا۔

رجا کی حقیقت: یاد رہے کہ جو کوئی مستقبل میں اچھائی کی امید رکھتا ہے اس کا امید رکھنے کا یہ عمل رجا کہلاتا ہے۔ اسے تمنا بھی کہہ سکتے ہیں اور اسے غرور اور حماقت بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور احمق ان کلمات کے باہمی فرق کو نہیں جانتے اور گمان یہ کرتے ہیں کہ ان سب کا مفہوم امید ہے۔ اور یہ رجا محمود ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اگر کوئی اچھا بیج طلب کرے اور زمین کو قلبہ رانی سے نرم کرے نا مطلوب گھاس پھوس سے پاک رکھے اور بروقت اسے سیراب کرے اور امید رکھے کہ محصول پالے گا اور اللہ تعالیٰ برق وطوفان اس کی کھیتی سے دور رکھے تو اس امید کو رجا کہا جائے گا۔ اور اگر کوئی پوشیدہ تخم سخت زمین میں ڈالے گا اور کھیتی کو خس وخاشاک سے پاک نہ کرے گا یا پانی نہیں دے گا اور محصول کی امید رکھے گا تو اسے رجا نہیں بلکہ غرور اور حماقت کہا جائے گا۔ اور اگر اچھا بیج پاک زمین میں ڈالے اور کھیتی خس وخاشاک سے پاک بھی رکھے گا لیکن کھیتی کو پانی نہ دے اور امید یہ باندھے کہ بارش ہوگی حالانکہ یہ جگہ بارانی ہے ہی نہیں۔ لیکن محال بھی نہیں ہوتی۔ تو اسے آرزو اور تمنا کہا

جائے گا۔اسی طرح جو کوئی ایمان کا درست بیج صحرائے سینہ میں کاشت کرے اور سینے کو اخلاق بد کے کانٹوں سے پاک رکھے اور درخت ایماں کی طاعت پر نظر رکھے اور اسے سیراب کرے اور اللہ کے فضل سے امید رکھے کہ آفات کو دور رکھے گا۔اور موت کے وقت تک اسی کو معمول رکھے اور ایمان کو بہ سلامت ساتھ لے لیا جائے تو اسے امید کہتے ہیں اور علامت اس کی یہ ہے کہ وہ آئندہ بھی حتی الوسع کوئی تقصیر نہیں کرتا اور عہد کو ایفا کرتا ہے۔کیونکہ بدعہدی نومیدی سے ہوتی ہے نہ کہ امید سے۔لیکن اگر ایمان کا بیج گلا سڑا ہو کہ یقین درست نہ ہو یا اگر درست ہو لیکن سینہ اخلاق بد سے پاک نہ کرے اور طاعت کو پانی نہ دے تو ایسے میں رحمتِ حق تعالیٰ کی امید رکھنا حماقت ہوگی نہ کہ رجا۔جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ''فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُلَنَا '' (قرآن: ۱۶۹/۷) (یعنی حق سبحانہ تعالیٰ ان لوگوں کی مذمت کرتے ہیں جنھیں انبیاء علیہم السلام کے بعد علم حاصل ہوا مگر دنیا کے ساتھ مشغول رہے اور کہتے رہے کہ حق تعالیٰ ہم پر رحمت کریں گے۔تو جس چیز کے اسباب بندے کے اختیار سے علاقہ رکھتے ہیں جب وہ اسباب بہ تمام وکمال بروئے کار لائے جائیں تو اس چیز کی چشم داشت رجا کہلائے گی اور جب اسباب ناپید اور برباد ہوں تو چشم داشت حماقت اور غرور ٹھہرے گی۔اور اگر نہ ویران ہوں نہ آباد ہوں تو اس چیز کی چشم داشت آرزو کہلائے گی۔آنحضرت نے فرمایا ہے کہ ''لیس الدّین بالتمنی '' دین کا کام محض آرزو سے تکمیل نہیں پاتا۔پس جو کوئی توبہ کرے تو چاہئے کہ قبولیت کی امید رکھے۔اور جس نے توبہ نہیں کی لیکن اپنے گناہوں کے باعث اندوہ گیں اور رنجور ہے اور امید یہ رکھتا ہے اللہ اسے توبہ کی توفیق دے گا تو یہ رجا کہلائے گی۔کیونکہ اس کی رنجوری سبب اس کا ہے کہ اسے توبہ کی طرف کھینچ لے جائے۔لیکن اگر رنجیدہ نہ ہو اور توبہ کا امیدوار ہو تو یہ غرور ہوگا۔اگر بے توبہ کئے بخشش کی امید رکھے وہ بھی اسی طرح غرور ہوگا۔اگرچہ احمق اسے امید کا نام دیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ '' (قرآن: ۲۱۸/۲) (وہ لوگ جو ایمان لائے ور انھوں نے اپنی آرزو کو اپنے شہر اور گھر میں چھوڑ دیا اور مسافرت اختیار کی اور کفار کے ساتھ جہاد کیا ان کے لئے ہماری رحمت کی جگہ ہے)۔

یحیٰی معاذؒ کہتے ہیں ''کوئی حماقت اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ انسان بیج تو آگ کے بوتا ہے اور توقع بہشت کی رکھتا ہے۔سرائے اللہ کی اطاعت گذاروں کی ڈھونڈتا ہے اور عمل گناہ گاروں کے سے کرتا ہے اور نا کردہ عمل پر ثواب کی امید رکھتا ہے!''

ایک شخص تھا جسے لوگ زید الخیل کہتے تھے۔اس نے آنحضرت سے کہا کہ ''میں آپ سے پوچھنے آیا

ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کے لئے خیر کا ارادہ کیا ہے اس کی علامت کیا ہے اور وہ کہ جس کے لئے خیر کا ارادہ نہ کیا ہو اس کی علامت کیا ہے؟'' تو آنحضرت نے فرمایا کہ ہر روز جب تم بیدار ہوتے ہو کس صفت پر ہوتے ہو؟'' تو وہ بولا کہ ''ایسے کہ میں خیر اور اہل خیر کو عزیز رکھتا ہوں اور اگر کوئی خیر ظہور پذیر ہو تو میں جلدی کرتا ہوں اور ثواب اس کا یقینی جانتا ہوں۔ اور اگر خیر مجھ سے فوت ہو جائے تو میں غمگین ہوتا ہوں۔ اور اس کی آرزو میں رنجور رہتا ہوں''۔ تو آنحضرت نے فرمایا کہ: ''یہی ہے علامت اس بات کی اللہ تعالیٰ نے تمھارے لئے خیر چاہی ہے۔ اللہ اگر تمھارے لئے کچھ اور چاہتا تو تمھیں اُسی میں مشغول کر دیتا تو پھر تمھیں اس کا خوف نہ ہوتا کہ دنیا کی وادیوں میں سے کس وادی میں تجھے ہلاک کر دیتا''۔

رجا کے حصول کی تدبیر

معلوم رہے کہ اس دوا کی حاجت کسی کو نہیں ہوتی۔ بجز دو بیماروں کے۔ ایک وہ جو کثرتِ گناہ کے باعث ناامید ہو چکا ہے اور توبہ نہیں کرتا کہ کہتا ہے کہ قبول نہ ہوگی۔ اور دوسرا وہ جو جہد وطاعت میں ریاضت کے باعث ہلاک ہو جاتا ہے اور ایسے کثیر رنج اٹھاتا ہے کہ جن کی طاقت نہیں رکھتا۔ ان دو بیماروں کو اس کی ضرورت ہے اور اہل غفلت کے لئے رجا دوا نہیں بلکہ زہر قاتل ہے اور امید دو سبب سے غالب ہوتی ہے:

سببِ اوّل: عبرت پکڑنا ہے کہ انسان عجائب دنیا پر غور کرے اور نباتات' حیوانات اور گوناگوں نعمتوں کی تخلیق پر نظر ڈالے جیسے کہ ہم شکر کی اصل میں بیان کر چکے ہیں تاکہ وہ رحمت اور عنایت اور لطفِ خداوندی کو دیکھے کہ جس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر خود اپنے پیکر پر نگاہ ڈالے کہ جو کچھ اس کے لئے لازم تھا کیسے پیدا کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ جو ضروری تھا جیسے اس کا سر یا دل ہے یا جس کی حاجت بے ضرورت تھی جیسے کہ ہاتھ پاؤں ہیں یا زینت کا سامان جس کی حاجت نہیں ہوتی مثلاً ہونٹوں کی سرخی' ابرو کی کجی اور اس کی سیاہی' آنکھوں کی پلکوں کی راستی پر غور کرے کہ کیسے پیدا ہوتے ہیں اور یہ عنایت اللہ تعالیٰ نے تمام جانداروں پر کی ہے حتیٰ کہ شہد کی مکھی پر صنعت گری کے کتنے ہی الطاف اس کی شکل کے تناسب اور اس پر نقش ونگار کا حسن اور وہ شعور جو اسے اپنا چھتہ بنانے کے لئے عطا ہوا ہے اور اس میں شہد کی جمع آوری اور اپنی ملکہ کی اطاعت جو ان کی سیاست بھی کرتی ہے۔ تو جو کوئی خود اپنے ظاہر و باطن میں نیز دوسری تمام مخلوق کی تخلیق کے بارے میں تامل و غور کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس سے کہیں زیادہ ہے کہ جس میں ناامیدی کی گنجائش ہو۔ یا خوف غالب ہو سکے بلکہ چاہئے کہ بیم ورجا دونوں برابر ہوں لیکن اگر رجا غالب ہو تو گنجائش اس کی ہے اور اللہ تعالیٰ رحمت ولطف کے آثار اپنی آفرینش میں بے انتہا ہیں۔ یہاں تک کہ اسلاف میں سے ایک کا کہنا ہے کہ

کوئی آیت قرآن میں سے ادھار کے لین دین میں وارد آیت سے زیادہ امید ورجا کی حامل نہیں ہے کہ حق تعالیٰ نے طویل ترین آیت قرآن میں نازل کی ہے تاکہ مال کی حفاظت کی جائے کہ ضائع نہ ہو اور اسے قرض دیا جا سکے۔ اور کیسے ہوسکتا ہے کہ اس طرح کی عنایت ہماری بخشش سے قاصر ہو جس سے ہم سب دوزخ میں جائیں یہ ایک علاج ہے رجا کے حاصل کرنے کے لئے۔ اور یہ بہت عظیم اور بے نہایت ہے اور ہر کوئی اس درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔

سببِ دوم: رجا پر مبنی آیاتِ قرآن اور احادیث نبوی پر غور وفکر ہے اور وہ بھی حد سے زیادہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں کہ "کوئی شخص میری رحمت سے مایوس نہ ہو: "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ"[۱] اور فرشتے تمھاری بخشش کے خواہاں ہیں "وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ"[۲] اور دوزخ اس لئے ہے کہ کفار کو وہاں رکھا جائے لیکن تمھیں (مومن کو) اس سے ڈرایا جاتا ہے یا رنج پہنچایا جاتا ہے: "ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ"[۳] یعنی یہ وہ ہے کہ جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ اور آنحضرت (ﷺ) دن رات امت کی بخشش مانگتے نہ تھکتے تھے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: "وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى" (قرآن: ۵/۹۳) اور اللہ تجھے عطا کرے گا کہ تو راضی ہو جائے گا"۔ فرمایا کہ "محمد راضی نہ ہوگا جب تک اس کا ایک امتی بھی دوزخ میں ہوگا"۔ اور ایسی آیات بہت سی ہیں۔

اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت فرماتے ہیں کہ: "میری امت بخشش شدہ ہے۔ ان کا عذاب دنیا ہی میں ہوتا ہے۔ جیسے کہ فتنہ اور زلزلہ وغیرہ ہیں۔ اور جب مومن قیامت میں آئے گا تو ہر ایک کے قبضے میں ایک کافر دے دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ تیرے لئے دوزخ کا فدیہ ہے"۔ نیز فرمایا کہ "بخار دوزخ کی تپش میں سے ہے اور مومن کے لئے دوزخ سے یہی نصیب ہوا ہے"۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا کہ بارِ خدایا میری امت کا حساب مجھ سے پوچھ تا کہ دوسرے ان کے گناہوں اور اعمال کی برائیوں کو نہ دیکھ پائیں"۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تیرے امتی ہیں اور میرے بندے ہیں۔ اور میں ان پر زیادہ رحیم ہوں اور نہیں چاہتا کہ دوسرے ان کے گناہوں کو دیکھیں۔ نہ تُو اور نہ کوئی اور"۔

آنحضرت نے فرمایا کہ "میری حیات تمھارے لئے باعثِ خیر ہے کیونکہ زندہ ہوں گا تو تمھیں شریعت سکھاؤں گا۔ اور اگر مر جاؤں گا تو تمھارے اعمال میرے سامنے لائے جائیں گے جو اچھے ہوں گے اس پر اللہ کی

(۱) قرآن: ۵۳/۳۹ (۲) قرآن: ۵/۴۲ (۳) قرآن: ۱۶/۳۹

حمد اور اس کا شکر بجالاؤں گا۔ اور جو اعمال برے ہوں گے ان کے لئے اللہ سے بخشش طلب کردوں گا''۔

ایک دن آنحضرت نے فرمایا کہ ''یا کریم العفو '' تو اس پر جبریل علیہ السلام نے کہا'' کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ معنی یہ ہیں کہ ''اے اللہ برائی کو معاف کردے اور اسے نیکی میں بدل دے''۔

آنحضرت نے فرمایا کہ ''جب بندہ گناہ کرتا ہے اور بخشش مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: ''اے فرشتو! دیکھو کہ میرا بندہ گناہ کرتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ اس کا ایک خدا بھی ہے جو اسے گناہ پر گرفت کی بجائے بخش دے گا تو تم میرے گواہ رہو کہ میں نے اسے بخش دیا'' نیز فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر میرا بندہ پورے آسمان وزمین کے برابر گناہ کرے تو جب وہ استغفار کرتا ہے اور مجھ سے امید رکھتا ہے کہ میں اسے بخش دیتا ہوں۔ نیز فرمایا کہ 'فرشتہ بندے کے گناہ کے بعد چھ گھنٹوں تک اس کا گناہ اس کے نامۂ اعمال میں درج نہیں کرتا تو اگر وہ اس دوران میں توبہ واستغفار کرلے تو فرشتہ اس کا گناہ درج ہی نہیں کرتا۔ اور اگر توبہ نہ کرے لیکن نیکی کرے تو دائیں ہاتھ کا فرشتہ بائیں ہاتھ والے فرشتے سے کہتا ہے کہ گناہ کا اندراج اس کے نامۂ اعمال سے ختم کردے تاکہ میں بھی اس کے عوض اس کی ایک نیکی کم کردوں۔ اور ہر نیکی دس گنا ہوتی ہے۔ اس لئے ایک کے کم کرنے پر بھی دس نیکیاں اس کے خزینۂ اعمال میں باقی رہتی ہیں''۔ نیز آنحضرت نے فرمایا کہ: ''جب بندہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کا اندراج اس کے نامۂ اعمال میں ہوجاتا ہے' اس پر ایک اعرابی نے پوچھا کہ ص ''اگر وہ توبہ کرے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ اندراج مٹادیا جاتا ہے۔ تو اعرابی نے کہا 'اگر وہ پھر وہی گناہ کرے' تو آپ ﷺ نے فرمایا 'لکھا جاتا ہے' اعرابی نے کہا کہ 'اگر وہ توبہ کرے؟' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا 'مٹادیا جاتا ہے' تو اعرابی نے پوچھا کہ 'کب تک؟' آپ ﷺ نے فرمایا جب تک بندہ استغفار کرتا رہے گا اللہ تعالیٰ کو اسے بخش دینے میں ملال نہ ہوگا۔ جب تک بندے کو استغفار پر ملال نہ ہو۔ جب بندہ نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو فرشتہ قبل اس کے کہ انسان نیکی کرے اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی کا اندراج کرلیتا ہے۔ اگر بندہ وہ نیکی کرے تو دس نیکیوں کا اندراج کرلیتا ہے۔ پھر اس میں فزونی بھی دیتا ہے یہاں تک کہ یہ شمار سات سو (۷۰۰) تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن انسان جب بدی کا ارادہ کرتا ہے تو جب تک وہ بدی نہیں کرتا کچھ اندارج نہیں کرتا جب بدی کرتا ہے تو اس کی ایک بدی لکھ لیتا ہے۔ اور اللہ کی طرف سے عفو کی امید ہوتی ہے''۔ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ ''میں رمضان کے روزے رکھتا ہوں' پنجگانہ نماز بہ دوام ادا کرتا ہوں لیکن اس پر اضافہ نہیں کرتا' زکوٰۃ اور حج مجھ پر فرض نہیں کہ مال دار نہیں ہوں۔ تو کیا روزِ قیامت آپ کے ساتھ ہوسکوں گا؟''۔ تو آپ نے فرمایا کہ: ''تو میرے ساتھ ہوگا بشرطیکہ دل کو خیانت اور حسد سے بچائے

رکھے گا اور زبان کو دو چیزوں سے یعنی غیبت دروغ سے بچائے رکھے گا اور آنکھ کو دو چیزوں سے بچائے رکھے گا یعنی نامحرم کو دیکھنے اور کسی کو حقارت کی نظر سے دیکھنے سے باز رہے گا تو تو میرے ساتھ اکٹھا بہشت میں داخل ہوگا۔ اور میں اپنی اس کفِ دست پر تجھے عزیز رکھوں گا''۔ اوا یک اور اعرابی نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ ''یارسول اللہ'' مخلوق کا حساب کل کون کرے گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''حق تعالیٰ'' اعرابی نے پوچھا ''تنہا خود ہی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہاں خود ہی'' تو اس پر وہ اعرابی ہنسا تو آپ ﷺ نے کہا ''اے اعرابی تم ہنسے!'' تو اعرابی بولا: ''ہاں کیونکہ کریم جب پکڑتا ہے تو معاف کر دیتا ہے اور جب حساب کرتا ہے تو مسامحت سے کام لیتا ہے''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''تم نے سچ کہا اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی کریم نہیں'' اس کے بعد آپ ﷺ نے کہا کہ ''یہ اعرابی فقیہہ ہے''۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے کعبے کو صاحب شرف اور بزرگ قرار دیا ہے اور اگر کوئی کعبے کو ویران کر دے اور اس کا ایک ایک پتھر اکھاڑ پھینکے اور جلا ڈالے تو اس کا یہ جرم اتنا بڑا نہ ہوگا جتنا اُس کا جو اللہ کے اولیاء میں سے کسی ولی کے استخفاف کرنے والے کا ہو گا''۔ اعرابی نے کہا کہ ''اللہ کے اولیاء کون لوگ ہیں؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''سب مومن اللہ کے اولیاء ہیں۔ تو نے یہ آیت نہیں سنی کہ: ''اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ'' (قرآن: ۲/ ۲۵۷) (اللہ دوست ہے ان کا جو ایمان لائے وہ انھیں تاریکی سے نور کی طرف لاتا ہے)۔ نیز فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''میں نے خلق کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ مجھ سے فائدہ اٹھائیں نہ کہ اس لئے کہ میں ان سے فائدہ اٹھاؤں''۔ نیز اللہ تعالیٰ نے خلق کو پیدا کرنے سے پہلے ہی لکھ رکھا ہے کہ ''میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''جس نے لا الٰہ الا اللہ بہ اخلاص کہا وہ بہشت میں جائے گا اور جس کا کلمہ دم آخر تک یہی ہوگا۔ آگ اسے نہ دیکھے گی اور جو کوئی شرک کئے بغیر اُس جہان میں جائے گا وہ دوزخ میں نہ جائے گا''۔ نیز فرمایا کہ ''اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ ایک اور مخلوق کو پیدا کرتا کہ گناہ کرتے تا کہ اللہ تعالیٰ انھیں بخش دیتے۔ کیونکہ وہ غفور و رحیم ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ اس مشفق ماں سے جو اپنے بچے پر رحیم ہوتی ہے کہیں بڑھ کر اپنے بندے پر رحیم ہوتا ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اتنی رحمت کا اظہار کرے گا کہ جس کا خیال بھی کسی بندے کے دل میں نہ گذرا ہوگا۔ یہاں تک کہ ابلیس بھی امیدِ رحمت میں گردن بلند کرے گا''۔ نیز فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں جن میں سے ایک رحمت سے زیادہ کا اس دنیا میں اس نے اظہار نہیں کیا۔ اور ننانوے اس نے روزِ قیامت کے لئے رکھی ہوئی ہیں۔ اور جملہ مخلوق کے دل اسی ایک رحمت کے فیض سے رحیم ہیں۔ یہاں تک کہ ماں کی رحمت اپنے فرزند اور حیوانوں کی رحمت ان کے اپنے بچوں پر سب کی سب اسی

ایک رحمتِ حق تعالیٰ کی مرہونِ منت ہیں۔ اور روزِ قیامت اللہ تعالیٰ اس ایک رحمت کو ان ننانوے رحمتوں میں شامل کردے گا۔ اور خلق پر نچھاور کردے گا۔ اور اس کی ایک ایک رحمت زمین و آسمان کے جملہ طبقات کے برابر ہوگی۔ اور روزِ قیامت کوئی شخص ہلاک نہ ہوگا سوائے اس کے جو روزِ ازل ہی ہلاک تھا"۔ نیز فرمایا کہ: "میں نے اپنی شفاعت اپنی امت کے اہل کبائر کے لئے محفوظ رکھی ہوئی ہے۔ یہ گمان نہ کرنا کہ یہ اللہ کے مطیع اور فرماں برداروں کے لئے ہے۔ بلکہ گناہوں سے آلودہ مخلوق کے لئے ہے"۔

سعد بن بلال کہتے ہیں کہ: "روزِ قیامت دو مردوں کو دوزخ سے باہر لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کہ: "جو کچھ تم نے دیکھا اپنے برے عمل کے باعث دیکھا کیونکہ میں اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا" پھر فرمائے گا کہ انھیں دوزخ میں لے جاؤ۔ تو ان میں سے ایک اپنی زنجیروں اور طوق کے ساتھ جلدی جلدی دوزخ کی طرف چلنے لگتا ہے جب کہ دوسرا پیچھے کھڑا رہتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں جس پر دونوں کو واپس لایا جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس سے جو جلدی جلدی دوزخ کی طرف گامزن تھا پوچھتے ہیں کہ "تم نے ایسا کیوں کیا؟" تو وہ کہے گا کہ 'میں ڈر گیا تھا اور میں نے نافرمانی کے وبال سے یہ دیکھا تھا تو مجھے اس کا حوصلہ نہ تھا کہ آپ کے حکم کے بعد توقف کروں' تو دوسرا بولا کہ "میں نے خوش خیالی کی کہ جب آپ نے دوزخ سے واپس بلایا ہے تو دوبارہ دوزخ میں نہ بھیجیں گے"۔ اس پر اللہ تعالیٰ دونوں کو بہشت میں بھیج دیں گے"۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: "قیامت کے دن منادی یہ اعلان کرے گا کہ 'اے محمد ﷺ کی اُمت میں نے اپنا حق تمھارے کام میں صرف کر دیا۔ لیکن تمھارے آپس کے حقوق باقی ہیں جنھیں تم ایک دوسرے کے کام میں صرف کر دو اور بہشت میں چلے جاؤ"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: میری امت میں سے ایک کو روزِ قیامت حاضر کیا جائے گا اور گناہوں کے ننانوے دفتر کہ جہاں بھی نگاہ جائے اپنے تمام گناہوں کو دیکھے' تو خدائے عزوجل فرمائیں گے کہ تم ان سب میں سے کسی ایک کی کوئی تردید کرتے ہو یا فرشتوں نے ان کے اندراج میں کوئی ظلم کیا ہے؟" تو وہ شخص کہے گا کہ 'نہیں یا رب' اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ "کوئی عذر؟" تو وہ جواب میں کہے گا کہ "نہیں یارب کوئی عذر نہیں" اور دوزخ کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہمارے پاس تمھاری ایک نیکی ہے اور ہم تم پر ظلم نہ کریں گے' پس ایک رقعہ لایا جائے گا جس پر لکھا ہوگا: "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" پس وہ شخص کہے گا کہ یہ رقعہ گناہوں کے ان دفتروں کی کیا کفایت کرے گا' لیکن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ تو وہ تمام دفتر میزان کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور یہ رقعہ دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا۔ تو یہ رقعہ اس پلڑے کی پوری جگہ گھیر لے گا اور دوسرے پلڑے

سے گراں تر نکلے گا کیونکہ کوئی شے توحیدِ خداوندی کے مقابلے میں نہیں آ سکتی'' نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ روزِ قیامت فرشتوں سے کہے گا کہ جس شخص کے دل میں مثقال بھر بھی خیر ہے اسے باہر لے آؤ تو بہت سی خلق باہر لائی جائے گی اور فرشتے کہیں گے کہ اس قوم کا کوئی شخص اب دوزخ میں نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ وہ جس کے دل میں نیم مثقال بھی نیکی ہے اسے بھی باہر لے آؤ تو بہت سی مخلوق دوزخ سے باہر آ جائے گی۔ دوزخ خود کہے گی کہ اس قوم میں سے رب کوئی میرے ہاں نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ''جس کے دل میں ذرہ برابر بھی خیر ہے اسے بھی باہر لے آؤ تو بہت سے لوگ باہر لائے جائیں گی اور کہا جائے گا کہ اب پیچھے کوئی شخص نہیں رہا جو ذرہ بھر خیر رکھتا ہو۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ فرشتوں کی شفاعت اور پیغمبروں کی شفاعت اور مومنوں کی شفاعت سب تمام ہو گئیں اور قبول کر لی گئیں مگر ارحم الراحمین کی شفاعت ابھی باقی ہے۔ یہ کہہ کر اللہ تعالیٰ دوزخ کو ایک مشت پکڑیں گے تو مومنوں میں سے ایک خلق کو باہر لے آئیں گے جنھوں نے کبھی کوئی نیکی نہ کی ہوگی۔ سب جل کر سیاہ کوئلہ ہو گئے ہوں گے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو ایک ندی میں ڈال دیں گے جس کا نام نہر الحیات ہے۔ تو وہ اس میں سے پاک اور روشن نکلیں گے۔ ایسے ہی جیسے سبزہ آبِ سیل سے نمودار ہوتا ہے۔ سب کے سب مروارید کی طرح روشن ہوں گے اور ان کی گردنوں میں مہروں کا ہار ہوگا جس سے بہشتی ان سب کو پہچان لیں گے اور کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا میں کوئی نیکی نہ کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں آزاد کر دیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان سے کہے گا کہ بہشت میں چلے جاؤ وہاں جو کچھ دیکھو وہ تمھارا ہے۔ تو وہ کہیں گے کہ اے اللہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا فرمایا ہے کہ جو کسی اور بہشتی کو نہیں دیا۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرے پاس تمھارے لئے اس سے بھی بڑی شے ہے' تو وہ کہیں گے کہ ''بارِ خدایا یہ بزرگ تر کیا شے ہے؟'' تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے وہ ہے میری رضا کہ میں تم سے راضی ہو گیا ہوں اور اب کبھی ناراض نہ ہوں گا''۔ یہ حدیث صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں موجود ہے۔ عمرو بن حزمؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ تین دن سے غائب تھے۔ آپ سوائے فرض نماز کے باہر نہ آتے تھے۔ آپ ﷺ جب چوتھے دن باہر آئے تو فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ میری امت میں سے ستر ہزار کو بے حساب بخش دوں گا۔ اور بہشت میں داخل کر دوں گا۔ اور میں ان تین دنوں میں زیادہ کی درخواست کرتا رہا تو میں نے اللہ تعالیٰ کو عظیم اور کریم پایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان ستّر ہزار میں سے ہر ایک کے ساتھ ستّر ہزار مزید کی بخشش عطا فرمائی۔ تو میں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ ''بارِ خدایا میری امت کی تعداد کتنی ہوگی؟'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں یہ تعداد تمام عربوں سے پوری کر دوں گا''۔ کہتے ہیں کہ ایک چھوٹے بچے کو بعض غزوات میں سے قید کیا گیا تھا اور اب وہ

نیلامی کے لئے رکھا ہوا تھا۔ایک عورت کی نگاہ ایک گرم دن میں اس بچے پر پڑی تو وہ جلدی سے دوڑی تو اہل خیمہ بھی اس کے پیچھے دوڑے۔ یہاں تک کہ اس عورت نے اس لڑکے کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگالیا اور اس پر اس طرح سایہ کیا کہ لڑکے کو گرمی نہ لگے۔ وہ بولی کہ یہ لڑکا میرا بیٹا ہے۔لوگوں نے جب یہ دیکھا تو رونے لگے اور اس کی عظیم شفقت کی بناء پر اپنے کاموں سے ہاتھ روک لیا۔ اتنے میں آنحضرت ﷺ وہاں آ گئے تو لوگوں نے یہ واقعہ ان سے بیان کیا۔تو آپ ﷺ نے ان کی رحم دلی اور گریہ زاری پر خوش ہوئے اور فرمایا کہ ''تمھیں اس عورت کی بچے پر شفقت اور رحمت پر حیرت ہوئی؟''تو لوگوں نے کہا ''ہاں یارسول اللہ''۔تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''خدائے تعالیٰ تو سب مخلوق پر اس عورت کے اپنے بیٹے پر رحم اور شفقت سے زیادہ رحیم ہے''۔اس پر جملہ مسلمان وہاں سے بے نظیر خوشی کے ساتھ ادھر ادھر ہو گئے۔

ابراہیم بن ادھمؒ نے فرمایا کہ ''ایک دن میں طوافِ کعبہ میں تنہا تھا۔اور بارش ہو رہی تھی۔تو میں نے اللہ سے دعا کی: ''بارِ خدایا مجھے گناہ سے محفوظ رکھنا تاکہ میں کوئی تقصیر نہ کروں؛ تو کعبے کی جانب سے میں نے یہ آواز سنی: 'تو عصمت کا خواہاں ہے اور تمام بندے بھی یہی چاہتے ہیں لیکن اگر میں سب کو گناہ سے بچائے رکھوں تو میں اپنا فضل و رحمت پھر کس پر ظاہر کروں؟''

معلوم رہے کہ اس قسم کی احادیث بہت سی ہیں۔اور جس پر خوف غالب ہو یہ اس کی شفا کا موجب بنتی ہیں۔لیکن وہ جس پر غفلت غالب ہے اسے معلوم ہونا چاہئے کہ باایں ہمہ احادیث کے مومنوں میں سے بعض دوزخ میں جائیں گے اور دوزخ سے باہر آنے والے اشخاص میں سے آخری وہ ہوگا جو سات ہزار سال کے بعد دوزخ سے باہر آئے گا۔ چونکہ یہ ہر کسی کے حق میں ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہی ہو اس لئے حزم و احتیاط کی راہ اختیار کرنی چاہئے۔اور حتی الوسع انتہائی کوشش کرنی چاہئے کہ یہ شخص وہ نہ ہو۔ اگر دوزخ میں ایک دن کی سزا سے بچنے کے لئے انسان کو دنیا کی تمام نعمتیں ترک کرنی پڑیں تو بھی ناروا نہ ہوگا۔اور کہاں سات ہزار سال دوزخ میں گذارنا''۔

مختصر یہ کہ خوف اور رجا اعتدال کے ساتھ ہونے چاہئیں جیسے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ ''منادی ہو رہی ہو کہ کل کوئی بہشت میں نہ جائے گا سوائے ایک شخص کے' تو میں گمان کردوں گا کہ شاید وہ ایک شخص میں ہی ہوں گا۔اور اگر منادی والا یہ کہہ رہا ہو کہ کوئی دوزخ میں نہ جائے گا سوائے ایک شخص کے' تو مجھے گمان ہوگا کہ شاید دوزخ میں جانے والا ایک شخص میں ہی ہوں''۔

فضیلتِ خوف کی حقیقت اور اس کی اقسام کا بیان

معلوم رہے کہ خوف بزرگ مقامات میں سے ہے۔ اور فضیلت اس کی اس کے اسباب اور ثمرات کے لائق ہے۔ خوف کے اسباب علم و معرفت ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد اس کی شرح آئے گی۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ''انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء'' (قرآن: ۱۸/۳۵) (بے شک علماء اللہ سے ڈرتے ہیں) اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''راس الحکمة مخافة اللہ'' (حکمت کا لب لباب اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہے)۔ اور ثمراتِ خوف عفت، ورع اور تقویٰ ہیں۔ جو سب خوش بختی کا بیج ہیں۔ کیونکہ شہوات ترک کئے بغیر اور ان سے صبر کے بغیر آخرت کی راہ چلنا ممکن نہیں۔ اور کوئی چیز شہوت کو خوف سے بڑھ کر جلانے والی نہیں یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ڈرنے والوں کے لئے ہدیٰ، رحمت، علم اور رضوان جمع کر دیئے ہیں۔ اور قرآن میں تین آیات نازل فرمائیں: ''هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ'' (قرآن: ۱۵۴/۷) (ہدایت اور بخشائش ان کے لئے ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں) اور یہ کہ ''انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء'' اور فرمایا کہ: ''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ'' (قرآن: ۸/۹۸) (اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے یہ بدلہ اس کے لئے ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے) اور تقویٰ کہ خوف کا ثمر ہے اسے اللہ نے اپنے آپ سے نسبت دی۔ اور فرمایا کہ: ''وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ'' (قرآن: ۳۷/۲۲) (لیکن اسے تمھاری طرف سے سچائی اور دل کی پاکیزگی پہنچتی ہے)۔

اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس دن سرزمین قیامت میں جمع کیا جائے گا تو منادی ایسی آواز میں کی جائے گی کہ جو دور و نزدیک ہر جگہ سنائی دے گی کہ ''اے لوگو میں نے تمھاری تمام باتیں اسی روز سے جب میں نے تمھیں پیدا کیا سن لیا آج میری بات سنو۔ متوجہ رہو کہ میں تمھارے اعمال تمھارے سامنے رکھ دوں گا۔ اے لوگو تم نے اپنی نسب رکھی اور میں نے بھی اپنی نسب رکھی۔ تم نے اپنی نسب بلند کی اور میری نسب فروگذار کی۔ میں نے کہا: ''اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ'' ''تم میں بزرگوار ترین وہ ہے جو پرہیزگار تر ہے۔ جب کہ تم نے کہا بزرگ وہ ہے جو فلاں ابن فلاں ہے۔ آج میں اپنا نسب بلند کروں گا اور تمھارا نسب فروگذار کروں گا۔ ''این المتقون'' کہاں ہیں پرہیزگار؟ پس ایک جھنڈا کھڑا کیا جائے گا اور آگے آگے لے جایا جائے گا اور پرہیزگار اس کے پیچھے چلیں گے حتیٰ کہ بہشت میں بدوں حساب پہنچ جائیں گے''۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سے ڈرنے والوں کا ثواب دوگنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ'' (قرآن:

(وہ جو اپنے اللہ کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرا اس کے لئے دو جنتیں ہیں)۔ (۴۶/۵۵)

آنحضرت نے فرمایا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے اپنی عزت کی قسم دو خوف اور دو امن ایک بندے میں جمع نہیں کرتا' اگر وہ مجھ سے دنیا میں ڈرتا ہے تو میں اسے خرت میں ایمن کر دیتا ہوں۔ اور اگر دنیا میں بے فکر ہو تو میں آخرت میں اسے خوف میں ڈال دیتا ہوں''۔ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے ہر شے اس سے ڈرتی ہے اور جو اللہ سے نہیں ڈرتا تو اللہ تعالیٰ اسے ہر شے سے ڈراتا ہے'' اور فرمایا کہ ''تم میں عقل مند ترین وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے خائف ترین ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''کوئی مومن ایسا نہیں ہے کہ جس کی آنکھوں سے اللہ کے خوف سے ایک قطرہ آنسو بہہ نکلا ہو اگر وہ ایک مکھی کے پر کے برابر بھی اس کے رُخ پر پہنچے تو وہ چہرہ آتش دوزخ پر حرام ہوگا''۔ نیز فرمایا کہ ''جب بندے کے جسم پر اللہ کے خوف سے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور وہ اپنے گناہوں پر متفکر ہو تو اس کے گناہ اس سے اسی طرح جھڑ جاتے ہیں جیسے کہ درخت سے پتے''۔ نیز فرمایا کہ ''جو کوئی اللہ کے خوف سے رویا وہ جہنم میں نہ جائے گا۔ اسی طرح جیسے پستان سے نکلا ہوا دودھ دوبارہ پستان میں داخل نہیں ہو سکتا''۔

حضرت عایشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ: ''کیا کوئی شخص آپ کی امت میں سے بدون حساب جنت میں داخل ہوگا؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہاں ہوگا وہ جو اپنے گناہ یاد کر کے لرزہ براندام ہو جائے''۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''اللہ کے نزدیک پانی کا کوئی قطرہ اس قطرۂ اشک سے جو خوف خدا میں بہا ہو یا اس قطرۂ خون سے جو اللہ کی راہ میں بہا ہو زیادہ عزیز نہیں''۔ نیز فرمایا کہ روزِ قیامت سات قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں ہوں گے۔ ان سات قسم کے لوگوں میں ایک وہ ہوگا جو خلوت میں اللہ کو یاد کرتا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے ہوں گے''۔ حنظلہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت ﷺ کے پاس تھے اور آپ ﷺ ہمیں نصائح سے بہرہ ور فرما رہے تھے۔ چنانچہ دل رقیق ہو گئے اور آنسو آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ پھر میں اپنے گھر لوٹا۔ میری بیوی مجھ سے باتیں کرنے لگی اور ہم دنیا کی باتوں میں لگ گئے۔ پھر مجھے آنحضرت ﷺ کی بات یاد آ گئی جس سے میں رویا تھا' تو میں اپنی بیوی سے دور آ گیا اور میں نے فریاد کی ''آہ حنظلہ منافق ہو گیا'' تو ابوبکر آگے آ گئے اور فرمایا کہ ''تو منافق نہیں ہوا' میں آنحضرت ﷺ کے پاس گیا اور کہا کہ 'حنظلہ منافق ہو گیا' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کلا لم ینافق حنظلہ' حنظلہ منافق نہیں ہوا' پس یہ حال میں نے بیان کیا۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اے حنظلہ اگر تم جس طرح میرے پاس ہوتے ہو اسی حال پر رہتے تو فرشتے تم سے راہ میں' گھر میں' مصافحہ کرتے لیکن اے حنظلہ ساعت

پس از ساعت اس حالت میں رہنا چاہئے''۔

آثار: شبلیؒ فرماتے ہیں کہ ''کسی دن بھی مجھ پر ایسا خوف طاری نہیں ہوا کہ جس کی برکت سے مجھ پر حکمت کے دروازے نہ کھلے ہوں''۔ یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں کہ ''مومن کا گناہ بیم عقوبت اور امید رحمت میں اس لومڑی کی طرح ہوتا ہے جو دو شیروں کے درمیان ہو''۔ نیز فرمایا کہ ''مسکین آدمی اگر دوزخ سے اسی طرح ڈرتا جیسے کہ وہ افلاس سے ڈرتا تھا بہشت میں ہوتا'' یحییٰ بن معاذؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ کل روزِ قیامت کون ایمن تر ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا کہ ''جو آج خائف تر ہے''۔ ایک شخص نے حسن بصریؒ سے کہا'' آپ اس قوم کی مجلس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو ہمیں اتنا ڈراتے ہیں کہ دل پارہ پارہ ہونے لگتا ہے؟'' تو آپ نے فرمایا کہ آج (زندگی میں) ایسی قوم کے ہم نشیں بنو جو تمھیں کل (قیامت) سے ڈرائیں تا کہ آخرت میں مامون رہو یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم اس قوم کے ہم صحبت رہو جو آج تمھیں ایمن رکھیں لیکن کل روزِ قیامت تم خائف رہو'' اور بوسلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ ''جو دل خوف سے خالی ہوا ویران ہوگیا''۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ''قرآن میں فرمایا کہ ''کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں'' ''يُؤْتُونَ مَآ اٰتَوْ وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ'' (قرآن: ۶۰/۲۳) (وہ لاتے ہیں اور دکھاتے ہیں اور دیتے ہیں، جو کچھ کہ دیتے ہیں دکھاتے ہیں اور دیتے ہیں کوشش اور پرستش میں اور دل ان کے خائف ہوتے ہیں) تو کیا یہ چوری اور زنا ہے؟' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا 'نہیں کیونکہ نماز، روزہ اور صدقہ کرتے ہیں لیکن ڈرتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ بارگاہ خداوندی میں مقبول نہ ہو''۔ اور محمد بن منکدرؒ جب روتے تھے تو آنسو اپنے چہرے پر مل لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں سنا ہے کہ جہاں جہاں آنسو پہنچتے ہیں وہ جگہ کبھی آگ میں نہیں جلتی''۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''روو اگر رو نہیں سکتے تو روہانسا چہرہ بناؤ''۔ اور کعب احبار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اس کی قسم میں اتنا روتا ہوں کہ پانی میرے چہرے پر سے بہنے لگتا ہے اور میں اسے کئی پہاڑوں کے برابر سونا صدقہ کرنے (درویشوں کو دینے) سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ کے خوف سے بہنے والا ایک قطرۂ اشک مجھے ہزار دینار صدقہ دینے سے زیادہ محبوب ہے''۔

حقیقتِ خوف

یاد رہے کہ خوف بھی احوالِ دل میں سے ایک حالت ہے۔ اور ایک درد کی آگ ہے جو دل میں پیدا ہوتی ہے اور اس کا ایک سبب ہے اور ایک ثمرہ ہے۔

سبب اس کا علم و معرفت ہے جن سے انسان آخرت کے کام کے خطر کو دیکھتا ہے۔ اور اپنی ہلاکت کے

اسباب موجود اور غالب پاتا ہے۔ لازماً یہ آتش درد اس کی جان میں ظہور پذیر ہوتی ہے اور یہ دو معرفتوں سے جنم لیتی ہے:

ایک: یہ کہ انسان خود کو اور اپنے عیوب کو، گناہوں کو اور طاعات کی آفت کو اپنی اخلاقی خیانت کو حقیقتاً دیکھتا ہے۔ اور ان تقصیروں کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے اوپر بارانِ نعمت دیکھتا ہے۔ اس کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے بادشاہ سے خلعت ونعمت تو بہت پائی ہو اس کے باوصف بادشاہ کے حرم وخزانہ میں خیانتوں کا مرتکب ہوا ہو۔ اچانک مطلع ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اس کی یہ خیانتیں دیکھ لی ہیں۔ اور جانتا ہے کہ بادشاہ غیرت مند ہے اور منتقم ہے اور بے باک ہے اور یہ کہ اس کا کوئی بادشاہ کے پاس شفاعت کرنے والا بھی نہیں اور کوئی وسیلہ اور قرابت نہیں رکھتا۔ تو لازماً اس کی جان میں آتشِ درد لگ جائے گی جب وہ اپنے کام کے خطر کو دیکھے گا۔

معرفتِ دوم: یہ ہوگی کہ جو اس کی صفت رحم سے جنم نہ لے گی بلکہ اللہ کی بے باک قدرت سے جنم لیتی ہے جس سے انسان خائف ہوتا ہے۔ جیسے کوئی شیر کے پنجے میں گرفتار ہو جانے پر ڈرتا ہے اپنے گناہ سے نہیں لیکن اس سے کہ جانتا ہے کہ شیر کی طبع ہلاک کرنا ہے اور یہ کہ اسے شکار کی کمزوری کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اور یہ خوف تمام تر اور فاضل تر ہے۔ اسی طرح جس نے حق تعالیٰ کی صفات کو پہچان لیا اور اس کے جلال، عظمت، قدرت اور بے باکی کا ادراک کر لیا کہ اللہ اگر تمام عالم کو ہلاک کر دے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں ڈال دے تو اس کی مملکت میں ایک ذرے کی کمی نہیں ہونے کی۔ اور وہ جسے اللہ کی رأفت اور شفقت کہا جاتا ہے اس کی حقیقت سے اس کی ذات منزہ ہے۔ اور مناسب یہ ہے کہ انسان اس کی ذات سے ڈرے۔ اور یہ خوف انبیاء کو بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ جانتے ہیں کہ معاصی سے معصوم ہیں اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کا زیادہ عارف ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ اس سے خائف ہوتا ہے۔ اسی لئے آنحضرت نے فرمایا ہے کہ ''میں تم میں سے اللہ تعالیٰ کا عارف ترین فرد ہوں اور اتنا ہی خائف ترین بھی''۔ اور یہ اس بناء پر کہا کہ ''**انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء**'' اور جو زیادہ جاہل ہوتا ہے وہ زیادہ تر ایمن ہوتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی آئی کہ اے داؤد! مجھ سے ایسے ڈر جیسے تو شیر خشمگیں سے ڈرتا ہے'' خوف کا سبب یہی ہے۔

اور خوف کا نشان دل میں ہے، جسم میں ہے نیز جوارح میں ہے:

دل میں یہ صورت ہوتی ہے کہ شہوات انسان کے لئے نامطلوب ہوتی ہیں اور انسان کو ان کی پروا نہیں ہوتی کیونکہ اگر کسی کو شہوتِ فرج یا شہوتِ شکم ہو جب وہ شیر کے پنجے میں گرفتار ہو یا کسی قاہر سلطان کی قید میں

پڑا ہوتو اسے شہوت کی پروا کہاں ہوتی ہے۔ بلکہ دل کا حال خوف میں سراپا خضوع وخشوع اور خواری ہوتا ہے اور تمام تر مراقبہ اور محاسبہ اور نظر عاقبت پر مرتکز ہوتی ہے۔نہ کبر باقی رہتا ہے نہ حسد نہ دنیا کی حرص نہ غفلت۔اور جسم میں خوف کی علامت شکستگی اور نزاری اور زردی ہے۔

اور جوارح میں خوف کی نشانی جوارح کو گناہوں سے پاک رکھنا اور طاعت میں مؤدّب رکھنا ہے۔

اور خوف کے درجے متفاوت ہوتے ہیں۔اگر انسان خود کو شہوت سے باز رکھے اسے عفت کہتے ہیں۔اگر خود کو حرام سے باز رکھے تو اسے وَرع کہا جاتا ہے۔اگر شبہات سے باز رکھے یا ایسے حلال سے بھی باز رہے جس میں حرام کا خوف ہو تو اسے تقوٰی کہیں گے۔اور اگر خود کو ہر اس چیز سے جو راہِ آخرت میں خلل انداز ہو' روکے تو اس کا نام صدق ہے۔اور صاحب صدق کا نام صدیق ہوگا۔اور عفت اور وَرع تقوٰی کے ماتحت ہیں اور یہ سب مل کر صدق کے ماتحت ہیں۔حقیقت میں خوف اسی کا نام ہے لیکن وہ جو اشک بہائے اور آنسو پونچھے اور کہے کہ ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ'' اور پھر غافل ہو جائے تو اسے عورتوں کی تنگ دلی کہا جائے گا۔ یہ خوف نہ کہلائے گا کیونکہ جو کوئی کسی چیز سے ڈرتا ہے اس سے دور بھاگتا ہے۔اور وہ شخص جو اپنے آستین میں کوئی شے محسوس کرتا ہو اور دیکھے کہ سانپ ہے تو ممکن نہیں کہ وہ صرف لاحول پڑھنے پر اکتفا کرے بلکہ وہ سانپ کو جھٹک کر پھینک دے گا۔لوگوں نے ذوالنون سے کہا کہ: خائف بندہ کون ہے؟'' فرمایا'' وہ جو خود کو ایسی بیماری میں مبتلا کرے کہ بیم مرگ سے تمام شہوتوں سے محترز ہو جائے''۔

خوف کے درجے: معلوم رہے کہ خوف کے بھی تین درجے ہیں: ضعیف وقوی ومعتدل اور پسندیدہ ان میں خوفِ معتدل ہے، ضعیف وہ ہوتا ہے کہ جو انسان کو عمل پر آمادہ نہیں کرتا۔جیسے عورتوں کی رقت ہے۔اور قوی وہ ہوتا ہے کہ اس سے ناامیدی کا خطرہ ہوتا ہے۔ بلکہ بیماری' بے ہوشی اور موت تک کا خطرہ ہوتا ہے۔اور اس لئے ضعیف وقوی دونوں ناپسندیدہ ہیں۔کیونکہ خوف اپنی ذات میں کوئی کمال نہیں ہے۔جیسے کہ توحید و معرفت ومحبت ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کی صفات میں سے نہیں ہے۔ بلکہ خوف بغیر جہالت کے اور عجز کے نہیں ہوتا کیونکہ جب تک عاقبت مجہول نہ ہو اور خطر سے حذر کرنا عجز نہ ہو خوف نہ ہوگا۔لیکن خوفِ کمال تب ہوتا ہے کہ جب اسے غافلوں کے حال سے نسبت دیں کہ یہ اس تازیانے کی مانند ہے۔جو لڑکوں بالوں کو حصول علم میں لگائے رکھتا ہے یا حیوانات کو سیدھی راہ پر چلاتا ہے۔اور اگر تازیانہ کمزور ہو کہ ذرا سی تکلیف کا باعث نہ ہو سکے تو وہ نہ تو لڑکوں بالوں کو حصول تعلیم میں لگائے گا نہ حیوانات کو رراہ روی سکھائے گا۔یا اتنا قوی ہوتا ہے کہ لڑکوں اور حیوانوں کو مجروح کر دیتا ہے اس لئے خوفِ قوی وخوفِ ضعیف دونوں بیکار ہیں۔

اس لئے چاہئے کہ خوفِ معتدل ہوتا کہ انسان کو معاصی سے باز رکھے اور طاعت پر حریص بنائے۔ اور جو کوئی عالم تر ہوتا ہے اس کا خوف معتدل تر ہوتا ہے کیونکہ اگر افراط کو پہنچے تو انسان اسبابِ رجا میں لگ جاتا ہے اور جب ضعیف ہو تو وہ کاموں کے خطرات سے بےفکر ہو جاتا ہے۔ اور جو کوئی خایف نہ ہو لیکن خود کو عالم گردانے وہ اس لئے ایسا ہوتا ہے کہ جو اس نے سیکھا ہے وہ بےہودہ ہوتا ہے علم نہیں ہوتا۔ ایسے ہی جیسے کہ بازاری فال گو جو خود کو حکیم کا نام دیتا ہے۔ جب کہ اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ حکمت کس چڑیا کا نام ہے کیونکہ تمام معرفتوں کا اوّلین قدم یہ ہے کہ انسان خود کو اور اپنے خدا کو پہچانے۔ خود کو عیب کو تقصیر کی رُو سے اور اللہ تعالیٰ کو اس کی عظمت وجلال اور بے باکی اور ہلاک عالم کی حیثیت سے پہچانے۔ تو ان دو معرفتوں سے بجز خوف کے اور کوئی شے جنم نہیں لیتی۔ اسی لئے تھا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''اول العلم معرفة الجبار و آخر العلم تفویض الامر الیه '' فرمایا کہ اول علم یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی جباری اور قہاری کو پہچانے اور آخر یہ کہ بندہ کی طرح اپنے کام اللہ کے حوالے کرے اور جان لے کہ تو خود کوئی شے نہیں اور نہ کوئی شے تجھ سے ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی یہ بات جانتا ہو اور اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرے؟

انواعِ خوف کا بیان

یاد رہے کہ خوف خطر سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ہر ایک کو مختلف خطر درپیش ہوتا ہے۔ کوئی شخص ایسا ہوتا ہے کہ دوزخ اس کے سامنے آتی ہے تو اس کا خوف اس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور ایک شخص وہ ہوتا ہے کہ دوزخ کی راہ میں کوئی چیز اس کے درپیش ہوتی ہے۔ چنانچہ ڈرتا ہے کہ توبہ سے پہلے مر جائے گا۔ یا ڈرتا ہے کہ دوبارہ معصیت میں لگ جائے گا۔ یا اس کے دل میں قسوت اور غفلت پیدا ہو جائے گی۔ یا اس کی عادت اسے پھر معصیت میں لگا دے گی۔ یا نعمت کے باعث اس پر غرور غالب ہو جائے گا یا قیامت کے دن لوگوں پر مظالم کے باعث گرفتار ہوگا۔ یا اس کے سکینڈل طشت از بام ہو جائیں گے جس کی وجہ سے رسوا ہوگا۔ یا ڈرتا ہے کہ خود اس کے فکر و خیال میں کوئی ایسی چیز آئے کہ جسے اللہ تعالیٰ دیکھتا ہو اور جانتا ہو اور وہ شے مذموم ہو۔ تو ان سب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس میں لگ جاتا ہے جس سے خائف ہوتا ہے۔ جب وہ اس عادت سے ڈرتا ہے کہ جو اسے معصیت کی طرف لے جانے والی ہو تو وہ عادت کی اس راہ سے گریز کرتا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی اطلاع سے ڈرتا ہے تو اپنے دل کو پاک رکھتا ہے۔ اسی طرح دل پر سب سے زیادہ خوف بیمِ خاتمت کا ہوتا ہے کہ مبادا ایمان سلامت نہ لے جائے اور تمام تر خوف سابقت کا ہوتا ہے کہ ازل میں اس کی شقاوت اور سعادت کے بارے میں کیا حکم لوحِ محفوظ میں ہے۔ خاتمت سابقت کی فرع ہے۔ اور اصل اس کی وہ ہے جو

آنحضرت ﷺ نے برسرِ منبر بیان کی کہ ''اللہ تعالیٰ نے ایک کتاب لکھ رکھی ہے جس میں اہل بہشت کے نام ہیں''۔ پھر آپ نے دایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور فرمایا کہ ایک اور کتاب بھی لکھی ہے جس میں اہل دوزخ کے نام ونسب اور ان کا پتہ درج ہے'' ساتھ ہی بایاں ہاتھ بلند کیا۔ اور فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ ان میں اضافہ کرے گا نہ کمی۔ اور اہلِ سعادت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے کہ جن کے عمل اہل شقاوت کے سے ہوں گے جس پر سب کہیں گے کہ یہ ان میں سے ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو مرنے سے پہلے اگرچہ ایک گھنٹہ ہی کیوں نہ ہو شقاوت سے روک کر سعادت کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ اس لئے سعید وہی ہے جو قضائے ازلی میں سعید ہوا اور شقی وہ ہے جو قضائے ازلی میں شقی ہے۔ اور کام خاتمون پر منحصر ہیں۔ پس اس سبب سے اہل بصیرت کا خوف اسی سے ہے اور یہ کامل خوف ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتِ جلال کے سبب سے خوف انسان کے اپنے گناہوں کے سبب خوف سے مکمل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ خوف کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اور جب انسان گناہ سے ڈرتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ مغرور ہوجائے کہ میں نے گناہ سے ہاتھ روک لیا ہے کیوں ڈروں؟''

مختصر یہ کہ جو کوئی یہ جانتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اعلیٰ درجات میں ہوں گے اور ابوجہل درجۂ اسفل میں ہوگا۔ حالانکہ پیدا ہونے سے پہلے دونوں میں سے کوئی وسیلہ یا گناہ نہ رکھتا تھا۔ تو جب اللہ نے ان کو پیدا کیا تو معرفت اور طاعت کی راہ تو آنحضرت ﷺ کو فراہم کی بغیر ان کی طرف سے سبب کے۔ اور حق تعالیٰ نے یہ امر آپ ﷺ کے لئے لازم کردیا کہ آپ کے داعیہ کو اس میں صرف کیا اور جو کچھ آپ کو دکھایا گیا یا کشف کیا گیا اسے چھپا نہ سکتے تھے۔ اور جیسے آپ نے زہر قاتل جانا ممکن نہ تھا کہ اس سے دور نہ رہتے۔ اور بوجہل کہ جس پر دیکھنے کی راہ ہی بند کردی گئی تھی نہ دیکھ سکا۔ پس دونوں مضطر ٹھہرے۔ لیکن جیسے چاہا بے سبب ایک پر شقاوت کا حکم لگایا اور اس کا پیچھا دوزخ تک کیا ور ایک کے لئے سعادت کا حکم فرمایا اور اسے اعلیٰ علیین تک بہ سلسلۂ قہر لے گئے۔ اور وہ جو جیسے چاہتا ہے حکم کرتا ہے اور کسی سے باک نہیں رکھتا تو ایسے سے ڈرنا لازم ٹھہرا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت داود علیہ السلام سے کہا کہ ''مجھ سے ایسے ڈر جیسے شیر غضب ناک سے ڈرتے ہیں''۔ کیونکہ شیر اگر کسی کو ہلاک کردے تو خائف نہیں ہوتا۔ تو شیر تیرے کسی جرم کے سبب ایسا نہیں کرتا بلکہ اس کے شیر ہونے کا غلبہ اسے اس پر آمادہ کرتا ہے۔ اور اگر تجھ سے ہاتھ روک لے تو اس لئے نہیں کہ وہ شفقت کا قائل ہے۔ یا تجھ سے ڈرتا ہے لیکن صرف تیری بے وقعتی کے باعث رک جاتا ہے۔ اور جس نے حق تعالیٰ کی ان صفات کو جان لیا۔ ممکن ہی نہیں کہ وہ خوف سے خالی رہے۔ واللہ اعلم۔

بُرے خاتمے کا بیان

یاد رہے کہ بیشتر ڈرنے والے انجام سے ڈرتے ہیں۔ اس لئے کہ انسان کا دل بدلتا رہتا ہے۔ اور موت کا وقت بڑا عظیم وقت ہوتا ہے کسے خبر کہ اس وقت دل کس چیز پر قرار پکڑے گا۔ حتیٰ کہ عارفانِ دین میں سے ایک فرماتے ہیں کہ ''اگر ہم کسی کو پچاس برس توحید پر قائم جانتے رہے ہوں تو جب وہ ہم سے غائب ہوکر ایک دیوار کے پیچھے چلا جائے تو ہم اس کی توحید پر گواہی نہ دیں گے کیونکہ دل کا احوال بدلتا رہتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ کس شے سے بدلتا ہے''۔ اور ایک دوسرے عارف کہتے ہیں کہ اگر مجھ سے کہا جائے کہ گھر کے دروازے پر شہادت کو عزیز رکھتے ہو یا حجرے میں اسلام پر مرنے کو عزیز رکھتے ہو تو میں کہوں گا کہ مجھے حجرے میں اسلام پر مرنا زیادہ پسند ہے۔ کیونکہ نہیں جانتا کہ گھر کے دروازے تک جاتے جاتے ایمان باقی رہے گا یا نہیں''۔ اور حضرت بودرداؓ قسم کھاتے کہ ''کوئی شخص اس بات سے ایمن نہیں ہوتا کہ وقتِ مرگ بھی ایمان سلب کرلیا جاتا ہے''۔ سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ ''صدیق ہردم سوءِ خاتمت سے خائف رہتے ہیں''۔ اور سفیان ثوریؒ موت کے وقت جزع کرتے اور روتے تھے۔ تو لوگوں نے کہا کہ ''نہ روو کیونکہ حق تعالیٰ کی آمرزش تمھارے گناہوں سے زیادہ عظیم ہے''۔ تو اس پر سفیان نے کہا کہ ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں توحید پر مر رہا ہوں تو مجھے خوف نہ تھا اگر چہ میرے گناہ کئی پہاڑوں کے برابر بھی ہوتے''۔ بزرگوں میں سے ایک نے وصیت کی اور جو چیز رکھتے تھے کسی کو دی اور کہا کہ ''علامت اس کی کہ میں توحید پر مر رہا ہوں فلاں چیز ہے۔ اگر تو یہ علامت دیکھے تو اس مال سے شکر اور مغز بادام خرید کر شہر کے بچوں پر نچھاور کر دینا اور کہنا کہ یہ فلاں شخص کی عروسی ہے جو اس دنیا سے سلامتی کے ساتھ نکل گیا اور اگر یہ علامت نہ دیکھے تو شہر کے لوگوں سے کہنا کہ میری نماز جنازہ نہ پڑھیں اور مجھ پر فخر نہ کریں تاکہ پس مرگ ریاکاری کا مرتکب نہ ہوں''۔ سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ ''مرید اس لئے ڈرتا ہے کہ معصیت میں جا پڑے گا اور عارف اس لئے ڈرتا ہے کہ کفر میں جا پڑے گا''۔ اور بویزیدؒ فرماتے ہیں کہ ''جب میں مسجد کو جاتا ہوں تو اپنی کمر پر زنّار دیکھتا ہون اور ڈرتا ہوں کہ یہ مجھے کلیسا میں لے جائے گی۔ یہاں تک کہ میں مسجد میں پہنچ جاتا ہوں۔ اور روزانہ پانچ دفعہ میری کیفیت یہی ہوتی ہے''۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا کہ: ''تم معصیت سے ڈرتے ہو اور ہم کہ پیغمبر ہیں کفر سے خائف ہیں''۔ پیغمبروں میں سے ایک بھوک پیاس اور بڑی تکالیف میں مبتلا تھے۔ اور اس حالت میں سالوں گذر گئے۔ پس انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کی تو وحی آئی کہ ''میں نے تیرے دل کو کفر سے بچا رکھا ہے تو تُو اس پر راضی نہیں ہے اور تو دنیا کا خواہاں ہے؟'' تو انھوں نے کہا کہ ''بارِ خدایا میں نے توبہ کی اور میں خرسند

ہوں''۔اور آپ نے اپنے سر پر خاک اپنے اس سوال کی بناء پر ڈالی۔سوءخاتمت کے دلائل میں ایک نفاق بھی ہے۔یہی وجہ تھی کہ صحابہ ہمیشہ نفاق سے خائف رہتے تھے۔حسن بصریؒ نے فرمایا کہ''اگر میں جانتا کہ مجھ میں نفاق نہیں ہے تو میں دنیا میں جو کچھ بھی ہے اس سے کبھی نہ ڈرتا''۔نیز فرمایا کہ''ظاہر و باطن کا اختلاف نیز دل وزبان کا اختلاف منجملہ نفاق ہی ہے۔

فصل: یاد رہے کہ سوئے خاتمت کہ جس سے سب ڈرتے رہے ہیں کے معنی یہ ہیں کہ اس دنیا سے جانے پر اُس سے ایمان واپس لے لیتے ہیں اور اسباب اس کے بہت سے ہیں اور علم اس کا مخفی ہے۔لیکن جو کچھ اس کتاب میں بیان ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دو اسباب سے ہوتا ہے:

ایک: یہ کہ کوئی بدعتی باطل اعتقاد رکھتا ہے اور زندگی اسی پر گذار دیتا ہے۔اور گمان نہیں کرتا کہ یہ خود خطا ہوسکتی ہے اور موت کے نزدیک جا کر حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ممکن ہے کہ اس پر خطا کشف کریں اور وہ اس کے سبب سے دوسرے اعتقاد جو رکھتا تھا اُن میں سے بھی شک پیدا ہو جائے۔جس سے اسے اپنے اعتقاد پر سے اعتماد جاتا رہے۔اور وہ اس شک کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو۔اور یہ خطر بدعتی کو ہوتا ہے۔نیز اسے بھی جس نے کلام اور دلیل کی راہ لی ہو اگر چہ وہ باورع اور پارسا ہو،لیکن وہ احمق اور اہل سلامت جنھوں نے مسلمانی بہ ظاہر جیسا کہ قران وحدیث میں وارد ہے اختیار کی ہو وہ اس سے مامون ہوتے ہیں۔اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ:''علیکم بدین العجائزاھل الجنة البله ''یعنی بیشتر اہل جنت سادہ لوح ہیں''۔یہی وجہ ہے کہ اسلاف کلام اور بحث اور کاموں کی حقیقت کی کُرید سے منع کرتے تھے کیونکہ ہر کوئی اس کی تاب نہیں رکھتا اور کسی بدعت میں جا پڑتا ہے۔

سبب دوم: یہ ہوتا ہے کہ ایمان دراصل کمزور ہوتا ہے اور دنیا کی دوستی اللہ تعالیٰ کی دوستی پر غالب ہوتی ہے۔اس لئے بوقت مرگ جب انسان دیکھتا ہے کہ اس کی شہوت اس سے واپس لی جارہی ہے اور اسے دنیا سے بقہر باہر ہانک رہے ہیں اور اسے ایسی جگہ لے جا رہے ہیں جہاں وہ جانا نہیں چاہتا تو ممکن ہے اس سبب سے وہ کراہت جو اس کے ساتھ یہ کرتی ہے اس کے ساتھ بدل جائے[1] اس شخص کی طرح جو ایک بیٹے کو عزیز رکھتا ہے لیکن بہ دوستی ضعیف جب یہ بیٹا جو اس کا محبوب ہے وہ اس سے کوئی چیز واپس لے لیتا ہے جسے وہ زیادہ عزیز

(۱) ترجمہ احیاء: پس اس وقت جو مرگ وکراہیت میں سے اس پر مقدور ہے اس بناء کہ پر اللہ کی طرف سے ہے اس کے ضمیر میں بدل جائے۔

رکھتا ہے تو فرزند کو دشمن سمجھتا ہے جس سے دوستی کی وہ مقدار بھی باطل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہادت کا درجہ بہت بڑا ہے۔ کیونکہ اس وقت دنیا نظروں سے گر چکی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت غالب ہو گئی ہوتی ہے۔ اور موت کے لئے انسان تیار ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اگر موت آ جائے تو یہ بڑی غنیمت ہے کیونکہ یہ حال جلد متغیر ہو جاتا ہے اور دل اس صفت پر قائم نہیں رہتا۔ پس جس کسی پر اللہ تعالیٰ کی دوستی ہر شے سے غالب تر ہو تو وہ اسے لازماً دنیا میں محو ہونے سے روکتی ہے۔ اور وہ اس خطرے سے ایمن تر ہوتا ہے۔ تو جب موت کا وقت آتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ دیدارِ دوست کا وقت آ پہنچا ہے تو وہ موت سے کراہت نہیں کرتا۔ اور حق تعالیٰ کی دوستی غالب ہو جاتی ہے اور دنیا کی دوستی باطل اور ناپید ہو جاتی ہے۔ تو یہ حُسنِ خاتمہ کی علامت ہے۔ پس جو کوئی اس خطرے سے دور رہنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ بدعت سے دور رہے اور جو کچھ قرآن وحدیث میں ہے اس پر ایمان لائے اور جو کچھ جانتا ہے اسے قبول کرے اور جو نہیں جانتا اسے تسلیم کرے اور سب پر ایمان لے آئے۔ اور کوشش یہ کرے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اس پر غالب ہو جائے اور دنیا کی دوستی کمزور ہو کر ناپید ہو جائے۔ اور یہ دوستی اسی طرح کمزور ہو سکتی ہے کہ انسان حدود شرع کو ملحوظ خاطر رکھے تاکہ دنیا اس کے لئے ناگوار ہو جائے اور وہ اس سے نفور ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کی محبت اسی طرح قوی ہوتی ہے کہ ہمیشہ اس کا ذکر کرتا رہے۔ اور ہم نشین اللہ کے دوستوں کا ہو۔ نہ کہ دنیا دوستوں کا پس اگر دنیا کی دوستی غالب تر ہو گی تو معاملہ خطرناک ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ "اگر تم باپ، بیوی، بچوں اور مال ونعمت کو کہ تمھارے پاس ہے اللہ تعالیٰ سے زیادہ عزیز رکھتے ہو تو تیار رہو تاکہ فرمان اللہ کا پہنچ جائے۔ "فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ" (قرآن:۹/۲۴) (تو اس کی امید رکھو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اپنا کام لائے اور تمھارے سر پر اپنا حکم صادر کر دے)۔

خوف کے حصول کی تدبیر

یاد رہے کہ مقاماتِ دین میں سے اولین مقام یقین ومعرفت ہے۔ اور معرفت ہی پر خوف پیدا ہوتا ہے۔ اور خوف سے زہد، صبر اور توبہ جنم لیتے ہیں۔ اور زہد اور توبہ سے صدق واخلاص اور ذکر وفکر پر دوامی مواظبت وجود میں آتے ہیں۔ جن سے اُنس اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ جو مقامات کی غایت ہے۔ اور رضا تفویض اور شوق سب محبت ہی کے پیرو ہیں۔ پس کیمیائے سعادت یقین ومعرفتِ خوف کے بعد وقوع میں آتی ہے اور جو صفات اس کے بعد ہیں وہ بغیر خوف کے راستے نہیں آتیں اور خوف تین طرح سے پیدا ہوتا ہے:

اوّل علم ومعرفت سے: کہ جب کسی نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا تو اللہ تعالیٰ سے ضرور ڈرے گا۔ کیونکہ جو

کوئی شیر کے پنجے میں گرفتار ہو اور وہ شیر کو پہچانتا ہو اسے ڈرانے کے لئے کسی تدبیر کی حاجت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ سراپا خوف بن جاتا ہے۔ اور جس کسی نے حق تعالیٰ کو بہ کمال وجلال وقدرت اور خلق سے بے نیازی کے ساتھ پہچان لیا۔ اور اپنے تئیں بے چارگی اور درماندگی کے ساتھ پہچان لیا تو اس نے حقیقتاً خود کو شیر کے پنجے میں دیکھ لیا۔ بلکہ جس نے حق تعالیٰ کے حکم کو پہچان لیا کہ جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے اس کا حکم اس نے پہلے ہی سے لگا رکھا ہے۔ بعض کے لئے بے وسیلہ سعادت کا تو بعض کے لئے بے شقاوت گناہ گاری کا۔ بلکہ جیسا چاہا۔ اور وہ ہرگز تبدیل ہونے والا نہیں تو انسان ضرور ڈرے گا۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام پر معترض ہوئے اور حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر معترض ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا کہ: اللہ تعالیٰ نے تجھے بہشت میں اتارا اور تیرے ساتھ ایسی ایسی نیکیاں کیں تو تُو نے اس کی نافرمانی کیوں کی کہ جس سے خود کو نیز ہمیں مصیبت میں ڈال دیا؟ تو حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ اللہ نے وہ معصیت روزِ ازل ہی میرے باب میں لکھ رکھی تھی' تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا ''ہاں لکھی ہوئی تھی'' تو حضرت آدم علیہ السلام نے کہا ''تو ایسے میں اللہ کے کسی حکم کے خلاف کر سکتا تھا؟'' تو حضرت موسیٰ نے کہا کہ ''نہیں'' فحج آدم موسیٰ ''حضرت موسیٰ حضرت آدم کے ہاتھوں ساکت ہو گئے اور ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اور معرفت کے وہ ابواب کہ جن سے خوف پیدا ہوتا ہے' بہت ہیں اور جو کوئی ان کا عارف تر ہوتا ہے وہ خائف تر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ کہتے ہیں کہ حضرت جبریل اور حضرت رسول ﷺ دونوں رو رہے تھے کہ ان پر وحی آئی کہ ''کیوں روتے ہو حالانکہ میں نے تمھیں ایمن ٹھہرا رکھا ہے' تو انھوں نے کہا کہ 'ہم تیرے مکر سے ایمن نہیں' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ 'تم ایسے ہی رہو' اور یہ ان کے کمال معرفت کی دلیل ہے کہ انھوں نے کہا کہ یہ جو ہمیں کہا گیا ہے کہ ایمن رہو ہو سکتا ہے یہ آزمائش ہو جس میں کوئی بھید ہو جسے دریافت کرنے سے ہم عاجز ہوں۔ روزِ بدر ابتدا میں مسلمانوں کے لشکر میں ضعف تھا اور آنحضرت خائف تھے تو آپ نے فرمایا کہ ''بارِ خدایا یہ مسلمان ہلاک ہو گئے تو روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو گا''۔ اس پر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا ''آپ اللہ کو قسم کیوں دیتے ہیں'' کیونکہ اس نے آپ کی نصرت کا وعدہ کر رکھا ہے تو وہ لازماً اپنا وعدہ پورا کرے گا'' اس وقت صدیق کا مقام وعدہ وکرم پر اعتماد تھا۔ اور آنحضرت ﷺ کا مقام اللہ کے مکر پر خوف تھا جو کامل تر تھا کیونکہ آنحضرت جانتے تھے کہ کوئی بھی اللہ کے کاموں کے اسرار اور تدبیر مملکت اور سررشتۂ تقدیر کے رموز کو نہیں جانتا۔

طریقِ دوم: یہ ہے کہ اگر کوئی معرفتِ خداوندی سے عاجز ہو تو وہ اہلِ خوف کی صحبت اختیار کرے

تا کہ ان کا خوف اس میں بھی سرایت کر جائے۔جس سے وہ اہل غفلت سے بچ رہے گا اور اُسے خوف حاصل ہوگا اگر چہ تقلیداً ہی ہوگا۔سانپ سے بچے کے خوف کی طرح کہ جس نے اپنے باپ کو اس سے بھاگتے دیکھا ہو تو وہ بھی سانپ سے ڈرے گا اور بھاگے گا۔اگر چہ بچہ سانپ کی صفات سے بے خبر ہو۔اور یہ خوف عارف کے خوف کی نسبت کمزور تر ہوگا۔اس لئے کہ اگر لڑکا چند بار سپیرے کو دیکھے کہ سانپ پر ہاتھ ڈالتا ہے تو جس طرح تقلیداً ڈرتا ہے تقلیداً نڈر بھی ہو جائے گا۔اور سانپ پر ہاتھ ڈالے گا اور جو شخص سانپ کے موذی پنے کو جانتا ہے وہ اس سے ایمن نہ ہوگا۔پس چاہئے کہ خوف کا ایسا مقلد اہل امن اور اہل غفلت کی صحبت سے دور رہے خصوصاً ایسے کی صحبت سے جو صورتاً اہل علم ہو۔

طریقِ سوم: یہ ہے کہ اگر وہ عارفوں کو نہ پائے کہ ان کی صحبت اختیار کرتا کیونکہ عصر حاضر میں وہ لوگ کمیاب ہیں تو اسے چاہئے کہ ان عارفوں کی سیرت واحوال کو سنے اور کتب سے پڑھے۔اور ہم اس لئے خوف کے باب میں بعض انبیاء اور اولیاء کا تذکرہ کرتے ہیں تا کہ جسے ذرہ سی عقل بھی ہو جان سکے کہ وہ خلق میں عاقل ترین، عارف ترین اور متقی ترین تھے لیکن نہایت خائف تھے تو دوسروں کے لئے تو یہ اولیٰ تر ہے کہ ڈریں۔

پیغمبروں اور فرشتوں کی حکایات

کہتے ہیں کہ جب ابلیس ملعون ہو گیا تو جبریل اور میکائیل مسلسل رو رہے تھے۔اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی کی کہ ''تم کیوں روتے ہو؟'' حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ جاننے والا ہے تو وہ بولے کہ ''بارِ خدایا ہم تیرے مکر سے مامون نہیں''۔تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''ایسے ہی چاہئے تم ایمن نہ رہو''۔

محمد بن المنکدر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''جب اللہ تعالیٰ نے دوزخ پیدا کی تو فرشتے روئے اور جب انسانوں کو پیدا فرمایا تو فرشتے خاموش ہو گئے۔کیونکہ انھوں نے جان لیا کہ اُن کے لئے پیدا کی گئی ہے''۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ''کبھی بھی حضرت جبریل میرے پاس نہیں آئے کہ خوفِ خدا سے ان پر لرزہ طاری نہ ہو''۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے پوچھا کہ ''میں نے کبھی میکائیل کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کیوں؟'' تو حضرت جبریل نے فرمایا کہ ''جب سے آگ پیدا کی گئی ہے میکائیل نہیں ہنسے''۔اور جب حضرت ابراہیم خلیل نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو ان کے دل کا جوش ایک میل تک سنائی دیتا تھا اور مجاہدؒ کہتے ہیں کہ ''حضرت داؤد زمیں پر سر سجدہ چالیس دن تک روتے رہے حتیٰ کہ ان کے

آنسوؤں سے سبزہ اگ کھڑا ہوا۔ ندائی آئی کہ 'اے داؤد! کیوں روتے ہو اگر بھوکے پیاسے ہو تو میں آب و نان بھیجتا ہوں اور اگر لباس نہیں تو میں لباس بھیجتا ہوں'' تو اس پر حضرت داؤد نے ایسا نالہ کیا کہ ان کے سانس کی گرمی سے لکڑی جل اٹھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ تو حضرت داؤد نے فرمایا کہ ''بارِ خدایا میرا گناہ میری ہتھیلی پر نقش کر دے تاکہ میں بھول نہ سکوں''۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی۔ تو حضرت داؤد کھانے پینے کی چیز کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتے جب تک اس نقش کو نہ دیکھتے اور گریہ نہ کرتے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ پیالہ جو پانی سے پُر نہ ہوتا آپ کو دیا جاتا تو وہ آپ کے آنسوؤں سے پُر ہو جاتا تھا''۔

روایت ہے کہ حضرت داؤد اتنا روئے کہ طاقت تمام ہوگئی تو فرمایا کہ ''بارِ خدایا تو نے میرے رونے پر رحمت کی ہے؟'' تو وحی آئی کہ رونے کا ذکر کرتے ہو شاید گناہ کو بھول گئے ہو؟'' تو آپ نے فرمایا کہ اے بارِ خدایا میں گناہ کو کیسے بھولوں گا۔ حالانکہ گناہ سے پہلے جب میں زبور کی تلاوت کرتا تھا تو چلتا ہوا پانی اور فضا میں ہوا رک جاتی تھی اور پرندے میرے سر کا طواف کرتے اور صحرا کے وحشی جانور میری محراب میں آ جاتے تھے۔ اور اب ان میں سے کوئی چیز نہیں۔ بارِ خدایا یہ کیسی وحشت ہے؟' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ 'اے داود وہ طاعت کا اُنس تھا اور یہ معصیت کی وحشت ہے۔ اے داود آدم میرا بندہ تھا میں نے اسے اپنے دستِ لطف سے تخلیق کیا تھا اور میں نے اس میں اپنی روح پھونکی تھی اور میں نے فرشتوں کو اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا تھا اور میں نے کرامت کی خلعت آدم کو پہنائی تھی اور وقار کا تاج اس کے سر پر سجایا تھا تو اس نے اپنی تنہائی کی شکایت کی تو میں نے اس کے پہلو سے حوّا کو جنم دیا۔ اور دونوں کو بہشت میں اتارا۔ اس نے ایک گناہ جو کیا تو میں نے اسے خوار اور برہنہ اپنی بارگاہ سے نکال دیا۔ اے داؤد سن اور بحق سن! تو نے ہماری اطاعت کی تو ہم نے بھی تمھاری طاعت کی اور جو تم نے چاہا تمھیں دیا۔ تو نے گناہ کیا تو ہم نے تجھے مہلت دی اب با ایں ہمہ اگر تو توبہ کرے تو ہم تیری توبہ قبول کر لیں گے''۔

یحییٰ بن کثیر فرماتے ہیں کہ روایت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب چاہتے کہ اپنے گناہ پر نوحہ کریں تو ہفتہ بھر کچھ نہ کھاتے اور نہ عورتوں کے پاس جاتے تھے۔ پھر صحرا میں چلے جاتے اور حضرت سلیمان سے کہتے جس پر وہ ندا کرتے کہ اے خلقِ خدا جو کوئی حضرت داؤد کا نوحہ سننا چاہتا ہے آئے' تو شہروں سے لوگ اور پرندے آشیانوں سے اور چرندے اور درندے بیابانوں سے اور حشرات پہاڑوں اور صحرا سے اس طرف کا رخ کرتے تو حضرت داؤد ابتداء اللہ تعالیٰ کی ثناء سے کرتے اور خلق فریاد کرتی پھر آپ جنت دوزخ کی توصیف کرتے پھر اپنے گناہ کا نوحہ کرتے یہاں تک کہ خوف وہراس سے بہت سے لوگ مر جاتے تو حضرت سلیمان

ان کے سر پر کھڑے ہو جا کر کہتے کہ "ابا جان بس کیجئے کہ خلق بہت سی ہلاک ہو چکی" اور منادی کرتے کہ فلاں فلاں فوت ہو گئے ہیں جس پر ان کے وارث آ کر جنازے اٹھاتے اور جو کوئی اپنے مردے کو اٹھا تا تو ایک دن میں چالیس ہزار کو جو مجمع اس مجلس میں ہوتا ان میں سے تیس ہزار مر جاتے تھے اور آپ کی دو کنیزیں تھیں جن کا کام یہ تھا کہ خوف کے وقت انھیں تھام لیتی تھیں کہ کہیں ان کے اعضا ٹوٹ کر الگ نہ ہو جائیں۔

یحییٰ بن زکریا علیہ السلام بیت المقدس میں عبادت کرتے تو ایک لڑکا تھا جسے دوسرے لڑکے کھیلنے کی دعوت دیتے تو وہ کہتا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے کھیل کود کے لئے پیدا نہیں فرمایا۔ تو جب وہ پندرہ سال کا ہو گیا تو وہ صحرا کی طرف نکل گیا اور خلق سے دور ہو گیا۔ ایک دن حضرت زکریا اس کے پیچھے نکلے تو آپ نے دیکھا کہ پانی کے کنارے کھڑا ہے اور پیاس سے اس کی جان لبوں پر ہے۔ اور کہہ رہا تھا کہ "تیری عزت کی قسم کہ میں اس وقت تک پانی نہ پیوں گا جب تک تو مجھے یہ نہ بتا دے تیرے نزدیک میری جگہ کہاں ہے؟" اور اس نے اتنا گریہ کیا تھا کہ اس کے چہرے پر گوشت باقی نہ رہا تھا۔ اور اس کے دانت دکھائی دینے لگے تھے۔ اور اس نے نمدے کا ایک ٹکڑا اپنے چہرے پر ڈال رکھا تھا تا کہ لوگ نہ دیکھ سکیں۔ اور اس طرح کی مثالیں پیغمبروں کی حکایات میں بہت ہیں۔

حکایاتِ صحابہ وسلف

معلوم رہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ باوصف اپنی عظمت کے جب کسی پرندے کو دیکھتے تو فرماتے کاشکے میں پرندہ ہوتا"۔ اور ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے کہ "کاشکے میں ایک درخت ہوتا" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا "کاشکے میرا نام ونشان نہ ہوتا"۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ قرآن کی آیت سنتے تو گر پڑتے اور ہوش کھو دیتے اور چند دن تک لوگ ان کی عیادت کو جاتے تھے۔ تو آپ کے چہرے پر رونے کے باعث دو سیاہ لکیریں ہوتیں تو فرماتے "کاشکے عمر کو اس کی ماں نے نہ جنا ہوتا" ایک دفعہ ایک کوچے میں سے گذر رہے تھے کہ کوئی قرآن کی تلاوت کر رہا تھا جب وہ یہاں پہنچا کہ: "اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ لا مَّالَہٗ مِنْ دَافِعٍ" (قرآن: ۵۲/۷،۸) (یعنی تیرے ربّ کا عذاب واقع ہونے والا ہے اور اسے کوئی روکنے والا نہیں)۔ تو آپ رضی اللہ عنہ سواری سے اترے اور بے طاقتی میں خود کو دیوار کا سہارا دیا۔ تو لوگ انھیں ان کے گھر لے گئے جہاں وہ ایک ماہ تک بیمار رہے۔ اور کسی شخص کو ان کی بیماری کا سبب معلوم نہ ہو سکا۔

اور علیؒ بن الحسین رضی اللہ عنہ جب وضو کرتے تو ان کا چہرہ زرد ہو جاتا تھا۔ تو لوگ کہتے کہ "یہ کیا ہے؟" تو آپ فرماتے کہ "تم نہیں جانتے کہ میں کس ذات کے سامنے کھڑا ہونے والا ہوں؟" اور مسعود بن مخزمہ قرآن

سننے کی تاب نہ لاتے تھے۔ایک دن ایک مسافر شخص نے جوان کی عادت سے بے خبر تھا یہ آیت پڑھی: ''یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ۙ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِیْنَ اِلٰی جَهَنَّمَ وِرْدًا ''(قرآن:۸۶/۱۹) (جس دن ہم پرہیزگاروں کو اللہ رحمٰن کی طرف بطور مہمان کے جمع کریں گے اور گناہ گاروں کو سخت پیاسی حالت میں جہنم کی طرف ہانک لے جائیں گے)۔

تو مسعود نے کہا کہ ''ہم مجرموں میں سے ہیں نہ کہ متقیوں میں سے'' اور اس قاری سے کہا کہ ایک دفعہ اس آیت کو پھر پڑھو' تو اس نے یہ آیت دوبارہ پڑھی تو مسعود نے ایک آواز نکالی اور جان جان آفرین کے حوالے کر دی۔اور حاتم اصمؒ فرماتے ہیں کہ ''اچھی جگہ پر فخر نہ کر کیونکہ بہشت سے بڑھ کر اچھی جگہ اور کوئی نہیں۔ جانتے ہو کہ حضرت آدم نے بہشت میں کیا دیکھا؟ اور کثرتِ عبادت پر فخر نہ کرنا کہ جانتے ہو کہ ابلیس نے کیا دیکھا؟ اور کثرتِ علم پر بھی نازاں نہ ہونا کیونکہ بلعم باعور کو علم میں وہ مقام حاصل تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کو بھی جانتے تھے۔لیکن ان کے حق میں یہ آیا کہ: ''فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ''(قرآن:۱۷۶/۷)(اس کی مثل کتے کی سی ہے) اور نیک مردوں کے دیدار پر فخر نہ کرنا کیونکہ آنحضرت ﷺ کے اقارب نے آپ ﷺ کو بہت دیکھا تھا اور آپ سے باتیں بھی کی تھیں لیکن مسلمان نہ ہوئے تھے''۔سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ ''میں ہر روز اپنی ناک کو دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں کہ شاید میرا چہرہ سیاہ ہو گیا ہے'' اور عطای سلمیؒ خائف اصحاب میں سے تھے۔ چالیس سال نہ ہنسے اور آسمان کی طرف نہ دیکھا تھا۔ایک دفعہ آسمان کی طرف جو دیکھا تو خوف سے بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ہر رات ہاتھ اپنے چہرے کی طرف لاتے کہ دیکھیں مسخ تو نہیں ہو گیا اور جب کوئی بلا یا مصیبت یا قحط لوگوں کو پہنچتا تو فرماتے کہ ''یہ سب میری نحوست کی وجہ سے ہے۔ اگر میں مر گیا ہوتا تو لوگ ان سے نجات پا گئے ہوتے''۔اور امام احمد بن حنبلؒ فرماتے کہ ''میں نے دعا کی اللہ تعالیٰ خوف کے ابواب میں سے ایک باب مجھ پر کھول دے تو یہ دعا قبول ہو گئی۔تو مجھے خوف ہوا کہ میری عقل جاتی رہے گی اس لئے میں نے کہا کہ ''بارِ خدایا میری طاقت کے مطابق' تو میرے دل کو سکون حاصل ہوا''۔

عابدوں میں سے ایک کو لوگوں نے دیکھا کہ رو رہا تھا تو پوچھا کہ: کیوں رو رہے ہو؟'' تو اس نے جواب میں کہا ''اس گھڑی کے خوف سے رو رہا ہوں جب لوگوں کو روزِ قیامت پیش کیا جائے گا''۔ایک شخص نے حسن بصریؒ سے پوچھا کہ ''احوال کیسے ہیں؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''کیسے ہو سکتا ہے احوال اس کا جو ایک جماعت کے ساتھ سمندر میں ہو اور کشتی ٹوٹ چکی ہو اور ہر کوئی تختے پر سوار ہو؟'' تو لوگوں نے کہا کہ ''بڑا خطرناک'' تو آپ نے فرمایا کہ ''میرا حال ایسا ہی ہے''۔آپ ہی نے فرمایا کہ ''حدیث میں ہے کہ ایک شخص کو

ہزار سال کے بعد دوزخ سے باہر لایا جائے گا اور کاشکے وہ شخص میں ہوتا''۔ یہ آپ نے اس لئے کہا کہ سوء خاتمت کی بناء پر ہمیشہ کی دوزخ سے ڈرتے تھے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ایک کنیز تھی ایک روز جب نیند سے بیدار ہوئی تو کہنے لگی کہ: ''اے امیر المؤمنین میں نے نہایت عجیب خواب دیکھا ہے''۔ تو آپ نے فرمایا کہ ''بیان کرو'' تو وہ بولی کہ میں نے دیکھا کہ دوزخ کو گرم کیا جارہا ہے اور صراط اس پر قایم کیا جارہا ہے اور خلفاء کو لا رہے ہیں اور سب پہلے عبدالملک بن مروان کو دیکھا کہ لایا گیا ار کہا گیا کہ ''اس صراط پر چلو'' اور ایک لمحہ نہیں گذرا تھا کہ وہ دوزخ میں گر گیا۔ تو پھر اس کے بیٹے ولید کو لایا گیا تو وہ بھی فوراً دوزخ میں گر گیا۔ تو اس کے بعد اس کے بیٹے سلمان کو لایا گیا تو وہ بھی اس میں اسی طرح گر گیا''۔ تو عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ ''اسی طرح بیان کرو'' تو وہ بولی ''اے امیر المؤمنین آپ کو لایا گیا'' جب اس نے یہ کہا تو عمر نے ایک نعرہ مارا اور بے ہوش ہو گئے اور گر پڑے۔ اور کنیز فریاد کر رہی تھی کہ ''اللہ کی قسم میں نے دیکھا کہ آپ پل صراط سے بسلامت گذر گئے'' کنیز اسی طرح بہ آواز بلند دہرا رہی تھی اور آپ ؒ گرے ہوئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔

حسن بصریؒ کئی سال تک نہ ہنسے۔ لوگوں نے انھیں ہمیشہ اس عالم میں دیکھا جیسے کسی قیدی کو ستایا گیا ہو اور اس کی گردن اڑائی جانے والی ہو۔ تو لوگ ان سے کہتے کہ ''اتنی عبادت اور جہد کے باوصف آپ اس قدر سوختہ کیوں ہیں؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''میں حق تعالیٰ کی طرف سے ایمن نہیں ہوں۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس نے مجھ سے کوئی ایسی چیز دیکھی ہو جس کی وجہ سے مجھے اپنا دشمن گردانا ہو۔ اور کہتا ہو کہ جو چاہے کر میں تجھ پر رحم نہ کروں گا' اور میں بے فائدہ جان کنی میں لگا رہوں''۔ یہ اور اس جیسی حکایات بہت سی ہیں۔ اب تو دیکھ کہ وہ کس قدر خائف تھے اور تو ہے کہ چین کی بنسری بجا رہا ہے۔ اس لئے کہ وہ گناہ گار تھے اور تم معصوم ہو یا اس لئے کہ وہ بہت زیادہ معرفت رکھتے تھے اور تم نادان ہو۔ اور تم باوجود معصیتِ کثیر کے سادہ لوحی اور غفلت کے باعث ایمن ہو۔ اور وہ لوگ باوصف کثیر طاعت کے بصیرت اور معرفت کی بناء پر ہراساں تھے۔

فصل: اسی طرح کوئی یہ کہتا ہے کہ خوف ورِجا کے بارے میں حدیثیں بہت سی ہیں۔ ان دونوں میں سے فاضل تر کون ہے۔ اور کون سی کو غالب ہونا چاہئے۔ یاد رہے کہ خوف ورِجا دواؤں کی مانند ہیں اور دوا کو فاضل نہیں کہتے بلکہ نافع کہتے ہیں۔ چونکہ خوف ورجا جیسے کہ ہم نے بیان کیا صفات نقص میں سے ہیں۔ اور انسان کا کمال اس میں ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی محبت میں مستغرق ہو اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر نے اُسے گھیر رکھا ہو اور وہ اپنی ابتداء اور انتہا کے بارے میں نہ سوچے وقت کو دیکھے۔ بلکہ خداوندِ وقت کو دیکھے۔ اگر خوف ورجا

کی طرف متوجہ ہوگا تو یہ اس کے لئے حجاب بن جائے گا۔لیکن یہ حالت نادر ہوتی ہے۔پس جس کا موت کا وقت قریب ہے اس کے ہاں رجا غالب ہونی چاہئے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی محبت میں فزونی ہوتی ہے۔ تا کہ اللہ کا دیدار اس کی سعادت بن جائے۔کیونکہ مزہ تو محبوب کے دیدار ہی میں ہوتا ہے اور قربِ مرگ کے علاوہ دوسرے اوقات میں: اگر انسان اہل غفلت میں سے ہے تو اس پر خوف غالب رہنا چاہئے کیونکہ اس کے لئے رجا کا غلبہ زہر قاتل ہوگا۔اور اگر وہ اہل تقویٰ میں سے ہو اور احوال اس کے مہذب ہوں اس کے ہاں خوف ورجا دونوں معتدل صورت میں ہونے چاہئیں۔اور جب وہ عبادت اور طاعت میں ہو تو چاہئے کہ رجا غالب کیونکہ دل کی پاکیزگی مناجات اور محبت سے ہوتی ہے اور رجا محبت کا باعث ہے۔لیکن معصیت کے وقت خوف کو غالب ہونا چاہئے۔بلکہ مباح کاموں کے وقت بھی خوف غالب ہونا چاہئے اگر کوئی اہل عبادت میں سے ہو ورنہ معصیت میں جا پڑے گا۔پس یہ دارو وہ ہے جو اختلافِ افراد کے ساتھ مختلف ہوتا رہتا ہے۔اس کا مطلق جواب نہ ہو سکے گا۔

◆◆◆

اصل چہارم: فقر و زہد کے بیان میں

یاد رہے کہ راہ دین کا انحصار چار اصلوں پر ہے جن کا ذکر ہم عنوانِ مسلمانی کے تحت کر چکے ہیں۔یعنی تیرا اپنا نفس، حق تعالیٰ، اور آخرت، اور دنیا سے گذرنا آخرت کو پانے کے لئے ہے۔پس تجھے اپنے نفس سے رخ حق تعالیٰ کی طرف موڑنا چاہئے اور دنیا سے رخ آخرت کی طرف موڑنا چاہئے۔اور صبر اور خوف اور توبہ اسی ہدف کے مقدمات ہیں۔دنیا کی محبت مہلکات میں سے ہے۔چنانچہ ہم اس کا علاج بیان کر چکے ہیں اور دنیا کی دشمنی اور اس سے قطع تعلق منجیات میں سے ہے۔اب ہم اس کی تفصیل بیان کریں گے۔جو فقر و زہد سے عبارت ہے پس چاہئے کہ تُو اس کی حقیقت کو جانے۔

فقر و زہد کی حقیقت: یاد رہے کہ فقیر وہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی اسے حاجت ہو وہ اس سے بے بہرہ ہو اور وہ اس کے حصول پر قادر نہ ہو۔انسان کو پہلے اپنے وجود کی حاجت ہے پھر اپنی بقا کی حاجت ہے اور پھر غذا، مال اور دوسری بہت سی چیزوں کی حاجت ہے۔اور ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے قبضۂ قدرت میں نہیں لیکن وہ ان سب کا محتاج ہے۔اور غنی وہ ہے جو کسی غیر کا محتاج نہیں ہوتا۔اور وہ فقط ایک یعنی خدائے جل جلال ہے۔ اس کے سوا جن وانس، ملائکہ اور شیاطین وغیرہ جو کوئی بھی ہے ان کی ہستی اور ان کی بقا ان کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہے۔پس سب کے سب فقیر ہیں۔اسی لئے فرمانِ الٰہی ہے کہ: ''وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآء'' (قرآن: ۴۷

۳۸/)''بے نیاز خدا ہے اور تم سب فقیر ہو''۔حضرت عیسٰی علیہ السلام نے فقیر کی تفسیر میں کہا ہے کہ ''اصبحت مرتھنا بعملی والامر بید غیری فلا فقیر آفقر منی ''فرمایا کہ ''میں اپنے کردار کا گروی ہوں اور میرے کردار کی چابی دوسرے کے ہاتھ میں ہے''۔تو مجھ سے بڑھ کر اور کون فقیر ہوگا''؟ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر بھی فرمایا ہے اور کہا ہے کہ: ''وَرَبُّکَ الْغَنِیُّ ذُو الرَّحْمَةِ اِنْ یَّشَاْ یُذْھِبْکُمْ وَیَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِکُمْ مَّا یَشَآءُ'' (قرآن:۶/ ۱۳۳)(اور تیرا رب غنی ہے اور رحمت والا ہے اگر چاہے کہ تمھیں اس دنیا سے لے جائے اور اس پر قادر ہے کہ تمھارے بعد جسے خلق میں سے چاہئے زمین پر بٹھادے)فرمایا کہ غنی وہ ہے کہ اگر چاہے تو سب کو ہلاک کردے ،اور ایک دوسری قوم کو پیدا کرے۔پس سب مخلوق فقیر ہے۔لیکن اہل تصوف کے ہاں فقیر اسے کہا جاتا ہے جو خود کو اسی صفت پر پائے اور یہ حالت اس پر غالب ہوتی ہے کہ وہ جان لے کہ اس کے پاس کچھ نہیں اور کوئی چیز اس کے قبضۂ قدرت میں نہیں۔نہ اس دنیا میں نہ آخرت میں۔نہ آفرینش کی اصل میں نہ دوام آفرینش میں۔

لیکن احمقوں کا ایک گروہ جو یہ کہتا ہے کہ ''تو فقیر اس وقت ٹھہرے گا جب کوئی طاعت نہ کرے گا کیونکہ اگر طاعت کرے گا تو تُو اس کا ثواب اپنے پاس رکھے گا۔اسی طرح تیرے پاس ایک شے ہوگی جس سے تو فقیر نہ رہے گا''۔تو یہ زندقہ اور اباحت کا بیج ہے جو شیطان انسان کے دل میں ڈالتا ہے اور شیطان احمقوں کو جنھیں زیرکی کا دعویٰ ہوتا ہے اسی وسیلے سے بدراہ کرتا ہے جو برائی کو اچھے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔تاکہ احمق اس لفظ پر مغرور ہو جائے اور گمان کرے کہ وہ خود بڑا دانا ہے۔یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی کہے کہ ''جو کوئی خدا رکھتا ہے تو وہ ہر چیز رکھتا ہے۔لہٰذا اسے چاہئے کہ خدا سے بیزار ہو جائے اور اسے ترک کردے تاکہ فقیر ہو جائے'' حالانکہ فقیر وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طاعت کرتا ہے۔جیسے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ ''طاعت بھی مجھ سے نہیں ہے اور میرے قبضۂ قدرت میں نہیں ہے بلکہ میں خود اس کا گروی ہوں''مختصر یہ کہ فقر کے وہ معنی جو صوفیا کے ہاں لئے جاتے ہیں اس وقت ان کا بیان مقصود نہیں اور نہ تمام چیزوں میں انسان کے فقر کا بیان مقصود ہے بلکہ مال سے فقر کی تفصیل بیان کریں گے اور لاکھوں حاجات جو انسان کو لاحق ہوتی ہیں اور جن سے وہ عاری ہوتا ہے مال ان میں سے ایک ہے۔

یاد رہے کہ مال کا نہ ہونا یا تو اس لئے ہوتا ہے کہ انسان اپنے اختیار سے اس سے دستکش رہتا ہے یا اس لئے کہ مال ہاتھ ہی نہیں آتا۔اگر انسان مال سے خود دستکش رہے تو اسے زہد کہتے ہیں اور اگر مال ہاتھ ہی نہ آتا ہو تو ایسے کو فقیر کہیں گے اور فقیر کی تین حالتیں ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ مال نہیں رکھتا لیکن جس قدر طلب کر سکتا ہے طلب کرتا ہے تو ایسے فقیر کو حریص کہا جائے گا۔
دوسرا وہ جو طلب نہیں کرتا اور اگر اسے کچھ دینا چاہیں تو نہ لے اور وہ اس کو پسند نہ کرتا ہو تو ایسے کو زاہد کہا جائے گا۔
تیسرا وہ کہ جو نہ طلب کرے نہ رد کرے اگر اسے دیں تو لے لے اور اگر نہ دیں تو نہ مانگے۔ تو ایسے فقیر کو قانع کہا جائے گا۔ اور ہم پہلے فقر کی فضیلت بیان کریں گے پھر زہد کی۔ کیونکہ مال کا نہ ہونا اگرچہ انسان اس کا حریص ہو تب بھی ایک گونہ فضیلت ہے۔

فقیر ہونے کی فضیلت: یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: "لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ" (قرآن: ۸/۵۹) "فقیروں کے لئے جنھوں نے اپنے گھر بار سے ہجرت کی" تو اللہ نے فقیر کو مہاجر پر سبقت دی ہے۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ بیوی بچوں والے پارسا فقیر کو دوست رکھتا ہے" نیز فرمایا کہ "اے بلال کوشش کر کہ جب تو اس دنیا سے رخصت ہو تو فقیر ہو نہ کہ دولت مند" نیز فرمایا کہ میری امت کے فقیر دولت مندوں سے پانچ سو سال پہلے بہشت میں جائیں گے۔ اور ایک اور روایت کے مطابق چالیس سال پہلے' شاید اِس سے حریص فقیر مراد ہو اور اُس سے وہ فقیر جو خرسند اور راضی برضا ہو مراد ہو۔ نیز فرمایا کہ میری امت کے بہترین افراد فقیر ہیں اور جلد تر جو لوگ بہشت کی سیر کریں گے کمزور لوگ ہوں گے"۔ نیز فرمایا کہ: "میرے دو پیشے ہیں اور جو کوئی ان دونوں کو محبوب رکھے گا وہ گویا مجھے محبوب رکھے گا۔ اور وہ ہیں فقر اور جہاد"۔ کہتے ہیں کہ حضرت جبریل نے فرمایا کہ: "اے محمد ﷺ اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں زمین کے تمام پہاڑوں کو سونا بنا دوں تا کہ تم جہاں چاہو تمھارے ساتھ ہم سفر ہوں"۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "نہیں اے جبریل دنیا نگھروں کا گھر ہے اور بے مالوں کا مال ہے۔ اور اس میں مال کی جمع آوری بے عقلوں کا کام ہے"۔ تو اس چیز پر جبریل نے فرمایا کہ "یا محمد اللہ بالقول الثابت" (اے محمد اللہ تجھے سخنِ استوار پر قائم رکھے)۔ حضرت عیسیٰ ایک سوئے ہوئے شخص کے پاس سے گذرے تو فرمایا کہ "اٹھ اور اللہ کو یاد کر" تو اس شخص نے جواب دیا کہ "مجھ سے کیا چاہتے ہو کہ میں نے دنیا کو دنیا والوں پر چھوڑ دیا ہے"۔ تو حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ "پھر اے دوست سو جا اور اچھی نیند سے بہرہ ور ہو"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسے ہی سوئے شخص کے پاس سے گذرے جو زمین پر سویا ہوا تھا اور ایک اینٹ بہ طور سرہانے کے سر کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ اور اس کے پاس سوائے ایک کمبل کے کچھ نہ تھا تو حضرت نے کہا کہ "بارِ خدایا تیرا یہ بندہ تو برباد ہو گیا کہ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں" تو اس پر وحی آئی کہ "اے موسیٰ تو نہیں جانتا کہ میں جس کا بہمہ رُو استقبال کرتا ہوں تو میں اس سے دنیا

سراسر باز رکھتا ہوں''۔اور ابورافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''آنحضرت کے پاس ایک مہمان پہنچ گئے۔اور آپ کے پاس مہمان کی تواضع کے لئے کچھ نہ تھا۔اس لئے مجھ سے فرمایا کہ فلاں یہودی کے پاس جاؤ کہ مجھے آٹا ادھار دے اور میں اس کی قیمت رجب کی پہلی تاریخ کو ادا کردوں گا۔تو میں اس کے پاس گیا تو یہودی نے کہا کہ ''لا واللہ میں گرو رکھے بغیر نہ دوں گا' تو میں نے اس کی یہ بات آنحضرت کو بتائی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''خدا کی قسم میں زمین نیز آسمان میں امین ہوں اگر وہ دے دیتا تو میں یقیناً ادا کردیتا۔اب تُو میری زرہ لے جاکر گروی رکھ دے''۔تو میں نے زرہ گرو کردی۔تو آپ ﷺ کی دلی خوشی کے لئے یہ آیت نازل ہوئی: ''وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ''(قرآن:)(اے محمد! نہیں چاہئے کہ آپ دنیا اور دنیاداروں کو کنکھیوں سے دیکھیں کیونکہ یہ سب ان کے واسطے فتنہ ہے اور جو آپ کے لئے اللہ نے پاس رکھی ہے وہ بہتر اور پائیدار ہے)۔اور کعب احبار کہتے ہیں کہ ''حضرت موسیٰ پر وحی آئی کہ ''اے موسیٰ جب کوئی فقیر آپ کا رخ کرے تو آپ کو ''و مرحبا بشعار الصالحین ''(خوش آمدید کہ آپ نے نیکوں کی پیروی کی) کہنا چاہئے'' آنحضرت نے فرمایا ہے کہ مجھے بہشت دکھائی گئی تو میں نے دیکھا کہ بیشتر فقیر ہی تھے۔اور جب دوزخ دکھائی گئی تو وہاں بیشتر دولت مند دکھائی دیئے''۔نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے بہشت میں عورتیں کمتر دیکھیں تو میں نے کہا کہ وہ کہاں ہیں؟''تو مجھے بتایا گیا کہ: ''شغلهن الاحمران: الذهب و زعفران ''ان کو زر ینے اور لباس رنگین نے قید کر رکھا ہے'' کہتے ہیں کہ ایک پیغمبر سمندر کے کنارے سے گذرے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک شکاری جال پھینک رہا تھا اور کہتا تھا کہ اللہ عزوجل کے نام سے' اور کوئی مچھلی اس کے جال میں نہ پھنستی تھی۔ایک اور صیاد نے جال پھینکا تو کہا' شیطان کے نام سے' تو بہت سی مچھلیاں اس کے جال میں پھنس گئیں۔تو وہ پیغمبر بولے کہ ''اے اللہ میں جانتا ہوں کہ یہ سب تیری طرف سے ہے لیکن سبب اس کا کیا ہے؟'' اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ ''اس پیغمبر کو ان دونوں شکاریوں کی جگہ جنت اور دوزخ میں دکھاؤ'' تو انھوں نے اس پیغمبر کو دکھایا۔تو دیکھ کر کہا کہ 'بارِ خدایا میں اس پر راضی ہوں'' اور ہمارے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''پیغمبروں میں ان کی دولت مندی کے باعث جو سب سے آخر میں بہشت میں داخل ہوں گے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں اور میرے اصحاب میں سے جو سب سے آخر میں بہشت میں داخل ہوگا وہ عبدالرحمٰن بن عوف ہے''۔اور حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں کہ ''دولت مند پوری سختی کے بعد داخل بہشت ہوگا''۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''خدائے تعالیٰ جب کسی بندے کو دوست بناتے ہیں تو اسے بلاؤں میں مبتلا کرتے ہیں۔اور اگر انتہائی دوستی ہو تو اسے اقتنا کرتے ہیں''۔لوگوں نے پوچھا کہ ''یارسول اللہ اقتنا کیا چیز

ہے؟'' فرمایا کہ ''اس بندے کے پاس نہ مال رہنے دیتے ہیں نہ اس کی بیوی''۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا ''بارِ خدایا تیرے دوست کون لوگ ہیں تا کہ میں بھی ان کو دوست بناؤں''۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''جہاں بھی کوئی فقیر ہے۔ فقیر یعنی فقیر کامل''۔ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''فقیر کو روزِ قیامت لایا جائے گا اور جس طرح لوگ ایک دوسرے سے عذر خواہی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس فقیر سے اسی طرح عذر خواہی کرے گا۔ اور کہے گا کہ ''اے میرے بندے یہ تیری پستی کے باعث نہ تھا جو میں نے دنیا تجھ سے دور رکھی لیکن اس لئے کہ میں چاہتا تھا کہ تو میری تکریم اور خلعتیں پائے' اب تو خلایق کی ان صفوں میں چلا جا جس نے بھی تجھے میرے لیے ایک دن کھانا یا کپڑا دیا ہو تو اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آ کیونکہ میں نے اس کو ایک دن تیرے کام میں لگایا تھا'' اور خلق اس دن پسینے میں غرق ہوگی۔ اور وہ فقیر مرد صفوں میں داخل ہو کر مومنوں میں سے ہر ایسے شخص کو جس نے اس کے ساتھ نیکی کی تھی باہر لے آئے گا''۔ نیز فرمایا کہ ''درویشوں کو پہچانو اور ان سے نیکی کرو کیونکہ ایک دولت ان کی منتظر ہے''۔ لوگوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟'' فرمایا کہ جس نے بھی فقیروں کو پانی پلایا ہو یا روٹی کا لقمہ دیا ہو یا خرقہ دیا ہو وہ فقیر ان کا ہاتھ پکڑیں گے اور جنت میں لے جائیں گے''۔ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا کہ ''جب دینا دار دنیا جمع کرنے اور دنیا کی تعمیر میں لگ جاتے ہیں اور فقراء کو دشمن جانتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ ایسے دنیاداروں کو چار چیزوں میں مبتلا کر دیتے ہیں: قحطِ زماں' جورِ سلطان' خیانت قاضیاں اور کافروں اور دشمنوں کی قوت اور شوکت میں''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ملعون ہے وہ شخص جو خود کو فقر کے باعث ذلیل رکھے اور دولت مندی کے باعث عزیز رکھے''۔ کہتے ہیں کہ سفیان ثوریؒ کی مجلس میں جتنے دولت مند ذلیل ہوتے تھے کسی اور کی مجلس میں اس قدر نہ ہوتے تھے۔ سفیان انھیں کبھی آگے جگہ نہ دیتا تھا انھیں آخری صف میں جگہ دیتا تھا لیکن فقیر کو اپنے پاس بٹھاتا تھا''۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا کہ ''اے بیٹے یاد رکھ کہ جو کوئی پھٹا پرانا لباس پہنے ہوئے ہو اسے حقیر نہ سمجھنا کیونک تمھارا اور اس کا اللہ ایک ہی ہے''۔ اور یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''اے مسکین فرزندِ آدم! اگر تو دوزخ سے ایسے ہی ڈرتا ہے جیسے کہ فقر سے ڈرتا ہے تو تُو دونوں سے مامون ہو جاتا۔ اور اگر بہشت کو بھی اسی طرح طلب کرتا ہے جس طرح دنیا کو طلب کیا تو دونوں کو پالیتا اور اگر باطن میں اللہ تعالیٰ سے ایسے ہی ڈرتا ہے جس طرح ظاہر میں خلق سے ڈرتا ہے تو تُو دونوں جہانوں میں خوش بخت ہوتا''۔ ایک شخص نے ابراہیم بن ادھمؒ کی خدمت میں دس ہزار درم پیش کیے تو انھوں نے قبول نہ کیے۔ اس شخص نے بہت اصرار کیا۔ تو حضرت ابراہیم ادھم نے کہا ''کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس مقدار پر اپنا نام درویشوں کے جریدے سے حذف کرا دوں؟ یہ میں کبھی نہیں کر سکتا۔ اور آنحضرت ﷺ

نے عایشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ "اگر تو چاہتی ہے کہ کل قیامت کو مجھے پائے فقیرانہ زندگی بسر کر اور دولت مندوں کی ہم نشینی سے دور رہ اور کوئی لباس پیوند لگا کر پہنے بغیر اتار نہ پھینکنا"۔

فقر اور شادمانی کی فضیلت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مبارک ہے وہ شخص جسے اسلام کی راہ دکھائی گئی اور روزی بقدرِ کفایت دی گئی اور وہ اس پر قانع ہو گیا" اور آپ نے درویشوں سے کہا کہ "تہِ دل سے فقر پر راضی رہو تا کہ فقر کا ثواب پاؤ۔ اور اگر ایسا نہ کرو گے تو ثواب سے محروم رہو گے"۔ یہ اشارہ اس بات کا ہے کہ حریص فقیر کو ثواب نہیں ملتا۔ لیکن ایسی صریح احادیث بھی ہیں جن کے مطابق اسے بھی ثواب ملتا ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر چیز کے لئے کلید ہوتی ہے اور بہشت کی کلید فقرائے صابر سے دوستی ہے۔ صابر فقیر روزِ قیامت اللہ کے ہم نشینوں میں سے ہوں گے"۔ نیز فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کے دوست ترین بندوں میں وہ فقیر ہے جو اپنے اثاثے پر قانع ہے اور جو روزی بھی اللہ سے اسے پہنچتی ہے اس پر راضی ہے: "نیز فرمایا کہ "روزِ قیامت کیا فقیر اور کیا مالدار آرزو کریں گے کہ کاش دنیا میں قوتِ لایموت سے زاید کے مالک نہ ہوتے"۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ "مجھے شکستہ دلوں کے ہاں تلاش کرو"۔ تو حضرت علیہ السلام نے پوچھا کہ "بارِ خدایا وہ کون لوگ ہیں؟" تو اللہ نے فرمایا کہ "وہ ہیں سچے فقراء" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت فرمائیں گے کہ "خلق میں سے میرے بندگانِ خاص اور برگزیدوں کو تلاش کرو" تو فرشتے کہیں گے کہ "وہ کون ہیں؟" تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ "وہ مسلمان فقیر جو میرے فیصلے پر راضی تھے۔ ان سب کو بہشت میں لے جاؤ؛ اور وہ بہشت میں چلے جائیں گے جب کہ باقی سب خلق ابھی حساب کتاب میں ہو گی"۔

اور بودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ جس کی عقل نقصان میں نہ ہو کہ جب دنیا بہ افراط ہو تو خوش ہوتا ہے اور عمر مسلسل کم ہو رہی ہے اور اس کا غم نہیں کرتا" ایک شخص نے عامر بن عبد قیس کے پاس سے گذرا تو دیکھا کہ نان اور سبزی کھا رہا ہے۔ تو اس شخص نے کہا کہ "اے عامر تُو نے دنیا میں سے اس پر قناعت کر لی؟" تو عامر نے کہا کہ: "میں ایسے شخص کو بھی جانتا ہوں جس نے اس سے بھی کم پر قناعت کر لی ہے"۔ تو اس شخص نے پوچھا کہ "وہ کون ہے؟" تو عامر نے کہ "وہ جس نے دنیا آخرت کے بدلے لے لی ہو تو اس نے اس سے بھی کم تر پر قناعت کی"۔ ایک دن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے اور لوگوں سے باتیں کر رہے تھے تو ان کی بیوی آ گئی اور کہنے لگی "آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور آپ کے گھر میں کوئی شے

نہیں ہے''۔تو آپ نے فرمایا''اے بیوی ہمارے سامنے ایک بلند گھاٹی ہے اور اس پر سے گذرنا اسی کے لئے ممکن ہے جو سبک بار ہو''۔ یہ سن کر ان کی بیوی خوش ہوگئی اور واپس لوٹ گئی۔

فصل: معلوم رہے کہ اہل علم اس امر میں باہم اختلاف رائے رکھتے ہیں کہ صابر فقیر فاضل ہے یا شاکر دولت مند؟ لیکن صحیح یہ ہے کہ صابر فقیر فاضل تر ہے۔ اور یہ حدیثیں سب اسی کی دلیل ہیں۔لیکن اگر تو چاہے کہ اعمال کے بھیدوں کو جانے تو حقیقت یہ ہے کہ جو شے تجھے حق تعالیٰ کے ذکر اور محبت سے مانع آئے وہ مذموم ہے۔اس لئے ایسا شخص بھی ہوسکتا ہے کہ جس کا فقر اس سے مانع ہو اور کوئی ایسا بھی ہوسکتا ہے جس کی دولت اللہ کے ذکر اور محبت میں آڑے آئی ہو۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ روزی کا بہ قدرِ کفایت میسر ہونا نہ ہونے سے اولیٰ تر ہے۔ کیونکہ اس قدر کو دنیا نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ تو آخرت کا زادِراہ ہے۔اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''اے اللہ آلِ محمد کے لئے روزی' بہ قدرِ کفایت عطا فرما''اور جو کچھ قدرِ کفایت سے زائد ہے اس کا نہ ہونا ہی اچھا ہے۔ کیونکہ حرص وقناعت میں یہ دونوں حال برابر ہیں۔ کیا حریص فقیر اور کیا حریص دولت مند مال میں معلق ہیں اور اسی میں حریص مشغول ہیں۔

لیکن فقیر کی بشری صفات شکستہ کردی گئی ہوتی ہیں۔تو جب وہ کوئی رنج دیکھتا ہے تو دنیا سے نفور ہو جاتا ہے۔اور مومن کے ہاں جس قدر دنیا کی دوستی کم ہوجاتی ہے اس قدر حق تعالیٰ کی دوستی میں اضافہ ہوتا ہے۔اور جب دنیا اس کے لئے قید خانہ ہے اگرچہ وہ اس سے کارہ ہوتا ہے۔لیکن موت کے وقت اس کا دل دنیا کی طرف کم ہی متوجہ ہوتا ہے۔اور دولت مند جب دنیا سے بہرہ اندوز ہوتا ہے تو اس سے انس کرنے لگتا ہے۔اور دنیا کو ترک کرنا اس کے لئے دشوار ہوتا ہے۔تو موت کے وقت ان دونون دلوں کے درمیان بہت فرق ہوتا ہے۔ بلکہ عبادت اور مناجات کے وقت بھی ایسے ہی فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ جو لذت مرد فقیر کو عبادت و مناجات میں ملتی ہے دولت منداس سے محروم رہتا ہے۔ دولت مند کا ذکر نوک زبان اور ظاہر دل پر ہوتا ہے اور دل زخمی اور شکستہ نہ ہو اور رنج وغم میں سوختہ نہ ہو ذکر کی لذت اس کے باطن میں نہیں اترتی۔اور اس طرح یہ دونوں قناعت میں برابر ہوں تو بھی درویش کا درجہ فاضل تر ہوگا۔لیکن اگر فقیر حریص ہو اور دولت مند شاکر اور قانع ہو اور وہ مال کھو دے اور رنجور نہ ہو اور شکر پر قائم رہے تو اس کا دل شکر وقناعت سے پاکیزگی حاصل کرتا ہے۔اور حریص درویش کا دل حرص سے آلودہ ہوجاتا ہے۔لیکن وہ دل شکستگی اور اندوہ سے پاکیزگی پاتا ہے۔تو یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب قرار پاتے ہیں۔لیکن حقیقت میں حق تعالیٰ سے دوری یا نزدیکی انسان کے دل کی دنیا سے تعلق

یا ترک کے مطابق ہو گی۔ لیکن اگر دولت مند ایسا ہو کہ اس کے لئے مال کا ہونا نہ ہونا برابر ہو جائے۔ اور دل اس سے فارغ ہو اور جو مال اس کے پاس ہے وہ خلق کی حاجت روائی کے لئے وقف ہو جیسے کہ حضرت عایشہ رضی اللہ عنہا نے ایک ہی دن میں ہزار درم خلق خدا پر نچھاور کر دیئے اور روزہ افطار کرنے کے لئے ایک درم بھی اپنے لئے نہ رکھا کہ گوشت خرید تیں تو یہ درجہ فقیر کے اس درجہ سے کہ دل اس کا اس صفت سے محروم ہو کہیں بڑھ کر ہے۔ لیکن جب احوال کا اندازہ برابر سرابر ہو تو صابر درویش برتر ہوگا۔ کیونکہ دولت مند کا کام زیادہ تر صدقہ دینا اور خیرات کرنا ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ فقیروں نے آنحضرت ﷺ سے از راہ گلہ عرض کیا کہ ''دولت مند تو دنیا و آخرت کی خیر دونوں لے گئے کیونکہ وہ صدقہ و زکوٰۃ دیتے ہیں۔ حج کرتے ہیں اور غزوات میں جہاد کرتے ہیں جب کہ ہم ان میں سے کچھ بھی نہیں کر پاتے''۔ تو آپ ﷺ نے ان فقیروں کو جو آپ ﷺ کے پاس بھیجے گئے تھے نوازش کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''مرحبا بك و بمن جنت من عندهم'' آفرین تم پر اور ان پر جن کی طرف سے تم آئے ہو کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ تم ان سے کہو کہ جو کوئی اللہ کے لئے فقر پر صبر کرتا ہے۔ تو ایسوں کے تین خصائل ہوتے ہیں جو دولت مندوں میں نہیں ہوتے۔ ایک یہ کہ بہشت میں ان کے ایسے محل ہوتے ہیں کہ جنھیں بہشتی ۔ ایسے دیکھتے ہیں جیسے دنیا والے ستاروں کو دیکھتے ہیں۔ اور وہ پیغمبروں، فقیروں اور شہیدوں کے لئے مختص ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ فقیر دولت مندوں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے۔ تیسرے یہ کہ جب فقیر سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہتا ہے اور دولت مند بھی یونہی کہتا ہے تو وہ ہرگز اس درجے کو نہیں پہنچتا اگرچہ وہ اس کے ساتھ دس ہزار درم صدقہ میں نیز دے؛ اس پر فقیر بولے کہ' رضینا رضینا' ہم راضی ہیں ہم راضی ہیں'' یہ آنحضرت نے اس لئے فرمایا کہ ذکر وہ بیج ہے کہ جب وہ درویش کے دل کو دنیا سے فارغ اور اندوہ گین اور شکستہ پاتا ہے تو وہ اس کے دل میں عظیم اثر کرتا ہے۔ لیکن وہ دولت مند جو دنیا سے مسرور مشغول ہو اس کے دل سے یہی بیج اس طرح دور جا گرتا ہے جیسے کہ کسی پتھر سے ٹکرایا ہو۔ پس چونکہ ہر کسی کا درجہ اللہ سے اُس کے دل کی نزدیکی اور ذکر و محبت میں مشغولی کے مطابق ہوتا ہے اور ذکر و محبت کی یہ مشغولی کسی اور چیز سے انس کے مقابلے میں ہوتی ہے۔ اور دولت مند کا دل ماسوا اللہ کے انس سے خالی نہیں ہوتا تو یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ ممکن ہے کہ دولت مند یہ گمان کرتا ہو کہ میں مال کے درمیان بھی مال سے فارغ ہوں لیکن یہ خود فریبی ہے۔ کیونکہ علامت اس کی یہ ہے جس کا مظاہرہ حضرت عایشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ مال سب کا سب نچھاور کر دیا ایسے جیسے کہ وہ مٹی کی طرح بے حقیقت ہو۔ اگر اسی دنیا داری کے باوجود ذکر

وفکر کی فراغت ممکن ہوتی تو پیغمبر اس سے اس قدر احتراز کیوں کرتے اور اس کی تعلیم کیوں دیتے؟ حتیٰ کہ آنحضرت فرماتے ہیں کہ ''مجھ سے دور رہو مجھ سے دور رہو''۔ جب دنیا آپ کی نگاہوں میں آ کر خود کو پیش کر رہی تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: ''دنیا والوں کے مال کو نہ دیکھو کیونکہ اس کی چمک دمک تمھارے دل سے حلاوت اُچک لے گی''۔ آپ نے یہ اس لئے فرمایا کہ ''مال کی حلاوت دل میں آ کر ذکرِ حق کی حلاوت کو مزاحم ہوتی ہے۔ یہ دونوں ایک ہی دل میں بیک وقت جمع نہیں ہوسکتیں۔ اور انسانی دل میں دو چیزوں سی زیادہ نہیں ہوتیں۔ یا تو حق ہوگا یا غیر حق ہوگا۔ اس لئے تُو غیر حق میں جس قدر دل لگائے گا اسی قدر حق سے دور ہو گیا ہوگا۔ اسی طرح جو کوئی غیر حق سے کٹا ہوا ہوگا اسی قدر وہ حق تعالیٰ کے نزدیک ہوگا۔ ابوسلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ ''مرد فقیر کے دل سے جب اس کی آرزو کی ناکامی پر آہِ سرد نکلتی ہے وہ دولت مند کی ہزار سالہ عبادت سے برتر ہوتی ہے''۔ ایک شخص نے بشر حافیؒ سے کہا کہ ''میرے لئے دعا فرمائیں کہ میں عیال دار ہوں لیکن خالی ہاتھ ہوں''۔ تو بشر نے فرمایا کہ ''جس وقت تیرے اہل وعیال یہ کہیں کہ روٹی ہے نہ پانی اور تو اس کی فراہمی سے عاجز ہو اور درد اس کا تیرے دل میں جاگزین ہو تو تو اس وقت میرے لئے دعا کر کیونکہ ایسے وقت میں تیری دعا میری دعا سے فاضل تر ہے''۔

آدابِ درویشی: یادر ہے کہ فقر کا ادب باطن میں رضا ہے۔ اور ظاہر میں یہ ہے کہ انسان گلہ نہ کرے اور فقیر کے باطن کی تین حالتیں ہوتی ہیں:

ایک: یہ کہ فقیر فقر پر شاداں اور شاکر ہو اور جانتا ہو کہ یہ محض حق تعالیٰ کی عنایت ہے جو وہ اپنے دوستوں پر کرتا ہے دوسرے یہ کہ اگر فقیر شاکر نہ ہو تو کم از کم اللہ تعالیٰ کے فعل سے کراہت نہ کرے۔ اگرچہ فقر سے کارہ ہو۔ ایسے ہی جیسے کہ کوئی فصد کھلوائے اور وہ اس سے کارہ ہو لیکن وہ فصد کھولنے والے سے تو نفور ہوتا نہیں۔ تو ایسا فقیر بھی بزرگ ہی ہے۔ تیسرے یہ کہ فقیری پر اللہ ہی سے کارہ ہو جائے تو وہ قطعاً حرام ہے۔ جو فقر کے ثواب کو زائل کر دیتا ہے۔ بلکہ ہر وقت واجب ہے کہ اعتقاد کرے کہ حق تعالیٰ وہی کرتا ہیں جو بایدو شاید ہو اور کسی کو کراہیت اور انکار کا حق نہیں۔ اور ظاہر میں بھی فقیر کو گلہ نہیں کرنا چاہئے اور تحمل کے پردے کو ملحوظ رکھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے درویش اہلِ عقوبت ہو علامت اس کی یہ ہے کہ بدخو ہو اور اللہ کے فیصلے پر شاکی اور ناراض ہو اور ہوسکتا ہے کہ درویش خوش سعادت ہو اور علامت اس کی یہ ہے کہ خوش خُو ہو شاکی نہ ہو شاکر ہو۔ اور حدیث میں ہے کہ اپنے فقر کو چھپانا عظیم مخزنوں میں سے ہے۔

اور دوسرا ادب: یہ ہے کہ فقیر دولت مندوں سے میل جول نہ رکھے۔ اور ان کے ساتھ انکساری سے پیش نہ آئے۔ اور ان کی چاپلوسی نہ کرے۔ سفیان فرماتے ہیں کہ ''جب کوئی درویش دولت مندوں کے گرد پھرے تو سمجھ لے کہ یہ ریاکار ہے اور فقیر سلطان کے گرد پھرے تو سمجھ لے کہ چور ہے''۔

اور نیز یہ کہ بعض احوال میں اگر ممکن ہو تو فقیر صدقہ دے اور اپنے آپ سے واپس لے۔ آنحضرت فرماتے ہیں کہ ''ایک درم ایسا بھی ہوتا ہے جو لاکھ درم سے سبقت لے جاتا ہے''۔ تو لوگوں نے پوچھا ''کہاں؟'' تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ ''وہ شخص جس کے پاس فقط دو درم ہوں اور وہ ان میں سے ایک صدقہ کردے تو یہ برتر ہے اس سے کہ مال بہت ہو اور وہ اس میں سے لاکھ درم صدقہ میں دے''۔

عطا قبول کرنے کا ادب

عطا قبول کرنے کا ادب یہ ہے کہ جو کچھ مشتبہ میں سے ہو اسے قبول نہ کرے۔ اور جو کچھ فقیر کی حاجت سے زیادہ ہو اسے بھی قبول نہ کرے۔ الّا یہ کہ درویشوں کی خدمت میں مشغول ہو اور لے لے۔ پس اگر سب کے سامنے لے اور پوشیدہ طور پر دے تو یہ درجہ صدیقوں کا ہے۔ اگر اس کی طاقت نہیں رکھتا تو مال کے مالک سے کہے کہ وہ خود مستحقوں تک پہنچا دے۔ لیکن ضروری ہے کہ دینے والے کی نیت کو اچھی طرح سن لے کہ یہ ہدیہ ہے یا صدقہ ہے یا بہ طور ریا ہے۔

اور جو کچھ بہ طور تحفہ ہو اسے قبول کرنا سنت ہے۔ کیونکہ یہ احسان سے خالی ہوتا ہے۔ اور اگر معلوم ہو جائے کہ بعض تو بہ طور احسان ہے اور بعض نہیں تو اسی قدر لے جس میں منّت نہ ہو۔ ایک شخص آنحضرت کی خدمت میں روغن اور کشک (خشک لسی) اور ایک بکری لایا تو آپ نے بکری واپس کردی اور باقی دونوں قبول فرمالئے۔ ایک شخص فتح موصلیؒ کے لئے پچاس درم لایا اور کہنے لگا کہ ''حدیث میں ہے کہ جو کوئی بے مانگے پیش کی گئی شے کو رد کردے تو گویا اس نے عطائے خداوندی کو رد کردیا''۔ تو فتح نے ایک درم قبول کرلیا اور باقی لوٹا دیئے۔ اور حسن بصریؒ نے بھی اسی حدیث کی روایت کی۔ لیکن ایک دن ایک شخص اُن کے لئے ایک تھیلی چاندی کے سکوں کی اور بہت عمدہ لباس لایا تو آپ نے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ جو کوئی وعظ کہتا ہو وہ اگر لوگوں سے کوئی شے لے تو وہ روزِ قیامت دیدارِ خداوندی سے محروم رہے گا اور اللہ سے کچھ نہ پائے گا''۔ اور آپ نے یہ اس لئے نہ لیا ہوگا کہ ان کی نیت وعظ کے ثواب کی ہو۔ اور یہ جانا ہو کہ عطا کرنے والا شخص بہ سبب ان کے وعظ کے لایا ہو۔ اور آپ نے نہ چاہا ہو کہ اخلاص باطل ہو جائے۔ ایک شخص نے اپنے ایک دوست کو کوئی چیز دی تو اس

نے کہا کہ ''چھوڑ دے اور سن ! اگر اسے قبول کرنے سے میری قدر تیرے دل میں بڑھے گی تو میں قبول کرلیتا ہوں''۔ اور سفیان ثوریؒ کسی سے کوئی چیز نہ لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر مجھے علم ہوتا کہ وہ اس کا تذکرہ نہ کرے گا تو میں قبول کرلیتا یعنی دینے والے اکثر لاف زنی کرتے ہیں اور احسان دھرتے ہیں۔ اور کوئی ایسا بھی ہوتا کہ خاص دوستوں سے تو لے لیتا تھا لیکن اوروں سے نہ لیتا تھا۔ احسان دھرنے کے خوف سے سب دامن بچاتے تھے۔ بشر حافیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سوائے سری سقطی کے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا کیونکہ میں ان کے زُہد کو جانتا تھا کہ وہ اس پر خوش ہوتے تھے کہ کوئی چیز ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔ اگر کوئی ریاکاری کی نیت سے کچھ دے تو قبول نہ کرنا ہی ضروری ہے۔ بزرگوں میں سے ایک نے کوئی چیز رد کردی۔ تو لوگوں نے ان سے اظہارِ ناراضگی کیا تو انھوں نے کہا کہ ''یہ تو شفقت تھی جو میں نے ان پر کی کیونکہ وہ برملا اس کا ذکر اوروں سے کریں گے جس سے مال بھی گیا اور ثواب بھی''۔

اگر کوئی شخص بہ قصد صدقہ دے تو فقیر اگر مستحق نہ ہو تو اسے لینا نہ چاہئے۔ لیکن اگر حاجت مند ہو تو رد نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ ''جو کوئی بے مانگے فقیر کو دے تو وہ ایسا رزق ہوتا ہے جو دراصل اللہ تعالیٰ نے اسے بھیجا ہوتا ہے'' اور داناؤں نے کہا ہے کہ ''وہ جسے کوئی چیز دیں اور وہ نہ لے تو مبتلا اس میں ہوگا کہ وہ مانگے گا لیکن لوگ اسے نہ دیں گے''۔ اور سری سقطیؒ جب بھی احمد بن حنبل کی خدمت میں کوئی چیز بھیجتے تو وہ نہ لیتے تو سری کہتے ''اے احمد رد کرنے کی آفت سے ڈر'' تو آپ اس سے کہتے کہ ''ایک دفعہ پھر کہو''۔ تو سریؒ نے یہ کلمہ دہرا دیا تو اس پر احمدؒ نے تامل کیا پھر کہا کہ ''میرے پاس ابھی ایک ماہ کا روزینہ ہے۔ اسے اپنے پاس رکھ جب وہ موجودہ روزینہ تمام ہو جائے گا تو میں قبول کرلوں گا''۔

اس امر کا بیان کہ بے حاجت سوال کرنا حرام ہے

یاد رہے کہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''سوال فواحش میں سے ہے اور فواحش بے ضرورت حلال نہیں ہوتے۔ فواحش میں اس کا شمار تین بڑے کاموں کی وجہ سے ہے:

ایک یہ کہ مردِ فقیر کا اظہار کرنا گویا حق تعالیٰ کی شکایت کرنا ہے۔ اگر کوئی غلام کسی غیر سے کوئی چیز مانگے تو اس کے اپنے آقا کے حق میں طعن کرنے کے مترادف ہوگا۔ تو کفارہ اس کا یہ ہے کہ سوائے ضرورت کے سوال نہ کرے نیز بر سبیل شکایت نہ کہے۔

دوسرے یہ کہ فقیر نے سوال کر کے خود کو ذلیل کیا جب کہ مومن کے لئے روا نہیں کہ سوائے حق تعالیٰ کی بارگاہ کے خود کو خوار کرے۔ اور اس سے خلاص اس طرح ممکن ہے کہ حتی الوسع سوال کسی دوست یا خویشاوند یا

فراخ دل سے کرے کہ جو اسے سوال کے باعث چشمِ حقارت سے نہ دیکھے تاکہ فقیر ذلیل نہ ہو۔ اور ایسے سے بھی سوائے حاجت کے سوال نہ کرنا چاہئے۔

تیسرے یہ کہ اس میں اس شخص کو رنج پہنچانا ہوگا کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ شرم کے مارے دے اور بہ ریا دے کہ ملامت سے ڈرتا ہو۔ پس اگر دے گا تو رنجور ہوگا اور دل سے نہ دے گا اور اگر نہ دے گا تو شرم اور ملامت کے رنج سے دوچار ہوگا۔ تو ایسی صورت میں مناسب یہ ہوگا کہ صریحاً سوال نہ کرے اشارے کنائے سے کام لے۔ اس طرح کہ اگر وہ شخص اپنے آپ کو غافل ٹھہرانا چاہے تو ٹھہرا سکے اور اگر صریحاً کہے تو بھی تعیین نہ کرے مختصراً کہے۔ الا یہ کہ کوئی از خود تیار ہو اور مال دار ہو اور جانتا ہو کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہے تو سوال کرنا روا ہے اگرچہ اسے تکلیف ہی کیوں نہ پہنچے اس لئے کہ وہ زکوٰۃ کا مستحق ہے اور اگر کوئی دولت مند ہو تو سب اس سے امید رکھتے ہیں اور اگر وہ نہ دے گا تو لوگ اس کی ملامت کریں گے تو یہ بھی تعیین کرنے کے مترادف ہوگا۔ لیکن اگر کسی دوسرے کے لئے چاہے جو زکوٰۃ کا مستحق ہو اور جانتا ہو کہ اس شخص پر زکوٰۃ واجب ہے تو جائز ہوگا اگرچہ اسے دلی رنج پہنچے۔ اور اگر کوئی خود مستحق زکوٰۃ ہو تو بھی ایسے ہی۔ لیکن جو کچھ ملامت کے خوف سے دے یا شرم کے مارے دے اس کا لینا حرام ہوگا۔ کیونکہ وہ تاوان کی مانند ہوگا۔ فتویٰ ظاہر میں زبان کو دیکھتے ہیں لیکن یہ صورت اس دنیا میں کارآمد ہے۔ اُس جہان میں دل کے فتوے پر اعتماد کیا جاتا ہے اس لئے اگر دل گواہی دے کہ بہ کراہیت دے رہا ہے تو لینا حرام ہے۔ پس ان سب مباحث سے معلوم ہوا کہ سوال حرام ہے۔ اِلّا بہ ضرورت یا اہم حاجت کی بناء پر ہو۔ اگر تجمل افزونی یا خوش خوراکی یا اچھے لباس کے لئے ہو تو لینا حرام ہے۔ یہ اسی کے لئے روا ہے جو عاجز ہو اور خالی ہاتھ ہو اور کوئی کام بھی نہ کرسکتا ہو۔ لیکن اگر کام کرسکتا ہو لیکن طلب علم میں مشغول ہے اور کسب کی وجہ سے طلبِ علم سے رہ جائے گا تو اس کے لئے روا ہے۔ لیکن اگر عبادت میں مشغول ہے تو سوال نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ ایسے میں کام کر کے روزی حاصل کرنا فرض ہے۔ لیکن اگر کوئی اپنے گھر میں ایسی کتاب رکھتا ہے کہ جس کا وہ محتاج نہیں یا اضافی سجادہ کا مالک ہے یا اضافی گدڑی یا ایسی ہی کوئی اور شے رکھتا ہے تو اس کے لئے سوال حرام ہے۔ تو اسے چاہئے کہ پہلے اسے بیچ کر گذارہ کرے۔ لیکن اگر کوئی سوال اس لئے کرے کہ اس کے ذریعے اپنے اور اپنی اولاد کے لئے تجمل کا سامان کرے تو یہ حرام ہوگا۔ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ ''جو کوئی کسی چیز کا مالک ہونے پر بھی سوال کرے گا وہ روزِ قیامت یوں آئے گا کہ اس کے چہرے پر سے گوشت اتر چکا ہوگا اور ہڈیاں دکھائی دیں گی''۔ نیز فرمایا کہ ''جو کوئی ہوتے ساتے پر بھی مانگے تو یہ گویا دوزخ کی آگ ہے جو لیتا ہے خواہ تھوڑا لے یا زیادہ''۔

لوگوں نے آنحضرت (ﷺ) سے پوچھا کہ ''کتنا موجود ہونے پر سوال نہ کرنا چاہئے؟'' تو ایک حدیث میں ہے کہ ''شام اور چاشت'' اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ پچاس درم' اور یہ جو پچاس درم کہا گیا ہے تو اس کا مطلب پچاس درم چاندی ہوگا یا کوئی چیز جس کی قیمت اس قدر ہو۔ جو شخص تنہا ہو تو یہ اس کے لئے پورے سال کے لئے کافی ہوگا۔ جب اس قدر بھی نہ رکھتا ہو اور اس شہر کا رواج یہ ہو کہ زکات وصدقات دینے کا ایک ہی وقت ہو تو اگر اس وقت میں سوال نہ کرے گا تو سارا سال محروم رہے گا تو اس کے لئے اس قدر سوال کرنا روا ہے۔ اور یہ جو ''شام اور چاشت'' کہا گیا ہے وہ اس کے لئے ہے جو ہر روز سوال کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے ایک دن ایسا ہی ہے جیسے دوسرے کے لئے سال ہے۔ تو یہ تفاوت مدت کی مناسبت سے ہے۔

لیکن فقیر کی ضرورت دراصل تین ہی چیزیں ہیں یعنی روٹی' کپڑا اور مکان۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ ''فرزندِ آدم کو دنیا میں سوائے تین چیزوں کے اور کوئی حق نہیں : کھانا کہ جس سے اس کی کمر سیدھی رہے' کپڑا جو اس کا ستر پوش ہو اور مسکن کہ جہاں وہ رہ سکے''۔ اور جو کچھ اس کے گھر میں استعمال کے لئے لازم ہو وہ بھی اس معنی میں ہے۔ اگر اس کے پاس نمدہ ہے یا بوریا تو اسے رنگین فرش کے لئے سوال نہ کرنا چاہئے۔ اگر مٹی کا برتن موجود ہو تو آفتابے کے لئے سوال نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس کی تو کوئی حد نہیں۔ اس لئے چاہئے کہ سوائے اہم چیز کے کسی اور شے کی خواہش نہ کرے۔

فصل: فقیروں کے درجات

یاد رہے کہ فقیروں کے درجے متفاوت ہیں۔ بشر حافیؒ فرماتے ہیں کہ ان کے تین درجے ہیں:

ایک وہ جو نہیں چاہتا اور اگر دیں تو نہیں لیتا تو ایسے لوگ صوفیاء کے ساتھ علیین میں ہوں گے۔

دوسرا وہ جو مانگتا نہیں لیکن اگر دے دیں تو لے لیتا ہے تو ایسے لوگ فردوس میں مقربوں کے ہمراہ ہوں گے۔

تیسرا وہ جو چاہتا ہے لیکن بہ ضرورت تو یہ اصحاب الیمین میں سے ہوگا۔

ابرہیم بن ادھمؒ نے شقیق بلخیؒ سے پوچھا کہ ''تم نے فقراء کو اپنے شہر میں کس حال میں چھوڑا؟'' تو انھوں نے فرمایا کہ ''بہترین حال میں'' اگر مل جائے تو شکر کرتے ہیں' نہ ملے تو صبر کرتے ہیں''۔ تو ابراہیمؒ نے فرمایا کہ ''میں نے بلخ میں کتوں کو اس حال میں چھوڑا ہے'' تو شقیق نے کہا ''تو پھر تمھارے فقراء کیسے ہوں گے؟'' تو

ابراہیم نے کہا کہ: ''اگر نہ ملے تو شکر کرتے ہیں اور اگر ملے تو ایثار کر دیتے ہیں'' تو انھوں نے ابراہیم کے سر پر بوسہ دیا اور فرمایا کہ ''حقیقت یہی ہے''۔ ایک شخص نے ابوالحسین نوری کو دیکھا کہ ہاتھ پھیلائے ہوئے مانگ رہا ہے تو وہ حیران ہوا۔ تو اس نے یہ بات حضرت جنیدؒ سے بیان کی تو انھوں نے کہا کہ: ''یہ نہ سمجھنا کہ اس نے ہاتھ اس لئے پھیلایا ہے کہ وہ خلق سے کوئی چیز اپنے لئے چاہتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ حقیقت میں ان کے لئے ثواب اور نیکی کا باعث ہو اس لئے اس سے ابوالحسن کو کوئی ضرر نہیں ہونے کا''۔ پھر جنیدؒ نے کہا کہ ''جاؤ اور ترازو لاؤ''۔ میں گیا اور ترازو لے آیا تو انھوں نے سو درم ۱۰۰ تولے اور پھر اس پر مٹھی بھر چاندی اور ڈال دی اور کہا یہ نوریؒ کے پاس لے جاؤ اور انھیں دو''۔ تو اس نے کہا کہ مجھے حیرت ہوئی کہ وزن اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس چیز کی مقدار معلوم ہو سکے۔ تو انھوں نے ایک چیز اس پر مستزاد کیوں ڈال دی۔ کہا کہ میں نوریؒ کے پاس لے گیا تو انھوں نے بھی ترازو طلب کر کے سو ۱۰۰ درم تولے اور کہا کہ ''یہ اس کو دے دو''۔ اور باقی لے لئے اور فرمایا کہ ''جنید مردِ حکیم ہے جو رسّی کے دونوں سروں پر نظر رکھتا ہے''۔ تو اس نے کہا کہ میں اس سے اور بھی حیران ہوا اور جنید کے پاس لے گیا اور جو کچھ دیکھا سنا تھا بیان کیا۔ تو جنید نے فرمایا کہ ''اَللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ'' جو کچھ اس کا تھا وہ اس نے لے لیا اور جو ہمارا تھا لوٹا دیا''۔ تو میں نے پوچھا کہ قصہ کیا ہے تو فرمایا کہ ''وہ سو درم ثواب آخرت کے لئے تھے اور جو کچھ زائد تھے وہ حق تعالیٰ کے لئے تھے۔ اور اس نے جو لِلّٰہ تھے قبول کر لئے جو کچھ خود ان کے لئے دیئے تھے وہ لوٹا دیئے''۔ اُس زمانے کے درویش اس طرح کے تھے۔ اور دل ان کے ایسے صاف شفاف تھے کہ زبان کے ترجمان کے بغیر ہی ایک دوسرے کے مطلب کو پا لیتے تھے۔ اگر کوئی اس خوبی کا مالک نہ ہو تو وہ اس سے کمتر نہیں ہوتا کہ وہ اس کا آرزومند ہو۔ اگر آرزومند نہ بھی ہو وہ اس کی صداقت پر ایمان ضرور رکھتا ہے

زُہد کی حقیقت اور اس کی فضیلت

جان لے کہ گرمیوں میں جس کے پاس برف ہے وہ اس پر حریص ہوتا ہے تاکہ جب پیاس لگے تو اس سے پانی کو ٹھنڈا کرے۔ کوئی شخص آ کر اسے سونے کے برابر خرید لیتا ہے تو حرص زر کی بناء پر اس کی حرص تیز جاتی رہتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ایک دن گرم پانی ہی پی لوں اور صبر کروں اور یہ سونا تمام عمر میرے پاس رہے گا۔ تو اسے برف کو محفوظ رکھنے کی بجائے لے لینا اولیٰ تر ہے۔ کیونکہ برف رہنے والی شے نہیں رات میں پگھل جاتی ہے۔ اس کا برف کو ایسی چیز کے مقابلے میں نہ چاہنا جو اس سے بہتر ہے اس کو برف میں زُہد کہا جائے گا۔ عارف کا حال دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دنیا گذشتنی ہے اور متواتر گذرتی جاتی ہے اور گذرتی جاتی ہے حتیٰ کہ وقتِ مرگ تمام ہو جاتی ہے۔ جب وہ آخرت کو صافی اور باقی دیکھتا ہے کہ ہرگز ختم ہونے والی

نہیں اور وہ دنیا سے دستکش ہوئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی تو دنیا اس کی نظروں میں حقیر ہو جاتی ہے۔ اس لئے آخرت کے بدلے میں اسے ہاتھ سے دے دیتا ہے۔ جو اس سے بہتر ہے۔ تو اس کی اس حالت کو زُہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ یہ زہد دنیا کی مباحات میں ہو۔ اور ممنوعات کا ترک تو خود فریضہ ہے۔ نیز یہ تارک خود دنیا پر قادر ہو۔ اگر وہ دنیا پر قادر نہ ہو تو اس کا زہد وجود پذیر نہیں ہوتا۔ الّا یہ کہ ایسا ہو کہ اگر اُسے دنیا دیں تو بھی قبول نہ کرے۔ لیکن جب تک آزمایا نہ جائے جانا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ جب قدرت حاصل ہو جاتی ہے تو نفسِ انسانی منقلب ہو جاتا ہے اور یہ فریب جو اس نے دیا ہو وہ بدل جاتا ہے۔

دوسری شرط:

یہ ہے کہ مال ہاتھ سے دے دے اور محفوظ نہ رکھے اور جاہ سے بھی دستکش ہو جائے۔ کیونکہ زاہد مطلق وہ ہوتا ہے جو دنیا کی تمام لذائذ سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ اور آخرت کی لذت سے بدل لیتا ہے۔ لیکن یہ ایک قسم کی تجارت ہوگی تاہم اس میں منفعت بہت ہے۔ جیسے کہ فرمان خداوندی ہے کہ: ''اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ'' (قرآن: ۱۱۱/۹) (اللہ نے مومنوں کے بدن اور جان و مال خرید لئے ہیں تاکہ بہشت ان کے لئے ہو جائے)۔ نیز فرمایا کہ: ''فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ'' (قرآن: ۱۱۱/۹) (خوش خبری ہو اس خرید و فروش پر جو تم نے کی کہ یہ بہت بڑی کامیابی ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے بہشت کے بدلے مومنوں کا جان و مال خرید لیا اور فرمایا کہ مبارک ہو یہ بیع اور مسرور ہو اس بیع پر کہ تم نے اس سے بہت نفع پایا۔ یاد رہے کہ جو کوئی ترکِ دنیا اظہار سخاوت یا ایسے ہی کسی دوسرے سبب سے جو سوائے طلبِ آخرت کے ہو کرے گا وہ زاہد نہیں سمجھا جائے گا۔ یاد رہے کہ دنیا کو آخرت کے عوض فروخت کرنا اہل معرفت کے نزدیک ادنیٰ درجے کا زہد ہے۔ عارف وہ ہے کہ آخرت بھی اس کی نگاہوں سے ایسے ہی دور ہو جیسے کہ دنیا۔ کیونکہ بہشت بھی آنکھ، پیٹ اور شرم گاہ کی سہولت کا نصیب ہے۔ بلکہ ان سب کو عارف حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور خود کو ان سے بالاتر دیکھتا ہے کیونکہ یہ تو حیوانوں کا درجہ ہے۔ اور شہوات میں سے جن میں حیوان بھی شریک ہیں عارف ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ دنیا و آخرت میں سے سوائے حق تعالیٰ کے اور کچھ نہیں چاہتا۔ اور سوائے اللہ تعالیٰ کی معرفت اور مشاہدے کے قانع نہیں ہوتا۔ کیونکہ جو کچھ ماسوا اللہ ہے اس کی نگاہوں میں حقیر ہوتا ہے اور یہ عارفوں کا زُہد ہے۔ اور ایسے عارف کے لئے جائز ہوگا کہ مال سے گریزاں نہ ہو اور حذر نہ کرے بلکہ لے لے اور اپنے موقع پر رکھ لے اور مستحقوں میں تقسیم کر دے۔ جیسے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہ روئے زمین کے اموال ان کے دستِ قدرت میں تھے

لیکن آپ کا دل ان سب سے فارغ تھا۔ بلکہ جس طرح حضرتِ عائشہ نے ایک لاکھ درم ایک ہی دن میں مستحقوں میں تقسیم کر دیئے اور روزہ افطار کرنے کے لئے بھی ایک درم باقی نہ رکھا۔ پس عارف کے ہاتھ میں اگر ایک لاکھ درم بھی ہوں تو وہ زاہد ہی ہوگا۔ اور اس کے مقابلے میں کوئی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے پاس فقط ایک درم ہو لیکن زاہد نہ ہو۔ بلکہ کمال اس میں یہ ہے کہ دل دنیا سے اچاٹ ہوا ایسا کہ نہ اس کی طلب میں مصروف ہو اور نہ اس کے ترک میں، مال دنیا سے نہ جنگ ہو نہ صلح، دنیا کو دوست رکھے نہ دشمن کیونکہ جو کوئی کسی شے کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے تو وہ اس کے ساتھ مشغول ہوتا ہے ایسے ہی وہ جو اسے دوست رکھتا ہے۔ اور کمال اس میں ہے کہ تُو بجز خدائے تعالیٰ کے ہر شے سے فارغ ہو۔ اور چاہئے کہ دنیا کا مال تیرے نزدیک سمندر کے پانی کی طرح ہو اور ہاتھ تیرا اللہ تعالیٰ کے خزانے کی مانند ہو۔ اور دنیا خواہ زیادہ ہو خواہ کم اور خواہ آئے اور خواہ جاتی رہے تُو اس سے فارغ ہو۔ کمال یہی ہے لیکن یہ احمقوں کے غرور کا محل ہے کہ جو کوئی ترکِ مال دنیا نہیں کرسکتا وہ زبانی طور پر خود کو فریب دیتا ہے۔ کہ میں مال سے فارغ ہوں لیکن جب وہ اُس مستحق میں جو اس کا مال لے یا سمندر کا پانی لے یا کسی اور کا مال لے امتیاز کرتا ہے۔ تو ظاہر ہے وہ فریب میں مبتلا ہے۔ اور مال کی حاجت اس کے باطن میں موجود ہے۔ پس اصل یہ ہے کہ انسان جہاں تک ممکن ہو ہاتھ دنیا کے مال سے دور رکھے اور اس سے گریز کرے تاکہ اس کے سحر سے نجات پا جائے۔ ایک شخص نے عبداللہ بن مبارکؒ کو ''اے زاہد'' کہہ کر خطاب کیا تو عبداللہ نے فرمایا کہ ''زاہد تو عمر بن عبدالعزیز ہے کہ جس کے قبضہ قدرت میں دنیا جہان کا مال ہے اور وہ اس قدرت کے باوجود اس سے دامن کش ہے۔ اور میں کہ جس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں مجھ پر زاہد کے کلمے کا اطلاق کیسے درست ہوگا؟'' ابن ابی لیلیٰؒ نے ابن سیرینؒ سے کہا[1] کہ ''دیکھتے ہو کہ یہ ابوحنیفہ یہ جولاہے کا بچہ، ہم جو فتویٰ دیتے ہیں اس کو ردّ کر دیتا ہے'' تو ابن سیرین نے فرمایا کہ ''میں نہیں جانتا کہ یہ جولاہے کا بچہ ہے یا کیا ہے۔ لیکن یہ جانتا ہوں کہ دنیا نے اس کی طرف رخ کر لیا ہے لیکن وہ اس سے گریزاں ہے جب کہ دنیا نے ہم سے منہ پھیر لیا ہے اور ہم اس کو اپنی طرف بلا رہے ہیں''۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ ''مجھے ہرگز معلوم نہ تھا کہ ہمارے درمیان کوئی ایسا ہے جو دنیا کو دوست رکھتا ہے یہاں تک یہ آیت نازل ہوئی کہ: ''مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ'' (قرآن: ۱۵۲/۳) (تم میں کوئی ایسا ہے جو اس دنیا کو چاہتا ہے اور کوئی ایسا ہے جو اُس جہان کا طالب ہے) اور ایک یہ دوسری آیت کہ: ''وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ'' (قرآن: ۶۶/۴) (اور اگر ہم ان پر یہ فرض

(۱) احیاء میں ہے کہ ابن لیلیٰ نے ابنِ شبرمہ سے کہا

لکھ دیتے کہ خود کو قتل کر دو یا اپنے خان ومان سے نکل جاؤ تو اس پر سوائے کم تعداد کے عمل پیرانہ ہوتے)۔تو مسلمانوں نے کہا کہ اگر ہم جانتے کہ اللہ کی محبت کس شے میں ہے تو ہم سب وہی کرتے اور یہ آیت اس وقت اتری۔یاد رہے کہ برف سونے کے عوض بیچنے کے لئے زیادہ سرمائے کی ضرورت نہیں' کیونکہ یہ بات سب عاقل جانتے ہیں کہ دنیا کی نسبت آخرت سے برف کی نسبت سونے سے بھی کم تر ہے۔لیکن لوگ اس سے تین وجوہ سے بے خبر ہیں: ایک ضعفِ ایمان' دوسرے موجودہ حالت غلبۂ شہوت اور تیسرے سستی اور آج کل پر ٹالنے کے باعث اور اپنے آپ سے یہ کہنا کہ میں کرلوں گا۔اور سب سے بڑا سبب شہوات کا غلبہ ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں کر پاتا اور نقد کو ملحوظ رکھتا ہے اور نسیہ (آخرت) کو فراموش کر دیتا ہے۔

فضیلت زُہد

یاد رہے کہ ہر وہ چیز جو ہم نے دنیا دوستی کی برائی میں مذکور کی ہے وہ اس کی دلیل ہے۔لیکن دنیا کی دوستی مہلکات میں سے ہے اور دنیا کی دشمنی منجیات میں سے ہے۔یہاں ہم وہ احادیث جو دنیا سے دشمنی میں وارد ہوئی ہیں ان کا بیان کریں گے۔اور زہد کی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ اسے اہل علم سے نسبت دی گئی ہے۔اور قرآن میں ہے کہ جب قارون شان وشوکت کے ساتھ نمودار ہوا تو ہر کوئی چاہتا تھا کہ کاشکے یہ آن بان مجھے حاصل ہوتی۔"قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللهِ خَیْرٌ" (قرآن:۸۰/۲۸) (تو وہ لوگ جو اہل علم تھے کہنے لگے کہ ان سب سے آخرت کا ثواب بڑھ کر ہے)۔اور یہ اس لئے کہا گیا ہے کہ جو کوئی چالیس دن دنیا سے دامن کش رہے تو حکمت کے چشمے اس کے دل میں جاری ہو جاتے ہیں۔اور آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ "اگر تُو چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے دوست رکھے تو دنیا میں زُہد اختیار کر"۔اور جب حارثہ ؓ نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ "میں سچا مومن ہوں" تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ "علامت اس کی کیا ہے؟" تو حارثہ نے کہا کہ "میرا نفس دنیا سے اس قدر نفور ہے کہ سونا اور پتھر میرے نزدیک برابر ہیں گویا میں بہشت و دوزخ کو دیکھ رہا ہوں"۔تو آنحضرت (ﷺ) نے اس سے کہا کہ "اب اس کی حفاظت کرو کہ جو کچھ چاہئے تھا تم نے پالیا ہے" پھر آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ "یہ وہ بندہ ہے جس کا دل اللہ تعالیٰ نے روشن کر دیا ہے"۔عَبدٌ نَوَّرَ اللهُ قَلْبَهٗ اور جب یہ آیت نازل ہوئی کہ: "فَمَنْ یُّرِدِ اللهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ" (قرآن:۱۲۵/۶) (جسے اللہ تعالیٰ راہ دکھانا چاہیں تو اس کا دل تصدیق وتسلیم کے لئے کھول دیتے ہیں) تو صحابہ نے پوچھا کہ یہ 'شرح صدر' کیا ہے"۔آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ "اس کا دل اس سرائے غرور (دنیا) سے نفور ہو جاتا ہے اور انسان ہمیشہ رہنے والے گھر کا رخ کرتا اور مرنے کے بعد والے ابدی زمانے کے لئے مرنے سے پہلے ساز و

سامان تیار کرتا ہے‘‘۔ نیز فرمایا کہ ’’اللہ تعالیٰ سے حیا کرو جیسا کہ اس سے حیا کرنے کا حق ہے‘‘۔ تو لوگوں نے کہا کہ ’’کیا ہم اللہ کی شرم نہیں رکھتے‘‘؟ تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ: ’’پھر وہ مال کیوں جمع کرتے ہو جس کے کھانے کی نوبت ہی نہ آئے گی اور کیوں اس جگہ مسکن تعمیر کرتے ہو جہاں تمھیں رہنا ہی نہیں؟‘‘ ایک دن آنحضرت (ﷺ) خطبہ دے رہے تھے۔ تو فرمایا کہ ’’جو کلمۂ لا الـہ الا اللہ سلامی کے ساتھ لایا اور اس میں اور کوئی شے نہ ملائی بہشت اس کے لئے ہے‘‘۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ ’اے اللہ کے رسول تفسیر کیجئے کہ وہ کیا شے ہے کہ جسے اس کلمے میں نہیں ملانا چاہئے‘‘۔ تو آنحضرت نے فرمایا کہ: ’’دنیا کی دوستی اور اس کی طلب۔ کیونکہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جن کی بات پیغمبروں کی بات کی سی ہوتی ہے لیکن کردار ان کا جبّاروں کا سا ہوتا ہے۔ اور جس نے لَا اِلٰـــهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اور پھر نفاق اس میں نہ ہو اس کی جگہ بہشت میں ہے‘‘۔ نیز فرمایا کہ ’’جو دنیا میں زاہد ہو گیا تو اللہ تعالیٰ حکمت کا دروازہ اس کے دل میں کھول دیتا ہے اور اس کی زبان اس کلمے کا وِرد کرنے لگتی ہے۔ اور دنیا کی بیماری کا دارُو اس پر آشکار کر دیتی ہے اور اسے دنیا سے سلامتی کے ساتھ دار السلام میں لے جاتی ہے۔ آنحضرت (ﷺ) صحابہ کے ساتھ صحرا میں اونٹوں کے ایک گلے کے پاس سے گذرے سب اونٹ فربہ خوب صورت اور حاملہ تھے۔ اور عربوں کا عزیز ترین مال اونٹ ہی ہوتا ہے کہ وہ اس کا دودھ پیتے ہیں۔ اس کا گوشت کھاتے ہیں اس کے ذریعے بار برداری کرتے ہیں اس کے بالوں سے استفادہ کرتے ہیں اور ان کا مال بھی یہی ہیں۔ آنحضرت (ﷺ) نے منہ پھیر لیا اور ان اونٹوں کی طرف نہ دیکھا تو صحابہ نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ کہ یہ اہل عرب کا عزیز ترین سرمایہ ہے اس کو آپ کیوں نہیں دیکھتے؟‘‘ تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کو دیکھنے سے منع فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: ’’وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَامَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ‘‘(قرآن: ۲۰/۱۳۱) (اور اپنی دو آنکھوں کو ان چیزوں کے دیکھنے میں ہلاک نہ کر جن سے ہم نے چند مردوں اور چند عورتوں کو بہرہ ور کیا ہے اس دنیا کے فانی شگوفوں سے)۔ اور حضرت عیسٰی علیہ السلام سے لوگوں نے کہا ’’اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے لئے ایک گھر بنا دیں کہ جس میں آپ عبادت کریں‘‘۔ تو آپ (ﷺ) نے فرمایا ’’جاؤ اور پانی پر ایک گھر تعمیر کر دو‘‘ تو وہ بولے کہ ’’پانی پر گھر کیسے تعمیر ہو سکتا ہے؟‘‘ تو حضرت عیسٰی نے فرمایا کہ: ’’دوستیٔ دنیا کے ساتھ اللہ کی عبادت کیسے ممکن ہے؟‘‘ ہمارے رسول (ﷺ) نے فرمایا کہ ’’اگر تو چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے دوست رکھے تو دنیا سے ہاتھ کھینچ لے اور اگر چاہتا ہے کہ لوگ تجھے دوست رکھیں تو جس چیز کو لوگ محبوب رکھتے ہیں تو اس سے ہاتھ روک لے‘‘۔ حضرت حفصہؓ نے اپنے باپ (عمر رضی اللہ عنہ) سے کہا کہ ’’ابا جان جب مال غنیمت شہروں

سے آ رہا ہے تو آپ بھی موجودہ لباس پہنیں اور کھانا موجودہ کھانے سے اچھا کھائیں تا کہ جو کوئی آپ کے ساتھ ہو وہ بھی کھائے''۔ تو امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ''اے حفصہ اپنے شوہر کا حال اس کی بیوی سے زیادہ کوئی اور نہیں جانتا۔ تو رسول (ﷺ) کا حال سب سے بہتر جانتی ہے۔ اللہ کی قسم کہ بتا آنحضرت (ﷺ) کو کتنے سال رسالت اور نبوت میں گذر گئے کہ وہ اور ان کی بیویوں نے اگر صبح سیر ہو کر کھایا تو شام کو بھوکے تھے اور اگر رات کو سیر ہو کر کھایا تو صبح کے وقت کھانے کو کچھ نہ تھا۔ اور کتنے سال آپ (ﷺ) پر ایسے گذرے کہ خُرما سیر ہو کر کھانے کو نہ ملے۔ یہاں تک کہ فتحِ خیبر واقع ہوئی۔ تُو جانتی ہے کہ ایک دن آپ کے لئے کھانا دسترخوان پر چنا گیا تو آپ (ﷺ) کا چہرہ کراہیت سے متغیر ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ آپ کے فرمانے پر کھانا سُفرہ (زمین) پر چنا گیا۔ اور تُو جانتی ہے کہ آپ (ﷺ) دوہری کملی پر سوتے تھے تو ایک دفعہ یہ کملی چوتہی کر دی گئی تا کہ نرم ہو تو آپ نے فرمایا تھا کہ کل رات کملی چار تہہ ہونے پر نرم تر تھی جس نے مجھے نمازِ عشا سے باز رکھا تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''جس طرح پہلے تھی اسی طرح دوتہی سے زیادہ نرم نہ کرنا''۔ تُو جانتی ہے کہ تُو آنحضرت (ﷺ) کا لباس دھوتی تھی اور بلال رضی اللہ عنہ اذان دے دیتے تھے تو آپ جب تک لباس خشک نہ ہو جاتا باہر نہ نکل سکتے تھے کیونکہ دوسرا لباس آپ کے پاس تھا ہی نہیں۔ اے حفصہ تو جانتی ہے کہ بنی ظفر[1] میں سے ایک عورت نے ازار اور ردا آنحضرت (ﷺ) کے پاس بھیجی۔ تو آپ (ﷺ) اس حالت میں برآمد ہوئے کہ وہ پشت پر ڈالی ہوئی تھی اور آگے گرہ لگائی ہوئی تھی اور سوائے اس کے اور کپڑا نہ تھا''۔ تو حفصہ نے کہا کہ ''سب ایسے ہی تھا میں جانتی ہوں''۔ اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ اور حفصہ رضی اللہ عنہا اتنا روئے کہ ہوش سے جاتے رہے۔ جو ہوش آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ گویا ہوئے کہ: ''میرے دو یار مجھ سے پہلے ہو چکے یعنی آنحضرت (ﷺ) اور ابوبکر اور وہ اس راستے پر چلے کہ اگر میں بھی اس راہ پر چلوں ان تک پہنچ جاؤں گا ورنہ مجھے دوسرے راہ سے لے جائیں گے۔ میں بھی ان کی طرح سختی کی زندگانی پر چلوں اور صبر کروں تا کہ اس قسم کی زندگانی کے ذریعے ان کے ساتھ جاودانی زندگی پاؤں''۔ صحابہ میں سے بعض نے تابعین کے پہلے طبقے سے کہا کہ تمھاری عبادت صحابہ کی عبادت سے زیادہ ہے لیکن وہ تم سے بہتر ہیں کیونکہ وہ تم سے دنیا میں بڑھ کر زاہد تھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''دنیا میں زہد دل کی راحت بھی ہے اور بدن کی راحت بھی''۔ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''زاہد کی دو رکعت نماز مجتہدوں کی عمر بھر کی عبادت سے فاضل تر ہے''۔ سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ ''تُو عمل اسی وقت بہ اخلاص کر سکتا ہے کہ چار چیزوں سے نہ ڈرے: بھوک، بے لباسی، فقر اور خواری سے۔

---

(۱) ایک نسخے میں بنی نضیر لکھا ہوا ہے

درجاتِ زُہد کا بیان

یاد رہے کہ زاہدوں کے تین درجے ہیں: ایک یہ ہے کہ زاہد دنیا سے ہاتھ کھینچ لے لیکن دل دنیا کی طرف دیکھتا ہو لیکن زاہد مجاہدہ اور صبر کرتا ہے۔ ایسے کو متزہد کہتے ہیں نہ کہ زاہد۔ لیکن ابتدائے زہد میں یہی ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ دنیا کی طرف نہیں دیکھتا ہے لیکن اپنے زہد کو دیکھتا ہے اور زہد کو کاری دیکھتا ہے۔ یہ زاہد ہے۔ لیکن نقص سے خالی نہیں۔

تیسرے وہ ہے جو زہد میں بھی زاہد ہوتا ہے۔ یعنی اپنے زُہد کو نہیں دیکھتا اور اسے کاری نہیں جانتا۔ اس کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو بادشاہ کی بارگاہ میں وزیر بننے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن ایک کتا بادشاہ کے محل پر اس کا مانع ہو تو وہ اسے ایک لقمہ ڈال دے تا کہ خود سے اسے دور رکھے اور پھر بادشاہ کے محل میں داخل ہو کر اس کا وزیر بن جائے۔ ممکن نہیں اس لقمہ نان کی کوئی قدر اس کی نگاہ میں ہو۔ پوری دنیا لقمہ نان ہے۔ اور شیطان اٹھارہ ہزار عالموں کے بادشاہ کی درگاہ کا کتا ہے۔ جو بھونکتا ہے تو تو نے جب وہ لقمہ اس کے آگے ڈال دیا تو وہ کتا تجھ سے دور رہ گیا۔ اور پوری دنیا آخرت کے مقابلے میں اس لقمہ نان سے فروتر ہے جو وزارت میں بکار تھا کیونکہ آخرت تو ابدی ہے۔ اور ختم ہو جانے والی شے کو ابدی اور لا انتہا شے سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں نے بویزید سے کہا کہ ''فلاں زہد کے باب میں بات کرتا ہے''۔ تو بویزید نے کہا کہ ''زہد کس شے میں؟'' لوگوں نے کہا کہ ''دنیا میں'' تو آپ نے فرمایا کہ ''دنیا ایسی چیز نہیں ہے کہ جس میں کوئی زہد کر سکے اوّل کوئی چیز ہونی چاہئے کہ جس میں کوئی زاہد ہو سکے''۔ لیکن زہد جس چیز کے حق میں ہو اس کے تین درجے ہیں: ایک یہ کہ زاہد ہو جائے تا کہ عذابِ آخرت سے چھوٹ جائے اور بس۔ اور اگر اسے عدم میں لے جائیں تو روا رکھے۔ اور یہ زہد خائفوں کا ہے۔ ایک دن مالک دینارؒ نے کہا کہ ''کل رات میں نے اللہ کے سامنے بڑی دلیری کی کہ اللہ سے بہشت مانگی''۔ دوسرا یہ کہ زہد ثواب آخرت کے لئے ہو تو یہ تمام تر ہوگا کیونکہ یہ بر بنائے رجاء محبت ہوگا۔ اور یہ زہد رجائیوں کا ہے۔ تیسرا درجہ کمال کا ہے کہ زاہد کے دل میں نہ دوزخ کا خوف ہوتا ہے نہ بہشت کی امید بلکہ حق تعالیٰ کی محبت نے اس کے دل سے دنیا کی دوستی اور آخرت کو اُچک لیا ہو۔ اور جو کچھ ماسوا اللہ ہے اس سے ننگ رکھتا ہو کہ اس کی طرف ملتفت ہو۔ چنانچہ جب رابعہؒ سے بہشت کی بات کی جاتی تو آپ فرماتیں کہ ''الجار ثم الدار'' ''یعنی گھر کا مالک گھر سے اچھا ہے'' اور وہ خوش بخت جسے اللہ تعالیٰ کی محبت کی نعمت مل جائے اس کے لئے بہشت کی لذائذ ایسی ہیں جیسے بچوں کے لئے بادشاہی کے مقابلے میں چڑیوں سے کھیلنے میں ہوتی

ہے اور ممکن ہے کہ بچے کی نظروں میں یہ کھیل بادشاہی سے بڑھ کر ہو۔ اس لئے کہ وہ بادشاہی کے مزے سے بے خبر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ابھی ناقص ہوتا ہے۔ اسی طرح جس کی مراد ابھی تک دیدارِ الٰہی کے سوا کوئی اور ہو تو وہ ابھی ناقص ہے اور ذہنی طور پر بالغ نہیں ہوا۔ اور اس درجے کو نہیں پہنچا۔

زُہد کے درجات اس چیز کے حق میں جسے وہ ترک کرتے ہیں نیز مختلف ہیں۔ کیونکہ کوئی شخص ایسا ہوتا ہے کہ دنیا کی بعض چیزوں کا ترک کرتا ہے۔ جب کہ کامل تارک وہ ہے کہ ہر وہ شے جس سے اس کا نفس محظوظ ہو حالانکہ اس کی ضرورت نہ ہو نہ ہی راہِ آخرت میں اس کی حاجت ہو ان سب کو ترک کر دے۔ کیونکہ دنیا حظوظِ نفس ہی سے عبارت ہے۔ یعنی مال وجاہ' کھانے پینے' سخن زنی' سونے' لوگوں سے ہم نشینی' درس و مجلس و روایتِ حدیث یعنی جو کچھ بھی لذتِ نفس کے لئے ہو سب دنیا ہی میں شمار ہوتی ہے۔ الّا یہ کہ تحصیل علم کا مقصد خود اللہ ہو۔ ابوسلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے زہد کے بارے میں باتیں تو بہت سنی ہیں لیکن ہمارے نزدیک زہد یہ ہے کہ جو چیز بھی تجھے اللہ تعالیٰ سے ہٹا کر خود میں مشغول کرتی ہے اس کو ترک کر دے"۔ نیز فرمایا کہ: "جو بھی نکاح یا سفر یا حدیث نگاری میں لگ گیا اس نے گویا رُخ دنیا ہی کی طرف کر لیا"۔ لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ اس آیہ قرآنی کے معنی کیا ہیں کہ: "اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ؟" تو آپ نے فرمایا کہ "سلیم وہ دل ہوتا ہے کہ جس میں بجز اللہ تعالیٰ کے اور کچھ نہیں ہوتا"۔ یحیٰی بن زکریا ٹاٹ کا لباس پہنتے تھے تاکہ لباس کی نرمی ان کے جسم کو راحت نہ پہنچائے۔ کیونکہ یہ من جملہ خطوطِ نفس ہے۔ ان کی ماں نے ان سے چاہا کہ وہ اونی لباس زیب تن کر لیں کیونکہ ٹاٹ پوشی کی وجہ سے ان کے جسم پر زخم ہو گئے تھے۔ تو حضرت یحیٰی پر وحی ائی کہ "اے یحیٰی تو نے مجھے چھوڑ کر دنیا اختیار کر لی" تو آپ پر گریہ طاری ہو گیا۔ اور آپ نے پھر سے ٹاٹ پہن لیا۔ یاد رہے کہ یہ زہد کی انتہا ہے کہ کوئی اس کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے ہر ایک کا درجہ اسی قدر ہے جس قدر اس نے ترکِ دنیا کیا ہے۔ اور جس طرح بعض گناہوں سے توبہ درست ہے اسی طرح بعض چیزوں میں زہد بھی درست ہو گا۔ یعنی کہ بے ثواب اور بے فایدہ نہیں۔ لیکن وہ مقام جس کا وعدہ آخرت میں کیا گیا ہے وہ تائب اور زاہد سے اسی صورت میں ایفا ہو گا؟ اگر وہ ہر شے سے دست کش ہو جائے۔

ان چیزوں کی تفصیل کہ جن پر زاہد کو دنیا میں قناعت کرنی چاہیئے

معلوم رہے کہ مخلوق دنیا کے دوزخ میں گری ہوئی ہے اور دنیا کی وادیوں کی کوئی انتہا نہیں؟ لیکن دنیا میں اہم چیزیں صرف چھ ہیں: روٹی' کپڑا اور مکان؛ آلات اور بیوی اور مال وجاہ۔

پہلی اہم شے غذا ہے

یعنی جنس' مقدار اور سالن اور نظر

جنس: کمترین چیز ہے جو غذا فراہم کرتی ہے۔ اگرچہ سراسر چھان بُورا ہو اور میانہ اس کا جو اور گاورسین کی روٹی ہے اور اعلیٰ ترین گندم کا اَن چھنا آٹا ہے۔ اس کی روٹی' جب یہ آٹا چھان لیا گیا تو یہ زہد نہ رہا بلکہ تنعم ہو گیا۔

اور مقدار: دس[1] سیتر ہو گی۔ اور میانہ آدھا من[1] اور زیادہ ایک مُد اور شرع میں درویش کے لئے اندازہ یہی ہے اگر وہ اس میں اضافہ کرے تو گویا اس کا زہد معدے میں فوت ہو گیا۔

اور مستقبل کو ملحوظ رکھنے کے لئے بزرگ ترین درجہ یہ ہے کہ زاہد سوائے بھوک کو دور کرنے کے کسی چیز کو نگاہ میں نہ لائے زہد کی اصل خواہشوں کی کمی ہے۔ اور میانہ روی یہ ہے کہ ایک ماہ یا چالیس روز کے لئے کھانے پینے کی اشیاء جمع کر لے۔ اور پست ترین درجہ یہ ہے کہ سال بھر کے لئے جمع کر لے۔ لیکن سال بھر سے بھی زیادہ کا سامان کرے تو زہد سے کلیۃً محروم ہو جائے گا۔ کیونکہ جو کوئی زندگی کی امید ایک سال سے زیادہ کی رکھے اس سے زہد ممکن نہیں ہوتا۔ آنحضرت (ﷺ) اہل وعیال کے لئے ایک سال تک کا سامان کرتے تھے کیونکہ وہ صبر کی تاب نہ رکھتے تھے لیکن آپ (ﷺ) اپنے لئے رات کے لئے بھی کچھ باقی نہ رکھتے تھے۔

اور سالن: کمترین سرکہ اور پیازی ہے اور میانہ روغن اور جو اس سے تیار کیا جائے اور بہترین گوشت ہے۔ جسے اگر زاہد مسلسل کھائے تو زہد سے جاتا رہے اور اگر ہفتے میں ایک دو دفعہ سے زیادہ نہ کھائے تو زہد کے مدارج سے کلیۃً خارج نہیں ہوتا۔

اور کھانے کے وقت کے بارے میں: چاہئے کہ دن میں ایک بار سے زیادہ نہ کھائے۔ اور اگر دو دنوں میں صرف ایک دفعہ کھائے تو یہ کامل زاہد ہو گا۔ اور اگر ایک دن میں دو بار کھائے تو یہ زہد نہ کہلائے گا۔

جو کوئی زہد کی حقیقت جاننا چاہے اسے چاہئے کہ صحابہ اور احوال رسول سے آشنائی حاصل کرے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایسا وقت بھی تھا کہ اللہ کے رسول کے گھر میں چالیس راتوں میں چراغ نہ جلتا تھا۔ اور سوائے کھجور اور پانی کے کوئی اور شے کھانے کو نہ ہوتی تھی''؟ حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں کہ'' جسے فردوس کی تمنا ہے اس کے کھانے کے لئے جو کی روٹی اور گھورے پر کتوں کے ساتھ سونا کافی ہو گا'' نیز فرماتے کہ'' اے میرے حواریو جَو کی روٹی کھاؤ اور گندم کے گرد نہ منڈلاؤ ورنہ اللہ تعالیٰ کے شکر پر قیام نہ کر سکو گے۔

(۱) سیتر یعنی سیر۔ ایرانی من ساڑھے تین کیلو کا ہوتا ہے سیر کو اسی پر قیاس کر لیجئے

دوسری ضروری شے لباس ہے: زاہد کو چاہئے کہ اس کے پاس ایک سے زیادہ لباس نہ ہو جب اسے دھوئے تو ننگا ہو' جب لباس کے دو جوڑے ہوں گئے زاہد نہ رہا۔ لباس میں کمترین کرتہ' کلاہ اور جوتا ہے اور بیش ترین علاوہ برکمترین دستار اور ازار پا اور بس۔

اور لباس کی جنس: کمترین ٹاٹ ہے میانہ موٹی اون ہے اور اعلیٰ روئی کا موٹا کھدر ہے۔ لباس جب نرم اور باریک ہوا زہد جاتا رہا۔ جب آنحضرت (ﷺ) اس دنیا سے رخصت ہوئے تو حضرت عایشہؓ ایک کملی اور موٹا تہبند لائیں اور فرمایا کہ یہ تھا آپ (ﷺ) کا لباس اور بس۔

حدیث پاک میں ہے کہ ''کوئی شخص شہوت کا لباس نہیں پہنتا کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے منہ نہ پھیر لیا ہو اگرچہ وہ دوست ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں تک کہ وہ شخص شہوانی لباس کو جسم سے الگ نہ کر دے۔ آنحضرت کے لباس تہبند اور کملی دونوں کی قیمت پندرہ درم سے زیادہ نہ تھی۔ اور کبھی ایسا ہوتا کہ آپ کا یہ لباس اس قدر میلا ہوتا کہ گمان ہوتا کہ یہ کسی تیلی کا لباس ہے۔ ایک دفعہ آپ کے لئے ہدیہ میں منقش لباس موصول ہوا۔ آپ نے زیب تن کیا لیکن پھر اُتار دیا اور فرمایا کہ: ''اسے بوجہم کے پاس لے جاؤ اور اس کی کملی لے آؤ کیونکہ اس کے نقش و نگار نے میری آنکھ کو خود میں مشغول کر لیا تھا''۔ ایک دفعہ آپ (ﷺ) کے نعلین میں نیا تسمہ ڈال دیا گیا تو نماز کے دوران آپ کی نگاہ اس پر پڑی تو فرمایا کہ وہی پرانا تسمہ لاؤ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ یہ میری توجہ کا باعث بنے اور آپ نے منبر پر انگشتری انگلی سے الگ کر دی کیونکہ ایک بار اس پر نظر پڑ گئی تھی فرمایا کہ ''ایک نظر تم پر تو ایک نظر انگشتری پر'' ایک دفعہ آپ کے لئے اچھے نعلین لائے گئے۔ تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا سجدہ ادا کیا اور باہر نکلے اور پہلا فقیر جو نظر پڑا یہ نعلین اسے دے دیئے۔ فرمایا کہ یہ میری نظروں میں بھلے لگے تو میں ڈرا کہ اللہ تعالیٰ کہیں ان کے باعث مجھے دشمن نہ ٹھہرا لے تو سجدہ میں نے اس لئے کیا۔ حضرت عایشہؓ راوی ہیں کہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''اگر تو چاہتی ہے کہ مجھے پالے تو دنیا سے ایک مسافر کے بقدر زادِراہ پر قناعت کر اور کوئی لباس نہ اتارنا جب تک اس پر پیوند لگا کر پہن نہ لینا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کرتے پر پیوندوں کا شمار چودہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں تین درم کا لباس خرید اتو آستین اس کے ان کے بازو سے لمبے تھے تو آپ نے زاید کو کاٹ ڈالا اور فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہ اس کی فراہم کردہ خِلعت ہے''۔ ایک شخص کا بیان ہے کہ سفیان ثوریؒ کے جسم پر جملہ لباس کا مع ان کی نعلین کے قیمت کا اندازہ کیا تو وہ ایک درم اور چار دانگ سے زیادہ کے نہ تھے۔ حدیث میں ہے کہ جو کوئی جامۂ تجمل پر قادر ہو لیکن وہ انکساری اختیار کرے اور جامۂ تجمل سے دست کش رہے تو اس کو اس کے بدلے میں بہشت کا لطیف اور نفیس لباس عطا فرمائیں گے اور

تخت ہائے یاقوت پر جگہ دیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ائمہ ہُدیٰ کے ساتھ عہد باندھ رکھا ہے کہ چونکہ ان کا لباس مفلس ترین لوگوں کا سا ہوتا ہے اس لئے کہ دولت مندان کی پیروی کریں اور درویش شکستہ دل نہ ہو۔ فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ مصر کا گورنر تھا تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ ننگے پاؤں جا رہا ہے اور لباس بھی مختصر سا ہے تو لوگوں نے کہا کہ "آپ تو والیٔ شہر ہیں ایسے نہ کریں"۔ تو فضالہ نے فرمایا کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تنعم سے منع فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ کبھی کبھی پابرہنہ بھی چلا کرو۔ محمد بن واسعؒ قتیبہ بن مسلمؒ کے پاس گئے اور آپ نے اس وقت جامۂ صوف پہن رکھا تھا۔ تو اس نے پوچھا کہ تم نے صوف کیوں پہن رکھا ہے؟ تو محمد بن واسع خاموش رہے۔ تو قتیبہ نے کہا "جواب کیوں نہیں دیتے ہو؟" تو آپ نے کہا کہ "میں نہیں چاہتا کہ کہوں کہ زہد کی بناء پر کیونکہ اس طرح خودستائی کا مرتکب ٹھہروں گا۔ یا اگر کہوں کہ بربنائے فقر تو یہ اللہ تعالیٰ کے باب میں شکایت ہوگی۔" حضرت سلیمان علیہ السلام سے لوگوں نے کہا کہ "آپ اچھا لباس کیوں زیب تن نہیں فرماتے؟" تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ "غلام کو اچھے لباس سے کیا سروکار؟ کل (روزِ قیامت) جب آزاد ہو جاؤں گا تو اچھے لباس سے محروم نہ رہوں گا"۔ اور عمر بن عبدالعزیز کے پاس ٹاٹ کا لباس تھا جسے وہ رات کو زیب تن فرماتے اور نماز ادا کرتے اور دن کو نہ پہنتے تھے تاکہ لوگ نہ دیکھیں۔ حسن بصریؒ نے فرقد سنجی سے کہا کہ "کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ اس کملی کی بناء پر جو تم پہنے ہوئے ہو تم دوسروں پر برتری رکھتے ہو؟ میں نے تو سنا ہے کہ بیشتر دوزخی گلیم پوش ہی ہوں گے"۔

تیسری ضروری شے مکان ہے: اور اس کی ادنیٰ ترین صورت یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی خصوصی جگہ نہ ہو۔ کسی مسجد کا گوشہ ہو یا کسی سرائے کا اسی پر قناعت کرے۔ اور اس سے زیادہ یہ ہے کہ ایک حجرے کا مالک ہو یا کرایہ دار ہو جو حاجت کے بہ قدر ہو اور زیادہ بلند نہ ہو اور اس پر نقش و نگار نہ ہوں۔ اور مقدار حاجت سے زیادہ نہ ہو اور جب کسی نے چھت چھ گز سے اونچی کر لی اور گچ کیا تو وہ زہد سے گر گیا۔ مختصر یہ کہ مسکن سے مقصود یہ ہے کہ وہ گرمی، سردی، آندھی، بارش سے بچائے۔ اس سے زیادہ کسی اور شے کی طلب نہ ہونی چاہئے۔

کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلی چیز جو طول امل سے ظہور پذیر ہوئی گچ کے مکان کی تعمیر اور لباس میں کئی درزوں نے رواج پایا حالانکہ پہلے لباس میں ایک ہی درز ہوتی تھی۔ اور عباس رضی اللہ عنہ نے ایک اونچی کھڑکی لگائی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو بند کر دی گئی تھی۔ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بلند گنبد کے پاس سے گذرے تو پوچھا کہ یہ کس کا ہے تو لوگوں نے کہا کہ فلاں شخص کا ہے۔ اس کے بعد وہ شخص آپ کے پاس آتا تھا تو آپ اس کی طرف نہ دیکھتے تھے۔ حتیٰ کہ اس شخص نے اس کا سبب پوچھا تو لوگوں نے بتایا تو اس شخص نے جا کر

وہ گنبد مسمار کر دیا۔ اس پر آنحضرت ﷺ اس سے راضی ہو گئے اور اس کے لئے دعائے خیر کی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے پوری زندگی میں اینٹ پر اینٹ رکھی نہ لکڑی پر لکڑی رکھی۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کا برا چاہتے ہیں اس مٹی پانی میں برباد کر دیتے ہیں۔'' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ہمارے پاس سے گذرے تو ہم سے پوچھا کہ ''یہ کیا ہے جو تم کر رہے ہو؟'' ہم نے کہا کہ ''سرکنڈے کا ایک گھر تباہ ہو گیا تھا اسے ٹھیک کر رہے ہیں''۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''قریبی تر کام تو وہ ہے جو مہلت لے گیا یعنی موت'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے ضرورت سے زیادہ تعمیر کیا تو روزِ قیامت اسے کہا جائے گا کہ اٹھائے'' نیز فرمایا کہ اور سب کاموں میں خرچ کرنے کا ثواب ہے سوائے مٹی پانی والے کام کے''۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ایک گھر سرکنڈے کا تیار کیا۔ تو لوگوں نے کہا کہ ''اگر اینٹ لکڑی سے تعمیر کرتے تو کیا ہوتا''۔ تو حضرت نوح نے فرمایا کہ جسے مرنا ہے اس کے لئے یہی بہت ہے''۔ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''ہر تعمیر بندے کے لئے روزِ قیامت وبال ہو گی سوائے اس عمارت کے جو اسے سردی گرمی سے بچاتی ہو''۔ حضرت عمر نے شام کے راستے میں ایک محل دیکھا جو پکی اینٹوں سے بنا ہوا تھا تو فرمایا کہ ''میں ہرگز نہ جانتا تھا کہ اس امت میں بھی لوگ ایسی عمارتیں بنائیں گے جیسی ہامان نے فرعون کے لئے بنائی تھیں''۔ کیونکہ پکی اینٹیں اسی نے طلب کی تھیں۔ فرعون نے کہا تھا کہ ''اوقد لی یا هامان علی الطین'' (میرے لئے پختہ اینٹ کے لئے آگ روشن کرا اے ہامان''۔ آثار میں ہے کہ جب کوئی چھ گز سے بلند تر عمارت بناتا ہے تو ایک فرشتہ آسمان پر منادی کرتا ہے کہ ''اے فاسقوں کے فاسق کہاں آ رہے ہو؟'' یعنی تجھے تو زمین میں اترنا چاہئے یعنی قبر میں تو آسمان کی طرف کیوں آ رہے ہو؟'' اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ '' آنحضرت ﷺ کے حجروں میں ہاتھ چھت کو چھو لیتا تھا۔'' اور فضیل فرماتے ہیں کہ میں اس شخص پر تو حیران نہیں ہوتا جو مکان بناتا ہے اور آخر چھوڑ جاتا ہے لیکن حیرت مجھے اس شخص پر ہوتی ہے کہ جو دیکھتا ہے لیکن عبرت حاصل نہیں کرتا۔

چوتھی اہم شے گھر کا سامان ہے: اس باب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا درجہ اعلیٰ ہے کہ جن کے پاس کنگھی اور کوزے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ تو آپ نے کسی کو دیکھا کہ ہاتھ سے اپنی داڑھی میں خلال کر رہا ہے تو آپ نے کنگھی پھینک دی۔ اور جب کسی کو دیکھا کہ اوک سے پانی پی رہا ہے تو آپ نے کوزہ بھی چھوڑ دیا۔ اور انتہائی درجہ یہ ہے کہ جو شے ناگزیر ہو وہ بھی صرف ایک رکھے۔ جو لکڑی یا مٹی کی ہو اگر وہ شے پیتل یا کانسی کی ہو تو یہ زہد نہ ہو گا۔ اور اسلاف تو کوشش فرماتے تھے کہ ایک چیز ایسی رکھیں جو کئی طرح کے کام دے۔

آنحضرت ﷺ کا سرہانہ چمڑے کا تھا جس میں بھرتی کھجور کی چھال کی تھی اور فرش آپ کا ایک دوہری

کملی تھی۔ ایک دن حضرت عمر نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کے پہلو پر کھجور کے پتوں کی چٹائی کا نشان بنا ہوا تھا۔ تو حضرت عمر پر گریہ طاری ہوگیا۔ تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ "اے عمر روتے کیوں ہو؟" تو حضرت عمر نے کہا کہ: "قیصر و کسریٰ کہ اللہ کے دشمن ہیں وہ تو نعمتوں میں ہوں اور آپ کہ اللہ کے دوست ہیں اتنی سختیوں میں!" اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: "اے عمر اس بات پر راضی نہیں کہ اُن کے لئے تو دنیا کی نعمت ہو اور ہمارے لئے آخرت کی نعمت ہو؟" تو عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "ہاں راضی ہوں" تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "پس جان لے کہ حقیقت یہی ہے"۔ ایک شخص حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے گھر میں داخل ہوا تو پورے گھر میں کوئی شے نہ ملی۔ بولا کہ "آپ کے گھر میں کوئی شے بھی نہیں؟" تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمارا ایک گھر ہے جس میں جو کچھ ہاتھ آتا ہے بھجوا دیتے ہیں" یعنی وہ جہان۔ تو اس شخص نے کہا کہ "جب تک آپ اس دنیا میں ہیں متاع کے بغیر چارہ نہیں" تو ابوذر نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ ہمارا یہ گھر یہیں نہ چھوڑ دے گا۔" جب عمیر بن سعد امیر حمص تھے تو وہ حضرت عمر کے پاس پہنچے تو حضرت عمر نے پوچھا کہ "دنیا کے مال میں سے تمھارے پاس کیا ہے؟" تو عمیر نے کہا کہ ایک عصا ہے جس پر میں ٹیک لگاتا ہوں اور سانپ وغیرہ کو اس سے مارتا ہوں۔ ایک تھیلا ہے جس میں اپنا کھانا رکھتا ہوں۔ اور ایک پیالہ ہے کہ جس میں کھانا کھاتا ہوں۔ اور اپنا سر اور لباس اس میں دھوتا ہوں اور ایک لوٹا ہے کہ جس سے میں پانی پیتا ہوں اور جس سے وضو کرتا ہوں۔ اور جو کچھ ان کے علاوہ ہے وہ انھیں کا شاخسانہ ہے کہ جو دنیا میں ہے"۔ آنحضرت ﷺ ایک سفر سے لوٹے تو حضرت فاطمہ کے گھر گئے تو آپ نے ان کے دروازے پر ایک پردہ دیکھا اور چاندی کی دو چوڑیاں ان کے ہاتھوں میں پائیں تو ان چیزوں کی کراہیت کے باعث واپس لوٹ گئے۔ تو جب حضرت فاطمہؓ کو علم ہوا کہ آپ کی کراہیت کا سبب کیا تھا تو آپ نے وہ چوڑیاں ڈیڑھ درم میں فروخت کر دیں اور پردہ بھی صدقہ کر دیا تو آنحضرت ﷺ کا دل ان پر راضی ہوگیا۔ تو فرمایا تم نے ٹھیک کیا"۔ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں ایک پردہ تھا۔ رسول ﷺ نے فرمایا کہ "جب میری نظر اس پر پڑتی ہے مجھے دنیا یاد آتی ہے اسے لے جاؤ اور فلاں شخص کو دے دو"۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ ایک دوہری کملی پر سوتے تھے۔ ایک رات میں نے ایک نیا فرش بچھا دیا تو آپ ﷺ رات بھر پہلو بدلتے رہے۔ تو اگلے دن فرمایا کہ میں کل رات سو نہیں سکا۔ وہی پرانی کملی بچھا دو"۔ ایک دفعہ سونا لایا گیا تھا۔ سب تقسیم فرما دیا لیکن چھ دینار بچ گئے۔ رات بھر نیند نہ آئی تو کسی کو بھجوا دیئے اور گہری نیند سو گئے"۔ فرمایا کہ "کیسا ہوتا میرا احوال اگر میں مرجاتا اور یہ چھ دینار میرے پاس ہوتے"! حسن بصری فرماتے ہیں کہ میں صحابہ رسول میں سے ستر اصحاب سے مل چکا ہوں اور ان میں سے کسی ایک کے پاس بھی ایک جوڑے لباس

کے سوا جو انھوں نے پہن رکھا تھا نہ تھا۔ اور خاک اور اپنے درمیان فرق نہ کرتے تھے جب سونا چاہتے زمین پر سو جاتے تھے۔ وہ لباس اپنے اوپر ڈال لیتے تھے۔

پانچویں اہم شے نکاح ہے: سہل تستریؒ اور سفیان عینیہ رضی اللہ عنہ اور ایک گروہ اس کے قایل ہیں کہ نکاح میں زہد نہیں۔ کیونکہ زاہد ترین خلق آنحضرت ﷺ ہی تھے اور آپ عورتوں کو عزیز رکھتے تھے۔ اور آپ کی نو عدد ازواج مطہرات تھیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ باوصف ان کے زہد کے چار ازواج رکھتے تھے اور دس بارہ کنیزیں تمتع کے لئے اس کے علاوہ تھیں۔ اور اس سے غرض یہ ہوگی کہ جائز نہیں کہ کوئی نکاح سے اس لئے دست کش ہو کہ طریق زہد میں اسے مباشرت کی لذت نہ ہو۔ کیونکہ نکاح حصول اولاد کے لئے ہوتا ہے اور اس میں فواید بہت ہیں۔ اور بقائے نسل کا ذریعہ ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہوگا کہ کوئی روٹی پانی سے اس بناء پر دست کش ہو جائے کہ اس سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ اس طرح مر جائے گا۔ نسل کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔ لیکن اگر کسی کو خوف ہو کہ نکاح اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے گا تو ایسے کے لئے نکاح نہ کرنا اولیٰ تر ہے۔ اگر شہوت غالب ہو جائے تو زہد کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی عورت سے نکاح کرے جو خوب صورت نہ ہو تا کہ شہوت کو سکون تو دے شہوت کی انگیخت کا باعث نہ ہو۔ امام احمد بن حنبلؒ کو ایک خوب صورت عورت زوجہ کے لئے دینے والے تھے کہ انھیں بتایا گیا کہ اس عورت کی ایک بہن ہے جو اس سے عاقل تر ہے لیکن ایک آنکھ کی مالک ہے۔ تو آپ نے عاقل تر کو زوج کے لئے چاہا۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ ''میں اس بات کو زیادہ پسند کرتا ہوں کہ مبتدی مرید اپنے دل کو تین چیزوں سے بچائے: کسب، نکاح اور حدیث کی نوشت سے''۔ نیز فرمایا کہ ''میں اسے عزیز نہیں رکھتا کہ صوفی پڑھے یا لکھے کیونکہ اس سے خیالات پراگندہ ہو جاتے ہیں اور یک سو نہیں ہوتے''۔

چھٹی اہم شے مال و جاہ ہے: رکنِ مہلکات میں اس کی تفصیل ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ دونوں زہر قاتل ہیں۔ لیکن بقدرِ حاجت اس میں سے تھوڑا سا گویا تریاق ہے جو دنیا داری میں شمار نہیں ہوتا۔ بلکہ جو شے دین کے لوازم میں سے ہے وہ بھی دین ہی ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام نے اپنے ایک دوست سے قرض مانگا تو آپ پر وحی آئی کہ ''تم نے اپنے خلیل سے (یعنی اللہ) سے کیونکہ قرض طلب نہیں کیا؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''بارِ الٰہا میں جانتا تھا کہ آپ دنیا کو دشمن جانتے ہیں تو میں آپ سے دنیا طلب کرنے سے ڈرا''؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''جو کچھ بقدرِ حاجت ناگزیر ہو وہ دنیا نہیں''۔ مختصر یہ کہ جب مردِ زاہد نے جملہ شہوات اور افراط کو ترک کر دیا اور مال و جاہ پر صرف بقدرِ لازم کفایت کی تو اس کا دل اس سے نفور ہوگا۔ اور وہ دنیا دوست نہ کہلائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ انسان جب اُس جہان میں جائے۔ اس کا سر جھکا ہوا ہونا چاہئے اور وہ پیچھے مڑ کر دنیا کو نہ

دیکھے۔ دنیا تو وہی مڑ کر دیکھے گا کہ جس کے لئے دنیا آرام گاہ اور آسائش گاہ ہو۔ لیکن زاہد کے لئے تو دنیا جائے ضرور کی طرح ہوتی ہے جسے وہ سوائے قضائے حاجت کے لئے نہیں چاہتا تو جب وہ موت پر اس کی حاجت سے چھوٹ گیا تو وہ اس کی طرف التفات کیوں کرے گا۔ لیکن جو کوئی دل دنیا سے لگاتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایسی جگہ چھوڑنا نہیں چاہتا تو وہ وہاں ایک زنجیر اپنی گردن میں کس کر باندھ لیتا ہے اور سر کے بال بھی مضبوطی کے ساتھ اس سے باندھ لیتا ہے تاکہ جب اسے اس جگہ سے اٹھائیں تو وہ اپنے بالوں سے آویختہ ہو اور جب تک اس کے تمام بال جڑ سے اکھڑ نہ جائیں وہاں سے نجات نہ پاسکے۔ تو اس طرح اُس کے سر پر زخم باقی رہیں گے۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے ایک جماعت کو دیکھا کہ جو بلا میں اس سے کہیں زیادہ خوش تھے کہ جیسے تم نعمت پاکر خوش ہوتے ہو۔ اور اگر وہ تمھیں دیکھتے تو کہتے کہ یہ تو شیاطین ہیں اور اگر تم انھیں دیکھتے تو تم کہتے کہ یہ تو دیوانے ہیں۔ یہ لوگ بلا میں رغبت اس لئے پاتے تھے تاکہ ان کا دل دنیا سے اچاٹ ہو جائے اور نفور ہو۔ تاکہ موت کے وقت کسی شے سے معلق نہ رہے۔

اصل پنجم: نیت، صدق اور اخلاص کے بارے میں

یاد رہے کہ اہلِ بصیرت پر یہ بات منکشف ہو چکی ہے کہ سوائے عابدوں کے باقی خلق ہلاک ہو چکی ہے اور عابد بھی سب ہلاک ہو گئے ہیں سوائے عالموں کے اور عالم بھی ہلاک ہو گئے ہیں ماسوائے عاملوں کے اور عامل بھی ہلاک ہو گئے ہیں ماسوائے مخلصوں کے۔ اور خود مخلص بھی عظیم معرضِ خطر میں ہیں۔ پس اخلاص کے بغیر سب رنج ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اخلاص اور صدق دونوں نیت ہی میں ہوتے ہیں۔ جو شخص نیت کا علم نہیں رکھتا تو وہ نیت میں اخلاص کو کیوں کر ملحوظ رکھے گا۔ اس لئے ہم ایک باب میں نیت کا ذکر کریں گے۔ اور دوسرے باب میں حقیقتِ اخلاص کے معنی میں ذکر کریں گے اور تیسرے باب میں حقیقتِ صدق کا بیان ہوگا۔

◆◆◆

باب اوّل: نیت کے بیان میں

پہلے تجھے نیت کی فضیلت کا علم ہونا چاہئے کیونکہ تمام اعمال کی روح نیت ہی ہے۔ اور حکم نیت ہی کے مطابق لگتا ہے۔ اور عمل میں اللہ تعالیٰ کی نظر نیت ہی پر ہوتی ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ تمھاری صورت اور شمائل کو نہیں دیکھتے وہ تو تمھارے دل اور سیرت کو دیکھتے ہیں''؟ اور دل پر نظر اس لئے ہے کہ نیت کا محل دل ہی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ '' کاموں کا مدار نیت ہے۔ اور ہر کسی کی عبادت اس کی نیت کے مطابق محسوب ہوتی ہے۔ جو کوئی ہجرت کرے یعنی اپنے شہر کو چھوڑے اور جہاد کے لئے جائے یا حج پر جائے مگر اللہ تعالیٰ کے لئے تو اس کی یہ ہجرت حق تعالیٰ کے لئے ہے۔ اور اگر کوئی مال کے حصول یا کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہجرت کرے تو ایسی ہجرت اللہ تعالیٰ کے لئے نہ ہوگی بلکہ اسی کے لئے ہوگی جس کا وہ متلاشی ہے''؟ نیز فرمایا کہ ''میری امت کے بہت سے شہید بستر و بالین پر مرتے ہیں اور بہت سے وہ ہوں گے جنھوں نے میدان جنگ میں بہت سے دشمنوں کو تہ تیغ کیا ہوگا۔ تو ان کی نیت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں''۔ نیز فرمایا کہ: ''بندہ بہت سے نیک اعمال کرتا ہے اور فرشتے ان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لئے اوپر جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہتے ہیں کہ اسے اس کے نامۂ اعمال میں سے محو کر دو کہ یہ عمل اس نے میرے لئے نہیں کئے۔ اس کے فلاں فلاں عمل البتہ لکھ لو؛ تو فرشتے کہیں گے' بارِ الٰہا اس نے یہ عمل نہیں کئے' تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ''لیکن اس نے نیت انھی اعمال کی کی تھی''۔ نیز فرمایا کہ ''لوگ چار قسم کے ہیں: ایک وہ جو مالدار ہے لیکن مال بحکم علم صرف کرتا ہے تو دوسرا کہتا ہے کہ ''اگر میں بھی مال دار ہوتا تو ایسے ہی کرتا۔ تو دونوں ثواب میں برابر ہوں گے۔ دوسرا وہ مال دار ہے لیکن مال بحکم شرع صرف نہیں کرتا تو وہ جو یہ کہے کہ اگر میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں بھی یہی کرتا تو گناہ اور وبال میں دونوں یکساں ہیں کیونکہ دونوں کی نیت عمل میں باہم ایک ہی ہے۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ: غزوہ تبوک میں ایک دن آنحضرت باہر نکلے تو فرمایا کہ 'مدینہ میں لوگ بہت ہیں کہ ہر وہ رنج جس سے ہمیں سفر اور بھوک کا سامنا ہے وہ اس میں شریک ہیں' تو ہم نے کہا کہ 'کیوں؟ کیونکہ وہ تو ہمارے ساتھ غزا میں شریک نہیں' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ بہ عذر پیچھے رہ گئے ہیں ورنہ نیت ان کی ہماری نیت ہی کی سی ہے''۔ بنی اسرائیل میں ایک شخص صحرا سے ایک بڑے پہاڑ پر پہنچا اور زمانہ قحط کا تھا۔ تو کہنے لگا کہ اگر یہ پہاڑ سراپا گندم ہوتا تو میں اسے محتاجوں میں تقسیم کر دیتا''۔ اس زمانے کے پیغمبر پر وحی

آئی کہ اسے کہو کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمھارا صدقہ قبول فرمالیا ہے اور تمھیں اتنا ثواب دیا ہے کہ اگر تو وہ سب گندم رکھتا اور اسے صدقے میں دے دیتا تو بھی اسی قدر ثواب دیا جاتا''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جس شخص کی نیت دنیا کی ہو تو اس کی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ افلاس رہے گا۔ اور جب دنیا سے جائے گا دنیا کا عاشق ہوگا۔ اور جس کی نیت و ہمت آخرت پر وقف ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس کو دولت مند رکھے گا۔ اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوگا تو وہ دنیا کے بارے میں زاہد شمار ہوگا''۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جب مسلمان کفار کے خلاف جنگ میں صف بستہ ہوتے ہیں تو فرشتے ان کے نامہ ہائے اعمال لکھنے لگتے ہیں کہ فلاں جنگ تعصب کی وجہ سے کرر ہا ہے اور فلاں حمیت کے باعث کرر ہا ہے تو مت کہو کہ اللہ کی راہ میں شہید ا ہوا ہے لیکن وہ جو جنگ اس لئے کرتا ہے کہ کلمہ توحید غالب آئے تو اس کا یہ جہاد اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہوگا''۔ نیز فرمایا کہ: ''جو شخص نکاح کرتا ہے اور نیت اس کی یہ ہو کہ موعود حق مہر نہیں دے گا تو وہ زانی ہے۔ اسی طرح جو قرض لیتا ہے اور نیت یہ ہو کہ ادا نہ کرے گا تو وہ مقروض نہیں چور ہے''۔ معلوم رہے کہ علماء کہتے ہیں کہ ''پہلے عمل کی نیت کو سیکھو اور پھر عمل سیکھو۔ ایک شخص کہہ رہا تھا کہ مجھے وہ عمل سکھایئے کہ میں جس میں دن رات لگا رہوں تا کہ خیر سے کسی وقت بھی خالی نہ رہوں۔ تو س سے کہا گیا کہ اگر خیر نہیں کر سکتا خیر کی نیت بادوام کرلے تا کہ اس کا ثواب ملتا رہے''۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ روزِ قیامت حشر لوگوں کی نیتوں کے مطابق فرمائیں گے''۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''بہشتِ جاویدان ولامنتہا ان چند روزہ عمل کی بناء پر عطا نہ ہوگی بلکہ نیکی کی بناء پر عطا ہوگی کیونکہ نیت بھی جاودانی ہے''۔

نیت کی حقیقت

یاد رہے کہ انسان کے ہاں سے کوئی حرکت معرض وجود میں نہیں آتی جب تک تین حاجات اس کے پیش نظر نہ ہوں: یعنی علم، ارادہ اور قوت یعنی دانش وخواست وتوانائی۔ مثلاً جب کھانا نہیں دیکھتا تو نہیں کھاتا۔ اور اگر دیکھ لیا لیکن اس کی ضرورت کے مطابق نہ ہو تو بھی نہیں کھاتا۔ لیکن اگر اس کی خواہش کے مطابق ہو لیکن ہاتھ مفلوج ہو تو ناتوانائی کے باعث پھر بھی نہیں کھاتا۔ کیونکہ قدرت سے محروم ہے۔ پس یہ تینوں حاجتیں تمام حرکات کا لازمہ ہیں۔ حرکت قدرت کے تابع ہے اور قدرت چاہت وارادہ کے تابع ہے۔ جو قدرت کو بروئے کار لانے کے لئے لازم ہے۔ اور نیاز علم کے تابع ہے۔ کیونکہ انسان کئی چیزوں کا شاہد ہے لیکن ان کا خواہاں نہیں ہوتا۔ لیکن علم کے بغیر چاہت بھی صورت پذیر نہیں ہوتی۔ کیونکہ جس چیز کا علم نہیں رکھتا انسان اس کا خواہاں کیوں کر ہو سکتا ہے اور نیت ارادہ، قدرت اور علم تینوں سے عبارت ہے۔ اور ارادہ یہ ہے کہ جو انسان کو انگیخت کرتا

اور کام میں لگا دیتا ہے۔ اسے غرض بھی کہتے ہیں قصد بھی اور نیت بھی۔ ان تینوں کا مطلب ایک ہی ہے۔

پس غرض جو انسان کو انگیز کرتی ہے اور کام میں لگاتی ہے' کبھی یہ ہوتا ہے کہ غرض ایک ہی ہوتی ہے اور کبھی یہ ہوتا ایک چیز میں دو اغراض پیش نظر ہوتی ہیں۔ (ایک تیر دو نشانہ)۔

اور غرض ایک ہی ہو تو اسے خالص کہتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی بیٹھا ہوا ہے اور ایک اس کا قصد کئے ہو تو وہ اٹھ کر بھاگ جائے تو اس کی غرض اور نیت ایک چیز سے زیادہ نہ ہوگی۔ اور وہ ہے بھاگ نکلنا۔ اسی طرح اگر کوئی صاحب حشمت تشریف لائے اور کوئی اس کے لئے کھڑا ہو جائے تو اس کی غرض سوائے اس کی تکریم کے اور کوئی نہیں ہوگی۔ اور یہ خالص کہلائے گی۔ اغراض اگر دو ہوں تو یہ تین قسم کی ہوں گی:

ایک یہ کہ ہر غرض یوں ہوتی ہے کہ اگر تنہا ہوئی تو اسے بروئے کار لاتا' جیسے کہ کوئی حاجت مند رشتہ دار ایک درم مانگے تو وہ اسے خویشاوندی اور فقر کی وجہ سے ایک درم دے دے۔ اور اپنے دل میں جانتا ہو کہ اگر وہ محتاج نہ بھی ہوتا تو اسے دے دیتا اور اگر فقیر ہوتا لیکن رشتہ دار نہ ہوتا تو بھی دے دیتا تو یہ دو اغراض ہوئے اور دو نیتیں باہم شریک۔

دوسری قسم یہ ہے کہ اگر جانتا کہ مانگنے والا رشتہ دار ہوتا نہ کہ درویش۔ یا اگر درویش ہوتا لیکن رشتہ دار نہ ہوتا تو نہ دیتا۔ لیکن چونکہ دونوں یک جا ہو گئے اس لئے اسے دینے پر کاربند کر دیا۔ پہلے کی مثال ایسی ہے کہ دو شخص ایک پتھر کو مل کر اٹھائیں جب کہ ان دونوں میں سے ہر ایک تنہا بھی اس پتھر کو اٹھانے پر قادر ہو۔ اور دوسرے کی مثال ایسے ہے کہ دو کمزور افراد مل کر ایک پتھر کو اٹھائیں کہ تنہا ہونے کی صورت میں ان میں سے کوئی بھی یہ پتھر اٹھانے پر قادر نہ ہو۔

تیسری قسم یہ ہے کہ ایک غرض کمزور ہو جو کام پر آمادہ نہ کر سکے۔ اور دوسری قوی ہو اتنی کہ وہ تنہا کام پر لگا سکے۔ لیکن اس کے باعث کام آسان تر ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی عشاء کی نماز تنہا ادا کرے لیکن اگر اور لوگ بھی وہاں آ جائیں تو نماز کی ادائیگی آسان تر ہو جائے گی۔ اور اس میں نشاط بھی زیادہ ہوگا۔ لیکن اگر ثواب کی نیت نہ ہوتی تو ان کے لئے نماز اادا نہ کرتا۔ اس کی مثل ایسے ہے کہ ایک مرد بھاری پتھر کو تنہا بھی اٹھا سکتا ہو لیکن اگر کوئی کمزور شخص اس کی مدد کرے تو اسے اٹھانا آسان تر ہو جائے گا۔

اور ان تینوں قسموں کے لئے جداگانہ احکام ہیں۔ جیسے کہ اخلاص کے بیان میں مذکور ہوگا۔ مقصود یہ ہے کہ تجھے معلوم ہو کہ نیت کے معنی غرض' باعث اور محرک ہیں۔ اور یہ کبھی اخلاص پر مبنی ہوتی ہے اور کبھی آمیختہ۔

فصل: یاد رہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''نیتة المو من خیرٌ من عمله'' مومن کی

نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ کیونکہ یہ امر مخفی نہیں کہ عمل بے نیت عبادت نہیں ہوتا جب کہ نیت بغیر عمل کے بھی عبادت ہوتی ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسان کی طاعت جسم سے بھی ہوتی ہے اور دل سے بھی۔ یہ عبادت کے دو اجزاء ہیں۔ ان دونوں میں سے جو جزو دل سے متعلق ہے وہ بہتر ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جسم کے ذریعے عمل کی غرض یہ ہوتی ہے کہ تا کہ دل کی صفت بن جائے۔ جب کہ دل کے عمل اور نیت سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ یہ جسم کی صفت بن جائے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ نیت عمل کے لئے درکار ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ عمل نیت کے لئے ہے کیونکہ مقصود سب کا یہ ہے کہ دل متغیر ہو جائے۔ کیونکہ اُس جہان کا مسافر دراصل دل (رُوح) ہے اور سعادت وشقاوت دل ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن اگر چہ جسم درمیان میں موجود ہوگا لیکن وہ دل کے تابع ہے۔ ایسے ہی جیسے اونٹ (سواری) کہ حج بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا لیکن حاجی تو انسان ہوتا ہے اونٹ نہیں۔ اور دل کے تغیر سے مراد بھی فقط ایک شے یہ ہوتی ہے کہ دنیا سے رخ پھیر کہ آخرت کی جانب کر لے۔ بلکہ دنیا اور آخرت دونوں سے رخ موڑ کر حق تعالیٰ کی طرف کر لے۔ اور دل کی یہ گردش انسان کی خواہش اور ارادے سے قبل ممکن نہیں ہوتی۔ جب اس کے دل پر دنیا کی طلب غالب ہوگی تو وہ رو بہ دنیا ہوگا۔ اور اس کا تعلق دنیا کے ساتھ اُس کی طلب کے مطابق ہوگا۔ اور یہ بات روزِ اول سے اسی طرح ہے۔ اگر اللہ کی طلب اور آخرت میں اللہ کے دیدار کی تمنا غالب تر ہو تو گویا اس کی صفت منقلب ہوگئی اور منہ اس نے دوسری جانب کر لیا۔ پس تمام اعمال کا مقصد دل کا یہی انقلاب ہے۔ سجود سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ پیشانی بدلے اور ہوا سے زمین پر جا لگے بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ صفت دل کی ہو جائے تا کہ ہوا اور تکبر سے تواضع کو پہنچ جائے۔ اور اللہ اکبر کا مقصود یہ نہیں ہے کہ زبان گردش میں آئے اور حرکت پذیر ہو بلکہ غرض یہ ہوتی ہے کہ دل اپنی تعظیم کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی تعظیم میں لگ جائے۔ اسی طرح حج کے دوران کنکریاں مارنے سے یہ غرض نہیں ہوتی کہ سنگریزوں کا ایک ڈھیر لگ جائے یا ہاتھ حرکت کرے بلکہ غرض یہ ہوتی ہے کہ دل بندگی کے لئے کمربستہ ہو جائے اور ہوا و ہوس کی پیروی اور اپنی عقل کے تصرف کو خیر باد کہہ دے۔ اور انسان سراپا فرمانِ خداوندی کا مطیع ہو جائے۔ اور عمل کی باگ ڈور اپنے ہاتھ سے لے کر اللہ تعالیٰ کے فرمان کو دے دے۔ چنانچہ کہا کہ: "لَبَّیكَ بِحَجَّةٍ حَقاً وَتَعَبُّداً وَرِقاء"[1] اسی طرح قربانی کا مقصد یہ نہیں کہ بکری جان سے جائے۔ بلکہ غرض یہ ہوتی ہے کہ بخل کی پلیدی انسان کے سینے سے جاتی رہے۔ اور انسان جانوروں پر شفقت طبعاً نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے تحت ایسا کرتا ہے۔ کیونکہ اگر تجھ سے کہا جائے کہ اس بکری کو ذبح کر تو تو نہیں کہے گا کہ اس بے چاری

(۱) حاضر ہوں حجت حق کے ساتھ، بندہ اور مطیع ہو کر

نے کیا جرم کیا ہے اور میں اسے سزا کیوں دوں لیکن تو خود کو ترک کر دیتا ہے اور در حقیقت معدوم ہو جاتا ہے کہ جیسے تو خود باقی نہیں۔ کیونکہ بندہ اپنے حق میں نابود ہے اور فی الاصل اللہ کا عاشق ہوتا ہے۔ اسی طرح تمام عبادتوں کی حقیقت یہی ہے۔

لیکن دل کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ جب اس میں کوئی ارادہ یا خواہش پیدا ہوتی ہے اور جسم اس کی موافقت کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ تو وہ صفت دل میں ثابت تر اور محکم تر ہو جاتی ہے۔ مثلاً جب یتیم پر رحم دل میں پیدا ہوتا ہے اور ہاتھ یتیم کے سر پر پھرتا ہے تو وہ رحمت دل میں قوی تر ہو جاتی ہے اور بڑھ جاتی ہے۔ اور انکساری کے معنی ظہور میں آتے ہیں تو سر بھی تواضع کرتا ہے اور زمین کی طرف جھک جاتا ہے (یعنی مطیع فرمان ہو جاتا ہے) اور جملہ عبادات کی نیت اور خیر طلبی یہ ہے کہ انسان دنیا کو اپنا قبلہ نہ بنائے بلکہ رُو بہ آخرت رہے۔ اور اپنے عمل کو اس نیت اور غرض سے ثابت اور موکد بنائے۔ پس عمل نیت اور ارادے کی تاکید کے لئے ہے۔ اگرچہ نیت ہی سے وجود میں آتا ہے۔ جب حقیقت یہی ہے تو ظاہر ہے کہ نیت عمل سے بہتر ہے۔ کیونکہ نیت خود نفس دل سے ہے اور عمل دوسری جگہ سے دل میں سرایت کرتا ہے۔ اگر سرایت کرے گا تو عمل میں لگ جائے گا اور اگر سرایت نہ ہو اور غفلت کا مرتکب ہو تو عمل جاتا رہتا ہے۔ جب کہ عمل کے بغیر نیت باطل نہیں ہوتی۔ یہ ایسے ہی ہے کہ معدے میں درد ہو تو جب وہ شخص دوا کھالے گا اور دارو معدے میں پہنچ جائے گا تو مقصود حاصل ہو جائے گا۔ اور اگر وہ سینے پر طلی کرے گا تاکہ اثر اس تک پہنچ جائے تو اس کا بھی فایدہ ہے لیکن جب نفسِ معدہ میں دوا پہنچتی ہے تو اس کا اثر لازماً بہتر ہوگا۔ کیونکہ طلیٰ کا اثر سینے پر ہوگا۔ جب کہ دوا کا مقصد سینہ نہیں بلکہ معدہ ہے۔ لازماً اگر اس تک سرایت نہ کرے ضائع ہو جائے گا۔ اور جو کچھ معدے میں پہنچ جائے گا اگرچہ سینے میں نہ پہنچے گا ضائع نہ ہوگا۔

جو خیالاتِ نفسانی اور وسواس معاف ہیں اور جو معاف نہیں ان کا بیان

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''میری امت کو نفسانی خیالات سے معاف فرمایا گیا ہے۔ اور یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں ہے کہ جو برائی کا ارادہ کرے لیکن اس کا ارتکاب نہ کرے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ اسے اس کے نامۂ اعمال میں درج نہ کرنا۔ لیکن اگر وہ معصیت کا مرتکب ہو جائے تو ایک برائی لکھو۔ اور اگر کوئی نیکی کا ارادہ کرے تو اس کی ایک نیکی لکھ دو۔ اور اگر وہ خیر عمل میں لے آئے تو دس نیکیاں لکھو۔ بعض احادیث میں ہے اس تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ شمار سات سو ۷۰۰ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سے بعضوں نے یہ سمجھا کہ دل میں جو بھی برا ارادہ یا خیال پیدا ہو اس کے لئے انسان ماخوذ نہ ہوگا۔ یہ غلط فہمی

ہے۔ کیونکہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اصل دل ہے اور جسم اس کا تابع اور فرمانِ خداوندی ہے کہ ''اگر وہ جو کچھ تو دل میں رکھتا ہے اسے ظاہر کرے یا مخفی رکھے اس کا حساب تم سے لیا جائے گا''۔ ''اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ'' (قرآن: ۲/۲۸۴) نیز فرمایا کہ آنکھ' کان اور دل تینوں سے سوال ہوگا: ''اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا'' اور فرمایا کہ قسم میں لغو کو زبان پر لانے پر گرفت نہ ہوگی بلکہ گرفت اس پر ہوگی جو قسم کھانے والے کے دل میں ہے ''لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ'' اور اس امر میں بھی اختلاف نہیں کہ کبر و نفاق وحسد وعجب سب پر گرفت ہوگی اور یہ سب اعمال دل کے ہیں۔

پس حقیقت اس باب میں یہ ہے کہ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ جو کچھ دل میں گذرتا ہے چار صورتوں کا ہوتا ہے: ان میں سے دو بے اختیار ہیں اس لئے ان میں انسان ماخوذ نہ ہوگا۔ اور دو جو انسان کے اختیار میں ہیں ان میں ماخوذ ہوگا۔ مثل اس کی اس طرح ہے کہ دل میں آتا ہے کہ جس راہ پر جا رہا ہوں میرے پیچھے پیچھے ایک عورت آ رہی ہے تو اگر تو مڑ کر پیچھے دیکھے گا تو اس خیال کو حدیثِ نفس کہتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ جی میں یہ رغبت پیدا ہوتی ہے کہ مڑ کر دیکھے' اسے طبیعت کا میلان کہا جاتا ہے اور یہ شہوت کی حرکت ہے۔

تیسرے یہ کہ دل حکم دیتا ہے کہ پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہئے۔ اور یہ حکم وہاں ہوتا ہے جہاں خوف اور شرم مانع نہ ہو کیونکہ شہوت جس کی متقاضی ہو یا دل جس کا حکم دے' کرنا نہیں چاہئے۔ بلکہ چاہیئے کہ انسان کہے کہ یہ کام ناپسندیدہ ہے اسے حکمِ دل کا نام دیا گیا ہے۔

چوتھے یہ کہ کچھ نیت کرے اور کچھ عزم کرے کہ مڑ کر دیکھے اور یہ عزم اگر دل کے حکم کو رد نہ کرے جلد پختہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے یا لوگوں سے ڈرائے تاکہ اس حکم کو باطل کر دے۔

پس وہ پہلی دو حالتیں جنھیں ہم نے حدیثِ نفس' اور مَیلِ طبع' کا نام دیا ہے انسان ان کے لئے ماخوذ نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اس کے اختیار میں نہیں اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا'' (قرآن: ۲/۲۸۶) ''اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا حکم نہیں دیتا'' اور یہ حدیثِ نفس ایسی ہے کہ عثمان بن مظعون نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ ''میرا یہ نفس مجھ سے کہتا ہے کہ تو اپنے آپ کو خصّی کر لے تاکہ شہوت سے نجات پا جائے''۔ آپ نے فرمایا کہ ''ایسا نہ کرنا کیونکہ میری امت کو خود کو آختہ کرنے کے لئے روزہ رکھنا چاہئے'' تو اس نے کہا کہ ''میرا نفس مجھ سے کہتا ہے کہ گوشت مت کھاؤ''۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ

''نہیں ۔ میں خود گوشت کو پسند کرتا ہوں اگر میں پالیتا ہوں تو کھاتا ہوں اور اگر میں چاہتا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے عطا کرتے ہیں''۔عثمان نے کہا کہ ''میرا نفس مجھے کہتا ہے کہ راہبوں کی طرح پہاڑوں کی طرف نکل جا'' تو آپ نے فرمایا کہ ''اس طرف نہ نکلو کیونکہ میری امت کی رہبانیت حج اور غزا ہے''۔ یہ خیالات جو اسے آئے حدیثِ نفس کہلاتے ہیں اور یہ معاف ہیں کیونکہ اس نے ان کا عزم نہ کیا ہوگا اسی لئے آنخضرت سے مشورہ کررہا تھا۔

اور وہ دو جو انسانی اختیار میں شمار ہوتے ہیں اور وہ ہے دل کا حکم کہ کردنی ہے اور دل کا عزم ان کے کرنے کا ہے۔تو انسان ان دو کی بناء پر ماخوذ ہوگا۔اگر چہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں بلکہ خلق سے شرم وہراس یا کسی اور سبب سے اس پر عمل نہ کرے۔اور یہ کہنا کہ انسان اس کے لئے ماخوذ ہوگا اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی کو اس پر غصہ آتا ہے یا ازاراہ انتقام اس پر عقوبت کی جائے گی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات خشم وانتقام سے پاک ہے۔ بلکہ معنی اس کے یہ ہیں کہ یہ نیت جو اس نے کی اس سے دل نے ایک صفت ایسی قبول کی کہ جس سے حضورِ الٰہیت سے دور جا گرا۔اور یہ اس کی شقاوت ہے جیسے کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔ کیونکہ انسان کی سعادت یہ ہے کہ منہ اپنا اپنی ذات سے نیز دنیا سے موڑ کر حق تعالیٰ کی طرف کرے۔اور انسان کا نصب العین اس کی غرض ہوتی ہے۔اور اس کی دل بستگی کا عالم یہ ہوجاتا ہے کہ جو امید وآرزو وہ کرتا ہے وہ دنیا سے متعلق ہوتی ہے جس سے اس کا تعلق دنیا سے محکم تر ہوتا جاتا ہے۔اور دراصل جو مقصود ہے اس سے دور تر جا پڑتا ہے۔اور اس کے ماخوذ ہونے یا ملعون ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ گرفتار تر ہوگیا اور دور تر ہوگیا۔تو اس کا مرتکب وہ خود ہوا۔ کیونکہ کسی کو اس کی طاعت پر خوشی ہوتی ہے نہ معصیت پر غم وغصہ کہ جس کی بناء پر اسے انتقام کے لئے پکڑا جائے۔لیکن عوام کی سمجھ کے مطابق عبارت کچھ اس قسم کی ہوتی ہے۔

جس نے یہ اسرار جان لئے اسے ہرگز شک نہیں رہتا کہ انسان احوال دل کے باعث ماخوذ ہوتا ہے اور دلیلِ قاطع اس پر یہ ہے کہ آنخضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''دو شخص جو ایک دوسرے پر تلوار کھینچتے ہیں اور ان میں سے ایک مارا جاتا ہے تو قاتل ومقتول دونوں دوزخی ہیں''۔اس پر لوگوں نے کہا کہ ''مرنے والا کیوں؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''وہ بھی اگر قتل کرسکتا تو قاتل کو قتل کردیتا''۔اور دوسرے یہ کہ ایک شخص مالدار ہے لیکن بہ حکم علم روپیہ صرف نہیں کرتا تو اس کے دیکھا دیکھی اگر کوئی اور یہ کہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں بھی ایسے ہی کرتا تو معصیت میں دونوں برابر ہوں گے''۔اور یہ سوائے ارادۂ دل کے اور کچھ نہیں ۔ اس بات میں بھی شک نہیں کہ اگر کوئی بستر خواب پر ایک عورت کو پائے اور اس کے ساتھ ہم خوابی کرے اس گمان میں کہ غیر عورت ہے تو وہ گناہ گار ہوگا۔اگر چہ وہ عورت اس کی اپنی بیوی ہی کیوں نہ ہو جو اس پر حلال ہے۔ بلکہ اگر کوئی

بے وضو نماز ادا کرے تو اسے ثواب ملے گا کیونکہ اس کا گمان یہ ہے کہ وہ باوضو ہے۔لیکن اگر اس کا گمان یہ ہو کہ وہ بے وضو ہے اگرچہ حقیقت میں باوضو ہو تو وہ گناہ گار ہوگا۔اگرچہ نماز کے بعد اسے یاد آ جائے کہ باوضو تھا۔ اور یہ تمام مثالیں احوالِ دل کی ہیں۔

لیکن وہ شخص جو گناہ کی نیت کرے پھر گناہ نہ کرے کہ اللہ سے خائف تھا تو اس کے نامہ اعمال میں نیکی لکھی جاتی ہے۔ جیسے کہ حدیث میں وارد ہے۔ کیونکہ قصد موافقتِ طبع پر ہے اور گناہ سے رک جانا طبع کے خلاف مجاہدہ ہے۔ کیونکہ اس کا اثر دل کو منور کرنے میں دل کو تاریک کرنے کے قصد کی نسبت زیادہ ہے۔ اور مطلب اس حسنہ کے لکھے جانے کا مفہوم یہی ہے۔لیکن اگر کوئی ناتوانی کے باعث دست کش ہوتا ہے اور اس کا کوئی کفارہ بھی ادا نہیں کرتا تو وہ ظلمت اس کے دل سے زایل نہیں ہوتی اس لئے وہ اس پر ماخوذ ہوگا۔اس مقتول کی طرح جو کمزوری کے باعث اپنے دشمن کو قتل نہ کر سکے اور خود مارا جائے۔

جو اعمال نیت کے سبب سے بدل جاتے ہیں ان کا بیان

یاد رہے کہ اعمال تین قسم کے ہیں: طاعات، معاصی اور مباحات

ہوسکتا ہے کہ یہ جو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیات" لوگ یہ گمان کریں کہ معصیت بھی نیک نیتی کی بناء پر من جملۂ عبادات ہے! ایسا سمجھنا خطا ہے۔ بلکہ اس قسم کی نیت کا اثر اس پر کچھ نہیں لیکن بری نیت اسے خبیث تر بنا دیتی ہے۔اور مثال اس کی ایسی ہے کہ کوئی کسی کے دل کو خوش کرنے کے لئے غیبت کرے۔ یا مسجد یا مدرسہ یا سرائے حرام مال سے تعمیر کرے اور کہے کہ میری نیت خیر کی ہے۔اور وہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ یہ نہ صرف کہ خیر نہیں بلکہ اسے خیر کا مقصد قرار دینا شر بالائے شر ہے۔اگر جانتا ہے تو فاسق ہے اور اگر نہیں جانتا اور سمجھتا ہے کہ یہ خیر ہے تو بھی فاسق ہے۔کیونکہ حصولِ علم فریضہ ہے۔اور بیشتر خلق جہالت کی وجہ سے تباہ ہوتی ہے۔اسی بناء پر سہیل تستری نے فرمایا ہے کہ کوئی گناہ جہالت سے بڑھ کر نہیں ہے۔اور اپنے جہل سے بے خبری جہالت سے بھی بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ نہیں جانتا کہ وہ جاہل ہے اس لئے کبھی سیکھ نہ سکے گا۔اور یہ بات اس کے لئے حجاب اور رکاوٹ بن جاتی ہے۔اسی طرح ایسے لڑکے کو تعلیم دینا کہ جس کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کا مقصد حصولِ علم سے قضاوت، اوقاف اور اموالِ یتاماں سے بہرہ اندوزی اور سلطان سے فال لینے کا ہے اور دنیا جمع کرنا ہے اور مباہات اور منافست میں مشغول ہونا ہے تو یہ حرام ہوگا۔ اگر معلم یہ کہے کہ میری نیت تو علم شرع کو فروغ دینا ہے۔اس لئے اگر میرا شاگرد علم کو فساد کے لئے استعمال کرے تو میں تو اپنی نیت کے لئے جواب دہ ہوں تو اس کا خیال جہلِ محض ہے اور وہ ایسے ہی ہے کہ کوئی کسی ایسے

کو شمشیر فراہم کرے جس کے بارے میں جانتا ہو کہ یہ راہ زن ہے۔ یا انگور کسی ایسے کو دے یا فروخت کرے کہ جس کے بارے میں جانتا ہو کہ یہ انگور سے شراب تیار کرتا ہے اور کہے یہ کہ میرا مقصد سخاوت ہے اور اللہ تعالیٰ سخی سے بڑھ کر کسی کو دوست نہیں رکھتے تو یہ اس کی جہالت ہے۔ اسی طرح جب جانتا ہے کہ یہ راہ زنی کرے گا تو چاہئے کہ اس سے اس کی سابقہ تلوار بھی چھین لی جائے تو یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ اسے ایک اور شمشیر فراہم کر دی جائے؟ بلکہ اسلاف تو عالم فاجر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے تھے۔ اور جس شاگرد کے ہاں معصیت کے آثار دیکھے ہیں اسے حلقہ درس سے خارج کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ امام احمد بن حنبل نے اپنے ایک پرانے شاگرد کو محض اس بناء پر حلقہ سے نکال دیا تھا کہ اس نے اپنے گھر کی دیوار پر توڑی گارے کی لپائی سے راہ کو ذرا سا تنگ کر دیا تھا۔ اسے کہا کہ ''تو نے مسلمانوں کے راستے میں سے ناخن بھر جگہ روک لی ہے تو تجھے تعلیم دینا جائز نہ ہوگا'' پس معصیت خیر کی نیت سے خیر نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ خیر وہی ہے جو فرمانِ خداوندی کے تحت خیر ہو۔

طاعت کی دوسری قسم:

اس میں نیت دو[۲] وجہ سے اثر کرتی ہے۔

ایک یہ کہ اصل عمل نیت سے درست ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جس قدر نیت بیشتر ہوگی ثواب بھی کئی گنا ہوگا۔ اور جو کوئی نیت کا علم سیکھتا ہے وہ ایک طاعت میں دس[۱۰] نیکیاں کر سکتا ہے۔ تا کہ وہ دس عمل طاعت ہو جائیں۔ مثلاً جب مسجد میں اعتکاف کیا تو نیت کرے کہ یہ اللہ کا گھر ہے۔ تو جو کوئی بھی اس میں داخل ہوتا ہو وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت ہی کے لئے داخل ہوا ہوگا۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''جو کوئی مسجد میں داخل ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت ہی کے لئے داخل ہوتا ہے اور زیارت شدہ (یعنی اللہ) پر اس کا حق ہوتا ہے کہ زائر کی تکریم کرے''۔

دوسری نیت یہ کہ اگلی نماز کا انتظار کرتا ہے اور حدیث میں ہے کہ ''جو نماز کا منتظر ہو وہ گویا حالتِ نماز میں ہوتا ہے''۔

تیسری نیت یہ کہ اعتکاف میں آنکھ' کان' ہاتھ' زبان اور پاؤں کو بے جا حرکت سے باز رکھوں گا۔ اور یہ ایک قسم کا روزہ ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ ''مسجد میں اعتکاف میری امت کے لئے بمنزلہٗ رہبانیت کے ہے''۔

چوتھی نیت یہ کہ ہر قسم کی مشغولیوں سے خود کو دور رکھے گا تا کہ خود کو سراپا حق تعالیٰ کے حوالے کر دے۔ اور پھر ذکر و فکر اور مناجات میں مشغول ہو جائے گا۔

پانچویں یہ کہ لوگوں کے میل جول اوران کے شر سے سلامت رہے گا۔

چھٹے یہ کہ اگر مسجد میں کوئی ممنوعہ عمل دیکھے گا تو اسے روکے گا۔ اور کسی کو نماز صحیح طور پر ادا کرتے نہ دیکھے گا تو اس کو صحیح طریقہ بتائے گا۔

ساتویں یہ کہ ممکن ہے کہ اہل دین سے ملاقات ہوجائے تو ان سے دینی اخوت قائم کر سکے گا۔ کیونکہ مسجد اہل دین کی آرام گاہ ہوتی ہے۔

آٹھویں یہ کہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرے گا تو اس طرح معصیت اور بدفکری سے محفوظ رہے گا۔ وقِس عَلیٰ ھٰذا کہ تمام طاعات میں ایک طاعت کے ساتھ ساتھ بہت سی دیگر طاعتوں کی نیت کر سکتا ہے تا کہ ثواب کئی گنا ہوجائے۔

تیسری قسم: مباحات کی ہے۔ اور کسی بھی صاحبِ خرد کو مناسب نہیں کہ غافل وار حیوانوں کی طرح مباحات میں پھرے اور اچھی نیت سے غافل ہو۔ تو یہ اس کے لئے بہت بڑا خسران ہوگا۔ کیونکہ ناسمجھی کی جملہ حرکات پر سوال کیا جائے گا۔ اور جملہ مباحات کا حساب لیا جائے گا کہ اگر نیت بری ہوگی تو اس کا وبال اس پر ہوگا اور اگر نیت نیک ہوگی تو اس کا اجر بھی اس کے لئے ہوگا۔ لیکن اگر کچھ نیت نہ کی تو گویا اپنا وقت ضائع کیا جو وقت وہاں صرف کیا اور اس سے کوئی فایدہ حاصل نہ کیا۔ تو گویا اس نے اس آیہ قرآن کے خلاف عمل کیا کہ: ''وَلَا تَنسَ نَصِیبَکَ مِنَ الدُّنیَا وَاَحسِن کَمَآ اَحسَنَ اللّٰہُ اِلَیکَ'' (قرآن:۲۸/۷۷) (اُس جہان کا اپنا نصیبہ اس دنیا میں نہ چھوڑ اس لئے نیکی کر جیسے کہ اللہ نے تیرے ساتھ نیکی کی ہے) کہ دنیا گذشتنی ہے تو اپنا حصہ اس سے لے لے تا کہ تیرے ساتھ رہے۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''بندے سے جو کچھ اس نے کیا ہوگا اس کے بارے میں اس سے سوال ہوگا۔ حتی کہ سرمہ جو اس نے آنکھوں میں ڈالا ہوگا یا مٹی کے ایک ڈھیلے کو انگلیوں سے ملا ہوگا یا ہاتھ جو اس نے اپنے کسی بھائی کے لباس میں ڈالا ہوگا ان کا حساب بھی دینا ہوگا۔

اور مباحات کی نیت کا علم بڑا طویل ہے۔ اسے بھی سیکھنا چاہئے۔ مثلاً خوش بُو کا استعمال بھی مباح ہے اور روا ہے کہ انسان جمعہ کے روز اسے استعمال میں لائے۔ لیکن یہ جائز نہیں کہ خوش بُو کے استعمال سے غرض اپنی دولت پر فخر ومباہات ہو یا لوگوں کو دکھاوا منظور ہو۔ یا فساد کے ارادے سے غیر محرم عورتوں کے دل میں جگہ بنانا مقصود ہو۔ نیک نیتیں یہ ہیں کہ انسان حُرمت کو ملحوظ رکھے اور اللہ تعالیٰ کے گھر کی تعظیم کرے۔ اور ہمسایوں کو راحت رسانی کی نیت کرے تا کہ وہ آسودہ ہوں۔ اور وہ جو اپنے جسم سے ناخوش بو کو دور کرے تا کہ لوگوں کو رنج نہ پہنچے جس سے وہ غیبت کی معصیت میں گرفتار ہوجائیں۔ نیت یہ کرے کہ خوشبو اس کی قوتِ شامہ کو بڑھاتی

ہے تا کہ پاک ہو کر قوتِ شامہ میں اضافہ ہو۔اور اللہ تعالیٰ کے ذکر وفکر کو معمول بنائے اور اس پر قادر تر ہو جائے یہ اور اس جیسی نیتیں وجود میں اسی کے ہاں آتی ہیں جس پر خیر کا غلبہ ہو اور ان میں سے ہر ایک سے قربت جنم لیتی ہے۔اسلاف ایسے ہی تھے جو ایسی ہی نیتیں کرتے تھے تا کہ کھانا کھانے میں اور جائے ضرور میں جانے ہیں اور اپنی بیوی سے جماع میں تا کہ ہر ایسے موقعے پر نیت نیک ہو اور ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جو خیر کا باعث نہ ہو اور جب انسان اس خیر کو اپنا مقصود بنالے تو اُسے اس کا ثواب مل جائے گا۔جیسے بیوی سے جماع میں اولاد کی نیت کرے تا کہ امتِ مصطفیٰ میں اضافے کا ذریعہ بنے۔نیز اپنی بیوی کی راحت کی نیت بھی کرے۔اور خود کو نیز بیوی کو گناہ سے بچائے۔سفیان ثوری ایک دن لباس الٹا پہنے ہوئے تھے۔تو لوگوں نے اس کی نشاندہی کی تو آپ نے ہاتھ بڑھایا کہ اسے سیدھا کریں۔پھر رک گئے اور اسے علیٰ حالہ چھوڑ دیا اور فرمایا کہ ''میں نے اللہ تعالیٰ کے لئے اسے اس طرح پہنا ہوا ہے۔اس لئے نہیں چاہتا کہ کسی اور کے لئے اسے سیدھا کروں''۔ حضرت زکریا علیہ السلام ایک جگہ مزدوری کر رہے تھے۔تو کچھ لوگ ان کے پاس پہنچے اس وقت آپ روٹی کھا رہے تھے انھوں نے ان لوگوں کو شریک طعام نہ کیا۔جب پوری روٹی کھا چکے تو فرمایا کہ اگر میں سنت کے لئے ساری روٹی نہ کھالیتا تو میں کمزوری کے باعث کام کا حق ادا نہ کر پاتا اس طرح اپنے فرض کی ادائیگی سے قاصر رہتا''۔سفیان ثوری روٹی کھا رہے تھے۔تو ایک شخص اندر آ گیا۔تو انھوں نے اس سے نہیں کہا کہ شریک طعام ہو جاؤ۔حتیٰ کہ پوری روٹی کھا گئے۔پھر فرمایا کہ ''اگر میں نے یہ روٹی قرض پر نہ لی ہوتی تو میں ضرور تمھیں بھی کھلاتا''۔نیز فرمایا کہ ''جو کوئی کسی سے کہے کہ تم بھی کھاؤ لیکن دل نہ چاہتا ہو تو اگر وہ شخص نہ کھائے تو اس نے ایک گناہ کیا اور یہ نفاق ہے اور اگر دوسرا شخص شریک ہو کر کھالے۔تو ایک تو نفاق کا مرتکب ہوا اور دوسرے خیانت کا ارتکاب کیا۔کیونکہ اسے ایسی چیز کھلائی کہ اگر وہ جانتا تو شریک طعام نہ ہوتا۔

اس امر کا بیان کہ نیت انسانی اختیار میں نہیں

یاد رہے کہ سادہ دل انسان جب سنتا ہے کہ ہر مباح میں نیت ممکن ہے۔تو ہو سکتا ہے کہ دل یا زبان سے کہے کہ میں نے نیت کی کہ میں نکاح کروں اللہ تعالیٰ کے لئے یا روٹی کھاؤں اللہ تعالیٰ کے لئے یا درس دوں اور وعظ کہوں اللہ تعالیٰ کے لئے اور گمان کرے کہ نیت ہے۔لیکن یہ تو حدیثِ زبان ہے یا حدیثِ نفس۔کیونکہ نیت تو ایک کشش اور میلان ہوتا ہے۔جو دل میں پیدا ہوتا ہے جو انسان کو کام پر لگا دیتا ہے۔ایک متقاضی کی طرح جو اصرار کرے۔حتیٰ کہ جسم اس کام کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔اور وہ کام کرنے لگ جاتا ہے۔اور یہ اس

وقت ہوتا ہے جب غرض ظاہر ہواور غالب ہواور جب یہ متقاضی نہ ہوتو نیت بہ زبان ایسی ہے جیسے کہ کوئی سیر ہو اور کہے کہ میں نے نیت کی میں بھوکا ہو جاؤں یا کسی سے تعلق منقطع کر چکا ہواور کہے کہ ''میں نے نیت کی کہ میں اسے دوست رکھتا ہوں''۔ اور یہ محال ہے۔ اسی طرح کسی کو شہوت جماع پر لائے اور وہ شخص کہے کہ 'میں نے نیت کی میں جماع اولاد کے لئے کرتا ہوں' تو یہ بے ہودہ بات ہوگی۔ جب سبب اس کا عقدِ شہوت پر ہو' کہے کہ 'میں نے نیت کی عقد برائے سنتِ شرع کروں' تو یہ بے ہودہ بات ہوگی۔ بلکہ چاہئے کہ پہلے شرع پر ایمان قوی ہو۔ اس کے بعد جیسا کہ احادیث میں وارد ہے اولاد کے سبب نکاح کے ثواب میں غور کرے۔ تا کہ اس ثواب کی حرص اس کے باطن میں پیدا ہو جو اسے نکاح پر لا رکھے۔ تو یہ خود نیت ہوگی بغیر اس کے وہ زبان سے کہے۔ اسی طرح جیسے فرماں برداری کی حرص انگیخت کرے اور وہ آمادہ ہو نماز میں کھڑا ہو جائے تو یہ خود نیت ہوگی اور زبان سے کہنا کہ میں نے نیت کی بے ہودہ بات ہوگی۔ ایسے ہی جیسے کہ بھوکا شخص کہے کہ 'میں نے نیت کی کہ میں روٹی کھاؤں بھوک کے لئے اور یہ بے ہودہ ہے۔ کیونکہ جب بھوکا ہوگا خود کھانا اس کے لئے ناگزیر ہوگا۔ اور جہاں کہ حظِ نفس وجود میں آئے وہاں آخرت کی نیت دشوار ہوگی۔ سوائے اس کے کہ کارِ آخرت کا کام غالب ہو چکا ہو۔ پس مقصود یہ ہے کہ تو جان لے کہ نیت تیرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ نیت اس خواہش سے عبارت ہے جو تجھے کام میں لگا دے۔ اور تیرا کام تیری قدرت سے ہوتا ہے۔ اگر چاہے تو کرے اگر نہ چاہے نہ کرے۔ لیکن نیت تیرے بس میں نہیں کہ اگر تو چاہے تو کر لے اور نہ چاہے تو نہ کرے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ نیت پیدا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ پیدا نہ ہو۔ اور نیت کے پیدا ہونے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ تجھے یقین ہو جائے کہ تیری غرض اس دنیا میں یا اُس جہان میں کسی کام سے متعلق ہے تا کہ تو اس کا خواہاں ہو جائے اور جو کوئی اس راز سے بے بہرہ ہے بہت سی طاعات سے اس لئے رہ جاتا ہے کہ نیت حاضر نہیں ہوتی۔

ابن سیرینؒ نے حسن بصریؒ کے جنازے کی نماز نہ پڑھی۔ فرمایا کہ ''میں نماز کی نیت سے قاصر ہوں''۔ سفیان ثوریؒ سے لوگوں نے کہا کہ حماد بن سلیمانؒ کے جنازے کی نماز نہ پڑھو گے کہ علمائے کوفہ میں سے تھے؟ تو آپ نے جواب میں کہا کہ ''اگر نیت ہوتی تو میں شرکت کرتا''۔ کسی شخص نے طاوسؒ سے دعا کی درخواست کی تو فرمایا کہ ''صبر کرتا کہ نیت پیدا ہو جائے پھر دعا کروں گا''۔ حضرت طاوس سے جب حدیث کی روایت کی درخواست کی جاتی تھی تو ایسا بھی ہوتا کہ بیان حدیث نہ کرتے اور کبھی ایسا ہوتا کہ ناگاہ روایت حدیث میں لگ جاتے اور فرماتے کہ ''میں نیت کے انتظار میں تھا تا کہ پیدا ہو جائے''۔ ایک نے کہا کہ ''ایک مہینہ ہو گیا ہو گا کہ میں نیت کروں کہ فلاں بیمار کی عیادت کو جاؤں لیکن ابھی نیت ہی پیدا نہیں ہوئی''۔

مختصر یہ کہ جب تک کسی میں دین کی حرص اور اللہ کا خوف پیدا نہ ہو اس میں خیر کی نیت وجود پذیر نہیں ہوتی۔ بلکہ فرائض میں یہ نیت بہ جہد پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ جب تک کوئی خود کو دوزخ پر تامّل میں نہ لگائے اور اس کی آگ سے نہ ڈرائے خیر کی نیت پیدا نہ ہو۔ جب کسی نے یہ حقایق جان لئے ہوسکتا ہے کہ وہ فضایل کو چھوڑ دے اور مباحات میں لگ جائے۔ کیونکہ مباحات میں اس کی نیت اس طرح کی ہوتی ہے کہ کوئی قصاص کی نیت سے بہرہ مند ہو لیکن عفو کی نیت سے محروم ہو تو اس کے حق میں قصاص لینا خوب تر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی نماز عشاء کی نیت نہ پائے اور سونے کی نیت پائے تاکہ علی الصبح بیدار ہوسکے تو خواب اس کے لئے فاضل تر ہوگا۔ بلکہ اگر کوئی عبادت سے ملول ہوتا ہو اور جانتا ہو کہ اگر اپنی بیوی کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے سے یا کسی اور سے خوش طبعی کرنے پر نشاط واپس آجائے گا تو اس کی یہ خوش طبعی ملال کے ساتھ عبادت کی نیت سے بڑھ کر ہوگی۔ بودردؓ فرماتے ہیں کہ ''میں کبھی کبھی خود کو لہو اور آسایش دیتا ہوں تاکہ حق تعالیٰ کے لئے نشاط واپس مل جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اگر تو دل کو بہ جبر واکراہ کسی کام میں لگائے رکھے گا دل اندھا ہو جائے گا''۔ یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی طبیب بیمار کو گوشت دے اگرچہ بیمار تپ کا شکار ہو، تاکہ بیمار میں قوت پیدا ہو یا دوا کی تاب پیدا ہو۔ اسی طرح اگر کوئی میدانِ جنگ میں پسپائی اس لئے اختیار کرے کہ دشمن اس کا پیچھا کرے تو پھر وہ دفعۃً دشمن پر حملہ آور ہو جائے۔ اور فوجی اس طرح کی تدبیریں بہت کرتے ہیں۔ اور دین کی راہ بھی جنگ ومناظرے کی راہ ہے۔ اور اپنے نفس اور شیطان سے جنگ کی راہ ہے۔ اس لئے تلطّف اور حیلہ گری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ بات بزرگانِ دین کے نزدیک پسندیدہ تر ہے۔ اگرچہ علمائے ناقص اس کا طریقہ نہیں جانتے۔

فصل: جب تو نے جان لیا کہ نیت کے معنی ہیں 'عمل کا باعث' تو جان لے کہ کوئی شخص ایسا ہوتا ہے کہ جس کی طاعت کا باعث دوزخ کا خوف ہوتا ہے۔ اور کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس کی نیت کا باعث بہشت کی نعمت (کی امید) ہوتی ہے۔ اس لئے جو کوئی عمل بہشت کے لئے کرتا ہے وہ شکم وشرم گاہ کا اسیر ہے اور کوشاں ہوتا ہے کہ ایسی جگہ میں جائے جہاں اپنے شکم اور شرم گاہ کو سیر کر سکے۔ اور وہ جو طاعت دوزخ کے خوف سے کرتا ہے وہ ایسے برے غلام کی طرح ہے جو اپنے آقا کے خوف کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ تو ان دونوں کو اللہ تعالیٰ سے کوئی زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ بلکہ پسندیدہ وہ غلام ہے کہ جو بھی کرے وہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے کرے۔ نہ کہ بہشت کی امید کے لئے نہ دوزخ کے خوف سے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی اپنے معشوق کو معشوق ہی کے لئے دیکھے۔ اور اس لئے نہیں کہ اس کا معشوق اسے سیم وزر دے۔ کیونکہ جو کوئی سیم وزر کے لئے اسے دیکھے تو سیم وزر

اس کا معشوق ہوا نہ کہ خود وہ معشوق پس جس کا معشوق ومحبوب جلال و جمال حضرتِ الٰہیت نہیں اس کے ہاں سے ایسی نیت صورت پذیر کہاں ہوگی۔ اور جسے یہ نیت حاصل ہوگئی۔ اس کی عبادت سراسر خیالِ الٰہی میں تفکر اور اللہ کے ساتھ مناجات ہوتی ہے۔ اگر وہ جسم سے طاعت کرتا ہے تو اس لئے کہ محبوب کا حکم بجالانے کو دوست رکھتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے جسم کو بھی ریاضت دے اور حتی المقدور درگاہِ محبوب کی بندگی اور خدمت کی طرف کھینچے تا کہ اس جمالِ بے مثال کے نظارے سے دل کو باز نہ رکھے۔ وہ اگر گناہ سے دست کش ہوتا ہے تو اس لئے ہوتا ہے کہ شہوت مشاہدے اور مناجات کی لذت میں خلل انداز ہوتی ہے اور حجاب بن جاتی ہے۔ حقیقت میں ایسا ہی بندہ عارف ہوتا ہے۔

احمد خضرویہؒ نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا کہ کہہ رہے ہیں کہ "سب لوگ مجھ سے مانگتے ہیں سوائے بویزیدؒ کے جو خود مجھے طلب کرتا ہے" تو انھوں نے کہا کہ "لوگوں نے شبلیؒ کو خواب میں دیکھا تھا ان سے پوچھا کہ "اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا"؟ تو انھوں نے کہا کہ "ایک دفعہ میری زبان پر یہ جملہ آ گیا تھا کہ اس سے بڑا خسران کیا ہوگا کہ بہشت نہ مل سکے" اور حق یہ ہے کہ یہ دوستی اور اس کی لذت اصلِ محبت میں بیان ہونی چاہیئے؟ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اخلاص وفضیلت وحقیقت اور ان کے درجات کا بیان

اخلاص کی فضیلت: فرمانِ خداوندی سے اسے جانا جاسکتا ہے۔ فرمایا کہ: "وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللہَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ" (قرآن: ۵/۹۸) (اور نہیں فرمایا لوگوں کو سوائے ان کے جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے دین کو پاک رکھتے ہیں"۔ نیز فرمایا کہ: "اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ" (قرآن: ۳/۳۶) "اللہ ہی کے لئے دینِ خالص" اور نہیں فرمایا کہ خلق کو سوائے عبادت بہ اخلاص کے اور دینِ خالص اللہ تعالیٰ کے' اور دینِ خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور بس" اور آنحضرت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "اخلاص میرے اسرار میں سے ایک راز ہے جسے میں نے اس بندے کے دل میں ڈال دیا ہے جسے میں دوست رکھتا ہوں"۔ آپ ﷺ معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ "عمل اخلاص کے ساتھ کرتا کہ تھوڑا بھی کافی ہو" اور جو کچھ بھی ہم نے ریا کی برائی کی ذیل میں بیان کیا ہے وہ سب اخلاص کے باب میں ہے۔ کیونکہ نظرِ خلق بھی ان اسباب میں سے ہے جن کے باعث اخلاص جاتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اور سبب بھی ہیں۔ معروف کرخیؒ اپنے آپ کو تازیانے سے مارتے اور فرماتے تھے کہ "یا نفس اخلصی تخلصی" اے "نفس اخلاص کرتا کہ خلاصی پائے" اور ابوسلیمانؒ فرماتے ہیں کہ "خوش نصیب ہے وہ جس نے زندگی میں ایک قدم اخلاص سے

چاہا ہو جس میں سوائے اللہ تعالیٰ کی چاہت کے اور کچھ نہ ہو''۔ ابوایوب سختیانیؒ فرماتے ہیں کہ ''اصل نیت سے نیت کا اخلاص دشوار تر ہے''۔ ایک بزرگ کو لوگوں نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' تو انھوں نے فرمایا کہ ''جو کچھ اللہ تعالیٰ کے لئے کیا تھا وہ میں نے حسنات کے پلڑے میں دیکھا' اور ایک دھاگا ریشم کا جو میری کلاہ میں تھا اسے گناہوں کے پلڑے میں دیکھا۔ میرا ایک گدھا جو مر گیا تھا جس کی قیمت سو دینار تھی اسے میں نے نیکیوں کے پلڑے میں نہ دیکھا۔ تو میں نے کہا اے سبحان اللہ بلّی تو حسنات میں ہو اور گدھا نہ ہو'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جہاں اسے تم نے بھیجا تھا وہاں چلا گیا۔ تو نے جب سنا تھا کہ (گدھا) الا لعنۃ اللہ اگر تو کہتا فی سبیل اللہ تو تو اسے پالیتا' میں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ دیا تھا لیکن لوگوں کے سامنے اور وہ دیکھ رہے تھے اور لوگوں کا دیکھنا مجھے اچھا لگا تھا۔ تو وہ صدقہ میرے لئے مفید تھا نہ مضر''۔ سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ ''اس جوان نے بڑی دولت پائی کہ ایسے صدقے نے اسے ضرر نہ پہنچایا''۔

ایک شخص کہتا ہے کہ میں سمندر میں غزا کے لئے جا رہا تھا تو ہمارا ایک ساتھی ایک تھیلا بیچ رہا تھا میں نے کہا کہ میں خرید لوں اور اسے کام میں لاؤں اور فلاں شہر میں بیچ دوں گا اور اس سے نفع ہوگا۔ تو رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ دو شخص آسمان سے اترے تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ غازیوں کے نام لکھو کہ فلاں تجارت کے لئے آیا ہے اور فلاں سیر و تماشا کے لئے آیا ہے۔ اور فلاں ریاکاری کے لئے آیا ہے۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور کہا کہ لکھو کہ فلاں تجارت کے لئے آیا ہے' تو میں نے کہا اللہ اللہ میرے کام پر غور کرو میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تو میں تجارت کے لئے کیسے آیا ہوں؟ میں تو اللہ کے لئے آیا ہوں' تو اُس نے کہا کہ 'اے شیخ تو نے تھیلا نفع کے لئے نہیں خریدا؟' تو میں رونے لگا۔ اور کہا کہ واللہ میں تاجر نہیں ہوں تو اس نے دوسرے سے کہا کہ 'لکھ کہ فلاں غزا کے لئے آیا تھا اور راستے میں اس نے توبرہ نفع کے لئے خریدا؛ تاکہ اللہ جیسا چاہے اس کا فیصلہ فرمائے''۔ اسی لئے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ایک ساعت کے اخلاص میں ابدی نجات ہے۔ لیکن اخلاص بہت کمیاب ہے''۔ اور کہا گیا ہے کہ ''ایمان تخم ہے اور عمل کھیتی ہے جس کا پانی اخلاص ہے''۔ بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا تو اسے لوگوں نے بتایا کہ 'فلاں جگہ ایک درخت ہے اور ایک قوم اس کی پجاری ہے کہ اسے خدا سمجھ رکھا ہے' تو وہ غیظ میں آ گیا اٹھا اور کلہاڑی کندھے پر رکھی تاکہ اس درخت کو اکھاڑ پھینکے تو ابلیس ایک بوڑھے کے روپ میں راہ میں آ ملا اور کہنے لگا کہ کہاں کے ارادے ہیں؟ تو اس عابد نے کہا کہ میں جا رہا ہوں تاکہ اس درخت کو اکھاڑ پھینکوں' تو ابلیس نے کہا کہ نہ جاؤ وہاں۔ یہیں عبادت کرو کیونکہ تمھارے لئے یہ اس سے بہتر ہے' تو اس عابد نے کہا کہ یہی میری عبادت ہے اس لئے میں اس درخت کو نہ چھوڑوں گا۔ وہ ابلیس سے ہاتھا

پائی میں لگ گیا تو ابلیس کو زمین پر چت گرا کر اس کے سینے پر بیٹھ گیا تو ابلیس بولا "ہاتھ روک لے میں ایک بات بتاتا ہوں اگر تمھیں پسند نہ آئے تو پھر جو جی میں آئے کرنا۔ تو اس عابد نے ہاتھ روک لیا۔ ابلیس بولا: 'اے عابد تو مرد فقیر ہے اور تیرا خرچ لوگ برداشت کرتے ہیں' تو اگر تیرے پاس بھی کچھ ہو جو تو دوسرے عابدوں پر خرچ کرے تو تیرے لئے اس درخت کی بیخ کنی سے بہتر ہے۔ کیونکہ تو اگر اسے اکھاڑ پھینکے گا تو وہ اور بولیں گے۔ اس طرح پجاریوں کو کوئی ضرر نہیں ہونے کا۔ اس لئے اس کام کو ترک کر دے میں ہر روز دو دینار تیرے سرہانے رکھ دیا کروں گا۔ عابد نے سوچا اور یہ جانا کہ یہ ٹھیک کہتا ہے۔ میں ایک دینار صدقے میں دے دیا کروں گا اور ایک دینار اپنے لئے صرف کروں گا۔ تو یہ اُس درخت کے کاٹنے سے بہتر ہے۔ اور مجھے اسے کاٹنے کا حکم تھوڑے ہی ملا ہے۔ نہ میں پیغمبر ہوں کہ یہ مجھ پر واجب ہو۔ پس اس نے ارادہ ترک کر دیا۔ تو اگلے دن اس نے دیکھا کہ دو دینار موجود ہیں۔ اس نے وہ اٹھا لئے۔ دوسرے دن بھی دو دینار پائے تو اٹھا لئے۔ تو بولا یہ اچھا ہی ہوا کہ میں نے اس درخت کو نہ گرایا۔ تیسرے دن سرہانے کچھ بھی نہ پایا۔ تو غیظ و غضب میں آ گیا اور کلہاڑا اٹھایا اور اس درخت کی طرف چل پڑا۔ ابلیس نے آ کر پوچھا کہ "کہاں جا رہے ہو؟" کہا کہ "اس درخت کو اکھاڑنے جا رہا ہوں" تو ابلیس نے کہا تم جھوٹ کہہ رہے ہو کیونکہ مجھے اللہ کی قسم کہ تم اس درخت کو اکھاڑ نہیں سکتے۔ دونوں دست و گریباں ہو گئے تو ابلیس نے عابد کو چت گرا لیا۔ اور ایسے غالب ہوا جیسے کہ اس کے ہاتھ میں کوئی چڑیا ہو؟ ابلیس نے کہا کہ واپس لوٹ جا ورنہ میں ابھی تیرا سر ایسے ہی تن سے جدا کر دوں گا جیسے بکری کا سر کاٹتے ہیں۔ تو عابد نے اسے کہا رُک جاؤ تا کہ میں واپس لوٹ جاؤں لیکن سچ سچ یہ بتاؤ کہ پہلی دفعہ میں غالب آیا تھا اور اس دفعہ تم غالب آئے کیوں؟" تو ابلیس نے کہا کیونکہ اُس وقت تم اللہ تعالیٰ کے لئے خشمگین تھے اس لئے اللہ نے مجھے تمھارے ہاتھوں مغلوب کر دیا۔ کیونکہ جو کوئی عمل اللہ کے لئے کرتا ہے مجھے اس پر دسترس نہیں ہوتی۔ اس دفعہ تم اپنے لئے اور دیناروں کے لئے خشمگین ہوئے تھے اور جو کوئی بھی اپنی خواہش کے تابع کوئی اقدام کرے مجھے اس پر غلبہ ہوتا ہے"۔

حقیقتِ اخلاص: اے عزیز! جب تو جان چکا کہ نیت عمل کا باعث اور اس کی متقاضی ہوتی ہے۔ اگر وہ تقاضا ایک ہو تو اسے اخلاص کہتے ہیں اور اگر متقاضی دو ہوں تو چونکہ اس میں آمیزش ہو گئی لہٰذا نیت خالص نہ رہی۔ آمیزش یا شرکت کی مثال یہ ہے کہ کوئی روزہ اللہ تعالیٰ کے لئے رکھے۔ لیکن مقصود کھانا کھانے سے پرہیز بھی بہوائے تندرستی ہو۔ یا مقصد یہ ہو کہ خرچ کم ہو جائے۔ یا کھانا پکانے کی تکلیف سے چھوٹ جائے یا کوئی ایسا کام درپیش ہو یا اس میں لگ جائے تا کہ نیند نہ آئے اور وہ کام کر سکے۔ یا غلام اس لئے آزاد کر دے

کہ اس پر ہونے والے اخراجات سے نجات پائے یا غلام کی بری عادت سے نجات ہو۔ یا کوئی حج کرے تا کہ سفر سے قوی اور تندرست ہو جائے۔ یا سیر وسیاحت کرے اور شہروں کو دیکھے' یا بیوی اور ان کے رنج سے چنداں آزاد رہے۔ یا کسی دشمنی کے رنج سے نجات پائے یا نماز رات بھرادا کرتا رہے تا کہ نیند نہ آئے جس سے اپنے مال کی حفاظت کر سکے۔ یا کوئی علم اس لئے پڑھے کہ اپنی روزی اس سے حاصل کر سکے۔ یا اپنے اسباب اور غلّہ خیز زمین کی حفاظت کر سکے۔ یا اس لئے کہ عزیز اور صاحب حشمت ہو جائے۔ یا کوئی تدریس اور وعظ کرے تا کہ خاموشی کے رنج سے چھوٹے اور تنگ دل نہ ہو۔ یا کوئی قران کی کتابت اس لئے کرے کہ اس کا خط اچھا اور مستقیم ہو جائے۔ یا کوئی پیادہ حج کرے تا کہ کرایہ بچ جائے۔ یا کوئی وضو اس لئے کرے کہ خنک ہو اور پاکیزہ ہو جائے۔ یا کوئی غسل اس لئے کرے تا کہ اس کے جسم سے خوشبو پیدا ہو۔ یا کوئی مسجد میں اس لئے اعتکاف کرے کہ مکان کا کرایہ نہ دینا پڑے۔ یا کوئی سائل کو صدقہ اس لئے دے کہ اس کے اصرار اور الحاح سے چھوٹ جائے۔ یا کوئی فقیر کو کوئی چیز اس لئے دے کہ نہ دینے پر شرم سار ہوگا۔ یا کوئی بیمار کی عیادت کو جائے تا کہ جب وہ خود بیمار ہو تو وہ اس کی عیادت کو آئے یا اس لئے کہ بیمار اس سے گلہ نہ کرے اور آزار میں مبتلا نہ ہو۔ یا کوئی خیر اس لئے کرے کہ صلاح میں شہرت پائے۔ تو یہ ریاکاری ہوگی۔ اور ریاکاری کا حکم ہم بیان کر چکے ہیں لیکن اس قسم کے تمام خیالات اخلاص کو باطل کر دیتے ہیں۔ کم ہوں یا زیادہ۔ کیونکہ خالص وہ نیت ہوگی کہ جس میں اپنے نفس کا کوئی حصہ نہ ہو۔ بلکہ جو کام بھی کیا جائے وہ فقط اور فقط اللہ تعالیٰ ہی کے لئے کیا جائے اور بس۔ جیسے کہ لوگوں نے آنحضرت سے پوچھا تھا کہ ''اخلاص کیا ہے''؟ تو آپ ﷺ فرمایا کہ ''تو کہے کہ ''رَبِّیَ اللهُ ثُمَّ تَسْتَقِیْمُ کَمَا اُمِرْتُ ''یعنی میرا رب اللہ تعالیٰ ہے اور پھر تو راہ راست اختیار کر' جیسا کہ تجھ سے کہا گیا ہے''۔

اور جب تک انسان صفاتِ بشری سے نجات نہیں پاتا یہ کام سخت دشوار ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ کوئی چیز اخلاص سے زیادہ دشوار اور صعب تر نہیں۔ اگر مسافتِ زندگی میں ایک قدم بھی اخلاص کے ساتھ اٹھا تو نجات کی امید کی جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی عمل کو بشری اغراض وصفات سے پاک اور خالص انجام دینا ایسا ہی مشکل ہے جیسا کہ گوبر اور خون کے درمیان میں پاک دودھ کو نکالنا دشوار تر ہے۔ فرمان خداوندی ہے کہ:
''مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ'' (قرآن:۶۶/۱۶) (گوبر اور خون کے درمیان میں سے پاک صاف دودھ پینے والوں کے لئے) پس علاج اس کا یہی ہے کہ انسان پہلے دنیا سے دل کو منقطع کر لے۔ اور حق تعالیٰ کی محبت غالب ہو جائے تا کہ عاشق کی طرح ہو جائے جو وہی چاہتا ہے جو اس کا معشوق

چاہتا ہو۔ ایسا شخص اگر کھانا کھائے اور پھر قضائے حاجت کے لئے جائے تو اس میں بھی اخلاص کی نیت کر سکتا ہے۔ اور وہ شخص جس پر دنیا کی دوستی غالب ہو چکی ہو تو اس کے لئے نماز روزے میں اخلاص مشکل ہوگا۔ کیونکہ تمام اعمال دل کی صفات اختیار کر لیتے ہیں تو انسان اسی طرف راغب ہوتا ہے جس طرف اس کا دل راغب ہو۔ اور جس پر جاہ دوستی غالب ہو جائے تو اس کے تمام کاموں کا قبلہ لوگ ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ صبح کو جب ہاتھ منہ دھوتا اور لباس پہنتا ہے تو لوگوں کے لئے۔ اور وعظ کہنے، تعلیم اور روایتِ حدیث میں اخلاص پیدا کرنے سے کہ جن کا قبلہ لوگ ہوتے ہیں اور کوئی کام زیادہ مسکل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا بیشتر سبب قبولِ خلق ہوتا ہے یا اس میں اس کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ اور ساتھ قبولیت کا ارادہ بھی۔ جیسے تقرب کا قصد ہو یا اس سے قوی تر یا ضعیف تر۔ لیکن اس خیال سے دل کو پاک رکھنے سے اکثر علماء قاصر ہیں۔ اِلّا یہ کہ احمق سمجھیں کہ وہ مخلص ہیں۔ تو وہ اس فرض کی ادائیگی میں لگ جاتے ہیں۔ اور اپنے عیب سے بے خبر رہتے ہیں۔ بلکہ بہت سے زیرک بھی اس کے ادراک سے عاجز ہوتے ہیں۔

بزرگوں میں سے ایک کا ارشاد ہے کہ میں نے تیس سالہ نمازیں قضا کی ہیں۔ جو میں نے صفِ اول میں کھڑے ہو کر ادا کی تھیں۔ اس لئے کہ میں ایک دن ذرا دیر سے مسجد میں پہنچا تو آخری صف میں جگہ پائی۔ تو اپنے باطن میں لوگوں سے شرمندگی کا احساس ہوا کہ وہ کہیں گے کہ دیر سے آیا ہے۔ تو تب مجھے معلوم ہوا کہ میری ساری خوشی اس میں تھی کہ لوگ مجھے صفِ اوّل میں دیکھیں۔ پس اخلاص وہ راز ہے جس کا پہچاننا امر دشوار ہے۔ اور اس پر عمل پیرا ہونا دشوار تر ہے۔ اور جو کام اخلاص سے خالی ہو یا اس میں ملاوٹ ہو تو وہ ہرگز مقبول نہ ہوگا۔

فصل: معلوم رہے کہ بزرگوں نے کہا ہے کہ ایک عالم کی دو رکعت نماز ایک جاہل کی یک سالہ عبادت سے افضل تر ہے۔ اس لئے کہ جاہل عمل کی آفات سے بے خبر ہوتا ہے۔ اور اس کی اغراض سے آلودگی کو نہیں جانتا۔ اور سب کو خالص گمان کرتا ہے۔ عبادت میں کھوٹ ایسے ہی ہے جیسے سونے میں کھوٹ ہو۔ کیونکہ بعض زر اس قسم کا ہوتا ہے کہ جو بھی دیکھے اسے سونا گمان کرے۔ اور صیرفی بھی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ ماسوائے ماہر صرّاف کے۔ اور جاہلوں کا تو یہ حال ہے جو شے زر نہیں ہوتی اسے بھی زر ہی سمجھتے ہیں۔ محض اس بنا پر ظاہر صورت میں سونے کا سا ہوتا ہے۔ اور وہ کھوٹ جو عبادت سے اخلاص کو لے اڑتا ہے وہ چار درجوں کا ہوتا ہے۔ بعض پوشیدہ تر اور دقیق تر ہوتا ہے اور ہم اسے ریا میں دکھائیں گے تا کہ واضح ہو سکے۔

درجہ اوّل: یہ ہے کہ بندہ نماز ادا کرتا ہے کہ اور لوگ بھی وہاں آ جاتے ہیں تو شیطان اسے کہتا ہے کہ

اچھی طرح ادا کرتا کہ لوگ تجھے ملامت نہ کریں۔تو یہ کھوٹ نمایاں تر ہے۔

درجہ دوم: یہ ہے کہ انسان اس کھوٹ کو پہچانتا ہے اور اس سے حذر کرتا ہے تو شیطان اسے کہتا ہے کہ اور بھی خوبی سے کرتا کہ لوگ تیری پیروی کریں اور تجھے ان کی پیروی کا ثواب پہنچے تو ممکن ہے کہ انسان شیطان کے اس فریب کا شکار ہو جائے۔ اور نہ جانے کہ اقتداء کا ثواب اس وقت ہوتا ہے۔ کہ جب اس کے خشوع کا نور دوسروں میں سرایت کرے لیکن جب وہ خود خاشع نہ ہو لیکن دوسرے اسے خاشع گمان کریں۔تو دوسروں کو تو اس کا ثواب حاصل ہوگا۔لیکن وہ خود نفاق کے لئے ماخوذ ہوگا۔

درجہ سوم: یہ ہے کہ وہ یہ جانتا ہو کہ خلوت میں نماز ادا کرنا جلوت کے برخلاف عین نفاق ہے، لیکن خلوت میں نماز اس لئے ادا کرتا ہے تا کہ جلوت میں بھی اسی طرح خوبی کے ساتھ ادا کر سکے۔تو یہ بھی ریا سے خالی نہیں لیکن اس کی تشخیص دقیق تر ہے۔لیکن یہ رُو اور ریا وہ خود اپنے آپ سے کرتا ہے۔ کیونکہ اپنے آپ سے شرم رکھتا ہے کہ تنہائی میں جماعت کے برخلاف ہو۔اور اس غرض سے کہ جلوت میں بھی نماز اچھی طرح کرے وہ خلوت میں اچھی طرح نماز ادا کرتا ہے۔اور گمان یہ کرتا ہے کہ اس نے ریا سے نجات پالی جب کہ حقیقت میں تنہائی میں بھی ریا کار ہی ہوتا ہے۔

درجہ چہارم: یہ اور بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہ جو نہیں جانتا کہ خلا وملا میں خشوع لوگوں کے لئے بیکار ہے۔تو شیطان اس سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا خیال کر اور دیکھ کہ تو نہیں جانتا کہ کہاں کھڑا ہے۔تا کہ وہ پھر سوچے اور خاشع ہو جائے۔ اور لوگوں کی نگاہ میں آراستہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہو کہ خلوت میں اس قسم کا خیال اس کے دل میں عادتاً نہیں آتا تو اس کا سبب ریا ہے۔لیکن شیطان اسے اس طریقے سے باہر لاتا ہے تا کہ یہ بات اس پر پوشیدہ رہے۔ انسان جب خلق کو دیکھے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت کو یاد کرے تو اس کی یہ یاد کام نہ آئے گی۔ بلکہ چاہئے یہ کہ لوگوں کی نگاہیں یا حیوانات کی نگاہیں اس کیلئے برابر ہوں۔لیکن اگر ان میں ذرا فرق بھی پائے تو یہ ابھی ریا سے پاک نہیں۔اور یہ مثال ہم نے ریا میں بیان کی ہے۔اور دیگر اغراض میں کہ جن کا تذکرہ ہم قبل ازیں کر چکے ہیں۔ اس قسم کے دھوکے بہت ہیں۔تو جو کوئی ان باریکیوں کو نہیں پہچانتا وہ ہمیشہ اپنے آپ کو رنج میں رکھتا ہے اور بے مُزد جاں کھپاتا ہے۔اور جو کچھ کرتا ہے سب ضائع ہو جاتا ہے۔اس معنی میں حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: ''وَبَدَالَهُمْ مِنَ اللهِ مَالَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ '' (قرآن:۳۹/۴۷) (اور ظاہر ہوگا ان کے لئے وہ کام اور چیز کہ جس کا وہ گمان نہ کرتے تھے)۔

فصل: یاد رہے کہ جب نیت میں ملاوٹ ہوگئی تو اگر ریا کی نیت یا کوئی اور غرض عبادت کی نیت سے

غالب تر ہوگئی تو یہ مستوجب عقوبت ہوگی۔ اگر برابر سرابر ہوگی تو نہ انسان عقوبت کا مستوجب ہوگا نہ ثواب کا مستحق۔ لیکن اگر ریا کی نیت کمزور تر ہوگی تو یہ عمل ثواب سے خالی نہ ہوگا۔ اگر چہ احادیث میں یہ اشارہ موجود ہے کہ کہا جائے گا کہ چونکہ ملاوٹ تھی لہٰذا جاؤ ثواب اسی سے طلب کرو کہ عبادت جس کے لئے کی تھی۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ اس صورت میں ہے کہ جب دونوں قصد برابر ہوں۔ پس ثواب نہ ہوگا۔ جب طلب کرے گا تو کہا جائے گا کہ اسی شخص سے طلب کر۔ اور یہ کہ حدیث عقوبت کی دلیل ہے۔ تو مطلب اس کا یہ ہے کہ سراسر نیت ریا کی ہو نیتِ ریا غالب تر ہو لیکن اگر اصلی باعث اللہ تعالیٰ کا ثواب ہو اور دوسری غرض ضعیف ہو تو اسے ثواب سے خالی نہ رہنا چاہئے۔ اگر چہ یہ ثواب اس ثواب کے درجے کو نہیں پہنچتا جس میں سراسر خلوصِ نیت ہو۔ اور ہم نے یہ رائے ان دو دلیل کی بناء پر اختیار کی ہے:

ایک: یہ کہ ہمیں بہ برہان معلوم ہے کہ عقوبت کے معنی حضرتِ الٰہیت کی شایستگی سے دل کا دور ہونا ہے۔ اور یہ دوری آتش حجاب میں جلنے کا سبب ہوتی ہے۔ تقرب کا قصد خوش بختی کا تخم ہے اور قصدِ ریا شقاوت کا تخم ہے۔ اور ان دونوں نیتوں کو قبول کرنا انھیں مدد دینے کے مترادف ہے۔ جب کہ ایک انسان کو تقرب سے دور کرتی ہے تو دوسری اسے قریب لاتی ہے۔ جب یہ دونوں برابر ہوں تو ایک بالشت بھر دور ہو جاتی ہے تو دوسری بالشت بھر قریب ہو جاتی ہے گویا جہاں تھا وہیں ہے۔ اگر نیم بالشت نزدیک ہو جائے تو ایک خُسران اور بُعد حاصل ہوگا۔ اور اگر اسی قدر دور ہو جائے تو نزدیکی باقی رہے گی۔ ایسے ہی جیسے کوئی بیمار گرم شے کھائے اور اسی قدر ٹھنڈی شے کھائے، تو حساب برابر ہوا۔ اور اگر کمتر کھائے اور گرم شے میں کچھ بڑھائے۔ اور اگر بڑھائے تو گرم شے سے کچھ کم ہو جائے گا۔ معصیت اور طاعت دل کی روشنی اور تاریکی میں ایسا ہی اثر رکھتے ہیں جیسا کہ مزاج تن میں دوائیں اثر رکھتی ہیں۔ اور ان میں سے ایک ذرہ بھی ضائع نہیں ہوتا۔ اور میزان عدل میں اس کا جھکاؤ اور نقصان ظاہر ہو جاتا ہے۔ "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَه" (قرآن: ۷/۹۹) (جس نے مثقال بھر نیکی کی وہ اسے دیکھ لے گا)۔ لیکن احتیاط خردمندی کی بات ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ غرض کا قصد قوی تر ہو اور انسان اُسے ضعیف تر گمان کرے۔ اور سلامتی اس میں ہے کہ غرض کا راستہ سرے سے بند کر دیا ئے۔

دوسری دلیل: یہ ہے کہ اس پر علمائے ملت کا اجماع ہے کہ اگر کوئی حج کے راستے میں تجارت کرے تو اس کا حج ضایع نہیں ہوتا۔ اگر چہ ثواب اس کا اس حاجی کے ثواب کے برابر نہ ہوگا جو مخلص ہو۔ لیکن چونکہ اس کی اصل نیت، حج ہی کی تھی اور تجارت ایک ضمنی امر ہے تو اس کا ثواب کلیۃً باطل نہیں ہوتا۔ اگر چہ کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے غزا میں جانا چاہتا ہو لیکن ایک طرف مال دار کفار سے جنگ ہو اور دوسری طرف

کفار مفلس ہوں۔تو غازی اگر مال دار کفار سے جنگ کا انتخاب اس بناء پر کرے کہ مالِ غنیمت زیادہ ملے گا۔ تو اس کا غزا کا ثواب تمام تر ضایع نہ ہوگا۔ کیونکہ آدمی اس سے خالی نہیں ہوتا کہ اپنے باطن میں غنیمت کے پانے نہ پانے میں فرق نہ کرے اور عیاذ باللہ اگر شرط یہی مال غنیمت ہو تو ثواب کا پانا مشکوک ہو جائے گا۔اس لئے کہ ایسی شرط سے کوئی عمل درست نہیں ہوتا۔خصوصاً وعظ' تصنیف اور جو کچھ خلق سے متعلق ہے کہ جب تک کوئی خود کو اس سے الگ نہ کرے وہ اس سے خالی نہ ہوگا۔کہ مثلاً اس کی تصنیف کسی اور سے منسوب کریں یا اس کے کلام کو کسی اور سے نسبت دے دیں تو اس سے آگاہ ہو جائے۔اگر چہ یہ آگاہی اسے بُری معلوم ہو۔

———◆◆◆———

باب سوم: صدق کے بیان میں

یادر ہے کہ صدق اخلاص کے قریب قریب ہے اور درجہ اس کا بہت عظیم ہے۔اور جوکوئی صدق کے کمال کو پہنچتا ہے نام اس کا صدیق ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صدیق کی ثناء کی ہے کہ: ''رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ''(قرآن: ۲۳/۳۳)(وہ لوگ ہیں جنھوں نے صدق کیا اور اللہ کے ساتھ اس عہد باندھا)۔نیز فرمایا کہ: ''لِيَسْئَلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ''(قرآن: ۸/۳۳)(اور یہ عہد اس لئے لیا گیا کہ کل راست گووں سے راستی کا سوال کیا جائے)۔لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ''کمال کس بات میں ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''گفتار بحق اور کردار بہ صدق'' پس صدق کے معنی جاننا لازم ٹھہرا۔ صدق کے معنی راستی ہیں۔اور یہ صدق وراستی چھ چیزوں میں ہوتی ہے۔اور جو ان سب میں کمال کو پہنچے وہ صدیق ہوتا ہے۔

صدقِ اوّل:

زبان میں ہے کہ کبھی جھوٹ نہ کہے نہ ماضی کی خبر میں نہ اپنے موجود حال کے بارے میں اور نہ اس وعدہ کے باب میں جو مستقبل کے لئے کرے۔کیونکہ ہم اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ دل زبان سے صفت پذیری میں اثر لیتا ہے۔ٹیڑھی بات سے دل ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔اور راست گفتاری سے سیدھا ہو جاتا ہے۔اور اس صدق کا کمال دو چیزوں سے ہے:

ایک یہ کہ کنایۃً ایسے نہ کہے کہ وہ خود تو راست کہے لیکن سننے والا اس کو کچھ اور سمجھے۔الا یہ کہ راست گوئی میں مصلحت نہ ہو۔جیسے کہ حرب کے بارے میں۔یا میاں بیوی کی لڑائی میں یا دو مردوں میں صلح کرانے میں جھوٹ بولنے کی اجازت ہے۔لیکن کمال اس میں ہے کہ ایسے مواقع پر بھی جہاں تک ممکن ہو تعریض سے کام لے اور صریح دروغ گوئی نہ کرے۔پس اگر صادق ہے تو قصد و نیت میں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے کہے اور مصلحت خلق کے لئے کہے تو درجۂ صدیق سے نہیں گرتا۔

کمالِ دوم: یہ ہے کہ وہ جو حق تعالیٰ کے ساتھ مناجات میں اپنے آپ سے صدق طلب کرتا ہے جب کہتا ہے کہ ''وَجَّهْتُ وَجْهِيَ'' لیکن دل اس کا ریا کی طرف رخ کئے ہوئے ہو تو گویا اس نے جھوٹ کہا۔اور اس نے منہ اللہ تعالیٰ کی طرف نہ کیا ہوگا۔اور جب کہے کہ ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' یعنی میں تیرا بندہ ہوں اور تجھی کو پوجتا

ہوں‘‘اور نگاہ دنیا کی فکر میں ہو یا شہوت کی اسیر ہو اور شہوت پر اُسے قابو حاصل نہ ہو بلکہ وہ خود شہوات کا خادم ہو تو اس نے جو یہ کلمہ کہا جھوٹ کہا۔ کیونکہ وہ تو اس کا غلام ہے کہ اسی کی فکر میں ہے۔ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’’تَعِسَ عَبْدُالدِّرْهَمِ وَالدِّيْنَار ‘‘یعنی اسے زر و سیم کا غلام کہا۔ بلکہ جب تک کوئی تمام دنیا سے آزادی نہ پالے وہ اللہ کا بندہ نہیں ہوسکتا۔ اور اس آزادی و حریت کی تکمیل اس پر ہوتی ہے کہ بندہ خود سے بھی آزاد ہو جائے۔ جیسے کہ خلق سے آزاد ہو۔ تاکہ اسے کوئی ارادت نہ ہو بلکہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کچھ نہ چاہتا ہو۔ اور جو کچھ اللہ اس کے ساتھ کرے اس پر راضی ہو۔ اور یہ بندگی میں صدق کی تکمیل ہوگی۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو نام صدیق نہ ہوگا۔ بلکہ نام صادق بھی نہ ہوگا۔

صدق دوم: نیت میں ہوتا ہے کہ جو کچھ اس سے تقرب کرے تو اس سے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کچھ نہ چاہے نہ اس میں کسی اور نیت کی ملاوٹ کرے تو یہ اخلاص کہلائے گا۔ اور اخلاص کو بھی صدق کہتے ہیں۔ کیونکہ جس شخص کے ضمیر میں اللہ کے تقرب کے سوا کوئی اور شے بھی ہو تو وہ جو عبادت بھی کرے گا اس میں کاذب متصور ہوگا۔

صدقِ سوم: عزم میں ہوتا ہے کہ کوئی عزم کرے کہ اگر اس کی کوئی ولایت ہو تو انصاف کرے گا۔ اور اگر اس کے پاس مال بھی ہوگا تو صدقہ کرے گا۔ اور اگر کوئی ایسا سامنے آئے جو ولایت یا مجلس یا تدریس میں خود اس سے بڑھ کر ہو تو یہ مناصب اس کے حوالے کر دے گا۔ اور یہ عزم کبھی تو قوی ہوتا ہے اور جازم اور کبھی ضعیف ہوتا ہے یا اس میں ابھی تردد ہوتا ہے۔ اور اس بے تردد قوی عزم کو صدقِ عزم کہا جاتا ہے۔ جیسے کہ کہتے ہیں کہ ’’یہ شہوت کاذب ہے یعنی بے اصل ہے‘۔ اور صادق ہے یعنی کہ قوی ہے‘ اور صدیق وہ ہوتا ہے جو ہمیشہ اپنے باطن میں خیرات کا عزم انتہائی قوی پاتا ہو۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ’’اگر ایک ایسی قوم کہ جس میں ابوبکر موجود ہوں اس کی امارت سے مجھے برطرف کر کے قتل کر دیں تو مجھے یہ بات پسندیدہ تر ہوگی‘‘۔ کیونکہ حضرت عمر نے اپنے دل میں صبر کرنے اور جان قربان کرنے کا عزم قوی پالیا تھا۔ اور کوئی ایسا شخص ہو کہ اگر اسے یہ اختیار دے دیا جائے کہ اسے قتل کیا جائے یا ابوبکر کو قتل کیا جائے تو وہ اپنی زندگی کو عزیز تر رکھے گا۔ اور کتنا ہی فرق ہوگا۔ اس شخص مین اور اس میں جو ابوبکر کی موجودگی میں امیری اختیار کرنے کے جرم میں موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

صدقِ چہارم: ایفائے عزم کا نام ہے۔ کیوکہ ہوسکتا ہے کہ کسی کا عزم خود اس امر میں قوی ہو کہ جنگ میں جان فدا کرے گا اور اگر کوئی پیشوا ظہور کرے گا تو ولایت اس کے حوالے کر دے گا۔ لیکن جب اس کا وقت

آ تا ہے تو اس کا نفس اس کے ایفا پر آمادہ ہی نہیں ہوتا۔اسی معنی میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''رجال صدقوا ماعاھدوا اللہ علیہ'' (قرآن: ۲۳/۳۳) (ایسے لوگ ہیں کہ جو عہد انھوں نے باندھا اس پر پورے اترے اپنے اللہ کے ساتھ)۔یعنی کہ انھوں نے اپنے عزم کو ایفا کیا اور خود کو قربان کر دیا۔اور اس گروہ کے حق میں کہ جنھوں نے عزم کیا تھا کہ مال عطا کریں گے لیکن وفا نہ کی یہ فرمایا کہ: ''وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنۡ اٰتٰنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ○ فَلَمَّاۤ اٰتٰهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ'' (قرآن: ۷۵/۹ و ۷۶) (اور ان میں سے کوئی ایسا ہے کہ جس نے اللہ سے عہد کیا تھا اور کہا تھا کہ اگر ہمیں اللہ اپنے فضل سے کچھ عطا فرمائے گا تو ہم اسے بہمہ حال صدقہ کر دیں گے۔اور اس مال سے ہم نیکوں میں سے ہو جائیں گے۔اور جب اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے فضل سے عطا فرمایا تو وہ بخیل ثابت ہوئے اور اس عہد و پیمان سے وہ پھر گئے۔اور وفا سے روگردانی کی) یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ''بِمَا كَانُوا يَكۡذِبُوۡنَ'' (قرآن: ۷۷/۹) (اس جھوٹ کی بناء پر کہ جو وہ کہتے تھے) حتیٰ کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے اس عہد و وعدہ میں کاذب کہا۔

صدقِ پنجم: یہ ہے کہ کسی عمل کو اس طرح نہ دکھائے جس طرح کہ اس کے باطن کی کیفیت ہو۔مثلاً اگر کوئی راستے میں آہستہ آہستہ چلے لیکن اس کے باطن میں وقار نہ ہو تو وہ صادق نہ سمجھا جائے گا۔اور یہ صدق ظاہر و باطن کو یکساں رکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔اور یہ اس کے ہاں ہوتا ہے کہ جس کا باطن اس کے ظاہر سے بہتر ہو یا ظاہر جیسا ہو۔اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''بارِ خدایا میرا باطن میرے ظاہر سے بہتر بنا دے''۔ تو جو کوئی اس صفت پر نہ ہو تو ظاہر کا باطن پر دلالت کرنا کاذب ہوگا اور وہ صدق سے گر جائے گا۔اگرچہ مقصود اس کا ریا نہ ہو۔

صدقِ ششم: یہ ہے کہ مقاماتِ دین میں صدق کی حقیقت کو اپنی ذات سے طلب کرے اور تاویل وظواہر پر قناعت نہ کرے۔جیسے کہ زُہد' محبت' توکل' خوف' رجا' رضا اور شوق ہیں کہ کوئی مومن بھی ان احوال سے کلیۃً خالی نہیں ہوتا۔لیکن ضعیف ہوتا ہے۔اور جو اس میں قوی ہو صادق وہ ہوتا ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ''اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ لَمۡ يَرۡتَابُوۡا'' یہاں تک کہ فرمایا کہ: ''اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ'' (قرآن: ۱۵/۴۹) (مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔اور پھر کسی شک میں مبتلا نہیں ہوئے تو وہی ہیں کہ اگر کہیں کہ ہم مومن ہیں اور وہ اس کہنے میں سچے ہیں)۔

پس جس کسی کا ایمان کامل ہوا سے اللہ تعالیٰ نے صادق کہا۔اور مثال اس کی یہ ہے کہ کوئی کسی چیز سے

ڈرتا ہے تو علامت اس کی یہ ہوتی ہے کہ جسم اس کا کانپتا ہے چہرہ زرد ہو جاتا ہے اور کھانے پینے کا اسے ہوش نہیں ہوتا اور وہ بے قرار ہوتا ہے تو اگر کوئی اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈرے تو کہا جائے گا کہ یہ خوفِ صادق ہے۔ لیکن اگر کوئی زبان سے تو یہ کہے کہ میں معصیت سے ڈرتا ہوں لیکن ہاتھ معصیت سے نہ روکے تو اسے کاذب کہا جائے گا۔ تمام مقامات سلوک میں بھی تفاوت اس طرح بہت ہے۔ پس جو کوئی ان چھ معنوں میں کاملاً صادق ہو اور کمال درجے میں ہو تو اسے صدیق کہتے ہیں۔ لیکن وہ جو ان میں سے بعض میں صادق ہو اسے صدیق نہیں کہتے درجہ اس کا اس کے صدق کے مطابق قرار پائے گا۔

◆◆◆

اصل ششم: محاسبہ اور مراقبت کے بیان میں

یاد رہے کہ خدائے تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم روزِ قیامت ترازو قائم کریں گے؟ اور ہم کسی پر ظلم نہ کریں گے۔ تو جس نے ذرہ بھر نیکی یا بدی کی ہوگی وہ لائیں گے اور ترازو میں رکھ دیں گے اور لوگوں کے حساب کو چکائیں گے اور ہم اس کے لئے کافی ہیں۔ فرمایا کہ: ''وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا '' (قرآن: ۴۷/۲۱) پس یہ وعدہ دیا تو خلق سے فرمایا کہ اس دنیا میں اپنے حساب پر نظر رکھیں فرمایا کہ: ''وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ '' (قرآن: ۱۸/۵۹) (اور جو کوئی غور کرتا ہے کہ اس نے اپنے کل کے لئے کیا چیز آگے بھیجی ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے خشم و عذاب سے ڈرا کہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے آگاہ ہے)۔ حدیث میں ہے کہ ''عاقل وہ ہے کہ جس کی چار ساعتیں ہوتی ہیں: ایک ساعت کہ وہ اپنا حساب کرتا ہے۔ دوسری ساعت وہ کہ اللہ تعالیٰ سے مناجات کرتا ہے' تیسری ساعت وہ اپنی معاش کی تدبیر کرتا ہے۔ اور چوتھی ساعت وہ ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں اس کے لئے مباح کر دیا گیا ہے اس پر قانع رہتا ہے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ''حَاسِبُوْا اَنْفُسَكُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوا ''یعنی اپنا حساب خود کر لو قبل اس کے کہ تمھارا حساب تمھارے سامنے رکھا جائے۔ اور فرمان خداوندی ہے کہ: ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا ''صبر کرو' وَصَابِرُوْا ' اپنے نفس اور شہوت کے ساتھ خوب جہاد کرو' وَرَابِطُوْا ' (قرآن: ۲۰۰/۳) (اور اس جہاد میں پافشاری کرو۔ پس اہل بصیرت اور بزرگانِ دین نے پہچان لیا کہ وہ اس جہان میں تجارت کے لئے آئے ہیں۔ اور لین دین ان کا نفس کے ساتھ ہے۔ اور اس معاملے کا نفع و نقصان بہشت اور دوزخ کی

صورت میں ہے۔ بلکہ ابدی سعادت اور شقاوت ہے۔ پس اپنے نفس کو معاملے میں اپنا شریک بنایا اور جس طرح شراکتِ کار میں پہلے شرایط طے کرتے ہیں اور پھر اس پر قائم رہتے ہیں اور پھر حساب کرتے ہیں تو اگر شریک نے خیانت کی ہو تو اس پر عقوبت اور عتاب کیا جاتا ہے۔ پس وہ اپنے اپنے نفس کے ساتھ ان چھ مقامات پر کھڑے ہیں: مشارطت، مراقبت، محاسبت، معاقبت، مجاہدت و معاتبت۔

مقام اوّل: مشارطت کے بیان میں

یاد رہے کہ جس طرح شریکِ کار کو مال دیتے ہیں کہ وہ نفع اندوزی میں معاون ہوتا ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ دشمن ہو جائے اور خیانت کی طرف راغب ہو جائے۔ جس طرح شریکِ کار کے ساتھ پہلے شرایط طے کر لینی چاہئیں اور متواتر اس پر مواظب رہنا چاہئے۔ اور حساب میں خوب چھان پھٹک کرنی چاہئے۔ تو خود اپنے نفس کے ساتھ تو یہ عمل اولیٰ تر ہے۔ کیونکہ اس معاملے کا نفع ابدی ہوتا ہے۔ جب کہ معاملتِ دنیا کا نفع چند روزہ ہوتا ہے۔ اور جو چیز باقی رہنے والی نہ ہو صاحب خرد کے نزدیک بے قدر ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ شر جو باقی رہنے والا ہے وہ اس خیر سے بہتر ہے جو باقی نہ رہے۔ اور چونکہ انفاسِ عمر میں ہر نفس ایک نفیس گوہر ہے کہ جس کے ذریعے ایک خزانہ جمع کیا جاسکتا ہے تو اس میں حساب اور چھان پھٹک اولیٰ تر ہے۔

پس عاقل وہ ہے جو روز نمازِ فجر کے بعد ایک ساعت دل کو فارغ کرے اور اس کام کے لئے اپنے نفس سے کہے کہ: ”میرا کوئی راسُ المال سوائے عمر کے نہیں ہے۔ اور جو لمحہ بھی گذر گیا اس کا نعم البدل نہیں ہوتا۔ کہ سانس گنے چنے ہیں اور اللہ ہی کو معلوم ہیں اور اُن انفاس میں یقیناً اضافہ نہیں ہوسکتا۔ جو عمر گذر گئی تو اسے لوٹایا نہیں جاسکتا اور کام ابھی باقی ہے اور زمانہ مختصر ہے۔ اور آخرت اگرچہ وسیع ہے لیکن وہاں عمل نہ ہوگا اور آج کا دن تمھارے تصرف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عمر عطا کی ہے۔ اگر موت آ پہنچی تو تم یہ آرزو کرتے کہ تمھیں ایک دن کی اور مہلت دی جائے تا کہ اپنا کام سیدھا کرسکو۔ اب چونکہ تمھیں یہ مہلت حاصل ہے تو اے میرے نفس تو اس وقت اتنا بڑا سرمایہ رکھتا ہے اسے کبھی ضائع نہ کرنا کیونکہ کل مہلت نہ ہوگی اور سوائے حسرت کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے آج ہی یہ فرض کر لے کہ تو مر گیا ہے اور تو چاہتا ہے کہ ایک دن کی مہلت اور دیں۔ اب وہ مہلت تجھے دی گئی ہے۔ اس لئے اس سے بڑھ کر خسران اور کیا ہوگا کہ تُو وقت کو ضائع کرے اور اس سے اپنی سعادت حاصل نہ کرے۔ حدیث میں ہے کہ ”کل ہر روز شب کہ جس کے چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں بندے کے سامنے چوبیس خزانے لائے جائیں گے: ایک دروازہ کھولیں گے جسے انسان پُرنور دیکھے گا ان حسنات سے کہ جو اس نے اس ساعت میں کی ہوں گی۔ تو اُس سے اِس قدر خوشی، راحت اور نشاط اس کے

دل کو پہنچے گا کہ اگر اِس خوشی کو تمام اہلِ دوزخ پر تقسیم کردیں تو وہ آتشِ دوزخ سے بے خبر ہو جائیں اور وہ خوشی اس لئے ہوگی کہ جانتا ہے کہ یہ انوارِ حق تعالیٰ کے نزدیک قبولیت کا ذریعہ بنیں گے۔ پھر ایک اور خزانے کا دروازہ کھولا جائے گا جو سیاہ ہوگا اور انسان اسے مظلم دیکھے گا۔ اور شدید بدبو اس میں سے خارج ہو رہی ہوگی کہ تمام اہل قیامت اپنی اپنی ناکیں پکڑ لیں گے۔ ایسی کہ اگر اسے تمام اہل بہشت پر بانٹ دیا جائے تو نعمتِ بہشت سب بہشتیوں کے لئے منغص ہو جائے۔ پھر ایک اور دروازہ کھولا جائے گا کہ جو تاریک ہوگا نہ روشن تو وہ اس ساعت کا آئینہ دار ہوگا کہ جس کو انسان نے ضائع کیا ہوگا۔ تو اس سے اس قدر حسرت وغبن اس کے دل میں پیدا ہوگی جیسے کہ کوئی کسی عظیم مملکت پر نیز بڑے خزانے پر قادر ہو لیکن وہ اُسے بے کار چھوڑ دے حتیٰ کہ ضائع ہو جائے اور اس طرح ایک ایک کر کے اس کی تمام ساعات کو اس کو دکھایا جائے گا''۔ پس انسان کو اپنے نفس سے کہنا چاہئے کہ ''اے نفس اس طرح کے چوبیس خزانے تیرے سامنے رکھے گئے ہیں۔ خبردار! کسی ایک کو بھی فارغ نہ چھوڑنا کیونکہ تو ان کی حسرت کی تاب نہیں رکھتا'' بزرگوں نے کہا ہے کہ: ''مانا کہ تجھے معاف کر دیا جائے گا۔ لیکن تجھ سے نیکوکاروں کا درجہ اور ثواب تو فوت ہو جائے گا اور تو غبن کا شکار ہوگا''۔ پس چاہئے کہ اپنے جملہ اعضا کو اپنے نفس کے حوالے کر کے کہے کہ ''خبردار زبان پر، آنکھ پر اور دیگر جملہ عضاء پر کڑی نظر رکھنا'' اور جو یہ کہا گیا ہے کہ دوزخ کے سات دروازے ہیں تو یہ تیرے اعضاء ہی اس کے دروازے ہیں لیکن جن میں سے ہر ایک سے دوزخ میں جایا جا سکتا ہے۔ پس ان اعضا کے معاصی کو یاد میں لائے کہ ان میں سے ہر ایک سے کون سی معصیت کا ارتکاب ہو سکتا ہے تو اس سے احتراز کرے۔ اسی طرح ان اعضا سے جو عبادت کی جا سکتی ہے اسے یاد کرے اور اسے اس کی رغبت دلائے۔ اور عزم بالجزم کرے اور اپنے نفس کو ڈرائے کہ اگر اس کے خلاف کرے گا تو سزا پائے گا۔ نفس ہر چند سرکش ہے لیکن نصیحت کو قبول کرتا ہے اور ریاضت کا اثر اس پر ہوتا ہے۔

یہ وہ محاسبہ ہے جو عمل سے پہلے ہونا چاہئے۔ جیسے کہ فرمانِ خداوندی ہے کہ: ''وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ'' (قرآن: ۲/۲۳۵) (جان لو کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے اس سے حذر کرو)۔ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''زیرک وہ ہے جو اپنا حساب خود کرتا ہے اور ایسا عمل کرتا ہے جو موت کے بعد اس کے کام آئے''۔ نیز فرمایا کہ: ''جو کام بھی سامنے آئے تو اسے غور سے دیکھ اگر راہ وہی ہے تو وہ کام کر اور اگر بے راہی ہے تو مت کر اس سے دور رہ''۔ پس نفس کو ہر صبح اس قسم کی شرط کی ضرورت ہے سوائے اُس کے جو راستی پر قائم ہو۔ پھر بھی ہر نیا دن نئے مسائل سے خالی نہیں ہوتا اس لئے اُسے

بھی شرط کی حاجت ہوگی۔

مقامِ دوم: مراقبے کے بارے میں

مراقبت کے معنی پاسبانی اور محافظت کے ہیں۔ جیسے کہ سرمائے جب شریک کار کا حوالے کرتے ہیں تو اس کے ساتھ شرط عاید کرتے ہیں۔ تو چاہئے کہ انسان اس سے غافل نہ رہے۔ اور مواظب رہے۔ اسی طرح نفس پر ہر وقت مواظب رہنا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر انسان اس سے غافل ہوجائے تو نفس کاہلی اور شہوت رانی میں اپنی فطرت کے مطابق لگ جاتا ہے۔ اور حقیقی مراقبت یہ ہے کہ انسان جان لے کہ اللہ تعالیٰ اس پر آگاہ ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے اور وہ کرتا کیا ہے۔ لوگ تو انسان کا ظاہر دیکھتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن دونوں کا شاہد ہے۔ جس نے یہ راز پالیا اور اس کے دل پہ معرفت کی محبت غالب ہوگئی تو اس کے ظاہر اور باطن دونوں مہذّب ہوجاتے ہیں کہ اگر ایمان نہیں رکھتا تو کافر ہے اور اگر ایمان دار ہے تو اس کا مخالفتِ حق کرنا بڑی جسارت ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی'' (قرآن: ۹۶/۱۴) (تو نہیں جانتا کہ اللہ تجھے دیکھ رہا ہے؟) ایک حبشی نے آنحضرت ﷺ سے کہا تھا کہ ''میں بہت گناہ گار ہوں کیا میری توبہ قبول ہوگی؟'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''ہاں ہوگی'' پھر بولا کہ ''جب میں گناہ کررہا تھا تو کیا اس وقت اللہ مجھے دیکھ رہا تھا'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہاں دیکھ رہا تھا'' تو اس نے کہا ''افسوس'' اور ایک نعرہ مارا اور جان دے دی۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''عبادت اس طرح کر کہ گویا تُو اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ نہ کرسکے تو یہ حقیقت سمجھ لے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے''۔ اور سوائے اس کے کہ تجھے علم ہو کہ اللہ تجھے ہر حال دیکھتا ہے کام ٹھیک نہیں ہوتا جیسے کہ فرمان خداوندی ہے کہ: ''اَنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبا'' اور کمال اس میں ہے کہ تُو ہمیشہ اللہ کے مشاہدہ میں رہے اور اُسے دیکھے۔ پیروں میں سے ایک کا ایک ایسا مرید تھا کہ وہ دوسرے مریدوں کی نسبت اس کا زیادہ لحاظ کرتے تھے تو ان مریدوں کو اس پر غیرت آئی تو پیر نے ہر مُرید کو ایک ایک مرغی دی کہ اسے ایسی جگہ لے جاکر ذبح کرو جہاں کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ تو ہر ایک نے جیسے جیسے خلوت کی جگہ دیکھی مرغی ذبح کردی۔ لیکن وہ مرید مرغی زندہ واپس لے آیا۔ تو پیر نے کہا کہ ''تم نے مرغی ذبح کیوں نہیں کی؟'' تو وہ بولا کہ ''مجھے کوئی ایسی خالی جگہ نہیں ملی جہاں کوئی نہ دیکھتا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ دیکھتے ہیں''۔ پس پیر نے اس طرح اس کا درجہ دوسرے مریدوں کو دکھایا کہ وہ مرید بردوام مشاہدہ حق میں ہوتا ہے اور کسی دوسری طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

جب زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی طرف دعوت دی تو پہلے اٹھی اور اس بت کو جسے وہ بہ طور خدا پوجتی تھی کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ پتھر کے ایک ٹکڑے سے تو حیا کرتی

ہے تو کیا میں اپنے خالق سے جس نے سات آسمان وزمین پیدا کئے جو دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے شرم نہ کروں؟''

ایک شخص نے حضرت جنیدؒ کو دیکھا تو کہا کہ ''میں اپنی آنکھوں کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ میں کس طرح ان پر قابو پاؤں؟'' تو آپؒ نے فرمایا کہ ''اس سے کہ تُو جانے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر تجھ پر تمھاری دوسروں پر نظر کی نسبت کہیں زیادہ ہے''۔

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''بہشتِ عدن ان لوگوں کے لئے ہے جو معصیت کا ارادہ کرتے ہیں تو وہ میری عظمت کو یاد کرتے ہیں۔ تو رُک جاتے ہیں اور میری شرم رکھتے ہیں''۔ عبداللہ بن دینارؒ نے کہا ہے کہ ''میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مکے کی راہ پر تھا۔ تو ہم ایک جگہ اترے تو ایک چرواہا بکریاں پہاڑ سے نیچے لایا تو عمر رضی اللہ عنہ نے چرواہے سے کہا کہ ایک بکری ہمارے ہاتھ بیچ دے''۔ تو اس نے کہا کہ میں تو نوکر ہوں اور یہ بکریاں میری مِلک نہیں ہیں''۔ تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مالک سے کہہ دینا بھیڑیا لے گیا۔ اسے کیا پتا''؟ تو وہ بولا کہ آخر اللہ تو جانتا ہے اگر چہ میرا آقا نہیں جانتا''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری ہو گیا۔ آپ نے اس کے مالک کو طلب فرمایا اور اس غلام کو خرید کر آزاد کر دیا اور فرمایا ''تجھے تیری اس ایک بات نے اس دنیا میں آزادی دلا دی اور مجھے اُس جہان میں آزادی دلائے گی''۔

فصل: یاد رہے کہ مراقبت کی دو صورتیں ہیں:

ایک مراقبت صدیقوں کی ہے کہ دل ان کا حق تعالیٰ کی عظمت میں مستغرق ہوتا ہے اور اللہ کی ہیبت سے شکستہ ہوتا ہے اور اس میں ماسوا اللہ کی جانب التفات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ مراقبت مختصر ہوتی ہے۔ جب دل حق پر قائم ہو گیا تو اعضاء خود اس کے ماتحت ہوتے ہیں۔ تو ایسا شخص تو مباحات سے دست کش ہوتا ہے وہ معاصی میں کیونکر لگ سکتا ہے اور اسے کسی تدبیر اور حیلے کی حاجت نہیں ہوتی کہ جوارح کی پاسبانی کرے اور یہ وہ صورت ہے جس کے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''مَنْ اَصْبَحَ وَھُمُومُہ ھماً وَاحِداً کفاہ اللّٰہُ ھُمُومَ الدُّنیا وَالآخِرۃ'' یعنی جو کوئی علی الصبح ایک ہمت پر اٹھے تو وہ اس کے جملہ کاموں کے لئے کافی ہے۔ اور کوئی ایسا ہوتا ہے اس میں وہ ایسے مستغرق ہوتا ہے کہ اگر کوئی اُس سے بات کرے تو وہ نہیں سنتا اور اگر کوئی اس کے سامنے آئے باوصف اس کے کہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں وہ اسے نہیں دیکھتا۔ عبدالواحد بن زیدؒ سے لوگوں نے کہا کہ ''کسی ایسے شخص کو جانتے ہو کہ جو اپنے حال میں خلق میں مشغول ہوا ہو''؟ انھوں نے فرمایا کہ ''میں ایک کو جانتا ہوں جو ابھی آنے والا ہے''۔ اتنے میں عتبۃ الغلام داخل ہوا تو انھوں نے اس سے سوال

کیا کہ ''راستے میں کس سے ملے؟'' تو عتبہ نے کہا کہ ''کسی سے بھی نہیں ملا''۔ حالانکہ راستہ اس کا بازار میں سے تھا۔ یحییٰ زکریا علیہ السلام ایک عورت کے پاس سے گذرے تو انھوں نے اس پر ہاتھ مارا جس سے وہ گر گئی۔ تو لوگوں نے آپ سے کہا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟'' تو فرمایا ''کہ میں نے سمجھا کہ دیوار ہے'' اور ایک کا بیان ہے کہ ''میں ایک جماعت کے پاس سے گذرا جو تیراندازی کررہے تھے۔ اور ایک شخص ان سے دور بیٹھا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس سے بات کروں تو وہ بولا ''اللہ تعالیٰ کا ذکر باتوں کی نسبت اولیٰ تر ہے۔ میں نے کہا کہ ''تو تنہا ہے؟'' تو وہ بولا کہ ''نہیں'' کیونکہ خود اللہ تعالیٰ اور دو فرشتے میرے ساتھ ہیں''۔ میں نے کہ کہا کہ اس جماعت میں سے سبقت کسی نے پائی؟'' تو فرمایا کہ ''جسے اللہ تعالیٰ نے بخش دیا''۔ میں نے پوچھا کہ ''وہ راہ کس طرف ہے؟'' تو اس نے رخ آسمان کی طرف کیا۔ اٹھا اور چلا گیا۔ اور کہا کہ: ''بارِ خدایا بیشتر لوگ تجھ سے شاغل ہیں''۔ شبلیؒ ابوالحسین نوریؒ کے پاس گئے تو انھیں مراقبت میں ساکن بیٹھے دیکھا کہ اُن کے جسم پر ایک بال بھی حرکت میں نہ تھا۔ تو شبلی نے کہا ''اس خوبی کی مراقبت آپ نے کس سے سیکھی؟'' تو فرمایا کہ ''بلی سے'' کہ جسے میں نے چوہے کے بل پر دیکھا کہ وہ چوہے کے انتظار میں مجھ سے بھی ساکن تر بیٹھی تھی''۔ ابوعبداللہؒ خفیف کہتے ہیں کہ ''مجھے لوگوں نے بتایا کہ'' کچھ لوگ پیری اور جوانی کے رُوپ میں یہ دوام مراقبت میں ہیں''۔ تو میں وہاں گیا؟ تو میں نے دو شخصوں کو دیکھا کہ رُو بقبلہ بیٹھے ہیں۔ میں نے تین بار سلام کیا لیکن انھوں نے سلام کا جواب نہ دیا۔ تو میں نے کہا کہ ''تمھیں اللہ تعالیٰ کی قسم کہ میرے سلام کا جواب دو'' تو جوان میں جوان تھا بولا ''یا ابن خفیف! یہ دنیا مختصر ہے اور اس مختصر میں سے ذراسی سے کچھ زیادہ باقی نہیں۔ اور اس تھوڑی سے اپنا حصہ زیادہ تر لے لے۔ اے ابن خفیف تو بہت فارغ ہے۔ کہ ہمارے سلام میں مشغول ہو'' یہ کہا اور سر جھکالیا۔ اور میں بھوکا پیاسا تھا میں نے بھوک پیاس کو فراموش کر دیا۔ اور مجھے انھوں نے سراسر اپنالیا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ اور ان کے ساتھ میں نے ظہر اور عصر کی نماز ادا کی۔ تو میں نے کہا مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔ تو اس نے کہا کہ ''اے ابن خفیف ہم اہل مصیبت ہیں ہمیں نصیحت کی زبان نہیں ملی''۔ میں وہاں تین دن ٹھہرا۔ اس دوران میں نہ ہم نے کچھ کھایا نہ سوئے۔ پھر میرے جی میں آیا کہ میں انھیں قسم دوں تاکہ مجھے نصیحت کریں۔ اور ابھی میں نے کچھ بھی کہا نہیں تھا کہ اس جوان نے سر اٹھایا اور کہا کہ ''ایسے شخص کی صحبت طلب کر کہ جس کا دیدار تجھے اللہ تعالیٰ کی یاد دلائے اور اس کی ہیبت تیرے دل میں جاگزیں ہو جائے۔ اور تجھے بذریعہ زبانِ فعل نصیحت دے۔ نہ کہ گفتار کی زبان سے'' والسّلام'' تو یہ ہے حال اور درجہ صدیقوں کا کہ وہ تمام تر حق تعالیٰ میں مستغرق ہوتے ہیں۔

دوسرا درجہ پارساؤں اور اصحاب الیمین کی مراقبت کا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جانتے ہیں کہ اللہ ان سے آگاہ ہے اور وہ اس سے شرم رکھتے ہیں۔ لیکن وہ حق تعالیٰ کی عظمت وجلال میں مستغرق نہیں ہوتے بلکہ خود اپنے آپ سے نیز احوالِ عالم سے باخبر ہوتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ کہ تنہا کام کرے یا خود کو برہنہ رکھے تو اگر کوئی چھوٹا لڑکا وہاں آ نکلے تو اس سے شرم کرے اور اپنے اختیار سے اپنا ننگ ڈھانپ لے۔ اور اس دوسرے کی مثال ایسے ہے کہ ناگاہ اس کے پاس بادشاہ آ نکلے جس سے بادشاہ کی ہیبت کی بناء پر اس پر دہشت طاری ہو جائے اور بے خودی میں اپنا ننگ ڈھانپے اور خود ایک جگہ سے گر کر ہیبت کی وجہ سے مدہوش ہو جائے۔ پس جو کوئی اس درجے میں ہوا سے اپنے اعمال، خاطرات اور حرکات سب کی مراقبت کرنی چاہیئے اور جو کام بھی کرنا چاہے اسے دو نظروں سے دیکھنا چاہیئے۔

نظر اوّل قبل اس کے کہ وہ کرے بلکہ شروع خیال سے کہ دل میں آئے اس پر نظر رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ دل کی مراقبت کرتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ اس میں کیا فکر پیدا ہوتی ہے۔ تو وہ دیکھتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کے لئے ہو تو اسے پورا کرتا ہے۔ اگر ہوائے نفس میں ہو تو رک جاتا ہے اور خدائے تعالیٰ سے شرم کرتا ہے۔ اور خود کو برا بھلا کہتا ہے کہ یہ داعیہ کیوں اس کے باطن میں پیدا ہوا اور آخرت کی فضیحت اور عاقبت کار اپنے آپ کو سمجھاتا ہے۔ تمام اندیشوں کی ابتداء میں یہ مراقبت فرض ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ ہر حرکت یا سکون جو انسان اپنے اختیار سے کرتا ہے تو تین دیوان اس کے سامنے رکھے جاتے ہیں:

ایک یہ کیوں؟ دوسرے یہ کہ کیسے؟ تیسرے یہ کہ کس کے لئے؟ 'کیوں' کے معنی یہ ہیں کہ کہا جائے گا کہ تیرا فرض تھا کہ جو کچھ کرے حق تعالیٰ کے لئے کرے۔ تو نے شہوتِ نفس پر یا شیطان کی موافقت میں کیوں کیا؟ اگر اس سوال پر سلامتی پا جائے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے لئے ہی کیا ہو تو کہا جائے گا ''کیسے کیا؟'' کیونکہ ہر حق کے لئے ایک شرط، ایک طریقہ اور علم ہوتا ہے۔ اس لئے جو تو نے کیا کیا وہ بہ شرط علم تھا یا جہالت کے ساتھ تو نے اسے آسان سمجھا؟ تو اگر اس میں پورا نکلا اور عمل بہ شرط کیا ہوگا تو یہ سوال ہوگا کہ: کس کے لئے؟ یعنی یہ کہ تجھ پر فرض تھا کہ یہ بہ اخلاص محض حق تعالیٰ کے لئے کرتا۔ اس لئے اگر تو نے اللہ تعالیٰ کے لئے کیا تو اس کی جزا پائے گا۔ یا بہ رُو وریا کیا تاکہ مُزد اس کی پائے یا حصولِ دنیا کے لئے کیا کہ یہیں نقد مُزد پالے۔ یا یہ عمل کسی اور کے لئے کیا تو تُو اللہ کے خشم وعقوبت کا مستوجب ہوگا۔ کیونکہ تجھ سے کہا گیا تھا کہ: ''اَلا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِص'' (قرآن: ۳۹/۳) (خبردار! اللہ ہی کے لئے ہے دین خالص) نیز کہا گیا تھا کہ ''اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ'' (القرآن: ۷/۱۹۳) (بیشک یہ لوگ اللہ کے سوا تم جیسوں کی طرف بلاتے ہیں)۔

تو جس نے یہ بات جان لی اگر عاقل ہو تو اپنے دل کی مراقبت سے غافل نہ ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ پہلے ہی خیال پر نظر رکھے اگر بہ دوام ایسا کرے تو اس سے رغبت پیدا ہوتی ہے۔ پھر وہ ہمت بن جاتی ہے پھر قصد ہو جاتی ہے اور جوارح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: "اِتَّقِ اللّٰهَ عِنْدَ هَمِّكَ اِذَا هَمَمْتَ"، یعنی جب کسی کام کے لئے ہمت پیدا ہو تو اللہ سے ڈر"۔ یاد رہے کہ یہ معلوم کرنا کہ خواطر میں سے کیا ہے جو اللہ کی طرف سے ہے اور کیا ہے جو ہوائے نفس کی طرف سے ہے بڑا دشوار اور نادر امر ہے۔ اور جو کوئی اس سے بے بہرہ ہو اسے چاہئے کہ کسی پرہیزگار عالم کی صحبت اختیار کرے تاکہ اس پرہیزگار کے انوار اس میں سرایت کریں۔ اور علماء جو دنیا پر حریص ہوں اُن سے محترز رہے۔ کیونکہ شیطان نے ایسے ہی علماء کو اپنی نیابت دے رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی کی کہ: "اے داؤد ایسے عالم کی دوستی سے دور رہ کہ جس کو دنیا کی محبت نے مست کر رکھا ہو۔ کیونکہ وہ تجھے میری محبت سے دور کر دے گا۔ کیونکہ ایسے لوگ میرے بندوں پر راہ زنی کرتے ہیں"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو محبوب رکھتا ہے جو مشتبہ کے بارے میں تیز بین ہو اور غلبۂ شہوت کے وقت عقل کامل ہو"۔ کیونکہ کمال ان دونوں باتوں میں ہے کہ وہ حقیقتِ حال نافذ بصیرت کے بل پر جان لیتا ہے؟ پھر عقل کامل کے ذریعے شہوت کو دور کر دیتا ہے۔ اور یہ دونوں بیک وقت بروئے کار ہوتے ہیں کیونکہ جس کے ہاں شہوت کو دفع کرنے والی عقل نہ ہو اسے شبہات میں بھی بصیرتِ نافذہ حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جس کسی نے گناہ کیا عقل اس سے جدا ہوگئی اور پھر کبھی واپس نہیں آتی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ کام تین ہیں: روشن حق کو بجالا؟ واضح باطل کو چھوڑ دے اور اس کا مشکل مسئلہ عالم پر چھوڑ دے"۔

نظر دوم: عمل کے وقت مراقبت ہے۔ اور اس کے جملہ احوال تین اقسام سے خالی نہیں ہوتے:

کہ عمل یا طاعت ہوگا یا معصیت ہوگا یا مباح ہوگا۔ طاعات میں مراقبت یہ ہے کہ: عمل بہ اخلاص کرے اور حضور دل کے ساتھ ہو۔ اور جملہ آداب کو ملحوظ رکھے۔ اور ہر وہ چیز کہ جس میں فضیلت زیادہ ہو اسے ہاتھ سے نہ دے۔ اور معصیت میں مراقبت یہ ہے کہ شرم کرے۔ نیز توبہ کرے اور اس کے کفارے میں لگ جائے اور مباح میں مراقبت یہ ہے کہ باادب ہو اور نعمتِ اللہ تعالیٰ میں منعم کو دیکھے اور جان لے کہ وہ ہر وقت اللہ کے حضور میں ہے۔ مثلاً اگر بیٹھے تو ادب کے ساتھ بیٹھے، اگر سوئے تو دائیں پہلو پر سوئے اور قبلہ رُو سوئے اور اگر کھانا کھائے تو اس کے دل کو تفکر سے خالی نہ رہنا چاہئے۔ کیونکہ یہ تمام اعمال سے برتر ہے کہ ہر طعام میں کتنے ہی عجائب اللہ تعالیٰ کی صنعت گری کے ہیں۔ اس کی صورت گری و رنگ و بو و مزہ اور شکل کے مظہر ہیں خود انسان

کے اعضاء جو وہ کھانا کھاتے وقت بروئے کار لاتا ہے مثلاً انگلیاں، منہ، دانت وحلق ومعدہ وجگر ومثانہ اور جو کھانے کی قبولیت کے لئے ہیں اور وہ طعام کی نگہداشت کے لئے ہیں تا کہ ہضم ہوجائے اور جو کچھ فضلے کو دور کرنے کے لئے ہیں ان پر غور کرے۔ یہ تمام عجائب اس کی صنعت کے ہیں۔اوران کے بارے میں غور کرنا عظیم عبادت ہے۔اور یہ درجہ علماء کا ہے۔اور ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہے کہ جب وہ صنع خداوندی کے یہ عجائب دیکھتے ہیں تو وہ صانع کی عظمت کا ادراک کرتے ہیں اور اس کے جلال وجمال میں ڈوب جاتے ہیں۔اور یہ درجہ موحّدوں اور صدیقوں کا ہے۔ایک گروہ وہ ہے جو کھانے کو بچشم خشم دیکھتے ہیں اور کراہیت سے دیکھتے ہیں۔ برخلافِ شہوت اپنی ضرورت پر غور کرتے ہیں اور اس میں مشغول ہوتے ہیں کہ کاشکے ہم اس کے محتاج نہ ہوتے۔اور اس ضرورت پر غور کرتے ہیں اور اس معنی میں ہر وقت مراقبت کرتے ہیں۔تو یہ زاہدوں کا درجہ ہے۔اور ایک گروہ وہ ہے جو کھانے کو بہ چشم شہوت دیکھتے ہیں اور سراپا اس فکر میں ہوتے ہیں کہ کس طرح بہترین اور عمدہ کھانا کھاسکیں اور جی بھر کر کھاسکیں۔اور پھر ہوسکتا ہے کہ پکوان کو نیز کھانا پکانے والے کو اور میووں اور کھانوں میں عیب جوئی کریں۔اور کم بخت نہیں جانتے کہ یہ صنائع تو اللہ تعالیٰ کے ہیں اور صنعت کا عیب حقیقتاً صانع کا عیب ہوتا ہے۔تو یہ درجہ اہل غفلت کا ہے اور تمام مباحات میں یہ درجات دیکھنے میں آتے ہیں۔

مقام سوم: عمل کے بعد محاسبہ ہے

چاہئے کہ دن کے آخر میں انسان سوتے وقت ایک گھڑی پورے دن کا حساب اپنے نفس کے ساتھ کرے۔تا کہ سرمایہ سود وزیاں سے جدا ہوسکے۔سرمایہ فرائض ہیں اور سود نوافل اور زیان معاصی ہیں۔جس طرح انسان شریک کار کے ساتھ چانہ زنی کرتا ہے تا کہ غبن نہ ہونے پائے۔تو چاہئے کہ انسان اپنے نفس کے ساتھ اس سے بھی بڑھ کر احتیاط کرے۔ کیونکہ نفس بڑا طرّار مکّار اور حیلہ گر ہے کہ اپنی غرض کو تمھاری طاعت کہتا ہے تا کہ تو گمان کرے کہ یہ تیرے فائدہ کی بات ہے۔اور ممکن ہے کہ زیان کی بات ہو۔ بلکہ جملہ مباحات میں چاہئے کہ حساب لیا جائے کہ ''ایسا کیوں کیا؟'' اور کس کے لئے کیا؟'' پس اگر نفس کے لئے تاوان دیکھے تو اسے اس پر عاید کرے اور جرمانہ نفس سے طلب کرے۔ابن الصمہؒ بزرگوں میں سے ہوئے ہیں۔انھوں نے اپنا حساب کیا کہ ساٹھ برس کے تھے دن گنے تو اکیس ہزار پانچ سو شمار میں آئے۔تو بولے کہ اگر ایک دن میں صرف ایک گناہ کیا ہو تو ان اکیس ہزار پانچ سو گناہوں سے نجات کیسے پاؤں گا؟ خصوصاً ایسے دن بھی تھے کہ ایک ہی دن میں ہزار گناہوں کا ارتکاب ہوا ہوگا۔پس آپ نے نعرہ مارا اور گر گئے لوگ آگے بڑھے کہ انھیں تھامیں لیکن وہ مر چکے تھے۔لیکن انسان خود احتسابی سے عموماً فارغ ہوتا ہے اگر ہر گناہ پر ایک سنگریزہ اپنے گھر

میں ڈالتا جائے تو تھوڑے ہی عرصے میں اس کا گھر پتھروں سے بھر جائے گا اور اگر کرام الکاتبین اس کے اندر اجات کے لئے اس سے مزدوری طلب کریں تو اس کا پورا اثاثہ اس میں صرف ہو جائے۔ لیکن اگر وہ چند بار سبحان اللہ' غفلت کے ساتھ کہے اور تسبیح بدست شمار کرے اور کہے کہ میں نے سو دفعہ یہ کلمہ کہہ لیا۔ اور دن بھر جو یاوہ گوئی کرتا ہے اور اس کا شمار نہیں کرتا جو شاید ہزار سے بھی زیادہ ہو اور پھر یہ امید رکھے کہ اس کے حسنات کا پلڑا بھاری ہو گا محض بے عقلی ہے۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے کہ ''اپنے اعمال کا وزن کر و قبل اس کے کہ ان کا وزن کیا جائے۔ حضرت عمرؓ جب رات کو گھر آتے تو ایک تازیانہ اپنے پاؤں پر مار کر کہتے کہ ''آج تُو نے کیا کام کیا ہے؟'' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ بوقتِ مرگ ابوبکرؓ نے کہا کہ ''میرے نزدیک حضرت عمرؓ سے زیادہ دوست تر نہیں ہے''۔ پھر فرمایا کہ ''میں نے کیا کہا ہے؟'' تو میں نے اسے دہرایا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں بلکہ کوئی بھی میرے نزدیک اس سے عزیز تر نہیں ہے''۔ تو ابوبکر نے اس ذرا سی کوتاہی پر حساب کیا اور جب اسے درست نہ پایا تو اس کا تدارک کیا''۔ ابنِ سلام نے لکڑیوں کا ایک گٹھا اپنی گردن پر رکھا اور باہر نکلے تو لوگوں نے کہا کہ 'یہ کام تو خادموں کا ہے'' تو فرمایا کہ ''میں اپنے نفس کو سکھا رہا ہوں کہ اس کو کیسے ہونا چاہئے''۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو ایک احاطے میں دیوار کے پیچھے دیکھا کہ کہہ رہے ہیں کہ ''واہ واہ لوگ تجھے امیر المومنین کہتے ہیں۔ اللہ کی قسم اللہ سے ڈرو ورنہ اس کی عقوبت کے لئے تیار ہو جا''۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''النفس اللوامۃ'' وہ ہوتا ہے جو خود کو ملامت کرتا ہے کہ تو نے فلاں کام کیا' فلاں کھانا کھایا تو تُو نے وہ کام کیوں کیا اور وہ کھانا کیوں کھایا۔ یعنی خود اپنے تئیں ملامت کرتا ہے''۔ پس ماضی کا حساب کرنا مہمات میں سے ہے اور لازم۔

مقام چہارم: نفس کی معاقبت میں

معلوم رہے کہ جب تُو نفس کے حساب سے فارغ ہو گیا اور نفس نے کوئی تقصیر کی ہو اور تُو اس پر اس کا مواخذہ نہ کرے تو وہ دلیر ہو جائے گا اور تُو اس کا تعاقب بھی نہ کر پائیگا۔ اس لئے چاہئے کہ نفس نے جو تقصیر کی ہو اس کے لئے عقوبت کی جائے۔ اگر اس نے کوئی مشتبہ چیز کھائی ہو تو اسے بھوکا مار کر سزا دے۔ اگر کسی نامحرم کو دیکھا ہو تو آنکھوں پر پٹی باندھ کر اُسے دیکھنے سے محروم کر دے اور جملہ اعضا کی تادیب اسی طرح کرے۔ اسلاف اسی طرح کیا کرتے تھے۔

عرفاء میں سے ایک نے ایک عورت کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اپنے ہاتھ کو آگ کی نذر کر دیا اور

جلا ڈالا۔ بنی اسرائیل کے عابدوں میں سے ایک مدت تک صومعہ میں معتکف تھا۔ایک عورت نے اسے اپنے آپ کو پیش کیا تو اس نے ایک پاؤں صومعہ سے باہر نکالا تا کہ اس سے قربت پائے۔ پھر اللہ تعالیٰ سے ڈر گیا۔ اور توبہ کی اور لوٹنا چاہا تو بولا کہ "یہ پاؤں جو معصیت کے لئے صومعہ سے باہر نکلا ہے اسے اب صومعہ میں واپس نہیں لے جانا چاہئے؟ اسے اسی طرح رکھا یہاں تک کہ گرمی سردی کے اثرات سے تباہ ہو گیا اور اس کے جسم سے الگ ہو کر گر گیا۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ ابن الکریبیؒ نے فرمایا کہ میں ایک رات محتلم ہو گیا؟ تو میں نے چاہا کہ فوراً غسل کروں۔ رات سرد تھی اور میرے نفس نے کاہلی کی اور کہا اپنے آپ کو ہلاک نہ کر صبح تک صبر کرتا کہ صبح کو حمام میں جائے؛ تو میں نے قسم کھائی کہ میں سوائے گدڑی کے غسل نہ کروں گا۔ اور اسے اسی طرح تر رکھوں گا۔ اور نچوڑوں گا نہیں یہاں تک کہ میرے جسم ہی پر خشک ہو جائے۔ اور میں نے ایسے ہی کیا اور میں نے کہا کہ یہ نفس کی سزا ہے کہ حق تعالیٰ کے حق میں تقصیر کرتا ہے"۔

ایک شخص نے ایک غیر محرم عورت پر نگاہ ڈالی پھر پشیمان ہو گیا۔ اور قسم کھائی کہ اس گناہ کی سزا کے طور پر کبھی ٹھنڈا پانی نہ پیوں گا۔ اور نہیں پیا۔

حسان بن ابی سنان ایک منظر پر سے گذرا تو بولا کہ: "یہ کس نے کیا ہے؟" پھر خود سے کہا کہ "وہ چیز جس سے تمھیں کوئی سروکار نہیں اس کے بارے میں کیوں پوچھتے ہو؟ اللہ کی قسم میں تمھیں اس کی سزا دوں گا۔ ایک سال کے مسلسل روزوں کے ذریعے"۔ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ ایک کھجوروں کے باغ میں نماز ادا کر رہے تھے تو ایک پرندہ دکھائی دیا اتنا خوب صورت تھا کہ آپ نماز سے غافل ہو گئے اور رکعتوں کے تعداد کے بارے میں شک میں پڑ گئے تو اس نخلستان کو اسی سبب سے صدقہ کر دیا۔

مالک بن ضیغمؒ فرماتے ہیں کہ: "ریاح القیسیؒ آئے نماز ظہر کے بعد میرے باپ کو طلب کیا تو میں نے کہا کہ سو رہے ہیں۔ تو بولے کہ یہ کون سا سونے کا وقت ہے۔ اور لوٹ گئے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا تو میں نے سنا کہ کہہ رہے ہیں: "اے فضول تو کہتا ہے کہ یہ کون سا سونے کا وقت ہے، تجھے اُس سے کیا کام؟ لہٰذا میں نے عہد کیا ہے میں تمھیں پورا ایک سال اجازت نہ دوں گا کہ سر سرہانے پر رکھو، جا رہے تھے اور رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے: تُو اللہ تعالیٰ سے بھی نہیں ڈرے گا؟"

تمیم داریؒ ایک رات سوئے رہ گئے اور نماز عشاء فوت ہو گئی۔ تو عہد کیا کہ ایک سال بھر رات کو نہ سوؤں گا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک شخص نے خود کو بے لباس کر لیا اور جسم کو گرم سنگریزوں پر پھیرتا تھا

اور کہتا تھا کہ ''اے کاہل رات کو مردار اور دن کے بیکار کب تک یہی کرو گے؟'' اتفاقاً آنحضرت ﷺ ادھر آنکلے تو اس سے پوچھا کہ ''ایسے کیوں کر رہے ہو؟'' تو وہ بولا ''میرا نفس مجھ پر غلبہ کر رہا ہے''۔ تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ اس ساعت میں تو آسمان کے دروازے تمھارے لئے کھول دیئے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے تجھ پر فخر فرما رہے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے اصحاب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ ''زادِ آخرت اس شخص سے حاصل کرو'' تو ایک ایک اس شخص کے پاس جا کر کہتا تھا کہ میرے لئے دعا کرو تو وہ ایک ایک کے لئے دعا کرتا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے اسے کہا کہ پوری جماعت کے لئے اکٹھی دعا کر' تو وہ شخص بولا' بارِ خدایا ان لوگوں کے لئے تقویٰ زادِ راہ بنا دے اور سب کو صراطِ مستقیم پر رکھ' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ 'بارِ خدایا اس کی تسدید کر' تا کہ وہ دعا جو بہتر ہو وہ اس کی زبان پر آئے' تو وہ بولا کہ 'بارِ خدایا بہشت کو ان کا ٹھکانہ بنا دے'۔

مجمع نام کے ایک بزرگ تھے ایک دفعہ نگاہ بام پر اٹھائی جس سے ایک عورت کو دیکھا۔ تو انھوں نے عہد کیا کہ اب میں آسمان کی طرف کبھی نگاہ نہ اٹھاؤں گا''۔ احنف قیس دیئے کو رات کے وقت پکڑ لیتے اور بار بار انگلی دیئے کی لو پر رکھتے اور کہتے کہ فلاں دن فلاں کام تو نے کیوں کیا اور فلاں شے کیوں کھائی؟

اہل حزم واحتیاط ایسے ہی تھے جو جانتے تھے کہ نفس سرکش ہے اگر اسے عقوبت نہ کرو گے تو وہ تم پر غالب آجائے گا تو وہ تمھیں ہلاک کر دے گا۔ اس لئے نفس کو سیدھا کرتے رہتے تھے۔ جیسے گھوڑے کو سدھاتے ہیں۔

مقامِ پنجم : مجاہدہ ہے

معلوم رہے کہ ایک گروہ نے اپنے نفس کو کاہل پایا ہے تو اسے سزا کثیر عبادت کے ذریعے لازم کر کے دی ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ جب کبھی نمازِ باجماعت سے رہ جاتے تو پوری رات عبادت میں گذار دیتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک نماز جماعت کے ساتھ نہ ہوسکی تو آپ نے کفارے میں زرخیز زمین کا قطعہ جس کی قیمت دو ہزار درہم تھی صدقہ کر دیا۔ ابن عمرؓ نے ایک دفعہ نماز مغرب میں تاخیر کر دی حتیٰ کہ دو ستارے بھی طلوع ہو گئے تو انھوں نے ایک غلام آزاد کر دیا۔ اور ایسی حکایات بہت سی ہیں۔ اور جب ایسی عبادت کے لئے نفس آمادہ نہ ہو تو علاج اس کا یہ ہے کہ کسی مجتہد کی صحبت اختیار کرے۔ تا کہ اسے دیکھ کر راغب بہ عبادت ہو جائے۔ ایک صاحب کا بیان ہے کہ میں جب کبھی عبادت میں سستی سے دوچار ہوتا ہوں تو میں محمد بن واسعؒ کے اجتہاد پر غور کرتا ہوں۔ جس سے ہفتہ بھر عبادت کا شوق مجھ پر طاری رہتا ہے' اگر کوئی خود میں عبادت کا انگیزہ محسوس نہ کرے اسے چاہئے کہ مجتہدوں کی حکایات پڑھے۔ یہاں ہم ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

داؤد طائیؒ روٹی نہ کھاتے تھے۔ روٹی کے ٹکڑے پیالے میں تر کرتے اور پی لیتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ "میرے اس پینے میں اور باقاعدہ روٹی کھانے میں جتنا تفاوت وقت کا ہے اس میں تو پچاس آیہ ہائے قرآن کی تلاوت کر سکتا ہوں۔ پس میں اس میں وقت ضائع کیوں کروں"۔ ایک شخص نے داؤد طائی سے کہا کہ تیرے حجرے کی چھت کا ایک شہتیر تو ٹوٹا ہوا ہے۔ تو انھوں نے فرمایا کہ اس حجرے میں رہتے مجھے بیس برس ہو گئے ہیں اور میں نے کبھی سر اٹھا کر اس طرف نہیں دیکھا" گویا بے فائدہ دیکھنے کو مکروہ جانتے تھے۔ احمد زرینؒ نماز فجر سے لے کر نمازِ ظہر تک معتکف رہے اور کسی طرف نہ دیکھا۔ تو لوگوں نے کہا کہ "ایسے کیوں کرتے ہو؟" فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے آنکھیں اس لئے پیدا کی ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی صنعت گری کے عجائب اور اس کی عظمت کا مشاہدہ کریں۔ اور جو کوئی عبرت کو نہیں دیکھتا تو اس کے نامۂ اعمال میں ایک خطا لکھ دی جاتی ہے۔

ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ میں زندگی کو تین چیزوں کے لئے عزیز رکھتا ہوں اور بس: سجود کو لمبی راتوں میں، پیاس کو لمبے دنوں میں اور ان اصحاب کی صحبت کو کہ جن کی باتیں برگزیدہ اور پُر حکمت ہوں"۔

علقمہ بن قیس سے لوگوں نے کہا کہ "تم اپنے نفس کو اس قدر عذاب میں کیوں رکھتے ہو؟" تو آپ نے فرمایا کہ "اس دوستی کے سبب کہ مجھے اس سے ہے میں اسے دوزخ کی آگ سے بچاتا ہوں" تو لوگوں نے کہا کہ یہ سب تم پر فرض تو نہیں کیا گیا"۔ تو فرمایا کہ "میں جو کچھ کر سکتا ہوں کرتا ہوں تاکہ کل (روزِ قیامت) یہ حسرت نہ ہو کہ میں نے کیوں نہ کیا"۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے سری سقطیؒ سے عجیب تر اور کوئی نہیں دیکھا کہ اٹھانوے سال کے تھے تب بھی کسی نے انھیں زمین پر استراحت کے لئے لیٹے ہوئے نہیں دیکھا سوائے وقتِ مرگ کے"۔

ابو محمد جریریؒ نے ایک سال مکے میں قیام کیا۔ کوئی بات نہ کی نہ زمین پر پشت لگائی اور نہ پاؤں پھیلائے۔ ابوبکر کتانیؒ نے اُن سے کہا کہ "آپ یہ سب کس طرح کر سکے؟" تو فرمایا کہ "میرے باطن کے صدق نے جانا اور میرے ظاہر نے قوت دی"۔ ایک صاحب کا بیان ہے کہ میں نے فتح موصلیؒ کو دیکھا کہ زار زار رو رہے ہیں یہاں تک کہ ان کے آنسوؤں میں خون بھی شامل ہو گیا تھا۔ تو میں نے کہا کہ "کیا بات ہے؟" فرمایا "ایک مدت میں نے اپنے گناہوں پر پانی کے آنسو گرائے اب میں خون کے آنسو روتا ہوں اس لئے کہ میرے پانی کے آنسو ممکن ہے، اخلاص سے عاری ہوں"۔ لوگوں نے فتح موصلی کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ: "اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟" تو فرمایا: "کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اُن گریوں کی بناء پر عزیز ٹھہرایا"۔ اللہ نے نیز فرمایا کہ "مجھے اپنی عزت کی قسم کہ فرشتے چالیس سال سے تمھارے نامہ ہائے اعمال کو

لا رہے ہیں کہ جن میں کسی خطا کا اندراج نہیں''۔

داؤد طائیؒ سے لوگوں نے کہا کہ ''اگر تم اپنی ڈاڑھی میں کنگھی کر لو تو کیا حرج ہے''۔ فرمایا کہ ''جب فارغ ہوں گا کنگھی کر لوں گا''۔ اویس قرنیؒ نے راتیں تقسیم کر رکھی تھیں۔ فرماتے کہ آج رکوع کی رات ہے تو ایک رکوع ہی میں رات گذار دیتے تھے۔ اگلی رات فرماتے کہ یہ سجود کی رات ہے تو سجود ہی میں پوری رات کو دن کر دیتے تھے۔

عتبۃ الغلام جہد کثیر کے باعث کھانا پینا خوبی سے نہ کرتے تھے۔ تو ان کی ماں نے ان سے کہا کہ'' اپنے اوپر رحم کرو''۔ تو فرمایا کہ ''اس پر رحم کی آرزو میں ہوں کہ چند دن (اس دنیا میں) رنج اٹھائے تا کہ (آخرت کی) جاویدان راحت اور رِفق سے بہرہ مند ہو جائے''۔

اور ربیعؒ فرماتے ہیں کہ ''میں اویس قرنی سے ملنے کو گیا۔ تو وہ نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو تسبیح میں لگ گئے۔ میں نے کہا کہ فارغ ہوں تو بات کروں گا۔ میں نے صبر کیا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھے حتیٰ کہ نمازِ ظہر اور اسی طرح نماز عصر اور اسی طرح اگلے دن نماز فجر ادا کی۔ تو ان کی آنکھ ذرا سی نیند میں لگ گئی۔ تو جب نیند سے بیدار ہوئے تو فرمایا کہ 'بارِ خدایا میں آپ کی پناہ کا طالب ہوں اس بہتر سونے والی آنکھ سے اور بسیار خور پیٹ سے' تو میں نے خود سے کہا کہ یہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے یہی کافی ہے اور میں لوٹ آیا''۔

ابو بکر عیاشؒ نے چالیس سال زمین سے پہلو نہ لگایا؟ پھر آپ کی آنکھوں میں سیاہ پانی اتر آیا تو آپ نے یہ بات اپنی بیوی سے بیس سال مخفی رکھی۔ روزانہ پانچ سو رکعت نماز کا وِرد تھا۔ جوانی میں روزانہ تیس ہزار بار قل ھو اللہ احد کی تلاوت فرماتے تھے۔

کرز بن وبرہؒ ابدال میں سے تھے۔ اور ان کے جہد کا حال یہ تھا کہ روزانہ تین بار ختم قران فرماتے تھے۔ تو لوگوں نے ان سے کہا کہ ''آپ نے اپنے اوپر رنج بہت لاد دیا ہے'' تو فرمایا کہ ''دنیا کتنی ہے؟'' لوگوں نے کہا کہ ''سات ہزار سال'' تو فرمایا کہ روزِ قیامت کی طوالت کتنی ہے؟'' لوگوں نے کہا کہ ''پچاس ہزار سال'' تو فرمایا کہ ''کون ہے وہ جو سات دن رنج برداشت نہ کرے تا کہ پچاس دن آرام کر سکے؟'' یعنی اگر میں سات ہزار برس جیوں اور روزِ قیامت کے لئے جہد کروں تو یہ پھر بھی کم ہوگا۔ تو یہ مختصر عمر اُس حیات جاودانی کے مقابلے کیا شے ہے؟''

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ 'ایک رات میں حضرت رابعہ بصریؒ کے ہاں گیا تو وہ محراب میں جا کر نماز

میں مصروف ہوگئیں اور رات بھر نماز میں لگی رہیں تو میں ان کے گھر کے ایک گوشے میں وقت سحر تک نماز ادا کرتا رہا۔ پھر میں نے رابعہؒ سے کہا کہ ہم اس اللہ کا شکر کس طرح ادا کریں جس نے ہمیں شب بیداری کی توفیق دی؟'' تو انھوں نے فرمایا کہ ''اس طرح کہ کل ہم روزہ رکھیں''؟

تو یہ ہے مجتہدوں کا احوال۔ اور اس طرح کے احوال بہت ہیں۔ اور حکایت ان کی طویل۔ ہم نے اپنی کتاب احیاء میں اس سے زیادہ ان کا بیان کیا ہے؟ اس لئے چاہئے کہ اگر اس طرح کے احوال دیکھنے کو نہ ملیں تو کم از کم انھیں انسان سنے تا کہ اپنی تقصیر سے آگاہ ہو۔ اور خیر کی رغبت اس میں پیدا ہو اور اپنے نفس کا مقابلہ کر سکے۔

مقام ششم: نفس پر عتاب اور زجر و توبیخ کے بیان میں

یاد رہے کہ اس نفس کی تخلیق اس طرح ہوئی کہ یہ خیر سے گریزاں ہوتا ہے اور شر کی جانب مائل ہوتا ہے اور فطرت اس کی کاہلی اور شہوت رانی ہے۔ اور انسان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تو نفس کو اس صفت سے منقلب کر کے بے راہی سے راہ کی طرف لائے۔ اور یہ نفس کے ساتھ کبھی درشتی کے ساتھ اور کبھی لطف کے ساتھ اور کبھی عملاً تو کبھی قولاً پیش آنے سے ممکن ہے۔ کیونکہ نفس کی یہ فطرت ہے کہ جب وہ کسی کام میں اپنی خیر دیکھتا ہے تو اس کا قصد کرتا ہے۔ اگر رنج اٹھانا پڑتا ہے رنج پر صبر کرتا ہے۔ لیکن بیشتر اس کا حجاب جہل و غفلت ہی سے ہے۔ اگر تو اسے خوابِ غفلت سے بیدار کر دے اور روشن آئینہ اس کے سامنے لائے۔ تو وہ قبول کر لیتا ہے۔ اسی لئے فرمان خداوندی ہے کہ: ''وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ'' (قرآن: ۵۵/۵۱) (ذکر کی نصیحت کر کیونکہ ذکر مومنوں کے لئے سود مند ہے) تیرا نفس بھی دوسروں کے نفسوں جیسا ہی ہے۔ کہ آخر نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ نفس پر اثر کرتی ہے۔ پس پہلے اپنے آپ کو نصیحت کر۔ اور نفس پر عتاب کر بلکہ کسی وقت بھی عتاب اور ڈانٹ پٹ سے دست کش نہ ہونا چاہئے۔ اور اپنے نفس سے کہنا کہ: ''اے نفس تو ہوش مندی کا مدعی ہے۔ اور اگر کوئی تجھے احمق کہہ دے تو تو ناراض ہو جاتا ہے۔ تو تجھ سے احمق تر کون ہے کہ اگر کوئی لہو و لعب اور ہنسی مذاق میں مشغول ہو ایسے میں کہ جب شہر کے دروازے پر ایک لشکر اس کا منتظر ہو اور اس لشکر نے ایک آدمی کو بھیجا ہو کہ وہ اسے پکڑ لائے کہ اسے ہلاک کیا جائے اور وہ بدبخت لہو و لعب میں مشغول ہو۔ تو اس سے احمق تر اور کون ہوگا؟ اور مُردوں کا ایک لشکر شہر کے دروازے پر تیرا منتظر ہے۔ اور اس نے عہد کر رکھا ہے کہ وہ جب تک تجھے نہ لے جائیں محاصرہ ترک نہ کریں گے۔ اور دوزخ اور بہشت تیرے ہی لئے پیدا کی گئی ہیں تو ممکن ہے کہ تجھے آج ہی لے جائیں نہیں تو کل لے جائیں گے۔ اور جو بات شُدنی ہے اسے ناگزیر سمجھ اور

موت کسی سے نہیں پوچھتی کہ میں رات کو اٰوں یا دن کو۔ جلدی آؤں یا بدیر آؤں؟ سردیوں میں آؤں یا گرمیوں میں، تو وہ تو ناگاہ آ پکڑتی ہے اور ایسے میں پکڑتی ہے کہ انسان اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لئے اگر تو موت کے لئے تیاری نہ کرے تو تجھ سے بڑا احمق اور کون ہوگا؟ اے میرے نفس تجھ پر افسوس ہے۔ سارا دن گناہوں میں لگا رہتا ہے تو اگر یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ نہیں دیکھتا تو تو کافر ہے اور اگر جانتا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے تو تو بُرا دلیر ہے اور بے شرم کہ اس کے مطلع ہونے سے نہیں ڈرتا۔ دیکھ اگر تیرا کوئی خادم تیرے حق میں نافرمانی کرے تو تجھے اس پر کتنا غصہ آئے گا۔ پس اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے مامون کیسے ہو گئے ہو۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ اللہ کے عذاب کو جھیلنے کی تاب رکھتے ہو تو ذرا اپنی انگلی دیئے کی لَو کے اوپر تو رکھو یا ایک گھڑی دھوپ میں بیٹھو یا حمام کے گرم کمرے میں ٹھہرو تا کہ تمھیں اپنی بے کسی اور بے طاقتی کا علم ہو جائے۔ یا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم جو کچھ بھی کرو اس پر تمھاری گرفت نہ ہوگی۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم قرآن کے منکر ہو۔ اور خدائے تعالیٰ اور ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر کو جھوٹا سمجھتے ہو۔ جب کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءً ا یُّجْزَ بِہٖ'' (قرآن: ۴/۱۲۳) (جو برائی کرتا ہے اُس جہاں میں اسے اس کی پاداش دی جائے گی)۔ جو کوئی بُرا کرتا ہے اسے برائی کا سامنا بھی ہوگا۔ افسوس ہے تجھ پر! تو کہتا ہے کہ اللہ کریم اور رحیم ہے مجھے سزا نہیں دے گا۔ تو وہ لاکھوں خلق کو بھوک، بیماری اور دکھوں میں مبتلا رکھتا ہے۔ اور کیوں جو بیج بوتا نہیں وہ فصل کاٹتا بھی نہیں۔ اور کیونکہ اپنی شہوانی خواہش کو پورا کرنے کے لئے ہر قسم کے حیلے رُوئے زمین پر کرتا ہے۔ تا کہ کامیاب ہو سکے اس کے لئے تو نہیں کہتا کہ اللہ رحیم ہے اور میرے بے رنج اٹھائے گا میرا کام بنا دے گا۔ تجھ پر افسوس! کہ کہتا ہے کہ ہاں ایسا ہی ہے لیکن میں سختی برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اس شخص کے لئے جو مدامی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا اس کے لئے تو اور بھی لازم ہے کہ تھوڑی تکلیف آج برداشت کرے گا تا کہ کل قیامت کو رنج دوزخ سے نجات پا جائے۔ کیونکہ جو کوئی زحمت نہیں کرتا زحمت سے نجات نہیں پاتا۔ اگر آج اس ذرا سی زحمت کی تاب نہیں تو کل رنجِ دوزخ وذلّت وخواری ورواندگی اور ملعونی کی تاب کہاں سے لائے گا۔ تجھ پر افسوس! کہ پیسے کی طلب میں تو اس قدر زحمات اور خواری کو برداشت کرتا ہے اور تندرستی کی طلب میں جاہل طبیب کے کہنے پر تمام شہوات سے دست کش ہو جاتا ہے۔ اتنا بھی نہیں جانتا کہ دوزخ بیماری اور فقر سے صعب تر ہے کہ آخرت کی مدت دنیا کی زندگی سے درازتر ہے۔ تجھ پر افسوس! کہ تو کہتا ہے کہ میں اس فکر میں ہوں کہ توبہ کروں اور پھر اس سے بہتر کام میں لگ جاؤں گا۔ ممکن ہے کہ تو ابھی اس اندیشے ہی میں ہو کہ موت آ پہنچے تو تیرے ہاتھ میں سوائے حسرت کے کچھ نہ رہے۔ اگر یہ گمان کرتا ہے کہ آج کی نسبت کل توبہ کرنا آسان

ہوگا تو یہ جہالت ہے کیونکہ جس قدر تاخیر کرتے جاؤ گے توبہ دشوار تر ہوتی جائے گی۔اور پھر جب موت نزدیک پہنچ جائے گی تو ایسے ہوگا جیسے ضرب المثل ہے کہ سواری کے جانوروں کو چڑھائی کے وقت جو کھلانے سے فایدہ نہیں ہوتا (یعنی پہلے سے کھلانا چاہئے کہ قوت حاصل ہو) اور تیری مثال اس شخص کی سی ہے جو طلب علم میں لگے لیکن تحصیلِ علم میں سستی کرے اور کہے کہ جب میں اپنے وطن کو واپس جاؤں گا جہد کروں گا اور علم حاصل کروں گا۔اور اتنا بھی نہیں جانتا کہ علم سیکھنے کے لئے ایک طویل مدت چاہئے۔اسی طرح پُر خباست نفس کو ایک طویل مدت تک توبہ ومجاہدہ کی کٹھالی میں رکھنا پڑتا ہے تاکہ پاک ہوجائے۔تاکہ معرفت واُنس ومحبت کے درجے کو پہنچے۔اوراس راہ کی تمام گھاٹیوں کو طے کرجائے۔جب عمر گذر گئی اور ضائع ہوگئی۔بغیر مہلت کے یہ کیسے کرسکے گا؟ کیوں بڑھاپے سے پہلے جوانی کو' بیماری سے پہلے تندرستی کو' مصروفیت سے پہلے فراغت کو' اور فقر سے پہلے خوش حالی کو اور زندگی کو موت سے پہلے تو غنیمت نہیں جانتا؟ افسوس! ہے تجھ پر! گرمیوں کے موسم میں سردیوں میں پیش آنے والی ضرورتوں کا سامان کیوں کرتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر بھروسہ کیوں نہیں کرتا آخر دوزخ کا زمہریر زمستان کی سردی سے تو کم نہیں ہوتا۔اور دوزخ کی گرمی موسم گرما کی گرمی سے تو کم نہیں ہوتی۔ دنیا کے ان سب کاموں میں تو تُو تاخیر نہیں کرتا اور آخرت کے کاموں کے لئے تقصیر کرتا چلا جاتا ہے! کیا سبب اس کا یہ نہیں ہے کہ تو روزِ قیامت اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور یہ سبب تیری ابدی ہلاکت کا ہے۔افسوس! جو کوئی یہ گمان کرتا ہے کہ نورِ معرفت کی حمایت کے بغیر مرنے کے بعد شہوت کی آگ اس کی جان میں نہ لگے گی۔ایسے ہی ہے کہ جو یہ سمجھتا ہے کہ جُبّہ کی حمایت کے بغیر زمستان کی سردی اس کے بدن کو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے نہ چھوئے گی۔اور اتنا بھی نہیں جانتا کہ فضل اللہ تعالیٰ کا فی الحقیقت یہ ہے کہ جب اس نے زمستان کو پیدا فرمایا تو انسان کو اس وقت جُبّہ کی راہ بھی دکھائی تھی۔اور جُبہ کو بھی وجود بخشا اور اس کے اسباب بھی مہیا کئے سردی کا دفاع جس کے بغیر ممکن نہیں تھا۔یہ گمان مت کر کہ تیری یہ معصیت عقوبت پر اس لئے منتج ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تیری مخالفت پر غیظ وغضب آتا ہے تاکہ کہہ سکے کہ اللہ تعالیٰ کو میری معصیت سے کیا زیان پہنچ سکتا ہے کیونکہ یہ یوں نہیں ہے۔ بلکہ دوزخ کی آگ تیرے باطن میں تیری اس شہوت ہی کی بناء پر از خود جنم لیتی ہے۔ایسے ہی جیسے تیری بیماری زہر یا ایسی ہی زیاں کار چیز کھانے سے پیدا ہوتی ہے۔اس لئے نہیں کہ فرمان طبیب کی مخالفت کی بناء پر طبیب خشمناک ہوتا ہے۔تجھ پر افسوس! یہ سب اس کے سوا نہیں ہے کہ تو نے دنیا کی لذت ونعمت پر قرار پالیا ہے اور دل وجان سے اس پر فریفتہ ہوگیا ہے۔اگر تو دوزخ اور جنت پر ایمان نہیں رکھتا موت پر تو ایمان رکھتا ہے کہ مرنے پر یہ سب کچھ تجھ سے واپس لے لیا جائے گا۔اور تو اس کے فراق میں جلے

گا۔ دنیا کی دوستی کو جتنا چاہے اپنے جی میں محکم تر کر لے۔ جان لے کہ رنجِ فراق بھی دوستی ہی کے متناسب ہوتا ہے۔ تجھ پر افسوس! دنیا سے کیا دل لگاتا ہے؟ اگر مشرق سے لے کر مغرب تک پوری دنیا تجھے دے دی جائے اور سب تجھے سجدہ کریں۔ یہاں تک کہ ایک اور مدت میں تم اور وہ سب مٹی ہو جائیں گے۔ اور کوئی تمھیں یاد بھی نہ کرے گا۔ جیسے کہ گذشتہ بادشاہوں کو کوئی یاد نہیں رکھتا۔ اور جب دنیا میں تھوڑے ہی کے سوا تجھے میسر ہو اور وہ بھی منغص ومکدّر رہو اور تو بہشت جاوداں کو اس کے لئے ہاتھ سے دے رہا ہے۔ تجھ پر افسوس! اگر کوئی مٹی کا شکستہ پیالہ گوہرِ شب چراغ کے عوض خریدے تو تو اس پر کیسی خندہ زنی کرتا ہے؟ دنیا ایک ٹوٹنے والے مٹی کے پیالہ ہی کی سی ہے کہ ناچار ٹوٹ جائے گی اور وہ گوہرِ جاوید حاصل نہ ہوگا۔ البتہ حسرت رہ جائے گی یہ اور اس جیسے عتاب اپنے نفس پر کیا کرتا کہ تو نے اپنا فرض پورا کر دیا ہو اور وعظ میں ابتداء اپنے آپ پر نصیحت سے کرنی ہوگی۔ والسلام۔

•••

اصل ہفتم: تفکر کے بیان میں

یاد رہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''تَفَکر سَاعَةٍ خیرٌ من عبادة سنةٍ'' ''ایک ساعت کا تفکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ اور قرآن میں بہت سے مواقع پر تفکر وتدبر ونظر اور اعتبار کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ سب تفکر ہی ہے، جو کوئی تفکر کی فضیلت کو تو جانتا ہے لیکن اس کی حقیقت اور اس کے کوائف کو نہیں جانتا۔ اور نہیں جانتا کہ یہ تفکر کس امر میں ہے۔ اور کس لئے ہے اور اس کا حاصل کیا ہے۔ اس لئے اس کی تفصیل بہت اہم ہے۔ ہم پہلے اس کی فضیلت کا بیان کریں گے' پھر اس کی حقیقت اور پھر اس چیز کا جس کے لئے تفکر کا حکم دیا گیا اور آخر میں وہ کہ جس میں تفکر مقصود ہے۔

فضیلتِ تفکر

جان لے کہ وہ کام کہ جس کی ایک گھڑی ایک سال کی عبادت سے فاضل تر اور بہتر ہے اس کا درجہ بہت عظیم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک جماعت اللہ تعالیٰ میں تفکر کرتی تھی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''تم خلق کے بارے میں تفکر کرو اور خود اُس کے بارے میں تفکر نہ کرو کیونکہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے اور اس کی قدر کو پہچان نہیں سکتے''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ رات کو نماز ادا کر رہے تھے اور رو رہے تھے تو میں نے کہا کہ 'اے اللہ کے رسول آپ کیوں روتے ہیں حالانکہ آپ کے گناہ تو بخش

دیئے گئے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''میں کیوں نہ روؤں کہ مجھ پر یہ آیت نازل ہوچکی ہے کہ: ''اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ''(قرآن: ۱۹۰/۳ و ۱۹۱) (آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور شب وروز کی آمد میں خردمندوں اور زیرکوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ وہ اٹھتے بیٹھتے (اور بیماری میں) اور سوتے ہوئے پہلوؤں پر یاد کرتے ہیں) پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''افسوس ہے اس پر جو یہ آیت پڑھتا ہے اور تفکر نہیں کرتا''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لوگوں نے کہا ''اے روح اللہ روئے زمین پر تیرے جیسا کوئی اور بھی ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں ہے وہ کہ جس کی ساری بات ذکر ہو اور خاموشی فکر اور نظر اس کی سراپا عبرت ہو وہ میرے ہی جیسا ہے''۔

اور ہمارے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''اپنی آنکھوں کو اپنی عبادت میں سے حصہ دو''۔ تو صحابہ نے پوچھا؟ ''کیسے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مصحف میں سے قرآن کی تلاوت اور اس میں تفکر اور عبرت اندوزی اور اس کے عجائب کے وسیلے سے''۔ بوسلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ ''دنیا کے بارے میں تفکر آخرت کے لئے حجاب ہے۔ جب کہ آخرت میں تفکر کا ثمر حکمت ہے۔ اور دلوں کے لئے زندگی ہے'' داؤد طائیؒ ایک رات ایک چھت پر ملکوتِ آسمان کے بارے میں تفکر میں تھے اور رورہے تھے۔ حتیٰ کہ ہمسائے کے گھر میں گر گئے۔ ہمسایہ اٹھا اور اس نے تلوار پکڑی کیونکہ اس نے سمجھا کہ چور ہے تو جب اس نے داؤد طائی کو دیکھا تو بولا آپ کو کس نے گرایا ہے؟'' تو فرمایا کہ ''میں بے خبر تھا مجھے نہیں معلوم''۔

تفکر کی حقیقت

یاد رہے کہ تفکر کے معنی علم کی طلب ہے' اور ہر وہ علم جو بالبداہت معلوم نہ ہوا سے طلب کرنا چاہئے۔ اور طلب اس کی ممکن نہیں اِلّا یہ کہ دو معرفتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جمع کرے اور تالیف ان کی اس طرح کرے تا کہ وہ جفت ہو جائیں پھر ان دو معروفتوں سے ایک تیسری معرفت پیدا ہو ایسے ہی جیسے کہ نر و مادہ کے ملاپ سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس معرفت کے لئے وہ دو معرفتیں اصل ہوں گی۔ پھر اس تیسری معرفت کو ایک اور معرفت کے ساتھ جُفت کرتے ہیں جس سے ایک چوتھی معرفت وجود میں آتی ہے۔ اس طرح بذریعہ تناسل بے انتہا علوم میں افزونی ہوتی ہے۔ اور جو کوئی اس طریقے سے علوم حاصل نہیں کرسکتا اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ان علوم کا جو اصل ہیں راہ نہیں جانتا۔ مثال اس کی ایسے شخص کی سی ہے کہ جس کے پاس سرمایہ نہیں تو وہ

تجارت کیسے کرے گا۔ اگر وہ جانتا ہو لیکن ان مصارف کو جمع کرنا نہ جانتا ہو وہ ایسے شخص کی طرح ہے کہ جو سرمایہ تو رکھتا ہے لیکن تجارت کرنا نہیں جانتا۔ تفصیل اس حقیقت کی بہت طویل ہے۔ تفکر کے بارے مین ایک مثال بیان کرتے ہیں اور وہ ایسے ہے کہ کوئی یہ جاننا چاہتا ہے کہ یہ جان سکے کہ آخرت دنیا سے بہتر ہے تو وہ نہیں جان سکتا جب تک یہ دنیا کے بارے میں دو چیزیں نہ جانتا ہو: ایک یہ کہ جانتا ہو کہ باقی فانی سے بہتر ہے۔ دوسرے یہ کہ جانتا ہو کہ آخرت باقی ہے اور دنیا فانی۔ پس جب اس نے یہ دو اصل جان لئے تو وہ لازماً یہ علم کہ آخرت دنیا سے بہتر ہے۔ انھی دو اصلوں سے جنم لیتا ہے۔ اس جنم سے ہماری مراد وہ نہیں جو معتزلہ کا مقصود ہے۔ اور شرح اس کی بھی بہت طویل ہے۔ پس جملہ تفکروں کی حقیقت ایسے علم کی طلب ہے کہ جو دو علوم کے اِحضار بر دل میں وجود پذیر ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح گھوڑے گھوڑی کے ملاپ سے بکری وجود میں نہیں لائی جاسکتی اس طرح ہر دو علم کے ملاپ سے جی چاہا علم حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ علوم کی ہر نوع کے لئے دو جداگانہ اصل ہوتے ہیں اس لئے جب تک کوئی ان دو اصلوں کو دل میں حاضر نہ کرے تو وہ فرع اس سے پیدا نہ ہوگی۔

یہ بیان کہ تفکر کس لئے ہونا چاہئے

یاد رہے کہ انسان کو اندھیرے اور جہالت میں پیدا کیا گیا ہے۔ اسے نور کی حاجت ہوتی ہے تا کہ اس ظلمت سے باہر آسکے اور اپنا رستہ جان سکے کہ کیا کرنا چاہئے اور کس طرف کو جانا چاہئے۔ دنیا کی طرف یا آخرت کی طرف خود اپنی ذات میں مشغول ہونا چاہئے یا اللہ تعالیٰ کے باب میں مشغول ہونا چاہئے۔ اور یہ نورِ معرفت کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتا۔ اور یہ نور معرفت تفکر سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے کہ حدیث میں ہے کہ ''خَلَقَ اللّٰہُ الْخَلْقَ فِیْ ظُلْمَۃٍ ثم رَشَّ عَلَیْھِمْ مِنْ نُورِہٖ '''' اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اندھیرے میں پیدا کیا پھر ان پر اپنا نور ڈالا اور جس طرح تاریکی میں انسان عاجز ہوتا ہے اور راہ نہیں دیکھ پاتا تو پتھر لوہے پر مارتا ہے تا کہ اس سے آگ پیدا ہو اور چراغ جلا سکے اس چراغ کے جلنے پر اس کی حالت بدل جاتی ہے۔ جس سے وہ بینا ہو جاتا ہے اور راہ و بے راہی میں امتیاز کرسکتا ہے۔ پس وہ چلنے لگتا ہے۔ ایسی ہی مثال ان دو علموں کی ہے کہ اصل ہیں اور انھیں باہم جمع کرنا چاہئے تا کہ تیسری معرفت جنم لے یہ پتھر اور آہن ہی کے سے ہیں۔ اور تفکر کی مثال پتھر کو لوہے پر مارنے کی ہے۔ اور معرفت کی مثال اسی نور کی سی ہے جو سنگ و آہن کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ تا کہ اس سے دل کی حالت دگرگوں ہو جائے اور جب حالِ دل بدل جاتا ہے تو کام اور عمل بھی بدل جاتا ہے۔ اور جب اس نے دیکھا کہ مثلاً آخرت بہتر ہے تو دنیا کی طرف پشت کرے گا اور رُو بہ آخرت ہو جائے گا۔

پس تفکر تین چیزوں کے لئے ہوتا ہے: معرفت وحالت وعمل کے لئے۔ لیکن عمل حالت کے تابع ہوتا ہے اور حالت معرفت کے تابع ہوتی ہے اور معرفت تفکر کی تبع ہوتی ہے۔ پس تفکر اصل ہے اور جملہ خیرات کی کلید۔ تفکر کی فضیلت اسی سے ظاہر ہوتی ہے۔

تفکر کی جولانگاہ

یادرہے کہ تفکر کی مجال اور اس کا میدان بہت وسیع ہے۔ کیونکہ علوم کی کوئی انتہا نہیں۔ اور فکر سب علوم میں جاری وساری ہے۔ لیکن جو راہِ دین سے متعلق نہیں ہمیں اس کی تفصیل مقصود نہیں۔ اور جو راہِ دین سے تعلق رکھتا ہے اگر چہ ان سب کی تفصیل بھی بے نہایت ہے لیکن مختصراً وہ اور اس کی اجناس کے بارے میں کچھ کہا جاسکتا ہے۔

راہِ دین سے وہ معاملہ مراد ہوتا ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان ہے۔ کیونکہ یہ وہ راستہ ہے کہ جس پر چل کر وہ اللہ تک پہنچتا ہے۔ تفکر بندے کا یا خود اپنی ذات سے ہوتا ہے یا حق تعالیٰ کے بارے میں؛ اگر حق کے بارے میں ہو یا اس کی ذات میں ہوتا ہے یا اس کی صفات کے بارے میں۔ یا اس کے افعال وعجایب مصنوعات میں۔ اگر انسان خود اپنی ذات کے بارے میں تفکر کرے یا صفات کے بارے میں ہوگا کہ وہ مکروہِ حق ہے جو اسے حق سے دور کردیتا ہے اور وہ معاصی اور مہلکات ہیں۔ یا تفکر اس میں ہوتا ہے جو اللہ کو محبوب ہے۔ جو اسے اللہ کے نزدیک کردیتا ہے اور وہ طاعات ومنجیات ہیں۔ پس مختصر یہ کہ یہ چار میدان ہیں اور بندے کی مثال عاشق کی سی ہے کہ اس کی فکر کسی طور بھی معشوق سے جدا نہیں ہوتی۔ اور اگر فکر باہر نکل جائے تو یہ اس کے عشق کے ناقص ہونے کی دلیل ہے کیونکہ عشق کامل وہ ہوتا ہے کہ جس میں معشوق کے علاوہ کسی اور شے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ پس عاشق کی فکر معشوق کے جمال اور اس کے حسن صورت یا اس کے اداواطوار کے بارے میں ہوتی ہے۔ اور اگر اپنے بارے میں سوچے: تو یا تو یہ سوچے گا کہ خود کو معشوق کی قبولیت کے لئے بڑھائے یا اسے طلب کرے یا جس سے معشوق کو کراہت ہو اس سے خود کو دور رکھے۔ جو تفکر بھی بحکم عشق ہو گا۔ ان چار سے باہر نہ ہوگا۔ دین کے عشق کا اندیشہ اور دوستی حق تعالیٰ کا اندیشہ بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔

میدان اوّل:

یہ ہے کہ انسان خود اپنے بارے میں سوچے کہ میری بری صفات اور ناپسندیدہ اعمال کون سے ہیں تاکہ خود کو ان سے پاک کرے۔ تو یہ یا تو ظاہر معاصی ہوں گے یا اخلاق کی برائیاں جو باطن میں ہوتی ہیں۔ ظاہر معاصی بعض انسان کے جوارح واعضاء سے متعلق ہوتے ہیں جیسے کہ زبان، آنکھ، ہاتھ وغیرہ

ہیں۔اور بعض پورے جسم سے متعلق ہوتے ہیں۔اور اس طرح باطنی خباثت سے۔تو ان میں سے ہر ایک میں فکر کی جولان گاہیں تین ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ فلاں کام یا فلاں صفت مکروہ ہے یا نہیں۔کیونکہ یہ واضح نہیں ہوتیں۔انھیں تفکر ہی سے پہچانا جا سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ جب مکروہ ہے تو کیا مجھ میں یہ مکروہ صفت ہے کہ نہیں۔کیونکہ نفس کی صفات بھی غور و فکر کے بغیر پہچانی نہیں جا سکتیں۔

تیسرے یہ کہ اگر انسان مکروہ صفت سے متصف ہے تو اس سے نجات کیسے ہو؟

پس ہر روز صبح کے وقت ایک گھڑی اسی تفکر کی نذر کرنی چاہئے۔سب سے پہلے ظاہر معاصی کے بارے میں سوچے۔مثلاً زبان کے بارے مین فکر کرے کہ بات میں مبتلا ہوگا تو ممکن ہے غیبت کا یا جھوٹ کا مرتکب ہو جائے۔تو اس کی تدبیر سوچے کہ کس طرح ان سے دور رہے۔اسی طرح اگر یہ خطرہ ہو کہ لقمۂ حرام منہ میں ڈالے گا۔تو اس سے کیونکر حذر ممکن ہے؟ اسی طرح اپنے تمام اعضاء و جوارح کے بارے میں غور کرے اور تمام طاعات کے بارے میں بھی تفکر کرے۔اور جب اس سے فارغ ہو جائے تو فضائل کے بارے میں بھی غور کرے۔تا کہ سب کو بجالائے۔مثلاً کہے کہ یہ زبان اللہ کے ذکر اور مسلمانوں کی راحت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔اور میں اس بات پر قادر ہوں کہ اللہ کا ذکر کروں اور فلاں اچھی بات کروں جو دوسروں کے لئے باعث آسایش ہو۔اور آنکھ اس لئے پیدا کی گئی ہے تا کہ دین کا دام ٹھہرے اور اس سے سعادت کا شکار کرے۔اس آنکھ سے فلاں عالم کو تعظیم کی نگاہ سے دیکھوں اور فلاں فاسق کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھوں تا کہ میں آنکھ کا حق ادا کر سکوں۔اور مال مسلمانوں کی راحت کے لئے پیدا کیا گیا ہے تا کہ میں فلاں مال صدقے میں دے دوں۔ اگر مجھے اس کی ضرورت بھی ہو لیکن میں صبر کروں اور دوسروں کے لئے ایثار کروں۔یہ اور اس جیسے امور پر ہر روز غور کرے۔ہو سکتا ہے کہ انسان کے ایک ساعتہ فکر سے ایک ایسا خیال دل میں آئے کہ پوری زندگی انسان گناہ سے بچ جائے۔پس یہ من جملہ تفکر کے ہے جو ایک سالہ عبادت سے بہتر ہے۔کیونکہ فایدہ اس کا پوری زندگی میں ہوتا ہے۔اور جب طاعات و معاصیٔ ظاہر کے تفکر سے عہد برآء ہو چکا تو اپنے باطن کی طرف متوجہ ہو اور اخلاق کے بارے میں سوچے کہ میرے باطن میں کیا موجود ہے اور منجیات میں سے کیا نہیں ہے تا کہ ان کی طلب میں لگے۔اس کی تفصیل بھی طویل ہے۔لیکن اصل مہلکات دس ہیں۔اگر انسان ان دس مہلکات سے نجات پا جائے تو کام مکمل ہو جائے: بخل و کبر و عُجب و ریا و حسد و تیزیٔ خشم و شرہِ طعام و شرہِ سخن و

دوستی مال اور دوستیٔ جاہ۔ اسی طرح منجیات بھی دس ہی ہیں: توبہ، پشیمانی گناہ پر، بلا پر صبر، رضا بہ قضا، نعمت پر شکر، اور بیم و رجا دونوں کو برابر جاننا، دنیا میں زہد، طاعات میں اخلاص، اور دوسروں کے ساتھ خوش خلقی اور دوستیٔ اللہ تعالیٰ۔ اور ان میں سے ہر ایک میں تفکر کا میدان بہت وسیع ہے اور وہ اسی پر کھلتا ہے جو ان صفات کے علوم کو، جیسا کہ ہم نے اس کتاب میں بیان کیا ہے، جانتا ہو۔ چاہئے یہ کہ انسان اپنا ایک روزنامچہ رکھے جس میں صفات مرقوم ہوں۔ جب ایک صفت کے معاملے میں فارغ ہو جائے تو اس پر خط تنسیخ کھینچ دے اور دوسری صفت کے تفکر میں لگ جائے۔ ممکن ہے کہ کسی کو ان کی نسبت مہم تر اندیشے لاحق ہوں کہ جن میں وہ مبتلا تر ہو۔ مثلاً عالم ورع جو ان سب سے نجات پا چکا ہو لیکن غالب یہ ہوتا ہے کہ کلیۃً ناجی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اپنے علم پر نازاں ہوتا ہے اور اس کے اظہار کے ذریعے نام و جاہ کا متلاشی ہوتا ہے۔ اور عبادت اور اپنا ظاہر لوگوں کی نگاہوں میں آراستہ رکھتا ہے۔ اور قبولِ خلق پر خوش ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی اس پر طعنہ زنی کرے تو اُسے دل میں رکھتا ہے اور بدلہ لینے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ یہ سب عصیان ہے لیکن پوشیدہ تر۔ سراسر فساد دین کا تخم ہے۔ پس انسان کو چاہئے کہ ہر روز اس میں فکر کرے کہ اس سے کس طرح چھوٹا جا سکتا ہے۔ اور خلق کی موجودگی اور عدم موجودگی کو برابر کس طرح کرے۔ تاکہ اس کی نگاہ میں فقط حق تعالیٰ کی ذات ہو۔ اور اس باب میں فکر کا میدانِ عمل بہت وسیع ہے۔ پس اس تمام بحث سے معلوم ہو جاتا ہے کہ تفکر کے لئے بندہ اپنی صفات کے بارے میں غور کرے اس میں دو جنس کی انتہا نہیں ہے۔ اس بناء پر اس کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔

میدان دوم تفکر کا: اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہے

تفکر یا تو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں ہوتا ہے یا اس کے افعال اور اس کی مصنوعات کے بارے میں ہوتا ہے۔ اور تفکر کا بزرگ ترین مقام اللہ کی ذات وصفات میں ہے۔ لیکن چونکہ لوگ اس کی تاب نہیں رکھتے۔ اور عقلیں اس کی پہنچ سے قاصر ہیں۔ اس لئے شریعت نے اس باب میں تفکر سے منع کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس میں تفکر نہ کرو۔ ''فانکم لم تقدروا قدرہ'' اور یہ دشواری جلال حق کی پوشیدگی کی بناء پر نہیں بلکہ اس کے شدت ظہور کی بناء پر ہے کہ روشنی نہایت شدید ہے جب کہ انسانی بصیرت اس کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ اس لئے وہ اس کے مشاہدے کی تاب نہیں رکھتی۔ بلکہ وہ اس روشنی میں مدہوش اور متحیر ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی جیسے چمگادڑ دن کی روشنی میں پرواز نہیں کرتی کہ اس کی آنکھ بہت ضعیف ہوتی ہے۔ اور نورِ آفتاب کی تاب نہیں رکھتی۔ اور روزِ روشن میں دیکھ نہیں سکتی۔ اور رات کو جب نورِ آفتاب بہت تھوڑا باقی ہوتا ہے تب اسے کچھ

سجھائی دینے لگتا ہے۔اور عوام الناس اس درجے میں ہوتے ہیں۔لیکن صدیقوں اور اللہ کے بزرگوں کو اس نگاہ کی طاقت ہوتی ہے لیکن بردوام نہیں کیونکہ وہ بے طاقت بھی ہو جاتے ہیں۔ایسے ہی جیسے کہ لوگ چشمۂ آفتاب کو دو چار لمحوں کے لئے تو دیکھ سکتے ہیں لیکن اگر مداومت کریں تو بینائی جاتی رہتی ہے۔ایسے ہی اس امر میں نظر ڈالنے میں خوف یہ ہے کہ عقل جاتی رہے۔حقایق صفات حق تعالیٰ میں بزرگوں نے جو کچھ جانا ہے انھیں وہ بھی خلق سے بیان کرنے کی اجازت نہیں۔سوائے ایسے پیرایہ میں کہ جو خلق کی صفات کے قریب ہو۔اس طرح سے کہ گویا عالم ومرید ومتکلم اور وہ خود اس سے ایسی چیز تصور کرتا ہے کہ جو اس کی اپنی صفات کی جنس سے ہو۔وہ تشبیہاً ہوتی ہے۔لیکن اس قدر ضرور کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی بات انسانوں کی بات کی سی نہیں ہوتی۔کہ حرف وصوت ہو اور اس میں پیوستگی اور گستگی ہو۔اور جب تو ہوسکتا ہے مخاطب تاب نہ لائے۔اور انکار کر دے۔جیسے کہ جب تو اس سے کہے کہ اللہ کی ذات تمھاری ذات کی سی نہیں کہ نہ جوہر ہے اور نہ عرض نہ کسی جگہ میں نہ کسی مقام پر نہ جہت میں نہ عالم سے متصل، نہ عالم سے منفصل نہ عالم سے باہر نہ عالم کے اندر تو وہ اس کا بھی انکار کر دے گا اور کہے گا کہ یہ ممکن نہیں۔اس وجہ سے کہ وہ اسے اپنے اوپر قیاس کرتا ہے۔اور اس سے کسی عظمت کو سمجھ نہیں پاتا۔کیونکہ لوگوں نے جو عظمت دیکھی ہوتی ہے وہ بادشاہوں کی عظمت سے آشنا ہوتے ہیں کہ وہ تخت پر بیٹھتے ہیں۔اور خادم ان کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔پس اسی طرح اللہ کے بارے میں اندازہ کرتے ہیں۔اس لئے ہوسکتا ہے کہ کہیں کہ لازماً اللہ کے بھی ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، منہ، زبان وغیرہ ہوں گے۔چونکہ انھوں نے خود کو ان اعضاء کے ساتھ دیکھا ہے اس لئے گمان کرتے ہیں کہ اگر یہ اعضاء اللہ کے نہ ہوں تو وہ تو ناقص ٹھہرا۔اگر مکھی کو بھی ایسی ہی عقل دی گئی ہوتی جیسی کہ ان لوگوں کو دی گئی ہے۔تو وہ کہتی کہ میرے خالق کے بھی پر وبال ہونے چاہئیں کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ جو قوت وقدرت مجھے حاصل ہے اللہ اس سے محروم ہو۔پس انسان اسی طرح تمام کاموں کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے۔اسی سبب سے شرع نے اسے اس بارے میں تفکر سے منع کیا ہے۔اور اسلاف اس امر میں بات کرنے سے روکتے تھے اور بہ صراحت اسی طرح کہنے سے کہ وہ عالم میں نہیں ہے نہ عالم سے باہر ہے۔پیوستہ ہے نہ منفصل ہے وغیرہ کہنے کو روا نہ رکھتے تھے۔بلکہ فقط یہ کہنے پر قناعت کرتے تھے کہ "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَئْیءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ" (قرآن: ۱۱/۴۲)(اس کی سی کوئی شے نہیں وہ ہے سننے والا اور دیکھنے والا) کیونکہ کوئی شے اللہ کے مشابہ نہیں ہے۔اور یہ بہ اختصار کہتے تھے۔اور تفاصیل میں نہ جاتے تھے بلکہ اس امر میں تفصیل کو بدعت جانتے تھے۔اس سبب سے کہ جانتے تھے کہ عامۃ الناس کی عقلیں اس کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔اسی وجہ سے بعض انبیاء پر وحی آئی کہ "میرے بندوں کو میری صفات کی خبر نہ

دو کیونکہ وہ انکار کریں گے۔ ان سے وہی بات کہو جو وہ سمجھ سکیں' پس اولیٰ تر یہی ہے کہ نہ تو اس بارے میں بات کریں نہ اس میں تفکر کریں۔ سوائے اس شخص کے جو کمال کو پہنچ گیا ہو لیکن وہ بھی آخر کار لازماً حیرت اور دہشت کا شکار ہوگا۔ پس اللہ کی عظمت اس کے عجائب صنع سے طلب کرنی چاہئے۔ کیونکہ جو کچھ بھی وجود میں ہے وہ سراپا نور ہے اللہ کی قدرت اور عظمت کے انوار میں سے۔ اگر کوئی چشمۂ آفتاب میں دیکھنے کی قوت نہیں رکھتا وہ نورِ آفتاب میں دیکھے جو زمین پر پڑتا ہے۔

خلقِ اللہ تعالیٰ کے عجائبات میں تفکر کا بیان

یاد رہے کہ جو کچھ عالمِ وجود میں ہے سب اللہ تعالیٰ کی صنعت گری ہے۔ اور سب عجیب وغریب ہے۔ اور آسمان وزمین کے ذرات میں سے کوئی ذرہ ایسا نہیں جو زبان حال سے اپنے خالق کی تسبیح وتقدیس نہ کرتا ہو۔ یہ ذرے کہتے ہیں کہ تیری یہ قدرت کمال پر ہے اور تیرا یہ علم بے نہایت ہے۔ اور یہ اتنا زیادہ ہے کہ یہ تفصیل پذیر نہیں۔ بلکہ اگر تمام سمندر روشنائی کے بن جائیں اور تمام درخت قلم بنجائیں اور جملہ مخلوق کاتب بن جائیں اور لمبی عمریں لکھنے میں صرف کر دیں تو جو کچھ وہ لکھ پائیں گے وہ اس سے جو درحقیقت ہے نہایت کم ہو گا۔ چنانچہ فرمایا کہ: "قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَاداً لِّكَلِمَاتِ رَبِّىْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّىْ" (قرآن: ۱۸/۱۰۹) (کہہ دے اگر سمندر روشنائی ہوتے اور میرے رب کی باتوں کو لکھا جاتا تو سمندر ختم ہو جاتے قبل اس کے کہ میرے رب کی باتیں تمام ہو جاتیں) مختصراً یہ سمجھو کہ مخلوق دو قسم کی ہے۔ ایک قسم وہ ہے جس کی ہم خبر ہی نہیں رکھتے۔ لہٰذا ہم س کے بارے میں تفکر نہیں کر سکتے۔ جیسے کہ فرمایا کہ: "سُبْحٰنَ الَّذِىْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ" (قرآن: ۳۶/۳۶) (پاک ہے اور بے عیب ہے وہ اللہ جس نے ہر قسم کی تخلیق کی جوڑا جوڑا جو زمین اگاتی ہے اور لوگوں کے نفوس سے اور ان سے جن کو لوگ نہیں جانتے) اور وہ مخلوق جس کی ہمیں خبر ہے وہ دو قسم کی ہے:

ایک وہ ہے جسے ہم ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے جیسے کہ عرش' کرسی' فرشتے' دیو پری' وغیرہ کہ ان میں تفکر دشوار ہے۔ اس لئے ہم اسی پر اکتفا کریں گے جسے ہم دیکھ سکتے ہیں جیسے کہ آسمان ہے' سورج ہے' چاند ہے' ستارے ہیں زمین ہے اور جو کچھ زمین پر ہے جیسے کہ پہاڑ ہیں سمندر ہیں' صحرائیں' شہر ہیں۔ اور جو کچھ پہاڑوں میں جواہر ومعادن کی شکل میں موجود ہیں۔ اور روئے زمین پر جو گوناں گوں نباتات ہیں۔ حیوانات (ماسوائے انسان کے) ہیں تاکہ یہ آدمی کے کام آئیں اور آدمی جوان سب سے عجیب تر ہے۔ اور جو کچھ زمین

وآسمان کے درمیان ہے جیسے بادل' بارش' برف' اولے' برق ورعد' قوس وقزح اور ہوا میں ظاہر ہونے والی علامات ہیں۔

پس مختصر یہ ہے اوران میں سے ہرایک پر تفکر کے لئے میدان بہت وسیع ہے۔ کیونکہ جملہ مخلوق اللہ تعالیٰ کی صنعت کے عجائب میں سے ہے۔ پس ہم ان میں سے بعض کی طرف مختصر اشارہ کریں گے۔ اور یہ تمام آیات حق تعالیٰ ہیں جو تجھے کہی گئی ہیں۔ تاکہ تو ان پر بصیرت کی نظر ڈالے اوران میں تفکر کرے۔ فرمانِ خداوندی ہے کہ: ''وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ'' (قرآن: ۱۲/۱۰۵) (اور کتنے ہی نشانات زمین وآسمان میں ان (مشرکانِ مکّہ) پر گذرتے ہیں اور وہ خدائے واحد کی آیات دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں اور غافل ہیں)۔ نیز فرمایا کہ: ''اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ'' (قرآن: ۷/۱۸۵) (آسمانوں میں اور زمینوں میں جو اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کے نشانات ہیں انھیں نہیں دیکھتے اور جو کچھ اللہ نے پیدا کیا اور جس چیز سے پیدا کیا) نیز فرمایا کہ: ''ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنهار لآيات لاولی الالباب'' (قرآن: ۳/۱۹۰) (آسمانوں اورزمین کی تخلیق میں اور شب وروز کی آمد وشعر میں خردمندوں کے لئے نشانیاں ہیں) اوراسی قسم کی آیات بہت سی ہیں۔ پس ان آیات میں تفکر کرو۔

آیتِ اوّل:

جو تیرے نزدیک زیادہ ہے وہ خود تیری ذات ہے اورروئے زمین پر تجھ سے زیادہ عجیب اورکوئی شے نہیں اورحال یہ ہے کہ تو خود اپنے آپ سے غافل ہے۔ حالانکہ منادی ہورہی ہے کہ اپنے اوپر نگاہ غائر ڈالو تاکہ ہمارے جلال کی عظمت کا مشاہدہ کرسکو۔ ''وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ'' (قرآن: ۵۱/۲۱) (تمھارے نفسوں میں (بھی نشانیاں ہیں) تم اس پر غور نہیں کرتے) پس پہلے اپنی ابتداء پر غور کر کہ تو کہاں سے آیا ہے کہ پہلے تجھے پانی کے ایک قطرے سے پیدا کیا۔ اوراس پانی کی پہلی قرارگاہ باپ کی پشت اور ماں کے سینے کو بنایا۔ ماں کے رحم کو زمین بنایا اور باپ کی پشت کو بیج ٹھہرایا۔ پھر تیری پیدائش کا بیج بنایا۔ پس شہوت کو نر و مادہ پر مؤکل ٹھہرایا تاکہ زمین میں بیج ڈالیں۔ پھر حیض کے خون کواس بیج کی نشوونما کے لئے بہ طور آب فراہم کیا۔ اور تجھے نطفے اور حیض کے خون سے جنم دیا۔ پہلے خون کا ایک لوتھڑا بنایا پھر گوشت بنایا جسے مضغہ کہتے ہیں پھراس میں جان ڈالی۔ پھراس خون اور یک صفت آب سے مختلف چیزیں پیدا کیں۔ جیسے کھال وگوشت ورگ وپے اور ہڈیاں پھران سب سے تمام اعضا کو تشکیل کیا۔ گول سر' دو ہاتھ اور دو لمبے پاؤں اوران میں سے ہرایک

کے سرے پر پانچ شاخیں (انگلیاں) کیں۔ پھر باہر آنکھ' کان' منہ' ناک' زبان اور دیگر اعضا پیدا کئے۔ اور تیرے باطن میں معدہ' گردہ' جگر' تلی' پتا ورحم ومثانہ اور بہت سی انتڑیاں پیدا کیں۔ ہر ایک جداگانہ شکل کی' جداگانہ صفات کی اور جداگانہ مقدار کی۔ پھر ان میں سے ہر ایک کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر انگلی کو تین جوڑ دیے۔ اور ہر عضو کو گوشت پوست اور رگ وپے اور ہڈیاں فراہم کیں۔ اور تیری آنکھ کو کہ ایک اخروٹ کے اندازے سے کچھ زیادہ نہیں سات پردوں کے ساتھ پیدا کیا۔ جس کا ہر طبقہ ایک جداگانہ صفت سے متصف ہے کہ اگر ان میں سے ایک پردہ بھی برباد ہو جائے تو دنیا تجھ پر تاریک ہو جائے۔ ہم اگر صرف آنکھ کے عجائب کی تفصیل بیان کرنا چاہیں تو کتنے ہی اوراق سیاہ کرنے پڑیں گے۔

اپنی ہڈیوں پر غور کر کہ کس طرح آبِ لطیف وتنک سے سخت اور محکم پیدا کی گئی ہے۔ ان میں سے بعض لمبی ہیں تو بعض چوڑی۔ اور بعض اندر سے خالی اور بعض اندر سے بھری ہوئی ہیں۔ اور سب کو ایک دوسری پر ترکیب دی ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کی مقدار' شکل اور صورت میں ایک حکمت بلکہ کئی حکمتیں رکھی گئی ہیں۔ پھر ان ہڈیوں کو تمھارے جسم کا ستون قرار دیا ہے جس پر تمام جسم کی تعمیر ہوئی ہے۔ اگر پشت کی ہڈی یک لخت ہوتی تو جھکنا دشوار ہوتا اور اگر پراگندہ ہوتی تو پیٹھ کو سیدھا رکھنا ممکن نہ ہوتا اور تو کبھی سیدھا کھڑا نہ ہو سکتا۔ پس اسے مہرہ مہرہ کر کے پیدا کیا تاکہ جھک سکے۔ پھر ان کو اکٹھا بنایا اور رگ وپے میں لپیٹ کر محکم بنا دیا اور اسے یک لخت کا سا بنا دیا۔ تاکہ جب چاہے سیدھا کھڑا ہو سکے۔ اور ہر مہرہ کے سر پر چار لک باہر نکالے تاکہ ان کے نیچے جو چار گہرائیاں گچی کی سی ہیں پیدا کیں تاکہ وہ زایدہ گہرائی میں بیٹھ جائے اور محکم ہو جائے۔ اور مہروں کے اطراف میں پر نکالے تاکہ وہ پے جو اس پر لپٹے ہوئے ہیں اس کی مضبوطی کا سہارا نہیں اور تیرے کاسۂ سر کو ہڈیوں کے پچپن ٹکڑوں سے پیدا کیا اور باریک درزوں کے ساتھ باہم پیوست کیا۔ تاکہ اگر کاسۂ سر کی ایک ہڈی کو ضرب پہنچے تو باقی کی ہڈیاں سلامت رہیں تاکہ سب کی سب یک بارگی ٹوٹ نہ جائیں۔ اور تمھارے دانت پیدا کئے جن میں سے بعض کا سرا چوڑا ہے تاکہ لقمے کو پیس سکیں۔ اور بعض ذہنوں کا سرا باریک اور تیز ہوتا ہے تاکہ کھائی جانے والی شے کو کاٹ سکے اور ریزہ ریزہ کر سکے۔ اور پھر چکی میں ڈال دے۔ گردن کے ساتھ مہرے بنائے اور رگ وپے ان پر لپیٹ کر انھیں محکم بنایا۔ اور سر گردن پر قرار دیا۔ پشت کو چوبیس مہروں پر مشتمل پیدا فرمایا۔ اور گردن ان پر رکھ دی اور سینے کی ہڈیاں چوڑائی کے رخ ان مہروں میں بنائیں۔ اس طرح دوسری ہڈیاں بنائیں کہ تفصیل جن کی طویل ہے۔ مختصر یہ کہ دو سو اڑتالیس ٹکڑے ہڈیوں کے تمھارے جسم میں بنائے کہ جن میں سے ہر ایک کی حکمت دوسرں سے جداگانہ ہے۔ تاکہ تیرا کام سیدھا اور ساختہ ہو جائے۔

یہ سب اعضاء وجوارح اللہ نے اس گندے قطرۂ آب سے پیدا کئے۔ اگر ان ہڈیوں میں سے ایک بھی کم ہو جائے تو تُو ادائے فرض سے قاصر رہ جائے۔ یا اگر ایک بھی اس تعداد سے زیادہ ہو جائے تو بھی ناکام رہے۔ پس چونکہ تجھے ان ہڈیوں اور اعضاء کو ہلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تیرنے تمام اعضاء میں پانچ سوستائیس عضلے پیدا کئے۔ اور ہر عضلے کی ایک شکل ہے۔ بعض مچھلی کی طرح درمیان میں موٹے اور اطراف میں باریک تو بعض چھوٹے تو بعض بڑے ہیں۔ اور ہر عضلہ گوشت اور پٹھے اور ایک پردے کا مرکب ہوتا ہے جو اس کا غلاف ہوتا ہے۔ اور آنکھ میں چوبیس[۲۴] عضلے اس لئے رکھے گئے ہیں تاکہ تیری آنکھ اور پلکیں ہر طرف پھر سکیں اور حرکت کر سکیں۔ دوسرے عضلات کو بھی اسی پر قیاس کر لے کیونکہ سب کی تفصیل بہت طویل ہو گی۔

پھر تیرے جسم میں تین حوض پیدا کئے گئے ہیں اور ان حوضوں سے تمام بدن میں نہریں کھول دی گئی ہیں۔ ایک دماغ کہ اس سے اعصاب کی نہریں نکلتی ہیں جو تمام بدن میں پہنچتی ہیں۔ تاکہ جسم میں حس وحرکت کی قوت جاری ہو۔ اور اس میں سے ایک بڑی نہر پشت کے مہروں میں رکھی تاکہ اعصاب مغز سے دور نہ ہونے پائیں کہ پھر وہ خشک ہو جائے۔ اور دوسرا حوض جگر کا ہے کہ جس سے ہفتِ اندام کی جانب رگیں کھول دی گئیں تاکہ غذا اس میں جاری ہو۔ اور تیسرا حوض دل کا ہے۔ جہاں سے رگیں جسم کی طرف کشادہ کر دیں تاکہ روح اس میں جاری ہوتا کہ دل سے ساتوں اندام کی طرف پہنچے۔

پس اپنے کسی ایک عضو کے بارے میں غور کر کہ کیسا تخلیق ہوا ہے اور ہر عضو کس لئے پیدا ہوا ہے۔ آنکھ کے سات پردے پیدا کئے ایسی ہیت اور رنگ کے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ اور پلکیں پیدا کیں تاکہ آنکھوں کی گرد وغیرہ کو صاف کرتی رہیں۔ اور مژگان پیدا کئے سیدھے اور سیاہ رنگ کے تاکہ آنکھ خوب صورت تر ہو جائے۔ تاکہ آنکھ کی پتلی کی قدرت بینائی میں فزونی ہو۔ اور جب فضا میں غبار نمودار ہو تو مژگان کو اکٹھا کر سکے تاکہ گرد آنکھ میں نہ پڑ سکے۔ اور تو ان کے درمیان سے دیکھ بھی سکے۔ اور خاشاک کو جو اوپر سے گرے تو مژگان اس کو روک سکے اور پرچین چشم کی صورت اختیار کر سکے۔ اور عجب تر یہ ہے کہ آنکھ کی پتلی جو عدس کے مقدار سے زیادہ نہیں آسمان اور زمین باوصف اتنی وسعت کے اس میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ تاکہ ایک لحظہ کے لئے آنکھ کھولے تو آسمان کو اس میں ملاحظہ کرے۔ اگر آنکھ کے دیدار کے عجائب اور آئینہ کے دیدار کے عجائب اور جو کچھ اس میں دکھائی دیتا ہے بیان کرنا چاہیں تو بے شمار مجلسوں میں بھی بیان نہیں ہو سکتے۔

کان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تو اس میں ایک ایسا تلخ مایہ رکھا کہ اگر کوئی ذی روح اس میں داخل ہو تو وہ زندہ نہ رہے۔ اور ساتھ ہی کان کا بیرونی صدفہ اس لئے پیدا کیا کہ وہ آواز کو جمع کر کے کان کے سوارخ

میں پہنچائے اور اس میں کجی اور کئی پیچ پیدا کئے تا کہ سوتے میں کوئی متحرک چیونٹی کان میں داخل ہونے کا قصد کرے تو اس کے لئے راہ لمبی ہو جائے۔ تا کہ وہ ہر پھر کر واپس نکل آئے۔ یا تجھے اس کی خبر لگ جائے۔ اگر ہم اسی طرح ناک' منہ اور دیگر اعضاء کی تفصیل بیان کرنے لگیں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔

مقصود اس سے ہمارا یہ ہے کہ تو ان کارہ شناس ہو اور ہر عضو کے بارے میں غور کرے کہ یہ کس لئے ہے تا کہ اپنے خالق کی حکمت' عظمت' مہربانی' رحمت' علم' قدرت کو جان سکے۔ تیرا سراپا سراسر عجائب کا سرچشمہ ہے۔ اور تیرے سراپے میں جو باطن کے عجائب اور دماغ کے خزانے اور قوت ہائے حس رکھی گئی ہیں' وہ سب سے زیادہ عجیب ہیں۔ بلکہ جو کچھ سینے اور شکم میں ہے اسی طرح۔ معدے کو ایک دیگ کی طرح پیدا کیا گیا ہے۔ جو متواتر ابلتا رہتا ہے تا کہ کھانا اس میں پک جائے۔ اور جگر اس کھانے کو خون میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اور رگیں اس خون کو پورے جسم میں پہنچا دیتی ہیں۔ اور پتہ اس خون پر کی جھاگ کو کہ صفرا کہلاتی ہے لے لیتا ہے۔ اور تلی جو اس خون کی تلچھٹ ہوتی ہے جو سودا کہلاتی ہے اسے لے لیتی ہے اور گردہ اس میں سے پانی کو لے لیتا ہے۔ اور مثانہ میں پہنچا دیتا ہے۔ رحم اور آلاتِ ولادت کے عجائب بھی اسی طرح کے ہیں۔ اور معانی کے عجائب اور دیگر ایسے قویٰ جو از قسم بینائی' سماعت' عقل و علم ہیں کہ انسان میں پیدا کئے گئے ہیں اور بھی حیران کن ہیں۔

پس اے سبحان اللہ اگر کوئی خوب صورت تصویر ایک دیوار پر بنا دے کہ جس سے تو اس کی استادی میں حیرت زدہ ہو جائے اور تو اس ہنرمند پر ستایش بہت کرے۔ جب کہ تو دیکھتا ہے کہ پانی کے ایک قطرے سے تمام ظاہری اور باطنی نقوش اس میں پیدا ہو جاتے ہیں کہ جہان تو نقاش کو دیکھتا ہے نہ اس کے موقلم کو۔ پھر اس نقاش کی عظمت پر متعجب نہ ہو اور اس کے کمال قدرت پر مدہوش نہ ہو۔ تو کیا اس کی کمال شفقت اور رحمت سے متعجب نہ ہوگا؟ کہ جب تجھے ماں کے رحم میں غذا کی حاجت ہوتی تو تُو اگر منہ کھول دیتا تو خونِ حیض تیرے معدے کے اندازے کے علی الرغم داخل ہو جاتا تو تُو ہلاک ہو جاتا۔ اس لئے خالق نے ناف کے ذریعے سے تیری غذا رسانی کا اہتمام کیا۔ اور جب تو رحم سے باہر نکل آیا تو ناف کا راستہ بند کر دیا اور منہ کو کھول دیا تا کہ ماں غذا با اندازہ تجھے دے سکے۔ چونکہ اس وقت تیرا جسم کمزور اور نازک تھا۔ اور طعام کی تاب نہ رکھتا تھا ماں کے دودھ کو کہ لطیف ہوتا ہے تیری غذا بنا دیا۔ ماں کا سینہ تخلیق کیا اور سینے میں پستان پیدا کئے اور پستان کا سرا تیرے منہ کے اندازے کے برابر خلق کیا اور اس میں باریک سوراخ پیدا کئے تا کہ دودھ تجھ پر غالب نہ ہو۔ اور ایک دھوبی ماں کے سینے میں بٹھایا تا کہ وہ خون سرخ جو اسے پہنچتا ہے اسے سفید کر دے۔ اور وہ پاک اور لطیف صورت میں تجھے دے۔ اور شفقت کو تیری ماں پر موکل ٹھہرایا تا کہ جب تجھے بھوک لگے تو ماں قرار و آرام نہ

پا سکے۔ چونکہ دودھ کو دانتوں کی ضرورت نہیں ہوتی تو آغاز خلقت میں دانت پیدا نہ کئے۔ تا کہ تو اپنی ماں کے سینے کو زخمی نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ کھانا کھانے کی قوت تجھ میں پیدا ہو جائے۔ پھر اپنے وقت پر منہ میں دانت پیدا کر دیئے۔ تا کہ تو سخت کھانا کھانے پر قادر ہو سکے۔ وہ شخص یقیناً کور دل اور اندھا ہے جو یہ سب کچھ دیکھے اور حیرت میں ہوش نہ کھو دے۔ اور اللہ کے کمال اور شفقت پر متحیر نہ ہو۔ اور اس جمال وجلال پر فریفتہ نہ ہو! بے شک وہ غافل ہے اور حیوان طبع کہ جو اس بارے میں تفکر نہ کرے۔ اور اس سے اپنے نفس کے بارے میں غور نہ کرے۔ اور وہ عقل جو اسے عطا کی گی ہے جو عزیز ترین متاع ہے اسے ضائع کر دے اور اس سے زیادہ نہ جانتا ہو کہ جب بھوکا ہو تو کھانا کھائے۔ اور جب غصے میں آئے اور کسی سے الجھے تو وہ حیوانوں کی مانند بوستانِ معرفتِ حق تعالیٰ سے محروم رہے۔

آگاہی کے لئے اسی قدر کافی ہوگا اور یہ تیری ذات کے لاکھوں عجائب میں سے ایک سے زیادہ نہیں۔ اور ان عجائب میں سے بیشتر حیوانات میں بھی موجود ہیں۔ مچھر سے لے کر ہاتھی تک غور کیجئے۔ تفصیل اس کی بہت طویل ہے۔

دوسری نشانی زمین ہے اور جو کچھ زمین پر پیدا کیا گیا ہے تو اگر چاہے کہ اپنے نفس کے عجائب سے ذرا آگے بڑھ کر زمین کو دیکھے اور غور کرے کہ تیرے لئے بساط کی طرح بنائی گئی ہے اور اس کے اطراف وجوانب نہایت وسعت کے ساتھ پھیلائے گئے ہیں۔ اتنے وسیع کہ تو کتنا بھی چلتا جائے اس کے کناروں تک نہ پہنچے گا اور پہاڑ اس پر میخوں کی طرح بنائے گئے ہیں تا کہ ساکن رہے اور تیرے پاؤں کے نیچے ہلتی نہ رہے۔ اور سخت پتھروں کے نیچے سے صاف شفاف پانی جاری فرما دیا تا کہ رُوئے زمین پر چلے اور بتدریج باہر نکلے کیونکہ اگر سخت پتھروں سے جکڑا ہوا نہ ہوتا تو یک بارگی باہر آ جاتا تو دنیا کو غرق کر دیتا۔ یا قبل اس کے کہ سبزہ بہ تدریج پانی سے مستفیض ہوتا باقی نہ رہتا۔ فصل بہار پر غور کر کہ رُوئے زمین سراسر خاکِ غلیظ ہوتی ہے۔ تو جب اس پر بارش برستی ہے تو کیسے زندہ ہو جاتی ہے۔ اور ہفت رنگ ریشم کی طرح بلکہ ہزار رنگ دیبا کی مانند ہو جاتی ہے۔ ایک رنگ دوسرے سے خوب تر ہوتا ہے۔ اور اس نباتات پر تفکر کر جو وجود پذیر ہوتی ہے۔ اور ان پھولوں اور شگوفوں پر غور کر کہ جن میں سے ہر ایک جداگانہ رنگ و بو کا حامل ہوتا ہے۔ اور ایک سے دوسرا حسین تر ہوتا ہے۔ پھر درختوں اور ان کے پھلوں پر غور کر اور ان کے جمال اور صورت اور مزے اور لذت اور ان میں سے ہر ایک کے رنگ ومنفعت پر غور کر۔ بلکہ جڑی بوٹیاں جنھیں تو زیادہ نہیں جانتا قدرت نے ان میں کیسی کیسی منفعتیں مخفی کر رکھی ہیں۔ ایک تلخ ہے تو دوسری شیریں ہے اور تیسری ترش ہے۔ ان میں سے ایک بیمار کو تندرستی عطا

کرتی ہے تو دوسری اسے بیمار کرتی ہے۔ ایک وہ ہے جو زندگی کو بچاتی ہے تو دوسری وہ ہے کہ زہر ہے جو زندگی کُش ہے۔ ایک سے صفرا تو دوسری سے سودا پیدا ہوتا ہے۔ ایک کی تاثیر گرم ہوتی ہے تو دوسری کی تاثیر سرد ہوتی ہے۔ ایک خشکی آور تو دوسری نرمی آور ایک خواب آور ہے تو دوسری خواب رُبا' ایک خوشی لاتی ہے تو دوسری غم انگیز ہوتی ہے۔ ایک انسان کی غذا ہے تو دوسری حیوانات کا چارہ۔ یا پرندوں کی غذا۔ تفکر کر کہ یہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور ہر ایک میں ہزاروں عجیب خصایص ہیں تا کہ قدرت کے کمال کا مشاہدہ کر سکے کہ تمام عقلوں کو اس سے مدہوش ہو جانا چاہئے۔ اور یہ امر بھی کوئی انتہا نہیں رکھتا۔

کمیاب اور نفیس ودائع کی ایک اور نشانی:

جو پہاڑوں کے نیچے چھپا دی گئی ہیں اور انھیں معادن کہتے ہیں۔ اور آرایش کے لئے جو کچھ درکار ہے مثلاً سونا' چاندی' لعل' فیروزہ' لعل بدخشاں' شبہ ویشم' وبلور ولا جورد وعقیق اور وہ جس سے آلات واوزار بنائے جاتے ہیں جیسے کہ آہن' تابنا' پیتل' کانسی اور وہ جو اور کاموں کے لئے درکار ہوں مثلاً نمک' گندھک' تیل' تارکول' کہ ان میں کمترین نمک ہے کہ جس سے کھانے گوارندہ ہوتے ہیں کہ اگر کسی شہر میں نمک نایاب ہو جائے تو تمام کھانے برباد ہو جائیں اور لذت تمام کھانوں سے جاتی رہے اور سب بیمار پڑ جائیں۔ اور ہلاک ہو جانے کا خطرہ ہو۔ پس اللہ تعالیٰ کے الطاف ورحمت پر غور کرو کہ اگر چہ تجھے غذا عطا کی لیکن چونکہ اس کی خوبی میں اضافے کے لئے کچھ چاہئے تھا تو اس نمک کو بارش کے آبِ شفا سے پیدا کیا۔ کہ آئے اور زمین میں جمع ہو جائے۔ اور نمک میں منقلب ہو جائے۔ اس قسم کی تخلیقات کی بھی حد نہیں۔

ایک اور آیت وہ جانور ہیں جو روئے زمین پر ہیں کہ ان میں سے بعض چلتے ہیں تو بعض فضا میں پرواز کرتے ہیں۔ بعض سینے کے بل گھسٹتے ہیں۔ بعض دو پاؤں سے چلتے ہیں۔ تو بعض چار پاؤں پر اور بعض بہت سے پاؤں کے سہارے چلتے ہیں۔ پس تو فضا میں اڑنے والے گونا گوں پرندوں اور حشرات الارض پر غور کر کہ ہر ایک جداگانہ شکل وصورت کا مالک ہے۔ اور سب ایک دوسرے سے بڑھ کر خوب صورت ہیں۔ اور اللہ نے جو جس کام کا تھا اُسے اُس پر لگا دیا ہے۔ اور ہر ایک کو بذریعہ الہام بتایا کہ وہ اپنی غذا کس طرح حاصل کرے۔ اور اپنے بچے کو کس طرح پالے اور اُس کی حفاظت کیونکر کرے۔ اور اپنا آشیانہ کیسے بنائے۔ چیونٹیوں پر نگاہ ڈال کہ کس طرح بروقت اپنی غذا جمع کرتی ہے۔ اگر گندم ہو تو چونکہ جانتی ہے کہ سالم رکھنے سے برباد ہو جائے گی تو اس کے دو ٹکڑے کر ڈالتی ہے تا کہ اسے کیڑا نہ لگے۔ اور کشینز اگر سالم نہ ہو تو خراب ہو جاتی ہے۔ تو اسے سالم رہنے دیتی ہے۔ مکڑی کو دیکھ اپنا گھر کس طرح بناتی ہے۔ اور حساب کیسے ملحوظ رکھتی ہے۔ اپنے

لعابِ دہن سے دھاگا بناتی ہے۔ اور دیوار کا گوشہ طلب کرتی ہے۔ ایک طرف اس کی بنیاد رکھتی ہے تو دوسری طرف تانے کو لے جاتی ہے۔ پھر اس میں پُود کا آغاز کرتی ہے۔ اور دھاگوں کے درمیان ایسا اندازہ رکھتی ہے کہ بعض دھاگے دور تر تو بعض نزدیک تر نہ ہونے پائیں تاکہ اچھی اور متناسب ہوں؟ پھر ایک دھاگے کے ساتھ دیوار کے گوشے میں معلق ہو جاتی ہے۔ اور منتظر ہوتی ہے کہ کوئی مکھی اڑ کر پھنسے تاکہ اس کی غذا بن سکے۔ پس وہ مکھی پر ٹوٹ پڑتی ہے اور اس کو شکار کر لیتی ہے اور اس دھاگے سے مکھی کے ہاتھ پاؤں کو جکڑ لیتی ہے تاکہ اس کے بھاگ نکلنے سے ایمن ہو جائے۔ پھر اسے چھوڑ کر دوسری مکھی کے شکار میں لگ جاتی ہے۔ شہد کی مکھی کو دیکھ کہ کس طرح اپنا چھتا شش پہلو خانوں سے ترکیب دیتی ہے کیونکہ اگر چار پہلو کے خانے بناتی تو گوشے ان خانون کے خالی رہتے اور جگہ ضائع ہوتی۔ جُملہ اشکال میں کوئی شکل بہم چسپیدہ ہو اور دائرے کے قریب ہو مسدس سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔ اور یہ امر ہندسے کی برہان سے معلوم کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور لطف سے اس قدر عنایت اس چھوٹے سے حیوان پر بذریعہ الہام کر دی ہے۔ اور مچھر کو بذریعہ الہام بتایا ہے کہ غذا اس کی خون ہے۔ اور اسے تیز اور باریک خرطوم دے کر پیدا کیا گیا ہے۔ تاکہ تجھ میں چبھو دے اور اس سے خون کشید کرے۔ اور یہ حِس بھی عطا کی کہ جب تُو اسے پکڑنے کے لئے ہاتھ ہلائے تو بھاگ جائے اور دو لطیف پر دیئے تاکہ اُڑ سکے اور جلدی بھاگ جائے۔ نیز جلدی واپس آ سکے۔ اگر مچھر کو عقل دی گئی ہوتی اور اس کے پاس زبان بھی ہوتی تو اپنے خالق کی عنایت و فضل پر اتنا شکر کرتا کہ سب انسان اسے دیکھ کر حیرت میں ڈوب جاتے تاہم وہ زبانِ حال سے شُکر اور تسبیح سرانجام دیتا ہے۔ ''وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ'' (قرآن ۱۷/۴۴:) (لیکن تم اس کی ستایش کو سمجھ نہیں سکتے) یہ جنس بھی عجائب میں بے نہایت ہے۔ کس کا یہ حوصلہ ہے کہ لاکھوں کروڑوں میں سے ایک عجوبہ کو بھی سمجھ سکے۔ تیرا کیا خیال ہے کہ یہ جانور جو ان عجیب و غریب شکل وصورتوں کے ہیں اور خوب صورت رنگوں کے مالک ہیں اور متناسب جسموں کے ہیں کیا وہ خود بخود پیدا ہو گئے ہیں یا تو نے انھیں تخلیق کیا ہے؟ پاک ہے وہ ذات جو آنکھوں کے اس نور کو اندھا کر سکتی ہے تاکہ یہ دیکھ نہ سکیں۔ اور دلوں کو غافل رکھ سکتا ہے تاکہ تفکر نہ کریں۔ کہ ظاہری آنکھوں سے دیکھیں لیکن چشمِ دل سے عبرت اندوز نہ ہوں۔ اور سماعت ان کی جس کو سننا چاہیئے اس سے معزول کر دی جائے تاکہ چوپایوں کی طرح سوائے آواز کے نہ سن سکیں اور جس طرح پرندوں کی زبان میں حرف نہیں ہوتے راہ نہ پائیں۔ اور دیدار جیسا کہ ہونا چاہیئے آنکھیں اس سے محروم کر دی جائیں تاکہ ہر خط جو سفیدی پر ہو اُسے نہ دیکھیں۔ اور اللہ کے یہ خط کہ نہ حرف ہیں نہ تحریر جو عالم کے ذرہ ذرہ کے ظاہر و باطن پر تحریر ہیں انسان انھیں سمجھ نہ سکیں۔ اور چیونٹی کے اس گھر کو

جو چند ذروں سے زیادہ نہیں پر غور کر اور کان لگا کہ وہ کیا کہتی ہے۔ وہ بزبان فصیح فریاد کرتی ہے کہ ''اے سادہ دل اگر کوئی ایک تصویر دیوار پر بنادے تو اس کی نقاشی اور استادی پر حیرت میں گم ہو جاتا ہے' آ تا کہ نقاش اور صورت گر کو دیکھے۔ میں خود ایک ذرہ سے زیادہ نہیں کہ نقاش نے آفرینش کے روز اول سے مجھ ذرہ سے چیونٹی بنانا تھی۔ دیکھ کہ میرے جسم کے اجزا کو کس طرح تقسیم کیا ہے تا کہ میرے سر' پاؤں' دل' ہاتھ اور دیگر اعضا بنائے۔ اور میرے سرو دماغ میں کتنے ہی بالا خانے اور خزانے تعمیر کئے ہیں کہ ایک میں قوت ذائقہ ہے تو دوسرے میں قوت شامہ' ایک میں قوت سمع' پھر سر کے باہر کتنے ہی منظر (چشم) سجائے ہیں کہ ان سے نگینۂ چشم کی صورت گری کی اور درمیان میں آنکھ کی پتلی رکھی۔ اور منہ جو کھانے کی راہ ہے اسے بنایا۔ میرے ہاتھ پاؤں بنائے۔ اور باطن میں وہ جگہ جہاں غذا پہنچتی ہے تا کہ ہضم ہو جائے اور وہ جگہ جہاں سے غذا باہر آتی ہے اور اس سے متعلق جملہ آلات پیدا کرتا ہے۔ پھر میری چابک شکل وصورت اور میرا جسم تین طبقوں میں تعمیر کرتا ہے۔ پھر ان کو باہم جوڑ دیتا ہے' پھر حاجب کی مانند میری کمرِ خدمت باندھتا ہے اور مجھے سیاہ قبا کا لباس عطا کرتا ہے۔ پھر مجھے اس دنیا میں جسے تو سمجھتا ہے کہ تیرے لئے خلق ہوئی ہے باہر لاتا ہے۔ تا کہ میں تیری ہی طرح اس کی نعمت کے حصول کے لئے پھروں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ تجھے مسخر کرتا ہے تا کہ تو دن رات کھیتی کا اہتمام کرے۔ بیج بوئے' آب رسانی کرے' زمین تیار کرے تا کہ جَو وگندم اور دوسرے دانے اور روغن دار اجناس حاصل کرے۔ پھر تو انھیں جہاں چھپا کر ذخیرہ کرے مجھے اس کی راہ سکھاتا ہے جس سے میں زیرزمین اپنے گھر میں بیٹھی اس کی خوشبو سونگھ لوں اور اسے لے جانے میں لگ جاؤں۔ اور تو خود اس رنج میں ہوتا ہے کہ تو سال بھر کے لئے اناج نہیں رکھتا اور میں اس میں سے ایک سالہ ضرورت کا اناج اٹھا لیتی ہوں اور حفاظت سے اپنے پاس رکھ لیتی ہوں۔ پھر میں اپنی غذا باہر لاتی ہوں تا کہ دھوپ میں خشک کرلوں۔ اور قبل اس کے کہ بارش آئے اللہ مجھے بتادیتا ہے کہ بارش آنے والی ہے تو میں اسے اٹھا کر مناسب جگہ لے آتی ہوں۔ جب کہ تو نے اگر خرمن کھیت میں رکھا ہو اور سیل اور بارش آنے والی ہو تجھے اس کی کوئی خبر نہیں ہوتی حتیٰ کہ سب ضائع ہو جاتی ہے۔ اور سیلاب برد ہو جاتی ہے۔ پس میں اس اللہ کا شکر کیوں نہ بجالاؤں جس نے مجھے ایک ذرہ سے اس حُسن اور ہوش مندی کے ساتھ خلق کیا۔ اور تجھ جیسے کو میرے حضور زراعت کے لئے کھڑا کر دیا۔ تا کہ تو میرے لئے اناج کاشت کرے۔ پھر اُسے کاٹے اور رنج اٹھائے اور دانے میں اٹھالے جاؤں۔ اور مزے سے کھاؤں، چھوٹے بڑے جملہ حیوانات میں سے کوئی حیوان ایسا نہیں جو زبانِ حال سے اپنے پروردگار کی ثنا خوانی نہ کرتا ہو۔ بلکہ نباتات میں سے کوئی نبات ایسی نہیں جو یہ ثنا خوانی نہ کرتی ہو۔ بلکہ کوئی ذرہ بھی دنیا بھر کے ذروں میں ایسا نہ ہوگا

کہ اگر چہ وہ جماد ہے' یہ منادی نہ کرتا ہو۔ اور انسان ان کی منادی سے بے خبر ہو' اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ '' (قرآن: ۴۴/۱۷) (کوئی شے ایسی نہیں جو اللہ کی ستایش نہ کرتی ہو اور اس کی پاکی کی بات نہ کرتی ہو۔ بحمد اللہ لیکن تم ان کی تسبیحات کو نہیں پا سکتے)۔ اور یہ عالم بھی وہ ہے جس کے عجائب کی کوئی حد نہیں۔ اس کی شرح کیسے ممکن ہو؟

مزید نشانی سمندروں میں ہے۔ جو روئے زمین پر ہے اور یہ سب اس بڑے سمندر کے اجزاء ہیں کہ جو زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور پوری زمین اس سمندر کے درمیان ایک جزیرہ سے زیادہ نہیں۔ حدیث میں ہے کہ سمندر میں ربع مسکون یہ مقدار مانند ایک اصطبل کے ہے۔ پس جب تو خشکی کے عجائب کے نظارے سے فارغ ہو چکا ہے اب ذرا سمندر کے عجائب کو دیکھ۔ کہ سمندر جتنا زمین سے زیادہ ہے اس کے عجائب بھی اسی قدر زیادہ ہیں۔ کیونکہ ہر حیوان جو خشکی پر موجود ہے اس کا سا سمندر میں بھی موجود ہے۔ بلکہ اور بہت سے حیوانات سمندر میں ہیں کہ جن کا سا خشکی پر موجود نہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک صورت وطبع میں دوسروں سے جداگانہ ہے۔ ایک اتنا چھوٹا کہ آنکھ اسے دیکھنے سے قاصر اور ایک اتنا بڑا کہ اگر کوئی اس کی پشت پر سوار ہو جائے تو یوں گمان کرتا ہے کہ پہاڑ ہے۔ پس جب اس کی پشت پر آگ جلاتے ہیں تو وہ محسوس کر کے ہلتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ جانور کی پشت پر ہے۔ سمندروں کے عجائب پر کتنی ہی کتابیں معرضِ تحریر میں لائی گئی ہیں۔ ان کی تفصیل یہاں کیسے ممکن ہے۔ حیوانوں کے علاوہ دوسری کسی مخلوق پر نظر ڈالیں۔ جنھیں صدف کہا جاتا ہے۔ اور صدف دراصل ایک حیوان کا چھلکا ہے۔ اسے الہام دیا گیا ہے کہ بہار کے موسم کی بارش کے وقت ساحل کی طرف آ جائے اور اپنا منہ کھول دے تا کہ بارش کا قطرہ جو اچھا ہو اور سمندر کے پانی کی طرح شور نہ ہو صدف کے منہ میں جا گرتا ہے۔ پھر وہ اپنا منہ بند کر لیتی ہے اور سمندر کی گہرائی میں چلی جاتی ہے۔ جب کہ یہ قطرۂ باراں اس کے باطن میں موجود ہوتا ہے۔ ایسے ہی جیسے نطفہ رحم مادر میں ہوتا ہے۔ صدف اس کی پرورش کرتی ہے۔ صدف کا وہ جوہر حق تعالیٰ نے مروارید کی صفت سے متصف پیدا کیا ہے۔ اور وہ غذا اس میں سرایت کرتی ہے ایک مدت دراز تک' تا کہ بارش کا ہر قطرہ مروارید بن جائے۔ بعض چھوٹے ہوتے ہیں تو بعض اُن سے بڑے ہوتے ہیں تا کہ تو اس سے زیب وزینت کا سامان کر سکے۔ سمندر کے اندر سنگِ نباتی اگایا جاتا ہے جو رنگ میں سرخ اور شکل میں نباتات کی طرح ہوتا ہے اور وہ جوہر سنگ کا ہوتا ہے۔ اسے مرجان کہا جاتا ہے اور سمندر کی جھاگ میں سے ایک جوہر ساحل پر آ گرتا ہے کہ جسے عنبر کہتے ہیں۔ حیوانات کے علاوہ جواہروں کے علاوہ سمندر میں کثیر ہیں۔ سمندر میں کشتی رانی اور کشتی کی ایسی شکل وصورت وضع کرنا کہ غرقاب نہ ہو اور کشتی

بان کی راہنمائی کی ٹیڑھی سے سیدھی ہوا کا امتیاز کر سکے۔ اور ستارے کی آفرینش کہ ملاح کے لئے دلیل راہ بن سکے کیونکہ سمندر میں سراسر پانی ہونے کی وجہ سے تو کوئی اور نشان راہ نہیں ہوتا تو یہ صورت سب سے عجیب ہوتی ہے۔ بلکہ ایسے پانی کی تشکیل کہ لطیف صورت اور روشنی میں اور اس کے اجزاء کی باہم ترکیب میں اور نباتات اور حیوانات پر زندگی کی راہ بند کرنا اور بھی عجیب تر ہے۔ کہ اگر تو پانی کے ایک گھونٹ کا محتاج ہو تو سمندر سے نہ ملے۔ اور دنیا اور دنیا کا مال سب انسان کے لئے ہے تو تُو یہ سب بھی دے دے تاکہ تجھے پانی دیں۔ اور اگر وہ پانی کا گھونٹ تیرے پیٹ میں ہو اور اس کے باہر آنے کا راستہ بند ہو جائے کہ باہر نہ آ سکے۔ تو اپنا تمام اثاثہ بھی اللہ کی راہ میں دے دے گا تاکہ اس سے نجات پائے۔ مختصر یہ کہ پانی اور سمندر کے عجائب بے انتہا ہیں۔

ہوا کی نشانی نیز جو کچھ ہوا میں ہے اس کی نشانیاں

ہوا بھی ایک گونہ سمندر ہے جو موجیں مارتا ہے اور ہوا اس کی موج زن ہے۔ ہوا ایسا لطیف جسم ہے کہ آنکھ اس کو دیکھنے سے قاصر ہے۔ لیکن وہ تمھاری قوتِ باصرہ کے آگے حجاب نہیں بنتی اور تمھاری زندگی کی مسلسل غذا ہے۔ کھانے پینے کی حاجت تو دن میں ایک یا دو بار ہوتی ہے لیکن اگر ایک ساعت تُو سانس نہ لے اور ہوا تیرے باطن میں پہنچ نہ پائے تو تُو ہلاک ہو جائے۔ حالانکہ اس امر سے غافل ہے۔ اور ہوا کے خواص میں ایک خاصیت یہ ہے کہ کشتیوں کو سطح آب پر لٹکا رکھتی ہے۔ اور انھیں غرق ہونے سے بچاتی ہے۔ اور اس کی اس کیفیت کی تفصیل بہت طویل ہے۔ اور دیکھ کہ اس ہوا سے قبل کہ یہ آسمان پر پہنچے بادل، بارش، برف، گرج چمک وغیرہ کیا کچھ پیدا کیا ہے۔ اور اس گھنگھور گھٹا پر نظر ڈال جو ناگاہ ہوائے لطیف میں نمودار ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ سمندر سے اٹھے اور وہاں سے پانی لے اور پھر بہ سبیلِ بخارات پہاڑوں پر دکھائی دے اور ممکن ہے کہ خود نفس ہوا سے ظہور پذیر ہو اور اُن مقامات پر جو کوہ و دریا اور چشموں سے دور ہیں قطرہ قطرہ پانی وہاں گرائے۔ ہر قطرہ جو گرتا ہے وہ بخطِ مستقیم اور اس اندازہ کے مطابق جو اسے بتایا گیا ہے وہاں گرتا ہے تاکہ فلاں کیڑا جو پیاسا ہے، سیراب ہو جائے۔ اور فلاں نباتات خشک ہونے والی ہے تر ہو جائے، اور فلاں بیج کو پانی کی ضرورت ہے، اسے پانی دے۔ اور فلاں میوہ فلاں درخت پر خشک ہو رہا ہے اس کے درخت کی جڑ میں پہنچنا چاہئے تاکہ درخت کے اندر داخل ہو اور پھر ان عروق کے ذریعے جو بال کی طرح باریک ہوتی ہیں پانی میوے تک پہنچتا ہے تاکہ وہ پھل تر و تازہ ہو۔ جسے تو کھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے الطاف سے بے خبر ہوتا ہے۔ اور ہر ایک کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ کہاں اترے اور کس کی روزی بنے۔ اگر پوری مخلوق بھی مل کر اس کے قطروں کا

شمار کرنا چاہے تو ممکن نہیں کہ یہ کام کر سکے۔ اور اگر یہ بارش یک بارگی آ جائے اور گذر جائے تو وہ نباتات کو بہ تدریج نہیں اگاتی۔ تو اللہ تعالیٰ سردی کو اس کی راہ میں مسلّط کر دیتا ہے اور اسے برف بنا دیتا ہے۔ جو دھنکی ہوئی روئی کی مانند گرتی ہے۔ اور پہاڑوں میں اس کے ذخیرے کے لئے گودام بنائے تاکہ وہاں جمع ہو جائے۔ اور ٹھنڈی ہو جائے اور جلد نہ پگھلے۔ پھر جب موسم بہار کی فضا میں حرارت پیدا ہوتی ہے وہ اس برف کو بتدریج پگھلاتی ہے جس سے ندیاں بقدر حاجت رواں ہوتی ہیں۔ تاکہ موسم گرما میں اس پانی کو بہ تدریج کھیتی میں صرف کرے۔ اگر ایسا انتظام نہ ہوتا اور بارش بردوام برستی تو رنج و ملالت کا باعث ہوتی۔ یا یک بارگی آتی اور گذر جاتی تو نباتات سارا سال پانی سے محروم رہتی۔ برف کی صورت میں اللہ کا کتنا لطف و رحمت ہے بلکہ اس کی ہر شے میں اس کی رحمت و لطف مضمر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے تمام اجزا حق و عدل و حکمت کے ساتھ پیدا کئے ہیں۔ اسی لئے فرمایا کہ: ''وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ'' (قرآن: ۳۸/۴۴ و ۳۹) (ہم نے زمین و آسمان میں نیز جو ان کے درمیان ہے کھیل نہیں بنایا بلکہ ہم نے اسے بالحق پیدا کیا ہے لیکن اکثر انسان یہ بات نہیں جانتے)۔ ہم نے اسے بہ بازی پیدا نہیں کیا۔ یعنی ایسے پیدا کیا ہے جیسا کہ باید و شاید۔

ایک اور نشانی آسمان کی بادشاہی ہے

ستارے اور ان کے عجائب ہیں۔ اور زمین اور جو کچھ کہ زمین پر ہے بہ اختصار ہے۔ اور پورے قرآن میں آسمان کے عجائب اور ستاروں میں تفکر کی تاکید ہے۔ جیسے کہ فرمایا کہ: ''وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ'' (قرآن: ۳۲/۲۱) (ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا اور لوگ اس کی نشانیوں سے اعراض کئے ہوئے ہیں)۔ نیز فرمایا کہ: ''لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ'' (قرآن: ۵۷/۴۰) (آسمان اور زمین کی تخلیق لوگوں کی تخلیق سے زیادہ بڑی ہے) پس اے انسان تجھے حکم دیا گیا ہے کہ ملکوت آسمان کے عجائبات میں تفکر کرے۔ یہ مطلب نہیں کہ آسمان کی نیلاہٹ اور ستاروں کی روشنی کو دیکھے اور پھر آنکھ بند کر لے کیونکہ یہ کام تو حیوانات بھی کرتے ہیں۔ لیکن جب تو خود اپنی ذات کو اور اپنے عجائب کہ تیرے زیادہ قریب ہیں اور جو عجائبات آسمان کے ایک ذرہ کے برابر بھی نہیں تو پہچانتا تو تُو آسمان کے عجائب کو کیسے پہچانے گا؟ بلکہ چاہئے کہ بہ تدریج ترقی کرے۔ پہلے اپنی شناخت کرے۔ پھر زمین و نباتات و حیوانات و معادن میں تفکر کرے۔ پھر اہوا، گھٹا اور اس کے عجائب میں غور کرے پھر آسمانوں پر غور

کرے پھر کرسی پر' پھر عرش پر پھر جب عالمِ اجسام کے غور سے فارغ ہو تو عالمِ ارواح میں وارد ہو۔ پھر ملائکہ و شیطان و جن کو پہچانے اور فرشتوں کے مختلف درجات اور مقامات کا اِدراک کرے۔ اس کے بعد چاہئے کہ آسمان' ستاروں اور ان کی حرکت اور مشرق و مغرب میں ان کی گردش میں تفکر کرے۔ اور غور کرے کہ ان کی ماہیت کیا ہے اور یہ کس کام کے لئے ہیں۔ پھر ستاروں کی کثرت پر غور کرے کہ کوئی ان کا شمار نہیں جانتا اور ان میں سے ہر ایک جداگانہ رنگ کا مالک ہے۔ بعض سرخ ہیں تو بعض سفید بعض پارے کی طرح ہیں۔ بعض چھوٹے ہیں تو بعض بڑے اور پھر ان کا ہر گروہ ایک دوسری صورت میں اکٹھا ہو جاتا ہے۔ بعض صورت حمل میں ہوتے ہیں تو بعض صورت ثور میں تو بعض صورت عقرب میں وقس علیٰ ہٰذا۔ بلکہ ہر صورت جو زمین میں ہے کواکب کی اشکال میں تیرے لئے وہاں مثال ہے۔ پھر ان کی سیر و گردش باہم مختلف ہوتی ہے۔ بعض پورے ایک ماہ میں فلک کو طے کرتے ہیں تو بعض سال بھر میں تو بعض بارہ[۱۲] سالوں میں تو بعض تیس[۳۰] سالوں میں اور اکثریت ان کی ہے جو چھتیس ہزار سالوں میں فلک کو طے کرتے ہیں۔ بشرطیکہ فلک قائم رہے اور قیامت نہ آ جائے۔ اور ستاروں کے علوم کے عجائب وہ ہیں کہ جن کی انتہا نہیں۔ جب تو نے زمین کے بعض عجائب کو پہچان لیا تو جان لے کہ ان میں تفاوت ان کی شکل کے تفاوت کے مطابق ہوگی۔ کیونکہ زمین اس قدر وسیع ہے کہ کوئی اس کی نہایت کو نہیں پہنچتا۔ اور سورج زمین سے ایک سو ساٹھ گنا سے کچھ اوپر بڑا ہے۔ تو تُو اس سے جان سکتا ہے کہ وہ ستارے جو اتنے چھوٹے دکھائی دیتے ہیں ان کی مسافت کتنی دور ہے۔ اور اسی سے جانتا ہے کہ کس قدر تیزی سے حرکت کرتے ہیں کہ آدھ گھنٹے میں سورج کی ٹکیہ زمین سے باہر نکلتی ہے۔ تو اس عرصے میں اس نے زمین کی نسبت ایک سو ساٹھ گنا مسافت طے کر لی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دن حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ زوال ہو گیا؟ تو حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا ''نہیں' ہاں'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''یہ کیسے؟'' تو حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ اس وقت سے جب میں نے 'نہ' کہا اور اب جو 'ہاں' کہا سورج نے پانچ سو سالہ راہ طے کر لی تھی۔ اور آسمان پر ایسا ستارہ بھی ہے کہ زمین سے سو گنا بڑا ہے لیکن بلندی کی وجہ سے اتنا چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ جب ایک ستارہ ایسے ہو تو قیاس کر کہ پورا فلک کتنا بڑا وسیع ہوگا۔ اور بایں ہمہ بزرگی کے تیری نگاہ میں کتنا چھوٹا دکھایا گیا ہے تاکہ اس وسیلے سے تو اپنے خالق کی عظمت اور اس کی سلطنت کا اندازہ کر سکے۔ پس ہر ستارے میں حکمت ہے۔ اور اس کے رنگ میں' نیز اس کی رفتار میں اور اس کے رجوع میں' اس کی استقامت میں اور اس کے طلوع غروب میں حکمتیں ہیں اور وہ جو روشن تر ہے وہ حکمتِ آفتاب ہے کہ اس کے فلک کو فلک البروج کے ساتھ میدان دیا گیا ہے۔ جس سے وہ سال کے بعض

حصوں میں تیرے سر کے قریب ہوتا ہے تو بعض میں دور ہوتا ہے۔ تا کہ موسم مختلف ہو جائے' کبھی سرد ہوتا ہے کبھی گرم اور کبھی معتدل اور اسی سبب سے شب و روز مختلف ہو جاتے ہیں۔ کبھی لمبے تو کبھی چھوٹے۔ اور اگر ہم اس کی کیفیت کی شرح میں لگ جائیں تو وہ طویل ہو جائے گی۔ اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان علوم میں سے ہمیں عطا فرمایا ہے تو اُسے ہم اس مختصر زندگی میں بیان کرنا چاہیں تو اس کے لئے ایک زمانہ درکار ہے۔ اور جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ حقیر اور مختصر ہے بمقابلہ اس کے جو علماء اور انبیاء کو معلوم تھا۔ اور تفصیل تخلیق میں انبیاء کے علم کے مقابلے میں تمام اولیاء اور علماء کا علم مختصر ہوتا ہے اور انبیاء کا علم مقرب فرشتوں کے علم کے مقابلے میں مختصر ہوتا ہے۔ اور اگر ان سب کے علم کو مجموعاً علم حقِ تعالیٰ سے کوئی نسبت دینا چاہیں تو یہ اس قابل ہی نہیں کہ اسے علم کہا جا سکے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے خلق کو اتنا علم عطا فرمایا اور پھر ان پر نادانی کا داغ لگا دیا فرمایا کہ:

''مَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا'' (قرآن: ۸۵/۱۷) (اور ہم نے نہیں دیا علم تم کو مگر تھوڑا سا)

راہِ فکر ایک نمونہ ہے جو بیان ہوا۔ تا کہ تو اپنی غفلت سے آگاہ ہو سکے کہ اگر تو کسی امیر کے گھر میں داخل ہو جو منقش ہو اور اس میں گچکاری کی گئی ہو تو تُو ایک لمبی مدت تک اس کی صفات بیان کرتا ہے اور تعجب کا اظہار کرتا ہے۔ حالانکہ تو خانۂ خدا میں یہ سب عجائب دیکھتا ہے اور کوئی تعجب نہیں کرتا! اور یہ عالمِ اجسام خانۂ خدا ہے جس کا فرش زمین ہے۔ اور چھت جس کی آسمان ہے۔ جو بے ستون ہے اور یہ امر عجب تر ہے اور خزانہ اس کا پہاڑ ہیں۔ اور گنجینہ اس کا سمندر ہیں۔ اور اس گھر کے آلات ولوازم حیوانات اور نباتات ہیں۔ چراغ اس گھر کا چاند ہے۔ اور مشعل اس کی آفتاب ہے۔ اور قندیلیں اس کی ستارے ہیں۔ اور مشعل بردار فرشتے اور تُو ہے کہ اس گھر کے عجائب سے بے خبر ہے۔ یہ گھر بہت بڑا ہے۔ اور تیری نگاہ نہایت مختصر ہے اس لئے یہ اس میں نہیں سماتا اور تو مثل ایک چیونٹی کے ہے۔ جو بادشاہ کے محل کے ایک گوشے میں بل کی مالک ہے۔ اور وہ سوائے اپنے بل کے یا اپنی غذا کے یا اپنے معاونوں کے کسی اور شے کی اسے خبر نہیں۔ اس محل کی زیبائش اور غلاموں کی کثرت نیز بادشاہ کے تخت اور اس کی مملکت کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی۔ تو اگر چاہتا ہے کہ ایک چیونٹی کے مرتبے پر قانع رہے تو رہ ورنہ تجھے بُستانِ معرفتِ حق تعالیٰ کی راہ دکھا دی گئی ہے۔ اسے دیکھ باہر نکل اور اپنی آنکھیں کھول تا کہ عجائب خداوندی دیکھے اور مدہوش ہو جائے اور متحیر۔ والسلام۔

اصل ہشتم: توحید و توکل کے بیان میں

یاد رہے کہ توکل مقربوں کے مقامات میں سے ہے۔ اور درجہ اس کا بہت بڑا ہے۔ لیکن اپنے نفس میں

اس کا علم بہت دقیق ہے۔ اور مشکل۔ اور عمل اس پر دشوار ہے۔ اور اشکال اس کا اس وجہ سے ہے کہ جو کوئی کسی چیز میں سوائے حق تعالیٰ کے کسی اور کا اثر دیکھتا ہو اس کی توحید ناقص ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی تمام اسباب کو درمیان سے نکال دے تو گویا اس نے شریعت پر طعن کی۔ اور اگر اسباب کے مسبب کو نہ دیکھے تو گویا اس نے اپنی عقل کو بڑا اقرار دیا ہوگا۔ اور جب غور کریں تو ہوسکتا ہے کہ اسباب کے علاوہ کسی اور شے پر توکل کرتا ہو جس سے توحید میں نقص واقع ہوتا ہو۔ پس توکل کی شرح اس طرح سے کہ عقل شرع اور توحید اکٹھا بیان کرے اور سب کو باہم جمع کرے تو یہ ایک گہرا علم ہے جس سے ہر کوئی بہرہ مند نہیں ہوتا۔ ہم پہلے توکل کی فضیلت بیان کریں گے۔ پھر اس کی حقیقت اور پھر اس کے احوال و اعمال کا بیان کریں گے۔

فضیلت توکل

اللہ تعالیٰ نے سب کو توکل کا حکم دیا ہے۔ اور اسے ایمان کی شرط قرار دیا ہے اور فرمایا کہ: ''وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ'' (قرآن: ۵/۲۳) (اور اللہ پر توکل کرو اگر تم مومن ہو)۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ متوکلوں کو دوست رکھتا ہے۔ ''اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ''(۱) اور فرمایا کہ ''جو کوئی اللہ پر توکل کرتا ہے کافی ہے۔ ''وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ''(۲) نیز فرمایا کہ کیا اللہ بندے کے لئے کافی نہیں؟'' ''اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ''(۳) اور اس قسم کی آیات بہت سی ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھے امتیں دکھائی گئیں تو میں نے اپنی امت کو دیکھا کہ کوہ و صحرا ان سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں ان کی کثرت سے حیران ہوا تو مجھ سے کہا گیا کہ تم راضی ہو؟' میں نے کہا ''ہاں میں راضی ہوں'' تو اللہ نے فرمایا کہ ان سب میں سے ستر ہزار بے حساب جنت میں داخل ہوں گے' تو صحابہ نے پوچھا کہ ''وہ کون لوگ ہیں'' تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو اپنے کاموں کی بنیاد افسون و فال اور داغ پر نہ رکھیں گے اور سوائے اللہ پر اعتماد و توکل نہ کریں گے''۔ پھر عکاشہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور بولے ''اے اللہ کے رسول دعا فرمائیں تا کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان میں سے قرار دیں'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''بارِ خدایا اسے ان میں سے ٹھہرا لے''۔ ایک اور صحابی کھڑے ہو گئے اور اسی دعا کی خواہش کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''سبقك بها عكاشه'' یعنی عکاشہ سبقت لے گیا۔

آنحضرت نے فرمایا کہ ''اگر تم اللہ پر توکل اس طرح کرتے جیسا کہ توکل کا حق ہے تو تمھاری روزی

(۱) (قرآن: ۳/۱۵۹) (۲) (قرآن: ۶۵/۳) (۳) (قرآن: ۳۹/۳۶)

تمھیں پہنچادیتا ایسے ہی جیسے وہ پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ جو صبح اپنے آشیانے سے اڑتے ہیں تو ان کے پیٹ خالی ہوتے ہیں اور وہ بھوکے ہوتے ہیں۔ رات کو لوٹتے ہیں تو ان کے پیٹ پُر ہوتے ہیں اور وہ سیر ہوتے ہیں''۔ نیز فرمایا کہ: ''جو کوئی خود کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہے تو اللہ اُسکی حاجات کی کفایت کرتا ہے اور روزی اسے ایسی جگہ سے فراہم کرتا ہے جو اس کے گمان میں بھی نہیں ہوتی۔ اور جو کوئی دنیا کی پناہ میں خود کو دیتا ہے تو اللہ اسے دنیا ہی کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

جب حضرت ابراہیم خلیل کو لوگوں نے پکڑا کہ انھیں منجنیق میں رکھیں تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''حَسْبِیَ اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل'' (اللہ میرے لئے کافی ہے اور وہ اچھا کاردان ہے) تو ہوا میں جبریل علیہ السلام آپ کے پاس پہنچے اور کہا ''آپ کو کوئی ضرورت ہے تاکہ پوری کی جائے؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''نہیں'' یہ اس لئے فرمایا تاکہ اپنے قول 'حَسْبِیَ اللہ' کی تصدیق کرسکیں۔ آپ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس صفت سے متصف کردیا اور فرمایا کہ: ''وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِیْ وَفّٰی'' (قرآن: ۳۷/۵۳) (اور ابراہیم علیہ السلام وہ ہے جس نے جو کچھ کہا گیا تھا اس پر وفا کی)۔

حضرت داؤد پر وحی آئی کہ: ''اے داؤد کوئی بندہ جملہ خلق میں سے ایسا نہیں ہے جو میرا دامن تھامے کہ اگر تمام زمین وآسمان اس کی مخالفت میں کید و مکر کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں کہ میں اسے نجات نہ دوں''۔

اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''مجھے بچھو نے ڈنگ مارا تو میری ماں نے مجھے قسم دی کہ اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ میں افسون کراؤں'' تو میں نے اپنی ماں کا دل رکھنے کے لئے وہ ہاتھ جو سلامت تھا افسون گر کے آگے بڑھا دیا''۔ یہ آپ نے اس لئے کیا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ 'وہ متوکل نہیں ہے جو افسون یا داغ وغیرہ کرے''۔ ابراہیم بن ادھمؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک راہب سے پوچھا کہ کھانا کہاں سے کھاتے ہو؟ تو اس نے کہا کہ جو روزی دیتا ہے اس سے پوچھو کہ کہاں سے بھیجتا ہے کہ مجھے تو اس کا علم نہیں ہے''۔ ایک شخص سے جو ہمیشہ عبادت میں مصروف رہتا تھا پوچھا گیا کہ کھانا کہاں سے کھاتے ہو؟'' تو اس نے اپنے دانتوں کی طرف اشارہ کیا کہ ''جس نے یہ چکی پیدا کی ہے وہ پیسنے کا سامان بھی فراہم کرتا ہے''۔ ہرم بن حیان رضی اللہ عنہ نے اویس قرنی سے کہا کہ ''مجھے بتایئے کہ میں کہاں سکونت اختیار کروں'' تو اویس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''شام میں'' تو حیان نے کہا کہ ''وہاں معیشت کیونکر ہوگی؟'' تو اویس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''اف لهذه القلوب قد خالطها الشك فلا تنفعها الموعظة'' ''ان دلوں پر شک غالب ہوگیا ہے اس لئے یہ نصیحت قبول نہیں کرتے''۔

حقیقتِ توحید کہ توکل کی بنیاد اس پر ہے

یاد رہے کہ توکل احوال دل سے ایک حال کا نام ہے۔ جو ایمان کا ثمر ہے۔ اور ایمان کے آثار بہت سے ہیں۔ لیکن توکل ان سب میں سے دو میں ایمان پر مبنی ہے۔ ایک توحید پر ایمان اور دوسرے اللہ تعالیٰ کے لطف و رحمت کے کمال پر ایمان پر۔ لیکن توحید کی شرح بہت دراز ہے۔ اور اس کے علم کی کوئی حد نہیں۔ لیکن ہم اس مقدار کے مختصر بیان پر اکتفا کریں گے کہ جو بنائے توکل ہے۔

تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ توحید کے چار درجے ہیں۔ اس کا ایک مغز ہے اور پھر اس کے مغز کا ایک مغز ہے۔ اور اس کا ایک پوست ہے اور پھر اس پوست کا پوست ہے۔ پس اس کے دو مغز ہیں اور دو قشر۔ مثال اس کی ایسے ہے جیسے تر اخروٹ کہ جس میں دو مغز اور دو چھلکے معلوم ہیں۔ اور اخروٹ کا روغن اس کے مغز کا مغز ہے۔ توحید کا درجۂ اول یہ ہے کہ انسان زبان سے لاَاِلٰـــہ اِلَّا اللہُ کہے لیکن دل سے اعتقاد نہ رکھتا ہو۔ اور یہ منافق کی توحید ہے۔

درجۂ دوم یہ ہے کہ اس کلمے کے معنی پر دل سے اعتقاد رکھتا ہو لیکن عامی کی طرح تقلیداً یا عالمِ علمِ کلام کی طرح ایک طرح کی دلیل پر۔

درجۂ سوم یہ ہے کہ انسان مشاہدۃً دیکھتا ہو کہ سب کی اصل ایک ہے اور فاعل صرف ایک ہے اور اس کے سوا کوئی فاعل نہیں۔ اور یہ ایک نور ہوتا ہے جو دل میں نمودار ہوتا ہے اور اس نور میں یہ مشاہدہ حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ اعتقاد عامی یا متکلم کے اعتقاد کا سا نہیں ہوتا کہ اعتقاد وہ قید ہوتی ہے جو دل پر بہ حیلہ تقلید یا بہ حیلہ دلیل ڈالی جاتی ہے۔ بلکہ یہ مشاہدہ گشایش ہوتی ہے جو تمام قیود سے آزادی عطا کرتی ہے۔ اور فرق ہے اس شخص میں جو اس امر کا معتقد ہو کہ خواجہ گھر میں ہے کہ فلاں شخص نے یہ کہا ہے تو یہ گویا عامی کی تقلید ہے کہ اس نے باپ سے ایسا سنا ہوتا ہے۔ اور اس شخص میں جو کہ بہ استدلال کہتا ہے کہ خواجہ میں گھر میں موجود اس دلیل کی بناء پر ہے کہ گھوڑے اور غلام گھر پر موجود ہیں اور یہ متکلم کے عقیدے کی مثال ہے۔ اور اس کے درمیان کہ جس نے خواجہ کو اپنی آنکھوں سے گھر مین دیکھا ہو۔ اور یہ مثال عارفوں کی توحید کی ہے۔ یہ توحید اگرچہ درجے میں بہت بڑی ہے۔ لیکن عارف اس میں خلق کو دیکھتا ہے خالق کو بھی دیکھتا ہے۔ اور جانتا ہے کہ مخلوق خالق سے ہے۔ پس اس میں کثرت اور بہتات ہے۔ اور جب تک انسان دو کو دیکھتا ہے تو وہ تفرقے میں ہوتا ہے اور جمعیت سے عاری۔

اور کمال توحید درجۂ چہارم میں ہے کہ انسان سوائے ایک کے اور کچھ نہ دیکھے۔ اور سب کو ایک دیکھے اور ایک پہچانے اور تفرقے کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسے صوفیاء توحید میں فنا کا نام دیتے ہیں۔ جیسے کہ حسینِ حلاجؒ نے خواصؒ کو دیکھا کہ جو بیابان میں پھر رہے تھے تو فرمایا کہ ''کیا کر رہے ہو؟'' تو خواص نے فرمایا کہ ''میں توکل میں اپنے قدم کو راست کر رہا ہوں'' تو حسین حلاجؒ نے فرمایا کہ ''زندگی تو تُو نے باطن کی آبادانی میں گزار دی اور بیٹھ رہا توحید میں کیونکر پہنچے گا؟''[۱]

پس توحید کے یہی چار درجے ہیں:

اوّل: منافق کی توحید: اور وہ گویا چھلکے کا بھی چھلکا ہے۔ جیسے کہ اخروٹ کا باہر کا سبز چھلکا۔ اگر تو اسے کھائے تو ناپسندیدہ ہے۔ اس کے باطن میں اگر جھانکے تو بدشکل دکھائی دے اگرچہ نظر بہ ظاہر سبز ہوتا ہے۔ اور اگر اس تر چھلکے کو جلائے تو دھواں دے بلکہ آگ بجھا دے اور اگر گھر میں رکھے تو کسی کام نہ آئے سوائے اس کے کہ کچھ جگہ گھیرے۔ اور بے مصرف۔ سوائے اس کے کہ چندروز اگر رکھ لے تو اخروٹ کی اندرنی پوست کو تازہ رکھے اور خرابی سے بچائے۔ منافق کی توحید بھی کسی کام کی نہیں ہوتی۔ سوائے اس کے کہ منافق کی کھال کو تلوار سے بچائے رکھتی ہے۔ اور پوست اس کی اس کا جسم ہوتا ہے۔ اس لئے اس نے تلوار سے نجات پالی۔

لیکن جب بدن جاتا رہا (یعنی انسان مرگیا) اور روح باقی رہ گئی تو ایسی توحید کوئی فایدہ نہیں دیتی کیونکہ اخروٹ کا اندرونی چھلکا ایندھن کا کام دیتا ہے۔ اور اسے مغز کے اوپر اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ مغز اس کے اندر آسایش پائے اور خراب نہ ہونے پائے۔ لیکن وہ مغز کے مقابلے میں کم حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔ اسی طرح عوام الناس اور متکلمین کی توحید اس کام کی ہے کہ اس کے مغز کو یعنی اس کی جان کو آتشِ دوزخ سے محفوظ رکھے۔ لیکن اگرچہ اس کام کی ہے تاہم مغز کی لطافت اور روغن سے عاری ہوتی ہے۔ اور جس طرح اخروٹ میں سے دراصل مغز مقصود ہوتا ہے اور عزیز ہے لیکن اگر اسے روغن کے مقابلے میں دیکھا جائے تو وہ کھلی کے مترادف ہوتا ہے۔ اور اپنے نفس میں صفا کو نہیں پہنچا ہوگا۔

توحید کا تیسرا درجہ وہ ہے کہ جس میں ابھی تفرقہ' کثرت اور زیادتی کا وجود باقی ہوتا ہے۔

بلکہ صافی بہ کمال توحید چوتھے درجے ہی میں ہے۔ کہ اس میں اللہ کی ذات باقی رہتی ہے اور بس۔ اور انسان سوائے ایک کے اور کچھ نہیں دیکھتا۔ اور خود اپنی ذات کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ اور اپنے دیدار کے حق

(۱) احیاء میں ہے کہ تو نے اپنی عمر آبادانی باطن میں فنا کر دی پھر توحید میں فنا کہاں؟

میں نیست ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی جیسے دیگر سب کچھ اس کی نگاہوں سے مفقود ہو جاتا ہے۔

فصل: بے شک تو کہے گا کہ توحید کے یہ درجات میرے لئے مشکل ہیں۔ اس کی تفصیل ہونی چاہئے تا کہ میں جان سکوں کہ اس کثرت میں وحدت کیونکر دیکھوں حالانکہ میں دیکھتا ہوں کہ اسباب بہت سے ہیں۔ سب کو ایک کیسے دیکھوں کیونکہ انسان آسمان، زمین اور مخلوقات کو دیکھتا ہے اور یہ سب ایک نہیں ہیں۔

یاد رہے کہ تو منافق کی زبانی کلامی توحید کو نیز عامی کی توحید بہ اعتقاد اور متکلم کی توحید بہ دلیل کو تو تُو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن تجھے اِشکال چوتھے درجے کی توحید میں ہوسکتا ہے۔

اور چوتھے درجے کی توحید کی حاجت توکل کو نہیں۔ توکل کے لئے تیسرے درجے کی توحید کافی ہے۔

اور اس چوتھی توحید کا بیان کرنا اور اس کی تشریح اس شخص کے لئے مشکل ہے جو اس درجے میں نہ پہنچا ہو۔

لیکن مختصراً اس قدر جان لے کہ جائز ہے کہ چیزیں کثیر ہوں لیکن وہ ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوں کہ وہ اس ارتباط کی بناء پر ایک چیز کی مانند ہو جائیں۔ کیونکہ مردِ عارف کی نگاہ میں وہ ایک چیز دکھائی دے اور اس نے اس کے اجزائے ترکیبی کو نہ دیکھا ہو۔ جیسے کہ انسان کی چیزیں بھی بہت سی ہیں جیسے کہ گوشت، پوست، سر، پا، معدہ اور جگر وغیرہ ہیں۔ لیکن حقیقتاً وہ انسان ایک ہی ہے۔ اس لئے روا ہے کہ مرد کسی کو مرد جانے جیسے کہ کسی ایک چیز کو جانتا ہے اور اس کے عناصر کو یاد نہیں کرتا۔ اور اگر اسے کہا جائے کہ تُو نے کیا دیکھا تو وہ کہے گا کہ سوائے ایک کے جسے آدمی کہتے ہیں اور کچھ نہیں دیکھا اور اگر کہیں کہ کیا سوچ رہے ہو؟ تو وہ کہے کہ ایک چیز کے سوا نہیں سوچ رہا۔ میں اپنے معشوق کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ تو سب کچھ اس کا معشوق ہی ہوگا جو ایک چیز ہے۔ پس جان لے کہ معرفت میں ایک مقام وہ ہے کہ جو اس مقام پر پہنچتا ہے تو وہ حقیقتاً دیکھتا ہے کہ جو کچھ وجود میں ہے وہ باہم مرتبط اور سب مل کر ایک ذی روح کی مانند ہیں اور زمین، آسمان اور ستاروں کی باہمی نسبت ایسی ہی ہے جیسی کہ ایک حیوان کے متعدد اعضاء کی باہمی نسبت ہوتی ہے۔ اور پورے عالم کی نسبت اپنے مدبر کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایک وجہ سے نہ کہ بہمہ وجوہ۔ جیسے کہ حیوان کے جسم کی نسبت روح و عقل کے ساتھ کہ جو اس کے مدبر مین ہوتی ہے۔ اور جب تک کوئی اس کو نہ پہچانتا ہو کہ "اِنَّ اللہ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُورَتِہٖ" (بے شک اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا) وہ اسے نہیں سمجھ سکتا۔ عنوان کتاب میں ہم نے اشارۃً کچھ بیان کیا ہے۔ اس باب میں بات مختصر ہی اولیٰ تر ہے۔ کہ یہ تو دیوانوں کی زنجیر ہلانے کے مترادف ہے۔ اور ہر کوئی اس کو سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

لیکن توحیدِ سوم کے بارے میں کہ وہ توحید ہے فعل میں، ہم نے اپنی کتاب احیاء میں بڑی تفصیلی شرح کی ہے۔تم وہاں سے حاصل کر سکتے ہو۔اور جس قدر ہم نے اصل تفکر میں بیان کیا ہے کافی ہے کہ تو جان لے کہ سورج، چاند، ستارے، بادل، ہوا، بارش، اور ہر وہ چیز جسے تو اسباب سمجھتا ہے سب مسخر ہیں ایسے ہی جیسے قلم دبیر کے ہاتھ میں مسخر ہوتا ہے۔کوئی چیز خود بخود حرکت میں نہیں آتی ۔ کیونکہ چیزوں کو ہلایا جاتا ہے وقت مقررہ پر اور طے شدہ اندازے کے مطابق ۔ جیسے کہ ہونا چاہئے ۔ پس ان کا حوالہ غلطی ہوگا۔جیسے توقیع خِلعت کا حوالہ قلم وکاغذ پر ہو۔اور جو بات محل نظر ہے وہ حیوانات کا اختیار ہے کہ تو گمان کرتا ہے کہ ذی روح کے ہاتھ میں کچھ ہے۔لیکن یہ غلط فہمی ہے۔ کیونکہ انسان فی نفسہٖ مجبور و مضطر ہے۔جیسے کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ فعل اس کا قبضہ قدرت میں ہے۔اور قدرت ارادت کی مسخر ہوتی ہے۔حتیٰ کہ جوارادہ ہوتا ہے وہی کرتا ہے۔مگر جب اللہ تعالیٰ ارادے کو پیدا کرتا ہے تو وہ خواہ نخواہ کوئی بات چاہتا ہے۔پس جب قدرت ارادہ کی مسخر ٹھہری اور ارادہ انسان کے اختیار میں نہیں تو کچھ بھی اس کے اختیار میں نہیں اور وہ مجبورِ محض ہے۔تُو اس کو کاملاً یوں پہچانے گا کہ جب جانے گا کہ فعل جس کو آدمی سے منسوب کرتے ہیں تین درجوں کا ہے:

ایک یہ کہ مثلاً پانی پر پاؤں رکھے گا تو ڈوب جائے گا۔کہیں گے کہ اس نے پانی کو پھاڑ ڈالا اور ایک دوسرے سے جدا کر دیا، اس فعل کو طبعی کہتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ کہتے ہیں کہ آدمی نے سانس لیا۔اس فعل کو ارادتی کہتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ کہتے ہیں کہ اس نے بات کی اور چلا گیا، اس فعل کو اختیاری کہتے ہیں۔

مگر وہ فعل طبعی ظاہر ہے کہ وہ انسان کے اختیار میں نہیں۔ کیونکہ جب بھی وہ پانی پر چلے گا تو پانی لازماً اس کے بوجھ سے پھٹ جائے گا۔اور یہ انسان کی طرف سے نہیں کیونکہ وہ چاہے یا نہ چاہے نتیجہ یونہی ہو گا۔ کیونکہ اگر پتھر کا ایک ٹکڑا پانی پر رکھو گے تو وہ ڈوب جائے گا۔اور اس کا ڈوبنا پتھر کا فعل نہیں۔ کیونکہ یہ تو اس کی گرانی کا لازمہ ہے۔

اور ارادتی فعل جیسے کہ سانس لینا ہے، اگر تو غور کرے تو وہ بھی ایسے ہی ہے کہ اگر انسان سانس کو روکنا چاہے تو روک نہیں سکتا۔ کیونکہ اس کی تخلیق ہی اس طرح ہوئی ہے کہ اس میں سانس کی ارادت پیدا ہوتی ہے خواہ وہ چاہے خواہ نہ چاہے۔اور اگر کوئی دور سے یہ قصد کرے کہ اس کی آنکھ میں سوئی مارے تو وہ لازماً آنکھیں بند کرنے لگے گا۔اور اگر چاہے کہ آنکھیں بند نہ کرے تو یہ ممکن نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی تخلیق ہی اس طرح کی گئی ہے

کہ یہ ارادت اس میں طبعاً پیدا ہوجاتی ہے۔ ایسے ہی جیسے کہ از روئے آفرینش جب وہ پانی پر پاؤں رکھے گا تو ڈوب جائے گا۔ پس ان دونوں صورتوں میں انسان کی مجبوری معلوم ہوگئی۔

لیکن 'کہنے اور جانے' کو کہ جسے فعل اِختیاری کہا جاتا ہے' اِشکال اس میں ہے کہ اگر چاہے تو کرے اور اگر نہ چاہے تو نہ کرے۔ لیکن تجھے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اگر وہ چاہے تو وہ اس وقت چاہتا ہے کہ جب اس کی عقل حکم لگاتی ہے کہ تیری خیر اسی میں ہے۔ ممکن ہے کہ اسے غور کرنے کی ضرورت ہو۔ اور جب حکم لگا دیا گیا کہ خیر اسی میں ہے تو یہ ارادت لازماً وجود پذیر ہوگی تو اعضا کو انسان اسی طرح حرکت میں لانے لگے گا جس طرح آنکھ کو دور سے سوئی دیکھ کر بند کرنے لگتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ علم کہ سوئی آنکھ کے لئے باعث ضرر ہے اور آنکھ بند کرنے میں خیر ہے۔ وہ ہمیشہ تیار ہوتا ہے۔ یہ بات بالبداہت معلوم ہے اور اسے کسی تامّل اور فکر کی حاجت نہیں ہوتی۔ کیونکہ بے تامل اس نے جان لیا کہ یہ خیر ہے۔ خیر کا علم ہونے پر اس میں ارادت پیدا ہوئی اور اس ارادت سے قدرت لازماً بروئے کار آئی۔ یہاں چونکہ فکر سے فارغ ہو اتو پھر اسی صفت پر آ گیا کہ جہاں تھا۔ یہاں تک اگر کسی ایسی چھت کے پاس پہنچ جائے کہ جس کو پھلانگنا لاٹھی کی ضرب کھانے سے آسان تر ہو تو وہ پھلانگ جائے گا۔ اگر سمجھے کہ بام بلند ہے تو وہ وہاں کھڑا ہو جائے گا۔ تو وہ حرکت کرنے کی فرماں برداری نہ کر سکے گا۔ کیونکہ پاؤں کی حرکت ارادت کے تحت ہوتی ہے۔ اور ارادت اس امر کی پابند ہوتی ہے کہ یہ خیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی خود کو قتل نہیں کر سکتا اگرچہ اس کا ہاتھ بھی ہے اور چھری بھی کیونکہ قدرتِ دست ارادت کے تحت ہے اور ارادت اس کی پابند ہے کہ عقل کہے کہ یہ خیر ہے۔ اور یہ کام کرنے کے لائق ہے۔ اور خود عقل بھی بے اختیار ہے۔ کیونکہ وہ مثل ایک آئینے کے ہے' جو پہچانتی ہے وہ اس میں ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ چونکہ قتل خیر نہیں ہے اس لئے اس کا حکم نہیں دیتی۔ اور وہ ارادت پیدا نہیں ہوتی سوائے ایسے وقت کے کہ انسان ایسی بلا میں گرفتار ہو جائے جس کی تاب نہ رکھتا ہو تو خودکشی کو بہتر سمجھے گا۔ پس انسان کے اس فعل کو اس لئے اختیاری کہا گیا ہے کہ وہ اس میں مقیّد ہوتا ہے کہ اس کی خیر کی تمیز پیدا ہو۔ ورنہ اگر لزوماً ظہور میں آیا تو سانس لینے اور آنکھ بند کرنے کی ضرورت کی مانند ٹھہرا۔ اور ان کا لزوم بھی پانی میں ڈوبنے کے لزوم کی مانند ہوا۔

اور یہ اسباب آپس میں بندھے ہوئے ہیں۔ اور اسباب کی کڑیاں بہت سی ہیں جن کی تفصیل ہم نے کتاب احیاء میں بیان کی ہے۔ اور وہ قدرت جو انسان میں پیدا کی گئی ہے وہ اسی سلسلے کی کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے۔ اس قدرت کی بناء پر انسان گمان کرتا ہے کہ وہ بھی کوئی چیز ہے۔ حالانکہ یہ خطائے محض ہے۔ کیونکہ

انسان کا تعلق اس قدرت کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ اس کا محل ہے اور وہ قدرت کی راہ گذر ہے۔ پس انسان میں تخلیق شدہ قدرت کا وہ مالک نہیں اس کے لئے راہ گذر ہے۔ اور قدرت کی جو راہ گذر انسان میں تخلیق ہوئی ہے۔ درخت جو ہوا کے باعث ہلتا ہے اس میں وہ قدرت وارادت پیدا نہیں کی گئی۔ اس لئے درخت کو اس کا محل نہیں ٹھہرایا گیا۔ اسے اضطرارِ مطلق کا نام دیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے تو اس کی قدرت کسی اور شے کی چونکہ پابند نہیں ہوتی اس لئے اسے اِختراع کا نام دیا گیا ہے۔ اور چونکہ انسان نہ اس طرح کا ہے نہ اُس طرح کا۔ کیونکہ اس کی قدرت وارادت دیگر اسباب سے متعلق ہیں۔ جو اس کے قبضے میں نہیں ہیں تو اس کے فعل کو کہ اللہ تعالیٰ کے فعل کے مانند نہیں ہوتا اسے خلق یا اِختراع کہا جائے۔ اور چونکہ انسان قدرت وارادت کا محل ہوتا ہے تو بہ ضرورت اس میں پیدا کرتے ہیں۔ اور انسان درخت کے مانند بھی نہیں ہوتا کہ اس کے فعل کو اضطرارِ محض کہہ سکیں۔ بلکہ یہ ایک اور قسم ہوتی ہے اور اس کے لئے نام بھی نیا دیا گیا ہے جسے 'کسب' کہا جاتا ہے۔ اس ساری بحث سے معلوم ہوا کہ اگرچہ انسان کا عمل اس کے اختیار میں ہے لیکن چونکہ وہ اپنے نفس اختیار میں مضطر ہے۔ اس لئے چاہے یا نہ چاہے اس کے قبضۂ قدرت میں کچھ نہیں۔

فصل: بے شک تو کہے گا کہ ایسے ہی ہے تو ثواب وعقاب کیوں؟ اور شریعت کا مصرف پھر کیا ہوا؟ جب کسی کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں۔ یاد رہے کہ یہ وہ مقام ہے کہ جسے توحید در شرع اور شرع در توحید کہتے ہیں۔ اور اس میں بہت سے خام فکر غرق ہو گئے ہیں اور اس مہلکے سے وہی جانبر ہو سکا ہے جو پانی پر چلنا جانتا ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم تیرنا جانتا ہو۔ اور بیشتر خلق نے سلامتی اس لئے پائی کہ وہ اس سمندر میں ڈوبنے کے لئے اترے ہی نہیں۔ اور عامۃ الناس انھی میں سے ہیں۔ جو یہ نہیں جانتے اور اللہ کی شفقت ان پر یہ ہے کہ انھیں اس سمندر کے ساحل پر سے ڈوبنے کے لئے گذارا ہی نہیں جاتا۔ اور وہ لوگ جو توحید کے سمندر میں بیٹھے بیشتر اس لئے غرق ہو گئے کہ تیرنا نہ جانتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ انھیں یہ فہم ہی میسر نہ ہو کہ تیرنا سیکھیں۔ جس سے اپنے بارے میں خوش فہمی میں ہوں اور پیرا کی نہ چاہی ہو اور اس سمندر میں ڈوب گئے ہوں کہ ہمارے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں ہے جو کرتا ہے وہ (اللہ) ہی کرتا ہے اور جس پر شقاوت کا حکم لگا دیا گیا ہے اسے جہد کی حاجت نہیں۔ یہ سب جہل اور گمراہی ہے اور ہلاکت کا باعث ہے۔ اس حقیقت کی پہچان ہر چند اس کتاب میں نہ لکھنی چاہئے لیکن چونکہ بات یہاں تک آ گئی ہے اس لئے کسی قدر بیان کی جاتی ہے:

''اور یہ جو تُو نے کہا ہے کہ ''ثواب وعقاب کس لئے؟'' یاد رہے کہ عقاب اس لئے نہیں ہوتا کہ تو نے کوئی برائی

کی تو کوئی اس پر غیظ وغضب میں آ گیا اور اس نے انتقاماً تجھ پر عقوبت کی یا اچھائی کی بناء پر تجھ سے خوش ہوا اور تجھے مکافات میں خلعت عطا کی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات الٰہیہ سے بعید ہے۔ لیکن جس طرح خِلط خون یا صفرا یا کوئی اور کیفیت تیرے باطن میں غلبہ کرتی ہے کہ جس سے وہ چیز پیدا ہوتی ہے جسے بیماری کہتے ہیں۔ اور جب انسان دوا کے ذریعے اس کا علاج کرتا ہے تو اس سے ایک اور حالت پیدا ہوتی ہے جسے تندرستی کہتے ہیں۔ ایسے ہی جب شہوت و خشم تجھ پر غالب ہوتے ہیں تو تُو ان کا اسیر ہو جاتا ہے تو وہ آگ جو اس طرح پیدا ہوتی ہے تو وہ جان میں جالگتی ہے تو وہ تیری ہلاکت کا باعث بن جاتی ہے۔ اس لئے آنحضرت نے فرمایا ہے کہ: ''اَلغَضَبُ قِطعَةٌ مِنَ النَّار ''یعنی وہ خشم جو تو نے خود پر مسلط کر لیا ہے وہ آگ کا ایک اَخگر ہے اور جس طرح نور عقلی جب غالب ہوتا ہے تو شہوت و خشم کی آگ بجھ جاتی ہے۔ تیرا نور ایمان اسی طرح دوزخ کی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ دوزخ کہتی ہے: ''جز یامومن فان نورك اطفاناری ''(اے مومن گذر جا کہ تیرے نور نے تو میری آگ بجھا دی)۔ دوزخ ایمان سے فریاد کرتی ہے کہ حرف وصوت درمیان میں نہیں ہوتے بلکہ دوزخ مومن کے نورِ ایمان کی تاب ہی نہیں رکھتی اور ہار جاتی ہے۔ ایسے ہی جیسے مچھر ہوا سے شکست کھا جاتا ہے۔ شہوت کی آگ نورِ عقل سے شکست کھاتی ہے۔ پس تیرے لئے کہیں اور جگہ سے کوئی شے لائی نہ جائے گی۔ تیری ملک میں سے تجھے عطا ہوگی۔ ''اِنَّمـا هِیَ اَعمَالُکُم تُرُدا اِلَیکُم ''(وہ دوزخ نہیں ہے بلکہ تمھارے عمل ہیں جو تمھاری طرف لوٹائے گئے ہیں) پس دوزخ کی آگ کا بیج تیرا ہی خشم وشہوت ہے اور وہ تیرے باطن میں جاگزیں ہے۔ اور اگر تو علم یقین سے بہرہ مند ہو تو تُو اسے بہ رائے العین دیکھ سکتا ہے جیسے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ''کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ ''(قرآن: ۱۰۲/۶،۵) (اگر تم علم الیقین کو جانتے تو بے شک آتشِ دوزخ کو دیکھ لوگے)۔

پس جان لے کہ جس طرح زہر آدمی کو بیماری تک لے جاتی ہے اور بیماری اسے قبرستان تک لے جاتی ہے۔ اسی طرح خشم وانتقام درمیان میں نہیں ہوتے بلکہ معصیت وشہوت دل کو بیمار کر دیتے ہیں اور وہ بیماری اس کے لئے آگ بن جاتی ہے۔ اور وہ آگ آتشِ دوزخ کی ہم جنس ہوتی ہے نہ کہ اس دنیا کی آگ کی ہم جنس، تو بحکم اس مجانست کے جیسے مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے دوزخ دوزخی کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور درمیان میں کسی خشم کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ اور ثواب کو اسی طرح قیاس کر لے کیونکہ تفصیل اس کی بہت طویل ہے۔ یہ ہے جواب اس کا کہ ''ثواب وعقاب کس لئے''؟

لیکن یہ جو تو نے کہا ہے کہ ''شریعت اور پیغمبروں کی بعثت کس لئے ہے؟'' تو جان لے کہ یہ بھی عظیم قہر ہے تاکہ خلق کو قہر کی زنجیر میں باندھ کر بہشت میں لے جائیں' جیسے کہ فرمایا گیا ہے کہ: ''اَتَعجَبُ مِنْ قَوْمٍ یُقَادُونَ اِلَی الْجَنَّةِ بِالسَّلاسِل '' یعنی'' آیا تو ایک قوم پر متعجب ہے کہ جسے زنجیروں میں باندھ کر جنت کی طرف لے جایا جائے گا'' بلکہ مندِ قہر آپ کی حفاظت کی جائے گی تاکہ آپ جہنم میں نہ جائیں۔ جیسے کہ آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''اَنْتُم تَتَہَافَتُوْنَ عَلَی النَّارِ وَاَنَا اٰخِذٌ بِحجزِکُم '' یعنی تم پروانے کی طرح اپنے آپ کو آگ میں ڈالتے ہو اور میں نے تمھاری کمر گاہ کو پکڑ رکھا ہے تاکہ تمام آگ میں نہ گرو۔ پس جان لے کہ اللہ کی جباری کی زنجیر کی ایک کڑی پیغمبروں کی باتیں ہیں کہ جن سے فہم پیدا ہوتا ہے تاکہ تو راہ کو بے راہی سے الگ جان سکے۔ اور اس کی تخویف سے ہراس پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ معرفت اور ہراس تیرے آئینے سے غبار کو دور کر دیتے ہیں۔ اور عقل کے چہرے کو دھو ڈالتے ہیں تاکہ یہ حکم کہ راہِ آخرت پر چلنا راہِ دنیا سے بہتر ہے اس میں دکھائی دینے لگے۔ اور اس نمایش سے راہ چلنے کی ارادت پیدا ہوتی ہے۔ اور ارادت سے اعضا کام میں لگ جاتے ہیں کہ اس کے مسخر ہوتے ہیں۔ تو چاہے یا نہ چاہے۔ اور اس سلسلے کے ذریعے تجھے دوزخ کے قہر سے بچاتے اور بہشت میں لے جاتے ہیں۔ اور مثل انبیاء کی شبان کی سی ہے جو بکریوں کا گلہ بان ہے۔ جس کے دائیں ہاتھ پر چراگاہ ہے اور بائیں ہاتھ غار ہے جس میں بہت سے بھیڑیئے ہیں۔ تو یہ شبان غار کے کنارے کھڑا ہو جاتا ہے اور لاٹھی ہلاتا رہتا ہے تاکہ بکریاں لاٹھی کے خوف سے پیچھے رہیں اور غار کی بجائے چراگاہ کی طرف جائیں۔ پیغمبروں کی بعثت کا مطلب یہی ہے۔

اور یہ جو تو نے کہا ہے کہ ''اگر شقاوت کا حکم لگ جائے تو جہد کا فایدہ؟'' بات صحیح ہے لیکن ایک رُو سے غلط بھی ہے۔ اور یہ بات ٹھیک تیری ہلاکت کا باعث ہے۔ کہ علامت اس کی کہ کس کی شقاوت کا حکم کیا گیا ہے یہ ہے کہ یہ بات اس کے دل میں ڈال دیتا ہے تاکہ جہد نہ کرے۔ اور کاشت نہ کرے تاکہ حاصل نہ پائے۔ اور جس کی موت کا حکم لگ چکا ہو علامت اس کی یہ ہے کہ کوئی بھوکا ہو اور اس کے دل میں ڈال دے تاکہ روٹی نہ کھائے اور کہے کہ روٹی مجھے کیا فایدہ دے گی۔ تو ہاتھ روٹی کی طرف نہ بڑھائے۔ اور روٹی نہ کھائے تاکہ لازماً مر جائے۔ اور اگر کسی کے بارے میں فقر کا حکم لگ چکا ہے۔ تو وہ کہے کہ بیج بونے کا کیا فایدہ؟ تو نہ بوئے نہ کاٹے۔ اور جس پر سعادت کا حکم لگ چکا ہے اسے آگاہ کر دے کہ جسے دولت مندی اور زندگانی کا حکم لگ چکا ہے۔ اس سبب سے یہ حکم لگا ہے کہ اسے کھیتی باڑی اور تجارت میں مشغول کر دے اور کھانا کھانے میں لگا

دے۔ یہ حکم ہرزہ نہیں ہوتا بلکہ اسباب پر مبنی ہوتا ہے۔ اور جسے جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے اسے اس کے لئے اسباب بھی مہیا کئے جاتے ہیں۔ اس لئے آنحضرت نے فرمایا ہے کہ ''اِعْمَلُوا فَکُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہ،'' (عمل کرو کیونکہ ہر کوئی اس کی استعداد اور آمادگی رکھتا ہے جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے) تو اپنے اعمال و احوال سے جو تجھ پر جبراً اور قہراً طاری کئے گئے ہیں تُو ان سے اپنی عاقبت کی بشارت کو پڑھ لے۔ جب تجھ پر جہد و تکرار غالب ہوگئی تو جان لے کہ یہ بشارت ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ تجھے امامت کی سعادت کا حکم دیا گیا ہے بشرطیکہ تو پوری سعی کرے۔ اگر سستی اور غفلت تجھ پر غالب ہے اور یہ بے ہودہ بات تیرے دل میں ڈالی گئی ہے کہ تو کہے کہ: ''اگر ازل ہی سے میری جہالت کا حکم لگ چکا ہے تو رنج اٹھانے کا کیا فایدہ؟'' تو اس سے اپنی جہالت کا منشور پڑھ لے کہ نشانی اس کی یہ ہے کہ تو کبھی امامت کے درجے کو نہ پہنچے گا۔ مختصر یہ کہ آخرت کو دنیا پر قیاس کر۔ ''مَا خَلْقُکُمْ وَلَا بَعْثُکُمْ اِلَّا کَنَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ؛[1] سَوَآءً مَّحْیَاھُمْ وَ مَمَاتُھُمْ'' (قرآن: ۲۱/۴۵) (یکساں ہے ان کی زندگی اور ان کی موت'' جب تو نے ان حقایق کو جان لیا تو یہ تینوں اشکال رفع ہوگئے۔ اور توحید قرار پائی۔ اور معلوم ہوگیا کہ شرع و عقل و توحید میں کوئی تناقض نہیں' اس کے نزدیک جس کی چشم بصیرت کھل گئی ہو۔ اس معنی میں مزید طول نہیں دیا جائے گا کیونکہ یہ کتاب ایسی باتوں کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

اس دوسرے ایمان کا بیان جس پر توکل کی بنیاد ہے

یاد رہے کہ ہم نے کہا تھا کہ توکل دو ایمان پر مبنی ہے۔ ایک توحید جس کی تفصیل ہم بیان کر چکے ہیں' دوسرے یہ کہ تُو جان لے کہ خالق وہی ہے اور سب کچھ اس سے ہے۔ اور بایں ہمہ رحیم ہے' کریم ہے' لطیف ہے' اور اس کی شفقت و عنایت چیونٹی اور مچھر سے لے کر آدمی تک ماں کی اپنی اولاد پر شفقت سے بڑھ کر ہے۔ جیسے کہ حدیث میں وارد ہوا ہے۔ جان لے عالم اور جو کچھ عالم میں ہے وہ ایسی صورت میں پیدا کیا گیا ہے کہ جس کمال و جمال و حکمت کا وہ پیکر ہے اسے بہتر ممکن ہی نہیں۔ جان لے کہ اس نے اپنی رحمت و لطف سے کچھ بھی واپس نہیں لیا ہے۔ اور جو کچھ بھی اس نے پیدا کیا ہے اس انداز کا پیدا کیا ہے کہ باید و شاید۔ اگر روئے زمین کے تمام صاحبانِ عقل و خرد جمع ہو جائیں اور انھیں کمال عقل وزیرکی تک دسترس دے دیں اور وہ غور کریں کہ دنیا

(۱) قرآن: ۳۱/۲۸: نہیں تمھاری پیدایش اس جہان میں اور نہ دوبارہ زندگی اُس جہان میں مگر مماثل ایک ہی نفس کی آفرینش اور آخرت میں زندہ کرنے کے۔

میں کوئی سرِمُو یا مچھر کا پر ہے جو اس طرح نہیں ہونا چاہئے۔ ذرا چھوٹا یا بزرگتر تو نہ پائیں گے اور وہ جان لیں گے کہ سب کچھ ایسا ہی ہونا چاہئے جیسا کہ ہے۔ اور وہ جو بدنما ہے اس کا کمال اس میں ہے کہ زشت ہو کیونکہ اگر زشت نہ ہوتا تو ناقص ہوتا اور حکمت فوت ہو جاتی۔ اگر اللہ تعالیٰ مثلاً برائی کو پیدا نہ کرتا تو کوئی بھی نیکی کو نہ جان سکتا اور اس سے راحت نہ پاتا۔ اور اگر ناقص نہ ہوتا تو کمال کہاں سے ہوتا۔ اور کامل کو اپنے کمال پر مزا نہ آتا۔ اور کامل و ناقص نسبت کے ساتھ پہچانے جا سکتے ہیں۔ جیسے کہ اگر باپ نہ ہوتا تو بیٹا نہ ہوتا اس طرح اگر بیٹا نہ ہوتا باپ نہ ہوتا۔ کیونکہ یہ چیزیں ایک دوسرے کے مقابلے میں ہوتی ہیں اور یہ مقابلہ دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اور جب دوئی جاتی رہے تو ایک ہو جاتی ہے۔ اور جو بر بنائے مقابلہ ہو وہ جاتی رہتی ہے۔ یاد رہے کہ یہ روا ہے کہ کاموں کی حکمت مخلوق سے پوشیدہ رہے۔ لیکن ایمان اس پر ہونا چاہئے کہ تیرے لئے خیر اسی میں ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے اور ایسے ہی ہے جیسا کہ ہونا چاہئے۔ پس جو کچھ دنیا میں بیماری یا عجز بلکہ معصیت اور کفر اور تباہی اور نقصان ہے یا درد و رنج ہے ان سب میں کوئی نہ کوئی حکمت ہے اور ایسی ہی ہونی چاہئے جیسی کہ وہ ہے جس کو اللہ نے فقیر پیدا کیا ہے تو اس لئے کہ اس کی بہتری اسی میں ہوگی۔ کیونکہ اگر وہ دولت مند ہوتا تو تباہ ہو جاتا۔ اور جسے دولت مند پیدا کیا اس میں بھی ایسی ہی مصلحت تھی۔ اور یہ بھی دریائے توحید کی طرح عمیق و وسیع سمندر ہے۔ اور اس میں بھی بہت لوگ غرق ہو گئے ہیں اور یہ بھی تقدیر کے راز سے پیوست ہے کہ جس کے افشا کی اجازت نہیں۔ اگر ہم اس سمندر میں غور کریں بات لمبی ہو جائے گی۔ لیکن یہ تمام ایمان کا راز ہے اور توکل کو بھی اس کی حاجت ہے۔

توکل کی حقیقت کا بیان

معلوم رہے کہ توکل احوالِ دل میں سے ایک حال کا نام ہے جو توحید اور کمال لطف پر ایمان کا ثمرہ ہے۔ اور اس حالت کے معنی وکیل پر دل کا اعتماد اور اس کی پختگی اور اس پر اطمینان ہے۔ تاکہ دل روزی کی فکر میں نہ لگے۔ اور اسبابِ ظاہر کے مختل ہو جانے پر انسان شکستہ دل نہ ہو بلکہ اللہ پر بھروسہ رکھے جو روزی اُسے پہنچاتا ہے۔ مثال اس کی ایسی ہے کہ کسی پر جھوٹا دعویٰ دائر کیا گیا ہو اور وہ ایک شخص کو اپنا وکیل مقرر کرے تاکہ اس تلبیس کو دفع کرے۔ اگر اس کی چار صفات[1] پر ایمان ہوگا تو اس کا دل وکیل پر اعتماد کرے گا اور وہ مطمئن ہوگا:

ایک یہ کہ تلبیسات کی جملہ صورتوں کا کامل عالم ہو۔

(۱) احیاء میں ہے کہ "جب وہ چار کاموں یعنی: نہایت ہدایت، نہایت قوت، نہایت وضاحت، نہایت شفقت کا معتقد ہو"

دوسرے یہ کہ اپنے علم کے اظہار کی قدرت دو چیزوں سے بہ تمام وکمال رکھتا ہو۔ ایک قوتِ دل کی دلیر ہو۔ دوسرے زبان کی فصاحت۔ کیونکہ کوئی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ عالم تو ہوتا ہے قوتِ بیان نہیں رکھتا یا بزدلی کہ بناء پر یا عدم فصاحت کی بناء پر۔

تیسرے یہ کہ مشفق ہو اپنے موکل پر۔ یا احقاق حق پر حریص ہو۔

تو جب وہ ان تین چیزوں پر اعتقاد رکھے گا تو دلی طور پر مطمئن ہوگا اور اس پر بھروسہ کرے گا۔ اور اپنی طرف سے حیلہ وتدبیر وغیرہ کو ترک کردے گا۔ اسی طرح جس نے اس آیت ''نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ الْوَكِيْل'' کو پہچان لیا اور ایمان لایا کہ جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور دوسرا کوئی فاعل اس کے سوا نہیں اور باایںہمہ علم وقدرت کے اللہ میں کوئی کمی نہیں اور رحمت وعنایت اس کی اس قدر انتہا کی ہے کہ اور ممکن ہی نہیں۔ دل سے اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد کرے۔ اور اپنی تدبیر اور حیلوں کو چھوڑ دے۔ اور یہ جانے کہ روزی اس کی مقدر ہے۔ اور وہ اپنے وقت پر اسے مل جائے گی۔ اور کام اس کے جو اللہ کے فضل وکرم وبزرگی اور خداوندی کے شایانِ شان ہوں گے' تکمیل پذیر ہوتے رہیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان تو ہو لیکن طبیعت میں بزدلی کے باعث ترساں ہو۔ کیونکہ انسان اللہ پر جس بات کا یقین رکھتا ہو اس کی طبیعت بھی اس یقین کی مطیع ہو ضروری نہیں ہوتا بلکہ طاعت اس کی کرتا ہے۔ جس کے بارے میں اس کا یقن ہوتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ جیسے کہ اگر جو حلوا وہ کھاتا ہے کوئی اسے نجاست سے تشبیہ دے دے تو ایسے ہوتا ہے کہ نہ کھا سکے اگرچہ جانتا ہو کہ یہ جھوٹ ہے۔ اگر چاہے کہ اکیلا کسی کمرے میں مردے کے ساتھ سوئے تو نہیں سوسکتا۔ اگرچہ اسے یقین ہوتا ہے کہ مردہ تو اب جماد ہے اور حرکت نہیں کرسکتا۔ پس توکل کے لئے قوتِ یقین بھی لازم ہے اور قوتِ دل بھی تاکہ اضطراب دل سے جاتا رہے اور جب تک یہ اطمینان اور اعتماد تامہ حاصل نہ ہو توکل نہ ہوگا۔ کیونکہ توکل کے معنی ہیں: تمام کاموں میں دل کا اللہ تعالیٰ پر اعتماد۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل کو اللہ پر پورا ایمان ویقین تھا جب کہا کہ: ''اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ''(قرآن: ۲/۲۶۰) (مجھے دکھا کہ تو مردے کے کیونکر زندہ کرتا ہے تو' اللہ نے کہا تو ایمان نہیں لایا؟) تو حضرت ابراہیم نے کہا' کیوں نہیں؟' لیکن اس لئے کہ میرا دل مطمئن ہوجائے اور دیدار چشم یقین افروز ہوتا ہے) فرمایا کہ مجھے یقین ہے لیکن اس لئے تاکہ دل مطمئن ہوجائے۔ کیونکہ ابتدائے حال میں دل کا اطمینان تخیل اور حس کے تابع ہوتا ہے' لیکن جب سالک کمال کو پہنچتا

ہے تو دل بھی یقین کے تابع ہو جاتا ہے۔ پھر اسے مشاہدۂ ظاہر کی ضرورت نہیں رہتی۔

درجات توکل

جان لے کہ توکل کے تین درجے ہیں:

درجۂ اوّل: وہ ہے کہ حال اس کا اس مرد کا سا ہوتا ہے جو جھگڑے کی صورت میں جلد فصیح ہادی دلیر اور مشفق وکیل مقرر کر دیتا ہے جس پر اسے اطمینان ہوتا ہے۔

درجۂ دوم: وہ ہے کہ حال اس کا اس بچے کا سا ہوتا ہے جو ہر حال میں سوائے ماں کے کسی اور کو نہیں جانتا۔ جب بھوک لگتی ہے تو ماں کو پکارتا ہے۔ جب ڈرتا ہے تو اسی سے لپٹ جاتا ہے کیونکہ یہ اس کی فطرت ہوتی ہے۔ اس میں تکلف اور اختیار کا شائبہ نہیں ہوتا۔ یہ ایسا متوکل ہے جسے اپنے توکل کی خبر نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے کہ وہ وکیل میں مستغرق ہوتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کو اپنے توکل کی خبر ہوتی ہے بر بنائے توکل و اختیار وہ اپنے آپ کو توکل پر لایا ہوتا ہے۔

درجۂ سوم: یہ کہ حال اس کا مردہ شُوی کے سامنے مردے کا سا ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایسا مردہ سمجھتا ہے جو قدرت ازلی سے حرکت میں آتا ہو اور از خود حرکت نہ کرتا ہو۔ جیسے مردہ غسل دینے والے کے ہاتھ سے حرکت میں آتا ہے۔ اور اگر اسے کوئی کام درپیش ہو تو دعا بھی نہیں کرتا۔ نہ اس بچے کی طرح جو بوقت حاجت ماں کو پکارتا ہے۔ بلکہ وہ ایسے بچے کی طرح ہوتا ہے جو یہ جانتا ہے کہ اگرچہ ماں کو نہ بلائے ماں خود اس کے حال سے باخبر ہے۔ وہ خود ہی اس کے کام کا تدارک کرے گی۔

پس اس آخری مقام میں سالک کو کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اور دوسرے مقام میں بھی کوئی اختیار نہیں ہوتا سوائے تضرّع' زاری' دعا اور سوائے وکیل کے تقرر کرنے کے۔ اور مقامِ اوّل میں اختیار ہوتا ہے لیکن صرف ان اسباب کی تدبیر کے جو سنت اور معمول اور وکیل کی عادت کے بارے میں معلوم ہوئی ہوں مثلاً جب جانے کہ وکیل کی عادت یہ ہے کہ جب تک وہ خود حاضر نہ ہو اور شناسنامہ پیش نہ کرے تو وہ مقدمہ نہیں لڑے گا۔ لازماً اسے یہ سنت پوری کرنی چاہیے۔ اور پھر سراپا انتظار بن جائے اور دیکھے کہ وکیل کیا کرتا ہے۔ اور جو کچھ بھی ہو اسے وکیل ہی کی طرف سے سمجھے اور اسناد کے احضار کو بھی وکیل ہی کی طرف سے دیکھے کیونکہ اسی کے اشارے پر تیار کیے ہیں۔ پس جو توکل کے اس مقام پر ہو تو اسے تجارت اور کھیتی باڑی جیسے اسباب ظاہر سے کہ جو اسے سنت اللہ سے معلوم ہوئے ہوں ان سے دست کش نہ ہو۔ لیکن باوصف اس کے متوکل بھی ہو اور بھروسہ

تجارت وحراثت پر نہ کرے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ کرے جو کہ کھیتی باڑی اور تجارت کو مقصود تک پہنچاتا ہے۔اس طرح سے کہ حرکات وتجارت اس طرح کرے جس طرح سے اسے ہدایت دی گئی ہے۔ یہ کام انجام دے اور جو کچھ دیکھے اللہ ہی کی طرف سے دیکھے۔ چنانچہ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔اور ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِــــاللہ '' کے معنی یہی ہیں۔ کہ حول حرکت ہے' اور قوت قدرت ہے۔ جب جان لے کہ اس کی حرکت و قدرت دونوں فی الاصل اس کی نہیں ہیں بلکہ اس کے خالق کی ہیں۔ جو کچھ دیکھے وہ اس اللہ ہی کی طرف سے دیکھے۔ مختصر یہ کہ جب کاموں کی نسبت اسباب سے اس کی نگاہوں میں سے دور ہوگئی۔ تا کہ کوئی چیز سوائے اللہ تعالیٰ کے نہ دیکھے تو وہ متوکل ہوگا۔

لیکن متوکل کے اعلیٰ مقامات وہ ہیں جن کے بارے میں بایزید فرماتے ہیں کہ بوموسیٰ دیلی فرماتے ہیں کہ انھوں نے بایزیدؒ سے پوچھا کہ ''توکل کیا ہے؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''تو اس بارے میں کیا کہتا ہے؟'' تو میں نے کہا کہ : ''مشائخ فرماتے ہیں کہ ''تیرے دائیں بائیں ہر طرف سے سانپ اور اژدہے ہوں لیکن تیرے دل کا راز حرکت نہ کرے''۔ تو بایزیدؒ نے فرمایا کہ ''یہ آسان ہے۔ لیکن اگر سب اہل دوزخ کو عذاب میں دیکھے اور جملہ اہل بہشت کو نعمت میں دیکھے تو اپنے دل میں ان دونوں گروہوں میں امتیاز کرے تو وہ متوکل نہ ہوگا'' اور جو کچھ ابوموسیٰ نے کہا ہے کہ وہ متوکل کے اعلیٰ درجات میں سے ہے۔ شرط یہ ہے کہ انسان حذر نہ کرے۔ کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق نے سانپ کے بل پر اپنی ایڑی رکھی تھی جب آپ غار میں تھے تو وہ متوکل تھے۔ انھیں سانپ کا ڈر نہ تھا بلکہ خالق کا خوف تھا کیونکہ سانپ کو حرکت وقوت وہی مہیا کرتا ہے۔ اور ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ '' کو اللہ ہی کے حق میں دیکھتا ہے اور جو کچھ بُویزید نے فرمایا ہے۔ تو انھوں نے دراصل ایمان کی طرف اشارہ کیا ہے جو توکل کی بنیاد ہے۔ اور ایسا ایمان نہایت کمیاب ہے۔ اور وہ ایمان ہے اللہ تعالیٰ کے عدل' حکمت فضل اور رحمت پر کہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے ایسے کرتا ہے جیسے کہ کرنا چاہئے۔ پس اس معنی میں وہ عذاب اور نعمت میں فرق نہیں کرتا۔

اعمال متوکل کا بیان

یاد رہے کہ دین کے تمام مقامات تین اصلوں کے گرد گھومتے ہیں: علم وحال وعمل۔ لیکن توکل کے علم وحال کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ البتہ عمل کا بیان ابھی باقی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی یہ خیال کرے کہ توکل کی شرط یہ ہے کہ تمام کام حق تعالیٰ پر چھوڑ دے اور اپنے اختیار سے انسان کوئی کام نہ کرے۔ یہاں تک کہ کسب نہ کرے

اور کوئی شے کل کے لئے اٹھا نہ رکھے اور بھیڑیئے' سانپ' شیر' بچھو وغیرہ سے نہ بھاگے۔ اور اگر بیمار ہو جائے تو دوا دارو نہ کرے۔ لیکن یہ سب غلطی ہے کیونکہ یہ شریعت کے خلاف ہے اور شرع نے توکل[1] کی ستائش کی ہے۔ تو توکل شرع کا مخالف کیسے ہوسکتا ہے۔ بلکہ انسان کا اختیار یا تو مال حاصل کرنے میں ہوگا کہ جو نہیں رکھتا' یا مال کی نگاہ داشت کرنے میں ہے جو اس کے پاس ہے۔ یا اس ضرر سے بچنے میں جو ہنوز اسے نہ پہنچا ہو تو ان میں سے ہر ایک امر میں توکل کرنے کا حکم جداگانہ ہے۔ اس لئے ان چاروں مقامات کی تفصیل بیان کرنا چاہئے۔

مقام اوّل:

کسب وجذب منفعت کے بیان میں: اور اس کی تین صورتیں ہیں:

اوّل: سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ سبب کے بغیر کوئی کام قطعاً انجام نہیں دیا جاسکتا۔ اور اسباب سے ہاتھ کھینچنا پاگل پن ہوگا توکل نہ ہوگا۔ مثلاً کوئی ہاتھ کھانے کی طرف نہ بڑھائے نہ کھانا منہ میں رکھے اور چاہے کہ بغیر کھائے پیئے اللہ تعالیٰ اس میں سیری پیدا کردے یا اللہ طعام کو حرکت دے کہ وہ اس کے منہ میں پہنچ جائے۔ اسی طرح کوئی نکاح کرے نہ بیوی سے جماع کرے اور چاہے کہ بغیر اس کے اس کے ہاں اولاد ہو جائے اور گمان یہ کرے کہ یہ توکل ہے' تو یہ حماقت ہوگی بلکہ جس شے میں سبب یقینی ہے اس میں توکل علم وحال میں ہے عمل وکردار میں ہرگز نہیں۔

اور علم یہ ہے کہ انسان جانتا ہو کہ ہاتھ' کھانا' قدرت' حرکت' منہ' دانت سب اللہ کی تخلیق ہیں۔ اور حال اسے کہتے ہیں کہ انسان کے دل کا اعتماد اللہ تعالیٰ کے فضل پر ہو کھانے اور اپنے ہاتھوں پر نہ ہو۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ہاتھ اس کے مفلوج ہو جائیں یا کھانا کوئی اور چھین کرلے جائے۔ پس انسان کی نظر خود اس کی تخلیق میں اور اس کی حفاظت میں اللہ تعالیٰ کے فضل پر ہونی چاہئے نہ کہ اپنے حول وقدرت پر۔

درجۂ دوم: یہ ہے کہ اسباب قطعی نہ ہوں لیکن بیشتر صورتوں میں ان کے بغیر مقصد حاصل نہ ہوتا ہو۔ جیسے کہ سفر کا زادِ راہ لینا تو اس سے دست کش ہونا توکل کی شرط نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے پیغمبر اور اسلاف کی سنت ہے لیکن متوکل وہ ہے جس کے دل کا اعتماد زادِ سفر پر نہ ہو۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ زادِ سفر کو کوئی اور لے جائے۔ بلکہ زاد کے خالق اور اس کے محافظ پر اعتماد ہونا چاہئے۔ لیکن اگر کوئی بغیر زادِ سفر کے بیابان میں چلا جائے تو اس کا یہ عمل کمالِ توکل میں سے ہوگا۔ کھانا نہ کھانے کی طرح نہیں کہ وہ توکل میں سے نہیں ہے۔

---

(۱) احیاء میں توکل کی بجائے متوکل کا لفظ استعمال کیا ہے۔

لیکن روا یہ اُس کے لئے ہوگا کہ جس میں دو صفات ہوں؛ ایک یہ کہ اس نے اتنی طاقت جمع کر لی ہو کہ ایک ہفتہ تک کھانا نہ ملے تو بھوک برداشت کر سکتا ہو۔ اور دوسرے یہ کہ گھاس پات کھا کر ایک مدت تک زندہ رہ سکتا ہو۔ جب یہ صورت ہو تو غالب یہ ہوگا کہ بادیہ گھاس پات سے خالی نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ اسے کھانا وہاں سے آ پہنچے کہ جہاں سے اسے توقع نہ تھی۔ ابراہیم خواصؒ متوکلوں میں سے تھے اور اسی صفت پر تھے کہ صحرا میں بے زادِ راہ نکل جاتے لیکن سوئی، ناخن تراش اور ڈول اور رسی البتہ ساتھ رکھتے تھے کیونکہ یہ چیزیں قطعی اسباب میں شمار ہوتی ہیں۔ کیونکہ بغیر ڈول رسی کے پانی کنویں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا، اور صحرا میں ڈول رسی ہوتی نہیں اور اگر لباس پھٹ جائے تو سوئی کے بغیر سیا نہیں جا سکتا۔ پس ایسی چیزوں کا ترک توکل نہیں کہلاتا۔ بلکہ توکل اس سے ہوتا ہے کہ انسان کا دل اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد کرے نہ کہ اشیاء واسباب پر۔

پس اگر کوئی کسی ایسی غار میں جا بیٹھے جہاں سے لوگوں کا گذر نہ ہوتا ہو اور وہاں نباتات بھی نہ ہو اور وہ کہے کہ میں نے توکل کیا ہے تو حرام ہوگا۔ اور اس کے لئے باعث ہلاکت ہوگا۔ اس نے گویا اللہ تعالیٰ کی سنت کو جانا ہی نہیں۔ یہ ایسے توکل کی مانند ہے جو خصومت میں ہو۔ اور بندہ وکیل کے پاس ضروری کاغذات واسناد نہ لے جائے، حالانکہ اس کی عادت کو جانتا ہو کہ بغیر استناد کے بات نہیں کہتا۔ زاہدوں میں سے ایک ماضی میں شہر سے دور چلا گیا اور ایک غار میں بیٹھ گیا۔ اور اس نے توکل کیا تاکہ روزی اس تک پہنچ جائے۔ ایک ہفتہ گذر گیا کوئی شے نظر نہ آئی۔ کمزور ہو گیا اور قریب تھا کہ ہلاک ہو جائے۔ تو اس کے زمانے کے پیغمبر پر وحی آئی کہ اسے کہو کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''مجھے اپنی عزت کی قسم کہ میں تمھیں روزی نہ دوں گا جب تک تم شہر کو لوٹ نہیں جاتے۔ اور لوگوں کے درمیان نہیں بیٹھتے''۔ تو جب وہ شہر میں لوٹ آیا تو لوگ ہر طرف سے کوئی نہ کوئی چیز لانے پر لگ گئے۔ تو کوئی چیز زاہد کے دل میں آئی۔ تو زمانے کے پیغمبر پر وحی آئی کہ ''اسے کہو کہ ''تو چاہتا تھا کہ اپنے زہد سے تو ہماری حکمت کو باطل کر دے۔ تو نہ جانتا تھا کہ میں اپنے بندوں کو روزی دوسرے بندوں کے ہاتھ سے پہنچانا اپنے دستِ قدرت کے ذریعے پہنچانے کی نسبت زیادہ دوست رکھتا ہوں''۔ اسی طرح اگر کوئی شہر ہی میں خانہ نشین ہو جائے اور دروازہ بند کر لے اور توکل کرے تو یہ حرام ہوگا۔ کیونکہ قطعی اسباب سے کاملاً دست کش ہونا جائز نہیں۔ لیکن اگر دروازہ بند نہ کرے اور توکل پر بیٹھ رہے تو جائز ہوگا۔ بشرطیکہ اس کی نگاہیں دروازے پر نہ لگی رہیں تاکہ کوئی اس کے لئے شے لائے اور دل اس کا لوگوں میں نہ لگا رہے۔ بلکہ دل اللہ سے لگائے رکھے اور عبادت میں مشغول رہے اور اس حقیقت کو جان لے کہ اگر اسباب کو کلیۃً ترک نہ کرے گا تو

روزی سے محروم نہ رہے گا۔

یہاں یہ بات سچ ثابت ہوجائے گی کہ ''اگر بندہ اپنی روزی سے بھاگے تو روزی اسے ڈھونڈ نکالتی ہے''۔اوراگروہ اللہ سے سوال کرے تاکہ وہ اسے روزی دے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''اے احمق میں نے تجھے پیدا کیا ہے تو کیا میں تمھیں روزی نہ دوں گا؟ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا'' پس توکل اس میں ہوتا ہے کہ انسان اسباب سے دست کش نہ ہو۔لیکن روزی کو اسباب سے نہ جانے مسبب الاسباب سے سمجھے۔کیونکہ تمام مخلوق اللہ کی دی ہوئی روزی ہی کھاتی ہے۔لیکن بعض سوال کی ذلت کے ذریعے کھاتے ہیں تو بعض تاجروں کی طرح رنج اور انتظار کے بعد کھاتے ہیں۔بعض پیشہ وروں کی مانند سعی وکوشش پر اور بعض صوفیاء کی مانند کہ جن کی نگاہ اللہ پر ہوتی ہے اور جو کچھ ان کو ملتا ہے وہ حق تعالیٰ سے ملتا ہے اور وہ خلق کو درمیان میں نہیں دیکھتے اور فخر اور راحت کے ساتھ روزی سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

درجۂ سوم: یہ ہے کہ اسباب نہ قطعی ہوں نہ ان کی زیادہ حاجت ہو۔ بلکہ وہ حیلہ واستقصا میں سے ہوں اور نسبت ان کی کسب وکار کے ساتھ بیماری میں داغ وافسوں وفال جیسی ہو۔آنحضرت ﷺ نے متوکلوں کی توصیف یہ کی ہے کہ وہ افسوں وداغ نہیں کرتے۔یہ نہیں کہا کہ وہ کسب وکار نہیں کرتے اور شہر سے باہر جاکر بادیہ نشن ہوجاتے ہیں۔

پس اس مقام پر توکل کے تین مرتبے ہیں:

اوّل درجہ خواص کا ہے' وہ صحرا میں گھومتے پھرتے ہیں بغیر زاد کے اور یہ درجہ بلند تر ہے۔اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ متوکل میں پانچ چھ روز بھوکے رہنے کی تاب ہوتی ہے۔یا گھاس پھوس کھالیتا ہے یا اگر نہ پائے تو موت کے قریب ہونے سے خائف نہیں ہوتا۔اور سمجھتا ہے کہ خیر اس کی اسی میں ہے۔کیونکہ وہ شخص جو زادِراہ ساتھ لیتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ یہ زاد اس سے لوگ چھین لیں اور وہ مرجائے۔اور نادر الوقوع کا احتمال سفر میں ہمیشہ ہوتا ہے جس سے حذر واجب نہیں۔

مرتبۂ دوم یہ ہے کہ متوکل کسب وکار نہ کرے لیکن صحرا میں بھی نہ جائے۔ بلکہ شہر ہی میں کسی مسجد میں قیام کرے لیکن توقع لوگوں سے نہ رکھے بلکہ اللہ کی صُنع اور لطف پر نگاہ رکھے۔

مرتبۂ سوم یہ ہے کہ کسب روزی کے لئے باہر نکلے اور کسب شرعی سنت وآداب کے مطابق کرے' جیسے کہ میں نے اس کتاب میں اصل کسب کے باب میں بیان کیا ہے اور حصولِ رزق کے لئے حیلہ واستقصا

اور باریک تدبیریں اوراستادی سے کام نہ لے۔ان سے دور رہے۔کیونکہ اگراس قسم کے اسباب میں لگے گا تو وہ اس شخص کے درجے میں ہوگا جوافسون وداغ سے کام لیتا ہےاور وہ متوکل نہیں ہونے کا۔

دلیل اس امر کی کہ کسب وکار کو چھوڑ دینا توکل کی شرط نہیں یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ متوکلوں میں سے تھے۔اور وہ اس درجے سے کسی صورت بھی محروم نہ تھے۔تو جب آپ نے خلافت قبول کرلی تو آپ نے کپڑوں کی ایک گٹھڑی اٹھائی اور بازار کی راہ لی تاکہ تجارت کریں۔تو لوگوں نے کہا کہ ''خلافت میں آپ یہ کیا کررہے ہیں؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''اگر میں اپنے بال بچوں کو بھوکا ننگا چھوڑ دوں تو لوگوں کو تو میں اس سے بھی پہلے نظرانداز کردوں گا''۔پس آپ کے لئے بیت المال سے روزی فراہم ہوئی تو آپ نے اپنا سارا وقت خلافت کے کاموں کی نذر کردیا۔اور توکل ان کا اس بناء پر تھا کہ وہ مال کے حریص نہ تھے۔اور جو کچھ بیت المال میں آتا تھا اسے اپنا مال نہ سمجھتے تھے بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے دیکھتے تھےاور مسلمانوں کے مال کی نسبت اپنے ذاتی مال کو عزیز تر نہ جانتے تھے۔

مختصر یہ کہ توکل زہد کے بغیر درست نہیں ہوتا۔پس زہد توکل کی شرط ہے۔اگرچہ توکل زہد کی شرط نہیں ہے۔ابوحفص حدّادؒ حضرت جنیدؒ کے پیر تھے۔اور متوکلوں میں سے تھے۔انھوں نے فرمایا کہ ''میں نے بیس سال توکل کو مخفی رکھا میں ہر روز بازار سے ایک دینار کماتا تھا۔میں اس میں سے ایک قیراط بھر حمام کے لئے صرف نہ کرتا تھا بلکہ سب کا سب صدقہ میں دے دیتا تھا''۔اور حضرت جنید ان کے سامنے توکل کی بات نہ کرتے تھے۔کہتے تھے کہ ''مجھے حیا آتی ہے کہ میں ان کے سامنے ایسے مقام کا تذکرہ کروں جو آپ کا مقام ہے''۔لیکن صوفی جہاں بیٹھتے ہیں اور خادم ان کا کہیں باہر ہو تو ان کا توکل کمزور ہوتا ہے۔اس شخص کے توکل کی طرح جو روزی کماتا ہےاور اس کے لئے بہت سی شرایط ہیں تاکہ اس کا توکل درست ہو۔لیکن اگر صوفی فتوح پر بیٹھ رہیں تو یہ امر توکل کے نزدیک تر ہوگا۔لیکن جب ایسی جگہ مشہور ہوجائے تو وہ بازار کی مانند ہوگی۔جس سے خطرہ یہ ہوتا ہے کہ دل شہرت کی طرف مائل ہوجائے گا۔لیکن اگر دل اس طرف مائل نہ ہو تو صوفی مکتسب متوکل کی مانند ہوگا۔اصل یہ ہے کہ متوکل کی امید گاہ لوگ نہ ہوں اور نہ وہ اسباب پر اعتماد رکھتا ہو۔بلکہ اس کی نگاہ مسبب الاسباب پر ہو۔حضرت خواصؒ فرماتے ہیں کہ: ''میں نے خضر علیہ السلام کو دیکھا کہ میری صحبت پر راضی ہیں لیکن میں نے انھیں اس لئے چھوڑ دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا دل اُن پر اعتماد کرنے لگے اور مطمئن ہوجائے۔اور میرا توکل ناقص ہوجائے''۔احمد ابن حنبلؒ نے ایک شخص کو مزدوری پر لگادیا تھا۔تو اپنے ایک شاگرد سے کہا

کہ اسے طے شدہ مزدوری سے زیادہ دے۔ لیکن مزدور نے وہ زیادہ قبول نہ کئے تو جب وہ چلا گیا تو فرمایا کہ اس کے پیچھے جاؤ کہ شاید ایزادی قبول کر لے'' تو شاگرد نے پوچھا کہ 'کیوں کس لئے'' تو آپؒ نے فرمایا کہ ''اس نے اپنے باطن میں اس کی طمع دیکھی تھی تو ہوسکتا ہے کہ نہ لے لیکن جب طمع جاتی رہی تو ہوسکتا ہے کہ لے لے''۔ مختصر یہ کہ مکتسب کا توکل یہ ہے کہ اس کا اعتماد سرمائے پر نہ ہو اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر اس کا راس المال چوری ہو جائے تو دل اس امر سے متاثر نہ ہو۔ اور اسے روزی کے بارے میں کوئی فکر لاحق نہ ہونے پائے۔ کیونکہ جب اعتماد اللہ کے فضل پر ہوگا تو جانتا ہے کہ روزی ایسی جگہ سے آئے گی کہ جو اس کے شان گمان میں بھی نہ ہو۔ اور اگر روزی نہ ملے تو سمجھے کہ اس کی بھلائی نایابی ہی میں ہے۔

یہ حال کہ جو نہایت نادر احوال میں سے ہے۔ اس حال کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کے پاس کچھ مال متاع ہے اگر چوری ہو جائے اور ضائع ہو جائے تو دل پر اس کا مطلق اثر نہ ہو وہ اپنی جگہ متمکن رہے تو اگرچہ عزیز و نادر ہے لیکن محال نہیں۔ اور یہ اس بناء پر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت اور کمال فضل و رحمت پر یقین حاصل ہوتا کہ جان لے کہ وہ ذات بدون سرمایہ کے بھی روزی دیتی ہے۔ اور سرمائے کی کثرت اس شخص کے لئے موجب ہلاکت ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''ہوسکتا ہے کہ بندہ رات کو کسی کام کے بارے میں سوچے کہ جس میں اس کی ہلاکت ہو اللہ تعالیٰ عرش کی بلندی سے اُسے بہ نظر عنایت دیکھتے ہیں جس سے وہ اس کام سے صرفِ نظر کرتا ہے۔ حتیٰ کہ صبح کو غم زدہ اٹھتا ہے اور بدگمانی کرتا ہے کہ یہ کس نے کیا اور کیوں کیا۔ اور یہ قصد ممکن ہے کہ فلاں ہمسائے نے کیا ہو۔ حالانکہ وہ خود اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے جو اس تک پہنچتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں بے باک ہوں کہ صبح محتاج اٹھوں گا یا دولت مند۔ کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میری بھلائی کس میں ہے''۔

اور دوسرے یہ کہ جانتا ہے کہ بدگمانی اور محتاجی کا خطرہ شیطان کی تلقین ہے: ''اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ'' (قرآن: ۲۶۸/۲) (شیطان تمھیں فقر کا خوف دلاتا ہے اور بخل کا حکم دیتا ہے) اور ایسے احوال میں اللہ تعالیٰ کے حسنِ نظر پر اعتماد کمالِ معرفت کی دلیل ہے۔ خصوصاً وہ کہ جس نے یہ جان رکھا ہو کہ روزی پوشیدہ اسباب میں سے ہے جنھیں کوئی بھی جان نہیں سکتا۔ مختصر یہ کہ اسبابِ خفی پر بھی اعتماد نہ کرے بلکہ اللہ کے اسباب پر بھروسہ کرے۔ ایک متوکل عابد ایک مسجد میں تھا۔ تو امام مسجد نے کئی دفعہ اس سے کہا کہ 'تیرے پاس کوئی چیز نہیں اگر کسب و کار کرتا تو یہ فاضل تر تھا''۔ تو اس نے کہا کہ اسی ہمسائیگی میں ایک

یہودی نے وعدہ کر رکھا ہے کہ ہر روز دو روٹیاں مجھے پہنچائے گا'' تو امام نے کہا کہ ''اگر ایسے ہی ہے تو روا ہے کہ تو کوئی کسب نہ کرے''۔ تو اس متوکل زاہد نے کہا کہ ''اے جواں مرد اگر تو امامت نہ کرے تو یہ بہتر ہے کیونکہ تیرے نزدیک یہودی کا وعدۂ رزق رسانی اللہ تعالیٰ کے وعدے سے قوی تر ہے''۔ اس طرح ایک پیشوائے نماز نے ایک شخص سے پوچھا کہ ''روٹی کہاں سے کھاتے ہو''؟ تو اس نے کہا کہ صبر کر پہلے وہ نماز جو میں نے تمھاری اقتداء میں ابھی پڑھی ہے اسے لوٹالوں''۔ یعنی کہ تجھے اللہ تعالیٰ کے وعدے پر ایمان نہیں ہے۔ اور جنھیں اللہ تعالیٰ کی رزق رسانی پر ایمان تھا ان کا تجربہ ہے کہ انھیں فتوح ایسی جگہ سے ملی ہیں جو ان کے شان گمان میں بھی نہ تھی۔ ان کا ایمان اس آیت پر پختہ تھا کہ ''وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا '' (قرآن:۱۱/۶) (زمین پر کوئی جاندار ایسا نہیں ہے کہ جس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو)۔

حذیفہ مرعشیؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے ابراہیم ادھمؒ میں کیا عجیب ترشے دیکھی تھی کہ آپ انکی خدمت میں لگ گئے''؟ تو انھوں نے فرمایا کہ ''میں مکہ کی راہ میں بہت زیادہ بھوک کا شکار تھا۔ تو جب ہم کوفہ میں پہنچے تو انھوں نے بھوک کا یہ اثر مجھ پر دیکھا۔ تو فرمایا کہ ''بھوک سے کمزور ہو گیا ہے''؟ تو میں نے کہا 'ہاں' تو فرمایا کہ ''دوات اور کاغذ لاؤ'' تو میں لے آیا۔ تو انھوں نے لکھا کہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اے وہ کہ تو ہر حال میں میرا مقصود ہے اور اشارہ سب تجھی سے وابستہ ہے۔ میں تیرا ثنا گو اور شاکر اور ذاکر ہوں۔ لیکن بھوکا پیاسا اور ننگا ہوں۔ میں کہ یہ تینوں میرے نصیب میں ہیں ان کا ضامن ہوں اور تو کہ ان تینوں کا صاحب نصیب ہے ضامن ہو جا''۔ اور رقعہ مجھے دیا اور کہا کہ ''باہر جاؤ اور دل سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور سے نہ لگانا جو تجھے سب سے پہلے ملے رقعہ اسے دینا'' میں باہر نکلا تو میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ اونٹ پر سوار ہے۔ تو رقعہ میں نے اسے دیا۔ اس نے پڑھا تو رونے لگا۔ اور بولا کہ 'رقعہ لکھنے والا کہاں ہے؟'' میں نے کہا 'مسجد میں ہے' تو انھوں نے ایک تھیلی سونے کی مجھے دی جس میں چھ سو دینار تھے۔ تو میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ صاحب کون تھے' تو اس نے بتایا کہ ایک عیسائی ہے۔ تو میں نے یہ تھیلی ابراہیمؒ کے پاس لے گیا اور قصہ بیان کیا تو فرمایا کہ اس سونے کو ہاتھ نہ لگانا کیونکہ اس کا مالک ابھی آیا چاہتا ہے۔ اسی وقت وہ عیسائی آ گیا اور ان کے قدموں میں گر گیا اور مسلمان ہو گیا''۔

ابو یعقوب بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''میں دس دن حرم شریف میں بھوکا رہا تھا تو بے تاب ہو گیا۔ میں باہر نکلا تو میں نے ایک شلغم پڑا دیکھا۔ میں نے خیال کیا کہ اسے اٹھالوں۔ تو کسی نے میرے باطن میں ندا دی

کہ ''دس دن کی بھوک کے بعد ایک گلاسڑا شلغم تیرا نصیب ہے؟'' تو میں نے ہاتھ روک لیا اور مسجد حرام میں واپس آ گیا۔ تو ایک شخص مسجد میں داخل ہوا۔ ایک صندوق میں ایک روٹی جو گھی اور دودھ میں تیار کی گئی تھی اور شکر اور بادام تھے' میرے سامنے رکھ دیئے اور کہا کہ ہم سمندر میں سفر پر تھے تو طوفان آ گیا میں نے منت مانی کہ اگر ہم سلامتی کے ساتھ بچ نکلے تو میں یہ قطرہ اس حاجت مند کو دے دوں گا جو مجھے سب سے پہلے ملے گا۔ تو میں نے ان میں سے ہر ایک سے مٹھی بھر لے لیا اور کہا کہ باقی تمھارا۔ اور اپنے جی سے کہا کہ ''طوفان کو حکم دیا گیا ہے کہ سمندر میں تمھارے لئے روزی تیار کرے اور تو ہے کہ کہیں اور سے ڈھونڈتا پھرتا ہے''۔ پس اس قسم کی نادر مثالوں سے بہرہ وری ایمان کو تقویت دیتی ہے۔

عیال داروں کے لئے توکل کا بیان

عیال دار کے لئے لازم نہیں کہ وادی میں جائے اور کسب وکار سے ہاتھ کھینچ لے۔ بلکہ عیال داروں کا توکل سوائے تیسرے درجے کے اور کوئی نہیں۔ اور وہ توکل مکتسب کا ہے۔ جیسے کہ حضرت ابوبکر صدیق کیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ توکل دو معنی میں مسلم ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ انسان بھوک پر صبر کر سکے اور جو کچھ میسر ہے اس پر قناعت کر سکے۔ اگرچہ وہ گھاس پھوس ہی کیوں نہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ ایمان رکھتا ہو کہ ممکن ہے کہ روزی اس کی بھوک پیاس اور موت ہو اور اس کی بھلائی اسی میں ہو۔ حالانکہ وہ عیال کو اس پر عامل نہیں رکھ سکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا اپنا نفس بھی اس کی عیال میں سے ہے۔ اگر بھوک پر صبر کی تاب نہیں رکھتا اور مضطرب ہو جائے گا۔ تو اس کے لئے ترک کسب جائز نہیں۔ پس فرق ان میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اپنے آپ کو بھوکا رکھنا جائز ہو گا لیکن عیال کے لئے روا نہیں۔

اور جب کسی کا ایمان کامل ہو اور وہ تقویٰ میں مشغول ہو۔ اگرچہ کسب نہ کرے۔ اس کے رزق کے اسباب ظاہر ہوتے ہیں جیسے کہ جنین ماں کے رحم میں کسب سے عاجز ہوتا ہے۔ لیکن اس کی روزی ناف کی راہ سے اسے پہنچتی رہتی ہے۔ تو جب ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی روزی ماں کے سینے سے فراہم کرتا ہے۔ جب کھانا کھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو عین اس وقت پر اللہ اس کے دانت پیدا کر دیتا ہے۔ اگر ماں باپ مر جائیں تو یتیم رہ جاتا ہے۔ تو اللہ نے جس طرح ماں میں شفقت کو موکل کر دیا تھا تاکہ وہ بچے کو خوبی سے پالے تو اللہ تعالیٰ یہ شفقت اوروں پر موکل کر دیتے ہیں تاکہ ان کے دل میں یتیم پر رحم پیدا ہو۔ اس سے پہلے یہ شفقت صرف ایک ماں کی تھی اور دوسروں نے اسی پر چھوڑ رکھی تھی۔ جب ماں مر گئی تو لاکھوں شفقتیں وجود میں آ گئیں۔ جب بچہ بڑا ہو گیا تو اسے کمانے کی قوت عطا کی اور حاجت اس پر مسلط کر دی تاکہ شفقت

کے ذریعے اپنی دیکھ بھال کرے۔ جس طرح ماں اپنی شفقت کے ذریعے اس کی حفاظت کرتی تھی۔ اگر چہ اللہ تعالیٰ اسے اِس ضرورت سے بے نیاز کر دیتا ہے تا کہ اپنے کسب سے یتیم ہو جائے اور تقویٰ کی طرف رخ کرے تو تمام دلوں کو اس کی شفقت سے پُر کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ سب کہنے لگتے ہیں کہ یہ اپنے اللہ تعالیٰ میں مشغول ہے۔ اس لئے ہمارے پاس جو زیادہ اچھا ہے اور عمدہ ہے وہ اسے دینا چاہئے۔ اس سے پہلے وہ خود اپنے اوپر تنہا مشفق تھا اور اب جملہ خلق اس پر مشفق ہو گئی۔ ایسے ہی جیسے کہ یتیم پر مشفق ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ کام کاج کر سکتا ہو لیکن ہرزہ روی یا سستی کا شکار ہو جائے تو پھر شفقت دلوں میں پیدا نہیں ہوتی۔ تو اسے ترکِ کسب پر توکل نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ جب وہ اپنے نفس میں مشغول ہے تو اپنی تیمارداری بھی اسے خود ہی کرنی چاہئے اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف رُخ کرے اور خود سے یتیم ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ دلوں کو اس پر مشفق اور رحیم بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی متقی نہیں دیکھا گیا جو بھوک کے ہاتھوں ہلاک ہوا ہو۔

پس جو کوئی اس تدبیر محکم کو دیکھے کہ اس مملکت کے مالک نے ملک وملکوت کا نظام کیسے قائم کیا ہے اور کس کمال کو پہنچایا ہے۔ تو لازماً اسے یہ آیت ملحوظ خاطر ہو گی کہ فرمایا کہ: ''وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا'' تو وہ جان لے گا کہ اس نے یہ مملکت اس خوبی سے قائم کی ہے کہ کوئی شخص ضائع نہیں ہوتا۔ الا یہ کہ نادر ہو اور وہ بھی اس لئے کہ خیر اس کی اسی میں ہو گی اور اس لئے نہ ہو گی کہ کس نے کسب وکار سے ہاتھ کھینچا تھا۔ کیونکہ وہ جس نے مال بہت کما رکھا ہو وہ بھی شاذ نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ ضائع ہو۔ یا ہلاک ہو۔ اور حسن بصریؒ جنھوں نے اس حال کا مشاہدہ کیا تھا' فرمایا کہ ''میں چاہتا ہوں کہ تمام بصرہ والے میری عیال ہوں اور گندم کا ایک دانہ ایک دینار میں ملتا ہو''۔

وہیب بن الوردؒ نے فرمایا کہ ' اگر آسمان آہنیں ہو جائے اور رُوئے زمین کانسی کی ہو جائے اور میں اپنی روزی کا غم کھاؤں تو مجھے خوف ہے کہ مشرک ٹھہرایا جاؤں گا''۔ اللہ تعالیٰ نے روزی آسمان کے حوالے کر دی ہے تا کہ کوئی اس راز کو پا نہ سکے۔ ایک جماعت حضرت جنیدؒ کے پاس گئی اور کہا کہ ''ہم اپنی روزی طلب کریں؟'' تو فرمایا کہ اگر جانتے ہو کہ کہاں ہے تو طلب کرو''۔ تو انھوں نے کہا کہ ''ہم خدا سے روزی چاہتے ہیں''۔ تو فرمایا کہ ''اگر جانتے ہو کہ اس نے تمھیں فراموش کر دیا ہے تو اسے یاد دلا دو''۔ تو وہ بولے کہ ''ہم توکل کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ از خود کیا ہوتا ہے؟'' تو فرمایا کہ ''توکل بہ آزمائش تو شک ہوا'' تو انھوں نے کہا ''پس حیلہ کیا ہے؟'' تو فرمایا کہ ''حیلہ کو بروئے کار لانا''۔ پس اسی قدر روزی کے وعدے کے لئے کافی ہو گا۔ جس نے بھی اللہ پر بھروسہ کیا ہے اسے چاہئے کہ وہ اُسی کی طرف دیکھے۔

مقام دیگر: توکل کوملحوظ رکھنا اور اِدّخار کے بارے میں (ادّخار: ذخیرہ اندوزی)

یادرہے کہ جس نے اپنے لئے سال بھر کا ساز وسامان فراہم کرلیا وہ توکل سے جاتا رہا۔ کیونکہ اس نے پوشیدہ اسباب کی راہ کو طے نہ کیا۔ اور اسباب ظاہر پر بھروسہ کیا۔ جو ہر سال حسب سابق موجود ہوتے ہیں۔ لیکن جس نے حالیہ وقت کی ضرورت پر قناعت کرلی اتنے کھانے پر جس سے وہ سیر ہوجائے اور لباس پر جو وہ پہن لے تو اس نے گویا توکل کے ساتھ وفا کی اور اگر ذخیرہ اندوزی چالیس روز کے لئے کی تو اس کے بارے میں خواصؒ فرماتے ہیں کہ ''توکل اس مقدار سے باطل نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ اس سے زیادہ عرصے کے لئے جمع کرے'' اور سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ ''اِدّخار توکل کو باطل کردیتا ہے۔ خواہ کتنا ہی ہو'' اور بوطالب مکیؒ فرماتے ہیں کہ ''اگر چالیس دنوں سے زیادہ کا سامان بھی کرلے تو توکل باطل نہ ہوگا بشرطیکہ اعتماد جمع آوری پر نہ ہو''۔ حسین مغازلیؒ جو بشر حافیؒ کے مریدوں میں سے تھے فرماتے ہیں کہ: ''ایک دن ایک شخص جس کے بال کھچڑی ہورہے تھے۔ بشر حافیؒ کے پاس آیا تو بشر نے مٹھی بھر چاندی مجھے دی کہ ''اس سے عمدہ اور اچھا سا کھانا لے آ''۔ حالانکہ میں نے یہ کلمہ اس سے پہلے کبھی انکے منہ سے نہ سنا تھا۔ میں کھانا لے آیا تو آپؒ نے اس شخص کے ساتھ مل کر کھایا اور میں نے اس سے پہلے یہ بھی نہ دیکھا تھا کہ انھوں نے کسی کے ساتھ مل کر کھانا کھایا ہو۔ جب انھوں نے کھانا کھالیا تو بہت سا کھانا بچ رہا۔ تو اس شخص نے وہ سب اکٹھا کیا۔ اٹھایا اور لے کر چل دیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ بلا اجازت اس نے یہ کام کیا۔ تو بشر حافیؒ نے فرمایا کہ ''کیا تمھیں اس پر حیرت ہوئی ہے؟'' تو میں نے کہا کہ 'ہاں' تو آپؒ نے فرمایا کہ یہ فتح موصلیؒ تھے جو آج ہماری زیارت کو تشریف لائے تھے اور کھانا انھوں نے اس لئے لے لیا کہ ہمیں سکھائیں کہ جب توکل درست ہوگیا تو اِدّخار سے کوئی زیاں نہیں ہونے کا''۔

پس حقیقت یہ ہے کہ توکل کی اصل کوتاہ امیدی ہے۔ جس کا حکم یہ ہے کہ اپنے لئے اِدّخار نہ کرنا چاہئے۔ لیکن اگر ادخار کرے اور مال کو اپنے ہاتھ میں ایسے ہی تصور کرے کہ جیسے خدا تعالیٰ کے خزانے میں ہے اور توکل مال پر نہ کرے تو توکل اس کا باطل نہ ہوگا۔ لیکن یہ جو ہم نے بیان کیا ہے یہ تنہا شخص کے لئے ہے۔ لیکن عیال دار اگر ایک سالہ ضرورت فراہم کرلے تو اس کا توکل باطل نہ ہوگا۔ اِلّا یہ کہ اس مدت سے زیادہ کے لئے کرے۔ آنحضرت ﷺ بھی اپنے عیال کے لئے ان کی کمزوردلی کے باعث ایک سالہ ضرورت کے لئے رکھ لیتے تھے۔ لیکن خود اپنے لئے صبح کے بعد چاشت تک کی ضرورت کے لئے اٹھا نہ رکھتے تھے اور ان کا توکل کسی

زیان کا ہدف نہ بنتا تھا۔ کیونکہ مال کا ان کے اپنے ہاتھ میں ہونے یا کسی اور کے ہاتھ میں ہونے میں اُن کے لئے یکساں تھا۔ لیکن خلق کو ان کے ضعف کے مطابق درس دیا۔ حدیث میں ہے کہ اصحابِ صفّہ میں سے ایک شخص فوت ہوگیا۔ تو اس کے لباس میں دو دینار پائے گئے۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''دو داغ'' اور احتمال اس کا دو وجوہ سے ہے: ایک یہ کہ اس نے بہ تلبیس خود کو مجرّد دکھایا ہوا اور یہ دو داغ ہوگا آگ سے برسبیلِ عذاب[1]۔ دوسرے یہ کہ اس نے تلبیس نہ کی ہوگی۔ لیکن یہ ادخار اُسے آخرت کے لئے ضرر کے درجے میں لے آیا ہے۔ اس طرح سے کہ چہرے پر دو داغ اس کی خوب رُوئی کے لئے مضر ہوتے ہیں۔ جیسے کہ ایک ایسے محتاج کے بارے میں جو فوت ہوگیا تھا فرمایا کہ: ''وہ روزِ قیامت آئے گا تو وہ چودھویں کے چاند کی مانند روشن رُو ہوگا۔ اگر ایک خصلت اس میں نہ ہوتی تو چہرہ اس کا آفتاب کی مانند روشن ہوتا۔ اور وہ خصلت یہ تھی کہ وہ سردیوں کا لباس اگلی سردیوں کے لئے اٹھا رکھتا تھا اور گرمیوں کا لباس اسی طرح آئندہ گرمیوں کے لئے اٹھا رکھتا تھا''۔ اور فرمایا کہ ''تمھیں کوئی چیز یقین و صبر سے کمتر عطا نہیں کی گئی''۔ یعنی لباس کو مستقبل کے لئے اٹھا رکھنا یقین کی کمی کی دلیل ہے۔ لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کوزہ، سفرہ اور لوٹا اور ہر وہ شے جو ہمیشہ کام آتی ہے اس کا اِدّخار جائز ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ ہر سال روٹی، کپڑا ایک اور ہی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ لیکن لوازم خانہ ہر گھڑی نئی صورت میں پیدا نہیں ہوتے اور سنت کی مخالفت جائز نہیں۔ لیکن گرمیوں کا لباس جو سردیوں میں کام نہیں آتا اس کی نگہداشت یقین کے ضُعف کی دلیل ہے۔

فصل: جان لے کہ اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ اگر وہ اِدّخار نہ کرے تو بے چین ہو جاتا ہو اور اس کے لئے اسے لوگوں سے امید رکھنی پڑتی ہو تو اس کے لئے ادّخار اولیٰ تر ہے۔ بلکہ اگر ایسا ہو کہ دل اس کا بے چین ہو جس سے وہ ذکر و فکر میں مشغول نہ ہو سکے اِلّا یہ کہ زرخیز زمین کا مالک ہو جو اس کی کفایت کر سکے۔ تو اس کے لئے اولیٰ تر یہی ہے کہ بقدرِ کفایت غلہ خیز زمین رکھے کیونکہ ان سب سے مقصود دل ہے کہ ذکرِ حق تعالیٰ میں مستغرق ہو۔ دلوں میں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ مال کا ہونا ان کو مشغول رکھتا ہو اور فقر میں سکون پاتا ہو تو یہ شریف تر ہوگا۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ بے قدر کفایت سکون پذیر نہ ہوتے ہوں تو ایسے شخص کے لئے غلہ خیز زمین کا ہونا اولیٰ تر ہے۔ لیکن اگر کثرتِ مال اور تجمّل کے بغیر سکون نہ پاتا ہو تو ایسا دل اہل دین دلوں میں سے نہیں ہوتا اور یہ کسی شمار کے قابل نہیں ہوتا۔

---

(۱) احیاء میں ہے کہ: ایک یہ کہ آگ کے دو داغ حق ہیں جیسے کہ قرآن میں ہے: فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ (اور داغ کرتے ہیں ان کی پیشانیوں پر اور ان کے پہلوؤں پر)۔

مقامِ سوم:

کہ یہ جانتا ہو کہ اسباب دفعِ ضرر کے لئے ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہر وہ سبب جو قطعی ہوتا ہے یا اکثر اس کی حاجت ہوتی ہے۔ توکل کی راہ میں اسے ترک کرنا شرط نہیں ہے بلکہ متوکل اگر گھر کا دروازہ بند کر کے اس پر قفل لگا دے تا کہ چور اس کا سامان نہ لے جائے تو اس سے اس کا توکل باطل نہیں ہوتا اور اگر ہتھیار بند ہو جائے اور دشمن سے احتراز کرے تو وہ بھی ایسا ہی ہے اور اگر ایک جبہ اس لئے ساتھ لے لے کہ سردیوں میں نہ پائے گا وہ بھی ایسا ہی بے ضرر ہے۔ اور اگر سیر ہو کر اس لئے کھائے کہ باطن کی حرارت راہ میں سردی کے اثر کو کم کر دے گی تو اس قسم کے اسباب دقیق توکل کے مناقض ہوتے ہیں اور داغ وافسون کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن جو کچھ اسباب ظاہری میں سے ہے ان کا ترک توکل کی شرط نہیں۔ ایک اعرابی آنحضرت ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا کہ ''اونٹ کا کیا کیا؟'' تو اس نے کہا کہ ''میں نے توکل کے سہارے پر کھلا چھوڑ دیا'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اسے باندھ اور پھر توکل کر''[1] لیکن اگر کسی آدمی سے رنج پہنچے تو اسے برداشت کرنا اور مدافعت نہ کرنا توکل ہی سے ہے۔ جیسے کہ فرمانِ خداوندی ہے کہ: ''وَدَعْ اَذٰھُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ'' (قرآن: ۳۳/۴۸) (کفار کے رنج پہنچانے کو چھوڑ اور توکل اللہ پر کر) نیز فرمایا کہ: ''وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَا اٰذَيْتُمُوْنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ'' (قرآن: ۱۴/۱۲) (ہم اس پر ہیں کہ صبر کریں ان رنجوں پر جو تم ہمیں دکھاتے ہو اور اب چاہئے کہ متوکل اللہ پر توکل کریں) لیکن اگر رنج سانپ، بچھو یا درندوں سے پہنچے تو صبر نہیں کرنا چاہئے بلکہ انھیں دفع کرنا چاہئے۔ پس جس نے ہتھیار اٹھائے دشمن سے احتراز کرنے کے لئے وہ متوکل اس لئے ہوتا ہے کہ اسلحے کی قوت پر بھروسہ نہیں کرتا۔ اسی طرح جب گھر پر تالا ڈالتا ہے تو اعتماد تالے پر نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ پر کرتا ہے کیونکہ اکثر تالے ایسے ہوتے ہیں کہ چور کو دفع کرنے سے قاصر ہوتے ہیں اور متوکل کی علامت یہ ہے کہ اگر وہ گھر کو لوٹے اور اثاثہ اس کا چور لے گئے ہوں تو اللہ تعالیٰ کی قضا پر راضی رہے اور رنجیدہ نہ ہو۔ بلکہ جب گھر سے باہر جائے بہ زبان حال یہ کہے کہ ''میں نے تالا اس لئے نہیں ڈالا کہ میں تیرے فیصلے کو دور کروں لیکن اس لئے ڈالا ہے تا کہ تیری سنت کی موافقت کر سکوں۔ بارِ خدایا اگر تو کسی اور کو اس مال پر مسلط فرمائے تو میں تیرے فیصلے پر راضی ہوں کیوں کہ میں نہیں جانتا کہ تو نے یہ کسی اور کے لئے پیدا کئے ہیں اور میرے پاس امانتاً رکھے ہیں یا کہ میرے لئے پیدا فرمائے ہیں''۔

پس اگر کوئی اپنے گھر لوٹنے پر گھر میں مال اسباب نہ پائے اور اس وجہ سے رنجور ہو جائے تو فائدہ اس

(۱) گفت پیغمبر بہ آواز بلند — در توکل زانوئے اشتر بہ بند (رومی)

کا یہ ہے کہ اسے معلوم ہو گیا کہ توکل اس کا درست نہیں ہے۔ وہ فقط ایک فریب تھا جو اس کے نفس نے اسے دیا۔ اور اگر وہ اس نقصان
کے باوجود خاموش رہے اور گلہ نہ کرے تو اس نے صابر کا ایک درجہ پالیا اور اگر شکایت کرنے لگے اور چور کی تلاش میں دوڑ دھوپ کرے تو درجۂ صبر سے بھی گر گیا۔ تو اسے معلوم ہو گیا کہ وہ نہ صابروں میں سے ہے نہ متوکلوں میں سے۔ تا کہ اپنے دعوے سے دست کش ہو جائے۔(۱) اور یہ تمام فایدہ ہے جو چور سے حاصل ہوا۔(۲)

سوال:

اگر کوئی کہے کہ اگر وہ چرائے گئے سامان کا محتاج نہ ہوتا تو گھر کا دروزاہ بند نہ کرتا نہ ہی اس کی نگہ داشت کرتا۔ تو جب اس نے اپنی ضرورت کے لئے اس کی حفاظت کا سامان کیا تو وہ جب چوری ہو گیا تو کیوں کر غمگین نہ ہوگا؟

جواب:

اس اشکال کا یہ ہے کہ ممکن ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسے دیا ہو تو اس نے گمان کیا ہوگا کہ اس کے لئے خیر اسی میں ہے کہ یہ مال اس کے پاس رہے اور اس خیر کی نشانی یہ ہے کہ اللہ نے اسے دیا ہے اور اب اس کی خیر اس میں ہے کہ یہ سامان اس کے پاس نہ رہے اور اس خیر کی دلیل یہ ہے کہ وہ اس سے واپس لے لیتا ہے۔ پس چاہئے کہ ہر دو حالتوں میں اپنی بھلائی پر خوش رہے اور ایمان لائے کہ اللہ تعالیٰ اس کے حق میں سوائے اس کی بھلائی کے اور کچھ نہیں کرتا۔ جب کہ انسان اپنی بھلائی سے خود باخبر نہیں ہوتا۔ اور اللہ بہتر جانتا ہے جیسے کہ ایک بیمار جس کا باپ مشفق اور طبیب ہو تو اگر وہ اسے طعام اور گوشت کھانے کے لئے دے تو خوش ہو جاتا ہے کہتا ہے کہ ''اگر تندرستی کے آثار نہ دیکھتا تو مجھے یہ کھانے کو نہ دیتا۔ اور اگر اسے گوشت نہ دے اور واپس لے لے تو بھی وہ خوش ہوگا اور کہے گا کہ ''اگر وہ نہ جانتا ہوتا کہ گوشت سے اسے نقصان ہوگا تو گوشت واپس نہ لیتا''۔ تو جب تک یہ ایمان نہ ہوگا تو توکل درست نہ ہوگا اور بے اصل بات ہوگی۔

متوکل کے آداب جب اس کا اثاثہ چور لے جائیں

یاد رہے کہ متوکل کو چھ آداب ملحوظ خاطر رکھنے چاہئیں:

---

(۱) احیاء میں ہے کہ: ''چاہئے کہ کوشش کرے کہ اپنے نفس کو دعووں میں استوار نہ رکھے اور اس کے غرور کے رستے کو تھام کر کنویں میں غرق نہ ہو کیونکہ وہ فریبی ہے اور برا حکم دینے والا اور مدعی اس کا ہوتا ہے کہ وہ خیر خواہ ہے۔

(۲) [illegible]

ایک یہ کہ اگر چہ دروازہ بند کرے لیکن اسی امر میں انتہا کو نہ پہنچے۔ اور بہت سے بند دروازے پر نہ لگائے۔ نہ ہمسایوں سے نگاہ داشت کا تقاضا کرے۔ لیکن آسانی کی راہ لے۔ مالک بن دینارؒ اپنے دروازے پر رسی باندھ دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ "اگر یہ کتوں کے باعث نہ ہوتا تو میں رسی بھی نہ باندھتا"۔

دوسرا ادب یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں جانتا ہو کہ وہ چیز نفیس ہے اور چور اس پر حریص ہوگا۔ اسے گھر میں نہ رکھے۔ کیوں کہ وہ معصیت میں چور کی ترغیب کا باعث ہوتی ہے۔ مالک بن دینار کو مغیرہ نے ایک مشکیزہ بھیجا تو مالکؒ نے آدمی بھیجا کہ آ اور یہ مشکیزہ لے جا کیوں کہ شیطان میرے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ اسے چور لے جائے گا۔ یعنی آپؒ نے پسند نہیں کیا کہ چور معصیت میں گرفتار ہو جائے۔ جب بوسلیمان دارانی نے یہ سنا تو فرمایا کہ "یہ صوفیوں کے دل کی کمزوری کی بناء پر ہے۔ مالکؒ دینار کے بارے میں کہ زاہد ہے۔ اسے اس سے کیا کہ چور لے جائے گا؟" اور یہ نکتہ نظر کامل تر ہے۔

تیسرا ادب یہ ہے کہ جب متوکل گھر سے باہر نکلے تو نیت کرے کہ اگر چور لے جائے تو اس کے لئے حلال ہے تا کہ اگر کوئی ضرورت مند ہو تو اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ اور اگر دولت مند ہو تو وہ اس سبب سے دوسروں کا مال چوری نہ کرے گا۔ اس طرح متوکل کا مال دوسرے مسلمانوں پر فدا ہو جائے گا۔ تو یہ شفقت ہوگی چور پر بھی اور دیگر مسلمانوں پر بھی۔ اور جانتا ہو کہ اس نیت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر تقدیر تبدیل نہیں ہوتی تو اسے صدقے کا ثواب بھی حاصل ہو جائے گا۔ ایک درم کی جگہ سات درم کا ثواب۔ کوئی مال لے جائے یا نہ لے جائے کیوں کہ اس نے نیت تو خیر کی کی تھی! جیسے کہ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی اپنی بیوی سے جماع کرتے وقت عزل نہ کرے اور بیوی کے رحم میں تخم ڈال دے تو بچہ وجود میں آئے یا نہ آئے اس کے نامۂ اعمال میں ایک غلام کو آزاد کرنے کا ثواب لکھ دیا جاتا ہے کہ بچہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرے گا حتیٰ کہ میدانِ جنگ میں مارا جائے گا تو اسے شہیدوں کا ثواب حاصل ہوگا۔ اور یہ اس بناء پر ہے کہ جو کچھ اس کے بس میں تھا وہ اس نے انجام دے دیا تو اسے لڑکے کا اجر جو اس جماع سے پیدا ہوتا اور زندہ رہتا اور راہِ اللہ میں مارا جاتا' حاصل ہوتا۔

چوتھا ادب یہ ہے کہ متوکل غمگین نہ ہو اور یہ سمجھے کہ خیر اسی میں تھی کہ دوسرے لے گئے اور اگر اس نے کہا ہو کہ میں نے راہِ اللہ میں دے دیا تو پھر اسے طلب نہ کرے بلکہ اگر اسے دیں بھی تو نہ لے۔ اگر واپس لے لے تو یہ اس کی ملک ہو جائے گا۔ کیوں کہ محض نیت کی بناء پر اس کی ملک سے نہ جائے گا لیکن مقام توکل میں محسوب نہ ہوگا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اونٹ چوری ہو گیا۔ اس نے اسے تلاش کیا حتیٰ کہ تھک ہار گیا۔ تو کہا: فی

سبیل اللہ' اور مسجد میں چلا گیا اور نماز ادا کی۔ اتنے میں ایک نے آ کر خبر دی کہ آپ کا اونٹ فلاں جگہ ہے۔ تو انھوں نے جوتا پہنا پھر کہا ''استغفر اللہ'' اور بیٹھ گیا۔ تو پھر کہنے لگا: ''میں نے کہا تھا کہ اب میں راہِ حق میں اس کے تعاقب میں نہ نکلوں گا''۔ شیوخ میں سے ایک کا کہنا ہے کہ ''میں نے ایک بھائی کو خواب کی حالت میں بہشت میں دیکھا لیکن غمگین تو میں نے کہا کہ بہشت میں غمگین کیوں ہو؟'' تو وہ بولا کہ: ''یہ غم تا قیامت ستائے گا کہ مجھے علیین میں عظیم مقامات دکھائے گئے تھے کہ ان جیسے تمام بہشت میں اور نہ تھے۔ تو میں نے جب ان کا ارادہ کیا تو غیب سے ندا آئی کہ اسے واپس بھیج دو۔ کیوں کہ یہ مقامات اس کے لئے ہیں کہ جس نے سبیل رانی کی ہو'' تو میں نے کہا کہ ''سبیل رانی کیا ہوتی ہے؟'' تو منادی نے کہا کہ تو نے کہا تھا کہ ''فلاں چیز اللہ کی راہ میں'' اور پھر اس کو پورا نہ کیا۔ اگر پورا کرتا تو یہ بھی پورے تمھیں دے دیئے جاتے''۔ ایک شخص مکے میں بیدار ہوا تو سونے کی ہمیانی جو اس کے پاس تھی وہ اسے دکھائی نہ دی تو اس نے بزرگ عابدوں میں سے ایک جو وہاں تھے انھیں موردالزام ٹھہرایا تو وہ بزرگ اس شخص کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ اور پوچھا سونا کس قدر تھا؟ تو جتنا اس نے بتایا اُن بزرگ نے اتنا اسے دے دیا۔ تو جب وہ اس بزرگ کے گھر سے نکلا تو اس نے یہ خبر سنی کہ اس کے دوستوں میں سے ایک از راہ مذاق اس کی تھیلی زر لے گیا تھا۔ تو وہ شخص لوٹ کر ان بزرگ کے پاس گیا اور زر واپس کرنا چاہا۔ ہر چند اس نے اصرار کیا انھوں نے قبول نہ کیا فرمایا کہ ''میں نے یہ اپنی نیت میں اللہ کی راہ میں کر دیا ہے'' آخر ان کے فرمانے پر محتاجوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اسی طرح مثلاً کوئی روٹی لے کر نکلے تا کہ درویش کو دے اور درویش جا چکا ہو تو اسلاف اس بات کو مکروہ جانتے تھے کہ یہ روٹی واپس لا کر خود کھائی جائے بلکہ اسے دوسرے کسی حاجت مند کو دے دینا چاہئے۔

پانچواں ادب یہ ہے کہ چور اور ظالم کو بددعا نہ دے کیوں کہ اس سے توکل اور زہد دونوں باطل ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ جو گذشتہ پر افسوس کرتا ہے زاہد نہیں ہوتا۔ ربیع خثیمؒ کا ایک گھوڑا جو کئی ہزار درم کا تھا' چور لے گئے۔ تو آپؒ نے فرمایا کہ ''میں دیکھ رہا تھا کہ گھوڑا لے جا رہے ہیں''۔ تو لوگوں نے کہا ''تو پھر تم نے انھیں چھوڑ کیوں دیا؟'' تو فرمایا کہ میں اسی وقت جس میں مصروف تھا وہ مجھے گھوڑے سے زیادہ عزیز تھی۔ میں نماز میں تھا''۔ تو اس پر لوگوں نے چور کے لئے بددعا دینا شروع کی تو ربیع نے فرمایا کہ 'ایسا نہ کرو کیوں کہ میں نے گھوڑا اس کے لئے حلال کر دیا اور اسے صدقے میں دے دیا ہے''۔ ایک شخص سے لوگوں نے کہا کہ ''اپنے ظالم کے لئے بددعا کر'' تو اس نے کہا کہ ''ظلم اس نے خود اپنے اوپر کیا ہے نہ کہ مجھ پر تو اس کے لئے یہی برائی کافی ہے میں اس پر زیادتی نہیں کر سکتا''۔ حدیث میں ہے کہ ''بندہ اپنے ظالم پر بددعا کرتا ہے یا برا کہتا ہے حتیٰ

کہ اپنا پورا حق قصاص کے طور پر لے لیتا ہے۔اور ہوسکتا ہے کہ ظالم کا کچھ اس کے ذمے رہ جائے جس کا مال غصب ہوا ہے۔

چھٹا ادب یہ ہے کہ متوکل چور کے لئے اندوہ گین ہوجائے اس پر شفقت کے سبب کہ وہ بے چارہ معصیت کا مرتکب ہوا اور اس کے باعث عذاب میں گرفتار ہوجائے گا۔اور شکر کرے کہ وہ مظلوم ہے اور ظالم نہیں ہے۔اور شکر کرے کہ نقصان مال کا ہوا ہے دین محفوظ رہا ہے اس کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔اگر کسی شخص کا دل ایسے آدمی کے لئے رنجیدہ نہ ہو جس نے گناہ کو حلال سمجھا تھا وہ شخص گویا خلق کی نصیحت (خیر خواہی) اور شفقت سے دست بردار ہوگیا۔فضیل بن عیاضؒ نے ایک لڑکے کو دیکھا جس کا مال اسباب چوری ہوگیا تھا' رو رہا تھا۔تو فضیل نے کہا کہ "سامان کے لئے روتے ہو؟" تو اس لڑکے نے کہا کہ "نہیں بلکہ اس مسکین پر گریہ کر رہا ہوں جس نے یہ حرکت کی ہے کہ قیامت کے دن اس کے پاس کوئی دلیل یا عذر نہ ہوگا"۔

مقام چہارم:

بیماری کے علاج میں اور اس کے ضرر کے ازالے میں کہ جو واقع ہوا ہو۔

ایک قطعی ہے۔جیسے کہ بھوک کا علاج روٹی سے اور تشنگی کا علاج پانی سے اور آگ کا علاج اگر کہیں لگ گئی ہو تو یہ ہے کہ تُو اس پر پانی ڈالے۔تو ان سب سے ہاتھ روک لینا توکل نہیں ہے بلکہ حرام ہے۔

دوسرے یہ کہ قطعی ہو نہ ظنی مگر محتمل ہو کہ اثر کرے گی جیسے کہ افسون وداغ اور فال وغیرہ ہیں۔تو ان سے ہاتھ اٹھانا توکل کی شرط ہے۔جیسے کہ حدیث میں وارد ہے۔کیوں کہ ان کا کرنا انتہائی کوشش میں سے ہے اور اسباب پر اعتماد کرنا ہے اور ان میں سے سب سے قوی داغ ہے' پھر افسون کا درجہ ہے اور ضعیف ترین فال ہے کہ اسے بدفالی کہتے ہیں۔

اور تیسرا درجہ ان متذکرۃ الصدر دونوں درجوں کے درمیان کا درجہ ہے جو قطعی نہیں ہوتا لیکن غالب ظن ہوتا ہے۔جیسے کہ فصد کھولنا' جراحی اور مُسہل کھانا ارگرمی کا علاج سردی سے اور سردی کا علاج گرمی سے ہے۔ان سے ہاتھ روکنا حرام نہیں لیکن توکل کی شرط بھی نہیں۔اور ہوسکتا ہے کہ بعض احوال میں ان کا نہ کرنا اولیٰ تر ہو اور دلیل اس امر کی اُن کا ترک توکل کے لئے شرط نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ کا قول وفعل اس پر ہے۔ قول یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: "اے بندگان خدا! دوا کو استعمال کرو"۔اور فرمایا کہ "کوئی بیماری ایسی نہیں کہ جس کی دوا نہ ہو سوائے موت کے۔لیکن ہوسکتا ہے کہ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔تو لوگوں نے پوچھا کہ "دوا اور افسون اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو بدل دیتے ہیں"؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بھی تو قدر ہی ہے' اور فرمایا

کہ معراج کی رات میں فرشتوں کے گروہ پر سے نہیں گذرا کہ جنھوں نے نہ کہا ہو کہ اپنی امت سے فصد کھلوانے کا کہو کہ غلبۂ خون کو تمھیں ہلاک نہ کرنا چاہیئے۔ اور فرمایا کہ ''خون فرمان خداوندی ہے کہ ہلاکت کا سبب ہے اور جسم سے خون باہر کرنے یا سانپ کو اپنے لباس سے دور کرنے یا آگ کو بجھانے میں جو گھر کو جلا رہی ہو کچھ فرق نہیں۔ کیوں کہ یہ سب ہلاکت کے اسباب ہیں۔ اور ان کا ترک کرنا توکل کے لئے شرط نہیں''۔ نیز فرمایا کہ ''مہینے کی سترہ تاریخ کو جمعرات کے دن فصد کھلوانا ایک سالہ بیماری کو زایل کر دیتا ہے''۔ لیکن یہ ایک منقطع حدیث میں بیان ہوا ہے۔ سعد بن معاذ نے فصد کھلوائی۔ حضرت علی کو آنکھ کا درد تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ نہ کھاؤ یعنی نورس کھجوریں اور فرمایا کہ اسے کھاؤ یعنی چقندر کے پتے کشک جو پختہ کے ساتھ۔ اور آپ ﷺ نے صہیب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ''دکھتی آنکھ میں خرما کھا رہے ہو''؟ تو انھوں نے کہ کہ دسری جانب سے کھا رہا ہوں'' تو آپ اس پر مسکرا دیئے۔

آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ ہر رات آنکھوں میں سرمہ لگاتے اور ہر ماہ پچھنے لگواتے اور ہر سال دوا کھاتے اور جب وحی آتی تو آپ کے سر میں درد ہونے لگتا تو مہندی لگاتے اور جب کہیں زخم لگتا اس پر مہندی لگاتے اور کبھی اس پر مٹی ڈال لیتے اور اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں۔ جن پر مشتمل طب النبی' کتاب تیار ہوئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں ایک بیماری نے ظہور کیا تو بنی اسرائیل نے کہا کہ اس کی دوا فلاں شے ہے۔ لیکن آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''میں علاج نہ کروں گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ عافیت دے دیں گے۔ تو آپ نے اس بیماری کا علاج نہ کیا۔ لوگوں نے کہا کہ دوا اس کی معروف ہے اور مجرب۔ بیماری فوراً جاتی رہتی ہے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''میں چاہتا ہوں کہ بیماری رہے''۔ اس پر وحی آئی کہ: ''مجھے اپنی عزت کی قسم کہ جب تک تو دوا نہیں کھائے گا میں عافیت نہ دوں گا''۔ حضرت نے دوا کھا لی اور اچھے ہو گئے۔ آپ کے دل میں کوئی بات آئی تو وحی آئی کہ ''کیا تو چاہتا تھا کہ میری حکمت کو اپنے توکل سے باطل کر دے؟ دوا میں فواید میرے سوا کس نے رکھے؟'' انبیاء میں سے ایک نے شکایت اپنے ضعف کے بارے میں کی۔ تو وحی آئی کہ ''گوشت کھاؤ اور دودھ پیو''۔ ایک قوم نے وقت کے نبی کے پاس اولاد کی بدصورتی کے بارے میں شکایت کی تو وحی آئی کہ ''ان سے کہو کہ حمل کی حالت میں ان کی عورتیں بہی کھائیں''۔ تو ان عورتوں نے بہی کھائی تو ان کی اولاد خوب صورت ہو گئی۔ اس کے بعد حمل کے دوران وہ بہی کھاتی رہیں اور نفاس کے دوران رطب (نورس خرما)۔ پس اس ساری بات سے یہ معلوم ہوا کہ دوا شفا کا باعث ہوتی ہے۔ ایسے ہی جیسے کہ روٹی پانی سیری کا سبب ہے' اور یہ سب مسبب الاسباب کی تدبیر پر منحصر ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا

کہ ''اے اللہ بیماری کس سے ہے اور شفا کس سے؟'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''دونوں میری طرف سے ہیں''۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ ''پھر طبیب کیا کرتے ہیں؟'' تو جواب میں اللہ نے فرمایا کہ وہ میری روزی کھائیں اور میرے بندوں کو اچھا کریں''۔ بس توکل اس میں بھی علم و حال پر ہے کہ اعتماد دوا پیدا کرنے والے پر ہو نہ کہ خود دوا پر۔ کیوں کہ بہت لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے دوا کھائی اور مر گئے۔

فصل: یاد رہے کہ ایک جماعت کے ہاں داغ بھی معمول میں ہے لیکن اس پر عمل کے باعث توکل باطل ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کے بارے میں نہی آئی ہے کہ جب کہ افسون کے بارے میں نہیں وارد ہوئی۔ اس لئے کہ آگ سے جسم کو جلانا خطرناک جراحت ہے اور اس کی سرایت باعثِ خوف ہے۔ اور فصد اور پچھنوں کی طرح نہیں اور اس کی منفعت بھی اتنی واضح نہیں کہ جتنی کہ پچھنے لگوانے کی ہے۔ اور اس کا متبادل بھی ہے۔ عمران بن الحصین کو ایک بیماری لاحق ہوگئی تو لوگوں نے کہا کہ ''داغ کرو'' لیکن آپ نے داغ نہ کیا۔ لیکن جب لوگوں نے اصرار کیا تو داغ لگوایا تو آپ اچھے ہوگئے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ ''داغ لگوانے سے پہلے میں ایک نور دیکھتا تھا اور ایک آواز بھی سنتا تھا اور ملائکہ مجھے سلام بھیجتے تھے۔ لیکن جب سے میں نے یہ داغ لگوایا ہے وہ سب مجھ سے محجوب ہوگئے ہیں پس میں نے توبہ و استغفار کی''۔ پھر فرا مطرف بن عبداللہؓ نے کہا کہ ایک مدت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ کرامت مجھے لوٹا دی۔

یاد رہے کہ بعض احوال میں دوا نہ کھانا ہی فاضل تر ہوتا ہے۔ اور وہ آنحضرت کی سنت کے منافی نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اسلاف میں سے بہت سوں نے دوا نہیں کھائی تھی۔ یہ اِشکال اس طرح رفع ہو سکتا ہے کہ تو جان سکے کہ معالجہ نہ کرنے کے اسباب چھ ہیں:

اوّل: یہ کہ اسے بذریعہ کشف یہ معلوم ہو چکا ہو کہ مرگ آ چکی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق سے ایک بیماری کے دوران لوگوں نے کہا کہ کیا طبیب کو بلائیں؟'' تو آپ نے فرمایا کہ مجھے طبیب نے دیکھ لیا ہے اور کہا ہے کہ ''انی افعل ماارید'' میں جو چاہتا ہوں وہ کرتا ہوں۔

دوسرا سبب: یہ ہے کہ بیمار خوفِ آخرت میں مشغول ہو تو جی علاج کو نہیں چاہتا۔ جیسے کہ ابودرداء رضی اللہ عنہ سے ان کی بیماری کی حالت میں لوگوں نے کہا کہ ''روتے کس لئے ہو؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''گناہوں کے بوجھ کے باعث'' لوگوں نے کہا ''تمھاری آرزو کیا ہے؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ کی رحمت'' لوگوں نے پوچھا کہ ''طبیب کو بلائیں؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''مجھے طبیب ہی نے بیمار کیا ہے'' حضرت بوذر رضی اللہ عنہ کو آنکھ کا درد تھا۔ تو لوگوں نے کہا ''تو علاج کیوں نہیں کراتا''۔ تو فرمایا کہ ''مجھے معالجہ سے اہم تر کام درپیش ہے''۔ اس

کی مثال ایسے ہی ہے کہ کسی کو بادشاہ کے پاس لے جاتے ہیں تا کہ وہ زجر وتوبیخ کرے۔کوئی کہے کہ روٹی نہیں کھاتے ہوتو وہ یہ جواب دے کہ روٹی کھانے اور بھوک کی کیا پروا؟'' تو یہ کسی پر جو روٹی کھاتا ہے اس پر طعن نہیں ہوگا نہ اس کی مخالفت سمجھی جائے گی اور یہ استغراق بھی ایسے ہی ہے کہ سہل تستریؒ سے لوگوں نے کہا کہ ''تمھاری غذا کیا ہے؟'' تو فرمایا کہ ''میری غذا حی وقیوم کا ذکر ہے'' تو لوگوں نے کہا کہ ہم تو قوام کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جو انسان کی زیست کا مایہ ہے''۔تو فرمایا کہ ''میرا قوام علم ہے''۔لوگوں نے کہا کہ ہم غذا کو پوچھ رہے ہیں''۔فرمایا کہ: ''غذا میری خداوند کا ذکر ہے''۔لوگوں نے کہا کہ ''ہم تمھارے جسم کا طعام پوچھ رہے ہیں''۔تو آپ نے فرمایا کہ ''جسم سے دست کش ہوجا۔جسم کو جسم بنانے والے کے حوالے کردے''۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ بیماری مزمن ہو اور مریض کے نزدیک دوا دارو افسون کی مانند ہو جس کا فایدہ بہت نادر ہوتا ہے۔اور جو شخص علم طب سے بے بہرہ ہوتا ہے وہ بیشتر دواؤں کو اسی نظر سے دیکھتا ہے۔ربیع خثیمؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے ارادہ کیا کہ میں اپنی بیماری کا علاج کروں لیکن مجھے خیال آیا کہ عاد وثمود اور گذر جانے والوں کے درمیان بہت سے طبیب تھے لیکن سب مرگئے۔اور طب نے فایدہ نہ دیا''۔ظاہر ہے ربیع نے طب کو اسباب ظاہر میں سے نہیں پہچانا ہے۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ بیمار نہیں چاہتا کہ بیماری اس کی زایل ہوجائے تا کہ اسے بیماری کا ثواب ملتا رہے یا وہ اپنے صبر کو آزمانا چاہتا ہو۔کیوں کہ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو بلا کے ذریعے آزماتا ہے۔جیسے سونے کو آگ کے ذریعے پرکھتے ہیں۔کوئی ایسا ہوتا ہے کہ بیماری سے بہ خلوص نجات پاتا ہے تو بعض ایسا ہوتا ہے کہ تباہ ہوجاتا ہے۔سہل تستریؒ لوگوں کو دوا دارو کا حکم دیتے تھے۔لیکن خود اپنی بیماری کا معالجہ نہ کرتے تھے۔تو فرماتے تھے کہ ''بیماری کے باعث بیٹھ کر نماز ادا کرنا تندرستی کے ساتھ قیام کے ساتھ نماز ادا کرنے سے فاضل تر ہے''۔

پانچواں سبب یہ ہوتا ہے کہ انسان گناہوں کا بارِ گراں رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ بیماری ان کا کفارہ ہوجائے کیوں کہ حدیث شریف میں ہے کہ بخار بندے سے اس لئے لاحق ہوجاتا ہے تا کہ اسے گناہوں سے پاک کردے تا کہ اس پر کوئی گناہ باقی نہ رہے۔جیسے کہ اولوں پر کوئی گرد وغبار نہیں ہوتا۔حضرت عیسیٰ کا فرمان ہے کہ: ''جو شخص تن و مال میں بیماری و مصیبت پر خوش نہ ہو وہ گناہوں کے کفارے سے ناآگاہ ہوتا ہے''۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک بیمار کو دیکھا تو عرض کیا ''بارِ خدایا اس پر رحمت فرما'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''میں اس پر کیسے رحمت کروں اس چیز میں کہ جس کے ذریعے اس پر رحم کرنے والا ہوں؟ کیوں کہ میں اسی بیماری

کے ذریعے اس کے گناہوں کا کفارہ کر رہا ہوں اور اس کے درجات بڑھا رہا ہوں''۔

چھٹا سبب یہ ہے کہ بندہ جانتا ہو کہ تندرستی سے غرور، غفلت اور سرکشی جنم لیتے ہیں۔ تو اس لئے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ بیمار رہے تاکہ غفلت کا شکار نہ ہونے پائے۔ اور جس کے لئے خیر چاہی گئی ہو ہمیشہ اسے بلا و بیماری کے ذریعے تنبیہ کی جاتی ہے۔ اسی بناء پر کہا گیا ہے کہ مومن تین چیزوں سے خالی نہیں ہوتا: وہ ہیں فقر بیماری اور خواری۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''بیماری میری ہتھکڑی ہے اور فقر قید خانہ اور جسے دوست رکھتا ہوں اسے قید و بند میں رکھتا ہوں''۔ پس چونکہ تندرستی معصیت کی طرف کھینچتی ہے اس لئے عافیت بیماری میں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک قوم کو آراستہ پیراستہ دیکھا تو پوچھا کہ ''یہ کیا ہے؟'' لوگوں نے کہا کہ: ''یہ ان کی عید کا دن ہے''۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس دن ہم معصیت نہ کریں وہ ہمارے لئے روزِ عید ہے''۔ بزرگوں میں سے کسی ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ ''کیسے ہو؟'' تو اس نے کہا کہ ''بہ عافیت ہوں''۔ تو انھوں نے فرمایا کہ جس دن تم نے معصیت نہ کی اس دن تم عافیت میں ٹھہرے اور اگر معصیت کے مرتکب ہو گئے تو اس سے زیادہ بڑی بیماری اور کون سی ہے؟'' کہتے ہیں کہ فرعون نے خدائی کا دعویٰ اس لئے کیا کہ وہ چار سو سال جیتا رہا ہے اور پوری زندگی اسے دردِ سر لاحق ہوا نہ بخار میں کبھی مبتلا ہوا۔ لیکن اگر اسے ایک ساعت درد شقیقہ لاحق ہوتا تو کبھی خدائی کا یہ فضول دعویٰ نہ کرتا۔ کہا گیا ہے کہ جب بندہ ایک دو بار بیمار ہوا اور گناہوں سے توبہ نہ کرے تو ملک الموت اُسے کہتا ہے کہ ''اے غافل ہم نے اپنا رسول کئی بار تمھارے پاس بھیجا لیکن کوئی فایدہ نہ ہوا''۔ کہتے ہیں کہ ''اچھی بات نہیں کہ مومن چالیس روز تک کسی رنج بیماری یا خوف یا زیادتی سے دوچار نہ ہو''۔ آنحضرت ایک عورت سے ازدواج چاہتے تھے تو لوگوں نے بتایا کہ ''وہ کبھی بیمار نہیں ہوئی''۔ وہ گمان کرتے تھے کہ یہ قابل ستایش بات ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میں اسے نہیں چاہتا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن صُداع کے موضوع پر بات کر رہے تھے تو ایک اعرابی نے پوچھا کہ ''صداع کیا ہوتا ہے؟'' مجھے کبھی کوئی بیماری لاحق نہیں ہوئی'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے دور ہو جاؤ جو کوئی کسی دوزخی کو دیکھنا چاہے اسے دیکھ لے''۔ حضرت عایشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ ''یارسول اللہ کوئی شہیدوں کا درجہ پا سکتا ہے؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''ہاں وہ جو کہ دن میں بیس دفعہ اپنی موت کو یاد کرے اور بے شبہ بیماری موت کو زیادہ یاد دلاتی ہے''۔

پس ان اسباب کی بناء پر ایک گروہ نے معالجہ نہیں کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی حاجت نہ تھی اس لئے آپ بیماری میں معالجہ فرماتے تھے۔

مختصر یہ کہ اسبابِ ظاہر کی مخالفت توکل نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام جانا چاہتے تھے کہ یہ خبر ملی کہ وہاں

عظیم طاعون پھیلی ہوئی ہے۔تو ایک گروہ کہتا تھا کہ وہاں نہ جائیں تو دوسرا کہتا تھا کہ ہم تقدیر سے حذر نہ کریں۔تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ''ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر کی طرف گریزاں ہیں''۔ نیز فرمایا کہ اگر تم میں سے ایک کی دو وادیاں ہوں کہ ایک اُن میں سے نباتات سے پُر ہو اور دوسری خشک ہو تو جہاں بھی وہ اپنی بکریاں لے جائے گا وہی اس کی تقدیر شمار ہوگی''۔ پھر آپ نے عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو بلایا اور ان کی رائے طلب کی۔تو انھوں نے کہا: ''میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ: ''جب تمھیں خبر ملے کہ فلاں جگہ وبا ہے تو وہاں نہ جاؤ۔لیکن اگر جہاں تم رہتے ہو تو وہاں اگر وبا شروع ہو جائے تو پھر اس شہر سے باہر نہ نکلو، نہ بھاگو''۔پس حضرت عمرؓ نے شکر کیا کہ اس کی رائے حدیث کے مطابق تھی۔اور تمام صحابہ نے اس پر اتفاق کرلیا۔ممانعت باہر آنے سے اس لئے کی گئی کہ تندرست اگر شہر چھوڑ دیں گے تو بیمار بے تیمار رہ جائیں گے اور ہلاک ہو جائیں گے۔اور پھر جب وبا باطن میں اثر انداز ہو چکی ہو تو شہر چھوڑنے کا کوئی فایدہ نہ ہوگا۔اور بعض احادیث میں مذکور ہے کہ اس طرح کا فرار کفار کے ساتھ جنگ سے فرار کا سا ہے۔اور یہ اس لئے ہے کہ اس سے بیمار شکستہ دل ہوں گے اور کوئی نہ ہوگا جو انھیں کھانا دے تو وہ یقیناً ہلاک ہو جائیں گے اور وہ جو فرار کرے گا اس کی نجات بھی تو مشکوک ہے۔

فصل: یاد رہے کہ بیماری کو مخفی رکھنا توکل کی شرط ہے۔ بلکہ اس کا اظہار کرنا گلہ سے زبان کو آلودہ کرنا مکروہ ہے سوائے کسی عذر کے جیسے کہ طبیب کو حال بتانا یا اپنے ضعف کا اظہار تاکہ اپنی رعونت اور گستاخی کو دور کر سکے۔جیسے کہ لوگوں نے حضرت علیؓ سے کہ جب وہ بیمار تھے پوچھا کہ آپ اچھے ہیں؟'' تو آپ نے فرمایا: ''نہیں'' تو احوال پرسی کرنے والے تعجب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کہ آپ نے 'نہیں' کیوں کہا۔پھر آپ نے فرمایا کہ ''کیا میں اللہ سے دلیری اور مردمی دکھاؤں؟'' اور یہ ایسے کے لئے اس کے احوال کے مناسب ہے کہ جو اس قدر قوت اور عظمت کے باوجود اپنی عاجزی کا اظہار کرے۔اسی لئے حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ ''اے خدا مجھے صبر کی روزی عطا کر''۔آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو بلا نہ مانگو''۔پس اگر بے ضرورت اپنی بیماری کا ذکر بر سبیل شکایت کرے تو یہ حرام ہے۔لیکن اگر بہ طور شکایت نہ ہو تو روا ہے۔لیکن اولیٰ تر یہی ہے کہ اس سے محترز رہے کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ بیان میں مبالغہ ہو جائے۔اور ہو سکتا ہے کہ گلے شکوے کا تاثر پیدا ہو۔اس لئے داناؤں نے کہا ہے کہ بیماری میں واویلا اور نالہ و فریاد نہ کرنا چاہئے۔کیوں کہ اس کا اندراج اس کے نامۂ اعمال میں ہوتا ہے اور ابلیس نے حضرت ایوب علیہ السلام سے اور کچھ نہ پایا مگر نالہ۔فضیل بن عیاضؒ و بشر حافیؒ اور وہیب بن الوردؒ جب بیمار ہوتے تو اپنے گھر کا دروازہ

بند کر دیتے تا کہ کسی کو پتہ نہ لگے۔اور فرماتے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اگر بیمار ہو جائیں تو کوئی ہماری عیادت کو نہ آئے کہ پھر بیماری کی شکایت کا امکان ہے۔ والسلام۔

◆◆◆

اصل نہم: محبت وشوق ورضا کے بیان میں

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ سے دوستی عالی ترین مقامات میں سے ہے۔ بلکہ تمام مقامات کا مقصود یہی ہے۔ کیوں کہ ربع مہلکات جیسی ہر اس چیز سے جو اللہ تعالیٰ کی دوستی سے غافل کر دے اُس سے پاکیزگی کا نام ہے اور جملہ منجیات جو اس سے پہلے مذکور ہوئی ہیں اسی کے مقدمات ہیں۔ جیسے توبہ' صبر' زہد' خوف' رجا وغیرہ ہیں۔ اور جو کچھ اس کے بعد ہے وہ اسی کا ثمرہ اور تبع ہے۔ جیسے کہ شوق' رضا ہیں۔ اور بندہ کے کمال کی غایت یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے دوستی اس کے دل پر اس طرح غالب ہو کہ پورے دل پر چھا جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم دوسری چیزوں سے غالب تر ہو اور محبت کی حقیت کا عرفان اس قدر مشکل امر ہے کہ متکلموں[(۱)] کا ایک گروہ تو اس کا منکر ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ جو کوئی نوعاً تجھ جیسا نہیں ہے اسے دوست نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لئے دوستی کے معنی فرماں برداری ہے اور بس''۔ اور جو کوئی یہ گمان رکھتا ہے وہ اصل دین سے بے خبر ہوتا ہے اور شرح اس کی بہت اہم ہے اس لئے ہم پہلے حق تعالیٰ سے دوستی کے اثبات کے لئے شرعی شواہد پیش کریں گے پھر اس کی حقیقت اور اس کے احکام کا بیان کریں گے۔

خدا تعالیٰ کی دوستی کی فضیلت

یاد رہے کہ سب اہل اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دوست رکھنا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ'' (قرآن: ۵/۵۴) (اللہ انھیں دوست رکھتا ہے اور وہ اللہ کو دوست رکھتے ہیں) آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''کسی کا ایمان کامل نہیں ہے جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو باقی ہر شے سے زیادہ دوست نہ رکھے''۔ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ''ایمان کیا ہے؟'' فرمایا یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کو باقی ہر شے سے زیادہ دوست رکھے''۔ نیز فرمایا کہ: ''بندہ مومن نہیں ہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو اپنے اہل وعیال و مال اور جملہ خلق سے زیادہ دوست نہ رکھے''۔ اور حق سبحانہ نے فرمایا ہے کہ ''اگر تم اپنے باپ' اولاد اور مال و مسکن جو کچھ رکھتے ہو اس کو خدا اور اس کے رسول سے بڑھ کر دوست

(۱) متکلم: مثلاً معتزلہ

رکھتے ہو تو تیار ہو جاؤ کہ فرمان تم تک پہنچ جائے۔ ''قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ.... الآیہ''
ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ ''میں آپ کو دوست رکھتا ہوں''۔ تو آپ نے فرمایا ''فقر کے لئے تیار ہو جا''، تو اس شخص نے کہا کہ ''میں اللہ تعالیٰ کو دوست رکھتا ہوں''۔ تو فرمایا ''فقر کے لئے تیار ہو جا''۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب ملک الموت حضرت خلیل اللہ کی جان لے رہا تھا تو حضرت خلیل نے فرمایا کہ ''تم نے کبھی دیکھا ہے کہ خلیل اپنے خلیل کی جان لے رہا ہو؟ تو آپ پر وحی آئی کہ ''تو نے کبھی دیکھا کہ خلیل اپنے خلیل کے دیدار سے کارِہ ہو؟'' تو آپ نے فرمایا کہ: ''اب میری جان لے لے کہ میں رضا مند ہوں''۔ اور آنحضرت ﷺ کی دعا میں ہے کہ فرمایا کہ: ''اَللّٰھُمَّ ارزقنِی حُبَّکَ وَحُبَّ مَن اَحَبَّکَ وَحُبَّ مَن یَقرَبنی اِلٰی حُبِّکَ وَاَجعَل حُبَّکَ احب اِلٰی مِنَ المَاءِ البَارِدِ'' فرمایا کہ ''بارِ خدایا مجھے اپنی دوستی اور اپنے دوستوں کی دوستی اور ہر ایسی شے جو مجھے تیری دوستی کے قریب کردے عطا فرما۔ اور خود اپنی دوستی پیاسے کے لئے آبِ سرد کی نسبت دوست تر عطا فرما''۔ ایک اعرابی آیا اور بولا ''اے محمد قیامت کب آئے گی؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس روز کے لئے تم نے کیا اثاثہ جمع کیا ہے؟'' تو اس نے کہا کہ ''میں نماز روزہ تو زیادہ نہیں رکھتا لیکن مجھے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہے'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کل قیامت کو ہر شخص اس کے ساتھ ہوگا جسے وہ دوست رکھتا ہے؟'' اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ ''جس نے اللہ تعالیٰ کی خالص محبت کا مزا چکھا اس نے دنیا سے منہ موڑ لیا اور خلق سے نفور ہو گیا''۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ: ''جس نے خدا کو پہچانا اس نے خدا کو اپنا دوست بنا لیا اور جو دنیا کی حقیقت سے آشنا ہوا اس نے دنیا کو اپنا دشمن قرار دیا''۔ اور مومن جب تک غافل نہ ہو اور شاداں نہ ہو اور تفکر کرے تو اندوہ گین ہو جائے گا۔ حضرت عیسیٰ کا ایک ایسی قوم پر سے گذر ہوا جو نزار اور ضعیف تھی تو آپ نے کہا کہ ''تمھیں کیا ہوا ہے؟'' تو انھوں نے جواب دیا کہ اللہ کے عذاب کے خوف سے ہم پگھل گئے ہیں''۔ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ ''تمھارا اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ تمھیں عذاب سے مامون فرمائے۔ اس طرح ایک اور نزار تر اور ضعیف تر قوم پر سے ان کا گذر ہوا تو فرمایا کہ ''تمھیں کیا ہوا ہے؟'' تو بولے ''بہشت کی آرزو نے ہمیں گداز کر دیا ہے''۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تمھارا اللہ پر حق ہے کہ تمھیں تمھاری آرزو تک پہنچائے''۔ تو پھر ایک اور قوم پر سے گذرے جو ان دونوں سے ضعیف تر اور نزار تر تھی۔ لیکن ان کے چہرے نور سے روشن تھے۔ تو آپ علیہ السلام نے ان سے پوچھا کہ: ''تمھیں کیا ہوا ہے؟'' تو انھوں نے کہا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے پگھلا دیا''۔ تو آپ ان کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا کہ ''تم ہو مقربان اور مجھے تم سے ہم جلیسی کا حکم دیا گیا ہے''۔ سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ ''کل (روزِ قیامت) ہر کسی کو ان کے انبیاء کے ساتھ

بلایا جائے گا۔ کہیں گے: ''اے موسیٰ کی امت' اے امتِ عیسیٰ' اے امتِ محمد ﷺ مگر اللہ کے دوستوں کو یہ کہا جائے گا ''اے اللہ کے اولیاء (دوستو) اپنے اللہ کے قریب آؤ''۔ تو ان کے دل خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے۔ اور بعض پیغمبروں کی کتب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ: ''اے میرے بندے میں تجھے دوست رکھتا ہوں۔ میرا حق تجھ پر ہے کہ تو بھی مجھے دوست رکھے''۔

دوستی کی حقیقت

یاد رہے کہ یہ دوستی اس قدر مشکل ہے کہ ایک گروہ نے تو حق تعالیٰ کے ساتھ دوستی سے انکار کر دیا ہے اور اس کی تفصیل بڑی اہم ہے۔ اگر چہ بات اس معنی میں دقیق ہے۔ اور ہر کوئی اسے سمجھ نہیں پاتا لیکن ہم مثالوں کے وسیلے سے اس امر کو اس طرح روشن کریں گے کہ اگر کوئی سعی کرے تو اسے سمجھ سکے گا۔ معلوم رہے کہ پہلے دوستی کی اصل کو پہچاننا چاہئے کہ کیا ہے۔ یاد رہے کہ دوستی کے معنی کسی خوب صورت شے کی طرف میلانِ طبع ہے۔ یہ میلان اگر قوی ہو اسے عشق کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دشمنی بری شے سے طبعی نفرت کا نام ہے اور جہاں خوبی اور زشتی نہ ہو وہاں دوستی یا دشمنی نہیں ہوتی۔

اب چاہئے کہ تو جان لے کہ پسندیدہ کیا شے ہے۔ معلوم رہے کہ اشیاء تیری طبع کے حق میں تین قسم کی ہیں: بعض وہ ہیں جو طبع کے موافق ہیں اور وہ سازگار ہوتی ہیں بلکہ طبیعت خود ان کا تقاضا کرتی ہے اور جو طبع کے موافق ہوں انھیں اچھی اور پسندیدہ کہا جاتا ہے۔ اور بعض وہ ہوتی ہیں کہ ناموافق اور ناسازگار ہوتی ہیں۔ اور مقتضائے طبع کے خلاف ہوتی ہیں انھیں ناخوش کہا جاتا ہے۔ جو اشیاء نہ مخالف ہوں نہ طبع کے موافق ہوں تو انھیں نہ پسندیدہ کہا جاتا ہے نہ ناپسندیدہ۔

اب تجھے یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ جب تک تو کسی شے سے آگاہ نہ ہو تو تُو اس کے پسندیدہ ہونے یا ناپسندیدہ ہونے کا فیصلہ نہیں کر پاتا۔ اور چیزوں سے آگاہی حواس اور عقل کے توسط سے ہوتی ہے اور حواس پانچ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی ایک لذت ہے اور انسان اس لذت کے سبب اسے دوست رکھتا ہے یعنی طبیعت اس کی طرف مائل ہوتی ہے۔ حاسۂ چشم کی لذت خوب صورت چیزوں میں ہے۔ سبزہ و آب رواں میں ہے اور ایسی ہی دوسری خوش نما چیزوں میں ہے۔ تو آنکھ بے شبہ انھیں دوست رکھتی ہے۔ اور کان کی لذت موزوں اور پسندیدہ آہنگ میں ہے۔ اور شامہ کی حس کی لذت خوش بو سے ہے۔ اور ذائقے کی لذت کھانوں میں ہے۔ اور حاسۂ لمس کی لذت نرم اشیاء کے چھونے میں ہے۔ یہ سب محبوب ہوتی ہیں یعنی کہ طبیعت کو ان کی طرف میلان ہوتا ہے اور یہ حسیں سب بہایم میں ہوتی ہیں۔

حاسۂ ششم: وہ چیز ہے جو دل میں ہوتی ہے اور جسے عقل کہا جاتا ہے یا بصیرت کہتے ہیں یا نور بھی کہتے ہیں یا جو نام بھی آپ چاہیں اسے دے لیں۔ یہی چیز انسان اور دیگر حیوانات کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔ انسان کے اور مدرکات بھی ہیں۔ اور وہ اسے اچھے لگتے ہیں اور وہ اُسے محبوب ہیں۔ جس طرح کہ اور لذات حواس کے موافق ہیں جو اس کو محبوب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ: ''دنیا میں سے تین چیزیں میرے لیے محبوب کر دی گئی ہیں: عورتیں، خوش بو اور میری آنکھوں کا نور نماز''۔ آپ (ﷺ) نے نماز کو بلند تر درجہ دیا ہے جو کوئی حیوانات کا سا ہوتا ہے وہ اپنے دل سے بے خبر ہوتا ہے اور سوائے حواس پنج گانہ کے اور کچھ نہیں جانتا۔ وہ ہرگز باور نہیں کرتا کہ نماز اچھی ہے اور اس سے دوستی کی جاسکتی ہے۔ لیکن وہ شخص جس پر عقل غالب ہو اور حیوانات کی صفات سے دور تر ہو اور وہ چشمِ باطن کے ذریعے حضرتِ الٰہیت کے جمال اور اس کی صنعت گری کے عجائب اور اس کی ذات و صفات کے کمال و جلال کے مشاہدے کو دوست رکھتا ہے اور چشمِ ظاہر کے ذریعے اچھی صورتوں اور سبزہ اور آبِ رواں کا نظارہ کرتا ہے بلکہ یہ سب اس کی نگاہوں میں حقیر ہو جاتے ہیں۔ جب حضرتِ الٰہیت کا جمال اس پر منکشف ہوتا ہے۔

اسبابِ دوستی کا بیان

تا کہ اس سے معلوم ہو کہ دوستی کا مستحق سوائے اللہ تعالیٰ سبحانہ کے اور کوئی نہیں۔

سببِ اوّل: یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوست رکھتا ہے اور اپنے کمال کو دوست رکھتا ہے۔ اور اپنی بقا کو دوست رکھتا ہے۔ اور اپنی ہلاکت کو دشمن جانتا ہے۔ اگر چہ عدم اس کا بے رنج والم ہو۔ اور کیوں دوست نہ رکھے؟ جب دوستی کا سبب طبیعت کی موافقت ہے تو کون سی چیز ہے جو اس کے لیے اپنی ہستی اور ہستی کے دوام اور اس کے کمالِ صفات سے بڑھ کر موافق تر اور سازگار تر ہو سکتی ہے؟ اور کون سی شے اس کی نیستی اور اس کے کمالِ صفات کی ہستی سے دشمن تر اور ناسازگار تر ہو سکتی ہے؟ پس اس سبب سے باپ بیٹے کو دوست رکھتا ہے کہ وہ بیٹے کی بقا اپنی بقا کی مانند جانتا ہے۔ چونکہ انسان اپنی بقا سے عاجز ہے (یعنی آخر موت ہے) تو جو کچھ بہ وجہے اس کی اپنی بقا کے مشابہ ہوتا ہے اس کو بھی دوست رکھتا ہے اور حقیقتاً وہ خود ہی کو دوست رکھتا ہے۔ مال کو اس لیے دوست رکھتا ہے کہ وہ اس کی بقا اور اس کی صفات کی بقا کا آلہ ہے۔ اور اپنے اقارب کو دوست رکھتا ہے کیونکہ انھیں اپنے دست و بازو جانتا ہے۔ اور خود کو اُنھیں اپنے ساتھ شامل کر کے کامل سمجھتا ہے

دوسرا سبب: دوستی کا نیکوکاری ہے کہ جس نے اس کے ساتھ نیکی کی ہو اسے طبعاً دوست رکھتا ہے۔ اسی

بناء پر کہا گیا ہے کہ: ''اَلْاِنْسَانُ عَبِیْدُالْاِحسَان'' (انسان احسان کا غلام ہے) اور آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ: ''یارب کسی فاجر شخص کو یہ مجال نہ دے کہ وہ مجھ پر کوئی احسان کرے کیونکہ اس طرح میرا دل اسے دوست رکھے گا''، یعنی یہ فطری بات ہے جو کوشش پر بھی بدلی نہیں جا سکتی۔ اور حقیقت میں یہ بھی اس لیے ہوتا ہے کہ اس نے خود اپنی ذات کو محبوب گردانا ہو۔ کیونکہ احسان وہ ہے کہ جو ایسا عمل کرے جو اس کی بقا کا سبب ہو۔ یا اس کی صفات کے کمال کا ذریعہ ہو۔ انسان تندرستی کو دوست رکھتا ہے اور طبیب کو تندرستی کی وجہ سے اور تندرستی کے لیے دوست رکھتا ہے۔ اسی طرح خود اپنے اپ کو دوست رکھتا ہے۔ اور اس کو جو اس کے ساتھ نیکی کرتا ہے نیکی کرنے کی وجہ سے دوست رکھتا ہے۔

سببِ سوم: یہ ہے کہ انسان نیکوکار کو دوست رکھتا ہے اگرچہ نیکوکار نے خود اس کے ساتھ کبھی نیکی نہ کی ہو۔ مثلاً اگر کوئی سنے کہ مغرب میں ایک نیک عمل بادشاہ ہے جو عالم ہے جو عادل ہے اور تمام رعایا اس سے راحت میں ہے تو طبیعت اس کی طرف راغب ہو جاتی ہے اگرچہ جانتا ہے کہ وہ خود کبھی مغرب میں نہ جائے گا اور اس کے احسان کا مشاہدہ نہ کرے گا۔

سببِ چہارم: یہ ہے کہ انسان کسی کو دوست رکھتا ہو جو نیک ہو۔ اس لیے نہیں کہ اس سے کوئی چیز حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن محض اس کی ذات کے لیے کہ نیک ہے۔ جمال خود فی نفسہٖ طبعاً محبوب ہوتا ہے اور جائز ہے کہ کوئی خوبصورت شخص کو دوست رکھے شہوت کے لیے نہیں۔ چنانچہ انسان سبزے اور آبِ رواں کو دوست رکھتا ہے لیکن انھیں کھانے پینے کے لیے نہیں لیکن اس لیے کہ نگاہوں کو ان کے نظارے سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ اور اصل میں جمال اور حسنِ شے محبوب ہوتا ہے۔ اگر جمالِ حق ظاہر ہو جائے تو یہ بات خود بخود درست قرار پائے گی کہ اسے دوست رکھا جا سکتا ہے۔ جمال کے معنی بعد میں بیان ہوں گے کہ وہ کیا شے ہے۔

سببِ پنجم: دوستی میں مناسبت ہے دو طبایع میں۔ کیونکہ کوئی ایسا شخص ہو سکتا ہے جسے طبعاً کسی اور سے مناسبت ہو۔ تو وہ اس کو کسی نیکی کی وجہ سے نہیں بلکہ طبعی مناسبت کی وجہ سے دوست رکھے گا اور یہ مناسبت کبھی تو ظاہراً ہوتی ہے۔ جیسے کہ چھوٹے لڑکے کو چھوٹے لڑکے سے انس ہوتا ہے۔ اور بازاری کو بازاری کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور عالم کو عالم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور ہر کسی کو اپنے ہم جنس کے ساتھ اُنس ہوتا ہے۔ (کند ہم جنس با ہم جنس پرواز) اور کبھی یہ مناسبت مخفی ہوتی ہے۔ اور اصل فطرت میں اور اسبابِ سماوی میں کہ وقتِ ولادت مستولی ہوں ایک گونہ مناسبت پیدا ہو گئی ہو کہ کوئی اسے نہ جانتا ہو۔ جیسے کہ آنحضرت (ﷺ) نے اس کا ذکر بدیں الفاظ کیا ہے: ''اَلْاَرواحُ جنُوْد مجندةً فَمَا تعارُف مِنهَا وَمَاتنا کرمنها اَختَلَف'' فرمایا کہ روحوں

کوایک دوسری سے آشنائی ہوتی ہے اور بیگانگی بھی ہوتی ہے۔تو جب اصل میں آشنائی واقع ہوئی تو وہ ایک دوسرے سے انس کرنے لگتی ہیں۔اور یہی آشنائی مناسبت سے عبارت ہے۔جس کا ذکر ہو چکا۔اور مزید تفصیل ممکن نہیں۔

نیکی کا بیان کہ وہ حقیقتاً کیا شے ہے

یاد رہے کہ جو شخص ڈھور ڈنگروں کا سا ہے اور راہ سوائے حس چشم ظاہر کے نہیں دیکھتا۔ہوسکتا ہے کہ وہ کہے کہ خوبی سوائے اس کے اور کوئی معنی نہیں رکھتی کہ چہرہ سرخ وسفید ہو' اعضا متناسب ہوں اور حاصل اس کا رنگ وروپ ہے۔اور جسے رنگ وروپ میسر نہ ہو ممکن نہیں کہ وہ خوب ہو۔لیکن یہ غلط ہے۔کیونکہ دانا کہتے ہیں کہ یہ خط (تحریر) حسین ہے اور یہ آواز حسین ہے۔یا یہ لباس خوبصورت ہے۔یا یہ گھوڑا خوب صورت ہے' یا یہ مکان خوب صورت ہے۔یا باغ صاحب جمال ہے اور فلاں شہر نہایت خوب صورت ہے۔پس ہر چیز میں خوبی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہر وہ کمال جو اس کے لیے لازم ہو اس میں موجود ہو اور کسی قسم کے حک واضافہ سے بے نیاز ہو۔اور ہر چیز کا کمال جداگانہ نوعیت کا ہوتا ہے جیسے کمال خط اس کے حروف کا متناسب ہونا ہے۔نیز معناً اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حسین خط اور حسین عمارت کو دیکھ کر ایک گونہ لذّت حاصل ہوتی ہے۔پس حسن چہرے کی خوب صورتی تک محدود نہیں کہ یہ تو چشم ظاہر سے محسوس ہوتا ہے۔تو ہوسکتا ہے کہ کوئی یہ تو مان لے کہ لیکن کہے کہ جو چیز ہمیں دکھائی نہیں دیتی وہ حسین کیونکر ہوسکتی ہے؟ حالانکہ یہ سوال بھی جہالت کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں زیبا اخلاق کا مالک ہے۔اور حسین مروت کا مالک ہے۔کہا جاتا ہے کہ علم تقویٰ کے ساتھ نہایت جمیل ہوتا ہے۔اور سخاوت کے ساتھ شجاعت نہایت مرغوب ہوتی ہے اور پرہیزگاری' قناعت اور کوتاہ طمعی تمام چیزوں سے زیباتر ہیں۔یہ اور اس جیسے اقوال معروف ہیں اور ان جملہ اوصاف کو ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔بلکہ عقلی بصیرت کے ذریعے ان کا ادراک ممکن ہے۔ریاضتِ نفس کی اصل کے بیان میں اس کتاب میں ہم کہہ چکے ہیں کہ صورتیں دو ہیں ایک ظاہر تو ایک باطن اور خوش خلقی صورت باطن ہے اور طبعاً محبوب ہے۔دلیل اس کی یہ ہے کہ کوئی امام شافعی کو دوست رکھتا ہے بلکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ عمر رضی اللہ عنہ کو دوست رکھتا ہے تو یہ کوئی امر محال نہیں ہے اور محال کیسے ہوسکتا ہے کیونکہ کوئی شخص ایسا بھی ہوتا ہے جو ان کی دوستی میں مال وجان نچھاور کرتا ہے۔تو یہ دوستی ان کے رنگ وروپ کی وجہ سے نہیں ہوتی کیونکہ اس نے تو انھیں دیکھا ہی نہیں ہوتا۔اور ان کے پیکر تو خاک سے مل کر اب خاک ہو چکے ہوں گے۔اسی لیے ان سے یہ دوستی ان کے باطن کے حسن اور ان کے علم وتقویٰ وحسن سیاست وغیرہ کی بناء پر ہوتی ہے۔حتیٰ کہ پیغمبروں سے دوستی بھی اسی بناء پر ہوتی ہے

۔اور جو کوئی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دوست رکھتا ہے۔ وہ جس صورت میں بھی دوست رکھے۔ وہ اسی صفت سے دوست رکھتا ہے جو صدیق میں ہے۔اور صدق وعلم حضرت صدیق (رضی اللہ عنہ) کی ذات میں یوں بہم آمیز ہیں کہ انھیں جز ولایتجزا کہا جاتا ہے۔اور صفت کی کوئی صورت ہوتی ہے نہ رنگ۔اور یہ ایک گروہ کے نزدیک مؤثر ہے اور دوسرے گروہ کے نزدیک غیر موثر۔اور جس صفت کی بناء پر بھی دوستی ہے اس کا کوئی ظاہری رنگ روپ نہیں ہوتا۔اور محبوب وہ صفت ہی ہوتی ہے نہ کہ ظاہری گوشت پوست۔پس جو عاقل ہوگا وہ باطنی حسن کا انکار نہ کرے گا۔اور وہ باطنی حسن کو ظاہری حسن کی نسبت مقدم رکھے گا۔اور فرق ہے اس شخص کے درمیان جو صورت کو دوست رکھتا ہے جو کسی نے دیوار پر نقش کردی ہو اور اس شخص کے درمیان جو کسی پیغمبر کو دوست رکھتا ہو بلکہ نادان لڑکا جس کے بارے میں یہ تمنا ہو کہ لوگوں میں سے کسی ایسے کو دوست رکھے تو اس کے چشم وابرو وغیرہ کی توصیف نہیں کرتے بلکہ اس کی سخاوت، شجاعت، وعلم وقدرت کی توصیف کی جاتی ہے۔اگر چاہتے ہوں کہ کسی کو دشمن سمجھے تو اس کے باطن کی برائی کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی ظاہری صورت کی زشتی کا ذکر نہیں کرتے۔اس لیے مسلمان صحابہ کو دوست رکھتے ہیں اور ابوجہل کو دشمن گردانتے ہیں۔پس معلوم ہوا کہ جمال دو قسم کے ہیں۔ ایک ظاہر تو دوسرا باطن اور باطن کی صورت کا حسن محبوب ہے جمال ظاہری کی طرح بلکہ محبوب تر ہے اس سے' اس کے نزدیک جو ذرا سی عقل بھی رکھتا ہو۔

اس امر کا بیان کہ دوستی کا مستحق درحقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہے اور بس

یادرہے کہ حقیقت میں دوستی کے مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہیں اور ان کے سوا کوئی اور نہیں۔اور جو کوئی سوائے اللہ کے کسی اور کو دوست رکھتا ہے وہ بر بنائے جہالت ہے۔سوائے اس صورت کے جو کہ اللہ تعالیٰ ہی سے متعلق ہو۔جیسے کہ آنحضرت (ﷺ) سے محبت کرنا بھی اللہ ہی سے محبت کرنا ہے۔کیونکہ جو کوئی کسی کو دوست رکھتا ہے وہ اس کے رسول کو اس کے محبّ کو اور اس کے محبوب کو بھی دوست رکھتا ہے۔پس علماء اور متقین کے ساتھ دوستی بھی اللہ ہی کی دوستی کے مصداق ہے۔اور یہ امر اسبابِ دوستی پر غور کرنے سے معلوم ہوگا:

سببِ اوّل: یہ ہے کہ انسان اپنے تئیں اور اپنے کمال سے محبت کرتا ہے۔اور یہ اللہ تعالیٰ کو دوست رکھنے کے لوازم ہی میں ہے۔کہ خود اس کی ہستی اور اس کے صفات وکمال کی ہستی سب اللہ کے وجود کے مرہونِ منت ہیں۔اللہ کا فضل اگر نہ ہوتا تو وہ شخص پیدا ہی نہ ہوتا۔اور اگر اس کا فضل نہ ہوتا تو اس کی حفاظت میں کیسے رہتا۔اور اگر اس کا فضل نہ ہوتا تو اس کے اوضاع اور اوصافِ کمال اس سے ناقص تر نہ ہوتے۔پس حیرت ہے

اس شخص پر جوگرمی سے گریزاں ہے اور درخت کے سائے کو دوست رکھتا ہے اور خود درخت کو کہ سائے کا قوام اس کی بدولت ہے دوست نہ رکھتا ہو؛ اور جانتا ہو کہ جس طرح سائے کا قوام درخت کا مرہون منت ہے اس کی ہستی اور اس کے صفات کا قوام اللہ تعالیٰ کا مرہونِ احسان ہے تو وہ کیونکر اللہ تعالیٰ کو دوست نہ رکھے گا۔ سوائے اس کے کہ اس حقیقت سے آگاہ نہ ہو۔ بے شک جاہل اللہ کو دوست نہیں رکھتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی دوستی دراصل اس کی پہچان کا ثمر ہے۔

سببِ دوم: یہ ہے کہ انسان اسے دوست رکھتا ہے جو اس کے ساتھ نیکی کا سلوک کرے۔ اس بناء پر جو کوئی حق تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو دوست رکھتا ہے تو یہ اس کی جہالت کے باعث ہوگا۔ کیونکہ انسان کے ساتھ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور نے کب نیکی کی؟ اور اللہ تعالیٰ کے انسانوں پر گوناں گوں احسانات گنے ہی نہیں جا سکتے۔ جیسے کہ ہم اصل تفکر وشکر کے باب میں اس کتاب میں ذکر کر چکے ہیں اور وہ احسان جسے تو ماسوا اللہ سے دیکھتا ہے وہ تو بر بنائے جہل دیکھتا ہے کیونکہ کوئی شخص تجھے کوئی چیز نہیں دیتا جب تک اللہ تعالیٰ اس کے لیے موکل نہیں بھیجتا تا کہ اس کے خلاف نہ کر سکے جو اس کے دل میں ڈالا گیا ہے کہ دنیا میں اس کے لیے صواب، مصلحت اور منفعت اسی میں ہے کہ کوئی چیز اس دوسرے شخص کو دے تا کہ اپنی مراد کو پہنچے۔ پس اللہ نے اسے اپنی مراد بنایا اور تجھ سے ایک سبب بنایا تا کہ آخرت کے ثواب کو پہنچے۔ ثنا سے یا نیک نامی سے یا ایسے ہی کسی وسیلے سے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ہی نے وہ چیز تجھے دی کہ اس کی بے غرضی کو اس اعتقاد اور داعیے پر موکل کر دیا حتیٰ کہ اس نے وہ چیز تیرے حوالے کر دی۔ اس معنی کو ہم اصلِ شکر میں بیان کر چکے ہیں۔

سببِ سوم: یہ ہے کہ کوئی نیکوکار فرد کو دوست رکھتا ہے اگرچہ اس نے خود اس کے ساتھ کوئی نیکی نہ کی ہو۔ ایسے ہی کہ جو کوئی یہ سنے کہ مغرب میں ایک بادشاہ ہے نیکوکار و عادل اور خلق پر مشفق اور خزانہ اس کا محتاجوں کے لیے وقف ہے۔ اور اپنے ملک میں ظلم نہیں ہونے دیتا۔ تو لازماً اسے دوست رکھے گا۔ اگرچہ جانتا ہے کہ وہ کبھی اس بادشاہ سے نہ ملے گا اور اس سے کوئی نیکی خود اس تک پہنچنے والی نہیں۔ اس بناء پر بجز اللہ تعالیٰ کے کسی اور سے دوستی رکھنا جہالت ہوگی کہ احسان خود سوائے حق تعالیٰ کی طرف سے نہیں اس لیے جو کوئی دنیا میں احسان کرتا ہے اسی کے لزوم سے کرتا ہے۔ پھر خود خلق کے ہاتھ میں کون سی نعمت ہے اور کتنی ہے؟ حق یہ ہے کہ جملہ مخلوق کو اللہ ہی نے پیدا کیا اور جو کچھ چاہیے تھا عطا فرمایا۔ یہاں تک کہ وہ بھی کہ جس کی ضرورت ہے نہ ہوگی لیکن چونکہ انسان کی تزئین اور آراستگی اس میں تھی عطا کی۔ اور یہ امر انسان اس طرح جان سکتا ہے کہ آسمان وزمین اور نبات وحیوان پر غور کرے تا کہ عجائب دیکھ سکے اور اللہ کے بے انتہا انعام واحسان کا ادراک کر سکے۔

سببِ چہارم: یہ ہے کہ کوئی کسی کو خوب صورتی کی وجہ سے دوست رکھتا ہے یعنی باطنی جمال کی بناء پر جیسے کہ مثلاً شافعیؒ یا آئمہ میں سے کسی دیگر امام کو دوست رکھے یا حضرت علیؓ کو دوست رکھے یا کوئی اور ابوبکرؓ و عمرؓ کو دوست رکھے۔ یا کوئی سب کو دوست رکھے بلکہ پیغمبروں کو دوست رکھے۔ تو سبب اس کا ان کا باطنی حسن اور ان کی ذات کی صفات ہوں گی۔ اور اگر تو غور کرے تو حاصل اس کا تین چیزیں اور ہیں:

ایک جمالِ علم کیونکہ علم و عالم محبوب ہوتے ہیں۔ کیونکہ خوب اور شریف ہیں۔ اور علم جس قدر شریف تر ہوگا اور معلوم شریف تر ہوگا تو حسن اس کا بیشتر ہوگا۔ اور تمام علوم میں شریف ترین علم اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے اور حضرتِ الٰہیت کی معرفت ہے جو ملائکہ، کتب، رسل، شرائع انبیاء و تدبیر ملک و ملکوتِ دنیا و آخرت پر مشتمل ہے۔ اور انبیاء اور صدیق محبوب اس لیے ہوتے ہیں کہ انھیں ان علوم میں کمال حاصل ہوتا ہے۔

دوم: یہ کہ انسان قدرت مند ہو جاتا ہے اور اس کی قدرت اپنے نفس کی اصلاح پر اور بندگانِ خدا کی اصلاح پر اور ان کی تادیب پر اور مملکتِ ظاہر پر اور حقیقتِ دین کی تنظیم پر ہے۔

سوم: یہ کہ انسان منزہ ہو جاتا ہے اور عیب و نقص اور اخلاقی خبائث سے انسان پاک ہو جاتا ہے اور محبوب ان میں سے صفات ہوں گی اور خود افعال نہیں۔ کیونکہ جو فعل ان صفات کے باعث نہ ہو وہ محمود نہیں ہوتا۔ اس فعل کی طرح جو اتفاقاً سرزد ہو یا غفلت سے وجود میں آئے۔ پس جو کوئی ان صفات میں کمال تر ہوگا۔ تو دوستی بھی اس کی زیادہ تر ہوگی۔ اور یہ مثلاً اس طرح ہوتا ہے کہ کوئی صدیق کو شافعی سے دوست تر رکھے اور پیغمبروں کو صدیق سے دوست تر جانے۔

اب تو ان تین صفات پر غور کر کہ اللہ تعالیٰ مستحق دوستی ہے اور اس میں یہ تینوں صفات ہیں۔ کیونکہ کوئی سلیم دل ایسا نہ ہوگا جو اتنا بھی نہ جانتا ہو کہ اولین اور آخرین علم انسانوں اور فرشتوں کا اللہ کے علم کے مقابلے میں ناچیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے کہا ہے کہ: ''وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا'' (قرآن: ۸۵/۱۷) (نہیں دیا گیا تم کو علم مگر تھوڑا سا)۔ بلکہ اگر سارا عالم اکٹھا ہو جائے تاکہ وہ ایک چیونٹی یا ایک مچھر کی تخلیق کے عجائب میں غور کریں اور چاہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و علم کا احاطہ کر سکیں تو ایسا نہ کر سکیں گے۔ اور جو کچھ وہ جانتے ہیں وہ بھی اس علم کی بناء پر جانتے ہیں جو انھیں ودیعت کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ: ''خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ'' (قرآن: ۵۵/۳، ۴) (انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان سکھایا)۔ پھر انسانی علوم سب کے سب متناہی ہیں لیکن اللہ کا علم بے نہایت ہے۔ تو مخلوق کے علم کو اللہ تعالیٰ کے علم سے کیا نسبت ہے؟ اور علمِ خلق عطائے خداوندی ہے اور سب علوم اُس کی طرف سے ہیں۔ اور اُس کا علم مخلوق نہیں۔ لیکن اگر تو قدرت پر غور کرے تو

معلوم ہوگا کہ قدرت بھی محبوب ہے۔ اسی باعث لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت کو دوست رکھتے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست کو دوست ہیں کیونکہ یہ بھی قدرت ہی کی ایک قسم ہے۔ اور ساری مخلوق کی جملہ قدرت اللہ کی قدرت کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہے؟ بلکہ سب عاجز ہیں سوائے اس مقدار کے جو اللہ نے انھیں بہ طور قدرت عطا فرمائی ہے۔ اور چونکہ سب کو اس بات میں عاجز کر دیا ہے کہ اگر ایک مکھی کوئی چیز لے اڑے تو یہ اس سے واپس نہیں لے سکتے۔ سب عاجز آ جائیں گے۔ پس قدرت بے نہایت اللہ ہی کی ہے کہ جو کچھ زمین و آسمان اور ان کے درمیان ہے از قسم جن و انس، حیوانات، نباتات وغیرہ سب اسی کی قدرت کے آثار ہیں اور وہ ان جیسی اور چیزوں میں بے انتہا قادر ہے۔ پس یہ کیسے جائز ہے کہ اللہ کی قدرت کے باوصف اسی کے سوا کسی اور کو دوست رکھیں۔ صفتِ تنزیہہ اور عیوب سے پاکیزگی کی صفت میں انسان کو کس قدر کمال حاصل کرنے کی قدرت ہے؟ پہلا عیب اس میں یہ ہے کہ وہ غلام ہے اور اس کی ہستی اس کی نہیں ہے بلکہ وہ تو مخلوق ہے۔ تو اس سے بڑا عیب اور کیا ہوگا؟ اور جاہل ہے خود اپنے باطن کو نہیں جانتا کہ اس کی مجالِ علم دوسروں تک ہو۔ اگر اس کے دماغ میں ایک رگ کج ہو جائے تو دیوانہ ہو جاتا ہے اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ دیوانگی کا سبب کیا ہے۔ اور اگر تو اس کی جہالت اور عجز کا اندازہ کرنا چاہے کہ کس قدر ہے تو اس کا علم و قدرت اس میں سمٹ جائے گا۔ اگرچہ صدیق ہو یا خود پیغمبر ہو پس عیوب سے پاک وہی ہے کہ جس کا علم بے نہایت ہے اور اللہ عزوجل کا علم بے نہایت ہے اور جہل کی کدورت کو اس کے علم میں راہ نہیں۔ اور قدرت اس کی کمال ہے کہ ساتوں آسمان وزمین اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اگر ان سب کو ہلاک کر دے تو اس کی بزرگی اور پادشاہی میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ اور اگر چاہے کہ لاکھ نئے عالم وجود میں لائے تو ایک لحظہ میں معرضِ وجود میں لا سکتا ہے۔ اور اس کی عظمت میں ایک ذرہ اضافے کا امکان نہیں کیونکہ وہاں اضافے کو راہ نہیں۔ وہ عیب سے پاک ذات ہے اور نیستی کو بھی اس کی ذات و صفات میں راہ نہیں۔ بلکہ نقصان خود اس کے حق میں ممکن نہیں۔ پس جو کوئی اسے دوست نہ رکھے تو یہ اس کے انتہائے جہل کی دلیل کیا ہے۔ اور یہ محبت اس محبت سے کمال تر ہے جو بہ سبب احسان ہو کیونکہ وہ تو نعمت کی زیادتی اور کمی کے ساتھ بڑھتی گھٹتی رہتی ہے اور جب سبب یہ ہو ہر حال میں عشق اس کا بکمال ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت داؤد پر وحی آئی کہ: اے داؤد میرے نزدیک بندوں میں دوست ترین وہ ہے کہ جو میری عبادت بیم و طمع کے باعث نہیں کرتا لیکن اس لیے کرتا ہے کہ ربوبیت کا حق ادا کر سکے''۔ اور زبور میں ہے کہ: ''اس سے ظالم تر کون ہوگا۔ جو میری پرستش بہشت و دوزخ کے لیے کرتا ہو۔ تو کیا میں اگر بہشت و دوزخ پیدا نہ کرتا تو کیا میں مستحقِ عبادت نہ ہوتا؟''

سببِ پنجم: دوستی میں مناسبت ہے اور انسان کو بھی حق تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے کہ "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" اسی مناسبت کی طرف اشارہ ہے۔ اور "وَاِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ" میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ "میرا بندہ جب میرا تقرب میری دوستی کے لیے کرتا ہے تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں اس کی زبان بن جاتا ہوں۔ اور یہ جو کہا کہ: "مرضت فلم تعدنی یا موسٰی" میں بیمار ہوا تو میری عیادت کو کیوں نہ آیا؟ تو موسیٰ نے کہا کہ "تو تو عالم کا خدا ہے اور آفتوں سے منزّہ تو کیسے بیمار ا ہوا؟" تو اللہ نے فرمایا کہ "اے موسیٰ میرا فلاں بندہ بیمار تھا اگر تو نے اس کی عیادت کی ہوتی تو میری ہی عیادت کی ہوتی"۔ اور بعض مناسبتِ صورتِ آدمؑ اللہ تعالیٰ کے ساتھ' عنوان کتاب میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اور اس کے مزید معانی کتابوں میں درج نہیں کیے جا سکتے کیونکہ خلق ان کے سننے کی تاب نہیں رکھتی۔ بلکہ اس باب میں بہت سے زیرک بھی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ بعضوں نے اسے تشبیہ کہا ہے۔ کیونکہ گمان کیا کہ صورت سوائے صورتِ ظاہر نہیں ہوتی۔ بعض نے اسے حلول واتحاد سے تعبیر کیا ہے۔ اور سمجھنا اس کا سراسر دشوار ہے۔ اور مقصود یہ ہے کہ جب تو نے دوستی کے اسباب کو جان لیا تو یہ بھی جان لے کہ ہر وہ دوستی جو بجز اللہ تعالیٰ کی دوستی کے ہے وہ جہل کی بناء پر ہے۔ اسی بناء پر تُو معتزلہ کی سادہ دلی کو پہچان لے گا کہ انھوں نے کہا کہ "چونکہ دوستی سوائے ہم جنس کے ساتھ ممکن نہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہماری دوستی ناممکن ہے۔ پس دوستی کے معنی فرماں برداری ہیں۔ اور بس"۔ اس بے چارہ احمق نے دوستی کا مفہوم سوائے شہوت کے جس کے لیے عورتوں کو دوست رکھا جاتا ہے اور کچھ سمجھا ہی نہیں۔ بے شبہ شہوت مجانست کی طالب ہوتی ہے۔ لیکن جس دوستی کا بیان ہم نے کیا ہے وہ جمال وکمالِ معنی کی طالب ہوتی ہے نہ کہ صورتاً ہم جنسی کی۔ کیونکہ جو پیغمبرؐ کو دوست رکھتا ہے اس لیے نہیں رکھتا کہ وہ بھی پیغمبر ہی کا سرؐ، چہرہ یا ہاتھ پاؤں رکھتا ہے۔ بلکہ معنی میں باہم مناسبت رکھتا ہے کہ وہ بھی اسی کی طرح عالم' مرید' متکلم' سمیع وبصیر ہے اور یہ صفات اس میں بدرجۂ کمال موجود ہیں۔ اور اصل اس مناسبت کی اللہ کی دوستی میں بھی ہے لیکن تفاوت کمال وصفات میں بے انتہا ہے۔ اور ہر فراق اور دوری جو فزونی کمال سے پیدا ہوتی ہے اس سے دوستی میں بھی اضافہ ہوتا ہے لیکن یہ امر اصل دوستی کو جو بر بنائے مناسبت ہوتی ہے اسے منقطع نہیں کرتا۔ اور سب اس قدر مناسبت کے مُقر ہیں اور پہچانتے ہیں۔ لیکن جو حقیقت اور رازِ مناسبت ہے جس کی طرف "ان اللہ خلق آدم علی صورتہ" نے اشارہ کیا ہے اس سے بے خبر ہیں۔

اس امر کا بیان کہ کوئی لذت دیدارِ حق سے بڑھ کر نہیں

یاد رہے کہ زبانی طور پر تمام مسلمانوں کا مذہب و مسلک یہی ہے۔ لیکن اگر اپنے آپ سے اس حقیقت کی تلاش کریں کہ ''ایسی چیز کا دیدار جو جہت و مکان سے عاری ہو اور رنگ و روپ نہ رکھتا ہو اس سے کیا لذت ہوگی؟'' وہ اسے نہیں جانتے لیکن زبان سے اقرار کرتے ہیں۔ اس خوف سے کہ شرع میں بیان ہوا ہے۔ لیکن باطن میں دیدار کا کوئی شوق نہیں ہوتا۔ اس سبب سے کہ وہ اس کے لیے مشتاق ہونے کا علم نہیں رکھتے۔ ہر چند اس راز کی تحقیق اس قسم کی کتاب میں دشوار ہے لیکن ہم اختصار کے ساتھ کنایۃً اس کی توصیف کرتے ہیں:

یاد رہے کہ اس کی چار بنیادیں ہیں: ایک یہ کہ تُو جان لے کہ حق تعالیٰ کا دیدار خُوب تر ہے۔ دوسرے یہ کہ تو یہ جان لے کہ حق تعالیٰ کی معرفت اس کے ماسوا کی معرفت سے خوب تر ہے۔ تیسرے یہ کہ تجھے معلوم ہو کہ دل کے لیے معرفت و علم میں راحت ہوتی ہے اگر چہ ظاہری آنکھ اور جسم کو اس سے کچھ حاصل نہ ہو۔ چوتھے یہ کہ تجھے معلوم ہو کہ وہ خوشی جو دل کا خاصہ ہے وہ ہر اس خوشی سے جو حواس کے ذریعے حاصل ہو غالب تر ہوتی ہے۔ اور قوی تر بھی۔ جب تُو ان سب کو جان لے گا تو لازماً تجھے معلوم ہو جائے گا کہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی چیز سوائے دیدارِ حق تعالیٰ کے خوب تر ہو۔

اصل اوّل: کہ دل کی راحت کا ادراک معرفتِ حق تعالیٰ میں ہے کہ اس سے لذتِ بے کسی پیکر کے ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ انسان میں کئی قوتیں پیدا کی گئی ہیں اور ہر قوت کسی کام کے لیے پیدا کی گئی ہے جو اس کی طبیعت کا مقتضا ہے۔ اور انسان کی لذت اس کے مقتضائے طبع میں ہوتی ہے۔ جیسے کہ قوتِ غضب غلبہ اور انتقام کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اور لذت اس کی اسی میں ہے اور قوتِ شہوت کو غذا حاصل کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اور لذت اس کی اس میں ہے اور سمع و بصر وغیرہ قویٰ کو بھی اسی پر قیاس کرے کہ یہ سب لذت سے بہرہ ور ہیں اور یہ لذائذ گوناگوں ہیں کہ جماع کی لذت خشم رانی کی لذت کے برعکس ہے اور قوت میں بھی متفاوت ہے۔ بعض قوی تر ہیں کہ لذتِ نگاہ جو حسین صورتوں سے حاصل ہوتی ہے وہ اس لذت سے قوی تر ہے تو جو انسان کو ناک کے ذریعے خوشبو سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان کے دل میں بھی ایک لذت پیدا کی گئی ہے جسے عقل کہا جاتا ہے اور نور کہا جاتا ہے۔ جسے علم و معرفت کے لیے پیدا کیا گیا ہے جو خیال اور حِس میں نہیں آتے اور طبع بھی اس کی یہی ہے۔ اور لذت اس کی اس میں ہے کہ اس کے ذریعے جانے کہ یہ عالم پیدا کیا گیا ہے اور عالم کو ایک حکیم اور قادر مدبّر کی مدامی حاجت ہے۔ اس طرح وہ صانع اور اس کی حکمت کو

جوتخلیق میں ہے جان لیتا ہے۔اور یہ سب حس وخیال میں متصورنہیں ہوتے۔ بلکہ انسان دقیق صنایع کواسی قوت کے ذریعے جانتا ہے اوراستنباط کرتا ہے جیسے کہ اصل سخن کی بنیاد کتاب کی نہاد ہندسہ کی نہاد اور دیگر دقیق علوم کی بنیاد ہے۔اوراس کواس میں لذت حاصل ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی معمولی اور حقیر شے کا علم ہوتو ستایش پر خوش ہوتا ہے۔اور اگر اُسے کہا جائے کہ جاہل ہے تو ناراض ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ علم کو اپنا کمال جانتا ہے۔ بلکہ اگر وہ شطرنج بازوں کے قریب بیٹھے تو اسے کہا جاتا ہے کہ رہنمائی نہ کر۔اوراس پر کئی شرایط عاید کردیتے ہیں جن کی تاب وہ نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس علم خسیس کی معمولی مقدار سے لذت گیر اور شاداں ہوتا ہے اس لیے بے تاب ہوجاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس پر ناز کرے۔اور علم اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے۔اور علم کے کمال سے بڑھ کر انسان کے نزدیک اور کیا شے خوش تر ہوسکتی ہے۔اور کمالات میں سے اس کمال سے عظیم تر اور کون سا کمال ہو سکتا ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ کی صفات حاصل ہوں۔ پس اس اصل سے تو نے جان لیا ہوگا کہ دل کو معرفت سے ایسی لذت حاصل ہوتی ہے جس سے آنکھ اور جسم بے بہرہ ہیں۔

اصل دوم: یہ ہے کہ تو جان لے کہ علم ومعرفت کی وہ لذت جو دل کو حاصل ہوتی ہے وہ محسوسات اور شہوات کی لذت سے قوی تر ہوتی ہے۔

یاد رہے کہ جب کوئی شطرنج بازی میں مشغول ہوتا ہے۔اگر چہ دن بھر میں اس نے کھانا نہ کھایا ہو اسے آپ کہیں کہ کھانا کھالو تو وہ نہیں کھاتا بلکہ اسی طرح کھیل میں لگا رہتا ہے۔اس سے ہم یہ اخذ کرتے ہیں کہ اس کی لذت کھانا کھانے کی نسبت شطرنج کھیلنے اور جیتنے میں قوی تر ہے۔اسی سبب سے اس نے شطرنج کو مقدم رکھا ہے۔ پس لذت کی قوت کا اندازہ ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ دونوں کو اکٹھا کر کے موازنہ کریں اور نتیجۃً ایک کو مقدم گردانیں۔

جب تُو نے یہ جان لیا کہ تو یہ بھی جان لے کہ جو کوئی عاقل تر ہوگا قوائے باطنی کی لذت اس پر غالب تر ہوگی۔ کیونکہ اگر ایک عاقل کو یہ اختیار دیا جائے کہ لوزینہ اور مرغ بریاں نوش جان کرے یا کوئی ایسا معرکہ مارے کہ جس سے دشمن مغلوب ہوجائے اور اسے ریاست حاصل ہوجائے تو وہ لازماً ریاست اور غلبہ اختیار کرے گا اِلّا یہ کہ فطرت اس کی بھی ناتمام ہو۔ جیسے کہ چھوٹا بچہ ابھی ناقص العقل ہوتا ہے یا اس کے قوائے باطن مرگئے ہوں مدہوش کی مانند۔ پس جس شخص کے لیے شہوتِ طعام پیدا کی گئی ہو اور شہوتِ جاہ وریاست بھی تو حبِ جاہ وریاست کو ترجیح دے گا تو ہم اس سے جان لیں گے کہ یہ لذت قوی تر ہے۔اسی طرح وہ عالم جو حساب پڑھتا ہے یا علم ہندسہ یا علم شرع یا جو علم بھی وہ پڑھتا ہو اسے اس علم سے لذت حاصل ہوتی ہے۔اور

اگر وہ ناقص نہ ہو بلکہ بہ کمال ہو تو وہ اس علم کو تمام لذائذ پر مقدم رکھے گا۔ بلکہ ریاست وولایت پر بھی مقدم رکھے گا۔ اِلّا یہ کہ علم میں ناقص ہو اور اس سے پوری لذت نہ پائی ہو۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ علم ومعرفت کی لذت دوسری تمام لذتوں سے غالب تر ہے لیکن اسی کے لیے جو ناقص نہ ہو اور دونوں شہوتیں اس کی فطرت میں موجود ہوں۔ کیونکہ اگر چہ نابالغ بچہ اخروٹ سے کھیلنے کو لذتِ مباشرت اور لذتِ ریاست پر مقدم رکھے گا تو ہم ہرگز اس شبہ میں نہ پڑیں گے کہ یہ اس کے اس نقص کی وجہ سے ہے کہ ہنوز اس میں شہوت پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اس دلیل پر کہ جب یہ دونوں شہوتیں اکٹھی ہو جائیں گی تو مباشرت اور ریاست ہی کی خواہش مقدم ہوگی۔

•••

اصل سوم: یہ کہ حق تعالیٰ کی معرفت دیگر تمام معرفتوں سے خوب تر ہے

جب تو نے جان لیا کہ علم ومعرفت خوب ہیں۔ تو اس میں شبہ نہیں کہ یہ بعض علوم سے خوب تر ہیں۔ کیونکہ جو شئے معلوم شریف تر اور بزرگ تر ہو اس کا علم بھی خوب تر ہوگا۔ شطرنج کی تخلیق خود شطرنج بازی سے خوب تر ہے اور ملکی سیاست کا علم، علم وزارت سے خوب تر ہے۔ اور علم وزارت خیاطی کے علم اور زرگری کے علم سے خوب تر ہوگا۔ شرع کی حقیقت واسرار کا علم، علم نحو ولغت سے خوش تر ہے۔ اور وزارت میں وزیر کے اسرارِ کار کا علم اہل بازار کے علم سے خوش تر ہوگا۔ اسی طرح بادشاہ کے اسرار کا علم اسرارِ وزیر سے خوب تر ہوگا۔ پس جس قدر معلوم شریف تر ہوگا اُس کے علم کی لذّت بھی اسی قدر شریف تر ہوگی۔ پس غور کر کہ عالمِ وجود میں کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے کہ جو ہر قسم کے کمال و جمال کا خالق ہے شریف تر یا عظیم تر یا با کمال تر یا با جلال تر ہے؟ اور کسی بادشاہ کی تدبیر مملکت کی نگہ داشت میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر کی سی ہے؟ جو اس نے زمین و آسمان اور اس دنیا اور آخرت کے نظام ہائے کار میں فرمائی ہے اور کوئی بارگاہِ حضرت الٰہیت سے خوب تر اور با کمال تر کہیں ہے؟ پس کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے منظر سے کسی اور کی بارگاہ کا منظر بڑھ کر ہو؟ اگر کسی کو یہ بصیرت حاصل ہو کہ دیکھے یا وہ عقل ہو کہ جانے۔ یا کسی مملکت کے اسرار کا جاننا مملکت خداوندی کے اسرار جاننے سے خوب تر ہوگا؟

پس اِس سے معلوم ہوا کہ معرفتِ حق تعالیٰ، اس کی صفات کی معرفت اور اس کے ملکوت ومملکت کے اسرار کی معرفت اور اس کی الٰہیت کے اسرار کی معرفت، دیگر تمام معرفتوں سے خوب تر ہے۔ کیونکہ اس معرفت کا ثمر سب سے شریف تر ہے۔ بلکہ ماسوا کو شریف کہنا خطا ہے۔ کیونکہ جب تو کسی چیز کو اللہ کے ساتھ نسبت دیتا

ہے تو اس کا استحقاق باقی نہیں رہتا کہ تو اسے شریف کہے یا یہ کہنا کہ وہ شریف تر ہے۔ پس عارف اس دنیا میں بہشت میں ہوتا ہے کہ ''عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ'' (قرآن: ۱۳۳/۳) (کہ وسعت اس کی سات آسمانوں اور سات زمین کے برابر ہے) بلکہ اس سے بھی زاید ہوگی۔ کیونکہ زمین و آسمان کی وسعت متناہی ہے۔ جب کہ معرفت متناہی نہیں۔ اور وہ بوستان جو مردِ عارف کی تماشا گاہ ہے وہ بے کنار ہے جب کہ آسمان و زمین بے کنار نہیں۔ اور میوے جو اس باغ میں ہوتے ہیں دوامی ہیں اور دسترس میں ہوتے ہیں۔ ''قُطُوۡفُهَا دَانِيَةٌ'' (قرآن: ۲۳/۶۹) (اس کے خوشے دسترس میں ہوتے ہیں) کیونکہ جو چیز عارف کے دل میں ہو اس سے زیادہ نزدیک اور کیا شے ہوگی؟ اور مزاحمت، فریب اور حسد کو اس میں راہ نہیں ہوتی کیونکہ عارف جس قدر زیادہ ہوگا اُنس بیشتر ہوگا اور یہ بہشت ایسی ہے کہ جو اس کے باشندوں کی کثرت سے تنگ نہیں ہوتی بلکہ فراخ تر ہوتی ہے۔

•••

اصل چہارم: یہ کہ لذتِ نظر لذتِ معرفت سے بیشتر ہوتی ہے

یاد رہے کہ جاننے کے لایق جو امور ہیں وہ دو قسم کے ہیں: بعض وہ ہیں جو خیال میں آتے ہیں۔ جیسے کہ رنگ و شکلیں۔ اور بعض وہ ہیں کہ جن کا احاطہ عقل کرتی ہے اور خیال میں نہیں آتے جیسے کہ حق تعالیٰ اور اس کی صفات ہیں۔ بلکہ خود انسان کی صفات مثلاً قدرت و علم و ارادات و حیات کہ ان سب کی چگونگی (کیفیت) خیال میں نہیں آتیں۔ بلکہ غضب، عشق، شہوت، درد، راحت کہ سب کے سب بے کیف ہیں خیال میں نہیں آتے لیکن یہ بذریعہ عقل معلوم ہوتے ہیں۔

اور جو چیز خیال میں آتی ہے اس کا ادارک تیرا دو درجے میں ہے: ایک یہ کہ خیال میں آ جائے۔ جیسے کہ تُو کہے کہ تُو اس پر غور کر رہا ہے اور یہ ناقص ہے۔ اور دوسرے وہ جو مشاہدے میں آ جائے تو وہ کامل تر ہوگا۔ بے شک معشوق کے دیدار میں جو لذت ہے اس کے خیال کی لذت سے کہیں زیادہ ہوگی۔ اس لیے نہیں کہ دیدار میں صورت اور ہوتی ہے اس کے برخلاف یا اس سے نیکوتر بلکہ صورت وہی ہوتی ہے لیکن دیدار میں روشن تر ہوتی ہے۔ چنانچہ معشوق کو چاشت کے وقت دیکھے گا تو اسی وقت کی لذت ابتدائے طلوع کے وقت کی نسبت زیادہ ہوگی۔ اس لیے نہیں کہ صورت اور ہو گئی بلکہ اس لیے کہ روشن تر اور مکشوف تر ہو گئی ہے۔

اسی طرح جو امر خیال میں نہیں آتا اور جسے عقل دریافت کرتی ہے۔ اس کے بھی دو درجے ہیں: ایک

درجے کو معرفت کہا جاتا ہے اور اس کے علاوہ ایک اور درجہ ہے جسے رُویت یا مشاہدہ کہتے ہیں۔ اور نسبت اس کی معرفت کے ساتھ کمال روشنی میں دیدار کی نسبت کے خیال کے ساتھ جیسی ہے۔ جس طرح آنکھ کی پلکیں دیدار کے لیے آڑ ہیں اور خیال کے لیے آڑ نہیں ہوتیں۔ اس لیے کہ جب تک پہلے پپوٹے اوپر نہ اٹھیں دیدار نہیں ہوتا۔ اسی طرح انسان کا اپنے جسم کے ساتھ تعلق ہے جس نے آب و خاک سے ترکیب پائی ہے اور مشغولی اس کی اس عالم حجاب کے شہوات سے مشاہدے کی بناء پر ہوتی ہے نہ کہ بربنائے معرفت اور جب تک یہ حجاب اُٹھ نہ جائے مشاہدہ ممکن نہیں ہوتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا تھا کہ ''لَنْ تَرَانِی'' (تو نہیں دیکھ سکتا) پس مشاہدہ اگر تمام ہوا اور روشن تر ہو تو لازماً اس کی لذت بیشتر ہوگی جیسے کہ دیدار و خیال میں۔

یاد رہے کہ حقیقت یہ ہے کہ یہی معرفت اُس دوسرے جہاں میں ایک اور صفت کے ساتھ ہوگی اور موجودہ صورت کے ساتھ کسی قسم کی مشابہت نہ ہوگی۔ جیسے کہ نطفہ انسان بن جاتا ہے۔ اور خرما کہ درخت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اور کمال کو پہنچ جاتا ہے اور اس گردش کے باوجود انتہائی روشن ہو جاتا ہے۔ اسے مشاہدہ' نظر و دیدار کہا جاتا ہے۔ دیدار کمالِ اِدراک سے عبارت ہے اور یہ مشاہدہ اس ادراک کا کمال ہے اور اس لیے ہے کہ یہ مشاہدہ جہت و مکان کا مقتضی نہیں ہوتا۔ جیسے کہ معرفت نے اس دنیا میں جہت و مکان کا تقاضا نہیں کیا۔ پس دیدار کا تخم معرفت ہے اور جسے معرفت حاصل نہیں وہ دیدار سے محجوب رہتا ہے۔ ابدی حجاب میں۔ کیونکہ جس کے پاس بیج ہی نہ ہو مزرعہ کیسے صورت پذیر ہو؟ اور جسے معرفت کاملاً حاصل ہوا سے دیدار بھی تمام تر حاصل ہوگا۔ پس یہ گمان نہ کرنا کہ تمام لوگ دیدار میں برابر ہیں۔ بلکہ ہر ایک کو دیدار اس کی معرفت کے بقدر میسر ہوگا۔ ''وَاِنَّ اللّٰهَ يَتَجَلّٰى لِلنَّاسِ عَامَّةً وَلِاَبِي بَكْرٍ خَاصَّةً'' (اللہ تعالیٰ تجلی فرماتے ہیں لوگوں کے لیے بہ طور عموم لیکن ابوبکر کے لیے بہ شکل خاص ہے) یہ ہے مفہوم اس کا۔ نہ یہ کہ بوبکر تنہا دیکھتا ہے اور دوسرے اکٹھے دیکھتے ہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے اور دوسرے خود نہیں دیکھتے کہ یہ خاص اس کے لیے مختص ہے کہ بیج اس کا معرفت ہوتی ہے جس سے دوسرے محروم ہوتے ہیں۔ اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ جو فرمایا ہے کہ ''ابوبکر کی فضیلت نماز روزے کی کثرت کی بناء پر نہیں ہے لیکن ایک راز کی بناء پر ہے جو اس کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے''۔ وہ راز معرفت کی ایک نوع ہی تو ہے جو اس دیدار کا تخم ہے جو فقط اس کے لیے مختص ہے۔ پس تفاوتِ دیدارِ حق باوجود اس کے کہ حق تعالیٰ واحد ہے وہ اس تفاوت کی طرح ہے جو ایک ہی صورت کے مختلف آئینوں میں منعکس ہونے سے واقع ہوتا ہے: بعض چھوٹی ہوتی ہے تو بعض بڑی' بعض روشن تر تو بعض تاریک تر۔ بعض ٹیڑھی تو بعض سیدھی۔ اور ٹیڑھ اس حد تک بھی ہوتا ہے کہ خوب رو بدرو دکھائی دیتی ہے۔ انھی

صورتوں کی طرح جوشمشیر پر اس کی چوڑائی اور لمبائی میں منعکس ہوتی ہیں کہ اچھی بھی ہوتی ہیں ناخوش بھی بلکہ مکروہ بھی ہوتی ہیں۔ اور جو کوئی اس کے مقابل تاریک آئینہ دل لے جائے گا یا ٹیڑھا آئینہ لے جائے گا تو جو تصویر دوسروں کے لیے باعث راحت ہوگی وہ بعینہٖ اس کے لیے باعثِ رنج ہو جائے گی (گویا حسن مطلق کا انعکاس دلوں کے آئینوں میں ان کی اپنی استعداد کے مطابق ہوگا)۔ پس یہ گمان نہ کر کہ دیدارِ حق سے جو لذت پیغمبر پاتے ہیں دوسرے بھی پاتے ہیں۔ اور جو اہل علم پاتے ہیں وہی عامی پاتے ہیں اور جو متقی اور محبّ عالم پاتے ہیں وہی دوسرے عالم پاتے ہیں۔ اور وہ عارف کہ جس کے دل پر اللہ کی محبت غالب ہو اور دوسرا وہ عارف کہ جس کے دل پر یہ محبت ایسی غالب نہ ہو تو تفاوت ان میں لذت میں ہوتی ہے نہ کہ دیدار میں۔ کیونکہ دونوں ایک ہی کو دیکھتے ہیں جو تخم معرفت ہے۔ اور تخم معرفت دونوں کا یکساں ہے۔ لیکن ان کی مثال ایسے دو اشخاص کی سی ہوتی ہے کہ دیدارِ چشم ان کا برابر ہو اور وہ خوبی کو دیکھ رہے ہیں لیکن ان میں سے ایک عاشق ہوتا ہے جب کہ دوسرا عاشق نہیں تو عاشق کو لذت زیادہ حاصل ہوگی۔ اور اگر ایک عاشق تر ہوگا تو لذت بھی اس کی بیشتر ہوگی۔ پس فقط معرفت کمالِ سعادت کے لیے کافی نہیں جب تک اس کے ساتھ محبت شامل نہ ہو۔ اور محبتِ حق اس طرح غالب ہو سکتی ہے کہ دنیا کی محبت عارف کے دل سے پاک ہو جائے اور یہ صفت زہد و تقویٰ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ پس زاہد عارف کو کامل تر لذت حاصل ہوگی۔

فصل: لذت دیدار اور لذت معرفت میں ما بہ الامتیاز

بے شک تو کہے گا کہ ''اگر لذتِ دیدار معرفت ہی کی جنس سے ہے تو یہ کوئی بڑی لذت نہیں''۔ اور یہ بات تو اس لیے کہتا ہے کہ تو لذت معرفت سے ناآگاہ ہے۔ ہوسکتا ہے تو نے چند باتیں اکٹھی یاد کر رکھی ہوں۔ کسی کتاب سے یا کسی اور سے سیکھ لی ہوں اور انھیں معرفت کا نام دے دیا ہو تو اس سے تو کسی طور پر لذت حاصل نہ کر سکے گا۔ یاد رہے کہ اگر کوئی خشک[1] روٹی کو مرغ بریاں کا نام دے لے اور کھائے تو مرغ بریاں کی لذت تو نہ پائے گا لیکن جس نے معرفت کی حقیقت کو چکھا ہو تو وہ اس میں اتنی لذت پاتا ہے کہ اگر اس دنیا میں اسے اس کے عوض بہشت دیں تو وہ معرفت کو بہشت پر ترجیح دے گا۔ جس طرح مردِ عاقل سلطنت کی لذت کو فرج و شکم کی لذت سے دوست تر رکھتا ہے۔ اگرچہ معرفت کی لذت عظیم ہے لیکن آخرت میں لذتِ دیدار سے اسے کوئی نسبت ہی نہیں۔ اور یہ بات ایک روشن مثال کے سوا سمجھی نہیں جا سکتی ہے: فرض کرو ایک عاشق علی الصبح اپنے معشوق کو دیکھتا ہے کہ جب ابھی دن روشن نہیں ہوا ہوتا اور عشق اس کا کمزور ہوتا ہے اور شہوت ناقص ہوتی

(۱) امام نے ترینہ کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی فقیروں کی غذا ہے

ہے اوراس کے لباس میں بچھو اور بھڑ چھپے ہوتے ہیں جو اسے کاٹتے ہیں اور دل ابھی اس کا اور کاموں میں مشغول ہوتا ہے اور وہ ہر شے سے ہراساں ہوتا ہے۔ بے شبہ اس کی لذتِ دیدار ضعیف ہوگی۔لیکن اگر سورج ناگاہ نکل آئے اور بہت روشن ہوتو اس کی شہوت اور عشق بہت قوی ہوں اور بچھو بھڑ کا مشغلہ اس سے دور ہوجائے اور ہراس دل سے اٹھ جائے تو وہ معشوق کے دیدار سے عظیم لذت پائے گا۔اور وہ جو پہلے کیفیت تھی اس کو اس کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں ہوگی۔ عارف کا حال دنیا میں اسی طرح کا ہے۔تاریکی اس دنیا میں ضعفِ معرفت کی مثال ہے۔گویا عارف پردے کے پیچھے سے دیکھ رہا ہے۔اور عشق کی کمزوری آدمی کے نقص کے سبب سے ہوتی ہے کہ جب تک اس دنیا میں ہوتا ہے ناقص ہوتا ہے۔اور عشق میں کمال کو نہیں پہنچتا۔اور بچھو بھڑ وغیرہ دنیا کی شہوات کی مثل ہیں اور غم واندوہ از قسم رنج ہیں جن سے انسان دوچار ہوتا ہے۔تو یہ سب لذتِ معرفت میں کھنڈت ڈالتے ہیں اور مشغلۂ ہراس فکر روزگار و معاش روزی وغیرہ فراہم کرنے کے لیے ہوتے ہیں' جو موت کے ساتھ جاتے رہتے ہیں۔اور شہوت و عشقِ دیدار تمام نہیں ہوتے الا اس وقت کہ غم واندوہ اور مشاغل دنیا منقطع ہوجائیں اس سبب سے وہ لذت انتہائی کمال کو پہنچ جاتی ہے۔اگرچہ معرفت کی مقدار سے زیادہ نہیں ہوتی۔جیسے کہ بھوکا جو کھانے کی خوشبو سے لذت پاتا ہے اسے تو کھانے کی لذت سے کوئی نسبت ہی نہیں ہوتی۔معرفت کی لذت کو دیدار کی لذت سے کچھ ایسی ہی نسبت ہوتی ہے۔

فصل: آخرت میں آنکھ ہماری موجودہ آنکھ کی سی نہ ہوگی

بے شک تو کہے گا کہ معرفت دل میں ہوتی ہے اور دیدار آنکھ سے ہوتا ہے۔تو یہ کیسے ہوگا؟ یادرہے کہ دیدار کو دیدار اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ خیال کے کمال کو پہنچنے پر ہوتا ہے۔نہ یہ کہ آنکھ سے ہوگا کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ قوتِ دیدار پیشانی میں رکھ دیتے تو بھی دیدار ہی ہوتا۔پس جائے دیدار میں الجھنا فضول ہے۔ بلکہ جب دیدار کا لفظ وارد ہوا ہے اور ظاہر اس کی آنکھ ہے تو تجھے یہ اعتقاد رکھنا چاہیے کہ آخرت میں دیدار اسے نصیب ہوجائے گا۔یادرہے کہ آخرت کی آنکھ دنیا والی آنکھ کی سی نہ ہوگی' کیونکہ یہ دنیا والی آنکھ جہات و مکان کے سوا نہیں دیکھ سکتی۔لیکن آخرت میں فراہم ہونے والی آنکھ بے جہت و مکان کو دیکھ سکے گی۔اس سے زیادہ عامی کو کہنے یا بحث کرنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ یہ اس کی اوقات سے باہر ہے۔مثل ہے کہ درودگری بندر کا کام نہیں ہے۔اور ہر صاحب علم کہ جس نے فقہ' حدیث اور تفسیر سیکھنے میں رنج اٹھایا ہے وہ اس معنی میں عامی ہی ہے اور یہ اس کا کام نہیں بلکہ وہ بھی جس نے علم کلام حاصل کرنے میں رنج برداشت کیا ہو وہ بھی فی الحقیقت عامی ہی

ہے۔ کیونکہ متکلم تو اعتقادِ عامی کے لیے بدرقہ اور کوتوال ہوتا ہے تا کہ عامی نے جو اعتقاد کیا ہے وہ بوسیلہ حدیث اس کو محفوظ رکھے۔ اور بدعتی کا شر اس سے دور کرے۔ اور طریقہ اس کا وہ جدل میں سمجھتا ہے۔ لیکن معرفت کسی اور ہی کوچے کا نام ہے اور اس کے اہل اور ہی لوگ ہیں۔ چونکہ یہ موضوع اس کتاب سے غیر متعلق ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسی قدر پر بس کیا جائے۔

فصل: لذتِ معرفت اور دوستی حق تعالیٰ کو کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے

بے شک تو کہے گا کہ وہ لذت جسے پا کر بہشت بھی فراموش ہو جائے میرے نزدیک صورت پذیر نہیں ہوتی۔ اگرچہ اس باب میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اس کی تدبیر کیا ہے؟ تا کہ اگر وہ لذت حاصل نہ ہو تو کم از کم اس پر ایمان تو حاصل ہو جائے۔ یاد رہے کہ علاج اس کا چار چیزوں سے ہے:

ایک یہ کہ جو کچھ اس موضوع پر کہا گیا ہے تو اس پر غور کرے اور اس میں تفکر کرے تا کہ معلوم ہو۔ کیونکہ جو بات صرف ایک بار کانوں میں پڑے دل میں جاگزیں نہیں ہوتی۔

دوسرے یہ کہ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ شہوات ولذت کی صفات سب کی سب ایک ہی دفعہ انسان میں پیدا نہیں کی گئیں کہ بچے کی شہوت پہلے کھانے پینے میں ہوتی ہے اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔ جب دس سال کے لگ بھگ ہو جاتا ہے تو کھیل کود کی شہوت اس میں پیدا ہوتی ہے۔ جس سے وہ کھانے پینے کو بھی ترک کر کے کھیل میں لگ جاتا ہے۔ جب تقریباً دس برس کا ہو جاتا ہے تو اس میں اچھے لباس کی شہوت پیدا ہو جاتی ہے جس کی تمنا میں وہ کھیل کو ترک کر دیتا ہے۔ جب پندرہ برس کا ہو جاتا ہے تو اس میں عورتوں کی صحبت اور شہوت کی لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ باقی تمام آرزوئیں اس کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اور جب بیس برس کے سن کو پہنچتا ہے تو اس میں ریاست اور مہتری، تفاخر، تکاثر اور طلبِ جاہ کی لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو لذایذ دنیا کے آخری درجات میں سے ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ: ''اِنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِیْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ'' (قرآن: ۲۰/۵۷) (اس دنیا کی زندگانی کھیل ہے، نابکاری ہے، آرایش ہے، اور باہم تفاخر ہے اور اموال واولاد میں تکاثر ہے)۔ تو جب انسان ان سب سے گذر جاتا ہے اور دنیا نے اس کے باطن کو سراسر تباہ نہ کر دیا ہو اور اس کے دل کو بیمار نہ کر دیا ہو تو اس میں معرفتِ عالم اور عالم کے خالق کی معرفت اور ملک وملکوت کے اسرار کی معرفت کی لذت نمودار ہوتی ہے۔ اور جس طرح جو کچھ بعد میں ہوتا ہے۔ گذشتہ اس میں ذرہ سارہ جاتا ہے۔ تو یہ سب کچھ بھی اس میں مختصر سارہ

جاتا ہے۔اور بہشت کی لذت بھی شکم وفرج ونگاہ کی لذت سے کچھ زیادہ نہیں ہوتی کہ کسی بوستان کو دیکھتا ہے اور کھانا کھاتا ہے سبزہ وآب رواں اور نگاریں محل پر نگاہ ڈالتا ہے۔اور یہ شہوت ایسی ہے کہ خود اس دنیا میں شہوتِ ریاست واستیلا اور فرماں روائی کے مقابلے میں نہایت حقیر ہے۔حتیٰ کہ معرفت کو پہنچے۔ایسا راہب ہوسکتا ہے جو دَیر کو اپنے لیے قید خانہ بنانے اور دن بھر میں جاہ وقبول اور اس کی لذت کے لیے ایک چنے سے زیادہ نہ کھائے۔تو جاہ کی لذت اسے بہشت کی نسبت زیادہ دوست ٹھہری۔کیونکہ بہشت لذتِ فرج وشکم سے زیادہ کچھ نہیں۔پس لذتِ جاہ کہ جس نے تمام دوسری شہوات کو ہیچ کر دیا تو وہ لذتِ معرفت میں لگ گیا۔اور تو ان سب پر ایمان رکھتا ہے کیونکہ تو نے ان سب کا تجربہ کرلیا ہے۔اور وہ بچہ جو شہوتِ جاہ کو ابھی نہ پہنچا ہو وہ اس پر ایمان نہ لائے گا۔اگر تو چاہے کہ اسے ریاست کی لذت سے آشنا کرے تو نہ کر سکے گا۔عارف تیرے ہاتھ میں تیری نابینائی کی وجہ سے اسی طرح عاجز اور درماندہ ہوگا جس طرح تو اس بچے کے ہاتھ میں عاجز ودرماندہ ہے۔لیکن اگر تو تھوڑی سی عقل کا مالک ہو اور غور کرے تو یہ امر مخفی نہ رہے گا۔

علاجِ سوم: یہ ہے کہ تو عارفوں کے احوال پر نگاہ ڈالے اور ان کی بات سنے کہ خواجہ سرا اور نامرد اگرچہ مباشرت کی شہوت اور اس کی لذت سے بے خبر ہوتے ہیں لیکن جب وہ لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنا داشتہ اس میں صرف کرتے ہیں اور اس کی طلب میں خرچ کرتے ہیں۔تو انھیں یہ ضروری معلوم ہوجاتا ہے کہ لوگوں میں شہوت ولذت ایسی بھی ہے جو خود ان میں نہیں ہے۔رابعہؒ ایک عورت تھی جب اس کے سامنے بہشت کا ذکر کرتے تو وہ کہتی کہ ''اَلجَارُ ثُمَّ الدَّار'' ''پہلے گھر کا مالک پھر اس کا گھر''۔ابوسلیمان دارائیؒ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ بیم دوزخ اور امیدِ بہشت انھیں اللہ تعالیٰ سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکتے۔دنیا انھیں کیونکر خود میں مشغول کرسکتی ہے؟'' معروف کرخیؒ کے دوستوں میں سے ایک نے اسے کہا کہ: ''کہیے وہ کیا چیز ہے کہ جس نے تجھے اس طرح خلق اور دنیا سے متنفر کردیا ہے۔اور خلوت وعبادت میں مصروف کردیا ہے۔کیا وہ موت کا خوف ہے یا قبر کا خوف ہے یا دوزخ کا خوف ہے یا بہشت کی امید؟'' تو معروف نے فرمایا کہ: ''یہ سب ہیچ ہیں۔ایک بادشاہ ہے کہ یہ سب اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔اگر تو اس بادشاہ کی دوستی کو چکھ لے تو ان سب کو بھول جائے۔اور اگر تجھ میں اس سے معرفت اور آشنائی پیدا ہوجائے تو تو ان سب سے بیزار ہوجائے''۔

بشر حافیؒ کو لوگوں نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ابونصر تمّار اور عبدالوہاب ورّاق کا احوال کیسا ہے؟'' تو بشر نے کہا کہ اس وقت میں نے انھیں بہشت میں چھوڑا ہے جہاں وہ کھانا کھا رہے تھے''۔لوگوں نے

کہا ''اور خود تو؟'' تو فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ مجھے کھانے پینے کی خواہش نہیں ہے تو اس نے مجھے اپنا دیدار کرامت فرما دیا''۔

علی بن الموفق ؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے بہشت کو خواب میں دیکھا کہ بہت سے لوگ کھانا کھا رہے ہیں اور فرشتے پاکیزہ کھانا ان کے منہ میں ڈال رہے ہیں۔ ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ احاطۂ قدس میں حیرت زدہ دیکھ رہا ہے۔ تو میں نے رضوان سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو اس نے کہا معروف کرخیؒ ہے کہ جس کی عبادت نہ دوزخ کے خوف سے تھی نہ بہشت کی امید میں اس کے لیے نظر حلال کر دی گئی ہے''۔ ابو سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ ''آج جو خود میں مشغول ہے کل بھی اسی طرح خود میں مشغول رہے گا اور جو آج اپنے اللہ میں مشغول ہے فردائے قیامت بھی اسی طرح اپنے اللہ میں مشغول رہے گا''۔ یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے ایک رات بایزید کو دیکھا کہ نمازِ عشا سے لے کر نمازِ فجر تک دو پاؤں پر بیٹھا ہے۔ ایڑی ایک جگہ پر رکھی ہوئی تھی اور آنکھیں سر سے باہر نکلی ہوئی مبہوت آخر سجدہ کیا اور بہت زیادہ قیام کیا۔ اور سر اٹھایا اور کہا کہ ''بارخدا ایک جماعت نے تجھے طلب کیا تو تو نے کرامات دی جس سے وہ پانی پر چلتے اور ہوا میں اڑتے تھے۔ اور میں نے اس سے تیری پناہ طلب کی۔ ایک جماعت کو تو نے زمین کے خزانے عطا کیے۔ اور ایک جماعت کو تو نے یہ کرامت دی کہ ایک رات میں دور کی مسافت طے کر لیں اور اس پر راضی ہو جائیں۔ اور میں نے ان سب سے تیری پناہ چاہی؛ پھر مڑ کر میری طرف دیکھا اور کہا کہ ''اے یحییٰ تو یہاں ہے؟'' میں نے کہا ہاں۔ تو پوچھا کہ کب سے؟ تو میں نے کہا کہ خاصی دیر سے' پھر میں نے کہا مجھے ان احوال میں سے کچھ بتاؤ تو بایزید نے فرمایا کہ جو کچھ تجھے چاہیے میں بیان کرتا ہوں۔ مجھے ملکوتِ اعلیٰ اور ملکوتِ اسفل میں پھرایا گیا۔ ندا آئی کہ ان سب میں سے جو تو چاہتا ہے وہ مانگ لے تاکہ میں تجھے دوں'' تو میں نے کہا کہ ''میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں چاہتا'' تو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''بے شک تو میرا بندہ ہے''۔

ابوتراب نخشبی کا ایک مرید تھا جو اپنے کام میں مستغرق رہتا تھا۔ ایک دفعہ ابوتراب نے اسے کہا کہ: ''اگر تو بایزید کو دیکھے تو روا ہوگا''۔ تو اس نے کہا کہ 'میں بایزید کی نسبت زیادہ مشغول ہوں' جب ابوتراب نے اصرار کیا تو بولا: ''میں بایزید کے اللہ کو دیکھ رہا ہوں میں بایزید کو کیا کروں؟'' تو ابوتراب نے کہا کہ: ''ایک بار بایزید کو دیکھتے تو وہ بایزید کے اللہ کو ستر بار دیکھنے سے بہتر ہے''۔ مرید متحیر ہو کر بولا کہ ''کس طرح؟'' ابوتراب نے کہا کہ 'اے بے چارے تو اپنے اللہ کو اپنے نزدیک دیکھتا ہے تو وہ تیری مقدار ہی کے مطابق ظاہر ہوتا ہے۔ اور اگر بایزید کو اللہ کے نزدیک دیکھے گا تو تو اسی کے مرتبے کے مطابق دیکھے گا''۔ مرید سمجھ گیا تو بولا ''تو ہم چلیں''

فرمایا کہ : ''ہم اس کے پاس پہنچے وہ جنگل میں بیٹھتے تھے۔ ہم بلندی پر گئے حتیٰ کہ وہ باہر نکلے پوستین الٹی پہنی ہوئی تھی تو مرید نے انھیں دیکھا تو ایک نعرہ مارا اور جان جان آفرین کے حوالے کردی۔ میں نے کہا ''اے بایزید'' ایک نظر اور مار ڈالنے والی؟'' فرمایا کہ ''نہیں۔ مرید صادق تھا اس میں ایک ایسا راز تھا جو اس کی قوت سے آشکار نہ ہوتا تھا۔ جب اس نے ہمیں دیکھا تو وہ راز دفعتہً آشکار ہوگیا لیکن چونکہ ہنوز ضعیف تھا تاب نہ لا سکا اس لیے ہلاک ہوگیا''۔ بایزید نے نیز فرمایا کہ ''اگر ابراہیم کی دوستی' موسیٰ علیہ السلام کی مناجات اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روحانیت بھی اللہ تعالیٰ تجھے عطا کردے تو بھی اس کی طرف سے منہ نہ پھیرنا کیونکہ وہ ان سے بھی آگے کچھ کام رکھتا ہے''۔

بایزید کا ایک مزکی[1] دوست تھا اس نے بایزید سے کہا کہ ''میں تیس سال سے رات نماز میں گذارتا ہوں اور دن کو روزہ سے ہوتا ہوں اور یہ جو تو کہتا ہے میرے ہاں اس میں سے کوئی چیز وجود میں نہیں آتی'۔ تو بایزید نے کہا کہ ''اگر تین سو سال بھی یہ کرو گے تو ظہور پذیر نہ ہوگی''۔ بولا ''کیوں؟'' فرمایا کہ ''تو خود اپنی ذات سے محجوب ہے'' بولا ''علاج اس کا کیا ہے'' فرمایا کہ ''تو نہیں کرسکتا''۔ بولا ''آپ بتائیں میں کروں گا'' فرمایا ''تو نہیں کرے گا'' بولا ''آخر بتایئے تو'' فرمایا ''ابھی جاؤ اور حجام کے پاس جا کر کہو کہ وہ تمھاری ڈاڑھی مونڈھ دے۔ لباس اتار دے ایک چادر باندھ لے اور ایک تھیلا اخروٹوں سے بھر کر گلے میں لٹکا لے اور بازار میں منادی کر کہ جو لڑکا میری گردن پر ایک دھول مارے گا اس کو میں ایک اخروٹ دوں گا۔ اور اسی حالت میں قاضیٔ شہر اور قصیدہ نگاروں کے پاس جا''۔ تو وہ بولا ''سبحان اللہ! یہ کیا ہے جو تو کہہ رہا ہے؟'' بایزید نے فرمایا کہ ''تو نے شرک کا ارتکاب کیا۔ تو نے یہ جو سبحان اللہ کہا ہے یہ تو نے اپنی تعظیم کے بارے میں کہا ہے''۔ بولا کہ ''کوئی اور طریقہ بتاؤ کہ میں یہ تو نہیں کرسکتا'' فرمایا کہ ''اوّلین علاج یہی ہے'' بولا ''میں یہ نہیں کرسکتا''۔ فرمایا کہ ''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تم نہ کرسکو گے''۔ آپ نے یہ اس لیے کہا تھا کہ وہ شخص خود اپنی ذات اور کبر اور طلب جاہ میں مشغول و مغلوب تھا اور علاج اس کا یہی تھا۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ ''جب میں اپنے بندے کے دل میں دیکھتا ہوں کہ اس میں دنیا ہے نہ آخرت تو میں وہاں اپنی دوستی رکھ دیتا ہوں اور اس کی حفاظت کا متولی بن جاتا ہوں''۔ ابراہیم بن ادھمؒ فرماتے ہیں کہ : ''بار خدایا! تو جانتا ہے کہ تیری محبت کے مقابلے میں بہشت میرے نزدیک مچھر کے برابر وقعت نہیں رکھتی۔ وہ محبت جو تو نے مجھے عطا فرمائی اور وہ اُنس جو اپنے ذکر سے مجھے

---

(۱) مزکی اسے کہتے ہیں جو شاہان عادی کے لیے تزکیے اور پاکی و پارسائی کا سامان کرتا ہے

ارزانی فرمایا''۔ لوگوں نے رابعہؒ سے کہا کہ: ''رسول (ﷺ) سے تمھاری محبت کیسی ہے؟'' فرمایا کہ ''سخت' لیکن اللہ تعالیٰ کی دوستی نے مجھے مخلوق کی دوستی کے علی الرغم خود میں مشغول کر رکھا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لوگوں نے پوچھا کہ ''اعمال میں کون سا عمل فاضل ہے؟'' فرمایا کہ 'اللہ تعالیٰ کی دوستی اور راضی برضا رہنا''

مختصر یہ کہ اس قسم کی احادیث اور روایات تو بہت ہیں۔ اور ان بزرگوں کے احوال سے بقرینہ یہ بات لازماً معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کی معرفت اور دوستی کی لذت بہشت کی لذت سے کہیں زیادہ ہے۔ چاہیے کہ تو اس باب میں خوب غور کرے۔

معرفتِ حق تعالیٰ کے اِخفا کا سبب

یاد رہے کہ جس چیز کی شناخت دشوار ہوتی ہے۔ اس کے دو اسباب ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ پوشیدہ ہو روشن نہ ہو۔ دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ نہایت زیادہ روشن ہوتی ہے اس لیے آنکھ اس کی تاب نہیں لاتی۔ یہی وجہ ہے کہ چمگادڑ دن کے وقت دیکھ نہیں سکتی ہے اس لیے نہیں کہ رات کو چیزیں ظاہر تر ہوتی ہیں بلکہ اس لیے کہ دن کو بغایت ظاہر ہوتی ہیں لیکن اس کی آنکھ کمزور ہے۔

پس معرفتِ حق تعالیٰ کی دشواری اس روشنی کی وجہ سے ہے جو بغایت ظاہر ہے اور دل اسے پانے کی تاب نہیں رکھتے۔ اور روشنی اور ظہور حق تعالیٰ کو انسان اس سے پہچانتا ہے کہ قیاس کرے کہ اگر تو کوئی تحریر لکھی ہوئی دیکھے یا سیا ہوا لباس دیکھے تو تیرے نزدیک کوئی چیز دبیر کے علم وقدرت وحیات وارادت سے روشن تر نہ ہوگی۔ اسی طرح درزی جس نے اس لباس کو سیا ہے کہ اس کا یہ فعل ان صفات کو اور اس کے باطن کو اس قدر روشن کر دیتا ہے کہ ضروری علم حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ پوری کائنات میں ایک پرندے کے سوا اور کچھ پیدا نہ فرماتا یا ایک پودے سے زیادہ نباتات وجود میں نہ لاتا تو جو کوئی اس میں غور کرتا تو اسے اللہ کے کمال قدرت وعلم وجلال اور اس کی صنعت گری کی عظمت لازماً معلوم ہو جاتی۔ کیونکہ اس کی دلالت کاتب کی تحریر سے روشن تر ہے۔ لیکن چونکہ جو شے بھی وجود میں ہے آسمان وزمین وحیوان ونباتات اور سنگ وکلوخ وغیرہ جو کچھ بھی اس نے پیدا فرمایا ہے یا وہم وخیال میں آتا ہے سب ایک صفت پر گواہی دیتے ہیں: اپنے صانع کے جلال وجمال پر جو کثرتِ دلیل اور روشنی کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتے۔ کیونکہ اگر بعض فعل تو اس کا ہوتا اور بعض نہ ہوتا تو پھر ظاہر ہوتا۔ لیکن چونکہ تمام ایک صفت پر ہیں اس لیے پوشیدہ ہے۔ مثل اس کی یہ ہے کہ کوئی چیز آفتاب کی طرح روشن تر نہیں ہے کہ ہر چیز اسی کے نزدیک دکھائی دینے لگتی ہے۔ لیکن اگر سورج رات کے وقت غروب نہ ہوتا یا سائے کے سبب محجوب نہ ہوتا تو کوئی بھی نہ جانتا کہ روئے زمین میں مثلاً کوئی نور ہے۔ کیونکہ سوائے سبزی

سپیدی اور رنگوں کے کچھ نہ دیکھتے اور کہتے کہ یہی ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ پس جب یہ جان لیا کہ نور رنگوں کے علاوہ اور چیز ہے کہ رنگ جس سے پیدا ہوتے ہیں یہ اس لیے تھا کہ رات کو رنگ پوشیدہ ہو گئے۔ اور نورِ آفتاب میں ہونے کی نسبت سائے میں پوشیدہ تر ہو گئے۔ پس اس کی ضد سے اسے پہچانا۔ اسی طرح اگر خالقِ کائنات کے لیے غیبت اور عدم ممکن ہوتا تو آسمان وزمین درہم برہم ہو جاتے اور معدوم ہو جاتے تو پھر لازماً اسے پہچان لیتے۔ لیکن چونکہ ہر چیز اپنے صانع پر گواہی میں ایک ہی صفت پر ہے اور یہ شہادت دوامی ہے نیز بہت روشن ہے۔ پس یہ روشنی ہی کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتی۔ دوسرے یہ کہ بچپن ہی سے یہ ہماری نگاہوں میں ہے یعنی اس وقت میں جب اتنی عقل نہ تھی کہ اس کی شہادت کو سنتی جب اس کی عادت ہوگئی اور الفت ہوگئی تو اس کے بعد شہادت سے آگاہی نہیں پاتی۔ سوائے اس کے کہ کوئی عجیب حیوان دیکھے یا عجیب نباتات دیکھے تو پھر اس سے آگاہ ہوئے بغیر زبان پر سبحان اللہ کا کلمہ آجاتا ہے جس سے شہادت وہ آگاہی اس کے دل کو دیتی ہے۔ پس جس کی آنکھ کمزور نہیں ہے تو وہ جس چیز کو دیکھے گا وہ اللہ تعالیٰ کی صنعت گری کے حوالے سے اسے دیکھے گا نہ کہ اس چیز کو دیکھے گا۔ آسمان وزمین کو نہ دیکھے گا بلکہ اس رُو سے دیکھے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صنعت ہے۔ جیسے کوئی کسی خطاطی کے نمونے کو دیکھتا ہے تو اس رُو سے نہیں دیکھتا کہ یہ روشنائی ہے یا کاغذ ہے (کیونکہ اس طرح تو وہ دیکھتا ہے جو خطاطی کو نہیں جانتا) بلکہ اس لحاظ سے دیکھتا ہے۔ خط منظوم ہے تاکہ اس میں خطاط کو دیکھے۔ جیسے تصنیف میں مصنف کو دیکھتے ہیں نہ کہ خط کو جب یوں ہوگا تو انسان جس چیز پر بھی غور کرے گا اللہ تعالیٰ کو دیکھے گا۔ کیونکہ کوئی چیز نہیں جو اس کی صنع نہ ہو۔ بلکہ تمام کائنات اسی کی تصنیف اور مصنوع ہے۔ تو اگر کسی ایسی چیز کو تلاش کرے جو اس کی نہ ہو یا اس کی طرف سے نہ ہو تو کبھی نہ پا سکے گا۔ بلکہ ہر شے بہ زبان فصیح کہ جسے زبان حال کہا جاتا ہے اللہ کی قدرت وجلال اور عظمت پر گواہی دیتی ہے۔ اور اس سے روشن تر دنیا میں اور کوئی شے نہیں۔ لیکن اس کے اِدراک سے خلق کا عجز ان کے اپنے ضعف کے سبب سے ہے۔

محبت کی تدبیر

یاد رہے کہ محبت بزرگ ترین مقامات میں سے ہے اس لیے اس کی تدبیر کا جاننا اہم ہے۔ جو کوئی کسی حسین پر عاشق ہونا چاہے تو اوّلین تدبیر اس کی یہ ہے کہ پہلے محبوب کے سوا ہر چیز سے منہ موڑ لے۔ پھر بردوام اُسے دیکھتا رہے۔ جب وہ محبوب کا چہرہ دیکھتا ہے لیکن اس کے ہاتھ پاؤں اور بال پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اور وہ بھی خوب صورت ہوتے ہیں تو کوشش اس کی یہ ہوتی ہے کہ انھیں بھی دیکھے۔ یہاں تک کہ جب وہ ایک جمال کو دیکھتا ہے تو اس کی آرزو میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ تو جب وہ اس میں استقامت کرے گا تو لازماً اس میں کم ہو یا

زیادہ میلان پیدا ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ سے محبت بھی ایسی ہی ہے جس کی اوّلین شرط یہ ہے کہ انسان منہ دنیا سے موڑ لے اور دنیا کی دوستی سے دل کو کلیتہً پاک کر لے تا کہ حق تعالیٰ کی دوستی میں مشغول ہو جائے۔ اور یہ زمین کو خس و خاشاک اور نا مطلوب بوٹیوں سے پاک کرنے کے مصداق ہے۔ پھر انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت کی طلب کرے۔ کیونکہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کا دوست نہیں ہوتا وہ اسی لیے نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کو پہچانتا نہیں۔ ورنہ جمال و کمال انسان کو طبعاً مرغوب ہیں۔ جو کوئی صدیق رضی اللہ عنہ کو فاروق رضی اللہ عنہ کو پہچان لے تو ممکن ہی نہیں کہ وہ ان سے محبت نہ کرے۔ کیونکہ ان کے مناقب و محامد طبعاً محبوب ہوتے ہیں' اور معرفت کا حصول زمین میں بیج ڈالنے کی طرح ہے۔ پھر اللہ کے ذکرِ دوام اور اس کے تفکر میں مشغولیت ہے جو کھیتی کو پانی دینے کے مانند ہے۔ کیونکہ جو کوئی کسی کو زیادہ یاد کرے گا اسی کے ساتھ لازماً اسے اُنس و محبت پیدا ہوگی۔ یاد رہے کہ کوئی مومن بھی اصل محبت سے خالی نہیں ہوتا۔ لیکن اس میں تفاوت تین وجوہ کی بنا پر ہوتی ہے: ایک یہ کہ لوگ دنیا میں مشغول اور دوستی میں متفاوت ہوتے ہیں۔ اور جس شے سے بھی دوستی ہو تو وہ دوسری شے کی دوستی کو نقصان پہنچاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ لوگ معرفت میں بھی متفاوت ہوتے ہیں۔ مثلاً عامی شافعیؒ کو دوست رکھتا ہے فقط اسی لیے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ بزرگ عالم ہے۔ لیکن مرد فقیہہ جو امام شافعی کے بعض علوم کی تفصیل سے باخبر ہوتا ہے وہ امام کو دوست تر رکھتا ہے کیونکہ وہ انھیں عامی کی نسبت بہتر پہچانتا ہے۔ اور مزنی جو شافعی کا شاگرد تھا وہ ان کے تمام علوم و احوال و اخلاق سے باخبر تھا تو وہ دوسرے فقہاء کی نسبت امام کو دوست تر رکھتا ہے۔ پس اسی طرح جو خدائے تعالیٰ کو زیادہ پہچانتا ہے وہ اسے دوست تر رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ذکر و عبادت سے جو انس حاصل ہوتا ہے اُس میں بھی لوگ متفاوت ہوتے ہیں۔ پس محبت کا تفاوت بھی تین چیزوں سے پیدا ہوتا ہے اور جو کوئی اللہ کو بالکل دوست نہیں رکھتا وہ اس لیے کہ وہ اسے بالکل نہیں جانتا۔ جس طرح محبوب کی ظاہر صورت طبعاً محبوب ہوتی ہے اس کے باطن کا حسن بھی اسی طرح محبوب ہوتا ہے۔ پس محبت معرفت کا ثمرہ ہے۔ اور معرفت میں کمال کے حصول کے دو طریقے ہیں:

ایک طریق صوفیوں کا ہے کہ وہ پاکیزہ روزگار ہوتے ہیں۔ اور مجاہدے میں لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ذکرِ دوام کے ذریعے اپنے باطن کو پاک رکھتے ہیں تا کہ خود کو نیز ماسوا کو فراموش کر دیں۔ پھر صوفی کے باطن میں ایسے کام ظہور پذیر ہونے لگتے ہیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ کی عظمت روشن ہو جاتی ہے اور مشاہدے میں بھی آ جاتی ہے۔ مثال اس کی جال پھیلانے کی طرح ہے کہ ہو سکتا ہے کہ شکار پھنس جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ نہ پھنسے اور ہو سکتا ہے کہ چوہا پھنس جائے یا باز پھنس جائے۔ اس طرح اس میں تفاوت بہت ہوتا ہے۔ جو دولت

وروزی کے مطابق ہوتا ہے۔

اور دوسرا طریقہ علم معرفت سیکھنے کا ہے۔ علم کلام اور دیگر علوم نہیں۔ جس کا اوّلین قدم عجائبِ صُنع خداوندی میں تفکر ہے جیسے کہ تفکر کی اصل کے بارے میں ہم اس کتاب میں اشارہ کر چکے ہیں۔ اس کے بعد ترقی کر کے ذاتِ خداوندی کے جلال و جمال میں تفکر کرے تا کہ حقایقِ اسماوصفات اس پر منکشف ہوسکیں اور یہ علم بہت دراز ہے۔ لیکن زیرک کے لیے اس میں تفکر کے ذریعے پہنچنا ممکن ہے۔ جب وہ ایک عارف استاد کو پالے۔ لیکن کند ذہن کے لیے یہ رسائی ممکن نہیں۔ اور یہ جال پھیلانے کی طرح نہیں ہے کہ ہوسکتا ہے کہ شکار پھنس جائے اور ہوسکتا ہے نہ پھنسے۔ بلکہ یہ زراعت، تجارت اورکسب وکار کی مانند ہے۔ اور یہ ایسے ہوتا ہے کہ انسان بکری بکرے کا جوڑا لے لے اورنسل فزونی میں لگ جائے کہ اس سے لازماً مال میں اضافہ ہوگا۔ لیکن بجلی گرے اور سب کچھ ہلاک ہوجائے۔

اور جوکوئی ماسوائے طریقۂ معرفت کے محبت کا طالب ہوتو وہ گویا شئے محال کا طالب ہے۔ اور جوکوئی معرفت کو بجز ان دوطریقوں کے جو مذکور ہوئے حاصل کرنا چاہے ناکام رہے گا۔ اور جوکوئی یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے بغیر سعادتِ آخرت کو پالے گا۔ غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ کیونکہ سعادتِ آخرت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تو خدائے تعالیٰ تک پہنچ جائے۔ اور جوکوئی کسی چیز کو پہنچ جاتا ہے۔ اگر اس نے اس سے پہلے اسے دوست رکھا ہولیکن کسی اور مصروفیت کے باعث اس سے محجوب رہا ہو اور اس نے اس شے کے شوق میں ایک مدت گذاری ہوتو جب وہ اُس کو پہنچتا ہے تو عوایق اٹھ جاتے ہیں تو وہ بڑی عظیم لذت پاتا ہے۔ اور سعادت یہی ہے۔ اور اگر دوست نہ رکھا ہوتو کوئی لذت نہ پائے گا۔ اگر تھوڑا دوست رکھا ہوگا تو تھوڑی لذت پائے گا۔ پس سعادت ولذّت عشق ومحبت کے مطابق ہوتی ہے۔ اور اگر وَالْعیاذُ باللہ کسی نے اپنے باطن کو اس طرح نہ کیا ہو اور وہ چیز جو اس کی ضد ہے اس سے آشنا ہوگیا ہو اور اس سے الفت اور مناسبت پالی ہوتو جو کچھ آخرت میں ظہور میں آئے گا وہ اس کے الٹ ہوگا۔ جو اس کی ہلاکت کا باعث ہوگا۔ اور وہ رنج والم میں گرفتار ہوجائے گا۔ اور جس سے دوسرے شاد ہوں گے وہ اس سے شقی ہوجائے گا۔ اس کی مثال اس کناس کی سی ہے جو عطاروں کے بازار مین جانکلا تو رنگارنگ خوشبوئیں اس کی ناک میں داخل ہوئیں تو بے ہوش ہوکر گرگیا تو لوگ آکر مشک وگلاب اس کے چہرے پر چھڑکنے لگے تو اس کی حالت اور بھی غیر ہوگئی۔ یہاں تک کہ ایک شخص جس نے کبھی کناسی کا پیشہ کیا تھا وہاں آنکلا تو اس کو معلوم ہوگیا کہ بے ہوشی اس کی کس وجہ سے ہے؟ تو انسان کے گوہ کی نجاست لے آیا اور اس کی ناک کے قریب رکھ دی۔ تو وہ فوراً ہوش میں آگیا اور بولا: اے واے یہ

خوشبو! پس جس کسی نے لذائذ دنیا سے انس اختیار کیا اور وہ اس کی محبوب ہوگئی تو حال اس کا اسی کناس کا سا ہے جو عطاروں کے بازار میں اسے نہیں پاتا بلکہ وہاں جو کچھ ہوگا وہ اس کی طبیعت کے منافی ہوگا۔ اور اس سے اس کی تکلیف بڑھ جائے گی۔ اور وہ نجاست جس سے اس نے دل لگالیا ہے وہاں نہ پائے گا۔ آخرت میں بھی شہوات دنیا میں سے کوئی چیز نہ پائے گا۔ اور وہاں جو ہوگا وہ اس کی طبیعت کے برعکس ہوگا تو وہ سب کا سب اس کے رنج وشقاوت کا سبب ہوگا۔

پس آخرت عالم ارواح ہے۔ اور عالم جمالِ حضرتِ الٰہیت ہے۔ اور خوش بخت وہی ہے کہ جس نے اس دنیا میں اپنی طبیعت کو حق کے ساتھ مناسبت دے دی ہوتا کہ وہ اس کی طبیعت کے موافق ہوجائے۔ تمام ریاضتیں اور عبادتیں اور معرفتیں اسی مناسبت کے لیے ہیں۔ اور محبت خود عین یہی مناسبت ہے۔ اور "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا" (کامیاب ہوگیا جس نے اپنا تزکیہ کرلیا) اور دنیا کی تمام دوستیاں، شہوتیں اور گناہ اسی مناسبت کی ضد ہیں جنھیں "وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا" (پس ماندہ اور ناامید ہوگیا جس نے اپنے آپ کو گم نام اور فرومایہ کردیا) سے تعبیر کیا گیا ہے اور اہل بصیرت ان معانی کے مشاہدے میں حدِ تقلید سے آگے نکل گئے ہیں۔ اور صدق پیغمبر سے اس امر کو پہچانا ہے۔ بلکہ اس صدقِ پیغمبری کے وسیلے سے جانا ہے جس میں معجزہ کا دخل نہیں۔ جیسے کہ جو شخص علم طب سے واقف ہے جب کسی طبیب کی بات سنتا ہے تو لازماً پہچان لیتا ہے کہ یہ طبیب ہے (ولی را ولی می شناسد) اور جب وہ کسی کوچہ گرد حکیم کی بات سنتا ہے تو اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ شخص جاہل ہے۔ پس نبی کو مدعیٔ نبوت سے اسی طریقے سے متمائز کرکے پہچان لیتا ہے۔ اور پھر جو کچھ اپنی بصیرت کے ذریعے نہیں جان سکتا تو بیشتر وہ ہے جسے وہ صدق نبی سے پہچانتا ہے اور یہ علم بدیہی ہے۔ اور یہ ایسا علم نہیں جو عصا کے اژدہا بننے سے حاصل ہوتا ہو۔ کیونکہ یہ علم اس خطرے میں ہوتا ہے کہ اگر گوسالہ آواز دینے لگے تو باطل ہوجائے۔ کیونکہ معجزے کا امتیاز جادو سے آسان کام نہیں۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامات

یاد رہے کہ محبت ایک کمیاب گوہر ہے۔ محبت کا دعویٰ آسان ہے۔ جس سے آدمی اس گمان میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ وہ من جملہ محبان ہے۔ لیکن محبت کی علامات اور دلائل ہوتے ہیں تو انسان کو چاہیے کہ وہ یہ علامات ودلائل اپنے آپ میں تلاش کرے۔ یہ علامات تعداد میں سات ہیں:

ایک یہ کہ موت سے نفور نہ ہو۔ کیونکہ کوئی دوست اپنے دوست کے دیدار سے متنفر نہیں ہوتا۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ہے کہ "جو کوئی اللہ کے دیدار کو دوست رکھتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کے دیدار کو

دوست رکھتے ہیں''۔ بوبطی نے زاہدوں میں سے ایک سے کہا کہ ''کیا تم موت کو دوست رکھتے ہو؟'' زاہد نے جواب میں توقف کیا تو فرمایا کہ ''اگر سچا ہوتا تو موت کو دوست رکھتا''۔ لیکن یہ روا ہے کہ محبّ ہو اور تعجیلِ مرگ سے تو نفور ہو لیکن اصل مرگ سے نفور نہ ہو۔ اس بناء پر کہ ابھی اس نے اس کے لیے زاد تیار نہ کیا ہو اور تاخیر اس لیے چاہتا ہو کہ اس کا ساز و سامان کر لے۔ جس کی علامت یہ ہے کہ وہ زادِ آخرت کی تیاری میں بے قرار ہو۔

دوسری علامت یہ ہے کہ اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی پر قربان کر دے اور جس چیز کو محبوب کے قرب کا ذریعہ جانتا ہے اسے فروگذار نہ کرے اور جو کچھ محبوب سے دوری کا سبب ہو اس سے احتراز کرے۔ چنانچہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''جو ایسے شخص کو دیکھنا چاہے جو بہ ہمہ جان و تن اللہ کو دوست رکھتا ہے تو اسے کہو کہ سالم کو دیکھے جو حذیفہ ؓ کا غلام ہے''۔ پس اگر کوئی معصیت کا مرتکب ہو جائے تو یہ امر اس پر دال نہیں کہ وہ اللہ کا محبّ نہیں۔ بلکہ اس کی دوستی پورے دل کے ساتھ نہیں ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ نُعیمان پر شراب خوری کی وجہ سے کئی بار حد جاری ہوئی۔ تو ایک نے ایک بار پیغمبر کی موجودگی میں اس پر لعنت کی تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ ''اس پر لعنت نہ کرو۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کو اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے''۔ فضیل ؒ نے فرمایا کہ ''جب تجھ سے پوچھیں کہ کیا تو خدا کو دوست رکھتا ہے؟ تو چپ رہنا۔ کیونکہ اگر 'نہ' کہے گا تو کافر ہو جائے گا اور اگر ہاں کہے گا تو تیرے کام تو دوستوں جیسے نہیں''۔

علامتِ سوم یہ ہے کہ اللہ کا ذکر ہمیشہ اس کے دل میں تازہ ہوتا ہے اور وہ اس پر کسی قسم کے تکلف کے بغیر طبعاً حریص ہوتا ہے کیونکہ انسان جس شے سے محبت کرتا ہے اس کا ذکر بکثرت کرتا ہے اور اگر دوستی کامل ہو تو کبھی بھول نہیں سکتا۔ پس اگر دل کو بہ تکلف ذکر پر لگانا چاہے۔ تو خوف یہ ہوتا ہے کہ محبوب اس کا وہ ہے جس کا ذکر اس کے دل پر غالب ہے۔ پس ہو سکتا ہے کہ دوستی حق تعالیٰ غالب نہیں لیکن دوست کے دوست سے دوستی غالب ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ اسے دوست رکھے۔ لیکن دوستی اور شے ہے اور دوست کے دوست سے دوستی اور شے ہے۔

علامتِ چہارم یہ ہے کہ قرآن کو اللہ کا کلام اور اور رسول کو اور جو کچھ رسول سے منسوب ہے دوست رکھے۔ جب یہ دوستی قوی ہو جائے تو تمام خلق کو اس لیے دوست رکھے کہ سب اللہ کے بندے ہیں۔ بلکہ تمام موجودات کو دوست رکھے۔ کیونکہ سب اُسی کے تخلیق کردہ ہیں۔ جیسے کہ انسان جسے دوست رکھتا ہے اس کی تحریر و تصنیف کو بھی دوست رکھتا ہے۔

علامتِ پنجم یہ ہے کہ انسان خلوت اور اللہ سے مناجات پر حریص ہو۔ اور اس امر کا آرزومند ہو کہ

شب آ جائے تا کہ اِزدحام اور عوائق جاتے رہیں۔تو وہ اپنے دوست کے ساتھ خلوت میں مناجات کرے اور اگر کوئی نیند اور باتوں کو شب و روز کی خلوت سے بڑھ کر دوست رکھتا ہو تو اس کی دوستی کمزور ہوگی۔ حضرت داوٗد علیہ السلام پر وحی آئی کہ ''اے داوٗد خلق میں سے کسی سے اُنس نہ رکھ۔ کیونکہ مجھ سے کوئی منقطع نہیں ہوتا سوائے دو اشخاص کے: ایک وہ کہ ثواب کی طلب میں عجلت کرتا ہے۔ جب دیر ہو جائے تو کاہل ہو جاتا ہے۔ دوسرا وہ جو مجھے فراموش کر دیتا ہے اور اپنے حال پر قناعت کرتا ہے۔ اور علامت اس کی یہ ہے کہ ہم اسے خود اس کے اپنے نفس کے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور اسے دنیا میں حیران رکھتے ہیں''۔ پس جب دوستی کامل ہو جاتی ہے تو سوائے اللہ کے کسی اور شے سے اُنس باقی نہیں رہتا۔ بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا جو رات کو نماز ادا کرتا اور مصلّٰی اپنا ایک درخت کے نیچے لے جاتا کیونکہ وہاں ایک خوش الحان پرندہ چہچہاتا تھا۔تو اس زمانے کے رسول پر وحی آئی کہ ''اسے کہو کہ تم نے خلوت سے اُنس پیدا کر لیا ہے۔ اس لیے تمھارا ایک درجہ کم ہو گیا ہے کہ اب تو کسی عمل کے ذریعے اس درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور اللہ کے ساتھ اُنس میں ایک جماعت اس درجے کو پہنچی ہے کہ ان کے گھر کے دوسری طرف آگ لگ گئی ہے اور انھیں اس کا کچھ پتا نہیں چلا اور ایک شخص کا پاؤں ایک عذر کے باعث نماز کے دوران کاٹا گیا اور اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ حضرت داوٗد پر وحی آئی کہ: ''جھوٹ کہا اس شخص نے جس نے میرے ساتھ دوستی کا دعویٰ کیا اور رات بھر سوتا رہا تو کیا دوست دوست کا دیدار نہیں چاہتا؟ کیونکہ جو مجھے ڈھونڈتا ہے میں اس کے ساتھ ہوں''۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: ''بارِ خدایا تو کہاں ہے تا کہ تجھے طلب کروں؟'' تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ ''جب تو نے طلب کا قصد کیا تو پا لیا''۔

علامتِ ششم یہ ہے کہ اللہ کے دوست کے لیے عبادت آسان ہوتی ہے۔ اور گرانی اس سے جاتی رہتی ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ''میں نے بیس سال جان کنی کے ساتھ خود کو نمازِ عشاء پر لگائے رکھا۔ پھر بیس سال میں نے اسے شادمان کیا'' جب اللہ کے ساتھ دوستی قوی ہو جاتی ہے تو کوئی لذت بھی عبادت کی لذت کو نہیں پہنچتی۔ تو دشوار کیونکر ہوگی؟

علامت ہفتم یہ ہے کہ سالک اللہ تعالیٰ کے تمام فرماں بردار بندوں کو بھی دوست رکھتا ہے۔ اور ان سب پر رحیم اور مشفق ہوتا ہے اور تمام کافروں اور عاصیوں کو دشمن جانتا ہے۔ جیسے کہ فرمان خداوندی ہے کہ ''اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ'' (قرآن: ۲۹/۴۸) (سخت ہیں کافروں پر اور مہربان ہیں باہم)۔ انبیاء میں سے ایک نے پوچھا کہ بارِ خدایا تیرے اولیاء اور تیرے دوست کون ہیں؟'' فرمایا کہ ''وہ جو چھوٹے بچے کی طرح جو ماں کا عاشق ہوتا ہے اسی طرح وہ میرے عاشق ہیں اور جس طرح پرندہ پناہ آشیانے میں پاتا

ہے وہ میرے ذکر میں پناہ پاتے ہیں اور جس طرح چیتا غضب کے عالم میں کسی سے نہیں ڈرتا وہ اس پر غضب ناک ہوتے ہیں جو معصیت کا ارتکاب کرے''۔ یہ متذکرہ علامت اور دیگر اور علامات بہت سی ہیں کہ جس کی دوستی بھی حق تعالیٰ سے کامل ہوگی اس میں یہ تمام علامات پائی جائیں گی اور وہ جس میں ان میں سے بعض علامات پائی جائیں تو اللہ سے اس کی دوستی بھی اسی قدر ہوگی۔

اللہ تعالیٰ سے شوق کا بیان

یاد رہے کہ جس نے محبت سے انکار کیا تو اس نے شوق سے بھی انکار کیا۔ آنحضرت کی دعا میں ہے کہ: ''اَسئَالُکَ الشَّوقَ اِلٰی لِقَائِکَ وَلَذَّہ النَّظرِ اِلٰی وَجْھِکَ الْکَرِیْم ''(خدایا میں تیرے دیدار کی آرزو اور تیرے جمال کی دید کی تمنا رکھتا ہوں)۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ خدائے تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''طَالَ شَوقُ الْاَبْرَارِ اِلٰی تَعَالٰی وَاَنِّی اِلٰی لِقَایھِم لَاَشَدَّ شَوقاً'' (نیک لوگوں کی آرزو میرے لیے دراز ہوگئی اور میں تو ان سے زیادہ آرزومند ہوں اُن کی اُس آرزو سے جو وہ مجھ سے رکھتے ہیں''۔ پس چاہیے کہ تُو شوق کے معنی کو پہچانے کیونکہ محبت بے شوق نہیں ہوتی۔ لیکن جسے لوگ بالکل نہ جانتے ہوں اس سے شوق نہیں ہوتا۔ اور اگر اسے جانتے ہوں اور وہ موجود ہو اور وہ اسے دیکھتے ہوں تو بھی شوق نہیں ہوتا۔ پس شوق اس چیز کا ہوتا ہے کہ جو ایک لحاظ سے موجود ہو تو دوسرے لحاظ سے غائب ہو۔ جیسے کہ معشوق خیال میں موجود ہوتا ہے لیکن آنکھوں سے غائب ہوتا ہے اور شوق کے معنی اس امر کے طالب و تقاضا ہیں کہ وہ نگاہوں کے سامنے آجائے تاکہ پورا پورا اِدراک ہو جائے۔ پس اس سے یہ جان لے کہ خدائے تعالیٰ کا شوق اس دنیا میں ممکن نہیں کہ پورا ہو سکے کہ وہ معرفت میں موجود ہے لیکن مشاہدے سے غائب ہے۔ اور مشاہدہ معرفت کا کمال ہے۔ جیسے کسی شے کا دیدار خیال کا کمال ہے اور شوقِ دیدار جز بہ مرگ رخصت نہیں ہوتا۔ اور شوق کی ایک اور قسم باقی رہتی ہے جو آخرت میں بھی رخصت نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں ادراک میں کمی دو وجوہ سے ہے: ایک یہ کہ معرفت ایسا اِدراک ہے جیسے کہ تاریک پردے کے پیچھے سے دیدار کیا جائے یا دیدار آفتاب نکلنے سے پہلے سپیدیٔ صبح کے وقت کیا جائے اور آخرت میں یہ روشن ہو جائے گا۔ تو یہ شوق منقطع ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ کسی کا معشوق ایسا ہوگا کہ عاشق نے اس کا منہ تو دیکھا ہو لیکن اس کے بال اور دیگر اندام نہ دیکھے ہوں لیکن جانتا ہو کہ وہ سب خوب صورت ہیں۔ لیکن ان کے دیدار کا شوق رکھتا ہو۔ اسی طرح جمال حضرت الٰہیت کی کوئی انتہا نہیں اور اگر کوئی زیادہ جانتا ہو تو جو اعضا دید سے رہ گئے ہوں وہ اسی قدر زیادہ ہوں گے۔ کیونکہ اس کی معلومات بھی بے نہایت ہیں۔ اور جب تک ان سب کو نہیں جان لیتا جمالِ حضرتِ الٰہیت کو بھی کلیتہً نہ پایا ہوگا۔ اور یہ انسان کے لیے نہ

اس دنیا میں نہ آخرت میں ممکن نہیں۔ کیونکہ انسان کا علم تو بے انتہا نہیں۔ پس آخرت میں جس قدر دیدار میں فزونی دیں گے لذت میں بھی اس قدر فزونی ہوگی جو بے انتہا ہوگی۔ اگر دل کی نظر اس حسن پر ہو جو حاضر ہے تو اس سے حال سراسر فرح اور خوشی ہوگا۔ اور اسے انس کہتے ہیں۔ اور اگر دل کی نظر اس پر ہو جو ابھی باقی ہے تو دل کا حال طلب و تقاضا ہوگا[1]۔ اور اسے شوق کہتے ہیں۔ اور اس اُنس اور شوق کی کوئی انتہا نہیں نہ اس دنیا میں نہ اُس جہانِ آخرت میں۔ اور آخرت میں ہمیشہ کہیں گے کہ ''رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا '' (قرآن: ۸/۶۶) (اے ہمارے پروردگار ہمارا نور کامل کر دے) کیونکہ جمالِ حضرتِ الٰہیت سے جو کچھ آشکار ہوتا ہے سراسر انوار ہوتے ہیں۔ اور انسانوں کو اس کے انتہا کی طلب ہوتی ہے۔ اس کی استعداد نہیں رکھتے کیونکہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو سوائے خود اللہ تعالیٰ کے نہیں جانتا۔ تو جب اسے بکمال نہ جانے گا تو بہ کمال نہ دیکھ سکے گا۔ لیکن اہل شوق کے لیے راہ کھلی ہوتی ہے تاکہ مداومت کے ساتھ اس کشف اور دیدار کو فزونی دے اور بہشت میں بے انتہا لذت کی حقیقت یہی ہوگی۔ اور اگر یہ نہ ہوتا تو بے شبہ لذت کی آگاہی جاتی رہتی کیونکہ جو شے دایم ہو جائے اور دل اس کا عادی ہو جائے تو وہ اس سے لذت نہیں پاتا۔ جب تک اسے تازہ شے نہ ملے۔ پس نعیم اہلِ بہشت ہر لحظہ تازہ ہوتی ہے۔ چنانچہ لمحہ حاضر میں گذشتہ کو مختصر دیکھتا ہے کیونکہ ہر روز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور اس اصل سے بھی تو نے انس کے مفہوم کو پہچانا۔ کہ جو کچھ حاضر ہے دل کا اُنس بھی اسی نسبت سے ہوتا ہے تاکہ جو کچھ رہ گیا اس کی طرف التفات نہ کرے۔ اور جب التفات کرے تو یہ حالتِ شوق ہوگی۔ پس اللہ تعالیٰ کے محبّ اس دنیا میں اور اُس جہان میں انس اور شوق کے درمیان سرگرداں رہتے ہیں۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''اے داؤد! اہلِ زمین کو میری طرف سے اطلاع دے کہ میں اس کا دوست ہوں جو مجھے دوست رکھے اور اس کا ہم نشین ہوں جو خلوت نشین ہو۔ اور مونس اس کا ہوں جو میری یاد میں انس گرفتہ ہو اور رفیق اس کا ہوں جو میرا رفیق ہے اور اسے برگزیدہ قرار دیتا ہوں جو مجھے انتخاب کرتا ہے۔ اور اس کی بات مانتا ہوں جو میری بات مانتا ہے۔ اور میرے کسی بندے نے مجھے دوست نہیں رکھا کہ جسے میں نے اس کے دل سے نہ جانا ہو۔ اور اسے دوست نہ بنایا ہو اور دوسروں پر ترجیح نہ دی ہو۔ جو میرا متلاشی ہوتا ہے وہ حق کو پالیتا ہے اور جو ماسوا کو ڈھونڈتا ہے مجھے نہیں پاتا۔ اے اہل زمین وہ کام نہ کرو جن پر تم فریفتہ ہو گئے ہو ان میں نہ کھو جاؤ۔

---

(۱) ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر'' (علامہ اقبال)

تم میری صحبت، مجالست اور موانست کی طرف رخ کرو اور مجھ سے اُنس کرو تاکہ میں تم سے اُنس کروں۔ کیونکہ اپنے دوستوں کو اپنے دوست ابراہیم خلیل کی طینت سے میں نے پیدا کیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام میرے ہم راز ہیں اور محمد (ﷺ) میرے برگزیدہ ہیں اور میں نے اپنے مشتاقوں کے دل اپنے نور سے پیدا کیے ہیں اور اپنے جلال سے ان کی تربیت کی ہے"۔

بعض انبیاء پر وحی آئی کہ "میرے ایسے بندے بھی ہیں کہ جو مجھے دوست رکھتے ہیں اور میں ان کو دوست رکھتا ہوں وہ میرے آرزومند ہیں تو میں ان کا آرزومند ہوں۔ وہ مجھے یاد کرتے ہیں اور میں انھیں یاد کرتا ہوں ان کی نظر مجھ پر ہے تو میری نظر ان پر ہے۔ اگر تو بھی ان کی راہ اختیار کرلے تو میں تجھے بھی اپنا دوست بنالوں۔ اور اگر ان کی راہ سے پھر جائے تو میں تجھے اپنا دشمن بنالوں"۔ یہ اور اس جیسی اور احادیث محبت، اُنس اور شوق کے باب میں بہت سی ہیں۔ لیکن یہی کافی ہیں۔

حقیقتِ رضا اور اس کی فضیلت کا بیان

یاد رہے کہ رضا بہ قضائے حق تعالیٰ بلند تر مقامات میں سے ہے۔ اور کوئی مقام اس سے بالاتر نہیں ہے۔ کیونکہ محبت بہترین مقام ہے اور اللہ تعالیٰ جو بھی کرے اس پر رضا محبت کا ثمر ہے۔ ہر محبت کا ثمر نہیں بلکہ اس محبت کا ثمر ہے جو درجۂ کمال میں ہو۔ اسی لیے آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ: "اَلرِّضَا بِالقضاءِ بابُ اللهِ الاَعظَمُ" "یعنی اللہ کی سب سے بڑی درگاہ اس کی قضا پر رہنا ہے"۔ اور جب آنحضرت (ﷺ) نے ایک جماعت سے پوچھا کہ "تمھارے ایمان کی علامت کیا ہے؟" تو انھوں نے کہا کہ: "ہم بلا میں صبر کرتے ہیں اور قضا پر راضی ہوتے ہیں" تو آپ (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ "یہ لوگ علماء ہیں اور یہ فقہ کی عظمت کے اعتبار سے انبیاء کے قریب ہیں" نیز فرمایا کہ "جب قیامت قائم ہوگی تو میری امّت میں سے بعض کو پروبال عطا کیے جائیں گے تاکہ اڑ کر بہشت میں داخل ہو جائیں۔ تو فرشتے ان سے پوچھیں گے کہ "تم نے حساب و ترازو اور صراط دیکھے؟" تو وہ کہیں گے کہ "ہم نے تو ان میں سے کچھ بھی نہیں دیکھا" تو فرشتے کہیں گے کہ "تم کون لوگ ہو؟" تو وہ کہیں گے کہ "ہم محمد (ﷺ) کے امّتی ہیں" تو فرشتے کہیں گے کہ "تمھارا وہ کون سا عمل تھا کہ جس پر تم نے یہ کرامت پائی ہے؟" تو وہ کہیں گے کہ ہم میں دو خصلتیں تھیں: ایک یہ کہ ہم خلوت میں بھی معصیت کا ارتکاب نہ کرتے تھے کیونکہ ہم اللہ سے شرم رکھتے تھے۔ تو دوسرے یہ کہ ہم تھوڑے رزق پر بھی راضی بہ رضا رہتے تھے کہ یہ اللہ کی عطا تھی" تو فرشتے کہیں گے کہ "تم واقعی اس درجے کے مستحق ہو"۔ حضرت موسیٰ کی قوم

میں سے ایک گروہ نے آپ سے پوچھا کہ ''آپ اللہ تعالیٰ سے پوچھیں کہ وہ کیا شے ہے کہ جس میں اس تعالیٰ کی خوشنودی ہے تاکہ ہم وہ عمل کریں؟'' تو وحی آئی کہ: ''مجھ پر راضی ہو جاؤ تاکہ میں تم پر راضی ہو جاؤں'' حضرت داؤد پر وحی آئی کہ ''میرے دوستوں کو غمِ دنیا سے کیا سروکار؟ کیونکہ غمِ دنیا ان کے دل سے مناجات کی لذت چھین لیتا ہے۔ اے داؤد میں اپنے دوستوں میں سے دوست اس لیے رکھتا ہوں کہ وہ روحانی ہوتے ہیں: کہ کسی شے کا غم نہیں کھاتے اور دل دنیا کی کسی شے سے نہیں لگاتے''۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ: ''خدائے تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں وہ اللہ ہوں کہ میرے سوا اور کوئی اللہ نہیں۔ جو کوئی میری بلا پر صبر نہیں کرتا اور میری نعمت پر شکر نہیں کرتا اور میری قضا پر راضی نہیں ہوتا اسے کہہ کہ ''کوئی اور اللہ ڈھونڈے''۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''میں نے تقدیر کی۔ نیز تدبیر کی اور اپنی صنعت گری کو محکم کیا اور جو کچھ ہونے والا ہے اس کا حکم کر دیا اور جو کوئی اس پر راضی ہے میری رضا بھی اسی کے لیے ہے اور جو کوئی راضی نہیں ہے میرا غضب اس کے لئے ہے یہاں تک کہ مجھے دیکھے''۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''میں نے خیر و شر پیدا کیے خوش بخت وہ ہے جسے میں نے خیر پر جنم دیا اور اس کے ہاتھ پر خیر آسان کر دی۔ افسوس ہے اس پر جسے میں نے شر کے لیے پیدا کیا اور اس کے ہاتھ پر شر انگیزی آسان کر دی۔ اور افسوس ہے اس پر جو کہے کہ کیوں؟ اور کیسے؟''

انبیاء میں سے ایک بیس سال سے بھوک ننگ جیسے محن میں گرفتار تھے۔ دعا کرتے تھے لیکن اجابت نہ ہوتی تھی۔ پس وحی آئی کہ ''قبل اس کے کہ میں نے آسمان و زمین پیدا کیے تیرے نصیب اور قسمت میں میری تقدیر یہی تھی تو کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میں تیرے لیے آسمان و زمین کی آفرینش اور تدبیر مملکت کو پھر سے واپس لے لوں اور جو کچھ میں نے حکم کر رکھا ہے اسے تبدیل کر دوں تاکہ وہ ہو جو تو چاہتا ہے اور وہ نہ ہو جو میں چاہتا ہوں اور کام ایسے ہو جسے تو پسند کرتا ہے نہ ایسے کہ جیسے میں چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم کہ اگر دوبارہ یہ خیال تمھارے دل میں آیا تو میں تمھارا نام ابنیاء کی فہرست سے مٹا دوں گا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے بیس سال آنحضرت (ﷺ) کی خدمت کی۔ تو اس دوران میں میں نے جو کچھ بھی کیا کبھی آپ ﷺ نے یہ نہ کہا کہ تو نے ایسے کیوں کیا؟ اور جو کام میں نے نہ کیا آپ نے کبھی اس پر تعرض کرتے ہوئے نہ فرمایا کہ تو نے یہ کام کیوں نہیں کیا؟ لیکن جب کسی نے مجھ سے جھگڑا کیا تو فرمایا کہ تو نے قضا پر عمل کیا ہوتا''۔ حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی آئی کہ ''اے داؤد! ایک بات تو چاہتا ہے اور ادھر میں ایک بات چاہتا ہوں۔ لیکن وہی ہو گا جو میں چاہتا ہوں اگر تو مجھ پر چھوڑ دے کہ میں جو چاہوں کروں تو اس سے تیری خواہش کی کفایت کر دوں گا۔ اور تو

مجھ پر نہ چھوڑے گا تو میں تجھے رنج میں مبتلا کردوں گا۔اس میں جوتو چاہتا ہے لیکن جو کچھ میں چاہتا ہوں اس کے سوا پھر بھی نہ ہوگا''۔عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ ''میری خوشی اسی میں ہے جو اس کی تقدیر ہے جو میری سرنوشت ہے'' تو لوگوں نے کہا ''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حکم لگا رکھا ہے وہی''۔ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''یہ کہنے کی بجائے کہ جو چیز نہ ہو کاش کہ ہوتی اور جو چیز کہ ہو اس کے لیے یہ کہنا کہ کاش کہ یہ نہ ہوتی میں آگ کھانے کو ترجیح دیتا ہوں'' بنی اسرائیل کے عابدوں میں سے ایک نے عبادت میں ایک طویل زمانہ صرف کیا۔تو اس نے خواب میں دیکھا کہ کہا گیا کہ بہشت میں تیری ساتھی فلاں عورت ہے۔تو اس عابد نے اس عورت کو بلایا تا کہ دیکھے کہ اس کی ایسی کون سی عبادت ہے تو اس نے اس سے نہ رات بھر کی نماز دیکھی نہ دن کا روزہ۔سوائے فرائض کے۔تو اسے کہا کہ مجھے بتاؤ کہ تمھارا عمل کیا ہے؟ تو اُس عورت نے کہا کہ ''یہی جو تو نے دیکھا'' جب اس عابد نے بہت اصرار کیا اور کہا کہ: ''آخر یاد تو کرو''۔تو اسی عورت نے کہا کہ ''مجھ میں ایک ذراسی خصلت ہے کہ جب میں بیماری یا کسی ابتلا میں ہوتی ہوں تو میں عافیت کی خواہش نہیں کرتی۔اگر دھوپ کا سامنا ہو تو میں سایہ کی آرزومند نہیں ہوتی۔اسی طرح اگر سائے میں ہوں تو دھوپ کی خواہاں نہیں ہوتی۔اور جو حکم اللہ کا ہو اس پر راضی رہتی ہوں''۔تو عابد نے ہاتھ سر پر رکھا اور بولا کہ ''یہ ذراسی خصلت نہیں ہے یہ تو عظیم خصلت ہے''۔

رضا کی حقیقت

یاد رہے کہ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ بلا اور جو کچھ بھی انسان کی خواہش کے برعکس ہو اس پر راضی رہنے کو رضا کہتے ہیں اور یہ ممکن نہیں بلکہ غایت اس کی صبر ہے۔لیکن یہ خطا ہے۔بلکہ دوستی جب غالب ہو جائے تو اپنی خواش کے خلاف رضا دو وجوہ سے ممکن ہے:

ایک یہ کہ انسان اپنے عشق میں اس قدر مستغرق اور مدہوش ہوتا ہے کہ اپنے درد کی اسے خبر ہی نہیں ہوتی۔جیسے کہ کوئی شخص دوران جنگ اس قدر غصے میں مشغول ہو کہ زخموں کے درد کا پتہ ہی نہیں چلتا۔اسے زخم لگتا ہے تو اسے خبر ہی نہیں ہوتی۔یہاں تک کہ اپنا خون اسے نظر ہی نہیں آتا۔اور جو شخص کسی حرص کی بناء پر چلا جا رہا ہو اور کانٹا اس کے پاؤں میں چبھ جائے تو اسے اس کی خبر ہی نہیں ہوتی۔اسی طرح جب دل مصروف ہو تو بھوک پیاس کی خبر ہی نہیں ہوتی۔جب یہ سب عشقِ مخلوق اور عشقِ دنیا میں ممکن ہے تو دوستی حق تعالیٰ اور آخرت کے باب میں کیوں ممکن نہیں، مسلّم ہے کہ باطن میں صورتِ معانی کا جمال، صورتِ ظاہر کے جمال سے عظیم تر ہوتا ہے۔جو حقیقت میں گھورے پر پڑے ہوئے پردے کی مانند ہے۔اور چشمِ بصیرت کہ جس سے

انسان باطنی جمال سے آگاہ ہوتا ہے وہ چشمِ ظاہر سے روشن تر ہوتی ہے۔ کیونکہ چشم ظاہر مشاہدے میں اکثر غلطی کا شکار ہو جاتی ہے جس سے اسے بڑا جسم چھوٹا دکھائی دیتا ہے اور دور کو وہ نزدیک دیکھتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان اَلم کا سامنا کرتا ہے لیکن جب جانتا ہو کہ دوست کی رضا اسی میں ہے تو وہ اس پر راضی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دوست اگر اس سے کہے کہ پچھنے لگواؤ یا کڑوی دوا پیو تو وہ اس پر راضی ہو جاتا ہے۔ اس آرزو میں کہ دوست کی رضا کو حاصل کر سکے۔ پس جو کوئی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے تو جو کچھ وہ کرے اس پر رضا کا اظہار کرتا ہے۔ فقر، بیماری ہو یا کوئی مصیبت ہو صبر کرتا ہے اور راضی رہتا ہے۔ ایسے ہی جیسے مرد طامع دنیا کے لیے رنج سفر اور سمندروں کے خطرات اور دشوار کاموں پر راضی ہو جاتا ہے۔ اور اللہ کے بہت سے محبّ اس درجے کو پہنچے ہیں۔ فتح موصلیؒ کی بیوی کے پاؤں کا ناخن ٹوٹ گیا، گر پڑی تو ہنسنے لگی۔ گھر والوں نے پوچھا "کیا درد نہیں ہوا؟" تو اس نے کہا کہ "ثواب کی خوشی نے مجھ سے درد کی خبر چھین لی"۔ سہل تُستری کو کوئی بیماری لاحق تھی۔ علاج نہ کرتے تھے تو لوگوں نے کہا کہ: "آپ علاج کیوں نہیں کرتے؟" تو فرمایا کہ "اے دوست تو نہیں جانتا کہ دوست کا لگایا ہوا زخم درد نہیں کرتا؟" حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے سری سقطیؒ سے کہا کہ "کیا محبّ بلا کا الم پاتا ہے؟" تو اس نے کہا کہ "نہیں" تو میں نے کہا کہ "اگر تلوار سے ماریں تو؟" تو انھوں نے کہا کہ "نہیں۔ بلکہ اگر شمشیر سے ستر زخم بھی لگائیں تو بھی نہیں"۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ "جو کچھ میرا دوست عزیز رکھتا ہے میں بھی اس کو عزیز رکھتا ہوں اور اگر وہ چاہے کہ میں دوزخ میں جاؤں تو میں اس پر بھی راضی ہوں"۔ بشر حافیؒ کا دوست کہتا ہے کہ "بغداد میں ایک شخص کو ہزار کوڑے مارے گئے تو اس نے ذرہ بھر ہائے وائے نہ کی تو میں نے اس سے پوچھا کہ "تم نے فریاد کیوں نہ کی؟" تو وہ بولا: "اس لیے کہ میرا معشوق حاضر تھا اور دیکھ رہا تھا"۔ تو میں نے اس سے کہا کہ "اگر تو اس بڑے معشوق کو دیکھ لیتا تو کیا کرتا؟" تو اس نے ایک نعرہ مارا اور مر گیا"۔ بشر حافیؒ ہی کا بیان ہے کہ "ارادت کی ابتداء میں مَیں آبادان جایا کرتا تھا۔ تو میں نے وہاں ایک مجذوم دیوانے کو دیکھا کہ وہ گرا پڑا ہے اور چیونٹیاں اس کے گرد جمع ہیں اور اسے کھا رہی ہیں۔ میں نے اس کا سر اپنی آغوش میں لیا کیونکہ مجھے اس پر رحم آ گیا تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو بولا کہ "یہ کون فضول ہے کہ جو خود کو میرے اور میرے خداوند کے درمیان ڈالتا ہے"۔ قرآن میں مذکور ہے کہ عورتیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ رہی تھیں انھوں نے حضرت یوسف کے جمال کی عظمت کی وجہ سے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے اور انھیں اس بات کی خبر بھی نہ ہوئی۔ مصر میں ایک دفعہ شدید قحط تھا تو لوگ جب بھوک محسوس کرتے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے دیدار کو چلے جاتے تو اپنی بھوک بھول جاتے۔ یہ اثر مخلوق کے جمال کا تھا۔

اگر اللہ تعالیٰ کہ خالق ہے اس کا جمال کسی پر مکشوف ہو جائے تو کیا عجب کہ وہ بلا سے بے خبر ہو جائے۔ ایک شخص صحرا میں تھا اللہ تعالیٰ جو بھی حکم کرتا تو وہ کہتا ''خیر اسی میں ہے''۔ اس کا ایک کتا تھا جو اس کے اثاثے کا پاسبان تھا۔ ایک اس کا گدھا تھا جس پر وہ اپنا اثاثہ لادا کرتا تھا۔ اور ایک مرغا تھا جو انھیں بیدار کرتا تھا۔ کہ ایک دن ایک بھیڑیا آ گیا جس نے گدھے کا پیٹ پھاڑ دیا تو اس نے کہا ''خیر'' کتے نے مرغے کو مار دیا تو کہا ''خیر'' پھر کتا بھی کسی وجہ سے مر گیا تو بولا ''خیر'' اس کے اہل و عیال غمگین ہو گئے۔ تو بولے کہ جو کچھ بھی ہو تو تو کہہ دیتا ہے ''خیر'' یہ کیسی خیر ہے کہ ہمارے دست و باز و تو یہی تھے جو ہلاک ہو گئے؟'' تو بولا ''ممکن ہے خیر اسی میں ہو'' اگلے دن جب وہ سو کر اٹھے تو دیکھا کہ وہ لوگ جوان کے ہمسائے ہیں رہ رہے تھے۔ سب مرے پڑے تھے اور ان کا اثاثہ سب کا سب چور لے گئے تھے۔ اور چور مرغے کتے اور گدھے کے نہ بولنے کی وجہ سے اس شخص کے گھر کی راہ نہ پا سکے۔ تو وہ شخص بولا کہ آپ لوگوں نے دیکھ لیا نا کہ اللہ تعالیٰ کی 'خیر' کو کوئی نہیں جانتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گذر ایک ایسے شخص کے پاس سے ہوا جو برص اور کوڑھ کا شکار تھا اور دونوں طرف سے مفلوج بے دست و پا پڑا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ اس اللہ کا شکر ہے جس نے ان بلاؤں سے جن میں اکثر لوگ گرفتار ہیں مجھے عافیت میں رکھا ہے''۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ کون سی مصیبت رہ گئی ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے تجھے عافیت بخشی ہے؟'' تو وہ بولا کہ ''میں اس شخص کی نسبت زیادہ عافیت میں ہوں کہ جس کے دل میں وہ معرفت نہیں جو میرے دل میں ہے'' تو حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ ''تم نے درست کہا''۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس پر اپنا ہاتھ پھیرا تو وہ تندرست اور بینا اور راست اندام ہو گیا۔ تو اس نے حضرت عیسیٰ کا ساتھ اختیار کر لیا۔ آپ کے ساتھ اللہ کی بہت عبادت کی۔ شبلیؒ کو ہسپتال میں روک رکھا گیا تھا۔ اور لوگ کہتے تھے کہ دیوانہ ہے۔ کچھ لوگ شبلی کے پاس گئے تو پوچھا کہ ''تم کون ہو؟'' تو وہ بولے ''ہم تمھارے دوست دار ہیں'' تو شبلی ان کی طرف پتھر مارنے لگے۔ تو وہ سب بھاگ گئے۔ تو شبلی نے فرمایا کہ ''تم جھوٹ بولتے تھے کیونکہ اگر تم میرے دوست ہوتے تو میری طرف سے آنے والی بلا پر صبر کرتے''۔

فصل: ایک جماعت کا کہنا ہے کہ رضا کی شرط یہ ہے کہ تو دُعا نہ کرے۔ اور جو کچھ تیرے پاس نہیں وہ اللہ سے نہ مانگے۔ اور جو کچھ دیا گیا ہے اس پر راضی رہے۔ اور مصیبت اور فسق کا انکار نہ کرے۔ کیونکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی قضا سے ہیں۔ اور جس شہر میں معصیت غالب ہو یا وبا ہو یا کوئی اور بلا ہو وہاں سے فرار نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ قضائے فرار کے مترادف ہے اور یہ سب خطا ہے۔ لیکن آنحضرت نے خود دعا کی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ ''الدعا مخ العبادة'' دعا عبادت کا مغز ہے۔ اور حقیقت میں دعا وہ ہے کہ جس سے دل میں

رقت، شکستگی، تضرع، عجز، تواضع اور التجاء اللہ کے ساتھ پیدا ہو جائے۔ اور یہ تمام صفات پسندیدہ ہیں۔ چنانچہ پانی پینا کہ پیاس جاتی رہے اور روٹی کھانا کہ بھوک کا ازالہ ہو اور لباس پہننا کہ سردی نہ لگے۔ رضائے خداوندی کے خلاف نہیں۔ اور دعا کرنا کہ بلا جاتی رہے بھی ایسے ہی ہے بلکہ جس چیز کو اس کا سبب ٹھہرایا ہے اور حکم اس کا دیا ہے اس کی مخالفت کرنا رضا کی مخالفت ہے۔ نیز اس کے حکم کی مخالفت۔ اور معصیت کی رضا کیسے ہو سکتی ہے؟ کیونکہ اس کے بارے میں نہی آئی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ جو معصیت پر راضی ہے وہ گویا اس میں شریک ہے۔ اور کہا ہے کہ اگر کسی بندے کو مشرق میں قتل کر دیں اور کوئی مغرب نشین اس پر راضی ہو تو وہ اس عمل میں شریک گردانا جائے گا۔ ہر چند معصیت اللہ تعالیٰ ہی کی قضا ہے لیکن اس کے دو رخ ہیں: ایک بندے کے ساتھ ہے جو بندے کے اختیار میں ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے دشمن قرار دیا ہے۔ اور دوسرا رخ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس لیے کہ اسی کی قضا اور تقدیر ہے۔ پس اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے قضا کی ہے کہ عالم معصیت و کفر سے خالی نہ ہو اس پر تو رضا دینی چاہیے۔ اور اس بناء پر کہ بندے کے اختیار میں ہے اور صفت و نشانی اس کی یہ ہے کہ اللہ اسے دشمن جانتا ہے اس پر رضا نہ دینی چاہیے۔ اور یہ اس کی نقیض نہیں۔ کیونکہ اگر کسی کا دشمن مرجائے جو اس کے دشمن کا دشمن ہو تو وہ غمگین بھی ہوگا اور خوش بھی۔ لیکن شاد وہ اور وجہ سے ہوتا ہے اور اندوہ گین اور وجہ سے۔ حالانکہ اس کا تناقض ہوگا کہ دونوں ایک وجہ سے ہیں۔ اسی طرح ایسی جگہ سے فرار جہاں معصیت غالب ہو اہم ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ''اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا'' (قرآن: ۴/۷۵) (ہمیں اس شہر سے نکال کہ اس کے باسی کافر ہیں)۔ اور اسلاف ہمیشہ ایسے شہروں سے فرار کرتے رہے ہیں کیونکہ معصیت دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر خود معصیت اثر انداز نہ ہو تو اس کی بلا اور عقوبت تو اثر انداز ہوگی۔ جیسے کہ فرمایا کہ: ''وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً'' (قرآن: ۸/۲۵) (بلا سے پرہیز کرو کیونکہ بلا صرف تمھارے ظالموں ہی کی دامن گیر نہ ہوگی) اگر کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سے اس کی نگاہ کسی غیر محرم پر پڑتی ہو تو وہ وہاں سے فرار کرے تو یہ رضا کی مخالفت نہ ہوگی۔ اسی طرح کسی شہر میں اگر تنگی اور قحط ہو تو وہاں سے جائز ہے کہ بندہ نکل جائے۔ سوائے اس جگہ کے کہ وہاں طاعون ہو کہ اس کی نہی آئی ہے۔ کیونکہ ایسے میں اگر تندرست لوگ وہاں سے چلے جائیں تو بیماروں کی تیمارداری کون کرے گا۔ لیکن اور بلائیں طاعون کی سی نہیں ہیں۔ بلکہ جن اسباب کو مقرر کیا گیا ہے انھیں اللہ تعالیٰ کا جو حکم ہو اور فرمان ہو اس کے مطابق بجالانا چاہیے کیونکہ خیر اسی میں ہے۔ والسلام۔

اصل دہم: موت کو یاد کرنے کے بارے میں

یاد رہے کہ جس نے یہ پہچان لیا کہ آخر کار بہر حال اسے مرنا ہے۔ اور ٹھکانہ اس کا قبر ہے اور موکل اس کے منکر و نکیر ہیں اور وعدہ اس کا قیامت ہے۔ اور جائے درود اس کی بہشت ہوگی یا دوزخ۔ نعوذ باللہ (اللہ کی پناہ) اس کے لیے کوئی فکر موت کی فکر سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ اور اس کی کوئی تدبیر موت کے سامان کی تدبیر سے غالب تر نہ ہوگی۔ بشرطیکہ عاقل ہو۔ چنانچہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ "اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نفسہ' وَ عَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ" (سمجھ دار وہی ہے کہ جس نے اپنے نفس پر قابو پالیا اور موت کے بعد کے لیے کام کیا) اور جو کوئی موت کو بہت یاد کرتا ہے تو وہ ناچار اس کا سامان کرنے میں لگ جاتا ہے۔ اور قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ کی صورت میں پاتا ہے۔ اور جو کوئی موت کو فراموش کر دیتا ہے اس کی تمام تر ہمت دنیا کے لئے ہوتی ہے اور وہ زادِ آخرت سے غافل ہوتا ہے اور پھر قبر کو دوزخ کے ایک گڑھے کی صورت میں پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موت کو یاد کرنے کی بڑی فضیلت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ "اکثروا من ذکر ھادم الذات" اے وہ لوگو کہ دنیا کی لذتوں میں کھو گئے ہو اسے بہت یاد رکھو کہ جو تمام لذتوں کو غارت کرنے والی ہے یعنی موت۔ نیز فرمایا کہ جانوروں کو اگر موت کا اس طرح علم ہوتا جس طرح کہ تمھیں ہے تو تم ان کا اس قدر فربہ گوشت نہ کھا سکتے یعنی جانور اس غم میں دُبلے ہو جاتے۔ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت (ﷺ) سے کہا کہ: "اے اللہ کے رسول! کوئی شخص ایسا ہے جو شہیدوں کے درجے میں ہو؟" تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ "ہاں وہ جو دن میں بیس دفعہ اپنی موت کو یاد کرتا ہو"۔ آنحضرت (ﷺ) کا گذر ایک دفعہ ایسے لوگوں کے قریب سے ہوا جو قہقہے لگا رہے تھے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "اپنی اس مجلس میں اسے بھی یاد کرو جو تمام لذتوں کو تاریک کرنے والی ہے"۔ تو انھوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "وہ موت ہے" اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ: "موت کی یاد کو فزونی دے تا کہ وہ تجھے دنیا میں زاہد بنا دے اور تیرے گناہوں کا کفارہ کرے"۔ نیز فرمایا کہ: "کفی بالموت واعظًا" "موت کافی ہے کہ لوگوں کو نصیحت کرتی ہے۔ صحابہ کسی شخص کی بہت زیادہ تعریف کر رہے تھے تو آپ نے پوچھا "موت کا ذکر اس کے دل پر کیسا ہے؟" تو صحابہ نے کہا کہ ہم نے موت کے بارے میں کبھی کوئی بات ان سے نہیں سنی" تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "پس وہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم اسے گمان کرتے ہو" ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "میں دس اور لوگوں کے ہمراہ آنحضرت (ﷺ) کی بارگاہ میں پہنچا تو انصار میں سے ایک نے کہا کہ "لوگوں میں سے زیرک ترین اور کریم ترین کون ہے؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "وہ جو موت کو بہت یاد کرتا ہو اور جہانِ آخرت کے زاد

کے لیے حریص ہو۔ یہی ہیں وہ زیرک جو دنیا کا شرف نیز آخرت کی کرامت لے گئے''۔

ابراہیم تیمیؒ فرماتے ہیں کہ ''دو چیزیں ایسی ہیں جو مجھ سے دنیا کی راحت اچک لے گئی ہیں۔ ایک موت کی یاد اور دوسرے اللہ کے حضور کھڑے ہونے کا خوف''۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہر رات فقہا کو جمع کرتے اور مرگ و قیامت کے بارے میں مذاکرہ کرتے تھے۔ اور اتنا روتے تھے کہ جیسے کسی کا جنازہ ان کے سامنے ہو۔ حسن بصریؒ جب بھی مجلس آراء ہوتے تو ان کا موضوع سراسر موت' دوزخ اور آخرت ہوتا تھا اور بس۔ ایک عورت نے حضرت عایشہؓ سے اپنی سخت دلی کا شکوہ کیا تو حضرت عایشہؓ نے فرمایا کہ ''موت کو بہت یاد کرتا کہ تنگ دلی سے نجات پا جائے''۔ تو اس عورت نے ایسے ہی کیا حتٰی کہ اس کے دل سے قساوت رخصت ہوگئی۔ تو وہ واپس آئی اور شکریہ ادا کیا۔ ربیع خثیمؒ نے اپنے گھر میں ایک قبر تعمیر کر رکھی تھی۔ ہر روز کئی بار اس قبر میں لیٹتے تھے تا کہ موت کی یاد کو اپنے دل میں تازہ کریں۔ اور فرماتے کہ ''اگر ایک ساعت میں موت کو فراموش کردوں تو میرا دل سیاہ ہو جاتا ہے''۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک شخص سے فرمایا کہ ''موت کو بہت یاد کر کہ جب کبھی رنج و محن میں ہو تو وہ تیرے دل کی تسلی کا باعث ہو اور اگر تو نعمت میں ہو تو وہ اسے تجھ پر منغص کردے''۔ ابوسلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے اُمِ ہارون سے پوچھا کہ ''تم موت کو دوست رکھتی ہو؟'' تو اس نے کہا کہ ''نہیں'' تو میں نے کہا کہ ''کس لیے؟'' تو بولی کہ ''اگر میں نے کسی انسان سے برائی کی ہو تو میں اسے دیکھنا نہیں چاہتی۔ اللہ تعالیٰ کا دیدار کثیر گناہوں کے ساتھ کیونکر چاہوں؟''

فصل: یاد رہے کہ موت کو یاد کرنے کی تین صورتیں ہیں:

ایک مردِ غافل کا یاد کرنا جو دنیا میں مشغول ہوتا ہے' اگر موت کو یاد کرے تو یہ اسے پسندیدہ نہ ہوگی اس خوف کی بناء پر کہ شہوت دنیا سے باز رہے گا۔ پس وہ موت کو برا کہتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ یہ بُرا کام ہے کہ جو درپیش ہے اور افسوس کہ دنیا کو اس راحت کے باوصف چھوڑنا پڑے گا۔ اور یہ ذکر اسے اس بناء پر اللہ تعالیٰ سے دور تر کر دیتا ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے دنیا اس کے لیے منغص ہو جائے تو اس کا دل دنیا سے نفور ہو جائے تو یہ امر خالی از فایدہ نہیں۔

دوسرے کسی تائب کا موت کو یاد کرنا کہ وہ اس لیے یاد کرتا ہے تا کہ خوف اس پر غالب ہو اور وہ توبہ میں [illegible] ثابت تر رہے۔ اور گذشتہ کے تدارک کے لیے حریص تر ہو۔ تو ثواب اس کا بہت ہوگا۔ اور تائب مرگ کو ناپسند نہیں کرتا لیکن تعجیلِ موت کو ناپسند کرتا ہے کہ اس طرح موت کا سامان کئے بغیر جانا ہوگا۔ اس بناء پر اس کی موت کی کراہیت ضرر کا سبب نہیں ہوتی۔

تیسرے مردِ عارف کا موت کو یاد کرنا ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کے دیدار کا وعدہ موت کے بعد ہے اور دوست کے وعدہ گاہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے عارف اسی کی امید رکھتا ہے بلکہ اس کی آرزو میں رہتا ہے۔ چنانچہ حضرت خذیفہؓ نے وقتِ مرگ کہا کہ: ''حَبِیب جَاءَ علی فا قتہ''۔ ''دوست بوقت ضرورت آ گیا'' و نیز فرمایا کہ کہ ''بارِ خدایا! اگر تو جانتا ہے کہ میں فقر کو دولت مندی کی نسبت اور بیماری کو تندرستی کی نسبت اور موت کو زندگی کی نسبت دوست تر رکھوں تو مرگ مجھ پر آسان فرما تا کہ میں تیرے دیدار سے آسایش پاؤں''۔

اس کے ماورا ایک درجہ اور بھی ہے جو اس سے بھی بڑا ہے۔ کہ کوئی نہ موت کو برا سمجھے نہ اس کا طالب ہو اس کی تعجیل کا خواہاں ہو نہ تاخیر کا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو زیادہ دوست رکھتا ہو۔ اور خود اپنے تصرف کو اور حاجت کو ترک کر دے اور مقام تسلیم ورضا کو پہنچ گیا ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے کہ موت اسے یاد ہو اور بیشتر احوال میں دوست کے بارے میں بے فکر ہو۔ کیونکہ وہ اسی دنیا میں صاحب مشاہدہ ہوتا ہے اور ذکر اس کا دل پر غالب ہوتا ہے۔ اور موت اور زندگی اس کے نزدیک یکساں ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ ہر حال میں دوستیِ حق تعالیٰ کے ذکر میں مستغرق ہوتا ہے۔

ذکرِ مرگ سے دل پر اثر انگیزی کا بیان اور اس کی تدبیر

یاد رہے کہ موت ایک بڑا مرحلہ ہے اور ایک عظیم خطرہ۔ لیکن لوگ اس سے غافل ہیں۔ اگر وہ اسے یاد بھی کریں تو یہ بات ان کے دل پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتی۔ کیونکہ دل ان کا دنیا میں اس قدر مستغرق ہوتا ہے کہ اس میں کسی اور شے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تسبیح و ذکرِ حق تعالیٰ میں کوئی لذت ہی نہیں پاتے۔ پس علاج اس کا یہ ہے کہ انسان تنہائی میں بیٹھ کر دل کو اس کام کے لیے ایک ساعت فارغ کرے۔ اور جس طرح کوئی صحرا کو چھوڑنے والا ہو تو وہ اس کی تدبیر کے لیے دل کو تمام چیزوں سے فارغ کرتا ہے۔ اپنے آپ سے کہے کہ موت نزدیک ہے۔ ممکن ہے آج ہی آ جائے اگر تجھے کہا جائے کہ تُو ایک تاریک دہلیز میں ہو جا اور تُو نہ جانتا ہو کہ اس دہلیز کے پاس کنواں ہے یا کوئی پتھر سدِّ راہ ہے یا یہ کہ کوئی خلل وہاں نہیں ہے تو اس سے نہایت درجہ ڈرے گا۔ اور تیرا پتہ پانی ہو جائے گا۔ تو مرنے کے بعد تیرے کام کی عدم اطلاع اور قبر میں خطر اس سے کچھ کم نہیں ہو گا تو اس سے غفلت آخر کس برتے پر ہے؟ بہترین علاج اس کا یہ ہے کہ انسان اپنے اعزہ واقارب پر غور کرے جو مر چکے ہیں اور ان کی وہ صورت یاد کرے کہ وہ دنیا میں اپنے منصب اور اپنے کاموں میں کیسے تھے اور دنیا میں ان کی خوشی کس قدر تھی۔ اور موت کے بارے میں ان کی غفلت کا کیا حال تھا۔ پھر ناگاہ

بغیر تیاری کے موت آئی اوران کو اچک لے گئی۔ اوراب وہ قبروں میں ہیں اوران کے جسم اوراعضا کیسے ایک دوسرے سے الگ ہوگئے ہیں اوران کے گوشت پوست اور کانوں آنکھوں میں کیڑے پڑے ہوئے ہیں۔ اور کیسا تصرف کرتے ہیں۔ مرنے والے اس حال سے دوچار ہیں۔ جب کہ وارث ان کے ان کا مال باہم تقسیم کرکے کھا اڑا رہے ہیں۔ اوران کی بیوی ایک اور شوہر کے ساتھ گلگشت میں ہے۔ اور خود اسے بھول چکی ہے۔ بس اپنے اقارب میں سے ایک ایک کے بارے میں سوچے اوران کے سیر وتماشا، خندہ وغفلت اوتدبیر کار میں ان کی لگن کہ بیس سال بعد جس کی صورت دیکھنے کا امکان تھا۔ اس کے لیے انھوں نے کس قدر زیادہ رنج برداشت کیے تھے۔ اور کفن ان کے دھوبی کے ہاں سے دھل کر تیار تھے۔ اور وہ اس سے بے خبر تھے۔ انسان خود سے کہے کہ تُو بھی انھی میں سے ایک ہے اور تیری غفلت اور حرص اور حماقت انھی کی غفلت کے مانند ہے۔ تجھے یہ مہلت ملی کہ وہ تجھ سے پہلے چلے گئے تا کہ تو ان سے عبرت حاصل کرے۔ ''فَانَ السَّعیدَ من وُعظ بغیرہ'' نیک بخت وہ ہے جسے دوسرے کے ذریعے نصیحت دی جائے۔ پھر اپنے ہاتھ پاؤں انگلیوں، چشم وزبان وغیرہ پر نظر ڈالے اور سوچے کہ یہ سب اعضا ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں گے۔ اور نہایت عجلت کے ساتھ کیڑوں مکوڑوں کا چارہ بن جائیں گے۔ اور اپنے چہرے کو قبر میں اپنے خیال میں لائے کہ ایک گندے مردار اور تباہ شدہ اور آپس میں سے جدا شدہ حال میں ہوگا۔ یہ اور اس جیسی باتیں ہر روز ایک ساعت خود اپنی ذات کو مخاطب کرکے کہے تو ممکن ہے کہ اس کا باطن موت سے آگاہی پالے۔ کیونکہ یاد کرنا بہ ظاہر دل پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ انسان نے ہمیشہ دیکھا ہے کہ لوگ جنازہ اٹھائے جارہے ہیں۔ اور انسان خود کو ہمیشہ ناظر ہی سمجھتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ وہ موت کا نظارہ کرتا رہے گا۔ اور اس نے خود کو کبھی مردہ نہیں دیکھا ہے اور جو چیز انسان نے نہ دیکھی ہو وہ اس کے وہم میں متشکل نہیں ہوتی۔ آنحضرت (ﷺ) نے اسی کے بارے میں خطبہ میں فرمایا کہ ''تو ٹھیک کہتا ہے کہ یہ مرگ ہمارے لیے نہیں لکھی گئی۔ اور یہ جن کے جنازے لیے جارہے ہیں وہ مسافر ہیں جو جلد لوٹ آئیں گے۔ انھیں لوگ زمین میں دفن کردیتے ہیں اور ان کا ترکہ کھاتے ہیں اور خود اپنے بارے میں غافل ہیں'' اور موت کو یاد نہ کرنے کا سبب اکثر و بیشتر طولِ امل ہوتا ہے جو تمام فسادات کی جڑ ہے۔

مختصر امید وآرزو کی فضیلت کا بیان

یاد رہے کہ جو کوئی طویل زندگی پائے گا اور ایک مدّت اس کی موت کی نوبت نہ آئے گی تو اس قسم کے خیال کے مالک شخص کے ہاتھوں کبھی کوئی دینی کام انجام پذیر نہیں ہونے کا کیونکہ وہ خود اپنے آپ سے کہتا ہے

کہ ابھی بڑا وقت پڑا ہے تو جب چاہے گا توبہ اور عبادت کر لے گا۔ اور فی الوقت آسایش کی راہ لیتا ہے۔ اور جو اپنی موت کو قریب گمان کرتا ہے تو سراپا اس کی تدبیر میں لگ جاتا ہے اور یہ تمام سعادتوں کی اصل ہے۔ آنحضرت نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: ''صبح جب نیند سے بیدار ہونا تو خود سے یہ مت کہنا کہ میں شام تک زندہ رہوں گا اور رات کو یہ مت کہنا کہ کل صبح تک زندہ رہوں گا اور زندگی میں سے موت کا سامان حاصل کر' تندرستی سے بیماری کا سامان حاصل کر لے کیونکہ تجھے کیا خبر کہ اللہ کے نزدیک تیرا انجام کیا ہوگا''۔ نیز فرمایا کہ ''میں تمھارے لئے دو خصلتوں سے بڑھ کر کسی اور شے سے زیادہ خائف نہیں ہوں: اپنی خواہشوں کے پیچھے لگنا اور طویل زندگی کی امید رکھنا'' اسامہ رضی اللہ عنہ نے کوئی شے ایک مہینے کے ادھار پر خریدی تو آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''آپ لوگ اس پر حیران نہ ہوں کہ اُسامہ نے کوئی شے ایک ماہ کے ادھار پر خریدی ہے؟'' اِنَّ اُسَامَةَ لَطَوِیلُ الْاَمَلِ '' بے شک اسامہ طویل زندگی کی امید رکھتا ہے اس اللہ تعالیٰ سے کہ محمد کی جان جس کے قبضے میں ہے کہ میں آنکھ نہیں جھپکتا کہ مجھے یہ خیال نہ ہو کہ قبل اس کے میں دوبارہ آنکھ کھولوں موت آ جائے اور میں آنکھ نہیں کھولتا کہ مجھے یہ خیال نہ ہو کہ قبل اس کے میں جھپکوں موت آ جائے گی۔ اور میں کوئی لقمہ اپنے منہ میں نہیں ڈالتا کہ مجھے یہ خیال نہ ہو کہ موت کے باعث میرے گلے ہی میں اٹک جائے گا''۔ پھر آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ ''اے لوگو! اگر عقل رکھتے ہو تو اپنے آپ کو مردہ سمجھو کہ اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے کہ جو کچھ تم سے وعدہ دیا گیا ہے تم اس سے خلاصی نہیں پا سکتے''۔ آنحضرت (ﷺ) جب قضائے حاجت کرتے تو فوراً تیمم کر لیتے صحابہ ان سے کہتے کہ پانی نزدیک ہے تو آپ (ﷺ) فرماتے کہ ''ہوسکتا ہے کہ پانی تک پہنچنے سے پہلے میں زندہ نہ رہوں''۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''آنحضرت (ﷺ) نے ایک مربع خط کھینچا پھر اس کے درمیان ایک اور سیدھا خط کھینچا پھر اس خط کے دونوں جانب چھوٹے خط کھینچے اور اس مربع کے باہر بھی ایک خط کھینچا تو فرمایا کہ یہ خط جو مربع کہ اندر ہے آدمی ہے اور یہ مربع خط جو اس کے اردگرد ہے وہ اس کی موت ہے کہ جس سے باہر وہ نہیں جا سکتا۔ اور یہ جو چھوٹے چھوٹے خط اس کے دونوں اطراف میں ہیں وہ اس کی راہ گذر میں بلائیں ہیں۔ کہ جب ایک سے نکلے تو دوسری میں گرفتار ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ موت آ جائے گی۔ اور مربع کے باہر والا خط اس کے امید و آرزو ہیں کہ وہ ہمیشہ ایسے کام کے بارے میں سوچتا ہے جو اس کی موت کے بعد ہونے والے ہوں''۔

آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ انسان روز بروز پیر تر ہوتا جاتا ہے لیکن اس میں دو چیزیں جوان تر ہوتی جاتی ہیں مال کی خواہش اور عمر کی خواہش''۔ حدیث میں ہے کہ ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک بوڑھے کو دیکھا کہ

اس کے ہاتھ میں بیلچا ہے اور مصروفِ کار ہے۔ تو آپ (ﷺ) نے کہا: بارِ خدایا اس شخص کے دل سے آرزو وا پس لے لے' اس شخص نے بیلچا ہاتھ سے رکھ دیا اور سو گیا۔ جب ایک ساعت گذر گئی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ: ''بارِ خدایا اس کی آرزو اسے دے دے''۔ تو بوڑھا اٹھ کر پھر کام میں لگ گیا۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے پوچھا کہ ''یہ کیا تھا؟'' تو وہ بولا کہ ''میرے دل میں آیا کہ کام کیوں کرتے ہو بوڑھے ہو گئے ہو جلد مر جاؤ گے تو میں نے بیلچہ ہاتھ سے رکھ دیا۔ پھر دوسری بار میرے جی میں آیا کہ مرنے سے پہلے تجھے روٹی کی حاجت ہے تو میں پھر اٹھ کھڑا ہوا۔'' آنحضرت نے فرمایا ہے کہ ''کیا تم بہشت میں جانا چاہتے ہو؟'' تو صحابہ نے کہا کہ ''ہاں ہم چاہتے ہیں''۔ تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ ''اپنی آرزوئیں کم کر دو اور اپنی موت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو اور اللہ تعالیٰ سے شرم رکھو جیسے کہ اس کا حق ہے''۔ ایک بزرگ نے ایک شخص کو رَے سے ایک خط لکھا کہ: ''اما بعد دنیا ایک خواب ہے اور آخرت بیداری ہے اور درمیان موت ہے اور جس میں ہم ہیں وہ نیند ہے''۔

طولِ امل کے اسباب کا بیان

یاد رہے کہ انسان نے ایک لمبی عمر کو اپنے دل میں صورت دے رکھی ہے۔ دو سبب سے: ایک جہل تو دوسرے دوستیِ دنیا؛ جب دنیا کی دوستی غالب ہو جاتی ہے اور موت اس کے اس دوست (دنیا) کو اس سے چھین لیتی ہے تو اس وجہ سے بے شک وہ موت کو اپنا دشمن جانتا ہے اور موت اس کی موافقت نہیں کرتی۔ اور انسان جو شے اس کے موافق نہ ہو اس سے اپنے آپ کو دور رکھتا ہے۔ اور خود کو فریب دیتا ہے۔ اور اپنے دل میں ایسی چیزوں کی صورت گری کرتا ہے جو اس کی مراد و آرزو کے موافق ہوں۔ پس ہمیشہ زندگی' مال' زن و فرزند اور اسبابِ دنیا کو فرض کرتا رہتا ہے کہ یہ قائم رہیں گے۔ اور موت کو جو اس کی مراد کے مخالف ہے بھلائے رکھتا ہے۔ اگر کبھی دل میں در آئے تو تسویف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میاں ابھی ایک زمانہ باقی ہے موت کا سامان ہوتا رہے گا۔ جب بڑا ہوتا ہے تو کہتا ہے میاں صبر کرو تا کہ بوڑھے ہو جاؤ۔ جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ تعمیر کر لو اس فرزند کے لئے ساز و سامان تیار کر لو اور اس بیٹے کو بیاہ لو اور دل ان کی فکر سے فارغ کر لو اور اس زرخیز زمین کو بنا سنوار لو تا کہ دل روزی سے فارغ ہو جائے پھر تم عبادت سے لذت گیر ہو گے اور یہ دشمن جس نے میری ہنسی اڑائی ہے اس کی گوشمالی کر لوں۔ اور فراغت کے لئے اسی طرح تاخیر کرتا جاتا ہے۔ اور اپنے ہر کام سے اور دس شاخسانے اور پیدا کر لیتا ہے اور یہ احمق نہیں جانتا کہ فراغت انھیں چھوڑے بغیر حاصل نہ ہو گی۔ گمان کرتا ہے کہ کسی وقت فارغ ہو جائے گا۔ اس طرح دن بدن تاخیر کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ موت ناگاہ آ جاتی ہے اور حسرت رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر اہل دوزخ کی فریاد تسویف کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ان

سب کی اصل دنیا کی محبت ہے اور غفلت ہے آنخضرت کے فرمان سے کہ: ''تو جسے چاہے دوست بنالے آخر تجھ سے اسے واپس لے لیا جائے گا''۔

اور جہل یہ ہے کہ انسان جوانی پر اعتماد کرتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ جب تک ایک بوڑھا مرتا ہے کتنے ہی لڑکے بالے اور جوان مرجاتے ہیں۔ اور شہر میں بوڑھوں کی تعداد تھوڑی ہوتی ہے اس لئے کہ بڑھاپے کو تھوڑے سے ہی پہنچتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انسان تندرستی میں مرگِ مفاجات کو نادر سمجھتا ہے اور اتنا بھی نہیں جانتا کہ اگر ناگہانی موت نادر ہے ناگہانی بیماری تو نادر نہیں۔ کیونکہ تمام بیماریاں ناگہاں ہی آتی ہیں۔ اور جب بیماری آ گئی۔ موت آ گئی۔ بلکہ بخار تاپ موت کا پیش رَو ہے اور بیمار کی موت نادر نہیں۔

پس موت کو ہمیشہ اپنے سامنے فرض کر لینا چاہیے۔ دھوپ کی طرح کہ جلدی اس میں داخل ہوگا اور سائے کی مانند نہیں جو آگے چلتا ہے اور انسان اس تک کبھی نہیں پہنچتا۔

طولِ امل کا علاج

یاد رہے کہ علاج بیماری کے سبب کو دور کرنے کا نام ہے۔ جب سبب معلوم ہوگیا تو اُسے دور کرنے میں لگ جانا چاہیے۔ دوستیٔ دنیا کے سبب کو دور کرنے کا طریقہ ہم 'حُبِ دنیا' کے باب میں بیان کر چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ جو کوئی دنیا کو خواب جانتا ہے وہ اسے دوست نہیں رکھتا۔ کیونکہ جانتا ہے کہ اس کی لذتیں چندروزہ ہیں جو موت کے ساتھ ہی ناچار باطل ہو جاتی ہیں۔ اور اِس وقت بھی خود منغص اور مکدّر رہیں اور رنج سے خالی نہیں۔ اور ہر گز کسی کے لئے ان سے پاک نہیں ہوتیں۔ اور جو کوئی آخرت کی ابدی مدت اور دنیوی زندگی کے اِختصار پر غور کرتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ آخرت کو دنیا کے عوض بیچ دینا ایسے ہی ہے جیسے کہ کوئی خواب کے ایک درم کو بیداری کے دینار کے عوض دوست رکھے۔ کیونکہ دنیا تو ایک خواب کی مانند ہے'' ۔اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوا اَنْتَبَھُوا' یعنی لوگ سو رہے ہیں جب مریں گے بیدار ہو جائیں گے''۔

جہل کا علاج انسان صاف فکر اور حقیقی معرفت کے ذریعے کرتا ہے کہ جانے کہ موت چونکہ اس کے اختیار میں نہیں اس لئے وہ اس وقت نہیں آتی جب وہ چاہتا ہے کہ انسان جوانی پر اعتماد کرے یا کسی اور کام پر۔

طولِ امل کے درجات

یاد رہے کہ خلق اس امر میں متفاوت ہے۔ کوئی ایسا ہوگا کہ جو چاہتا ہے کہ ہمیشہ دنیا میں رہے۔ جیسے کہ فرمان حق تعالیٰ ہے کہ: ''یَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْیُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ'' (قرآن: ۹۶/۲) (آتش پرستوں میں سے ایک اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ اسے ہزار سال عمر دی جاتی) اور کوئی ایسا ہوگا کہ جو چاہے گا کہ بوڑھا ہو کر مرے

اور کوئی ایسا بھی ہوگا جو ایک سال سے زیادہ کی امید نہ رکھتا ہو۔ اس لئے دوسرے سال کے لیے ساز وسامان نہیں کرتا۔ اور کوئی ایسا بھی ہوسکتا ہے ایک روز سے زیادہ کی امید نہیں رکھتا اس لئے دوسرے دن کے لئے تدبیر نہیں کرتا۔ جیسے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''آیندہ کل کا غم نہ کھاؤ کیونکہ کل اگر مہلت ہوئی تو کل کی روزی بھی موجود ہوگی۔ اور اگر زندگی نہ رہی ہو تو تُو دوسروں کے لئے اور ان کی روزی کے لئے رنج اٹھاتا ہے''۔ اور ایسا شخص بھی ہوتا ہے جو ایک ساعت کی امید بھی نہیں رکھتا۔ جیسے کہ حضور طہارت کے لئے تیمّم اس لئے فوراً کر لیتے تھے کہ ہوسکتا ہے کہ پانی تک پہنچنے سے پہلے موت آ جائے۔ اور کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ موت اس کے سامنے ہوتی ہے اور کبھی غائب نہیں ہوتی۔ جیسے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے معاذ رضی اللہ عنہ سے اس کے ایمان کی حقیقت دریافت فرمائی تھی تو معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ ''میں نے کبھی ایک قدم نہیں اٹھایا کہ میں نے نہ سوچا ہو کہ دوسرا قدم نہ اٹھا سکوں گا''۔ اسود حبشی نماز کے دوران ادھر ادھر دیکھتا تھا تو لوگوں نے کہا ''کیا دیکھ رہا ہے؟'' تو وہ بولا ''میں دیکھ رہا ہوں کہ ملک الموت کدھر سے آتا ہے''۔

مختصر یہ کہ لوگ طولِ امل کے بارے میں متفاوت مدارج کے ہیں جسے ایک ماہ سے زیادہ کی امید نہیں اُسے اس شخص پر فضیلت ہے جو چالیس روز کی امید رکھتا ہے اور اثر اس کا اس کے معاملات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کے دو بھائی غائب ہوں۔ ایک تو ایک ماہ تک اس کے پاس پہنچتا ہے اور دوسرا ایک سال تک تو وہ تدبیر کار کے لئے ایسے کرتا ہے کہ ایک جو ماہ تک آئے اور دوسرے کے لئے تاخیر کرتا ہے۔ اور کوئی ایسا شخص ہوتا ہے کہ وہ گمان کرتا ہے کہ کوتاہ امل ہے لیکن دلیل اس کی عمل میں مبادرت اور عجلت ہے اور ایک ایک لحظے کو غنیمت جاننا ہے۔ چنانچہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ: ''پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو: جوانی کو بڑھاپے سے پہلے' تندرستی کو بیماری سے پہلے' دولت مندی کو فقر سے پہلے' فراغت کو مصروفیت سے پہلے اور زندگی کو موت سے پہلے''۔ نیز فرمایا کہ: ''دو نعمتیں ایسی ہیں کہ جن سے بیشتر خلق مغبون ہے: اور وہ ہیں تندرستی اور فراغت''۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب صحابہ میں غفلت کے آثار دیکھتے تو ان میں منادی کرتے کہ ''موت آ گئی اور سعادت لائی یا شقاوت'' حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ ''کوئی دن ایسا نہیں کہ علی الصبح منادی اعلان نہ کرتا ہو کہ اے لوگو! الرحیل' الرحیل'' (رحلت کرو) داؤد طائی کو لوگوں نے دیکھا کہ جلد جلد نماز کے لئے جا رہے ہیں تو بولے کہ ''یہ جلدی کیسی ہے؟'' داؤد نے فرمایا کہ: ''ایک لشکر شہر کے دروازے پر میرا منتظر ہے یعنی قبرستان کے مردے تا کہ مجھے لے جائیں اور جب تک نہ لے جائیں گے وہاں سے نہ جائیں گے''۔ ابو موسیٰ اشعریؓ آخر عمر میں بہت ریاضت کرتے تھے لوگوں نے کہا کہ ''اگر نرمی کرلو تو کیا ہو جائے گا''۔ تو انھوں نے فرمایا کہ: ''گھڑ دوڑ

میں گھوڑے کو آخر میں زیادہ تیز دوڑاتے ہیں اور یہ میری عمر کے میدان کا آخر ہے کیونکہ موت قریب ہے اس لئے میں ریاضت سے دست کش نہیں ہوسکتا''۔

سکراتِ مرگ اور جان کنی کی سختی کا بیان

معلوم رہے کہ اگر انسان کے سامنے جان کنی اور اس کی شدت کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا تو چاہیے تھا کہ اگر عقل کا مالک ہوتا تو اس کے خوف سے دنیا سے کوئی لذت نہ پاتا۔ اگر ڈرتا کہ ایک ترک گھر میں دَر آئے گا اور اُس پر ایک گُرزِ آہنی مارے گا تو وہ اس کے خوف کی وجہ سے کھانے پینے اور سونے میں کوئی لذت نہ پائے گا۔ حالانکہ ہوسکتا ہے کہ وہ ترک خود نہ آئے۔ لیکن ملک الموت کا آنا اور جان لینا تو یقینی ہے اور یہ بے شک ترکوں کے آہنی گرز سے خوفناک تر ہے۔ اور اس شدنی سے نہ ڈرنا غفلت کی وجہ سے ہوتا ہے اور جان کنی کی تکلیف اس قدر ہوتی ہے کہ سب اس پر متفق ہیں کہ یہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے کہ کسی کو تلوار سے ریزہ ریزہ کردیا جائے درمیان سے دو ٹکڑے کردیا جائے۔ اس لئے کہ زخم کی تکلیف اس لئے ہوتی ہے کہ جہاں زخم لگتا ہے تو اس کی آگاہی روح کو پہنچتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ تلوار کس قدر روح سے محل جراحت میں ملاقات کرتی ہے اور اس کا درد تلوار کے جملہ اجزا میں سے گذر جانے سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور جان کنی وہ درد ہے جو خود نفسِ روح میں پیدا ہوتا ہے کہ اس کے تمام اعضا اس میں مستغرق ہوجاتے ہیں۔ اور مرنے والے کی خاموشی بے طاقتی کے باعث ہوتی ہے کہ زبان اس کی سختی کے باعث گنگ ہوجاتی ہے اور عقل مدہوش ہوجاتی ہے۔ اور یہ بات وہی جان سکتا ہے جس نے موت کی سختی چکھی ہو۔ یا نور نبوت کے ذریعے چکھنے سے پہلے معلوم کیا ہو یا دیکھا ہو۔ جیسے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ''اے میرے حواریو! دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ جان کنی مجھ پر آسان فرمادے کیونکہ میں موت سے اس قدر خائف ہوں کہ مجھے ڈر ہے کہ میں اس خوف ہی سے مرجاؤں گا'' اور ہمارے پیغمبر ﷺ اس وقت کہہ رہے تھے کہ ''اَللّٰھُمَّ ھَوِّنْ عَلٰی مُحَمَّدٍ سَکَرَاتِ الْمَوْتِ'' اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ''جس کسی کے لئے جان کنی آسان ہو میں اس سے کوئی امید نہیں رکھتی کہ میں نے آنحضرت کی جان کنی کی سختی کو دیکھا ہے۔ آپ ﷺ کہہ رہے تھے کہ ''بارِ خدایا جب تُو اس روح کو میری ہڈیوں اور رگ و پے میں سے باہر نکالے تو اس تکلیف کو مجھ پر آسان فرما''۔ آنحضرت اس درد کی توصیف اس طرح فرماتے تھے کہ ''ہر جان کنی تلوار کی تین سو ضربات کی مانند ہوتی ہے''۔ اور فرمایا کہ آسان ترین موت خارِ خشک کی طرح ہے جو اُون میں الجھ جاتا ہے اور ممکن نہیں ہوتا کہ آسانی سے باہر آئے حتیٰ کہ کھینچو تو تمام رگیں اور اعضا ٹوٹ جائیں۔ آنحضرت ایک بیمار کے پاس نزع کے وقت گئے تو فرمایا کہ ''میں جانتا ہوں

کہ اس کے رنج کی کیا کیفیت ہے۔اس کے جسم میں کوئی ایسی رگ نہیں جو جداگانہ درد سے اس وقت دوچار نہ ہو"۔حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ"قتال کروتا کہ میدانِ جہاد میں مارے جاؤ۔کیونکہ تلوار کی ہزار ضربیں میرے لئے جان کنی سے آسان تر ہیں"۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گذر بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے ساتھ ایک قبرستان پر ہوا۔توانھوں نے دعا کی حتّی کہ اللہ نے ایک کو زندہ کر دیا۔تو وہ قبر سے اٹھا اور بولا:"اے لوگو تم مجھ سے کیا چاہتے تھے کہ مجھے مرے ہوئے پچاس برس بیت گئے ہیں لیکن جان کنی کی تلخی ہنوز باقی ہے"۔

آثار میں ہے کہ"مومن کے لئے بہشت میں درجات ہوں گے کہ جن تک وہ اپنے اعمال کی وجہ سے نہ پہنچا ہوگا۔بلکہ اس پر جان کنی اتنی صعب کی گئی ہوگی کہ وہ اس کے باعث ان بلند درجات کو جا پہنچا۔اور وہ کافر جس نے کوئی نیکی کی ہوگی تو جان کنی اس کے لئے آسان کردی جاتی ہے تاکہ اس کا کوئی حق اللہ تعالیٰ پر باقی نہ رہے"۔

حدیث شریف میں ہے کہ"ناگہانی موت مومن کے لئے باعث رحمت ہے لیکن فاجر کے لیے باعث حسرت"۔حدیث شریف میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وفات پائی تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ موت میں تم نے خود کو کیسے پایا؟ تو حضرت نے جواب دیا کہ"جیسے زندہ مرغ کو بریاں کباب کیا جارہا ہو نہ اڑ سکتا ہو اور نہ مرسکتا ہو کہ خلاص پاسکے"۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کعب احبار سے پوچھا کہ"جان کنی کیسی ہے؟"فرمایا کہ"جیسے کہ ایک خاردار شاخ کسی کے جسم میں داخل کردی جائے اور اس کے کانٹے رگ رگ میں الجھ جائیں اور پھر کوئی مردِ قوی اس خاردار شاخ کو مرنے والے کے جسم سے باہر کھینچے"۔

جان کنی کے کارہائے سخت و دشوار

یادرہے کہ جان کنی کے مذکورہ رنجوں کے علاوہ تین اور ہولناک مرحلے بھی ہیں:

ایک یہ کہ مرنے والا ملک الموت کی صورت دیکھتا ہے۔حدیث شریف میں ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل نے ملک الموت سے کہا کہ میں تجھے اس صورت میں کہ تو گناہ گاروں کی جان لیتا ہے دیکھنا چاہتا ہوں۔تو ملک الموت نے فرمایا کہ آپ اس کی تاب نہیں رکھتے؛تو حضرت نے فرمایا کہ'یہ ناگزیر ہے'تو ملک الموت نے خود کو اس صورت میں نمودار کیا تو انھوں نے جب دیکھا کہ ایک کالے رنگ کا گندہ اژدہا جس کے جسم پر بال کھڑے ہوں اور اس نے سیاہ لباس پہن رکھا ہو اور اس کے منہ سے اور ناک سے آگ اور دھواں نکل رہے ہوں تو بے ہوش ہوکر گر گئے۔جب ہوش آیا تو ملک الموت اپنی معمول کی صورت میں موجود تھے تو حضرت نے کہا کہ اے

ملک الموت اگر عاصی اپنے جرموں کی سزا میں صرف تیری صورت دیکھ لے تو یہی کافی ہوگی''۔

یاد رہے کہ اللہ کے فرماں بردار بندے اس ہَول سے محفوظ ہوں گے۔ کیونکہ انھیں ملک الموت حسین ترین روپ میں دکھائی دے گا ایسے کہ اگر کسی نے کوئی راحت نہ دیکھی ہو تو اس کے لئے ملک الموت کا حسن و جمال کافی ہوگا۔

حضرت سلیمان بن داوُد علیہ السلام نے ملک الموت سے کہا کہ تم لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک کیوں نہیں کرتے؟ کہ ایک کو جلدی لے جاتے ہو جب کہ دوسرے کو بہت تکلیف میں چھوڑ رکھتے ہو''۔ تو ملک الموت نے کہا کہ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ ہر ایک کے نامۂ اعمال کا جریدہ مجھے دیا جاتا ہے جیسے حکم دیں میں ویسے ہی کرتا ہوں''۔

وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ایک پادشاہ نے سوار ہونے کا ارادہ کیا۔ اس کے حکم پر لباس لائے گئے۔ تو ان میں سے جو زیادہ عمدہ تھا وہ اس نے پہنا۔ اسی طرح چند گھوڑے لائے گئے۔ حتی کہ جو عمدہ تھا اس پر سوار ہوگیا۔ اور ایک عظیم موکب کے ساتھ برآمد ہوا اور تکبر کی وجہ سے کسی کی طرف نگاہ نہ ڈالتا تھا۔ تو ملک الموت ایک فقیر کے روپ میں میلے کپڑے پہنے اس کے سامنے آ گیا۔ اور بادشاہ کو سلام کہا لیکن بادشاہ نے جواب میں سلام نہ کیا تو ملک الموت نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی تو بادشاہ نے کہا کہ ہاتھ پرے کرو نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہو؟ ملک الموت نے کہا کہ ''مجھے آپ سے کچھ حاجت ہے'' بادشاہ نے کہا کہ 'صبر کرتا کہ میں نیچے اتروں' تو اس نے کہا کہ نہیں۔ ابھی'' بادشاہ نے کہا 'کہو' تو وہ اپنا سر بادشاہ کے کان کے پاس لے جا کر بولا: میں ملک الموت ہوں اور میں آیا ہوں کہ اسی ساعت میں تمھاری جان نکالوں'' تو بادشاہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اور زبان بے کار ہوگئی۔ بولا کہ اتنی مہلت دے کہ میں اندر جا کر بیوی بچوں کو وداع کر سکوں' ملک الموت نے کہا نہیں۔ میں ابھی تیری جان لوں گا' یہ کہا اور جان لے لی۔ اور بادشاہ گھوڑے سے گر گیا۔ تو ملک الموت وہاں سے چلا گیا۔ تو ایک مومن کو دیکھا تو کہا مجھے تم سے ایک راز کی بات کہنی ہے' مومن بولا 'کہو کیا ہے؟' بولا: ''میں ملک الموت ہوں۔ تو مومن بولا مرحبا ایک مدت سے میں تمھارا منتظر تھا۔ اور تجھ سے بڑھ کر عزیز اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہ جان لے لے' فرشتے نے کہا بیٹھ جاؤ اور اگر کوئی حاجت یا کام ہے تو اسے انجام دے لو' تو مردِ مومن بولا: میں کوئی کام اس سے زیادہ اہم نہیں جانتا کہ میں اپنے خالق کو دیکھوں''۔ تو ملک الموت نے کہا کہ 'جس حال میں تو چاہے گا میں اسی حال میں تیری جان لوں گا۔ تو مرد مومن نے کہا کہ صبر کرتا کہ میں وضو کر لوں اور نماز ادا کر لوں۔ تو سجدے میں میری جان لے لینا' تو فرشتے نے ایسے ہی کیا''۔

وہب بن منبہ کا بیان ہے کہ ''ایک ملک میں ایک بادشاہ تھا کہ رُوئے زمین پر اس سے بڑا بادشاہ اور کوئی نہ تھا۔ ملک الموت نے اس کی جان لے لی اور جب آسمان پر پہنچا تو دیگر فرشتوں نے اس سے کہا کہ 'اے ملک الموت کبھی تجھے کسی شخص پر جان لیتے وقت رحم آیا؟'' تو ملک الموت نے کہا کہ 'ایک بیابان میں ایک عورت تھی جو حاملہ تھی اس نے وضع حمل پر ایک لڑکے کو جنم دیا۔ مجھے حکم ملا کہ اس عورت کی جان لے لے۔ تو میں نے اس ماں کی جان لے لی اور اس لڑکے کو بیابان میں ضائع چھوڑ دیا۔ مجھے اس لڑکے اور اس کی ماں دونوں پر رحم آیا کہ بچہ اس تنہائی اور کمزوری کی وجہ سے ضائع چھوڑ دیا؛ تو فرشتوں نے ملک الموت سے کہا 'تو نے ابھی جس بادشاہ کی جان لی ہے کہ رُوئے زمین پر اس جیسا کوئی اور نہ تھا اسے دیکھا؟ تو ملک الموت نے کہا 'ہاں' تو فرشتوں نے بتایا کہ وہی ننھا بچہ تھا جسے تو نے بیابان میں بے آسرا چھوڑ دیا تھا' تو ملک الموت بولا: ''سبحان اللطیف لما یشاء) پاک ہے وہ صاحب الطاف ذات جو چاہے کرے)۔

آثار میں ہے کہ پندرہ شعبان کی رات کو ملک الموت کے ہاتھ میں ایک جریدہ دیا جاتا ہے کہ اس سال میں جس جس کی جان لینی ہوتی ہے ان کے نام اس میں مندرج ہوتے ہیں۔ کوئی تعمیر کرتا ہے' کوئی بیاہ کرتا ہے' کوئی جھگڑا کرتا ہے ان سب کے نام اس میں لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔

اعمشؒ کا بیان ہے کہ ملک الموت حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس گیا تو وہاں اس نے اُن کے ندیموں میں سے ایک کو بڑی گہری نظر سے دیکھا۔ جب ملک الموت چلا گیا تو ندیم نے حضرت سلیمان سے کہا کہ 'یہ کون تھا جو مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا۔ حضرت نے کہا کہ یہ ملک الموت تھا؛ تو ندیم بولا: ''شاید میری جان لینا چاہتا ہے۔ آپ ہوا کو حکم دیں تا کہ وہ مجھے ہندوستان میں پہنچا دے۔ تا کہ جب ملک الموت یہاں آئے تو مجھے نہ پا سکے؛ حضرت سلیمان نے ہوا کو حکم دیا تو اس نے ایسے ہی کیا۔ اتنے میں ملک الموت پھر لوٹ کر وہاں آ گیا۔ تو حضرت سلیمان نے اس سے پوچھا کہ تم نے میرے ندیم کی طرف بھی دیکھا تھا تو سبب کیا تھا؟ ملک الموت نے کہا کہ مجھے حکم ملا تھا کہ اس ساعت میں ہندوستان میں جا کر اس کی جان لوں۔ اور وہ آپ کے یہاں تھا تو میں نے اپنے جی میں کہا کہ ایک ساعت میں یہ ہندوستان کیسے پہنچے گا۔ لیکن جب میں ہندوستان پہنچا تو میں نے اسے وہاں پایا۔ میں بہت حیراں ہوا۔ میں نے اس کی جان لے لی''۔ مقصود اس حکایت کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ ملک الموت سے بالآخر ملاقات ہو کر رہے گی اس کے بغیر چارہ نہیں۔

دوسرا مشکل مرحلہ: ان دو فرشتوں کا دیدار ہے کہ جو ہر فرد پر موکل ہیں۔ حدیث میں ہے کہ یہ دونوں فرشتے مرنے پر اس شخص سے ملاقات کے لیے آتے ہیں' مرنے والا اگر اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار ہو تو کہتے ہیں

ہیں کہ جَزَاكَ اللهُ خیراً (اللہ تجھے اچھی جزا دے) تو نے ہمارے سامنے اللہ کی طاعت کی اور ہمیں راحت پہنچائی۔ اور اگر کوئی گناہ گار بندہ ہو تو یہ فرشتے کہتے ہیں ''لَا جَزَاكَ اللهُ خیراً'' لاجزاك الله خیراً'' (اللہ تجھے اچھا بدلہ نہ دے) کہ تو نے بہت فضیحتیں اور گناہ ہماری موجودگی میں کئے)۔ اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ بندہ جانکنی میں باہر کی طرف دیکھتا ہے اور آنکھ تک نہیں جھپکتا۔

تیسرا مشکل مرحلہ یہ ہے کہ مرنے والا اپنی جگہ مرتے وقت بہشت دیکھتا ہے یا دوزخ میں پاتا ہے اور ملک الموت اللہ کے فرماں بردار بندے سے کہتا ہے کہ اے اللہ کے دوست تمھیں بہشت کی بشارت ہو' اور گناہ گار سے کہتا ہے کہ ''اے دشمنِ خدا تجھے دوزخ کی بشارت ہو''۔ تو اس خبر کا رنج جان کنی کے رنج پر مستزاد ہو جاتا ہے۔ وَالعَیاذاً بِاللهِ (اللہ کی پناہ؛) یہ وہ احوال ہیں جو انسان دنیا ہی میں دیکھ لیتا ہے اور جو قبر میں جا کر دیکھے گا یہ اس کے مقابلے میں بہت مختصر ہیں۔

مردے کے ساتھ قبر کے معاملے کا بیان

آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ ''جس قت مردے کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے قبر کہتی ہے ''افسوس! اے ابن آدم تو مجھ سے کس بناء پر متکبر تھا۔ تو نہیں جانتا تھا کہ میں رنج ومحن کا گھر ہوں' اور تاریکی کا گھر ہوں' تنہائی کا گوشہ ہوں اور کیڑوں مکوڑوں کی آماجگاہ ہوں۔ تو کس فریب میں مبتلا تھا کہ مجھ پر سے گذرتا تھا تو ایک قدم میرے آگے تو دوسرا پیچھے رکھتا تھا''۔ لیکن مردہ اگر مصلح ہو تو کوئی اس کی جگہ یہ جواب دیتا ہے کہ ''اے قبر تو کیا کہہ رہی ہے کہ یہ تو صالح تھا۔ کہ معروف کا حکم دیتا تھا اور نہی سے روکتا تھا' تو قبر کہتی ہے کہ بے شک میں اس کے لئے سبز وشاداب باغ بن جاؤں گی پھر اس کا جسم نور میں منقلب ہو جائے گا۔ اور رُوح اس کی آسمان پر چلی جائے گی''۔

آثار میں ہے کہ جب مردے کو قبر میں عذاب کا آغاز کرتے ہیں تو اس کے پڑوسی قبرنشین آواز دیتے ہیں کہ اے متخلف تو ہمارے پیچھے رہ گیا تھا۔ اور ہم تجھ سے پہلے یہاں آ گئے تھے۔ تو کیوں تو نے ہم سے عبرت نہ پکڑی' تو نے نہ دیکھا کہ ہم تجھ سے پیشتر آ گئے تھے۔ اور ہمارے اعمال کا دور ختم ہو گیا تھا۔ جب کہ تجھے مہلت مل گئی تھی' تُو نے کیوں اس کا تدارک نہ کیا جسے ہم نے کھو دیا تھا''۔ زمین کے گوشے گوشے سے ایسی ہی ندائیں ہوں گی کہ اے دنیا کے ظاہر پر فریفتہ! تو نے ان لوگوں سے کیوں عبرت نہ پکڑی جو تجھ سے پہلے یہاں آئے تھے جو تیری ہی طرح دنیا پُر فریفتہ تھے؟'' حدیث شریف میں ہے کہ جب کسی شایستہ بندے کو قبر میں اتارتے ہیں تو اس کے اچھے اعمال اس کے اردگرد کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

جب عذاب کے فرشتے اس کی پائینتی کی طرف آتے ہیں تو نماز آڑے آتی ہے کہتی ہے نہیں۔ کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے لئے نماز میں بہت قیام کیا ہے۔ جب فرشتے سر کے جانب آتے ہیں تو روزہ کہتا ہے کہ نہیں کیونکہ اس شخص نے بھوک دنیا میں بہت برداشت کی ہے''۔ جب جسم کی طرف آتے ہیں تو حج اور غزا کہتے ہیں کہ ''نہیں کہ اس نے اپنے جسم پر بہت رنج اٹھائے ہیں''۔ ہاتھوں کی جانب آتے ہیں تو صدقہ کہتا ہے کہ ''نہیں تم اپنے ہاتھ روک لو کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے بہت صدقات دیئے ہیں۔'' تو وہ ملائکہ پکار اٹھتے ہیں کہ ''شادمانی اور تبریک سے بہرہ مند ہو'' پھر رحمت کے فرشتے آجاتے ہیں اور اس کی قبر میں ایک بہشتی فرش بچھادیتے ہیں اور قبر کو اس کے لئے حدِ نگاہ تک فراخ کردیتے ہیں اور نور کی ایک قندیل بہشت سے لاتے ہیں تاکہ وہ اس نور میں تا قیامت رہے۔ عبداللہ بن عبیدؓ فرماتے ہیں کہ: آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ جب مردے کو قبر میں اتارتے ہیں تو وہ لوگوں کے قدموں کی چاپ سنتا ہے جو جنازے کے ساتھ آئے ہوں۔ مردے سے کوئی شخص سوائے خود قبر کے اس سے بات نہیں کرتا جو کہتی ہے کہ ''کیا بہت سوں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ میری کیفیت اور ہول اور تنگی کا کیا عالم ہے۔ تو تُو نے میرے لئے کیا ساز و سامان تیار کیا؟''

منکر و نکیر کا سوال

آنحضرت (ﷺ) فرماتے ہیں کہ جب بندہ مرجاتا ہے اور اسے قبر میں رکھ دیتے ہیں تو دو فرشتے آتے ہیں۔ دونوں کے چہرے سیاہ اور آنکھیں ازرق ہوتی ہیں۔ ایک کا نام منکر ہے تو دوسرے کا نکیر ہے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ''پیغمبر کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟'' مردہ اگر مومن ہو تو کہے گا کہ: ''ہمارے پیغمبر اللہ کے بندے تھے اور اس کے رسول تھے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں''۔ پس وہ فرشتے ستر ہاتھ ضرب ستر ہاتھ تک قبر کو فراخ کردیتے ہیں۔ اور روشن اور پُرنور کردیے ہیں۔ تو کہتے ہیں کہ ''آپ آرام سے سو جائیں''۔ تو مردہ کہتا ہے کہ مجھے اجازت دیں تاکہ میں اپنے خویش و اقارب کے پاس جاؤں اور اپنا احوال بتاؤں''۔ تو فرشتے اسے کہیں گے کہ ''سو جاؤ جس طرح دلہنیں سوتی ہیں۔ ایسی نیند سو جاؤ کہ کوئی شے تمھیں بیدار نہ کرسکے سوائے اس کے جسے تو دوست رکھے''۔ اور مردہ اگر منافق ہو تو وہ منکر نکیر کے سوال پر کہے گا کہ ''میں نہیں جانتا۔ میں لوگوں سے کچھ سنتا تھا جو وہ بیان کرتے تھے تو میں بھی کہہ دیتا تھا''۔ تو فرشتے یہ سن کر زمین سے کہتے ہیں کہ اکٹھی ہو جا تو وہ منافق مردے پر یوں سمٹتی ہے کہ اس کی پسلیاں ایک دوسری میں پیوست ہو جاتی ہیں اور وہ قیامت تک اسی طرح عذاب میں مبتلا رہے گا۔ آنحضرت (ﷺ) نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ''اے عمر تم خود کو کیسے دیکھتے ہو کہ جب تم مرجاؤ اور تمھارے لوگ تمھارے لئے چار گز دو گز

وایک ہاتھ قبر تیار کریں گے پھر تمھیں غسل دیں گے اور کفن پہنا کر اس قبر میں رکھ دیں گے۔ اور اس پر مٹی ڈال دیں گے اور لوٹ جائیں گے۔ تو قبر کے رفیق منکر ونکیر آئیں گے جن کی آواز کی کڑک رعد جیسی ہوگی۔ اور آنکھیں برق کی سی ہوں گی۔ اور بال ان کے زمین کو چھوتے ہوں گے اور دانتوں کے ذریعے قبر کی مٹی کو زیروزبر کردیں گے۔ اور تجھے پکڑ کر بلائیں گے؟ حضرت عمر نے اس پر فرمایا کہ ''اے اللہ کے رسول کیا عقل اس وقت میرے ساتھ ہوگی؟'' آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ ''ہاں ہوگی''۔ تو حضرت عمر نے فرمایا پھر میں نہیں ڈرتا میں منکر نکیر کے لئے کافی ہوں''۔ حدیث میں ہے کہ دو جانوروں کو کافر کی قبر میں مسلّط کیا جائے گا۔ جو دونوں اندھے اور بہرے ہوں گے۔ اور دونوں کے ہاتھوں میں لوہے کی چھڑیاں ہوں گی۔ اور اس کے سر کو ایک ڈول کی طرح جس سے اونٹ کو پانی پلاتے ہیں، قیامت تک ماریں گے۔ وہ آنکھ نہیں رکھتے کہ دیکھ کر رحم کر سکیں نہ کان رکھتے ہیں کہ مردے کی ہاوہو سنیں''۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''قبر کا ایک فشار ہے جس سے وہ مردے کو دباتی ہے۔ اس فشار سے اگر کوئی بچا تو وہ سعد بن معاذ ہے'' انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''زینب دختر رسول فوت ہوگئیں تو انھیں قبر میں اتارا گیا تو آنحضرت (ﷺ) کا چہرہ بہت زرد ہوگیا جب آپ قبر سے باہر آئے تو پھر ٹھیک ہوگیا تو ہم نے کہا کہ ''یارسول اللہ کیا ہوا تھا؟'' فرمایا کہ ''مجھے قبر میں پڑنے اور اس کے عذاب کا خیال آگیا تھا تو مجھے یہ بتایا گیا کہ یہ زینب کے لئے آسان کردیا گیا ہے۔ بااین ہمہ قبر کا وہ فشار ایسا ہے کہ پوری دنیا نے اس کی آواز سنی ہے''۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ 'کافر کی قبر میں عذاب کی یہ صورت ہوتی ہے کہ اس پر ننھانوے ۹۹ اژدہے مقرر کردیئے جاتے ہیں تم جانتے ہو کہ اژدہا کیا ہوتا ہے؟ ایک سانپ ہوتا ہے جس کے نو ۹ سر ہوتے ہیں جو مردے کو ڈستے ہیں۔ اُسے چاٹتے ہیں، پھنکارتے ہیں اور یہ عمل روزِ قیامت تک جاری رہتا ہے''۔ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''قبر آخرت کی منزلوں میں سے اوّلین منزل ہے اگر آسانی سے طے ہوجائے تو جو کچھ اس کے بعد ہوگا وہ آسان تر ہوگا۔ لیکن اگر قبر کی منزل دشوار ہوئی تو بعد کی منازل دشوار تر ہوں گی۔ اور سخت تر۔

یاد رہے کہ قبر کی منزل کے بعد جو کچھ ہوگا وہ یہ ہے: پہلے نفخِ صور ہوگا، پھر روزِ قیامت کا ہول اور اس کی درازی شدتِ گرما اور اس سے بہنے والا پسینہ پھر عرض کرنے کا خوف اور گناہوں کی پُرسش اور نامۂ اعمال کا دستِ راست یا دستِ چپ میں ملنے کا خوف۔ پھر فضیحت اور رسوائی کا خوف جو ظاہر ہوجائے گی۔ پھر ترازو کا خوف کہ نیکیوں کا پلہ بھاری ہوتا ہے کہ برائیوں کا۔ پھر دشمنون کے مظالم اور ان کا جواب، پھر پل صراط کا خوف پھر دوزخ کا خوف اور زقوم، جحیم اور سانپ بچھوؤں اور ان کے عذاب کا خوف۔ اور یہ عذاب دو قسم کے

ہیں: ''ایک جسمانی اور دوسرے روحانی۔ جو جسمانی عذاب ہیں ان کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب احیا کے آخر میں دے دی ہے۔ اور ہر چیز کا بیان وہاں کر دیا ہے۔ اور جو عذابِ روحانی ہیں وہ ہم نے اس کتاب کے عنوان میں بیان کر دیئے ہیں۔ اسی طرح موت کی حقیقت کہ کس طرح کی ہوتی ہے اور موت کے بعد روح کی حقیقت اور اس کے احوال ہم نے یہ تفصیل اس کتاب میں بیان کر دیئے ہیں اور جو کوئی جسمانی عذاب کی تفصیل جاننا چاہے اسے کتاب احیاء کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اور جو روحانی عذاب کی شرح کا طالب ہو وہ اسی کتاب کے عنوان میں ملاحظہ کرے۔ اس لئے کہ ان کا یہاں بیان دشوار ہے۔ اِس لئے ہم نے اِسی پر اکتفا کیا ہے تاکہ کتاب ضخیم نہ ہو جائے۔ ہم اپنی اس کتاب کو ان خوابوں کے بیان پر جو بزرگوں نے مرنے والوں کے احوال میں دیکھے ہیں ختم کرتے ہیں۔

یادرہے کہ دنیا والوں کے لیے مرنے والوں کے احوال کا علم یا تو باطنی مکاشفے کے ذریعے سے ممکن ہے خواہ وہ خواب میں ہو خواہ بیداری میں۔ لیکن حواسِ خمسہ کے ذریعے ممکن نہیں۔ کیونکہ مردے دوسری دنیا میں ہیں اور ہمارے تمام حواس ان کے احوال جاننے سے قاصر ہے۔ ایسے ہی جیسے کان رنگوں کے ادراک سے قاصر ہے اور آنکھ آوازوں کے ادراک سے قاصر ہے۔ بلکہ انسان میں ایک خاصیت ہے کہ جس کے ذریعے وہ اُس جہان کے باسیوں کو دیکھ سکتا ہے لیکن وہ خاصیت ہجوم حواس اور مشاغل دنیا کے غلبے کی وجہ سے پوشیدہ ہے۔ نیند میں جب انسان ان کے غلبے سے نجات پاتا ہے تو اس کا حال مُردوں کے قریب ہی ہوتا ہے۔ جس سے مُردوں کے احوال کشف ہونے لگتے ہیں۔ اور اس میں یہ خاصیت بھی ہے کہ خود مُردوں کو ہمارے بارے میں خبر ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ہمارے نیک اعمال پر خوش ہوتے ہیں اور ہمارے معاصی پر غمگین ہوتے ہیں۔ جیسے کہ احادیث میں بیان ہوا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے احوال کی خبر انھیں اور ان کے احوال کی خبر ہمیں لوحِ محفوظ کے واسطے کے بغیر نہیں ہوتی کیونکہ ہمارے نیز ان کے احوال لوحِ محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں۔ جب انسان کے باطن کو اس سے مناسبت ہو جاتی ہے تو وہ خواب میں ان کے احوال وہیں سے جانتا ہے۔ اور جب مُردوں میں یہ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ہمارا احوال جاننے لگتے ہیں اور لوحِ محفوظ کی مثال آئینے کی سی ہے۔ کہ ہر چیز کی صورت اس میں ہوتی ہے اور زندہ انسان کی روح بھی آئینے ہی کی طرح ہوتی ہے۔ اور مُردے کی روح بھی اسی طرح کی ہوتی ہے۔ پس جس طرح ایک آئینے سے کوئی صورت دوسرے آئینے میں نمودار ہوتی ہے۔ لوحِ محفوظ سے ہم میں نیز مُردوں میں منعکس ہو جاتی ہے اور یہ گمان نہ کرنا کہ لوحِ محفوظ کوئی جسم ہے جو مربع شکل میں ہے اور جو لکڑی یا نے یا ایسی ہی کسی اور شے کی بنی ہوئی ہے کہ جسے اس چشم ظاہر سے

دیکھا جاسکتا ہواور اس کی تحریروں کو پڑھا جاسکتا ہو لیکن اگر تو اسے کسی مثال کے ذریعے جاننا چاہے ہے تو اپنے آپ سے طلب کر۔ کیونکہ خود تیرے نفس میں خلقت کا ہر نمونہ فطرۃً موجود ہے۔ تا کہ اس سبب سے تجھے جملہ آفرینش کا علم ہو سکے لیکن چونکہ تو اپنے آپ سے غافل ہے دوسروں کو کیا پہچانے گا؟ اس کا مظہر قاری کا دماغ ہے کہ وہ تمام قرآن کا حافظہ ہے۔ تو گویا تمام قرآن قاری کے دماغ میں تحریر ہے جسے وہ اس کو اور اس کے حرفوں کو دیکھتا ہے لیکن اگر کوئی قاری کے دماغ کو چشم ظاہر سے دیکھے تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ وہاں کہیں بھی لکھا ہوا قرآن موجود نہیں۔ پس لوحِ محفوظ میں اعمال کے نقش کو اس قسم سے جاننا چاہیے کہ بے انتہا اعمال اس میں نقش ہیں جب کہ تیری آنکھ سوائے متناہی کے نہیں اور نامتناہی کا نقش متناہی میں ممکن ہی نہیں کہ اسے کوئی صورت دی جائے۔ پس اس کی لوح وقلم اور ہاتھ وغیرہ میں سے کوئی چیز بھی تیرے ان آلات جیسی نہیں۔ چنانچہ وہ بھی تیرے مشابہ نہیں۔ بلکہ ایسی ہے جیسی کہ داناؤں نے بیان کی ہے کہ:

”ع درخانہ بہ کدخدای ماند ہمہ چیز“ (گھر میں ہر شے گھر کے مالک ہی کی مانند ہوتی ہے)

مقصود یہ ہے کہ تو اس امر کو محال نہ جاننا کہ مُردوں کو ہماری خبر ہوتی ہے اور ہمیں ان کی۔ جیسے کہ تو خواب دیکھتا ہے اور مردوں کو خواب میں اچھے احوال یا برے احوال میں دیکھنا ایک بڑی دلیل اس امر کی ہے کہ وہ زندہ ہیں خواہ نعمت میں ہوں خواہ عذاب میں۔ اور وہ نابود نہیں نہ ہی مردہ جیسے کہ فرمایا: ”وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ“ (قرآن: ۱۶۹/۳) (جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے انھیں مردہ نہ سمجھنا بلکہ وہ زندہ ہیں اور انھیں رزق فراہم کیا جاتا ہے)۔

مُردوں کے احوال کا بیان جو بذریعہ خواب منکشف ہوا

آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ: ”جس نے خواب میں مجھے دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کرسکتا“۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ”میں نے آنحضرت (ﷺ) کو خواب میں دیکھا کہ مجھ سے سرگراں ہیں تو میں نے عرض کیا کہ ’کیا ہوا ہے؟‘“ فرمایا کہ ”کیا تو وہ نہیں ہے کہ جس نے روزہ کے ساتھ اپنی بیوی کو بوسہ دیا تھا“ حالانکہ عمر نے ایسا نہیں کیا تھا اور ہر چند کہ یہ حرام نہیں لیکن اس کا نہ کرنا اولیٰ تر ہے۔ اور صدّیقوں کے ایسے عمل سے صرفِ نظر نہیں کیا جاتا۔ اگرچہ عامۃ الناس کے ساتھ ایسا نہیں کیا جاتا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ میری دوستی تھی میں چاہتا تھا کہ مرحوم کو خواب میں دیکھوں۔ تو ان کی وفات کے ایک سال بعد خواب میں دیکھا کہ آنکھیں مل رہے ہیں اور فرمایا کہ

''اب فارغ ہوا ہوں۔ معاملہ خطرناک تھا اگر اللہ تعالیٰ رحیم نہ ہوتے'' عباس ہی فرماتے ہیں کہ ''میں نے ابولہب کو خواب میں دیکھا کہ آگ میں جل رہا ہے۔ تو میں نے اس سے پوچھا کیسے ہو؟'' بولا ہمیشہ عذاب میں ہوں سوائے پیر کی رات کے کہ آنحضرت اس رات کو پیدا ہوئے تھے۔ تو جب مجھے یہ خوشخبری ملی تھی تو میں نے اس خوشی میں ایک غلام آزاد کیا تھا۔ تو اس عمل کے ثواب میں شبِ پیر کو مجھے عذاب نہیں دیا جاتا''۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت (ﷺ) ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تشریف فرما ہیں جب میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا تو ناگہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کو لایا گیا۔ اور انھیں گھر میں بھیج کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ تو میں نے دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فوراً واپس آ گئے اور فرمایا کہ: ''قُضِیَ لِیْ وَرَبَّ الْکَعْبَۃِ''یعنی میرا حق مل گیا۔ پھر جلد ہی معاویہ رضی اللہ عنہ بھی باہر آ گئے اور فرمایا کہ ''غُفِرَلِیْ وَرَبُّ الْکَعْبہ''''مجھے بھی معاف کر دیا گیا اور بخش دیا گیا''۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے قبل ایک دفعہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نیند سے بیدار ہوئے تو فرمایا کہ: ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ''لوگوں نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ تو فرمایا کہ حضرت حسین کو مار ڈالا گیا' لوگوں نے کہا'' تجھے کیسے معلوم ہوا''؟ تو آپ نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت (ﷺ) کو دیکھا کہ اُن کے پاس خون سے بھرا ایک آبگینہ ہے اور فرما رہے ہیں کہ 'تو نہیں دیکھتا کہ میری امت نے میرے بعد کیا کیا میرے فرزند حسین کو مار ڈالا اور یہ اسی کا خون ہے یا اس کے ساتھیوں کا۔ میں اللہ کے ہاں ظلم کے خلاف فریاد کے لئے جا رہا ہوں' چوبیس روز بعد خبر ملی کہ حضرت حسین شہید ہو گئے''۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب لوگوں نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ''آپ ہمیشہ زبان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے کہ ''اس نے کچھ کام میرے سامنے رکھے ہیں''۔ آپ نے جواب دیا کہ ''ہاں میں اسی کے ذریعے لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللہ کہا کرتا تھا تو اس نے میرے سامنے بہشت رکھ دی''۔

یوسف بن الحسینؒ کو لوگوں نے خواب میں دیکھا تو کہا کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمائی'' تو لوگوں نے پوچھا کہ کس بناء پر؟'' تو فرمایا کہ ''اس بناء پر کہ میں نے کبھی سنجیدہ کو ہزل کے ساتھ خلط ملط نہ کیا تھا''۔

منصور بن اسمٰعیلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بزاز کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' تو فرمایا ''میں نے جس گناہ کا اقرار کیا اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا لیکن سوائے ایک گناہ کے کہ جس کے بارے میں مجھے شرم آتی تھی کہ اقرار کروں۔ میرے سر سے پاؤں تک پسینہ بہہ نکلا۔ حتی کہ میرے چہرے پر کا سارا گوشت بھی گر گیا''۔ تو میں نے پوچھا کہ ''وہ کیا گناہ تھا؟'' تو فرمایا کہ ایک دفعہ

ایک غلام پر میری نظر پڑی وہ مجھے بہت بھایا۔تو مجھے شرم آئی کہ اس گناہ کا اقرار کروں؟''

ابو جعفر صید لانی ؒ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت کو خواب میں دیکھا کہ ایک جماعت درویشوں یعنی صوفیوں کی آپ (ﷺ) کے ساتھ بیٹھی ہے۔تو دو فرشتے آسمان سے اترے ایک کے ہاتھ میں صراحی تھی تو دوسرے کے ہاتھ میں طشت تھا۔آنحضرت (ﷺ) نے ہاتھ دھوئے اور درویشوں نے بھی ہاتھ دھوئے۔پھر میرے پاس وہ ابریق وطشت لائے تا کہ میں بھی دھوؤں۔تو ان میں سے ایک درویش نے کہا کہ اس کے ہاتھوں پر پانی نہ ڈالو کہ یہ ہم میں سے نہیں ہے۔تو میں نے کہا کہ ''اے اللہ کے رسول ﷺ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی جس قوم کو دوست رکھتا ہے وہ انھی میں سے ہے'اور میں قوم صوفیا کو دوست رکھتا ہوں' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کے ہاتھ دھلاؤ کہ یہ بھی صوفی ہے''۔

لوگوں نے مجمعؒ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ''آپ نے اپنا کام کیسا پایا؟'' فرمایا کہ ''دنیا و آخرت کی بھلائی زاہد لے گئے''۔

زرارہ بن ابی اوفیٰ ؒ کو لوگوں نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ آپ نے اپنے اعمال میں کن اعمال کو برتر پایا؟'' تو آپ نے فرمایا کہ کہ ''حکم اللہ پر رضا اور کوتاہ امل کو''۔

اور یزید بن مذعورؒ کہتے ہیں کہ ''میں نے اوزاعی ؒ کو خواب میں دیکھا تو میں نے کہا کہ ''مجھے بتاؤ کہ کون سا عمل بہتر ہے تا کہ میں اس سے تقرب کروں''۔تو آپ نے فرمایا کہ میں نے کوئی درجہ عالموں کے درجے سے بڑھ کر نہیں دیکھا اور س سے بڑھا ہوا درجہ اندوہ گینوں کا ہے'' اور یزید ایک بوڑھا شخص تھا جو ہمیشہ رویا کرتا تھا حتیٰ کہ جب فوت ہوا ہے تو بینائی سے محروم تھا۔

ابن عُیینہؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے اپنے بھائی کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' تو وہ بولا ''کہ ہر گناہ جس کے لئے میں نے استغفار کی تھی اللہ نے وہ گناہ بخش دیا لیکن جس گناہ کے لئے میں نے زندگی میں استغفار نہ کی تھی وہ نہ بخشا''۔

زبیدہ (زنِ ہارون الرشید) کو لوگوں نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' تو بولی کہ ''رحمت فرمائی''۔لوگوں نے کہا کہ ''کیا اس مال کی وجہ سے جو تو نے مکّے کی راہ میں نفقہ کیا تھا؟'' تو بولی کہ ''نہیں کیونکہ اس کا ثواب تو مال کے مالکوں کو پہنچا۔مجھے تو اللہ تعالیٰ نے میری خوش نیتی کی بناء پر بخش دیا''۔

لوگوں نے سفیان ثوریؒ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟'تو

آپ نے فرمایا کہ ''میں نے ایک قدم صراط پر رکھا تو دوسرا بہشت میں''۔

احمد بن الحواریؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے اپنی بیوی کو خواب میں دیکھا۔ ایسے حسن و جمال میں کہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور چہرہ اس کا نور سے تاباں تھا۔ تو میں نے اس سے پوچھا کہ تیرے چہرے کی یہ روشنی کس بناء پر ہے؟'' تو بولی کہ یاد ہے کہ فلاں رات تم خدا کو یاد کرتے ہوئے رو رہے تھے تو میں نے کہا کہ ہاں مجھے یاد ہے' تو بولی کہ میں نے تمھارے آنسو اپنے چہرے پر مل لئے تھے۔ یہ تمام نورانی آنسوؤں کی وجہ سے ہے''۔

کتانیؒ کا بیان ہے کہ ''میں نے جنیدؒ کو خواب میں دیکھا تو میں نے ان سے پوچھا کہ 'اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' بولے ''وہ تمام عبادات اور اشارات کچھ نہ نکلے برباد ہوگئے اور ان سے کچھ حاصل نہ ہوا سوائے اس دو رکعت نمازِ شب کے جو میں ادا کیا کرتا تھا''۔

زبیدہ کو لوگوں نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' تو بولی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ان چار کلمات کی بناء پر رحم فرمایا جو میں ادا کیا کرتی تھی: لا الہ الا اللہ افنی بہ عمری' لا الہ الا اللہ اَدخلَ بھا قبری' لا الہ الا اللہ اَخلُو بِھا وحدی' لا الہ الااللہ الفی بھا رَبّی''[1]۔

بشر حافیؒ کو لوگوں نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' تو بولے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر رحم فرمایا اور کہا کہ ''کیا تجھے اس شدت کے ساتھ مجھ سے خائف ہوتے شرم نہ آئی؟''

ابوسلیمانؒ کو لوگوں نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر رحمت فرمائی اور کسی چیز نے اس قوم کے اس وطیرے نے کہ مجھے مشارٌ الیہ بنا دیا تھا کہ میں اہل دین کے درمیان انگشت نما تھا اس سے زیادہ کسی عمل نے نقصان نہ پہنچایا''۔

ابوسعید خرازؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے ابلیس کو خواب میں دیکھا تو میں نے اسے مارنے کے لئے لاٹھی اٹھائی لیکن وہ اس سے خائف نہ ہوا اور نہ ڈرا۔ تو فرشتۂ غیبی نے آواز دی کہ شیطان اس سے نہیں ڈرتا یہ تو اس نور سے ڈرتا ہے جو مومن کے دل میں ہوتا ہے''۔

مسوحیؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے ابلیس کو خواب میں دیکھا کہ بالکل ننگا ہے تو میں نے اسے کہا کہ تمھیں لوگوں سے شرم نہیں آتی؟ تو وہ بولا کہ یہ مرد نہیں ہیں اگر مرد ہوتے تو جس طرح میں بچوں کے ساتھ گیند بلا کھیلتا ہوں ان کے ساتھ نہ کھیلتا۔ مرد تو اور ہی لوگ ہیں جنھوں نے مجھے بیمار اور نزار و نحیف کر دیا ہے۔ اس نے صوفیا

(۱) ''میں لَا اِلٰـــہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ساتھ عمر تمام کروں' اسی کے ساتھ قبر میں داخل ہوں اسی کے ساتھ تنہائی میں بیٹھوں' اور اسی کے ساتھ اپنے رب سے ملاقات کروں۔

کی طرف اشارہ کیا تھا''۔

ابو سعید خرّازؒ فرماتے ہیں کہ ''میں دمشق میں تھا تو میں نے آنحضرت کو خواب میں دیکھا کہ آپ ابوبکر اور عمر کے سہارے چلے آ رہے ہیں۔ اور میں ایک شعر کہہ رہا تھا اور انگلی سینے پر مار رہا تھا تو فرمایا کہ ''اس کا شر خیر سے زیادہ ہے''۔

شبلیؒ کو لوگوں نے ان کی وفات کے تیسرے دن خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟' تو بولے کہ حساب نے اس سختی کے ساتھ پکڑ لیا تھا کہ میں مایوس ہو گیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے جب میری نومیدی کو دیکھا تو مجھ پر رحم فرمایا''۔

سفیان ثوریؒ کو لوگوں نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ''تمھارے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا سلوک کیا؟'' فرمایا کہ ''اللہ نے رحم فرمایا''۔ تو پوچھا کہ ''عبداللہ مبارک کا حال کیسا ہے؟'' فرمایا کہ ''انھیں ہر روز دو بار موقع دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں''۔

مالک بن اَنس کو لوگوں نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ''تمھارے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا سلوک کیا؟'' تو جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اس کلمے کی وجہ سے رحم کیا کہ جو میں نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے سنا تھا کہ آپ جب کسی جنازے کو دیکھتے تھے تو فرماتے کہ: ''سُبْحَانَ الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْت''۔

جس رات حسن بصریؒ فوت ہوئے تو لوگوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور منادی ہو رہی تھی کہ ''حسن بصری نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور خوشنود ہوئے''۔

جنید نے ابلیس کو خواب میں ننگا دیکھا تو بولے کہ ''تجھے لوگوں سے شرم نہیں آتی؟'' ابلیس نے جواب دیا کہ یہ مرد نہیں مرد تو وہ ہیں جو شونیزیہ مسجد میں ہیں جو مجھے آزار دیتے ہیں اور نحیف رکھتے ہیں''۔ جنید کہتے ہیں کہ ''سحر کے وقت میں مسجد شونیزیہ کی طرف گیا تو جب مسجد کے دروازے میں سے داخل ہوا تو دیکھا کہ لوگ تفکر میں سر بزانو تھے۔ تو بولے ''اس پلید ملعون کی بات پر مغرور نہ ہو جانا''۔

عتبہ الغلام نے ایک بہشتی حور کو خواب میں دیکھا جو نہایت خوب صورت تھی۔ ان سے کہہ رہی تھی ''اے عتبہ میں تجھ پر عاشق ہوں کبھی ایسا کام نہ کرنا کہ مجھے تم سے باز رکھیں۔ تو عتبہ نے کہا کہ ''میں نے دنیا کو تین طلاقیں دی ہیں۔ اب میں اس کی طرف متوجہ نہ ہوں گا تا کہ تجھ تک پہنچ سکوں''۔

ابوایوب سختیانی نے ایک مفسد مرد کا جنازہ دیکھا تو اوپر کی منزل پر چلے گئے تا کہ اس کے جنازے میں شریک نہ ہونا پڑے۔ لوگوں نے اس مردے کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا

سلوک کیا؟'' تو اس نے کہا کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھ پر رحمت کی۔ نیز کہا کہ ایوب سے کہنا کہ ''قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّیْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ '' (قرآن: ۱۷/۱۰۰) یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے رحمت کے خزانے تیرے اختیار میں ہوتے تو بخل کی بناء پر تو ان میں سے کوئی بھی نفقہ نہ کرتا''۔

جس رات داؤد طائیؒ فوت ہوئے تو ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ ملائکہ آسمان سے آمدورفت کررہے ہیں تو اس نے پوچھا کہ یہ کون سی رات ہے؟'' تو جواب ملا کہ آج داؤد طائی فوت ہو گئے ہیں ان کے لئے بہشت آراستہ کی جارہی ہے''۔

ابوسعید شحامؒ کہتے ہیں کہ ''میں نے صعلوکیؒ کو خواب میں دیکھا تو میں نے کہا کہ ''اے خواجہ'' تو وہ بولے ''خواجگی کو چھوڑ کہ وہ تو جاتی رہی''۔ تو میں نے کہا ''آپ کے وہ جملہ اعمال و کردار کہاں پہنچے؟'' بولے کہ ان کا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ سوائے ان مسائل کے جو بوڑھی عورتیں مجھ سے پوچھا کرتی تھیں''۔

ربیع بن سلیمانؒ فرماتے ہیں کہ میں نے شافعیؒ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا کیا؟'' فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھے سونے کے ایک تخت پر بٹھایا اور تازہ مروارید مجھ پر نچھاور کئے''۔

حضرت شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ''مجھے ایک سخت کام کا سامنا تھا کہ جس میں میں ناکام رہا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص آیا اور بولا کہ ''اے محمد بن ادریس کہو: ''اَللّٰھُمَّ لَا اُمْلِكُ لِنَفْسِی نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا وَّلَا مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوراً وَّلَا اَسْتَطِیعُ اَنْ آخُذَ اِلَّامَا اَعْطَیْتَنِی وَلَا اَتَقِی اِلَّا مَا وَقَیْتَنِی؛ اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنِیْ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی مِنَ الْقَولِ وَالْعَمَلِ فِی عَافِیَةٍ (خداوند میرا نفع میرا جینا میرا مرنا اور دوبارہ جی اٹھنا میرے اختیار میں نہیں۔ میں کوئی شے حاصل نہیں کرسکتا الا یہ کہ تو عطا فرمائے۔ اور میں کسی شے سے خود کو بچا نہیں سکتا الا یہ کہ تو میری نگہداشت فرمائے۔ اے اللہ مجھے اس پر جسے تو دوست رکھتا ہے اور پسند کرتا ہے اچھے قول و فعل میں موفق اور کامیاب فرما)۔ تو جب میں صبح کے وقت بیدار ہوا تو میں نے یہی دعا کی تو چاشت کے وقت وہ مہم آسان تر ہوگئی۔ لہٰذا تجھے چاہئے کہ اس دعا کو فراموش نہ کرے''۔

ایک شخص کا بیان ہے کہ ''میں نے عتبہ الغلام کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' تو بولے کہ ''اللہ نے مجھے بخش دیا۔ اس دعا کی بناء پر جو تیرے گھر کی دیوار پر لکھی ہوئی ہے۔ تو جب میں بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ عتبہ الغلام کے خط میں لکھا ہوا ہے کہ ''یَا ھَادِیَ الْمُضَّلِین یَا رَاحِمُ الْمُذْنِبِیْن وَیَا مُقِیلَ عَشَرَاتِ الْعَاثِرِین اَرحَم عَبدَكَ ذَالخَطَرِ العَظِیم وَالْمُسلِمِین كُلَّھُم اَجمَعِین؛ وَاجعَلنَا مَعَ الْاَحْیَاءِ الْمَرزُوقِینِ الَّذِین اَنْعَمْتَ عَلَیھِم مِنَ النَّبِیِّینَ وَالصِّدِّیقِینَ وَالشُّھَدَاءِ

وَالصَّالِحِینَ آمِین یَا رَبَّ العَالَمِین ''۔(اے گمراہوں کوراہ دکھانے والے اوراے گناہ گاروں کوبخشنے والے اوراے لغزش کرنے والوں کی لغزشوں سے صرف نظر کرنے والے تو اپنے اس بندے کو بڑے خطر سے بخش دے۔اور عموماً تمام مسلمانوں پر اور ہمیں روزی کھانے والے زندوں کے گروہ میں قرار دے۔ وہ جن پر تو نے انعام دیئے پیغمبروں میں سے' صدیقوں میں سے شہیدوں میں سے اور صالحوں میں سے۔اے جہانوں کے رب ہماری دعا قبول فرما''۔

موت کے بارے میں جس قدر بیان ہوا کافی ہے۔اور کتاب ہم اس پر ختم کرتے ہیں۔امید رکھتے ہیں کہ جوکوئی یہ کتاب پڑھے گا اوراس سے استفادہ کرے گا۔اسے چاہئے کہ کتاب کے مصنف کواپنی دعاؤں میں فراموش نہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے لئے عفوو بخشش چاہے۔تاکہ اگر سہواً بیان میں کہیں لغزش یا خلل واقع ہوا ہو یا کہیں تکلف یا ریا نیت میں شامل ہو گیا ہو' اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم نیز ان کی دعاؤں کی برکت سے درگذر فرمائے اوراس کتاب کے ثواب سے مصنف کو محروم نہ کرے۔ اس سے بڑھ کر اور خسران کیا ہوگا کہ کوئی خلق اللہ تعالیٰ کی طرف بلائے اور نظر بہ خلق کے باعث اللہ تعالیٰ سے محجوب ہوجائے۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذالِكَ فَنَقولُ فِيُ خَاتِمَةُ الْكِتَاب: اَللّٰهُمَّ نَعُوذُ بِعَفوِكَ مِن عِقَابِكَ وَنَعُوذُ بِرَضَاكَ مِن سَخِطِكَ وَنَعُوذُ بِكَ مِنْكَ لَا تُحصٰى ثَنَاءً عَلَيْكَ انت كَمَا اثنيتَ عَلٰى نَفسِكَ وَالْحَمْدُ رَبِّ العَالَمِينَ وَالصَّلٰوةُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّالِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِينَ۔

(اس سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اوراس کتاب کے آخر میں کہتے ہیں کہ : بارِالٰہا ہم تیرے عتاب سے عفو کے لئے تیری پناہ چاہتے ہیں اور تیرے خشم سے تیری خوش نودی کے طالب ہیں اور تجھ کوتجھ سے تیری تعریف کہ جوشمار میں نہیں آتی تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی تعریف کی ہے ستایش ہے اس اللہ کے لئے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔اور درود ہے محمد ﷺ پر اوران کے پاک دامن خاندان پر)۔

اللہ تعالیٰ کا شکر' کہ شہید جس کے قرب وجوار میں زندہ ہیں اور روزی سے بہرہ مند ہیں۔وہ اللہ جس نے میری زندگی میں میری دستگیری کی یہاں تک کہ میں غزالیؒ کے احیاء کے فارسی ترجمے کی تکمیل کے بعد ان کی نوسو سالوں سے کچھ اوپر پرانی تصنیف **کیمیائے سعادت** کی تصحیح اور طباعت کا کام انجام دے سکا۔امید ہے میرا یہ تحقیقی کام ہمعصروں کی مسرّت اور بعد میں آنے والوں کی دعائے خیر کا مقدمہ ثابت ہوگا۔

حسین خدیو جم

ششم مہر ۱۳۶۱ھ دہم ذالحجہ ۱۴۰۲

پایان ترجمہ : بروز پیر ۱۰ ماہ ستمبر ۲۰۱۲ عیسوی۔کینیڈا۔

مترجم کیمیائے سعادت کی دیگر مطبوعات

اُردو ترجمہ دبیرِ عجم

علم معانی، علم بیان اور علم بدیع پر مولانا اصغر علی روحی کی یہ تالیف فارسی زبان میں ہے۔ صاحب موصوف ماضی قریب کے باکمال اساتذہ میں تھے۔ سخن سرائی اور موزونی طبع ایک خصوصی ودیعۂ خداوندی ہے۔ تاہم شاعر کو بھی مرحلۂ ابلاغ میں متذکرہ بالا علوم ہی معاونت کرتے ہیں۔ سخن سنجی کے لئے بھی انھی علوم پر دسترس لازم ہے۔ ورنہ اعلیٰ وادنیٰ اچھے برے شعر میں امتیاز ممکن نہیں۔ مولانا کی یہ تالیف دونوں کے لئے ہادی کا کام دیتی ہے۔ چونکہ مولانا کا اسلوبِ تکلّم وتحریر ادق اور عالمانہ فارسی میں تھا اس لئے تفہیم کے لئے اردو ترجمہ کی ضرورت تھی۔ دبیرِ عجم (اردو) کحلِ نظرنواز کی صورت میں حاضر ہے۔

قائداعظم سوونیئر ۱۹۷۶

قائداعظم صدی کی تقریبات میں ضلع رحیم یار خان سے سوونیئر کی صورت میں ایک ضخیم تالیف انگریزی اردو دونوں زبانوں میں تیار کی گئی۔ انگریزی حصے کی تالیف پروفیسر نسیم صدیقی نے کی تو اردو حصے کی تالیف پروفیسر عبدالعزیز جاوید کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ سوونیئر سید زاہد حسین مرحوم رئیسِ صادق آباد رحیم یارخان کے ہاں سے مل سکتا ہے۔

تذکرۂ خوشنویساں مؤلّفہ: غلام محمد دہلوی ہفت قلم

تاریخِ خط، اسالیبِ خطاطی اور سوانحِ خطّاطان کے ذکر پر مبنی یہ فارسی کتاب بھی اردو میں پروفیسر عبدالعزیز جاوید ہی کا ترجمہ کردہ ہے۔ اس میں ضمناً بعض نادر معلومات بھی ہیں جو بعض کم نظر بادشاہوں کی دوں ہمتی کی غماز ہیں۔

راہ آورد

پروفیسر عبدالعزیز جاوید کے فارسی اردو غزلوں، نظموں پر مشتمل دیوان کا پہلا ایڈیشن ہے۔ جسے سخن شناسوں نے بہ نظرِ تحسین دیکھا ہے۔

Designed By:
Khush Qalam Printers
Rahim Yar Khan